تاریخ سندھ

قبل از اسلام رائے حکومت سے لے کر 1947ء تک

اعجاز الحق قدوسی

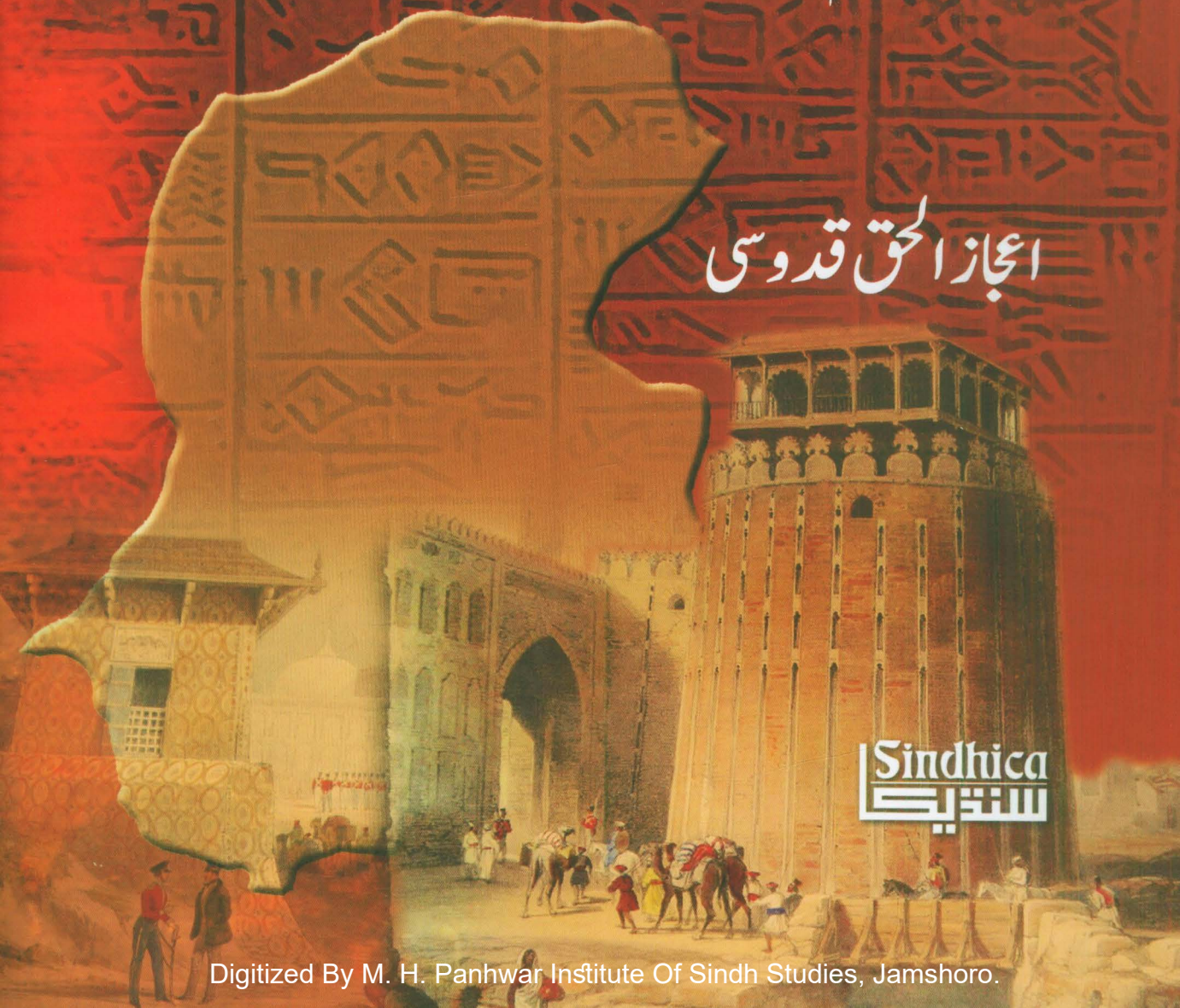

Sindhica
سندیکا

Digitized By M. H. Panhwar Institute Of Sindh Studies, Jamshoro.

تاریخ سندھ

قبل از اسلام رائے حکومت سے لے کر 1947ء تک

برہمن حکومت، عہد بنو امیہ، خلافت بنی عباس، حباری حکومت، اسماعیلی حکومت، غزنوی عہد حکومت، غوری حکومت، خاندان غلاماں کی حکومت، خلجیوں کی حکومت، تغلقوں کی حکومت اور سومرہ حکومت، سمّا حکومت، کلہوڑا حکومت، ٹالپور عہد اور انگریز دورِ حکومت کے تفصیلی واقعات پر مشتمل مستند اور جامع تاریخ

مرتب
اعجاز الحق قدوسی

Sindhica
سندیکا

بک نمبر
360

اشاعت اول: 1971ء
اشاعتِ جدید: 2014ء
کتاب کا نام: تاریخ سندھ (مکمل ۳ حصے)
مصنف: اعجاز الحق قدوسی
کمپوزنگ: عبید اللہ میمن
کمپیوٹر لے آؤٹ: ندیم احمد سولنگی
ناشر: سندھیکا اکیڈمی کراچی
طابع: آزاد کمیونیکیشنز، کراچی

ISBN # 978-969-9866-12-8

اسٹاکسٹ

سندھیکا اکیڈمی B-24، نیشنل آٹو پلازہ مارسٹن روڈ کراچی 74400. فون: 021-32737290
سندھیکا بوک شاپ: شاپ نمبر 5، مین نائین فلور، حیدرآباد ٹریڈ سینٹر، حیدر چوک، 03133692150-
سندھیکا بوک شاپ، 19 بلدیہ پلازہ گھنٹا گھر چوک، سکھر فون: 03352233803- 03013431537
سندھیکا بوک شاپ، افتراء سینٹر، جی پی او روڈ، لاڑکانو، فون: 0331-3480039
العماد بوک سیلرز، اردو بازار، کراچی فون: 0212214521، 0300-343115
کاٹھیاواڑ بوک اسٹور، اردو بازار کراچی - افضل بوک اسٹال، ماروئڑا گوٹھ، کراچی، فون 03333509236- کتاب مرکز فریئر روڈ، عزیز کتاب گھر بیرج روڈ، بخاری کتاب گھر، قادری بوک اسٹور، مہران بوک اسٹور، سندھ کتاب گھر، مجاہد بوک اسٹور نیم کی چاڑھی سکھر - سلمان کتاب گھر پنوعاقل - بھٹائی بوک ہاؤس حیدرآباد، فون: 03223011560 - سندھی ادبی بورڈ بوک شاپ، تلک چاڑھی حیدرآباد - شیریزدان بوک شاپ، درگاہ بھٹ شاہ - عثمانیہ لائبریری، چنیہانی کنڈیارو، فون: 0306-3665563، - نیشنل بوک اسٹور، نورانی بوک ڈپو بندر روڈ، رائیل کتاب گھر اسٹیشن روڈ، رہبر بوک اکیڈمی رابعہ سینٹر بندر روڈ لاڑکانہ - مدنی اسلامی کتبخانہ، نئوں چوک دادو - حافظ بوک اسٹور، خیرپور بوک اسٹور مسجد روڈ، خیرپور میرس - مشعل کتاب گھر، پڈعیدن فون: 03063291657 - المھران کتاب گھر، زاہد بوک ڈپو، سانگھڑ - سیدماس میگا اسٹور، جیکب آباد - میمن بوک اسٹور، شاہی بازار نوشہرو فیروز - حافظ اینڈ کمپنی، لیاقت مارکیٹ، نواب شاہ - دیدار بوک ڈپو، ٹنڈوالہیار - مرچولال پریمی، بدین - عطار کتاب گھر، بدین، مکتبہ یوسفیہ، میرپور خاص فون 0300-3319565، مہران کتاب گھر، عمرکوٹ، حافظ کتاب گھر، کپرو، سندھ کتاب گھر، مورو، سعید بوک اسٹور، شکارپور. سومرا بوک اسٹور میہڑ، ساحر کتاب گھر، کوندی میہڑ، فون: 0346-8948535، مکتبہ امام العصر گھوٹکی، فون: 03033695037

کتاب ملنے کا پتہ
سندھیکا اکیڈمی
B-24، نیشنل آٹو پلازہ، مارسٹن روڈ، کراچی 74400
فون: 021-32737290
ای میل: sindhicaacademy@gmail.com
ویب: www.sindhica.org

فہرست

تعارف.....11

باب:1

رائے حکومت.....13

رائے سیمرس.....13

باب:2

برہمن حکومت چچ بن سلاج 18

چندر 27

داھر 28

باب:3

ہندوستان میں اسلام کا پہلا مرکز 35

باب:4

عہد بنی اُمیہ 40

سندھ میں عہد معاویہ کے گورنر.....40

عبدالملک بن مروان.....43

ولید بن عبدالملک 44

سلیمان بن عبدالملک 99

محمد بن قاسم کے بعد کے گورنر.....104

حضرت عمر بن عبدالعزیز.....105

یزید بن عبدالملک 105

ہشام بن عبدالملک.....106

ولید ثانی بن یزید بن عبدالملک 109

باب:5:

خلافت بنی عباس 111

ابو العباس عبداللہ بن محمد، سفاح 111

ابو جعفر منصور 112

محمد بن منصور، مہدی 116

ہارون الرشید 116

محمد امین بن ہارون.....118

عبداللہ بن ہارون۔ مامون 119

ابو اسحاق محمد بن ہارون۔ معتصم باللہ.....120

ابو جعفر ہارون ملقب۔ بہ واثق باللہ.....121

جعفر بن معتصم ملقب۔ بہ متوکل علی اللہ.....121

باب:6:

سندھ میں ہباری حکومت 122

عمر بن عبدالعزیز ہباری 122

باب:7:

سندھ کی خودمختار اور آزاد ریاستیں 125

باب:8:

اسماعیلی حکومت 127

باب:9:

غزنوی عہد حکومت 134

محمود غزنوی.....135

سلطان مسعود.....138
سندھ میں غزنوی عہد کے گورنر.....139

باب10:
سندھ میں غوری حکومت 141
علاء الدین جہاں سوز.....141
سیف الدین ثانی.....142
غیاث الدین غوری.....142
سلطان شہاب الدین غوری.....142

باب11:
سندھ میں خاندان غلاماں کی حکومت 144
قطب الدین ایبک.....144
شمس الدین التمش.....145
سندھ میں خاندان غلاماں کے عہد کے گورنر.....149
سلطان غیاث الدین بلبن.....151
عہد بلبنی میں سندھ کے گورنر.....151

باب12:
سندھ میں خلجیوں کی حکومت 155
سلطان جلال الدین فیروز شاہ.....155
سندھ میں عہد جلال الدین کے گورنر.....155
سلطان علاء الدین خلجی.....156
عہد علاء الدین میں سندھ کے گورنر.....158
سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی.....159
خسرو خان.....159

باب13:
سندھ میں تغلقوں کی حکومت 163
غیاث الدین تغلق.....163
سلطان محمد شاہ تغلق.....164
عہد محمد شاہ تغلق میں سندھ کے گورنر.....164
سلطان فیروز محمد شاہ.....167
سلطان فیروز تغلق کے بعد.....173
غیاث الدین تغلق شاہ.....173
ابوبکر شاہ تغلق.....173
ناصر الدین محمد شاہ تغلق.....173
سلطان علاء الدین شاہ تغلق.....173
ناصر الدین محمود شاہ.....173
تیمور کا حملہ.....174

باب14:
سومرا حکومت.....175
سومرہ.....178
بھونگر.....178
دودا.....178
سنگھار.....179
ہموں.....179
پھٹو (فتح خاں).....179
خیرا.....179
ارمیل.....179
سومرہ دور کے رومانی قصے.....182

باب15:
سمہ حکومت.....187
فیروز الدین جام اُنڑ بن بابینہ.....188
صدر الدین جام بابینہ بن فیروز الدین شاہ جام اُنڑ
معروف علاء الدین جام جونہ.....189
رکن الدین جام تماچی بن فیروز الدین شاہ جام اُنڑ
معروف خیر الدین جام تماچی بن علاء الدین جام جونہ.....190
علاء الدین جام جونہ بن بابینہ.....193
سلطان رکن الدین شاہ جام تماچی ثانی.....193

جام صلاح الدین 194
جام نظام الدین بن جام صلاح الدین 194
جام علی شیر بن جام تماچی 195
جام کرن بن خیر الدین جام طغاچی بن علاء الدین جام جونہ 195
جام سکندر شاہ صدر الدین بن خیر الدین جام طغاچی
بن علاء الدین جام جونہ 195
جام فتح خاں بن صدر الدین سکندر شاہ 196
جام تغلق شاہ (جونہ) بن صدر الدین سکندر شاہ 198
جام مبارک 198
جام سکندر شاہ ثانی جام محمد عرف اُنڑ بن جام فتح خاں 199
سلطان صدر الدین شاہ جام سنجر عرف رائڈنہ بن
سلطان صلاح الدین شاہ جام (اُنڑ) (نمبر ۵) 199
جام نظام الدین (ثانی) معروف بہ جام نندہ 200
ناصر الدین ابو الفتح سلطان فیروز شاہ 204
سکے: 210

باب16:
شاہ حسن ارغون 216

باب: 17
میرزا عیسیٰ ترخان اول 238

باب: 18
سلطان محمود خان کوکل تاش 247

باب19:
بکھر کے مغل گورنر 252

باب20:
میرزا محمد باقی ترخان 255

باب21:
میرزا محمد پایندہ ترخان و میرزا جانی بیگ ترخان .. 267

باب22:
مغل گورنر 283
عہد اکبری (۱۰۰۰ھ – ۱۰۱۲ھ) 283
عہد جہانگیری (۱۰۱۴ھ – ۱۰۳۷ھ) 283
عہد شاہجہانی 285
عہد اورنگزیب عالمگیر 286
عہد حکومت معزالدین جہاندار شاہ (۱۱۲۴ھ) 288

باب23:
ٹھٹھہ کے مغل گورنروں کے حالات و ترتیب .. 290
عہد اکبری 290

باب24:
میرزا غازی کے درباری علماً و شعراً 311
عہد اورنگزیب 332
بعد عالمگیر 337
عہد حکومت 338
معز الدین جہاندار شاہ (۱۱۲۴ھ)
و محمد فرخ سیر (۱۱۲۴ھ تا ۱۱۳۱ھ) 338

باب: 25
کلہوڑا دور حکومت 344
کلہوڑا خاندان 344
چنے خان 346
کلہوڑے خان 347
میاں آدم شاہ 347
میاں الیاس محمد 349
میاں شاہ علی (عرف شاہل محمد) 349
میاں نصیر محمد کلہوڑا 350
میاں دین محمد 350
میاں یار محمد 352

میاں نور محمد کلہوڑہ 357
محمد مراد یاب خان 373
میاں غلام شاہ کلہوڑا 375
کچھ کی یورشیں 379
میاں محمد سرفراز خاں 383
ٹالپروں کی، دربار کلہوڑہ میں حیثیت 384
میاں محمود خاں کی مسند نشینی 385
میاں غلام نبی کی فرمانروائی 386
میاں عبدالنبی 391
صادق علی خاں 396
ہالانی کی جنگ 404
شعر و ادب 419
شاہ عبداللطیف بھٹائی 422
کلہوڑہ دور کے شہر اور عمارتیں 425

باب: 26
ٹالپوروں کا دور حکومت 428
ٹالپوروں کا عہد 428
میرانِ حیدرآباد 430
میر غلام علی خاں 432
میر کرم علی خاں 434
میر مراد علی خان 447
میر نور محمد خاں و میر محمد نصیر خاں 451
میرانِ حیدرآباد کی سیرت و شخصیت 473
میرانِ خیرپور -میر سہراب خان 475
میر رستم خان 477
میرانِ میرپور 493
ٹالپور عہد پر تبصرہ 498

باب: 27
سندھ میں انگریزوں کی آمد 507
میرانِ سندھ اور انگریز 510

ضمیمہ 514
اقرار نامہ 514
معاہدوں پر تبصرہ 517
جنگ میانی اور جنگ دبہ 524
جنگ دوآبہ (۲۴ مارچ ۱۸۴۳ء) 532
سندھ پر ۱۸۵۷ء کی تحریک کے اثرات 539

باب: 28 541
عہد انگریز 541
پہلا گورنر سندھ سرچارلس جیمز نیپیر
(Sir Charles James Napier) 541
کمشنر اول مسٹر پرنگل (Mr. Pringle) 542
کمشنر دوم سربارٹل فریئر (Sir Bartle Frere) 544
کمشنر سوم جنرل جیکب (Jaccob) 547
کمشنر چہارم مسٹر انواریٹی (Mr. J.D. Inverarity) 548
کمشنر پنجم مسٹر ایس مینسفیلڈ (Mr. S. Mansfild) 548
کمشنر ششم ایڈی رابرٹس (Eddy Roberts) 549
کمشنر ہفتم مسٹر ہیولاک (W.H. Havelock)
قائم مقام کمشنر سندھ 550
کمشنر ہشتم سرولیم میری ویدر (Si William Mere Wether) 550
کمشنر نہم ایف ڈی میلول (F.D. Melvill) قائم مقام کمشنر .. 551
کمشنر دہم ایچ۔ این۔ بی ارسکین
(Henry Nepier Bruce Erskine) 551
کمشنر یازدہم مسٹر ٹریور 552
کمشنر دوازدہم سر چارلس پرچرڈ (Sir Charles Purchard) 552.
کمشنر سیزدہم ایچ ای ایم جیمس (Mr. H.E.M James)
اسٹار آف انڈیا 553
کمشنر چہاردہم سرچارلس اولیونٹ
(Sir Charles Ollivant) قائم مقام کمشنر 553
مسٹر ایچ ای ایم جیمس (Mr. H.E.M James)
دوسری مرتبہ کمشنری سندھ پر 555

کمشنر پانزدہم مسٹر ونگیٹ (Mr. Wingate) قائم مقام کمشنر . 556
مسٹر آر جائیلس (Mr. R. Giles) قائم مقام کمشنر سندھ 556
مسٹر ایچ ای ایم جیمس (Mr. H.E.M James) کی
دوبارہ سندھ کی کمشنری پر آمد 557
مسٹر آر جائیلس (Mr. R. Giles) تیسری مرتبہ
کمشنری سندھ پر 557

باب: 29
سندھ میں انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کی
سیاسی تحریکیں 558
حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تحریک 561
سندھ میں حضرت سید احمد شہید کی تحریک 562

باب: 30
تحریک خلافت 574
ہجرت کابل کی تحریک 575

باب: 31
سندھ میں تحریک انقلاب(عرف ریشمی رومال) .579
سندھ میں ریشمی رومال کی تحریک کے لیڈر 580
شیخ عبدالرحیم 581
عبدالحق 581
شیخ ابراہیم سندھی 581
مولانا محمد صادق کھڈے والے 581
مولانا سید تاج محمود امروٹی 582
مولانا عبیداللہ سندھی 582
انڈین نیشنل کانگریس کا قیام 585
سندھ میں مسلم لیگ کا قیام 588
سندھ صوبائی اسمبلی ۱۹۳۷ء کے عام انتخابات 589
سندھ کے مسلم لیگی لیڈر 594
ہزہائی نس سر آغا خان سوم 594
رئیس غلام محمد بھرگڑی 594
حاجی سر عبداللہ ہارون 595
خان بہادر محمد ایوب کھوڑو 596
قاضی فضل اللہ 598
پیر الٰہی بخش 599
جی ایم سید 600
شیخ عبدالمجید سندھی 601
سید میراں محمد شاہ 603
حاجی محمد ہاشم گزدر 604
پیر غلام مجدد جان سرہندی 604
حاجی مولیٰ بخش سومرو 605
جناب اللہ بخش سومرو 606
پیر علی محمد راشدی 607

باب: 32
انیسویں اور بیسویں صدی کے علمائے کرام 609
مولانا عبدالغفور مفتون ہمایونی 609
مولانا حافظ اسد اللہ کلرائی 610
مولوی عبداللہ لغاری 611
پیر احسان اللہ شاہ راشدی 611
مولانا مفتی محمد صاحبداد 612
مولانا محمد قاسم گڑھی یاسینی 613
مولانا عبدالکریم چشتی 614
مولانا دین محمد وفائی 614

باب: 33 617
انگریزی عہد کے سندھی زبان کے مصنف، ادیب،
شاعر اور صحافی 617

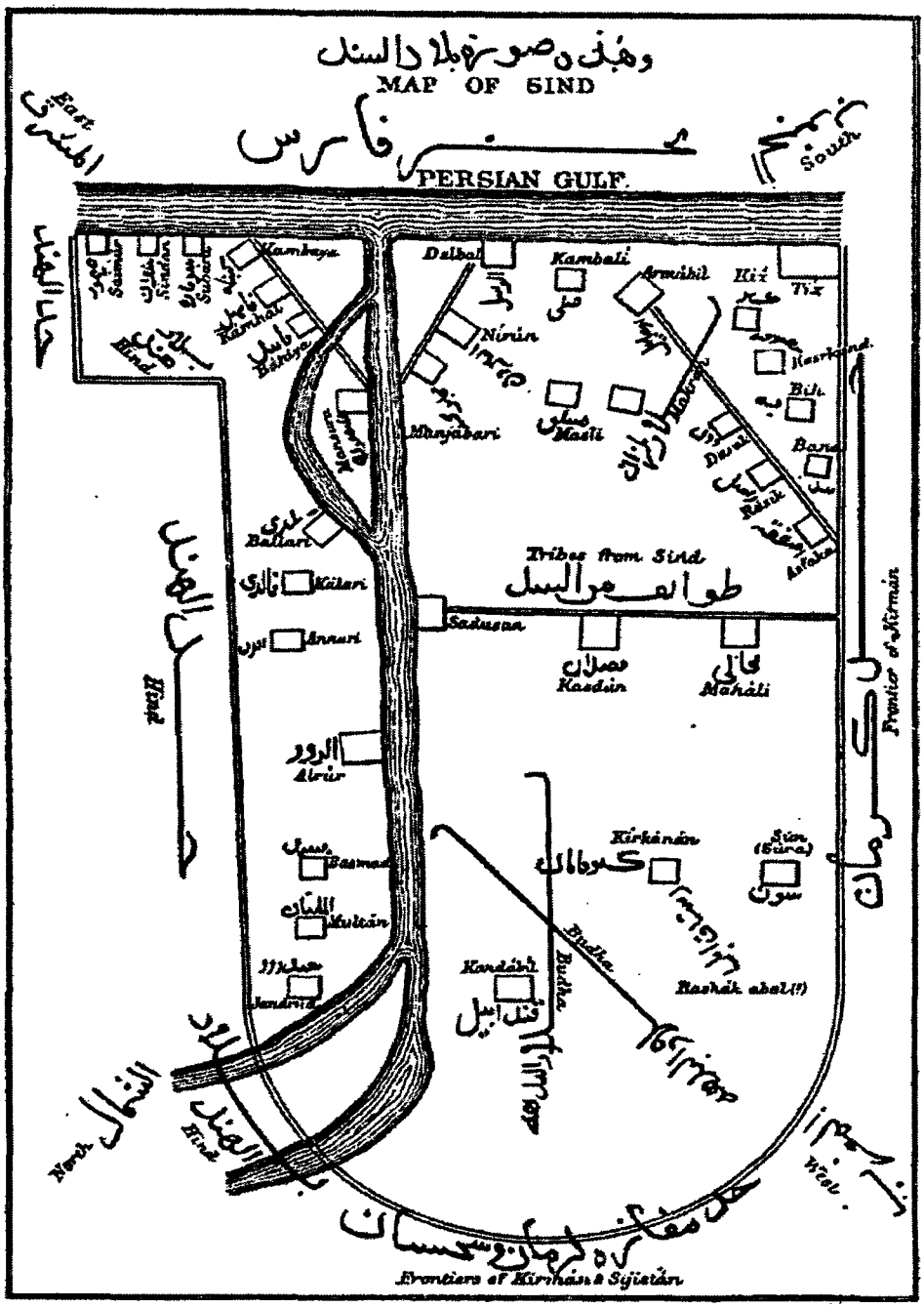

سندھ اور گجرات کا دنیا میں سب سے پہلا نقشہ

جو ابن حوقل بغدادی نے سنہ ۳۴۲ھ / 943ء میں تیار کیا۔

ایلیٹ کو یہ نقشہ نظام اودھ کے شاہی کتب خانے سے ملا۔

پیش لفظ

جس قدر پاک و ہند کے مسلمانوں کو سندھ کی تاریخ سے دلچسپی ہے، اسی قدر سندھ کی تاریخ پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں، کیونکہ ابھی تک اردو میں سندھ کی کوئی مفصل، جامع اور مستند تاریخ شائع نہیں ہوئی جو سندھ کے تمام ادوار کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہو، اور جس سے بیک وقت سندھ کی پوری تاریخ ہمارے سامنے آسکے۔

اس تشنگی کو دیکھ کر مجھے خیال پیدا ہوا کہ عام مطالعے کے لیے سندھ کی ایک ایسی مفصل تاریخ مرتب کی جائے، جو مغربی پاکستان کے اس صوبے کی سیاسی و معاشرتی تاریخ ہو اور جس سے ہر دور کی صحیح معاشرت، اخلاق اور انسانیت کے اعلیٰ نمونے سامنے آسکیں اور عبرت و بصیرت کے لیے ان کوتاہیوں کو بھی درج کیا جائے جو یہاں کے حکمرانوں سے سرزد ہوئیں، اور ساتھ ہی ساتھ اس خطے کی مسلمان حکومتوں اور حکمرانوں کے محاسن اور ان کی خدمات اور کارناموں کو بھی بیان کیا جائے، جن سے اس خطے کو بے شمار فوائد پہنچے۔

لیکن میرے لیے بڑی مشکل یہ تھی کہ موجودہ دور میں سندھ کی تاریخ کا مواد اس قدر منتشر اور متفرق حالت میں ہے کہ اس پر قلم اٹھانا بہت مشکل کام ہے، پھر سندھ کے مختلف ادوار کی تاریخ کے مآخذ اس قدر کم یاب بلکہ نایاب ہیں کہ ان کا حصول بہت مشکل ہے، کیونکہ سندھ کی تاریخ کے اکثر مآخذ ابھی تک شائع نہیں ہوئے، کچھ کتابیں اگر پہلے شائع ہوئی ہیں تو وہ اب ملتی نہیں، اگر وہ کسی کے پاس موجود ہیں بھی، تو اُن کے مالک ان کو نسخہ کیمیا بنائے ہوئے ہیں۔ ایسے حالات میں سندھ کی تاریخ پر قلم اٹھانا ایک بڑے عزم اور حوصلے کا کام تھا۔

میں نے خدا کا نام لے کر اس مشکل اور اہم کام کو شروع کیا اور مسلسل دو سال کی محنت و کاوش کے بعد تاریخ سندھ کی پہلی جلد پیش کر رہا ہوں جو رائے حکومت قبل اسلام سے لے کر سمہ عہد حکومت 928ھ (1521-22ء) تک ہے۔

اُردو میں سندھ کی تاریخ پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اُس کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہ کتابیں اس وقت لکھی گئی تھیں، جب کہ سندھ کی تاریخ کے مآخذ بالکل ہی کمیاب تھے، اور اس وقت سندھ کی تاریخ پر قلم اٹھانا ایک بہت ہی مشکل کام تھا، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ کتابیں سندھ سے دور بیٹھ کر لکھی گئیں، اس لیے ان کتابوں کے قارئین کو انہیں پڑھتے وقت بڑی تشنگی محسوس ہوتی ہے، میں نے اس جلد میں مسلمانوں کے حملے سے پہلے یہاں کی دو حکومتوں رائے اور برہمن حکومت کے حالات مختصر طور پر دیے ہیں، پھر اسلامی فتوحات کے مفصل حالات، خلافت راشدہ سے لے کر دسویں صدی ہجری کے اوائل تک جو حکومتیں یہاں قائم ہوئیں یا سندھ جن جن حکومتوں کے ماتحت رہا ان کی مفصل تاریخ اور ان حکومتوں نے جو اہم کارنامے انجام دیے ان کی تفصیل درج کی ہے، اس کے علاوہ بعض اہم رجال و بلاد کے متعلق ذیلی حواشی بھی دیے ہیں، ساتھ ہی مآخذ کے حوالے بھی ذیلی حواشی میں دے دیے گئے ہیں۔

میں اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کر سکیں گے لیکن جہاں تک میری سعی کا تعلق ہے، میں نے حتی الامکان واقعات کا اخذ و استناد اور تاریخی تسلسل میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔

میں گرامی قدر سید حسام الدین راشدی کا بہ صمیم قلب شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کے لکھتے وقت اس سلسلے کی بعض اہم کتابیں مجھے دیں اور اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا۔

میں آخر میں جناب محترم ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ صدر شعبہ تعلیم سندھ یونیورسٹی کا بھی بے حد شکر گزار ہوں کہ موصوف نے مرکزی اردو بورڈ لاہور کے ایما پر اس کتاب کے مسودے پر نظر ثانی فرمائی اور نہایت گراں قدر اور قیمتی مشورے دیے۔

اعجاز الحق قدوسی
قدوسی منزل 5/457، لیاقت آباد
کراچی---19

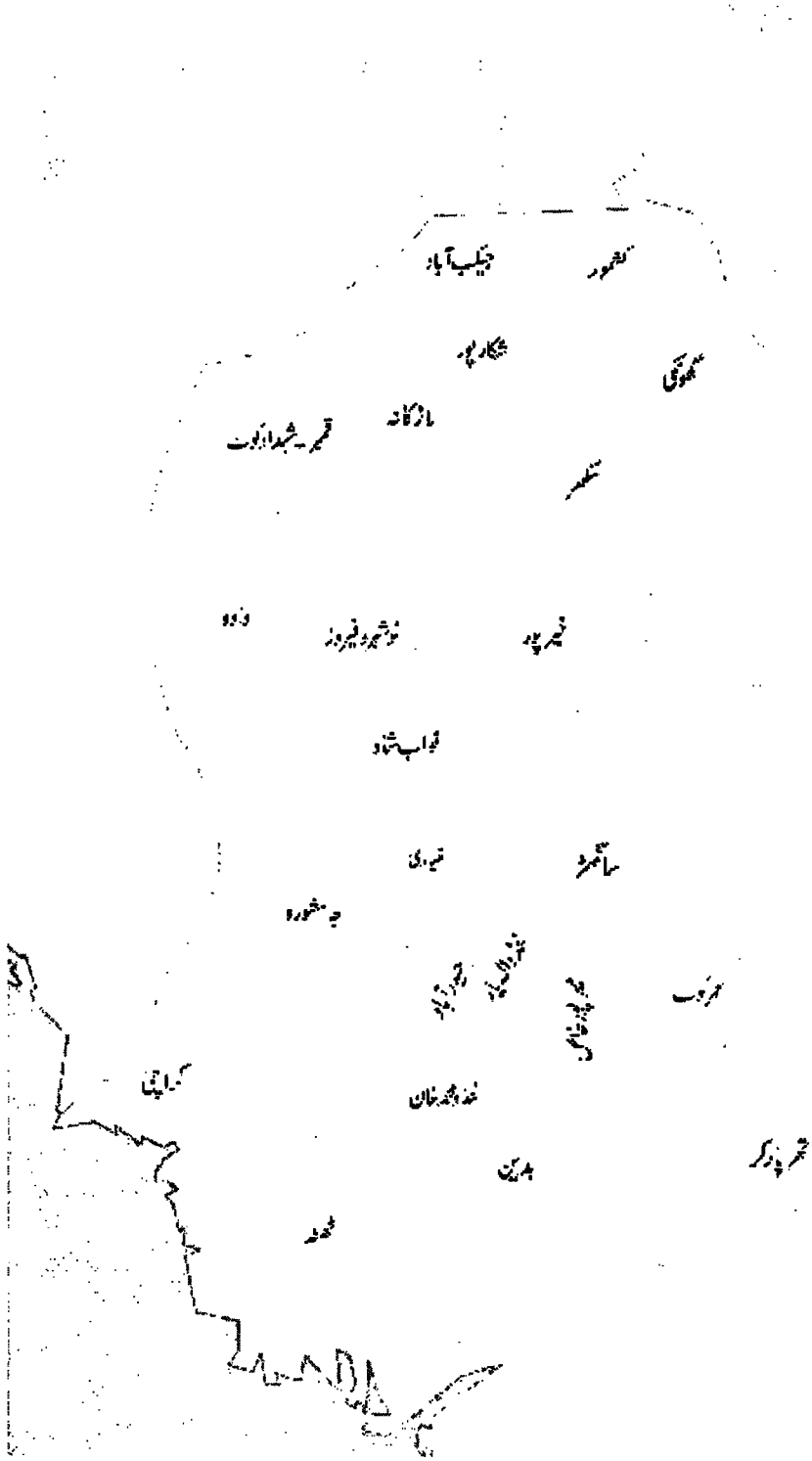

سندھ کا موجودہ نقشہ 2013ء

تعارف

سندھ

آج کل سندھ، پاکستان کا ایک جزو ہے، سندھ کا نام سن کر جو تصور ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ اسی چھوٹے سے ملک کا تصور ہوتا ہے، جو اس وقت پاکستان کا حصہ ہے، لیکن تیرہ سو سال پہلے سندھ کا اطلاق جس علاقے پر ہوتا تھا وہ بہت لمبا اور چوڑا تھا۔ اسلام سے پہلے راجا داہر کی حکومت کے زمانے میں جس ملک کو سندھ کے نام سے موسوم کرتے تھے، وہ سمت مغرب میں مکران تک، جنوب میں بحر عرب اور گجرات تک، مشرق میں موجودہ مالوہ کے وسط اور راجپوتانے تک اور شمال میں ملتان سے گزر کر جنوبی پنجاب کے اندر تک وسیع تھا اور عرب مورخین اسی سارے علاقے کو سندھ کہتے تھے۔

پھر یہ ملک اتنا قدیم ہے کہ اس کے متعلق یہ بھی نہیں بیان کیا جاسکتا کہ کب سے ہے اور اس کے نام میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ صرف تاریخ سے اتنا پتا چلتا ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے جب آریہ اس ملک میں آئے تو انھوں نے اس کا نام 'سندھو' رکھا، کیونکہ وہ اپنی زبان میں دریا کو 'سندھو' کہتے تھے۔ ابتداءً وہ اس ملک کو سندھو کہتے رہے، مگر آہستہ آہستہ وہ اسے سندھ کہنے لگے۔ یہ نام اس قدر مقبول ہوا کہ ہزاروں سال گزر جانے پر بھی اس کا نام سندھ ہی ہے۔ کہتے ہیں کہ شروع میں آریوں نے سندھ کے ادھر جتنے ملک فتح کیے، انھوں نے سب کا نام سندھ ہی رکھا۔ یہاں تک کہ پنجاب کی سرحد سے آگے بڑھ گئے مگر نام میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ جب گنگا تک پہنچ کر رک گئے تو اس کا نام آریہ ورت رکھا، مگر ہندوستان سے باہر اس نام کو شہرت حاصل نہ ہوئی۔

ایرانیوں نے اپنے لہجے میں سندھ کو ہند کر ڈالا اور یونانیوں نے 'ھ' کو اس کے قریب المخرج حرف ہمزہ سے بدل کر اند کر دیا، رومن میں یہ لفظ اندس اندیا ہو گیا اور انگریزی زبان میں چونکہ 'دال' نہیں اس لیے وہ انڈیا بن گیا۔

میر علی شیر قانع ٹھٹوی نے اپنی مشہور کتاب 'تحفتہ الکرام' کے مقدمے میں سندھ کے نام پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ ملک سندھ کا یہ نام حام بن نوح علیہ السلام کے صاحبزادے ہند کے بھائی سندھ کے نام پر مشہور

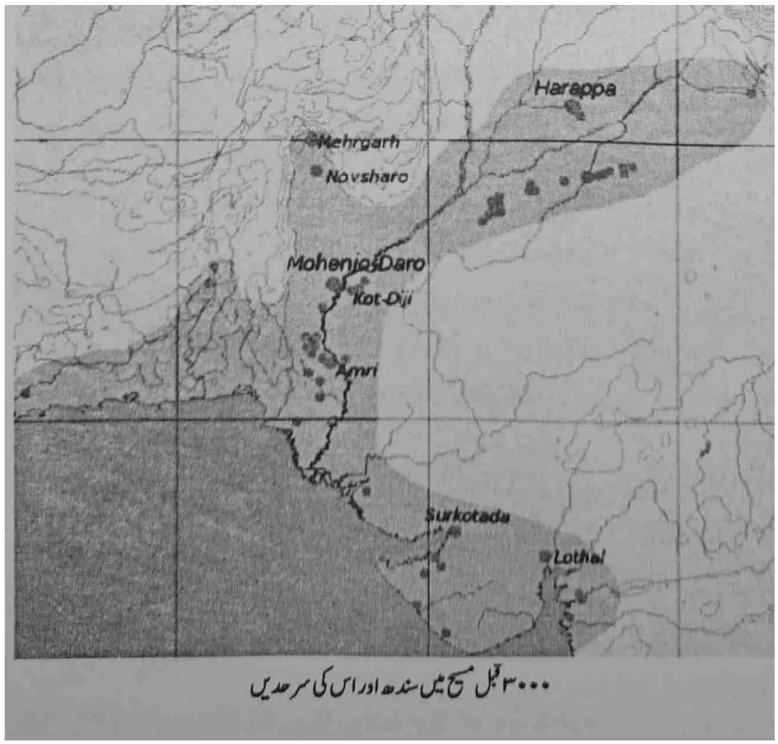

۳۰۰۰ قبل مسیح میں سندھ اور اس کی سرحدیں

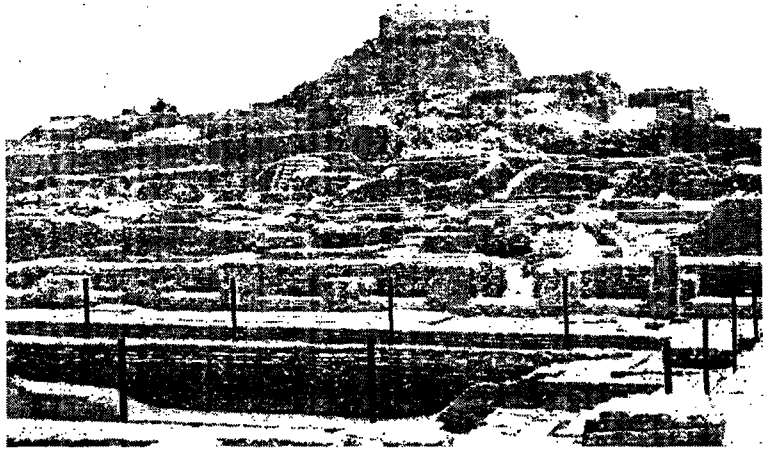

ہوا ہے۔ روئے زمین کے ممالک میں سے یہ تینتالیسویں ملک کا نام ہے۔ پہلی اقلیم اس کے شمال سے اور دوسری اس کے وسط سے گزرتی ہے۔

سندھ کی موجودہ حدود:

سندھ کی موجودہ حدود یہ ہیں کہ اس کے شمال کی طرف پنجاب اور بلوچستان، شمال مغرب کی جانب کوہ ہالار بلوچستان سے علیحدہ کرتا ہے، مشرق کی طرف ریاست جودھ پور، بہاولپور اور جیسلمیر، جنوب میں 'کچھ' کا ریگستان اور بحر عرب اور مغرب میں بحیرۂ عرب کوہ ہالار اور بلوچستان ہیں۔

سندھ کا رقبہ اور شہر:

سندھ کا کل رقبہ ۵۴۴۰۸ میل اور ۱۴۰۹۱۵ کلو میٹر ہے اور اس کے ۲۴ اضلاع ۱۱۹ ٹاؤن اور ۱۱۰۸ یونین کاؤنسلز ہیں۔ سندھ کے مشہور شہر یہ ہیں: حیدرآباد، شہید بے نظیر آباد، میرپور خاص، سانگھڑ، خیرپور، نوشہرو فیروز، بدین، تھرپارکر، لاڑکانہ، سکھر، روہڑی، ٹھٹھہ، شکارپور اور جیکب آباد۔

سندھ کا خطہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصے کو بالائی سندھ اور دوسرے کو زیریں سندھ کہتے ہیں۔ بالائی سندھ کو شمالی سندھ اور زیریں سندھ کو جنوبی سندھ بھی کہتے ہیں۔

دریا اور اس کی شاخیں

سرزمین سندھ میں جو دریا بہتا ہے اُسے مہران اور دریائے سندھ بھی کہتے ہیں۔ یہ دریا ملک تبت کیلاس پہاڑ سے نکل کر کشمیر، پنجاب اور صوبہ سرحد سے چل کر مٹھن کوٹ کے قریب پانچوں دریا پنجاب میں شامل ہو کر کشمور شہر کے قریب سندھ میں داخل ہوتا ہے اور جنوب مغرب میں سات سو میل بہہ کر کیٹی بندر کے متصل کئی شاخوں میں تقسیم ہو کر میدانوں میں بہتا ہوا بحر عرب میں گرتا ہے۔

دریائے سندھ کی شاخیں

دریائے سندھ کی بڑی بڑی شاخیں یہ ہیں:

۱۔ مشرقی نارو

یہ شاخ دریائے سندھ کے مشرقی کنارے روہڑی کے قریب سے نکلتی ہے۔

۲۔ مغربی نارو

یہ شاخ دریائے سندھ کے مغربی کنارے ضلع لاڑکانہ سے نکل کر جھیل منچھر میں جا گرتی ہے۔

۳۔ گھاڑ

یہ شاخ مغربی نارو کے شمال ضلع لاڑکانہ ہی میں دریائے سندھ سے نکلتی ہے اور مغرب کی طرف بہتی ہے۔

۴۔ پھلیلی

یہ شاخ حیدرآباد کے قریب سے نکلتی ہے اور کچھ کے ریگستان تک جاتی ہے۔

۵۔ پنجاری، جاڑو اور بگھاڑ

یہ تینوں شاخیں کراچی کے متصل سے نکلتی ہیں۔

زبان

سندھ کی قومی زبان سندھی ہے۔ اس زبان کا رسم الخط عربی سے ملتا جلتا ہے۔ مختلف خطوں کے لہجے الگ الگ ہیں، لیکن تلفظ میں شیرینیت اور لہجے میں ایک دلکشی پائی جاتی ہے۔

باب :1

رائے حکومت

قبل از اسلام تا ۶۳۲ء (۱۱ ہجری)

اسلام سے پہلے سندھ میں جو راجا حکومت کرتے تھے وہ رائے کہلاتے تھے، جناب سرور کائنات ﷺ کی ہجرت سے پہلے یہاں رائے حکومت تھی اور یہ حکومت ایک سو سینتیس سال تک رہی۔ اس حکومت کے پانچ راجا گزرے ہیں جو عقیدتاً بدھ مذہب کے پیرو تھے، اُن کے نام یہ ہیں:

۱۔ رائے ڈیوانج۔
۲۔ رائے سیھرس۔
۳۔ رائے ساہسی۔
۴۔ رائے سیھرس ثانی۔
۵۔ رائے ساہسی ثانی۔

رائے سیھرس

ہمیں اس تاریخ کو چونکہ اسلامی حکومت سے شروع کرنا ہے، اس لیے واقعات کے تسلسل کو قائم کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس تاریخ کو رائے سیھرس بن ساہسی کے حالات سے شروع کریں، تاکہ ہندوؤں کی آخری حکومت کا ہلکا سا خاکہ سامنے آسکے۔ سندھ کی قدیم تاریخوں سے پتا چلتا ہے کہ اسلام سے قبل سندھ میں رائے خاندان کی حکومت تھی، اور اس خاندان کا پہلا راجا رائے ڈیوانج تھا، اور جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی اس وقت سندھ میں رائے سیھرس بن ساہسی کی حکومت تھی، اور اس وقت سندھ کا دارالحکومت شہر اروڑ (الور)[1] تھا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس شہر میں عالیشان عمارتیں، سرسبز باغات، ہری بھری کھیتیاں اور قسم قسم کے درخت تھے، جس سے شہر کی خوبصورتی اور رونق دوبالا ہوگئی تھی۔ راجا سیھرس نہایت دولتمند تھا اور اس کا خزانہ مال و دولت سے معمور تھا۔ وہ اپنے اخلاق و سیرت کے اعتبار سے بھی بہت نیک نام تھا۔ اس نے اپنی فطری فیاضی و سخاوت سے رعایا کے دلوں کو موہ لیا تھا۔ اس کے عدل و انصاف کی وجہ سے رعایا کا ہر فرد اس کی اطاعت کو اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا۔

راجا سیھرس کی حدود حکومت:

راجا سیھرس کی حدود حکومت بہت وسیع تھی۔ اس کی حکومت کی حدود مشرق میں کشمیر، مغرب میں مکران، جنوب میں دریائے محیط اور دیبل اور ساحل سمندر تک اور شمال میں کوہ کردان[2] اور کیکانان[3] تک تھیں۔

---

[1] الور یا اروڑ قرن ششم مسیحی سے سنہ ۷۱۱ء تک رایوں اور برہمنوں کے عہد حکومت میں سندھ کا دارالسلطنت تھا، اور آج اس نام کا ایک گاؤں قصبہ روہڑی سے جنوب مشرق میں پانچ میل کے فاصلے پر اسی قدیم جگہ پر آباد ہے۔ (تعلیقات تاریخ طاہری، صفحہ ۲۸۹، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ)۔

[2] کردوں کے پہاڑ، کرمان اور مکران کے سرحدی پہاڑوں کو سمجھنا چاہیے۔ ویسے کرد قبائل زیادہ تر ترکمان سے کافی دور شمال میں ایران اور عراق کی سرحد پر ہیں۔ مگر کرد، کنج اور بلوچ ایک ہی جیسا تاریخی پس منظر اور کنج (قفص یا کوچ) رکھتے ہیں اور بلوچ قبائل کی بستیاں کرمان اور مکران کی سرحد پر قدیم زمانے سے آباد تھیں۔ اندازاً نوشکی کے جنوب مغرب میں واقع پہاڑوں کو کردوں کے پہاڑ تصور کرنا چاہیے۔

[3] کیکانان وہ ملک ہے جسے رائے خاندان کے زمانے میں چین کے مشہور سیاح ہوان سانگ نے "کی کیانگ نا" کے نام سے پکارا ہے۔ (کننگھام: قدیم جغرافیہ، صفحہ ۱۰۰) ہوان سانگ کے بیان اور عرب مؤرخوں کے متعدد حوالوں کی بنا پر ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی رائے میں ملک کیکانان، نوشکی کے قریب قصدار اور قندابیل (گنداوا) کے درمیان والا علاقہ تھا۔ یہاں متن میں جس سرحد کا ذکر

سیھرس حکومت کے صوبے:

راجا سیھرس نے اپنی مملکت کو چار صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا، جس میں اس نے چار صوبیدار مقرر کر رکھے تھے۔

۱۔ صوبہ برہمن آباد:

اس صوبے میں نیرون، دیبل، لوہانہ، لاکھ اور سمہ شامل تھے۔

۲۔ صوبہ سیوستان:

اس صوبے میں بودہیہ (بودہی ممالک) چنکان، رونجھان اور کوہ پایہ سے لے کر سرحد مکران کا علاقہ شامل تھا۔

۳۔ صوبہ اسکلندہ:

اس صوبے میں بھانیہ، تلواڑہ، بچ پور اور دیوہ پور کی کچھ زمین شامل تھی۔

۴۔ صوبہ ملتان:

اس صوبے کے تحت سکھ، برہم پور، کرور، اشہار اور تاکیہ سے لے کر کشمیر کی حدود تک کے علاقے شامل تھے۔ اس صوبے کی سرحد کشمیر سے جاملتی تھی۔

ہر صوبے پر ایک گورنر تھا، جو اس صوبے کے نظم و نسق کو چلاتا تھا۔ راجا خود الور میں رہتا تھا اور کردان و کیکانان اور برہاس پر براہ راست اس کی نگرانی تھی۔ ہر ایک گورنر کو راجا کا حکم تھا کہ وہ کیل کانٹے سے لیس رہے تاکہ کوئی دشمن حملہ آور نہ ہو سکے۔ ساتھ ہی ان کو اس کی بھی تاکید تھی کہ رعایا کے مفاد کو ہمیشہ مد نظر رکھیں اور اپنے محکوم علاقوں کی حفاظت کریں اور بڑے زمینداروں کو مطمئن رکھیں۔

راجا سیھرس کے اس حسن انتظام کی بدولت ملک میں امن و امان تھا اور ایک طویل عرصے تک کوئی بغاوت و سرکشی کسی جانب سے رونما نہیں ہوئی۔

ایرانیوں کا حملہ:

اچانک نیمروز[1] کے بادشاہ نے کرمان کے راستے سے سندھ پر حملہ کیا اور کیچ و مکران پہنچ کر جو اس وقت سندھ کے ماتحت تھا، لوٹ مار مچائی اور بہت سے لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ راجا سیھرس کو جب اس حملے کا علم ہوا تو وہ فوراً ہی قلعہ الور سے اس ظلم کا انتقام لینے کے لیے ایک لشکر جرار لے کر مکران پہنچا، اور دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن سیھرس کا آفتاب اقبال زوال پذیر تھا۔ دونوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی اور سیھرس مارا گیا۔[2]

معصومی میں ہے کہ راجا سیھرس بڑی شجاعت اور بہادری سے لڑ رہا تھا کہ اتفاقاً ایک تیر راجا کے گلے میں آکر لگا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا اور اس کی فوج منتشر ہو گئی۔ اس کے بعد نیمروز کے بادشاہ کے لشکر نے خوب لوٹ مار مچائی۔ دوسرے دن سندھیوں کا منتشر لشکر جمع ہوا اور الور کی طرف لوٹ گیا۔ جب یہ لشکر الور پہنچا اور الور والوں کو معلوم ہوا کہ راجا سیھرس مارا گیا تو راجا کے امیروں نے آپس میں مشورہ کر کے سیھرس کے بیٹے سہاسی کو تخت نشین بنایا اور ایک جشن عظیم ترتیب دے کر اس پر زر و جواہر نچھاور کیے۔[3] اس لڑائی میں ساہسی کے قبضے سے بلوچستان اور مکران کا علاقہ نکل کر ایرانیوں کے قبضے میں چلا گیا۔

رائے ساہسی

رائے ساہسی بھی اپنے باپ کی طرح بہت نیک تھا۔ عدل و انصاف، اخلاق، کرم و حلم، تواضع اور سیاست سے متصف تھا۔ اس کی بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی ہر صفت سے بر محل اور بر موقع کام لیتا تھا۔ اس نے زمام حکومت سنبھالنے کے ایک سال بعد پورے ملک کا دورہ کیا۔ ہر شہر میں پہنچا، وہاں کے لوگوں سے ملا، ان کے درد و دکھ کو معلوم کیا۔ ہر جگہ مفسدین اور باغیوں کا قلع و قمع کیا۔ ملک کے حالات سے بخوبی واقف ہونے کے بعد ساہسی نے حکومت کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لیے کچھ ضوابط اور قواعد مرتب کیے۔ چاروں صوبوں کے گورنروں نے اس کے سامنے سر اطاعت خم کیا۔[4]

ہے، اس سے مراد سرحد کیکانان ہے، یعنی کوہ سلیمان کی اسی قطار کا وہ حصہ جو دریائے گومل سے لے کر نوشکی تک پہنچتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے گویا موجودہ ریاست قلات بلکہ سراوان اور جھالاوان کی ریاستیں بھی اسی خاندان کی مملکت میں شامل تھیں۔

(1) نیمروز: قدیم زمانے میں ملک نیمروز ان خطوں پر مشتمل تھا: فارس، اصفہان، اہواز، بست، زابل، سجستان، سندھ، مکران اور کرمان۔ بعد میں یہ نام سجستان (سیستان) اور اس کے نواحی علاقوں پر بولا جانے لگا۔ (دیکھیے الخفا کتاب شفاء العلیل، صفحہ 334) (تعلیقات چچ نامہ ترجمہ سندھی، صفحہ ۴۰۵ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ۔

(2) یہ تمام تفصیل چچ نامہ شائع کردہ مخطوطات فارسیہ حیدرآباد دکن کے صفحات ۱۵،۱۶،۱۷ سے ماخوذ ہے۔

(3) تاریخ معصومی صفحہ ۹۔

(4) چچ نامہ صفحہ ۱۶۔

ساہسی حکومت کے ضابطے:

ساہسی نے انتظام ملکی و مالی کے لیے چار ضابطے مرتب کیے تھے جنھیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

۱۔ پہلا ضابطہ لشکریوں سے متعلق تھا، اُس میں اس نے لکھا تھا کہ فوجیوں کی جو بھی تنخواہ مقرر ہے وہ انھیں بروقت ملنی چاہیے۔

۲۔ دوسرے ضابطے میں تحریر تھا کہ رعایا سے جو بھی خراج و عشر وصول کیا جاتا ہے وہ تین قسطوں میں وصول کرنا چاہیے۔

رعایا پروری کے مد نظر اُس نے حکم دیا تھا کہ رعایا میں سے جو غلے اور نقد کی صورت میں محصول ادا نہیں کر سکتا۔ وہ الور، سیوستان، اوچھ، مانیلہ، مُود اور سورائی کے قلعوں کو مرتفع کرنے میں مدد دیں۔ ایسے لوگوں کا محصول ان کی محنت کے معاوض میں محسوب کر دیا جائے گا۔

۳۔ ضابطۂ سوم میں اس نے ملک کے تاجروں کو ہدایت دی تھی کہ حکومت کی جانب سے جو اُن پر ٹیکس عائد ہے، انھیں بغیر کسی مطالبے کے بروقت ادا کرنا چاہیے۔

۴۔ چوتھا ضابطہ اہل صنعت و حرفت سے متعلق تھا۔ خصوصاً اُن پیشہ وروں سے اس کا تعلق تھا جو دیوانی سے کسی سرکاری خدمت کی ادائیگی پر متعین تھے اور اپنی خدمات کی وجہ سے مختلف شہروں میں قیام کیے ہوئے تھے۔[1]

رائے ساہسی نے دانائی، عقل و تدبر سے اپنی حکومت کو مستحکم کیا۔

بدھیمن وزیر:

ساہسی کا وزیر بدھیمن نامی ایک شخص تھا۔ بدھیمن کا منشی میر منشی یا نائب رام نامی ایک شخص تھا۔ معصومی میں ہے کہ ساہسی کو اپنے وزیر پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے اس کو جزو کل کا بالکلیہ مختار بنا رکھا تھا اور بدھیمن بھی اپنے فرائض کو نہایت دیانت اور احتیاط سے انجام دیتا تھا۔ رام کو بھی بدھیمن کی وجہ سے ایک گونہ اعتماد ساہسی کی نظر میں حاصل ہو گیا تھا۔ بعض اوقات ضروری کاغذات پر دستخط لینے کے لیے وہ محل سرا میں آتا جاتا تھا۔

چچ کی آمد:

ایک دن جب کہ دفتر میں بدھیمن اور رام بیٹھے ہوئے تھے، ایک نوجوان برہمن ان سے ملنے کے لیے آیا اور ان کی نہایت فصیح اور بلیغ الفاظ میں تعریف کرنے لگا۔ رام نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کس غرض سے آئے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ میرا نام چچ ہے اور میرے والد کا نام سیلاج اور میرے بھائی کا نام چندر ہے۔ میرا باپ اور بھائی اسی شہر الور کے ایک مندر کے پجاری ہیں، جو راجا پر جا اور آپ کے لیے ہر وقت دعا کرتے ہیں۔ کیونکہ ادھیراج مہاراج اور آپ کی وجہ سے پوری مملکت میں امن ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں حضور سے ملاقات کروں، اور اس ملاقات کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بلاغت و فصاحت نیک بختی کی دلیل ہوتی ہے۔ میرا خیال ہوا کہ میں اس ذریعے سے ملک اور قوم کی خدمت کر سکوں گا۔

چچ نے یہ باتیں کچھ ایسے ڈھنگ سے کیں کہ رام اس کی قابلیت سے بے حد متاثر ہوا۔ رام نے کہا کہ تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم غیر معمولی صلاحیت و استعداد رکھتے ہو۔ بلاشبہ تمہاری فصاحت میں شک نہیں، لیکن کیا تم قانون اور اخلاق سے بھی واقف ہو؟ چچ نے جواب دیا خدا کا شکر ہے کہ میں چاروں ویدوں کا عالم ہوں اور مجھے چاروں وید حفظ ہیں۔ جو بھی خدمت میرے سپرد کی جائے گی میں اس کو ذمہ داری، خلوص، دیانت اور احتیاط کے ساتھ انجام دوں گا۔

دیبل کے خطوط:

اتفاق سے جب یہ دونوں باتیں کر رہے تھے، سکہ و دیبل سے چند ضروری خطوط جواب طلب وصول ہوئے۔ رام نے یہ خط چچ کو دیے کہ وہ پڑھ کر بتائے کہ ان میں کیا لکھا ہے؟ چچ نے بہترین طریقے سے اُن خطوط کے مضامین کو پڑھ کر سنایا، اور ان کا جواب بھی نہایت اچھے الفاظ میں لکھ کر رام کے سامنے پیش کیا۔ رام اس کی قابلیت کو معلوم کر کے بے حد خوش ہوا اور اس کی بڑی تعریف کی اور بیش قیمت انعام سے سرفراز کیا اور کہا کہ تم اس قابل ہو کہ تم میرے نائب بن کر کام کرو۔ چچ نے اس کو قبول کر لیا اور تھوڑی ہی مدت میں وہ اپنے فن میں یکتا ہو گیا۔[2]

ساہسی کے دربار میں چچ کی حاضری:

چچ نے نائب وزیر بن کر خوب شہرت حاصل کی، یہاں تک کہ وہ دیوان رسائل (وزیر مراسلات) کے نام سے پکارا جانے لگا۔ شہر میں اس کی قابلیت کے ہر جگہ چرچے ہونے لگے۔ ایک دن راجا دربار میں تھا، شہر

---

[1] یہ چاروں ضابطے تاریخ معصومی کے صفحہ 10 پر مذکور ہیں۔

[2] یہ تمام تفصیل چچ نامہ صفحات 18,17 سے ماخوذ ہے۔

کے اُمراء و اکابر سب جمع تھے، سیوستان سے کچھ ضروری کاغذات آئے، جن کا جواب دینا اسی وقت ضروری تھا۔ راجا نے فوراً رام کو طلب کیا، اتفاقاً اس وقت دفتر میں رام موجود نہ تھا۔ چچ نے راجا کے آدمیوں سے کہا کہ اس وقت رام تو موجود نہیں، میں ان کا نائب ہوں، اگر کوئی ضروری کام ہو تو میں حاضر ہوں۔ راجا کے آدمیوں نے جا کر راجا سے اس کی بات کہی، راجا نے فوراً چچ کو بلوایا اور وہ کاغذات اس کے حوالے کیے، جس کا اس نے بہترین اور خوشخط جواب لکھا اور بہت ہی عمدگی سے پیش کیا۔ راجا خود بھی خوشخطی سے اُنس رکھتا تھا اور بلاغت کے اصولوں سے واقف تھا، وہ چچ کی قابلیت سے بے حد متاثر ہوا اور اس کے طرز تحریر کو بہت پسند کیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب راجا، رام سے ملا تو اس نے کہا کہ تمہارا نائب نہایت عقلمند، ذہین، فصیح اور خوش قلم ہے۔ تمھیں یہ قابل انسان کہاں سے مل گیا۔ تم اس کا خاص خیال رکھو اور اس کے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آیا کرو۔ رام نے جواب دیا، یہ سیلاج برہمن کا بیٹا ہے، نہایت ہی نیک اور دیانتدار اور تجربہ کار ہے۔

رام نے جب یہ دیکھا کہ راجا، چچ پر بہت مہربان ہے تو اس نے سارے امور کو اس کے سپرد کر دیا۔ اس طرح چچ کو راجا کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل ہو گیا۔ وہ امور سلطنت کو نہایت خوبی سے انجام دیتا تھا۔ راجا اس سے بہت خوش تھا۔ جب بھی وہ راجا کے پاس جاتا تھا، راجا اس کی خوبیوں اور کارگزاریوں کے پیش نظر اس کو انعامات و خلعت سے نوازتا اور کہا کرتا تھا: "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نوجوان سے ہمارے ملک کی انتظامی حالت درست ہو گی اور یہ ملک کی کوئی اہم خدمت انجام دے گا"۔[1]

چچ کی وزارت:

چند روز کے بعد رام کا انتقال ہو گیا۔ رائے ساہسی نے چچ کو بلا کر باقاعدہ قلمدان وزارت اس کے سپرد کیا اور وہ نہایت عمدگی سے امور وزارت انجام دینے لگا۔

ایک دن رائے ساہسی اپنے محل میں تھا کہ چچ راجا کی ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ راجا نے اس کو محل میں بلوالیا۔ جب چچ محل میں پہنچا تو اُس وقت راجا کے پاس اس کی رانی سونھن دیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ چچ کے آنے کی اطلاع جب راجا کو ہوئی تو اس نے رانی سے کہا، تم پردے میں ہو جاؤ، چچ آرہا ہے۔ رانی نے کہا کہ کتنے معمولی لوگ تو محل میں بے جھجک آتے ہیں، اور چچ تو برہمن ہے، اس سے پردے کی کیا ضرورت ہے؟ ساہسی رانی کی یہ بات سن کر خاموش ہو گیا اور چچ کو بلالیا۔ چچ نے راجا کے سامنے حاضر ہو کر نہایت فصاحت سے اپنا مطلب پیش کیا۔[2]

رانی کی فریفتگی:

صاحب چچ نامہ کا بیان ہے کہ چچ ایک خوبصورت نوجوان تھا، اُس کا قد لمبا، اعضا متناسب اور رخسار چمکدار تھے۔ رانی سونھن دیوی کو چچ کے حسن و جمال اور قابلیت نے بے حد متاثر کیا، اور وہ اس کی محبت میں عقل و ہوش کھو بیٹھی۔ اُس نے چچ کو ورغلانا چاہا، اور کہلا بھیجا کہ اگر تم میری محبت کو ٹھکرا دو گے تو میں خودکشی کر لوں گی۔ چچ نے اُسے جواب دیا کہ میں ایک برہمن ہوں، میرا باپ اور بھائی دونوں اب بھی پجاری ہیں اور وہ اس وقت بھی خدا کی عبادت میں مصروف ہیں، مجھ سے آپ کو کسی نمک حرامی کی توقع نہ رکھنی چاہئے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بادشاہوں کی نوکری میں انسان ہمیشہ خوف اور امید کے درمیان رہتا ہے۔ انسان کو ان چیزوں پر کبھی اعتبار نہ کرنا چاہیے، بادشاہ، آگ اور سانپ، بہر حال میں اس بدنامی کا داغ اپنے دامن پر نہیں لے سکتا اور آپ کو اس سلسلے میں مجھ سے کوئی امید نہ رکھنی چاہئے۔ رانی کو جب چچ کی جانب سے یہ کورا جواب ملا تو اس نے اُس کے جواب میں دوبارہ کہلا بھیجا "اگر تم کو یہ پسند نہیں تو کم از کم مجھے ہر روز اپنے دیدار سے مشرف کرتے رہو، میں اس پر بھی خوش ہوں۔ چچ اس پر راضی ہو گیا اور محبت اپنی منزلیں طے کرنے لگی، یہاں تک کہ رائے ساہسی بیمار پڑا۔ مختلف علاج معالجے ہوتے رہے، لیکن اس کی زندگی کی کوئی امید نہ رہی۔[3]

رانی سونھن دیوی کا مشورہ:

رانی سونھن دیوی نے یہ حالت دیکھ کر ایک دن چچ کو بلوایا اور کہا کہ تم دیکھتے ہو کہ رائے کی بیماری کس قدر طوالت پکڑ چکی ہے۔ مجھے اس کی موت کا یقین ہونے لگا ہے، تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ نہ میری کوئی اولاد ہے اور نہ میرا کوئی ہمدرد، رہے یہ نام کے رشتے دار اور عزیز جنہیں تم دیکھتے ہو، یہ سب اس تاک میں ہیں کہ ادھر راجا مرے اور ادھر وہ

---

[1] چچ نامہ صفحات 17-19۔

[2] چچ نامہ صفحہ 20۔

[3] چچ نامہ صفحات 22-23۔

تخت پر قابض ہو جائیں، مجھے ان سے ہر قسم کا خطرہ ہے، جب وہ راجا کی زندگی میں مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تو اس کے مرنے کے بعد تو یہ پوری طرح آزاد ہوں گے اور کوئی دقیقہ میری برائی میں اٹھا نہ رکھیں گے۔ اس وقت ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے، اگر اس پر عمل کیا گیا تو ہماری امیدیں کامیاب ہوں گی اور تم تخت و تاج کے مالک ٹھہرو گے۔ یہ کہہ کر اس نے حکم دیا کہ کل دربار عام منعقد ہو اور سب امیر و کبیر جمع ہوں۔ دوسرے دن جب سب جمع ہوئے تو اس نے راجا کے ہاتھ سے انگوٹھی اُتاری اور اس کو لے کر دربار میں آئی۔ رانی کو دیکھ کر سارے دربار میں سناٹا چھا گیا، سب اُسے دیکھ کر مؤدب بیٹھ گئے۔ اس نے درباریوں سے کہا کہ راجا کی حالت خراب ہے، وہ خود بیماری اور ضعف کی وجہ سے دربار میں تشریف نہیں لاسکتے، اُنھوں نے یہ اپنی انگوٹھی مجھے دی ہے اور حکم دیا ہے کہ میں تم سے کہوں کہ چچ کو تخت نشین کر کے سب اس کے حکموں پر چلیں۔ یہ سن کر درباریوں نے اُسی وقت چچ کو راجا بنالیا اور چچ ایک دم وزیر سے راجا ہو گیا۔

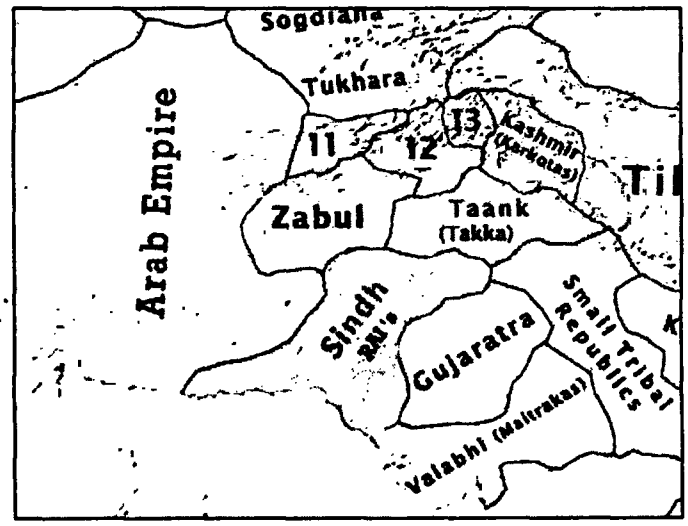

جب چچ راجا ہو گیا تو رانی سونھن دیوی نے محل میں آکر چچ سے کہا "کیا میں اب بھی اس لائق نہیں ہوں کہ تم میری تمنا پوری کرو؟" چچ خاموش ہو گیا۔ رانی سونھن دیوی نے ہمیشہ کے لیے فتنوں کا دروازہ بند کرنے کے لیے ایک نئی تدبیر سوچی۔ اس نے حکم دیا کہ پچاس زنجیریں محل کے بڑے کمرے میں رکھی جائیں۔ جب زنجیریں رکھی جاچکیں تو اس نے اپنے نوکروں سے کہا کہ رائے ساہسی کے عزیزوں کو اطلاع دو کہ رائے تمھیں کچھ وصیت کرنا چاہتے ہیں، تم سب فوراً محل میں حاضر ہو۔ چنانچہ رائے ساہسی کے سب عزیز محل کے باہر جمع ہوئے۔ رانی سونھن دیوی ایک ایک کو محل میں بلاتی جاتی تھی اور اس کو زنجیروں میں جکڑواتی جاتی تھی۔ جب سب قید ہو چکے تو اس وقت رانی سونھن دیوی کو یقین ہوا کہ اب چچ کی مخالفت کرنے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ پھر اس عقلمند رانی نے ایک اور نئی تدبیر اختیار کی۔ اس نے راجا کے اُن غریب عزیزوں کو بلوایا جو اپنی غربت کی وجہ سے ایک ایک دانے کے محتاج تھے۔ رانی سونھن دیوی نے ان سے کہا آج تم کو جن لوگوں نے اس حالت میں پہنچایا ہے، تمھیں مبارک ہو کہ میں نے ان سب کو قید کر لیا ہے، دیکھو وہ تمھارے سامنے جکڑے ہوئے پڑے ہیں، میں ان سب کا مال و اسباب تم کو دیتی ہوں، مگر شرط یہ ہے کہ جو جس کو قتل کرے گا وہی اس کا مال پائے گا۔ رانی کے اس حکم کے سنتے ہی ذرا سی دیر میں ان لوگوں نے اُن تمام جکڑے ہوئے لوگوں کو فوراً ہی قتل کر دیا۔ اس طرح رانی سونھن دیوی کے تدبر اور ہوشمندی کی وجہ سے چچ سلطنت سندھ کا بغیر کسی خدشے کے راجا بن گیا۔ رائے مر ہی چکا تھا، دوسرے دن رانی سونھن دیوی نے ہر طرف سے مطمئن ہو کر، رائے ساہسی کی موت کا اعلان کر دیا۔ سارے ملک میں رائے ساہسی کا سوگ منایا گیا اور شاہانہ اعزاز و مراسم کے مطابق ارتھی اٹھائی گئی اور چتا میں جلادی گئی۔[1]

رائے ساہسی کی موت کے بعد رانی سونھن دیوی نے اپنے مذہب کے مطابق چچ سے شادی کر لی۔[2] ساہسی رائے حکومت کا آخری راجا تھا، جس کے بعد سندھ میں برہمن حکومت کی بنیاد پڑی۔

---

(1) یہ تمام تفصیل تاریخ معصومی، صفحات 13-14 اور چچ نامہ فارسی صفحات 25-23 سے ماخوذ ہے۔

(2) معصومی اور تحفۃ الکرام میں ہے کہ یہ شادی رانا مہرت کی جنگ سے پہلے ہوئی تھی، اس جنگ کا تذکرہ آئندہ اوراق میں آرہا ہے، لیکن چچ نامے میں ہے کہ یہ شادی رانا مہرت کی جنگ کے بعد ہوئی۔ ہم نے معصومی اور تحفۃ الکرام کی روایت کو ترجیح دی ہے۔

باب:2

برہمن حکومت چچ بن سلاتج

(۶۳۲ء تا ۶۶۶ء مطابق ۱۱ھ تا ۴۲ھ)

رائے حکومت کے ختم ہونے کے بعد سندھ میں ۱۱ھ (۶۳۲ء) میں برہمن حکومت قائم ہوئی۔ اس حکومت کا پہلا راجا چچ تھا، جس نے حکومت سنبھالتے ہی خزانے کا منہ کھول دیا اور بڑی فیاضی سے لوگوں کو انعام واکرام سے مالامال کیا، اپنی فوجی قوت کو بڑھایا اور رعایا پر جو ٹیکس اور محصول عائد ہوتے تھے ان میں کمی کی اور اپنے اس طرز عمل سے رعایا میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔

چچ کو حکومت کرتے ابھی چند مہینے ہی گزرے تھے کہ رائے ساہسی کی وفات کی اطلاع اس کے بھائی رانا مہرتھ[1] کو ملی جو چتوڑ کا راجا تھا۔ وہ اس خبر کو سن کر بے حد برہم ہوا، کیونکہ وہ خود اپنے آپ کو اس تخت کا وارث اور حق دار سمجھتا تھا۔ اُس نے فوراً ہی فوج کو اکٹھا کر کے جنگ کا اعلان کر دیا۔ جس وقت رانا مہرت فوجیں لے کر اور اروڑ[2] سے تین میل کے فاصلے پر خیمہ زن ہوا اس نے ایک وفد کے ذریعے چچ کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا کہ میں اس تخت کا جائز وارث اور یہ تخت ہمارے آباو اجداد کی ملکیت ہے، اگر تم یہ تخت میرے حوالے کر دوگے تو میں تم سے اچھے سلوک کرنے کا وعدہ کرتا ہوں، اور یوں بھی تم برہمن ہو، تمہارا کام پوجا پاٹ ہے، جنگ اور لڑائی تمہارے بس کا روگ نہیں، بہتر یہ ہے کہ کسی گوشے میں بیٹھ کر خدا کو یاد کرو اور مفت میں اپنی جان نہ گنواؤ۔[3]

جب یہ خط چچ کو ملا، وہ اس خط کو لے کر رانی سوگھن دیوی کے پاس آیا اور کہا کہ دشمن ہمارے سر پر کھڑا ہے اور سلطنت و تخت کا دعوے دار ہے، اب بتاؤ مجھے کیا تدبیر کرنی چاہیے۔ رانی نے ہنس کر کہا کہ میدان جنگ میں لڑنا مردوں کا کام ہے، اگر آپ لڑائی سے ڈرتے ہیں تو برائے مہربانی آپ میرے کپڑے پہن کر محل میں بیٹھیے اور اپنا لباس مجھے دیجئے تاکہ میں دشمن کے مقابلے کے لیے نکلوں۔ اس میں مجھ سے مشورے کی کیا ضرورت تھی، جب آپ اس ملک کے راجا ہو چکے تو دھاڑتے ہوئے شیر کی طرح اُٹھیے اور دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیجیے، خوب یاد رکھیے کہ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔

یہ سن کر چچ کو بہت غیرت آئی، رانی نے اس کو مزید غیرت دلانے کے لیے کہا "خدا نے بیشمار مال و دولت آپ کو دیا ہے، لوگوں پر اپنی دولت کو نثار کیجیے تاکہ پروانہ وار لوگ آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں اور آپ پر جان قربان کرنا اپنے لیے فخر سمجھیں"۔ چچ نے رانی کے اس مشورے کے مطابق اپنی فوج میں خوب روپیہ تقسیم کرایا اور ایک عظیم الشان لشکر رانا مہر کے مقابلے کے لیے تیار کر کے مقابلے کے لیے نکلا۔ دونوں فوجوں میں مقابلہ شروع ہوا۔ جب اس جنگ میں طرفین کے بہت سے جواں مرد سپاہی تلوار کے گھاٹ اُتر چکے تو رانا مہرت نے چچ کو کہلا بھیجا کہ سپاہیوں کی جان لینا اور ان کو اپنے فائدے کے لیے کٹوانا مردوں کا شیوہ نہیں۔ یہ جھگڑا تو ہمارا تمھارا ہے، ہمیں سواری سے اُتر کر آپس میں مقابلہ کر کے جنگ کا فیصلہ کرنا چاہیے جو ہم میں سے زندہ بچے گا وہی آئندہ سندھ کے تخت کا مالک ہوگا۔ چچ نے اس بات کو منظور کر لیا۔ مہرت کو اپنی بہادری اور شجاعت پر کامل اعتماد تھا۔ وہ اپنے دل میں سمجھتا تھا کہ ایک برہمن جس کا ساری عمر ذرا بھی واسطہ تلوار سے نہیں رہا، میرا مدمقابل کس طرح ہو سکتا ہے، میں ذرا سی دیر میں اس کا سر تن سے جدا۔

---

[1] اس نام کا املا فارسی نسخے میں مہرت ہے اور بعض نسخوں میں اس کا املا مہترین اور بعض میں مہرب ہے، مگر ہم نے یہاں نام کی اصلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مہرتھ درج کیا ہے۔ (چچ نامہ سندھی، صفحہ ۳۶، حاشیہ نمبر 1 مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ)۔

[2] چچ نامہ فارسی۔ صفحہ ۲۷۔

[3] تحفتہ الکرام اور معصومی میں ہے کہ رانا مہرتھ نے یہ خط جیسلمیر کے قریب پنچ کر لکھا تھا۔ (تحفتہ الکرام فارسی۔ صفحہ ۱۳ و معصومی فارسی صفحہ ۱۴)۔

کر دوں گا۔ مگر تقدیر اس پر ہنس رہی تھی۔ وہ فوراً ہی گھوڑے سے اتر کر چچ کے مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔ ادھر چچ نے چپکے سے اپنے ایک نوکر سے کہا کہ جب ہم دونوں مقابلے کے لیے نکلیں تو تم اپنا گھوڑا آہستہ آہستہ میرے پیچھے لانا اور مجھ سے قریب رہنا۔ چنانچہ جب دونوں مقابلے کے لیے ایک دوسرے سے بالکل قریب ہو گئے، تو نوکر نے ایک دم گھوڑا چچ کے برابر لا کر کھڑا کر دیا۔ چچ اُچک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور جھپٹ کر مہرت پر تلوار کا ایسا کاری وار کیا کہ ایک ہی وار میں اس کا کام تمام ہو گیا۔[1] مہرت کے قتل ہوتے ہی چچ کی فوج نے دفعتاً مہرت کی فوج پر حملہ کر دیا، مہرت کی فوج کا بہت بڑا حصہ تہ تیغ ہوا اور جو باقی بچے امن کے خواستگار ہوئے۔[2]

اس کے بعد چچ فتح کے شادیانے بجاتا ہوا اروڑ (الور) میں داخل ہوا اور اس مسرت میں سندھ کی راجدھانی اروڑ (الور) میں ایک بڑا جشن منایا گیا، پھر چچ نے وہ علاقے بھی فتح کر لیے جو بودھ راجاؤں کی کمزوری کے باعث چھن گئے تھے۔

چچ کے بھائی چندر کا الور کی حکومت پر تقرر:

چچ نے ان تمام امور سے فارغ ہونے کے بعد اپنے بھائی چندر کے پاس ایک آدمی بھیجا اور اسے کہلایا کہ اگرچہ ہمارے بزرگوں کا طریقہ پوجا پاٹ ہے اور ہم بتوں کی پوجا میں خاص رغبت رکھتے ہیں، ہمارے باپ سیلائج نے بھی اپنے بزرگوں کی طرح اس پر عمل کیا ہے، لیکن ہند کی مذہبی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب کوئی آدمی اپنی روح کی اصلاح کرتا ہے اور نیکی اور اچھائی کو اپنا شعار بناتا ہے تو اس کی روح اس کی جسم سے جدا ہو کر کسی بادشاہ کے گھر میں اس کی اولاد کی صورت میں دوسرا جنم لیتی ہے، یا کسی بڑے آدمی کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے، جس کے جسم میں وہ ہر طرح کی راحت اور آرام حاصل کرتی ہے، چنانچہ ہمارے باپ سیلائج کے خدا نے ہم پر رحمت کی ہے اور ہمیں تاج و تخت سے سرفراز فرمایا ہے۔ ایک بڑا ملک ہمارے زیر نگیں ہے، میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اروڑ (الور) کے شہر کا حاکم بناؤں اور اپنے بعد تمہیں اپنا ولی عہد مقرر کروں کہ تم اس ملک میں اپنے مذہب کی سچی پیروی، وفاداری، رحم دلی اور پرہیزگاری سے ممد و معاون ہو سکتے ہو۔

چندر اگرچہ فطرتاً عہدے اور مناصب سے بچتا تھا، لیکن اسے مجبوراً اپنے بھائی کے اس حکم کو قبول کرنا پڑا۔ وہ دربار شاہی میں شامل ہوا اور الور کا تمام نظم و نسق بحیثیت ایک حاکم کے اس کے سپرد کیا گیا۔ اس کے علاوہ وہ چچ کے تمام اہم کاموں اور امور سلطنت کی انجام دہی کا انچارج مقرر ہوا۔

چندر کی ولی عہدی کا فرمان:

چندر کو الور کا حاکم اعلیٰ مقرر کرنے کے بعد چچ نے ایک فرمان شاہی جاری کیا، جس میں لکھا کہ سیلائج کے خدا نے ہمیں اس تاج و تخت کا مالک بنایا ہے اور ہماری قسمت میں یہاں کے لوگوں پر حکومت کرنا مقدر کر دیا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اس ملک کے لوگوں کے ساتھ اچھی طرح پیش آئیں اور عدل و انصاف سے ان کو خوش رکھیں تاکہ خدا کے یہاں ہم سے ظلم و بے انصافی کا مواخذہ نہ ہو، اس لیے میں اپنے بھائی چندر کو جو راہبوں کا سردار ہے، یہ اہم اور نازک ذمہ داری سپرد کرتا ہوں، وہ ہماری موجودگی اور عدم موجودگی میں تمام امور کا ذمہ دار ہے۔ تمام اُمراء، ملازمین اور رعایا پر اس کی اطاعت واجب ہے۔[3]

چچ کا اپنے وزیر سے ایک سوال:

اس کے بعد چچ نے اپنے وزیر بدہیمن طاکی[4] کو بلایا اور پوچھا کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ ہماری مملکت سندھ کے حدود اُس وقت کیا تھے جب کہ وہ رائے ساہسی رائے اعظم کے زیر حکومت تھا اور اس کی حکومت کی انتظامی تقسیم کیا تھی؟ بدہیمن نے جواب دیا: خدا مہاراج کی عمر دراز کرے، یہ تمام ملک اور دارالسلطنت صرف ایک راجا کے زیر حکومت تھا، اور ملک کے تمام اُمراء و رؤسا اس کے مطیع و منقاد تھے، جس وقت یہ مملکت سیہرس[5] بن ڈیوائج کے پاس آئی تو اس نے ایرانیوں کی فوج

---

(1) صاحب تحفتہ الکرام کا بیان ہے کہ یہ واقعہ ہجرت نبوی صہ کے پہلے سال کے لگ بھگ کا ہے۔ (تحفتہ الکرام، ج 3، صفحہ ۷)۔

(2) چچ نامہ فارسی، صفحات ۲۸-۲۷۔

(3) ماخوذ از چچ نامہ، صفحات ۳۰-۲۹۔

(4) طاکی: غالباً تاکی کی نسبت تاکیہ سے ہے، یعنی تاکیہ کا باشندہ، تاکیہ کا ذکر اس سے پہلے جہاں سیہرس رائے کے صوبوں کا تذکرہ آیا ہے گذر چکا ہے کہ اس نے ایک حاکم ملتان میں مقرر کیا تھا۔ اس صوبے میں سکہ، برہم پور، کرور، اشہار اور تاکیہ سے لے کر کشمیر کی سرحد کا علاقہ شامل تھا، اس سے ظاہر ہے کہ تاکیہ ملتان سے ملحق اور ملتان و کشمیر کا درمیانی علاقہ تھا۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، صفحہ ۴۰۶)۔

(5) یہ رائے سیہرس بن دیوائج غالباً رائے سیہرس بن ساہسی سے پہلے گزرا ہے، جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے، جو ایران کے لشکر کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ (چچ نامہ ترجمہ سندھی، صفحہ ۴۴ ان-ب)۔

سے شکست کھائی اور وہ مارا گیا۔ اس کے بعد تخت سندھ پر رائے ساہسی ثانی بیٹھا۔ ساہسی نے اس ملک کے چار گورنر مقرر کیے تاکہ ملک کے محصولات کی وصولی میں اور حفاظت میں سہولت ہو۔ اب چونکہ آپ بھی حکومت کو مضبوط بنانا چاہتے ہیں تو ضرورت ہے کہ اس قسم کی تدبیر اختیار کی جائے کہ جس سے آئندہ ناگوار قسم کے واقعات کا اعادہ ہی ناممکن ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ ایک بہادر فوج اور ہاتھیوں کا کثیر التعداد لشکر اگر فراہم کیا جائے تو ملک میں ہمیشہ امن وامان قائم رہے گا اور اطراف وجوانب کے اُمراء آپ کے مطیع اور فرمانبردار ہو جائیں گے اور آپ کے تمام دشمن آپ کی تلوار کے ڈر سے امن اور پناہ کے خواہاں ہوں گے، اور اس حکومت کا ڈنکا قیامت تک بجتا رہے گا۔ آپ کو چاہیے کہ ہر کام میں انجام پر نظر رکھیں اور خدا پر بھروسہ کریں تاکہ ہر کام میں خدا آپ کا حامی وناصر ہوا۔[1]

دوبارہ حدود حکومت کا تعین:

چچ نے اپنے دانشمند وزیر کی عالمانہ تقریر سن کر اس کی تعریف کی اور اس کے مخلصانہ مشورے کی داد دی۔ پھر اس نے بدیہمن وزیر کے مشورے کے مطابق ملک میں ہر طرف اپنے قاصد روانہ کیے تاکہ وہ گرد ونواح کے راجاؤں کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ مملکت سندھ کو مضبوط اور وسیع بنانے میں اس کے ساتھ شامل ہوں۔ اُس نے لشکر اور فوج کو اپنے وزیر کے مشورے کے مطابق ترتیب دیا۔

بھالیہ کی فتح

آخر ایک نیک ساعت میں چچ اپنی فوج لے کر شہر باطیہ[2] پر حملہ آور ہوا جو کہ دریائے بیاس کے جنوبی کنارے پر واقع تھا اور وہاں کے حاکم نے چچ سے سرکشی کی تھی، دونوں کی فوجوں میں نہایت خونریز جنگ ہوئی، جس میں چچ نے فتح پائی اور بھالیہ کا حاکم فرار ہو کر اسکلندہ کے قلعے میں پناہ گزین ہوا۔

اسکلندہ کی فتح:

جب چچ کو معلوم ہوا کہ بھالیہ کا حاکم اسکلندہ کے قلعے میں پناہ گزین ہے تو اُس نے بھالیہ میں اپنے ایک قابل اعتماد شخص کو حاکم مقرر کر کے اسکلندہ کا رخ کیا اور قلعے کے باہر اپنا خیمہ لگایا۔ اسکلندہ کے قلعے میں شجاع نامی ایک ایسا شخص بھی تھا جو چچ کا وفادار اور مطیع تھا، اس شخص کا شہر کے عوام اور رؤسا پر بڑا اثر تھا۔ چچ نے اس کو خفیہ پیغام بھیجا کہ میں نے پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ اگر یہاں کا راجا چتر مارا جائے یا قید ہو جائے تو میں اس قلعے کو فتح کر کے تم کو اسکلندہ کا حاکم بناؤں۔ پھر اُس نے ایک تحریر بھی اس شخص کے پاس بھیجی، جس میں لکھا کہ اگر تم بھالیہ اور اسکلندہ کے حاکم کو قید یا قتل کروا دو گے تو تمہیں ان قلعوں کا سردار بنایا جائے گا۔ اس شخص نے اس شرط کو قبول کر لیا اور اپنے لڑکے کو بطور ضمانت چچ کے پاس بھیج دیا کہ وہ اس کام کو ضرور کر کے رہے گا۔ آخر ایک دن اس نے حسب وعدہ موقع پا کر چتر کو قتل کر دیا اور اس کا سر چچ کے پاس بھجوا دیا۔ چچ نے اپنے وعدے کے مطابق اس کو خلعت اور انعام سے سرفراز کر کے قلعہ اسکلندہ اور بھالیہ کی حکومت کا فرمان اس کے نام جاری کیا۔ حاکم بننے کے بعد شہر کے تمام رؤسا نے بھی اس کے سامنے بیش قیمت نذرانے پیش کیے۔ چچ نے ان اُمراء کو اس کا پابند کیا کہ وہ ہمیشہ اس کی اطاعت کریں اور اس کے فرمانبردار رہیں۔[3]

---

[1] ماخوذ از چچ نامہ صفحات ۳۳۔۳۲۔

[2] باطیہ: یعنی بھالیہ جسے بعض مؤرخین نے بھاطیہ بھی لکھا ہے، اسی چچ نامے میں محمد بن قاسم کی فتوحات کے ضمن میں آیا ہے کہ اروڑ کو فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم شمال کی طرف بڑھا اور پہلے پہل قلعہ بھالیہ کے قریب پہنچا، جو کہ دریائے بیاس کے جنوب میں ایک پرانا قلعہ تھا اور چچ کا بھتیجا اروڑ کی حکومت کی جانب سے وہاں حکمراں تھا۔ بھالیہ فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے دریائے بیاس کو عبور کر کے قلعہ اسکلندہ کا محاصرہ کیا، جو کہ دریائے راوی کے جنوبی کنارے پر ایک مضبوط قلعہ تھا۔ پھر اس قلعے کو فتح کر کے ملتان پہنچا۔ (چچ نامہ فارسی، صفحات 236-237) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چچ کے زمانے میں اس قلعے اور علاقے کا نظم ونسق ملتان کی بجائے اروڑ سے متعلق تھا اور بھالیہ اروڑ اور ملتان کے درمیان دریائے بیاس کے جنوبی کنارے پر تھا۔ اس سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بھالیہ اروڑ کے مقابلے میں ملتان سے زیادہ قریب تھا، پھر تقریباً تین صدیوں کے بعد بھی بھالیہ کا قلعہ اپنے اسی نام سے موجود رہا۔ چنانچہ محمود غزنوی کی فتوحات کے سلسلے میں تاریخ یمینی کا مصنف لکھتا ہے کہ بھالیہ ملتان کے اس طرف ہے، اس کے دو صدی کے بعد چچ نامہ کا مصنف چچ نامہ کے صفحہ 15 پر لکھتا ہے کہ اس وقت بھالیہ کو تلواڑہ اور چچ پور کہتے ہیں۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، از صفحہ ۴۰۴ تا ۴۰۵)۔

[3] چچ نامہ فارسی، صفحہ ۳۴۔

سکہ اور ملتان کی طرف روانگی:

اسکلندہ[1] کے انتظام سے فارغ ہو کر چچ نے سکہ اور ملتان کا رخ کیا۔ ملتان کا راجا اس زمانے میں بجھرا نامی ایک شخص تھا جو راجا ساہسی کا قریبی رشتہ دار تھا۔ اس کی حکومت بہت وسیع تھی اور وہ خود بھی ایک دانا اور عقلمند حکمران تھا۔ اس نے چچ کی آمد کی خبر سنی تو ایک لشکر جرار تیار کر کے دریائے راوی کے کنارے پہنچا۔ بجھرا کا بھتیجا سیہول اُس وقت سکہ کے قلعے کا گورنر تھا، جو ملتان کے مشرق کی جانب واقع تھا، وہ بھی اپنے چچازاد بھائی اجے سین سے مل کر مقابلے کے لئے آیا۔ دریائے بیاس کے گھاٹ کے قریب طغیانی کی وجہ سے چچ اور اس کا لشکر تین ماہ تک خیمہ زن رہا۔ جب دریا کی طغیانی کم ہوئی تو اُسی گھاٹ پر اس نے دریا کو عبور کر کے سیہول سے جنگ شروع کر دی اور خاصے عرصے تک قلعے کا محاصرہ کیے رہا۔ سیہول نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن جب شکست کے آثار ظاہر ہونے لگے اور اس کے بعض نامور ساتھی مارے گئے[2] تو سیہول رات کو بھاگ کر قلعہ ملتان میں پناہ گزین ہوا۔ راجا چچ نے سکہ پر قبضہ کر کے پانچ ہزار فوجیوں کو قتل کیا اور تمام شہر کو لوٹ کر وہاں کے گرفتار شدہ لوگوں کو غلام بنایا، اور اپنے ایک امیر عین الدین ریحان کو سکے کا حاکم بنا کر خود ملتان کے محاصرے کے لیے آگے بڑھا۔

ملتان کی فتح:

ملتان کا حاکم بجھرا جنگی ہاتھیوں اور ایک زبردست فوج کو لے کر چچ کے مقابلے کے لیے نکلا۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مدمقابل ہوئیں اور نہایت خونریز جنگ کے بعد بجھرا قلعہ ملتان میں محصور ہو گیا اور راجہ کشمیر سے مدد کا طالب ہوا۔ اس نے کشمیر کے راجا کو لکھا کہ سیلایچ برہمن کا لڑکا اروڑ کا راجا ہو گیا ہے، وہ ایک لشکر جرار کے ساتھ ہمارے ملک پر حملہ آور ہوا ہے، اطراف و نواح کے مضبوط قلعے فتح کر لیے ہیں اور کوئی راجا بھی اُس کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکا، اس وقت وہ ملتان پر حملہ آور ہے، ہماری مدد کیجیے اور اعانتی فوج روانہ کیجیے۔

اتفاق سے جب بجھرا کا قاصد یہ خط لے کر کشمیر پہنچا، اُس وقت کشمیر کے راجا کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کا نابالغ لڑکا تخت نشین ہوا تھا۔ کشمیر کے وزراء اور اُمراء نے باہمی مشورہ کر کے جواب دیا کہ کشمیر کے راجا کا انتقال ہو چکا ہے، اُس کا نابالغ لڑکا ابھی تخت نشین ہوا ہے جو بالکل ناتجربہ کار ہے۔ اس انقلاب کی وجہ سے خود ہمارے ملک میں آثار بغاوت پائے جا رہے ہیں، ایسے وقت میں ہم کسی امداد سے معذور ہیں۔ جب قاصد اہل کشمیر کا یہ پیغام لے کر آیا تو بجھرا بہت ناامید ہوا، اور اس نے حالات سے مجبور ہو کر چچ سے صلح کی درخواست کی، اور کہلا بھیجا کہ اُسے اس کی اجازت دی جائے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ جہاں چاہے چلا جائے۔ چچ نے اسے منظور کر لیا اور بجھرا اپنے اہل و عیال کے ساتھ قلعہ ملتان سے نکل کر کشمیر کی پہاڑیوں میں چلا گیا اور چچ قلعے میں داخل ہو کر ملک پر قابض ہو گیا۔

چچ نے ملتان کا حاکم ایک ٹھاکر کو مقرر کیا، اور خود ایک مندر میں جا کر بت کے سامنے اس فتح پر سجدہ شکر ادا کیا اور صدقہ کر کے آگے بڑھا۔ برہم پور، کرور اور اشہار کے حاکموں نے بغیر کسی مقابلے کے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ قلعہ شاگلہا پر پہنچا جو کہ بہت مشہور ہے۔ یہ مقام تاکیہ[3] سے کچھ آگے بتایا جاتا ہے، جہاں کشمیر کی سرحد ہے۔ چچ کی دھاک اور قدر بیٹھ گئی تھی کہ وہ جہاں بھی پہنچتا تھا کوئی راجا اس کے مقابلے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ کنبہ میں وہ ایک ماہ مقیم رہنے کے بعد اور ہر جگہ امن و امان قائم کرنے کے بعد کشمیر اور اپنی سرحد پر ایک چشمے کے کنارے مقام پنج ماہیات پر دو پودے صنوبر اور بید کے لگائے، اور وہاں اتنے دنوں مقیم رہا کہ دونوں درخت بڑے ہو کر ایک دوسرے سے مل گئے۔ اس کے بعد اُس نے اس مقام کو اپنی اور راجا کشمیر کی سرحد قرار دیا۔[4]

الور کو واپسی:

سرحد کو متعین کرنے کے بعد چچ اپنے دارالسلطنت اروڑ (الور)

---

(1) اسکلندہ: مجمل التواریخ کے مصنف نے اس شہر کا نام عسقلند لکھا ہے، اس شہر کو اُچ کی قدیم بستی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دیکھیے راورٹی کی کتاب مہران، صفحات ۲۵۵-۲۵۴، حاشیہ ۱۹۲۔ (چچ نامہ سندھی تعلیقات صفحہ ۴۰۳)۔

(2) صاحب چچ نامہ نے یہاں چچ کے بعض ساتھیوں کو شہید لکھا ہے، اس سے گمان ہوتا ہے کہ اس کے لشکر میں کچھ مسلمان عرب بھی شامل تھے، اس گمان کی تصدیق چچ نامہ فارسی کے صفحہ ۳۶ سے ہوتی ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ چچ نے سکہ کا حاکم امیر عین الدولہ ریحان مدنی کو بنایا۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، صفحہ ۴۰۷)۔

(3) چچ نامے کی اصل فارسی عبارت یہ ہے: تا بحصار شاکلھا رسید، وآں موضع بالاتر کنبہ گوبند۔ کنبہ کا لفظ یہ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے، یہ لفظ چچ نامے کے کسی قدیم اور خطی نسخے میں موجود نہیں۔ البتہ بعض نسخوں میں یہ لفظ تاکیہ ہے، اور بعض میں یہ نام تاکبہ ہے۔ صحیح لفظ تاکیہ ہی ہے۔ کیونکہ ملتان سے آگے یا اس کے آس پاس کے علاقے کا نام نکادیش تھا۔ (چچ نامہ ترجمہ سندھی، حاشیہ ۱، صفحہ ۵۱)۔

(4) چچ نامہ فارسی، صفحات ۳۵ تا ۳۸۔

کو واپس ہوا اور ایک سال تک آرام کرتا رہا۔ اس عرصے میں اُس کے ارکان حکومت نے بہت سامان حرب جمع کر لیا۔ ایک دن اس نے اپنے وزیر کو بلا کر کہا کہ اب میں مشرق کی طرف سے مطمئن ہو گیا ہوں، اب ہمیں مغرب اور جنوب کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ وزیر نے کہا: جہاں پناہ! واقعی سچ ہے، بادشاہوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ملک کے حالات سے واقف رہیں، اس کا امکان ہے کہ آپ کے مشرقی دورے سے جنوبی اُمراء بے فکر ہو گئے ہوں اور انہیں یہ خیال گزرا ہو کہ رائے ساہسی کے بعد اب ان سے خراج وصول کرنے والا کوئی نہیں۔

سیوستان کی طرف روانگی:

اس مشورے کے بعد چچ نے بدہیہ[1] اور سیوستان کا رخ کیا، سیوستان کے قلعے میں ستہ نامی گورنر حکمران تھا۔ چچ نے دہتایت[2] نامی موضع کے قریب سے دریائے مہران کو عبور کیا جو کہ سمہ قوم اور اروڑ (الور) کی سرحد تھی۔ وہاں سے وہ بدہیہ کی طرف روانہ ہوا۔ بدہیہ کا حاکم اس زمانے میں سر کوندہ بن بھنڈر بھکو[3] تھا، اور اس کا دارالسلطنت کاکا راج[4] تھا، وہاں کے لوگ سیویس کہلاتے تھے۔ چچ نے ان پر حملہ کر کے سیویس کے قلعے کو فتح کر لیا۔ یہ دیکھ کر اس طرف کے دوسرے حاکم کاکا کے لڑکے وکیہ بن کاکا نے خراج ادا کرنے کا عہد کر کے اطاعت قبول کر لی۔

یہاں سے چچ سیوستان روانہ ہوا، جب شہر سیوستان کے قریب پہنچا تو سیوستان کے گورنر نے ایک بڑی فوج کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا مگر شکست کھا کر قلعے میں محصور ہوا، ایک ہفتے کے بعد اس نے مجبور ہو کر امان مانگی اور قلعے کو چچ کے افسروں کے حوالے کر دیا۔ چچ نے اس کو امان دی اور اس پر مہربانی کر کے پھر اس کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا، لیکن بطور مشیر و نگران اپنا ایک افسر بھی اس کے ساتھ مقرر کیا۔ پھر کچھ دن وہاں قیام کر کے برہمن آباد پہنچا۔

برہمن آباد کے حاکم کو پیغام:

جب وہ برہمن آباد کے قریب پہنچا تو اس نے برہمن آباد اور لوہانہ[5] کے بادشاہ اکھم کو جس کا تخت لاکھا، سمہ اور سہتہ قومیں تھیں پیغام بھیجا کہ وہ اس کی اطاعت قبول کرے، لیکن اسی زمانے میں ایک خط اکھم لوہانہ کا راجا متھ، گورنر سیوستان کے نام پکڑا گیا، جس کو اس کا ایک خاص قاصد لیے ہوئے جا رہا تھا۔ اس میں لکھا تھا: "میں ہمیشہ تمہارے ساتھ مخلصانہ طریقے سے پیش آیا ہوں اور کبھی تمہارا مخالف نہیں رہا، میں تمہارے خط کی جو تم نے مجھے لکھا ہے رسید بھیج رہا ہوں، اس خط میں تم نے لکھا ہے کہ جب تک ہم متحد رہیں گے، کوئی دشمن ہم پر غالب نہیں آسکتا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم میں اور ہم میں مکمل اتحاد ہے اور جن تکلیفوں کا تذکرہ تم نے اپنے خط میں کیا ہے، اس قسم کی تکلیفیں راجاؤں پر

---

(1) بدہیہ: یہ قدیم سندھ کا شمال مغربی صوبہ تھا۔ جو سیوستان یا سیوہن کے پرگنے سے متصل شمال میں واقع تھا اور موجودہ پورے ضلع لاڑکانہ اور ضلع جیکب آباد کے مغربی حصے پر مشتمل تھا۔ شمال مغرب میں کیکانان کا ترکی صوبہ اس سے ملحق تھا۔ چچ نامہ کے صفحہ ۳۹ سے واضح ہوتا ہے کہ رائے خاندان کے زوال کے وقت اس صوبے کا پایہ تخت کاکا راج تھا۔ بعد کے حوالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قندابیل (گنداوا) اس صوبہ بدہیہ کا سرحدی شہر تھا، جس کی دوسری طرف کیکانان کا جنوبی علاقہ 'توران' واقع تھا۔ قندابیل عین سرحد پر تھا، چنانچہ اسے توران کے علاقوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ (یاقوت، بلدان (قندابیل) اور مقدسی، صفحہ ۴۷۶) حالانکہ قندابیل خطۂ بدہیہ کا ایک اہم تجارتی شہر تھا۔ (ابن حوقل، ص ۲۳۱ (ن،ب) تعلیقات چچ نامہ سندھی، صفحہ ۴۰۲)۔

(2) فارسی نسخوں میں اس کا جو تلفظ استعمال کیا گیا ہے، وہ 'دھیایت' ہے اور دھتایت کا تلفظ بھی بعض نسخوں کے مطابق ہے۔ ہم نے بھی رسم الخط اختیار کیا ہے۔ (چچ نامہ سندھی، حاشیہ ۳، صفحہ ۵۳)۔

(3) چچ نامے کے قدیم فارسی نسخوں میں یہ نام بہت غلط ہو کر رہ گیا ہے، ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے چچ نامہ سندھی کے حواشی میں اس نام کو سندھی قالب میں ڈھال کر سر کونڈہ بن بنڈر کو بھکو لکھا ہے۔ ہم نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ (چچ نامہ سندھی، صفحہ ۵۳)

(4) کاکا راج: یعنی کاکا قوم کا راج، سندھ کے شمال مغربی صوبے کا پایہ تخت کاکا راج تھا۔ تحفۃ الکرام (133x3) میں بھی کاکا راج کا ذکر آیا ہے۔ غالباً ضلع لاڑکانہ میں تحصیل کنڑ کا نام اسی قدیمی کاکا راج کی بگڑی ہوئی شکل کی یادگار ہے۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، صفحہ ۴۰۷)۔

(5) لوہانہ، لاکھ اور سمہ: لوہانہ اس زمانے میں سندھ کا ایک پرگنہ تھا، جس کا حاکم رائے خاندان کے زوال کے وقت اکھم تھا۔ چچ نامے میں لوہانہ کے حاکم اکھم کا تذکرہ صفحات ۵۷-۵۵ پر آیا ہے اور صفحہ 64 پر لوہانے کے جتوں کا ذکر آیا ہے۔ لوہانے کے پرگنے میں لاکھ، سمہ اور سہتہ کی اراضی شامل تھیں۔ (صفحہ ۵۵) اور ان اراضی کے یہ نام اُن میں رہنے والی قوموں کے نام پر مشہور تھے۔ پرگنہ لوہانہ غالباً ضلع نواب شاہ، ضلع سانگھڑ، شہداد پور اور سنجورو کی تحصیلوں اور ضلع حیدرآباد کے بالا تعلقے پر مشتمل تھا۔ اس علاقے میں آج بھی ساہتی، لاکھاٹ، لوہانو کے نام اُن قوموں کی قدیم بستیوں کی یادگار ہیں، شہداد پور کے نشیب میں دریا کی ایک پرانی شاخ اس وقت تک لوہانو کہلاتی ہے، اس لیے کہ یہ شاخ لوہانو پرگنے کے خاص علاقوں سے گزرتی تھی۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، صفحہ ۴۰۲، (ن-ب)

آتی ہی رہتی ہیں۔ تمہیں اجازت ہے کہ تم برہمن آباد سے دریائے دیبل تک جہاں بھی مناسب سمجھو اپنا ٹھکانا بنا سکتے ہو، اگر تمہارا ارادہ کہیں اور جانے کا ہے تب بھی تمہیں کوئی روک نہیں سکتا، جب تم کسی جگہ پہنچ کر مطمئن ہو جاؤ گے تو میں تمہیں مالی اور فوجی ہر طرح کی مدد دوں گا، میرے پاس اتنے گھوڑے اور فوج مہیا ہو سکتی ہے کہ میں تمہاری مدد کر سکوں"۔

آگھم لوہانہ کے خط کے پکڑے جانے کی خبر سن کر متھ ہند کے ریگستان کے بادشاہ[1] راجا نیرمل کی حکومت میں چلا گیا، جسے بھٹی بھی کہتے ہیں۔

چچ کا پیغام:

چچ نے دوبارہ آگھم لوہانہ کو حسب ذیل پیغام بھیجا کہ:

"تم اپنے آپ کو اس زمانے کا سب سے بڑا راجا سمجھتے ہو اور ہمیں اپنی اس موروثی سلطنت پر بڑا ناز ہے۔ اگرچہ میں نے یہ حکومت و سلطنت وراثتاً حاصل نہیں کی اور یہ دولت و طاقت میرے آباو اجداد کا متروکہ نہیں، لیکن میری اس موجودہ شوکت و حشمت کا باعث خدائے تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ تمام اسباب حکومت میں نے زور بازو سے حاصل نہیں کیے، بلکہ خدائے واحد جس کی کوئی نظیر و مثال نہیں، جو تمام دنیا کا خالق ہے، اُس نے سیلائچ کی دعا سے یہ سب چیزیں مجھے عطا کی ہیں۔ وہی میرے ہر کام اور ارادے میں حامی و مددگار ہے، میں ہر حال میں اُسی سے مدد چاہتا ہوں اور کسی دوسرے سے معاونت اور مدد کی امید نہیں رکھتا، کیونکہ تمام مشکلات میں اور لڑائیوں میں اُسی نے مجھے فتح و نصرت بخشی ہے اور اُسی کی ذات سے مجھے دونوں جہاں کی نعمتیں حاصل ہیں۔

اگر تمہارا خیال ہے کہ تمہارا یہ شان و شکوہ تمہاری اپنی بہادری اور طاقت کا نتیجہ ہے تو یقیناً تمہارا زوال قریب ہے اور موت تمہارے لیے حلال ہے۔

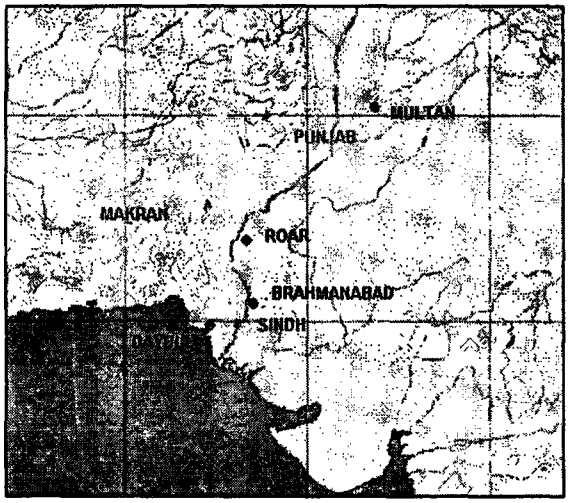

برہمن آباد کی فتح:

چچ نے اس پیغام کے بعد آگھم لوہانہ پر حملہ کیا، اُس وقت آگھم اپنی مملکت کے دورے پر گیا ہوا تھا۔ اس نے سنا کہ چچ نے اس کے ملک پر حملہ کر دیا ہے، وہ فوراً لوٹ کر برہمن آباد آیا اور فوج کو تنظیم اور سامان حرب مہیا کرنے میں مشغول ہو گیا۔ کچھ دن کے بعد دونوں کی فوجوں میں جنگ شروع ہوئی، دونوں طرف کے بہت سے بہادر مارے گئے۔ آخر آگھم لوہانہ کی فوج کو شکست ہوئی، آگھم قلعے میں محصور ہو گیا۔ ایک سال تک چچ نے اس قلعے کا محاصرہ جاری رکھا۔ آگھم نے کنوج کے راجا راسل کے بیٹے ستبان سے ایک خط کے ذریعے مدد چاہی، مگر قبل اس کے کہ ستبان کا جواب آتا، آگھم لوہانہ نے وفات پائی اور اس کا لڑکا اس کا جانشین ہوا۔ جب یہ لڑکا محاصرے کی زندگی سے تنگ آگیا اور اس کا لشکر بھی لڑائی سے جان چھڑانے لگا تو اس نے قلعہ چچ کے حوالے کیا اور صلح کا خواہاں ہوا۔

آگھم کا ایک مربی تھا، جو کہ بدھ مت کا (مقتدر) شمنی راہب تھا اور "بدھر کو" کے نام سے مشہور تھا۔ اس کا ایک مندر تھا، اُسے بدھنو وہار کہتے تھے۔ اسی مندر میں وہ کنوہار نامی بت کی مجاوری کرتا تھا، وہ اپنی بھگتی اور مجاوری کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس علاقے کے اطراف و جوانب کے لوگ اُس کے بے حد معتقد تھے، آگھم خود بھی اس کے دھرم کا پیرو تھا۔ جب وہ قلعہ بند ہوا تھا تو اسی پروہت نے اس کی حمایت کی تھی، لیکن جنگ کے دوران اس نے جنگ میں حصہ نہیں لیا، بلکہ وہ مندر میں جا کر اپنی مذہبی کتابوں کی تلاوت میں مصروف ہو گیا تھا۔ جب

---

[1] ریگستان کا بادشاہ: چچ نامہ فارسی میں ملک رمل ہے، رمل عربی میں ریت کو کہتے ہیں، اس لیے اس کا ترجمہ ریگستان کا بادشاہ کیا گیا ہے، غالباً اس سے مراد جیسلمیر اور باڑھ میر کے حاکم سے ہے، کیونکہ قدیم زمانے سے لے کر جیسلمیر بھٹی قوم کے لوگوں کا ملک رہا ہے۔ سندھی نسب نامے کے ایک قدیم شعر میں کہا گیا ہے کہ سندھ، سما، کاچھی، چنا، بھاٹی، جیسلمیر، عربوں کی فتوحات کے ضمن میں بھی ایک شہر بالمد کا ذکر آیا ہے، جس سے مراد غالباً باڑھ میر ہے۔ اس لحاظ سے ملک رمل کو باڑھ میر کے راجا سے تعبیر کرنا مناسب ہو گا۔ (تعلیقات چچ نامہ، سندھی، صفحات ۴۰۸-۴۰۷ (ن-ب)

Digitized By M. H. Panhwar Institute Of Sindh Studies, Jamshoro.

آسھم نے وفات پائی اور اس کا بیٹا اس کا جانشین ہوا تو یہ ڈرا کہ کہیں اس کی ملکیت، اسباب اور زمین ہاتھ سے نہ نکل جائے، اس نے اپنا اصظرلاب اٹھا کر اور حساب لگا کر قطعی فیصلہ کیا کہ یہ ملک یقیناً راجا چچ کے قبضے میں جائے گا اور وہ مجھ پر مہربان ہوگا۔ چچ کو جب یہ معلوم ہوا کہ آسھم اور اس کا بیٹا دونوں اس راہب کے مرید ہیں اور اس راہب کی مکاریوں اور چالاکیوں کی بدولت ہی جنگ نے ایک سال تک طول کھینچا ہے، تو اس نے قسم کھائی کہ اگر یہ قلعہ فتح ہو گیا تو میں اس راہب کی کھال کھنچوا کر نقاروں پر مڑھواؤں گا، تاکہ نقارچی اُسے کوٹ کوٹ کر پارہ پارہ کر دیں۔ شمنی راہب کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ ہنسا، اور اُس نے ہنستے ہوئے کہا کہ چچ کی یہ مجال نہیں کہ وہ مجھے ہلاک کر سکے۔

چچ نے قلعے میں داخل ہو کر آسھم کے لڑکے کو حکم دیا کہ اگر تم جانا چاہتے ہو تو بے خوف ہو کر جاؤ، کوئی تمہیں روک نہیں سکتا، اور اگر تم یہیں رہنا چاہتے ہو تو خوشی سے رہو، ہمیں تمہارے رہنے پر کوئی اعتراض نہیں، آسھم کے لڑکے سربند نے وہیں رہنا پسند کیا، پھر چچ نے کچھ دن وہاں رہ کر وہاں کے لوگوں کے مزاج سے کماحقہ واقفیت حاصل کی۔

چچ کی شادی:

چچ نے اپنے قیام برہمن آباد کے زمانے میں آسھم لوہانہ کی بیوہ کو بلا کر اس سے شادی کر لی، اور اپنے بھتیجے دہرسیہ کی لڑکی کا نکاح آسھم لوہانہ کے لڑکے سربند کے ساتھ کر دیا۔[1]

پھر چچ نے وہاں کے لوگوں سے پوچھا کہ وہ شمنی راہب کہاں ہے؟ میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے کہا وہ بھگت ہے اور بھگتوں کے پاس ہوگا، وہ ہندوستان کے داناؤں اور کنوھار کے مجاوروں میں سے ہے، تمام راہب اس کی بڑی عزت کرتے ہیں، اور اس نے ایک دنیا کو اپنا مطیع اور مرید بنا رکھا ہے۔ اس کے سارے مقاصد طلسم کے زور سے پورے ہوتے ہیں، کچھ دنوں وہ سرہند کا معاون رہا تھا اور اُسی کے سہارے برہمن آباد کے سپاہی ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔

پھر چچ مسلح سپاہیوں اور محافظوں کے ساتھ سوار ہو کر شمنی راہب کو قتل کرنے کے لیے بدھ کے مندر کنوھار[2] میں گیا۔ راستے میں اس نے اپنے مسلح سپاہیوں کو حکم دیا کہ جب میں اُس سے گفتگو کرنے کے بعد خاموش ہو جاؤں اور تمہاری طرف دیکھوں تو تم فوراً تلوار سے اُس کا سر جدا کر دینا۔ جب چچ بدھ کنوھار میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ شمنی راہب ایک کرسی پر بیٹھا ہوا اپنی عبادت میں مشغول تھا، اس کے ہاتھ میں سخت گندھی ہوئی مٹی تھی، جس کے بت بنا کر ایک مہر جیسی چیز ان پر لگا رہا تھا، جس کی وجہ سے اُن بتوں پر بدھ کی تصویر نقش ہو جاتی تھی اور وہ اُنھیں ایک جگہ رکھتا جاتا تھا۔ چچ وہاں جا کر اس کے سامنے کھڑا رہا مگر اُس نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ایک گھنٹے کے بعد اُن بتوں کے بنانے سے فارغ ہونے پر سر اٹھا کر اس نے کہا، "سیلا بیج بھگت کا بیٹا آیا ہے"۔ چچ نے جواب دیا: ہاں اے عبادت گزار پروہت! پھر اس نے پوچھا کہ تم کس کام سے آئے ہو؟ چچ نے جواب دیا کہ میں اپنی عقیدت کی بنا پر تمہیں دیکھنے آیا ہوں۔ شمنی راہب نے گھاس کا ایک پولا کھول کر بچھایا اور چچ کو اس پر بٹھایا۔ پھر اس نے چچ سے پوچھا کہو کیا کام ہے؟ چچ نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم میری موافقت کرو اور برہمن آباد کے قلعے میں واپس آجاؤ، تو میں تمہارے سپرد بعض اہم کام کروں، تاکہ تم سربند کے ایک اچھے مشیر بن سکو۔ شمنی راہب نے جواب دیا کہ مجھے تیری حکومت کی ضرورت نہیں، میں حکومت کے امور سے کوئی رغبت نہیں رکھتا اور نہ اس کا متمنی ہوں۔ پھر چچ نے پوچھا کہ پھر تم نے برہمن آباد کے قلعے میں میرا مقابلہ کیوں کیا تھا۔ شمنی راہب نے جواب دیا کہ جب حاکم آسھم وفات پا گیا تو اُس کا یہ لڑکا باپ کی مفارقت سے پریشان ہونے لگا، تو میں اسے صبر کی تلقین کرتا رہا اور طرفین کے مابین صلح کی دعا کرتا رہا۔ میرے خیال میں دنیوی سرداری سے بدھ کی خدمت کرنا اور آخرت کی نجات طلب کرنا بہتر ہے۔ اب تم چونکہ اس ملک کے راجا ہو، اس لیے میں تمہارے فرمان کے مطابق اپنے قبیلے سمیت آبادی میں منتقل ہونے کو تیار ہوں، مگر مجھے اندیشہ ہے کہ قلعے کے لوگ بدھ مندر کی آبادی کو نقصان پہنچائیں گے۔ چچ نے کہا: بدھ کی بندگی زیادہ بہتر ہے، اب اگر تمہاری کوئی حاجت مجھ سے متعلق ہو تو میں اُسے پورا کرنا اپنی سعادت سمجھوں گا۔ شمنی راہب نے کہا کہ میں

---

[1] چچ کے متعلق یہ تمام تفصیل صفحات ۳۵ تا ۵۰ سے ماخوذ ہیں۔

[2] چچ نامے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ کنوھار کا مندر برہمن آباد سے کچھ فاصلے پر تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ بدھ مندر کس جگہ تھا، کزنس کی کتاب "سندھ کے آثار قدیمہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ منصورہ سے چھ میل مشرق کی طرف دیہہ دوفانی میں ڈیپر گھانگرے جو ٹھل (موضع جھول تحصیل سنجورو سے تقریباً دو میل مغرب میں) کے کھنڈرات کسی قدیمی بدھ مندر کے ہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہی کنوھار کا مندر ہے۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، صفحات ۴۰۹-۴۰۸)۔

کوئی حاجت اور ضرورت نہیں رکھتا، کاش خدا تمہیں عاقبت کے کاموں کی توفیق دے۔ لیکن جب چچ نے اصرار کیا تو شمنی راہب نے کہا اگر تم یہی چاہتے ہو تو نوبہار کے مندر کی عمارت جو ایک قدیمی عبادت گاہ ہے اور مرور زمانہ سے اُسے کافی نقصان پہنچ چکا ہے، اگر اس کی عمارت نئے سرے سے بنوا دی جائے تو اچھا ہو۔ چچ نے اُس کی اس بات کو شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔[1]

اس کے بعد چچ نے قلعہ برہمن آباد میں مقیم رہ کر اس مفتوحہ علاقے کے نظم و نسق کو درست کیا۔ گورنمنٹ کے مطالبات از سر نو مقرر کیے، رعایا کی حالت کو درست کیا اور جتوں اور لوہانوں کے زور کو توڑا، ان کے سرداروں کو اطاعت پر مجبور کیا اور بعض سرداروں کو قلعۂ برہمن آباد میں نظر بند کر کے لوہانہ کے جتوں[2] کے لیے حسب ذیل قوانین بنائے اور انہیں مجبور کیا کہ آئندہ وہ ان قوانین کی پابندی کریں:

۱۔ مصنوعی تلوار کے سوا وہ کسی قسم کا ہتھیار نہ باندھیں۔
۲۔ قیمتی کپڑے، مخمل اور ریشمی کپڑے نہ پہنیں۔
۳۔ گھوڑے کی سواری بغیر زین کے کریں۔
۴۔ ننگے سر اور ننگے پاؤں رہیں۔
۵۔ جس وقت وہ اپنے گھر سے نکلیں تو اپنے کتے ساتھ رکھیں۔
۶۔ برہمن آباد کے گورنر کے مطبخ کے لیے جلانے کی لکڑی مہیا کریں اور اس کے لیے رہبروں اور جاسوسوں کی خدمت انجام دیں۔

ساتھ ہی اس نے ان دونوں قوموں پر اس امر کو بھی واضح کیا کہ اگر انھوں نے ان قوانین کی پابندی کی تو ان کو دیانتدار سمجھا جائے گا اور اُن پر اعتماد کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس نے اُن کے لیے یہ بھی لازمی قرار دیا کہ وہ آکھم کے بیٹے سربند کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ رہیں، اگر کوئی دشمن اس ملک پر حملہ آور ہو تو وہ سربند کی مدد کریں۔ پھر اس نے چند منتخب افراد کو یہاں کے مختلف عہدوں پر مقرر کیا۔

کرمان پر حملہ

برہمن آباد کی مہم سے فارغ ہو کر چچ ۲ھ (۶۲۳ء) میں کرمان کی طرف بڑھا، جس پر ایرانیوں کا قبضہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ایران کا بادشاہ کسریٰ بن ہرمز مر چکا تھا اور ایران کی زمام حکومت ایک عورت[3] کے ہاتھ میں تھی، اور ایرانی حکومت امراء اور اراکین دولت کی نااتفاقیوں کی وجہ سے سسکیاں لے رہی تھی۔

سب سے پہلے چچ ارمائیل[4] (ارمن بیلہ) پہنچا۔ یہاں کا راجا بدھ مذہب کا ماننے والا اور شمنی پروہت تھا۔ یہ ہندوستان کے راجا سیھرس رائے کے گورنروں کی اولاد میں سے تھا، جسے دیانت و صداقت کی خصوصیتوں کی بنا پر وہاں متعین کیا گیا تھا، لیکن بعد میں وہ سرکشی اختیار

---

(1) ماخوذ از چچ نامہ فارسی، صفحات 44-45-46۔

(2) چچ کا لوہانہ کے جتوں سے اس قسم کی سخت شرائط قبول کرانا کوئی عجیب بات نہیں۔ ظاہر ہے کہ چچ ایک کٹر برہمن تھا اور اس نے جتوں پر ہندو قانون کے مطابق اچھوتوں جیسی پابندیاں عائد کی تھیں۔ اس سلسلے میں محقق ہوڑی والا کی یہ تنقید قابل غور ہے: چچ نے جتوں سے چنڈالوں جیسا برتاؤ کیا، جن کے بارے میں منو (دیوتا) کا کہنا ہے کہ اُنھیں شہروں سے باہر رکھا جائے، کتوں اور گدھوں کے سوا اُن کی اور کچھ ملکیت نہ ہونی چاہیے۔ ان کے لباس میتوں میں استعمال شدہ کپڑوں کے ہوں، اُن کے برتن بھانڈے ٹوٹے پھوٹے اور ٹیڑھے میڑھے ہونے چاہئیں۔ اُن کے گہنے اور زیور لوہے کے اور زنگ آلودہ ہوں۔ (Inistitutes, X-12,29.30)

جت: سندھ کے قدیم باشندے ہیں اور گمان ہے کہ انھیں آریوں اور دوسرے فاتحوں نے غلامی کی اس منزل پر پہنچایا ہے۔ کروک (Kroke) کے بیان کے مطابق پنجاب میں راجپوتوں نے اس سے بھی کچھ پہلے جاٹوں کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔ نہ انھیں پگڑی باندھنے دیتے تھے اور نہ انھیں سرخ یا رنگین کپڑے پہننے کی اجازت تھی، شادی کے موقع پر اُن کے دولھا کو سہرا باندھنے اور عورتوں کو نتھ پہننے کی اجازت نہ تھی۔ اُن کی دلہنوں پر پہلے راجپوتوں سے ہمبستر ہونا فرض تھا۔ دیکھیے Tribes and Costes of the North Western Provinces, 1896, (111/23) (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۱۲)

(3) اس عورت کا نام بوران دخت تھا، جو اردشیر بن شیرویہ کے بعد تخت پر بیٹھی۔ (سنی ملوک الارض والانبیاء، ص ۲۲) حمزہ اصفہانی کے حساب کے مطابق بوران دخت کی حکومت کا زمانہ 8 یا 9 ہجری ہوگا، بشرطیکہ مروج الذہب مسعودی کے مطابق یزدگرد کا قتل ۳۲ھ میں تسلیم کر لیا جائے۔ (تعلیقات چچ نامہ، سندھی، ص ۴۱۳)۔

(4) ارمائیل: یعنی ارمن بیلہ جو موجودہ لس بیلہ کا ایک مشہور شہر تھا، جو ساموندی کے ساحل کے قریب تھا۔ عرب مؤرخوں اور جغرافیہ نویسوں کی کتابوں میں شاید کاتبوں کی غلطی کی وجہ سے اس شہر کا نام ارمائیل اور ارمیل لکھا گیا ہے۔ اس شہر کے محل وقوع کے متعلق یاقوت کا معجم البلدان میں دیا ہوا بیان کافی واضح ہے، لیکن اس زمانے کے دیے ہوئے خطوط عرض البلد اور طول البلد آج اس زمانے میں اس کی صحیح جگہ متعین کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتے۔ یاقوت کے بیان کے مطابق یہ دیبل اور مکران کے درمیان سندھ کا ایک بڑا شہر ہے۔ شہر اور سمندر کے درمیان نصف فرسنگ کا فاصلہ ہے، یہ شہر دونوں مملکتوں میں ہے، اس کا طول البلد ۹۲ درجے ۱۵ دقیقے اور عرض البلد ۲۵ درجے ۴۶ دقیقے ہے۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۱۴)۔

کر کے خود مختار ہو گیا تھا۔ ارمابیل کے راجا کو جب معلوم ہوا تو وہ چچ کے استقبال کے لیے شہر سے باہر نکلا اور اس کا شاندار استقبال کیا۔ اور چچ اس سے اتحاد باہمی کا عہد لے کر مکران کی طرف بڑھا۔ پھر وہ کنزپور پہنچا، جس کو عرب مؤرخین قنزپور کہتے ہیں اور جو اب پنج پور[1] کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کے ایک پرانے قلعے کو اس نے از سر نو درست کیا اور ہندوستانی رواج کے مطابق اس میں پنجتوری نوبت رکھوائی، یعنی پانچ سازوں والی نوبت، جو کہ ہندوؤں کی رسم کے مطابق شام کو اور پو پھوٹنے کے وقت بجائی جاتی ہے۔ پھر اس اطراف کے سارے دہقانوں کو بلا کر قلعے کی عمارت کو مکمل کرنے کا حکم دیا۔ پھر پنج پور میں کچھ دن قیام کر کے وہ اس شہر کے کنارے خیمہ زن ہوا جو کرمان اور مکران کے درمیان ہے اور اس نے وہاں کھجور کے درخت لگا کر اپنی مشرقی سرحد قائم کی، جو ایران اور سندھ کو علیحدہ کرتی تھی، اور اعلان کیا کہ مکران اور کرمان کی سرحد یہ کھجوروں کے درخت ہیں۔[2] اور ان پر نشان لگا دیا گیا ہے کہ یہ چچ بن سیلائج بن بساس[3] کے زمانے میں قائم ہوئیں اور یہی حد اس وقت تک قائم ہے۔

---

(1) پنج پور: چچ نامے کے تمام نسخوں میں اس کا تلفظ کنزپور ہے، جو دراصل قنزپور کی دوسری صورت خطی ہے، عرب جغرافیہ نویسوں کی تصنیفات میں اس شہر کا نام "قنز پور" یا "قج پور" یعنی پنج پور' ہے اور غالباً یہ وہی شہر ہے جو اس وقت علاقہ قلات میں "پنج گور" کے نام سے مشہور ہے۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۱۴)۔

(2) اصل فارسی عبارت یہ ہے "وامروز حمان حد بمار سید" ظاہر ہے کہ یہ عبارت علی کوفی مترجم چچ نامہ فارسی کی ہے اور اس کا اشارہ مکران اور کرمان کی سرحد کے متعلق ہے، جو ناصر الدین قباچہ کے عہد میں قائم ہوئی تھی اور جو مترجم کا عہد ہے۔ (چچ نامہ سندھی، ص 67، حاشیہ 1)۔

(3) چچ بن سیلائج بن بساس: چچ نامے میں چچ کے نسب کے متعلق صرف یہی ایک فقرہ ملتا ہے، ہوڑی والے کے خیال میں چچ دراصل 'جج' ہے۔ کشمیر کے راجا جاپید کے بھائی کا بھی یہی نام تھا (دیکھیے ویدیا: ہسٹری آف میڈیول انڈیا 2, 15x2) نام "جج" متھرا کے قریب مہابن کے ایک ۱۱۵۰ء کے کتبے میں بھی یہ لفظ موجود ہے۔ دراصل لفظ جج بیات کی ایک پراکرت شکل ہے۔ چچ کے باپ کا نام سیلائج بھی اصل میں شلادتیہ معلوم ہوتا ہے۔ چچ ناموں کے نسخوں کے مطابق چچ کے دادا کا نام 'بساس' ہے، جو ممکن ہے کہ کاتبوں کے سہو کی وجہ سے 'بسباس' سے بساس بن گیا ہو، اگر یہ صحیح ہے تو پھر ہوڑی والا کے خیال کے مطابق بسباس شاید 'وشواسک' ہو، جو کہ متھرا کے بدھ مذہب کے بہت سے کتبوں میں نظر آتا ہے۔ چچ نامے اور دوسری کتابوں کے مطالعے کے بعد چچ کے خاندان کا شجرہ اس طرح بنتا ہے۔

قندابیل کی فتح:

پھر وہ اپنی قائم کی ہوئی سرحد سے ارمابیل واپس لوٹا اور توران[4] کے علاقے سے ہوتا ہوا یورال ندی کے اوپر سے ہوتا ہوا قندابیل یعنی قندھار[5] پہنچا۔ چچ نے اس شہر پر دفعتاً حملہ کرنے کا ارادہ کیا، مگر اس شہر

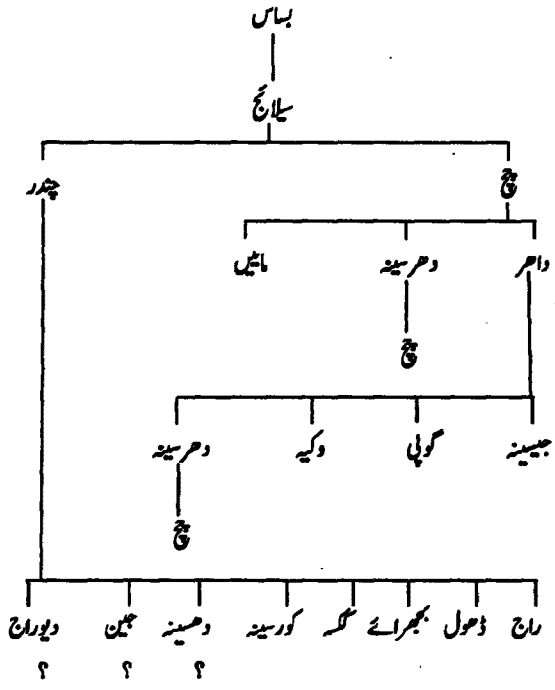

(تعلیقات چچ نامہ سندھی، صفحات ۴۱۵-۴۱۴)۔

(4) توران: قلات کا جنوبی حصہ یا خزدار کا علاقہ، عرب جغرافیہ نویسوں کے بیانات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ مکران کی شمالی سرحد قصدار (قزدار یا موجودہ خزدار) سے ملحق تھی، اور علاقہ قصدار کا نام توران تھا، جس کا پایہ تخت بھی قصدار تھا۔ (ابن حوقل ص ۲۳۳، مقدسی ص ۴۸۶ اور ۴۸۷ یاقوت بلخان 577x3 اور المشترک ص ۲۹۶، تفشندی عن ابن حوقل۔ صبح الاعشی 66x5) اس علاقے کی مشرقی سرحد سندھ کے علاقے بدھیہ سے ملحق تھی اور علاقہ بدھیہ کا شہر قندابیل اس سرحد کی نشان دہی کرتا تھا، توران دراصل کیکانان کا ایک صوبہ تھا اور کیکانان ہی کا جنوبی حصہ توران کہلاتا تھا، امپیریل گزیٹیر آف انڈیا ۱۹۰۸ء (275x14) میں توران کو موجودہ ریاست جھالاوان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۱۶)۔

(5) قندابیل (یعنی قندھار) بریکٹ کا فقرہ یعنی قندھار مترجم کا ہے، لیکن قندابیل کو قندھار سمجھنا صحیح نہیں۔ قندابیل سندھ کے شمال مغربی صوبہ بدھیہ اور توران یعنی خزدار کا سرحدی شہر تھا اور یہ غالباً موجودہ گنداوا کی جگہ پر جو کہ کچھ، گنداوا پر گنے میں ہے یا اُس کے آس پاس واقع تھا اور گنداوا شکار پور سے بولان جانے والے قدیمی راستے پر واقع ہے۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۱۷)۔

کے رہنے والے قلعہ بند ہو چکے تھے۔ وہ دریائے سینی کے کنارے خیمہ زن ہوا اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ محصورین نے مجبور ہو کر سالانہ سو خچر اور ایک لاکھ درہم سالانہ خراج دینے کا وعدہ کیا اور ایک سال کا خراج پیشگی ادا کیا۔

وفات:

اس معاہدے کے تکمیل کے بعد اروڑ (الور) واپس ہوا اور ایک مدت کے بعد چالیس سال حکومت کر کے اس نے ۴۰ھ (۶۶۰ء) میں وفات پائی۔[1]

اولاد:

چچ کے رانی سونھن دیوی سے دو لڑکے اور ایک لڑکی تولد ہوئی، بڑے لڑکے کا نام داہر اور چھوٹے کا دہرسیہ اور لڑکی کا نام مائیں رکھا گیا۔

دونوں لڑکوں اور لڑکی کے منجموں نے زائچے بنائے، اور ستاروں کا حساب کر کے انھوں نے چچ کو بتایا کہ آپ کے دونوں لڑکے بادشاہ ہوں گے اور ایک عرصے تک تمام سندھ ان کے قبضے میں رہے گا۔ لڑکی کے متعلق انھوں نے کہا کہ وہ دارالسلطنت سے باہر نہیں جائے گی اور جو کوئی اس کا شوہر ہو گا تمام مملکت سندھ کا مالک ہو گا۔ جب منجموں نے چچ سے یہ پیشگوئی بیان کی، اس نے حکم دیا کہ یہ پیشگوئی راز میں رکھی جائے۔[2]

چندر

۴۰ھ (۶۱-۶۶۰ء) تا ۴۸ھ (۶۹-۶۶۸ء)

چچ کی وفات کے بعد اس کا بڑا بھائی چندر بن سیلائج 40ھ (۶۶۰-۶ء) اروڑ (الور) میں تخت نشین ہوا۔ یہ بدھ مذہب کا ماننے والا تھا۔ س نے لوگوں کو بزور شمشیر مجبور کیا کہ وہ بدھ مذہب اختیار کریں۔ اُس =قت سندھ میں عام آبادی بدھوں کی تھی، البتہ ارکان حکومت برہمن =تھے، اس حکومت سے عوام بہت خوش تھے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ سیوستان کا گورنر متھ سیوستان سے بھاگ کر =دوستان کے راجا کے پاس چلا گیا تھا۔ جس وقت چچ کی وفات ہوئی، اس =انے میں ہندوستان میں قنوج کا راجا راسل کا بیٹا سیھرس[3] تھا، متھ نے اُس کے پاس جا کر درخواست کی کہ سندھ کا راجا چچ مر چکا ہے اور اس کی جگہ اس کا بھائی چندر تخت نشین ہوا ہے، جو ایک تارک الدنیا شخص ہے اور جس کا زیادہ تر وقت مندروں میں کتابوں کے پڑھنے میں گزرتا ہے۔ اس وقت سندھ پر قبضہ کر لینا آسان ہے، اگر آپ اس ملک پر قبضہ کر کے میرے حوالے کر دیں تو میں اس ملک کا سالانہ خراج وصول کر کے بالالتزام شاہی خزانے میں داخل کرتا رہوں گا۔ راجا سیھرس اس پر تیار ہو گیا، چنانچہ اس نے اپنے بھائی برہاس بن کسائس[4] کو سپہ سالار بنا کر ایک فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ راجا چچ کا نواسا جو کشمیر کی سرحد پر حکمران تھا، وہ بھی برہاس کے ساتھ مل گیا۔ دونوں اپنی فوجوں کے ساتھ چندر کے علاقے پر حملہ کرنے کے لیے دریائے باسی پر خیمہ زن ہوئے، اور چندر کے ایک قلعے دیو دہنوز[5] (دیو پورہ) پر قبضہ کر لیا اور آگے بڑھ کر بند کا ہویہ کے قریب پہنچے۔ یہاں ایک مہینہ تک مقیم رہے اور بودھ بھگوان کی پرستش کرتے رہے اور ساتھ ہی راجا چندر کو ایک دھمکی آمیز خط لکھا کہ وہ فوراً حاضر ہو کر اطاعت قبول کرے۔ راجا چندر کے پاس جب یہ خط پہنچا تو اس نے اطاعت سے انکار کر دیا اور قلعہ بند ہو کر مقابلے کے لیے فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے چچ کے بیٹے دھرسینہ کو برہمن آباد بھیجا، تاکہ وہ وہاں فوجی تیاریاں کرے۔ وہ برہمن آباد پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے اس کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور ہر طرح اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا یقین دلایا۔ چندر نے چچ کے چھوٹے بیٹے داھر کے ساتھ اروڑ (الور) کے قلعے کی حفاظت کا انتظام کیا۔ اس کی ان تمام تدبیروں کا نتیجہ یہ نکلا کہ دشمن اپنے ارادوں میں ناکام ہو کر واپس ہو گیا۔

وفات

چندر نہایت شوکت سے سات سال حکومت کر کے 48ھ (668ء) میں مر گیا۔[6]

---

[1] چچ کے متعلق یہ جملہ تفصیلات چچ نامہ صفحات ۳۵ تا ۵۰ سے ماخوذ ہیں۔

[2] چچ نامہ فارسی، صفحات ۳۰-۲۹۔

[3] سیھرس: ہوڑی والا سیھرس کو شری ہرشا تصور کرتا۔ "شری ہرشا" ویسے خاصا مشہور ہے، لیکن اس کے عہد حکومت اور اس واقعہ کے سلسلے میں سن کی مطابقت غور طلب ہے۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۱۷)۔

[4] برہاس بن کسائس: اس سے پہلے سیھرس کے باپ کا نام راسل بتایا گیا ہے، اس صورت میں برہاس بن کسائس اس کا بھائی کیسے ہو سکتا ہے؟ فارسی متن کی عبارت میں "برادر خود" ہے (یعنی اپنا بھائی) ممکن ہے کہ یہ عبارت "برادر زادہ خود" ہو، یعنی اپنے بھائی کا بیٹا۔ تحفۃ الکرام میں (8x3) برہاس کی جگہ بسایس ہے۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۱۷)۔

[5] دیو دہنوز: فارسی متن میں یہ نام صفحہ 15 پر دیو ہنوز اور صفحہ 51 پر دیو دہنوز مندرج ہے، چچ نامے کے ایک نسخے سے اس کا تلفظ دیو ہپور ہے، اسی کو تاریخ معصومی صفحات ۲۸ اور ۳۱ پر دیبالپور لکھا گیا ہے۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۰۵)۔

[6] چچ نامہ فارسی، صفحات 50 تا 53۔

داھر

۷۰۰ء تا ۷۱۲ء مطابق ۸۱ھ - ۹۴ھ

چندر کے مرنے کے بعد سلطنت سندھ دو حصوں میں تقسیم ہوگئی، اروڑ (الور) میں چچ کا لڑکا داہر تخت نشین ہوا اور برہمن آباد میں چندر کا لڑکا راج نامی راجا بنا۔ اتفاق سے ایک سال کے بعد راج مر گیا، اس کی جگہ برہمن آباد میں داہر کے چھوٹے بھائی دہرسینہ بن چچ نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس کی بہن مائین نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پھر دہرسینہ نے اتھم کی بیٹی سے شادی کی اور پانچ سال وہاں رہا، اس کے بعد کچھ دنوں راوڑ کے قلعے میں جا کر رہا۔ اس قلعے کی بنیاد چچ نے رکھی تھی، مگر یہ قلعہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ چچ نے وفات پائی۔ دہرسینہ نے اس قلعے کی تعمیر مکمل کر کے آس پاس کے دیہاتیوں کو بلایا اور ان میں سے اچھے اچھے لوگوں کو اس قلعے میں آباد کر کے اس کا نام راوڑ[1] رکھا۔ پھر خود برہمن آباد میں واپس چلا گیا اور سلطنت کے کاروبار میں مصروف ہو گیا۔[2]

داہر نے تخت نشین ہوتے ہی عدل و انصاف کو اپنا شعار بنایا۔ فوج کو روپے سے اور رعایا کو احسان سے اپنا ممنون بنایا، جس کی وجہ سے رعایا میں اس کے لیے غیر معمولی جذبہ اطاعت و فرمانبرداری پیدا ہو گیا۔ وہ تخت نشین ہونے کے بعد ایک سال تک الور میں مقیم رہا اور ملک کا نظم و نسق بہتر بنانے کی تدبیریں سوچتا رہا۔

ملک کا دورہ

جب داہر دارالسلطنت کے حالات سے مطمئن ہو گیا تو اس نے پورے سندھ کا دورہ شروع کیا، سندھ کی مشرقی سرحد پر جا کر اس نے قابل اعتماد لوگ رکھے، وہاں سے مطمئن ہو کر وہ سندھ کی مغربی سرحد پر پہنچا اور وہاں کے انتظامات کو درست کیا۔ مغربی سرحد کے انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد وہ برہمن آباد پہنچا اور اپنے بھائی دہرسینہ کی حکومت کی توثیق کی۔ برہمن آباد میں چند روز قیام کر کے وہ کیچ و مکران پہنچا

---

(1) راوڑ: متاخر دور میں جس نے بھی سندھ کی تاریخ پر قلم اٹھایا ہے، اس نے راوڑ اور اروڑ کو ایک سمجھا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ مندرجہ بالا متن سے ظاہر ہوتا ہے کہ چچ نے اپنے زمانے میں راوڑ کی بنیاد رکھی تھی اور اس کے بیٹے دہرسینہ نے اسے بنوا کر وہاں شہر آباد کیا تھا اور اس کا نام راوڑ رکھا تھا۔ بخلاف اس کے اروڑ ایک قدیمی شہر تھا اور چچ سے پہلے رائے خاندان کے زمانے میں بھی سندھ کا پایہ تخت تھا۔ اروڑ شمالی سندھ میں روہڑی کے قریب تھا۔ راوڑ نشیب میں مہران (دریائے سندھ) کے ڈیلٹا پر جزیرے میں ایک مضبوط حفاظتی قلعہ تھا۔

آج قلعہ راوڑ کا صحیح مقام متعین کرنا مشکل ہے، لیکن چچ نامے میں محمد بن قاسم اور داہر کی جنگ کے سلسلے میں دی ہوئی روایات سے پتا چلتا ہے کہ راوڑ، لاڑ (نشیبی سندھ) میں مہران (دریائے سندھ) کے مدخل والی اراضی پر واقع تھا۔

بہر حال قلعہ راوڑ کے محل وقوع کے متعلق ماہرین آثار قدیمہ اور مؤرخوں کے حسب ذیل قیاسات ہیں:

۱۔ کزنس (سندھ کے آثار قدیمہ صفحہ 23) کا یہ گمان ہے کہ راوڑ کا قلعہ اروڑ سے ۲۰ یا ۲۵ میل مغرب یا جنوب مغرب میں شہر کنگری سے کچھ نشیب میں واقع تھا۔

۲۔ میجر راورٹی کا یہ اندازہ ہے کہ راوڑ برہمن آباد کے مغرب میں تقریباً دس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

۳۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کا خیال ہے کہ راوڑ موجودہ حیدرآباد کی جگہ پر تھا۔

۴۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کا قیاس یہ ہے کہ راوڑ کا قلعہ غالباً لاڑ میں موجودہ ضلع ٹھٹہ کے شاہ بندر ڈویژن اور حیدرآباد ضلع کے ٹنڈو ڈویژن کی حدود میں کسی جگہ واقع تھا۔ ان کی رائے میں نام کی مناسبت سے شاہ بندر ڈویژن میں قدیمی شہر رڑی کے کھنڈرات شاید راور کے قدیمی قلعے اور شہر کے ہیں۔

۵۔ ہوڈی والا: (صفحہ ۸۷) کی رائے کے مطابق راوڑ، نیرن کوٹ اور برہمن آباد کے درمیان میں تھا۔

۶۔ ہیگ: جس نے مہران کے دوآبے اور اس کی قدیمی شاخوں کی کافی تحقیق کی ہے، اس کی رائے میں راوڑ، لاڑ میں ونگی کے آس پاس مشرقی نارے کے کنارے برہمن آباد سے تقریباً اسی میل جنوب مشرق میں واقع تھا۔ (انڈس ڈیلٹا کنٹری، صفحات ۶۴-۶۳) یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ شہر کب اور کیسے برباد ہوا؟ البتہ اس کا پتا چلتا ہے کہ شہر راوڑ محمد بن قاسم کی فتوحات کے تقریباً پانچ سو برس کے بعد تک بھی موجود تھا، کیونکہ یاقوت اپنی کتاب معجم البلدان (راوڑ) میں سنہ ۱۲۲۸-۱۲۲۴ء کے زمانے میں لکھتا ہے کہ "راوڑ سندھ میں ایک بڑا شہر ہے جسے محمد بن قاسم نے فتح کیا۔ بقول ہوڈی والا (صفحہ ۸۷) راوڑ کے متعلق سنہ ۱۶۱۲ء کا ایک حوالہ، انڈیا آفس لائبریری میں پہلوی زبان کی ایک کتاب کا فارسی منظوم ترجمہ موجود ہے، جو کہ سنہ ۱۶۱۲ء میں ایران کے ایک باشندے مرزبان زرتشتی نے کیا، دیکھیے: Sachu, J.R.A.S, New Series, IV. 24, West Pahpavi texts

ممکن ہے کہ اس کتاب میں تحریر کردہ راوڑ اصل میں اروڑ کی غلط صورت نویسی ہو، لیکن اگر واقعی یہ وہی زیر بحث "راوڑ" ہے، تو پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سنہ ۱۶۱۲ء تک راوڑ موجود تھا۔ اس لحاظ سے راوڑ غالباً شاہ بندر سب ڈویژن کا وہی قدیم برباد شدہ شہر 'رڑی' ہے جو کہ مقامی روایتوں کے مطابق دو تین صدی پہلے برباد ہوا۔ اپنے آخری دور میں رڑی جت قوم کے لوگوں کا مشہور شہر تھا، جس پر اپنے فرض کے بدلے میں کیہر قوم کے لوگ قابض ہو گئے تھے۔ لاڑ میں کیہر قوم کا زوال تقریباً سترھویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوا اور غالباً اسی زمانے میں شہر رڑی برباد ہوا۔ (ماخوذ از تعلیقات چچ نامہ سندھی، صفحات ۴۱۷ تا ۴۲۴)۔

(2) چچ نامہ فارسی، ص ۵۴۔

اور وہاں چند دن ٹھہر کر کرمان کے بادشاہ سے جس کی سرحد سندھ سے ملتی تھی، دوستی و خیر سگالی کے معاہدے کیے، ان انتظامات سے فارغ ہو کر وہ الور لوٹا۔

الور کو واپسی:

داہر جب الور کے قریب پہنچا تو الور کے شہریوں نے اس کا شاندار استقبال کیا، داہر نے بھی اُس دن ہر چھوٹے بڑے کو انعام و اکرام سے نوازا۔

نجومیوں کی پیشگوئی:

الور کے برہمنوں اور نجومیوں کا ایک وفد بھی راجا داہر سے ملا اور واپسی کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے نجومیوں نے کہا مہاراج کو خدا سلامت رکھے، ہم نے آپ کا اور آپ کے بھائی بہن کا زائچہ بنایا ہے۔ آپ دونوں بھائیوں کے زائچے میں کسی قسم کی خرابی نظر نہیں آتی لیکن آپ کی بہن مائین رانی کے زائچے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی اس سے شادی کرے گا، وہ سندھ کے تاج و تخت کا مالک ہو گا اور ہمیں اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مائین رانی سندھ سے باہر نہیں جائے گی۔[1]

مائین رانی

مائین رانی داہر کی بہن تھی جو اپنے بھائی دہرسینہ کے پاس برہمن آباد میں رہتی تھی۔ جب وہ جوان ہوئی تو دہرسینہ کو اس کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ جس زمانے میں وہ اس فکر میں تھا، اسی زمانے میں بھاٹیہ کے راجا سوکھن رائے نے مائین کو اپنا پیغام بھیجا۔ دہرسینہ نے یہ پیغام منظور کر لیا اور سامان جہیز تیار کیا اور اپنے بھائی داہر کے پاس مائین کو سات سو گھوڑوں اور پانچ سو ٹھاکروں کے ساتھ بھجوا دیا، ساتھ ہی داہر کو لکھا کہ وہ مائین کو بھاٹیہ کے راجا کی طرف روانہ کرے اور ایک قلعہ بھی اُس کے حوالے کرے، جس کا دینا شادی کے موقع پر طے ہو چکا ہے۔[2]

مشورہ:

نجومیوں کی پیش گوئی کے وقت مائین الور میں موجود تھی، داہر نجومیوں کی اس پیش گوئی سے پریشان ہو گیا، اس نے ایک روز اپنے وزیر بدہیمن کو بلا کر مشورہ کیا اور کہا کہ نجومیوں کی پیشگوئی کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کی سلطنت کا مالک وہ شخص ہو گا جو مائین سے شادی کرے گا۔ تم مجھے بتاؤ کہ اتنی بڑی سلطنت و حکومت کیسے چھوڑی جا سکتی ہے اور میں دوسرے کو اس ملک کا راجا بنتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا ہوں اور اس صورت حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟

بدہیمن وزیر کی رائے:

داہر کے مشورہ طلب کرنے پر بدہیمن وزیر نے کہا، مہاراج! انتظام مملکت خدا کی ایک عظیم الشان نعمت ہے اور کسی بادشاہ کا اپنی مملکت، رعایا اور فوج سے جدا ہونا، اس بادشاہ کے لیے بہت برا ہے۔ چنانچہ پانچ چیزیں ایسی ہیں جو اپنے مقام سے جدا ہو کر بری لگتی ہیں: (۱) بادشاہ اپنے تخت سے (۲) وزیر اپنی وزارت سے (۳) پیر اپنے مرید سے (۴) دانت اور بال اپنی اصل جگہ سے (۵) نوجوان عورت کے پستان اپنی جگہ سے۔

یہ وہ پانچ چیزیں ہیں جو اپنی جگہ سے ہٹ کر بری معلوم ہوتی ہیں، اس لیے آپ کو مملکت سے علیحدہ نہ ہونا چاہیے، بلکہ میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنی بہن سے شادی کر کے اس کو اپنے ساتھ تخت نشین کر لیں، لیکن ازدواجی تعلقات سے کنارہ کش رہیں۔ اس طرح وہ آپ کی بیوی بھی کہلائے گی اور سندھ کا تاج و تخت بھی آپ کے پاس رہے گا۔

اُمرا اور مصاحبوں سے مشورہ:

بدہیمن وزیر سے رائے لینے کے بعد داہر نے اپنے اُمراء، مصاحبوں اور سرداروں جن کی تعداد پانچ سو تھی، کو طلب کیا اور کہا کہ مجھے تمہاری بہادری اور شجاعت پر پورا اعتماد ہے، میں کوئی کام تمہارے مشورے کے بغیر کرنا نہیں چاہتا۔ پھر اس نے نجومیوں کی پیشگوئی کو بیان کر کے بدہیمن کی رائے کو اُن کے سامنے بیان کیا اور کہا کہ بدہیمن نے جو رائے ہمیں دی ہے، اُس میں بدنامی کا بڑا اندیشہ ہے اور ہمارے مذہب

---

[1] یہ تمام تفصیل تاریخ معصومی، صفحات ۱۶-۱۷ سے ماخوذ ہے۔

[2] چچ نامہ، ص ۵۴۔

میں بھی اس سے فتنے برپا ہونے کا اندیشہ ہے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ مہاراج یہ بڑا پاپ ہے اس سے سارے ملک میں بڑی بدنامی ہو گی۔

بھائی بہن کی شادی:

وزیر بدہیمن نے اب راجا کو ایک اور طرح سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ دربار سے اُٹھ کر اپنے گھر گیا اور اس نے ایک بھیڑ منگا کر اس کے بالوں میں مٹی ڈال کر رائی ڈالی اور اُس پر دو تین روز تک پانی چھڑکتا رہا، یہاں تک کہ اس رائی کی کونپلیں پھوٹ آئیں۔ پھر اُس نے اس بھیڑ کو شہر کے بازار میں چھوڑ دیا، جدھر سے وہ بھیڑ گزرتی تھی لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اس کو دیکھنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ تین روز کے بعد وہ بھیڑ بازاروں میں ماری ماری پھرتی تھی اور کوئی اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے والا نہ تھا۔ سب لوگ اس واقعہ کو معمولی سمجھ کر بھول چکے تھے۔ اس کے بعد بدہیمن نے داہر سے کہا، مہاراج! آپ نے دیکھا کہ تین روز تک اس بھیڑ کے متعلق شہر میں کس قدر چرچے رہے، لیکن اب کوئی اس کی طرف توجہ نہیں کرتا، بس یہی حال ہر واقعہ کا ہے، خواہ وہ واقعہ کتنا ہی اچھا یا برا ہو، دو تین روز تک لوگوں میں اس کے متعلق چرچے رہتے ہیں، پھر لوگ اسے بھول جاتے ہیں، انہیں یہ یاد بھی نہیں رہتا کہ کوئی ایسی بات ہوئی بھی تھی یا نہیں۔ بہر حال سلطنت کو کسی حالت میں نہیں چھوڑا جاسکتا، آپ انہیں پانچ سو سرداروں کو بلائیے اور خاموشی سے اس رسم کو ادا کیجیے۔ داہر نے پھر اُن پانچ سو سرداروں کو بلایا اور انھیں سمجھا بجھا کر کہا کہ میرے اور مائین کے درمیان گٹھ بندھن کی رسم ادا کر دی جائے، یعنی میری دھوتی کے کونے سے اس کی اوڑھنی کا پلہ باندھ دیا جائے، اس طرح وہ رسماً میری رانی اور میں یہاں کا راجا رہوں گا۔ لیکن ہم میں میاں بیوی کے تعلقات قائم نہ ہوں گے۔ اس طرح نجومیوں کی بات بھی پوری ہو جائے گی اور میں بھی پاپ سے بچ جاؤں گا۔ سب لوگوں نے راجا کی اس بات کو پسند کیا، شادی کی رسم باقاعدہ برہمنوں نے ادا کی اور دونوں کی شادی ہو گئی۔

دہر سینہ کا حملہ:

شادی کی یہ رسم اگرچہ خاموشی سے ادا کی گئی، اس کے باوجود کہ دونوں میں ازدواجی تعلقات قائم نہیں ہوئے، لیکن پھر بھی اس شادی کا سارے ملک میں چرچا ہوا، بھائی بہن کی اس شادی پر ہر ایک کو حیرت ہوئی۔ جب یہ خبر برہمن آباد پہنچی تو اس خبر کو سن کر داہر کے بھائی دہر سینہ کو بہت افسوس ہوا۔ اُس نے فوراً ہی داہر کو ایک خط میں لکھا کہ تم نے یہ کام اتنا برا کیا ہے کہ ہمارے خاندان کی عزت خاک میں مل گئی، تمہارے لیے یہ ہرگز مناسب نہ تھا۔

داہر نے اس کے جواب میں بھائی کو اظہار ندامت کرتے ہوئے لکھا کہ میں خود بھی اس کام کو برا سمجھتا ہوں، یہ شادی میں نے رسمی طور پر نجومیوں کے کہنے سے کر لی ہے، ورنہ خدا جانتا ہے کہ آج بھی میں اور مائین بہن بھائی ہیں۔ دہر سینہ نے اس کو جواب میں لکھا کہ تم شاید اس تدبیر سے تقدیر کو بدلنا چاہتے ہو لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر ہی رہے گا۔ اب بھی وقت ہے کہ تم اس کام سے توبہ کر کے اس بدنامی کو دور کرو جو سارے ملک میں ہو رہی ہے۔ لیکن داہر پر اس خط کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ دہر سینہ کو اور بھی غصہ آیا اور وہ ایک فوج لے کر داہر کے مقابلے کے لیے الور روانہ ہوا۔ راجا داہر نے بھی اس کے مقابلے کے لیے ایک بڑا لشکر تیار کیا اور بھائی کا انتظار کرنے لگا۔ دہر سینہ کے پہنچنے میں کچھ دیر ہوئی تو یہ کچھ دن کے لیے شکار کے لیے باہر نکل گیا۔ چند دن کے بعد دہر سینہ الور پہنچا، اس نے قلعے میں داخل ہونا چاہا، مگر شہر کے لوگوں نے قلعہ بند ہو کر لڑائی شروع کر دی اور ایک آدمی داہر کو بلوانے کے لیے بھیجا، جیسے ہی داہر کو یہ خبر معلوم ہوئی وہ الور پہنچا۔[1]

چچ نامے میں ہے کہ مائین سے شادی کے بعد داہر نے اپنے بھائی دہر سینہ کو خط بھیجا، جس میں لکھا کہ میں نے نجومیوں کی اس رائے کی بنا پر کہ یہ لڑکی اروڑ کی ملکہ ہو گی اور اس کا شوہر راجا ہو گا اور اسی کے قبضے میں یہ ملک آئے گا، اس بنا پر سب کے مشورے سے میں نے بادشاہی کی خاطر یہ ننگ اختیار کر لیا ہے۔ میں معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے یہ صورت خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے اختیار کی ہے، آپ مجھے معاف فرمائیں۔

دہر سینہ نے اس خط کا جواب دیا۔ چچ نامے میں بھی تقریباً وہی ہے جو ہم نے مندرجہ بالا سطور میں معصومی سے نقل کیا ہے۔ چچ نامے میں ہے کہ اس خط کے ملنے کے بعد داہر نے اپنے وزیر بدہیمن سے مشورہ کیا کہ وہ اپنے بھائی دہر سینہ سے ملنے کے لیے برہمن آباد جانا چاہتا ہے۔ لیکن بدہیمن نے اس کی مخالفت کی، بلکہ اُس نے مشورہ دیا کہ وہ اپنے بھائی سے ملنے جلنے سے احتراز کرے اور اپنے لیے قلعہ بندی کو لازم جانے۔ چنانچہ داہر اُس کے

---

(1) داہر کے متعلق مندرجہ بالا تفصیل چچ نامہ صفحات ۵۲ تا ۶۰ اور معصومی صفحات ۱ تا ۲۰ سے ماخوذ ہے۔

مشورے پر مضبوطی سے جم گیا اور جنگ کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد داہر نے ایک اور خط نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ اپنے بھائی دہر سینہ کو لکھا جس میں اس نے مائین کے متعلق لکھا کہ اگرچہ مائیں کو ہمارے باپ سے نسبت ہے، لیکن اصل میں وہ جتوں کی بیٹی ہے، جو کہ سرکش اور جرائم پیشہ ہیں۔ خصوصاً جتوں کی عورتیں ہرگز اعتماد کے قابل نہیں اور وہ امانت و دیانت سے بہت دور ہوتی ہیں۔ بہر حال چونکہ مائین اجنبی ہے، اس لیے میرا اور اس کا نکاح مباح ہے، اس لیے اب اس قسم کی نصیحتیں چھوڑ دیجیے، میں قسم کھا کر پختہ عہد کرتا ہوں کہ میں ہر حالت میں تمہارا فرمانبردار رہوں گا۔ میں اروڑ کے قلعے میں تمہاری جانب سے ایک گورنر کی حیثیت سے ہوں، میں نہ کبھی تمہاری مخالفت کروں گا اور نہ کبھی تم سے مقابلہ کروں گا۔

دہر سینہ کو داہر کا جب یہ خط ملا تو اُسے یقین ہو گیا کہ داہر نے لطیف طریقے پر مکاری سے آنے سے انکار کیا ہے اور اس کی نصیحت کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا، دہر سینہ کو اور بھی غصہ آیا اور وہ ایک فوج لے کر اروڑ (الور) کی طرف روانہ ہوا۔ ادہر راجا داہر نے بھی اُس کے مقابلے کے لیے ایک بڑا لشکر تیار کیا، دہر سینہ کے جاسوسوں نے خبر دی کہ داہر اور اس کا لشکر سارا دن عیش و عشرت میں مشغول رہتا ہے۔ دہر سینہ کو خیال ہوا کہ جب وہ اس قدر غافل ہے تو یہ قلعہ آسانی سے فتح ہو جائے گا۔ وہ فوراً ہی یلغار کرتا ہوا ایک دن اور رات میں بیس فرسنگ کی مسافت طے کر کے صبح کے وقت اروڑ پہنچا، داہر اس وقت شکار پر جانے کے لیے تیار تھا، سواروں کے قلعے کے دروازے پر پہنچتے ہی قلعے کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ دہر سینہ نے قلعے کے دروازے پر کھڑے ہو کر دربان سے کہا دروازہ کھولو تاکہ میں اندر آؤں۔ لیکن قلعے والوں نے دروازہ نہ کھولا اور جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ دہر سینہ نے یہ صورت دیکھ کر داہر کو پیغام بھیجا کہ میں لڑائی کے لیے نہیں آیا ہوں، بلکہ یہ قلعہ میرے باپ کا دارالسلطنت ہے اور تو میری جانب سے یہاں کا گورنر ہے، اس لیے تجھے یہ قلعہ میرے معتمدوں کے حوالے کر دینا چاہیے۔ داہر نے جواب میں کہلا بھیجا کہ تم قریب نہ آؤ اور باہر جا کر خیمہ زن ہو اور اپنے قابل اعتماد لوگوں کو بھیجو، جن پر مجھے بھی اعتماد ہو، تاکہ میں باہر نکل کر قلعہ ان کے حوالے کر دوں۔

دہر سینہ کو جب اندازہ ہو گیا کہ داہر مقابلے کے لیے تیار ہے اور یہ حیلہ کارگر نہیں ہوا تو اس نے مہران (دریائے سندھ) کے اُس طرف جا کر پڑاؤ ڈالا اور پھر داہر کو گرفتار کرنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ ادہر وہ داہر سے نرمی اور ملاطفت کی باتیں کرتا رہا اور دوسری طرف وہ اروڑ (الور) کے سربراہوں اور سرداروں کے ملانے کی فکر کرتا رہا، لیکن اس کی ان کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

داہر کا اپنے وزیر سے مشورہ:

ادہر داہر نے اپنے وزیر بدہیمن سے مشورہ کیا اور اس سے کہا کہ دہر سینہ نے اپنی خط و کتابت میں مجھ سے اس قدر نرمی اور خوش اخلاق کا اظہار کیا ہے کہ میں اپنے بڑے بھائی کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی خوشنودی حاصل کروں، مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے دغا نہیں کرے گا۔ بدہیمن نے جواب دیا کہ آپ کو ہرگز اس کے قول پر اعتماد نہ کرنا چاہیے اور اس کی باتوں کے فریب میں نہ آنا چاہیے۔ اس قسم کے قول و قرار تو فریب کے وہ پھندے ہیں جن میں اپنے مخالف کو پھانسا جاتا ہے، مجھے ڈر ہے کہ مبادا ایسا نہ ہو کہ دہر سینہ کے ہاتھوں آپ کو تکلیف پہنچے۔ داہر نے جواب دیا کہ اگرچہ تمہارے اندیشے ٹھیک ہیں، لیکن وہ میرا حقیقی بھائی ہے، میں اُس سے گریز کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ میں اس کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں گا، بشرطیکہ مجھے یہ اعتماد حاصل ہو جائے کہ مجھے اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ادہر دہر سینہ نے نہایت وثوق کے ساتھ داہر کو خط لکھا کہ میں تمہارے اعتماد کی خاطر قلعے کے دروازے پر تنہا آؤں گا اور تم قلعے سے لشکر کے ساتھ باہر آنا۔

دونوں بھائیوں کی ملاقات:

اس وعدے پر متفق ہو کر دونوں نے وقت مقرر کیا۔ دوسرے دن صبح کو دہر سینہ نے قلعے کے دروازے پر پہنچ کر اطلاع دی۔ داہر نے حکم دیا کہ قلعے کا دروازہ کھول کر دہر سینہ کو تنہا اندر لایا جائے، چنانچہ دہر سینہ کو اندر لے جایا گیا۔

وزیر سے دوبارہ مشورہ:

جب دہر سینہ قلعے کے اندر آچکا تو داہر نے اپنے وزیر سے دوبارہ مشورہ کیا کہ اب دہر سینہ قلعے کے اندر آچکا ہے، مجھے اس کے استقبال کے لیے جانا ہے۔ اگر ملاقات کے دوران اس نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کے ساتھ قلعے سے باہر چلوں تو مجھے اس سے انکار کی ہمت

نہ ہوگی۔ وزیر نے جواب دیا کہ آپ کو اس کے قول پر اعتماد نہ کرنا چاہیے، مجھے جو اس کے لشکر سے خبریں مل رہی ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کو دھوکہ دینے کی فکر میں ہے۔ اول تو اس کا قلعے میں بلانا ہی خلاف مصلحت تھا اور اب جب کہ وہ قلعے میں آچکا ہے اور تنہا ہے تو اس وقت اس کا قتل کرنا خلاف مصلحت ہے۔ میرے خیال میں مناسب یہ ہے کہ جب تک آپ میں اور اس میں قابل اطمینان معاہدہ نہ ہو جائے، اس وقت تک اسے قید رکھنا مناسب ہوگا۔

لیکن داہر نے وزیر کا مشورہ نہ مانا۔ یہاں تک کہ دہر سینہ ہاتھی پر سوار ہو کر اس کے محل کے دروازے تک آگیا۔ داہر اسکے استقبال کے لیے آگے بڑھا اور دہر سینہ سے کہا محل کے اندر آیئے۔ دہر سینہ نے جواب دیا کہ بہتر یہ ہے کہ تم ہاتھی پر سوار ہو کر میرے پاس آؤ، تاکہ ہم باہر چلیں اور کسی جگہ بیٹھ کر دکھ سکھ کی باتیں کریں۔ اس طرح خاص و عام کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ پھر کوئی دشمن اور چغلخور ہمارے درمیان نہ آسکے اور یہ بات سب لوگوں کو معلوم ہو جائے، اس کے بعد تم واپس چلے آنا۔ داہر نے دہر سینہ کی اس بات کو بخوشی منظور کر لیا، لیکن اس کی منظوری سے اُس کا وزیر بدھیمن جو شاید اتفاق سے وہیں موجود تھا، فکر مند ہو گیا۔

پھر دہر سینہ نے فیل بان کو حکم دیا کہ وہ ہاتھی کو آگے بڑھائے تاکہ داہر بھی اس پر سوار ہو۔ داہر ہاتھی پر بیٹھ گیا، دونوں روانہ ہو گئے۔ وزیر بدھیمن بھی اُن کے ساتھ ساتھ گھوڑے پر چل رہا تھا، یہاں تک کہ قلعے کے دروازے کے قریب پہنچے۔ داہر اپنے اس کیے پر اچانک پشیمان اور خوف زدہ ہوا اور وزیر کی طرف متوجہ ہو کر آہستہ سے کہا کہ اب مجھے قلعے کے باہر جانے میں خیر نظر نہیں آتی، اب تم مجھے بتاؤ کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ وزیر نے جواب دیا کہ رائے کو تو آپ ٹھکرا چکے ہیں، اب میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ داہر نے کہا اب کچھ تو مشورہ دو۔ وزیر نے کہا کہ اب اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ جب آپ قلعے کے دروازے سے گزرنے لگیں تو فوراً قلعے کے دروازے کے سردر کو پکڑ کر لٹک جائیں، یہاں تک کہ ہاتھی گزر جائے، پھر ہم آپ کو نیچے اتار لیں گے۔ داہر نے وزیر کے مشورے کے مطابق ایسا ہی کیا اور ہاتھی کے دروازے سے گزرتے ہی داہر کو اتار کر قلعے کا دروازہ بند کر لیا۔ باہر نکل کر جب دہر سینہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو داہر کو غائب پایا، ادھر قلعے کے دروازے کو بند پایا تو اُسے اپنی تدبیر کو ناکام دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔

دہر سینہ کی وفات:

ادھر داہر اپنے محل میں واپس ہوا، اُدھر دہر سینہ کو اپنی فرودگاہ میں جا کر گرمی کے اثر سے ایسا زہریلا بخار چڑھا کہ اس کے تمام جسم میں آبلے پڑ گئے اور اسی بیماری میں مبتلا رہ کر چوتھے دن ۵۲ھ (۶۷۲ء) میں وہ مر گیا۔ اُس وقت اُس کی عمر تیس سال کی تھی۔

داہر کو جب اُس کی وفات کی خبر ملی تو اس نے اپنے وزیر کے مشورے کے مطابق پہلے تحقیق حال کے لیے ایک جاسوس بھیجا۔ جب اس کی موت کی تصدیق ہو گئی تو داہر خود وہاں پہنچا۔ بھائی کی میت کو دیکھتے ہی اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور سر سے پگڑی پھینک کر نوحہ و ماتم میں مشغول ہو گیا۔

دہر سینہ کی آخری رسوم:

پھر داہر نے صندل کی لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دیا اور دہر سینہ کی لاش کو جلا کر کریا کرم کے تمام رسوم ادا کیے۔ دوسرے دن بھائی کے خزانے پر قبضہ کر کے اور اس کے ملازموں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا کر اروڑ (الور) واپس آیا اور اروڑ میں ایک ماہ قیام کرنے کے بعد اس نے اپنے بھائی کی بیوہ سے شادی کر لی جو لوہانہ کے حاکم اکھم کی بیٹی تھی۔ (1)

برہمن آباد کو روانگی:

ان تمام امور سے فارغ ہو کر ایک ماہ بعد داہر برہمن آباد پہنچا، وہاں ایک سال تک قیام کیا۔ اس عرصے میں اس علاقے کے تمام لوگوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ دہر سینہ کے لڑکے پیچ کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آیا اور اس سے اطاعت کا عہد لیا۔ یہاں سے سیوستان گیا، وہاں سے راوڑ پہنچا۔ راوڑ کا قلعہ جس کی بنیاد اس کے باپ نے رکھی تھی نامکمل تھا۔ راوڑ میں قیام کر کے داہر نے اس قلعے کی تکمیل کرائی۔ (2)

---

(1) یہ تمام تفصیل چچ نامہ فارسی، صفحات ۵۴ تا ۶۸ سے ماخوذ ہے۔ صرف دہر سینہ کی سنہ وفات تاریخ سندھ مولانا ابو ظفر ندوی ۲۴ سے ماخوذ ہے۔

(2) پہلے صفحات میں بحوالہ چچ نامہ گزر چکا ہے کہ راوڑ کے قلعے کو دہر سینہ نے مکمل

چونکہ یہ مقام سرد تھا، داہر گرمیوں کے چار مہینے ہمیشہ راوڑ میں بسر کرتا تھا، سردیوں کے چار مہینے برہمن آباد میں گزارتا تھا اور بہار کے چار مہینے الور میں بسر کرتا تھا۔ تقریباً آٹھ سال تک یہ اس کا معمول رہا اور اس کی سلطنت و اقبال کا آفتاب انتہائی عروج پر پہنچ گیا اور نزدیک دور اس کی شہرت ہوئی، یہاں تک کہ رمل کے راجا کو اس کی دولت و حشمت کا علم ہوا۔[3]

رمل کے راجا کا حملہ:

راجا داہر اطمینان اور سکون سے زندگی بسر کر رہا تھا کہ اچانک ۵۹ھ (۷۷۸-۷۷۹ء) میں رمل کے راجا نے ایک کثیر فوج اور مست ہاتھیوں کے ساتھ داہر کے ملک پر حملہ کیا۔ وہ بودھیہ کی طرف سے آیا اور داہر کے ملک کے کچھ حصے پر قبضہ کر کے راوڑ پر حملہ آور ہوا۔ داہر اس حملے سے پریشان ہو گیا۔ اس نے وزیر بدھیمن کو بلا کر کہا کہ ایک طاقتور دشمن نے ہم پر حملہ کیا ہے، اب تم مشورہ دو کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ بدھیمن نے کہا مہاراج! میری رائے میں اگر آپ اپنے دشمن سے مقابلے کی طاقت پاتے ہیں تو ڈٹ کر مقابلہ کیجیے اور تلوار سے اس کا نام و نشان مٹا ڈالیے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو پھر اس سے صلح کی صورت اختیار کرنا چاہیے، اس میں کتنا ہی روپیہ کیوں نہ صرف ہو، کیونکہ روپیہ کمانے میں اسی دن کے لیے جمع کیا جاتا ہے۔ داہر نے کہا کہ میں موت کو اس سے زیادہ پسند کرتا ہوں کہ ذلیل ہو کر دشمن سے صلح کی جائے۔ میں اس ذلت کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ بدھیمن نے کہا "حضور اس کے علاوہ دوسری تدبیر میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ جو عرب ہمارے یہاں میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں اُن سے بھی مشورہ لینا چاہیے، کیونکہ عرب فطرتاً دلیر ہوتے ہیں اور جنگی مہموں کا کافی تجربہ رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس موقع پر یہ ہمیں کوئی اچھی تدبیر بتا سکیں۔" راجا کو وزیر کا یہ مشورہ پسند آیا۔

علافی سے مشورہ:

اس زمانے میں جب کہ راجا داہر اور رمل کے راجا میں لڑائی کی ٹھن رہی تھی، عرب کا ایک مشہور سردار محمد علافی[4] جو بنی اُسامہ کے قبیلے سے تھا۔ اسلامی حکومت سے بغاوت کر کے پانچ سو سرداروں کے ساتھ سندھ بھاگ آیا تھا اور راجا داہر کی حمایت میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ راجا داہر اپنے وزیر کے مشورے کے مطابق فوراً اس کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میرا جو سلوک تمہارے ساتھ اب تک رہا ہے اور میں جس قدر تم کو عزیز رکھتا ہوں، میرا خیال ہے کہ اُسے تم بھی محسوس کرتے ہو گے، آج رمل کے راجا کے ہاتھوں ہمارا ملک خطرے میں ہے، تم مجھے مشورہ دو کہ اس موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ محمد علافی نے داہر کو تشفی دیتے ہوئے کہا کہ آپ بالکل پریشان نہ ہوں، میں ایسی تدبیر کروں گا کہ آپ کا دشمن عمر بھر یاد رکھے گا۔ پھر اس نے کہا کہ پہلے تو آپ مجھے کچھ فوج دیجیے تاکہ میں اس کو ساتھ لے کر دشمن کا حال معلوم کروں۔ دوسری تدبیر یہ اختیار کیجیے کہ یہاں سے تین میل کے فاصلے پر خندق کھود کر وہاں ٹھہریے۔ راجا داہر نے محمد علافی کو پانچ سو سوار دیے۔ محمد علافی نے ان پانچ سو سواروں اور اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک رات جب کہ رمل کی فوجیں بے خبر سو رہی تھیں، شب خون مارا اور اچانک اس زور سے حملہ کیا کہ رمل کی فوجیں گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ اس کے علاوہ ہزاروں

کرایا تھا، مگر یہاں چچ نامے کے مصنف کا بیان ہے کہ اس قلعے کو دہرسینہ کی وفات کے بعد داہر نے مکمل کرایا، جو اس کے باپ کے وقت سے نامکمل چلا آرہا تھا۔ ممکن ہے کہ داہر نے بھی اس قلعے کی عمارت میں جو مکمل تھا کوئی نیا اضافہ یا ترمیم کیا ہو اور اُسے چچ نامے کے مصنف نے تکمیل کے نام سے تعبیر کر دیا ہو۔

[3] تمام تفصیل چچ نامہ صفحہ ۶۹-۷۰ سے ماخوذ ہے۔

[4] محمد علافی: یہ محمد علافی غالباً وہی محمد حارث علافی ہے جس کا ذکر مترجم چچ نامہ فارسی نے بعد میں صفحہ ۱۶۰ پر بھی کیا ہے۔ صفحہ ۱۳۸ پر اس کا نام 'محمد' دیا گیا ہے اور صفحہ ۱۴۴ پر 'علافی'۔ ساری کتاب سے صرف صفحہ ۱۶۰ پر ہی اس کا پورا نام محمد حارث علافی دیا گیا ہے۔ محمد علافی دراصل عربوں کے شاہی لشکر کے سپاہیوں میں سے تھا دیکھیے صفحہ ۱۳۸۔ اسی کتاب میں صفحہ ۱۹۲ پر آگے چل کر بیان کیا گیا ہے کہ اس علافی نے عبدالرحمان بن اشعث کو قتل کیا تھا جو غلط ہے۔ درحقیقت علافیوں نے خلیفہ عبدالملک کے زمانے میں مکران کے گورنر سعید بن اسلم کلابی کو قتل کیا تھا۔ (دیکھیے چچ نامہ فارسی، صفحات ۸۶-۸۰) سعید کے خلاف اس سازش میں جن علافیوں نے حصہ لیا تھا، اُن میں محمد بن حارث علافی کا نام نہیں دیا گیا۔ (دیکھیے ص ۸۶) مگر مؤرخ بلاذری نے معاویہ اور محمد بن حارث علافی دونوں کو اس سازش کا قائد لکھا ہے۔ (فتوح البلدان، صفحہ ۴۳۵) علافیوں نے سعید کو قتل کر کے مکران پر قبضہ کر لیا تھا۔ (دیکھیے چچ نامہ فارسی، ص ۸۶) یہاں تک کہ سنہ ۸۵ھ (۷۰۴ء) کے قریب حجاج نے محمد بن ہارون کو مکران کی طرف روانہ کیا، جس کے پہنچنے سے پہلے ہی علافی وہاں سے بھاگ کر راجا داہر کے پاس جا پہنچے تھے۔ (چچ نامہ ص ۸۸) اس لحاظ سے محمد علافی کی رمل کے خلاف کی ہوئی کارروائی کو سنہ ۸۵ھ (۷۰۴ء) کے بعد کا واقعہ سمجھنا چاہیے۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۲۵)۔

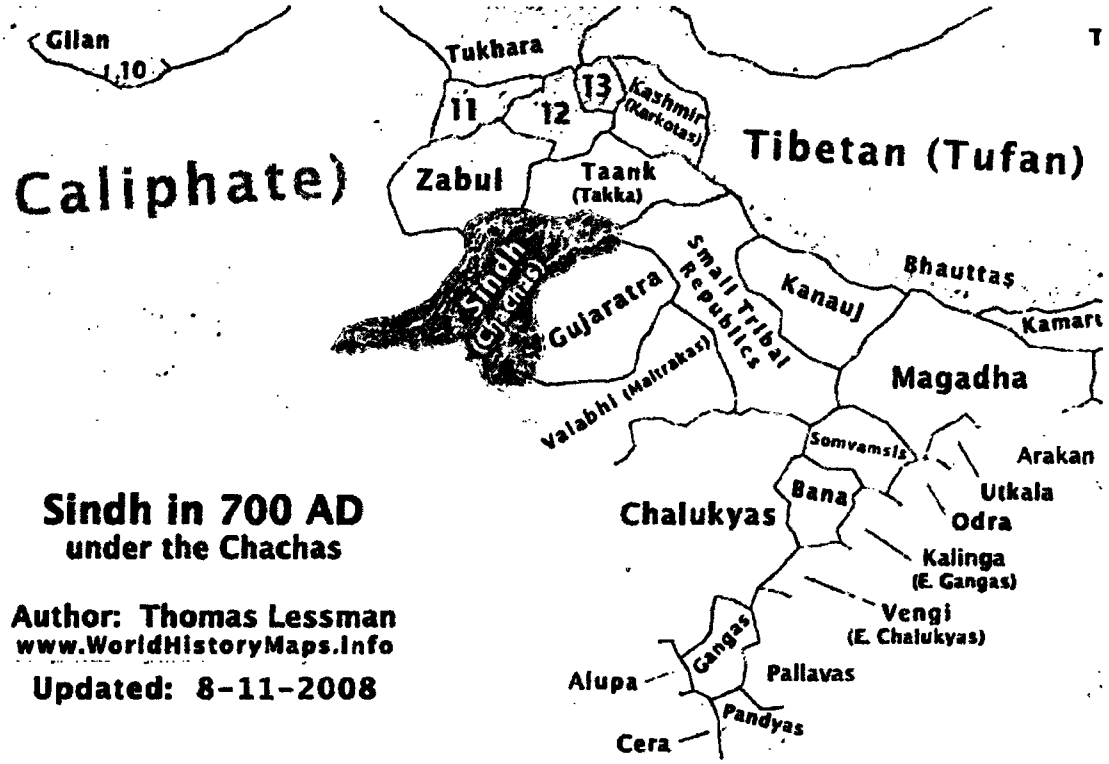

چچ حکمراں کے زمانہ میں سندھ

آدمی گرفتار ہوئے اور ہزاروں قتل ہوئے۔ دشمنوں کا بیشمار ساز و سامان ان کو ملا اور اس جنگ میں پچاس ہاتھی بھی ان کے ہاتھ لگے۔

داہر کو اس فتح سے غیر معمولی مسرت ہوئی، اس نے خوش ہو کر محمد علافی کو انعام و اکرام سے نوازا اور سرحد مکران پر ایک علاقہ ان لوگوں کے قیام کے لیے مقرر کر دیا، جہاں یہ اسلامی حکومت کے باغی آباد ہو گئے۔ دوسرے دن جنگی قیدی حاضر کیے گئے، راجا داہر نے چاہا کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ بدھیمن وزیر نے کہا، اس فتح پر خدا کا شکر ادا کیجیے، بادشاہوں کا طریقہ یہ ہے کہ جب ان کو فتح حاصل ہوتی ہے اور دشمن کے اُمراء اور اکابر ان کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ہیں تو وہ عفو و بخشش سے کام لیتے ہیں۔ صحیح تدبیر یہ ہے کہ آپ بھی درگزر سے کام لیجیے اور قیدیوں کو رہا کیجیے۔ داہر نے اپنے وزیر کے مشورے کے مطابق قیدیوں کو آزاد کر دیا اور اس سے خوش ہو کر کہا کہ اگر تمہاری کوئی خواہش ہو تو مجھ سے کہو تاکہ میں اس کو پورا کروں۔ وزیر نے کہا "مہاراج آپ کا دیا ہوا سب کچھ ہے، مجھے کسی چیز کی تمنا نہیں، صرف ایک آرزو ہے، وہ یہ ہے کہ میرا کوئی لڑکا نہیں، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ میرے بعد میرا نام دنیا سے مٹ جائے گا۔ اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ آپ کے دارالضرب میں چاندی کے جو سکے ڈھالے جاتے ہیں، ان پر ایک طرف آپ کا نام ہوتا ہے، اگر دوسری طرف سکوں پر میرا نام بھی کندہ ہو تو حضور کے سکوں کی بدولت میرا نام بھی زندہ رہے گا اور جب تک ہندو سندھ کی سلطنتیں قائم ہیں، لوگ مجھے نہیں بھول سکیں گے۔ داہر نے حکم دیا کہ سکوں کی دوسری طرف وزیر کا نام ڈھالا جائے اور ہمارے وزیر کی اس خواہش کو پورا کیا جائے۔[1]

---

[1] چچ نامہ فارسی، 71-72۔

باب:3

ہندوستان میں اسلام کا پہلا مرکز

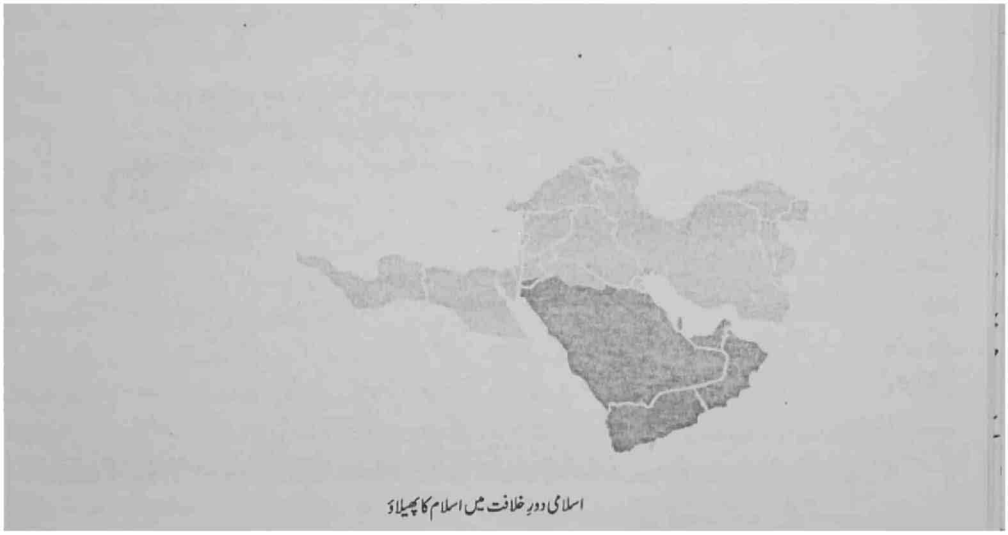

اسلامی دورِ خلافت میں اسلام کا پھیلاؤ

اس سے پہلے کہ ہم سندھ میں اسلامی حکومت کے قیام اور محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے کے تفصیلی حالات لکھیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتاتے چلیں کہ ہندوستان میں اسلام محمد بن قاسم کے حملے سے بہت پہلے داخل ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں اسلام کا سب سے پہلا مرکز جسے قرار دیا جاسکتا ہے، وہ جنوبی ہند میں ملابار ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانے میں ملابار میں بدھ مذہب، برہمنی مذہب اور عیسائی یہودی پائے جاتے تھے۔ لیکن اُن میں باہمی مذہبی تعصب نہ تھا۔ ملابار چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا، یہ ریاستیں حجاز و یمن اور مسقط کے تاجروں کے ساتھ تعلقات رکھتی تھیں اور یمن و حجاز کے تاجر بغرض تجارت یہاں آتے جاتے تھے۔ عرب چونکہ تجارت کے لیے ملابار آتے جاتے تھے، اس لیے جب رسول اللہ صلی علیہ وسلم عرب میں مبعوث ہوئے تو آپ کی بعثت کا حال اُسی زمانے ملابار میں معلوم ہو چکا تھا۔

ملابار کے راجا نے جس کا نام زمورن یا سامری تھا، اُس نے شق القمر کا معجزہ ملابار میں اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا تو اس نے حکم دیا کہ اس کا اندراج روزنامچے کے سرکاری رجسٹر میں کر لیا جائے۔ پھر اسے عرب کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ عرب میں ایک رسول ﷺ پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے یہ معجزہ دکھایا ہے۔ راجا نے فوراً ہی اسلام قبول کر لیا اور تخت سلطنت اپنے ولی عہد کے سپرد کر کے کشتی میں سوار ہو کر ملک عرب کی طرف روانہ ہوا تاکہ رسول ﷺ کی زیارت سے مشرف ہو۔ لیکن اُس نے راستے ہی میں وفات پائی اور یمن کے ساحل پر مدفون ہوا۔

اس زمانے میں کچھ مسلمان تاجر جزیرہ سراندیپ میں آئے اور

اُنھوں نے اس جزیرے میں اسلامی تعلیمات کو عام کیا۔ سب سے پہلے ان کی تبلیغ اور اخلاق سے متاثر ہو کر اُن عربوں نے اسلام قبول کیا جو تجارت کی غرض سے اسی جزیرے میں رہ پڑے تھے۔ پھر اس جزیرے کے اصل باشندے اسلام میں داخل ہوئے۔ یہاں تک کہ سراندیپ کے راجا نے بھی اسلام قبول کر لیا اور اپنا ربط خلافتِ اسلامیہ سے پیدا کر لیا۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ سراندیپ کا راجا خلافت راشدہ کے زمانے میں مسلمان ہو چکا تھا یا خلافت بنی امیہ کے ابتدائی زمانے میں، بہر حال خلافت بنی امیہ کے زمانے میں سراندیپ کا راجا مسلمان تھا۔ تاریخ فرشتہ میں ہے: "بر آئینہ حاکم سراندیپ پیشتر از رایان دیگر مواضع ہندوستان بر حقیقت اسلام مطلع شدہ – در عہد صحابہ کرام مقلد قلائد شریعت مصطفوی گردیدہ بود"۔ ابن بطوطہ جب سراندیپ میں گیا تھا تو اس نے وہاں شیخ عبداللہ بن حنیف، شیخ عثمان اور بابا طاہر وغیرہ بہت سے اولیاء اللہ کے مزارات دیکھے۔ سراندیپ کے بعد لکادیپ اور مالدیپ کے لوگ حلقہ بگوش اسلام بنے۔ ملابار میں اسلام کی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام کی رواداری، مساوات کی تعلیم سے وہاں کے لوگ بے حد متاثر ہوئے اور وہ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔

بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ محمد بن قاسم کے فوجی حملے سے پہلے اسلام ہندوستان میں بذریعہ تبلیغ داخل چکا تھا اور جنوبی ہند میں اسلام مسلمان مبلغوں، تاجروں، درویشوں اور سیاحوں کے ذریعے برابر ترقی کر رہا تھا کہ کچھ حالات ایسے پیش آئے جس نے عربوں کو سندھ پر حملے کے لیے مجبور کر دیا۔[1]

مسلمانوں کے سندھ پر حملے کے اسباب:

ایران سندھ کی وہ ہمسایہ حکومت تھی کہ جس سے سندھ کی حکومت کی کبھی صلح رہتی تھی اور کبھی ان دونوں حکومتوں کے تعلقات کشیدہ رہتے تھے۔ کبھی ایرانی دریائے سندھ تک کا علاقہ اپنے میں لے آتے تھے اور کبھی سندھی مکران تک پہنچ جاتے تھے۔ لیکن جس زمانے میں مسلمانوں اور ایرانیوں کی لڑائیاں ہو رہی تھیں، اُس زمانے میں سندھ اور ایران کے درمیان صلح تھی۔ مگر اس صلح سے کچھ دن پہلے ہی ایرانی صوبے کے ایک گورنر ہرمز نے ایک بحری بیڑے سے سندھ کے ساحل پر حملہ کیا تھا اور سندھ کے بہت سے لوگوں کو گرفتار کر کے لے گیا تھا، جو سب کے سب جاٹ تھے۔ جب مسلمانوں اور ایرانیوں میں لڑائی شروع ہوئی تو ایرانیوں نے سندھیوں سے صلح کر لی۔ ہرمز نے ان جاٹوں کو جو قیدی کی حیثیت سے اس کے پاس تھے، نہایت خاطر و مدارت کر کے ان کو اس پر راضی کر لیا کہ وہ اس کی فوج میں بھرتی ہو کر مسلمانوں سے مقابلہ کریں۔ جاٹ اس پر راضی ہو گئے۔

ہرمز نہایت ہی دلیر اور جنگجو سردار تھا۔ اس کی دلاوری اور شجاعت کی دھاک تمام عراق، عرب اور ہندوستان میں بیٹھی ہوئی تھی، وہ بری اور بحری لڑائیوں کا بڑا وسیع تجربہ رکھتا تھا۔ 12ھ جنگ ذات السلاسل میں ہرمز نے حضرت خالد بن ولید کے مقابلے میں ان سندھی جاٹوں کو استعمال کیا۔ یہ جاٹ میدان جنگ میں اس طرح لڑتے تھے کہ پاؤں میں زنجیر باندھ لیتے تھے تاکہ ان میں سے کوئی میدان جنگ سے نہ بھاگ سکے۔ چنانچہ جنگ ذات السلاسل میں بھی ان کے ہر سپاہی کے پاؤں میں زنجیر بندھی ہوئی تھی، اس لیے اس جنگ کا نام جنگ ذات السلاسل پڑ گیا، یعنی زنجیروں والی لڑائی۔ اس لڑائی میں ہرمز حضرت خالد بن ولید رضہ کے ہاتھوں مارا گیا اور جاٹ زنجیریں تڑا کر بھاگ نکلے اور بہت سے مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ اس لڑائی میں پہلی مرتبہ سندھ کے جاٹ مسلمانوں کے قبضے میں آئے اور اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر اُنھوں نے بخوشی اسلام قبول کر لیا اور ایک آزاد مسلم کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے لگے۔[2]

جنگ قادسیہ:

جنگ ذات السلاسل کے دو برس بعد ۱۴ھ (۶۳۵ء) میں جنگ قادسیہ ہوئی۔ اس لڑائی میں ایران کے بادشاہ نے پچھلی شکستوں سے تنگ آ کر اپنی پوری قوت سے مسلمانوں کے مقابلے کی تیاری کی۔ ایران کے بادشاہ یزدجرد نے خود بھی عظیم الشان فوجی تیاری کی اور دوسری مملکتوں کے بادشاہوں سے بھی مدد طلب کی۔ اس نے سندھ کے راجا کے پاس ایک سفیر بھیجا کہ وہ اس جنگ میں اس کی مدد کرے۔ سندھ کے راجا نے سندھ سے اس کی مدد کے لیے ایک فوج روانہ کی اور اس کو سب سے بڑی مدد یہ دی کہ وہ جس قدر جنگی ہاتھی بھیج سکتا تھا اس کی مدد کے لیے

---

(1) یہ تمام تفصیل آئینہ حقیقت نما، صفحات ۷۱-۷۰-۶۹ سے ماخوذ ہے۔

(2) آئینہ حقیقت نما، ص ۷۹-۷۸۔

روانہ کیے، یہاں تک کہ اپنی سواری کا سفید ہاتھی بھی اس نے روانہ کیا۔ قادسیہ کی لڑائی تین دن اور تین رات جاری رہی، اس لڑائی میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان سندھ کے راجا کے ہاتھیوں نے پہنچایا۔ تیسرے روز راجا کا سفید ہاتھی مارا گیا اور مسلمانوں نے ہاتھیوں کو بھگا دیا اور ایرانی فوج کا سپہ سالار رستم مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس طرح اس لڑائی میں ایرانیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کو فتح ہوئی۔[1]

اس کے علاوہ مسلمانوں کے سندھ پر حملے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضہ کے زمانے میں مکران تک مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ جس وقت مسلمانوں نے مکران کو فتح کیا تو ایرانیوں کے ساتھ مل کر سندھیوں نے بھی مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ مسلمانوں نے جب ایران کو فتح کر لیا، تو اصولی طور پر ایران کے وہ صوبے جن پر دوسرے لوگوں نے قبضہ کر رکھا تھا مسلمانوں کے لیے واپس لینے ضروری تھے۔ چنانچہ مکران کے سرحدی صوبے پر ایک ایرانی سردار نے قبضہ جمایا تو مسلمانوں نے اس کو چھین لیا چونکہ سندھیوں نے جنگ نہاوند، جنگ ذات السلاسل، جنگ قادسیہ اور مکران کی لڑائیوں میں ایرانیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا مقابلہ کیا تھا، اس لیے مسلمانوں کو سندھ پر حملہ کرنے کا حق حاصل ہو چکا تھا۔

پہلا بحری حملہ:

۱۳ھ (۳۵-۶۳۴ء) میں حضرت ابو بکر صدیق رضہ کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروق رضہ اُن کے جانشین ہوئے۔ حضرت عمر رضہ نے ۱۵ھ (۶۳۶ء) میں عثمان بن ابی عاص ثقفی کو بحرین اور عمان کا گورنر مقرر کیا۔

اسی زمانے میں سب سے پہلے مسلمانوں نے محسوس کیا کہ انھیں اپنے تجارتی جہازوں کی حفاظت کے لیے جو ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آتے جاتے رہتے تھے ہندوستان کی کسی ساحلی بندرگاہ پر قبضے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ عثمان ابن ابی عاص نے ایک بحری بیڑہ تیار کر کے بمبئی کے قریب تانہ (تھانہ) بندرگاہ پر جو اب بھی موجود ہے 15ھ (۶۳۶ء) میں پہلا بحری حملہ کیا، اور یہاں سے بہت سا مال غنیمت لے کر عمان پہنچے۔ یہ مسلمانوں کا ہندوستان پر پہلا بحری حملہ تھا،[2] لیکن چونکہ یہ حملہ خلیفہ کی بغیر اجازت کیا گیا تھا، اس لیے عثمان بن ابی عاص نے اپنی کامیابی اور مال غنیمت حاصل کرنے کی اطلاع ڈرتے ڈرتے حضرت عمر فاروق رضہ کو دی۔ حضرت عمر رضہ نے جواب میں لکھ کر بھیجا:

> "برادر ثقفی! تمہارا یہ اقدام نہایت خطرناک تھا، تم نے یہ فوج نہیں بھیجی تھی بلکہ گویا ایک کیڑے کو لکڑی پر بٹھا کر سمندر میں ڈال دیا تھا، خدا کی قسم اگر یہ لوگ کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتے تو میں تمہاری قوم سے اتنے ہی آدمی لے لیتا"۔

سندھ پر پہلا بحری حملہ:

اس کے چند دن بعد ہی عثمان ابن ابی عاص نے اپنے بھائی مغیرہ کی سرکردگی میں ایک بحری بیڑہ دیبل پر حملے کے لیے روانہ کیا اور خود بروص (بروچ) پر حملہ کیا۔ دیبل اس زمانے میں سندھ کی مشہور بندرگاہ تھا[3]۔ اُس وقت سندھ میں راجا چچ کی حکومت تھی، اور اس کو حکومت کرتے ہوئے پینتیس سال گزر چکے تھے۔ صاحب چچ نامہ نے اس لڑائی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "جس زمانے میں مغیرہ نے دیبل پر حملہ کیا، اُس وقت چچ کی جانب سے دیبل کا حاکم سامہ بن دیوائج تھا، دیبل کے لوگ زیادہ تر تجارت پیشہ تھے۔ جب مغیرہ کا لشکر دیبل پہنچا تو سامہ اپنے لشکر کے ساتھ قلعے سے نکل کر مقابل ہوا۔ مغیرہ نے تلوار نکالی اور بسم اللہ وفی سبیل اللہ کہہ کر دشمن پر ٹوٹ پڑے، یہاں تک کہ شہید ہوئے[4]۔"

یہ سندھ پر پہلا بحری حملہ تھا جو مسلمانوں کی طرف سے ہوا۔

مکران پر حملہ:

حضرت عمر فاروق رضہ کی خلافت کے زمانے میں جب حضرت ابو موسیٰ اشعری رحہ عراق کے گورنر مقرر ہوئے تو انھوں نے ربیع بن زیاد حارثی کو بھیج کر مکران پر قبضہ کر لیا، لیکن یہ قبضہ ابھی پوری طرح ہونے نہ پایا تھا کہ مسلمان واپس چلے آئے، جس کی وجہ سے مکران کے لوگ

---

(1) آئینہ حقیقت نما، ص ۷۹۔

(2) فتوح البلدان—بلاذری ص ۴۳۲۔

(3) ایضاً-ص ۴۳۲۔

(4) چچ نامہ فارسی، ص ۷۲-۷۳۔

خود مختار ہو گئے۔[1]

پھر جب ۲۲ھ (۴۳-۶۴۲ء) میں مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا، اس وقت عبداللہ بن عامر بن ربیع کرمان پر قبضہ کر کے سیستان کی طرف بڑھے، سیستان کے حاکم (مرزبان) نے اطاعت قبول کر لی۔ سیستان پر قبضے کے بعد وہ مکران کی طرف بڑھے، اس وقت مکران کا راجا راسل تھا، راسل نے سندھ کے راجا سے مدد مانگی، سندھ کے راجا نے اس کو مدد دی۔ دریائے ہلمند پر مسلمانوں اور مکرانیوں کی لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں سندھی مکرانیوں کے مددگار و معاون ہو کر لڑے، بہت سے مکرانی مارے گئے، اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ اس لڑائی میں حکم تغلبی اسلامی فوج کے سپہ سالار تھے، یہ پہلا موقع تھا کہ سندھیوں نے بلاوجہ مسلمانوں کے دشمنوں کی کھلم کھلا مدد کر کے مسلمانوں کو اپنے خلاف بنایا۔

حکم نے مکران میں فتح حاصل کرنے کے بعد فتح کی خوش خبری اور بہت سا مال غنیمت صحار عبدی کے ذریعہ سے حضرت عمر فاروق رضہ کی خدمت میں بھجوایا۔ جب صحار عبدی حضرت عمر رضہ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے اُن سے مکران کا حال پوچھا۔ انھوں نے کہا "امیر المومنین! وہاں پانی کی بے حد کمی ہے، پھل ردی ہیں، وہاں کے لوگ ڈاکو ہیں، اگر وہاں تھوڑی فوج بھیجی جائے تو لوٹ لی جائے، اگر زیادہ فوج جائے تو بھوک سے مر جائے"۔ حضرت عمر رضہ نے اُن کی یہ بات سن کر مسکراتے ہوئے کہا "تم شاعری کر رہے ہو، یا وہاں کے حالات بیان کر رہے ہو"۔ صحار نے عرض کیا "امیر المومنین! میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں، میں نے جو کچھ وہاں دیکھا بعینہ عرض کر دیا ہے"۔ حضرت عمر رضہ نے وہاں کے حالات سن کر حکم دیا کہ اب اسلامی فوجیں آگے نہ بڑھیں۔[2]

۴۵-۶۴۴ء میں حضرت عمر رضہ کی شہادت کے بعد حضرت عثمان رضہ مسند آرائے خلافت ہوئے، آپ کے زمانے میں سندھ کے راجا چچ نے اسلامی حکومت سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی، اس نے سرحد مکران پر فوجیں جمع کر کے حملے کی دھمکی دی، حضرت عثمان رضہ نے مکران کے حاکم عبدالرحمٰن بن ثمرہ کو لکھا کہ چچ کی فوجیں جو سرحد مکران پر جمع ہو رہی ہیں ان کو نکال دے۔ عبدالرحمان بن ثمرہ نے اس حکم کے ملتے ہی حملہ کر کے سندھی فوجوں کو بھگا دیا اور مکران سے سرحد کیکانان تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا، یہ وہ علاقہ تھا جس پر چچ نے اس لڑائی سے چند سال پہلے قبضہ کیا تھا۔ مسلمانوں کو اس علاقے پر قبضے کی اس لیے بھی ضرورت تھی کہ بہت سے ایرانی جو مسلمانوں کے دشمن تھے ایران سے بھاگ کر چچ کی حکومت میں چلے آئے تھے، اور اس علاقے میں رہ کر گڑبڑ پیدا کرتے رہتے تھے۔ عبدالرحمان بن ثمرہ اس علاقے کو فتح کر کے آگے نہیں بڑھے، اور اُن کو فوراً کابل جانا پڑا جہاں ایک بغاوت کا فرو کرنا ضروری تھا۔[3]

حضرت عثمانؓ ہی کے زمانے میں عبیداللہ بن معمر مکران کے حاکم ہوئے، جو بڑی بہادری سے دوسرے علاقوں کو فتح کرتے ہوئے

---

(1) چچ نامہ، ص 71۔ یہ صحیح ہے کہ ہند و سندھ کے شہروں میں اسلامی لشکر کی پہلی جنگ حضور اکرم ﷺ کی ہجرت کے 15 سال بعد حضرت عمر رضہ کے عہد خلافت میں ہوئی، اور بلاذری نے بھی مدائنی کی سند سے اس پہلی فوج کشی کی روایت نقل کی ہے (دیکھیے بلاذری، ص ۳۲-۴۳۱) لیکن چچ نامے کی روایت کا یہ حصہ صحیح نہیں کہ مغیرہ دیبل میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ بلاذری نے واضح طور پر لکھا ہے کہ انھوں نے دشمن کا مقابلہ کیا اور اس پر فتح حاصل کی (فتوح، ص ۴۴۲) دوسرے تاریخی حوالوں سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مغیرہ اس کے بعد بھی زندہ رہے (تعلیقات چچ نامہ سندھی، مرتب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، صفحہ ۴۲۵)۔

(2) تاریخ سندھ - مولانا ابو ظفر ندوی - ص 28-29 چچ نامہ فارسی میں یہ واقعہ حضرت عثمان رضہ کے زمانے کا بیان کیا گیا ہے۔ چچ نامے میں ہے کہ حضرت عثمان رضہ چاہتے تھے کہ کوئی صالح اور پاک دامن شخص سندھ اور ہند کے شہروں کا حال معلوم کر کے وضاحت کے ساتھ ان سے بیان کرے۔ ان کے حکم کی بنا پر عبداللہ بن عامر نے حکیم بن جبلہ عبدی کو تحقیق حال کے لیے بھیجا تھا، اور انھوں نے مکران کا یہ حال حضرت عثمان رضہ کو سنایا تھا۔ بلاذری نے بھی اس واقعے کو حضرت عثمان رضہ کے عہد خلافت کا واقعہ بتایا ہے اور یہ رپورٹ حکیم بن جبلہ عبدی کی طرف منسوب کی ہے۔ لیکن طبری (20707x1) ان الفاظ کا رپورٹر صحار العبدی کو قرار دیتا ہے، جو کہ مکران کے جنرل حکم بن عمر تغلبی کی طرف سے خمس اور اموال غنیمت لے کر حضرت عمر رضہ کے پاس گیا تھا (طبری 2612x1) ابن قتیبہ نے بھی 'عیون الاخبار' (199x2) میں اس واقعہ کا تعلق حضرت عمر رضہ سے بتایا ہے، لیکن جس نے حضرت عمر رضہ کے سامنے یہ رپورٹ پیش کی تھی اس کا نام نہیں لیا، الاخبار الطوال (مطبوعہ یورپ ص 366) اور "محاضرات راغب اصفہانی" میں یہ رپورٹ دینے والا ابن القریہ کو بتایا گیا ہے۔
ان کے علاوہ تقی الدین حموی کی "ثمرات الاوراق" (61x2) ابن حامد کرمانی کی تاریخ کرمان المعروف "عقد العلی للموقف الاعلیٰ" (طبع طہران ص 764) اور تاریخ گزیدہ میں (ص 270 پر نام کی غلطی کے ساتھ) یہ الفاظ عضبان بن القبعثری نامی شخص سے منسوب ہیں (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص 428)۔

(3) جنت السندھ (سندھی) تالیف مولائی شیدائی ص 80 و آئینہ حقیقت نما مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، ص 8۔

ہندوستان کی سرحد تک پہنچ گئے۔

حضرت عثمانؓ ہی کے زمانے میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضہ تمام مشرقی ممالک کی اعلیٰ حاکم مقرر ہوئے۔ انھوں نے ابن عامر کو بصرے کا حاکم مقرر کر کے بھیجا، ابن عامر نے سیستان کی حکومت ربیع بن زیاد حارثی کو دی۔ ربیع بن زیاد نے سیستان پہنچ کر قلعہ زالق کو فتح کیا، پھر شہر کہ کو یہ کو مطیع کیا، اس کے بعد شہر راشت پر سخت معرکہ ہوا، اور وہاں کے لوگوں نے اطاعت قبول کرلی۔ پھر ناشروذ اور شرواز کو فتح کرنے کے بعد زرنج کی طرف بڑھے۔ زرنج کے حاکم نے پہلے توڈٹ کر مقابلہ کیا، مگر آخر میں قلعہ بند ہو گیا، ربیع بن زیاد نے قلعہ کا محاصرہ کر کے حاکم زرنج کو صلح پر مجبور کر دیا، آخر حاکم زرنج نے صلح کا پیغام دے کر اطاعت کا اقرار کیا، ربیع نے اس کو قبول کرلیا۔

ایک سال کے بعد ربیع بن زیاد، ابن عامر سے ملنے گئے اور اپنی جگہ اپنا ایک نائب مقرر کر گئے۔ ان کے جاتے ہی باغیوں نے پھر گڑبڑ پیدا کی۔ ابن عامر کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے عبد الرحمان بن سمرہ بن حبیب صحابی رسول پاک ﷺ کو حاکم مقرر کر کے بھیجا، عبد الرحمٰن بن سمرہ نہایت تجربہ کار افسر تھے، انھوں نے زرنج کا ایسا سخت محاصرہ کیا کہ باغی چند دن ہی میں صلح پر مجبور ہو گئے۔ اس فتح کے بعد عبد الرحمان بن سمرہ نے زرنج اور کیچ کے درمیان جو علاقے تھے اُن پر قبضہ کر لیا۔ یہ علاقے اس وقت بلوچستان سے ملے ہوئے ہیں، مگر اس زمانے میں یہ علاقے ہندوستان میں شامل تھے، یہ پہلا حملہ تھا جو خشکی کے راستے سے ہندوستان پر ہوا۔[1]

حضرت علیؓ کی خلافت:

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ۳۵ھ (۵۶-۶۵۵ء) میں حضرت علیؓ مسند آرائے خلافت راشدہ ہوئے۔ آپ نے ۳۸ھ (۶۵۸-۵۹ء) میں ثاغر بن دعورا[2] کو سپہ سالار بنا کر ہندوستان کی سرحد پر مقرر کیا، یہ ایک بڑی فوج لے کر جس میں حارث بن مرہ جیسے تجربہ کار بھی تھے جنگی ساز و سامان کے ساتھ وہاں پہنچے اور مختلف علاقوں کو فتح کرتے ہوئے کوہ قیقان پہنچے۔ قیقان کا موجودہ نام قلات ہے۔ قیقان میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ کیونکہ پہلے ہی سے بیس ہزار قیقانی تمام دروں کی ناکہ بندی کیے ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے لڑائی کے دوران نعرۂ اللہ اکبر اس زور سے بلند کیا کہ قیقانی لشکر میں ہیبت سے بھگدڑ پڑ گئی۔ قیقان کے رہنے والوں نے شکست کھائی اور مسلمانوں نے بڑی تعداد میں جنگی قیدی گرفتار کیے۔[3]

بلاذری کے قول کے مطابق اواخر ۳۸ھ یا اوائل ۳۹ھ میں حضرت علی رضہ نے حارث بن مرہ[4] ہی کو ہندوستان کے محاذ پر سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا۔ حارث بن مرہ نے اس مہم میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی، کافی مال غنیمت اور قیدی ہاتھ لگے۔ مال غنیمت کی فراوانی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ صرف لونڈی غلام ہی اتنے تھے کہ ایک دن میں ایک ہزار لونڈی غلام لشکر میں تقسیم ہوئے۔[5]

یہ لوگ ابھی قیقان ہی میں تھے کہ انھوں نے حضرت علی رضہ کی شہادت کی خبر سنی، یہ خبر سن کر وہ مکران لوٹے، جب مکران پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ امیر معاویہ مسلمانوں کے خلیفہ بن چکے ہیں۔[6]

---

(1) تاریخ سندھ مؤلف مولانا ابو ظفر ندوی ص 30 تا 31 بحوالہ ابن اثیر جلد ۳ ص ۱۰۰ تا ۱۰۱۔

(2) چچ نامے کے بعض نسخوں میں یہ نام ثاغر بن ذعر ملتا ہے، اور یہی صحیح ہے۔

(3) تاریخ سندھ مولانا ابو ظفر ندوی، صفحہ 33 بحوالہ ابن اثیر جلد 3، ص 321۔

(4) حارث بن مرہ عبدی قبیلہ ربیعہ کے مشہور سخی سرداروں میں تھے اور حضرت علی رضہ کے حامیوں میں تھے، صفین کی لڑائی میں حضرت علی رضہ نے ان کو اپنے لشکر کے میمنہ کا سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص 431 بحوالہ کتاب الصفین - المنتری طبع ایران - ص ۱۰۷)

(5) چچ نامہ فارسی ص ۷۸ چچ نامہ سندھی ص ۴۳۱، بحوالہ فتوح البلدان ص ۴۳۲۔ و جنتہ السندھ (سندھی) مولائی شیدائی، شالیح کردہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۸۰۔

(6) چچ نامہ فارسی، ص ۷۸۔

باب:4

عہد بنی اُمیہ

۴۱ھ (۶۶۱-۶۲ء) تا ۶۰ھ (۶۷۹-۸۰ء)

سندھ میں عہد معاویہ کے گورنر

عبداللہ بن سواء

خلافت راشدہ کا عہد ختم ہونے کے بعد 41ھ میں امیر معاویہ بن ابی سفیان مسلمانوں کے خلیفہ ہوئے، انھوں نے مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد 44ھ میں عبداللہ بن سوار عبدی کو چار ہزار سواروں کے ساتھ سندھ روانہ کیا، اور اُن کو ان علاقوں کا گورنر اور حاکم اعلیٰ مقرر کیا۔ جب وہ روانہ ہونے لگے تو امیر معاویہ رضہ نے ان سے فرمایا کہ سندھ کے شہروں میں ایک پہاڑ ہے جس کو کیکانان (قلات) کہتے ہیں، اس مقام کے گھوڑے قد آور اور خوبصورت ہوتے ہیں، یہاں سے پہلے بھی مال غنیمت آچکا ہے، مگر یہ لوگ بہت غدار ہیں، اور اس پہاڑ میں پناہ لے کر تمرد اور سرکشی کرتے رہتے ہیں، اس لیے تمہیں نہایت ہوشیاری اور عقلمندی سے اُن کے مقابلے کی ضرورت ہے۔

خلیفہ کی اس ہدایت کے بعد عبداللہ بن سوار چار ہزار سواروں کے ساتھ کیکانان (قلات) روانہ ہوئے، اس لشکر میں ساز و سامان اس قدر وافر تھا کہ فوجی کیمپ میں کسی کو آگ روشن کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی، اس شان و شکوہ سے یہ لشکر کیکانان پہنچا۔ کیکانان (قلات) والوں نے جب یہ خبر سنی تو مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے، لیکن لشکر اسلامی نے اُن کو شکست دی اور بہت سامالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ کیکانان (قلات) کے لوگوں نے دوبارہ جمع ہو کر پہاڑی دروں کو گھیر لیا، اور بڑی سخت لڑائی شروع ہوئی۔ کیکانان (قلات) والوں کا یہ شدید حملہ دیکھ کر عبداللہ بن سوار نے اپنی صفوں کو درست کیا اور اپنے لشکر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

"اے انصار و مہاجرین کی اولاد! شجاعت و بہادری سے لڑو، اور اپنا رخ کفار سے نہ پھیرو، تاکہ تمہارا ایمان داغ دار نہ ہو، اور تم کو شہادت کا شرف حاصل ہو سکے"۔

عبداللہ بن سوار کی اس ولولہ انگیز تقریر نے اسلامی فوج پر بجلی کا سا اثر کیا، اور لوگ عبداللہ بن سوار کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے، اور لشکر اسلامی میں ایک جوش پیدا ہو گیا، فوراً قبیلہ بنی قیس کا ایک بہادر میدان میں نکلا اور دشمنوں کو للکارا کہ کوئی تم میں سے میرا مقابل ہے؟ یہ سنتے ہی دشمن کی فوج کا سردار اُس کے مقابلے کے لیے جھپٹا، دونوں کا مقابلہ شروع ہوا، اتنے میں اسلامی لشکر سے ایک دوسرا جواں مرد یاسر بن سوار بڑی تیزی سے میدان میں نکلا، دونوں نے مل کر دشمن کے سردار کا خاتمہ کر دیا۔ دشمن کی فوج نے یہ دیکھ کر کہ اُن کا سردار مارا گیا ہے ایک عام ہلہ بول دیا، یہ عام حملہ اس قدر سخت تھا کہ مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے، اور اسلامی لشکر کو شکست ہوئی، اور مسلمان مکران لوٹ آئے۔[1] عبداللہ بن سوار کے متعلق چچ نامہ میں ہے کہ وہ اسی لڑائی میں بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔[2]

---

(1) ماخوذ از چچ نامہ، ص 78-79۔

(2) عبداللہ بن سوار کے متعلق کہ وہ شہید ہوئے، چچ نامہ کی روایت ہے، لیکن فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ وہ مکران میں کئی ماہ رہے، انھوں نے کیکانان (قلات) والوں کو شکست دی اور بہت سامال غنیمت اور قلاتی گھوڑے لے کر امیر معاویہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر وہ دوبارہ دمشق سے کیکانان آئے، کیکانان آتے ہی ان کا مقابلہ ترکوں کی ایک جماعت سے ہوا، اس مقابلے میں وہ شہید ہوئے (بلاذری، ص ۴۲۳ و ابن اثیر جلد ۳، ص ۳۶۶)۔

درۂ خیبر میں مسلمانوں کا داخلہ:

۴۱ھ میں امیر معاویہ نے عبداللہ بن عامر کو بصرے کا اعلیٰ حاکم مقرر کیا۔ عبداللہ بن عامر نے بصرے کے نظم و نسق کا جائزہ لینے کے بعد بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے ۴۳ھ (۶۴-۶۶۳ء) میں عبدالرحمٰن بن سمرہ کو سیستان کا گورنر مقرر کیا، جو پہلے بھی اس عہدے پر رہ چکے تھے۔ انھوں نے تمام بغاوتوں کا خاتمہ کر کے کابل کو فتح کیا، ان کی فوج میں مہلب بن ابی صفرہ نامی ایک سردار تھے جو ۴۴ھ (۶۵-۶۶۴ء) میں ایک فوج لے کر ہند کی طرف بڑھے، اور درۂ خیبر سے ہندوستان میں داخل ہوئے، مہلب کابل اور پشاور کی درمیانی گھاٹیوں سے ہو کر اُس علاقے میں پہنچے جو اُس زمانے میں سندھ میں داخل تھا، اور اس کو تاخت و تاراج کر کے واپس ہوئے۔ واپسی میں شہر قندابیل کے متصل ان کا مقابلہ دشمنوں سے ہوا، جس میں دشمنوں کو شکست ہوئی اور بہت سا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ اس فتح کے بعد وہ کیکانان (قلات) آئے، یہاں اُن کا مقابلہ اٹھارہ ترکی سواروں سے ہوا جو باوجود قلت تعداد کے اُن کے مقابل ہوئے اور بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے، ان کا جو مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا اس میں کچھ گھوڑے بھی تھے جن کی ایالیں اور دم کٹی ہوئی تھی۔ یہ طریقہ مہلب کو بہت پسند آیا، انھوں نے حکم دیا کہ لشکر اسلامی کے تمام گھوڑوں کی ایالیں اور دمیں کاٹ دی جائیں۔ مہلب پہلے مسلمان تھے جو درۂ خیبر سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔[1]

سنان بن سلمہ:

ادھر جب عبداللہ بن سوار کی شہادت کی خبر پہنچی تو خراسان کے حاکم اعلیٰ زیاد[2] نے سنان بن سلمہ کو عبداللہ بن سوار کی جگہ مکران کا حکام بنا کر بھیجا۔ سنان نہایت ہی نیک، عالم و فاضل اور خدا سے ڈرنے والے انسان تھے، یہ پہلے شخص ہیں کہ جنھوں نے فوجی لوگوں کو ثابت قدم رہنے کے لیے طلاق کی قسم دینے کا رواج جاری کیا۔ سنان بن سلمہ نے ساحل ہند پر پہنچ کر مکران کے باغیوں کا قلع قمع کیا، ملک کے نظم و نسق کو بہتر بنایا۔ آبادی کو ترقی دی۔

راشد بن عمر جدیدی:

لیکن بعد میں کسی وجہ سے زیاد نے راشد بن عمر جدیدی کو سنان بن سلمہ کی جگہ مکران کا حاکم بنا کر بھیجا۔ راشد عرب کے نہایت شریف خاندان سے تھے، بہت بہادری، جری اور اخلاقی خوبیوں سے متصف تھے۔ راشد کے مکران روانہ ہونے سے پہلے امیر معاویہ نے ان کو بلایا اور اپنے تخت پر بٹھایا، اور دیر تک اُن سے مشورہ کرتے رہے، پھر اپنے درباریوں سے کہا "راشد ایک شریف شخصیت ہے اور ہر طرح سے عہدے داری کی صلاحیت رکھتا ہے، اس کی عزت کرو، اور اس کی اطاعت کرو، اور لڑائی میں اس کو پوری پوری مدد دو، اور اس کو اکیلا مت چھوڑو"۔

اس کے بعد راشد مکران روانہ ہوئے، جب مکران پہنچے تو سنان بن سلمہ نے ان کا شاندار استقبال کیا اور مکران کے صحیح صحیح حالات اُن کو بتائے، دونوں بہت دیر تک بیٹھ کر مشورہ کرتے رہے۔ راشد سنان کی دور اندیشی دیکھ کر اور عقلمندانہ باتیں سن کر بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے کہا خدا کی قسم سنان بہت بڑے آدمی ہیں اور ہر طرح سے عہدہ داری اور سپہ سالاری کے مستحق ہیں۔ راشد نے حالات سے واقف ہو کر فوجی تیاری کر کے سندھ پر حملہ کیا، اور بہت سے سرکشوں کو نیچا دکھایا، اور کیکانان (قلات) والوں سے دو سال کا خراج جو اُن کے ذمہ واجب الادا تھا وصول کیا۔ ایک سال کے بعد جب وہ فاتح و کامیاب ہو کر سیستان کے راستے سے واپس ہو رہے تھے، مندر اور بھرج کے پہاڑوں کے درمیان وہاں کی پہاڑی قوم مید نے جو تقریباً پچاس ہزار تھے اچانک راشد کو گھیر لیا۔ راشد نے بڑی بہادری سے اُن کا مقابلہ کیا، صبح سے شام تک لڑائی ہوتی رہی، آخر اسی جنگ میں راشد شہید ہوئے۔

راشد کی شہادت کے بعد سنان بن سلمہ نے فوجی کمانڈ سنبھالی اور قوم مید کا جواں مردی سے مقابلہ کیا۔ مرکزی حکومت نے دوبارہ سنان بن سلمہ کو مکران کی حکومت پر بحال کر دیا۔ سنان نے اپنے تجربے اور قابلیت سے بہت سے علاقے فتح کیے، وہ دو سال تک مکران میں رہے، آخر مقام بدھیہ[3] میں دشمنوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔[4]

---

(1) تاریخ سندھ مولانا ابو ظفر ندوی، ص ۳۵-۳۶۔

(2) زیاد امیر معاویہ رضہ کا بھائی تھا، جس کی ماں سے زمانہ جاہلیت میں ابوسفیان نے نکاح کیا تھا۔ حضرت علی رضہ نے اس کو فارس کا گورنر مقرر کیا تھا، امیر معاویہ رضہ نے اس کو اس کے عزت و مرتبے کو بڑھا کر بصرہ کا گورنر مقرر کیا، پھر اس کو بصرہ و کوفہ دونوں جگہ کی حکومت سپرد کی، ۵۳ھ (۷۳-۶۷۲ء) میں زیاد بن ابی سفیان نے مرض طاعون میں وفات پائی۔

(1) ریاست بدھ یا بدھا (بدھیہ) ایک بڑا علاقہ تھا جس کے حدود عرض میں سیبی سے ساحل دریائے سندھ تک تھے وہاں بدھوں کی حکمرانی تھی۔

(4) یہ تمام تفصیل چچ نامہ، ص ۸۱ تا ۸۳ سے ماخوذ ہے۔

منذر بن جارود:

زیاد کے بعد مشرقی ممالک کا اعلیٰ حاکم عبید اللہ بن زیاد[1] ہوا، اس نے سنان کی شہادت کے بعد 61ھ میں منذر بن جارود بن بشر کو اُن کی جگہ مقرر کیا۔ چچ نامہ میں ہے کہ جب خلیفہ کے حکم سے منذر نے خلعت امارت زیب تن کی جو خلیفہ نے مرحمت کی تھی، اور وہ روانہ ہونے لگے تو اتفاقاً ان کی خلعت ایک لکڑی کے ٹکڑے میں اٹک کر پھٹ گئی۔ اس واقعہ سے عبید اللہ بن زیاد بے حد غمگین ہوا اور اس نے منذر کو رخصت کرنے کے بعد لوگوں سے روتے ہوئے کہا کہ منذر کے لیے یہ بات اچھی نہیں ہوئی، میرا خیال ہے کہ منذر اس سفر سے واپس نہیں آئے گا اور وہیں مر جائے گا، چنانچہ جب منذر وہاں سے روانہ ہو کر دشمنوں کے ملک میں پہنچے تو راستے ہی میں مقام پورالی[2] میں بیمار ہوئے اور وہیں وفات پائی۔[3]

حکم بن منذر: [4]

منذر کا لڑکا حکم اپنے باپ کی وفات کے وقت کرمان کا حاکم تھا، اُس کے باپ کی وفات کی افسوسناک خبر اس کو وہیں پہنچائی گئی۔ حجاج[5] کے پاس منذر کے بھائی عبدالعزیز نے درخواست کی کہ منذر کی جگہ حکومت مکران پر اس کا تقرر کیا جائے۔ عبدالعزیز نے جس وقت یہ درخواست کی حجاج دروازے پر تھا اور اتفاق سے اذان کی آواز آرہی تھی۔ حجاج نے عبدالعزیز سے کہا کہ اگر اس اذان کی آواز میرے کان میں نہ آتی تو میں تجھ کو ضرور قتل کرا دیتا، بڑی افسوس کی بات ہے کہ ہمارے اکابر اور اُمراء میں سے ایک شریف شخصیت نے اپنے آپ کو خدا کے راستے میں قربان کیا ہے، اس کا لڑکا زندہ موجود ہے۔ کیا تم اس قدر بے حیا ہو کہ اس کے موجود ہوتے ہوئے اس عہدے کے لیے درخواست کرتے ہو۔[6]

عبید اللہ بن زیاد نے حکم کو بلا کر اُس کے باپ کا عہدہ دیا، وہ بیک وقت کرمان اور مکران کا گورنر مقرر ہوا، عبید اللہ بن زیاد نے تین ہزار

---

(1) عبید اللہ بن زیاد کی عمر اپنے والد زیاد کی وفات کے وقت پچیس سال کی تھی، وہ زیاد کی وفات کے بعد امیر معاویہ کی خدمت میں حاضر ہوا، امیر معاویہ رضہ نے اس سے پوچھا کہ تمہارے باپ نے اپنی وفات کے وقت کس کس کو کہاں کہاں کی حکومت عطا کی۔ عبد اللہ نے کہا کہ انہوں نے بصرہ کی حکومت سمرہ بن جندب کو، اور کوفے کی حکومت عبید اللہ بن خالد بن اسید کو دی۔ امیر معاویہ نے پوچھا، اُس نے تمہیں کہاں کی حکومت دی؟ عبید اللہ نے کہا، انھوں نے مجھے کہیں کی بھی حکومت نہیں دی۔ امیر معاویہ رضہ نے کہا جب تمہارے باپ نے تم کو کہیں کی بھی حکومت نہیں دی تو میں تم کو کسی مقام کی حکومت نہیں دوں گا۔ عبید اللہ نے کہا میرے لیے یہ بات بڑی ذلت کی ہو گی کہ میرے باپ نے مجھے کہیں کا حاکم مقرر نہیں کیا اور اب آپ میرے چچا ہو کر مجھے کہیں کا حاکم نہیں بناتے۔ امیر معاویہ رضہ نے کچھ سوچ کر عبید اللہ بن زیاد کو بصرہ، خراسان اور فارس کا اعلیٰ حاکم مقرر کیا۔

(2) چچ نامہ میں ان کا مقام وفات پورالی مذکور ہے مگر بلاذری نے ان کا مقام قصدار بتلاتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے بوقان اور قیقان (قلات) پر حملے کیے جن میں مسلمان غالب ہوئے اور بہت سا مال غنیمت حاصل کیا۔ منذر نے ان علاقوں میں چھوٹے چھوٹے دستے پھیلا دیے جو ہر جگہ کامیابی حاصل کر رہے تھے، اسی اثنا میں قصدار والوں نے بغاوت کی۔ قصدار کے علاقے کو سنان فتح کر چکے تھے، منذر کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے ان پر فوج کشی کی اور قصدار کو دوسری دفعہ فتح کیا اور وہیں وفات پائی۔ ایک شاعر نے ان کا مرثیہ لکھتے ہوئے کہا، جس کے بعض اشعار کا ترجمہ یہ ہے کہ:

وہ قصدار میں گیا اور وہیں قبر میں پہنچ گیا
اس نے غفلت شعاروں کے ساتھ کبھی غفلت نہیں کی
قصدار کیسا اچھا مقام ہے، اور اس کے انگور کیسے اچھے ہیں
دین اور دنیا نے دین اور دنیا کے کیسے اچھے جوان کو چھین لیا

فتوح البلدان بلاذری جلد دوم، ص 435

تعلیقات چچ نامہ سندھی میں ہے کہ "قلادۃ النہرفی وفیات اعیان الدھر" کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ پیر جھنڈا میں موجود ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ منذر نے ۶۱ھ (۶۸۰-۸۱ء) میں وفات پائی۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۳۵)۔

(3) چچ نامہ ص ۸۳ تا ۸۴۔

(4) حکم بن منذر: کوفے میں اپنے قبیلے عبدالقیس کا بڑا مقتدر سردار تھا (المحاسن و المساوی 74x1، المعارف لابن قتیبہ، صفحہ ۱۷۲) بعد میں اس کے چچا نے حجاج کے خلاف بغاوت کی، لیکن وہ رستقباز کے قریب مارا گیا (المعارف، صفحہ ۱۷۲) حکم کو اس سے بہت محبت تھی، چنانچہ اس نے اس کی موت پر مرثیہ کہا، غالباً اسی وجہ سے آخر میں حجاج نے حکم کو ہمیشہ کے لیے قید کر دیا، اس نے الدیماس کے قید خانے ہی میں وفات پائی (بلاذری، الانساب طبع یروشلم 171x5، تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۳۵)۔

(5) عبید اللہ بن زیاد کے زمانے میں حکم بن منذر بحیثیت مکران کے گورنر کے مقرر ہوا، مگر چچ نامہ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالعزیز نے حجاج سے اپنے تقرر کی درخواست کی تھی، حالانکہ اس کا تقرر عبید اللہ بن زیاد کے ہاتھ میں تھا۔ میرا خیال ہے کہ صاحب چچ نامہ نے جس کو درخواست سے تعبیر کیا ہے، غالباً اس نے عبید اللہ بن زیاد سے سفارش چاہی ہو گی، جس پر حجاج نے اس کو یہ تلخ جواب دیا، کیونکہ بعد میں خود ہی صاحب چچ نامہ نے اس کا ذکر کیا ہے کہ عبید اللہ بن زیاد نے حکم کا تقرر اس عہد پر کیا۔

(6) چچ نامہ فارسی، صفحہ ۸۳-۸۴۔

درہم بھی اس کو سامان سفر کے لیے دیے، لیکن کسی وجہ سے وہ چھ ماہ کے بعد واپس بلالیا گیا۔[1]

ابن حری بابلی

حکم کی واپسی کے بعد ابن حری بابلی کو مکران کا گورنر مقرر کیا گیا جس نے وہاں پہنچ کر بہت سے علاقوں کو فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کیا اور ہر جنگ میں فتح اور مال غنیمت حاصل کیا۔[2]

22 رجب بروز جمعرات 60ھ کو امیر معاویہ رضہ نے ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔ ابن حری بابلی اُن کے عہد کا آخری گورنر تھا جو مکران کی حکومت پر مقرر ہوا۔

امیر معاویہ رضہ کے بعد یزید، زبردستی مسلمانوں کا بادشاہ بنا۔ یزید نے تین سال آٹھ ماہ کی حکومت کے بعد 38 یا 39 سال کی عمر میں انتقال کیا۔ یزید کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا معاویہ بن یزید اس کا جانشین ہوا، لیکن اُس نے چالیس دن کے بعد وفات پائی۔ امیر معاویہ کی وفات کے بعد 3 ذیقعدہ 64ھ کو مروان خلیفہ بنا اور 2 رمضان 65ھ کو 63 سال کی عمر میں وفات پائی، مروان نے ساڑھے نو مہینے خلافت و حکومت کی۔ ان تینوں کے عہد حکومت میں اندرونی خلفشار کی وجہ سے کوئی مہم نہ ہندوستان کی طرف روانہ ہوئی اور نہ تاریخ سے سندھ و ہند میں کسی فتوحات کا پتہ چلتا ہے۔

عبدالملک بن مروان

۶۵ھ (۶۸۴-۸۵ء) تا ۸۶ھ (۷۰۵-۶ء)

مروان بن حکم کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا عبدالملک جس کو اُس نے ولی عہدی کے لیے نامزد کیا تھا، ۶۵ھ (۶۸۴-۸۵ء) میں خلیفہ ہوا، اس کی کنیت ابو الولید تھی اور وہ ابوالملوک کے نام سے بھی مشہور تھا کیونکہ اس کے کئی بیٹے یکے بعد دیگرے خلیفہ ہوئے، وہ علم و فضل میں بھی بڑا مرتبہ رکھتا تھا، مدینے کے اکابر، علماء اور اہل کمال سے اُس نے استفادہ کیا تھا، اُس دور کے اکابر، علماء اس کے بحر علمی کے قائل تھے۔

شعبی کہتے ہیں کہ میں جس اہل علم کے پاس بیٹھا وہ میرے علم کا قائل ہو گیا، مگر میں عبدالملک بن مروان کے علم و فضل کا قائل ہوں، میں نے اُس سے جب کوئی حدیث بیان کی، اُس نے میرے علم میں اضافہ کر دیا، اُسی طرح جب میں نے کوئی شعر پڑھا تو اُس نے بھی اُس کے ہم مضمون بہت سے اشعار پڑھ دیے۔

قدرت نے اس کو علم و فضل کے ساتھ تدبر، حوصلہ مندی، مستقل مزاجی اور شجاعت جیسے جلیل القدر اوصاف سے نوازا تھا، اُس نے اپنے عزم و استقلال و بہادری سے اموی خاندان کی گرتی ہوئی حکومت کو سنبھالا اور اُموی حکومت کو مضبوط کر کے اُس نے شوال ۸۶ھ (۶-۷۰۵ء) میں وفات پائی۔[3]

---

[1] تاریخ سندھ - از مولانا سید ابو ظفر ندوی، ص ۳۸۔

[2] ایضاً۔

[3] حجاج کے ابتدائی تقرر کا واقعہ مولانا مناظر احسن نوراللہ مرقدہ نے اپنی کتاب امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی کے صفحہ 64-65 بحوالہ ابن خلکان و ابن عساکر نقل کیا ہے کہ: عبدالملک کو اپنی فوج کے نظم و ضبط کو درست کرنے کے لیے ایک شخص کی ضرورت تھی، ایک دن اُس نے اپنے وزیر روح بن زنباع سے شکایت کرتے ہوئے کہا کہ کیا کوئی ایسا آدمی نہیں ہے، جو فوج کی بد نظمی کو درست کر سکے۔ روح نے کہا کہ حال ہی میں میرے فوجی عملے میں ایک سپاہی بھرتی ہوا ہے، اس کی صلاحیتوں کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر فوج کا نظم و ضبط اس کے سپرد کیا جائے تو وہ فوج کے نظم و ضبط کو درست کر دے گا۔ روح نے جس سپاہی کی طرف اشارہ کیا تھا وہ حجاج تھا۔ حجاج پہلے طائف میں لڑکوں کو پڑھایا کرتا تھا، پھر یہ پیشہ ترک کر کے سپاہیوں میں بھرتی ہو گیا اور کسی طرح وزیر کے عملے کے سپاہیوں میں پہنچ گیا۔ اپنے وزیر کی یہ بات سن کر عبدالملک نے حجاج کو بلوایا اور ابتداء فوج کا انتظام اس کے سپرد کیا۔ عبدالملک نے حجاج کو حکم دیا کہ جیسے ہی ہماری سواری روانہ ہو، ہمارے ساتھ فوراً ہی تمام فوج کو کوچ کرنا چاہیے۔ حجاج نے کہا امیر المومنین اس حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ اتفاق سے اسی دن عبدالملک کی سواری روانہ ہوئی۔ حجاج تمام فوج میں کہتا پھرتا تھا کہ امیر المومنین کی سواری کے ساتھ ہر سپاہی کو سوار ہونا چاہیے۔ وہ اسی طرح گھومتے ہوئے خود وزیر کے عملے میں پہنچا۔ دیکھا کہ عملے کے سپاہی کچھ سوئے ہوئے پڑے ہیں، کچھ کھانا پکانے میں مصروف ہیں۔ حجاج نے گرجدار آواز میں کہا تم ابھی تک سوار نہیں ہوئے، حالانکہ امیر المومنین کی سواری روانہ ہونے کے لیے تیار ہے۔ چونکہ حجاج انہیں میں رہا تھا، اس لیے ان لوگوں نے مذاق سے کہا "کیا ٹرٹر لگا رکھی ہے، آؤ بیٹھ کر ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ"۔ ابھی یہ لوگ پوری بات کہہ بھی نہ پائے تھے کہ حجاج نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ہر ایک کی پیٹھ پر کوڑے برسانے شروع کر دیے، لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ حجاج نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ وزیر اور اس کے رفیقوں کے خیموں میں آگ لگا دی، جب وزیر اپنے خیمے میں واپس آئے تو اس حال کو دیکھ کر رونے لگے اور عبدالملک سے جا کر حجاج کی شکایت کی۔ عبدالملک نے حجاج کو بلا کر پوچھا کہ تم نے یہ کیا کیا؟ حجاج نے صاف انکار کر دیا کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ عبدالملک نے کہا کیا تو نے لوگوں کو کوڑے نہیں مارے؟ کیا تو نے خیموں کو آگ نہیں لگائی۔ پھر عبدالملک نے پوچھا کہ آخر وزیر کے آدمیوں کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا؟ حجاج نے برجستہ کہا امیر المومنین نے۔ عبدالملک نے تعجب سے

سندھ کی فتوحات کی تاریخ کا اصل باب دراصل عبدالملک بن مروان ہی سے شروع ہوتا ہے۔

حجاج بن یوسف:

۷۵ھ (۶۹۴-۹۵ء) میں عبدالملک بن مروان نے مشرقی ممالک کا اعلیٰ حاکم حجاج بن یوسف ثقفی کو مقرر کیا۔ اہل عراق خصوصاً کوفے کے لوگ نہایت سرکش واقع ہوئے تھے۔ حجاج نے اپنے عہدے کا جائزہ لیتے ہی اول کوفے میں آکر وہاں کا انتظام کیا، پھر اُس نے بصرے جاکر وہاں کے شورش پسندوں کو درست کیا۔ مکران، بلوچستان، خراسان اور سندھ کی سرحد تک کا تمام علاقہ اس کے ماتحت تھا۔

مکران میں عہد عبدالملک کے گورنر سعید بن اسلم کلابی:

پھر بصرے ہی سے حجاج بن یوسف نے سعید بن اسلم کلابی کو مکران کا گورنر مقرر کرکے بھیجا۔ جب وہ مکران پہنچا تو سفھوی بن لام الحمامی ازد سے اس کے پاس آیا۔ سعید نے اس سے کہا کہ میں جہاں بھی مقیم ہوں، تمہارے لیے مناسب ہے کہ تم میرے شریک اور مددگار ہو۔ سفھوی نے جواب دیا کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا، اس لیے کہ میرے پاس کوئی فوج نہیں ہے۔ سعید نے کہا، تم اتنے سرکش ہو کہ میں نے خلیفہ کے حکم اور نام سے تم سے مدد طلب کی ہے اور تم اُس کی بھی پرواہ نہیں کرتے اور بہانے کررہے ہو۔ سفھوی نے کہا، خدا کی قسم میں تمہارا حکم نہیں مانوں گا اور میں تمہارا حکم ماننا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہوں۔ اس پر سعید نے سفھوی کو قید کرکے قتل کرڈالا، اس کی کھال اُتاری اور اس کا سر حجاج کے پاس بھیج دیا۔ پھر سعید نے مکران میں اپنے عامل مالگزاری وصول کرنے کے لیے مقرر کیے، نہایت ہی حسن تدبیر سے وہ ہندوستان سے زیادہ دولت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔

علافی خاندان جس کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے کہ راجا داہر نے اس خاندان کو سرحد مکران پر آباد کردیا تھا۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ سفھوی بن لام الحمامی کو سعید نے قتل کردیا ہے تو تمام علافی خاندان سعید کا دشمن ہوگیا۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کرتے ہوئے ایک دوسرے سے کہا کہ سفھوی ہمارے علاقے کا تھا، عمان کا رہنے والا تھا جو ہمارے ملک کا ایک حصہ ہے، سعید کو کیسے جرات ہوئی کہ اُس نے ہمارے رشتے دار کو قتل کردیا۔ چنانچہ سعید خراج وصول کرکے واپس آرہا تھا کہ مرج میں علافیوں نے اچانک اس پر حملہ کرکے اس کو قتل کردیا اور مکران پر قابض ہوگئے۔[1]

بلاذری کا بیان ہے کہ حارث علافی کے بیٹوں معاویہ اور محمد نے اپنے قبیلے کو لے کر سعید پر حملہ کیا اور اس کو قتل کرکے سرحد پر قابض ہوگئے۔[2] سعید کی وفات کی خبر جب حجاج کو ملی تو اُسے نہایت غصہ آیا اور اس نے علافی خاندان کے سردار سلیمان کو جو عرب میں تھا قید کرکے قتل کرڈالا اور اُس کا سر کاٹ کر سعید کے گھر والوں کے پاس بھجوایا تاکہ اس انتقام سے ان کا دل ٹھنڈا ہو اور اُن کو تعزیت کا پیغام بھیجا اور سعید کے قریبی رشتے داروں کو نوازا۔

مجاعہ بن سعر التمیمی:

حجاج نے سعید کے بعد مجاعہ بن سعر تمیمی کو مکران اور سرحد سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، اُس وقت علافی مکران سے بھاگ چکے تھے۔ مجاعہ نے ان کے تعاقب میں لوگوں کو روانہ کیا، لیکن وہ راجا داہر کے پاس سندھ میں پہنچ چکے تھے۔ مجاعہ ایک سال تک مکران میں رہا، اس نے قندابیل کے اطراف و جوانب کو فتح کیا اور ۷۶ھ (۶۹۵-۹۶ء) مکران ہی میں وفات پائی۔

کسی شاعر نے مجاعہ کی مجاہدانہ خدمات کو سراہتے ہوئے کہا ہے:

ترجمہ:- اے مجاعہ تو جتنے معرکوں میں شریک ہوا، اُن کی یاد کو تجھ ہی سے زینت ہے۔[3]

ولید بن عبدالملک

۸۶ھ (۷۰۶ء) تا ۹۶ھ (۱۵-۷۱۴ء)

شوال ۸۶ھ (۷۰۶ء) میں عبدالملک کی وفات کے بعد اس بیٹا ولید تخت نشین ہوا۔ اگرچہ وہ اپنے والد کے بالکل برعکس علم و فضل

کہا میں نے!! حجاج نے کہا جی ہاں آپ نے۔ پھر اس نے کہا "امیر المومنین! میری کیا مجال تھی کہ میں ایسا کرتا، لیکن یہ جو کچھ ہوا آپ کے حکم سے ہوا۔ میرا کوڑا اب میرا کوڑا نہیں، بلکہ حضور کا کوڑا ہے، اسی طرح میرا ہاتھ اب میرا نہیں بلکہ امیر المومنین کا ہاتھ ہے"۔ عبدالملک اس کی یہ باتیں سن کر فرط مسرت سے اچھل پڑا اور کہنے لگا، بخدا مجھے اسی قسم کے آدمی کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد حجاج ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ مشرقی ممالک کا وایسرائے مقرر ہوا۔ اس واقعے سے حجاج کی فطرت کا اندازہ ہوتا ہے کہ باوجود ظالم و جابر ہونے کے اپنے انتظام میں کس طرح سخت تھا۔

(1) چچ نامہ، ص ۸۵ تا ۸۶۔

(2) فتوح البلدان، ص ۴۳۵۔

(3) چچ نامہ، ص ۸۸ و فتوح البلدان بلاذری، ص ۴۳۵۔

سے عاری تھا، لیکن فرمانروائی اور حکومت کے جوہر اس میں بدرجہ کمال موجود تھے۔ اموی خلفاء میں فرمانروائی کے اعتبار سے اس کا مرتبہ بہت بلند سمجھا جاتا ہے۔ اسی کی حکومت کے دور میں اسلامی حکومت چین سے لے کر یورپ تک وسیع ہوگئی۔ اس کے عہد میں قتیبہ بن مسلم فاتح چین، موسیٰ بن نصیر فاتح اندلس، محمد بن قاسم فاتح سندھ جیسے نامور جنرل تھے، جن پر تاریخ اسلام کو ناز ہے۔ اسی کے زمانے میں ایک ناگوار واقعہ کی وجہ سے مسلمانوں کو مستقل طریقے پر سندھ کے فتح کرنے کا خیال پیدا ہوا، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

محمد بن ہارون بن زراع النمری:

حجاج بن یوسف نے جو ولید کے زمانے میں مشرقی ممالک کا حاکم اعلیٰ تھا، مجاعہ کی وفات کے بعد محمد بن ہارون بن زراع نمری کو مکران اور سرحد سندھ پر گورنر مقرر کیا۔ اور پہلے گورنروں سے اس کے اختیارات وسیع کرتے ہوئے کہا کہ وہ جس طرح ممکن ہو، علافیوں سے سعید کا انتقام لے اور خراج وصول کرنے کی پوری کوشش کرے۔ ۸۶ھ (۷۰۶ء) میں محمد بن ہارون نے مکران پہنچتے ہی علافیوں کا تعاقب شروع کیا اور ایک علافی کو گرفتار کرکے، اُس کا سر کاٹ کر حجاج کے پاس بھیجتے ہوئے لکھا کہ ایک علافی کا سر حاضر ہے، اگر میری زندگی نے وفا کی اور قسمت نے یاوری کی تو میں دوسرے علافیوں کو بھی ضرور گرفتار و قتل کروں گا۔ اس کے بعد پانچ سال تک محمد بن ہارون نے مختلف بری و بحری فتوحات حاصل کیں۔[1]

سندھ پر حملے کا اصل سبب:

یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ سندھ کا ملک نسبتاً عراق سے نزدیک تھا ر ایرانی سرحد سندھ سے ملتی تھی، اس لیے اس زمانے میں جب کہ رانی اور مسلمانوں کی جنگ ہو رہی تھی اور اسلامی فتوحات ایران میں ہ رہی تھیں، اس دور کے فتنہ پرور ایرانی سندھ میں آکر پناہ لیتے تھے ر سندھ ان فتنہ پردازوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ خود سندھ کا راجہ داہر بھی ں کوشش میں تھا کہ ایرانی سلطنت کسی طرح قائم رہے۔ وہ مسلمانوں ر ایرانیوں کے مختلف معرکوں میں ایرانیوں کو فوجی مدد دیتا رہا۔ لیکن ب ایران کی سلطنت پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا، تو راجا نے سرحدی ایرانی یوں کو اپنی حکومت میں شامل کرلیا اور ایرانیوں نے بھی کرمان و

بلوچستان کے صوبوں کو سندھ کے راجا کے سپرد کر دیا تاکہ مسلمان ان پر قبضہ نہ کر سکیں۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے سندھ کو فتح کرنے کی طرف توجہ نہیں دی، یہاں تک کہ راجا داہر نے ایک خاص واقعہ سے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کے ملک پر حملہ کریں۔

اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ ولید بن عبدالملک کی فتوحات نے اسلامی حکومت کی دھاک دور دور بٹھا رکھی تھی۔ اُس وقت کے فرمانروا اور شاہان وقت ولید سے دوستی کی تمنا رکھتے تھے۔ سراندیپ کے راجا کی بھی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح ولید سے دوستی پیدا کرے۔ چنانچہ اس نے جزیرہ یواقیت سے آٹھ جہازوں کے ذریعے حجاج کے پاس (خلیفہ ولید بن عبدالملک کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے) بہت سے تحائف بھیجے، جن میں انواع واقسام کے موتی وجواہر، حبشی غلام اور کنیزیں اور دوسرے نادر تحائف روانہ کیے۔ ان جہازوں میں کچھ مسلمان عورتیں بھی تھیں، جو کعبے شریف کی زیارت کے لیے اور دارالخلافہ دیکھنے کی غرض سے جارہی تھیں۔ جب جہازوں کا یہ بیڑا ملک قازرون کے قریب پہنچا تو مخالف ہواؤں کے طوفان نے ان جہازوں کو بے قابو کرکے ساحل دیبل پر پہنچا دیا۔ اس وقت دیبل سندھ کی بندرگاہ اور راجا داہر کے علاقے کا مشہور شہر تھا۔ یہاں راجا داہر کا ایک گورنر اور سپہ سالار رہا کرتا تھا۔ یہاں قزاقوں کے ایک گروہ نے جسے نکامرہ[2] کہتے تھے اور وہ دیبل کے باشندے تھے،

---

[1] چچ نامہ، ص ۸۸-۸۹۔

[2] نکامرہ: مؤرخ بلاذری نے صفحہ ۴۳۵ پر ان لوٹنے والوں کو میدوں کی قوم سے بتایا ہے، جنھوں نے کشتیوں پر سوار ہو کر سراندیپ کے جہازوں پر حملہ کیا تھا۔ ممکن ہے کہ نکامرہ مید قوم کا ایک قبیلہ ہو، کیونکہ خود چچ نامے کے صفحہ ۱۲۱ پر میدوں کے دیبل کا ذکر آیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ دیبل بندر قوم مید کا مرکز تھا۔ عرب مؤرخوں کے بعض حوالوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکران، سندھ اور کاٹھیاواڑ کے ساحل پر رہنے والی ساری قومیں جن کا پیشہ بھی لوٹ مار اور قزاق تھا، ان سب کو 'مید' کہا گیا ہے۔ بلاذری نے واضح طور پر لکھا ہے کہ 'مید' وہ ہیں جو سمندر میں ڈاکے ڈالتے ہیں۔ پھر بلاذری مکران کے گورنر راشد بن عمر الجدیری کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس نے پہلے تو شمالی پہاڑی علاقے کیکانان پر حملہ کرکے فتح حاصل کی، اس کے بعد مکران میں میدوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گیا۔ (بلاذری، صفحہ ۴۳۲) عہد بنو عباس میں بھی سندھ کے گورنر موسیٰ بن عمران نے قندابیل فتح کرنے کے بعد میدوں پر حملہ کیا۔ (بلاذری صفحہ ۴۴۵) اور پھر سندھ میں جتوں کی مدد سے سمندر کی کھاڑی کھدوا کر میدوں کی رہائشی نشیبی زمین کو پانی میں غرق کرکے انھیں تباہ کیا۔ (بلاذری صفحہ ۴۴۶)۔ لاتک ورتھ ڈیمس اپنی کتاب 'بلوچ قوم' کے صفحہ ۱۷ پر لکھتا ہے کہ میدیا میدہ سندھ اور مکران کے (بحری) ساحل کے قدیم سہانے (ملاح) ہیں، جنھیں بلوچ حقارتاً لس نام سے

ان جہازوں پر قبضہ کر کے ان جہازوں کو لوٹ لیا اور مردوں اور عورتوں کو گرفتار کر کے سارے سامان اور جواہرات پر قبضہ کر لیا۔ سراندیپ کے راجا کے آدمیوں اور عورتوں نے کہا کہ ہم یہ مال خلیفہ وقت کے لیے لے جا رہے ہیں، مگر انھوں نے مطلقاً پروانہ کی اور سب کو قید کر کے کہا کہ اگر تمہارا کوئی دادرس ہو تو اس کے توسط سے خود کو پھر خرید لو۔ اس پر ایک عورت نے چیخ کر کہا "یا حجاج یا حجاج! اغثنی" (اے حجاج، اے حجاج میری مدد کو پہنچ) یہ عورت قبیلہ بنی عزیر[1] میں سے تھی۔ بلاذری میں ہے کہ یہ عورت یربوعیہ خاندان کی تھی۔

ان جہازوں کے کچھ مسافر جو کسی طرح بچ بچا کر نکل بھاگے تھے، انھوں نے عراق پہنچ کر جہازوں کو لوٹنے اور مسافروں کے قید کرنے کی اطلاع نہایت دردناک طریقے پر حجاج کو پہنچائی اور یہ بھی کہا کہ اس وقت جب کہ ڈاکو مسافروں کو گرفتار کر رہے تھے اور عورتوں پر ظلم توڑنے جا رہے تھے، یربوعیہ خاندان کی ایک عورت بے اختیار یا حجاج اغثنی (اے حجاج میری فریاد کو پہنچو) پکار رہی تھی۔ یہ بات سن کر حجاج نے کہا "لبیک لبیک (میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں)۔ حجاج ان واقعات کو سن کر بے حد متاثر ہوا۔

اس نے فوراً راجا داہر کو ایک خط لکھا اور ایک خط محمد بن ہارون، گورنر کو لکھا کہ میں ایک خط داہر کے نام اپنے خصوصی قاصد کے ذریعے سے بھیج رہا ہوں۔ جب یہ قاصد تمہارے پاس پہنچے، تم اپنے کسی معتبر افسر کو اس قاصد کے ساتھ داہر کے پاس بھیجو جو اس سے کہے کہ وہ ان تحائف کو جو خلیفہ کے لیے لنکا کے راجا نے بھیجے تھے اور ان بیواؤں اور یتیموں اور حاجیوں کو آزاد کر دے جنھیں دیبل کی بندرگاہ پر قید کر لیا گیا ہے۔

داہر کے نام جو خط تھا، اس میں لکھا کہ ہمارے ملک کے لوگ جو تمہارے علاقے میں قید کر لیے گئے ہیں، اُن کو باعزت طریقے سے واپس کرو اور مال و اسباب کا جو کچھ نقصان ہوا ہے، اُس کا تاوان ادا کرو۔ حجاج نے خود اس خط پر اپنے دستخط ثبت کیے۔ یہ خط جس قدر معقول اور شریفانہ انداز میں لکھا گیا تھا، اس کا جواب بھی اسی قدر معقول ہونا چاہیے تھا لیکن راجا داہر نے اس خط کا جواب نہایت بے پروائی اور فریب سے دیا اور لکھا کہ یہ کام بحری ڈاکوؤں کا ہے، جن پر ہمارا بس نہیں چلتا[1]۔ یہ الفاظ چچ نامے کے ہیں۔

راجا داہر کی غیر معقولیت اور فریب کا اندازہ اس سے ہوتا ہے، جب کہ محمد بن قاسم نے الور کو فتح کیا، تو ان جہازوں کے مسافر قیدی الور کے جیل خانے سے نکالے گئے، جس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئے گی۔ اگر بحری ڈاکوؤں نے ان مسافروں کو گرفتار کیا تھا تو سرکاری جیل خانے سے ان کے برآمد ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، سوائے اس کے کہ داہر کے جواب کو ایک فریب سمجھا جائے۔ لیکن فرشتے نے اس واقعے کو حسب ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے:

حاکم سراندیپ چوں بسلاطین اسلام اعتقاد فراوان داشت۔ از دریا کشتی مملو از تحف و ہدایا و غلامان و کنیزان جہت ولید روانہ دارالخلافہ ساخت۔ چوں بحوالی باب عجم رسیدند مردم لوک کہ بحکم حاکم دیبل بر روے دریا متردد بودند سر راہ بر آں کشتی گرفتہ با ہفت کشتی دیگر بتصرف در آوردند، و اموال و اشیائے کہ در آنہا بود از خود گرفتہ۔ چند زن مسلمان کہ از سراندیپ روانہ حج بودند آنہا را اسیر ساختند، و جمعیکہ از دست آن کفار توفیق گریختن یافتہ بودند نزد حجاج رفتہ داد خواہ شدند۔ حجاج مکتوبے بحاکم سندھ داہر ابن صعصعہ نوشتہ نزد محمد ہارون فرستاد تا بدست معتمدان خود نزد داہر فرستد۔ داہر بعد ورود نامہ و اطلاع بر مضمون آن در جواب نوشت کہ این عمل از قومے بوقوع آمدہ کہ در کمال شوکت و قوت اند۔

پکارتے ہیں۔ دریائے سندھ کے مویانوں (ملاحوں) کو بھی مید کہتے ہیں اور اکثر مید اور ماچھی دونوں نام ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں۔

سندھ کے مید غالباً سندھ کے بحری ساحل کے میر بحر تھے اور موجودہ سندھی 'میہ' شاید 'مید' کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

صاحب چچ نامہ نے ان لوٹنے والوں کو قوم نکامرہ میں سے لکھا ہے لیکن سندھ کے ملاحوں میں اس وقت تک کوئی قبیلہ اس نام کا موجود نہیں البتہ تحفۃ الکرام کے ایک حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نکامرہ گیارھویں صدی عیسوی کے نصف اول تک موجود تھی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے تحفۃ الکرام، مطبع ناصری، جلد 3x95) اگر یہ قوم گیارھویں صدی ہجری میں تھی تو اس حالت میں اس قوم کے لوگوں کا اب تک باقی رہنا ممکن ہے، ہو سکتا ہے کہ اس قوم کا یہ نام متروک ہو چکا ہو۔ ہمیں اس وقت تک بحری ساحل اور لاڑ کے ملاحوں کے جو قبائل یا ان کی شاخیں معلوم ہوئی ہیں وہ یہ ہیں۔ لاڑا، ونگرا، دیلا، (دھارا جا کے اصلی باشندے) ہولانی، لیلگانی، ماچھی، جوبانیا، ٹانڈیا، ولہاری، ہوڑائی، ڈوکی، کڈائی، گجاریا، سوڈھائی، بکھیڑا، ٹیبائی، پاٹاری، ٹھوری، ڈھورائی وغیرہ مگر نکارہ کا نام کہیں نہیں ملتا۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، صفحات ۴۳۶ تا ۴۳۹۔ مرتب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ)

[1] صاحب چچ نامہ نے اس عورت کو قبیلہ بنی عزیز یا بنی عزیر سے بتایا ہے، مگر بلاذری نے (فتوح البلدان، صفحہ ۴۳۵) پر اس عورت کو بنی یربوع کے قبیلے سے بتایا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۳۹)

[1] چچ نامہ، صفحات ۹۰-۹۱۔

بدستیاری سعی دفع آن گروہ پر شکوہ متصور نیست۔

فرشتے کی اس بین السطوری عبارت کو سیاق وسباق سے ملا کر اگر غور سے پڑھا جائے تو فرشتے کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاکم دیبل کے حکم سے جس قوم نے ان جہازوں کو لوٹا ہے، وہ اتنی شوکت اور قوت رکھتے ہیں کہ تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا یہ مطلب تھا کہ بیشک ہم نے تمہارے جہازوں کو لوٹا ہے اور تم ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتے۔

داہر کا یہ جواب جب حجاج کو ملا تو اس نے ولید بن عبدالملک کے پاس ایک عرضداشت بھیجی اور تمام حالات لکھ کر سندھ پر حملے کی اجازت طلب کی، لیکن ولید نے اس کی اجازت نہ دی۔ حجاج نے چند دن کے بعد بارگاہ خلافت میں دوسری عرضداشت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ میرا خیال ہے کہ امیر المومنین نے کثیر اخراجات کی وجہ سے سندھ پر حملے کی اجازت نہیں دی، لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس مہم میں جو رقم شاہی خزانے سے خرچ ہوگی، میں اس سے دوگنی رقم شاہی خزانے میں داخل کروں گا۔ ولید نے یہ سوچ کر کہ اس میں کوئی نقصان نہیں ہے، حجاج کو سندھ پر حملے کی اجازت دے دی۔[1]

حجاج کی پہلی مہم:

ولید کی اجازت ملتے ہی حجاج نے عبداللہ بن نبہان کی سپہ سالاری میں ایک فوج دیبل روانہ کی۔ عبداللہ بن نبہان نے دیبل پہنچ کر حملہ کیا اور شجاعت و دلیری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔[2]

بدیل کا حملہ:

عبداللہ بن نبہان کی شہادت کے بعد حجاج نے فوراً بدیل بن طہفہ بجلی کے نام احکام بھیجے کہ وہ دیبل پر حملہ کریں۔ بدیل اس وقت عمان میں تھے اور اسی کے ساتھ حجاج نے مکران کے گورنر محمد بن ہارون کے نام فرمان جاری کیا کہ جیسے ہی بدیل پہنچیں ان کی امداد کے لیے فوراً تین ہزار فوج ان کے ساتھ روانہ کرو۔ بدیل حجاج کا حکم ملتے ہی تین سو سپاہیوں کے ساتھ مکران پہنچے اور محمد بن ہارون سے تین ہزار فوج ساتھ لے کر دیبل روانہ ہوئے۔ دیبل والوں کو جیسے ہی اُن کے آنے کی اطلاع ملی فوراً ہی داہر کے پاس الور ایک آدمی بھیجا اور بدیل کے آنے کی اطلاع دی۔ داہر نے جلدی سے اپنے لڑکے جیسیہ کو چار ہزار سواروں کے ساتھ جو اُونٹوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں پر سوار تھے دیبل روانہ کیا۔ بدیل دشمن کی اس کمک کے آنے سے پہلے دیبل کے جنگجو سپاہیوں کو بھگا چکے تھے۔ لیکن اب جیسیہ اپنی فوج اور چار ہاتھیوں کے ساتھ میدان جنگ میں پہنچا اور گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی۔ یہ لڑائی صبح سے شام تک جاری رہی۔ طرفین بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے۔ ابھی کچھ فیصلہ نہ ہونے پایا تھا کہ بدیل کا گھوڑا ہاتھیوں کو دیکھ کر بھڑکا اور بدیل گھوڑے سے زمین پر گر پڑے۔ دشمنوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ان کو گرفتار کر کے شہید کر دیا۔

حجاج کا تاثر:

حجاج کو جب بدیل کی شہادت کی خبر ملی تو اُسے بے حد صدمہ ہوا۔ اس کے صدمے کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اُس نے مؤذن سے کہا کہ جب تم اذان کہو تو ہر اذان کے بعد مجھے بدیل کا نام یاد دلاتے رہو، تاکہ میں اُس کے لیے اس وقت تک دعا کرتا ہوں، جب تک کہ اُس کا بدلہ نہ لے لوں۔

اسی زمانے میں ایک شخص جو بدیل کے ساتھ جنگ میں تھا، واپس آیا۔ اُس نے حجاج کے سامنے بدیل کی شہادت و شجاعت کے وہ واقعات بیان کیے جو اُس نے اس جنگ میں دیکھے تھے۔ اس نے کہا کہ میں اُس وقت وہیں تھا جب بدیل شہید ہوئے اور لشکر اسلام کو شکست ہوئی۔ جب وہ تمام واقعہ بیان کر چکا تو حجاج نے اُس سے کہا کہ اگر تم بہادر آدمی ہوتے تو بدیل کے ساتھ جان دیتے اور واپس نہ آتے۔ پھر اس نے حکم دیا کہ اس شخص کو سزا دی جائے۔[3]

نیرون کا وفد:

بدیل کی شہادت کے بعد سندھ میں نیرون[4] کے لوگوں نے

---

[1] چچ نامہ، ص ۹۱ تا ۹۲۔

[2] فتوح البلدان بلاذری، صفحہ ۴۳۵۔ تاریخ معصومی فارسی کی توضیحات میں شمس العلماء ڈاکٹر داؤد پوتہ نے لکھا ہے کہ کلفٹن پر جو عبداللہ شاہ کا مقبرہ ہے۔ عوام میں مشہور ہے کہ یہ عبداللہ بن نبہان کا مقبرہ ہے جو سندھ کی فتح کے لیے آئے تھے۔ اور جن کو حجاج نے بدیل بن طہفہ بجلی سے پہلے دیبل کی فتح کے لیے بھیجا تھا (توضیحات تاریخ معصومی فارسی، ص ۲۶۲)۔ (توضیحات چچ نامہ فارسی، صفحہ ۲۵۴)۔

[3] چچ نامہ ص ۹ تا ۲۲۔

[4] تحفۃ الکرام جلد۔ صفحہ ۷۷ پر ہے کہ موجودہ حیدرآباد نیرون کی قدیم بستی کی جگہ آباد ہے۔ محب اللہ بھکری نے اپنی کتاب مختصر تاریخ کے دوسرے باب میں حیدرآباد کے متعلق لکھا ہے کہ حیدرآباد پہلے نیرون کے نام سے مشہور تھا۔ اس شہر کی بنیاد نبوت اور ہجرت کے درمیانی زمانے میں پڑی۔ مغلوں کی فتح کے بعد یہ شہر حیدرآباد کے نام سے مشہور ہوا۔ حیدر قلی ارغوں نے اس شہر کو نئے سرے سے تعمیر کرایا۔ (توضیحات چچ نامہ سندھی، صفحہ ۴۰۱)۔

مسلمانوں سے ڈر کر آپس میں مشورہ کیا کہ یقیناً عرب اس کا انتقام لیں گے اور اُن کے حملے کا پہلا نشانہ ہم لوگ بنیں گے۔ اگر اسی وقت ان کی اطاعت قبول کرلی جائے تو ہمارا شہر بربادی سے محفوظ رہے گا۔ اُس زمانے میں نیرون کا حاکم سندر نامی بدھ مذہب کا ماننے والا تھا، اُس نے بغیر داہر کے علم و اطلاع کے ایک وفد حجاج کے پاس بھجوایا اور جزیہ قبول کرتے ہوئے امن کا طالب ہوا۔ حجاج نے اس وفد کی استدعا قبول کرلی اور ان کو تسلی و تشفی دیتے ہوئے کہا کہ تم کوئی ایسی تدبیر اختیار کرو کہ ہمارے قیدی چھوٹ جائیں۔[1]

عامر بن عبداللہ کی حکومت ہند کے لیے استدعا:

بدیل کی شہادت کے بعد عامر بن عبداللہ نے حجاج سے خواہش کی کہ اُسے محاذ ہند و سندھ پر سپہ سالار بنا کر بھیجا جائے۔ حجاج نے جواب دیا کہ تمہاری یہ حرص فضول ہے، میں نے خود بھی قرعہ ڈالا ہے۔ مجھے جہاں تک اندازہ ہے وہ یہ ہے کہ سندھ تو امیر عماد الدین محمد بن قاسم ثقفی کے ہاتھ پر فتح ہوگا۔[2]

محمد بن قاسم کی سندھ کو روانگی:

حجاج نے محاذ سندھ کی سپہ سالاری کے لیے محمد بن قاسم کو منتخب کیا، جو اس کے چچازاد بھائی تھے۔ محمد بن قاسم کی کنیت ابو البہار تھی، چونکہ وہ بہار البر کے پھول کو پسند کرتے تھے، اس لیے اس کنیت سے مشہور ہوگئے۔ ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:

محمد بن قاسم بن محمد بن حکم بن ابی عقیل

وہ ۷۵ھ (۹۵-۶۹۴ء) میں طائف میں پیدا ہوئے۔ جب حجاج بن یوسف عراق کا گورنر مقرر ہوا تو اُس نے ثقفی خاندان کے ممتاز لوگوں کو مختلف عہدوں پر مقرر کیا۔

انھیں میں محمد کے والد قاسم بھی تھے جنہیں اُس نے بصرے کا گورنر مقرر کیا تھا۔ غالباً اس کے بعد محمد بن قاسم کی تربیت بصرے میں ہوئی۔ محمد بن قاسم ابھی بچے ہی تھے کہ ان کے والد نے وفات پائی، پانچ

---

(1) چچ نامہ فارسی، صفحہ ۹۳۔

(2) سندھ کے مشہور محقق ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ پروفیسر سندھ یونیورسٹی نے چچ نامہ سندھی کی توضیحات کے صفحہ ۴۴۰ پر ابو عقیل کی اولاد کا شجرہ حسب ذیل دیا ہے:

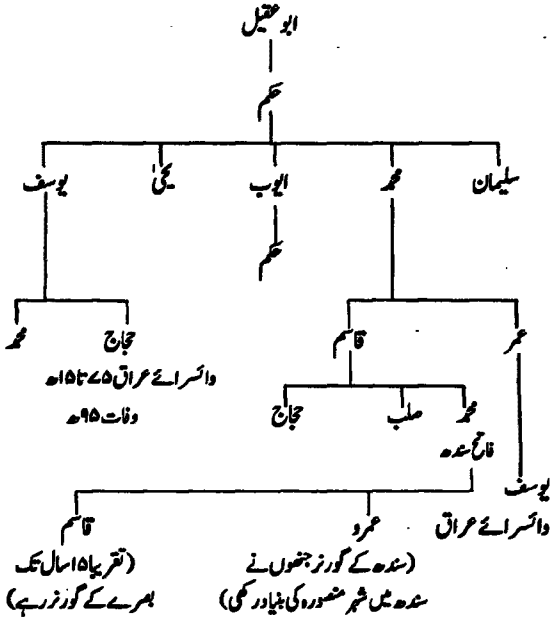

عام مؤرخین کا بیان ہے کہ محمد بن قاسم حجاج بن یوسف کے چچا کا لڑکا اور حجاج کا داماد تھا۔ چچ نامے کی مختلف عبارتوں سے بھی اسی بیان کی تائید ہوتی ہے۔ مگر سندھ کے محقق ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے چچ نامہ سندھی کی توضیحات میں اس خیال کو مختلف دلائل سے غلط ٹھہرایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مؤرخین کو یہ اشتباہ ہے کہ محمد بن قاسم حجاج کے چچا کا لڑکا تھا۔ چچ نامہ فارسی کی اس عبارت سے "ابن عم او بود" سے لگا ہے۔ حالانکہ عربی میں ابن عم کا اطلاق چچا کے بیٹے، اس کے پوتے اور پڑپوتے پر بھی ہوتا ہے۔ اُن کے دیے ہوئے مندرجہ بالا شجرے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم حجاج کے چچا کا بیٹا نہیں، بلکہ حجاج کے چچا محمد کا پوتا تھا۔ وہ اس روایت کو بھی غلط ٹھہراتے ہیں کہ محمد بن قاسم حجاج کا داماد تھا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ابن حزم نے جو انساب عرب کا ماہر مانا جاتا ہے، اپنی کتاب (جمہرۃ الانساب کے صفحہ ۲۵۵) پر حجاج کی اولاد میں صرف چار لڑکے بتائے ہیں۔ محمد، عبدالملک، آبان اور سلیمان۔ جب حجاج کے لڑکی ہی نہیں تھی تو داماد کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ وہ آگے چل کر کتاب الاغانی صفحہ ۲۷ جلد ۴ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ البتہ یہ حقیقت ہے کہ حجاج نے اپنی بہن زینب کو اختیار دیا تھا کہ خواہ وہ محمد بن قاسم سے شادی کرے یا حکم بن ایوب بن حکم بن ابی عقیل سے شادی کرلے۔ محمد بن قاسم کی عمر اس وقت سترہ سال کی تھی۔ زینب نے اپنی عمر کے لحاظ سے حکم کو پسند کیا۔ حجاج نے اس کی شادی حکم سے کردی۔ (کتاب الاغانی جلد ۴ ص ۲۷)۔

لیکن ہمارا ماخذ چونکہ چچ نامہ اور بلاذری ہے۔ بلاذری سے محمد بن قاسم کا نسب نامہ اس طرح لکھا ہے، محمد بن قاسم بن محمد بن حکم بن ابی عقیل۔ اس لیے ہم نے محمد بن قاسم کا چچازاد بھائی ہونے کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کی تحقیق اہل علم کے لیے اپنی جگہ قابل غور ضرور ہے۔

سال ہی کی عمر سے اُن کی ذہانت وجودت کے جوہر محسوس کیے جانے لگے۔ ان کا خاندان غربت کی وجہ سے انھیں اعلیٰ تعلیم نہ دلا سکا اس لیے بڑے ہونے کے بعد دمشق میں فوج میں بھرتی ہوگئے، اور قابل و تجربہ کار فوجی عہدے داروں کے تحت فوجی تربیت حاصل کی۔ چودہ سال کی عمر میں محمد بن قاسم نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے فوج میں اعلیٰ عہدہ حاصل کیا۔ 90ھ میں حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو کردوں کے معاملے میں جنھوں نے، ایران میں بغاوت برپا کی تھی سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ اُس وقت محمد بن قاسم کی عمر پندرہ سال کی تھی، انھوں نے ایران پہنچ کر کردوں کو شکست دی، پھر اصطخر کو فتح کیا، اور دوسرے علاقوں کو فتح کرتے ہوئے جرجان کی طرف پیش قدمی کی اور ایک خاص نقشے کے مطابق شہر شیراز کی بنیاد ڈالی ورنہ اس سے پہلے شیراز ایک معمولی چھاونی تھا۔[1]

مؤلف جنتہ السندھ کا بیان ہے کہ محمد بن قاسم سترہ سال کی عمر میں فارس کے دارالسلطنت شیراز کے گورنر مقرر کیے گئے، انھوں نے نہایت ہی عمدگی اور عدل و انصاف سے حکومت کی، تنخواہ سے جو کچھ بچا پاتے اُسے تبلیغ اسلام میں صرف کرتے تھے، اپنی فرصت کے اوقات میں لوگوں کے سامنے تقریر کرتے جنھیں عوام بڑے ذوق و شوق سے سنتے، ان کے خلوص، ایمانی قوت کی اس دور کے جلیل القدر اکابر، علماء اور مجتہد تعریف کرتے تھے۔

صاحب جنتہ السندھ نے اُن کا حلیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم ایک خوبصورت نوجوان تھے، آنکھیں بڑی بڑی، پیشانی کشادہ، بازو گول، چوڑی کلائیاں، بھرا ہوا بدن، گلابی رنگ اور ہیبتناک آواز تھی، قدرت نے انھیں فولاد کا دل و جگر عطا کیا تھا، قدرت کی طرف سے اُن کو بلند خیالی، مستحکم ارادے اور بہادری کے جوہر عطا کیے گئے تھے۔ وہ نہایت ہی خلیق، حلیم الطبع، شیریں زبان اور ہنس مکھ چہرہ رکھتے تھے، ہر چھوٹے اور بڑے سے نہایت شیریں اور محبت سے بات کرتے تھے، فوج میں اُن سے بڑی عمر کے لوگ جو اُن کے ماتحت تھے اُن سے بے حد عزت و احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔[2]

رے کی مہم:

اُس زمانے میں جب کہ حجاج بن یوسف سندھ پر حملہ کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا محمد بن قاسم فارس میں تھے اور حجاج اُن کو رے پر لشکر کشی کا حکم دے چکا تھا۔ وہ رے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ اچانک حجاج کا حکم اُن کے نام پہنچا کہ تم رے کے عوض سندھ جاؤ اور اُس فوج کا انتظار کرو جو میں تمہارے لیے خشکی کی راہ سے بھیج رہا ہوں۔[1]

اس حکم کے ملتے ہی محمد بن قاسم نے اپنا ارادہ بدل دیا اور وہ شیراز میں ٹھہر کر اس فوج کا انتظار کرنے لگے۔

حجاج نے سندھ کی لڑائی کے لیے پوری پوری تیاری کی، اس زمانے میں جب کہ وہ سندھ کے لیے فوجی تیاریاں کر رہا تھا، اس نے ایک جمعہ کو عوام کے سامنے ایک خطبہ دیا۔ ہم اُس کے خطبے کو یہاں نقل کرتے ہیں، تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اس جنگ کے متعلق اس کے جذبات و احساسات کیا تھے، اس نے عوام کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے کہا:

"میں تم لوگوں کو واقف کرا دینا چاہتا ہوں کہ وقت بدلنے والا ہے اور وہ دو دھاری تلوار کی طرح ہے کہ کبھی ہمارے موافق ہے اور کبھی

---

[1] محمد بن قاسم کے متعلق متذکرہ معلومات کے لیے میں جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ پروفیسر سندھ یونیورسٹی کا ممنون ہوں، انھوں نے محمد بن قاسم کے متعلق متذکرہ بالا تفصیل مجھے ایک خط میں لکھ کر بھیجی تھی۔

[2] جنت السندھ (سندھی) تالیف مولانا شیدائی شائع کردہ سندھی ادبی بورڈ ص 96 تا 97۔

[1] تاریخ سندھ - تالیف مولانا ابو ظفر ندوی ص 44۔

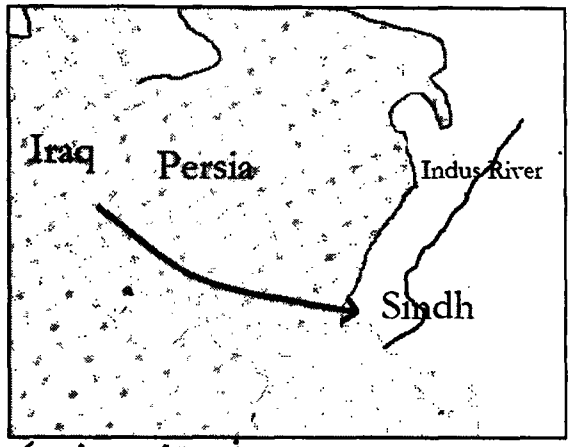

ہمارے خلاف ہے، جب وہ ہمارے موافق ہو تو ہمیں اپنی فوجوں کو تربیت دینی چاہیے اور جب وہ ہمارے خلاف ہو تو ہمیں مصائب کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے اور ان مصائب کو مٹانا چاہیے۔ ہمیں خدائے تعالیٰ کا ہر حال میں شکر ادا کرنا چاہیے اور اس کی فیاضانہ عنایتوں پر بھروسہ کرنا چاہیے تاکہ وہ ہم پر مزید نوازشات فرمائے اور ہم پر اپنی نعمتوں کا دروازہ بند نہ کرے، اور ہم پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔

بدیل بن طہفہ بجلی سپہ سالار کی شہادت کا مجھے بیحد غم ہے، ہر لمحہ اس کے انتقام کی آوازیں میرے دل کے کانوں میں آتی رہتی ہیں اور میں اس کو فوراً جواب دیتا رہتا ہوں کہ خدا کی قسم عراق کی جو دولت میرے قبضے میں ہے میں اس مہم پر خرچ کرنے کے لیے پورے طور پر تیار ہوں اور میرے غضب کی آگ کا شعلہ کبھی نہیں بجھے گا تاوقتیکہ میں اس کا بدلہ نہ لے لوں، اور یہ دھبہ اپنے نام سے نہ دھوؤں۔"[1]

سندھ کے محاذ کے لیے فوج اور اس کا اہتمام:

حجاج نے چھ ہزار بہادر شامی لشکر سے اور بکثرت جواں مرد دوسرے لشکروں سے انتخاب کیے، چھ ہزار تیز رفتار سانڈیاں ان بہادروں کی سواری کے لیے دیں، اس کے علاوہ بوجھ لادنے والے کئی ہزار اونٹ ساتھ کیے، اس اہتمام سے اس لشکر کا سر و سامان کیا کہ اہل لشکر کو جن جن چیزوں کی ضرورت ہو سکتی تھی مہیا کر دیں، یہاں تک کہ سوئی دھاگہ تک بھی ان کے ساتھ روانہ کیا، فوج کے آرام اور اس کی خوراک کا اس حد تک انتظام کیا کہ عرب سرکے کو بہت شوق سے کھاتے تھے، اس نے روئی سرکے میں بھگو کر سائے میں خشک کی، پھر اس روئی کے گٹھے بندھوا کر جہازوں میں روانہ کیے تاکہ جب لشکر کو سرکے کی ضرورت ہو روئی تر کر کے اس کو چھان لیا جائے اور لشکریوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ عام سامان رسد کے ساتھ تیس ہزار دینار بھی ساتھ کیے تاکہ فوج کو اخراجات کی تکلیف نہ ہو۔

اس کے علاوہ فوجی ضرورتوں کا تمام سامان جہازوں پر لاد کر سمندری راستے سے دیبل بھیجا، جس میں کئی منجنقیں تھیں، جن سے دشمنوں کے قلعے پر پتھر پھینکے جاتے تھے، ان میں سے ایک کا نام عروس تھا، جسے پانسو آدمی حرکت میں لاتے تھے۔[2]

محمد بن قاسم کی مکران میں آمد:

جہم بن زحر کے ساتھ یہ لشکر شیراز پہنچا، پھر محمد بن قاسم کی سرکردگی میں یہ لشکر شیراز سے روانہ ہو کر خشکی کے راستے سے مکران پہنچا، جہم بن زحر جعفی بھی ساتھ تھے، مکران میں محمد بن ہارون گورنر مکران نے ان کا استقبال کیا، مکران میں محمد بن قاسم نے ایک مہینے تک قیام کیا۔[3]

قنزپور پر حملہ:

وہاں سے محمد بن قاسم ارمن بیلے کی طرف روانہ ہوئے، محمد بن ہارون اُس وقت بیمار تھا۔ باوجود بیماری کے اس نے اس مہم میں شرکت پر اصرار کیا، محمد بن قاسم نے اس کو ساتھ لے لیا، مکران کی سرحد سے نکل کر سب سے پہلے محمد بن قاسم نے قنزپور (پنج گور) پر حملہ کیا، اور کئی ماہ کے بعد اس شہر کو فتح کر لیا یہ پہلا مقام ہے جس کو محمد بن قاسم نے اس علاقے میں فتح کیا۔[4]

ارمن بیلہ کا محاصرہ:

قنزپور کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے ارمن بیلہ کا محاصرہ کیا، اور

---

(1) چچ نامہ فارسی، ص ۹۶ تا ۹۷۔

(2) چچ نامہ فارسی، ص ۹۶ و بلاذری ص ۴۳۶۔

(3) چچ نامہ فارسی ص ۹۹ تا ۱۰۰ و فتوح البلدان - بلاذری - ص ۴۳۵۔

(4) بلاذری کا تحریر کردہ قنبل وہی شہر ہے، جسے عرب جغرافیہ نویسوں نے اکثر قنبلی لکھا ہے، قنبل یا قنبلی دراصل قنبیلہ یعنی بن بیلہ ہے، جو غالباً ریاست لس بیلہ کی راجدھانی بیلہ (جو غالباً عربوں کا ارمائیل یعنی ارمن بیلہ ہے) کے متصل واقع تھا۔ اس وقت شہر بیلہ کے ایک جانب پیر آری کا مقبرہ ہے اور مقامی راویتوں کے مطابق یہ کسی صحابی کی قبر ہے، ممکن ہے کہ محمد بن ہارون کا نام ابن ہارون سے ہارون اور مرور زمانہ سے یہ نام بعد میں مقامی تلفظ یا غلطی کی وجہ سے آری ہو گیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب (تعلیقات چچ نامہ سندھی - ص ۴۴۷ تا ۴۴۸)۔

اس کو فتح کر کے وہ یہاں کئی ماہ تک مقیم رہے، تاکہ فوجیں کچھ دن آرام لے لیں، بلاذری میں ہے کہ محمد بن ہارون نے ارمائیل (ارمن بیلہ) کے قریب وفات پائی اور وہ قنبل میں مدفون ہوئے۔

حجاج بن یوسف کا ایک خط:

اسی زمانے میں جب کہ محمد بن قاسم ارمن بیلے میں مقیم تھے انھیں حجاج بن یوسف کا ایک خط ملا، جس میں اُس نے انھیں جنگ کے متعلق ضروری ہدایتیں دیتے ہوئے لکھا تھا:

جب تم ان منزلوں پر پہنچو جو کہ سندھ کے حدود کے اندر ہیں اور تمھیں دیبل نظر آنے لگے تو تم اپنی قیام گاہوں کے متعلق بہت احتیاط برتو، پھر جہاں کہیں اترو اپنی قیام گاہ کے گرد خندق کھودو تاکہ وہ خندق تمہاری حفاظت اور سلامتی کا کام دے، رات کا زیادہ حصہ جاگتے رہو، جو لوگ قرآن پڑھ سکتے ہیں وہ قرآن کی تلاوت میں مصروف رہیں، اور باقی لوگ اپنا وقت دعا میں اور لشکر کی حفاظت میں چوکنے ہو کر گزاریں، خدا کا ذکر ہر وقت زبان پر جاری رکھو، خدا کی نصرت اور مدد ہر وقت طلب کرتے رہو، تاکہ خدائے تعالیٰ تمہیں فتح عطا فرمائے اور زیادہ تر لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھ کر خدا سے مدد چاہو۔

جب تم دیبل کے گرد و نواح میں پہنچو تو ایک خندق بارہ گز اور چھ گز گہری کھودو، جب تم دشمن سے مقابل ہو تو خاموش رہو خواہ تم کو دشمن گالیاں دے اور غوغا کرے اور اس وقت تک مستقل جنگ نہ شروع کرو جب تک کہ میں تمہیں نہ لکھوں اور وہ ہدایات جو میں تمہیں دوں ان پر حرف بہ حرف عمل کرو۔ اگر تم نے ان پر عمل کیا تو انشاء اللہ تمہاری کامیابی یقینی ہے۔

دیبل کو روانگی:

ارمن بیلے سے محمد بن قاسم دیبل کی طرف روانہ ہوئے۔

متواتر کوچ کرتے ہوئے جمعہ کے دن ۹۲ھ کو محمد بن قاسم دیبل [2] پہنچے۔ سرزمین سندھ پر سب سے پہلے یہیں نماز جمعہ ادا کی گئی۔ جمعہ کا خطبہ محمد بن قاسم نے دیا۔ اتفاق سے اُسی دن وہ جہاز بھی ساز و سامان لے کر پہنچے جو حجاج نے فوجوں کے لیے روانہ کئے تھے، ان جہازوں میں

---

[2] دیبل مغربی سندھ کا مشہور شہر تھا، اور قدیم بندرگاہ تھی، ایران، عراق، افریقہ کے جہاز یہاں آکر ٹھہرتے تھے، اب اس شہر کا کہیں نام و نشان اور نہ اس کا محل وقوع ابھی تک صحیح طور پر متعین ہو سکا۔ اس شہر کی قدامت کے متعلق چچ نامہ سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ دیبل چھٹی صدی عیسوی رائے گھرانے کے عہد حکومت میں موجود تھا۔ دیبل کے متعلق پہلا تاریخی حوالہ ہمیں بلاذری کی فتوح البلدان میں ملتا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضہ نے 15ھ میں عثمان بن ابی العاص ثقفی کو بحرین و عمان کا گورنر مقرر کیا تو انھوں نے اپنے بھائی مغیرہ کو خلیج دیبل کی طرف روانہ کیا، جنھوں نے ہندوستان کی تین بندرگاہوں دیبل، بروچ اور تھانے پر حملہ کیا۔ پھر ہمیں دیبل کا تذکرہ محمد بن قاسم کی ۷۱۲ء میں دیبل کی فتح اور اس کے بعد سندھ میں عربوں کے دور حکومت میں دیبل کے متعلق مسلسل حوالے ملتے ہیں۔ عرب کے سیاح اور جغرافیہ دان مسعودی (۴۲ تا ۹۴۳ء) اصطخری (۵۱-۹۵۰ء) ابن حوقل (۶۸-۹۴۳ء) اور آخر میں مقدسی (۹۸۵-۸۶ء) خود دیبل آئے تھے، جنھوں نے اس شہر کا تذکرہ اپنی اپنی کتابوں میں کیا ہے، ان کے بعد ہمیں مسعر بن مہلل کے سفرنامے (۴۳-۹۰۲ء) حدود العالم (تصنیف ۹۸۲ء) بیرونی کی کتاب الہند اور دوسرے اس عہد کے سفرناموں میں دیبل کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان تمام شواہد سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تیرہویں صدی کے نصف تک دیبل اچھی یا خراب حالت میں موجود تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ دسویں صدی عیسوی جب عرب حکومت کمزور پڑی تو اس وقت سے دیبل کی اہمیت کم ہونے لگی، دوسری طرف مقامی حالت کی تبدیلی کی وجہ سے دریائے سندھ کی ختم ہونے والی شاخ میں رد و بدل کے سبب، خود دریائے سندھ کی ایک شاخ پر ایک نئی بندرگاہ کی سہولت پیدا ہوئی جسے "لوہارانی" بندر کہا جاتا تھا۔ گیارھویں صدی عیسوی کے شروع دور کا محقق بیرونی دیبل کے ساتھ ساتھ ایک دوسری بندرگاہ لوہارانی کا بھی تذکرہ کرتا ہے، غالباً اسی بندرگاہ کی سہولت نے دیبل کی اہمیت کو آہستہ آہستہ ختم کر دیا۔ اس کے بعد دو سو سال کے اندر دیبل بالکل ختم ہو گیا، چنانچہ ۱۳۳۳ء میں ابن بطوطہ لاہری بندر کے قریب چھ سات میل پر ایک شہر کے خرابے کا تذکرہ کرتا ہے، شاید جس شہر کا اس نے تذکرہ کیا ہے وہ پرانا دیبل ہی ہو گا۔

بہرحال بندرگاہ دیبل تقریباً چھ سو برس تک سندھ کی ایک اہم بندرگاہ رہی، اور اس عرصے میں سندھ کی سیاسی اور اقتصادی تاریخ اسی دیبل سے وابستہ تھی۔ اسی وجہ سے دیبل کی تباہی کے بعد سندھ کے لوگ نئی بندرگاہ کو بھی دیبل کا ہی نام دیتے تھے۔ گویا بندرگاہ کے ساتھ دیبل کا نام لازم و ملزوم تھا۔ آخری دور کی تاریخوں سے بھی اس عام رواج کی تصدیق ہوتی ہے۔ سولھویں صدی کے ہر تکیزی مصنفین نے لاہری بندر کو لاہوری بندر، دیوئل اور دیوئل سندھ لکھا ہے، اس کے بعد کے انگریزی مورخین بھی اس کو سٹی دیول اور لاہری بندر لکھتے ہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ دیول بندر اور لاہری بندر دونوں علیحدہ علیحدہ تھے، لیکن اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ دیبل کہاں تھا۔

قیاس اور قرائن کی بنا پر واگھودر، بھنبھور، ماڑی موروڑ اور تھنب والی مسجد ان مقامات میں سے کسی ایک مقام کو دیبل قرار دیا جا سکتا ہے، مگر تاریخی روشنی اور محکمہ آثار قدیمہ کی اس تحقیق کی بنا پر جو اس نے اب تک کی ہے یہ کہہ سکتے ہیں کہ بھنبھور کے کھنڈرات کا دیبل ہونا زیادہ قرین قیاس ہے (ماخوذ از توضیحات چچ نامہ سندھی، ص ۳۸۷ تا ۳۹۰)

سامان رسد کے علاوہ قلعہ کشائی کے آلات اور منجنیقیں بھی تھیں۔ ان میں ایک منجنیق جس کا نام عرسک تھا سب سے بڑی تھی، جس کو پانچسو آدمی کھینچتے تھے، اس کو چلانے والا استاد جعونہ نامی ایک شامی تھا جو بڑا نشانے باز تھا۔

دیبل شہر کی آبادی بہت بڑی تھی، اس شہر میں ایک عالیشان دیول (مندر) تھا، جس کی وجہ سے اس کا نام دیبل پڑا، مندر کا گنبد بہت بڑا اور بلند تھا، جو بہت دور سے نظر آتا تھا، اس گنبد کی چوٹی پر ایک بہت لمبے بانس میں ایک ریشم کا سبز پرچم آویزاں تھا، اور اس کا گنبد بھی چالیس گز اونچا تھا، اس پرچم میں چار بیر قیں تھیں۔

اس جھنڈے کے متعلق شہر والوں کا یہ اعتقاد تھا کہ جب تک یہ ہوا میں لہرا رہا ہے، شہر کو کوئی فوج فتح نہیں کر سکتی، مندر میں سات سو پجاری تھے، اور شہر کے گرد فصیل بنی ہوئی تھی۔

محمد بن قاسم جیسے ہی دیبل پہنچے، سندھی فوجیں اُن کی آمد کی خبر سن کر شہر کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئیں۔ محمد بن قاسم نے یہ دیکھ کر کہ سندھی فوجیں شہر پناہ کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئی ہیں اپنی فوج کو حکم دیا کہ جابجا مورچے قائم کیے جائیں، موقع بموقع منجنیقیں نصب کی جائیں، اور لشکر کے سامنے خندقیں کھودی جائیں، تاکہ اچانک دشمن حملہ نہ کر سکے، چنانچہ شہر کے چاروں طرف خندقیں کھود کر اور مورچے قائم کر کے اسلامی فوج نے شہر کو محاصرے میں لے لیا، سندھی فوجیں کبھی کبھی شہر پناہ سے نکل کر حملہ کرتیں، اور پھر شہر پناہ کے دروازے بند کر لیتیں، لیکن چونکہ ابھی تک حجاج کی طرف سے جنگ کی اجازت نہیں ملی تھی، اس لیے اسلامی فوج ان حملوں کو جھیل رہی تھی۔ اس طرح ایک ہفتہ گذر گیا، یہاں تک کہ آٹھویں روز حجاج کا حکم پہنچا کہ جنگ شروع کر دی جائے۔ اس کے بعد جنگ شروع ہوگئی، دونوں جانب کے لوگ بہادری سے لڑتے تھے، شہر پناہ کی دیواریں جابجا سے ٹوٹ رہی تھیں مگر شہر پھر بھی فتح نہیں ہوتا تھا۔

ایک برہمن کا مشورہ:

مسلمان اسی شش و پنج میں تھے کہ اس شہر کو کس طرح فتح کیا جائے کہ اچانک ایک دن ایک برہمن شہر پناہ سے نکل کر اسلامی لشکر میں آیا، اور اُس نے محمد بن قاسم سے جان کی امان طلب کرتے ہوئے کہا "خدا امیر کی عمر دراز کرے ہمیں نجوم کی کتابوں سے معلوم ہوا ہے کہ سندھ کا ملک مسلمان فتح کر لیں گے، لیکن جب تک کہ یہ بت خانہ برقرار ہے، اس شہر کو فتح کرنا ممکن نہیں۔ آپ کو اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہ بت خانہ مسمار ہو اور اس پر جو جھنڈا لہرا رہا ہے وہ کسی طرح پارہ پارہ ہو، اسی میں اس شہر کی فتح کا راز ہے[1]۔"

محمد بن قاسم کا حکم:

برہمن یہ کہہ کر چلا گیا۔ محمد بن قاسم کو شہر والوں کے اس عقیدے کا حال معلوم ہوا تو اس نے جعونہ سلمی[2] کو جو بہت بڑا نشانے باز تھا بلا کر کہا، اگر تم اس جھنڈے اور مندر کے گنبد کو منجنیق کے ذریعہ پتھروں سے گرا دو تو میں تمہیں دس ہزار درہم انعام دوں گا۔ جعونہ نے کہا عروسک نامی منجنیق لائی جائے، میں تین پتھروں سے جھنڈے اور گنبد کو گرا دوں گا۔ محمد بن قاسم نے کہا لیکن اگر تم نہ گرا سکے اور منجنیق کو کوئی نقصان پہنچا تو تمہاری کیا سزا ہونی چاہیے۔ جعونہ نے جواب دیا اگر میرا نشانہ خطا ہو جائے تو میرے ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔ محمد بن قاسم نے اس گفتگو کے بعد حجاج بن یوسف کو ایک خط لکھا، جس میں اُسے ساری صورت حال سے مطلع کیا۔ حجاج کو اس جنگ سے اس قدر دلچسپی تھی کہ اُس نے محمد بن قاسم سے سندھ کی لڑائی کے حالات جاننے کے لیے خط و کتابت کا اس قدر عمدہ انتظام کیا تھا کہ سندھ کا ہر خط ساتویں دن بصرے میں اس کو مل جاتا تھا۔ اور ایک ہی ہفتے میں اس کا جواب سندھ پہنچ جاتا تھا۔

حجاج کو جب یہ خط ملا تو اُس نے جواب میں لکھا کہ ہمیں وہ شرائط منظور ہیں جو جعونہ سے کی گئی ہیں، اُس نے مزید جنگ کے متعلق ہدایات دیتے ہوئے لکھا کہ جب تم جنگ شروع کرو تو فوج کو اس طرح ترتیب دو کہ سورج تمہاری پشت پر رہے، تاکہ تم دشمنوں کی نقل و حرکت کو اچھی طرح دیکھ سکو، دن کے ابتدائی حصے ہی میں جنگ شروع کر دو، جنگ شروع کرنے سے پہلے خدائے تعالیٰ سے نصرت اور مدد طلب کرو، اگر سندھ کا کوئی شخص رحم اور پناہ کے لیے درخواست کرے تو اُسے امن دو، لیکن دیبل والوں کو بالکل پناہ نہ دو۔ حجاج نے یہ بھی لکھا تھا کہ عروسک نامی منجنیق کو مشرق کی سمت گاڑ کر اور ایک پایہ کم کر کے مندر کے گنبد کو نشانے پر لے کر سنگ باری کرے، پھر یقیناً فتح تمہاری ہے۔

پس محمد بن قاسم نے حجاج کی ہدایت کے مطابق دیبل پہنچنے کے

---

(1) ماخوذ از چچ نامہ فارسی ص ۱۰۴۔

(2) چچ نامے میں یہ نام جعوبہ ہے، مگر یہ نام عربوں میں غیر معروف ہے۔ علامہ عبدالعزیز میمنی نے اس نام کی تصحیح کرتے ہوئے اسے جعونہ بتایا ہے، اس لیے ہر جگہ جعونہ لکھا گیا ہے (حاشیہ چچ نامہ سندھی نمبر ا ص ۱۴۷)۔

نویں روز جب آفتاب طلوع ہو رہا تھا منجنیق کو نصب کر کے حکم دیا کہ مندر پر سنگ باری شروع کی جائے، سب سے پہلا پتھر جعونہ نے پھینکا، اور پتھروں کی بارش شروع کر دی، آخر گنبد ٹوٹ گیا، جھنڈا گر پڑا۔ گنبد کے ٹوٹتے ہی شہر میں ہلچل مچ گئی اور سندھی فوجیں شہر سے نکل کر رودر رو مقابلہ کرنے لگیں۔ مسلمان یہی چاہتے تھے کہ رودر رو مقابلہ ہو، جیسے ہی سندھی فوجیں شہر سے نکل کر مقابل ہوئیں، مسلمانوں نے ہر طرف سے شدید حملہ شروع کر دیا۔ سندھی فوجیں ان حملوں کی تاب نہ لا کر پھر شہر میں گھسنے لگیں، مسلمانوں نے شہر پناہ کی فصیل پر چڑھنا شروع کر دیا، پہلا شخص جو شہر پناہ کی فصیل پر چڑھا وہ کوفے کا ایک بہادر صعدی بن خزیمہ تھا[1]، اس کے بعد عجل بن عبدالملک بن قیس دیبی[2] تھا جو بصرے کا رہنے والا تھا۔ دیبل والوں نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان شہر پناہ کی فصیل پر چڑھ گئے ہیں، انھوں نے فوراً شہر پناہ کے دروازے کھول دیے اور امن کے خواہاں ہوئے، لیکن محمد بن قاسم نے کہا کہ مجھے امن دینے کی اجازت نہیں۔ تین روز تک فتنہ پرداز اور ہتھیار بند لوگ قتل کیے گئے، شہر کے فتح ہوتے ہی دیبل کا گورنر بھاگ نکلا۔ شہر میں امن قائم ہونے کے بعد محمد بن قاسم نے پیمائش کر کے زمین کے قطعات مسلمانوں میں تقسیم کیے۔

دیبل کے جیل خانے سے مسلمان قیدیوں کی برآمدگی:

دیبل کے جیل خانے میں سراندیپ کے وہ مسلمان قید تھے جن کی آزادی کے متعلق حجاج بن یوسف نے راجا داہر کو لکھا تھا اور راجا داہر نے فریب سے جواب دیا تھا کہ یہ کام بحری قزاقوں کا ہے جن پر ہمارا بس نہیں چلتا۔ دیبل کے فتح ہوتے ہی راجا داہر کے اس فریب کا پردہ اس طرح چاک ہوا کہ محمد بن قاسم نے جیل کے داروغہ کو جس کا نام قبلہ تھا بلوا کر حکم دیا کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ قبلہ نہایت عقلمند، ہوشیار، ہندوستان کا مشہور ادیب، ماہر انشا پرداز اور صاحب علم انسان تھا۔ اس نے محمد بن قاسم سے کہا کہ قبل اس کے کہ آپ مجھے سزا دیں آپ مسلمان قیدیوں کو بلا کر پوچھیے کہ میرا سلوک ان کے ساتھ کیسا رہا ہے، اور میں نے ان کے آرام اور سزا کو ہلکا کرنے میں کس قدر سعی کی ہے، جب تک کہ آپ یہ معلوم نہ کر لیں اس وقت تک مجھے قتل کرنا مناسب نہیں۔[3]

محمد بن قاسم نے داروغہ جیل کی یہ بات سن کر حکم دیا کہ جیل خانے سے مسلمان قیدیوں کو لایا جائے۔ مسلمان قیدی لائے گئے، محمد بن قاسم نے ان سے پوچھا کہ داروغہ جیل کا تمہارے ساتھ کیا سلوک رہا ہے؟ اُن سب نے یک زبان ہو کر کہا ہم داروغہ جیل کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہماری تسلی و تشفی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اس کا برتاؤ ہمارے ساتھ نہایت شریفانہ تھا، یہ ہمیں ہمیشہ یقین دلاتا تھا کہ گھبراؤ نہیں، وہ وقت قریب ہے جب اسلامی لشکر یہاں آئے گا، اور تم اس مصیبت سے نجات حاصل کرو گے۔ محمد بن قاسم کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو وہ داروغہ جیل کے ساتھ نہایت اچھی طرح پیش آیا، پھر انھوں نے اس کو اسلام کی دعوت دی۔ داروغہ جیل نے بخوشی اسلام قبول کر لیا۔ محمد بن قاسم نے اس حاکم کو جسے انہوں نے دیبل کی حکومت پر مقرر کیا تھا، داروغہ جیل کو اس کے سپرد کرتے ہوئے کہا کہ تمام معاملات میں داروغہ جیل سے مشورہ لے اور آمد و خرچ کے حسابات کی توثیق اس سے کرائے، پھر انہوں نے تمام مسلمان قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ دیبل کا سب سے بڑا افسر حمید بن وداع مجدی[4] کو مقرر کیا، شہر میں ایک خوبصورت مسجد تعمیر کروائی، یہ سندھ میں پہلی مسجد تھی جو تعمیر ہوئی۔[5]

مال غنیمت کی تقسیم:

ان امور سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم نے ان جنگوں میں جو مال غنیمت حاصل ہوا تھا، اس کا پانچواں حصہ خزانے میں داخل کیا، اور دیبل کے مال غنیمت کا پانچواں حصہ پورا کا پورا حجاج کے پاس روانہ کر دیا۔ ارمن بیلہ کی فتح میں جو مال غنیمت ملا تھا وہ فوجیوں کے درمیان ان کی قابلیت اور عہدے کے مطابق تقسیم کیا، گھوڑے سوار کو شتر سوار اور پیادوں سے دوگنا حصہ ملا۔[6]

---

(1) چچ نامہ ص ۱۰۷ پر اس شخص کا نام صعدی بن خزیمہ مذکور ہے، لیکن فتوح البلدان بلاذری میں صرف اتنا ہے کہ پہلا شخص جو شہر پناہ کی فصیل پر چڑھا وہ کوفے کا رہنے والا قبیلہ مراد سے تھا (تعلیقات چچ نامہ سندھی ص ۴۵۶)۔

(2) عجل بن عبدالملک بن قیس الدیبی: اس نام کی آخری نسبت چچ نامے میں واضح طور پر نہیں دی گئی، جس کی وجہ سے یہ مبہم ہے، البتہ چچ نامے کے ص ۱۶۹ پر غالباً اس شخص کے باپ عبدالملک بن قیس کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ آل جارود میں سے تھا، اسی وجہ سے اس کی نسبت العبدی تھی، اسی لحاظ سے اس نام کی مبہم نسبت الدیبستی ہے جو شاید العبدی کی بگڑی ہوئی صورت خطی ہے (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۰۷)۔

(3) یہ تمام تفصیل چچ نامہ ص ۱۰۱ تا ۱۰۵ سے ماخوذ ہے۔

(4) صحیح نام حمید بن وداع بحری ہے (توضیحات چچ نامہ سندھی، ص ۴۵۹)۔

(5) چچ نامہ فارسی، ص ۱۰۹۔

(6) چچ نامہ فارسی، ص ۱۔

داہر کا خط:

دیبل کے فتح ہونے کی خبر داہر کو پہنچ چکی تھی، اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ دیبل کا حاکم فرار ہو کر نیرون (موجودہ حیدرآباد) پہنچ چکا ہے، اسے اسلامی فوجوں کی بہادری کی بھی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے جیسینہ کو ایک خط لکھا جو کہ نیرون کا حاکم تھا، اس خط میں اُسے حکم دیا کہ اس خط کے ملتے ہی وہ دریائے سندھ عبور کر کے برہمن آباد چلا جائے اور نیرون کی حکومت دشمنی کے سپرد کر دے۔ اُسے ہدایت دے کہ وہ قلعے کی حفاظت کرے اور اُسے دشمن کے حملے سے بچائے۔[1]

پھر اُس نے ایک خط محمد بن قاسم کے نام لکھا:

یہ خط داہر چچ کے بیٹے کی طرف سے جو سندھ کا بادشاہ اور ہندوستان کا راجا ہے، جس کا حکم دریا اور جنگل پر چلتا ہے محمد بن قاسم کے نام ہے، جو انسانوں کے قتل کرنے میں حریص اور بے رحم ہے، جس نے بے وقوفی سے اپنے لشکر کو تباہی اور ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔

"تم سے پہلے بھی کچھ لوگوں کے دماغ میں یہ خبط سمایا تھا کہ وہ سندھ اور ہند کو فتح کریں، لیکن اسی شہر دیبل میں ہم نے ان کو بری طرح شکست دی، اب یہ سودا تمہارے دماغ میں سمایا ہے، دیبل کی فتح پر آج تم پھولے نہیں سماتے، لیکن تمہیں دیبل کی فتح پر غرور نہ کرنا چاہیے کیونکہ دیبل ایک معمولی قصبہ ہے جہاں بیوپاری اور کاروباری لوگ آباد ہیں، جنھیں بیوپار اور کاروبار کے سوا جنگ سے کوئی واسطہ نہیں، نہ دیبل میں کوئی مضبوط قلعہ ہے، اور نہ وہ ہماری فوجوں کا مرکز ہے، ان حالات میں شکست دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر وہاں ہمارا ایک بھی بہادر سپہ سالار ہوتا تو تمہیں ناک کے چنے چبوا دیتا، اور تمہارے لشکر میں سے ایک بھی زندہ نہ بچتا، اب تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ ایک قدم آگے نہ بڑھو، ابھی تمہیں میرے لڑکے جے سینہ سے واسطہ ہی نہیں پڑا کہ جس کے قہر سے بڑے بڑے بادشاہ پناہ مانگتے ہیں، اور ہندوستان کے بڑے بڑے راجا اس کے سامنے پیشانی رگڑتے ہیں جو کہ سندھ، مکران اور توران کے تمام علاقوں پر حکومت کرتا ہے، جس کے پاس ایک سو مست ہاتھی ہیں، اور خود سفید ہاتھی پر سوار ہوتا ہے، جس کا مقابلہ نہ گھوڑے کر سکتے ہیں اور نہ کوئی بڑے سے بڑا بہادر۔ غرور میں مست ہو کر تمہارا بھی وہی انجام ہو گا، جو اس سے پہلے بدیل کا ہوا تھا۔"[2]

محمد بن قاسم کا جواب:

داہر کا یہ خط جب محمد بن قاسم کو ملا انھوں نے مترجم کو بلا کر کہا کہ وہ اس خط کا ترجمہ اُن کو سنائے، اُس کے مضمون کو سن کر محمد بن قاسم نے اس کا حسب ذیل جواب لکھوایا:

"یہ خط محمد بن قاسم ثقفی کی طرف سے کہ جو سرکشوں اور مغروروں سے مسلمانوں کا انتقام لینے والا ہے۔ کافر، جاہل، منکر اور ضدی داہر بن چچ برہمن غدار کے نام کہ جو بے وفا زمانے کے رد و بدل اور ظالم وقت کے گھمنڈ پر مغرور ہے۔

اس کے بعد اُسے معلوم ہو کہ تم نے اپنی جہالت اور بے وقوفی سے جو کچھ بھی لکھا ہے، اور تم اپنی رکیک رائے پر جس طرح مغرور ہو، وہ پہنچا، تم نے جو کچھ لکھا ہے اُس کے مضمون سے واقفیت حاصل ہوئی۔ طاقت، حشمت، ہتھیار، سامان، ہاتھیوں، سوار اور لشکر کے متعلق تم نے جو کچھ بھی لکھا ہے، مجھے وہ ہر ایک بات معلوم ہوئی اور میں نے اُسے سمجھا، ہماری ساری قوت اور مدد کا مدار خدائے تعالیٰ کے کرم اور فضل پر ہے، ولا حول ولا قوتہ الا باللہ العظیم، فیکیدوا[3] لک کیدا انتم لا ینظرون، انی توکلت علی اللہ ربی و ربکم و مکروا و مکر اللہ واللہ خیر الماکرین ولا یحیق المکر السیی الا باھلہ، کم من فیئتہ قلیلتہ غلبت فئہ کثیرۃ باذن اللہ واللہ مع الصابرین۔

اے عاجز! سوار، ہاتھیوں اور لشکر پر کیا ناز کرتا ہے؟ ہاتھی تو ایک ذلیل اور عاجز ترین چیز ہے، جو کہ مچھر جیسے ایک ضعیف جانور کو بھی اپنے جسم سے نہیں ہٹا سکتا، اور تم جن گھوڑوں اور سواروں کو دیکھ کر حیران ہو گئے ہو، وہ اللہ کے سپاہی ہیں (قولہ تعالیٰ) الا ان حزب اللہ ھم الغالبون و خیل اللہ و فرسانھا ھم المنصورون۔[4]

تمہاری بد اعمالیوں، بری عادتوں اور تکبر کی وجہ سے ہمیں تم پر لشکر کشی کا خیال پیدا ہوا، کیونکہ تم نے سراندیپ کی کشتیاں روک کر مسلمانوں کو قید کیا، حالانکہ دنیا کے تمام ممالک خلیفہ کی برتری اور حکومت تسلیم کرتے ہیں، جو نبوت کا نائب ہے۔ صرف تم ہی سرکشی اور عناد اختیار کیے ہوئے ہو اور بیت المال کے خزانے کا وہ مال (خراج) جو کہ تم سے پہلے کے بادشاہ اور حاکم خود پر لازم اور واجب سمجھ کر ادا کرتے

---

(1) چچ نامہ، ص ۱۱۱۔

(2) چچ نامہ فارسی، ص ۱۱۱۔

(3) چچ نامے کے مطبوعہ نسخے میں لکیدوا ہے، لیکن چچ نامے کے ایک قدیم نسخے میں فیکیدوا ہے، جو صحیح ہے۔

(4) اس عربی عبارت میں مختلف آیتیں ملا کر موزوں مضمون پیدا کیا گیا ہے۔

رہے ہیں، وہ بھی تم نے روک لیا ہے، اور جب تم نے اپنے آپ کو ان ناپسندیدہ حرکات سے ملوث کر کے خدمت سے انکار کیا، اور ان بری باتوں کو جائز سمجھا، اور ان قبیح باتوں کو جائز سمجھا، اس وقت دارالخلافہ سے فرمان جاری ہوا کہ میں تیری ان کرتوتوں کا بدلہ لینے کے لیے تجھ سے جنگ کرنے کے لیے رخ کروں، مجھے یقین ہے کہ میرا اور تمہارا مقابلہ جہاں کہیں ہوگا، میں خدائے تعالیٰ کی مدد سے جو ظالموں کو مغلوب کرنے والا ہے میں تمہیں مغلوب اور ذلیل کروں گا، اور تمہارا سر کاٹ کر عراق بھجواؤں گا یا اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کروں گا، یہ جہاد اللہ تعالیٰ کے حکم سے جاھدالکفار و المنافقین کے مطابق میں نے خود پر واجب سمجھ کر خدائے پاک کی رضامندی کے لیے قبول کیا ہے، اور اس کے احسان کا امیدوار ہوں کہ ہمیں فتح اور کامیابی عطا فرمائے ۹۳ھ۔" (1)

ٹھٹھہ اور دیبل کا تقابلی مطالعہ:

سندھ کے قدیم اور تاریخی شہروں میں جو اہمیت ٹھٹھہ اور دیبل کو حاصل ہے، وہ محتاج بیان نہیں، لیکن جتنی عہد حاضر کے مورخوں کو ان دونوں شہروں سے دلچسپی ہے اتنی ہی تاریخی نقطۂ نظر سے کئی باتیں ان دونوں شہروں کے متعلق ایسی ہیں کہ وہ ابھی تک ایک عقدۂ لاینحل بنی ہوئی ہیں۔ وہ مسائل جو ان دونوں شہروں کے متعلق ابھی تک حل طلب ہیں اور تاریخ کے عقدہ کشا ان دونوں شہروں کے متعلق جن گتھیوں کو ابھی تک نہیں سلجھا سکے ہیں، ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ دیبل کی آبادی کے متعلق ہم آج تک بھی کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکے کہ وہ کس جگہ آباد تھا، دوسری بات جو دیبل کے متعلق آج تک الجھی ہوئی گرہ بنی ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ شہر کب برباد ہوا۔

اسی کے ساتھ سندھ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے طالب علم کے ذہن میں ٹھٹھہ کے متعلق جو سوالات ابھرتے ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ ٹھٹہ کب آباد ہوا، اور اس شہر کا بانی کون تھا؟ کیا ٹھٹہ اس جگہ آباد ہوا، جہاں دیبل آباد تھا، یا کسی علیحدہ جگہ آباد ہوا، کیا ٹھٹہ اور دیبل دونوں ایک وقت میں آباد تھے، اور ٹھٹہ کو دیبل کی بربادی کے بعد شہرت حاصل ہوئی۔ تاریخوں میں ٹھٹہ دیول ایک جگہ مندرج ہے، جس سے ایک قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں نام ایک ہی شہر کے ہیں، اس التباس کی کیا توضیح ہو سکتی ہے؟

یہ ہیں وہ سوالات جو عہد حاضر میں بھی جب کہ تاریخ کو خوردبین سے دیکھا جا رہا ہے، اور آثار و تاریخ کے چھپے ہوئے گوشوں کو بے نقاب کیا جا رہا ہے، آج بھی سندھ کی تاریخ کے ان مسائل پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔

مجھے خیال آیا کہ دیبل اور ٹھٹہ کے متعلق ان الجھے ہوئے مسائل کو میرے محترم اور عزیز دوست اور سندھ کی تاریخ کے محقق سید حسام الدین راشدی نے جس تحقیق اور دلکش انداز میں "حواشی مکلی نامہ" میں سندھ کی قدیم تاریخوں سے سلجھایا ہے، اس کا ترجمہ بجنسہ یہاں پیش کر دیا جائے۔ "حواشی مکلی نامہ" سندھ کی تاریخ پر کام کرنے والوں کے لیے جہاں ایک معلومات کا خزانہ ہیں، وہیں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تاریخی واقعات سے صحیح طور پر استخراج نتائج کا بہترین شاہکار ہیں۔ یہ حواشی سندھی میں ہیں، کاش یہ حواشی اردو زبان میں بھی ہوتے تو اردو میں تاریخ پر کام کرنے والوں کو ان کے تاریخی اسلوب نگارش، طرز تحقیق، اور تاریخ کے مسائل پر فکر کے طریقوں اور اُس عظیم محنت کاوش کا اندازہ ہوتا جو ان حواشی کے لکھنے میں انھوں نے برداشت کی ہے۔

مکلی نامہ کے متعلق بھی اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ وہ سندھ کے مشہور مؤرخ میر علی شیر قانع ٹھٹوی کا ایک مختصر سا فارسی میں منظوم رسالہ ہے، جس کی ضخامت چالیس پچاس صفحات سے زیادہ نہیں۔ اس میں میر علی شیر قانع نے ٹھٹہ کے مشہور قبرستان مکلی میں مدفون بزرگوں اور مشاہیر کے حالات اور وہاں کے آثار اور عمارتوں کے حالات نظم کیے ہیں۔ اس رسالے کو عزیز دوست سید حسام الدین راشدی نے ایڈٹ کیا ہے، اور اس کے حواشی پانچ چھ سو صفحات پر سندھی میں لکھے ہیں۔ اگرچہ شملہ دستار سے بڑھا ہوا ہے، مگر یہ حواشی اپنی معنویت اور افادیت کے لحاظ سے اس قدر دلچسپ ہیں کہ انہیں ٹھٹہ کی تاریخ کے متعلق خصوصاً اور سندھ کی تاریخ کے متعلق عموماً ایک مختصر سی انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب سندھی ادبی بورڈ سے شائع ہو رہی ہے اور شاید دو تین ماہ میں منظر عام پر آ جائے۔ ہم آئندہ اوراق میں حواشی کے اس حصے کے ترجمے کو پیش کر رہے ہیں، جو ٹھٹہ اور دیبل کے تقابلی مطالعے سے متعلق ہے جس میں انہوں نے اس تقابل کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دیبل اور ٹھٹہ دو مختلف شہر تھے اور ٹھٹہ دیبل کی بربادی کے بعد آباد نہیں ہوا بلکہ اس سے کہیں پہلے آباد تھا، راشدی صاحب نے یہ حاشیہ لفظ ٹھٹہ کے تحت لکھا ہے۔ (جس کا ترجمہ پیش ہے۔ ص ۱۱-۴۰ پر ہے)

---

(1) چچ نامہ فارسی، ص ۱۱۲-۱۱۳۔

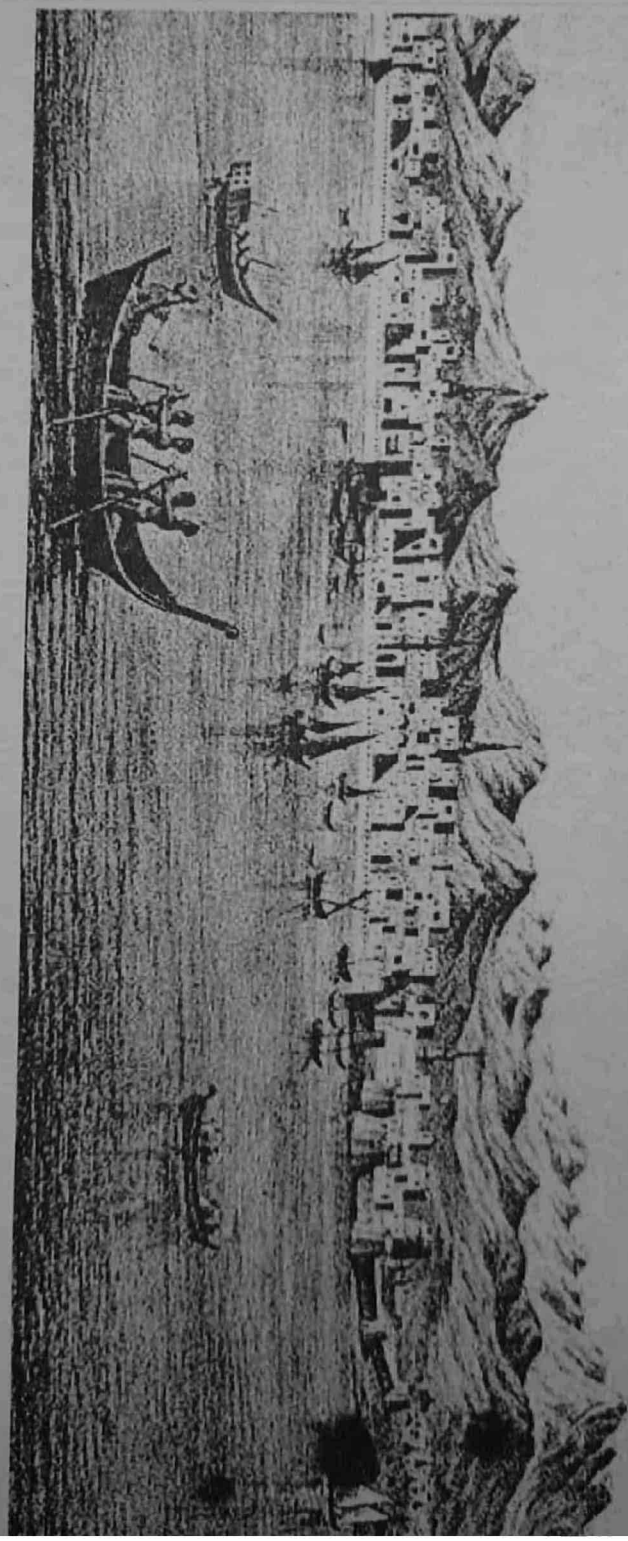

دیبل کی بندرگاہ

ٹھٹہ کی آبادی کے متعلق ایک غلط فہمی:

تاریخ طاہری کے مصنف نے لکھا ہے کہ: جام نظام الدین کی تخت نشینی (۲۵ ربیع الاول ۸۶۶ھ) کے بعد اس نے ٹھٹہ کے شہر کو آباد کیا۔

اُس کے دل میں آیا کہ کسی مبارک ساعت میں ایک نئے شہر کی بنیاد رکھے کہ جہاں خرمی و خوشدلی ہمیشہ اور ہر وقت رہے۔

برہمنوں، منجموں اور اختر شناسوں نے ساعت سعید دیکھ کر اور ساموئی کے ارد گرد چکر لگا کر اُس جگہ کو کہ جہاں شہر ٹھٹہ ہے، اُس زمین کو پسند کر کے جام سے عرض کیا، اور شہر ٹھٹہ کی بنیاد رکھی۔ الخ

لیکن یہ قول صحیح نہیں، جام نظام الدین کے زمانے سے کم و بیش دو سو برس پہلے سندھ کا دارالسلام شہر ٹھٹہ آباد ہو چکا تھا۔

اور سندھ میں جتنے بھی تاریخی شہر ہیں، اُن میں پہلے دیبل کو اور اس کے بعد ٹھٹہ کو خاص اہمیت و شہرت حاصل رہی ہے۔ ان دونوں شہروں کے سلسلے میں محققین کے درمیان کتنے ہی مسائل تصفیہ طلب ہیں، جن کے متعلق آج تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکا ہے۔ اس وقت کا بڑا کام یہ ہے کہ ان مسائل کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کیا جائے۔ یہ حل طلب مسائل حسب ذیل ہیں:

(الف) دیبل اُن متعدد جگہوں میں کس جگہ آباد تھا، جن جگہوں کے متعلق انگریز محققین نے اشارہ کیا ہے۔

(ب) دیبل کب برباد ہوا۔

(ج) ٹھٹہ کس زمانے میں آباد ہوا، اور اس کا کون بانی تھا۔

(د) ٹھٹہ کسی اور جگہ پر آباد ہوا، یا اُسی جگہ آباد ہوا، جہاں دیبل آباد تھا۔

(ھ) تاریخوں میں دیول ٹھٹہ ایک جگہ نظر آتا ہے، اُس کا کیا مطلب ہے۔

ان سوالوں کا حل کرنا ممکن ہے، بشرطیکہ تحقیقات کے تمام جدید ذرائع کو ان کے حل کرنے میں استعمال کیا جائے۔

اب ہم ذیل میں بترتیب سنین ان ماخذوں کو پیش کرتے ہیں، جن میں دیبل یا ٹھٹہ کا ذکر آیا ہے، تاکہ ایک قاری کو معلوم ہو سکے کہ مسلمانوں کی کتابوں میں دیبل کا ذکر کب سے شروع ہوتا ہے۔ اور کس زمانے میں اس کا نام تاریخ کے صفحات سے گم ہوا۔ اور ٹھٹہ کا نام سب سے پہلے کب تاریخ میں آیا، اور دیبل کے ختم ہونے کے بعد ٹھٹہ کے ظہور ہونے میں کتنے زمانے کا وقفہ تھا۔

دیبل:

۱۵۰ھ: طرائف الادبیہ: (مرتب: مولانا عبدالعزیز میمنی، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۳۷ء ص ۱۰۲) خالد قناص کا نواں نوینہ قصیدہ جس کو عروس کہا جاتا ہے اس کے پہلے شعر میں دیبل کا ذکر اس طرح آتا ہے:

عوجوا اعلی طلل بالقفص خلانی
اقدی فقطاز ارآل حیقان
کالدیبلیات او اجل قراحیتہ
من بین احمد یرعا و یشیران

قفص۔ (عراق کا ایک تفریحی شہر ہے)۔

ترجمہ: "چلو میرے دوستو! مقام قفص کی طرف چلو جو اب ویران ہو گیا ہے، اور اب شتر مرغوں اور نیل گایوں کی چراگاہ ہے۔ جہاں جنگلی نیل گائیں وغیرہ اپنی وادیوں میں رہتی ہیں اور چرتی اور چلتی پھرتی ہیں۔"

شاید اس دور میں دیبل کے آس پاس نیل گائیں رہتی ہوں گی، جس کو اس نے دیبل کی نسبت سے "دیبلیات" کہا ہے، یہ شاعر دوسری صدی ہجری کے وسط کا ہے۔

۲۳۱ھ: المعجم ما استعجم: کے مصنف ابی عبید عبداللہ بن عبدالعزیز متوفی ۴۸۷ھ نے دیبل کے تحت ایک شعر لکھا ہے (۵۶۹/۳) جس میں اُس نے دیبل کا ذکر کیا ہے، یہ شعر ابن الاعرابی (محمد ابن زیاد ۱۵۰-۲۳۱ھ - زرکلی ۳۶۵/۶) نے تعلب سے سنا تھا، جسے ابو عمر (زاہد) نے سنا: اور اُس سے کتاب کے مصنف نے سن کر اپنی کتاب میں درج کیا۔

وہ شعر یہ ہے:

کان ذراعہ المشکول منہ
سلیب من رجال الدیبلان

گویا دیبل کے کالے آدمی ہیں، جن کے کپڑے لتے بھی ویسے ہی کالے ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیبل کے آدمی کالے ہوتے تھے، جن کے کالے پن کو شراب کے مٹکے کے اودے پن کو نمایاں کرنے کے لئے وہ بطور تشبیہ کے لایا ہے۔

اس کتاب کے مصنف نے لکھا ہے کہ یہ شعر ایک مٹکے کی تعریف میں ہے، مشکول بمعنی مشدود، اور دیبلان سے مراد دیبل کے کالے آدمی ہیں۔

- ۲۵۰ھ: المسالک و الممالک: ۲۵۰ھ از ابن خرداذبہ (۸۶۴-۶۵ء) متوفی ۳۰۰ھ (۹۱۲-۱۳ء)

- ۲۷۹ھ (۹۳-۸۹۲ء) فتوح البلدان: بلاذری، متوفیٰ ۲۷۹ھ (۹۳-۸۹۲ء)۔
- ۲۸۷ھ (۱-۹۰۰ء) تاریخ یعقوبی: احمد بن یعقوب متوفیٰ ۲۸۷ھ (۱-۹۰۰ء)۔
- ۳۰۳ھ: مروج الذہب: المسعودی متوفیٰ ۳۴۶ھ (۵۸-۹۵۷ء) یہ کتاب اُس نے ۳۳۲ھ (۴۴-۹۴۳ء) میں لکھی، وہ اس سے پہلے ۳۰۳ھ (۱۶-۹۱۵ء) میں یہاں کا سفر کر چکا تھا۔
- ۳۰۳ھ (۱۶-۹۱۵ء) التنبیہ والاشراف: مسعودی متوفیٰ ۳۴۶ھ (۵۸-۹۵۷ء)۔
- ۳۴۱ھ (۵۳-۹۵۲ء) صورت الارض: ابن حوقل ۳۳۱ھ (-۹۴۲ء) میں ہندوستان آیا۔
- ۳۴۰ھ (۵۲-۹۵۱ء): المسالک و الممالک: اصطخری ۳۴۰ھ (-۹۵۱ء) میں ہندوستان آیا۔
- ۳۷۲ھ (۸۳-۹۸۲ء): حدود العالم: مصنف نامعلوم، یہ کتاب ۳۷۲ھ (۸۳-۹۸۲ء) میں لکھی گئی۔
- ۳۷۵ھ (۸۶-۹۸۵ء) احسن التقاسیم: بشاری مقدسی نے یہ کتاب ۳۷۵ھ (۸۶-۹۸۵ء) میں لکھی۔
- ۴۱۶ھ (۲۶-۱۰۲۵ء) کتاب الہند: ابو ریحان بیرونی تالیف ۴۱۶ھ (۲۶-۱۰۲۵ء)۔
- ۴۳۰ھ (۳۹-۱۰۳۸ء) قانون مسعودی: ابو ریحان بیرونی، متوفیٰ ۴۴۰ھ (۴۹-۱۰۴۸ء) یہ کتاب مسعود بن محمود غزنوی کے دور میں تصنیف ہوئی۔
- ۴۸۷ھ (۹۵-۱۰۹۴ء) المعجم ما استعجم: ابی عبید، عبداللہ بن عبدالعزیز بکری اندلسی متوفیٰ ۴۸۷ھ (۹۵-۱۰۹۴ء) دیبل کے سلسلے میں اس کتاب کے مصنف کا قول اوپر آچکا ہے۔
- ۵۱۰ھ (۱۷-۱۱۱۶ء) فارس نامہ: ابن بلخی، تالیف قبل از ۵۱۰ھ (۱۷-۱۱۱۶ء) اس کتاب کے مؤلف نے دیبل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دیبل بہرام گور بن یزدگرد بن شاپور ساسانی (۴۴۲-۴۶۵ھ - ۱۰۵۰ء - ۷۳-۱۸۷۲ء) کو جہیز میں ملا، تاریخ گزیدہ، کامل ابن اثیر اور ثعالبی کی تاریخ غرر السیر وغیرہ میں بھی اس کا ذکر ہے۔
- ۴۵۹ھ (۶۷-۱۰۶۶ء) نزھتہ المشتاق: تالیف شریف ادریسی، یہ کتاب ۵۴۹ھ (۵۵-۱۱۵۴ء) میں لکھی گئی، اس کا مصنف ۴۹۳ھ (۱۱۰۰-۱۰۹۹ء) میں پیدا ہوا۔
- ۵۶۲ھ (۶۷-۱۱۶۶ء) کتاب الانساب: سمعانی، متوفیٰ ۵۶۲ھ (۶۷-۱۱۶۶ء)۔
- ۵۷۸ھ (۸۳-۱۱۸۲ء) طبقات ناصری: سلطان شہاب الدین محمد غوری (بن سام) جس نے ۵۷۸ھ (۸۳-۱۱۸۲ء) میں سندھ کو فتح کیا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے طبقات ناصری کے مصنف نے لکھا:
- "اور دوسرے سال کہ ۵۷۸ھ (۸۳-۱۱۸۲ء) کے مہینوں میں سے کوئی مہینہ تھا، سلطان غازی (محمد غوری) کا لشکر دیول کی طرف گیا، اور اس کے تمام شہروں اور دریا کے کناروں کو اپنے قبضے میں لے لیا، اور مال لے کر لوٹا۔۔۔" (۴۶۷)۔
- ۶۰۷ھ (۱۱-۱۲۱۰ء) ساتھ ہی مصنف نے ناصر الدین قباچہ کے ذکر میں جس نے (۲ جمادی الاول ۶۲۵ھ (۲۸-۱۲۲۷ء) یا ۱۹ جمادی الآخر سلطان شمس الدین التمش کے خوف سے بکھر کے قلعے کے نیچے دریا میں کود کر خودکشی کی تھی، لکھا ہے کہ:

ملک ناصر الدین قباچہ ایک بڑا بادشاہ اور سلطان غازی (شہاب الدین محمد بن سام غوری) کا غلام تھا۔۔۔

سلطان قطب الدین ایبک کے حادثے ۶۰۷ھ (۱۱-۱۲۱۰ء) کے بعد وہ اُچ کی طرف چلا گیا، اور شہر ملتان کو اپنے قبضے میں لایا، اور ہندستان دیول کنارہ دریا تک کے تمام کے تمام علاقے اس کے تصرف میں آگئے، اور سندھ کی مملکت کے قلعے اور قصبے اور شہر اس نے اپنے قبضے میں لے لیے۔

- ۶۱۳ھ (۱۷-۱۲۱۶ء) چچ نامہ: علی بن حامد کوفی - تالیف ۶۱۳ھ (۱۷-۱۲۱۶ء)
- ۶۱۸ھ: جلال الدین خوارزم شاہ، چنگیز خان کی یورش کی وجہ سے اپنا ملک چھوڑ کر ۸ شوال ۶۱۸ھ (۱۲۲۱ء) کو سندھ میں داخل ہوا، اور ۶۱۹ھ (۲۳-۱۲۲۲ء) میں وہاں سے واپس ہوا، صاحب طبقات ناصری (تالیف ۶۵۹ھ، ۶۱-۱۲۶۰ء) نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ "جلال الدین خوارزم شاہ سندھ میں آیا، اور دیول و مکران کی طرف چلا گیا"۔۔۔ (ص ۴۹۲)۔
- ۶۱۸ھ (۲۲-۱۲۲۱ء) جہانکشائی، جوینی: (تالیف ۶۵۹ھ، ۶۰-۱۲۶۰ء) میں بھی اس کا ذکر اس طرح مذکور ہے۔ "اور دیول و دمریلہ

کی طرف گیا" (ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کے قیاس کے مطابق دمریلہ مکران کی سرحد تھی، اور چنیسر کہ اس ولایت کا حاکم تھا، بھاگ گیا، اور کشتی کے ذریعے سے اس نے دریا کو پار کیا، سلطان دیول اور دمریلہ کے نزدیک اُترا۔۔ اور سلطان نے دیول میں ایک جامع مسجد کی بنیاد اُس جگہ رکھی، جہاں پہلے بت خانہ تھا، (تاریخ معصومی۔ ص ۲۸۶ بحوالہ جہانکشائی ج ۲- ص ۱۴۶- ۱۴۸ ترجمہ انگریزی ۱۷-۴۱۶ Bayle Vau II B آثار الوزراء عقیلی مطبوعہ طہران ۱۳۳۷ش- ص ۲۷۱)-

- ۶۲۵ھ (۲۸-۱۲۲۷ء) طبقات ناصری کے مصنف نے قباچہ کے مرنے کے بعد سلطان شمس الدین التمش (۶۰۷-۶۳۳ھ) کے قبضے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:
- وہ شہر آب محیط تک فتح ہو گئے، اور ملک سنان الدین جنسیر (چنیسر) کہ والی دیول اور سندھ تھا، شمس الدین کی بارگاہ سے منسلک ہو گیا۔ (۵۲۳)۔
- ۶۲۶ھ (۲۹-۱۲۲۸ء) معجم البلدان: یاقوت حموی متوفیٰ ۶۲۶ھ (۲۹-۱۲۲۸ء)-
- ۶۳۴ھ (۳۷-۱۲۳۶ء) سلطان رضیہ، (۶۳۴-۶۳۷ھ) کا ذکر کرتے ہوئے طبقات ناصری کے مؤلف نے لکھا کہ:
لکھنوتی سے دیول تک کے ممالک کے تمام ملوک اور اُمرا اس کے تابع ہو گئے (۵۳۷)۔
- ۶۵۰ھ (۵۳-۱۲۵۲ء) العباب الزاخر و اللباب الفاخر: از امام صاغانی (متوفیٰ ۲۹ شعبان ۶۵۰ھ - ۵۳-۱۲۵۲ء، بروز جمعرات) امام صاغانی نے کئی سال تک سندھ اور ہند کے مختلف شہروں کا سفر کیا، اُس نے پہلا سفر ۵۹۰ھ (۹۴-۱۱۹۳ء) سے ۹۵ (۹۹-۱۱۹۸ء) تک کیا تھا، جس میں سندھ ہوتے ہوئے وہ عراق چلا گیا، پھر وہ
- ۶۰۶ھ (۱۰-۱۲۰۹ء) میں ہندوستان آیا، اور ۶۱۰ھ (۱۴-۱۲۱۳) میں حج کے لیے چلا گیا، اور پھر ۶۱۳ھ (۱۷-۱۲۱۶ء) میں حج سے فارغ ہو کر ہندوستان پہنچا، اور ۶۱۵ھ (۱۹-۱۲۱۸ء) میں بغداد واپس ہو گیا، اس کے بعد وہ ۶۱۶ھ (۲۰-۱۲۱۹ء) میں خلیفہ ناصر الدین کا سفیر ہو کر التمش کے دربار میں آیا۔ وہ اپنی کتاب
- العباب الکندی میں لفظ (بکم) تک پہنچا تھا کہ اس نے ۶۵۰ھ (۵۳-۱۲۵۲ء) میں وفات پائی، اور یہ کتاب نامکمل رہ گئی۔

اس کتاب میں جابجا کچھ شہروں کا تذکرہ آیا ہے، چنانچہ دیبل کے سلسلے میں اس نے جو لکھا ہے، اس کا ترجمہ ہم ذیل میں دے رہے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت وہ یہ کتاب لکھ رہا تھا، اس وقت دیبل موجود تھا، وہ لکھتا ہے کہ:

- دیبل، سندھ کے شہروں میں سے ایک قصبہ ہے، جس کی بندرگاہ میں بڑے بڑے جہاز ٹھہرتے ہیں۔
- وہاں کے عام رہنے والے نیک ہیں، لیکن قدیم امیر اور حاکم اور موجودہ امیر و حاکم بدباطن ہیں، ان کا تعلق بحری ڈاکوؤں سے ہے، اور لوٹ کھسوٹ کے مال میں اپنا حصہ لیتے ہیں۔
- (عربی عبارت کے لیے دیکھیے معارف نمبر ۳- جلد ۳- ص ۲۲۳) اس کتاب کا روٹو گراف سینٹرل اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کراچی میں موجود ہے۔
- تاج العروس میں زبیدی نے (مادۂ دبل) میں مندرجہ بالا عبارت نقل کی ہے، صاحب تاج العروس نے دیبل کو بجائے قصبے کے سندھ کا پایہ تخت بتایا ہے۔
- ۶۵۸ھ (۶۰-۱۲۵۹ء) طبقات ناصری: قاضی منہاج سراج جزجانی نے یہ کتاب ۶۵۸ھ (۶۰-۱۲۵۹ء) میں مرتب کی۔ وہ کتنے ہی زمانے قباچہ کے ساتھ اُچ میں رہا، اس نے دیبل کا ذکر کیا ہے، جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں، (ہمارے سامنے اس کتاب کا آقائے حبیبی کا پہلا ایڈیشن ہے)۔
- ۶۵۹ھ (۶۱-۱۲۶۰ء) جہانکشائی جوینی: از عطا ملک جوینی، تالیف ۶۵۹ھ (۶۱-۱۲۶۰ء) اس میں جلال الدین خوارزم شاہ کی دیبل میں آمد کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، جس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔
- ۶۸۲ھ (۸۴-۱۲۸۳ء) آثار البلاد: قزوینی متوفی ۶۸۲ھ (-۱۱۸۳ء) کی تالیف ہے، جس کا ماخذ اصطخری ہے۔
- ۷۳۴ھ (۳۴-۱۳۳۳ء) رحلہ ابن بطوطہ: ابن بطوطہ (-۱۳۳۳ء) میں ابن بطوطہ لاہری بندر سے سیوھن تک آیا تھا، لیکن اُس نے دیبل کا ذکر کہیں نہیں کیا۔
- ۷۴۰ھ (۴۰-۱۳۳۹ء) نزہتہ القلوب: حمد اللہ مستوفی، یہ کتاب ۷۴۰ھ (۴۰-۱۳۳۹ء) میں تالیف ہوئی۔
- ۷۴۹ھ (۴۹-۱۳۴۸ء) مراصد الاطلاع: از صفی الدین بغدادی متوفی ۷۴۹ھ (۴۹-۱۳۴۸ء) یہ کتاب معجم البلدان یاقوت کا

اختصار ہے۔

- ۸۲۱ھ (۱۹-۱۴۱۸ء) صبح الاعشیٰ: قلقشندی متوفیٰ ۸۲۱ھ (۱۴۱۸-۱۹ء) نے چوتھی جلد میں امام صاغانی کی کتاب العباب الذاخر کے حوالے سے دیبل کا ذکر کیا ہے۔

مندرجہ بالا چار کتابوں کے مصنفین نے قدیم کتابوں پر اپنے مواد کا انحصار رکھا ہے، اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ خود ان مصنفین کے زمانے میں دیبل موجود تھا۔

مندرجہ بالا سالواری نقشے کے مطابق امام صاغانی اور منہاج سراج کے قول سے ثابت ہوتا ہے کہ دیبل ۶۵۰ھ (۵۳-۱۲۵۲ء) تک موجود اور آباد تھا، لیکن دارالسلطنت کے بجائے قصبہ بن چکا تھا۔ جب امام صاغانی آئے ہیں اُس وقت اور جب ۷۳۴ھ (۳۴-۱۳۳۳ء) ابن بطوطہ آیا ہے، اُس زمانے میں دیبل یا تو بالکل برباد ہو چکا تھا، یا اس کی بندر گاہ کی حیثیت اور اہمیت بالکل ختم ہو چکی تھی، جس کے بعد ہی ابن بطوطہ لاہری بندر سے ہوتا ہوا سیوھن آیا، گویا منہاج سراج کے بعد ابن بطوطہ تک جو بھی عرصہ گزرا، اس زمانے کے درمیان دیبل کا وجود ختم ہو چکا تھا۔

دیبل کے متعلق جو مسلسل حوالے اوپر گزر چکے ہیں، اسی ترتیب سے ذیل میں ٹھٹہ کے متعلق حوالے دیے جائیں گے، جن سے ٹھٹہ کی قدامت اور اس کا پتا چل سکے گا کہ دیبل اور ٹھٹہ کے درمیان کتنے سالوں کا وقفہ ہے۔

ٹھٹہ:

۵۷۱ھ (۷۶-۱۱۷۵ء) سلطان شہاب الدین محمد بن سام غوری نے بقول مبارک شاہی تالیف ۸۳۸ھ (۳۵-۱۴۳۴ء) ٹھٹہ اور اُچ تک چڑھائی کی تھی۔

> ۵۷۱ھ (۷۶-۱۱۷۵ء) میں اُچ، ٹھٹہ اور ملتان کی سمت لشکر لے گیا، ٹھٹہ کی ایک جماعت نے اُچ کے قلعے میں قلعہ بند ہو کر سلطان (شہاب الدین غوری) سے لڑائی کی۔۔۔ ص ۶۔

طبقات ناصری میں ٹھٹہ کے بجائے دیبل لکھا ہے، آثار الوزرا (عقیلی) میں وزیر نظام الملک جنیدی کے تحت مذکور ہے کہ:

> ۔۔۔ جب سلطان شہاب الدین غوری نے ہندوستان کے ممالک کو فتح کیا تو یہ ملک اُس نے اپنے غلاموں کے سپرد کیا ۔۔۔ اور ٹھٹہ اور اُچ سلطان ناصر الدین قباچہ کو دیا (۳۲۹)۔

طبقات اکبری (۱/۳۷) میں ہے کہ:

> ۔۔۔ دوسرے سال دیول کی طرف جو ٹھٹہ سے عبارت ہے، لشکر لے گیا، اور تمام شہروں اور دریا کو اپنے قبضے میں لایا۔۔۔

تاریخ مبارک شاہی میں جہاں ٹھٹہ کا لفظ آیا ہے، اس کے متعلق ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم و مغفور کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ یہ لفظ دراصل ٹھٹہ نہیں، بلکہ بھاتیہ ہے، (حاشیہ معصومی)۔

حقیقت میں اس دور کے دونوں مورخ ٹھٹہ کی مرکزی حیثیت اور شہرت کے باعث دیول اور ٹھٹہ میں کوئی فرق نہیں کر سکے ہیں۔

۶۶۷ھ (۶۹-۱۲۶۸ء) دیوان تحفتہ الصغر: امیر خسرو (ولادت ۶۵۱ھ (۵۴-۱۲۵۳ء)، وفات ۷۲۵ھ (۲۵-۱۳۲۴ء) یہ دیوان امیر خسرو نے اپنی ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس کی عمر تک غزلوں کا مرتب کیا تھا، اس میں ایک غزل ہے، جس کے مطلع میں ٹھٹہ کا قافیہ آیا ہے، وہ مطلع یہ ہے:

سرو چو تو، در اُچھ و در تتہ نباشد
گل مثل رخ خوب تو البتہ نباشد

(تحفتہ الصغر (۶۷۱ھ) کلیات عناصر دو اوین خسرو، نول کشور، کانپور - ۱۹۱۶ء)

(ترجمہ) تیرے مثل سرو اُچ اور ٹھٹہ میں نہیں ہو گا، پھول تیرے حسین چہرے کی مثل ہرگز نہیں ہو سکتا۔

امیر خسرو، خان شہید کے ساتھ ۶۷۸ھ (۸۰-۱۲۷۹ء) سے ۶۸۳ھ (۸۵-۱۲۸۴ء) تک ملتان میں تھے، حضرت صدر الدین بن بہاء الدین زکریا ملتانی بھی اسی دور کے ہیں۔ قلندر لعل شہباز بھی کچھ وقت خان شہید کے ساتھ رہے، اس کے بعد وہ سیوھن آئے۔

امیر خسرو کے مندرجہ بالا شعر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ٹھٹہ ۶۶۷ھ (۶۹-۱۲۶۸ء) اور ۶۷۱ھ (۷۳-۱۲۷۲ء) میں نہ صرف آباد اور مشہور تھا، بلکہ وہ اس قدر متمدن اور پر رونق تھا کہ شاعر نے وہاں کے پھولوں کی خوبصورتی اور وہاں کے سرو سے اپنے محبوب کو تشبیہ دے کر اس کی تعریف کی ہے۔

۶۶۹ھ (۷۱-۱۲۷۰ء) سلطان غیاث الدین بلبن (۶۴-۶۸۶ھ) کا بیٹا محمد قاآن، جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، ۶۶۸ھ (۷۰-۱۲۶۹ء) میں ملتان اور سندھ پر حاکم ہو کر آیا وہ ۶۸۳ھ (۸۵-۱۲۸۴ء) میں مغلوں کے لشکر کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوا، وہ تاریخ میں "خان شہید" کے عرف سے مشہور ہے، اس کے حدود حکومت کا تذکرہ کرتے ہو۔

صاحب تاریخ مبارک شاہی تالیف ۸۳۸ھ (۳۵-۱۴۳۴ء) نے لکھا ہے کہ:

مالم سے لے کر جناتی تک اس کے اقطاع ملتان میں داخل تھے - جناتی ٹھٹہ سے ساٹھ کوس پہلے دریا کے سرے پر ہے - (۴۳)۔

۷۰۵ھ (۶-۱۳۰۵ء) مکاتبات رشیدی: از خواجہ رشید الدین فضل اللہ طبیب مشہور وزیر (ابا قل خان اور غازی خان) کا تھا، جو معروف اور مشہور مورخ ہے اور تاریخ رشیدی کا مؤلف ہے، جس کو سلطان خدا بندہ نے قتل کرایا تھا۔

خواجہ مذکور نے اپنے بیٹے عزیز الدین ابراہیم حاکم شیراز کو ایک خط میں لاہور اور سندھ پر مغلوں کے حملے کا ذکر کرتے ہوئے جس کی کمان اس کا دوسرا بیٹا جلال الدین خواجہ (حاکم اصفہان) کر رہا تھا، ٹھٹہ کا نام لیا ہے۔

عزیز الدین کو بھی ۱۸ جمادی الاول ۷۱۸ھ (۱۳۱۸ء) (گزیدہ-۱-۶۰۳) خدا بندہ نے قتل کرایا، اس کے گھر میں علاؤ الدین بادشاہ ہند (۶۹۵-۷۱۵ھ) کی بیٹی تھی۔

مولانا محمد شفیع مرحوم (مرتب مکاتبات رشیدی) کا خیال ہے کہ مذکورہ خط میں مغلوں کے جس حملے کا ذکر کیا گیا ہے، وہ ۷۰۵ھ (۱۳۰۵ء) کے لگ بھگ ہوا تھا، اس خط کی ضروری عبارت کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

فرزند جلال (جلال الدین خواجہ، حاکم بلدۂ اصفہان) --- نے قلعہ لھاور کو --- ایک معمولی حملے میں مسخر کر لیا، اور وہاں سے مغلوں کی امیروں کی ایک جماعت کے ساتھ ولایت سندھ کی طرف متوجہ ہوا، ذلیلوں کی جماعت نے جو ایک مسلک میں منظم تھی، ولایت مذکور کے حدود میں جمع ہو کر ایران کے لشکر کے راستے میں مکر کا جال بچھایا، اور آدم خور شیروں کی طرح کمین گاہیں بنائیں۔ جب انھوں نے جان لیا کہ قہرمانان لشکر ایران کے بہادر اور لشکان کے لشکر کو پراگندہ کرنے والے، دلیروں کے، ہمہموں کو باجے اور گانے کی آواز سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے، اور سر کی کھوپڑیوں کو شراب کا پیالہ اور تیز شراب کا جام سمجھتے ہیں، اور لڑائی میں وہ دریا کی مانند جوش میں اور بجلی کی کڑک اور ہوا کے مانند خروش میں آتے ہیں۔ جب انہوں نے شکست کھائی، تو وہ جزائر اور گھنے جنگلوں میں چھپ گئے، اور مغل اُمرا مال و منال اور مویشی کے لوٹنے اور اطراف و جوانب میں لوٹ مار میں مشغول ہو گئے۔ لیکن فرزند جلال مثل شہاب ثاقب کے جو شیطانوں کے بھگانے کے لیے مارا جاتا ہے، اُن کے پیچھے دوڑا اور اُس جماعت کے تعاقب میں حدود جزائر بکھر اور اُچ اور لاہری کے ممنوعہ علاقے اور ٹھٹہ تک گیا۔

۷۶۰ھ (۲۱-۱۳۲۰ء) سلطان قطب الدین مبارک شاہ (۷۰-۷۱۶ھ) بن سلطان علاء الدین خلجی (۶۹۵-۷۱۵ھ) کو خسرو ملک ۷۲۰ھ (۲۱-۱۳۲۰ء) میں قتل کر کے تخت پر بیٹھا، جس کو اسی سال سندھ کے گورنر غازی ملک نے تہہ تیغ کر کے خود سلطان غیاث الدین تغلق متوفی ۷۲۵ھ (۲۵-۱۳۲۴ء) کے لقب سے تخت پر بیٹھا، صاحب تحفۃ الکرام کے قول کے مطابق اسی کے دور میں ٹھٹہ پر سومروں کا قبضہ ہوا، (تحفۃ الکرام فارسی تحت غازی ملک)۔

۷۵۲ھ (۵۲-۱۳۵۱ء) سلطان محمد تغلق ٹھٹہ سے چودہ کوس اس طرف تھا، جب وہ پلہ مچھلی کھا کر بیمار ہوا، اور محرم ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) کو اس نے وفات پائی، اُس کی جگہ سلطان فیروز ۲۳ مارچ ۱۳۵۱ء کو تخت نشین ہوا۔ سلطان محمد تغلق کی لاش کو پہلے سیوہن میں دفن کیا گیا، پھر دہلی لے جایا گیا، تاریخ مبارک شاہی کے مصنف نے لکھا ہے کہ:

--- مع ہذا ٹھٹہ کا قصد کیا، تاکہ طغی کو جس نے وہاں پناہ لی تھی، وہاں کے لوگوں سے قبضے میں لے کر قتل کرے، جب سلطان (محمد تغلق) ٹھٹہ کے قریب پہنچا، پھر وہی بیماری عود کر آئی، ۲۱ محرم ۷۵۲ھ (۵۲-۱۳۵۱ء) کو وہ لب آب سندھ رحمت حق سے پیوست ہو گیا۔ (۱۱۷)۔

۷۶۴-۶۳ھ (۶۲-۱۳۶۱/۶۳-۱۳۶۲ء) تاریخ فیروز شاہی: عفیف برنی ۸۰۱ھ (۹۹-۱۳۹۸ء) سلطان محمد تغلق کی وفات کے بعد فیروز تغلق دہلی سے ٹھٹہ آیا، تاریخ فیروز شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ٹھٹہ عظیم شہر تھا، اس کا قلعہ اتنا مضبوط تھا کہ اس کا فتح کرنا مشکل تھا، پہلی مرتبہ فیروز مایوس ہو گیا، دوسری دفعہ پھر آیا، عفیف کا قول ہے کہ ٹھٹہ کے جام نے مجبور ہو کر سید جلال الدین جہانیاں جہاں گشت کو اُچ سے بلایا کہ وہ سلطان فیروز سے صلح کی گفتگو کریں، لیکن اس کی عبارت کے انداز سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کے بلانے میں سلطان فیروز کا بھی ہاتھ تھا، بہر حال یہاں یہ موضوع خارج از بحث ہے۔ اور قسم قسم کی رعنائی میدان خود نمائی میں دکھاتے تھے،---

اُنھوں نے بہت لشکر جمع کیا تھا، اور اُن کی سلطنت بہت بڑی تھی (عفیف-ص۱۹۹)۔

جس وقت جنگ شروع ہوئی اُس وقت کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے مؤلف نے لکھا کہ:

-جام اور بابنیہ اپنا تمام لشکر لے کر اور تیار ہو کر بہت سے سواروں اور بے شمار پیادوں کے ساتھ قلعے سے باہر آئے- (۲۰۱)

---اور ٹھٹہ والوں کے لشکر کا اندازہ بیس ہزار بہادر سوار تھا، ہر ایک قوت، دلاوری میں یگانہ روزگار تھا، اور پیادوں کا اندازہ چار لاکھ تھا، اس بے پناہ لشکر اور بے پایاں قوت کے ساتھ ٹھٹہ کے لوگوں سے جنگ نہیں ہو سکتی تھی- (۲۰۲)

--- ٹھٹہ کے لوگ اس بے پایاں قوت کے باوجود قلعے میں مرے جا رہے تھے۔ (۲۰۲)۔

ہم ذیل میں اُس عبارت کا ترجمہ نقل کرتے ہیں کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹھٹہ ایک بڑا اور مستحکم شہر تھا، اور ٹھٹہ کا قلعہ ناقابل تسخیر تھا، یہ قلعہ اتنا وسیع اور کشادہ تھا کہ اُس میں ایک پورا لشکر سما سکتا تھا، سندھ کی لڑائی کا جو کچھ بھی انجام ہوا، لیکن حب الوطنی اور وطن کے دفاع کے احساس کی شدت اُن میں اس قدر تھی کہ سندھ کے عام لوگ بھی اپنی جان دینے سے دریغ نہیں کرتے تھے، چنانچہ کونجی رن میں فیروز تغلق کا سندھی رہبروں کے ہاتھوں حیران و سرگرداں ہونے کا واقعہ اس کا شاہد ہے۔

ٹھٹہ کی آبادی دو جگہ تھی، ایک تو کنارہ لب آب سندھ جانب دہلی اور دوسری اس سڑک پر جو ٹھٹہ والوں کی طرف دریائے سندھ سے ملی ہوئی تھی۔

ٹھٹہ والوں کی جانب سے لوگوں کا بیشمار ہجوم تھا، ہر ایک اُن میں سے باشکوہ تھا، بلکہ ہر ایک آدمی بجائے خود ایک انجمن تھا، اور وقار میں مثل پہاڑ کے تھا، تمام کے تمام بہادر اور جنگ جو تھے، چنانچہ ان کی قوت اور بہادری کا حال جہاں اور اہل جہاں پر روشن ہے، اُس زمانے میں جام بر اور رائے اُنڑ اور بابنیہ جو اُس کے بھائی کا لڑکا تھا ٹھٹہ کے حاکم تھے۔

اس دفعہ فیروز، جنگ میں ناکام اور مایوس ہو کر نامراد دہلی لوٹا، پھر وہ دوسری دفعہ آیا، اُسی سلسلے میں صاحب تاریخ مبارک شاہی کا بیان ہے کہ:

اُس (فیروز) نے نگر کوٹ کو فتح کیا، اور وہاں سے ٹھٹہ کا رخ کیا، جب وہ ٹھٹہ پہنچا، تو جام بابنیہ جو اُس وقت ٹھٹہ کا حاکم تھا، قلعے میں پوری قوت کے ساتھ قلعہ بند ہو گیا، ایک مدت تک لڑائی جاری رہی- آخر بہت سی کوششوں کے بعد ضرورت سے مجبور ہو کر گجرات کی جانب چلا گیا- (ص۱۳۱)۔

۷۶۵ھ (۶۴-۱۳۶۳ء) تاریخ فیروز شاہی: عفیف تالیف ۸۰۲ھ (۹۹-۱۳۹۸ء) میں ہے کہ سلطان فیروز کے پہلی مرتبہ ٹھٹہ آنے کے وقت اُس کی فوج میں نوے ہزار سوار، چار سو اسی ہاتھی، پانچ ہزار کشتیاں، بے اندازہ پیادے تھے اور اس وقت جام کے ساتھ بیس ہزار سوار اور چار لاکھ پیادے تھے۔

جام کا تمام لشکر ٹھٹہ کے قلعے میں قلعہ بند ہو گیا، اس قلعے کی وسعت کا اندازہ ایک شہر کے برابر کیا جاتا ہے۔

دوسرے حملے کے متعلق عفیف نے لکھا ہے کہ:

---اور سندھیوں کی جماعت بے حد قوت اور بے پایاں بہادری کے ساتھ دریائے سندھ کے کنارے کے ساتھ ساتھ ستر کوس تک سواروں اور بہادر جوانوں کے ساتھ حائل تھی، نہایت ہوشیاری اور بیداری کے ساتھ کوشش کر رہی تھی، وہاں سے (دشمن کا) گزرنا ممکن نہ تھا۔

---ملک عماد الملک اور ظفر خاں کثیر لشکر اور بے انتہا فوج کے ساتھ ایک سو بیس کوس لوٹ کر بکھر کی طرف سے گزر کر اہل ٹھٹہ کی سرزمین میں آئے اور ٹھٹہ کے لوگ بھی کثیر لشکر، باشکوہ پیادوں اور سواروں کے ساتھ قلعے سے باہر آئے، دونوں کے درمیان سخت جنگ ہوئی، جو تحریر میں نہیں آسکتی، سلطان فیروز اس حال میں بھی گوئے سبقت لے گیا اگرچہ ٹھٹہ کا قلعہ مضبوط تھا (ص۲۳۵)۔

پہلی مرتبہ سلطان فیروز ٹھٹہ کے لشکر کو کیوں زیر نہ کر سکا؟ کہ نہیں بتا سکتا کہ اس کی کیا وجہ تھی، آخر اُس نے نیا لشکر دہلی سے بلو جس کے بعد تقریباً تمام مملکت سے لشکری آکر جمع ہو گئے، عفیف کا ہے کہ ٹھٹہ کے لوگوں کے پاس جو غلہ تھا، اُنھوں نے اُسے فیروز کے ف ہونے کے بعد بے فکر ہو کر اپنی زمینوں میں بطور بیج کے ڈال دیا، دو مرتبہ جو اُن پر چڑھائی ہوئی، جس کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے، وہ اس لیے تیار نہ تھے اور نہ ان کے پاس رسد تھی اور نہ خوراک کا پورا

تھا، آخر وہ مقابلہ اور مجادلہ کرتے ہوئے قحط میں مبتلا ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ جام بابنیہ نے ایک خاص آدمی کو بھیج کر سید جلال الدین جہانیاں جہاں گشت کو اُچ سے بلوایا (ص ۲۴۰) عفیف کی عبارت کے انداز سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان فیروز نے بھی سید جلال الدین جہانیاں جہاں گشت کے بلانے کے لیے آدمی بھیجے، اس کے لیے دیکھیے (صفحہ ۲۴۲-۲۴۱) آخر سید صاحب کے بیچ میں پڑنے کی وجہ سے صلح ہو گئی، بقول عفیف کے جام بابنیہ فیروز کے سامنے پیش ہوا، اس طریقے کی فتح کے متعلق عفیف نے یہ شعر لکھا ہے جس میں ٹھٹہ کا نام آیا ہے:

ہم تھتہ بدست آمد و ہم کار فراہم شد
المنتہ للہ کہ ایں ہم شد و آں ہم شد
(ص ۲۴۷)

(ترجمہ) ٹھٹہ بھی ہاتھ آیا اور اسباب فتح بھی جمع ہو گئے، اللہ کا احسان ہے کہ یہ بھی ہوا اور وہ بھی۔

جام بابنیہ کو فیروز اپنے ساتھ لے گیا اور ٹھٹہ کو جام کے بیٹے اور تماچی برادر بابنیہ کے سپرد کیا (ص ۲۴۷) جو چار لاکھ ٹنکا سالانہ خراج دیتے تھے، عفیف کا بیان ہے کہ ٹھٹہ اور گجرات کی سرزمین فیروز شاہ کے دور میں فتح ہوئی، جس کو سلطان معزالدین (شہاب الدین) محمد سام سے لے کر اس وقت تک کوئی بھی فتح نہ کر سکا تھا، سلطان علاؤالدین خلجی (۶۹۵-۷۱۵ء) اپنے ساتھ سلطان روم اور سلطان حسین کے امدادی لشکر کے ساتھ یہاں آیا تھا، تاہم فتح نہ کر سکا (ص ۲۵۱) اس فتح کو عفیف نے دو شعروں میں بیان کیا ہے، جن میں ٹھٹہ کا نام آیا ہے:

ور تھتھہ چو شاہ رخ نہادہ — شاہانش دویدہ پا فتادہ
آوردہ ہمہ برابر خویش — گنجینہ بدادیش ز حد بیش

(ترجمہ) "جب ٹھٹہ کی طرف شاہ نے رخ کیا، وہاں کے بادشاہ گرتے پڑتے دوڑے۔

"ہر ایک اپنے ہمسروں کی برابر اپنی مقدرت سے زیادہ خزانہ پیش کرنے کے لیے لایا"۔ دہلی میں جس جگہ جام اور سندھ کے لوگ رہے، وہ جگہ سرائے ٹھٹہ کے نام سے مشہور ہو گئی۔"

دوسری فتح کے سلسلے میں تاریخ مبارک شاہی کی تحریر یہ ہے کہ:

جب سلطان (فیروز) دوسری دفعہ ٹھٹہ گیا، جام بابنیہ نے امان چاہی، اور مراحم خصوصی سے نوازا گیا، سلطان اُس کو اس طرف کے مقدمان کی کوشش سے اپنے ساتھ دہلی لایا، جب اس نے ایک مدت تک خدمت کی، سلطان نے پھر جام کو اطراف ٹھٹہ دیا، اور نہایت سلیقے سے رخصت کیا۔ (ص ۳۱)

۷۶۵ھ (۶۴-۱۳۶۳ء) قصائد مطہر کڑہ: متوفی تقریباً ۷۹۰ھ (۸۹-۱۳۸۸ء) مطہر شاعر کڑے کا رہنے والا فیروز شاہ تغلق کے مدح خوانوں میں ہے، ملک الشرق عین الملک ماہرو جو کہ اس دور میں ملتان کا صوبہ دار تھا، اُس کی مدح میں بھی اس کا قصیدہ ہے، مطہر نے دو قصیدے فیروز تغلق کی مدح میں لکھے ہیں، جن میں ٹھٹہ کا ذکر موجود ہے، ان قصیدوں میں ٹھٹہ کی اہمیت اور مدنیت کو واضح کیا گیا ہے، ایک قصیدے میں فیروز شاہ کی فتوحات، اخلاق اور حسن انتظام وغیرہ کو سراہتے ہوئے ٹھٹہ کا ذکر اس طرح کیا ہے:

وز جملۂ فتوح گل فتح تھتہ بود
کز استماع ان ہمہ خلق انتشار بود

پھر آگے چل کر وہ ٹھٹہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے۔

نی نی کہ شہر نیست بہشت است دلپذیر
آراستہ بسندس و استبرق و حریر
حوراں در و کواعب اتراب بے نظیر
سلسال و سلسبیل درو چشمہ و غدیر
وز شربت و شراب خمیرش در آبگیر
جاری ہزار جوئے می و انگبین و شیر
آبش ہمہ گلاب و گلابش ہمہ عبیر
خشتش ز زر سرخ و زمینش زسیم ناب

۷۸۶ھ (۸۵-۱۳۸۴ء) ٹھٹہ کے شیرازی انجوی سادات کے بزرگ سید محمد اور اُن کے بیٹے سید احمد ۷۸۶ھ (۸۵-۱۳۸۴ء) شیراز چھوڑ کر قندھار، سیوہن اور ساموئی ہوتے ہوئے آئے اور ٹھٹہ میں قاضی نعمت اللہ عباسی کی رشتے داری کے سبب قاضیوں کے محلے میں سکونت اختیار کی۔ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ بھی سید محمد کے ساتھ شیراز سے سندھ کے لیے روانہ ہوئے تھے، لیکن وہ سید محمد کے قندھار میں ٹھہرنے کی وجہ سے شیراز لوٹ گئے، جس کے بعد ۷۹۲ھ (۱۳۸۸-۸۹ء) ان کا انتقال ہو گیا، اُسی سال مطہر نے کڑے میں وفات پائی، جس کا دوسرا قصیدہ ہم نے اوپر نقل کیا ہے، سید محمد اور سید احمد کی آمد تاریخ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے (۷۸۶ھ) نکلتی ہے۔

صاحب رسالہ معارف الانوار نے ٹھٹہ اور دیبل کو ملا کر لکھا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "وہ عازم بلاد ٹھٹہ یعنی دیبل ہوئے" (ص ۱۱۰)

لیکن اس سے ان کا مطلب ٹھٹہ ہی ہے، کیونکہ دوسری جگہ لکھا ہے کہ وہ پاک شہر ٹھٹہ کی طرف تشریف لائے (ص ۱۱۷)

سید محمد نے ۱۰ محرم ۸۰۰ھ (۱۳۹۷ء) کو وفات پائی، اُن کے بیٹے سید پور میں رہے، لیکن ان کی بھی مستقل سکونت ٹھٹہ ہی میں تھی۔

۷۹۱ھ (۸۹-۱۳۸۸ء) : جام تماچی کی بغاوت: فیروز تغلق نے ٹھٹہ کو جام بابنیہ کے بھائی کے سپرد کیا تھا، چند سال کے بعد جب جام تماچی بغاوت پر آمادہ ہوا تو اس کی خبر سلطان فیروز کو دہلی میں ملی، اُس نے اس کی سرکوبی کے لیے جام کو روانہ کیا، جو اس کو گرفتار کر کے دہلی لے گیا، عفیف نے لکھا ہے کہ:

---مع ہذا جب اس بات کو چند سال گزرے، اور تماچی برادر بابنیہ نے ٹھٹہ میں بغاوت اختیار کی، حضرت شہنشاہ (فیروز) نے جام کو اس کے رفع شر کے لیے ٹھٹہ بھیجا، جام ٹھٹہ پہنچا، اور تماچی کو شہر کی طرف روانہ کیا۔

جام بابنیہ کے سلسلے میں عفیف نے لکھا کہ:

اور بابنیہ بھی دہلی میں رہا---جب سلطان تغلق شاہ (۷۹۰ھ) میں تخت شاہی پر بیٹھا، اس نے بابنیہ کو چتر سرداری دے کر ٹھٹہ روانہ کیا۔ بابنیہ نے راستے میں وفات پائی (ص ۲۵۴)۔

گویا بابنیہ ۷۹۰ھ میں اپنے وطن واپس ہوتے ہوئے راستے میں فوت ہوا۔

۸۳۳ھ (۳۰-۱۴۲۹ء): تاریخ مبارک شاہی: (تالیف ۸۳۸ھ) مؤلف نے سلطان معزالدین ابوالفتح مبارک شاہ (۸۲۴-۸۳۷ھ) کے تحت لکھا کہ ۸۲۳ھ میں جسرت شیخا کھوکھر (؟) نے بغاوت کی جس کے دفعیہ کے لیے کشمیر کے بادشاہ سلطان علی نے لشکر لے کر ٹھٹہ پر چڑھائی کی، (در ولایت تھتہ آمد) - - - ص (۱۹۴) بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے مطبوعہ نسخے میں ٹھٹہ کا نام کتابت کی غلطی کی وجہ سے یہاں آگیا ہے، ورنہ کشمیر کے بادشاہ علی اور جسرت کا نام سندھ کی تاریخ میں کہیں بھی کسی عنوان کے تحت نہیں ملتا۔

مندرجہ بالا حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹھٹہ جام نظام الدین سے دو سو برس پہلے موجود تھا، بلکہ سندھ کا پایہ تخت تھا اور دیبل کا نام تاریخ کے صفحات سے ۶۵۸ھ کے بعد گم ہو چکا تھا، اور ٹھٹہ ۶۷۱ھ سے پہلے اس کا قائم مقام ہو چکا تھا، ان دونوں کے درمیان صرف ۹ یا ۱۳ سال کا فرق تھا۔ امیر خسرو کے مندرجہ بالا شعر میں جو ۶ اور ۱۹ سال کی عمر کے درمیان انھوں نے کہا ہے، صاف واضح ہوتا ہے کہ جس وقت انہوں نے یہ شعر کہا ہے، اُس وقت ہندوستان کے پایہ تخت دہلی میں وہاں کے لوگوں میں عام طور پر ٹھٹہ کی خوبصورتی خاص طور پر مشہور تھی، اس کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان تاریخی شہادتوں کی روشنی میں ان امور کو تسلیم نہ کریں۔

۱۔ ٹھٹہ اور دیبل دونوں ایک وقت میں موجود تھے۔

۲۔ ٹھٹہ ۶۵۱ھ (امیر خسرو کی پیدائش) سے پہلے آباد تھا۔

۳۔ ورنہ ناممکن ہے کہ یہ شہر اپنے آباد ہونے کے بعد ۹ یا ۱۳ سال کے نوجوان کو اس قدر متاثر کرے کہ وہ اپنے شعر میں اس شہر سے تشبیہ کا کام لے۔

۴۔ ٹھٹہ موجود تھا، لیکن اس کو اہمیت تمام تر دیبل کے زوال کے بعد حاصل ہوئی۔

۴۔ یہی سبب تھا کہ لوگوں کے ذہنوں سے دیبل کا نام محو نہیں ہوا تھا اور ٹھٹہ کی شہرت شروع ہو گئی تھی، اس لیے لوگوں کی زبان پر ٹھٹہ اور دیبل کے نام ایک ساتھ گڈمڈ ہو کر آجاتے تھے، انھیں کی وجہ سے مؤرخین اور مصنفین کو بھی اشتباہ لگا، انہوں نے جہاں بھی دیبل کا ذکر کیا وہاں ساتھ ہی ٹھٹہ بھی لکھ دیا، اور جہاں ٹھٹہ کا ذکر آیا وہیں ساتھ ہی دیبل بھی تحریر کر دیا ہے، یہ طریقہ شہاب الدین غوری کے فتوحات کے تذکرے تک چلتا رہا، یہاں تک کہ صاحب معصومی اور صاحب تحفتہ الکرام بھی کتنی جگہ دیبل اور ٹھٹہ میں فرق نہ کر سکے۔

اسی طریقے کے مطابق تاریخ معصومی کا مصنف عربوں کی فتوحات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

---بندر دیول کہ اس زمانے میں بندر ٹھٹہ اور لاہری مشہور ہے۔ (ص ۶)۔

یا دیبل کی فتح کا بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

اور لشکر اسلام نے فیروزی کے ساتھ عنان عزیمت تسخیر ٹھٹہ کی طرف پھیری، اور تھوڑے ہی زمانے میں ٹھٹہ کو مسخر کر لیا۔

اور یہی غلطی سلطان محمود غزنوی کی فتوحات میں ٹھٹہ کے نام ساتھ کی ہے۔

اور جب ۴۱۶ھ میں سلطان محمود غازی نے، دارالسلطنت

غزنی سے ہندوستان کا عزم کیا، اور ملتان کے خطے میں پہنچا
- - - عبدالرزاق وزیر - - - سنہ ۴۱۷ھ میں متوجہ
سیوستان اور ٹھٹہ ہوا۔

اسی طریقے پر جلال الدین کے سلسلے میں بھی دیبل کے بجائے ٹھٹہ کا ذکر کیا ہے، ٹھٹہ کا ذکر ختم کرتے ہوئے ہم دکنی زبان کے ایک شاعر کا ایک شعر نقل کرتے ہیں۔ جو جہانگیری دور کا شاعر تھا لیکن اُس نے اس میں ٹھٹہ کی تعریف کی ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دکن کی ولایت میں ٹھٹہ کے متعلق کیا تصور تھا، یہ شعر عثمان نے اپنی مثنوی چترا ولی میں نظم کیا ہے:

ہیرے سی ٹھٹہ نگر سو ہا وا
بیہن ہرن سیو بن گنجا وا

یعنی ٹھٹہ نگر ہیرے کی طرح خوبصورت ہے، ہر جگہ سایہ دار درخت، اور اس میں دھان کے ہرے بھرے کھیت، ہرن، کشادہ اور خوبصورت جنگل موجود ہیں۔[1]

نیرون کی طرف روانگی:

دیبل کی فتح اور انتظام سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم نیرون کی طرف روانہ ہوئے، منجنیقیں اور دوسرا فوجی سامان کشتیوں میں ڈال کر ساکرہ[2] نالے کے راستے نیرون روانہ کیا اور خود اپنی فوج کے ساتھ خشکی کے راستے سے سیسم[3] کی طرف سے روانہ ہوئے جب سیسم پہنچے تو نہیں حجاج بن یوسف کا ایک خط ملا۔ جس میں لکھا تھا۔

حجاج بن یوسف کی طرف سے محمد بن قاسم کی جانب: جاننا چاہیے کہ ہمارے دلی ارادوں اور ہمت کا تقاضا یہ ہے کہ تمہیں ہر حال میں کامیابی حاصل ہو، اور انشاء اللہ تم کامیاب اور فتح مند ہو گے، اور اللہ عزوجل کے احسان سے دشمن دنیا کی سزا اور عاقبت کے عذاب میں ہمیشہ گرفتار اور مغلوب رہے گا۔

تمہیں ہرگز یہ خیال بھول کر بھی دل میں نہ لانا چاہیے کہ تمام ہاتھی، گھوڑے، دولت اور دشمنوں کا تمام مال و اسباب تمہاری ملکیت ہو جائے گا۔ بلکہ تم اپنے رفیقوں کے ساتھ ایک پر مسرت زندگی بسر کرو۔ اور ہر ایک کے ساتھ احترام اور حسن سلوک کے ساتھ پیش آؤ، اور انہیں یہ یقین دلاؤ کہ یہ ملک تمہارا ہو گا، جب تم کوئی قلعہ فتح کرو، اور اس میں سے لشکر کی ضروریات کی جو چیز بھی تمہارے ہاتھ آئے وہ لشکر پر خرچ کرو اور فوجی تیاری میں صرف کرو، کھانے پینے کی چیزوں میں کسی کو روک ٹوک نہ کرو۔ اشیاء کی قیمتوں کی شرح مقرر کرو، تاکہ تمہارے کیمپ میں غلہ سستا ملے، جو کچھ دیبل میں رہ گیا ہے، وہ فوجوں کی رسد کی فراہمی پر خرچ کرو، بجائے اس کے کہ وہ دیبل میں ذخیرے کی صورت میں پڑا رہے۔ جب تم ملک فتح کر چکو اور قلعوں کو مضبوط کر لو تو اس کی کوشش کرو کہ وہاں کے لوگ مطمئن زندگی بسر کریں، مفتوحہ علاقے کے لوگوں کی دل جوئی کرو، تاکہ کسان، پیشہ ور اور تاجر مرفہ الحال اور آسودہ ہوں، اور ملک سرسبز و شاداب رہے[4]۔ ۲۰ رجب ۹۳ھ

نماز استسقا:

سیسم سے محمد بن قاسم نیرون کوٹ کی طرف بڑھے، جو دیبل سے پچیس فرسنگ پر ہے، اور ساتویں دن نیرون کوٹ کے باہر بروری[5] کے میدان میں ایک سبزہ زار ہے جسے بلہار (یعنی ولہاریاوی) کہتے ہیں منزل انداز ہوئے۔ گرمی کا موسم تھا اور پانی کا میلوں پتا نہ تھا، لشکر کو پانی کی سخت تکلیف تھی، پانی کی تکلیف دیکھ کر محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ نماز

---

[1] حواشی مکلی نامہ سندھی ص ۱۱ تا ۴۰۔

[2] فارسی متن کی اصل عبادت "نالہ ساکرہ" مختلف نسخوں میں اس کا تلفظ نالہ سانکرہ، ساکرہ، دھند ساکرہ، ہند ساکرہ ہے، ساکرہ کا لفظ آج بھی میرپور ساکرہ کے نام میں موجود ہے، یعنی وہ میرپور جو خطہ ساکرہ میں ہے، اس لحاظ سے نالہ ساکرہ جس کے ذریعے محمد بن قاسم نے سامان سے بھری ہوئی کشتیاں نیرون کوٹ روانہ کیں، غالباً بگھیار حاٹ (بگھیار شاخ) ہے، جو کہ اس وقت ایک چھوٹی ندی تھی (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۶۳)۔
فارسی ایڈیشن میں "سیم" دیا گیا ہے، مگر ہم نے قدیم معتبر نسخوں کے مطابق سیسم کو صحیح سمجھ کر ترجیح دی ہے (حاشیہ چچ نامہ سندھی نمبر ۲ ص ۱۶۲)۔

[4] چچ نامہ فارسی، ص ۱۱۶-۱۱۵۔

[5] فارسی متن کی اصل عبارت یہ ہے "مرغزاریست کہ آن را بلہار گویند بزمین بروی" اس کے علاوہ ص 117 پر بھی دوبارہ لفظ بروی آیا ہے، لیکن صفحہ ۱۱۷ پر لفظ بروی کا تلفظ چچ نامے کے بعض قدیم نسخوں میں 'بروزی' اور 'بروی' بھی ملتا ہے۔ ان تمام تلفظوں کو دیکھتے ہوئے یہ لفظ 'بروری' یا 'بروزی' ہے، ہم نے 'بروری' کے لفظ کو ترجیح دی ہے، کیونکہ سندھ کے اکثر دیہات اور گاؤں کے نام کے آخر میں 'ری' یا 'ڑی' کا لفظ ہوتا ہے، مثلاً 'کلری، کوٹری، ہوسٹری اور ہتڑی وغیرہ (حاشیہ چچ نامہ سندھی - ص ۱۶۴ نمبر ۳)۔

استسقا ادا کی جائے، سب نے مل کر نماز استسقا ادا کی، اور نہایت ہی گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ محمد بن قاسم نے استسقا کی نماز کے بعد جن الفاظ میں دعا مانگی تھی وہ یہ تھے:

یا دلیل المتحیرین ویا غیاث المستغیثین اغثنی بحق
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اے گمراہوں اور پریشانوں کے رہبر، اے فریاد کرنے والوں کی فریاد سننے والے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے وسیلے سے میری دعا کو سن۔"

خدا نے مجاہدین کی دعاؤں کو قبول فرمایا، خوب بارش ہوئی اور ہر طرف جل تھل ہو گیا۔[1]

نیرون کی فتح:

بلھار سے روانہ ہو کر محمد بن قاسم نیرون پہنچے۔ نیرون کا حاکم بدھ مذہب کا ماننے والا تھا۔ پہلے گزر چکا ہے کہ اُس نے پہلے ہی حجاج سے معاملہ طے کر لیا تھا۔ جب محمد بن قاسم نیرون پہنچے، اس وقت نیرون کا حاکم راجا داہر کے پاس گیا ہوا تھا، شہر والوں نے جب محمد بن قاسم کی آمد کی خبر سنی، شہر کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ پانچ چھ روز کے بعد شمنی حاکم نیرون واپس آیا، اُس نے فوراً ہی شہر کے دروازے کھلوائے اور نہایت شاندار طریقے سے محمد بن قاسم کا استقبال کر کے اُن کو شہر میں لایا، نہایت بیش قیمت تحائف پیش کیے، فوج کی مہمانداری کا پورا پورا انتظام کیا، اور محمد بن قاسم کو یقین دلایا کہ اہل نیرون مسلمانوں کے سچے وفادار ہیں۔ محمد بن قاسم نے بھی نیرون کے حاکم کو انعام و اکرام سے نوازا، غرضیکہ نیرون بغیر کسی جنگ کے فتح ہو گیا۔[2]

نیرون میں مسجد کی تعمیر:

نیرون میں محمد بن قاسم نے ایک مسجد تعمیر کرائی اور مسجد کے لیے امام و مؤذن مقرر کر کے حکم دیا کہ پانچوں وقت اذان دی جائے اور باجماعت نماز ادا کی جائے۔ اس کے بعد محمد بن قاسم نے ذہلی بصری کو نیرون کا کوتوال مقرر کیا، نیرون کے انتظامات سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم نے سیوستان کے فتح کرنے کا ارادہ کیا، اور نیرون کے حاکم کو ساتھ لے کر وہ سیوستان روانہ ہوئے۔[3]

---

(1) چچ نامہ فارسی، ص ۱۱۶۔

(2) چچ نامہ، ص ۱۱۷۔

(3) چچ نامہ ص ۱۱۸ و تحفۃ الکرام ج ۳ ص ۲۲۔

سیوستان کی فتح:

نیرون سے روانہ ہو کر محمد بن قاسم موج[4] پہنچے، یہ مقام نیرون

---

(4) مندرجہ بالا متن کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم نیرون کوٹ سے سیوستان جاتے ہوئے سب سے پہلے 'موج' پہنچا، جو کہ نیرون کوٹ سے تیس فرسنگ پر تھا، لغت کے اعتبار سے موج کے معنی نہر یا تیز بہتے ہوئے پانی کے ہیں، اس سے خیال ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کسی برساتی ندی کے قریب پہنچے تھے، نیرون کوٹ میں محمد بن قاسم نے دعا مانگی تھی، جس کے بعد سخت بارش ہوئی تھی اس سے پتا چلتا ہے کہ بارش کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ اسی صفحے پر آئندہ چل کر ہے کہ موج سے روانہ ہو کر محمد بن قاسم سیوستان (سیون) کے قلعے کے قریب پہنچا، اور اس موج کے قریب ہی وہاں کے شمنی (بدھ مذہب کے راہب) اکٹھے ہو کر اُن کے پاس آئے اور ان کے ساتھ صلح کا عہد نامہ کیا۔ مورخ بلاذری کا بیان ہے کہ محمد بن قاسم نے مہران کے اس طرف ایک نہر کو عبور کیا، جہاں سربیدس کے شمنی ان کے پاس آئے اور ان سے صلح کی (فتوح البلدان ص 438) مورخ یعقوبی (327x2) کا بھی یہی بیان ہے کہ محمد بن قاسم نے مہران کے اس طرف سندھ کی ایک نہر پار کی، اور وہاں سے سیہان (سیوستان) کی طرف روانہ ہوئے۔
بلاذری اور یعقوبی کے ان حوالوں اور چچ نامے کی عبارت میں پوری مطابقت ہے، ظاہر ہے چچ نامے میں جسے موج سے تعبیر کیا گیا ہے، ان متذکرہ بالا مورخوں نے اُسے نہر لکھا ہے، دونوں مورخ اُسے ممالک اسلامیہ سے مغرب کی طرف لکھتے ہیں، اُن کا بیان ہے کہ وہ مہران کے اُس طرف ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ نہر مہران کے مغرب میں تھی۔ سندھ کے جغرافیے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد (جہاں غالباً قدیم نیرون کوٹ تھا) اور سیوھن کے درمیان مغرب کی طرف کوہستانی علاقے میں دریائے سندھ کی کسی بھی شاخ کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ محمد بن قاسم سے پہلے یا بعد کی تاریخ سے بھی اس خطے میں کسی ایسی مغربی شاخ کا پتا نہیں چلتا، اگر مہران کے مغرب کی جانب کوئی نہر ہو سکتی ہے تو وہ کوئی دریائی ندی یا نالا ہو گا، اور چچ نامے کا لفظ موج اس دلیل کی واضح شہادت ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ کون سا نالا ہے جسے نیرون کوٹ سے سیوھن جاتے ہوئے محمد بن قاسم نے پار کیا؟ چونکہ اس خطے میں صرف "ننّن سن" ہی ایک نمایاں اور قدیمی نالہ ہے، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ یہی نالہ ہے جسے چچ نامے میں موج اور عربی تاریخوں میں نہر کہا گیا ہے۔
بلاذری کے قول کے مطابق نہر عبور کرنے کے بعد سربیدس کے شمنی اُن سے ملے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان شمنیوں کی بستی نہر کے اس پار کہیں تھی، اب ہمیں "ننّن سن" کے مغرب عامری کے قریب قدیمی ٹیلے اور کھنڈرات ملتے ہیں۔ اسی طرح مقام 'لکی' بھی بہت پرانا ہے، جو اپنے قریب کے پہاڑوں اور پانی کے چشمے کی وجہ سے بدھ مذہب کے راہبوں کے رہنے کے لیے ایک موزوں مقام ہو سکتا ہے، غالباً یہ شمنی وہیں رہتے ہوں گے اور وہیں سے وہ سیوھن کے حاکم بجھرائے کو پیغامات بھیج کر صلح کے لیے آمادہ کرتے رہے ہوں گے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ سیوھن سے بہت دور نہیں تھے، اس لیے کہ لکی سیوھن سے زیادہ دور نہیں۔

سے نوے میل کے فاصلے پر تھا، یہاں کے لوگ بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ اس وقت یہ مقام سیوستان کے تحت تھا، اور سیوستان کا حاکم بجھرا (بجے رائے) نامی تھا جو راجا داہر کا بھتیجا تھا۔ جیسے ہی محمد بن قاسم موج پہنچے، موج کے حاکم نے شہر کے لوگوں کو بلا کر مشورہ کیا کہ اب کیا صورت اختیار کرنی چاہیے۔ سب نے مل کر طے کیا کہ ہمیں سیوستان کے حاکم کے پاس لکھ کر بھیجنا چاہیے کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم بدھ مذہب کے ماننے والے ہیں، ہمارے مذہب میں خون کا بہانا حرام ہے۔ اور یوں بھی آپ تو ایک محفوظ مقام پر ہیں، اور ہم غیر محفوظ جگہ پر ہیں، ہمیں حالات کے لحاظ سے خوف ہے کہ اگر مسلمانوں سے ہماری لڑائی شروع ہو گئی تو ہمیں سخت نقصان پہنچے گا۔ ہم نے مسلمانوں کے متعلق یہ بھی سنا ہے کہ جو ان سے امن چاہتا ہے وہ اس کو نہیں لوٹتے، اور اپنے وعدے کے نہایت پابند ہیں، اپنے مفتوحہ شہروں کی حفاظت کرتے ہیں، اگر آپ سب سمجھیں اور ہمارا مشورہ قبول کریں تو ہم آپ کے لیے اور اپنے لیے اُن سے امن کے طالب ہوں۔

موج کے شہریوں کا یہ محضر حاکم موج نے سیوستان کے حاکم کے پاس بھجوایا مگر اس نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، اور جنگ کی تیاریاں کرنے لگا۔

محمد بن قاسم موج سے روانہ ہو کر سیوستان پہنچے، جسے آج کل سیوھن کہتے ہیں اور جو سندھ کا ایک مشہور شہر ہے۔ سیوھن کے لوگوں نے جیسے ہی محمد بن قاسم کی آمد کی خبر سنی فوراً ہی قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ اس لیے کہ اس آبادی کا کثیر حصہ بدھ مذہب کا پیرو تھا جو جنگ کو ناپسند کرتا تھا۔ محمد بن قاسم نے حالات معلوم کرنے کے لیے جاسوس روانہ کیے جنہوں نے واپس آ کر اطلاع دی کہ شہر کے لوگ تو لڑنے کے لیے تیار نہیں البتہ فوجی آمادہ جنگ ہیں۔ محمد بن قاسم نے قلعہ کا محاصرہ کر کے منجنیقوں سے سنگ باری شروع کی، سنگ باری سے قلعے کے اندر کے لوگ گھبرا اُٹھے، اور بجھرائے حاکم سیوستان سے کہا ہم مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے اس لیے جنگ موقوف کی جائے، لیکن وہ نہ مانا۔ آخر شہریوں نے محمد بن قاسم سے کہلا بھیجا کہ ہم لوگ غریب کسان، بیوپاری، کاریگر اور دوسرے پیشہ ور ہیں، ہمیں لڑائی سے کوئی تعلق نہیں، ہم لوگ حاکم شہر بجھرائے سے متنفر ہیں، اس کے علاوہ آپ یقین کیجیے کہ اس کے پاس اتنی فوج نہیں جو آپ کا مقابلہ کر سکے۔ مسلمانوں کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے جنگ کو اور تیز کر دیا۔ محمد بن قاسم نے ایک ہفتے تک مسلسل شب و روز جنگ جاری رکھی یہاں تک کہ سیوھن کی فوج ہمت ہار بیٹھی اور لڑائی سے جان چرانے لگی۔ رائے بجھرائے نے جب یہ رنگ دیکھا تو سمجھ گیا اب جنگ فضول ہے۔ وہ رات کے اندھیرے میں قلعے کے شمالی دروازے سے نکل کر فرار ہو گیا اور دریائے سندھ کو عبور کر کے علاقہ بدھیہ میں پہنچا۔ اُس زمانے میں علاقہ بدھیہ کا حاکم کاکا بن کوتل[1] تھا جو بدھ مذہب کا پیرو تھا۔ اس کا پایہ تخت سیسم دریائے کنبھ[2] کے کنارے واقع تھا۔ جب کاکا رائے بجھرا (بجے رائے) یہاں آیا تو وہ اس کے استقبال کے لیے نکلا، اور نہایت احترام سے اس کو قلعے میں ٹھہرایا۔

رائے بجھرا کے بھاگ جانے پر سیوہن کے شہریوں نے اطاعت قبول کر لی اور مسلمان قلعے پر قابض ہو گئے۔ محمد بن قاسم نے کچھ دن سیوہن میں قیام کر کے آرام لیا اور ساتھ ہی ساتھ وہاں کے نظم و نسق کو درست کیا، اور جابجا نئے حاکم مقرر کیے، اور سیوستان کی فتح کی اطلاع حجاج کو بھیجی۔[3]

نماز کا اثر:

اُس زمانے میں جب کہ محمد بن قاسم سیوستان میں ٹھہرا ہوا تھا چنہ قوم نے جو سیوستان کے قرب و جوار میں آباد تھی اپنا ایک جاسوس

صاحب چچ نامے نے نیرون کوٹ سے موج کا فاصلہ تیس فرسنگ لکھا ہے، اگر سب فرسنگ کو تین میل کے برابر سمجھا جائے تو یہ فاصلہ ۹۰ میل ہو گا، جو کہ آج کل تقریباً حیدرآباد اور سیوھن کے درمیان کا فاصلہ ہے، یا جس وقت چچ نامہ لکھا گیا اُس وقت فرسنگ کا اطلاق تقریباً ڈیڑھ میل پر ہوتا ہو گا، کیونکہ 'نئن سن' حیدرآباد سے تقریباً ۴۵ میل کے فاصلے پر ہے، یا پھر چچ نامے کی عبارت میں خلل ہے، ممکن ہے کہ بجائے سی فرسنگ کے بست و سہ فرسنگ (تینتیس فرسنگ) ہو، جو کہ قریب قریب حیدرآباد اور لکی کے درمیان فاصلے کے برابر ہے، (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۶۳ تا ۴۶۷)۔

(1) چچ نامے میں یہ نام کوتک ہے، مگر بعض قدیم نسخوں میں اس کا تلفظ کوتل بھی ہے، ہم نے یہی تلفظ اختیار کیا ہے (حاشیہ چچ نامہ سندھی، ص 170 نمبر 2)۔

(2) منچھر جھیل اس زمانے میں کنبھ کہلاتی تھی اس لیے اُسے کنبھ نہر (جھیل والی نہر) کہا جاتا ہے، البتہ ہیگ (ص ۵۸) کے خیال کے مطابق سیسم وہی قصبہ "شاہ حسن" ہے، جو منچھر کے مغربی کنارے پر واقع ہے، اس کا یہ خیال محض ان دونوں ناموں کے تلفظ کی صوتی مناسبت پر مبنی ہے، جو صحیح نہیں ہے، کیونکہ 'شاہ حسن' بہت بعد کے زمانے کی بستی ہے، سیسم کے قلعے کے متعلق وثوق کے ساتھ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ منچھر جھیل کے کنارے یا قدیم مغربی نالے کے کنارے پر واقع تھا۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۶۸)۔

(3) چچ نامہ فارسی، ص ۱۱۸ تا ۱۲۰۔

حالات معلوم کرنے کے لیے محمد بن قاسم کے لشکر میں بھیجا۔ اتفاق سے جب یہ جاسوس محمد بن قاسم کے فوجی کیمپ میں پہنچا اُس وقت نماز کا وقت تھا۔ اُس نے دیکھا کہ اذاں ہوئی اور اذاں کے ساتھ ہی سارا لشکر نماز کے لیے جمع ہو گیا، سب نے وضو کیا تھوڑی دیر بعد جماعت کھڑی ہوئی، محمد بن قاسم نے امامت کی سب نے مل کر ان کے پیچھے نماز پڑھی۔ پھر اُس نے یہ بھی دیکھا کہ نماز کے ارکان ادا کرنے میں سب اپنے امام کی پیروی کرتے ہیں، اور اس کے اتباع میں ذرا بھی فرق نہیں ہونے دیتے۔ جاسوس یہ ضبط و نظم دیکھ کر بے حد متاثر ہوا، اُس نے واپس جا کر اپنی قوم سے تمام کیفیت بیان کی، اور کہا کہ میں نے ان لوگوں میں جو اتفاق و اتحاد دیکھا ہے مجھے یقین ہے کہ ان پر کوئی فتح نہیں پا سکتا۔ چنہ قوم کے لوگوں نے جب یہ سنا تو وہ بیش قیمت تحائف لے کر محمد بن قاسم کے پاس حاضر ہوئے۔ جب یہ لوگ محمد بن قاسم کے پاس پہنچے، اُس وقت کھانے کا وقت تھا، دستر خوان بچھایا جا رہا تھا، ان لوگوں نے نہایت عقیدت و محبت سے اپنے تحائف محمد بن قاسم کے سامنے پیش کیے اور بخوشی اسلام قبول کر لیا۔ محمد بن قاسم نے ان کو دیکھ کر کہا یہ قوم تو مرزوق ہے، یعنی اللہ ان کے رزق و روزی میں برکت عطا فرمائے گا، اسی وقت سے چنہ قوم کا نام مرزوق بھی مشہور گیا۔[1]

سیسم کی فتح:

سیوستان فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے رائے بجھرا کا تعاقب کرنے کے لیے سیسم کا رخ کیا۔ اوپر گزر چکا ہے کہ حاکم سیوستان بجھرائے نے اسی شہر میں پناہ لی تھی۔ محمد بن قاسم راستے میں جو بڑے بڑے شہر پڑتے تھے، ان کو فتح کرتے ہوئے کاکا کے علاقے میں بندھان[2] پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے جو سب کے سب کفار تھے متفق ہو کر ارادہ کیا کہ وہ لشکر اسلام پر شب خون ماریں۔ چنانچہ آپس میں مشورے کے بعد انھوں نے اپنے سمجھدار لوگوں کو کاکا بن کوتل کے پاس بھیجا اور اطلاع دی کہ ہمارا ارادہ ہے کہ مسلمانوں پر شبخون ماریں۔ کاکا بن کوتل جو نہایت عقلمند تھا، اور حالات زمانہ سے واقف تھا اُس نے پہلے تو اُن کی اس تدبیر کی تعریف کی اور انہیں ہمت دلائی، پھر اُس نے کہا لیکن میرا خیال ہے کہ سندھی مسلمانوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتے، لیکن پھر بھی میں تمہارے ساتھ ایک مسلح فوجی دستہ ساتھ کرتا ہوں۔ چنانچہ اس نے ایک ہزار نوجوانوں کا فوجی دستہ جو چنہ[3] قوم کے لوگوں پر مشتمل تھا اور جو ہر طرح کے ہتھیاروں سے مسلح تھا بہمن نامی ایک کھیا کے ساتھ کیا، جب یہ لوگ کاکا سے رخصت ہو کر شب خون کے لیے روانہ ہوئے تو مسلمانوں کے لشکر کے قریب پہنچ کر راستہ بھٹک گئے، اور صبح تک حیران و سرگرداں پھرتے رہے، جب صبح ہوئی تو انہوں نے اپنے کو قلعہ سیسم کے قریب کھڑا پایا۔ کاکا کے پاس پہنچ کر اپنی داستان سنائی، کاکا نے سمجھ لیا کہ تقدیر اُس کا ساتھ نہیں دے رہی، وہ فوراً اپنے سرداروں اور عمائدین حکومت کو لے کر اسلامی لشکر میں آیا، ادھر محمد بن قاسم نے بھی نباتہ بن حنظلہ نامی ایک شخص کو دریافت حالات کے لیے سیسم روانہ کیا۔ کاکا، نباتہ بن حنظلہ کو راستے میں ملا، کاکا نے شب خون کے تمام حالات اس کو سنائے، اور بتایا کہ کس طرح وہ لوگ راستہ بھٹک گئے، جس کی بنا پر اُس نے سمجھ لیا کہ تقدیر الٰہی یہی ہے کہ مسلمان اس ملک کو فتح کریں، اس لیے وہ اطاعت قبول کرنے کے لیے محمد بن قاسم کے پاس جا رہا ہے۔ نباتہ بن حنظلہ کاکا کو اپنے ساتھ لے کر محمد بن قاسم کے پاس حاضر ہوا۔ کاکا نے محمد بن قاسم کو اپنی اطاعت و وفاداری کا یقین دلایا، محمد بن قاسم بھی اس کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آئے، جس سے دونوں میں یگانگت و خلوص کا ربط پیدا ہوا اور محمد بن قاسم کو کاکا کے مشوروں سے شہروں کے فتح کرنے میں بڑی مدد ملی۔

کاکا کی سرافرازی:

محمد بن قاسم نے کاکا سے پوچھا کہ جب تمہارے ملک میں کسی عزت افزائی کی جاتی ہے تو کیا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے؟ کاکا نے کہا امتیازی نشان کرسی اور خلعت ریشمی کپڑا ہے، جو ہم سر پر پگڑی کی طرح لپیٹ لیتے ہیں، یہی ہمارے سرداروں کا شاندار لباس ہے۔ محمد بن قا

---

(1) تاریخ معصومی، ص ۲۳-۲۲۔

(2) بندھان: یہ بستی کنبھ کے کنارے پر تھی، جہاں سیسم کے قلعے پر حملہ کرنے سے پہلے محمد بن قاسم منزل انداز ہوئے تھے۔ بندھان چچ نامے کے ایک قدیم نسخے کا تلفظ ہے اور ہم نے اسی کو ترجیح دی ہے، ممکن ہے کہ اصل سندھی نام 'بندھان' ہو اور منجھیر کے کسی قدیمی بند کی وجہ سے اس بستی کا یہ نام پڑ گیا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ اصل نام بندھان ہو، چچ نامے کے بعض قدیم نسخوں میں یہ نام 'نیلھان' ہے۔ (ص ۵۸)۔

(3) چناں: اس مقام پر اور چچ نامے فارسی کے ص (۱۲۱) پر 'جناں' کا تلفظ اختیار کیا ہے لیکن چچ نامے فارسی کے بعض قدیم نسخوں میں 'چنان' ہے، تحفتہ الکرام (ج ۳، ص ۱۵) میں بتایا گیا ہے کہ یہ کاکا ذات کا 'چنا' تھا، اس لیے ہم نے جناں کے تلفظ کو ترجیح دی ہے (حاشیہ چچ نامہ سندھی، ص ۱۷۳ نمبر ۱)۔

نے کاکا کو اس ملک کے دستور کے مطابق خلعت اور کرسی سے نوازا، عت سے سر فرازی کے بعد اُس کے ساتھی بہت خوش ہوئے اور ان ے دلوں میں مسلمانوں سے خیر سگالی کا جذبہ پیدا ہوا۔ کاکا نے ان کے زبہ خیر سگالی کو محسوس کر کے انہیں امان دلائی، جو لوگ اس کے بعد ی مخالف رہے، کاکا نے اُن کے متعلق مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ انہیں زادی جائے۔ محمد بن قاسم نے عبدالملک بن قیس دسی کو اپنا نمائندہ رر کیا تاکہ وہ کاکا کے ساتھ مل کر سرکشوں کو اپنا مطیع کرے اور باغیوں سزا دے۔ کاکا نے بھی دل سے مسلمانوں کا ساتھ دیا، اس نے لمانوں کے دشمنوں پر یلغار کر کے سونا چاندی، کپڑے، جانور، غلہ اور ت سامال غنیمت حاصل کیا، جس سے اسلامی لشکر میں ہر چیز کی افراط گئی۔ محمد بن قاسم وہاں سے روانہ ہو کر سیسم کے قلعے پر پہنچے، قلعۂ سم پر دو روز تک سخت خون ریز جنگ ہوئی، جس میں رائے بجھرائے ن چندر) حاکم سیوستان اور اُس کے سردار اس لڑائی میں مارے گئے، اس کے بعض ساتھی بھطلور[1] کی طرف جان بچا کر بھاگ ئے۔ جو لوج اور قندابیل کے درمیان تھا۔ ان لوگوں نے وہاں سے ایک معافی درخواست محمد بن قاسم کی خدمت میں روانہ کی۔ یہ لوگ راجا داہر کے ف تھے، کیونکہ اس نے ان کے بعض آدمیوں کو قتل کر دیا تھا، اس ، یہ راجا داہر کے پاس جانا نہیں چاہتے تھے، محمد بن قاسم نے ان کو فی دی، ان لوگوں نے ایک ہزار درہم سالانہ بطور خراج دینا قبول کیا پنے ضامنوں کو سیوستان بھیجا، جس پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔

سیسم کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے اس علاقے پر خراج قائم کیا، وبارہ لوگوں کو امن اور حفاظت میں لینے کا حکم جاری کیا، اور آل سو میں سے دو قابل اعتماد اشخاص عبدالملک بن قیس[2] اور حمید بن انجدی کو یہاں کا حاکم مقرر کیا۔[3]

سیسم کی فتح کے بعد مغربی سندھ کے سارے علاقے پر محمد بن قاسم کا قبضہ ہو گیا، مغربی سندھ کے تمام سردار محمد بن قاسم کے حسن اخلاق اور بلند کردار سے بے حد متاثر تھے، محمد بن قاسم کے حسن سلوک کی وجہ سے یہ بات اُن کے قلب میں نقش ہو گئی تھی کہ مسلمانوں کی حکومت اُن کے لیے خدا کی رحمت ہے۔

حجاج بن یوسف کا خط:

محمد بن قاسم ابھی سیسم ہی میں تھے کہ انہیں حجاج بن یوسف کا خط ملا، جس میں اُس نے لکھا تھا، اب تم آگے بڑھنے کا خیال چھوڑ کر نیرون لوٹ جاؤ اور دریائے سندھ کو عبور کر کے داہر سے مقابلہ کرو، ساتھ ہی ساتھ ہر وقت خدا سے دعا کرتے رہو کہ خدائے تعالیٰ تم کو نصرت و کامیابی عطا فرمائے، میرا خیال ہے کہ جب تم داہر کے مقابلے میں فتح حاصل کر لو گے تو پھر بقیہ ملک کے فتح کرنے میں کوئی جھگڑا باقی نہ رہے گا۔[4]

محمد بن قاسم کا جواب:

محمد بن قاسم اس خط کے ملنے کے بعد نیرون واپس لوٹ گئے، اور نیرون کی ایک پہاڑی پر ٹھہرے، جس کے ارد گرد سبزہ تھا اور پانی وافر تھا، وہیں سے اُنہوں نے ایک خط حجاج بن یوسف کو لکھا، جس کا مضمون تھا:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خادم محمد بن قاسم کی طرف سے بعد سلام کے عرض ہے کہ خدا کے فضل سے آپ کا یہ مخلص تمام امیروں، خادموں، غلاموں اور مسلمان فوجوں اور لشکر کے ساتھ بخیریت ہے، اور ہر بات بہتر طریقے پر انجام پا رہی ہے، سب لوگ خوش ہیں۔ جناب والا کو معلوم ہو کہ ہم جنگلوں اور خطرناک راستوں کو طے کر کے سندھ کے علاقے میں پہنچے، اب ہم دریائے سندھ کے کنارے پر ہیں جس کو مہران کہتے ہیں، وہ حصہ ملک جو مقام بدھیہ کے گرد ہے اور بغرور[5] کے قلعے کے مقابل بدھیہ کی

فتہ الکرام جلد 3 ص 15 اس مقام کا نام بھطلور مذکور ہے۔

اُنامے کے تمام فارسی نسخوں میں یہ نام عبدالقیس ہے، مگر اسلام کے بعد ایک سلمان کا یہ نام ہونا غیر ممکن ہے، اس شخص کا صحیح نام غالباً عبدالملک بن قیس ہے، ی کا ذکر اس سے قبل چچ نامے فارسی ص 99 اور ص 133 میں بھی آیا ہے، جو کہ محمد قاسم کے لشکر میں موجود تھا، (حاشیہ چچ نامہ سندھی، ص ۱۷۷ انمبر ۱)

بن وداع النجدی: صحیح نام حمید بن وداع بحری ہے، چچ نامہ فارسی میں اس کا رہ ہمیں ص ۱۴۶ اور ص ۱۷۰ پر ملتا ہے، ہر جگہ اس کی نسبت النجدی ہی ظاہر ئی ہے، لیکن "النجدی" دراصل "البحری" ہے، ابن حزم نے اپنی کتاب رۃ الانساب میں ص ۳۹۸ پر لکھا ہے کہ وداع بن حمید قبیلۂ بنو بحری میں سے تھا، وہ بڑا شریف تھا، اور محاذ ہند کا امیر مقرر ہوا تھا، اس کا تذکرہ طبری 1412x2 پر بھی موجود ہے (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۵۰۸)۔

(4) چچ نامہ ص ۱۲۲ تا ۱۲۴۔

(5) چچ نامے کے فارسی ایڈیشن میں یہاں 'راور' ہے، چچ نامے کے بعض قدیم نسخوں میں 'بغرورا' 'اغرور' 'اعرور' اور 'مرور' ہے، ہم نے بغرور کو ترجیح دی ہے۔ محمد بن قاسم نے صوبۂ بدھیہ کو سیوہن پر قبضہ کرنے کے بعد فتح کیا تھا، جس کے معنی یہ

طرف جو علاقہ مہران کے کنارے واقع ہے سب پر قبضہ کر لیا گیا ہے، لیکن یہ قلعہ مملکت اروڑ کی حدود میں ہے، قلعہ ابھی تک راجا داہر کے قبضے میں ہے، جو لوگ سرکش اور مسترد ثابت ہوئے ان کو قابو میں لایا گیا ہے، اور باقی ڈر کر بھاگ گئے ہیں اور نیرون کا قلعہ بھی جو راجا داہر کی راجدھانی الور کے تحت تھا وہ بھی ہمارے قبضے میں آچکا ہے۔ سیسم اور سیوستان کا قلعہ بھی خدا کے فضل سے ہمارے قبضے میں ہے، یہاں سے داہر کے چچازاد بھائی کو مع چند بہادروں کے نکال دیا گیا ہے، امید ہے کہ اسی طرح کافروں کے تمام قلعے ہمارے قبضے میں آجائیں گے، اور ہر جگہ مسجدیں بنا دی گئی ہیں، تاکہ پانچوں وقت نماز اور عبادت ہوتی رہے، چنانچہ ان مساجد میں اذاں، نماز اور خطبے اپنے وقت پر ہوتے ہیں۔

جناب والا کے ارشاد کے مطابق ہم نیرون کوٹ لوٹ آئے ہیں فی الحال ہم نے ایک قلعے کے قریب ڈیرے ڈال دیے ہیں، یہ قلعہ سکندر کی مضبوط دیوار سے بھی زیادہ اونچا ہے۔

ہم طاقت اور پناہ کے لیے ہر وقت اللہ پر بھروسا رکھتے ہیں۔

امیر کبیر کو یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ داہر کے گورنروں میں سے ایک گورنر مہران کے مشرق کی طرف اس وادی میں جو کہ کشہا[1] (کچھ) کے سمندر کا جزیرہ ہے قلعۂ بیٹ کا والی ہے، جسے بسامی بن راسل[2] کہتے ہیں، اس کا بیٹا داہر کے مقربان خاص میں سے ہے، ہند اور سندھ کے بہت سے بادشاہ اُس کے مطیع ہیں، اور ان کے درمیان پختہ عہد نامے ہیں۔

دیبل کے جو لوگ ہم سے مل گئے ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ وہ ہمارا خیر خواہ ہے، اس نے ہم سے امیدیں وابستہ کر کے التجا کی ہے کہ ہم اس سے عہد نامہ مستحکم کریں، اگر خدا کے فضل سے یہ تدبیر کارگر ہو گئی اور وہ ہمارے ساتھ مل گیا تو ہمیں دریا کے عبور کرنے میں بڑی سہولت ہو گی اور اللہ کے حکم سے سب کچھ درست اور ٹھیک ہو گا۔[3]

حجاج بن یوسف کو جب محمد بن قاسم کا یہ خط ملا تو اُس نے فوراً ہی اُن کو جواب میں ایک خط لکھا، جس میں اُس نے تمنا ظاہر کی کہ کاش وہ مشرق کے تمام بادشاہوں پر فتح یاب ہوں، اور جنگ کے اور مفتوحہ ممالک کے متعلق مختلف ہدایتیں دیں، ہم یہ خط ذیل میں نقل کرتے ہیں:-

حجاج بن یوسف کا جواب:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیارے فرزند عزیز کریم الدین محمد قاسم! ا۔ام اللہ تمکینہ تمہارا خط جو انواع و اقسام کے تکلفات اور طرح طرح کی تعظیمات سے آراستہ تھا ملا، وہ تمام حالات جو اس خط میں درج تھے معلوم ہوئے، آخر اے بیٹے! یہ کیا ہے اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اپنی رائے، تدبیر، عقل اور سمجھ کو استعمال نہیں کرتے، اے کاش! تم مشرق کے سارے بادشاہوں

ہوئے کہ یہ علاقہ سیوہن کے آگے شمال کی طرف تھا، اس صوبے کا پایہ تخت 'کاکا راج' تھا، اس نام کی یادگار آج بھی تحصیل 'کنگر' کے نام سے موجود ہے، اس سے اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ یہ صوبہ بدھیہ دریائے مہران کے دائیں طرف اور سیوہن کے شمال میں تھا، بغرور سے مراد قلعۂ بکھر ہے، مورخ بلاذری نے بھی فتوح البلدان (ص ۴۴۰-۴۴۱) پر دو شہروں کے نام ساتھ استعمال کیے ہیں۔ جن سے اس کی مراد اروڑ اور بکھر ہی سمجھنے چاہیے (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۶۹)۔

[1] چچ نامہ فارسی میں اصل عبارت یہ ہے کہ "در بر جوے کہ جزیرۂ بحر کنبا است"، لیکن بعض قدیم نسخوں میں 'ہمبا' اور 'کشتھا' ہے، اسی تلفظ کی بنیاد پر 'کشہا' کو ترجیح دی گئی ہے، کیونکہ چچ نامے سے آگے چل کر اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ قلعہ بیٹ مہران کے دوآبے یا ڈیلٹا پر تھا، محمد بن قاسم یقیناً اسی دوآبے کا ذکر کر رہے ہیں، جو کہ مہران کے مدخل کے قریب اس کی دو شاخوں کے درمیان تھا، جو دونوں غالباً جنوب کی طرف 'میر'، 'رین' اور مغربی پران کے قدیمی پیٹوں کے آس پاس علاقہ 'کچھ' کے سامنے گرتے تھے، اسی لحاظ سے مہران کا نشیبی دوآبہ گویا 'کچھ' کے سمندر کا ایک جزیرہ تھا، اسی لحاظ سے 'کشھا' کو ترجیح دی گئی ہے، جس کے معنی 'کچھ' کے ہیں، جو بالکل قرین قیاس ہے (تعلیقات چچ نامہ سندھی ص ۴۷۰-۴۷۱)۔

[2] بسامی بن راسل: خیال ہے کہ چچ نامے میں یہ نام غلط ہے۔ بلکہ صحیح نام وسایو بن سربند ہونا چاہیے کیونکہ مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ یہ شخص قلعہ بیٹ کا حاکم اور داہر کے خاص آدمیوں میں سے تھا، لیکن اس کا بیٹا محمد بن قاسم کی طرف مائل تھا، آگے چل کر اسی چچ نامے میں ہے کہ بیٹ کا حاکم وسایو بن سربند تھا (دیکھیے چچ نامہ فارسی ص ۲۱۶) اور وہ خود اور اس کا ایک بیٹا راسل دونوں داہر کے وفادار تھے اور اسی وجہ سے وہ اپنے ایک بیٹے موکو کے مخالف تھے (دیکھیے چچ نامہ ص ۱۶) لیکن موکو ابتدا ہی سے محمد بن قاسم کی طرف مائل تھا، اور آخر کار اُن کے ساتھ شامل ہو گیا، اور اُن کی اطاعت قبول کر لی (دیکھیے چچ نامہ ص ۱۸۴-۱۸۷-۹۹)۔ ان تمام تواریخی شواہد سے یہ پتا چلتا ہے کہ یہاں صحیح نام "بسامی بن راسل" بجائے وسایو بن سربند ہونا چاہیے، 'بسامی' شاید 'وسایو' کا بگڑا ہوا تلفظ ہے، کاتب یا چچ نامے کے فارسی مترجم نے سہواً 'وسایو' کے باپ 'سربند' کی جگہ اس بیٹے 'راسل' کا نام لکھ دیا ہے (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۷۲)۔

[3] چچ نامہ فارسی ص ۱۲۶-۱۲۵۔

کو مغلوب کرو، اور کافروں کے شہروں کو برباد کرو، تم اس مہم پر غالب آنے سے کیوں عاجز ہو؟ اور دشمنوں کے شر کا ازالہ کر کے کیوں ان پر مسلط نہیں ہوتے، امید ہے کہ اُن کے مکارانہ منصوبے ناکام ہوں گے، وہ (کفار) لشکر اسلام سے مدافعانہ جنگ کے منصوبے مرتب کر رہے ہیں، تم قوی دل رہو، اور جس قدر بھی مال خرچ کر سکو، کرو اور مخالفوں کے حق میں بخششوں اور انعامات کی بارش کرو، جو کوئی بھی جاگیر یا ملک طلب کرے تم اسے ناامید نہ کرو، بلکہ ان کی التجاؤں کو قبول کر کے اپنے فرامین اور امن ناموں سے ان کو تسلی دو، کیونکہ سلطنت حاصل کرنے کے چار طریقے ہیں۔ اول صلح، ہمدردی، چشم پوشی اور رشتہ داری۔ دوسرا مال کا خرچ کرنا، انعامات اور عطیے دینا۔ تیسرا دشمنوں کی مخالفتوں کے طوفانوں میں صحیح رائے قائم کرنا، اور اُن کے مزاج کو معلوم کرنا۔ چوتھا رعب، ہیبت، دلیری اور قوت اور دبدبہ۔ تمہیں ہر طرح سے ان دشمنوں کو دفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور جو التماس بادشاہ کریں انہیں موثق عہد ناموں سے تسلی دو۔ جب وہ تمہاری خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اوپر خراج مقرر کر لیں، تو پھر وہ جو بھی نقد یا سامان خزانے میں پہنچائیں تم اسے قبول کرو، اور ہر ایک کو تسلی دیتے رہو، اگر کسی کو قاصد بنا کر بھیجنا چاہو تو وہ شخص ایسا ہونا چاہیے کہ اس کی عقل، مذہب، دور اندیشی، ذہانت اور امانت پر تمہیں اعتماد ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی غلط آدمی کے بھیجنے کی وجہ سے اس کی گفتگو اور بات چیت سے کوئی نقصان پہنچ جائے، خود کو دشمنوں کے مکر، آفت، دھوکے اور بد عہدی سے محفوظ رکھو۔ ضروری کاموں کی تکمیل میں دور اندیشی اور ہوشیاری کے شرائط بجالاؤ، اور داہر سے خبردار رہو، اور جب بھی تم اپنا معتمد اور معتقد (کہیں) روانہ کرو تو اسے وصیت کرو کہ وہ دشمن کے میل جول اور ہم نشینی سے کہیں بدل نہ جائے، اور اسے خیر خواہی کے شرائط وضاحت سے بتاؤ کہ اگر وہ پیغام پہنچانے کے لیے راجا کے سامنے جائے تو وہ تمام سرداروں اور اراکین دولت کے سامنے بے خوفی سے پیغام دے اور اس کا جواب بھی اچھی طرح سنے، اور اپنے قاصدوں کی ہمت دلکش وعدوں سے بڑھانی چاہیے، اور انہیں بتانا چاہیے کہ تم سارے اسلامی لشکر کے پیشوا اور امام ہو، اور سب تمہاری بات پر آنکھ لگائے ہوئے ہیں، اس لیے ہمیں چاہیے کہ پیغام کو پوری طرح پہنچاؤ، مسلمانوں کا قاصد پاک مذہب لاہونا چاہیے کہ بات کو پر شکوہ اور بغیر کسی کمی بیشی کے ادا کرے اور ان توحید پر ایمان لانے کی دعوت دے، اور انہیں بتائے کہ جو اللہ کی حدانیت کو تسلیم کر کے اطاعت کرے گا، اُسے مال، شہر، زمین اور کھیت عطا کیے جائیں گے، اور جو اسلام کے سامنے سر نہ جھکائے تو اُسے دھمکی دو تاکہ وہ فرمانبردار ہو جائے، اگر اس کے باوجود اطاعت سے سرکشی کرے تو پھر اس سے صاف کہہ دو کہ تم نے اطاعت سے منہ موڑا ہے، اس لیے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ لیکن داہر اور اس کے لشکر کو دریائے مہران (سندھ) عبور کرنے کا اختیار نہ دو، بلکہ ان سے کہو کہ اگر تم تیار ہو تو پھر تمہارے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہے، لیکن چونکہ ہم اتنا طویل راستہ طے کر کے آئے ہیں، اس لیے ہمیں مہران کو عبور کرنا، اور بغیر روک ٹوک کے مقابلے میں آنا ہے، تاکہ طرفین کے درمیان شک و شبہ اور یہ خار خار نہ رہے، جس جگہ بھی دشمن کا مقابلہ کرو وہ جگہ کشادہ میدان ہونی چاہیے، تاکہ مرد مرد کو اور سوار سوار کو برابر جولاں دیکھ سکے۔ یہ سب کچھ ہونے پر بھی جب جنگ شروع کرو تو اللہ تعالیٰ کے کرم پر توکل کرو، اور اُس کی رسی کو مضبوط پکڑو، اور دیکھو کہ قضا و قدر پردۂ غیب سے کیا ظاہر کرتی ہے، اور وہاں سے کس فریق کی بادشاہی ختم ہونے کا حکم جاری ہوتا ہے، اور اگر وہ پیغام بھیجیں کہ دریائے مہران سے تم گزرتے ہو یا ہم گزریں تو انہیں اختیار نہ دینا بلکہ کہنا کہ میں عبور کر کے آتا ہوں، تاکہ تمہارا رعب اور ہیبت دشمنوں پر اثر انداز ہو، اور وہ پکار اٹھیں کہ اگر لشکر اسلام میں قوت و طاقت نہ ہوتی تو یوں بے دھڑک ہمارے مقابلے کے لیے نہ آتا۔

اس کے علاوہ یہ کہ لشکر عرب کی جو جماعت تمہاری اطاعت میں ہے، امید ہے کہ وہ لوگ پیٹھ نہ دکھائیں گے، اور جنگ سے منہ نہ موڑیں گے بلکہ جان کی بازی لگا دیں گے، اور خدا پر بھروسا کر کے شوق سے جنگ لڑیں گے اور ثابت قدم رہیں گے، وہ لڑائی میں اور تمہاری اطاعت میں مخلص ثابت ہوں گے تاکہ خدائے عزوجل کی رضا حاصل کر سکیں، دریا کو ایسی جگہ سے پار کرنا، جہاں تم مضبوطی سے قدم جما سکو، اور سیدھی سادھی راہوں سے بھی سمجھ بوجھ کر گزرنا، اور طریقہ حزم و احتیاط کو ہاتھ سے نہ جانے دینا، گزرتے وقت لشکر کو محتاط رکھنا، اور لشکر کا میمنہ، میسرہ، قلب، مقدمہ اور ساقہ سیدھا رکھنا، اور پیادوں اور اکیلوں کو پہلے بھیجنا، اور کسی بھی برگستوانی[1] کو درمیان میں نہ رکھنا۔

حجاج بن یوسف کے اس خط کے پہنچنے کے بعد محمد بن قاسم جنگ کا پختہ ارادہ کر کے دریا کو عبور کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔[2]

---

(1) برگستوان: ایک قسم کی زرہ ہوتی ہے۔ جو کہ جنگ کے وقت گھوڑوں کو پہناتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ زخموں سے محفوظ رہتے ہیں۔

(2) چچ نامہ فارسی ص ۱۲۷ تا ۱۳۰۔

محمد بن قاسم نیرون سے چل کر ایک منزل پر خیمہ انداز تھے کہ شمنی راسل کے بزرگوں اور قوم بھٹی کے کچھ سربراہوں نے حاضر ہو کر امان طلب کی، محمد بن قاسم حجاج کے حکم کے مطابق جواب دے کر اور اقرار مستحکم لے کر اشبہار کے قلعے کی طرف روانہ ہوئے۔[1]

قلعۂ اشبہار کی فتح:

محرم ۹۳ھ (۱۲-۷۱۱ء) میں محمد بن قاسم قلعۂ اشبہار[2] پہنچے، یہاں کے لوگوں نے کافی جنگی تیاریاں کر رکھی تھیں اور اس کے چاروں طرف خندق کھودی تھی، وہ قلعے کے مغرب میں رہنے والے جتوں اور دیہاتیوں کو بھی قلعے میں لے آئے تھے، محمد بن قاسم نے اُن سے جنگ شروع کر دی اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا، یہ محاصرہ تقریباً ایک ہفتہ تک رہا، اس عرصہ میں اہل قلعہ کو اندازہ ہو گیا کہ مسلمانوں کی فوج زیادہ ہے اور ہم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے، آخر میں انہوں نے امان طلب کی، محمد بن قاسم نے ان کی درخواست منظور کر لی، اور اُن پر سالانہ ٹیکس لگا کر حاکم مقرر کر دیا، پھر کچھ دن یہاں آرام لے کر دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر راوڑ کی حدود میں منزل انداز ہوئے، یہاں ان کی جنگ بیٹ کے حاکم جاہین[3] سے ہوئی۔

راجا راسل کے جواب کا انتظار:

دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر پہنچ کر وہ اپنے خط کا انتظار کرنے لگے، جس میں انہوں نے راجا راسل کو لکھا تھا کہ صوبہ کچھ اور جورتہ (سورتھ) کی حکومت تم کو دی جاتی ہے، اور اُن پر تمہاری حکومت تسلیم کی جاتی ہے۔ جب راسل کا کوئی جواب نہ آیا تو انہوں نے اس کے بھائی موکو بن وسایو کو یہی شرائط لکھے جو سورتہ کا حاکم تھا، موکو نے جواب میں لکھا کہ آپ نے جو وعدہ مجھ سے فرمایا ہے میں اس کا شکر گزار ہوں، اور میں آپ کی اطاعت دل و جان سے چاہتا ہوں بلکہ اپنے ظن میں بہتر سمجھتا ہوں لیکن اگر کسی بہانے سے یہ حادثہ پیش آئے تو پھر ہم حکم کا تابع رہنا لازمی سمجھیں گے، لیکن جن بادشاہوں کے نمک کا حق ہم خدمتگاروں پر لازم ہے، اُن سے عہد شکنی اور بیوفائی کرنا ایسا گناہ اور خیانت ہے کہ جو دور اندیشی اور امانت سے بعید ہے، اور جب تک مخالف کی طاقت سے ایسا خوف پیدا نہ ہو جو کہ نفس اور جان کے لیے خطرہ بن جائے اُس وقت تک امانت اور دور اندیشی سے کنارہ کش ہو جانا ناپسندیدہ طریقہ ہے۔

مزید یہ کہ ملک سندھ ہمارا وطن اور ہمارے آباء و اجداد کا ورثہ اور حاصل کیا ہوا ہے، راجا داہر ہمارا عزیز ہے، اگر وہ سربلند ہو گا تو اس کی سربلندیوں میں ہمارا بھی حصہ ہو گا، اس کے آرام اور تکلیف میں شریک ہونا ہمارا فرض ہے، لیکن یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یہ ملک ہمارے ہاتھ سے نکل کر دوسروں کے پاس جانے والا ہے، عقل مند انسان وہ ہے جو موقع سے فائدہ اٹھائے۔

آپ نے چونکہ مجھ پر بھروسا کیا ہے اور فیاضی سے پیش آئے ہیں، اس لیے اس کا تقاضا ہے کہ میں بھی آپ کا ساتھ دوں لیکن اگر میں بغیر جنگ کے آپ کے ساتھ ہو جاؤں تو اپنے خاندان اور لوگوں کی نظر میں ذلیل ہو جاؤں گا، اس کی تدبیر جو میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ میں اپنی لڑکی کی شادی کے بہانے سے ساکرا جاتا ہوں، آپ ایک ہزار سپاہی بھیج کر مجھے گرفتار کر لیجیے۔

چنانچہ اس تدبیر کے مطابق عمائدین کے ساتھ موکو روانہ ہوا، محمد بن قاسم نے نباتہ بن حنظلہ کو ایک فوجی دستے کے ساتھ ساکرا روانہ کیا، نباتہ نے موکا کو گرفتار کر کے محمد بن قاسم کے سامنے پیش کیا، گرفتار ہونے والوں میں اُس کے خاندان کے علاوہ بیس ٹھاکر بھی تھے۔

راجا موکو کی سرافرازی:

جب موکو کو اس کے خاندان اور سرداروں کے ساتھ محمد بن قاسم کے سامنے پیش کیا گیا تو محمد بن قاسم اس کے ساتھ نہایت احترام اور عزت کے ساتھ پیش آئے، انہوں نے اس کو فوراً کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دی، اور ایک لاکھ درہم بطور انعام اس کو دئے اور خلعت سے سرفراز کیا، پھر اس کو ایک سبز چتر جس پر مور بنا ہوا تھا دیا۔ اُس کے

---

(1) چچ نامہ فارسی، ص ۱۳۲۔

(2) اشبہار کے آخر میں بہار کے لفظ سے ظاہر ہے کہ اس قلعے کے قریب بھی کوئی بدھ دھرم کا مندر تھا، ٹنڈہ محمد خان کے قریب "یودہ جانکہ" (بدھ کی پہاڑیاں) قدیم آثار ہیں، اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ قلعہ بھی یہیں کہیں واقع ہو گا (تعلیقات چچ نامہ سندھی ص ۴۷۳)۔

(3) اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ جاہین داہر کی طرف سے دیبل کا حکمران تھا، اور وہاں سے بھاگ نکلا تھا، (دیکھیے چچ نامہ فارسی ص ۱۰۵) مندرجہ بالا لڑائی سے گمان ہوتا ہے کہ بعد میں داہر نے محمد بن قاسم کا مقابلہ کرنے کے لیے جاہین کو قلعۂ بیٹ کا حکمران مقرر کیا تھا اور اُسے حکومت کے بھی کلی اختیارات دے دیے تھے، جس کی تصدیق چچ نامے کی عبارت ص ۱۴۴ سے بھی ہوتی ہے، لہٰذا یہاں "حاکم" سے مراد کمانڈر یا سپہ سالار لینی چاہیے، کیونکہ "بیٹ" کا حکمران یا والی وسایو بن سربند اور اُس کے دو بیٹے مرکو اور راسل تھے (دیکھیے چچ نامہ فارسی ص ۱۵۷)* (تعلیقات چچ نامہ سندھی ص ۴۷۳)۔

خاندان کے لوگوں اور ٹھاکروں کو بھی خلعت اور گھوڑے عطا کیے گئے، اس کے علاوہ بیٹ کے علاقے کی حکومت بھی موکو کے سپرد کی گئی، اور مزید نوازش یہ کی کہ ایک تحریری فرمان جاری کیا کہ بیٹ کی حکومت نسلاً بعد نسل اُس کے خاندان میں قائم رہے گی۔[1]

مورخین کا بیان ہے کہ موکو کو جو انعام دیا گیا، یہ اپنی قسم کا پہلا عطیہ تھا جو عربوں نے دیا، اور اُس کی درخواست پر قصبہ[2] وجورتہ کی اراضی بھی بطور ملکیت پروانہ لکھ کر اس کو اور اس کے فرزندوں کو تفویض کی اور اسے کشتیاں فراہم کرنے کی وصیت کی۔

راجا داہر کی تیاریاں:

اس کے بعد محمد بن قاسم دریائے سندھ کو عبور کرنے کی فکر میں تھے کہ داہر کو معلوم ہوا کہ اُس کے حاکم اس سے بغاوت کر کے مسلمانوں سے ملتے جا رہے ہیں۔ داہر کو یہ معلوم ہو کر نہایت غصہ آیا اور اس نے ایک لشکر جرار مسلمانوں کے مقابلے کے لیے بھیجا جو دریائے سندھ کو عبور کر کے مسلمانوں کا مقابل ہوا، مسلمانوں نے بھی اس لشکر کا نہایت بہادری سے مقابلہ کیا، اور داہر کے لشکر کے دانت کھٹے کر دیے، یہاں تک کہ داہر کا لشکر شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔[3]

مولانا اسلامی کی سفارت:

محمد بن قاسم نے مناسب سمجھا کہ اس سے قبل کہ لڑائی شروع کی جائے ایک سفارت راجا داہر کے پاس روانہ کی جائے تا کہ وہ اس سے بات چیت کرے، ممکن ہے کہ اس گفتگو سے کوئی بہتر نتیجہ نکل سکے، اس بات چیت کے لیے انہوں نے شام کے ملک کے ایک صاحب کو جو شامی کہلاتے تھے اور مولانا اسلامی کو جو دیبل کے رہنے والے تھے جنہوں نے محمد بن قاسم کے ہاتھ پر اسلام قبول کر کے مولانا اسلامی کا خطاب پایا تھا راجا داہر کے دربار میں بھیجا۔ جب مولانا اسلامی اور شامی دونوں کے دونوں راجا داہر کے دربار میں پہنچے تو داہر کے دربار کے رواج کے مطابق ان دونوں نے نہ اُس کے سامنے سر جھکایا اور نہ سجدہ کیا۔ راجا داہر کو اس پر بہت غصہ آیا، اُس نے مولانا اسلامی سے کہا جنہیں وہ پہلے سے بھی اچھی طرح سے جانتا تھا کہ تم شاہی آداب کیوں نہیں بجالائے، حالانکہ تم اس ملک کے باشندے ہو، اور شاہی آداب سے واقف ہو، کیا تم کو اس سے روک دیا گیا ہے؟ مولانا اسلامی نے جواب دیا خدا کے فضل سے میں مسلمان ہو چکا ہوں، جب تک میں آپ کے طریقے پر تھا اور آپ کی رعایا میں تھا میں آپ کے دربار کے آداب بجالانا ضروری سمجھتا تھا، اب میں مسلمان ہوں، ہم مسلمان سوائے اللہ کے کسی کے سامنے سر جھکانا جائز نہیں سمجھتے۔ داہر کو یہ سن کر اور بھی غصہ آیا اس نے کہا کہ اگر تم ایلچی بن کر نہ آئے ہوتے تو میں تم کو ضرور قتل کرا دیتا۔ مولانا اسلامی نے کہا کہ میرے قتل سے عربوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ میرے خون کا بدلہ مسلمان اس طرح لیں گے کہ جس کا اندازہ آپ نہیں کر سکتے۔

یہ بات چیت ختم ہوئی، اب شامی نے اُن سے کہا کہ ہم اپنے سردار محمد بن قاسم کے قاصد ہیں اور تمہیں اُن کا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں۔ داہر نے کہا کہو تم کیا پیغام لے کر آئے ہو، قاصد کا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ اس پیغام کو پہنچا دے، جس کو وہ لے کر آیا ہے۔

شامی نے کہا تمہیں دو باتوں میں سے ایک بات اختیار کرنی چاہیے یا تو تم دریا عبور کر کے ہمارے پاس آؤ، اس صورت میں تمہارے لیے راستہ چھوڑ دیا جائے گا، اور تمہیں روکا نہیں جائے گا، یا پھر ہمارے لیے راستہ چھوڑ دو تا کہ مسلمان فوج دریا کو عبور کر کے تمہارا مقابلہ کرے۔[1]

داہر کا مشورہ:

داہر نے یہ سن کر اپنے وزیر سیا کر سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ وزیر نے کہا حضور میری رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو دریا

---

(1) چچ نامہ، ص ۱۲۵۔

(2) فارسی متن چچ نامے میں قصبے کی بجائے "زمین قصبہ" ہے، لیکن چچ نامے کے چھ قدیم نسخوں میں "ولایت قصبہ وجورتہ" ہے، اور ایک نسخے میں "ولایت قصبہ جورتہ" ہے، اس لیے ہم نے وجورتہ ہی کو ترجیح دی ہے، موکو کا باپ وسایو، دریائے مہران کے جزیرے یعنی دوآبے یا ڈیلٹا، بیٹ کا والی تھا اور محمد بن قاسم نے موکو کو اسی بیٹ کا علاقہ اور ساتھ ہی ساتھ "قصبہ وجورتہ" کا ملک بھی دیا تھا، (دیکھیے چچ نامہ ص ۱۳۶) پھر چچ نامہ فارسی کے صفحہ ۱۵۳ پر ہے کہ اس قصبہ وجورتہ کا علاقہ ریگستان تھا، چنانچہ سندھ کا ریگستانی علاقہ جنوب مشرق میں تھرپارکر کا حصہ ہے۔ چچ نامہ فارسی میں اس قصبے کا نام وجورتہ ہے، لفظی اصلیت کے اعتبار سے یہ لفظ "وگورتہ" ہو سکتا ہے، جو ممکن ہے کہ وہ مہرانی اور تھرو الا ہی خطہ ہو، جسے آجکل وگھو کہا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (تعلیقات چچ نامہ سندھی ص ۴۷۳ تا ۴۷۲)۔

(3) یعقوبی جلد اول مطبوعہ لیدن۔ ص 346۔

(1) چچ نامہ ص ۱۳۶ تا ۱۳۷۔

کے اس پار آنے دیا جائے، کیونکہ دریا کے اس طرف تمام ہمارا علاقہ ہے، جب وہ ہمارے علاقے میں آجائیں گے تو دریائے سندھ اُن کے پیچھے ہوگا، جب ہماری فوجوں سے اُن کا مقابلہ ہوگا تو غلہ اور ہتھیار سب ہمارے پاس موجود ہیں اور دریا کے اُس طرف سے مسلمانوں کو کوئی مدد نہیں مل سکتی، اس طرح ہماری فتح یقینی ہے۔

علافی سردار سے مشورہ:

راجا داہر نے اپنے وزیر سیاکر سے اس مشورے کے بعد کہ ہمیں دریا کو پار کر کے دشمن کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے، پھر خاندان علافی کے سردار کو بلایا جو اسلامی حکومت کا باغی تھا، اور راجا داہر کے یہاں پناہ لیے ہوئے تھا۔ داہر نے علافی سردار کو ساری بات بتاتے ہوئے اپنے وزیر کی رائے بھی بتائی، پھر پوچھا کہ اب تم مجھے بتاؤ کہ کیا کرنا چاہیے۔ علافی سردار نے کہا حضور! میرے خیال میں آپ کے وزیر کی رائے صحیح نہیں، کیونکہ وہ مسلمانوں کی عادات و طبائع سے واقف ہی نہیں۔ اول تو محمد بن قاسم بڑی فوج لے کر آیا ہے، جس میں بڑے بڑے بہادر اور جواں مرد ہیں، دوسرا یہ کہ مسلمان جب لڑائی کے لیے نکلتے ہیں تو وہ سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلتے ہیں، ان کا بھروسا صرف خدا پر ہوتا ہے، اور وہ ہر وقت خدا سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ الٰہی! ہم تیرے بندے ہیں، تیرے دین کے پھیلانے کی خاطر لڑائی کے میدان میں آئے ہیں، الٰہی! ہمیں اس لڑائی میں شہادت اُس وقت عطا فرما کہ جب کہ ہم اپنے سے دوگنوں کو مار لیں۔ جب یہ لوگ دشمن کے مقابلے میں آتے ہیں تو وہ اس قدر بہادر ہوتے ہیں کہ لڑائی سے منہ پھیرنا نہیں جانتے تاوقتیکہ وہ اپنے دشمن کو پسپا نہ کر دیں، میری رائے میں انہیں دریا کے اُس پار ہی رہنے دیجیے، اور کشتی کے ملاحوں، جتوں اور علاقے کے دوسرے لوگوں کو حکم دیجیے کہ وہ غلہ، لکڑی اور دوسری کھانے پینے کی چیزیں اُن کے لشکر میں نہ پہنچائیں، اور اُن پر معیشت کو تنگ کریں، شاید اس تدبیر سے کوئی بہتر صورت نکل آئے۔[1]

داہر کا جواب:

داہر نے اپنے عمائدین سے مشورہ کرنے کے بعد محمد بن قاسم کے قاصدوں کو جواب دیا کہ تم جا کر محمد بن قاسم سے کہہ دو کہ مجھے تمہاری کوئی بات منظور نہیں، میرا اور تمہارا فیصلہ تلوار ہی سے ہوگا، دریا کے پار کرنے میں تم کو اختیار ہے، اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا خواہ تم آؤ یا ہم آئیں، ہم ہر وقت لڑائی کے لیے تیار ہیں۔

اراکین وفد یہ جواب لے کر واپس لوٹ گئے اور سارا واقعہ محمد بن قاسم سے بیان کیا۔ ادھر داہر نے بھی فوجی تیاری شروع کر دی، اور اُس نے دریائے سندھ کے قریب اپنی فوجیں جمع کیں۔ اُدھر محمد بن قاسم کوچ کر کے دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر راوڑ کے قلعے کے مقابل خیمہ زن ہوئے اور حجاج کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

حجاج کا خط:

چند ہی روز کے بعد محمد بن قاسم کو حجاج کا خط[2] ملا، جس میں لکھا تھا کہ:

"تم نے دریائے سندھ کو عبور کرنے اور داہر کے ساتھ لڑائی کے متعلق لکھا ہے، مجھے خدا کے فضل سے امید ہے کہ تم ضرور کامیاب اور فتحمند ہوگے اور تمہارا دشمن داہر ذلیل ہوگا، کیونکہ پانچ وقت کی نمازوں میں اور خلوت و جلوت میں ایسا کوئی بھی وقت نہیں گزرتا کہ جس میں تمہارے لیے غائبانہ دعا کی امداد نہ کی جاتی ہو کہ خدائے تعالیٰ تمہیں کافروں پر فتح نصیب کرے، اور تمہارے دشمن ذلیل اور خوار ہوں، ازل میں جو حکم مقدر ہو چکا ہوتا ہے، پردۂ مراد سے بھی وہی ظاہر ہوتا ہے اور وہی ہوتا ہے، میں خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں نہایت تضرع وزاری سے عرض کرتا رہتا ہوں کہ اے خدا! تو ایسا بادشاہ ہے کہ تیرے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے، لشکر اسلام کو اس کی حیثیت سے زیادہ قوت اور کامیابی عطا کر۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے امید ہے کہ تم مقصد حاصل کر کے ہم سے آملو گے، البتہ یہ ضروری ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو دریا کو عبور کرو، اور تائید الٰہی کی التجا کرتے رہو، اور اس کی رحمت کو اپنے لیے پناہ جانتے رہو، تاکہ وہ اپنی عقلوں پر غرور کرنے والے مشیروں سے تمہیں محفوظ رکھے۔ جب تم دشمن کے مقابل ہو تو رضائے الٰہی پر بھروسا کرتے ہوئے اپنی پوری شجاعت اور ہمت کا مظاہرہ کرو، کیونکہ فتح اور تائید الٰہی تمہارے ہمرکاب اور قوت تمہارے ساتھ اور مددگار ہے، اور فرشتوں کی امداد اور مسلمانوں کی تلوار تمہاری طرف سے ان مخالفوں پر مسلط ہے،

---

[1] چچ نامہ ۱۳۷ تا ۱۳۹۔

[2] یہ اس خط کا خلاصہ ہے جو تفصیل سے چچ نامہ ص ۱۴۱ تا ۱۴۳ پر منقول ہے۔

خدائے عزوجل اُن کی خبیث ذات کو مسلمانوں اور فرشتوں کی تلواروں اور نیزوں کی خوراک بنائے گا۔ غضب الٰہی کا دروازہ ان کے لیے کھلا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ پورے انتقام اور عبرتناک انجام کے سزاوار ہوں گے۔

جس وقت دریائے مہران (سندھ) کو عبور کرنا چاہو تو دریا کے گھاٹ کو اچھی طرح دیکھ لینا، اور دریا پار کرنے کا مکمل انتظام رکھنا، پہلے اس ملک کے ملاحوں کو جو کشتیوں پر ہوں، اپنے پختہ وعدوں سے اپنا مطیع و مخلص بنانا اور اُنھیں اچھی طرح پہچان لینا، پھر دریا کو پار کرنا، چونکہ پانی تمہاری پشت پر ہوگا، لہٰذا اس طرف سے تمہارے لیے دشمن کا کوئی خوف نہ ہوگا اور تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے گی۔ اس کے بعد جب تم اُن کے گاؤں اور شہروں اور قلعوں میں داخل ہوگے، تو کسی شخص کی بھی یہ مجال نہ ہوگی کہ وہ تم سے جنگ کر سکے، اور وہ ہرگز تمہاری سمت رخ نہ کریں گے، اور اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالیں گے وہ جس قلعے کو بھی پناہ بنا کر اپنا سہارا بنائیں گے، اس پر جس وقت تمہاری نظر پڑے گی، اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت سے اس کے دروازے کھل جائیں گے، اور ان کے دلوں پر تمہاری تلواروں کی ہیبت کا ایسا رعب اور خوف غالب ہو جائے گا کہ کوئی بھی ہتھیار ان کے کام نہ آئے گا اور یہی رعب تمہیں فتح مند اور کامیاب کرے گا۔ جب وہ بھاگیں تو فوراً اُن کے اسباب اور خزانے پر قبضہ کرنا، لیکن خود کو اُن کے دھوکے اور فریب سے بچانا، پھر ہر ایک کو اسلام کی طرف بلانا، اور جو اسلام سے مشرف ہو، اس کی تربیت کرنا، اس طرح کہ وہاں کوئی دین کا دشمن باقی نہ رہے کہ جس کا خون تمہاری تلواروں کے لیے مباح ہو۔"

یہ دعا کہ جس کا میں ورد کرتا ہوں، ہر وقت پڑھتے رہنا۔ بسم الله الرحمٰن الرحيم۔ اللهم انا نسئلك ذلك بانك انت الله الحيي القيوم لاتاخذه سنته ولانوم، لك مافي اسموات ومافي الارض، من ذا الذي يشفع عندك الا باذنك تعلم ما بين ايذينا و ما خلفنا ولايحيط بشئي من علمك الا بما شئت، وسع كرسيك السموات و الارض ولا يؤدك حفظهما، وانت العلي العظيم۔ و بانك انت الاحد الصمد لم يلد و لم يولد ولم يكن له كفواً احد۔ بوجهك الكريم رب الوجوه و خالق الوجوه وقاهر الوجوه و القادر على الوجوه لك الخير و الكرم و الكمات التامات فارزقنا مع ذلك شكراً لنعمتك و معرفته لحقك و عملاً برضواتك و السلام عليك و رحمته الله و بركاته و كتبه حمران في سنه ثلاث و تسعين۔

(ترجمہ) اے پیارے اللہ! ہم تجھ سے یہ اسی وجہ سے طلب کرتے ہیں کہ تو ہمیشہ زندہ اور ہمیشہ قائم رہنے والا اللہ ہے جس پر کوئی اونگھ یا نیند طاری نہیں ہوتی، آسمان اور زمین پر جو کچھ بھی ہے، وہ تیرا ہے، ایسا کون ہے کہ جو تیری اجازت کے بغیر تیرے پاس سفارش کرے؟ جو بھی ہمارے سامنے اور پیچھے ہے وہ تو جانتا ہے، اور تیری مرضی کے بغیر ہم تیرے علم میں سے کسی چیز کو بھی نہیں سمجھ سکتے، تیری حکومت آسمانوں اور زمینوں پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کی حفاظت تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچاتی، اور تو غالب اور عظیم ہے، اور اس وجہ سے کہ تو واحد اور بے نیاز ہے، جس نے نہ کسی کو جنا ہے اور نہ کسی سے تولد ہوا ہے، اور نہ جس کا کوئی ثانی ہے (ہم تجھ سے طلب کرتے ہیں) تیری مقدس ذات کے طفیل جو ساری ذاتوں کا رب اور ساری ذاتوں پر غالب اور ساری ذاتوں کا خالق اور ہر ذات پر قادر ہے، بھلائی، احسان اور مکمل کلمے تیرے بس میں ہیں، اُن کے ساتھ ہمیں اپنی نعمت کا شکر، اپنے حق کی معرفت اور اپنی رضامندی پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔

تجھے خدائے تعالیٰ کی رحمت، سلامتی اور برکت حاصل ہو۔

نوشتہ

حمران ۹۳ھ [1]

---

[1] نوشتہ حمران ۹۳ھ: اس خط کے آخر میں کاتب کا نام اور سن کتابت درج ہے، خط کا کاتب "حمران" غالباً حمران بن ابان ہے، جس کی مختصر سوانح حیات یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضہ کے زمانے میں جب خالد بن ولید رضہ کی سرکردگی میں اسلامی لشکر نے "عین التمر" فتح کیا اُس وقت قریب کے ایک گاؤں میں بچے املا کی تعلیم حاصل کر رہے تھے، حمران بھی ان میں شامل تھا، اپنے بڑوں کے ساتھ یہ بچے بھی جنگی قیدیوں کی حیثیت سے نظر بند ہوئے، حمران کو حضرت عثمان رضہ نے خرید کر آزاد کیا اور اسے فن کتابت کی تعلیم دلائی، پھر وہ حضرت عثمان رضہ کے زمانے میں کاتب اور حاجب کی حیثیت سے مقرر ہوا، اور شروع میں حضرت عثمان رضہ کی مہر بھی اس کی تحویل میں رہا کرتی تھی، اس کے بعد وہ حضرت عثمان رضہ کی جانب سے بصرے کا حاکم مقرر ہوا، زیاد کی گورنری کے

حجاج کے اس خط کے پڑھنے کے بعد محمد بن قاسم نے اپنے ساتھیوں کے سامنے ایک تقریر کی اور داہر سے جنگ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے کہ اتنے میں حجاج کا دوسرا خط ملا۔

حجاج کا دوسرا / اگلا خط:

اس خط میں لکھا تھا کہ مجھے اندازہ ہوا ہے کہ تمہارے دشمن کے سر میں غرور کی ہوا بھری ہوئی ہے، لیکن اس سے خوف نہ کرنا، اگر وہ صلح کرے اور خراج دارالخلافہ پہنچائے تو ٹھیک ہے۔

تم نے جو داہر سے جنگ کرنے کی اجازت طلب کی ہے، تو تمہیں دریا کو ایسے مقام سے عبور کرنا چاہیے، جہاں کیچڑ یا دلدل نہ ہو، اور لشکر کو دریا عبور کرنے میں کوئی تکلیف نہ پہنچے، بلکہ تم مجھے اوپر سے نیچے بارہ میل تک دریا کی لمبائی اور چوڑائی کا نقشہ بنا کر بھیجو، اور اس میں گھاٹ اور کناروں کی نشان دہی کرو، اس کے بعد جس مقام کو میں پسند کروں، وہاں سے دریا کو عبور کرو۔

اس خط کے بعد محمد بن قاسم نے موکو بن وسایو کو بلا کر کہا کہ دریا کے پار کرنے کی کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔

داہر کا سامنے آنا:

داہر کو جب خبر ملی کہ محمد بن قاسم جیور کے سامنے اپنے سارے لشکر کے ساتھ خیمہ زن ہے تو وہ ہاتھی پر سوار ہو کر دریا کے کنارے کی طرف روانہ ہوا، اور اسلامی لشکر کے سامنے جا پہنچا، دریائے مہران دونوں کے درمیان میں تھا اور اُس وقت محمد بن قاسم اپنے لشکر کو جنگ کے لیے تیار کر رہے تھے۔

شامی کی شہادت:

اُس وقت ایک شامی نے جو ماہر تیر انداز تھا، راجا داہر کو دریا کے اُس کنارے پر دیکھ کر اپنے گھوڑے کو پانی میں ڈالا، تاکہ اس پر تیر برسائے، لیکن گھوڑا پانی کو دیکھ کر بھڑکنے لگا، اور پانی میں نہ اُترا، داہر نے شامی کو دیکھ کر ایک ایسا تیر مارا جو شامی کے پیوست ہو گیا، اور شامی نے وہیں شہادت پائی۔

داہر نے وہاں سے واپس ہوتے ہوئے جاہین کو حکم دیا کہ قلعۂ بیٹ کے سامنے جو گھاٹ ہے، اس پر پہرہ رکھے، تاکہ عرب وہاں سے نہ گزر سکیں، اور اس کا بھی خیال رکھے کہ وہ ایسی جگہ سے گزریں جہاں دلدل اور پانی گہرا ہو، اس کے علاوہ کشتیاں بھی تیار رکھی جائیں، تاکہ اگر وہ دریا کو پار کریں تو ان کی مزاحمت کی جاسکے، اس حکم کے بعد جاہین مہران کے کنارے پر ڈٹ گیا۔[1]

سیوستان کی بغاوت:

اسی زمانے میں بعض اسلامی لشکر کے سواروں نے جو سیوستان میں متعین تھے، آکر اطلاع دی کہ چندرام ہالہ نے جو سیوستان کا حاکم تھا، کچھ ٹھاکروں کو ورغلا کر سیوستان کے قلعے پر قبضہ کر لیا ہے اور عرب سپاہیوں کو باہر نکال دیا ہے، محمد بن قاسم نے محمد بن مصعب کو ایک ہزار سوار اور دو ہزار پیادوں کے ساتھ فوراً ہی سیوستان بھیجا۔ محمد بن مصعب جب وہاں پہنچا تو چندرام نے قلعے سے باہر نکل کر جنگ کی، لیکن شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا، چندرام قلعے میں واپس جانا چاہتا تھا، مگر قلعے میں جو لوگ تھے، انہوں نے قلعے کے دروازے بند کر لیے، اور اُسے اندر نہ آنے دیا، آخر چندرام مجبور ہو کر جھم کی طرف چلا گیا۔

محمد بن مصعب[2] دوسرے روز شہر میں آیا، شہر کے معززین، دستکاروں اور دوسرے لوگوں نے معذرت کی کہ ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں، بلکہ یہ زبردستی قلعے پر قابض ہو گیا تھا۔ پھر انہوں نے قلعہ محمد بن مصعب کے حوالے کر دیا، اس فتح اور کامیابی کی خبر سن کر محمد بن قاسم

زمانے میں وہ کچھ عرصے شیراز اور فارس کا عامل رہا، اپنے ابتدائی دور میں حجاج اُس سے سخت ناراض تھا، اور اس کی ملکیت ضبط کر کے سزا دینا چاہتا تھا، لیکن خلیفہ عبدالملک کی سفارش پر اُس نے اس کی ملکیت واپس کر دی، اور اس پر جو اس کی جانب سے سختیاں ہوئی تھیں، اُن سختیوں کے متعلق عبدالملک سے معافی چاہی۔ حمران کو حدیث کے راویوں میں شمار کیا گیا ہے، اس کی اس مختصر سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حمران فن کتابت کا ماہر اور کاتب تھا، اور جب سنہ 75ھ میں حجاج وایسرائے مقرر ہوا تب بھی وہ حیات تھا، اس کے سنہ وفات میں بھی اختلاف ہے، ابن حجر کے بیان کے مطابق حمران نے ۷۰ھ کے بعد بصرے میں وفات پائی، بعض نے اس کا سنہ وفات ۷۱ھ بعض نے 75ھ اور کچھ نے ۶۷ھ لکھا ہے، لیکن چچ نامے کے مندرجہ بالا متن کے خط سے صحیح طور پر یہ متعین ہوتا ہے کہ حمران 93ھ میں حجاج کے خاص کاتبوں میں تھا، اور ۹۳ھ تک زندہ تھا، چونکہ حضرت خالد بن ولید رضہ نے جس وقت "عین التمر" کو ۹۳ھ میں فتح کیا، اس وقت حمران بچہ تھا، یعنی اس کی عمر اس وقت سات آٹھ سال کی ہوگی، اس حساب سے ۹۳ھ میں اس کی عمر ۸۷ یا ۸۸ سال کی ہوگی، جو بالکل ممکن اور قرین قیاس ہے (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۷۶ تا ۴۷۸)

---

(1) یہ تمام تفصیل چچ نامہ فارسی ص ۱۴۴ و ۱۴۵ سے ماخوذ ہے۔

(2) چچ نامہ فارسی میں صرف مصعب ہے، لیکن صحیح محمد بن مصعب ہے۔

بہت خوش ہوئے اور پیغام بھیجا کہ تمہیں قلعے کی حفاظت کے لیے قابل اعتماد لوگ مقرر کرنے چاہئیں، اور وہاں کے شمنیوں اور تاجروں سے مناسب ضمانتیں لے کر چار ہزار مردان جنگجو اپنے ساتھ لانے چاہئیں، چنانچہ محمد بن مصعب قلعے کے محافظ اور آفیسر مقرر کر کے چار ہزار مسلح سپاہیوں کے ساتھ محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوا، اُسی دن موکو بن وسایو بھی قلعہ بُیٹ کے قریب آکر محمد بن قاسم سے ملا۔[3]

جے سینہ کا محمد بن قاسم کے مقابلے کے لیے تقرر:

راجا داہر کو جب اس کا علم ہوا کہ موکو بن وسایو محمد بن قاسم کی اطاعت پر بیعت کر چکا ہے تو اُس نے اپنے بیٹے جے سینہ کو اسلامی لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے قلعہ بُیٹ روانہ کیا، تاکہ وہ دریا عبور نہ کر سکیں۔ جے سینہ پورے ساز و سامان سے لیس ہو کر دریائے کوتکہ کے راستے سے کنارے پر جا پہنچا، اُدھر محمد بن قاسم جھم اور کرھل کے علاقوں[4] میں داہر کی فوج کے مقابل اُترے اور انھیں وہاں تقریباً پچاس دن رہنا پڑا، جس کی وجہ سے لشکر میں غلے اور چارے کی کمی ہو گئی، لشکر اور جانوروں کے خلاف مزاج چارہ ملنے کی وجہ سے گھوڑوں میں بیماری پھیلنے لگی، دوسری طرف دشمن ہر طرح کی تیاری میں مصروف تھا، جب یہ خبر داہر کو پہنچی تو وہ بہت خوش ہوا۔

داہر کا پیغام:

اور داہر نے محمد بن قاسم کو پیغام بھیجا کہ کسی کام کی انتہا کے پیچھے پڑنا نہایت بد بختی اور ذلالت ہے، تم نے ہمارے لیے اور اپنے لیے تنگی پیدا کی ہے، اگر صلح کر کے واپس چلے جاؤ، تو میں تمہارے لیے رسد کا سامان بھیجوں، تاکہ تمہارے ساتھی بھوک اور بے سر و سامانی میں مبتلا ہو کر تباہ نہ ہوں، تمہیں خود بھی سوچنا چاہیے کہ تمہارے پاس کون سا بہادر مرد ہے جو ہمارے مقابل ہو کر جنگ کرے گا، اگر تم اس کے لیے تیار نہیں تو پھر تم جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔

محمد بن قاسم کا جواب:

محمد بن قاسم نے اُسے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں اُن سپہ سالاروں میں سے نہیں ہوں جو اتنی سی بات سے گھبرا کر واپس چلے جائیں، تم نے جو اتنے دن تک سرکشی کی ہے، اگر تم اس زمانے کا سارا خراج دارالخلافہ کے خزانے میں جمع کراؤ گے تو ہمارے درمیان صلح ہو سکتی ہے، ورنہ خدائے تعالیٰ کی مدد سے مجھے توقع ہے کہ میں تمہارا سر عراق لے کر جاؤں گا۔

حجاج بن یوسف کو اطلاع:

پھر محمد بن قاسم نے ان تمام حالات کی اطلاع حجاج بن یوسف کو بھیجی۔ حجاج نے طیار نامی ایک شخص کو حالات سے باخبر ہونے کے لیے سندھ روانہ کیا۔ طیار مکران پہنچا، طیار کو ایک شخص سندھ سے آتا ہوا ملا، اس نے اُسے لشکر میں غلے کی کمی اور چارے کی کمیابی کے حالات بتائے اور گھوڑوں میں بیماری پھیلنے کی تفصیلات بیان کیں۔

طیار اس شخص کو ساتھ لے کر عراق واپس ہوا اور ساری رپورٹ حجاج بن یوسف کو پہنچائی، حجاج تمام حالات سن کر بہت افسردہ ہوا، اور اُس نے علماء، صلحاء اور متقین اور خاص آدمیوں سے دعا کی التجاء کی، پھر اُس آدمی کو بلا کر جسے طیار اپنے ساتھ لایا تھا، تمام حالات خود دریافت کیے، پھر حجاج نے اس آدمی کو دارالخلافے روانہ کیا، تاکہ وہ سارے حالات وہاں جا کر بیان کرے۔

حجاج بن یوسف کا دو ہزار گھوڑے بھیجنا:

دوسری طرف حجاج بن یوسف نے ان حالات سے واقف ہوتے ہی دو ہزار گھوڑے محمد بن قاسم کو بھجوائے، اور خط میں اُسے لکھا کہ مجھے قاصد کے ذریعہ گھوڑوں کے مرنے کا حال معلوم ہوا، اس لیے دو ہزار

---

(3) ماخوذ از چچ نامہ فارسی، ص ۱۴۶۔

(4) جھم اور کرھل کے علاقے: جھم غالباً اس خطے پر مشتمل تھا، جس کا مرکز "جھم پیر" کی زیارت گاہ ہے۔ جھم پیر کا مطلب ہے خطۂ جھم کا پیر اور "جھم" کے معنی ہیں نچلی نشیبی زمین، جو کہ موجودہ جھم پیر کے شمال سے لے کر نیچے جنوب کی طرف دور تک چلی گئی ہے، اور جس میں "سونھری" اور "کینجھر" کی جھیلیں بھی آجاتی ہیں، اس جھم یا نشیبی وادی کا جنوبی سرا تقریباً کینجھر جھیل کا جنوبی حصہ سمجھنا چاہیے، جو کہ ٹھٹہ سے تقریباً ۱۹-۲۰ میل شمال میں ہے۔

"کرھل" یا "گرھل" یا "گرھر" (خورد و کلاں) ٹھٹہ کے نواح میں تھا، جیسا کہ کتاب "بیان العارفین" میں بیان کیا گیا ہے۔ مغل شہنشاہ اکبر کے زمانے میں "گرھر" ٹھٹہ پرگنے میں شامل تھا، دیکھیے آئین اکبری طبع بلاخ میں ص ۵۷۔

میروں کے دور تک ٹھٹہ کے شمالی مشرقی خطے کو "گرڑ" کے نام سے پکارا جاتا تھا، جس میں خان سومرو ایک طاقتور سردار رہتا تھا، اور بعض میروں کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ "گرڑ" یا "گرھر" یا "گرھل" یا "کرھل" کا خطہ علاقہ جھم پیر سے متصل جنوب کی طرف تھا اور ممکن ہے کہ اُس کی جنوبی سرحد موجودہ ٹھٹہ شہر کے جنوب تک پھیلی ہوئی ہو۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۴۷۸)۔

گھوڑے بھیجے جاتے ہیں، تاکہ یہ فوج کے کام آسکیں، لشکر کو ہمیشہ منظم اور لیس رکھو، تاکہ دشمن کے لشکر کو دفع کرسکو، آخر میں اُس نے لکھا کہ تمہیں کسی طرح کشتیاں حاصل کرکے ان کا پل بنا کر دریا کو عبور کرنا چاہیے، خواہ کافروں کو کتنا ہی برا کیوں نہ معلوم ہو۔

محمد بن قاسم نے اس خط کے جواب میں حجاج بن یوسف کو لکھا کہ خلاف مزاج غذاؤں اور بے وقت کھانے پینے کی وجہ سے رطوبت اور طبیعت میں خرابی پیدا ہوئی ہے، جس طرح بھی ممکن ہو سرکہ روانہ کیا جائے کہ لشکر کو اس کی بے حد ضرورت ہے۔

سرکے کی روانگی:

چنانچہ اس خط کے ملنے کے بعد حجاج نے حکم دیا کہ دہنکی ہوئی روئی کو سرکے میں تر کرکے اسے خشک کیا جائے، اس طرح کئی مرتبہ سرکہ روئی میں جذب کیا گیا، پھر اس روئی کی گانٹھیں بنا کر محمد بن قاسم کو روانہ کی گئیں۔ حجاج بن یوسف نے لکھا کہ تم نے سرکہ طلب کیا ہے، وہ اس دہنکی ہوئی روئی میں جذب ہے، جب یہ گانٹھیں پہنچیں اور تمہیں سرکے کی ضرورت ہو تو اس روئی کو پانی میں تر کرو سرکہ نکل آئے گا۔

محمد بن قاسم کا گورنری پر تقرر:

جس زمانے میں کہ محمد بن قاسم ایک طویل عرصے تک مہران کے مغربی کنارے پر پڑاؤ کیے ہوئے تھے، اس زمانے میں حجاج نے ایک خط محمد بن قاسم کو لکھا، اور اس کے ساتھ گورنری کا پروانہ بھی روانہ کرکے انہیں آزادی کے ساتھ حکومت کرنے کا اختیار دیا۔ اس خط میں مزید لکھا کہ تمہاری یہ روش اور طریقہ مجھے ناپسند ہے کہ تم امان دینے کے بڑے شائق ہو، آزمائش کے وقت جس دشمن سے بھی عداوت یا مخالفت ظاہر ہو اُسے امان نہ دینی چاہیے، کیونکہ رذیل شریف یکساں سلوک کے مستحق نہیں، نیز اس طرز عمل سے تمہاری کم عقلی ثابت ہوگی، اور دشمن اسے تمہاری کمزوری پر محلول کرے گا۔ خدا نے تمہیں قابل فکر عقل دی ہے، لیکن تم اُس سے کام نہیں لیتے، تم ساری توجہ اس پر صرف کررہے ہو کہ سب کو امان دی جائے، یہ بات تمہیں اپنے اُن ہمراہیوں کو بھی سنانی چاہیے، جو تمہارے مشیر ہیں، تم صرف امان دینے میں مصروف ہو، اور ادھر بے کار وقت گزر رہا ہے، اور تم دشمن کے مقابلے میں بے کار بیٹھے ہو، اگر تم اسی طرح امان دیتے رہے، اور جنگ میں دھوکے کا خیال ہی دل سے نکال دیا تو پھر جنگ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا جائے گا، اور یہ طویل کم عقلی ختم کردی جائے گی۔

پھر آگے چل کر لکھا کہ تمہیں حکومت اور سیاست کے طریقے ہاتھ سے نہ دینے چاہئیں، تمہیں عزم مصمم کرکے لشکر کو بہادری اور دور اندیشی کے لیے حوصلہ دلانا چاہیے، راست گو اور عقل پر ثابت قدم رہو، غفلت نہ کرو، خدائے تعالیٰ کے ذکر میں دل اور جان اور زبان کو مشغول رکھو۔

تم نے جو دریائے مہران کے بہاؤ کے متعلق اطلاعات بہم پہنچائی ہیں، اس کی بنا پر ہماری رائے ہے کہ تمہیں مہران کو بیٹ سے عبور کرنا چاہیے، کیونکہ مہران کا پانی وہاں تنگ ہے اور عبور کرنا زیادہ آسان ہے، دوسرا یہ کہ چونکہ بیٹ دوآبے میں ہے، اس لیے تم سہولت سے عبور کرسکو گے، پل کشتیوں کا بنانا، اور جنگ میں اللہ کی مدد اور اس کی نصرت کو اپنے ہمرکاب سمجھنا، جب تم طاقت اور دبدبے سے کام کروگے تو پھر دشمن کی فوج اور رعایا اپنی جان بچانے اور ذریعہ معاش حاصل کرنے کی خاطر تمہاری بیعت کرے گی، اور مطیع ہو کر اپنے آپ کو تمہارے دربار سے وابستہ کرے گی۔

سلیمان کی جنگ پر روانگی:

اس خط کے بعد محمد بن قاسم نے دریا کو پار کرنے کا مصمم ارادہ کیا، اور وہ سوچنے لگے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ راجا داہر لشکر لے کر مہران کے کنارے پر آکر ہمارا راستہ روکے، اس لیے پہلے دشمن کے حالات معلوم کرنا ضروری ہیں۔

پھر محمد بن قاسم نے سلیمان بن نبہان قشیری کو حکم دیا کہ اُسے فوج لے کر راوڑ کے قلعے کے سامنے جانا چاہیے، تاکہ داہر کا بیٹا گوپی اپنے باپ کی مدد کو نہ آسکے۔ سلیمان چھ سو سپاہی لے کر جنگ کے لیے روانہ ہوا، اس کے بعد عطیہ تغلبی کو پانسو سپاہیوں کے ساتھ اکھم کے راستے پر مقرر کیا، تاکہ کند راہ والے علاقے پر پہرہ رکھے، ادہر قلعۂ نیرون کے سردار شمنی مگدھینہ کو حکم دیا کہ راستے میں لشکر کے لیے اناج اور گھاس مہیا رکھے، محمد بن مصعب بن عبدالرحمٰن کو لشکر کے مقدمتہ الجیش پر مقرر کیا، تاکہ وہ آگے جاکر راستوں کی حفاظت کرے۔

اسی اثناء میں ذکوان بن علوان البکری پندرہ سو سواروں کے ساتھ بیٹ کے حاکم موکو بن وسایو، اور بھٹی ٹھاکروں اور مہران کے مغربی کنارے پر رہنے والے مطیع جتوں کو ساتھ لے کر حاضر ہوا، اور بیٹ کے علاقے میں ساکرے کے سربراہ بھی مستعد ہوگئے۔[1]

---

(1) چچ نامہ فارسی، ص ۱۵۵۔

کشتیوں کا پل:

اس کے بعد محمد بن قاسم نے دریائے سندھ کو عبور کرنے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ کیونکہ داہر کا سارا لشکر دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر تھا۔ اور اس سے بغیر مقابلہ کیے سندھ کی فتح نامکمل تھی۔ بہت غور کے بعد محمد بن قاسم نے موکو بن وسایو کو کشتیوں کے فراہم کرنے پر مامور کیا۔ جب کشتیاں جمع ہو گئیں تو یہ تدبیر عمل میں لائی گئی کہ دریا کے مغربی کنارے کے متصل پانی میں کشتیوں کو ایک دوسرے سے باندھ کر ایک قطار بنائی گئی۔ کشتیوں کی یہ قطار اس قدر طویل تھی جس قدر اس مقام پر دریا کی چوڑائی تھی، یہ مقام وہ تھا جہاں کا پاٹ بہت کم اور پانی کی روانی بہت تیز تھی، پھر اس کا ایک سرا مغربی کنارے پر مضبوط بندھوایا، دوسرا سرا دریا میں چھوڑ دیا۔ یہ سرا خود بخود مشرقی کنارے پر جا لگا اگلی کشتی کے سپاہیوں نے کنارے پر رسوں اور میخوں کے ذریعے اس کو ساحل سے باندھ دیا۔ اس طرح کشتیوں کا ایک پل قائم ہو گیا۔ اس پل پر سے محمد بن قاسم کی پوری فوج صحیح سلامت مشرقی کنارے پر اتر گئی۔ صرف ایک سپاہی تراب نامی جو بنی حنظلہ میں تھا، اس پل سے گزرتے ہوئے دریا میں گر کر شہید ہوا۔[1]

محمد بن قاسم کا اعلان:

دریا کو عبور کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے اپنے لشکر کے سامنے ایک تقریر کی جس میں کہا:

"مجاہدو! دریائے سندھ تمہارے پیچھے ہے اور دشمن کی فوج تمہارے سامنے ہے، جس سے عنقریب ہمارا مقابلہ ہو گا، اس لیے جو تم میں واپس جانا چاہتا ہے، ابھی چلا جائے، اس سے پہلے کے دشمن سے ہمارا مقابلہ ہو، کیونکہ اگر عین جنگ میں کوئی بھاگا، تو وہ ہمارے بہادروں کو بد دل بنائے گا۔"

اس تقریر کے بعد پورے لشکر میں سے سوائے تین آدمیوں کے کوئی بھی واپس جانے کے لیے تیار نہ ہوا۔ ان تینوں میں سے ایک نے محمد بن قاسم سے کہا میری ایک لڑکی ہے اور اس کا پرورش کرنے والا میرے سوا کوئی نہیں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ واپس چلا جاؤں۔ دوسرے نے کہا کہ میری ماں بوڑھی ہے اور میرا کوئی ایسا قریبی عزیز نہیں جو اس کی دیکھ بھال کر سکے۔ تیسرے نے کہا مجھ پر بے حد قرض ہے اور میرا کوئی رشتہ دار ایسا نہیں جو اس کو ادا کر دے۔ محمد بن قاسم نے ان تینوں کو واپسی کی اجازت دے دی۔[2]

راوڑ کی طرف روانگی:

محمد بن قاسم وہاں سے اپنی فوج کے ساتھ راوڑ کی طرف روانہ ہوا اور راوڑ کے قریب جیور نامی ایک گاؤں پر قبضہ کر لیا۔ داہر کو جب یہ خبر ملی کہ مسلمانوں نے دریائے سندھ کو عبور کر لیا ہے تو وہ بھی اپنے لشکر کے ساتھ اسلامی لشکر کے سامنے پہنچ کر خیمہ زن ہوا، دونوں لشکروں کے درمیان ایک جھیل حائل تھی، داہر نے اپنی فوج کے ایک مسلح دستے کو جھیل کے کنارے مقرر کیا تاکہ وہ دشمن کی حرکات کی نگہداشت کرے۔ محمد بن قاسم نے داہر کی جارحانہ کارروائی کو دیکھ کر محرز بن ثابت قیسی[3] کو دو ہزار فوج کے ساتھ جھیل کے اُس طرف بھیجا اور محمد زیاد العبدی کو ہزار سواروں کے ساتھ جھیل کے اس طرف مقرر کیا تاکہ وہ داہر کی فوجوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتے رہیں۔[4]

محمد علافی کی طلبی:

داہر نے محمد علافی عرب کے باغی سردار کو بلا کر کہا آج ہم پر جو مشکل وقت پڑا ہے اُسے تم جانتے ہو، آج ہی کے دن کے لیے میں نے تم کو پناہ دی تھی، تم عربوں کی لڑائی کے طور و طریقے سے خوب واقف ہو، میں تمہیں اپنی فوج میں ایک دستے کی کمان دینا چاہتا ہوں۔

محمد علافی نے کہا اگرچہ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے، اُس کا شکریہ مجھ پر لازم ہے، لیکن میں مسلمان ہوں، اور اسلامی لشکر سے جنگ میرے مذہب میں حرام ہے، اگر میں ان میں سے کسی کو ماروں تو میرا ٹھکانا دوزخ ہو گا، اور اگر میں ان میں سے کسی کے ہاتھ سے مارا جاؤں تو حرام موت مروں گا۔

داہر نے کہا میں نے آج کے دن ہی کے لیے تمہیں پناہ دی تھی، اگر تم ہماری مدد نہیں کر سکتے تو ہمارے ملک سے چلے جاؤ، محمد علافی وہاں سے سیلمان کے علاقے میں چلا گیا، اور داہر کے مارے جانے تک سیلمان کے پاس مقیم رہا۔[5]

---

(1) چچ نامہ ص ۱۵۹۔

(2) چچ نامہ ص ۱۵۹۔

(3) چچ نامے فارسی کے تمام نسخوں میں یہ لفظ قیسی، لیکن چچ نامے کے ص ۱۷۱ پر یہ لفظ الدمشقی ہے۔

(4) چچ نامہ ص ۱۵۹-۱۶۰۔

(5) چچ نامہ ص ۱۶۰-۱۶۱۔

چچ نامے کی یہ روایت خود چچ نامے کے آئندہ آنے والے بیانات کے خلاف ہے، کیونکہ چچ نامے کے آئندہ بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد علافی آخری شکستوں تک داہر اور اس کے بیٹے جے سینہ کے ساتھ رہا، مثلاً جب داہر نے جے سینہ کو محمد بن قاسم کے مقابلے میں بھیجا تو اس وقت محمد علافی بھی اس کے مشیر کی حیثیت سے اس کے ساتھ گیا تھا، اور طریقہ جنگ کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کیا تھا، (چچ نامہ فارسی ص ۲۳۷-۲۳۶) داہر کے قتل ہو جانے کے بعد بھی وہ اس کے بیٹے جے سینہ کا حامی و مشیر رہا (چچ نامہ ص ۲۷۰-۲۶۹) البتہ جب جے سینہ ناامید ہو کر برہمن آباد کے قلعے سے نکل کر چتور میں پناہ گزیں ہوا، اور اس میں مقابلے کی طاقت نہ رہی تو محمد علافی اس سے رخصت ہو کر پہلے طاکیہ (ٹکادیش) آیا، پھر وہاں سے کشمیر کے راجا کے پاس چلا گیا، اور آخر وقت تک وہیں مقیم رہا (چچ نامہ ص ۲۸۴-۳۸۵)۔ چچ نامے کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب محمد علافی نے لڑائی میں شرکت سے عذر کیا تو داہر نے اس سے کہا اچھا اگر تم لڑائی میں شریک نہیں ہونا چاہتے تو نہ ہو، لیکن کم از کم ہمارے ساتھ رہ کر مشورہ تو دو کہ ہمیں اس جنگ میں کیا تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں۔ محمد علافی نے اسے منظور کر لیا اور وہ جاسوسوں کی ایک جماعت کا سالار بن کر اسلامی لشکر میں پہنچا، مسلمانوں نے اسے دیکھ کر لعنت و ملامت کی۔ محمد علافی شرمندہ ہو کر واپس بھاگ آیا۔[1]

حجاج کا خط:

عین اس وقت کہ محمد بن قاسم داہر سے آخری جنگ کی تیاریاں کر رہے تھے کہ انہیں حجاج بن یوسف کا ایک اور خط ملا، جس میں لکھا تھا:

فرزند عزیز محمد بن قاسم

جو کچھ تم نے لکھا ہے وہ مجھے معلوم ہوا، اس کام میں خدا کے حکم اور اُس کی توفیق سے اس وقت کامیابی ہو گی کہ تم بڑے سے بڑے کاموں پر پانچ وقت کی نماز کو مقدم رکھو اور خدا کے سامنے رو رو کر دعائیں مانگو اور ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے رہو، خوب یاد رکھو کہ خدا کی عنایت کے بغیر کسی کو طاقت و شوکت حاصل نہیں ہو سکتی، جب تمہارا پورا بھروسا اللہ پر ہو گا تو انشاء اللہ تم فتح و کامرانی حاصل کرو گے۔

بخط حمران

جے سینہ سے جنگ:

چچ نامے میں ہے کہ جب محمد علافی جاسوسی کرتے ہوئے مسلمانوں کی ملامت سن کر واپس ہوا، تو داہر نے اپنے بیٹے جے سینہ کو کچھ فوج اور ہاتھی دے کر روانہ کیا، اور وہ ہاتھی پر بیٹھ کر لشکر اسلام سے مقابل ہوا۔ طویل جنگ کے بعد کافروں کو شکست ہوئی، اور عربوں نے اُس کے لشکر کے بڑے حصے کو موت کے گھاٹ اُتار دیا، اور جے سینہ کو محافظوں اور اسلحہ برداروں کے ساتھ گھیرے میں لے لیا، فیل بان نے بڑی مشکل سے ہاتھی پر حملہ کیا، مسلمان سوار اور پیادے ہاتھی کا مقابلہ نہ کر سکے، اور منتشر ہو گئے۔ اس طرح جے سینہ کے لیے بھاگنے کا راستہ ہموار ہو گیا، اور وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر باپ کے پاس پہنچا۔ داہر نے یہ دیکھ کر کہ اس کا سارا لشکر مارا جا چکا ہے اپنے بیٹے کو صحیح سلامت پا کر خدا کا شکر ادا کیا۔

حجاج کا خط:

اُسی دن محمد بن قاسم کے نام حجاج کا خط پہنچا، جس میں لکھا کہ جہاں داہر ہو، وہیں جا کر اس کا مقابلہ کرو، فتح تمہاری ہو گی، اور کافر ذلیل و خوار ہوں گے۔

یکم رمضان ۹۳ھ (۱۲-۷۱۱ء) کو راوڑ کے قریب محمد بن قاسم اور داہر کی وہ آخری جنگ شروع ہوئی، جس نے سارے سندھ کو اسلام کے نور سے منور کر دیا۔

اس جنگ میں داہر کے پاس دس ہزار سوار اور تین ہزار پیدل سپاہی اور ایک سو جنگی ہاتھی تھے، اس عظیم الشان لشکر کے ساتھ جنگی ساز و سامان کی بھی کمی نہ تھی۔ راجا داہر خود بھی بڑا بہادر سپہ سالار تھا، اُس کی کمان اتنی سخت تھی کہ بڑے سے بڑا بہادر اس کو کھینچ نہ سکتا تھا، اس کی کمند میں لوہے کا ایک چکر لگا ہوا تھا، جس کی دھار بہت تیز تھی، جب داہر اس کمند کو دشمن پر پھینک کر کھینچتا تو دشمن کی گردن صاف اڑ جاتی۔

ادہر اس کے مقابلے میں محمد بن قاسم تھے، جن کی عمر سترہ سال کی تھی، اُن کے ساتھ صرف بارہ ہزار مجاہدین تھے، جو صرف اللہ کے بھروسے پر میدان جنگ میں آئے تھے، ان کے پاس نو سو تیر انداز بھی تھے جو تیروں کے ذریعہ سے دشمن پر آگ پھینکتے تھے۔

نو روز تک دونوں فوجوں میں مسلسل جھڑپیں ہوتی رہیں۔

۹ رمضان ۹۳ھ (۱۲-۷۱۱ء) کی تاریخ میں جو جنگ ہوئی اس میں اسلامی فوج کی ترتیب یہ تھی، محمد بن قاسم اور محرز بن ثابت وسط میں

---

(1) (2) چچ نامہ ص ۱۶۲-۱۶۳۔

تھے، جہم[1] جعفی کو دائیں بازو پر اور ذکوان بن علوان بکری بائیں بازو پر، اور بنانہ حنظلہ کلابی[2] کو فوج کے پچھلے حصے پر، اور عطا بن مالک قیسی کو مقدمتہ الجیش پر مقرر کیا گیا، پھر محمد بن قاسم نے فوج سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے اہل عرب! اگر میں لڑائی میں مارا جاؤں تو میرے قائم مقام محرز بن ثابت ہوں گے، اگر وہ بھی مارے جائیں تو ان کے قائم مقام سعید ہوں گے۔

اس کے بعد محرز نے حملہ شروع کیا، یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے، پھر سعید آگے بڑھے، اور فوجوں کی حوصلہ افزائی کر کے دشمن پر حملہ کیا، اس لڑائی میں حسن بن محبۃ بکری کا انگوٹھا تلوار کی ضرب سے کٹ گیا، لیکن مسلمان اپنے مقام پر جمے رہے۔ داہر نے یہ دیکھ کر کہ مسلمان فوج آہنی دیوار بنی ہوئی ہے، اور اپنی جگہ سے ہٹنے کا نام نہیں لیتی مست ہاتھیوں کو لڑائی کے میدان میں بھیجا۔ اسلامی فوج نے یہ دیکھ کر کہ مست ہاتھی آرہے ہیں، اپنے آپ کو چھوٹے چھوٹے دستوں میں تقسیم کر لیا، اور ہاتھیوں پر حملہ کر کے ان کو بھگا دیا، ہاتھیوں کے بھاگتے ہی مسلمانوں نے مل کر ایک دم سے دشمن پر حملہ کیا، اور دشمن کی فوجوں کو پیچھے دھکیل دیا، یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا، اور دونوں فوجیں اپنے اپنے مقام پر واپس لوٹ گئیں۔[2]

آخری جنگ:

10 رمضان جمعرات کے دن 93ھ کو محمد بن قاسم اور داہر کے درمیان آخری جنگ شروع ہوئی۔ راجا داہر بڑی شان و شوکت سے خود میدان جنگ میں آیا، اس کے ساتھ اس کا بیٹا جے سینہ بھی تھا، جو فوج کے درمیان تھا، اور دس ہزار بہادر اُس کے گرد و پیش تھے جو سر تا پا لوہے میں غرق تھے، اُن میں سے بعض ایسے بھی تھے کہ اُن کے بال لٹکے ہوئے تھے اور تلواریں کھینچے ہوئے تھے۔ بعض ایسے تھے کہ اُن کے بال بندھے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں تلواریں اور ڈھالیں تھیں، اس شان سے یہ لوگ بڑھ کر مسلمان فوجوں کے مقابلے میں آئے۔[3]

معصومی کا بیان ہے کہ داہر کی فوج کے سامنے جنگی ہاتھی تھے، ان کے بعد دس ہزار سوار زرہ پوش تھے، پھر تیس ہزار پیادے ہتھیاروں سے لیس تھے، لشکر کے وسط میں راجا داہر سفید ہاتھی پر سوار تھا، راجا کے

---

[1] توضیحات چچ نامہ سندھی میں لکھا ہے کہ جہم بن رحر جعفی کے والد زحر بن قیس جعفی کوفے کے شریف سرداروں اور شہسواروں میں تھے، نہایت ہی فصیح مقرر تھے، جنگ صفین میں حضرت علی رضہ کے ساتھ تھے، ان کے تمام لڑکے بھی شریف تھے، جن میں سے جہم نہایت مشہور تھے، جہم غالباً محمد بن قاسم کے ہم عصر تھے، وہ سندھ کے حملے میں محمد بن قاسم کے ساتھ تھے۔ سندھ پر حملے سے پہلے جب محمد بن قاسم فارس کے گورنر تھے اس وقت جہم ان کے سپہ سالار تھے، 92ھ میں جب محمد بن قاسم رے کی فتح کے لیے تیاریاں کر رہے تھے تو انہوں نے روانہ ہونے سے پہلے ایک فوجی دستے کے ساتھ جہم کو رے کی طرف روانہ کیا تھا، مگر جب حجاج نے محمد بن قاسم کو سندھ کا سپہ سالار مقرر کیا تو جہم بن قیس کو بھی محمد بن قاسم کے ساتھ جانے کا حکم دیا، جہم بن زحر سندھ کی فتوحات میں محمد بن قاسم کے ساتھ رہے، غالباً ان کی بہادری و شجاعت کی وجہ سے محمد بن قاسم کو جہم سے بے حد محبت تھی، اسی زمانے میں جب کہ محمد بن قاسم سندھ کی فتوحات میں مشغول تھے، حجاج بن یوسف نے جہم کا تبادلہ محاذ خراسان پر کر دیا اور حکم دیا کہ وہ وہاں پہنچ کر قتیبہ بن مسلم سپہ سالار کی مدد کریں، جہم نے محاذ خراسان پر پہنچ کر قتیبہ کے تحت اپنے نئے عہدہ کا چارج لیا، لیکن وہ محمد بن قاسم کی طرح قتیبہ کو اپنا گرویدہ نہ بنا سکے۔ جب خلیفہ سلیمان نے قتیبہ کے خلاف انتقامی کارروائی شروع کی اور قتیبہ نے بغاوت کی تو جہم نے قتیبہ کے خلاف شاہی فوج کا ساتھ دیا اور قتیبہ کا مقابلہ کیا، قتیبہ کے قتل کے بعد محاذ خراسان کا سپہ سالار یزید بن مہلب مقرر ہوا، جہم نے یزید بن مہلب کے تحت بھی نمایاں کارنامے انجام دیے، خصوصاً جرجان کی آخری فتح میں جو 98ھ میں ہوئی جہم کا بڑا حصہ ہے۔ یزید بن مہلب نے جہم کو جرجان کا گورنر مقرر کیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد 101ھ میں جب یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا تو اُس نے یزید بن مہلب اور اس کے ساتھیوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کیں۔ آخر خراسان کے نئے کماندار (ویسرائے) سعید بن خزینہ کے حکم پر جہم بن زحر بھی گرفتار کیے گئے اور قبیلہ باہلہ کے ایک افسر نے جس کا نام زبیر بن نشیط تھا، اس جواں مرد اور بہادر کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچا کر مار ڈالا۔ سعید بن خزینہ کو جب اُن کی وفات کی خبر ملی تو اُس نے زبیر کو سخت ملامت کی اور کہا کہ میرا مقصد تو صرف ان کو گرفتار کرنا تھا، وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا خدا زبیر بن نشیط کا خانہ خراب کرے جس نے جہم کو روند روند کر مارا۔ عرب کے مشہور شاعر ثابت بن قطنہ نے جہم کی وفات پر بڑا دردناک مرثیہ کہا (توضیحات چچ نامہ سندھی - مرتب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (ص ۴۴۹-۴۵۱) بحوالہ بلاذری، انساب العرب، طبری)۔

بنانہ بن حنظلہ - اس نام کی تصحیح کرتے ہوئے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے توضیحات چچ نامہ سندھی میں لکھا ہے کہ صحیح نام نباتہ بن حنظلہ کلابی ہے، نباتہ بھی ایک مشہور شہسوار تھے، جن کو حجاج نے محمد بن قاسم کے ساتھ محاذ سندھ پر روانہ کیا، نباتہ نہ صرف ایک قابل ترین سپہ سالار تھے بلکہ بہترین سیاست داں بھی تھے۔ نباتہ نے دیبل اور سیوستان کی جنگ میں داہر کا دوبدو مقابلہ کیا، اور برہمن آباد کی جنگ میں بھی ان کا بڑا حصہ تھا۔ اس کے علاوہ محمد بن قاسم نے مقامی حاکموں سے جو صلح کی گفت و شنید کی تھی ان میں بھی نباتہ نے نمایاں خدمات انجام دیں۔

[3] یہ تمام تفصیل چچ نامہ ص ۱۷۲-۱۷۳ سے ماخوذ ہے۔

[4] چچ نامہ ص ۱۷۳۔

ہاتھی کو بڑے بڑے سردار اور امیر گھیرے ہوئے تھے، داہر ہاتھی پر عماری میں بیٹھا ہوا تھا، اس کے ساتھ دو نہایت خوبصورت کنیزیں بیٹھی ہوئی تھیں، اُن میں سے ایک داہر کو شراب کے جام دیتی جاتی تھی، اور دوسری تھوڑی تھوڑی دیر سے پان کے بیڑے کھلاتی جاتی تھی۔[1]

اسلامی فوج کی تیاریاں:

جیسے ہی داہر کی فوج میدان میں آئی محمد بن قاسم بھی دشمن کی فوج کو دیکھ کر میدان میں نکلے، انھوں نے دائیں بازو پر حنظلہ گلابی کو، بائیں بازو پر ذکوان بن علوان بکری اور ابو بن سلیمان ازدی اور صابر ہمدانی کو دشمن کے ہاتھیوں کے بالمقابل علم برداری پر مقرر کیا۔ زیاد بن جلیدی ازدی جن کے ساتھ بہت سے سوار تھے جیسے نمیلہ، مسعود بن الشعری کلبی اور مخارق بن کعب راسی کو فوج کے قلب کے آگے مقرر کیا۔ سب سے پہلے مقدمتہ الجیش حرکت میں آیا، محمد بن زیاد عبدی اور بشر بن عطیہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک طرف سے، اور مصعب بن عبدالرحمٰن ثقفی اور خریم بن عروہ مدنی دوسری طرف سے داہر کے مقابل ہوئے۔ پھر محمد بن قاسم نے نو سو تیر اندازوں کو تین ٹکڑیوں میں تقسیم کر کے حکم دیا کہ وہ ہر وقت تیار رہیں۔ چنانچہ تیر اندازوں نے اپنے مسموم تیر کمانوں میں لگائے، صبح کی نماز کے بعد سارا لشکر پانچ صفوں میں مرتب ہو گیا، ایک صف قبیلہ عالیہ کے لوگوں کی تھی، دوسری صف قبیلہ تمیم کے لوگوں کی، تیسری صف قبیلہ بکر وائل کے لوگوں کی، چوتھی صف عبدالقیس اور اس کے قبیلے کی اور پانچویں صف ازدی قبیلے کی تھی۔[2]

محمد بن قاسم کی تقریر:

صفوں کے مرتب ہونے کے بعد محمد بن قاسم نے اپنی فوج کے سامنے حسب ذیل تقریر کی:

"اے اہل عرب! کافروں کی اس فوج نے جنگ کے لیے ہماری طرف رخ کیا ہے تم ہمت سے کام لینا، کیونکہ وہ اپنے اہل و عیال، مال و اسباب اور گھر اور زمین کے لیے خطرناک جنگ کریں گے، اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان پر حملہ کرو، ہم سب اپنی خونخوار تلواروں سے ان کو ذلیل و خوار کریں گے، اور ان کے مال و عیال پر قبضہ کر کے کافی غنیمتیں حاصل کریں گے، تمھیں چاہئے کہ جمے رہو اور متردد نہ ہو، اور خاموشی کو اپنا طریقہ بناؤ، ہر ایک جہاں مقرر کیا گیا ہے، اسے اپنی جگہ سے ہلنا نہیں چاہیے، کوئی بھی آدمی قلب سے میمنہ اور میمنہ سے میسرہ کی طرف جا کر کسی کی مدد میں مصروف نہ ہو، ہر ایک اپنی جگہ اور مرکز پر ڈٹا رہے۔ خوب یاد رکھو کہ خدا کی فتح و نصرت نیکوں اور پرہیزگاروں کو حاصل ہوتی ہے، ہمیشہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہو اور لاحول ولا قوتہ الا باللہ العلی العظیم پڑھتے رہو۔"[3]

پھر محمد بن قاسم نے سقوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی مشکیں بھر لیں، اور ہر صف میں پہنچ کر لوگوں کو پانی پہنچائیں تاکہ وہ پانی کے لیے باہر نہ نکلیں۔

لڑائی شروع ہونے سے کچھ قبل بکر وائل اور قبیلہ بنی تمیم کے لوگ محمد بن قاسم کے پاس آئے اور کہا آج کافروں کا لشکر ایک مصیبت عظمیٰ ہے، اس کے پاس تمام اسلحہ اور آلات حرب موجود ہیں، اور وہ اپنی جنگی قوت پر مسرور ہے، اس لیے وہ لڑائی کے شروع کرنے کے لیے بے چین ہے۔

یہ سن کر محمد بن قاسم نے ان سے مخاطب ہو کر کہا: اے بنو تمیم اور اے عزیزو[4]! اگرچہ دشمن تیار ہو کر ہمارے مقابلے کے لیے آیا ہے، تم بھی پوری طاقت اور انتہائی قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرو، انشاء اللہ تم کامیاب ہو گے، محمد بن قاسم کی اس تقریر سے لوگوں کی ڈھارس بندھی، اور وہ لڑنے کے لیے آمادہ ہو گئے، بہادروں نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے اور جنگ کے لیے آگے بڑھے۔

محمد بن قاسم کی جنگ کے وقت تقریر:

عین جنگ کے وقت محمد بن قاسم نے اپنے ساتھیوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"مسلمانو! اپنے گناہوں کے لیے خدا سے معافی کے خواستگار رہو اور استغفار زیادہ کرو، خدائے تعالیٰ نے مسلمانوں کو دو عظیم الشان نعمتیں عطا کی ہیں، ایک رسول اکرم ﷺ پر درود پڑھنا، اور دوسری اپنے گناہوں پر استغفار کرنا، اگر تم قوی دل

---

(1) معصومی ص ۲۴۔

(2) چچ نامہ ص ۱۷۴-۱۷۵۔

(3) چچ نامہ ص ۱۷۵۔

(4) فارسی کے مروجہ نسخ چچ نامے میں یہاں "اے بنی عزیز" ہے، مگر اس وقت تک بنی عزیز کوئی قبیلہ تحقیق نہیں ہوا، چچ نامے کے بعض قدیم نسخوں میں "اے عزیز" بھی ہے، یعنی اے عزیزو!، چونکہ قبیلہ بنو تمیم کے لوگ واقعی محمد بن قاسم کے عزیز تھے، اور ان کی شادی بھی اس قبیلے میں ہوئی تھی، اس لیے ترجمے: "اے عزیزو" کو ترجیح دی گئی ہے (حاشیہ چچ نامہ سندھی)۔

رہو تو خدائے تعالیٰ تم کو دشمن پر غالب کرے گا۔" (1)

بوفضہ کی دلیری:

اس کے بعد محمد بن قاسم میدان جنگ میں آئے، انہوں نے ملیمان بن نبھان اور ابوفضہ تمیمی کو جو کندی کا آزاد کردہ غلام تھا چالیس تخب سواروں کے ساتھ حکم دیا کہ وہ مقدمتہ الجیش کے طور پر کام رے۔ ابوفضہ ان سواروں کو لے کر بڑھا، یہاں تک کہ وہ داہر اور اس کے ٹھاکروں اور جنگجو فوجیوں کے مقابل ہوا، ابوفضہ کو دیکھتے ہی داہر کی ج کا ایک دستہ اس کے مقابلے کے لیے نکلا، ابوفضہ نے نہایت بہادری سے ان کی بڑی تعداد کو قتل کر دیا، ان میں جو کچھ بچے وہ جان بچا کر داہر ، فوج میں مل گئے، داہر نے یہ دیکھ کر دوسرا دستہ روانہ کیا، ابوفضہ نے رۂ تکبیر بلند کر کے اس دستے پر زور شور سے حملہ کیا، اس دستے کے بھی بچے کھچے لوگ شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے، داہر نے تیسری دفعہ پنے ٹھاکروں کو مقرر کیا، ابوفضہ نے اس مرتبہ بھی ان کو بھگا دیا۔

اس کے بعد دونوں فوجوں میں سخت جنگ شروع ہوئی، اسلامی جیں اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتی ہوئی آگے بڑھیں، اور اس زور و شور سے یں کہ داہر کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی، اور گڑبڑ میں ان کی صفیں لزل ہو گئیں۔ محمد بن قاسم نے اپنی فوج کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا، لمانوں بڑھتے چلے جاؤ، کیونکہ کافروں کی فوج اب منتشر ہو چکی ہے۔ بن قاسم کے ان جملوں نے اسلامی فوج کے حوصلے اور بڑھا دیے، اور مان اس بہادری سے لڑے کہ کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ داہر نے یہ دیکھا تو وہ اپنے سفید ہاتھی پر سوار ہو کر چار سو سواروں کو لے کر جو اریں، ڈھالیں اور نیزے لیے ہوئے تھے میدان جنگ میں نکلا، ہاتھی اری میں اُس کے ساتھ دو خوبصورت کنیزیں بیٹھی ہوئی تھیں، ایک کو بار بار پان کے بیڑے دیتی جاتی تھی، اور دوسری اس کو شراب کے بھر بھر کر پلا رہی تھی، راجا داہر کے ہاتھ میں ایک چکر تھا، جس میں چاقو لگے ہوئے تھے، جس کو وہ گھماتا تھا، جو بھی اس کے قریب آتا فوراً ہی اس کا سر تن سے جدا ہو جاتا تھا، داہر اور اس کے ساتھی آخری ، کو بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے، کبھی کبھی داہر اسلامی فوج کو نے کے لیے اپنے ہاتھی کو اسلامی فوج کی طرف بڑھاتا تھا، اس کا یہ نہایت خطرناک تھا۔

شجاع حبشی کی قسم:

محمد بن قاسم کی فوج میں ایک سپاہی تھا، جس کا نام شجاع حبشی تھا، شجاع نہایت دلیر اور بہادر تھا، اس نے یہ رنگ دیکھا تو محمد بن قاسم کے پاس آیا، اور قسم کھائی کہ میں اُس وقت تک نہ کھاؤں گا نہ پیوں گا جب تک کہ میں داہر کا مقابلہ کر کے اس کے ہاتھی کو زخمی نہ کر لوں گا، میں اُس سے لڑتا رہوں گا، یہاں تک کہ اس کا سر کاٹ کر لاؤں یا پھر وہیں شہید ہو جاؤں۔ یہ کہہ کر شجاع جو ایک سیاہ گھوڑی پر تھا بجلی کی طرح دشمن کی فوج میں گھس کر داہر کے ہاتھی کے قریب پہنچ گیا، داہر نے شجاع کو آتے ہوئے دیکھا تو اس کو روندنے کے لیے ہاتھی بڑھایا، شجاع نے بھی اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہاتھی کے سامنے لایا، گھوڑا ہاتھی کو دیکھ کر ایک طرف مڑنے لگا، شجاع نے فوراً ہی اپنے سر سے پگڑی اُتار کر گھوڑے کی آنکھوں پر باندھ دی، تاکہ وہ ہاتھی کی دہشت سے نہ بھاگے، پھر اس نے اپنے گھوڑے کو ہاتھی کی طرف بڑھایا، اور ایک تلوار کا وار ہاتھی کی سونڈ پر کیا، جس سے ہاتھی زخمی ہو گیا، داہر نے بھی ایک دو شاخہ تیر تاک کر اپنی پوری طاقت و قوت سے شجاع پر چلایا، جو شجاع کی گردن میں لگا، اور یہ مجاہد شہید ہو گیا۔

گھمسان لڑائی:

شجاع حبشی کی شہادت سے داہر کی فوج کے حوصلے بلند ہو گئے اور چاروں طرف سے اُنہوں نے اسلامی فوج پر حملہ کر دیا، یہ حملہ اس قدر سخت تھا کہ اسلامی فوج متزلزل ہو گئی، اور ان کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ داہر کی فوج کو گمان ہو گیا کہ مسلمانوں کو شکست ہو گئی، اور ان میں دہشت پھیل چکی ہے۔ اسلامی فوج کا یہ حال دیکھ کر محمد بن قاسم سخت پریشان ہوئے، انہوں نے پانی پلانے والے سے کہا کہ مجھے تھوڑا سا پانی دو، پانی پیا۔ محمد بن قاسم کی پریشانی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے بجائے پانی پلا کہنے کے پانی کھلا کہا، اور فوراً ہی میدان جنگ میں آکر للکار کر کہا:

اے اہل عرب! میں تمہارا سپہ سالار محمد بن قاسم موجود ہوں، تم کہاں بھاگے جا رہے ہو، ڈھالیں اٹھاؤ، اور حملہ کرو، تاکہ دشمن کو شکست ہو، اور تمہیں دشمن پر فتح حاصل ہو۔

محمد بن قاسم کے ان جملوں نے اسلامی فوج کو پھر یک جا جمع کر دیا، اب موکو بن وسایو بھی ان کے سامنے آگیا، اور اپنے لشکر کے ساتھ حکم کا منتظر ہو کر کھڑا ہو گیا۔

---

1. تمام تفصیل چچ نامہ فارسی ص ۱۷۶-۱۷۵ سے ماخوذ ہے۔

محمد بن قاسم کا خطاب:

پھر محمد بن قاسم نے بلند آواز سے پکارا، خریم بن عمرو مدنی کہاں ہے، کلی ذہلی محمد بن مصعب بن عبدالرحمٰن، نباتہ بن حنظلہ کلابی، دارس بن ایوب کہاں ہیں، ابوفضہ اور محمد بن زیاد عبدی اور تمیم بن زید قینی کہاں ہیں، میرے ساتھیو اور رشتے دارو، میرے شمشیر زنو، میرے محافظو اور میرے تیر اندازو، تم سب اسلام کے محافظ ہو، تم اپنی فوجوں کو اپنی جگہ تیار کرو، متزلزل نہ ہو، اور اپنی فوج کا حوصلہ بڑھاؤ۔

پھر محمد بن قاسم نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر حملے کا حکم دیا، داہر کی فوج بھی اپنی جگہ پر مضبوط کھڑی رہی، گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی، تلواروں کے شعلے آسمانوں میں بلند ہوئے، اور تلواریں اور نیزے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ داہر کی فوج بڑی بہادری سے لڑ رہی تھی اور مسلمان بھی جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر اُن کی صفیں الٹ رہے تھے، دن ڈھل رہا تھا، داہر کی فوج لڑتے لڑتے تھک کر چور ہو چکی تھی۔ یکایک داہر نے اسلامی فوج کی طرف اپنا ہاتھی بڑھایا، محمد بن قاسم نے منجنیق اندازوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی منجنیقیں چلائیں، ادھر مسلمان تیر اندازوں نے آگ کے تیر داہر کے سفید ہاتھی پر برسانے شروع کیے، ایک تیر انداز نے تاک کر ایسا تیر پھینکا کہ راجا کی عماری میں آگ لگ گئی، اور ہاتھی گھبرا کر قریب کی ایک جھیل میں جا گھسا اور بیٹھ گیا، ہر چند فیل بان نے کوشش کی کہ ہاتھی جھیل سے باہر نکل آئے مگر وہ نہ نکلتا تھا۔ داہر کے حفاظتی دستوں نے یہ حال دیکھا تو بعض پانی میں کود پڑے، اور بعض جھیل کے کنارے پر کھڑے رہے، پانی پینے کے بعد ہاتھی خود بخود کھڑا ہو گیا۔ داہر نے قلعے کی طرف جانا چاہا، لیکن مسلمانوں نے تیروں کی بارش شروع کر دی، راجا اور ہاتھی تیروں سے زخمی ہو گئے۔[1]

داہر کا انجام:

داہر نے دیکھا کہ لڑائی جاری ہے، اُس کے بہت سے عزیز، رشتے دار اور ساتھی لڑائی میں مارے جا چکے ہیں، اس منظر کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک جوش پیدا ہوا اور پاپیادہ بڑی بہادری سے میدان میں لڑتا رہا، سورج غروب ہو رہا تھا کہ ایک عرب نے اس کے سر پر زور سے تلوار ماری، تلوار سر سے گردن تک اتر گئی۔

مدائنی کی روایت ہے کہ داہر کو قبیلہ بنی کلاب کے کسی شخص نے قتل کیا تھا، ابن کلبی کی روایت ہے کہ داہر کو قبیلۂ طے کے قاسم بن ثعلبہ بن عبداللہ بن حصن نے قتل کیا تھا۔[2]

داہر کے قتل کے بعد برہمنوں نے اس کی لاش کو کیچڑ میں چھپا دیا اور مسلمان قلعے میں فاتحانہ داخل ہو گئے، یہ فتح جمعرات کے دن 10 رمضان المبارک ۹۳ھ (۷۱۲ء) کو حاصل ہوئی اور اُسی دن داہر راوڑ کے قلعے کے قریب قتل ہوا۔[3]

داہر کی تلاش:

اسلامی فوجیں جب راوڑ میں فاتحانہ داخل ہو چکیں تو محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ راجا داہر کا پتا چلایا جائے کہ اس کا کیا انجام ہوا، چنانچہ داہر کی تلاش ہر جگہ شروع ہوئی یہاں تک کہ ایک برہمن محمد بن قاسم کے پاس آیا اور دست بستہ کھڑے ہو کر کہا، اے انصاف پسند حاکم اگر مجھے اور میرے گھر والوں کو امان دی جائے تو میں بتا سکتا ہوں کہ داہر کا کیا انجام ہوا۔ محمد بن قاسم نے اس کو اور اس کے خاندان کو امان دے دی۔ برہمن محمد بن قاسم کے آدمیوں کو جھیل کے پاس لایا، جہاں کیچڑ میں برہمنوں نے اس کی لاش چھپا دی تھی، لاش کیچڑ سے برآمد کی گئی اور داہر کا سر محمد بن قاسم کے پاس لایا گیا۔ جو لوگ اس وقت اُس کے ساتھ موجود تھے محمد بن قاسم نے اُن سے پوچھا کہ تم میں سے کوئی آدمی ایسا ہے جو داہر کو پہچانتا ہو، پھر اُنہوں نے حکم دیا کہ وہ کنیزیں لائی جائیں جو اس کے ساتھ عماری میں تھیں، دونوں کنیزیں اُسی وقت حاضر کی گئیں۔ دونوں نے اس کے سر کو دیکھ کر کہا کہ بیشک یہ داہر ہی کا سر ہے۔ محمد قاسم نے اس سر کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا، اور دو رکعت نماز شکرانہ کی اور داہر کا سر صارم بن ابی صارم ہمدانی کے ہاتھ عراق بھجوا دیا۔

راوڑ کو فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے ایک بہترین سیاسدان ہونے کی حیثیت سے تمام باغیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا، امن شہریوں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی، بلکہ نہایت عمدگی سے ان سب کو شہر میں آباد کیا۔[4]

داہر کے لڑکے جے سینہ (جے سنگھ) نے بھاگ کر برہمن میں پناہ لی، اور آس پاس کے تمام مددگاروں سے امداد طلب کی، اور ب

---

(1) چچ نامہ ص ۸۸-۱۸۷۔

(2) فتوح البلدان ص ۴۳۸-۴۳۹۔

(3) چچ نامہ ص ۱۸۳۔

(4) چچ نامہ ص ۱۸۷-۱۸۳-۱۸۴۔

کی تیاریاں کرنے لگا، اور چاروں طرف خطوط لکھے، اس نے ایک خط اپنے بھائی گوپی کو لکھا، جو راوڑ میں رہتا تھا، دوسرا خط بھانیہ کے قلعے میں اپنے بھتیجے دھرسینہ کو بھیجا، جو اس قلعے کا مالک تھا، تیسرا خط چندر کے بیٹے ڈھول کو لکھا جو بدھیہ اور کیکانان کا حاکم تھا، ان میں اس نے داہر کے مارے جانے کی اطلاع دی اور مستقبل کے متعلق مشورے طلب کیے۔ راوڑ کی فتح کے بعد مشرقی سندھ کے چھوٹے چھوٹے حاکم ایک ایک کر کے محمد بن قاسم کے ساتھ ہوتے گئے۔

مال غنیمت کی عراق کو روانگی:

راوڑ کی فتح میں بہت سا مال غنیمت محمد بن قاسم کے ہاتھ لگا، قیدیوں میں راجا داہر کی بھانجی حسنہ بھی تھی، شوال ۹۳ھ (۷۱۲ء) کو راجا داہر کا سر اور مال غنیمت کا پانچواں حصہ اور قیدی کعب بن مخارق رابسی کی معرفت حجاج کے پاس روانہ کر دیے، جسے دیکھ کر حجاج نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر ہونے کی جامع مسجد میں لوگوں کو جمع کر کے فتح سندھ کی خوش خبری سنائی، اور لوگوں کو جہاد پر آمادہ کیا، پھر داہر کا سر، چتر شاہی اور دوسری چیزیں پایہ تخت دمشق میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے پاس بھیج دیں، ولید نے حجاج کا خط پڑھ کر خدا کا شکر ادا کیا، داہر کی بھانجی حسنہ کو خلیفہ نے اپنے لیے مخصوص کرنا چاہا کہ اسی درمیان میں عبداللہ بن عباس نے اس کی استدعا کی۔ ولید نے کہا کہ گو میں اس کا خواہاں تھا، لیکن اب میں اس کو آپ کو دیتا ہوں، پھر عبداللہ بن عباس نے اس سے نکاح کر لیا اور وہ ایک عرصے تک ان کے نکاح میں رہی، لہٰذا اس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔[1]

برہمن آباد کا رخ:

راوڑ کو فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم شوال ۹۳ھ (۷۱۲ء) کو برہمن آباد کی طرف بڑھے، راوڑ اور برہمن آباد کے درمیان دو مضبوط قلعے تھے، جن کو بہرور[2] اور دہلیلہ کہا جاتا تھا، محمد بن قاسم نے پہلے بہرور پر حملہ کیا، اس قلعے میں سولہ ہزار جنگی سپاہی تھے، انہوں نے اسلامی فوج کا سخت مقابلہ کیا، لڑائی نے اس قدر طوالت کھینچی کہ محمد بن قاسم دو ماہ تک اس میں مصروف جنگ رہے آخر انہوں نے حکم دیا کہ کچھ آدمی دن کے وقت لڑیں اور کچھ آدمی رات کو روغن نفت کے تیر اور منجنیقیں چلائیں۔ اس تدبیر پر عمل کیا گیا، اور رفتہ رفتہ دشمن کے تمام جنگ جو آدمی مارے گئے، آخر قلعے کی دیواریں توڑ کر مسلمان قلعے میں داخل ہوئے، بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا۔ وہاں سے وہ دہلیلہ پہنچے، اور قلعے کو گھیرے میں لے لیا۔ دہلیلہ کے تاجر اور دوسرے شہری محمد بن قاسم کے آنے کی خبر سن کر پہلے بھاگ چکے تھے، قلعے میں صرف فوجی ٹھہرے ہوئے تھے، دو ماہ تک اسلامی فوج اس قلعے کا محاصرہ کیے پڑی رہی۔ جب قلعے کے لوگوں پر سخت دباؤ پڑا اور ان کو کسی طرف سے مدد نہ مل سکی تو مایوس ہو کر انہوں نے ایک رات عطر لگا کر موت کے کپڑے پہنے اور اپنے اہل و عیال کو لے کر اس پھاٹک سے باہر نکل آئے جس کا رخ ریگستان کی جانب تھا اور مسلمانوں کے علم کے بغیر نہر سمجھل کو عبور کر لیا۔

ماہ صفر ۹۴ھ (۷۱۲ء) میں محمد بن قاسم نے دہلیلہ کو بھی فتح کر لیا، دہلیلہ میں کچھ دن ٹھہر کر ضروری انتظامات کیے۔

تبلیغی خطوط:

یہیں سے محمد بن قاسم نے ہندوستان کے راجاؤں اور دوسرے حکمرانوں کے نام تبلیغی خطوط بھیجے جن میں اُن پر اسلام کی خوبیاں واضح کر کے اسلام کے قبول کرنے کی دعوت دی۔[3]

داہر کے وزیر سیاکر کی درخواست:

راجا داہر کے وزیر سیاکر کو جب یہ حال معلوم ہوا کہ محمد بن قاسم نے راجاؤں کو تبلیغی خطوط لکھے ہیں، اس نے خفیہ طور پر اپنے چند آدمی محمد بن قاسم کے پاس بھیجے اور اُن کے ذریعہ سے اپنی غلطیوں پر شرمندگی کا اظہار کر کے امن و معافی کا خواستگار ہوا۔ محمد بن قاسم نے اس کو معاف کر دیا۔ سیاکر معافی کا پروانہ حاصل کرنے کے بعد محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اُن مسلمان عورتوں کو بھی اپنے ساتھ لایا، جنہیں گرفتار کر کے بطور یرغمال رکھ گیا تھا، یہ وہی عورتیں تھیں، جنہوں نے گرفتاری کے وقت حجاج کا نام لے کر فریاد کی تھی، اور اس کی مدد چاہی تھی۔ محمد بن قاسم ان مظلوم عورتوں کے ملنے سے بہت خوش ہوا اور اُن عورتوں کو فوراً ہی عرب بھجوا دیا۔[4]

سیاکر جیسے ہی حاضر ہوا، محمد بن قاسم اُس کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آئے، اور اُسے خصوصی اعزاز و اکرام سے نوازا، یہاں

---

[1] چچ نامہ فارسی ص ۱۹۵۔

[2] گمان غالب ہے کہ بہرور، بہریا سے متصل تھا یا بہلانی کے قریب تھا، بہریا آج بھی ضلع نواب شاہ میں موجود ہے۔ (توضیحات چچ نامہ سندھی، ص ۵۱۶)۔

[3] چچ نامہ فارسی، ص ۱۹۸-۱۹۹۔

[4] چچ نامہ، ص ۱۹۹۔

تک کہ اُسے اپنا وزیر بنایا، سیاکر نہایت ہی عقل مند، مدبر اور دور اندیش انسان تھا، وہ چند ہی دن میں محمد بن قاسم کا اس قدر معتمد ہو گیا کہ تمام معاملات میں محمد بن قاسم اُس سے مشورہ کرتے تھے۔ سیاکر بھی اُن کا اس قدر ممنون تھا کہ وہ اکثر اُن کی تعریف کے گن گاتا تھا۔

دہلیلہ کو فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے وہاں کا حاکم نوبہ بن ہارون کو مقرر کیا اور دہلیلہ سے ودہاتیہ تک دریا کے کنارے کنارے کشتیوں کو اکٹھا کرنے اور نگرانی کا کام اُس کے سپرد ہوا، یہ مقام برہمن آباد سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔[1]

برہمن آباد کی جنگ:

[2] دہلیلہ سے روانہ ہو کر محمد بن قاسم برہمن آباد پہنچے، اور جلوالی نہر

---

(1) چچ نامہ، ص ۲۰۰۔

(2) چچ نامہ میں اس شہر کے نام کا رسم الخط برہمن آباد ہے، اس نام کے آخری لفظ "آباد" سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اصل میں ایرانی نام ہے، تاریخی نقطۂ نظر سے خیال ہوتا ہے کہ یہ شہر غالباً ایران کے بادشاہ بہمن اردشیر کے حکم سے تعمیر کیا گیا تھا، اس لحاظ سے اس کا اصل نام "بہمن آباد" تھا۔ بہمن اردشیر نے اپنی وسیع مملکت میں تین شہر اس نام سے آباد کیے تھے، ایک بہمن آباد خراسان میں تھا جو رے اور نیشاپور کے درمیان میں تھا، دوسرا سواد عراق میں تھا، جس کو پہلے "ابیذ اردشیر" کا نام دیا گیا، مگر بعد میں وہ "بہمنیا" کہلانے لگا، اور خود مورخ طبری کے زمانے (۸۶۸-۹۳۶ء) میں موجود تھا (طبری جلد ا ص ۶۸۷)۔
چونکہ سندھ کو بھی اردشیر نے فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا اور اس کے دور حکومت میں سندھ میں یکے بعد دیگرے اس کے گورنر یہاں مقرر ہوتے رہے (حمزہ اصفہانی سنی ملوک الارض ولا انبیاء، ص ۱۲-۱۳) اسی لیے سندھ میں بھی اس کے نام سے یہ شہر آباد ہوا ہو گا، ہمارے اس خیال کی تصدیق "مجمل التواریخ" سے بھی ہوتی ہے۔ مجمل التواریخ میں ہے کہ بہمن اردشیر نے اس طرف (سندھ میں) بھی شہر تعمیر کرائے تھے، ایک تو ترکوں اور ہندوؤں کی سرحد ظاہر کرنے کے لیے قندابیل (گندا وا) اور دوسرا بدھیہ کے علاقے میں بہمن آباد، جو اب منصورہ کے نام سے مشہور ہے، (مجمل التواریخ ص ۱۱۷-۱۱۸) غالباً اس شہر کے آباد ہونے کے طویل عرصے کے بعد، جب سندھ میں برہمن برسر اقتدار آئے تو انہوں نے بہمن آباد کا نام بدل کر برہمن آباد رکھا، برہمنوں کا سندھ پر قبضہ چونکہ تعصب سے خالی نہ تھا، اس لیے ہندوستان کے برہمن راجا "قصند" نے اپنے بھائی "سامید" کو سندھ پر لشکر کشی کے لیے مقرر کیا، اور بہمن آباد میں آتشکدے کی جگہ بتکدہ تعمیر کروایا (مجمل التواریخ ص ۱۱۹) اس شہر کے نام کی تبدیلی یا تو اس برہمنی تعصب کی بنا پر ہوئی یا برہمنوں کے طویل تسلط کی وجہ سے اس شہر کا نام برہمن آباد پڑا یا سندھی زبان کے مقامی تلفظ کی وجہ سے برہمن آباد ہو گیا (کتاب الہند عربی متن ص ۱۳۰۔ ترجمہ XI ۲۶۰)۔

گیارھویں صدی کے شروع میں بھی ہمیں اس شہر کا نام "بہمنوا" لکھا ہوا ملتا ہے، جس سے اس شہر کے نام کے متعلق ایرانی نام ہونے کی اور بھی تائید ہوتی ہے، البیرونی نے یہ بھی لکھا ہے کہ "برہمن آباد" درحقیقت "بہمنوا" ہے (ایضاً، ترجمہ XI ۱۶۲)۔
چچ نامہ سے ظاہر ہے کہ برہمن آباد رائے گھرانے کی حکومت کے زمانے میں لوہانی پرگنے کا مرکزی شہر اور وہاں کے حاکم اگھم کا دارالسلطنت تھا (متن چچ نامہ ص ۵۷) محمد بن قاسم کے فتح کے زمانے ۹۴ھ (۷۱۲ء) میں بھی برہمن آباد اس علاقے کا خاص قلعہ تھا، اور شہر اس مضبوط قلعے کے اندر تھا، جس کے چار دروازے تھے، اور شہر کے مشرقی جانب "جلوالی" نامی ایک نہر بہتی تھی۔
برہمن آباد کی مرکزی حیثیت اس وقت کم ہوئی، جب کہ محمد بن قاسم کے بیٹے عمرو نے سندھ کے گورنر حکم کی حکومت کے زمانے (۱۱۱-۲۲/۱۲۱ھ -- ۷۳۸-۳۹ء) میں اپنی شاندار فتوحات کی یادگار کے طور پر منصورہ کے نام سے ایک شہر آباد کیا (فتوح البلدان۔ بلاذری ص ۴۴۴) جو برہمن آباد سے دو فرسنگ کے فاصلے پر تھا (ایضاً ص ۴۳۹) اس شہر کا نام اس دور کی فتوحات کی وجہ سے منصورہ رکھا گیا لیکن چونکہ یہ نیا شہر برہمن آباد اور سارے سندھ کا پایہ تخت بنا، اس لیے سندھ کے لوگ اس شہر کو بھی برہمن آباد کہنے لگے (اصطخری ص ۱۷۲) اور (ابن حوقل ص ۲۲۶) نے صاف طور پر لکھا ہے کہ سندھی منصورہ کو بھی برہمن آباد کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اسی لیے عرب مورخین دونوں شہروں میں فرق کرنے کے لیے اصل برہمن آباد کو قدیم برہمن آباد لکھتے ہیں، جو منصورہ سے دو فرسنگ کے فاصلے پر تھا۔
اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اصل اور قدیم برہمن آباد کس جگہ واقع تھا، اس سلسلے میں مذکورہ بالا دو حوالے بہت اہمیت رکھتے ہیں، ایک تو یہ کہ برہمن آباد نئے تعمیر شدہ شہر منصورہ سے دو فرسنگ کے فاصلے پر تھا، دوسرا یہ کہ اس کے مشرقی جانب "جلوالی" نامی نہر بہتی تھی، محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے ۲۰-۱۹۲۲ء میں کھدائی ہوئی تھی اس سے یہ امر یقینی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ شہداد پور سے تقریباً ۸ میل جنوب مشرق کی طرف اور نہر جمڑاؤ کے قریب مشرق کی طرف دلور مشہور ٹیلہ اور وسیع کھنڈرات درحقیقت عرب دور کے مشہور شہر منصورہ کے کھنڈرات ہیں۔ عرب گورنروں کے دستیاب شدہ سکے، مٹی کے برتن اور قدیم شاہی کے آثار ہمارے اس نظریے کی مکمل تائید کرتے ہیں، حالانکہ محکمہ آثار قدیمہ کے لوگوں نے تاریخ عرب سے لاعلمی [illegible] شہر کے مقامی نام "بانبھ" کی وجہ سے دھوکا کھا کر ان آثار کو بھی برہمن آباد قرار دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدیم برہمن آباد کو اس شہر منصورہ کے کھنڈرات سے کوئی دو فرسنگ فاصلے تلاش کرنا چاہیے، اس لحاظ سے اگر آثار منصورہ کے درمیانی حصے (۱) کو مرکز قرار دے کر دو فرسنگ (یعنی پانچ یا چھ میل) کے نیم قطر سے دائرہ کھینچا جائے تو قدیم برہمن آباد اسی دائرے والی لکیر کے بالکل متصل واقع ہونا چاہیے۔
منصورہ کے گرد و نواح کے معائنے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دوسرے قدیمی ٹیلے آثار منصورہ کے قدیم کھنڈرات سے جنوب مشرق اور شمال مشرق کی طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

کے کنارے برہمن آباد کے مشرقی جانب قیام کیا۔ وہیں سے انہوں نے ایک خط اپنے قاصد کے ذریعہ سے برہمن آباد روانہ کیا، جس میں لکھا تھا کہ یا تو اسلام قبول کرو، ورنہ ہماری اطاعت قبول کر کے جزیہ دو، اگر یہ منظور نہ ہو تو پھر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔

داہر کا لڑکا۔ جے سینہ (جے سنگھ) جس نے داہر کے قتل ہونے کے بعد اپنی سازشوں کا مرکز برہمن آباد کو بنایا تھا، وہ برہمن آباد کا فوجی انتظام کر کے چنیسر کی طرف فرار ہو چکا تھا۔ جو افسر اُس نے مقرر کیے تھے انہیں لڑنے کا حکم تھا، اس لیے محمد بن قاسم کا قاصد ناکام لوٹا، قاصد کے ناکام واپس آنے پر محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ خندقیں کھودی جائیں، جب خندقیں تیار ہو گئیں تو پیر کے روز ماہ رجب ۹۴ھ (۷۱۳ء) کی پہلی تاریخ کو برہمن آباد کی جنگ شروع ہوئی۔

قلعہ بُرہمن آباد میں تقریباً چالیس ہزار فوجی تھے، جو صبح کو ڈھول بجاتے ہوئے قلعے سے نکلتے اور شام تک معرکہ آرا ہو کر قلعے میں واپس چلے جاتے، اور مسلمان اپنی لشکر گاہ میں آکر آرام کرتے، اس طرح اس قلعے پر چھ مہینے تک لڑائی ہوتی رہی، مگر قلعہ کسی طرح فتح نہ ہوتا تھا۔

روز یکشنبہ ماہ ذوالحج ۹۴ھ (۷۱۳ء) کو جے سینہ رمل بادشاہ کے علاقے بھاٹیہ سے واپس آیا، یہ محاصرے کی وجہ سے قلعہ میں تو داخل نہ ہو سکا، لیکن اس نے اسلامی لشکر پر چھاپے مارنے شروع کر دیے، اور مسلمانوں کو جو رسد باہر سے پہنچتی تھی اس کا راستہ روک دیا، جس کی وجہ سے اسلامی لشکر کو سخت پریشانیوں کا سامنا ہوا۔

محمد بن قاسم نے موکو بن بسایو سے مشورہ کر کے نباتہ بن حنظلہ کلابی، عطیہ تغلبی، صارم بن صارم ہمدانی اور عبدالملک مدنی سرداران لشکر کو ان کی متعلقہ سواروں کے ساتھ الگ الگ کر کے ایک خاص فوج ترتیب دی، اور اس فوج کا افسر اعلیٰ موکو بن بسایو اور خریم بن عمرو المدنی[2] کو بنا کر جے سینہ (جے سنگھ) کے تعاقب اور مقابلے کے لیے مامور کیا۔ جے سینہ کے ساتھ محمد علافی بھی تھا جو اس کا معین و مددگار تھا، جیسے ہی جے سینہ کو معلوم ہوا کہ اسلامی فوج اس کے مقابلے کے لیے آرہی ہے، وہ فوراً ہی اپنے اہل و عیال اور اپنی فوج کو لے کر ریگستان کے راستے سے چترور[3] کے علاقے جنگن و عوراوکایا کی طرف آیا، موکو نے اس کا تعاقب کیا، یہاں تک کہ محمد علافی اور جے سینہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ محمد علافی طاکیہ کے علاقے میں چلا گیا، وہاں سے وہ سیدھا کشمیر پہنچا۔ اُس نے کشمیر کے راجا کو لکھا کہ میں آپ کی مہربانیوں اور کرم کا متوقع ہو کر آیا ہوں۔ راجا نے اُس کے خط کو پڑھ کر دربار میں حاضر ہونے کی اجازت دے دی، اور وہ پایہ تخت کشمیر میں پہنچ گیا، جب وہ دربار میں پہنچا تو راجا کشمیر نے پچاس گھوڑے ساز و سامان کے ساتھ، اور دو سو قیمتی خلعتیں اس کو اور اس کے ساتھیوں کو دیں، اور موضع شاکلھار جاگیر کے طور پر اس کو دیا۔ محمد علافی نے اُسی وقت جہم بن سامہ شامی کو اس جاگیر پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کر دیا، دوسری دفعہ محمد علافی جب راجا کشمیر سے ملا تو اُس وقت بھی راجا کشمیر نے کرسی اور چتر کے علاوہ قیمتی تحفے اس کو دیے، اور وہ اعزاز بخشا جو صرف بادشاہوں کو دیا جاتا ہے۔ محمد علافی ایک طویل عرصے تک وہاں رہا اور اُس نے شاکلھار میں وفات پائی اُس نے بہت سی مسجدیں تعمیر کرائیں اور کشمیر کے دربار میں اس کو بھی بہت عزت و رسوخ حاصل ہوا۔[4]

جے سینہ نے چترور کے علاقے سے اپنے بھائی توفی (گوپی) کو اروڑ خط لکھا کہ میں سلطنت سے دست بردار ہوتا ہوں، تم قلعہ اروڑ کی

منصورہ سے شمال مشرق کی طرف "جراری" نامی بستی ہے، جس کا نام نہر قدیم جلوالی کی ایک یادگار ہے۔ اس علاقے کی ہم نے خوب چھان بین کی ہے، ہمارے خیال میں گاڑھو بھڑو موضع (پلیہ لغاری گاؤں) تحصیل سنجورو کے قریب مشرق کی طرف کے کھنڈرات یا ڈیپر جھانگرے کی ٹھل (جھول سے مغرب کی طرف کے) مغربی کھنڈرات، ان دونوں میں سے کسی ایک کے آثار قدیم برہمن آباد کے آثار ہیں، یہ دونوں کھنڈرات منصورہ سے تقریباً پانچ چھ میل دور دو فرسنگ کے فاصلے پر ہیں۔ (توضیحات چچ نامہ سندھی، مرتب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ص ۳۹۶-۴۰۰)۔

(1) خود منصورہ کے موجودہ آثار بھی کافی اراضی میں پھیلے ہوئے ہیں، تخمیناً وہ حصہ جہاں جامع مسجد تھی شہر کا ابتدائی حصہ تھا۔ ہینری کزنس کی کتاب انٹی کوائیٹیز آف سندھ سے ان آثار کی کھدائی اور صورت حال کے نقشے سے یہ بات آسانی سے متعین کی جاسکتی ہے کہ وہ جگہ مشرق کی جانب تعمیر شدہ مینار کے شمال مشرق کی طرف ہے (فٹ نوٹس توضیحات چچ نامہ سندھی، ص ۴۰۰)۔

(2) فارسی ایڈیشن میں یہ نسبت یہاں "الدیبی" مذکور ہے، اور دوسرے قدیم نسخوں میں بھی یہ عبارت بہت مبہم ہے مگر صحیح "المدنی" ہے جیسا کہ پہلے یہ نام صاف طور پر خریم بن عمرو مدنی تحریر کیا گیا ہے (حاشیہ چچ نامہ سندھی مرتب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، ص ۲۹۴)۔

(3) چچ نامہ فارسی، ص ۱۹۹-۲۰۳۔

(4) چچ نامے کے قدیم نسخوں میں اس کا تلفظ "جزور" ہے، البیرونی نے بھی کتاب الہند میں اس شہر کا نام "جتھرور" لکھا ہے، بقول اس کے بازان سے جنوب کی طرف جاتے ہوئے، آپ میواڑ پہنچیں گے جہاں کا پایہ تخت جتھرور ہے (تعلیقات چچ نامہ سندھی، مرتب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، ص ۴۰۵)۔

پوری طرح حفاظت کرو۔

ادہر جیسینہ کے جانے کے بعد برہمن آباد کے باشندے جو لڑائی سے تنگ آچکے تھے، اس فکر میں تھے کہ کس طرح اس لڑائی سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ آخر چار معزز شہری جن کا شہر کے لوگوں پر اثر تھا، قلعے کے جربطری دروازہ کے پاس جمع ہوئے، انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہمیں قلعہ بند ہو کر چھ ماہ گزر چکے ہیں، اب نہ ہم میں مقابلے کی قوت ہے اور نہ کوئی بظاہر صلح وصفائی کی صورت نظر آتی ہے، اگر چند دن اور یہی حالت رہی تو ہمارا شہر خود بخود فتح ہو جائے گا، اور نہ اس کا کوئی امکان ہے کہ کوئی مدد ہمیں باہر سے مل سکے گی۔ اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم مسلمانوں سے معاہدہ کر کے شہر اُن کے حوالے کر دیں، اس طرح ہماری عزت بھی باقی رہے گی، اور ہم اس مصیبت سے نجات بھی حاصل کر سکیں گے۔ سب نے اس رائے سے متفق ہو کر محمد بن قاسم کے پاس ایک قاصد بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ ہم لڑائی سے تنگ آچکے ہیں، اب آپ کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں بشرطیکہ آپ ہمیں امن دیں لیکن اس کی صورت یہ ہو گی کہ ہم فلاں دن قلعے کے جربطری دروازے سے نکلیں گے اور مسلمانوں کے پہلے ہی حملے میں گھبرا کر قلعے میں گھس جائیں گے اور شہر کا دروازہ کھلا چھوڑ دیں گے، آپ فوراً اپنی فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہو جائیں۔

یہ درخواست باشندگان شہر کی جانب سے تھی، فوج اور فوجی سرداروں کی طرف سے نہ تھی۔ محمد بن قاسم نے قاصد کو جواب دیا کہ ہمیں تمہاری درخواست منظور ہے، تمام غیر فوجی شہریوں کو امن دی جاتی ہے، لیکن یہ عمل تمہیں کس دن کرنا چاہیے اس کا دن اور تاریخ میں مقرر کروں گا۔ برہمن آباد کا قاصد یہ جواب لے کر واپس چلا گیا۔ محمد بن قاسم نے تمام صورت حال لکھ کر حجاج سے مشورہ طلب کیا۔ حجاج نے جواب لکھا کہ تم ان لوگوں سے معاہدہ کرو اور جو عہد کرو اس کو پورا کرو۔ حجاج کا جواب آنے پر محمد بن قاسم نے ایک تاریخ مقرر کر کے برہمن آباد کے لوگوں کو اطلاع دے دی، چنانچہ اپنے وعدے کے مطابق انہوں نے قلعے سے نکل کر لڑائی شروع کر دی، اور مسلمانوں کے پہلے ہی جوابی حملے پر قلعے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر قلعے میں گھس گئے۔ اسلامی فوجیں اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتی ہوئیں قلعے میں داخل ہو گئیں، قلعے کے اندر دشمن کی جو فوج تھی وہ اس اچانک اور غیر متوقع صورتحال سے گھبرا کر قلعے کے دوسرے دروازے سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد محمد بن قاسم نے سختی سے حکم دیا کہ سوائے اُن لوگوں کے جو لڑائی پر آمادہ ہیں کسی امن پسند شہری سے تعارض نہ کیا جائے، سب نے اس حکم کی بڑی سختی سے پابندی کی۔[1]

رانی لاڈی کے متعلق مختلف روایتیں:

راجا داہر کی رانی لاڈی کے متعلق ہمیں چچ نامہ میں دو روایتیں ملتی ہیں، ایک روایت تو یہ ہے کہ راجا داہر کے قتل کے بعد اس کی رانی لاڈی برہمن آباد میں ہی مقیم ہو گئی تھی، اس کا خیال تھا کہ وہ آخر وقت تک مسلمانوں کا مقابلہ کرے گی، اور اگر ناکامی ہوئی تو وہ آخر میں ستی ہو جائے گی۔ چنانچہ اُس نے برہمن آباد کے قیام کے زمانے میں اپنے خرچ سے ایک چھوٹی سی فوج تیار کی تھی، جو قلعے کے ایک دروازے پر متعین تھی۔ جب مسلمان فوجیں اچانک قلعے میں داخل ہوئیں تو لاڈی کو خبر بھی نہ ہونے پائی، اور وہ دوسرے قیدیوں کی طرح گرفتار ہو کر محمد بن قاسم کے پاس پیش ہوئی۔ محمد بن قاسم کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ داہر کی بیوی ہے تو انہوں نے حکم دیا کہ اس کو پردے میں نہایت عزت واحترام سے دوسرے قیدیوں سے الگ رکھا جائے۔

دوسری روایت ہے کہ برہمن آباد کے فتح ہونے کے بعد محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ راجا داہر کے رشتے داروں کو تلاش کیا جائے، مگر ان کا کچھ پتا نہ چلا، وہ اسی فکر میں تھے کہ دوسرے دن برہمنوں کا ایک وفد جو ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا اور بھدرا کرائے ہوئے تھا، محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب یہ وفد آیا تو انہوں نے اس کی ہیبت کو دیکھ کر پوچھا کہ تم لوگ کس فوج سے تعلق رکھتے ہو؟ اُن لوگوں نے جواب دیا کہ اے امیر! ہمارا تعلق کسی فوج سے نہیں، ہم برہمن ہیں، ہم اس راجا کے ملازم تھے، اب وہ مارا گیا ہے، اور یہ مملکت آپ کی تحویل میں آئی ہے، ہم میں سے بعضوں نے تو وفاداری کے طور پر اپنے آپ کو ہلاک کر لیا ہے، اور ہم جو باقی بچے ہیں ان کے سوگ میں بھدرا کرا کر آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ اب آپ اس ملک کے حاکم ہوئے ہیں، آپ کو سلام کریں، اور یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کا ہمارے متعلق کیا فیصلہ ہے؟ محمد بن قاسم نے کہا کہ میں تم کو اس شرط پر امان دیتا ہوں کہ تم داہر کے رشتے داروں کو جہاں کہیں بھی وہ موجود ہوں لا کر حاضر کرو، چنانچہ اس وعدہ معافی کے بعد ان برہمنوں نے داہر

---

[1] چچ نامہ، فارسی، ص ۲۰۵-۲۰۹۔

کی رانی لاڈی کو لا کر محمد بن قاسم کے سامنے حاضر کر دیا۔ محمد بن قاسم نے حجاج اور خلیفہ ولید بن عبدالملک کی اجازت کے بعد رانی لاڈی کو آزاد کر کے اس سے شادی کر لی[1] لیکن ہماری رائے میں شادی کی روایت ایک افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، کیونکہ عرب مورخین نے مطلقاً اس کا تذکرہ نہیں کیا، بلکہ بلاذری میں بصراحت موجود ہے کہ محمد بن قاسم نے راوڑ بزور بازو فتح کیا، وہیں داہر کی بیوی موجود تھی، وہ گرفتاری کے خوف سے مع اپنی لونڈیوں اور سامان کے جل مری۔[2]

اب سوال یہ ہے کہ محمد بن قاسم نے کہاں شادی کی تھی، کیونکہ اس کے دو بیٹے عمرو اور قاسم تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ عمرو سندھ کا گورنر اور مشہور شہر منصورہ کا بانی تھا، اس کا بھائی قاسم پورے پندرہ سال بصرے کا گورنر رہا، وہ بڑا قابل اور عام و خاص میں مقبول حاکم تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مشہور رجز گو شاعر روبہ بن العجاج نے اس کی مدح میں قصیدے کہے ہیں، وہ اپنے ایک طویل قصیدے میں جس کا مطلع ہے:

قلت و قد اقصر جمل الاصور (دیوان روبہ ص ۵۷-۶۳) کے ۱۹۳ تا ۱۹۷ مصرعوں میں کہتا ہے۔

مانی غد انی امرو من معشر
یغدون انصارک یوم النصر
وھم علیٰ رغم العداتہ الزفر
اخوال آبائک فی المجد الشزی
سعد بن زید فی الصمیم الدوسری

(یعنی میں اس گروہ میں سے ہوں کہ جو ہر مصیبت کے دن تیرے دشمنوں کے خلاف صف آرا اور تیرا معاون ہے، اور وہ گروہ "سعد بن زید" کے قبیلے کے شیر مردوں کا ہے، جو تیرے خاندان کے ننہالی عزیز اور اعلیٰ شان اور بلند مرتبے کے لوگ ہیں)۔

ان متذکرہ بالا اشعار سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں، ایک یہ کہ اس شاعر نے سعد بن زید کے قبیلے کا ذکر کیا ہے، جس قبیلے کا وہ خود بھی ایک فرد ہے، کیونکہ روبہ بن العجاج قبیلہ بنو تمیم کی ایک بڑی شاخ "بنو سعد بن مالک بن سعد بن زید مناۃ بن تمیم" سے تھا اور قبیلہ سعد بن زید مناۃ اسی بڑی شاخ کی ایک شاخ تھا، جسے شاعر نے اختصار کے طور پر صرف "سعد بن زید" لکھا ہے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ اس قبیلے کے لوگ اس کے ممدوح قاسم کے خاندان کے ننھالی عزیز ہیں، اُس کے اصل الفاظ "اخوال ابائک" ہیں یعنی "تیرے اجداد کے ننھالی" جس کا مطلب یہ ہوا کہ قاسم کے باپ محمد بن قاسم اور اُس کے آباؤ و اجداد کے ننھالی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ محمد بن قاسم کے بزرگوں کی شادیاں بنو تمیم کے اسی گھرانے یا خاندان میں ہوئی تھیں، اور اسی رسم کے مطابق غالباً خود محمد بن قاسم کی شادی بھی اسی خاندان یا قبیلے میں ہوئی ہوگی۔ واقعہ بھی یہی ہے کیونکہ مشہور محقق اور ادیب خطیب تبریزی روبہ کے مذکورہ رجزیہ قصیدے کے ۱۹۵ اور ۱۹۶ نمبر کے مصرعوں کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ابو محمد نے کہا ہے کہ میں نے اُس شاعر روبہ کے "س" کے قافیہ والے قصیدے کا ایک مصرعہ دیکھا ہے، جس سے شاعر روبہ کی مراد یہ ہے کہ محمد بن قاسم کی ننھال بنی سعد بن تمیم میں سے ہے۔ ابو محمد کی اصل عبارت یہ ہے کہ:

"یرید ان القاسم بن محمد لہ خؤولتہ فی بنی سعد بن تمیم[3]۔"

یہ ابو محمد مشہور عالم ابن بالسیرانی ہیں، جن کی شہادت کو قطعی مستند سمجھنا چاہیے۔ ان تمام حوالوں اور وضاحت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ محمد بن قاسم کی ننھال قبیلہ بنی تمیم کی ایک شاخ قبیلہ بنو سعد (بن مالک بن سعد بن زید مناۃ بن تمیم) سے تھی اور محمد بن قاسم نے بنو تمیم کے اسی خاندان میں شادی کی تھی۔[4]

برہمن آباد کا انتظام:

برہمن آباد کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے اعلان کیا کہ جو لوگ بخوشی مسلمان ہو گئے ہیں ان کے حقوق عرب مسلمانوں کے مساوی ہوں گے اور وہ غلامی اور جزیے سے مستثنیٰ ہوں گے، اور جو لوگ اپنے مذہب پر رہیں گے، اُن پر اُن کے مذہب کے معاملے میں کوئی زبردستی نہ کی جائے گی، لیکن ان کو جزیہ دینا پڑے گا، جس کی شرح یہ ہوگی:

(۱) امیر اور دولت مندوں سے فی کس ۴۸ درہم یعنی تقریباً تیرہ روپے سالانہ۔

---

[1] چچ نامہ، ص ۲۰۷-۲۰۸۔

[2] بلاذری، ص ۴۳۹ مطبوعہ لیدن و ص ۱۸۵۔

[3] حاشیہ کتاب "تہذیب الالفاظ" ص ۶۸۔

[4] یہ تمام تفصیل تعلیقات چچ نامہ سندھی مرتب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ص ۴۴۶-۴۴۵-۴۴۴ سے ماخوذ ہے۔

(۲) درمیانی اور متوسط درجے کے لوگوں سے فی کس ۲۴ درہم یعنی چھ روپے سالانہ۔

(۳) غریب لوگوں سے فی کس ۱۲ درہم یعنی تین روپے سالانہ۔

اس اعلان کے بعد کچھ لوگوں نے بخوشی و رضامندی اسلام قبول کر لیا اور کچھ لوگ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے، جو لوگ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے، اُن کے ساتھ بھی نہایت اچھا سلوک کیا گیا، اور ان کے مال و اسباب میں سے کوئی چیز زبردستی نہیں لی گئی۔

رعایتیں:

اُن کے ساتھ یہ بھی رعایت کی گئی کہ برہمنوں کو جو سابقہ حکومت کی طرف سے حقوق حاصل تھے ان کو اسی طرح باقی رکھا گیا۔

منادر کے لیے جو جائدادیں چلی آتی تھیں اُن میں بھی کوئی دخل نہیں دیا گیا، اس کے علاوہ سرکاری مال گذاری میں سے برہمنوں کے وظیفے مقرر کیے گئے۔

شہر کے ان تاجروں، کسانوں، پیشہ وروں اور شہریوں میں جن کا مال جنگ میں لٹ گیا تھا اور جن کی تعداد تقریباً دس ہزار تھی، ایک لاکھ بیس ہزار درہم تقسیم کیے گئے تاکہ وہ اپنی حالت درست کر کے اچھے شہریوں کی طرح اپنی زندگی بسر کریں۔

چچ کے زمانے میں جو لوگ جن عہدوں پر تھے اُن کو برقرار رکھا گیا، اور بڑے بڑے برہمنوں کو بلا کر محمد بن قاسم نے کہا کہ داہر کے زمانے میں تم معقول عہدوں پر فائز تھے، اس لیے تم شہر کے ہر اچھے اور برے آدمی کو جانتے ہو، اگر کچھ شریف لوگ تمہاری نظر میں ایسے ہوں جو ہماری امداد کے مستحق ہوں تو ہمیں بتاؤ تاکہ اُن کی امداد کی جاسکے۔

قلعے کا انتظام یہ کیا کہ قلعے کے چاروں دروازے پر جو فوجی دستے مقرر کیے گئے ان میں ہر دستے کا فوجی افسر برہمن تھا، ان افسروں کو یہ عزت بخشی گئی کہ ایک گھوڑا اور خلعت ان کو دیا گیا اور سندھی رواج کے مطابق ان کے ہاتھوں اور پاؤں میں سونے کے کڑے پہنائے گئے، اور ہر ایک کو دربار میں کرسی دی گئی۔

ہر عہدہ دار کو محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ تمہارا سب سے بڑا فرض یہ ہوگا کہ رعایا اور حکومت کے درمیان اچھے تعلقات پیدا کرو اور اگر ان تعلقات کے خوشگوار بنانے میں کوئی حائل ہو تو حکومت ان مفسدین کے مقابلے میں تمہاری پوری مدد کرے گی۔

مال گذاری وصول کرنے پر جو برہمن مقرر کیے انہیں نصیحت کی کہ مال گذاری وصول کرنے میں رعایا پر ظلم و زیادتی نہ کرنا۔ اتنا محصول، لگان یا ٹیکس کسی پر نہ لگانا جو اس کی استطاعت سے باہر ہو، رعایا کی بھلائی کے لیے جو کچھ تم سوچو اس کی حکومت کو اطلاع دو تاکہ اس پر عمل کیا جاسکے۔

محمد بن قاسم کے اس سلوک اور برتاؤ سے سارے شہر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، ہر ایک برہمن کی زبان پر اسلامی حکومت کی تعریف تھی، کل تک جو برہمن اسلامی حکومت کے دشمن تھے وہ گاؤں گاؤں پہنچ کر لوگوں سے کہتے تھے:

> اے معزز اور مشہور لوگو! تم سب جانتے ہو کہ داہر مارا گیا ہے اور کافروں کا دور بالکل ختم ہو چکا ہے، اب تمام ملک خواہ سندھ ہو یا ہند پورے طور پر عربوں کے ہاتھ میں ہے، ان کے نزدیک بڑا، چھوٹا، شہری اور دیہاتی سب برابر ہیں، اب جو کچھ بھی ہم کریں گے اسے بادشاہ کی طرف سے جاننا چاہیے، ہمیں تمہارے پاس بھیجا گیا ہے اور ہم سے شاندار وعدے کیے گئے ہیں، اگر ہم عربوں کی اطاعت نہ کریں گے تو ہم سخت نقصان میں رہیں گے، ہم اپنی سابقہ پوزیشن اور عزت ان کی اطاعت ہی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر یہ جزیہ جو تم پر عائد کیا گیا ہے، اس میں گرانباری سمجھتے ہو تو پھر ہند و سندھ کے کسی ایسے علاقے میں چلے جاؤ، جہاں تمہارے دل کو اطمینان حاصل ہو، کیونکہ انسان کے لیے جان کی سلامتی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، جزیے کے ادا کرنے ہی سے ہمارا مال اور اہل عیال محفوظ ہوں گے۔

برہمنوں کی یہ باتیں سن کر لوگ دیہات سے برہمن آباد آتے اور ضروری باتیں معلوم کر کے جاتے تھے۔ جو معزز لوگ اطراف و اکناف سے محمد بن قاسم کے پاس آتے وہ اُن کو اسلامی حکومت کی خوبیاں سمجھاتے، اور اُن سے کہتے کہ تم ہر طرح سے مطمئن رہو، اور ہمارے متعلق کسی قسم کا برا خیال دل میں نہ لاؤ، اور تمہاری بات سنی جائے گی، اور تمہارا مشورہ قبول کیا جائے گا۔[1]

برہمن افسروں کو ہدایات:

محمد بن قاسم نے جن برہمن افسروں کو محصول کی وصولی پر متعین

---

[1] یہ تمام تفصیل چچ نامہ ص ۲۰۷-۲۱۲ اور تاریخ سندھ - مولف: مولانا ابو ظفر ندوی، ص ۹۰-۹۳۔

کیا تھا، انہیں ہدایت دی کہ محصول لگانے اور وصول کرتے وقت حکومت اور خالق کے درمیان سچائی کا خیال رکھنا، اگر کوئی شے تقسیم کرنا تو برابر بانٹنا، ہر ایک پر اس کی برداشت کے مطابق مالیہ مقرر کرنا، باہم متفق ہو کر کام کرنا، اور منتشر نہ ہونا تاکہ ملک ویران نہ ہو۔

برہمن آباد کا مندر:

محمد بن قاسم کی رواداریوں کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ ایک روز برہمن آباد کے مندر کے پجاری اُن کے پاس آئے، اور کہا اے امیر! ہم مندر کے پجاری ہیں، ہم لوگوں کا گذارہ پوجا پاٹ پر ہے، لیکن جب سے شہر پر آپ کا قبضہ ہوا ہے، لوگ اس قدر خوف زدہ ہو گئے ہیں کہ انہوں نے خوف سے مندر میں پوجا کے لیے آنا چھوڑ دیا ہے، اب ہم بھوکوں مر رہے ہیں، اب جب کہ ان لوگوں نے جزیہ دینا منظور کر لیا ہے تو انہیں مندر میں پوجا کی اجازت دی جائے۔ محمد بن قاسم برہمنوں کی یہ بات سن کر خاموش ہو گئے، کیونکہ اسلام میں بتوں کی پرستش حرام ہے۔ انہوں نے تمام معاملہ حجاج بن یوسف کو لکھ کر مشورہ طلب کیا، چند دن بعد حجاج کا حسب ذیل جواب آیا:

تمہارا خط ملا، برہمن آباد کے پجاریوں نے جو تم سے مندر کے آباد کرنے اور مذہبی معاملات میں نرمی اختیار کرنے کی استدعا کی ہے، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب وہ لوگ اپنے مذہب پر قائم رہ کر جزیہ دیتے ہیں، تو پھر اُن کے مذہبی معاملات میں دخل نہ دینا چاہیے، تم انہیں اجازت دو کہ وہ اپنے طریقے پر اپنے مذہبی مراسم ادا کریں، اور کسی کو اس کے طریقہ عبادت سے روکنے کی ضرورت نہیں، اُن کے جان و مال کی حفاظت ہمارا فرض ہے، اس کا خیال رکھو کہ ان کی جان و مال کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے، تاکہ وہ اپنے گھروں میں مطمئن اور خوش حال زندگی بسر کریں۔

حجاج بن یوسف کا جب یہ خط محمد بن قاسم کو ملا، انہوں نے شہر کے معززین اور برہمنوں کو بلا کر کہا کہ تم اپنے مندر میں آزادی سے اپنے طریقے پر پوجا پاٹ کر سکتے ہو، حکومت کی طرف سے کسی کو اس کی عبادت سے نہیں روکا جاتا، تم لوگ جو اپنے مندر کی خدمت کرتے تھے اور پجاریوں کو نذر و نیاز دیتے تھے حسب دستور اب بھی دیتے رہو، آپس میں میل ملاپ رکھو اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر رہو۔ پھر اُن عہدے داروں کو جو سرکاری محصول وصول کرنے پر مقرر تھے حکم دیا کہ خراج میں سے تین فیصد الگ کر کے ان برہمنوں کو دیں جو امداد کے مستحق ہیں، افسروں اور سرداروں کے وظائف مقرر کیے، محمد بن قاسم نے یہ تمام انتظامات تمیم بن زید القینی[1] اور حکم بن عوانہ کلبی کے ذریعہ سے لوگوں کی خواہش کے مطابق کیے، یہ بھی طے کیا کہ برہمن آزادی سے لوگوں کے گھروں پر جا کر اپنی کشکول کے ساتھ خیرات مانگ سکتے ہیں، اور اس اناج کو جو وہ اس طرح حاصل کریں جس مصرف میں چاہیں خرچ کر سکتے ہیں۔[2]

سیاکر سے مشورہ:

اس کے بعد محمد بن قاسم نے وزیر سیاکر کو بلا کر پوچھا کہ لوہانہ کے جاٹوں کے ساتھ چچ اور داہر کیا سلوک کرتے تھے، اور اب ان کا کیا حال ہے، وزیر سیاکر نے موکو بن وسایو کی موجودگی میں جواب دیا کہ رائے چچ کی حکومت کے زمانے میں لوہانہ کے جاٹوں یعنی سمہ اور لاکھا دونوں قبیلوں کو ریشم یا مخمل کے کپڑے پہننے کی اجازت نہ تھی، بلکہ وہ ایک موٹا سیاہ کمبل پہنا کرتے تھے، اور ایک موٹی چادر اپنے کاندھوں پر ڈال لیا کرتے تھے، ننگے سر اور ننگے پیر رہتے تھے، اگر ان میں سے کوئی نرم لباس پہنتا، اُس پر جرمانہ کیا جاتا تھا، جب وہ اپنے گھروں سے باہر نکلتے تو اُن کے ساتھ ایک کتا بھی ضرور ہوتا تھا تاکہ دوسری قوموں سے اُن کو تمیز کیا جاسکے، ان کے سرداروں میں سے کسی کو گھوڑی پر بیٹھنے کی اجازت نہ تھی، ان سے راہبری کا کام لیا جاتا تھا، اگر ان کا کوئی مقدم یا راناگھوڑے پر بیٹھتا تو بغیر زین کے گھوڑے کی پشت پر کمبل ڈال کر بیٹھتا، راستوں کی حفاظت بھی ان سے متعلق تھی، اگر کوئی حادثہ پیش آتا تو ان سے جواب طلب کیا جاتا، اور قصور ثابت ہونے پر اس کو اور اس کے اہل و عیال کو آگ میں زندہ جلا دیا جاتا۔ ان کے لیے یہ اصول اس لیے مقرر کیے گئے تھے کہ یہ قومیں وحشی ہیں اور ہمیشہ حکومت کی متمرد اور سرکش رہی ہیں، اور ڈاکہ مارتے ہیں۔ دیبل میں بھی یہ لوگ وہاں کے باشندوں کے ساتھ لوٹ مار میں شریک رہا کرتے تھے، ان کا یہ بھی فرض تھا کہ شاہی باورچی خانے کے لیے لکڑیاں کاٹ کر لائیں، اور بادشاہ کے صرفخاص کے لیے رسد جمع کریں، چنانچہ آج تک یہ ان اصولوں کے پابند ہیں۔

محمد بن قاسم نے یہ حالات معلوم کر کے مصالح کے لحاظ سے ان قبیلوں کے لیے انہیں اصولوں کو برقرار رکھا، اور جس طرح پر کہ حضرت

---

(1) چچ نامہ میں یہ نسبت قیسی ہے، لیکن صحیح القینی۔ (تعلیقات چچ نامہ سندھی، ص ۳۱۲)۔

(2) یہ تمام تفصیل چچ نامہ فارسی، ص ۲۱۲-۲۱۳ سے ماخوذ ہے۔

عمر بن خطاب رضہ کے طریقے کے مطابق جو شام کے عیسائیوں کے متعلق انہوں نے اختیار کیا تھا مزید یہ اضافہ کیا کہ اگر کوئی اجنبی یا مسافر ان کے حدود میں آئے تو یہ ایک دن اور ایک رات اس کی مہمانی کے فرائض بجا لائیں، اگر وہ بیمار ہو جائیں تو تین روز تک اس کی تیمارداری کریں۔

اندرونی نظم و نسق:

برہمن آباد کے اندرونی نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لیے محمد بن قاسم نے چار معزز تاجروں کی ایک کمیٹی بنائی اور دیوانی عدالت اُن کے سپرد کر دی کہ وہ ان لوگوں کے مذہب کے مطابق فیصلے کریں۔ وداع بن حمید الحجری کو چیف کمشنر مقرر کیا کہ تمام جزوی اور کلی امور ان کے فیصلے کے بغیر طے نہیں پائیں گے۔ نوبہ بن دارس کو راوڑ کا قلعہ دار مقرر کیا، اور حکم دیا کہ وہ وہاں پہنچ کر جس قدر بھی ہو سکے کشتیاں فراہم کرے، اور قلعے کے سامنے سے جو کشتی بھی گزرے اگر اس میں سامان حرب ہو تو روک لے۔ اس کے علاوہ مزید کشتیوں کے جمع کرنے کا کام حکم ابن زیاد عبدی کے بھی سپرد کیا۔ کیرج کے متصلہ علاقوں پر سلیمان ازدی کو مقرر کیا، تاکہ وہ سرحد کی حفاظت کا انتظام کرے، اور نباتہ کے بھائی کے بیٹے حنظلہ کلابی کو دہلیلہ کا ناظم مقرر کیا۔ ان عہدے داروں کو تاکید کی کہ وہ ایک دوسرے سے پورے طور پر تعاون کریں۔ اور ملک کے ہر معاملے سے باخبر رہیں، اور ماہانہ رپورٹ روانہ کریں، عبدالملک بن قیس دسی اور خالد انصاری کو ایک ہزار جوانوں کے ساتھ سیوستان پر مقرر کیا، مسعود تمیمی بن شیبہ جدیدی فراس عنگی، صابر یشکری، عبدالملک بن عبداللہ خزاعی، مصنیٰ بن عکہ اور وفا بن عبدالرحمٰن کو دیبل اور نیرون کی حفاظت کے لیے مقرر کیا۔ لیح نامی ایک غلام کو اس کی جانبازی کے صلے میں کسی جگہ کا حاکم مقرر کیا، اور علوان بکری اور قیس بن ثعلبہ کو تین سو جوانوں کے ساتھ اس کی مدد کے لیے مقرر کیا جو یہیں مقیم ہو گئے اور انہوں نے یہیں شادیاں کیں جن سے ان کی اولاد ہوئی۔[1]

برہمن آباد سے روانگی:

ان تمام انتظامات سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم ۳ محرم ۹۴ھ (۷۱۲ء) کو جمعرات کے دن روانہ ہو کر منحل پہنچے، جو ساوندی کے اطراف میں تھا، اور ڈہدا نامی جھیل کے مرغزار میں جس کو دندہ و کربھا کہتے تھے مقیم ہوئے۔ اس نواح میں زیادہ تر بدھ مذہب کے ماننے والے اور تاجر آباد تھے، جیسے ہی ان لوگوں کو محمد بن قاسم کے آنے کی خبر معلوم ہوئی یہ لوگ محمد بن قاسم کے پاس آئے اور اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار کیا۔ محمد بن قاسم نے بھی ان کو معافی دے دی اور تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تم لوگ اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرو، اور وقت مقررہ پر جزیہ ادا کرتے رہو۔ انتظامی امور کی انجام دہی کے لیے انہوں نے ان میں سے دو آدمیوں کو ان کا سردار مقرر کیا، ان میں سے ایک کا نام بواد تھا، اور دوسرے کا نام بدھی بمن دھول تھا۔ یہاں زیادہ تر جٹ قوم آباد تھی، اس قوم نے بھی اطاعت قبول کر لی، جس کی اطلاع حجاج بن یوسف کو دی گئی۔ حجاج نے لکھا:

> میرا صاف اور واضح حکم یہ ہے کہ جو لوگ اہل حرب ہیں اور نافرمانی اور تمرد کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں، ان کو قتل کیا جائے، یا کم از کم ان کے لڑکے اور لڑکیوں کو بطور یرغمال کے اپنے پاس رکھا جائے، اور فرمانبردار لوگوں کو امان دی جائے، تاجروں، پیشہ وروں، اور کاشتکاروں پر ہلکا جزیہ مقرر کیا جائے، جو کوئی اسلام قبول کر لے اس سے صرف عشر لیا جائے اور جو شخص اپنے آبائی مذہب پر رہے اس کے پیشے یا زراعت کی آمدنی سے جزیہ ملک کے قانون کے مطابق دیوانی محصول کا حصہ لیا جائے۔[1]

بھرور میں قیام:

منحل سے روانہ ہو کر محمد بن قاسم بھرور پہنچے، اور وہاں انہوں نے سلیمان بن نبہان اور ابو فضہ قشیری سے حلف وفاداری لے کر جنید بن عمرو اور بنی تمیم کی فوج کے ساتھ بھرج روانہ کیا، تاکہ وہاں امن قائم کیا جائے اور عمرو بن مختار الاکبر حنفی کو اُن پر سردار مقرر کیا۔

یہاں سے روانہ ہو کر محمد بن قاسم سمہ قوم کے علاقے میں پہنچے، اس قوم کے سرداروں کو معلوم ہوا تو وہ لوگ ناچتے، گاتے، اور ڈھول بجاتے استقبال کے لیے نکلے۔ محمد بن قاسم نے حیران ہو کر لوگوں سے پوچھا یہ شور کیسا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ ان لوگوں کا یہ طریقہ ہے کہ جب کوئی حاکم آتا ہے تو یہ خوش ہو کر ناچتے اور گاتے ہوئے اس کے استقبال کے لیے آتے ہیں۔ خریم بن عمرو یہ سن کر محمد بن قاسم کے سامنے آیا اور کہا کہ ہم پر واجب ہے کہ ہم خدا کا شکر ادا کریں کہ جس نے ان لوگوں کو ہمارا مطیع و فرمانبردار کر دیا ہے۔ محمد بن قاسم کو اس بات

---

(1) یہ تمام تفصیل چچ نامہ، ص ۲۱۷-۲۱۸ سے ماخوذ ہے۔

(1) چچ نامہ فارسی، ص ۲۱۹۔

پر ہنسی آگئی اور انہوں نے کہا اچھا میں تم ہی کو ان کا حاکم بناتا ہوں، اور لوہانہ[1] والوں کو حکم دیا کہ وہ خریم کے سامنے ناچیں خریم نے اس رقص کے اختتام پر بیس دینار بطور انعام انہیں دیئے۔[2]

سہتہ قوم میں آمد:

لوہانہ کے انتظام سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم سہتہ قوم کے علاقے میں پہنچے، یہ لوگ ان کی آمد کی خبر سن کر ننگے پاؤں اور ننگے سر دوڑے ہوئے آئے، اور امن کے خواستگار ہوئے۔ محمد بن قاسم نے ان کو بھی معاف کر دیا، اور ان پر جزیہ مقرر کیا، اور ان سے اس پر ضامن لیے کہ فرمانبردار رہیں گے اور جزیہ ادا کرتے رہیں گے۔ پھر انہوں نے الور کے راستے، تمام منزلوں اور قیام گاہوں کا نقشہ طلب کیا، مقامی رہنماؤں نے یہ نقشہ مہیا کر کے پیش کیا اور کہا الور ہند کا دارالحکومت ہے اور سندھ کا سب سے بڑا شہر ہے، اس شہر کے رہنے والے زیادہ تر پیشہ ور، تاجر اور کاشتکار ہیں، داہر کے بیٹے قوفی (گوپی) نے اس شہر کو اپنا دارالسلطنت بنا رکھا ہے، اس کے سامنے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ داہر مر گیا ہے، بلکہ وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ داہر ابھی زندہ ہے اور ہند سے فوج لینے گیا ہے تاکہ ان کی مدد سے اسلامی فوجوں کو نکال دے۔[3]

اروڑ[4] کا محاصرہ: یہ حالات معلوم کرنے کے بعد محمد بن قاسم اروڑ کی طرف روانہ ہوئے اور قلعہ اروڑ کے مقابل تقریباً ایک میل فاصلے پر اپنا فوجی کیمپ قائم کیا، اور ایک ماہ تک قلعے کا محاصرہ کیے رہے، انہوں نے لشکر گاہ میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی، جہاں وہ جمعہ کے روز خود خطبہ دیتے، اروڑ والوں نے کچھ دن تک اس محاصرے کی پروا نہیں کی، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ داہر مرا نہیں ہے، بلکہ وہ ان کے لیے ہند کے راجاؤں سے فوج فراہم کرنے گیا ہے، لیکن جب اس کو عرصہ گزر گیا اور داہر فوج لے کر نہ آیا، تو یہ لوگ پریشان ہوئے، اور انہوں نے جنگ شروع کر دی، ان کے بعض لوگ قلعے کی فصیل پر چڑھ کر نعرے لگاتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری موت یہاں لائی ہے، عنقریب راجا داہر ہندوستان سے ایک بڑا لشکر لے کر آرہا ہے، وہ اُدھر سے اور ہم قلعے کے اندر سے تم کو پیس کر رکھ دیں گے، اپنی خیر چاہتے ہو تو اُلٹے پاؤں واپس ہو جاؤ، اور اپنی جانوں پر رحم کرو۔

---

(1) لاکھ اور سمہ اوہانہ: اس وقت سندھ کا ایک پرگنہ تھا، جس کا حاکم رائے گھرانے کے زوال کے وقت اکھم تھا، لوہانہ پرگنے میں لاکھ، سمہ اور سہتہ کی اراضی شامل تھیں، انہیں قوموں کے نام سے ان علاقوں کے نام مشہور ہوئے۔ لوہانے کا پرگنہ غالباً ضلع نواب شاہ، ضلع سانگھڑ کے شہداد پور اور سنجھورہ تعلقے، اور حیدرآباد ضلع کے بالا تعلقے پر مشتمل تھا، اس علاقے میں ساہتی، لاکاٹ اور لوہانہ کے نام آج تک ان قوموں کی قدیم بستیوں کی یادگار ہیں (توضیحات چچ نامہ سندھی، ص ۴۰۲)۔

(2) چچ نامہ فارسی، ص ۲۲۰-۲۲۱۔

(3) چچ نامہ فارسی، ص ۲۲۱۔

(4) چچ نامہ کے قدیم نسخوں میں یہ لفظ الور اور ارور دونوں طرح پر ملتا ہے، فتوح البلدان — بلاذری، یعقوبی، ابن اثیر، ابن حوقل اور معجم البلدان میں عرب مورخوں اور جغرافیہ دانوں نے اس شہر کا نام "الرور" لکھا ہے، الرور میں غالباً ال معرفہ کا ہے، گمان غالب ہے کہ اسلام سے پہلے اس شہر کا نام "رود" ہوگا، جس کے معنی نہر یا دریا کے ہیں، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ یاقوت نے حمزہ اصفہانی کا قول نقل کر کے لکھا ہے کہ سندھ ہندی کا قدیم ایرانی نام مہران رود تھا (معجم البلدان (مہران) اس کے بعد جب کہ مہران اس مقام پر دو شاخوں پر منقسم ہو گیا، اس لیے دریا کے رخ کی اہمیت کے لحاظ سے اس مقام کا نام رود یا نہر پڑ گیا۔ محب اللہ بھکری نے اپنی ایک مختصر تاریخی تصنیف (قلمی) کے دوسرے باب "در تفصیل امصار و بلاد و حصار و قصبات سندھ و وجہ تسمیہ و لغت آنہا" میں لکھا ہے کہ اس شہر کو کسریٰ نوشیرواں کے زمانے میں ایک تاجر مہاس بن اروخ بن ہمیلاج ارمنی نے آباد کیا تھا۔

یہ روایت بھی اس شہر کی تعمیر کو ایرانی دور کے اندر سے وابستہ کرتی ہے، اس لحاظ سے اس کا نام رود اور بھی قرین قیاس ہو جاتا ہے، جس کو مقامی لب و لہجے کی تبدیلی نے "رور" کر دیا، اور عرب اس کو الرور کہنے لگے، پھر عربوں کا یہ نام مقامی لب و لہجے کے لحاظ سے اروڑ (عربی اصول کے مطابق ل کے حذف کے ساتھ، اور الور بے قاعدہ ل کے قائم رکھنے اور "ر" کے حذف کے ساتھ پڑ گیا، یہ دونوں تلفظ اب تک رائج ہیں)۔

تعجب یہ ہے کہ سندھ کے مورخین مثلاً میر معصوم اور میر علی شیر قانع نے اپنی کتابوں میں اس کا تلفظ "الور" اختیار کیا ہے، حالانکہ ارور نسبتاً زیادہ صحیح ہے، محقق بیرونی نے کتاب الہند (متن ص ۱۰۰، انگریزی ترجمہ 150x1) میں اس شہر کا نام صاف طور پر ارور لکھا ہے اور آج تک بھی سندھ کے عوام اسی تلفظ کی مناسبت سے اس شہر کو "اروڑ" کہتے ہیں۔

اس قدیم شہر کے آثار روہڑی سے تقریباً تین میل جنوب مشرق والی نہر کی طرف جس کو سندھی میں "اوبھر ندو نارو" یعنی مشرقی نہر کہتے ہیں، اس کے قدیم بہاؤ کے مغرب میں اور موجودہ نئی مشرقی نہر کے شمالی جانب پہاڑی پر اب بھی موجود ہیں، اور یہاں اس وقت بھی پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹا سا گاؤں اروڑ کے نام سے آباد ہے، جہاں سے شمال مغرب کی طرف دریائے سندھ کے قدیم بہاؤ کا مقام صاف طور پر نظر آتا ہے۔

یہ شہر رائے گھرانے اور برہمن خاندان کی حکومت اور عربوں کے ابتدائی دور حکومت میں تقریباً ۱۲۵ھ (۷۴۳-۷۴۲ء) تک دارالسلطنت رہا، پھر اس کے بعد منصورہ دارالسلطنت بنا (توضیحات چچ نامہ سندھی، ص ۳۷۳-۳۷۵)۔

محمد بن قاسم نے یہ دیکھ کر کہ اروڑ کے باشندے جنگ پر ڈٹے ہوئے ہیں، اور انہیں اب بھی داہر کی موت کا یقین نہیں، رانی لاڈی کو سیاہ اونٹ پر سوار کر کے جس پر وہ راجا داہر کے ساتھ سوار ہوا کرتی تھی بھیجا، وہاں اُس نے لوگوں کو آواز دے کر کہا کہ اے الور کے باشندو! میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں، سامنے آؤ تاکہ میں تم سے گفتگو کروں، یہ سن کر الور کے بڑے بڑے سردار بالائے حصار پر آکر کھڑے ہو گئے، لاڈی نے اپنے چہرے پر سے نقاب اٹھا کر کہا دیکھو میں داہر کی بیوی لاڈی ہوں، راجا داہر مارا جا چکا ہے، اور اس کا سر اس کے جھنڈے اور چتر کے ساتھ عراق بھیج دیا گیا ہے، تم ناحق کیوں اپنے آپ کو ہلاک کرتے ہو یہ کہہ کر اس نے نقاب ڈال لیا، اور زار زار رونے لگی، جو لوگ بالائے حصار پر کھڑے تھے، انہیں اب بھی یقین نہ آیا، انہوں نے کہا کہ تم غلط کہتی ہو، تم ان چنڈالوں اور گائے کھانے والوں سے مل گئی ہو، ہمارا راجا ابھی زندہ ہے وہ عنقریب ایک لشکر جرار کے ساتھ آئے گا، تم ان عربوں کے ساتھ مل کر اپنے آپ کو نحسی بنا لیا ہے، اب تم ان کی حکومت کو ہماری حکومت پر ترجیح دیتی ہو، پھر وہ اس کو برا بھلا کہنے لگے۔ محمد بن قاسم کو یہ معلوم ہوا تو اُس نے لاڈی کو بلا لیا، اور افسوس کرتے ہوئے کہا کہ جب خاندان سلانج کی قسمت میں تباہی لکھی جا چکی ہے تو کون اسے مٹا سکتا ہے۔[1]

جادو گرنی سے مشورہ:

محاصرے کی سختی سے تنگ آکر داہر کا بیٹا قوفی (گوپی) اور اروڑ کے بڑے بڑے سردار ایک جادو گرنی کے پاس گئے، اور اُس سے کہا کہ تم ہمیں اپنے جادو کے علم کی مدد سے بتاؤ کہ داہر کہاں ہے۔ جادو گرنی نے کہا کہ میں تمہارے اس سوال کا جواب کل دوں گی، پھر وہ اپنے گھر میں چلی گئی اور تین پہر دن گزرنے کے بعد جا پھل اور سیاہ مرچ کی ایک سرسبز شاخ جس میں پھل پھول بھی تھے لے کر نکلی، اور لوگوں سے کہا کہ میں دنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک گئی، خصوصاً سارے سندھ و ہند کو میں نے چھان ڈالا مگر مجھے کہیں اُس کا پتا نہ چلا، اگر وہ زندہ ہوتا تو میں ضرور اس کو پا لیتی، میں تمہارے اعتبار کے لیے یہ سرسبز شاخ سراندیپ سے توڑ لائی ہوں، یقیناً تمہارا راجا مر چکا ہے، تمہیں اپنی فکر کرنی چاہیے۔

اہل اروڑ کی اطاعت:

جادو گرنی کی یہ بات سن کر شہر والوں پر مایوس چھا گئی اور انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہم محمد بن قاسم کے دیانت، انصاف، ایفائے عہد اور سچائی کے متعلق حالات سنتے رہے ہیں، اب سب کچھ ہم نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا ہے، اب ہمیں محمد بن قاسم کے پاس اپنے کسی معتبر آدمی کو بھیجنا چاہئے اور رحم کی درخواست کر کے قلعہ ان کے حوالے کر دینا چاہیے۔[1]

قوفی (گوپی) کو جب یہ خبر ملی کہ قلعے کے لوگ اطاعت کرنا چاہتے ہیں تو وہ رات کو خاموشی سے اپنے خاندان کے لوگوں اور ملازموں کو لے کر نکلا اور جتور کے علاقے میں چلا گیا علافی خاندان کا ایک آدمی جو اب تک وفاداری سے قوفی (گوپی) کا ساتھ دے رہا تھا، اس نے جب دیکھا کہ قوفی (گوپی) سب کو بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگا جا رہا ہے تو اس نے تمام حالات ایک کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ کر ایک تیر کے ذریعے سے اسلامی لشکر میں پھینک دے۔

اروڑ کی فتح:

محمد بن قاسم نے اس خبر کے ملتے ہی فوراً فوج حملے کے لیے بھیجی اور مسلمان بہادری سے لڑنے لگے، یہ رنگ دیکھ کر شہر کے تاجروں، صناعوں اور پیشہ وروں نے محمد بن قاسم کے پاس ایک وفد بھیجا کہ ہمیں آج سے پہلے راجا داہر کے مرنے کا یقین نہ تھا، اس کا لڑکا گوپی بھی ہمیں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے، ہم یہ برا دن دیکھنا نہیں چاہتے تھے، لیکن یہ دن بھی ہمارے مقدر میں تھا، اس لیے ہم اطاعت کے ساتھ آپ کی خدمت

---

[1] چچ نامہ، فارسی، ص ۲۲۲-۲۲۳۔

[1] چچ نامہ فارسی ص ۲۲۳-۲۲۴ یہ بیان چچ نامہ کا ہے، لیکن یعقوبی میں ہے کہ محمد بن قاسم جب الرور پہنچے جو سندھ کے بڑے شہروں میں سے ایک تھا تو اہل شہر نے ان کا سخت مقابلہ کیا، مگر وہ لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ داہر مارا گیا ہے لیکن جب وہ داہر کی طرف سے مایوس ہو گئے تو محمد بن قاسم نے ان کے پاس داہر کی بیوی کو بھیجا، جس نے انہیں بتایا کہ داہر مارا جا چکا ہے، اب تمہارے لیے مناسب یہ ہے کہ تم امن کے خواستگار ہو۔ چنانچہ وہ اس کے مشورے کے مطابق امن کے طالب ہوئے اور انہوں نے محمد بن قاسم کی اطاعت کر کے قلعے کا دروازہ کھول دیا، محمد بن قاسم نے شہر میں داخل ہو کر اس پر اپنا قبضہ کر لیا اور وہاں اپنا نائب مقرر کیا۔
فتوح البلدان میں ہے کہ الرور (الور) پہاڑی پر آباد تھا، اور سندھ کے بڑے شہروں میں سے تھا، محمد بن قاسم کئی مہینے اس کا محاصرہ کیے رہے، آخر شہر والوں نے اس شرط پر صلح کر لی کہ یہاں کے باشندے قتل نہ کیے جائیں، اور بدھ (دہار) سے تعارض نہ کیا جائے۔ محمد بن قاسم نے یہ شرائط منظور کر لیے، خراج مقرر کیا اور اس شہر میں مسلمانوں کے لیے مسجد بنوائی اور کہا بدھ (دہار) میرے نزدیک ویسا ہی ہے جیسے یہود اور نصاریٰ کے کنیسے اور مجوس کے آتشکدے۔

میں حاضر ہونا چاہتے ہیں، اور آپ کی اطاعت کا اقرار کرتے ہوئے قلعہ آپ کے حوالے کرنا چاہتے ہیں، بشرطیکہ آپ ہمیں امان دیں۔

محمد بن قاسم نے جواب میں کہلا بھیجا کہ اگر واقعی تم اپنے عہد میں سچے ہو تو سب سے پہلے لڑائی بند کرو، اور قلعے کی فصیل سے سب لوگ نیچے اُتر آؤ، ورنہ ہم میں اور تم میں جنگ جاری رہے گی۔ محمد بن قاسم کا یہ پیغام پہنچتے ہی سب لوگ قلعے کی فصیل سے اُتر آئے، اور قلعے کے دروازے کی کنجی لے کر قلعے کا پھاٹک کھول دیا، محمد بن قاسم فوج کے ساتھ شہر میں فاتحانہ داخل ہوئے۔[1]

نوبہار:

جیسے ہی وہ شہر میں پہنچے، محمد بن قاسم نے دیکھا کہ تمام شہر کے لوگ نوبہار بت کدے میں جمع ہیں اور ایک بت کو سجدہ کر رہے ہیں۔ محمد بن قاسم نے پوچھا یہ کس کا مکان ہے، جہاں یہ لوگ جمع ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ بت خانہ ہے جس کو نوبہار کہتے ہیں، وہ یہ سن کر اندر داخل ہوئے، دیکھا کہ سنگ رخام سے تراشا ہوا ایک گھوڑا ہے جس پر ایک پتھر کی مورت سوار ہے، اور اس کے بازوؤں پر سنہرے بازو بند ہیں جن پر یاقوت و جواہر جڑے ہوئے ہیں، انہوں نے ایک بازو بند نکال لیا، پھر نوبہار کے پجاری سے پوچھا کہ اس کا ایک بازو بند کہاں ہے؟ پجاری خاموش ہو گیا، انہوں نے ہنس کر بت کو دوبارہ بازو بند پہناتے ہوئے کہا، تمہارے بت کو یہ بھی خبر نہیں کہ اس کا بازو بند کس نے اُتار لیا ہے۔[2]

پھر محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ اگر جنگ کرنے والے لوگ اطاعت بھی کریں تو انہیں قتل کیا جائے۔ رانی لاڈی نے یہ حکم سن کر کہا کہ یہاں کے لوگ معمار اور بعض تاجر ہیں، یہاں کے تمام گھر انہی کے بنائے ہوئے ہیں، اور یہاں کی تمام زمینیں وہی کاشت کرتے ہیں، اُن کی محنت سے خزانہ معمور ہے، اگر ان کو قتل کر دیا جائے گا تو تم اپنا خزانہ کھو دو گے۔ محمد بن قاسم نے رانی لاڈی کے مشورے کے مطابق ان سب کو چھوڑ دیا۔[3]

اروڑ (الور) کا نظم و نسق:

اروڑ اور بغرور[4] پر قبضہ کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے وہاں کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لیے رواح بن اسد کو جو احنف قیس کا نواسا تھا، اروڑ کا حاکم مقرر کیا اور مذہبی امور کے لیے موسیٰ بن یعقوب بن محمد بن شیبان بن عمان ثقفی کو قاضی القضاۃ مقرر کیا اور ہدایت دی کہ رعایا کے ساتھ نرمی کا سلوک کریں اور قرآن مجید کی اس آیت یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر پر عمل کریں۔[5]

قلعہ بَاتیہ کی فتح:

اروڑ سے روانہ ہو کر محمد بن قاسم قلعہ باتیہ[6] پہنچے، یہ قلعہ دریائے بیاس کے جنوبی یا مشرقی کنارے واقع تھا، جس کا حاکم ککہ[7] نامی تھا جو راجا داہر کا چچازاد بھائی تھا، اور داہر کے ساتھ لڑائی میں موجود تھا، مگر جب داہر کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا تو ککہ نے اس قلعے میں آکر پناہ لی۔ ککہ کو جب اسلامی لشکر کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو اس نے اپنے امیروں کو محمد بن قاسم کے پاس تحائف کے ساتھ روانہ کیا، اور اطاعت قبول کر لی۔ محمد بن قاسم ان امرا کے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آئے، اور کہا کہ ککہ اروڑ کا رہنے والا ہے یہاں کے لوگ عقل مند، فلسفی، سچائی، دیانتداری، وفاداری اور دلیری میں مشہور ہیں، اگر وہ میرے پاس آئے تو میں اس کو اپنا مشیر بناؤں گا، اور اس کی عزت کروں گا۔

جب ککہ کو معلوم ہوا کہ محمد بن قاسم اُس سے ملنا چاہتے ہیں تو وہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ محمد بن قاسم نے اس کو اپنا مشیر مقرر کیا، اور اس کی یہاں تک قدر و منزلت کی گئی کہ وہ ہمیشہ مشورے کے لیے دربار میں تخت کے سامنے کرسی پر بیٹھتا تھا، اور چونکہ وہ نہایت دانشمند اور فلسفی تھا تمام امور میں اُس سے مشورہ لیا جاتا تھا، تمام اُمرا اور فوج کے

---

(1) چچ نامہ فارسی، ص ۲۲۵-۲۲۶۔

(2) چچ نامہ فارسی ص ۲۲۶۔

(3) چچ نامہ فارسی، ص ۲۲۶-۲۲۷۔

(4) توضیحات چچ نامہ سندھی میں ہے کہ بغرور سے مراد بھکر ہے، جس کا نظام حکومت محمد بن قاسم کی فتح کے وقت الور سے وابستہ تھا (توضیحات چچ نامہ سندھی، ص ۵۲۲)۔

(5) چچ نامہ فارسی، ص ۲۳۴-۲۳۵۔

(6) اس قلعے کا نام بعض مصنفین نے بھاطیہ بھی لکھا ہے، چچ نامے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ چچ کے زمانہ حکومت میں اس قلعے اور پرگنے کا انتظام ملتان کے بجائے اروڑ سے متعلق تھا، اور یہ قلعہ محمد بن قاسم کی فتوحات کے دور میں الور اور ملتان بیاس ندی کے جنوبی کنارے پر واقع تھا، اور یہ نسبت ملتان کے اروڑ سے زیادہ قریب تھا، محمد بن قاسم کے بعد بھی تقریباً تین سو سال تک یہ قلعہ موجود تھا، محمود غزنوی کی فتوحات کے سلسلے میں بھی اس قلعے کا ذکر ملتا ہے۔ تاریخ یمینی کے مصنف کا بیان ہے کہ بھاطیہ کا قلعہ ملتان کے اُس طرف یعنی سندھ کی جانب ہے، اُس زمانے میں اس قلعے کو تلواڑہ اور چچ پور بھی کہتے تھے (ماخوذ از توضیحات چچ نامہ سندھی، ص ۴۰۴-۴۰۵)۔

(7) ککہ چندر کا بیٹا اور سیلانج کا پوتا تھا۔

کپتانوں پر اس کو برتری دی گئی، یہاں تک کہ خزانہ اس کی تحویل میں دے کر اس کو وزیر مال بنایا گیا، اسی کے ساتھ یہ بھی اعزاز بخشا گیا کہ محمد بن قاسم نے اس کو مبارک مشیر کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔[1]

قلعہ اسکلندہ کی فتح:

محمد بن قاسم، لکھہ کے ساتھ دریائے بیاس کو عبور کر کے قلعہ اسکلندہ[2] پہنچے، پہلے انہوں نے زائدہ بن عمیر طائی اور لکھہ کو ایک فوجی دستے کے ساتھ بطور مقدمہ الجیش کے روانہ کیا، قلعے والوں کو خبر ہوئی تو وہ فوراً جنگ پر آمادہ ہو گئے، دونوں فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا، اور خون کی ندیاں بہہ گئیں، مسلمان ظہر کی نماز کے وقت زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر حملہ آور ہوئے، دشمن کی فوجیں اس حملے کی تاب نہ لا کر قلعے میں گھس گئیں، اور قلعے کے اندر سے تیروں اور پتھروں کی بارش کرتی رہیں۔ سات روز تک لڑائی کا ہنگامہ برپا رہا، آٹھویں روز قلعے کا حاکم سیہرا فرار ہو کر سکہ چلا گیا، سکہ دریائے راوی کے جنوبی جانب ایک عالیشان قلعہ تھا۔

اسکلندہ کے لوگوں نے جب دیکھا کہ حاکم فرار ہو گیا ہے اور اب کامیابی کی کوئی صورت نہیں تو انہوں نے محمد بن قاسم کو کہلا بھیجا کہ ہمارے قلعے کا حاکم فرار ہو چکا ہے، ہم آپ کی اطاعت قبول کرتے ہیں، آپ ہمیں امن دیجیے۔ محمد بن قاسم نے ان کی درخواست قبول کر لی، اور قلعے میں داخل ہوئے۔ داخلے کے وقت شہریوں کو کسی قسم کا گزند نہیں پہنچایا گیا، البتہ تقریباً دشمن کے چار ہزار فوجی مارے گئے، اور اُن کے اہل وعیال کو گرفتار کیا گیا۔

اسکلندہ کے فتح ہونے کے بعد محمد بن قاسم نے یہاں کا حاکم عتبہ بن سلمہ تمیمی کو بنایا۔

سکہ کی فتح:

اسکلندہ کی فتح کے بعد محمد بن قاسم قلعۂ سکہ[3] کی طرف روانہ ہوئے، یہاں کا حاکم بجھرا، بچے رائے کا نواسا تھا، جیسے ہی اُسے محمد بن قاسم کی آمد کی اطلاع ملی وہ فوراً جنگ کے لیے میدان میں نکلا، یہ سترہ دن مسلمانوں سے مقابلہ کرتا رہا، اس لڑائی میں مسلمانوں کے دو سو پندرہ سپاہی اور بیس افسر شہید ہوئے، اور بجھرا کی فوج کے بھی بہت سے لوگ مارے گئے، بجھرا ابھی فتح کا امکان نہ پا کر ایک رات خاموشی سے اہل شہر کو چھوڑ کر فرار ہوا، اور ملتان چلا گیا۔ محمد بن قاسم نے اپنے بہترین فوجی افسروں کے شہید ہونے کی وجہ سے قسم کھائی تھی کہ وہ اس شہر کو برباد کریں گے، چنانچہ اس غصے میں یہ شہر برباد کر دیا گیا۔[4]

فتح ملتان:

سکہ سے محمد بن قاسم دریائے راوی کو عبور کر کے ملتان پر خیمہ زن ہوئے، تھوڑی دیر کے بعد ملتانی فوج مقابلے کے لیے نکلی جس کا سپہ سالار بجھرا حاکم سکہ تھا، اس نے سکہ کا بدلہ لینے کے لیے زبردست فوجی حملہ کیا، شام تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی، اس لڑائی میں زائدہ بن عمیر طائی نے خوب داد شجاعت دی، شام کو مشرکین منہزم ہو کر قلعہ بند ہو گئے۔[5]

صاحب چچ نامہ کا بیان ہے کہ دوسرے دن قلعے سے نکل کر ملتانی پھر حملہ آور ہوئے، اور بہت سے مارے گئے، اس طرح مسلسل دو مہینے تک جنگ جاری رہی، آخر ملتانیوں کو قلعے سے باہر نکلنے کا حوصلہ نہ ہوا اور وہ قلعے کی فصیل سے منجنیقوں کے ذریعے پتھر برسانے لگے۔ مسلمانوں نے قلعے کا محاصرہ کر لیا، لیکن اس محاصرے میں سب سے بڑی دقت یہ پیش آئی کہ نیرون، برہمن آباد اور الور مفتوحہ علاقے دور ہونے کی وجہ سے لشکر میں غلے کی کمی ہو گئی، یہاں تک کہ لوگ مجبور ہو کر گدھے ذبح کر کے کھانے لگے، لیکن اس پر بھی اسلامی فوج نے ہمت نہ ہاری اور دشمن کا مقابلہ ڈٹ کر کرتی رہی۔

آخر ایک شخص قلعے سے باہر آ کر ایک نالے کا پتا دیا، جس سے شہر والے پانی پیتے تھے، محمد بن قاسم نے اس کو بند کروا دیا، ملتانی پیاس سے تنگ آ کر قلعے سے باہر نکلے اور جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔

اُس وقت ملتان کا حاکم راجا کورسیہ (گورسنگھ) تھا جو راجا داہر کے بھائی چندر کا لڑکا تھا، اس نے جب دیکھا کہ شدت تکلیف کے باوجود مسلمانوں کے عزم و حوصلے میں فرق نہیں آیا اور ملتانی فوجیں لڑتے

---

(1) چچ نامہ فارسی، ص ۲۳۶۔

(2) مجمل التواریخ کے مصنف نے اس شہر کا نام عسقلند لکھا ہے، اور اس کو اُچ کے شہروں میں بتایا جاتا ہے، (توضیحات چچ نامہ، سندھی بحوالہ کتاب مہران-راورٹی، ص ۲۴۴-۲۵۵)۔

(3) سکہ ملتان سے ملا ہوا شہر تھا، ان دونوں شہروں کے درمیان راوی ندی بہتی تھی، یہ راوی ندی کے جنوبی مغربی کنارے پر تھا، اور ملتان اس کے سامنے دوسری طرف تھا۔ مورخ بلاذری کے زمانے 256ھ میں یہ شہر ویران ہو چکا تھا (توضیحات چچ نامہ سندھی، ص ۵۲۴)۔

(4) چچ نامہ، فارسی ص ۲۳۷۔

(5) فتوح البلدان-بلاذری، ص ۴۳۹۔

لڑتے ہمت ہارے جارہی ہیں، اور باہر سے کسی امداد کی توقع نہیں تو وہ کشمیر کے راجا کے پاس پناہ لینے کے لیے چلا گیا، لیکن اُس کے جانے کے بعد بھی ملتانی فوجیں قلعے سے نکل کر روزانہ جنگ کرتیں اور شام کو قلعے میں گھس جاتیں، مسلمان ہر طرف سے قلعے کا ایک ایک کونہ دیکھتے تھے کہ جہاں کہیں بھی درز نظر آئے وہیں سے وہ قلعے میں گھس جائیں، مگر کوئی صورت بن نہ پڑتی تھی۔ ایک روز ایک آدمی قلعے سے نکل کر آیا اور رحم کا خواستگار ہوا، محمد بن قاسم نے اس کو معافی دے دی۔ معافی حاصل کرنے کے بعد اُس نے قلعے کے مشرقی جانب نشاندہی کی جو دریا کے کنارے پر تھا، محمد بن قاسم نے اس جگہ منجنیقیں نصب کرا کر قلعے کی دیوار پر سنگ باری کرائی، یہاں تک کہ مسلسل سنگ باری سے قلعے کی دیوار ٹوٹ گئی، اور مسلمان قلعے میں فاتحانہ داخل ہوگئے۔ قلعے میں داخل ہونے کے بعد چھ ہزار فوجی قتل کیے گئے، اور ان کے متعلقین قیدی بنائے گئے۔ تاجروں، صناعوں اور کاشتکاروں کو معافی دی گئی اور اُن پر جزیہ عائد کیا گیا، اور انہیں حکم دیا گیا کہ مسلمانوں کو محاصرے میں تکلیف اٹھانی پڑی، اس کے معاوضے میں وہ جزیے کے علاوہ مزید رقم دیں، چنانچہ شہر کے اُمرا اور معززین نے ساٹھ ہزار درہم جمع کیے، یہ رقم فوج میں تقسیم کی گئی، ہر ایک گھوڑے سوار کے چار چار سو درہم حصے میں آئے، ملتان کی فتح ۹۵ھ (۷۱۳-۱۴ء) میں ہوئی۔[1]

ایک چھپا ہوا خزانہ:

پہلے گزر چکا ہے کہ حجاج بن یوسف نے ولید بن عبدالملک سے مہم سندھ کی اجازت لیتے وقت اس کا وعدہ کیا تھا کہ اس مہم میں جس قدر رقم خرچ ہوگی، وہ فتح سندھ پر اس سے دوگنی رقم خزانہ شاہی میں داخل کرے گا، لیکن محمد بن قاسم نے جو رقم فتح ملتان تک شاہی خزانے کو بھیجی تھی وہ بہت تھوڑی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی فطری رحم دلی اور فیاضیوں نے جو وہ مفتوحین کے ساتھ روا رکھتے تھے، اتنی رقم جمع ہونے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ ملتان کی فتح کے بعد وہ اسی فکر میں تھے کہ کون سی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ شاہی خزانے میں یہ رقم داخل ہوسکے کہ ایک دن اُن کے پاس ایک برہمن آیا، اُس نے محمد بن قاسم سے کہا کہ ہماری حکومت ختم ہوچکی، میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ جدھر بھی جاتے ہیں خدا کی تائید آپ کے ساتھ ہوتی ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اب ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم ہر طرح آپ کا ساتھ دیں، میں آپ کو ایک چھپے ہوئے خزانے کا پتا دینا چاہتا ہوں، قدیم زمانے کا ذکر ہے کہ ہمارے اس شہر میں ایک راجا جسوین نامی تھا جو راجا کشمیر کی اولاد سے تھا، یہ بہت ہی نیک انسان تھا، ہر وقت پوجا پاٹ میں لگا رہتا تھا، اس کے پاس بڑی دولت جمع تھی، اور روز بروز وہ دولت میں ترقی کرتا جاتا تھا۔ جب اس کے پاس دولت بے حد اکٹھی ہوگئی تو اس نے شہر سے باہر مشرقی جانب ایک حوض بنوایا، جس کا طول و عرض سو گز تھا، اس حوض کے درمیان میں اس نے ایک خوبصورت مندر بنایا اس میں چالیس منکے سونے کی خاک سے بھروا کر اور اس کے ساتھ دو سو تیس من سونا رکھ کر زمین میں دفن کرا دیے، اور اُس خزانے پر سونے کا ایک بت نصب کرایا اور حوض کے ارد گرد درخت لگوا دیے تاکہ اس خزانے کا لوگوں کو پتا نہ چلے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ وہ خزانہ آپ کو بتادوں۔ محمد بن قاسم نے برہمن کی بات سن کر کہا چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں، پھر وہ اپنے چند مصاحبین کو لے کر مندر میں گئے، جیسے ہی محمد بن قاسم مندر میں داخل ہوئے وہاں بالکل تاریکی تھی، انہیں ایسا محسوس ہوا کہ اندر کوئی آدمی ہے، محمد بن قاسم نے فوراً ہی تلوار کھینچ کر وار کرنا چاہا، برہمن نے کہا حضور! جسے آپ آدمی سمجھتے ہیں، یہ تو وہ سونے کا بت ہے، جس کے نیچے خزانہ دفن ہے، اس کی آنکھیں یاقوت کی ہیں جو اندھیرے میں چمکتی ہیں، محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ بت کو وہاں سے ہٹایا جائے، چنانچہ بت ہٹایا گیا، اس کے نیچے سے دو سو تیس من سونا خالص اور چالیس منکے سونے کے چورے کے نکلے، تمام سونے کا وزن کیا گیا، جس کا مجموعی وزن ایک ہزار تین سو بیس من تھا، بت اور سونا خزانہ شاہی میں بھیجے گئے۔[2]

چچ نامہ میں ہے کہ جس روز یہ خزانہ ملا اتفاق سے اسی روز حجاج کا ایک خط پہنچا، جس میں محمد بن قاسم کو لکھا تھا۔ "اے میرے چچازاد بھائی! اس مہم کو سندھ روانہ کرتے وقت میں نے خلیفہ سے عہد کیا تھا کہ اس پر جتنا روپیہ خرچ ہوگا میں اس کی دوگنی رقم خزانہ شاہی میں داخل کروں گا، اب دریافت کرنے پر مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس پر ساٹھ ہزار نقروی درہم صرف ہوئے ہیں اور جو کچھ تم نے اب تک جنس و نقد کی صورت میں بھیجا ہے اس کی مجموعی رقم ایک لاکھ بیس ہزار درہم ہے، یہ سب رقم شاہی خزانے میں داخل کر دی گئی ہے، اب تم ہر موضع، قصبے اور شہر میں شاندار مسجد اور منبر بناؤ، اور حکم دو کہ خطبے میں خلیفہ کا نام لیا جائے، اسی کے ساتھ خلیفے کے نام کا سکہ جاری کیا جائے، تم نے نہایت ہی مبارک وقت میں سندھ

---

(1) چچ نامہ فارسی، ص ۲۳۸-۲۳۹۔

(2) چچ نامہ فارسی، ص ۲۳۹-۲۴۰۔

پر فوج کشی کی ہے، مجھے یقین ہے کہ تم کفار کے جس ملک میں بھی جاؤ گے، تمہیں فتح حاصل ہو گی۔[1]

فتوح البلدان (بلاذری) میں ہے کہ حجاج نے اس مہم کے مصارف اور غنائم کا حساب کیا تو معلوم ہوا کہ چھ کروڑ درہم خرچ ہوئے، اور بارہ کروڑ حاصل ہوئے[2]، اس حساب سے واقف ہونے کے بعد حجاج بہت خوش ہوا، اور اس نے کہا ہم نے اپنے خون کا بدلہ پالیا، ہم نے جو کچھ خرچ کیا، اس پر چھ کروڑ درہم مزید ہاتھ آئے، اور داہر کا سر الگ ملا۔[3]

ملتان کا انتظام:

فتح ملتان کے بعد محمد بن قاسم نے ملتان میں ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی، جس کا ایک بڑا منارہ تھا، اور داؤد بن نصر بن ولید عمانی کو ملتان کا حاکم اور خریم بن عبدالملک تمیمی کو برہمپور پر جو دریائے جہلم کے کنارے پر تھا حاکم مقرر کیا، اور عکرمہ بن ریحان شامی کو اطراف ملتان کی حکومت تفویض کی، اور احمد بن خزیمہ بن عتبہ مدنی کو اشہار اور کرور[4] کا حاکم مقرر کیا۔

پھر انہوں نے وہ سونا جو چھپے ہوئے خزانے سے ملا تھا اور ملتان کے مال غنیمت کا پانچواں حصہ کشتیوں کے ذریعے دیبل بھجوایا تاکہ وہ جہازوں کے ذریعے سے عراق روانہ کر دیا جائے۔

ان انتظامات کے بعد محمد بن قاسم نے پچاس ہزار منتخب سواروں کے ساتھ جو آلات حرب سے آراستہ تھے ملتان میں اقامت اختیار کی۔

قنوج کا عزم:

چند دن کے بعد محمد بن قاسم نے ابو حکیم شیبانی کو دس ہزار سواروں کے ساتھ قنوج بھیجا، اور اس سے کہا کہ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے راجا کو اسلام کی دعوت دینا، اور اگر وہ نہ مانے تو اُسے جزیہ و خراج کے ساتھ اطاعت کی طرف توجہ دلانا اور کہنا کہ سمندر سے لے کر کشمیر کی حد تک اکثر راجاؤں نے اسلام کی اطاعت قبول کر لی ہے اور جو باقی بچے ہیں انہوں نے جزیہ ادا کرنے کا اقرار کیا ہے۔

ابو حکیم شیبانی نے محمد بن قاسم کا پیغام اودے پور[5] سے ایک سفیر کے ذریعہ سے قنوج کے راجا کو پہنچایا، رائے ہرچندر نے جو اس وقت قنوج کا راجا تھا جواب دیا کہ سولہ سو سال سے ہماری حکومت اس ملک پر ہے اور کسی کو یہ جرات نہیں ہوئی کہ وہ ہماری حدود میں قدم رکھے، ہم تمہاری ان فضول باتوں کی پروا نہیں کرتے، سفرا کو قید کرنا آئین مملکت کے خلاف ہے، ورنہ میں تمہیں اس بے ہودہ بکواس کی وہ سزا دیتا کہ دوسروں کو عبرت ہوتی، جاؤ اپنے امیر سے کہہ دو کہ تلوار ہی ہمارا اور اس کا فیصلہ کرے گی۔

جب رائے ہرچندر کا یہ پیغام محمد بن قاسم کو ملا، تو انہوں نے اپنے اُمرا، سپہ سالاروں، افسروں اور بہادروں کو بلایا، اور اُن کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اب تک ہم نے خدا کے فضل سے ہندوستان کے راجاؤں پر فتح و نصرت حاصل کی ہے اور ہمیں ہر موقع پر کامیابی حاصل ہوئی ہے، آج جب کہ ہم اس مغرور شخص کے مقابل آئے ہیں جسے اپنے آدمیوں اور ہاتھیوں پر غیر معمولی غرہ ہے تو ہمیں خدا کے بھروسے پر پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ہم اس کو مغلوب کر کے فتح حاصل کریں، سب نے عہد کیا کہ وہ پوری توانائیوں سے اس دشمن کو شکست دیں گے اور قنوج کی طرف کوچ کے لیے تیاریاں شروع ہو گئیں۔[6]

حجاج بن یوسف کی وفات:

ابھی محمد بن قاسم، قنوج کی طرف روانہ نہیں ہوئے تھے کہ اچانک شوال ۹۵ھ میں حجاج بن یوسف نے وفات پائی، محمد بن قاسم کو اس کی وفات سے بے حد صدمہ ہوا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ ان کا

---

(1) چچ نامہ، فارسی ص ۲۴۰-۲۴۱۔

(2) چچ نامہ فارسی، ص ۳۴۱۔

(3) فتوح البلدان—بلاذری، ص ۴۴۰۔

(4) کرور کا شہر آج بھی کرور پکا کے نام سے ضلع ملتان تعلقہ لودراں میں لودراں سٹیشن سے 24 میل اس طرف واقع ہے (توضیحات چچ نامہ سندھی مولف ڈاکٹر نبی بخش بلوچ پروفیسر سندھ یونیورسٹی، ص ۵۳۴)۔

(5) اودھاپر چچ نامے کے مختلف نسخوں میں یہ نام اوردھاپور یا اودھافر ہے، میر معصوم نے تاریخ معصومی ص ۲۸ پر نہ معلوم کس بنا پر اس شہر کا نام دیاپور لکھ دیا ہے، یہی ہوڈی والا نے لکھا ہے لیکن میجر راورٹی کے خیال کے مطابق اودھاپر یقینی طور پر اودیپور ہے، جو الوان سے 14 میل اس طرف جنوب کی جانب گھگر کے کنارے تھا، یہ رائے میجر راورٹی کی ہے، مگر ہماری رائے میں یہ نام بالکل مبہم ہے، اور اس مقام کا متعین کرنا مشکل ہے (توضیحات چچ نامہ سندھی، ص 534 بحوالہ ہوڈی والا ص ۱۰۰)۔

(6) چچ نامے کے بیان کے مطابق راجا ہرچندر محمد بن قاسم کی فتوحات کے وقت قنوج کا راجہ تھا، ممکن ہے کہ صاحب چچ نامہ نے ہرشا کو ہرچندر سے تعبیر کیا ہو، لیکن قنوج کا مشہور راجا ہرشا برہمن گھرانے کی حکومت سے پہلے گزرا ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ راجا ہرچندر قنوج کا دوسرا راجا ہو جو راجا ہرشا کے بعد حکمران ہوا ہو (توضیحات چچ نامہ سندھی، مرتب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ص ۵۳۵)۔

چچازاد بھائی تھا، دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کو اب اس کی بھی فکر تھی کہ دیکھیے اب مشرقی ممالک کا اعلیٰ حاکم کون ہوتا ہے، اور اس کی پالیسی اس صوبے کے متعلق کیا ہوتی ہے۔ ان اسباب کی بنا پر قنوج پر فوج کشی کا خیال بدل کر محمد بن قاسم ملتان، الور اور بغرور واپس آگئے۔

سیلمان کی فتح:

الور و بغرور واپس آنے کے بعد انہوں نے سیلمان کی طرف ایک فوج روانہ کی، سیلمان والوں نے بغیر لڑے اطاعت قبول کرلی، یہاں سے یہ فوج سرست (سورت) گئی، سرست کے لوگوں نے بغیر جنگ کے اطاعت قبول کرلی۔

کیرج کی فتح:

ان شہروں کے فتح ہونے کے بعد محمد بن قاسم نے کیرج پر لشکر کشی کی، وہاں کا راجا دوہر مقابلے کے لیے نکلا، اور بڑی بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا، اور مسلمان شہر پر قابض ہوگئے، کسی شاعر نے اس فتح پر شعر کہا:

نحن قتلنا داہراً ودوھراً

داہر اور دوہر کو ہمیں نے قتل کیا

والخیل تردی منسرا فمنسرا

سواروں کے بڑے بڑے جتھے تو چکر ہی کاٹتے رہے۔

سلیمان بن عبد الملک

۹۶ھ (۱۵-۷۱۴ء) تا ۹۹ھ (۱۸-۷۱۷ء)

ولید بن عبد الملک کی وفات:

حجاج بن یوسف کی وفات کو ابھی آٹھ مہینے ہی ہوئے تھے کہ جمادی الثانی ۹۶ھ (۱۵-۷۱۴ء) میں خلیفہ ولید بن عبد الملک نے دمشق میں وفات پائی، اپنی وفات سے کچھ پہلے خلیفہ ولید بن عبد الملک نے ممالک مشرقیہ کے تمام گورنروں کے نام احکام جاری کر دیے تھے کہ وہ تمام فتوحات اور پیش قدمیوں کو روک دیں، اور اپنے آپ کو کسی خطرے میں نہ ڈالیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ عبد الملک نے اپنے انتقال کے وقت ولید کے بعد سلیمان بن عبد الملک کو اپنا ولی عہد بنایا تھا جو ولید کا حقیقی بھائی تھا، لیکن ولید چاہتا تھا کہ سلیمان عبد الملک کو معزول کر کے اپنے بیٹے عبد العزیز کو ولی عہد بنائے، اس کام میں حجاج اور اس کے تمام مقرر کردہ سردار ولید کے ساتھ تھے، لیکن ابھی یہ تجویز عملی جامہ نہ پہن سکی تھی کہ 96ھ میں ولید نے وفات پائی، اور اس کے بعد سلیمان بن عبد الملک تخت نشین ہوا اور اُس کی تخت نشینی کے ساتھ ہی وہ سیاست بدل گئی جس پر ولید اور حجاج گامزن تھے۔ سلیمان بن عبد الملک اچھی طرح جانتا تھا کہ حجاج اُس کا سب سے بڑا دشمن تھا، کیونکہ وہ اسے تخت سے محروم رکھنے کے سلسلے میں ولید کا سب سے بڑا مددگار تھا، لہٰذا سلیمان نے تخت نشین ہونے کے بعد، سب سے پہلے حجاج کے مقرر کردہ افسروں کو معزول یا قتل کر کے اپنی رائے میں اپنے راستے کے کانٹوں کو ہٹا دیا، ان میں قتیبہ بن مسلم فاتح چین، موسیٰ بن نصیر فاتح اندلس اور محمد بن قاسم فاتح سندھ بھی تھے جو اس کے انتقام کا نشانہ بنے، اور جن کی موت سے دنیائے اسلام کو عظیم ترین نقصان پہنچا۔

محمد بن قاسم کی معزولی:

سلیمان بن عبد الملک نے مشرقی ممالک کا اعلیٰ حاکم یزید بن مہلب کو بنایا جس کو حجاج اور اُس کے خاندان سے پرانی دشمنی تھی۔ یزید بن مہلب نے محکمہ خراج کا حاکم صالح بن عبد الرحمٰن کو بنایا جو خارجی تھا اور حجاج اور اس کے خاندان کا سخت دشمن تھا، چونکہ حجاج نے خارجیوں کو مارا تھا، اور اس کے بھائی آدم کو بھی خارجی ہونے کی وجہ سے قتل کیا تھا، اس لیے صالح اپنی جماعت اور اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لیے بے چین تھا۔ ادھر عبد الملک بن مہلب بھی اس کے ساتھ ہوگیا۔ دونوں نے مل کر حجاج کے خاندان کے ایک ایک فرد کو قید کرنا اور قتل کرنا شروع کیا، اس سلسلے میں محمد بن قاسم کو بھی مجرم قرار دے کر سندھ کی حکومت سے معزول کیا گیا، اور اُن کی جگہ یزید بن کبشہ سکسکی سندھ کا گورنر مقرر ہوا۔ یزید بن ابی کبشہ کے ساتھ یزید بن مہلب کا بھائی معاویہ بن مہلب بھی محمد بن قاسم کی گرفتاری کے لیے روانہ کیا گیا۔ یزید بن ابی کبشہ نے سندھ پہنچ کر محمد بن قاسم کو ٹاٹ کے کپڑے پہنا کر اور ہتھکڑی بیڑی ڈال کر معاویہ بن مہلب کے ساتھ عراق بھجوا دیا۔[1] سندھ کا یہ فاتح اعظم جب سندھ سے رخصت ہونے لگا تو اس نے رخصت ہوتے وقت یہ شعر پڑھا:

اضاعونی و ای فتی اضاعوا

انہوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کیسے جوان کو ضائع کیا

لیوم کریھتہ و سداد ثغر

جو مرد نبرد آزما اور سرحد کا محافظ تھا

---

(1) تاریخ سندھ۔ مولانا ابو ظفر ندوی، بحوالہ یعقوبی (ترجمہ: فتوح البلدان۔ بلاذری، ص ۱۹۲)۔

محمد بن قاسم کا انجام

محمد بن قاسم جب عراق پہنچے تو صالح بن عبدالرحمٰن نے ان کو واسط کے جیل خانے میں بھجوادیا جہاں حجاج بن یوسف کے خاندان کے سب لوگ قید تھے، محمد بن قاسم خود کہتے ہیں:

فلئن ثویت بواسط و بارفها — رهن الحدید مکبلا مغلولا
فلرب فتیته فارس قد رعتها — ولرب قرن قد ترکت قتیلا

اگر واسط میں مجھے قید کر دیا یا زنجیروں میں باندھ کر بیکار کر دیا تو کیا ہوا میں ہی تو ہوں جس نے شہسواروں کے دل میں ہیبت بٹھادی، اور بہت سے حریفوں کو قتل کیا۔

اس قید خانے میں محمد بن قاسم کو رات دن سخت سزائیں دی جاتی تھیں، جس کو وہ نہایت صبر اور بہادری[1] کے ساتھ برداشت کرتے تھے، اس کے علاوہ قبیلہ عک کے ایک شخص کو محمد بن قاسم کی خاص نگرانی کے لیے ان کے قید کے زمانے میں مقرر کیا گیا، محمد بن قاسم نے اپنے مخالفین کے لیے کہا ہے:

لو کنت اجمعت القرار لوطت — اناث اعدت للوعی و ذکور
وما دخلت خیل السکاسک ارضنا — ولا کان من عك علی امیر
ولا کنت للعهد المزونی تابعا — فیالك دهر بالکرام عثورا

اگر میں ثابت قدمی سے کام نہ لیتا تو وہ عورتیں اور مرد جو لڑائی کے لیے فراہم کیے گئے تھے روند ڈالے جاتے، نہ سکسکوں کے گھوڑے ہمارے علاقے میں داخل ہوسکتے اور نہ عک میں سے کوئی مجھ پر امیر ہوتا، اور نہ میں مزونی غلام کا کبھی تابع ہوتا، اے زمانے تجھ پر افسوس ہے تو شرفا کے حق میں بڑا ہی خائن ہے۔

وفات:

صالح نے اپنے بھائی آدم خارجی کا انتقام لینے کے لیے جس کو حجاج نے قتل کرایا تھا، محمد بن قاسم کو واسط کے جیل خانے میں آل عقیل کے حوالے کر دیا، جنہوں نے ان کو اس قدر زدوکوب کیا کہ وہ ان سزاؤں اور تکلیفوں کو بھگتتے بھگتتے بائیس سال کی عمر میں واسط کے جیل خانے میں انتقال کر گئے، حمزہ بن بیض حنفی شاعر نے محمد بن قاسم کو سراہتے ہوئے اپنے اشعار میں کہا:

ان المروته و السماحته و الندی — محمدبن القاسم بن محمد
ساس الجیوش لسبع عشرته حجته — یا قرب ذالك سودد أمن مولد

مروت، دل کی بڑائی اور فیاضی محمد بن قاسم بن محمد کا حصہ تھیں، جس نے سترہ برس کی عمر میں لشکروں کی سرداری کی، یہ سرداری اس کی پیدائش سے کس قدر قریب تھی۔

ایک اور شاعر نے ان کے محامد واوصاف کو بیان کرتے ہوئے کہا:

ساس الرجال لسبع عشرته حجته — ولداته عن ذاك فی اشغال

اس نے سترہ ہی برس کی عمر میں مردان کارزار کی سرداری کی، حالانکہ اس کے ہم سن لڑکے ابھی کھیلوں ہی میں مشغول تھے۔

محمد بن قاسم کا ماتم:

سندھیوں نے محمد بن قاسم کی وفات کی خبر سن کر بڑا ماتم کیا اور وہ اُن کے اخلاق واوصاف کو یاد کر کے روئے، اور شہر کیرج میں اُن کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے اُنہوں نے محمد بن قاسم کا ایک اسٹیچو بنا کر نصب کیا۔[2]

محمد بن قاسم کی معزولی کے متعلق چچ نامے کی ایک بے سروپا روایت:

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کی معزولی کے متعلق چچ نامے کی وہ بے سروپا روایت نقل کر دی جائے جو ایک افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

چچ نامے میں ہے کہ اس زمانے میں جب کہ محمد بن قاسم اودھاپور میں تھے اور ہندوستان کو فتح کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے وہیں خلیفہ کی جانب سے اُن کی معزولی کا حکم پہنچا، اس معزولی کی وجہ یہ تھی کہ جب راجا داہر مارا گیا، اس کی دو کنواری لڑکیاں اُس کے محل سے گرفتار ہوئیں، محمد بن قاسم نے حبشی غلاموں کے ساتھ ان دونوں کو دارالخلافہ بغداد روانہ کیا۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ اُن کو چند روز محل میں رکھ کر اُن کو آداب شاہی کی تعلیم دی جائے، تاکہ وہ اس کے حرم میں داخل کرنے کے لیے موزوں ہوں۔ کچھ عرصے کے بعد خلیفہ نے حکم دیا کہ وہ دونوں لڑکیاں رات کے وقت اس کے پاس لائی جائیں، جب وہ آئیں تو ولید بن عبدالملک نے ترجمان سے کہا کہ وہ ان سے پوچھے کہ اُن میں بڑی کون

---

(1) فتوح البلدان۔

(2) محمد بن قاسم کی معزولی و وفات کی یہ تفصیلات فتوح البلدان (بلاذری) مطبوعہ لیدن، ص ۴۴۰-۴۴۱-۴۴۲ سے ماخوذ ہے۔

سی ہے، تاکہ اس کو الگ رکھا جائے اور اس کی خبر گیری کی جائے اور اس کی بہن کی باری ختم ہونے پر اس کو بلایا جائے۔ ترجمان نے پہلے ان دونوں کے نام پوچھے، بڑی نے کہا کہ میرا نام سورج دیوی ہے اور چھوٹی نے کہا میرا نام پرمل دیوی ہے، تب خلیفے نے بڑی کو اپنے پاس بلایا، اور چھوٹی کے متعلق حکم دیا کہ اسے علیحدہ رکھا جائے۔ جب خلیفے نے بڑی کے رخ سے نقاب اٹھایا تو وہ اس کے غیر معمولی حسن و جمال کو دیکھ کر اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا، اس کے ناز و ادا نے خلیفے کو بے قرار کر دیا، اور اس نے سورج دیوی کو اپنی طرف کھینچا، وہ ایک دم اُچھل کر علیحدہ کھڑی ہو گئی، اور اس نے کہا بادشاہ سلامت کی عمر دراز ہو، میں بادشاہ سلامت کے قابل نہیں ہوں، کیونکہ محمد بن قاسم نے ہم دونوں بہنوں کو تین دن اپنے پاس رکھ کر بادشاہ سلامت کے پاس بھجوایا ہے، ممکن ہے کہ یہ آپ کے یہاں کی رسم ہو، لیکن اس قسم کی ذلت بادشاہ برداشت نہیں کر سکتے۔ خلیفہ ان کے عشق و محبت میں ہوش و حواس کھو چکا تھا، سورج دیوی کی یہ بات سن کر اس نے بغیر کسی تحقیق کے قلم دوات منگایا اور اپنے قلم سے فرمان جاری کیا کہ محمد بن قاسم جہاں بھی ہو اُسے کچے چمڑے میں لپیٹ کر دارالسلطنت بھیجا جائے۔

جب یہ فرمان محمد بن قاسم کو اودھاپور میں ملا، تو انہوں نے اپنے آدمی کو حکم دیا کہ وہ خلیفہ کے فرمان کے مطابق انہیں کچے چمڑے میں لپیٹ کر روانہ کر دیں، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اور زندہ پارسل ایک صندوق میں رکھ کر روانہ کر دیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں محمد بن قاسم اس صندوق میں مر گئے، ان کی وفات کے بعد وہ حاکم جو ملک کے مختلف حصوں پر مقرر تھے اپنی جگہ بحال رہے، صندوق خلیفے کے پاس لے جایا گیا، جب یہ لوگ صندوق لے کر دارالسلطنت پہنچے تو انہوں نے شاہی محل کے بڑے چوبدار سے کہا کہ وہ خلیفے کو اطلاع دے کہ ہم لوگ محمد بن قاسم ثقفی کو لائے ہیں۔ خلیفے نے پوچھا وہ زندہ ہے یا مر گیا، انہوں نے جواب دیا کہ روانگی کے دو دن بعد اس نے اپنی جان خدا کے سپرد کر دی۔ جو حکام محمد بن قاسم نے مقرر کیے تھے وہ سب اپنی اپنی جگہ مامور ہیں، اور وہ خلیفے کے نام سے بہترین انتظام کی کوشش کر رہے ہیں، اور خلیفے کو اپنے خطبوں اور تقریروں میں یاد کرتے ہیں۔

ان حالات کے معلوم کرنے کے بعد خلیفے نے صندوق کا ڈھکنا کھولا اور اُن دونوں بہنوں کو بھی بلایا، اس وقت خلیفہ کے ہاتھ میں سبز یاقوت کی ایک چھڑی تھی، اُس نے وہ لکڑی محمد بن قاسم کے دانتوں سے لگائی، اور اُن دونوں بہنوں سے کہا، داہر کی لڑکیو! ہم نے دیکھا کہ ہمارے افسر ہمارے احکام کی کس طرح فوری طور پر تعمیل کرتے ہیں جیسے ہی قنوج میں اسے ہمارا حکم ملا، اس نے ہمارے حکم پر اپنی جان قربان کر دی۔

یہ سن کر سورج دیوی نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھایا اور زمین پر سر رکھتے ہوئے کہا، خدا بادشاہ کو دیر تک سلامت رکھے، بادشاہ وقت کمال عقل سے آراستہ ہوتا ہے، اس کا فرض ہے کہ جو کچھ اس کے کانوں میں پہنچے اُس پر اچھی طرح غور کرے، جب اس بات کی صداقت اس پر اچھی طرح واضح ہو جائے تو وہ اس وقت فیصلہ کن احکام جاری کرے، اس میں شک نہیں کہ بادشاہ سلامت کے احکام کی تعمیل بلا چون و چرا کی جاتی ہے لیکن آپ کے لیے ضروری تھا کہ اس واقعے کی ابتدائی تحقیقات فرما لیتے، حقیقت یہ ہے کہ محمد بن قاسم ہمارے بھائی یا باپ کی مانند تھا، اس نے کبھی ہمیں ہاتھ نہیں لگایا، اور اُس کے پاس ہماری عصمت ہر طرح محفوظ تھی، لیکن چونکہ اس نے ہندوستان کے بادشاہ کو قتل کیا، اور ہمارے خاندان کے راج کو اُجاڑا، ہمیں غلام بنایا، ہم نے محض انتقام لینے کے لیے یہ واقعہ گھڑ کر آپ سے بیان کیا، آپ کے لیے ضروری تھا کہ آپ اس کی تحقیقات کر کے احکام جاری کرتے، اسی طرح اگر محمد بن قاسم میں بھی کچھ عقل ہوتی تو اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ تمام راستے معمولی طور پر سفر کرتا اور جب دارالخلافہ بالکل قریب رہ جاتا تو اپنے آپ کو کچے چمڑے میں ڈال کر خلیفہ کے سامنے پیش کرتا۔ خلیفہ، سورج دیوی کی یہ بات سن کر بہت مغموم ہوا اور دانتوں سے اپنا ہاتھ کاٹنے لگا۔

سورج دیوی نے پھر کچھ بولنا چاہا، لیکن خلیفے کو غضبناک دیکھ کر اس نے عرض کیا کہ خلیفے نے ایک بڑی بھاری غلطی یہ کی ہے کہ دو غلام لڑکیوں کی خاطر ایک ایسے آدمی کو قتل کر دیا کہ جس نے ہم جیسی لاکھوں شریف لڑکیوں کو گرفتار کیا اور ہندو و سندھ کے ستر بادشاہوں کو تخت سے تختۂ تابوت تک پہنچایا، مندروں اور بت خانوں کی جگہ مساجد تعمیر کرائیں، اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ اس سے کچھ غلطی ہوئی تب بھی اس کو محض ایک مخالف کے کہنے پر قتل نہیں کرنا چاہیے تھا۔

خلیفے نے غصے میں آ کر حکم دیا کہ ان دونوں بہنوں کو دیوار میں زندہ چنوا دیا جائے۔

تاریخ معصومی میں ہے کہ دونوں بہنوں کو گھوڑوں کی دم کے ساتھ بندھوایا گیا اور انہیں اس قدر گھسیٹا گیا کہ وہ مر گئیں، بعد میں ان کی لاشوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا میں بہا دیا گیا، اور محمد بن قاسم کی

لاش کو دمشق کے علاقے میں دفن کیا گیا۔

تحفتہ الکرام میں ہے کہ دونوں بہنوں کو ہاتھی کے پاؤں کے ساتھ اور بازاروں میں ننگا پھرانے کے بعد ان کو زندہ جلا دیا گیا۔

یہ ہے وہ من گھڑت افسانہ جو ہمیں محمد بن قاسم کی معزولی اور قتل کے متعلق چچ نامے میں ملتا ہے جو حسب ذیل وجوہ سے تاریخی نقد و نظر کے اعتبار سے بالکل مہمل ہے:

(۱) چچ نامے کی اس روایت کے راوی محمد بن علی اور ابوالحسن مدائنی ہیں، جس میں سے محمد بن علی ایک گمنام راوی ہے۔

(۲) اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں لڑکیاں داہر کے قتل کے بعد راوڑ کے قلعے سے گرفتار ہوئیں حالانکہ چچ نامہ میں ص 186 پر جہاں فتح راوڑ کا تذکرہ ہے، اس میں صرف داہر کی بیوی لاڈی کی گرفتاری کو بیان کیا گیا ہے اور اس موقع پر لڑکیوں کی گرفتاری کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا، البتہ چچ نامے کے ص ۲۰۷ پر برہمن آباد کی فتح کے موقع پر داہر کی دو لڑکیوں کی گرفتاری کا تذکرہ ملتا ہے، خود ان روایتوں کا تضاد اس واقعہ کے غیر معتبر ہونے کی دلیل ہے۔

(۳) اس روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ محمد بن قاسم نے داہر کی ان دونوں لڑکیوں کو حبشی غلاموں کے ساتھ دارالخلافہ بغداد بھجوا دیا، حالانکہ محمد بن قاسم کی فتوحات کے زمانے میں بغداد موجود ہی نہیں تھا، بلکہ اس وقت دارالخلافہ دمشق تھا، اس بنیادی غلطی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک من گھڑت افسانہ ہے، جس کا حقیقت و واقعیت سے کوئی تعلق نہیں۔

(۴) عرب مورخین نے اس واقعہ کی واضح تردید کی ہے کہ محمد بن قاسم کو کچے چمڑے میں لپیٹ کر اور صندوق میں بند کر کے روانہ کیا گیا، اور اس کی لاش وہاں پہنچی۔

(۵) داہر کی لڑکیوں کا خلیفے کے سامنے جھوٹ بولنا اور فریب دینا یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ اگر اس میں کچھ صداقت ہوتی تو عرب مورخین اس کا ضرور تذکرہ کرتے، لیکن عربی تاریخوں میں ہمیں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم چچ نامہ کی متذکرہ بالا روایت کو صداقت سے بعید اور من گھڑت افسانہ سمجھتے ہیں۔

عہد محمد بن قاسم پر تبصرہ:

محمد بن قاسم سترہ سال کی عمر میں سندھ آئے اور صرف ساڑھے تین سال سندھ میں رہے، اس مختصر سی مدت میں انہوں نے پورے سندھ کو فتح کر کے ایک ایسے عادلانہ نظام سلطنت کی بنیاد ڈالی جس کے دوست و دشمن سب معترف تھے۔ ان کی دانائی، تدبر اور سلامت روی کا سکہ سارے ملک پر بیٹھا ہوا تھا۔

محمد بن قاسم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے ہر منزل و موقع پر اپنے مربی و محسن حجاج بن یوسف سے مشورہ لیا، حجاج بن یوسف اگرچہ تاریخ اسلام کی ایک بدنام شخصیت ہے لیکن سندھ کے معاملے میں اس کی ہدایات و مشوروں کو پڑھ کر اس کے تدبر، ہوشمندی اور اس کے اعلیٰ سیاست داں ہونے کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ جب محمد بن قاسم نے دیبل کی فتح کی اطلاع اس کو دی تو اُس نے 20 رجب 93ھ کو محمد بن قاسم کو لکھا:

> جب تم ملک فتح کر چکو تو قلعوں کی مضبوطی اور لشکر کی ضرورتوں کی تکمیل کے بعد، تمام مال اور خزانے کو رعایا اور رفاہی امور پر خرچ کرو، اور خوب سمجھ لو کہ کاشتکاروں، صناعوں، اور تاجروں کی خوشحالی سے ملک پر رونق و آباد ہوتا ہے، اس کی کوشش کرو کہ رعایا مطمئن رہے، اور وہاں کے باشندوں کے ساتھ رعایت کرو تاکہ وہ تمہاری طرف محبت سے راغب ہوں۔[1]

جب محمد بن قاسم نیرون پہنچے تو حجاج نے ان کو خط لکھا:

> تم نیرون کے لوگوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ اور ہر طرح ان کی بھلائی کی کوشش کرو اور انہیں ہماری سرپرستی کی امید دلاؤ، جو کوئی تم سے امن چاہے، اس کو امن دو، جو معززین و اکابر تمہارے پاس آئیں ان کو خلعت اور انعام و اکرام سے نوازو، اُن کے مرتبے کے مطابق ان کی مدارات کرو۔ عقل اور دانائی کو اپنا رہبر بناؤ، جس سے جو وعدہ کرو اسے پورا کرو تاکہ اطراف و اکناف کے اُمرا و اکابر تمہارے وعدے پر اعتبار کریں۔[2]

فتح سیوستان کے موقع پر حجاج نے محمد بن قاسم کو لکھا:

> تم اہل سندھ کو بڑے انعام اور تحائف دو، جو لوگ جاگیریں اور زمین مانگتے ہیں، ان کو مایوس نہ کرو، ان کو حفاظت و امن کے

---

[1] چچ نامہ فارسی - رسیدن مثال حجاج بہ محمد قاسم ص ۱۱۶-۱۱۵۔

[2] چچ نامہ - خبر دیبل و مثال ستدن نیرونیان از حجاج بن یوسف ص ۱۱۷۔

وعدوں سے مطمئن کرو، سلطنت کے حاصل کرنے کے چار طریقے ہیں، اول مداوا، درگذر اور نرمی، دوم سخاوت اور انعام، سوئم دشمنوں کے مزاج پہچاننے، اور ان کی مخالفت کے وقت صحیح رائے قائم کرنا، چہارم دشمنوں کو روکنے اور ہٹانے کے لیے زبردست فوجی طاقت، قوت اور شان و شوکت- تم راجاؤں کے ہر التماس کو پورا کرنے کی کوشش کرو، اور اپنے سچے وعدوں سے ان کو خوش کرو، جب وہ خراج دینے کا اقرار کرلیں تو جو کچھ وہ خزانے کے لیے لائیں اُن سے لے لو اور ہر طرح اُن پر مہربانی کرو، جب کسی کو قاصد بنا کر بھیجو تو پہلے اس کی عقل، ایمان، سمجھ اور دیانتداری کو جانچ لو، جو شخص توحید کو مان لے اور تمہاری اطاعت کرے تو اس کا مال، جاگیر اور ملک اس پر برقرار رکھو، اور جو شخص اسلام کی اطاعت قبول نہ کرے اس کو اس قدر تکلیف دو کہ وہ تمہارا مطیع ہو جائے اور جو شخص بغاوت اختیار کرے اس سے لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔[1]

داہر کی فوجوں سے جب محمد بن قاسم کا مقابلہ شروع ہوا تو حجاج نے ان کو لکھا:

اس کام میں خدا کے فضل اور اس کے حکم سے اس وقت کامیابی ہوگی، جب تم تمام کاموں پر پانچ وقت کی نماز کو مقدم رکھو، تکبیر و قرات، قیام و قعود اور رکوع و سجود میں خدائے تعالیٰ کے سامنے تضرع وزاری کرو، اور اُس سے مدد چاہو، ہر وقت زبان سے اللہ کا ذکر کرتے رہو، یاد رکھو کہ کسی کو طاقت و شوکت بغیر خدا کی رحمت کے حاصل نہیں ہو سکتی، جب تمہارا بھروسہ اللہ پر ہوگا تو انشاء اللہ تم فتح و کامرانی حاصل کروگے۔[2]

فتح راوڑ کی خبر معلوم ہونے پر حجاج نے محمد بن قاسم کو لکھا:

تمہارے خط سے حالات معلوم ہوئے تم نے جو اصول و ضوابط بنائے ہیں وہ عین شرع کے مطابق ہیں، لیکن معافی دینے کا طریقہ جو تم نے اختیار کیا ہے وہ اس سے مختلف ہے، کیونکہ ہر شخص کو خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا بغیر دوست و دشمن کے فرق کے معافی دینا مناسب نہیں، تم رحم کرنے کے اس قدر مشتاق مت بنو کہ رحم کرنے کی مصلحت ہی فوت ہو جائے، آئندہ کسی کو دشمنوں میں سے معافی نہ دو، ورنہ لوگ اسے تمہاری کمزوری پر محمول کریں گے (۹۳ھ)۔[3]

برہمن آباد کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے جو سلوک وہاں کے باشندوں کے ساتھ کیا، حجاج نے اس پر لکھا:

تم نے رعیت نوازی، اور رفاہی امور میں جو کوشش کی ہے اس کے لیے تم تعریف کے مستحق ہو۔

اے میرے پیارے چچا کے بیٹے ایسے کام کرو کہ تم سے قاسم کا نام روشن ہو اور تمہارے دشمن مطیع اور ذلیل ہو جائیں۔[4]

حجاج بن یوسف کے ان خطوط کے اقتباس سے، جہاں اس کی بعض خوبیاں ہمارے سامنے آتی ہیں وہیں یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ سندھ کو فتح کرنے کے بعد وہاں کس قسم کا نظام حکومت قائم کرنے کا خواہاں تھا، اور اس ملک کی رعایا کو خوشحال بنانے کے لیے اس نے کیسی زریں ہدایتیں محمد بن قاسم کو دی تھیں۔

محمد بن قاسم نے جو حکومت سندھ میں قائم کی تھی وہ امن، رواداری کی بہترین نمونہ تھی، اُن کی رواداری کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے جس طرح مسجدوں کے لیے اوقاف مقرر کیے ویسے ہی مندروں کے لیے جاگیریں مقرر کیں۔ برہمن آباد کے پجاریوں کی شکایت پر کہ مسلمانوں کی فتح کے بعد لوگ ڈر سے پوجا پاٹ کے لیے نہیں آتے، مندر ویران ہوگئے اور اُن کی پوجا پاٹ کی آمدنی مسدود ہوگئی ہے، وہ سخت پریشان ہیں۔ محمد بن قاسم نے اُن کی اس شکایت پر حجاج بن یوسف کو لکھا۔

حجاج نے جواب دیا:

تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ برہمن آباد کے ہندو اپنے مندروں کو درست کرنا چاہتے ہیں، جب انہوں نے ہماری اطاعت کرلی اُن کو اپنی عبادت میں آزادی حاصل ہونی چاہیے اور اُن پر کسی قسم کا جبر نہ ہونا چاہیے۔

اس خط کے بعد محمد بن قاسم نے برہمن آباد کے اکابر و معززین کو بلا کر پجاریوں کے حقوق و مراسم کے متعلق پوچھا کہ راجا داہر کے زمانے میں ان کو کیا کیا حقوق ملے ہوئے تھے۔ ان کے تمام حقوق معلوم کرنے کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ جو لوگ اپنے مذہب پر قائم ہیں، اُن کو

---

(1) چچ نامہ- ص ۱۲۸ تا ۱۲۷ رسیدن مثال حجاج بن یوسف بہ محمد قاسم-

(2) چچ نامہ- ص ۱۶۲ رسیدن مثال حجاج بہ محمد قاسم-

(3) چچ نامہ- مثال حجاج بعد رسیدن خبر فتح راوڑ-

(4) چچ نامہ- جواب نامہ حجاج ص ۲۱۶-۲۱۷-

اپنے مذہبی مراسم بجالانے میں حکومت کی طرف سے بالکل آزادی ہے، ہماری حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں، وہ اپنے مندروں میں برہمنوں کو دان، پن وغیرہ جیسے پہلے دیتے تھے اب بھی دیں۔ سرکاری مالگذاری میں سے تین فی صد برہمنوں کے لیے علیحدہ خزانے میں جمع کیا جائے گا، اس روپے سے برہمن اپنے مندروں وغیرہ کی مرمت کے لیے خزانے سے درخواست دے کر رقم حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ محمد بن قاسم نے ایک بڑے پنڈت کو رانا کا خطاب دے کر منادر کے انتظام و اہتمام کے لیے مقرر کیا، غیر مسلم جو مسلمانوں کی فوج میں کام کرتے تھے، اُن کو باقاعدہ تنخواہ دی جاتی تھی۔ اور ان کا سرکاری لگان معاف کر دیا جاتا تھا۔

محمد بن قاسم نے سندھ میں جو علاقے بھی فتح کیے، عام طور پر وہاں کے قدیم حاکموں سے اقرار اطاعت لے کر انہیں کو حکومت پر بحال رکھا، صرف عام انتظام کو بہتر بنانے اور انصاف کے لیے ان کے ساتھ مسلمان سرداروں کو بھی مقرر کر دیا جاتا تھا، مگر پولیس اور فوج میں زیادہ تر سندھ کے نو مسلم ہوتے تھے۔ انتظامی عہدوں پر بھی سندھ کے ہندوؤں کو رکھا گیا، اس کے علاوہ رواداری کی حد یہ تھی کہ سندھ میں ہندوؤں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر دی گئیں، اس طرح ملک کا تمام نظم و نسق فتح ہونے کے بعد بھی مقامی ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا، اور ان راجاؤں سے صرف خراج وصول کیا جاتا تھا۔ زر لگان اور خراج سے جو رقم وصول ہوتی تھی، اس کا بڑا حصہ ملک کی رفاہی ضرورتوں پر خرچ کیا جاتا تھا، برہمنوں کو حکومت کے معزز عہدوں پر مقرر کیا گیا تھا۔ محمد بن قاسم نے یہ معلوم کرنے کے بعد کہ برہمن ایک معزز قوم ہے اور انتظام سلطنت سے واقف ہے، مال کے تمام محکمے میں ان برہمنوں ہی کو مقرر کیا تھا۔ زر مالگذاری کی وصولی، اس کا حساب خزانے کا تحفظ سب برہمنوں سے متعلق تھا۔ حکومت اس کا خاص طور پر خیال رکھتی تھی کہ ملک کے کسی طبقے اور جماعت کو تکلیف نہ پہنچے۔ محمد بن قاسم کی حکومت نے پست افراد کو اُبھارا اور ترقی دی، لیکن بلند طبقے کو گرایا نہیں، البتہ پست طبقوں کی حالت کو بہتر بنانے اور اُن کی فلاح و بہبود پر سب سے زیادہ توجہ دی۔ عدل و انصاف، مساوات پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھی اور اس کا خصوصیت سے خیال رکھا کہ ملک کے کسی طبقے اور جماعت کو نقصان نہ پہنچے، چنانچہ مفتوحہ علاقوں میں تاجروں، پیشہ وروں، دستکاروں اور کاشتکاروں کو جنگ کی وجہ سے جو نقصان پہنچا تھا، محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ ان لوگوں میں ہر ایک کو بارہ درہم وزن چاندی دی جائے اور جس کا اس سے زیادہ نقصان ہوا ہے، اسے تحقیق کے بعد اس سے زیادہ دیا جائے۔ برہمنوں کو جو زر لگان وصول کرنے پر متعین تھے تاکید کی گئی تھی کہ کسانوں سے لگان اور محصول کے وصول کرنے میں کسی قسم کی سختی نہ کی جائے، کسانوں کو ہر طرح کی سہولتیں دی جائیں، جس کسان کی یہاں پیداوار کم ہو، اس کو سرکاری لگان معاف کر دیا جائے۔ محمد بن قاسم کے اس طرز عمل نے سندھ کے لوگوں کو بے حد متاثر کیا، رعایا میں مسرت اور خوشی کی لہر دوڑ گئی، اور ہر طرف اسلامی حکومت کی تعریف کے گن گائے جانے لگے، یہاں تک کہ برہمن خود گاؤں گاؤں پھر کر اسلامی حکومت کی تعریف کرتے تھے اور لوگوں کو حکومت کی وفاداری کا سبق دیتے تھے۔

محمد بن قاسم جب سندھ سے رخصت ہونے لگے تو سارے سندھ میں اُن کے جانے پر اظہار افسوس کیا گیا، اُن کی وفات پر شہر کیرج کے ہندوؤں اور بودھوں نے اپنے شہر میں اُن کا ایک مجسمہ بنا کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔

محمد بن قاسم کے بعد کے گورنر

یزید بن ابی کبشہ سکسکی:

یزید بن ابی کبشہ سکسکی جو محمد بن قاسم کے بعد سندھ کا گورنر ہو کر آیا تھا، وہ سندھ پہنچنے کے اٹھارہ دن بعد وفات پا گیا، اس کی اطلاع دارالخلافہ میں پہنچنے اور وہاں سے نئے گورنر کے آنے میں دیر لگی، ادھر محمد بن قاسم کی گرفتاری اور سکسکی کی وفات نے ملک میں کافی بدنظمی پیدا کر دی، اور اس بدنظمی کو ہوا زیادہ تر اس وجہ سے ملی کہ مجاہدین اپنے گھروں کو واپس ہو چکے تھے، داہر کے بیٹے جے سینہ (جے سنگھ) نے اس موقع کو غنیمت سمجھا، اور برہمن آباد پر قابض ہو گیا، باقی ملک مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔[1]

یزید بن ابی کبشہ کے بعد چند دن کے لیے عامر بن عبداللہ سندھ کا گورنر ہو کر آیا، ابھی وہ مقبوضہ علاقے کا نظم و نسق بھی درست کرنے نہ پایا تھا کہ اُس نے بھی وفات پائی، اور جے سینہ (جے سنگھ) اُسی طرح برہمن آباد پر قابض رہا۔

---

[1] فتوح البلدان - بلاذری، ص ۴۴۱۔

حبیب بن مہلب:

اس کے بعد سلیمان بن عبد الملک نے حبیب بن مہلب کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، وہ کافی فوج اپنے ساتھ لے کر آیا اور دریائے مہران کے کنارے اُترا، اس عرصے میں جے سینہ کی کامیابی کو دیکھ کر سندھ کے کچھ اور راجا بھی خود مختار ہو چکے تھے، الور کے لوگوں نے حبیب بن مہلب کی اطاعت قبول کی۔ حبیب نے پہلے حکومت اسلامیہ کے ان باغیوں کو مطیع بنایا، ابھی وہ برہمن آباد کی طرف متوجہ نہ ہونے پایا تھا کہ ۲۰ صفر ۹۹ھ (۱۸-۷۱۷ء) کو سلیمان بن عبد الملک نے وفات پائی اور اُس کی جگہ حضرت عمر بن عبد العزیز مسلمانوں کے خلیفہ منتخب ہوئے، انہوں نے حبیب کے بھائی یزید بن مہلب کو عراق و خراسان کی گورنری سے اور حبیب بن مہلب کو سندھ کی گورنری سے خیانت کے جرم پر معزول کر کے قید کر دیا۔[1]

حضرت عمر بن عبد العزیز

۹۹ھ (۱۸-۷۱۷ء) تا ۱۰۱ھ (۲۰-۷۱۹ء)

سلیمان بن عبد الملک کی وفات کے بعد صفر 99ھ میں حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ منتخب ہوئے، انہوں نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد سندھ کے حکمرانوں اور زمینداروں کے نام خطوط لکھے جن میں ان کو اسلام کی دعوت دی اور لکھا:

> تم اسلام قبول کر لو، اگر تم اسلام قبول کر لو گے تو تمہاری ریاستیں اور زمینیں ہم بدستور قائم رکھیں گے، تمہاری خطائیں معاف کر دی جائیں گی، تمہارے ساتھ مسلمانوں کی طرح سلوک کیا جائے گا اور ہم تمہیں اپنا بھائی سمجھیں گے اور تمہارے وہی فرائض ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں۔

عمرو بن مسلم باہلی:

حضرت عمر بن عبد العزیز نے عمرو بن مسلم باہلی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے خطوط پر سب سے پہلے داہر کے بیٹے جے سینہ (جے سنگھ) نے اسلام قبول کیا، اس کے ساتھ سندھ کے اکثر راجاؤں نے بھی جو اس کے رشتے دار تھے اسلام قبول کیا اور اپنے نام بدل کر عربوں کی طرز پر اسلامی نام رکھے۔ ان راجاؤں کے مسلمان ہوتے ہی عام رعایا پر بھی اس کا خوشگوار اثر پڑا اور اس ملک میں اسلام خوب پھیلا، یہ مسلمان راجا خلیفہ کے اقتدار کو تسلیم کرتے تھے اور متبع شریعت تھے۔ ان کو اپنی ریاستوں میں ہر قسم کی خود مختاری حاصل تھی، سندھ کا ایک حصہ وہ بھی تھا جو گورنر سندھ کے قبضے میں تھا، اس میں اسلامی حکومت کی طرف سے جابجا ہندو راجا بر سر حکومت تھے، جو خراج ادا کرتے تھے، اور مسلمانوں کے تحت امن سے زندگی بسر کرتے تھے۔ سندھ میں جس قدر اسلام حضرت عمر بن عبد العزیز کے زمانے میں پھیلا، اس کی مثال کسی دوسرے خلیفہ کے زمانے میں نہیں ملتی۔

سندھ کے گورنر عمرو بن مسلم باہلی نے سندھ کے نظم و نسق کو بہتر بنایا۔ پھر وہ ہندوستان کے بعض حصوں پر حملہ آور ہوا اور فتح و کامیابی حاصل کی پھر اس نے سندھ کے متصل (کش) کچھ پر حملہ کیا جو جالندھر سے ملا ہوا تھا، اور جہاں کا راجا دلہہ رائے تھا۔[1]

۱۰۱ھ (۲۰-۷۱۹ء) میں حضرت عمر بن عبد العزیز نے وفات پائی۔

یزید بن عبد الملک

۱۰۱ھ (۷۱۹ء) تا ۱۰۵ھ (۷۲۵ء)

بلال بن احوز تمیمی:

حضرت عمر بن عبد العیزیز کے بعد ۱۰۱ھ (۲۰-۷۱۹ء) میں یزید بن عبد الملک خلیفہ ہوا، یزید کے زمانے میں یزید بن مہلب جس کو حضرت عمر بن عبد العزیز نے خیانت کے جرم میں قید خانے میں ڈال دیا تھا، وہ کسی طرح جیل خانے سے بھاگ نکلا، اور اپنے خاندان اور ساتھیوں کو لے کر سندھ کی طرف بھاگ آیا، حکومت کی طرف سے بلال ابن احوز تمیمی کو اس کے تعاقب میں روانا کیا گیا، اُس نے قندابیل میں مہلب کے بیٹے مدرک کو پکڑا اور ایک ایک کر کے اس کے سب بیٹوں مفضل، عبد الملک، زیاد، مروان اور معاویہ کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا، ان مقتولوں میں معاویہ بن یزید بھی تھا، جس نے واسط کے جیل خانے میں محمد بن قاسم کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی تھیں۔[3]

---

[1] تاریخ سندھ۔ مولانا ابو ظفر ندوی، ص 124۔

[2] یہ تمام تفصیل فتوح البلدان بلاذری۔ ص 243 و تاریخ سندھ مولانا ابو ظفر ندوی سے ماخوذ ہے۔

[3] فتوح البلدان۔ بلاذری، ص ۴۴۲۔

25 شعبان 105ھ (24-723ء) کو یزید بن عبدالملک نے وفات پائی، بلال بن احوز تمیمی یزید بن عبدالملک کی وفات تک سندھ کا گورنر رہا۔

ہشام بن عبدالملک

۱۰۵ھ (۲۵-۷۲۴ء) تا ۱۲۵ھ (۴۳-۷۴۲ء)

یزید بن عبدالملک کی وفات کے بعد، اس کی بھائی ہشام بن عبدالملک رمضان 105ھ (25-724ء) میں تخت خلافت پر بیٹھا۔

ہشام کی تخت نشینی کے وقت عمر بن ہبیرہ عراق کا گورنر جنرل تھا۔ شوال 105ھ (25-724ء) میں ہشام نے عمر بن ہبیرہ کو معزول کر کے اُس کی جگہ خالد بن عبداللہ القسری کو عراق کا گورنر جنرل مقرر کیا۔

جنید بن عبدالرحمٰن المری:

خالد نے جنید بن عبدالرحمٰن المری کو سندھ کا گورنر مقرر کر کے بھیجا، جنید سندھ پہنچ کر پہلے دیبل میں ٹھہرا، یہاں اُس نے چند دن ٹھہر کر سندھ کے تمام حالات سے واقفیت حاصل کی، پھر وہ دریائے سندھ کے کنارے کنارے چل کر برہمن آباد کے قریب پہنچا، جس پر جے سیہ (جے سنگھ) کا قبضہ تھا، جے سیہ (جے سنگھ) نے اُسے دریا کو عبور کرنے سے روکا اور کہلا بھیجا میں اسلام لا چکا ہوں اور مجھ کو مرد صالح (حضرت عمر بن عبدالعزیز) نے اس مملکت کا حاکم بنایا ہے، تم کو میری ریاست میں قدم رکھنے اور یہاں داخل ہونے کا کوئی حق نہیں ہے، جنید کو اس کا یہ جواب ناگوار گزرا، لیکن اس نے اپنی ناگواری ظاہر نہ کی اور جے سیہ (جے سنگھ) کو کہلا بھیجا، میں تمہاری ریاست میں مداخلت کرنے نہیں آیا ہوں، جے سیہ نے کہا مجھے تمہاری بات کا اعتبار نہیں، بلکہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم مجھ کو معزول نہ کر دو، جنید نے کہا میں اس بات کی ضمانت دینے کے لیے تیار ہوں کہ میں تمہیں معزول نہیں کروں گا، البتہ اطاعت کے طریقے پر تم سے خراج ضرور وصول کیا جائے گا۔ جنید نے اُسے معزول نہ کرنے کی ضمانت دی اور جے سیہ (جے سنگھ) نے جنید کو خراج ادا کرنے کی ضمانت دی، لیکن باوجود ان ضمانتوں کے دونوں میں بدگمانیاں بڑھتی گئیں، جنید کو دریا کے پار کرنے پر اصرار تھا، اور جے سیہ (جے سنگھ) بھی اس کی طرف سے غافل نہ تھا، یہ اعصابی جنگ یہاں تک بڑھی کہ اُس نے عملی جنگ کی صورت اختیار کی، دونوں کے ضامن واپس ہو گئے، دونوں کی طرف سے قوت کا استعمال ہوا، اِدھر سے روکنے کے لیے اور اُدھر سے دریا کو عبور کرنے کے لیے کشتیاں بڑھیں، دونوں میں دریائی جنگ ہوئی، جے سیہ شکست کھا کر بھاگا، اور اُس کی فوج منتشر ہو گئی، جنید دریا کے پار پہنچ گیا، جے سیہ گرفتار ہوا اور جنید نے اس کو قتل کرا دیا۔

بعض مورخوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جے سیہ مرتد ہو گیا تھا، لیکن اس کا کوئی ثبوت ہمیں نہیں ملتا۔

جے سیہ (جے سنگھ) کے قتل کے بعد اس کا بھائی صعصہ (پچ) بن داہر کسی طرح بچ بچا کر نکلا تا کہ وہ دمشق پہنچ کر خلیفہ سے جنید کی شکایت کرے اور اپنے بھائی کا قصاص طلب کرے۔ جنید کو جب یہ معلوم ہوا تو اُس نے اپنے ایک آدمی کو بھیج کر اور اس سے وعدے وعید کر کے اُسے واپس بلا لیا، جیسے ہی وہ واپس آیا اُسے قتل کرا دیا۔ یہ پہلی بدعہدی تھی جو سندھ میں جنید کی جانب سے ہوئی، اگرچہ یہ جنید کی انفرادی غلطی تھی، لیکن اس نے غالباً یہ سوچ کر کہ اس کی وجہ سے ملک میں کوئی فتنہ نہ کھڑا ہو جائے اُسے قتل کرا دیا۔

اس کے بعد جنید نے کیرج پر حملہ کیا، یہاں کا راجا باغی ہو چکا تھا، راجا نے مقابلہ کیا، پھر بھاگ کر قلعہ بند ہو گیا، جنید نے دیوار شکن آلے کبش اور نطافہ سے قلعے کی دیواروں میں رخنے ڈالے اور راستہ بنا کر فوج قلعے کے اندر داخل ہو گئی۔ اکثر باغی قتل کیے گئے، بہت سے لوگ گرفتار ہوئے اور خاصا مال غنیمت ہاتھ آیا۔ جنید نے اس علاقے میں اپنے عامل، مرمد، مندل، دہنج اور بروص پر مقرر کیے۔

کیرج کی فتح اور وہاں امن و امان قائم کرنے کے بعد جنید نے ایک لشکر حبیب بن مرہ کی قیادت میں مالوہ بھیجا اور خود سیلمان اور گجرات کے علاقوں پر لشکر کشی کی اور ان کو فتح کر کے واپس آیا۔[1]

پھر وہ دریائے بیاس کے مغربی جانب بڑھا، یہاں ایک چھوٹی سی ریاست چیناپیٹھ کے نام سے مشہور تھی جس کو عرب شاہ چین کہتے تھے، اس ریاست کے ماتحت بہت سے قلعے تھے، جنید نے پہلے یہاں کے راجا کو اسلام کی دعوت دی، اس نے اسلام کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، جنید نے اس ریاست پر حملہ شروع کر دیا، راجا نے جوابی کارروائی شروع کی اور متعدد مقامات پر لڑ کر شکست کھائی، پھر بھی وہ ڈٹ کر جنید کا مقابلہ کرتا رہا یہاں تک کہ جنید اُس کو پیچھے ہٹاتا ہوا اس کے قلعے تک آ گیا۔ راجا اپنی فوج کے ساتھ قلعہ بند ہو گیا، جنید نے قلعے کا محاصرہ کر کے آگ کے تیروں کی بارش شروع کی، لیکن جنید کو حیرت ہوتی تھی کہ قلعے میں جو آگ برسائی

---

(1) فتوح البلدان—بلاذری، ص ۴۴۷ مطبوعہ مصر۔

جاتی ہے، وہ فوراً بجھادی جاتی ہے اُسے خیال ہوا کہ قلعے میں ضرور کوئی عرب موجود ہے، کیونکہ عربوں کے سوا کسی کو اس آگ کے بجھانے کا طریقہ معلوم نہیں تھا، جنید نے محاصرے کو اور سخت کر دیا، یہاں تک کہ قلعے کے لوگوں نے تنگ آکر صلح کی درخواست کی، جنید نے اس درخواست کو منظور کر لیا، اور قلعے میں فاتحانہ داخل ہو کر اُس نے پتا چلایا کہ اصل میں آگ کے بجھانے والے کون تھے، تحقیقات کے بعد دو عرب اس جرم کے مجرم نکلے، جنید نے اس غداری کی سزا میں اُن کو قتل کرا دیا۔[1]

جنید ایک اولوالعزم اور بہادر انسان تھا، اُس نے سندھ میں آکر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے باغیوں کو کچلا، حکومت کے وقار کو دوبارہ قائم کیا، ماتحت راجاؤں کو مرعوب رکھنے کی کوشش کی اور اپنی فتوحات سے اسلامی حکومت کے دائرے کو وسیع کر دیا۔ جنید کے زمانے میں شمال میں کشمیر تک مشرق میں بیاس اور دریائے راوی تک، مغرب میں بحر یہ عرب اور جنوب میں مالوے تک کی سرزمین اس کے تحت اور خراج گزار تھی۔

اس کا قول تھا کہ مردانہ وار قتل ہو جانا ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے کہیں بہتر ہے۔

اس کی غیر معمولی فتوحات کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ خلیفہ نے اس کو لکھا کہ روم کی لڑائی میں کثرت سے مویشی اور قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے ہیں۔ جنید نے اس کے جواب میں خلیفے کو لکھا کہ مجھے اپنے دفتر کے اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ میں اس وقت تک ساڑھے چھ لاکھ قیدی قید کر چکا ہوں، اور آٹھ کروڑ درہم (دو کروڑ روپے) خزانہ شاہی کے لیے روانہ کر چکا ہوں اور اسی قدر روپیہ اور قیدی فوجیوں میں تقسیم کر چکا ہوں۔[2]

جنید فطرتاً بے حد فیاض تھا، فتوح البلدان میں ہے کہ کبھی کوئی اُس کے پاس سے خالی ہاتھ نہیں گیا، ان فتوحات میں جنید کے پاس اس قدر دولت آئی کہ اس فیاضی کے باوجود چار کروڑ درہم یعنی تقریباً ایک کروڑ روپیہ اس کے پاس بچ گیا۔

عرب کے مشہور شاعر جریر نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

اصبح زوار الجنید و صحبه　　یحیون صلت الوجه جماً مواهبه

جنید کے دوستوں اور ملاقاتیوں کے چہرے، دن نکلتے ہی اس کے عطایا سے روشن ہو جاتے ہیں۔

ابوالجویریہ نے اُس کی مدح کرتے ہوئے کہا ہے۔

لو کان یقعد فوق الشمس من کرم　　قوم باحسانهم او مجدهم قعدوا

محسودون علی ما کان من کرم　　لا ینزع الله منهم ماله حسدوا

اگر فیاضی کے سبب سورج پر بیٹھنا ممکن ہوتا تو بیشک یہ قوم اپنے احسان اور بزرگیوں کے سبب سورج پر جا بیٹھتی۔

وہ اپنی بخشش و فیاضی کے سبب سے محسود ہے، خدا کرے کہ ان سے وہ چیزیں نہ چھینی جائیں، جس کی وجہ سے اُن سے حسد کیا جاتا ہے۔[3]

جنید ۱۱۱ھ (۷۲۹-۳۰ء) میں سندھ سے ترقی پا کر خراسان کی گورنری پر گیا، وہاں ۱۱۶ھ (۷۳۵-۳۶ء) پانچ سال تک گورنر رہا، یزید بن مہلب کی لڑکی فاضلہ سے شادی کرنے کی وجہ سے خلیفہ کا اس پر عتاب ہوا، اور گورنری سے معزول کر دیا گیا، بعد میں جنید نے مرض استسقا میں مبتلا ہو کر مرو میں وفات پائی جہاں وہ مقیم تھا۔

تمیم بن زید عتبی:

ہشام نے جنید کے بعد تمیم بن زید عتبی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، تمیم نہایت کمزور، سست، رحمدل اور فیاض انسان تھا، وہ سندھ میں آنے کے بعد اپنی کمزوری کی وجہ سے امن نہ قائم کر سکا، اور اس کی بدنظمی کی وجہ سے سندھ کی حکومت کا نظام درہم برہم ہو گیا، اس نے سب سے بڑی غلطی یہ بھی کی کہ وہ اپنی داد و دہش کا مرکز صرف اپنے فوجی سرداروں کو بنائے ہوئے تھا، اور عطایا میں مقامی سرداروں کا بالکل خیال نہ رکھتا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرداروں میں اختلاف اور ناچاقی شروع ہو گئی، اور خانہ جنگی تک نوبت پہنچی، تمیم نے یہ رنگ دیکھ کر کہ حالات اس کے قابو سے باہر ہیں راہ فرار اختیار کی اور وہ بھاگ کر عراق کی طرف روانہ ہو گیا، ابھی وہ دریائے سندھ کو عبور کر کے دیبل کے قریب ایک تالاب کے کنارے جس کو ماء الجوامیس (بھینسوں کا پانی) کہتے تھے پہنچا تھا کہ وہیں بیمار ہو کر اُس نے وفات پائی۔[4]

اس کی فیاضی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب وہ سندھ کا گورنر ہو کر آیا تو اس نے سندھ کے خزانے میں ایک کروڑ اسی لاکھ طاطری[5] درہم پائے، اور بہت جلدی ٹھکانے لگا دیے[6] بلاذری نے

---

(1) تاریخ سندھ - مؤلف مولانا ابو ظفر ندوی، بحوالہ ایلیٹ صاحب کی تاریخ سندھ۔

(2) تاریخ سندھ - مولانا ابو ظفر ندوی، ص ۱۳۴ - بحوالہ یعقوبی ج ۲، ص ۳۸۰۔

(3) فتوح البلدان - بلاذری۔

(4) فتوح البلدان - بلاذری، ص ۴۴۲۔

(5) یہ ایک سکہ تھا جو اس زمانے میں سندھ اور گجرات میں چلتا تھا اور موجودہ آٹھ

لکھا ہے کہ اس کا شمار اسخیائے عرب میں ہوتا ہے۔

فرزدق کا خط:

تمیم کے ساتھ جو لوگ سندھ آئے تھے، اُن میں خنیس نام کا ایک یربوعی نوجوان بھی تھا، خنیس کی ماں قبیلے طے کی تھی، وہ ایک دن عرب کے مشہور شاعر فرزدق کے پاس آئی، اور بڑی لجاجت سے اُس کے باپ غالب کی قبر کا واسطہ دے کر کہا کہ وہ سندھ کے گورنر تمیم بن زید کے پاس اُس کی سفارش کرے کہ وہ اس کے لڑکے کو واپس بھیج دے، فرزدق نے بڑھیا کی لجاجت سے متاثر ہو کر یہ چند شعر تمیم بن زید کو لکھے:

اتتنی فعاذت یا تمیم بغالب — وبالحفرته الساقی علیها ترابها
فهب لی خنیسا و اتخذ فیه منته — لحوبته ام ما یسوغ شرابها
تمیم بن زید لا تکونن حاجتی — بظهر و لایخفی علیك جوابها
فلا تکثر الترداد فیها فانني — ملول لحاجات بطی طلابها

اے تمیم! (خنیس کی بڑھیا ماں) میرے پاس آئی اور اس نے مجھے میرے باپ غالب کی قبر کا واسطہ دیا تو ایک خنیس کو مجھے بخش دے، اور ایسی ماں پر احسان کر جس کا یہ حال ہے کہ پانی بھی حلق سے نہیں اترتا۔

زید کے بیٹے تمیم میری درخواست رد نہ کر جب کہ اس کا قبول کرنا تیرے لیے کچھ بھی مشکل نہیں۔ میری درخواست کے قبول کرنے میں پیش و پش بھی نہ کر، میں ایسی حاجتوں سے ملول ہو جاتا ہوں جن کے پورا کرنے میں دیر کی جاتی ہے۔

تمیم کو جب فرزدق کا یہ منظوم خط ملا تو اس کے لیے بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ خنیس کا لفظ کچھ اس طرح لکھا ہوا تھا کہ وہ جبیش (ح) بھی پڑھا جاسکتا تھا، اس نے حکم دیا کہ جن لوگوں کے نام اس طرح لکھے جاتے ہیں، اُن سب کو وطن واپس جانے کی اجازت ہے۔

تمیم کی گورنری اور اس کی اچانک موت سے سندھ میں اسلامی حکومت کو سخت نقصان پہنچا۔ اس کے زمانے میں اکثر علاقے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے اور اپنے مرکز انہیں چھوڑنے پڑے جن کے متعلق بلاذری متوفی ۲۷۹ھ لکھتا ہے کہ وہ اب تک دوبارہ فتح نہیں ہوئے۔[1]

حکم بن عوانہ کلبی:

تمیم کی وفات کے بعد عراق کے گورنر جنرل خالد قسری نے خلیفہ سے منظوری لے کر حکم بن عوانہ کلبی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، وہ اپنے ساتھ محمد بن قاسم فاتح سندھ کے لڑکے عمرو بن قاسم کو لے کر آیا، جب وہ سندھ پہنچا، اس نے یہاں آکر دیکھا کہ سندھ کے اکثر علاقوں میں بغاوت پھیلی ہوئی ہے، تحریک ارتداد زوروں پر ہے، جس کی وجہ سے عراق اور شامی عرب جو مختلف شہروں اور قصبوں میں منتشر آباد تھے خطرے میں پڑ گئے ہیں۔

محفوظہ کی بنیاد:

حکم بن عوانہ نے سندھ میں آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ان تمام عربوں کو جو مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے تھے بلا کر ایک جا جمع کیا، اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی طاقت و قوت کو یکجا جمع کر کے ان کو ایک اجتماعی طاقت بنایا جائے، کیونکہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے سندھ کو فتح کیا تھا، اور جن پر کامل اعتماد و بھروسا کیا جاسکتا تھا، اس نے ان سب کو آباد کرنے کے لیے دریائے سندھ کے دھانے پر مشرقی جانب ۱۱۳ھ (۳۲-۷۳۱ء) میں ایک شہر کی بنیاد رکھی، اور اس میں ان عربوں کو آباد کیا۔ حکم نے قبیلہ کلب کے اپنے شامی ساتھیوں سے پوچھا کہ اس شہر کا کیا نام رکھا جائے، کسی نے دمشق نام رکھنے کی رائے دی، کسی نے حمص، ایک شخص نے کہا کہ اس کا نام تدمر رکھا جائے، حکم نے یہ نام سن کر کہا دمر اللہ علیك یا احمق (بیوقوف، خدا تجھے ہلاک کرے) میں اس کا نام محفوظہ رکھتا ہوں، پھر اُس نے خود بھی اس شہر میں اقامت اختیار کر کے اس کو سندھ کا دارالحکومت قرار دیا۔

حکم نے محمد بن قاسم کے صاحبزادے عمرو بن قاسم کو جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور جو عقل و تدبر، دانشمندی اور بہادری میں بالکل اپنے باپ کے نقش قدم پر تھا، اپنا مشیر اور اپنی فوج کا سپہ سالار بنا کر باغیوں اور سرکشوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا، عمرو نے ہر جگہ فتوحات حاصل کیں اور تمام سرکشوں اور باغیوں کو مطیع و فرمانبردار بنا کر اپنے باپ کی روایت کو زندہ کر دیا۔

منصورہ کی بنیاد:

عمرو بن قاسم جب سلطنت اسلامیہ کو سندھ میں مستحکم کرنے کے بعد فاتح و منصور واپس ہونے لگا تو اس نے ۱۲۰ھ (۷۳۷ء) میں اپنی ان

آنے کے برابر تھا، اس حساب سے ایک کروڑ اسی لاکھ طاطری درہم ہمارے زمانے کے نوے لاکھ ہوتے ہیں۔

(6) فتوح البلدان-بلاذری، ص ۴۴۴۔

(1) فتوح البلدان-بلاذری، ص ۴۴۳۔

فتوحات کی یادگار کے طور پر دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر محفوظہ کے بالمقابل ایک نیا شہر منصورہ کے نام سے آباد کیا، جو بعد میں سندھ کا دارالسلطنت بنا۔ عراق کا گورنر جنرل خالد قسری سندھیوں کے مزاج کو دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا کرتا تھا کہ سندھ کے لوگ بھی عجیب ہیں، میں نے ان پر عرب کے دریادل اور فیاض تمیم جیسے شخص کو مقرر کیا تو یہ لوگ اس سے ناراض ہوگئے، اور بخیل ترین انسان حکم جیسے انسان کو ان پر حاکم بنایا تو یہ خوش ہوگئے۔

جمادی الاخریٰ ۱۲۰ھ میں عراق کا گورنر جنرل خالد قسری معزول ہوا، اور اُس کی جگہ یوسف بن عمر ثقفی عراق کی حکومت پر فائز ہوا، یوسف نے عراق کا نظم و نسق سنبھالتے ہی خالد کے مقرر کیے ہوئے عہدے داروں کو چن چن کر علیحدہ کر دیا، حکم بھی خالد کے مقرر کردہ عہدے داروں میں تھا، وہ مرکز کی پالیسی کا یہ رنگ دیکھ کر بہت خائف ہوا، اس نے بہت غور و فکر کے بعد یہ رائے قائم کی کہ یا تو اُسے کوئی ایسا کار نمایاں انجام دینا چاہیے، جس سے اس کی غیر معمولی شہرت ہو اور یوسف بھی اس سے خوش ہو جائے، ورنہ علیحدگی کی ذلت سے موت کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں سندھیوں کی ایک جماعت نے بغاوت کی، حکم بن عوانہ نے اُن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اسی جنگ میں ۱۲۱ھ (۷۳۸ء) میں لڑتے ہوئے حکم نے شہادت پائی۔[1] حکم نے اپنے زمانۂ حکومت میں سندھ کے بیرونی و اندرونی انتظام کو بہتر سے بہتر بنایا، یہاں تک کہ ہر شخص اس کی تعریف کرتا تھا، اس نے اپنی حکمت عملی سے حجازی اور یمنی لوگوں کی چپقلش کو دور کر دیا جو اس وقت سندھ میں آباد تھے، اور جن کے اختلاف نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔

اسی حکم بن عوانہ کے ساتھ منذر بن زبیر ہباری بھی آیا تھا، جس کا پوتا آگے چل کر سندھ پر قابض ہوا، اور جس نے ہباری حکومت کی بنیاد رکھی۔[2]

عمرو بن محمد بن قاسم:

حکم کی شہادت کے بعد عمرو بن محمد بن قاسم ثقفی اور یزید بن عرارہ جو حکم کے ماتحت تھے سندھ کی گورنری کے لیے کھڑے ہوئے، عراق کے گورنر جنرل یوسف بن عمر ثقفی نے دونوں کے نام خلیفہ کے پاس بھیج دیے، خلیفہ نے لکھا کہ اگر عمرو بن محمد بن قاسم جوان ہو گیا ہو تو اسے سندھ کا گورنر بنایا جائے، چنانچہ حکم بن عوانہ کے بعد عمرو بن محمد بن قاسم سندھ کا گورنر منتخب ہوا، عمرو نے سندھ کا گورنر منتخب ہوتے ہی یزید بن عرارہ کو جیل میں ڈال دیا۔

ان دونوں کے اختلاف سے دشمنوں نے خوب فائدہ اُٹھایا، یہاں تک کہ دشمن بڑھتے بڑھتے منصورہ تک پہنچ گئے اور منصورہ کا محاصرہ کر لیا، اس نے اس کی اطلاع عراق کے گورنر جنرل یوسف ثقفی کے پاس بھیجی، یوسف نے چار ہزار فوج منصورہ روانہ کی، فوج کے آتے ہی دشمن فرار ہوگئے، عمرو نے اپنی فوجی طاقت کو ترقی دینی شروع کی، جب اسے اپنی قوت کے متعلق یقین ہو گیا تو وہ دشمنوں کے مقابلے کے لیے نکلا، اس نے اپنی فوج کا سردار معن بن زائدہ جیسے بہادر شخص کو بنایا۔ عمرو[3] نے اپنی فوج کے ساتھ دشمن پر شب خون مارا، جس میں دشمن کی فوج کا بڑا حصہ کام آیا، یہ دیکھ کر راجا خود جنگ کے لیے نکلا، مسلمان راجا کو پہچانتے نہ تھے، لیکن جو سندھی فوج میں شامل تھے، وہ اُسے پہچان کر چلائے کہ یہ رائے ہے رائے، مسلمان فوراً اس پر ٹوٹ پڑے، راجا بھاگ کھڑا ہوا۔ راجا کے بھاگتے ہی اس کا تمام لشکر منتشر ہو گیا، اس فتح سے عمرو کا رعب دلوں پر بیٹھ گیا اور شہر مطیع ہو گیا۔ لیکن عین اُس وقت جب کہ عمرو بن محمد بن قاسم دشمنوں کو شکست دے رہا تھا، اُس کے ایک فوجی مروان بن یزید بن مہلب نے موقع پا کر اس کے تمام مال و اسباب اور سواری کے جانوروں کو لوٹ لیا، عمرو کو یہ معلوم ہوا، اس نے اس کا پیچھا کیا اور اس کی جماعت پر حملہ کر کے انہیں منتشر کر دیا، مروان بھی کہیں چھپ گیا۔ عمرو نے اعلان کیا کہ سوائے مروان کے اس کے تمام ساتھیوں کی غلطیاں معاف کی جاتی ہیں، چنانچہ اُسی کے ساتھیوں میں سے کسی نے یزید کو پکڑوا دیا اور وہ فوراً ہی قتل کر دیا گیا۔[4]

۶ ربیع الثانی ۱۲۵ھ (۷۴۳ء) میں ہشام بن عبد الملک نے مرض خناق میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔

ولید ثانی بن یزید بن عبد الملک

۱۲۵ھ (۷۴۲-۴۳ء) تا ۱۲۶ھ (۷۴۳-۴۴ء)

ہشام کی وفات کے بعد ربیع الثانی ۱۲۵ھ (۷۴۳ء) میں یزید کا بیٹا ولید تخت نشین ہوا۔

---

(1) فتوح البلدان۔ بلاذری، ص ۴۴۶۔

(2) تاریخ سندھ۔ مولانا ابو ظفر ندوی، بحوالہ یعقوبی، ص ۳۸۹۔

(3) کہیں یہ صراحت نہیں ملتی کہ یہ راجا کون تھا اور یہ لڑائی کہاں ہوئی تھی۔

(4) تاریخ سندھ۔ مولانا ابو ظفر ندوی، ص ۱۴۱-۱۴۲ بحوالہ یعقوبی، جلد ۲، ص ۳۹۰۔

عمرو بن محمد بن قاسم کی معزولی:

اُس نے حکومت سنبھالنے کے بعد ہی ہشام کے زمانے کے تمام عہدے داروں کو معزول کر دیا، اُن میں عمرو بن محمد بن قاسم بھی تھے، عمرو بن محمد نے 126ھ (44-743ء) میں وفات پائی۔

یزید بن عرار:

عمرو بن محمد کے بعد ولید نے یزید بن عرار کو سندھ کا گورنر مقرر کیا، یزید بن عرار بھی بہترین صلاحیتوں کا مالک تھا، اُس نے سندھ کی حکومت سنبھالتے ہی ملک کے اندرونی خلفشار کو دور کیا، پھر اُس نے بیرونی نظم کی طرف توجہ کی اور اطراف کے راجاؤں پر پے در پے اٹھارہ حملے کر کے اسلامی حکومت کی رعب کو قائم کر دیا۔

جمادی الثانی ۱۲۶ھ (۷۴۴ء) میں ولید مارا گیا، اور اس کی جگہ اس کا بھائی ابراہیم بن ولید بن عبدالملک تخت نشین ہوا، لیکن وہ برائے نام خلیفہ تھا، عام طور پر اس کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا گیا اور تین چار مہینوں کے بعد اُس کے بھاگ جانے پر ۱۲۷ھ (۷۴۴ء) میں مروان الحمار بن محمد خلیفہ ہوا، یہ باغیوں سے مقابلہ کرتا رہا، یہاں تک کہ ذی الحجہ ۱۳۲ھ (۷۵۰ء) میں اس کے قتل پر اموی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور بنی امیہ کی جگہ بنی عباس کی حکومت قائم ہوئی۔

منصور باغی:

مروان حمار کے زمانے میں اموی حکومت کے باغیوں میں ایک شخص منصور بن جمہور کلبی بھی تھا، یہ بھاگ کر اس خیال سے سندھ چلا آیا تھا کہ سندھ کا گورنر یزید بن عرار اس کے رشتے داروں میں تھا، اسے خیال تھا کہ اگر وہ اس کے پاس پہنچ جائے گا تو وہ اس کا معین و مددگار ثابت ہو گا، لیکن جب یزید بن عرار کو معلوم ہوا کہ منصور سندھ میں داخل ہو چکا ہے، تو اس نے اس کو فوراً ہی لکھا کہ تم جہاں تک پہنچ چکے ہو وہیں رک جاؤ، یہاں آنے کا ارادہ نہ کرو، منصور کو یزید بن عرار کا یہ خط پڑھ کر بہت غصہ آیا، اور اس نے جواب میں لکھا کہ میں تمہیں اپنا رشتے دار سمجھ کر تمہارے پاس آیا تھا، مگر تم نے بے حمیتی کا جو رویہ اختیار کیا ہے، اس کا انجام تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا، منصور اُس وقت دریائے سندھ کے کنارے شہر سدوسان میں مقیم تھا، اس نے اس شہر پر قبضہ کر کے کشتیاں تیار کرائیں، اُن کشتیوں کو لدوا کر دریائے سندھ پر پہنچا، اور دریا کو عبور کر کے یزید بن عرار کے مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔ یزید بن عرار کو جب معلوم ہوا تو اُس نے اس معاملے کو کوئی

اہمیت نہ دی اور وہ معمولی سی فوج لے کر اس کے مقابلے کے لیے منصورہ سے نکلا۔ تھوڑی ہی دور بڑھ کر اُس کا مقابلہ منصور سے ہوا، منصور جان پر کھیلے ہوئے تھا، وہ اس بہادری سے لڑا کہ یزید بن عرار اس کے مقابلے میں ٹک نہ سکا اور پسپا ہو کر منصورہ میں محصور ہو گیا۔ منصور نے اس کا پیچھا کیا اور بڑھ کر منصورہ کو محاصرے میں لے لیا، محاصرہ اتنا سخت تھا کہ چند ہی دن میں یزید بن عرار نے اس سے پناہ مانگی، منصور نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں تمہاری پناہ کے متعلق مطلقاً غور نہیں کر سکتا، پہلے تو منصورہ کو میرے حوالے کر دو، پھر جو میں مناسب سمجھوں گا کروں گا۔ مجبوراً یزید بن عرار نے منصورہ کو اُس کے حوالے کر دیا، اور اس سے معافی چاہی، مگر منصور نے اس کی ذرا بھی پروانہ کی اور حکم دیا کہ اس کو زندہ ستون میں چنوا دیا جائے۔ اس کے بعد منصور تمام سندھ پر قابض ہو گیا۔[1]

منصور نے اپنے بھائی منظور کو قندابیل اور دیبل کا حاکم بنا کر بھیجا اور خود منصورہ میں رہ کر انتظام میں مشغول ہو گیا۔

سندھ پر منصور ہی کا قبضہ تھا کہ بنی اُمیہ کی حکومت کا چراغ گل ہو گیا اور بنو عباس کی حکومت کی داغ بیل پڑی۔

عہد بنی اُمیہ پر تبصرہ:

سندھ میں اموی حکومت تقریباً چالیس سال قائم رہی۔ بنی امیہ کے زمانے میں سندھ میں خالص اسلامی حکومت تھی، ان کے دور حکومت میں سندھ میں اسلام کو خاص ترقی ہوئی، اور ان کے طرز حکومت کی بہتری کی وجہ سے سندھ کے مقامی باشندوں کو اسلام سے کوئی دشمنی اور عداوت نہیں ہوئی بلکہ لوگ اسلامی مساوات و رواداری کو دیکھ کر جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے، اور ان کے زمانے میں اسلامی اخوت کی وجہ سے قومی و نسلی تعصبات کے جذبات بہت کم سر اُٹھا سکے۔

---

[1] تاریخ یعقوبی، ج ۲۔ ص ۴۰۷ مطبوعہ لیدن۔

باب:5

خلافت بنی عباس

عہد بنی عباس کے گورنر

ابو العباس عبد اللہ بن محمد، سفاح

۱۳۲ھ (۷۴۹-۵۰ء) تا ۱۳۶ھ (۷۵۳-۵۴ء)

۱۳ ربیع الثانی ۱۳۲ھ (۷۴۹ء) میں ابو مسلم خراسانی کی کوششوں کی وجہ سے عباسیوں کا پہلا خلیفہ ابو العباس عبد اللہ سفاح منتخب ہوا۔ بنی عباس کے حامیوں کی تعداد چونکہ عراق و خراسان میں زیادہ تھی اس لیے خراسان ہی میں سفاح کے ہاتھ پر بیعت ہوئی، اس نے دمشق سے پایۂ تخت منتقل کر کے عراق کو اپنا مرکز بنایا، اور 134ھ (751-52ء) میں انبار میں ایک شہر ہاشمیہ آباد کر کے اس کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ یہ شہر مدینۃ المنصور بھی کہلاتا تھا۔

ابو مسلم خراسانی[1] جو حکومت عباسیہ کا بانی اور روح رواں تھا، اس نے عباسی حکومت کی طرف سے خراسان بلکہ تمام مشرقی ممالک پر قبضہ کر لیا اور ہر جگہ اپنے آدمی بھیج کر اپنی حکومت مضبوط کر لی۔

مغلس عبدی:

اُس نے مغلس عبدی سجستانی کو فوج دے کر سندھ روانہ کیا تا کہ وہ منصور کو گرفتار کر کے سندھ کی حکومت اپنے قبضے میں لے، مغلس طغارستان کے راستے روانہ ہوا، جب وہ سندھ پہنچا تو اس کا مقابلہ منصور کے بھائی منظور سے ہوا جو اُس وقت دیبل کا حاکم تھا، دونوں میں خون ریز جنگ ہوئی، اس لڑائی میں منظور مارا گیا اور مغلس آگے بڑھا۔ جب اس کی خبر منصور کو ہوئی تو اسے بھائی کی وفات سے بے حد رنج ہوا اور وہ فوراً بدلہ لینے کے لیے تیار ہو گیا، مغلس بڑھتا بڑھتا منصورہ کے قریب پہنچا، منصور بھی پوری تیاریوں کے ساتھ اُس کے مقابلے کے لیے نکلا، دونوں میں بڑی سخت جنگ ہوئی، آخر میں مغلس شکست کھا کر گرفتار ہوا اور منصور نے اُسے فوراً ہی قتل کرا دیا۔[1]

موسیٰ بن کعب تمیمی:

مغلس عبدی کے قتل ہونے کی خبر ملنے پر ابو مسلم خراسانی نے خلیفہ سفاح سے اجازت لے کر موسیٰ بن کعب تمیمی کو ایک فوج کے

---

[1] دنیا کی سیاسی تاریخ میں ابو مسلم خراسانی ایک امتیازی مرتبہ کا مالک ہے۔ اسی نے بنی امیہ کی حکومت کا تختہ الٹ کر عباسی حکومت کی بنیاد رکھی اور دنیا کے جلیل القدر فاتحوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ابو مسلم خراسانی عجمی النسل تھا، اس کا باپ مرو کے قریب قصبۂ ماخون کا رہنے والا تھا، مویشیوں کی تجارت کرتا تھا اور اپنے کاروبار کے سلسلے میں کبھی کبھی کوفے بھی آیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی آخری عمر میں رستاق کے قریب ایک گاؤں سنجرو میں تھوڑی سی زمین لے کر زراعت شروع کر دی تھی لیکن حکومت کی مالگذاری نہ ادا کر سکا اور اپنی بیوی کو جس کا نام دشیکہ تھا لے کر آذربائیجان بھاگ گیا۔ اس وقت اُس کی بیوی حاملہ تھی۔ تھوڑے ہی دن کے بعد اُس کا انتقال ہو گیا۔ اپنے باپ کے مرنے کے بعد ابو مسلم خراسانی پیدا ہوا۔ بعض تعلیم یافتہ اور مالدار گھرانوں نے اس کی یتیمی پر رحم کھا کر اس کی تعلیم و تربیت کو اپنے ذمے لے لیا۔ ان گھرانوں میں اسے اچھی تعلیم و تربیت کا موقع ملا اور اُس نے اپنی غیر معمولی ذہانت و جودت کی وجہ سے تعلیم میں غیر معمولی ترقی کی۔ وہ عربی و فارسی کا غیر معمولی خطیب تھا، جہاں وہ مختلف علوم کا غیر معمولی عالم تھا، وہیں اس کو قدرت نے غیر معمولی وجاہت بھی عطا کی تھی، گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، چوڑی پیشانی، بھرا ہوا جسم، کشیدہ قامت، یہ سب چیزیں اس کی شخصیت میں بڑی دلکشی رکھتی تھیں، ابتدا ہی سے اس کے دماغ میں خیالات کا ایک طوفان برپا رہتا تھا، وہ انہیں خیالات میں رات رات بھر ٹہلتا رہتا۔ لوگ اس سے پوچھتے کہ تم سوتے نہیں وہ کہا کرتا تھا کچھ نہ پوچھو میرا دماغ ہر وقت فکر کرتا رہتا ہے اور آئینے کی طرح صاف و شفاف خیالات میرے دماغ میں آتے رہتے ہیں، ہر وقت میں اس فکر میں سرگرداں رہتا ہوں کہ میں کوئی بڑا کام کروں۔

[1] تاریخ سندھ - مولانا ابو ظفر ندوی، ص 146 بحوالہ یعقوبی جلد دوم ص 449۔

ساتھ سندھ روانہ کیا۔ موسیٰ بیس ہزار فوج کے ساتھ سندھ پہنچا۔ سب سے پہلے اُس نے قندابیل میں قیام کیا تاکہ وہ وہاں ٹھہر کر سندھ کے حالات سے پورے طور پر باخبر ہو۔ جب وہ مقامی حالات سے ہر طرح باخبر ہو گیا تو اُس نے اپنی فوجی تیاریاں مکمل کیں، اور خفیہ خفیہ یہ تدبیر بھی اختیار کی کہ منصورہ کے شہریوں کو مختلف طریقوں پر اپنی طرف مائل کرتا رہا۔ منصورہ کے فوجیوں میں چونکہ موسیٰ بن کعب کے فوجیوں کے بہت سے عزیز و اقارب تھے ان کی باہمی خط و کتابت نے منصورہ والوں کو اس کی طرف مائل کرنے میں بڑی مدد دی۔ موسیٰ کو جب ہر طرح اطمینان ہو گیا تو وہ منصورہ کی طرف بڑھا۔ دریائے سندھ کو عبور کر کے اُس کا شدید مقابلہ منصور سے ہوا۔ ایک سخت حملے کے بعد منصور نے شکست کھائی، موسیٰ آگے بڑھا، منصور چاہتا تھا کہ وہ پایہ تخت منصورہ پہنچ کر محصور ہو جائے لیکن اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ شہری اور فوجی دونوں موسیٰ سے مانوس ہو چکے ہیں اس لیے اُس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ ہندوستان بھاگ جائے، وہ ہندوستان کی طرف چلا، لیکن راستہ بھٹک کر ریگستان میں آ گیا، یہیں موسیٰ کے لوگوں نے اُسے پکڑ کر قتل کر دیا۔[2]

ابن اثیر اور فتوح البلدان میں ہے کہ وہ ریگستان میں خود ہی بھوک اور پیاس سے ہلاک ہو گیا۔

موسیٰ نے 134ھ میں سندھ پر قبضہ کر کے یہاں کے انتظامات کو بہتر بنایا۔ منصورہ کی مرمت کرائی۔ منصورہ کی مسجد کو وسیع کیا۔[3]

۱۴۰ھ (۵۸-۷۵۷ء) تک موسیٰ نے سندھ میں حکومت کی۔ اس کی حکومت مجموعی حیثیت سے بہترین حکومت تھی۔ اس کے بعد وہ رخصت لے کر اپنے وطن گیا، بغداد میں ٹھہرا ہوا تھا کہ وہیں اس نے ۱۴۱ھ (۵۹-۷۵۸ء) میں وفات پائی۔ موسیٰ کی سندھ پر حکومت کے زمانے میں ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۶ھ (۷۵۴ء) کو سفاح نے وفات پائی۔

ابو جعفر منصور

۱۳۶ھ (۷۵۴ء) تا ۱۵۸ھ (۷۷۶ء)

۱۳۶ھ (۷۵۴ء) میں سفاح کے بعد اس کا بھائی ابو جعفر عبد اللہ بن محمد جو منصور کے لقب سے مشہور تھا تخت خلافت پر بیٹھا۔

عیینہ بن موسیٰ:

۱۴۰ھ (۵۸-۷۵۷ء) میں جب موسیٰ بن کعب رخصت لے کر اپنے وطن گیا تو وہ سندھ سے جاتے وقت اپنے بیٹے عیینہ بن موسیٰ تمیمی کو اپنی جگہ گورنر مقرر کر گیا تھا جو موسیٰ کی وفات پر سندھ کا مستقل گورنر کر دیا گیا تھا لیکن اُس میں حکومت کی صلاحیت نہ تھی اور وہ یہاں کی حکومت کو سنبھال نہ سکا۔ اس کی نااہلی کی وجہ سے مسلمان عرب قبیلے اہل یمن (قحطانی) اور اہل حجاز (نزاری) جو یہاں آباد تھی اس کی بے راہ روی پر معترض ہوئے۔ عیینہ نے بجائے اس کے کہ اپنے طرز عمل میں تبدیلی پیدا کرتا اپنے مخالفین کو گرفتار کر کے سب کو قتل کرا دیا۔ اس واقعہ کی وجہ سے عیینہ کے خلاف بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ وہ ابھی اپنی مخالفت کو فرو بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اس کے زوال کی ایک نئی صورت پیدا ہوئی۔ وہ یہ کہ عیینہ کا باپ موسیٰ سندھ کی گورنری سے پہلے خلیفہ کی جانب سے انسپکٹر جنرل پولیس تھا۔ وہ اس عہدے سے ترقی پا کر سندھ کی گورنری پر آیا تھا اور اپنی جگہ مسیب ابن زبیر کا تقرر کرا آیا تھا۔ مسیب ابن زبیر کو جب یہ معلوم ہوا کہ عیینہ کے خلاف سندھ میں بغاوت کا طوفان برپا ہے تو اُسے اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عیینہ وہاں سے آ کر اپنے باپ کی جگہ تقرر کا خواستگار ہو اور اُسے یہ جگہ چھوڑنی پڑے اس لیے اس نے ایک گمنام خط عیینہ بن موسیٰ کے نام لکھا، جس میں تحریر تھا:

فارضك ارضك ان تاتنا تم نومته ليس فيها حلم

جس زمین میں تم ہو اُس پر راضی رہو، اگر تم یہاں آؤ گے تو ایسی نیند سوؤ گے کہ کبھی نہ جاگو گے۔

عیینہ کو جب یہ خط ملا تو وہ بے حد خوف زدہ ہوا، اس خط کے بعد اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ سندھ کو کسی قیمت پر نہ چھوڑے گا، اس کی حماقت پر حماقت یہ تھی کہ ادھر تو اندرونی طور پر اس کے خلاف شورش برپا تھی، اُدھر اُس نے اپنی بیوقوفی سے مرکز سے اپنا تعلق منقطع کر لیا، اور خود مختاری کی راہ اختیار کی، منصور کو جب اس کی بغاوت کا حال معلوم ہوا تو وہ اس بغاوت کے فرو کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔

عمر بن حفص عنکی:

خلیفہ منصور عباسی نے سندھ کی اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے عمر بن حفص عنکی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا وہ اس قدر بہادر اور شجیع تھا کہ لوگ اسے "ہزار مرد" کے لقب سے پکارتے تھے، اس کے ساتھ

---

[2] تاریخ سندھ - مولانا ابو ظفر ندوی، ص 147۔

[3] تاریخ ابن اثیر - ترجمہ اردو - فتوح البلدان - بلاذری، ص 200۔

عقبہ بن مسلم کو اس کا مشیر بنا کر روانہ کیا۔

یہ دونوں ایک جرار فوج کے ساتھ ۱۴۲ھ (۶۰-۷۵۹ء) میں سندھ پہنچے، عیینہ نے ان دونوں کی آمد کی خبر سن کر مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں، جیسے ہی عمر منصورہ پہنچا، عیینہ نے اُسے شہر میں داخل نہ ہونے دیا، مجبوراً عمر کو دیبل میں ٹھہرنا پڑا اور وہیں اس نے عیینہ سے مقابلے کی تیاریاں شروع کیں، لیکن لوگ عیینہ کے نظام سے تنگ آچکے تھے، جیسے ہی لوگوں کو عمر کی آمد کی اطلاع ملی لوگ ہر طرف سے کھنچ کھنچ کر اُس کے پاس آنے لگے، دو ایک جھڑپوں ہی میں عیینہ نے محسوس کر لیا کہ اس کی کامیابی ناممکن ہے، کیونکہ اُس کی فوج کے بہت لوگ ٹوٹ کر عمر سے ملے ہیں، مجبوراً اس نے صلح کی درخواست کی، عمر نے اُس کی درخواست کو اس شرط پر منظور کیا کہ وہ پہلے منصورہ کو حوالے کر دے، چنانچہ عمر نے منصورہ پر قبضہ کرنے کے بعد عیینہ کو قید کر کے خلیفہ کے پاس روانہ کر دیا، راستے میں وہ محافظوں سے آنکھ بچا کر فرار ہو گیا، مقام رخج پر یمنی لوگوں نے اس کی بغاوت کا حال معلوم کر کے گرفتار کر لیا اور اس کا سر کاٹ کر دارالخلافہ لے گئے۔[1]

عمر بن حفص نے منصورہ میں قیام کر کے انتظام حکومت کی طرف توجہ دی۔ عین اُس زمانے میں کہ ابو جعفر منصور تخت خلافت پر متمکن تھا، آخر 144ھ خلافت کے بارے میں اہل بیت و غیر اہل بیت کی نزاع جو بنی امیہ کے عہد سے چلی آرہی تھی، اس سیاسی کشمکش نے شدت اختیار کی اور حسنی سادات میں سے عبداللہ بن حسن مثنیٰ بن حسن بن علی بن ابی طالب کے صاحبزادوں میں محمد نے جو "نفس زکیہ" کے لقب سے مشہور تھے، اور اُن کے بھائی ابراہیم عباسی حکومت کے خلاف کھڑے ہوئے، "نفس زکیہ" اپنے زہد و ورع، تقویٰ و تقدس کے لحاظ سے نہایت ممتاز بزرگ تھے۔ حجاز و عراق میں اُن کے ہزاروں طرفدار اُٹھ کھڑے ہوئے، مسعودی کا بیان ہے کہ محمد نفس زکیہ کی بیعت میں تمام شہروں کے لوگ شریک ہوئے، حسنی سادات کی یہ جدوجہد اتنی منظم تھی کہ یافعی نے لکھا ہے کہ اگر منصور کا اقبال یاوری نہ کرتا تو اُس کا تخت اُلٹ پکا ہوتا، کیونکہ صرف کوفے میں ایک لاکھ تلواریں اس کے لیے چھپی ہوئی تھیں۔[2]

نفس زکیہ رمضان ۱۴۵ھ (۷۶۲ء) میں مدینہ منورہ میں عباسی فوج سے مقابلہ کرتے ہوئے حمید بن قحطبہ کے ہاتھ سے شہید ہوئے، اور اُن کا سر تن سے جدا کر کے منصور کے پاس بھیجا گیا۔

اُن کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ جو خفیہ طور پر ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتے رہتے تھے آخر میں بصرے پہنچے، بصرے کے عمائدین نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی، ابراہیم نے قوت حاصل کرنے کے بعد والی بصرہ، سفیان بن معاویہ کو اطاعت پر مجبور کر کے قصر امارات پر قبضہ کر لیا۔ بصرے کے قبضے کے بعد انہوں نے اہواز اور واسط پر قبضہ کیا، پھر عراق کے مختلف حصوں میں انہوں نے اپنی فوجیں روانہ کیں، اسی زمانے میں نفس زکیہ کی شہادت کی خبر ان کو ملی۔ اس خبر کے سنتے ہی وہ بصرے سے کوفہ روانہ ہوئے۔ اس وقت ایک لاکھ فوج ابراہیم کے ساتھ تھی، احمزا میں پہنچ کر انہوں نے قیام کیا۔ منصور کو ان کی نقل و حرکت کی خبریں برابر مل رہی تھیں، اس نے عیسیٰ بن موسیٰ کو ابراہیم کے مقابلے کے لیے روانہ کیا، احمزا میں دونوں کا مقابلہ ہوا، پہلے حملے میں عیسیٰ کی فوج کے قدم اُکھڑ گئے، لیکن عیسیٰ نے سنبھل کر اس زور کا حملہ کیا کہ ابراہیم کی فوج مقابلے کی تاب نہ لا سکی، ابراہیم بڑی شجاعت و بہادری سے دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے کہ دفعتاً دشمن کی فوج سے ایک تیر آکر ان کے حلق میں لگا اور انہوں نے شہادت پائی۔ عیسیٰ نے اُن کا سر کاٹ کر منصور کے پاس بھجوا دیا ان کی شہادت ذی الحجہ 145ھ (۷۶۲ء) میں ہوئی۔

نفس زکیہ نے اپنے بھائیوں اور صاحبزادوں کو اپنا نمائندہ بنا کر مختلف ممالک میں بھیجا تھا تاکہ وہ علوی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کریں۔

اسی سلسلے میں ۱۴۴ھ (۶۲-۷۶۱ء) میں سندھ میں اُنہوں نے اپنے صاحبزادے عبداللہ بن محمد کو جو عبداللہ الاشتر کے نام سے مشہور تھے روانہ کیا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سندھ کا گورنر عمر بن حفص تھا، عمر بن حفص اگرچہ عباسیوں کا گورنر تھا، لیکن اسے بباطن سادات سے بہت زیادہ ہمدردی تھی، عبداللہ بن اشتر نے چند اچھے گھوڑے خریدے اور گھوڑے کے تاجروں کے بھیس میں سندھ پہنچے، عمر بن حفص گورنر نے بحیثیت ایک تاجر کے ان کی آؤ بھگت کی، لیکن ایک دن موقع پا کر اُن کے ایک ساتھی نے عمر بن حفص کو اپنے آنے کا مقصد بتایا، اور نفس زکیہ اور ابراہیم کے عباسیوں کے مقابلے میں نکل آنے کی اطلاع دی، اور اس کو سادات کی حکومت کے قائم کرنے میں معین و مددگار ہونے کی دعوت دی، عمر بن حفص نے فوراً اس دعوت کو قبول کر لیا، اور اُن کو ایک مخفی جگہ میں رکھا، اور شہر کے معززین کو بلا کر اُن سے مشورہ کیا، آخر میں جمعرات کا دن اُن کی

---

[1] تاریخ سندھ - مولانا ابو ظفر ندوی، بحوالہ یعقوبی، ج ۲، ص ۴۴۸۔

[2] الیافعی جلد ۱، ص ۲۹۹۔

بیعت کے لیے مقرر ہوا، ایک سفید جھنڈا تیار کیا گیا، اور عبداللہ الاشتر کے سفید کپڑے بنائے گئے جنہیں وہ پہن کر خطبہ دیتے تھے۔

ادھر سندھ میں یہ تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ایک جہاز بغداد سے سندھ پہنچا، جس میں ایک تاجر بھی تھا جو ایک خط عمر بن حفص کی بیوی کا لے کر آیا تھا، جس میں لکھا تھا کہ نفس زکیہ اور ابراہیم دونوں کے دونوں عباسیوں کے ہاتھوں شہید ہو چکے ہیں، عمر بن حفص یہ خط لے کر عبداللہ الاشتر کے پاس گیا اور اُن کے والد اور چچا کی تعزیت ادا کی، یہ حالات سن کر عبداللہ الاشتر بہت پریشان ہوئے، لیکن عمر بن حفص نے کہا آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں آپ کو یہاں کے ایک ہندو راجا کے پاس بھیج دیتا ہوں جو کہ اپنے مذہب پر قائم ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کا بے حد احترام کرتا ہے، وہ انشاء اللہ آپ کو بڑے احترام سے رکھے گا، چونکہ وہ خود مختار ہے اس لیے خلیفہ اس کو کسی بات پر مجبور نہیں کر سکتا، چنانچہ عبداللہ الاشتر کو اس راجا کے پاس روانہ کر دیا گیا، اس ہندو راجا نے یہ سن کر کہ یہ لوگ رسول اکرم ﷺ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں بہت قدر افزائی کی اور بالکل شاہزادوں کی طرح عبداللہ الاشتر کے قیام کا انتظام کر دیا، یہ وہاں بہت آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ جب عبداللہ الاشتر کے قیام کی خبر عام ہوئی تو اُن کے بہی خواہ بھی اطراف سے آکر اُن کے گرد جمع ہونے لگے، عبداللہ الاشتر اپنا وقت سیر و شکار میں گزارتے اور زیدیہ فرقے کے عقاید کی تبلیغ کرتے تھے۔ مولانا ابو ظفر ندوی کا خیال ہے کہ سندھ میں شیعیت کی ابتدا اسی وقت سے ہوئی۔

ادھر خارجی بھی سندھ سے غافل نہ تھے، اور وہ بھی یہاں کر اپنے عقاید کی تبلیغ کرتے تھے ۱۴۲ھ (۷۵۹-۶۰ء) میں حسان بن مجاہد ہمدانی رقہ سے سندھ آیا اور اس نے یہاں کا دورہ کر کے کوشش کی کہ وہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر عباسیوں سے ٹکر لے، مگر عمر بن حفص نے اُس کو اُبھرنے نہ دیا، اور وہ ناکام ہو کر موصل چلا گیا۔

عمر بن حفص کی حکومت کے زمانے میں دس بارہ سال تک عبداللہ الاشتر اس ہندو راجا کے علاقے میں آرام کی زندگی بسر کرتے رہے۔

۱۵۱ھ (۷۶۸-۶۹ء) میں خلیفہ منصور کو معلوم ہوا کہ عبداللہ الاشتر سندھ میں مقیم ہیں، اس نے فوراً ہی عمر بن حفص سے جواب طلب کیا کہ تم نے عبداللہ الاشتر کو کیسے پناہ دی، عمر بن حفص خلیفہ کی اس جواب طلبی سے بہت پریشان ہوا، آخر اُس نے اپنے معتمدوں سے مشورہ کیا کہ خلیفہ کو کیا جواب دیا جائے، اُن میں سے ایک شخص نے کہا کہ آپ میرا نام خلیفہ کو لکھ کر بھیج دیجیے، مجھے یقین ہے کہ خلیفہ معاف فرما دے گا، عمر بن حفص نے کہا تم خام خیالی میں مبتلا ہو، مجھے ڈر ہے کہ تم قتل کر دیے جاؤ گے، اس نے کہا کہ آپ اس کی پروانہ کیجیے، اگر بالفرض میں قتل بھی کر دیا جاؤں تو یہ کیا کم ہے کہ میں آپ پر تصدق ہو جاؤں گا، چنانچہ عمر بن حفص نے خلیفہ کو اس شخص کا نام لکھ کر بھیج دیا، منصور نے لکھا کہ فوراً اُسے ہمارے پاس بھیج دیا جائے، عمر نے اس کو روانہ کر دیا منصور نے اس کو قتل کرا دیا، اس طرح ایک بے گناہ قتل ہونے پر عمر بن حفص خلیفہ کے عتاب سے تو بچ گیا، مگر منصور کے دل میں اس کی طرف سے شبہات پیدا ہو چکے تھے، منصور نے اُس کو ۱۵۱ھ (۷۶۸-۶۹ء) میں ترقی دے کر افریقہ کا گورنر بنا کر بھجوا دیا۔[1]

ہشام بن عمرو تغلبی:[2]

منصور نے عمر بن حفص کا تبادلہ افریقہ کی گورنری پر کرنے کے بعد ہشام بن عمرو تغلبی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا اور اُسے خصوصیت سے ہدایت کی کہ عبداللہ الاشتر کو قید کرو، اگر وہ آسانی سے گرفتار نہ ہوں تو سندھ کے جس راجا کے پاس وہ مقیم ہیں، اس پر حملہ کر کے اس مقصد میں کامیابی حاصل کرو۔

ہشام بن عمرو تغلبی سندھ پہنچا، لیکن یہ خود بھی عمر بن حفص کی طرح سادات سے عقیدت رکھتا تھا، اس لیے وہ بڑا متفکر ہوا کہ کس طرح اپنے آپ کو عبداللہ الاشتر کی گرفتاری سے بچائے۔ سندھ میں آنے کے بعد وہ مختلف حیلوں اور بہانوں سے عبداللہ الاشتر کی گرفتاری کے متعلق خلیفہ کو ٹالتا رہا، لیکن تقدیر الٰہی اس طرح پوری ہوئی کہ اسی زمانے میں سندھ کے ایک حصے میں بغاوت رونما ہوئی تھی۔ ہشام نے اپنے بھائی سفیح کو اس بغاوت کے فرو کرنے کے لیے بھیجا، اتفاق سے وہ مقام جہاں یہ بغاوت رونما ہوئی تھی، اُس راجا کے علاقے سے متصل تھا، جہاں عبداللہ الاشتر مقیم تھے۔ جب سفیح اُس راجا کے علاقے کے قریب پہنچا، تو اسے کچھ سوار نظر آئے، سفیح نے سمجھا کہ دشمن کا دستہ ہے، لیکن اسے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عبداللہ الاشتر دس سواروں کے ساتھ

---

[1] تاریخ سندھ - مولانا ابو ظفر ندوی، بحوالہ ابن اثیر، ص ۴۵۶۔

[2] فتوح البلدان میں ہے کہ ہشام تغلبی عمر بن حفص سے پہلے سندھ کا گورنر ہو کر آیا، لیکن ابن اثیر اور یعقوبی میں ہے کہ عمر بن حفص کے بعد ہشام سندھ کا گورنر ہو کر آیا۔

دریائے سندھ کے کنارے سیر و تفریح اور شکار کے لیے جارہے ہیں، سفیح نے انہیں گرفتار کرنے کا ارادہ کیا، لیکن اُس کے ساتھیوں نے سمجھایا کہ یہ رسول اکرم ﷺ کے خاندان کے لوگ ہیں، ان سے کسی قسم کا تعارض مناسب نہیں، مگر سفیح نہ مانا، اور اُن کے مقابل ہوا، عبداللہ الاشتر نے بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ بڑی پامردی سے اُس کا مقابلہ کیا، یہاں تک کہ آپ اور آپ کے سب ساتھی شہید ہوگئے، سفیح نے اس کی اطلاع اپنے بھائی ہشام کو دی۔ ہشام کو یہ امر جتنا بھی ناگوار ہوا ہو مگر وہ کچھ بول نہیں سکتا تھا کیونکہ یہ خلیفہ کے حکم کی تعمیل تھی، اس نے اس کی اطلاع خلیفہ منصور کو دی، منصور اس خبر سے بہت خوش ہوا۔

لیکن راجا کے پاس عبداللہ الاشتر کے چار سو معتقدین، اُن کا لڑکا محمد اپنی والد کے ساتھ مقیم تھا، راجا کے لیے یہ بڑی توہین تھی کہ ان لوگوں کو جس نے ان کو عقیدت و محبت کے ساتھ پناہ دی تھی، اب بے یار و مددگار ہونے پر اُن کو ہشام کے سپرد کردے۔

ادھر خلیفہ منصور کو یہ خدشہ لگا ہوا تھا کہ اگرچہ عبداللہ الاشتر اب اس کی راہ میں حائل نہیں رہے، لیکن ممکن ہے کہ لوگ اُن کے صاحبزادے کو اُن کا نشین بنا کر کوئی نیا جھگڑا کھڑا کریں۔

ان حالات میں ۱۵۱ھ (۶۹-۷۶۸ء) میں ہشام نے راجا پر حملہ کیا، دونوں میں خوں ریز جنگ ہوئی، آخر ہشام نے فتح پاکر راجا کے علاقے پر قبضہ کرلیا، عبداللہ الاشتر کے معتقدین کچھ تو مارے گئے اور جو باقی بچے وہ ادھر اُدھر پھیل گئے۔

عبداللہ الاشتر کی بیوی اور اُن کے لڑکے محمد کو خلیفہ منصور کے پاس بھیج دیا گیا، منصور نے انہیں مدینے بھجوادیا۔

فتوحات:

ان جھگڑوں سے فارغ ہونے کے بعد ہشام نے خارجی امور کی طرف توجہ کی، اور بہت سے وہ علاقے جو اب تک فتح نہ ہوئے تھے، فتح کیے، اس نے عمر بن جمل کی سرکردگی میں جنگی جہازوں کا ایک بیڑا گجرات کے مغربی ساحل نارند کی طرف بھیجا۔ یہ حالات معلوم کرکے چند روز میں واپس آگیا، ادھر ہشام خود منصورہ پر اپنے بھائی بسطام کو نائب بنا کر ہندوستان میں شمال کی طرف بڑھا اور کشمیر تک کا علاقہ فتح کر لیا، اس کے بعد ملتان کی بغاوت کو فرو کرکے ملتان پر قبضہ کیا، پھر وہ دریا کو عبور کرکے قندابیل (گنداوا) آیا، یہاں کا حاکم خود مختار بن بیٹھا تھا، اسے نکال کر وہاں کا انتظام درست کیا۔

آخر خود ہشام نے ایک بحری بیڑے کے ساتھ بھروچ کی بندرگاہ گندھار پر قبضہ کیا اور یہاں اُس نے اپنی فتح کی یادگار میں ایک مسجد بنوائی۔ یہ سندھ کے علاوہ گجرات میں پہلی مسجد تھی۔

ان فتوحات کے بعد ہشام، منصورہ واپس آیا، اور انتظام سلطنت میں مصروف ہوگیا۔ اس کے زمانے میں حکومت کو استحکام حاصل ہوا، اندرونی شورشوں کا قلع قمع ہوا، ملک میں خوش حالی اور فارغ البالی اس حد تک بڑھی کہ لوگ اس حکومت کو اپنے لیے مبارک سمجھتے تھے۔

اسی کے زمانے میں ایک سندھی وفد جس میں بڑے بڑے علماء شامل تھے منصور کے دربار میں باریاب ہوا، غالباً ہندوستان کے علماء کا عربوں سے یہ پہلا ربط تھا، اس وفد میں سنسکرت کا ایک بہت بڑا عالم بھی تھا جس نے سدہانت کو خلیفہ کے سامنے پیش کیا، پھر خلیفہ کے فرمان پر ابراہیم فزاری ریاضی دان نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا۔

یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ عربوں نے 9 تک کے حسابی رقم (ہندسے) کے لکھنے کا طریقہ ہندوؤں سے سیکھا، اس لیے اہل عرب اس کو حساب ہندی یا ارقام ہندیہ کہتے ہیں، لیکن یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ یہ طریقہ انہوں نے کہاں اور کس سے سیکھا تھا، قیاس یہ ہے کہ یہی پنڈت جس نے سدہانت کو خلیفہ کے سامنے پیش کیا تھا، اسی نے عربوں کو یہ طریقہ سکھایا تھا۔[1]

خلیفہ منصور نے ہشام کی انتظامی قابلیت سے خوش ہو کر 156ھ (۷۷۲-۷۳ء) میں سندھ کی گورنری کے ساتھ کرمان کی گورنری بھی اس کے سپرد کردی، وہ ان دونوں صوبوں کے انتظامات کو بڑی خوبی سے چلاتا رہا، سندھ میں پانچ چھ برس قیام کرنے کے بعد ہشام ۱۵۷ھ (۷۴-۷۷۳ء) میں رخصت لے کر اپنے وطن گیا، اور اُس نے وہیں وفات پائی۔[2]

معبد بن خلیل تمیمی:

ہشام کی وفات کے بعد خلیفہ منصور نے ۱۵۷ھ (۷۴-۷۷۳ء) میں معبد بن خلیل تمیمی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، اُس نے بھی ملک کی زمام حکومت کو اچھی طرح سنبھالا۔ یہ خلیفہ منصور کے عہد کا سندھ میں آخری گورنر تھا۔

---

(1) عرب و ہند کے تعلقات، ص ۱۳۴۔

(2) یعقوبی جلد-۲، ص ۴۴۹ مطبوعہ لیدن۔

محمد بن منصور، مہدی

۱۵۸ھ (۷۵-۷۷۴ء) تا ۱۶۹ھ (۷۶-۷۷۵ء)

منصور کے بعد اس کا بیٹا محمد جس کا لقب مہدی تھا ذی الحجہ 158ھ (۷۶-۷۷۵ء) میں تخت خلافت پر بیٹھا، اسی کے زمانے میں سندھ کے گورنر معبد بن خلیل کا انتقال ہوا۔

روح بن حاتم اور بسطام:

مہدی نے ۱۵۹ھ (۷۶-۷۷۵ء) میں معبد کی جگہ روح بن حاتم کو سندھ کا گورنر مقرر کیا، لیکن اس سے سندھ کا انتظام سنبھل نہ سکا، اس کے زمانے میں سندھ کے مغربی حصے میں جو جاٹ آباد تھے انہوں نے سرکشی اختیار کی، لیکن یہ اُن پر قابو پانے سے عاجز رہا، مہدی نے روح کو معزول کر کے ہشام تغلبی کے بھائی بسطام کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، جو سندھ میں اپنے بھائی کی گورنری کے زمانے میں رہ چکا تھا، اور کافی تجربہ کار تھا، لیکن کسی وجہ سے مہدی نے ۱۶۱ھ (۷۸-۷۷۷ء) میں بسطام کو معزول کر کے پھر روح کو سندھ کا گورنر بنا دیا، لیکن اس مرتبہ بھی اُس نے اپنے آپ کو حکومت کا اہل ثابت نہیں کیا، آخر مہدی نے اُس کی جگہ نصر بن محمد بن اشعث خزاعی کو سندھ کا گورنر مقرر کیا، لیکن وہ ایک سال بھی گورنر نہ رہنے پایا تھا کہ معزول ہوا، اور اس کی جگہ محمد بن سلیمان بن علی ہاشمی کو سندھ کا گورنر بنایا گیا، یہ خود تو سندھ نہ آئے بلکہ انہوں نے اپنا نائب عبدالملک بن شہاب مسمعر کو بنا کر سندھ بھیجا، لیکن یہ بیس روز بھی حکومت کرنے نہ پایا تھا کہ علیحدہ کر دیا گیا، اور دوبارہ نصر بن محمد اشعث خزاعی سندھ کا گورنر مقرر ہوا، لیکن کچھ ہی دن کے بعد معزول کیا گیا، ان کے بعد زبیر بن عباس سندھ کا گورنر مقرر ہوا لیکن یہ بغداد ہی سے سندھ پر حکومت کرنا چاہتا تھا۔

سندھ میں اس گورنر گردی اور اُکھاڑ پچھاڑ سے بدامنی بڑھ گئی۔

مصبح بن عمرو تغلبی:

اس لیے مہدی نے ۱۶۱ھ (۷۸-۷۷۷ء) میں مصبح بن عمرو تغلبی کو جو ہشام تغلبی کا بھائی تھا سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، مصبح اگرچہ انتظامی قابلیت اچھی رکھتا تھا، لیکن بدقسمتی سے سندھ میں حجازی اور یمنی لوگوں کا فساد آپس میں اس قدر بڑھا کہ یہ حالات پر قابو نہ پا سکا، اس کی جگہ تیسری مرتبہ نصر بن محمد بن اشعث سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا گیا، جو ۱۶۳ھ تک سندھ کا گورنر رہا۔[1]

لیث بن طریف:

ان حالات سے مجبور ہو کر ۱۶۴ھ (۸۱-۷۸۰ء) میں مہدی نے اپنے غلام لیث بن طریف کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، اس کے زمانے میں سندھ کے جاٹوں نے پھر سرکشی اختیار کی، جس پر قابو پانا بہت دشوار تھا، غالباً لیث کی اطلاع پر مہدی نے ایک فوج بصرے سے روانہ کی۔ جیسے ہی یہ فوج سندھ پہنچی تو لیث نے مارشل لا لگا دیا، فوج نے باغیوں کو کچل کر رکھ دیا اور ملک میں امن قائم ہو گیا۔

فتوحات:

مہدی کے زمانے میں سندھ کے علاقے میں بھی بعض فتوحات حاصل ہوئیں، اس نے عبدالملک بن شہاب مسمعی کو بحری مہم پر سندھ روانہ کیا، جس نے ۱۶۰ھ (۷۷-۷۷۶ء) میں باربد کو جس کا ہندی نام بھاڑ بھوت ہے اور جو بھروچ کے قریب ہے حملہ کر کے فتح کیا، لیکن فوج میں وبا پھوٹنے کی وجہ سے تقریباً ایک ہزار سپاہی مر گئے، جس کی وجہ سے پریشان ہو کر عرب اپنے ملک لوٹ گئے۔[2]

۱۶۹ھ (۸۶-۷۸۵ء) میں مہدی نے وفات پائی، اور اس کی جگہ اس کا لڑکا موسیٰ ہادی تخت پر بیٹھا، اس نے سوا سال حکومت کر کے ۱۷۰ھ (۸۷-۷۸۶ء) میں وفات پائی۔

ہارون الرشید

۱۷۰ھ (۸۷-۷۸۷ء) تا ۱۹۳ھ (۹-۸۰۸ء)

ہادی کی وفات کے بعد ربیع الاول ۱۷۰ھ میں اس کا حقیقی بھائی ہارون الرشید تخت خلافت پر بیٹھا۔

سالم یونسی:

ہارون نے لیث بن طریف کو سندھ کی گورنری سے معزول کر کے سالم یونسی اسماعیل بن علی کے آزاد کردہ غلام کو سندھ کا گورنر مقرر کیا، سندھ میں لیث کے زمانے میں چونکہ امن و امان قائم ہو چکا تھا، اس لیے

---

[1] یہ تمام تفصیل تاریخ سندھ - مولانا ابو ظفر ندوی سے بحوالہ ابن اثیر جلد ۶، ص ۷۱ سے منقول ہے۔

[2] عرب و ہند کے تعلقات، ص ۱۸۔

سالم یونسی کو اپنی حکومت کے زمانے میں کسی دقت کا سامنا پیش نہیں آیا اور وہ چار سال تک نہایت سکون سے حکومت کرتا رہا۔ آخر ۱۷۴ھ (۹۱-۷۹۰ء) میں کسی وجہ سے معزول ہوا۔[2]

اسحاق بن سلیمان بن علی ہاشمی:

۱۷۴ھ (۹۱-۷۹۰ء) میں سالم یونسی کی جگہ اسحاق بن سلیمان ہاشمی سندھ اور مکران کے گورنر مقرر ہوئے، لیکن وہ ایک سال بھی حکومت نہ کرنے پائے تھے کہ ان کی وفات ہو گئی، یعقوبی کا بیان ہے کہ اسحاق نہایت ہی نیک اور متقی انسان تھے، ان کے بعد ان کا لڑکا یوسف اُن کا جانشین ہوا۔[3]

طیفور بن عبداللہ بن منصور الحمیری:

ہارون کو جب اسحاق بن سلیمان کی وفات کی خبر معلوم ہوئی تو اس نے طیفور بن عبداللہ کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، لیکن جیسے ہی یہ سندھ پہنچا، تو سندھ میں جو نزاری (حجازی) اور قحطانی (یمنی) قبائل کے جو لوگ آباد تھے اُن میں جنگ شروع ہو گئی، طیفور چونکہ یمنی تھا اس نے قحطانی لوگوں کا ساتھ دیا، جس کی وجہ سے یہ اختلاف اور بھی بڑھ گیا۔

جابر بن اشعث طائی:

ہارون کو جب اس کی خبر ملی تو اس نے طیفور کی جگہ جابر بن اشعث کو سندھ اور مکران کا گورنر بنا کر بھیجا، لیکن یہ بھی اس اختلاف کو دور نہ کر سکا۔

سعید بن مسلم بن قتیبہ[4]:

ہارون نے جابر کی جگہ سعید بن مسلم بن قتیبہ کو سندھ اور مکران کا گورنر مقرر کیا، انہوں نے خود تو آنے کی تکلیف گوارا نہ کی لیکن اپنے بھائی کثیر بن مسلم کو اپنا نائب بنا کر سندھ بھیج دیا، کثیر بالکل ہی نااہل انسان تھا، سندھ پہنچتے ہی بد اخلاقیوں میں مبتلا ہو کر اور بھی تباہی کا باعث ہوا۔

عیسیٰ بن جعفر:

ہارون کو معلوم ہوا تو اس نے عیسیٰ بن جعفر بن منصور کو سندھ کا گورنر مقرر کیا، لیکن انہوں نے بھی سعید بن مسلم کی طرح محمد بن عدی ثعلبی کو اپنا قائم مقام کر کے سندھ بھیجا۔ سندھ کی حکومت کے لیے محمد بن ثعلبی سب سے بدتر انسان ثابت ہوا، اور اس کی نااہلی کی وجہ سے قبائل کے اختلافات خوب بڑھے، اور یہ کوئی تلافی نہ کر سکا، آخر اپنی ناکامیوں سے مجبور ہو کر ملتان کی طرف بھاگا، ملتان والوں کو جب اس کا علم ہوا تو وہ اس خیال سے کہ کہیں ابن عدی کے آنے کی وجہ سے یہاں بھی اختلاف اور خانہ جنگی پیدا نہ ہو اُس کے مقابلے کے لیے نکلے، محمد بن عدی نے اُن کا مقابلہ کیا، آخر شکست کھا کر مجبوراً پھر منصورہ واپس ہوا۔

عبدالرحمٰن:

ہارون الرشید کو جب اس بدنظمی کا حال معلوم ہوا تو اُس نے عبدالرحمٰن نامی ایک شخص کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، مگر یہ بھی ان بدانتظامیوں کو دور نہ کر سکا جو محمد بن عدی کے زمانے میں پیدا ہو چکی تھیں۔

ایوب بن جعفر بن سلیمان:

اس کے بعد ہارون نے ایوب بن جعفر بن سلیمان کو سندھ کا گورنر مقرر کیا، مگر یہ بھی نااہل ثابت ہوا۔

داؤد بن یزید بن حاتم مہلبی:

آخر ہارون نے بڑے غور و فکر کے بعد ۱۸۴ھ[1] میں داؤد بن یزید بن حاتم مہلبی کو سندھ کا گورنر منتخب کیا، داؤد بڑا مدبر، علم دوست، انصاف پسند اور عاقل شخص تھا، اُس نے پہلے تو اپنے بھائی مغیرہ کو اپنا نائب بنا کر سندھ بھیجا۔

اُس وقت سندھ میں نزاریوں (حجازیوں) نے اس قدر طاقت حاصل کر لی تھی کہ حکومت اُن کو دبانے سے عاجز تھی، انہوں نے اپنی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر فیصلہ کر لیا تھا کہ تمام سندھ سے قحطانیوں (یمنیوں) کو نکال دیا جائے، اور اُن کو نکالنے کے بعد ملک کو اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ملک کا ایک حصہ قریش کے لیے خاص ہو، دوسرا حصہ قیس کو دیا جائے اور تیسرے حصے پر ربیعہ کا قبضہ ہو۔

---

(1) تاریخ سندھ - مولانا ابو ظفر ندوی بحوالہ ابن خلدون، جلد-3، ص ۲۱۸۔

(2) تاریخ سندھ - مولانا ابو ظفر ندوی بحوالہ تاریخ یعقوبی، جلد ۲-، ص ۴۹۴۔

(3) مولانا ابو ظفر ندوی نے تاریخ سندھ میں بحوالہ یعقوبی یہ نام سعید بن سلیم لکھا ہے، لیکن حواشی تحفۃ الکرام اردو ترجمہ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ص ۸۴ پر یہ نام سعید بن مسلم بن قتیبہ ہے، ہم نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ (مولف)

(4) تحفۃ الکرام اردو ترجمہ کے حواشی ص ۸۴ پر داؤد کے تقرر کا سنہ ۱۷۴ھ لکھا ہے۔ (مؤلف)

اسی زمانے میں مغیرہ، منصورہ پہنچا، لیکن نزاریوں نے اُسے منصورہ میں داخل ہونے نہ دیا، اور کہلا بھیجا کہ وہ فیصلہ جو انہوں نے کیا ہے، اگر وہ اس کو مانتا ہے تو وہ اُسے منصورہ میں داخل ہونے دیں گے، لیکن مغیرہ نے انکار کر دیا، اور اس نے منصورہ کا محاصرہ کر لیا، اس کا خیال تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح نزاریوں کو سمجھا بجھا کر راضی کر لے گا مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا، محاصرے کی سختی سے تنگ آ کر نزاریوں نے اسے پیغام دیا کہ وہ اس شرط پر منصورہ میں داخل ہو سکتا ہے کہ شہر کے ایک دروازے سے وہ داخل ہو اور دوسرے دروازے سے ہم نکل جائیں، اور ہم سے کسی قسم کا تعارض نہ کیا جائے، لیکن مغیرہ نے اس کو بھی منظور نہیں کیا آخر دونوں میں جنگ کی ٹھنی اور ایک خونریز لڑائی کے بعد مغیرہ کو شکست ہو گئی، مغیرہ، منصورہ چھوڑ کر سندھ کے دوسرے حصے میں چلا گیا، اور اُس نے اپنے بھائی داؤد کو تمام حالات لکھے۔

داؤد کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ نہایت غصے میں فوج لے کر سندھ پہنچا اور اُس نے سندھ میں داخل ہوتے ہی نزاریوں کو کچلنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہ منصورہ پہنچا، نزاریوں نے اس کی اطلاع ملتے ہی شہر کے دروازے بند کر لیے، اور جنگ شروع کر دی، داؤد نے بھی بڑی پامردی سے ان کا مقابلہ کیا، جس میں بہت سے نزاری مارے گئے، لیکن نزاری اس پر بھی ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرتے رہے، بیس روز تک شدید جنگ ہوتی رہی، لیکن نزاریوں نے اطاعت قبول نہ کی، اور کمزور ہونے پر بھی انہوں نے منصورہ کا دروازہ نہ کھولا، لیکن داؤد نے بھی سختی سے شہر کا محاصرہ جاری رکھا، کئی ماہ کے محاصرے کے بعد اُس نے منصورہ کو فتح کر لیا، نزاریوں نے مفتوح ہونے پر بھی شورش و فساد کا سلسلہ جاری رکھا، آخر داؤد نے اس فتنے کو ختم کرنے کے لیے منصورہ کے ان محلوں سے جہاں جہاں نزاری آباد تھے ان کو شہر بدر، قتل اور قید کر کے ویران کر دیا، اس طرح اُس نے منصورہ میں امن قائم کر دیا پھر اُس نے سندھ کے ہر حصے میں نزاریوں کا قلع قمع کر دیا، اس فتنے کو ختم کرنے کے بعد داؤد نے ملک کے اندرونی انتظامات کی طرف توجہ کی، اور اپنے حسن انتظام سے ملک کو سرسبز و شاداب بنا دیا۔

۱۹۲ھ (۷۷۸-۷۹ء) میں ہارون الرشید نے رقہ سے بغداد آ کر ایک مہم میں خراسان کے سفر کا ارادہ کیا، اس زمانے میں ہارون الرشید کی طبیعت ناساز تھی، شاہی طبیب جبرئیل بن بختیشوع خلیفہ کے ساتھ تھا۔ ہارون نے داؤد بن یزید گورنر سندھ کی معرفت قنوج کے راجا کو خط لکھا کہ ہم ایک طویل سفر پر بغداد سے روانہ ہو رہے ہیں، ہماری طبیعت ناساز ہے، لہٰذا تم اپنے خاص طبیب منکہ (مانک چند) کو ہمارے پاس بھیج دو تاکہ وہ ہمارے ساتھ رہے، جب ہم بلخ پہنچیں گے تو اُسے واپس کر دیں گے، چنانچہ قنوج کے راجا نے منکہ (مانک چند) کو خراسان بھجوا دیا جہاں اُس نے ہارون کا علاج کیا، لیکن کرگان پہنچ کر اُس کا مرض اور بڑھ گیا، طوس کی آب و ہوا کو بہتر سمجھ کر وہ طوس لوٹ آیا، ہندو طبیب کو حسب وعدہ قنوج بھیج دیا گیا۔[1]

تاریخ الاطبا میں ہے کہ منکہ کو سفر خرچ بھیج کر بلوایا گیا تھا، اُس کے علاج سے خلیفہ کو صحت ہوئی۔ خلیفہ نے اس کو غیر معمولی انعام و اکرام سے نوازا، پھر یہ دارالترجمے میں سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے پر مقرر کیا گیا[2]۔ وہ دارالترجمے میں خود بھی کام کرتا تھا اور دوسروں کو بھی کتابوں کے ترجمے میں مدد دیتا تھا، اس نے طبیب شاناق کی کتاب 'السموم'[3] کے ترجمے میں ابوحاتم بلخی کی بڑی مدد کی۔

اسی دور میں ہمیں ایک اور ہندی طبیب صالح بن بھلہ کا پتا چلتا ہے، جو ہندوستانی طب کا ماہر تھا اور جو حذاقت فن میں شاہی طبیب جبرئیل بختیشوع کا مدمقابل سمجھا جاتا تھا، ایک موقع پر جب کہ خلیفہ ہارون الرشید کا چچازاد بھائی اور اس کی بہن عباسیہ کا شوہر سکتے میں مبتلا ہوا اور درباری طبیب جبرئیل بختیشوع نے اس کی موت کا حکم لگا دیا تو صالح بن بھلہ ہی نے اس کا وہ حیرت انگیز علاج کیا کہ اس کی شہرت سے تمام بغداد گونج اُٹھا۔

۱۹۳ھ (۸۰۷-۸ء) میں ہارون نے وفات پائی۔

محمد امین بن ہارون

۱۹۳ھ (۸۰۸-۹ء) تا ۱۹۸ھ (۸۱۳-۱۴ء)

ہارون کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمد امین تخت نشین ہوا، اس کا

---

(1) تاریخ طبری ابن جریر - ترجمہ ابوصالح منصور بن نوح۔

(2) تاریخ الاطبا، جلد ۲، ص ۳۳۔

(3) یہ ترجمہ ساتویں صدی ہجری تک موجود تھا کیونکہ ابن صبیعہ نے ۶۶۸ھ میں اس کتاب کا حال لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ کتاب پانچ بابوں میں ہے، منکہ پنڈت نے یحییٰ ابن خالد برمکی کے لیے فارسی میں ابوحاتم بلخی کی مدد سے اس کا ترجمہ فارسی میں کیا، پھر عباس بن سعید جوہری نے اس کا دوسرا ترجمہ ۲۱۸ھ (۸۳۳-۳۴ء) میں مامون الرشید کے لیے کیا (عرب و ہند کے تعلقات، ص ۱۵۷)

تمام وقت اپنے بھائی مامون کے ساتھ خانہ جنگی میں گزرا اور دور دراز کے صوبوں کی طرف اُسے توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی، مگر داؤد بن یزید گورنر سندھ نے سندھ میں کوئی ہل چل پیدا نہیں ہونے دی، بلکہ مرکز میں گڑبڑ رہنے کی وجہ سے اس کے ملک کا خراج بھی مرکز کو روانہ نہیں کیا، اور یہ رقم ملک پر صرف کر کے اس نے اپنی مقبولیت اور شوکت کو اور بھی ترقی دی۔

محرم ۱۹۸ھ (۸۱۳ء) میں امین مارا گیا۔

عبد اللہ بن ہارون۔ مامون

۱۹۸ھ (۸۱۳ء) تا ۲۱۸ھ (۳۴-۸۳۳ء)

امین کے مارے جانے کے بعد محرم ۱۹۸ھ (۸۱۳ء) میں مامون تخت نشین ہوا، لیکن سندھ میں داؤد بن یزید گورنر سندھ کا انتظام اس قدر اچھا تھا کہ مامون نے بھی سندھ میں کسی تغیر و تبدل کو مناسب نہ سمجھا اور داؤد بن یزید نہایت اطمینان سے سندھ پر حکومت کرتا رہا۔

اسی زمانے میں بنی کندہ کا آزاد کردہ غلام ابو الصمہ، سندھ پہنچا، جو کچھ دن کے بعد سندھ پر قبضہ کر بیٹھا، یہ اُن لوگوں میں تھا، جو اس سے پہلے داؤد کے ساتھ سندھ آئے تھے۔[3]

۲۰۵ھ (۲۱-۸۲۰ء) میں بیس برس حکومت پر فائز رہنے کے بعد داؤد بن یزید نے وفات پائی۔ بہادری، شجاعت، اولوالعزمی کے اعتبار سے سندھ کے عرب دور کے گورنروں میں جنید کے بعد اس کی مثال نہیں ملتی، اس کے دور حکومت کو بہترین دور حکومت کہا جاتا ہے۔

بشر بن داؤد مہلبی:

مامون الرشید نے داؤد بن یزید کی وفات کے بعد اُس کے بیٹے بشر بن داؤد مہلبی کو سندھ کی گورنری پر فائز کیا، بشر کچھ دن تو مرکزی حکومت کا مطیع و فرمانبردار رہا، لیکن بعد میں اُس نے سرکشی اختیار کر کے دربار خلافت میں خراج بھیجنا بند کر دیا اور بغاوت اختیار کر کے خود مختار ہو بیٹھا۔

مامون نے ۲۱۲ھ (۲۸-۸۲۷ء) میں بشر کی گوشمالی کے لیے حاجب بن صالح کو کچھ فوج دے کر سندھ روانہ کیا تاکہ وہ خراج وصول کر کے سندھ کی گورنری کو سنبھالے، لیکن وہ اپنی بزدلی کی وجہ سے بشر کے مقابلے میں کامیابی حاصل نہ کر سکا۔

غسان بن عباد:

مامون نے نہایت غور و فکر کے بعد ۲۱۳ھ (۲۹-۸۲۸ء) میں غسان بن عباد مہلبی کو جو بہت دلیر اور بہادر تھا بشر کے مقابلے کے لیے روانہ کیا، اور اس کے ساتھ اُس کے بھائی محمد بن عباد کو اس کا مشیر بنا کر بھیجا اور حکم دیا کہ تم کسی طرح سندھ کے انتظام کو درست کر کے وہاں کے باغی بشر بن داؤد کو اپنے ساتھ لاؤ، اور واپسی کے وقت سندھ کی حکومت موسیٰ بن یحییٰ بن خالد برمکی کے سپرد کر دو۔ ۲۱۳ھ (۸۲۸-۲۹ء) میں غسان منصورہ پہنچا، بشر نے بغیر کسی حیل و حجت کے اس کی اطاعت قبول کر لی، غسان نے اُسے نظر بند کر دیا، حالات معمول پر آنے کے بعد غسان نے سندھ کی حکومت موسیٰ بن یحییٰ برمکی کے سپرد کر دی۔ ۲۱۶ھ میں غسان بشر کو لے کر بغداد پہنچا، اور اُسے خلیفہ مامون کے سامنے پیش کرتے ہوئے اس کی معافی کے لیے سفارش بھی کی، مامون نے اُس کو معاف کر دیا، اور اُس کے خاندان کے تمام لوگوں کو بھی چھوڑ دیا جو پہلے گرفتار کیے جا چکے تھے۔

جس زمانے میں غسان سندھ میں تھا، اور بغداد جانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ سندھ کے راجاؤں میں سے ایک راجا نے جس کا نام بالا چندر تھا اُس نے غسان کو اپنے دربار میں طلب کیا، مگر غسان نے اُسکے ہاں جانا اپنی توہین سمجھا، چونکہ وہ بغداد جانے والا تھا، اس لیے وہ اس توہین کی سزا راجا کو نہ دے سکا اور بغداد روانہ ہو گیا۔

غسان کے ساتھ ابراہیم بن فرازون بھی جو ایک مشہور طبیب تھا سندھ گیا تھا اس کی روایت ہے کہ جس زمانے میں غسان سندھ میں تھا، اُس نے ایک مرتبہ مور کا گوشت کھایا، اُسے مور کا گوشت اس قدر پسند آیا کہ جب تک وہ سندھ میں رہا مور ہی کا گوشت کھاتا رہا، وہ کہا کرتا تھا کہ خدا کی قسم میں نے ایسا لذیذ گوشت کبھی نہیں کھایا۔

موسیٰ بن یحییٰ برمکی:

غسان کے واپس جانے کے بعد موسیٰ بن یحییٰ بن خالد برمکی سندھ کا گورنر ہوا، اس نے سندھ کی حکومت کا جائزہ لیتے ہی سب سے پہلے اُس راجا کی طرف توجہ کی کہ جس نے غسان کو اپنے دربار میں بلایا تھا، اور غسان نے اس کے یہاں جانے کو اپنی توہین سمجھ کر انکار کر دیا تھا، مگر چونکہ اُسے جلد واپس ہونا تھا اس لیے وہ اس کی گوشمالی نہ کر سکا تھا۔

موسیٰ نے مشرقی اضلاع کے اس راجا کا دماغ درست کرنے کے

---

[3] تاریخ سندھ - ابو ظفر ندوی، ص ۱۷۲۔ بحوالہ بلاذری، ص ۴۴۵۔

لیے ایک فوج بھیجی، راجا نے بھی اس فوج کا مقابلہ کیا، کچھ دن کی جنگ کے بعد راجا گرفتار ہو کر موسیٰ کے سامنے لایا گیا، راجا نے ہر چند کوشش کی کہ پانچ لاکھ درہم فدیہ لے کر اُسے چھوڑ دیا جائے، مگر موسیٰ نہ مانا، اور اس کو قتل کرا دیا۔

موسیٰ بن یحییٰ کے زمانے میں سندھ سے جو خراج بغداد کو بھیجا جاتا تھا مورخین نے اس کی تعداد تمام اخراجات نکالنے کے بعد دس لاکھ بتائی ہے۔

موسیٰ سندھ کے کامیاب گورنروں میں سے تھا، اس نے اندرونی و بیرونی انتظامات کی طرف خصوصیت سے توجہ دی، یمنی اور حجازی قبائل بھی اس کے شکوہ سے مرعوب ہو کر خاموش بیٹھ گئے تھے۔

۲۱۸ھ (۳۴-۸۳۳ء) میں مامون نے وفات پائی، اس وقت سندھ کا گورنر موسیٰ بن یحییٰ ہی تھا۔[1]

ابو اسحاق محمد بن ہارون۔ معتصم باللہ

۲۱۸ھ (۳۴-۸۳۳ء) تا ۲۲۷ھ (۴۲-۸۴۱ء)

ماموں کے بعد ۲۱۸ھ (۳۴-۸۳۳ء) میں ہارون کا منجھلا لڑکا ابو اسحاق محمد جس کا لقب معتصم باللہ تھا تخت خلافت پر بیٹھا۔

عمران بن موسیٰ برمکی:

معتصم باللہ کے زمانے ۲۲۱ھ (۳۶-۸۳۵ء) میں سندھ کے گورنر موسیٰ برمکی نے وفات پائی، مرتے وقت وہ عارضی طور پر اپنے بیٹے عمران کو سندھ کی حکومت سپرد کر گیا، خلیفہ معتصم باللہ کو جب معلوم ہوا تو اُس نے بھی عمران کو سندھ کی حکومت دے دی۔

عمران کے زمانے میں مغربی علاقے قیقان کے جاٹوں نے علم بغاوت بلند کیا، عمران نے اس بغاوت کو فرو کیا، باغیوں کا قلع قمع کرنے کے بعد اس نے ضروری سمجھا کہ وہ اس علاقے میں بطور چھاؤنی کے ایک شہر آباد کرے، چنانچہ اُس نے "بیضاء" کے نام سے ایک شہر آباد کیا، یہاں اُس نے فوجوں کو مقیم کیا تاکہ کوئی فتنہ سر نہ اُٹھا سکے۔

پھر وہ قندابیل (گنداوی) گیا جو پہاڑ پر آباد تھا، یہاں کے لوگ باغی ہو چکے تھے قندابیل میں خلیل بن محمد حکومت کرتا تھا، اس نے یہاں بھی باغیوں کا خاتمہ کر کے شہر کو فتح کر لیا اور جو باقی بچے انہیں قصدار بھجوا دیا۔

وہ اس سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اُسے مید قوم کی بغاوت کی خبر ملی، وہ فوراً موقع پر پہنچا اور باغیوں سے جنگ شروع کر دی، اس جنگ میں تین ہزار مید قتل ہوئے۔ میدوں کا زور توڑ کر وہ الور پہنچا، اور حکم دیا کہ تمام جاٹ حاضر کیے جائیں اور راجا چچ کے زمانے کی رسم کے مطابق ہر جاٹ ایک کتا ضرور رکھے، جب جاٹ اُس کے سامنے پیش ہوئے تو اُس نے اُن کے ہاتھوں پر مہریں لگوائیں اور جزیہ مقرر کر دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک کتے کی قیمت پچاس درہم تک پہنچ گئی۔

اس کے بعد پھر اُس نے دوبارہ میدوں پر حملہ کیا، مید موقع پا کر ایک قلعے میں محصور ہو گئے تھے ان لوگوں کے قریب ایک تالاب بھی تھا، جس سے یہ لوگ میٹھا پانی حاصل کرتے تھے، عمران کو معلوم ہوا تو اُس نے سمندر سے ایک نہر نکال کر اس تالاب میں ملا دی جس سے تالاب کا سارا پانی کھارا ہو گیا، جس کی وجہ سے مید سخت تکلیف محسوس کرنے لگے۔ عمران نے ان پر پے در پے حملے شروع کر دیے، وہ یقیناً اس سرکشی کا خاتمہ کر دیتا کہ بدقسمتی سے یمنی اور حجازی قبائل کی چپقلش پھر شروع ہو گئی، وہ فوراً اس فتنے کی طرف متوجہ ہوا، حالات کے لحاظ سے اُسے یمنیوں کا طرفدار ہونا پڑا، یہ بات حجازیوں کے لیے بڑی ناگوار تھی، حجازیوں نے اس کے خلاف خفیہ طور پر سازش شروع کی، آخر حجازیوں کے ایک سردار عمر بن عبدالعزیز ہباری نے موقع پا کر عمران کو قتل کر دیا۔

اس کے قتل سے سندھ کو بڑا نقصان پہنچا، کیونکہ ابھی پوری طرح میدوں کا قلع قمع نہ ہوا تھا، ادھر قبائلی کشمکش سے ملک میں گڑبڑ پیدا ہو گئی اور مختلف اُمرا قلعے اور شہر دبا کر خود مختار بن بیٹھے۔[2]

عنبسہ بن اسحاق:

عمران کی وفات کے بعد ۲۲۶ھ (۴۱-۸۴۰ء) مین عنبسہ بن اسحاق ضبی، سندھ کا گورنر مقرر ہوا، اس نے ملک کے حالات کا بغور مطالعہ کر کے ایسا طریقہ اختیار کیا کہ لوگ مطمئن ہو گئے، عنبسہ کا تمام وقت سندھ کے باغی رئیسوں کے دبانے میں گزرا جو عمران کے قتل کے بعد مختلف حصوں میں خود مختار ہو گئے تھے۔ عنبسہ نے دیبل کی سڑک اور عمارتوں کی بھی مرمت کرائی۔[3]

---

(1) یہ تمام تفصیل تاریخ سندھ مولانا ابو ظفر ندوی بحوالہ تاریخ یعقوبی، ص ۵۵۸ جلد ۲ سے ماخوذ ہے۔

(1) فتوح البلدان - بلاذری، ص ۴۴۶۔

(2) فتوح البلدان - بلاذری، ص ۴۳۷۔

دیبل کا مندر جو محمد بن قاسم کے زمانے میں منجنیقوں سے برباد ہو گیا تھا، اور اب بے چراغ تھا عنبسہ نے ۲۳۲ھ (۸۴۶-۴۷ء) اس کے مینارے کو توڑ کر اور اُس پر چھت ڈال کر سنٹرل جیل خانہ بنایا، اور اُس کے بچے ہوئے پتھر سے شہر کی مرمت کرائی۔

تحفتہ الکرام اردو ترجمہ صفحہ ۸۵ کے حواشی میں ہے کہ ایتاخ الترکی سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا تھا، اُس نے اپنے بجائے عنبسہ بن اسحاق ضبی کو سندھ بھیجا، یعقوبی کے مطابق عنبسہ کو براہ راست خلیفہ معتصم باللہ نے مامور کیا تھا اور وہ الواثق کے عہد میں بھی اس عہدے پر برقرار رہا۔

۔۔۔ واثق باللہ ابو جعفر ہارون ملقب ۔۔۔

۲۲۷ھ (۸۴۱-۴۲ء) تا ۲۳۲ھ (۸۴۶-۴۷ء)

معتصم باللہ کی وفات کے بعد ۲۲۷ھ میں اُس کا لڑکا ابو جعفر ہارون جس کا لقب واثق باللہ تھا تخت خلافت پر متمکن ہوا، اس کے زمانے میں بھی سندھ میں عنبسہ ہی گورنر رہا، ۲۳۲ھ (۸۴۶-۴۷ء) میں واثق باللہ کا انتقال ہو گیا۔

جعفر بن معتصم ملقب ۔۔۔ متوکل علی اللہ

۲۳۲ھ (۸۴۶-۴۷ء) تا ۲۴۶ھ (۸۶۰-۶۱ء)

واثق کے انتقال کے بعد اُس کا بھائی جعفر بن معتصم جس کا لقب متوکل علی اللہ تھا، ذی الحجہ ۲۳۲ھ (۸۴۶-۴۷ء) میں تخت نشین ہوا، اُس نے عنبسہ کو برطرف کر کے سندھ کا گورنر ہارون بن ابی خالد مروزی کو بنایا۔[1]

ہارون بن ابی خالد مروزی:

۲۳۵ھ (۸۴۹-۵۰ء) میں ہارون نے سندھ کی گورنری کا جائزہ لیا۔ اُس وقت سندھ میں عرب قبائل میں حجازیوں کا زور تھا، عمر بن عبدالعزیز ہباری جس کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے وہ حجازیوں کا سردار تھا، اور اس قدر طاقت حاصل کر چکا تھا کہ سندھ کے گورنر اُس سے دبتے تھے، ادھر دربار خلافت میں بھی ضعف آتا جا رہا تھا، دربار خلافت پر جاہل ترکی غلام چھائے ہوئے تھے، ایران و خراسان پر صفاریوں کا تسلط تھا، مرکز سے دور دراز کے صوبے خود مختار ہونے لگے تھے، سندھ بھی خود مختاری کی طرف گامزن تھا، اس ملک کے چھوٹے چھوٹے حصوں پر کہیں مسلمان اور کہیں ہندو گورنر سندھ کی ماتحتی میں حکومت کرتے تھے، مرکزی حکومت کی خلفشار کو دیکھ کر ان حاکموں نے خراج دینا بند کر دیا اور مرکزی حکومت سے براہ راست ربط پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگے تاکہ سندھ کے گورنر کی ماتحتی سے نجات حاصل ہو، اسی خلفشار کے زمانے میں ۲۴۰ھ (۸۵۴-۵۵ء) میں ہارون مارا گیا۔[2]

تاریخ یعقوبی میں ہے کہ وہ مارا نہیں گیا بلکہ اپنی طبعی موت سے مر گیا۔[3]

---

(1) تاریخ سندھ حصہ اول-مولانا ابو ظفر ندوی، ص ۱۸۷ بحوالہ بلاذری-ص ۴۳۷۔

(2) فتوح البلدان-بلاذری، ص ۴۳۷۔

(3) تاریخ سندھ-مولانا ابو ظفر ندوی، ص ۱۸۷ بحوالہ یعقوبی، ص ۵۹۹۔

باب:6

سندھ میں ہباری حکومت

۲۴۰ھ (۸۵۴-۵۵ء) تا ۴۰۱ھ (۱۰۱۰-۱۱ء)

عمر بن عبدالعزیز ہباری

ہارون کے قتل ہونے کے بعد عمر بن عبدالعزیز ہباری نے جو بہت ہوشیار اور مدبر انسان تھا، سندھ، منصورہ پر قبضہ کر لیا، اور متوکل علی اللہ کو لکھا کہ میں آپ کا وفادار ہوں، اگر سندھ کی حکومت میرے سپرد کی جائے تو میں یہاں کا بہترین انتظام کروں گا، خلیفہ چونکہ بغاوتوں کی وجہ سے نہایت پریشان تھا، اُس نے عمر بن عبدالعزیز ہباری کی درخواست منظور کرلی اور سندھ کی گورنری کا فرمان اُس کے نام بھیج دیا، عمر بن عبدالعزیز ہباری نے برائے نام خلیفہ سے تعلق رکھ کر سندھ میں ہباری خاندان کی مستقل اور خود مختار حکومت کی بنیاد رکھی، اگرچہ اس نے منصورہ پر قبضہ کر لیا تھا لیکن یہ اپنے وطن "باتیہ" ہی میں رہا جو منصورہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔

ہباری خاندان کی اصل یہ ہے کہ خاندان قریش کی ایک شاخ بنی اسد کا ایک شخص جس کا نام ہبار بن اسود تھا، اس کی اولاد میں سے ایک آدمی منذر بن زبیر، حکم بن عوانہ گورنر سندھ کے ساتھ ۱۲۱ھ (۷۳۸-۳۹ء) میں سندھ آیا، اور یہیں بود و باش اختیار کرلی، عمر بن عبدالعزیز اسی کا پوتا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز ہباری نے سندھ پر قبضہ کرنے کے بعد تمام سندھ کو اپنا باج گذار بنالیا، لیکن اس نے بڑی دانشوری سے اپنی خود مختاری کو خلیفہ پر ظاہر نہیں ہونے دیا، اور بظاہر اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کرتا رہا کہ وہ خلیفہ کے ماتحت ہے، خطبے میں خلیفہ عباسی ہی کا نام لیا جاتا تھا۔

۲۴۷ھ (۸۶۱-۶۲ء) میں معتمد علی اللہ نے جب یعقوب بن لیث صفاری کی عرضداشت کی بنا پر اُس کو طبرستان، جرجان، رے، آذربائیجان، کرمان، بجستان اور سندھ تمام مشرقی ممالک کی ولایت عطا کی تو عمر بن عبدالعزیز بھی یعقوب صفاری کے تحت ہو گیا۔

عمر بن عبدالعزیز نے سندھ پر کس سنہ تک حکومت کی، اس کا تعین نہیں کیا جاسکتا لیکن اندازاً اس نے ۲۷۰ھ (۸۸۳-۸۴ء) میں یا اس سے کچھ پہلے وفات پائی، اس کا دور حکومت نہایت پر امن تھا اور وہ ایک کامیاب حکمران سمجھا جاتا ہے۔

عبداللہ بن عمر ہباری:

۲۷۰ھ (۸۸۳-۸۴ء) میں عمر بن عبدالعزیز ہباری کی وفات کے بعد اس کا لڑکا عبداللہ بن عمر اُس کا جانشین ہوا، اس کی کنیت ابوالمنذر تھی۔

۲۷۹ھ (۸۹۲-۹۳ء) میں ابو صمہ (جس کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے) اُس کے بیٹے صمہ نے بغاوت کرکے منصورہ پر قبضہ کر لیا، مگر تھوڑے ہی دن بعد عبداللہ بن عمر نے طاقت حاصل کرکے دوبارہ منصورہ کو اس سے چھین لیا اور اپنے وطن باتیہ سے منصورہ میں منتقل ہو گیا۔

قرآن مجید کا پہلا سندھی ترجمہ:

اُسی کے زمانے میں ایک ہندو راجا نے جس کا نام مہرو تھا، عبداللہ بن عمر ہباری سے درخواست کی کہ سندھی زبان میں مذہب اسلام کی تعلیم لکھ کر بھیج دے، اس زمانے میں منصورہ میں عراق کا ایک عالم رہتا تھا، جس کی پرورش منصورہ میں ہوئی تھی وہ بہت ذہین، سمجھ دار اور شاعر تھا، اور یہاں کی مختلف زبانیں جانتا تھا۔ عبداللہ بن عمر ہباری نے راجا کی خواہش کا ذکر اس سے کیا، اُس نے اُن کی زبان میں ایک قصیدہ تیار کرکے راجا کو بھیج دیا، راجا نے اُس قصیدے کو سنا تو بہت پسند کیا اور عبداللہ سے درخواست کی کہ اس شاعر کو اس کے دربار میں بھیج دیا جائے، چنانچہ عبداللہ نے اس کو بھجوا دیا، وہ راجا کے دربار میں تین برس رہا اور اُس کی خواہش سے اس عالم نے قرآن مجید کا ترجمہ سندھی زبان میں کیا، راجا روزانہ ترجمہ سنتا تھا اور اُس سے بے حد متاثر ہوتا تھا، قرآن مجید کا یہ پہلا ترجمہ تھا جو سب سے پہلے سندھی زبان میں ہوا۔ اس عالم کا یہ بھی بیان

ہے کہ راجا نے چھ سو من سونا اسے تین دفعہ دیا۔[1]

عبداللہ بن عمر ہباری نے تقریباً تیس سال سندھ پر حکومت کی اور اس نے اپنے دور حکومت میں ملک کا بہترین انتظام کیا۔

عمر بن عبداللہ ہباری:

۳۰۳ھ (۱۶-۹۱۵ء) میں اُس کا بیٹا عمر بن عبداللہ ہباری جس کی کنیت ابوالمنذر تھی تخت پر بیٹھا، یہ اپنے باپ کی طرح دانشمند اور نہایت مدبر تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ جب کہ عرب کا مشہور مورخ مسعودی سندھ آیا تھا۔

عمر بن عبداللہ نے ملک کے نظم و نسق کو کافی ترقی دی اور بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ عمر بن عبداللہ کا وزیر ریاح تھا، اور شہر کے قاضی آل ابی الشوارب کے خاندان سے تھے، مسعودی نے ایک بڑے رئیس سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے، جس کا نام حمزہ تھا۔

عمر بن عبداللہ ہباری کے زمانے میں منصورہ کی سلطنت اور بھی وسیع ہو گئی تھی اور اس سلطنت نے آبادی اور سرسبزی میں بھی کافی ترقی کی تھی اس سلطنت کے تحت تقریباً تین لاکھ گاؤں تھے۔

فوجی اعتبار سے بھی یہ سلطنت ایک طاقتور سلطنت تھی، منصورہ کے حاکم کے پاس اُس وقت پانچ ہزار اسی جنگی ہاتھی اور چالیس ہزار پیادہ فوج تھی۔

منصورہ کے عوام کی زبان سندھی تھی، مگر حکام اور خواص عربی اور سندھی دونوں زبانیں بولتے تھے، خود اس حکومت کا سکہ رائج تھا۔

اس کے عہد میں تجارت کو بھی بڑا فروغ ہوا، سندھ کا مال دوسرے ملکوں کی منڈیوں میں فروخت ہوتا تھا۔

عمر بن عبداللہ کے زمانے میں بھی ہباری حکومت کا بغداد سے کوئی تعلق نہ تھا، صرف اس قدر تعلق تھا کہ خطبے میں خلفا کا نام لیا جاتا تھا۔

ادھر عباسی حکومت کے کمزور ہو جانے پر عباسی قلم رو میں طاہری، سامانی، صفاری، طولونی وغیرہ جن حکومتوں کی بنیادیں پڑیں وہ سب کی سب عباسی خلفاء کے تحت تھیں اور وہ اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر مرکز کی قیادت کو تسلیم کرنے پر مجبور تھیں، لیکن مقتدر کے زمانے میں مصر کی فاطمی حکومت کی بنیاد پڑی جو مرکز سے بالکل آزاد تھی، بلکہ اس کے مدمقابل تھی، اور ایک فرقے کی مذہبی مقتدا تھی، اس حکومت کے بانی عبیداللہ المہدی کے باپ محمد الحبیب تھے جو سلمیہ علاقہ، حمص میں رہتے تھے، اور حضرت امام جعفر صادق رضہ کے بیٹے اسماعیل کی اولاد سے تھے، یہ امام جعفر صادق رضہ کے بعد ان کے صاحبزادے اسماعیل کی امامت کے قائل تھے، انہوں نے سب سے پہلے لوگوں کو اس خیال کی طرف متوجہ کیا کہ عنقریب امام مہدی کا ظہور ہونے والا ہے، اور وہ علوی فاطمی ہوں گے، فاطمی حکومت کی صورت اختیار کرنے سے قبل یہ ایک تحریک تھی جو داعیوں کے ذریعے سے یمن، حجاز، بحرین اور خراسان وغیرہ میں پھیلا گئی، جس نے آگے چل کر فاطمی حکومت کی صورت اختیار کی۔ ۲۹۷ھ (۱۰-۹۰۹ء) میں محمد الحبیب کے بیٹے عبیداللہ کے ہاتھ پر رقادہ میں عام بیعت ہوئی، انہوں نے امیر المومنین مہدی کا لقب اختیار کیا، اس سے قبل سوائے عباسی خلفا کے کسی فرمانروا کے لیے امیر المومنین کا لقب استعمال نہیں ہوتا تھا، یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ فاطمی حکومت دینی اعتبار سے بھی عباسی حکومت کی حریف ہے، اور بجائے خود فاطمی حکومت ایک شیعی دینی حکومت کا قیام تھا۔ جو اسماعیلیوں کی حکومت تھی۔[2]

سندھ میں اسماعیلیوں کا پہلا داعی:

اس پہلے فاطمی فرمانروا عبداللہ المہدی نے جہاں تمام ممالک اسلامیہ میں اپنے داعی بھیجے، عبداللہ بن عمر ہباری کے زمانے میں ان کا ایک داعی ہیثم نامی سندھ پہنچا، یہ اسماعیلیوں کا پہلا داعی تھا جو سندھ آیا، پھر اس کے بعد برابر اسماعیلیوں کے داعی سندھ آتے رہے اور خاموشی سے ملک میں انقلاب لانے کی کوشش کرتے رہے، لیکن منصورہ میں انہیں کامیابی نہ ہوئی، البتہ ملتان کے لوگوں نے اس تحریک کو قبول کیا، جس کی تفصیل آئندہ اوراق میں ملتان کے ضمن میں آرہی ہے۔

بہرحال ہباری خاندان کی حکومت منصورہ میں ۴۰۱ھ (-۱۰۱۰ ۱۱ء) تک قائم رہی۔

---

[1] تاریخ سندھ - حصہ اول، مولانا ابو ظفر ندوی، بحوالہ عجائب الہند - بزرگ بن شہر یار، ص ۳۳۔

[2] حضرت امام جعفر صادق رضہ کی وفات کے بعد شیعوں میں دو فرقے ہو گئے تھے، ایک نے امام جعفر صادق رضہ کے صاحبزادے حضرت موسیٰ کاظم کو امام اور اُن کا جانشین تسلیم کیا، دوسرے فرقے نے امام جعفر صادق رضہ کے صاحبزادے اسماعیل کو ان کا امام و جانشین مانا، حضرت اسماعیل کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت امام محمد امام قرار پائے، پھر حضرت احمد وفی ان کے جانشین ہوئے، اُن کے قائم مقام حضرت محمد تقی الحبیب ہوئے، ان کے جانشین حسین الرضی ہوئے، اُن کے خلیفہ عبداللہ المہدی ہوئے، جنہوں نے افریقہ میں حکومت فاطمیہ کی بنیاد رکھی، اس فرقے کو اسماعیلیہ کہتے ہیں۔ (مؤلف)

سندھ میں عہد بنو عباس کے گورنر

نمبر	نام گورنر	کس خلیفہ کے عہد میں	کیفیت
۱	مغلس العبدی	ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ تا ۱۳۶ھ کے عہد میں	۴ سال
۲	موسیٰ بن کعب تمیمی	=	
۳	عیینہ بن موسیٰ بن کعب	ابو جعفر منصور ۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ کے عہد میں	
۴	عمر بن حفص عکی (ہزار مرد)	منصور کے عہد میں	
۵	ہشام بن عمرو تغلبی	منصور کے عہد میں	
۶	معبد بن خلیل تمیمی	مہدی ۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ کے عہد میں	
۷	روح بن حاتم مہلبی	منصور کے عہد میں	
۸	بسطام بن عمرو	=	معزولی ۱۶۱ھ میں (یہ روح کے بعد سندھ کا گورنر ہو کر آیا تھا، لیکن چند دن کے بعد خلیفہ نے اسے موقوف کر کے پھر روح کو گورنر مقرر کیا۔
۹	نصر بن محمد اشعث		یہ خود سندھ نہیں آیا البتہ عبد الملک بن شہاب مسمعی کو اپنا نائب بنا کر سندھ روانہ کیا۔
۱۰	محمد بن سلیمان		
۱۱	زبیر بن عباس		
۱۲	مصبح بن عمرو تغلبی	مہدی کے عہد میں	
۱۳	نصر بن محمد بن اشعث خزاعی	مہدی کے عہد میں	۱۶۳ھ تک گورنر رہا۔ یہ تیسری مرتبہ سندھ کا گورنر مقرر ہوا۔
۱۴	لیث بن طریف	مہدی کے عہد میں	۱۶۴ھ تا ۱۷۰ھ
۱۵	سالم یوسی	ہارون الرشید کے عہد میں	مدت حکومت چار سال
۱۶	اسحاق بن سلیمان بن علی ہاشمی	ہارون کے عہد میں	۱۷۴ھ میں صرف ایک سال گورنر رہا۔
۱۷	طیفور بن عبد اللہ بن منصور الحمیری	ہارون کے عہد میں	
۱۸	جابر بن اشعث طائی	ہارون کے عہد میں	
۱۹	سعید بن مسلم بن قتیبہ	ہارون کے عہد میں	یہ خود سندھ نہیں آیا، بلکہ اس نے اپنے بھائی کثیر بن مسلم کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا۔
۲۰	عیسیٰ بن جعفر بن منصور	ہارون کے عہد میں	اس نے اپنے بجائے محمد بن عدی تغلبی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا۔
۲۱	عبد الرحمان	ہارون کے عہد میں	
۲۲	ایوب بن جعفر بن سلیمان	ہارون کے عہد میں	
۲۳	داؤد بن یزید بن حاتم مہلبی	ہارون کے عہد میں	اس نے اپنے بجائے اپنے بھائی مغیرہ کو گورنر بنا کر بھیجا۔
۲۴	بشیر بن داؤد مہلبی	مامون کے عہد میں	
۲۵	غسان بن عباد	مامون کے عہد میں	
۲۶	موسیٰ بن یحییٰ برمکی	مامون کے عہد میں	
۲۷	عمران بن موسیٰ برمکی	معتصم باللہ کے عہد میں	
۲۸	عنبسہ بن اسحاق ضبی	واثق باللہ کے عہد میں	
۲۹	ہارون بن ابی خالد مروزی	بعہد متوکل	۲۳۵ھ تا ۲۴۰ھ
۳۰	عمر بن عبد العزیز ہباری	بعہد متوکل	
۳۱	عبد اللہ بن عمر ہباری		

باب:7

سندھ کی خود مختار اور آزاد ریاستیں

۲۶۵ھ (۸۷۹-۸۰ء) میں دربار خلافت سے منقطع ہونے کے بعد سندھ میں ملتان اور منصورہ کی دو وسیع اور خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی تھیں، اس کے علاوہ بھی کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں سندھ میں ان کے ساتھ ہی قائم ہو گئی تھیں، بعض ہندو ریاستیں بھی تھیں۔

۳۶۷ھ (۹۷۷-۷۸ء) میں ابن حوقل[1] نے اپنے سفر نامے میں سندھ کے ان صوبوں کا حال لکھا، جسے ہم یہاں اختصار سے درج کرتے ہیں۔

مکران:

ابن حوقل کے زمانے میں یہ ایک وسیع اور عریض خطہ تھا، اور یہاں کا امیر عیسیٰ بن معدان تھا، جو اس پر قابض ہو گیا تھا، اس کا پایہ تخت کیچ تھا۔

مشکی:

کرمان کے قریب ایک اور علاقہ تھا، جس کو مشکی کہتے تھے، یہاں کا حاکم مطہر بن رجا خارجی تھا۔

منصورہ:

منصورہ جس کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے، ۱۱۰ھ سے ۴۰۱ھ تک سندھ کا پایہ تخت رہا، ابن حوقل کے زمانے میں ہبار بن اسود کا خاندان یہاں خود مختارانہ طور پر حکمران تھا۔ اس کا بیان ہے کہ منصورہ ایک مربع میل رقبے کا پر رونق شہر ہے، شہر کے چار دروازے ہیں، باب البحر، باب طوران، باب سندان اور باب ملتان۔ شہر کے ارد گرد سرسبز اور شاداب باغ ہیں، یہاں کھجوریں، گنے، لیموں اور آم بکثرت ہوتے ہیں، اور ہر قسم کے چوپائے اس علاقے میں بکثرت پائے جاتے ہیں، اس ریاست کی وسعت دیبل سے لے کر الور تک ہے، الور سے شمال کی جانب ریاست ملتان کی حد شروع ہو جاتی ہے، اس ریاست کا رقبہ ملتان کی ریاست سے بڑا تھا۔

ملتان:

ملتان ابتداءً منصورہ کے تحت تھا، مگر تیسری صدی ہجری میں ملتان کا تعلق منصورہ سے منقطع ہو گیا، اور ملتان ایک خود مختار ریاست بن گیا۔ مسعودی کا بیان ہے کہ جب وہ ۳۰۳ھ میں ملتان پہنچا ہے تو ملتان میں سامہ بن لوی کے خاندان کی حکومت تھی، اس وقت ملتان میں ابو اللباب منبہ بن اسد قریشی سامی ملتان کا فرمانروا تھا، یہ بہت سرسبز اور شاداب علاقہ تھا، ملتان میں ایک مندر تھا، اس مندر میں ایک مورتی تھی، اس کی پرستش کے لیے دور دور سے لوگ آتے تھے، اور اس مورتی پر نہایت قیمتی تحفے چڑھاتے تھے، موتی، جواہرات، سونا، چاندی، عود اور دوسری خوشبودار چیزیں اس مورتی پر چڑھاتے تھے، جس کی وجہ سے یہاں کے فرمانروا کو بہت آمدنی ملتی تھی۔ جب کوئی ہندو راجا ملتان پر چڑھائی کا ارادہ کرتا، تو ملتان کا فرمانروا اس کو دھمکی دیتا کہ میں تمہارے مندر کو تباہ کر دوں گا، ہندو راجا ڈر کر واپس ہو جاتا۔[2] ملتان کو فرج بیت

---

[1] ابن حوقل بغداد کا ایک تاجر تھا، جس نے ۳۲۱ھ میں بغداد سے روانہ ہو کر یورپ، افریقہ اور ایشیا کے ملکوں کا سفر کیا، اسپین اور سسلی سے لے کر ہندوستان تک پہنچا، اس نے ملکوں کے نقشے تیار کیے، ایلٹ صاحب نے ایک قلمی نسخے سے اپنی کتاب میں سندھ کا وہ نقشہ دیا ہے جو ان کو ابن حوقل کے قلمی نسخے میں ملا تھا، یہ ہندوستان کے ایک صوبے کا پہلا جغرافیائی نقشہ ہے جو دنیا میں تیار ہوا (عرب و ہند کے تعلقات ص ۳۷)

[2] مروج الذہب، ج ۱، ص ۳۷۸ مطبوعہ لیدن۔

الذہب بھی کہتے تھے، چونکہ اس کے فتح کرنے سے قبل مسلمانوں کی مالی حالت بہت خراب تھی، ملتان کی فتح کے بعد ان کو کافی مقدار میں سونا ملا، جس سے ان کی مالی حالت درست ہوگئی، اس لیے وہ ملتان کو فرج بیت الذہب سنہری سرحد بھی کہنے لگے۔

طوران:

سندھ سے متصل ایک اور ریاست تھی جس کو طوران کہتے تھے، شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ نے ترجمہ چچ نامہ میں لکھا ہے کہ طوران کو ستھیا بھی کہتے ہیں، یہ اُس قوم کی طرف منسوب تھا جو وسط ایشیا میں آباد تھی، طوران اور قیقانان جھالاوان ان کا نام ہے، جس کا پایہ تخت قصدار تھا۔

۳۷۵ھ جب کہ بشاری مقدسی سندھ آیا ہے، اُس زمانے میں یہاں کا حاکم معین بن احمد تھا۔ قصدار شہر بیچ میں وادی ہونے کی وجہ سے دو حصوں میں تقسیم تھا، ایک حصے میں شاہی محل اور قلعہ تھا اور دوسرے حصے میں تاجر اور عام آبادی تھی، اس حصے کو بودین بھی کہتے تھے۔ قصدار اگرچہ چھوٹا سا شہر تھا لیکن بے حد پر رونق تھا، خراسان، سندھ اور مکران کے وسط میں ہونے کی وجہ سے یہ شہر قافلوں کی آمد و رفت کا مرکز تھا۔

یاقوت حموی نے اس شہر کا نام قیقان بھی بتایا ہے، عربوں نے بیضا نامی شہر اسی ریاست کے اس حصے میں آباد کیا تھا جو سندھ کی سرحد تھی۔ ۳۷۰ھ میں سلطان سبکتگین نے اس ریاست پر قبضہ کیا۔[1]

ویھند:

ویھند بھی ایک ریاست تھی، اس کے محل وقوع کے متعلق سندھ کے کسی مورخ نے وضاحت نہیں کی کہ یہ کہاں واقع تھی، مولوی نور محمد نظامانی نے اپنی کتاب تاریخ سندھ کے دوسرے باب میں صرف اتنا لکھا ہے کہ ویھند ایک عظیم الشان شہر تھا، جو منصورہ سے بھی زیادہ آباد تھا، اس کے چاروں طرف سرسبز و شاداب باغ تھے، شہر میں ہر چیز سستی ملتی تھی۔

مسٹر عبدالغنی عبداللہ نے اپنی کتاب تاریخ سندھ کے تیسرے باب میں سندھ کی خود مختار ریاستوں کا تذکرہ کیا ہے، لیکن اُس میں ہمیں ویھند کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

سندھ کی یہ ریاست گندارا بھی کہلاتی تھی، اس کا پایہ تخت ویھندا تھا، جو اٹک سے کچھ فاصلے پر واقع تھا، ویھندا کے مغرب میں چارسدہ (پشکلاوتی) اور مشرق میں ٹکسلا واقع تھا۔

ویھند ہندوستان کے پرانے شہروں میں تھا، یہاں کا راجا ہندو تھا، لیکن اس ریاست میں مسلمانوں کی کافی آبادی تھی، سلطان محمود غزنوی نے پشاور فتح کرنے کے بعد اس علاقے پر قبضہ کیا۔

عام طور پر اس ریاست کو سندھ سے علیحدہ شمار کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں یہ ریاست قدیم سندھ میں شامل تھی۔[2]

قنوج:

ملتان کی سرحد سے متصل قنوج (کنوج) ایک ریاست تھی، یہاں کے راجا کا خطاب بودرہ تھا، اس کا کل رقبہ ۹۶۰ مربع میل تھا، یہ ریاست محمد بن قاسم کے وقت میں بھی موجود تھی۔ مگر وہ اسے فتح نہ کر سکے تھے کہ واپس چلے گئے، غزنوی عہد تک یہ ریاست خود مختار رہی، ۳۰۳ھ (۱۶-۹۱۵ء) میں اس کا سرحدی شہر بھوج رائے اسلامی مملکت میں شامل ہوگیا، جس کا الحاق ملتان سے ہوا۔[3]

بدھ:

بدھ کا علاقہ طوران، مکران، ملتان اور منصورہ کے درمیان پھیلا ہوا تھا، اس کا پایہ تخت قندابیل تھا، یہاں کے لوگوں کا طرز زندگی دیہاتی تھا، اُن کے پاس جنگل اور جھاڑیاں تھیں۔[4]

یہ سندھ کی وہ خود مختار ریاستیں تھیں جو مرکز کی کمزوری کے بعد وجود میں آئیں۔

---

[1] جنتہ السندھ - مولائی شیدائی، ص ۱۵۲-۱۵۱۔

[2] جنت السندھ - مولائی شیدائی، ص ۱۵۰-۱۵۱۔

[3] تاریخ سندھ - ابو ظفر ندوی، ص ۲۰۸ بحوالہ مسعودی، ص ۳۷۶۔

[4] تاریخ سندھ - مولانا ابو ظفر ندوی، ص ۲۱۸-۲۱۹۔

باب:8

اسماعیلی حکومت

ملتان پر عربوں نے پہلی صدی ہجری میں قبضہ کیا اور غزنوی عہد تک اس پر مسلمانوں کا قبضہ برابر رہا۔ ۱۳۲ھ (۵۰-۷۴۹ء) تک ملتان کا تعلق خاندان بنی امیہ سے رہا مگر اموی حکومت کی بساط الٹنے کے بعد اس کا تعلق بنو عباس سے ہوا۔ تیسری صدی ہجری یعنی معتصم کے زمانے تک ملتان عباسی حکومت کے تحت رہا۔ بعد میں ملتان کی صورت یہ رہی کہ اگر مرکز میں خلیفہ طاقتور ہوتا تو دور دراز کے صوبے اس کے ماتحت ہوتے اگر مرکز میں خلیفہ کمزور ہوتا تو دور دراز علاقوں کے عامل خود مختار ہو جاتے۔ ایسے زمانوں میں بھی ملتان سندھ اور منصورہ کے تحت رہا مگر تیسری صدی ہجری کے وسط میں ملتان سندھ سے علیحدہ ہو کر ایک خود مختار سلطنت بن گیا جس کی وسعت پچھم میں مکران تک اور دکن میں منصورہ تک تھی۔ اس زمانے کے اعداد و شمار کے لحاظ سے ایک لاکھ بیس گاؤں اس سلطنت کی حدود میں تھے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ ملتان میں بنو سامہ کی حکومت تھی جو خالص عربی النسل تھے اور اپنے آپ کو سامہ بن لوئی کی اولاد سے کہتے تھے۔ لوئی قریش کی اجداد میں تھا اور لوئی کی ایک اولاد کا نام سامہ تھا۔ اسی کی اولاد کو بنو سامہ کہتے تھے۔

بنو سامہ کا عروج معتضد کے دور ۲۷۹ھ (۶۴-۸۶۳ء) میں ہوا۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ عمان میں خارجیوں کا تسلط تھا۔ معتضد نے اُن کے فتنے کو فرو کرنے کیلئے محمد بن قاسم کو بھیجا۔ اس نے خارجیوں کو شکست دے کر عمان میں اپنی ریاست قائم کرلی، اور اس ریاست میں مذہب اہل سنت کو رواج دیا۔ ۳۰۵ھ (۱۸-۹۱۷ء) تک اس خاندان کی حکومت کا سلسلہ برابر چلتا رہا لیکن اس خاندان کی باہمی خانہ جنگی سے قرامطہ نے جو بحرین میں طاقت حاصل کرتے جارہے تھے فائدہ اٹھایا اور ۳۱۷ھ (۳۰-۹۲۹ء) میں ابو طاہر قرمطی نے عمان پر قبضہ کر کے اس کو اپنی حدود سلطنت میں شامل کرلیا۔

عمان اور سندھ میں قدیم زمانے سے آمد و رفت جاری تھی اور دونوں ملکوں میں بحری تجارت ہوتی تھی۔ اور یوں بنو سامہ کا تعلق سندھ سے قدیم تھا کیونکہ بنو سامہ کے غلام فضل بن ماہان اور اس کے خاندان کے لوگ مامون کے زمانے ۱۹۸ھ (۱۴-۸۱۳ء) سے لے کر معتصم کے زمانے ۲۲۷ھ (۴۲-۸۴۱ء) تک سندھ کے ایک مقام سندان پر حکومت کرتے رہے۔ ان کی سلطنت آپس کی خانہ جنگی کی وجہ سے تباہ ہوئی۔

اس لیے یہ اور بھی قرین قیاس ہے کہ بنو سامہ عمان کی حکومت ختم ہونے کے بعد سندھ سے ملتان چلے آئے ہوں اور یہاں انہوں نے اپنی حکومت قائم کرلی ہو۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ بنو سامہ ملتان کے فرمانروا تھے، اور ان کو بنو منبہ بھی کہتے تھے۔ تیسری صدی ہجری کے ختم پر ہمیں ان کی خود مختار ریاست کا نام ۲۹۰ھ (۳-۹۰۲ء) میں ابن رستہ کی کتاب الاعلاق النفیسہ میں ملتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

ملتان میں ایک قوم رہتی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ سامہ بن لوی کے خاندان سے ہے۔ ان کو لوگ بنو منبہ بھی کہتے ہیں اور وہی وہاں فرمانروا ہیں اور وہ امیر المومنین کا خطبہ پڑھتے ہیں۔[1]

مسعودی جو ابن رستہ کے دس برس بعد ۳۰۰ھ (۱۵-۹۱۴ء) میں ملتان آیا، اس کا بیان ہے کہ:

> ملتان کا امیر جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ یہاں کی سلطنت سامہ بن لوئی بن غالب کے ہاتھ میں ہے اور ملتان اسلامی حکومت کی بڑی سرحدوں میں سے ایک ہے۔[2]

اصطخری جو مسعودی کے چالیس برس بعد ۳۴۰ھ (۵۲-۹۵۱ء) میں ملتان پہنچا اس کا بیان ہے کہ:

---

(1) عرب و ہند کے تعلقات، ص ۳۰۶-۳۰۹ الاعلاق النفیسہ - ابن رستہ ص ۱۳۵۔

(2) مروج الذہب - مسعودی جلد اول ص ۳۷۵-۳۷۶۔

ملتان کے چاروں طرف ایک مضبوط شہر پناہ ہے۔ شہر کے باہر آدھے فرسنگ پر بہت سے عمارتیں ہیں جن کا نام جندراون ہے۔ یہ فوجی کیمپ ہے۔ یہیں، یہاں کا بادشاہ رہتا ہے۔ وہ ملتان میں صرف جمعے کو ہاتھی پر سوار ہو کر جمعے کی نماز پڑھنے جاتا ہے۔ وہ نسلاً قریشی ہے۔ سامہ بن لوی کے خاندان سے ہے۔ ملتان پر اس نے قبضہ کر لیا ہے وہ منصورہ کے امیر یا کسی اور کا تابع نہیں۔ صرف خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتا ہے۔[1]

یہاں تک کہ تمام مورخوں اور جغرافیہ نویسوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتان میں سامہ بن لوی کے خاندان کی حکومت قائم تھی جو سنیوں کی حکومت تھی۔

اصطخری کے ستائیس برس بعد ۳۶۷ھ (۹۷۷-۷۸ء) میں ابن حوقل ملتان آتا ہے۔ اس نے بھی ملتان کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا کہ یہاں باطنیوں یا اسماعیلیوں کی حکومت قائم ہے۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ یقیناً اس کا تذکرہ کرتا۔

ابن حوقل کے آٹھ برس بعد بشاری مقدسی ملتان پہنچتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ:

ملتان کے لوگ شیعہ ہیں۔ اذان میں حی علی خیر العمل کہتے ہیں اور اقامت میں بھی دو دفعہ تکبیر کہتے ہیں۔

ملتان میں خطبے میں مصر کے فاطمی خلیفہ کا نام لیا جاتا ہے اور اسی کے حکم سے یہاں کے انتظامات ہوتے ہیں۔ یہاں سے برابر تحفے تحائف مصر کو بھیجے جاتے ہیں۔[2]

حلم بن شیبان:

ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے قیاس چاہتا ہے کہ ملتان میں اسماعیلیوں کی حکومت ۳۶۷ھ اور ۳۷۵ھ (۹۷۷-۹۸۵ء) کے درمیان کسی زمانے میں قائم ہوئی۔ اب یہ امر حل طلب باقی رہ جاتا ہے کہ ملتان میں جن اسماعیلیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ کیا یہ وہی بنو سامہ کا خاندان تھا جو سنی سے اسماعیلی بن گئے تھے یا کوئی دوسرا خاندان تھا؟ اس سوال کا کوئی تشفی بخش جواب ہمیں تاریخ کی کتابوں سے نہیں ملتا لیکن کتاب الہند میں جسے ابو ریحان البیرونی نے ۴۲۴ھ میں ملتان کے بت خانے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

جب قرمطی (اسماعیلیہ) ملتان پر قابض ہوئے تو حلم بن شیبان نے جس نے یہاں تسلط حاصل کر لیا تھا، محمد بن قاسم کی جامع مسجد کو اموی دور کی یاد سمجھ کر بند کر دیا اور اس بت خانے کو توڑ کر مسجد بنا لیا۔[3]

پھر البیرونی نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ ان قرامطہ کا زمانہ ہم سے سو سال پہلے تھا۔ بیرونی کے اس بیان کی رو سے ملتان میں قرامطہ کے تسلط کا زمانہ ۳۲۴ھ (۹۳۵-۳۶ء) قرار پاتا ہے لیکن مورخین اور جغرافیہ نویسوں کے سابقہ بیانات سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ ۳۴۰ھ (۹۵۱-۵۲ء) تک یہاں خاندان بنو سامہ کی حکومت تھی جو سنی تھا اور ۳۴۰ھ (۹۵۱-۵۲ء) وہ زمانہ ہے جب کہ عراق اور خلیج فارس کے ساحل پر قرامطہ کا ظہور ہوا اس لیے البیرونی کا یہ بیان صحیح نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تین فرقوں کے نام اس طرح گڑبڑ ہو گئے ہیں کہ یہ گتھی الجھی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ تینوں فرقے قرامطہ، اسماعیلیہ اور ملاحدہ ہیں۔ اگرچہ یہ تینوں اسماعیلی شیعیت ہی کی قسمیں ہیں لیکن ان میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے اور ان تینوں فرقوں کی پیدائش کی تاریخ بھی الگ الگ ہے۔ سب سے پہلے قرمطی[4] تیسری صدی ہجری کے آخر میں بحرین، خلیج فارس اور عراق میں ظاہر ہوئے۔ فرقۂ اسماعیلیہ ۳۵۶ھ (۹۶۶-۶۷ء) میں پیدا ہوا اور ۳۵۶ھ (۹۶۶-۶۷ء) میں یہ مصر آئے۔ ملاحدہ جن کو باطنیہ بھی کہتے ہیں جس کا سرگروہ حسن بن صباح تھا ۴۸۳ھ (۱۰۹۰-۹۱ء) کے بعد خراسان میں ظاہر ہوا۔

ان تینوں فرقوں میں سے جو فرقہ ملتان میں برسر اقتدار آیا وہ اسماعیلی شیعہ تھے۔ رہا یہ امر کہ بعض مؤرخین نے ان کو قرامطہ اور بعض نے ملاحدہ کہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تینوں اسماعیلی شیعیت کی شاخیں ہیں اور ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ اس اشتباہ کی وجہ سے کسی نے ان کو قرامطہ اور کسی نے ملاحدہ لکھ دیا ہے۔

ہمارے اس خیال کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ بساری مقدسی[5] نے جو مذہبی عالم بھی تھا ان کو شیعہ لکھا ہے۔

---

(1) اصطخری بحوالہ معجم البلدان یاقوت لفظ مولتان۔

(2) احسن التقاسیم۔ مقدسی، ص ۴۸۱-۴۸۵۔

(3) عرب و ہند کے تعلقات، ص ۳۱۵ بحوالہ کتاب الہند۔ البیرونی، ص ۵۰۱۔

(4) قرمطی فرقے کا بانی حمدان نامی عرف قرمط تھا جو ۲۷۸ھ اطراف کوفے کے ایک مقام نہرین میں ظاہر ہوا۔ وہ صرف سات ائمہ کا قائل تھا، ۳۰۰ھ کے لگ بھگ قرامطہ بحرین یعنی ساحل خلیج فارس سے فلسطین تک اور بصرہ سے مکہ معظمہ تک چھا گئے (تاریخ اسلام جلد۔ ۲، ص ۲۳۵ مولانا معین الدین ندوی)۔

(5) بشاری مقدسی کا نام شمس الدین محمد بشاری تھا، یہ بیت المقدس کا رہنے والے تھا،

ہماری حکومت کے ضمن میں گزر چکا ہے کہ اسماعیلیوں کے داعی سندھ میں ابو عبداللہ مہدی ہی کے زمانے سے آنے شروع ہو گئے تھے۔ اگرچہ منصورہ میں انہیں کامیابی نہ ہو سکی لیکن ملتان کے لوگ اُن کے ہمنوا ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ اسماعیلی امام العزیز باللہ ۳۸۶ھ (۹۹۶ء) ۳۷۲ھ (۹۸۲ء) کے بعد جلم بن شیبان فوجی دستے کے ساتھ سندھ پہنچا لیکن اس نے کوئی بیرونی حملہ ملتان پر نہیں کیا بلکہ اسماعیلی داعیوں نے اپنی تبلیغ سے جو راہیں ہموار کی تھیں اس سے فائدہ اٹھا کر اندرون شہر بغاوت کرا کر اس کو ہوا دیتا رہا۔ یہاں تک کہ بنو سامہ کا خاندان جو ملتان میں برسر حکومت تھا تاب مقاومت نہ لا کر تباہ ہو گیا، اور جلم بن شیبان ملتان پر قابض ہو گیا۔

جلم بن شیبان کا نظم حکومت:

جلم بن شیبان نے ۳۷۳ھ (۸۴-۹۸۳ء) میں ملتان پر قبضہ کر کے سب سے پہلے فاطمی خلفاء کا سکہ اور خطبہ جاری کیا۔ ملتان کے اُس قدیم مندر کو توڑ دیا جو فتح ملتان سے اس وقت تک صحیح و سالم چلا آتا تھا۔ مندر کی جگہ ایک جامع مسجد بنوائی اور محمد بن قاسم کے زمانے کی جامع مسجد کو بنو امیہ کی یادگار سمجھ کر بند کر دیا۔ اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے کافی جدوجہد کی۔ چونکہ اُسے اپنے آس پاس کی اسلامی سلطنتوں سے جو عباسی خلفا کے تحت تھیں کسی امداد اور تعاون کی توقع نہ تھی اس لیے اس نے مقامی ہندو راجاؤں سے معاہدے کر کے اپنی سلطنت کو مضبوط بنایا۔

جلم بن شیبان نے کب تک ملتان پر حکومت کی اس کی کوئی صراحت ہمیں تاریخ میں نہیں ملتی، قیاس چاہتا ہے کہ جلم بن شیبان نے ۳۷۶ھ (۸۷-۹۸۶ء) اور ۳۸۰ھ (۹۱-۹۹۰ء) کے درمیان انتقال کیا۔

شیخ حمید:

لیکن جلم بن شیبان کے بعد تاریخوں میں ہمیں شیخ حمید (اسماعیلی) کا حال ملتا ہے جو ملتان کا حکمران ہوا اور امیر سبکتگین کا ہمعصر تھا۔ امیر ناصر الدین سبکتگین اگرچہ ۳۶۶ھ (۷۷-۹۷۶ء) میں تخت نشین ہوا اور جلم بن شیبان اور سبکتگین بھی ہمعصر تھے مگر اس کے زمانے میں سبکتگین کا ملتان پر حملہ کسی تاریخ سے ثابت نہیں۔ یہ بھی تاریخوں سے متعین نہیں ہوتا کہ شیخ حمید کا جلم بن شیبان سے کیا تعلق تھا لیکن خیال ہے کہ وہ جلم بن شیبان کا بیٹا ہو گا کیونکہ اسماعیلیوں کا عام طریقہ یہ تھا کہ داعی کی جگہ اس کا بیٹا اور والی کی جگہ اس کا بیٹا جانشین ہوتا تھا۔

اب ہم سندھ کی تاریخ کے اس موڑ پر پہنچ چکے ہیں جہاں سندھ کی حکومت کا تعلق غزنوی حکومت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غزنوی حالات کے شروع ہونے سے پہلے ہم سندھ میں عرب دور کے متعلق جائزہ لیں کہ عرب دور اہل سندھ کے لیے کتنا مبارک و مسعود تھا۔

سندھ میں عربوں کی حکومت پر تبصرہ:

عربوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں سندھ میں جو رفاہی اور تمدنی کارنامے انجام دیے اس نے سندھ کو تیزی سے شاہراہ ترقی پر گامزن کر دیا۔

اسلام نے عربوں کو مساوات، اخوت، ایمانداری اور علم و فضل کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ وہ جہاں بھی گئے اور جس ملک میں بھی فاتحانہ داخل ہوئے انہوں نے مفتوحہ ملکوں میں مساوات، اخوت اور رواداری کے پیغام کو عام کیا اور ایک ایسی تہذیب و تمدن کو جنم دیا جس نے ان ملکوں پر خوشحالی، اخلاقی بلندی اور ثروت کے دروازے کھول دیے۔

عرب جس وقت سندھ میں داخل ہوئے اس وقت یہاں برہمنوں کی حکومت تھی جنہیں ان کے مذہبی قانون کے مطابق تمام قوموں پر فوقیت حاصل تھی۔ برہمنوں نے ایسے سخت قانون نافذ کیے تھے جس سے یہاں کی رہنے بسنے والی دوسری قومیں اُن کے ظلم و تشدد کی چکی میں پس رہی تھیں۔ عام رعایا شہری حقوق سے محروم تھی۔ عوام کا فرض تھا کہ وہ حکمران طبقے کے لیے حیوانوں کی طرح محنت کریں۔ مندروں میں کافی

اس نے اپنی کتاب ۳۷۵ھ میں ختم کی ہے، اس نے اپنے زمانے میں دنیائے اسلام کا سفر کیا، ہندوستان بھی آیا مگر برصغیر پاک و ہند میں سندھ سے آگے نہیں بڑھا (عرب و ہند کے تعلقات، ص ۴۰)

اسماعیلی خلافت کا پھیلاؤ

تعداد میں دیو داسیاں رہتی تھیں۔ جہاں بتوں کی پوجا پاٹ ہوتی تھی وہیں یہ مندر غلط کاری کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ تجارتی ترقی منفود تھی۔ خشکی میں جاٹ، میہ اور بلوچ لوٹ مار کرتے تھے۔ سمندر میں دریائی ڈاکو ڈاکا ڈالتے تھے، ان حالات میں محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا اور عربوں نے ہندوؤں کی مذہبی آزادی کو نہ صرف بحال رکھا بلکہ بت خانوں کے پروہتوں کو مندروں کے اخراجات کے لیے جاگیریں عنایت کیں۔ شہری آزادی کو بحال کیا۔ ذمیوں کے جان و مال کی اسی طرح حفاظت کی جس طرح وہ مسلمانوں کے جان و مال کی کرتے تھے۔ جزیہ کی وصولی میں کسی قسم کی سختی نہ کرتے تھے بلکہ رعایت برتتے تھے۔ سندھ کے جس حصے کو بھی عربوں نے فتح کیا وہاں کے لوگوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا۔ کسی کی کوئی جائیداد جبراً نہیں چھینی، یہاں تک کہ برہمنوں کو جو حقوق سلطنت کی طرف سے تھے اُن کو بحال رکھا۔ محمد بن قاسم نے مالگزاری وصول کرنے کے لیے بھی برہمنوں کو بطور عامل مقرر کیا اور انہیں ہدایت دی کہ جہاں تک ممکن ہو رعایا پر ظلم نہ کیا جائے۔ رعایا کے لیے اپنے مشاہدے سے جو بات وہ مفید سمجھیں اس کی اطلاع دیں تاکہ اس پر عمل درآمد کیا جائے۔ فتح برہمن آباد کے بعد محمد بن قاسم نے جس شخص کو جس عہدے پر مقرر کیا موروثی طور پر مامور کیا اور انہیں ہدایت دی گئی کہ رعایا اور حکومت کے درمیان اچھے تعلقات پیدا کرنا تمہارا فرض ہے۔ اگر اس فرض کی حمایت میں تمہیں کوئی نقصان پہنچے گا تو حکومت ہر طرح سے تمہاری حمایت اور امداد کرے گی۔

ملک کے سیاسی طبقے نے جب یہ درخواست کی کہ برہمن آباد کا ملکی انتظام بھی ہمارے سپرد کیا جائے تو محمد بن قاسم نے اس کو بھی منظور کر لیا، اور تمام سرکاری عہدے دار الگ کر کے ملک کا انتظام ملک والوں کے سپرد کر دیا۔

سمہ اور لاکھا قومیں وحشی قومیں تھیں جو لوٹ مار کا بازار گرم رکھتی تھیں۔ برہمن حکومت نے ان کے لیے بڑے سخت قوانین نافذ کیے تھے اور اُن سے سخت نفرت کی جاتی تھی۔ بعض مصالح کی بنا پر ان کے بعض نافذ کردہ قوانین محمد بن قاسم نے بحال رکھے لیکن ان سے جو نفرت کا برتاؤ کیا جاتا تھا اس پر انہوں نے اظہار تعجب کیا اور ان کی بے کاری اور افلاس کو دور کرنے کے لیے حکم دیا کہ وہ شاہی مطبخ کے لیے لکڑیاں مہیا کریں۔ محمد بن قاسم نے سندھ کے عدالتی نظام میں بھی تبدل و تغیر کیا اور قانون کے ان حصوں کو بدل دیا جو برہمن راجاؤں نے اپنی خود غرضی کی بنا پر نافذ کر رکھے تھے اور اسلامی مساوات اور انصاف کے خلاف تھے۔ وہ سندھ میں چار سال رہے مگر انہوں نے اس تھوڑے سے عرصے میں عدل و انصاف اور رواداری کی وہ شاندار مثال قائم کی جس کی نظیر ہمیں تاریخ میں کم ملتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب اُن کو معزول کیا گیا اور جب واسط کے جیل خانے میں انہوں نے وفات پائی تو اہل سندھ نے ان کی موت پر بڑا ماتم کیا اور اُن کے انصاف و رواداری اور احسانات کو یاد کر کے وہ روتے تھے۔ چنانچہ کیرج میں ان کی یادگار کے طور پر انہوں نے محمد بن قاسم کا مجسمہ نصب کیا۔

عربوں کے یہاں آنے کے بعد تجارت کو بھی غیر معمولی فروغ حاصل ہوا اور تجارتی مال کی درآمد و برآمد کو بہت ترقی ہوئی۔ سندھ کے شہر دیبل، نیرن کوٹ، سیوستان، قندار، اروڑ، منصورہ اور ملتان عربوں کے زمانے میں تجارتی مرکز بنے۔ گجرات، مالابار، مدراس، بنگال وغیرہ میں عربوں کی جو تجارت تھی وہ اس قدر کامیاب نہ تھی جس قدر سندھ میں اس کو عروج حاصل تھا۔

عربوں نے اس ملک میں زراعت کو بھی غیر معمولی ترقی دی جس کی

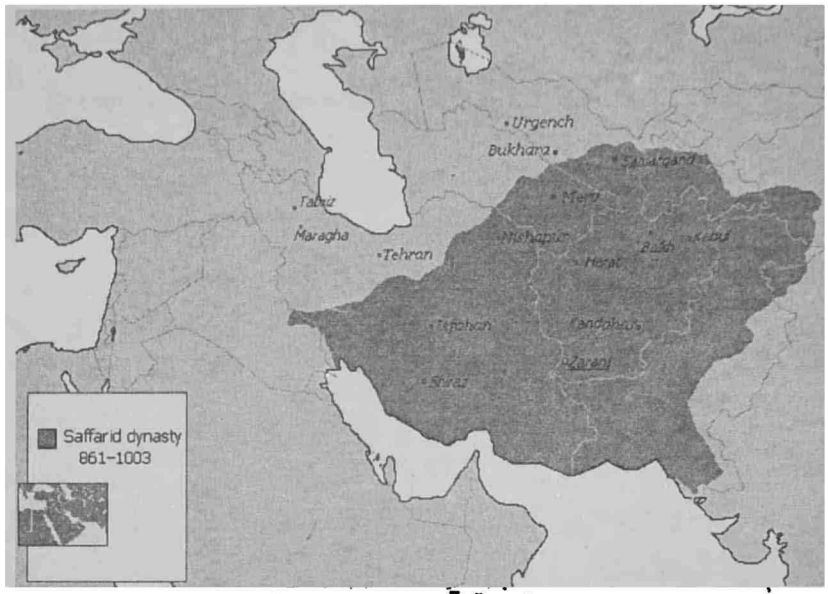

وجہ سے ہر جگہ سرسبزی اور شادابی نظر آتی تھی۔ چنانچہ عرب کے جس قدر سیاح بھی سندھ آئے انہوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ اُس زمانے میں سندھ کے مختلف اضلاع میں جن چیزوں کی کثرت سے پیداوار ہوتی تھی ان میں کافور، نیل، بید، کیلا، ناریل، قسط (کٹ)، کھجور، نیشکر، لیموں، آم، بادام، اخروٹ، نرکل، گیہوں، چاول خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اگرچہ اس ملک میں باغوں کی کثرت نہ تھی لیکن جہاں جہاں کی زمین زرخیز تھی عربوں نے وہاں بکثرت باغیچے لگائے۔

بشاری مقدسی نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ: "یہاں تروتازہ بکثرت باغ ہیں جو مسطح زمین پر پھیلے ہوئے ہیں ۔۔۔ یہاں کے درخت لمبے لمبے ہوتے ہیں اور پھل اچھے ۔۔۔ تمام شہر اخروٹ اور بادام کے درختوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ کیلا اور دوسرے ترمیووں کی کثرت ہے"۔

کنوج میں کیلے کی پیداوار بہت زیادہ تھی۔ ملتان میں ناریل، کیلے اور کھجور کے بہت باغ تھے۔ قندار میں انگوروں کے باغوں کی کثرت تھی۔

عربوں کے آنے کے بعد سندھ میں صنعت و حرفت کو بھی غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔ پہلے سندھ کے کاری گر چمڑے کو کماتے تھے لیکن وہ سخت رہ جاتا تھا۔ ابن ندیم کا بیان ہے کہ کوفے کے کاری گروں نے سندھ اور مکران کے کاریگروں کو کھجور سے چمڑے کو رنگنے کا ہنر سکھایا جس سے چمڑے میں نرمی پیدا ہوگئی۔ منصورہ کے چمڑے کی صنعت کے متعلق امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ (۸۵۵-۵۶ء) نے اپنی کتاب کتاب الورع میں لکھا ہے کہ منصورہ کے زرین جوتے اسلامی دنیا میں صرف امیر طبقہ پہنتا ہے۔ چمڑے کی صنعت نے سندھ میں اس درجہ ترقی کی کہ سندھ کا رنگین اور نرم چمڑا "السندیہ" کے نام سے ساری دنیا کی مارکیٹوں میں پھیل گیا۔ مروج الذہب میں ہے کہ ہندوستان میں منصورہ اور کھنبایت کے جوتے مشہور ہیں۔

عربوں نے سندھ میں زراعت و تجارت کو ترقی دینے کے علاوہ یہاں کی حیوانی نسلوں کی ترقی میں بھی کافی حصہ لیا۔ سندھ کا علاقہ چونکہ ریگستانی ہے یہاں کے جانوروں میں اونٹ سب سے زیادہ کارآمد جانور تھا۔ اس لیے عربوں نے اس کی طرف خصوصیت سے توجہ کی۔ گندھاری علاقے کا اونٹ چونکہ سب سے زیادہ اچھا ہوتا تھا اس لیے عربوں نے اُسے منتخب کر کے اُس کی پرورش اور نسل لینے کا انتظام کیا۔ پھر خراسانی اونٹوں سے کراس کرا کر ایک خاص نسل لی گئی جس کو "بخت" یا "بختائی" اونٹ کہا جاتا تھا۔ یہ مضبوط، خوب صورت اور دو کوہان والا اونٹ ہوتا تھا۔

گائے بھینس اور بیل چونکہ ضروریات زندگی میں شامل ہیں عرب نہ صرف ان کی پرورش اور افزائش نسل کے متعلق سندھ میں متوجہ رہے بلکہ وہ یہ جانور اپنے وطن عرب اور بصرے میں بھی لے گئے۔

آل مہلب نے جو عرصے تک سندھ میں حکومت کرتے رہے انہوں نے بھینسیں منگوا کر بصرے میں رکھی تھیں۔

عربوں نے سندھ میں گھوڑوں کی پرورش اور افزائش نسل کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ گھوڑوں کی نسلیں یہاں تک بڑھیں کہ سندھ سے کچھ اور کاٹھیاواڑ تک پہنچ گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ عربوں کو تعمیرات کا شوق نہ تھا لیکن ہماری رائے میں یہ خیال صحیح نہیں۔

سندھ میں عربوں نے جو شہر آباد کیے افسوس کہ آج اُن میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔

سب سے پہلی آبادی جو عربوں نے سندھ میں آباد کی وہ دیبل کے مقام پر ایک محلہ یا گاؤں تھا جہاں چار ہزار عربوں کے خاندان آباد کیے گئے۔ اس کے بعد جو دوسرا شہر باقاعدہ اس نقطۂ نظر سے آباد کیا گیا کہ

مقبوضات کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کی شدید ضرورت تھی کہ دریائے سندھ کے مشرقی جانب ایک نو آبادی کوفے کے طرز پر تعمیر کی جائے جو عربوں کے لیے ایک مرکز کا کام دے۔ چنانچہ حکم بن عوانہ گورنر سندھ نے ۱۱۴ھ (۳۳-۷۳۲ء) میں دریائے سندھ کے جنوب مشرق میں ایک شہر محفوظہ کے نام سے آباد کیا اور اُس کو پایۂ تخت قرار دیا۔ وہاں ایک قلعہ بھی تعمیر کیا جس میں فوج رہتی تھی۔

اس کے بعد محمد بن قاسم کے بیٹے عمرو نے جب وہ دریائے سندھ کے شمال مشرق کے علاقے کو جن پر دشمنوں نے قبضہ کر لیا تھا اور جس میں برہمن آباد بھی شامل تھا واپس لے کر لوٹا تو اس فتح کی خوشی میں اُس نے برہمن آباد سے چھ میل مغربی جانب ایک شہر آباد کیا، جس کا نام "منصورہ" رکھا۔ چند سال ہی میں یہ شہر ترقی کرتے کرتے سندھ کا پایہ تخت بن گیا۔ جو اس زمانے کا بڑا پر رونق شہر تھا۔

یہ شہر ساتویں صدی ہجری کے وسط تک موجود تھا۔ اسی صدی کے آخر میں زلزلے کی وجہ سے برہمن آباد اور منصورہ دونوں تباہ ہو گئے۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ شہر بھی عربوں نے بہت خوبصورت آباد کیا ہو گا۔

تیسرا شہر جو عربوں نے سندھ میں آباد کیا تھا اس کا نام "بیضاء" تھا۔ اس شہر کو عمران برمکی نے بوقان کے قریب ضلع بودھیہ میں آباد کیا تھا۔ یہ علاقہ دریائے سندھ کے مغربی جانب واقع تھا۔ اس علاقے میں زیادہ تر جاٹ آباد تھے۔

یہ شہر عمران برمکی نے ۲۲۰ھ (۳۶-۸۳۵ء) میں اُس وقت آباد کیا تھا جب کہ اس نواح کے جاٹوں نے بغاوت کی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے فوج لے کر ان سے مقابلے کے لیے قیقان (قلات) پہنچا اور ان کو شکست دے کر حفاظتی نقطۂ نظر سے یہ شہر آباد کیا اور اس میں مستقل چھاؤنی قائم کی تاکہ ہر وقت فوج تیار رہے۔

اس کا تذکرہ صرف بلاذری کی فتوح البلدان میں ملتا ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس شہر نے کوئی ترقی نہیں کی اور اس کی حیثیت صرف ایک چھاؤنی کی رہی۔

۲۴۰ھ (۵۵-۸۵۴ء) میں عربوں نے یہاں ایک اور نیا شہر آباد کیا تھا جس کا نام جندرور تھا جس کے معنی فوج کے رہنے کی جگہ یا فوجی آبادی کے ہیں۔ یہ ملتان سے ڈیڑھ میل شمال مشرق میں آباد کیا گیا تھا۔ خیال ہوتا ہے کہ ابتداءً یہ فوجوں کے لیے ایک چھاؤنی بنائی گئی تھی۔ پھر اس چھاؤنی نے آہستہ آہستہ شہر کی صورت اختیار کی، یہاں تک کہ ملتان کا حاکم بھی اُسی جگہ رہنے لگا۔

ان جدید شہروں کے علاوہ عربوں نے یہاں کے قدیم شہروں کو ترقی دینے کی بھی بہت کوشش کی۔ عربوں کے آنے سے پہلے دیبل بہت بڑا شہر سمجھا جاتا تھا لیکن ۲۸۰ھ (۹۴-۸۹۳ء) میں جو زلزلہ آیا وہ اتنا شدید تھا کہ تمام دیبل تباہ ہو گیا۔ اس شہر کی آبادی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے ملبے سے ۲/۱ لاکھ لاشیں نکالی گئیں۔ اس زلزلے نے اس شہر کو ایک خرابہ بنا دیا تھا لیکن چند ہی سالوں کے بعد عربوں نے اس شہر کو دوبارہ آباد کیا اور اس شہر کو پہلے سے بھی زیادہ پر رونق بنایا کیونکہ اس سے پہلے اس شہر کے آس پاس کا علاقہ بالکل غیر آباد تھا۔ جب عربوں نے اس شہر کو آباد کیا تو اس کے آس پاس گاؤں آباد کیے۔ بشاری مقدسی نے اپنی کتاب احسن التقاسیم فی معرفتہ الاقالیم میں لکھا ہے کہ: دیبل ساحلی شہر ہے جس کے ساتھ تقریباً ایک سو گاؤں آباد ہیں۔

ابوالحسن علی مسعودی جو ۳۰۰ھ (۱۳-۹۱۲ء) کے بعد ملتان پہنچا ہے وہ لکھتا ہے کہ: "یہ بہت سرسبز و شاداب ملک ہے، ہر جگہ شہر اور گاؤں آباد ہیں۔"

عمارت سازی میں اگرچہ آج عرب دور کی کوئی عمارت سندھ میں ہمیں نہیں ملتی لیکن عربوں نے جب سندھ فتح کیا تو سب سے پہلا شہر جس پر ان کا قبضہ ہوا وہ دیبل تھا۔ محمد بن قاسم نے اس شہر میں جو سب سے پہلی عمارت تعمیر کرائی وہ ایک جامع مسجد تھی۔ یہ مسجد اتنی بڑی تھی کہ جس میں تقریباً دس ہزار آدمی آجاتے تھے۔

دیبل کے بعد جب نیرون فتح کیا گیا تو وہاں بھی محمد بن قاسم نے ایک مسجد تعمیر کرائی۔ اسی طرح الور اور ملتان کی فتح کے بعد وہاں مسجدیں تعمیر کیں۔ منصورہ کی جامع مسجد عمان کے نمونے پر تھی۔

جنت السندھ کے مؤلف مولائی شیدائی نے سندھ میں عرب دور کی ایک یادگار کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عرب دور کی یادگاروں میں اس وقت "خانقاہ بوترابی" میرپور ساکرو کے تعلقے میں موضع گجو گوٹ میں موجود ہے۔ یہ ہارون الرشید کے بعد کے زمانے کی یادگار ہے۔ اس کے گنبد پر نقاشی کا کام جام صلاح الدین نے کرایا تھا۔

مؤلف تاریخ لب سندھ خان بہادر خداداد خان نے عربوں کے زمانے کی ایک اور یادگار قلعہ بکھر کا پتا دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بعض قدیم کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بکھر کی تعمیر کی تاریخ "بالا حصار" ہے، جس سے ۳۳۳ھ (۴۵-۹۴۴ء) سنہ برآمد ہوتا ہے۔ شاید

اس کی تعمیر بنو عباس کی خلافت کے زمانے میں ہوئی۔

وہ بنو عباس کے عہد کی ایک اور عمارت "درگاہ خضر" کے متعلق بھی لکھتے ہیں کہ ہندو اس کو جند پیر یا زندہ پیر کہتے ہیں اور یہ دریائے مہران (انڈس) کے درمیان واقع ہے۔ اس کی تاریخ "درگاہ عالی" سے ۳۴۱ھ (۹۴۹ء) نکلتی ہے۔ خیال ہے کہ یہ عمارت بنو عباس کے عہد میں تعمیر ہوئی ہوگی۔

عربوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں سندھ پر رفاہ عام کے متعلق بھی خاصے کام انجام دیے، دریائے سندھ پر عربوں نے عوام کی آمد و رفت کے لیے ایک پل تعمیر کیا، جس کا نام انہوں نے سکر المیدر رکھا تھا، جو سکھر کے پاس تھا۔

عربوں نے اپنے زمانے میں سندھ میں ڈاک کا بھی معقول انتظام کیا تھا۔ بنی امیہ کے عہد میں جب کہ حجاج شہر واسط میں رہتا تھا اور محمد بن قاسم کبھی الور، کبھی برہمن آباد یا ملتان میں رہتا تھا، مگر دونوں میں برابر خط و کتابت رہتی تھی اور ایک کو دوسرے کا خط ساتویں دن مل جاتا تھا۔

بنو عباس کے عہد میں رسل و رسائل کے نظام کو اور بھی ترقی ہوئی اور باقاعدہ گھوڑوں کی ڈاک بٹھائی گئی۔ ان گھوڑوں کا مقررہ جگہوں پر تبادلہ ہوتا اور مرکزی مقام میں گھوڑوں کی تعداد زیادہ رکھی جاتی تھی۔ اس طرح ڈاکیہ پانچ دن کی راہ ایک دن میں طے کرتا تھا۔ اس طرح ڈاک کے انتظام کو بغداد سے منصورہ اور ملتان تک اور بھی بہتر بنایا گیا۔

عربوں نے سندھ میں بسنے والے ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو یکساں مذہبی آزادی دی تھی۔ اُس وقت سندھ کی عام رعایا کا مذہب بدھ تھا۔ اُن کے دھار (خانقاہیں) ہر جگہ تھیں۔ عربوں نے سندھ پر قابض ہونے کے بعد اُن کے مذہبی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ اسی طرح برہمنوں کے ساتھ بھی غیر معمولی رعایت برتی۔ برہمن آباد کا مندر ان کو واپس کر دیا۔ بلکہ مندر کے پجاریوں کے وظیفے مقرر کیے۔ اُن کے ساتھ یہاں تک رعایت کی گئی کہ مالگزاری کی رقم میں سے تین فیصد ان برہمنوں کو دیا جاتا تھا۔

رواداری کی انتہا یہ تھی کہ مشرقی ممالک کے حاکم اعلیٰ کو جب یہ معلوم ہوا کہ زراعت کے لیے بیل کا وجود ضروری ہے اور اس کی کمی ہوتی جارہی ہے تو سرکاری طور پر حکم جاری کیا گیا کہ گائے ذبح نہ کی جائے۔

عرب اس نقطے کو خوب سمجھ گئے تھے کہ جس قدر مفتوحہ علاقوں کو خوش رکھا جائے گا اسی قدر ان کی حکومت کی بنیاد مضبوط ہوگی۔ اس لیے انہوں نے اپنے دور حکومت میں سندھیوں کے خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی۔ چنانچہ انہوں نے ان پر اعتماد کر کے ان کو بڑے بڑے عہدے دیے۔

مسلمان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اشاعت اسلام ہے۔ چنانچہ عرب جہاں بھی گئے ان کا بڑا مقصد یہ بھی رہا کہ اس سرزمین میں وہ خدا کے نام کو سربلند کریں۔

ہم گزشتہ اوراق میں ذکر کر آئے ہیں کہ ایک عراقی عالم نے جو منصورہ میں رہتے تھے اور سندھی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے سندھ کے ایک راجا کے لیے عقائد اسلام کو منظوم کیا تھا۔ پھر جب یہ اُس کے دربار میں پہنچے تو اس کو قرآن مجید کا ترجمہ باقاعدہ سندھی زبان میں پڑھایا اور اُس کی فرمائش پر قرآن مجید کا ترجمہ سندھی زبان میں کیا۔ یہ قرآن مجید کا پہلا ترجمہ تھا جو سندھی زبان میں ہوا۔

عربوں کی آمد کے بعد سندھ نے علوم و فنون کے اعتبار سے بھی بڑی ترقی کی۔ عرب کے بڑے بڑے علماء و فضلا نے سندھ میں آکر مستقل طور پر سکونت اختیار کی۔ اُن ہی کی بدولت سندھ میں اسلامی علوم و فنون کے سرچشمے جاری ہوئے۔ وہ اکابر علما جنہوں نے سندھ میں مستقل سکونت اختیار کرلی ان میں موسیٰ بن یعقوب ثقفی قاضی ارور، محمد بن ابی الشوارب قاضی منصورہ، ہارون بن عبداللہ ملتانی شاعر، قاضی ابو محمد منصوری قاضی منصورہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہاں کے اصل متوطن باشندوں میں سندھی عالم مولانا اسلامی کا نام لیا جاسکتا ہے جو دیبل کے رہنے والے تھے اور محمد بن قاسم کے عہد میں مسلمان ہوئے تھے انہوں نے مسلمانوں کی طرف سے راجا داہر کے سامنے سفارت کے فرائض انجام دیے تھے۔

اس کے علاوہ وہ اکابر بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنہوں نے اپنے وطن سے باہر جا کر سندھ کے نام کو روشن کیا۔ ان میں ابو معشر سندھی، ان کے صاحبزادے ابو عبدالملک محمد بن ابی معشر، امام اوزاعی، حافظ ابو محمد خلف بن سالم، ابو العطا سندھی مشہور ہیں۔

باب:9

غزنوی عہد حکومت

۳۵۰ھ (۶۲-۹۶۱ء) تا ۵۹۱ھ (۹۵-۱۱۹۴ء)

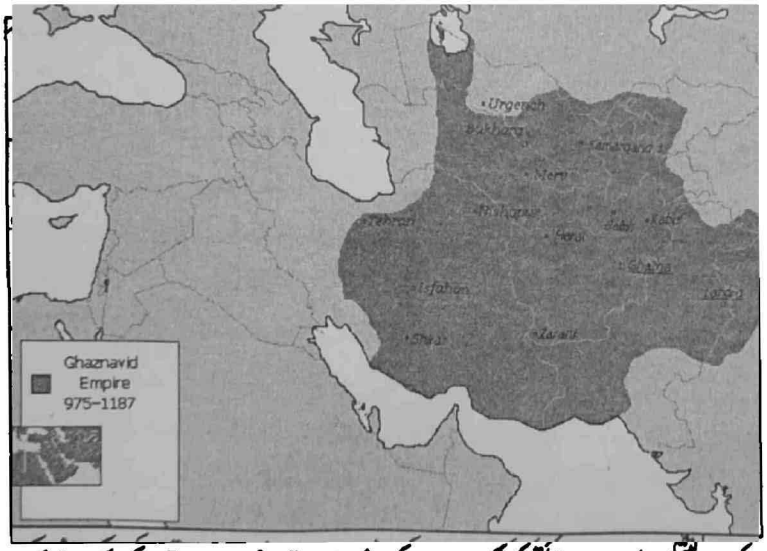

سامانی حکومت کے زمانے میں ۳۵۰ھ (۶۲-۹۶۱ء) میں جب ابو صالح منصور بن نوح تخت نشین ہوا تو غزنوی خاندان کا جلا اعلیٰ الپتگین جو منصور بن نوح کی تخت نشینی کے خلاف رائے دے چکا تھا اور اس وقت خراسان کا گورنر تھا خراسان سے غزنی چلا آیا جو اس زمانے میں ایک معمولی بستی تھی۔ یہاں آکر اس نے اپنی ایک خود مختار ریاست قائم کر کے حکومت شروع کر دی۔

۳۶۷ھ (۷۸-۹۷۷ء) میں الپتگین کا انتقال ہوا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا اسحاق غزنی کا فرمانروا ہوا مگر وہ اس قدر نااہل تھا کہ مجبوراً فوجی سرداروں نے اس کو معزول کر کے سبکتگین کو جو الپتگین کا سپہ سالار اور داماد بھی تھا غزنی کا فرمانروا بنایا۔ سبکتگین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ الپتگین کا غلام تھا۔ سبکتگین کا سلسلۂ نسب ایران کے بادشاہ یزد جرد سے ملتا ہے۔ بعض مورخین نے سبکتگین کو باپ کی طرف سے ترک اور ماں کی طرف سے ایرانی بتایا ہے۔ بہر حال حسب و نسب کے اعتبار سے وہ ایک شریف آدمی تھا۔ سبکتگین نے تقریباً بیس سال تک غزنی پر حکومت کی۔ اس نے شہر بیست کو فتح کیا جو غزنی سے کئی سو میل کے فاصلے پر تھا اور نصدار کو مطیع بنایا۔

ابو صالح منصور کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابو القاسم نوح بن منصور ثانی سامانی تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں نیشاپور اور ہرات کے عامل باغی ہو گئے۔ پھر نیشاپور کے عامل ابو علی نے ہرات کے عامل فائق کو شکست دے کر بھگا دیا اور تمام خراسان پر قبضہ کر کے اپنی ایک جداگانہ حکومت قائم کر لی، فائق شکست کھا کر دیلمیوں کے پاس پہنچا۔ فخر الدولہ دیلمی نے اپنا لشکر اس کے ساتھ بخارا پر چڑھائی کرنے کے لیے بھیج دیا جو سامانیوں کا دار السلطنت تھا، اُدھر بغرا خاں حاکم ترکستان نے موقع غنیمت سمجھ کر بخارا پر چڑھائی شروع کر دی۔ اس طرح نوح بن منصور تین دشمنوں میں گھر گیا۔ مجبوراً منصور ثانی نے سبکتگین کو اپنی مدد کے لیے خط لکھا۔ سبکتگین جو پہلے ہی سے خائف تھا کہ کہیں منصور ثانی غزنی پر چڑھائی نہ کر دے اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور غزنی سے فوج لے کر بخارا کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن اتفاق یہ ہے کہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی شاہ ترکستان بیمار ہو کر وفات پا چکا تھا اور اس کی فوج واپس جا چکی تھی۔ اب صرف دو دشمن تھے جو منصور ثانی کے مقابل میں صف آرا

تھے۔ ہرات کے قریب منصور ثانی اور سبکتگین نے مل کر ابو علی اور فائق اور فخر الدولہ کی فوجوں کو شکست دی۔ اس لڑائی میں سبکتگین کے ساتھ اس کا بیٹا محمود غزنوی بھی موجود تھا۔ اس لڑائی میں ابو علی مارا گیا اور فائق ترکستان کے نئے بادشاہ ایلک خان کے پاس چلا گیا۔

نوح بن منصور ثانی نے فتح کے بعد سبکتگین کو ناصر الدین اور اس کے بیٹے محمود کو سیف الدولہ کا خطاب دیا اور غزنی کی حکومت کے ساتھ ساتھ خراسان کا تمام ملک بھی سبکتگین کے سپرد کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب قرامطہ کا بہت زور تھا اور سبکتگین ان کے استیصال کی طرف متوجہ تھا۔ اُس وقت ملتان کا امیر شیخ حمید تھا جس کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔

۳۶۸ھ (۷۹-۹۷۸ء) میں جب سبکتگین نے کابل فتح کر کے ہندوستان کی سرحد پر حفاظتی انتظام شروع کیے۔ چونکہ غزنہ اور کابل کی سرحد لاہور اور ملتان سے ملی ہوئی تھی۔ اس وقت لاہور کا راجا جے پال بن ست پال تھا۔ وہ ملک گیری کے شوق میں غزنی کی جدید سلطنت کو ایک تر لقمہ سمجھ کر ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ لاہور سے پشاور اور وہاں سے جرود ہوتا ہوا سیلاب کی طرح بڑھا اور غزنہ کی سرحد پر حملہ آور ہوا۔ اس وقت سبکتگین اپنے بیٹے محمود کی مدد کے لیے نیشاپور گیا ہوا تھا جہاں دیلمیوں اور باغیوں نے محمود کو تنہا پا کر چڑھائی کر دی تھی۔ سبکتگین طوس کے قریب مصروف پیکار تھا کہ اُسے اچانک غزنہ پر جے پال کے حملے کا حال معلوم ہوا۔ سبکتگین طوس کے میدان میں فتح پا کر اپنے دارالسلطنت کو بچانے کے خیال سے فوراً واپس آیا۔ دونوں فریقین نبرد آزما ہوئے۔ یہ لڑائی ایک جشنے کے قریب ہوئی جو پرگنہ غزنی میں تھا لیکن جے پال کو شکست ہوئی۔ جب راجا جے پال نے اپنے آپ کو مجبور دیکھا تو اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے قصور کی معافی چاہی اور آئندہ اطاعت کا اقرار کیا اور وعدہ کیا کہ وہ پنجاب پہنچ کر بہت سا سونا چاندی بطور تاوان جنگ بھیجے گا۔ اس کے لیے وہ سبکتگین کے کچھ آدمیوں کو بھی ساتھ لے گیا تاکہ ان کے ہاتھ وہ تاوان جنگ روانہ کرے، لیکن جے پال نے دریائے سندھ کو عبور کرتے ہی بد عہدی شروع کر دی۔ ہندوستان کے دوسرے راجاؤں کو لڑائی کے لیے اکسایا اور سبکتگین کے آدمیوں کو قید کر لیا۔

۳۸۱ھ (۹۲-۹۹۱ء) میں جے پال اور سبکتگین کی دوسری جنگ ہوئی۔ اس وقت ملتان کا حاکم شیخ حمید تھا۔ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ اسماعیلی تھا اور ملتان کی یہ اسماعیلی حکومت فاطمیوں کے زیر اثر تھی۔ عباسی اور فاطمی حکومت کی چشمک ہونے کی وجہ سے اور قرب و جوار کے مسلم سرداروں پر عباسی حکومت کا اثر ہونے کی وجہ سے انہوں نے ہندو راجاؤں سے معاہدے کیے تھے۔ اس لیے غالب قیاس یہ ہے کہ شیخ حمید نے ہندو راجاؤں کا ساتھ دیا ہو گا یا احتیاط کے پیش نظر غیر جانبدار رہا ہو گا۔

۳۸۱ھ (۹۲-۹۹۱ء) یا ۳۸۲ھ میں سبکتگین نے ملتان کی طرف توجہ کی اور اُس نے شیخ حمید امیر ملتان سے باز پرس کی۔ شیخ حمید نے غزنی کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر سبکتگین سے صلح کر لی اور خراج دینا منظور کر لیا اور سبکتگین نے شیخ حمید ہی کو ملتان کی حکومت پر بحال رکھا۔ ۳۸۷ھ (۹۸-۹۹۷ء) میں سبکتگین نے وفات پائی اور اُس کا بیٹا محمود بن سبکتگین غزنی کے تخت پر بیٹھا۔

شیخ نصر:

یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ شیخ حمید کا بیٹا شیخ نصر تھا لیکن اس کا پتا نہیں چلتا کہ اُس نے ملتان میں حکومت کی بھی یا نہیں۔

محمود غزنوی

۲ نومبر ۹۷۱ء۔ ۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء

شیخ ابو الفتوح داؤد بن نصر:

۳۹۵ھ (۵-۱۰۰۴ء) میں ملتان کی سرحد سے متصل ایک ہندو ریاست بھاطیہ یا بھاطیہ تھی۔ اس ریاست کا راجا بجے رائے تھا۔ یہ راجا اپنے آپ کو خود مختار سمجھتا تھا۔ اسی زمانے میں بجے رائے نشۂ اقتدار میں مست ہو کر کسی معاملے میں غزنہ کے سرحدی حاکموں سے بد تمیزی سے پیش آیا۔ محمود غزنوی کو جب اس کا علم ہوا تو وہ ایک جرار لشکر لے کر ملتان سے گزرتا ہوا بھاطیہ پہنچا۔ بجے رائے نے ایک سخت مقابلے کے بعد فتح کے آثار نہ پا کر خودکشی کر لی۔ محمود اس ریاست کو فتح کر کے غزنہ واپس چلا آیا۔

اُس وقت ملتان کا امیر شیخ حمید کا پوتا شیخ ابو الفتوح داؤد بن نصر تھا۔ پہلے گزر چکا ہے کہ شیخ حمید نے سبکتگین سے معاہدہ صلح کر لیا تھا۔ اس معاہدے کی بنا پر اُس وقت جب کہ سلطان محمود بھاطیہ کے راجا سے لڑ رہا تھا فطرتاً سلطان محمود کو خیال تھا کہ بحیثیت ایک حلیف ہونے کے شیخ ابو الفتوح امیر ملتان اس کا ساتھ دے گا لیکن بجائے اس کے کہ وہ سلطان کا

ساتھ دیتا اور اپنی فوجیں اس کی امداد کے لیے بھیجتا شیخ ابو الفتوح نے بعض ایسی غیر وفادارانہ حرکتیں کیں کہ جس سے سلطان پر بے حد برا اثر ہوا۔ اس وقت تو سلطان نے شیخ ابو الفتوح سے کوئی تعارض نہیں کیا لیکن غزنہ واپس آنے کے بعد اُس نے ملتان پر حملے کی تیاری شروع کی۔ چنانچہ ۳۹۶ھ (۶-۱۰۰۵ء) میں وہ درّہ بولان کے قریبی راستے کو چھوڑ کر درۂ خیبر سے اس لیے روانہ ہوا تاکہ شیخ ابو الفتوح کو اس کا علم نہ ہو کہ وہ ملتان پر حملے کے لیے آرہا ہے۔ لاہور کا راجا اُس وقت جے پال کا بیٹا انندپال تھا۔ سلطان نے اسے اطلاع دی کہ ہم تمہارے علاقے سے سفر کرتے ہوئے گذریں گے۔ ہمارا مقصد ملتان پر حملہ کرنا ہے۔ ہم صرف تم سے راستہ چاہتے ہیں تاکہ ہم آسانی کے ساتھ ملتان چلے جائیں لیکن انندپال اس کے لیے تیار نہ ہوا اور جنگ کے لیے آمادہ ہو گیا حالانکہ انندپال بھی ملتان کے امیر کی طرح سلطان محمود کا باجگذار تھا۔

انندپال کے اس انکار کی وجہ بعض مؤرخین نے یہ لکھی ہے کہ سلطان محمود کے حملے کی خبر امیر ملتان کو بھی مل چکی تھی۔ وہ اس خبر کو سن کر بہت گھبرایا اور اس نے انندپال سے جس سے اس کا معاہدہ بھی تھا مدد چاہی۔ راجا انندپال نے کچھ تو ہمسائیگی اور کچھ اپنی سیاسی مصالح کی بنا پر امیر ملتان کی مدد ضروری سمجھی اور وہ فوج لے کر محمود کا راستہ روکنے کے لیے پشاور تک پہنچا۔ دونوں میں جنگ ہوئی اور انندپال شکست کھا کر بھاگا۔ غزنوی لشکر نے اس کا پیچھا دریائے چناب تک کیا۔ راجا نے جب یہ دیکھا کہ اب اس کے لیے کوئی راہ نہیں تو وہ بھاگ کر کشمیر کے درّوں میں داخل ہو گیا۔ سلطان محمود واپس ہو کر سیدھا ملتان آیا۔ شیخ ابو الفتوح کو انندپال کے انجام سے اپنے متعلق بھی بہت کچھ اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ فوراً ہی سلطان کی آمد کی خبر سن کر قلعہ بند ہو گیا۔ محمود نے فوراً قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ سات روز تک جاری رہا۔ آخر محمود کی خدمت میں شیخ ابو الفتوح نے عاجزانہ صلح کی درخواست کی اور معاہدہ کیا کہ وہ دو لاکھ درہم سالانہ بطور خراج غزنہ روانہ کرتا رہے گا اور غالباً اسی معاہدے میں یہ بھی طے پایا کہ ملتان کا ایک حصہ جو دریائے سندھ سے متصل تھا وہ سلطان کو دے دیا جائے۔

۳۹۹ھ (۹-۱۰۰۸ء) میں انندپال نے ہندوستانی راجاؤں کو متحد کر کے ایک لشکر جرار تیار کیا اور اس لشکر کو لے کر پشاور کے میدان میں خیمہ زن ہوا۔ ملتان کے امیر شیخ ابو الفتح داؤد بن نصر نے بھی انندپال کی طرف سے اس جنگ میں شرکت کی لیکن انندپال کی متحدہ فوج کو شکست ہوئی۔ امیر ملتان کے اس منافقانہ طرز عمل پر محمود کو بہت غصہ آیا لیکن مصلحتاً اس نے امیر ملتان سے باز پرس نہیں کی بلکہ وہ چاہتا تھا کہ وہ ملتان پر اچانک اس طریقے پر حملہ کرے کہ وہ بچ نہ سکے۔

چنانچہ ۴۰۱ھ (۱۱-۱۰۱۰ء) میں محمود نے غوریوں پر فتح حاصل کر کے ملتان پر ایک ایسا سخت حملہ کیا کہ ملتانیوں کو بالکل تیاری کا موقع نہ مل سکا۔ اُس نے ملتان کو فتح کر کے باغیوں کو سخت سزائیں دیں اور بڑی تعداد کو قید کر دیا۔ اُن ہی میں شیخ ابو الفتوح داؤد بن نصر بھی تھا جس کو وہ قید کر کے غزنہ لے گیا اور قلعہ غورک میں نظر بند کر دیا۔ وہیں اُس نے وفات پائی۔ صوبہ ملتان پر محمود نے قبضہ کر کے وہاں ایک حاکم مقرر کر دیا۔ سلطان محمود نے محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی جامع مسجد کو از سر نو آباد کیا جس کو جلم بن شیبان نے بند کرا دیا تھا اور جلم بن شیبان اسماعیلی کی بنوائی ہوئی مسجد کو بند کرا دیا۔

منصورہ کی اسماعیلی حکومت پر قبضہ:

پہلے گذر چکا ہے کہ ۳۷۵ھ (۸۶-۹۸۵ء) تک منصورہ میں ہباری سلطنت تھی اور یہ ابو داؤد ظاہر محدث کے مقلد تھے لیکن ۴۱۶ھ (۲۶-۱۰۲۵ء) میں جب ابن اثیر یہاں آیا ہے تو اُس کا بیان ہے کہ یہاں کے لوگ اسماعیلی قرامطہ تھے۔

اسماعیلی قرامطہ کی حکومت منصورہ میں کب اور کس طرح قائم ہوئی تاریخ اس کے متعلق خاموش ہے۔ صرف قیاس کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ۳۷۶ھ (۸۷-۹۸۶ء) سے ۳۹۶ھ (۶-۱۰۰۵ء) کے کسی درمیانی عرصے میں منصورہ میں یہ انقلاب اسماعیلی داعیوں کی وجہ سے آیا۔ دوسری صورت یہ ممکن ہے کہ شیخ ابو الفتوح داؤد بن نصر کی گرفتاری کے بعد اسماعیلیوں نے مجتمع ہو کر منصورہ پر قبضہ کر لیا ہو لیکن ہماری رائے میں پہلی صورت زیادہ قرین قیاس ہے۔

بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ ۴۱۶ھ (۲۶-۱۰۲۵ء) میں منصورہ میں اسماعیلیوں کی آزاد سلطنت قائم تھی۔ اسی زمانے میں محمود نے گجرات پر حملہ کیا۔ گجرات کا راجا محمود کی آمد کا حال سن کر کاٹھیاواڑ بھاگ گیا۔ محمود نے اُس کا تعاقب کیا۔ وہ وہاں سے کچھ کوٹ چلا گیا۔ محمود اس کا پیچھا کرتا ہوا وہاں بھی پہنچا۔ آخر اُس نے پہاڑوں میں پناہ لی۔ محمود فتح حاصل کر کے کچھ کے چھوٹے رن سے ہوتا ہوا سندھ واپس آیا۔ اسے راستے میں پانی نہ ملنے کی سخت تکلیف تھی اس لیے وہ دریائے سندھ کے کنارے ملتان جانا چاہتا تھا مگر چونکہ یہ راستہ منصورہ ہو کر گزرتا تھا، غالباً منصورہ کے اسماعیلی حاکم کو یہ ناگوار تھا کہ سلطان محمود منصورہ سے گزرے۔ خیال ہوتا ہے کہ درپردہ اس نے دریائے سندھ کے کنارے بسنے والے جاٹوں اور میدوں کو ورغلایا کہ وہ محمود کے لشکر پر چھاپے ماریں۔ چنانچہ جیسے ہی محمود سندھ کے علاقے میں داخل ہوا تو سلطان کو سندھ کے جاٹوں سے بہت تکلیف اُٹھانی پڑی اور اُس کے بہت سے آدمی اور جانور مارے گئے۔

جب سلطان محمود منصورہ کے قریب آیا تو اُسے شاید اندازہ ہوا کہ یہ سب کچھ منصورہ کے حاکم کے اشاروں پر ہو رہا ہے۔ اس نے اُسی وقت حاکم منصورہ سے نمٹ لینا چاہا اور منصورہ پر حملہ کر دیا۔ منصورہ کے لوگ سلطان محمود کے اس اچانک حملے کی تاب نہ لا سکے۔ شہر کے حاکم خفیف نے فرار ہو کر جھاڑیوں میں پناہ لی۔ سلطان محمود کو جب معلوم ہوا تو اس کا پیچھا کرتا ہوا اس جگہ تک پہنچا جہاں خفیف نے پناہ لی تھی۔ منصورہ کے بہت سے لوگ مارے گئے۔ کچھ دریا میں ڈوب گئے۔ اس سال کے واقعات کے ضمن میں ابن اثیر نے لکھا ہے کہ:

اور سلطان نے منصورہ کا قصد کیا۔ یہاں کا والی اسلام سے پھر گیا تھا۔ جب اس کو سلطان کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو شہر سے نکل کر جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ بہت سے آدمی مارے گئے اور بہت سے دریا میں ڈوب گئے۔ وہاں سے سلطان بھاٹیہ ہو کر غزنین چلا گیا۔[1]

سلطان محمود کے درباری شاعر حکیم فرخی سیستانی نے جو اس سفر میں اس کے ساتھ تھا ایک قصیدے میں اس سفر کے حالات نظم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

سلطان سومنات کے بعد کندہ (کنتھ کوٹ) کے قلعے پر حملہ آور ہوا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ پھر منصورہ پہنچا۔ وہاں کا امیر خفیف نامی تھا۔ وہ یہ سن کر منصورہ سے بھاگ نکلا حالانکہ اس کے پاس جنگی ہاتھی، لشکر، مال سب ہی کچھ موجود تھا۔[2]

فرخی کے بیان کے مطابق کہ منصورہ کے حاکم کا نام خفیف تھا ہمیں اس بات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے کہ ملتان کے اسماعیلی خالص عرب تھے اور منصورہ کے اسماعیلی سندھ کے باشندے تھے جو عرب و سندھ کی مخلوط نسل تھی اور جو ایک طویل عرصے سے سندھ میں آباد تھے کیونکہ یہ نام سندھی ناموں سے ملتا جلتا ہے۔

سندھی جاٹوں کا قلع قمع:

منصورہ کی فتح کے بعد سلطان محمود ملتان ہوتا ہوا غزنین چلا گیا لیکن اس نے اپنے دل میں یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ کسی وقت سندھ کے جاٹوں کا ضرور قلع قمع کرے گا تاکہ سندھ میں پھر کسی مخالف طاقت کے سر اٹھانے کا موقع باقی نہ رہے۔ چنانچہ ۴۱۸ھ (۲۸-۱۰۲۷ء) میں سلطان محمود ایک کثیر لشکر لے کر ملتان پہنچا اور اس نے حکم دیا کہ ایک ہزار چار سو کشتیاں اس قسم کی تیار کی جائیں کہ ہر ایک کشتی میں تین تین لوہے کے بڑے تیز برچھے ہوں۔ ہر ایک کے اگلے حصے میں ایک برچھا اور دائیں بائیں ایک برچھا لگایا جائے اور وہ اس قدر تیز ہوں کہ اگر سخت سے سخت چیز بھی ماری جائے تو وہ اس کو چیر دیں۔ جب وہ کشتیاں تیار ہو گئیں تو سلطان محمود نے ان کشتیوں کو دریائے سندھ میں ڈال کر حکم دیا کہ ہر ایک کشتی پر بیس بیس سپاہی سوار ہوں جو تیر و کمان، ڈھال اور نفط اندازی کے تمام سامان سے مسلح ہوں۔ اس طرح اس نے اٹھائیس ہزار فوج کو ان کشتیوں میں سوار کرایا اور باقی فوج کو دریائے سندھ کے دونوں بازوؤں سے پیدل روانہ ہونے کا حکم دیا۔

---

(1) تاریخ سندھ - مولانا ابو ظفر ندوی، ص ۲۷۳-۲۷۴ بحوالہ کامل ابن اثیر جلد ۹، ص ۱۱۹۔

(2) دیوان فرخی، ص ۷۴۔

سندھی جاٹوں کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے بال بچوں کو کشتیوں میں بٹھا کر کسی جزیرے میں محفوظ کر دیا اور خود چار ہزار یا آٹھ ہزار کشتیاں لے کر محمود کے مقابل ہوئے۔ جیسے ہی ان کی کشتیاں محمود کی کشتیوں کے مقابل ہوئیں تو سلطان محمود کی بحری فوج نے ان کشتیوں پر تیروں کی بارش شروع کر دی اور روغن نفط سے ان کی کشتیوں میں آگ لگا دی۔ اس پر بھی جو آگے بڑھے ان کی کشتیوں کو تیز آہنی شاخوں سے چیر کر دریا میں غرق کر دیا۔ سندھی جاٹ باوجود بہادری کے کثرت سے مارے گئے۔ ان کی کشتیاں غرق کر دی گئیں۔ جو بھاگ کر دریا کے کنارے پر اترے۔ محمود کی بری فوجوں نے ان کا صفایا کر دیا۔ سلطان محمود کی فوج ان جاٹوں سے لڑتی بھڑتی اس جزیرے میں پہنچ گئی جہاں انہوں نے اپنے بال بچوں کو محفوظ کر رکھا تھا۔ محمود کی فوجوں نے جزیرے میں داخل ہو کر سندھی جاٹوں کے اہل و عیال کو گرفتار کر لیا اور بہت سا مال غنیمت لے کر سلطان محمود اس جزیرے سے ملتان واپس آیا اور ۴۱۸ھ (۲۸-۱۰۲۷ء) ہی میں وہ غزنین واپس چلا گیا۔

اس طرح سندھ کے فتح کر لینے کے بعد بحر عرب سے لے کر ہمالیہ تک اور مشرق میں قنوج سے غزنین تک کا تمام ملک اس کے تحت آ گیا۔ ۴۲۱ھ (۳۱-۱۰۳۰ء) میں سلطان محمود نے وفات پائی۔

سلطان مسعود

سلطان محمود غزنوی کی وفات کے وقت اس کا بیٹا مسعود اصفہان میں اور دوسرا بیٹا محمد گرگان میں تھا۔ باپ کی وفات کی خبر سنتے ہی محمد پہلے غزنی پہنچا اور محمود کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اراکین سلطنت اس کی تخت نشینی کو دل سے ناپسند کرتے تھے مگر پچاس روز تک سب خاموش رہے۔ پچاسویں روز امیر ایاز نے جو لاہور سے غزنی آیا ہوا تھا دوسرے شاہی غلاموں کو اپنا ہم خیال کر کے اور سب سے قسمیں لے کر ایک اور امیر ابو الحسن علی بن عبداللہ معروف بہ علی دایہ کو اپنے موافق بنا کر شاہی طویلے سے زبردستی گھوڑے لے کر ایک جمعیت کے ساتھ امیر مسعود کو لانے کے لیے بھیجا۔ سلطان محمد کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اس نے سونے رائے ہندو سردار کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا جو سلطان محمود کے زمانے سے ہندو لشکر کا سردار تھا۔ امیر مسعود نے غزنی پر حملہ کر کے امیر محمد کو قید کر کے ایک قلعے میں نظر بند کر دیا اور خود تخت شاہی پر بیٹھا۔

سلطنت غزنی میں کیچ و مکران کا شمول:

سلطان محمود ہی کے زمانے میں ۴۲۲ھ (۳۱-۱۰۳۰ء) میں کیچ و مکران کا صوبہ دارالسلطنت غزنی میں شامل ہوا اور سلطان مسعود کے نام کا سکہ و خطبہ وہاں جاری ہوا۔

۴۲۶ھ (۳۵-۱۰۳۴ء) میں لاہور کے گورنر احمد نیالتگین پر بغاوت کا الزام لگا۔ سلطان مسعود نے صحیح حالات معلوم کرنے کے لیے ناتھ نامی ایک ہندو سپہ سالار کو مقرر کیا۔ ناتھ نے پنجاب آتے ہی احمد نیالتگین پر حملہ کر دیا، احمد نیالتگین نے مقابلہ کیا۔ اس لڑائی میں ناتھ مارا گیا۔ ناتھ کے مارے جانے کے بعد سلطان مسعود نے تلک نامی ایک ہندو سردار کو احمد نیالتگین کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ تلک نے ہندوستان آ کر احمد نیالتگین کو قتل کر دیا۔ ۴۲۹ھ (۳۸-۱۰۳۷ء) میں سلطان مسعود نے قلعہ ہانسی اور سونی پت کو فتح کرنے کے بعد اپنے بیٹے مجدود کو لاہور کا گورنر مقرر کیا اور ایاز کو اس کا اتالیق مقرر کیا۔

۴۳۱ھ (۴۰-۱۰۳۹ء) میں سرخس کے بیابان میں سلطان مسعود کو سلجوقیوں سے ایسی شکست ہوئی کہ اس نے ہمت ہار دی۔ غزنی پہنچ کر اس نے اس ارادے سے کہ وہ بجائے غزنی کے لاہور کو اپنا دارالسلطنت بنائے گا تمام مال اور خزانہ جمع کر کے ہندو لشکر کی نگرانی میں ہندوستان روانہ کیا۔ اراکین دولت اور اُمراء نے ہر چند اس خیال کی مخالفت کی مگر سلطان مسعود اپنے ارادے سے باز نہ آیا۔ غزنی سے چلتے وقت اس نے اپنے بھائی محمد کو بھی جو اندھا ہونے کے بعد قید خانے میں تھا اپنے ساتھ لے لیا۔ جب یہ دریائے جہلم کے کنارے پہنچا تو ہندو لشکر نے بغاوت کر کے تمام خزانہ لوٹ لیا۔ ساتھ ہی اس ہندو لشکر نے سلطان مسعود کو گرفتار کر کے اس کے بھائی محمد کو زبردستی تخت نشین بنا کر سلطان مسعود کو اس کے سامنے بطور مجرم کے پیش کیا۔ محمد نے مسعود کو قید کر دیا۔ ایک دن محمد کے بیٹے احمد نے اپنے باپ کی اجازت کے بغیر اپنے چچا مسعود کو قتل کر دیا۔

سلطان مسعود کا لڑکا مودود جو غزنی میں تھا باپ کا انتقام لینے کی غرض سے روانہ ہوا۔ اُدھر سلطان محمد بھی لڑائی کے لیے تیار ہو گیا۔ دونوں میں لڑائی ہوئی۔ محمد اور اس کا بیٹا احمد اس لڑائی میں مارے گئے۔ اس کے بعد مودود نے لاہور پر قبضہ کرنا چاہا۔ ایاز اور مجدود نے جو پہلے ہی سے لاہور پر قابض تھے مقابلے کی تیاری کی۔ مودود مصلحتاً اس وقت مقابلے کی طاقت نہ پا کر غزنی واپس چلا گیا۔

۴۳۳ھ (۴۲-۱۰۴۱ء) میں مودود ایک کثیر لشکر کے ساتھ لاہور پر حملہ آور ہوا۔ ابھی دونوں لشکروں میں مقابلہ شروع نہ ہوا تھا کہ مجدود اپنے خیمے میں پراسرار طریقے پر مردہ پایا گیا۔ کچھ دن کے بعد ایاز نے بھی وفات پائی۔ اب مودود نے آسانی سے تمام پنجاب پر قبضہ کر لیا۔

سندھ میں غزنوی عہد کے گورنر

سرہنگ خطیبی:

سرہنگ خطیبی بروی سلطان مسعود کے امرا میں سے تھا۔ بلند پایہ شاعر اور ادب نواز تھا۔ مسعود سعد نے بھی ایک قصیدہ خطیبی کے قصیدے کے جواب میں کہا ہے۔ سنائی نے بھی اس کی تعریف کی ہے۔ مختار غزنوی نے ۴۹۵ھ (۲-۱۱۰۱ء) تا ۴۹۸ھ (۵-۱۱۰۴ء) میں جو قصاید کہے ہیں اُن میں ہندوستان کی مختلف جنگوں میں اس کی بہادری اور شجاعت کو سراہا ہے۔ مختار غزنوی ہی کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ سرہنگ خطیبی سندھ کا بھی گورنر رہا تھا۔ وہ اس کو سندھ کی حکومت پر فائز ہونے کی مبارک باد دیتے ہوئے کہتا ہے:

ترا بجا کمی سند ہنیت چہ کنم
ہمہ ممالک مشرق سپردہ گیر بتو
کہ گشت ازہنرت ہند در زمانہ سمر
چو ہند بر تونو شتند، سند راچہ نظر

اسی قصیدے میں ان اشعار سے پہلے ایک شعر کہتا ہے کہ:

ہند و سند بہر تاختن چو ابر بہار
بجای آب، ہمی خون برانی اندر جر[1]

ابو نصر بن محمد:

۴۳۲ھ (۴۱-۱۰۴۰ء) تا ۴۴۱ھ (۵۰-۱۰۴۹ء) میں سلطان مسعود کے بیٹے شہزادے مودود نے غزنی پر قبضہ کرنے کے بعد ابو نصر بن محمد بن احمد کو لاہور کا گورنر مقرر کر کے سندھ اور ملتان کا صوبہ بھی اس کے حوالے کیا۔ ابو نصر گورنری کا جائزہ لیتے ہی تمام سندھ کا تفصیلی دورہ کر کے بانسی سے لے کر تھانیسر تک تمام علاقے کے نظم و نسق کو درست کر کے غزنی لوٹا۔ اس کے غزنی واپس ہونے کے بعد سندھیوں اور ملتانیوں نے بغاوت کی۔ اس کے علاوہ دہلی کے راجا نے بانسی سے تھانیسر تک قبضہ کرنے کے بعد نگر کوٹ پر بھی قبضہ کر لیا۔

ابو القاسم محمود:

۴۴۰ھ (۴۹-۱۰۴۸ء) میں سلطان مودود نے اپنے بیٹے ابو القاسم محمود کو سندھ کا گورنر مقرر کر کے لاہور روانہ کیا۔ اسی سال سلطان مودود کا کوتوال ابو علی سندھ، ملتان، پشاور اور کشمیر کے باغیوں کو شکست دے کر غزنی لوٹا۔ ۲۴ رجب ۴۴۱ھ (۵۰-۱۰۴۹ء) میں سلطان مودود نے وفات پائی اور اس کی جگہ اس کا بیٹا جو تین سال کا تھا تخت پر بٹھایا گیا مگر اراکین سلطنت نے اس بچے کو تخت پر سے اُتار کر سلطان علی بن مسعود کو تخت پر بٹھایا جس نے پشاور سے لے کر دیبل تک کے علاقے پر قبضہ جمایا۔

نوشتگین:

اُسی زمانے میں عبد الرزاق بن مہندی نے جس کو سلطان مودود نے سیستان کا گورنر مقرر کیا تھا، عبد الرشید بن محمود کو جو بست کے قلعے میں قید تھا آزاد کر کے غزنی کے تخت پر بٹھایا۔ ۴۴۳ھ (۵۲-۱۰۵۱ء) میں سلطان عبد الرشید نے ہندوستان اور سندھ کی حکومت نوشتگین کرخی کے سپرد کی۔

طغاتگین:

عبد الرشید بن محمود کی چار سال کی حکومت کے بعد فرخ زاد ابن مسعود چھ سال تک حکمران رہا۔ اس کے بعد ابراہیم بن مسعود تخت پر بیٹھا۔ ۴۸۱ھ (۸۹-۱۰۸۸ء) میں ابراہیم بن مسعود نے وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مسعود بن ابراہیم تخت پر بیٹھا۔ سلطان مسعود بن ابراہیم نے طغاتگین کو پنجاب اور سندھ کی حکومت حوالے کی۔ طغاتگین سندھ میں امن و امان قائم کرنے کے بعد گنگا کے اُس طرف چڑھائی کر کے بہت سا مال غنیمت لے کر لاہور لوٹا۔ ۵۰۸ھ (۱۱۱۴ء) میں سلطان مسعود بن ابراہیم نے وفات پائی۔

محمد باحلیم:

سلطان مسعود بن ابراہیم کے بعد اس کا بیٹا ارسلان شاہ بن مسعود تخت نشین ہوا۔ ارسلان نے سندھ اور پنجاب کی گورنری محمد باحلیم کے سپرد کی۔ ارسلان کے تخت نشین ہونے کے بعد اس کا بھائی بہرام شاہ بھاگ کر سلطان سنجر سلجوقی کے پاس گیا اور اپنے بھائی کے مقابلے کے لیے

---

[1] یادداشت جبی صاحب مدیر رسالہ سروش کراچی، بحوالہ دیوان مختار غزنوی طبع تہران، ص ۱۳۳۶ بسعی ہمایوں فرخ۔

اس سے مدد چاہی، سلطان سنجر نے غزنی پر فوج کشی کی۔ ارسلان شاہ شکست کھا کر ہندوستان بھاگ گیا۔ سنجر بہرام شاہ کو تخت نشین کر کے خود غزنی سے خراسان کی طرف لوٹ گیا۔ ارسلان شاہ نے ہندوستان سے بہت بڑا لشکر تیار کر کے غزنی پر چڑھائی کی۔ مگر بہرام شاہ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کے بعد بہرام شاہ نے ہندوستان پر متعدد مرتبہ حملے کیے اور یہاں کے تمام سرکشوں کو اپنا مطیع بنایا۔ بہرام شاہ کے زمانے میں محمد باھلیم نے دوبارہ بغاوت کی اور ملتان کے قریب ایک لڑائی میں مارا گیا۔[1]

حسین بن ابراہیم:

اس کے بعد بہرام شاہ حسین بن ابراہیم کو سندھ اور پنجاب کا گورنر مقرر کر کے غزنی لوٹا۔ ۵۴۷ھ (۵۳-۱۱۵۲ء) میں بہرام شاہ نے وفات پائی۔ بہرام شاہ کے بعد اُس کا بیٹا خسرو شاہ بن بہرام تخت نشین ہوا۔ چونکہ وہ علاء الدین حسین غوری کا مقابلہ نہ کر سکا اس لیے لاہور چلا آیا۔ اُس نے لاہور میں ۵۵۵ھ (۶۲-۱۱۶۱ء) میں وفات پائی۔

خسرو شاہ کے بعد اس کا بیٹا خسرو ملک لاہور میں تخت پر بیٹھا۔ یہ خاندان غزنوی کا آخری فرمانروا تھا۔ خسرو ملک نے ستائیس سال حکومت کی۔ ۵۸۳ھ (۸۸-۱۱۸۷ء) میں سلطان شہاب الدین غوری نے جب لاہور پر غلبہ پایا تو اس نے خسرو ملک کو گرفتار کر کے غزنی بھیج دیا۔ اس طرح سلطنت غزنوی کا خاتمہ ہو گیا۔

مؤرخین نے خاندان غزنوی کے زوال کا سبب سلجوقیوں کے حملے اور اُن کے ہندوؤں پر غیر معمولی اعتماد کو بتایا ہے۔

سندھ میں اردو زبان کی ابتدا:

سندھ میں عربوں کی فتوحات کے بعد سندھی زبان میں بہت سے عربی الفاظ شامل ہوئے۔ اس کے علاوہ آبلہ، سیراف اور شیراز کے جتنے بھی تاجر سندھ آتے تھے اُن کی زبان فارسی تھی۔ اس لیے ملتان، مکران اور منصورہ میں فارسی زبان تجارتی تعلقات کی وجہ سے کچھ نہ کچھ رائج تھی۔ منصورہ، ملتان اور مکران میں تجارتی کاروبار کے لیے فارسی زبان استعمال ہوتی تھی۔ عربوں میں یہ بھی رواج تھا کہ وہ جس ملک میں رہتے وہاں کی زبان کو عربی حروف میں لکھتے تھے۔ غزنوی حکومت کا قبضہ سندھ میں ۵۵۲ھ (۸۷-۱۱۸۶ء) تک رہا۔ غزنوی فوجوں میں افغان، ترکی، بلوچی، ایرانی اور ہندی سپاہی تھے۔ ان سب کے میل جول سے ایک نئی زبان نے جنم لیا۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ نئی زبان اردو زبان کی ابتدائی شکل ہو گی۔ اس کے علاوہ غزنوی دور کے شاعر حکیم سنائی، مسعود سعد سلیمان کے اشعار میں بھی ہمیں بعض ہندی الفاظ ملتے ہیں۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنی سلطنت میں جو بعض ہندوؤں کی ریاستیں باقی رکھی تھیں ان ریاستوں میں جو سلطان نے سکہ جاری کیا تھا اس سکے پر عبارت ہندی تھی۔

۴۱۳ھ (۲۳-۱۰۲۲ء) میں جب سلطان محمود نے قلعہ کالنجر کا محاصرہ کیا تو وہاں کے راجا نندا نے سوہا تھی اور ایک ہندی زبان میں قصیدہ لکھ کر سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ درباری علماء نے اس قصیدے کی تعریف کی۔ سلطان محمود نے خوش ہو کر راجا کا تمام مفتوحہ ملک اس کو واپس کر دیا۔ ان تمام قرائن سے پتا چلتا ہے کہ سندھ و ہند میں وقت کے تقاضوں کے مطابق ایک ایسی زبان کی داغ بیل پڑ رہی تھی کہ جسے اس ملک کے رہنے والے اور باہر سے آنے والے سب سمجھیں اور آسانی سے بول سکیں اور اس زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ کثرت سے ہوں تاکہ ہر جگہ کے لوگوں کو اس کے بولنے اور سمجھنے میں آسانی ہو۔ آج اردو کے مزاج اور اس کی خصوصیات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ وہی زبان ہو گی جس کی ابتدا سلطان محمود غزنوی کے عہد میں ہوئی۔

عہد غزنوی میں علوم و فنون اور اسلامی تبلیغ کا مرکز:

غزنوی سلاطین نے ہندوستان کے مقبوضہ علاقوں کا پایہ تخت لاہور کو بنایا تھا جو اُن کے عہد میں غزنی اور نیشاپور کی طرح علوم و فنون اور اسلامی تبلیغ کا مرکز بنا۔ شیخ اسماعیل پہلے مبلغ تھے جنہوں نے ۳۹۶ھ (۶-۱۰۰۵ء) میں لاہور میں اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ ہر جمعہ کے دن ان کا وعظ ہوتا تھا جس میں ہزاروں کی تعداد میں ہندو اسلام قبول کرتے تھے۔

شیخ اسماعیل کے بعد آخری غزنوی عہد میں جس بزرگ نے اس سرزمین کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے منور و تاباں بنایا وہ حضرت شیخ علی بن عثمان ہجویری (داتا گنج بخش) تھے جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ سلطان مسعود کے زمانے میں لاہور تشریف لائے۔ آب کوثر میں ہے کہ لاہور تشریف لانے کے بعد یہاں آپ نے ایک مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ کچھ دن تک درس دیتے رہے پھر تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ آپ کی تبلیغ سے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اُن میں سے ایک رائے راجو بھی تھا جو سلطان مودود ابن مسعود غزنوی کی طرف سے لاہور کا نائب تھا۔ اسلام لانے کے بعد آپ نے اس کا نام شیخ ہندی رکھا۔ اُسی کی اولاد سے آپ کے مزار کے خدام و مجاور ہیں۔[1]

---

[1] یہ تمام تفصیل تاریخ جنتہ السندھ - تالیف مولائی شیدائی، ص ۲۳۳-۲۳۵ سے ماخوذ ہے۔

[1] آب کوثر - ص ۸۶۔

باب: 10

سندھ میں غوری حکومت

۵۹۱ھ (۹۵-۱۱۹۴ء) تا ۶۰۲ھ (۶-۱۲۰۵ء)

ہرات کے مشرقی کوہستان میں غور ایک وسیع خطے کا نام ہے۔ محمود غزنوی نے اس علاقے کو فتح کر کے سلطنت غزنوی کا ایک صوبہ بنالیا تھا۔ غور کے باشندوں نے دوسری صدی ہجری کے شروع میں اسلام قبول کر لیا تھا اور یہاں سب افغان قومیں آباد تھیں۔ محمود غزنوی نے انہی افغانوں میں سے ایک افغان کو اس علاقے کا صوبے دار بنایا تھا۔ یہ صوبے داری اس خاندان میں نسلاً بعد نسل چلی آتی تھی۔ یہاں تک کہ بہرام شاہ غزنوی کے زمانے میں یہاں کا صوبے دار قطب الدین تھا۔ بہرام شاہ اور قطب الدین میں کسی بات پر اختلاف پیدا ہوا اور نوبت لڑائی تک پہنچی۔ اس لڑائی میں قطب الدین مارا گیا۔ قطب الدین کے بھائی سیف الدین نے اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لیے غزنی پر حملہ کیا اور بہرام شاہ کو غزنی سے نکال کر خود غزنی پر قابض ہو گیا۔ بہرام نے کچھ دن کے بعد اطراف سے فوجیں جمع کر کے غزنی پر حملہ کیا اور سیف الدین کو گرفتار کر کے نہایت بے دردی سے قتل کر دیا۔ سیف الدین کے تیسرے بھائی علاء الدین غوری کو جب اس کا علم ہوا تو وہ اپنے دونوں بھائیوں کا بدلہ لینے کے لیے غزنی پر حملہ آور ہوا۔ بہرام غزنوی نے اگرچہ اسے مختلف لالچ دے کر واپس کرنا چاہا لیکن اس کی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور علاء الدین نے غزنی پر حملہ کر کے غزنی کو فتح کر لیا۔ بہرام غزنی سے جان بچا کر ہندوستان کی طرف بھاگ گیا۔ علاء الدین غوری نے اپنے بھائیوں کے انتقام میں مشتعل ہو کر غزنی میں قتل عام کرایا، سلاطین غزنوی کے بعض مقبروں کو مسمار کرا دیا اور مکانوں کو آگ لگا دی۔ تقریباً ایک ہفتے تک قتل و خوں ریزی کا بازار گرم رہا جس کی بنا پر یہ علاء الدین جہانسوز کے لقب سے مشہور ہوا۔

۵۳۷ھ (۴۳-۱۱۴۲ء) میں علاء الدین جہاں سوز نے غزنی کو فتح

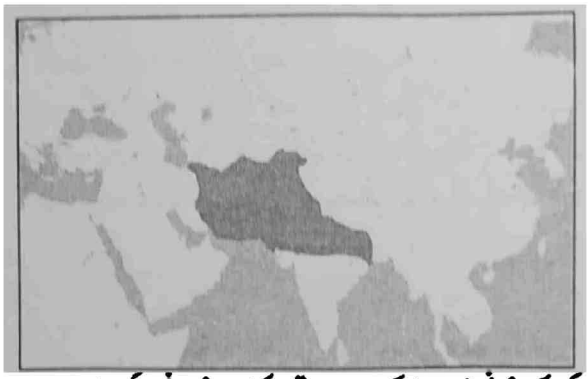

کر کے غزنی میں اپنا ایک نائب مقرر کیا اور خود غور کی جانب اپنے دارالحکومت فیروز کوہ چلا گیا۔ اس طرح غزنی حکومت غوریہ کا ایک صوبہ بن گیا لیکن دوسرے سال سلطان سنجر سلجوقی نے غور اور غزنی کو فتح کر کے پھر بہرام غزنوی کو اپنی طرف سے غزنی کا حاکم بنا دیا اور علاء الدین جہاں سوز کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گیا لیکن چند روز کے بعد سلطان سنجر سلجوقی نے علاء الدین جہاں سوز کی قابلیتوں اور غیر معمولی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر نہ صرف اس کو رہا کر دیا بلکہ غور کا حاکم بنا دیا۔

علاء الدین جہاں سوز

ترکان غز نے جب سلطان سنجر کو قید کر لیا تو علاء الدین جہاں سوز غور کا مستقل اور خود مختار بادشاہ ہو گیا اور اس نے بہرام کو غزنی سے بے دخل کر کے غزنی پر بھی قبضہ کر لیا۔ سلطان علاء الدین جہاں سوز خاندان غوری کا سب سے پہلا خود مختار بادشاہ تھا۔ علاء الدین نے ۵۵۱ھ (-۱۱۵۶ ۵۷ء) میں وفات پائی۔

سیف الدین ثانی

علاء الدین جہاں سوز کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا سیف الدین ثانی تخت پر بیٹھا۔ ڈیڑھ سال حکومت کرنے کے بعد ترکان غز کے ہاتھوں ایک لڑائی میں مارا گیا۔

غیاث الدین غوری

۵۵۲ھ (۵۸-۱۱۵۷ء) میں علاء الدین کا بھتیجا شمس الدین ابن بہاء الدین سام تخت نشین ہوا۔ اس کا لقب غیاث الدین تھا۔ اس کا بھائی شہاب الدین غوری اس وقت بامیان میں تھا۔ شہاب الدین بھائی کی تخت نشینی کی خبر سن کر فوراً بامیان سے فیروز کوہ پہنچا۔ دونوں بھائیوں میں بڑی محبت تھی۔ غیاث الدین نے شہاب الدین کو اپنے کاروبار سلطنت میں شریک کر لیا۔ غیاث الدین اور شہاب الدین دونوں بھائی بڑے اتفاق و محبت سے رہتے تھے اور دونوں ملک میں بادشاہ سمجھے جاتے تھے مگر باوجود

سلطان غیاث الدین غوری شہنشاہ افغان (۵۵۸ ھ۔ق)

Sultan Ghiassuddine le Ghouride
Empereur Afghan (1192)

اس کے شہاب الدین غوری اپنے بھائی غیاث الدین غوری کو اپنا آقا سمجھتا تھا اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کو اپنا فرض جانتا تھا۔ دونوں بھائیوں نے مل کر بغاوتوں کو فرو کر کے حکومت و سلطنت کو مستحکم بنایا۔ جب سلطنت مستحکم ہو گئی تو غیاث الدین نے اپنے بھائی شہاب الدین کو تگین آباد اور گرم سیر کے علاقے کا حاکم مقرر کیا۔ سلطان شہاب الدین تگین آباد سے بار بار غزنی پر حملہ کرتا رہتا تھا جو اس وقت ترکان غز کے قبضے میں تھا۔ آخر صاحب تاریخ مبارک شاہی کے بیان کے مطابق ۵۶۹ھ (۱۱۷۳-۷۴ء) میں سلطان غیاث الدین نے غزنی کو فتح کر کے اپنے بھائی شہاب الدین کو غزنی کے تخت پر بٹھا کر اس کا لقب سلطان معزالدین قرار دیا۔ اس طرح دونوں بھائی علیحدہ علیحدہ مستقل فرمانروا ہو گئے لیکن شہاب الدین نے مستقل بادشاہ ہونے کے بعد بھی ہمیشہ اپنے بھائی کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھا۔ سلطان غیاث الدین نے ۵۹۹ھ (۱۲۰۲-۳ء) تک حکومت کی اور ۵۹۹ھ (۱۲۰۲-۳ء) میں وفات پائی۔

سلطان شہاب الدین غوری

سلطان غیاث الدین غوری کی وفات کے بعد ۵۹۹ھ (۱۲۰۲-۳ء) میں اس کی جگہ فیروز کوہ میں اس کا بھائی شہاب الدین غوری تخت نشین ہوا۔

فتح ملتان:

وہ اپنے بھائی ہی کی زندگی میں جب کہ وہ غزنی کا حاکم تھا ۵۷۱ھ (۱۱۷۵-۷۶ء) میں اُچ اور ملتان کو فتح کر چکا تھا۔ ملتان اور اُچ کو فتح کرنے کے بعد وہ اپنے سپہ سالار علی کرماخ کو ان علاقوں کا گورنر مقرر کر کے غزنی لوٹ گیا تھا۔[1]

تسخیر سندھ:

اسی زمانے میں اُس نے اپنے ایک فوجی افسر قطب الدین ایبک کو فوج کے ساتھ مقرر کیا تھا کہ وہ سندھ کو فتح کرے۔ چنانچہ قطب الدین ایبک تین ماہ میں سندھ کو فتح کر کے اور سیف الملوک کو وہاں کا حاکم بنا کر دہلی چلا گیا۔[2]

---

(1) تاریخ مبارک شاہی۔
(2) تاریخ سندھ۔ معصومی، ص ۳۴۔

سلطان شہاب الدین محمد غوری

اسی زمانے میں سلطان شہاب الدین نے ملتان سے فوجیں تیار کر کے ہندوستان پر حملہ شروع کیا اور مختلف شہروں اور قلعوں کو فتح کرتا ہوا دہلی پر قابض ہو گیا۔ دہلی کو فتح کرنے کے بعد اُس نے وہاں اپنا قائم مقام قطب الدین ایبک کو بنایا اور خود عازم خراسان ہوا۔ اسی اثنا میں اسے اپنے بھائی سلطان غیاث الدین کی وفات کی خبر ملی۔ وہ فوراً ہی غزنی پہنچا اور زمام حکومت سنبھالتے ہی اُس نے اپنے بھتیجوں اور رشتے داروں کو خراسان، ایران اور افغانستان وغیرہ کے علاقوں پر حاکم مقرر کیا۔ خوارزم شاہیوں اور غوریوں میں ایک طویل عرصے سے اختلاف چلا آتا تھا۔ غیاث الدین کی وفات کے بعد ہی اس موقع کو غنیمت سمجھ کر خوارزم شاہیوں نے حملے شروع کر دیے۔ سلطان شہاب الدین نے ان کی مدافعت شروع کی۔ خوارزم شاہیوں کے ہاتھوں ایک لڑائی میں سلطان شہاب الدین فیروز کوہ واپس ہوا۔ اس موقع سے شرارت پسندوں اور فتنہ پردازوں نے فائدہ اٹھا کر سلطان کی وفات کی خبر مشہور کر دی جس سے پنجاب اور ملتان میں شورش پسندوں اور ملاحدہ نے بغاوت پیدا کر دی۔ ۶۰۱ھ (۵-۱۲۰۴ء) میں سلطان شہاب الدین نے خوارزم شاہیوں کے مقابلے کو مؤخر کر کے ضروری سمجھا کہ وہ پہلے پنجاب و ملتان کی بغاوت کو فرو کرے۔ چنانچہ وہ فوراً ہی ملتان پہنچا اور ملتان کی بغاوت کو فرو کر کے باغیوں کو سخت سزائیں دیں۔ پھر وہ شمالی اور مغربی پنجاب کے اضلاع کی طرف متوجہ ہوا۔ جہاں گھگڑوں یا کھوکھروں نے فساد برپا کر رکھا تھا۔ سلطان نے ان کو سخت سزائیں دیں اور اس علاقے کے امن و امان کو بحال کر کے غزنی کی طرف لوٹا۔ واپسی میں جب وہ اپنے لشکر کے ساتھ دمیک میں جو پنجاب کے ضلع جہلم میں واقع تھا خیمہ زن ہوا تو رات کے وقت چند ملاحدہ جو سلطانی لشکر میں اپنے عقائد کو چھپا کر ملے ہوئے تھے، شاہی خیمے کو چاک کر کے اندر داخل ہوئے اور سلطان شہاب الدین کو شہید کر دیا۔ یہ واقعہ ۳ شعبان ۶۰۲ھ (۱۲۰۶ء) میں پیش آیا۔ سلطان شہاب الدین کی شہادت کے وقت سندھ و گجرات سے لے کر بنگال و آسام تک مسلمانوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔[1]

---

[1] تاریخ معصومی، ص ۳۴ و آئینہ حقیقت نما، ص ۳۲۲۔

باب:11

سندھ میں خاندان غلاماں کی حکومت

قطب الدین ایبک

۶۰۲ھ (۶-۱۲۰۵ء) تا ۶۰۷ھ (۱۱-۱۲۱۰ء)

سلطان شہاب الدین کی وفات کو بعد ہندوستان کی حکومت کا غزنی سے تعلق منقطع ہو کر ہندوستان میں ایک خود مختار اور آزاد سلطنت قائم ہوئی۔ یہ حکومت خاندان غلاماں سے موسوم ہوئی اور اس کا پہلا فرمانروا قطب الدین ایبک تھا۔

سلطان شہاب الدین کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ اس نے اپنے غلاموں کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کیا تھا اس لیے اس کی شہادت کے بعد اس کے غلام قطب الدین ایبک، تاج الدین یلدوز اور ناصر الدین قباچہ یہ سب کے سب جو اس کے غلام تھے حکومت سے فرمانروائی کے مرتبے کو پہنچے۔

چنانچہ تاج الدین یلدوز کو غزنی کی، ناصر الدین قباچہ کو سندھ اور ملتان اور قطب الدین ایبک کو لاہور اور دہلی کی حکومت ملی۔

سلطان شہاب الدین غوری کے بعد اس کے بھتیجے سلطان محمود نے جو فیروز کوہ میں تخت نشین ہوا تھا قطب الدین ایبک کے پاس ایک فرمان اور خلعت روانہ کی۔ فرمان میں اس کو سلطان کے لقب سے سرفراز کیا گیا تھا اور ہندوستان کی حکومت مستقلاً اس کے سپرد کی گئی تھی، اس فرمان کے آنے کے بعد ماہ ذیقعدہ ۶۰۲ھ (۱۲۰۷ء) میں قطب الدین ایبک نے دہلی سے لاہور آکر مراسم تخت نشینی ادا کئے اور وہ ہندوستان کا مستقل اور خود مختار فرمانروا قرار پایا اور اسی طرح تاج الدین یلدوز غزنی کا بادشاہ ہوا۔[1]

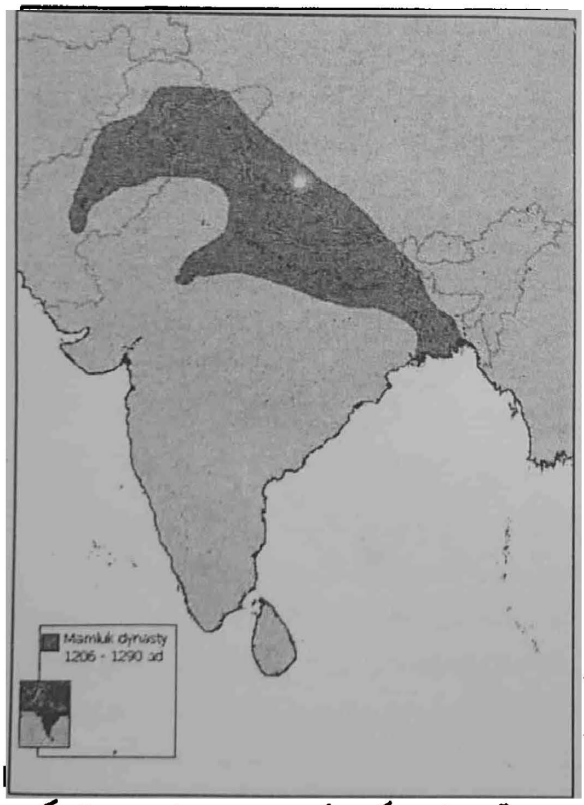

قطب الدین ایبک نے سندھ اور ہندوستان پر ۶۰۷ھ تک حکومت کی۔ ۶۰۷ھ میں سلطان قطب الدین نے چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر وفات پائی۔

ناصر الدین قباچہ:

قطب الدین ایبک کی شادی تاج الدین یلدوز کی لڑکی سے ہوئی تھی اور قطب الدین کی ایک لڑکی کی شادی سلطان شہاب الدین غوری

---

[1] جنت السندھ - مولف مولائی شیدائی، ۲۵۸۔

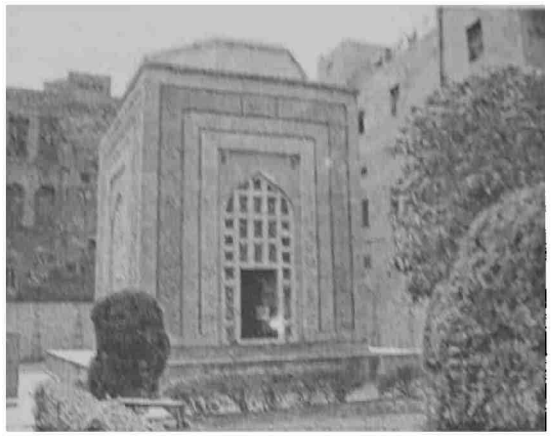

لاہور میں قطب الدین ایبک کا مزار

کے غلام ناصر الدین قباچہ سے اور دوسری لڑکی کی شادی قطب الدین ایبک کے غلام شمس الدین التمش سے ہوئی تھی۔

تاریخ فرشتہ جلد دوم میں ہے کہ ناصر الدین قباچہ سلطان شہاب الدین کا غلام تھا جو نہایت ہی بہادر، ذہین و فہیم تھا اور ایک عرصے تک سلطان شہاب الدین غوری کی خدمت میں رہ کر امور سلطنت و کشور کشائی کا تجربہ بھی حاصل کر چکا تھا۔ سلطان شہاب الدین نے حاکم اُچ کی وفات کے بعد اُچ کی حکومت ناصر الدین قباچہ کے سپرد کی تھی۔ ناصر الدین قباچہ کے نکاح میں قطب الدین ایبک کی دو لڑکیاں یکے بعد دیگرے آئی تھیں لیکن ناصر الدین قباچہ چونکہ سلطان شہاب الدین کے فرمان کے مطابق قطب الدین ایبک کے تحت تھا اس لیے وہ اپنی حکومت کو قطب الدین ایبک کی منشا کے مطابق چلاتا تھا اور وہ کبھی کبھی اُچ سے سلطان قطب الدین ایبک کی خدمت میں دہلی آتا تھا۔

ناصر الدین قباچہ کا سندھ اور ملتان پر مستقل قبضہ:

سلطان قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد اُمرائے سلطنت نے ۶۰۷ھ (۱۱-۱۲۱۰ء) میں اس کے بیٹے آرام شاہ کو دہلی میں تخت نشین کیا لیکن آرام شاہ میں حکومت کی قابلیت نہ تھی۔ اسی زمانے میں ناصر الدین قباچہ نے ملتان اور سندھ کے بقیہ حصے اور قلعوں کو فتح کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان اور سلطان کا لقب اختیار کیا اور اس طرح اس نے سندھ اور ملتان کی حکومت کو شاہان دہلی سے علیحدہ کر کے ایک مستقل سلطنت قائم کر لی اور اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا۔

غزنی کے فرمانروا تاج الدین یلدوز نے متعدد مرتبہ اس کے ملک پر قبضہ جمانے کے لیے غزنی سے فوجیں روانہ کیں لیکن ہر مرتبہ ناکام رہا۔[1]

طبقات ناصری میں ہے کہ سلطان قطب الدین کی وفات کے بعد ۶۰۷ھ (۱۱-۱۲۱۰ء) میں ناصر الدین قباچہ اُچ اور ملتان کی طرف گیا اور ملتان پر قبضہ کر کے ہندوستان اور دیبل کے علاقے اور سندھ کے دوسرے شہروں، قصبوں اور قلعوں کو اپنے قبضے میں لے کر وہاں کا مستقل فرمانروا ہو گیا۔ اُس نے متعدد مرتبہ تاج الدین یلدوز کے لشکر کو بھی جو غزنی سے آکر اس کے ملک پر حملہ آور ہوتا تھا شکستیں دیں۔ سندھ کا خود مختار فرمانروا ہونے اور کفار چین کے حوادث کے بعد غور و غزنی اور خراسان کے بہت سے اکابر اس سے وابستہ ہو گئے اور ناصر الدین قباچہ نے بھی ان کو بیش بہا انعام و اکرام سے نوازا۔[2]

آرام شاہ کی نااہلی اور بد نظمی کی وجہ سے ہندوستان کی سلطنت چار حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ بنگال میں حسام الدین عوض خود مختار بن بیٹھا۔ تاج الدین یلدوز نے غزنی سے پنجاب پر حملہ آور ہو کر تمام پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ سندھ اور ملتان اور اُچ پر ناصر الدین قباچہ نے قبضہ جمایا اور صرف صوبہ آگرہ و اودھ آرام شاہ کے قبضے میں رہا۔ اُمرائے سلطنت نے یہ طوائف الملوکی دیکھ کر شمس الدین التمش کو جو اس وقت بدایوں کا حاکم تھا بلوا کر اور آرام شاہ کو معزول کر کے شمس الدین التمش کو اس کی جگہ تخت نشین کیا۔ آرام شاہ اپنی نااہلی کی وجہ سے ایک سال سے زیادہ حکومت نہ کر سکا۔

شمس الدین التمش

۶۰۷ھ (۱۱-۱۲۱۰ء)

شمس الدین التمش قطب الدین ایبک کا غلام اور اُس کا داماد تھا جو ۶۰۷ھ (۱۱-۱۲۱۰ء) میں آرام شاہ کی معزولی کے بعد دہلی میں تخت نشین ہوا۔ وہ ابھی پنجاب کو تاج الدین یلدوز کے قبضے سے نکالنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ تاج الدین یلدوز نے دہلی کی طرف فوج کشی کی۔ شمس

---

(1) تاریخ فرشتہ جلد دوم - ذکر حکومت ناصر الدین قباچہ، ص ۶۱۰-۶۰۹۔

(2) طبقات ناصری، ص ۵۶-۵۷۔

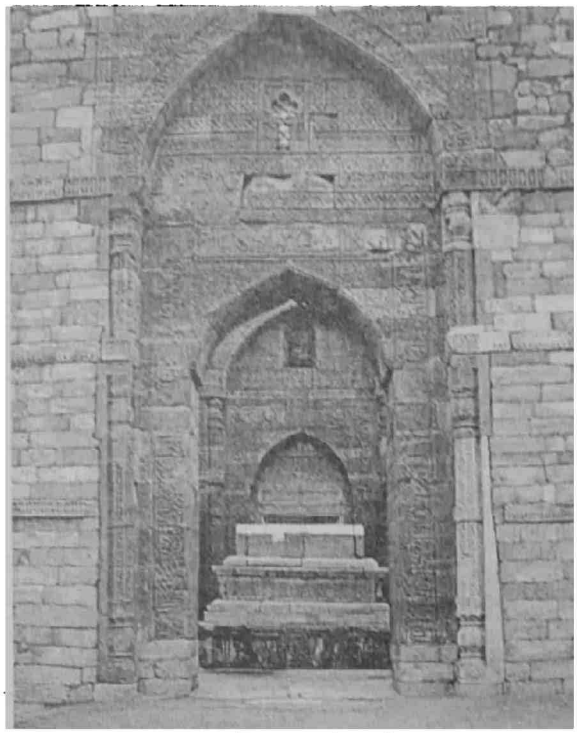

دھلی میں شمس الدین التمش کا مزار

الدین التمش نے بڑھ کر تراوری میں اس کا مقابلہ کیا۔ اس لڑائی میں تاج الدین یلدوز کو شکست ہوئی اور وہ التمش کے ہاتھوں گرفتار ہو کر بدایوں میں قید کر دیا گیا۔ وہیں اس نے وفات پائی۔[1]

۶۱۴ھ (۱۸-۱۲۱۷ء) میں ناصر الدین قباچہ نے پنجاب پر حملہ کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا اور سربند تک علاقے کو فتح کر لیا لیکن شمس الدین التمش نے اُسے شکست دے کر ملتان کی طرف بھگا دیا۔

۶۱۸ھ (۲۲-۱۲۲۱ء) میں سلطان جلال الدین خوارزم چنگیز خان سے شکست کھا کر دریائے سندھ کو گھوڑے سے عبور کر کے سندھ آیا۔ اس نے ناصر الدین قباچہ اور سلطان شمس الدین التمش سے مدد چاہی لیکن دونوں نے اسے ناامید کر دیا۔ جلال الدین مایوس ہو کر جب واپس ہونے لگا تو اس نے شہر اُچ میں آگ لگا دی اور راستے میں جو بھی سندھ کا شہر اور قصبہ اس کو ملا جس کا تعلق ناصر الدین قباچہ سے تھا اُس کو برباد کرتا ہوا وہ کیچ و مکران کے راستے سے عراق چلا گیا۔[2]

(1) آئینہ حقیقت نما جلد اول۔

(2) تاریخ فرشتہ، جلد دوم۔ ص ۶۱۴۔

ملتان پر کفار مغول کا حملہ:

چنگیز خان کا بیٹا چغتائی خان جو مغلوں کے ایک لشکر کے ساتھ سلطان جلال الدین کا تعاقب کر رہا تھا ملتان پہنچا اور ملتان کا محاصرہ کر لیا۔ ناصر الدین قباچہ نے یہ دیکھ کر کہ وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ بجائے اس کے کہ مغلوں کا مقابلہ کرے وہ اپنے آپ کو قلعے میں محصور رکھے۔ مثل چالیس روز تک ملتان کا محاصرہ کیے پڑے رہے۔ ناصر الدین قباچہ نے اس نازک وقت میں بڑی دانشمندی سے کام لیا، دوران محاصرے میں رعایا کے آرام و آسائش کے لیے بے دریغ روپیہ خرچ کیا اور نہایت ہی استقلال و پامردی سے محاصرے کی صعوبتوں اور شدائد کا مقابلہ کیا۔ آخر مغلوں نے تنگ آ کر چالیس روز کے بعد محاصرہ اٹھا لیا اور چغتائی خان اپنے لشکر کے ساتھ کیچ و مکران کی طرف چلا گیا۔[3]

ملک خاں خلجی کا بلاد سیوستان پر قبضہ:

۶۲۳ھ (۲۷-۱۲۲۶ء) میں ملک خاں خلجی نے منصورہ کی اراضی اور سیوستان کے دوسرے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ سلطان ناصر الدین قباچہ فوراً ہی اس کی مدافعت کی طرف متوجہ ہوا اور ایک سخت لڑائی کے بعد ملک خلج خان منہزم ہو کر مارا گیا۔ خلج خان کو شکست دینے کے بعد ناصر الدین قباچہ ملتان اور اُچ کی طرف لوٹ آیا۔[4]

حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی سلطان التمش کی حمایت:

قباچہ ہی کے زمانے میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ملتان میں مقیم تھے۔ سلطان شمس الدین التمش جو ناصر الدین قباچہ کا حریف تھا چونکہ نہایت عابد و زاہد اور متقی انسان تھا اور اولیا اللہ میں شمار کیا جاتا تھا اس لیے حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا رجحان قلبی اس کی طرف تھا۔ سلطان ناصر الدین قباچہ نے التمش کی بڑھتی ہوئی قوت و شوکت کو دیکھ کر اس کے خلاف خفیہ سازش شروع کی۔ اس کی اس سازش کو حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی اور ملتان کے قاضی مولانا شرف الدین اصفہانی نے پسند نہ کیا۔ قاضی شرف الدین نے دین کی فلاح اس میں دیکھی کہ وہ سلطان التمش کو قباچہ کی سازش سے مطلع کر دیں۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا بھی اس معاملے میں اُن کے ہم خیال تھے۔ دونوں

(3) تاریخ فرشتہ۔ جلد دوم، ص ۶۱۴ و تاریخ معصومی، ص ۳۶۔

(4) طبقات ناصری، ص ۵۶-۵۷۔

نے علیحدہ علیحدہ التمش کو خطوط لکھے لیکن اتفاق سے ان دونوں بزرگوں کے خطوط قباچہ کے آدمیوں کے ہاتھ لگ گئے۔ قباچہ ان خطوط کو پڑھ کر نہایت مشتعل ہوا اور دونوں کو طلب کیا۔ جب یہ دونوں اُس کی مجلس میں تشریف لے گئے تو قباچہ نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کو اپنی داہنی طرف بٹھایا اور قاضی شرف الدین کو اپنے سامنے بٹھایا اور اُن کا خط اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔ قاضی شرف الدین خط کو پڑھ کر خاموش ہو گئے۔ قباچہ نے جلاد کو حکم دیا کہ اسی وقت ان کا سر قلم کر دیا جائے۔ جلاد نے فوراً ہی ان کو شہید کر دیا۔ اسی طرح حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا خط اُن کے ہاتھ میں دیا گیا، آپ نے وہ خط پڑھ کر فرمایا بیشک یہ میرا خط ہے مگر میں نے خدائے تعالیٰ کے حکم سے لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے۔ یہ سن کر قباچہ کانپ اٹھا اور اس نے آپ سے معافی چاہی اور آپ کو نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔[1]

التمش کی سندھ اور ملتان پر فوج کشی:

۶۲۴ھ (۱۲۲۹ء) میں سلطان شمس الدین التمش نے ناصر الدین قباچہ کی سرکوبی کے لیے سندھ اور ملتان پر فوج کشی کی۔ جب وہ ناصر الدین قباچہ کے پایہ تخت اُچ کے قریب پہنچا ناصر الدین قباچہ نے یہ خبر سن کر اپنے وزیر عین الملک حسین اشعری کو حکم دے کر کہ وہ تمام خزانہ جو قلعہ اُچ میں ہے قلعہ بھکر میں منتقل کر دے خود قلعہ بھکر کی طرف بھاگ گیا۔

سلطان شمس الدین التمش نے پہلے اپنے مقدمتہ الجیش کو اپنے دو سرداروں ملک عزالدین محمد اور کزلخان کے ساتھ اُچ روانہ کیا۔ اس کے چار روز کے بعد سلطان التمش خود اپنے لشکر اور ہاتھیوں کے ساتھ اُچ پہنچا۔ چونکہ ناصر الدین قباچہ فرار ہو چکا تھا اس لیے سلطان التمش نے اپنے وزیر نظام الملک محمد بن اسعد کو اس کے تعاقب میں قلعہ بھکر کی طرف بھیجا اور خود ایک ماہ تک قلعہ اُچ کا محاصرہ کر کے جنگ کرتا رہا۔ نظام الملک قلعہ بھکر کا محاصرہ کر کے واپس ہوا۔ سلطان التمش قلعہ اُچ کی تسخیر اس کو تفویض کر کے خود دہلی لوٹ گیا۔ نظام الملک وزیر نے دو ماہ میں یوم شنبہ ۲۷ ماہ جمادی الثانی ۶۲۵ھ (۱۲۲۸ء) کو قلعہ اُچ فتح کر لیا۔[2]

ناصر الدین قباچہ کی غرقابی:

تاریخ فرشتہ میں ہے کہ نظام الملک وزیر نے قلعہ اُچ کو فتح کرنے کے بعد قلعہ بھکر کا رخ کیا۔ ناصر الدین قباچہ کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کا آفتاب اقبال زوال پذیر ہے اور کوئی کوشش اب اس کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے چند رشتے داروں اور عزیزوں کے ساتھ زر و جواہر اور اشرفیوں کو صندوقوں میں بھروا کر کسی قریبی جزیرے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ اتفاقاً اس کی کشتی جس میں وہ سوار تھا غرق ہو گئی۔ باقی کشتیاں منزل مقصود پر سلامت پہنچیں۔[3]

لیکن طبقات ناصری میں ہے کہ وہ قلعہ اُچ کی فتح کی خبر سن کر دریائے سندھ میں ڈوب کر مر گیا۔ اس نے چند روز پہلے اپنے لڑکے ملک علاء الدین بہرام شاہ کو سلطان التمش کی خدمت میں بھجوایا تھا۔ ناصر الدین قباچہ کی سندھ اور ملتان میں مدت حکومت بائیس سال تھی۔[4]

ناصر الدین قباچہ کی وفات کے بعد اس کی دولت اور خزانہ سلطان التمش کے پاس روانہ کیا گیا اور سلطان شمس الدین التمش نے بندرگاہ دیبل سے تمام ملک اپنے قبضے میں لا کر اپنے عامل مقرر کیے۔

ملک سنان الدین والی دیبل کی اطاعت:

ملک سنان الدین حبش جو اس وقت دیبل اور سندھ کا والی تھا اس نے اطاعت قبول کر کے اپنے آپ کو سلطان التمش سے وابستہ کر لیا۔[5]

قباچہ کے دور کی علمی ترقیاں:

ناصر الدین قباچہ نے اگرچہ سندھ اور ملتان پر بائیس برس حکومت کی مگر اس کا یہ دور علوم و فنون کی ترقی سے معمور تھا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ گکھڑوں کے مظالم اور مغلوں کے حملے کی وجہ سے مغربی پنجاب کا راستہ بند تھا۔ ترکستان، افغانستان اور خراسان سے آنے والوں کے لیے فقط ملتان کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ جو بھی علما، فضلا اور صوفیا اُس زمانے میں ان ممالک سے ہندوستان تشریف لائے تھے اُن کو سندھ کے دارالخلافہ اُچ سے لازمی طور پر گزرنا پڑتا تھا۔ بہت سے سادات کے خانوادے جو مختلف ارادوں سے عراق سے نکل کر ہندوستان میں وارد ہوئے وہ سندھ کے ان دو شہروں میں یعنی ملتان اور اُچ سے گذرے۔ اس گزرگاہ کی وجہ

---

(1) سیر العارفین، ص ۲۸-۲۹ فوائد الفواد، ص ۱۲۰، تاریخ فرشتہ جلد دوم، ص ۴۰۶۔

(2) طبقات ناصری، ص ۸۴۔

(3) تاریخ فرشتہ - جلد دوم، ص ۶۱۴۔

(4) طبقات ناصری، ص ۸۴۔

(5) طبقات ناصری، ص ۸۴۔

سے سندھ ایک علمی مرکز بن گیا تھا۔ اُن میں جو علما و فضلا سندھ کی رونق بنے ہم ان کا مختصر حال ذیل میں درج کرتے ہیں۔

مولانا قطب الدین کاشانی:

مولانا قطب الدین کاشانی اپنے دور کے جید عالم تھے۔ یہ جب تشریف لائے تو مولانا کے لیے ناصر الدین قباچہ نے ملتان میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔

سندھ کی پہلی تاریخ کی بازیابی:

ناصر الدین قباچہ ہی کے زمانے میں علی بن حامد بن ابو بکر کوفی کو عربی میں لکھی ہوئی ایک تاریخ "منہاج المسالک" (تاریخ سندھ و ہند) الور اور بھکر کے ایک خستہ حال خاندان کے ایک بزرگ قاضی اسماعیل بن علی بن محمد طائی کے ذریعے سے ملی۔ قاضی صاحب موصوف الور کے قاضی موسیٰ بن یعقوب کے پڑپوتے تھے۔ قاضی موسیٰ محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ تشریف لائے تھے جنہیں فتح الور کے بعد محمد بن قاسم نے الور کا قاضی مقرر کیا تھا۔ اُن کی اولاد میں پشت ہا پشت تک مسلسل الور اور بھکر کی قضات چلی آتی رہی۔

علی بن حامد کوفی نے تاریخ منہاج المسالک کا ۶۱۳ھ (۱۲۱۶ء) میں اُچ ہی میں عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا جس کا نام چچ نامہ رکھا۔ یہ سندھ کی پہلی اسلامی تاریخ ہے جس سے ہمیں سندھ میں عربوں کی فتوحات کے متعلق حالات ملتے ہیں۔

قاضی منہاج الدین سراج:

طبقات ناصری کا مصنف قاضی منہاج الدین سراج غزنی کی تباہی کے بعد ۶۲۴ھ میں اُچ پہنچ کر قباچہ کے دربار کی زینت بنا اور اُچ کا مشہور مدرسہ فیروزی اس کے حوالے کیا گیا۔ قلعہ اُچ کی فتح کے بعد یہ شمس الدین التمش کے دربار سے وابستہ ہو گیا اور دہلی چلا گیا۔ منہاج الدین سراج کی مشہور تاریخ طبقات ناصری ۱۸۴۴ء میں کلکتے سے شایع ہوئی جس کا انگریزی میں ترجمہ ریورٹی نے کیا۔

سید بدر الدین عوفی:

سید بدر الدین عوفی جو بخارا کا رہنے والا تھا اُچ پہنچا۔ اس نے سندھ اور گجرات تک کا سفر کیا۔ اُس کی تصانیف میں "لب الالباب" جو غزنوی دور کے فارسی شعرا کا تذکرہ ہے مشہور ہے۔

نور الدین محمد عوفی:

جامع الحکایات کا مصنف نور الدین محمد عوفی بھی قباچہ ہی کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس نے اپنی کتاب جامع الحکایات کو ۱۱۱۲ء میں قباچہ ہی کے زمانے میں تصنیف کیا اور قباچہ کے نام کو زندہ جاوید بنا دیا۔ جامع الحکایات کا ایک قلمی نسخہ دار المصنفین اعظم گڈھ میں موجود ہے۔

عین الملک اشعری:

عین الملک اشعری قباچہ کا وزیر تھا جو خود بھی بڑا عالم تھا اور شعر و ادب کا مربی تھا۔ اُس کی معارف نوازیوں نے مختلف علما و شعرا کو قباچہ کے دربار کی رونق بنایا۔

امیر کبیر سید قطب الدین مدنی:

ناصر الدین قباچہ ہی کے زمانے میں امیر کبیر سید قطب الدین مدنی جو حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے بھتیجے تھے، جہاد کے ارادے سے سندھ پہنچے اور وہاں سے دہلی گئے۔ وہیں سلطان قطب الدین ایبک اُن کا مرید ہوا۔ امیر کبیر نے اودھ میں کڑہ کو فتح کیا اور کڑہ ہی میں ۵۲۸ھ (۳۴-۱۱۳۳ء) میں وفات پائی۔

سید حامد سندھی:

سید حامد سندھی اپنے دور کے بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے سید امیر کبیر قطب الدین مدنی کے ملفوظات کو ایک کتاب کی صورت میں جمع کیا۔ اسی کتاب میں امیر کبیر کے سندھ میں تشریف لانے اور ہندوستان میں جہاد کرنے کے واقعات بھی ہیں۔

سید محمد بھکری:

بھکر کے رضوی خاندان کے مورث اعلیٰ سید محمد مکی بھکری جن کا مزار مبارک آج سکھر میں زیارت گاہ عام و خاص ہے۔ ان کے کوئی بزرگ یمن میں حاکم تھے۔ یمن ہی سے سید محمد مکی جہاد کے ارادے سے ناصر الدین قباچہ کے دور میں تین ہزار سواروں کے ساتھ بھکر تشریف لائے۔

سید محمد مکی کی اولاد میں شعبان الملت سید شمس الدین اور سید ماہ مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ سید شمس الدین نے حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی سے فیوض باطنی حاصل کیے اور سلطان ناصر الدین محمود بن التمش کے زمانے میں جھونسی (الہ آباد) گئے جہاں اُن کی تبلیغ سے بہت سے ہندو مسلمان ہوئے۔ ان کے صاحبزادے شاہ تقی الدین بھی بڑے

بزرگ تھے۔

سید محمد مکی کی اولاد میں سید میر محمد ثانی بھکری سیاحت کے لیے جونپور تشریف لے گئے۔ وہیں انہوں نے مخدوم شیخ منجھے شطاری کی صاحبزادی سے شادی کی اُن کا مزار جونپور کے ایک قصبے کمال پور میں واقع ہے۔[1]

سندھ میں خاندان غلاماں کے عہد کے گورنر

نظام الملک:

اوپر گذر چکا ہے کہ التمش کے وزیر نظام الملک نے ۶۲۵ھ (۱۲۲۷-۲۸ء) میں ناصر الدین قباچہ سے سندھ اور ملتان کی حکومت فتح کی۔ شمس الدین التمش نے نظام الملک کو ہی سندھ و ملتان کا گورنر مقرر کیا۔ نظام الملک نے پورے مقبوضہ سندھ کا دورہ کر کے سندھ کے لوگوں کو اپنی طرف مائل کیا۔ پھر اس نے ان شہروں اور قصبوں کو جن کو سلطان جلال الدین خوارزم برباد کرتا ہوا چلا گیا تھا۔ از سر نو تعمیر اور آباد کیا۔ پہلے سندھ کا دارالسلطنت اُچ تھا، نظام الملک نے التمش کے حکم سے بھکر کو دارالسلطنت بنایا۔ ۶۳۰ھ (۳۳-۱۲۳۲ء) میں مالوہ فتح کرنے کے بعد سلطان شمس الدین التمش نے اس کو واپس بلا لیا۔

نور الدین محمود:

نظام الملک کی واپسی کے بعد ۶۳۰ھ (۳۳-۱۲۳۲ء) میں سلطان التمش نے نور الدین محمود کو سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ ۶۳۳ھ (۳۵-۱۲۳۶ء) میں سلطان شمس الدین التمش نے وفات پائی اور اس کی جگہ اس کا چھوٹا بیٹا رکن الدین فیروز شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا مگر یہ نہایت بے سمجھ انسان تھا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی انعام و اکرام میں تمام خزانہ لٹا دیا، اور اپنی ماں کو جو ایک ترکی کنیز تھی امور سلطنت سپرد کر کے عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ اُمرائے سلطنت نے یہ رنگ دیکھ کر رکن الدین کو معزول کر کے التمش کی بڑی لڑکی رضیہ سلطانہ کو تخت پر بٹھایا۔ رضیہ سلطانہ نہایت ہی سمجھ دار خاتون تھی جس نے انتظام مملکت کو نہایت خوبی سے چلایا۔ رضیہ سلطانہ ہی وہ پہلی خاتون ہے جس نے تخت دہلی پر بیٹھ کر سندھ سے لے کر برہم پتر تک ایک وسیع ملک پر حکومت کی۔

سلطان شہاب الدین نے اگرچہ اپنے زمانے میں سندھ اور ملتان میں قرامطہ کا خاتمہ کر دیا تھا مگر پھر بھی سندھ میں ان کی خفیہ جماعت قائم تھی۔ رضیہ سلطانہ کے زمانے میں قرامطہ نے پھر سر اٹھایا۔ اُس کے زمانے میں انور ترک نامی جو ملاحدہ میں سے تھا سندھ سے نکل کر دہلی پہنچا اور دہلی کی جامع مسجد کے پاس اس نے ہزار ہا باغیوں کی ایک مسلح جماعت کے ساتھ حنفی اور شافعی مذہب کے علماء کو گالیاں دینا شروع کیں۔ آخر نصیر الدین ایتم نے امیر ناصر امام کے جانبازوں کے ایک دستے کے ساتھ ان ملاحدہ کا خاتمہ کیا۔

رضیہ سلطانہ ایک طویل عرصے تک حکومت کرتی رہی لیکن جب اس نے جمال الدین یاقوت نامی غلام کو امیر الامرا کا عہدہ دیا تو ترک اور افغان امرا یاقوت کی امیر الامرائی سے ناخوش ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو گئے اور لاہور کے صوبے دار ملک اعز الدین نے بغاوت کی۔ رضیہ سلطانہ نے فوراً ہی لاہور کا رخ کیا لیکن ملک اعز الدین نے معافی کی درخواست پیش کی اور رضیہ سلطانہ اُس کی خطا معاف کر کے لاہور سے دہلی واپس آئی۔ اسی زمانے میں امیر الامرا جمال الدین یاقوت کی زیادتیوں سے تنگ آ کر بھٹنڈے کے حاکم ملک التونیہ نے بغاوت کی۔ رضیہ سلطانہ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے بھٹنڈے روانہ ہوئی۔ اُمرائے لشکر نے موقع پا کر جمال الدین یاقوت کو جو اس لشکر کے ہمراہ تھا قتل کر دیا اور رضیہ سلطانہ کو گرفتار کر کے ملک التونیہ کے پاس بھیج دیا اور خود دہلی واپس ہو کر سلطان التمش کے بیٹے معز الدین بہرام شاہ کو تخت پر بٹھایا۔ ملک التونیہ نے سلطانہ رضیہ سے نکاح کر لیا اور دونوں نے ہندو جاٹوں اور گھکڑوں کی ایک فوج تیار کر کے دہلی پر چڑھائی کی۔ سلطان معز الدین بہرام کو معلوم ہوا تو اس نے مقابلے کے لیے فوراً فوجیں روانہ کیں۔ کیتھل کے قریب دونوں فوجوں میں جنگ ہوئی لیکن رضیہ سلطانہ اور ملک التونیہ مقابلے کی تاب نہ لا کر فرار ہوئے۔ ۶۳۷ھ (۴۰-۱۲۳۹ء) میں راستے میں کسی گاؤں میں کاشتکاروں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔

رضیہ سلطانہ کے بعد معز الدین بہرام شاہ ۲۷ رمضان ۶۳۷ھ (۴۰-۱۲۳۹ء) کو دہلی میں تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے بعض سرداروں سے اچھا سلوک نہیں کیا جس کی وجہ سے اس کے خلاف اُمرائے سلطنت میں بددلی پیدا ہو گئی۔ اسی کے زمانے میں مغلوں نے

---

[1] قباچہ دور کی علمی ترقیوں کی یہ تمام تفصیلات جنت السندھ مولف مولائی شیدائی شائع کردہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۲۶۱-۲۶۴ سے بحوالہ طبقات ناصری ص ۲۱ و تاریخ آئینہ اودھ ص ۵۸ سے ماخوذ ہیں۔

لاہور پر قبضہ کر کے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ ۱۸ ذی القعدہ ۶۳۹ھ (۱۲۴۲ء) کو اپنے باغی امرا کے ہاتھوں سلطان بہرام شاہ قتل ہوا۔ اُس نے دو سال ایک مہینہ، پندرہ روز حکومت کی۔ بہرام شاہ کے بعد اُمرائے سلطنت نے رکن الدین فیروز شاہ کے بیٹے علاء الدین مسعود کو قید خانے سے نکال کر تخت پر بٹھایا۔[1] اس وقت سلطان التمش کے دربار کا ایک امیر ملک اعزالدین بلبن چاہتا تھا کہ دہلی پر قبضہ کر لے مگر تمام دربار کے امیر اس کے خلاف تھے۔ امیروں نے اس خیال سے کہ بلبن کی بھی دل شکنی نہ ہو اس کو ایک علاقہ جس میں اجمیر، ناگور (مارواڑ) اور سنبھر بھی شامل تھا جاگیر میں دے دیا۔[2]

منکوتہ کا ملتان اور اُچ پر حملہ:

سلطان مسعود کے تخت نشین ہونے کے بعد ۶۴۳ھ (۱۲۴۵-۴۶ء) میں منکوتہ نامی مغل نے ایک زبردست لشکر کے ساتھ اُچ اور ملتان پر حملہ کیا۔ یہ خبر سن کر سلطان مسعود نے تمام صوبوں سے فوجیں طلب کیں اور ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ خود مغلوں کے مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔ ابھی سلطان مسعود دریائے بیاس کے کنارے پر ہی پہنچا تھا کہ مغل، سلطان مسعود کے لشکر کی کثرت اور شوکت کا حال سن کر اس قدر مرعوب ہوئے کہ وہ اُچ اور ملتان کو چھوڑ کر خراسان کی طرف بھاگ گئے اور سلطان فتح یاب ہو کر بھکر پہنچا۔ طبقات ناصری کا مصنف منہاج سراج بھی اس سفر میں سلطان کے ساتھ تھا۔[3]

جلال الدین:

سلطان مسعود نے بھکر پہنچ کر نور الدین محمد کو سندھ کی گورنری سے علیحدہ کر کے جلال الدین کو سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ اس انتظام کے بعد سلطان محمود دہلی واپس ہوا لیکن ملتان ہی میں بعض بے راہ نوجوانوں کو سلطان مسعود کی بارگاہ میں تقرب حاصل ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان انتظام سلطنت سے لاپروا ہو کر اپنا تمام وقت عیش و عشرت اور بادہ خواری میں گذارنے لگا۔ اُمرائے سلطنت یہ دیکھ کر کہ ملک کا نظام درہم و برہم ہو رہا ہے اُس کے چچا ناصر الدین محمود بن التمش کو جو اس وقت بہرائچ کا گورنر تھا اور نہایت ہی عمدہ صلاحیتوں کا مالک تھا بلا کر تخت سلطنت پر بٹھایا[4] اور ۲۳ محرم ۶۴۴ھ (۱۲۴۶ء) کو سلطان مسعود شاہ کو قید کر دیا۔ سلطان مسعود نے قید خانے ہی میں وفات پائی۔

سلطان سنجر اور قتلغ خان ملتان اور سیون کی گورنری پر:

۲۵ محرم ۶۴۴ھ (۱۲۴۶ء) کو قصر فیروزہ میں سلطان ناصر الدین محمود تخت نشین ہوا جو اپنی خدا پرستی، پرہیزگاری اور اعلیٰ کردار کے اعتبار سے تاریخ میں مشہور ہے۔ روز دوشنبہ ۲۲ شوال ۶۴۹ھ (۱۲۵۱ء) کو وہ لاہور، ملتان، اُچ اور بھکر کے ارادے سے روانہ ہوا اور اُچ سے ہوتا ہوا وہ سندھ پہنچا۔ وہاں اُس نے بھکر سے لے کر ملتان تک کے بالائی علاقے پر سلطان سنجر کو اور دیبل سے لے کر بھکر تک کے علاقے پر قتلغ خان کو گورنر مقرر کیا۔ قتلغ خان کا دارالحکومت سیون تھا۔ اس انتظام کے بعد وہ دہلی لوٹ آیا۔[5]

ملک اعزالدین بلبن بزرگ سندھ میں:

۶۴۸ھ میں سلطان ناصر الدین نے بلبن بزرگ کو اس کی جاگیر سندھ میں روانہ کیا۔ ۶۴۹ھ (۱۲۵۱-۵۲ء) میں بلبن بزرگ نے بغاوت کی۔ سلطان ناصر الدین نے اس کے مقابلے کے لیے ملک شیر خان، حاکم ملتان کو بھیجا۔ ملک شیر خان نے اُچ کا محاصرہ کر لیا۔ بلبن بزرگ نے محاصرے سے تنگ آ کر اُچ کا قلعہ ملک شیر خان کے حوالے کر دیا۔

۶۵۰ھ (۱۲۵۷-۵۸ء) میں خود سلطان ناصر الدین محمود، ملتان اور اُچ کی طرف روانہ ہوا مگر بعض سیاسی مصلحتوں کے باعث درمیان ہی سے واپس لوٹ آیا۔ اسی زمانے میں سندھیوں نے بغاوت کر دی۔ ملک شیر خان نے ہر چند اس بغاوت کو فرو کرنا چاہا لیکن اس کو شکست ہوئی۔ شوال ۶۵۱ھ (۱۲۵۳ء) میں سلطان ناصر الدین محمود، دہلی سے روانہ ہو کر دریائے بیاس کے پاس ٹھہرا اور ارسلان خان کو سندھ کا علاقہ سپرد کر کے واپس آیا۔ پھر کچھ دن کے بعد سندھ کا علاقہ ملک اعزالدین کے سپرد ہوا، جس کا نام طبقات ناصری اور تاریخ مبارک شاہی میں کشلو خان بھی لکھا ہے۔

۶۵۵ھ (۱۲۵۷-۵۸ء) میں بلبن بزرگ گورنر سندھ نے قتلغ خان اور بعض دوسرے امیروں کو اپنے ساتھ ملا کر بغاوت کی۔ سلطان ناصر الدین نے اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے ایک لشکر کو الغ خان کی سپہ سالاری میں مقرر کیا۔ اس درمیان میں سید قطب الدین شیخ الاسلام

---

[1] ماخوذ از آئینہ حقیقت نما جلد اول۔

[2] تاریخ سندھ - مولانا ابو ظفر ندوی، ص ۳۰۱ بحوالہ طبقات اکبری ص ۱۷۔

[3] طبقات ناصری۔

[4] تاریخ معصومی، ص ۳۷۔

[5] تاریخ معصومی، ص ۳۸۔

اور قاضی شمس الدین بہڑائچی اور دوسرے عمایدنے خفیہ طور پر قتلغ خان اور بلبن بزرگ کو خطوط لکھ کر دہلی طلب کیا تاکہ وہ دہلی پر آکر قبضہ کریں۔ جاسوسوں نے ان خطوط کی خبر الغ خان کو دی۔ الغ خان نے سلطان ناصر الدین کو ساری کیفیت سے مطلع کیا اور لکھا کہ ان خط لکھنے والوں کو فوراً اپنی اپنی جاگیر بھیج دیا جائے تاکہ یہ فساد زیادہ نہ بڑھنے پائے۔ سلطان ناصر الدین نے الغ خان کا خط ملتے ہی ان میں بعضوں کو قید کر دیا اور بعضوں کو اُن کی جاگیر بھجوا دیا، لیکن یہ خطوط بلبن بزرگ اور قتلغ خان کو مل چکے تھے۔ چنانچہ یہ دونوں ایک سو کوس کی مسافت دو دن میں طے کر کے دہلی کے قریب پہنچے، لیکن چونکہ سلطان ناصر الدین مدافعت کا پہلے ہی انتظام کر چکا تھا یہاں آکر وہ اصل حقیقت سے واقف ہوئے، حالات کے لحاظ سے ان دونوں نے سوائے فرار کے کوئی چارہ نہ دیکھا۔ ۱۱ ماہ جمادی الآخر ۶۵۵ھ (۱۲۵۷ء) کو الغ خان کامیاب اور فاتح ہو کر واپس لوٹا۔ بلبن بزرگ نے سندھ واپس پہنچ کر الغ خان کے ذریعے سے سلطان ناصر الدین سے معافی چاہی، سلطان ناصر الدین نے اس کو سندھ کی گورنری پر برقرار رکھا۔

اسی سال کے آخر میں تاتاری مغل خراسان کی طرف سے آکر پھر اُچ اور ملتان پر حملہ آور ہوئے۔ سلطان ناصر الدین بھی ایک عظیم الشان لشکر لے کر ملتان کی طرف بڑھا۔ تاتاری مغل سلطانی فوجوں کی آمد کی خبر سن کر واپس لوٹ گئے۔[1]

سلطان ناصر الدین کی وفات:

۶۶۴ھ (۶۶-۱۲۶۵ء) میں سلطان ناصر الدین نے وفات پائی۔[2]

سلطان غیاث الدین بلبن

۶۶۴ھ (۶۶-۱۲۶۵ء)

سلطان ناصر الدین کی وفات کے بعد ۳ جمادی الثانی ۶۶۴ھ (۱۲۶۶ء) کو اُمرائے مملکت نے سلطان غیاث الدین بلبن کو تخت پر بٹھایا، جو دراصل سلطان شمس الدین التمش کا ایک ترک غلام تھا۔ اس کو امور مملکت کی تعلیم خود التمش نے دی تھی۔ یہ تخت مملکت پر فائز ہونے سے پہلے بھی تقریباً بیس سال تک مختلف صوبوں کی گورنری پر مامور رہ چکا تھا اور سلطان ناصر الدین کے زمانے میں اس کا وزیر بھی رہ چکا تھا، جس کو اس نے الغ خان کا خطاب دیا تھا۔ سلطان غیاث الدین بلبن نہایت ہی عقل مند، مدبر اور متقی و پرہیزگار بادشاہ تھا۔

عہد بلبنی میں سندھ کے گورنر

خان شہید:

جب سلطان غیاث الدین بلبن فرمانروا ہوا اس وقت اُس کا چچازاد بھائی ملک شیر خان ملتان کا گورنر تھا، جو ملتان اور پنجاب پر مغلوں کے حملوں کو نہایت بہادری سے روکتا رہتا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد، بلبن نے اپنے بڑے بیٹے سلطان محمد کو جو اپنی شہادت کے بعد خان شہید کے لقب سے مشہور ہوا، ملتان اور سندھ کا گورنر مقرر کیا۔

خان شہید نہایت ہی نیک نفس، متقی، پاکباز اور بہادر انسان تھا۔ وہ صوفیائے کرام اور علماء سے نہایت عقیدت رکھتا تھا۔ اس کا اکثر وقت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی[3] اور شیخ فرید الدین گنج شکر[4] کی صحبت میں

---

[1] یہ تمام تفصیل طبقات ناصری، ص ۱۲۳-۱۲۴ و تاریخ مبارک شاہی ص ۳۷-۳۸ سے ماخوذ ہے۔

[2] تاریخ مبارک شاہی۔

[3] شیخ الشیوخ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی ہباری خاندان سے تھے۔ آپ کے دادا کا نام شیخ کمال الدین علی شاہ تھا جو مکہ معظمہ سے خوارزم آئے، اور وہاں سے آکر ملتان میں سکونت اختیار کی۔ اُن کے فرزند مولانا وجیہہ الدین کی شادی مولانا حسام الدین ترمذی کی دختر سے ہوئی، جو اُس وقت تاتاریوں کے حملے کی وجہ سے نواح ملتان میں کوٹ کروڑ میں مقیم تھے۔ ۵۷۸ھ میں کوٹ کروڑ ہی میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کی ولادت باسعادت ہوئی۔ علوم ظاہری کی تحصیل کے بعد بغداد میں آپ نے شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی سے بیعت کر کے خرقۂ خلافت حاصل کیا، اور اپنے شیخ کے حکم پر آپ ملتان واپس تشریف لائے اور آپ کے فیوض و برکات سے نہ صرف ملتان بلکہ سارا ہندوستان مستفیض ہوا۔ آپ نے ۶۶۱ھ میں وفات پائی۔ (بزم صوفیا)۔

[4] آپ کا اسم گرامی مسعود، لقب فرید الدین تھا، مگر عام طور سے "گنج شکر" کے لقب سے مشہور تھے۔ حضرت شیخ فرید کی ولادت باسعادت ۵۸۴ھ میں قصبہ کھتوال ضلع ملتان میں ہوئی۔ جس زمانے میں کہ آپ ملتان میں بغرض تعلیم مقیم تھے، اتفاق سے اسی زمانے میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا ورود مسعود ملتان میں ہوا۔ حضرت بابا شیخ فرید نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے دست حق پرست پر بیعت کی اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ حضرت شیخ فرید کے رشد و ہدایت سے نہ صرف مسلمان، مسلمان بنے بلکہ غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً سترہ غیر مسلم قوموں

گزرتا تھا۔ ۶۸۰ھ (۱۲۸۰ء) میں امیر خسرو[1] اُس کے ملازموں میں داخل ہوئے اور ملتان میں ان کا قیام تقریباً پانچ سال رہا۔ امیر حسن سجزی بھی خان شہید کے ملازموں میں تھے۔

شیخ عثمان[2] مروندی معروف بہ لعل شہباز قلندر جو سندھ[3] کی جلیل القدر صوفیا میں ہیں جب ملتان تشریف لائے تو خان شہید نے ان کی نہایت تعظیم کی اور آپ کی خدمت میں نذر اور تحفے پیش کیے اور شیخ سے ملتان میں قیام کے لیے اصرار کیا، لیکن شیخ نے کسی وجہ سے ملتان میں قیام پسند نہیں کیا۔

خان شہید کی علم دوستی اور معارف نوازی کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اُس نے دو مرتبہ ملتان سے شیخ سعدی علیہ الرحمتہ کو بلانے کے لیے سفر خرچ دے کر شیراز آدمی روانہ کیے۔ اس کی دلی تمنا یہ تھی کہ کسی طرح حضرت شیخ سعدی ملتان تشریف لے آئیں تاکہ وہ اُن کے لیے ملتان ہی میں ایک خانقاہ تعمیر کرائے اور اس خانقاہ کے اخراجات کے لیے کچھ نقد اور گاؤں وقف کرے، لیکن ہر مرتبہ شیخ سعدی نے اپنی پیری اور ضعیفی کا عذر کرکے آنے سے معذرت چاہی اور دونوں مرتبہ اپنے اشعار کی دو بیاضیں بھیجیں، جو خود حضرت شیخ سعدی کے قلم کی لکھی ہوئی تھیں، ساتھ ہی امیر خسرو کی تعریف کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ تمہارے دربار میں امیر خسرو کا وجود کافی ہے۔[4]

خان شہید کی شہادت:

۶۸۳ھ (۱۲۸۴ء) یا ۶۸۴ھ میں چنگیز خان نے تتلغ خان اور تیمور کو ایک لشکر گراں کے ساتھ ہندوستان بھیجا۔ جب یہ لشکر لاہور کے حدود میں پہنچا تو خان شہید نے تیس ہزار سواروں کے ساتھ اس لشکر کا مقابلہ کیا۔ دونوں لشکروں میں سخت معرکہ آرائی ہوئی۔ تاریخ فیروز شاہی میں ہے کہ اس لڑائی میں ملتان کے بڑے بڑے امیر اور سردار شہید ہوئے۔ خود سلطان محمد خان شہید نے اس لڑائی میں شہادت پائی۔ اسی لڑائی میں امیر خسرو انہیں تاتاریوں کے ہاتھ قید ہوئے اور بڑی مشکل سے رہائی پائی۔ ملتان کے اس قدر لوگ تاتاریوں کے ہاتھوں سے شہید ہوئے کہ ملتان کا ہر گھر ماتم کدہ بن گیا تھا۔

کیخسرو:

خان شہید کی شہادت کے بعد بلبن نے خان شہید کے بیٹے کیخسرو کو ملتان اور سندھ کا گورنر مقرر کیا، لیکن بلبن کو خان شہید کی شہادت کا اس قدر صدمہ تھا کہ وہ اس صدمے سے جانبر نہ ہوسکا۔ بلبن کی وفات کے متعلق مؤرخین نے لکھا ہے کہ خان شہید کے درباری شاعر حضرت امیر خسرو نے اُس کی شہادت پر ایک نہایت ہی دردناک مرثیہ کہا تھا جس کے چند شعر یہ ہیں:

نے آپ کی تبلیغ سے اسلام قبول کیا۔ راحت القلوب میں آپ کی سیاحت کے جو جستہ جستہ واقعات مذکور ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ آپ سندھ بھی تشریف لائے تھے اور سہوستان میں آپ کی ملاقات شیخ اوحد الدین کرمانی سے ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی سیوستان کے ایک اور بزرگ سے آپ نے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔ حضرت شیخ فرید گنج شکر نے ترانوے سال کی عمر میں ۶۸۷ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار مبارک اجودھن میں ہے جہاں آپ مقیم ہوگئے تھے۔ اکبر نے اجودھن کا نام پاک پتن رکھا۔ جس زمانے میں کہ ابن بطوطہ ہندوستان آیا ہے، اُس زمانے میں حضرت بابا فرید کے پوتے علاء الدین موج آپ کی درگاہ کے سجادہ نشین تھے، حضرت علاء الدین موج نے ۷۳۳ھ میں وفات پائی۔ (بزم صوفیا تذکرہ حضرت خواجہ فرید الدین شکر گنج وجنت السندھ مولائی شیدائی ص ۲۶۹-۲۷۰)۔

(1) امیر خسرو کا نام ابوالحسن یمین الدین، اور تخلص خسرو تھا۔ ۱۲۵۳ھ میں آپ پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ آپ بچپن ہی سے شعر کہتے تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں آپ بلبن خاندان کے ایک ممتاز رکن ملک کشلی خان معروف بہ ملک چھجو کے پاس ملازم ہوئے۔ اُس کے بعد بلبن کا بیٹا بغرا خان آپ کو بنگال لے گیا۔ ۶۸۰ھ (۱۲۸۰ء) میں وہ بلبن کے دوسرے بیٹے خان شہید کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ ۶۸۸ھ (۱۲۸۹ء) میں سلطان جلال الدین خلجی نے اُن کو اپنا ندیم بنا کر مصحف داری اور امارت کا عہدہ سپرد کیا۔ اسی وقت سے آپ امیر کہلائے۔ امیر خسرو آٹھ سال کی عمر سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی خدمت میں جاتے تھے۔ بیس سال کی عمر میں اُنہوں نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ وہ سلطان غیاث الدین کے ساتھ لکھنوتی میں تھے کہ امیر خسرو کو اپنے مرشد کے وصال کی اطلاع ملی۔ یہ فوراً دہلی پہنچے ۱۰ نومبر ۷۲۵ھ (۱۳۲۴ء) کو حضرت امیر خسرو نے وفات پائی (آب کوثر مؤلف۔ شیخ محمد اکرام صاحب)۔

(2) امیر حسن سجزی کا نام خواجہ نجم الدین حسن سجزی تھا۔ ان کے بزرگ سجستان کے رہنے والے تھے۔ یہ ۵۶۱ھ (۶۶-۱۱۶۵ء) میں پیدا ہوئے اور خان شہید کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ ان کی مشہور تالیف فوائد الفواد ہے۔ (آب کوثر)۔

(3) حضرت شیخ عثمان مروندی سندھ کے اولیائے کبار میں ہیں اور لعل شہباز قلندر کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ سندھ میں ۶۶۲ھ (۶۴-۱۲۶۳ء) میں تشریف لائے اور سیوستان میں مقیم ہوئے۔ سیوستان ہی میں آپ نے ۶۷۳ھ (-۱۲۷۴ ۷۵ء) میں وفات پائی۔ (مقالات الشعرا، ص ۴۳۴-۴۳۵ و تحفتہ الکرام جلد-۳، ص ۱۲۶)۔

(4) تاریخ معصومی، ص ۴۰-۴۱۔

واقعہ ست این یا بلا از آسماں آمد پدید
آفت ست این یا قیامت در جہاں آمد پدید
راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ را
رخنۂ کا مسال در ہندوستان آمد پدید
مجلس یاراں پریشان شد چو برگ گل زیاد
برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید
بسکہ آب چشم خلقی شد رواں در چار سو
پنج آبے دیگر اندر مولتاں آمد پدید

دو تین سال کے بعد ایک دن امیر خسرو نے بلبن کے دربار میں یہ پر درد مرثیہ پڑھ کر سنایا۔ سلطان بلبن اس قصیدے کو سن کر اس قدر متاثر ہوا کہ اُسے بخار ہو گیا۔ اسی بخار سے اس نے ۶۸۵ھ (۱۲۸۶ء) میں وفات پائی۔[2]

سلطان معزالدین کیقباد

سلطان غیاث الدین بلبن کی وفات کے وقت اُس کا بیٹا ناصر الدین بغرا خاں بنگال میں تھا۔ اُمرائے سلطنت نے اُس کے پوتے یعنی ناصر الدین بغرا خاں کے بیٹے معز الدین کیقباد کو جس کی عمر اُس وقت تقریباً سترہ سال کی تھی تخت دہلی پر بٹھایا۔ کیقباد نے تخت نشین ہوتے ہی تمام امور سلطنت خود غرض اُمرا کے سپرد کر دیے اور خود عیش و عشرت میں پڑ گیا۔

کیخسرو گورنر ملتان کا قتل:

ملک نظام الدین جو کیقباد کے دربار کا ایک نہایت ہی منہ چڑھا امیر تھا۔ اُس نے یہ دیکھ کر کہ کیقباد کی بادہ خواری اور عیش و عشرت کی وجہ سے سلطنت بلبنی کی بنیادیں روز بروز کمزور ہو رہی ہیں۔ کیقباد میں فرمانروائی کی مطلقاً صلاحیت نہیں۔ صرف اس خاندان میں کیخسرو ایسا ہے جو امور سلطنت کی صحیح طور پر صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر اس کو راستے سے ہٹا دیا جائے تو اُس کے لیے آسانی سے آئندہ تخت دہلی پر قبضہ کرنے کی راہیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ملک نظام الدین نے اپنے دل میں یہ منصوبہ طے کر کے ایک دن نہایت مخلصانہ انداز میں سلطان معزالدین کیقباد کو مشورہ دیا کہ آپ کے مقابلے میں کیخسرو ہی ایسا ہے جو کسی وقت بھی مدعی سلطنت ہو سکتا ہے اور چونکہ اُس میں فرمانروائی اور جہانداری کی پوری صلاحیتیں موجود ہیں اور اُمرائے سلطنت کا میلان بھی اس کی طرف ہے اندیشہ ہے کہ کسی دن بھی اُمرائے سلطنت اُس سے مل کر آپ کو تخت سلطنت سے علیحدہ کر کے اُس کو تخت پر بٹھا دیں گے۔ پس مصلحت اسی میں ہے کہ کیخسرو کو ملتان سے بلا کر راستے ہی میں اُس کا کام تمام کر دیا جائے۔ کیقباد نے ملک شمس الدین کے مشورے کے مطابق فوراً ہی کیخسرو کی طلبی کا فرمان جاری کر دیا اور کچھ لوگ اُس کے قتل کے لیے متعین کر دیے گئے۔ جیسے ہی کیخسرو ریحک پہنچا ان لوگوں نے کیخسرو کو قتل کر دیا۔[1]

اُمرائے سلطنت نے جب دیکھا کہ کیقباد کے لہو و لعب و عیش و عشرت کی وجہ سے سلطنت روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہے تو انہوں نے اس ناعاقبت اندیش فرمانروا کو ۶۸۸ھ (۹۰-۱۲۸۹ء) میں جب کہ وہ کثرت بادہ نوشی کی وجہ سے بیمار تھا قتل کر ڈالا۔ یہ خاندان غلاماں کا آخری فرمانروا تھا۔

سندھ میں خاندان غلاماں کی حکومت پر تبصرہ

غلام سلاطین نے دہلی میں ۶۰۲ھ (۶-۱۲۰۵ء) سے ۶۸۶ھ (۸۸-۱۲۸۷ء) تک حکومت کی۔ ان کے دوران حکومت سندھ پر چنگیزی مغلوں کے متواتر حملے ہوتے رہے، مگر غلام سلاطین کی کوششوں کی وجہ سے انہیں سندھ میں قتل و غارتگری کا کوئی بڑا موقع نہ مل سکا، البتہ جلال الدین خوارزمی جب سندھ سے گزرا تو اُس وقت سندھ کے بہت سے شہروں کو نقصان پہنچا، جن کو نظام الملک نے از سر نو آباد کیا۔ چنگیزی مغلوں کی وجہ سے اگرچہ غلام سلاطین سندھ میں صنعت و حرفت اور زراعت کو پورے طور پر فروغ نہ دے سکے، لیکن ملک کی فوجی حالت بہتر تھی۔ انہیں کے زمانے میں سندھ کے مختلف صوبے مقرر ہو کر صوبے کے علیحدہ علیحدہ حاکم مقرر ہوئے، جن کو فوجی اور سول اختیارات دیے گئے۔ پہلے سندھ کا دارالسلطنت بکھر تھا، اور ثانوی حیثیت سیوھن کو حاصل تھی، لیکن ۶۴۹ھ (۵۲-۱۲۵۱ء) میں سلطان ناصر الدین محمود نے سندھ کو دو صوبوں میں تقسیم کر کے ہر صوبے کے علیحدہ علیحدہ گورنر مقرر کیے۔ اس نے ایک صوبہ بکھر سے لے کر سیوھن تک قائم کیا۔ اس کا صدر مقام بکھر تھا۔ دوسرا صوبہ سیوھن سے لے کر سمندر تک تھا، جس میں "لاڑ" کا علاقہ بھی شامل تھا۔ اس کا صدر مقام سیوھن تھا۔

---

[1] فیروز شاہی-ضیا برنی، ص ۱۳۲-۱۳۳۔

[2] تاریخ معصومی ص ۴۱ و تاریخ فیروز شاہی-ضیا برنی ص ۱۰۹-۱۱۰۔

بلبن کے زمانے میں سندھ اور پنجاب کا دارالسلطنت ملتان تھا جو اس زمانے میں اسلامی تبلیغ کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ خان شہید کی گورنری کے زمانے میں ملتان نے علمی حیثیت سے کافی ترقی کی۔ تمام عدالتی نظام قاضیوں کے ماتحت تھا۔

خاندان غلاماں کے زمانے میں قرامطہ کی خفیہ سازشیں برابر جاری رہیں۔ ان سازشوں نے سلطانہ رضیہ کے زمانے میں ایک بڑے فتنے کی صورت اختیار کی۔

تاتاریوں کے حملوں کی وجہ سے اگرچہ ان کے دور میں سندھ میں تجارت نے کوئی نمایاں ترقی نہیں کی، لیکن پھر بھی ترکستان اور غزنی سے سندھ کے تجارتی تعلقات قائم تھے، اور آپس میں ان ممالک میں قافلوں کے ذریعے سے غلاموں، ہتھیاروں اور گھوڑوں کی تجارت ہوتی تھی۔ سمندری راستے سے سندھ کی تجارتی تعلقات عرب سے قائم تھے۔ ادریسی کا بیان ہے کہ بارھویں صدی عیسوی میں لونگ، کالی مرچ، آبنوس، کافور، ناریل، ریشمی کپڑا، مشک، گھوڑوں کی زینیں اور تلواریں سندھ سے عدن پہنچتی تھیں۔ بحری تجارت بہ نسبت خشکی کے زیادہ ترقی پر تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ خشکی کا راستہ جن ملکوں کو سندھ سے مربوط کرتا تھا مثلاً ہرات، خیوا، سمرقند، بخارا، مرو، بصرہ، بغداد اور دمشق یہ سب شہر جو اسلامی تہذیب، اسلامی علوم اور تجارت کے بڑے مرکز تھے، یہ سب تاتاریوں کے ہاتھوں ویران ہو چکے تھے۔ فقط تجارت کے لیے سمندری راستہ صاف تھا اور سندھ کے تاجر غرناطہ اور مشرق میں چین تک پہنچتے تھے۔ غلام سلاطین کے زمانے میں مسافروں کے لیے سرائیں تھیں ڈاک کی چوکیوں کا باقاعدہ انتظام تھا۔ ان کے سکوں پر عربی اور ہندی کی عبارتیں لکھی ہوئی تھیں۔

غلام سلاطین کے دور میں سندھ نے علوم و فنون کے اعتبار سے بھی کافی ترقی کی۔ تاتاریوں کے حملوں کی وجہ سے خراسان، عراق اور عجم کے علماء نے سندھ کو اپنا وطن بنایا۔ بکھر اور سیوھن علوم کے مرکز بنے۔ ان دونوں شہروں میں تعلیم کے لیے بہترین مدرسے قائم ہوئے۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ جو آٹھویں صدی ہجری میں سندھ آیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ اس نے بکھر اور سیوھن میں شیراز، بغداد اور مصر کے متعدد علماء سے ملاقات کی۔

غلام سلاطین علماء، محدثین، صوفیا اور فقہا کی صحبتوں کے بے حد شائق تھے۔ ان کے دربار اہل کمال اور شاعروں سے معمور نظر آتے تھے، ناصر الدین اور غیاث الدین بلبن خود بھی علم و فضل کے اعتبار سے بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ سندھ کا گورنر خان شہید جو علم نوازی اور معارف پروری میں مشہور ہے، خود بھی بہت بڑا عالم تھا۔

باب:12

سندھ میں خلجیوں کی حکومت

۶۸۹ھ (۹۱-۱۲۹۰ء) تا ۷۲۰ھ (۲۱-۱۳۲۰ء)

سلطان جلال الدین فیروز شاہ

سلطان معزالدین کیقباد کے بعد ۶۸۹ھ (۹۱-۱۲۹۰ء) میں امرائے سلطنت نے یہ دیکھ کر کہ سلطان بلبن، سلطان التمش اور سلطان ایبک کی اولاد میں کوئی لائق شخص موجود نہ تھا، خاندان خلجی کے ایک امیر ملک جلال الدین فیروز شاہ کو جو اس وقت سامانہ کا نائب ناظم اور ستر برس کی

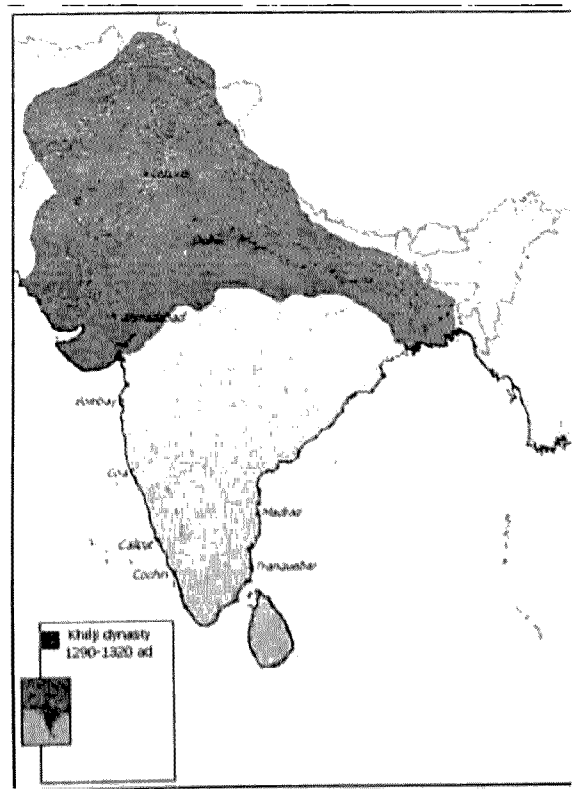

عمر کا تجربہ کار انسان تھا، تخت پر بٹھایا۔ سلطان جلال الدین سے ہندوستان میں خلجی حکومت کی بنیاد پڑی۔ خلجیوں نے اکتیس برس تک ہندوستان پر حکومت کی۔ اس خاندان کے فرمانرواؤں کی فہرست حسب ذیل ہے:

(۱) جلال الدین فیروز	حکومت از ۶۸۹ھ تا ۶۹۵ھ
(۲) ابراہیم رکن الدین	حکومت از ۶۹۵ھ تا ۶۹۵ھ
(۳) محمد علاء الدین	حکومت از ۶۹۵ھ تا ۷۱۵ھ
(۴) عمر شہاب الدین	حکومت از ۷۱۵ھ تا ۷۱۶ھ
(۵) مبارک قطب الدین	حکومت از ۷۱۶ھ تا ۷۲۰ھ
(۶) خسرو ناصر الدین	حکومت از ۷۲۰ھ تا ۷۲۰ھ

سلطان جلال الدین نہایت ہی پاک باطن، خدا ترس، شجیع اور بہادر انسان تھا۔ وہ تخت نشین ہونے سے پہلے برسوں مغلوں کے مقابلے میں داد شجاعت دے چکا تھا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی لوگوں پر احسانات کر کے سب کو اپنا ہوا خواہ بنا لیا۔

سندھ میں عہد جلال الدین کے گورنر

ارکلی خان و نصرت خان:

۶۹۶ھ (۹۷-۱۲۹۶ء) میں سلطان جلال الدین نے لاہور پہنچ کر اپنے منجھلے بیٹے ارکلی خان کو جو نہایت ہی مدبر اور بہادر انسان تھا، ملتان اور اُچ کا گورنر مقرر کیا اور نصرت خان کو سندھ کی حکومت پر متعین کیا لیکن سندھ کی مالگذاری اور حکومت بھی ارکلی خان کی زیر نگرانی تھی۔

ارکلی خان نہایت خوش اخلاق اور بہادر انسان تھا۔ اس نے اپنے زمانۂ حکومت میں دو مرتبہ سندھ کا دورہ کیا اور سندھ کے باغیوں کو زیر

کر کے حدود سندھ کو وسیع کر دیا۔[1]

تاریخ مبارک شاہی میں ہے کہ سلطان جلال الدین کی تخت نشینی کے دوسرے سال ملک چھجو الخاطب یہ کشلی خان کو اس کے ہندو مصاحبوں نے بہکایا کہ خاندان بلبنی کے فرد ہونے کی حیثیت سے سلطنت اور تخت کے آپ مالک ہیں، خلجیوں کو کیا حق ہے کہ وہ آپ کے ہوتے ہوئے حکومت کریں۔ یہ بات ملک چھجو کے دل میں بیٹھ گئی۔ ادھر امیر علی مولیٰ زادہ سلطان بلبن، جس کو حاتم خان بھی کہتے تھے، اور اودھ کا صوبے دار تھا، ملک چھجو کا ہم خیال ہو گیا۔ ملک چھجو نے کڑہ میں تاج شاہی اپنے سر پر رکھ کر ملک مغیث الدین کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور ملک اودھ علاقہ کڑہ میں اس کے نام کا سکہ اور خطبہ جاری ہوا۔ ۶۹۰ھ (۹۲-۱۲۹۱ء) میں ملک چھجو، ہندوؤں کی بے شمار فوج لے کر دہلی کی طرف بڑھا۔ یہ سن کر سلطان جلال الدین بھی اپنی منتخب فوج لے کر دہلی سے روانہ ہوا۔ سلطان جلال الدین نے اپنے بیٹے ارکلی خان کو ایک دستہ فوج کے ساتھ بطور ہراول سلطانی لشکر سے دس بارہ کوس آگے چلنے کا حکم دیا۔ بدایوں سے آگے بڑھ کر ارکلی خان اور ملک چھجو کے لشکر کا مقابلہ ہوا، لیکن ارکلی خان کے پہلے ہی حملے کی تاب نہ لا کر ملک چھجو کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔ ملک چھجو بھی میدان جنگ سے بھاگ کر قریب کے کسی گاؤں میں پناہ گزیں ہوا۔ وہاں کے مقدم نے اس کو گرفتار کر کے سلطان جلال الدین کے پاس پیش کیا۔ سلطان جلال الدین نے ملک چھجو کو ملتان بھجوا دیا اور حکم دیا کہ اس کو عزت و احترام کے ساتھ نظر بند رکھا جائے اور کسی قسم کی تکلیف نہ دی جائے۔

سلطان جلال الدین کی شہادت:

سلطان جلال الدین نے ملک چھجو کے بعد کڑہ کی صوبے داری پر اپنے بھتیجے اور داماد علاء الدین خلجی کو مقرر کیا۔ علاء الدین اپنی بیوی اور ساس سے ناراض رہتا تھا۔ خصوصاً وہ اپنی ساس سے بہت خائف تھا۔ اس لیے اُس نے دارالسلطنت سے چلے جانے کو بہت غنیمت سمجھا۔ وہ جب کڑہ میں پہنچا تو وہی ہندو سردار جنہوں نے ملک چھجو کو بہکایا تھا، اب اس کے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے مختلف طریقوں سے علاء الدین خلجی کو یقین دلایا کہ ملک چھجو کی شکست کی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس مال اور خزانہ نہ تھا۔ اگر اس کے پاس مال و خزانہ ہوتا تو وہ کبھی شکست نہ کھاتا۔

[1] تاریخ معصومی۔ ص ۴۲۔

انہوں نے یہ معلوم کر کے کہ علاء الدین اپنی ساس اور بیوی سے ناراض ہے اور جلال الدین سے بھی کچھ مطمئن نہیں، آزادی سے علاء الدین کو جلال الدین کی مخالفت پر اکسایا۔ آخر اُن کی تدبیر کارگر ہوئی۔ ۶۹۴ھ (۹۶-۱۲۹۵ء) میں جب علاء الدین نے دیوگری (دکن) پر حملہ کیا تو وہاں کے راجا رام دیو نے محاصرے سے تنگ آ کر چھ سو من سونا، ایک ہزار من چاندی، سات من موتی، دو من جواہرات اور چار ہزار ریشمی کپڑوں کے تھان اپنے ایلچیوں کے ہاتھ روانہ کر کے علاء الدین سے صلح کی درخواست کی۔ علاء الدین نے اس مال و دولت کے علاوہ ایلچ پور اور اس کے متعلقہ علاقوں کا بھی مطالبہ کیا اور رام دیو نے اپنی ریاست کا یہ حصہ بھی علاء الدین کو دے دیا۔ جب وہ مال غنیمت لے کر کڑہ پہنچا، تو اُس نے مال غنیمت کا وہ حصہ جو اُسے شاہی خزانے میں بھیجنا چاہیے تھا، نہیں بھیجا، اور سلطان جلال الدین کے قتل کی تدبیروں میں مصروف ہو گیا۔ سلطان جلال الدین دیوگری کی فتوحات کا حال سن کر علاء الدین سے ملاقات کے لیے روانہ ہوا۔ ۱۷ رمضان ۶۹۵ھ (۱۲۹۶ء) کو جب کہ وہ کڑہ اور ملک پور کے درمیان دریائے گنگ کے کنارے تھا اپنے بھتیجے اور داماد علاء الدین خلجی کے ہاتھ سے مارا گیا۔[1]

عہد جلالی کے سندھی اُمرا:

سلطان جلال الدین کے دور میں جو علماء اور صاحب کمال مختلف عہدوں پر فائز تھے، ان میں ہمیں سندھ کے ایک عالم مولانا جلال الدین بھکری کا بھی نام ملتا ہے جو مستوفی الممالک کے عہدے پر فائز تھے۔[2]

سلطان علاء الدین خلجی

۶۹۵ھ (۹۶-۱۲۹۵ء) تا ۷۱۶ھ (۱۷-۱۳۱۶ء)

سلطان علاء الدین خلجی اپنے چچا جلال الدین خلجی کو قتل کرنے کے بعد بھی دہلی کا تخت حاصل کرنے سے مایوس تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سلطان جلال الدین کا بیٹا ارکلی خان جو اُس زمانے میں ملتان کا

[1] تاریخ معصومی۔ ص ۴۲، آئینہ حقیقت نما۔ ص ۲۷۵ تاریخ فیروز شاہی ص ۲۳۵ پر ہے کہ جس وقت جلال الدین، علاء الدین سے ملاقات کر رہا تھا علاء الدین کے اشارے سے محمود سالم نے تلوار ماری، لیکن اس کا وار کارگر نہیں ہوا، اختیار الدین نے زمین پر گرا کر اُس کا سر تن سے جدا کیا۔

[2] تاریخ فیروز شاہی۔ ضیا برنی، ص ۲۰۱-۲۰۲۔

سلطان علاء الدین خلجی محمد شاہ اول (۶۹۵ ھ۔ق)
Sultan Aala-Ouddine Khildji (1295)

گورنر تھا، اور مغلوں کے حملوں کو روکنے کی وجہ سے ملتان ہی میں رہتا تھا، تخت حکومت سنبھالنے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا، اور اس کا مقابلہ علاء الدین کے لیے آسان نہ تھا۔ دوسرا یہ کہ جیسے ہی سلطان جلال الدین کی شہادت کی خبر ملک احمد چپ کو ملی جو لشکر لے کر براہ خشکی جا رہا تھا، وہ اس خبر کے سنتے ہی فوراً دہلی لوٹ گیا، سلطان جلال الدین کی بیوی نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ سلطان جلال الدین کی شہادت کی خبر سنتے ہی بجائے اس کے کہ وہ ارکلی خان کو ملتان سے طلب کر کے اس کو تخت نشین کرتی، اُس نے فوراً ہی بغیر کسی کے مشورے کے اپنے چھوٹے بیٹے رکن الدین ابراہیم کو جو امور سلطنت کی مطلقاً صلاحیت نہ رکھتا تھا، دہلی کے تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔ ارکلی خان نے جب ملتان میں یہ خبر سنی تو وہ اپنی والدہ کے اس طرز عمل کی وجہ سے دہلی نہیں آیا۔ علاء الدین کو جب یہ معلوم ہوا کہ ارکلی خان ماں سے ناراض ہونے کی وجہ سے دہلی نہیں آیا ہے، تو وہ اس خبر کو سن کر بہت خوش ہوا اور ماہ صفر ۶۹۵ھ (۱۲۹۵ء) کو وہ کڑہ سے دہلی روانہ ہوا۔ راستے میں اُس نے لوگوں پر خوب روپیہ لٹایا، اور اپنی فیاضی اور بخشش سے لوگوں کو اپنی طرف مائل کیا۔[1] تاریخ مبارک شاہی میں ہے کہ عوام کے بدلے ہوئے رخ کو دیکھ کر اُمرائے سلطنت نے خفیہ طور پر قاصد بھیج کر علاء الدین کی اطاعت کا عہد کیا۔ آخر میں تو یہ کیفیت ہو گئی کہ دو تین امیر ہر روز اس طرف سے ٹوٹ کر علاء الدین سے ملتے جاتے تھے۔ جب سلطان رکن الدین کو یہ حال معلوم ہوا اور اسے اندازہ ہوا کہ وہ مقابلے کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ اپنی والدہ اور چند امیروں کے ساتھ جو اُس کے موافق تھے، اپنے بھائی ارکلی خان کے پاس ملتان چلا گیا۔ علاء الدین نے دہلی پہنچ کر ۶۹۵ھ (۹۶-۱۲۹۵ء) میں تخت دہلی پر جلوس کیا، اور اپنے بھائی الماس بیگ کو الغ خان کا اور ملک نصرت جلیسری کو نصرت خان کا خطاب دیا۔[2]

ملتان پر فوج کشی:

اسی سال سلطان علاء الدین نے اپنے بھائی الغ خان[3] اور اپنے ایک امیر ظفر خان کو جس کا خطاب الب خان تھا[4]، ایک کثیر لشکر کے ساتھ ارکلی خان کے مقابلے کے لیے ملتان بھیجا۔ ان دونوں نے ملتان پہنچ کر ملتان کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ تقریباً دو ماہ تک جاری رہا۔ کوتوال ملتان اور ملتان کے عوام محاصرے کی تاب نہ لا کر صلح کے طالب ہوئے، اور سلطان جلال الدین کے دونوں بیٹوں ارکلی خان اور سلطان رکن الدین کو قید کر کے الغ خان کے پاس لائے۔ الغ خان ان کو گرفتار کر کے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ وہ ابوہر کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اسے سلطان علاء الدین کا فرمان ملا کہ دونوں بھائیوں کی آنکھوں میں سلائی پھیری جائے اور الب خان اُن دونوں کو ہانسی کے کوتوال کے سپرد کر کے فوراً دہلی آئے۔ اس فرمان کی تعمیل میں دونوں بھائیوں کی آنکھوں میں سلائی پھیری گئی اور سلطان رکن الدین کے اُمرا میں سے بھی احمد چپ اور الغورہ کی آنکھوں میں سلائی پھیری گئی اور ان کو گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ اسی طرح ارکلی خان کے مصاحبوں کو بھی اندھا کر کے کھرام بھیج دیا گیا۔[5]

---

(1) تاریخ معصومی۔ ص ۴۲ تاریخ فیروز شاہی۔ ضیا برنی ص ۲۳۸۔
(2) تاریخ مبارک شاہی۔ ص ۷۱-۷۲۔
(3) الغ خان کا نام الماس بیگ تھا۔
(4) ظفر خان المخاطب بہ الب خان کو سلطان علاء الدین نے اپنے زمانے میں عرض ممالک کے عہدے پر مقرر کیا تھا۔
(5) تاریخ مبارک شاہی۔ ص ۷۱-۷۲۔

عہد علاء الدین میں سندھ کے گورنر

ملک ہر نمار:

ارکلی خان اور رکن الدین کے قید ہونے کے بعد ملتان کی حکومت ملک ہر نمار کے سپرد ہوئی، لیکن کچھ ہی دن کے بعد ہر نمار کو بھی دہلی طلب کیا گیا اور اُسے بھی اندھا کر کے اُچ بھجوا دیا گیا۔[1]

الب خان:

ملک ہر نمار کے بعد ملتان کا گورنر الب خان کو بنایا گیا۔[2]

مغلوں کا سندھ پر حملہ:

اسی سال یعنی ۶۹۶ھ (۹۷-۱۲۹۶ء) میں مغلوں نے دریائے سندھ سے گزر کر ہندوستان پر حملہ کیا۔ علاء الدین نے اُن کے مقابلے کے لیے الغ خان اور ظفر خان کی سرکردگی میں فوج بھیجی۔ جالندھر کے قریب لڑائی ہوئی اور مغل شکست کھا کر بھاگ گئے۔ سلطان جلال الدین کے بیٹوں کی گرفتاری اور مغلوں کی شکست نے سلطان علاء الدین کی سلطنت کو مستحکم کر دیا۔[3]

نصرت خان:

اس کے بعد سلطان علاء الدین نے نصرت خان کو دس ہزار سواروں کے ساتھ ملتان، اُچ، بکھر، سیوستان اور ٹھٹھہ کی حکومت سپرد کی اور حکم دیا کہ نصرت خان تمام سندھ کا دورہ کرے، اور جہاں کہیں باغی اور مفسد نظر آئیں اُن کا قلع قمع کر کے قابل اعتماد لوگوں کو سندھ کے شہروں اور قلعوں پر متعین کرے۔[4]

سیوستان کی مہم:

۶۹۸ھ (۹۹-۱۲۹۸ء) میں سیوستان جو سندھ کا ایک حصہ تھا، یہاں کا راجا صلدی یا چھلدیو مغلوں سے مدد پا کر خود مختار ہو گیا تھا۔ سلطان علاء الدین نے اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے ظفر خان المخاطب بہ الب خان کو متعین کیا۔ الب خان فوج لے کر سیوستان پہنچا، اور قلعہ سیوستان کا محاصرہ کر لیا، لیکن راجا صلدی اور اس کا بھائی اور مغل جو قلعے کے اندر تھے، اس قدر تیروں کی بارش کرتے تھے کہ قلعے کے پاس کسی پرندے کا بھی ٹھہرنا محال تھا، لیکن ظفر خان نے اس کے باوجود قلعے کو فتح کر لیا اور راجا صلدی، اس کے بھائی اور تمام مغلوں کو جو قلعے کے اندر تھے گرفتار کر کے دہلی بھجوا دیا۔[5]

تاج الملک کافوری:

تاریخ فیروز شاہی میں ہے کہ سلطان علاء الدین ہمیشہ عیش و کامرانی کے وقت لوگوں سے پوچھا کرتا تھا کہ مجھے کون سا ایسا کام کرنا چاہیے تاکہ میرا نام قیامت تک باقی رہے۔ میرے پاس مال و دولت بے حد جمع ہو چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں دہلی کو کسی کے سپرد کر کے سکندر کی طرح دنیا کو اپنے قبضے میں لاؤں۔ ایک دن اُس نے یہی بات دہلی کے کوتوال علاء الملک سے کہی، اور پوچھا بتاؤ کہ وہ دو مہم کون سی ہیں جنہیں سب سے زیادہ مقدم رکھنا چاہیے۔ علاء الملک نے جواب دیا کہ میری رائے میں پہلی مہم یہ ہے کہ ہندوستان کے جتنے صوبے ہیں انہیں اس طرح مطیع و منقاد بنانا چاہیے کہ کسی سرکشی اور باغی کا کہیں نام و نشان باقی نہ رہے۔ دوسری مہم جو پہلی مہم سے بھی زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ مغل جو ملتان کے راستے سے حملے کرتے ہیں ان کے راستے کو اس طرح بند کر دینا چاہیے، کہ وہ ہندوستان میں داخل نہ ہو سکیں۔[6] غالباً اس کے بعد سلطان علاء الدین نے گجرات کی گورنری پر الغ خان کو مقرر کیا اور ملتان و سیوستان کی گورنری پر تاج الملک کافوری مقرر کیا گیا۔[7]

ملک غازی تغلق:

۷۰۳ھ (۴-۱۳۰۳ء) میں سلطان علاء الدین نے مغلوں کا بالکلیہ استیصال کرنے کے لیے اپنے تجربہ کار سپہ سالار ملک غازی تغلق کو دس ہزار سواروں کے ساتھ دیپالپور پر مقرر کیا اور ملتان، اُچ اور سندھ کا تمام علاقہ اُس کی جاگیر میں دے دیا۔ ملک غازی تغلق نے مغلوں کے حملوں کو روکنے کے لیے ملتان اور دیپالپور میں مضبوط قلعے تعمیر کرائے۔

مغلوں کا حملہ:

۷۰۵ھ (۶-۱۳۰۵ء) میں کیک اور اقبال مند دو مغل سردار

---

(1) تاریخ مبارک شاہی-ص ۷۲۔
(2) ایضاً ص ۷۲۔
(3) تاریخ فیروز شاہی-ضیا برنی، ص ۲۵۰۔
(4) تاریخ معصومی-ص ۴۳۔
(5) تاریخ فیروز شاہی-ضیا برنی، ص ۲۶۳-۲۶۴۔
(6) تاریخ فیروز شاہی-ضیا برنی، ص ۲۶۹-۲۷۰۔
(7) ایضاً-ص ۳۲۳۔

نے محمد علی ترتق اور علی بیگ کا بدلہ لینے کے لیے جو گرفتار ہو چکے تھے، ساٹھ ہزار مغلوں کے ساتھ ملتان پر حملہ کیا، لیکن ملک غازی تغلق نے جو مغلوں کے حملوں کو روکنے کے لیے دیپالپور پر متعین تھا، ان کا مقابلہ دریائے سندھ کے کنارے کیا۔ ساٹھ ہزار مغلوں میں سے صرف چار ہزار جان بچا کر فرار ہو سکے، باقی سب مارے گئے۔ ان کا سردار کبک زندہ گرفتار کر کے دہلی بھیجا گیا، جہاں اس کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوایا گیا۔ اقبال مند کو ملک غازی نے شکست دے کر قتل کیا۔ ان متواتر شکستوں کی وجہ سے مغلوں پر ملک غازی کی دھاک کچھ اس طرح بیٹھ گئی کہ وہ ایک طویل عرصے تک پھر ہندوستان پر حملہ کرنے کی جرات نہ کر سکے۔[1]

سلطان علاء الدین کی وفات:

۷۱۶ھ (۸-۱۳۰۷ء) میں سلطان علاء الدین نے وفات پائی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ ملک کافور[2] نے اس کو زہر دے کر مار ڈالا۔ سلطان علاء الدین کی وفات کے بعد اس کا سب سے چھوٹا لڑکا شہاب الدین جس کی عمر اس وقت پانچ چھ سال کی تھی، ملک کافور کی مدد سے تخت پر بٹھایا گیا، مگر ملک کافور کے قتل کے بعد جو سلطان علاء الدین کی وفات کے پینتیس روز بعد ہوا، سلطان علاء الدین کا دوسرا بیٹا مبارک شاہ خلجی اُمرائے سلطنت کے مشورے سے تخت پر بیٹھا جس نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنا لقب سلطان قطب الدین مبارک شاہ رکھا۔

سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی

۷۱۷ھ (۱۸-۱۳۱۷ء) تا ۷۲۱ھ (۲۲-۱۳۲۱ء)

سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد یک ہندو بچے کو جو بچپن میں مالوہ کی جنگ میں اپنے بھائی کے ساتھ لشکر سلام کے ہاتھوں گرفتار ہو کر آیا تھا اور سلطان علاء الدین کے ایک سردار ملک شادی خان نے اس کی پرورش کر کے اس کا نام حسن رکھا، بعد میں اُسے خسرو خان کا خطاب دیا، اور اس کے بھائی پر بھی جس کا نام حسام الدین تھا، خصوصی توجہ مبذول فرمائی۔ اپنی تخت نشینی کے دوسرے سال سلطان قطب الدین نے خسرو خان کو وزارت کا عہدہ دے کر دکن کا انتظام اس کے سپرد کیا، اور ملک دکن کے تمام راجاؤں کی نگرانی اور ان سے خراج وصول کرنے کا کام اس کے سپرد ہوا۔ ادھر گجرات کا گورنر ظفر خان المخاطب بہ الغ خان جو ملک کافور کی غلط شکایتوں پر قتل کیا گیا تھا، اس کی جگہ گجرات کی گورنری پر خسرو خان کے بھائی کو مقرر کیا، اس طرح گجرات اور دکن کی حکومت ان دونوں ہندو زاد بھائیوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ بڑے بڑے عہدے دیے اور اس کوشش میں مصروف ہو گیا کہ موقع پاتے ہی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دے۔ اُدھر خسرو خان دکن میں ہندوؤں کی فوج بھرتی کر کے اپنی خود مختاری کے خواب دیکھنے لگا۔ ضیا برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں خسرو خان کی نسبت لکھا ہے:

"شبہا مجلس خلوت می ساخت، و ابنائے ہندوے خود با چند بلغا کی از باران ملک نائب کہ مجرم خود گردانیدہ بود اندیشۂ بلغا کی (بغاوت) میکرد"

گجرات اور دکن میں ہندوؤں کی دوبارہ سلطنت قائم ہونے کی تجویزیں ہو رہی تھیں، اُدھر سلطان قطب الدین نماز و روزہ ترک کر کے لہو و لعب میں مصروف ہو کر امور سلطنت سے بے نیاز ہو چکا تھا، خیر خواہ اُمرا نے جب سلطان قطب الدین کو خسرو خان کی بدنیتی سے مطلع کیا تو اُس نے خسرو خان کو دہلی طلب کر لیا، اور وہ تمام اُمرا جنہوں نے خسرو خان کی شکایت کی تھی، مورد عتاب ٹھہرے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ کسی کو بھی خسرو خان اور اُس کے بھائی کے خلاف لب کشائی کی جرات نہ رہی، آخر اسی خسرو خان نمک حرام نے ۵ ربیع الاول ۷۲۱ھ (۱۳۲۱ء) کو جاہریا برادو کے ہاتھ سے قتل کرایا، جب کہ وہ خود سلطان قطب الدین سے ستم گھتا تھا، اور سلطان قطب الدین اس کو پٹک کر اس کے اُوپر تھا۔

خسرو خان

۷۲۰ھ (۱۳۲۰ء)

۶ ربیع الاول ۷۲۰ھ (۱۳۲۰ء) کی صبح خسرو خان تخت شاہی پر بیٹھا، اور اُس نے اپنے لیے سلطان ناصر الدین کا خطاب اختیار کیا، خسرو خان کو جس سے سب سے زیادہ خطرہ تھا وہ ملک غازی تغلق دیپالپور کا گورنر تھا، جو مغلوں کو پے در پے شکستیں دے کر کافی شہرت حاصل کر چکا تھا، اس کا بیٹا ملک فخر الدین جونا خان جو بعد میں سلطان محمد تغلق کے نام سے مشہور ہوا دہلی میں موجود تھا، خسرو خان نے ملک غازی تغلق کو ہموار کرنے کے لیے اس کے بیٹے ملک فخر الدین جونا خان کو امیر اخور کا

---

[1] تاریخ مبارک شاہی۔ ص ۷۴۔

[2] ملک کافور ایک حبشی غلام تھا، جس کو الغ خان نے گجرات کی فتح کے وقت بغداد کے ایک عرب تاجر سے کھمبایت کی بندرگاہ سے خریدا تھا، جو بعد میں ترقی کرتے کرتے سپہ سالاری کے عہدے تک پہنچا۔ (مؤلف)۔

عہدہ دیا، اور اس کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر اٹھا کر نہ رکھی، تاکہ اُس کا باپ ملک غازی مخالفت پر آمادہ نہ ہو سکے، جاہر یا برادو کو جو سلطان قطب الدین کا قاتل تھا، زر و جواہر سے تولا گیا، اپنے بھائی حسام الدین کو خانخانان کا خطاب دیا۔ خسرو خان کو پہلے ہی اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا، لیکن اُس نے بادشاہ ہونے کے بعد اپنا اسلامی نام اس لیے نہیں بدلا کہ وہ اپنے اسلامی نام کو قائم رکھ کر اُمرائے سلطنت کو اپنی مخالفت سے باز رکھنا اور بتدریج اسلامی سلطنت کو ہندو سلطنت میں تبدیل کرنا چاہتا تھا، آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ دہلی کی مسجدوں کو ہندوؤں نے مسلمانوں سے چھین لیا، مسجدوں کی محرابوں میں بت رکھے گئے اور مسجدوں کو مندر بنا کر ان میں گھنٹے بجنے لگے، اسلامی شعار مٹائے گئے۔[1]

ملک جونا خان کی غیرت اسلامی:

ملک فخر الدین جونا خان کچھ دن تو اس ہندو گری کو برداشت کرتا رہا، آخر وہ اپنے باپ کے پاس دیپالپور بھاگا، خسرو خان نے اس کے تعاقب میں سوار بھیجے، لیکن وہ ملک جونا خان کو نہ پکڑ سکے، ملک جونا خان نے دیپالپور پہنچ کر خسرو خان کی ہندو نوازی اور کمینہ حرکات کو تفصیل سے بیان کیا، ملک غازی سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے خون کا انتقام لینے کے لیے تیار ہوا۔

ملک غازی گورنر دیپالپور کے خطوط اُمرائے سلطنت کے نام:

ملک غازی نے عہد علاء الدین کے اُمرا اور ملوک کے نام خطوط لکھے۔ یہ خط اس نے ملک بہرام ایبہ، ملک مغلطی، امیر ملتان، ملک عین الملک شہاب ملتانی، امیر سیوستان کے لڑکے محمد شاہ اور ملک بک لکھی امیر سامانہ کے نام لکھے، اس نے ان خطوط میں سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے خون ناحق کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا کہ تم سب فوج لے کر میرے ساتھ شریک ہو جاؤ تاکہ ہم سب مل کر خسرو خان سے سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے خون کا انتقام لیں۔

ملک مغلطی امیر ملتان نے جواب میں لکھا کہ میں ملتان کا ایک چھوٹا سا امیر ہوں۔ چند ہزار سواروں اور پیادوں کے ساتھ ہم بادشاہ دہلی کا مقابلہ کہاں کر سکتے ہیں، تمہارے لیے مناسب یہ ہے کہ اس سودائے فاسد کو دماغ سے نکال دو اور بادشاہ دہلی کی اطاعت کرو، امیر ملتان کا جب یہ جواب ملک غازی کو ملا، اُس نے فوراً ہی خفیہ طور پر ملک بہرام ایبہ کو لکھا کہ امیر ملتان امارت کے قابل نہیں رہا، تم اُس کو قتل کر کے ملتان کی حکومت اپنے قبضے میں لے لو اور وہاں کی فوج لے کر میرے پاس چلے آؤ، ملک بہرام ایبہ نے اس کی تعمیل کی اور امیر ملتان کو قتل کر کے فوج لے کر دیپالپور چلا آیا۔

حاکم سیوستان کا جواب:

سیوستان کے حاکم کا لڑکا محمد شاہ اتفاقاً اس خط کے پہنچنے سے پہلے سیوستانیوں کے ہاتھ میں قید تھا، یہ خط سیوستانیوں نے محمد شاہ کو پہنچا کر کہا کہ اگر تم ملک غازی کی اطاعت کا وعدہ کرو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے، محمد شاہ نے اطاعت کا وعدہ کیا، اور انہوں نے حسب وعدہ اس کو رہا کر دیا، محمد شاہ نے قید سے چھوٹنے کے بعد ملک غازی کو لکھا کہ میں قید تھا، میرا لشکر ابھی مرتب نہیں ہے، میں اپنے لشکر کو تیار کر کے فوراً پہنچتا ہوں۔

ملک عین الملک ملتانی کا جواب:

ملک عین الملک ملتانی کو جب کہ وہ دہلی میں تھا، ملک غازی کا خط ملا، اس نے جواب میں لکھا کہ میں آ نہیں سکتا، لیکن میں جب اپنے وطن واپس جاؤں گا تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں بالکل غیر جانبدار رہوں گا، تم میں سے جو کوئی بھی دہلی کو فتح کر لے گا میں اس کے ساتھ ہوں گا۔

ملتان و سیوستان کے خراج کی لوٹ:

اسی زمانے میں ملک غازی کو خبر ملی کہ سیوستان اور ملتان کا خراج دہلی جا رہا ہے، جس میں لاتعداد گھوڑے بھی ہیں، اُس نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ تمام مال و گھوڑے لوٹ لیے جائیں اور ہر ایک لشکری کو دو سال کی تنخواہ دے کر فارغ البال کر دیا جائے، چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی۔[2]

خسرو خان کا خاتمہ:

غازی ملک نے فوج لے کر دہلی کی طرف کوچ کیا، خسرو خان کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو اس نے ایک زبردست فوج اپنے بھائی کی سرکردگی میں مقابلے کے لیے روانہ کی، سرستی کے قریب دونوں فوجوں میں جنگ ہوئی، آخر خسرو خان کی فوج شکست کھا کر بھاگی، غازی ملک سرستی سے آگے بڑھ کر اندرپت کے خرابے میں مقیم ہوا۔ خسرو خان ہندوؤں کا ایک عظیم الشان لشکر لے کر دہلی سے نکلا، لیکن ملک غازی کی

---

[1] آئینہ حقیقت نما۔ حصہ اول، ص ۲۹۸۔

[2] یہ تمام تفصیل تاریخ مبارک شاہی۔ ص ۷۷-۸۹-۹۰ سے ماخوذ ہے۔

مٹھی بھر فوج نے خسرو خان کے اس عظیم لشکر کو بھی شکست دے دی، خسرو خان شکست کے بعد میدان سے فرار ہو کر ملک شادی خان کے مقبرے میں پناہ گزیں ہوا، وہیں سے اُس کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا، خسرو کی مدت حکومت چار ماہ تھی۔

ملک غازی نے دہلی پہنچ کر تلاش و جستجو کی کہ خاندان خلجی کا کوئی چھوٹا یا بڑا مرد اس کو مل جائے تاکہ وہ اس کو تخت نشین کر کے اپنا حق نمک ادا کر دے، لیکن خسرو خان اس خاندان کے ہر فرد کو قتل کر کے پورے خاندان کا نام و نشان مٹا چکا تھا، مجبوراً ملک غازی نے تمام سرداروں کو جمع کر کے کہا بھائیو! میرا مقصد صرف سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے خون ناحق کا انتقام لینا تھا، سو وہ میں لے چکا، اب تم جس کو چاہو اپنا بادشاہ منتخب کرو، میں بھی تمہاری طرح اس کی اطاعت و فرمانبرداری کروں گا، سب نے بالاتفاق ملک غازی کو اپنا بادشاہ منتخب کیا، اس نے سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے تخت دہلی کو زینت بخشی۔[1]

خلجی سلاطین کے عہد پر تبصرہ

خلجی سلاطین نے اپنی کوششوں سے سندھ کو مغلوں کے حملوں سے محفوظ رکھا، ملک نصرت خان اور ظفر خان اُن کے وہ تجربہ کار سپہ سالار تھے، جنہوں نے سندھ کو ہمیشہ بیرونی حملوں سے بچائے رکھا، نصرت خان نے سندھ کے چھوٹے چھوٹے پرگنوں کا دورہ کر کے شہروں کی عدالتوں میں قاضی اور امیر مقرر کیے۔ خلجیوں کے عہد حکومت میں یہ بہت اچھا انتظام تھا کہ ہر ہفتے سندھ کی خبریں باقاعدہ مرکز میں پہنچتی تھیں، علاء الدین خلجی نے سندھی لشکر کی مدد سے گجرات فتح کیا، ملک غازی نے سندھی اور پنجابی لشکر کی مدد سے دہلی کو فتح کیا، خلجیوں کے دور میں سندھ کی تجارت نے بھی ترقی کی اور سندھ کی تجارت عدن اور افریقہ میں ہونے لگی۔ سلطان علاء الدین نے شراب کی ممانعت کر کے تمام ملک سے شراب خواری کا نام و نشان مٹا دیا۔ اس نے خفیہ پولیس کا محکمہ قائم کیا، تحصیلدار اور پٹواری مقرر کر کے زمینداروں سے نقد خراج وصول کرنے کا طریقہ موقوف کر کے بٹائی کا طریقہ جاری کیا۔ جھوٹ بولنے کی سخت سزا مقرر کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ملک سے کذب اور دروغ کا نشان مٹ گیا، اس کے زمانے میں غارت گری اور لوٹ مار کا بالکلیہ استیصال ہوا۔ بہار سے پنجاب اور سندھ تک تمام سڑکیں اور راستے محفوظ تھے، ملک میں ضروریات زندگی کی ارزانی ہوئی، ارزانی کا یہ عالم تھا کہ علاء الدین کے زمانے میں ایک روپے میں پونے چھ من گیہوں آتے تھے، تمام ملک میں زراعت کو ترقی ہوئی۔

خلجیوں کے دور میں علوم و فنون کی بھی کافی ترقی ہوئی، سلطان جلال الدین علم و فضل سے کافی دلچسپی رکھتا تھا، ضیا برنی نے تاریخ فیروز شاہی عہد جلالی کے ان اکابر اور ملوک کی ایک طویل فہرست دی ہے جو علم و فضل سے آراستہ تھے، اُن کے نام یہ ہیں، ملک قطب الدین علوی، ملک تاج الدین کہرامی، ملک مرید جاجرمی، ملک سعد الدین امیر بحر، خواجہ جلال الدین امیر چہ نائب وزیر، مولانا جلال الدین بھکری مستوفی ممالک، ان کے متعلق ضیا برنی لکھتا ہے کہ یہ سب کے سب عہد جلالی میں اہم خدمتوں پر فائز تھے، جب یہ اپنے دفاتر میں بیٹھتے تو فیصلے کے وقت اور عام اوقات میں کبھی کوئی لفظ خلاف شرع ان کی زبان پر نہیں آتا تھا۔[2]

حضرت امیر خسرو نے اپنا مشہور خمسہ اسی دور میں لکھا ہے۔

سلطان علاء الدین اگرچہ پڑھا لکھا نہ تھا، لیکن وہ اہل علم اور باخدا لوگوں کا قدر دان تھا اور اپنے اہم امور میں علما اور تجربہ کار لوگوں سے مشورہ کرتا تھا، اس کے عہد حکومت میں علما اور ہر فن کے اہل کمال کی اس قدر کثرت تھی جو دوسرے زمانے میں نظر نہیں آتی۔

ضیا برنی نے عہد علائی کے علما کی فہرست درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو علوم و فنون میں غزالی اور رازی کے درجے پر فائز ہیں، جیسا کہ قاضی فخر الدین ناقلہ، قاضی شرف الدین سریاہی، مولانا نصیر الدین غنی، مولانا تاج الدین مقدم، مولانا ظہیر الدین لنگ، قاضی مغیث الدین بیانہ، مولانا رکن الدین سنامی، مولانا تاج الدین کلاہی اور مولانا ظہیر الدین بھکری وغیرہ۔[3]

عہد علائی کے صوفیائے کرام میں ضیا برنی نے جن شیوخ کا تذکرہ کیا ہے، ان میں اُس نے حضرت شیخ رکن الدین ملتانی کے تذکرے کو خصوصیت سے اہمیت دی ہے۔

حضرت شیخ ابو الفتح رکن الدین حضرت شیخ صدر الدین کے صاحبزادے اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے پوتے تھے، انہوں نے ظاہری تعلیم اپنے والد سے اور باطنی تعلیم اپنے دادا حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے حاصل کی تھی، سلطان علاء الدین اُن سے

---

[1] ماخوذ از آئینہ حقیقت نما۔ حصہ اول، ص ۲۹۸-۲۹۹۔

[2] تاریخ فیروز شاہی۔ ضیا برنی، ص ۲۰۱-۲۰۲۔

[3] تاریخ فیروز شاہی۔ ضیا برنی، ص ۳۵۳۔

غیر معمولی عقیدت و محبت رکھتا تھا۔

ایک دفعہ حضرت شیخ رکن الدین ملتان سے دہلی تشریف لائے تو سلطان علاء الدین نے شاہی کروفر کے ساتھ دہلی سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا، اور انتہائی تعظیم و توقیر کے ساتھ ان کو دہلی لایا اور دو لاکھ ٹنکے پیش کیے۔ جب وہ ملتان واپس ہونے لگے تو مزید پانچ لاکھ ٹنکے بطور نذر پیش کیے، آپ نے یہ سب رقم دہلی ہی میں غربا اور مساکین میں تقسیم کر دی اور فرمایا کہ میں تو دہلی میں صرف حضرت خواجہ نظام الدین کی محبت اور شوق ملاقات میں آتا ہوں۔[1]

سلطان علاء الدین خلجی کے بعد اس کا لڑکا قطب الدین مبارک شاہ تخت نشین ہوا، اُسے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا سے ذاتی مخالفت تھی، اُس نے اس مخالفت و عناد کی وجہ سے اپنے عقیدت مندانہ تعلقات دوسرے مشائخین سے پیدا کیے، اسی سلسلے میں اُس نے حضرت شیخ رکن الدین کو بھی ملتان سے دہلی تشریف لانے کی دعوت دی، جب آپ دہلی تشریف لائے اور سلطان قطب الدین سے ملنے کے لیے گئے تو اس نے پوچھا کہ دہلی میں سب سے پہلے آپ کا کس نے استقبال کیا، آپ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ سلطان قطب الدین حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا مخالف ہے، فرمایا کہ اس نے جو اس شہر کا سب سے اچھا آدمی ہے یعنی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے۔[2]

حضرت شیخ رکن الدین کی عادت مبارک تھی کہ جب آپ سلطان قطب الدین سے ملنے کے لیے جاتے تو راستے میں اپنی سواری، تخت رواں کو ٹھہراتے تاکہ ضرورت مند اپنی درخواستیں سواری میں ڈال دیں، بعض اہل ضرورت کی حاجتیں زبانی بھی سنتے، شاہی محل کے قریب دو دروازوں تک تخت رواں پر جاتے، تیسرے دروازے پر سلطان قطب الدین خود اُن کے استقبال کو موجود ہوتا تھا، وہ آپ کو نہایت تعظیم و احترام سے دربار میں لے جا کر بٹھاتا، اور خود مؤدب بیٹھ جاتا، حضرت شیخ رکن الدین وہ تمام درخواستیں بادشاہ کے سامنے پیش کرتے، وہ ہر ایک درخواست کو غور سے پڑھ کر اس پر مناسب حکم لکھتا۔ حضرت شیخ رکن الدین واپسی کے وقت ان تمام درخواستوں کو اپنے ساتھ لے آتے۔[3]

سلطان غیاث الدین تغلق سے بھی حضرت شیخ رکن الدین کے تعلقات بہت خوشگوار تھے، جب وہ بنگالہ کی مہم سے واپس آیا تو آپ اُس کے استقبال کے لیے افغان پور تک گئے، رات کو آپ سلطان غیاث الدین کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ آپ کو عالم کشف میں معلوم ہوا کہ جس عمارت میں آپ کھانا کھا رہے ہیں وہ گرنے والی ہے، آپ کھانا چھوڑ کر فوراً ہی باہر نکل گئے، مگر سلطان غیاث الدین نے نکلنے میں دیر کی، اتنے میں عمارت گر پڑی اور سلطان نے اس کے نیچے دب کر وفات پائی۔[4]

غیاث الدین کے بعد سلطان محمد تغلق سر بر آرائے سلطنت ہوا، اُس سے بھی آپ کے تعلقات نہایت خوشگوار رہے اور اُس کے یہاں مہمان ہوئے، ۱۶ رجب ۷۳۵ھ (۱۳۳۵ء) کو حضرت شیخ رکن الدین نے ملتان میں وفات پائی۔[5]

ضیا برنی عہد علائی میں آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"در ہمہ عہد علائی شیخ رکن الدین داد طریقت مشائخ میداد و حق تکمیل مریداں می گذارد، و سجادۂ پدر و جد را منور می داشت، و تمامی اہالی دریائے سندھ از ملتان واچھ و فرود ترو مریلہ باستان متبرک شیخ رکن الدین قدس اللہ سرہ العزیز تشبث و تعلق نمودہ بودند۔"

---

(1) بزم صوفیا۔ ص ۲۶۳۔

(2) سیر العارفین۔ جلد ۲، ص ۹-۱۰۔

(3) سیر الاولیا ص ۱۳۶ و اخبار الاخبار، ص ۶۳۔

(4) تاریخ فرشتہ۔ جلد ۲، ص ۴۱۱۔

(5) تاریخ فیروز شاہی۔ ضیا برنی، ص ۳۴۸۔

باب:13

سندھ میں تغلقوں کی حکومت

۷۲۰ھ(۲۱-۱۳۲۰ء) تا ۸۰۲ھ(۴۰۰-۱۳۹۹ء)

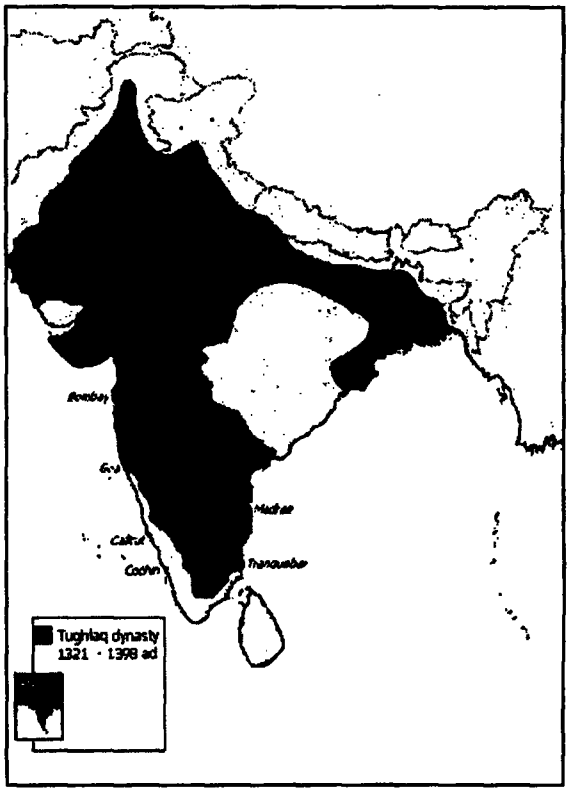

عیاث الدین تغلق

۷۲۰ھ(۲۱-۱۳۲۰ء) تا ۷۲۵ھ(۲۵-۱۳۲۴ء)

خلجیوں کے بعد تغلق سلاطین نے ۷۲۰ھ سے لے کر ۸۰۲ھ تک ہندوستان پر حکومت کی۔ اس خاندان کا پہلا فرمانروا ملک غازی تھا جو سلطان غیاث الدین تغلق کے لقب سے دہلی میں ۷۲۰ھ(۱۳۲۱ء) میں سربر آرائے سلطنت ہوا، اس کے تخت نشین ہوتے ہی بہت جلد حدود سلطنت میں امن وامان قائم ہو گیا، خسرو خان نے ملک غازی سے لڑائی کے وقت دہلی کا تمام خزانہ ہندوؤں میں لٹا دیا تھا۔ سلطان غیاث الدین جب دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اسے خزانہ بالکل خالی ملا لیکن اس نے اپنی خداداد قابلیت سے بغیر کسی ظلم وستم کے بہت جلد خزانے کو معمور کر دیا۔

سومرا کی بغاوت:

خاندان سومرا جو اس زمانے میں سندھ کے بعض حصوں پر حکمران تھا، اور جن کا تذکرہ آئندہ مستقل عنوان کے تحت کیا جائے گا، اس خاندان کے بعض لوگ اس زمانے میں کہ سلطان غیاث الدین خسرو خان کے مقابلے کے لیے ملتان سے دہلی گیا ہوا تھا خروج کر کے ٹھٹھہ پر قابض ہو گئے۔

ملتان وسندھ کی حکومت پر تقرر:

سلطان غیاث الدین نے ملک تاج الدین کو ملتان پر، خواجہ خطیر کو بکھر میں اور ملک علی شیر کو سیوستان پر حاکم مقرر کیا۔

۷۲۳ھ(۱۳۲۳ء) کے آخر میں سلطان غیاث الدین نے اپنے بیٹے سلطان محمد شاہ کو اپنا ولی عہد منتخب کیا اور امرا اور اراکین سلطنت سے اس کے لیے بیعت لی۔[1]

۷۲۵ھ(۲۵-۱۳۲۴ء) کے ابتدا میں سلطان غیاث الدین تغلق

---

[1] تاریخ معصومی۔ص ۴۶-۴۷۔

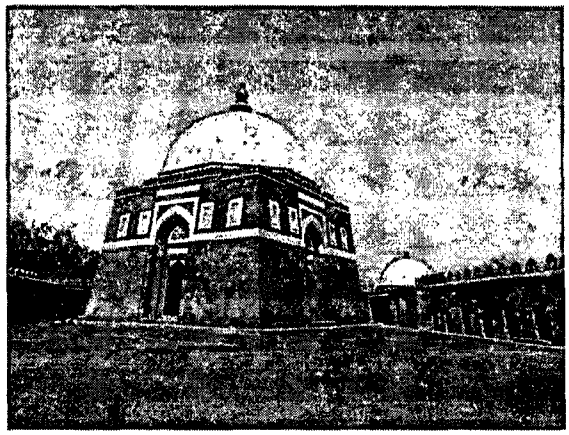

دھلی میں سلطان غیاث الدین تغلق کا مزار

نے جب کہ وہ بنگال سے واپس ہو کر دہلی کے قریب پہنچ چکا تھا تغلق آباد سے تین چار کوس کے فاصلے پر افغان پور کے قریب اُس مکان کی اچانک چھت گر جانے کی وجہ سے جس میں وہ ٹھہرا ہوا تھا، دب کر وفات پائی۔

سلطان محمد شاہ تغلق

۷۲۵ھ (۲۵-۱۳۲۴ء) تا ۷۵۲ھ (۵۲-۱۳۵۱ء)

۷۲۵ھ (۲۵-۱۳۲۴ء) میں سلطان غیاث الدین کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا محمد شاہ دارالحکومت تغلق آباد میں سربر آرائے تخت سلطنت ہوا۔

عہد محمد شاہ تغلق میں سندھ کے گورنر

کشلو خاں:

۷۲۷ھ (۲۷-۱۳۲۶ء) میں سلطان محمد شاہ تغلق نے بہرام ایبہ کو جس کا خطاب کشلو خاں تھا سندھ کا گورنر مقرر کیا اور اُچ اور ملتان بھی اُس کے حوالے کیے، سلطان محمد تغلق، کشلو خاں کی بڑی عزت کرتا تھا۔

اب محمد تغلق کو مغلوں کے حملوں سے اطمینان ہو چکا تھا، لیکن دکن کی جانب سے جہاں مسلمانوں کی نئی نئی حکومت قائم ہوئی تھی اُسے اطمینان نہ تھا، لہٰذا اُس نے دیوگیری (دولت آباد) کو اپنا دارالسلطنت بنانا چاہا، چنانچہ وہ دیوگیری (دولت آباد) روانہ ہو گیا، اور اپنی والدہ مخدومہ جہاں کو بھی دیوگیری (دولت آباد) لے گیا اور اُسے اپنا دارالسلطنت بنایا، وہ تقریباً دو سال تک وہاں مقیم رہا۔

کشلو خاں کی بغاوت:

اس زمانے میں کہ سلطان محمد تغلق دیوگیری (دولت آباد) میں مقیم تھا، کشلو خاں گورنر سندھ نے بغاوت کی، بغاوت کے اسباب مختلف مورخین نے مختلف لکھے ہیں۔ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے آئینہ حقیقت نما کے دوسرے حصے میں اس بغاوت کے علل و اسباب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۷۲۷ھ (۲۷-۱۳۲۶ء) کے آخر میں سب سے پہلے ملک بہادر گرشاسب کی بغاوت دہلی میں ظہور پذیر ہوئی، جب کہ سلطان محمد شاہ دیوگیری میں تھا، اور اُس کی وجہ یہ تھی کہ ملک احمد ایاز گورنر دہلی سلطان محمد تغلق کے دیوگیری پہنچنے کے بعد ان لوگوں کو جنہیں اپنی سکونت دولت آباد میں منتقل کرنے کا حکم تھا دہلی سے روانہ ہونے پر زور دے رہا تھا، گرشاسب نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر علم بغاوت بلند کیا، آخر ملک احمد ایاز اور گرشاسب کا مقابلہ ہوا، اور گرشاسب گرفتار ہو کر سلطان کے پاس بھیجا گیا، اور اپنی غلطی کی سزا پر قتل کیا گیا، بہرام ایبہ الخاطب بہ کشلو خاں جو کہ سندھ و ملتان کا گورنر تھا، وہ سلطان محمد تغلق کو ایک ناتجربہ کار لڑکا سمجھ کر خاطر میں نہ لاتا تھا، وہ بھی گرشاسب کے قتل سے متاثر اور ناخوش ہو کر بغاوت پر آمدہ ہوا۔[1]

لیکن تاریخ فرشتہ میں کشلو خاں کی بغاوت کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ سلطان محمد تغلق نے اپنے ایک قاصد علی خططی کو کشلو خاں کے پاس روانہ کیا کہ وہ بھی اپنے اہل و عیال کو دولت آباد بھیج دے جس پر وہ علی خططی کو قتل کر کے باغی ہو گیا۔[2]

ضیا برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں اس بغاوت کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اول فتنہ جو ملتان میں پیدا ہوا وہ بہرام ایبہ کی بغاوت تھی، سلطان محمد تغلق اُس زمانے میں دیوگیری (دولت آباد) میں تھا، سلطان محمد تغلق اُس کی بغاوت کی خبر سن کر دہلی پہنچا اور لشکر لے کر ملتان کی طرف روانہ ہوا۔ جب سلطانی لشکر بہرام ایبہ کے لشکر کے ساتھ مقابل ہوا تو پہلے ہی حملے میں بہرام ایبہ کے لشکر نے شکست کھائی، اور بہرام ایبہ کا سر کاٹ کر سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ بہرام ایبہ کے لشکر کے بہت سے لوگ مارے گئے اور جو باقی بچے وہ بھاگ گئے، چونکہ

---

[1] آئینہ حقیقت نما حصہ دوم ص ۸۲-۲۸۳۔

[2] تاریخ فرشتہ۔

بہرام ایبہ کے لشکر میں زیادہ تر ملتانی تھے، لہٰذا سلطان محمد تغلق نے ارادہ کیا کہ ملتان میں قتل عام کرے، جب سپاہی قتل عام کرنے کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو عین اُس وقت حضرت شیخ رکن الدین نے سلطان محمد تغلق کی خدمت میں ننگے سر تشریف لا کر اہل شہر کی سفارش کی اور سلطان نے آپ کی سفارش پر ملتانیوں کو معاف کر دیا۔[1]

قوام الملک:

منتخب التواریخ میں ہے کہ بہرام ایبہ کے بعد سلطان محمد تغلق نے قوام الملک مقبول کو ملتان کا گورنر بنایا، قوام الملک تلنگانے کے کنور رور دیو کا نوکر تھا، جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا، اور حضرت کی وفات کے بعد سلطان محمد تغلق نے اس کی تربیت کی جانب خصوصی توجہ دی، اس کا مرتبہ یہاں تک بلند کیا کہ اس کو قوام الملک کا خطاب دے کر ملتان کا گورنر مقرر کیا، قوام الملک کو ملتان کا گورنر مقرر کرنے کے بعد بہزاد خاں کو قوام الملک کی امداد کے لیے ملتان کا سپہ سالار اور شاہو افغان کو بہزاد کا نائب مقرر کیا۔[2]

عماد الملک:

۷۴۴ھ (۴۳-۱۳۴۲ء) میں جب کہ دہلی اور مالوہ میں سخت قحط پڑ رہا تھا اور سلطان محمد تغلق زراعت اور قحط کے رفع کرنے کے اسباب کی طرف متوجہ تھا۔ خبر پہنچی کہ فخر الدین بہزاد کے فوج کے ساتھ برے سلوک کی وجہ سے شاہو لودھی افغان نے بہزاد کو قتل کر کے خود ملتان پر قبضہ کر لیا اور قوام الملک گورنر کو ملتان سے بھگا دیا، یہ خبر سن کر سلطان محمد تغلق ملتان کی طرف روانہ ہوا، تاریخ مبارک شاہی میں ہے کہ اُس وقت ایسا شدید قحط تھا کہ آدمی آدمی کو کھاتا تھا، جب سلطان حدود دیپالپور میں پہنچا تو شاہو لودھی تاب مقاومت نہ پا کر پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا اور سلطان دیپالپور ہی سے عماد الملک کو ملتان کا گورنر مقرر کر کے لوٹ آیا۔[3]

فیروز شاہی میں ہے کہ ابھی سلطان ملتان سے کئی منزل کے فاصلے پر تھا کہ شاہو افغان کی درخواست معافی سلطان کی خدمت میں پہنچی، اُس نے لکھا تھا کہ میں آپ کا وفادار ہوں، باغی نہیں ہوں۔ میں ملتان کو چھوڑ کر افغانستان جا رہا ہوں، آپ جسے چاہیں ملتان کا گورنر مقرر کریں۔[4]

اسی سفر میں جب کہ سلطان ملتان جا رہا تھا، دہلی میں اس کی والدہ مخدومہ جہاں کا انتقال ہوا۔

طغی حرام خور کی بغاوت:

سلطان محمد تغلق کے آخر عہد حکومت میں بہت سے فتنے اور بغاوتیں نمودار ہوئیں۔ ان سازشوں اور سازشیوں کے لیے دکن اور گجرات کے صوبوں کی آب و ہوا زیادہ موافق تھی، سلطان نے ان بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے ان صوبوں کے نظم و نسق میں تبدیلی ضروری سمجھی، اور قوام الملک نو مسلم کو جو ملتان کی گورنری کے بعد اب بدایوں کا حاکم تھا، خانجہاں کا خطاب دے کر گجرات کی گورنری پر مامور کیا اور دولت آباد (دکن) میں قتلغ خاں گورنر دکن کا طرز عمل جو باغیانہ سازشوں کے لیے نشو و نما کا موجب تھا، سلطان نے اسے محسوس کر کے مجبوراً قتلغ خاں کو معزول کر کے دہلی بلا لیا اور دکن میں قتلغ خان کے تحت جو چھوٹے چھوٹے حاکم مقرر تھے، ان کو بھی معزول کر کے اپنے معتمد سرداروں کو مقرر کیا۔ قتلغ خان کی جگہ دکن کی گورنری پر مجد الملک تھانیسری کو مقرر کر کے اس کے ماتحت صوبوں میں زین الدین المخاطب بہ مخلص الملک، یوسف بغرا آخور بیگی، عزیز الدین المخاطب بہ عزیز الملک اور عماد الملک وغیرہ کو مقرر کیا، مخلص الملک اور یوسف بغرا تو مرہٹی کے صوبوں میں مقرر ہوئے اور عزیز الملک کو دھار کی حکومت سپرد کی۔ لیکن قتلغ خاں اور اُس کے ماتحت عاملوں کو علیحدگی کی وجہ سے امیر ان صدہ میں جنہیں موجودہ زمانے کے تحصیلداروں یا تھانیداروں کے مساوی سمجھنا چاہیے بڑی ہل چل پیدا ہوئی، کیونکہ وہ پہلے حاکموں کے ساتھ سازشوں میں شریک تھے، ان مقرر ہونے والے صوبیداروں میں عزیز الملک نو مسلم کلال اور قوام الملک نو مسلم بھی تھا جن کی وجہ سے مخالفین کو جن کا سر گروہ قتلغ خاں تھا اس پروپیگنڈے کا خوب موقع ملا کہ سلطان نے سفلہ پروری پر کمر باندھ لی ہے، اور اس نے ایک مطرب بچے اور ایک کلال کو گورنریوں کے عہدے پر فائز کیا ہے، یہاں تک کہ اس عہد کا مورخ ضیا برنی بھی اس پروپیگنڈے سے متاثر نظر آتا ہے، اس نے ان دونوں کا تذکرہ نہایت ہی برے الفاظ میں اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں کیا ہے، قوام الملک کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ:

---

(1) تاریخ فیروز شاہی-ضیا برنی، ص ۴۷۹ و تاریخ معصومی، ص ۴۷-۴۸۔

(2) آئینہ حقیقت نما-حصہ دوم، ص ۸۳۔

(3) تاریخ مبارک شاہی-ص ۱۰۶-۱۰۷۔

(4) تاریخ فیروز شاہی-ص ۴۸۳۔

مطرب بچہ بُد اصل راچناں بر کشید کہ درجہ اُواز درجات بسیاراں از ملوک بگزشت، و گجرات و ملتان و بداون بدو داد۔

عزیز الملک کے مامور ہونے کے ضمن میں وہ اس کو نہایت کریہہ الفاظ میں یاد کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

کہ در آخر سال کہ قتلغ خاں را از دیو گیر در دہلی اُوردند، سلطان محمد عزیز خمار (کلال) کم اصل راولایت دہار داد و تمام مالوہ بدو تفویض کرد۔

عزیز الملک نے دہار کی حکومت سنبھالتے ہی سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ امیران صدہ کی ایک سرکش جماعت کو کسی بہانے سے ایک جگہ بلا کر تہہ تیغ کر دیا، اس سے مخالفین کو بغاوت کی آگ کو ہوا دینے کا خوب موقع ملا۔ گجرات کے امیران صدہ نے جب دہار کے امیران صدہ کے قتل کا حال سنا تو علم بغاوت بلند کر کے شاہی خزانے کو جو دہلی جا رہا تھا لوٹ لیا، ادھر قتلغ خاں جو دکن کی صوبہ داری سے معزول ہو چکا تھا، وہ دہلی میں خفیہ خفیہ سلطان کی آتش مخالفت کو اور بھی مشتعل کر رہا تھا۔

۱۶ رمضان ۷۴۸ھ (۱۳۴۷ء) کو سلطان محمد تغلق کو جب کہ وہ دہلی سے پندرہ میل کے فاصلے پر تھا گجرات کے امیران صدہ کی بغاوت کی خبر ملی وہ فوراً ہی اس کے انسداد کے لیے گجرات روانہ ہو گیا، گجرات میں پہنچ کر سلطان نے امن و امان قائم کر دیا، لیکن دولت آباد کی حالت خطرناک ہو گئی، باغیوں نے دولت آباد کے گورنر محمد الملک کو قتل کر دیا، یہ خبر سن کر سلطان بھروچ سے لشکر لے کر دولت آباد کی جانب روانہ ہوا،[1] سلطان دولت آباد میں ملک کے بندوبست اور انتظام میں مصروف تھا کہ اچانک خبر پہنچی کہ طغی[2] نامی غلام دہلی سے اوباشوں اور بدمعاشوں کا ایک لشکر لے کر گجرات پہنچا ہے اور امیران صدۂ گجرات کو اس نے اپنے ساتھ ملا کر علم بغاوت بلند کر دیا ہے، اور اس نے ملک مظفر کو جو شیخ معز الدین گجرات کے صوبہ دار کا مددگار تھا قتل کر کے شیخ معز الدین کو گرفتار کر لیا ہے۔ سلطان طغی نمک حرام کی اس بغاوت کا حال سن کر فوراً بھروچ کی طرف روانہ ہوا، جہاں طغی اپنی فوج کو لیے ہوئے پڑا تھا، اس وقت طغی کنبھایت میں قتل و غارت گری کرنے کے بعد بھروچ پہنچ چکا تھا، جب سلطان اساول پہنچا تو نہروالہ سے خبر ملی کہ طغی اپنے لشکر کے ساتھ اساول کی سمت روانہ ہو کر قبضہ کڑہ میں مقیم ہے، سلطان اس خبر کو سن کر موسلا دھار بارش میں طغی کے تعاقب میں اساول سے روانہ ہو کر تیسرے یا چوتھے روز قصبہ کڑہ کے قریب پہنچا، پہنچنے کے دوسرے ہی روز سلطان نے لشکر مرتب کر کے اس کا مقابلہ کیا، طغی شکست کھا کر نہروالہ کی طرف بھاگ گیا، سلطان نے اس کے تعاقب میں نہروالہ کا رخ کیا، وہ اس خبر کو سن کر (کرنال) گرنار کے راجا رائے مہروپ کے پاس جو اُس کا ہمدرد و حلیف بن چکا تھا چلا گیا، سلطان نے اس کے تعاقب میں (کرنال) گرنار کا رخ کیا۔[3]

طغی کی ٹھٹھے کی طرف فراری:

راجا گرنار نے لشکر سلطانی کی کثرت و حشمت کو دیکھ کر خفیہ طور پر چاہا کہ وہ طغی کو زندہ گرفتار کر کے سلطان کے حوالے کر دے، لیکن کسی طرح طغی کو یہ راز معلوم ہو گیا، وہ وہاں سے بھاگ کر ٹھٹھہ چلا گیا، جہاں اُس نے جام ٹھٹھہ کے پاس پناہ لی۔ موسم برسات گزرنے کے بعد سلطان نے کرنال (گرنار) پر قبضہ کر کے تمام ساحل اور جزیرے جو اس سے متعلق تھے اپنے تصرف میں لے لیے۔[4]

سلطان محمد تغلق کا عزم ٹھٹھہ:

کرنال (گرنار)[5] کی فتح کے بعد وہ ۷۵۱ھ (۱۳۵۰-۵۱ء) کو کوندل[6] میں مقیم ہوا جو ٹھٹھہ کے راستے میں ہے، گوندل ہی میں وہ بخار میں مبتلا ہوا، جس کی وجہ سے اُسے بہت دن تک گوندل میں مقیم رہنا پڑا۔[7]

جس زمانے میں کہ سلطان کوندل میں مقیم تھا، اُس نے دہلی سے خداوند زادہ، مخدوم زادہ اور بعض مشائخ و علما اور ملوک و امرا اور سوار اور پیدل فوج کو طلب کیا، یہ سب کے سب کوندل پہنچے، اور ملتان، دیپالپور، اُچ اور سیوستان سے کشتیاں طلب کیں، جب تمام سامان فراہم ہو گیا،

---

(1) یہ تمام تفصیل آئینہ حقیقت نما۔ حصہ دوم سے ماخوذ ہے۔

(2) طغی سلطان محمد تغلق کا غلام اور دربار سلطانی کے چوبداروں اور نقیبوں کا افسر تھا، جو قتلغ خاں کی سازش میں شریک ہو کر دہلی میں اس کا سب سے بڑا بہی خواہ تھا، اور قتلغ خاں کے اشارے پر ہی اُس نے دہلی سے اوباشوں کا لشکر بغاوت کے لیے تیار کیا۔

(3) یہ تمام تفصیل تاریخ فیروز شاہی۔ ضیا برنی ص ۵۱۵-۵۱۶ سے اور آئینہ حقیقت نما حصہ دوم سے ماخوذ ہے۔

(4) تاریخ فیروز شاہی۔ ضیا برنی ص ۵۲۳۔

(5) کرنال یا گرنار کا موجودہ نام جونا گڑھ ہے۔

(6) کوندل یا گوندل جونا گڑھ سے شمال رویہ پندرہ کوس پر کاٹھیاواڑ میں واقع ہے (طبقات اکبری، جلد۔ ۱، ص ۲۲۳)۔

(7) تاریخ فیروز شاہی۔ ضیا برنی ص ۵۲۳۔

اور سلطان کو صحت ہوگئی، تو اس نے ٹھٹھہ پر حملہ کر کے طغی کو اور جام ٹھٹھہ کو جس نے اس کو پناہ دی تھی سزا دینے کی ٹھانی۔ عین اس وقت جب کہ وہ دریائے سندھ کو عبور کر رہا تھا مغلوں کی ایک امدادی فوج جس کی تعداد چار یا پانچ ہزار تھی اور جس کو اس نے بیان قلی خاں کے وزیر اعظم امیر قرغن کو خط لکھ کر طلب کیا تھا، التون بہادر نامی سردار کی ماتحتی میں پہنچی، اس فوج کے پہنچنے سے سلطان بہت خوش ہوا اور التون بہادر اور اس کی فوج کو بے حد انعام و اکرام سے نوازا، سلطان ایک کثیر لشکر کے ساتھ ٹھٹھہ کی طرف روانہ ہوا۔[1]

تاریخ معصومی میں ہے کہ سلطان نے ناکنی کا عزم کر کے ٹھٹھہ کی طرف کوچ کیا، اور موضع تھری[2] میں پانی کے کنارے منزل انداز ہو کر لشکر کا انتظار کرنے لگا، وہاں سلطان کو تپ کا عارضہ لاحق ہو گیا، اور سفر کی پریشانی اس کے دل میں جاگزیں ہوگئی، چنانچہ وہ تھری سے کوچ کر کے کوندل آگیا، یہاں سلطان کو مرض سے صحت حاصل ہوئی، اور اسی منزل میں دریا کی راہ سے اس کے اہل حرم بھی اس کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔۔۔ پھر وہ جمعیت عظیم کے ساتھ ٹھٹھے کی طرف روانہ ہوا۔۔۔ جس دن سلطان ٹھٹھہ سے چودہ کوس کے فاصلے پر پہنچا، اتفاق سے وہ عاشورے کا دن تھا، سلطان نے وہاں پر قیام کر کے روزہ رکھا، دوسرے دن سلطان کا وہی مرض پھر پلٹ آیا، اور اس کے جسم پر حرارت نے سخت غلبہ کیا، طبیبوں نے کافی علاج کیا، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا، آخر کار ۲۱ محرم ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) کو سلطان محمد شاہ نے اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کی۔[3]

سلطان محمد تغلق کی وفات کی تفصیل:

ٹھٹھہ سے ابھی وہ تیس کوس کے فاصلے پر ہی تھا کہ ۱۰ محرم ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) کو سلطان نے عاشورے کا روزہ رکھا، اور افطار کے وقت مچھلی کھائی، جس سے بخار ہو گیا، لیکن اس نے بیماری کی پروانہ کی اور سفر کو جاری رکھا، اب ٹھٹھہ صرف چودہ کوس باقی تھا، جہاں سلطان مقیم تھا اور لشکر سلطانی حکم کا منتظر تھا کہ حکم ملتے ہی ایک حملے میں ٹھٹھہ کے باغیوں اور طغی کا خاتمہ کر دے کہ یکایک سلطان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوئی، اور قبل اس کے کہ وہ فوج کو حملے کا حکم دے۔ ۲۱ محرم ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) کو سلطان نے وفات پائی۔[4]

سلطان فیروز محمد شاہ

۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) تا ۷۹۰ھ (۱۳۸۸ء)

سلطان محمد تغلق کی اچانک موت سے تمام لشکر میں سراسیمگی پھیل گئی، مغلوں کا وہ پانچ ہزار لشکر جو سلطان محمد تغلق کی مدد کے لیے آیا تھا انہوں نے واپس ہوتے وقت لشکر میں لوٹ مار شروع کر دی۔ ضیا برنی کا بیان ہے کہ لشکر میں افراتفری اور پریشانی کا یہ عالم تھا کہ سلطان محمد تغلق کی وفات کے تیسرے دن جب لشکر نے سیوستان کی طرف کوچ کرنا چاہا تو وہ اس طرح روانہ ہوئے کہ ایک دوسرے کا ہوش نہ تھا، ابھی مشکل سے ایک دو کوس ہی چلے ہوں گے کہ مغلوں نے لوٹ مار شروع کی۔ ادھر پیچھے سے ٹھٹھہ کے مفسدین نے لشکر پر ہلہ بول دیا، صورت حال یہ ہوئی کہ اگر آگے بڑھتے تھے تو مغل لوٹتے تھے اور پیچھے ہٹتے تھے تو ٹھٹھہ کے مفسدین لوٹتے تھے، تمام لشکر معرض ہلاکت میں تھا، اس صورت حال کو دیکھ کر لشکر میں جو علما، مشائخ اور ملوک تھے انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب ہمارے لیے بغیر بادشاہ کے انتخاب کے چارہ نہیں، ایک طویل مشاورت کے بعد سب نے متفقہ طور پر بادشاہی کے لیے فیروز شاہ کا انتخاب کیا۔ لشکر میں ہر چھوٹے بڑے، مرد اور عورت کی زبان پر تھا کہ اس وقت فرمانروائی کے لائق اور اہل فیروز شاہ سے زیادہ کوئی نہیں، اگر آج اس کو تخت پر نہ بٹھایا گیا تو کل کو ہمیں مغل اور ٹھٹھہ

---

(1) تاریخ فیروز شاہی۔ ضیا برنی ص ۵۲۳-۵۲۴۔

(2) ایضاً۔ ص ۵۲۵-۵۲۶۔

(3) تھری کے کھنڈرات موجودہ تالی تعلقہ حیدرآباد میں واقع ہیں۔ تھری کس زمانے میں سومروں کا پایہ تخت تھا۔

(4) تاریخ معصومی، فارسی۔ ص ۴۸۔

کے مفسدین زندہ نہ چھوڑیں گے، آخر مخدوم زادہ عباسی، شیخ الشیوخ مصری، خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ اور دوسرے علماء اور مشائخین، ملوک اور اُمرا نے متفقہ طور پر فیروز شاہ سے کہا کہ تم سلطان محمد تغلق کے چچازاد بھائی اور اس کے وصی اور ولی عہد ہو، تمہارے سوا لشکر میں اور دہلی میں کوئی ایسا شخص ہمیں نظر نہیں آتا جو تم سے بہتر حکومت اور فرمانروائی کی صلاحیت رکھتا ہو، اس لیے تم تخت شاہی پر متمکن ہو کر اُن ہزارہا انسانوں کی جان بچاؤ جو اس وقت اس لشکر میں ورطۂ ہلاکت میں پڑے ہوئے ہیں، فیروز شاہ نے ہر چند معذرت کی، لیکن ان بزرگوں اور ملوک نے اسے مجبور کر دیا۔ عفیف کی تاریخ فیروز شاہی میں ہے کہ تاتار خاں نے جو اس جماعت میں سب سے بوڑھا انسان تھا، فیروز شاہ کے بازو پکڑ کر اسے تخت سلطنت پر بٹھانا چاہا، سلطان فیروز نے کہا، اچھا اگر تم میرے ذمے یہ بلا ڈالنا ہی چاہتے ہو تو ذرا صبر کرو تاکہ میں وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کر لوں، سلطان فیروز نے دو رکعت نماز ادا کر کے دعا کی کہ الٰہی! میں اس معاملے میں تیری پناہ اور تجھ ہی سے قوت چاہتا ہوں، اس دعا کے بعد تاج شاہی اس کے سر پر رکھا گیا، سلطان فیروز کی تخت نشینی ۲۴ محرم ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) کو دریائے سندھ کے کنارے لشکر سلطانی میں ہوئی۔[3]

سیوستان کی طرف سے روانگی:

تخت نشینی کے دوسرے دن وہ براہ سیوستان عازم دہلی ہوا، طغی نے جب سلطان محمد تغلق کی وفات کی خبر سنی تو وہ سمہ، جاریجہ اور سومروں کا ایک لشکر لے کر سلطانی لشکر کے تعاقب میں آیا، سلطان فیروز شاہ کو جب یہ معلوم ہوا تو اُس نے دو ہزار کا ایک لشکر امیر علی غوری کی سرکردگی میں طغی کی سرکوبی کے لیے متعین کیا اور خود دہلی کے لیے روانہ ہوا، امیر علی غوری نے راتوں رات دریائے سندھ کو عبور کر کے طغی اور سومروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، طغی شکست کھا کر گجرات کی طرف بھاگا اور بھاگتے ہوئے اتفاق سے عماد الملک کے ہاتھ پڑا، عماد الملک نے اسے قتل کر دیا اور قتل کرنے کے بعد وہ فوراً ہی آ کر فیروز شاہی لشکر میں شامل ہو گیا[2] مغل جو مزید لوٹ مار کے انتظار میں کچھ آگے جا کر ٹھہر گئے تھے، نوروز کرکز کے مشتعل کرنے پر سلطان فیروز کے مقابل میں صف آرا ہوئے، لیکن مغل شکست کھا کر واپس ہو گئے اور سلطان فیروز سندھ کے تفصیلی حالات سے واقف ہونے کے لیے ہر روز پانچ کوس سے زیادہ سفر نہ کرتا تھا۔

کولاب سانکرہ پر قلعہ کی تعمیر:

راستے میں سلطان فیروز نے کولاب سانکرہ پر ایک قلعے کی تعمیر کا حکم دیا، اور وہاں اپنے ایک عہدہ دار نصیر کو ایک ہزار فوج کے ساتھ متعین کیا، اور ملک بہرام کو ان حدود میں بحیثیت فوجدار کے مقرر کیا۔ سیوستان پہنچنے پر پہلی مرتبہ فیروز شاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا، سیوستان میں سلطان فیروز شاہ نے کچھ دن قیام کیا، وہاں علماء و مشائخ، اُمرا و ملوک کو خلعت اور داد و دہش سے نوازا، سیوستان کے مشہور بزرگ حضرت لعل شہباز قلندر اور دوسرے اولیائے کرام کے مزارات کی زیارت کی، اور درگاہوں کے خدام اور مستحقین کے نام وظائف جاری کیے۔

سیوستان کی حکومت:

ملک علی شیر اور ملک تاج کافوری کو سیوستان کی حکومت تفویض کی۔

بکھر میں آمد:

سلطان فیروز سیوستان سے روانہ ہو کر بکھر پہنچا، بکھر میں تقریباً بیس روز سلطان نے قیام کیا، ملک رکن الدین کو اخلاص خانی کا خطاب دے کر نائب مقرر کیا اور تمام سندھ کے صوبے کا انتظام بھی اس کو تفویض کیا۔ ملک عبدالعزیز برید کو بکھر کا دیوان مقرر کر کے اسی آدمی قلعہ بکھر کی محافظت پر متعین کیے، وہاں سے منزل بہ منزل روانہ ہو کر رجب ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) میں دہلی پہنچا۔[2]

ٹھٹھہ پر دوبارہ فوج کشی:

۷۶۶ھ (۶۵-۱۳۶۴ء) میں سلطان فیروز شاہ تغلق نے ٹھٹھہ پر دوبارہ فوج کشی کا ارادہ کیا اگرچہ اس کے وزیر خان جہاں اور دوسرے اُمرا کی خواہش نہ تھی کہ ٹھٹھہ پر فوج کشی کی جائے، انہوں نے سلطان فیروز تغلق سے عرض کیا کہ جام ٹھٹھہ کی صرف یہ خطا تھی کہ اس نے طغی نمک حرام کو پناہ دی تھی، اب جب کہ طغی نمک حرام کا قصہ پاک

---

(1) یہ تمام تفصیل تاریخ فیروز شاہی- ضیا برنی ص ۵۳۴-۵۳۵-۵۳۶ و تاریخ فیروز شاہی، عفیف ص ۴۷ سے ماخوذ ہے۔

(2) طغی کے مقابل ہونے کا واقعہ تاریخ معصومی ص ۴۹ سے ماخوذ ہے، اور اس کے قتل کی تفصیل آئینہ حقیقت نما حصہ دوم ص ۱۴۷ سے لی گئی ہے، باقی حصہ جو نوروز کرکرے سے متعلق ہے وہ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۱۸-۱۱۹ سے لیا گیا ہے۔

(3) یہ تمام تفصیل تاریخ معصومی- ص ۴۹-۵۰ سے ماخوذ ہے۔ صرف خطبہ کا تذکرہ تاریخ مبارک شاہی- ص ۱۱۸ سے لیا گیا ہے۔

ہو چکا اور جام ٹھٹھہ حضور کا مطیع و فرمانبردار ہے، تو ان حالات میں ٹھٹھہ پر فوج کشی کی ضرورت نہیں۔ مگر فیروز تغلق ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ سلطان محمد تغلق میرا بھائی اور مربی تھا، وہ اپنی وفات سے پہلے جام ٹھٹھہ کو سزا دینے کا پکا ارادہ کر چکا تھا، لہٰذا میں اسے کیسے معاف کر سکتا ہوں، خاں جہاں اور اُمرا نے جب سلطان کو اس پر مصر پایا تو وہ خاموش ہو گئے، عفیف کی تاریخ فیروز شاہی میں ہے کہ جب کبھی سلطان فیروز کے سامنے ٹھٹھہ کا ذکر آتا تو وہ نہایت ہی متاسفانہ لہجے میں داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا، افسوس صد ہزار افسوس کہ سلطان محمد تغلق کے دل میں ایک آرزو باقی رہ گئی کہ وہ ٹھٹھہ کو فتح نہ کر سکے، اُس کی اس گفتگو سے اُمرا اور مقربین کو اندازہ ہوتا تھا کہ سلطان، ٹھٹھہ پر فوج کشی کا ارادہ رکھتا ہے۔ ایک دفعہ اس نے اپنے وزیر خان جہاں سے کہا کہ سلطان (تغلق) مرحوم رحمت حق سے جا ملے، لیکن ٹھٹھہ کے فتح کرنے کی آرزو اُن کے دل میں باقی رہی، اب جب کہ خدا تعالیٰ نے مجھے ان کا جانشین بنایا ہے، ان کا انتقام لینا میرا فرض ہے۔

آخر خان جہاں وزیر اعظم کو دہلی میں اپنا قائم مقام بنا کر تو ّے ہزار سوار اور چار سو اسّی ہاتھی لے کر ٹھٹھہ کی طرف روانہ ہوا، راستے میں اجودھن (پاک پتن) ہوتا ہوا اور حضرت بابا فرید گنج شکر کے مزار کی زیارت کرتا ہوا ٹھٹھہ پہنچا، اُس وقت ٹھٹھہ کی آبادی دریائے سندھ کے دونوں جانب آباد تھی، ٹھٹھہ کے رہنے والے بہت بہادر اور دلیر سمجھے جاتے تھے، اس زمانے میں ایک جانب جام اُنڑ کا بھائی اور دوسری جانب جام اُنڑ کے بھائی کا بیٹا جام بابینہ حکمران تھا، سلطان فیروز شاہ نے ٹھٹھہ کا محاصرہ کیا، جام بابینہ نے بھی فیروز شاہ کے حملے کی خبر سن کر فوراً ایک لشکر تیار کیا، اور ٹھٹھہ کی اس آبادی کے قریب جو دریائے سندھ کے کنارے تھی لڑائی کے لیے مورچے بنائے، فیروز شاہ جیسے ہی ٹھٹھہ پہنچا، جام بابینہ اپنے لشکر کے ساتھ جنگ کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا، دونوں فوجوں میں جنگ شروع ہوئی لیکن اتفاق سے فیروز شاہ کے لشکر میں قحط اور جانوروں کی بیماری پھیل گئی، غلے کی گرانی روز بروز اس قدر بڑھی کہ سارے لشکر میں مایوسی کے آثار پیدا ہو گئے، ادھر جانوروں کی وبائی بیماری سے تقریباً تین چوتھائی لشکر کے گھوڑے مر گئے، جام بابینہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ڈٹ کر سلطان فیروز شاہ کا مقابلہ کیا، فیروز شاہ بھی مقابلہ کرتا رہا، لیکن جب اُس نے دیکھا کہ حالات اس کے موافق نہیں، اور ان حالات میں ٹھٹھہ کا فتح ہونا ممکن نہیں تو اُس نے اپنے اراکین دولت اور فوجی سرداروں سے مشورہ کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت حالات ہمارے اس درجہ خلاف ہیں کہ ہماری فتح ممکن نہیں، مناسب یہ ہے کہ اس وقت ہم گجرات کا رخ کریں، اور حالات سازگار ہونے کے بعد آئندہ سال ہم ٹھٹھہ پر دوبارہ حملہ کریں، سب نے فیروز شاہ کی رائے سے اتفاق کیا اور اُنہوں نے کہا بلاشبہ جہاں پناہ کی رائے صائب ہے، گجرات میں ہماری فوج کو غلہ بھی اچھی طرح مل سکے گا، اور ہماری فوج بھی کچھ آرام لے کر تازہ دم ہو جائے گی اور ہماری واپسی سے اہل ٹھٹھہ مطمئن ہو کر غلے کی کاشت کی طرف زیادہ توجہ کریں گے، ہم عین ربیع کے موسم میں جب کہ غلہ کھیتوں میں کھلیان ہو گا ٹھٹھہ پر حملہ کریں گے، اور ان لوگوں کے غلے پر بھی آسانی سے قبضہ کر سکیں گے، فیروز شاہ نے اس کے بعد لشکر کو کوچ کا حکم دیا، اور خان اعظم ظفر خاں کو بنگالی فوج کے ساتھ اپنا قائم مقام بنا کر ٹھٹھہ کے اطراف میں چھوڑا۔ اہل ٹھٹھہ نے جب یہ خبر سنی کہ فیروز شاہ، دہلی روانہ ہو چکا ہے تو انہوں نے اس کے لشکر کا تعاقب کیا، ظفر خاں چونکہ ٹھٹھہ ہی کے اطراف میں موجود تھا، اُس نے اہل ٹھٹھہ کا مقابلہ کیا، جس سے اہل ٹھٹھہ کو فرار ہونے پر مجبور ہونا پڑا، ظفر خاں نے ٹھٹھہ کے چند لوگوں کے سر کاٹ کر سلطان فیروز کی خدمت میں پیش کیے۔[1]

کونجی رن کی مصیبتیں:

فیروز شاہ جب اپنے لشکر کے ساتھ گجرات جا رہا تھا تو راستے میں غلے کا قحط اور بھی بڑھ گیا، اور گھوڑوں کی وبائی بیماری بھی اور زیادہ ہو گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ بھوک کی وجہ سے چل نہیں سکتے تھے، غلہ نہ ملنے کی وجہ سے اہل لشکر مردار گوشت اور کچا چمڑہ کھاتے تھے، بڑے بڑے اراکین سلطنت اور فوجی سردار گھوڑوں کے مر جانے کی وجہ سے پیدل چلنے پر مجبور ہوئے۔

قحط اور وبا کی مصیبتوں سے سلطان فیروز شاہ کا لشکر دوچار تھا کہ اُن نو سندھیوں نے جنہیں سلطان فیروز نے رہبری کے لیے اپنے ساتھ لیا تھا، مزید ستم یہ ڈھایا کہ انہوں نے دھوکا دے کر سارے لشکر کو غلط راستے پر ڈال کر ایک ایسے جنگل میں پہنچا دیا جس کو کونجی رن (کچھ کا رن) کہتے تھے، اس جنگل کا پانی اس قدر کھارا تھا کہ اگر اس کا ایک قطرہ زبان پر رکھا جاتا تو کھارے پن کی وجہ سے حلق سے نہ اتر سکتا اور زبان ٹکڑے

---

[1] یہ تمام تفصیل تاریخ فیروز شاہی۔ عفیف، مقدمہ سیوم۔ مقدمہ چہارم اور مقدمہ پنجم سے ماخوذ ہے۔

ٹکڑے ہو جاتی تھی، تمام لشکر اس نئی مصیبت سے اور بھی پریشان ہو گیا، سلطان فیروز شاہ نے غصے میں آکر اُن سندھیوں میں سے ایک کو فوراً قتل کر دیا، پھر اُس نے باقی سندھیوں کو بلا کر پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے جان کے خوف سے سچ بولتے ہوئے کہا کہ واقعی ہم نے آپ کو دھوکا دیا ہے، اور اب آپ اور آپ کا لشکر ایسے مقام پر آچکا ہے جہاں سے زندہ سلامت بچ نکلنا محال ہے، اس مقام کو "کوتجی رن" (کچھ کا رن) کہتے ہیں، اس مقام سے دریا قریب ہے، اور پانی میں کھاراپن اسی دریا کی وجہ سے ہے۔ سندھیوں کی اس گفتگو کو سن کر سلطان فیروز اور اُس کا لشکر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا، کیونکہ جہاں تک نظر جاتی تھی کھاراہی کھاراپانی نظر آتا تھا، فیروز شاہ نے اہل لشکر کو حکم دیا کہ شیریں پانی جس قدر بھی ہے اسے احتیاط سے خرچ کرتے ہوئے اس جنگل کو عبور کریں، غرض کہ طرح طرح کی مصیبتیں اٹھانے کے بعد فیروز شاہ کا لشکر "کوتجی رن" سے نکلا، اب یہ سب ایسے ہیبت ناک جنگل میں پہنچے جہاں میلوں کوئی پرندہ نظر نہ آتا تھا اور دور دور تک اس جنگل میں درختوں اور گھانس کا پتا نہ تھا۔ لشکر قحط، وبا اور ان نئی مصیبتوں کی وجہ سے نہایت بدحال ہو چکا تھا، ان مصیبتوں سے بادشاہ اور لشکر دونوں تنگ آچکے تھے، یہاں تک کہ چھ ماہ تک دہلی میں لشکر اور فیروز شاہ کی کوئی خبر نہ ملنے کی وجہ سے یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ سلطان فیروز شاہ اپنے لشکر کے ساتھ کہیں غائب ہو گیا ہے، چھ ماہ بھٹکنے کے بعد فیروز شاہ کو اس جنگل سے نکلنے کا راستہ معلوم ہوا اور تمام لشکر نے اس مصیبت سے نجات پائی، اور گجرات پہنچا۔[1]

ٹھٹھہ پر دوبارہ حملے کی تیاریاں:

گجرات پہنچ کر فیروز شاہ نے امیر حسین نظام الملک گورنر گجرات سے سخت باز پرس کی اور کہا کہ اگر تم گجرات سے غلہ بھیجتے رہتے اور تمہیں ہمارے لشکر کا کچھ بھی خیال ہوتا تو آج اس تباہی کی نوبت نہ پہنچتی، پھر اس نے نظام الملک کو گجرات کی گورنری سے معزول کر دیا، اور گجرات میں قیام کر کے فیروز شاہ نے ٹھٹھہ کو فتح کرنے کے لیے نئے سرے سے تیاریاں شروع کیں، گجرات کی مال گزاری جو تقریباً دو کروڑ تھی اس نے ان تیاریوں پر صرف کی، اس کے علاوہ اُس نے دہلی میں اپنے وزیر خان جہاں کو لکھا کہ میں بری اور بحری فوج کے ساتھ دوبارہ ٹھٹھہ پر حملے کے لیے روانے ہو رہا ہوں، تم کو چاہیے کہ تم میری مدد کے لیے سندھ کے محاذ پر زیادہ سے زیادہ فوج اور سامان جنگ بھیجو۔[2]

اسی زمانے میں بہرام خاں جو دکن میں دولت آباد پر قابض تھا اس کے اور حسن کانگو کے لڑکے کے درمیان مخالفت رونما ہوئی، بہرام خان نے فیروز شاہ کی خدمت میں عرضداشت روانہ کی، جس میں فیروز شاہ سے دولت آباد آنے کی خواہش کی گئی تھی، سلطان فیروز شاہ نے اس کے جواب میں لکھا کہ جب تک کہ میں ٹھٹھہ کو فتح نہ کرلوں اور دوبارہ ٹھٹھہ نہ پہنچ جاؤں اور ٹھٹھہ کو اچھی طرح سے زیر و زبر نہ کرلوں، اس وقت تک مجھے قرار نہیں آسکتا اور نہ میں کسی دوسری طرف کا ارادہ کر سکتا ہوں، انشاء اللہ جب میں ٹھٹھہ کو فتح کرلوں گا، اُس وقت میں دولت آباد کا رخ کروں گا۔[3]

گجرات پر ظفر خاں کو گورنر مقرر کرنے کے بعد سلطان فیروز شاہ ایک کثیر لشکر کے ساتھ ٹھٹھہ کی مہم پر روانہ ہوا، سلطانی لشکر چونکہ پہلے ٹھٹھہ کی مہم کے مصائب دیکھ چکا تھا، اس لیے اکثر سپاہی لشکر کو چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو بھاگنا شروع ہوئے، سلطان کو جب یہ معلوم ہوا، تو اُس نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ لشکر کے چاروں طرف چوکی پہرے قائم کر دینا چاہئیں تاکہ کوئی بھاگ نہ سکے، شمس سراج عفیف کا بیان ہے کہ سرداران لشکر کی یہ رائے فیروز شاہ کو پسند نہ آئی، اس نے کہا کہ میری رائے میں تمہارا یہ خیال درست نہیں، کیونکہ قیدیوں کی طرح سپاہیوں کو ساتھ ساتھ رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں، اگر ٹھٹھہ کا فتح ہونا خدا کی مرضی نہیں ہے تو خدا کے حکم کے سامنے ہم مجبور ہیں، اس کے بعد سلطان نے اپنے وزیر خان جہاں کے نام دہلی فرمان بھیجا کہ جو لوگ ہمارے لشکر سے بھاگ کر دہلی پہنچیں انہیں بلا کر صرف معمولی سرزنش کی جائے اور کوئی سخت سزا نہ دی جائے۔

ان تمام انتظامات کے بعد سلطان ایک کثیر لشکر کے ساتھ ٹھٹھہ کی مہم پر روانہ ہوا راستے میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے نواسے نے جو اس وقت شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز تھے، سلطان سے عرض کیا کہ پہلی مرتبہ جب آپ دہلی سے ٹھٹھہ کی مہم پر روانہ ہوئے تو راستے میں آپ نے اجودھن میں حضرت فرید گنج شکر کی زیارت کی اور سیدھے ٹھٹھہ تشریف لے آئے حالانکہ انہیں کے قریب ملتان کے بزرگ بھی تھے، خصوصاً آپ کو حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کی بھی زیارت

---

(1) تاریخ فیروز شاہی۔ عفیف، مقدمہ ہفتم۔

(2) تاریخ فیروز شاہی۔ عفیف، مقدم ہشتم۔

(3) تاریخ فیروز شاہی۔ عفیف، مقدمہ نہم۔

کرنی چاہیے تھی، حالانکہ کسی نے بھی ان دونوں خانوادوں کی باہمی یگانگت اور یک نفسی کی وجہ سے کبھی فرق نہیں کیا، اس مرتبہ آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ نذر فرمائیں کہ اگر ٹھٹھہ فتح ہوگا تو آپ ملتان حاضر ہو کر بزرگوں کی بھی زیارت کر کے دہلی جائیں گے۔ سلطان نے شیخ الاسلام کی بات سن کر کہا کہ یہ بات کئی مرتبہ میرے دل میں بھی کھٹک چکی ہے، میں اب انشاء اللہ ایسا ہی کروں گا۔[1]

آخر سلطان ٹھٹھہ کے قریب پہنچا، ٹھٹھہ کے لوگ سلطان کی پہلی ناکامی سے مطمئن ہو کر زراعت و کاشت میں مصروف تھے اور انہوں نے ہر موضع، قصبے اور قریے میں خوب کاشت کی تھی۔

سندھ میں اُردو کا پہلا فقرہ:

سندھی سلطان فیروز کے ٹھٹھہ سے ناکام گجرات جانے کے بعد اپنی کامیابی کو سندھ کے مشہور بزرگ حضرت پیر پٹھو کی کرامت قرار دیتے ہوئے کہا کرتے تھے:

برکت شیخ پٹھا، اک موا اک نٹھا

اک موا سے اُن کا اشارہ سلطان محمد تغلق کی طرف تھا، جس نے ٹھٹھہ ہی میں وفات پائی تھی اور اک نٹھا سے ان کا اشارہ سلطان فیروز کی طرف تھا جو ٹھٹھہ سے ناکام گجرات کی طرف چلا گیا تھا کہا جاتا ہے کہ نثر میں یہ اردو کا پہلا فقرہ ہے جو سندھ میں بولا گیا۔

اہل سندھ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس مرتبہ سلطان بڑی فوجی تیاریوں کے ساتھ سندھ آرہا ہے، انہوں نے یہ معلوم ہوتے ہی دریائے سندھ کے پل اور گھاٹ کو توڑ دیا، اور ایک جگہ قلعہ بند ہو گئے، یہ وہ زمانہ تھا کہ کھیتیاں پک چکی تھیں اور فصل کٹنے کے لیے تیار تھی، سلطان نے معرکۂ دارو گیر گرم کیا، اس معرکے میں چار ہزار سندھی گرفتار ہوئے، سلطان نے ٹھٹھہ کے قریب خیمہ زن ہو کر لوگوں کو زراعت کاٹنے اور غلہ فراہم کرنے کا حکم دیا، اور عماد الملک کو دہلی کی جانب روانہ کر کے وزیر اعظم کے نام حکم بھیجا کہ جتنی بھی فوج ممکن ہو روانہ کرو، عماد الملک دہلی پہنچا اور بدایوں، قنوج، سندیلہ، اودھ، جونپور، بہار، تربت، مہوبہ، چندیری، دھار، دہلی، سامانہ، دیپالپور اور لاہور وغیرہ کی فوجیں لے کر دہلی سے ٹھٹھہ واپس ہوا۔

اس مرتبہ باوجود بہادری اور دلیری کے سندھیوں کی قسمت کا پانسہ پلٹ چکا تھا، غلے پر سلطان کے لشکریوں نے کھیتوں ہی میں قبضہ کر لیا تھا، جس کی وجہ سے ٹھٹھہ میں قحط پڑ گیا، ادھر دہلی سے مزید فوجی امداد پہنچنے کی وجہ سے سندھی اور بھی پریشان ہوئے، جام بابینہ نے اپنی شکست کے آثار صاف طور پر دیکھنے کے بعد حضرت مخدوم جہانیاں، سید جلال الدین بخاری کی خدمت میں بمقام اُچ آدمی بھیجا اور حضرت سے التجا کی کہ اگر آپ تشریف لا کر صلح کرا دیں تو ہزاروں انسان خوں ریزی سے بچ جائیں گے، چنانچہ سندھیوں کی التجا پر حضرت سید جلال الدین[2] بخاری اُچ سے چل کر سلطانی لشکر میں پہنچے، جب آپ سلطانی لشکر میں آئے تو لشکر کا ہر آدمی آپ کی قدم بوسی کو اپنی سعادت سمجھتا تھا اور جو لشکری آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے آپ اُن سے فرماتے بابا انشاء اللہ تعالیٰ اللہ میاں کے فضل سے چند روز میں صلاح ہو جائے گی۔

خود سلطان فیروز شاہ حضرت سید جلال الدین بخاری کا استقبال کر کے آپ کو خیمۂ شاہی میں لایا اور عزت کے مقام پر بٹھایا، حضرت سید جلال الدین بخاری نے فرمایا کہ ٹھٹھہ میں ایک صالحہ اور پارسا عورت تھی، اس کی دعا کی برکت کی وجہ سے ٹھٹھہ اب تک فتح نہیں ہو سکا، میں جب بھی تمہاری کامیابی اور فتح کے لیے دعا کرتا تھا وہ عورت قبولیت دعا میں حائل ہوتی تھی، اب تین روز ہوئے کہ اس کی وفات ہو گئی، اس لیے امید ہے کہ ٹھٹھہ جلد فتح ہو جائے گا۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ عفیف، مقدمہ یازدہم۔

[2] حضرت سید جلال الدین بخاری کا لقب مخدوم جہانیاں جہان گشت تھا، صاحب سیر العارفین کا بیان ہے کہ ایک دفعہ عید کے دن آپ نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، حضرت شیخ صدر الدین اور حضرت شیخ رکن الدین کے مزاروں پر مراقبہ کیا، اور ان بزرگوں سے عیدی طلب کی، آپ کو ان بزرگوں کی جانب سے عیدی کے طور پر "مخدوم جہانیاں" کا لقب ملا، مخدوم جہانیاں کے والد کا نام سید کبیر اور دادا کا نام سید جلال الدین سرخ بخاری تھا۔ وہ بخارا سے بکھر آئے، اور بکھر سے ملتان آکر حضرت بہاء الدین زکریا سے بیعت کی اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔ حضرت مخدوم جہانیاں کی ولادت ۷۰۷ھ میں ہوئی، آپ نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے پوتے شیخ ابو الفتح رکن الدین سے بیعت کی اور خلافت حاصل کی، سلطان محمد تغلق نے حضرت مخدوم جہانیاں کو شیخ الاسلام بنا کر یہ خدمت اُن کے سپرد کی تھی، لیکن آپ کو چھوڑ کر گج کے لیے روانہ ہو گئے، سلطان فیروز شاہ تغلق بھی حضرت مخدوم جہانیاں کا بے حد معتقد تھا، جس کا اندازہ حتمد کرہ واقعہ سے ہوتا ہے کہ آپ ہی کی کوشش سے جام بابینہ اور سلطان فیروز شاہ تغلق کے درمیان صلح ہوئی، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے اٹھتر سال ایک ماہ چھبیس روز کی عمر میں ۷۸۵ھ میں وفات پائی، آپ کا مزار شریف اُچ میں ملتان سے ستر میل کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع ہے۔ (از ماخوذ بزم صوفیاء تذکرہ حضرت سید جلال الدین بخاری)۔

اُدھر جام بابینہ نے جس کی تحریک پر آپ اُچ سے تشریف لائے تھے، پے درپے پیغام بھیجنے شروع کیے کہ ہم سخت پریشانی میں ہیں، اور اپنے مطالبات جو وہ سلطان فیروز شاہ سے منوانا چاہتا تھا، حضرت کے سامنے پیش کیے۔

جام اور جام بانبینہ کی سلطان فیروز شاہ کی خدمت میں حاضری:

الغرض حضرت نے سندھیوں کی سلطان سے سفارش فرمائی۔ سلطان فیروز شاہ نے اُن کے مطالبات سے بھی زیادہ سندھیوں کو مرحمت فرمایا، ان حالات کے معلوم ہونے کے بعد جام اور بابینہ نے آپس میں مشورہ کیا، بابینہ نے جام سے کہا کہ سلطان فیروز شاہ کے کانوں تک یہ بات پہنچ چکی ہے کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے، پہلے میں سلطان فیروز شاہ کے پاس جاتا ہوں، میرا جو کچھ بھی انجام ہو اس کے دیکھنے کے بعد تم آنا، جام کو بابینہ کی یہ بات پسند آئی، پہلے بابینہ سلطان فیروز کی خدمت میں حاضر ہوا، اتفاق سے اس دن سلطان فیروز شاہ شکار کے لیے گیا ہوا تھا، جس وقت بابینہ وہاں پہنچا، اس وقت سلطان فیروز ایک بھیڑیے کے گھیر اڈالنے کی فکر میں تھا، اسی وقت اُس کو بابینہ کے آنے کی اطلاع دی گئی، سلطان بھیڑیے کے شکار سے فارغ ہو کر خیمۂ شاہی میں آیا، اس وقت بابینہ اپنی پگڑی کو گردن میں ڈال کر تلوار کو اپنے گلے میں حمائل کر کے مجرموں کی طرح سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سلطان کے پیروں پر گر پڑا، اور رکاب سعادت کو بوسہ دیا۔ سلطان نے اوس کی دل جمعی کرتے ہوئے کہا تم کیوں اتنا ڈرتے ہو ہم کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے، تمہیں ہم سے کسی قسم کا خوف نہ کرنا چاہیے، سلطان نے اس کو ایک تازی گھوڑا عنایت کیا۔

اُسی دن جام بھی بانبینہ کے بعد سلطان کی خدمت میں اپنی پگڑی کو گردن میں ڈال کر اور تلوار کو گلے میں حمائل کر کے حاضر ہوا، اور سلطان کے قدموں پر گر پڑا، سلطان نے اس کی پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور نہایت ہی نرمی سے گفتگو کی، جام نے اپنی ایک ایک غلطی کو پیش کر کے معافی چاہی اور اپنی تمام لغزشوں کو پیش کرنے کے بعد معافی چاہتے ہوئے یہ مصرع پڑھا:

شاہا! بخشندہ توئی، بندۂ شرمندہ منم

سلطان نے جام کو بھی اپنے انعام سے نوازا اور ایک تازی گھوڑا دیا، شکار سے واپس آنے کے بعد جام اور بابینہ دونوں کو خلعت سے سرفراز فرمایا، اور عزت و احترام کے ساتھ اپنے ملوک و اُمرا کی طرح اپنے پاس جگہ دی، اور جام اور بابینہ کو حکم دیا کہ تم اپنے متعلقین کے ساتھ ہمارے ہمراہ دہلی چلو، دونوں نے بخوشی منظور کر لیا، اور دونوں اپنے متعلقین کے ساتھ سلطان فیروز شاہ کے ساتھ روانہ ہوئے، سلطان نے ٹھٹھہ کی حکومت پر جام کے بیٹے اور بابینہ کی جگہ تماچی کو مقرر کر کے ان سے سالانہ خراج کی ادائی کا اقرار لیا۔[1]

دہلی کو واپسی:

ان انتظامات کے بعد سلطان فیروز شاہ تغلق دہلی کے ارادے سے ملتان پہنچا، ملتان کے بزرگوں کی زیارت کر کے، ملتان کے لوگوں کو انعام و اکرام سے نوازا، اور ملک مردان دولت کو ملتان کا حاکم مقرر کیا، ملتان ہی سے اس نے ٹھٹھہ کے فتح کرنے کی اطلاع اپنے وزیر خان جہان کو دہلی روانہ کی۔[2]

دہلی میں جام اور بانبینہ پر نوازش شاہانہ:

متواتر دو سال دہلی سے دور رہنے کے بعد سلطان فیروز ۷۷۰ھ (۱۳۶۸-۶۹ء) میں دہلی پہنچا، جام اور بانبینہ دونوں کے لیے خزانۂ شاہی سے دو دو لاکھ روپے سالانہ وظیفہ مقرر کیا، اور ان دونوں کے رہنے کے لیے دارالسلطنت کے قریب ایک اچھی جگہ عنایت کی جو ان لوگوں کے رہنے کی وجہ سے "سرائے ٹھٹھہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ شاہی دربار میں ان دونوں کو یہ رسوخ حاصل ہوا کہ دونوں کو تخت شاہی کے داہنی جانب جگہ ملتی تھی، اور ہر روز وہ قیمتی لباس، سامان اور مختلف نعمتوں سے سلطان کی طرف سے اس قدر سرفراز کیے جاتے تھے کہ وہ ٹھٹھہ کو بالکلیہ بھول چکے تھے۔[3]

جام تماچی کی بغاوت:

چند سال کے بعد بابینہ کے بھائی تماچی نے بغاوت کی، سلطان نے جام کو اس بغاوت کے فرو کرنے کے لیے روانہ کیا، جام نے ٹھٹھہ پہنچ کر تماچی کو دہلی روانہ کیا اور خود اس کی جگہ اپنے بیٹے کے ساتھ ٹھٹھہ میں حکومت کرتا رہا، اور سلطان فیروز کی غلامی کا دم بھرتا رہا۔[4]

---

(1) تاریخ فیروز شاہی-عفیف، مقدمہ پانزدہم۔
(2) ایضاً-عفیف، مقدمہ شانزدہم۔
(3) تاریخ فیروز شاہی-عفیف، مقدمہ شانزدہم۔
(4) آئینہ حقیقت نما-حصہ دوم، ص ۱۷۴۔

بابینہ کا حکومت ٹھٹھہ پر تقرر:

۷۸۹ھ (۸۸-۱۳۸۷ء) میں سلطان فیروز نے بابینہ کو چتر سفید دے کر ٹھٹھہ کی حکومت پر مامور کر کے دہلی سے رخصت کیا، مگر اس نے راستے میں ہی وفات پائی۔

صاحب تاریخ فیروز شاہی سراج عفیف نے سلطان فیروز شاہ کے ارکان سلطنت کی فہرست اور دربار میں اُن کے مراتب اور نشست کا تذکرہ کیا ہے، ان اراکین سلطنت میں اُس نے جام اور جام بابینہ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

ملتان کی گورنری:

۷۷۵ھ (۷۴-۱۳۷۳ء) میں ملتان کے گورنر ملک مردان دولت المخاطب بہ نصیر خان نے وفات پائی۔ سلطان فیروز شاہ نے اس کے بیٹے ملک شیخ کو ملتان کی گورنری سپرد کی، چند دن کے بعد ملک شیخ نے بھی وفات پائی، اس کی جگہ مردان دولت کالے پالک (متبنیٰ) سلیمان کو ملتان کا گورنر مقرر کیا، اسی ملک سلیمان کا بیٹا خضر خان تھا، جو بعد میں سید خضر کے نام سے دہلی کا بادشاہ ہوا۔[1]

سلطان فیروز کی وفات:

۱۸ رمضان ۷۹۰ھ مطابق ۲۳ اکتوبر ۱۳۸۸ء کو سلطان فیروز نے وفات پائی۔[2]

سلطان فیروز تغلق کے بعد

غیاث الدین تغلق شاہ

سلطان فیروز تغلق کی زندگی ہی میں اُس کا پوتا سلطان غیاث الدین ابن فتح خان ۷۹۰ھ (۱۳۸۸ء) میں تخت نشین ہو چکا تھا، یہ یکم صفر ۷۹۱ھ کو ان ہندو بچوں کے ہاتھ سے قتل ہوا، جو غلامان فیروز شاہی کہلاتے تھے، غیاث الدین تغلق کی مدت پانچ ماہ اور تین دن تھی۔[3]

(1) آئینہ حقیقت نما-حصہ دوم، ص ۱۷۴-۱۷۵۔

(2) تاریخ معصومی-ص ۵۲۔

(3) تاریخ معصومی ص ۵۳۔ ابو بکر شاہ کے میرٹھ کے قلعے میں قید ہونے کا واقعہ آئینہ حقیقت نما حصہ دوم ص ۱۸۶ سے ماخوذ ہے، لیکن معصومی میں ہے کہ ابو بکر شاہ

ابو بکر شاہ تغلق

غیاث الدین تغلق کے قتل کے بعد اراکین سلطنت نے ۷۹۱ھ (۸۹-۱۳۸۸ء) میں ابو بکر بن ظفر خان بن سلطان فیروز کو قید خانے سے نکال کر تخت پر بٹھایا، لیکن یہ بھی غلامان فیروز شاہی کی شرارتوں کی وجہ سے گرفتار ہو کر میرٹھ کے قلعے میں قید کیا گیا، اس کی مدت حکومت صرف ڈیڑھ سال تھی۔[4]

ناصر الدین محمد شاہ تغلق

۱۶ رمضان ۷۹۲ھ (۹۰-۱۳۸۹ء) کو ناصر الدین محمد شاہ تغلق دہلی کے تخت پر بیٹھا اور چھ سال سات ماہ حکومت کر کے اس نے ۱۷ ربیع الاول ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) میں وفات پائی۔[5]

سلطان علاء الدین شاہ تغلق

سلطان ناصر الدین محمد شاہ کی وفات کے بعد ۱۹ ربیع الاول ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) کو اس کا منجھلا لڑکا جس کا خطاب ہمایوں تھا تخت نشین ہوا اور ڈیڑھ مہینے حکومت کرنے کے بعد اس نے بیمار ہو کر ۵ جمادی الاول ۷۹۶ھ میں وفات پائی۔[6]

ناصر الدین محمود شاہ

علاء الدین شاہ ہمایوں کی وفات کے پندرہ دن بعد امرا اور ارکان سلطنت نے ناصر الدین محمود شاہ کے دوسرے بیٹے ناصر الدین محمود شاہ کو ۲۰ جمادی الاول ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) کو ناصر الدین محمد شاہ کے لقب

بے دست و پا ہو کر میوات کی طرف بھاگ گیا، اس کی مدت حکومت کل ڈیڑھ سال تھی۔

(4) تاریخ معصومی-ص ۵۵۔

(5) تاریخ معصومی-ص ۵۶۔

(6) سلطان ناصر الدین محمد شاہ ہی کے زمانے میں ۷۹۵ھ میں شیخا کھکڑ نے قلعہ لاہور پر قابض ہو کر علم بغاوت بلند کیا تھا، سلطان ناصر الدین محمد شاہ نے اس بغاوت کے فرو کرنے کے لیے اپنے بیٹے ہمایوں کو متعین کیا تھا، لیکن ابھی وہ روانہ نہ ہونے پایا تھا کہ سلطان ناصر الدین محمد شاہ نے وفات پائی۔

سے تخت سلطنت پر بٹھایا، یہ وہ زمانہ تھا کہ خاندان تغلق کی حکومت باہمی مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے زوال پذیر تھی، صوبوں پر سے مرکز کا رعب ختم ہو چکا تھا، گجرات، خاندیس، مالوہ، ملتان اور جونپور کے صوبے دار خود مختارانہ حکومت کرنے لگے تھے، صرف پنجاب اور دیپالپور کا تعلق برائے نام سلطان ناصر الدین محمود سے تھا، لیکن پنجاب میں پہلے ہی سے شیخا گکھڑ یا کھوکر نے علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ ادھر بعض اراکین سلطنت فتح خان بن فیروز خان کے بیٹے نصرت خان کو تخت سلطنت پر بٹھانا چاہتے تھے، انہوں نے اس زمانے میں جب کہ سلطان ناصر الدین محمود، گوالیار کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھا، نصرت خان کو نصرت شاہ کے لقب سے تخت نشین کر کے اس کے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا۔ ناصر الدین محمود یہ خبر سن کر فوراً ہی دہلی واپس آیا، نصرت شاہ نے فیروز آباد میں اور ناصر الدین نے دہلی میں قیام کیا، اور طرفین میں لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

تیمور کا حملہ

ملتان پر قبضہ:

۸۰۰ھ (۹۸-۱۳۹۷ء) میں عین اُس وقت جب کہ ان دو بادشاہوں میں جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری تھا کہ تیمور نے اپنے پوتے میرزا پیر محمد کو تیس ہزار سواروں کے ساتھ کوہ سلیمان کے راستے سے ملتان پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ کیا، تاریخ معصومی میں ہے کہ میرزا پیر محمد نے پنجاب کے دریا کو عبور کر کے پہلے قلعہ اُچ کا محاصرہ کیا، اور ملک علی نے جو سارنگ خاں[5] کی طرف سے قلعہ اُچ پر متعین تھا محصور ہو کر بھی ایک ماہ تک میرزا پیر محمد سے لڑائی کا سلسلہ جاری رکھا، سارنگ خاں کو جب یہ معلوم ہوا تو اُس نے چار ہزار سوار ملک تاج الدین کے ہمراہ ملک علی کی مدد کے لیے بھیجے، میرزا پیر محمد کو اس کمک کا حال پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا جو سارنگ خاں نے روانہ کی تھی، اس نے قلعے کا محاصرہ چھوڑ کر پہلے ملک تاج الدین کا مقابلہ کر کے اُسے شکست دی، اور اُس کے بعد قلعۂ ملتان کا بھی محاصرہ کر لیا، چھ ماہ تک سارنگ خاں اُس کا مقابلہ

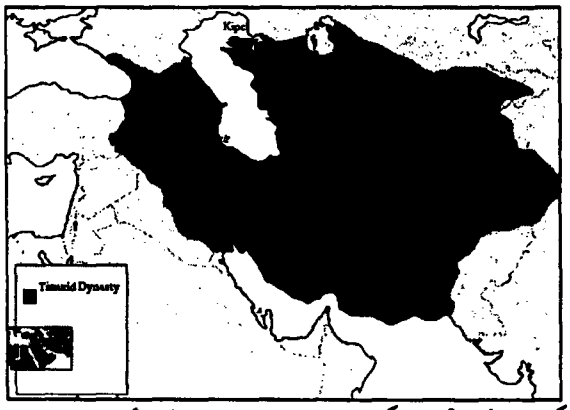

کرتا رہا، آخر مجبور ہو کر میرزا پیر محمد سے امان کا خواستگار ہوا اور ملتان میرزا پیر محمد کے حوالے کر دیا۔ آئینہ حقیقت نما حصہ دوم میں ہے کہ میرزا پیر محمد کا سارنگ خاں لودی نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، آخر لڑتا لڑتا میدان جنگ میں کام آیا، چونکہ اس کی لاش نہیں ملی اس لیے اُس کا مارا جانا بھی مشتبہ ہے۔

ملتان کو فتح کرنے کے بعد میرزا پیر محمد چند دن وہاں ٹھہرا، ماہ صفر ۸۰۱ھ (۱۳۹۸ء) میں تیمور بھی طلنبہ کو تاخت و تاراج کر کے ملتان پہنچا اور میرزا پیر محمد نے جن فوجی لوگوں کو گرفتار کیا تھا اس نے ان کو قتل کرا دیا۔

تیمور کے قبضے کے بعد اہل سندھ حکومت کی ماتحتی کا تعلق ہندوستان کی حکومت سے بالکل ختم ہو گیا اور اس کے بعد سندھیوں کی ایک خود مختار حکومت کی بنیاد پڑی، جس کا تذکرہ آئندہ اوراق میں آئے گا۔[1]

تغلقوں کے دور میں سندھ کی حالت:

شاہان تغلق کے دور میں سندھ ملتان کے گورنر کے ماتحت تھا، جس کے تحت بکھر اور سیوھن کے حاکم رہتے تھے، تغلق سلاطین خود بھی صاحب علم، خدا پرست، شریعت کے پابند اور علم و فن کے قدر دان تھے، اُن کے دربار سے بہت علما، شعرا، صوفیا اور اہل کمال وابستہ تھے، ان کے دور میں سندھ میں کافی علمی ترقیاں ہوئیں، بکھر سیوھن اور سندھ کے مختلف مقامات پر متعدد مدارس قائم ہوئے، جن میں خراسان تک سے طالب علم تعلیم حاصل کرنے آتے تھے، سندھ کے دو علما دہلی کے دربار میں ملازم تھے۔

---

(5) سارنگ خاں، ظفر خان لودی گورنر گجرات کا لڑکا تھا، جو سلطان ناصر الدین محمود شاہ کے تخت نشینی کا سب سے بڑا حامی تھا، ناصر الدین محمود نے تخت نشین ہونے کے بعد اس کو دیپالپور کا گورنر مقرر کیا، اسی نے لاہور پر چڑھائی کر کے شیخا گکھڑ کو شکست دی، اسی نے خضر خاں حاکم ملتان کو شکست دے کر ملتان سے بے دخل کیا تھا۔

(1) تاریخ معصومی۔ ص ۵۹-۶۰۔

باب:14

سومرا حکومت

۷۰۰ھ (۱-۱۳۰۰) تا ۸۴۳ھ (۴۰-۱۴۳۹ء)

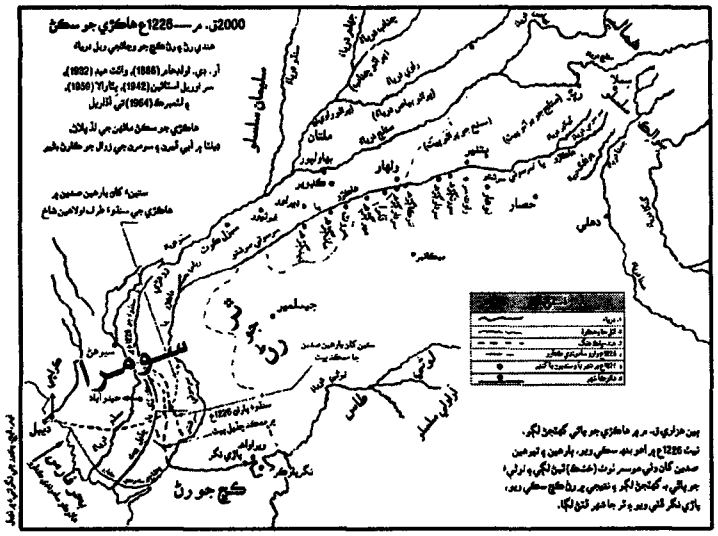

سندھ میں جن دو مختار قبیلوں نے حکومت کی ان میں ایک سومرا اور دوسرا سمہ کہلاتا ہے۔ غزنویوں کی حکومت کمزور ہونے کے بعد، جس مقامی قبیلے نے سندھ پر حکومت کی، وہ سومرا کہلاتا ہے، پھر سلطان محمد شاہ تغلق کے عہد میں جو دوسرا مقامی قبیلہ برسر اقتدار آیا وہ سمہ کہلاتا ہے۔

ان دونوں قبیلوں کے متعلق مورخین میں سخت اختلاف ہے، خصوصاً سومرہ کے متعلق یہ امر معرض بحث میں ہے کہ اُن کی قومیت کیا تھی اور اُن کا مذہب کیا تھا۔

سندھ کے مشہور مورخ میر محمد معصوم نے تاریخ معصومی میں لکھا ہے کہ سلطان محمود غازی نے ملتان اور سندھ کو فتح کر کے وہاں اپنے عامل مقرر کیے، لیکن سلطان محمود کی وفات کے بعد جب سلطنت اس کی اولاد میں منتقل ہوئی، اور سلطان عبدالرشید بن محمود (۴۴۱-۴۴۴ھ) بادشاہ ہوا تو اس کی سلطنت عیاشی اور آرام طلبی میں پڑ کر کمزور ہوگئی، جس کی وجہ سے سرحدی علاقے کے لوگوں نے بغاوت کر کے خود مختاری حاصل کرلی۔

اسی زمانے میں سومرہ قبیلے کے لوگوں نے تھری کے شہر میں جمع ہو کر اپنے قبیلے کے ایک شخص سومرہ نامی کو تخت پر بٹھایا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا، ایک طویل عرصے تک یہ قبیلہ اس سرداری میں زندگی بسر کرتا رہا، سومرہ نے اسی نواح کے صاد (سعد) نامی ایک زمیندار کی لڑکی سے شادی کرلی، جس سے ایک لڑکا بھونگر نامی پیدا ہوا۔

اس کے بعد میر معصوم نے سومرہ کی اولاد اور اولاد کی اولاد کے حالات لکھے ہیں، جن میں بعض عربی نام ہیں اور بعض ہندی۔

میر معصوم کے بعد سندھ کے ایک اور مورخ میر طاہر محمد نیسانی نے اپنی کتاب تاریخ طاہری میں عمر سومرو اور ماروی کی عشقیہ داستان کے ضمن میں لکھا ہے کہ:

سومرا ہندو قبیلہ تھا اور ہندو مذہب رکھتا تھا، ۷۰۰ھ (۱-۱۳۰۰ء) سے ۸۴۳ھ (۴۰-۱۴۳۹ء) تک اس قبیلے نے حکومت کی، محمد طور[1] نامی شہر ان کا دارالسلطنت تھا۔

سندھ کے تیسرے مورخ امیر سید قاسم خان بن سید قاسم ترفدی نے اپنی کتاب بیگلار نامے میں لکھا ہے کہ:

---

(1) محمد طور شہر کے آثار آج تک شاہ کپور گاؤں کے متصل تعلقہ میر پور بٹھورہ ضلع ٹھٹھہ میں موجود ہیں۔ (تعلیقات تاریخ طاہری ص ۲۸۹)۔

سندھ کی فتح کے بعد عرب کے ایک قبیلے تمیم نے سندھ پر حکومت کی، کچھ عرصے کے بعد سومرہ قبیلے کے لوگوں نے سندھ پر قبضہ کر لیا، اس قبیلے نے سندھ پر پانچ سو برس حکومت کی، ان کا پایہ تخت مہاتم طور تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح اس قبیلے کے اشخاص کے نام عربی و ہندی ہیں، اسی طرح ان کے پایہ تخت کا نام بھی عربی و ہندی میں ہے، کہیں ان کے پایہ تخت کا نام "محمد تور" ملتا ہے اور کہیں مہاتم طور۔

سندھ کے چوتھے مورخ میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے اپنی مشہور کتاب تحفۃ الکرام میں محمد یوسف کی کتاب منتخب التواریخ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> جب (غزنوی خاندان کے بادشاہ) سلطان عبدالرشید بن سلطان محمود کی سندھ پر حکومت ہوئی، تو سندھ کے لوگوں نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور ۴۴۵ھ (۱۰۵۳ء) میں سومرہ قبیلے کے لوگوں نے تھری میں جمع ہو کر سومرہ نامی ایک شخص کو بادشاہ بنالیا، اس کے ایک لڑکا بھونگر صاد نامی زمیندار کی لڑکی سے پیدا ہوا، بھونگر نے پانچ برس حکومت کر کے ۴۶۱ھ میں وفات پائی۔

خود تحفۃ الکرام کے مصنف میر علی شیر قانع نے جو اپنی تحقیق اس سلسلے میں سپرد قلم کی ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ:

> سومرہ قوم سامرہ کے عربوں سے نکلی ہے، یہ قوم آل تمیم قبیلے کے ساتھ دوسری صدی ہجری میں سندھ آئی اور یہاں کی سکونت اختیار کی، کافی مدت کے بعد اہل "سامرہ" میں سے ایک مستقل قوم "سومرا" وجود میں آگئی۔

یورپی مورخین نے سومرہ قبیلے کو نو مسلم راجپوت لکھا ہے لیکن ان مورخین نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل نہیں پیش کی۔

مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم نے اپنی کتاب تاریخ سندھ کی پہلی جلد میں اس قبیلے کے متعلق ایک نئی بات یہ لکھی ہے کہ یہ نو مسلم یہودی تھے، مولانا کو شاید یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ یہودیوں کے ایک فرقے کا نام سامری تھا، جو شام کے کوہ شمرون کی طرف منسوب تھے، مولانا کو یہ اشتباہ جو محض نام سے پیدا ہوتا ہے ہمیں اس کے لیے کوئی علمی دلیل نہیں ملتی۔

بعض مصنفین نے سومرہ کو سامرہ (سر من رائے) کا عرب باشندہ سمجھا جو والی سندھ تمیم کے ساتھ سندھ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔

یہ خیال بھی صحت پر مبنی نہیں، کیونکہ تمیم عہد بنو امیہ میں ۱۱۱ھ میں سندھ کا گورنر ہو کر آیا تھا، اور سامرہ شہر عباسی خلیفہ معتصم باللہ کا آباد کیا ہوا ہے۔

سومروں کا مذہب:

عرب و ہند کے تعلقات میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے سومروں کے مذہب کے متعلق اظہار خیال کیا ہے، ہم یہاں اسے مختصر طور پر اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں، اُن کی رائے یہ ہے کہ سومرہ ابتداء میں اسماعیلی تھے، اس سلسلے میں جو چیز سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، وہ دروزیوں کی مقدس کتاب کا ایک ٹکڑا ہے، مصر کے اسماعیلی خلیفہ الحاکم بامر اللہ (۳۸۶ھ - ۴۱۱ھ) نے مصر و شام میں جو اپنا خاص فرقہ پیدا کیا تھا اُس کا نام دروزی ہے، اور جو آج بھی شام و لبنان میں آباد ہے، اُن کی مقدس کتاب کی یہ تحریر ایک خط ہے جو دروزیوں کے امام نے ملتان اور ہندوستان کے موحدوں کے نام عموماً اور شیخ ابن سومرہ راجا پال کے نام خصوصاً لکھا تھا، اس کے بعض فقرے یہ ہیں:

> ملتان اور ہندوستان کے اہل توسید کے نام عموماً، اور شیخ ابن سومر راجہ پال کے نام خصوصاً:
>
> اے معزز راجا اپنے خاندان کو اٹھا، موحدین اور داؤد اصغر کو اپنے سچے دین میں واپس لا کہ مسعود نے جو اسے حال ہی میں قید اور غلامی سے آزاد کیا ہے، وہ اس وجہ سے ہے کہ تو اس فرض کو انجام دے سکے، جو تجھ کو اس کے بھانجے عبداللہ اور ملتان کے تمام باشندوں کے برخلاف انجام دینے کے لیے مقرر کیا گیا ہے، تاکہ تقدیس اور توحید کے ماننے والے جہالت، ضد اور سرکشی اور بغاوت والی جماعت سے ممتاز ہو جائیں۔

اس خط میں دروزیوں کے امام نے ملتان والوں اور ہندوستان کے ہم مذہب اسماعیلیوں اور سومرہ کو جوش دلا کر اُبھارنے کی کوشش کی ہے تاکہ ملتان اور سندھ میں اسماعیلی حکومت دوبارہ قائم ہو جائے۔

اس خط سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

۱۔ سومرہ سندھ کا اصل باشندہ تھا، اس کے بعد جو سومرہ خاندان کے بانی ہوئے وہ اسماعیلی مذہب کے تھے۔

۲۔ ملتان کا حاکم ابوالفتح داؤد بھی سومرہ کی طرح اسماعیلی مذہب کا پیرو تھا۔

۳۔ ان کے نام ہندوانہ اور عربی قسم کے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ

اس خاندان میں عرب وہند کا امتزاج تھا۔

۴۔ سومرہ غالباً سندھ کے اسماعیلیوں کا شیخ اور امام تھا، کیونکہ اسماعیلی اپنے مذہبی سرداروں کے لیے شیخ کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

۵۔ عبداللہ ابوالفتح داؤد اکبر کا نواسہ اور داؤد اصغر کا بھانجا تھا، جس کو اہل ملتان اپنا امیر بنانا چاہتے تھے۔

۶۔ اس خط سے اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ اس خط کے کاتب کا منشا یہ تھا کہ ابن سومرہ راجا پال کو سلطان مسعود، عبداللہ اور اہل ملتان کے خلاف اپنے قبیلے کو جنگ کے لیے اُبھارے، اور قرمطی اسماعیلیوں کی جو طاقت زائل ہو چکی تھی اس کو پھر سے بحال کرے، چنانچہ ملتان میں اس کی بار بار کوشش کی گئی مگر یہ کوشش بار آور نہیں ہوئی۔

۷۔ اس خط سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ سومرہ کوئی طاقتور انسان تھا، جب اس کا بیٹا سلطان مسعود کا ہم عصر تھا، تو یہ خود سلطان محمود کا ہم عصر ہوگا۔

۸۔ انہیں سومروں نے اس خط کے بیس برس بعد سلطان عبدالرشید (متوفی ۴۴۴ھ) کی کمزور حکومت کے زمانے میں غزنویوں کے بجائے سندھ کی حکومت پر قبضہ جمایا، اور سومرہ نامی ایک شخص کو سندھ کا حاکم بنایا، اور اُسی شخص سے سندھ میں سومرہ خاندان کی حکومت کی مستقل بنیاد پڑی۔

ان شواہد و نتائج کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ سومرا نہ تو ہندو تھے اور نہ ہندو راجپوت، بلکہ وہ عرب تھے جو ہندوستان میں آباد ہوگئے تھے، اور پشت باپشت یہاں رہ کر یہیں کے باشندے شمار ہونے لگے تھے۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے تاریخ طاہری کی توضیحات میں سومروں کے مذہب اور ان کی مدت حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

صاحب تاریخ طاہری کا یہ بیان کہ ساتویں صدی سے آٹھویں صدی اور تینتالیس سال تک سومرہ جو ہندو مذہب کے تھے حاکم تھے، حکمرانان سومرگان سندھ کے متعلق اُس کے بعض روایات محض صدری —اور غیر محققانہ ہیں، جنہیں قصے کہانیاں اور خرافات کہا جاسکتا ہے، ہمارا —خیال ہے کہ قبیلۂ سومرہ دوسرے قبیلوں کی طرح سندھ میں اصلاً ہندو —مذہب یا بدھ مذہب کے تھے، یہاں تک کہ اس علاقے کو ۹۳ھ میں محمد بن قاسم نے فتح کر لیا اور اس علاقے کے شہروں میں اسلام پھیل گیا، چنانچہ بائل سمہ، سہتہ اور لوہانہ وغیرہ عرب حکمرانوں کے اثر کی وجہ سے چوتھی صدی ہجری تک مشرف بہ اسلام ہوگئے، سومرہ قبیلے کے لوگوں نے بھی اپنی حکومت سے بہت پہلے اسلام سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا تھا، اور انہوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں شاہان اسلام کے لقب اختیار کیے، مثلاً عصام الدین بھونگر، سنان الدین چنسیر، لہٰذا صاحب طاہری کا یہ قول کہ سومرہ قبیلے کے حاکم لوگ ہندو تھے، تاریخی شہادت اور صدری روایات کے اعتبار سے جو سندھ میں مشہور ہیں صحیح نہیں۔

اسی طرح تاریخ طاہری کے مصنف نے سومرہ کی مدت حکومت جو ایک سو تینتالیس بتائی ہے، یہ بھی ایک مشتبہ امر ہے، کیونکہ تاریخی قرائن سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ سومرہ قبیلے کے لوگوں نے چوتھی صدی کے وسط سے سیاسی اقتدار حاصل کیا تھا اور پانچویں صدی ہجری کے ابتدائی ربع میں انہوں نے منصورہ پر جو عربوں کا دارالحکومت تھا قبضہ کر لیا تھا، چنانچہ ۴۱۶ھ میں جب سلطان محمود غزنوی سومنات کو فتح کر کے منصورہ آیا تو اس شہر کا حاکم خفیف نامی تھا، جو ایک سومرہ حکمراں تھا، یہ نام آج تک بھی سندھ کے سومروں میں مشہور ہے، رفتہ رفتہ سومرہ سیاسی اقتدار حاصل کرتے گئے، پہلے انہوں نے زیرین سندھ پر بعد ازاں پورے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ میر معصوم نے سومروں کا ابتدائے عہد حکومت سلطان عبدالرشید غزنوی (۴۴۱ھ – ۴۴۴ھ) قرار دیا ہے، جب یہ نواح تھری میں آکر جمع ہوئے اور انہوں نے سومرہ نامی ایک شخص کو مسند حکومت پر بٹھایا۔ اس بنا پر ہم سومروں کی آغاز حکومت کا زمانہ پانچویں صدی ہجری کا نصف قرار دیتے ہیں، اور ہم عصر تاریخی ماخذ کے اعتبار سے سومروں کی حکومت کا اختتام آٹھویں صدی ہجری کے ربع ثالث کے اختتام پر ہوا سومرہ حکومت کے اختتام کا سبب سلاطین دہلی کا اثر و نفوذ، اور سندھ میں قبائل سمہ کا خروج تھا۔ محمد تغلق کے عہد میں شمالی سندھ، سندھ سے منقطع ہو کر دہلی کے تحت ہوگیا، چنانچہ ۷۳۴ھ میں ملکہ رتن سیوستان میں بادشاہ دہلی کی طرف سے عامل تھا، اور اسی سال وہ امیر قیصر رومی اور جام اُنڑ سمہ کے لوگوں کے ہاتھوں سے مارا گیا، یہ دونوں اس وقت بادشاہ دہلی کی خدمت میں تھے، اس واقعہ کے چند روز بعد ابن بطوطہ سیاح سیوھن پہنچا، اس واقعے کے متعلق جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا اس کا ذکر اپنے سفر نامے میں کیا ہے۔

۷۵۲ھ (۵۲-۱۳۵۱ء) میں سلطان محمد تغلق، طغی باغی کا تعاقب کرتے ہوئے گجرات سے ٹھٹھہ زیریں سندھ یلغار کرتا ہوا پہنچا، جسے سندھ کے سومروں نے اپنی پناہ میں رکھا تھا، ضیاء الدین برنی مصنف تاریخ

فیروز شاہی نے اس سلسلے میں سومروں کے ساتھ سمہ کا بھی ذکر کیا ہے، برنی کے اس بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سمہ اور سومرہ یہ دونوں قبیلے طغی کی حمایت میں متفق تھے، اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ قبائل سمہ نے بھی ۷۵۲ھ کے قریب سیاسی قوت حاصل کرلی تھی اور سندھ کی سیاست میں حصہ لینے لگے تھے، اس کے بعد جامان سمہ رفتہ رفتہ قوت حاصل کرتے گئے اور وسط سندھ میں خصوصاً سیوستان اور ٹھٹھہ کے پرگنجات میں سومروں کو بے دخل کرکے خود قابض ہوگئے۔ ۵۷۲ھ کے بعد سومروں کی حکومت زوال پزیر ہوئی اور سومروں کا آخری حاکم ہمیر بن دودہ تھا کہ جس نے دہلی کے سلاطین کے عاملوں کے تحت برائے نام چند سال حکومت کی۔ عین الملک ماہرو کہ جو سلطان فیروز شاہ (۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) کی طرف سے ملتان کا گورنر تھا اپنے ایک خط میں جو اُس نے ۱۳۵۲-۱۳۶۵ء کے درمیان کسی وقت لکھا تھا اُس سے اس زمانے کے سندھ پر روشنی پڑتی ہے، وہ لکھتا ہے کہ ہمیر دودا کی حکومت کا درخت کہ جو باد حوادث سے مرجھانے کے قریب تھا اس نے شفقت خداوندی کی سیرابی سے پھر نشوونما حاصل کی، لیکن بابینہ نے علم فساد اور بغاوت بلند کیا ہے، اور قبلۂ (عالم) سے روگردانی اختیار کی ہے، اور مغلوں کو لاکر شہروں کی تخریب کو اپنی عادت بنائے ہوئے ہے، چنانچہ اس بدنصیب اور فضول انسان کے قلع قمع کے لیے حضرت اعلیٰ نے ہمیر دودا کے حالات درست کرنے کی طرف توجہ فرمائی ہے۔

بابینہ جو اُس زمانے میں قبائل سمہ کا سردار تھا اور وہ اسی جام اُنڑ سمہ کا بیٹا تھا کہ جس نے ۷۳۴ھ (۳۴-۱۳۳۳ء) میں ملک رتن کو سیوہن میں قتل کیا تھا، اگرچہ عین الملک نے ہمیر بن دودا کی حکومت کی آبیاری کی بہت کوشش کی لیکن اس کی کوششیں کارگر نہ ہوئیں، قبائل سمہ نے اُسے ایک ہی معرکے میں شکست دے کر قتل کردیا اور جام بابینہ ۱۳۶۵ء کے قریب سندھ پر قابض ہوگیا، اُسی سال سلطان فیروز شاہ نے دہلی سے آکر ٹھٹھہ پر حملہ کیا، لیکن جامان سمہ کی قوت کو شکست نہ دے سکا اور انجام کار صلح کرلی۔

اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ سومروں کی حکومت پانچویں صدی ہجری کے نصف سے آٹھویں صدی ہجری کے نصف تک تھی، اس طرح ان کی مدت حکومت تقریباً تین سو سال قرار پائی ہے۔[1]

سومرہ

سومرہ خاندان کے حالات ابھی تک اس قدر تاریکی میں ہیں کہ اُن کے متعلق تفصیلات کا فراہم کرنا بے حد مشکل ہے مگر اجمالاً ان کے عہد حکومت کے متعلق جو کچھ ہمیں مختلف تاریخوں سے ملتا ہے، ہم اسے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

جب غزنوی سلطنت باہمی خانہ جنگی کی وجہ سے کمزور ہوچکی تھی اور سلطان عبدالرشید کی عیاشی اور آرام طلبی کی وجہ سے سرحدی علاقے خودمختاری حاصل کررہے تھے۔ ۴۴۴ھ میں سندھ میں سومرہ خاندان کی مستقل حکومت کی بنیاد پڑی، سومرہ قبیلے کے لوگوں نے تھری میں جمع ہوکر سومرہ نامی ایک شخص کو سندھ کا حاکم بنایا، سومرہ نے بڑے تزک و احتشام سے سندھ پر حکومت کی اور مفسدین کا قلع قمع کیا۔

اس کے بعد اس نے انہیں اطراف کے ایک طاقتور زمیندار صاد نامی کی لڑکی سے شادی کی، اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام بھونگر تھا جو سومرہ کے بعد تخت نشین ہوا، سومرہ نے ۱۰۵۴ھ میں وفات پائی۔[2]

صاحب جنت السندھ کا بیان ہے کہ سومرہ پہلا شخص تھا، جو اُچ کے مشائخ کے ہاتھ پر اسماعیلی عقاید سے توبہ کرکے سنی ہوا۔

بھونگر

سومرہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا بھونگر تخت پر بیٹھا اور پندرہ سال حکومت کرکے اس نے ۶۲-۴۶۱ھ (۱۰۶۸ء) میں وفات پائی۔[3]

دودا

بھونگر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا دودا نامی اس کا جانشین ہوا، اس نے تقریباً چوبیس سال حکومت کی اور نصرپور تک قبضہ کرلیا۔ دودا نے ۱۰۹۲ء (۸۶-۴۸۵ھ) میں وفات پائی، وفات کے وقت اس کی ایک لڑکی تاری نامی اور ایک لڑکا سنگھار نامی تھا۔

---

[1] ماخوذ از تعلیقات تاریخ طاہری ص ۲۸۳-۲۸۸۔

[2] سومرہ خاندان کے سرداروں کے حالات تاریخ معصومی ص ۶۰ سے لیے گئے ہیں، صرف سنہ وفات کی صراحت جنت السندھ ص ۳۱۸ سے لی گئی ہے۔

[3] جنت السندھ (سندھی) مولائی شیدائی۔ ص ۳۱۸۔

سنگھار

سنگھار چونکہ بہت ہی کم عمر تھا، اس لیے اس کی بہن تاری کو تخت نشین کیا گیا، یہ حکومت کرتی رہی، جب سنگھار بالغ ہو گیا تو اس کو تخت نشین کیا گیا، اس نے نظام حکومت سنبھالتے ہی باغیوں کا قلع قمع کیا اور اپنی سلطنت کو مکران کے مغربی جانب نانکی تک وسیع کر دیا۔ سنگھار نے ۱۱۰۶ء (۱-۵۰۰ھ) میں لاولد وفات پائی۔

ہموں

سنگھار کی چونکہ کوئی اولاد نہ تھی اس لیے اس کی بیوی ہموں نے قلعہ واہکہ کو اپنا دارالسلطنت قرار دے کر اپنے دونوں بھائیوں کو اپنی مدد کے لیے محمد طور اور تھری میں حکومت کے لیے متعین کیا۔ چند دن کے بعد ہی دودا کے بھائیوں نے جو اسی اطراف میں چھپے ہوئے تھے ظاہر ہو کر ان دونوں بھائیوں کو قتل کر دیا۔

پھٹو (فتح خاں)

اسی زمانے میں دودا کی اولاد میں سے ایک شخص پھٹو نامی نے خروج کر کے کچھ لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیا اور ہموں کی حکومت کا تختہ الٹ کر خود قابض ہو گیا، پھٹو نے کئی سال حکومت کی۔

خیرا

پھٹو کے بعد خیرا نامی ایک شخص تخت سلطنت پر متمکن ہوا، یہ بہت سی خوبیوں کا مالک تھا اور مہمات ملکی میں خصوصی توجہ دیتا تھا، خیرا نے چند سال حکومت کر کے وفات پائی۔

ارمیل

خیرا کی وفات کے بعد ارمیل سندھ کے تخت پر بیٹھا، یہ نہایت ہی ظالم اور مردم آزار تھا، لوگ اس کے ظلم سے تنگ آ چکے تھے، آخر لوگوں نے اس کے ظلم سے تنگ آ کر اس کے قتل کی ٹھانی۔[1]

سمہ قبیلے کے لوگ جو نواح کچھ سے آ کر سندھ میں مقیم ہو چکے تھے، ان میں اور سومروں میں نہایت ہی اتفاق و یگانگت تھی، لیکن ارمیل کے ظلم و ستم کی وجہ سے دونوں قبیلوں کے تعلقات خراب ہونے شروع ہوئے، اور اس کا آخری نتیجہ یہ تھا کہ سومرہ خاندان کے ہاتھ سے حکومت نکل کر سمہ خاندان میں منتقل ہو گئی۔

"لب تاریخ سندھ" میں ہے کہ ایک دن سومرہ خاندان کے کسی شخص نے سمہ خاندان کے کسی آدمی کے گھر سے جب کہ وہ گھر میں موجود نہ تھا، زبردستی ایک بھینس کا بچہ پکڑ کر ذبح کر ڈالا، اور محفل جما کر اس کے کباب بنائے اور خوب شراب پی، شام کو جب سمہ خاندان کا یہ آدمی اپنے گھر واپس آیا تو اس کی بیوی نے سارا واقعہ بیان کر کے اُسے غیرت دلاتے ہوئے کہا کہ سومروں نے یہ خوب طریقہ نکالا ہے کہ جس کا مال چاہتے ہیں چھین لے جاتے ہیں، لیکن اُن کے ظلم کے سامنے کوئی کچھ نہیں بول سکتا، آج یہ بھینس کا بچہ اٹھا کر لے گئے، اگر یہی حالات رہے تو وہ دن دور نہیں جب یہ سمہ قوم کی عورتوں کو زبردستی پکڑ کر لے جائیں گے اور کوئی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ سمہ قبیلے کے اس آدمی کو اپنی بیوی کی یہ بات سن کر کے بے حد غیرت آئی، اس نے سمہ قبیلے کے کچھ لوگوں کو جمع کر کے بہت سے سومرہ سرداروں کو قتل کر دیا، اور سب ریگستان کی طرف بھاگ نکلے، سومروں نے ان کا تعاقب کیا، لیکن انہیں گرفتار نہ کر سکے، پھر سمہ خاندان کے سربرآوردہ افراد خفیہ خفیہ سمہ خاندان کے ایک معزز شخص اُنڑ نامی کے گھر پر جمع ہوئے اور سب نے باہمی مشورے سے اُنڑ کو سندھ کا والی منتخب کر کے ارمیل کو قتل کر دیا، اور اس کا سر شہر کے دروازے پر لٹکا دیا۔[2]

سومرہ سلاطین دہلی کے ماتحت حکومت کرتے تھے:

سندھ میں سومروں کی سلطنت سلطان عبدالرشید غزنوی کے دور انحطاط ۴۴۴ھ (۵۳-۱۰۵۲ء) میں قائم ہو کر ۷۵۲ھ (۵۲-۱۳۵۱ء) تک یعنی تین سو آٹھ سال تک قائم رہی۔ ابن بطوطہ جو سندھ بھی آیا تھا اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سومرہ قوم کے حکمران سلاطین دہلی کے ماتحت حکمرانی کرتے تھے، اور سلاطین دہلی کا ایک امیر یا ریذیڈنٹ ان کے ساتھ رہتا تھا، ابن بطوطہ کہتا ہے کہ:

---

(1) سومرہ خاندان کے سرداروں کے حالات تاریخ معصومی ص ۶۰-۶۱ سے اور سنین وفات جنت السندھ (سندھی) تالیف مولائی شیدائی۔ ص ۱۳۸ سے لیے گئے ہیں۔

(2) لب تاریخ سندھ قلمی مملوکہ سندھی ادبی بورڈ و تاریخ معصومی ص ۶۱-۶۲۔

دو روز کی مسافت کے بعد ہم کشتی سے جنانی پہنچے، جو دریائے سندھ کے کنارے ایک خوبصورت اور بڑا شہر ہے، اور جس میں خوشنما بازار ہیں، یہاں کے رہنے والے وہ لوگ ہیں جن کو سامرہ کہتے ہیں، ان کے اسلاف یہاں اس وقت آباد ہوئے جب حجاج کے زمانے میں سندھ فتح ہوا، جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے۔

شیخ رکن الدین ابن شیخ شمس الدین بن شیخ بہاء الدین زکریا قرشی نے مجھے خبر دی کہ اُن کے جد اکبر محمد بن قاسم قرشی فتح سندھ کے موقع پر حاضر تھے اور یہ اس لشکر کے ساتھ آئے تھے، جس کو حجاج بن یوسف نے اپنی امارت کے زمانے میں عراق سے اس مقصد کے لیے بھیجا تھا۔[1]

سیوستان کے تذکرے میں اُس نے لکھا ہے کہ:

اسی شہر میں سامری امیر ونار جس کا ذکر اوپر گزرا اور امیر قیصر رومی رہتے ہیں، اور یہ دونوں سلطان دہلی کے ماتحت ہیں اور ان دونوں سرداروں کے ساتھ اٹھارہ سو سوار تھے، اور یہاں ایک ہندو رہتا تھا، جس کا نام رتن تھا، جو حساب و کتاب میں بڑا ماہر تھا، وہ بعض اُمرا کے ساتھ سلطان کے دربار میں گیا، سلطان نے اس کو پسند کیا اور اس کو "سندھ کا راجا" کا خطاب اور راجگی کے ماہی مراتب دے کر سیوستان بھیجا، اور اس کو وہ جاگیر میں دے دیا، جب وہ وہاں پہنچا تو ونار اور قیصر کو برا معلوم ہوا کہ ایک کافر کو ان پر فوقیت دی جائے، انہوں نے باہم مشورہ کر کے اس کو قتل کر دیا، اور خزانہ لوٹ لیا، اور سب نے مل کر ونار کو ملک فیروز کا خطاب دے کر اپنا بادشاہ بنالیا، پھر ونار یہ سمجھ کر کہ وہ اس وقت اپنے قبیلے سے دور ہے ڈرا، اور اپنے قبیلے میں چلا گیا، لشکریوں نے قیصر کو امیر بنالیا، جب ملتان کے نائب کو خبر لگی تو اس نے اس کی سزا کے لیے فوج بھیجی، اور سخت سزا دی۔[2]

ابن بطوطہ کے ان دونوں اقتباسات سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:

(۱) سومروں کے اسلاف حجاج بن یوسف ثقفی کے زمانے میں سندھ آکر آباد ہوئے۔

(۲) اگر محمد بن قاسم قرشی کو فرض کر لیا جائے کہ وہ محمد بن قاسم ثقفی فاتح سندھ تھا، اور یہ ثابت ہو سکے تو سومروں کا نسب محمد بن قاسم سے جا کر مل جائے گا۔

(۳) سومرہ مذہب کے اعتبار سے ہندو نہ تھے اور نہ ہندوؤں کے ماتحت رہنا پسند کرتے تھے۔

(۴) سندھ سلطان دہلی کے ماتحت اس طرح تھا کہ ان کا ایک امیر یا ریذیڈنٹ یہاں رہتا تھا۔

(۵) سندھ انتظام ملکی میں ملتان کے ماتحت تھا اور ملتان مرکز (دہلی) کے ماتحت تھا۔

سومروں کا پایہ تخت:

سومروں کا پایہ تخت ابتداً تھری تھا، پھر سنگھار کی بیوی ہیموں نے اپنا پایہ تخت قلعہ واہکہ[3] کو بنایا۔ تھری اور قلعہ واہکہ کے بعد ساتویں صدی ہجری میں ان کا پایہ تخت محمد طور نامی شہر بنا۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم نے تاریخ معصومی کی توضیحات میں لکھا ہے کہ تھری کے بعد سومروں کا پایۂ تخت محمد طور تھا جس کا خرابہ تعلقہ میرپور بٹورہ میں اطراف شاہ کپور میں گونگرہ واہ کے کنارے موجود ہے۔ سید محمد طاہر نسیانی (متوفی ۱۰۵۱ھ) مولف تاریخ طاہری کا بیان ہے کہ اس نے اور بہت سے لوگوں نے اس شہر کے ویرانے کو چشم عبرت سے دیکھا ہے، اس شہر کے اکثر متوطنین کی اولاد اس کے ویران ہونے کے بعد جامان سمہ کے عہد میں پرگنہ ساکورہ میں جو جامان سمہ کے عہد میں آباد ہوا تھا ایک گاؤں کو آباد کر کے جس کا نام بھی انہوں نے محمد طور رکھا تھا رہنے لگے تھے۔[4]

بیگلار نامے میں ہے کہ سندھ کی اسلامی فتح کے بعد عرب قبیلے تمیم نے حکومت کی، تھوڑے دنوں کے بعد سومرہ لوگوں نے قبضہ کیا، یہ پانچ سو پانچ برس تک قابض رہے، ان کا پایہ تخت مہاتم تور یا مہتم پور تھا۔[5]

مہاتم تور کون سا شہر تھا، اس کے متعلق کچھ پتا نہیں چلتا، مورخین کا خیال ہے کہ غالباً صاحب بیگلار نامے نے محمد طور کو مہاتم طور یا مہتم پور[6] لکھ دیا ہے۔

---

(1) توضیحات تاریخ معصومی۔ ص ۲۸۸۔

(2) عرب و ہند کے تعلقات۔ مولانا سید سلیمان ندوی، ص ۲۶۰-۲۶۱-۲۶۲ بحوالہ سفر نامہ ابن بطوطہ جلد دوم، ص ۴-۶۔

(3) قلعہ واہکہ کو سندھی میں وگہ کوٹ یا وجہ کوٹ کہتے ہیں، اور یہ مقام نہر پران سے مشرق کی طرف پانچ میل دور واقع تھا، اس وقت جب کہ "رن کچھ" کشتی رانی کے قابل تھا۔ قلعہ واہکہ ایک بندرگاہ تھا (توضیحات تاریخ معصومی مرتب ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم ص ۲۹۴ بحوالہ آثار قدیم سندھ تالیف کزنس ص ۱۲۲)۔

(4) تاریخ طاہری، ص ۲۵۔

(5) بیگلار نامہ، ص ۸۔

(6) مطبوعہ بیگلار نامہ میں یہ نام مہتم پور درج ہے۔

ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم نے ایک قیاسی فہرست مرتب کی ہے، جسے ہم ذیل میں تاریخ معصومی کی توضیحات و تعلیقات سے اُن کے سنین وفات کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

تاریخ معصومی	تحفۃ الکرام	دولت علویہ
۱۔ سومرہ	۱۔ سومرہ ۴۴۵-۴۴۶ھ۔	۱۔ سومرہ۔ وفات ۴۴۸ھ
۲۔ بھونگر	۲۔ بھونگر۔ وفات ۴۶۱ھ۔	۲۔ عصام الدین بھونگر۔ وفات ۴۶۶ھ
۳۔ دودا	۳۔ دودا۔ وفات ۴۸۵ھ۔	۳۔ عصام الدولہ دودا ۴۸۱ھ میں گوشہ نشین ہو گیا۔
۴۔ تاری	۴۔ سنگھار۔ وفات ۵۰۰ھ۔	۴۔ زینب (تاری) ۴۹۱ھ میں تخت سے دست بردار ہو گئی۔
۵۔ سنگھار	۵۔ خفیف۔ وفات ۵۳۶ھ۔	۵۔ شہاب الدین سنگھار۔ وفات ۵۰۳ھ۔
۶۔ ہموں	۶۔ عمر۔ وفات ۵۷۶ھ۔	۶۔ فخر الملک ہموں کا بھائی جس نے ایک سال حکومت کی۔
۷۔ پھتو	۷۔ دودا۔ وفات ۵۹۰ھ۔	۷۔ سراج الدین فتح خاں (پھتو)۔ وفات ۵۱۱ھ۔
۸۔ خیرو	۸۔ پھتو۔ وفات ۶۶۳ھ۔	۸۔ عماد الدین خفیف۔ وفات ۵۳۶ھ۔
۹۔ ارمیل	۹۔ گھنرو۔ وفات ۶۳۹ھ۔	۹۔ جلال الدین عمر۔ وفات ۵۵۶ھ۔
	۱۰۔ محمد طور۔ وفات ۶۵۴ھ۔	۱۰۔ صلاح الدین ہجو۔ وفات ۵۷۰ھ۔
	۱۱۔ گھنرو۔ وفات ۶۶۵ھ۔	۱۱۔ غیاث الدین داؤد۔ وفات ۶۰۰ھ۔
	۱۲۔ طائی۔ وفات ۶۸۲ھ۔	۱۲۔ علاء الدین خیرہ (گھنرہ)۔ وفات ۶۱۹ھ۔
	۱۳۔ چنسیر۔ وفات ۷۰۰ھ۔	۱۳۔ سیف الدین طائی۔ وفات ۶۳۸ھ۔
	۱۴۔ بھونگر۔ وفات ۷۱۵ھ۔	۱۴۔ شمس الدین بھونگر۔ وفات ۶۷۸ھ۔
	۱۵۔ خفیف۔ وفات ۷۳۳ھ۔	۱۵۔ کمال الدین چنسیر جسے ۶۹۶ھ میں تخت سے معزول کر دیا گیا۔
	۱۶۔ دودا۔ وفات ۷۰۸ھ۔	۱۶۔ اسد الملت دودا۔ وفات ۷۰۰ھ۔
	۱۷۔ عمر۔ وفات ۷۹۳ھ۔	۱۷۔ ظہیر الدین بھونگر۔ وفات ۷۴۰ھ۔
	۱۸۔ بھونگر۔ وفات ۸۰۳ھ۔	۱۸۔ فخر الدین عمر۔ ۷۷۵ھ میں گوشہ نشین ہو گیا۔
	۱۹۔ ہمیر۔ اسے سمہ قوم کے لوگوں نے معزول کر دیا۔[1]	۱۹۔ قمر الدین طاہر۔ وفات ۸۱۳ھ۔
		۲۰۔ معین الدین ارمیل۔ وفات ۸۲۲ھ۔
		۲۱۔ بہاء الدین شعہ میر، عرف حمیر۔ وفات ۸۴۳ھ۔

ڈاکٹر داؤد پوتہ نے آگے چل کر لکھا کہ میر معصوم نے سومرہ حکمرانوں کے سنین نہیں لکھے، تحفۃ الکرام اور دولت علویہ کے مصنفین نے سومرہ حکمرانوں کے متعلق جو سنین درج کیے ہیں وہ میں اُن کے مطابق درج کر رہا ہوں۔[2]

---

(1) تاریخ معصومی، تحفۃ الکرام اور دولت علویہ کی مندرجہ بالا فہرستیں تاریخ معصومی ص ۲۸۹-۲۹۰ سے ماخوذ ہیں۔

(2) تعلیقات تاریخ معصومی (فارسی) ص ۲۸۹-۲۹۰۔

سومرہ دور کے رومانی قصے

سومرہ دور کے رومانی قصوں کا تعلق اگرچہ تاریخ سے بالکل نہیں لیکن ہم ان کو اس لیے یہاں نقل کرتے ہیں کہ اس دور کی رومانی کہانیاں سندھی شعر و ادب پر بہت زیادہ اثر انداز ہوئی ہیں اور وہ اس دور کے تہذیب و تمدن و معاشرت کو ہمارے سامنے لاتی ہیں۔

سیف الملوک اور بدیع الجمال:

صاحب تحفتہ الکرام نے سومرہ فرمانرواؤں کے سلسلے میں دلو رائے نامی ایک حاکم کا مزید اضافہ کیا ہے، یہ نام اس فہرست میں نہیں جو ہم اوپر درج کر چکے ہیں، نہ خود صاحب تحفتہ الکرام نے یہ تحریر کیا ہے کہ وہ کب تھا اور کب تک اس کی حکومت رہی، لیکن اس کے بعض اشارات سے پتا چلتا ہے کہ دلو رائے غالباً عمر سے پہلے تھا اور دلو رائے کی حکومت شمال میں ڈیرہ غازی خان اور جنوب میں حیدرآباد سندھ کے قریب تک تھی، اس کا پایۂ تخت الور تھا، واقعات سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بھونگر دوم یا خفیف دوم کے زمانے میں اس نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔

دلو رائے بہت ظالم تھا، اس کے ظلم کی انتہا یہ تھی کہ جو کوئی اس کے ملک سے گزرتا یہ اس کا نصف مال لے لیتا تھا، اگر کسی کے ساتھ کوئی خوبصورت عورت ہوتی یہ اس کو بھی قید کر لیتا۔

ایک دفعہ ایک شہزادہ جس کا نام سیف الملوک تھا، اپنی بیوی بدیع الجمال کے ساتھ جو حج کے ارادے سے جا رہا تھا، دلو رائے کے علاقے سے گزرا، دلو رائے کو معلوم ہوا تو اس نے اس کی بیوی کو چھین لینا چاہا، شہزادے نے بمنت و سماجت دلو رائے کو اس پر راضی کر لیا کہ وہ تین دن تک اس کی بیوی کو اس کے پاس رہنے دے، دلو رائے اس پر راضی ہو گیا، شہزادے نے اس تین دن میں خفیہ خفیہ بیشمار روپیہ خرچ کر کے مزدوروں کے ذریعہ ٹیلہ کھود کر ایک ایسا راستہ بنا لیا، جس سے ایک کشتی نکل سکے، جب راستہ تیار ہو گیا تو وہ اس کشتی میں اپنی بیوی کے ساتھ بھاگ نکلا، اس نے چلتے چلتے راجا کو اس کی بدنیتی کی یہ سزا دی کہ ایک پشتہ بنوایا، جس سے وہ ندی جو اور کے پاس بہتی تھی اس کا رخ دوسری طرف ہو گیا۔

دلو رائے نے سیف الملوک کو گرفتار کرنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ اس کے ہاتھ نہ آیا۔ ندی کا رخ بدل جانے کی وجہ سے الور اور اس کے اطراف کی زمینیں خشک ہو کر رہ گئیں۔ کچھ دن کے بعد شہر ویران ہو گیا، اور لوگ شہر چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں چلے گئے، دلو رائے بھی الور چھوڑ کر برہمن آباد چلا گیا۔[1]

لیلا چنسیر:

سومرہ حکمرانوں کے سلسلے میں چنسیر کا نام بھی آتا ہے، جو بائی کے بعد ۶۵۲ھ (۵۵-۱۲۵۴ء) میں سندھ کا فرمانروا ہوا۔

تحفتہ الکرام میں ہے کہ چنسیر بہت خوبصورت اور خوش رو نوجوان تھا، اس کی شادی لیلا نامی ایک حسین و جمیل عورت سے ہوئی تھی، جس کے حسن و جمال کے دور دور چرچے تھے، دونوں میاں بیوی میں غیر معمولی محبت تھی اور دونوں بڑے عیش و آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

اُسی زمانے میں ایک اور راجا تھا، جس کا نام کھنگار تھا، اس کی رانی کا نام مرگی تھا، اس راجا کی ایک خوبصورت لڑکی تھی، جس کا نام کونرو تھا۔ کونرو کو اپنے حسن و جمال پر بڑا ناز تھا، اور وہ اپنی سہیلیوں کے سامنے بڑے ناز و نخرے کرتی تھی، ایک دن کونرو کی سہیلیاں جمع تھیں، وہ اُن کے سامنے طرح طرح کی بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی تھی کہ اس کی ایک سہیلی چمنی نے طعنہ دیا کہ آج تو تم ایسی بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی ہو، جیسے تم چنسیر کی رانی بن گئی ہو۔ کونرو کے دل پر چمنی کی اس بات سے چوٹ لگی اور اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ چنسیر سے ضرور شادی کرے گی۔ کونرو نے اپنے اس ارادے کی اطلاع اپنے ماں باپ کو بھی کر دی، آخر مشورے کے بعد طے پایا کہ کونرو اپنی ماں کے ساتھ دیبل جائے جو چنسیر کا پایۂ تخت تھا۔

چنانچہ کونرو اور اس کی ماں کچھ سوداگری کا مال لے کر ایک سوداگر کے بھیس میں دیبل آئیں اور کسی نہ کسی طرح چنسیر کے وزیر جکھرا تک رسائی حاصل کی، اور اپنے آنے کی غرض بیان کی۔ وزیر کو اُن سے ہمدردی ہو گئی اور ایک دن اُس نے موقع پا کر چنسیر سے کونرو کی بڑی تعریف کی، لیکن چنسیر نے اس پر کوئی توجہ نہ کی اور کہا میں لیلا کے ہوتے ہوئے دوسری عورت سے شادی کرنا گناہ سمجھتا ہوں، وزیر نے چنسیر کا یہ جواب کونرو اور اس کی ماں کو پہنچا دیا، مگر اس پر بھی ماں، بیٹی نے ہمت نہ ہاری۔

اب کونرو کی ماں نے ایک نئی تدبیر سوچی، اس نے سوداگری کا سارا مال اونے پونے میں فروخت کر دیا اور ایک غریب عورت کا بھیس

---

(1) تحفتہ الکرام جلد ۳ ص ۴۴ واقعہ خرابی شہر الور۔

بدل کر دونوں ماں بیٹی لیلا کے محل میں پہنچیں اور اپنی غربت کا حال بیان کر کے ملازمت کی خواہشمند ہوئیں۔ لیلا نے رحم کھا کر دونوں ماں بیٹی کو ملازم رکھ لیا، یہاں تک کہ کونرو، چنسیر کے کمرے کی صفائی اور فراشی کے لیے مقرر ہوئی، ایک دن وہ بستر بچھا رہی تھی، لیلا اور چنسیر دونوں کمرے میں موجود تھے کہ وطن کو یاد کر کے کونرو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، چنسیر نے اسے آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کیا بات ہے؟ کونرو نے جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا کچھ نہیں، میرے ہاتھ میں چراغ کا تیل لگا ہوا تھا، اتفاقاً آنکھ میں کھجلی ہوئی، میں نے ہاتھ سے آنکھ ملی، اُس کے اثر سے آنکھوں سے پانی بہنے لگا، چنسیر کو اس کا یقین آگیا، لیکن لیلا نے اس کا یقین نہیں کیا، اُس نے تنہائی میں کونرو سے پوچھا کہ سچ سچ بتاؤ، تم اُس وقت کیوں رو رہی تھیں؟ کونرو نے جب دیکھا کہ اب حقیقت بتائے بغیر چارہ نہیں، اُس نے ساری حقیقت کھول کر رکھ دی، اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ ایک راجا کی لڑکی ہے، لیلا کو کونرو کی اس بات کا یقین نہ آیا، اس پر کونرو نے ایک نولکھا ہار لیلا کو دکھایا، اور کہا کہ اب تو آپ کو یقین آیا کہ میں فقیر کی لڑکی نہیں ہوں، لیلا اس بیش قیمت ہار کو دیکھ کر حیران ہو گئی۔ اُس نے بے اختیار ہو کر کونرو سے کہا کہ یہ ہار مجھے دے دو، کونرو نے کہا کہ میں یہ ہار اس شرط پر آپ کو دے سکتی ہوں کہ آپ ایک رات کے لیے چنسیر کو میرے حوالے کر دیں، لیلا نے یہ شرط منظور کر لی اور ہار کونرو سے لے لیا۔ چنسیر کو جب یہ معلوم ہوا کہ اُس کی بیوی نے ایک ہار کے بدلے میں اس کو فروخت کر دیا ہے تو اپنے اس طرز عمل سے لیلا اس کی نظر سے گر گئی، اور اُسے لیلا سے نفرت ہو گئی اور وہ کونرو سے محبت کرنے لگا، ادھر لیلا جب ہر طرح سے مایوس ہو گئی تو اپنے ماں باپ کے گاؤں چلی گئی اور وہیں غم میں گھلتی رہی۔

اتفاق سے چنسیر کے وزیر جکھرا کی منگنی لیلا کے گاؤں کی ایک لڑکی سے ہوئی تھی، جب لیلا کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تو لڑکی کے ماں باپ نے شادی سے انکار کر دیا اور جکھرا کو کہلا بھیجا، آج لیلا اپنے گھر آکر بیٹھ گئی، کل اسی طرح ہماری لڑکی بھی گھر آکر بیٹھ جائے گی، اس لیے یہ شادی ہمیں منظور نہیں۔ جکھرا یہ سن کر بہت پریشان ہوا، لیلا نے اسے کہلا بھیجا اگر تم چنسیر کو کسی طرح ہمارے گاؤں میں لے آؤ تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری شادی اس لڑکی سے کرا دوں گی، جکھرا کسی نہ کسی طرح چنسیر کو راضی کر کے لیلا کے گاؤں لے آیا، لیلا بھیس بدل کر اور نقاب ڈال کر اس جگہ پہنچی جہاں چنسیر ٹھہرا ہوا تھا، اس نے چنسیر سے کچھ اس طرح باتیں کیں کہ چنسیر اس پر عاشق ہو گیا، لیلا نے اس سے کہا کہ تم سے کون محبت کر سکتا ہے، تم نے لیلا جیسی شریف عورت سے بیوفائی کی، چنسیر نے کہا کہ لیلا کے ذکر کو چھوڑو، تم خود کیا لیلا سے کم ہو، بتاؤ تم کون ہو، تمہاری محبت نے مجھے لوٹ لیا ہے، لیلا نے کہا تمہارے جیسے بیوفا سے کون دل لگائے، چنسیر اٹھا تاکہ لیلا کا نقاب الٹ دے، اتنے میں خود ہی لیلا اپنا نقاب الٹ کر سامنے آگئی، چنسیر نے یہ دیکھ کر کہ وہی لیلا ہے سرد آہ بھری اور زمین پر گر کر جان دے دی، لیلا بھی چیخ مار کر اس پر گری اور دنیا سے رخصت ہو گئی، دونوں کو لوگوں نے رسم و رواج کے مطابق جلا دیا۔[1]

سندھی شعرا نے اس واقعہ کو سندھی زبان میں اور ادراکی بیگلاری نے اس واقعہ کو فارسی میں "چنسیر نامہ" کے نام سے نظم کیا ہے۔

عمر، ماروئی:

تاریخ معصومی میں سومرا فرمانرواؤں میں دودا چہارم کے بعد عمر سومرہ کا ذکر ملتا ہے۔ تحفتہ الکرام میں بھی عمر انار کا نام موجود ہے، عمر انار علاء الدین خلجی کا ہمعصر ہے، عمر انار علاء الدین خلجی کے تحت حکومت کرتا تھا۔

۷۹۲ھ (۹۰-۱۳۸۹ء) میں سندھ کے جنوبی حصے پر عمر کی حکومت تھی، اس کا پایہ تخت عمر کوٹ تھا جو ضلع تھرپارکر میں واقع ہے، تھرپارکر دو اسموں سے مرکب ہے، ایک تھر اور دوسرا پارکر، تھر وہ حصہ ہے جس میں ریت کے ٹیلے ہیں، جب اس حصے میں بارش برستی ہے تو یہ سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے، اس میں عموماً چرواہے رہتے ہیں۔

جس زمانے کا یہ واقعہ ہے اُس زمانے میں تھر کے حصے میں ایک چھوٹی سی بستی تھی جس کا نام تھا "بھال وے کاتڑ" تڑ سندھی میں کنویں کو کہتے ہیں، اس بستی میں ایک پٹیل رہا کرتا تھا، جس کا نام تھا "پالنا"، پالنا کی بیوی کا نام "ماڈوئی" تھا، ان دونوں کی صرف ایک لڑکی تھی، جس کا نام تھا "ماروئی"۔ لڑکی بہت خوبصورت تھی، ماں باپ اس سے بے حد محبت رکھتے تھے، پالنا نے ایک یتیم لڑکے کو بھی پرورش کیا تھا جس کا نام "پھوگ" تھا۔ پھوگ اُن کے گھر کے کام کاج بھی کرتا تھا اور پالنا ہی کے ہاں رہتا، تھا پھوگ کو ماروئی سے محبت تھی، اسے ابتدا ہی سے خیال تھا کہ وہ ماروئی سے شادی کرے گا مگر اس زمانے کی رسم و رواج اور معاشرے

---

(1) تحفتہ الکرام جلد - ۳، ص ۴۰-۴۱-۴۲۔

کی پابندیوں کی وجہ سے وہ یہ بات اپنی زبان پر نہ لا سکتا تھا۔

جب ماروئی جوان ہوئی تو پالنا نے ماروئی کی شادی اپنے بھتیجے کھیت سے کرنا چاہی، یہاں تک کہ منگنی بھی کر دی، پھوگ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ماروئی کی منگنی کھیت سے ہو چکی ہے تو اُسے بے حد رنج ہوا، اور وہ اسی صدمے میں اپنے گاؤں سے نکل کر سیدھا عمر کوٹ پہنچا، اور اس نے کسی نہ کسی طرح عمر سومرو کی دربار میں رسائی اور تقرب حاصل کیا۔

ایک دن پھوگ نے موقع پا کر عمر سومرو سے کہا کہ "بھال دے کے تڑ" میں ایک ایسی خوبصورت لڑکی ہے، جس کے سامنے چاند بھی شرماتا ہے، وہ اپنے حسن و جمال کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ آپ کی بیگم بنے۔ عمر کے دل میں پھوگ کی باتیں سن کر ماروئی کی محبت کا چراغ جل اٹھا، اس نے پھوگ سے کہا ابھی میرے ساتھ چلو اور مجھے اس لڑکی کو دکھاؤ۔ دونوں تیز رفتار سانڈنیوں پر سوار ہو کر "بھال دے کا تڑ" پہنچے جو عمر کوٹ سے اسی میل دور تھا۔ پھوگ عمر سومرو کو اُس پنگھٹ پر لایا جہاں گاؤں کی لڑکیاں پانی بھرتی تھیں، جس وقت یہ دونوں وہاں پہنچے، اس وقت گاؤں کی لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں، پھوگ نے عمر کو دور سے بتایا، دیکھیے وہ جو لال دوپٹہ اوڑھے پانی بھر رہی ہے وہی ماروئی ہے۔ عمر آگے بڑھ کر اس کے راستے میں کھڑا ہو گیا، جیسے ہی ماروئی اپنا گھڑا لیے ہوئے اس کے قریب آئی، عمر نے اس کا راستہ روک کر کہا، میں مسافر ہوں، مجھے سخت پیاس لگ رہی ہے، اگر تھوڑا سا پانی پلا دو تو بڑی مہربانی ہو گی، ماروئی نے پانی پلانے کے لیے گھڑا زمین پر رکھا ہی تھا کہ عمر نے ماروئی کو اٹھایا، اور اپنی اونٹنی پر ڈال کر سیدھا عمر کوٹ لایا، اُس نے ماروئی کو عمر کوٹ کے قلعے میں بظاہر تو قید رکھا، مگر اس کی مدارات میں کوئی کسر اٹھا کر نہ رکھی، اس کے عیش و آرام کے لیے ہر قسم کے سامان مہیا کیے، مگر ماروئی نہ کھاتی تھی نہ پیتی تھی، وہ قلعے میں ایک درخت کے نیچے سارا سارا دن خاموش بیٹھی رہتی تھی، عمر نے نہایت منتوں اور خوشامدیوں کے ساتھ ماروئی کو شادی کا پیغام دیا، ماروئی نے اُسے جواب دیا کہ عورت کی شادی تو صرف ایک دفعہ ہوتی ہے، میری شادی تو کھیت سے ہو چکی ہے، اب میں کسی دوسرے کی نہیں ہو سکتی، وہ قلعہ عمر کوٹ میں اس خوشگوار تصور کے ساتھ مصیبت کے دن کاٹ رہی تھی کہ اُسے یقین تھا کہ پھر وہ ایک نہ ایک دن فخر کے ساتھ اپنے گاؤں واپس جائے گی، اور اُس کی شادی کھیت سے ہو گی، جس سے اس کی منگنی ہو چکی ہے۔

آخر ایک سال اسی طرح گزر گیا، جب عمر نے دیکھا کہ وہ کسی طرح راضی نہیں ہوتی تو اس کے ہونے والے شوہر کھیت کو بلا کر ماروئی کو اس کے حوالے کر دیا اور بہت سا انعام و اکرام دے کر اسے رخصت کیا، جب ماروئی اپنے گاؤں واپس آئی تو اس کے اعزہ اور رشتے داروں نے اُسے طرح طرح سے طعنے دیے، جب یہ خبر عمر سومرو کو پہنچی تو اُسے بہت غصہ آیا، اس نے ماروئی کے قبیلے پر حملے کا ارادہ کیا۔ ماروئی کے عزیز یہ خبر سن کر بہت گھبرائے، ماروئی نے اُن سے کہا گھبراؤ نہیں، میں ابھی عمر کے پاس تمہیں لے کر جاتی ہوں، چنانچہ وہ اُنہیں لے کر آئی اور عمر سے کہا تم جو میرے عزیزوں پر چڑھائی کا ارادہ رکھتے ہو، ان بے چاروں کا کیا قصور ہے، خطا تو تمہاری ہے کہ تم نے ایک غیر عورت کو سال بھر اپنے گھر میں قید رکھا، ان حالات میں میری پاکدامنی کو کون مان سکتا ہے، عمر پر ماروئی کی اس بات کا بہت اثر ہوا، اُس نے اس کے شوہر اور عزیزوں کو بلا کر کہا بے شک میں قصوروار ہوں، میں نے ماروئی کو اتنے دن روکے رکھا، خدا جانتا ہے کہ وہ نہایت نیک اور پاکدامن ہے، پھر ماروئی نے اپنی بھری برادری میں کہا چونکہ مجھ پر الزام لگایا جاتا ہے، اس لیے میرے ہاتھ پر لوہا تپا کر رکھا جائے، اگر میں سچی ہوں گی تو گرم اور تپتا لوہا مجھ پر اثر نہیں کرے گا، چنانچہ لوہا گرم کر کے ماروئی کے ہاتھوں پر رکھا گیا، لیکن گرم لوہے نے اس پر اثر نہیں کیا، جب سب کو اس کی پاکدامنی کا یقین ہو گیا تو وہ بڑے فخر کے ساتھ اپنے سارے قبیلے سے سرخرو ہو کر اپنے شوہر کھیت کے ساتھ چلی گئی۔[1]

سندھ کے مشہور شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنے مجموعہ کلام "شاہ جو رسالو" میں اس کہانی پر کئی نظمیں لکھی ہیں اور اس قصے سے بہت مفید نتیجے نکالے ہیں، اس کے علاوہ پوری سندھی شاعری کی بنیاد اس قصے کے نازک پہلوؤں پر ہے۔

سندھ کے مشہور مورخ سید محمد طاہر نسیانی نے اس قصے کو فارسی میں "نازو نیاز" کے نام سے نظم کیا ہے۔

مومل، رانو:

سومرہ فرمانرواؤں کے آخری بادشاہ کا نام ہمیر یا ارمائیل بتایا جاتا ہے، اس فرمانروا کا سنہ وفات ۸۱۰ھ (۸-۱۴۰۷ء) ہے، مومل رانو کی عشقیہ داستان اسی فرمانروا سے متعلق ہے۔

---

[1] ماخوذ از مضمون عثمان علی صاحب انصاری سابق ڈائریکٹر تعلیمات سندھ شائع شدہ ماہنامہ ریاض کراچی، سنہ ۵۴ و تحفۃ الکرام جلد ۳، ص ۳۶-۳۷۔

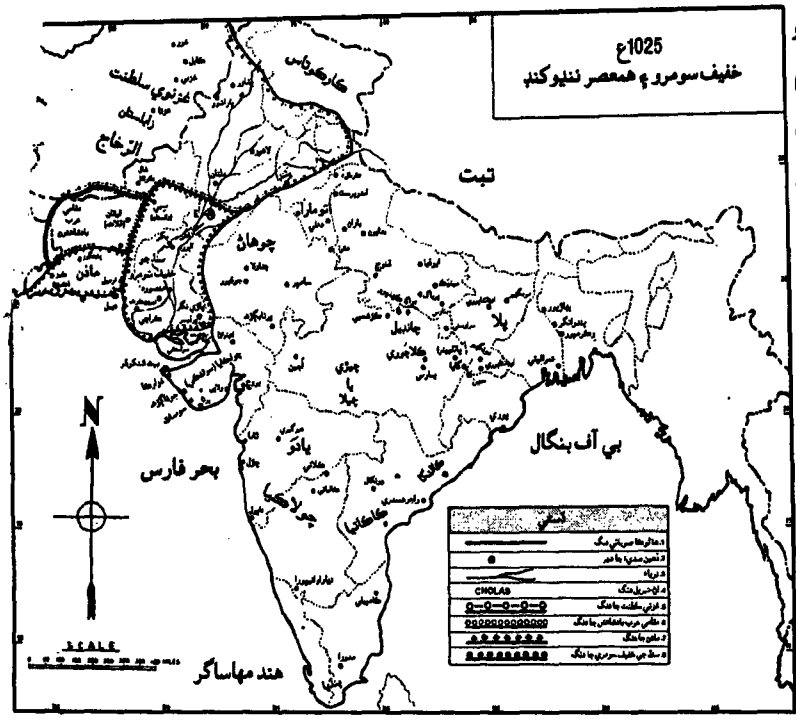

کہتے ہیں کہ ہمیر (ارمائیل) سومرو کے زمانے میں سندھ میں ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس کا نام تھا کاک، اس وقت ریاست کاک کا راجا نند گوجر تھا، راجا نند کے دو حسین اور خوبصورت لڑکیاں تھیں، جن میں سے ایک کا نام تھا مومل اور دوسری کا نام تھا سومل، نند گوجر کے مرنے کے بعد مومل چونکہ بڑی تھی وہ اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھی، اس کے حسن و جمال کی غیر معمولی شہرت تھی، مومل نے ایک طلسمی محل تیار کیا، اور اعلان کیا کہ جو کوئی اس سے گزر کر میرے تخت پر آبیٹھے گا، میں اس سے شادی کروں گی، بہت سے لوگوں نے اس محل سے گزرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

ایک دن ہمیر (ارمائیل) اپنے تین مصاحبوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہوا رانی مومل کے محل کے قریب پہنچا، ان مصاحبوں میں رانا میدرہ جو اس کا برادر نسبتی بھی تھا اور اس کا وزیر بھی اس کے ساتھ تھا، ہمیر سومرو کو بھی رانی مومل کے محل کا قصہ معلوم ہوا، اور اُسے محل میں جانے کا بڑا شوق پیدا ہوا، پہلے دن ہمیر خود محل میں داخل ہونے کے لیے گیا، مگر محل میں داخل نہ ہو سکا اور ناکام لوٹا، دوسرے دن اسکا دوسرا ساتھی گیا مگر وہ بھی ناکام واپس آگیا۔ تیسرے دن رانا میدرہ گیا، اور وہ ہمت کر کے محل میں داخل ہو گیا، اور رانی مومل کے تخت پر جا بیٹھا، اس طرح اُس نے رانی مومل کی شرط پوری کر دی اور رانی مومل نے اس کے ساتھ شادی کر لی، رانا میدرہ نے محل سے واپس آکر یہ سب قصہ اپنے دونوں ساتھیوں سے بیان کیا، ہمیر کو جب یہ معلوم ہوا کہ رانا میدرہ سے مومل نے شادی کر لی ہے تو وہ جل گیا اور اپنے شہر میں واپس ہو کر اس نے رانا میدرہ کو نظر بند کر دیا، لیکن پھر بھی رانا میدرہ اپنے محافظوں کو ملا کر کسی نہ کسی طرح رات کو سانڈنی پر سوار ہو کر 'کاک' جاتا اور رانی مومل سے مل کر تڑکے ہی واپس آجاتا۔

ادھر رانی مومل کی بہن سومل رانا میدرہ اور مومل کی محبت کو دیکھ کر جل گئی، ایک دن وہ رات کو کسی بہانے سے مردانہ لباس پہن کر اپنی بہن کے پاس سو گئی، حسب عادت رات کو رانا میدرہ آیا، اُس نے دور سے مومل کے پاس ایک غیر مرد کو سوتے ہوئے دیکھا وہ اُسے پہچانا نہیں، اور اُلٹے پاؤں واپس ہو گیا، اُس رات سے اُسے مومل سے نفرت ہو گئی، اور وہ سب کاروبار چھوڑ کر اپنے گاؤں دھٹ چلا گیا، مومل کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے ریاست پر لات مار کر دھٹ کا راستہ لیا اور وہیں میدرہ کے محل کے قریب ایک جھونپڑی ڈال کر رہنے لگی، وہ اس تمنا میں اس جھونپڑی میں رہتی تھی کہ کسی نہ کسی دن میدرہ محل سے نکلے گا، اور وہ اُسے صحیح حقیقت حال سے آگاہ کر کے اس کی بدگمانی کو دور کرے گی، مگر میدرہ کا دل کچھ اس طرح ٹوٹ چکا تھا کہ اس نے محل سے نکلنا چھوڑ دیا، مومل اسی تمنا میں دنیا کے دکھ جھیل کر چل بسی، جب رانا میدرہ کو اس کی وفات کی خبر ملی اور صحیح حالات معلوم ہوئے تو اسے اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ بھی اس صدمے میں مر گیا۔

سندھ کے ایک فارسی گو شاعر ملا مقیم نے اس قصے کو "ترنم عشق" کے نام سے فارسی میں نظم کیا ہے۔

اس کے علاوہ کئی اور عشقیہ داستانیں مثلاً سیف الملوک اور بدیع الجمال، اور سسی پنہوں جن کا تعلق سومرہ عہد سے ہے، سندھ کی فارسی اور سندھی شاعری کا محور ہیں۔

عمر کوٹ

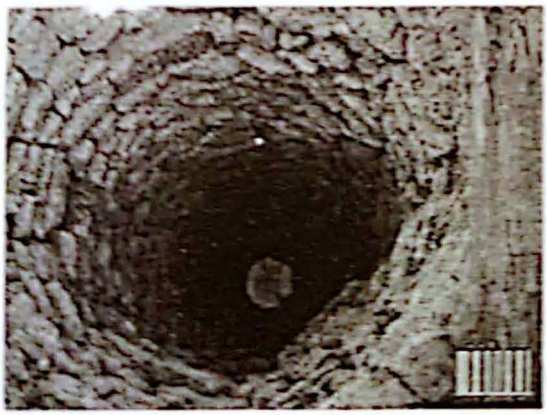

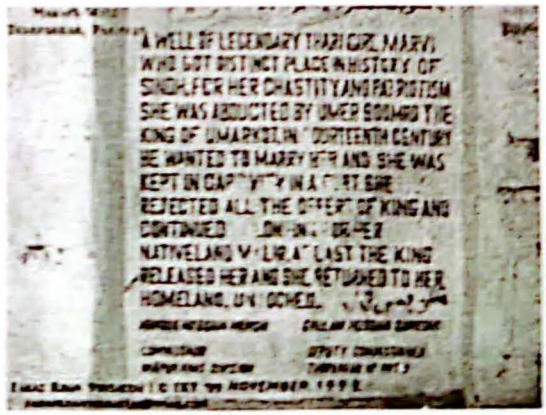

عمر ماروی داستان کی سورمی ماروی کا وہ کنواں جہاں وہ پانی بھرتی تھی

باب:15

سمہ حکومت

۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) تا ۹۲۳ھ (۱۵۱۹ء)

سندھ میں سومرا قبیلے کے بعد سمہ خاندان برسر حکومت آیا، سومرہ خاندان کے زوال کی وجہ ان کی اخلاقی حالت کا بگڑ جانا تھا، ارمیل کے ضمن میں ہم بتا چکے ہیں کہ اس کے ظلم سے لوگ تنگ آچکے تھے، ادھر سمہ قوم خوب طاقتور ہو چکی تھی اور مکران کے علاوہ مغربی سندھ سے جنوبی سندھ تک پھیل چکی تھی، آخر سمہ قوم کے لوگوں نے سومرہ خاندان کے آخری فرمانروا ارمیل کے مظالم سے تنگ آکر ایک دن بہت سے سومرہ سرداروں کو قتل کر دیا، اور پھر سب ریگستان کی طرف بھاگ نکلے، سومروں نے ان کا تعاقب کیا، لیکن وہ ان کو گرفتار کرنے میں ناکام رہے، ادھر سمہ کے لوگوں نے اپنی قوم کے ایک شخص اُنڑ کے مکان پر جمع ہو کر مشورہ کیا اور اس کو اپنا سردار بنایا، پھر سب نے مل کر ارمیل کو قتل کر دیا اور اُس کے سر کو شہر کے دروازے پر لٹکایا۔ سومروں کو شکست دینے کے بعد سمہ نے سومروں کے پایہ تخت محمد طور اور ٹھٹھہ پر قبضہ کر لیا لیکن محمد طور کو شاہی لشکر نے تباہ کر دیا تھا، اس لیے انہوں نے اس کو منحوس سمجھ کر ایک اور شہر آباد کیا، جس کا نام ساموئی رکھا، اُنڑ نے ساموئی ہی کو اپنا پایہ تخت بنایا۔

سمہ کے متعلق تحقیق:

فارسی مورخین نے سمہ کو جمع کی صورت میں سمگان لکھا ہے، بعض لوگوں نے ان کا نام ساس لکھا ہے، اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ شروع میں مسلمان تھے یا بعد میں مسلمان ہوئے، مگر یہ مذہباً مسلمان تھے، ان کا صدر مقام ٹھٹھہ تھا اور سرکاری لقب جام تھا، ان کا نام ہندی اور عربی ملا ہوتا تھا۔

اس قبیلے کی اصلیت کے متعلق بھی مورخین میں سخت اختلاف ہے، بعض مورخین ان کو عرب نسل سے بتاتے ہیں اور وہ ان کے سلسلۂ نسب کو عکرمہ بن عصام بن ابی جہل تک پہنچاتے ہیں، ان کا بیان ہے کہ محمد بن قاسم کے ورود کے وقت اس قبیلے کے بزرگ سندھ آئے تھے اور مسلمان ہو گئے تھے اور بعض مورخین ان کو سام بن عمر بن ہشام بن ابی لہب کی اولاد سے بتاتے ہیں۔

تاریخ فرشتہ اور آئین اکبری میں ان کو جام کے لقب کی وجہ سے ایرانی بادشاہ جمشید کی اولاد سے بتایا گیا ہے۔

یورپین مورخین الیٹ اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مضمون نگاروں نے ان کو نو مسلم راجپوت لکھا ہے۔

صاحب چچ نامہ کا بیان ہے کہ سمہ قبیلے کے لوگ سندھ میں محمد بن قاسم کے زمانے ۹۶ھ سے پہلے ہی سے آباد تھے، جب محمد بن قاسم ان کی آبادی میں پہنچے، تو ان لوگوں نے راگ اور باجے سے اس کا استقبال کیا، اور بہت خوش ہوئے، محمد بن قاسم نے ایک عرب سردار کو جس کا نام خریم تھا ان کا سردار بنایا۔

تاریخ طاہری میں ہے کہ:

> اس طرح وہ ملک جو سمندر کے کنارے ہے، سمہ قوم کے ماتحت ہو گیا، جہاں اس کی نسل اب تک آباد ہے، رائے بہارا اور جام سہتہ جو "کچھ" کے چھوٹے اور بڑے راجا ہیں، ان ہی سمہ لوگوں کی اولاد سے ہیں۔

تاریخ بلاذری جو ۲۹۷ھ کی تصنیف ہے ایک جگہ اس میں ہے کہ:

> پھر سندھ کا والی داؤد بن یزید بن حاتم مقرر ہوا، اسی کے ساتھ صمہ کا باپ (ابو الصمہ التغلب الیوم) بھی گیا تھا، جو آج کل سندھ پر قابض ہے، وہ قبیلہ کندہ کا آزاد کردہ غلام ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کا خیال ہے کہ قیاس چاہتا ہے کہ یہ سمہ قوم اسی "صمہ" کی اولاد ہو جو بعد میں سمہ کے نام سے مشہور ہو گئی ہو، اور جو ممکن ہے کہ کچھ میں جا رہی ہو، اور پھر اُس نے ۷۵۲ھ (۱۳۵۰-۵۱ء) میں آکر سومرہ لوگوں سے سندھ چھین لیا ہو۔[1]

سمہ قوم کا مذہب:

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ سمہ قوم مسلمان تھی، لیکن یہ قوم کب مسلمان ہوئی اور ان کا اسلام کے کس فرقے سے تعلق تھا، تاریخ اس کے متعلق خاموش ہے۔ فرشتے نے ان کے ہندی اور عربی ناموں کی وجہ سے یہ قیاس کیا ہے کہ ان میں سے جن کے نام ہندی تھے وہ ہندو تھے اور جن کے نام عربی تھے وہ مسلمان تھے، چنانچہ اس نے اس قبیلے کے پہلے چار بادشاہوں یعنی جام انڑ، جام جونا، جام مانی اور جام تماچی کو محض ہندی ناموں کی وجہ سے ہندو سمجھا ہے، وہ لکھتا ہے کہ:

> و از نام جماعت مذکور خصوصاً از نام تماچی
> ظاہر میشود کہ آنہا زنار دار بودند۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اس کا قیاس صحیح نہیں، کیونکہ اس قیاس کی صحت کے لیے ہمیں کوئی دلیل نہیں ملی، جام رائے دنہ جو بالکل ہندی نام ہے، اس کے متعلق تاریخ معصومی میں ہے، جب وہ ۸۵۷ھ میں کچھ سے آکر ٹھٹھہ پر قابض ہوا تو اُس نے کہا میں تو صرف اس لیے یہاں آیا ہوں کہ میں مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کروں۔[2]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باوجود مسلمان ہونے کے یہ اُن کے قومی نام تھے، جنہیں وہ رکھتے تھے محض ہندی نام ہونے کی وجہ سے یہ قیاس کر لینا کہ وہ مسلمان نہ تھے کسی طرح صحیح نہیں۔

"عرب و ہند کے تعلقات" میں علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ نے سمہ قوم کے مذہب کے متعلق مختلف قراین و دلائل سے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اگر یہ عرب تھے تو یہ شروع ہی سے مسلمان تھے اور اگر یہ ہندو تھے تو سلطنت حاصل کرنے سے پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے اور اہل سنت و جماعت سے تھے، انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ آرنلڈ صاحب کا قیاس ہے کہ اس قوم کو عرب تاجروں کی وجہ سے اسلام کی دولت ہاتھ آئی، لیکن میری رائے میں ان کے اسلام کا ذریعہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی اور اُن کے مرید حضرت جلال الدین جلال سرخ بخاری اور ان کے پوتے سید جلال الدین حسین بخاری تھے، ملتان کا یہی سہروردی خاندان اُن کی ہدایت کا باعث ہوا، جو ان کے اہل سنت ہونے کو بھی ظاہر کرتا ہے۔[3]

سمہ بادشاہوں کا زمانہ:

سمہ خاندان کی فرمانروائی کا دور وہ زمانہ ہے کہ جب دہلی میں مسلمان بادشاہوں کی حکومت مضبوطی سے قائم ہو چکی تھی، اس لیے یہ نسبت سومرہ خاندان کے سمہ فرمانرواؤں کے حالات، ان کا لقب اور زمانہ ہمیں تاریخ میں تفصیل سے ملتا ہے۔ تاریخ فرشتہ میں ہے کہ:

سندھ کے زمینداروں کی دو قسمیں تھیں، ایک کو سومرہ اور دوسری کو سمہ کہتے تھے، سمہ اپنے بزرگوں کو جام کے لقب سے یاد کرتے تھے، شاہ محمد تغلق کے آخر عہد میں مسلمانوں کی کوشش اور مدد سے حکومت سومروں کے ہاتھوں سے نکل کر سمہ خاندان کے ہاتھ میں آئی، اس خاندان کے اکثر سردار مسلمان تھے اور اکثر اوقات یہ شاہان دہلی کے مطیع اور باجگزار تھے، لیکن کبھی کبھی علم مخالفت بھی بلند کر بیٹھتے تھے، یہ اپنے اپ کو جمشید کی طرف منسوب کرتے تھے، اسی لیے یہ اپنے سرداروں کو جام کے لقب سے ملقب کرتے تھے۔

اسلام کے زمانے میں پہلا شخص جو ان میں سے حکومت سندھ پر فائز ہوا وہ جام اُنڑ تھا۔[4]

(۱)

فیروز الدین جام اُنڑ بن بانبینہ

۷۵۱ھ (۱۳۵۰-۵۱ء) تا ۷۵۳ھ (۱۳۵۲-۵۳ء)

جام اُنڑ سمہ خاندان کا پہلا فرمانروا ہے، جو ہمیر سومرہ کے قتل کے بعد ۷۵۱ھ (۱۳۵۰-۵۱ء) میں سندھ کا فرمانروا ہوا، یہ عقل و فراست میں ممتاز تھا، تمام لوگوں نے اس کی اطاعت اختیار کی، لیکن سیوھن او—

---

(1) یہ تمام تفصیل عرب و ہند کے تعلقات مولف مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم ص ۳۷۵-۳۷۷ سے ماخوذ ہے۔ تاریخ طاہری، ص ۴۴۔

(2) تاریخ معصومی، ص ۷۱۔

(3) یہ تمام تفصیل عرب و ہند کے تعلقات - ص ۳۸۲-۳۸۸ سے ماخوذ ہے۔

(4) تاریخ فرشتہ جلد دوم در بیان برخی از احوال سمگان کہ زمینداران ملک سندھ اند

بکھر اس وقت سلاطین مغلیہ کے تحت تھا۔ مغلوں کی طرف سیوھن پر ملک رتن حکومت کرتا تھا، جام اُنڑ نے سندھ کی زمام حکومت سنبھالنے کے کچھ دن بعد ایک کثیر لشکر کے ساتھ سیوھن پر حملہ کیا، ملک رتن بھی اُس کے مقابلے کے لیے قلعے سے نکلا، دونوں میں لڑائی کا سلسلہ شروع ہوا، پہلے حملے میں جام اُنڑ کو شکست ہوئی۔ لیکن جام اُنڑ نے ہمت نہیں ہاری، وہ اپنے بھائیوں کی مدد سے دوبارہ لشکر تیار کر کے سیوھن پر حملہ آور ہوا، اس مرتبہ قسمت ملک رتن کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ ملک رتن گھوڑا دوڑاتے ہوئے گھوڑے سے زمین پر آگرا اور جام اُنڑ اس کا سر تن سے جدا کر کے سیوستان پر قابض ہو گیا، اس زمانے میں ملک فیروز اور علی شاہ ترک جو اطراف بکھر میں تھے، جب انہیں یہ خبر ملی تو انہوں نے جام اُنڑ کو لکھا کہ اس قسم کی جسارت تمہارے لیے مناسب نہ تھی، اب تم شاہی لشکر کے مقابلے کے لیے تیار رہو، جام اُنڑ ان کے اس خط کو دیکھ کر متاثر ہوا اور تھری کی طرف لوٹ گیا، اسی زمانے میں بیمار ہو کر اس نے وفات پائی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جام اُنڑ فتح سیوستان کے بعد اپنے دارالسلطنت لوٹ آیا، ایک رات جب وہ عیش و عشرت اور مے نوشی میں مشغول تھا اُسے خبر ملی کہ باغیوں کی ایک جماعت اس پر حملہ کرنے کے لیے آئی ہے، اس خبر کے ملتے ہی اس نے اسی وقت کاھ بن تماچی کو جو اس کا وکیل بھی تھا مدافعت کے لیے مقرر کیا، وہ عین عالم مدہوشی میں ایک لشکر کے ساتھ باغیوں پر حملہ آور ہوا، اور اثنائے جنگ میں باغیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا، باغیوں نے اُسے قید خانے میں ڈال دیا، جام اُنڑ نے اس کے قید ہونے کی مطلقاً پروانہ کی اور عیش و عشرت میں مشغول رہا، جام اُنڑ کی اس بے التفاتی کی وجہ سے کاھ بن تماچی کے دل میں گرہ پڑ گئی اور وہ کسی حیلے بہانے دشمنوں سے رہائی حاصل کر کے بکھر کے قلعے میں پہنچا اور بکھر کے حاکم علی شاہ ترک کو اس نے جام اُنڑ کی مخالفت پر آمادہ کیا۔ علی شاہ ترک اور ملک فیروز جو مغلوں کی طرف سے سندھ کے کسی حصے کا حاکم تھا، دونوں نے مل کر بہرام پور کے قلعے[1] میں جام اُنڑ کو قتل کر دیا، علی شاہ ترک ملک فیروز کو قلعے کا حاکم بنا کر لوٹ آیا، تین روز کے بعد جام اُنڑ کے لوگوں نے مختلف حیلوں اور ترکیبوں سے کاھ بن تماچی اور ملک فیروز کو قتل کر دیا۔[2]

جام اُنڑ نے تین سال اور چھ ماہ حکومت کی۔ محترم ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے جام اُنڑ کی مدت حکومت ۷۴۹ھ تا ۷۵۳ھ لکھی ہے۔[3]

(۲)

صدر الدین جام بابینہ بن فیروز الدین شاہ جام اُنڑ معروف علاء الدین جام جونہ

۷۵۳ھ (۱۳۵۲-۵۳ء) تا ۷۶۸ھ (۱۳۶۶-۶۷ء)

جام اُنڑ کی وفات کے بعد اُس کا بھائی جام جونہ ۷۶۸ھ (۱۳۶۶-۶۷ء) میں جام کے لقب سے ملقب ہو کر سندھ کے تخت شاہی پر بیٹھا، اس کو تخت نشین ہوتے ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ پورے سندھ پر اس کا قبضہ ہونا چاہیے، جام جونہ نے سندھ کی زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی، اپنے بھائیوں اور رشتے داروں کو اپنے مقبوضہ علاقوں کی مختلف مقامات کی حکومت پر مقرر کیا، یہ لوگ موضع تلٹی کے قریب سے گزر کر بکھر کے قصبات اور دیہات میں لوٹ مار مچانے لگے، ان میں اور بکھر کے حکام میں دو تین مرتبہ سخت جنگ ہوئی، لیکن بکھر کے مغل حکام مقابلے کی تاب نہ لا کر قلعۂ بکھر کو چھوڑ کر اُچ کی طرف بھاگ گئے۔ جام جونہ کو جب ان کے فرار کی اطلاع ملی وہ ایک لشکر کو لے کر بکھر پہنچا اور بکھر پر قابض ہو گیا۔ جام جونہ کئی سال تک نہایت شان و شوکت سے سندھ پر حکومت کرتا رہا، یہاں تک کہ سلطان علاء الدین نے اپنے بھائی الغ خان کو ملتان کی مہم پر متعین کیا، اور الغ خان نے ملک تاج کافوری اور تاتار خاں کو جام جونہ کے مقابلے کے لیے سندھ بھیجا، ابھی یہ لشکر سندھ پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ جام جونہ مرض خناق میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا، علاء الدین کے لشکر نے سندھ پہنچ کر بکھر کے قلعے پر قبضہ کر کے سیوستان کا رخ کیا، جام جونہ کی مدت حکومت بقول معصومی تیرہ سال اور بقول فرشتہ چودہ سال تھی۔[4]

سندھ کی تاریخ کے مشہور محقق سید حسام الدین راشدی نے حواشی مکلی نامہ میں جام صدر الدین کے متعلق لکھا کہ وہ بے حد وطن

---

[1] بہرام پور کا قلعہ غالباً تعلقہ گوٹی میں واقع تھا۔ تاریخ معصومی۔ ص ۲۹۷۔ تاریخ معصومی۔ ص ۶۲-۶۳۔

[2] تعلیقات تاریخ طاہری۔ ص ۳۰۷۔

[3] تاریخ معصومی۔ ص ۶۳ و تحفۃ الکرام جلد۔ ۳، ص ۵۰ جام جونہ کے سنین عہد حکومت۔

دوست تھا، اور بیرونی مداخلت کو سخت ناپسند کرتا تھا اور دہلی کی حکومت کی بالادستی کا سخت مخالف تھا، کتنی مرتبہ اس نے دہلی کے علاقوں پر حملہ کیا تھا۔[1]

محترمی ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے اس کی مدت حکومت ۷۵۳ھ تا ۷۶۸ھ بتائی ہے۔[2]

(۳)

رکن الدین جام تماچی بن فیروز الدین شاہ جام انڑ معروف خیر الدین جام تماچی بن علاء الدین جام جونہ

۷۶۸ھ (۶۷-۱۳۶۶ء) تا ۷۷۷ھ (۷۶-۱۳۷۵ء)

جام جونہ کی وفات کے بعد جام انڑ کا بیٹا جام تماچی تخت پر بیٹھا، صاحب تاریخ فرشتہ نے اس کا نام جام مانی لکھا ہے۔

سلطان علاء الدین کے لشکر نے جام تماچی کو شکست دے کر اس کو مع اہل و عیال کے گرفتار کر کے دہلی بھجوا دیا، جہاں اس کے دو لڑکے پیدا ہوئے، جام تماچی کے بعد سمہ قوم حوالی تھری پر قابض رہی اور جام تماچی کے بعد جام انڑ کے حکام اپنے مقبوضہ علاقے کا انتظام کرتے تھے، ایک طویل عرصے کے بعد جام تماچی کا لڑکا ملک خیر الدین جو بچپن ہی میں اپنے والد کے ساتھ دہلی چلا گیا تھا، جام تماچی کی وفات کے بعد سندھ آیا اور تخت حکومت پر بیٹھا۔

اس کے کچھ دن بعد ہی سلطان محمد شاہ تغلق طغی نمک حرام کے تعاقب میں گجرات سے سندھ آیا چونکہ جام خیر الدین نے شاہان دہلی کے ہاتھ سے طرح طرح کی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ سلطان محمد شاہ تغلق نے ہر چند اس کو طلب کیا، لیکن اس نے اس کی اطاعت سے گریز ہی کیا، یہاں تک کہ سلطان محمد تغلق نے اطراف ٹھٹھہ ہی میں وفات پائی۔

سلطان محمد تغلق کی وفات کے بعد سلطان فیروز شاہ اس کی وصیت کے مطابق دریائے سندھ کے کنارے تخت نشین ہوا، جب وہ عازم دہلی ہوا تو جام خیر الدین نے مخالفانہ رویہ اختیار کر کے کئی منزل تک اس کا تعاقب کیا، یہاں تک کہ وہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے موضع سن تک گیا جو مضافات سیوھن میں ہے، اس طرح سلطان فیروز تغلق نے جام خیر الدین کی مخالفت کو اچھی طرح محسوس کر لیا۔

جام خیر الدین نے اس تعاقب سے واپسی کے بعد عدل و انصاف اور رعایا کی فلاح و بہبود پر زیادہ توجہ دی۔

معصومی میں ہے کہ وہ اس قدر نیک اور عدل پرور تھا کہ ایک دن وہ اپنے امیروں اور مصاحبوں کے ساتھ شکار کے لیے نکلا، ایک جگہ اس نے دیکھا کہ آدمیوں کی بہت سے ہڈیاں پڑی ہوئی ہیں، جام خیر الدین وہیں اپنی سواری کو روک کر کھڑا ہو گیا اور بہت دیر تک ان بوسیدہ ہڈیوں کو دیکھتا رہا، پھر اُس نے اپنے مصاحبین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ تم جانتے ہو کہ یہ ہڈیاں مجھ سے کیا باتیں کر رہی تھیں، مصاحبین اس عجیب و غریب سوال کو سن کر خاموش ہو گئے، جام خیر الدین نے ان کو خاموش دیکھ کر کہا کہ یہ مظلوم انسانوں کی ہڈیاں ہیں جو مجھ سے انصاف کا مطالبہ کرتی ہیں، پھر اُس نے حکم دیا کہ قریب کے گاؤں کے کسی بوڑھے آدمی کو لایا جائے، چنانچہ اسی وقت اطراف کے ایک گاؤں کے کسی بوڑھے آدمی کو لایا گیا، جام خیر الدین نے اس بوڑھے کو وہ بوسیدہ ہڈیاں دکھا کر پوچھا کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ کون لوگ تھے؟ اور کس طرح مارے گئے؟ بوڑھے نے جواب دیا کہ اب سے کوئی سات سال پہلے کی بات ہے کہ گجرات کا ایک قافلہ ادھر سے گزرا تھا اور فلاں ڈاکوؤں کی ٹولی نے اس قافلے کے لوگوں کو قتل کر کے ان کا سب مال اسباب لوٹ لیا اور آج بھی ان لوگوں کا مال ان ڈاکوؤں کے پاس موجود ہے، جام خیر الدین نے یہ سنا تو بے چین ہو گیا، اور حکم دیا کہ ان ڈاکوؤں کو گرفتار کیا جائے اور اُن سے وہ مال و اسباب حاصل کیا جائے جو مظلوموں کا ان کے پاس موجود ہے، چنانچہ سب ڈاکو گرفتار کر کے خیر الدین کے سامنے پیش کیے گئے، جام خیر الدین نے ان سب کو قصاص میں قتل کرا دیا اور وہ مال جو اُن کے پاس سے برآمد ہوا تھا، گجرات کے پاس بھجوا کر لکھا کہ ان مظلوموں کے ورثا جو اب موجود ہوں یہ مال اُن میں تقسیم کر دیا جائے،[3] جام خیر الدین نے چند حکومت کر کے وفات پائی۔[4]

---

(1) حواشی مکلی نامہ۔ ص ۴-۱۔

(2) تعلیقات تاریخ طاہری، ص ۳۰۷۔

(3) یہ تمام تفصیل تاریخ معصومی۔ ص ۶۴-۶۵ سے ماخوذ ہے۔

(4) تعلیمات تاریخ طاہری: ص ۳۰۷۔

شجرہ سلاطین سمہ

بابنیہ اول (بابیہنر)

۱۔ نیروز الدین شاہ جام اُنر اول
(۷۵۳-۳۷ھ)

- ملک راہو
  - ملک راؤ ڈنو
    - ملک راہو
      - ملک اُنر
        - ملک راج پال
- ۲ الف۔ صدر الدین جام بابنیہ ثانی (۷۶۸-۵۳ھ)
- ۳ الف۔ رکن الدین جام تماچی (۷۶۸ھ - ۷۷۲ھ) بار دیگر (۷۹۱ھ کے بعد سے)
  - ۸۔ جام علی شیر
  - ۶۔ سلطان صلاح الدین شاہ جام اُنر ثانی
    - ۷۔ جام نظام الدین اول
    - ۱۵۔ سلطان صدر الدین شاہ جام سنجر عرف راؤ ڈنو (؟-۲۵ ربیع الاول ۸۶۶ھ)
      - دختر
        - مارک عرف شیخ الوبو مرید پیر مراد شیرازی دفن ٹھٹھہ (م-۸۵۸ھ)
      - ۱۸۔ صلاح الدین شاہ (۱۷-۹۱۹ھ) (شہادت - ۹۲۷ھ)
        - ہیبت خاں (فتح خاں؟) اپنے باپ کے ساتھ شہید ہوا سلطان مظفر گجراتی کا داماد تھا
      - بی بی رانی (زوجہ مظفر ثانی والی گجرات) (۱۷-۹۳۲ھ) عروسی (۹۲۴ھ)
      - ۱۹۔ سلطان جام نظام الدین ثانی جام اُندو (۲۵ ربیع الاول ۸۶۶ھ - ۹۱۲ھ)
        - (دختر زوجہ مارک عرف شیخ الوبو)
        - فتح خاں
        - ۱۷۔ ناصر الدین ابو الفتح سلطان فیروز شاہ ثانی (۲۴-۹۱۹ھ)
          - ۱۹۔ دوسری مرتبہ شاہ حسن ارغون کے عہد میں (۹۱۹ھ-۹۲۸ھ) میں حاکم ہوا - ۹۴۲ میں شہید ہوا
            - دختر زوجہ شیخ ابراہیم
            - زوجہ سلطان بہادر (۱۰) ولد سلطان مظفر والی گجرات
            - پسر فتح خاں ؟ ۸۴۹ھ میں پیدا ہوا (جس سے بی بی عائشہ بنت مظفر ثانی بیاہی تھی)

ماخوذ از تحفۃ الکرام طبع راشدی - ص ۱۲۲

بابنیہ اول (بابیہنو)

۲-ب علاءالدین جام جونو اول
(۷۶۸-۵۳ھ)
(دوسری مرتبہ) (۷۷۱-۷۹۱ھ)

۳ب - خیر الدین جام تماچی

۹ - جام کرن (ڈیڑھ دن حکومت کی)

۱۰ - صدر الدین جام سکندر شاہ اول

جام فیروز اول
(۵۵ - ۸۶۳ھ)

۱۲ - جام تغلق شاہ جونو ثانی

۱۳ - جام مبارک

۱۱ - جام فتح خان

بی بی سرکی یا سرگی
(م-۵۶ - ۸۵۷ھ)
مدفون روضہ
جام جونو
نزد احمد آباد
زوجہ
شاہ علم بخاری
(۸۸۰ھ)

بی بی سنلی زوجہ
سلطان محمد اول
گجراتی
۲- زوجہ شاہ عالم
گجراتی

جام خیر الدین

جام صلاح الدین

جام زادی زوجہ
قطب عالم
گجراتی
(۴۰ - ۸۵۸ھ)

جام سکندر شاہ ثانی
جام محمد عرف
جام انر

بی بی امان

بی بی وچن

سید بیگ محمد
عرف شاہ بھیکن
مدفن روضہ جام جونو
نزد احمد آباد

بی بی شاہ عالم

بی بی شاہ فردوس

ان کے بطن سے سلطان محمود بیگرہ والی گجرات
(۸۷۲ھ میں پیدا ہوا تخت نشینی ۸۶۳-۹۱۷ھ)

سلطان مظفر ثانی والی گجرات
تولد ۸۷۲ھ - شوہر بی بی رانی

بی بی عائشہ جو بی بی
رانی کے بطن سے پیدا
ہوئیں جو فتح خان
بن فیروز بن نظام الدین
کی بیوی تھیں

بی بی رقیہ بی بی رانی
کے بطن سے تھیں
اور سلطان عادل شاہ
فاروقی والی برہان پور
کی بیوی تھیں

لطیف خاں
سلطان محمود
ثالث

سلطان بہادر
داماد
فیروز سلطان بن
جام نظام الدین تندو

سلطان سکندر
والی گجرات
بی بی رانی کے
بطن سے تھا

(۴)

علاء الدین جام جونہ بن بابینہ

۷۷۷ھ (۷۶-۱۳۷۵ء) تا ۷۹۱-۷۹۰ھ (۸۹-۱۳۸۸ء)

جام خیر الدین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جام علاء الدین جام جونہ بن بابینہ (ثانی) تخت حکومت پر بیٹھا یہ وہ زمانہ تھا کہ فیروز شاہ تغلق ہندوستان اور گجرات سے فوجیں جمع کر کے تسخیر سندھ کے لیے عازم ہوا، جس کی تفصیل ہم فیروز شاہ تغلق کے حالات میں لکھ چکے ہیں، جب سندھ کے تمام علاقے پر سلطان فیروز نے قبضہ کر لیا، سلطان فیروز جام بابینہ کو اپنے ساتھ لے کر دہلی آیا، دہلی کے قیام کے زمانے میں جام بابینہ نے اپنی وفا شعارانہ خدمات سے سلطان فیروز کو اس قدر خوش کیا کہ سلطان نے اُس کو دوبارہ سندھ کی حکومت عطا کر کے سندھ بھیجا، جام بابینہ ایک عرصے تک دوبارہ سندھ پر حکومت کرتا رہا۔

گجی میں شیخ ترابی کے مزار پر جو کتبہ ہے، اُس میں علاء الدین جام جونہ کا نام اور سال ۷۸۲ھ درج ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سال تک اُس کی حکومت تھی، یہ سال اُس کے دہلی سے واپس ہونے کے بعد کا ہے، لیکن کوئی تاریخی شہادت ہمیں ایسی نہیں ملتی کہ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ سندھ میں دوبارہ اس کی مدت حکومت کتنی تھی، وہ کتبہ یہ ہے:

بعد شہر یار دہر سلطان داور (کذا)
شہہ فیروز منصور و مظفر در صف شاہاں
با مر سرفراز ہند خاص حضرت عالی
کہ پائے قدر او اعلا زفر فرقد تاباں
ستودہ جام جم سیرت علاء الدین دریا دل
کہ از مہماتی لطفش جہاں سد جملہ آباداں
بر آمد ایں چنیں گنبد معلا کز ضفہ گوئی
بسان بیت معمور آمدہ ست از بار ایں ایواں
مقام شیخ حاجی بو ترابی، آں ولی اللہ
کہ بر درگاہ او گردد روا حاجات خلق آساں
بسال ہفصد و ہشتاد و دو از ہجرت احمد
زعون ایزد ذوالمن والا فضال والا حساں
بناشد ثالث ماہ صفر ایں روضۂ میموں
بسعی کمترین بندگان موسی بن شہجاں

مولانا محمد شفیع مرحوم نے (اورنٹیل کالج میگزین، ۱۹۳۵ء، ۲/) میں لکھا ہے کہ ۳ صفر ۷۸۲ھ فیروز تغلق کے عہد میں جام علاء الدین کے حکم سے موسیٰ بن شہجان نے یہ مقبرہ بنوایا تھا، شہجاں شاید شاہجہاں کا شعری ضرورت کی وجہ سے مخفف ہے۔

اسی زمانے میں جام جونہ نے جام تماچی اور اس کے بیٹے سلطان صلاح الدین جام اُنڑ ثانی کو دہلی روانہ کیا، جیسا کہ صاحب تحفۃ الکرام نے صاحب حدیقۃ الاولیا کا بیان نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> جام جونہ، جام تماچی و پسرش جام صلاح الدین را مقید بہ دہلی فرستادہ بود، و بہ تصرف شیخ (حماد جمالی) نامبردہا از قید ہند خلاص شدہ بہ سند رسیدند۔[1]

(۵)

سلطان رکن الدین شاہ جام تماچی ثانی

۷۹۱ھ (۱۳۸۸ء) تا ۷۹۵ھ (۹۳-۱۳۹۲ء)

جام بابینہ کی وفات کے بعد اس کا بھائی جام تماچی تخت سلطنت پر بیٹھا، یہ عیش پسند انسان تھا، اس کا زیادہ وقت عیش و انبساط میں گزرا، آخر تیرہ سال حکومت کر کے جام تماچی نے طاعون میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔[2]

حدیقۃ الاولیاء کے مصنف عبد القادر بن ہاشم بن محمد نے شیخ حماد جمالی کے تذکرے کے ضمن میں لکھا ہے کہ:

> جام جونہ نے جام تماچی اور اس کے بیٹے جام صلاح الدین کو جو شیخ حماد جمالی سے عقیدت رکھتے تھے، اور اُن کے آستانے کی جاروب کشی کو اپنے لیے باعث فخر و سعادت سمجھتے تھے، بعض شر پسندوں کے اکسانے پر کہ جام تماچی سندھ کی حکومت کا داعیہ اپنے قلب میں رکھتا ہے، اور وہ اپنی حکومت کے لیے شیخ سے دعا کا طالب ہے، جام تماچی اور جام صلاح الدین کو قید کر کے اُس نے دار الخلافہ دہلی بھجوا دیا، ان کو اس خفیہ طریقے پر قید کیا کہ کسی کو اس واقعے کی خبر نہ ہونے پائی، وہاں وہ ایک عرصے

---

(1) یہ تمام تفصیل مکلی نامہ تالیف سید حسام الدین راشدی ص ۱۰۶-۱۰۷ سے ماخوذ ہے۔
(2) تاریخ معصومی ص ۶۶۔

تک قید رہے، اتفاق سے ایک دن شیخ حماد جمالی نے ان کو یاد کیا، لیکن کسی کو اُن کی گرفتاری کی اطلاع نہ تھی، شیخ نے ایک آدمی اُن کے گھر بھجوایا۔ گھر والوں نے شیخ کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا، اس خبر کو سننے سے شیخ کی غیرت جوش میں آئی، اور اپنے حجرے میں آکر سندھی کا ایک شعر پڑھنے لگے، جس میں جام تماچی سے ملاقات کا اشتیاق اور اُس کے بلانے کی آرزو تھی، جب یہ خبر جام جونہ کو پہنچی تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے گستاخانہ انداز میں کہا کہ درویشوں اور بزرگوں کو امور سلطنت میں دخل نہ دینا چاہیے، شیخ نے اُسے غصے ہو کر جواب دیا کہ یہ زمین کا ٹکڑا ہمارے حوالے کیا گیا ہے، اور ہم نے اس کثیف پونجی کو جام تماچی کے حوالے کیا ہے، جام جونہ شیخ کی یہ بات سن کر ملول و محزون واپس لوٹ گیا، شیخ کی دعا سے یہ دونوں آزاد ہو کر سندھ میں آئے اور پھر جام جونہ کو معزول کر کے ملک کے وارث ہوئے۔[1]

مکلی نامے کے حواشی میں سید حسام الدین راشدی نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ ۹۳-۷۹۲ھ کا ہے، اور یہ وہی جام تماچی ہے، جسے نوری سے عشق تھا جو گندری ذات کے جھیل کینجھر کے ایک ملاح کی بیٹی تھی اور جسے بعد میں جام تماچی نے اپنی ملکہ بنایا تھا، اور اس کے لیے کینجھر جھیل کے کنارے ایک محل تیار کرایا تھا، جس میں سے اس کے کچھ آثار اب بھی موجود ہیں، پھر اُنہوں نے تحفۃ الکرام کے حوالے سے لکھا کہ جام تماچی اور نوری کی قبریں مکلی میں شیخ حماد جمالی کے گنبد کے پاس ایک حجرے میں موجود ہیں۔[2]

(۶)

جام صلاح الدین

۷۹۵ھ (۹۳-۱۳۹۲ء) تا ۸۰۶ھ (۴-۱۴۰۳ء)

جام تماچی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جام صلاح الدین تخت سلطنت پر بیٹھا اور اس کا جانشین ہوا، جام صلاح الدین نے تخت پر بیٹھتے ہی اُن باغیوں کی سرکوبی کے لیے ایک لشکر روانہ کیا جنہوں نے ملک میں افراتفری مچا رکھی تھی، ملک کے اندرونی باغیوں کا قلع قمع کرنے کے بعد وہ "کچھ" پر حملہ آور ہوا۔ کچھ کے لوگوں سے اس کے سخت معرکے ہوئے، لیکن وہ ہر معرکے میں فتح یاب ہوا اور بہت سا مال غنیمت لے کر لوٹا، اس نے اپنے زمانۂ حکومت میں فوجیوں اور رعایا کے حالات بہتر بنانے کی طرف خصوصیت سے توجہ دی اور نہایت ہی عدل و انصاف سے حکومت کی۔

جام صلاح الدین نے گیارہ سال اور چند ماہ حکومت کر کے وفات پائی۔[3]

(۷)

جام نظام الدین بن جام صلاح الدین

۸۰۷ھ (۵-۱۴۰۴ء) تا ۸۰۹ھ (۷-۱۴۰۶ء)

جام صلاح الدین کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا جام نظام الدین اُمرائے سلطنت کے مشورے سے تخت پر بیٹھا، اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنے چاروں چچاؤں ملک سکندر، کرن، بہاء الدین اور آمر کو جو کسی سیاسی اور ملکی مصالح کی بنا پر قید میں تھے آزاد کر کے اور امور ملکی کو عمال حکومت کے سپرد کر کے خود عیش و عشرت میں مصروف ہو گیا، یہاں تک کہ اُسے ملکی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ رہی، لیکن وہی اس کے چاروں چچا جن کو اُس نے نیک نیتی سے آزاد کیا تھا، متفق ہو کر اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو کر دارالسلطنت پر حملہ آور ہوئے، جام نظام الدین اُن کی تاب مقاومت نہ لا کر آدھی رات کو اپنے کچھ سپاہیوں کے ساتھ شہر سے نکل کر گجرات کی طرف بھاگ گیا، صبح کو اطلاع ملنے پر ان چاروں نے اس کا تعاقب کیا، یہ چاروں ادھر اُس کے تعاقب میں مصروف تھے، اُدھر اراکین سلطنت نے یہ گڑبڑ دیکھ کر جام علی شیر کو جو اس وقت گوشہ نشین تھا لا کر متفقہ طور پر تخت سلطنت پر بٹھایا، جام نظام الدین گجرات پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ راستے میں اُس نے وفات پائی، اُس کے چچاؤں کو جب یہ حال معلوم ہوا تو انہوں نے اس ناکامی سے متاسف ہو کر جنگلوں میں پناہ لی۔[4]

---

(1) حدیقۃ الاولیاء، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۵۱-۵۴۔

(2) حواشی مکلی نامہ، مولف سید حسام الدین راسدی ص ۱۰۹۔

(3) تاریخ معصومی - ص ۶۶۔

(4) تاریخ معصومی - ص ۶۶-۶۷۔

(۸)

جام علی شیر بن جام تماچی

۸۰۹ھ (۷-۱۴۰۶ء) تا ۸۱۵ھ (۱۳-۱۴۱۲ء)

جام نظام الدین کے بعد جام علی شیر بن جام تماچی اعیان و اراکین سلطنت کے مشورے سے تخت سلطنت پر بیٹھا، یہ نہایت مدبر، انصاف پسند اور بہادر انسان تھا۔ اس نے تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی ملک کے نظم و نسق کو بہتر بنایا اور اپنے انصاف اور احسان سے رعایا کے قلوب کو فتح کر لیا۔ اُس کے زمانہ حکومت میں پورے ملک میں امن و امان، سکون و اطمینان کی لہر دوڑ گئی، امور جہانبانی سے مطمئن ہونے کے بعد، جب اس کو ملک کی طرف سے پوری طرح اطمینان ہو چکا تھا، وہ اکثر چاندنی راتوں میں سیر کے لیے دور دور نکل جاتا، سکندر، کرن، اور فتح خان، جام تماچی کے لڑکوں کو جو جام نظام الدین کی وفات کے زمانے سے صحرا میں پناہ لیے ہوئے تھے، جب یہ معلوم ہوا کہ جام علی شیر چاندنی راتوں میں دارالسلطنت سے سیر و تفریح کے لیے دور دور نکل جاتا ہے اور اب عیش و عشرت میں پڑ چکا ہے، تو ان کی سلطنت حاصل کرنے کی خوابیدہ تمنا پھر بیدار ہوئی، چنانچہ یہ اپنے برے ارادے سے اس طرح نکلے کہ راتوں کو سفر کرتے اور دن میں جنگل میں کسی جگہ چھپ کر آرام لیتے، یہاں تک کہ شب جمعہ کو جب کہ تیرھویں تاریخ تھی اور جام علی شیر اپنے چند مصاحبوں اور تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ دریا کی سیر کے لیے گیا ہوا تھا، یہ تینوں شہر کے قریب پہنچے، اور انہوں نے شہر کے کچھ لوگوں کو سبز باغ دکھا کر اپنے ساتھ ملا لیا، آدھی رات کے قریب جب جام علی شیر واپس ہوا اور اس نے شہر میں داخل ہونا چاہا تو ان لوگوں نے برہنہ تلواریں لے کر اس کا مقابلہ کیا، جام علی شیر کے ساتھ بہت تھوڑے سے لوگ تھے، ان لوگوں نے ان کا مقابلہ کیا، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، اور جام علی شیر ان باغیوں کے ہاتھوں شہید ہوا، جب شور و غل کی آوازیں بلند ہوئیں تو شہر کے دوسرے لوگ دوڑے لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا، اور جام علی شیر کو وہ لوگ شہید کر چکے تھے، مجبوراً شہر کے لوگوں نے ان تینوں کی اطاعت قبول کر لی۔[1]

(۹)

جام کرن بن خیر الدین جام طغاچی بن علاء الدین جام جونہ

۸۱۶ھ (۱۴-۱۴۱۳ء)

جام علی شیر کی شہادت کے بعد بھائیوں کے اتفاق سے جام کرن تخت سلطنت پر بیٹھا، لیکن اراکین سلطنت اور شہر کے شرفا سے وہ دل ہی دل میں اس وجہ سے عناد رکھتا تھا کہ اس کا خیال تھا کہ وہ جام علی شیر کے قتل کی وجہ سے اس کی حکومت سے متفق نہیں ہوں گے، اس نے تخت پر بیٹھتے ہی ذہنی طور پر یہ منصوبہ بنایا کہ وہ بعضوں کو قتل اور بعضوں کو قید کر کے اپنی حکومت کے لیے راہ ہموار کرے، چنانچہ اُس نے دربار شاہی منعقد کیا اور عوام و خواص کو اپنے دربار میں طلب کیا اور انہیں اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ایک تقریر کی، تقریر کے بعد دستر خوان بچھایا گیا، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ طہارت خانے میں گیا، تو فدائیوں کی ایک جماعت نے جس کو لوگوں نے پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا، طہارت خانے میں گھس کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے، چونکہ جام کرن کے قتل کے معاملے میں فتح خاں بن سکندر پیش پیش تھا، اس لیے لشکریوں نے اور رعایا نے متفقہ طور پر اس کو اپنا فرمانروا تسلیم کر لیا۔[2]

(۱۰)

جام سکندر شاہ صدر الدین بن خیر الدین جام طغاچی بن علاء الدین جام جونہ

۸۱۶ھ (۱۴۱۳ء)

توضیحات تاریخ معصومی ص ۴۶۴ پر جام سکندر شاہ صدر الدین کی مدت حکومت صرف ۸۱۶ھ درج ہے، "ذکر کرام" کے مؤلف مولوی حفظ الرحمٰن بہاولپوری نے لکھا ہے کہ جام سکندر شاہ صدر الدین کے زمانے کا ایک کتبہ جو سرائیکی زبان میں ہے، سنجر پور، (ضلع رحیم یار

---

[1] تاریخ معصومی - ص ۶۸۔

[2] تاریخ معصومی - ص ۶۸۔

خان، بہاولپور) کے نواح میں ایک کنویں سے ایک پختہ سل پر برآمد ہوا اس پر یہ تین شعر کندہ ہیں:

سلاں سل بندھیاں پھگیا نام نصیر
کہو کھٹا یا پتر گانمن دے اونٹر نام حمیر
وقت سکندر بادشاہ ملک دھنی پھلوان
رعیت راضی ایہہ جہی جو پیدانت جوان
حک لکھ سلاں لگ چکیاں تھیا کوہ تمام
ترے سو بوٹی باغ دی رادھی اُنڑ جام

(ترجمہ) اینٹیں خشت ساز نے تیار کیں جس کا نام نصیر قوم گانمن کے بیٹے حمیر اُنڑ ذات نے کنواں تیار کرایا سکندر بادشاہ ولی ملک اور طاقتور کے عہد میں جس سے رعیت اس قدر خوش ہے کہ بڈھے جوان معلوم ہوتے ہیں ایک لاکھ سولہ اینٹیں لگیں، جب کنواں مکمل ہوا باغ میں تین سو درخت جام اُنڑ نے لگائے ہیں۔[1]

(۱۱)
جام فتح خاں بن صدر الدین سکندر شاہ

۸۱۶ھ (۱۴۱۳-۱۴ء) تا ۸۳۱ھ از ربیع الاول (۱۴۲۷ء)

جام کرن کے بعد جام فتح خاں بن سکندر تخت پر بیٹھا، اس نے حکومت کے قواعد اور شاہی ضوابط کو مستحکم کیا، اور نہایت دانشمندی اور تدبیر سے حکومت کے فرائض انجام دینے لگا، اسی کے زمانے میں ۸۰۰ھ (۱۳۹۸ء) میں امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا اور امیر تیمور کے پوتے میرزا پیر محمد نے ملتان اور اُچ کو فتح کر کے چند دن وہاں قیام کیا۔ میرزا پیر محمد کے ملتان میں قیام کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اُس کی فوج کے اکثر سپاہیوں کے گھوڑے ضائع ہو چکے تھے اور میرزا پیر محمد کے بہت سے سپاہی گھوڑوں کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے پیادہ ہو گئے تھے، جب یہ خبر امیر تیمور کو ملی تو اس نے میرزا پیر محمد کے لیے شاہی طویلے سے تین ہزار گھوڑی بھجوائے، میرزا پیر محمد نے اپنی قوت کو مستحکم کر کے بھٹی اور واھن قوم کے لوگ جو سرکشی پر آمادہ تھے ان کا ایک ہی حملے میں قلع قمع کر دیا۔ ان امور سے فارغ ہونے کے بعد میرزا پیر محمد نے بکھر کی طرف توجہ کی جو اس وقت سلاطین دہلی کے تحت تھا، اُس نے وہاں کے حکام کو لکھا کہ وہ فوراً حاضر ہوں، سلاطین دہلی کے گماشتوں نے جب یہ خبر سنی کہ اُن کی طلبی کا حکم آ رہا ہے انہوں نے بکھر سے فرار ہی میں عافیت دیکھی، چنانچہ وہ سب کے سب جیسلمیر کے راستے سے فرار ہو گئے اور اس طرح بکھر کے لوگوں کو بے یار و مددگار چھوڑ گئے۔

بکھر کے ایک بزرگ ابوالغیث جو خاندان سادات سے تھے اور اپنے تقویٰ اور بزرگی کے لحاظ سے ممتاز تھے، وہ فوراً ہی میرزا پیر محمد کی ملاقات کے لیے روانہ ہو گئے، میرزا پیر محمد نے اُن کی آمد کی خبر سن کر ان کا شاندار استقبال کیا اور نہایت ہی عزت و احترام سے پیش آیا اور ان کو اپنے برابر بٹھایا۔ ابوالغیث کو رخصت کرتے وقت ان کو گھوڑے اور مختلف تحائف اور ہدایا سے سرفراز کر کے ان کو پرگنہ اروڑ انعام میں دیا۔[2]

تیمور بانوے ہزار کے لشکر جرار کے ساتھ درۂ خیبر کے راستے پنجاب میں داخل ہوا،[3] لاہور میں اس وقت عادل خان برادر سارنگ خاں کی حکومت تھی، عادل خاں نے بڑی بہادری سے تیمور کا مقابلہ کیا، مگر تیمور کے لشکر کے مقابلے میں غالب نہ آ سکا اور تیمور لاہور پر قابض ہو گیا، تیمور، شیخا گھکڑ کو پنجاب کے بعض اضلاع کی حکومت دے کر اور تاریخ فرشتہ کے مصنف محمد قاسم فرشتہ کے دادا ہندو شاہ کو اپنی طرف سے لاہور کے قلعے میں مامور کر کے، ملتان کی جانب متوجہ ہوا، جہاں اس کا پوتا میرزا پیر محمد پہلے ہی قابض ہو چکا تھا ماہ صفر ۸۰۱ھ (۹۹-۱۳۹۸ء) کو تیمور، تلنبے کو غارت کرتا ہوا ملتان پہنچا، ملتان سے میرزا پیر محمد کو ہمراہ لے کر اجودھن (پاک پٹن) آیا، پھر اجودھن سے پچاس کوس چل کر قلعۂ بھٹنیر پر حملہ آور ہوا، یہاں ایک راجا راؤ جلجی یا راؤ جلجین حکمراں تھا۔ تیمور نے اس کو شکست دی، راجا قلعے میں محصور ہو گیا، پھر اس نے ایک سید کو تیمور کے پاس بھیج کر جان کی امان اور ایک روز کی مہلت طلب کی جو اسے دے دی گئی، مہلت گزرنے کے بعد جب وہ حاضر نہ ہوا تو تیمور نے حکم دیا کہ قلعے کی دیواروں میں نقب لگائی جائے، راجا کو جب اپنی موت نظر آنے لگی تو وہ شیخ سعد الدین نبیرہ حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر کو جو اوجھن سے اس کے پاس قلعے میں کسی وجہ سے آئے ہوئے تھے

---

(1) حواشی مکلی نامہ، مولف سید حسام الدین راشدی ص ۱۷۶ بحوالہ ذکر کرام۔

(2) حملۂ تیمور کے وقت دہلی میں ناصر الدین محمود شاہ بن ناصر الدین محمد شاہ تغلق کی حکومت تھی۔

(3) تاریخ معصومی ص ــــ

اپنے ساتھ لے کر تیمور کے پاس حاضر ہو گیا، تیمور نے شیخ کی سفارش پر اس کی خطا معاف کر کے اس کو خلعت عطا کیا، لیکن راجا کا بھائی اور اس کا بیٹا مخالفت پر آمادہ ہو گئے اور انہوں نے تیمور کے آدمیوں کو قلعے میں داخل ہونے سے روکا، تیمور نے غصے میں آ کر حکم دیا کہ قلعے کو مسمار کر دیا جائے، چنانچہ بھٹنیر کا قلعہ زمین کے برابر کر دیا گیا۔ بھٹنیر سے تیمور سرستی اور فتح آباد کے قلعوں کو مسمار کرتا ہوا سامانہ پہنچا۔ سامانہ سے کیتھل پہنچ کر اس نے اپنے لشکر کا جائزہ لیا، پھر پانی پت پہنچ کر دریائے جمنا کو عبور کیا، اور قلعہ لونی پر قبضہ کر لیا، یہاں سے دریا کے کنارے کنارے دہلی کے مقابل پہنچا اور دریا کو عبور کر کے وہ اقبال خاں برادر سارنگ خاں سے صف آرا ہوا۔ ۷ ربیع الاول ۸۰۱ھ کو اقبال خاں سے اس کا معرکہ کارزار گرم ہوا، اقبال خاں نے شکست کھائی اور وہ دہلی میں آ کر محصور ہو گیا، یہ رنگ دیکھ کر ناصر الدین محمود نے جو اس وقت دہلی کا فرمانروا تھا راتوں رات فرار ہو کر گجرات کا رخ کیا، اقبال خاں بھی مجبوراً دہلی چھوڑ کر برن (بلند شہر) پہنچا اور وہیں مقیم ہو گیا اور تیمور فاتحانہ دہلی میں داخل ہوا۔ تیمور پندرہ روز تک دہلی میں مقیم رہا اور خوب لوٹ مار مچائی، یہاں تک کہ دہلی ویران ہو گیا، دہلی سے تیمور فیروز آباد گیا فیروز آباد میں بہادر ناہر اور خضر خاں اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تیمور نے ناہر کو خلعت دے کر میوات کی طرف بھیج دیا اور خضر خاں کو اپنے ساتھ لے کر پانی پت کی طرف روانہ ہوا، پانی پت پہنچ کر امیر شاہ ملک کو فوج دے کر میرٹھ کی طرف بھیجا۔ میرٹھ کے قلعے دار ملک الیاس خاں اور ملک صفی نے مقابلے کی تیاری کی، امیر شاہ ملک نے ان کے ارادوں سے فوراً تیمور کو اطلاع دی اور لکھا کہ حالات کے لحاظ سے قلعے کا فتح کرنا دشوار ہے، یہ معلوم ہوتے ہی تیمور خود میرٹھ آیا اور قلعے کو فتح کر کے دونوں سرداروں کو قتل کر دیا اور میرٹھ کے قلعے کو بھی مسمار کر دیا، اس کے بعد دامن کوہ سوالک (موجودہ ضلع سہارن پور) کو تاخت و تاراج کر کے گنگا کو عبور کر کے ضلع بجنور میں داخل ہوا اور کوہ ہمالیہ کے دامن میں سفر کرتا ہوا جموں پہنچا، جموں کے راجا نے مقابلہ کیا، مگر زخمی اور گرفتار ہو کر تیمور کی خدمت میں آیا اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا اور گائے کا گوشت کھایا۔

شیخا گھکڑ نے تیمور کے جاتے ہی لاہور کے قلعے سے بندو شاہ کو نکال کر خود قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت جب کہ تیمور، جموں پہنچا تو شیخا گھکڑ سرکشی کی بنا پر سلام کے لیے حاضر نہ ہوا، یہ سن کر تیمور نے کچھ فوج شیخا گھکڑ کی گرفتاری کے لیے لاہور بھیجی، شیخا گرفتار ہو کر آیا، تیمور نے اس کو قتل کرا دیا، اس کے بعد تیمور خضر خاں کو لاہور، دیپالپور اور ملتان کا حاکم مقرر کر کے کابل کے راستے سے سمرقند کی طرف روانہ ہو گیا۔

۸۱۵ھ (۱۳-۱۴۱۲ء) میں سلطان ناصر الدین محمود[1] نے بیمار ہو کر وفات پائی اور اسی پر تغلق خاندان کی حکومت ختم ہو گئی، ناصر الدین محمود کی وفات کے بعد دولت خاں لودھی تخت سلطنت پر بیٹھا لیکن اسے ایک سال اور چند ماہ سے زیادہ حکومت کا موقع نہ ملا۔

واقعہ یہ ہے کہ حملۂ تیمور کے بعد تغلقیہ خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا، حملۂ تیمور کے بعد جہاں صوبوں میں جدا جدا خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں تھیں، وہیں دہلی میں بھی برائے نام ناصر الدین محمود حکومت کرتا تھا، لیکن عملاً لودھیوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی، دولت خاں لودھی کی سلطنت اگرچہ ایک سال اور کچھ ماہ بیان کی جاتی ہے، لیکن اقبال خاں کے مارے جانے کے بعد دہلی میں عملاً اسی کی حکومت قائم تھی، لودھیوں نے اپنے آقاؤں کے ساتھ بے مروتی کا برتاؤ نہیں کیا اور برائے نام ان کو تخت سلطنت پر قائم رکھا، چنانچہ وہ باوجود اراکین دولت کی ناراضی کے سلطان ناصر الدین محمود جیسے نااہل فرمانروائی کو بھی پندرہ سولہ سال تک نبھاتے رہے، پندرہ سولہ سال کے بعد دولت لودھیہ کا خاتمہ ہو کر دہلی میں خضر خاں کی حکومت قائم ہوئی جو سلطنت سادات کے نام سے مشہور ہے، اس خاندان کے افراد نے ۷۱۷ھ سے ۸۵۵ھ تک حکومت کی۔ خاندان سادات کے آخری بادشاہ علاء الدین نے پنجاب کے صوبیدار بھلول خاں کو دہلی کی حکومت حوالے کر کے خود گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

یہ سب کچھ ہندوستان میں ہوتا رہا مگر سندھ ابو الغیث بکھری کی سفارش کی وجہ سے تیمور کے تاخت و تاراج سے محفوظ رہا، جام فتح خاں نے پندرہ سال سندھ پر کامیابی سے حکومت کر کے وفات پائی، وفات سے تین روز پہلے اُس نے اپنے بھائی جام تغلق کو اپنا جانشین مقرر کیا۔[2]

---

[1] سلطان ناصر الدین محمود ماہ جمادی الاول ۷۹۶ھ (۹۴-۱۲۹۳ء) میں تخت نشین ہوا اور ۸۱۵ھ (۱۳-۱۴۱۲ء) میں وفات پائی۔ آئینہ حقیقت نما باب ہشتم، ص ۱۹۱

[2] تیمور کے متعلق تمام تفصیل آئینہ حقیقت نما جلد دوم باب ششم سے ماخوذ ہے۔ باقی حالات تاریخ معصومی، ص ۶۹-۷۰ سے لیے گئے ہیں۔

(۱۲)

جام تغلق شاہ (جونہ) بن صدر الدین سکندر شاہ

۸۳۱ھ (۲۸-۱۴۲۷ء) تا بعد ربیع الاول ۵۸۷ھ (۱۴۵۳ء)

جام فتح خاں کی وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کا چھوٹا بھائی، جس کو اُس نے جام تغلق کا خطاب دیا تھا تخت سلطنت پر بیٹھا، جام تغلق نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے بھائیوں کو سیوستان اور قلعہ بکھر کی حکومت پر متعین کیا، وہ خود زیادہ تر سیر و شکار میں مشغول رہتا تھا، جب بلوچوں نے اطراف بکھر میں فتنہ و فساد کا آغاز کیا، جام تغلق ایک کثیر لشکر کے ساتھ بلوچوں کے فتنے کو فرو کرنے کی طرف متوجہ ہوا اور ان کی تادیب کر کے واپس لوٹا، اُس نے ملک کے انتظام کو مستحکم بنانے کے لیے ہر پرگنے میں تھانے قائم کیے۔[1]

حواشی مکلی نامہ میں ہے کہ جام تغلق (جونہ) اُس وقت اندرونی اختلافات کی وجہ سے سخت پریشان تھا اور وہ باہر سے مدد کا خواہاں تھا، مولانا محمد صدیقی ملتانی[2] نے جو جام تغلق جونہ کے پیر تھے اُسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی دونوں بیٹیوں کو گجرات میں بیاہے، ایک کو سلطان محمد سے اور دوسری کو قطب عالم کے فرزند شاہ عالم سے۔

چنانچہ جام تغلق جونہ نے اپنی دونوں بیٹیوں کو جام خیر الدین اور جام صلاح الدین سمیت مولانا محمد صدیقی کے ذریعے گجرات روانہ کیا۔ اس رشتے سے مقصد سیاسی فائدہ اور اپنی حکومت کی تقویت مد نظر تھی۔ گجرات پہنچنے کے بعد بی بی مغلی کی شادی سلطان محمد کے ساتھ اور بی بی مرکی کی شادی شاہ عالم کے ساتھ ہوئی، حالانکہ جام تغلق جونہ نے بی بی مغلی کو شاہ عالم کے لیے اور بی بی مرکی کو سلطان محمد کے لیے بھیجا تھا، لیکن یہ تبدل و تغیر سلطان محمد اور جام تغلق کے بھیجے ہوئے آدمیوں کی سازش سے ہوا، اس کا امکان ہے کہ اس منصوبے میں خود مولانا محمد صدیقی بھی شامل تھے۔

بہر حال بی بی مغلی کا نکاح سلطان محمد والی گجرات (۴۶-۸۵۵ھ) سے ہوا اور بی بی مرکی کا عقد قطب عالم (۷۹۰-۸۵۸ھ) کے فرزند شاہ عالم (۸۱۷-۸۸۰ھ) کے ساتھ ہوا۔

یہ نکاح (۴۷-۸۴۸ھ) میں ہوئے تھے، بی بی مغلی کے بطن سے ۸۴۹ھ میں فتح خاں نامی لڑکا پیدا ہوا، جو آگے چل کر سلطان محمود بیگڑہ کے نام سے گجرات کا بادشاہ ہوا۔

بی بی مرکی کے بطن سے جو شاہ عالم، کی اولاد ہوئی، ان میں دو لڑکیاں بی بی امان اور بی بی وچین اور ایک لڑکا بیگ محمد عرف بھیکن پیدا ہوئے۔

جب ۲۰ محرم ۸۵۵ھ کو سلطان محمد فوت ہوا، اُس وقت فتح خاں بچہ تھا، بعض خطرات کی بنا پر بی بی مغلی شاہ عالم کے گھر میں آ رہی۔

جب بی بی مرکی کا (۵۷-۸۵۸ھ) میں انتقال ہو گیا تو شاہ عالم نے بی بی مغلی سے فوراً نکاح کر لیا۔

مراہ سکندری سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت سلطان محمود بیگڑا دس سال کا تھا، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ بی بی مغلی سے شاہ عالم کی شادی ۸۵۸ھ میں ہوئی ہوگی۔

بی بی مرکی اور اس کے بیٹے شاہ بھیکن[3] کا مزار جام جونہ کے مقربے میں سابر ندی کے کنارے احمد آباد سے جانب جنوب واقع ہے۔[4]

اٹھائیس سال کے بعد جام تغلق نے اپنی طبعی موت سے وفات پائی۔ توضیحات معصومی میں اس کی مدت حکومت ۸۳۱ھ (۲۸-۱۴۲۷ء) تا ۸۵۷ھ (۵۴-۱۴۵۳ء) مندرج ہے۔[5]

(۱۳)

جام مبارک

۸۵۷ھ (۵۴-۱۴۵۳ء)

توضیحات تاریخ معصومی میں جام تغلق کے بعد جام مبارک کی حکومت کا ذکر کیا گیا ہے، جو جام تغلق کا گماشتہ اور عزیز تھا اور اس کی مدت حکومت ۸۵۷ھ (۵۴-۱۴۵۳ء) مندرج ہے[6]، تاریخ معصومی میں اس جام کا تذکرہ جام سکندر شاہ ثانی کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

---

(1) تاریخ معصومی، ص ۷۰۔

(2) مولانا محمد صدیقی سہروردی، ملتان میں پیدا ہوئے اور نواح ٹھٹھہ اور لاہور میں رہے، جام جونہ اور اس کا باپ اُن کے مرید و مستفید تھے۔ (حواشی مکلی نامہ - مولف سید حسام الدین راشدی، ص ۱۲۳)

(3) شاہ بھیکن کا سال ولادت و رحلت کہیں واضح طور پر نہیں ملتا۔ البتہ ان کے عرس کی تاریخ ۱۴ ماہ رجب ہے (تاریخ اولیائے گجرات - مولانا ابو ظفر ندوی، ص ۷-۸)

(4) حواشی مکلی نامہ، ص ۱۱۹-۱۲۰-۱۲۱۔

(5) توضیحات واستدراکات تاریخ معصومی اردو ص ۴۶۴۔

(6) توضیحات تاریخ معصومی اردو۔

(۱۴)

جام سکندر شاہ ثانی جام محمد عرف اُنڑ بن جام فتح خاں

۸۵۷ھ (۱۴۵۳-۵۴ء) تا ۶ جمادی الاول ۸۵۸ھ (۱۴۵۴ء)

جام تغلق کے بعد اس کا بیٹا جام سکندر جو ابھی خورد سال تھا تخت سلطنت پر بیٹھا، اس کے زمانے میں سیوستان اور بکھر کے حاکموں نے بغاوت اختیار کی، جام سکندر اس بغاوت کے فرو کرنے کے لیے ٹھٹھہ سے بکھر روانہ ہوا، وہ نصرپور تک ہی پہنچتے پایا تھا کہ اچانک مبارک نامی ایک شخص نے جو جام تغلق کے زمانے میں اس کا دربان تھا ٹھٹھہ میں خروج کیا اور اپنا خطاب جام مبارک اختیار کر کے تخت سلطنت پر بیٹھ گیا، لیکن ٹھٹھہ کے لوگ اس کی حکومت سے متفق نہ تھے، انہوں نے تین ہی روز میں اس نئی حکومت کا خاتمہ کر کے جام سکندر کو واپس بلانے کے لیے آدمی بھیجا، جام سکندر کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ فوراً ہی اپنے نائبین سے صلح کر کے ٹھٹھہ واپس لوٹا اور ڈیڑھ سال کی حکومت کے بعد اس نے وفات پائی۔[1]

حواشی مکلی نامہ میں سید حسام الدین راشدی نے جام سکندر ثانی کے ضمن میں لکھا ہے کہ مولانا علاء الدین منظوری نے اپنی کتاب "الزبدہ" لکھ کر اس کے نام سے معنون کی تھی، یہ کتاب قاضی اختر مرحوم جوناگڑھ کے کتب خانے میں موجود تھی، جو ان کی وفات کے بعد سندھ یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے، اس کتاب کے مقدمے میں اس جام کا نام اس طرح مندرج ہے، الملک المعظم محمد المعروف انڑ بن فتح خاں بن صدر الدین بن طماچی بن جام۔[2]

(۱۵)

سلطان صدر الدین شاہ جام سنجر عرف رائڈنہ بن سلطان صلاح الدین شاہ جام (اُنڑ) (نمبر ۵)

۶ جمادی الاول ۸۵۸ھ (۱۴۵۴ء) تا ربیع الاول ۸۶۶ھ (۶۲-۱۴۶۱ء)

جام رائڈنہ جام تغلق کے زمانے میں کچھ کی سرحد پر غالباً حاکم مقرر تھا، اس نے اپنے طرز عمل، داد و دہش اور انعام و اکرام سے وہاں کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا، جام رائڈنہ کو جب جام سکندر کی وفات کی خبر ملی تو وہ ۶ جمادی الاول ۸۵۸ھ کو ایک بڑا لشکر لے کر ٹھٹھہ پہنچا اور اس نے ٹھٹھہ کے لوگوں کو جمع کر کے کہا کہ مجھے تخت و تاج کی تمنا یہاں لے کر نہیں آئی ہے، بلکہ میں تو اس لیے آیا ہوں کہ میں مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کروں۔ میں اپنے آپ کو ہرگز سلطنت کا اہل نہیں سمجھتا، بلکہ تم جس کو بادشاہ منتخب کرو گے میں بھی اس کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا، لیکن اُن میں سے کوئی بھی حکومت کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے تیار نہ ہوا اور انہوں نے متفقہ طور پر جام رائڈنہ کو اپنا فرمانروا منتخب کر کے تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔ جام رائڈنہ نے زمام حکومت سنبھالتے ہی چھ ماہ کے اندر آب شور سے موضع کاجربلی اور کندھی تک جو موضع ماتھیلہ اور اباوڑی کی سرحد ہے فتح کر کے سندھ میں شامل کر دیا۔ جام رائڈنہ کو حکومت کرتے ہوئے ساڑھے آٹھ سال گزرے تھے کہ اس کے ایک مصاحب جام سنجر کے دماغ میں حکومت حاصل کرنے کا سودا سمایا، اس نے دوسرے مصاحب اور ندیموں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک روز جب کہ جام رائڈنہ شراب پینے میں مشغول تھا، شراب میں زہر ملا کر اس کو پلوا دیا، تین روز کے بعد جام رائڈنہ اسی زہر کے اثر سے فوت ہو گیا۔[3]

حواشی مکلی نامہ میں سید حسام الدین راشدی نے اس کی تاریخ وفات ۲۵ ربیع الاول ۸۶۶ھ (۱۴۶۱-۶۳ء) سے ایک آدھ دن پہلے لکھی ہے۔[4]

جام سنجر

جام رائڈنہ کی وفات کے بعد جام سنجر تخت سلطنت پر متمکن ہوا، یہ نہایت ہی خوبصورت حسین و جمیل نوجوان تھا، کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ اس پر اس درجہ مفتون تھے کہ بغیر تنخواہ لیے محض اس کے حسن و جمال کی خاطر اس کی ملازمت کرتے تھے۔

معصومی کا بیان ہے کہ ابھی سنجر بادشاہ نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک رات ایک درویش کی خدمت میں گیا جو اس سے بے حد محبت رکھتے تھے اور اس نے اُن سے کہا کہ میری تمنا یہ ہے کہ میں ٹھٹھہ کا بادشاہ بنوں،

---

(1) تاریخ معصومی، ص ۷۰-۷۱ و تحفۃ الکرام جلد ۳ ص ۵۱۔

(2) حواشی مکلی نامہ، ص ۱۱۰۔

(3) حواشی مکلی نامہ، ص ۱۱۰۔

(4) تاریخ معصومی، ص ۷۱-۷۲۔

خواہ میری بادشاہت آٹھ ہی دن کی کیوں نہ ہو، درویش نے کہا تم آٹھ دن کی بادشاہت کی سوچ رہے ہو، حالانکہ تم آٹھ سال بادشاہ رہو گے۔

سنجر کی فرمانروائی کے زمانے میں سندھ کی رونق اور شادابی کو بڑی ترقی ہوئی جو اس سے پہلے بادشاہوں کے زمانے میں نہیں دیکھی گئی، اس کے زمانے میں سپاہ و رعیت دونوں بڑے اطمینان و سکون سے زندگی بسر کرتے تھے۔

سنجر عالموں، درویشوں کا بے حد قدردان تھا، اس نے مستحقین کے کثرت سے وظائف مقرر کیے تھے اور جمعہ کے دن بڑی فرمانروائی کے ساتھ فقرا اور مساکین کو خیرات کرتا تھا۔

اس کی عدل پروری اور انصاف پسندی کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کے فرمانرواؤں نے اپنے عمال اور ملازمین کی تنخواہیں اس قدر کم مقرر کی تھیں کہ وہ اس قلیل تنخواہ میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ گزر بسر نہیں کر سکتے تھے اور مجبور ہو کر رشوت لیتے تھے، چنانچہ سنجر کے دور حکومت میں بکھر کے قاضی معروف کی شکایت پیش ہوئی کہ جب ان کی عدالت میں کوئی مقدمہ پیش ہوتا ہے تو یہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں سے رشوت لیتے ہیں، سنجر کو قاضی کی اس شکایت پر بہت غصہ آیا اور اس نے فوراً قاضی کو طلب کیا، قاضی حاضر ہوئے تو جام سنجر نے ان سے پوچھا کہ میں نے سنا ہے کہ تم ہر مقدمے میں جو تمہاری عدالت میں پیش ہوتا ہے، مدعی اور مدعا علیہ دونوں سے رشوت لیتے ہو، قاضی صاحب نے جواب دیا بلاشبہ حضور نے جو سنا ہے وہ بالکل صحیح ہے، بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اگر موقع ملے تو گواہوں سے بھی کچھ اینٹھ لوں، مگر افسوس ہے کہ اس کا موقع نہیں ملتا، جام سنجر قاضی صاحب کی یہ بات سن کر بے اختیار ہنس پڑا اور اس نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ آخر آپ کے دل میں یہ خواہش کیوں پیدا ہوئی ہے، قاضی صاحب نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ آپ سے پہلے جو فرمانروا گزرے ہیں، انہوں نے حکومت کے ملازمین کی تنخواہیں اس قدر قلیل مقرر کی ہیں کہ ان قلیل تنخواہوں میں ملازمین اور ان کے اہل و عیال کا گزر نہیں ہوتا اور وہ بھوکوں مرتے ہیں، اس لیے رشوت پر مجبور ہوتے ہیں، آپ مجھ ہی کو دیکھیے کہ میں اپنا سارا وقت عدالت میں صرف کرتا ہوں، میرے لیے اور کوئی وجہ معاش نہیں ہے، میری تنخواہ اس قدر قلیل ہے کہ میرے اہل و عیال کا گزارہ اس میں کسی صورت سے نہیں ہو سکتا، اب آپ ہی فرمایئے کہ اگر میں رشوت نہ لوں تو اور کیا کروں۔

جام سنجر پر قاضی صاحب کے اس تلخ حقیقت بیان کرنے کا بے حد اثر ہوا، اس نے اسی وقت قاضی صاحب کو بہت سے انعام و اکرام سے نوازا اور اُن کی تنخواہ میں معقول اضافہ کر دیا، پھر اس نے عام فرمان جاری کیا کہ اس کے ممالک محروسہ میں ملازمین سرکار کی تنخواہیں اس قدر بڑھا دی جائیں کہ وہ اور اُن کے متعلقین فراغت سے زندگی بسر کر سکیں۔

جام سنجر نے آٹھ سال حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔[1]

توضیحات معصومی میں جو فہرست سمہ فرمانرواؤں کی دی گئی ہے، اس میں جام کا تذکرہ نہیں، بلکہ جام رائے ڈنہ کے بعد جام نظام الدین نندہ کی حکومت کا ذکر کیا گیا ہے۔[2]

(۱۶)

جام نظام الدین (ثانی) معروف بہ جام نندہ

۲۵ ربیع الاول ۸۶۶ھ (۱۴۶۱ء) تا ۹۱۴ھ (۹-۱۵۰۸ء)

جام سنجر کی وفات کے بعد ۲۵ ربیع الاول ۸۶۶ھ (۱۴۶۱ء) کو جام نظام الدین نندا مسند سلطنت پر بیٹھا، جام نندا کی تخت نشینی علما، صلحا، رعایا اور فوج کے متفقہ انتخاب سے ہوئی۔ جام نظام الدین نندا ابتدا ہی سے علم کا شائق، زاہد و عابد اور اخلاق حمیدہ سے متصف تھا، وہ اپنے وقت کا بڑا حصہ مدارس اور خانقاہوں میں گزارتا تھا، نہایت ہی متواضع اور خلیق تھا، اُس کے زمانے میں مسجدیں نمازیوں سے بھری رہتی تھیں، وہ اپنی تخت نشینی کے کچھ دن بعد کثیر لشکر کے ساتھ ٹھٹھہ سے بکھر آیا اور اس نے ایک سال تک بکھر میں رہ کر اور وہاں کے ڈاکوؤں اور رہزنوں کو سزا دے کر ملک کے امن کو بحال کیا، پھر اُس نے بکھر کے قلعے میں مختلف اشیا کا ذخیرہ کر کے اس کو محفوظ کر دیا اور اپنے غلام دل شاد نامی کو بکھر کا ناظم مقرر کر کے ٹھٹھہ واپس ہوا، اب اس نے سندھ کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کی طرف توجہ دی، اس کی کوششوں کا نتیجہ یہ تھا کہ رعایا میں سکون و اطمینان کی لہر دوڑ گئی، تاجروں اور سیاحوں کو آمد و رفت میں سہولت ملی، اس کے زمانے میں علما و صلحا اور فقرا نہایت فراغت سے زندگی بسر کرنے لگے اور فوج بھی آسودہ حالی کے ساتھ بسر کرنے لگی۔

---

(1) یہ تمام تفصیل تاریخ معصومی، ص ۷۲-۷۳ سے ماخوذ ہے۔

(2) توضیحات تاریخ معصومی، اردو، ص ۴۶۳-۴۶۵۔

حواشی مکلی نامے میں سندھ کی تاریخ کے محقق سید حسام الدین راشدی نے جام نظام الدین نندا کی بلندی سیرت و کردار کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

جام نندا کی پاکبازی، زہد اور تقویٰ کے متعلق کئی کہانیاں مشہور ہیں، قاضی عبداللہ کی نماز جنازہ کے متعلق جب یہ سوال پیدا ہوا کہ ان کے جنازے کی نماز وہ پڑھائے جو ساری عمر باوضو رہا ہو، لیکن کوئی اس کے لیے آگے نہ بڑھ سکا، حالانکہ اس وقت ٹھٹھہ میں بہت سے صوفیائے کرام اور علماء موجود تھے، چونکہ یہ وصف سندھ کے سلطان جام نندا میں موجود تھی، اس لیے اس نے آگے بڑھ کر ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

ایک روایت کے مطابق سندھ کے مشہور شیخ طریقت پیر مراد شیرازی کی نماز جنازہ بھی جام نظام الدین نندا ہی نے پڑھائی۔

ذیل کی رباعی سے اُس کی بلند سیرت اور پاکیزہ اخلاق پر روشنی پڑتی ہے:

اے الٰہ کہ ترا نظام الدین می خوانند
تو مفتخری کہ، مراچنین می می خوانند
گر در رہ دین از تو، خطائی رفتہ
شک نیست کہ ترا کافر لعین می خوانند

سب ہی مورخین نے سندھ کے اس نیک نام سلطان کو سراہا ہے، تاریخ معصومی میں ہے کہ:

در اوائل حال، طلب علم می نمود، و در مدارس و خوانق میگزرانیدہ، و بغایت متواضع و خلیق بود، بصفات پسندیدہ و اخلاق حمیدہ متصف، و زہد و عبادت بدرجہ کمال داشتہ۔

میر معصوم نے آخر میں لکھا کہ:

و فضیلت و حالت او زیادہ از آن بود کہ شمہ از آن تحریر تواں نمود۔

ماثر رحیمی کے مصنف نے اُس کے محاسن و خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ:

نہ صرف سندھ میں بلکہ پورے ہندوستان میں اُس جیسا دیندار، متقی اور صاحب فضیلت کوئی نہ تھا، صاحب ماثر رحیمی کے اصل الفاظ یہ ہیں:

در میان سلاطین سندھ چہ؟ کہ در میان سلاطین ہندوستان بفضیلت و حالت او نبودہ۔

پھر آگے چل کر اُس کے احیائے سنت اور مدارس دینی کے قیام و شغف کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ:

- احیاء سنن و رواج مدارس بنوعی در سند مقرر بود کہ زبان قلم از تحریر آں عاجز است۔

تحفتہ الکرام کا مولف میر علی شیر قانع اس فرمانروا کی مدح و ستایش میں رقم طراز ہے کہ:

- در زمانش علما و سادات و صلحا و عموم خلق اللہ براحت کلی، گزرانیدہ، احیای سنن بنوعی شیوع یافت کہ احدی بدون صوم و صلوٰۃ نبودے۔

مختصر یہ کہ تمام مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے اس بادشاہ کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس بادشاہ کے دور میں سندھ کے اندر اطمینان و دلجمعی کی لہر دوڑ گئی، اور اس فرمانروا نے دینی اور دینوی علوم کو اپنے ملک میں غیر معمولی فروغ دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس قدر اس ملک کی فراغت اور خوش حالی کی خبریں سندھ سے باہر پھیلیں، اُسی قدر باہر کے مشاہیر اور علما نے قطار در قطار سندھ کا رخ کیا سلطان جام نظام الدین کے آخری دور میں ایران، خراسان اور ماوراء النہر کے علما کے گھرانے خاص طور پر سندھ میں آباد ہوئے اور جام نظام الدین نے اُن کو آباد کرنے کے لیے ٹھٹھہ میں علیحدہ محلّے مخصوص کیے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ وسط ایشیا میں سخت بدامنی اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، اس لیے وہاں کے علما بھی سندھ کے توطن کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر آئے۔ مثلاً مولانا عبدالعزیز ابھری، اُن کے بیٹے مولانا اثیر الدین، علامہ جلال الدین دوانی کے دو شاگرد میر شمس اور میر معین ٹھٹھہ آئے اور علم کی اشاعت میں مصروف ہو گئے۔

جام نظام الدین کی یہ رعایا پروری صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ غیر مسلم رعایا کے ساتھ بھی اس کا سلوک بہت اچھا تھا، تاریخ میں کتنے ہی ہندو امیروں کے نام ہمیں ملتے ہیں جو اُس کے دور میں اہم عہدوں پر فائز تھے۔[1]

جام نظام الدین کو مسلمانوں سے جنگ کرنے اور ناحق خوں ریزی کرنے سے نفرت تھی، وہ ہر ہفتے اپنے اصطبل میں جاتا اور اپنے گھوڑوں کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ان سے خطاب کرتے ہوئے کہتا کہ میں نہیں چاہتا کہ سوائے جہاد کے تم پر سواری کی جائے کیونکہ ہمارے چاوروں

---

[1] یہ تمام تفصیل مکلی نامہ - تالیف سید حسام الدین راشدی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۸۸ تا ۹۶ سے ماخوذ ہے۔

طرف خدا کے فضل سے مسلمان حاکم ہیں، تم بھی دعا کرو کہ بغیر شرعی ضرورت کے میں کسی پر حملہ آور نہ ہوں اور نہ کوئی میرے ملک پر حملہ کرے کہ ناحق مسلمانوں کی خوں ریزی ہو اور میں قیامت کے روز خدا کے سامنے شرمندہ ہوں۔

اس کے عہد حکومت میں خود اس کی دین داری کی وجہ سے پورے ملک میں دین داری، تقویٰ اور پرہیز گاری کو اس درجہ فروغ ہوا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی، لوگ عبادت اور ریاضت کی طرف اس درجہ مائل تھے کہ چھوٹے اور بڑے مساجد میں آکر نماز باجماعت ادا کرتے تھے اور مسجدیں نمازیوں سے معمور رہتی تھیں، یہاں تک کہ کوئی شخص بھی تنہا گھر میں نماز پڑھنے کے لیے تیار نہ تھا۔[1]

ٹھٹھہ کی بنیاد:

لب تاریخ سندھ میں ہے کہ جام نظام الدین نندا ایک عرصے سے چاہتا تھا کہ ایک خوبصورت شہر تعمیر کرائے، اس نے ایک روز نجومیوں کو بلا کر پوچھا کہ میں ایک نیا شہر آباد کرنا چاہتا ہوں تم مجھے بتاؤ کہ اس شہر کی بنیاد کہاں رکھوں، نجومیوں نے حساب لگا کر بتایا کہ اگر یہ شہر کوہ مکلی[2] کے اوپر آباد کیا جائے گا تو یہاں کے رہنے والے سخت دل، جاہل اور دلیر پیدا ہوں گے، اگر آپ پہاڑ کے نیچے آباد کریں گے تو اس شہر کے رہنے والے نرم دل، نازک اور عقل مند ہوں گے، جن کے وجود سے بادشاہوں کو بھی خطرہ ہوگا۔

اس مشورے کے بعد جام نظام الدین نے ۹۰۰ھ کے آخر میں اس شہر کی بنیاد کوہ مکلی کے نشیب میں رکھی اور اس شہر کا نام پہاڑ کے نشیب میں واقع ہونے کی وجہ سے تہہ تہہ مشہور ہو گیا، پھر آہستہ آہستہ لوگ اس شہر کو ٹھٹھہ کہنے لگے، پھر ٹھٹھہ نے صنعت و حرفت، تجارت میں اس قدر ترقی کی کہ وہ ایشیا کے بڑے تجارتی اور صنعتی شہروں میں شمار ہونے لگا، جام نظام الدین کی علم پروری اور معارف نوازی کی وجہ سے خراسان اور ایران کے بہت سے علما، شاعر اور اہل کمال اس شہر میں آباد ہو گئے، جن کی وجہ سے یہ شہر علم و فضل کا بھی مرکز بن گیا، کہا جاتا ہے کہ ایک وقت میں اس شہر میں تین سو دارالعلوم تھے اور یہ شہر اپنی رونق و شادابی میں قرطبہ اور بغداد کی ہمسری کرتا تھا۔

لیکن ہم اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ اس شہر کی بنیاد جام نظام الدین نے رکھی، کیونکہ ہمیں اس شہر کا نام محمد شاہ تغلق کے زمانے ۷۵۱ھ (۱۳۵۰-۵۱ء) میں بھی ملتا ہے، قیاس چاہتا ہے کہ ٹھٹھہ پہلے سے آباد تھا، لیکن جام نظام الدین نندا نے اپنے عہد حکومت میں غالباً اس شہر کی توسیع اور جدید تعمیر کی ہوگی، غالباً اس کی وجہ سے یہ مشہور ہو گیا کہ جام نظام الدین نے ٹھٹھہ کی بنیاد رکھی۔

جام نظام الدین اپنے وقت کا بڑا حصہ علماء کی صحبت میں علمی مذاکروں اور مباحثوں میں صرف کرتا تھا، اُسے علماء سے بڑی عقیدت تھی اور اس کی قدر افزائیوں کی وجہ سے مختلف ممالک کے علماء بھی سندھ کو اپنا وطن بنانے کی تمنا رکھتے تھے، چنانچہ مولانا جلال الدین دوانی نے شیراز سے جب سندھ میں آنا چاہا تو انہوں نے پہلے اپنے دو شاگردوں میر شمس الدین اور میر معین الدین کو ٹھٹھہ بھیجا اور استدعا کی کہ وہ شیراز سے آکر ٹھٹھہ میں آباد ہونا چاہتے ہیں۔ جام نظام الدین نے مولانا کے شایان شان قیام اور وسائل معیشت کا انتظام کر کے، اُن کے شاگردوں کے ہاتھ سفر خرچ بھی روانہ کیا تاکہ مولانا کو سفر میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو، لیکن اتفاق کی بات یہ ہے کہ جب یہ دونوں شیراز پہنچے تو مولانا سفر آخرت اختیار فرما چکے تھے، لیکن چونکہ میر شمس الدین اور میر معین الدین جام نظام الدین نندا کی قدر افزائیوں کو دیکھ چکے تھے، اس لیے وہ ٹھٹھہ لوٹ آئے اور یہیں مقیم ہو گئے۔[3]

شاہ بیگ ارغون کا سندھ پر پہلا حملہ:

تاریخ فرشتہ میں ہے کہ ۸۹۰ھ (۸۶-۱۴۸۵ء) میں شاہ بیگ

---

(1) یہ تمام تفصیل تاریخ معصومی ص ۷۴-۷۵ سے ماخوذ ہے۔

(2) کوہ مکلی، ۱۲ میل لمبی سی ایک پہاڑی ہے جس پر ایک قبرستان ہے، اس قبرستان میں بڑے بڑے اولیا، جلیل القدر علما، نامی گرامی شاعر، مختلف اہل کمال اور سندھ کے فرمانروا اور ملوک مدفون ہیں، یہ اپنی نزہت اور منظر کے اعتبار سے قابل دید ہے۔ اس قبرستان کے مقبروں کی شاندار عمارتوں کو دیکھ کر ارغون، ترخان اور مغل دور کی صناعی اور عمارت سازی کے مختلف نمونے ہمارے سامنے آتے ہیں۔
تحفۃ الکرام اور لب تاریخ سندھ میں مکلی کی وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے کہ ایک بزرگ جو زیارت حرمین شریفین کے لیے جا رہے تھے، وہ اتفاق سے آکر اس پہاڑی پر مقیم ہوئے، یہاں کے فیوض و برکات دیکھ کر ان پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی اور اسی عالم وجد میں وہ بے اختیار پکار اٹھے "ہذا مکتہ لی ہذا مکتہ لی" (یہ میرے لیے مکہ ہے یہ میرے لیے مکہ ہے) اسی وقت سے اس پہاڑی کا نام مکلی پڑ گیا، پھر لوگ اسے مکلی کہنے لگے (تحفۃ الکرام جلد ۳ ص ۱۸۴-۱۸۵ و لب تاریخ سندھ)۔

(3) تاریخ معصومی، ص ۷۵۔

ارغون نے قندھار سے آکر قلعہ سیوی کو جو جام نندا کے ایک امیر بہادر خان نامی کے تصرف میں تھا، محصور کر کے اپنے جبر و قہر سے فتح کر لیا، اور وہاں کی حکومت اپنے چھوٹے بھائی سلطان محمد کے سپرد کی، اور خود قندھار چلا گیا، اس کے جانے کے بعد جب جام نظام الدین کو معلوم ہوا تو اُس نے اپنے ایک امیر مبارک خاں کی سرکردگی میں جو نہایت بہادر اور شجیع تھا سلطان محمد کے مقابلے کے لیے ایک عظیم الشان لشکر بھیجا، جانبین میں کئی مرتبہ جنگ ہوئی، آخر سلطان محمد مارا گیا اور قلعہ سیوی پر جام نظام الدین کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ شاہ بیگ کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو اس نے جام نظام الدین کے مقابلے کے لیے میرزا عیسیٰ ترخان کو بھیجا، جام نظام الدین نے بھی اس کے مقابلے کے لیے مبارک خان کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا، سرحد پر دونوں لشکروں کے درمیان سخت جنگ ہوئی۔ اس لڑائی میں جام نظام الدین کے بہت سے قدیم اُمرا مارے گئے اور مبارک خان زخمی اور بدحال ہو کر بکھر کے قلعے میں پہنچا۔

شاہ بیگ کو جب میرزا عیسیٰ خان ترخان کی فتح کا حال معلوم ہوا تو اس کے حوصلے بڑھ گئے، اور اب وہ تمام ملک سندھ کے فتح کرنے کا خواب دیکھنے لگا، وہ ایک لشکر جرار کے ساتھ قلعہ بکھر پر حملہ آور ہوا، قاضی قاضن نے جو اُس زمانے میں جام نظام الدین نندا کی طرف سے قلعۂ بکھر کے حاکم تھے، مدافعت کی بے حد کوشش کی اور شاہ بیگ کا مقابلہ کیا، لیکن قلعہ کے عدم استحکام اور جام نظام الدین کی طرف سے کسی مدد کے نہ پہنچنے کی وجہ سے مجبور ہو کر قاضی قاضن شاہ بیگ سے امن کے طالب ہوئے اور قلعہ اس کے سپرد کر دیا۔ شاہ بیگ نے قلعہ بکھر کا حاکم فاضل بیگ کوکلتاش کو مقرر کیا اور خود قلعہ سہوان کی طرف روانہ ہو گیا، اور اس قلعے کو فتح کر کے وہاں کا حاکم خواجہ بیگ[1] کو مقرر کیا اور خود قندھار واپس لوٹ گیا۔

جام نظام الدین نندا نے اگرچہ بہت سا روپیہ خرچ کر کے قلعۂ سیوی فتح کرنے کے لیے ایک کثیر لشکر مرتب کیا، لیکن سندھی میرزا عیسیٰ خان کے مغل لشکر سے اس قدر مرعوب ہو چکے تھے کہ وہ کسی طرح ان کے مقابلے کے لیے تیار نہ تھے، سندھیوں کی مرعوبیت کا اندازہ صرف اس ایک واقعے سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک موقع پر ایک مغل کے گھوڑے کی زین کا بند ڈھیلا ہو کر اس کی زین زمین پر گر پڑی، مغل گھوڑے سے اُتر کر زین کو درست کرنے لگا، اتفاق سے سندھی فوج کے چالیس سپاہی اس طرف آنکلے، انہوں نے اس مغل کو تنہا پا کر اس پر حملے کی ٹھانی، مغل نے جیسے ہی ان کو دیکھ کر بھاگنے کے ارادے سے باگ میں قدم رکھا یہ چالیس سندھی سپاہی اس کے گھوڑے پر سوار ہوتے ہی فوراً بھاگ کھڑے ہوئے۔

جام نظام الدین نے باسٹھ سال حکومت کر کے ۹۲۳ھ (۱۵۱۷-۱۸ء) کے آخر میں وفات پائی[2]، صاحب تاریخ فرشتہ نے اس کی موت کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی بیماری کی وجہ اس کی ناکامی تھی، جس سے وہ متاثر ہو کر بیمار پڑا اور وفات پا گیا۔[3]

قبل اس کے کہ ہم جام نظام الدین نندا کے حالات کو ختم کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے وزیر دریا خاں کا حال بھی مختصر طور پر یہاں درج کر دیا جائے کہ وہ سمہ دور کی تاریخ میں نہایت اہمیت رکھتا ہے، اور اس نے آخری دور میں سمہ حکومت کو بچانے کے لیے نہایت شاندار خدمات انجام دیں جس کا حال اس کتاب کے آئندہ اوراق میں آئے گا۔

دریا خان:

دریا خان کا اصل نام قبولہ تھا، یہ جام نظام الدین نندا کے دیوان لکھدیریا (لکسیر) کا غلام تھا، صاحب تحفتہ الکرام کا بیان ہے کہ قبولہ نسباً سید تھا، جو قید ہو کر آیا تھا اور لکھدیریا نے اس کو خرید کر آبداری کی خدمت اس کے سپرد کی تھی۔

کہتے ہیں کہ ایک روز جام نظام الدین نندا سخت گرمی کے دن شکار کے لیے نکلا، واپسی میں اُسے سخت پیاس معلوم ہوئی، لکھدیریا کا مکان قریب تھا، وہ اس خیال سے لکھدیریا کے مکان پر آیا کہ اپنی تشنگی رفع کرے، لکھدیریا کو معلوم ہوا تو وہ باہر نکل کر فوراً آداب شاہی بجالایا، جام نظام الدین نے اُس سے پانی مانگا، لکھدیریا نے اپنے آبدار قبولہ کو جو اس وقت بالکل لڑکا تھا، پانی لانے کا حکم دیا، قبولہ ایک کٹورے میں پانی لے کر آیا، اور نہایت ادب سے جام نظام الدین کے سامنے پانی کا کٹورہ پیش کیا، جب جام نظام الدین پانی پینے لگا تو اس نے دیکھا کہ پانی میں کچھ تنکے پڑے ہوئے ہیں، جام نے لڑکے سے کہا تم عجیب آدمی ہو تم نے پانی کو

---

(1) طبقات اکبری جلد سوم ص ۵۱۷ میں شاہ بیگ نے جس کو قلعہ سیوان کا حاکم مقرر کیا تھا، اس کا نام خواجہ باقی بیگ مذکور ہے۔

(2) تاریخ معصومی، ص ۱۱۲۔

(3) یہ تمام تفصیل تاریخ فرشتہ جلد دوم، ص ۶۱۸-۶۱۹ سے ماخوذ ہے۔

دیکھا تک نہیں کہ اس میں کتنے تنکے پڑے ہوئے ہیں، قبولہ نے جواب دیا، حضور بات یہ ہے کہ آپ سخت دھوپ اور گرمی میں باہر سے تشریف لارہے ہیں، جب آپ نے پانی مانگا تو میری یہ مجال نہ تھی کہ آپ پانی طلب فرمائیں اور میں پانی نہ لاؤں، لیکن مجھے خیال ہوا کہ اگر آپ نے فوراً پانی نوش فرمالیا تو کہیں خدانخواستہ مزاج ناساز نہ ہوجائے، یہ سوءِ ادب تھا کہ میں آپ کو پانی پینے سے روکوں، اس لیے میں نے عمداً پانی میں کچھ تنکے ڈال دیئے تھے کہ جب آپ پانی میں تنکے دیکھیں گے تو آپ وہ پانی نہیں پئیں گے، اور دوسری دفعہ پانی منگائیں گے، اس طرح پانی پینے میں کچھ دیر لگے گی اور اس تاخیر میں گرمی کا اثر دور ہوجائے گا، یہ وجہ تھی کہ جس کی وجہ سے میں نے جان بوجھ کر پانی میں تنکے ملائے تھے، جس کے لیے میں دست بستہ معافی چاہتا ہوں۔

جام نظام الدین کو اُس لڑکے کی یہ بات بہت پسند آئی اور اُس نے اس کو اسی وقت "دریاخان" کا خطاب دیا اور اپنا متبنیٰ بنالیا اور اپنے زمانے کے مطابق اس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت دلائی۔ دریاخان نے اپنے جوہر ذاتی سے غیر معمولی ترقی کی اور رفتہ رفتہ وہ اپنی استعداد و قابلیت سے ترقی کرتے ہوئے جام نندا کے وزیر دلشاد سے بھی تفوق لے گیا، آخر وہ مدار المہام (وزیر اعظم) اور امیر الامرا کے عہدے پر فائز ہوا اور "مبارک خان" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

جس زمانے میں کہ سید محمد مہدی جون پوری ٹھٹھہ تشریف لائے تو جام نظام الدین نے علما کی تحریک پر اُن سے سرد مہری برتی، لیکن دریا خان اُن کے ساتھ نہایت تعظیم و توقیر سے پیش آیا۔

دریا خان نے شاہ بیگ ارغون کا مقابلہ کرتے ہوئے ۹۲۶ھ (۲۰-۱۵۱۹ء) میں ٹھٹھہ میں وفات پائی۔[1]

(۱۷)

ناصر الدین ابوالفتح سلطان فیروز شاہ

۹۱۴ھ (۹-۱۵۰۸ء) تا ۹۲۶ھ (۲۰-۱۵۱۹ء)

جام نظام الدین نندا کی وفات کے وقت اُس کا لڑکا جام فیروز بہت ہی کم عمر تھا، اُس کی کم عمری کو دیکھ کر جام صلاح الدین کے قلب میں داعیہ سلطنت پیدا ہوا، جام صلاح الدین جام نظام الدین نندا کا قریبی عزیز اور جام سنجر کا نواسا تھا، لیکن دریاخان اور سارنگ خان جو جام نظام الدین کے اُمرا میں سے تھے اور عوام میں بھی ان کو مقبولیت حاصل تھی، انہوں نے جام صلاح الدین کی مخالفت کی، اور اُمرائے سلطنت کے اتفاق سے جام فیروز کو تخت سلطنت پر بٹھایا۔ جام صلاح الدین نے اس ناکامی کے بعد اولاً تو مخالفت اور لڑائی کی ٹھانی، لیکن جب اُس کی دال نہ گلی تو اس نے گجرات کا رخ کیا اور سلطان مظفر گجراتی کو اپنی ناکامی کی داستان سنا کر اس سے درخواست کی کہ وہ اس کٹھن اور نازک موقع پر اس کی مدد کرے، سلطان مظفر گجراتی کی بیوی جام صلاح الدین کے چچا کی لڑکی تھی، اس قرابت نے اسے متاثر کیا۔

ادھر جام فیروز تخت نشین ہوتے ہی عیش و عشرت میں پڑ گیا، اُس کا زیادہ وقت محل سرا میں گزرتا تھا، اس کے دربار کی رونق مسخرے تھے، جن میں بیٹھ کر وہ اپنا وقت خوش گپیوں میں گزارتا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سمہ خاندان کے افراد عوام پر ظلم و زیادتی کرنے لگے، جس کی وجہ سے جام فیروز کے خلاف عام بد دلی پیدا ہونے لگی۔ دریاخان جو اس خاندان کا بہت ہی بہی خواہ اور نہایت ہی شجیع، مدبر اور عقل مند انسان تھا اور جس نے اپنی کوششوں سے جام فیروز کو تخت نشین کیا تھا، سلطنت اور بادشاہ کا یہ رنگ دیکھ کر بے حد متاسف تھا، وہ اصلاح حالات کی کوشش کرتا تھا، لیکن اس کی بالکل نہ چلتی تھی، آخر جب اُس نے دیکھا کہ جام فیروز عیاشی میں پڑ کر امور سلطنت سے بالکل بے پروا ہوتا جاتا ہے اور اس کی تمام اصلاحی کوششیں رائیگاں جارہی ہیں، دریاخاں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ وہ چند دن کے لیے اپنا تعلق ملازمت شاہی سے منقطع کرلے، چنانچہ وہ جام فیروز سے اجازت لے کر اپنی جاگیر موضع 'کاہان' میں مقیم ہوگیا اور دربار شاہی سے اس نے اپنا تعلق منقطع کرلیا۔

جام صلاح الدین کا ٹھٹھہ پر قبضہ:

ادھر جام صلاح الدین کو جب یہ معلوم ہوا کہ جام فیروز عیش و عشرت میں مصروف ہے اور دریاخان جیسا مدبر اور بہی خواہ سلطنت ان حالات سے مایوس اور بیزار ہو کر کاہان میں مقیم ہوگیا ہے اور عوام جام فیروز سے متنفر ہے، جام صلاح الدین نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور وہ خطوط جو ان حالات کے متعلق ٹھٹھہ سے آئے تھے، سلطان مظفر گجراتی کو دکھا کر اس سے امداد کی استدعا کی، سلطان مظفر نے اس کی امداد کے لیے ایک کثیر لشکر اس کے ساتھ کیا۔ جام صلاح الدین اس لشکر کے

---

[1] تحفۃ الکرام جلد-۳، ص ۵۵ و معصومی ص ۱۱۷۔

ساتھ دریائے سندھ کو عبور کر کے ٹھٹھہ پر حملہ آور ہوا، جام فیروز اس کا مقابلہ نہ کر سکا، اور بھاگ کھڑا ہوا، جام صلاح الدین نے ٹھٹھہ پر قبضہ کر کے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔

جام فیروز کا دوبارہ ٹھٹھہ پر قبضہ:

جام فیروز شکست کھا کر نہایت پریشانی کے عالم میں اپنی والدہ کے ساتھ موضع کاہان میں دریاخان کے پاس پہنچا، اگرچہ دریاخان جام فیروز کی حرکات سے متنفر ہو کر گوشہ گیر ہو چکا تھا، لیکن جام فیروز کی والدہ نے نہایت ہی منت سماجت سے دریاخان کو اپنے شوہر جام نظام الدین کے احسانات یاد دلاتے ہوئے کہا کہ یہ تمہارے آقا کا لڑکا ہے، اگر کٹھن اور نازک موقع پر تم اس کا ساتھ نہ دوگے تو پھر اس کی مدد کون کرے گا، جام فیروز نے بھی اپنی گذشتہ غلطیوں پر اظہار ندامت کیا، آخر دریاخان کو رحم آگیا اور وہ اس کی مدد کے لیے تیار ہو گیا، اس نے پہلے بکھر اور سیوستان سے ایک کثیر لشکر جمع کیا، جب فوجی تیاری پوری طرح مکمل ہو گئی تو اس نے جام صلاح الدین کے مقابلے کے لیے ٹھٹھہ کا رخ کیا، جام صلاح الدین کو جب معلوم ہوا تو اس نے حاجی وزیر کی سرکردگی میں ایک لشکر دریاخان کے مقابلے کے لیے بھیجا، ایک زبردست جھڑپ کے بعد دریاخان نے شکست کھائی اور واپس لوٹ گیا۔

حاجی وزیر نے اس مہم میں فتح حاصل کرنے کے بعد، جام صلاح الدین کو اس فتح کی خوشخبری کا ایک خط بھیجا، جس میں لکھا کہ خدا کا شکر ہے کہ ہم اس لڑائی میں کامیاب ہوئے اور دریاخان شکست کھا کر واپس ہو گیا، چونکہ اس کا تعاقب مناسب نہیں تھا، اس لیے میں نے اس کا تعاقب نہیں کیا۔

اتفاقاً وہ قاصد جو یہ خط لے کر جام صلاح الدین کے پاس جا رہا تھا راستے میں دریاخان کے ہاتھ پڑ گیا۔ دریاخان نے یہ خط پھاڑ کر ایک دوسرا خط حاجی وزیر کی طرف سے لکھا، جس میں لکھا کہ افسوس ہے کہ دریاخان کے مقابلے میں ہمارے لشکر نے شکست کھائی، دشمن کی فوجی تیاریاں بہت زیادہ مکمل ہیں، میرا خیال ہے کہ ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے خاندان کو لے کر فوراً ٹھٹھہ سے نکل جائیں اور موضع چاچکان میں مجھ سے ملیں۔

یہ خط لکھ کر دریاخان نے قاصد کو انعام و اکرام کا لالچ دے کر اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ یہ خط جام صلاح الدین کو پہنچا دے، اور یہ راز کھلنے نہ دے کہ اصل خط پھاڑ دیا گیا ہے، قاصد نے اس کی پوری پوری تعمیل کی، جیسے ہی یہ خط جام صلاح الدین کو ملا، اُس نے یہ سمجھ کر کہ یہ خط حاجی وزیر کا ہے فوراً اس کے لکھنے کے مطابق ٹھٹھہ کو خالی کر دیا، جیسے ہی اُس نے ٹھٹھہ کو خالی کیا، دریاخان نے عین عید کے روز جام فیروز کو ٹھٹھہ میں لا کر عید کی نماز ادا کی اور ٹھٹھہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

جام صلاح الدین اُس خط کی تحریر کے مطابق ٹھٹھہ سے نکل کر حاجی وزیر سے ملا، حاجی وزیر نے اُسے دیکھ کر ملامت کرتے ہوئے حیرانی سے پوچھا کہ آخر آپ نے ٹھٹھہ کو کیوں چھوڑا؟ جام صلاح الدین نے وہ خط جو اس کی طرف سے لکھا گیا تھا، اس کو دکھایا، حاجی نے کہا بخدا یہ خط میں نے نہیں لکھا، آخر دونوں یہ سمجھ کر کہ یہ دریاخان کی ایک چال تھی بے حد متاسف ہوئے، لیکن معاملہ ہاتھ سے نکل چکا اور سوائے حسرت و ندامت کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔[1]

تاریخ فرشتہ اور طبقات اکبری میں ہے کہ جام صلاح الدین کہ جو اپنے آپ کو وارث سلطنت سمجھتا تھا، اور جام فیروز کے رشتے داروں میں تھا، جام نظام الدین ننداکی وفات کے بعد مدعی سلطنت ہوا، لیکن ناکام ہوا۔ سلطان مظفر گجراتی کے پاس چلا گیا جس سے جام صلاح الدین کے چچا کی بیٹی بیاہی تھی۔ سلطان مظفر گجراتی نے اس کے حالات سے متاثر ہو کر ایک بڑا لشکر دے کر اُسے ٹھٹھہ روانہ کیا، دریاخان جو اس وقت سیاہ و سفید کا مالک اور حکومت کے بالکلیہ اختیار رکھتا تھا، وہ جام صلاح الدین کے موافق ہو گیا اور اس طرح جام صلاح الدین بغیر کسی جنگ و جدال کے ٹھٹھہ پر قابض ہو گیا اور جام فیروز گوشہ نشین ہو کر اپنے کوکب اقبال کے عروج کا انتظار کرنے لگا، یہاں تک کہ دریاخان نے جو جام صلاح الدین کے زمانے میں بھی اقتدار کا مالک تھا، حالات سے متاثر ہو کر جام فیروز کو بلا کر ٹھٹھہ کے تاج و تخت کا مالک بنا دیا، جام صلاح الدین ناکام ہو کر یہ حسرت و یاس پھر گجرات چلا گیا۔ سلطان مظفر گجراتی نے دوبارہ ۹۲۶ھ میں ایک کثیر لشکر دے کر جام صلاح الدین کو ٹھٹھہ روانہ کیا، جام صلاح الدین نے جام فیروز کو نکال کر پھر ٹھٹھہ پر قبضہ کر لیا، جام فیروز مجبور ہو کر شاہ بیگ ارغون سے مدد کا خواستگار ہوا، شاہ بیگ ارغون نے اپنے غلام سنبل خان کی سرکردگی میں ایک کثیر لشکر جام فیروز کی امداد کے لیے مقرر کیا۔ جام فیروز اس لشکر کے ساتھ سندھ پہنچا اور سیوھن کے قریب اس کا مقابلہ جام صلاح الدین سے ہوا، طرفین میں سخت جنگ ہوئی، اس لڑائی میں جام صلاح الدین اور اس کا بیٹا ہیبت خان مارا گیا اور سندھ بدستور سابق جام

---

[1] تاریخ معصومی، ص ۷۷-۷۸۔

فیروز کے قبضے میں آگیا۔

جام فیروز اس کے بعد کئی سال تک حکومت کرتا رہا، یہاں تک کہ ۹۲۶ھ[1] کے آخر میں شاہ بیگ ارغون نے قندھار سے آکر سندھ پر قبضہ کر لیا، اس طرح سمہ خاندان کی حکومت ختم ہو کر ارغون خاندان کی حکومت کی بنیاد پڑی۔[2]

تاریخ طاہری سے سمہ خاندان کے زوال کی صحیح تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کی حکومت کی تباہی کا باعث خود جام فیروز، اس کی والدہ اور خود غرض اراکین دولت تھے۔ جنہوں نے اپنی خود غرضیوں کی بنا پر ارغونوں کی بیرونی طاقت کو اپنے ملک پر مسلط ہونے کی دعوت دی تھی۔

تاریخ طاہری میں ہے کہ جب جام فیروز اپنے باپ کی جگہ تخت نشین ہوا تو اس خاندان کے وفادار اور بہی خواہ دریا خان کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر اس عیش و عشرت میں سرمست اور خامکار فرمانروا کو اس کے خود غرض مصاحبین نے مشورہ دیا کہ ملک کے تمام زمیندار اور یومیہ دار علی الاعلان دریا خان کے مطیع و فرمانبردار بنے ہوئے ہیں اور وہ آپ کو خاطر میں بھی نہیں لاتے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے والد کی وفات کے بعد اصل میں حکومت کا مالک دریا خان ہی ہے اور ابھی تک یہ ملک آپ کے تصرف میں نہیں آیا۔ جام فیروز ان کی یہ باتیں سن کر اس لیے خاموش رہا کہ وہ دریا خان کے اقتدار کو ختم کرنے کی طاقت اپنے میں نہیں پاتا تھا، جب ان مصاحبین نے دیکھا کہ اُن کا جادو جام فیروز پر نہیں چلتا تو ان کو ان کی خود غرضی اور رشک و حسد کی آگ اس کی ماں مدینہ ماچھانی کے پاس لے کر گئی، انہوں نے اس کی ماں کو سمجھایا کہ سارے ملک پر بڑا اثر اس غلام دریا خان کا ہے اور کوئی بھی جام فیروز کو نہیں مانتا، ہر چند ہم نے اس کے قید کرنے کے بہانے ڈھونڈھے مگر اس کا قید کرنا ممکن نہ ہو سکا، اب اس کے اقتدار کو ختم کرنے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ مغلوں اور ارغونوں کو ہمارے ملک پر قبضہ کرنے کی دعوت دی جائے، تاکہ وہ اس کا دماغ درست کریں، اگر وہ اس ملک پر قبضہ کرنے کے بعد پھر ملک ہمارے حوالے کر دیں تو سبحان اللہ اور اگر وہ ایسا نہ بھی کریں تو ان کی غلامی اس زر خرید کی غلامی کی ذلت سے کہیں بہتر ہے۔ ناعاقبت اندیش و ناقص العقل عورت نے ان خود غرضوں کے غیر مخلصانہ مشورے کو قبول کر لیا اور خود ہی اُس کو اپنی سلطنت کی تباہیوں کا سامان بنا کر بحیثیت ایک مستغیثہ کے ۹۲۲ھ (۱۷-۱۵۱۶ء) میں شاہ بیگ کے پاس قندھار بھیجا، اس فریب خوردہ نے اپنے وہ حالات بیان کر کے جو اُسے ان خود غرض اراکین دولت نے سمجھائے تھے، اسے سندھ پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور خود وہ شاہ بیگ کو سندھ لانے کے لیے راہبر بنی۔ شاہ بیگ موضع باغبان سے سیوھن کے راستے ہوتا ہوا ٹھٹھہ کے نالے "خانواہ" کے قریب آیا، جسے دریا خان نے موضع سانگورہ اور دوسری زمینوں کی آبادی کے لیے کھدوایا تھا، یہاں اُس نے بے وقت جنگ کا نقارہ بجوایا، اس طبل جنگ کی آواز سنتے ہی دریا خان نے جام فیروز سے کہا کہ مغلوں کی یہ بلا تم مجھ پر نہیں لائے، بلکہ تم نے خود اپنے پیر پر کلھاڑی ماری ہے، بہتر یہ ہے کہ اب بھی متحد و متفق ہو کر اس فتنے کے سدباب کی کوشش کرو، تاکہ یہ ملک مغلوں کے ہاتھوں میں نہ جائے ورنہ اپنے کیے پر سخت پشیمان ہو گے، لیکن جام فیروز اور اس کے جواری اس نصیحت کو اس کی خود غرضیوں پر محمول کر کے گھروں میں بیٹھ گئے، دریا خان نے ٹھٹھہ سے باہر نکل کر اُن سواروں کے ساتھ جو اس کے پاس تھے مغلوں سے مردانہ وار جنگ کی اور شہید ہو گیا۔[3]

سمہ خاندان کی حکومت پر تبصرہ:

ارغون عہد کو شروع کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ سمہ دور کے نظم و نسق اور اس دور کی ترقیوں کے متعلق بھی کچھ اشارات کرتے چلیں، تاکہ ان کے دور کی صحیح تصویر سامنے آسکے۔

تجارتی اور فوجی حالات:

سمہ دور حکومت میں سندھ میں ارزانی اور آسودگی کا دور دورہ تھا، سمہ فرمانرواؤں نے امن کو بحال کرنے کے لیے ڈاکوؤں کی بیخ کنی کی، یہاں تک کہ بیرونی تاجروں کا مال جو سندھ میں لوٹا گیا تھا وہ سب کا سب حاصل کر کے ان تاجروں کے ورثا کو گجرات تک پہنچایا گیا۔ اشیا کی قیمتوں کی نگرانی کے لیے ہر ایک شہر میں ناظم مقرر کیے گئے۔

سمہ حکمرانوں کی فوجی طاقت بھی مضبوط تھی، انہوں نے اپنی

---

(1) معصومی میں شاہ بیگ ارغون کے تسخیر سندھ کا ہجری سن ۲۹۶ھ طبقات اکبری میں ۹۲۶ھ اور تاریخ فرشتہ جلد دوم میں ۹۲۷ھ مذکور ہے۔

(2) طبقات اکبری جلد سوم، ص ۵۱۸-۵۱۹، تالیف خواجہ نظام الدین احمد - تاریخ فرشتہ جلد دوم، ص ۶۱۹۔

(3) تاریخ طاہری، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۵۶-۵۹۔

فوجی حالت کو بہتر بنانے کے لیے فوجی عہدے داروں کو جاگیریں دیں اور اپنی اس ترغیب و تحریص سے ملک کے ہر طبقے میں فوجی اسپرٹ پیدا کی، چنانچہ ارغونوں نے جب سندھ پر حملہ کیا تو سندھی لشکر کے ساتھ ہندو سوڈہا اور رانا بھی شریک تھے جنہوں نے سمہ فوج کے ساتھ اپنے ملک کی مدافعت کی۔ ان کے دور میں فوجی جذبہ اس قدر عام تھا کہ مخدوم بلاول جیسے بزرگ درویش نے بھی شاہ بیگ ارغون کے خلاف جنگ میں شمولیت اختیار کی۔

سموں کی حکومت میں سندھ کی مذہبی حالت:

سمہ سلاطین عموماً شریعت کے پابند تھے، یہ اُچ کے گیلانی، بخاری اور ملتان کے سہروردیہ مشائخ کے مرید تھے، سندھ میں حنفیت کا زور تھا، اور مدارس میں فقہ کی تعلیم کی طرف خصوصیت سے توجہ دی جاتی تھی، اپنی اسلامیت اور مذہبیت کی وجہ سے سندھ "عرب صغیر" اور ہندوستان میں "باب الاسلام" کے نام سے مشہور تھا، تصوف کا اس خطے پر گہرا اثر تھا، صوفیائے کرام کی روحانی تبلیغ و تلقین کا اثر سندھ کے ہندوؤں اور مسلمانوں پر کافی ہوا۔

تعلیمی حالت:

سموں سے پہلے اسلامی طریقے کے مطابق مدارس مساجد میں قائم تھے، مگر سموں کی حکومت کے زمانے میں مدارس کے لیے علیحدہ عمارتیں تعمیر ہوئیں، جن میں اپنے وقت کے جلیل القدر محدث اور بلند پایہ ادیب تعلیم دیتے تھے۔ صرف ٹھٹھہ میں مدارس کی تعداد ہزار کے قریب تھی، اس کے علاوہ بھکر، سیوھن اور کاہان تعلیمی مرکز تھے۔

سندھی زبان اور شاعری کی ابتدا:

سندھی زبان کی ابتدا کے متعلق سندھ کی تاریخ کے محقق ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ پروفیسر سندھ یونیورسٹی نے اپنی کتاب "سندھی بولی جی مختصر تاریخ" کے دوسرے باب میں اس امر پر روشنی ڈالتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے ہم مختصر طور پر اس کا خلاصہ یہاں لکھتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے اس باب کے شروع ہی میں تحریر فرمایا کہ:

> سندھی بولی کی تشکیل اور بننے کا بنیادی دور تقریباً رائے اور برہمن حکومت اور عرب حکومت کا دور ہے اور اس دور کو چھٹی صدی عیسوی سے گیارہویں صدی عیسوی تک سمجھنا چاہیے، اس دور میں موجودہ سندھی بولی متشکل ہوئی، ہمارے پاس یقینی تو کیا کوئی دلیل بھی اس کے لیے موجود نہیں کہ برہمنوں اور عربوں کی حکومت سے قبل موجودہ سندھی زبان کا کوئی ہلکا سا خاکہ بھی کسی صورت میں موجود تھا۔ (ص ۲۰)۔

پھر آگے چل کر انہوں نے لکھا کہ:

> معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک زبان کی تشکیل اکثر مفرد الفاظ پر مبنی تھی، حروف خواہ ازمنہ کے نقطۂ نظر سے افعال ابھی تک جملے کے ربط دار تباط اور ترکیب کے لازمی اجزا نہیں بنے تھے۔ (ص ۲۲)۔
>
> ماضی کے مطالعہ سے الفاظ کی تشکیل اور بناوٹ کے لحاظ سے ہم سمجھتے ہیں کہ عربی کے اثر سے قبل سندھی الفاظ حروف صحیحہ کے مرکبات تھے، جیسا کہ سندھی کے اکثر الفاظ مثلاً مکھ (اردو مکھی) نتھ، ککڑ (مرغ) مکڑ (مکڑ) گدڑ (گیدڑ) وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے۔ (ص ۲۲)۔

آگے چل کر انہوں نے تحریر فرمایا کہ:

> سندھی چونکہ بہت خام زبان تھی، اس لیے تمام نحوی خصوصیات مثلاً ضمائر، افعال، اسمائے فاعل، اسمائے مفعول وغیرہ عربی سے سندھی زبان میں آئے، سندھی میں ضمیر متکلم آ عربی الاصل ہے جو "انا" سے ماخوذ ہے (ص ۴۰)۔

اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ:

> عربی ضمیۂ مفعول سے آخری 'ل' اپنا کر سندھی نے اپنے تمام اسمائے مفعول بنائے، کیونکہ سندھی کے اسمائے مفعول میں آخری حرف 'ل' ہوتا ہے (ص ۴۱)۔

مختصر یہ کہ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے سندھی زبان کو عربی النسل بتایا ہے اور سندھی کو ایک سامی زبان قرار دیا ہے، سندھی زبان کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے کہ اسلامی فتوحات سے قبل سندھی زبان ایک خام اور غیر پختہ شکل میں تھی، جس میں صرف و نحو کے کوئی اصول اور قواعد موجود نہ تھے۔ جب اس ملک میں عربی رائج ہوئی تو اس نیم پختہ زبان نے اس کے تمام الفاظ، اس کی صرف و نحو کو اپنایا اور سندھی زبان کی موجودہ متشکل بنی اور صحیح طور پر یہ زبان متشکل ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب سے قبل سندھی زبان کے متعلق ماہرین لسانیات کا یہ نظریہ تھا کہ:

> سندھی زبان ہند اور یورپی زبانوں کے گروہ کی ایک زبان ہے، اس کی اصل سنسکرت اپ بھرنش سے بتائی جاتی ہے، چنانچہ ہندوستانی زبانوں کی گروہ بندی کرتے ہوئے مشہور و معروف ماہر لسانیات سر گریئرسن نے اُسے وارچڈ اپ بھرنش سے مشتق قرار دیا ہے وارچڈ کے معنی بگڑی ہوئی زبان کے ہیں۔

انیسویں صدی سے اب تک سندھی زبان کے متعلق یہی نظریہ چلا آتا ہے، گو کہ ٹرمپ، گولڈ سمتھ وغیرہ نے اس نظریے پر خاصی تنقید کی ہے، ٹرمپ کی گرامر سندھی زبان پر ایک مستند بحث ہے، اس کا نظریہ یہ ہے کہ ہندوستانی زبانوں کے مطالعے کے بعد یہ ثابت ہوتا ہے کہ چند اہم لسانی خصوصیات کی بنا پر سندھی، سنسکرت کے قریب ترین زبان ہے اس لیے اسے وارچڈ اپ بھرنش سے مشتق بتانا صحیح نہیں ہے۔

بہر حال سر گریئرسن کا نظریہ باوجود مستحکم اور مضبوط اعتراضات کے لسانی دنیا میں مقبول عام ہے۔

سندھی زبان کے مآخذ اور اس کی اصل پر سب سے زیادہ معتبر کتاب مسٹر بھیرومل ہرچند کی "سندھی بولی" سمجھی جاتی ہے، اس کتاب میں سندھی زبان اور اس کی نحوی خصوصیات پر ایک جامع بحث کی گئی ہے، لیکن بنیادی طور پر مسٹر بھیرومل ہرچند کا بھی وہی نظریہ ہے، جو سر گریئرسن کا ہے۔

حال ہی میں ایک کتاب سندھ کے ایک نوجوان ادیب سراج الحق میمن کی "سندھی بولی" کے نام سے شائع ہوئی ہے، انہوں نے سندھی زبان کے متعلق ان تمام نظریوں کو باطل ٹھہرایا ہے، جن کا تذکرہ ہم اوپر کر چکے ہیں، انہوں نے خاص طور پر ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کے نظریے کو رد کرنے کی سر توڑ کوشش کی ہے۔ سراج الحق میمن کا خیال ہے کہ جب تک موہن جو دڑو کی قدیم زبان کو حل نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک یہ کہنا غلط ہے کہ قدیم سندھی زبان سامی یا اور کسی نسل کی زبان ہے، وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ جن نشانات کا ڈاکٹر صاحب نے ذکر فرمایا ہے، وہ محض ایک تصوری اور ذہنی خاکہ ہے جس کو آج تک کسی عالم نے بیان نہیں کیا، محض ذہنی اور تصوری خاکوں پر اس زبان کو سامی النسل زبانوں کے مسخ شدہ نشانات کہنا صحیح نہیں۔ سراج الحق میمن نے اس کی دلیل پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سامی النسل زبانوں کے مادے اکثر و بیشتر سہ حرفی ہیں، مثلاً فعل، قتل وغیرہ، اس کے برعکس سندھی مادے اکثر و بیشتر یک حرفی یا دو حرفی ہیں اور یہ ایک بہت بڑا فرق ہے ہند یورپی زبانوں اور سامی زبانوں میں (ص ۴۵-۴۶)۔ آگے چل کر انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے اس نظریے کی کہ "سندھی کی عرب دور حکومت میں تشکیل ہوئی" تردید کرتے ہوئے لکھا کہ:

خود ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب فتح نامۂ سندھ میں سندھی کے استعمال شدہ چند الفاظ نقل کیے ہیں، یہ الفاظ سندھی میں آج بھی ہو بہو اسی طرح استعمال ہوتے ہیں۔ اور اس زبان کی تکمیل اور پختگی کے گواہ ہیں، ان الفاظ میں اسمائے فاعل اور اسمائے مفعول بھی ہیں، ان ہی الفاظ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سندھی صوتیات کا نظام عربوں سے قبل وہی تھا، جو آج ہے، اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ سندھی زبان کی تشکیل عربوں کی آمد سے بہت پہلے ہوئی۔

انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے اس نظریے کی بھی تردید کی ہے کہ سندھی زبان میں نحوی اور صرفی طور پر جملے افعال کے بغیر بنتے تھے اور سندھی الفاظ حروف صحیحہ کا مجموعہ تھے، سراج صاحب نے ان کی اس دلیل کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ:

کسی زبان کا کوئی لفظ حروف علت کے بغیر نہیں بن سکتا اور نہ اُسے بولا جاسکتا ہے، کیونکہ لسانیات کا یہ ایک کلیہ ہے کہ کوئی لفظ حروف علت کے بغیر نہیں ہوتا اور زبانوں کے اولین الفاظ افعال ہوتے ہیں۔

اس تردید کے بعد سراج صاحب نے سندھی زبان کے متعلق اپنا جداگانہ نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھا کہ سندھی زبان علاقہ سندھ کی قدیم زبان ہے اور اُسے کسی بیرونی زبان سے مشتق کہنا غلط ہے، وہ اس عام نظریے کے بھی خلاف ہیں کہ:

> سندھی سنسکرت کی کسی پراکرت کی یا کسی اپ بھرنش کی ایک خاص نوعیت وارچڈ سے پیدا ہوئی، ان کا ایک انوکھا نظریہ جسے انہوں نے بہت زیادہ مدلل بنانے کی کوشش کی ہے، وہ یہ ہے کہ سنسکرت یہیں کی ایک مقامی زبان ہے، سنسکرت کے معنی ہیں تہذیب یافتہ زبان، اور اسے سنسکرت اس بنا پر کہا گیا ہے کہ یہ کئی ایک مقامی زبانوں سے بالکل اسی طرح بنی تھی، جس طرح سوا دو سو برس پہلے اردو وجود میں آئی، وہ سنسکرت کی صرف و

نحو اور اس کی گرامر، اس کے مادے غرض کہ ان تمام چیزوں کا ماخذ سندھی زبان کو بتاتے ہیں، وہ سندھی مادوں کو سنسکرت کے مادوں سے قدیم تر بتاتے ہیں۔

یہ ہیں وہ نظریات جو سندھی زبان کی ابتدا اور اس کے ارتقا کے متعلق ہمیں معلوم ہو سکے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ عربوں کے عہد حکومت میں بھی اس ملک میں سندھی زبان رائج تھی لیکن یہ کس نمونے کی تھی اور اُس قدیم سندھی اور اس موجودہ سندھی میں کیا فرق ہے اسی طرح یہ بات کہ اس وقت اس زبان کا رسم الخط کیا تھا، یہ سب باتیں تاریکی میں ہیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سندھ کی عشقیہ داستان اور قصہ کہانیوں کی بنیاد سومروں کے دور حکومت میں پڑی، جن سے سندھی زبان میں ادائی بیان کی صلاحیت پیدا ہوئی، اور اس وقت کی روایتیں بھی محفوظ ہو گئیں۔

جہاں تک سندھی شاعری کا تعلق ہے، اس کے متعلق ہمیں صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ سومروں کے عہد میں یہاں کے صوفیائے کرام کی محفل سماع و سرود میں سندھی اشعار گائے جاتے تھے لیکن اس دور کے سندھی شاعر کون کون تھے اور یہ اشعار کیا تھے، کوئی بھی تاریخ و تذکرہ اُن کو متعین نہیں کرتا۔

البتہ سموں کا دور حکومت (۱۳۵۰-۱۵۲۰ء) علم و فضل اور معیاری سندھی زبان کے ارتقا اور سندھی شاعری کی ابتدائی ترقی کے اعتبار سے ایک اہم دور ہے، ان ہی کے زمانے میں سندھی زبان اور شاعری میں قوت بیان کو ترقی ملی، انہیں کے زمانے میں لسانی سرمائے میں وسعت پیدا ہوئی، انہیں کے زمانے میں سب سے پہلے سات درویشوں کے سندھی کے وہ اشعار ملتے ہیں، جو انہوں نے جام تماچی کے دور میں بطور پیش گوئی کے جنہیں ماموئی یا ساموئی کے اشعار کہا جاتا ہے کہے، ماموئی دراصل لفظ معما کی بگڑی ہوئی صورت ہے، غالباً معمائی سے ماموئی بنایا گیا ہے، یہ پیش گوئیاں ہر درویش نے اپنے اپنے شعر میں جام تماچی سے ناراض ہو کر سندھ کے مستقبل کے متعلق اس وقت کی تھیں، جب جام تماچی نے انہیں قتل کرنے کا حکم دیا تھا، اُن کے ان اشعار کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

پہلا درویش:

دریائے ہاکڑا بہت زور و شور سے بہے گا اور اروڑ کا بند ٹوٹ جائے گا اور "بہ" مچھلی اور "لوڑ" جیسی سوغاتیں سمہ خاندان سے چلی جائیں گی۔

دوسرا درویش:

ملک میں پیار و محبت کے بادل برس برس کر آخر ختم ہو جائیں گے اور بلوچوں کا بچہ صرف پانچ درم میں بکنے لگے گا۔

تیسرا درویش:

"کارا" اور "ہارا" کے علاقوں میں آٹھوں پہر جھگڑا فساد جاری رہے گا، آخر شرم و حیا کا دیوالہ نکال کر سندھ پھر سے سرسبز ہو گا۔

چوتھا درویش:

شرم و حیا کا دیوالہ نکل جائے گا، شرم و حیا کے متعلق کیا پوچھتے ہو، عورتوں کے دوپٹے نیچے لٹکے ہوئے ہوں گے، اور کالے بال اوپر کو اُبھرے ہوئے۔

پانچواں درویش:

"لاڑ" کے علاقے سے بغاوت کے شعلے اٹھیں گے اور اس کا اثر سرے (شمالی سندھ) پر پڑے گا، اے سندھ! تجھے آخر مشرق کی طرف سے نقصان پہنچے گا۔

چھٹا درویش:

نیلے اور دبلے گھوڑے شمال کی طرف سے آئیں گے۔ لہنگا پہننے والی عورتیں راستے میں تقسیم ہوتی ہوتی نظر آئیں گی اور اس کے بعد تاجانی قبیلے کی نوبت بجنے لگے گی۔

ساتواں درویش:

اے لوگو! اپنی اپنی منزل کے بھروسے پر آباد ہونا کیونکہ (عنقریب) تمہاری بستیاں کھنڈرات بن جائیں گی اس لیے تم مکانات تعمیر نہ کرنا۔[1]

ساتویں درویش کا شعر بالکل خالص اور سندھی زبان میں ہے، جس پر فارسی اور عربی کا بہت کم اثر ہے۔ سندھی شاعری کی قدیم صنف دوہا ہے، معمائی فقیروں کے اشعار بھی دوہے ہیں۔ اس کے بعد ہمیں جس

---

[1] ان ساتوں درویشوں کے متعلق ایک طویل قصہ مشہور ہے، چونکہ اس کا ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں اس لیے ہم نے اسے یہاں نقل نہیں کیا ہے۔

سندھی کے شاعر کا پتا چلتا ہے، وہ ۱۵۰۰ء میں شیخ حماد ٹھٹھوی ہیں، جنہیں "گجے والا پیر" بھی کہتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے سندھی زبان میں کچھ شعر کہے تھے، لیکن ان کا کوئی نمونہ کلام ہمیں نہیں ملتا۔

سمہ دور کے سندھی شاعروں میں درویش نوح، پیر صدر الدین، پیر حسن کبیر الدین، پیر مراد شیرازی، میر سید علی ثانی شیرازی، مخدوم احمد بھٹی، اسحاق آھن گر اور قاضی قاضن وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

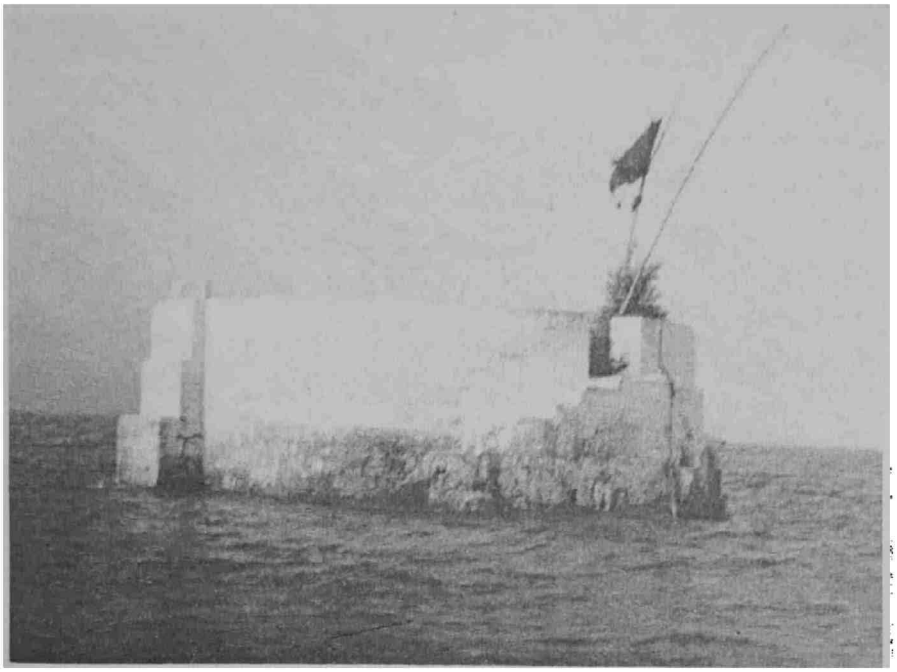

سندھ کی رومانوی داستان نوری جام تماچی کا مزار سیمجھر جھیل کی آغوش میں

لیکن سندھی شاعری کا باقاعدہ دور سولھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے اور اسی دور کو سندھی شاعری کا ابتدائی دور کہا جاسکتا ہے۔

اس دور کے سب سے نامور شاعر قاضی قاضن سیوستانی (متوفی ۱۵۵۱ء) ہیں، یہ سمہ حکومت کے آخری زمانے اور ارغون حکومت کے ابتدائی دور میں موجود تھے، ان کے چھ اشعار "رسالہ کریمی" مصنف شاہ عبدالکریم (بلڑی) میں موجود ہیں۔

شاہ عبدالکریم سندھ کے مشہور شاعر و صوفی شاہ عبداللطیف بھٹائی کے جد اعلیٰ اور خود بھی سندھی کے عظیم المرتب شاعر اور درویش ہیں۔ ۱۵۳۶ء میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ۱۶۳۳ء میں وفات پائی، ان کا سندھی کلام رسالہ کریمی کے نام سے مشہور ہے۔

سندھی عربی رسم الخط کی ابتدا:

سندھی عربی رسم الخط کی ابتدا عربوں کے دور حکومت میں ہوئی۔ البیرونی نے کتاب الہند میں لکھا ہے کہ سندھی، عربی اور ناگری اسی خط میں لکھی جاتی ہیں۔

مولانا ابوالحسن سندھی دسویں صدی ہجری کے آخر اور گیارہویں صدی ہجری کے شروع میں ہوئے۔ انہوں نے مقدمتہ الصلوٰۃ لکھ کر پہلی سندھی درسی کتاب کی بنیاد ڈالی اور بچوں کی تعلیم اول سندھی زبان میں اور بعد میں فارسی اور عربی میں ہونے لگی۔ مولانا ابوالحسن کو سندھی علم و ادب کا معمار کہا جاتا ہے، مولانا نے اس رسم الخط میں پچاس کتابیں جو ان ہی کی تصنیف ہیں لکھیں، یہ کتابیں خالص عربی رسم الخط میں ہیں اور اُن کی زبان بھی پرانی ہے، اس لیے آج کل اُن کے پڑھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔

سکے:

سموں کی حکومت میں دوسری حکومتوں کے سکوں کے ساتھ خود اُن کے سکے بھی رائج تھے، اُس وقت سندھ میں سموں کے سکوں کے علاوہ جو سکے رائج تھے، ان میں شاہان دہلی کے سکے، تیموری اشرفیاں اور روپے، محمود بیگڑی کی سنہری اشرفیاں اور روپے، گجراتی روپے جنہیں سندھ میں "لاڑی" کہا جاتا تھا، گولکنڈہ اور بیجاپور کی اشرفیاں جو سندھ میں "یگوڈا" کہلاتی تھیں تجارتی تعلقات کی وجہ سے رائج تھیں۔

بہر حال سموں کا عہد حکومت ایک کامیاب دور تھا، جس میں علم و فضل اور تجارت وغیرہ کو فروغ ہوا۔

ہم ان کے حالات پر اس جلد کو ختم کرتے ہیں۔

ضمیمہ نمبر (۱)

(۱) عہد خلافت راشدہ کے عرب سپہ سالار جنہوں نے دیبل اور مکران پر خلفائے راشدین رضہ کے زمانے میں پیش قدمی کی۔ (یہ فہرست عبداللہ مبشر الطرازی حسینی کی مرتب ہے، جسے ہم نے تحفتہ الکرام (طبع راشدی) سے نقل کیا ہے)۔

نمبر شمار	نام گورنر	حکومت	سنہ	عہد خلافت	نتیجہ	ماخذ
۱	مغیرہ بن ابی العاص	دیبل	۱۵ھ	حضرت عمر رضہ	انہوں نے دیبل پر پے در پے حملے کیے۔	بلاذری-چچ نامہ
۲	الحکم بن عمرو الغفاری	مکران	۲۳ھ	حضرت عمر رضہ	انہوں نے مکران کو فتح کیا۔	بلاذری-طبری
۳	عبیداللہ بن معمر تمیمی	مکران	۲۹ھ	حضرت عثمان رضہ	"	چچ نامہ-بلاذری
۴	حارث بن مرہ عبدی	مکران	۳۹ھ	حضرت علی رضہ	"	"

(۲) عہد بنو امیہ (یعنی امیر معاویہ سے عہد ولید تک ۴۱ھ تا ۹۲ھ) فتح سندھ سے قبل مکران کے گورنر۔

نمبر شمار	نام گورنر	حکومت	سنہ	عہد خلافت	نتیجہ	ماخذ
۱	مہلب بن ابی صفرہ	مکران	۴۲ھ تا ۴۶ھ	امیر معاویہ	تبادلہ ہو کر چلے گئے۔	بلاذری
۲	عبداللہ بن سوار العبدی	"	۴۵ھ تا ۴۹ھ	"	قیقان میں شہید ہوئے۔	بلاذری-یعقوبی
۳	سنان ابی سلمہ ھذلی	"	۴۹ھ تا ۵۱ھ	"	معزول ہوئے۔	بلاذری
۴	عاشد بن عمر جدیدی	"	۵۱ھ تا ۵۳ھ	"	قیقان میں شہید ہوئے۔	چچ نامہ
۵	سنان بن ابی سلمہ ھذلی	"	۵۳ھ تا ۵۶ھ	"	بودھیہ میں شہید ہوئے۔	بلاذری
۶	عباد بن زیاد	"	۵۷ھ تا ۵۹ھ	"	تبادلہ ہوا۔	چچ نامہ-تحفتہ الکرام بلاذری
۷	ابوالاشعث المنظر العبدی	"	۵۹ھ تا ۶۲ھ	"	مکران میں وفات پائے۔	بلاذری
۸	الحکم بن المنظر العبدی	"	۶۲ھ	یزید بن معاویہ	تبادلہ ہوا۔	چچ نامہ
۹	حری بن حری الباھلی	"	۶۴ھ تا ۶۸ھ	عبدالملک بن مروان	"	بلاذری
۱۰	؟ ؟	"	۶۸ھ تا ۷۵ھ	"	یا تبادلہ ہوا یا شہید ہوئے۔	ابن اثیر-کسی کتاب میں ان کا نام نہیں ملا۔
۱۱	سعید بن اسلم کلابی	"	۷۵ھ تا ۸۰ھ	"	تبادلہ ہوا۔	بلاذری-یعقوبی-چچ نامہ

۱۲	محمد علافی[1]	"	۸۰ھ تا ۸۵ھ	"	بھاگ کر سندھ گیا۔	چچ نامہ-بلاذری-ابن اثیر
۱۳	مجاعہ بن سعر التمیمی	"	۸۵ھ تا ۸۶ھ	"	مکران میں وفات پائی۔	بلاذری-چچ نامہ-ابن اثیر
۱۴	محمد بن ہارون النمری	"	۸۶ھ تا ۹۲ھ	ولید بن عبدالملک	"	چچ نامہ-بلاذری-یعقوبی-فرشتہ-تحفتہ الکرام
--	عبیداللہ بن نبہان العلمی (سپہ سالار لشکر دیبل)	"	۹۰ھ	"	دیبل میں شہید ہوئے۔	بلاذری-چچ نامہ
--	بدیل بن طفتہ الجبلی (سپہ سالار لشکر دیبل)	"	۹۱ھ	"	"	چچ نامہ-بلاذری

(۳) سندھ کے گورنر فتح سندھ سے لے کر آخر عہد بنو امیہ یعنی (۹۲ھ تا ۱۳۲ھ) تک۔

نمبر شمار	نام گورنر	حکومت	سنہ	عہد خلافت	نتیجہ	ماخذ
۱	محمد بن قاسم ثقفی (فاتح سندھ)	سندھ	۹۲ھ تا ۹۶ھ	ولید بن عبدالملک	معزول کیے گئے۔	بلاذری- چچ نامہ-معصومی-یعقوبی-طبری-ابن اثیر- ابن خلدون-تحفتہ الکرام
۲	یزید بن ابی کبشہ سکسکی	"	۹۶ھ تا ۹۶ھ	سلیمان بن عبدالملک	وفات پائی۔	بلاذری-ابن اثیر
۳	حبیب بن مہلب بن ابی صفرہ	"	۹۷ھ تا ۹۹ھ	"	معزول کیے گئے۔	بلاذری-ابن اثیر-ابن خلدون
۴	عمرو بن مسلم باھلی	"	۹۹ھ تا ۱۰۱ھ	عمر بن عبدالعزیز	"	ابن اثیر-بلاذری
۵	ہلال بن احوز تمیمی	"	۱۰۱ھ تا ۱۰۷ھ	یزید ثانی بن عبدالملک	"	بلاذری
۶	جنید بن عبدالرحمٰن مری	"	۱۰۷ھ تا ۱۱۱ھ	ہشام بن عبدالملک	تبادلہ کیا گیا۔	بلاذری- یعقوبی- ابن اثیر-طبری
۷	تمیم بن یزید عقبی	"	۱۱۱ھ تا ۱۱۲ھ	"	دیبل میں وفات پائی۔	یعقوبی-بلاذری
۸	حکم بن عوانہ کلبی	"	۱۱۲ھ تا ۱۲۱ھ	"	سندھ میں شہید ہوئے۔	چچ نامہ-بلاذری-یعقوبی
۹	عمرو بن محمد قاسم	"	۱۲۱ھ تا	"	منصورہ میں وفات پائی۔	یعقوبی-بلاذری

[1] محمد علافی نے بغیر اجازت خلیفہ کے سندھ پر قبضہ کر لیا تھا۔

			۱۲۵ھ		
۱۰	یزید بن عرار کلبی	"	۱۲۵ھ تا ۱۲۹ھ	ولید بن یزید	منصورہ (سندھ) میں عربوں نے انہیں قتل کیا۔	طبری-یعقوبی
۱۱	منصور بن جمہور کلبی	"	۱۲۹ھ تا ۱۳۴ھ	مروان بن محمد	منصورہ میں عربوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔	یعقوبی- ابن اثیر- ابن خلدون

(۴) سندھ کے عرب گورنر عباسیوں کے دور اول ۱۳۲ھ تا ۲۴۰ھ) میں

نمبر شمار	نام گورنر	حکومت	سنہ	عہد خلافت	نتیجہ	ماخذ
۱	مغاس العبدی	سندھ	۱۳۲ھ تا ۱۳۲ھ	ابو العباس سفاح	سندھ میں قتل کیے گئے۔	بلاذری-یعقوبی-طبری
۲	موسیٰ بن کعب تمیمی	"	۱۳۴ھ تا ۱۴۱ھ	"	بغداد میں وفات پائی۔	یعقوبی- بلاذری- ابن اثیر-طبری
۳	عینبہ بن موسیٰ تمیمی	"	۱۴۱ھ تا ۱۴۲ھ	منصور	معزول ہوئے۔	طبری- یعقوبی- ابن خلدون-ابن اثیر
۴	عمر بن حفص العتکی	"	۱۴۲ھ تا ۱۵۱ھ	"	تبادلہ ہوا۔	یعقوبی- ابن اثیر- طبری-ابن خلدون
۵	ہشام بن عمرو تغلبی	"	۱۵۱ھ تا ۱۵۷ھ	"	بغداد میں وفات پائی۔	بلاذری- ابن اثیر- یعقوبی
۶	معبد بن خلیل تمیمی	"	۱۵۷ھ تا ۱۵۹ھ	مہدی بن منصور	تبادلہ ہوا۔	ابن اثیر- طبری- ابن خلدون
۷	روح بن حاتم	"	۱۵۹ھ تا ۱۶۱ھ	"	"	ابن اثیر- طبری- ابن خلدون
۸	بسطام بن عمرو تغلبی	"	۱۶۱ھ تا ۱۶۱ھ	مہدی بن منصور	تبادلہ ہوا۔	ابن اثیر-طبری
۹	روح بن حاتم	"	۱۶۱ھ تا ۱۶۱ھ	"	"	طبری-ابن اثیر
۱۰	نصر بن محمد خزاعی	"	۱۶۱ھ تا ۱۶۱ھ	"	معزول ہوئے۔	"
۱۱	عبد الملک بن شہاب	"	۱۶۱ھ تا ۱۶۲ھ	"	تبادلہ ہوا۔	ابن خلدون-طبری

	اسمی[1]					
۱۲	زبیر بن عباس	"	۱۶۲ھ تا ۱۶۲ھ	"	معزول ہوئے۔	تاریخ سندھ
۱۳	مصبح بن عمرو تغلبی	سندھ	۱۶۲ھ تا ۱۶۲ھ	"	"	ابن اثیر
۱۴	نصر بن محمد خزاعی	"	۱۶۲ھ تا ۱۶۴ھ	"	منصورہ میں وفا پائی۔	"
۱۵	سطیح بن عمرو تغلبی	"	۱۶۴ھ تا ۱۶۴ھ	مہدی بن منصور	معزول ہوئے۔	طبری
۱۶	لیث بن طریف	"	۱۶۴ھ تا ۱۷۰ھ	"	"	یعقوبی-طبری
۱۷	سالم یونسی	"	۱۷۱ھ تا ۱۷۴ھ	ہارون الرشید	تبادلہ ہوا۔	یعقوبی-ابن اثیر-طبری
۱۸	اسحاق بن سلیمان ہاشمی	"	۱۷۲ھ تا ۱۷۴ھ	"	سندھ میں وفات پائی۔	ابن خلدون-یعقوبی
۱۹	یوسف بن اسحاق ہاشمی	"	۱۷۴ھ تا ۱۷۴ھ	"	تبادلہ ہوا۔	ابن خلدون
۲۰	طیفور بن عبداللہ حمیری	"	۱۷۴ھ تا ۱۷۵ھ	"	معزول ہوئے۔	یعقوبی
۲۱	جابر بن اشعث طائی	"	۱۷۵ھ تا ۱۷۶ھ	"	"	"
۲۲	کثیر بن مسلم بن قتیبہ[1]	"	۱۷۶ھ تا ۱۷۸ھ	"	"	"
۲۳	محمد بن عدی بن تغلبی[2]	"	۱۷۹ھ تا ۱۸۱ھ	"	"	"
۲۴	عبدالرحمٰن۔۔۔؟	"	۱۸۱ھ تا ۱۸۲ھ	"	"	"
۲۵	ایوب بن جعفر بن سلیمان	"	۱۸۲ھ تا ۱۸۴ھ	"	"	"
۲۶	مغیرہ بن یزید مہلبی[3]	"	۱۸۴ھ تا ۱۸۵ھ	"	ناکام لوٹے۔	ابن اثیر-یعقوبی
۲۷	داؤد بن یزید مہلبی	"	۱۸۵ھ تا ۲۰۵ھ	"	منصورہ میں وفات پائی۔	بلاذری-یعقوبی-ابن اثیر
۲۸	بشر بن داؤد مہلبی	"	۲۰۵ھ تا ۲۱۳ھ	مامون الرشید	معزول ہوا۔	بلاذری-طبری
۲۹	حاجب بن صالح	"	۲۱۳ھ تا ۲۱۳ھ	"	ناکام ہوئے۔	یعقوبی-ابن اثیر-طبری
۳۰	غسان بن عباد مہلبی	"	۲۱۳ھ تا ۲۱۶ھ	"	تبادلہ ہوا۔	طبری-بلاذری
۳۱	موسیٰ بن یحییٰ برمکی	"	۲۱۶ھ تا ۲۲۱ھ	"	منصورہ میں وفات پائی۔	طبری-ابن خرداذبہ

---

(1) عبدالملک بن شہاب: محمد سلیمان ہاشمی گورنر سندھ کی جانب سے اس کا نائب تھا۔

(1) کثیر بن مسلم قتیبہ: سعد بن مسلم بن قتیبہ (گورنر سندھ) کی جانب سے نائب تھے۔

(2) محمد بن تغلبی: داؤد بن یزید مہلبی کا نائب تھا، عرب قبائل کی بغاوت کو فرو نہ کر سکا اور ناکام لوٹا۔

(3) مغیر بن یزید مہلبی: بشر کے مقابلے میں ناکام ہو کر معزول ہوا۔

۳۲	عمران بن موسیٰ برمکی	"	۲۲۱ھ تا ۲۲۶ھ	معتصم	منصورہ میں قتل ہوئے۔	یعقوبی- بلاذری- ابن اثیر-ابن خرداذبہ
۳۳	عنبسہ بن اسحاق الضبی[4]	"	۲۲۷ھ تا ۲۳۵ھ	واثق	مستعفی ہوئے۔	بلاذری-یعقوبی
۳۴	ہارون بن ابی خالد المتروی	"	۲۳۵ھ تا ۲۴۰ھ	متوکا	منصورہ میں قتل ہوئے۔	یعقوبی-بلاذری

عباسیوں کے آخری دور کے گورنر جو ہباریوں کی حکومت (۲۴۰ھ تا ۴۱۶ھ) میں ہوئے۔

نمبر شمار	نام گورنر	حکومت	سنہ	عہد خلافت	نتیجہ	ماخذ
۱	عمر بن عبدالعزیز ہباری	سندھ	۲۴۰ھ تا ۲۷۰ھ	متوکل	منصورہ میں وفات پائی۔	یعقوبی- بلاذری- ابن خلدون
۲	ابوصمہ	"	۲۵۵ھ	"	چند ماہ میں قتل ہوا۔	بلاذری
۳	عبداللہ بن عمر ہباری	"	۲۷۰ھ تا ۳۰۰ھ	معتمد	منصورہ میں وفات پائی۔	بلاذری- عجائب الہند- مروج الذہب- ابن اثیر-تاریخ الخلفاء
۴	عمر بن عبداللہ ہباری	"	۳۰۰ھ تا ۳۳۰ھ	مقتدر	"	مروج الذہب
۵	محمد بن عبداللہ ہباری	"	۳۳۰ھ تا ۳۶۰ھ	المتقی	"	احسن التقاسیم- مروج الذہب
۶	علی بن عمر ہباری	"	۳۶۰ھ تا ۳۷۵ھ	الطائع	"	ابن حوقل- مروج الذہب
۷	(؟) نبی علی بن ہباری	"	۳۷۵ھ تا ۴۰۱ھ	القادر باللہ	منصورہ میں وفات پائی۔	احسن التقاسیم- مروج الذہب
۸	خفیف (سومرہ)[1]	"	۴۰۱ھ تا ۴۱۶ھ	"	منصورہ میں قتل ہوا۔	دیوان فرخی- فرشتہ- ابن اثیر-زین الاخبار

[4] عنبسہ وقتی طور پر گورنر تھے، تاوقتیکہ دوسرا گورنر نہیں آیا، جب ایتاخ (ترک) مارا گیا عنبسہ نے ڈر کر استعفیٰ دے دیا۔

[1] خفیف (سومرہ) خاندان کا پہلا بادشاہ۔

نوٹ:-ہم نے عرب گورنروں کی یہ مکمل فہرست تحفۃ الکرام (طبع راشدی) سے ص ۶۱۹ تا ۶۲۴ سے نقل کی ہے جو عبداللہ مبشر الطرازی الحسینی کی مرتب کی ہوئی ہے، جس کے لیے ہم محترمی سید حسام الدین راشدی کے بصمیم قلب شکر گزار ہیں۔

باب :16

شاہ حسن ارغون

۹۲۸ھ (۱۵۲۲ء) تا ۹۶۲ھ (۱۵۵۴ء)

یکم شوال ۹۲۸ (۱۵۲۲ء) کو شاہ بیگ کا بیٹا میرزا شاہ حسن اپنے باپ کی جگہ نصرپور میں مسند حکومت پر بیٹھا، جس دن وہ مسند نشین ہوا، چونکہ عید کا دن تھا اس لیے تمام امرا اور اراکین دولت نے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو آپ کا اسم گرامی خطبے میں شامل کیا جائے، یہ سنتے ہی شاہ حسن نے استغفر اللہ کہا اور اپنے اُمرا اور وزرا کو جواب دیا کہ جب تک کہ صاحب قرآن کی اولاد میں سے کوئی بھی شخص موجود ہے، ہمیں اس کے سامنے یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم اپنا نام خطبے میں شامل کریں، چنانچہ بابر کا نام خطبے میں لیا گیا۔

میرزا شاہ حسن کی ٹھٹھہ میں آمد:

پھر عید کا دن نصرپور میں گزار کر وہ ٹھٹھہ کی جانب روانہ ہوا جام فیروز نے حافظ رشید خوشنویس[1]، اور قاضی حاجی مفتی کو اس کی خدمت میں تحائف و ھدایا کے ساتھ بھیج کر اُس کے والد کی وفات پر اظہار تعزیت کیا اور نہایت عاجزی و انکسار کے ساتھ اپنے گزشتہ قصوروں کی معافی چاہی، لیکن ان قاصدوں نے تنہائی میں شاہ حسن کو بتایا کہ اگرچہ بظاہر تو جام فیروز نے آپ کے ساتھ اظہار اخلاص و نیاز مندی کی ہے لیکن وہ خفیہ طور پر سامان جنگ اور اسلحہ فراہم کر کے آپ کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے۔

شاہ حسن جام فیروز کے قاصدوں کو واپس جانے کی اجازت دے کر خود منزل بمنزل ٹھٹھہ کی طرف بڑھا، جام فیروز کو جب اس کی آمد کا علم ہوا تو وہ سمجھ گیا کہ اب خیر نہیں ہے، اس لیے اس نے اپنے میں مقابلے کی طاقت نہ پا کر مصلحت اس میں دیکھی کہ وہ ٹھٹھہ کو خالی کر کے دریا کے اس طرف چلا جائے، چنانچہ وہ ٹھٹھہ سے فرار ہو گیا، میرزا شاہ حسن نے اپنے لشکر کو دریا عبور کر کے ٹھٹہ میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ جب میرزا شاہ حسن کا لشکر دریا عبور کر رہا تھا، تو جام فیروز کے وزیر مانک اور اس کے داماد شیخ ابراہیم نے بارود اور کچھ سامان حرب لے کر اور کشتیوں میں کچھ توپچیوں اور تیر اندازوں کو بٹھا کر شاہ حسن کے لشکر کی کچھ مزاحمت کی، لیکن شاہ حسن کے جنگ جو اور بہادر جوانوں نے انہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا، جام فیروز مایوس اور ناکام ہو کر "کچھ" کی طرف چلا گیا اور وہاں کچھ مدت ٹھہر کر کچھی باشندوں کی فوج تیار کرتا رہا۔[2]

جام فیروز کی پچاس ہزار فوج:

جام فیروز موضع چاچکان اور راہمہ میں پہنچ کر تقریباً پچاس ہزار سوار اور پیدل فوج جمع کر کے شاہ حسن سے جنگ کے لیے تیار ہوا، سارے ٹھٹھہ میں اس کی کثرت فوج کا شور مچ گیا، اسی وقت امیر محمد مسکین ترخان، میر فرخ اور سلطان قلی بیگ اور دوسرے امرا نے شاہ حسن کو صورت حال سے مطلع کیا، شاہ حسن نے کچھ لوگ ٹھٹھہ کی حفاظت کے لیے چھوڑے اور خود اس کے مقابلے کے لیے نکلا، اور دریا پار کر کے جنگ کے لیے روانہ ہوا، کچھ دور چلنے کے بعد جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے اور جام فیروز کے لشکر نے شاہ حسن کے لشکر کو دیکھا تو گھوڑوں سے اُتر کر اپنی پگڑیاں سروں سے اُتاریں اور اس کے سروں سے باہم ایک دوسرے کی کمر باندھ کر خوفناک جنگ شروع کی، اس زمانے میں سندھ و ہند کے لوگوں کا یہ دستور تھا کہ جب وہ مرتے دم تک لڑنے کا ارادہ کرتے تھے تو گھوڑوں سے اتر کر ننگے سر ہو جاتے اور

---

[1] حافظ رشید خوش نویس: یہ جام نظام الدین اور جام فیروز کے زمانے میں مہارت خوش نویسی کے علمبردار تھے ان کا شمار وقت کے ممتاز افراد میں ہوتا تھا۔ (تحفۃ الکرام، اردو ترجمہ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۷۲۹)۔

[2] تاریخ معصومی، فارسی، ص ۱۴۱ تا ۱۴۳۔

پگڑیوں اور کمر بندوں سے ایک دوسرے کو باندھ لیتے۔

میرزا شاہ حسن نے سندھیوں کی فوج کی یہ حالت دیکھ کر اپنے امرا کو فتح کی بشارت دی اور سپاہیوں کو تیر کمان لے کر حملے کا حکم دیا اور خود گھوڑے سے اتر کر وضو کیا، اور دو رکعت نماز نفل پڑھ کر خدا سے اپنی فتح و نصرت کے لیے دعا کی، پھر وہ خود گھوڑے پر سوار ہوا اور اس نے اپنی فوج کو پوری طاقت سے دشمن پر ہلہ بول دینے کا حکم دیا، جس سے دشمنوں کی صف میں زلزلہ پیدا ہو گیا، صبح سے شام تک شدید لڑائی ہوتی رہی، تقریباً بیس ہزار آدمی اس لڑائی میں کام آئے اور جام فیروز شکست کھا کر گجرات کی طرف بھاگ گیا اور تمام عمر وہیں رہا،[1] اس طرح سمہ خاندان کی یہ برائے نام حکومت بھی سندھ میں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی اور سندھ صدیوں تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔

طاہر نسیانی نے تاریخ طاہری میں میرزا شاہ حسن کی تخت نشینی اور جام فیروز کی اس سے سرکشی کے حالات لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ جب میرزا شاہ بیگ نے وفات پائی اور شاہ حسن نصرپور میں تخت نشین ہوا، تو تمام امرا اور اراکین سلطنت نے مراسم تعزیت بجالا کر شاہ حسن کی تخت نشینی کے بعد اُسے مبارکباد دی اور رسوم اطاعت و بندگی بجا لائے، سوائے جامان سمہ کے کہ ان کے دل میں اس سے فرق پیدا ہو چکا تھا انہوں نے نہ تو شاہ بیگ کے مراسم تعزیت ادا کیے اور نہ شاہ حسن کو اس کی تخت نشینی کے موقع پر تحائف بھیج کر اظہار عقیدت و اطاعت کیا، بلکہ وہ شاہ بیگ کی موت کو ایک بہترین موقع جان کر اپنے موروثی ملک پر قبضہ جمانے کی فکر میں پڑ گئے، میرزا شاہ حسن ان کی یہ بیگانگی اور بے مروتی دیکھ کر سخت آزردہ ہوا، اور اس نے جام فیروز کو لکھا کہ یہ کون سی انسانیت و شرافت ہے، اور یہ کون سا طریقہ اتحاد و یگانگت، دوستی و فرمانبرداری ہے کہ وہ ولی نعمت (شاہ بیگ) جو تم سے انتہائی شفقت و مہربانی سے پیش آتا تھا، جب اس نے رخت حیات باندھا، اور رحمت حق سے پیوست ہو گیا اور اس کی وفات سے سلطنت کے بہی خواہوں اور دوستوں کے دل دکھی ہوئے، تو اس خاندان کے خیر خواہان سلطنت سے یہ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ اس جانکاہ حادثے کو جو اس ولایت کے حاکموں پر گزرا ہے، غنیمت جان کر فارغ البال اور مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں، اور وہ ملک جو ہم نے بزور شمشیر فتح کر کے اپنا ملک بنایا ہے، وہ اسے اپنی میراث سمجھ کر ہمیں خاطر میں بھی نہیں لاتے، یہ پہلی بزدلی اور نادانی کی بات ہے، جس کا ظہور پہلی مرتبہ ان بدبختوں کی طرف سے ہوا، اور جو رویہ انہوں نے اس موقع پر اختیار کیا ہے، اسے دیکھ کر ہمارا خیال ہے کہ یہی طریقہ بعد میں وہ ہمارے ساتھ اختیار کریں گے، اگر وہ اس خام خیالی کو اپنی دل میں جگہ دیے ہوئے ہیں کہ میں جس کا باپ مر گیا ہے، ہمیشہ اپنی اسی پریشانی میں غلطاں و پیچاں رہوں گا تو یہ غلط ہے، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری پہلی کوشش یہی ہو گی کہ ایسے خام خیالوں کی ایسی گوشمالی کریں کہ جو دوسروں کے لیے باعث عبرت و تنبیہ ہو، انہیں ہمارے اس ارادے سے غافل نہ رہنا چاہیے، ہم آج کل ہی میں کوہ پیکر جوانوں کے ساتھ آندھی کی طرح اُٹھیں گے اور اس تمام خس و خاشاک کو اڑا لے جائیں گے۔

لیکن جام فیروز پر میرزا شاہ حسن کے اس تہدیدی خط کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ بغاوت اختیار کر کے تیزی سے جنگ کی تیاریاں کرنے لگا، آخر شاہ حسن اپنے لشکر کے ساتھ طوفان کی طرح بڑھا اور ٹھٹھہ میں داخل ہوا۔

ٹھٹھہ میں قتل عام:

اور ٹھٹھہ میں داخل ہونے کے بعد اس نے جو قتل و خون کا بازار گرم کیا، اس کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے طاہر نسیانی لکھتا ہے کہ:

تا آنکہ میرزا شاہ حسن ارغون در شہر ٹھٹھہ قتل عام از بے سعادتی و بدبختی آں تیرہ روزاں چند نوعی نمود کہ بچہ از شکم زن حاملہ برسنان نوک نیزہ نہادند، و مردم نام ہر کہ در پیش آمد اورا از شمشیر خوں ریز کشیدند، فیروز نا پیروز، تیرہ روز پا برہنہ پیادہ، بصوب گجرات گریخت، زنان و فرزندان ایشاں اکثر از بیم مغل غرق در دریا گردیدند، و آنچہ ماندہ بہ بند افتادہ چناں ابتر و خراب گشتند کہ نصیب مومن و کافر مباد، نہ در بلدہ ہمیں حال، کہ تمام ملک از آن معموری ماضی رو بخرابی آورد، "خرابی سند" از ہمہ روز تاریخ یافتہ اند۔

(ترجمہ) یہاں تک کہ شہر ٹھٹھہ میں پہنچ کر شاہ حسن ارغون نے ان بدبختوں اور برگشتہ روزگاروں کی وجہ سے اس قدر قتل عام کیا کہ حاملہ عورتوں کے پیٹ سے بچے نکال کر انہیں نیزوں کی نوکوں پر چڑھایا اور نام کو بھی کوئی مرد انہیں ملا، اسے تلوار کی گھاٹ اتار دیا، بدبخت فیروز پا برہنہ پیدل گجرات کی طرف بھاگ گیا، ان کی اکثر عورتیں اور بچے مغلوں کے ڈر سے دریا میں غرق ہوئے اور جو باقی بچے وہ قید میں پڑ کر اس قدر تباہ و برباد ہوئے کہ خدا کرے کہ یہ دن دیکھنا کسی کافر و مومن کو

---

[1] تاریخ معصومی، فارسی۔ ص ۱۴۳-۱۴۴۔

نصیب نہ ہو، نہ صرف شہر کا یہ حال ہوا، بلکہ تمام ملک کی گزشتہ آبادی و شادابی تباہی و بربادی سے بدل گئی، اسی روز سے "خرابی سند" اس ملک نے تاریخ پائی۔

اُسی دن صحیح معنی میں سمہ حکومت کا چراغ گل ہو گیا اور میرزا شاہ حسن کی حکومت کی بنیاد پڑی۔[1]

ٹھٹھہ میں شاہ حسن کی حکومت:

ٹھٹھہ پر شاہ حسن نے قبضہ کرنے کے بعد سب سے پہلے سموں کو اس طرح کچلا کہ ان کا نام و نشان مٹا دیا، پھر جس کسی نے بھی اس کی اطاعت سے منہ موڑا، اس کے بدن پر اس کا سر سلامت نہیں رہنے دیا، اس ملک میں اس نے اپنی حکومت کو مستحکم کرنے اور اہل سندھ کی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط بنانے کے لیے وہ تدبیریں اختیار کیں، جو ہر فاتح مفتوحہ ممالک کے لوگوں کے ساتھ اختیار کرتا ہے، اس نے یہاں کے سربر آوردہ، سرداروں، عمایدین اور شمشیر زنوں سے اپنی تدبیروں سے شجاعت، بہادری، خود داری اور عزت نفس کے جوہر چھین لیے، سپاہیانہ اور بہادرانہ پیشوں سے ہٹا کر انہیں باغبانی، کسانی اور دوسرے اسی قسم کے پیشوں میں ڈالا، اس طرح ان کے ہاتھ میں بجائے شمشیر کے زراعت کا کدال نظر آنے لگا، اور بجائے خنجر کے انہوں نے کھرپے اور درانتی کو گھاس کاٹنے کے لیے کمر میں لگایا، کبھی نیزے جو ان کے کندھے پر رہتے تھے، اب اس کی جگہ ہل ان کے کندھوں پر نظر آتے تھے، گھوڑوں کی سواری کے بجائے، اب وہ کھیتی کے لیے بیلوں کو ہانکتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ شاہ حسن اپنی تدبیروں سے انہیں اس منزل میں لے آیا کہ حکومت کا سودا ان کے دماغ سے نکل گیا، عزت نفس اور قومی احساس ان سے رخصت ہوا۔ اور وہ محض غلام ہو کر رہ گئے، خال خال اگر کوئی غلامی کے ان طریقوں کے اختیار کرنے سے منہ موڑتا ہوا نظر آتا تھا تو میرزا اسے زندہ نہیں چھوڑتا تھا، اس نے ملک میں مغلوں کی ہیبت اس قدر بٹھائی کہ زرہ پوش مغلوں کو دیکھ کر ان کا پتا پانی ہوتا تھا اور ان کے خوف سے عورتوں کے حمل گر جاتے تھے۔[3]

جب شاہ حسن نے ٹھٹھہ کے لوگوں کو اسٹیم رولر کی طرح اچھی طرح کچل لیا اور ان کی آزادی کے سارے کس بل نکال دیے اور انہیں غلامی کی خو کا عادی بنا لیا، تو پھر وہ نظم و نسق کی طرف متوجہ ہوا۔

نظم و نسق کی بحالی:

سب سے پہلے شاہ حسن نے رعیت و رعایا کی دل جوئی کی فکر کی اور اُن کے زخمی دلوں پر مرہم رکھا اور رعایا کے ساتھ رعایت و مروت کا طرز اختیار کیا، اس کے کشت و خون کے دور کے ویرانے آبادی سے بدلنے لگے، اس کی اس پالیسی کی تبدیلی سے اہل سندھ نے اطمینان کا سانس لیا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا وہ دوزخ سے نکل کر ایک دم جنت میں آ گئے۔

شاہ حسن کی سیاست کے تقاضے:

اب شاہ حسن نے اپنی سیاست کو ایک قدم اور آگے بڑھایا، اس نے محسوس کیا کہ اب تک گرد و نواح کے لوگ میرے ظلم و ستم کا تماشا دیکھتے رہے ہیں، لیکن مجھے اپنی مروت و دلداری کے کرشمے بھی انہیں دکھانے چاہئیں، تاکہ یہ مانوس ہوں اور ملک کے نظم و نسق میں کوئی خلل واقع نہ ہو، چنانچہ وہ ٹھٹھہ اور ملتان کے درمیان جو دیہات اور شہر واقع تھے، کبھی ان میں خشکی کے راستے سے اور کبھی کشتی میں دریائی راستے سے جاتا تھا، اور ان دیہات و قصبات اور شہروں میں قیام کر کے وہاں کے لوگوں کو تسلی و تشفی دیتا اور اس طرح اس بد ظنی کو دور کرتا تھا جو لوگوں کے قلوب میں اس کے سابقہ طرز عمل سے پیدا ہو گئی تھی۔

پھر اس نے اپنے سیاست کے دامن کو اور بھی وسیع کیا، اسے خیال پیدا ہوا کہ شہر ساموئی کے وہ لوگ جو اس شہر پر قبضہ ہونے کے بعد کچھ کی طرف بھاگ گئے ہیں اور وہاں مقیم ہو گئے ہیں، انہیں رام کرنا چاہیے، ورنہ وہ ہمیشہ اس کی حکومت کے لیے خطرہ بنے رہیں گے، چنانچہ اس نے ایک خط کنگار سمہ نامی زمیندار کچھ کو اس مضمون کا لکھا کہ: تمہیں معلوم ہے کہ ایک مدت سے ہم تمہارے بھائیوں کے اس ملک کو فتح کر چکے ہیں اور ہم نے اس ملک کو خس و خاشاک سے پاک صاف کر دیا ہے، اب تمہارے لیے مناسب ہے کہ "کچھ" کے بہترین گھوڑے جن کی بہت شہرت سنی جاتی ہے، ہمارے لیے لے کر آؤ، اور ہم سے نوکریاں اور مناصب حاصل کر کے اس ملک میں جو تمہارا وطن ہے اطمینان سے رہو، اور ہم سے قریب رہ کر تم جو اپنی نادانی اور غفلت کی بنا پر ہماری ہمسری اور برابری کا خیال رکھتے ہو، اسے اپنے دل سے نکال دو، اگر تمہیں ہماری اطاعت و فرمانبرداری منظور ہو تو تمہارے لیے مناسب ہے کہ بیش بہا تحائف کے ساتھ اپنی گزشتہ کوتاہیوں اور قصوروں پر تحریری طور پر اظہار ندامت

---

[1] تاریخ طاہری، ص ۶۱-۶۲۔

[2] ماخوذ از تاریخ طاہری، ص ۶۳-۶۴۔

کر کے پھر ہماری قدم بوسی کی سعادت حاصل کرو اور اس ملک کو اپنے لیے امن کی جگہ اور اپنا موروثی ملک سمجھو، ورنہ خوب یاد رکھو کہ ہمارا ارادہ احمد آباد اور گجرات کا ہے، جب ہم اس طرف روانہ ہوں گے تو اسی طرف ہی سے گزریں گے اور خود سری کی وہ ہوا جو تمہارے دماغوں میں سما گئی ہے، اسے تمہارے دماغوں سے نکال دیں گے۔

جب شاہ حسن کا یہ خط کنگار سمہ زمیندار کچھ کو ملا، جس میں ملاطفت اور دھمکیاں دونوں موجود تھیں، تو اس نے شاہ حسن کو اس کے جواب میں ایک سخت خط لکھا، جس کا مضمون یہ تھا کہ: ہم پہاڑی لوگ مثل پتھر کے ہیں، جو اپنی عزت و ناموس کی حفاظت خوب جانتے ہیں ہم اپنی معمولی روزی پر قناعت کیے ہوئے ہیں، ہم میں یہ استطاعت کہاں ہے کہ ہم گھوڑے اور قیمتی اجناس اپنے ملک سے حاصل کر کے تمہارے لیے تحفہ میں بھیجیں، ہمارے گزر اوقات کی یہ صورت ہے کہ ہم بعض ننگے بھوکے راجپوتوں کو لوٹ مار کر لیے سندھ اور گجرات کی طرف بھیجتے ہیں، وہ تلوار کے زور سے جو کچھ لوٹ مار کر لے آتے ہیں، اسی پر ہماری گزر بسر ہوتی ہے، اس کے بعد بھی جو شخص اپنے ننگ و ناموس کے شیشے کو اس پتھر سے چکنا چور کرنا چاہے اور اپنے شیشے کے اس سنگ خارہ پر ٹپکے، اپنے مال و متاع کو ان رہزنوں کے سپرد کرے، تو اس کی اپنی مرضی ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوگی کہ خدائے تعالیٰ کسی کی روزی کو اس کے پاؤں پر اس کے گھر بھجوائے، ہم آپ کی آمد کے منتظر ہیں۔

اس خط کا لہجہ جس قدر طنز آمیز ہے، اس نے میرزا شاہ حسن کی غیرت پر تازیانے کا کام کیا، وہ فوراً لشکر کے ساتھ روانہ ہو گیا، باوجود اس مردانگی اور شجاعت کے جو یہ راجپوت اپنے میں رکھتے تھے، میرزا شاہ حسن کے لشکر کا سامنا نہ کر سکے، مگر اتنا ضرور کرتے تھے کہ شاہ حسن کے لشکر پر راتوں کو شب خون مارتے تھے، اور ان کنوؤں اور تالابوں میں جو میرزا شاہ حسن کے راستے میں پڑتے تھے، مردہ چوپائے اور تھوہر ڈال کر پانی کو زہریلا اور ناقابل استعمال بنا دیتے تھے اور اس کارروائی کے بعد پہاڑوں میں چھپ جاتے تھے، لیکن میرزا کا لشکر بھی اس قدر مستعد تھا کہ وہ فوراً بیلداروں اور سنگ تراشوں کو بلا کر کنویں تیار کرتا تھا، اور پانی کی کمی لشکر کو محسوس نہ ہونے دیتا تھا، یہاں تک کہ میرزا کے لشکریوں نے اس ملک کی اکثر آبادیوں کو جلا دیا اور بڑھتے بڑھتے جرگ اور جرگی کے دو چشموں تک پہنچ گئے، آخر ان سرکشوں نے بیچ میں سفارشی ڈال کر صلح کی اور سالانہ خراج دینا منظور کیا، جب میرزا ان کی شورش سے مطمئن ہو گیا تو پھر وہ ٹھٹھہ لوٹ آیا اور اس نے ملتان کا قصد کیا۔[1]

فتح ملتان کا عزم:

تاریخ معصومی میں ہے کہ فتح ملتان سے پہلے اس نے چاہا کہ ارغون، تکدری اور ہزارہ قبائل کے لوگوں کے خدشے سے مطمئن ہو جائے جو ولایت سیوی میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے تھے، چنانچہ وہ ایک ہزار سواروں کے ساتھ یلغار کرتا ہوا سیوی پہنچا اور وہاں اس نے قلعے کی مرمت کرا کر اپنے قابل اعتماد لوگوں کو متعین کیا، واپسی میں وہ روہڑی اور چتر کے راستے سے لوٹا اور رند اور بگٹی بلوچوں پر حملہ آور ہو کر اس نے انہیں مطیع و منقاد بنایا، اور ان سے عہد و پیمان لے کر انہیں آزاد کیا اور اُن کے وڈیروں اور سرکردہ لوگوں کو ساتھ لے کر بکھر آیا۔[2]

بابر کی ہندوستان پر فوج کشی:

اسی زمانے میں جب کہ میرزا شاہ حسن بکھر میں مقیم تھا، بابر کی ہندوستان پر فوج کشی کی خبریں مشہور ہوئیں، میرزا شاہ حسن نے فوراً ہی بیش بہا تحائف اپنے قاصدوں کے ذریعے سے بابر کی خدمت میں روانہ کیے، جس زمانے میں کہ وہ بابر کی خدمت میں رہا کرتا تھا، اس نے میر خلیفہ کی بیٹی سے جو کہ بابر کے دربار میں "دیوان بیگی" اور وکیل تھا، اپنی شادی کی سلسلہ جنبانی کی تھی، اور بابر نے اسے منظور بھی کر لیا تھا، اس موقع پر شاہ حسن نے اس رشتے کو مستحکم بنانے کے لیے عبدالباقی کی دادی مسمات شاہ سلطانی کو جو کہ سید جعفر کی اولاد میں سے تھی، بابر کے پاس اس مقصد کے لیے بھیجا، بابر نے ولی بن کر میر خلیفہ کی بیٹی گلبرگ "بیگم" کو شاہ حسن کے نکاح میں دے کر میر خلیفہ کے چھوٹے بیٹے میر حسام الدین میرک کے ساتھ اسے بکھر روانہ کیا، شاہ حسن نے اس سے نکاح کر کے اسے حرم میں داخل کیا اور باغبان اور پاتر کا پرگنہ میر حسام الدین میرک کو بطور مہمانی دیا۔[3]

قلعہ سیورائی کی فتح:

۹۳۱ھ (۲۵-۱۵۲۴ء) کو میرزا شاہ حسن ملتان فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا، تاریخ طاہری میں ہے کہ اس نے اپنا لشکر خشکی کی راہ سے بھیجا،

---

[1] یہ تمام تفصیل تاریخ طاہری مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۶۴-۶۷ سے ماخوذ ہے۔
[2] تاریخ معصومی، فارسی - ص ۱۴۶-۱۴۷۔
[3] تاریخ معصومی، ص ۱۴۷۔

اور خود کشتی سے روانہ ہوا،[1] معصومی میں ہے کہ اس نے سب سے پہلے قلعہ سیورائی پر یورش کی اور حکم دیا کہ اس قلعے کو زمین کے برابر کر دیا جائے، چنانچہ ایک ہفتے میں یہ قلعہ زمین کے برابر کر دیا گیا، پھر اس نے قلعہ مئو کا رخ کیا، وہاں شیخ روح اللہ کے صاحبزادے شیخ حماد نے جو اس دور کے بزرگوں میں تھے حاضر ہو کر شاہ حسن سے اہل قلعہ کی پریشانی بیان کر کے ان کی سفارش کی، شاہ حسن نے میرزا مسکین ترخان کو حکم دیا کہ وہ قلعے میں جا کر وہاں کا معائنہ کرے، لانگوں اور بلوچوں میں سے جو آدمی قلعے کے اندر ہوں، انہیں گرفتار کر کے حاضر کرے، اور جو اہل خانہ شیخ حماد کی خانقاہ میں پناہ لیں، ان سے مطلقاً تعارض نہ کرے۔ مسکین ترخان نے ان لوگوں کو چھوڑ کر جنہوں نے خانقاہ میں پناہ لی تھی، باقی سپاہیوں کو گرفتار کر کے میرزا شاہ حسن کی خدمت میں حاضر کیا، شاہ حسن اس کے دو تین دن بعد قلعے کے اندر گیا، اور وہاں کے بزرگان کرام کے مزارات کی زیارت کر کے مئو کے مشائخ سے عہد لیا کہ ہمارے جو بھی آدمی اس قلعے میں آئیں گے، وہ ان سے کسی قسم کا تعارض نہ کریں گے، اور ہمارے مخالفوں کو وہ اپنے پاس پناہ نہ دیں گے، اس موقع پر شیخ روح اللہ نے رحموڈھر کے قصور معاف کرنے کی درخواست کی، چونکہ اس کی رنجش سلطان محمود خان سے تھی، شاہ حسن نے جواب دیا کہ اس معاملے کا تعلق سلطان محمود خان سے ہے، کیونکہ اس کے دو بھائی انہیں لوگوں کی بدولت ضائع ہوئے ہیں، اس لیے سلطان محمود اور رحموڈھر اس معاملے کو آپس میں طے کر سکتے ہیں، پھر کچھ مصلحت سمجھ کر شاہ حسن نے رحموڈھر کو طلب کیا، وہ تلوار گلے میں حمائل کر کے حاضر ہوا، سلطان محمود خان بکھری نے اس کا قصور معاف کر دیا، قصور کے معاف ہونے کے بعد رحموڈھر نے درخواست کی کہ اس کی بھتیجی حرم سرا کی کنیزوں میں شامل کی جائے، چنانچہ اس کی یہ درخواست بھی منظور ہوئی، اور جام جیون ڈھر کی بہن سلطان محمود خان کے حوالے کی گئی۔[2]

اُچ کی جنگ:

مئو سے روانہ ہو کر میرزا شاہ حسن لاڑ کی سرحد کے قریب پہنچا، وہاں سے سیدھا اُچ کی طرف روانہ ہوا، اُچ میں لانگوں اور شاہ حسن کے لشکر کی شدید جنگ ہوئی، لانگوں کے لشکر کی تعداد شاہ حسن کے لشکر سے سو گنا زیادہ تھی۔ شدید لڑائی کے بعد آخر لانگوں کو شکست ہوئی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ شاہ حسن کی فوج شہر کی طرف بڑھی، اور انہوں نے قلعے کا دروازہ توڑ کر خوفناک جنگ شروع کر دی، لانگوں کا انبوہ قلعے پر چڑھ کر ان پر تیر اور پتھر برسانے لگا، شاہ حسن کی فوجوں نے ان کی فوجوں کے سرداروں کے سر جو اس جنگ میں مارے گئے تھے، نیزوں پر بلند کر کے ان کو دکھائے، جس پر قلعے کے لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی اور شاہ حسن کی فوجیں اُچ کے قلعے میں داخل ہو گئیں اور قتل عام شروع کر دیا اور خوب لوٹ مار مچائی۔ قلعے اور شہر کی تباہی کو دیکھ کر سید زین العابدین بخاری، شیخ ابراہیم، شیخ اسماعیل جمالی، قاضی ابو الخیر اور قاضی عبدالرحمان حاضر ہو کر شاہ حسن کو شہر کی تباہی کی صورت حال سے واقف کرا کر رحم کے خواستگار ہوئے، اس وقت شاہ حسن نے حکم دیا کہ آج کے بعد کسی کو قتل نہ کیا جائے، جو قیدی ہیں ان کو چھوڑ دیا جائے اور جو لوگ ہماری حکم عدولی کریں، ان کے سر تن سے جدا کیے جائیں، پھر اس نے قلعے اور عمارتوں کو مسمار کرنے کا حکم دیا اور ان عمارتوں کی لکڑیاں کشتیوں میں بھروا کر بکھر لایا۔[3]

سلطان حسین لانگا اور شاہ حسن کا معاہدہ:

جب اُچ کی فتح کی خبریں ملتان کے حاکم سلطان محمود لانگا کو ملیں تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا اور اس نے بلوچوں، جتوں، رندوں، دودائیوں، کورائیوں، چانڈیوں اور دوسرے سپاہیوں کا لشکر جمع کرنے کے لیے چاروں طرف قاصد بھیجے، اس کی اس کوشش سے تقریباً اسی ہزار سوار اور پیادہ ملتان میں جمع ہو گئے، اور سلطان محمود بڑے زور شور کے ساتھ اس لشکر کو لے کر میدان جنگ کی طرف روانہ ہوا، ادھر میرزا شاہ حسن "گھارہ واہ" کے اس طرف فروکش ہو کر اس کا انتظار کرنے لگا۔

سلطان محمود لانگا ابھی راستے ہی میں تھا کہ شیخ شجاع بخاری جو اس کا داماد بھی تھا اور جسے امور ملکی و مالی میں بڑا اقتدار حاصل تھا، اس کی بعض خیانتیں سلطان محمود کے علم میں آئیں، جس سے وہ نہایت برہم ہوا، وہ لوگ جو شاہ شجاع کے ساتھ ان خیانتوں میں شریک تھے، انہوں نے اپنی عافیت اسی میں دیکھی کہ وہ زہر ہلاہل جو شاہی خزانے میں دوسروں کے لیے رکھا ہوا تھا موقع پا کر اسے پلا دیا، جس کا آدھا گھونٹ پیتے ہی اس کا

---

[1] تاریخ طاہری، ص ۶۵۔

[2] تاریخ معصومی، ص ۱۵۰-۱۵۱-۱۵۲۔

[3] تاریخ معصومی، ص ۱۵۲-۱۵۳۔

کام تمام ہو گیا، اس کی وفات سے لشکر میں تفرقہ پڑ گیا، لیکن لانگاہوں نے کسی نہ کسی طرح اس افتراق کی آگ کو دبا کر سلطان محمود کے بیٹے سلطان حسین لانگاہ کو تخت پر بٹھایا، حالات اس قدر ابتر ہو چکے تھے کہ سلطان حسین کے لیے سوائے صلح کے کوئی چارہ نہ تھا، اس لیے اس نے مخدوم زادہ شیخ بہاؤ الدین کو صلح کے لیے درمیان میں ڈالا، یہ بزرگ "گھارہ واہ" کے کنارے میر زاشاہ حسن سے آکر ملے، میر زاشاہ حسن ان کے ساتھ نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آیا اور صلح کی عرضداشت منظور کرلی، آخر معاہدہ لکھا گیا، جس کی رو سے طے پایا کہ "گھارہ واہ" جو نہر ملتان اور بکھر کے درمیان بہتی ہے، آج کے بعد دونوں حکمران ان حدود سے آگے نہ بڑھیں گے، مخدوم زادہ شیخ بہاؤ الدین کی رخصت کے بعد میر زاشاہ حسن نے "اُچ" میں دوسرا قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا، چنانچہ یہ قلعہ تعمیر کیا گیا۔[1]

قلعۂ دلاور کی فتح:

ان ہی دونوں سلطان محمود لانگاہ کا ایک ملازم اقبال خان نامی میر زا شاہ حسن کے ہاں بازیاب ہوا، اور اُس نے میر زا شاہ حسن کو یہ کہہ کر دلاور کے قلعے کی فتح کرنے کی طرف ترغیب دلائی کہ اس قلعے میں خزانے مدفون ہیں، میر زاشاہ حسن نے اس قلعے کے حاکم غازی خان کو لکھا کہ تم ہماری اطاعت قبول کرو اور ہمارے سامنے قلعے کے تمام آدمیوں کے ساتھ حاضر ہو، مگر غازی خان نے اس کی پروانہ کی، آخر میر زاشاہ حسن نے فوجوں کو حکم دیا کہ وہ ایک ماہ کا غلہ اور رسد فراہم کر کے دلاور کی مہم کے لیے مستعد ہوں، پھر خود اس نے سنبل خان، خاصہ خیلوں کے سواروں، توپچیوں اور پیادوں کو ساتھ لے کر، مورچے تقسیم کیے اور قلعے کو گھیرے میں لے لیا، جب محاصرے کو کچھ مدت گزری تو اہل قلعہ نہایت پریشان ہوئے اور اس ناکہ بندی سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ اہل قلعہ کو انتہائی کوششوں کے باوجود اُبلا ہوا چنڑہ بھی میسر نہ ہوتا تھا، اسی اثنا میں سنبل خان اور اس کے ساتھیوں نے دو طرف سے سرنگیں لگا کر قلعے کی فصیل اور برجی مسمار کر دی، اور اہل قلعہ نے موت کو سامنے دیکھ کر آگ کی ہانڈیاں اور انگارے پھینکنے شروع کیے، جب جنگ نے شدت اختیار کی تو میر زا شاہ حسن کے بہادر فوجیوں نے ڈھالوں کو سروں پر باندھا اور قلعے کی فصیلوں اور برجیوں پر جا پہنچے، بہت سے قلعے کے لوگ قتل اور زخمی ہوئے اور باقی ماندہ گرفتار ہوئے۔ قلعے کے فتح ہونے کے بعد میر زاشاہ حسن نے وہاں کے خزانوں اور دفینوں کا جائزہ لینے کے لیے اپنے معتمد لوگوں کو متعین کیا اور دوسرے دن صبح کو بہت سا سونا اپنے سپاہیوں میں تقسیم کر کے، باقی سونے کا بڑا حصہ خزانے میں محفوظ کیا، پھر وہاں سے وہ بکھر آیا اور یہاں اس نے اس فتح کا جشن منایا۔[2]

فتح ملتان:

ادھر سلطان محمود لانگاہ کی وفات کے بعد اس کے اُمرا اور خاندان میں عداوت و اختلاف کی آگ بھڑک اُٹھی، ہر ایک امیر اس درجہ خود سر ہوا کہ وہ دوسرے کی اطاعت کرنے کو تیار نہ ہوتا تھا، ملک کا نظم و نسق برباد ہو گیا، نو عمر فرمانروا سلطان حسین لانگاہ شیخ شاہ شجاع بخاری کے ہاتھوں کٹھ پتلی اور عورتوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گیا تھا، اسے ملک کی حکومت اور نظم و نسق سے کوئی واسطہ نہ تھا، پورا ملک بدامنی، انتشار، مفلوک الحالی اور ظلم و زیادتی کا شکار تھا، سارے ملک کی حالت اس قدر ابتر ہو چکی تھی کہ اپنے اور بیرونی حکومت کا امتیاز بھی عوام و خواص کے دماغ سے نکل گیا تھا، انہیں یہ فکر تھی کہ اپنا ہو یا پرایا کوئی بھی ہو جو آکر اس برباد شدہ نظم و نسق کو درست کرے، چنانچہ سب سے پہلے لنگر خان نے میر زاشاہ حسن کی خدمت میں حاضر ہو کر اسے ملتان کے حالات سے واقف کرایا، اور میر زا کو مشورہ دیا کہ اسے یہ شہر ضرور فتح کرنا چاہیے۔ اس کے مشورے پر ۹۳۲ھ (۱۵۲۵-۲۶ء) کے اواخر میں میر زا نے آمادہ ہو کر مسکین ترخان کو پہلے بطور قراول کے روانہ کیا، لانگاؤں کو جب ارغون لشکر کی آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے اس دور کے ایک بزرگ شیخ اسماعیل قریشی کو صلح کا پیامی بنا کر شاہ حسن کے پاس بھیجا، اگرچہ شاہ حسن ان کے ساتھ نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آیا، لیکن صلح کی گفتگو ناکام رہی، پھر میر زا منزلیں طے کرتا ہوا ملتان کی طرف روانہ ہوا، لانگاؤں میں اس کی آمد کی خبر سن کر اس قدر خوف و ہراس پیدا ہوا کہ وہ ملتان آگئے، سب سے پہلے لنگر خان نے میر زا کی فوجوں کی مدد سے "بھٹی کھلوان" کو تاخت و تاراج کیا، اور وہاں سے بہت سا غلہ اور مویشی لوٹ کر میر زا کے لشکر میں لایا اس کے بعد میر زا کی فوجوں نے ملتان کا محاصرہ کر کے لڑائی شروع کر دی۔ والی ملتان نے اپنے ایک بھائی کو شیخ شجاع بخاری کے ساتھ روانہ کر کے میر زا سے اطاعت و فرمانبرداری قبول

---

[1] تاریخ معصومی، ص ۱۵۲-۱۵۳۔

[2] تاریخ معصومی، فارسی- ص ۱۵۵-۱۵۶۔

کرنے کا اظہار کیا، میرزا نے انہیں نہایت عزت سے رخصت کیا اور کہا کہ اپنے بھائی سے کہو کہ ہم سے قلعے سے باہر آکر ملے اور اطاعت قبول کرے، تاکہ ہم اسے اپنی نوازشوں سے نوازیں، اور قلعہ اس کے حوالے کر کے واپس جائیں، لیکن اس پیغام کے بعد وہ سرکشی کی بنا پر نہیں آیا اور لانگاؤں نے جنگ کی آگ کو بھڑکایا، اور ایک دم وہ خلاف توقع قلعے سے باہر نکل کر حملہ آور ہوئے، اور میرزا شاہ حسن کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا، اس حرکت پر میرزا شاہ حسن کو نہایت طیش آیا اور اس نے قلعہ ملتان کے مشرقی دروازے "شمس" کے سامنے خیمہ زن ہو کر اور مورچے قائم کر کے محاصرے کو سخت کر دیا۔ دونوں طرف سے جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے، محاصرے کی شدت کا یہ نتیجہ ہوا کہ ملتان میں سخت قحط پڑ گیا، یہاں تک کہ بلی اور کتا بھی ملتانیوں کے ہاتھ پڑ جاتا تو اس کو وہ حلوا سمجھ کر کھا لیتے تھے۔ لانگاؤں میں اخلاقی پستی اس قدر پیدا ہوئی کہ "جاڑوما جھی" کو جسے شیخ شجاع نے تین ہزار دیہاتی پیادوں کا سردار بنا کر قلعے کی نگرانی پر متعین کیا تھا، اس نے اس قدر لوٹ مار مچائی کہ اسے جس گھر میں اناج کا شبہ بھی ہو جاتا تھا، وہ فوراً جا کر اس غریب کے گھر کو لوٹ لیتا تھا، لوگ اس نامناسب روش سے تنگ آکر لانگاؤں کی سلطنت کے لیے بددعا کرنے لگے، یہ محاصرہ ایک سال تک جاری رہا، یہاں تک کہ قحط کی مصیبتیں انتہا کو پہنچ گئیں۔

یہاں تک کہ ۱۱ ربیع الثانی ۹۳۳ھ (۱۵۲۷ء) کو ارغونوں نے ایک بھرپور حملہ کیا اور یہ لوہی دروازہ توڑ کر شہر میں داخل ہو گئے،[1] پھر جو ارغونوں کے ہاتھوں ملتان پر تباہیاں نازل ہوئیں، اس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے تاریخ طاہری کا مولف سید طاہر محمد نسیانی لکھتا ہے کہ: ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ارغون قیامت بن کر آسمان سے ملتان کی سرزمین کے غریبوں اور امیروں پر نازل ہوئے ہیں، وہ افراتفری ملتان کے شہریوں اور سپاہیوں میں مچی کہ باپ بیٹے سے، بھائی بہن سے، بلکہ ہر شخص اپنے سایے سے بیزار نظر آتا تھا اور اس قیامت خیز تباہی سے اپنی جان سلامت لے جانے کو بہت غنیمت سمجھتا تھا، بہت سی عورتیں کہ جنہوں نے نامحرموں کا منہ تک نہ دیکھا تھا، اور جن کا سایہ عصمت کبھی زمین پر بھی نہ پڑا تھا اور جن کی آوازیں کبھی غیر کانوں نے نہ سنی تھیں قیدی بنائی گئیں۔[1]

معصومی میں ہے کہ ارغونوں نے سات سال سے لے کر ستر سال تک کی عمر کے لوگوں کو قید کیا، لوگوں پر قیامت کا سا حادثہ گزرا، لوگوں نے خانقاہوں میں پناہ لی تو انہیں وہاں بھی تلوار کے گھاٹ اُتارا گیا، اس قتل عام میں لانگاؤں اور ملتانیوں کا لشکر ختم ہو گیا، اس قتل و غارت گری اور لوٹ مار میں بے شمار خزانے اور جواہرات ارغونوں کے ہاتھ لگے، تب جا کر شاہ حسن کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور اس نے ملتان کی باقی ماندہ رعایا کو معاف کر کے حکم دیا کہ مقتولوں کو اٹھا کر گڑھوں میں دفن کیا جائے اور اب کسی سے تعارض نہ کیا جائے۔

اس کے بعد مخدوم زادہ شیخ بہاؤ الدین نے سلطان محمود لانگاہ کی بیٹی اور اس کے بیٹے کو میرزا شاہ حسن کی خدمت میں پیش کیا، میرزا نے ان دونوں کو مسکین ترخان کو دے دیا، مسکین ترخان نے اس کی بیٹی سے باقاعدہ نکاح کر لیا، اور اس کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنا لیا۔

پھر میرزا ملتان میں دو ماہ قیام کر کے دوست میر اخور اور خواجہ شمس الدین ماحونی کو وہاں کا حاکم مقرر کر کے بکھر آیا، اور سلطان محمود خان بن فاضل کو کلتاش کو بکھر کا حاکم مقرر کیا اور اس صوبے کا انتظام جس کی سرحدیں سیوہن سے لے کر ملتان تک اور سیوی اور گنجاوا تک تھیں اس کے سپرد کیا۔[3] دوست میر اخور، خواجہ شمس الدین اور لنگر خان ایک سال ملتان میں رہے، پھر لنگر خان علیحدہ ہو کر بابر کی خدمت میں حاضر ہو گیا، اس خبر کے ملتے ہی میرزا شاہ حسن نے ایک عرضی بابر کی خدمت میں روانہ کی اور ملتان بابر کی نذر کیا، جس کے بعد دوست میر اخور اور خواجہ شمس الدین بکھر واپس آگئے اور بابر نے ملتان میرزا کامران کو عطا کیا۔[4]

کھنگار کی مخالفت:

میرزا شاہ حسن بکھر ہی میں تھا کہ اسے ٹھٹھہ کے امرا کی یہ عرضداشت ملی کہ کھنگار ٹھٹھہ پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میرزا شاہ حسن اس عرضداشت کے ملتے ہی یلغار کرتا ہوا ٹھٹھہ کی حدود میں داخل ہوا، کھنگار نے اپنے قاصد کے ذریعے سے میرزا کو کہلایا کہ چونکہ آپ نے میرے بھائی آمر آمرانی کو قتل کیا ہے، اس کے خون کا بدلہ لینے کے لیے لوگ میرے گرد جمع ہوئے ہیں، لیکن چونکہ آپ ملتان گئے ہوئے تھے اس لیے میں نے احتراماً آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے اہل و عیال پر

---

(1) تاریخ معصومی، ص ۱۵۷-۱۵۸۔

(2) تاریخ طاہری، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۷۲۔

(3) تاریخ معصومی، ص ۱۵۹-۱۶۰۔

(4) ایضاً۔ ص ۱۶۰۔

حملہ نہیں کیا، اب آپ ہم سے یا تو صلح کر کے سندھ کا کچھ علاقہ ہمیں دیں یا ہم سے جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ میرزا شاہ حسن نے اسے جواب میں کہلا بھیجا کہ ہم جنگ کے سوا کوئی دوسری بات نہیں جانتے، آمر آمرانی کے خون سے ہم نے جس میدان کو رنگین کیا تھا، ابھی وہ میدان اور خون کا مطالبہ کرتا ہے، قبل اس کے کہ تم ادھر کا رخ کرو، ہم خود ہی تمہارے مقابلے کے لیے آرہے ہیں۔

اس کے بعد میرزا شاہ حسن اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے لیے کچھ لوگ چھوڑ کر "کچھ" کی طرف روانہ ہوا، دونوں فوجوں کا شدید مقابلہ ہوا، اس جنگ میں مرزا شاہ حسن کی طرف سے سلطان محمود اور میرزا فرخ نے شجاعت کے نمایاں کارنامے انجام دیے، کھنگار کی فوجوں کو شکست ہوئی۔ میرزا کے لشکر نے صبح کو دیہات و قصبات کا رخ کیا اور خوب قتل و غارت کا بازار گرم کیا، بیشمار اونٹ، گھوڑے، مویشی اور دوسرا سامان میرزا کے فوجیوں کے ہاتھ لگا، اور میرزا شاہ حسن فاتح و کامران ہو کر ٹھٹھہ لوٹ آیا۔

میرزا شاہ حسن کا پٹن پر حملہ:

۹۴۲ھ (۳۶-۱۵۳۵ء) میں ہمایوں نے چتوڑ پر حملے کا قصد کیا، اس موقع پر سلطان محمود بہادر گجراتی نے چتوڑ کے بادشاہ کی سفارش کے سلسلے میں ایک خط لکھا، جس میں بعض جملے سخت بھی تھے، جو ہمایوں کو سخت ناگوار گزرے، جس پر ہمایوں چراغ پا ہو کر سلطان محمود گجراتی پر حملہ کرنے کے ارادے سے یلغار کرتا ہوا گجرات پہنچا، سلطان محمود گجراتی اس خبر کے سنتے ہی قلعہ بند ہو گیا۔

اس فوج کشی کے موقع پر ہمایوں نے میرزا شاہ حسن کے نام فرمان بھیجا کہ وہ وفاداری کے طریقے کو ملحوظ رکھتے ہوئے خود کو فی الفور سندھ سے پٹن پہنچائے اور وہاں پہنچ کر عرضداشت پیش کرے، پھر ہم جو حکم دیں اس کے مطابق عمل کرے، چنانچہ میرزا شاہ حسن ہمایوں کے اس فرمان کے ملتے ہی ایک لشکر جرار کے ساتھ نصرپور سے روانہ ہو کر براہ رادھن پور پٹن کے حدود میں جا پہنچا، پٹن کا قلعہ دار خضر خان اس کی آمد کی خبر سن کر قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا، سلطان محمود خان جو اس مہم میں میرزا شاہ حسن کے ساتھ تھا پانسو سوار لے کر آگے بڑھا اور بعض قصبوں کو لوٹتا ہوا پٹن سے سات کوس کے فاصلے پر منزل انداز ہوا۔ اس نے ایک طرف تو جان علی شقراق کو میرزا شاہ حسن کی خدمت میں بھیجا اور دوسری طرف جنید اور جونا جاریجہ کو خضر خان کے پاس بھیجا کہ اسے سمجھایا جائے کہ میرزا شاہ حسن ایک کثیر فوج کے ساتھ آیا ہوا ہے، اس لیے اس کے حق میں مناسب یہی ہے کہ وہ شاہ حسن کی خدمت میں حاضر ہو کر قلعہ اس کے حوالے کر کے اپنے اہل و عیال کے ساتھ جس طرف چاہے چلا جائے۔ خضر خان نے سلطان محمود کو جواب میں کہلا بھیجا کہ ابھی سلطان بہادر کرنال[1] میں صحیح سلامت موجود ہے، میں اس کے حکم کے بغیر قلعہ کس طرح میرزا شاہ حسن کے حوالے کر سکتا ہوں، اس کے بعد یہ قاصد خضر خان کی والدہ کے پاس گئے، اور اسے سمجھا بجھا کر اس سے کہا کہ اگر ایک لاکھ فیروز شاہی میرزا شاہ حسن کو اور تیس ہزار سلطان محمود کو پیش کیے جائیں تو ہم یہاں سے واپس جا کر انہیں لوٹ جانے پر آمادہ کریں گے، چنانچہ اس کی والدہ نے ایک لاکھ تیس ہزار کی رقم اپنے معتمدوں کے ہاتھوں بھجوادی، اس رقم کے وصول ہونے کے بعد میرزا شاہ حسن نے اپنے آنے کی اطلاع ایک عرضداشت کے ذریعہ سے عبدالقدوس کے ہاتھ ہمایوں کی خدمت میں روانہ کی، اور خود پندرہ دن پٹن کے نواح میں مقیم رہا، اس عرصے میں سلطان محمود نے محمود آباد تک جا کر گجراتیوں کا خوب مال و متاع لوٹا، جس کی وجہ سے کثیر مال و متاع لشکر کے ہاتھ لگا۔

اسی اثنا میں میر فرخ نے شاہ حسن میرزا سے عرض کیا کہ اگر ہمایوں نے یہ حکم بھیجا کہ آپ آکر ہمارے لشکر میں رہیں تو آپ کو وہاں جانے کے بغیر کوئی چارۂ کار نہ ہو گا، اور وہاں جانے کے بعد جب ہمارے ارغون اور ترخان سپاہی چنتہ امیروں کا ساز و سامان دیکھیں گے اور ہمایوں بادشاہ جب گجرات سے ہاتھ آنے والا سونا اپنے لشکر میں تقسیم کریں گے، تو پھر آپ کے پاس ارغونوں اور ترخانوں میں سے ایک بھی سپاہی نہیں ٹکے گا، اس لیے مصلحت اسی میں ہے کہ ہم یہیں سے کوئی بہانہ کر کے سندھ واپس لوٹ جائیں۔ میر فرخ کی یہ بات شاہ حسن میرزا اور اس کے امرا نے پسند کی اور اس نے میرزا قاسم بیگلار کے ہاتھوں ایک عریضہ ہمایوں کے پاس بھیجا، جس میں لکھا کہ: شاہی حکم کی تعمیل میں میں اپنا سارا لشکر لے کر یہاں آگیا تھا، لیکن ابھی ابھی مجھے ٹھٹھہ اور بکھر کے امرا کی جانب سے خطوط وصول ہوئے ہیں کہ کلمتی، جتوئی اور دوسرے زمیندار لشکر جمع کر کے ہر طرف لوٹ مار کر رہے ہیں، اس لیے میں مجبوراً واپس جا رہا ہوں، اس کے بعد وہ رادھن پور کے راستے سے ۹۴۵ھ

---

(1) کرنال یعنی "گرنار" گرنار کا کوٹ، ریاست جوناگڑھ میں مشہور ہے (حاشیہ تحفۃ الکرام، ترجمہ سندھی۔ ص ۱۵۵)۔

(۳۵-۱۵۳۴ء) میں ہمایوں کے احمد آباد پہنچنے سے بیس روز قبل ٹھٹھہ روانہ ہو گیا، واپسی میں اس نے جاڑیجہ اور سوڈھا قبائل کا قتل عام کر کے انہیں خوب تاخت و تاراج کیا۔[1]

ہمایوں کی سندھ میں آمد:

۹۴۶ھ (۳۶-۱۵۳۵ء) میں میرزا شاہ حسن نے ٹھٹھہ پہنچنے کے بعد میر علیکہ ارغون کو ہمایوں کی خدمت میں گجرات اور بنگال کی فتح پر مبارکباد دینے کے لیے بھیجا۔ میر علیکہ جب ہمایوں کے دربار میں پہنچا تو اس نے بادشاہ کے غرور اور بے توجہی سے اندازہ کر لیا کہ جلد ہی کوئی لشکر اس سے بغاوت کر کے اس پر حملہ کرنے والا ہے، چنانچہ وہ ہمایوں سے بغیر اجازت لیے ہی میرزا شاہ حسن کے پاس واپس چلا آیا اور اس نے میرزا شاہ حسن سے بیان کیا کہ میں نے ہمایوں کو سخت مغرور اور اعیان سلطنت کو اپنی جانب سے سخت بے توجہ محسوس کیا، میرا خیال ہے کہ عنقریب کوئی غنیم اس پر حملہ آور ہو گا، اور اس کی سلطنت کی بنیادوں کو ہلا دے گا، اسی لیے میں بغیر اجازت کے آپ کو آگاہ کرنے کے لیے واپس چلا آیا ہوں، اسی زمانے میں ہمایوں کے شیر شاہ سے شکست کھانے کی خبر پہنچی، سب نے میر علیکہ کی فہم و فراست کی تعریف کی اور میرزا شاہ حسن نے اپنے امرا کے مشورے سے طے کیا کہ وہ ہمایوں میرزا کامران اور میرزا عسکری کی مخالفت کی بنا پر اس طرف ضرور آئے گا، اس لیے اُچ سے بکھر تک دریا کے کناروں کو ویران کر کے زراعت کو تلف کر دینا چاہیے، چنانچہ جب ہمایوں کے لشکر کی پیہم فراری کی خبریں آنے لگیں تو میرزا شاہ حسن نے "ببر لو" کا چار باغ جس میں ہر قسم کی عمارتیں اور قلعہ داری کا سامان موجود تھا اور بکھر سے لے کر سیوستان تک جملہ مواضعات اور قصبات ویران کر دیے، اس سے میرزا شاہ حسن اور اس کے امرا کا مقصد یہ تھا کہ ملک میں ویرانی اور قحط کے اتنے شدید آثار پیدا کیے جائیں کہ ہمایوں یہاں ٹک نہ سکے، چنانچہ ان کی یہ خواہش پوری ہو گئی۔[2]

تاریخ طاہری کا مصنف اس وقت کے سندھ کی بدحالی اور قحط کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے کہ: میر سلطان محمود خان حاکم بکھر نے اس فیصلے کے بعد ملک کو اس طرح تباہ و برباد کیا کہ جو کوئی کسان غلہ بوتا تھا، وہ اس کی کھال کھنچوا کر اس میں بھس بھرتا تھا، سوائے پانی اور گھاس کے کہیں غلہ خواب و خیال میں بھی نہیں دکھائی دیتا تھا، بھوک کا اس قدر سخت دور دورہ تھا کہ روٹی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی، پھر آگے چل کر وہ سندھ کی ویرانیوں پر ماتم کناں ہو کر لکھتا ہے کہ:

> ویرانی چناں بملک سند پدید آمد کہ در ہر مرز و بوم کہ نغمہ سرای می شد، بجز ادای بوم شوم نوای دیگر نمی بر آمد، امن و امان از میان چناں برخواست کہ فتنہ بجای آں بنشست و حکم میرزا نیز ہم چناں برزمیندار جاری گشت کہ آبادی خراب سازند، و بنا کہ برپا باشد برانداز ند، کدیوران از کدیوری کنارہ گیرند، تا لشکر بیگانہ از بینوائی نتواند پا بجنگ محکم داشت، از بکھر تا تھتہ ہمچناں داشتند، بنوعی و نہجی قحط پدید آمد کہ قفل غلہ رازریں کلید آمد، ہر کہ داشت میخورد، و آنکہ نداشت جان از جوع بمرگ مفاجات می سپرد۔[3]

(ترجمہ) اس قدر سندھ کے ملک میں ویرانی پھیلی کہ ملک کے جن حصوں میں نغمہ سرائیاں ہوتی تھی وہاں بجز اُلو کی آوازوں کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی تھی، ملک کا امن و امان اس طرح جاتا رہا تھا کہ اس کی جگہ فتنے نے جڑ پکڑلی تھی، مزید برآں میرزا شاہ حسن کا حکم زمینداروں کے نام جاری ہوا کہ وہ آبادیوں کو خراب کریں اور جو عمارتیں نظر آئیں انہیں گرا دیں، تاکہ باغبان باغبانی سے کنارہ کش ہو جائیں، اور غیروں کا لشکر اپنی بینوائی کو محسوس کر کے یہاں جنگ کے لیے قدم نہ جما سکے اس طرح عجیب طرح کا قحط پڑا کہ غلے کے قفل کے لیے روپیہ ایک زریں کنجی تھا، جو کوئی روپیہ رکھتا تھا، وہ غلہ حاصل کر لیتا تھا، اور جو نادار تھا، وہ اپنے آپ کو اچانک موت کے سپرد کرتا تھا۔

جب ہمایوں، شیر شاہ سے شکست کھا کر لاہور آیا، تو شیر شاہ نے اس کا تعاقب لاہور تک کیا، آخر ہمایوں نے حالات کو نامساعد پا کر اور اپنے بھائیوں کی کدورت دیکھ کر سندھ کا رخ کیا، چنانچہ شعبان ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) میں وہ اپنے لشکر کے ساتھ اُچ پہنچا، چونکہ بخشو لانگاہ وہاں سے قریب تھا، اس لیے ہمایوں نے بیگ محمد بکاول اور کچک بیگ کے ہاتھ سے اُسے قیمتی خلعت بھیجا اور خان جہاں کے لقب اور علم و نقارے سے بھی اسے نوازا، لیکن ہمایوں کے اس التفات کے باوجود اس نے یہ بے التفاتی

---

[1] یہ تمام تفصیل تاریخ معصومی، فارسی۔ ص ۱۶۱-۱۶۳ سے ماخوذ ہے۔

[2] تاریخ معصومی، ص ۱۶۵-۱۶۶۔

[3] تاریخ طاہری، ص ۷۷۔

برتی کہ اس نے غلہ اور کشتیاں تو بھیج دیں لیکن وہ خود ہمایوں کے پاس حاضر نہیں ہوا۔ یکم رمضان ۹۴۷ھ (۱۵۴۱ء) کو ہمایوں اور اس کا لشکر کوچ کر کے ۲۸ رمضان کو روہڑی میں خیمہ زن ہوا۔

ببر لو کے چار باغ میں قیام:

ببر لو کا چار باغ جو لطافت اور منظر کے اعتبار سے نہایت حسین اور دلکش مقام تھا ہمایوں نے بنفس نفیس اس میں قیام کیا۔

ادھر سلطان محمود خان حاکم بکھر نے ہمایوں کی روہڑی میں آمد کی خبر سنتے ہی اس انداز سے کہ ہمایوں کو یہ معلوم بھی نہ ہو کہ وہ تیاریاں کر رہا ہے اس نے قلعے کے انتظامات کو اور بھی مستحکم کیا اور ساری کشتیاں منگوا کر انہیں قلعے کے نیچے لنگر انداز کیا۔

ہمایوں نے روہڑی پہنچتے ہی سلطان محمود خان حاکم بکھر کے نام فرمان جاری کیا کہ وہ حاضر ہو کر آستان بوسی کا شرف حاصل کرے اور قلعہ شاہی ملازمین کے حوالے کرے اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں میرزا شاہ حسن کا ملازم ہوں، اس لیے جب تک میرزا شاہ حسن آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو، میرا حاضر ہونا اس کے حق نمک کے خلاف ہو گا اور قلعہ بھی حوالے کرنا میرے لیے اسی وقت مناسب ہو گا جب میرزا شاہ حسن مجھے اس کا حکم دے۔[1]

میرزا شاہ حسن اور اس کے حواریوں کا مقصد ملک میں جو قحط پیدا کرنے سے تھا، اس کے نتائج بر آمد ہوئے، ہمایوں اور اس کے لشکر کو سندھ میں آنے کے بعد غلے کی سخت قلت کا سامنا کرنا پڑا، اس نے پھر دوبارہ میر بازار، مہتر المشرف کو سلطان محمود خان حاکم بکھر کے پاس غلہ کے لیے بھیجا، اس نے اشک شوئی کے لیے پانسو خروار غلہ اور کھانے کی کچھ چیزیں بھجوا دیں، ہمایوں نے اس کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

سلطان محمود خان نے اس حسن تدبیر سے اپنے آپ کو ہمایوں کی مخالفت سے بچا لیا۔[2]

میرزا شاہ حسن کے نام فرمان:

اب ہمایوں کی توجہ میرزا شاہ حسن کی طرف مبذول ہوئی اور اس نے اپنے دو معتمد ملازمین امیر طاہر صدر اور سمندر بیگ کو ایک خط کے ساتھ ٹھٹھہ بھیجا جس میں اس نے میرزا شاہ حسن کو وہ رشتہ اخلاص یاد دلایا تھا جو اس کا بابر سے تھا، اس کا واسطہ دے کر اس نے لکھا تھا کہ تمہیں ہماری مدد کرنی چاہیے، میرزا شاہ حسن ایک جہاں دیدہ انسان تھا، اس نے شاہی قاصدوں کی عزت و احترام میں کوئی کسر اٹھا کر نہ رکھی اور اس کا وعدہ کیا کہ جب بادشاہ ہمایوں یہاں تشریف لائیں گے تو میں اس وقت فوراً ہالہ کنڈی سے لے کر بھوراتک دریا کے اس پار کا علاقہ حرم سرا کے اخراجات کے لیے حوالے کر کے حاضری کا شرف حاصل کروں گا۔[3]

میرزا شاہ حسن کی عرضداشت:

پھر اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس دور کے بزرگ شیخ میرک پورانی اور میرزا قاسم طغائی کو بیش قیمت تحائف دے کر ہمایوں کی خدمت میں بھیجا، جنہوں نے اس سے ملاقات کر کے ہمایوں کے قلب پر اس کے اخلاص کے نقش کو اور جمایا اور ہمایوں کے سامنے اس کی ایک عرضداشت پیش کی، جس میں شاہ حسن نے لکھا تھا کہ: ولایت بکھر کی پیداوار کم ہے اور پرگنہ چاچکان آبادی اور زراعت کے لحاظ سے میرے علاقے کا ممتاز حصہ ہے، اگر حضور اس طرف تشریف لے جائیں تو وہاں لشکر کو آرام بھی ملے گا اور میں بھی خدمت کے لیے قریب رہوں گا، میری خوش نصیبی ہے کہ حضور نے اس ملک میں قدم رنجہ فرمایا ہے۔

ہمایوں میرزا شاہ حسن کی اس عرضداشت سے مطمئن ہو گیا، لیکن اسی کے امرا نے تنہائی میں اس سے کہا کہ یہ بھی شاہ حسن کی ایک چال ہے، آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ ہمارے لیے قصبات و دیہات کے تو نام لیتا ہے، لیکن اپنے قلعوں کو تحفتاً پیش کرنا نہیں چاہتا تاکہ ہم ان میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ مطمئن ہو کر گجرات کی فتح کا عزم کریں۔

اپنے امرا و وزرا کے اس مشورے کے بعد ہمایوں چونکا اور بکھر کے محاصرے کی طرف متوجہ ہوا، جب اس کی خبر میرزا شاہ حسن کو ملی تو اس نے کہا کہ بکھر کی طرف سے تو میں مطمئن ہوں، کیونکہ ہمایوں خود ببر لو چار باغ کے راحت و آرام کو چھوڑ کر خود بکھر کے محاذ پر نہ آئے گا اور دوسرے امرا جو محاصرے کے لیے پہنچیں گے وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ چنانچہ وہ سلطان محمود خان کو بکھر کی حکومت کا اختیار دے کر اور میر جملہ ارغون، جانی ترخان، دولت خان، پاینده محمد قریش اور دیگر معتمد امرا کو قلعہ بکھر کی حفاظت پر مامور کر کے خود سیوستان روانہ ہو گیا اور

---

[1] تاریخ معصومی، ص ۱۶۷۔

[2] ایضاً۔ ص ۱۶۸۔

[3] تاریخ معصومی، ص ۱۶۸۔

وہاں پہنچ کر اس نے قلعہ سیوستان کو بھی مسمار کر کے ویران کر دیا۔[1]

ہمایوں کی فوج:

۹۴۷ھ (۱۵۴۰-۴۱ء) ہمایوں ببر لو کے باغ میں قیام پذیر تھا، اسے یہ باغ اور اس کی عمارت بہت پسند آئی، چنانچہ اس نے اپنے حرم کو باغ کے اندر ٹھہرا کر مسجد کے قرب وجوار میں دولت خانہ قائم کیا، اور اس کے ممتاز امرا باغ کے ارد گرد مقیم ہوئے، میرزا یادگار ناصر روہڑی کے مدرسے میں ٹھہرا، روہڑی سے لے کر ببر لو تک تین میل میں شاہی لشکر خیمہ انداز تھا، اس وقت شاہی کیمپ میں تقریباً دو لاکھ آدمی تھے، شاہ حسن کے ان پیدا کردہ حالات کی بنا پر شاہی لشکر اور بکھر کے گرد و نواح میں اس قدر قحط پڑا کہ لوگ بھوک کی وجہ سے موت کا شکار ہونے لگے، گرانی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ روٹی کا ایک پرت ایک مثقال سونے میں فروخت ہونے لگا۔[2]

حمیدہ بانو بیگم سے شادی:

آخر ہمایوں قحط سے تنگ آ کر پاٹ میں منزل انداز ہوا، ان ہی دنوں میں اس نے میرزا ہندال کے قریبی عزیز شیخ علی اکبر کی بیٹی بلقیس مکانی حمیدہ بانو بیگم سے نکاح کیا۔[3]

کچھ دن کے بعد جب لوگ قحط سے وہاں بھی مرنے لگے تو ہمایوں پھر بکھر واپس آ گیا۔

سیوستان پر حملہ:

یکم جمادی الاول ۹۴۸ھ (۱۵۴۱ء) ہمایوں نے سیوستان پر فوج کشی کی اور بکھر کی مہم یادگار ناصر میرزا کے سپرد کی، ہمایوں کے سیوستان آنے سے پہلے ہی قلعے کے محافظوں نے قلعہ کی عمارتوں کو برباد کر دیا تھا، ہمایوں نے آتے ہی اہل قلعہ کو محصور کر لیا، جب اہل قلعہ پر محاصرے کی سختی ہوئی تو یہ خبر سن کر میرزا شاہ حسن ٹھٹھہ سے سن آیا اور خندقیں کھود کر اور کشتیاں جمع کر کے موقع کا انتظار کرنے لگا، اسی کے ساتھ اس نے میر علیکہ کو کچھ لشکر کے ساتھ سیوستان بھیجا، جو کسی نہ کسی طرح قلعے کے اندر پہنچ گیا، جب ہمایوں کو اس کا علم ہوا تو اس نے قلعے میں سرنگ لگانے کا حکم دیا، چنانچہ انہوں نے قلعے کے برج کا ایک حصہ اُڑا دیا، لیکن اہل قلعہ نے فوراً ہی دوسری دیوار کھڑی کر دی، جس سے ہمایوں کو اندازہ ہوا کہ ارغونوں کا انتظام مضبوط ہے اور ہمارے پاس تسخیر قلعہ کے لیے جن آلات کی ضرورت ہے، وہ موجود نہیں، ادھر سیوستان کے محاصرے کو سات ماہ گزر چکے تھے، ادھر ان کے لیے آفت ناگہانی، ہوا اور پانی کا طوفان بنا، مزید یہ کہ میرزا شاہ حسن نے ہمایوں کے لشکر پر رسد کی آمد و رفت کے راستے مسدود کر دیے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمایوں کے لشکر کے سپاہی ان مصائب کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑے ہوئے، بلکہ بعض ممتاز افراد میر طاہر صدر، خواجہ غیاث الدین جانی اور مولانا عبدالباقی ذکری وغیرہ ہمایوں کو چھوڑ کر میرزا شاہ حسن کے پاس چلے گئے، اسی اثنا میں ہمایوں کو خبر ملی کہ لوگ میرزا یادگار ناصر کو بہکا کر قندھار لیے جا رہے ہیں، ان حالات نے ہمایوں کو سخت پریشانیوں میں ڈال دیا۔

یادگار ناصر میرزا کی غداری:

میرزا ناصر یادگار جسے ہمایوں بکھر کی مہم سر کرنے کے لیے چھوڑ گیا تھا، بکھر کے قلعے کے لوگوں نے اس پر دو مرتبہ باہر نکل کر اچانک حملہ کیا، جس میں یادگار ناصر میرزا کے بہت سے آدمی زخمی ہوئے، تیسری مرتبہ اہل قلعہ نے باہر آ کر نہایت زور و شور سے جنگ کی، لیکن اس مرتبہ یادگار ناصر میرزا نے خود سوار ہو کر مقابلہ کیا، جس کی وجہ سے اہل قلعہ پسپا ہو گئے، اور ایسی شکست کھائی کہ بعض نے تو گھبراہٹ میں دریا میں چھلانگ لگا دی اور کچھ کشتیوں میں بیٹھ کر فرار ہو گئے، یہ رنگ دیکھ کر میرزا شاہ حسن نے دوسری چال چلی، اس نے امیر قلی مہردار کو یادگار ناصر میرزا کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ چونکہ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میرا کوئی لڑکا نہیں ہے، اس لیے میں اپنی لڑکی کو آپ سے منسوب کرتا ہوں، لہٰذا آیندہ یہ ملک آپ کی ملکیت ہو گا، اس کے علاوہ میں آپ کو نقد خزانہ بھی دوں گا اور گجرات کا ملک ہم مل کر ساتھ فتح کریں گے، یادگار ناصر میرزا شاہ حسن کے ان دھوکوں میں آ گیا اور اس کے وعدوں کے فریب میں مبتلا ہو کر ہمایوں کی مخالفت پر تیار ہو گیا۔

ادھر جب ہمایوں کو یادگار ناصر میرزا کی مخالفت کی خبر ملی تو وہ فوراً ہی سیوستان سے بکھر پہنچا، لیکن قحط کی مصیبت ہر جگہ ہمایوں اور اس کے لشکر کے ساتھ تھی۔ ہمایوں کا لشکر غلے کی قلت اور تنگ دستی کی وجہ سے سندھ کے شہروں میں پھیل گیا، اس افراتفری میں بہت سے لوگ ضائع ہو گئے، دو تین مرتبہ بکھر کے اہل قلعہ اور ہمایوں کے لشکر میں جنگ بھی

---

(1) تاریخ معصومی، فارسی-ص ۱۶۸-۱۶۹۔

(2) تاریخ معصومی، ص ۱۷۰-۱۷۱۔

(3) ایضاً-ص ۱۷۱۔

ہوئی، جس میں ہمایوں کا لشکر غالب رہا، لیکن چونکہ ہمایوں کے لشکر میں قلعہ شکن آلات نہ تھے، اس لیے بکھر کا قلعہ فتح نہ ہو سکا۔

ہمایوں کا حجاز کا قصد:

آخر ہمایوں نے حالات کی نامساعدت سے تنگ آکر اور اہل لشکر اور اپنے بھائیوں کی بے وفائی دیکھتے ہوئے دنیا سے منقطع ہو کر ارادہ کیا کہ وہ اپنی زندگی کے بقیہ ایام خانہ کعبہ میں حاضر ہو کر حجاز مقدس کی سر زمین میں بسر کرے، اس نے جب اپنا یہ خیال اپنے معتمد امرا سے ظاہر کیا تو انہوں نے اس خیال کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ یہ بہترین خیال ہے، لیکن ایک بڑی جمعیت آپ کے ہمراہ ہے، اگر آپ یہ ارادہ کریں گے تو اندیشہ ہے کہ بہت سے لوگ راستے میں ضائع ہو جائیں گے اور اس پریشانی اور تنگ دستی کے عالم میں حجاز مقدس تک پہنچنا دشوار ہو جائے گا، ہماری رائے میں مصلحت اسی میں ہے کہ ابھی کچھ دن اور توقف کیا جائے، اس پر ہمایوں نے لوگوں کی یہ رائے دیکھ کر کسی اور طرف کا قصد کیا۔

راجا مالدیو کی عرضداشت:

اسی زمانے میں جب کہ ہمایوں نہایت پریشان و سرگرداں تھا کہ راجا مالدیو کی عرضداشت پہنچی کہ میں غائبانہ طور پر حضور کی ملازمت قبول کرتے ہوئے حضور کی آمد کا منتظر ہوں، اگر آپ کا لشکر اس علاقے کو زینت بخشے تو میں بھی پندرہ بیس ہزار راجپوتوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر جس طرف بھی فوج کشی کا ارادہ ہو، دل و جان سے آپ کا حکم بجالاؤں گا۔

راجا مالدیو کی عرضداشت وصول ہوتے ہی ہمایوں نے ۲۱ محرم ۹۴۹ھ (۱۵۴۲ء) اُچ کا قصد کیا، اور وہ اُچ پہنچنے کے بعد ۸ ربیع الاول ۹۴۹ھ (۱۵۴۲ء) کو مالدیو کی طرف روانہ ہوا اور ۲۰ ربیع الاول ۹۴۹ھ (۱۵۴۲ء) کو وہ بیکانیر کے میدان میں اترا، یہاں کچھ لوگوں نے بیکانیر سے شاہی چھاونی میں آکر بیان کیا کہ ہمیں اہل بیکانیر میں کوئی خیر خواہی کا جذبہ نظر نہیں آتا، ہمایوں نے یہ خبر سنتے ہی سمندر بیگ کو جو بہت مدبر اور دور اندیش تھا، راجا مالدیو کے پاس بھیجا، تاکہ وہ صحیح صورت حال سے مطلع کرے، اس نے واپس آکر ہمایوں سے کہا کہ اگرچہ مالدیو بظاہر بہت خلوص کا اظہار کر رہا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں خلوص نام کو نہیں، چونکہ شاہی لشکر پہلودی سے جو کہ مالدیو کے پایہ تخت جودھپور سے تیس کوس کے فاصلے پر دو تین منزلیں آگے بڑھ کر دریائے کول کے ساحل پر منزل انداز تھا، اس لیے ہمایوں نے مزید احتیاط کی بنا پر جاسوس بھیجے، جاسوسوں نے آکر خبر دی کہ مالدیو شیر شاہ کی فتوحات کو دیکھ کر اور اس کے فریب آمیز وعدوں میں آکر شاہی فوج کے راستہ روکنے کی تیاریاں کر رہا ہے، ہمایوں یہ خبر سن کر پریشان ہو گیا، اور اس نے اپنے امرا سے مشورہ کیا، چنانچہ سب نے متفقہ رائے دی کہ ہمیں واپس لوٹ جانا چاہیے، اس مشورے کے بعد ہمایوں وہاں سے ساتلمیر آیا اور اس نے مالدیو کی مدافعت کے لیے کچھ امرا متعین کیے، اسی اثنا میں دوسری طرف سے مالدیو کی فوج ظاہر ہوئی، ہمایوں نے تھوڑی سی فوج کے ساتھ اس پر حملہ کیا اور دشمن کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا، پھر وہ نہایت تیزی سے جیسلمیر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جیسلمیر میں نئی پریشانیاں:

ہمایوں، یکم جمادی الاول ۹۴۹ھ (۱۵۴۲ء) کو جیسلمیر پہنچا، مگر قسمت اس کے یہاں بھی مخالف تھی، یہاں پہنچتے ہی سون کرن جیسلمیری نے ہمایوں اور اس کے لشکر پر دریائے کول کا پانی بند کر دیا اور گھاٹ کی نگرانی کے لیے آدمی مقرر کر دیے، ہمایوں کے کچھ کے امیروں اور سپاہیوں نے جنگ کر کے سون کرن کے آدمیوں کو گھاٹ سے ہٹایا اور دریا کے کنارے قیام کر کے اپنے آپ کو پیاس کی شدت سے بچالیا۔

عمر کوٹ میں آمد:

آخر ۱۰ جمادی الاول ۹۴۹ھ (۱۵۴۲ء) کو ہمایوں عمر کوٹ پہنچا، عمر کوٹ کے رانا بیر سال[1] نے شہر سے باہر نکل کر اپنے چند آدمیوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا، اور ہمایوں کے لیے قلعے کے درمیانی حصے کو خالی کرایا، ہمایوں کچھ دنوں قلعے کے باہر مقیم رہا، پھر اس نے اپنی بیگم بلقیس مکانی حمیدہ بانو بیگم کو قلعے کے اندر بھیج دیا۔

اکبر کی ولادت:

اسی قلعے میں ۵ رجب ۹۴۹ھ[2] (۱۵۴۲ء) اتوار کی شب میں

---

[1] رانا بیر سال "تذکرۃ واقعات" کے مولف جوہر آفتابچی (ترجمہ انگریزی ص ۴۳) پر اس رانا کا نام "پرساد" لکھا ہے، بیر سال غالباً ویر سیں کی تحریف ہے، کیونکہ عمر کوٹ کے رانا خاندان میں رانا ویر سیں کا نام مشہور ہے، بیر سال یا پرساد نام کا کوئی بھی رانا نہیں ہوا، (تعلیقات معصومی، فارسی - ص ۱۷۷ تو ترجمہ سندھی، ص ۱۷۷)۔

[2] طبقات اکبری: ج ۱ ص ۵۵ پر اور اکبر نامہ میں اکبر کی ولادت کی تاریخ یہی بیان کی گئی ہے، لیکن گلبدن بیگم نے اکبر کی ولادت ۴ رجب ۹۴۹ھ اتوار کے دن صبح

جلال الدین محمد اکبر کی ولادت ہوئی، ہمایوں اس بیٹے کی ولادت سے بہت خوش ہوا۔[1]

یادگار ناصر میرزا کا انجام:

گزشتہ اوراق میں میرزا یادگار ناصر کی داستان حیات بیان کی جاچکی ہے کہ وہ کس طرح میرزا شاہ حسن کے فریب میں آگیا تھا، چنانچہ وہ شاہ حسن کے وعدوں پر یقین کرکے ہمایوں کے لشکر سے جدا ہو کر سکھر کی طرف چلا گیا، اس نے کچھ توپیں اور قلعہ شکن آلات بھی جو اس کے ساتھ تھے، بکھر کے قلعے میں بھجوادیے، ہمایوں کے دوسرے سپہ سالاروں یعنی ہالہ اور عمر شاہ کو قلعہ بکھر میں بھجوادیا، مگر ان سب غداریوں کے باوجود یادگار ناصر میرزا کو کچھ حاصل نہ ہوسکا اور شاہ حسن میرزا کے تمام وعدے جو فریب پر مبنی تھے، ان میں سے ایک بھی پورا نہ ہوا۔[2]

میرزا شاہ حسن کی ریشہ دوانیاں:

میرزا شاہ حسن کو جیسے ہی یہ اطلاع ملی کہ ہمایوں اُچ کی طرف روانہ ہوگیا ہے تو وہ فوراً ہی ۲۴ محرم ۹۴۹ھ (۱۵۴۲ء) میں بکھر آیا، اور اس نے سلطان محمود خان والی بکھر سے سختی سے باز پرس کی کہ اس نے بعض مواقع پر ہمایوں کو غلہ دے کر غلہ کیوں ضائع کیا، اس کے بعد اس نے ملا درویش محمد داروغہ رسد کو بلوا کر سلطان محمود کے گھر کے سامنے پھانسی پر لٹکوادیا اور ہمایوں کے سپہ سالاروں ہالہ اور عمر شاہ کی سکھر کے وسطی دروازے کے قریب کھال کھنچوائی، پھر وہ وہاں سے سیوستان گیا اور وہاں کے قلعے کی مرمت کرا کر کچھ دن سن میں رہا، پھر ٹھٹھہ واپس آگیا۔

ہمایوں کی جون میں آمد:

لیکن چند ہی روز میں ہمایوں نے محسوس کرلیا کہ عمر کوٹ کا چھوٹا سا قلعہ شاہی فوجوں کا بار برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لیے اسے سندھ آنا پڑا، اور جون[3] کو اس نے اپنی قیام گاہ بنایا، شاہی لشکر قصبہ جون کے باغات میں منزل انداز ہوا، میرزا شاہ حسن نے جب یہ سنا تو وہ بھی فوج لے کر دریا کے دوسرے کنارے خیمہ زن ہوگیا۔

اسی زمانے میں ہمایوں کو معلوم ہوا کہ بھٹورا کے قلعے میں غلہ اور دیگر ضروریات زندگی کا سامان کافی مقدار میں موجود ہے، اور اسے تھوڑی سی توجہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے، چنانچہ اس نے شیخ علی بیگ حلائر اور تیمور سلطان کو اس قلعے کی مہم پر متعین کیا، ادھر میرزا شاہ حسن نے بھی شاہی فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے میرزا عیسیٰ ترخان کو مقرر کیا، لیکن چونکہ میرزا عیسیٰ ترخان پر لوگ ہمایوں کی خیر خواہی کا الزام لگاتے تھے، اس لیے اس نے خود بھی اس تقرر کے منظور کرنے میں تامل کیا، میرزا شاہ حسن نے اس کی بجائے سلطان محمود خان حاکم بکھر کو اس مہم پر مقرر کیا، جون کے گرد و نواح میں ہمایوں کی فوجوں اور سلطان محمود ارغونوں کے لشکر میں جھڑپیں ہوتی رہیں، ان ہی جھڑپوں میں شیخ علی بیگ حلائر مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا، اور ہمایوں کے لشکر کے بہت سے بہادر ان جھڑپوں میں کام آئے، ان واقعات سے اور پیہم ناکامیوں سے ہمایوں اس قدر ملول و پراگندہ خاطر ہوا کہ اس نے سندھ سے دل برداشتہ ہو کر قندھار جانے کا پختہ ارادہ کرلیا۔

اسی زمانے میں ۷ محرم ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) کو بیرم خان گجرات سے ہمایوں کے پاس آیا، اور اس نے بھی ہمایوں سے قندھار ہوتے ہوئے عراق چلنے کی تحریک کی، میرزا شاہ حسن بھی خاموشی سے یہ حالات دیکھ رہا تھا، وہ کسی موقع کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا، اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ایک لاکھ گنیاں نقد، اور دوسرا سامان سفر اور تین سو گھوڑے اور تین سو اونٹ بہت سی معذرتوں کے ساتھ ہمایوں کی خدمت میں بھیجے، اور جون کے سامنے ایک پل تعمیر کرایا، تاکہ ہمایوں کی فوجیں اس پل پر سے آسانی سے عبور کرسکیں، پل کی تاریخ اور اس صلح کی تاریخ صراط المستقیم ۹۵۰ھ سے نکلتی ہے۔[4]

جس قسم کے اونٹ میرزا شاہ حسن نے ہمایوں کو دیے تھے، اس میں بھی اس کے دل کا کھوٹ شامل تھا، ہمایوں نامہ میں ان اونٹوں کی تعداد ایک ہزار بیان کی گئی ہے، ان اونٹوں کے متعلق لکھا ہے کہ یہ اونٹ اس قسم کے تھے کہ ان کی سات پشتوں نے تو کیا، بلکہ ستر پشتوں نے بھی شہر، آدمی اور بوجھ نہ دیکھا تھا، ہمایوں کے لشکر میں چونکہ گھوڑوں کی بہت کمی تھی، اس لیے اکثر لوگ اونٹوں پر سوار ہوگئے، اور

صادق کے وقت ہونا بیان کی ہے۔ جوہر آفتابچی نے "تذکرۂ واقعات" ص ۲۴ پر ۱۴ ماہ شعبان ۹۴۹ اکبر کی ولادت تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھا کہ اس دن کی یادگار میں ہمایوں نے اس کا نام "بدرالدین محمد اکبر" رکھا، لیکن جوہر آفتابچی کی یہ غلطی ظاہر ہے (تعلیقات معصومی، فارسی۔ ص ۳۱۷)۔

[1] تاریخ معصومی۔ فارسی، ص ۱۷۷۔

[2] ایضاً۔ ص ۱۷۷۔

[3] جون: اس وقت بھی تعلقہ بدین میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے (لب تاریخ سندھ، ص ۶۸)۔

[4] تاریخ معصومی، ص ۱۷۸-۱۷۹۔

جو کچھ باقی بچے ان پر سامان بار کیا، عالم یہ تھا کہ اونٹوں پر جو کوئی بھی سوار ہوتا وہ اسے فوراً زمین پر پٹک کر جنگل کا راستہ لیتے اور جس پر بوجھ لادا جاتا وہ گھوڑوں کے سموں کی آواز سن کر اچھل اچھل کر سامان کو زمین پر گرا دیتا اور خود جنگل کی راہ لیتا، اگر کسی اونٹ پر سامان کس کر باندھ دیا جاتا کہ وہ اچھلنے سے بھی نہ گرتا، تو وہ اونٹ خود اچھلتا کودتا سامان سمیت جنگل کی راہ لیتا، اس عالم میں وہ قندھار تک گئے اور تقریباً دو سو اونٹ راستے میں بھاگ گئے۔

ہمایوں کی سندھ سے روانگی:

آخر ۷ ربیع الآخر ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) کو ہمایوں اس پل کو عبور کر کے بہزار خرابی سندھ سے قندھار روانہ ہوا اور اس طرح میرزا شاہ حسن نے ہمایوں سے اور ہمایوں نے میرزا شاہ حسن سے نجات حاصل کی۔

میرزا کامران کی آمد:

ہمایوں کے جانے کے بعد ۹۵۰ھ (۴۴-۱۵۴۳ء) میرزا کامران نے اپنے قاصد کابل بھیج کر میرزا شاہ حسن سے اس کی بیٹی سے شادی کی درخواست کی، میرزا شاہ حسن نے اس کی درخواست منظور کر کے قاصدوں کو واپس کیا، جب ہمایوں نے کابل پر فوج کشی کی، اور میرزا کامران شکست کھا کر کابل سے بھاگا، تو وہ ہزارہ کے راستے سے سندھ پہنچا، میرزا شاہ حسن نے اس کے ٹھہرنے کا پاٹ میں انتظام کیا، پھر میرزا شاہ حسن نے اس کی خواہش پر اپنی بیٹی چوچک بیگم کا عقد میرزا کامران سے کر دیا، شادی کے بعد تین ماہ قیام کر کے وہ کابل چلا گیا، ہمایوں اس وقت بدخشاں میں تھا، ہمایوں نے اس کی آمد کی خبر سنتے ہی کابل کا محاصرہ کر لیا، میرزا کامران محاصرے سے تنگ آ کر وہاں سے بھاگا اور گھگر قوم کے لوگوں کے پاس پناہ لی۔ ہمایوں کو جب خوب اندازہ ہو گیا کہ میرزا کامران کی نیت ٹھیک نہیں، اس نے میرزا کامران کو کسی حیلے سے بلا کر اس کی آنکھوں میں گرم کر کے سلائی پھروا دی، اندھا ہونے کے بعد اس نے ہمایوں سے حج کے لیے اجازت چاہی، ہمایوں نے اسے اجازت دے دی۔

وفاداری کا ایک نمونہ:

ہمایوں سے اجازت لینے کے بعد ۹۵۷ھ (۵۱-۱۵۵۰ء) میں میرزا کامران دوسری بار بکھر آیا، میرزا شاہ حسن نے اس مرتبہ اسے کچھ دن سادھ بیلہ کی پہاڑی پر ٹھہرایا اور بٹھورے کا پرگنہ میرزا کامران کے باورچی خانے کے اخراجات اور فتح باغ اس کی رہائش کے لیے مخصوص کیا، لیکن چونکہ میرزا کامران حج کا ارادہ کر چکا تھا، اس لیے اس نے وہاں زیادہ دن ٹھہرنا پسند نہیں کیا، جب وہ حج کو جانے لگا تو اس کی بیوی چوچک بیگم نے اپنے والد سے کہا کہ میں بھی اپنے شوہر کے ساتھ جاؤں گی، میرزا شاہ حسن نے ہر چند اسے روکا اور سمجھایا مگر وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ میں اپنے شوہر کو اس حالت میں کیسے چھوڑ سکتی ہوں، جب کہ اسے آنکھوں سے بالکل نہیں دکھائی دیتا، آخر جب میرزا کامران کشتی میں سوار ہونے لگا تو وہ بغیر اپنے والد کی اجازت کے کشتی میں آ کر بیٹھ گئی، میرزا شاہ حسن خود کشتی میں آیا اور اس نے اپنی بیٹی کو ایک بار پھر روکنے کی کوشش کی، چوچک بیگم نے اپنے والد سے کہا کہ یہ بات کتنی شرمناک ہے اور دنیا کیا کہے گی کہ جب وہ بادشاہ تھا اور اس کی آنکھیں تھیں تو آپ نے مجھے اس کے حوالے کر دیا، آج جب اس پر مصیبت کا وقت ہے اور وہ اندھا ہو چکا ہے تو ایسے موقع پر میں اس کا ساتھ چھوڑ دوں، یہ میری غیرت گوارہ نہیں کرتی، میرزا شاہ حسن کو اس کی یہ بات پسند آئی اور اس نے اسے کثیر مال و اسباب دے کر اس کے شوہر کے ساتھ رخصت کر دیا۔

میرزا کامران دو تین سال مکہ معظمہ میں رہا، آخر اس نے عین حج کے دن عرفات میں وقوف کے بعد ۹۶۴ھ (۵۷-۱۵۵۶ء) میں وفات پائی،[1] اس کے سات ماہ بعد چوچک بیگم نے بھی مکہ معظمہ میں انتقال کیا، اس سندھی خاتون نے اپنے شوہر کی وفاداری کا ایک ایسا اعلیٰ نمونہ چھوڑا جسے مؤرخ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

شاہ حسن سے ارغونوں کی بغاوت اور اس کے اسباب:

میرزا شاہ حسن کا جب آفتاب زندگی غروب کے قریب آیا تو وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں فالج میں مبتلا ہوا، وہ کثرت سے شراب پینے لگا تھا اور اس کے آخری دور میں اس کی رذالت نوازیاں حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں، ہر وقت اوباش اور ذلیل لوگ اس کے گرد جمع رہتے، اس نے ملک کی خاص خاص خدمتیں بھی ان اوباشوں کو دی تھیں، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ارغون اور ترخان اور اس کے دوسرے مخلص ملازمتوں سے علیحدہ ہو کر گھروں میں بیٹھ رہے اور رذیل انسان ترقی پا کر نظم و نسق میں برسر اقتدار آ کر عوام پر دست تعدی دراز کرنے لگے۔

۹۶۰ھ (۵۳-۱۵۵۲ء) کے شروع میں اس نے ٹھٹھہ کی گورنری ایک نہایت کمینے انسان عربی گاہی کے سپرد کی اور رعایا کے کاروبار کا

---

[1] تاریخ معصومی، ص ۱۸۲-۱۸۳۔

انتظام اسماعیل بیتارہ کے تفویض ہوا جو رذالت کی پوٹ تھا، اس کے ان تقررات نے اور بھی لوگوں کو مایوس بنایا۔ تاریخ طاہری میں ہے کہ یہ دونوں میرزا شاہ حسن کے اس قدر مقرب تھے کہ یہ دونوں جھوٹ سچ جو بھی کہہ دیتے میرزا شاہ حسن اس کو فوراً مان لیتا، دوسرے لوگ خواہ کتنی ہی معقول بات کہتے ان کے مقابلے میں ان لوگوں کی بات غلط ٹھہراتا۔ عربی گاہی کا ایک بیٹا جو نہایت ناشائستہ اور شراب خوار تھا یہ بدبخت دیوان وزارت میں لوگوں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتا۔[1] آخر نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف ظلم کا بازار گرم ہوا اور لوگ میرزا شاہ حسن کی حکومت سے نجات حاصل کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔

اسی زمانے میں ان میں کسی ایک نے ایک ارغون حاملہ عورت کو اس قدر لاتیں ماریں کہ اس کا حمل ساقط ہو گیا، ارغونوں نے اس کی شکایت میرزا شاہ حسن سے کی، مگر اس نے اس شکایت کی طرف مطلقاً التفات نہیں کیا، جب بار بار اس ظلم کی شکایت اس سے کی گئی تو اس نے شیخ میرک پورانی کو ایک خط میں لکھا کہ اس مقدمے کا فیصلہ تحقیق کر کے شریعت اسلامیہ کے مطابق کر دیا جائے اور مجرم جس سزا کے مستحق قرار پائیں بعد ثبوت وہ سزا ان کو دی جائے، اس کے بعد وہ نصرت آباد کے قلعے کو اپنے دو وزر خرید غلاموں شنبہ اور رفیق کی نگرانی میں دے کر محرم ۹۶۱ھ (۵۴-۱۵۵۳ء) کو بکھر کے قلعے میں چلا آیا۔[2]

ان واقعات نے میرزا شاہ حسن کی مخالفت کی آگ کو اور بھی بھڑکایا۔

ٹھٹھہ میں میرزا عیسیٰ ترخان کی اطاعت کا عہد:

چنانچہ محرم ۹۶۲ھ (۱۵۵۴ء) کی ابتدا میں ارغون امرا نے ٹھٹھہ میں جمع ہو کر اس بات کا پکا عہد کیا کہ آج سے ہم میرزا شاہ حسن سے بغاوت کر کے میرزا عیسیٰ ترخان کی اطاعت کریں گے۔ تاریخ طاہری میں ہے کہ اگرچہ میرزا عیسیٰ ترخان، میرزا شاہ حسن کے ارغون اور ترخان امرائیں سب سے کمتر تھا اور شاہی ایوان میں وہ سب امرا کے بعد میں بیٹھتا تھا، لیکن قدرت کی جانب سے قرعہ فال اس کے نام پڑ چکا تھا، وہ بھی ارغونوں کی قدر افزائی کو غنیمت جان کر میرزا کے زوال پر اور اپنے تخت و تاج پر راضی ہو گیا۔[3] پھر انہوں نے میرزا شاہ حسن کے مقربوں، عربی گاہی، شنبہ اور رفیق کو قتل کر کے میرزا شاہ حسن کی بیوی ماہ بیگم کو قید کر دیا اور خزانے پر قبضہ کر کے بہت سا سونا لشکر میں تقسیم کیا۔[4]

یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ میرزا شاہ حسن کی ایک حماقت نے اس آتش بغاوت کو اور بھی تیز کر دیا، ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ وہ آخر عمر میں کثرت سے شراب پینے لگا تھا، اور نشے میں چور رہتا تھا، ایک دن جب وہ نشے کی حالت میں تھا، اس کے خاصہ خیلیوں نے موقع پا کر اس سے کہا کہ ارغونوں نے نمک حرامی کر کے آپ کے خاصہ خیلیوں کے ایک گروہ کو قتل کر دیا ہے، لہٰذا سیاست کے پیش نظر حکم دیا جائے کہ ان کے قصاص میں ان نمک حراموں کو بھی قتل کیا جائے، فی الحال احمد ولی کو جو فتنہ و فساد کی جڑ ہے گرفتار کر لیا جائے، چنانچہ میرزا شاہ حسن نے مستی کے عالم میں ساربان کی نگرانی میں احمد ولی کو قید کر کے سیوستان بھجوا دیا اور احمد علی کے عزیز علی حسین ارغون کو قتل کر کے اس کے سر کو نیزے پر بلند کر کے سارے لشکر میں پھرایا، جس سے ارغونوں میں بغاوت کی آگ کئی گونہ تیز ہو گئی۔[5]

سلطان محمود کے نام حکومت بکھر کا پروانہ:

جب میرزا شاہ حسن ارغونوں کی سرکشی اور بغاوت سے واقف ہوا، تو اس نے بکھر کی حکومت کا پروانہ سلطان محمود کے نام جاری کیا، اور بکھر کے ارغونوں اور ترخانوں کو قتل کرنے کا بھی حکم بھیجا، سلطان محمود خان نے اس معاملے میں اپنی والدہ سے مشورہ کیا اور صورت حال سے واقف کرایا، اس کی والدہ نے بکھر کی حکومت پر اسے مبارکباد دی اور کہا لیکن تمہیں بکھر کے ارغونوں اور ترخانوں کو قتل کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے، البتہ تمہیں ان لوگوں کو قید کر کے میرزا شاہ حسن کے پاس بھیج دینا چاہیے، وہ خود جو چاہے کرے، چنانچہ سلطان محمود خان نے میر جانی ترخان، احمد خان ترخان، حمزہ بیگ، مراد حسین بیگ لار اور دوسرے چند لوگوں کو جو بکھر میں تھے قید کر کے اپنے ساتھ میرزا شاہ حسن کے پاس لے گیا۔ ۲۲ محرم ۹۶۲ھ (۱۵۵۴ء) کو سلطان محمود خان ایک لیس لشکر لے کر میرزا شاہ حسن کے پاس پہنچا اور یہ لشکر اس کے ملاحظے سے گزرا، میرزا شاہ حسن نے خوش ہو کر جنگ کے ارادے سے ٹھٹھہ کا قصد کیا۔[6]

---

(1) تاریخ طاہری، ص ۹۰-۹۱۔
(2) تاریخ معصومی، ص ۸۴۔
(3) تاریخ طاہری، ص ۹۲۔
(4) تاریخ معصومی، ص ۱۸۷۔
(5) تاریخ معصومی، ص ۱۸۸۔
(6) تاریخ معصومی، ص ۱۸۸-۱۸۹۔

موضع ساپاہ میں جنگ:

موضع ساپاہ[1] میں پہنچنے کے بعد میرزا عیسیٰ خان ترخان اور سلطان محمود کے لشکر میں مد بھیڑ ہوئی، دو تین دفعہ دونوں لشکروں میں جنگ اور مقابلہ ہوا، دونوں طرف کے بہت سے لوگ مارے گئے۔[2]

میرزا عیسیٰ ترخان کا خفیہ پیغام:

جب جنگ کے شعلے تیزی سے بھڑکنے لگے، تو میرزا عیسیٰ ترخان نے خفیہ طور پر سلطان محمود خان کے پاس ایک قاصد بھیجا اور اسے پیغام دیا کہ تم دیکھ رہے ہو کہ جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں، جس میں روزانہ جانبین کے کثیر آدمی قتل ہو رہے ہیں، آخر اس جنگ کا مقصد کیا ہے، بہتر یہ ہوگا کہ ہم دونوں آپس میں مل کر اپنے معاملات پر غور کریں، چنانچہ یہ ملاقات آدھی رات کے وقت ہوئی، دونوں ملے اور طویل گفتگو کے بعد دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ میرزا شاہ حسن چند دن کا مہمان ہے، اس لیے ہمیں صلح کی راہ اختیار کرنی چاہیے، اس وقت ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی تیسرا آدمی موجود نہیں، لہٰذا جو بھی طے ہو اس کے مطابق اس ملک کی حکومت کا فیصلہ کریں گے، یہ صلح کے ابتدائی شرائط تھے، جن کے طے ہونے کے بعد دونوں اپنے اپنے لشکروں میں واپس آگئے۔

دوسرے دن صبح کو اس ملاقات کی خبر مشہور ہونے سے پہلے "پیر آر" کے گھاٹ پر فریقین کی نہایت سخت جنگ ہوئی، جس میں میرزا عیسیٰ ترخان کے بہت سے آدمی مارے گئے، ان مقتولوں کے سر جب میرزا شاہ حسن کے سامنے پیش کیے گئے تو اس میں بعض مغلوں کے سر بھی تھے، وہ انہیں دیکھ کر بے اختیار اشکبار ہو گیا، یہ حال دیکھ کر سلطان محمود خان نے آگے بڑھ کر کہا حضور! جب اس طرف کا کوئی آدمی قتل ہوتا ہے تب بھی آپ اشکبار ہوتے ہیں جب اُس طرف کا کوئی آدمی قتل ہوتا ہے تب بھی حضور چشم پرنم ہوتے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا کریں، اس موقع پر شیخ عبدالوہاب اور میرزا قاسم بیگ نے موقع دیکھ کر میرزا عیسیٰ ترخان کی طرف سے خطاؤں اور قصوروں کی معافی چاہی، سلطان محمود خان، میر شاہ محمود اور میر شاہ حسین تکدری نے بھی عرض کیا کہ اگر اس کی خطائیں معاف کر دی جائیں اور ترخان جو قید ہیں ان کو آزاد فرما دیا جائے تو میرزا عیسیٰ حاضری کا شرف حاصل کرے گا۔ میرزا شاہ حسن نے ان لوگوں کی درخواست منظور کر لی، میرزا عیسیٰ ترخان نے بھی ماہ بیگم کو میرزا کے خاصخیلیوں سمیت لشکر میں پہنچا دیا۔[3]

سندھ کی تقسیم کا معاہدہ:

۲ ربیع الاول ۹۶۲ھ (۱۵۵۵ء) کو سلطان محمود اور میرزا عیسیٰ ترخان کی ایک اور ملاقات ہوئی، اس ملاقات میں دونوں نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر عہد کیا کہ وہ آپس میں اتفاق سے رہیں گے اور جب تک میرزا شاہ حسن زندہ ہے، دونوں اس کے مطیع و فرمانبردار رہیں گے، اس کی وفات کے بعد دونوں سندھ کو نصف نصف تقسیم کر لیں گے، لکی سے اوپر کا حصہ سلطان محمود سے متعلق ہوگا اور لکی کی پہاڑیوں کے اُس طرف کا حصہ میرزا عیسیٰ ترخان کا ہوگا، اس معاہدے کو دستاویز کی صورت دے کر اس پر دونوں نے اپنی مُہریں ثبت کیں، اور دوسرے اکابرین نے بھی مُہریں لگائیں، یہ بھی فیصلہ ہوا کہ دونوں علاقوں کے لوگوں کی آمد و رفت جاری رہے گی، تاکہ باہمی ربط و ارتباط میں ترقی ہو، پھر دونوں بغل گیر ہو کر ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

دوسرے دن میرزا قاسم بیگ لار ٹھٹھہ جا کر میرزا عیسیٰ کے بیٹے محمد صالح کو ایک جماعت کے ساتھ میرزا شاہ حسن کی خدمت میں لایا، ادھر سے شیخ عبدالوہاب سلطان محمود خان کے بھائی امیر سلطان کو ٹھٹھہ لے کر گئے اور اسے میرزا عیسیٰ ترخان سے ملوایا۔ میرزا شاہ حسن نے مُلا یاری کی معرفت ایک حوزا نقاروں کا اور ایک قیمتی خلعت میرزا عیسیٰ ترخان کو بھیجا، دوسرے دن میر ذوالنون کا علم جو اسے سلطان حسین میرزا بایقرا نے دیا تھا، مع نقارہ و تمن طوق سلطان محمود خان کو بھجوایا۔[4]

میرزا شاہ حسن کی وفات:

میرزا شاہ حسن ابھی لشکر گاہ ہی میں تھا کہ اس کے طبیب شیخ عبدالوہاب نے اس کی حالت سے اندازہ کر لیا کہ میرزا کی حالت تیزی سے خراب ہوتی جا رہی ہے، اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ وہ صلح کر کے فوراً سیوستان روانہ ہو جائے، چنانچہ یہ حقیقت میرزا کے گوش گزار کی گئی، اور میرزا کی اجازت سے اسی دن صبح کو سب لوگ روانہ ہو گئے، جس

---

(1) ترخان نامے میں جہاں یہ جنگ واقع ہوئی ہے اس کا محل وقوع نالہ سانپا کے کنارے کو بتایا ہے، جو ٹھٹھہ سے دو کوس اس طرف ہے (ترخانہ نامہ) مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۳۹۔

(2) تاریخ معصومی، ص ۱۸۹۔

(3) تاریخ معصومی، ص ۱۸۹-۱۹۰۔

(4) ایضاً- ص ۱۹۰۔

دن میرزا شاہ حسن نے کوچ کیا، اس روز میرزا کی بیماری نے نہایت شدت اختیار کی اور ہر لمحہ اس کی حالت بگڑتی گئی، آخر کار ۱۱ ربیع الاول ۹۶۲ھ (۱۵۵۵ء) کی صبح کو وہ موضع علی پوترہ[1] پہنچے اور وہاں انہوں نے قیام کیا، دوسرے دن ۱۲ ربیع الاول ۹۶۲ھ (۱۵۵۵ء) کو دوشنبے کے دن، سہ پہر کے وقت اسی موضع میں میرزا شاہ حسن نے وفات پائی۔ موت کے وقت شیخ عبدالوہاب اور میرزا قاسم اس کے سرہانے موجود تھے۔

یہ خبر ان دونوں نے سلطان محمود خان کو پہنچائی، سلطان محمود خان نے کشتی میں جا کر میرزا کی لاش کو دیکھا تو وہ بے اختیار رونے لگا، اس نے منہ کھول کر میرزا کو دیکھا اور اس کے پاؤں کو بوسہ دیا، پھر اس کے پائینتی بیٹھ کر ان دونوں سے کہا کہ شیخ عبدالوہاب اور میرزا قاسم تم دونوں گواہ رہنا کہ میں نے آخر وقت تک میرزا کی مخالفت نہیں کی اور نمک حلالی کرتے ہوئے اس وقت بھی اس کے قدموں سے وابستہ ہوں اور میرے سوا کسی دوسرے امیر کو یہ سعادت حاصل نہیں ہے۔

شیخ عبدالوہاب نے میرزا کے غسل، تجہیز و تکفین کا انتظام کیا، اور میرزا کی میت کو تابوت میں رکھ کر شریعت کے مطابق نماز جنازہ ادا کی۔

جب تابوت تیار ہو گیا تو سلطان محمود خان نے میرزا شاہ حسن کی بیوی ماہ بیگم سے کہا کہ مناسب یہ ہے کہ آپ بھی میرے ساتھ بکھر چلیں، اور میرزا کے تابوت کو بھی ساتھ لے چلیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ارغون اور ترخان آپ کی تعظیم و تکریم کے بجالانے میں کوئی کمی کریں، مگر ماہ بیگم اس پر راضی نہ ہوئی اور کہا کہ چونکہ میرزا کی لاش مکہ معظمہ لے جائی جائے گی اور اسے اپنے والد کے مقبرے کے پاس دفن کیا جائے گا، مکہ معظمہ کا فاصلہ ٹھٹھہ سے کم اور بکھر سے زیادہ ہے، اس لیے میں بکھر نہیں جا سکتی۔

چنانچہ اسی دن صبح کو ماہ بیگم، شیخ عبدالوہاب، میرزا قاسم اور خواجہ محمد حسین میرزا کی لاش کو ٹھٹھہ لے جانے کے ذمے دار ہوئے اور سلطان محمود خان بکھر روانہ ہو گیا۔[2]

میرزا شاہ حسن کی مندرجہ بالا تاریخ اور سنہ وفات ہم نے معصومی سے لیا ہے لیکن ترکی بیڑے کا ایک امیر البحر سیدی علی رئیس جو دسویں صدی ہجری کی تیسری چوتھائی کے شروع میں سندھ آیا تھا، اس نے اپنا سفر نامہ مراۃ الممالک کے نام سے لکھا ہے، جس میں اس نے اپنے چشم دید واقعات لکھے ہیں، اس کے یہ چشم دید واقعات تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کتاب کے وہ باب جن کا تعلق سندھ کے ارغونی اور ترخانی دور سے ہے، ان کا ترجمہ سید حسام الدین راشدی نے رسالہ مہران سندھی ادبی بورڈ میں شائع کیا ہے۔ ہم اس سندھی ترجمے کے تحفۃ الکرام (طبع راشدی) کی تعلیقات سے ان اہم واقعات کو دیتے ہیں جو تاریخ معصومی کے بیان کردہ واقعات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

سیدی علی رئیس ۲۶ ربیع الاول ۹۶۲ھ کو جون (فتح باغ) پہنچا وہ لکھتا ہے کہ وہاں اسے میرزا عیسیٰ خان ترخان کی بغاوت کا حال معلوم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہ حسن ارغون نے سلطان محمود کو چار سو کشتیوں کے ساتھ اس کے مقابلے کے لیے بھیجا ہے۔

غالباً یکم یا دو ربیع الثانی (۹۶۲ھ) کو سیدی علی رئیس شاہ حسن کے لشکر میں پہنچا اور خلعت سے سرفراز ہوا، یہ مہینہ سلطان محمود اور عیسیٰ کی جنگ میں گزرا۔ وہ لکھتا ہے کہ ۲۹ ربیع الثانی ۹۶۲ھ کو حاجی ماہ بیگم ٹھٹھہ سے لشکر میں پہنچی حالانکہ معصومی نے اس کی لشکر میں آمد کی تاریخ یکم جمادی الاول ۹۶۲ھ لکھی ہے، جو قطعاً مشتبہ ہے۔

پھر سیدی علی رئیس نے لکھا کہ روز دوشنبہ یکم اپریل ۱۵۵۵ء (۹ جمادی الاول ۹۶۲ھ) کو شاہ حسن نے وفات پائی، وہ اس کی وفات کے وقت وہاں موجود تھا، پھر اس نے لکھا کہ جس وقت شاہ حسن نے وفات پائی تو مشہور ہوا کہ ماہ بیگم نے اس کو زہر دیا ہے، تاریخ طاہری صفحہ ۹۴ اور تحفۃ الکرام صفحہ ۱۲۹ پر بھی اس کے زہر دیے جانے کی طرف اشارہ موجود ہے لیکن زہر دینے والے کے نام کی صراحت نہیں، خود سیدی علی رئیس نے میرزا شاہ حسن کی تاریخ وفات کہی جو اس وقت وہاں موجود تھا:

شاہ حسن سند کہ شہ ایزد ولی جکیتی اجل جا یتی تاپی فنا
ہاتف غیب ایستی تاریخی[3] جنت فردوس مکانی اولا

میرزا عیسیٰ ترخان اور سلطان محمود کی مڈبھیڑ:

جیسے ہی میرزا شاہ حسن کی وفات کی خبر ٹھٹھہ پہنچی، میرزا عیسیٰ ترخان ایک کثیر لشکر لے کر روانہ ہوا اور سلطان محمود خان کے قریب

---

[1] ترخان نامے میں ہے کہ موضع "علی پوترہ" ٹھٹھہ سے بیس کوس کے فاصلے پر واقع ہے، معصومی کے سندھی ترجمے میں اس موضع کا نام "علی پوتہ" درج ہے۔ (ترخان نامہ، ص ۴۳)۔

[2] تاریخ معصومی، ص ۱۹۲-۱۹۳۔

[3] تحفۃ الکرام (طبع راشدی) تعلیقات، ص ۴۹۳-۴۹۴ بحوالہ مراۃ الممالک، ص ۴۰۔

پہنچ گیا، دونوں جانب نقارۂ جنگ بجنے لگے، سلطان محمود خان نے صفیں درست کر کے میرزا عیسیٰ ترخان کے پاس ایک قاصد بھیجا اور پوچھا کہ تمہاری آمد کا مقصد کیا ہے؟ اگر جنگ کا ارادہ ہے تو صاف کہو تاکہ میں صفیں آراستہ کروں، میرزا عیسیٰ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں نے ارغونوں سے سنا تھا کہ ماہ بیگم اور تم میرزا کی لاش بکھر لے جارہے ہو۔ میں اس لیے آیا تھا کہ تم سے کہوں کہ یہ مناسب نہیں کہ تم اس کی لاش کو یہاں سے بکھر لے جاؤ، آخر ٹھٹھہ بھی تو میرزا کی مملکت ہے، لیکن یہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ ماہ بیگم میرزا کا جنازہ ٹھٹھہ لے کر گئی ہے، اس لیے اب آپ اطمینان سے بکھر روانہ ہو جائیں۔[1]

میرزا عیسیٰ ترخان کا سیوہن پر قبضہ:

چنانچہ وہاں سے روانہ ہو کر سلطان محمود خان سیوہن پہنچا، سیوہن میں بعض امرا کے دماغ میں یہ خبط سمایا کہ ٹھٹھہ پر میرزا عیسیٰ ترخان کا قبضہ ہے اور بکھر پر سلطان محمود کا، پھر کیوں نہ ہم سیوہن پر اپنا قبضہ جمائیں، لہٰذا میرزا شاہ مسعود، شاہ حسین تکدری، میر ابوالخیر، میر حمید ساربان، خواجہ باقی اور دوسرے امرا نے سیوہن پر قبضہ کر لیا۔

جب سلطان محمود خان سیوہن پہنچا، تو انہوں نے اسے قلعہ کے اندر نہیں آنے دیا، ہر چند انہیں سلطان محمود نے سمجھانے کی کوشش کی، مگر وہ نہ مانے، مجبوراً وہ میر ابوالخیر اور عبدالحمید کو ساتھ لے کر بکھر روانہ ہو گیا۔

میرزا عیسیٰ ترخان جو اس وقت سن[2] کے نواح میں تھا جب اسے یہ خبر ملی کہ سیوہن کے لوگوں نے قلعہ بند ہو کر سلطان محمود خان کو اندر نہیں آنے دیا، تو اس نے اپنے بیٹے محمد صالح کو ایک کثیر لشکر کے ساتھ سیوہن کے محاصرے کے لیے بھیجا، میرزا محمد صالح نے سیوہن پہنچ کر سیوہن کا محاصرہ کر لیا، بعد میں خود بھی میرزا عیسیٰ ترخان وہاں آ پہنچا، یہاں تک کہ اہل قلعہ محاصرے سے عاجز آ گئے، آخر تاریخ معصومی کے مولف میر معصوم کے دادا میر کلاں نے درمیان میں بڑھ کر صلح کرائی اور سیوہن پر میرزا عیسیٰ ترخان کا قبضہ ہو گیا۔

میرزا شاہ حسن کی لاش ٹھٹھہ میں:

ہم گزشتہ اوراق میں بیان کر آئے ہیں کہ میرزا شاہ حسن کی بیوی اس کی لاش ٹھٹھہ لے کر گئی تھی، ٹھٹھہ میں پہلے میرزا کی لاش کو میر احمد ولی کی حویلی میں بطور امانت سپرد کیا گیا، پھر تین ماہ بعد مکلی پر ایک عمارت تعمیر کرا کر میرزا عیسیٰ ترخان نے اسے پہلی جگہ سے نکلوا کر اس عمارت میں دفن کیا، اس موقع پر تمام ارغون اور ترخان اُمرا ماتمی لباس پہن کر پاپیادہ میرزا کے تابوت کے ساتھ گئے، پھر دو سال کے بعد وہاں سے بھی میرزا کی لاش نکال کر مکہ معظمہ لے جایا گیا، جہاں اسے اس کے والد شاہ بیگ کے پہلو میں دفن کیا گیا اور اس پر ایک خوبصورت عمارت تعمیر کرائی گئی۔[3]

میرزا شاہ حسن کے ذاتی اوصاف:

میرزا شاہ حسن کے ذاتی اوصاف کا جہاں تک تعلق ہے، مورخین لکھتے ہیں کہ وہ نہایت ہی شجاع اور بہادر انسان تھا، اس نے اپنی زندگی میں جس معرکے میں بھی قدم رکھا اسے سر کر کے چھوڑا۔ علم سے اسے غیر معمولی تعلق تھا، وہ علوم کے استفادے اور استفاضے میں بے حد دلچسپی لیتا تھا، علوم منقول کا تو وہ ماہر تھا، حکومت کی اہم ذمہ داریوں کے باوجود وہ علم کے حصول میں لگا رہتا، جو سبق بھی پڑھتا تھا، اس کے مفاہیم و مطالب کو فارسی میں لکھ لیتا تھا۔

میر معصوم کا بیان ہے کہ میں نے قاضی دتہ سیوستانی کے کتب خانے میں اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے وہ دس جزو دیکھے تھے، جسے اس نے قاضی صاحب کے حلقۂ درس و تدریس میں شریک ہو کر فارسی میں اپنے طور پر قلم بند کیا تھا۔[4]

شعر کو سمجھتا بھی خوب تھا، اور خود بھی شعر کہتا تھا، شاعری میں "سپاہی" تخلص کرتا تھا، میر علی شیر قانع نے اپنے مشہور تذکرے مقالات الشعراء میں اس کے بعض اشعار نقل کیے ہیں، جن میں سے چند یہ شعر ہیں۔

عشقت کہ بود مایۂ اربابِ سلامت
از وی نبود حاصلِ ما جز بندامت
آن کس کہ بتیغ ستم عشق تو میرد
نبود ہوس زندگیش روزِ قیامت
عمریست کہ ای سرو خرامندہ گزشتی
غائب نشد از دیدہ من آن قدوقامت

---

(1) تاریخ معصومی، ص ۱۹۳۔

(2) سن: سندھ کا ایک مشہور قصبہ ہے، جو تعلقہ سیوہن میں واقع ہے۔

(3) تاریخ معصومی، ص ۱۹۳-۱۹۴۔

(4) تاریخ معصومی، ص ۱۹۵۔

ای شاہ تو دربار گہ ناز مقیمی
مارا بسر کوی نیاز است اقامت
پابوس سگت گریہ "سیاہی" ندہد دست
تا زندہ بود میگزد انگشت ندامت[1]

سیاست و جہاں بانی کی تعلیم اس نے بابر جیسے مدبر اور اولو العزم بادشاہ کی تربیت گاہ میں حاصل کی تھی، جب وہ بابر کے پاس مقیم تھا، تو خود بابر نے اسے یہ کہہ کر سندِ امتیاز بخشی تھی کہ شاہ حسن ہمارے پاس ملازمت اور نوکری کے لیے نہیں آیا بلکہ وہ تو اس لیے آیا ہے کہ ہم سے حکومت کے آداب و جہاں بانی کے اصول سیکھے۔

مشائخ و علماء کا وہ بے حد احترام کرتا تھا، ان کے مشاہروں، تنخواہوں اور وظائف میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرتا تھا۔[2]

میرزا شاہ حسن کا دورِ حکومت سندھ:

لیکن سوال یہ ہے کہ اس نے اپنے سندھ کے چوتیس سالہ دور حکومت میں اہل سندھ کو کیا دیا، تو ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ بھی اس معاملے میں اپنے باپ کے نقش قدم پر تھا، ہمیں اس کے چوتیس سالہ دور حکومت میں ایک بھی کارنامہ ایسا نہیں ملتا کہ جسے ہم مثال کے طور پر پیش کر سکیں اور کہہ سکیں کہ یہ اس نے سندھ کے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے انجام دیا تھا، ابتداً اپنی سیاست کا سکہ بٹھانے کے لیے اس نے ٹھٹھہ میں جو قتل عام کیا، اس کا تذکرہ ہم کسی جگہ طاہر نسیانی کی زبانی گزشتہ اوراق میں کر آئے ہیں، ہمایوں سے روباہ بازیاں کرنے میں اس نے سندھ کے مختلف حصوں کو کئی سال تک غلہ روک کر مصنوعی قحط کے عذاب میں گرفتار رکھا، اپنے آخری دور میں ملک کے اوباشوں اور کمینوں کو رعایا اور عوام کے سر پر مسلط کر کے وہ اذیت پہنچائی کہ طاہر نسیانی لکھتا ہے کہ:

اعیان ارغون و ترخان، بل ہمہ سپاہی و شہری از دل و جان از میرزا رنجیدند ابنائی جنس او، کہ ہر یک در مردانگی و دلاوری خود را رستم زمانِ و اسفندیار دوراں، می پند اشتند، بریں آمدند کہ وجود او را معدوم سازند، و از تختش بتحت الثری اندازند۔[3]

ارغونوں اور ترخانوں کے سردار، بلکہ ہر سپاہی اور شہری میرزا شاہ حسن سے سخت رنجیدہ تھا، خود اس کے ہم قوم لوگ جو اپنے آپ کو رستم زماں اور اسفندیار دوراں سمجھتے تھے، اس فکر میں تھے کہ کسی طرح اس کے وجود کو مٹا دیں، اور اس کو تخت سے تحت الثریٰ میں پہنچا دیں۔

آخر اس نے اپنی زندگی ہی میں دیکھ لیا کہ وہ ارغون اور ترخان جو اس کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے تھے، خود انہوں نے اس سے بیزار ہو کر میرزا عیسیٰ ترخان کے حلقۂ اطاعت کو اس کی زندگی ہی میں اپنی گردن میں ڈال لیا۔

ہمیں شاہ حسن ارغون کے دور میں سندھیوں میں آزادی کی وہ تڑپ نظر نہیں آتی، جو شاہ بیگ کے زمانے میں نظر آتی ہے، بلکہ اس کے اس طویل اور مسلسل دور میں ان پر خاموشی طاری دکھائی دیتی ہے اور ان میں ایک علیحدہ پسندی اور گوشہ گیری نظر آتی ہے، اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ شاہ بیگ ارغون نے اپنے مختصر سے دور میں رولر مشین کی طرح ان کے جذبۂ آزادی کو اس طرح کچلا تھا کہ وہ اس سے بھی پنپ نہیں پائے تھے یا مایوسی نے ان کو اس منزل میں پہنچا دیا تھا کہ اب وہ کسی کرشمۂ غیبی کے منتظر تھے۔

ازواج و اولاد:

میرزا شاہ حسن نے پہلی شادی ۹۳۰ھ (۲۴-۱۵۲۳ء) میں گل برگ بیگم سے کی تھی، لیکن کچھ مدت کے بعد اسے طلاق دے دی اور گل برگ بیگم نے ہمایوں سے نکاح کر لیا، جب ہمایوں سندھ آیا تھا تو گل برگ بیگم بنت نظام الدین علی خلیفہ برلاس اس کے ساتھ تھی۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام میرزا ابو المنصور تھا، ابھی یہ دو سال ہی کا تھا کہ اس نے وفات پائی۔

اس نے دوسری شادی حاجی ماہ بیگم سے کی تھی، جس کے بطن سے ایک لڑکی چوچک بیگم تھی، جس کی شادی میرزا کامران سے ہوئی۔[4]

ارغون دور میں سندھ کے علماء و فضلاؤ شعراء:

ارغون دور میں ہمیں حکومت کی جانب سے سندھ میں علم و فضل کو ترقی دینے اور ملک سے جہالت کو دور کرنے کی کوئی کوشش نہیں ملتی، یہ اور بات ہے کہ یہاں کے بعض علماء و شعراء کو ارغون فرمانرواؤں کی

---

(1) مقالات الشعراء، ص ۲۸۷-۲۸۹۔
(2) تاریخ معصومی، ص ۱۹۵۔
(3) تاریخ طاہری، ص ۹۱۔
(4) بیویوں اور اولاد کی تفصیل شجرہ F مشمولہ ترخان نامہ مرتب سید حسام الدین راشدی سے ماخوذ ہے۔

سرپرستیاں حاصل تھیں، مگر پھر بھی ہمیں اس عہد میں، بڑی کثرت سے عالم، صوفیہ، شاعر اور اہل قلم نظر آتے ہیں جن کی ضیاباریوں نے نہ صرف سندھ کو روشن کر رکھا تھا، بلکہ ان کے علم و فضل، شعر و ادب کی روشنی دنیا کے دوسرے خطوں کو بھی منور بنائے ہوئے تھی۔

یہاں ہم اس دور کے اکابر علم و فضل و شعر و ادب کے حالات اختصار سے نقل کرتے ہیں۔

۱۔ میر محمود معروف بشیخ میرک بن میر ابو سعید پورانی:

عرب شاہی سادات کے خاندان کے چشم و چراغ تھے، جو پشتوں سے فضائل میں ممتاز چلا آتا ہے، وہ خود بھی فضل و سخاوت، زہد و تقوی میں منفرد تھے، کئی سال تک سندھ میں شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز رہے، ان کی ذات علم و فضل کا وہ سرچشمہ تھی کہ اکثر طالب علم ان سے کسب علم کر کے اپنے ہمعصروں سے بازی لے گئے۔ میر محمود مختلف خطوں میں عموماً اور خط نستعلیق میں خصوصاً بڑی مہارت رکھتے تھے، انہوں نے ماہ محرم ۹۶۲ھ (۱۵۵۴ء) میں وفات پائی۔[1] "رفت میرک آہ آہ" سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

۲۔ شیخ میر محمد اور شیخ عبد الوہاب:

یہ دونوں میر بایزید اور میر ابو سعید پورانی کے فرزند اور شیخ میرک کے بھتیجے تھے، شیخ عبد الوہاب خصائل حمیدہ اور اطوار پسندیدہ سے آراستہ تھے، نہایت خوش طبع بزرگ تھے، وہ بادشاہوں کو وعظ و نصیحت کرنے کی حتی الامکان کوشش فرماتے، "جامع فتاوی پورانی" علم فقہ میں ان کی مشہور تصنیف ہے۔

ان دونوں بزرگوں نے ۹۹۰ھ (۸۳-۱۵۸۲ء) میں وفات پائی۔[2]

۳۔ شاہ قطب الدین بن شاہ محمد طیب:

یہ خراسان کے رفیع الدرجات سادات میں تھے، ترکمانیوں کے ساد کے بعد انہوں نے سندھ آکر بکھر میں سکونت اختیار کی، ہر جمعہ کو اپنے وعظ سے لوگوں کو راہ ہدایت کی ترغیب دیتے، انہوں نے ۹۷۷ھ (۱۵۷۷ء) میں وفات پائی، ان کی تاریخ وفات "واعظ" سے نکلتی ہے۔[3]

۴۔ سید میر کلاں:

یہ کربلا کے جلیل القدر سادات تھے، سید میر کلاں جب قندھار پہنچے تو ان کا گزر میر شیر قلندر کے مزار پر ہوا، جن کا مزار قندھار سے تین فرسخ پر اشکلچہ میں واقع ہے، سندھ کی فتح کے بعد میر کلاں قندھار سے سندھ تشریف لائے اور سیوستان کے نواح میں مقیم ہوگئے، ان کا زیادہ تر وقت حضرت شہباز قلندر کے مزار پر گزرتا، زہد و عبادت میں ان کی کوئی مثال نہ تھی، فقیروں اور مسکینوں کے ساتھ نہایت حسن سلوک سے پیش آتے تھے، صاحب اولاد کثیرہ تھے، ان ہی کی اولاد میں سندھ کے مشہور مورخ میر معصوم بکھری ہیں۔[4]

۵۔ مخدوم محمود فخر پوترہ:

یہ اپنے دور کے جلیل القدر عالم تھے، علوم ظاہری و باطنی کے حامل تھے، سندھ میں اشاعت علم کا سہرا ان ہی کے سر ہے، موضع کاہان میں مقیم تھے، جو طلباء بھی ان کی خدمت میں علم حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوئے، وہ سب اپنے مقصود پر فائز ہو کر اعلیٰ مدارج تک پہنچے۔[5]

۶۔ مخدوم بلاول:

یہ بزرگ موضع ٹلٹی میں رہتے تھے، ان کا وقت زیادہ تر پند و موعظت میں گزرتا تھا، بہت بڑے عارف اور واصل باللہ بزرگ تھے، علم تفسیر اور حدیث کے ماہر تھے، یہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے سندھ میں بیرونی اقتدار کے مسلط ہونے کی علی الاعلان مخالفت کی اور شاہ بیگ ارغون سے ٹکر لی، فارسی کے خوش گو شاعر تھے، صاحب مقالات الشعراء نے ان کے فارسی کی یہ رباعی نقل کی ہے:

در راہِ خدا ز سر قدم باید ساخت
سرمایۂ اختیار خود می باید باخت
کفر ست بخود نمائی بردن بہ جہاں
از خویش برون شدہ سویش می باید تاخت[6]

---

[1] تاریخ معصومی، ص ۱۹۶۔
[2] تاریخ معصومی، ص ۱۹۷۔
[3] تاریخ معصومی، ص ۱۹۷۔
[4] تاریخ معصومی-فارسی، ص ۱۹۸ و تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۴۳۶۔
[5] تاریخ معصومی-فارسی، ص ۱۹۸۔
[6] مقالات الشعراء، ص ۹۲۔

زہد و ریاضت کے ساتھ ساتھ آپ نے عوام کی مذہبی اور روحانی تعلیمات کی طرف خاص طور پر توجہ دی، عبادت و ریاضت کے بعد آپ کو جو کچھ وقت ملتا، آپ اپنے وقت کا بڑا حصہ پند و موعظت میں صرف کرتے اور عوام کی مذہبی، اخلاقی و معاشرتی حالت سنوارنے کی کوشش کرتے۔

مخدوم بلاول نے ۹۲۹ھ (۲۳-۱۵۲۲ء) میں وفات پائی، آپ کا مزار مکلی میں درگاہ شیخ حماد جمالی کے عقب میں واقع ہے۔[1]

۷۔ مولانا عبدالعزیز ہروی ابھری:

تاریخ معصومی میں ہے کہ یہ عصمت دین کی حفاظت کی خاطر اپنے دو صاحبزادوں کے ساتھ اندرون سندھ تشریف لے گئے اور موضع کاہان میں سکونت اختیار کر کے وہاں کے طلباء کو تعلیم دینے میں مشغول ہو گئے، سندھ میں علم معقول زیادہ تر ان ہی کی وجہ سے پھیلا۔[2]

۸۔ قاضی دتہ سیوستانی بن مخدوم راہو:

ان کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں قاضی صدر الدین سے جا ملتا ہے، قاضی دتہ سیوستانی نے مطول وغیرہ اپنے والد مخدوم راہو سے پڑھی، اور اس کے بعد مخدوم بلاول کی خدمت میں رہ کر حدیث و تفسیر کا مطالعہ کیا، ان کے علاوہ انہوں نے مخدوم فخر پوترہ، مخدوم عبدالعزیز ہروی سے بھی تحصیل علم کی، میرزا شاہ حسن نے کچھ دن ان کی خدمت میں رہ کر تعلیم حاصل کی تھی، وہ ان کی بے حد تعظیم و توقیر کرتا تھا اور انہیں اس نے مخدوم اور استاد کا لقب دیا تھا، وہ انہیں علم میں امام جاراللہ زمخشری کہا کرتا تھا۔ میر معصوم بکھری مؤلف تاریخ معصومی بھی ان کے تلامذہ میں تھے، قاضی دتہ سیوستانی کا مزار موضع باغبان میں ہے۔[3]

۹۔ مخدوم رکن الدین عرف مخدوم متو:

یہ مخدوم بلاول کے جلیل القدر خلفاء میں تھے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کی اولاد میں تھے، ان کے وقت کا بڑا حصہ طاعات و عبادات میں صرف ہوتا تھا۔ علم حدیث میں وہ اپنے دور میں یگانہ تھے، ان کی تصانیف میں شرح اربعین، شرح کیدانی اور بعض دوسرے رسائل مشہور ہیں، مخدوم متو نے ۹۴۹ھ (۴۳-۱۵۴۲ء) ہمایوں کے عین فتراق کے زمانے میں ٹھٹھہ میں وفات پائی، "وارث الانبیاء" سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔[4]

۱۰۔ قاضی قاضن:

ارغون دور کے مشہور علماء میں تھے، ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: قاضی قاضن بن ابو سعید بن قاضی زین الدین عسکری بن قاضی قاضن، کیونکہ ان کے جد اعلیٰ کا لقب قاضی قاضن تھا، اسی نسبت سے یہ بھی قاضی قاضن کہلائے، قاضی قاضن کے بزرگوں میں سب سے پہلے قاضی ابو الخیر سندھ تشریف لائے اور بکھر میں متوطن ہوئے، اس کے بعد اس خاندان کے دوسرے افراد نے ٹھٹھہ اور سیوستان کو اپنا وطن بنایا، قاضی قاضن ثانی بھی اپنے علم و فضل کے اعتبار سے ارغون عہد کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے، حافظ قرآن مجید تھے، قرات و تجوید، حدیث، تفسیر، فقہ، تصوف اور دوسرے علوم میں غیر معمولی تبحر رکھتے تھے، فن انشا میں تو ان کی مثال نہیں ملتی تھی، وادی سلوک میں بے حد ریاضتیں کی تھیں، حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے اور بہت سیر و سیاحت کی تھی، چونکہ سید میراں مہدی جون پوری کے مرید تھے، اس لیے اس دور کے اکثر علماء ان کے مخالف تھے۔ شاہ بیگ کی وفات کے بعد شاہ حسن ارغون نے ان کو بکھر کا قاضی بنایا تھا، مقدمات کے فیصلوں میں کمال احتیاط اور تمام شرعی امور کو پیش نظر رکھتے تھے، آخر میں پیری کی وجہ سے اس عہدے سے مستعفی ہو گئے اور ان کی جگہ ان کے بھائی قاضی نصر اللہ مقرر ہوئے۔ قاضی قاضن نے ۹۵۸ھ (۵۲-۱۵۵۱ء) میں وفات پائی۔[5]

۱۱۔ قاضی عبداللہ بن قاضی ابراہیم:

یہ بہت بڑے صاحب تقویٰ اور صاحب علم و فضل بزرگ تھے، انہوں نے مخدوم عبدالعزیز ہروی بھری سے فضل و کمال حاصل کیا تھا۔ طبیعت کے ذرا تیز تھے۔ ابتداً اپنے وطن دربیلہ میں رہتے تھے، لیکن شاہ بیگ کے سندھ فتح کرنے کے کچھ عرصے بعد وہ باغبان اور راوت میں بھی مقیم رہے۔ ۹۳۴ھ (۲۸-۱۵۲۷ء) میں وہ سندھ سے گجرات چلے گئے اور

---

(1) تذکرہ صوفیائے سندھ (تالیف: اعجاز الحق قدوسی) ص ۶۶-۶۷۔

(2) معصومی، ص ۱۹۹۔

(3) تاریخ معصومی، ص ۱۹۹۔

(4) تاریخ معصومی-فارسی، ص ۲۰۰، تذکرۂ علمائے ہند، تحفۃ الکرام، فارسی، ج-۳ ص ۲۱۸۔

(5) تاریخ معصومی-فارسی، ص ۲۰۱-۲۰۲۔

پھر وہاں سے مدینہ منورہ جاکر مقیم ہوگئے اور انہوں نے وہیں وفات پائی۔

ان کے خلفاء میں شیخ صالح، شیخ رحمت اللہ، اور شیخ حمید جو سندھ میں تھے مشہور ہیں۔[1]

۱۲۔ مولانا مصلح الدین لاری:

یہ نہایت دانشمند اور متبحر عالم تھے، کچھ عرصے انہوں نے میرزا شاہ حسن کو بھی تعلیم دی تھی۔ ۹۵۱ھ (۴۴-۱۵۴۳ء) میں وہ حج کی اجازت لے کر مکہ معظمہ چلے گئے، ان کی تصانیف میں شرح شمائل نبوی، حواشی تفسیر بیضاوی، شرح منطق فارسی اور دوسرے رسائل مشہور ہیں۔[2]

۱۳۔ شاہ جہانگیر ہاشمی:

شاہ حسن ارغون کے دور کے مشہور شاعر ہیں، ان کا پدری سلسلۂ نسب شاہ قاسم انوار سے اور مادری سلسلۂ نسب شاہ نعمت اللہ ولی[3] سے جا ملتا ہے۔ وہ شاہ حسن ارغون کے ابتدائی عہد میں خراسان سے سندھ آئے اور شاہ حسن ارغون ان کے ساتھ نہایت اعزاز و احترام سے پیش آیا۔ فن شاعری میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے، انہوں نے مثنوی مظہر الآثار تحفتہ الاحرار کے جواب میں ۹۴۲ھ (۲۴-۱۵۲۳ء) میں ٹھٹھہ میں لکھی تھی اور مثنوی مظہر الآنوار مخزن الاسرار کے جواب میں تالیف کی تھی۔ اس مثنوی کا ابھی تک کوئی نسخہ نہیں مل سکا، مثنوی مظہر الآثار کی تالیف کے بعد وہ چھ سال تک سندھ میں رہے، اس کے علاوہ ان کا دیوان مشہور ہے، ۹۴۶ھ (۴۰-۱۵۳۹ء) میں جب کہ وہ سفر حجاز کے ارادے سے کیچ و مکران کے راستے سے جا رہے تھے، انہوں نے ڈاکوؤں کے ہاتھوں سے شہادت پائی۔[4]

۱۴۔ حیدر کلوچ:

اس دور کا ایک مشہور اور صاحب دیوان شاعر تھا، وہ شاہ حسن ارغون کے دور میں سندھ آیا اور موضع پاٹ میں وفات پائی، شاہ حسن ارغون کی مدح میں اس نے متعدد قصیدے کہے ہیں، اس کے قصائد و غزلیات تقریباً دس ہزار اشعار پر مشتمل ہیں۔ صاحب مقالات الشعرا نے اس کے یہ دو شعر تذکرہ مقالات الشعرا میں درج کیے ہیں:

چناں طوطی صفت حیران آن آئینۂ رویم
کہ میگویم سخن اما نمید آنم چہ میگویم

--

پس ازیں بخاکِ کویت من و عجز بینوائی
کہ کم دعای جانت بجہانۂ گدائی[5]

۱۵۔ شاہ حسین تکدری:

یہ شاہ حسن ارغون کے امرا میں شامل تھے، شعر و تاریخ میں انہیں کمال دسترس حاصل تھا، ان کی تصانیف میں روضتہ السلاطین غلط طور پر ان کے نام سے مشہور ہے۔[6] معصومی نے خدا جانے کس طرح روضتہ السلاطین کو حسین تکدری کی تصنیف لکھ دیا ہے، حالانکہ یہ فخری ہروی کی تالیف ہے۔

۱۶۔ مولانا فخری ہروی:

یہ ایک خوش طبع انسان تھے، صنائع و بدائع اور عروض و قافیہ میں ان کی بعض تصانیف ہیں۔[7]

ہم نے یہاں ارغون دور کے چند علماء، صوفیاء اور شعرا کا تذکرہ کر دیا، ورنہ ان کے علاوہ اور بہت سے علماء، مورخ اور شعرا سندھ میں موجود تھے، اور اس وقت سیوہن، نصرپور، ٹھٹھہ، سکھر علوم و فنون کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

---

(1) تاریخ معصومی-فارسی، ص ۲۰۲-۲۰۳۔

(2) تاریخ معصومی-فارسی، ص ۲۰۲۔

(3) امیر نور الدین نعمت اللہ ولی بن میر عبداللہ ۷۳۰ھ یا ۷۳۱ھ میں حلب میں پیدا ہوئے، امام خامس ابو جعفر محمد الباقر بن علی بن حسین کی اولاد میں تھے، چالیس سال کی عمر میں مکہ معظمہ چلے گئے اور شیخ عفیف الدین ابی محمد عبداللہ بن اسعد سے خرقۂ خلافت حاصل کیا، سات سال کے بعد سیر و سیاحت کرکے کرمان آئے۔ اور قصبہ ماہان میں مقیم ہوگئے۔ ۲۲ یا ۲۵ رجب ۸۳۳ھ میں ایک سو چار سال کی عمر میں ماہان ہی میں وفات پائی۔ (فٹ نوٹس مقالات الشعراء تالیف: سید حسام الدین راشدی) ص ۸۴۵۔

(4) مقالات الشعراء، ص ۸۳۴ تا ۱۸۸۹۔

(5) تاریخ معصومی-فارسی، ص ۲۰۴-مقالات الشعراء ص ۱۸۶-۱۸۵۔

(6) مقالات الشعراء ص ۱۸۵ تا ۱۸۔

(7) تاریخ معصومی-فارسی، ص ۲۰۶۔

باب: 17

ترخانی دور حکومت

میرزا عیسیٰ ترخان اول

(عہدِ حکومت)

۹۶۲ھ (۱۵۵۵-۱۵۵۴ء) --- ۹۷۳ھ (۱۵۶۶-۱۵۶۵ء)

ہم گزشتہ اوراق میں ذکر کر آئے ہیں کہ میرزا شاہ حسن کی وفات سے کچھ پہلے سلطان محمود کو کلتاش اور میرزا عیسیٰ ترخان نے باہمی سندھ کو تقسیم کر لیا تھا، بالائی سندھ پر سلطان محمود کا قبضہ تھا، جس کا مرکز بکھر تھا اور زیرین سندھ پر میرزا عیسیٰ ترخان کا تسلط تھا، جس کا مرکز ٹھٹھہ تھا۔

تخت نشینی:

اس طرح ارغونوں کا آفتاب حکومت غروب ہونے کے بعد سندھ میں ترخانیوں کی حکومت کی بنیاد پڑی، اس خاندان کا پہلا فرمانروا میرزا عیسیٰ ترخان تھا، جو یکم جمادی الاول ۹۶۲ھ (۵۵-۱۵۵۴ء) کو تخت نشین ہوا، اس کا سلسلہ نسب یہ ہے، میرزا عیسیٰ ترخان بن میرزا عبدالعلی ترخان بن میرزا عبدالخالق ترخان بن میر حسین ترخان بن میرزا عبدالعلی ترخان، بن میرزا انور اللہ ترخان بن فضل اللہ ترخان بن امیر اتکش۔[1]

اس خاندان کے ترخان کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے صاحبِ ترخان نامہ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ امیر تیمور اپنے مصاحبین کے ساتھ شکار کے لیے نکلا، راستے میں بارش اور ہوا کا ایسا طوفان آیا کہ تیمور اور اس کے ساتھی اس طوفان باد و باراں میں راستہ بھول گئے، وہ راستے کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے پھر رہے تھے کہ ان کا گزر جنگل کے رہنے والے ایک قبیلے پر ہوا، پہلے تو اس قبیلے کے لوگوں نے انہیں ڈاکو سمجھ کر مقابلے کی ٹھانی لیکن بعد میں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ سب نے مل کر امیر تیمور سے معافی چاہی اور پھر مہمانداری کا حق بجالائے، امیر تیمور نے اس قبیلے کو "ترخان" کا خطاب دیا، جس کے معنی "بہادر" اور مطلق العنان کے ہیں۔ اس کے بعد سے یہ قبیلہ ترخان کے لقب سے مشہور ہوا۔

اس کے بعد جب امیر تیمور کی لڑائی تقتمش خان سے ہوئی، تو اس قبیلے کا ایک سردار ایکو تمر نامی امیر تیمور کی طرف سے لڑتا ہوا مارا گیا، جس سے امیر تیمور کی نظر میں اس قبیلے کی وقعت اور بڑھ گئی، سندھ کے ترخانی فرمانروا اسی "ایکو تمر" کی اولاد سے ہیں۔[2]

ترخان نامے میں ہے کہ میرزا عیسیٰ نہایت ہی نیک نفس اور بااخلاق فرمانروا تھا، سادات و مشائخ کرام کے ساتھ نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آتا تھا اور علماء و فضلا کو دوست رکھتا تھا اور اہل اللہ و فقرا سے غیر معمولی عقیدت رکھتا تھا، رعیت اور سپاہ کے ساتھ اس کا سلوک نہایت عمدہ و مشفقانہ تھا، ہر ایک کے مرتبے کا لحاظ رکھتا تھا۔[3]

ارغون اُمرا کی مخالفت:

تاریخ طاہری میں ہے کہ اس کے تخت نشین ہونے کے تھوڑے دن بعد اُن ارغون امرا نے جو میرزا شاہ حسن کے دست راست تھے او جنہوں نے اسے حکومت کے لیے منتخب کیا تھا، اس کی مخالفت شروع کی کیبک، فرخ تیمور اور دوسرے اُمرا شراب میں مست ہو کر اس کی حویلی میں آتے اور حویلی کے قالینوں کو گھوڑوں کے سموں سے پامال کرتے ہوئے گھوڑوں سے اُترتے۔ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا تھا کہ وہ ا

---

[1] ترخان نامہ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، شجرہ G۔

[2] ترخان نامہ، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۴-۵۔

[3] ایضاً۔ ص ۴۴۔

کے دروازے کو تیروں اور نیزوں سے چھلنی کر کے اس سے یہ نہ کہتے ہوں کہ میرزا شاہ حسن کا جو خزانہ تمہارے پاس ہے، وہ ہم میں تقسیم کرو، لیکن وہ ان بے وقاروں کو نہایت حلم و بردباری سے جواب دیتا کہ مجھے اس مال و خزانے سے کیا تعلق اور سروکار ہے، میں تو اس کا امین اور تحویلدار ہوں، لیکن سلطنت کی بہی خواہی اور ملک کی فلاح و بہبود کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر میں جزوی جزوی طور پر اس خزانے کو تم میں تقسیم کر دوں گا، تو تم میں سے ہر ایک اپنے حصے کو شراب و شاہد میں خرچ کر ڈالے گا، پھر کل اگر کسی جانب سے دشمن ہم پر حملہ آور ہو گا تو ہم اس کی مدافعت کے لیے کچھ نہ کر سکیں گے، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیشہ سے ملک کے استحکام اور بقا کا مدار خزانے پر ہے، اس لیے تم کیوں اس خزانے کو تقسیم کر اکر برباد کرتے ہو اور اس ملک کو دوسروں کی ملکیت بنانا چاہتے ہو، غرضیکہ وہ اس طرح کی باتیں کرتا تاکہ وہ مطمئن ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھیں، وہ ارغونوں کی برہمی سے بچنے کے لیے اس قدر احتیاط برتتا کہ اگر شہر میں کبھی کسی منادی کرانے کی ضرورت پیش آتی تو وہ "صدر کام سندھی" منادی کرنے والے کو کہتا کہ ہر ارغون کے محلے میں جب وہ منادی کرے تو حکومت کے ساتھ اس کا نام بھی شامل کرے، تاکہ میں اور تو ان کے آزار سے محفوظ رہیں اس طرح وہ نہایت تدبر اور احتیاط کے ساتھ اپنی حکومت کو چلا رہا تھا۔[1]

بیٹوں کی تربیت:

یہاں تک کہ میرزا عیسیٰ کے بیٹے میرزا محمد باقی، میرزا صالح، میرزا جان بابا اور میرزا غالب جوان ہو گئے، جن کی تربیت ملا بہبود،[2] شیر تنگ خان صالح اور فتح خان وغیرہ نے کی تھی، جب یہ لڑکے اپنے باپ کے سلام کے لیے حویلی میں آتے، ارغون انہیں دیکھ کر دل میں رشک کرتے، اور دل ہی دل میں خار کھاتے کہ میرزا عیسیٰ کو فرمانروا بنا کر انہوں نے بڑی غلطی کی ہے، لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اب سوائے ندامت کے کوئی چارہ نہ تھا، لیکن وہ اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ وہ اس درخت کو کسی طرح جڑ سے اکھاڑ پھینکیں، مگر جس قدر وہ اس کے اکھاڑنے کی کوشش کرتے تھے، اسی قدر اس کی حکومت کا درخت مضبوط ہوتا جاتا تھا۔[3]

قلعے کی تعمیر:

اسی زمانے میں میرزا عیسیٰ نے اپنی حویلی کے قریب ایک قلعہ تعمیر کرایا، اس کے بیٹے جو شہر میں منتشر طور پر رہتے تھے، ان سب کو یکجا اس قلعے میں رکھا۔[4]

میرزا باقی اور میرزا صالح میں اختلاف:

اسی زمانے میں بدقسمتی سے اس کے دو بیٹوں میرزا محمد باقی اور میرزا محمد صالح میں اختلاف رونما ہوا، چنانچہ میرزا محمد صالح بعض اوقات بطور زیادہ گوئی کے کہا کرتا تھا کہ جب جلال الدین اکبر بادشاہ اپنے مصاحبین کے ساتھ شکار کے لیے آئیں گے تو میں ان کے غلاموں کو یہاں لاؤں گا، مختصر یہ کہ وہ جوانی کی نخوت اور رعونت میں حکومت کو معمولی چیز سمجھ کر اس فکر میں لگا ہوا تھا کہ وہ کسی طرح اس ملک کی حکومت پر قبضہ کرے۔

ادھر میرزا محمد باقی بھی اپنے آپ کو مدبرانِ عالم میں سمجھتا تھا اور خود کو سب سے زیادہ حکومت کا مستحق اور سزاوار جانتا تھا، نتیجہ ان دونوں بھائیوں کے اختلاف نے جنگ کی صورت اختیار کی۔

ہر چند کہ میرزا عیسیٰ ترخان اپنے ان دونوں بیٹوں کو نصیحت کرتا رہتا تھا، اور انہیں آپس کی عداوت اور جھگڑوں سے روکتا رہتا تھا۔ میرزا محمد باقی چونکہ دنیا کے معاملات کو خوب سمجھتا تھا، اس لیے باپ کے کہنے سے باہر نہیں ہوتا تھا، لیکن میرزا محمد صالح اپنی تیزی طبع اور غلط رائے کی وجہ سے باپ کے کہنے کی پروا نہ کرتا تھا، یہاں تک کہ ادھر اس نے باپ کو بوڑھا پا کر اسے گوشہ نشین بننے پر مجبور کر دیا اور دوسری طرف میرزا محمد باقی کو جلاوطنی پر مجبور کر کے "کچھ" کی طرف نکال دیا، جہاں اس نے رائے کنھگار کے پاس پناہ لی، میرزا غالب جو تمام بھائیوں میں چھوٹا تھا، اسے مغلوب جان کر اپنے پاس رکھ لیا، جان بابا کو جو اپنے باپ کو جان سے بھی زیادہ عزیز تھا، اور جسے میرزا عیسیٰ ترخان اپنے سے ایک منٹ بھی جدا کرنا پسند نہ کرتا تھا "سمیجہ" قبائل کے جنگلات میں بھٹکنے پر مجبور کر دیا۔[5]

---

(1) تاریخ طاہری، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۹۵ تا ۹۷۔

(2) ملا بہبود: یہ میرزا عیسیٰ کے خاص خیلوں میں تھا، میرزا باقی نے محل کی ایک کنیز اسے عطا کی تھی، جس کے بطن سے میر علی نامی فرزند پیدا ہوا تھا، میرزا باقی کے زمانے میں جان بابا سے جنگ کے دوران میں سخت حملوں کے بعد یہ کام آیا، اس کے فرزند نے خود کو ارغون خاندان کا فرزند تصور کرتے ہوئے مرایم علی سلطان کا لقب اختیار کیا تھا، (تحفۃ الکرام - ترجمہ اُردو، ص ۲۸۲)۔

(3) تاریخ طاہری، ص ۹۷۔

(4) تاریخ طاہری، ص ۹۸۔

(5) تاریخ طاہری، ص ۹۸ تا ۹۹۔

میرزا محمد صالح کا تسلط:

غرضیکہ اس نے باپ کو گوشہ نشین بنا کر اور بھائیوں کو جلاوطن کر کے ملک کی حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔

میرزا محمد باقی کی مصیبتیں:

میرزا محمد باقی قاضی خمیسہ،[1] چھتہ جولی، خلیل خدمتگار، مل ہندو اور دوسرے چند خدمتگاروں کے ساتھ "کچھ" کے علاقے میں جا کر سخت پریشان ہوا اور وہاں اس نے طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھائیں، اس کی بدحالی اور پریشانی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ ایک روز اسی مسافرت میں کپڑا منہ پر تانے ہوئے سخت بھوک کی حالت میں پڑا ہوا تھا، اتفاق سے اس کے ایک ساتھی کو باجرے کے خوشے کہیں سے ملے، وہ اور اس کے ساتھی بھوک میں انہیں کچا چبانے لگے، میرزا نے بھوک کی تاب نہ لا کر کپڑا منہ پر سے ہٹا کر اپنے رفقا سے پوچھا کیا کھا رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ جو کچھ ہم کھا رہے ہیں، وہ آپ کے شایان شان نہیں، میرزا نے کہا تم یہ کیا کہتے ہو، کیا تم مجھے فرشتہ سمجھتے ہو کہ میں بغیر کھائے پیے زندہ رہ سکتا ہوں، جو کچھ بھی تم کھا رہے ہو، میرے لیے بھی لاؤ۔ پھر اس نے باجرے کے ان چند دانوں سے پیٹ بھرا۔[2]

میرزا باقی کے لڑکے مظفر خان کا بیان ہے کہ اسی سفر میں کئی دن کے فاقے کے بعد میرزا باقی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے سخت بھوک لگی ہے، کہیں سے کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے لاؤ، اس کے ساتھیوں کو کوئی چیز نہ ملی، اتفاق سے ملا خمیسو کہیں سے کچے چاول لے آیا، جس پر کُتے نے قے بھی کی تھی۔ ملا خمیسو نے سارا واقعہ بیان کیا، میرزا نے کہا عجیب وقت ہے، بات نہ کرو، اور فوراً پکا کر لے آؤ کہ اس بھوک میں یہ ہمیں حلال ہیں، چنانچہ وہ چاول پکائے گئے اور میرزا باقی پکنے کے بعد انہیں فی الفور کھا گیا۔ الغرض میرزا محمد باقی اسی قسم کے نامساعد حالات سے گزر رہا تھا کہ ایک روز اس کے ساتھیوں میں سے چھتہ جولی ایک بکری چُرا کر لایا، اور اس کے کباب بنائے، بکری کے مالک نے پتا چلا کر انہیں چور سمجھ کر پکڑ لیا، اور رائے کنھگار سمہ 'راجا' کچھ کی خدمت میں پیش کیا، جب رائے کنھگار کو یہ معلوم ہوا کہ میرزا محمد باقی میرزا عیسیٰ ترخان کا لڑکا ہے، تو اسے اس کی پریشان حالی دیکھ کر نہایت افسوس ہوا اور وہ اس کے ساتھ نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آیا، اور اسے ہر طرح کی مدد دے کر اسے اپنے پاس رکھا اور اس کے ساتھ ہر طرح کی ہمدردی کی، یہاں تک کہ اپنی بیٹی "جاریجی" کی شادی میرزا محمد باقی سے کر دی، اور نہایت بیش قیمت جہیز اپنی لڑکی کو دیا، میرزا باقی ترخان کا بیٹا میرزا مظفر ترخان اسی خاتون کے بطن سے پیدا ہوا۔[3]

میرزا محمد باقی اور میرزا صالح کی جنگ:

جب میرزا محمد باقی کے حالات سازگار ہوئے، تو اس نے "کچھ" میں رہ کر راجپوتوں کا ایک لشکر تیار کیا، تاکہ وہ بدین پہنچ کر سرکار بدین و چاچکان کو بزور شمشیر میرزا محمد صالح کے حکام سے لے لے، اس کی پوری پوری مدد رائے کنھگار نے بھی کی، چنانچہ جب میرزا محمد باقی اس لشکر کے ساتھ بدین کے قریب پہنچا، تو میرزا محمد صالح مغلوں اور ٹھٹھہ کے دوسرے قبائل کا لشکر ساتھ لے کر اس کے مقابلے کے لیے نکلا، دونوں نے جنگ کے لیے صفیں آراستہ کیں، دونوں میں زبردست جنگ ہوئی، لیکن چونکہ میرزا محمد باقی کے گردش کے دن ابھی باقی تھے، وہ میرزا محمد صالح سے نہایت ذلت و رسوائی کے ساتھ شکست کھا کر واپس لوٹا اور میرزا محمد صالح کامیاب ہو کر ٹھٹھہ چلا گیا۔[4]

سلطان محمود خان سے مدد کا مطالبہ:

اس شکست کے بعد میرزا محمد باقی "کچھ" آیا اور اس نے رائے کنھگار سمہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ آپ نے مجھے مدد دینے میں کسی قسم کی کمی نہیں کی، جس کے لیے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں، اب میں اپنے معاملے کو خدا کے سپرد کرتا ہوں آپ بھی مجھے خدا کے سپرد کیجیے اور اپنی بیٹی کی دیکھ بھال رکھیے، اب میں سلطان محمود خان والی بکھر کے پاس جاتا ہوں اور اس سے امداد کا طالب ہوتا ہوں، اس کی امداد اور کمک سے میں ایک مرتبہ پھر میرزا محمد صالح کا مقابلہ کروں گا،

---

(1) قاضی خمیسہ: تحفۃ الکرام میں ہے کہ یہ ایک آوارہ شخص تھا، قاضی کا لقب برعکس نہند نام زنگی کافور کے مصداق تھا، میرزا باقی کی رفاقت اور اپنی قسمت کی یاوری کی وجہ سے نالائق ہونے کے باوجود میرزا محمد باقی کے عہد میں اس کے بھائی میرزا صالح کی ساری جاگیروں پر قبضہ کر کے سارے ملک کا وکیل مطلق اور مدار المہام بن گیا۔ اس کا عروج اس حد تک ہوا کہ وہ ہزاروں گھوڑوں اور ملازموں کے جلوس میں نکلتا تھا لیکن نہایت ذلیل انسان تھا (تحفۃ الکرام اردو ترجمہ ص ۲۸۲ تا ۲۸۳)۔

(2) تاریخ طاہری، ص ۹۹-۱۰۰۔

(3) میرزا باقی کی پریشانی کے یہ واقعات تاریخ طاہری، ص ۱۰۰ تا ۱۰۲ سے ماخوذ ہیں۔

(4) تاریخ طاہری، ص ۱۰۳-۱۰۴۔

دیکھیے خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔[1]

چنانچہ وہ سلطان محمود خان کے پاس بکھر پہنچا اور اس نے میرزا محمد صالح سے جنگ کے تمام واقعات اس سے بیان کر کے امداد کی درخواست کرتے ہوئے کہا کہ اس بے کس کی مدد فرمایئے، تاکہ میں آپ کی اعانت و مدد سے اپنا ملک حاصل کر سکوں۔ سلطان محمود خان چونکہ ایک تجربہ کار اور نہایت مدبر انسان تھا، اُس نے جواب دیا کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے باپ کے اور میرے درمیان قدیم زمانے سے معاہدہ ہے کہ ہمارا لشکر نہ اس کے صوبے میں جائے گا اور نہ اس کا لشکر ہمارے صوبے میں آئے گا، اس معاہدے کے پیش نظر اس کے صوبے میں لشکر بھیجنا کسی طرح مناسب نہیں، میرزا باقی نے کہا کہ مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، وہ میں نے آپ کو اپنے باپ کی جگہ سمجھ کر عرض کر دیا، اب آپ کوئی ایسی تدبیر نکالیے کہ میں اس فلاکت و نکبت سے نجات پاؤں کہ اس زندگی و شرمندگی سے مرنا بہتر ہے۔ سلطان محمود نے اس سے کہا چند دن صبر کر کے میرے پاس قیام کرو، پھر میں تمہیں جلال الدین اکبر بادشاہ کے پاس روانہ کر دونگا کہ ان کی ملازمت میں تم سربلندیوں اور مراتب سے سرفراز ہو گے۔[2]

معصومی میں ہے کہ خود میرزا باقی نے ہندوستان جانے کی کوشش کی، لیکن سلطان محمود نے اس خیال سے اجازت نہ دی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ہندوستان سے لشکر لے آئے اور چونکہ وہ بکھر ہی سے گزرے گا، اس لیے ملک کے انتظام میں خلل واقع ہو گا۔[3]

تحفۃ الکرام میں ہے کہ یہ سلطان محمود خان کی ایک چال تھی، وہ محمد صالح سے اتفاق کر کے میرزا محمد باقی کو قید کر کے ہندوستان بھیج دینا چاہتا تھا۔[4]

تاریخ طاہری میں ہے کہ میرزا محمد باقی سلطان محمود خان کا یہ جواب سن کر اپنی غریبی و بے چارگی پر بہت متاسف ہوا اور سوچنے لگا کہ دیکھیے یہ نامساعد زمانہ آئندہ چل کر کیا رنگ دکھاتا ہے۔[5]

---

(1) تاریخ طاہری۔ ص ۱۰۴۔
(2) تاریخ طاہری، ص ۱۰۵۔
(3) تاریخ معصومی۔ ص ۲۰۸۔
(4) تحفۃ الکرام۔ ترجمہ اردو۔ ص ۲۱۳۔
(5) تاریخ طاہری، ص ۱۰۵۔

میرزا محمد صالح اول کا قتل:

میرزا محمد باقی ان ہی پریشانیوں میں مبتلا تھا کہ اچانک اس کی تقدیر نے پلٹا کھایا اور میرزا محمد صالح کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔

تاریخ طاہری میں اس کے قتل کے واقعے کو تفصیل سے لکھا گیا ہے، کہتے ہیں کہ مرید نامی جت[6] جو قوم بلوچ سے تھا، میرزا محمد صالح نے اس کے بعض اعزہ و اقربا کو قید میں ڈال دیا تھا، اور اس کے باپ کو قتل کر دیا تھا، وہ اس بنا پر میرزا محمد صالح سے سخت کینہ رکھتا تھا اور اپنے قبیلے اور قوم میں کہا کرتا تھا کہ جب تک میں میرزا صالح کو عین دیوان اور بھرے مجمع میں قتل نہ کروں گا، میں اس وقت تک اپنے سر پر دستار نہ رکھوں گا، وہ اسی دھن میں گاؤں سے شہر میں آیا اور دیوانہ وار ہر کوچہ و بازار میں چاقو کو سلی پر تیز کرتے ہوئے خود بخود بڑبڑایا کرتا تھا کہ ہاں اے چاقو! تو کام کرے گا یا نہیں، اور ہاں اے دل وقت پر مضبوط رہنا، تجھ سے موقع پر بے دلی اور کم ہمتی کا اظہار نہ ہونا چاہیے کہ تیری ہی بدولت میں نے اس معرکے کو اپنے ذمے لیا ہے، تمام شہری اور سپاہی اس کی یہ بے ہودہ باتیں سن کر اسے دیوانہ جانتے اور شہر کے لڑکے اس کے پیچھے بطور تماشا دیکھنے کے چلتے، اور جو وہ کہتا از راہِ تمسخر اس کو

---

(6) جت: صاحب تعلیقات تاریخ طاہری (ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) نے لکھا ہے کہ بیگلار نامہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ صاحب بیگلار نامے نے لکھا ہے کہ "میرزا صالح بدست مرید جت از قوم بلوچ شہید شد"، لیکن صاحب تعلیقات طاہری ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ میں نے زیریں سندھ کے بلوچوں سے پوچھا اور ثقہ راویوں سے معلوم کیا ہے کہ مرید خان قبیلہ رجیرہ سے تھا جو قبیلہ گلمتی بلوچ کی ایک شاخ ہے اور مجھے بعضوں نے بتایا کہ وہ لاشاری بلوچ قبیلے سے تھا، لیکن ایک بھی مجھے اس کا قائل نہیں ملا کہ وہ قبیلہ جت سے تھا۔ راویوں کے بیان کے مطابق اس قضیے کا سبب یہ تھا کہ میرزا محمد صالح چاہتا تھا کہ بلوچ قبیلے کی لڑکی اپنے نکاح میں لائے، لیکن اس کا باپ اس رشتے پر راضی نہ تھا، اور صاف انکار کرتا تھا، اس بات سے ناراض ہو کر میرزا صالح نے بلوچوں پر دست تعدی دراز کیا، مرید خان اس وقت گجرات میں تھا، وہ یہ سن کر بلوچوں کی مدد کے لیے فوراً روانہ ہوا اور میرزا کو قتل کر کے خود بھی جان دے دی، مرید خان کا یہ سندھی شعر اب تک گلمتی بلوچوں کے پاس محفوظ ہے جو میرپور ساکرہ میں رہتے ہیں۔

گلمیلی جی گارتان کریاں مشاری گھاہ
مرزا صالح ماریاں، بی نہ کریاں کاہ

یعنی میں ناموس کی خاطر اسے خنجر سے زخمی کروں گا اور سوائے میرزا صالح کے خون کے دوسرا کام نہ کروں گا (تعلیقات تاریخ طاہری، ص ۳۲۳-۳۲۴)۔

دہراتے اور سمجھتے کہ ایک دیوانہ اور مجنون ہے، یہاں تک کہ اس نے ایک دن موقع پا کر عین اس وقت جب کہ میرزا صالح سوار ہو کر اپنے محل کی طرف جا رہا تھا اس چھری کو کاغذ میں لپیٹ کر فریادیوں کی طرح "فریاد فریاد" کا نعرہ بلند کرتا ہوا آیا، میرزا کے چوبدار اس کی طرف اس کی عرضداشت لینے کے لیے دوڑے لیکن اس نے وہ کاغذ کسی کو نہیں دیا اور کہا کہ میں خود اسے میرزا کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں اور کچھ زبانی بھی عرض کرنا چاہتا ہوں، چونکہ میرزا کی موت آچکی تھی، اس نے چوبداروں کو حکم دیا کہ اسے نہ روکو اور آنے دو، تاکہ یہ اپنا درد دل خود بیان کر سکے، چنانچہ جب وہ قریب پہنچا تو اس نے کاغذ میں لپٹی ہوئی چھری کو کاغذ سے نکال کر میرزا کے پیٹ میں پیوست کر دیا، جس سے اس کی آنتیں باہر نکل پڑیں، فوراً ہی چوبداروں اور خدام نے بڑھ کر اس کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیے،[1] میرزا محمد صالح کے قتل کا واقعہ بروز ہفتہ ۲۳ شعبان ۹۷۰ھ (۱۵۶۲ء) کو پیش آیا۔

میرزا محمد باقی کی بہن نے جو اس سے بے حد محبت رکھتی تھی اور ہمیشہ باپ اور بھائی سے چھپا کر اُن ڈبوں میں جنہیں ہندو تل خریدنے کے لیے اس طرف بھیجا کرتے تھے، اُن میں اسے رقم بھیجا کرتی تھی، اُس نے محمد صالح کا خون آلود پیراہن بھی میرزا باقی کے پاس بھیج دیا۔

میرزا محمد صالح اول کی اولاد:

ترخان نامے کے اُس شجرے سے جو سید حسام الدین راشدی نے میرزا عیسیٰ ترخان کی اولاد کا مرتب کیا ہے، پتا چلتا ہے کہ میرزا محمد صالح کا ایک بیٹا محمد غالب نامی تھا، جو میرزا باقی کے حکم سے ۹۷۹ھ میں قتل کیا گیا اور میرزا عیسیٰ اول کے گورستان میں مدفون ہوا، اس کے علاوہ اس کی ایک بیٹی بھی تھی جو سندھ کے مشہور بزرگ سید جلال بن سید علی ثانی شیرازی[2] سے بیاہی گئی تھی۔ سید میر محمد مؤلف ترخان نامہ محمد غالب کا نواسا ہے اور سید جلال کا بیٹا ہے۔

میرزا محمد باقی کی طلبی:

میرزا صالح کی وفات کے بعد میرزا عیسیٰ ترخان نے سلطان محمود خان کو میرزا باقی کی طلبی کے سلسلے میں لکھا کہ آپ کسی طرح اُس فرزند ارجمند کو میرے پاس آنے کی طرف مائل کریں اور اس کا خیال رکھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کہیں دوسری طرف نکل جائے، میں اُس آنکھ سے دور یوسف کو دیکھنے کے لیے یعقوب کی طرح آنکھیں کیے ہوئے ہوں۔ اس کے روانہ کرنے میں کسی قسم کی غفلت نہ برتیں، کیوں کہ وہ یوسف کا کھانے والا بھیڑیا میرزا مرحوم خود اُس کنویں میں گر پڑا جو اُس نے دوسروں کے لیے کھودا تھا۔ پھر اسی خط میں میرزا باقی کو لکھا کہ میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں اور بحیثیت بادشاہی کے اس ملک کے قابل تم ہی ہو، میں نے اس ملک کا والی تمہیں بنایا ہے اور تمہیں اپنے تمام فرزندوں میں اس مسند حکومت کا اہل سمجھتا ہوں۔

تاریخ معصومی میں ہے کہ میرزا محمد صالح کے قتل ہونے کے بعد خود سلطان محمود خان نے میرزا محمد باقی کو خطاؤں کے معاف کرنے کی درخواست میرزا عیسیٰ ترخان سے کی تھی، میرزا عیسیٰ نے راضی ہو کر شیخ عبدالوہاب پورانی اور اپنے بھانجے میر یار محمد خان ترخان کو قاصد بنا کر سلطان محمود خان کے پاس بھیجا اور شکر گزاری اور احسان مندی کا اظہار کر کے اپنے بیٹے سے ملنے کی تمنا ظاہر کی، سلطان محمود خان نے شاہی آداب کے مطابق سامان سفر تیار کر کے میرزا محمد باقی کو ٹھٹھہ بھیج دیا، اس

---

(1) تاریخ طاہری، ص ۱۰۸-۱۰۹۔

(2) سید جلال (ثانی): مقدمہ ترخان نامہ میں سید حسام الدین راشدی نے سید جلال الدین ثانی کے حالات و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ: سید جلال ثانی حضرت سید علی ثانی کے صاحبزادے تھے جو اپنے والد کی وفات کے بعد اُن کے جانشین ہوئے اور "شیخ الاسلامی" کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ بالکل اپنے والد کے نقش قدم پر تھے، صاحب رشد و ہدایت تھے، جاذب شخصیت رکھتے تھے، اپنی شہرت اور سیاسی لحاظ سے عوام میں بہت محترم تھے۔ ان کی سیاسی بصیرت کی وجہ اس دور کے بہت سے سیاسی مسائل ہوئے۔

مثلاً میرزا باقی ترخان اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ڈرتا تھا کہ اکبر بادشاہ سندھ پر حملہ نہ کر دے، اُس نے سید جلال کو اپنا سفیر بنا کر دربار اکبری میں بھیجا اور اپنی ایک لڑکی بھی حرم شاہی کے لیے بھجوائی، اگرچہ اکبر بادشاہ نے اس ظالم حاکم کا تحفہ رد کر دیا، لیکن سید جلال کی سفارش پر سندھ پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اکبر بادشاہ سید جلال سے نہایت عقیدت رکھتا تھا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اکبر کی پیدائش کے بعد جو کپڑا سب سے پہلے اسے پہنایا گیا، وہ سید جلال کے والد حضرت سید علی ثانی کے پیراہن مبارک کے ایک ٹکڑے سے تیار کیا گیا تھا۔

اسی طرح میرزا جانی بیگ کی حکومت کے زمانے میں جب اکبر بادشاہ نے امیر صادق خان کو سندھ فتح کرنے کے لیے بھیجا تو اس نے بکھر سے گزر کر سیوستان پر حملہ کیا اور فتح سیوستان کی خوشخبری اکبر کو بھیجی، لیکن اس موقع پر بھی میرزا جانی بیگ نے انہیں اپنا سفیر بنا کر اکبر کے دربار میں بھیجا، اور اُن کی سفارش پر اکبر نے صادق خان کو واپس بلا لیا، ۹۹۴ھ (۱۵۳۸-۱۵۳۷ء) میں صادق خان سندھ سے لوٹا اور کچھ عرصے کے لیے سندھ میرزا جانی بیگ کے قبضے میں رہا۔

نے جاکر اپنے والد سے ملاقات کی۔ میرزا عیسیٰ نے سیوستان اُس کی جاگیر میں مقرر کیا اور اُسے وہاں جانے کی رخصت عطا فرمائی۔[1]

ارغونوں کی بیوفائی:

میرزا محمد باقی کے سیوستان جانے کے بعد ارغونوں نے میرزا عیسیٰ ترخان سے بیوفائی اور سرکشی اختیار کی، یہاں تک کہ جنگ کے لیے آمادہ ہوگئے، ایک موقع پر ارغون دریا سے گزر رہے تھے کہ میرزا عیسیٰ کے آدمیوں نے ان پر اچانک آتش بازی سے حملہ کیا، جس کی وجہ سے اُن کے بہت سے لوگ مارے گئے اور وہ شکست کھا کر پریشان حال بکھر پہنچے اور سلطان محمود خان سے حقیقت حال بیان کی۔ سلطان محمود خان نے پہلے تو انہیں قید کر لیا، پھر اپنی والدہ کے مشورے کی بنا پر انہیں قید سے رہا کر کے ان کو تسلی و تشفی دی، پھر اُن میں سے ہر ایک کو گھوڑا اور خلعت دے کر اپنے کثیر ملازموں کے ساتھ سیوستان روانہ کر دیا۔ سیوستان پہنچنے کے بعد سلطان محمود خان کے آدمیوں نے ارغونوں کے ساتھ مل کر سیوستان کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ دو ایک مرتبہ انہوں نے قلعے پر حملہ بھی کیا، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔[2]

میرزا عیسیٰ اور سلطان محمود کی جنگ:

جب دریا میں باڑھ آگئی تو میرزا عیسیٰ ایک عظیم لشکر لے کر آیا اور ان لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا۔ اس کے بعد موضع رفیان میں دونوں فوجوں کے درمیان شدید جنگ ہوئی، جس میں سلطان محمود خان کے بہت سے لوگ مارے گئے، پھر میرزا عیسیٰ ترخان موضع دربیلہ کے سامنے خیمہ زن ہو کر جنگ کرتا رہا۔ سلطان محمود خان نے بھی مزید آدمی اور اُمرا اس کے مقابلے کے لیے روانہ کیے، جنہوں نے موضع دربیلہ میں قلعہ بنا کر خوفناک جنگ شروع کر دی۔ آخر شیخ عبدالوہاب اور ماہ بیگم کی دانشمندی سے دونوں میں صلح ہوگئی، صلح کے بعد میرزا عیسیٰ ٹھٹھہ واپس لوٹ گیا اور سلطان محمود خان کے آدمی بکھر واپس چلے آئے۔[3]

تاریخ طاہری میں ہمیں اس دور کی تفصیلات زیادہ ملتی ہیں، میر طاہر محمد نسیانی نے تاریخ طاہری میں اس دور کی تفصیلات دیتے ہوئے لکھا ہے کہ میرزا محمد باقی اپنے باپ کی خدمت میں پہنچنے کے بعد اُس کی قدم بوسی سے مشرف ہوا اور رفتہ رفتہ باپ کی حکومت کے زمانے ہی میں وہ امور سلطنت کے تمام مالی، ملکی اُمور میں اس قدر دخل انداز ہوا کہ تمام معاملاتِ سلطنت کا مدار اس پر منحصر تھا، اس نے رعایا کو اپنے تدبر اور مصلحت اندیشی سے راضی کر لیا، سوائے ارغونوں کے کہ وہ اب بھی شاہ حسن کے چھوڑے ہوئے خزانے پر نظریں جمائے ہوئے تھے اور موقع کے منتظر تھے کہ کسی طرح ترخانیوں کی سلطنت میں کوئی رخنہ پیدا ہو، تاکہ وہ کھلم کھلا اسے بے دخل کر کے اُس خزانے اور ملک پر قابض ہوں۔[4]

پرتگیزیوں کی ٹھٹھہ میں آتش زنی:

جب میرزا محمد باقی اپنے باپ کی اطاعت شعاریوں اور خدمت گزاریوں پر مستحکم اور راسخ القدم ہو گیا تو اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اپنے باپ کی زندگی ہی میں پھر دوبارہ سلطان محمود خان سے اپنی مملکت کی سرحدوں کو متعین کرائے۔ مبادا ایسا نہ ہو کہ اُس کے بعد ارغون سلطان محمود خان کو ورغلا کر امورِ سلطنت میں خلل ڈالیں۔ چنانچہ میرزا عیسیٰ اس ارادے سے ۹۷۳ھ (۱۵۶۶-۱۵۶۵ء) میں بکھر کی طرف روانہ ہوا۔ میرزا محمد باقی بھی اس کے ساتھ تھا، جب یہ دونوں بکھر کے علاقے قصبۂ دربیلہ میں پہنچے، سلطان محمود خان نے قلعے کی محافظت کو مضبوط کر کے اپنے لشکر کو اُن کے مقابلے کے لیے بھیجا اور اُن سے کہلایا کہ معاہدے کے خلاف اپنے لشکر کو ہمارے صوبے میں لانے سے آپ کا کیا مقصد ہے؟ چونکہ میرزا محمد باقی کا ارادہ یہ تھا کہ پرگنۂ دربیلہ کو بکھر سے علیحدہ کر کے سیوہن میں داخل کرے، اس کا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ اس لیے کہ سلطان محمود خان کا قوی لشکر وہاں موجود تھا۔ جانبین جنگ کے لیے تیار ہوگئے، ابھی جنگ کی ابتدا نہ ہوئی تھی کہ ناگہاں ٹھٹھہ سے خبر پہنچی کہ فرنگی (پرتگیزی) لاہوری بندر کو عبور کر کے ٹھٹھہ پہنچے ہیں اور شہر کے دروازے بند ہیں اگر آکر ملک کو بچا سکو تو بچاؤ، ورنہ دشمن قوی ہے، اپنا کام کر جائے گا۔[5]

اس خبر کے سنتے ہی میرزا عیسیٰ ملک کی سرحدیں محمود خان کے حوالے کر کے فی الفور ٹھٹھہ واپس ہوا، لیکن میرزا عیسیٰ کے پہنچنے سے پہلے ہی پرتگیزی شہر میں خوب لوٹ مار اور قتل و غارت گری کر کے شہر کو

---

[1] تاریخ معصومی، فارسی-ص ۲۰۹۔
[2] تاریخ معصومی-فارسی، ص ۲۰۹۔
[3] تاریخ معصومی- فارسی، ص ۲۱۰۔
[4] تاریخ طاہری، ص ۱۱۱۔
[5] تاریخ طاہری، ص ۱۱۱-۱۱۲۔

جلا چکے تھے، شہر کے اکثر لوگوں نے پرتگیزیوں کی قتل وغارت گری سے بچنے کے لیے مسجد جامع میر فرخ ارغون میں پناہ لی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میرزا عیسیٰ آچکا ہے تو وہ مسجد سے باہر نکلے۔[1]

صاحب تاریخ طاہری نے پرتگیزیوں کی آمد کے واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ پرتگیزیوں کے آنے کا واقعہ یہ تھا کہ ٹھٹھہ اور لاہوری بندر کے درمیان خشکی اور تری کے راستوں کو ملا کر دو دن کا راستہ ہے، اور وہاں سے دریائے شور ایک منزل ہے، لیکن ایک پتلا سا نالہ جسے سندھی میں نار کہتے ہیں بندر مذکورہ تک پہنچتا ہے۔ درمیان میں "سون میائی" کے علاوہ کوئی آبادی نہیں ہے۔ وہاں ایک چوکی تھی جہاں میر بندر ایک توپ کے ساتھ ہمیشہ تیار رہتا تھا کہ جب جہاز دریائے کلاں سے اس نالے پر پہنچے تو وہ توپ کو سر کر کے چوکیداروں کو واقف کرائے کہ کشتی سمندر سے اس بندر میں داخل ہو رہی ہے۔ وہ چوکیدار بھی اپنی توپ چلاتے تھے، تاکہ اس کی آواز سے بندرگاہ کے منتظمین واقف ہو جائیں کہ بندرگاہ میں ایک نئی کشتی آرہی ہے اور پھر وہ اس کے سامان کی ایک مجمل فہرست لکھ کر ٹھٹھہ کے سوداگروں کے پاس فوراً بھیجیں، اور خود چھوٹی کشتی میں سوار ہو کر چوکی پر پہنچیں، تاکہ چوکیدار نار کے سرے پر پہنچ کر خبر لے کہ یہ کون سی کشتی اور کہاں کے سوداگر ہیں اور کون سی بندرگاہ سے آرہے ہیں۔ وہ یہ تمام معلومات حاصل کر کے نار کے سرے پر آتا، اگر وہ اسی بندرگاہ کی کشتی ہوتی تو اُسے لاہوری بندر میں لنگر انداز کراتا، اگر وہ کسی دوسری بندرگاہ کی ہوتی تو اُسے وہیں لنگر انداز کر کے اُس سے جو کچھ سامان لینا ہوتا چھوٹی کشتیوں میں اُتروا کر لاتا۔

مختصر یہ کہ جب پرتگیزیوں کی یہ جماعت تاجروں کے طریقے پر یہاں پہنچی، تو انہوں نے دیکھا کہ ملک سے والیٔ ملک بہت دور گیا ہوا ہے اور کوئی بھی ان کا مدمقابل ایسا نہیں کہ جم کر ان کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ میر بندر نے حسب ضابطہ اُن سے خواہش کی کہ وہ وہیں لنگر انداز ہوں، لیکن پرتگیزیوں نے یہ بھانپ کر کہ اس کے پاس جمعیت بہت تھوڑی ہے میر بندر سے کہا کہ ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے، ہم تو جن کشتیوں پر سوار ہو کر آئے ہیں اُن ہی پر ٹھٹھہ جائیں گے اور وہاں کی سیر کر کے اور خرید و فروخت کر کے واپس لوٹ جائینگے اور ضابطے کے مطابق جو چنگی ہم پر عائد ہوتی ہے، وہ ہم وہیں ادا کر دیں گے۔ میر بندر چونکہ اُن کے مقابلے کی طاقت نہ رکھتا تھا، وہ مجبور ہو گیا، پرتگیزی بندرگاہ سے گزر کر دریائے سندھ میں اپنی کشتیاں لائے اور ٹھٹھہ کی طرف روانہ ہوئے راستے میں دریا کے کنارے کنارے جو بھی آبادی ملتی تھی اس کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے چلے جاتے، چونکہ ملک بغیر مالک کے خالی پڑا ہوا تھا، لہٰذا کسی میں طاقت نہ تھی کہ جو ان بدمعاشوں کا مقابلہ کرے، یہاں تک کہ ٹھٹھہ کے قریب پہنچ گئے، اس تھوڑے سے لشکر نے جو وہاں موجود تھا دریا کے کنارے مقابلہ کیا مگر پسپا ہو گیا، اور پرتگیزیوں نے شہر میں داخل ہو کر حسب مدعا خوب لوٹ مار مچائی، جب میرزا عیسیٰ کے آنے کی خبر انہیں معلوم ہوئی تو انہوں نے جلدی سے لوٹے ہوئے مال و اسباب کو کشتیوں میں ڈالا اور فرار ہو گئے۔

تحفتہ الکرام میں ہے کہ پرتگیزی میرزا عیسیٰ کی آمد کی خبر سن کر شہر ٹھٹھہ کو لوٹ کر اور گلی کوچوں میں بارود بچھا کر اور اس میں آگ لگا کر بھاگ گئے۔ میرزا عیسیٰ نے واپس آنے کے بعد اپنی حویلی اور قلعے کو مستحکم کیا اور شہر کے چاروں طرف شہر پناہ تعمیر کرائی۔[2]

بیگلار نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ پرتگیزی خود نہیں آئے تھے، بلکہ میرزا عیسیٰ ترخان نے خود ان کو اپنی مدد کے لیے بلایا تھا، لیکن جب وہ آئے اور انہوں نے شہر کو بادشاہ سے خالی پایا تو ان کی نیت خراب ہوئی اور قتل و غارت گری اور لوٹ مار کر کے شہر کو بارود پھیلا کر جلا دیا۔[3]

صاحب بیگلار نامے کی تائید دوسرے مآخذ سے بھی ہوتی ہے۔ Danvers Frederick Charles, The Portuguese and India e.t.c; London 1894 Vol.I, P. 508. میں ہے کہ ۱۵۵۶ء (۹۶۴ھ) حاکم سندھ کی جانب سے ایک سفارت پرتگیزیوں کے عامل کے پاس شہر بسین میں پہنچی، جنہوں نے پرتگیزیوں سے اپنے دشمن کے خلاف جو انہیں ایذا پہنچاتا رہتا تھا مدد چاہی۔ سیاسی اعتبار سے پرتگیزی چاہتے تھے کہ حاکم سندھ سے دوستانہ تعلقات بڑھائے جائیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ حاکم سندھ کو مدد دینی چاہیے، چنانچہ سات سو افراد کا لشکر اٹھائیس کشتیوں میں پیڈرو بریتو ولیم کی سپہ سالاری میں ٹھٹھہ پہنچا۔ جو حاکم سندھ کا دارالسلطنت تھا۔ چونکہ حاکم سندھ موجود نہیں تھا، اس لیے بریتو نے اس کے بیٹے سے ملاقات کی، بیٹے نے اس کے آنے کی اطلاع باپ کو دی، بریتو نے کچھ دن وہاں قیام کیا۔ یہاں تک کہ اُس نے سنا کہ

---

[1] تاریخ طاہری، ص ۱۱۲۔

[2] پرتگیزیوں کے ٹھٹھہ میں آنے کی یہ تفصیل تاریخ طاہری، ص ۱۱۱ تا ۱۱۳ سے ماخوذ ہے۔

[3] بیگلار نامہ، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۴۹ و تعلیقات تاریخ طاہری، ص ۳۲۶، تالیف: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ۔

حاکم ٹھٹھہ نے اپنے دشمن سے صلح کرلی جب اُسے یہ خبر معلوم ہوئی تو اُس نے شاہزادے سے اس مہم کے اخراجات طلب کیے جیسا کہ سندھ کے حاکم کے سفیروں نے وعدہ کیا تھا۔ شاہزادے نے یہ اخراجات دینے سے انکار کیا۔ اس پر بریتو اپنے آدمیوں کو لے کر ٹھٹھہ میں داخل ہوا اور برہم ہو کر اس نے آٹھ ہزار شہریوں کو قتل کیا اور تقریباً دو ملین چاندی کی قیمت کا بہترین ساز و سامان اُس نے جلا دیا اور بہت سا ساز و سامان کشتیوں میں بھر کر کہ شاید ہی کسی کو اس مقدار میں مالِ غنیمت ملا ہو لے گیا۔ اس حملے میں اس کا ایک آدمی بھی ضائع نہیں ہوا، وہ اس نواح میں ایک ہفتے تک رہا اور دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر جو آبادیاں تھیں انہیں اس نے تباہ کر دیا۔ قلعۂ بندر کے محافظوں نے اس کا مقابلہ کیا، مگر بریتو اُن پر غالب آیا اور اس نے قلعے کو مسمار کر دیا۔[1]

ولی عہدی:

تاریخ معصومی میں ہے کہ اپنی وفات کے وقت میرزا عیسیٰ ترخان نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے چھوٹے بیٹے جان بابا کو ولی عہد بنائے، لیکن اس کی بیوی ماہ بیگم نے کوشش کی کہ چونکہ محمد باقی بڑا بیٹا ہے، اس لیے وہ ولی عہد ہو۔ میرزا محمد عیسیٰ نے ماہ بیگم سے کہا کہ وہ ایک ظالم انسان ہے، جس کی وجہ سے لشکر کو اور خدا کی مخلوق کو بہت نقصان پہنچے گا اور تم خود بھی اس کے ہاتھوں ہلاک ہو گی۔[2] چنانچہ آئندہ چل کر اُس کی پیش گوئی کس طرح لفظ بلفظ پوری ہوئی۔ ہم آئندہ اوراق میں بتائیں گے۔

وفات:

میرزا عیسیٰ ترخان نے اپنی اجل طبعی سے ۹۷۳ھ (۱۵۶۵-۱۵۶۶ء) میں وفات پائی، ملکی مصالح کی وجہ سے کچھ دن میرزا عیسیٰ کی وفات کو مخفی رکھا گیا۔ پھر جس دن میرزا محمد باقی سیوہن سے ٹھٹھہ پہنچا، اسی دن صبح کو میرزا عیسیٰ کی لاش کو لے کر مکلی میں اس مقبرے میں دفن کیا گیا، جو اس کے لیے بنایا گیا تھا۔[3]

تعویزِ قبر:

میر معصوم نے اس کی تاریخ وفات ۹۷۴ھ اور صاحبِ تاریخ طاہری نے ۹۸۴ھ اور صاحب تحفۃ الکرام نے ۹۹۰ھ بتائی ہے، لیکن ان میں سے کوئی صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کے تعویزِ قبر کے کتبے سے واضح ہے کہ اس نے ۹۷۳ھ میں وفات پائی، تعویزِ قبر کی عبارت یہ ہے:

"وفات یافت حضرت میرزا بندۂ آل محمد عیسیٰ بن عبد العلی ترخان ۹۷۳۔[4]

مرزا عیسیٰ کے ذاتی اوصاف:

صاحب تحفۃ الکرام میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے میرزا عیسیٰ ترخان کے ذاتی اوصاف کو سراہتے ہوئے لکھا کہ وہ اپنے اعلیٰ اوصاف، سنجیدگی اور فکر راسخ کے اعتبار سے اس خاندان میں ممتاز اور منفرد تھا۔ کم مرتبہ ہونے کے باوجود وہ شجاعت اور جوانمردی میں بڑے بڑے ارغون اُمرا سے بازی لے گیا تھا۔

میرزا عیسیٰ ترخان کا دورِ حکومت سندھ:

میرزا عیسیٰ ترخان نے سندھ میں تقریباً بارہ برس حکومت کی، لیکن اس کا سارا عہدِ حکومت ارغونوں کی مخالفت سے اپنے آپ کو بچانے اور اپنے بیٹوں کے جھگڑوں میں صرف ہوا۔ ہمارا خیال ہے کہ اہل سندھ نے اُس سے بھلائی اور برائی کچھ نہیں دیکھی، اس بارہ سالہ دور میں وہ ارغونوں سے بھگتتا رہا اور اہل سندھ کی بھلائی یا برائی کی طرف اُس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ہمیں سندھیوں پر اس کے دور میں وہ مظالم نظر نہیں آتے جو ارغونوں کے دور میں نظر آتے ہیں۔

اُس کے اہم کارناموں میں جو کارنامہ ملک کے دفاع میں اہم حیثیت رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ پرتگیزیوں کی قتل و غارت گری و آتش زنی کے بعد اس نے اپنے دارالسلطنت کی محافظت کے لیے اور ملک کو بیرونی خطرے سے بچانے کے لیے حویلی اور قلعے کو اور بھی مستحکم کیا اور شہر کے چاروں طرف شہر پناہ تعمیر کرائی، چونکہ لاہری بندر کی خلیج سے بندرگاہ کے ساحل تک خلیج سے نکلنے والی نہر "نارتی واہ" عمیق اور کشادہ تھی، جس سے بڑے بڑے جہاز بھی کھاڑی سے بندرگاہ کے ساحل تک بآسانی آسکتے تھے۔ اس نے اس نہر کو ماہرین کے مشورے سے بڑے بڑے پتھروں سے بھرنے کا حکم دیا، تاکہ کوئی بھی اچانک اندر نہ آسکے اس کے علاوہ ساحل اور خلیج کے درمیان بندرگاہ کی حفاظت کے لیے ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کرایا اور اس

---

(1) تعلیقات تاریخ طاہری، ص ۳۲۶-۳۲۷۔

(2) تاریخ معصومی-فارسی، ص ۲۱۰۔

(3) ایضاً-ص ۲۱۰۔

(4) تعلیقات تاریخ طاہری (تالیف: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، پروفیسر سندھ یونیورسٹی)، ص ۳۳۰۔

طرح ملک کو بیرونی خطرے سے بڑی حد تک محفوظ کر دیا۔[5]

اولاد:

میرزا عیسیٰ ترخان کثیر الاولاد تھا، اس کے آٹھ بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں، جن کے نام اور تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) میرزا محمد صالح اول: مقتول ۲۳ شعبان ۹۷۰ھ (۱۵۶۳-۱۵۶۲ء) مدفن، مکلی، یہ جس گورستان میں دفن ہے وہ اس کے نام سے مشہور ہے۔

(۲) سلطان ابراہیم اول: متوفیٰ ۱۶ ربیع الاول ۹۶۶ھ (۱۵۵۹-۱۵۵۸ء) مدفن، مکلی، یہ جس قبرستان میں دفن ہے، وہ اس کے نام سے مشہور ہے۔

(۳) میرزا ناصر:

(۴) میرزا جوہر: یہ میرزا باقی کے حکم سے قتل کیا گیا۔

(۵) میرزا سلیمان اول: متوفیٰ ۹۶۴ھ (۱۵۵۷-۱۵۵۶ء)۔

(۶) میرزا زاہد اول: متوفیٰ ۸ رجب بروز جمعہ ۹۶۶ھ (۱۵۵۹ء) مدفن، گورستان محمد صالح اول۔

(۷) میرزا محمد باقی ترخان: متوفیٰ بروز پنجشنبہ، ۸ شوال ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء)، اس کا مدفن میرزا عیسیٰ ترخان اول کے مقربے کے قریب واقع ہے اور اس کے نام سے مشہور ہے۔

(۸) میرزا جان بابا اول: یہ میرزا محمد باقی کے حکم سے قتل کیا گیا، اس کا مدفن اسی کے نام سے مشہور ہے، جو اس کے بیٹے میرزا عیسیٰ ثانی متوفیٰ ۹۷۸ھ (۱۵۷۱-۱۵۷۰ء) کے گورستان کے مقابل واقع ہے۔

اس کی بیٹیوں کے نام یہ ہیں:

(۱) ترسون بیگہ: متوفیٰ جمادی الاول ۹۶۴ھ (۱۵۵۷ء)۔

[5] یہ تمام تفصیل تحفۃ الکرام مترجمہ سندھی سے ماخوذ ہے۔

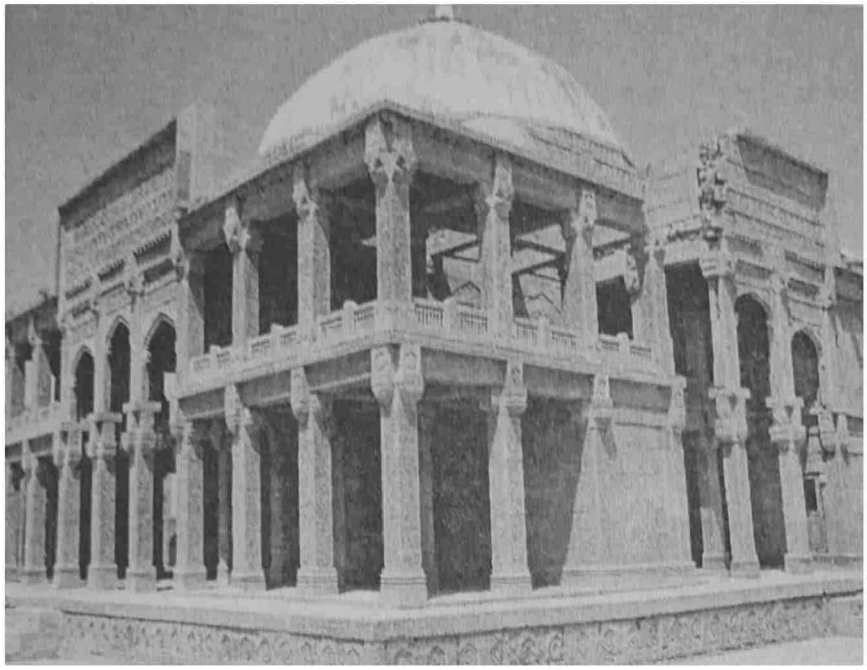

مکلی ضلع ٹھٹہ میں میرزا عیسیٰ خان ترخان کا مقبرہ

(۲) بیگہ ---؟: متوفیٰ شعبان ۹۶۴ھ (۱۵۵۷ء)، یہ لڑکی گورستان جان بابا میں مدفون ہے۔

(۳) انچہ بیگہ: متوفیٰ محرم ۹۶۵ھ (۱۵۵۷ء)۔

(۴) بیگہ بیگی آغا: یہ یادگار مسکین ترخان کی بیوی تھی، جو میرزا باقی کے حکم سے قتل کی گئی۔

(۵) دختر: یہ فقیر محمد ترخان کی بیوی تھی، جو رجب ۹۷۶ھ (۱۵۶۸ء) کو قتل کی گئی، اور میرزا محمد صالح اول کے گورستان میں مدفون ہوئی۔

اولاد کی یہ تفصیل ہم نے تاریخ سندھ کے محقق فاضل سید حسام الدین راشدی کے اس مرتبہ شجرے H سے لی ہے، جو انہوں نے ترخان نامہ میں میرزا عیسیٰ ترخان کی اولاد کا مرتب کیا ہے۔[1]

تاریخ طاہری میں میرزا عیسیٰ کے ایک اور بیٹے میرزا غالب کا تذکرہ بھی موجود ہے۔[2] لیکن راشدی صاحب نے اس شجرے میں محمد غالب کو میرزا محمد صالح اول کا بیٹا بتایا ہے اور یہی صحیح ہے، کیونکہ میرزا عیسیٰ کی وفات کے بعد صرف اس کے دو بیٹے میرزا محمد باقی اور میرزا جان بابا موجود تھے۔

[1] شجرہ H میرزا عیسیٰ ترخان اول مرتب سید حسام الدین راشدی مشمولہ ترخان نامہ۔

[2] تاریخ طاہری، ص ۹۷۔

باب:18

بکھر کی حکومت
سلطان محمود خان کوکل تاش
عہد حکومت
۹۶۲ھ (۵۵-۱۵۵۴ء) - ۹۸۲ھ (۷۵-۱۵۷۴ء)

سلطان محمود کا خاندان:

ہم گزشتہ اوراق میں ذکر کر آئے ہیں کہ میرزا شاہ حسن کی زندگی ہی میں سندھ کی حکومت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی، ایک حصے کا دارالسلطنت ٹھٹھہ تھا، جس کا حاکم میرزا عیسیٰ ترخان تھا، دوسرے حصے کا دارالحکومت بکھر تھا، جس کا حاکم سلطان محمود خان کوکلتاش تھا۔

اب ہم بکھر کی اس حکومت کے حالات تفصیل سے یہاں لکھنا چاہتے ہیں۔ سلطان محمود خان بن میر فاضل بن عادل بن احمد، خواجہ اصفہانی کی نسل سے تھا۔ اس کے بزرگ خراسان میں سکونت رکھتے تھے، جن کا شجرہ چین کے بادشاہوں سے جا ملتا ہے، جو کہ اصفہان کی شہنشاہیت کا ایک صوبہ تھا، جس زمانے میں کہ تیمور تسخیر عراق کے لیے روانہ ہوا اور اصفہان کے کچھ صوبے سرکشی اختیار کر کے اطاعت و فرمانبرداری سے منکر ہوگئے تو امیر تیمور نے ان لوگوں کو تاخت و تاراج اور قید کرنے کا حکم دیا، اسی لوٹ مار میں خواجہ عادل کا والد خواجہ احمد، میر ذوالنون کے والد حسن بصری کے ہاتھ لگا، حسن بصری نے اس کی پرورش اپنی اولاد کی طرح کی، خواجہ احمد کا سلسلۂ نسب تین واسطوں سے ملک محمود نان دہ سے جا ملتا ہے، اصفہان میں ملک محمود اپنی سخاوت و فیاضی کی بنا پر غیر معمولی شہرت رکھتا تھا، کہا جاتا ہے کہ انیس واسطوں سے اس کا شجرۂ نسب عدی بن حاتم طائی سے جا ملتا ہے، یہ خاندانی سخاوت و فیاضی وراثۃً سلطان محمود خان میں بھی آئی تھی۔

خواجہ احمد کے دو بیٹے تھے، عاقل خواجہ اتکہ اور عادل خواجہ اتکہ، عادل خواجہ اتکہ کے ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی، بیٹے کا نام میر فاضل تھا، میر فاضل کے پانچ بیٹے بابا احمد، سلطان محمود خان، میر عبدالفتاح، امیر سلطان اور میر عبدالواحد تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی ماں علیحدہ تھی، سلطان محمود خان کی والدہ کاسی شال مستنگ کے افغانوں میں سے تھی۔[1]

سلطان محمود کے ابتدائی کارنامے:

ابھی سلطان محمود خان کی عمر صرف چودہ سال کی تھی کہ وہ اپنے شجاعانہ کارناموں کی وجہ سے میرزا شاہ بیگ کا منظور نظر بن گیا، جب شاہ بیگ نے تسخیر سندھ کا ارادہ کیا تو باغبان، کاہان، ٹلٹی اور ٹھٹھہ پر فوج کشی کے موقع پر اس نے میدان کارزار میں اپنی ہمت، بہادری اور شجاعت کے مظاہرے کیے اور آگے بڑھ کر سب سے پہلے غنیم کے لشکر پر حملے کیے۔ بکھر کو فتح کرنے کے بعد شاہ بیگ نے قندھار واپس جاتے وقت اپنے بلند مرتبہ اُمرا سے کہا کہ وہ بکھر کی سکونت اختیار کریں، لیکن کوئی بھی اس کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ لیکن سلطان محمود خان باوجود صغر سنی کے اس کے لیے تیار ہوگیا اور ستر آدمیوں کے ساتھ وہ گیارہ ماہ تک قلعہ بکھر کی حفاظت کرتا رہا اور کسی خوف و اندیشے کے بغیر نہایت جرأت و مردانگی سے وہ قلعے کو دشمنوں سے بچاتا رہا، اس عرصے میں اس نے بہت تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ قلعے سے باہر نکل کر بارہا دھاریجہ اور سوڈھا قبائل پر حملے کیے، اور سارے معرکوں میں فتح مند رہا۔[2]

---

[1] تاریخ معصومی فارسی، ص ۲۱۸

[2] تاریخ معصومی - ص ۲۲۵۔

شاہ حسن کے زمانے میں سلطان محمود خان کے کارنامے:

۹۲۷ھ (۲۱-۱۵۲۰ء)[1] میرزا شاہ بیگ کی وفات کے بعد میرزا شاہ حسن تاج و تخت کا مالک ہوا تو اس وقت بھی سلطان محمود خان نے آمر آمرانی کی جنگ میں خوب اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے اور اُچ اور دلاور کے قلعوں نیز ملتان کے اطراف و جوانب میں اس نے اپنی شجاعت و بہادری کے نمایاں کارنامے انجام دیے۔ ۹۴۴ھ (۳۸-۱۵۳۷ء) میں جب اس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ ساتلمیر کے قلعے پر حملہ کیا اور ان لوگوں کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد جب وہ ایک جگہ ٹھہرا ہوا تھا کہ دشمن نے اچانک اس پر شب خون مارا اور وہ اپنے قیدیوں کو چھڑا کر اس سے جنگ کرنے لگا، سلطان محمود خان اس وقت سو رہا تھا، وہ اچانک بڑبڑا کر اٹھا اور دشمن سے جنگ کرنے لگا، اتفاق سے دوران جنگ میں اس کی دستار سر سے گر پڑی، اٹھاتے وقت اس کا ایک سر اسلطان محمود خان کے ہاتھ میں اور دوسرا سر اسوڈھوں کے سردار کمال کے ہاتھ لگا، اس موقع پر سلطان محمود دستار سر سے باندھتا جاتا تھا اور دستار کے جو پیچ زمین پر پڑی ہوئے تھے انہیں اٹھا کر کمال کی طرف بڑھتا جاتا تھا، جب وہ بالکل اس کے قریب پہنچ گیا تو سلطان محمود کے ہاتھ میں اس وقت کوئی ہتھیار نہ تھا، اس نے ریتی کی ایک مٹھی اٹھا کر اچانک کمال کے منہ پر ماری، ریتا آنکھوں میں پڑنے کی وجہ سے وہ دونوں آنکھیں ملنے لگا، سلطان محمود خان جلدی سے دستار باندھ کر روانہ ہو گیا میر معصوم کا بیان ہے کہ اس نے خود سلطان محمود خان سے سنا تھا کہ جب وہ روانہ ہو رہا تھا تو اس موقع پر اسے نفیر چی مل گیا، جس نے نفیری بجائی، جس کے سنتے ہی کچھ سپاہی جمع ہو گئے، عین اس وقت حسن علی پورانی نے اپنا گھوڑا سلطان محمود خان کے سامنے پیش کیا، اس نے پھر سے مستعد ہو کر غنیم پر ایسا سخت حملہ کیا کہ دشمن کے بہت سے آدمی قتل ہو گئے اور ان قیدیوں اور مال غنیمت کے علاوہ اور بھی قیدی اور مال غنیمت اس کے ہاتھ لگا۔

اس کے علاوہ گجرات اور کھنگار کی جنگ میں بھی اس نے بڑی بہادری اور جرأت دکھائی۔ جب ہمایوں سندھ آیا تو اس وقت بھی وہ شجاعت اور ثابت قدمی کے ساتھ قلعۂ بکھر کی محافظت کرتا رہا۔

۹۵۰ھ (۴۴-۱۵۴۳ء) میں جب میرزا شاہ حسن نے سیوی کی حکومت سلطان محمود خان کے حوالے کی تو اس نے بلوچوں کے کتنے ہی قلعے جو برسوں سے ان کے قبضے میں تھے فتح کر لیے اور کوہستان کے سرکشوں اور متمردوں کی گوشمالی کر کے انہیں اپنا مطیع بنایا۔

۹۶۱ھ (۵۴-۱۵۵۳ء) میں جب ارغون اور ترخان میرزا شاہ حسن کی مخالفت کرنے لگے تو وہ سیوی سے لشکر لے کر آیا اور کئی معرکوں کے بعد انہیں مطیع بنایا۔

۹۶۲ھ (۵۵-۱۵۵۴ء) میں میرزا شاہ حسن کی وفات کے بعد سندھ کی حکومت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، لکی سے بالائی حصے پر جس میں بکھر، مانیلہ اور اس کے جملہ قصبات شامل تھے ان کی حکومت سلطان محمود خان کے حصے میں آئی، اس کی راجدھانی بکھر تھا اور لکی سے زیریں سندھ دریائے سُور کے کنارے تک کی حکومت میرزا عیسیٰ ترخان کے حصے میں آئی، جس کا دارالسلطنت ٹھٹھہ تھا۔ ماہ ربیع الثانی ۹۶۲ھ (۱۵۵۴ء) میں سلطان محمود خان بکھر آیا اور مسند حکومت پر متمکن ہوا۔

۹۶۴ھ (۱۵۵۷-۱۵۵۶ء) میں ارغونوں کے بہکانے پر میرزا عیسیٰ ترخان ایک بڑا لشکر لے کر بکھر آیا اور لڑائی شروع کی، ادھر سلطان محمود خان قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا، پندرہ روز اسی طرح گزرے، ابھی دونوں میں دو تین جھڑپیں ہونے پائی تھیں کہ خبر پہنچی کہ میرزا عیسیٰ نے جن پرتگیزیوں کو گوا سے اپنی مدد کے لیے طلب کیا تھا، انہوں نے ٹھٹھہ پہنچ کر شہر کو خوب لوٹا اور شہر میں آگ لگا دی۔ یہ خبر سنتے ہی میرزا عیسیٰ ترخان ٹھٹھہ لوٹ گیا، ایک ہفتے بعد سلطان محمود خان بھی بکھر سے لشکر لے کر اس کے تعاقب میں روانہ ہوا، اور سیوستان تک دریا کے دونوں کناروں کی ربیع کی فصل کو پامال کرتا ہوا چلا گیا، اس کا خیال تھا کہ سیوستان کے چاروں طرف کے باغات کو بھی برباد کر دے، لیکن میر معصوم کے دادا سید میر کلاں کی سفارش پر وہ اس ارادے سے باز آیا۔

جب سلطان محمود خان سیوستان سے واپس ہو رہا تھا کہ میرزا عیسیٰ کی طرف سے شیخ الاسلام عبدالوہاب پورانی ایلچی بن کر آئے، اور دریلہ کے قرب و جوار میں سلطان محمود خان سے ملے اور میرزا عیسیٰ کی جانب سے صلح و اتفاق کی بنیادیں مستحکم کیں، اور نئے سرے سے عہد و پیمان کر کے عہد نامہ مرتب کیا جس کا ماحصل یہ تھا کہ اب پھر کبھی وعدہ خلافی نہ ہو گی، پھر یہ عہد نامہ مُہر لگا کر سلطان محمود کے حوالے کیا۔[2]

---

[1] یہاں میر معصوم نے شاہ بیگ کی وفات کا سنہ ۹۲۷ھ لکھا ہے، لیکن شاہ بیگ کے حالات کے ضمن میں تاریخ معصومی کے صفحہ ۱۲۷ پر وہ اس کا سنہ وفات ۲ شعبان ۹۲۸ھ لکھ آئے ہیں۔

[2] سلطان محمود خان کے یہ تمام کارنامے تاریخ معصومی فارسی، ص ۲۱۸ تا ۲۲۲ سے ماخوذ ہیں۔

۹۶۵ھ (۱۵۵۸-۱۵۵۷ء) میں ولی بیگ کی کوشش سے خانخاناں بیرم خان کی عزیز گوہر تاج خانم بنت تردی بیگ، سلطان محمود خان کے نکاح میں آئی۔[1]

۹۶۹ھ (۱۵۶۲-۱۵۶۱ء) شاہ طہماسپ نے اپنے ایلچی بردی بیگ کے ذریعہ لعلوں کا ہار مرصع کمر بند، قیمتی خلعت، چتر، اتاغہ، جیغہ زلف، عقار اور دوسرے انواع واقسام کے عطیات اور شاہی انعامات سے سلطان محمود خان کو نوازا اور اس کو خان خانی کے خطاب سے سرفراز کیا۔[2]

سلطان محمود خان کے سوائے ایک لڑکی کے اور کوئی اولاد نہ تھی، اس نے اکبر سے اس سے شادی کی درخواست کی تھی۔ ۲۰ صفر ۹۸۰ھ (۱۵۷۲ء) کو نواب اعتماد خان جو اکبر کی طرف سے سلطان محمود خان کی دختر لانے کے لیے مامور کیا گیا تھا، بکھر پہنچا، اور شاہی خلعت، مرصع نیام، زین ولگام سمیت گھوڑے اور چار ہاتھی اپنے ساتھ لایا، سلطان محمود خان نے بھی اپنی حیثیت کے مطابق انواع و اقسام کے جواہرات اور مرصع ہتھیار مہیا کر کے بیٹی کی رخصتی کی شاندار تیاری کی اور جشن مسرت کی عام محفلیں منعقد کیں، پندرہ دن تک اس کا دستر خوان ہر خاص وعام کے لیے عام رہا، ہر روز ان دعوتوں کے لیے تقریباً پانسو مویشی باورچی خانے کے لیے ذبح کیے جاتے تھے۔

جس روز نکاح کی محفل منعقد ہوئی اس دن کثیر علماء، مشائخ اور معززین اکٹھے ہوئے۔ سلطان محمود خان نے ہر ایک کو اس کی حسب حیثیت تحائف پیش کیے، اور نہایت پُر تکلف کھانے پکوا کر دیوان خانے کے صحن میں تقسیم کرائے، تیس ہزار روپے نقد و جنس کے انعام سے اعتماد خان کو نوازا۔[3]

۱۵ رجب ۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) کو اس نے اپنی بیٹی کو سلطان زین العابدین، نوروز خان اور دوسرے معتمد افراد اور عصمت پناہ پردہ نشین خواتین کے ساتھ جیسلمیر کی راہ سے روانہ کیا، اس وقت اکبر شہر ناگور میں شکار میں مشغول تھا۔[4]

لُب تاریخ سندھ میں ہے کہ سلطان محمود خان کے آخری عمر میں اکثر ارغون و ترخان اس کے خلاف ہو کر شورش پر تلے ہوئے تھے، اس لیے اس نے اس شورش کو ختم کرنے کے لیے اور یہ سوچ کر کہ اب سلطنت اس کے بس کا روگ نہیں اکبر سے درخواست کی کہ وہ کسی کو بھیجے، تاکہ بکھر کی حکومت اس کے سپرد کر دی جائے۔[5]

بکھر کا پہلا مغل گورنر:

اکبر نے کیسو خان کو بکھر کا گورنر بنا کر بھیجا، ابھی کیسو خان بکھر پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ سلطان محمود خان استسقا کی بیماری میں مبتلا ہوا، اس کا مرض روز بروز بڑھتا گیا، یہاں تک کہ کوئی علاج اس پر کارگر نہ ہوتا تھا، کسی طبیب نے اس کے لیے شراب انگوری تجویز کی، سلطان محمود نے علما اور سادات کو بلا کر کہا کہ طبیب میرے لیے شراب مفید بتاتے ہیں، مگر میں چالیس برس ہو چکے شراب چھوڑ چکا ہوں اور اب مرتے وقت اسے چھونا نہیں چاہتا، چنانچہ اس نے شراب نہیں چھوئی، بیماری بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ۸ صفر ۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) کو ہفتے کے دن دوپہر کے وقت ۸۴ سال کی عمر میں اس نے وفات پائی، میر معصوم نے اس کی تاریخ وفات "در بہشت آسود" (۹۸۲ھ) سے نکالی ہے۔[6]

سلطان محمود خان کی وفات کے بعد ۱۲ جمادی الاول ۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) کیسو خان نے بکھر میں داخل ہو کر بحیثیت اکبر کے گورنر کے بکھر پر قبضہ کر لیا، اس طرح بکھر کی حکومت ختم ہو کر بکھر مغلوں کا ایک صوبہ بن گیا اور یہاں مغلوں کے گورنر مقرر ہونے لگے۔ بکھر کی حکومت پر قبضہ سندھ میں مغلوں کا یہ پہلا قدم تھا۔

سلطان محمود خان کا دورِ حکومت، بکھر:

عہد اکبری کے مشہور مورخ میر معصوم نے سلطان محمود خان کی سیرت و کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب تاریخ معصومی میں لکھا کہ: سلطان محمود خان ایک جامع صفات انسان تھا، اس میں شجاعت و سخاوت کا دلکش امتزاج تھا، وہ بچپن سے لے کر وفات تک اپنی سخاوت کا حق ادا کرتا رہا، اس کی شجاعت اور دلیری کا یہ عالم تھا کہ اکثر میرزا شاہ حسن کے حکم سے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی جاتیں اور وہ ان بیڑیوں کے باوجود میرزا شاہ حسن کے دیوان خانے کے برج کے سامنے سے، جس کے نیچے ایک خطرناک کنڈ ہے خود کو قلعے سے گراتا، اور دریا کے دوسرے کنارے پر شکستہ ٹیکری کے سامنے تیرتا ہوا جا نکلتا۔

---

(1) تاریخ معصومی، فارسی، ص ۲۲۳۔

(2) ایضاً، ص ۲۲۵۔

(3) تاریخ معصومی-فارسی، ص ۲۲۹ تا ۲۳۰۔

(4) تاریخ معصومی، فارسی-ص ۲۲۹ تا ۲۳۰۔

(5) لب تاریخ سندھ، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۷۳۔

(6) تاریخ معصومی-فارسی، ص ۲۳۵-۲۳۷۔

میر معصوم کا بیان ہے کہ سلطان محمود خان کے مزاج میں تیزی تھی، جب غصے میں آتا تو اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکتا تھا، اسے خون ریزی کی ذرا بھی پروانہ تھی، ہر چند وہ خود ظالم انسان تھا، لیکن دوسروں کے مظالم کا روادار نہ ہوتا تھا، سپاہی، علما اور عوام اس کے عہد حکومت میں نہایت آرام سے زندگی بسر کرتے تھے، اس نے اپنی عمر میں ایک ہزار مرتبہ قرآن ختم کیا تھا، شہر بکھر کو اس نے نہایت خوبصورت طریقے پر آراستہ کیا تھا۔

جہاں تک اس کے دور حکومت کا تعلق ہے، اس میں ہمیں عوام کی فلاح و بہبود کے کام کم اور سیاسی جوڑ توڑ زیادہ نظر آتے ہیں اور ہمیں اس کا کوئی کارنامہ تاریخ میں ایسا نہیں ملتا جسے ہم یہاں پیش کر سکیں، البتہ اتنا ضرور تھا کہ وہ علم سے ذوق رکھتا تھا اور علماء و سادات کا قدر دان تھا اور اس نے شہر بکھر کو آراستہ و پیراستہ کیا تھا۔

سلطان محمود خان کے عہد حکومت کے علماء اور سادات

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود خان کے زمانے میں اس کے علمی طور، شاعرانہ ذوق کی بدولت بکھر بھی معمورۂ علم و فضل بنا ہوا تھا، اس کے زمانے کے چند جلیل القدر علماء اور سادات کا مختصر تذکرہ ہم یہاں لکھتے ہیں۔

(۱) شاہ قطب الدین ہروی ابن شاہ محمود بن شاہ طیب ہروی:

شاہ قطب الدین، سلطان محمود خان کے عہد میں خاصے عرصے تک "شیخ الاسلام" کے عہدے پر فائز رہے۔[1]

(۲) میر سید صفائی بن سید مرتضیٰ حسینی ترمذی:

میر سید صفائی (۸۹۸-۸۸۲ھ) سلطان محمود خان کے عہد حکومت میں بکھر آئے اور وہیں آباد ہو گئے، کچھ عرصے بعد انہوں نے سیوہن کے نواحی موضع کھابروٹ کے سادات میں شادی کر لی، عہد اکبر کا مشہور مورخ میر معصوم اور ان کے دو بھائی شہر بکھر میں پیدا ہوئے۔

میر سید صفائی ایک متبحر عالم اور فاضل بزرگ تھے، جب شیخ الاسلام شاہ قطب الدین ہروی نے وفات پائی تو سلطان محمود خان نے ان کے علم و فضل کی قدر کرتے ہوئے انہیں بکھر کے "شیخ الاسلام" کے عہدے پر مقرر کیا، انہوں نے ماہ ذیقعدہ ۹۹۱ھ (۱۵۸۳ء) میں وفات پائی۔[2]

(۳) شیخ میر غورمانی:

یہ شیخ رکن الدین علاء الدولہ سمنانی کی اولاد میں سے تھے، شیخ عبدالوہاب پورانی کی ہمشیرہ ان کے عقد میں آئی تھیں، نہایت خوش طبع اور لطیفہ گو تھے، علم موسیقی میں کمال رکھتے تھے، سلطان محمود خان کے اوائل عہد حکومت میں وہ ٹھٹھہ سے بکھر آئے اور دو سال کے بعد ہندوستان روانہ ہو گئے، انہوں نے ۹۸۰ھ (۱۵۷۳-۱۵۷۲ء) کے آخر میں ہندوستان ہی میں وفات پائی۔[3]

(۴) قاضی داؤد:

قاضی داؤد فتح پور کے رہنے والے تھے، جو کہ سیوی کے نواح میں ہے، انہوں نے سلطان محمود خان سے ابتدائے عہد حکومت میں شہر بکھر کے قضا کا عہدہ قبول کیا، انتہائی دیانت دار، امین، پرہیزگار اور درویشانہ صفات کے حامل تھے۔ ماہ شوال ۹۸۱ھ (۱۵۷۴ء) میں انہوں نے بکھر میں وفات پائی۔[4]

(۵) میر محمود پورانی:

یہ سادات کے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ پہلے ہرمز کی راہ سے ٹھٹھہ آئے اور شیخ بایزید پورانی کی صاحبزادی سے شادی کی، اس کے بعد بکھر میں سکونت اختیار کی، میر محمود بڑے زاہد اور متقی بزرگ تھے اور گوشہ نشین تھے۔ کبھی کبھی عیدین کے موقع پر سلطان محمود خان کی ملاقات کے لیے آتے تھے، انہوں نے ۹۷۷ھ (۱۵۶۹ء) کے اوائل میں وفات پائی۔

(۶) مولانا یار محمد عرف مولانا یاری:

مولانا یار محمد ہرات کے رہنے والے تھے، نہایت خوش طبع اور بلاغت میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے، فن انشا میں بے نظیر تھے۔ نہایت خوش گو شاعر تھے، ان کا ایک شعر یہ ہے:

گجرات خوش دیارے اما بشرط یارے
بے یار چوں تواں بود در ایں چنیں دیارے

سلطان محمود خان نے انہیں ایلچی بنا کر اکبر کے دربار میں بھیجا تھا۔

---

(1) تاریخ معصومی، فارسی-ص ۲۳۷۔
(2) ایضاً-ص ۲۳۷۔
(3) ایضاً-ص ۲۳۸۔
(4) تاریخ معصومی-فارسی، ص ۲۳۸۔

معصوم شاہ کا منارہ سکھر

یکن وہ یہ فرائض کما حقہ انجام نہ
دے سکے، اس لیے سیت پور میں آ
ر مقیم ہوگئے، اور وہیں وفات
پائی۔

(۷) مخدوم قاضی محمد عثمان
ربیلی:

یہ علوم منقول اور متداولہ
لوم میں بڑی مہارت رکھتے تھے
ور ہمیشہ درس و تدریس و
ستفادے میں مشغول رہتے تھے،
لمی کمال اور کبر سنی کے باوجود بے
د متواضع اور منکسر مزاج تھے،
ضلا اور طلبہ کی جماعت ہمیشہ ان
کے یہاں رہتی، جن کے خورد ونوش
کے وہ کفیل تھے۔ مخدوم قاضی محمد
ثمان نے ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۳-
۱۵۹۴ء) میں وفات پائی۔

(۸) مولانا محمد قاسم دیوان:

مولانا محمد قاسم دیوان نے
خدوم میراں کی خدمت میں رہ کر
علیم حاصل کی اور مطول پڑھنے
کے بعد ولایت روانہ ہوگئے، پھر
ولانا محمود سرخ کے مدرسے میں
پہنچ کر ان سے علوم معقول و منقول میں استفادہ کیا، وہاں سے سندھ واپس
ئے اور یہاں ایک طویل عرصے تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔
نب سلطان محمود خان حکومت سیوی پر مامور ہوا تو اس نے مولانا سے
رآن پاک اور دوسری کتابیں پڑھیں۔ انہوں نے ۹۷۷ھ (۱۵۶۹-
۱۵۷۰ء) میں وفات پائی۔[1]

---

[1] علما و سادات کے مندرجہ بالا حالات مختصراً تاریخ معصومی فارسی از ص ۲۳۷ تا
۲۴۱ ساخوذ ہیں۔

باب :19

بکھر کے مغل گورنر

۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) - ۱۰۹۰ھ (۱۶۷۹ء)

سلطان محمود خان کی وفات کے بعد بکھر کی مقامی اور خود مختار حکومت ختم ہوگئی اور بکھر مغل حکومت کا ایک صوبہ بن گیا اور یہاں مغل گورنر مقرر ہونے لگے، یہاں تک کہ محمد شاہ کے زمانے ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ء) میں جب مغلوں کی طاقت کمزور ہوگئی اور کلہوڑا خاندان نے سندھ پر زور پکڑا تو اس وقت بکھر میں مغل گورنروں کا آنا بند ہوا اور ہر جگہ کلہوڑوں کے حاکم مقرر ہوئے۔ سلطان محمود کے بعد جو بکھر میں مغل گورنر آئے ان کی تعداد ۴۹ ہے، جن کی تفصیل ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

نمبر شمار	نام گورنر	سال ورود	ضروری حالات
۱	کیسو خان	۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء	یہ پہلا گورنر ہے جو سلطان محمود خان کی وفات کے بعد بکھر پہنچا۔
۲	ترسو خان	۹۸۳ھ / ۱۵۷۵ء	
۳	میر سید محمد امیر ولد میر عبدل	۹۸۴ھ / ۱۵۷۵ء	پچاس ہزار بیگھ زمین بطور مدد معاش کے اس کی جاگیر میں تھی۔
۴	سید ابوالفضل ولد سید محمد امیر مذکور	۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء	اپنے والد کی شہادت کے بعد گورنر مقرر ہوا۔
۵	اعتماد خان خواجہ سرا	۹۸۵ھ / ۱۵۷۷ء	چونکہ یہ کسی رذیل خاندان سے تھا، اس نے بکھر میں گورنر مقرر ہونے کے بعد شرفا کو بہت ستایا، لوگ فریادی ہو کر بادشاہ کے پاس گئے۔ بادشاہ کی زبان سے نکلا کہ اگر یہ ایسا ہے تو ایک روز ضرور قتل ہوگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔
۶	نواب فتح خان، راجا پرمانند کے ساتھ، بشرلتِ جاگیر	۹۸۶ھ / ۱۵۷۸ء	دو سال کے بعد راجا پرمانند کی شرکت جاگیر میں ختم ہوگئی اور تمام جاگیر نواب فتح خان کے نام قرار پائی اور اس کا منصب بھی بڑھا دیا گیا۔ صاحب لب تاریخ سندھ کا خیال ہے کہ جامع مسجد روہڑی جو کہ موئے مبارک کی درگاہ کے متصل ہے اسی نواب کی بنوائی ہوئی ہے۔ اس کی حکومت کا آخری سال ۹۹۳ھ / ۱۵۸۵ء تھا۔
۷	نواب صادق خان	۹۹۴ھ / ۱۵۸۵ء	اس نے اکبر بادشاہ کے حکم کے مطابق میرزا جانی بیگ حاکم ٹھٹھہ پر حملہ کیا تھا، یہاں تک کہ اس کو مجبور کر دیا۔ آخر جب میرزا جانی بیگ نے گرانقدر تحائف بادشاہ کی خدمت میں بھجوائے، اور معافی چاہی، اس وقت نواب صادق خان نے اس کا پیچھا چھوڑا۔
۸	نواب اسماعیل قلی خان	۹۹۶ھ / ۱۵۸۷ء	اس کے زمانے میں تمام سندھ قحط کی مصیبت میں مبتلا ہوا۔

۹	نواب شیر وسلطان	۹۹۷ھ / ۱۵۸۸ء	یہ دائم الخمر تھا، اس لیے بہت جلد موقوف کیا گیا۔
۱۰	نواب صادق خان بار دوم	۹۹۸ھ / ۱۵۸۹ء	تجربہ کار اور آزمودہ کار ہونے کی وجہ سے دوسری مرتبہ بکھر کی گورنری پر مقرر کیا گیا۔
۱۱	نواب میر ابوالقاسم خان نمکین	۱۰۰۴ھ / ۱۵۱۵ء	اس نواب کا مقرب دریائے سندھ کے کنارے جانب روہڑی واقع ہے اور یہ قاسم جانی سے مشہور ہے۔
۱۲	نواب میرزا نور ولد خان اعظم	۱۰۰۵ھ / ۱۵۹۶ء	
۱۳	نواب میر ابوالقاسم خان نمکین	۱۰۰۷ھ / ۱۵۹۸ء	بکھر کے حالات سے کماحقہ واقف ہونے کی وجہ سے اس کا دوبارہ تقرر حکومت بکھر پر ہوا۔
۱۴	نواب سعد خان	۱۰۰۹ھ / ۱۶۰۰ء	غالباً یہ روہڑی کے سادات میں سے تھا۔
۱۵	نواب بقرا بیگ	۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء	اسی سال اکبر بادشاہ نے وفات پائی اور جہانگیر تخت سلطنت پر بیٹھا۔
۱۶	نواب سردار خان	۱۰۱۵ھ / ۱۶۰۶ء	یہ مہم قندھار میں قتل ہوا۔
۱۷	نواب قاضی خان	۱۰۱۶ھ / ۱۶۰۷ء	" " "
۱۸	نواب سید تاج خان	۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء	" " "
۱۹	نواب بازید خان	۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء	
۲۰	نواب ہوشیار خان	۱۰۲۸ھ / ۱۶۱۸ء	یہ نواب خان جہاں کا خواجہ سرا تھا۔ نور جہاں بیگم کی طرف سے بکھر کا حاکم مقرر ہوا، کیونکہ اس وقت بکھر نور جہاں بیگم کی جاگیر میں تھا۔
۲۱	نواب میرزا علی محمد بیگ	۱۰۳۱ھ / ۱۶۲۱ء	
۲۲	محمد علی فوجدار	۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۸ء	یہ بکھر کے فوجدار کے نام سے مشہور تھا، اور آصف جاہ کی طرف سے بکھر کا فوجدار مقرر ہوا تھا، کیونکہ بکھر آصف جاہ کی جاگیر میں تھا، اسی سال جہانگیر نے وفات پائی اور اس کا بیٹا شاہجہاں اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔
۲۳	میرزا حسینی	۱۰۳۹ھ / ۱۶۲۹ء	
۲۴	نواب عزت خان فوجدار	۱۰۴۱ھ / ۱۶۳۱ء	یہ بھی فوجدار کے لقب سے مشہور تھا۔
۲۵	سید محمد فوجدار	۱۰۴۳ھ / ۱۶۳۴ء	یہ فوجدار کے لقب سے مشہور تھا۔
۲۶	نواب اسد خان	۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۵ء	اس نے اپنے فرزندوں کے ساتھ یہاں حکومت کی۔
۲۷	نواب محمد یوسف خان	۱۰۴۶ھ / ۱۶۳۶ء	یہ بہادر اور سخی انسان تھا۔
۲۸	نواب محمد خان	۱۰۴۸ھ / ۶۳۸ء	
۲۹	نواب شاہ قلی خان	۱۰۴۹ھ / ۱۶۳۹ء	
۳۰	میراں سید جاون	۱۰۵۰ھ / ۱۶۴۰ء	
۳۱	میرزا التفات بیگ	۱۰۵۱ھ / ۱۶۴۱ء	

۳۲	میرزا زمان خان	۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء	یہ شہزادہ مراد بخش کا ملازم تھا اور فوجدار کے لقب سے مشہور تھا۔
۳۳	نواب سعد خان	۱۰۵۴ھ / ۱۶۴۴ء	یہ دوسری دفعہ بکھر کی حکومت پر مامور ہوا۔
۳۴	خواجہ لطف و میر محمد ناظر	۱۰۵۸ھ / ۱۶۴۸ء	خواجہ لطف فوجدار اور میر محمد ناظر دیوان بکھر کا تھا، اور یہ دونوں کے دونوں داراشکوہ کے ملازم تھے۔
۳۵	نواب خواجگی	۱۰۶۱ھ / ۱۶۵۰ء	یہ داراشکوہ کا ملازم تھا۔
۳۶	شیخ احمد	۱۰۶۲ھ / ۱۶۵۲ء	
۳۷	میرزا لعل بیگ	۱۰۶۵ھ / ۱۶۵۵ء	یہ فوجدار کے لقب سے مشہور تھا۔
۳۸	خواجہ عبدالواحد	۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۶ء	یہ حاکم کہلاتا تھا اور بے حد بکواسی تھا۔
۳۹	شیخ احمد	۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۸ء	یہ دوسری مرتبہ بکھر کی حکومت پر مقرر ہوا۔
۴۰	خواجہ محمد شریف	۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۸ء	اسی سال داراشکوہ کا جھگڑا کھڑا ہوا۔
۴۱	باقر خان	۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۹ء	یہ فوجدار کے لقب سے ملقب تھا، اسی سال شاہجہاں نے وفات پائی اور اس کی جگہ اورنگ زیب عالمگیر تخت نشین ہوا۔
۴۲	عبداللہ خان	۱۰۷۰ھ / ۱۶۶۰ء	یہ قلعہ دار کے لقب سے مشہور تھا۔ چار ماہ قلعہ دار رہ کر تبدیل ہو گیا۔
۴۳	خنجر خان	۱۰۷۰ھ / ۱۶۶۰ء	یہ فوجدار کے لقب سے ملقب تھا۔
۴۴	شیخ ابراہیم	۱۰۷۱ھ / ۱۶۶۱ء	یہ قلعہ دار کے لقب سے ملقب تھا۔
۴۵	نواب سید عزت خان	۱۰۷۴ھ / ۱۶۶۳ء	یہ اکثر امور اپنے پیشی کے افسر گوپی ناتھ کے ذریعہ انجام دیتا تھا۔
۴۶	نواب سید غلام مصطفیٰ	۱۰۷۸ھ / ۱۶۶۷ء	غالباً یہ سادات روہڑی سے تھا۔
۴۷	سید میر یعقوب خان رضوی	۱۰۸۱ھ / ۱۶۷۱ء	اس کی اولاد اب بھی روہڑی کے قرب وجوار میں آباد ہے۔
۴۸	سید میر صادق ولد میر یعقوب خان	۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۵ء	اپنے والد کی وفات کے بعد بکھر کی امارت پر سرفراز ہوا۔
۴۹	نواب خدایار خان	۱۰۸۷ھ / ۱۶۷۷ء	
۵۰	میر محمد اکرم حکیم [1]	۱۰۹۰ھ / ۱۶۷۹ء	یہ روہڑی کے قاضیوں کے خاندان سے تھا، اس کی اولاد اب تک روہڑی میں محلہ قاضیان میں سکونت رکھتی ہے۔ اس کے بعد مغلوں کا کوئی گورنر نہیں آیا اور کلہوڑوں کی حکومت شروع ہوئی۔

[1] گورنروں کی یہ فہرست لب تاریخ سندھ، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ از ص ۷۳ تا ص ۸۰ سے ماخوذ ہے۔

باب: 20

میرزا محمد باقی ترخان

(عہد حکومت)

۹۷۳ھ (۶۶-۱۵۶۵ء) تا ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء)

تخت نشینی:

میرزا عیسیٰ ترخان کی وفات کے بعد ارغون اُمراء نے جو میرزا عیسیٰ کی حکمرانی سے پہلے ہی پشیمان تھے، میرزا محمد باقی کی تخت نشینی کی مخالفت کی اور انہوں نے شور مچایا کہ یہ ملک اور خزانہ ہماری میراث ہے، جو ہم نے بطور امانت تمہارے باپ کے سپرد کیا تھا، چونکہ وہ ایک بوڑھا اور تجربہ کار انسان تھا اس لیے ہم شرم اور لحاظ کی بنا پر اس سے یہ خزانہ اور ملک واپس نہ لے سکے، لیکن اب ہم اس کے روادار نہیں کہ تم اس کے مالک بنو۔ اب تو ہم اپنے بھائیوں میں سے جسے اس کا اہل سمجھیں گے اس کے سپرد کریں گے۔ تمہیں خود انصاف کرنا چاہیے کہ جو ہم کہہ رہے ہیں وہ کہاں تک صحیح ہے۔ اگر ہمارا یہ دعویٰ صحیح ہے تو تمہیں جواب کی ضرورت نہیں۔ ہم ویسے بھی تم سے عہدہ برآ ہونے کی طاقت رکھتے ہیں، تم اس معاملے کو طوالت میں نہ ڈالو۔

میرزا محمد باقی جو بہت مدبر اور تجربہ کار تھا۔ وہ ارغونوں کے اس سوال سے حیران و متفکر ہو گیا اور وہ سوچنے لگا کہ اس صحیح حقیقت کا ان کو کیا جواب دیا جا سکتا ہے پھر اُس نے سوچ کر کہا کہ جو کچھ آپ لوگوں نے کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تم نے ہم خانہ زادوں کو خود ہی پرورش کیا ہے، اور خود ہی ہمیں جڑ سے اُکھیڑ کر پھینک دینا چاہتے ہو۔ میرے خیال میں یہ کسی طرح مناسب نہیں، میرے والد بھی آپ ہی کی ایک شاخ تھے اور یہ فقیر بھی آپ سے اسی سلوک کی توقع رکھتا ہے جو آپ نے میرے والد کے ساتھ کیا ہے۔ اگر میں ان کا قائم مقام ہوں تو میں ماضی کی کوتاہیوں کی تلافی میں پوری پوری کوشش کروں گا۔ یہ ملک اور خزانہ آپ کا ہے، آپ جسے پسند کریں گے اس کے سپرد کر دیا جائے گا۔ مجھے اس میں کوئی عذر نہ ہو گا، لیکن اُس حکومت سے جس سے آپ نے میرے باپ کو سرفراز فرمایا تھا مجھے محروم نہ کیجیے کہ اُس میں آپ کی معاونت لازمی ہے۔ رہا وہ خزانہ اور ملک جس کی بخشش میں میرے والد نے آپ جیسے عزیزوں سے بھی دریغ کیا تھا حاضر ہے۔ آپ حضرات آپس کے مشورے سے جو تجویز بھی میرے سامنے رکھیں، میں اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے بالکل تیار ہوں۔ اُس میں سے جو کچھ بھی آپ اس فقیر کے لیے رکھیں گے وہ آپ کا احسان ہو گا۔ باقی سب کا سب آپ اپنے قبضے میں لے سکتے ہیں۔ اس کی اس حکمت عملی کی باتوں سے بعض ارغون راضی ہو گئے اور بعض اپنی بات پر اسی طرح جمے رہے۔

جب میرزا محمد باقی نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ارغونوں میں پھوٹ ڈال دی اور اُن میں دو گروہ ہو گئے تو اُس نے ان کے اس افتراق کو غنیمت سمجھ کر اپنے قدیم اور جدید موافقین کو ایک خفیہ عہد نامہ بھیجا کہ خدائے تعالیٰ نے اس ملک کی سلطنت و حکومت کو ہم پر ارزانی فرمایا ہے۔ فی الحال وہ ارغون جو ہماری حکومت پر راضی ہیں اور جنہوں نے میرے والد کی حکومت کے لیے بھی کوشش کی تھی، وہ میری حکومت کے لیے پوری کشش کریں، میں وہ خزانہ و مال اُن میں تقسیم کروں گا۔ میرزا محمد باقی کی اس ترغیب و تحریص نے بڑے بڑے نامدار ارغونوں کو اس کا طرف دار بنا دیا اور جو باقی رہ گئے وہ شرمندہ ہو کر اپنے گھروں کے گوشوں میں چھپ گئے[1] اس طرح محمد باقی تخت سلطنت پر بیٹھا۔

نظم و نسق:

اس نے تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے اس کی کوشش

---

[1] یہ تمام تفصیل تاریخ طاہری، ص ۱۱۴-۱۱۷ سے ماخوذ ہے۔

شروع کی کہ وہ ارغونوں کو نیچا دکھائے اور ان کی شورش کو ختم کر دے۔ چنانچہ اس نے اس منصوبے کے تحت اپنے قدیم ملازموں، متعلقین اور غلاموں کو جو شروع سے اُس کے ساتھ تھے اور نہایت گھٹیا قسم کے لوگ تھے بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کیا۔ قاضی خمیسہ، چھوتہ چولی اور مل ہندو جیسے معمولی قسم کے لوگ اس کی حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے، ارغونوں کا یہ خطرہ ہمیشہ اس کے دل و دماغ پر مسلط رہتا تھا کہ جب بھی ان کو موقع ملے گا یہ مجھے قتل کر دیں گے۔ اس لیے وہ ہمیشہ سوچتا رہتا تھا کہ کسی طرح ان کے نام و نشان کو دنیا سے مٹا دے۔[1]

تاریخ معصومی میں ہے کہ اُس نے تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی ابتداء حکومت کے اہم اختیارات ارغون اُمرا امیر قاسم بیگ اور میر کوچک کے سپرد کیے۔ ارغون نہایت بے باک تھے اور سخت لاپروائی سے کام لیتے تھے، چونکہ اُنہوں نے اُس کی سیاست اور قہر کا رنگ نہ دیکھا تھا۔ وہ باوجود اس کی زبانی نصیحتوں اور تنبیہوں کے اپنی ناشائستہ حرکات سے باز نہ آئے، بالآخر ملکی حالات اور نظم و نسق کی ابتری اور بربادی کو دیکھ کر اس کے غصے اور سیاست کی آگ بھڑک اُٹھی۔[2]

ارغونوں کا قتل عام:

چنانچہ اُس نے ارغونوں کے قتل عام کا حکم جاری کیا اور یہ بھی حکم دیا کہ سندھی اور ماہی گیر انہیں لوٹنے کے بعد اُن کے بال بچوں کے ساتھ جو چاہیں کریں۔ اس قتل عام کے بعد جو ارغون باقی رہ گئے وہ جلاوطن ہو کر بکھر چلے گئے۔[3]

تاریخ طاہری میں ہمیں ارغونوں کے قتل کی تفصیلات کچھ اور ہی طرح ملتی ہے۔ تاریخ طاہری میں ہے کہ میرزا محمد باقی کی تخت نشینی کے بعد ارغونوں نے متفقہ طور پر ایک لشکر جمع کر کے یہ طے کیا کہ اگر وہ میرزا شاہ حسن کا خزانہ ہمیں دے تو فبھا، ورنہ اُسے خاک میں ملا دیا جائے۔

ادھر جب میرزا محمد باقی کو ان کی اس شورش کی خبر ہوئی تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب حکمت عملی کی باتوں سے کام نہیں چل سکتا، بلکہ اب کوئی ایسا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے کہ ہمیشہ کے لیے اس فتنے کا خاتمہ ہو۔ چنانچہ اس نے ارغونوں کو بلا کر اُن سے کہا کہ وہ گھبرائیں نہیں، میں فلاں روز اس خزانے کو تقسیم کر دوں گا۔ پھر اُس نے اپنے خاصہ خیل جبش خان، شبرنگ خان اور ملا صالح کو بلا کر خفیہ طور پر حکم دیا کہ میں جب ان ارغونوں کو دیوان خانے میں تقسیم خزانے کے لیے بلاؤں گا تو تم میں سے ہر ایک تھوڑے تھوڑے جوانوں کے ساتھ دیوان خانے کے فلاں فلاں حصے میں چھپا رہے اور تیار رہے اور موقع پاتے ہی ان پر حملہ کر دے۔ چنانچہ ملا خمیسہ اور دوسرے لوگ جنہیں اُس نے حکم دیا تھا، دیوان خانے میں مقررہ دن چھپ کر بیٹھ گئے۔ میرزا محمد باقی جس جھروکے میں بیٹھ کر لوگوں کے سلام لیتا تھا آ کر بیٹھا اور خزانہ داروں کو حکم دیا کہ وہ روپے اور اشرفیوں کے صندوق خزانے سے نکال کر انبار کر دیں اور عام و خاص ارغونوں کو دعوت عام دی کہ وہ چھوٹے اور بڑے سب حاضر ہوں، تاکہ اس جھگڑے کو ختم کر دیا جائے جو ہم میں اور تم میں مدت سے مابہ النزاع چلا آ رہا ہے۔ بے خبر ارغون اس مژدے کو سن کر شاداں و خنداں، روپے کے حصول کے لیے کچھی گھوڑوں پر سوار ہو کر اور لباس فاخرہ پہن کر دیوان خانے میں قاضی خمیسہ کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ جب تمام ارغون اکٹھے ہو گئے تو میرزا محمد باقی نے انہیں کہلا بھیجا کہ میں تم سب کو دیکھنے کی تمنا دل میں رکھتا ہوں، خوصوصاً اس وقت کہ تم سب جمع ہو۔ میں اس وقت تنہا، بغیر ہتھیاروں کے بالا خانے پر بیٹھا ہوا ہوں۔ تم بغیر کسی خوف و جھجک کے میرے پاس آؤ، کیونکہ تم میرے بھائی ہو۔ سادہ لوح ارغون بے جھجک بغیر ہتھیاروں کے اس کے پاس چلے گئے اور لائن لگا کر اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ جب سب بیٹھ چکے تو اس نے ارغونوں سے مخاطب ہو کر کہا، اے عزیزو! میں اس خزانے سے دل اُٹھا چکا ہوں، میں اس روپے کو تم سب میں تقسیم کر کے تم سب کو اپنا عزیز بنا لینا چاہتا ہوں۔ اب تقسیم زر کا وقت قریب ہے، تم جانتے ہو کہ یہ عجیب دن ہے اور روپیہ ایسی چیز ہے کہ باپ کو بیٹے اور بھائی کو بھائی کا دشمن بنا دیتا ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ تقسیم کے وقت جب کہ عموماً شور و شر ہوتا ہے، اور آپس میں جھگڑا ہوتا ہے، اس گڑبڑ میں مجھے آزار نہ پہنچے، اس لیے میں دور بیٹھتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ دور جا بیٹھا اور اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ وہ روپیہ تقسیم کرے۔ ابھی صندوقوں کے قفل بھی کھلنے نہ پائے تھے کہ چھپے ہوئے لوگ اپنی کمین گاہوں سے نکلے، انہیں پہلے ہی سے اشارہ دے دیا گیا تھا کہ روپیہ تولنے کی ترازو میں بجائے پتھر کے ہر ایک سر کو پاسنگ بنایا جائے اور ایک کو بھی زندہ واپس نہ جانے دیا جائے۔ انہوں نے اس زور سے ارغونوں پر حملہ کیا اور ایسا قتل عام کیا کہ ان میں سے ایک بھی زندہ باقی نہ بچا۔ پھر اُن کے سروں کو کاٹ کر دیوان خانے کے دریچے سے باہر

---

(1) تاریخ طاہری، ص ۱۱۸۔

(2) تاریخ معصومی فارسی، ص ۲۱۰۔

(3) تاریخ معصومی فارسی، ص ۲۱۰-۲۱۱۔

پھینک دیا اور ارغونوں کے عوام جو قاضی خمیسہ کے گرد جمع تھے، اس نے بھی اُن کے قتل کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ یہاں تک کہ ایک شخص بھی قلعے سے باہر سلامت نہ جاسکا، پھر میرزا محمد باقی نے اپنے خاصہ خیلوں کو حکم دیا کہ وہ ارغونوں کی حویلیوں میں جائیں اور وہاں قتل عام کریں۔ اگر ایک دن کا بھی بچہ ہو تو اُسے بھی زندہ نہ چھوڑیں۔ چنانچہ اُس کے حکم کے مطابق ایک جماعت ارغونوں کی حویلیوں پر پہنچی اور وہاں جو کوئی بھی اُن کے ہاتھ پڑا انہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس ورطۂ ہلاکت سے جو بھی ارغون باقی بچے وہ گجرات چلے گئے۔

دریائی ارغون ولد علی شیر ارغون اس قتل عام کے بعد ارغونوں کی تباہ حالیوں کو بیان کرتے ہوئے کہا کرتا تھا کہ اس حادثے کے بعد ارغونوں کا یہ حال ہوا کہ انہیں کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا میسر نہ تھا۔ اگر کسی کے پاس گھوڑا تھا تو وہ بھوک سے قاق ہو چکا تھا۔ پرانی تلوار کے سوا جو میان میں رہتی تھی اور فرتوت کمانوں کے سوا اُن کے پاس کچھ نہ رہا تھا، شکار پر ان کا گزر اوقات تھا اور بدنصیبی سے ایسا وقت اُن پر پڑا تھا کہ باپ بیٹے سے اور بیٹا باپ سے جدا ہو کر پریشان حال زندگی گزار رہے تھے۔[1]

خاصہ خیلوں پر نوازشیں:

الغرض جب میرزا محمد باقی ارغونوں کے خطرے سے مطمئن ہو گیا تو اس نے اپنے خاصہ خیلوں کو اپنی نوازشوں سے سرفراز کیا اور ہر ایک کو ارغونوں کے اُمرائے عظام کی جگہ عنایت کی۔ سب سے پہلے اس نے خسرو چرکس کو کہ جسے اس کا باپ بہت چاہتا تھا اور جسے اس کے باپ نے بڑی تمنا اور آرزو سے ملا جانی بندری سے لے کر اپنا خاصہ خیل بنایا تھا، اس کو پرگنوں کی عملداری دی۔

قاضی خمیسہ کو جو میرزا محمد باقی کی پریشانیوں کے زمانے میں اس کے ساتھ تھا۔ اُسے "وکیلِ کل" مقرر کیا، یہ اتنا اہم عہدہ تھا کہ ملک کا مدار اس عہدے پر تھا۔ قاضی خمیسہ کی خوش نصیبیوں نے اُسے اس بلند مرتبے پر پہنچایا کہ کئی ہزار سوار اور پیادے اس کے ہمرکاب رہتے تھے۔ اس کی شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ جس قدر رنگ کے گھوڑی اس کے پاس تھے اُسی قدر علیحدہ علیحدہ طویلے اُس نے ان گھوڑوں کے لیے بنوائے۔ اس کے طویلے عراقی، کچھی، ترکی، تازی، زہری اور کوہی گھوڑوں سے بھرے ہوتے تھے۔ حالانکہ وہ خود ایک جاہل انسان تھا، لیکن زمانے کی ستم ظریفی یہ تھی کہ اُس دور کے بڑے بڑے علماء اپنی ضروریات میں اس کو اپنا وسیلہ و توسط بنانے پر مجبور تھے اور اس کی جاہلانہ باتوں کو برداشت کرتے تھے۔[2]

میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے قاضی خمیسہ کی جہالت اور کودن پن کا ایک واقعہ تحفۃ الکرام میں نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ایک روز ٹھٹھہ کے بڑے بڑے علماء، جن میں حضرت سید علی شیرازی، شیخ عبدالوہاب پورانی بھی شامل تھے، کسی ضرورت سے قاضی خمیسہ کے پاس گئے۔ اُس نے دور سے علمائے کرام کو آتے ہوئے دیکھ کر از روئے تمسخر کہا آؤ۔ ملاؤ! قاضی نعمت اللہ نے جو ان علماء میں بہت تیز اور ذہین تھے قاضی خمیسہ سے کہا کہ قاضی صاحب! ملا کے کیا معنی ہیں؟ چونکہ خمیسہ علم سے بے بہرہ تھا، اُس نے جواب سے بچنے کے لیے خود ایک گول دائرہ بنا کر پوچھا کہ بتاؤ یہ کیا ہے؟ اس وفد کے تمام اہل کمال اس کے اس سوال پر متحیر ہوئے اور کہنے لگے، ہم تو اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ آپ ہی رہبری کیجیے کہ یہ کیا ہے؟ خمیسہ نے کہا کہ یہ شکل روٹی کی ہے کہ تم باوجود بزرگی کے اس کے چکر میں ہو، پھر اُس نے ایک اور ہندسے جیسی شکل بنائی اور کہا کہ یہ اس سے آسان ہے، بتاؤ یہ کیا ہے؟ ان بزرگوں نے کہا کہ ایسی شکل ہم نے کہیں نہیں دیکھی، آپ ہی اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ قاضی خمیسہ نے کہا اے نادانو! باوجود اس علم و فضل کے تم اس کے سمجھنے میں ناکام رہے، یہ کسان کے بیل کے پیشاب کی شکل ہے۔ اس کی صحبت ناجنس سے یہ بزرگ متنفر ہو کر بغیر اپنی ضرورت بیان کیے فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ قاضی خمیسہ نے جب یہ دیکھا کہ یہ بزرگ ناراض ہو کر جا رہے ہیں تو اس نے معافی چاہ کر ان کا کام فوراً کر دیا۔[3]

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرزا محمد باقی نے کس قسم کے نااہل لوگوں کے سپرد اس ملک کی زمام حکومت کی تھی۔

میرزا جان بابا کی شورش:

تاریخ معصومی میں ہے کہ اسی زمانے میں میرزا محمد باقی کے بھائی میرزا جان بابا اور داماد میرزا شاہ رخ نے جو نہایت بہادر تھا، علم بغاوت بلند کیا اور یہ دونوں بکھر پہنچے اور سلطان محمود خان سے امداد کے طالب

---

[1] یہ تمام تفصیل تاریخ طاہری، ص ۱۱۴ تا ۱۲۱ سے ماخوذ ہے۔

[2] تاریخ طاہری، ص ۱۲۲۔

[3] تحفۃ الکرام، اردو ترجمہ، ص ۲۸۲ تا ۲۸۵۔

ہوئے۔ سلطان محمود خان اُن کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آیا، اور انہیں خلعت، گھوڑے اور جاگیر سے نوازا، اور اُن کی مدد کے لیے بہترین آدمی اُن کے ساتھ کیے۔ جب وہ ٹھٹھہ کے قریب پہنچے اور میرزا باقی کے لشکر کے مقابلے میں خندقیں کھودیں تو ارغون اُمرا نے مخالفت کر کے میرزا جان بابا کو ورغلا دیا۔ میرزا جان بابا سمیجہ قبائل کی جمعیت کو اپنے ساتھ لے کر ان لوگوں سے جدا ہو گیا اور سلطان محمود خان کے لوگ بھی دریا میں طغیانی کی وجہ سے اپنے میں مقابلے کی طاقت نہ پا کر لوٹ گئے۔[1]

طاہر نسیانی نے اس شورش کی مزید تفصیلات دیتے ہوئے لکھا ہے کہ میرزا جان بابا جو اپنے باپ کے زمانے سے میرزا صالح کے ہاتھوں دربدر ہو کر سمیجہ قبائل سے قرابت ہونے کی وجہ سے وہاں رہنے لگا تھا، وہ اپنے والد کی تعزیت کے بہانے سے سلطان محمود خان کو کلتاش کو ہمراہ لے کر ۹۸۶ھ میں ٹھٹھہ آیا اور تعزیت کی رسم ادا کرنے کے بعد اس نے سلطان محمود خان کے توسط سے میرزا محمد باقی سے اپنے باپ کے ملک اور ورثے کا مطالبہ کیا۔ میرزا محمد باقی جو زمانے کے سرد و گرم کو کافی دیکھ چکا تھا اور بڑا تجربہ کار تھا، اس نے سلطان محمود خان کو جواب دیا کہ میرے والد کے زمانے سے آج تک ہم میں اور آپ میں ایک پختہ عہد نامہ چلا آرہا ہے۔ آپ نے جس طرح میرے اور میرے بھائی محمد صالح کے درمیان دخل نہیں دیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس معاملے میں بھی دخل نہ دیں۔ بہر حال یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تاجروں کے بچوں کی طرح اس ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ اس کے حوالے کروں اور اپنے پہلو میں اپنا ایک اور دشمن پرورش کروں، سلطان محمود خان نے جواب دیا اگر تم اپنے بھائی کو رضامند کر سکو تو اچھا ہے، ورنہ جو تم مناسب سمجھو کرو۔ میرزا جان بابا یہ جانتا تھا کہ اگر میں سلطان محمود کے بعد یہاں رہا تو میرزا باقی مجھے زندہ نہ چھوڑے گا۔ اس لیے وہ بھی اس کے ساتھ لوٹ آیا اور سمیجہ قبائل میں چلا گیا۔[2]

کچھ دن کے بعد وہ باقی ماندہ ارغونوں مثل شاہ قاسم، علی شیر اور اُن جیسے دوسرے لوگوں کو اکٹھا کر کے ایک لشکر کے ساتھ ٹھٹھہ پر حملہ آور ہوا۔ محمد باقی نے بھی مستعد ہو کر اپنے غلاموں، خاصہ خیلوں اور سپاہیوں سے کہا کہ ہماری حکومت کا انحصار آج کے دن پر ہے، اگر فتح مند ہو گئے تو یہ حکومت اور ملک ہمارا ہے، ورنہ دوسری صورت میں پریشانی اور سرگردانی ہمارا مقدر ہو گی اور کوئی ٹھکانہ ہمارے لیے نہیں رہے گا کہ جہاں ہم اپنے پاؤں جما سکیں۔

ان تیاریوں کے بعد مکلی اور شہر کے درمیان ان دونوں میں زور کا رن پڑا، چونکہ میرزا محمد باقی کے لوگ تربیت یافتہ تھے اور اس کا لشکر بھی کثیر تھا، انہوں نے زبردست حملے کر کے میرزا جان بابا کو شکست دے دی، ملا بہبود اسی لڑائی میں مارا گیا۔ میرزا جان بابا شکست کھا کر وہاں سے بھاگا اور گکرالہ کے حاکم جام ڈیسر کے پاس امداد کے لیے گیا۔ لیکن وہاں سے اسے کوئی مدد نہ مل سکی اور خالی ہاتھ قبائل سمیجہ میں واپس آیا۔[3] ترخان نامہ میں اس جنگ کا سنہ ۹۷۵ھ درج ہے۔[4]

شاہ قاسم ارغون کا شب خون:

یہاں آکر پھر اس نے ایک مرتبہ جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں، جب میرزا محمد باقی کو اس کی خبر ہوئی کہ میرزا جان بابا شورش سے باز نہیں آتا تو وہ اس کی طرف روانہ ہوا تا کہ وہ اس مرتبہ اُس کو آوارہ روزگار بنائے۔

اس مرتبہ میرزا محمد باقی نے سوچا کہ جان بابا اس کے لیے مارِ آستین بنا ہوا ہے اگر وہ اسی طرح فتنے اُٹھاتا رہا تو سلطنت کا زوال یقینی ہے، اس کو مکر و حیلے سے قبضے میں لا کر اسے زیر کرنا چاہیے، وہ ابھی اسی فکر میں تھا کہ اچانک شاہ قاسم ارغون نے ایک کثیر لشکر پر شب خون مارا، میرزا کا لشکر جو اپنی سابقہ فتح پر مغرور اور مفتخر تھا، اگرچہ اس نے بڑی شجاعت اور بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا، لیکن چونکہ اندھیری رات تھی اور شور و شر بہت تھا اس لیے میرزا محمد باقی کا لشکر منتشر ہو کر بھاگ کھڑا ہوا، یہاں تک کہ شاہ قاسم میرزا باقی کی کشتی پر جا پہنچا، تا کہ اپنے بھائیوں کے قتل کا انتقام لے۔ میرزا محمد باقی اپنے حرم کے ساتھ کمرے کے اندر نیند میں محو تھا، میرزا محمد باقی کی بیگم نے دونوں ہاتھوں سے دروازے بند کر لیے اور میرزا محمد باقی نے جان کے خوف سے دریا میں چھلانگ لگا دی، آخر قاسم ارغون مرد تھا، اس کے مقابلے میں کب تک ایک عورت ہاتھوں سے دروازے کو بند رکھ سکتی تھی، اس کے زور لگانے پر دروازہ کھل گیا، جیسے ہی محمد قاسم ارغون

---

[1] تاریخ معصومی، فارسی، ص ۲۱۱۔

[2] تاریخ طاہری، ص ۱۲۵-۱۲۶۔

[3] ایضاً۔ ص ۱۲۶-۱۲۷۔

[4] تحفۃ الکرام فارسی جدید ایڈیشن مصحح سید حسام الدین راشدی، ح حواشی، ۱۳۹، حاشیہ نمبر ۶ بحوالہ ترخان نامہ، ص ۵۶، صاحب بیگلار نامہ نے اس جنگ حالات نہایت تفصیل سے درج کیے ہیں (بیگلار نامہ، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ باب نہم، ص ۵۹ تا ۶۰)۔

اندر داخل ہوا، اس مرد افگن عورت نے شمع دان کی رکابی اُٹھا کر اس زور سے کھینچ کر اس کے منہ پر ماری کہ مرتے دم تک اس کے زخم کا نشان اس کے چہرے سے نہیں گیا، آخر کار اس عورت کو اندھیرے میں میرزا محمد باقی سمجھ کر شاہ قاسم ارغون نے اُسے قتل کر دیا۔

اِدھر میرزا محمد باقی نے جب دریا میں چھلانگ لگائی تو اتفاق سے خلیل خدمتگار[1] بھی جو جان بچانے کے خوف سے پانی میں چھپا ہوا تھا، اس نے میرزا کے پانی میں گرتے ہی فوراً غوطہ لگایا اور اس کے بالوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا، میرزا محمد باقی نے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے اپنا نام بتایا، میرزا محمد باقی نے اس سے کہا کہ اگر کوئی چھوٹی کشتی آس پاس موجود ہو تو تلاش کرو، اتفاق سے مرادیہ کشتی بان جو کہیں آس پاس موجود تھا اس نے اپنی کشتی حاضر کی، دونوں نے اس پر سوار ہو کر دریا کو عبور کیا اور علی پوترہ گاؤں کے قریب نکلے، وہاں پہنچنے کے بعد انہیں نقارہ نہیں مل سکا، اس لیے انہوں نے گاؤں سے ڈھول منگوا کر بجوایا۔ میرزا محمد باقی کا شکستہ خوردہ لشکر جو بے دلی سے میرزا محمد باقی کو مردہ سمجھ رہا تھا ڈھول کی آواز سن کر خوش ہو گیا اور دشمن بھی چوکنا ہو گیا کہ میرزا محمد باقی ابھی زندہ ہے۔ ہمیں اپنی فکر کرنی چاہیے، ورنہ وہ کسی کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ اس لیے وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ میرزا محمد باقی نے اسی خدمت کے سلسلے میں مرادیہ کشتی بان کو صوبہ ٹھٹھہ کا میر بحر بنایا اور اس خدمت کے معاوضے میں خلیل خدمتگار کو خاص مہردار مقرر کیا۔[2]

میرزا محمد باقی کے ہولناک مظالم:

الغرض جب میرزا محمد باقی اپنے بھائی میرزا جان بابا کو شکست دے کر مطمئن ہو گیا تو اس نے ان ہولناک مظالم کی ابتدا کی کہ جن کو سن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلے اس نے میرزا محمد صالح کے بیٹے میرزا غالب کو قتل کرایا۔ تاریخ طاہری کے مؤلف نے اور میر علی شیر قانع نے تحفۃ الکرام میں میرزا غالب کو میرزا محمد باقی کا سب سے چھوٹا بھائی لکھا ہے، لیکن سید حسام الدین راشدی نے میرزا غالب کو اپنے اُس شجرے جو ترخان نامہ میں انہوں نے میرزا عیسیٰ کا دیا ہے میرزا صالح کا بیٹا بتایا ہے جو صحیح ہے، اس لیے کہ میرزا عیسیٰ کے سب بیٹے سوائے میرزا محمد باقی اور جان بابا کے اس کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ اس کی قبر مکلی میں میرزا عیسیٰ اول کے مقبرے کے قریب ہے۔

میرزا محمد باقی کا دستِ تعدی بڑھتا گیا، یہاں تک کہ اُس نے اُس دور کے بزرگوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کیا، اس کے سب سے پہلے کشتۂ ستم شیخ برکیہ لنگ بنے جو مکلی میں رہتے تھے، ان کی زیارت کے لیے مقررہ وقتوں پر نقارہ بجایا جاتا تھا، اس وقت شہر کے لوگ ان کی زیارت کے لیے جاتے اور لوگ کثرت سے نذر و نیاز ان کی خدمت میں پیش کرتے، بیشمار ساز و سامان اور سونا و چاندی ان کے پاس جمع ہو گیا تھا، یہاں تک کہ میرزا محمد باقی لوگوں پر اُن کا روحانی اقتدار اور مادی جاہ و جلال کو دیکھ کر رشک کرنے لگا تھا کہ ٹھٹھہ میں ایک اور حاکم میرے مقابلے میں پیدا ہو گیا ہے، لوگ ان کو امین سمجھ کر روپے، سونا اور قیمتی اشیاء امانت رکھاتے تھے۔ یہ خبریں میرزا محمد باقی کو پہنچتی رہتی تھیں، یہاں تک کہ ایک دن اس نے خفیہ طور پر حکم دیا کہ شیخ برکیہ کو آدھی رات میں قتل کر کے اس طرح ان کی لاش کو دریا میں غرق کیا جائے کہ وہ قیامت تک سطحِ دریا پر نہ اُبھر سکے، اُن کا تمام مال و اسباب لوٹ کر میرے پاس پیش کیا جائے، پھر کسی کو ان کے قاتل کی خبر نہ ہونی چاہیے کہ وہ کون تھا، اور کس نے اُن کو قتل کیا تھا اور کس طرح قتل کیا تھا چنانچہ وہ شہید کر دیے گئے، صبح کو لوگ پہنچے اور ان کو اپنے مقام پر نہ پا کر سخت آہ و بکا کرنے لگے، خود میرزا نے بھی وہاں پہنچ کر مگرمچھ کے آنسو بہائے اور اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ وہ اس واقعے کی تحقیق کر کے اُن کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں، لیکن اس کی مکاری سے کوئی یہ نہ جان سکا کہ یہ سب کیا دھرا اُس کا ہے۔

ان کے بعد شیخ عبدالوہاب پورانی[3] جیسے جلیل القدر بزرگ اس

---

(1) خلیل خدمتگار: ایک غیر معروف شخص تھا، لیکن چونکہ اس نے میرزا باقی کو ڈوبنے سے بچایا تھا، اس لیے اعلیٰ خدمت پر فائز ہو کر مُہردار ہوا، اس کی قبر مکلی میں ہے۔ تحفۃ الکرام، اردو ترجمہ، ص ۲۸۴۔

(2) تاریخ طاہری، ص ۱۲۹ تا ۱۸۲۔

(3) شیخ عبدالوہاب پورانی: معصومی اور ترخان نامہ میں یہ نام میر عبدالرحمٰن بن شیخ میرک ثبت ہے، لیکن طاہری میں شیخ عبدالوہاب پورانی درج ہے، صاحب تحفۃ الکرام نے بھی تاریخ طاہری سے اخذ کر کے یہ نام عبدالوہاب پورانی درج کیا ہے، جو صحیح نہیں، درحقیقت صحیح نام میرک عبدالرحمٰن ہے، جو خمیسہ کے ہاتھ سے قتل ہوئے، ان کا مزار مکلی میں واقع ہے اور اس پر کتبہ نصب ہے:

میرک چو شہید شد بگفتم
باخامہ کہ سال آن نوشتی
گفتا کہ نوشتم و برآمد
تاریخ ز - میرکِ بہشتی

۹۸۷ھ

کے تیر ستم کا نشانہ بنے۔ ان کو محض اس بنا پر کہ اطراف و اکناف سے لوگ عقیدت مندانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اس وہم میں قتل کرایا کہ وہ باہر کے لوگوں کو اپنے گرد اکھٹا کر کے اس کی حکومت پر قبضہ کر لینے کی خواہش رکھتے ہیں، اس نے ملا خمیسہ کو حکم دیا کہ انہیں اس طرح قتل کیا جائے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ ہماری حکومت کی مصلحت اسی میں ہے، چنانچہ عین عید کے دن جب وہ نماز پڑھ کر اپنے مریدین و معتقدین کے ساتھ واپس آ رہے تھے ملا خمیسہ چند بد معاشوں کے ساتھ ایک مقام پر اس کے انتظار میں کھڑا ہو گیا، جیسے ہی وہ قریب پہنچے ان بد معاشوں نے قاضی خمیسہ کا اشارہ پاتے ہی بغیر کسی جرم و خطا کے اس بزرگ کو عین بازار میں شہید کر دیا۔ تحفتہ الکرام میں ہے کہ شیخ عبدالوہاب نے میر زا محمد باقی کی تخت نشینی کے لیے بڑی کوشش کی تھی۔

ان کے بعد اس کے ظلم کی کمان ایک اور بزرگ خلیفہ عبدالوہاب عباسی کے سر پر کڑکی جو ولایت و کرامت میں بہت مشہور تھے، ان کے قتل کے لیے میر زا محمد باقی نے خلیل مہر دار کو ایک جمعیت کے ساتھ مقرر کیا کہ ان کو اپنے سامنے بٹھا کر قتل کرے چنانچہ خلیل مہر دار نے اپنے آقا کے حکم کے مطابق ان کو شہید کر دیا۔ ان کے صاحبزادے محمد صادق نے باپ کے قتل ہونے پر مشتعل ہو کر خلیل پر تلوار کا وار کر کے اس کی ناک کاٹ دی۔ اس نے محمد صادق کو بھی شہید کر دیا، ان کا دوسرا بیٹا محمد ہاشم بھی گھوڑوں اور ہتھیاروں سمیت دریا میں غائب ہو گیا۔ خلیل جب تک بھی زندہ رہا موم کی ناک لگائے رہا اور عیب چھپانے کے لیے آنکھوں پر جس طرح آنکھیں آجانے پر لوگ کپڑا اڈالے رہتے ہیں، اسی طرح ایک رنگین کپڑا اڈالے رہتا تھا۔

غرضکہ لوگوں کی تباہی و بربادی میں میر زا محمد باقی نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی، کوئی شخص ایسا نہ تھا کہ اُس کے ظلم کے خلاف آواز اٹھائے، اس کی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ ملک میں جس کو بھی علم و فضل کا دعویٰ ہو اس کو زندہ سلامت نہ چھوڑے۔

اس کے بعد اس کے ظلم نے ایک اور نئی راہ نکالی۔ اس نے شہر کے (اکثر) خورد و کلاں، شریف و وضیع، مشائخ و سادات کو شہر سے باہر نکال کر کہا کہ انہیں ہمارے شہر میں نہ رہنا چاہیے۔ یہ ہماری سلطنت کے بد خواہ ہیں، ٹھٹھہ کے مشہور بزرگ سید علی شیر ازی[1] کے فرزند سید

میر شیخ عبدالوہاب پورانی دوسرے بزرگ ہیں، جن کی تصنیف فتاویٰ پورانی ہے، تاریخ معصومی میں ان کا سنہ وفات ۹۹۰ھ درج ہے۔

ترخان نامہ میں ہے کہ جناب میرک عبدالرحمٰن بن شیخ میرک کو جو اشراف و اکابر میں تھے، انہیں شراب نوشی سے متہم کر کے ایک جمعیت کو حکم دیا کہ جب وہ عید گاہ سے واپس آئیں ان کو قتل کر دیا جائے، چنانچہ جب وہ عید گاہ سے اپنی حویلی کے قریب پہنچے تو انہیں شہید کر دیا گیا۔

(تحفتہ الکرام فارسی جدید ایڈیشن، مصححہ سید حسام الدین راشدی مع حواشی، ص ۱۲۱، حاشیہ نمبر ۲، بحوالہ ترخان نامہ ص ۶۳)

---

[1] سید علی ثانی: متوفیٰ ۹۸۱ھ سید جلال اول کے صاحبزادے تھے، جو اپنے خاندان میں سید مراد شیر ازی کے بعد سب سے زیادہ صاحب خیر و برکت اور صاحب رُشد و ہدایت بزرگ تھے۔ سندھ کے بہت سے مشائخ انہیں کے فیض تربیت سے آراستہ ہو کر یگانۂ روزگار ہوئے، ان میں سے ایک سید عبدالکریم (بلڑی) بھی تھے، جو خود اپنے زمانے میں صاحب کرامت و ولایت بزرگ تھے، وہ سندھی کے باکمال شاعر تھے اور ان سے رُشد و ہدایت کا سلسلہ اس سرزمین میں پھیلا، سندھ کے قومی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی انہیں کی اولاد میں سے ہیں۔

ارغون انہیں سید علی ثانی کے زمانے میں سندھ میں آئے، پورا ارغون دور ان کے سامنے گزرا، ترخانی دور کے بھی دو حکمران میر زا عیسیٰ و میر زا محمد باقی ان کے ہمعصر تھے، وہ اپنے زمانے میں اس قدر محترم تھے کہ نہ صرف عوام، بلکہ اُس زمانے کے صاحبانِ اقتدار ان کی عقیدت کو اپنے لیے وسیلۂ سعادت اور ضامن امارت سمجھتے تھے، اس موقع پر جب کہ ہمایوں بادشاہ راجپوتانے سے مایوس ہو کر عمر کوٹ آیا تو سید صاحب شاہ حسن ارغون کی طرف سے اس کی دلداری کے لیے گئے۔ وہ وہیں تھے کہ شب یکشنبہ ۵ رجب ۹۴۹ھ کو اکبر پیدا ہوا، پہلا کپڑا جس میں ہندوستانی مغلوں کے سب سے بڑے بادشاہ کو لپیٹا گیا، وہ حضرت سید علی ثانی کے پیراہن کا ایک ٹکڑا تھا، جو تبرکاً آپ کے پیراہن سے لیا گیا تھا۔ ترخان نامہ میں ہے کہ:

حضرت بادشاہ از تولد فرزند ارجمند بغایت خوشحال و خوش وقت گشتہ، و لباس نور اقتباس اول حضرت عرش آشیانی (اکبر) بر سبیل تبرک از پیراھن سید مذکور مرتب فرمودہ۔

میر زا شاہ حسن کو ۹۶۱ھ میں دو سال کے لیے امانتہً گورستان مکلی میں دفن کیا گیا۔ جب اس کی بیوی اس کی لاش کو مکہ معظمہ لے جانے لگی تاکہ اس کو اس کے باپ شاہ بیگ کے پہلو میں دفن کیا جائے تو وہ تبرکاً حضرت سید علی ثانی کو اپنے ہمراہ لے گئی۔

حضرت سید علی ثانی نہ صرف شیخ طریقت تھے، بلکہ ادیب اور جلیل القدر عالم تھے، جو سندھی، عربی اور فارسی زبانوں پر قدرتِ کاملہ رکھتے تھے، اور سندھی کے بلند پایہ شاعر تھے، ان کی تصانیف میں "آداب المریدین" اور "تذکرۃ المراد" ہیں جن میں انہوں نے عربی اور فارسی میں اپنے دادا سید مراد کے حالاتِ زندگی مرتب کیے ہیں۔ قاضی محمد اچی کے بعد شیخ الاسلام کے فرائض بھی حکومت کی جانب سے ان کے سپرد ہوئے۔ حضرت سید علی ثانی نے ۹۸۱ھ میں وفات پائی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب سندھ میں میر زا محمد باقی ترخان کی حکومت تھی۔ میر معصوم نے ان کی تاریخ وفات تاریخ معصومی میں "مات الحاتم بجودہ" سے نکالی ہے (ماخوذ از مقدمہ ترخان نامہ مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۳۳-۱۳۸۔)

جلال[1] کو بھی جو اس کے بھائی میرزا محمد صالح کے داماد تھے ان کو بھی اس نے شہر میں نہ رہنے دیا۔

وہ اپنے مظالم کے لیے ہر روز نئے نئے طریقے اختیار کرتا تھا، مسافر جو نئے نئے شہر میں آتے انہیں بلا کر بظاہر ان کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتا اور نہایت ہمدردی کا برتاؤ کرتا جس سے وہ دھوکہ کھاتے تھے کہ اس سے زیادہ ہمدرد اور مسافر نواز دنیا میں مشکل سے ہی کوئی ہوگا۔ پھر انہیں دریا کی سیر کرانے کے بہانے مرادیہ میر بحر کے حوالے کرتا کہ وہ انہیں دریا کی سیر کرائے، وہ انہیں نہایت پُر تکلف کشتی میں دریا کی سیر کے بہانے سے لے جاتا اور بیچ منجدھار میں لے جانے کے بعد کشتی کا تختہ نکال کر ان کی کشتیٔ حیات کو گرداب اجل میں غرق کر دیتا تھا۔ ان بیرونی سیاحوں اور مسافروں کے غرق کرانے سے میرزا محمد باقی کا مقصد یہ تھا کہ کوئی شخص ملک کے حالات باہر نہ پہنچا سکے اور کسی بیرونی ملک میں اس کے خلاف کوئی آواز کسی قسم کی نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ جس شخص کو ملاقات کے لائق خیال نہ کرتا تھا اس کا خاتمہ باہر ہی کرا دیتا تھا۔ اگرچہ ہفتہ میں ایک مرتبہ جمعرات کے دن وہ دیوان خانے میں کھانا کھاتا تھا، لیکن بخیل اس قدر تھا کہ کسی کو کچھ نہ دیتا تھا، اگر کسی کے متعلق سُن لیتا کہ وہ لوگوں پر خرچ کرتا ہے، پھر تو وہ خواہ اپنا ہوتا یا بیگانہ، سپاہی ہوتا یا شہری اس کے ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا، جب تک کہ اسے مفلس اور کوڑی کوڑی کا محتاج نہ کر دیتا۔

اس کی ہوس زر بے حد بڑھی ہوئی تھی۔ تاریخ طاہری میں ہے کہ بالفعل اس کا تکیہ کلام تھا، وہ خیمۂ دیوان خانے میں آتا، اور اپنے اراکین دولت سے ہر گھڑی یہ بات کہتا تھا کہ بالفعل غلہ اور روپیہ لاؤ، اور سوائے اس کے کوئی دوسرا کام نہ کرو کہ حکومت کا مدار اسی پر ہے۔ چونکہ اس نے اپنی زندگی میں پریشان حالی اور بھوک کی مصیبتیں بہت اٹھائی تھیں، اس لیے خزانے پر خزانہ جمع کرتا جاتا تھا اور غلے پر غلہ اکھٹا کرتا جاتا تھا۔ آخر ایک دن اس کے وکلا نے اُس سے کہا کہ:

> قلعہ نئے اور پرانے غلے سے اس قدر بھر چکا ہے کہ اب اُس میں کہیں جگہ باقی نہیں رہی کہ نیا غلہ جو آنے والا ہے اُسے رکھا جا سکے، غلہ رکھے رکھے خراب ہو چکا ہے۔ اگر حکم ہو تو یہ غلہ لوگوں کو دے دیا جائے کیونکہ ضائع ہونے سے بہتر یہ ہے کہ وہ کسی کے کام آجائے۔ میرزا نے کہا کہ میں کل اس کا جواب دوں گا، اس نے راتوں ہی رات حکم دیا کہ کچھ مٹی کی روٹیاں اور کچھ اس سڑے ہوئے غلے کی روٹیاں پکائی جائیں، چنانچہ اُن کو دستر خوان پر رکھوایا گیا۔ پھر اس نے اپنے اراکین دولت کو بلایا، اور اُن سے کہا کہ کھاؤ۔ لوگ سڑے ہوئے اناج کی روٹیاں کھانے لگے۔ میرزا نے ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ مٹی کی روٹیاں کیوں نہیں کھاتے، لوگوں نے جواب دیا کہ حضور کو معلوم ہے کہ ان کا کھانا کس قدر دشوار ہے۔ میرزا نے کہا کہ اب تمہیں اندازہ ہوا ہوگا کہ وقت پڑنے پر سڑا ہوا غلہ بھی کارآمد ہوتا ہے، تم مجھے اس کو تقسیم کرنے کا مشورہ کیوں دیتے ہو۔ کیا تم ہمایوں کا زمانہ بھول گئے کہ جب وہ اس ملک میں آئے اور میرزا شاہ حسن نے ملک کو ویران کر دیا اور غلے کی کاشت سے لوگوں کو روک دیا، تو اُس وقت غریبوں نے بھوک کی کیسی کیسی مصیبت برداشت کی۔ اس بات کو سُن کر تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا کہ حضور کی رائے صواب ہے اور ہمارے پاس اس کا کوئی جواب سوائے شرمندگی اور ندامت کے نہیں۔[2]

اُسی زمانے میں سلطان محمود خان کو کلتاش نے بکھر سے اطلاع بھیجی کہ اکبر نے مجاہد خان نامی ایک امیر کو پچاس ہزار سواروں کے ساتھ ہمارے ملک میں جنگ کے لیے بھیجا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اُس نے قلعے کو محاصرے میں لے لیا ہے اور ہم قلعہ بند ہو کر قلعے میں

---

[1] سید جلال ثانی: حضرت سید علی ثانی کے صاحبزادے تھے، جو ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے، اور شیخ الاسلام مقرر ہوئے۔ یہ بزرگوار بھی تقویٰ و پرہیزگاری، عادت و اخلاق میں اپنے باپ کے نقش قدم پر تھے، اور سیاسی مسائل میں اپنے والد جیسا ہی تدبر و فراست رکھتے تھے اور اپنے والد کے مانند مرجع خلائق اور مسکین پرور تھے۔ میرزا جانی بیگ نے انہیں ہندوستان بھیجنے سے پہلے یا بھیجتے وقت ۹۹۴ھ (۱۵۸۶-۱۵۸۵ء) میں میرزا محمد صالح اول متوفی ۹۷۰ھ (۱۵۶۲-۱۵۶۳ء) کی لڑکی سید صاحب کے عقد میں دی تھی۔ جب خدا کی مخلوق پر میرزا محمد باقی نے دست تعدی دراز کیا تو اس نے اُس عفیفہ کو بھی قید خانے میں ڈلوا دیا۔ میرزا محمد باقی کی موت کے بعد جب زمام حکومت میرزا جانی بیگ کے ہاتھ میں آئی تو اس محترم خاتون کو دوسرے قیدیوں کے ساتھ جیل خانے سے چھٹکارا ملا۔ میر سید محمد صاحب ترخان نامہ کے فرزند حضرت سید علی ثانی اسی خاتون کے بطن سے تھے (مقدمہ ترخان نامہ مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۳۸-۴۰۔)

[2] یہ تمام تفصیل تاریخ طاہری، ص ۱۳۱-۱۴۲ سے ماخوذ ہے۔

اس طرح بیٹھے ہوئے ہیں کہ باہر نہیں نکل سکتے۔ اگر تم ہم کو کچھ رسد بھجوا سکو تو بھجواؤ، اور اس میں تاخیر نہ کرو کہ یہ وقت حق دوستی ادا کرنے کا ہے اور اگر ہو سکے تو کچھ لشکر بھی ہماری مدد کے لیے روانہ کرو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر انہوں نے ہمارا قلعہ لے لیا تو پھر تمہیں بھی وہاں نہ رہنے دیں گے۔ جب سلطان محمود خان کی جانب سے یہ اطلاع میرزا محمد باقی کو ملی تو اُس نے اپنے اہل دربار سے مشورہ کرتے ہوئے کہا، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اس معاملے میں بالکل دخل نہ دینا چاہیے اور اپنے آپ کو اکبر کے مخالفوں میں شمار نہ کرانا چاہیے کہ ہماری یہ حکومت اُنہیں کی عطا کردہ ہے۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ اپنی بیٹی سندھی بیگم کو حرم شاہی میں داخل کرنے کے لیے پیش قیمت تحائف اور ہدایا کے ساتھ روانہ کیا جائے۔ اس طرح ہم شاہی فوجوں کے حملوں سے محفوظ رہیں گے۔ بعض اہلِ دربار نے اُس کے اس مشورے کو مستحسن قرار دیا اور بعضوں نے اس رائے کو پسند نہیں کیا اور کہا کہ ہمیں بکھر کے معاملات کے ختم ہونے کا انتظار کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی رائے پسند کی گئی، چند دنوں کے بعد خبر ملی کہ سلطان محمود خان بڑھاپے کی وجہ سے اندھا ہو گیا ہے اور اپنے خرچ کے علاوہ قلعے کو مع خزانے کے اکبر کی فوجوں کے حوالے کر دیا ہے اور اُس نے اپنی لڑکی کو بعض خاصہ خیلوں اور مصاحبوں کے ساتھ اکبر کے حرم سرا میں داخل کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ چنانچہ میرزا محمد باقی نے بھی اپنی بیٹی سندھی بیگم کو قیمتی سامان اور جہیز کے ساتھ سید جلال شیرازی اور خواجہ امیر بیگ کے ہمراہ اکبر کی کنیزی کے لیے بھجوایا تاکہ وہ اس طرح اپنے آپ کو شاہی فوجوں کے حملے سے محفوظ رکھ سکے۔ چنانچہ جب یہ لڑکی وہاں پہنچی تو اکبر نے ایک دفعہ اس کو دیکھ کر پھر دوسری دفعہ اُس کی طرف رخ نہ کیا اور کہا کہ یہ باقی خونی کی لڑکی ہے، اُسے ہمارے محل سے باہر رکھا جائے۔ اس پر ان ارغون سرداروں نے جو دربدر ہو کر وہاں پہنچے تھے اپنے ناموس کا خیال رکھتے ہوئے اکبر بادشاہ سے عرض کیا کہ ایسی بے التفاتی بندگان درگاہ کے ساتھ حضور کی طرف سے دیکھنے میں کم آئی ہے، اگر آپ کے کرم سے یہ لڑکی اپنے باپ کے پاس واپس بھیج دی جائے تو محمد باقی آپ کا بے حد شکر گزار ہو گا، چنانچہ ان کی سفارش پر اکبر نے اُسے اس کے باپ کے واپس کر دیا۔[1]

تاریخ معصومی میں ہے کہ ۹۷۶ھ (۶۹-۱۵۶۸ء) میں محمد باقی نے اپنی لڑکی کو حرم شاہی میں داخل کرنے کے لیے اکبر کے پاس بھجوایا اور اس کے ساتھ ماہ بیگم اور ناہید بیگم کو بھیجا اور بیش قیمت تحائف و سامان جو بادشاہوں کے شایان شان ہوتا ہے بھجوایا، اور یادگار مسکین خان ترخان[2] کو بھی اُن کے ساتھ کیا۔ یہ لوگ جب "لکھلوی" (کی) کے قریب پہنچے تو میرزا جان بابا اُن سے آکر ملا۔ ان کے روانہ کرنے سے پہلے میرزا محمد باقی نے ناہید بیگم سے رشتہ قائم کرتے ہوئے اس کی بیٹی رانجہ بیگم کو جو کہ پہلے میرزا نجات خان کے نکاح میں تھی اور بعد میں اُس سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اُس سے نکاح کر لیا۔ یہی وہ خاتون تھی جب کہ شاہ قاسم ارغون نے شب خون مارا تھا تو اس میں اس کے ہاتھ سے قتل ہوئی۔[3]

ماہ بیگم قید و بند میں:

اس واقعے کے ایک سال بعد ۹۷۷ھ (۷۰-۱۵۶۹ء) میں ناہید بیگم نے ہندوستان جانے کا ارادہ کیا۔ میرزا محمد باقی نے ماہ بیگم اور ناہید بیگم کو اپنی بیٹی کے ساتھ مسکین میرزا کے ہمراہ ہندوستان روانہ کیا، تاکہ ان خواتین کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ یہ قافلہ اپنی منزلیں طے کر رہا تھا کہ راستے میں ایک جگہ میرزا جان بابا مسکین میرزا سے ملا۔ اس نے مسکین میرزا کو اپنے ساتھ ملا کر ماہ بیگم اور ناہید بیگم سے کہا کہ تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ محمد باقی نے یہ نئی چال چل کر تمہیں سندھ سے نکال دیا ہے۔ اب وہ چاہتا ہے کہ سندھ پر اکیلا حکومت کرے۔ ماں بیٹی اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آگئیں، اُنہوں نے جہیز اور تحائف کو کھول کر فوج اور لوگوں میں تقسیم کر دیا اور محمد باقی سے جنگ کی تیاریاں کرنے لگیں۔ لڑائی کے لیے ماہ بیگم نے ہاتھی پر سوار ہو کر علم بلند کیا اور میدانِ جنگ میں مقابلے کے لیے صفیں آراستہ کیں۔ دونوں میں مقابلہ ہوا۔ یہ جنگ مکلی کی پہاڑی پر واقع ہوئی، لیکن تھوڑے ہی عرصے میں ماہ بیگم کا لشکر پسپا ہونے لگا۔ میرزا جان بابا اور یادگار مسکین نے جب شکست کے آثار دیکھے تو پہلے ہی حملے میں "ککرالے" کی طرف بھاگ گئے، جو کہ ساحل سمندر پر جام ڈیسر کی اقامت گاہ تھا۔ ناہید بیگم نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بکھر میں پناہ لی۔ اس کی والدہ ماہ بیگم میرزا باقی کے ہاتھوں قید ہوئی۔

---

[1] یہ تمام تفصیل تاریخ طاہری، ص ۱۴۲-۱۴۷-۱۴۹-۱۵۰ سے ماخوذ ہے۔

[2] یادگار مسکین خان ترخان: یہ شاہ بیگ اور میرزا شاہ حسن کے ممتاز اُمرا میں تھا، جب میرزا شاہ حسن نے ملتان فتح کیا تو ملتان کے حکمران سلطان محمود لانگا کے فرزند اور دختر کو اسی کے حوالے کیا تھا (تحفۃ الکرام، ترجمہ سندھی، ص ۲۲۳)۔

[3] تاریخ معصومی فارسی، ص ۲۱۲۔

میرزا باقی نے اُسے ٹھٹھہ لا کر ایسی سخت قید میں رکھا کہ کھانے پینے کی کوئی چیز اس کو نہیں دی جاتی تھی۔ اسی قید خانے میں وہ ایڑیاں رگڑ کر چند دن میں مر گئی اور میرزا عیسیٰ ترخان کی وہ پیشگوئی پوری ہو گئی، جو اُس نے کہا تھا کہ تم خود اس کے ہاتھ سے ماری جاؤ گی۔[1]

میرزا جان بابا کا قتل:

اسی عرصے میں سلطان محمود خان ایک عظیم لشکر لے کر ٹھٹھہ پہنچا، میرزا محمد باقی نے میاں علی ثانی کو جو ٹھٹھہ کے عظیم المرتبت مشائخ میں تھے درمیان میں ڈال کر میرزا جان بابا اور یادگار مسکین کو صلح کے بہانے بلا کر قتل کرا دیا۔[2] میرزا جان بابا کے قتل کا واقعہ ۹۷۸ھ (۱۵۷۰-۷۱ء) میں پیش آیا۔[3]

سلطان محمود خان ایک عرصے تک اپنے لشکر کے ساتھ ٹھٹھہ کے سامنے خیمہ زن رہا، میرزا محمد باقی میں اُس کے مقابلے کی ہمت نہ تھی۔ سلطان محمود خان کے لوگوں نے دو تین بار حملے کیے، جن میں میرزا عیسیٰ کا داماد فقیر محمد ترخان اور سلطان محمد ترخان قتل ہو گئے۔ ادھر سلطان محمود خان "پیر آر" کے قریب آ کر ٹھہرا ہی تھا کہ خبر آئی کہ ترسون محمد خان کے بھائیوں نے قلعہ اُچ کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ اس خبر کو سنتے ہی ٹھٹھہ کے ٹھہرنے کو خلاف مصلحت سمجھ کر بکھر روانہ ہو گیا۔[4]

ملک کے مختلف حصوں پر بیٹوں کا تقرر:

میرزا محمد باقی نے اپنی آخری زندگی میں ملک کو تین صوبوں پر تقسیم کر کے اپنے تین بیٹوں کو جو خوب مدبر اور کارگزار ہو چکے تھے ان تینوں صوبوں کی حکومت پر مقرر کر کے روانہ کیا۔

میرزا محمد پایندہ ترخان جو اُس کے فرزندوں میں سب سے بڑا تھا، اُسے صوبہ سیوہن میں شاہی لشکر کے مقابلے میں جو بکھر میں تھا مقرر کیا، چونکہ میرزا پایندہ بیگ مخبوط العقل تھا، اس لیے مہمات کلی و جزوی اور داد و دہش کے جملہ امور اُس کے بیٹے میرزا جانی بیگ کے سپرد کیے، شمس کشمیری کو اس کا وکیل مقرر کیا۔

دوسرا صوبہ نصرپور اپنے دوسرے بیٹے میرزا شاہ رخ ترخان (متوفی ۹۹۲ھ) کے سپرد کیا، شیر علی کو اس صوبے کا وکیل مقرر کیا۔

تیسرے صوبہ سرکار چاچکان صوبہ بدین پر اپنے تیسرے فرزند میرزا محمد مظفر ترخان کو مقرر کیا اور اس کا مدار المہام علی خان کو مقرر کیا۔ اس کی غزل کا یہ شعر مشہور ہے:

اے علی خاں! رو، نکوئی کن کہ بعد از مرگِ تو
تا بگویندت کہ ایں مسکیں برحمت درگزشت

اور میرزا محمد زمان ترخان اور قاسم علی سلطان ساربان کو نیرون کوٹ کے علاقے میں وکیل مقرر کیا کہ وہاں کے لوگ مالگذاری کے ادا کرنے میں کوتاہی کرتے تھے۔

ٹھٹھہ کے ارد گرد لاہوری بندر، نار اور گکرالہ کی ان حدود میں سمہ، دل اور لنگا قبیلے کے لوگ دریائے شور میں رہزنی کرتے تھے، اور ٹھٹھہ کے ارد گرد بھی لوٹ مار مچاتے تھے وہاں بھی اپنے خاصہ خیلوں کو مقرر کیا۔

پھر اُس نے ایسا انتظام قائم کیا کہ اُسے اُمرا، فرزندوں اور رعایا کے حالات ہر ہفتے معلوم ہوتے رہیں۔ ہر جگہ اُس نے اپنے جاسوس علانیہ اور خفیہ مقرر کیے کہ وہ تمام ملک کے حالات اُس کو پہنچاتے رہیں، اور وہ ذرہ برابر بھی حالات اس سے پوشیدہ نہ رکھیں۔ پھر وہ قلعے کے اُس جھروکے میں بیٹھتا جہاں لوگ کورنش و آداب بجالاتے تھے اور تمام دیوان اور عمال دفتر ہر روز ہر صوبے کا حساب اس کے سامنے پیش کرتے۔

اُس کے مظالم روز بروز بڑھتے جاتے تھے، کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا کہ وہ لوگوں کی داڑھیاں نہ نچواتا ہو۔ ناک کان نہ کٹواتا ہو اور لوگوں کو ہاتھیوں کے پیروں میں بندھوا کر شہر کے گلی کوچوں میں نہ روندواتا ہو۔[5]

میرزا محمد باقی کی وفات:

غرضیکہ میرزا محمد باقی کی ناشائستہ حرکات اور مظالم سے بلا تخصیص مذہب و ملت لوگ اس قدر تنگ آ چکے تھے کہ مسلمان مسجدوں میں اور ہندو اپنے مذہبی مقامات میں ہون کر کے دعا کرتے کہ خدائے تعالیٰ ایسے ظالم اور بدخو بادشاہ کو دنیا سے نابود کرے، کہ اچانک اُس کے بیٹے میرزا شاہ رخ کی وفات کی خبر آئی، جو نصرپور کا حاکم تھا۔ میرزا محمد باقی کو اس کی

---

(1) تاریخ معصومی، ص ۲۱۲-۲۱۳۔
(2) ایضاً، ص ۲۱۳۔
(3) شجرہ میرزا عیسیٰ ترخان اول H، مرتب سید حسام الدین راشدی، مشمولہ ترخان نامہ۔
(4) تاریخ معصومی فارسی، ص ۲۱۳۔
(5) تاریخ طاہری، ص ۱۵۴-۱۵۵ و تحفتہ الکرام، ترجمہ سندھی، ص ۱۸۲۔

موت کا بے حد صدمہ ہوا۔ اُس نے حرم سرا کی عورتوں کی شلواروں میں بلّیاں چھڑوائیں اور ان کی چھاتیاں کٹوادیں اور مردوں کو ہاتھیوں کے پیروں سے بندھوا کر گلی کوچوں میں گھسیٹوایا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ انہوں نے ہی میرے بیٹے کو مجھ سے جدا کیا ہے۔ پھر اُس نے میرزا شاہ رخ کی جگہ پر اس صوبے کا حاکم شاہ قاسم ارغون کو بنا کر بھیجا۔

لوگوں کی بددعائیں اور اس کے مظالم رنگ لائے۔ آخر عمر میں اسے اپنی جان کا خوف ہونے لگا، اور اپنے مصاحبین اور مقربین سے بھی ڈرنے لگا کہ کہیں وہ اس کو زہر نہ دے دیں۔ یہاں تک کہ اس کے کھانے پینے کی چیزوں پر جب تک اس کے معتمد خاص ملک احمد کی مہر نہ ہوتی تھی وہ کھاتا پیتا نہیں تھا۔ اُس کے مظالم خود اب اُسے ڈسنے لگے تھے، یہاں تک کہ میاں حسن کی روایت ہے کہ اُس رات کو جس میں میرزا محمد باقی نے وفات پائی، اس کا باپ ملک احمد کی سرکردگی میں میرزا محمد باقی کے محل پر پہرے پر تھا۔ میرزا باقی اپنے چند خدمت گاروں مارقدم قورچی، چھتہ ہندو اور دریائی آبدار کے ساتھ محو استراحت تھا، وہ نصف شب میں اپنی چارپائی سے اُٹھا اور اس خوف سے کہ کہیں اس کے خدمتگار بیدار نہ ہو جائیں، اُس نے چراغ بجھادیا، اپنی خاص تلوار میان سے نکالی، اور اُس کی نوک اپنے پیٹ پر اور تلوار کا قبضہ کھڑکی کی طاق میں اَڑا کر اس طرح زور سے دبایا کہ تلوار اُس کے پیٹھ سے باہر نکل گئی، اور آنتیں باہر نکل پڑیں۔ اُس نے اپنی آنتوں کو ایک ہاتھ میں پکڑا اور دوسرے خون آلودہ ہاتھ سے اندھیرے میں راستہ ڈھونڈتے ہوئے تمام دیواروں کو خون سے رنگین بنادیا۔ جب وہ اپنی خواب گاہ تک نہ پہنچ سکا تو اُس کے چلنے پھرنے سے جو خدمت گار اُس کے قریب سوئے ہوئے تھے بیدار ہو گئے، انہوں نے دیکھا کہ میرزا خون میں لت پت ہے، چراغ بُجھا ہوا ہے اور میرزا مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا ہے۔ انہوں نے اس کو خواب گاہ میں پہنچا کر چراغ روشن کیا، تو دیکھا کہ میرزا نزع کے عالم میں ہے اور اس کے زخموں سے خون بڑی تیزی سے بہہ رہا ہے۔ خدمتگار پگڑیاں زمین پر پھینک کر رونے دھونے لگے۔ اُن کے رونے دھونے کی آواز سن کر چوکی کے پہرے دار بھی بیدار ہو گئے۔ اسی عالم میں میرزا باقی کو اپنا منہ بولا بیٹا ملک احمد یاد آیا۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ اُسے لائیں، چنانچہ لوگ اُسے بلانے گئے، وہ آنا نہیں چاہتا تھا کہ اتنے میں اور لوگ اُس کو بلانے کے لیے پہنچے، اور اس سے کہا میرزا پر نزع کا عالم طاری ہے۔ وہ اس آخری وقت میں تمہاری حسرت دیدار رکھتا ہے۔ ملک احمد ولد حریہ نے بر بنائے احتیاط اپنے والد کو بھی ساتھ لے لیا اور اس خوابگاہ میں پہنچا جہاں میرزا زخمی عالم نزع میں پڑا ہوا تھا۔ میرزا نے اُس کے آنے کے بعد آنکھ کھولی اور پوت پوت کہہ کر اسے گلے سے لگانے کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔

بالکل آخر وقت میں اُس نے ان لوگوں سے کہا جو وہاں موجود تھے کہ تم میرے اس اقرار کے گواہ رہو کہ میں نے خود اپنے آپ کو قتل کیا ہے، کسی کو میرے خون کی تہمت میں نہ پکڑا جائے۔ کل کو میرے فرزندوں اور میری حکومت کے حاکموں کو بھی اصل واقعہ بتا دیا جائے، لیکن پھر بھی کئی آدمی اُس کے قتل کے الزام میں گرفتار کیے گئے۔[1] میرزا محمد باقی نے جمعرات کے دن ۸ شوال ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) میں وفات پائی۔ اسے میرزا عیسیٰ ترخان اول کے مقبرے کے قریب مکلی میں دفن کیا گیا۔[2]

میرزا محمد باقی کی شخصیت:

میرزا محمد باقی کی داستان زندگی ہم گزشتہ اوراق میں مفصل بیان کر آئے ہیں۔ ہمیں اُس کی زندگی میں کوئی ایسا وصف نہیں ملتا، جسے ہم نمایاں طور پر پیش کر سکیں۔

میرزا محمد باقی کے دورِ حکومت سندھ پر تبصرہ:

میرزا محمد باقی کا سندھ میں ۳۰ سالہ دور حکومت تمام ارغون اور ترخان فرمانرواؤں میں سب سے زیادہ ظالمانہ دور حکومت ہے۔ اُس نے سندھ کے ہندو اور مسلمانوں کو جو اذیتیں پہنچائیں، ان کو پڑھ کر انسان لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی بہیمیت اور ظالمانہ طینت کی آسودگی کے لیے مظالم کے نئے نئے بہانے تراشتا تھا۔ جاہلوں، خوشامدیوں اور چاپلوسوں کو اُس نے اپنی حکومت میں بڑے بڑے عہدے دے کر ظلم

---

[1] یہ تمام تفصیل تاریخ طاہری، ص ۱۵۲-۱۵۹ سے ماخوذ ہے۔

[2] میرزا باقی کا مقبرہ تمام ترخانیوں کی دفن گاہ سے علیحدہ اپنے والد کے قبرستان سے شمال کی جانب تین سو قدم کے فاصلے پر واقع ہے، اس کی چار دیواری میں چند قبریں ہیں۔ اس چار دیواری کے وسط میں ایک اور چھوٹی سی چار دیواری ہے۔ اس میں پانچ قبریں ہیں۔ ان میں دوسری قبر میرزا محمد باقی کی ہے، اس پر یہ کتبہ نصب ہے:

وفات یافت حضرت جنت مکانی الواصل
الی جوار الملک میرزا محمد باقی بن میرزا
محمد عیسیٰ ترخان در تاریخ روز پنجشنبہ ہشتم
شہر شوال سنہ ۹۹۳ھ

(تحفۃ الکرام فارسی، جدید ایڈیشن مصحح مع حواشی، سید حسام الدین راشدی، ص ۱۴۸، حاشیہ نمبر ۲، بحوالہ مکلی نامہ، ص ۴۹۸-۵۰۵)۔

کی چکی کو اور بھی تیز تر کر دیا تھا۔ مال و دولت کے جمع کرنے کی ہوس نے اُسے انصاف اور رعایا پروری سے بالکل بے بہرہ بنا دیا تھا۔ اُس کے بخل کی انتہا یہ تھی کہ مولانا جمال الدین جو اس کے مقربین میں تھے اُن کا بیان ہے کہ میں کم عمری ہی سے میرزا کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ ایک دن میری نظر سے روزنامچہ گزرا۔ اُس میں تحریر تھا کہ مولانا شیرہ نے میرزا کے بخل کو دیکھ کر میرزا کی خیر خواہی کی بنا پر ہاتھیوں کی لید سے سالم نکالنے والے غلے کے ڈھوکہ صاف کر کے اس جمع شدہ غلے کی ہر فصل میں کچھ خروار حلال خوروں کے لیے مقرر کیے تھے۔ میرزا کو جب اُس کا یہ عمل معلوم ہوا تو بہت خوش ہوا، اور اُس کو ترقی دے کر توپچیوں اور توپ خانوں کا افسر اعلیٰ بنا کر آتش خان کا خطاب دیا۔

اس واقعہ کے پڑھنے کے بعد مولانا جمال الدین کو دل میں خیال آیا کہ اگر میں کبھی میرزا کے مقربین میں شامل ہو جاؤں تو میں اس کو اس دو ہمتی، رکاکت اور اس ظالمانہ طرز عمل سے جس پر وہ گامزن ہے روک دوں گا۔ چونکہ میری تمنا تھی، آخر ایک روز وہ بھی آیا کہ میں اُس کے مقربین میں شامل ہوا اور مجھے اس درجہ قرب و اختصاص حاصل ہوا کہ میرزا کوئی کام بھی میرے مشورے کے بغیر نہ کرتا تھا۔ ایک دن میرزا نے مجھ سے کہا کہ مجھے کچھ سونے کی ضرورت ہے، مگر میرا دل خزانے سے لینے کے لیے نہیں چاہتا۔ کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ چند سیر سونا مجھے کہیں سے مل جائے۔ میں اُسے چونکہ انتہائی ظالم و جابر سمجھتا تھا، میں نے اُس سے جل کر کہا کہ اگر آپ عمال کی آہ و زاری سے نہیں ڈرتے تو ان سے لے لیجیے۔ اُس نے فوراً ہی اپنے نائبوں اور عمال کو طلب کیا، اور کہا کہ میرزا شاہ حسن کے کارندے ہر سال اس مقدار میں سونے کے زیور میرزا کی خدمت میں تحفتہ پیش کرتے تھے۔ میرے لیے بھی تم یہ تحفہ لاؤ۔ ہر چند ان غریبوں نے آہ و بکا کی مگر مطلقاً شنوائی نہیں ہوئی۔ جب تک اُس نے اُن سے اس قدر سونا حاصل نہ کر لیا، جس قدر اُسے مطلوب تھا، اس وقت تک ان کو نہ چھوڑا۔[1]

مختصر یہ کہ میرزا محمد باقی کا سندھ میں دورِ حکومت نہایت تاریک دور ہے، جس میں اہل سندھ کو سوائے تباہیوں اور بربادیوں کے کچھ نہیں ملا اور اہل ملک کے لیے اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا کہ جس سے اُسے بھلائی سے یاد کیا جا سکے۔

ہر دور کی سیاست اور معاشرے کے نقیب اُس دور کے شعرا اور ادیب ہوتے ہیں، اُس دور کا ادب اور شاعری ایک آئینہ ہوتا ہے، جو اُس دور کی عکاسی کرتا ہے اور اسی شعر و ادب سے اُس دور کے معاشرے، سماج اور سیاست کے نقوش اُبھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ میرزا محمد باقی کے دور کے شعرا کو جب ہم پڑھتے ہیں، تو ان کے کلام میں نہایت واضح اور شعوری طور پر میرزا محمد باقی کے مظالم اور اس کے دور کی بدحالی اور تاریکیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

قانع ٹھٹھوی نے ترخانی دور کے ایک شاعر رنگین کے اشعار دیتے ہوئے اُس کے یہ دو شعر جو میرزا محمد باقی کے متعلق ہیں درج کیے ہیں:

درمیانِ میرزا باقی نماند
امتیاز نیک و بد اندر جہاں
قدرِ دولت را ندانست تا کہ شد
شیر کاسہ لیس با جمعی سگاں

غضنفر بیگ جو میرزا باقی کے دور کا ایک شاعر ہے، قبیلۂ ارغون سے تھا۔ میرزا محمد باقی کے مظالم کی بجلی جب ارغونوں کے سر پر کڑکی تو یہ غریب بھی اس کی لپیٹ میں آگیا۔ میرزا باقی نے اس کو اس کے وطن ٹھٹھ سے جلاوطن کر دیا، اُس نے میرزا باقی کی حکومت کا بقیہ دور جلاوطن ہو کر کیچ میں گزارا۔ اس کی زندگی میں وہ ایک مرتبہ بھی اپنے وطن کی صورت نہ دیکھ سکا۔ میرزا محمد باقی کے بعد جب میرزا جانی بیگ تخت سلطنت پر بیٹھا تو وہ خسرو خان کے توسل و سفارش سے میرزا جانی بیگ کے مقرب ملازمین میں شامل ہوا۔ وہ اپنی جلاوطنی کا شکوہ کناں ہو کر میرزا باقی کے متعلق کہتا ہے:

نمود آوارہ ام میرزای باقی نیاساید دمی بر جای باقی
ز حق است عنقریب ایں آرزویم ز گوشم بشنود ای ہای باقی

فراقی جو میرزا باقی کے دور کا ہی شاعر ہے، میرزا باقی کے دور میں اپنی ناقدردانیوں کی شکایت کرتے ہوئے کہتا ہے:

بزرگانِ زمانہ شاہ باقی
ندانستند احوال "فراقی"
کنوں پاینده چشم مہربانی
ہمی دارم من از یاران جانی[2]

---

(1) تحفتہ الکرام فارسی، جدید ایڈیشن مصححہ سید حسام الدین راشدی مع حواشی، صفحہ ۱۵۲، حاشیہ ۱، بحوالہ مقالات الشعرا، ص ۲۵۷، ۳۶۸، ۴۹۲۔

(2) یہ تمام تفصیل تاریخ طاہری، ص ۱۵۲، ۱۵۹ سے ماخوذ ہے۔

میرزا محمد باقی کی اولاد:

میرزا محمد باقی کے وہ لڑکے جن کے نام معلوم ہو سکے یہ ہیں (۱) میرزا شاہ رخ اول متوفی ۹۹۲ھ (۸۵-۱۵۸۴ء)- (۲) میرزا مظفر اول حاکم بدین و چاچکان۔ (۳) میرزا محمد پاینده متوفی ۱۰۰۰ھ (-۱۵۹۱ ۹۰ء)۔ ان کے علاوہ بھی اس کے کچھ اور لڑکے تھے جن کے نام ہمیں معلوم نہ ہو سکے۔

اس کی لڑکیوں کے نام یہ ہیں: (۱) حور بیگم متوفیہ ۱۰۱۲ھ (۴-۱۶۰۳ء)، مدفن قبرستان مکلی۔ (۲) بیگہ جان متوفیہ بروز پنجشنبہ ماہ رجب ۱۰۱۸ھ (۱۰-۱۶۰۹ء)، مدفن مکلی قبرستان زنانہ میرزا عیسیٰ اول (۳) ماہ بیگم متوفیہ ۱۰۱۴ھ (۶-۱۶۰۵ء) مدفن مکلی، گورستان زنانہ میرزا عیسیٰ اول، (۴) سندھی بیگم (۵) ایک لڑکی جو میرزا شادمان کی بیوی تھی، (۶) احسان بیگم متوفیہ ۹۸۱ھ (۷۴-۱۵۷۳ء) (۶) ایک لڑکی جو میرزا محمد صالح کے بیٹے میرزا غالب سے منسوب تھی (۷) ایک اور لڑکی، غالباً یہ وہی لڑکی ہے جسے میرزا جانی نے میرزا عیسیٰ ثانی کے میں دیا تھا۔[1]

---

[1] ماخوذ از تاریخ طاہری، ص ۱۴۵، ۱۴۶ میرزا محمد باقی کی اولاد کی یہ تفصیل عیسیٰ ترخان اول H، مرتب سید حسام الدین راشدی مشمولہ ترخان نا ہے۔

باب: 21

میرزا محمد پایندہ ترخان و میرزا جانی بیگ ترخان

۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) - ۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰ء)

تخت نشینی:

میرزا محمد باقی کی وفات کے بعد اُس کے اراکین دولت خلیل مہردار، ملا محمد فراغی، شمس الدین سلطانی، ملا جمال الدین اور دوسرے ذمہ دار اُمرا نے باہمی مشورہ کیا کہ میرزا کے دو بیٹے ہیں: میرزا مظفر اور میرزا محمد پایندہ ترخان، جو اتفاق سے اس وقت یہاں موجود نہیں۔ ہمیں ان میں سے ایک کو حکومت کے لیے منتخب کر کے تخت نشین کرنا چاہیے۔ پہلے طے ہوا کہ میرزا مظفر کو بدین سے بلایا جائے اور اسے میرزا کا قائم مقام بنایا جائے۔ لیکن چونکہ اس کی ماں جاریچہ سمہ قوم سے تھی، اس لیے خیال پیدا ہوا کہ یہ لوگ راجپوت ہیں جو عموماً شر انگیز ہوتے ہیں۔ یہ ضرور اس کی حکومت میں دخیل ہو جائیں گے اور ہمیں ملک سے باہر نکال دیں گے۔ اس لیے سب نے میرزا محمد پایندہ ترخان کی تخت نشینی کو پسند کیا، لیکن وہ یہ سوچنے لگے کہ میرزا محمد پایندہ کے مزاج میں دیوانگی اور کاذبی پن غالب ہے اس لیے اس کے بیٹے میرزا جانی بیگ کو اس کا قانونی مشیر مقرر کر کے کاروبار مملکت اس کے تحت رکھے جائیں۔ چنانچہ یہ فیصلہ کرنے کے بعد انہوں نے میرزا محمد باقی کی تجہیز و تکفین کی اور میرزا جانی بیگ اور اس کے باپ میرزا محمد پایندہ کو سیوہان سے بلایا۔ ادھر میرزا مظفر کو اس کے وکیل علی خان نے اس کی اطلاع دی، وہ فوراً ہی یلغار کرتا ہوا ٹھٹھہ پہنچا۔ اُمرا نے اسے شہر سے باہر دریائے علی جان کے کنارے روکے رکھا، یہاں تک کہ میرزا پایندہ اور جانی بیگ آ گئے۔ پھر انہوں نے میرزا پایندہ کو تخت نشین کر کے میرزا جانی کو اس کا وکیل مقرر کیا۔[1]

کشتگان ستم:

میرزا جانی بیگ نے باپ کی ماتحتی میں اقتدار سنبھالتے ہی ان لوگوں کو جن پر غلط طور پر میرزا محمد باقی کے قتل کا الزام لگایا گیا تھا طلب کیا اور سیاستاً ان بے گناہوں کو نہایت سخت سزائیں دیں۔ دریائی آبدار کو چٹائیوں میں لپیٹ کر جلوا دیا۔ مارقدم قورچی کو آرے سے چروا کر اس کے دو ٹکڑے کر کے اور دونوں ٹکڑوں کا قیمہ کر کے گلی کوچوں میں پھکوا دیا، ہندو کو سنگسار کرا دیا، ملک احمد کو بازار میں بٹھا کر سر سے پیر تک اس کی کھال کھنچوائی، پھر اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے سامنے پھکوا دیا۔

اس کے بعد میرزا محمد پایندہ کی حکومت کی منادی شہر میں کرائی۔ علی خان جو میرزا مظفر کو ٹھٹھہ کی حکومت کے لیے لایا تھا، راتوں رات میرزا مظفر کو ساتھ لے کر بھاگ گیا۔ میرزا مظفر بدین پہنچ کر میرزا جانی بیگ سے جنگ کی تیاریاں کرنے لگا۔

میرزا مظفر اور جانی بیگ میں جنگ:

میرزا جانی بیگ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کا چچا میرزا مظفر جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے اور وہ اپنے بھائی کی حکومت پر راضی نہیں۔ اس لیے اس نے طے کیا کہ اگر میں نے اس فتنے کو جڑ سے اُکھیڑ کر نہ پھینک دیا تو اس سے ہماری حکومت میں آیندہ بہت بڑا رخنہ پیدا ہو گا، اور رعایا میں پریشانی اور ابتری پیدا ہو گی۔ یہ سوچ کر وہ لشکر کے ساتھ بدین روانہ ہو گیا۔ ادھر میرزا مظفر علی خان کو کہ سے جنگ کا مشورہ کر کے اس پر تیار ہو گیا کہ دوسرے دن صبح کو وہ میرزا جانی بیگ سے جنگ شروع کر دے گا۔ میرزا جانی بیگ نے اس رات کی مہلت سے فائدہ اُٹھایا اور راتوں

---

[1] تاریخ طاہری، ص ۱۶۰-۱۶۲۔

رات بدین کے مغلوں کو ایک خفیہ خط لکھ بھیجا کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے بہت سے بھائی اور عزیز میرے لشکر میں ہیں۔ اگر تم ہم پر حملہ کروگے تو اپنے بھائیوں اور عزیزوں کے خون سے ہاتھ رنگوگے، جو تمہارے لیے کسی طرح مناسب نہیں۔ اگر میرزا مظفر نے فتح حاصل کرلی تو وہ ضرور اپنے کچھی اعزہ کو تم پر مسلط کرے گا اور تمہاری زندگی تلخ ہو کر رہ جائے گی، لیکن اگر ہم نے فتح حاصل کی تو میں انشاء اللہ تمہاری ساری اُمیدیں پوری کروں گا اور تم کو مناصب اور جاگیروں سے سرفراز کروں گا۔ مغلوں پر اُس کے اس خط کا اثر اس کے حسب دل خواہ پڑا اور انہوں نے کہلا بھیجا کہ کل صبح جب جنگ شروع ہوگی تو ہم مغل اپنے آدمیوں کو لے کر علیحدہ ہو جائیں گے۔

صبح کو جب دونوں میں جنگ شروع ہوئی تو مغل عین میدان جنگ میں لڑائی سے علیحدہ ہو کر کھڑے ہوگئے۔ میرزا مظفر کے خاصہ خیلوں اور جاریجہ قبائل کے لوگوں نے جو اس کے ساتھ تھے بڑی بہادری سے جنگ لڑی، لیکن وہ اس نفاق کی وجہ سے جو اُن کی فوج میں پیدا ہو چکا تھا۔ میرزا جانی بیگ کے مقابلے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ میرزا مظفر نے ہر چند مغلوں کو ترغیب و تحریص دی، لیکن وہ جنگ میں شریک نہ ہوئے۔ جب میرزا مظفر نے اپنی شکست کے آثار کا نمایاں طور پر اندازہ کر لیا تو اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ تم بدستور جنگ کرتے رہو، میں اپنی والدہ اور متعلقین کو کچھ دور تک پہنچا کر آتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ فرار ہوگیا اور "کچھ" کی طرف روانہ ہوگیا۔ میرزا جانی بیگ کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے اپنے لشکر کے لوگوں کو حکم دیا کہ جب تک وہ اپنی والدہ اور متعلقین اور ساز و سامان کو لے کر اپنی منشا کے مطابق باہر نہ چلا جائے کوئی شخص بدین میں داخل نہ ہو۔ جب میرزا جانی بیگ کو معلوم ہوگیا کہ وہ حسب منشا اپنے متعلقین اور ساز و سامان کو لے کر چلا گیا تو وہ بدین میں داخل ہوا اور جو سامان وہ اور اس کے ساتھی گھبراہٹ میں چھوڑ گئے تھے، وہ بھی سواریوں پر لدوا کر اس نے میرزا مظفر کو بھجوا دیا۔[1]

میرزا مظفر کے بعد:

میرزا مظفر کے بعد میرزا جانی بیگ نے اس صوبے کا انتظام حسب دلخواہ کیا، اور پھر ٹھٹھہ واپس ہوگیا۔ ٹھٹھہ پہنچنے کے بعد اُس نے وہ خزانہ جو میرزا محمد باقی نے غریبوں اور مسکینوں کا خون چوس چوس کر جمع کیا تھا، اُن لوگوں اور نوکروں کو بخش دیا جو سیوہن میں اس کے ہمراہ تھے، اس نے سر بمہر صندوق اور وہ غلہ اور لباس جو اس نے اکھٹا کیا تھا حاجت مندوں کو بخش دیا۔ پرانی شالیں جو سالہا سال سے قلعے میں جمع تھیں، اس نے فقرا کو حکم دیا کہ وہ اپنے لیے لے جائیں۔ جب وہ لوگوں کے لیے جانے کے بعد بھی بچ رہیں تو مرزا جانی بیگ نے حکم دیا کہ انہیں جلا دیا جائے، اس طرح اس نے میرزا محمد باقی کا سارا جمع کیا ہوا خزانہ، لشکر، اُمرا اور حق داروں میں تقسیم کر دیا، جس کی وجہ سے میرزا باقی کے زمانے کے پہنچائے ہوئے زخم لوگوں کے دلوں سے مندمل ہوگئے، اور میرزا جانی بیگ کی فیاضیوں اور بخششوں سے لوگ اس کی طرف مائل ہونے لگے، پھر اس نے اپنے بعض خاصہ خیلوں مثلاً عرب کو کہ، یعقوب علی کو کہ اور رستام بیگ کو بلند مراتب سے نوازا، ملا گدا علی ابن مہتر علی کو "بایخاں" کا خطاب دے کر اپنا وزیر بنایا۔[2]

دارالضرب:

کہا جاتا ہے کہ ٹھٹھہ میں اس سے قبل دارالضرب نہیں تھی اور زیادہ تر فرنگیوں کی مہر زدہ اشرفی جس کا نام "بیکی" تھا اور لمبی لاری کے سکے مروج تھے، لیکن میرزا عیسیٰ نے اپنے زمانے میں تانبے کا پیسہ ایجاد کیا تھا۔ جسے "عیسائی" کہتے تھے۔ یہی سکے میرزا محمد باقی کے عہد میں بھی رائج رہے، لیکن میرزا جانی بیگ نے اسے گھٹا کر اسکا نام "میری" رکھا، اور اسی طرح غلہ ناپنے کے پیمانوں میں بھی وزن میں کمی کر دی۔ لوگوں نے اس کے اس تغیر کو بدشگونی پر محمول کیا اور اس کے اس روپے کو اس کے خاندان کے تنزل کی علامت قرار دیا۔[3]

مغلوں کی دخل اندازی، صادق محمد کی آمد:

ادھر جب میرزا محمد باقی کی موت، میرزا پایندہ بیگ کی تخت نشینی اور اس کے بیٹے جانی بیگ کی مدار المہامی اور اس حاکم گردی کی خبریں ہندوستان میں بادشاہ اکبر کو ملیں تو اس نے میرزا جانی بیگ کے نام ایک فرمان جاری کیا، جس میں لکھا کہ: تم قدیم زمانے سے ہمارا خطبہ پڑھنا لازمی سمجھتے آئے ہو۔ بہتر یہ ہے کہ آج کے بعد سکہ اور ہمارے شایان شان تحائف اور ہدایا بھی سال بسال پیش کرنا لازمی سمجھو اور اپنے بزرگوں کے طریقے کے مطابق ہماری بندگی کو اپنا فرض عین جانو۔

---

(1) یہ تمام تفصیل تاریخ طاہری، ص ۱۶۴ تا ص ۱۴۸ سے ماخوذ ہے۔

(2) تاریخ طاہری، ص 119۔

(3) تاریخ طاہری، ص ۱۷۰۔

میرزا جانی بیگ نے اس فرمان کو انتہائی تعظیم و توقیر سے پڑھا اور آدابِ بندگی و اخلاص کو بجالا کر جواب دیا کہ ہم ترخان آپ کی اطاعت و بندگی کا حلقہ اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہیں اور آپ سے اس امر کے متوقع ہیں کہ وہ ملک جسے ہم نے دو تین سال میں نہایت محنت و مشقت سے آباد کیا ہے، آپ اس کے معاملے میں توقف اختیار کریں گے، ہم بندہائے صادق العقیدہ و اخلاص، جان نثاری کے تمام لوازم بجالا کر ہر قسم کے تحائف و ہدایا جو حضور کے شایان شان ہیں اپنے بھائی میرزا شاہ رخ بن شاہ رخ کے ذریعے سے آپ کی خدمت میں روانہ کیے جائیں گے۔ ہمیں توقع ہے کہ آستانِ عالی سے میرے بھائی (میرزا شاہ رخ) کو معزز و مفتخر فرمایا جائے گا:

ادھر اکبر نے اس فرمان کے ساتھ صادق محمد خان[1] کو ایک لشکر جرار کے ساتھ اس علاقے کے لیے مامور کیا تھا، اس نے آکر قلعہ سیوہن کا محاصرہ کر لیا اور ان لوگوں سے جو قلعے کے اندر تھے جنگ شروع کر دی۔ دلیل خان، ملا گدا علی "بایخان" اس کے بیٹوں ہتہ اور کربہ نہانہ نے جو قلعے میں تھے، قلعے کی محافظت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اور اس قدر مردانہ وار لڑائی لڑی کہ کوئی شخص قلعے کے پاس تک نہیں سکتا تھا۔ آخر صادق محمد خان نے عاجز آکر قلعے میں سرنگ لگانے کا حکم دیا، اور یہ خیال کیا کہ اس کی اطلاع قلعے والوں کو نہ ہوگی، لیکن قلعے کے اندر والوں نے یہ خبر سنتے ہی پہلی دیوار سے بھی زیادہ مضبوط بنا کر دیوار کھڑی کر دی، چنانچہ جب صادق محمد خان نے اس سرنگ میں آگ لگوائی اور بیرونی دیوار فرش پر آکر گری تو اس کے پیچھے سے اس سے بھی زیادہ مضبوط دیوار برامد ہوئی۔ صادق محمد خان اس قلعے کی تسخیر سے ناامید ہو گیا، اتنے ہی میں میرزا جانی بیگ نے بھی یہ خبر سن کر کہ صادق محمد خان نے قلعے کا محاصرہ کیا ہے ایک لشکر جرار لے کر جس میں مغل، سندھی، شورہ، سمیجہ، سمہ، سومرہ، گھور، نکامرہ اور پلیچہ وغیرہ شامل تھے سیوہن پہنچا، ادھر قلعے والے صادق محمد خان کی کمزوری محسوس کر چکے تھے۔ اب وہ اور بھی دلیر ہو گئے۔ سندھی راتوں میں صادق محمد خان کے لشکر میں شب خون مارتے اور اونٹ، گھوڑے، ساز و سامان جو کچھ ہاتھ لگتا لے جاتے اور جسے غافل پاتے اسے قتل کر دیتے۔ یہ آفتِ ناگہانی صادق محمد خان کے لشکر پر ٹوٹ رہی تھی کہ وہ میرزا جانی بیگ کے لشکر کے آنے کی خبر سنتے ہی گھبرا اٹھا، اور اس نے عافیت فرار ہی میں دیکھی، اس کی پریشانی کا یہ عالم تھا کہ اس کے لشکری عالم پریشانی اور گھبراہٹ میں کشتیوں کی رسی کو ہاتھیوں سے باندھ کر کھینچنے لگے، یہاں تک کہ جب تک وہ بکھر کی سرحد میں نہ پہنچے خوف و ہراس سے کھانا پینا ان پر حرام تھا، انہوں نے آخر بکھر کی سرحد میں پہنچ کر دم لیا۔[2]

میر معصوم جو اکبری دور کا مورخ ہے، اس نے اپنی تاریخ میں اس بارے میں لکھا کہ: سیوہن کا محاصرہ جاری تھا کہ میرزا جانی بیگ بری اور بحری فوج کے ساتھ سیوہن سے چھ کوس کے فاصلے پر دریائے مہران کے کنارے خیمہ زن ہوا، محمد صادق خان محاصرہ چھوڑ کر میرزا جانی بیگ کی طرف متوجہ ہوا، جب وہ اپنے لشکر کو لے کر کوہ لکی کے سامنے آیا تو میرزا جانی بیگ کی غرابوں (جنگی جہازوں) نے مقابل ہو کر اس پر گولے برسائے، اس طرح ایک عرصے تک دونوں فریقین ہمسری کے ساتھ جنگ کرتے رہے۔ اسی اثنا میں اکبر کا فرمان پہنچا کہ میرزا جانی بیگ نے ہماری بارگاہ میں شایان شان تحائف پیش کر کے عجز و نیاز اور خلوص کا اظہار کیا ہے، اس فرمان کے بعد محمد صادق خان بکھر لوٹ گیا، اور کچھ عرصے بعد عالم پناہ کی بارگاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔[3]

تحفۃ الکرام کے مؤلف میر علی شیر قانع نے بھی تاریخ طاہری کے مؤلف سید طاہر محمد نسیانی کی تائید کی ہے اور محمد صادق خان کی شکست کو تفصیل سے لکھا ہے، ممکن ہے کہ میر محمد معصوم نے جو اکبری دربار کا ایک امیر تھا حق نمک ادا کرتے ہوئے اس طرح ایک اکبری امیر کی پیشانی سے شکست کا داغ مٹانے کی کوشش کی ہو، اسی طرح میر علی شیر قانع اور تاریخ طاہری کے مؤلف سید طاہر محمد نسیانی کے متعلق یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے خواہ مخواہ ٹھٹھہ کے نواب کی شجاعت کے گیت گا کر اسے بڑھایا ہو، لیکن زیادہ تر مورخین سید طاہر محمد نسیانی کی تائید میں ہیں، چنانچہ بیگلار نامے سے بھی ہمیں طاہری کی تائید ملتی ہے، بیگلار نامے میں ہے کہ:

میرزا مظفر جب تاب مقابلہ نہ لا کر کچھ کی جانب بھاگ گیا، اور

---

[1] نواب صادق محمد خان کو اکبر نے بکھر بطور تنخواہ کے اس کی جاگیر میں دیا تھا اور تسخیر ٹھٹھہ بھی اس سے متعلق کی تھی۔ نواب صادق محمد خان ۱۲ ربیع الاول ۱۲۹۴ھ میں بکھر آیا اور اسی سال ذی الحجہ میں عازم سیوستان ہوا۔
(تحفۃ الکرام فارسی، جدید ایڈیشن، ص ۱۵۳ حاشیہ نمبر ۲، مرتب سید حسام الدین راشدی)۔

[2] تاریخ طاہری، ص ۱۷۱-۱۷۲۔

[3] تاریخ معصومی فارسی، ص ۲۴۸-۲۴۹۔

میرزا جانی بیگ صوبہ بدین پر متصرف و قابض ہو گیا، تو اس نے گھوڑا اور سروپا جو میرزا مظفر ترخان کے لیے تیار کیا تھا (اپنے ایک امیر) شاہ قاسم خان زمان کو دیا، اور کہا کہ یہ فتح تمہارے نام پر ہے۔

اسی زمانے میں خبر پہنچی کہ صادق محمد خان اکبر بادشاہ کے حکم سے سیوستان پر قبضہ کرنے کے لیے پہنچا ہے اور سیوستان کا محاصرہ کیے ہوئے ہے، میرزا جانی بیگ نے نواب شاہ قاسم خان زماں کو حکم دیا کہ تم جا کر احشامات کے لوگوں کو جو سیوستان اور نصرپور کے درمیان آباد ہیں وہاں سے کوچ کرا کر لاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ اپنی کوتاہ اندیشی سے معاندین کے ساتھ مل جائیں۔ تمہیں چاہیے کہ تم انہیں لے کر (سیوستان) پہنچو، میں بھی تمہارے پیچھے آتا ہوں۔

خان زماں میرزا جانی بیگ سے رخصت ہو کر عازم نصرپور ہوا، وہ پہلے نصرپور پہنچا اور وہاں سے موضع "ستیارہ" آیا، اور تمام احشامات کو کوچ کرا کر نصرپور کی طرف روانہ کیا، جب یہ خبر محمد صادق خان کو ملی کہ خان اعظم احشامات کو روانہ کر رہا ہے، تو اس نے ان کو چھڑانے کے لیے ارادہ کیا کہ وہ ایک لشکر اس کے مقابلے کے لیے بھیجے۔ ابھی یہ لشکر پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ خان زماں وہاں سے روانہ ہو کر "ہالہ کندی" میں میرزا جانی بیگ سے جا ملا، اور وہاں سے میرزا جانی بیگ کی رفاقت میں سیوستان روانہ ہوا اور سیوستان پہنچ کر ایک خندق تیار کی۔۔۔

پھر میرزا جانی بیگ نے امیر خسرو خان کو بحری کشتیوں پر دشمن کے مقابلے میں متعین کیا اور میر ابوالقاسم کو خشکی میں نامزد کیا کہ وہ دشمن کے مقابلے کے لیے دریا کے کنارے کنارے جائے، جب یہ سیوستان پہنچے تو صادق محمد خان ان شیروں سے مقابلے کی تاب نہ لا کر بکھر کی طرف لوٹ گیا، ادھر امیر خسرو خان سیوستان پہنچ کر ٹھہر گیا۔ میر ابوالقاسم سلطان موضع "ریل" پہنچ کر اور کچھ مویشی صوبہ بکھر سے لوٹ کر میرزا جانی بیگ سے آملا، یہاں تک کہ ہر کام اپنی جگہ پر ٹھیک ہو گیا اور مخالفین کے لشکر کا دغدغہ دل سے جاتا رہا۔[1]

میرزا شاہ رخ کی دربارِ اکبری میں حاضری:

ادھر حسب وعدہ میرزا جانی بیگ نے اپنے چچازاد بھائی میرزا شاہ رخ ترخان کو بیش بہا اور نفیس تحائف کے ساتھ دربارِ اکبری میں بھیجا اور ایک عرضداشت بھی روانہ کی جس میں آستاں بوسی کی تمنا اور اظہار اخلاص و بندگی کرتے ہوئے لکھا کہ میں نہ صرف آج سے آپ کا مطیع ہوں بلکہ میرے باپ دادا بھی قدیم سے آپ کے مطیع و فرمانبردار رہے ہیں۔ میں اپنے بھائی شاہ رخ کو آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں اور امیدوار لطف و کرم ہوں۔ میں نے اسی قسم کی درخواست اس سے قبل محمد صادق خان کے توسط سے آپ کی بارگاہ میں پیش کی تھی، میں اُمیدوار ہوں کہ اس خانہ زاد کو خداوند مجازی اپنا منظور بنائیں گے۔[2]

میرزا جانی بیگ کی اخلاقی کمزوریاں:

صاحب تاریخ طاہری نے میرزا کی بعض شخصی اور اخلاقی کمزوریوں کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ طاہری میں ہے کہ میرزا جانی بیگ اس عرضداشت کے روانہ کرنے کے بعد مطمئن و بے فکر ہو کر بیٹھ گیا اور بہترین عادات و خصائل کو چھوڑ کر بُری عادات و اطوار میں مبتلا ہو گیا۔ وہ علانیہ اغلام کرتا اور خوبصورت لڑکوں کو بہترین لباس پہنا کر عورتوں کی جگہ اپنے گھر میں رکھتا۔ اُس نے ایسے ایسے شریف گھرانوں کے لڑکوں کو خراب کیا کہ ان کے نام لینا ادب کے خلاف ہے۔ لوگ اُس کے اس افعال ناشائستہ کو دیکھ کر استغفار پڑھتے تھے اور اُنگلی دانتوں میں دیتے تھے اور اس پر اخ تھو کرتے ہوئے کہتے تھے کہ یہ علامت اس کے ملک و دولت کے زوال کی ہے وہ بہت جلد بے عزت و ذلیل ہو گا۔[3]

تسخیر سندھ کے لیے خانخاناں کا تقرر:

جب میرزا جانی بیگ کی بے راہ روی حد سے زیادہ بڑھی تو اس کے زوال کا وقت بھی قریب آ گیا۔ اکبر نے صادق خان کی بے نیل و مرام واپسی پر خانخاناں عبدالرحیم بن بیرم خان کو ۹۹۹ھ (۹۱-۱۵۹۰ء) میں فتح سندھ کی مہم پر متعین فرمایا۔ وہ الطاف شاہانہ سے معزز و مفتخر ہو کر ایک عظیم لشکر کے ساتھ سندھ کی طرف روانہ ہو گیا۔

تاریخ معصومی میں اکبر کے غضبناک ہونے کی ایک وجہ یہ بھی

---

[1] بیگلار نامہ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۲۲۹-۲۳۰۔

[2] تاریخ طاہری، ص ۱۷۲ سے اس عرضداشت کا خلاصہ لیا گیا ہے۔

[3] تاریخ طاہری، ص ۱۷۴-۱۷۵۔

لکھی ہے کہ جب اکبر لاہور میں تھا تو میرزا جانی بیگ نے میرزا شاہ حسن کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اطاعت و فرمانبرداری کی شرطیں پورے طور پر ادا نہ کی تھیں اور خود مختاری کا دم بھرنے لگا تھا۔ اس لیے اکبر نے برہم ہو کر نواب خان خانخاناں کو تسخیر ٹھٹھہ اور بلوچوں کے استیصال کے لیے متعین کیا۔[1]

صاحبِ طبقات اکبری نے وقائع سال سی و پنجم کے ذیل میں لکھا کہ: اگرچہ ۱۴ جمادی الاول ۹۹۸ھ (۹۰-۱۵۸۹ء) جانی بیگ حاکم ٹھٹھہ نے اکبر کو قیمتی تحائف و ہدایا بھیج کر اپنی نیاز مندی کا اظہار کیا لیکن وہ خود بارگاہ شاہی میں حاضر نہیں ہوا۔ اُسی زمانے میں بادشاہ اکبر نے خانخاناں کو ملتان و بکھر کی حکومت عطا کر کے ٹھٹھہ اور بلوچوں کو مسخر کرنے کا حکم دیا۔ شیخ ابو الفیض فیضی نے "قصدتہ" (۹۹۹ھ) سے اس کی تاریخ نکالی۔[2]

میرزا جانی بیگ کے مشورے:

تاریخ طاہری میں ہے کہ جب خانخاناں کی آمد کی خبر میرزا جانی بیگ کو ملی تو وہ خوابِ خرگوش سے بیدار ہوا اور اس نے اپنے ملک کے مدبروں سے مشورہ کیا۔ ان لوگوں نے رائے دی کہ بادشاہ کی اطاعت و فرمانبرداری سے سرگردانی کسی طرح مناسب نہیں۔ عاقبت اندیشی یہ ہے کہ پہلے میرزا محمد باقی کی بیٹی "سندھی بیگم" کو جو اعلیٰ حضرت کے محل میں داخل ہو چکی ہے، سابقہ فرامین اور عہد ناموں کے ساتھ نواب خانخاناں کے پاس بکھر بھیجنا چاہیے اور میرزا خانخاناں کو لکھنا چاہیے کہ ہم مریدین و معتقدین قدیم سے درِ اطاعت پر سر جھکائے ہوئے ہیں اور یہ ملک جو چند واسطوں سے ہماری میراث ہے، یہ فردوس مکانی کی ظاہری اور باطنی عنایتوں کی بدولت ہے، خصوصاً میرزا محمد باقی مرحوم نے اپنی بیٹی (سندھی بیگم) کو اعلیٰ حضرت کی خدمت میں ارسال کیا تھا کہ اس رشتے کی بدولت ہم غلاموں اور خاکساروں کو بندۂ درگاہ تصور فرمائیں گے اور اس ملک کی حکومت کو جو ہماری موروثی ہے، ہمیں مرحمت فرمائیں گے۔ چنانچہ اس التماس کو منظور فرما کر اور اس ملک کی ولایت ہمیں عطا کر کے اعلیٰ حضرت نے ہمیں رخصت کیا تھا۔ آپ بھی ایک شریف خاندان اور بزرگ سلسلے سے ہیں۔ ہماری عزت و آبرو کی حفاظت بحیثیت ایک خواجہ تاش ہونے کے آپ کے لیے مناسب و سزاوار ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس مضمون کو اپنے طور پر لکھ کر ہم غریبوں کی عرضی کے ساتھ دارالخلافہ بھجوا دیں گے۔ اس کرم پر ہم لوگ آپ کے بے حد ممنون و شکر گزار ہوں گے۔[3]

میرزا جانی بیگ کا فیصلہ:

میرزا جانی بیگ میں لاکھ اُس کی شخصی سیرت کی کمزوریاں سہی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا شجیع اور بہادر انسان تھا۔ چنانچہ میرزا جانی بیگ نے اپنے جوہر شجاعت و مردانگی کی وجہ سے اپنے مشیروں کے اس مشورے کو قبول نہیں کیا اور اس نے کہا کہ شجاعت و سخاوت و بہادری کے مدعیوں کو عورتوں کی طرح زندگی بسر کرنا شیوۂ مردانگی نہیں، محض ایک جزوی ملک کی خاطر جو ہمیشہ کسی کا ملک نہیں رہا اور ایسے تن کے لیے آسائش ڈھونڈنا جو ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں ہے، بہت بڑی بزدلی ہے۔ میں اس طوقِ بدنامی و لعنت کو اپنے گلے میں ڈالنا نہیں چاہتا کہ سلسلۂ ترخانی کے فلاں شخص نے نامردی و بزدلی اختیار کی۔ مجھے تو اس طرح طوقِ غلامی کو گلے میں ڈالنا عقل مندی سے بعید نظر آتا ہے، کیونکہ نتیجہ وہی ہونے والا ہے جو خدا کی مرضی ہے۔ میں اپنے بزرگوں کے دامن پر جنہوں نے بڑی عزت و شان سے زندگی بسر کی یہ داغِ بدنامی لگانا نہیں چاہتا۔ اب میں تم لوگوں میں سے ان کو جو خوف کی وجہ سے اپنی اور اپنی اولاد کی جان کو عزیز رکھتے ہیں، میں خوشی سے اجازت دیتا ہوں کہ وہ جہاں جی چاہے جائیں۔ میرزا جانی بیگ کی اس گفتگو پر اس کے مشیروں نے جواب دیا کہ ہمارا قلیل لشکر ایسے وسیع ملک کے بادشاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ خزانہ جو میرزا شاہ حسن سے میرزا محمد باقی تک کے فرمانرواؤں نے جمع کیا تھا، وہ آج ہی کے دن کے لیے جمع کیا تھا، جو آپ نے بے وقت اور بیہودہ مصرف میں خرچ کر دیا۔ پھر ہم کس کس بل پر اتنے بڑے بادشاہ کے لشکر سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں۔ خود بدولت خود ہی تصور فرمائیں کہ میرزا خانخاناں کہ جو اتنے اُمرا اور منصب دار، صاحب ساز و سامان لے کر آیا ہے کہ ہر ایک کی جاگیر آپ کے ملک سے بڑھی ہوئی ہے اور اس کا لشکر اتنا کثیر ہے کہ جس کا سلسلہ قیامت تک ٹوٹ نہیں سکتا۔ بھلا ہم اُن کے مقابلے میں کیسے صف آرا ہو سکتے ہیں۔ اس بنا پر ہم خیر خواہوں کا مشورہ یہی ہے کہ صلح کی کوشش فرمائیے تاکہ یہ ملک خراب نہ ہو۔

---

(1) تاریخ معصومی فارسی، ص ۲۵۰۔

(2) تحفۃ الکرام، جدید فارسی ایڈیشن، از حواشی سید حسام الدین راشدی، ص ۲۲۰۔

(3) ماخوذ از تاریخ طاہری، ص ۱۷۷-۱۷۸۔

میرزا جانی بیگ نے جواب دیا کہ بے شک تمہارا کہنا صحیح ہے، یہ واقعہ ہے کہ ہفت اقلیم کے بادشاہوں میں کسی کو اُن سے مقابلے کی طاقت نہیں، لیکن یہ امر شجاعت و مردانگی کے خلاف ہے کہ کوئی شخص اپنا ملک مفت دشمن کے سپرد کر دے، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کوئی کسی کا منہ نہیں پکڑ سکتا۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ مجھے بزدل اور کم ہمت کے نام سے یاد کریں اور کہیں کہ اس خاندان میں یہ کس قدر بزدل اور ناخلف تھا کہ اپنے موروثی ملک کو محض جان کے خوف سے کس آسانی سے دشمن کے نذر کر دیا۔

آخر اس بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ سوائے لڑائی کے کوئی چارہ نہیں۔ سندھی سوار اور پیادوں کا ایک لشکر میرزا جانی بیگ کی ہمرکابی میں تیار ہوا اور آتش جنگ گرم کرنے کے لیے موضع بوہری میں جو صوبہ نصرپور کے علاقے میں ہے پہنچا اور ایک محفوظ اور مستحکم جگہ منتخب کر کے خندق کھودی اور دستام بیگ کے باپ رستم بیگ کو جو اُس کے خاصہ خیلوں میں تھا قابل اعتماد سمجھ کر ایک عظیم لشکر کے ساتھ سیوان بھجوایا کہ وہ سیوان کے قلعے کے پاس کسی کو پھٹکنے نہ دے اور جو گھر قلعے کے آس پاس ہوں ان کو گرا کر میدان کر دے، چنانچہ وہاں پہنچ کر اس نے ایسا ہی کیا، اور اپنی خام خیالی کی بنا پر وہ وہاں ٹھہر کر خانخاناں میرزا عبدالرحیم کا انتظار کرنے لگا۔[1]

خانخاناں کی سندھ میں آمد:

اِدھر خانخاناں پہلے بکھر پہنچا، چونکہ وہ زمانہ گرم ہواؤں اور طغیانی کا تھا، اس لیے اُس نے اپنے لشکر سمیت کچھ دن بکھر میں قیام کیا۔ پھر وہ سیوہن آیا، اس کے آنے کی خبر پاتے ہی اہل سیوہن قلعہ بند ہو گئے تھے۔ تاریخ معصومی میں ہے کہ اُس نے اپنے اُمرا کی جماعت سے مشورہ کیا کہ کیا ہمیں پہلے میرزا جانی بیگ کی سرکوبی کے لیے ٹھٹھہ جانا چاہیے، یا پہلے سیوہن کی مہم سر کرنی چاہیے اور پھر آگے قدم بڑھانا چاہیے؟ اُمرا نے متفقہ طور پر جواب دیا کہ مناسب یہ ہے کہ چونکہ سیوہن ہمارے راستے میں ہے، ہمیں پہلے اسے فتح کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہماری کشتیوں اور فوجوں کا گزر ادھر ہی سے رہے گا۔ سیوہن کی مہم کے بعد پھر ہمیں اطمینان سے آگے بڑھنا چاہیے۔ اس فیصلے کے بعد میرزا خانخاناں نے دریائے سندھ کو عبور کیا اور اس کا لشکر سیوہن کے چاروں طرف مورچے تقسیم کر کے سرنگ لگانے میں مصروف ہو گیا۔

اسی اثنا میں خبر پہنچی کہ میرزا جانی بیگ ایک لشکر جرار کے ساتھ ٹھٹھہ سے جنگ کے ارادے سے آرہا ہے۔ اس اطلاع کے ملتے ہی خانخاناں سیوہن کا محاصرہ چھوڑ کر جانی بیگ کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس وقت جانی بیگ نصرپور سے اُس طرف موضع بوہری میں قلعہ بنا کر مستحکم ہو چکا تھا۔ جب خانخاناں اس قلعے سے چھ کوس کے فاصلے پر پہنچا، تو جانی بیگ نے خسرو خان اور دوسرے اُمرا کی سرکردگی میں دو سو جنگی غراب اور دوسری کشتیاں خانخاناں کی لشکر گاہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیں اور دریا کے دونوں کناروں پر فوج متعین کر دی۔ خانخاناں نے بھی کچھ لشکر دریا کے کنارے پر اُتار کر لشکر گاہ سے کچھ آگے دریا کے کنارے پر پانچ چھ جریب زمین پر ایک چھوٹا سا قلعہ بنوا کر محمد مقیم بخشی، علی مردان ترمذی اور میر معصوم بکھری کو بعض دوسرے اُمرا کے ساتھ اس قلعے پر متعین کیا۔ یہ قلعہ ایسے مقام پر واقع تھا کہ غرابوں کو وہاں پہنچ کر اس قلعے کے سامنے سے گزرنا پڑتا تھا، کیونکہ سامنے دریا کے دوسرے کنارے پر ایک بڑا جھنڈ تھا اور میرزا جانی بیگ کے آدمیوں کو مجبوراً اسی قلعے کے سامنے سے اپنی لشکر گاہ تک پہنچنا پڑتا تھا۔ درحقیقت یہ مفید تجویز محمد مقیم نے پیش کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس طرح عمل کیا گیا اور توپوں کو لشکر گاہ سے آگے بھیج دیا گیا تو اس طرح لشکر گاہ کو دشمن سے نقصان نہ پہنچ سکے گا۔[2]

صاحب طبقات اکبری نے اس جنگ کا حال وقائع سی و ششم الٰہی میں لکھا ہے، طبقات اکبری میں ہے کہ خانخاناں جو ٹھٹھہ کی تسخیر کے لیے متعین ہوا تھا پہلے سیوہن پہنچا اور اس نے قلعہ سیوہن کا محاصرہ کر لیا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ میرزا جانی بیگ سندھ کے زمینداروں کے ساتھ سامانِ حرب سے لیس ہو کر مقابلے کے لیے آرہا ہے تو خانخاناں محاصرہ ترک کر کے اس کے مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔ جب وہ نواح نصرپور میں پہنچا اور اس کے لشکر اور جانی بیگ کے لشکر میں سات کوس کا فاصلہ رہ گیا، جانی بیگ نے اپنے غرابوں میں سے ایک سو سے زائد غرابوں کو دو سو کشتیوں کے ساتھ تیر اندازوں اور توپچیوں کو بڑے توپ خانے کے ساتھ جنگ کے لیے بھجوایا۔ خانخاناں کے پاس پچیس غرابوں سے زیادہ نہ تھے، پھر بھی اس نے مقابلہ کیا اور ایک دن اور رات مسلسل فریقین میں یہ جنگ جاری رہی اور فتح شاہی لشکر کو ہوئی۔ جانی بیگ کے دو

---

[1] تاریخ طاہری، ص ۱۸۰-۱۸۱۔

[2] تاریخ معصومی، از ص ۲۵۱-۲۵۲۔

سو آدمی مارے گئے۔ یہ جنگ ۶ محرم ۱۰۰۰ھ (۱۶۸۸ء) میں واقع ہوئی۔[1]

تاریخ طاہری میں ہے کہ خانخاناں کی یہ کوشش تھی کہ وہ اِدھر میرزا جانی بیگ اور قلعہ سیوہن کو محاصرے میں رکھے اور اُدھر پورے سندھ میں جابجا اپنے لشکر کو متعین رکھے۔ چنانچہ اُس نے شاہ بیگ کو صوبۂ نصرپور پر خاص کر قلعہ شاہ گڑھ پر جہاں ابو القاسم تھا متعین کیا اور ایک اور جماعت کو جس میں تجربہ کار اور جنگ آزمودہ سپاہی تھے قلعہ نیرون کوٹ پر مقرر کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر حصے میں اس کی فوجیں متعین رہیں اور ضرورت کے وقت کام دیں۔

ادھر میرزا جانی بیگ نے اپنے لشکر میں اعلان کیا کہ جو کوئی دشمن کا سر لا کر ہمارے حضور میں پیش کرے گا اُسے بطور انعام کے پانسو کبر[2] دیے جائیں گے۔ سندھ کے غربا نے جب یہ انعام کی نوید سنی، اس تھوڑے سے انعام پر راضی ہو کر ہر روز سر دے کر سر لاتے تھے۔ یہاں تک کہ کئی ماہ اسی طرح گزر گئے۔

گربہ ہندو نے جو میرزا جانی بیگ کے خزانے کی مالیت اور روپے سے واقف تھا، یہ دیکھ کر کہ خزانہ خالی ہوتا جاتا ہے، عاقبت اندیشی کی بنا پر اس انعام کو آہستہ آہستہ کم کر کے اس کی تعداد پچاس کبر کر دی۔ لیکن پھر بھی بھوکے اور فلاکت زدہ لوگ اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہ انعام حاصل کرتے تھے۔[3]

لیکن اس طرح میرزا جانی بیگ کے بہت سے لوگ مارے گئے، خزانہ خالی ہو گیا اور لوگوں کی حالت نہایت خراب ہو گئی، میرزا جانی بیگ نے محسوس کر لیا کہ اس سرد جنگ سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب بجاءِ شدید جنگ کے کوئی چارہ نہیں۔ اس لیے اُس نے اپنی فوجوں کو پھیلا دیا، چونکہ اس نے سنا تھا کہ خشکی کے راستے سے خانخاناں کے لیے دارالخلافہ سے خزانہ آتا ہے۔ اس لیے اُس نے ابو القاسم ولد شاہ قاسم ارغون کو ایک جمعیت کے ساتھ جس میں سندھی اور مغل تھے اس پر متعین کیا کہ وہ جہاں بھی موقع پائے اُس خزانے کو لوٹ لے۔ چنانچہ ابو القاسم اس جگہ پہنچا جہاں سے وہ لوگ خزانہ لے کر گزرتے تھے اور ایک جگہ ٹھہر کر اس نے آدھی رات کو اپنے کچھ آدمیوں کو اس جگہ بھجوایا، جہاں خزانہ لانے والے لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اچانک وہاں پہنچ کر ان لوگوں نے چھاپہ مارا اور اُن سے خزانہ چھین لیا، لیکن اس ہنگامے میں ابو القاسم کے بہت سے آدمی مارے گئے۔[4]

فیصلہ کن جنگ:

آخر جانی بیگ اور خانخاناں میں ایک فیصلہ کن جنگ کی ٹھنی۔ تاریخ طاہری میں ہے کہ دونوں لشکروں کی تعداد کثیر تھی۔ خانخاناں کے لشکر نے امتیاز کے لیے اپنی پگڑیوں میں تیر لگائے اور میرزا جانی بیگ کے لشکریوں نے اپنی پگڑیوں میں درختوں کی سبز ٹہنیاں باندھیں۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان اس قدر ہولناک جنگ شروع ہوئی کہ جس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ شروع میں میرزا جانی کا پلہ بھاری تھا اور خانخاناں اپنی فوج کی پسپائی دیکھ کر نہایت بددل ہو رہا تھا اور دعائیں مانگ رہا تھا۔ عین اُس وقت جب کہ میرزا جانی بیگ کی فوجیں دشمن پر غالب آرہی تھیں کہ اچانک میرزا جانی بیگ کا ایک مست ہاتھی جو اس کے لشکر کے آگے آگے تھا بھڑک گیا اور اُس نے پلٹ کر اپنی ہی فوج کو روندنا شروع کر دیا، جس سے اس کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی، دوسرا یہ کہ اس کی فوج کے سامنے کے رخ سے سخت آندھی چلنے لگی جس کی وجہ سے جانی بیگ کی فوج میں سخت انتشار پیدا ہو گیا اور اس کی فتح شکست میں تبدیل ہو گئی، اور ساری فوج اپنا سامانِ اسلحہ میدان میں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی، اور میرزا جانی بیگ اپنے گیارہ سواروں کے ساتھ جن میں شاہ قاسم ارغون، خسرو چرکس، عرب کوکہ، مُلا محمد فراخی علی، سلطان غزنوی اور تاریخ طاہری کے مؤلف کا باپ حسن تھا جو میدان میں رہ گئے۔ ہر چند یہ لوگ فارسی اور سندھی میں اپنی بھاگتی ہوئی فوج کی ہمت بندھاتے تھے۔ لیکن کوئی نہ رکا، آخر خانخاناں کی فوجوں نے سیلاب کی طرح بڑھ کر میرزا جانی بیگ کی فوجوں کا تعاقب شروع کیا، لیکن پھر بھی میرزا جانی بیگ سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں جما رہا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ہم یہاں سے زندہ سلامت بچ کر کہاں زندگی گزار سکتے ہیں، لیکن شاہ قاسم ارغون نے زور دے کر اس سے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ تمام لشکر ہاتھ سے نکل گیا، اب ہم چند آدمیوں کی بہادری سے کیا نتیجہ نکل سکتا

---

(1) تحفۃ الکرام فارسی جدید ایڈیشن، ص ۲۲۰، جنگ نصرپور، حاشیہ سید حسام الدین راشدی، بحوالہ طبقات اکبری، ج ۲، ص ۲۱۲-۲۱۵۔

(2) ہر کبر میں پانسو میری ہوتے تھے، جنہیں میرزا جانی بیگ کے عہد میں "پوستنی" کہتے تھے اور ایک ٹنکہ میں باہتر پوستنی ہوتے تھے۔ (تاریخ طاہری، ص ۱۸۳)۔

(3) تاریخ طاہری، ص ۱۸۳۔

(4) تاریخ طاہری، ص ۱۸۳-۱۸۴۔

ہے۔ اس لیے مفت میں جان دینا شیوۂ بہادری کے خلاف ہے۔ اگر آپ سلامت رہیں گے تو پھر ہم جنگ کی تیاری کر کے مقابلہ کریں گے۔ مجبوراً میرزا جانی بیگ وہاں سے ہٹا اور کشتی پر سوار ہو کر روانہ ہوا اور خانخاناں کے لشکر نے میدان میں پہنچ کر میرزا جانی بیگ کے لشکر کے زخمیوں اور ان لوگوں کو جن میں ذرا سی بھی جان باقی تھی تہہ تیغ کر دیا اور وہ بھاگتی ہوئی فوجوں کا پیچھا کرنے لگے۔

میرزا جانی بیگ کشتی میں بیٹھ کر انزپور پہنچا اور فیصلہ کیا کہ وہ پھر اس جگہ خندقیں کھود کر اپنے آپ کو محفوظ و مضبوط کرے گا یہاں تک کہ اس کی منتشر فوج یہاں جمع ہو جائے گی، چونکہ وہاں بیلدار دستیاب نہ ہو سکے، اس لیے میرزا اور اس کے ساتھیوں نے خود ہی چٹائیوں کو سی کر اور ریت سے بھر کر شام تک ایک قدم آدم پناہ گاہ استادہ کی، لیکن منتشر فوج لوٹ کر نہ آئی۔ اکثر لشکری جان کے خوف سے اس طرح بھاگے کہ ٹھٹھہ کا راستہ جو چار روز کا تھا انہوں نے ایک دن اور ایک رات میں طے کیا اور قاصدوں کے پہنچنے سے پہلے انہوں نے شکست کی خبر میرزا محمد پایندہ بیگ اور میرزا جانی بیگ کے بیٹوں کو پہنچائی۔

اس طرف خانخاناں بھی اُس کا تعاقب کرتے ہوئے آیا اور اسی کے قریب خندقیں کھود کر توپ اور بندوقوں کی لڑائی شروع کر دی، اور آمد و رفت اور رسد کا راستہ منقطع کر دیا۔ میرزا جانی بیگ جب مایوس ہو گیا تو اُس نے اپنے باپ (میرزا محمد پایندہ بیگ) کو تمام حالات لکھے اور لکھا کہ حالات نہایت مایوس کن ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ محل والوں اور مال و دولت اور خاصہ خیلوں اور متعلقین کو لے کر ٹھٹھہ سے کلا کوٹ (تغرل آباد) چلے جائیں۔ میں نے آج کے دن ہی کے لیے کلا کوٹ کے قلعے کی مرمت کرائی تھی اور لوگوں کو شہر سے نکال کر ٹھٹھہ کے ہر کوچہ و بازار میں آگ لگا دیں۔ اسی طرح جہاں تک بھی دسترس ہو، ہر پرگنے، قصبے اور گاؤں کو برباد کر دیں، ہر گاؤں اور شہر میں تین روز تک منادی کرائیں کہ وہاں کا ہر آدمی آبادی کو اس طرح چھوڑے کہ وہ ایسی ویرانہ بنے کہ چغدوں کا نشیمن بن سکے اور جو چیز اپنے ساتھ لے جانا چاہے لے جائے ورنہ وہ لوٹ کا مال بنے گی۔

چنانچہ میرزا محمد پایندہ بیگ نے ایسا ہی کیا۔ تین روز منادی کرائی گئی۔ اس منادی کے بعد لوگوں کا یہ حال ہوا کہ وہ اس تعجیل میں جو کچھ اپنا مال و اسباب لے جا سکتے تھے لے گئے، لیکن پھر بھی اس پریشانی و حیرانی میں جب کہ انسان کو اپنا سایہ بھی بار گراں تھا تمام عمر کے اندوختے میں سے بہت کچھ چھوڑ گئے۔ اس بھگدڑ میں سامان لے جانے والوں نے کرائے اس قدر بڑھا دیے تھے کہ وہ سامان لے جانے کا کرایہ سامان کا تیسرا حصہ بلکہ نصف مانگتے تھے، سامان کو لے جانے کے کرائے کو اس قدر بڑھا ہوا دیکھ کر لوگوں نے اپنے مال و متاع کو اپنی حویلیوں میں گڑھے کھود کر دفن کر دیا تھا۔[1]

ٹھٹھہ میں آتش زنی:

ٹھٹھہ کو خالی کر دینے کے بعد وہاں کے باشندوں نے جنہوں نے اس شہر کو نہایت محنت و مشقت سے آباد کیا تھا، چاروں طرف سے شہر میں آگ لگا دی۔ وہ شہر جو خوبی و لطافت میں تمام دنیا میں مشہور تھا، لکڑی کے مکانات ہونے کی وجہ سے ایک ماہ تک جلتا رہا۔ ادھر لٹیروں اور اوباشوں کی خوب بن آئی، جو کچھ جلنے سے بچ رہا انہوں نے خوب لوٹا۔

پھر مصیبت پر مصیبت یہ تھی کہ جو لوگ قلعے میں داخل ہو گئے تو وہ اگرچہ اپنی جان تو بچا سکے، لیکن پانی کی کمی اور غلے کی قلت کی وجہ سے انہیں وہاں بھی سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں رہائش کی جگہ بھی اس قدر تنگ تھی کہ تھوڑی سی جگہ میں دس دس خاندان نہایت تنگی سے بسر کر رہے تھے، لیکن وہ لوگ جو کسی وجہ سے قلعے میں داخل نہ ہو سکے انہیں اُن سے بھی زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا، اور بد معاشوں اور لٹیروں نے انہیں خوب لوٹا، اور وہ مال جو انہوں نے کنوؤں اور پہاڑوں میں چھپا رکھا تھا، پتا چلا کر کھود کر لے گئے۔[2]

خانخاناں کا نیا اقدام:

خانخاناں کو جب اس صورتِ حال کی خبر ملی تو اس نے ان منصب داروں کو جنہیں اس نے پہلے ہی سے مختلف صوبوں پر متعین کر رکھا تھا، ہر متعینہ صوبے میں روانہ کر دیا اور حکم دیا کہ جس طرح ہم نے میرزا کو محاصرہ کر کے محصور کر دیا ہے، اسی طرح تم بھی وہاں جا کر وہاں کے صوبے داروں کو محصور کر کے رسد کے راستے منقطع کر دو اور رسد پر کڑی نگرانی رکھو کہ کسی طرح ان کو پہنچنے نہ پائے۔

قلعۂ نیرون کوٹ میں اُس وقت محمد امان ترخان[3] صوبیدار اور

---

(1) یہ تمام تفصیل تاریخ طاہری، ص ۱۹۱-۱۹۲ سے ماخوذ ہے۔

(2) ایضاً، ص ۱۹۳۔

(3) محمد امان ترخان: میرزا جانی بیگ کے اُمرا میں تھا، عام طور پر ملک امان کے لقب سے مشہور تھا، "چوک ملکاں" ٹھٹھہ میں اسی کے نام سے مشہور ہے، (تحفۃ

اس کا وکیل قاسم علی تھا۔ اتفاق سے محمد امان، میرزا جانی بیگ کے پاس آیا ہوا تھا۔ وہ شراب پی کر کشتی میں جا رہا تھا کہ اس کا پاؤں پھسلا اور دریا میں گر پڑا اور وہیں فوت ہو گیا۔ اُس کا بیٹا بہرام ترخان جو اُس وقت نیرون کوٹ کا نگران تھا، اُس سے خانخاناں کے آدمیوں نے قلعہ چھین لیا۔

دوسری طرف شاہ بیگ خان نے شاہ ساکرہ (ساکرہ) پہنچ کر ابو القاسم ارغون کو جو کہ وہاں صوبیدار تھا محاصرے میں لے لیا اور اس کو اس قدر تنگ و عاجز کر دیا کہ اُس کے قبضے سے شاہ ساکرا لے لیا۔

پرگنۂ چاچکاں صوبۂ بدین پر جو صوبیدار متعین تھا۔ اُس نے اور اس صوبے کے باشندوں نے خانخاناں کی اطاعت قبول کر لی۔[1]

اس طرح ہر جگہ نواب خانخاناں کامیاب و کامران ہوا۔ میرزا جانی بیگ کو ہر طرف سے خانخاناں کی کامیابی کی اطلاعیں مل ہی رہی تھیں کہ نئی مصیبت یہ آئی کہ سنہ ۱۰۰۰ھ میں اُس کے والد میرزا پایندہ بیگ[2] اور سنہ ۱۰۰۱ھ میں اس کے بیٹے میرزا ابو الفتح اول[3] کی وفات کی خبر پہنچی۔ اس خبر نے اس کی دل شکستگی کو اور بڑھا دیا۔ نواب خانخاناں نے میرزا جانی بیگ کو اس طرح محاصرے میں لے رکھا تھا کہ اس پر آنے جانے کا راستہ بالکل بند تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کوئی چیز میرزا کے لشکر میں پہنچنے نہ پاتی تھی۔ صاحبِ تاریخ طاہری سید محمد طاہر نسیانی اس محاصرے کی کیفیت اور میرزا کے لشکر کی بے سروسامانی اور ان کی بھوک و پیاس کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

> و لشکر نواب (خانخاناں) محاصرہ بنوعی گرداگرد داشتہ کہ راہ آمد و شد را نیز بر ایشاں مسدود ساختند، خوردن بجز خون جگر در لشکر چیز دیگر نبود، در آرزوی علف، علف خوار، لیل و نہار تلف گردیدن گرفت، بے مائیگی بجائی رسید کہ آتش در دیگ دان آب گردیدہ، و روزی دود کسی از روزن دیگ دان نمی دید، مگر از دھان توپ و تفنگ پیدا و ھویدا می گشت، شعلۂ بے آہ آتش بار گرسنان عیان و آشکار نماند، نمک بنوعی ناپدید شد کہ نمکین لبان از آرزوی آں بے نمک گشتند، نان چون جان بلک از آن عزیز در چشم گرسنگان میرسید، و روغن بنوعی و نبھی نایاب گشت کہ پہلو جریان نشان آن از لاغری در پہلوی خویش نمی دیدند، خزانہ چناں از زر تہی شد کہ زر بی رخسارۂ زر طلباں دیگر جا نشان نمی داد[4]۔۔۔ الخ۔

میرزا جانی بیگ کی شجاعت و پامردی:

لیکن اس کے باوجود کہ میرزا جانی بیگ کے حالات ہر طرف سے نامساعد تھے اور قسمت بظاہر اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی، مگر اس کی شجاعت و پامردی، عزم و استقلال کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس کے عزم میں مطلقاً تزلزل پیدا نہیں ہوا اور وہ خانخاناں کے مقابلے کے لیے ڈٹا رہا۔ آخر نواب خانخاناں کے لشکر نے اپنے مورچے میرزا جانی بیگ کے لشکر کے اس قدر قریب کر دیے کہ دونوں جانب کے سپاہی ایک دوسرے سے بات کر سکتے تھے اور ایک دوسرے پر پتھر پھینک سکتے تھے۔ یہ کھچاؤ اور تناؤ دونوں لشکروں کے درمیان جاری تھا، لیکن یہ صورتِ حال دونوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

صلح:

نواب خانخاناں نے سارے حالات پر غور کر کے ایک ایلچی میرزا جانی بیگ کے پاس بھیجا اور اُسے پیغام دیا کہ: تم اور ہم آج سے نہیں بلکہ قدیم سے ایک ہی خاندان کے یعنی "صاحبِ قرآن" کے غلاموں میں سے ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر ہم گردش آسمانی سے ایک گھرانے کے غلام ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ خدا کے فضل سے دونوں لشکروں نے جو شجاعت و بہادری کے جوہر دکھائے ہیں۔ اُسے تمام عالم جانتا ہے کہ دونوں طرف سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوئی۔ وہ تم ہی تھے کہ تم نے اتنی مدت تک شاہی افواج قاہرہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ یہ تمہاری ہی ہمت ہے۔ تمہاری اس شجاعت و مردانگی کی داد نہیں دی جا سکتی، لیکن اب مصلحتِ وقت یہ ہے کہ اپنے ملک اور اپنے بزرگوں کے گھر کو خراب نہ کرو۔ تم خود جانتے ہو کہ یہ لشکر سارے ہندوستان کے مالک بادشاہ کا ہے۔ جس کا توسل ساتوں اقلیم کے بادشاہ

الکرام، اُردو ترجمہ، ص ۲۸۷)۔

(1) تاریخ طاہری، ص ۱۹۴-۱۹۵ و تحفۃ الکرام، ترجمہ سندھی، ص ۱۹۲۔

(2) میرزا محمد پایندہ: متوفی ماہ صفر ۱۰۰۰ھ - مدفن: گورستان عیسیٰ اول (شجرہ میرزا عیسیٰ ترخان اول مرتب سید حسام الدین راشدی، مشمولہ ترخان نامہ) اس کی قبر پر یہ کتبہ نصب ہے، قد وصل الی جوار رحمت حضرت الملک السبحان میرزا محمد پایندہ بن میرزا محمد باقی ترخان۔۔۔ اللہ تعالیٰ، تاریخ ماہ صفر ۱۰۰۰ھ - (حواشی مکلی نامہ، ص ۵۱۰)۔

(3) میرزا ابو الفتح اول: متوفی ۱۰۰۱ھ یہ امیر شاہ قاسم خان زماں بیگلار (متوفی ۱۰۱۹ھ) کی بیٹی کے بطن سے تھا (شجرہ میرزا عیسیٰ ترخان اول، مشمولہ ترخان نامہ)۔

(4) تاریخ طاہری، ص ۱۹۷ و تحفۃ الکرام ترجمہ اردو، ص ۲۴۴-۲۴۵۔

ڈھونڈتے ہیں۔ جس حکمران نے اس بارگاہ کی چوکھٹ پر سر نہ رکھا، اس پر طرح طرح کی مصیبتیں آئیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ خلق کی خوں ریزی کے لیے کوشاں ہونا اپنی پیاری جان سے ہاتھ دھونے کے مترادف ہے۔ اگر زمین و زمان کے وارث (شہنشاہ اکبر) کی نافرمانی کے پاٹوں کے درمیان جو اپنے وقت کا "اولو الامر" ہے، تمہاری زندگی پس گئی، تو پھر عزت و ناموس اور شان و شوکت جو زندگی کے مقصد کا مقدمہ ہے کہاں باقی رہے گا۔ تمہارے وقار اور اعتماد کے لیے میں ضامن ہوں۔ بہتر ہے کہ ہاتھوں سے گئے ہوئے معاملے (اطاعت) کو پھر ہاتھ میں لے لو۔[1]

صلح کے متعلق ہم نے یہ پیغام تاریخ طاہری اور تحفتہ الکرام سے نقل کیا ہے، مگر تاریخ معصومی میں اس کے بالکل برعکس ہے۔ تاریخ معصومی میں میر معصوم جو اس جنگ میں شریک تھا اس کا بیان ہے کہ:

جانی بیگ شکست کھا کر اور بھاگ کر اٹر پورا آیا جو میدانِ جنگ سے بیس کوس کے فاصلے پر تھا۔ پھر جانی بیگ نے ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا، اور اس میں مستحکم ہو کر بیٹھ رہا۔ شاہی خیر خواہ وہاں بھی جا پہنچے اور محاصرہ کر لیا۔ کچھ دن بعد نواب خانخاناں نے بھی وہاں پہنچ کر مورچے تیار کرائے۔ پھر روزانہ جنگ ہوتی رہی اور دونوں جانب سے کثیر آدمی قتل ہوتے رہے۔ آخر ہم لوگ مٹی کھود کر اس کے انبار کی اوٹ لیتے ہوئے قلعے کی جانب بڑھنے لگے، یہاں تک کہ مٹی کے تودوں کی آڑ میں خندقوں تک جا پہنچے، (اس پر) جانی بیگ عاجز ہو کر صلح کے لیے آمادہ ہوا۔ اس کے عریضے کی صورت یہ تھی: میں تیس غراب اور سیوہن کا قلعہ آپ کے حوالے کرتا ہوں اور پھر ٹھٹھہ پہنچنے کے بعد آ کر آپ سے ملاقات کروں گا۔

خانخاناں نے اُمرا سے مشورہ کیا۔ تمام اُمرا نے متفقہ طور پر عرض کیا کہ اب اس کی حالت بہت نازک ہو چکی ہے۔ اس لیے صلح نہ کرنی چاہیے، کیونکہ ہم اپنے کام کو آج یا کل پر پہنچا چکے ہیں اور اس صورت میں اس کا امکان ہے کہ ٹھٹھہ پہنچنے پر جانی بیگ اپنی رائے کو بدل دے۔

خانخاناں نے کہا کہ اگر ہم اس قلعے سے چپاں رہیں، تو اس میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ دونوں طرف کے خاصے آدمی قتل ہو جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ ان کے اہل و عیال پاجیوں کے ہاتھ پڑیں گے اور ان کی بے عزتی ہو گی۔ اس لیے ہم صلح کرتے ہیں اور میرزا جانی بیگ کو اپنے جیسا منصب پنج ہزاری بندگانِ حضرت سے دلوائیں گے۔ بے شک اُن (خانخاناں) کی رائے درست تھی۔ جانی بیگ کے ایلچیوں نے آ کر عہد و پیمان کیے اور غراب لا کر حوالے کر دیے اور ساتھ ہی ساتھ سیوہن کا قلعہ حوالے کر دینے کے لیے بھی اپنے آدمی سیوہن روانہ کر کے جانی بیگ ٹھٹھہ روانہ ہو گیا۔[2]

میر معصوم کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جانی بیگ نے عاجز ہو کر خود صلح کی درخواست کی تھی۔ اگرچہ میر معصوم عہد اکبری کا مورخ ہے اور اس جنگ کا شاہد عینی ہے، لیکن ہم نے صاحبِ تاریخ طاہری اور صاحبِ تحفتہ الکرام کے بیان کو اس لیے ترجیح دی ہے کہ میر معصوم خود اکبری اُمرا میں شامل تھا۔ اس کا امکان ہے کہ اس نے خانخاناں اور شاہی لشکر کی حمایت میں اس قسم کا بیان اپنی تاریخ میں درج کر دیا ہو، ورنہ میرزا جانی بیگ کے رویے اور اس کے عزم کو دیکھ کر بھی یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ اس نے پہلے خود صلح کی درخواست کی ہو اور حقیقت بھی یہ تھی کہ میرزا جانی بیگ کے پاس تھوڑا سا لشکر باقی رہ گیا تھا۔ میرزا کے لشکر کی پریشانیاں اور تکلیفیں انتہا کو پہنچ چکیں تھیں۔ یہ بچا کھچا لشکر اپنے مقتولوں کے ماتم میں نیل میں رنگے ہوئے ماتمی کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اگرچہ میرزا پر یہ سخت پریشانی کا زمانہ تھا، لیکن جب نواب خانخاناں کا ایلچی آیا تو اس نے اس کے دکھاوے کے لیے نہایت رعب و داب ظاہر کیا اور ایسی چیزیں اپنی مجلس میں طلب کیں، جو شاہی لشکر میں نہ تھیں اور جنہیں دیکھ کر ایلچی حیران رہ گیا۔ آخر ایلچی سے گفتگو کے بعد حالات سے مجبور ہو کر میرزا نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ وہ نواب خانخاناں سے صلح کر لے، بلکہ میرزا کے کچھ اُمرا نے اس سے قبل ہی خفیہ طور پر نواب خانخاناں کے پاس امان طلبی کی کچھ عرضیاں لکھی تھیں، جس نے نواب خانخاناں کے ذہن میں یہ تحریک پیدا کی تھی کہ وہ میرزا کے پاس اپنا ایلچی بھیجے۔ چنانچہ میرزا نے بھی نواب خانخاناں کی بات مانتے ہوئے محمد علی کابلی کو نواب خانخاناں کے پاس بھیجا اور کہلا بھیجا کہ اگر آپ اپنے معاہدوں پر پختہ رہیں گے تو میں بھی اطاعت سے سر نہ موڑوں گا۔[3]

---

[1] تاریخ طاہری، ص ۱۹۷ و تحفتہ الکرام (ترجمہ اردو) ص ۲۴۴-۲۴۵۔

[2] تاریخ معصومی فارسی، ص ۲۵۵-۲۵۶۔

[3] تاریخ طاہری، ص ۱۹۷-۱۹۸-۱۹۹۔

شرائطِ صلح:

سب سے پہلے دونوں فریقوں میں یہ معاہدا ہوا کہ دونوں فوجوں کے سپاہی بغیر کسی تعصب اور کینے کے ایک دوسرے کے بازار میں خرید و فروخت کریں گے، تاکہ آپس میں دونوں لشکروں میں خلوص و محبت کی فضا پیدا ہو اور دلوں سے کدورت کا زنگ صاف ہو، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لوگوں کے دلوں سے ایک دوسرے کے لیے جو خطرہ تھا وہ نکل گیا اور ہر صوبے میں خانخاناں کے آدمی بے تکلف گھومنے لگے۔

پھر میرزا نے اپنے صوبیداروں کو لکھا کہ ہر ایک قلعے کی چابیاں جو اُن کے پاس ہیں، نواب خانخاناں کے آدمیوں کے حوالے کر دی جائیں، اور چابیاں حوالے کرنے کے بعد وہ خود میرے پاس آئیں۔

سب سے پہلے میرزا کے آدمیوں نے قلعہ سیوہن نواب خانخاناں کے آدمیوں کے حوالے کیا اور میرزا جانی بیگ ٹھٹھہ روانہ ہو گیا اور نواب خانخاناں بھی منزل بمنزل اُس کے پیچھے روانہ ہوا، جب دونوں اُس نہر کے کنارے پہنچے جو وسط سندھ میں ہے تو دونوں ایک دوسرے سے ملے، کہتے ہیں کہ پہلے میرزا جانی بیگ گھوڑے سے اُترا، اس کے بعد نواب خانخاناں بھی گھوڑے سے اُترا، دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے اور کچھ دیر مل کر بیٹھے، پھر میرزا بادشاہ کی بارگاہ میں دارالخلافہ حاضر ہونے کی تیاری کے لیے تغلق آباد چلا گیا اور نواب خانخاناں رعایا کی دل جوئی کے لیے ٹھٹھہ میں ٹھہر گیا۔[1]

تاریخ معصومی میں ہے کہ معاہدۂ صلح کے بعد میرزا جانی بیگ ٹھٹھہ کی طرف روانہ ہوا اور خانخاناں نے برسات کا موسم موضع "سن" میں گزارا اور ابتدائے سرما میں وہ ٹھٹھہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ فتح باغ[2] کے نزدیک پہنچا تو میرزا جانی بیگ اُس کے استقبال[3] کے لیے آیا، دونوں کے درمیان ملاقات ہوئی اور بڑی پُر لطف اور طویل نشستیں ہوئیں۔

ترخان نامہ میں ہے کہ زمانۂ قیام ٹھٹھہ میں میرزا جانی بیگ اور نواب خانخاناں کی متعدد مخلصانہ ملاقاتیں رہیں اور باہمی عہد و پیمان ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے مرتے دم تک دوست رہیں گے، نواب خانخاناں نے میرزا کو اس کا بھی یقین دلایا کہ وہ بادشاہ سلامت سے سفارش کر کے یہ ملک اس کو واپس کرا دے گا، پھر دونوں مل کر ٹھٹھہ اور قلعہ تغلق آباد دیکھنے کے لیے گئے اور وہاں سے سیر و شکار کے لیے بندر لاہوری روانہ ہوئے۔ راستے میں موضع منہرہ کے دیکھنے کا بھی خیال ہوا، جو ایک جزیرے کی صورت میں بندر لاہوری سے بیس کوس کے فاصلے پر تھا، چنانچہ جیسے ہی کشتیاں روانہ ہوئیں، اس زور کا طوفان آیا اور ہوائیں چلیں کہ کشتیاں ڈگ مگ ڈگ مگ ہونے لگیں۔ چونکہ نواب خانخاناں کے لوگوں کو کبھی بحری سفر کا اتفاق نہیں ہوا تھا، اس لیے متلیوں میں مبتلا ہو گئے، نواب خانخاناں کو یہ وہم ہونے لگا کہ ہمارا یہ سفر غلط تھا، کہیں میرزا نے جان بوجھ کر یہ تدبیر تو اختیار نہیں کی، ادھر میرزا جانی بیگ کے لوگوں نے خفیہ طور پر میرزا سے کہا کہ یہ موقع نہایت غنیمت ہے، اگر حکم ہو تو نواب خانخاناں کی کشتیوں کو غرق کر دیا جائے؟ میرزا جانی بیگ نے کہا استغفر اللہ کہ ہم عہد کو توڑیں، اب تو ہماری جان، خانخاناں کی جان کے ساتھ ہے۔ ہماری کشتی کو اُس کی کشتی کے برابر کیا جائے تاکہ ہم ڈوبیں تو ایک ساتھ ڈوبیں، جب میرزا جانی بیگ کی کشتی، خانخاناں کی کشتی کے برابر لائی گئی، تو خانخاناں اور بھی متوہم ہوا، مگر جب میرزا جانی بیگ اپنے دو خدمتگاروں کے ساتھ نواب خانخاناں کی کشتی میں آیا اور خانخاناں کی دہشت اور خوف کو کم کرنے کے لیے اس نے دلچسپ باتوں اور شعر و شاعری کا سلسلہ شروع کیا، یہاں تک کہ طوفان کا زور کم ہو گیا اور کشتیاں ساحل پر لگیں، دونوں کا قیام ایک دن اور ایک رات اس گاؤں میں رہا اور دریا کے مد و جزر کا لطف اٹھاتے رہے۔[4] دوسرے دن کشتی میں سوار ہو کر بندر لاہوری ہوتے ہوئے ٹھٹھہ واپس آئے۔

تحفتہ الکرام میں ہے کہ ایک دن خانخاناں نے میرزا جانی بیگ سے کہا کہ تم نے دیکھا، میں نے تمہیں کس حیلے سے اپنے قابو میں کیا ہے، میرزا نے کہا کہ بیشک! خدا کا شکر ہے کہ آپ اپنے حیلے کا خود اقرار کر رہے ہیں، لیکن الحمد اللہ کہ ہماری جانب سے کوئی حیلہ نہیں کیا گیا۔ خانخاناں کہا کرتا تھا کہ میرزا کے اس جواب سے میں جتنا شرمندہ ہوا اتنی شرمندگی مجھے کبھی نہیں ہوئی۔[5] اس طرح میرزا جانی بیگ کی حکومت کا دور ختم ہوا اور وہ اپنے والد کی وفات کے بعد صرف گیارہ روز سندھ کا

---

(1) تاریخ طاہری، ص ۲۰۰-۲۰۱۔

(2) فتح باغ: جون کے قریب تھا، جسے ارغونوں نے آباد کیا تھا، اس کا خرابہ اب بھی موجود ہے۔ تحفتہ الکرام جدید فارسی ایڈیشن ص ۲۳۴ حاشیہ نمبر ۱۔

(3) تاریخ معصومی فارسی۔ ص ۲۵۶ و تحفتہ الکرام فارسی جدید ایڈیشن ص ۲۲۶ بحوالہ طبقات اکبری۔

(4) ترخان نامہ۔ ص ۸۰ تا ۸۲۔

(5) تحفتہ الکرام، ترجمہ اردو، ص ۲۴۷۔

مستقل حاکم رہا۔[1] دارالسلطنت ٹھٹھہ میں اس فتح کا جشن منایا گیا اور چراغاں کیا گیا۔ اس جشن کے لیے اہل شہر اور سپاہی مقرر ہوئے، استاد یار محمد معمار اور جان بیگ حاکم ٹھٹھہ کو حکم دیا گیا کہ وہ پندرہ روز کے اندر ایسا شاندار پنڈال تعمیر کریں جو اس جشن کے شایان شان ہو، اس جشن کے موقع پر شیخ اور بہادر مغل اور ہندی سپاہیوں کو جن کی تعداد ایک ہزار چار سو تھی مختلف انعامات اور نوازشوں سے نوازا گیا اور خانخاناں نے اس موقع پر اس قدر فیاضی اور سخاوت کا مظاہرہ کیا کہ لوگ حاتم طائی اور آل برمک کے نام بھول گئے۔ اس جشن کے موقع پر خانخاناں کے درباری شعرا مثلاً ملا شکیبی اصفہانی، نظیری نیشاپوری، عرفی شیرازی، بوتقلی بیگ بقائی، غیوری شوشتری، محمد شریف وقوعی، میر مغیث محوی، حیاتی گیلانی اور کامی خراسانی اور دیگر شعرائے عراق و خراسان نے تہنیتی قصیدے پڑھے۔[2]

تاریخ طاہری میں ہے کہ ملا شکیبی نے بکھر سے جو ساقی نامہ خانخاناں کو بھیجا تھا، اس میں یہ شعر میرزا جانی بیگ کی جان بخشی کے متعلق بھی تھا۔

ہمائے کہ بر چرخ کردے خرام　　گرفتی و آزاد کردی زدام[3]

خانخاناں نے اس ساقی نامہ پر بارہ سو روپے بطور انعام ملا شکیبی کو بھجوائے۔

شیخ فرید بکھری نے ذخیرۃ الخوانین میں لکھا کہ میرزا جانی بیگ نے بھی اس شعر پر ایک ہزار اشرفیاں ملا شکیبی کو بطور انعام دیں اور کہا کہ خدا کی رحمت ہو شکیبی پر کہ اس نے مجھے اپنے شعر میں ہُما کہا ہے، اگر وہ شغال لکھ دیتا تو میں اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔[4]

میرزا جانی بیگ کی اکبر کے دربار میں حاضری:

اسی زمانے میں شاہی فرمان پہنچا کہ خانخاناں دولت خان لودھی کو اور خواجہ مقیم کو ملک کے انتظام کے لیے اپنا نائب مقرر کرکے اور میرزا جانی بیگ کو اپنے ہمراہ لے کر فوراً دارالسلطنت پہنچے۔ خانخاناں میرزا جانی بیگ کو لے کر روانہ ہوا اور ۲۳ جمادی الثانی ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۳ء) کو اس نے میرزا جانی بیگ کو اکبر کے حضور میں پیش کیا، اکبر نے بھی اس سے نہایت التفات آمیز برتاؤ کیا اور وہ اس قدر مورد الطاف و کرم ٹھہرا کہ کچھ دن کے بعد اُسے منصب "پنج ہزاری" سے سرفراز کیا اور جہانگیر کے بیٹے خسرو کو اس کی دامادی کے لیے نامزد کیا اور سیوستان اور لاہوری بندر کے علاوہ اس کا تمام ملک اس کو جاگیر میں دے دیا اور دولت خان لودھی کے نام فرمان بھیجا کہ نوروز کے موقع پر میرزا کے اہل و عیال کو بھی دستور کے مطابق دارالسلطنت بھیجے، تاکہ دوسرے اُمرا کی بیویوں کی طرح اس کے اہل و عیال بھی اس مسرت کے موقع پر محل سرا میں موجود ہوں۔ اس حکم کو سن کر جانی بیگ حیران ہو گیا، اُس نے خانخاناں سے کہا کہ ہم نے ایسی رسم آج تک نہیں دیکھی، ہم ایک دم اس طرح مستورات کے دور دراز سفر کرکے آنے کی ذلت کیسے برداشت کریں گے، شاید ہمیں اس ذلت کی وجہ سے خودکشی کرنی پڑے گی، خانخاناں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ یہ تو ہم اُمرا کے لیے باعث فخر ہے، لیکن جب میرزا جانی بیگ نہ مانا تو اس نے اکبر سے عرض کیا کہ نوروز بالکل قریب آپہنچا ہے اور میرزا کے اہل و عیال کے یہاں تک پہنچنے کے لیے خاصہ عرصہ چاہیے۔ شاید وہ نوروز تک یہاں نہ پہنچ سکیں، اس لیے یہ حکم ملتوی کر دیا جائے تو بہتر ہے، اکبر نے خانخاناں کی بات مان لی اور اس خیال سے درگزر اختیار کیا اور حکم دیا کہ میرزا جانی بیگ اپنی جاگیر کے کاروبار مملکت کے مدد دینے کے لیے اپنے وکیل، اپنے بیٹے کے پاس بھیج دے۔[5]

سندھ کی تاریخ کے محقق سید حسام الدین راشدی نے تحفۃ الکرام کے جدید ایڈیشن کے حواشی میں لکھا کہ: شاہ حسن نے سندھ کو چھ سرکاروں میں تقسیم کیا تھا۔ (۱) سرکار بکھر۔ (۲) سرکار سہوان۔ (۳) سرکار نصرپور۔ (۴) سرکار چاچکان۔ (۵) سرکار ٹھٹھہ۔ (۶) سرکار چاکر ہالہ دجون، سب سے پہلے بکھر اکبر کے قبضے میں آیا تھا اور سرکار بندر لاہری و سہوان ٹھٹھہ کی فتح اور میرزا جانی بیگ کی گرفتاری کے بعد مغل حکومت میں شامل ہوا تھا، اکبر نے ان دو مؤخر الذکر سرکاروں کو باقی رکھ کر باقی چاروں سرکار میرزا جانی بیگ کو بطور جاگیر دیں۔[6]

وکلا کی روانگی اور اُن کو ہدایتیں:

اس فرمان کے بعد میرزا جانی بیگ نے بحیثیت وکیل کے شاہ قاسم ارغون، خسرو خان چرکس، ملا گدا علی، بہائی خان، عرب کوکہ، جمال

---

(1) تاریخ طاہری، ص ۲۰۱۔

(2) تحفۃ الکرام فارسی جدید ایڈیشن، مصححہ سید حسام الدین راشدی، ص ۲۵۶-۲۵۷۔

(3) تاریخ طاہری، ص ۲۰۷۔

(4) مقالات الشعرا، ص ۳۴۲ حاشیہ نمبر ۳ مؤلف سید حسام الدین راشدی۔

(5) تاریخ طاہری، ص ۲۰۴-۲۰۵ و تحفۃ الکرام ترجمہ اردو، ص ۲۴۸۔

(6) تحفۃ الکرام جدید فارسی ایڈیشن، ص ۱۶۲ حاشیہ نمبر ۳۔

الدین دیوان کو ایک کثیر لشکر کے ساتھ اپنے بیٹے میرزا غازی بیگ کے پاس جو ابھی بچہ ہی تھا روانہ کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ فرزند میرزا غازی بیگ کی اس طرح تربیت کریں کہ وہ صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد ایک پہر تک معلم سے تعلیم حاصل کرے، پھر وہ میری جگہ مسندِ حکومت پر بیٹھے اور جو اس کے قریب بیٹھنے کے لائق ہوں انہیں اپنے قریب بٹھائے، دوسرے اُمرا جو ہمارے سامنے کھڑے رہتے تھے، وہ اس فرزند کے سامنے بھی کھڑے رہیں، دوپہر تک وہ ہماری طرح انتظام میں مصروف رہے، دوپہر کے بعد دو گھڑی تک تیر اندازی کی مشق کرے اور دو گھڑی ان خاص بزرگ زادوں کے ساتھ جو اس کی صحبت میں رہتے ہوں، وقت گزارے، پھر نصف گھنٹہ آرام کرے اور دن کی چار گھڑی میں چوگان بازی میں مشغول ہو اور گھوڑے پر سوار ہو کر تیر اندازی کرے، منگل کے روز جو ہفتے کا نصف ہے صبح ہی ایک جمعیت کو ساتھ لے کر سوار ہو کر شکار کو جائے اور وہ اپنے اوپر ہر صبح کو لازم جانے کہ اپنی والدہ کے گھر پہنچ کر سلام اور ان کی دعاؤں کی برکت حاصل کرے، پھر وہ دیوان خانے میں آکر ظہر کی نماز تک ملک کا انتظام اس طرح کرے کہ غریب و مسکین آسودہ حال ہو کر دعا میں مشغول ہوں اور وہ ویرانی جو حالیہ انقلاب اور لڑائیوں کی وجہ سے رونما ہوئی ہے، آبادی اور سرسبزی وشادابی سے بدل جائے، خدا کرے کہ ایسا نہ ہو کہ خدا کی مخلوق اس سے ناراض ہو، اور ان کے دل سے بددعائیں نکلیں، چونکہ میں اپنے کیے ہوئے بعض ناشائستہ امور پر سخت نادم ہوں، اگر میں اپنے بزرگوں کے طریقے پر اپنے خاندانی ننگ و ناموس کی خاطر اور اپنی نیک نامی کے لیے کشش نہ کرتا، تو نہ معلوم مجھ پر اپنی کردارانہ غلطیوں اور لغزشوں کی وجہ سے اور کیا کیا مصیبتیں آتیں، خدا کا شکر ہے کہ ہمارا خاندانی ناموس اور وقار باقی رہا اور اس میں کسی قسم کا رخنہ نہیں پڑا۔[1]

جب یہ وکلا بکھر پہنچے، تو انہوں نے دیکھا کہ میرزا جانی بیگ کے اہل و عیال کو دولت خان لودھی نے پہلے فرمان کی بنا پر روانہ کر دیا ہے، وہ سب کے سب ان کو بکھر میں ملے، یہ انہیں لوٹا کر ٹھٹھہ لے گئے اور دولت خان کو دوسرے فرمان سے مطلع کیا اور اس کو فرمان شاہی کی بنا پر نئے انتظام سے واقف کرا کر اکبر کے حضور میں روانہ کر دیا اور پھر یہ سب کے سب اپنے وطن میں رہ کر اس کی آبادی میں مشغول ہو گئے۔

[1] تاریخ طاہری، ص ۲۰۵ تا ۲۰۷۔

وفات:

میرزا جانی بیگ آٹھ سال تک اکبر کی ملازمت میں رہا، جس زمانے میں اکبر دکن کی طرف متوجہ تھا، اور احمد نگر اور قلعہ اسیر کو فتح کر چکا تھا، تو یہ اکبر کے ساتھ ہی تھا، وہیں اس نے ۲۷ رجب ۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰ء) کو سرسام میں مبتلا ہو کر برہان پور میں وفات پائی،[2] تاریخ طاہری میں ہے کہ اُس کی بیماری کی علت شراب کی کثرت تھی،[3] طبقات اکبری میں ہے کہ وہ بچپن ہی سے شراب کا رسیا تھا، اور شراب نوشی حد سے زیادہ کرتا تھا۔ شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے بیمار ہوا اور رعشہ و سرسام میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔[4] ذخیرۃ الخوانین میں ہے کہ سنہ ۱۰۰۸ھ حضرت خلیفہ الٰہی (اکبر) تسخیر قلعہ اسیر کے لیے تشریف لے گئے، اور بہادر خان اسیری جنگ کے لیے آیا، آخر میں اُس نے اکبر سے صلح کر لی، میرزا جانی بیگ کو معلوم ہوا تو اُس نے کہا خدا کی قسم اگر اس قسم کا مضبوط قلعہ میرے پاس ہوتا اور اکبر خود اس کو فتح کرنے کے لیے آتا تو کبھی فتح نہ کر سکتا تھا، میں سو سال تک اکبر کی فوج کو پریشان رکھتا، بہادر بے غیرت تھا کہ اُس نے صلح کر لی۔ اس کی یہ بات اکبر کے کانوں تک پہنچ گئی اسی دن سے وہ اکبر کی نظر سے گر گیا، اس کے چند ہی روز بعد میرزا جانی بیگ نے وفات پائی۔[5]

اکبر کے فرمان کی بنا پر خواجہ محمد قور بیگی نے میرزا جانی بیگ کی نعش کو ٹھٹھہ پہنچایا جہاں وہ مکلی کے قبرستان میں مدفون ہوا۔

میرزا جانی بیگ کا مقبرہ آج بھی قبرستان مکلی ٹھٹھہ میں موجود ہے جو اُس دور کی نقاشی اور صنعت گری کا ایک بہترین نمونہ ہے، ایک چار دیواری کے وسط میں یہ مقبرہ ہشت پہلو بنا ہوا ہے، اس مقبرے میں چار قبریں ہیں اور ان پر کوئی کتبہ نہیں، دو قبروں کا سنگ مزار سنگ مرمر کا ہے، گمان ہے کہ پہلی قبر میرزا غازی بیگ کی اور دوسری میرزا جانی بیگ کی اور تیسری قبر میرزا شارخ برادر میرزا جانی بیگ کی ہے، مقبرے کے احاطے کی مغربی دیوار پر جس میں محراب ہے یہ آیت اور عبارت ایک

[2] تاریخ معصومی فارسی۔ ص ۲۵۷ میں اس کی وفات کی تاریخ کا سنہ ۱۰۰۸ھ بتایا گیا ہے، لیکن اس کے مقبرے کی مغربی دیوار پر جو کتبہ نصب ہے، اس میں ۲۷ رجب ۱۰۰۹ھ تحریر ہے۔

[3] تاریخ طاہری، ص ۲۰۸ بحوالہ طبقات اکبری، جلد ۳، ص ۷۸۲-۷۸۳۔

[4] تحفۃ الکرام فارسی جدید ایڈیشن، مصححہ سید حسام الدین راشدی، ص ۲۳۲۔

[5] تحفۃ الکرام جدید فارسی ایڈیشن، حاشیہ، ص ۱۶۵-۲۹۳۔

سطر میں مرقوم ہے:-

فنادته الملائکة وهو قائم یصلی فی المحراب،[1]

تاریخ میرزا جانی بیست و ہفتم ماہ رجب ۱۰۰۹ھ

میرزا جانی بیگ اگرچہ اپنے باپ کے زمانے ہی سے خود مختار تھا، لیکن اُس نے باپ کی وفات کے بعد، صرف گیارہ روز حکومت کی، ورنہ اُس کی حیثیت ایک مغل گورنر کی سی تھی، یہ ارغوان خاندان کا آخری حکمران تھا، جس پر ارغون حکومت کا آفتاب غروب ہوگیا اور جس کے بعد سندھ میں مغلوں کی حکومت کا پرچم لہراتا ہوا نظر آتا ہے۔

میرزا جانی بیگ کی حکومت پر تبصرہ:

میرزا جانی بیگ کی مجموعی مدتِ حکومت سولہ سال تھی، جس میں آٹھ سال اس کی خود مختارانہ حکومت کے ہیں اور آٹھ سال اس کی حکومت ایک امیر کی حیثیت سے رہی، محمد باقی جیسے ظالم فرمانروا کے بعد کہ جس کے مظالم سے سندھ کی سرزمین کانپ اٹھی تھی، اس کی حکومت آیہ رحمت نظر آتی ہے، اُس کی وہ کمزوریاں چھوڑ کر جن کا تذکرہ ہم گزشتہ اوراق میں کر آئے ہیں اور جس کا خود بھی اُس نے اپنے وکیلوں کو ٹھٹھہ بھیجتے ہوئے اقرار کیا ہے، ہمیں عوامی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے بعض اہم خوبیاں بھی نظر آتی ہیں، اُس نے زمامِ حکومت سنبھالتے ہی اپنے آباؤ اجداد کا وہ خزانہ جو زر و جواہر سے معمور تھا، رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیا، اُس کے زمانے میں ملک میں خوش حالی اور مرفہ الحالی پیدا ہوئی۔ اُس نے اُس دہشت اور خوف کو دور کر دیا جو میرزا محمد باقی کے مظالم کی وجہ سے پورے ملک پر چھایا ہوا تھا اور پورے ملک میں سکون و اطمینان کی فضا پیدا کی، ترخان نامہ میں ہے کہ:

--- مردم ولایت سند کہ ہر گز شبی از ترس میرزا محمد باقی بفراغت بخواب نرفتہ بود، در سلطنت ایں جواں بخت در مہاد امن و امان و راحت غنودند۔[2]

اس کی بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اہل علم اور اہل اللہ کی بڑی توقیر کرتا تھا اُس کے ذاتی اوصاف میں اس کا عزم، اس کی شجاعت اور اُس کی صاف گوئی قابلِ داد ہے۔ خانخاناں سے جس بہادری و شجاعت سے اُس نے مقابلہ کیا، اس کا تذکرہ گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے، وہ واقعہ کہ جس میں اُس نے خانخاناں کو یہ کہہ کر شرمندہ کر دیا کہ آپ اپنے حیلے کا خود اقرار کر رہے ہیں، اُس کی صاف گوئی کی بڑی دلیل ہے۔

سندھ کی تاریخ کے محقق سید حسام الدین راشدی نے تحفۃ الکرام (طبع راشدی) میں میرزا جانی بیگ کی شخصیت و سیرت و کردار کے متعلق تمام مؤرخین کی آراء یک جا کر دی ہیں۔ ہم اُن تمام آرا کو ذیل میں نقل کرتے ہیں کہ اُن سے میرزا جانی بیگ کی شخصیت، سیرت و کردار کے نقوش واضح طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں اور اُن سے ہمیں اس کی سیرت و کردار کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

مآثر رحیمی:

مآثر رحیمی میں ہے کہ:

میرزا جانی بیگ بن پایندہ محمد بن میرزا محمد باقی بن میرزا عیسیٰ بن عبدالعلی بن پایندہ محمد ترخانی بعد از پدر حکومت و ایالت سند و توابع باو قرار گرفت۔۔۔ و میرزا جانی عادل و باذل و نامدار ذو کامگار بود، و در زمانۂ او علما و فضلا از اطراف و جوانب بہ سند رو نہادند، رعایت کلی از و یافتند۔[3]

میرزا جانی بیگ بن پایندہ محمد بن میرزا محمد باقی بن میرزا عیسیٰ بن عبدالعلی بن پایندہ محمد ترخان کو اس کے باپ کی وفات کے بعد سندھ اور اس کے توابع کی حکومت ملی۔۔۔ میرزا جانی بیگ نہایت سخی، خرچ کرنے والا، نامدار اور کامیاب انسان تھا، اس کے زمانے میں بہت سے علما و فضلا اطراف و جوانب سے سندھ آئے اور انہوں نے اس کی رعایتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

بدایونی:

ملا عبدالقادر بدایونی (۱۰۰۳ھ) (در ذکر دین الٰہی) میں لکھتا ہے کہ "کفر شائع شد" تاریخ یافتند۔

تا کار بعد از دوازدہ سال بجائی رسید کہ اکثر مخاذیل چوں میرزا جانی بیگ حاکم تھتہ و دیگر اہل ارتداد خط خود نوشتہ دادند، باین مضمون، ہذہ صورت منکہ فلان بن فلاں بطوع

یہاں تک کہ بارہ سال کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ اکثر ذلیلوں نے جیسا کہ میرزا جانی حاکم ٹھٹھہ اور دوسرے اہل ارتداد ہیں، اپنی تحریر اس مضمون

---

(1) حواشی مکلی نامہ تالیف سید حسام الدین راشدی ص ۵۱۹

(2) ترخان نامہ - ص ۶۶-۶۵۔

(3) تحفۃ الکرام جدید فارسی ایڈیشن، ص ۲۴۰ بحوالہ مآثر رحیمی۔

رغبت و شوق قلبی از دینِ اسلام مجازی و تقلیدی که از پدران دیده و شنیده بود۔ ایرا و تبرا نمودم، و در دین الہیٰ اکبر شاہی در آمدم و مراتب چار گانہ اخلاص کہ ترک مال و جان و ناموس و دین باشد قبول کردم۔[1]

کی لکھ کر دی جو صورت یہ تھی کہ: میں فلاں بن فلاں رضا و رغبت و شوق قلبی کے ساتھ دین اسلام مجازی و تقلیدی سے کہ جو میں نے اپنے باپ دادا کا دیکھا اور سنا تھا اس سے براۃ و تبرا کرتا ہوں اور دین الہیٰ اکبر شاہی میں داخل ہوتا ہوں، اور مراتب چار گانہ اخلاص کہ جو ترک مال، ترکِ جان و ناموس دین ہیں، قبول کرتا ہوں۔

طاہری:

میر طاہر محمد نسیانی نے میرزا جانی بیگ کی سیرت و اخلاق کے جو نقائص لکھے ہیں، وہ ہم گزشتہ اوراق میں کہیں لکھ چکے ہیں، لیکن میرزا کی زندگی کے باب کو اس نے ختم کرتے ہوئے لکھا کہ:

بحسب فرمان حضرت خواجہ محمد قور بیگی نعش ایشان را در بلد تھتہ رسانید، مردم سپاہی و شہری کہ ہنوز از حادثۂ ماضی آرام و آسائش نیافتہ بودند، مضطرب و متفکر گشتند کہ بازچہ بلا و محنت بریں مردم رو خواہد آورد، ہر یک مرگ میرزا جانی مردن خود پنداشتہ چرا کہ در مقام ارغون و ترخان میرزا جانی مرحومی طبقہ حکومت یازدہ روز داشت، اما از ناموس و ننگ بہر رعایت رعیت و سپاہ چہ محنت کہ در جنگ ندیدہ، و چہ شدت کہ در ہجرت نکشیدہ، آخر جان در راہِ غریباں بدینساں کہ

حسب فرمان حضرت (اکبر) خواجہ محمد قور بیگی میرزا جانی بیگ کی نعش کو لے کر ٹھٹھہ پہنچا، ٹھٹھہ کے لوگ سپاہی ہوں کہ شہری کہ جو ابھی تک ماضی کے حادثوں سے سکوں حاصل نہ کر سکے تھے، مضطرب و متفکر ہوئے کہ اب پھر کون سی بلا و مصیبت ان پر نازل ہوگی، ہر ایک میرزا جانی کی موت کو اپنی موت سمجھتا تھا، اگرچہ ارغون اور ترخان فرمانرواؤں میں اس کی بالا ستقلال مدت حکومت گیارہ روز ہے، لیکن اس نے

مذکور گشت باخت[2]۔۔۔۔

رعیت اور سپاہ کی فلاح و بہبود کے لیے کون سی محنت ہے جو جنگ میں نہیں اُٹھائی، اور کون سی مصیبت ہے جو ہجرت میں برداشت نہیں کی، آخر جان غریبوں کے لیے جیسا کہ مذکور ہو چکا قربان کر دی۔

ذخیرۃ الخوانین:

۔۔۔ میرزا بصفاتِ حسنہ آراستگی داشت بسیار درویش دوست بود، سخی بود، و در تعظیم علما و فضلا، صلحا بسیار میکوشید، و در شجاعت و کرم یگانۂ آفاق بود، شعر متین میگفت، تخلص "حملی" داشت۔ چنانچہ غزل از و شہرتی عظیم دارد کہ قوالاں میخوانند، مطلعش ایں ست:

دلت گر مہرباں بودی چہ بودی
توانی ناتواں بودی چہ بودی
لب لعل تو آب زندگانی
بکام عاشقاں بودی چہ بودی[3]

میرزا (جانی بیگ) صفات حسنہ سے آراستہ تھا، بہت درویش دوست تھا، سخی تھا اور علما و فضلا و صلحا کی بہت تعظیم کرتا تھا، شجاعت و فیاضی میں یگانۂ روزگار تھا، شعر سنجیدہ کہتا تھا، شاعری میں "حلمی" تخلص استعمال کرتا تھا، اس کی ایک غزل بڑی شہرت رکھتی ہے، جسے قوال گاتے ہیں اس کا مطلع یہ ہے:

دلت گر مہرباں بودی چہ بودی
توانی ناتواں بودی چہ بودی
لب لعل تو آب زندگانی
بکام عاشقاں بودی چہ بودی

ریاض الشعرا:

صاحبِ ریاض الشعرا نے میرزا جانی بیگ کی حسب ذیل رباعی نقل کی ہے جو کسی دوسری جگہ نہیں دیکھی گئی۔

صبرے بمن و رحم باد، ہر دو بدہ
من زندگیش خواہم، داد مردنِ من

داد من و آں بہانہ بجوہر دو بدہ؟
یارب! تو مراد من و او ہر دو بدہ[4]

---

(1) منتخب التواریخ، جلد ۲، ص ۳۰۴۔

(2) تاریخ طاہری، ص ۲۰۸-۲۰۹۔

(3) تحفۃ الکرام جدید فارسی ایڈیشن، ص ۳۱۰ بحوالہ ذخیرۃ الخوانین، ص ۱۸۰-۱۸۱۔

(4) تحفۃ الکرام جدید ایڈیشن، ص ۳۱۱ بحوالہ ریاض الشعرا۔

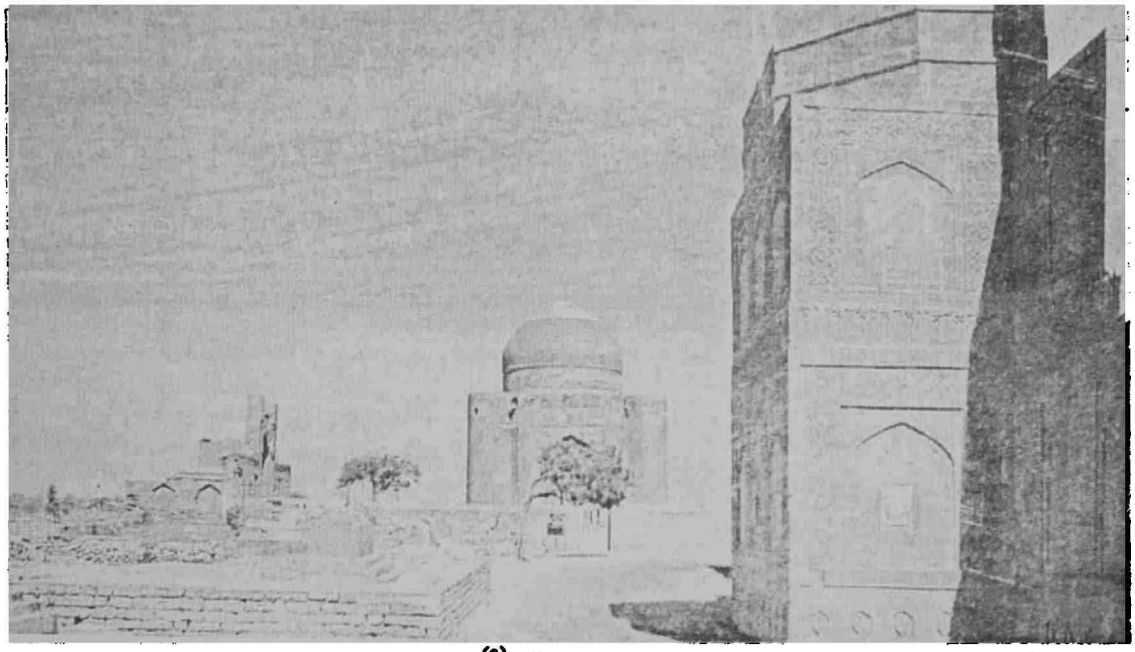

مقالات الشعرا:

صاحب مقالات الشعرا میں علی شیر قانع ٹھٹھوی نے میرزا جانی بیگ کے متعلق لکھا کہ: میں نے بزرگوں سے سنا کہ میرزا جانی جواں مردی و سخاوت سے اس قدر متصف تھا کہ سلاطین نامدار اس پر رشک کرتے تھے اور یہ چرچا عام تھا کہ کوئی سائل اس کے دروازے سے خالی ہاتھ نہیں جاتا، جو کچھ مانگتا ہے وہ پاتا ہے۔

مقالات الشعرا میں اس کے یہ شعر ملتے ہیں:

تخم دیگر بکف آریم و بکاریم زنو آنچہ کشتیم بخجالت نتواں کرد درو
خوش آں وقتیکہ عشق غم خوارم بود آہ شب و گریۂ سحر کارم بود
بد کردی چرخ ہیں کہ بامن بگزشت کالای غمی کہ زیب بازارم بود[1]

لیکن ساتھ ہی اس کے، تاریخ اس کے اس جرم کو معاف نہیں کر سکتی کہ اُس نے اپنی حکومت کو جاتے ہوئے دیکھ کر اس مقولے پر عمل کیا کہ "نہ تو کو نہ مو کو" ٹھٹھہ اور سندھ کے دوسرے شہروں کو جلانے اور ویران کرنے کا حکم دے کر خلق اللہ کو ایک مدت تک عذاب میں مبتلا کیا، اور لوگوں کو ان تباہیوں کی وجہ سے سخت پریشانی اٹھانی پڑی۔[2]

میرزا جانی بیگ کی اولاد:

میرزا جانی بیگ کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں، بیٹوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ میرزا غازی بیگ: جس کے حالات بحیثیت سندھ کے مغل گورنر کے آیندہ اوراق میں آئیں گے۔

۲۔ میرزا ابوالفتح اول: اس نے ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۲ء) میں وفات پائی، یہ امیر شاہ قاسم خان زمان بیگلار متوفی ۱۰۱۹ھ (۱۶۱۰ء) کی بیٹی کے بطن سے تھا۔

بیٹیوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ پیچہ یادگار بیگم: متوفی ۱۴ رمضان ۹۶۰ھ (۱۵۵۴ء)۔

۲۔ چوچک بیگہ: متوفی ۲۶ شعبان ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۳ء) مدفن: گورستان زنانہ میرزا عیسیٰ اول۔ مکلی۔

۳۔ لطیف بیگہ: متوفی ۱۴ ذیقعدہ، بروز دوشنبہ ۱۰۲۴ھ (۱۶۱۵ء) مدفن گورستان زنانہ میرزا عیسیٰ اول۔ مکلی۔

۴۔ ایک لڑکی: جو خسرو، جہانگیر کے بیٹے سے منسوب تھی۔[3]

---

(1) مقالات الشعرا، ص ۱۴۰-۱۴۴۔

(2) تاریخ طاہری، ص ۱۹۲۔

(3) میرزا جانی بیگ کے اولاد کی یہ تفصیل ترخان نامہ شجرۂ میرزا عیسیٰ ترخان اول مرتب سید حسام الدین راشدی سے ماخوذ ہے۔

باب :22

مغل گورنر

۱۰۰۰ھ (۹۲-۱۵۹۱ء) تا ۱۱۵۱ھ (۳۸-۱۷۳۷ء)

مغل گورنروں میں سید حسام الدین راشدی کی قائم کردہ ترتیب

اگرچہ ہم آئندہ اوراق میں مغل گورنروں کے حالات اسی ترتیب سے دیں گے جو ہمیں تحفتہ الکرام میں ملتی ہے، لیکن تاریخ سندھ کے محقق سید حسام الدین راشدی نے تحفتہ الکرام (طبع راشدی) کو ایڈٹ کرتے ہوئے نہایت ہی تحقیق وکاوش کے بعد تاریخی ماخذ سے مغل گورنروں کی آمد کی جو ترتیب قائم کی ہے ہم اس ترتیب کو بھی یہاں پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کی اس مرتب فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ کی تاریخ کے متعلق معلومات کس قدر آگے بڑھ چکی ہیں۔ یہ ٹھٹھہ کے گورنروں کا سلسلہ ہے۔ جسے انہوں نے عہد اکبری سے شروع کیا ہے۔ یہ حواشی انہوں نے تحفتہ الکرام فارسی، جلد ۳ کو ایڈٹ کرتے ہوئے طبقہ اُمرا سلاطین تیموریہ کے ضمن میں از صفحہ ۳۸۷ تا ۴۲۲ تک لکھے ہیں، مغل امرا کی یہ پوری ترتیب اور ان کے اجمالی حالات ان ہی حواشی سے ماخوذ ہیں۔

عہد اکبری (۱۰۰۰ھ - ۱۰۱۲ھ)

عہد اکبری میں جو گورنر (۱۰۰۰ھ ۱۰۱۲-ھ) تک مقرر ہوئے۔ ان کے ناموں کی تفصیل وترتیب اور ان کی آمد ورفت کی تاریخ۔ انہوں نے تحفتہ الکرام، جلد ۳ فارسی جدید ایڈیشن میں اس طرح دی ہے۔

نام گورنر	مدت حکومت	کیفیت
۱۔ دولت خان لودھی	(۱۰۰۰ھ تا ۱۰۰۲ھ)	فتح سندھ کے بعد خانخاناں نے اسے گورنر اور اپنا قائم مقام مقرر کیا تھا۔
۲۔ مرزا شاہ رخ بن میرزا ابراہیم وفائی	(۱۰۰۲ھ)	میں ٹھٹھہ کا گورنر مقرر ہوا لیکن جب خانخاناں کی کوششوں سے اکبر نے حکومت ٹھٹھہ کو میرزا جانی کے حق میں بحال کر دیا تو جانی بیگ نے خسرو چرکس کو حاکم ٹھٹھہ مقرر کر کے روانہ کیا۔ مرزا شاہ رخ نے ۱۰۱۶ھ میں وفات پائی۔
۳۔ خسرو چرکس	(۱۰۰۲ھ تا ۱۰۰۸ھ)	خسرو چرکس نے ترخانی حکومت ختم ہونے کے بعد اجمیر میں وفات پائی۔

عہدِ جہانگیری (۱۰۱۴ھ - ۱۰۳۷ھ)

۴۔ میرزا غازی بیگ ترخان	(۱۰۰۹ھ تا ۱۰۲۱ھ)	میرزا غازی نے ۱۰۲۱ھ میں وفات پائی۔
۵۔ میرزا احمد بیگ، نائب میرزا غازی بیگ	(۱۰۱۳ھ تا ۱۰۱۶ھ)	تک ان دونوں نے میرزا غازی کی نیابت کی۔

۶۔ ہندو خان، نائب میرزا غازی خان		میرزا غازی کے قندھار جانے کے بعد یہ اس کا قائم مقام ہوا۔
۷۔ خسرو خان چرکس، نائب میرزا غازی خان ۸۔ میرزا عبدالعلی ترخان	(۱۰۱۷ھ تا ۱۰۲۱ھ) (۱۰۲۱ھ)	میں خسرو چرکس نے اسے میرزا غازی کی وفات کے بعد بٹھایا میرزا رستم جب ٹھٹھہ کا گورنر ہو کر آیا تو اس نے خسرو چرکس، میرزا عبدالعلی اور دوسروں کو قید کر کے جہانگیر کے پاس اجمیر بھجوا دیا۔
۹۔ میرزا رستم قندھاری	(۱۰۲۲ھ تا ۱۰۲۳ھ)	یہ اپنے مظالم کی وجہ سے گورنری سے معزول ہوا۔
۱۰۔ تاج خان، تاش بیگ	(۱۰۲۳ھ)	میرزا رستم کی معزولی کے بعد فوجداری بکھر سے ٹھٹھہ کا گورنر ہو کر آیا اور ٹھٹھہ ہی میں اس نے وفات پائی۔
۱۱۔ ارسلان بیگ شمشیر خان اوزبک	(۱۰۲۳ھ تا ۱۰۲۵ھ)	یہ بھی فوجداری سیوستان سے تبدیل ہو کر ٹھٹھہ کی گورنری پر آیا۔ جب ۹ جلوس جہانگیری میں ٹھٹھہ کی صوبیداری مظفر خان معموری کو تفویض ہوئی تو یہ معزول ہو کر حضور میں آیا۔
۱۲۔ میر عبدالرزاق مظفر خان معموری	(۱۰۲۵ھ تا ۱۰۲۹ھ)	جہانگیر نے ۱۵ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ میں جبکہ وہ اجمیر میں تھا اسے ٹھٹھہ کا گورنر مقرر کیا اور یہ سید بایزید کے آنے تک ٹھٹھہ کا گورنر رہا۔ ۱۰۲۷ھ میں بھی حکومت ٹھٹھہ اسی کے پاس تھی۔
۱۳۔ مرزا شاہ بیگ ارغون خان دوران	(۱۰۲۸ھ)	میں یہ ٹھٹھہ کا گورنر مقرر ہوا، لیکن اپنی بعض ناگوار باتوں کی وجہ سے میرزا ابوالحسن کی نظروں سے گر گیا اور منصب و جاگیر ضبط کر کے بھیرہ خوشاب بھیج دیا گیا۔ پکا شرابی تھا اور نشے کو تیز کرنے کے لیے بھنگ، افیون اور کوکنار شراب میں ملا کر پیتا تھا۔
۱۴۔ سید بایزید بخاری، مصطفیٰ خان	(۱۰۲۹ھ تا ۱۰۳۵ھ)	یہ بکھر کا صوبیدار تھا، ۲۵ اردی بہشت ۱۰۲۹ھ میں جب کہ جہانگیر سری نگر میں تھا، ٹھٹھہ کا گورنر بنایا گیا۔ ۱۱ محرم ۱۰۳۵ھ میں سید بایزید نے ٹھٹھہ ہی میں وفات پائی اور یہ صوبہ شہریار کو عنایت ہوا۔
۱۵۔ سید ابراہیم بن بایزید بخاری	(۱۰۳۵ھ)	سید حسام الدین راشدی نے اس کے متعلق لکھا کہ گورنروں میں اس کا تذکرہ صرف تحفتہ الکرام میں ملتا ہے کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتا، ممکن ہے کہ یہ اپنے باپ کی وفات کے بعد شریف الملک کے ٹھٹھہ پہنچنے تک شہزادہ شہریار کا نائب رہا ہو۔
۱۶۔ شریف الملک	(۱۰۳۵ھ تا ۱۰۳۷ھ)	یہ شہزادہ شہریار کا ملازم تھا اور اس کے محالات جاگیر کا جو اکبر آباد میں تھیں فوجدار تھا۔ ۲۳ رمضان ۱۰۳۵ھ میں اس کے نائب کی حیثیت سے ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہو کر آیا۔
۱۷۔ میرزا ابوسعید	(۱۰۳۶ھ)	جہانگیر نے جلوس کے بائیسویں سال جب کہ وہ کشمیر پہنچا۔ ۳ رجب بروز یکشنبہ ۱۰۳۶ھ کے شروع میں اسے ٹھٹھہ کا فرمان حکومت دیا، لیکن یہ ٹھٹھہ پہنچنے نہ پایا تھا کہ جہانگیر نے وفات پائی اور شاہ جہاں نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنے اُمرا میں سے کسی کو ٹھٹھہ کا صوبیدار بنا کر بھیجا۔

عہدِ شاہجہانی

(۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۹ھ)

نام گورنر	مدت حکومت	کیفیت
۱۸۔ میرزا عیسیٰ ترخان ثانی	(۱۰۳۷ھ تا ۱۰۳۸ھ)	۱۸ ربیع الثانی ۱۰۳۷ھ کو شاہجہاں نے میرزا عیسیٰ ترخان ثانی کو ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر کیا اور یہ ربیع الاول ۱۰۳۸ھ تک ٹھٹھہ کا صوبیدار رہا۔
۱۹۔ سید بادشاہ خواجہ، شیر خواجہ باقی خاں	(۱۰۳۷ھ)	شاہ جہاں ۲۶ جمادی الاول ۱۰۳۷ھ میں آگرہ میں تخت نشین ہوا، اس نے اپنی تخت نشینی کے بعد بروز پنج شنبہ ۲ رجب ۱۰۳۷ھ میں سید بادشاہ خواجہ کے لیے حکومت ٹھٹھہ کا فرمان جاری کیا، یہ ٹھٹھہ پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے راستے میں وفات پائی۔ اس کے بعد اسی سال خواجہ باقی خاں مخاطب بہ شیر خواجہ خلعت و خنجر مرصع و اسپ و زین مطلا کے ساتھ صوبیداری ٹھٹھہ سے سرفراز ہوا۔ یہ بھی ٹھٹھہ نہ پہنچ سکا اور راستے میں وفات پائی۔
۲۰۔ مرتضیٰ خان، میر حسام الدین انجو	(۱۰۳۷ھ تا ۱۰۳۹ھ)	۲۲ رمضان المبارک ۱۰۳۷ھ کو خلعت و خنجر مرصع اور خطاب مرتضیٰ خان اور ہاتھی اور پچاس ہزار روپے کے انعام سے سرفراز ہو کر شیر خواجہ کی جگہ صوبیداری ٹھٹھہ پر بھیجا گیا۔ اس نے ٹھٹھہ ہی میں وفات پائی۔
۲۱۔ میر ابوالبقا امیر خان	(۱۰۳۹ھ تا ۱۰۴۱ھ)	میر ابوالبقا امیر خان کو ۱۸ ربیع الاول ۱۰۳۹ھ سے کچھ دن پہلے ٹھٹھہ کی حکومت کا فرمان جاری کیا گیا۔ میر ابوالبقا ۱۰۴۱ھ تک ٹھٹھہ کا صوبیدار رہا۔
۲۲۔ یوسف محمد خان تاشقندی	(۱۰۴۱ھ تا ۱۰۴۵ھ)	جلوس شاہجہانی کے پانچویں سال اصل و اضافہ منصب سہ ہزاری و دو ہزار سوار و عطائے نقارہ اور بیس ہزار روپے سے سرفراز کر کے ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا، پھر فوجداری بکھر پر مامور ہوا، فوجداری بکھر سے ۱۰۴۹ھ میں صوبیداری ملتان پر تبدیل ہوا، اور اسی سال اس نے وفات پائی۔
۲۳۔ دولت خان خواص خان مئی	(۱۰۴۵ھ تا ۱۰۵۰ھ)	یوسف محمد خان کے تبادلے کی وجہ سے دولت خان المخاطب بہ خواص خان مئی ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا اور ۱۰۵۰ھ تک یہ ٹھٹھہ کا صوبیدار رہا۔
۲۴۔ غیرت خان، خواجہ کامگار	(۱۰۵۰ھ)	یہ دولت خان کے تبادلے کی وجہ سے ۴ ربیع الاول ۱۰۵۰ھ کو ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا اور وہاں پہنچ کر اس نے اسی سال ۷ ذالحجہ ۱۰۵۰ھ میں وفات پائی اور مکلی میں مدفون ہوا۔
۲۵۔ مغل خاں، شادی بیگ، شجاعت خان، شاد خان	(۱۰۵۰ھ تا ۱۰۵۲ھ)	شاد خان بن جانش بہادر ۷ ذی الحجہ ۱۰۵۰ھ میں فوجداری بکھر سے غیرت خان صوبیدار ٹھٹھہ کی وفات کے بعد ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر کیا گیا، ۱۰۵۲ھ میں وہاں سے تبدیل ہو کر سیوستان گیا۔
۲۶۔ میر ابوالبقا امیر خان بار دوم	(۱۰۵۲ھ تا ۱۰۵۷ھ)	یہ دوسری مرتبہ ۴ ربیع الاول

		۱۰۵۲ھ کو دوبارہ ٹھٹھہ کا گورنر مقرر ہوا اور ۱۰۵۷ھ میں اس نے وفات پائی اور بکھر میں اپنے خاندانی قبرستان "صُفہ صفا" میں مدفون ہوا۔
۲۷۔ مغل خان	(۱۰۵۷ھ تا ۱۰۶۰ھ)	بن زین خان کوکہ جو دکن میں قلعہ دار تھا، امیر خان کی وفات کی وجہ سے ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا اور ۱۰۶۰ھ میں معزول ہوا۔
۲۸۔ عالمگیر	(یکم ذی الحجہ ۱۰۵۹ھ تا ۱۲ر رمضان ۱۰۶۲ھ)	یکم ذی الحجہ ۱۰۵۹ھ کو شاہجہاں نے جب کہ وہ لاہور میں تھا تو عالمگیر کو ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر کیا اور ملتان اور بکھر اس کی جاگیر میں دیا۔ اس طرح وہ دو سال آٹھ ماہ بارہ روز ٹھٹھہ کا صوبیدار رہا، یہ خود ٹھٹھہ نہیں آیا، بلکہ اس نے اپنے نائب بھیجے۔ ۱۲ر رمضان ۱۰۶۲ھ کو عالمگیر صوبیداری دکن کے لیے نامزد ہوا اور وہ لاہور سے سیدھا برہان پور پہنچا۔
۲۹۔ سعید خان بہادر، ظفر جنگ	(۱۰۶۱ھ)	عمل صالح سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل خان کی معزولی کے بعد سعید خان بہادر ظفر جنگ ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا۔
۳۰۔ جعفر خان عمدۃ الملک	(۱۰۶۱ھ)	اسی سال انتظام کابل کے لیے سعید خان ظفر جنگ کا تبادلہ صوبیداری ٹھٹھہ سے کابل ہوا اور اس کی جگہ یکم ربیع الاول ۱۰۶۱ھ میں جعفر خان عمدۃ الملک ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا۔
۳۱۔ مغل خان بن اعظم خان میر محمد باقر	(۱۰۶۱ھ)	اسی سال مغل خان بن اعظم خان میر محمد باقر صوبیداری ٹھٹھہ پر فائز ہوا۔
۳۲۔ سردار خان شاہجہانی	(۱۰۶۲ھ تا ۱۰۶۳ھ)	۱۰۶۲ھ میں مغل خان بن اعظم خان کے تبادلے کی وجہ سے ٹھٹھہ کا صوبیدار بنا کہ بھیجا گیا، لیکن اس نے اثناء راہ میں ۱۰۶۳ھ میں وفات پائی اور ٹھٹھہ نہیں پہنچ سکا۔
۳۳۔ ظفر خان احسن	(۱۰۶۳ھ تا ۱۰۶۷ھ)	سردار خان کی وفات کے بعد ظفر خان احسن بن خواجہ ابوالحسن تربتی اصل و اضافہ منصب سہ ہزاری دو ہزار سوار کے ساتھ ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا، ٹھٹھہ میں "مشکیں باغ" اسی کا تعمیر کیا ہوا ہے، یہ عہد شاہجہانی کا آخری صوبیدار تھا جو ٹھٹھہ پر مقرر ہوا۔

عہد اورنگزیب عالمگیر

(۱۰۶۹ھ تا ۱۱۱۸ھ)

نام گورنر	مدت حکومت	کیفیت
۳۴۔ قباد بیگ اوزبک، میر آخور، غضنفر خان	(۱۰۶۷ھ تا ۱۰۷۰ھ)	عالمگیر اورنگزیب نے اسے ۵ ماہ محرم ۱۰۶۷ھ کو جب کہ وہ دریائے بیاہ کے کنارے سلطان پور میں منزل انداز تھا صوبیدار ٹھٹھہ مقرر کر کے ٹھٹھہ بھیجا، یہ ۲۶ صفر ۱۰۶۷ھ میں ٹھٹھہ پہنچا اور ۹ر رمضان ۱۰۷۰ھ میں اس کا تبادلہ ٹھٹھہ سے ہوا۔ یہ عالمگیر کی طرف سے پہلا صوبیدار تھا جو ٹھٹھہ پر مقرر ہوا۔

۳۵۔ لشکر خان، یادگار	(۱۰۷۰ھ تا ۱۰۷۴ھ)	لشکر خان بن زبردست خان ۹ رمضان ۱۰۷۰ھ کو قباد خان کے تبادلے کی وجہ سے ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا اور یکم شعبان ۱۰۷۵ھ میں معزول ہو کر وہ بارگاہ سلطانی میں پہنچا اور عنایت و خلعت سے سرفراز ہوا۔
۳۶۔ غضنفر خان بن الہ وردی خان	(۱۰۷۴ھ تا ۱۰۷۷ھ)	لشکر خان کے بعد عالمگیر نے غضنفر خان کو منصب سہ ہزاری سے سرفراز کر کے ٹھٹھہ کی صوبیداری پر بھیجا اس نے ۱۰۷۷ھ میں ٹھٹھہ ہی میں وفات پائی۔
۳۷۔ عزت خان سید عبدالرزاق گیلانی	(۱۰۷۷ھ تا ۱۰۸۰ھ)	غضنفر خان کے بعد عزت خان ۱۰۷۷ھ میں ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہو کر آیا اور ۱۰۸۰ھ تک ٹھٹھہ کا صوبیدار رہا۔
۳۸۔ ابو النصر خان شائستہ خان	(۱۰۸۰ھ تا ۱۰۸۲ھ)	یہ ۱۰۸۲ھ تک ٹھٹھہ کا صوبیدار رہا۔
۳۹۔ سعادت خان	(۱۰۸۲ھ؟)	اس کی صوبیداری ٹھٹھہ کا ذکر صرف تحفتہ الکرام میں ہے۔
۴۰۔ کفایت خان	(۱۰۸۲ھ؟)	خافی خان نے لکھا ہے کہ عالمگیر نے شاہزادہ محمد سلطان کو ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر کر کے اسے حکم دیا کہ وہ کفایت خان کو اپنا نائب مقرر کر کے اسے ٹھٹھہ روانہ کرے، اسی سال شاہزادہ محمد سلطان نے وفات پائی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کفایت خان ٹھٹھہ گیا یا نہیں۔
۴۱۔ عزت خان، سید عبدالرزاق گیلانی بار دوم	(۱۰۸۴ھ تا ۱۰۹۰ھ)	تحفتہ الکرام میں ہے کہ یہ دوسری مرتبہ ۱۰۸۴ھ میں ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہو کر آیا اور چھ سال یعنی ۱۰۹۰ھ تک ٹھٹھہ کا صوبیدار رہا۔
۴۲۔ خانہ زاد خان	(۱۰۹۰ھ تا ۱۰۹۵ھ)	معلوم نہیں کہ یہ خانہ زاد خان کون تھا، خیال ہے کہ یہ خانہ زاد خان حمید الدین ولد میرزا ابو سعید بن محمد شریف بن اعتماد الدولہ تہرانی ہو گا، جو جلوس عالمگیری کے پہلے سال خانہ زاد خان کے خطاب اور کابل کی قلعہ داری سے سرفراز ہوا، ممکن ہے کہ وہاں سے تبدیل ہو کر ٹھٹھہ کی صوبیداری پر آیا ہو۔
۴۳۔ سردار خان	(۱۰۹۵ھ تا ۱۰۹۸ھ)	معلوم نہیں کہ یہ سردار خان کون سا ہے کیونکہ اس زمانے میں تین سردار خان تھے۔
۴۴۔ مرید خان	(۱۰۹۹ھ تا ۱۱۰۱ھ)	یہ نو مسلم تھا، اس نے جلوس عالمگیری کے تیسرے سال اسلام قبول کیا اور منصب اور مرید خان کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ لغت بہار عجم کا مؤلف ٹیک چند بھی جو شاعر تھا، مرید خان کے ہمراہ ٹھٹھہ آیا تھا۔
۴۵۔ زبردست خان	(۱۱۰۱ھ)	یہ متعین نہیں ہو سکا کہ یہ زبردست خان کون تھا کیونکہ عہد عالمگیری میں تین امیر اس لقب سے ملقب تھے۔ ممکن ہے کہ یہ زبردست خان نبیرۂ سعید خان بہادر ظفر جنگ ہو جو ۱۱۰۱ھ میں ٹھٹھہ کا گورنر ہو کر آیا اور اسی سال اس نے ٹھٹھہ میں وفات پائی، یہ اپنے جد نواب سعید خان کے لقب سے بھی ملقب تھا۔ شرف الدین شرف اور مظہر یہ دونوں ہندی کے شاعر اس کے ساتھ ٹھٹھہ آئے تھے۔

۴۶۔ ابو نصر خان شائستہ خان (بار دوم)	(۱۱۰۱ھ تا ۱۱۰۳ھ)	یہ دوسری مرتبہ ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہو کر آیا اور بقول قانع کہ اس نے دو سال اور چند ماہ بحیثیت صوبیدار کے ٹھٹھہ میں گزارے۔
۴۷۔ نواب حفظ اللہ خان بن سعد اللہ خان وزیر	(۱۱۰۳ھ تا ۱۱۱۲ھ)	یہ ۱۱۰۳ھ میں ٹھٹھہ اور سیوستان کا صوبیدار ہو کر آیا اور اس نے ۱۱۱۲ھ میں وفات پائی۔
۴۸۔ سعید خان، خان زاد خان محمد رشید بن عبد اللہ سعید خان صاحب بھکر	(۱۱۱۲ھ تا ۱۱۱۴ھ)	یہ ۱۱۱۲ھ میں ٹھٹھہ اور سیوستان کی صوبیداری پر آیا، یہ خود تو سیوستان میں رہا اور اپنے بیٹے ارشد خان کو ٹھٹھہ بھجوایا۔
۴۹۔ میر امین الدین خان حسین بن سید ابو المکارم شہود	(۱۱۱۴ھ تا ۱۱۱۵ھ)	یہ سعید خان کے بعد ۱۱۱۴ھ میں ٹھٹھہ کا صوبیدار ہو کر آیا۔
۵۰۔ یوسف خان تری (ترین)	(۱۱۱۵ھ تا ۱۱۱۶ھ)	
۵۱۔ احمد یار خان برلاس	(۱۱۱۶ھ تا ۱۱۱۸ھ)	اس نے ۱۱۱۸ھ میں وفات پائی۔
	بعد وفات عالمگیر	
عہد اعظم شاہ	(۱۱۱۸ھ)	
عہد کام بخش	(۱۱۱۹ھ)	
عہد شاہ عالم بہادر شاہ	(۱۱۱۹ھ تا ۱۱۲۴ھ)	
۵۲۔ سعید خان عطر خان بن محمد رشید سعید خان	(۱۱۱۹ھ تا ۱۱۲۱ھ)	یہ شاہ عالم بہادر شاہ کے حکم سے ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا۔
۵۳۔ مہین خان	(۱۱۲۱ھ تا ۱۱۲۲ھ)	
۵۴۔ شاکر خان	(۱۱۲۳ھ تا ؟)	
۵۵۔ مہین خان (بار دوم)	(۲۱ محرم ۱۱۲۴ھ)	۲۱ محرم ۱۱۲۴ھ میں شاہ عالم نے لاہور میں وفات پائی۔

عہدِ حکومت معز الدین جہاندار شاہ (۱۱۲۴ھ) و محمد فرخ سیر (۱۱۲۴ھ تا ۱۱۳۱ھ)

نام گورنر	مدت حکومت	کیفیت
۵۶۔ خواجہ محمد خلیل	(۱۱۲۴ھ)	جہاندار شاہ نے نو ماہ حکومت کر کے وفات پائی۔ خواجہ خلیل کی ٹھٹھہ میں آمد کی تاریخ کسی شاعر نے معدلت کعبہ راہنا کردہ۔ (۱۱۲۴ھ) سے نکالی۔
۵۷۔ عطر خان غیاث الدین	(۱۱۲۴ھ تا ۱۱۲۵ھ)	۱۱۲۴ھ میں عطر خان ٹھٹھہ کا صوبیدار ہوا، ۱۱۲۶ھ میں وہیں وفات پائی۔
۵۸۔ لطف علی خان، شجاعت علی خان، میر محمد شفیع	(۱۱۲۵ھ تا ۱۱۲۸ھ)	
	بعد وفات فرخ سیر	
عہد رفیع الدرجات، رفیع الدولہ، نیکو سیر، ابراہیم	(۱۱۳۱ھ)	
۵۹۔ اعظم خان بن محمد صالح فدائی خان	(۱۱۲۸ھ تا ۱۱۳۲ھ)	

۶۰۔ مہابت خان بہادر، غالب جنگ	(۱۱۳۲ھ تا ۱۱۳۴ھ)	اس نے ٹھٹھہ میں وفات پائی اور اس کی نعش لاہور لے جائی گئی۔
۶۱۔ سلطان محمود خان	(۱۱۳۴ھ تا ۱۱۳۵ھ)	سلطان محمود خان اپنے باپ کا جانشین ہوا اور رضی محمد خان بحیثیت نائب کے اس کی جگہ تمام صوبیداری کا کام انجام دیتا تھا، یہاں تک کہ (۱۱۳۵ھ) میں سیف اللہ خان ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا اور اس کا نائب عبدالسمیع خان ہوا۔
۶۲۔ عبدالسمیع خان	(۱۱۳۵ھ تا ۱۱۳۷ھ)	برادر شاہ عبدالغفور ہالائی سیف اللہ خان کا نائب ہو کر ٹھٹھہ پہنچا۔
۶۳۔ سیف اللہ خان	(۱۱۳۷ھ تا ۱۱۴۲ھ)	یہ فرخ سیر بادشاہ کے اُمرائے کبار میں تھا۔ ماہ ذی الحجہ (۱۱۳۷ھ) میں ٹھٹھہ کا صوبیدار ہو کر آیا اور ۹ ذیقعدہ (۱۱۴۲ھ) کو ٹھٹھہ ہی میں اس نے اپنی صوبیداری کے زمانے میں وفات پائی۔
۶۴۔ دلیر خان، معین الدولہ بہادر نصیر جنگ	(۱۱۴۳ھ تا ۱۱۴۵ھ)	
۶۵۔ محمد اسحاق، عمدۃ الملک، امیر خان، انجام۔	(۱۱۴۵ھ)	دلیر خان معین الدولہ کے تبادلے کی وجہ سے صوبہ ٹھٹھہ امیر خان انجام کو جاگیر میں دیا گیا اور اس کی نیابت کے لیے ہمت دلیر خان پسر دلیر دل خان (۱۱۴۵ھ) میں ٹھٹھہ پہنچا اور ٹھٹھہ کو اجارہ پر امیر خان سے لے لیا۔
۶۶۔ ہمت دلیر خان	(۱۱۴۵ھ تا ۱۱۴۹ھ)	اس کے پاس ٹھٹھہ بطور اجارہ کے تھا۔ (۱۱۴۷ھ) میں ہمت دلیر خان نے بحیثیت اجارہ دار ٹھٹھہ ہی میں وفات پائی۔
۶۷۔ صادق علی خان (آخری صوبیدار مغلیہ حکومت)	(۱۱۴۹ھ تا ۱۱۵۱ھ)	ولد سیف اللہ خان، یہ امیر خان انجام کی طرف سے اجارہ دار ہو کر ٹھٹھہ آیا لیکن نقصان اٹھایا اور اس نے (۱۱۵۱ھ) میں شیخ غلام محمد ولد شیخ عزیز اللہ وکیل خدایار خان (نور محمد خان عباسی کلہوڑہ) کو ٹھٹھہ اجارے پر دے دیا۔

باب :23

ٹھٹھہ کے مغل گورنروں کے حالات وترتیب

میر علی شیر قانع کی کتاب تحفتہ الکرام سے

عہد اکبری

(۱۰۰۰ھ تا ۱۰۱۲ھ)

(۱)

میرزا غازی بیگ ترخان:

میرزا جانی بیگ کی وفات کے بعد بقول میر معصوم علامی ابوالفضل کی سفارش پر اور بقول صاحب ترخان نامہ نواب خانخاناں کی سفارش پر میرزا غازی اکبر کی جانب سے اپنے باپ کے منصب پر غائبانہ فائز ہوا، سید حسام الدین راشدی نے "میرزا غازی ترخان" میں اس تقرر کی تفصیلات دیتے ہوئے لکھا کہ:

میرزا جانی کا انتقال ۲۷ رجب سال ۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰ء) میں برہان پور میں ہوا اور اس کی میت ٹھٹھہ لاکر دفن کی گئی، میرزا غازی انتقال کے بعد بقول مآثر رحیمی: شاہ قاسم ارغون کہ امیر الامرا تھا، اور خسرو خان چرکس ممالیک میرزا جانی بیگ تھا اور میرزا جانی بیگ کی وکالت کا منصب اس سے متعلق تھا، ان دونوں اراکین حکومت اور دوسرے اعیان سندھ نے متفق ہو کر میرزا غازی بیگ کو جس کی عمر چار سال (؟) کی تھی، مبارک گھڑی میں تخت سلطنت پر بٹھایا۔

پھر مآثر رحیمی کا مؤلف لکھتا ہے کہ میرزا غازی کے حق میں اکبر بادشاہ کی طرف سے بھی حکم صادر ہوا۔

در برھان پور نیز خلیفتہ اللہی فرمان واجب الاذعان بنام میرزا غازی عنایت نمودند کہ بدستور میرزا والی سند بودہ باشد۔	برہان پور میں بھی خلیفہ الٰہی (اکبر بادشاہ) میرزا غازی بیگ کے نام فرمان واجب الاذعان عنایت کیا کہ بدستور میرزا سندھ کا والی ہو۔

نیز حکم ہوا کہ یہ فرمان بابا طالب اصفہانی بطور ایلچی ٹھٹھہ لے جائے، اور میرزا غازی اور اس کے اُمرا کو نوازشات اور عنایات شاہی سے سرفراز کرے، اور واپسی میں میرزا غازی کو اپنے ساتھ لیتے آئے، تاکہ نوجوان حاکم اپنے بادشاہ کی آستاں بوسی سے معزز و مکرم ہو۔ صاحب اکبر نامہ نے ۱۰۰۹ھ کے واقعات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

گیتی خداوند از قدر دانی الکائے اورا بہ پور او، میرزا غازی باز گزاشت۔	خداوند گیتی نے از راہ قدر دانی اس کی جاگیر اس کی اولاد میرزا غازی پر واگزاشت کی۔

مختصر یہ ہے کہ میرزا غازی ۹۹۵ھ سے ۹۹۷ھ تک کسی سال میں پیدا ہوا، اکبری قبضہ ہونے کے وقت اس کی عمر چار پانچ سال کی تھی اور تیرہ یا چودہ سال کی عمر میں وہ اپنے باپ کی جگہ گورنر مقرر ہوا۔[1] جن اُمرا نے اسے لڑکپن میں دیکھا تھا اور وہ اس کی اس کے باپ اور بھائی کے زمانے میں اس کی عزت نہ کرتے تھے، انہوں نے اس کے بھائی ابوالفتح کی زندگی میں اپنی تنگ نظری کا یہ ثبوت دیا تھا کہ ایک دن میرزا اپنے بھائی کے ساتھ سوار تھا، لیکن انہوں نے اس کو اتنا حقیر سمجھا کہ وہ اس کے بھائی کی تعظیم و توقیر میں اُسے پیچھے چھوڑ گئے اور انہوں نے اس کی ذرا بھی پروانہ کی، میرزا غازی ان کے اہانت آمیز رویے سے بے حد متاثر اور رنجیدہ ہوا اور اس نے بچپن ہی میں عہد کیا تھا کہ اگر خدائے تعالیٰ نے اسے امارت و حکومت سے نوازا تو میں ان طوطا چشموں سے اس اہانت اور بے آبروئی کا انتقام لوں گا، چنانچہ جب اپنے بھائی کی وفات کی وجہ سے

---

(۱) غازی بیگ ترخان، تالیف سید حسام الدین راشدی، بحوالہ مآثر رحیمی، جلد ۲: ص ۲۴۹-۳۵۰ و اکبر نامہ، جلد ۳: ص ۷۸۲۔

اسے حکومت ملی، تو یہی طوطا چشم اور ابن الوقت اس کی خوشامد و چاپلوسی میں مصروف ہوگئے، یہ بھی ان کے ساتھ ظاہر داری برتنے لگا، لیکن وہ اس فکر میں لگا ہوا تھا کہ مناسب موقع و محل سے وہ ان اُمرا سے انتقام لے گا۔[1]

یعقوب علی کوکہ کو تنبیہ:

چنانچہ سب سے پہلے اس نے یعقوب علی کوکہ لنگ کو جو میرزا کو اپنی معلمی کے زمانے میں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتا تھا اور میرزا جس کسی کو بھی خلعت دیا کرتا تھا تو وہ میرزا کے پیٹھ پھیرتے ہی یہ خلعت اس سے چھین لیتا۔ اور پھر دس حصوں میں سے ایک حصہ بڑے حیلے حوالوں سے اس کو واپس کرتا اور باقی خود ہڑپ کر جاتا تھا، میرزا نے سب سے پہلے اس نقطۂ نظر سے کہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو، اس کی جاگیر ضبط کر کے مُلا یعقوب کو دے دی، جو کہ سن میں اس کے مکتب کا پیش امام تھا، وہ چاہتا تھا کہ اہم تبدیلیاں کرے۔ مگر چونکہ ابھی تک اس کی حکومت کا نظم و نسق مضبوط نہیں ہوا تھا تو وہ فوری طور پر ان امرا کے عزل و نصب کو خلافت مصلحت سمجھتا تھا، جو پہلے سے حکومت کا ستون بنے ہوئے تھے، وہ بظاہر اپنے باپ کے وکیلوں اور اُمرا پر مہربانیاں کرتا رہا، لیکن ساتھ ہی اس نے ترکیب یہ کی کہ خفیہ اور غیر محسوس طریقے پر وہ اپنے خاص آدمیوں کی بھی سرپرستی کرنے لگا اور لطف یہ ہے کہ یہ سب کام بھی اس نے ان جنفادری اُمرا کے مشورے سے کیا کہ جو پہلے سے امارت و حکومت کا ستون بنے ہوئے تھے، اس نے ایک روز ان قدیم اُمرا سے کہا کہ اگر تم اجازت دو اور خوشی سے راضی ہو تو میں چند نئے لوگوں کو اپنی ملازمت میں منسلک کر کے ان کو خطاب و منصب سے سرفراز کروں، چونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ میرزا کے رویے میں ان کے ساتھ کوئی فرق نہیں آیا ہے اور بظاہر ان پر اس کی نوازشیں دگنی ہیں، انہوں نے میرزا کی اس خواہش میں اپنا کوئی نقصان نہ دیکھ کر فوراً اس کو منظور کر لیا، انہیں کیا معلوم تھا کہ اس کی یہ کوششیں ایک خاص مقصد کے لیے ہیں اور وہ شہبازی کو منصب و خطاب سے سرفراز کر کے اپنا معتمد خاص بنانا چاہتا ہے۔[2]

شہبازی کی مدار المہامی:

اس طرح سے اس نے اپنے قدیم اُمرا کو مطمئن کر کے، بلا امتیاز قدیم اور جدید ملازموں کے منصب اور ماہانہ میں اضافہ کیا، جس سے تمام لوگ خوش ہوگئے۔ ان میں سے اکثر کو سلطانی کا خطاب مرحمت کر کے مزید نوازشوں کا امیدوار بنایا۔

سب سے پہلے اس نے "شہبازی" کو جو کتوں اور کبوتروں کی نگہبانی کرتا تھا۔ پھر مرغوں کا نگہبان اور آبدار مقرر ہوا تھا، "شہباز خان" کا خطاب دے کر مدار المہام بنا دیا، اگرچہ یہ شخص اپنے آپ کو ارغون کہتا تھا، لیکن اس کا لین دین، نشست و برخاست، شجاعت و بہادری، مردم شناسی اور بات کو سمجھنا اس میں ارغونوں کی طرح نہ تھا، میرزا غازی جو اس سے توقعات رکھتا تھا، وہ پوری نہ ہوئیں، یہ چند روز مدار المہام رہا، لیکن میرزا کے حسب منشا ملک کے نظم و نسق کو نہ چلا سکا، میرزا کو اپنی اس غلط بخشی پر افسوس تھا وہ اب بھی اس فکر میں تھا کہ اگر کوئی قابل آدمی اس کو مل جائے تو وہ ملک اور اس ملکیت کا جو اسے اپنے باپ سے ملی تھی انتظام اس کے سپرد کر دے اور اپنے باپ کے پرانے وکلا گرگ باراں دیدہ سے نجات حاصل کرے جو اپنی کم عقلی کی وجہ سے اسے بچہ سمجھتے تھے اور اُسے نظر میں نہ لاتے تھے۔[3]

اس کے باپ کے وکلا جو خالصہ کے علاقے پر اب تک قبضہ جمائے ہوئی تھے، ان کا یہ عالم تھا کہ میرزا کے ہاتھی اور گھوڑے بھوکے مرتے تھے، لیکن وہ اپنے علاقوں میں انہیں چرنے کے لیے داخل نہ ہونے دیتے تھے، ان وکلا کے توہین آمیز رویے کا یہ عالم تھا کہ وہ میرزا غازی کو ایک طفل نادان سمجھ کر قابلِ التفات نہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے کچھ نہیں ہو سکے گا، میرزا غازی کے مقابلے میں ان کی رعونت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایک روز عرب کوکہ میرزا جانی بیگ کی مزار کی زیارت کے لیے مکلی جا رہا تھا، اس نے میرزا غازی کو سواری پر آتے ہوئے دیکھا تو فوراً راستہ کترا کر مسجد میں نماز کے بہانے سے بیٹھ گیا، میرزا غازی نے حیرت سے پوچھا کہ یہ کون سی فوج کا سوار تھا جو اس طرح مجھ سے کترا کر گزر گیا اور میرے سامنے نہیں آیا، جاسوسوں نے بتایا کہ یہ عرب کوکہ تھا۔[4]

بہائی خاں اور مُلا گدا علی جنہیں میرزا جانی بیگ نے دکن سے وکیل بنا کر بھیجا تھا، وہ رعونت و نخوت میں اس قدر سرشار تھے کہ وہ مطلقاً ملک کے انتظام میں دخل نہ دیتے، ان کا خیال تھا کہ میرزا غازی ایک طفل

---

(1) تاریخ طاہری، ص ۲۱۱۔

(2) تاریخ طاہری، ص ۲۱۱-۲۱۲۔

(3) تاریخ طاہری، ص ۲۱۳-۲۱۴۔

(4) تاریخ طاہری، ص ۲۱۵۔

نادان ہے، اس کے بے ڈھنگے کاموں کے جھگڑوں میں کون پڑ کر اپنی عمر عزیز ضائع کرے۔[1]

میر احمد بیگ کا مختار عام کی حیثیت سے تقرر:

ان نامساعد حالات کو دیکھ کر میر زاغازی بیگ نے احمد بیگ کو مختار عام بنایا اور حکم دیا کہ میں نے تم کو تمام معاملات امور ملکی و مالی کا اہل سمجھ کر ملک کے تمام کلی و جزوی امور تمہارے سپرد کیے ہیں، تم اس طرح ملک کا انتظام کرو کہ عیب جویوں کو تم پر اُنگلی اُٹھانے کا موقع نہ ملے اور ان سے اس طرح حساب فہمی کرو کہ یہ شرمسار اور شرمندہ ہوں۔

احمد بیگ نے کہا کہ اگر آپ کا سایۂ اقبال مجھ پر ہوگا اور آپ کی توجہ میرے شامل حال رہے گی تو میں ملک کا انتظام اس طرح کروں گا کہ رعایا اور سپاہی خوش حال اور خزانہ روپے سے معمور ہوگا آپ میرے انتظام کو دیکھ کر مجھے آفریں کہیں گے اور یہ سلطنت کے دشمن جو آج تانا شاہی چلا رہے ہیں، اپنے کیے کی مناسب سزا پائیں گے اور انشاء اللہ تعالیٰ ان بدگمان بے اعتقادوں کو زمانہ اس طرح پچھاڑے گا کہ یہ اپنے کیے پر منفعل اور شرمندہ ہوں گے، بشرطیکہ آپ میرے خلاف عرضی دینے والوں کی شکایتوں پر کان نہ دھریں، جب تک کہ وہ شکایتیں تحقیق سے ثابت نہ ہوں اور ایک تحریر مجھے اپنے دستخطوں سے اس مضمون کی عنایت فرمائیں کہ میرے نظام میں کوئی دوسرا دخل نہ دے گا۔[2]

میر زاغازی نے احمد بیگ کی تمام باتیں مان لیں اور تمام معاملاتِ ملکی اس کے سپرد کر کے، اپنے اس محل میں جو اس نے نیا بنوایا تھا، اپنے ندیموں کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے لگا۔

اب احمد بیگ نے رفتہ رفتہ تمام ملکی معاملات کو درست کیا، پھر اس نے ضابطے میں پروانجات مہر اور دستخط ثبت کرانے کے لیے ان وکلا کے پاس بھیجے جو بھیڑیوں کی طرح قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ جب یہ کاغذات ان کے پاس پہنچے تو یہ خوابِ خرگوش سے بیدار ہوئے اور انہیں اپنی اپنی فکر پیدا ہوئی۔ مصلحت شناسی کی بنا پر ان میں سے اکثر خاموش رہے، لیکن بہائی خان سخت برہم ہوا۔ اس نے کہا اب ان لڑکوں نے ہمیں بالکل بیکار اور فضول سمجھ لیا ہے اور ہم پر اپنی حکومت کی دھونس جمانے لگے ہیں، اگر یہی رفتار رہی تو کل ان میں یہ جرأت پیدا ہو جائیگی کہ یہ ہمارے سروں پر کوئی نئی بلا لائیں گے۔ اس لیے انہیں ابھی سے ادب سکھانے کی ضرورت ہے تاکہ پھر وہ اس قسم کی حرکت نہ کر سکیں۔

چنانچہ بہائی خان غصے میں وہ کاغذات لے کر دیوان میں آیا، جب میر زاغازی دوسرے معاملات سے فارغ ہو گیا تو اس نے اس معاملے کو پیش کرتے ہوئے میر زاغازی سے احمد بیگ کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا کہ لوگ اب اس قدر دلیر اور جری ہو گئے ہیں کہ ملک کے اہم معاملات میں بغیر ہم سے مشورہ کیے ہوئے مدار المہام بن بیٹھے ہیں، اور ان میں اتنی جرأت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اب ہمیں خاطر میں بھی نہیں لاتے، وہ میدان کو خالی سمجھے ہوئے ہیں، لیکن وہ اپنے کیے پر سخت شرمندہ ہوں گے۔[3]

میر زاغازی بیگ نے جو نہایت ہی مدبر و معاملہ شناس تھا، بہائی خان کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں نے یہ اس کے حکم سے کیا ہے کہ جس کا حکم ماننے بغیر مجھے اور تمہیں کوئی چارہ نہیں، اگر اس حکم کے ماننے سے تمہیں انکار ہے تو صاف صاف اور کھل کر کہو اور اگر اس کے حکم ماننے میں تامل نہیں تو یہ شور و شغب فضول ہے وہ اس ملک کا والی ہے، اسے اختیار ہے جو چاہے کرے، آج اس نے یہ حکم دیا ہے، کل اس سے بہتر کوئی حکم اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے دے گا۔[4]

میر زاغازی کی اس گفتگو کو سن کر بہائی خان کے غصے پر پانی پڑ گیا، لیکن وہ اس گفتگو کے بعد بھی اس خودسری کی بنا پر جو بہت عرصے سے اس کے دماغ میں بسی ہوئی تھی کہتا پھرتا تھا کہ میر زا ایک نادان لڑکا ہے۔ وہ انتظام ملک کو کیا جانے، ملک کا انتظام تو ہم سے متعلق ہے۔ اس کے باپ نے اس کو اور اس ملک کی ولایت کو ہمارے سپرد کیا تھا اور کہا تھا کہ جس چیز میں تم اس خاندان کی بھلائی دیکھو وہ کرو، اب کیا اس کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ ملک کے انتظام کو درہم برہم کرے۔[5]

احمد بیگ نے جب یہ سنا تو اُس نے اسے کہلا کر بھیجا کہ یہ ملک اُس کی میراث ہے، تمہاری میراث نہیں، اسے اختیار ہے کہ وہ جس کو چاہے، ملک کا انتظام سپرد کر دے، وہ اس سے اس ملک کی بھلائی برائی کے متعلق باز پرس کرے گا، تم کیوں فضول اس چکر میں پڑے ہو، بہائی خان نے جواب دیا کیا اُس نے ہمیں معزول کر کے تمہیں مقرر کیا ہے؟ احمد بیگ نے کہا تب بھی تمہیں اپنی ملازمت کے متعلق ان سے استفسار کرنا

---

(1) تاریخ طاہری۔ ص ۲۱۵۔

(2) تاریخ طاہری، ص ۲۱۵-۲۱۷۔

(3) تاریخ طاہری، ص ۲۱۷-۲۱۸۔

(4) ایضاً۔ ص ۲۱۸-۲۱۹۔

(5) تاریخ طاہری، ص ۲۱۹۔

چاہیے، تاکہ بات واضح اور صاف ہو جائے اور ہر ایک بجائے خود اپنے مقام اور مرتبے کو پہچان لے۔[1]

اس پر بہائی خان نے مولہ خدمتگار کو جسے مرزا غازی نے دولت رائے کا خطاب دے کر امورِ مالیات اس کے سپرد کیے تھے بلا کر میرزا غازی سے اس گفتگو کی روشنی میں استفسار کیا، میرزا غازی نے جواب دیا کہ ان سے کہہ دو کہ میں ان کو اپنے مہماتِ امور میں تکلیف نہیں دوں گا۔ کیونکہ انہوں نے میرے والد مرحوم کی بہت خدمت انجام دی ہے اب وہ اطمینان سے بیٹھیں کہ یہ میری حکومت ہے میں جس کو بھی ملک کا انتظام سپرد کروں، اس کی اطاعت کرنا سب پر لازم ہے، کیونکہ بندوں کو بجز اطاعت و فرمانبرداری کے کوئی چارہ نہیں۔ میں نے اپنی حکومت کی بہتری اس میں دیکھی ہے کہ حکومت کے تمام معاملات احمد بیگ کے سپرد کر دیے جائیں اور ان سب کو بھی اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔[3]

جب بہائی خان کو میرزا غازی کا یہ جواب پہنچا، تو وہ رشک و غم کی آگ میں اپنی نادانی سے اور بھی جل گیا، میرزا غازی کے باپ کے زمانے کے تمام وکلا کہ جو نشۂ اقتدار میں سرشار تھے، ان سب کے نشے ہرن ہو گئے اور وہ سوچنے لگے کہ اس لڑکے سے اس تدبر اور فراست کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، بہرحال بظاہر بربنائے مصلحت، اطاعت و فرماں برداری میں انتہائی کوشش کرتے ہوئے نظر آتے تھے، لیکن دل سے وہ اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح ملک کے معاملات درہم برہم ہوں اور ملک میں افراتفری اور انتشار پھیلے، یا کسی جگہ سے کوئی فتنہ کھڑا ہو، تاکہ احمد بیگ کی کمان اُترے اور ہماری متانت و تدبر کا سکہ میرزا غازی پر بیٹھے۔[3]

اِدھر احمد بیگ نے بھی تمام وکیلوں کو نظر انداز کر کے بڑی دور اندیشی کے ساتھ ملک کی پیداوار سے جس پر امرا اور سرکردہ اصحاب نے قبضہ کر رکھا تھا اور اس قبضے کی وجہ سے میرزا غازی کو ایک ایک دانے کا محتاج بنا دیا تھا، لاکھوں روپے زائد حاصل کیے اور میرزا غازی نے بھی دل کھول کر رعایا اور سپاہیوں پر روپیہ خرچ کیا، ان کے مشاہرے اور تنخواہ میں اضافہ کیا، جس سے رعایا اور سپاہی دونوں خوش ہو گئے اور ان خود پرست امرا کو رفتہ رفتہ عضوِ معطل بنا دیا۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی جاگیریں لے کر خالصہ قرار دیں، اور ان جاگیروں کے معاوضے میں ان کے وظائف مقرر کر دیے پھر اُس نے احمد بیگ کو اس کے کارناموں پر احمد سلطان کے لقب سے سرفراز کیا۔[4]

ابو القاسم سلطان کی بغاوت:

لیکن اس کے باوجود میرزا غازی کی مخالفت کے شعلے اندر ہی اندر بھڑک رہے تھے اور فتنہ پرداز اس موقع کی تلاش میں تھے کہ کس طرح ملک کے نظم کو درہم وبرہم کیا جائے۔

سب سے پہلے محمد علی سلطان کابلی نے محض ایک مست ہاتھی کی بنا پر جس کو لانے کے لیے میرزا غازی نے اپنے معتمد جنگلی شاہ کو روانہ کیا تھا، نعرۂ بغاوت بلند کیا اور جنگ کے لیے آمادہ ہو گیا۔

یہ محمد علی سلطان کابلی وہی شخص تھا جس کا بیٹا محمد معین اپنے ماموں سیور علی کے ساتھ اس زمانے میں کہ میرزا جانی بیگ ترخان قلعۂ اسیر میں حیات تھا، میرزا غازی کے حضور شطرنج کی بازی پر غضب ناک ہو کر ان دونوں نے تلوار اور خنجر نکال لیے تھے اور ندیم کو کہ اور قاسم علی کو کہ کو زخمی کر کے دیوان سے نکل کر اپنی حویلی تک گئے، اور کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ ان کا راستہ روکے، جب ٹھٹھہ میں ہر طرف شور و غوغا ہوا اور ان کی گرفتاری کے لیے لشکر متعین ہوا، تو یہ دونوں اپنی حویلی کے پیچھے لڑتے ہوئے مارے گئے، محمد علی سلطان کابلی دربار میں مستغاثی ہوا۔ میرزا جانی بیگ نے اسے تلافی مافات کے طور پر اور اس کی دلداری کے لیے اسے بدین کا صوبیدار بنا دیا۔[5]

جیسے ہی مست ہاتھی کو لانے لیے جنگلی شاہ پہنچا، اس نے اسے کہا کہ تم یہ ہاتھی میری رضامندی کی بنا پر تو لے جاسکتے ہو، مگر اس دھونس کی بنا پر نہیں لے جاسکتے کہ میرزا غازی نے یہ ہاتھی طلب کیا ہے، اس صورت میں تو تم اپنی جان بھی سلامت نہ لے جاسکو گے، جنگلی شاہ نے جب یہ دیکھا کہ محمد علی سلطان کابلی لڑنے مرنے کے لیے تیار ہے، تو اس نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ وہ خالی ہاتھ لوٹ جائے، چنانچہ اس نے آکر سارا واقعہ میرزا غازی سے بیان کیا، میرزا غازی کو اس واقعہ سے اور بھی یقین ہو گیا کہ یہ ساری فتنہ پردازی ان پرانے اُمرا کی ہے، جب تک کہ ان کی گوشمالی نہ کی جائے گی، یہ فتنے ختم نہ ہوں گے پھر اس نے اپنے نئے

---

(1) ایضاً۔ ص ۲۱۹-۲۲۰۔

(2) ایضاً۔ ص ۲۲۰۔

(3) تاریخ طاہری، ص ۲۲۰-۲۲۱۔

(4) ایضاً۔ ص ۲۲۱-۲۲۲-۲۲۵۔

(5) تاریخ طاہری، ص ۲۲۵-۲۲۶۔

اُمرائے دولت سے مشورہ کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ آخر صلاح و مشورے کے بعد رائے قرار پائی کہ ان تمام شورش پسندوں کا سردار خسرو خان چرکس ہے، ہمیں پہلے اس سے نمٹنا چاہیے تو پھر دوسروں سے نمٹنا سہل ہو جائے گا، پھر طے پایا کہ خسرو خان چرکس کو کسی بہانے سے تنہا بلانا چاہیے اور اس کو وہیں ختم کر دینا چاہیے، خسرو خان چرکس، چونکہ میرزا عیسیٰ ثانی کا بہت دوست تھا اس نے چپکے سے اس فیصلے کی اطلاع اس کو دے دی، میرزا غازی بیگ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے طے کیا کہ میرزا عیسیٰ بھی چونکہ منافقین میں ہے، اس لیے خسرو خان سے بھی پہلے اسکا کام تمام کر دینا چاہیے، لیکن اس فیصلے کی اطلاع بھی کسی طرح میرزا عیسیٰ کو مل گئی۔ وہ فوراً وہاں سے فرار ہو کر قبیلہ سمیجہ میں جو اس کی ننہال بھی تھا، فرار ہو کر پناہ گزیں ہو گیا، اور وہاں اس کا انتظار کرنے لگا کہ آج کل ہی میں ٹھٹھہ میں فتنہ و فساد ہو گا، اس گڑبڑ میں سے فائدہ اٹھا کر میں بھی کسی گوشے پر قبضہ کر لوں گا، حقیقت بھی یہ ہے کہ اگر میرزا غازی کی تقدیر یاور نہ ہوتی تو بعض اُمرائے دولت نے میرزا مظفر بن باقی ترخان کو کچھ میں اور میرزا عیسیٰ ترخان کو سمیجہ قبائل میں سے امیدوار سلطنت بنا دیا تھا۔

اسی زمانے میں ابو القاسم سلطان ابن شاہ قاسم ارغون نے علمِ بغاوت بلند کیا، وہ ایک طویل عرصے سے پرگنہ نصرپور کا حاکم تھا، اور اس سے قبل اس پرگنے پر اس کے باپ کی حکومت تھی وہ اس قدر شجیع و بہادر اور شمشیر زن تھا کہ اس صوبے کے اطراف میں کوئی بھی اس کا مدِ مقابل نہ تھا، اس کی شجاعت و بہادری کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ وہ جس طرف بھی جاتا فتح اس کی ہوتی، اسی نے میرزا جانی بیگ کے زمانے میں سوڈھوں کو نکال کر قلعہ عمرکوٹ پر قبضہ کر لیا تھا اور قلعہ میں داخل ہو کر راجپوتوں کے گھر اور ان کی بیویاں اپنے نوکروں میں تقسیم کر دی تھیں، آخر کار اس کا باپ ابو القاسم وہاں سے اس کو لوٹا کر لایا تھا۔ اس کی بہن میرزا جانی بیگ کے گھر میں تھی اور وہ اپنی بیٹی کو میرزا ابو الفتح سے منسوب کر چکا تھا، ان تمام رشتے داریوں اور تعلقات کے باوجود اس کے دماغ میں یہ سودا سمایا کہ مجھ جیسا سخی اور بہادر کوئی دوسرا نہیں، اگر اس موقع پر میں نے بغاوت کر دی تو تمام ملک پر قبضہ جما لوں گا، کون ہے کہ جو میرا مقابل ہو سکے، میرزا غازی ابھی لڑکا ہے، میں اسے چند گاؤں بطور جاگیر کے دے دوں گا اور اس پر نگرانی رکھوں گا۔ باقی تمام کا تمام ملک میری ملکیت ہو گا، اپنے ذہن میں اس نے یہ منصوبہ تیار کر کے علی الاعلان یہ کہنا شروع کر دیا کہ میرزا غازی کون ہوتا ہے جو میرے ہوتے ہوئے اس ملک پر قبضہ جمائے، پھر اس نے بغاوت کا عملی اقدام یہ کیا کہ کپاتیہ چودھری جو سامان تجارت لیے ہوئے ٹھٹھہ سے جیسلمیر جا رہا تھا، اسے راستے میں لوٹ لیا۔ اس نے میرزا غازی بیگ کے پاس استغاثہ کیا، میرزا نے ابو القاسم سلطان کو لکھا کہ: یہ نہایت افسوس ناک بات ہے کہ ہماری حکومت کے زمانے میں جب کہ تم سے رشتہ داریاں بھی ہیں اور تعلق خاص بھی، تم نے اس قسم کا غلط اقدام کیا ہے کہ جس سے ہماری آبرو پر حرف آتا ہے، اگر کوئی دوسرا یہ ناشائستہ حرکت کرتا تو وہ اپنی اس حرکت پر بہت بُرے دن دیکھتا، مجھے امید ہے کہ تم انسانیت اور آدمیت کو اپنا شعار بنا کر اس شخص کا مال واپس کر دو گے۔[1]

میرزا ابو القاسم سلطان نے میرزا غازی کو بجائے اس کے کہ نرم اور صلح آمیز خط لکھتا، جواب میں سخت معاندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے لکھا کہ: اب ہمارے اور تمہارے درمیان "بارگاہ نہر" سرحد ہے۔ اس طرف تمہارا حکم چلتا ہے اور اس صوبے میں میرا حکم جاری ہے، اگر تم زیادہ چون و چرا کرو گے تو میں اپنی سرحدیں علی جان نہر[2] کے کنارے تک وسیع کر دوں گا۔ یہ خط لکھ کر اس نے فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانا شروع کر دی اور میرزا غازی کے تمام تحصیل داروں کو جو اس نواح میں تھے، انہیں زبردستی مار پیٹ کر نکال دیا، اور ہر جگہ اپنے آدمی بھیج دیے اور خشکی اور دریائی راستوں کی آمد و رفت بالکل مسدود کر دی۔ ملک کا امن و امان خطرے میں پڑ گیا، اس ابتری اور درہمی برہمی سے ترخان اور ارغون اُمرا جو اس کے باپ کے مقرر کردہ وکیل تھے خوش ہونے لگے کہ اب وہ وقت قریب آ گیا ہے کہ میرزا غازی برباد ہو گا، لیکن میرزا غازی ان کی تمناؤں کو جانتے ہوئے بھی ان پر نوازشیں کر کے ان سے مدد کا طالب ہوا اور خفیہ طور پر اس نے تمام انتظامات اپنے نئے ملازموں کے سپرد کیے، تاکہ وہ منافقین کے ارادے سے بھی واقف رہیں اور ایسے جوہر دکھائیں کہ جس سے دشمن برباد ہو۔[3]

میرزا غازی کی جنگ کے لیے تیاری:

آخر میرزا غازی نے طے کر لیا کہ ملک کے استحکام کے لیے دشمن کی

---

(1) تاریخ طاہری، ص ۲۲۹-۲۳۰۔

(2) نہر علی جان: ٹھٹھہ کے قریب ایک نہر تھی، جو وہاں کے باغوں کو سیراب کرتی تھی (میرزا غازی ترخان، تالیف سید حسام الدین راشدی)، ص ۳۶۔

(3) ایضاً۔ ص ۲۳۰-۲۳۱۔

بیخ کنی بہت ضروری ہے، اس فیصلے کے بعد وہ فوج لے کر ٹھٹھہ سے نصرپور کی طرف روانہ ہوا، راستے میں وہ دشمن کے خوف سے ہر چھاؤنی پر خندقیں کھودتا ہوا میرن کا تیار جا پہنچا اور وہاں خندقیں کھود کر خیمہ زن ہوا۔

رات کو ابو القاسم سلطان کچھ جوان ساتھ لے کر پاپیادہ میرزا غازی کو آواز دے کر کہنے لگا، ابو القاسم دعا و سلام کے بعد پوچھتا ہے کہ تمہارے یہاں آنے سے کیا مقصد ہے؟ ابو القاسم اتنا کمزور نہیں کہ تمہاری فوج کشی سے ڈر کر تم پر شب خون مارنے کی کوشش کرے، میں تمہیں اطمینان دلاتا ہوں کہ تم پر شب خون نہیں مارا جائے گا، تم پورے طور پر مطمئن ہو کر مقابل ہو کر جنگ کی کوشش کرو، میرزا غازی کی جانب سے اس چیلنج کا جواب دیا گیا کہ تو کیوں اپنی جان کا دشمن ہوا ہے۔ شاید جب تک کہ تو اس جنگ میں اپنا سر نہیں دے گا تجھے چین نہیں آئے گا اس تبادلۂ چیلنج کے بعد میرزا غازی نے شاہ گڑھ[1] پہنچ کر مورچے قائم کر کے حکم دیا کہ توپوں سے قلعہ شاہ گڑھ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر قلعے کو زمین کے برابر کر دیا جائے۔

ادھر ابو القاسم سلطان نے بھی قلعہ بند ہو کر اور قلعے کی فصیل پر چڑھ کر شراب کے نشے اور نخوتِ جوانی میں بعض بے ہودہ باتیں کہنا شروع کیں۔ وہ اپنے سپاہیوں سے بھی کہتا تھا اگر اس ملک کے ساتھ میرزا جانی بیگ کی والدہ بھی میرے قبضے میں آئی تو میں اسے اپنے باپ شاہ قاسم خان کے نکاح میں لاؤں گا، اور محمد باقی کی بیٹیاں اور سارے ترخانیوں کی بیویاں جو محل میں ہیں تم میں بانٹ دوں گا اور ان کے ملازموں کی جاگیریں بھی تمہیں عطا کروں گا۔[2]

صلح:

چند روز تک جنگ ہوتی رہی، ابو القاسم سلطان اپنی خود غرضیوں میں اندھا ہو کر جنگ میں مصروف تھا کہ اچانک اس کے والد شاہ قاسم نے عاقبت اندیشی سے کام لے کر دل میں سوچا کہ اس کے بیٹے نے جو اپنے ولی نعمت کے بیٹے کے مقابلے میں طریقہ اختیار کیا ہے، وہ یقیناً اس کے زوال کا باعث ہو گا، اگر وہ اس موقع پر اپنے بیٹے کی طرف داری کرے گا تو تمام عالم اسے نمک حرام ٹھہرائے گا اور اگر وہ اس موقع پر اپنے بیٹے کی مخالفت کرتا ہے تو وہ اس کی نظر میں مطعون ٹھہرے گا، ان تمام حالات پر غور کر کے شاہ قاسم نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ دونوں میں کسی طرح صلح کرا دی جائے، چنانچہ اس نے میرزا غازی سے درخواست کی کہ وہ اس کے بیٹے کی جان بخشی کرے اور اس کی گزشتہ خطاؤں کو معاف کر دے، میرزا غازی نے اس بوڑھے کی بات قبول کر لی، یہ صلح ان دو شرطوں پر ہوئی، اول یہ کہ ابو القاسم کی جان بخشی کی جائے، دوسری یہ کہ اس کی تمام گزشتہ خطائیں معاف کی جائیں، یہ شرطیں قرآن مجید پر لکھی گئیں لیکن بہائی خان اور ملا گدا علی جو اپنے آپ کو سندھ کے تمام معاملات کا ٹھیکیدار سمجھے ہوئے تھے، یہ دونوں کے دونوں صلح کے اس لیے مخالف تھے کہ اگر یہ فتنہ فرو ہو گیا تو میرزا غازی کی نظر میں ان کا پول کھلنے کے بعد ان کی کوئی عزت نہ رہے گی، خصوصاً بہائی خان اسے صلح سے روکنے کی بہت کوشش کرتا تھا، اس نے ان لوگوں کے ذریعے سے جن پر میرزا غازی کو اعتماد تھا، میرزا کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اسے صلح نہ کرنی چاہیے۔[3]

چنانچہ شاہ قاسم نے اس کے ملازم کارونامی کے ذریعے سے ایسا زہر دیا کہ وہ بیمار پڑ گیا اور اس بیماری کی وجہ سے میرزا غازی سے اجازت لے کر ٹھٹھہ روانہ ہوا اور گھر پہنچتے ہی مر گیا۔

اس رخنے کے دور ہونے کے بعد ابو القاسم سلطان اپنے والد اور اپنے بھائی مقیم سلطان کے توسل سے میرزا غازی کی خدمت میں حاضر ہوا، طاہر نسیانی کا بیان ہے کہ اس کے دماغ میں اس قدر رعونت اور سرکشی تھی کہ وہ میرزا غازی کے پاس جس مجلس میں آتا، اس کی رعونت کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی کو ان میں سے کسی کو انسان نہیں سمجھتا تھا، وہ تھوڑی دیر میرزا غازی کی مجلس میں بیٹھتا اور چلا جاتا، چند روز تک وہ اسی طرح آتا جاتا رہا۔

ابو القاسم سلطان کی آنکھوں میں سلائی پھروانا:

اگرچہ ابو القاسم سلطان نہایت سخی اور مخیر تھا، لیکن کہتے ہیں کہ اس نے ریل کے درویشوں کے کچھ مویشی لوٹ لیے تھے، ایک دن یہ سب درویش اس سے نہایت رنجیدہ ہو کر اکٹھے ہوئے اور آپس میں کہنے لگے کہ ترکش غیبی سے کوئی تیر نکال کر اس کو مارنا چاہیے، ان ہی میں سے

---

[1] میرزا جانی بیگ کے ابتدائی دور میں نصرپور کے قریب خان زمان نے شاہ گڑھ کے نام سے یہ عظیم الشان قلعہ تعمیر کرایا تھا، میر علی شیر قانع جس وقت تحفۃ الکرام لکھ رہے تھے، اس وقت یہ قلعہ منہدم ہو چکا تھا، آج بھی اس قلعے کے آثار موجود ہیں۔ پیش لفظ چچنسر نامہ مرتب سید حسام الدین راشدی۔ ص ۴۰-۴۹۔

[2] تاریخ طاہری، ص ۲۳۲-۲۳۳۔

[3] تاریخ طاہری، ص ۲۳۴۔

ایک درویش نے کہا کہ احسان اور سخاوت کی وجہ سے اس کے سارے اعضا خدائی حفاظت کی زرہ سے محفوظ ہیں، لیکن اس کی آنکھیں محفوظ نہیں جو اس کی آنکھوں کو نشانہ بنا سکے وہ اس پر وار کرے۔

جس زمانے میں کہ یہ واقعہ پیش آیا، اسی زمانے میں اتفاق سے میرزا غازی نے اپنے خاص معتمدین سے کہا کہ ابو القاسم کا کوئی اعتبار نہیں، میں اُسے دھوکے سے گرفتار کرا کر قتل نہیں کر سکتا، کیونکہ میں اس کی جان بخشی کی قسم کھا چکا ہوں لیکن اس کو کسی طرح اندھا کر دینا چاہیے، تاکہ اس نے جو ہمارے ساتھ کیا ہے، اس کی سزا ملے اور سلطنت کے دوسرے دشمنوں کے لیے بھی باعثِ عبرت ہو۔

اس فیصلے کے بعد وہ ایک دن کشتی میں بیٹھ کر اپنے مصاحبوں کے ساتھ نکلا، اور اس نہر سے گزر کر جو ابو القاسم کے ڈیرے کے سامنے تھی نہر کے کنارے اپنے ندیموں کے ساتھ محفل منعقد کی۔ حکم دیا کہ ہر سردار ہتھیاروں اور بغیر ملازموں کے تنہا حاضر ہو، وہیں سے اس نے ابو القاسم سلطان کو رقعہ لکھا جس میں تحریر کیا کہ ہم نے یہاں ایک محفل منعقد کی ہے، تم بھی آؤ اور اپنی تصنیف[1] چنیسر نامہ بھی ساتھ لے کر آؤ، تاکہ شعر و شاعری کا بھی لطف رہے اور محفل کی رونق بھی بڑھے۔[2]

چنانچہ تقدیر سے بے خبر ابو القاسم سلطان نہایت شوق سے کتاب لے کر دستور کے مطابق نہایت شان و شوکت سے روانہ ہوا، نصف راستہ طے کر پایا تھا کہ اسے محمد علی سلطان کابلی کا ایک رقعہ ملا، جس میں اس نے اُسے میرزا غازی کے منصوبے کی اطلاع دے کر وہاں جانے سے روکا تھا، لیکن تقدیر اپنا کام کر چکی تھی، اس لیے اس نے اس رقعے کو بغیر پڑھے ہوئے جیب میں ڈال لیا جب وہ میرزا غازی کے دربار میں پہنچا تو درباریوں نے بتایا کہ میرزا کچھ مصاحبوں اور ندیموں کے ساتھ نہر کی اس طرف تنہائی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ بھی تنہا تشریف لے جائیں۔ اس رعونت و نخوت کی بنا پر جو وہ اپنے سر میں رکھتا تھا، بغیر کسی چیز کی پروا کیے ہوئے اُس نے اپنے آدمیوں کو وہیں چھوڑا اور صرف ایک آدمی شمشیر بردار کو ساتھ لے کر چھوٹی کشتی میں بیٹھ کر وہ اس طرف روانہ ہوا، اس کشتی میں پہلے سے کچھ آدمی میرزا غازی کے بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ جب یہ کشتی دریا کے بیچ میں پہنچی تو باغ علی بیساول نے جو نہایت طاقتور اور قد آور انسان تھا، جست بھر کر اس کے دونوں ہاتھ اس کی کمر کی طرف مضبوطی سے باندھ دیے، پھر ان میں سے ایک نے اس کی پگڑی اُتاری اور دوسرے نے اُس سے تلوار و خنجر چھین کر اسے خوب جکڑ کر اس کی اطلاع میرزا غازی کو دی، میرزا غازی نے حکم دیا کہ وہیں سلاخیں آگ میں گرم کر کے سلائی کی طرح اُس کی آنکھوں میں پھیر دی جائیں، چنانچہ گرم سلاخیں اس کی آنکھوں میں پھیری گئیں اور اس کی دونوں آنکھیں بتاشے کی طرح بیٹھ گئیں، اندھا کر دینے کے بعد اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈلوا کر میرزا غازی نے اس کے ڈیرے کو لوٹ لینے کا حکم دیا۔ ابو القاسم سلطان کے ساتھی بُری طرح مارے گئے، صرف اس کے عزیز جعفر علی خان ارغون نے کچھ ہل چل مچائی، لیکن وہ بھی زخمی ہو کر گرفتار ہوا، اس کے بچے کھچے ساتھی میرزا غازی سے امان کے طالب ہوئے، اس تاخت و تاراج کے بعد اور ابو القاسم سلطان کے تمام مال و اسباب پر قبضہ کرنے کے بعد اس کے اہل و عیال سے کسی قسم کا تعارض نہیں کیا گیا اور انہیں کوئی ایذا نہیں پہنچائی گئی پھر ابو القاسم سلطان اور جعفر علی خان ارغون کو کشتی میں بٹھا کر عرب کوکہ کے ملازم دریا خان کے ساتھ ٹھٹھہ بھجوا دیا گیا چونکہ ابو القاسم سلطان کی جیب سے محمد علی سلطان کابلی کا رقعہ برآمد ہوا تھا، اس کے متعلق میرزا غازی نے حکم دیا کہ برق انداز بندوقوں کے کندوں سے اس کے شانے کی ہڈیاں چکنا چور کر دیں، پھر اس پر رقعے کے بھیجنے کا اور دوسری شورشیں برپا کرنے کا الزام قائم کر کے اسے سزا کے لیے آتش خان کے حوالے کیا گیا جس نے اسے توپ سے اُڑا دیا۔

میرزا عیسیٰ ثانی ترخان جو اس انتظار میں سمیجہ قبیلے کے لوگوں میں

---

(1) طاہر محمد نسیانی کے اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چنیسر نامہ کو ابو القاسم کی تصنیف سمجھتا ہے، اسی طرح صاحب منتخب التواریخ نے بھی اس مثنوی کو میر ابو القاسم کی تصنیف سمجھا ہے لیکن یہ مثنوی چنیسر نامہ جو فارسی زبان میں ہے اور سندھ کی ایک قدیم رومانی داستان چنیسر و لیلا کی داستانِ محبت پر مشتمل ہے اور جسے سندھ کے عہد حاضر کے محقق سید حسام الدین راشدی نے ایڈٹ کیا ہے اور اب شائع ہو چکی ہے، دراصل یہ مثنوی ایک شاعر و مؤرخ کی تالیف ہے، جس کا نام ادراکی ہے اور وہ بیگلاری تخلص کرتا تھا، امیر ابو القاسم سلطان اور اس کا باپ شاہ قاسم خان بیگلار اس کے ممدوح تھے، صاحب مقالات الشعرا امیر علی شیر قانع ٹھٹھوی مقالات الشعراص ۱۱۷-۱۱۸ پر اس مسئلے کو واضح طور پر لکھا ہے نیز سید حسام الدین راشدی نے "چنیسر نامہ" کے پیش لفظ میں تفصیل سے اس پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ بیگلاری کی پہلی تصنیف ہے، جس کو مؤلف نے اپنے ممدوح میر ابو القاسم سلطان بن شاہ قاسم خان زمان بن سید قاسم بیگلاری کی فرمائش پر ۱۰۱۰ھ (۲-۱۶۰۱ء) میں مکمل کیا تھا۔ ادراکی بیگلاری کی دوسری تالیف "بیگلر نامہ" ہے، جس میں اس نے بیگلروں کے حالات و مناقب کو جمع کیا ہے، اس کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خاں زماں کے اشارے اور تحریک پر، اس نے یہ کتاب لکھنی شروع کی تھی اور خاں زماں کے بیٹے میر مقیم نے بھی اس کتاب کی تحریر کے لیے اس سے اصرار کیا تھا (تفصیل کے لیے دیکھیے پیش لفظ چنیسر نامہ - مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۵-۶)۔

(2) تاریخ طاہری، ص ۲۳۶۔

بیٹھا ہوا تھا کہ اس فتنہ وفساد سے فائدہ اٹھا کر وہ سندھ کے کسی حصے پر قبضہ جمائے گا، اب جب کہ حالات کا نقشہ ہی بدل گیا، تو اُسے ہوش آیا اور وہ جان بچانے کی فکر میں اکبر کے حضور میں دارالخلافہ بھاگ گیا۔

اب میرزا غازی اپنے تمام حریفوں کو شکست دے کر اور اپنے نزدیک فتنوں کے تمام سوراخوں کو بند کر کے مطمئن ہو کر ٹھٹھہ میں سکونت پذیر ہو گیا۔[1]

بابا طالب کی آمد:

اُسی زمانے میں اکبری دربار کا ایلچی بابا طالب جو دارالخلافہ سے میرزا غازی کو لینے کے لیے آیا ہوا تھا، مندرجہ بالا واقعات اسی کے سامنے پیش آئے حالانکہ میرزا کو لانے کے لیے روزانہ تاکیدی احکام آ رہے تھے، لیکن ملک میں ابتری وفساد دیکھ کر وہ اس کو لے جانے میں ڈھیل دیتا رہا۔ ویسے بھی زبردستی لے جانے کی اس میں طاقت نہ تھی۔[2]

میرزا غازی کا حسنِ انتظام:

الغرض میرزا غازی نے اپنے والد کی وفات کے دو سال بعد ملک کے نظم ونسق کو درست کر کے رعایا اور سپاہ کو اپنی بخشش، فیاضی اور انصاف سے اپنا گرویدہ بنا لیا، وہ راتوں کو بھیس بدل کر شہر میں گھومتا اور رعایا کا حال معلوم کر کے ان کے درد دکھ کا مداوا کرتا۔

جام ہالہ گھور کی شورش:

یہاں تک کہ جام ہالہ گھور ولد جام ڈیسر نے جو ٹھٹھہ کے جاموں میں سے تھا، اور وہاں سے نکل کر ککرالہ کے ایک حصے کا جو ٹھٹھہ اور ملک کچھ کے درمیان ہے زمیندار ہو گیا تھا، فتنہ انگیزی شروع کی اور اس نے میرزا غازی کے بعض جاگیرداروں کو جو اس نواح میں تھے قتل کر دیا، میرزا غازی نے ان کا انتقام لینے کے لیے اور جام ہالہ کی سرکوبی کے لیے ایک لشکر متعین کیا، میرزا غازی کا اقبال اوج پر تھا، اتفاق سے جام ہالہ کا ایک عزیز جام داؤد میرزا غازی کے لشکر کا راہبر بن گیا، چنانچہ اس دشمن کو بھی نکال کر جام ہالہ کا سارا علاقہ میرزا غازی کے قبضے میں آ گیا۔[3]

میرزا غازی کا عقد:

اس فتح وکامرانی کے بعد جام داؤد نے میرزا غازی کی ملازمت کا شرف حاصل کر کے اپنی بیٹی کو میرزا غازی کے عقد میں دیا، یہ پہلا عقد تھا، جو ارغونوں، ترخانوں اور جاموں کے درمیان ہوا، ورنہ اس سے قبل جاموں اور ارغونوں اور ترخانوں کے درمیان شادیاں کبھی نہیں ہوئیں، بلکہ جام ارغونوں اور ترخانوں کو اپنی لڑکیاں دینا باعث ننگ وعار سمجھتے تھے۔

اس کے ساتھ ہی جام داؤد نے جام ہالہ کی زمینداری کے لیے میرزا غازی سے درخواست کی، اُس کی حسنِ خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے میرزا نے اس کی درخواست منظور کر لی اور جام ہالہ کے ملک کے تین حصے کر کے، ایک حصہ جام داؤد کو دیا، باقی دو حصے خالصہ قرار دیے۔[4]

سعید خان کی آمد:

۱۰۱۱ھ (۳-۱۶۰۲ء) میں ملک کے نظم کی ابتری کو دیکھ کر اور میرزا غازی کے نہ آنے نے اکبر کو مشکوک کر دیا، اس نے سعید خاں چغتہ اور اس کے بیٹے سعد اللہ خان چغتہ کو دارالسلطنت لاہور سے میرزا غازی کو لانے اور سندھ پر قبضہ کرنے کے لیے لشکر کے ساتھ بھیجا۔[5]

میرزا غازی کے مشورے:

جب یہ خبر میرزا غازی کو ملی کہ سعید خان[6] اور سعد اللہ خان اس کو لانے کے لیے متعین کیے گئے ہیں، اس نے اپنے اُمرا کو جمع کر کے مشورہ کیا اور کہا کہ اگر میرے پاس طاقت اور خزانہ ہوتا تو میں بھی اپنے والد کی طرح ایک مرتبہ زور آزمائی کرتا، کیوں کہ دوسری صورت میں بھی صلح مشکل نہ ہوتی اور اس طرح ہمارا رعب ووقار بھی قائم رہتا، پہلے ہم لکی کے قریب آمد ورفت کا راستہ مسدود کر کے ایک مضبوط چھوٹا سا قلعہ بناتے، لیکن اس کا دارومدار خزانے پر ہے، ہم اس کے لیے روپیہ کہاں سے لائیں، اس لیے مناسب یہ ہے کہ سعید خان کی آمد سے قبل ہی ہم حضور کی جانب روانہ ہو جائیں۔[7]

---

(1) یہ تمام تفصیل تاریخ طاہری، ص ۲۳۸-۲۳۹ سے ماخوذ ہے۔

(2) ایضاً۔ ص ۲۳۹۔

(3) تاریخ طاہری، ص ۲۳۹-۲۴۰۔

(4) تاریخ طاہری، ص ۲۳۹-۲۴۰۔

(5) ذخیرۃ الخوانین قلمی مملوکہ سید حسام الدین راشدی، ص؟

(6) تاریخ طاہری، ص ۲۴۰-۲۴۱۔

(7) سعید خان چغتہ: اکبر کے اُمرائے کبار میں تھا، سرکار ملتان اس کی جاگیر میں تھا، کچھ دن بنگال میں بھی رہا ۱۰۱۱ھ (۳-۱۶۰۲ء) میں ملتان اور سرکار بکھر اس کی جاگیر میں دے کر اکبر نے اسے میرزا غازی بیگ پر مقرر کیا (ذخیرۃ الخوانین-ج ۱-ص ۱۹۰)۔

اس فیصلے کے بعد میرزا غازی نے خسرو خان چرکس، عرب کوکہ اور آلہ قلی دیوان کو ایک لشکر کے ساتھ ملک کے انتظام کے لیے ٹھٹھہ میں چھوڑا اور احمد بیگ سلطان، لطف اللہ سلطان، خواجہ امیر بیگ بخشی اور خسرو خان کے بیٹے بہائی خان اور دوسرے مقربین کو ساتھ لے کر فتح باغ میں قیام پذیر ہو کر اکبر کے حضور میں حاضر ہونے کی تیاریاں کرنے لگا۔

ابو القاسم سلطان کا فرار اور دوبارہ گرفتاری:

اسی زمانے میں جب کہ میرزا غازی فتح باغ میں اکبر کے حضور حاضر ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا، میرزا ابو القاسم سلطان کی فراری کا واقعہ پیش آیا جو اندھا ہونے کے بعد ٹھٹھہ میں عرب کوکہ کی حویلی میں اس کے ملازم دریا خان کی نگرانی میں قید تھا، میرزا غازی نے اُس کے ساتھ یہ مراعات روا رکھی تھیں کہ وہ عورتوں اور مردوں میں سے جس سے بھی ملنا چاہے، اس پر کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی، جمعہ کی رات میں اُس کی بہن کے ہاں سے جو میرزا جانی بیگ کے گھر میں تھی ایک خوان میں مٹھائی وغیرہ آیا کرتی تھی، چنانچہ میرزا غازی کے فتح باغ میں جانے کے بعد اس نے اپنی بہن سے سازش کی اور طے پایا کہ دریا کے کنارے قریہ "پنیہ واہی" کے قریب وہ ایک چھوٹی کشتی اور لوگوں کو تیار رکھے، اسے جب بھی موقع ملے گا، بھاگ نکلے گا، کسی کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ اس پر بفلک عمارت سے یہ اندھا بھاگ بھی سکتا ہے، چنانچہ ایک جمعہ کی رات میں اس کی بہن نے ایک خوان میں کمند رکھ کر اور اس پر روٹیاں چن کر بھجوائی، رات کو جب اُس کے محافظ آرام کرنے لگے، تو وہ اس حویلی میں سے جس میں بادگیر کے علاوہ کوئی راستہ باہر نکلنے کا نہ تھا، بڑی صفائی سے بھاگ کھڑا ہوا، اندھا ہونے کے باوجود اس نے چارپائی کو عین بادگیر کے نیچے دیوار سے ملا کر کھڑا کیا اور بادگیر پکڑ کر باہر نکل گیا، پھر اس سہ منزلہ حویلی سے گزرتا ہوا، ایک تنگ کھڑکی سے کمند کو باندھ کر اس قدر تکلیف کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو زمین پر پہنچایا کہ اس کی کھال چھل گئی، اس کے بعد اس نے دوسری حویلی سے جعفر علی ارغون کو بھی اپنے ساتھ لیا، پھر کشتی کے ذریعہ نہر پار کر کے، اونٹوں پر سوار ہو کر کوہستانی شورو قوم کی راہ لی۔

صبح کے وقت پہرہ داروں کو اس کی خبر ہوئی، فوراً ہی فتح باغ میں ابو القاسم سلطان کی فراری کی اطلاع میرزا غازی کو دی گئی، ہر طرف اس کی گرفتاری کے لیے لشکر متعین کیا گیا، دریا خان اس خوف سے کہ اب اس پر اور اس کے گھر والوں پر مصیبت آئے گی، ہر گھاٹ پر اس کو تلاش کرتا رہا۔ آخر سالائی نامی گاؤں ہفت دختر گھاٹ پر اسے پتا چلا کہ صبح کے وقت ایک چھوٹی سی کشتی یہاں سے روانہ ہوئی تھی اور بعض سفید پوش آدمی اس میں سوار تھے، وہ اس گھاٹ سے فوراً ہی روانہ ہو کر دوسرے کنارے پر پہنچا، وہاں اسے معلوم ہوا کہ جو لوگ اس کشتی میں سے اُترے تھے، اس میں سے چار آدمی ان دو اونٹوں پر سوار ہو کر جو ایک دن پہلے سے یہاں چر رہے تھے اور کچھ آدمی پیدل ساتھ لے کر کوہستان کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔ ان نشان دہی پر دریا خان اس کے تعاقب میں روانہ ہوا، آخر اس نے ان کو جالیا، اس وقت پیادے تو جنگل میں روپوش ہو چکے تھے لیکن دو شتر سواروں، ابو القاسم سلطان اور جعفر خان ارغون کو دریا خانے پہچان لیا، اور وہ دیوانہ وار جعفر علی ارغون پر ٹوٹ پڑا، اس نے بھی اس کے گھوڑے کے منہ پر وار کیا، آخر جعفر علی ارغون مارا گیا، اب ابو القاسم سلطان اکیلا رہ گیا، اس نے اونٹ سے اُتر کر پتھر برسانا شروع کیے۔ دریا خان نے اسے للکار کر کہا خبردار جب تک کہ میرا منتشر لشکر یہاں آکر جمع ہو اپنی جگہ سے ہلنا نہیں، ورنہ میں تمہارا سر تن سے جدا کر دوں گا، حالانکہ ایک آدمی بھی اس کے ہمراہ نہ تھا، پھر وہ اس تلاش میں چلا کہ اگر کوئی اونٹ اس صحرا میں مل جائے تو وہ اس اندھے کو بٹھا کر اس پر لے جائے، وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا اس نواح کے ایک گاؤں کا مقدم اور ایک آدمی اس کو ملا، وہ ان کو اپنے ساتھ لے کر واپس لوٹا، مگر بدحواسی میں راستہ بھول گیا، جہاں اس نے ابو القاسم سلطان کو چھوڑا تھا، جب وہ سب اس جگہ کو تلاش کرتے کرتے تھک گئے، تو مقدم نے جو ایک تجربہ کار انسان تھا کہا کہ جہاں آدمی قتل ہوتا ہے اور لاش پڑی ہوتی ہے، وہاں کوے ضرور جمع ہوتے ہیں، اس لیے اس جگہ کو دیکھنا چاہیے جہاں کوے اڑ رہے ہوں، چنانچہ اس نشان دہی پر وہ اس جگہ جا پہنچے، دریا خان نے جعفر علی کا سر قلم کر کے نیزے پر چڑھایا اور ابو القاسم سلطان کو اونٹ پر لاد کر جسے باندھ دیا گیا تھا، اس سر کے ساتھ ٹھٹھہ لایا اور پورے شہر اور بازار میں اس کی تشہیر کر کے اُسے قید کر دیا۔

عرب کوکہ اور دریا خان کو انعام:

ابو القاسم سلطان کی دوبارہ گرفتاری پر خوش ہو کر میرزا غازی نے عرب کوکہ کو ایک گھوڑا اور خلعت اور دریا خان کو ایک خلعت اس کی تنخواہ میں اضافہ کر کے بھیجا۔[1]

---

(1) ابو القاسم سلطان کی فراری اور دوبارہ گرفتاری کے واقعات تاریخ طاہری، ص ۲۴۴-۲۵۰ و تحفۃ الکرام سے ماخوذ ہیں۔

بکھر میں سعید خان سے ملاقات:

اس کے بعد وہ اکبر کے حضور میں حاضر ہونے کے لیے روانہ ہوا، بکھر میں اس کی ملاقات سعید خان سے ہوئی، میرزا غازی نے سب سے پہلے اب تک اکبر کے حضور میں نہ پہنچنے کی معذرت کرتے ہوئے ٹھٹھہ کے لوگوں کی سرکشی کا حال بیان کیا اور کہا میں آتش فتنہ کے فرو کرنے کی وجہ سے اب تک بادشاہ کے حضور میں حاضر نہ ہو سکا، نواب سعید خان بھی اس کے ساتھ پدرانہ شفقت اور لطف و کرم کے ساتھ پیش آیا اور اس کی کچھ اس طرح ڈھارس بندھائی کہ اُس کے دل کا خوف امید سے بدل گیا اور اپنے فرزند سعد اللہ کو ہدایت کی کہ وہ میرزا غازی کے ساتھ ظاہر و باطن برادرانہ سلوک کرے، تاکہ وہ دل گیر اور غمگین نہ ہو، چنانچہ اس میں اور میرزا غازی میں نہایت گہرے دوستانہ روابط پیدا ہو گئے، دونوں شکار اور چوگان بازی میں مشغول رہے۔[1]

"میرزا غازی ترخان" میں بحوالہ مظہر شاہجہانی فاضل محقق سید حسام الدین راشدی نے لکھا کہ: جس دور میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا، اکبر نے میر ابو القاسم نمکین گورنر سہوان کو بھی فرمان بھیجا کہ وہ ٹھٹھہ جا کر میرزا غازی کو وہاں سے روانہ کرے اور دربار میں پہنچائے، چنانچہ ابو القاسم تیاریوں کے ساتھ سہوان سے ٹھٹھہ روانہ ہوا، اس وقت سعید خان دربیلہ میں منزل انداز تھا، میر ابو القاسم نمکین نے چاہا کہ وہ سعید خان سے پہلے ٹھٹھہ پہنچ کر میرزا غازی کو لے اور دریا کی طرف روانہ ہو جائے۔ اس غرض سے وہ نصرپور تک پہنچا اور میر عطاء اللہ مشہدی کو اپنی آمد کی اطلاع دینے کی غرض سے میرزا غازی کے پاس بھیجا۔ یہ پیام پہنچتے ہی میرزا غازی نے کہلا بھیجا کہ میں خود دربار میں حاضری کے لیے پابہ رکاب ہوں، اور عنقریب آپ کے پاس سہوان پہنچ رہا ہوں۔ آپ یہاں آنے کی زحمت نہ فرمائیں، چنانچہ ابو القاسم نمکین سہوان واپس چلا گیا اور چند روز کے بعد میرزا غازی بھی سہوان پہنچ گیا، پھر ابو القاسم نمکین میرزا غازی کو ہمراہ لے کر سعید خان کے پاس آیا اور وہاں سے یہ تینوں مل کر دارالخلافہ آگرہ روانہ ہوئے۔[2]

اکبر کے حضور میں حاضری:

اس طرح نواب سعید خان ۱۰۱۳ھ (۵-۱۶۰۴ء) میں میرزا غازی کو لے کر اکبر کے حضور میں آگرے حاضر ہوا، اکبر نے اس کا اندازہ کر لینے کے بعد کہ وہ اس کے مخلصین میں ہے الطاف شاہانہ سے اُس کو نوازا اور شمشیر خاص اس کو عنایت کی اور اس کے باپ کے منصب پر اس کو بحال رکھ کر حسب دستور سابق صوبہ سندھ اس کی جاگیر میں دیا اور میرزا غازی اکبر کے حضور میں رہنے لگا۔

مآثر الامرا میں ہے کہ جب میرزا غازی اکبر کے حضور میں پہنچا تو اس کی عمر سترہ سال کی تھی، صاحب تاریخ طاہری اور صاحب تاریخ لُب تاریخ سندھ نے اس کی اکبر کے حضور میں حاضری کا سنہ ۱۰۱۳ھ لکھا ہے، ابوالفضل نے اکبر نامہ میں بضمن واقعات ۱۰۱۳ھ لکھا ہے کہ:

> چہاردھم مہر ماہ الاہی- سعید خاں باپدر خود- و ابو القاسم نمکین ملازمت نمود- و میرزا غازی پور میرزا جانی ترخان از ٹھٹھہ آمدہ جبین بسجود آستان اقبال نورانی ساخت، و گزیدہ پیش کش بہ نذرانہ گزرانید- ہیژدھم بمیرزا غازی و ابو البقا اوزبک گوہر مرصع وبعابدی خواجہ جوھر مرحمت شد:[3]

جہانگیر کا عہد حکومت:

(۱۰۱۴ھ تا ۱۰۳۷ھ) چند ماہ کے بعد اکبر نے ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) کو وفات پائی، اور اس کا بیٹا جہانگیر تخت نشین ہوا، بعض بد خواہوں کے مشورے پر میرزا غازی خفیہ طور پر آگرہ سے ٹھٹھہ بھاگ گیا، لیکن اس کے ٹھٹھہ پہنچتے ہی جہانگیر کا فرمان اس کی طلبی کے لیے پہنچا، اس فرمان کے پہنچتے ہی میرزا غازی جہانگیر کے حضور میں حاضر ہو گیا اور ان حاسدوں کی توقع کے خلاف جنہوں نے جہانگیر کو اس کے خلاف بھڑکایا تھا وہ پہلے سے بھی زیادہ سرفراز ہوا۔[4]

اسی زمانے شاہزادہ خسرو باپ سے بغاوت کر کے فرار ہو گیا تھا اور جہانگیر کو خسرو کی مہم درپیش تھی، اور وہ اس کے متعلق اُمرا سے مشورہ کر رہا تھا، جب میرزا غازی جہانگیر کے حضور میں پہنچا تو جہانگیر نے اُمراء سے کہا کہ غازی بیگ سے بھی تو مشورہ کرنا چاہیے کہ ہمیں اس امر میں کیا

---

(1) تاریخ طاہری، ص ۲۴۱-۲۴۲۔

(2) میرزا غازی ترخان (تالیف سید حسام الدین راشدی، ص ۵۲-۵۳ بحوالہ مظہر شاہجہانی، ص ۱۱۱-۱۱۲۔)

(3) میرزا غازی ترخان (تالیف سید حسام الدین راشدی، ص ۵۶ بحوالہ مآثر الامرا، جلد-۲، ص ۳۲۶ و اکبر نامہ، جلد ۳، ص ۸۲۹۔

(4) تحفۃ الکرام اردو ترجمہ، ص ۲۹۲۔

کرنا چاہیے؟ بعض اُمرا نے کہا کہ وہ نوجوان اور ناتجربہ کار ہے، شاہی معاملات کو وہ کیا جانے، جہانگیر نے کہا کہ وہ ایک والی ملک کا بیٹا ہے، اس کی رائے غلط نہ ہوگی۔ چنانچہ میرزا کو بلا کر اس سے پوچھا گیا، اس نے عرض کیا کہ میرا مشورہ وہی ہے، جو آپ کی رائے ہے، جہانگیر نے کہا کہ آخر کچھ تو کہو، میرزا غازی نے کہا کہ اگر آپ مجھ سے دریافت ہی فرمانا چاہتے ہیں تو میں اپنی رائے اس وقت عرض کروں گا، جب آپ اپنا ایک قدم رکاب میں رکھیں گے، جہانگیر نے اس کا منشا سمجھ کر خوش ہو کر اپنے اُمرا سے کہا، تم نے دیکھا میں نہیں کہتا تھا کہ وہ ایک والی کا بیٹا ہے، میری بھی وہی رائے ہے، چنانچہ جہانگیر خود خسرو کے تعاقب میں روانہ ہوا اور بالآخر خسرو گرفتار ہوا۔[1]

خسرو خان چرکس کی شورش:

خسرو خان چرکس ترخانی اُمرا میں ہمیشہ ممتاز حیثیت کا مالک رہا اگرچہ اس کے روشن مستقبل کی ابتدا مرزا عیسیٰ ترخان اول کے دور میں ہوئی، لیکن اس کے اقتدار کا زمانہ میرزا جانی بیگ کے دور میں شروع ہوا اور میرزا غازی کی گورنری کے دور میں اس کی عظمت و شہرت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا۔

خانخاناں اور میرزا جانی کے درمیان جب مقابلہ ہوا تو خسرو خان نے میرزا جانی بیگ کی طرف سے شجاعت و بہادری کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا اور اس نے اپنے ملک کو ہندوستان کے مغلوں سے بچانے کے لیے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی، لیکن جب خانخاناں کی تحریک پر جانی بیگ صلح کے لیے مجبور ہوا تو مجبوراً خسرو چرکس بھی میدان چھوڑ کر باہر آگیا۔

جانی بیگ کو جب خانخاناں ہندوستان لے گیا، تو جانی بیگ جن اُمرا کو اپنے ساتھ لے گیا ان میں خسرو چرکس بھی تھا، خانخاناں کی سفارش پر جب اکبر نے سرکار نصرپور، سرکار چاچکاں، سرکار ٹھٹھہ، سرکار چاکر ہالہ اور جون، جانی بیگ کے حق میں بطور جاگیر واگزاشت کیے تو اس وقت بھی خسرو چرکس، دوسرے ترخانی اُمرا کے ساتھ ملک کے انتظام کے لیے ہندوستان سے ٹھٹھہ واپس آیا۔

میرزا جانی بیگ کے (۲۷ رجب ۱۰۰۹ھ) میں انتقال کے بعد جب اس کا بیٹا میرزا غازی اس کی جگہ سندھ کا گورنر ہوا تو وہ کمسن تھا، جس کی وجہ سے صحیح معنیٰ میں ملک کا مختارِ کل خسرو چرکس ہی رہا، اسی زمانے میں اس کے خاندان نے اتنا اثر اور نفوذ حاصل کر لیا کہ بعد میں میرزا غازی کو اس کے غلط اقتدار کی وجہ سے سخت تکلیفیں اٹھانی پڑیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے تیرہ سالہ دور گورنری میں بالکلیہ خسرو چرکس کے اقتدار کو زائل نہ کر سکا۔[2]

جب میرزا غازی جہانگیر کے حضور میں حاضر ہونے کے لیے آرہا تھا تو وہ احمد بیگ سلطان کو ملک کے انتظام کے لیے ٹھٹھہ میں رکھنا چاہتا تھا اور خسرو چرکس کو جس سے وہ مطمئن نہیں تھا، اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن خسرو چرکس نے ٹھٹھہ میں رہنے کے لیے متعدد سفارشیں کرائیں، یہاں تک کہ خود احمد بیگ سلطان نے بھی معاملات کے رخ کا اندازہ کر کے کہ اگر میں ٹھٹھہ میں رہا تو سوائے رسوائی کے کچھ حاصل نہ ہوگا، کیونکہ تمام یومیہ دار خسرو سے متعلق ہیں نہ معلوم آئندہ کیا صورت حال پیدا ہو، مرزا غازی سے کہا کہ مقامی لوگ خسرو کے یہاں رہنے سے متفق ہیں اس لیے میرے یہاں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، بہتر ہے کہ خسرو کو یہاں چھوڑ دیا جائے، چنانچہ میرزا غازی اس پر راضی ہو گیا اور احمد بیگ سلطان کو اپنے ساتھ لے گیا۔ لیکن جب وہ دارالخلافہ پہنچ کر جہانگیر کی نوازشوں سے سرفراز ہوا تو خسرو چرکس کی بعض شکایات پہنچنے پر اس نے جہانگیر کی اجازت سے شہباز خان اور احمد بیگ سلطان کو اس حکم کے ساتھ ٹھٹھہ بھیجا کہ خسرو سوائے فوجداری معاملات کے مالی معاملات میں دخل نہ دے۔

یہ انتظام میرزا غازی کو اس لیے کرنا پڑا کہ خسرو نے ملک میں اقتدارِ کامل حاصل کرتے ہی ملک سے میرزا غازی کے اقتدار کو زائل کرنے کی پوری کوشش کی اور ملک کے تمام محاصل اپنے خاندان کے تصرف میں لے آیا، یہاں تک نوبت پہنچی کہ میرزا غازی کو ملک کے مالیے سے ایک پائی نہ پہنچنے پاتی تھی، خسرو کے عزیزوں نے پورے ملک میں ظلم و تشدد کو عام کیا اور لاقانونیت کی فضا پیدا کی۔ جس سے ملک میں عام بیزاری پیدا ہوئی اور ملک کے حالات ابتر سے ابتر ہو گئے۔ یہاں تک کہ سندھ کے لوگوں نے میرزا غازی کے پاس پہنچ کر شکایت کی کہ خسرو خان کی سرکشی کا اب یہ عالم ہے کہ:

> او (خسرو خان) خود را گماشتہ شاہی پندارند، نواسہای خود را در صوبہ باسرانجام تمام صوبہ ساختہ - کہ ہر یک تقلید شاہی دارد[3]

---

[1] ترخان نامہ، ص ۸۸ و تحفۃ الکرام ترجمہ اردو ۲۹۳-۲۹۴۔

[2] حواشی مکلی نامہ تالیف سید حسام الدین راشدی، ص ۱۹۶-۱۹۸۔

[3] تاریخ طاہری، ص ۲۶۳۔

محمد بیگ ولد رستم بیگ، نیرن کوٹ کے حاکم کے متعلق انہوں نے بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

از غرور جوانی و نخوت کامرانی، بنوعی دماغ
بہم رسانیدہ کہ اکثر بر ارغون و ترخان تعدی
مید اشت، بر کسی کہ بدید او می امد، بجای
دست دادن، پادراز میکرد[1]

اس کے خاندان کے لوگ میرزا غازی کے آدمیوں کی توہین کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے، فتح اللہ بن بہائی خان جو بدین کا حاکم تھا، اس کے پندار و غرور کی حالت بیان کرتے ہوئے صاحب تاریخ طاہری لکھتا ہے کہ:

روز عید مرشدان را- کہ میرزا (غازی) اورا از پدرش بہائی خاں بیشتر میخواست- بہ تکلیف تمام از جاگیر کہ در آن صوبہ داشت، طلب نمودہ، ازیں قسم، آن نکتہ چین سخن آفرین را آزاد داد، وبہ بی تورگی پیش آمد کہ میرزا ہر گز بدیں مردم چنیں اداہای ناشائستہ نکردہ باشد، عاقبت چوں، بہ انباری فیل سوار گردیدہ متوجہ عید گاہ گشت- موی الیہ از آمدن منفعل گردیدہ بجاگیر رفت۔[2]

اس کے بے وقار اُمرا کی خفیف الحرکاتی کو بیان کرتے ہوئے صاحب تاریخ طاہری لکھتا ہے کہ شیخ عبدالباقی ولد شیخ کالہ جو خسرو چرکس کا نواسا بھی تھا اور حضرت غوث العالم مخدوم شیخ بہاء الدین زکریا کی اولاد میں سے تھا، ایسے بزرگ خاندان سے ہوتے ہوئے ایک لفنگا عبدالعزیز گوزورنگ ریز اس کی محفل میں بیٹھتا تھا اور گوز لگاتا تھا، اور وہ اور اس کے اہل محفل خوش ہو ہو کر اس پر ٹھٹھہ لگاتے تھے۔[3]

عوام خسرو چرکس اور اس کے اُمرا کے مظالم سے تنگ آچکے تھے ہر ایک چھوٹے بڑے کی زبان پر تھا الٰہی اس حکومت اور اس کے حاکموں کو ذلیل وخوار کر، جس طرح یہ غربا کو بے عزت کرتے ہیں، خدا کرے کہ یہ بھی بے ننگ ونام ہوں۔

احمد بیگ سلطان کو ذلیل کرنے کی کوشش:

یہ حالات تھے کہ جن میں احمد بیگ سلطان ٹھٹھہ پہنچا، خسرو کو جب اُس کی آمد کی خبر ملی تو اس نے شیخ کالہ اور قاسم چرکس سے مشورہ کیا، اور باہمی مشورے سے طے کیا کہ ایک دفعہ احمد بیگ سلطان کو ذلیل کر کے میرزا غازی کے پاس بھیج دینا چاہیے۔ اس فیصلے کے بعد اس نے ارغونوں کو بلا کر کہا کہ کل جب احمد بیگ میرزا غازی کی والدہ کو سلام کر کے دیوان عام میں آکر بیٹھے تو تم اس کی بے عزتی کرنا، صبح کے وقت اس سازش کی خبر احمد بیگ کو ملی، وہ اس خبر کے ملتے ہی اپنے آدمیوں کو جنہیں وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا، لے کر تیزی کے ساتھ حویلی میں داخل ہو گیا لیکن فسادی وہاں پہنچ گئے، آخر قاسم خان ارغون کی مدد طلب کی، وہ اسے لے کر اپنی جاگیر نصرپور میں آیا۔ ارغونوں اور ترخانوں نے اس کا تعاقب نصرپور تک کیا لیکن چونکہ شاہ قاسم ارغون اس کے ساتھ تھا کوئی علانیہ اس کے مقابل نہ ہو سکا، احمد بیگ وہاں سے عمرکوٹ اور جیسلمیر کے راستے سے سفر کرتا ہوا میرزا غازی بیگ کے پاس پہنچ گیا۔

قندھار کی گڑبڑ:

اُس زمانے میں قندھار کا صوبہ ہندوستان کی سرحد پر واقع ہونے کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا تھا، اس کے علاوہ وہاں کے نواح کے جاگیرداروں نے حاکم ہرات کی شہ پر قندھار پر حملہ کر دیا تھا، اس زمانے میں شاہ بیگ خان قندھار کا گورنر تھا، قلعہ قندھار محاصرے میں تھا اور شاہ بیگ باوجود محاصرے کے مردانہ وار مقابلہ کر رہا تھا۔ محاصرین تین طرف سے قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھے کہ اس کی اطلاع لاہور میں جہانگیر کو ملی، توزک میں ہے کہ اسی وقت جہانگیر نے ایک بڑا لشکر میرزا غازی بیگ کی سرداری میں جس میں منصب دار اور قرابیگ اور تختہ بیگ کابلی جیسے اُمرا شریک تھے روانہ کیا، میرزا غازی بیگ کو روانہ کرتے وقت منصب پنج ہزاری ذات وسوار سے سرفراز کر کے نقارہ عنایت کیا، خواجہ عاقل کو اس لشکر کی بخشگیری پر مقرر کیا، میرزا غازی بیگ کے ساتھیوں میں سے تینتالیس ہزار روپے فراخاں کو اور پندرہ پندرہ ہزار روپے نقدی بیگ اور قلیچ بیگ کو بطور مدد خرچ کے دیے۔[4]

ترخان نامہ میں ہے کہ اس لشکر کا سردار قرابیگ خاں تھا اور غازی بیگ اس کے ساتھ تھا۔ جب یہ لشکر ملتان پہنچا تو اتفاق سے قرابیگ خاں کی وفات ہو گئی، اُمرا نے آپس میں مشورہ کیا کہ عرضداشت بھیج کر جہانگیر سے حکم طلب کیا جائے کہ کیا کرنا چاہیے؟ مگر میرزا غازی بیگ

---

[1] تاریخ طاہری- ص ۲۶۴۔
[2] تاریخ طاہری، ص ۲۶۴۔
[3] تاریخ طاہری، ص ۲۶۴-۲۶۵۔
[4] توزک جہانگیری- سرسید ایڈیشن، ص ۳۳-۳۴۔

نے حکم دیا کہ کوچ کا نقارہ بجایا جائے، یہ حکم دے کر اس نے قرابیگ خاں کی فوج کو تسلی دی اور ان کی تنخواہوں میں پندرہ فیصد کا اضافہ کر کے اپنا نوکر بنالیا، اور دریا کو عبور کیا، اُمرا بھی مجبوراً اس کے ساتھ روانہ ہوئے، یہ منزلیں طے کرتا ہوا قندھار پہنچا۔ جب قندھار پانچ کوس رہ گیا تو اس نے فوج کو تیار کر کے قزلباشوں سے لڑنے کا حکم دیا۔ جب دونوں فوجیں آپس میں ٹکرائیں تو قزلباشی فوج شکست کھا کر فرار ہو گئی اور بہت سا مال غنیمت میر زاغازی کے ہاتھ آیا، اور وہ فاتح و کامران ہو کر قلعے میں داخل ہوا۔ شاہ بیگ[1] اور اس کے اُمرا اس کی آمد سے نہایت مسرور ہوئے اور سب نے متفقہ طور پر اس فتح کی نوید بصورت عرضداشت جہانگیر کو روانہ کی۔[2]

غازی بیگ کو فرزندی کا خطاب:

جب جہانگیر کو میر زاغازی کی فتح و نصرت کی خبر ملی تو اس نے ازراہ کمال و شفقت و مہربانی اسے ۱۰ شعبان ۱۰۱۶ھ میں فرزندی کے خطاب اور منصب پنج ہزاری سے منصب دوازدہ ہزاری پر سرفراز کیا، اور مملکت ٹھٹھہ کے ساتھ مملکتِ قندھار کا بھی اس کی جاگیر میں اضافہ کیا اور قندھار کی گورنری بھی اس کے سپرد کی، اور شاہی فرمان صادر ہوا کہ: فرزند غازی کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے اسے فرزندی کے خطاب سے سرفراز کیا ہے، شہزادگی کے تمام لوازم اس کے سامنے بجالائے جایا کریں اور حکم ہوا کہ منصب ہزاری تک پانے والے ملازم ہر روز اُس کے دیوان میں دست بستہ کھڑے ہوں اور ہزاری سے زیادہ منصب رکھنے والے اس کی مسند سے دور ادب کے ساتھ کھڑے ہوں اور قندھار کا نظم و نسق اور وہاں کے ملازمین کا عزل و نصب اور لوگوں کی تعیناتی کے پورے اختیار میں نے اس کو دے دیے ہیں اگر وہ احدی کو ہزاری اور ہزاری کو احدی کرے تو ہمیں منظور ہو گا۔[3]

قندھار میں قحط:

جس زمانے میں کہ میر زاغازی اور اس کا لشکر قندھار پہنچا ہے، اس وقت اس علاقے میں سخت قحط پڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے میر زاغازی اور اس کے لشکر کو سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، تحفۃ الکرام میں ہے کہ:

مردمان میر زاغازی بسیار تلف و سوار پیادہ شدند۔[4]

صاحب تاریخ طاہری سید طاہر محمد نسیانی جو میر زاغازی کے قندھار پہنچنے کے کچھ دن بعد ہی ٹھٹھہ سے قندھار پہنچا تھا، اس قحط کی شدت اور کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے:

قحط سالی بمرتبہ ای دید، کہ اکثر غربای آں سرزمین گوشت چینہای اسپ و شتر می بریدند و می خوردند، روزی از ایناں استفسار داشت کہ ایں محض حرام است، چرا می خورند؟ جواب دادند کہ بعد از سہ فاقہ حرام حلال ساختہ اند، و ما مردم راہفت و نہ فاقہ می گزرد،

چوں چیزی دیگر بہم نمی رسد ہمیں آرام نفس بے آرام می نمایم، الحق ہمچناں وقت بود۔[5]

اس شدید قحط کا اثر میر زاغازی اور اس کے لشکر پر بھی پڑا۔ میر طاہر محمد نسیانی اس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ میر زاغازی کے بہت سے لشکری اس قحط کی وجہ سے اس قدر پریشان و خراب ہوئے کہ ان میں بہت سے بغیر سواری کے پیادہ رہ گئے اور قرض سے زیر بار ہو کر دلدل میں پھنس گئے۔[6]

خود میر زاغازی کی پریشانی کے متعلق طاہر نسیانی نے لکھا ہے کہ میر زا کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ خود سردار خان اور میر بزرگ[7] بن

---

(1) شاہ بیگ ارغون، مخاطب بہ خاں دوراں بن ابراہیم بیگ چریک ابتدا او میر زا محمد حکیم کا نوکر اور پشاور کا حاکم تھا۔ میر زا محمد حکیم کے فوت ہونے کے بعد وہ اکبر کی ملازمت سے منسلک ہوا۔ ۳۹ جلوس اکبری میں یہ قندھار کا صوبیدار مقرر ہوا، (رک: مآثر الامرا، ج ۲، ص ۶۴۲-۶۴۵۔)

(2) ترخان نامہ - ص ۸۹-۹۰۔

(3) ترخان نامہ ص ۹۰-۹۱ و توزک جہانگیری اردو ترجمہ، اعجاز الحق قدوسی، جلد ۱، ص ۲۲۹-۲۳۰۔

(4) تحفۃ الکرام، جلد ۳، ص ۸۴۔

(5) تاریخ طاہری، ص ۲۵۶۔

(6) ایضاً - ص ۲۵۷۔

(7) میر بزرگ بن میر معصوم بکھری: یہ ابتدا میں اکبر کا چوکیدار تھا، خسرو کی بغاوت کے زمانے میں سپاہی اسے راستے سے مسلح پکڑ لائے۔ کوتوال نے اس کے متعلق بیان دیتے ہوئے کہا کہ یہ بھی اس بغاوت میں شامل تھا۔ میر بزرگ نے اس سے انکار کیا۔ جہانگیر نے اس سے پوچھا کہ پھر ایسے ناموزوں وقت میں تو نے ہتھیار کیوں باندھے؟ اس نے جواب دیا کہ میرے والد کی وصیت ہے کہ چوکی کی شب مجھے مسلح رہنا چاہیے، چوکی نویس نے بھی اس کی تصدیق کی، اس پر جہانگیر نے اسے معاف کر کے اس کے باپ کی مال و ملکیت کا اسے حق دار قرار دیا اور ساتھ ہی قندھار کی بخشیگری کا عہدہ بھی عطا کیا۔ وہ کافی مدت تک وہاں رہا، آخر میں اس کے دماغ میں کچھ خلل واقع ہو گیا تھا کہ وہ کسی سے بھی عجز و انکسار کے ساتھ پیش نہ آتا تھا اور نہ کسی گورنر سے دبا کر سکتا تھا، ایک مرتبہ وہ جہانگیر کے ہمراہ مانڈو بھی گیا تھا اور دکن پر بھی مامور ہوا تھا، جہاں وہ کافی عرصے تک رہا، اس کی

معصوم بکھری سے قرض لے کر اپنا گزارہ کر رہا تھا، جب سپاہی تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے شدت بھوک سے تنگ آ کر اس کی حویلی پر جاتے اور داد داد کا نعرہ لگاتے تو اُس کے وکلا ان کو آگے نہیں جانے دیتے تھے اور اس ڈر سے کہ میرزا غازی خود پریشان ہے ان کی فریاد اس سے بیان نہ کرتے تھے، ایک دن میرزا نے کسی طرح خود حالات کا اندازہ کر لیا اور حکم دیا کہ میں نے جو کچھ بچا کر مشکل وقت کے لیے رکھا ہے وہ سب ان میں تقسیم کر دو اور مجھے ان کی تکلیف سے نجات دو۔[1]

جہانگیر کی خدمت میں عریضہ:

جب حالات نہایت نازک صورت اختیار کر گئے تو میرزا غازی نے مجبور ہو کر ایک عرضداشت روانہ کی جو قندھار کے حالات پر مشتمل تھی۔

بکھر میں آمد:

اس عرضداشت پر جہانگیر نے میرزا کے نام قندھار حکم بھیجا کہ وہ اپنے حالات اور لشکر کے ساز و سامان کو درست کرنے کے لیے قندھار سے بکھر آ جائے اور جب تک دوسرا حکم نہ پہنچے بکھر میں قیام کرے، اس شاہی حکم کے ملتے ہی میرزا فوراً بکھر پہنچا اور اپنے ملکی اور ذاتی حالات کو درست کرنے میں مصروف رہا۔[2]

سال اول کے ماہ ربیع الثانی کے روزنامچے میں جہانگیر نے لکھا ہے کہ: میرزا غازی کو تیس لاکھ دام بطور انعام دیے گئے، قیاس چاہتا ہے کہ یہ انعام اس کو قندھار کی مہم سر کرنے اور اپنے حالات کو درست کرنے کے لیے دیا گیا ہو گا۔[3]

میرزا کے متعلق غلط فہمی:

قندھار کی مہم سر ہونے کے بعد جہانگیر مطمئن ہو کر لاہور سے بغرض سیر و تفریح کابل چلا گیا، اُن دنوں میرزا غازی بکھر میں مقیم تھا، بعض حاسدوں نے جہانگیر کے مزاج میں برہمی پیدا کرنے کے لیے غلط فہمیاں پیدا کرنی شروع کیں کہ اب میرزا اپنے وطن سے واپس نہ آئے گا، چنانچہ تاریخ طاہری میں ہے کہ:

> بعضی بعرض اقدس و اعلیٰ حضرت چناں معروض داشتند کہ او بعتبہ بوسی از ملکِ خویش باز نخواہد آمد۔[4]

اس پر جہانگیر نے میرزا غازی کے نام فوری فرمان جاری کیا کہ وہ بذریعہ ڈاک چوکی فوراً دربار میں پہنچے، چنانچہ میرزا غازی اس اخلاص و عقیدت کی بنا پر جو وہ بادشاہ سے رکھتا تھا، فوراً دربار کی طرف روانہ ہو گیا، اس زمانے میں جہانگیر کابل سے واپس آ کر لاہور میں مقیم تھا، یہ لاہور میں اس کے دربار میں حاضر ہو کر زمین بوس ہوا، جہانگیر نے اُسے منصب اور جاگیر اور صوبیداری قندھار سے نوازا اور ان خود غرض حاسدوں کو جنھوں نے میرزا کے متعلق غلط فہمی پیدا کی تھی سخت ندامت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔[5]

صاحب ترخان نامہ نے اس واقعہ کو قندھار سے متعلق بتایا ہے، اس کا بیان ہے کہ جب میرزا غازی نے قندھار کی حکومت سنبھالی تو اس کی قدر دانیوں کی وجہ سے ایران و توران سے آ کر بڑے عالم و فاضل و شعرا اس کے دربار کی زینت بنے، ادھر اُس نے شعراء، مدرسین، گوشہ نشینوں کے سالانہ وظائف مقرر کر کے سارے صوبے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی اور ملک کے نظم و نسق کو اس حد تک درست کیا کہ ایران کے لوگوں کو بھی اس نے اپنا مطیع بنا لیا، یہاں تک کہ شاہ ایران اس کو اپنا فرزند کہتا اور تحائف بھیجتا تھا، ظاہر ہے کہ جس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہو اس کے حاسد بھی پیدا ہو جاتے ہیں، چنانچہ بعض اُمراء نے حسد و بغض کی بنا پر دربار میں اس کی شکایت کے کہ میرزا غازی کے سر میں باغی ہونے کا سودا سمایا ہے اور شاہ ایران سے اس نے دوستی کو بڑھایا ہے۔ بس وہ آج کل ہی میں بغاوت شروع کرنے والا ہے، اس بنا پر جہانگیر نے امتحاناً فرمان جاری کیا کہ میرزا ڈاک چوکی سے فوراً دربار میں حاضر ہو۔ میرزا غازی فرمان کے پہنچتے ہی اخلاص و عقیدت کے ساتھ فوراً روانہ ہو گیا۔ اور سترہ دن کے اندر اس نے قندھار سے لاہور پہنچ کر شرف قدم بوسی حاصل کیا، جہاں بادشاہ شکار میں مشغول تھا۔ جہانگیر

جاگیروں کی آمدنی اس کے اخراجات کے لیے کافی نہ ہوتی تھی اس لیے وہ اس عہدہ سے مستعفی ہو کر اپنے آبائی وطن بکھر میں مقیم ہو گیا تھا اور اپنے والد کے باغات اور املاک پر قناعت کر لی تھی۔ اس نے ۱۰۴۴ھ میں وفات پائی، آج بھی اس کی اولاد شہر سکھر میں موجود ہے، اور یہ لوگ سادات معصومی کہلاتے ہیں۔ (رک: تاریخ معصومی، اردو ترجمہ، ص ۲۷-۲۸)۔

(1) تاریخ طاہری، ص ۲۵۷-۲۵۸۔

(2) تاریخ طاہری، ص ۲۵۸۔

(3) مضمون سید حسام الدین راشدی بعنوان میرزا غازی رسالہ تاریخ و سیاسیات ماہ اگست ۱۹۵۴ء بحوالہ توزک، ص ۳۷ و بیورج، ص ۷۵۔

(4) تاریخ طاہری، ص ۲۵۸۔

(5) تاریخ طاہری، ص ۲۵۹۔

اُسے دیکھ کر بہت مسرور و محظوظ ہوا اور ہر طرح اُس سے مطمئن ہو گیا بعد ازاں اس کو مختلف قسم کے انعام و اکرام سے نوازا اور پنجاب کے چند پرگنے بھی اس کی جاگیر میں مقرر کیے اور قندھار بھی اس کے پاس رہنے دیا اور قندھار کی حکومت پر اسے روانہ کیا۔[1]

جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، تاریخ طاہری کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ میرزا غازی کو پنجاب میں ملتان کی جاگیر آگرہ سے آنے کے بعد قیام لاہور کے زمانے میں جہانگیر نے اُسے عنایت کی تھی اور وہ وہاں سے قندھار کی مہم پر گیا تھا۔ قحط کی وجہ سے سردار خان کی سپردگی میں قندھار دے کر حسب فرمان شاہی بکھر میں آکر مقیم ہو گیا، اس زمانے میں بعض درباری اُمرا نے اس کے متعلق بادشاہ کو اس سے برہم کرنے کے لیے بغاوت اور سرکشی کی غلط فہمی پیدا کرنی چاہی، بادشاہ نے اسے بکھر سے بلایا، میرزا غازی بکھر سے لاہور پہنچا، جس سے نہ صرف بادشاہ کی غلط فہمی دور ہو گئی، بلکہ اس کو قندھار کا صوبہ بطور انعام دے کر قندھار روانہ ہونے کا حکم دیا۔ والی ایران سے تعلقات اور اس خطے میں اس کی مقبولیت یہ سب بعد کی چیزیں ہیں، چنانچہ توزک جہانگیری جشن سویم میں ہے:

> در چہار دہم ماہ مذکور حکم کردم کہ میرزا غازی متوجہ قندھار شود، از اتفاقات حسنہ بمجرد آنکہ میرزا می مشار الیہ از بھکر روانہ ولایت مذکور گردد خبر فوت سردار خاں حاکم آں جامی رسد، سردار خاں از ملازمان مقرر و روشناس میرزا محمد حکیم عم من بود، تختہ بیگ اشتہار داشت، نصف منصب او را بفرزندان او عنایت نمودم۔[2]

توزک کے جشن دوم میں جہانگیر نے ۱۰ شعبان ۱۰۱۶ھ کو میرزا غازی کے متعلق لکھا کہ:

> روز پنجشنبہ دہم میرزا غازی را بمنصب پنج ہزاری ذات و سوار ساختہ با آنکہ کل ولایت ٹھٹہ بجاگیر او مقرر بود، پارہ از صوبہ ملتان بجاگیر او مقرر گشت و حکومت قندھار و محافظت آں ملک کہ سرحد ہندوستان است بعہدۂ کاردانی و حسن سلوک او مقرر گردید۔[3]

توزک کی مندرجہ بالا عبارتوں سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ وہ جب دوسری مرتبہ حکومت قندھار پر گیا تو وہ بکھر سے گیا، دوسرے یہ کہ ٹھٹہ کی حکومت تو اس کے پاس ابتدا سے ہی تھی، ملتان، آگرہ سے لاہور پہنچ کر عطا ہوا، قندھار سے واپسی کے وقت تیس لاکھ دام اسے انعام ملے اور آخر میں ٹھٹہ، بکھر، ملتان کے ساتھ ساتھ قندھار کی حکومت بھی میرزا کو تفویض کی گئی۔

وطن کو روانگی:

میرزا غازی بادشاہ سے رخصت ہو کر ملتان پہنچا، تاریخ طاہری میں ہے کہ:

> چوں از حضور حضرت مرخص گردید، در بلدۂ ملتان رسید صلاح دولت درین یافت کہ معاملات آنجا را فیصل دادہ بحال مددے پردازد، صاحب دخلاں را طلب نمودہ۔[4]

ملتان کے انتظامات درست کرنے کے بعد پھر اس نے اپنے وطن جانے کا ارادا کیا، اُسے خیال ہوا کہ وہ قندھار جانے سے پہلے سندھ جا کر وہاں کے انتظامات درست کرے اور وہاں کے نظم و نسق میں جو انتشار پیدا ہو چکا، اُسے ہمیشہ کے لیے دور کر دے اور جب تک وہ وہاں قیام کرے اتنی مدت کے لیے وہاں اپنا نائب بھیج دے۔ تاریخ طاہری میں ہے کہ اس نے اس کے لیے اپنے ہم جنس اور اپنے اقربا میں سے میرزا بہرام ولد میرزا امان ترخان کو قندھار کی قائم مقامی کے لیے منتخب کیا۔ اور اسے خاص اعزازات، ایک ہاتھی، چند گھوڑوں مع فراش خانہ و سامانِ مطبخ اور منتخب فوج جو ارغونوں اور ترخانوں پر مشتمل تھی، اس کے لیے تیار کی۔ بہرام خاں پہلے تو جانے کے لیے تیار ہوا، لیکن عین روانگی کے وقت اس نے ٹھٹہ جانے کے لیے عذر کیا اور کہا کہ اس کا ایک بیٹا ایک گاؤں کی سندھی عورت سے ہے، جو اس کی جاگیر میں تھا وہ اس عورت کو اس کی ماں کے حوالے کر کے اس کے بعد جو خدمت اس کے سپرد کی جائے گی وہ بہ دل و جان بجالائے گا۔ میرزا غازی اپنے اس انتخاب پر سخت نادم ہوا اور بے حد متاسف و شرمندہ ہوا کہ اس کے ہم جنس و اقربا میں ایسے اشخاص ہیں آخر اس نے اس کی جگہ احمد بیگ سلطان کو منتخب کیا اور جو کچھ اس نے ساز و سامان اس کم ہمت کے لیے تیار کیا تھا، وہ احمد بیگ سلطان کو مرحمت کیا، اور اسے معتمد خان کے خطاب سے سرفراز کر کے

---

[1] ترخان نامہ۔ ص ۹۱-۹۲۔
[2] توزک جہانگیری، ص ۷۲ (سرسید ایڈیشن)
[3] توزک جہانگیری، ص ۶۳۔
[4] تاریخ طاہری، ص ۲۵۹۔

قندھار کی طرف روانہ کیا۔

احمد بیگ سلطان نے قندھار پہنچ کر وہاں کے نظم و نسق کو اس طرح درست کیا کہ رعایا اور لشکر اس کے حسن سلوک سے خوش ہو گئے اور لشکر میں جو ابتری پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی۔[1]

میرزا غازی کا بکھر میں قیام:

ادھر میرزا غازی، احمد بیگ سلطان کو قندھار روانہ کر کے ملتان کے انتظام میں مصروف ہو گیا اور وہاں سے فراغت پانے کے بعد بکھر آیا اور وہاں کچھ عرصے قیام کیا۔ ٹھٹھہ کا نظم و نسق بالکل خراب ہو چکا تھا، خسرو چرکس اور اس کے ہمنوا سارے ملک پر چھائے ہوئے تھے اور ملک کے محاصل پر قابض تھے، جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ سب کھا لیتے تھے اور برائے نام میرزا کو بھی کچھ بھیج دیتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرزا نے وہاں کی ابتری کو دیکھ کر ٹھٹھہ کے انتظامات کو بھی درست کیا، تاریخ طاہری میں ہے کہ اس نے ٹھٹھہ سے اپنی والدہ کلاں کو وہاں کے منتظمین کے ساتھ جن کو ملک کے نظم و نسق میں دخل تھا طلب کیا۔ اور ملک کے انتظامی امور کے متعلق اہم فیصلے کیے، ان میں سے بعض کو اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا اور بعضوں کو رخصت کر دیا، اسی طرح محل کی بیگمات میں بعض کو اپنے ساتھ لیا اور بعض کو ٹھٹھہ واپس کر دیا اس کے جدید انتظامات کی تفصیل ہمیں تاریخوں میں نہیں ملتی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خسرو چرکس حسب سابق صاحب اقتدار رہا، البتہ خسرو کے بیٹے بہائی خان کو وہ اپنے ساتھ لیتا گیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ باوجود خسرو چرکس[2] کی بدعنوانیوں کے میرزا غازی نے اسے علیحدہ نہیں کیا اور پھر اس نے رعایا کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یا تو میرزا کے پاس آدمی نہیں تھے یا پھر خسرو چرکس کا اقتدار اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ اس کی موجودگی میں کسی دوسرے آدمی کا تقرر نہیں کر سکتا تھا بہر حال اس ماحول میں جس میں وہ گھرا ہوا تھا، جو انتظام وہ کر سکتا تھا، اس نے کیے۔[3]

قندھار کو دوبارہ روانگی:

ان انتظامات کے بعد میرزا غازی بکھر سے قندھار کی طرف روانہ ہو گیا۔

تاریخ طاہری میں ہے کہ میرزا بکھر سے سیوی اور گنجاوہ کے راستے سے قندھار پہنچا اور قندھار پہنچنے کے بعد اس نے اس صوبے میں امن و امان قائم کرنے کے لیے ہر طرف بہترین لوگ مقرر کیے، بہائی خان اور لطف اللہ سلطان کو افغان کے مقابلے کے لیے بھیجا تاکہ وہ بغاوت کی ہوا اس کے دماغ سے نکال دے اور اس کو مطیع بنائے، اس نے اپنے حسن انتظام سے ملک کی آمدنی اور مال گزاری میں اضافہ کیا، رائے مانک چند ولد مہتا گھوریہ کو مکار حیدر پر متعین کیا، چنانچہ اس نے اس پر غلبہ حاصل کر لیا اور اس کے قلعوں پر قبضہ کر لیا اور اس کا دماغ اس طرح درست کیا کہ وہ اپنے دل سے کینے کو نکال کر اصلاح پذیر ہو گیا۔[4]

مختصر یہ کہ میرزا نے تھوڑے ہی عرصے میں فتنہ و فساد کی جڑیں اکھیڑ کر اس صوبے میں اس طرح امن و امان بحال کر دیا کہ کسی سرکش اور باغی کو سر اٹھانے کی مجال باقی نہ رہی اور ملک میں اطمینان اور فارغ البالی کی لہر دوڑ گئی۔

میرزا غازی کی خارجہ پالیسی:

میرزا غازی نے ملک کے اندرونی انتظامات کے ساتھ اس صوبے کی خارجہ پالیسی کی طرف بھی توجہ دی، ایران جو قریبی ملک تھا، اس سے تعلقات کو استوار کرنا ضروری تھا کیونکہ ایران کے سرحدی سردار جب بھی ان کو موقع ملتا تھا قندھار پر ہلہ بولتے رہتے تھے، اس لیے اس کی

---

(1) یہ تمام تفصیل تاریخ طاہری، ص ۲۶۰ سے ماخوذ ہے۔

(2) خسرو خان چرکس: یہ چنگیز خان کی اولاد میں اس چرکس خان سے منسوب ہے، جو قپچاق کے میدان پر حکومت کرتا تھا، ابتداً یہ ملا جانی بندری کے پاس تھا، جس سے میرزا عیسیٰ نے لے کر ابتداً اپنا آقا بہ بردار بنایا، پھر چند پرگنوں کی حکمرانی عطا کی۔ میرزا باقی کے زمانے میں بھی اس نے ترقی کی، یہاں تک کہ میرزا جانی بیگ کے زمانے میں یہ اس کا بڑا معتمد امیر بن گیا، کہتے ہیں کہ اس جیسا باتوفیق اور صاحب خیر انسان اس سرزمین میں دوسرا پیدا نہیں ہوا، اس کے ایام حکومت میں چرکس خاندان کے افراد اور اس کے نواسوں نے بڑے مظالم کیے، جس کی وجہ سے وہ میرزا غازی کے دل سے اتر گیا اور اس نے اس کی موقوفی کا حکم جاری کر کے اس کی جگہ بندو خان کو مقرر کیا تھا، لیکن جلد ہی میرزا غازی نے وفات پائی اور سندھ تیموری مغل اُمرا کے تصرف میں آیا، ایک روایت کے مطابق وہ ٹھٹھہ سے لاہری بندر جا کر ایران چلا گیا، دوسری روایت کے مطابق وہیں فوت ہو گیا (رک: تحفۃ الکرام، اردو ترجمہ، ص ۲۸۴-۲۸۶)۔

(3) ماخوذ از مضمون سید حسام الدین راشدی، بعنوان میرزا غازی، مطبوعہ رسالہ تاریخ وسیاسیات، اگست ۱۹۵۴ء، ص ۲۱۔

(4) تاریخ طاہری، ص ۲۶۱-۲۶۲۔

شدید ضرورت تھی کہ والیٔ ایران سے اپنے تعلقات اور بھی بہتر اور مضبوط بنیادوں پر قائم کیے جائیں، اگرچہ میرزا کے قندھار پہنچنے سے پہلے ایران سے مغلوں کے بہتر تعلقات تھے، لیکن میرزا نے انہیں اور بھی بہتر بنانے کی کوشش کی، چنانچہ اس نے سید عبداللہ سلطان کو میر خان کا خطاب دے کر بہت سے تحائف اور ہدایا کے ساتھ شاہ عباس صفوی کے دربار میں بھیجا، اس کے جواب میں شاہ ایران نے بھی ایک سفیر کو تحفے تحائف دے کر قندھار بھیجا، اس طرح دونوں ملکوں کے تعلقات دوستی اور بھی مضبوط ہوگئے اور سیاسی روابط کے ساتھ شاہ عباس اور میرزا غازی کے درمیان ذاتی تعلقات اور بھی بڑھے[1]، یہاں تک کہ شاہ ایران میرزا غازی کو اپنا فرزند کہتا تھا اور تحائف اور خلعت[2] بھیجتا تھا۔

مآثر الامرا میں ہے کہ:

بادشاہ عباس طریقۂ مراسلت سلوک نمود، گویند شاہ مکرر خلعت فرستاد۔[3]

صاحب ذخیرۃ الخوانین نے بھی شاہ عباس کی طرف سے دو مرتبہ خلعت آنے کا اور ذاتی مراسلت کا ذکر کیا ہے۔

میرزا غازی بیگ نے بھی شاہ عباس کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تھا، جس کا ایک شعر ذخیرۃ الخوانین میں ملتا ہے:

ز زہر مار زماں در اماں بود آنکس
کہ شاہ مہرۂ مدح تو در دہن گیرد[4]

قیام قندھار کا زمانہ:

میرزا ۱۴ رجب ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۸ء) کے بعد قندھار پہنچا اور اپنی وفات ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) تک وہیں مقیم رہا اور اس بارہ سال کے عرصے میں اس نے اپنے آپ کو بے حد مقبول بنالیا، ملک میں امن و امان کو بحال کیا، خارجہ پالیسی کو بہتر بنایا اور اپنے تعلقات پڑوسی ملکوں سے بہترین بنیادوں پر قائم کیے، رعایا اور لشکر کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کیا، اور اپنی داد و دہش سے دوسرے ملکوں کے علماء اور شعرا کو نوازا، یہاں تک کہ بڑے بڑے عالم اور شاعر اس کے دربار کی زینت بنے، علماء و فضلا اور شعرا کے اعتبار سے اس کا دربار بڑے بڑے فرمانرواؤں کی ہمسری کرتا تھا۔ ان تمام امور کے نتیجے میں ملک کی تہذیب و تمدن میں بھی غیر معمولی ترقی ہوئی، یہاں تک کہ اس کے ہمعصر مؤرخوں اور دوسرے مؤرخوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

میخانہ عبدالنبی کا مؤلف جو اس کا ہمعصر ہے، وہ اس کی انتظامی اور دوسری خوبیوں کو سراہتے ہوئے لکھتا ہے:

باوجودیکہ در قندھار اندک زمانی حکومت کردہ، فاما آثار خوب ازو بسیار ماندہ۔

شیخ فرید بکھری صاحب ذخیرۃ الخوانین جو اس کا ہم وطن اور ہم عصر ہے، اس کی خوبیوں کو بیان کرنے میں اس طرح رطب اللسان ہے کہ:

میرزا در صوبیداری قندھار نامے گزاشت، و نادر قندھار بود، سلوک بامتر ددین بعنوان پسندیدہ کرد، خود را بہ نیک نامی علم ساخت۔

صاحب مآثر رحیمی اس کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

در آنجا بہمت و حسن سلوک بامتر ددین عراق (کذا) بر آورد۔ گویند در قندھار مجلس میرزا مجمع صاحب کمالاں بود۔

صاحب ترخان نامہ سید میر محمد بن سید جلال نے اس کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

القصہ روز بروز شانو شوکت میرزا غازی زیادہ می شد، و آں جواں بخت دست ہمت در سخاوت وجود کشادہ مانند ابر زر فشانی می نمود، ازیں جہت فضلا و شعرا روزگار از ایران و توران رجوع بخدمت او نمودند، و مجلسش بہشت آئین ہموارہ مجمع فضلا و شعرا روزگار بود، و ہمیشہ بعیش و طرب میکوشید، چنانچہ ہر روز سپاہ و رعیت روز عید و ہر شب شب برات از دولت آں جوان بخت داشتند، و غائبانہ اکثر مدرسان و شعرا و گوشہ نشینانِ ایران را نام بنام سالیانہ مقرر فرمودہ بود کہ ہر سال بآنہا میرسید۔ ازیں ممر ہمہ مردم مداح او بردند، و دربارِ او نمونۂ دربار شاہی بود، و ضبط و ربط آں مملکت بنوعی نمود کہ مردم ایران را مطیع خود ساخت، و والی ایران ازو اندیشناک بود، و ایلچیان در میان آمد و رفت میکردند، و میرزا غازی را والیٔ ایران نیز فرزند میگفتہ تحائف آنجا یاد میفرمود۔[5]

خود جہانگیر نے بھی اپنی توزک میں اس کے حسن انتظام کی غیر معمولی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ میں نے اس مرتبہ میرزا غازی کی جاگیر

---

(1) مقالہ سید حسام الدین راشدی، مطبوعہ رسالہ تاریخ و سیاسیات، ص ۲۳، ماہ آگست ۱۹۵۴ء۔
(2) غازی بیگ ترخان۔
(3) مآثر الامراء، ج: ۳، ص ۳۴۶۔
(4) ذخیرۃ الخوانین، قلمی، ص ۱۶۲۔
(5) ترخان نامہ۔ ص ۹۱۔

میں ٹھٹھہ کے ساتھ قندھار کا بھی اضافہ کر کے اس کو مرحمت کیا۔ اس تاریخ سے زمانۂ رحلت تک وہ وہاں نظم وضبط کو بہتر بنانے اور حفاظتی میں کوشاں اقدام کرتا رہا، اس کا سلوک وہاں کی رعایا اور لشکر کے ساتھ اچھا تھا۔

میرزا کے قندھار کے اخراجات:

قندھار میں میرزا نے حکومت کا جو رنگ ڈھنگ اور طور وطریق اختیار کیا تھا، اور داد و دہش اور جود و سخا اور فیاضیوں میں جو اس کی شان اور اس کی دربار داری کا جو ڈھنگ تھا، اس کے لیے قندھار کی آمدنی کافی نہ ہوتی تھی۔ ٹھٹھہ کی ریاست اور آمدنی پر خسرو خان کا قبضہ تھا، وہ وہاں سے بار بار خسرو خان کو لکھتا تھا، مگر وہ ہر بار لطف و حیل سے ٹال دیتا تھا۔ تاریخ طاہری میں ہے کہ: اس کا خرچ آمدنی سے بڑھا ہوا تھا، باوجود اس کے کہ پورا ٹھٹھہ، قندھار، اور صوبۂ ملتان کا کچھ حصہ اور سیوہن اس کی جاگیر میں تھا، لیکن وہ ہمیشہ مفلس اور قرض دار رہتا تھا، ایک روز اس کے خزانے کے افسروں نے از روئے خیر خواہی عرض کیا کہ ہم ملازمین پر آپ کی خیر خواہی لازمی ہے اور آپ کو بہترین راہ دکھانا ہمارا فرض ہے، چھ ماہ ہوئے کہ ہم نے جمع و خرچ کے کاغذات تیار کیے ہیں، ہمارا مشورہ ہے کہ آپ بھی ان کو ملاحظہ فرمالیں کہ خرچ آمدنی سے بہت زیادہ ہے، میرزا نے ان کی دل جوئی کے لیے ان کاغذات کو دیکھا، اور پھر پھاڑ ڈالا، اور ان سے کہا کہ رزق رزاق حقیقی کے ہاتھ میں ہے۔ میرے والد کو باوجود اس کے کہ ارغونوں اور ترخانیوں کا خزانہ ان کے ہاتھ آیا تھا، انہوں نے اس تمام خزانے کو خرچ کر کے کچھ یوں ہی سا ہمارے لیے چھوڑا تھا، خدائے تعالیٰ نے بغیر کسی کے احسان کے اُس وقت سے لے کر آج تک ہمیں تنگ دستی کا منہ نہیں دکھایا، اور اس کے بعد بھی ہمیں یقین ہے کہ جب تک تن میں جان باقی ہے وہ بغیر رزق کے ہمیں نہیں رکھے گا، تو ہم اس کی فکر کیوں کریں۔

جب اخراجات کی تنگی حد سے بڑھ جاتی تو میرزا غازی مرکزی حکومت سے کبھی کبھی روپیہ منگا لیتا تھا۔ چنانچہ جہانگیر نے اپنی توزک کے جشن پنجم ۱۰۱۸ھ (۱۶۱۰ء) میں ایک دفعہ اس سے امداد کے طلب کرنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> میرزا غازی بیگ ترخان بجہت سامان اذوقۂ قندھار و ماہیانہ بر قندازاں مذکور درخواست نمودہ بود، فرمودم کہ دو لک روپیہ از خزانہ لاہور روانہ قندھار سازند۔[1]

اس حکم کا اجرا صفر المظفر ۱۰۱۹ھ (۱۱-۱۶۱۰ء) کو ہوا۔

ٹھٹھہ کی حکومت کی خرابیاں:

قندھار آنے سے قبل اگرچہ میرزا غازی ٹھٹھہ کے انتظامی حالات کو بہت کچھ درست کر آیا تھا اور خسرو چرکس اور اس کے حالی موالی جو ٹھٹھہ کی حکومت پر اس کی طرف سے قابض و متصرف تھے، انہیں خاصی تنبیہ و تادیب ہو چکی تھی، لیکن جیسے ہی میرزا غازی سندھ سے قندھار روانہ ہوا، پھر خسرو چرکس اور اس کے حالی موالیوں نے پر پرزے نکالنے شروع کیے۔ خسرو نے اپنے تمام اعزہ و اقربا کو ٹھٹھہ کے انتظامی عہدوں پر مقرر کر دیا، جنہوں نے اپنے عہدوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ملک میں خوب لوٹ مار شروع کر دی، ملک کا نظم و نسق ابتر ہو گیا، جب ٹھٹھہ سے ایک کوڑی بھی میرزا غازی کے خزانے میں قندھار نہ پہنچنے لگی، تو پھر دوسری دفعہ اس کے بہی خواہ ملازموں نے گزارش کی کہ: صوبۂ ٹھٹھہ میں آمدنی کے لحاظ سے بڑی گنجائش ہے اور یہ سب آمدنی خسرو ہضم کر رہا ہے اور اس کی بے پروائی کی وجہ سے وہاں کے انتظامات ابتر ہو رہے ہیں، وہاں کی شیرازہ بندی از بس ضروری ہے، لہٰذا کسی کو وہاں متعین فرمایا جائے۔ تاکہ وہ وہاں کے لشکر پر نظر ڈالے اور اسے متعین کرے کہ اصل لشکر میں سے کتنے فوت اور کتنے فرار ہو چکے ہیں، اس کے بعد وہ ایسے اشخاص کی جاگیر کو خالصہ میں شامل کرے۔[2]

ہندو بیگ کا ٹھٹھہ کی بخشگیری پر تقرر:

ملازموں کی اس گزارش اور ٹھٹھہ کی رعایا کی شکایت پر میرزا غازی نے رائے گھوریہ کے داماد سائیں ڈنہ کو ہندو بیگ کا خطاب دے کر ٹھٹھہ کا بخشی مقرر کیا اور شہباز خان کے خسر رائے مانک چند کو اس کے ساتھ ٹھٹھہ روانہ کیا، تاکہ وہاں کے رتی رتی حالات سے باخبر ہو کر میرزا کو اطلاع دیں۔[3]

ان دونوں کو ٹھٹھہ روانہ کرنے کے بعد میرزا غازی نے بڑے تہدید آمیز لہجے میں ٹھٹھہ کے نمک حراموں کی پاداش کے سلسلے میں اپنے امرا سے ایک ایک کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ:

> ہمہ غلامان حرام نمک را کہ پا از گلیم بیروں آوردہ و سر از اندازہ

---

(1) توزک جہانگیری، جشن پنجم، ص ۱۱۰۔

(2) تاریخ طاہری، ص ۲۶۳۔

(3) مقالہ سید حسام الدین راشدی، مطبوعہ تاریخ وسیاسیات اگست ۱۹۵۴ء، ص ۳۰۔

بیروں بردہ مارا بنظر نمی آورند بدیں عقوبت خوار و رسوا خواہم ساخت کہ خسرو خاں چوب در دست دادہ، دربان کنیزان چند کہ در رکاب است می نمایم۔ فتح اللہ ولد لطف اللہ بھائی خان کہ حاکم بدین شدہ آفتابچی می سازم کہ پدرش در جرگہ نشستہ باشد، و او آب بہ دست آں کساں ریزد کہ آں را از جملۂ نوکران خود می پنداشت۔ محمد بیگ کہ بسیار نازک و بیشتر تقلید ما می دارد جلاجل جلوداراں در کمرش می بندیم، و در جلو میدوانیم، تا بداند کہ صاحب ما است، و نتیجہ بد دیانتی خوب می یابد۔[1]

ہندو بیگ اور مانک چند کا انجام:

تاریخ طاہری میں ہے کہ ہندو بیگ اور مانک چند قندھار سے روانہ ہو کر سب سے پہلے نصرپور آئے، جہاں شاہ قاسم ارغون کے بیٹے حکومت کر رہے تھے، ان کا خیال تھا کہ وہاں کے حالات درست کر کے ٹھٹھہ چلے جائیں گے، لیکن شاہ قاسم کے لڑکے مقیم سلطان نے جو وہاں موجود تھا، وہ بجائے اس کے کہ میرزا غازی کے حکم کی تعمیل کرتا، ان کو قلعے میں قید کر دیا، خسرو چرکس کے تعلقات اس خاندان سے بہت اچھے تھے اور دونوں یکساں ملک پر قابض تھے اور دونوں والی ملک میرزا غازی سے روگرداں تھے، مقیم بیگ نے یہ رویہ خسرو کے اشارے پر اختیار کیا تھا۔

ہندو خان پریشان ہوا، لیکن رائے مانک چند نے قلعے سے نکل کر مقیم سلطان سے بات چیت کی، دوران گفتگو میں سخت کلامی تک نوبت پہنچی، اور مقیم کے آدمیوں نے جو پہلے سے تیار تھے رائے مانک چند اور اس کے ساتھی میرک محمد سلطان ولد قاسم علی سلطان کو قتل کر دیا۔[2]

رائے سنگھ کا انتقام:

رائے مانک چند کا بیٹا رائے سنگھ اس وقت سندھ میں موجود تھا، اسے جب اپنے باپ کے مارے جانے کی اطلاع ملی تو اس کی آتش انتقام بھڑکی اور وہ اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے طبل جنگ بجاتا ہوا نصرپور پہنچا، اس کا نعرہ یہ تھا کہ وہ اپنے باپ کی لاش بعد میں جلائے گا، پہلے وہ اس کا انتقام لے گا۔ چنانچہ مقیم سلطان اور رائے سنگھ میں بڑی سخت جنگ ہوئی، مقیم سلطان کے بہت سے آدمی مارے گئے اور وہ بھاگ کھڑا ہوا اور بہت سے ہاتھی اور سامان رائے سنگھ کے ہاتھ لگا، رائے سنگھ نے اس کے بعد اپنے باپ کی لاش جلائی اور فتح و شادمانی کے نقارے بجاتا ہوا میرزا غازی کے پاس قندھار روانہ ہو گیا۔[3]

میرزا غازی، رائے سنگھ کی بہادری اور شجاعت کے کارنامے سن کر بہت خوش ہوا، اور اس کو اس کے باپ سے بلند رتبہ دے کر اسے دوبارہ سندھ کی طرف روانہ کیا۔[4]

خسرو کی بیدخلی:

رائے سنگھ واپس سندھ پہنچا، ہندو بیگ پہلے ہی سے وہاں موجود تھا، دونوں نے مل کر خسرو چرکس اور اس کے ساتھیوں کو حکومت سے علیحدہ کر کے اپنے آدمیوں کو مقرر کیا۔ تاریخ طاہری میں ہے کہ:

> خان را از معاملات حکومتِ ملک بیدخل ساخت، در ہر صوبہ عمال تعین داشتہ بہ تحصیل مال و معاملہ مشغول گشتند۔[5]

خسرو ٹھٹھہ کی حکومت سے علیحدہ ہو کر اپنے ساتھیوں، دوستوں اور اہل کاروں کو ساتھ لے کر ہالہ کندی پہنچا اور اس نے ارادہ کیا کہ وہ وہاں سے میرزا غازی کی خدمت میں قندھار روانہ ہو جائے، لیکن اتفاق یہ ہے کہ اسی زمانے میں میرزا غازی نے قندھار میں وفات پائی، اس خبر کے سنتے ہی خسرو چرکس نے اپنی روانگی کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اس فکر میں پڑ گیا کہ وہ ہندو بیگ کو اس کے کیفر کردار تک اس طرح پہنچائے کہ دوسروں کے لیے اس کا انجام باعث عبرت ہو۔[6]

میرزا غازی کی وفات کی تفصیلات:

میرزا غازی کی وفات کی تفصیلات جو ہمیں تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں، وہ یہ ہیں،

> تحفۃ الکرام میں ہے کہ جب قندھار میں میرزا غازی نے غیر معمولی مقبولیت اور عروج حاصل کیا، تو اس کے امرا میں بعض از روئے حسد اس فکر میں پڑ گئے کہ میرزا کے چراغ حیات کو گل کر دیں، چنانچہ انہوں نے ۱۰۲۱ھ میں میرزا کو عبداللطیف نامی ایک خانہ زاد غلام کے ہاتھوں گلا گھٹوا کر اور ایک قول کے

---

(1) ماخوذ از مقالہ سید حسام الدین راشدی، مطبوعہ تاریخ و سیاسیات، ص ۳۰، بحوالہ تاریخ طاہری، ص ۲۶۷ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ۔

(2) تاریخ طاہری، ص ۲۶۸-۲۶۹۔

(3) تاریخ طاہری، ص ۲۷۱۔

(4) ایضاً۔ ص ۲۶۹-۲۷۰۔

(5) ایضاً، ص ۲۷۱۔

(6) تاریخ طاہری، ص ۲۷۱-۲۷۰

مطابق زہر دلوا کر مروا ڈالا۔[1]

صاحب تاریخ طاہری جو میرزا کا معاصر ہے، اور اس خاندان سے وابستہ تھا اور اُس وقت وہ قندھار میں موجود تھا، اُس نے اپنی کتاب کے دیباچے میں میرزا کے زہر دینے کا معاملہ واضح طور پر لکھا ہے۔ سید طاہر محمد نسیانی نے میرزا کے تاریخ وفات کے قطعے میں اس کی زہر خورانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

زہر در کامش غلاماں ریختند از بہر آن
تا بگیرند جای او آیندہ اندر منزلش
سال تاریخ وفاتش خواستم گفتہ خرد
بر کشیدند کینہ و دادند زہر قاتلش[2]

میرزا کے درباری شاعر مرشد خان بروجردی نے اس کی وفات پر جو مرثیہ کہا، اُس میں بھی زہر قاتل کی طرف اشارہ موجود ہے:

زہر دوراں ساخت در کامش ز لالِ جام را
خون او ترسم بگیرد دامنِ ایام را

صاحب مآثر رحیمی میرزا غازی کی وفات کا سبب درد قولنج بیان کرتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھتا ہے کہ! "وبقول جمعی مسموم شد۔"

صاحب ذخیرۃ الخوانین شیخ فرید بکھری نے میرزا غازی کی وفات کے متعلق لکھا کہ: "بیمار شد و در دو سہ روز وفات یافت"۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد بہائی خان جہانگیر کی ملازمت میں منسلک ہو گیا، اور پہلے سفر کشمیر ۱۰۲۸ھ میں وہ جہانگیر کے ساتھ تھا۔ مقام حسن ابدال میں اوراق کے مسود شیخ فرید بکھری کو میر خواجہ محمد مودودی چشتی کو سابقہ عارف اور ہم وطنی کی وجہ سے بہائی خان نے اپنے گھر پر بلا کر دعوت کی، اس مجلس میں میرزا غازی کے مرنے کی بات نکلی، بہائی خان نے حلف اٹھایا کہا کہ مجھ سے یہ امر صادر نہیں ہوا اور نہ میرے علم میں ہے، میرزا اپنی موت سے مرا، شراب نوشی کی کثرت میرزا کی موت کا سبب بنی۔

مآثر الامرا میں ہے کہ بعض لوگ اس کی موت کی تہمت لطف بہائی خان پر لگاتے ہیں جو میرزا کا مصاحب اور وکیل تھا۔ اس بنا پر کہ اس کے باپ خسرو خان چرکس کے ساتھ بے اعتنائی برتتا تھا۔[3]

ترخان نامہ میں ہے کہ بہائی خان ولد خسرو خان نے میرزا کی وفات کے بعد اپنے خیال فاسد کی بنا پر میرزا کی قائم مقامی کے لیے جنگ کا ارادہ کیا تھا، اس لیے لوگ اس کو متہم کرتے ہیں کہ اس نے اپنی نمک حرامی سے اپنے آقا کا گلا گھونٹا۔ میرزا نے ۱۰۲۰ھ شب جمعہ ماہ صفر میں وفات پائی۔ وفات کے وقت اس کی عمر ستائیس سال اور مدت حکومت دس سال تھی، جن میں سے تین سال ٹھٹھہ میں اور سات سال قندھار میں گزارے۔[4]

جہانگیر نے بھی اپنی توزک میں ۸ اردی بہشت ۱۰۲۱ھ کو جشن ہفتمین میں میرزا کی وفات کی خبر ملنے کا تذکرہ کر کے اس کے مختصر حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے اور قندھار میں اس کے حسن انتظام کی تعریف کی ہے۔[5]

میرزا غازی کی تدفین:

وفات کے بعد میرزا غازی کی نعش قندھار سے ٹھٹھہ لائی گئی اور قبرستان مکلی میں وہ اپنے والد میرزا جانی بیگ کے پاس مدفون ہوا۔

میرزا غازی کے عہد حکومت پر تبصرہ:

میرزا غازی کے حالات زندگی گزشتہ اوراق میں تفصیل سے لکھے جا چکے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حکمرانی اور حسن انتظام میں بہترین صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کی شجاعت و بہادری کے آئینہ دار اس کے وہ کارنامے ہیں جو اس نے قندھار کی مہم میں انجام دیے۔ یہ اور بات ہے کہ قندھار میں مستقل قیام کی وجہ سے وہ سندھ کے معاملات پر اس قدر توجہ نہ دے سکا جتنی اس کو دینی چاہیے تھی، لیکن پھر بھی اس نے وہاں کی رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کی۔ اس کی سعی آخر وقت تک یہ رہی کہ کسی طرح وہ سندھ کے حالات کو درست کر کے اُسے ایک خوش حال ملک بنائے، مگر افسوس ہے کہ موت نے اس کو اتنی فرصت نہ دی اور وہ عین عالم جوانی میں جب کہ اس کی عمر ستائیس سال سے زیادہ نہ تھی اپنے حاسدوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

قندھار میں اس کی مقبولیت اور اس کے حسن انتظام اور اس کی فیاضیوں اور داد و دہش کا اعتراف تمام مورخوں کو ہے جیسا کہ ہم گزشتہ اوراق میں ذکر کر آئے ہیں۔

---

[1] ۔ اکرام، اردو ترجمہ۔ ص ۲۷۲۔
زا غازی بیگ ترخان، تالیف سید حسام الدین راشدی، ص ۱۱۰ بحوالہ تاریخ ری، ص ۱۶-۱۷، مآثر رحیمی، جلد ۲، ص ۳۵۴-۳۵۵-۳۵۶۔
الامرا، ج ۳، ص ۳۴۷۔

[4] ترخان نامہ، ص ۹۳۔
[5] توزک جہانگیری (سرسید ایڈیشن) ص ۱۰۹۔

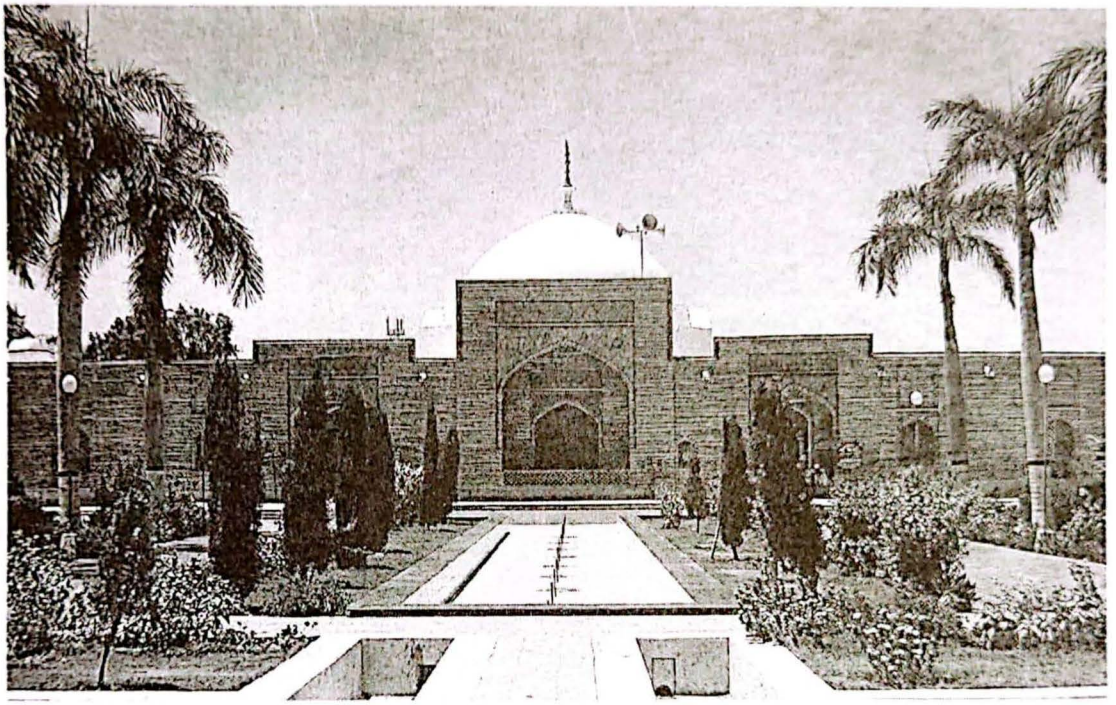

شاہجہاں مسجد ٹھٹھہ

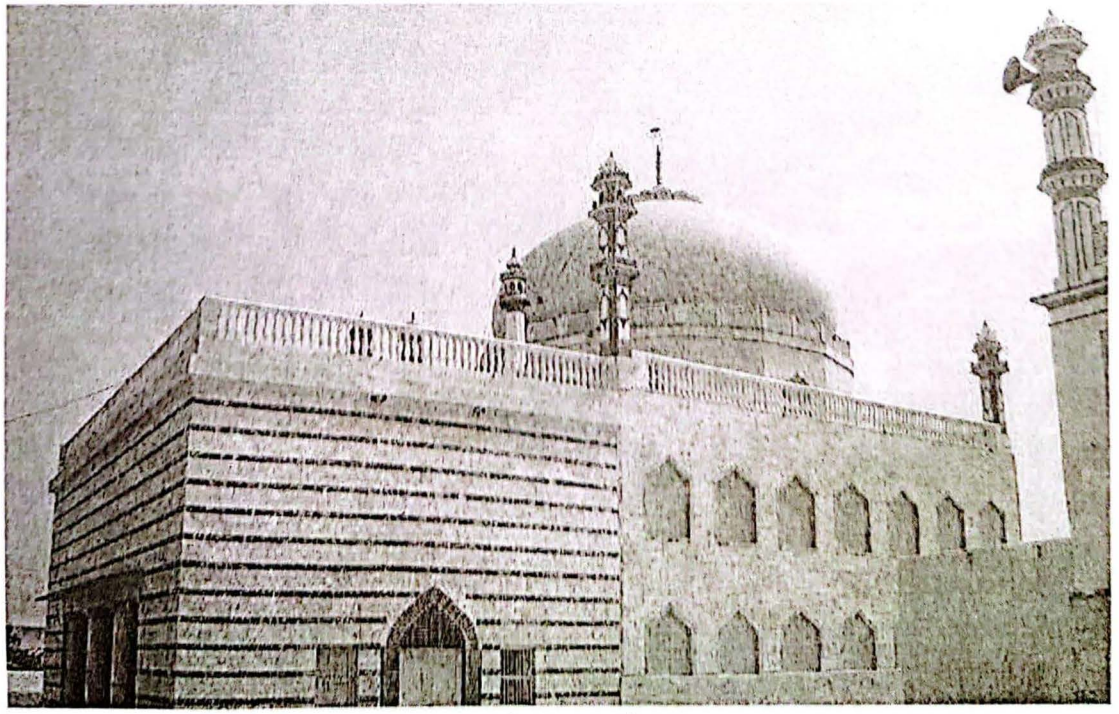

صوفی شاہ عنایت شہید کی مزار، جھوک

باب :24

میرزا غازی کے درباری علماؤ شعرا

میرزا غازی کی سیرت و شخصیت میں جو کمزوریاں تھیں، اُن کا تذکرہ ہم آیندہ اوراق میں کریں گے لیکن اس کے تمام تذکرہ نگار اور سندھ کے تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ وہ نہایت منتظم، فیاض، شجیع اور بہادر تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ خود بھی بڑا شاعر اور علم و فضل، شعر و ادب کا بڑا قدردان تھا۔ اُس دور کے بڑے بڑے علماؤ شعرا اُس کے دربار کی زینت تھے، اس کی قدر افزائیوں نے اس کے نام کو اس قدر روشن کر دیا تھا کہ بقول راشدی کے ہر صاحب ہنر اور اہل کمال جو بھی ایران سے نکلتا پہلے قندھار آکر میرزا کے ہاں باریاب ہوتا، پھر ہندوستان کے جہانگیری دربار کا رخ کرتا۔ اس کے دربار میں جو علماؤ شعرا اور اہل کمال نظر آتے ہیں، جنھوں نے اس کے دربار کو باغ و بہار بنا دیا تھا، اُن میں سے ہم چند کا تذکرہ اجمالاً ذیل میں کرتے ہیں۔

طالب آملی:

یگانۂ روزگار شاعر طالب آملی بھی میرزا غازی کی محفل شعر و ادب کا روشن ستارہ تھا، خیال ہے کہ وہ ۹۸۷ھ (۸۳-۱۴۸۲ء) کے لگ بھگ شہر آمل میں پیدا ہوا۔ تنگیٔ معاش کی وجہ سے جب کہ اس کی عمر تیس سال کی تھی کاشان آیا۔ کچھ دن وہاں رہ کر طالب اصفہان پہنچا، وہاں سے بد دل ہو کر مشہد آیا، مشہد سے وہ مرو پہنچا اور ایک سال تک وہ مرو میں رہا۔ ۱۰۱۶ھ (۸-۱۶۰۷ء) کے آخر میں اُس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ صاحب خیر البیان کا بیان ہے کہ: وہ ۱۰۱۶ھ (۸-۱۶۰۷ء) میں ہندوستان آیا اور یہاں آنے کے بعد میرزا غازی ترخان نے اُسے اپنے مصاحبوں میں داخل کر دیا اور اب تک وہ میرزا مذکور کی مصاحبت سے مکرم ہے۔

مجمع النفائس میں ہے کہ: طالب نے پہلے سندھ میں میرزا غازی کے پاس قیام کیا، اور اس کے بعد ہندوستان آیا۔

سید طاہر محمد نسیانی نے لکھا کہ: اسی زمانے میں طالب آملی اور شمس قندھار پہنچ کر میرزا غازی کی ملازمت سے مشرف ہوئے اور اُن کی ملازمت میں داخل ہوئے۔

قندھار ہی میں چیچک کے مرض میں طالب آملی کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی۔ آنکھ کے ضائع ہونے نے طالب کو قندھار سے دل برداشتہ کر دیا، اور وہ ۱۰۲۰ھ (۱۲-۱۶۱۱ء) میں میرزا کی زندگی ہی میں بد دل ہو کر ہندوستان آگیا، یہاں پہنچ کر وہ مصائب روزگار میں مبتلا ہو گیا۔ دیانت خان نے پہلے اُسے دربار جہانگیری میں پہنچایا، لیکن وہ بد قسمتی سے مفرح کھائے ہوئے تھا، وہ شاہی دربار میں کچھ نہ بول سکا اور ناکام واپس ہوا۔ دیانت خان نے اُسے مجبور ہو کر عبداللہ خان فیروز جنگ کے پاس گجرات پہنچا دیا، لیکن فیروز جنگ نہ فیاض تھا اور نہ شعر سے اس کا کوئی تعلق تھا۔ طالب بد دل ہو کر پھر آگرہ آیا اور اعتماد الدولہ میرزا غیاث الدین سے وابستہ ہو کر مہرداری کے منصب پر فائز ہوا۔ لیکن اُس عہدے کو نباہ نہ سکا اور استعفا دے دیا۔

اعتماد الدولہ نے اُس پر مہربانی یہ کی کہ اُسے دربار شاہی تک پہنچا دیا، اس طرح وہ جہانگیر کا منظور نظر بنا، یہاں تک کہ جہانگیر نے ۱۰۲۸ھ (۱۹-۱۶۱۸ء) میں جب وہ کشمیر جا رہا تھا کلانور میں اُسے "ملک الشعرا" کے خطاب سے سرفراز کیا۔

آخر میں چند سال طالب پر جنون کی کیفیت طاری رہی اور وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ جہانگیر کی وفات سے ایک سال پہلے ۱۰۳۶ھ (-۱۶۲۶ ۲۷ء) میں طالب آملی نے جوانی ہی میں وفات پائی اور فتح پور میں مدفون ہوا۔

اُس نے میرزا غازی کی تعریف و توصیف میں متعدد قصیدے کہے ہیں، سید حسام الدین راشدی نے اپنی گراں بہا تالیف غازی بیگ ترخان

میں ان تمام قصائد کو یکجا جمع کر دیا ہے۔[1]

مُلا مرشد بروجردی:

میرزا غازی کے دربار میں شعر و ادب کے جو ستارے منور و تاباں نظر آتے ہیں، اُن میں ملا مرشد بروجردی بھی ہے، وہ بروجرد ہمدان کا رہنے والا تھا۔ اس کا تمام عالمِ طفلی، بروجرد میں گزرا۔ وہیں تعلیم پائی، بروجرد اور ہمدان میں عمر کا بڑا حصہ گزارنے کے بعد عراق و ایران کی سیاحت کرتے ہوئے شیراز پہنچا، جہاں کے حسن و دلکشی نے اُسے فریفتہ کر لیا۔ عشق اس کی فطرت میں خمیر کیا گیا تھا، اس شہر داستانی کے خوبروں کو دیکھ کر عشق کا شعلہ اُس کے قلب میں بھڑک اٹھا۔ یہیں اس کے عشق نے اس کی شاعری کو جلا بخشی، پھر وہ سندھ یا ہندوستان میں جہاں کہیں بھی رہا، اس شہر کی حسین یادیں اس کو ڈستی رہیں اور یہ یادیں شعر کے قالب میں ڈھلتی رہیں۔ غالباً جب وہ ہندوستان آیا تو وہ اس شہر نگاراں کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے:

ز تاب فرقت شیراز و گلعذا رانش
دریں دیار چنانم کہ پنبہ در آتش

ایک اور جگہ کہتا ہے کہ:

کجاست خاک رہِ دلبرانِ شیرازی
کہ دیدہ کور شد از سرمۂ صفہانی

جب تک وہ شیراز میں رہا، اہل شیراز نے بھی اس کے فن کی قدر افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ شیراز کا حاکم محمد قلی پرناک اس کی سرپرستی کرتا رہا۔ ۱۰۱۲ھ (۴-۱۶۰۳ء) میں ملا اسد قصہ خواں کی تحریک پر میرزا غازی نے اس کو سندھ بلا لیا اور وہ ہرمز بندر کے راستے ٹھٹھہ پہنچا، ٹھٹھہ آنے کے بعد جب وہ میرزا غازی کے سامنے پیش ہوا تو وہ اس کے ساتھ انتہائی تعظیم و اکرام سے پیش آیا اور مرشد خان کے خطاب سے سرفراز کیا۔ مآثر رحیمی میں ہے کہ ٹھٹھہ پہنچنے کے بعد وہ تھوڑی ہی مدت میں خانی اور مدار المہامی کے مرتبے کو پہنچا یہاں تک کہ مہماتِ سندھ کا نظم و نسق اور ترخانوں اور ارغونوں کا متصدی مقرر کیا گیا، اور منصبِ وکالت سے سرفراز ہوا۔ میرزا غازی کے فرامین کی پشت پر اس کی مہر بھی لگتی تھی۔

اس نے میرزا غازی کی طبیعت میں اس قدر رسوخ حاصل کر لیا تھا کہ بہت سے شعرا اس کی تحریک پر دربار سے منسلک ہوئے، یا انعام سے نوازے گئے۔

۱۰۱۳ھ (۵-۱۶۰۴ء) میں جب میرزا غازی اکبر کے دربار میں گیا تو مرشد اس کے ساتھ گیا۔

اکبر کی وفات کے بعد جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو مرشد نے آگرے ہی میں اس کے لیے تہنیتی قصیدہ کہا، جب جہانگیر اپنے بیٹے خسرو کے تعاقب میں گیا تو میرزا غازی بھی لاہور تک اس کے ہمرکاب تھا، لاہور سے میرزا غازی مہم قندھار پر چلا گیا اور مرشد ٹھٹھہ چلا آیا۔ میرزا غازی کی وفات کے بعد مُلا مرشد ۱۰۲۱ھ سے لے کر ۱۰۲۲ھ تک ٹھٹھہ ہی میں رہا، جب میر عبدالرزاق معموری ارغونی اور ترخانی امرا کو ٹھٹھہ سے نکال کر جہانگیر کے پاس اجمیر لے گیا تو مرشد بھی ساتھ تھا، وہیں وہ مہابت خاں سے وابستہ ہو گیا۔ مہابت خاں کے ساتھ وہ اجمیر سے دکن کی مہم پر گیا، شاہزادہ خرم نے جب دکن فتح کیا تو مرشد نے اس کے لیے قطعات اور قصیدے کہے اور شاہزادہ خرم کے دامنِ دولت سے وابستہ ہو گیا۔ صاحب مآثر رحیمی کا بیان ہے کہ مہابت خاں اور مرشد کے درمیان رنجش ہو گئی۔ اُسے حیدر بوانائی کے ذریعہ سے خانخاناں نے اپنے پاس بلایا، لیکن اس وقت مرشد، شاہزادہ خرم کے پاس ملازم ہو چکا تھا۔ مرشد نے ۱۰۳۱ھ (۲۲-۱۶۲۱ء) کے بعد ہندوستان ہی میں وفات پائی۔ اس کی وفات کہاں ہوئی اور قبر کہاں ہے، تذکرے اور تاریخیں اس معاملے میں خاموش ہیں۔ مرشد کے دیوان کے نسخے نادر و نایاب ہیں، اس کے دیوان کا ایک نسخہ دیوان بہادر راجا نرندر ناتھ لاہوری کے کتب خانے میں تھا۔ اسپرنگر نے اس کے ایک اور نسخے کا ذکر کیا ہے جو کتب خانہ موتی محل کی ملکیت تھا۔ اس دیوان کا ایک نسخہ ایران میں عبدالحسین بیان مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں تھا، یہ دیوان ۱۰۰۳ھ کا لکھا ہوا تھا، اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں ہے (۴۶۸۱-۷۰) جس کے ابتدائی آٹھ اوراق غائب ہیں۔ فاضل محترم سید حسام الدین راشدی نے اپنی تالیف "غازی بیگ ترخان" میں مرشد کے اسی دیوان سے استفادہ کیا ہے۔

مرشد بروجردی کے متعلق صاحبِ میخانہ عبدالنبی نے لکھا کہ: ۱۰۲۸ھ (۱۹-۱۶۱۸ء) تک اس نے اپنا کلام ایک بیاض کی صورت میں

---

[1] طالب اصفہانی کے یہ تمام حالات میرزا غازی ترخان (تالیف سید حسام الدین راشدی) ص ۳۰۵ تا ۴۰۸ سے بحوالہ خیر البیان و مجمع النفائس و تذکرہ شعرائے کشمیر سے ماخوذ ہیں۔

جمع کر لیا تھا، یہ بیاض چھ ہزار اشعار پر مشتمل تھی،[1] مرشد کے قصائد، غزلیات، رباعیات، ہجویات کا خاصا انتخاب سید حسام الدین راشدی نے غازی بیگ ترخان میں دیا ہے، جسے وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

مُلّا اسد قصہ خواں:

ملا اسد قصہ خواں بھی میرزا غازی کی محفل شعر و ادب کے گوہر رخشاں تھے۔ اگرچہ شاعر بھی تھے، لیکن ان کا اصل فن قصہ خوانی تھا، نہایت ہی فصیح و بلیغ اور خوش گفتار تھے، تصوف کی طرف مائل تھے، ان کے والد کا نام مولانا حیدر تھا، ان کا پیشہ بھی قصہ خوانی تھا، گویا یہ فن ان کو وراثۃً ملا تھا، ان کا خاندان شیرازی تھا اور تقی اوحدی نے انہیں شیراز ہی میں دیکھا تھا۔ ملا اسد بھی ناقدری روزگار کا شکار ہو کر ۱۰۱۰ھ (۲-۱۶۰۱ء) کے لگ بھگ اکبر بادشاہ کی قدر دانیوں کی توقع لے کر آگرہ کے لیے روانہ ہوئے، راستے میں ٹھٹھہ پڑتا تھا، اس زمانے میں اگرچہ میرزا غازی کا عالم طفلی ہی تھا، یہ ٹھٹھہ پہنچے تو میرزا غازی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ میرزا غازی ان کی شیرینی گفتار، فنی خصوصیات اور ذاتی وجاہت سے بے حد متاثر ہوا اور ان کو منصب و جاگیر سے سرفراز کر کے اپنی معلمی سے ممتاز کیا۔

تاریخ طاہری میں ہے کہ: ملا اسد اور ملا رشید دونوں ایران سے بندر لاہوری پر اترے اور وہاں سے ٹھٹھہ پہنچے۔

میرزا غازی جب ۱۰۱۳ھ (۵-۱۶۰۴ء) میں ہندوستان گیا تو ملا اسد اور ملا مرشد دونوں کو ساتھ لیتا گیا اور یہ دونوں کے دونوں میرزا غازی کے ساتھ اُس کی وفات تک رہے۔ میرزا غازی کی وفات کے بعد ملا اسد بھی کچھ دن ٹھٹھہ میں رہے، پھر ۱۰۲۵ھ کے لگ بھگ جہانگیر کے پاس پہنچے۔ جہانگیر نے انہیں حفیظ خان کے لقب سے نوازا۔ ملا اسد نے گجرات سے آگرہ آتے ہوئے ۱۰۲۷ھ (۱۹-۱۶۱۷ء) میں وفات پائی۔ ملا مرشد نے اپنے عزیز دوست ملا اسد کی وفات پر ایک تاریخی قطعہ کہا اور اس شعر میں ان کی تاریخ وفات نکالی:

اسد رفت و تاریخ فوتش ز مرشد
طلب کرد دل گفت اسد رایگاں رفت[2]
۱۰۲۷ھ

مُلّا احسنی گیلانی:

مُلّا احسنی گیلانی احسنی بھی میرزا غازی کی محفل شعر و ادب سے وابستہ تھے۔ خیر البیان میں ہے کہ: مُلّا احسنی گیلانی شاعر پیشہ، ہزّال اور ہجو گو تھا۔ اس کے اوقات خوردہ گیری میں وقف تھے۔ ۱۰۱۹ھ (۱۶۱۰-۱۱ء) میں سیستان آ کر ملک الملوک ملک نجم الدین محمود بن ملک حیدر سے وابستہ ہوا اور مراعات سے نوازا گیا، اور ایک عرصے تک سیستان کے دوستوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا، وہاں سے قندھار آیا اور میرزا غازی کے دامنِ دولت سے وابستہ ہو گیا۔ میرزا غازی کی وفات کے بعد وہ لاہیجان میں مستقلاً مقیم ہو گیا، وہیں اس کی ملاقات خیر البیان کے مؤلف سے ہوئی، صاحب خیر البیان نے اس کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ: وہ قصائد میں کلمات عجیب اور الفاظ غریب استعمال کرتا ہے، ہجو نہایت فصیح کہتا ہے۔ اُس کے تین اشعار سید حسام الدین راشدی نے اپنی کتاب غازی بیگ ترخان میں نمونتاً دیے ہیں۔

مُلّا شیخ اسحاق بکھری اسحاق:

مُلّا شیخ اسحاق بکھری ان بزرگوں میں تھے کہ جنہوں نے میرزا غازی و قاری کے جوہر قابل کو نکھارا اور سنوارا۔ یہ ابتداءً سلطان محمود خان بکھری کی ملازمت سے منسلک تھے اور آخر میں میرزا غازی و قاری کے ملازم مقرر ہوئے۔ فاضل محترم سید حسام الدین راشدی نے لکھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان محمود خان بکھری کی وفات کے بعد گجرات چلے گئے۔ اُس وقت گجرات میں خواجہ نظام الدین ہروی صاحب طبقات اکبری دیوان اور بخشی تھے، یہ اُن سے وابستہ ہو کر اُن کے وکیل مطلق العنان بنے۔

ذخیرۃ الخوانین میں ہے کہ شیخ اسحاق فاروقی اور ذخیرۃ الخوانین کا مؤلف شیخ فرید بکھری اُن کے مطلق العنان وکیل تھے۔ سندھ کے مشہور مؤرخ میر معصوم بکھری کو شیخ اسحاق کی محبت کھینچ کر گجرات لائی کہ دونوں نے بکھر میں یک جا تعلیم پائی تھی۔ شیخ اسحاق نے میر معصوم کی گجرات تشریف آوری مغتنمات میں سمجھ کر صوبے دار گجرات شہاب الدین احمد خان نیشاپوری سے سفارش کر کے دیوانی کی خدمت دلائی اور منصب مقرر کرایا۔

شیخ اسحاق اور میر معصوم بکھری نے خواجہ نظام الدین ہروی کو ان کی گراں بہا تالیف طبقات اکبری کی تالیف میں بھی مدد دی۔ ۹۹۸ھ

---

(1) مرشد کے یہ تمام حالات اجمالاً غازی بیگ ترخان (تالیف سید حسام الدین راشدی) ص ۴۷۲ تا ۵۱۱ سے ماخوذ ہیں۔

(2) ملا اسد کے یہ تمام حالات غازی بیگ ترخان (تالیف سید حسام الدین راشدی) ص ۱۸۹ تا ۱۹۵ سے ماخوذ ہیں۔

(۹۰-۱۵۸۹ء) میں خواجہ نظام الدین ہروی کو بادشاہ خان نے گجرات سے لاہور بلا لیا۔ خیال ہے کہ اسی زمانے میں شیخ اسحاق بھی لاہور چلے آئے ہوں گے۔

سندھ پر مغلوں کا قبضہ ہونے کے بعد جب سندھ بطور جاگیر میرزا جانی کے حق میں واگزاشت کیا گیا اور اس نے انتظام کے لیے ٹھٹھہ اپنے اُمرا کو بھیجا، اسی زمانے میں میرزا غازی کی معلمی کے لیے شیخ اسحاق مقرر ہوئے۔

ترخانی دور کا مشہور مؤرخ سید طاہر محمد نسیانی مؤلف تاریخ طاہری بھی شیخ اسحاق کے تلامذہ میں ہے۔ شیخ اسحاق کی عمر اور اُن کے مدفن کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا، قیاس ہے کہ انہوں نے میر معصوم کی وفات ۱۰۱۵ھ (۷-۱۶۰۶ء) کے دو تین سال بعد وفات پائی ہوگی۔

میر عماد الدین محمود اسد ابادی، الٰہی:

میرزا غازی کی شعر و ادب کی محفلیں جن شعرا کے رونق پذیر رہیں ان میں میر عماد الدین محمود اسد آبادی المتخلص بہ الٰہی بھی تھے۔ اسد آباد ہمدان اور کرمان شاہ کے درمیان ایک قصبہ ہے۔ یہ بقول صاحب مجمع النفائس ۱۰۲۰ھ (۱۲-۱۶۱۱ء) میں ہندوستان آئے۔ صاحب مآثر رحیمی نے لکھا ہے کہ: قندھار میں میرزا غازی کی حکومت کے زمانے میں میر الٰہی اسد آبادی اور دوسرے مستعدان ایران میرزا غازی کی ملازمت سے کامگار ہوئے۔ میرزا غازی کی وفات کے بعد میر الٰہی ہندوستان آکر مختلف امرا سے وابستہ رہے۔ آخر شاہجہان کے دربار میں باریاب ہوئے۔ ظفر خان احسن اپنی صوبے داری کشمیر کے زمانے میں الٰہی کو بادشاہ سے عرض کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ الٰہی نے بقیہ عمر کشمیر ہی میں گزاری اور وہیں وفات پائی، غنی کاشمیری نے اس کی تاریخ وفات

برد الٰہی ز جہاں گوی سخن (۱۰۶۴ھ)

سے نکالی۔ میر الٰہی نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا، جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔[1]

ملا عبد الرشید، رشید:

ہم گزشتہ اوراق میں ذکر کر آئے ہیں کہ یہ ملا اسد قصہ خواں کے ساتھ لاہری بندر سے ٹھٹھہ آئے۔ یہ ایرانی الاصل تھے، نہایت ہی خستہ حالت میں ٹھٹھہ پہنچے، میرزا کی نگاہ انتخاب نے ان کو چن لیا اور میرزا غازی کی وفات تک میرزا سے وابستہ رہے، یہ فقہ اور شاعری میں شہرت رکھتے تھے۔ میرزا غازی ان کے شعر کو پسند کرتا تھا۔

عطاء اللہ کشمیری، رضوی:

ان کا نام عطا اللہ اور وطن کشمیر تھا۔ بعضوں نے ان کا تخلص رضوی اور بعضوں نے عطائی لکھا ہے۔ یہ میرزا غازی کے ساتھ ان کی وفات تک رہے، اس کے بعد آگرے آئے۔

سروری یزدی:

صاحب مآثر رحیمی نے سروری یزدی کا شمار میرزا غازی کے زمرۂ شعرا میں کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ:

--- محوی اردبیلی، و سروری یزدی و ملا اسد
--- و دیگر مستعدان ایران بشرف آں بختیار
(میرزا غازی) رسیدند۔

میر محمد ہاشم، سنجر کاشی:

یہ عظیم المرتبت شاعر ۱۰۰۰ھ یا ۱۰۰۲ھ میں ہندوستان پہنچا اور اکبر بادشاہ کے ملازموں میں منسلک ہوگیا۔ غلام علی آزاد نے خزانۂ عامرہ میں لکھا کہ:

وبا میرزا جانی والی تتہ و پسرش میرزا غازی بسیار ارتباط داشت، و مدح پدر و پسر را بر جریدۂ روزگار می نگاشت۔

غالباً ۱۰۰۸ھ (۱۶۰۰-۱۵۹۹ء) کے لگ بھگ میر سنجر پر عقاب شاہی ہوا۔ وہ کچھ دن گجرات میں راجا سورج سنگ کے پاس نظر بندی میں رہا، جب آزاد ہوا تو وہ بیجاپور پہنچا، اور شاہنواز خان کے توسل سے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دامن دولت سے وابستہ ہوگیا، یہیں سے شاہ ایران نے بلوا بھیجا۔ ابھی وہ سفر کی تیاریوں میں تھا کہ اسہال شروع ہوئے اور ۱۰۲۱ھ (۱۳-۱۶۱۲ء) میں اس نے وفات پائی۔[2]

ہم نے اس کے دربار کے چند شعرا کا یہ تفصیلی تذکرہ سید حسام الدین راشدی کی تالیف غازی بیگ ترخان سے کیا ہے۔ ان کے علاوہ وہ شعرا اور علما جو اُس کے دربار کی زینت تھے، اُن کے نام یہ ہیں، حافظ داؤد

---

[1] ملا احسنی، شیخ، اسحاق بکھری اور میر الٰہی کے یہ حالات غازی بیگ ترخان (تالیف سید حسام الدین راشدی) سے ماخوذ ہیں۔

[2] غازی بیگ ترخان (تالیف سید حسام الدین راشدی)۔

بدینی داؤد، محمد روشن ذہنی ٹھٹھوی، محمد شریف شاہد، ملا نفیس الدین شانی تکلو، شمسای زریں رقم، ملا اصفہانی شیدا، ملا محمد مازندرانی صوفی، طالب اصفہانی، عبدالباقی قصہ خواں، میر، حسن بیگ تکلو عتابی، میر عبداللہ سلطان سبزواری عریضی، فصیحی انصاری، کامی شیرازی، مولانا محوی اردبیلی، سید طاہر محمد نسیانی ٹھٹھوی وغیرہ۔

میرزا غازی خود بھی بہت بڑا شاعر اور موسیقی کا ماہر اور نغمے کو پہنچاننے اور طنبورہ نوازی میں بے نظیر تھا۔ وہ اور اس کا باپ ٹوڈی راگنی میں خصوصاً بڑی مہارت رکھتے تھے۔ صاحب مقالات الشعرا کا بیان ہے کہ اس کا دیوان پانچ ہزار اشعار سے متجاوز تھا، شاعری میں وقاری تخلص کرتا تھا۔ مؤرخین نے اس کے وقاری تخلص اختیار کرنے کا عجیب و غریب واقعہ لکھا ہے۔

ذخیرۃ الخوانین میں ہے کہ جب میرزا غازی قندھار میں تھا تو اسے خیال ہوا کہ وہ ایسا تخلص اختیار کرے جو اس کے والد میرزا جانی بیگ کے تخلص حلمی سے مناسبت رکھتا ہو چنانچہ اسے معلوم ہوا کہ قندھار میں ٹھٹھہ کا رہنے والا ایک شاعر ہے، جس کا تخلص وقاری ہے، چونکہ حلم اور وقار میں ایک مناسبت ہے، میرزا کو یہ تخلص بہت پسند آیا چنانچہ اس نے اس شاعر کو بلا کر کہا کہ تمہارا یہ تخلص مجھے بہت پسند ہے، میں تمہارا یہ تخلص خریدنا چاہتا ہوں۔ وہ شاعر اس پر راضی ہو گیا، میرزا نے ایک ہزار روپیہ اور اسے خلعت دے کر یہ تخلص اس سے خرید کر اپنا تخلص رکھا، اس شاعر نے بعد میں اپنا تخلص خلدی کر لیا۔[1]

صاحب ذخیرۃ الخوانین کا بیان ہے کہ اس نے اپنے باپ دادا کا پانچ چھ پشتوں کا جمع کیا ہوا خزانہ اور اپنی جاگیروں کی آمدنی پوری کی پوری شعراً اور سپاہ پر نثار کر دی تھی۔[2]

اس کی سیرت کے کمزور پہلوؤں میں اس کے تذکرہ نگاروں نے اس کی شراب نوشی اور عیاشی کو بتایا ہے۔ مآثر الامرا میں ہے کہ میرزا اپنے باپ کی طرح شراب سے شیفتگی رکھتا تھا اور رات دن شراب پینے میں مشغول رہتا تھا۔ وہ اتنا بڑا عیاش تھا کہ ہر رات ایک کنواری عورت اس کی قربان گاہِ ہوس کی بھینٹ چڑھتی تھی، پھر وہ دوبارہ اس کا منہ نہیں دیکھتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ٹھٹھہ میں ہر بدکار عورت اپنے آپ کو میرزا سے منسوب کرتی تھی۔[3]

صاحب ذخیرۃ الخوانین شیخ فرید بکھری نے لکھا کہ:

بے عیب خدا است، ہیچ عیب نداشت الا دوسہ افعال کریہہ داشت، اولاً ہر شب و روز بشرب مائل بود ہر شب عورت بکر یازدہ سالہ البتہ بتصرف او می آمد، موکلاں گزشتہ بودند کہ از ہر جامی آوردند، ہماں سب کہ بکارت رامی گرفت، باز روے اورا نمی دید، ودر محل افتادہ بودند۔

بے عیب خدا ہے، میرزا کوئی عیب نہیں رکھتا تھا۔ لیکن دو تین باتیں اس میں نہایت بری تھیں۔ اولاً رات دن پینے کی طرف مائل تھا۔ دوسری ہر شب گیارہ سال کی باکرہ عورت کو اپنے تصرف میں لاتا تھا، اس نے دلال چھوڑ رکھے تھے کہ جو ہر جگہ سے اس کے لیے عورتیں لاتے تھے جب ان کی بکارت زائل کر لیتا تو پھر ان کا منہ نہ دیکھتا اور وہ محل میں پڑی رہتیں۔

پھر شیخ فرید بکھری نے آگے چل کر لکھا کہ:

والد ایشاں از تھتہ ہزار و دولیست باکرہ جمیلہ در سن دہ و دوازدہ سالگی ہمراہ خود پیش پسر در قندھار آوردہ، ہمہ راتصرف نمود۔

میرزا غازی کی والدہ ٹھٹھہ سے بارہ سو باکرہ خوب صورت عورتیں جن کی عمر دس بارہ سال کی تھی، اپنے بیٹے کے لیے قندھار لے کر آئی، وہ ان تمام کو اپنے تصرف میں لایا۔

پھر ان عورتوں کو جو اس کی ہوس کا نشانہ بنتیں، لکھا کہ: وہ عورتیں جو اس نے محل میں جمع کی تھیں، واللہ اعلم زندہ ہیں یا مر گئیں ہر شاہد بازاری جسے وہ ٹھٹھہ سے بلاتا تھا، ان میں سے ہر عورت اپنے آپ کو میرزا کی بیوی بتاتی تھی۔

یہ سب باتیں لکھنے کے بعد آخر میں شیخ فرید بکھری لکھتا ہے کہ:

باوجود این، خیر خیرات و حسن معاش و کم آزاری و بربادباری و شفقت علی خلق اللہ درویش دوست بود۔[4]

ان سب باتوں کے باوجود صاحب خیر و خیرات و حسن معاش، کم آزار اور بردبار، اللہ کی مخلوق پر شفیق اور درویش دوست تھا۔

---

(1) ذخیرۃ الخوانین قلمی، ص ۱۶۵، می خانہ، ص ۲۲۹۔

(2) غازی بیگ ترخان، تالیف سید حسام الدین راشدی، ص ۳۴۱ بحوالہ ذخیرۃ الخوانین قلمی، ص ۱۶۶۔

(3) مآثر الامرا، ج ۳، ص ۳۴۸۔

(4) یہ تمام تفصیل غازی بیگ ترخان، ص ۱۷۱-۱۷۴ بحوالہ ذخیرۃ الخوانین سے ماخوذ ہے۔

میرزا غازی کی وفات کے بعد:

ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ خسرو چرکس ابھی ہالہ کنڈی ہی میں تھا کہ اسے میرزا غازی کی وفات کی خبر ملی، وہ اسے اپنے لیے فال نیک سمجھ کر اس فکر میں لگ گیا کہ رائے سنگھ اور ہندو بیگ سے پورا پورا انتقام لے، اس کی تفصیل کہیں ہمیں نہیں ملتی کہ وہ اپنے اس ارادے میں کہاں تک کامیاب ہوا، البتہ اس نے اپنی بقا کے لیے ایک نئی چال چلی، ترخان نامے میں ہے کہ: اس نے میرزا عبدالعلی بن میرزا فرخ بن میرزا شاہ رخ بن میرزا باقی کو جو ابھی بچہ ہی تھا، ٹھٹھہ کے تخت حکومت پر بٹھا کر اس کی آڑ میں سارے ملک پر قبضہ کر لیا۔[1]

اس تخت نشینی سے اس کا مقصد یہ تھا کہ چونکہ میرزا عبدالعلی اسی خاندان کا فرد ہے، لہٰذا سابقہ دستور کے مطابق جہانگیر بھی اس تخت نشینی کو مان لے گا۔ نیز ارغون اور ترخان بھی کوئی شورش پیدا نہ کر سکیں گے، کیونکہ حکومت بظاہر اسی خاندان میں ہے، لیکن خسرو کا یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔ ترخان نامہ میں ہے کہ جب اس کی اطلاع جہانگیر کو ملی کہ خسرو چرکس نے بغیر کسی حکم کے میرزا عبدالعلی[2] کو جو ابھی خورد سال ہے، بٹھا کر ٹھٹھہ کا والی بنا دیا ہے اور اس طرح وہ سلطنت کا باغی ہو گیا ہے، تو اس نے میرزا رستم قندھاری کو ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر کر کے چند اُمرا کے ساتھ خسرو خان پر متعین کیا اور میر عبدالرزاق معموری کو وہاں کا بخشی اور دیوان مقرر کر کے میرزا رستم سے پہلے اسے ٹھٹھہ روانہ کیا، تاکہ وہ خسرو خان کو دلاسا دے کر ٹھٹھہ پر قبضہ کرے، چنانچہ میر عبدالرزاق معموری ٹھٹھہ پہنچا اور خسرو خان کا منصب پانسو تجویز کیا، میرزا رستم بھی اس کے بعد ہی ۱۰ محرم ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) کو ٹھٹھہ پہنچا، اس نے میرزا عبدالعلی، خسرو خان اور میرزا غازی کے اہل و عیال و متعلقین، ارغونوں اور ترخانوں کو عبدالرزاق معموری کے ہمراہ ٹھٹھہ سے بارگاہ جہانگیر مین روانہ کیا۔ دربار میں پہنچنے کے بعد یہ سب جہانگیر کے سامنے پیش کیے گئے، جہانگیر نے حکم دیا کہ عبدالعلی، خسرو خان اور اس کے بیٹے کو جیل میں رکھا جائے اور میرزا غازی کے اچھے اچھے ملازموں کو مناصب سے سرفراز کیا اور میرزا غازی کے متعلقین کے لیے مدد معاش مقرر کی گئی، باقی کل ارغون اور ترخان سپاہ کو نواب میرزا عیسیٰ ترخان ثانی[3] کی سرکار میں بھیج دیا گیا۔

خسرو چرکس کا حشر:

خسرو چرکس نے جیل خانے میں وفات پائی، میرزا عبدالعلی اور بہائی خان لطف اللہ ولد خسرو خان کو نور جہاں بیگم[4] کی سفارش پر قید خانے سے رہائی ملی، عبدالعلی کا روزینہ مقرر کر کے اسے آصف خاں[5] کے حوالے کیا گیا، جب وہ جوان ہوا تو اسے جزوی منصب سے نوازا گیا۔ بہائی خان لطف اللہ کو پانصدی کا منصب مقرر کیا گیا۔ قندھار کا صوبیدار ابوالنبی اوزبک[6] کو مقرر کیا گیا۔

سندھ کی حکومت ۹۶۲ھ (۵۵-۱۵۵۴ء) میں ترخانوں نے ارغونوں سے حاصل کی تھی، اڑتیس سال ان کی حکومت رہی، ۱۰۰۰ھ (۹۲-۱۵۹۱ء) میں مغلوں نے سندھ پر قبضہ کیا۔ اکبر نے اس ملک پر قبضہ کرنے کے بعد بھی یہ ملک انہیں کے حق میں واگزاشت کر دیا، ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں میرزا غازی کی وفات کے بعد سندھ میں ترخانی

---

(1) ترخان نامہ۔ ص ۹۳۔

(2) میرزا عبدالعلی اول: متوفی ۱۰ رجب ۱۰۴۰ھ مدفن میرزا باقی کے مقبرے میں ہے۔

(3) نواب میرزا عیسیٰ ترخان: بن میرزا جان بابا اول: متوفی ۱۰۶۲ھ (۵۲-۱۶۵۱ء) مدفن: قبرستان مکلی ٹھٹھہ (شجرۂ مشمولۂ ترخان نامہ مرتب سید حسام الدین راشدی۔)

(4) نور جہان بیگم: ولادت ۹۸۴ھ وفات: ۲۹ شوال ۱۰۵۵ھ (۱۷ دسمبر ۱۶۴۵ء) مدفن: لاہور، وفات کے وقت نور جہاں کی عمر ۷۲ سال کی تھی۔ ۲۵ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) جہانگیر نے اُسے نور جہاں کا لقب اجمیر میں دیا تھا (مظہر شاہجہانی، مقدمہ حاشیہ نمبر ۱۱، ص ۳)

(5) آصف خاں بن اعتماد الدولہ، برادر نور جہاں بیگم - ۹ جلوس جہانگیری میں آصف خاں کے خطاب سے سرفراز ہوا، ۱۰۵۱ھ (۱۶۴۱ء) میں اس نے لاہور میں وفات پائی، زہے افسوس آصف خاں (۱۰۵۱ھ) سے اس کی تاریخ وفات نکلتی ہے (مآثر الامرا، ج ۱، ص ۱۵۱-۱۶۰)۔

(6) ابوالنبی اوزبک: توران کے بزرگ زادوں میں تھا، عبدالمومن خان کے عہد حکومت میں مشہد کی حکومت پر فائز تھا، عبدالمومن خان کے مارے جانے کے بعد ہندوستان آیا اور ۴۸ جلوس اکبری میں وہ اکبر کے ملازموں میں منسلک ہو گیا۔ جہانگیر کے تخت نشین ہونے کے بعد جہانگیر نے اسے چالیس ہزار روپے بطور مدد خرچ دے کر ۵۷ منصبداروں کے ساتھ شیخ فرید کی کمک پر مقرر کیا جو خسرو کے تعاقب میں جا رہا تھا، ۵ جلوس جہانگیری میں ملتان کا صوبیدار مقرر ہوا، ۷ جلوس جہانگیری میں سہ ہزاری و سہ ہزار اور بہادر خان کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ شاہ بیگ کے انتقال کے بعد وہ قندھار کا صوبیدار مقرر ہوا، ۱۵ ربیع الثانی ۱۰۲۹ھ میں بینائی کی کمزوری کا عذر کر کے قندھار کی حکومت سے مستعفی ہو گیا اور صوبہ اکبر آباد میں اسے جاگیر دی گئی (مآثر الامرا، ج ۱، ص ۴۰۰-۴۰۱)۔

حکومت کا بالکلیہ خاتمہ ہو گیا اور سندھ مغل حکومت کے تحت آگیا اور مرکز سے سندھ میں گورنر مقرر ہونے لگے۔

۲۔ میرزا رستم قندھاری:

میرزا غازی کی وفات کے بعد سندھ کا پہلا گورنر میرزا رستم قندھاری مقرر ہوا، تحفتہ الکرام میں ہے کہ: میرزا رستم بن سلطان حسین میرزا بن بہرام میرزا بن شاہ اسماعیل صفوی پہلے قندھار کے نواح داور کا حاکم تھا، اوزبکوں کے خراسان پر قبضہ پالینے کے بعد اپنے میں مقابلے کی طاقت نہ پاکر وہ ۱۰۰۲ھ (۹۴-۱۵۹۳ء) میں اکبر کی خدمت میں حاضر ہوا، جس کے بعد وہ مستقلاً ملتان کا گورنر رہا، پھر یہ ٹھٹھہ کا گورنر مقرر ہوا۔[1] منتخب التواریخ میں ہے کہ: میرزا رستم کو جہانگیر نے حکومت ٹھٹھہ سپرد کرکے منصب پنج ہزاری سے سربلند کیا اور میر عبدالرزاق معموری کو حکم دیا کہ محال ٹھٹھہ کی جمع بندی کرکے ٹھٹھہ بطور تنخواہ اس کی جاگیر میں دے۔

لیکن ٹھٹھہ میں گورنر مقرر ہونے کے بعد جو ناروا سلوک اس نے وہاں کے لوگوں کے ساتھ کیا، اس کا اندازہ جہانگیر کی توزک کے ان اندراجات سے ہوتا ہے، جو جشن نہم میں اس نے اس کے متعلق کیے، وہ لکھتا ہے کہ:

> مظفر حسین میرزا میرے والد بزرگوار کی حیات میں رحمت خداوندی سے جا ملا اور میرزا رستم کو انہوں نے خانخاناں کے ساتھ صوبۂ دکن بھیج دیا، وہاں اسے چھوٹی سی جاگیر دے دی گئی تھی، جب سلطنت مجھے ملی تو میں نے اس خیال سے اسے دکن سے بلوایا کہ اس کے ساتھ کچھ رعایت کروں اور اسے اپنے سرحدی علاقوں میں سے کسی ایک پر متعین کروں۔ اس کے آتے ہی میرزا غازی ترخان، جس سے ٹھٹھہ اور قندھار اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی حکومت متعلق تھی، رحمت حق سے جا ملا۔ مجھے خیال آیا کہ اسے ٹھٹھہ کی حکومت پر بھیجوں تاکہ وہ وہاں اپنے ذاتی جوہر و قابلیت دکھا کر اچھے طریقے سے ملک کی حفاظت اور نگرانی کرے، چنانچہ میں نے اسے پنج ہزاری ذات و سوار کے منصب سے سرفراز کرکے دو لاکھ روپے بطور مدد خرچ کے لیے دیے اور ٹھٹھہ کی صوبیداری کے لیے روانہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس سے اس سرحد پر بہترین خدمات وقوع میں آئیں گی، لیکن اس کے برعکس اس نے توقع کے خلاف کوئی مفید خدمت انجام نہ دی، بلکہ رعایا پر اس قدر ظلم و ستم ڈھائے کہ اکثر لوگ اس کے ناروا سلوک کی شکایت کرنے لگے۔ ایسی ہی چند اور باتیں اس کے متعلق سنی گئیں کہ جس کی وجہ سے اس کا واپس بلانا لازمی ہو گیا۔ چنانچہ میں نے دربار کے اُمرا میں سے ایک شخص کو بھیج کر اسے دربار میں طلب کیا۔ ۲۶ اردی بہشت ۱۰۲۳ھ (۱۶۱۴ء) کو وہ لایا گیا، چونکہ اس نے خدا کی مخلوق پر بہت ظلم ڈھائے تھے، اس لیے انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا لازمی ہو گیا، میں نے اسے رائے سنگھ دلن کو سپرد کیا، تاکہ وہ اس کے اعمال کی اچھی طرح سے تحقیقات کرے اور اس کی سزا کو دیکھ کر دوسرے بھی متنبہ ہوں اور عبرت حاصل کریں۔[2]

تحفتہ الکرام (طبع راشدی) کے حواشی میں سید حسام الدین راشدی نے ذخیرۃ الخوانین کے حوالے سے اس کے مظالم کی تفصیلات دیتے ہوئے لکھا کہ: ذخیرۃ الخوانین میں ہے کہ میرزا رستم اپنے تقرر کے بعد ٹھٹھہ پہنچا اور اس نے وہاں کی مالگزاری کی آمدنی کو بھی بڑھا دیا اور خسرو خان کے ہمراہ میرزا غازی بیگ اور میرزا جانی بیگ کے لواحقین اور اہل خاندان کو بارگاہِ جہانگیری میں بھجوایا لیکن وہاں کے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، اس کے مظالم کی وجہ سے بہت سے لوگ جلاوطن ہو گئے، قاضی محمود جن کا شمار سندھ کے اکابر علماء میں ہوتا تھا، اس کے مظالم سے تنگ آکر اپنے اہل و عیال کے ساتھ ترکِ وطن کرکے بکھر آئے اور شیخ فرید بکھری مولف ذخیرۃ الخوانین کے والد شیخ معروف کے پاس جو اس وقت صدر سرکار بکھر تھے، مقیم ہوئے۔ رفتہ رفتہ یہ خبریں جہانگیر کے کانوں تک پہنچیں، اس نے میرزا رستم کو بدل کر اپنے حضور میں طلب کر لیا، چند روز تک معتوب رہا۔ ۱۰۰۱ھ میں جب کہ ملتان میرزا رستم کی جاگیر میں تھا، وہاں بھی لوگوں پر اس نے اسی قسم کے مظالم ڈھائے تھے، آخر معزول ہوا۔

بدایونی نے لکھا کہ ـــــ ملتان میرزا رستم کے ظلم سے بالکل برباد

---

(1) تحفتہ الکرام اردو ترجمہ، ص ۲۸۹-۲۹۰۔

(2) توزک جہانگیری-ترجمہ اردو، جلد ۱، ص ۴۲۶ (مترجم اعجاز الحق قدوسی) جشن نہم توزک جہانگیری (سرسید ایڈیشن، ص ۱۲۸)۔

ہو گیا تھا۔[1]

تحفتہ الکرام میں ہے کہ فیصلہ ہوا کہ جب تک میرزا رستم فریادیوں کو راضی نہ کرے گا اس وقت تک اسے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت نہ ملے گی۔ بالآخر دو سال کے بعد یہ پابندی ختم ہوئی اور اس کو خلعت سے سرفراز کر کے پہلے صوبہ الہٰ آباد اور اس کے بعد پٹنہ و بہار کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ آخر میں اس نے شاہجہان کے عہد حکومت میں گوشہ نشینی اختیار کر کے آگرے میں سکونت اختیار کر لی اور کچھ عرصے کے بعد فوت ہو گیا۔[2] اس کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے، ذخیرۃ الخوانین میں اس کی تاریخ وفات ۱۰۴۸ھ (۳۹-۱۶۳۸ء) مآثر الامرا میں ۱۰۵۱ھ (۱۶۴۱ء) اور پادشاہ نامہ میں پیشتر یکم ربیع الاول ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) درج ہے۔[3]

میرزا رستم شاعر بھی تھا اور فدائی تخلص کرتا تھا، صاحب مقالات الشعرا نے ید بیضا سے اس کا یہ شعر نقل کیا ہے:

صاف دل را از گراں جاناں کجا نقصان رسد
قدر گوہر نشکنی گر پر کنی دریا بسنگ

سید حسام الدین راشدی نے مقالات الشعرا کے حواشی میں محک کمال سے اس کا مندرجہ بالا شعر اس طرح نقل کیا ہے:

بر سر کوے تو آمد شیشہ ام را یا بسنگ
قدر گوہر نشکند گر، پر کنی دریا بسنگ

اس کے علاوہ اس کے یہ اشعار ہمیں مقالات الشعرا میں ملتے ہیں:

برچید دلم بساط ایمانی را
کج باختہ ام نرد خدا دانی را
ابروے بتاں قبلۂ خود ساختہ ام
بر طاق نہادہ ام مسلمانی را
بے سوز دروں چشم تری را چہ کند کس
اشکے کہ نسوزد جگرے را چہ کند کس
در عشق سمندر شو اگر شعلہ پرستی
پروانۂ بے بال و پری را چہ کند کس

بر بال ہما تکیہ زدن ہمت ما نیست
آسودگی مشت پرے را چہ کند کس
جز آنکہ بہ نیک و بد ایام بسازی
ناسازی بہ بد گہرے را چہ کند کس[4]

سید حسام الدین راشدی کی تحقیق کی بنا پر میرزا رستم کے بعد خاں تاش بیگ ٹھٹھہ کا صوبیدار ہو کر آیا، اس کے بعد ارسلان بیگ شمشیر خاں اوزبک پھر عبدالرزاق معموری، پھر میرزا شاہ بیگ ارغون خان دوراں بالترتیب ٹھٹھہ کے صوبیدار ہوئے، لیکن قانع نے تحفتہ الکرام میں ان کی صوبیداری کا ذکر نہیں کیا، بلکہ وہ میرزا رستم کے بعد مصطفیٰ خان کو ٹھٹھہ کا صوبیدار لکھتا ہے۔

۳۔ مصطفیٰ خان:

میرزا رستم کے بعد ۱۰۲۵ھ (۲۰-۱۶۱۹ء) میرزا مصطفیٰ خان سندھ کا صوبے دار مقرر ہوا، راشدی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ ۱۰۳۵ھ (۲۶-۱۶۲۵ء) تک ٹھٹھہ کا صوبے دار رہا۔

۴۔ سید بایزید بخاری:

مصطفیٰ خان کے موقوف ہونے کے بعد ۱۰۳۵ھ (۲۶-۱۶۲۵ء) میں سید بایزید بخاری بن سید مبارک خان بن لال خان بن سید حبیب بن سید یعقوب بن سید صالح بن سید موسیٰ بن سید ابراہیم بن سید اسماعیل بن سید یحییٰ بن سید محمود بن سید رکن الدین بن سید عبداللہ بن سید مخدوم جہانیاں بخاری جو پہلے بکھر کا گورنر تھا، ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا۔[5]

ذخیرۃ الخوانین میں ہے کہ سید بایزید بخاری قطب الاقطاب حضرت دمدبہ (؟) کی اولاد سے تھا، جو پٹنے میں محو استراحت ہیں، یہ ابتداءً اکبر کے عہد میں داروغۂ داغ مقرر ہوا، اس نے بہت خدمت کی، چاہتا تھا کہ اسے کسی طرح مرتضیٰ خان کا خطاب ملے، لیکن یہ میسر نہ ہوا اور مصطفیٰ خان کے خطاب اور منصب سہ ہزاری تک پہنچ کر ٹھٹھہ کا صوبے دار مقرر ہوا، وہیں اس نے وفات پائی اور اُچ میں حضرت سید جلال بخاری[6] کے روضے میں مدفون ہے۔[1]

---

(1) تحفتہ الکرام (طبع راشدی)، ص ۳۱۵، حاشیہ نمبر ۲۔
(2) تحفتہ الکرام اردو ترجمہ، ص ۲۹۱۔
(3) تحفتہ الکرام (طبع حسام الدین راشدی) ص ۳۱۶، حاشیہ نمبر ۱۔
(4) مقالات الشعرا: ص ۴۸۸ تا ۴۹۰۔
(5) تحفتہ الکرام اردو ترجمہ، ص ۲۹۷۔ جنت السندھ (سندھی) ص ۴۱۵۔
(5) سید جلال بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت: سلسلۂ سہروردیہ کے مشہور بزرگ، ولادت: ۷۰۷ھ (۹ جنوری ۱۳۰۸ء) مقام اُچ، وفات: ۱۰ ذی الحجہ روز چہار

سید حسام الدین راشدی نے مصطفیٰ خان اور میر بایزید کو ایک شخصیت قرار دیتے ہوئے لکھا کہ وقائع نگار کو اشتباہ ہوا ہے۔ درحقیقت یہ ایک شخصیت ہے، اس کا نام سید بایزید اور لقب مصطفیٰ خان ہے، بایزید ۱۰۲۹ھ (۲۰-۱۶۱۹ء) میں میر معموری کے تبادلے کے بعد فوجداری بکھر سے ٹھٹھہ کا صوبیدار ہو کر آیا۔ ۲۵ ازدی بہشت ۱۰۲۹ھ (-۱۶۱۹ ۲۰ء) کو اسے مصطفیٰ خان کا خطاب ملا، یہ ۱۰۳۵ھ (۲۶-۱۶۲۵ء) تک ٹھٹھہ میں رہا اور وہیں محرم ۱۰۳۵ھ (۱۶۱۹ء) میں وفات پائی اور اُچ میں سید جلال بخاری کے روضے میں مدفون ہوا۔

دلیل الذاکرین قلمی میں ہے کہ: مصطفیٰ خان بایزید ٹھٹھہ کے مشہور بزرگ حضرت متھہ سے نہایت عقیدت و اخلاص رکھتا تھا اور جب ان کی ملاقات سے مشرف ہوتا، چاندی کے بیس روپے ان کے قدموں کے پاس رکھتا، یہ رقم آپ کے خادموں یا درویشوں میں سے کوئی نہ اٹھاتا بلکہ اُس کے خدمت گاروں میں سے کوئی اٹھالیتا۔

تحفتہ الطاہرین میں ہے کہ میاں متھہ مخدوم نوح ہالائی کے فیض یابوں میں تھے۔ اُن کی عمر جامع فرخ میں بسر ہوئی، میاں متھہ کا مزار مکلی میں پیر آسات کے مزار کے پاس سیڑھیوں کے قریب واقع ہے۔[2]

مصطفیٰ خاں بایزید شاعر تھا، اس کا یہ شعر صاحب مقالات الشعرا نے محفوظ کیا ہے:

عاشق از سوز دروں بہرہ ورست
شمع را شعلہ بسر تاج زرست[3]

توزک جہانگیری جشن یازدہم ۲۸ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) کے اندراجات کے تحت جہانگیر نے لکھا کہ میں نے ایک زنجیر فیل بایزید حاکم بکھر کو عنایت کیا۔[4] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بکھر کی حکومت پر اس کا تقرر اسی سال ہوا تھا۔

چار سال یعنی ۱۰۲۹ھ (۱۶۲۰ء) تک بکھر کا فوجدار رہ کر اس کا تبادلہ ٹھٹھہ کی صوبیداری پر کیا گیا، چنانچہ جہانگیر نے توزک کے پندرہویں جشن، ۲۵ ربیع الثانی روز شنبہ ۱۰۲۹ھ (۱۶۲۰ء) کے اندراجات میں لکھا ہے کہ: سید بایزید بخاری فوجدار بکھر-ولایت ٹھٹھہ کی صوبیداری سے سربلند ہوا، اور میں نے اس کا منصب اصل و اضافے کے ساتھ دو ہزاری ذات و ہزار و پانصد سوار کر دینے کا حکم دیا اور اُسے علم بھی مرحمت کیا۔[5]

سید بایزید کی وفات کی تاریخ کا پتا بھی توزک کے اندراجات سے چلتا ہے۔ بیسویں جشن ۱۰۳۴ھ میں ۱۱ محرم ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) کے اندراجات کے ضمن میں جہانگیر نے لکھا کہ مصطفیٰ خان (سید بایزید بخاری) حاکم ٹھٹھہ نے رحلت کی اور یہ صوبہ شہریار کو عنایت ہوا۔[6]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید بایزید بخاری نے یا تو ذی الحجہ ۱۰۳۴ھ کے آخر میں یا محرم ۱۰۳۵ھ کے شروع میں وفات پائی ہوگی۔ اس اندراج سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مصطفیٰ خان بایزید کے بعد ٹھٹھہ کا صوبیدار شہریار کو مقرر کیا گیا، لیکن تحفتہ الکرام میں اس کا تذکرہ نہیں۔

۵۔ نواب شریف الملک:

سید بایزید بخاری کی وفات کے بعد ۱۰۳۵ھ (۲۰-۱۶۱۹ء) میں ٹھٹھہ کا صوبیدار نواب شریف الملک مقرر ہوا۔

تحفتہ الکرام میں ہے کہ نواب شریف الملک عرف شریف خان یک چشم ٹھٹھہ کا صوبیدار ہو کر آیا۔ اُسی کے زمانے میں جلوس جہانگیری کے اکیسویں سال ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) میں شاہزادہ خرم (شاہجہان)[7] باپ سے ناراض ہو کر اپنے خاص آدمیوں کے ہمراہ عراق عجم کے ارادے سے ٹھٹھہ پہنچا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ چند روز ٹھٹھہ میں رہے، لیکن شریف الملک نے جنگ چھیڑ دی۔ کئی مرتبہ جانبین سے توپ و تفنگ تک نوبت پہنچی۔ شاہزادے نے بھی متعدد مرتبہ شہر کے مشرق، جنوب اور شمال سے حملے کیے، لیکن شکست کھائی۔ ایک مرتبہ مکلی[8] کے پُل کے

شنبہ ۷۸۵ھ (۱۳۸۴ء) مدفن اُچ (اخبار الاخیار ص ۱۴۳)۔

(1) ذخیرۃ الخوانین قلمی مملوکہ سید حسام الدین راشدی، ص ۳۴۹۔

(2) تحفتہ الکرام (طبع راشدی) ص ۳۱۷، حاشیہ نمبر ۲۔

(3) مقالات الشعرا، ص ۱۰۸۔

(4) توزک جہانگیری (سرسید ایڈیشن) ص ۱۵۷۔

(5) ایضاً-ص ۳۰۵۔

(6) توزک جہانگیری، ص ۳۹۷۔

(7) شاہجہاں: ولادت: یکم ربیع الاول ۱۰۰۰ھ (۹۰-۱۵۹۱ء) شب پنجشنبہ، تخت نشینی ۸ جمادی الثانی ۱۰۳۷ھ (۲۸-۱۶۲۷ء) تا یکم ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ (-۱۶۵۶ ۵۷ء) وفات: ۲۶ رجب ۱۰۷۶ھ (۶۶-۱۶۶۵ء) (دیباچہ توزک جہانگیری)، ص ۶ و حاشیہ مقالات الشعراء، ص ۲۱۶ مرتب: سید حسام الدین راشدی)۔

(8) مکلی: ٹھٹھہ کا مشہور قبرستان، جس میں بڑے بڑے علماء، صوفیا، شعراء، بادشاہ، وزرا اور اہل کمال مدفون ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس نام کی ایک پاک دامن خدا رسیدہ خاتون

قریب پیر بدر[1] کے نزدیک سخت جنگ ہوئی، اس جنگ میں مارے جانے والوں کی ہڈیاں آج تک اس سرزمین میں دکھائی دیتی ہیں۔[2]

کہتے ہیں کہ اسی زمانے میں شاہزادہ خرم کی بیگم نے جو حاملہ تھی، چند اناروں کی فرمائش کی، شاہزادہ خرم نے اپنے دستخط سے ایک رقعہ اس فرمایش کی تکمیل کے لیے شریف الملک کو لکھا۔ اس نے جواب دیا کہ میں خود بیگم کو انار بھیج رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک فرنگی توپچی کو حکم دیا کہ بیگم کے خیمے پر جہاں وہ ٹھہری ہوئی ہے گولے برسائے اور شاہزادہ خرم کو کہلا بھیجا کہ یہاں اسی قسم کے انار ہوتے ہیں، گولوں کی آواز سے بیگم کا حمل ساقط ہو گیا۔

بعض کہتے ہیں کہ شریف الملک نے خود دوربین سے دیکھ کر شاہزادے کو نشانہ بنانے کے خیال سے توپ کا فتیلہ جلایا تھا، لیکن چشم زدن میں شاہزادے نے خیمہ بدل دیا اور اس طرح اس کا نشانہ خطا ہو گیا، شریف الملک نے اپنے نشانے کے خطا ہونے پر غضب ناک ہو کر اپنی انگلی اُس آنکھ کے حلقے میں ڈال کر جس سے اُس نے نشانہ باندھا تھا اپنی آنکھ نکال ڈالی۔ اُسی وقت سے وہ کانا ہو گیا۔[3] ذخیرۃ الخوانین میں ہے کہ ـــــ شریف الملک شہریار کا ملازم تھا اور دھولپور کی حکومت اس کے سپرد تھی، وہیں دریاخان سے اس کی جنگ ہوئی۔ اسی لڑائی میں ایک تیر اس کی آنکھ میں لگا اور یہ کانا ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی آنکھ ٹھٹھہ میں نہیں پھوٹی تھی۔[4]

تکملۂ توزک جہانگیری میں محمد ہادی خان نے واقعات ۲۱ جلوس جہانگیری ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) میں لکھا کہ: شاہجہاں اپنے والد سے بغاوت کے زمانے میں ٹھٹھہ وارد ہوا، چونکہ اس کی اپنی شاہزادگی کے زمانے میں شاہ ایران شاہ عباس سے مراسم دوستی اور خط و کتابت تھی، اور ہرج و مرج کے زمانے میں شاہ عباس بھی اس کی خیریت اور حالات پوچھتا رہتا تھا، اس لیے شہزادے نے خیال کیا کہ مجھے شاہ ایران کے پاس جانا چاہیے، ممکن ہے کہ اس کی نوازشوں اور مہربانیوں سے یہ شورش و فساد کا غبار پھٹ جائے، چنانچہ جب وہ اس ارادے سے ٹھٹھہ کے نواح میں پہنچا تو شریف الملک نے جو اُس زمانے میں وہاں کا صوبیدار تھا، اُس کی آمد کی خبر سن کر نو ہزار سواروں اور بارہ ہزار پیادوں کو جمع کر کے شہر کے حصار کو مضبوط کیا، اور شاہزادے سے جرأت کے ساتھ مقابلے کی تیاریاں کرنے لگا، باوجود اس کے کہ شاہزادے کے ساتھ صرف تین چار سو جاں نثار تھے، لیکن وہ ان کے مقابلے کی تاب نہ لا کر قلعہ بند ہو گیا، چونکہ وہ پہلے ہی سے قلعے کی مرمت کر چکا تھا، اور فصیلوں اور برجوں کو درست کر چکا تھا اس لیے وہ قلعے ہی میں سے مدافعت اور مقابلہ کرتا رہا، شاہزادے شاہجہاں نے اپنے لوگوں کو منع کیا کہ وہ قلعے پر حملہ نہ کریں اور اپنی رعایا کو توپوں اور بندوقوں سے نقصان نہ پہنچائیں، لیکن اس ممانعت کے باوجود چند تجربہ کار جوانوں نے شہر کے حصار پر یورش کی، لیکن قلعے کی فصیلوں اور بُرجوں کے مضبوط ہونے اور توپ خانے کی کثرت کی وجہ سے وہ کچھ نہ بگاڑ سکے۔ مجبوراً انہوں نے لوٹ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا، پھر کچھ دن کے بعد شاہجہاں کے شیر دل بہادروں نے قلعے پر حملہ کیا، چونکہ قلعے کے اطراف کا میدان بالکل مسطح تھا اور کہیں بھی اس میں نشیب و فراز نہ تھا۔ یہ ڈھالیں کھینچ کر قلعے کی طرف دوڑے، اتفاق سے جس طرف یہ دوڑے اُس حصے میں پانی سے بھری ہوئی ایک گہری اور چوڑی خندق تھی، جس کی وجہ سے آگے جانا محال تھا اور وہاں سے لوٹنا اور بھی محال تھا، لہٰذا یہ مجبوراً خندق پر بھروسا کر کے میدان میں بیٹھ گئے، اُسی زمانے میں شاہجہان نے بعض موانع کی وجہ سے جس کا لکھنا طوالت کا باعث ہے سفر عراق ملتوی کر دیا، ادھر اُسے شہزادہ پرویز کی بیماری کی خبر ملی، جس سے اُسے یقین ہو گیا کہ وہ اس مرض سے جانبر نہ ہو سکے گا۔ اُسی زمانے میں اُسے نور جہاں کا خط ملا، جس میں تحریر تھا کہ: مہابت خاں پر شکوہ شاہی لشکر سے سراسیمہ ہو چکا ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ انتہائی دیوانگی اور غصے میں تمہارے لڑکوں کو تکلیف پہنچائے، سلطنت کی بہی خواہی اس میں ہے کہ تم دکن کی طرف لوٹ کر چند روز اسی طرح اور گزار لو۔

مسجد مکلی کے محراب کے زیر سایہ جو شیخ حماد جمالی ولد شیخ رشید الدین جمالی نے ۹۳-۷۹۲ھ (۹۰-۱۳۸۹ء) جام تماچی کے زمانے میں یہاں تعمیر کرائی تھی مدفون ہیں، آپ کے اشارے سے اس مسجد کا نام مسجد مکلی رکھا گیا تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہ نام اس قبرستان کا پڑ گیا۔ اس مسجد کی چار دیواری جام نظام الدین کے مقبرے کے سامنے نہایت خستہ حالت میں موجود ہے، شیخ حماد جمالی نے اس مسجد کے بننے کے بعد سموں کو حکم دیا کہ آیندہ سے اس مسجد کے آس پاس اپنے مقبرے بنوائیں، چنانچہ سلاطین سمہ اور دوسرے لوگ یہاں مدفون ہونے لگے، ورنہ اس سے پہلے سموں کا قبرستان پیر آر (پیر پٹھو) تھا۔ تحفۃ الکرام اردو ترجمہ ص ۵۶۷ و حواشی مکلی نامہ سندھی، مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۸۲-۸۵)۔

(1) پیر بدر: ایک صاحب کرامت بزرگ تھے، جو ارغونوں کی فوج کشی کے وقت شہید ہوئے۔ ان کا مزار محلہ جتاں میں مشہور و معروف ہے (تحفۃ الکرام اردو ترجمہ، ص ۷۴۲)۔

(2) تحفۃ الکرام، اردو ترجمہ، ص ۲۹۲-۲۹۳۔

(3) تحفۃ الکرام، اردو ترجمہ - ص ۲۹۲-۲۹۳۔

(4) تحفۃ الکرام (طبع راشدی) ص ۳۱۹، حاشیہ نمبر ۱ بحوالہ ذخیرۃ الخوانین جلد ۲- ص ۶۲۔

ان وجوہ کی بنا پر شاہزادہ خرم باوجود ضعف قوی اور بہت سے مصائب کے پالکی پر سوار ہو کر براہ گجرات و بہار دکن کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں اسے شاہزادہ پرویز[1] کی وفات کی خبر ملی۔[2] شریف خان ۱۰۳۷ھ تک شہریار کے نائب ہونے کی حیثیت سے ٹھٹھہ کا صوبیدار رہا۔

راشدی صاحب نے شریف الملک کے بعد (۱۰۳۶ھ) میں میرزا ابو سعید کے ٹھٹھہ کا گورنر مقرر کیے جانے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ: جہانگیر نے جلوس کے بائیسویں سال ۳ رجب روز یک شنبہ ۱۰۳۶ھ (۱۶۲۷ء) کو جب کہ وہ کشمیر پہنچا تو اس نے ابو سعید نبیرۂ اعتماد الدولہ کے نام ٹھٹھہ کی صوبیداری کا فرمان جاری کیا، لیکن یہ ٹھٹھہ پہنچنے نہ پایا تھا کہ ۲۸ صفر یکشنبہ ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) میں جہانگیر نے وفات پائی اور شاہجہاں نے اپنے امرا میں سے شریف الملک کی جگہ کسی اور کو ٹھٹھہ کا صوبیدار بنا کر بھیجا۔[3]

۶۔ میرزا عیسیٰ ترخان ثانی عہد شاہجہانی:

نواب شریف الملک کے بعد عہد شاہجہانی میں میرزا عیسیٰ ترخان ثانی بن جان بابا ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا، میرزا عیسیٰ ثانی کی ماں سمیجہ قوم سے تعلق رکھتی تھی، جو سندھ کا نامور، شریف اور بہادر قبیلہ تھا، میرزا عیسیٰ کی تاریخ ولادت کسی تاریخ میں مذکور نہیں، البتہ اس کی عمر کا تخمینہ مختلف مؤرخوں نے مختلف طور پر لکھا ہے، جس کے پیش نظر اس کی ولادت کی تاریخ متعین کی جاسکتی ہے۔ صاحب ذخیرۃ الخوانین نے اس کی عمر ایک سو بارہ سال، صاحب ترخان نامہ نے پچانوے سال، صاحب مآثر الامرا نے ایک سو سال اور صاحب مرآۃ محمدی نے بھی اس کی عمر ایک سو سال لکھی ہے۔ ان مورخین کی متعینہ عمر کے لحاظ سے اس کا سنہ ولادت حسب ذیل قرار پاتا ہے:

ذخیرۃ الخوانین	وفات کی عمر ۱۱۲ سال	ولادت ۹۴۸ھ	
ترخان نامہ	" ۹۵ سال	" ۹۶۶ھ	
مآثر الامرا اور مرآۃ محمدی	" ۱۰۰ سال	" ۹۶۰ھ	

لیکن سندھ کی تاریخ کے ایک محقق سید حسام الدین راشدی نے مؤرخین کے عمر کے اندازے کو غلط قرار دیتے ہوئے لکھا کہ: میرزا عیسیٰ ترخان اول ۹۷۳ھ میں فوت ہوا اور میرزا عیسیٰ ثانی کا والد میرزا جان بابا ۹۷۸ھ میں قتل ہوا۔ اس لحاظ سے میرزا کی ولادت کا سنہ ۹۷۴ھ کے بعد اور ۹۷۸ھ سے پہلے ہونا چاہیے۔ فرض کیجیے کہ اگر ہم میرزا عیسیٰ ثانی کی ولادت ۷۵-۹۷۶ء میں مان لیں تو اس کی عمر وفات کے وقت پچاسی یا چھیاسی سال ہونی چاہیے۔ فی الحال ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس کی عمر پچاسی یا چھیاسی سال فرض کر کے اس کی ولادت کا سال ۹۷۵ھ یا ۹۷۶ھ قرار دیں۔

میرزا باقی نے جب ۹۷۷ھ میں قتل عام شروع کیا، تو یہ سات آٹھ برس تک سمیجہ قبیلے میں روپوش رہا، جب ۹۸۳ھ میں میرزا باقی نے خودکشی کی اور ملک کی باگ ڈور میرزا پایندہ بیگ اور اس کے ساتھ اس کے بیٹے میرزا جانی بیگ کے ہاتھ آئی تو میرزا جانی بیگ اسے تسلی دلاسا دے کر نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے زمانے میں ٹھٹھہ لایا اور اپنی پھوپھی سے اس کا عقد کر دیا، اور اس کو جاگیر و منصب سے نوازا۔[4]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک میرزا جانی بیگ زندہ رہا، میرزا عیسیٰ ثانی نے وہ زمانہ نہایت اطمینان و سکون سے گزارا، لیکن جب میرزا غازی بیگ اس کا جانشین ہوا، اور اس کے قدیم امرا میں اختلاف ہوا تو میرزا عیسیٰ ترخان اندرونی طور پر ان اُمرا سے ہمدردی رکھتا تھا، میرزا کا خیال تھا کہ اگر امرا سے آویزش میں میرزا غازی ناکام ہو گیا، تو اس صورت میں شاید وہ سندھ کی حکومت حاصل کر سکے گا، ادھر میرزا غازی نے میرزا خسرو چرکس کو جو مرکز میں موجود تھا اور جس کو بڑی اہمیت حاصل تھی، یہ خیال کر کے کہ تمام شورش پسندوں کا سرغنہ یہی ہے، اگر اس کو ختم کر دیا گیا تو دوسروں سے نمٹنا بہت آسان ہے،[5] اس کے ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرزا غازی نے اپنے دل میں یہ رائے قائم کر کے منصوبہ بنایا کہ خسرو کو اکیلے کسی تنہا مقام پر بلانا چاہیے اور وہیں اس کو ختم کر دینا چاہیے، لیکن میرزا غازی کے اس منصوبے کی اطلاع کسی نہ کسی طرح میرزا عیسیٰ کو مل گئی، اور اس نے خسرو چرکس کو جس سے میرزا عیسیٰ کی دوستی اور خلوص تھا، میرزا غازی کے ارادے سے آگاہ کر دیا اور اس طرح اسے موت کی منہ سے بچالیا۔

میرزا غازی کو جب یہ حقیقت حال معلوم ہوئی تو اسے یقین ہو گیا کہ میرزا عیسیٰ اس کے مخلصین میں نہیں ہے۔ اس نے طے کیا کہ پہلے

---

(1) وفات شاہزادہ پرویز: شب چہار شنبہ ۷ صفر ۱۰۳۰ھ (۱۶۲۰ء)۔

(2) توزک جہانگیری (سرسید ایڈیشن)، ص ۴۱۳-۴۱۴۔

(3) تحفۃ الکرام (طبع راشدی)، ص ۳۹۲۔

(4) ترخان نامہ، ص ۶۶۔

(5) تاریخ طاہری، ص ۲۲۷۔

میرزا عیسیٰ ہی کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہیے، تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور آئندہ کوئی ہمراز ہو کر افشائے راز نہ کرے۔

میرزا عیسیٰ نے اگرچہ خسرو چرکس کو میرزا غازی کے ارادے سے آگاہ کر دیا تھا، لیکن فطری طور پر اسے یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ اگر اس کی اطلاع میرزا غازی کو مل گئی تو وہ اسے زندہ نہ چھوڑے گا۔ ترخان نامے میں ہے کہ وہ اس خیال سے کہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو، ٹھٹھہ چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا۔

تاریخ طاہری میں کچھ اور تفصیل ملتی ہے وہ یہ ہے کہ میرزا عیسیٰ نے ٹھٹھہ چھوڑنے کے بعد پہلے سمیجہ قوم میں قیام کیا اور ابو القاسم سلطان حاکم نصرپور کے قید ہونے کے بعد جب اس کی امیدیں مایوسی میں بدل گئیں تو وہ دارالخلافہ کی طرف اعلیٰ حضرت اکبر کی خاک بوسی کے ارادے سے روانہ ہو گیا۔[1]

صاحب مآثر الامرا نے اس باب میں لکھا کہ: میرزا جانی بیگ کی وفات کے بعد میرزا عیسیٰ ثانی حکومت کی ہوس میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ خسرو خان چرکس نے جو اس خاندان کا مستقل وکیل تھا، میرزا غازی کو اس کے باپ کا جانشین بنایا اور اس نے ارادہ کیا کہ میرزا عیسیٰ کو جیل خانے میں ڈال دے، لیکن وہ خوش نصیبی سے ٹھٹھہ سے بچ کر نکل گیا اور جہانگیر کے دربار میں پہنچ کر پناہ حاصل کی۔ جہانگیر نے اسے عمدہ منصب سے نواز کر دکن میں متعین کیا،[2] یہی بیان صاحب ذخیرۃ الخوانین شیخ فرید بکھری کا بھی ہے بلکہ صاحب مآثر الامرا نے یہ روایت ذخیرۃ الخوانین ہی سے اخذ کی ہے، لیکن سید حسام الدین راشدی نے حسب ذیل دلائل کی روشنی میں اس روایت کو ناقابل قبول ٹھہرایا ہے:

۱۔ سندھ کے جاگیردار کے تقرر کرنے کا اختیار خسرو کے ہاتھ میں نہیں تھا، بلکہ یہ جاگیردار بادشاہ کے حکم سے مقرر ہوتا تھا۔

۲۔ اکبر نامے میں ہے کہ: میرزا جانی کی وفات کے بعد بادشاہ نے غائبانہ اس کے بیٹے کے نام جانشینی کا پروانہ اور خلعت روانہ کیا۔[3]

۳۔ میرزا جانی بیگ کا انتقال ۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰ء) میں ہوا، اس وقت جہانگیر نہیں بلکہ اکبر تخت نشین تھا۔

۴۔ میرزا عیسیٰ یقیناً اکبر کے زمانے میں گیا، اس لیے کہ اس کا راوی صاحب تاریخ طاہری ہے، جو میرزا غازی کا ہمعصر ہے اور بہت سے واقعات کا عینی شاہد ہے اور اس سلسلے میں اس کی کتاب تاریخ طاہری سب سے قدیم ماخذ ہے۔

راشدی صاحب نے اکبر نامے سے میرزا عیسیٰ کے دربار اکبری میں پہنچنے کا سن ۱۰۱۳ھ (۱۶۰۴-۵ء) قرار دیا ہے۔[4]

اکبر کے عہد میں میرزا عیسیٰ کی باریابی کے بعد صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ میرزا عیسیٰ جب اکبر کے دربار میں باریاب ہوا تو اکبر اس کے ساتھ نہایت الطاف و نوازش سے پیش آیا اور دہ سی سے زیادہ کا منصب اسے مرحمت کیا اور اُمرا کے زمرے میں شامل کر لیا۔[5]

یہ وہ معلومات ہیں جو اکبری دور میں میرزا عیسیٰ کے متعلق ہمیں ملتی ہیں، اس کے علاوہ کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ اکبر کے زمانے میں کس کس عہدے پر اور کہاں کہاں رہا۔

۸ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) کو جہانگیر تخت نشین ہوا اور ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) کو اس نے وفات پائی۔[6] اس تیئیس برس کے طویل عرصے میں وہ شاہانہ الطاف و نوازشہائے بیکراں سے سرفراز رہا، اور جہاں بھی وہ مقرر کیا گیا، اس نے نہایت شجاعت و بہادری کے جوہر دکھائے اور نہایت ذمے داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے۔

صاحب ترخان نامہ نے اس کی غیر معمولی صلاحیتوں اور شجاعت و بہادری کو سراہتے ہوئے لکھا کہ:

> میرزا عیسیٰ ترخان از کمال جمعیت و ہمت و غیرت بغیر از بادشاہ بکسی سر فرو نمی آورد، و بہ ارکان دولت توسل نمی جست، لاجرم ارکان دولت در مقام نزاع او بود، او را جاہای سخت و زور طلب تنخواہ می کردند۔
>
> میرزا مذکور جمعیت خوب ہمراہ داشت، از وی تہور قبول نمودہ بہر صوبہ کہ میرفت ترددات نمایاں نمودہ بانعام و اکرام و اضافۂ منصب بی منت عمرو وزید سربلندی نمودہ می یافت۔[7]

حواشی مکلی نامہ میں ہے کہ میرزا عیسیٰ نے جہانگیر کے زمانے میں اپنی عمر کا بڑا حصہ دکن اور گجرات میں گزارا جس زمانے میں کہ جہانگیر

---

(1) تاریخ طاہری، ص ۲۳۹۔

(2) مآثر الامرا، ج ۳، ص ۴۸۵-۴۸۶۔

(3) اکبر نامہ، ج ۱، ص ۷۳-۷۷۔

(4) حواشی مکلی نامہ سندھی، ص ۲۵۶۔

(5) ترخان نامہ - ص ۹۶۔

(6) حواشی مکلی نامہ سندھی، ص ۲۶۱۔

(7) ترخان نامہ، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۹۶-۹۷۔

نے وفات پائی، وہ اس وقت گجرات میں تھا۔[1]

۱۰۱۴ھ (۶-۱۶۰۵ء) میں جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد اس کی پہلی تعیناتی دکن میں ہوئی لیکن اس نے دکن میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیے اور یہ کون کون سے عہدوں پر رہا، تاریخ اس باب میں خاموش ہے۔ صرف مآثر الامرا نے چند لفظوں میں اس کے دکن میں تقرر کیے جانے کا تذکرہ کیا ہے۔ تاریخ کے صحرا میں پورے آٹھ سال تک میرزا عیسیٰ کا پتا نہیں چلتا، یہاں تک کہ جہانگیر بھی جو عام طور پر اپنے امرا کے متعلق توزک میں کچھ نہ کچھ لکھتا رہا ہے، اس نے بھی ایک لفظ میرزا عیسیٰ کے متعلق نہیں لکھا، یہاں تک کہ ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں میرزا غازی نے وفات پائی۔ جب خسرو چرکس نے میرزا عبدالعلی کو میرزا غازی کی جگہ مسند نشین کیا تو جہانگیر نے اس خدشے کے ماتحت کہ شاہ ایران سے ظاہری روابط کے سوا دلوں میں صفائی نہیں، سندھ سرحدی علاقہ ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایرانیوں کی مدد سے یہ سندھ کے علاقے کو آزاد کرا لیں۔ اُس نے میرزا عیسیٰ کو دکن سے واپس بلا لیا۔

چنانچہ ذخیرۃ الخوانین میں ہے کہ: میرزا عیسیٰ غازی بیگ کی وفات کے بعد بموجب فرمان دربار میں حاضر ہوا۔ حضرت جنت مکانی (جہانگیر) چاہتے تھے کہ اس کو ٹھٹھہ بھیجیں، کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ خسرو خان بغاوت اختیار کرے اور عبدالعلی خان ترخان جسے اس نے میرزا غازی کی جگہ بٹھایا ہے، اس کا ممد و معاون ہوا۔[2]

تقریباً یہی بیان صاحب مآثر الامرا کا بھی ہے۔[3]

چنانچہ حسب فرمان شاہی میرزا عیسیٰ ۱۰ خورداد ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲-۱۳ء) کو دربار میں حاضر ہوا۔ توزک میں ہے کہ:

> میرزا عیسیٰ۔۔۔ در لشکر دکن متعین بود، بجہت تھتہ اور اطلبیدہ بودم، در ہمیں تاریخ بخدمت استسعاد یافت، چوں قابل رعایت و تربیت بود بہ منصب ہزاری و پانصد سوار ممتاز گشت۔

لیکن ذخیرۃ الخوانین میں ہے کہ: میرزا کے بعض حاسدوں نے جہانگیر کو یہ سمجھایا کہ میرزا عیسیٰ بیگ ایک طویل عرصے سے اپنے موروثی ملک ٹھٹھہ کی حکومت کی تمنا رکھتا ہے۔ اب جب کہ وہ وہاں کا حاکم ہو کر جائے گا، تو یہ شاہ عباس صفوی سے جوڑ توڑ کر کے اور حاکم کیچ و مکران اور ہرمز کے توسل و اعانت سے جس سے اس کی صلح ہو چکی ہے، وہاں اپنی مستقل حکومت قائم کر لے گا، پھر ایک عمر اس سے نمٹنے کے لیے چاہیے۔

تقریباً یہی روایت مآثر الامرا میں ہے، جو ذخیرۃ الخوانین سے ہی ماخوذ ہے۔

اس خطرے کے باعث جہانگیر نے ٹھٹھہ میں اس کو صوبے دار مقرر کرنے کا ارادہ منسوخ کر دیا، اور اس کی جگہ میرزا رستم صفوی کا ٹھٹھہ کی صوبیداری پر تقرر کر کے، میرزا عیسیٰ کو رادھن پور میں جاگیر دے کر وہاں بھجوا دیا۔[4] پھر وہ سنبھل کا جاگیر دار مقرر کیا گیا، چنانچہ توزک سے پتا چلتا ہے کہ وہ ۱۰۲۴ھ (۱۶۱۵ء) میں سنبھل کا جاگیر دار تھا اور اس نے اجمیر میں جہانگیر کے دربار میں حاضر ہو کر ایک سو اشرفیاں نذر گزارنی تھیں۔[5]

ٹھٹھہ کی صوبیداری:

۱۸ ربیع الثانی ۱۰۳۷ھ (۲۸-۱۶۲۷ء) کو شاہجہاں نے جب وہ تخت نشینی کے لیے دارالخلافہ آ رہا تھا۔ اُسے احمد آباد میں ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر کیا، میرزا عیسیٰ اس وقت احمد آباد میں تھا اور حکم دیا کہ وہ ٹھٹھہ پہنچ کر شریر الملک (شریف الملک) کو قید کر کے ہمارے دربار میں بھیجے تاکہ وہ اپنے افعال شنیعہ کی سزا پا سکے۔ اگر وہ جنگ کرے تو اس کو قتل کر دے۔ میرزا عیسیٰ اپنے بڑے بیٹے میرزا عنایت اللہ[6] کو ساتھ لے کر دو سو سواروں کے ہمراہ ٹھٹھہ روانہ ہو گیا۔

شریف الملک اول درجے کا سپاہی اور اپنے زمانے کے بہترین بہادروں اور جواں مردوں میں تھا اور ایک بڑا لشکر اس کے پاس تھا، لیکن شاہی اقبال کی بدولت میرزا عیسیٰ نے اطراف و جوانب سے لشکر جمع کر کے نہ صرف اس کا مقابلہ کیا، بلکہ اس کو قید کر کے بادشاہ کے پاس بھجوا دیا۔ شاہجہاں نے اس کے اس کارنامے پر اُسے نوبت سے نوازا اور ایک لاکھ روپے نقد انعام دیا اور ہزار کے اضافۂ منصب سے سرفراز کیا۔[7]

لیکن بقول مآثر الامرا کچھ ہی مہینوں کے بعد وقت کے تقاضوں کے مطابق شاہجہان نے یکم رجب ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۸ء) میرزا عیسیٰ کو ٹھٹھہ سے بدل کر خواجہ باقی خان مخاطب بہ شیر خواجہ کو ٹھٹھہ کا صوبیدار

---

(1) حواشی مکلی نامہ- سندھی، ص ۶۴۔

(2) ذخیرۃ الخوانین قلمی، ص ۲۸۶

(3) مآثر الامرا، ج ۳، ص ۴۸۰۔

(4) ذخیرۃ الخوانین قلمی و مآثر الامرا، ج ۳، ص ۴۸۰۔

(5) حواشی مکلی نامہ- سندھی، ص ۸۔

(6) میرزا عنایت: متوفی ۱۰۵۸ھ، مدفن: مقبرہ عیسیٰ ثانی (شجرہ H مشمولہ ترخان نامہ)۔

(7) ترخان نامہ، ص ۹۷-۹۸۔

مقرر کیا۔[1]

راشدی صاحب نے حواشی مکلی نامے میں لکھا ہے کہ اگرچہ میرزا عیسیٰ کے تبادلے کا فرمان یکم رجب ۱۰۳۷ھ کو جاری ہوا، لیکن شیر خواجہ کے ٹھٹھہ پہنچنے میں غالباً کچھ عرصہ لگا اور میرزا عیسیٰ نے اپنے تقرر سے نو ماہ بعد ربیع الاول ۱۰۳۸ھ (۱۶۲۸ء) کو چارج دیا اور ۱۰۳۸ھ ہی میں وہ متھرا کا گورنر مقرر ہوا اور یہ علاقہ اس کی جاگیر میں دیا گیا۔

۱۰ جمادی الاول ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۰ء) میں وہ عبداللہ خان کے کمیکوں میں دریا خان کی بغاوت دور کرنے کے لیے دکن روانہ کیا گیا۔

شعبان ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء) کو وہ ایلچ پور کی صوبیداری پر روانہ کیا گیا۔ ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء) سے صفر ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) تک وہ ایلچ پور میں رہا۔ اس کے بعد محمد طاہر آشنا کا بیان ہے کہ ۲۷ صفر ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) کو سرکار سورتھ میرزا عیسیٰ کو جاگیر میں دی گئی اور وہ سورتھ کا فوجدار مقرر ہوا۔[2]

۱۵ جلوس شاہجہانی ۱۲ محرم ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) کو اعظم خان[3] کی معزولی کی وجہ سے یہ گجرات کا صوبیدار مقرر ہوا اور سورتھ کا انتظام اس کے بڑے بیٹے عنایت اللہ کے سپرد ہوا۔

(1) مآثر الامرا، ج ۳، ص ۴۸۸۔

(2) حواشی مکلی نامہ، ص ۳۰۴ بحوالہ محمد طاہر آشنا و مآثر الامرا، ج ۳، ص ۴۸۸۔

(3) اعظم خان: میر محمد باقر عرف ارادت خان ملقب بہ اعظم خان، ساوہ شہر کے سادات میں تھا، اور میرزا جعفر آصف خان کا رشتے دار تھا، اسی سبب سے اس نے شاہجہاں کے عہد میں یمین الدولہ آصف خان کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں بڑی ترقی کی۔ شاہزادہ محمد شجاع کی پہلی بیوی جو میرزا رستم صفوی کی بیٹی تھی، اس کے وفات پا جانے کے بعد شجاع نے ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) میں اعظم خان کی بیٹی سے شادی کی، جب اعظم خان کو غیر معمولی اقتدار اور شکوہ حاصل ہوا تو اس نے رعایا پر غیر معمولی مظالم شروع کر دیے۔ رعایا میں کسی کی جرأت نہ تھی کہ بادشاہ کے سامنے صحیح صورت حال پیش کرے۔ آخر رعایا نے سید جلال بخاری کے ذریعہ اپنی زبوں حالی کی داستان بادشاہ کے سامنے پیش کی۔ صاحب مراۃ احمدی کا بیان ہے کہ اس بنا پر ۱۴ محرم ۱۰۵۲ھ (۱۷۴۲ء) میں اعظم خان کا تبادلہ صوبہ گجرات سے کیا گیا اور اس کی جگہ میرزا عیسیٰ ترخان کو صوبہ گجرات مرحمت ہوا۔
اعظم خان آخری زمانے میں جون پور میں تھا، اس نے چھہتر سال کی عمر میں ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۹ء) کو وہیں وفات پائی، "اعظم اولیا" سے اس کی تاریخ وفات نکلتی ہے اور دریائے جون پور کے کنارے مدفون ہوا۔ (حواشی مکلی نامہ، ص ۳۱۰-۳۱۱ و حاشیہ ص ۳۱۱ بحوالہ مراۃ احمدی، ج ۱، ص ۲۱۶ و مآثر الامرا، ج ۱، ص ۱۸۰)۔

وفات:

۱۰۶۰-۱۰۶۱ھ میں میرزا اپنا تمام کاروبار اپنے بیٹے محمد صالح[4] کے حوالے کر کے عملاً ریٹائر زندگی بسر کرنے لگا۔ شیخ فرید بکھری نے ۱۰۶۰ھ میں لکھا کہ: باوجود اس کے کہ میرزا کی عمر، عمر طبعی سے زیادہ ہے لیکن اس کے سننے، دیکھنے، رجولیت اور قوت اشتہا میں کوئی کمی نہیں۔ یہ تمام قوتیں اس میں بیس سالہ نوجوان کی طرح ہیں۔

۲۵ جلوس شاہجہانی میں شاہجہان نے اُسے اپنے حضور میں طلب کیا۔ وہ روانہ ہو گیا۔ ابھی راستے میں تھا کہ ۱۲ محرم ۱۰۶۲ھ (۱۶۵۱ء) کو وہ قصبہ سانبھر میں رحمت حق سے جا ملا۔

میرزا عیسیٰ کی قبر پر حسب ذیل کتبہ نصب ہے، جس سے اس کی تاریخ وفات ۱۰۶۲ھ نکلتی ہے:

چو رلت کرد از دار فنا آں سرور ترخاں
بہ بستان جناں آسودہ شد در منزلِ اعلیٰ
بپرسیدم چو سال رحلت او از خرد گفتہ
نمودہ میرزا عیسیٰ بگلزار ارم ماوا
۱۰۶۲ھ

اس کی لاش سندھ لائی گئی اور ٹھٹھہ کے مشہور قبرستان مکلی میں مدفون ہوا۔

میرزا عیسیٰ ثانی کے حالات کے متعلق ہمیں یہ تمام تفصیلات اور معلومات جناب سید حسام الدین راشدی کی کتاب حواشی مکلی نامہ سے از صفحہ ۲۳۷ تا ۳۲۴ سے حاصل ہوئیں جن کے لیے ہم اُن کے شکر گزار ہیں۔ ہم نے ان حالات کو حسب ضرورت تلخیص کے طور پر یہاں نقل کر دیا ہے، ورنہ میرزا عیسیٰ ترخان کی زندگی پر جس تفصیل اور جامعیت کے ساتھ راشدی صاحب نے لکھا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ اُن کا حصہ ہے، انہوں نے اس کی زندگی کے ہر گوشے کو آئینے کی طرح سامنے لا کر رکھ دیا ہے اور یہ مواد یک جا طور پر سندھ کی تاریخ میں بیش بہا اضافہ ہے۔

(4) محمد صالح: حواشی مکلی نامہ میں ہے کہ اس کے متعلق ہمیں تاریخ کی کتابوں میں جو اطلاع ملتی ہے، وہ عالمگیر نامہ ہے۔ عالمگیر نامے میں ہے کہ وہ ۱۰۷۶ھ میں راجا جے سنگھ کے ساتھ اورنگ آباد میں رہا لیکن یہ کسی تاریخ سے نہیں معلوم ہوتا کہ اس نے کس تاریخ میں وفات پائی اور وہ کہاں مدفون ہے۔ محمد صالح کے حالات زندگی کے لیے دیکھیے حواشی مکلی نامہ سندھی مؤلف سید حسام الدین راشدی، ص ۴۶۳-۴۵۱)۔

میرزا عیسیٰ کے عہدِ حکومت پر تبصرہ:

میرزا عیسیٰ صرف نو ماہ ٹھٹھہ کا صوبیدار رہا، اس کے اس مختصر سے عہد حکومت کے متعلق جب کہ اُسے اپنے ملک میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا کوئی موقع ہی نہ مل سکا۔ کیا لکھا جاسکتا ہے، لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ ایک بہادر، خود دار، مدبر، فریس اور دانشمند انسان تھا۔ اُس نے اپنی طویل زندگی میں جہاں بھی وہ رہا اپنی خداداد قابلیت اور حسن انتظام اور کارکردگی کے بہترین نقوش چھوڑے۔ جس کے تقریباً تمام مورخین متعرف نظر آتے ہیں۔

صاحب ترخان نامہ نے اُس کے محاسن و اوصاف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

> مردی خلیق و ادیب و حلیم و بردبار، صاحب ہمت و غیرت، قبیلہ پرور، سپاہ دوست، آبادان کار، در جوانی کسب کمالات نمودہ، در علوم دستگاہی بہم رسانیدہ بجمیع مکارم اخلاق آراستہ و پیراستہ، شیوۂ عدالت و سخاوت شعار خود داشتہ، در شجاعت و دلاوری نظیر نداشت۔[1]

صاحب ذخیرۃ الخوانین شیخ فرید بکھری نے اُس کی سیرت و اخلاق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

> مردی است حریص، جملہ کیفیا و در سرود و نغمۂ سندھی و ہندی قابل است، خود ہم در علم نظم و نثر و موسیقی و نواختن سازھا دستگاہی دارد، و اوقات بہ عیاشی و بی غمی می گزارد۔[2]

صاحب مآثر الامرا نے اُس کی شخصیت و کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

> با آنکہ عمر میرزا از صد متجاوز بود اما قویٰ از درجۂ طبیعی سقوط نیافتہ، باہ ہم جواناں داشت، و بسیار عیش دوست و شیفتۂ مسکرات و دل دادۂ راگ و رنگ بود در نغمہ خوانی و ساز نوازی خالی از کمال نبودی۔[3]

راشدی صاحب نے حواشی مکلی نامہ میں ذخیرۃ الخوانین اور مآثر الامرا کی رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ: ترخان گھرانے میں سب ہی فرمانروا علم دوست شاعر تھے اور راگ و رنگ کے دلدادہ تھے۔ میرزا عیسیٰ اول بہت بڑا علم دوست اور اہل کمال کا قدردان تھا۔ میرزا باقی باوجود شقی القلب اور ظالم ہونے کے معارف نواز اور علم کا سرپرست تھا۔ میرزا پائندہ بھی ان ہی خصوصیتوں کا حامل تھا۔ میرزا جانی بیگ بھی شاعر اور موسیقی سے واقف اور خوش ذوق امیر تھا۔ میرزا غازی کو شاعری، نغمہ نوازی اور اہل علم کی سرپرستی میں خاص مقام حاصل تھا۔ میرزا عیسیٰ ثانی بھی ان ہی خصوصیات کا حامل تھا اور یہ خصوصیات اس کو وراثت کے طور پر ملی تھیں۔

اس کی چھیاسی سالہ زندگی کے مختلف پہلو دیکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ اگر وہ سندھ میں کچھ زیادہ دن گورنر رہتا تو شاید ملک کی خدمت بہتر طریقے پر کر سکتا، مگر افسوس ہے کہ اُسے اپنے وطن کی خدمت کا موقع نہ مل سکا۔

میر علی شیر قانع نے تحفۃ الکرام میں اس کے بعد کے صوبیدار شیر خواجہ، مرتضیٰ خاں میر حسام الدین انجو کو چھوڑ کر نواب امیر خاں کے حالات لکھے ہیں۔ ہم ان دونوں کا تذکرہ ترتیب قائم رکھنے کے لیے ذیل میں تحریر کر رہے ہیں۔

۶۔ شیر خواجہ (۱۰۳۷ھ):

گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے کہ شاہجہاں نے میرزا عیسیٰ ثانی کی جگہ شیر خواجہ کا تقرر صوبیداری ٹھٹھہ پر کیا تھا۔ اس کا اصل نام سید بادشاہ خواجہ اور شیر خواجہ اور باقی خاں خطاب تھا۔ سادات اتائی میں سے تھا۔ اُس کے غیر معمولی کارناموں پر اکبر نے اُسے شیر خواجہ کے نام سے موسوم کیا تھا۔ اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر نے اُس کے لیے خلعت بھجوایا۔ مہابت خاں نے جب بغاوت کی تو یہ جہانگیر کے ہمرکاب تھا، جہانگیر کی وفات کے بعد یہ آصف جاہی سے متفق ہو کر اُس جنگ میں شریک تھا جو شہریار کے ساتھ ہوئی۔ شاہجہاں کے جلوس کے پہلے سال یہ حاضر دربار ہوا اور چہار ہزاری ہزار سوار کے منصب اور خواجہ باقی خان کے خطاب سے سرفراز ہو کر ٹھٹھہ کی صوبیداری سے سربلند کیا گیا۔ ۱۰۳۷ھ میں یہ ٹھٹھہ کے لیے روانہ ہوا، لیکن ابھی راستے ہی میں تھا کہ اس کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا اور اس نے وفات پائی۔[4]

بادشاہ نامے میں ہے کہ شاہجہان نے یکم رجب ۱۰۳۷ھ کو خواجہ باقی کے نام ٹھٹھہ کی صوبیداری کا فرمان جاری کیا تھا،[5] ٹھٹھہ کی حکومت دو ماہ اکیس دن اس کے نام رہی۔

---

(1) ترخان نامہ۔ ص ۹۶۔

(2) ذخیرۃ الخوانین قلمی، ص ۲۸۷۔

(3) مآثر الامرا، ج ۳، ص ۴۸۸۔

(4) مآثر الامرا، ج ۲، ص ۶۳۸-۶۵۰۔

(5) مظہر شاہجہانی بحوالہ بادشاہ نامہ، ص ۱۸۱۔

۷۔ میرزا حسام الدین مرتضیٰ خان انجو (۱۰۳۷ھ تا ۱۰۳۹ھ):

سید خواجہ کے بعد ۲۲ رمضان ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۹ء) کو میرزا حسام الدین مرتضیٰ خان انجو کے لیے ٹھٹھہ کی گورنری کا فرمان صادر ہوا۔ میرزا حسام الدین نے اواخر ۱۰۳۹ھ میں ٹھٹھہ میں وفات پائی۔[1] مظہر شاہجہانی کے مؤلف یوسف میرک نے اس کی حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ زیادہ تر پرگنہ ٹھٹھہ کی ویرانی مرتضیٰ خاں ثانی میرزا حسام الدین کے زمانے میں ہوئی۔[2]

۸۔ نواب امیر خان ابو البقا (۱۰۳۹ھ تا ۱۰۴۱ھ):

میرزا حسام الدین کے بعد ۱۲ ربیع الاول ۱۰۳۹ھ (۱۶۲۹ء) میر نواب امیر خاں ابو البقا جو اُس وقت ملتان میں یمین الدولہ کا نائب تھا اس کا تبادلہ کرکے اسے ٹھٹھہ کا گورنر مقرر کیا گیا، یہ تیسرا سندھی نژاد گورنر تھا، جو ٹھٹھہ کی حکومت پر فائز ہوا۔

بقول صاحب مآثر الامرا نواب امیر خاں عرف ابو البقا نے نواب ابو القاسم خان نمکین[3] کی وفات کے بعد غیر معمولی ترقی کی۔ جہانگیر کے زمانے میں وہ دو ہزار پانصدی ہزار و پانصد سوار کے منصب سے نوازا گیا اور یمین الدولہ کی نیابت میں صوبہ ملتان کی حکومت پر مقرر ہوا۔

ٹھٹھہ کی صوبیداری پر تقرر:

۱۰ جلوس شاہجہانی ۱۰۳۹ھ (۲۹-۱۶۳۰ء) کو مرتضیٰ خان انجو کی وفات کے بعد اس کے سابقہ منصب میں پانصدی ذات و پانصد سوار کا اضافہ ہو کر ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا۔

بادشاہ نامے کے مصنف نے اس کے منصب میں اضافے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ: جب شاہجہان کو اس کی اطلاع ملی کہ مرتضیٰ خان ولد میر جمال الدین حسین خان انجو کی وفات ہو گئی تو امیر خان ولد ابو القاسم نمکین کو جو اُس وقت یمین الدولہ کی نیابت میں حکومت ملتان پر متعین تھا، اس صوبے کے انتظام کے پیش نظر اس کے منصب سہ ہزاری دو ہزار سوار میں پانصدی ذات و پانصد سوار کا اضافہ کرکے ٹھٹھہ کی صوبیداری سے سرفراز کیا۔[4]

تحفتہ الکرام میں ہے کہ شاہجہان نے امیر خان کو ٹھٹھہ روانہ ہوتے وقت خاص طور پر ہدایت دی تھی کہ وہ ان ملازموں اور منصبداروں کو جو شریف الملک کی گورنری کے زمانے میں اس کے ساتھ کام کر رہے تھے سزائیں دے، چنانچہ اس نے ٹھٹھہ پہنچتے ہی ان میں سے اکثر عہدہ داروں کو موقوف کر دیا، جو شریف الملک کے زمانے میں کارگزار تھے اور ککرالہ کے جام کو بھی سزا دی کہ اس نے اُس زمانے میں جب کہ شاہجہان اپنی شاہزادگی کے زمانے میں ٹھٹھہ میں ٹھہرا ہوا تھا، اس کے لشکر کے بازار کو لوٹ لیا تھا، حمل جت اور رانا دھاراجہ جنہوں نے شاہجہان کے ٹھٹھہ کے قیام کے زمانے میں بہترین خدمات انجام دی تھیں، ان دونوں کو دربار شاہی میں بھجوایا۔

ابو البقا کے بھائی میرک یوسف نے اپنی مرتب کردہ تاریخ مظہر شاہجہانی میں ٹھٹھہ کی رعیت کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ اس شہر میں علما، فضلا، شعرا، کاتب، خوش نویس اور خدا پرست لوگ بکثرت ہیں۔ اس شہر کے اکثر لوگ پیشہ ور اور متبع شریعت ہیں، چنانچہ

---

(1) مظہر شاہجہانی، گوشوارہ واقعات مہم تاریخی ص ۹۲ و مآثر الامرا، ج ۳، ص ۳۸۳-۳۸۴۔

(2) مظہر شاہجہانی، ص ۳۷۔

(3) نواب ابو القاسم نمکین: بن ملا میر سبزواری کا آبائی وطن بجنت نامی ایک قصبہ تھا، جو سبزوار (اسفزار) کے مضافات میں تھا۔ ملا میر کے متعلق صرف اس قدر پتا چلتا ہے کہ کسی زمانے میں مشہد مقدس کی تولیت اُن کے سپرد تھی۔ اُوزبکوں کے فتنے کے زمانے میں وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر قندھار آ گئے تھے۔ ان کا بیٹا میر ابو القاسم ابتدا میں کابل کے والی میرزا محمد حکیم کے پاس ملازم تھا، بعد میں وہ ہندوستان آیا، اور لاہور میں اکبر کے دربار میں پیش ہوا اور اُمرائے اکبری کے زمرے میں شامل ہو گیا۔ میر ابو القاسم اپنے سرکاری عہدوں کی وجہ سے زیادہ تر سندھ میں رہا اور بکھر کو اپنا وطن بنا کر وہیں مکانات وغیرہ بنوائے۔ اس کی زندگی تک بکھر ہی اس کا وطن رہا، لیکن جب اُس کا بیٹا میر ابو البقا امیر خاں ٹھٹھہ کا گورنر بن کر آیا تو اس کے خاندان کا حصہ ٹھٹھہ میں منتقل ہو گیا، جن کی رہائش کے لیے ابو البقا امیر خاں نے قلعۂ حاکم نشین کے سامنے اور جامع مسجد ٹھٹھہ کی مشرقی دیوار کے متصل ایک محلہ آباد کیا، جو اُس کے نام پر محلۂ امیر خانی سے مشہور ہو گیا۔ اس خاندان کے افراد جو ٹھٹھہ میں رہ بس گئے وہ اور ان کی نسل سادات امیر خانی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس خاندان کے بعض مشاہیر نے سیوہن میں بھی توطن اختیار کیا۔

میر ابو القاسم نمکین جب اکبر کے ملازموں میں منسلک ہوا تو اکبر نے بھیرہ و خوشاب میں جاگیر دی، جہاں نمک کی کانیں تھیں۔ ان کانوں سے میر صاحب کو بہت آمدنی ہوئی۔ میر صاحب نے نمک کا ایک پیالہ اور ایک رکابی بنوا کر اکبر کی خدمت میں پیش کی جس سے اپنی نمک حلالی کی طرف اشارہ مقصود تھا۔ بادشاہ کو اس کی یہ ادا پسند آئی اور اسے نمکین کا لقب عنایت کیا، یہاں تک کہ یہ لقب اس کے نام کا جزو ہو گیا۔

(4) تذکرۂ امیر خانی سندھی، مؤلف سید حسام الدین راشدی، بحوالہ بادشاہ نامہ، ج ۱، ص ۲۷۶۔

جامع مسجد میں (علاوہ اور مسجدوں کے جو شہر میں واقع ہیں) نمازوں کے وقت بیس ہزار آدمی جمع ہوتے ہیں،۔۔۔ سرکار ٹھٹھہ کے لوگ غریب ہیں، بالکل سرکش نہیں، کہر اور ٹکامرہ قوم کے لوگوں سے یہاں کے لوگ ڈرتے ہیں۔ ترخانیوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں ان کے سرداروں سے صلح کر کے ان کو اپنی مٹھی میں لے لیا تھا۔ جب یہ علاقہ مغلوں کے قبضے میں آیا تو اُن کے وکیلوں نے بھی جام ہالہ، رعنا اور عمر کو جزوی منصب دے کر راضی کر لیا تھا کہ وہ اپنے اپنے علاقے میں رہیں اور ہمیشہ ٹھٹھہ کے صوبیدار کی خدمت میں موجود رہیں۔

میر ابو البقا جب اس صوبے کا گورنر ہو کر آیا، تو اس نے سب سے پہلے کہر اور اُن کے سردار جام ہالہ کی طرف توجہ دی اور ان کا استیصال کر دیا، چونکہ ٹکامرہ قوم کے استیصال کا حکم اسے نہ ملا تھا، اس لیے وہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔[1]

سرکار چاچکاں جو صوبہ ٹھٹھہ[2] کا ایک جزو ہے، یہ سرکار[3] عبدالرزق معموری[4] کے زمانے میں اس کو جاگیر میں ملی تھی۔ یہاں کی بسنے والی ایک قوم مندرہ سرکش تھی، جسے اُس نے اسی وقت ایسا سیدھا کر دیا تھا کہ پھر وہ کبھی سر نہ اٹھا سکے۔

اسی طرح سرکار نصرپور میں جو قبیلے سرکش و متمرد تھے، مثلاً سوڈہ، سمیجہ کہر، سمیجہ ساند، سمیجہ جونیجا، سمیجہ کیریا اور سمیجہ دل وغیرہ جن کی وجہ سے اس علاقے کی حالت انتہائی ابتر ہو چکی تھی، ان سب پر قابو پا کر اس علاقے کو اُس نے از سر نو آباد کر دیا۔

اس کے علاوہ اس نے سرکار چاکر ہالہ کا نظم و نسق درست کرنے کی طرف بھی خاص توجہ دی۔[5] یہ شوال ۱۰۴۱ھ (۳۲-۱۶۳۱ء) تک ٹھٹھہ کا صوبیدار رہا۔

جوناگڑھ تبادلہ:

امیر ابو البقا ٹھٹھہ کی صوبیداری پر ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء) تک رہا۔ مظہر شاہجہانی سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹھٹھہ سے اُس کا تبادلہ جوناگڑھ کی صوبیداری پر ہوا، جوناگڑھ میں میر ابو البقا کتنے دن رہا، اس کا پتا مظہر شاہجہانی سے نہیں چلتا، البتہ مآثر الامرا میں ہے کہ ۹ جلوس شاہجہانی ۴۶-۱۰۴۵ھ (۳۶-۱۰۳۵ء) میں جب کہ شاہزادہ دولت آباد سے دارالخلافہ لوٹا ہے، میر ابو البقا کے سپرد دولت آباد صوبۂ دکن کے مضافات میں سرکار بیڑا اس کی جاگیر میں دے کر اُسے وہاں متعین کیا گیا۔[6]

سیوہن کی صوبیداری پر تقرر:

۱۴ جلوس شاہجہانی ۱۰۵۱ھ (۴۲-۱۶۴۱ء) میں وہ سیوہن کا صوبیدار مقرر ہوا۔ بادشاہ نامہ میں ہے کہ:

امیر خاں ولد قاسم خاں تمکین بخلعت و اسپ و خدمت ضبط سیوستان از تغیر قزاق خاں سربرافراخت۔[7]

ٹھٹھہ کی دوبارہ حکومت:

میر ابو البقا ایک سال تک سیوہن میں رہا۔ ۱۵ جلوس شاہجہانی ۱۰۵۲ھ میں شاد خاں کے سیوہن تبادلے کے بعد پھر وہ دوبارہ ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا۔ شاہجہاں نامہ میں اس کے تبادلے کی تاریخ ۴ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ (۴۳-۱۶۴۲ء) مندرج ہے۔

ٹھٹھہ کی جامع مسجد کی تعمیر:

ٹھٹھہ کی مشہور جامع مسجد مسجد شاہجہانی جسے آج بھی سیاح دور دور سے دیکھنے آتے ہیں۔ اسی امیر نے شاہجہاں کے حکم سے اُس زمانے میں بنوائی جب کہ وہ دوسری مرتبہ ٹھٹھہ کا گورنر ہو کر آیا تھا۔ اُس نے اس مسجد کی تعمیر ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) میں شروع کرائی اور ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) میں اس کی تعمیر ختم ہوئی۔ میر ابو البقا کے زمانے کا کتبہ آج بھی اس مسجد میں موجود ہے:

ندیدہ چشم فلک مسجدی بدیں خوبی
کہ آمدند ملایک برای دیدن فیض
بجستم از خرد و عقل سال تعمیرش
بدیدہ کرد اشارت کہ "ہست معدن فیض"

۱۰۵۴ھ

اس مسجد کی تعمیر پر نو لاکھ صرف ہوئے۔

---

(1) یہ تمام تفصیل مظہر شاہجہانی، باب سوم، ص ۳۳-۳۵ سے ماخوذ ہے۔

(2) اس زمانے میں ملک ٹھٹھہ چار سرکاروں پر مشتمل تھا (۱) سرکار ٹھٹھہ (۲) سرکار چاچکان (۳) سرکار نصرپور (۴) سرکار چاکر ہالہ (مظہر شاہجہانی، ص ۳۳-۳۴)۔

(3) ۱۰۲۴ھ میں سرکار چاچکان میر ابو البقا کو ملی تھی۔

(4) میر عبدالرزاق معموری: ۹ جلوس جہانگیری ۱۰۲۴ھ میں ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا۔

(5) یہ تمام تفصیل مظہر شاہجہانی سے ماخوذ ہے۔

(6) تذکرۂ امیر خانی سندھی، مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۱۰۴۔

(7) تذکرۂ امیر خانی (سندھی) ص ۱۰۴-۱۰۵ بحوالہ بادشاہ نامہ، ص ۱۰۵۔

مختصر یہ کہ ٹھٹھہ میں کئی مسجدیں اس امیر کی یادگار ہیں۔[1]

امیر آباد:

اس کے علاوہ میر ابو البقا نے اپنے ٹھٹھہ کی پہلی صوبیداری کے زمانے میں ایک گاؤں امیر آباد کے نام سے بھی آباد کیا تھا۔[2] جامع مسجد کی دیوار کے متصل آج بھی ایک محلہ امیر خانی کے نام سے موسوم چلا آتا ہے۔ اس وقت یہ محلّہ بھی ٹھٹھہ کے دوسرے محلوں کی طرح نہایت زبوں حالت میں ہے۔[3]

وفات:

میر ابو البقا نے سو سال کی عمر سے متجاوز ہو کر ۲۰ جلوس شاہجہانی ۱۰۵۲ھ (۴۳-۱۶۴۲ء) کو ٹھٹھہ میں وفات پائی۔[4]

مآثر الامرا کے بیان کے مطابق میر ابو البقا اپنے خاندانی قبرستان صفہ صفار وہڑی میں جو قلعہ بکھر سے جنوب رویہ واقع ہے اپنے والد کے پہلو میں مدفون ہوا، لیکن تحفتہ الکرام میں ہے کہ اس کا مزار مکلی پہاڑی پر ٹھٹھہ میں ہے،[5] تحفتہ الکرام کی بنا پر مسٹر ہنری کزنس نے بھی اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ: نواب خلیل خان کے مقبرے سے تھوڑے فاصلے پر ایک شکستہ مقبرہ ہے، جس کی محراب کا ایک حصہ گر چکا ہے، لیکن جو حصہ باقی ہے، اس پر قدرے کاشی کے نقش و نگار موجود ہیں۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ امیر خان کا مقبرہ ہے۔ مقبرے کی تعمیر ۱۰۳۸-۳۷ھ (۱۶۲۱ء) میں ہوئی تھی۔[6]

تحفتہ الکرام میں نواب امیر خان کے بعد نواب مظفر خان جہانگیری عرف میر عبدالرزاق معموری کی صوبیداری ٹھٹھہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، لیکن عہد حاضر کے سندھ کے تاریخ کی محقق سید حسام الدین راشدی نے تحفتہ الکرام (طبع راشدی) کے حواشی میں اس سلسلے میں جدید معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے نواب امیر خان کے بعد ٹھٹھہ کے حسب ذیل صوبیداروں کا تذکرہ کیا ہے۔ یوسف محمد خان تاشقندی: نواب امیر خان کے بعد ۱۰۴۱ھ (۳۲-۱۶۳۱ء) جلوس شاہجہانی کے پانچویں سال ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہو کر آیا اور ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) تک وہ ٹھٹھہ کا صوبیدار رہا، پھر ٹھٹھہ سے تبادلہ ہو کر فوجداری بکھر پر مامور ہوا۔

یوسف محمد خان تاشقندی کے بعد دولت خان، خواص خان مئی ۱۰۴۵ھ (۳۶-۱۶۳۵ء) میں ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہو کر آیا، اور ۱۰۵۰ھ (۴۰-۱۶۴۱ء) تک ٹھٹھہ کا صوبیدار رہا۔ خواص خاں مئی کے بعد ربیع الاول ۱۰۵۰ھ (۴۱-۱۶۴۰ء) میں غیرت خان خواجہ کامگار ٹھٹھہ کا صوبیدار ہو کر آیا اور اسی سال ۷ ذی الحجہ ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۱ء) میں اس نے ٹھٹھہ ہی میں وفات پائی۔ خواجہ کامگار کے بعد مغل خاں المخاطب بہ شاد خاں بن جانش بہادر ۷ ذی الحجہ ۱۰۵۰ھ (۴۱-۱۶۴۰ء) کو ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا اور ۱۰۵۲ھ (۴۳-۱۶۴۲ء) تک ٹھٹھہ کا صوبیدار رہا۔

شاد خان کے بعد دوبارہ ۱۰۵۲ھ (۴۳-۱۶۴۲ء) میں نواب امیر خان کو ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر کیا گیا اور ۱۰۵۷ھ (۴۸-۱۶۴۷ء) میں نواب امیر خان نے وفات پائی۔ نواب امیر خان کی وفات کے بعد مغل بن زین خان کوکہ ۱۰۵۷ھ (۴۸-۱۶۴۷ء) میں ٹھٹھہ کا صوبیدار ہو کر ایا اور ۱۰۶۰ھ (۵۰-۱۶۴۹ء) میں معزول ہوا۔ مغل خان بن زین خاں کوکہ کے بعد یکم ذی الحجہ ۱۰۵۹ھ (۵۰-۱۶۴۹ء) کو شاہجہان نے جب کہ وہ لاہور میں تھا عالمگیر کو ملتان اور ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر کیا اور ۱۲ رمضان ۱۰۶۲ھ (۵۲-۱۶۵۱ء) تک وہ ٹھٹھہ کا صوبیدار رہا، لیکن وہ ٹھٹھہ نہیں آیا اور مغل خان اس کی نیابت میں کام کرتا تھا۔

عالمگیر کے بعد سعید خان بہادر ظفر جنگ (۱۰۶۱ھ) میں اس کے بعد جعفر خان عمدۃ الملک (۱۰۶۱ھ) اس کے بعد مغل خان بن اعظم خان (۱۰۶۱ھ) پھر سردار خان شاہجہانی (۶۲-۱۰۶۳ھ) یکے بعد دیگرے ٹھٹھہ کے صوبیدار ہوئے۔ صاحب تحفتہ الکرام نے ان میں سے کسی کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس نے نواب امیر خان کے بعد نواب مظفر خان جہانگیری (میر عبدالرزاق معموری) کی صوبیداری کا تذکرہ کیا ہے، اس کے بعد سید ابراہیم بن میر بایزید بخاری کا تذکرہ کیا ہے، پھر نواب ظفر خان احسن کی صوبیداری ٹھٹھہ کے حالات درج کیے ہیں۔

۹۔ میر عبدالرزاق معموری[1] مخاطب بہ مظفر خان:

صاحب تحفتہ الکرام نے امیر خان کے بعد میر عبدالرزاق معموری کی صوبیداری کا تذکرہ کیا ہے، لہٰذا ہم اس کے حالات مختلف

---

(1) تذکرہ امیر خانی، ص ۱۰۶-۱۰۸۔
(2) تحفتہ الکرام، اردو-ترجمہ، ص ۲۹۹۔
(3) تذکرہ امیر خانی، ص ۱۰۹۔
(4) مآثر الامرا، ج ۱، ص ۱۷۳۔
(5) تحفتہ الکرام اردو ترجمہ، ص ۲۹۷۔
(6) تذکرہ امیر خانی، ص ۱۱۱ بحوالہ کزنس، ص ۱۱۷۔

(1) مآثر الامرا، ج ۳، ص ۳۷۶-۳۷۹۔

کتابوں سے یہاں لکھتے ہیں۔ میر ابو البقا کے بعد ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا۔ مآثر الامرا میں ہے کہ یہ صحیح النسب معمور آباد کے سادات میں سے تھا، اس کے بزرگ ہندوستان آئے، یہ دانش و قابلیت میں یکتائے روزگار تھا۔ اکبر کے عہد میں بنگال کے لشکر کا بخشی متعین ہوا۔ جہانگیر نے اسے تخت نشین ہونے کے بعد مظفر خان کے خطاب سے سرفراز کیا، آخر عہد جہانگیری میں مالوے کا صوبیدار مقرر کیا گیا، شاہجہان نے اپنے عہد حکومت میں اس کی جگہ مالوے کا صوبیدار خان زماں ولد مہابت خان کو مقرر کیا اور اس کی طرف مطلقاً توجہ نہ دی، یہ دارالخلافہ میں گوشہ نشین ہو گیا، اور کچھ مدت کے بعد اس نے اجل طبعی سے وفات پائی۔

تحفتہ الکرام میں ہے کہ نواب امیر خان کے بعد نواب مظفر خان جہانگیری عرف میر عبدالرزاق معموری جو لودھی خان کے بعد ترخان خاندان کے حاصل کردہ پرگنوں کا امین تھا اور خسرو خان کے بعد ان امانتوں کے علاوہ ٹھٹھہ کا ضابطہ جس کے ذمے تھا، وہ بالاستقلال ٹھٹھہ کا ناظم مقرر ہوا۔ ٹھٹھہ کی گودری بازار کی جامع مسجد اس کی یادگار ہے، جسے اس نے اپنے امین ہونے کے زمانے میں تعمیر کرایا تھا اور جو خضری مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسجد اس نے ۱۰۱۷ھ (۹-۱۶۰۸ء) میں تعمیر کرائی تھی۔[1]

لب تاریخ سندھ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ٹھٹھہ کا گورنر ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) سے ۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) تک رہا۔[2]

۱۰۔ سید ابراہیم بن بایزید بخاری:

تحفتہ الکرام اور لب تاریخ سندھ میں ہے کہ میر عبدالرزاق معموری کے بعد ۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) میں سید ابراہیم بن بایزید بخاری ٹھٹھہ کا گورنر مقرر ہوا۔

لب تاریخ سندھ میں سید ابراہیم کے بعد لعل خان کا تذکرہ ہے کہ وہ ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) میں ٹھٹھہ کا گورنر ہو کر آیا، لیکن تحفتہ الکرام میں اس کا تذکرہ نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ سہو کتابت ہے یہ دراصل مغل خان ہے، جو کتابت کی غلطی سے لعل خان لکھا گیا ہے۔

۱۱۔ نواب مغل خان:

تحفتہ الکرام میں ہے کہ ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) ۲۱ جلوس شاہجہانی میں نواب مغل خان بن زین خان کو کہ ٹھٹھہ کا گورنر ہو کر آیا اور چھ سال تک ٹھٹھہ کا گورنر رہا۔ مآثر الامرا میں ہے کہ یہ جہانگیر کے عہد میں ہزاری پانصد سوار کے منصب تک پہنچا تھا۔ شاہجہاں کے تخت نشین ہونے کے پہلے سال کابل کا قلم دار بنا کر بھیجا گیا تھا۔

تحفتہ الکرام میں ہے کہ ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۹ء) ۲۳ جلوس شاہجہانی میں ملک ٹھٹھہ شاہزادہ اورنگ زیب کے حوالے ہوا۔ بکھر اور سیوستان کا علاقہ اسے شرطی زمینداری کے طور پر عنایت ہوا۔ اس سے پیشتر صوبۂ ملتان بھی اورنگ زیب کو تنخواہ میں بطور جاگیر مل چکا تھا، چنانچہ ضابطے کے مطابق صوبوں کے گورنر اس کے تحت تھے۔ ہم اس کی صوبیداری ٹھٹھہ کے حالات تذکرہ امیر خانی سے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۱۲۔ عالمگیر کی سندھ میں صوبیداری:

تذکرۂ امیر خانی میں سید حسام الدین راشدی نے بحوالۂ مقدمات رقعات عالمگیری لکھا کہ: جب اورنگ زیب عالمگیر بلخ اور بدخشاں کی مہم سے واپسی میں اٹک میں ٹھہرا ہوا تھا، اُس وقت اُسے شاہجہان کی طرف سے ۲۹ صفر ۱۰۵۸ھ (۱۵ مارچ ۱۶۴۸ء) کو ملتان کی گورنری کا فرمان ملا۔ اسی سال یکم ذوالحجہ ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۹ء) میں جب کہ وہ لاہور میں تھا سندھ کا صوبہ اُس کے اقتدار میں دے کر بکھر اور سیوہن کا علاقہ بھی اس کی جاگیر میں عنایت ہوا اور ۱۲ رمضان ۱۰۶۶ھ (۷ اگست ۱۶۵۲ء) تک یعنی ۶ سال آٹھ مہینے بارہ دن عالمگیر ٹھٹھہ کا صوبیدار اور بکھر و سیوہن کا جاگیردار رہا۔[3]

عالمگیر کی صوبیداری کے زمانے میں اس کے نائب:

تذکرۂ امیر خانی میں ہے کہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ عالمگیر کی صوبیداری کے زمانے میں سیوہن میں اس کا نائب کون تھا، لیکن ٹھٹھہ میں اس تمام عرصے میں جب کہ وہ سندھ کا صوبیدار تھا، مغل خان کو کہ بن زین خان کو کہ اس کا نائب رہا، جو امیر خان کے انتقال کے بعد ٹھٹھہ کا صوبیدار ہو کر آیا تھا۔ بکھر میں اُس کی طرف سے اس کے نائب خواجہ عبداللطیف فوجدار اور میر باقر دیوان تھے، عالمگیر سندھ کو تین حصوں میں تقسیم کر کے خود ملتان میں رہتا تھا، جب تک وہ سندھ کا صوبیدار رہا، اس عرصے میں وہ صرف کچھ عرصے کے لیے دہلی گیا اور کچھ زمانے قندھار کی مہم پر رہا۔[4]

---

(1) تحفتہ الکرام اردو ترجمہ، ص ۲۹۸۔

(2) لب تاریخ سندھ، ص ۱۰۲۔

(3) ماخوذ از تعلیقات تذکرہ امیر خانی مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۳۴۶۔

(4) ماخوذ از تعلیقات تذکرہ امیر خانی، مولف سید حسام الدین راشدی، ص ۳۴۷۔

سندھ میں انتشار:

شاہجہان کے آخری عہد حکومت میں تخت نشینی کے لیے اس کی اولاد میں جو کشمکش شروع ہوئی، اس نے نہ صرف مرکز کو کمزور کر دیا، بلکہ یہ کشمکش تمام صوبوں پر اثر انداز ہوئی۔ صوبے مرکز کی کمزوری کو دیکھ کر اپنی آزادی کی جدوجہد کرنے لگے۔ خود سندھ میں آزادی کا وہ جذبہ جو ارغونوں کے عہد میں پیدا ہوا تھا اور اکبر و جہانگیر کے عہد میں مرکز کی قوت سے دبا ہوا تھا، اب از سر نو سر اٹھانے لگا۔

چنانچہ شاہجہان نے اس صورت حال کو دیکھ کر عالمگیر کو سندھ کا صوبیدار مقرر کیا تھا۔ عالمگیر نے سندھ کے صوبیدار ہونے کے بعد اس سلسلے میں جو جدوجہد کی اُس کا اندازہ اس کے بعض خطوط سے ہوتا ہے جو اس نے اپنی صوبیداری کے زمانے میں شاہجہاں کو لکھے تھے، ایک خط میں لکھتا ہے کہ:

> قبل ازیں ایں مرید بوسیلۂ عرضداشت بعرض اقدس رسانیدہ بود کہ چوں متمردان نہمردی و جوکیہ کہ در کوہستان ولایت تھتہ می باشند، صوبیدارن سابق را اطاعت واقعی ننمودہ، پیوستہ براہ زنی و فساد روزگار می گزرانند ملک حسین با جمعیتی کہ ہمراہ داشت بہ تنبیہ و تادیب آنہا رفتہ است، دریں ولا از عرضداشت او و واقعہ نویس آنجا ظاہر گشت کہ مومی الیہ باہمراہان از سرحد تتہ بدہ منزل بہ کاہرہ و بیلہ کہ گریز گاہ قبائل نہمردی و جوکیہ است، رفتہ خطبۂ دولت و اقبال بنام نامی و اسم سامیٔ آنحضرت بلند آوازہ ساخت، و در آں مکان ہارون و کھتر تل برادر کانبھودی سرداران نہمردی، و مرید سرگروہ جوکیہ بقدم انقیاد و اطاعت آمدہ پیش کش قبول کردند۔ جعفر نہمردی خویش مان سنگھ زمیندار پنجور کیچ و مکران از قبل، او و پسران علی دکارنی کہ عمدۂ آں مرز بوم است، و حاجی رونجھا و جام جمعہ اعیان آں سرزمین کہ از عہد مکارم ترخانیہ تا حال رجوعی نداشتند، سر انقیاد بخط فرمان نہادہ بدہ نام نہمردی متعلقہ کوہستان ولایت قندھار کہ سر حلقۂ مفسدان آن ضلع است، و از سرحد خود گزشتہ بقصد دست اندازی بجانب کاہرہ و بیلہ آمدہ بود، از وصول لشکر نصرت اثر بکوہ نگار فرار نمود، بنا بر آں ملک حسین و جمعیتی از سپاہ را بر اہیری زمیندار آن حدود بتادیب او فرستادہ آنہا شب در میان ہفتاد کروہ ایلغار کردہ بر سر بنگاہ او رفت، سردار بجنگ پیش آمدہ با توابع خویش طعمۂ تیغ خون آشام گردید، و چہل و چند کس با دختر او اسیر کردند، و سپاہ نصرت قرین اسیران و مواشی را گرفتہ مظفر و منصور بلشکر گاہ مراجعت نمودند، دریں اثنا مان سنگھ مذکور وکلاء فرستادہ نوشت کہ در پنجور کیچ و مکران نیز خطبۂ جہانبانی بنام اعلیٰ حضرت خاقانی سامعہ افروز گشت، و چوں باقبال بی زوال پیر و مرشد جہانیاں چنیں فتحی دست داد، لشکر منصور ازاں نواحی بصوب تتہ مراجعت نمود۔[1]

ایک دوسرے خط میں عالمگیر نے شاہجہاں کو سندھ کے حالات کے متعلق لکھا کہ:

> قبلۂ دین و دنیا سلامت!
>
> ستاحالہ ولد زمیندار ککرالہ کہ برہمنونی توفیق ملک حسین را دید بود، دریں وقت کہ بجہت اصلاح حال خود روانۂ ملتان شد، گاہ مقہور برادر او کہ در سرحد کیچ بسر می برد، از روئی حسد اغوائی زمیندار آنجا جمعیت فراہم کردہ پرگنۂ مذکور در آمد می خواست دست اندازی نماید، بندھای درگاہ والا خصوصاً پسر امیر خان، ضیاء الدین یوسف و ابوالمکارم و جمعی از سپاہ کہ ملک حسین برای احتیاط شہر گزاشتہ بود، باغرابہا و توپ خانہ بقصد دفع آں مخذول شتافتند، و او تاب نیاوردہ راہ ادبار پیش گرفت بمومی الیہ تاکید نمودہ شد کہ در قلع مادہ فساد آں مقہور اہتمام تم بکار برد۔[2]

راشدی صاحب کے خیال کے مطابق عالمگیر کے ان خطوط سے تاریخی حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

۱۔ سندھ میں غیروں کی حکومت سے آزادی کی جدوجہد ارغون کے ابتدائی دور سے شروع ہوئی، اکبر اور جہانگیر کے دور میں جدوجہد قائم رہی اگرچہ دبی رہی، شاہجہان کے آخری دور میں سندھ کے مختلف قبیلے متحد ہو کر برسرپیکار ہوئے۔

۲۔ ان خطوط سے یہ حقیقت بھی واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ نہ فقط مغل دور میں بلکہ اس سے پہلے اہل سندھ بیرونی حکومت سے اپنی آزادی کی جدوجہد کر رہے تھے، جس کے متعلق عالمگیر نے ترخانی عہد کی مثال دی ہے۔

---

(1) ماخوذ از تعلیقات تذکرہ امیر خانی، ص ۲۴۸-۲۴۹ بحوالہ مکاتیب عالمگیر، نجیب اشرف ۲/۳۔

(2) یہ دونوں خط تعلیقات تذکرۂ امیر خانی، ص ۳۳۸-۳۵۰ بحوالہ مکاتیب عالمگیر، نجیب اشرف ص ۲/۳ سے نقل کیے گئے۔

۳۔ اس خط سے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ اس کے دور سے پہلے جو بھی مغل صوبیدار سندھ میں آئے، وہ ناکام رہے۔

۴۔ ان خطوط سے اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ شاہجہاں نے اسی انتشار کے باعث ملتان کے ساتھ سندھ کی حکومت بھی عالمگیر کو سپرد کی تھی، تاکہ وہ سندھ کے صوبے میں مغل تسلط کے خلاف جو شورشیں برپا ہیں، اُن کا قلع قمع کرے، جن کے ختم کرنے میں سابق صوبیدار ناکام ہو چکے تھے۔[1]

عالمگیر کے ایک خط سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک حسین کے متعلق بعض جبر و تشدد کی روایتیں واقعہ نویسوں کے ذریعہ سے شاہجہاں کو ملیں جس پر شاید اُس نے عالمگیر سے باز پرس کی، جس کے جواب میں عالمگیر نے لکھا:

قبلۂ عالمیاں سلامت!

آنچہ از تعدی ملک حسین بعرض اقدس رسیدہ، محض افترا است درین یک سال کہ صوبۂ مسطور تعلق بایں مرید داشت مومی الیہ از متمردان و دزدان معترض حال احدی از رعایا نگشتہ و درین مدت ہرگز چیزی ازیں مقولہ برایں مرید ظاہر نہ شدہ، والا آنچہ از پیر و مرشد حقیقی ارشاد یافتہ او را تادیب نمودہ نمی گزاشت کہ مرتکب جور و تعدی گردد غالباً اہل عرض حقیقت را بتفاوت معروض داشتہ اند۔[2]

سندھ کی سرسبزی و شادابی:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں عالمگیر یہاں کا صوبیدار تھا یہاں بڑی سرسبزی و شادابی تھی، پھل پھولوں کی کثرت تھی، صنعت و حرفت میں یہاں کی چھینٹوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور یہاں سے عالمگیر نے بعض پھل اور دوسری چیزیں تحفتاً شاہجہاں کو بھیجی تھیں۔ پھلوں کی نفاست اور عمدگی کا یہ عالم تھا کہ بکھر اور سیوہن کے خربوزے نہایت شیریں، بلکہ کابل کے خربوزوں کی مثل ہوتے تھے۔ عالمگیر یہ خربوزے اور دوسرے پھل بطور تحفہ بھیجتا رہتا تھا، ایک خط میں وہ شاہجہاں کو لکھتا ہے کہ:

بحکم جہاں مطاع بصد درہ پیوستہ کہ: انار بیدانہ تتہ کہ کمترین مریدان بدرگاہ سلاطین پناہ، ارسال می دارد بہ از انار جلال آباد است، ازیں نوید مسرت افزا خوش وقت و مبتہج گشت۔ خربوزہ بھکر اگرچہ امسال در زبونی بخربوزۂ کابل نزدیک است، اما انچہ بفدوی میرسد از روی عقیدت بحضور سراسر سرور می فرستد۔[3]

چھینٹوں کا تحفہ:

ایک خط میں عالمگیر ٹھٹھہ کی چھینٹ جو شاہجہاں کو اس نے پگڑیوں کے لیے بھیجی تھی، اس کے پسند آنے پر شاہجہاں کو لکھتا ہے کہ:

حکم اقدس پیرایۂ ورود یافتہ کہ چیرہای چھیت تتہ کہ ایں مرید فرستادہ بود مستحسن افتاد، ازہمان جنس دیگر نیز موصول دارد۔۔۔ چند تھان چیرہ دریں ولا از تتہ رسیدہ است، اما چوں کار بستہ ماندہ بود سعادت خود دانستہ متعاقب ارسال خواہد داشت۔[4]

اور نگا بندر کی تعمیر:

تذکرہ امیر خانی میں ہے کہ جس زمانے میں کہ عالمگیر سندھ کا صوبیدار تھا اس نے ۶۱-۱۰۶۰ھ کے درمیان اور نگا بندر کے نام سے ایک بندرگاہ تعمیر کی تھی، جو غلام شاہ کلہوڑا کے زمانے تک آباد تھی۔

۱۲۔ ظفر خان:

تحفۃ الکرام میں ہے کہ نواب مغل خان کے بعد ۱۰۶۳ھ (۵۳-۱۶۵۲ء) میں خواجہ احسن اللہ ظفر خان ٹھٹھہ کا نائب گورنر مقرر ہوا، یہ خواجہ ابوالحسن تربتی کا بیٹا تھا، ۱۹ جلوس جہانگیری میں جب مہابت خان کے تبادلے کی وجہ سے خواجہ ابوالحسن تربتی کابل کا صوبیدار مقرر ہوا تو یہ اس کا نائب ہونے کی حیثیت سے وہاں مقرر کیا گیا۔ ۲ جلوس شاہجہانی میں اپنے باپ کے ساتھ جھجھار سنگھ[5] کے تعاقب میں متعین ہوا۔ ۳ جلوس شاہجہانی میں یہ اپنے والد کے ساتھ میں ناسک، تربنک اور سنگمیر کے لیے مقرر کیا گیا۔ ۵ جلوس شاہجہانی جب اعتقاد[6] خان شاہ پور کی وجہ سے اس کا باپ کشمیر کا صوبیدار مقرر ہوا تو اس کے نائب کی حیثیت سے وہاں بھیجا گیا۔ ۶ جلوس شاہجہانی میں اپنے باپ کی وفات کے

---

(1) یہ تفصیل تعلیقات تذکرۂ امیر خانی، ص ۳۵۰ سے ماخوذ ہے۔

(2) یہ خط تعلیقات تذکرہ امیر خانی سے لیا گیا، جو اس میں بحوالہ رقعات ۲/۱۲ درج ہے۔

(3) تعلیقات تذکرۂ امیر خانی (سندھی) بحوالہ رقعات، ۲/۴-ص ۳۵۵۔

(4) تعلیقات تذکرہ امیر خانی (سندھی) رقعات ص ۲/۱۲-ص ۳۵۴-۳۵۵۔

(5) جھجھار سنگھ پسر میر سنگھ دیو بندیلہ ۱۰۴۴ھ میں گونڈوں کے ہاتھوں سے قتل ہوا (مآثر الامرا، ج ۲، ص ۲۱۴-۲۱۷)۔

(6) اعتقاد خان میرزا شاہپور: پسر اعتماد الدولہ و برادر آصف خان: وفات: ۱۰۶۰ھ (مآثر الامرا، ج ۱، ص ۱۸۰)۔

بعد شاہجہاں نے اسے مستقل کشمیر کا صوبیدار مقرر کیا۔

۱۰ جلوس شاہجہانی میں شاہی حکم کی بنا پر تبت (خورد) کو فتح کیا۔

۱۱ جلوس شاہجہانی میں یہ تبت کے مرزبان کے ساتھ شاہی دربار میں حاضر ہوا۔

۱۲ جلوس شاہجہانی میں یہ حکومت کشمیر سے معزول ہو کر خان دوراں نصرت جنگ کے ہمراہ ہزارجات کی تنبیہ کے لیے مقرر کیا گیا۔

۱۵ جلوس شاہجہانی میں یہ دوبارہ تربیت خان صوبیدار کشمیر کے تبادلے کی وجہ سے صوبیدار کشمیر مقرر کیا گیا۔

۲۶ جلوس شاہجہانی میں سردار خان کے انتقال کے بعد یہ ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا۔ تحفتہ الکرام میں ہے کہ جلوس شاہجہانی کے انتیسویں سال ۱۰۶۵ھ (۵۵-۱۶۵۴ء) میں جب ٹھٹھہ کی حکومت داراشکوہ کے بیٹے سلطان سپہر شکوہ کے سپرد کی گئی تو ۳۰ جلوس شاہجہانی میں یہ بادشاہ کی بارگاہ میں حاضر ہو گیا اور شاہجہان کے زمانے ہی میں یہ عزلت نشین ہو گیا۔ جب اورنگزیب بادشاہ ہوا تو اس نے اس کا چالیس ہزار روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

۶ جلوس عالمگیری ۱۰۷۳ھ میں ظفر خان نے لاہور میں وفات پائی۔ اگرچہ ظفر خان ظاہری وجاہت اور شکل و صورت نہ رکھتا تھا اور کوتاہ قد تھا لیکن عقل و دانش، فہم و فراست اور اصابت تدبیر میں اس کی مثال نہ تھی، شعر اکا بے حد قدردان تھا۔ صائب تبریزی جب کابل آیا تو ظفر خان کی داد و دہش اور دریا بخشی کو دیکھ کر اس کا دلدادہ ہو گیا اور مدت تک وہ ہندوستان میں اس کے ساتھ رہا۔

عہد اورنگزیب

(۱۰۶۹ھ تا ۱۱۱۸ھ)

۱۳۔ قباد خاں:

تحفتہ الکرام میں ہے کہ مظفر خان کے بعد ۱۰۶۹ھ (۱۶۵۸ء) میں قباد خان ٹھٹھہ کا نائب گورنر مقرر ہو کر آیا۔ یہ ابتدا میں نذر محمد خان والی بلخ و بدخشاں کا میر اخور تھا اور نذر محمد خان کے آخری دور میں قلعہ غوری کی حفاظت و حکومت اس کے سپرد تھی۔ جب ۱۹ جلوس شاہجہانی میں شاہزادہ مراد بخش کابل سے بدخشاں و بلخ کی تسخیر کے لیے گیا اور اس نے قلعہ کہمرد اور غور کے لیے جو حدود کابل سے ملے ہوئے ہیں قلیج خان و خلیل اللہ کو مقرر کیا تو قباد خان نے اسے ہزارجات کی فوج سمجھ کر تین سو سواروں کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا لیکن جلد ہی وہ اپنے میں مدافعت کی طاقت نہ پا کر امان کا خواہاں ہوا۔ قلیج خان نے اس کو اس کے چاروں بیٹوں اور اس کے تمام اہل و عیال کے ساتھ ابراہیم حسین ترکمان کے ہمراہ شاہی بارگاہ میں روانہ کر دیا۔ کابل میں دربار شاہی میں باریاب ہوا اور ہزاری پانصد سوار کے منصب اور بیس ہزار روپے کے انعام سے سرفراز ہوا۔ ۲۱ جلوس شاہجہانی میں منصب میں اضافہ پانصدی کے ساتھ قوش بیگی مقرر کیا گیا۔ جب شاہی لشکر داراشکوہ کے تعاقب میں حوالی ملتان میں خیمہ انداز تھا[1] تو یہ شیخ میر کے ساتھ داراشکوہ کے تعاقب پر مامور کیا گیا لیکن جب داراشکوہ دریائے ٹھٹھہ عبور کر کے گجرات کی طرف روانہ ہو گیا۔[2] تو شیخ میر خان جو شاہی دربار سے ٹھٹھہ کا صوبیدار نامزد ہو چکا تھا، خود اسے اپنی جگہ ٹھٹھہ کی صوبیداری پر مقرر کر کے وہاں سے چلا آیا اور قباد خان کا منصب چار ہزار ذات سہ ہزار سوار مقرر ہوا۔

مرآۃ العالم میں ہے کہ یہ بجائے لشکر خان کے ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا، ۱۰ جلوس عالمگیری میں جب یہ حکومت اوڑیسہ کے لیے گیا تو اس نے وہیں وفات پائی۔[3]

تحفتہ الکرام میں ہے کہ اس کے زمانہ صوبیداری میں اس ملک کے باشندوں پر سخت قحط اور وبا کی مصیبت آئی اور مزید یہ کہ داراشکوہ بھی آوارد ہوا، جس کے لشکر کی وجہ سے اور بھی نئی مصیبت پیدا ہو گئی۔[4]

۱۴۔ نواب لشکر خان:

تحفتہ الکرام میں ہے کہ قباد خان کے بعد ۱۰۷۱ھ (۱۶۶۰ء) ۳ جلوس عالمگیری میں نواب لشکر خان عرف جاں نثار خان ٹھٹھہ کا گورنر مقرر ہوا۔ اس کا نام یادگار بیگ اور اس کے باپ کا نام زبردست خان تھا، جو شاہجہاں کے اُمرا میں تھا۔ یہ اپنے باپ کے زمانے ہی میں عمدہ خدمات شاہی سے سرفراز ہوا اور ۱۹ جلوس شاہجہانی میں داروغہ گرزبرداراں مقرر

---

(1) ۲۶ ستمبر ۱۶۵۸ء کو عالمگیر نے ملتان میں شیخ میر اور دلیر خان کو نو ہزار فوج کے ساتھ داراشکوہ کے تعاقب میں متعین کیا تھا۔ رک: حواشی مکلی نامہ، ص ۴۰۶۔

(2) ۲۴ نومبر ۱۶۵۸ء کو داراشکوہ بدین پہنچا اور وہاں سے گجرات کی طرف روانہ ہو گیا۔ (رک: حواشی مکلی نامہ، مؤلف سید حسام الدین راشدی، ص ۴۱۲)۔

(3) مآثر الامراء، ج ۳، ص ۹۹-۱۰۲۔

(4) تحفتہ الکرام اردو، ترجمہ، ص ۱۹۹۔

ہوا، اسی سال اسے جاں نثار خاں کا خطاب ملا۔ جب ایران کے بادشاہ شاہ صفی نے انتقال کیا تو شاہجہاں نے اسے تعزیتی خط کے ساتھ اور اس کے بیٹے شاہ عباس ثانی کی تخت نشینی کی مبارکباد کے لیے ایران روانہ کیا۔

۲۱ جلوس شاہجہانی میں یہ ایران سے واپس آیا اور دو ہزاری ہفت صد کے منصب سے سرفراز ہوا۔

۲۳ جلوس شاہجہانی میں میر توزک اور ۲۴ جلوس شاہجہانی میں سیادت خان کے تبادلے کی وجہ سے بخشگیری کے عہدے پر فائز ہوا اور اس کے بعد بھی شاہجہاں کے زمانے میں مختلف خدمتوں پر رہا۔

عالمگیر کے تخت نشین ہونے کے پہلے سال خلعت اور اضافۂ پانصدی پانصد سوار سے سرفراز ہو کر سہ ہزاری دو ہزار پانصد سوار کے منصب پر فائز ہوا اور ملتان کا صوبیدار مقرر ہوا۔

۳ جلوس عالمگیری میں قباد خان کے تبادلے کے بعد ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا اور وہاں سے بہار کا صوبیدار بنا کر بھیجا گیا۔

۱۰ جلوس عالمگیری میں بہار کی صوبیداری سے معزول ہو کر طاہر خان صوبیدار ملتان کے تبادلے کی وجہ سے ملتان کا دوبارہ صوبیدار مقرر کیا گیا۔

۱۰۸۱ھ (۷۱-۱۶۷۰ء) میں لشکر خان نے وفات پائی۔[1]

صاحب تحفۃ الکرام نے ٹھٹھہ میں اس کی مدت چار سال لکھی ہے۔[2]

۱۵۔ نواب غضنفر خان:

تحفۃ الکرام میں ہے کہ نواب لشکر خان کے بعد ۱۰۷۵ھ (۶۵-۱۶۶۴ء) میں نواب غضنفر خان ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا۔[3]

غضنفر خان، الٰہ وردی کا بیٹا تھا، جو اپنے باپ سے جدائی اختیار کر کے شاہجہاں کی خدمت میں آ رہا تھا، یہ عہد شاہجہانی میں مختلف خدمتوں پر رہا۔

آغاز جلوس عالمگیری میں دوآبہ کی فوجداری سے سرفراز ہوا۔

۷ جلوس عالمگیری میں قباد خان کے تبادلے کی وجہ سے سہ ہزاری سہ ہزار سوار کے منصب سے سرفراز ہو کر ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا۔

اس نے ۱۰۷۷ھ (۶۷-۱۶۶۶ء) میں ٹھٹھہ ہی میں وفات پائی۔[4]

(1) مآثر الامرا، ج ۳، ص ۱۶۸-۱۷۱۔
(2) تحفۃ الکرام، اردو ترجمہ، ص ۳۰۰۔
(3) ایضاً۔
(4) مآثر الامرا، ج ۲، ص ۸۶۶-۸۶۸۔

۱۶۔ نواب سید عزت خان:

تحفۃ الکرام میں ہے کہ نواب غضنفر خان کے بعد ۱۰۷۸ھ (۶۸-۱۶۶۷ء) ۱۰ جلوس عالمگیری میں نواب عزت خان عرف عزت پیر جو بکھر کا فوجدار تھا، صوبیداری ٹھٹھہ سے سرفراز ہوا اور پورے دو سال تک ٹھٹھہ میں رہا۔[5]

مآثر الامرا میں ہے کہ سید عزت خان، عبدالرزاق گیلانی ابتدا سے دارا شکوہ کے متوسلین میں تھا۔ ۳۰ جلوس شاہجہانی میں دارا شکوہ کے التماس پر عزت خان کے خطاب سے سرفراز ہوا اور صوبہ ملتان کا گورنر مقرر ہوا۔

۳۱ جلوس شاہجہانی میں بہادر خان کے تبادلے کی وجہ سے دارالسلطنت لاہور کا گورنر مقرر ہوا۔

جب دارا شکوہ کی اکبر آباد کے متصل عالمگیر سے آویزش شروع ہوئی اور دارا شکوہ پسپا ہوا تو وہ لاہور چلا گیا، لیکن وہاں بھی دارا شکوہ کے قدم نہ جم سکے تو وہ ملتان چلا گیا۔ سید عزت خان اس کے ساتھ تھا جب دارا شکوہ نے وہاں بھی عافیت کی راہ نہ پائی تو وہ بکھر روانہ ہو گیا، سید عزت خان دارا شکوہ سے علیحدہ ہو کر عالمگیر کے وہاں پہنچنے پر اس سے مل گیا اور سہ ہزاری و پانصد سوار کے منصب سے سرفراز ہوا۔ عالمگیر اور محمد شجاع کے درمیان جو جنگ ہوئی تھی، یہ عالمگیر کے ساتھ تھا۔

۴ جلوس عالمگیری میں یہ سنجر خان کے تبادلے کی وجہ سے بکھر کا فوجدار مقرر ہوا۔ ۱۰ جلوس عالمگیری میں یہ غضنفر خان کے انتقال کی وجہ سے بکھر کی فوجداری سے تبدیل ہو کر ٹھٹھہ کی صوبیداری سے سرفراز ہوا۔[6] صاحب تحفۃ الکرام نے اس کی مدت حکومت ٹھٹھہ پورے دو سال بتائی ہے۔ راشدی صاحب نے تحفۃ الکرام (طبع راشدی) میں اس کی مدت حکومت (۱۰۷۷ھ تا ۱۰۸۰ھ) لکھی ہے۔ راشدی صاحب نے عزت خان کے بعد ابو النصر خان شائستہ خان کی صوبیداری ٹھٹھہ کا تذکرہ کیا ہے اور اُس کی مدت حکومت ٹھٹھہ ۱۰۸۰ھ تا ۱۰۸۲ھ بتائی ہے، لیکن تحفۃ الکرام میں اس کا تذکرہ نہیں۔

۱۷۔ ابو نصرت خان:

تحفۃ الکرام میں ہے کہ عزت خان کے بعد ۱۰۸۰ھ (-۱۶۶۹

(5) تحفۃ الکرام اردو ترجمہ، ص ۳۰۰۔
(6) مآثر الامرا، ج ۲، ص ۴۷۵۔

۷۰ء) ۱۲ جلوس عالمگیری میں عالمگیر بادشاہ کا ماموں نواب ابو نصرت خان جو ایک دین دار اور پرہیز گار امیر تھا، ٹھٹھہ کا گورنر ہو کر آیا۔ یہ شعر گوئی میں بھی بڑی مہارت رکھتا تھا۔ ابو نصرت خان دو سال تک ٹھٹھہ کا گورنر رہا،[1] لیکن راشدی صاحب کی مرتبہ فہرست میں جو ہم گزشتہ اوراق میں دے آئے ہیں ابو نصرت خان کا ذکر نہیں۔ انہوں نے لکھا کہ تحفتہ الکرام میں ابو نصرت خان نام بھی صحیح نہیں، بلکہ اس کا نام ابو نصرت خان بن شائستہ خان ہے اور بحیثیت صوبیدار ٹھٹھہ کے اس کا تذکرہ کسی کتاب میں نہیں ملتا۔[2]

۱۸۔ سعادت خان:

لُب تاریخ سندھ میں ہے کہ ابو نصرت خان کے بعد ۱۰۸۴ھ (۱۶۷۳ء) میں سعادت خان ٹھٹھہ کا گورنر ہو کر آیا، اس نے ٹھٹھہ ہی میں وفات پائی اور مکلی میں مدفون ہوا۔ اس کی قبر پر یہ کتبہ مرقوم ہے۔

بگفتا بے حجاب از عیب ہاتف
سعادت جاودانی یافت پی پی[3]

۱۹۔ سید عزت خان دوبارہ ٹھٹھہ کی گورنری پر:

لُب تاریخ سندھ میں ہے کہ ۱۰۸۶ھ (۱۶۷۵ء) میں دوبارہ سید عزت خان ٹھٹھہ کی گورنری پر مامور ہوا۔[4] تحفتہ الکرام میں ہے کہ دو سال گزرنے کے بعد ۱۰۸۴ھ (۷۴-۱۶۷۳ء) میں پھر سید عزت خان ٹھٹھہ کا صوبیدار ہوا، اس مرتبہ وہ چھ سال تک ٹھٹھہ کا گورنر رہا۔[5]

۲۰۔ نواب خانہ زاد خان:

تحفتہ الکرام میں ہے کہ سید عزت خان کے بعد ۱۰۹۰ھ (۸۰-۱۶۷۹ء) ۲۲ جلوس عالمگیری میں خانہ زاد خان ٹھٹھہ کا گورنر ہو کر آیا اور یہ تقریباً پانچ سال تک ٹھٹھہ کا گورنر رہا، شاعر تھا اور شعر گوئی میں خاص ملکہ رکھتا تھا۔[6]

راشدی صاحب نے اس کی مدت صوبیداری ٹھٹھہ ۱۰۹۰ھ تا ۱۰۹۵ھ لکھی ہے۔

۲۱۔ سردار خان (۱۰۹۵ھ تا ۱۰۹۸ھ):

تحفتہ الکرام میں ہے کہ نواب خانہ زاد خان کے موقوف ہونے کے بعد ۱۰۹۵ھ (۸۴-۱۶۸۳ء) ۲۷ جلوس عالمگیری میں نواب سردار خان ملک کی سرداری پر مامور ہوا اور پورے تین سال تک یہاں رہا۔ اتفاق سے اس کے عہد میں ملک میں سخت وبا اور قحط نمودار ہوا۔ اس زمانے میں اموات اور ترک سکونت کی وجہ سے جو مقامات ویران ہوئے، وہ دوبارہ آباد نہ ہو سکے۔[7]

راشدی صاحب نے لکھا ہے کہ: عہد عالمگیری میں تین امیر سردار خان کے لقب سے ملقب تھے، معلوم نہیں کہ ان میں سے یہ کون سا سردار خان ہے۔[8]

۲۲۔ مرید خان (۱۰۹۹ھ تا ۱۱۰۱ھ):

سردار خان کے بعد ۱۰۹۹ھ (۸۸-۱۶۸۷ء) ۲۰ جلوس عالمگیری میں مرید خان ٹھٹھہ کا صوبیدار ہو کر آیا جو اصل میں نو مسلم راجکمار تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کئی ہزار راجپوت اُس کے ساتھ تھے، جب وہ شہر کے گھاٹ کے قریب پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ شاہی محلات تک پہنچنے کے لیے اُسے قصابوں کے بازار سے گزرنا پڑے گا، اُس نے شہر کے قاضی حسن کے پاس پیغام بھیجا کہ ہندو راجپوتوں کی ایک بڑی جمعیت اُس کے ساتھ ہے اس لیے گائے کے گوشت فروخت کرنے والے قصابوں کی دکانیں راستے سے ہٹوا دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے ہمراہیوں کو یہ بات پسند نہ آئے اور وہ کوئی نئی اُلجھن پیدا کر دیں۔

چونکہ شرع پرور بادشاہ کا قانون ایسے لوگوں کو مجبور کرے اور ڈرانے سے بے نیاز تھا، اس لیے راتوں رات قاضی نے قصابوں کو حکم دیا کہ وہ بازار کے دونوں جانب پہلے سے بھی زیادہ دکانیں آراستہ کریں، بالآخر باشاہ کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار نہ دیکھ کر مرید خان سابقہ حاکموں کی طرح اسی بازار سے گزر کر گیا اور دو سال تک ٹھٹھہ پر مامور رہا۔

چونکہ اس کے لشکر سے مسلمانوں کو سخت تکلیف پہنچی، اس لیے

---

(1) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۰۰-۳۰۱۔
(2) تحفتہ الکرام (طبع راشدی) ص ۳۳۵، حاشیہ نمبر ۳۔
(3) لب تاریخ سندھ، ص ۱۰۲-۱۰۳۔
(4) ایضاً۔ ص ۱۰۳۔
(5) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۰۱۔
(6) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۰۱۔
(7) ایضاً۔ ص ۳۰۱۔
(8) تحفتہ الکرام (طبع راشدی) ص ۳۳۷، حاشیہ نمبر ۲۔

شہر کے ممتاز افراد کے بادشاہ سے عرض کرنے پر شاہی فرمان آیا کہ اس کے نام کے دو نقطے اوپر رکھ کر اسے مسلمانوں پر حکومت کرنے سے موقوف کر دیا جائے، چنانچہ ۱۱۰۱ھ (۹۰-۱۶۸۹ء) میں معزول ہوا۔

مرید خان موقوف ہونے کے بعد آنکھوں کی بیماری کی وجہ سے تغلق آباد [1] عرف کلاں کوٹ کی آب و ہوا کو موافق پاکر وہاں کچھ عرصے تک مقیم رہا۔

۲۳۔ زبردست خان (۱۱۰۱ھ):

مرید خان کی معزولی کے بعد ۱۱۰۱ھ (۹۰-۱۶۸۹ء) ۳۳ جلوس عالمگیری میں زبردست خان ٹھٹھہ کا صوبیدار ہو کر آیا، لیکن اُس نے کچھ دن کے بعد ہی وفات پائی۔ [2]

کسی شاعر نے اس کی وفات پر کہا:

سبوے زندگی خانِ زبردست
قضا بیں از کجا آورد و بشکست

۲۴۔ ابو نصرت خان کا دوبارہ ٹھٹھہ پر تقرر (۱۱۰۱ھ تا ۱۱۰۳ھ):

تحفتہ الکرام میں ہے کہ زبردست خان کی وفات کے بعد اُسی سال نواب ابو نصرت خان دوبارہ ٹھٹھہ پر گورنر مقرر ہو کر آیا اور دو سال کچھ ماہ تک یہاں حکومت کرتا رہا، [3] راشدی صاحب نے اس کے نام کی تصحیح کرتے ہوئے اس کا نام ابو النصر خان شائستہ خان لکھا ہے۔

۲۵۔ حفظ اللہ خان (۱۱۰۳ھ تا ۱۱۱۲ھ):

تحفتہ الکرام میں ہے کہ ابو نصرت خان کے بعد ۱۱۰۳ھ (۱۶۹۱-۹۲ء) میں حفظ اللہ خان جو شاہجہان کے وزیر نواب سعد اللہ کا بیٹا تھا ٹھٹھہ اور سیوستان کا گورنر ہو کر آیا، یہ ایک فیاض اور دریادل امیر تھا۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے روز ایک ہزار آدمیوں کے لیے دستر خوان بچھواتا اور کھانے کے شروع اور آخر میں خود آفتابہ لے کر لوگوں کے ہاتھ دھلواتا تھا۔

جب شاہزادہ محمد معزالدین، میاں دین محمد سرائی کو گرفتار کر کے لایا تو اس نے سیوہن کے قریب دریا پر پُل تعمیر کرنے کا حکم دیا، جس کے لیے شیخ عبدالغنی ٹھٹھوی کو مقرر کیا تھا، لیکن جب شیخ نے اس کے حکم کے مطابق کام انجام نہ دیا تو اس نے خود بنفس نفیس اس کی تعمیر کی طرف توجہ کی۔ اسی پُل کو تعمیر کرانے میں اُسے سورج کی تمازت سے تکلیف پہنچی اور اُسی تکلیف میں مبتلا ہو کر ۱۱۱۲ھ (۱-۱۷۰۰ء) میں اُس نے

---

(1) تغلق آباد، طغرل آباد: عرف کلاں کوٹ (کلیان کوٹ) یہ شہر اور قلعہ مکلی سے دکن کی جانب مکلی کے سرکاری بنگلے سے تقریباً سات میل اُس طرف تھا، یہ قلعہ اور شہر اصل میں قدیم دور کا ہے، جس کے مختلف زمانوں میں مختلف حاکم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اس کا نام بدلتا رہا، مثلاً کلا کوٹ، کلیان کوٹ، کلاں کوٹ، تغلق آباد، طغرل آباد۔ تقریباً پانسو سال تک یہ شہر اور قلعہ کھنڈر اور زبوں حالت میں موجود رہا، لیکن آج بالکل صفحۂ ہستی سے نابود ہو چکا ہے۔ میر علی شیر قانع کے قول کے مطابق یہ شہر کلا راجا کا آباد کیا ہوا ہے، جس کی بنا پر یہ کلا کوٹ سے مشہور ہے۔

میرزا قلیچ بیگ نے لکھا کہ: اس شہر کا نام کلیان کوٹ تھا، یعنی امن و راحت کا گہوارہ۔ یہ شہر سیوہن کے قلعے کے برابر قدیم ہے اور یہ شہر سکندر اعظم کے دور میں موجود تھا۔

تغلق آباد کے متعلق ایک روایت یہ ہے کہ سندھ کے سومرہ خاندان کے فرمانرواؤں کا پایۂ تخت محمد طور تھا، جب یہ شہر برباد ہوا تو انہوں نے کچھ عرصے کے لیے اس شہر سے دارالحکومت ہٹا دیا۔ سموں کے دور میں یہ شہر شاید کچھ کم ویران تھا، سموں کے ایک بادشاہ جام تغلق بن سکندر نے اس شہر میں کچھ عمارتیں نئے سرے سے تعمیر کرائیں، جام تغلق کے اس شہر کو از سر نو آباد کرنے کے بعد اس شہر کا نام تغلق آباد پڑ گیا اور اس کے قلعے کا نام کلاں کوٹ پڑ گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس قلعے کا کوئی مستقل نام نہ تھا بلکہ کلا کوٹ یا کلیان کوٹ ہی بگڑ کر کلاں کوٹ ہو گیا۔

اسی قلعے کا ایک نام طغرل آباد بھی ہے، جس کی وجہ یہ تھی کہ مغل دور کے ایک امیر طغرل بیگ (متوفی ۱۰۹۵ھ) نے اس قلعے کی مرمت کرائی تھی، جس کے بعد سے اس کا نام طغرل آباد پڑ گیا۔

ارغون دور (۶۳-۹۶۲ھ) اور ترخانی دور (۶۲-۱۰۰۰ھ) میں معلوم ہوتا ہے کہ تغلق آباد کا مستحکم قلعہ اور شہر دارالحکومت سے قریب ہونے کے باعث حفاظتی نقطۂ نظر سے محفوظ قلعہ اور محفوظ شہر سمجھا جاتا تھا۔ ضرورت کے وقت حاکم اس شہر میں آکر رہتے تھے، جنگ کے زمانے میں اہم جنگی اور قیمتی سامان اس قلعے میں منتقل کر دیا جاتا تھا، کیونکہ یہ قلعہ ایک پہاڑی پر ہونے کی وجہ سے اور اپنے جائے وقوع اور ساخت کے اعتبار سے نہایت محفوظ خیال کیا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغل دور میں یہ قلعہ اورنگ زیب کے زمانے تک آباد رہا۔ قرین قیاس یہ ہے کہ عالمگیر کی وفات کے بعد، جب سندھ میں مغل تسلط کا زوال ہوا تو ٹھٹھہ کا مرکز بھی کمزور ہوتا گیا، اُس وقت تغلق آباد کی آبادی بھی ویرانی میں بدل گئی، یہاں تک کہ بارہویں صدی ہجری کے آخر میں قلعے کی ہر شے برباد ہو گئی۔ (رک: حواشی مکلی نامہ سندھی، مصنف: سید حسام الدین راشدی، ص ۶۷۶-۶۸۷)۔

(2) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۳۰۳۔

(3) ایضاً۔ ص ۳۰۳۔

سیوہن میں وفات پائی۔ حاکمان ٹھٹھہ کا رہائشی قلعہ جو آج تک باقی ہے، اس کا تعمیر کرایا ہوا ہے۔ یہ شاعر تھا، صاحب علم و فضل اور بلند پایہ شاعر تھا، بہت لطیف شعر کہتا تھا،[1] اور شعرا کا قدردان تھا۔

مقالات الشعرا میں اُس کے یہ شعر ملتے ہیں:

اے کہ میگوئی کہ می آیم نمی آئی چرا
پائے شوکت راگر رنگ حنا زنجیر پاست

--

گل عذار و گل آتش و گل ساغر
اگر غلط نکنم فصل گل زمستان ست

--

بزم بے ہوشی ست دنیا خلوت ہشیار نیست
خواب غفلت بردہ مردم راکسے بیدار نیست
چشم حق بیں در تجلی گاہ طور اتحاد
گر بصد آئینہ افتد در نظر جز یار نیست[2]

جن شعرا کی ٹھٹھہ میں اُس نے سرپرستی کی اُن میں ذوالفقار، فدوی، محسن، میگراج خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان شعرا کے حالات مقالات الشعرا میں ملتے ہیں۔

۲۶۔ سعید خان (۱۱۱۲ھ تا ۱۱۱۴ھ):

حفظ اللہ خان کے بعد ۱۰۱۳ھ (۱۷۰۱ء) میں سعید خان عرف سعید خانی و چنگیز خانی، ٹھٹھہ اور سیوہن کا صوبیدار ہو کر آیا۔ یہ خود سیوہن میں مقیم رہا اور اپنے بیٹے ارشد خان کو بحیثیت اپنے نائب کے ٹھٹھہ بھیج دیا۔[3]

۲۷۔ میر امین الدین خان حسین (۱۱۱۴ھ تا ۱۱۱۵ھ):

سعید خان کے بعد ۱۱۱۴ھ (۱۷۰۲ء) میں میر امین الدین خان حسین بن سید ابو المکارم شہود جو ٹھٹھہ کے مشہور امیر خانی خاندان سے تھے، ٹھٹھہ کے گورنر مقرر ہوئے۔

یہ میر ابو المکارم شہود کے بڑے بیٹے تھے۔ میر امین الدین نہ صرف خاندانی امیر تھے، بلکہ دل بھی امیرانہ رکھتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی ساری زندگی نہایت ٹھاٹ باٹ، شان و شوکت اور وضع داری کے ساتھ بسر کی۔

میر سید علی خوش نویس کی روایت ہے کہ میر امین الدین خان جب ٹھٹھہ کے گورنر مقرر ہوئے تو یہ عالمگیر کی حکومت کا آخری زمانہ تھا، جس کے بعد عالمگیر صرف چار سال زندہ رہا۔

میر صاحب اپنے وقت کے جید عالم اور بڑے صاحب کمال بزرگ تھے، انہوں نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق علم کے چراغ کو جو ان کے خاندان میں پشتہا پشت سے روشن چلا آتا تھا، روشن رکھا۔ اُن کا عظیم الشان کتب خانہ تھا، کتابوں کے مطالعے میں ان کا اکثر وقت گزرتا تھا۔ میر علی شیر قانع ٹھٹوی صاحب مقالات الشعرا نے اُن کے علم و فضل کو سراہتے ہوئے لکھا کہ:

امیری باعتبار وسیدی عالی مقدار بود، باوجود رتبت امارت اغلب اوقات بمطالعہ کتب و صحبت باعلما پرداختہ۔

اہل علم اور اصحاب کمال ہر وقت اُن کے گرد جمع رہتے، جن سے ان کے علمی مذاکرے اور ادبی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔

میر صاحب کو تالیف و تصنیف کا بھی بہت ذوق تھا، اگرچہ ان کی تصانیف کی تعداد صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکی لیکن ان کی دو تصنیفوں یعنی رشحات الفنون اور معلومات الآفاق کے نسخے آج بھی بعض کتب خانوں میں موجود ہیں۔

رشحات الفنون میں اُنہوں نے چودہ علوم کے متعلق بحث کی ہے۔ یہ کتاب مطلع العلوم فی مجمع العلوم کے نمونے پر ہے، جس میں مختلف علوم کی تاریخ سے بحث کی گئی ہے۔

رشحات الفنون کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ اس کا کاتب سید احمد بن سید حبیب اللہ ہے۔ میر صاحب نے اس کتاب کی تکمیل ۱۱۲۳ھ (۱۲-۱۷۱۱ء) میں کی تھی۔

ان کی دوسری تصنیف معلومات الآفاق ہے۔ اس کتاب کا موضوع جغرافیہ ہے۔

میر امین الدین خان نے تعلیم کی تکمیل غالباً ٹھٹھہ ہی میں کی تھی۔ ان کے زمانے میں میر عبدالواسع کا مدرسہ سب سے بڑا مدرسہ تھا۔ میر صاحب نے غالباً اسی مدرسے میں تعلیم پائی تھی۔

میر علی شیر قانع نے مقالات الشعرا میں اُن کے علم و فضل، تصوف و عرفان کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ:

---

(1) تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۰۳-۳۰۵۔
(2) مقالات الشعراء، ص ۱۸۰۔
(3) تحفۃ الکرام، ص ۳۰۵۔

صوفی عالم متبحر و در طریق صوفیہ یگانۂ عصری زیست و صاحب تصانیف غریبہ است، شرح مخزن الاسرار بہتر از قاضی ابراہیم گفتہ۔

میر صاحب شعر و سخن کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے شاعری میں بڑا نام پیدا کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ اُن کے تمام کلام کا ذخیرہ ضائع ہو گیا، صاحب مقالات الشعرا نے اُن کے چند شعر محفوظ کیے ہیں۔ ہم یہاں تبرکاً ان کے دو تین شعر، مقالات الشعرا سے نقل کرتے ہیں:

افسوس کہ بے دوست ہمہ عمر بسر رفت
در صرفہ کار شتر استر و خر رفت

ہر دم کہ می کشیم بیاد تو می کشیم
ما را بغیر یاد تو یک دم نمی رود[1]

لُب تاریخ سندھ کے مصنف خداداد خان نے لکھا ہے کہ ان کی وفات ۱۱۲۷ھ (۱۷۱۵ء) میں ٹھٹھہ ہی میں ہوئی اور اُن کا مزار کوہ مکلی پر ہے، جس پر چند آیات، احادیث اور یہ اشعار منقوش ہیں:

خان باتمکیں امین الدین امیر
عالی از حسنِ عمل درجاتِ او
چوں سفر کرد از جہانِ بی ثبات
سال فوتش داخل الجنات او[2]

۱۱۲۷ھ (۱۵-۱۷۱۴ء)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹھٹھہ کی گورنری سے سبکدوش ہونے کے بعد میر صاحب اپنے وطن ٹھٹھہ ہی میں مقیم رہے اور یہیں انہوں نے وفات پائی۔[3]

۲۸۔ یوسف خان تری (ترین) (۱۱۱۵ھ تا ۱۱۱۶ھ):

میر امین الدین حسین خان کے بعد ۱۱۱۵ھ (۴-۱۷۰۳ء) میں ۴۷ جلوس عالمگیری میں نواب یوسف خان تری ٹھٹھہ کا گورنر ہو کر آیا اور ایک سال کے بعد موقوف ہوا۔[4]

۲۹۔ نواب احمد یار خان (برلاس) (۱۱۱۶ھ تا ۱۱۱۸ھ):

یوسف خان تری کے بعد ۱۱۱۶ھ (۵-۱۷۰۴ء) ۴۸ جلوس عالمگیری میں احمد یار خان ولد الٰہ یار خان ٹھٹھہ کا گورنر ہو کر آیا۔ یہ قوم برلاس سے تھا اور اس کے بزرگ لاہور کے علاقۂ خوشاب میں رہتے تھے، اس کا باپ الٰہ یار خان لاہور اور ملتان کا گورنر تھا اور تقریباً چالیس سال تک غزنی کا فوجدار رہا۔

یہ تین سال تک ٹھٹھہ کا حکمران رہا، نواب احمد یار خان ابھی ٹھٹھہ کی گورنری پر ہی تھا کہ ۲۶ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۷ء) کو عالمگیر نے وفات پائی اور یکم محرم ۱۱۱۹ھ (۱۷۰۷ء) کو اس کا بڑا بیٹا بہادر شاہ اول تخت نشین ہوا۔

ٹھٹھہ میں اس امیر کی یادگار شاہی محلات کے مشرقی دروازے کے سامنے ایک پُل نہر عالی جان تھا، جو میر علی شیر قانع ٹھٹھوی کے زمانے میں موجود تھا۔[5] ترخانیوں کے زمانے میں بھی ہمیں عالی جان کا تذکرہ ملتا ہے، جیسا کہ ہم گزشتہ اوراق میں اس نہر کا کہیں ذکر کر آئے ہیں۔ تاریخ محمدی میں ہے کہ میرزا محمد مخاطب بہ احمد یار خان نے تقریباً ستر سال کی عمر میں لاہور میں وفات پائی۔[6]

بعد عالمگیر

(عہد اعظم شاہ) (۱۱۱۸ھ) عہد کام بخش (۱۱۱۹ھ) عہد شاہ عالم بہادر شاہ (۱۱۱۹ھ تا ۱۱۲۴ھ)

۳۰۔ عطر خان (۱۱۱۹ھ تا ۱۱۲۱ھ):

احمد یار خان کے بعد ۱۱۱۹ھ (۱۷۰۸ء) میں بہادر شاہ کے حکم سے (محمد رشید) سعید خان بہادر کا بیٹا سعید خان عرف عطر خان ٹھٹھہ کا حاکم ہو کر آیا اور ایک سال چند ماہ کے بعد اس خدمت سے موقوف ہوا۔[7]

راشدی صاحب نے لکھا ہے کہ: عطر خان اُسی محمد رشید سعید خان کا بیٹا ہے کہ جو نواب حفظ اللہ کی وفات کے بعد ۱۱۱۳ھ میں خود سیوستان میں رہا، اور اپنے بیٹے ارشد خان کو اپنا نائب بنا کر ٹھٹھہ بھیجا[8] عطر خان شاہ

---

(1) مقالات الشعرا، ص ۲۴-۲۸۔
(2) لُب تاریخ سندھ، ص ۱۰۵۔
(3) میر امین الدین خان حسین کے یہ تمام حالات تذکرۂ امیر خانی (سندھی) مؤلف سید حسام الدین راشدی از صفحہ ۱۹۴-۲۰۷ سے ماخوذ ہیں۔
(4) تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۵۲۷۔
(5) تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۴۰۸۔
(6) تحفۃ الکرام (طبع راشدی) ص ۳۵۲ حاشیہ بحوالہ تاریخ محمدی (۱۱۴۷ھ)۔
(7) تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۰۸۔
(8) تحفۃ الکرام۔ (طبع راشدی) ص ۳۵۲، حاشیہ نمبر ۱۔

عالم کے حکم سے ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا تھا۔

۳۱۔ مہین خان (۱۱۲۱ھ تا ۱۱۲۲ھ):

عطر خان کے بعد (۱۱۲۱ھ) (۰۹-۱۷ء) میں مہین خان ٹھٹھہ کا صوبیدار ہو کر آیا۔[3]

۳۲۔ شاکر خان (۱۱۲۳ھ):

مہین خان کے بعد ٹھٹھہ کی حکومت شاکر خان کو ملی، تحفۃ الکرام میں ہے کہ میر عنایت اللہ شاکر خان (۱۱۲۳ھ) میں ٹھٹھہ کا صوبیدار ہو کر آیا، لیکن میر عبدالجلیل بلگرامی نے اس کی تاریخ صوبیداری ٹھٹھہ ۱۱۲۴ھ نکالی ہے اور تبصرۃ الناظرین میں بھی اس کی صوبیداری ٹھٹھہ کی تاریخ ۱۱۲۴ھ ہی بیان کی ہے۔

۳۳۔ مہین خان دوبارہ ٹھٹھہ کی حکومت پر (۱۱۲۴ھ تا ۱۱۳۳ھ):

اسی سال نواب مہین خان دوسری مرتبہ ٹھٹھہ کی حکومت پر مقرر ہو کر آیا۔

اسی کے زمانے میں بہادر شاہ[4] نے ۲۱ محرم ۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) میں لاہور میں وفات پائی اور اُس کے بعد اس کا بیٹا معزالدین جہاندار شاہ اس کا جانشین ہوا اور اس نے مہین خان کو ٹھٹھہ کی حکومت سے موقوف کر دیا۔[5]

---

(1) ایضاً۔ ص ۳۰۸۔

(2) بہادر شاہ: قطب الدین شاہ عالم بہادر شاہ، یکم رجب ۱۰۵۳ھ میں نواب بائی کے بطن سے برہان پور میں پیدا ہوا، اور محمد معظم کے نام سے موسوم ہوا۔ اسے ایام شاہزادگی میں بہادر شاہ کا خطاب ملا، اپنے تیسرے بھائی اعظم شاہ کے جنگ میں مارے جانے کے بعد ۱۹ ربیع الاول روز دوشنبہ ۱۱۱۹ھ کو اپنے باپ عالمگیر کی جگہ آگرے میں تخت پر بیٹھا۔ "ماآفتاب عالم تابیم" (۱۱۱۹ھ) سے اس کی تاریخ جلوس نکلتی ہے، وفات کے بعد اُسے خلد منزل کہا جانے لگا۔ اس کا مزار موتی مسجد کے متصل خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کے جوار میں واقع ہے۔ پائین مزار پر یہ کتبہ نصب ہے:

درخواست اللہ بامر مصطفیٰ
شاہ عالم را بود جنت جزا (۱۱۲۴ھ)

تحفۃ الکرام (طبع راشدی، ص ۳۵۷، ج نمبر ۱)۔
بحوالہ مفتاح التواریخ، ص ۲۹۷-۲۹۸۔

(3) فرخ سیر، معین الدین محمد فرخ سیر ولد عظیم الشان بن شاہ عالم بہادر نے ۱۷ ذیقعدہ ۱۱۲۴ھ میں جہاندار شاہ پر فتح حاصل کی اور اکبر آباد میں تخت سلطنت پر بیٹھ کر دہلی پہنچا۔ امیر الامرا ذوالفقار خان اور راجا سبہ چند دیوان امیر الامرا کو گرفتار کروا کر ان کی زبانیں کٹوا دیں۔ جہاندار شاہ کے بہت سے اُمرا کو تہ تیغ کرایا اور جہاندار شاہ کے بیٹے اعزالدین کو اور اعظم شاہ کے بیٹے اور اپنے برادر خورد ہمایوں بخت کو اندھا کرایا اور جیل بھجوا دیا، فرخ سیر نے جو سکہ جاری کیا، اس پر مشہور ہزل گو جعفر زٹلی نے یہ تاریخ لکھی:

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ پشہ کش فرخ سیر

کہتے ہیں کہ فرخ سیر نے اسی شعر پر جعفر زٹلی کو قتل کرا دیا۔ ۸ ربیع الاول ۱۱۳۱ھ میں قطب الملک سید عبداللہ خان اور امیر الامرا سید حسین علی خان نے فرخ سیر کو محل سے نکال کر اندھا کر کے قید میں ڈال دیا۔ دو ماہ کے بعد قطب الملک کے حکم سے قید خانے میں قتل کیا گیا (تحفۃ الکرام طبع راشدی، ص ۳۵۸-۳۵۹ حاشیہ نمبر ۳)

(4) تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ) حاشیہ ص ۳۰۹۔

عہد حکومت

معزالدین جہاندار شاہ (۱۱۲۴ھ) و محمد فرخ سیر (۱۱۲۴ھ تا ۱۱۳۱ھ)

۳۴۔ خواجہ محمد خلیل خان (۱۱۲۴ھ):

۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) ہی میں خواجہ محمد خلیل خان ٹھٹھہ کا حاکم ہو کر آیا اور ۹ ماہ کے عرصے کے بعد سادات بارھہ کی اعانت سے جہاندار شاہ معزول ہوا اور فرخ سیر تخت سلطنت پر بیٹھا۔

۳۵۔ عطر خان (۱۱۲۴ھ تا ۱۱۲۵ھ):

فرخ سیر کے تخت نشین ہونے کے فوراً بعد ہی عطر خان ولد سعید خان بہادر بن سعید خان المشہور بہ خانہ زاد خان سعید خانی چنگیز خانی ٹھٹھہ کی حکومت پر آیا۔ یہ نوعمر اور ناتجربہ کار تھا۔ اس کی حکومت کا سارا کاروبار محمد یعقوب کشمیری چلاتا تھا، جس کی وجہ سے کچھ ہی عرصے میں اس کی حکومت کا نظم و نسق درہم برہم ہو گیا اور اسے میر لطف علی خان کے ساتھ طویل جنگ لڑنی پڑی۔ لیکن باوجود شجاعت و بہادری کے پورے ایک سال کے محاصرے، مورچہ بندی اور بے شمار تدبیریں اختیار کرنے کے صف بصف لڑائی میں عطر خان مارا گیا۔[1] اور مکلی میں مدفون ہوا۔ مکلی نامہ میں ہے کہ اس کے مزار پر جو کتبہ نصب ہے اس کی عبارت یہ ہے۔

بتاریخ ہفتم شہر محرم مرحوم غیاث الدین عطر خان عرف سعد

خان بن سعید خان بگلگونہ شہادت رحلت نمود ۱۱۲۶ھ۔[2]

۳۶۔ میر لطف علی خان (۱۱۲۵ھ تا ۱۱۲۸ھ):

میر لطف علی خان جس کا نام محمد شفیع تھا اور جو سید العارفین میر محمد یوسف رضوی بکھری[3] کی اولاد میں تھا، عطر خان سے ملک چھین کر خود مختاری کا دم بھرنے لگا۔ اس کی حکومت کی ابتدا ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) میں ہوئی، ۱۱۲۷ھ (۱۷۱۴ء) میں عطر خان کے قتل کے بعد یہ خود مختار ٹھٹھہ کا حاکم بن بیٹھا، ۱۱۲۷ھ میں اسے شجاعت خان کا خطاب ملا، اور اس نے بڑی شان و سوکت سے ایک سال سے زائد حکومت کی، وہ ٹھٹھہ کی حکومت سے پہلے اور بعد بھی بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہا۔ میر علی شیر قانع کا بیان ہے کہ وہ نہایت قابل شخص تھا اور نظم و نثر میں بڑا کمال رکھتا تھا، شاعر تھا اور 'ہمت' تخلص کرتا تھا، مقالات الشعرا میں ہمیں اس کی نظم و نثر کے نمونے ملتے ہیں۔

میر لطف علی خان نے ۱۱۵۴ھ (۳۳-۱۷۳۲ء) کے اختتام پر وفات پائی "اُدخلہ فی الجنات" سے اس کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔[4]
۱۱۴۵ھ

۳۷۔ نواب اعظم خان (۱۱۲۸ھ تا ۱۱۳۲ھ):

اُس کے بعد ۱۱۲۸ھ (۱۶۱۷ء) ۵ جلوس فرخ سیری میں میر لطف علی خان کے موقوف ہونے کے بعد نواب اعظم خان بن صالح بن فدائی خان جہان بہادر عرف میر بابا کوکلتاش کا پوتا جو کہ خاندان سادات میں سے تھا، ٹھٹھہ کا حاکم ہو کر آیا، ابتداً اس نے کچھ عرصے کے لیے اپنی جانب سے خواجہ خلیل کو بھیجا، اس کے بعد وہ خود آ پہنچا اور چار سال تک حکومت کرتا رہا۔

صوفی شاہ عنایت کی شہادت:

اُس کے دور حکومت میں مقامی لوگوں کو طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچیں، قحط کی مصیبت عام ہوئی اور سندھ کے مشہور بزرگ صوفی شاہ عنایت کی شہادت کا واقع بھی اس کے زمانے میں پیش آیا۔

صوفی شاہ عنایت اللہ بن مخدوم فضل اللہ بن ملّا یوسف بن ملّا شہاب الدین بن ملّا رجب بن مخدوم صدو لنگاہ اپنے وقت کے نہایت جلیل القدر صوفی و درویش تھے۔ وہ دولتِ حق شناسی کے لیے ملکوں ملکوں پھرتے رہے، یہاں تک کہ دکن میں پہنچ کر شاہ عبدالملک کے دست حق پرست پر بیعت ہو کر تصوف کے تمام منازل طے کیے۔ وہ علوم ظاہری حاصل کرنے کے لیے بھی شاہ غلام محمد کی خدمت میں پہنچے، جو اس وقت شاہجہان آباد میں مقیم تھے۔ اگرچہ شاہ عنایت نے علوم ظاہری کی تعلیم شاہ غلام محمد سے حاصل کی تھی، لیکن سلوک کی منزلیں شاہ غلام محمد نے شاہ عنایت سے طے کی تھیں۔ وہ بھی ٹھٹھہ اُن کے ساتھ آئے۔ شاہ غلام محمد شیخ کی ارادت میں بعض ایسے طریقے اختیار کرتے تھے، جو علما کے نزدیک ناجائز تھے، مثلاً وہ اپنے شیخ کو سجدۂ تحیت کرتے تھے۔ علماء نے اس پر انہیں ٹوکا، تو شاہ عنایت نے انہیں شاہجہان آباد چلے جانے کا حکم دیا، اور خود پرگنۂ بٹورہ میں غازیاہ کے کنارے موضع جھوک عرف میراں پور میں اپنے مریدین و معتقدین کی ایک جماعت کے ساتھ مقیم ہو کر عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ شاہ عنایت کی ریاضت و عبادت کی شہرت دور دور پہنچی اور اطراف و اکناف کے لوگ عقیدت مندانہ طور پر آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔

اُن کے عقیدت مندانہ ہجوم کو دیکھ کر آس پاس کے دو حلقوں میں رقابت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اُن میں سے ایک حلقہ اطراف و جوانب کے زمینداروں کا تھا اور دوسرا آپ کے قریب کے موضع بلڑی کے سادات کا گروہ تھا، جن کی پیری مریدی اور عقیدت مندی کا فروغ شاہ عنایت کی وجہ سے کم ہوتا جاتا تھا اور اُن کے مریدین و معتقدین شاہ عنایت کے حلقے میں شامل ہوتے جاتے تھے، جس کی وجہ سے یہ سادات بلڑی شاہ عنایت سے سخت ناراض تھے۔

تحفۃ الکرام میں انفرادی طور پر بھی اُن اشخاص کے نام دیے گئے ہیں جنہوں نے شاہ عنایت کے خلاف ناظم ٹھٹھہ کے پاس شکایتیں کی

---

(2) مکلی نامہ سندھی، حاشیہ ص ۶۳۳۔

(3) میر محمد یوسف رضوی بکھری: ولد میر محمد جادم، نسب کے لحاظ سے رضوی سادات میں سے تھے۔ ان کے بزرگ ایران سے سندھ آئے اور بکھر میں سکونت اختیار کی، میر محمد یوسف بکھر سے ترکِ وطن کر کے ٹھٹھہ میں آباد ہوئے، ٹھٹھہ میں سید مبارک کے ہاتھ پر بیعت ہو کر تصوف و عرفان کی منزلیں طے کیں۔ سید مبارک، میراں سید محمد جونپوری کے خلیفہ میاں دانیال ٹھٹھوی کے مرید تھے۔ سید یوسف بیعت ہونے کے بعد ٹھٹھہ کو چھوڑ کر مکلی کی پہاڑی میں شب و روز عبادت میں مشغول رہے، یہ مکلی میں اوس جگہ مقیم رہے، جہاں میراں سید محمد جون پوری ٹھہرے تھے۔ انتقال کے بعد میر محمد یوسف رضوی وہیں مدفون ہوئے، میر مرحوم فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے (حواشی مکلی نامہ، مؤلف سید حسام الدین راسدی، ص ۶۲۸-۶۳۰)۔

(4) تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۰۹-۳۱۰۔

تھیں، اُن میں بلڑی کے سادات میں سید عبدالواسع بن سید عبدالغنی بن سید عبدالدلیل بن سید دین محمد تھے دوسرے نور محمد بن منبہ بن رادہ بن بابو بلیجا زمیندار بلیجا پور تھا۔ تیسرے حمل بن لاکھا بن لاکھا جت زمیندار تھا، لیکن سادات بلڑی مخالفت میں سب سے زیادہ سخت تھے، جس زمانے میں کہ شاہ عنایت کے خلاف شکایت پیش ہوئی، اس زمانے میں ٹھٹھہ کا ناظم لطف علی تھا، اس نے سادات بلڑی کی جنبہ داری میں بغیر تحقیقات کیے حکم دے دیا کہ وہ صوفی شاہ عنایت اور اُن کے مریدوں سے خود نبٹ لیں، ان لوگوں نے لطف علی کا اشارہ پا کر شاہ عنایت کی خانقاہ پر حملہ کر دیا، اس میں خانقاہ کے بہت سے درویش شہید ہوئے، ان بے گناہوں کے ورثا نے جب استغاثہ کیا تو حکومت کی جانب سے قاتلوں کی زمینیں مقتولوں کے ورثا کو دلا دی گئیں۔

سنہ ۱۱۲۸ھ (۱۷۱۶ء) میں لطف علی خان کی جگہ نواب اعظم خان ٹھٹھہ کا ناظم ہو کر آیا، وہ شاہ عنایت کے دشمنوں کی باتوں سے متاثر ہو کر ان کی امداد کے لیے تیار ہو گیا، اس نے شاہ صاحب کی مخالفت میں ان زمینوں کے محصول جو خانقاہ کے متصل تھیں اور جن کے محصول معاف ہو چکے تھے، دوبارہ ان زمینوں پر محصول لگا دیا اور محصول کا مطالبہ کیا، شاہ عنایت نے جواب دیا، کہ جب یہ محصول بادشاہ کی جانب سے معاف ہو چکے ہیں، اب ہم سے کیسے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اعظم خان اس جواب پر برہم ہو گیا، اس نے مرکز میں لکھ بھیجا کہ صوفی شاہ عنایت اور ان کے مرید سرکاری محصول ادا نہیں کرتے، ان سے بغاوت کی بو آرہی ہے۔ وہاں سے حکم ملا کہ اس فتنے کو روکا جائے، اس حکم کے ملنے پر اعظم خان نے اپنی فوج کے علاوہ یار محمد خان عباسی اور دوسرے رئیسوں کے نام احکام جاری کیے کہ وہ بھی مدد کے طور پر اس فوج میں شریک ہوں، اس فوج نے صوفی عنایت کی خانقاہ پر ہلّہ بول دیا۔ پہلے تو پورے چار ماہ یہ فوج شاہ صاحب کی خانقاہ کا محاصرہ کیے پڑی رہی شاہ صاحب کے فقیر راتوں میں اس فوج پر شب خون مارتے تھے۔

مقالات الشعرا میں ہے کہ ۱۸ ذیقعدہ ۱۱۲۹ھ (۳۱ اکتوبر ۱۷۱۷ء) کو جنگ کا آغاز ہوا، درویشوں کا طریقہ یہ تھا کہ رات کے وقت تلواریں لے کر نکلتے اور محاصرہ کرنے والوں پر شب خون مارتے، اس طرح اعظم خان کی فوج کے بہت سے آدمی مارے گئے۔

صوفی شاہ عنایت نے درویشوں کو تاکید کر دی تھی کہ وہ حملہ کرتے وقت نعرے بالکل نہ لگائیں، اور حکم دیا تھا کہ جب تک تم خاموشی سے حملے کرتے رہو گے، تمہیں کامیابی ہو گی، اتفاق سے ایک شب خون کے موقع پر ایک درویش کا پاؤں لکڑی سے ٹکرایا، اس کے منہ سے بے اختیار اسم ذات زور سے نکلا، جو ان لوگوں کا عام دستور تھا، دوسرے درویشوں نے بھی یہ نعرہ سن کر نعرے لگانے شروع کر دیے، اس طرح مخالفوں کو شب خون مارنے والوں کا پتا چل گیا اور انہوں نے باقاعدہ تیاری کے ساتھ جنگ شروع کر دی، درویش شکست کھا گئے، لیکن باقاعدہ جنگ ختم نہیں ہوئی اور درویش حملے کرتے رہے۔

۹ صفر ۱۱۳۰ھ (یکم جنوری ۱۷۱۸ء) کو شاہ عنایت کے سامنے صلح کی پیش کش کی گئی جن لوگوں نے بیچ میں پڑ کر صلح کرائی، ان میں میاں یار محمد خان کلہوڑا کا بیٹا محمد خان اور میر شہداد بلوچ شامل تھے۔ معاہدۂ صلح یہ ہوا کہ درویشوں کے جان و مال کو نقصان نہ پہنچایا جائے گا۔

اس صلح کے بعد صوفی شاہ عنایت اعظم خان کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ صلح نامہ ایک دھوکا تھا اور اس نے شاہ صاحب کو گرفتار کر کے پوچھا کہ بتاؤ تم نے شورش کیوں برپا کی تھی؟ شاہ عنایت نے جواب دیا۔

آں روز کہ توسنِ فلک زیں کردند
آرائش مشتری ز پرویں کردند
ایں بود نصیب ما ز دیوانِ قضا
ما را چہ گنہ قسمتِ ما ایں کردند

اس جواب کے بعد نواب اعظم خان کے ایک مصاحب محمد رضا نے کہا:

دوست بیدارِ بشو عالم خواب است ایں جا
حرف بیہودہ مگو پاے حساب است ایں جا

شاہ عنایت نے فوراً جواب دیا کہ:

در کوے نیک نامی مارا گزر ندادند
گر تو نمی پسندی تغیر کن قضا را

اعظم خان نے کہا کہ اب اس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

شاہ عنایت نے جواب میں فرمایا کہ:

محب حق کے لیے سزا وہی حیثیت رکھتی ہے، جو سونے کے لیے آگ۔

اعظم خان نے کہا کہ تم نے بدنامی کیوں مول لی، اور تیر بلا کا نشانہ کیوں بنے؟

شاہ عنایت نے جواب میں یہ شعر پڑھا کہ:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

نواب اعظم خان نے کہا کہ: یہ تو بتاؤ کہ تم نے بادشاہ کی فرماں برداری سے باہر کیوں قدم رکھا، حالانکہ قرآن میں اولوالامر کی اطاعت کا حکم ہے؟

شاہ عنایت نے جواب میں یہ شعر پڑھا:

ما مریدان رو بسوے کعبہ چوں آریم چوں
رو بسوے خانۂ خمار دارد پیر ما

نواب اعظم خان نے کہا اب آرزوؤں میں ناکام ہونے پر غمگین ہونے سے کیا نتیجہ؟

شاہ عنایت نے جواب میں یہ شعر پڑھا۔

من از آں دم کہ وضو ساختم از چشمۂ عشق
چار تکبیر زدم یکسرہ بر ہر چہ کہ ہست

نواب اعظم خان نے شاہ عنایت کو قید میں ڈال دینے کا حکم دیا۔ شاہ عنایت نے اس حکم کی بے تکلف تعمیل کی اور یہ شعر ان کی زبان پر تھا:

ساقیا برخیز و در دہ جام را
خاک بر سر کن غم ایام را

۱۵ صفر ۱۱۳۰ھ (۷ جنوری ۱۷۱۸ء) کو شاہ عنایت کو شہید کیا گیا، آخری وقت میں یہ شعر شاہ صاحب کی زبان پر تھا:

رہانیدی مرا از قیدِ ہستی
جزاک اللہ فی الدارین خیرا

تلوار گردن پر پڑی تو چار تکبیریں کہہ کر واصل حق ہوئے۔[1]

نواب اعظم خان پہلے ہی ملک میں غلہ گراں ہونے کی وجہ سے بدنام تھا، شاہ عنایت کی شہادت نے اسے اور ملک میں روسیاہ کر دیا، جس کی وجہ سے وہ ۱۱۳۱ھ (۱۹-۱۷۱۸ء) میں ٹھٹھہ کی حکومت سے معزول ہوا۔

عہد رفیع الدرجات (۱۱۳۱ھ) رفیع الدولہ (۱۱۳۱ھ) نیکو سیر (۱۱۳۱ھ) ابراہیم (۱۱۳۱ھ)

۳۸۔ نواب مہابت خان (۱۱۳۲ھ تا ۱۱۳۴ھ):

فرخ سیر کے زوال کے بعد ۱۱۳۱ھ (۱۹-۱۷۱۸ء) میں محمد شاہ بادشاہ غازی تخت نشین ہوا، اس سال بہادر شاہ کے وزیر اعظم منعم[2] خان خان خاناں کا بیٹا محمد کاظم مخاطب بہ مہابت خان غالب جنگ جلوس محمدی میں ٹھٹھہ کا ناظم ہو کر آیا۔ تحفۃ الکرام میں ہے کہ یہ بڑا معزز، کم آزار، غریب پرور امیر تھا، ہمیشہ اہل کمال کی صحبت میں رہتا تھا، شاعری سے ذوق رکھتا تھا اور شاعری میں کاظم تخلص کرتا تھا۔ بہت سے شعرا اس کے مصاحب تھے، ان میں شرف الدین علی محتسب، مسکین ہندی اور ضیا ٹھٹھوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نواب مہابت خان نے ۱۱۳۴ھ (۱۷۲۱ء) میں یہیں وفات پائی اور اس کی لاش لاہور لے جائی گئی۔[3]

۳۹۔ سلطان محمود خان (۱۱۳۴ھ تا ۱۱۳۵ھ):

اس کے بعد ۱۱۳۴ھ (۱۷۲۱ء) مہابت خان کا بیٹا سلطان محمود خان ٹھٹھہ کا ناظم مقرر ہوا۔ اس کے زمانے میں اکثر عمال مالیات ہضم کر جاتے تھے، اس لیے مہابت خان کی بیگم نے کاروبار سنبھالنے کے لیے رضی محمد خان کو بھیجا، جو ۱۱۳۶ھ (۱۷۲۳ء) میں آیا اور ایک سال تک رہا۔[4] یہاں تک کہ دوسرے سال نواب سیف اللہ خان ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہوا اور اس نے اپنی نیابت کے لیے عبدالسمیع خان برادر شاہ عبدالغفور ہالہ کندی کو جو قوم سانور سے تھا ٹھٹھہ بھیجا۔ یہ بحیثیت نائب کے ۱۱۳۵ھ سے ۱۱۳۷ھ تک رہا۔

۴۰۔ نواب سیف اللہ خان (۱۱۳۷ھ تا ۱۱۴۲ھ):

ماہ ذوالحجہ ۱۱۳۷ھ (۱۷۲۴ء) میں نواب سیف اللہ خان ٹھٹھہ کا ناظم ہو کر آیا۔ یہ پہلے نواب ابراہیم خان بن علی مردان خان کا باڈی گارڈ تھا۔

تحفۃ الکرام میں ہے کہ یہ ایک عالی قدر اور بلند مرتبہ امیر تھا، اس کے زمانے میں ٹھٹھہ کو جو رونق حاصل ہوئی، وہ خدا اس شہر کو پھر نصیب کرے، مذہباً شیعہ تھا، اس لیے اس نے شیعیت کو بھی فروغ دیا، اس نے شرعی اوامر و نواہی کی طرف بھی توجہ دی اور ملک میں ہر قسم کے مسکرات کو ممنوع قرار دیا۔

کہتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص جو بھنگ کا عادی تھا، اس کے پاس

---

(1) شاہ عنایت کے حالات زندگی اور شہادت کا واقعہ تحفۃ الکرام اور مقالات الشعرا سے ماخوذ ہے۔

(2) منعم خان خان خاناں: وزیر شاہ عالم بادشاہ، ۱۰۶۲ھ میں پیدا ہوا اور ۱۱ محرم روز دو شنبہ بوریہ کے قریب پرانے ناسور کے مرض میں وفات پائی۔ شاعر تھا اور رسالہ الھامات منعمی اس کی تالیف ہے۔ تحفۃ الکرام، (طبع راشدی) ص ۳۷۰، حاشیہ نمبر ۲ بحوالہ تاریخ محمدی۔

(3) تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۳۱۲۔

(4) تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۳۱۴۔

آیا اور کہا کہ آپ نے ہم سے ہماری محبوبہ کو چھین لیا، اس کی مراد بھنگ سے تھی۔ نواب نے برجستہ جواب دیا کہ تمہاری محبوبہ گداگر اور آوارہ ہوگئی تھی، اس لیے میں نے اُسے پردے میں بٹھادیا۔

نہایت بلند اخلاق اور پاک طینت امیر تھا، ۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء) میں فتق کے مرض میں مبتلا ہو کر اُس نے ۹ ذیقعدہ ۱۱۴۲ھ (۱۷۲۹ء) کو وفات پائی اور کوہ مکلی پر جلوہ گاہِ امامین کے متصل دفن ہوا۔ یہی سنہ تاریخ اس کے لوحِ مزار پر کندہ ہے۔[1]

اس کے بعد کچھ عرصے تک اس کا بیٹا صادق علی خان شہر میں رہا۔[2]

۴۱۔ نواب دلیر دل خان (۱۱۴۳ھ تا ۱۱۴۵ھ):

سیف خان کے بعد ۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء) کے اواخر میں ایک جلیل القدر امیر نواب معین الدولہ دلیر دل خان بہادر نصیر جنگ ٹھٹھہ کا صوبیدار ہو کر آیا۔ یہ دو سال تک نہایت امن و امان سے حکومت کرتا رہا۔

ٹھٹھہ اجارہ داری پر:

تحفۃ الکرام میں ہے کہ اس کے بعد ٹھٹھہ کا صوبہ انعام میں محمد اسحاق، عمدۃ الملک امیر خان المتخلص بہ انجام کو ملا اور اجارہ داری پر اس کے حوالے کیا گیا اور اس کی نیابت میں ہمت دلیر خان بن دلیر دل خان ٹھٹھہ آیا۔

۴۲۔ نواب ہمت دلیر خان (۱۱۴۵ھ تا ۱۱۴۹ھ):

تحفۃ الکرام میں ہے کہ نواب دلیر دل خان کے فرزند نواب ہمت دلیر خان نے یہ خیال کر کے کہ ممکن ہے کہ کوئی دوسرا جا کر اس کے والد سے حساب کتاب طلب کرے، اُس نے امیر خان سے مقررہ رقم کا پٹہ طے کر کے ٹھٹھہ کا رخ کیا، اور ۱۱۴۵ھ (۳۳-۱۷۳۲ء) میں وہاں پہنچا، حالانکہ ملک اجارہ داری میں تبدیل ہونے کی وجہ سے بڑا فرق پیدا ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی اس نے چار سال وہاں اچھی طرح گزارے۔[3]

۴۳۔ نواب صادق علی خان (۱۱۴۹ھ تا ۱۱۵۱ھ):

اس کے موقوف ہو جانے کے بعد نواب صادق علی خان بن نواب سیف اللہ ۱۱۴۹ھ (۱۷۳۶ء) میں امیر خان سے ٹھٹھہ کو اجارے پر لے کر ٹھٹھہ پہنچا، ایک سال اس نے پورا کیا، لیکن دوسرے سال اُسے نقصان ادا کرنا پڑا، چونکہ اُسی زمانے میں خدا یار خاں عرف میاں نور محمد کلہوڑا کے وکیل شیخ غلام محمد ولد شیخ عزیز اللہ نے حضور میں کہہ سن کر پہلے ہی انتظام کر لیا تھا، اس لیے صادق علی خاں نے اجارے میں نقصان دیکھ کر ملک کو خدا یار خاں کے وکیل شیخ غلام محمد کے حوالے کر دیا۔[4]

اس طرح مغل حکمرانوں کی حکومت ٹھٹھہ سے ختم ہوگئی اور سندھ میں کلہوڑا خاندان کی حکومت کا آفتاب طلوع ہوا۔ راشدی صاحب نے بحوالہ تاریخ مظفری لکھا ہے کہ جب مغلوں کا اقتدار سندھ میں ختم ہوا، اس وقت صوبۂ ٹھٹھہ چار سرکاروں پر مشتمل تھا اور ان چاروں سرکاروں کے ستاون پرگنے تھے اور اس کی مالگزاری سات کروڑ، انچاس لاکھ، چھہتر ہزار نو سو روپے وصول ہوتی تھی۔[5]

ٹھٹھہ کے مغل دورِ حکومت پر تبصرہ

ٹھٹھہ میں مغل دورِ حکومت ۱۰۰۰ھ (۹۲-۱۵۹۱ء) سے شروع ہو کر ۱۱۵۱ھ (۳۹-۱۷۳۸ء) پر ختم ہوتا ہے۔ ان کی ٹھٹھہ میں مدت حکومت تقریباً ۱۴۷ سال ہے۔ یہ دورِ صوبیداری سے شروع ہو کر آخری دور کے بادشاہ گردی کی وجہ سے اجارہ داری پر ختم ہوا۔ اس عرصے میں تقریباً ۶۴ صوبیدار مغل حکومت کی جانب سے ٹھٹھہ آئے، لیکن انہوں نے اس صوبے کے نظم و نسق کو کس طرح چلایا، ملکی معاملات کو کس طرح حل کیا، ملک کی سیاست میں کیا حصہ لیا۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کارنامے انجام دیے، افسوس ہے کہ مغل دور کی تاریخوں میں ہمیں اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، لیکن صرف ان میں سے بعضوں کے نیک فطرت اور بعضوں کے بد فطرت ہونے کے متعلق اشارات ملتے ہیں۔ مثلاً میرزا رستم جو عہد جہانگیری میں ٹھٹھہ کا صوبیدار ہو کر آیا۔ تحفۃ الکرام میں بحوالہ منتخب التواریخ ہے کہ اُسے جہانگیر نے صوبیداری پر رخصت کرتے وقت تاکید کی تھی کہ ترخانیوں کے دور میں اس ملک پر حد سے زیادہ مصائب گزر چکے ہیں وہ وہاں پہنچ کر وہاں کی رعایا کی دلجوئی

---

(1) ایضاً۔ ص ۳۱۳-۳۱۴۔

(2) تحفۃ الکرام (طبع راشدی)، ص ۳۷۵ بحوالہ حواشی مکلی نامہ، ص ۷۴۱-۷۴۳۔

(3) تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۱۵۔

(4) تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۱۵۔

(5) تحفۃ الکرام (طبع راشدی) ص ۳۸۶ حاشیہ نمبر ۲ بحوالہ تاریخ مظفری، ص ۱۶۹۔

کرے اور مخلوق کو آرام پہنچائے، لیکن وہ ٹھٹھہ آنے کے بعد بالکل برعکس نکلا، جب اُس کے ظلم و ستم کی اطلاع جہانگیر کو ملی تو اُس نے میرزا رستم کو بلا کر راجا انی سنگھ دنی رائے کے سپرد کیا کہ وہ اس کی تحقیقات کرے تاکہ دوسروں کو عبرت اور تنبیہ ہو۔

اسی طرح ان صوبیداروں میں نواب امیر خاں، عبدالرزاق معموری، نواب ابو النصر شائستہ خاں، ظفر خاں احسن، نواب حفظ اللہ خاں، میر امین الدین خاں حسین، میر لطف علی خاں ہمت، نواب مہابت خاں، نواب سیف اللہ خاں وغیرہ کا تذکرہ مغل دور کے مورخین نے اُن کے ذاتی اوصاف و محاسن کی وجہ سے نہایت اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ لیکن اُن کے دور کے وہ کارنامے جو انہوں نے اس صوبے کے لیے انجام دیے ہوں، ہمیں ان کے متعلق کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اس لیے ہم اُن کے فلاحی کارناموں پر سیر حاصل تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں۔ ٹھٹھہ کی مشہور تاریخی مسجد مسجد شاہجہانی، آج بھی ہمیں مغل دور کی یاد دلاتی ہے۔ جو ایک سندھی صوبیدار میر ابو البقا خاں نے شاہجہاں کے حکم سے تعمیر کرائی تھی۔ ٹھٹھہ کی مسجد جامع فرخ، مغل دور کے ایک امیر مصطفیٰ خاں بایزید کی تعمیر کرائی ہوئی ہے۔

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جو مغل صوبیدار خواہ وہ سندھی ہوں یا ہندی، ٹھٹھہ آئے، اُن میں بعض علم و فضل، شعر و ادب اور ذاتی صلاحیتوں کے اعتبار سے ممتاز درجہ رکھتے تھے، مثلاً ظفر خاں احسن عقل و تدبیر میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا، شاعر تھا، شعر آکا بے حد قدر دان تھا۔ نواب حفظ اللہ خاں، نواب احمد یار خاں، نواب مہابت خاں کاظم، نواب سیف اللہ خاں، میر ابو البقا امیر خاں، میر عبدالرزاق معموری، میرزا عیسیٰ ترخان ثانی وغیرہ، ان سب نے علم و فن، شعر و ادب کی سرپرستی کی اور ان کی قدردانیوں نے شعر و ادب کو نئی زندگی بخشی۔

سندھ کے مورخ سید حسام الدین راشدی نے تذکرہ امیر خانی میں مغل گورنروں کی آمد و رفت سے سندھ کے شعر و ادب پر جو اثرات مرتب ہوئے، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے میر حیدرالدین کامل کے ضمن میں لکھا کہ:

> مغل گورنروں کی سندھ میں آمد و رفت نے ہندوستانی شاعروں کو سندھ سے روشناس کرایا، کئی اُردو گو شاعر مغل صوبیداروں کی وجہ سے سندھ پہنچے، ان شعرا اور ادیبوں سے سندھ کے شعرا کی رسم و راہ بڑھی، اُن کو دیکھ کر سندھ کے فارسی گو شعرا نے ریختہ جیسی نئی زبان میں شاعری شروع کی۔ محمد سعید راہبر گوالیاری (۱۱۳۷ھ - ۱۱۴۳ھ) نواب سیف اللہ خاں کے ساتھ آیا۔ میر جعفر علی خاں بینوا نواب مہابت خاں کاظم کے دور میں ۱۱۳۴ھ تا ۱۱۳۵ھ میں ٹھٹھہ وارد ہوا سید فضائل علی خاں بیقید بھی یہاں آنے والے کسی حاکم کے ساتھ ٹھٹھہ آیا، محسن الدین شیرازی ۱۱۷۳ھ سے کچھ پہلے ٹھٹھہ آیا اور میر قانع سے ملا تھا، عماد الملک نواب غازی الدین فیروز جنگ جن کی یادگار دہلی میں عربک کالج کے نام کی ایک تاریخی عمارت ہے، وہ بھی ٹھٹھہ آئے، ان کے علاوہ جلیل القدر ادیب و شاعر و عالم سید عبدالجلیل بلگرامی اور میر غلام علی آزاد بلگرامی و قانع نویسی کے سلسلے میں ۱۱۱۶ھ سے ۱۱۴۰ھ تک سندھ میں رہے، یہ بزرگ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں ریختہ میں شعر کہنے کا نیا نیا ذوق پیدا ہوا تھا، آبرو، مضمون، ناجی، مظہر جان جاناں اسی ابتدائی دور کے اردو گو شاعر ہیں، ولی گجراتی نے بھی اسی دور میں فروغ حاصل کیا۔

سندھ میں ریختہ شاعری کا یہ پہلا دور ہے، سندھ میں ہندوستان کے ان شاعروں نے اس نئی زبان کی شاعری سے دلچسپی پیدا کی، مقالات الشعرا کے ذریعہ ہمیں چند ایسے سندھی فارسی گو شعرا کا پتا چلتا ہے جنہوں نے تفنن طبع کی خاطر اردو میں طبع آزمائی کی، ان میں نواب سیف اللہ کے دور میں شیخ ورو، عبدالسبحان فائز ٹھٹھوی (۱۱۳۷ھ - ۱۱۴۷ھ) مخدوم محمد معین بیراگی اسی زمانے کے شاعر ہیں۔ میر حیدر الدین ابو تراب کامل بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔ دارالسلطنت دہلی میں جیسے ہی ولی گجراتی کا دیوان پہنچا، اور اردو میں شعر گوئی کا ذوق بیدار ہوا، اسی طرح سندھ کے دارالسلطنت میں بھی ان ہندوستانی شعرا کی وجہ سے سندھی شعرا میں اردو شاعری کی تحریک پیدا ہوئی۔[1]

مختصر یہ کہ ان صوبیداروں نے جن میں شمالی ہند اور سندھی نژاد اُمرا دونوں شامل ہیں، علم و فضل، شعر و ادب کی سندھ میں سرپرستی کی، ان کا یہ کارنامہ ہمیں اس دور میں نمایاں نظر آتا ہے۔

---

[1] تذکرہ امیر خانی سندھی (تالیف سید حسام الدین راشدی) ص ۴۲۳-۴۲۴۔

باب :25

کلہوڑا دور حکومت

کلہوڑا خاندان

۱۱۱۱ھ (۱۷۰۰-۱۶۹۹ء) تا ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۴ء)

خاندان و نسب:

سندھ میں مغل گورنروں کی حکومت ختم ہوتے ہی کلہوڑہ خاندان کا آفتاب سلطنت طلوع ہوا، کلہوڑوں اور اُن ہی کی ایک شاخ داؤد پوتروں کا دعویٰ ہے کہ اُن کا سلسلۂ نسب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضہ سے جاملتا ہے، اس لیے وہ عباسی ہیں۔

تاریخی اعتبار سے جو شواہد ان کے عباسی ہونے کے ملتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

مآثر الامرا میں خدایار خان کے حالات میں ہے کہ:

بر زبان سندھ مشہور بہ لیٹی در نسب عباسی است، ولقب عشیرہ او بر زبان سندھ کلہوڑہ است

سندھ کا جاگیر دار لیٹی کے نام سے مشہور ہے نسب میں عباسی اور اُس کے قبیلے کا نام اہل سندھ کی زبان میں کلہوڑہ ہے۔

صاحب تحفتہ الکرام میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے اس خاندان کے متعلق لکھا کہ اہل خبر کو معلوم ہونا چاہیے کہ ماہر انساب کے فیصلوں کے مطابق اس بزرگ گروہ کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضہ سے منتہی ہوتا ہے۔

صاحب لُب تاریخ سندھ خان بہادر خداداد خان نے ان کے سلسلۂ نسب کے بارے میں تحفتہ الکرام ہی کی روایت کی تائید کی ہے۔

ملک باغ علی خائف نے میاں نور محمد عباسی کے دور میں شاہنامے اور سکندر نامے کے طرز پر نامۂ نغز کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، جس کی نقل سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد کی لائبریری میں موجود ہے، لیکن وہ بھی اس خاندان کو عباسی بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

کلہوڑے ز عباس پیدا شدند
ازیں جہت در نسب عباسی اند[1]

مولانا غلام رسول مہر نے اپنی مشہور تاریخ، تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) حصہ اول میں ان کے عباسی ہونے کا ثبوت انند رام مخلص[2] کے ایک مکتوب سے جو اُس نے میاں نور محمد کلہوڑہ کے نام لکھا تھا، پیش کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ بہ خدایار خاں ثابت جنگ عباسی[3]

یہ وہ دلائل و شواہد ہیں جو اس خاندان کے عباسی ہونے پر تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

لیکن انگریز مورخوں میں مثلاً برٹن نے اُن کے عباسی ہونے سے انکار کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ کلہوڑے اصلاً چنہ سندھی تھے، اس لیے سمجھنا چاہیے کہ ہندوؤں سے مسلمان ہوئے، جب اس خاندان نے درجۂ امتیاز حاصل کر لیا تو بنی عباس ہونے کا استحقاق پیش کر دیا، لیکن علمأ کے نزدیک اُن کا شجرۂ نسب عباسیت کے انتساب میں ناکام ثابت ہوا ہے۔ اس پر انہوں نے اپنے آدمی "سہر اخطیبہ" بھیجے، تاکہ وہاں کے مشائخ کے پاس جو سندیں ہیں ان کی نقل کر لیں، مشائخ نے تامل کیا تو کلہوڑوں نے ان کی جاگیریں ضبط کر لیں، ان کے گاؤں تباہ کر ڈالے، اور تانبے کی ان تختیوں کو اٹھا کر لے گئے جن پر شجرہ ثبت تھا اس طرح بے شک و ریب حضرت

---

(1) نامۂ نغز قلمی، مملوکہ سندھی ادبی بورڈ۔

(2) انند رام مخلص: مغلوں کے دور آخر کے ادیبوں اور شاعروں میں ممتاز تھا، وہ ذات کا کھتری اور سوہدرہ کا باشندہ تھا، محمد شاہ کے مدار المہام اعتماد الدولہ قمر الدین خاں وزیر الممالک کا وکیل بن گیا تھا، یہ ۱۷۰۱ء میں فوت ہوا (تاریخ کلہوڑہ حصہ اول، ص ۴۰)۔

(3) تاریخ کلہوڑہ، حصہ اول مؤلف مولانا غلام رسول مہر، بحوالہ رقعات انند رام مخلص، قلمی مملوکہ سید حسام الدین راشدی۔

عباس کے اخلاف بن گئے اور مرشد قرار پائے۔[1]

شجرہ ہائے نسب:

کلہوڑوں اور داؤد پوتوں کے شجرہائے نسب جو اب تک مل سکے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

تاریخ کلہوڑا جلد اول میں مولانا غلام رسول مہر نے بحوالہ مراتہ عباسیہ اور جواہر عباسیہ جو شجرہ نقل کیا ہے، وہ یہ ہے:

محمد چنے خاں بن بہلا خاں (بہاء اللہ خان) بن تھل خان (فتح اللہ خان) بن سکراسی خان (سکندر خان) بن کاہر خان (عبدالقاہر) بن ابن خان (ابو النصر خان) بن سلطان احمد ثانی، بن سلطان شاہ مزمل، بن سلطان عقیل، بن سلطان سہیل بن سلطان یاسین، بن خلیفہ احمد اول مستنصر باللہ، بن خلیفہ شاہ محمد، بن خلیفہ سلطان ابو الفضل، بن سلطان ابو جعفر عبداللہ، بن خلیفہ محمد امین، خلیفہ سلطان ہارون الرشید، بن خلیفہ محمد مہدی، بن خلیفہ ابو جعفر منصور، بن محمد بن علی بن عبداللہ بن حضرت عباس رضہ۔[2]

تحفتہ الکرام میں میر علی شیر قانع نے ان کے شجرۂ نسب کے سلسلے میں لکھا کہ:

> اس خاندان کے ایک بزرگ میاں اوڈھانہ کیچ و مکران میں ایک پیر طریقت تھے اور بہت سے لوگ ان کے معتقد تھے، انہوں نے کثیر اولاد چھوڑی، جو سب اوڈھانہ کے لقب سے مشہور ہوئی۔ ان ہی میاں اوڈھانہ کی پانچویں پشت میں تھل نامی ایک بزرگ کھاھر بیلہ میں آکر رہے، اور وہ ملک گوجر قوم سے چھین لیا، ان کے بعد ان کا فرزند بہل نامی گدی پر بیٹھا، برلس کا قلعہ اور موتی نام قبرستان آج تک اُن کی یادگار ہیں، اس کا ایک بیٹا چنہ بھائیوں کے فساد کی وجہ سے اپنے بہت سے پیروں کے ساتھ آکر کھمبات کے پرگنوں میں اوڈھیجا قوم کے پاس رہا۔ پھر اُس نے دیپال کانگڑہ کے علاقے کے سمہ زمیندار کی بیٹی سے شادی کی، جس کے بطن سے اس کو محمد نامی بیٹا پیدا ہوا، جو موجودہ حکمرانوں کا دادا ہے۔[3]

عہد کلہوڑہ کے مؤرخ ملک باغ علی خائف نے بھی اسی شجرے پر اپنی مہر توثیق اس طرح ثبت کی ہے:

یکے از بزرگان اڈھانہ نام
کہ در کیچ و مکران نستہ مدام
عبادت گزار و خدا ترس بود
عوامی بدانند مرشد وجود؟[4]

کلہوڑوں کا تیسرا شجرہ مولانا مہر نے اپنی کتاب تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد اول میں حکیم محمد صادق صاحب عباسی ساکن رانی پور (ریاست خیرپور) کا عطا کردہ درج کیا ہے۔ حکیم صاحب موصوف میاں نور محمد کلہوڑہ کے چچیرے بھائی میاں محمد اسلام کی اولاد میں ہیں، یہ شجرہ حضرت عباسؓ تک اس طرح منقول ہے:

جنیہ (عرف چنیہ) بن قائم بن ظاہر بن احمد بن جاہرہ بن قائم، بن عبدالرحمان بن عباس بن مامون بن ہارون بن مہدی بن منصور بن محمد بن علی بن حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔[5]

ان کے علاوہ بھی اس خاندان کے کئی شجرے ملتے ہیں، لیکن مولانا مہر نے ان تمام شجروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ان میں کوئی شجرہ بھی ایسا نہیں، جو ضعف و اختلال سے خالی ہو، لیکن اس کے باوجود مولانا نے اس خاندان کو عباسی قرار دیتے ہوئے یہ دلیل پیش کی کہ اکثر شجروں میں بعض ایسے اجزا موجود ہیں، جن میں ایک گونہ اشتراک پایا جاتا ہے، اس لیے ان کی عباسیت سے انکار مناسب نہیں، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں خاندان یعنی کلہوڑے اور داؤد پوترے یقیناً عباسی تھے، لیکن وہ اپنے شجروں کو محفوظ نہ رکھ سکے۔[6]

لیکن ہماری رائے میں قیاس دلائل کی موجودگی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، ہم مولانا کی رائے سے اس حد تک متفق ہیں کہ وہ تمام شجرے جو اُن کی عباسیت میں پیش کیے جاتے ہیں، سب کے سب مجروح ہیں، اور نتائج کو قاری پر چھوڑتے ہیں۔

کلہوڑوں کی سندھ میں آمد:

یہ امر بھی تنقیح طلب ہے کہ یہ خاندان سندھ میں کب آیا۔

---

(1) تاریخ کلہوڑہ حصہ اول بحوالہ تاریخ سندھ مصنف برٹن، ص ۴۱۰ بحوالہ رسالے، ص ۲۵۔

(2) ایضاً۔ ص ۴۹ بحوالہ مراتہ عباسیہ و جواہر عباسیہ۔

(3) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۱۸-۳۱۹۔

(4) نامہ نغز قلمی مملوکہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۳۔

(5) تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) مصنف مولانا مہر۔

(6) شجروں کے ضعف و اختلال کے متعلق تفصیل کے لیے دیکھیے تاریخ سندھ عہد کلہوڑا جلد اول ص ۳۵-۷۰۔

میر علی شیر قانع نے تحفتہ الکرام میں لکھا کہ اس خاندان کا پہلا فرد اوڈھانہ نامی کیچ و مکران پہنچا اور اپنے فقر و درویشی کی وجہ سے مرجع خاص و عام بن گیا، پھر اس کی پانچویں پشت میں تھل کا ہر بیلہ آیا، لیکن ان دونوں میں سے کسی کے آنے کا وقت متعین نہیں کیا گیا، البتہ وہ چنہ خان کے بیٹے محمد کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ ان سات راناؤں کی مدد سے جن کا ذکر غزنوی اور غوری سلاطین کے گورنروں کے بیان میں ہو چکا ہے، ملتان آکر حاکم وقت کے دربار میں رسائی حاصل کر کے سب کا سردار ہوا۔

مراۃ عباسیہ میں ہے کہ عباسی خاندان میں امیر سلطان احمد ثانی نے ایک رات حضرت امام زین العابدینؒ کی زیارت عالم رؤیا میں کی، اور اُن سے درخواست کی کہ حصول سلطنت میں اعانت فرمایئے، حضرت امام کی طرف سے اشارہ ہوا کہ سندھ جاؤ۔

جواہر عباسیہ میں ہے کہ:

خلیفہ ششم سلطان احمد بہ الہام غیبی از ملک عرب وطن مالوف خود ـــ مہاجر گردید، واز راہ کیچ و مکران در حوالی ملک سندھ ـــ رسید۔

بہاول پور گزیٹیر میں ہے کہ:

شاہ مزمل کے فرزند سلطان احمد ثانی نے مصر کے چھٹے عباسی خلیفہ ابو الفتح المعتضد باللہ، ابو بکر کے عہد حکومت ۱۳۲۶ء اور ۱۳۷۰ء کے درمیان مصر کو ترک کیا اور وہ کیچ و مکران کے راستے یہ امید لے کر سندھ آیا کہ دربار دہلی میں اُسے حامی مل جائیں گے۔

حکیم محمد صادق رانی پوری کا بیان ہے کہ عباسیوں میں سے قائم اور احمد، دو حقیقی بھائی ۲۵۹ھ (۸۷۳ء) میں کیچ و مکران کے راستے سے سندھ آئے۔

ان تمام بیانات سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اس خاندان کے سندھ میں پہلے آنے والے فرد کو یقینی طور پر متعین نہیں کیا جاسکتا۔ صرف قیاس یہ ہے کہ اس خاندان کا جو فرد بھی آیا ہو، وہ عباسی خلفاء کے آخری دور میں آیا ہو گا۔

چنے خان

تاریخ میں اس خاندان میں سب سے پہلے جو شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے، وہ امیر محمد چنے خان کی ہے۔ اس کا مختصر تذکرہ ہم گزشتہ اوراق میں کر آئے ہیں۔ سید علی محمد راشدی نے منشور الوصیت کے انگریزی ترجمے میں اس سلسلے میں جو کلہوڑوں کا شجرہ مرتب کیا تھا، اس میں چنے خان کا زمانہ (۶۱۷ھ) ۱۲۲۰ء قرار دیا ہے۔

تحفتہ الکرام میں ہے کہ: محمد چنے خان نے دیبال کانگڑہ کے علاقے کے سمہ زمیندار ڈھرہ بلال کی بیٹی سے شادی کی، جس کے بطن سے اس کے محمد نامی ایک بیٹا پیدا ہوا، جو کلہوڑہ حکمرانوں کا دادا ہے، پھر چنے خان اُن سات راناؤں کی مدد اور رفاقت سے جن کا ذکر غزنوی اور غوری سلاطین کے گورنروں کے بیان میں ہو چکا ہے ملتان آکر حاکم وقت کے دربار میں رسائی حاصل کر کے سب کا سردار ہوا اور ہر ایک کی بیٹی اپنے نکاح میں لاکر جام کا لقب اختیار کیا، اور اپنی خوش بختی سے ترقی کرتا ہوا اعلیٰ منصب تک جا پہنچا۔ ان بارہ بیویوں سے اس کو اٹھارہ بیٹے پیدا ہوئے، جن میں سے ہر ایک کی کثیر اولاد ہوئی، ان میں سے داؤد نامی ایک بیٹا رانا چنہ ولد دھتی ـــ کی نواسی مسمات چولیہ کے بطن سے پیدا ہوا، پھر یہ چنہ پرگنہ روہڑی کے تعلقہ پھرالو (پریاں لوء) کی ایک موضع چینہ بیلی یا دہ بیلی چنی میں رہنے لگا، آخر میں سانگرہ کے کنارے کمباتھ چلا گیا اور وہیں اُس نے وفات پائی اور وہیں مدفون ہوا۔[1]

جواہر عباسیہ میں ہے کہ امیر محمد چنے خان حاکم ملتان کے پاس گیا اور قیمتی جواہر اور نفیس تحفے اُس کے سامنے بطور نذر پیش کیے اور حاکم ملتان نے اس کو جاگیر دی اور جام کا لقب بھی دیا۔ مراۃ عباسیہ میں ہے کہ حاکم ملتان نے یہ حکم بھی جاری کیا کہ اوباڑہ سے لے کر لاہری بندر تک پورے سندھ کا مالیہ چنے خان کے توسط سے وصول ہو کر شاہی خزانے میں داخل ہوا کرے۔

نئے شہر کی بنیاد:

ملتان سے واپس ہو کر محمد چنے خان نے سیوستان سے چھ کوس پر مغربی جانب ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی اور اس شہر کا نام جھانگارہ باجارا رکھا، پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنی قوت کو بڑھایا، پرگنہ کمباتھ کو اپنے قبضے میں لے آیا، کوریچہ، سعتہ، چنہ وغیرہ اقوام کے سات زمیندار جنہیں رانا کا خطاب حاصل تھا، اس کے فرمانبردار ہو گئے۔

مختصر یہ ہے کہ اُس کا اقتدار مغرب میں گنجابہ تک، شمال میں داؤد جال تک، جنوب میں ماڑواڑ تک اور مشرق میں روہڑی و ابوہر تک مستحکم

---

[1] تاریخ سندھ کلہوڑہ، جلد ا، ص ۸۸-۸۹۔

ہو گیا۔ شاہو سمہ اس کا وزیر اور جاڑا مہر اس کا مشیر تھا۔[1]

عادات و اطوار و مشاغل:

محمد چنے خان کی عادات و اطوار و مشاغل کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ وہ بہت شریف، منصف، رحیم و شفیق اور بہادر تھا۔

تجارت کے مال اور اجناس میں شریعت کے مطابق زکوٰۃ وصول کرتا تھا، کھیتی باڑی میں عُشر وصول کرتا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کی رعایا خوش حال تھی، اور ملک قحط وغیرہ کی بلاؤں سے محفوظ رہا۔

مشاغل میں اُسے جانور پالنے، زراعت اور شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔[2]

اولاد:

ہم پہلے تحفتہ الکرام سے نقل کر آئے ہیں کہ محمد چنے خان کی بارہ بیویاں اور اٹھارہ بیٹے تھے، لیکن مراۃ عباسیہ اور جواہر عباسیہ سے صرف دو بیٹوں کا پتا چلتا ہے۔ ایک محمد مہدی اور دوسرا محمد داؤد خان، محمد مہدی جوڈھرا کی بیٹی کے بطن سے تھے۔

چنے خان نے وصیت کی تھی کہ میری دستار محمد مہدی کو دی جائے اور میرا قرآن مجید، تسبیح و مصلیٰ داؤد خان کو دیا جائے۔

گویا اس طرح محمد چنے خان نے سرداری کا منصب محمد مہدی کو دیا، اور روحانی پیشوائی کا اعزاز محمد داؤد خان کو عطا کیا۔

کلہوڑے خان

اپنے والد کی وفات کے کچھ دن بعد ہی محمد مہدی خان نے وفات پائی۔ اصولاً اس کے بعد حکومت محمد داؤد خان کو ملنی چاہیے تھی، لیکن محمد مہدی کا بیٹا محمد ابراہیم جو کلہوڑے خان کے نام سے مشہور تھا، خاندانی حکومت کا دعویدار بن گیا۔ اس کے کلہوڑا کے نام کے ساتھ مشہور ہونے کی وجہ مورخین نے یہ لکھی ہے کہ وہ ایک پہاڑ کلورا نام میں مقیم رہا، جو حیدرآباد کے شمال میں واقع تھا۔ اس لیے اس کا لقب کلورا مشہور ہوا، جو بعد میں کلہوڑا ہو گیا۔ اس تفرقے کے بعد داؤد خان اپنے بال بچوں کو لے کر وڈیرا جھانگی خان کے پاس شہر ونجی میں چلا گیا، یہ وڈیرا اس خاندان کا بڑا مرید و معتقد تھا، وہ داؤد خان کے ساتھ نہایت احترام و اعزاز کے ساتھ پیش آیا، یہیں داؤد خان نے کچھ آباد اور افتادہ زمینیں لے کر ایک آبادی کی بنیاد رکھی جو بتیا کے نام سے مشہور ہوئی، اور یہیں وہ خود بھی زراعت میں مصروف ہو گیا۔[3]

داؤد پوتوں کے حالات چونکہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں، اس لیے ہم ان کے حالات کی تفصیلات کو ترک کر کے پھر کلہوڑوں کے حالات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

مراۃ عباسیہ میں ہے کہ داؤد خان کی علیحدگی کے بعد کلہوڑے خان کی اولاد میں ریاست کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔ یہاں تک کہ نو پشتوں تک ان کا نام بھی کوئی نہ لیتا تھا اور نہ اُن کے پاس کوئی چیز ایسی تھی کہ کوئی اُن کا نام لے۔[4]

میاں آدم شاہ

لیکن اس خاندان کو جس نے اسے گوشہ گمنامی سے نکال کر ایک دم آسمان شہرت و اقبال کا آفتاب بنا دیا وہ میاں آدم شاہ کلہوڑہ تھے، جو میاں محمد مہدی کی نویں پشت میں پیدا ہوئے اور جن کے باپ کا نام میاں گجن شاہ تھا۔

تحفتہ الکرام میں ہے کہ: ایک مدت تک انقلابات زمانہ کی وجہ سے اس کی اولاد میں کوئی نامور شخص پیدا نہ ہوا، بالآخر نویں پشت میں آدم شاہ بن میاں گجن شاہ بن صاحب بن میاں خان بن طاہر، بن رانا بن میاں شاہ محمد عرف شاہم، بن میاں ابراہیم، بن میاں محمد، بن جام چنہ، شیخ الیاس لنگراج اور شیخ ابو بکر جتوئی کے واسطے سے ـــ میر سید محمد عرف میراں محمد جونپوری سے فیض پا کر مسند ارشاد منور کرنے اور اسرار کی سیر کرنے کے بعد تعلقہ چانڈو کی موضع ہٹڑی میں جو اب ہٹڑی غلام شاہ کے نام سے مشہور ہے سکونت پزیر ہو گئے۔[5]

مولانا مہر نے تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد اول میں محمد آدم شاہ

---

(1) تاریخ سندھ کلہوڑا، جلد ا، ص ۹۱-۹۲۔

(2) تاریخ سندھ کلہوڑا (مولانا مہر) جلد ا، ص ۹۶-۹۷۔

(3) یہ تمام تفصیل تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) ص ۸۵-۹۸ سے ماخوذ ہے۔

(4) ایضاً۔ ص ۱۲۱۔ بحوالہ مراۃ عباسیہ ص ۸۱۔

(5) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۳۱۸-۳۱۹۔

کازمانہ ۱۵۲۰ء سے ۱۶۰۰ء تک متعین کیا ہے۔[1]

لُب تاریخ سندھ میں ہے کہ:

میاں آدم شاہ خیلی بزرگ و خدا پرست بود و اکثر مردمان بباعث مریدی بہ اوشاں رجوع داشتند، سکونت آں بزرگ در حدود چاندو کہ کہ الآن در حدود تعلقہ لارکانہ و نصیر آباد و قنبر داخل می باشدمی بود۔۔۔ وعمری خیلی دراز داشت۔[2]

مولانا مہر نے تاریخ سندھ میں میاں آدم شاہ کے متعلق بیگ کا ایک اقتباس دی انڈس ڈیلٹا کنٹری ص ۱۱۱ سے پیش کیا ہے۔

آدم شاہ کلہوڑہ نے اپنے اعلیٰ کردار اور غیر آئینی اقدامات کی بنا پر شہرت حاصل کرنی شروع کی، وہ کلہوڑوں کی ایک جماعت لے کر شمالی و جنوبی سندھ میں داخل ہوا، وہاں اس کے دوسرے ہم مشرب ساتھ مل گئے، چانڈیہ قبیلے سے بہت سی زمینیں چھین لیں اور اپنے پیروؤں کے لیے چانڈو کہ میں نئے مامن کا انتظام کر لیا۔[3]

تحفتہ الکرام میں ہے کہ ان ہی ایام میں نواب خانخاناں میاں آدم شاہ کے پاس دعا کرانے آیا اور نذرانہ قبول کرنے کی استدعا کی، جس پر کھبڑ ابڑو نے درخواست کر کے چانڈیوں کے منقل ہو جانے کے بعد موضع چانڈیو کی زمین کی زمینداری انہیں دلا دی۔۔۔ دن گزرنے کے ساتھ جوں جوں ان کے مریدوں کی تعداد بڑھتی گئی، وہ زیادہ زمین حاصل کرتے رہے۔[4]

وفات:

تاریخ میں میاں آدم شاہ کی وفات کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ تحفتہ الکرام میں ہے کہ: آخر کار زمینداروں کی شہہ پر وہ ملتان کے حاکم کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔[5]

لُب تاریخ سندھ میں ہے کہ: بعض زمینداروں کی وجہ سے، جو ان سے بعض زمینوں کی وجہ سے عداوت رکھتے تھے، حکام بکھر کے ہاتھوں قید ہو کر ملتان پہنچے اور وہیں انہوں نے قید خانے میں جام شہادت نوش کیا اور اس بزرگ کی لاش کو وہاں سے لا کر سکھر کے باہر ایک پہاڑی پر دفن کیا گیا۔[6]

نامۂ نغز میں ملک باغ علی خائف نے ان کے واقعۂ شہادت کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

تبر سید والی ز پیر و مرید
بایمای حاکم ہلاکت رسید[7]

میاں آدم شاہ کا مقبرہ:

میاں آدم شاہ کا مقبرہ بیرون سکھر مغرب رویہ ایک چھوٹی سی پہاری پر آج بھی موجود ہے۔

نامۂ نغز میں ہے کہ میاں آدم شاہ نے وصیت کی تھی کہ مجھے بکھر میں دفن کیا جائے۔ تحفتہ الکرام میں ہے کہ: حاکم کے کوتوال آقا شاہ محمد نے جسے ان بزرگ سے ان کے ایام اسیری میں کافی فیض نصیب ہوا تھا، اسے وصیت کی تھی کہ اس نے ان کی نعش سکھر لا کر اس ٹیکری پر دفن کیا، اور ان کے بچوں اور مریدوں کو جمع کر کے خود ان کی مسند ارشاد پر بیٹھ گیا۔ یہ شخص قوم کا بلوچ کہیری اور چترہار کا رہنے والا تھا، جو سیوی کے قریب ہے۔[8]

میاں آدم شاہ کی اولاد:

(داؤد کی مسند نشینی)

تحفتہ الکرام میں ان کے دو کمسن فرزندوں ابراہیم اور داؤد کا پتا چلتا ہے،[9] لب تاریخ سندھ میں ہے کہ: میاں آدم شاہ کی وفات کے بعد ان کا بیٹا داؤد مسند ارشاد پر متمکن ہوا، اگرچہ اس کے زمانے میں ان کی اصل زمینیں اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں، لیکن اس کے زمانے میں مریدوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا، جس کی وجہ سے اصلی زمینوں کے علاوہ کچھ اور زیادہ زمینیں اس کے قبضے میں آئیں اور مریدوں کی جماعت میں اس کی قوت میں بھی اضافہ ہوا اور اس کی زندگی میں کوئی جھگڑا پیدا نہیں ہوا۔[10]

---

(1) تاریخ سندھ عہد کلہوڑا، ج ۱، ص ۱۳۱۔
(2) لب تاریخ سندھ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۱۱۷۔
(3) تاریخ سندھ کلہوڑا، جلد ۱، ص ۱۴۳۔
(4) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۳۱۹۔
(5) تحفتہ الکرام (طبع راشدی) ص ۳۳۱۔
(6) لب تاریخ سندھ، ص ۱۱۷۔
(7) نامہ نغز، ص ۵۔
(8) نامۂ نغز، ص ۵۔
(9) تحفتہ الکرام (طبع راشدی) ص ۳۳۱۔
(10) لب تاریخ سندھ، ص ۱۱۷۔

میاں الیاس محمد

میاں داؤد نے اپنی وفات کے بعد دو فرزند چھوڑے، جن میں ایک کا نام میاں الیاس محمد اور دوسرے کا نام میاں شاہ علی عرف شاہل محمد تھا۔

تحفتہ الکرام میں ہے کہ اپنے والد کی وفات کے بعد ان کے بڑے فرزند میاں الیاس محمد ان کی جگہ مسند رشد و ہدایت پر متمکن ہوئے اور مریدوں کی تعداد بڑھانے کی کوشش کی۔ آخر انہوں نے وفات پائی۔ ان کی قبر لاڑکانہ اور ہٹری کے وسط موضع رہڑی میں ہے۔[1] خان بہادر خداداد خان نے اب تاریخ سندھ میں لکھا کہ ان کا مقبرہ کسی حد تک منہدم ہو چکا ہے، لیکن اس کا نشان باقی ہے، اب ان کی اولاد میں کوئی باقی نہیں کہ ان کے مزار کی مرمت کرے۔ ان کا مزار ضلع لاڑکانہ میں گھاڑ نالے کے قریب واقع ہے۔

میاں شاہ علی (عرف شاہل محمد):

تحفتہ الکرام میں ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی میاں شاہ علی عرف شاہل محمد نے مسند ارشاد کو رونق بخشی، ان کے زمانے میں مریدوں کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوا اور انہوں نے زراعت کو بھی کافی ترقی دی۔ لاڑکانہ کی گھاڑ نہر ان ہی کی کھدوائی ہوئی ہے، اس نہر کے دونوں کناروں کی زمینیں قوم سانگی اور ابڑو سے لے کر اپنی اولاد اور بھائیوں میں تقسیم کر دیں اور خود موضع جیتانی میں رہنے لگے۔[2]

لُب تاریخ سندھ میں ہے کہ: میاں شاہ علی نہایت متقی انسان تھے، مشہور ہے کہ گھاڑ نالہ جو لاڑکانہ پُل کے پاس جاری ہے، ان ہی کا کھدوایا ہوا ہے، جو ایک بڑا نالہ ہے۔ انہوں نے سانگی اور ابڑو قوم کی بہت سی زمینیں اپنے قبضے میں کر لیں، اس وجہ سے ان کے اور ان قوموں کے درمیان مسلح جنگ ہوئی۔[3]

نامہ نغز میں ہے کہ:

به بعد وفاتش که الیاس بود
نبیرهٔ او جانشیں شد بزود

---

(1) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۳۲۰۔
(2) ایضاً۔ ص ۳۲۰۔
(3) لب تاریخ سندھ، ص ۱۱۸۔

دریں شہر دھیری ہمہ سن و سال
سراسر گزشت و بآخر وصال
اراضی به سانگین و ابره بجبر
گرفته و داده عزیزانِ گبر
چو رفت از جہاں نام نیکی ببرد
ھماں تاج با دیگری بر سپرد[4]

وفات:

تحفتہ الکرام میں ہے کہ: جام صدیق اور جلال خان ابڑہ نے مریدی کے تمام حقوق فراموش کر کے دوسرے زمینداروں سے مل کر انہیں کئی لڑائیوں کے بعد بکھر کے حاکم کے ہاتھوں قتل کرا دیا، ان کا مزار گھاڑی پر گنے میں نواح چانڈوکی، موضع مرندہ میں واقع ہے۔[5]

لُب تاریخ سندھ میں ہے کہ:

در آں جنگ لا ولد در سال ۱۰۶۸ھ برابر سال ۱۶۵۷ء کشتہ شد روضہ اش در جوار برادرش آں روی نالہ گھار بقرب لارکانہ جلوہ نما بود۔[6]

میاں شاہ علی کی وفات کا زمانہ وہ تھا جب کہ شاہجہاں کے بیٹے اقتدار حاصل کرنے کے لیے باہم جنگ کر رہے تھے۔ راشدی صاحب نے بھی ان کا سال وفات تحفتہ الکرام (طبع راشدی)، ص ۴۳۲ میں ۱۰۶۸ء (۱۶۵۷ء) ہی لکھا ہے۔

مقبرہ:

مولانا مہر نے شاہل محمد کی شخصیت و کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا) جلد اول میں لکھا ہے کہ: وہ بڑے اونچے پائے کے بزرگ تھے، اس کے علاوہ ان میں عمرانی اور انتظامی صلاحیتیں اعلیٰ پیمانے پر موجود تھیں۔ گھاڑ نہر ان ہی کی کھدوائی ہوئی تھی۔

اُن کا مرقد ۱۱۸۸ھ میں میاں غلام شاہ نے بنوایا تھا، مقبرے پر گنبد اور دیواروں پر کاشی کا نہایت خوبصورت کام تھا۔[7] لیکن اب یہ مقبرہ نہایت کہنہ اور زبوں حالت میں موجود ہے۔

---

(4) نامہ نغز، ص ۴۔
(5) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۳۲۰۔
(6) لب تاریخ سندھ، ص ۱۱۸۔
(7) تاریخ سندھ (کلہوڑا) جلد اول، ص ۱۶۱-۱۶۲۔

میاں نصیر محمد کلہوڑا

میاں شاہ علی کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے اور میاں الیاس کے صاحبزادے میاں نصیر محمد نے ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) میں اپنے بزرگوں کی مسند رشد وہدایت کو رونق بخشی۔ صاحب مراۃ عباسیہ نے ان کے زہد وتقویٰ کی مدح سرائی کرتے ہوئے لکھا کہ:

> میاں نصیر محمد بن الیاس محمد مرحوم مرقوم در عالم عبادت مجتہد وقت گردید، عامہ مردم براو گرد آمدند، واو عاقبت بینی کردہ از فرط لحاظ بر طرف ملتان ولاہور ہجرت گزیدہ وبعد مدتی از آنجا رجعت ورزیدہ در اقطاع متعلقہ مردم چینہ رسید۔[1]

تحفۃ الکرام میں ہے کہ: میاں شاہل محمد کے بعد ان کے بھتیجے میاں نصیر محمد ۱۰۶۸ھ میں اپنے بزرگوں کی مسند پر بیٹھے، یہ اپنے بزرگوں سے بھی بازی لے گئے، اُن کے ہم عصران کی جماعت پر رشک کرنے لگے، بالآخر مقامی لوگ لڑائی کے لیے تیار ہوگئے اور بکھر کے مغلوں کو بھڑکا کر لائے، جس کی وجہ سے وہ مجبور ہو کر تھر کی طرف چلے گئے۔ لیکن وہاں کھیتی باڑی کا سامان مہیا نہ ہونے کی وجہ سے پنھواروں کے علاقے میں رہنے لگے۔ پنھواروں کا سردار میر پنھوار بکھر کے حاکم سے مشورہ کر کے بڑا بھاری لشکر لے آیا، اس میں میر زاخان پنی حاکم سیبی بھی شامل تھا، کچھ جھڑپوں کے بعد میر زاخان نے اُنہیں صلح کا پیغام دے کر اپنے پاس بلوایا اور اپنے چچا محبت خان کے ساتھ عالمگیر کے دربار میں بھیج دیا، چنانچہ وہ وہاں بڑی مدت تک قید رہے اور ادھر اُن کے باقی ماندہ فقیروں پر کئی بار حملے کیے گئے، طویل مدت کے بعد وہ خود بخود آزاد ہو کر وطن پہنچے، خدائے تعالیٰ نے اُن کے مریدوں میں غیر معمولی ترقی عطا کی اور پھر اُن کے زمانے میں کوئی فساد برپا نہیں ہوا، اس مرتبہ وہ واپس آنے کے بعد پنھواروں کے علاقے میں ایسے مقام پر کہ جس کے ایک طرف پہاڑ اور دوسری جانب پانی تھا "گھاڑی"[2] نامی شہر بسا کر آباد ہوئے اور اپنا اصل وطن موضع ہنڑی فوجہ فقیر اور کاچھو عنایت شاہ فقیر کو عنایت کیا اب اُن کے وہ فقیر جو پہلے مجرد اور تنہائی کی زندگی بسر کرتے تھے، شادیاں کر کے عیال دار ہوگئے اور وہ ملک اور زمین میں توسیع کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ ایک مرتبہ وہ میر یعقوب حاکم بکھر سے جنگ کر کے کامیاب بھی ہوئے، اسی طرح کئی بار ان کے حامیوں سے بھی مقابلے ہوئے اور کامیابی انہیں فقیروں کو نصیب ہوئی، بالآخر انہوں نے سیوستان کے مغلوں سے لاکھاوٹ کا پرگنہ اجارے پر حاصل کر لیا، منگن موروہ پر فرید بھاگٹ کی کوششوں سے قبضہ کر لیا، اسی طرح پرگنہ سہتی بھی اُن کے قبضے میں آگیا، جس میں اُن کے ایک فقیر فیروز ویراڑ نے نئے شہر کی بنیاد رکھی، جو نوشہر وفیروز کے نام سے مشہور ہوا۔[3]

مختصر یہ کہ میاں نصیر محمد کے مریدوں نے سندھ کے مختلف حصوں پر ایک گونہ اقتدار حاصل کر لیا۔

وفات:

میاں نصیر محمد نے پینتیس یا چھتیس برس اپنے بزرگوں کی مسند کو رونق بخش کر وفات پائی اور ۱۱۰۳ھ (۱۶۹۲ء) میں وفات پا کر گھارو کے سرخ ٹیلے پر مدفون ہوئے۔[4]

میاں نصیر محمد کی شخصیت میں جو نقوش سب سے زیادہ ابھر کر سامنے آتے ہیں، وہ اُن کی شجاعت وبہادری ہے، وہ کلہوڑوں میں پہلے شخص ہیں کہ جنہوں نے مغلوں سے جنگ شروع کی اور انہوں نے درویشانہ اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے ہوئے بھی سندھ کے مختلف حصوں پر اقتدار حاصل کر لیا تھا۔

میاں دین محمد

تحفۃ الکرام میں ہے کہ میاں نصیر محمد کے بعد ان کے صاحبزادے میاں دین محمد نے ۱۱۰۳ھ (۱۶۹۲ء) میں اپنے آبائی مسند ارشاد کو زینت بخشی، گو میاں دین محمد نے اپنے آباء واجداد کے طریقے رشد وہدایت کو سرگرمی سے جاری رکھا، لیکن وہ زمیندار جو میاں نصیر محمد کے زمانے میں ناکام ہو کر خاموش زندگی بسر کر رہے تھے، اب موقع پا کر آویزش پر تیار ہوگئے۔ میر پنھوار جس کا شہر فتح پور سرائیوں[5] کے تحت آگیا تھا، بادشاہ کے حضور میں فریاد لے کر گیا اور میر زاخان پنی کے نام شاہی حکم جاری کرا

---

(1) ایضاً۔ تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا) ج ۱، ص ۱۶۷، بحوالہ مراۃ عباسیہ، ص ۸۲۔

(2) گھاڑی: تعلقہ قنبر میں قنبر سے چار میل کے فاصلے پر موجود ہے، (تحفۃ الکرام طبع راشدی، ص ۴۳۲ حاشیہ نمبر ۲)۔

(3) تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۳۲۰-۳۲۲۔

(4) تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ) ۳۲۰-۳۲۲۔

(5) سرائی: کلہوڑا خاندان کے مرید اور فقیر سرائی کہلاتے تھے، جہاں بھی یہ لفظ آئے، اس سے ان کے مرید وفقیر کا مفہوم سمجھنا چاہیے۔

لایا کہ وہ میر پنھوار کی مدد کرے، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا، آخر دربار شاہی سے اس مہم کے لیے امیر شیخ جہاں مقرر ہوا کہ وہ سرائیوں کا قلع قمع کرے، چنانچہ امیر شیخ جہاں آیا اور میر پنھوار کی نشاندہی پر اس نے سرائیوں پر ہلہ بول دیا، سرائیوں کی طرف سے فیروز دیر ڈیرہ کے قلعے سے نکل کر مقابل ہوا، اور موضع گریلی (گھریلہ)[1] پر ایسا شب خون مارا کہ امیر شیخ جہاں کو پریشان کر دیا، ادھر میاں دین محمد نے گھاری سے ایک لشکر اس کی کمک کے لیے بھیج دیا، چنانچہ ان دونوں لشکروں نے مل کر امیر شیخ جہاں کے لشکر پر سخت حملہ کیا جس میں امیر شیخ جہاں مارا گیا اور بکھر کے حاکم اللہ یار خان نے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔

دوسری مرتبہ قنبر خان بروہی ایک جمعیت لے کر اچانک سرائیوں پر حملہ آور ہوا، جس نے بعض جھڑپوں میں کامیابی حاصل کی، لیکن جب سرائیوں نے جوابی حملے کیے تو وہ ان کے سردار میرن شاہ سے صلح کر کے واپس ہو گیا۔

کچھ مدت کے بعد پنھواروں نے پھر سر اٹھایا تو سرائیوں نے گہرام سے نکل کر ان کی مرکھ پور کی اور دوسری زمینیں چھین لیں۔ لڑائیوں کا یہ رنگ دیکھ کر پنھواروں نے عافیت اطاعت ہی میں دیکھی اور خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

اب صرف سیوی اور شکارپور کے حکمران پنی پٹھانوں سے جھگڑا باقی رہا۔

شاہزادہ میر معزالدین:

ادھر امیر جہاں کے قتل اور اللہ یار خاں حاکم بکھر کی فراری کی خبر سن کر شاہزادہ محمد معزالدین نے جو عالمگیر کا پوتا اور صوبۂ لاہور و ملتان کا صوبیدار تھا، اور سندھ اس کی نگرانی میں تھا، لاہور سے سندھ کا رخ کیا۔ میاں دین محمد کو جب اس کی آمد کی خبر معلوم ہوئی تو میاں دین محمد نے اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کو اپنے دو وکیلوں کھمل اور قاسم کے ساتھ بکھر بھیجا، جنہوں نے شاہزادے کو سارے حالات سمجھا کر اس کا دل صاف کر دیا، اور شاہزادہ مطمئن ہو کر لاہور واپس ہو گیا۔[2]

تقدیر کے کرشمے:

لیکن تقدیر تدبیر پر ہنس رہی تھی، اسی اثنا میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، وہ یہ کہ شاہزادہ معزالدین کے واپس جانے کے بعد کلہوڑا خاندان کے نامور سپہ سالار شاہ بہارا کے بڑے بھائی مقصود فقیر کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاہزادے نے ہماری بہادری کا کرشمہ تو دیکھا ہی نہیں، اس لیے اسے اپنی طاقت کا اندازہ کرا دینا چاہیے، اس خیال کے آتے ہی اس نے ایک لشکر ساتھ لیا اور بغیر میاں دین محمد کی اجازت کے ماتھیلہ پر ہلہ بول دیا اور پھر آگے بڑھ کر اُچ میں قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا۔ شاہزادہ معزالدین کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ شدید غضبناک ہو کر واپس آیا اور شاہی فوجوں نے سیوہن میں مقیم ہو کر میاں دین محمد کے علاقوں گھارو اور اس کے نواحی علاقوں کو تاخت و تاراج کر کے صاف کر دیا اور خود شاہزادہ چھ ماہ تک سیوہن میں مقیم رہا، آخر کار میاں دین محمد نے صلح کی درخواست کی اور خود شاہزادے کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شاہزادے نے ایک فوج متعین کی کہ میاں دین محمد کے بقیہ لوگوں اور متعلقین کو لے کر آئے۔

میاں دین محمد کا منجھلا بھائی یار محمد ان کی جگہ نگراں تھا، وہ اس پر آمادہ نہ ہوا کہ اپنے آدمیوں کو اور متعلقین کو فوج کے حوالے کرے، اس نے جنگ کے لیے نقارہ بجوایا، اور ڈٹ کر شاہی فوج کا مقابلہ کیا، فریقین میں ہولناک جنگ ہوئی، جس میں خون کی ندیاں بہہ گئیں، یار محمد کی طرف سے تاجہ فقیر، جادو فقیر اور بختیار فقیر نے اپنے اپنے لشکروں کو لے کر مقابلہ کیا اور شاہی فوج کو لے کر راجا گج سنگھ بھٹی اور سورج مل اودے پوری میدان جنگ میں آئے۔ آخر یار محمد کے سرائی لشکر نے گاج ندی کے کنارے شاہی فوج کو شکست دے دی۔ یہ جنگ ۱۱۱۱ھ (۱۷۰۰-۱۶۹۹ء) میں ہوئی۔

شاہزادے نے اس شکست کی مطلق پروا نہیں کی اور وہ میاں دین محمد کو اپنے ساتھ لے کر واپس ہو گیا، اور شاہی فوج کو حکم دیا کہ وہ یار محمد کا تعاقب کرے۔ یار محمد لڑائی سے دست بردار ہو کر قلات چلا گیا، ادھر شاہزادے نے ملتان پہنچ کر میاں صاحب کو قتل کرا دیا۔[3]

لب تاریخ سندھ میں ہے کہ: میاں دین محمد نے اپنے مریدوں کی قوت اور زور شمشیر سے پنھواروں اور داؤد پوتوں پر فتح حاصل کی، جو

---

[1] گھریلہ: یہ قصبہ گھریلہ کے نام سے ضلع لاڑکانہ میں اب بھی موجود ہے، جو باقرانی سے سات میل اور لاڑکانہ سے بارہ میل کی فاصلے پر واقع ہے، تحفۃ الکرام (طبع راشدی)، ص ۴۳۲، حاشیہ نمبر ۱۔

[2] تحفۃ الکرام (طبع راشدی) ص ۴۳۲۔

[3] یہ تمام تفصیل تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۲۴، ۳۲۳ سے ماخوذ ہے۔

صاحب حکومت و لشکر و صاحب قلعہ تھے، تواریخ قدیم سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے قلعہ جات سرحد سندھ کو حاکم قلات سے چھین کر اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور دوسرے بہت سے ملکوں پر تصرف حاصل کر لیا تھا۔ میاں دین محمد نے ۱۱۱۱ھ (۱۷۰۰-۱۶۹۹ء) میں وفات پائی۔[4]

میاں یار محمد

لُب تاریخ سندھ میں ہے کہ میاں دین محمد کی وفات کے بعد ۱۱۱۱ھ (۱۷۰۰-۱۶۹۹ء) میں ان کے منجھلے بھائی میاں یار محمد نے اپنے آبائی مسند رشد و ہدایت کو رونق بخشی۔ پہلے گزر چکا ہے کہ مغلوں سے جنگ کے بعد قلات چلے گئے تھے۔

صاحب مآثر الامرا کا بیان ہے کہ: دین محمد کے چھوٹے بھائی یار محمد نے قبائل کو پہاڑوں کی گھاٹیوں میں پہنچایا اور خود جنگ پر تیار ہو گیا، جنگ میں شاہزادے کی فوج نے شکست کھائی، یار محمد کا حوصلہ بڑھ گیا، اور وہ پہاڑی دروں میں بیٹھ کر جنگ کا انتظار کرنے لگے۔[1]

میاں یار محمد قلات میں:

تحفتہ الکرام میں ہے کہ: میاں یار محمد جب قلات پہنچے، پہلے تو وہاں بروہی اُن سے لڑنے کے لیے نکل آئے اور سخت جنگ کی، جس میں محراب خاں حاکم قلات فریق ثانی کے علم کے بغیر قتل ہو گیا، لیکن اس کے بعد میاں یار محمد نے صلح کر لی اور اپنے دونوں فرزندوں میاں نور محمد اور میاں محمد خاں کو بطور یرغمال پیش کیا، جس کے بعد اہل قلات نے ان کو وہاں قیام کرنے کی اجازت دے دی، یہ ۱۱۱۱ھ (۱۷۰۰-۱۶۹۹ء) کا واقعہ ہے۔ وہاں دو سال میاں یار محمد نے سخت مصیبت میں گزارے، یہاں تک کہ اکثر سرائی سردار بھی اُن سے علیحدگی اختیار کر گئے اور ان کے ملک کے بیشتر حصوں پر میرزا خاں کے بیٹے بختاور خاں کے پٹھانوں نے قبضہ کر لیا۔[2]

قلات کی مصیبتوں کی داستان خود میاں یار محمد کے قلم سے:

مولانا مہر نے تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا) جلد اول میں گلدستہ نورس بہار سے وہ اقتباس دیا ہے کہ جس میں میاں یار محمد نے قلات کے زمانے کے اپنے مصائب کی داستان خود بیان کی ہے، جس کا ترجمہ ہم یہاں بجنسہ نقل کرتے ہیں:

> حضور کی بے توجہی کے زمانے میں جو حالات پیش آئے، کوہستانی علاقے میں جو پریشانیاں اٹھائیں، بروہی حاکم قلات کے ہاتھ سے زہر کے جو پیالے پیے، اُن کی یاد زندگی کی آخری سانس تک محو نہ ہوگی۔ بروہی نے تھوڑی دیر کے لیے ہم پریشاں حالوں کو بیٹھنے کی جگہ دی تھی، تو یہ اُس کی آدمیت کا کرشمہ نہ تھا، بلکہ اُسے گمان تھا کہ ہمارے پاس اتنی دولت ہوگی جو شاید ہی قلات کے کسی آدمی کے پاس ہو، اُسے یہ بھی خیال تھا کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے، آہستہ آہستہ چھنتا جائے گا، یہ بھی جانتا تھا کہ حضور کی توجہ کے بغیر ہماری رہائی کا کوئی امکان نہیں، جب اُس نے دیکھا کہ ہم جلاوطنوں کے لیے وقت گزارنا بھی مشکل ہے، تو نصف قبائل کو اپنے پاس گروی رکھا، باقی نصف کے ساتھ اپنے چند آدمی بھیجے اور رخصت کر دیا کہ جو کچھ ہاتھ لگے اُسے لا کر میرے حوالے کر دو، یہاں تک کہ نصیبے کی یاوری سے حضور کی عنایت کی ہوا چلنے لگی، جرموں کی معافی مل گئی، اور منصب و خطاب سے سرفرازی بخشی گئی۔[3]

وطن کو واپسی:

تحفتہ الکرام میں ہے کہ: دو سال کے بعد ۱۱۱۳ھ (۵-۱۶۰۴ء) میں سرائی درویش میاں یار محمد کے پاس پہنچنے لگے، میاں یار محمد راجی فقیر اور سرائی لشکر کے آنے پر اپنے مریدوں سے بیعت لے کر اور التماس خاں بروہی کو اپنی کمک میں لے کر روانہ ہوئے، اور زیدی[4] سے گزر کر مسافت طے کرتے ہوئے منچھر جھیل کے کنارے ہتڑی تعلقہ کے موضع نیتک[5] اور سانوہ تعلقہ ہتڑی میں پہنچے، وہاں انہوں نے پہلے قیصر پنھوار سے موضع سامتائی چھینا اور وہاں سے بڑھ کر گاہن میں خیمہ زن

---

(4) لب تاریخ سندھ، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۱۱۹-۱۲۰۔

(1) مآثر الامرا، ج ۱، ص ۸۳۶۔

(2) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۳۲۵۔

(3) تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا) جلد اول، ص ۲۰۹ بحوالہ گلدستہ نورس بہار، ص ۹۹-۱۰۰۔

(4) زیدی: یہ مقام قلات اور سندھ کے راستے میں بلوچستان میں واقع ہے، (تحفتہ الکرام (طبع راشدی) ص ۴۳۷)۔ یہ تمام تفصیل تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۳۲۵-۳۲۶ سے ماخوذ ہے۔

(5) نیتک: یہ دراصل نیتنگ ہے جو اس وقت ضلع دادو میں موجود ہے (تحفتہ الکرام (طبع راشدی) ص ۴۳۷، حاشیہ نمبر ۳)۔

ہوئے، وہاں سے انہوں نے اپنے بھتیجے میر محمد کو سرائی سرداروں کے ساتھ آگے روانہ کیا، جنہوں نے مار کھپور اور گاہی جمشید پر قبضہ کر کے فتح پور کا قلعہ فتح کر لیا، اس قلعے کے فتح کر لینے کے بعد میاں یار محمد بھی سرائیوں سے آملے، میاں یار محمد کی اس فتح و کامرانی کو دیکھ کر التماس خاں نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی توفیق اور مدد آپ کے ساتھ ہے، اس لیے اب میں اپنی ضرورت محسوس نہیں کرتا، یہ کہہ کر وہ اپنے وطن واپس چلا گیا۔

سرائی جو منتشر و متفرق تھے اب میاں یار محمد کے گرد جمع ہوتے جارہے تھے اور اُن کی جمعیت ایک مستحکم اور مضبوط جمعیت بنتی جارہی تھی، میاں صاحب نے گھیرو، شکارپور، کھاری اور کنڈیارو کو آزاد کرالیا، اور بختاور خان کے بھائی اللہ بخش سے لاڑکانہ چھین لیا۔

بختاور خاں نے مجبور ہو کر شاہزادہ معزالدین کی خدمت میں ملتان عریضہ بھیجا کہ دین محمد کے بھائی نے پھر دوبارہ شورش برپا کی ہے۔ شاہزادہ اس عریضے کے ملتے ہی فوج لے کر روانہ ہو گیا، جب شاہزادہ اس طرف روانہ ہونے لگا تو اُس نے دوسری عرضداشت بھیجی کہ اب آنے کی ضرورت نہیں، اب آپ رک جائیں، شاہزادہ اس کی یہ دو متضاد عرضداشتیں دیکھ کر بختاورِ خاں کی طرف سے مشکوک ہو گیا اور اُس نے سیدھا بختاور خاں کی طرف رخ کیا۔ چونکہ تقدیر کی جانب سے اُس کی تباہی کا سامان ہو چکا تھا، اس لیے اُس نے شاہزادے کو روکنے کی کوشش کی، دونوں میں سخت مقابلہ ہوا، آخر بختاور خاں مارا گیا۔[1]

میاں یار محمد کے وکلا شاہزادے کی خدمت میں:

میاں یار محمد نے اس دشمن کے مارے جانے کے بعد اطمینان کا سانس لیا اور فوراً شاہزادے کے پاس اپنے وکلا بھیجے۔ اس کے وکیلوں نے شاہزادے کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام غلط فہمیاں دور کریں اور میاں یار محمد کی طرف سے انتہائی نیاز مندی اور خلوص کا مظاہرہ کیا، جس کا اثر شاہزادے پر بہت اچھا ہوا۔

شاہزادہ، بختاور خاں کے قتل کے بعد کچھ دن بکھر میں رہا، پھر اس نے سبّی اور دھاڈر کی حکومت بختاور خان کے بعد غازی خان دودائی کے سپرد کی لیکن وہ سنبھال نہ سکا، اس لیے اُس نے اس کی جگہ بختاور خاں کے بھائی اللہ بخش کو یہاں کی حکومت پر مامور کیا، لیکن وہ بھی یہاں کی حکومت کو چلانے میں ناکام رہا، اس کے بعد اس نے یہاں کی حکومت پہلے اسلام خان نہارن کے حوالے کی۔ پھر قائم خان نہارن کو اس اہم خدمت پر مقرر کیا، لیکن دونوں ناکام رہے۔[2]

میاں یار محمد کی سرفرازی اور حاضری:

آخر شاہزادے نے یہاں کی حکومت کا فرمان میاں یار محمد کے نام لکھ کر اس کے موکلوں کے حوالے کیا کہ وہ اس تک پہنچائیں اور ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اس سرفرازی کے شکریے میں وہ ہماری بارگاہ میں حاضر ہو کر دست بوسی کا شرف حاصل کرے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں میاں یار محمد دربیلہ تک ہی پہنچا تھا کہ خواجہ حسین خان بہت سی نوازشوں کے ساتھ حاضری کی منسوخی کا فرمان لے کر آیا اور دیرہ کی نگرانی اس کے حوالے کی۔

تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد اول میں ہے کہ: اس کے علاوہ شاہزادے نے خان پور میر امین الدین کو، شکارپور داؤد پوتوں کو اور سیوستان غلام محمد سکھانی کو دے دیا اور خود بکھر سے ملتان چلا گیا۔[3]

میاں یار محمد کی وضاحت:

مولانا مہر نے تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا) جلد اول صفحہ ۵۱۲ پر بحوالہ گلدستہ نورس بہار قلمی صفحہ ۳۳ اس ضمن میں میاں یار محمد کی وضاحت کا جو اقتباس دیا ہے، اس کا ترجمہ ہم یہاں بجنسہ نقل کرتے ہیں:

> درہ جات سبی و گنجابہ کی حقیقت اس طرح ہے کہ میں پہلے دن ہی سے اس خدمت کی خواہش نہ رکھتا تھا لیکن بختاور خان کے قتل کے بعد اولاً اس کا بھتیجا باوجود اس سرزمین سے پوری طرح واقف ہونے کے، اور احمد یار خان ولد دلاور خان باوجود بڑے منصب دار ہونے کے درجات مذکورہ کے نظم و نسق پر قابو نہ پا کر مستعفی ہو گئے، پھر متصدیوں نے اس خدمت پر اس فدوی کو نہایت اصرار کے ساتھ مقرر کیا، چنانچہ میں نے حضرت عالمگیر خلّد مقامہ کے سند کے مطابق آج تک ان علاقوں کا انتظام ٹھیک ٹھیک کیا ہے، اور اپنی عزت کی حفاظت کی خاطر خاصی جمعیت نوکر رکھ کر زیر بار خرچ ہو رہا ہوں، آمدنی کی کمی اور خرچ کی زیادتی دیکھتے ہوئے بعض اوقات جی چاہتا ہے کہ ان محالات سے دوسروں کی طرح استعفا دے دوں، لیکن یہ

---

(1) تحفۃ الکرام (طبع راشدی) ص ۴۳۸۔

(2) یہ تمام تفصیل تحفۃ الکرام (طبع راشدی) ص ۴۳۷-۴۳۵ سے ماخوذ ہے۔

(3) تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد اول، ص ۲۱۵۔

امر موجودہ وقت کے متصدیوں کی مرضی کے خلاف ہے، بہر حال مجبوراً بسر کر رہا ہوں۔ (تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) ج ۱، ص ۲۱۵-۲۱۶ بحوالہ گلدستہ نورس بہار)۔

تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد اول میں بحوالہ گلدستہ نورس بہار منقول ہے کہ کچھ عرصے کے بعد بکھر اور سیوستان کی زمینداری بھی میاں یار محمد مخاطب بہ خدایار خاں کو حسب ذیل شرائط کے ساتھ عطا کی گئی۔

۱۔ سرحدی دروں کا انتظام مستحکم رکھا جائے گا۔

۲۔ جب بادشاہ کو ضرورت ہو گی تو وہ اپنی فوج لے کر ملتان اور ٹھٹھہ کے صوبیداروں کے ساتھ خدمت کے لیے تیار رہے گا۔

۳۔ راستوں کے امن کی حفاظت کی جائے گی۔

۴۔ رعایا کی خوشحالی کا خیال رکھا جائے گا۔

۵۔ ایران کی صحیح صحیح خبریں دربارِ شاہی میں پہنچائی جائیں گی۔

اسی کے ساتھ میاں صاحب کو خلعت فاخرہ، جڑاؤ کلغی، تلوار، گھوڑا اور ہاتھی بھی عنایت ہوا۔[1]

بروہیوں کے پیدا کردہ مصائب:[2]

میاں یار محمد کو اگرچہ بادشاہ کی طرف سے اعزاز و منصب اور زمینداری مل جانے کی وجہ سے ایک گونہ اطمینان ہو گیا تھا، لیکن خوانین قلات نے اُن سے از روئے حسد و دشمنی کی ایک نئی راہ نکالی۔ ہم گزشتہ اوراق میں ذکر کر آئے ہیں کہ جب میاں یار محمد نے قلات میں پناہ لی تھی، تو بروہیوں نے ان کے اہل و عیال اور کچھ آدمیوں کو بطور یرغمال کے اپنے پاس رکھا تھا اور کچھ کو واپس کر دیا تھا کہ وہ اپنے وطن جا کر لوٹ مار سے جو کچھ حاصل کریں وہ خوانین کے حوالے کر دیں، لیکن خوبیٔ تقدیر سے میاں صاحب کے واپس ہوتے ہی نہ صرف ان کی سابقہ زمینداری ان کو ملی، بلکہ شاہی فرمان کی بنا پر اُنہیں حکومت اور منصب دونوں مل گئے، اس نے خوانین قلات کے دل میں دشمنی کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔

سمندر خاں کا پیغام:

میاں صاحب کا بیان ہے کہ سمندر خاں کے دل میں خصومت اور عناد کی آگ بھڑک اُٹھی، اور جھگڑے کا بہانہ ڈھونڈتے ہوئے اُس نے پیغام بھیجا کہ جو محالات تم کو دیے گئے ہیں اگر ان میں گنجابہ کو ہمارے حق میں چھوڑ دو تو ہماری تمہاری صلح ہے ورنہ جنگ ناگزیر ہے۔[3]

خان قلات کے اس پیغام نے میاں صاحب کو سخت ذہنی پریشانی میں مبتلا کر دیا، ظاہر ہے کہ یہ علاقے ان کو بادشاہ کی طرف سے عنایت ہوئے تھے، جن کے وہ صرف امین تھے، وہ اس کے مجاز نہ تھے کہ ان میں سے کسی علاقے کے حقوق ملکیت کسی دوسرے کو منتقل کر دیں۔

میاں صاحب نے اس پیغام کے بعد مزید تحقیق حالات کے لیے اپنے چھوٹے بھائی میاں میر محمد خاں کو قلات بھیجا، لیکن خانِ قلات کا پھر بھی وہی جواب تھا، جس کا تذکرہ ہم بحوالہ گل دستہ بہار اوپر کر آئے ہیں۔

میاں میر محمد خاں کے واپس آنے کے بعد اور سمندر خاں کا فیصلہ معلوم ہونے کے بعد میاں صاحب نے اپنے مشیروں سے مشورہ کیا، اُن سب نے جواب دیا کہ اگر شاہی حکام اس پر راضی ہوں تو گنجابہ اس کے حوالے کر دیا جائے، لیکن میاں صاحب خود اس پر راضی نہ تھے، چنانچہ گل دستہ نورس بہار میں میاں صاحب نے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ:

> گنجابہ تو بجائے خود ایک قلعہ ہے، اگر کوئی اس کی ایک اینٹ بھی آئینہ بنانے کے لیے لینا چاہے، اس کی آنکھیں اندھی ہو جائیں میں اُس کی خاک بھی نہیں دے سکتا، خدا نہ کرے کہ اس قسم کے بے ہودہ خیالات مجھ بے مقدار کے دل میں گزریں۔۔۔ بروہی اپنے تمام لاؤ لشکر کو لے کر ہمارے محالات کی سرحدوں پر آیا ہوا ہے، اور گنجابہ کا محاصرہ کیے ہوئے ہے، رات دن جنگ ہوتی رہتی ہے۔ مجھے قدم مبارک کی قسم ہے کہ میرے دل میں اُس سے ذرا سا بھی اندیشہ پیدا نہیں ہوا۔ حق سبحانہ تعالیٰ مجھ کو اتنی وسعت اخراجات میں عطا کرے کہ میں سپاہ کا خرچ برداشت کر کے قلات پر بلّہ بولوں اور مفسدوں کا قلع قمع کر دوں، فرزنداں و قبائل فرمانبرداری کی راہ میں نثار ہیں۔[4]

میاں صاحب کے خاندان پر سختیاں:

اس عرصے میں خوانین قلات نے میاں صاحب کے اہل و عیال اور ان لوگوں پر جو قلات میں مقیم تھے نہایت سختیاں شروع کر دیں، خود میاں صاحب ان سختیوں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

---

(1) تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا) ج ۱، ص ۲۱۷-۲۱۸ بحوالہ گل دستہ نورس بہار قلمی، ص ۹۔

(2) سمندر خان، محراب خان کا چچازاد بھائی تھا، وہ محراب خان کی وصیت کے مطابق اس کا جانشین ہوا

(3) ماخوذ از تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد اول بحوالہ گل دستہ نورس بہار، قلمی، ص ۹۴۔

(4) تاریخ کلہوڑا جلد ۱، ص ۲۲۳-۲۲۴ بحوالہ گل دستہ نورس بہار، قلمی، ص ۵۲-۵۳۔

میرے بیٹے اور چار خانوادے اُس عہد و پیمان کے بھروسے پر قلات میں مقیم تھے اور دشمنوں جیسے سلوک کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے، اسی زمانے میں اُس نے میرے بیٹوں کو حکم دیا کہ اپنی پناہ گاہ چھوڑ کر قلعے میں آجاؤ اور اپنے ساتھ مستورات کو بھی قلعے میں لے آؤ، اور اپنے اس حکم کی تعمیل پر اُس نے سخت اصرار کیا، چونکہ اس کا یہ طرزِ عمل عزت و ناموس کے خلاف تھا، اس پر میرے نور چشم کو بہت غیرت و حمیت آئی۔[1]

میاں صاحب کے اہل و عیال کی رہائی:

آخر ملتان سے شاہی حکم پہنچا کہ میاں صاحب کے اہل و عیال اور ان کے آدمیوں کو رہا کر دیا جائے، تب ان کو رہائی ملی۔[2]

تحفتہ الکرام میں ہے کہ: میاں یار محمد نے سیوی کے درّے پر پہلے اپنے صاحبزادے میر محمد کو پھر محمد داؤد خان کو مقرر کیا، ایک مرتبہ رحیم خان پر آنکھ اور دولت خان پنّی نے فساد کھڑا کیا، لیکن انہیں اس کی سزا ملی، اس کے بعد داؤد پوتوں نے بھی سخت لڑائیوں کے بعد شکست کھا کر ہمیشہ کے لیے اطاعت قبول کر لی۔[3]

گل دستۂ نورس بہار میں میاں یار محمد کے مکاتیب سے رحیم اور دولت کے ہنگامے کی مزید تفصیلات ملتی ہیں، ایک مکتوب میں انہوں نے اس فتنے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ: میں نے اپنے بیٹے کو سرحدی درہ جات کی حفاظت کے لیے مقرر کیا تھا، اتفاق سے سیوی میں بخار نے وبا کی صورت اختیار کر لی، یہاں تک کہ کوئی شخص بھی اس بیماری سے محفوظ نہ رہا، خود میرا بیٹا بھی بخار کی وبا میں مبتلا ہو گیا اور واپس لوٹنے پر مجبور ہوا، ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ رحیم، یوسف وغیرہ نے افغانوں کو ملا کر قلعہ ڈھاڈر پر حملہ کر دیا، ہمارے آدمی سخت بیماری کی وجہ سے جم کر مقابلہ نہ کر سکے اور قلعہ ڈھاڈر پر انہوں نے قبضہ کر لیا۔

میں نے اپنے دوسرے بیٹے کو فوج دے کر مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ اس نے پہلے قلعہ ڈھاڈر کا محاصرہ کیا، پھر سخت جنگ کے بعد جس میں میرا بیٹا بھی زخمی ہوا اور دشمنوں کے سرداروں میں رحیم، یوسف، یوسف کا بھائی گوہر اور افغانوں کا سردار پنجو مارے گئے، یہ رنگ دیکھ کر سبزل خان اور دولت خان نے امان مانگی اور لڑائی ختم ہو گئی، رات کے وقت یہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے اور خدا کی مہربانی سے یہ دونوں قلعے پھر ہمارے قبضے میں آگئے۔[4]

گل دستۂ نورس بہار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳ ذوالحجہ ۱۱۱۹ھ (۲۵ فروری ۱۷۰۸ء) کو یہ دونوں قلعے دشمنوں کے قبضے میں گئے تھے۔

ان کا دوسرا بیٹا ۹ محرم ۱۱۲۰ھ (۲۰ مارچ ۱۷۰۸ء) کو مقابلے کے لیے موضع کھائی میں پہنچا جو ڈھاڈر سے چار کوس ہے۔

۱۲ محرم، ۱۱۲۰ھ (۲۳ مارچ ۱۷۰۸ء) کو اس نے یورش کی اور سینتیس روز کے بعد دونوں قلعے میاں صاحب کے قبضے میں دوبارہ آگئے۔[5]

میر عبدالجلیل بلگرامی نے فتح سیوی و ڈھاڈر پر ایک قطعہ لکھا ہے، جس کے آخری شعر کے دوسرے مصرعے سے ان دونوں قلعوں کی فتح کی تاریخ نکلتی ہے:

گزشت از سر جاں رحیم و بگفتم
ز داؤد شد فتح سیوی و ڈھاڈر[6]

۱۱۲۳ھ

جنگِ جھوک:

میاں یار محمد ہی کے زمانے میں جھوک کی جنگ اور صوفی شاہ عنایت کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، جسے ہم تفصیل سے گزشتہ اوراق میں لکھ آئے ہیں، اس جنگ میں میاں صاحب بھی شاہی فوجوں کے ساتھ شریک تھے، تحفتہ الکرام میں ہے کہ:

> اعظم خان نے حضور میں عرض کر کے خدا یار خان عباسی اور دوسرے گروہوں کو حسب الحکم طلب کر لیا اور بے شمار فوج لے کر صوفی شاہ عنایت پر چڑھائی کی۔[7]

مقالات الشعرا میں کچھ اور تفصیلات ملتی ہیں، مقالات میں ہے کہ: اعظم خان نے میاں یار محمد خان تمام زمینداروں اور خطۂ سندھ کے ان

---

(1) تاریخ کلہوڑا- جلد-۱- ص ۲۲۵-۲۲۶ بحوالہ گلدستہ نورس بہار، ص ۹۴۔
(2) ایضاً- ص ۲۲۷۔
(3) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۳۲۸۔
(4) تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد ۱، ص ۲۳۳-۲۳۲ بحوالہ گلدستہ نورس بہار، ص ۲۹-۳۰۔
(5) تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد ۱، ص ۲۳۴-۲۳۳۔
(6) تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد اول، ص ۲۳۸۔
(7) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۱۱۔

تمام لوگوں کے نام امداد کے احکام حاصل کر لیے، جن کے پاس لشکر تھے اور جو فقیروں سے پہلے ہی سے کینہ رکھتے تھے اور اس نے ایک ٹڈی دل لشکر کے ساتھ جو سبی اور ڈھاڈر کی سرحد سے دریائے شور تک جمع تھا، فقیروں کا محاصرہ کر لیا۔[1]

خود میاں یار محمد نے بھی اس جنگ کے متعلق تفصیلات لکھی ہیں، جنہیں ہم تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا) جلد اول صفحہ ۲۹۹ سے یہاں نقل کرتے ہیں، میاں صاحب کا بیان ہے کہ:

> میں اور نواب اعظم خان دریائے اوتھل سے گزر کر جھوک پہنچے، چونکہ قلعے کے گرد گہری خندق کھود رکھی تھی، اس لیے لشکر کو جھوک سے نصف کوس پر ٹھہرایا گیا۔ ۱۷ ذیقعدہ کو سواروں اور پیادوں کے ساتھ خندق، قلعے اور ارد گرد کے علاقے کا چکر لگایا اور شاہ عنایت کے مقابلے کی ہمت نہ پڑی۔

اگلے دن اتوار کی رات کو جب صبح ہونے میں تقریباً ایک پہر باقی تھا، شاہ عنایت کی فوج کے ایک ہزار سترہ پیادے شب خون کی غرض سے آئے، ہمارے لشکر کے بھی چند آدمی مارے گئے، لیکن بہادروں نے مفسدوں کو تلوار پر رکھ لیا، بہت تھوڑے لوگ جان سلامت بچا سکے باقی سب تلوار کی گھاٹ اتر گئے۔

مقتولین میں اکثر پنھوار جو قاسم ولد کہرام اور سید کے ساتھ تھے، وکیل ٹھٹھہ، اور احمد بوبکانی اور اس کے دونوں بھائی، اور اودھیجہ قبیلے کے لوگ، اور دوسرے زمیندار جو اپنے آپ کو اس کے زمرۂ فدائیان میں شامل کیے ہوئے تھے۔

یہ اقتباس مولانا مہر نے گلدستہ نورس بہار کے کسی خط سے دیا ہے، اس خط کے آخر میں ہے کہ:

> داؤد خاں عباسی سخت بیمار ہے، امید ہے، کہ خدا کی رحمت سے شفا پائے، انہوں نے تلوار کے پانچ چھ زخم چہرے پر اور جسم کے دوسروں حصوں میں کھائے، اس جنگ میں میاں داؤد کے علاوہ ان کے بھائی میاں غلام حسین نے نیز خدا یار خاں کے بھائی میاں میر محمد خاں نے بڑی بہادری دکھائی اور سب نے کم و بیش زخم کھائے۔

اس خط میں فقیروں میں سے جن خاص لوگوں کے زخمی ہونے کا ذکر آیا ہے، وہ یہ ہیں خوشحال پسر جمال، خیالی ولد صدور، یاقوت، شیر، ابراہیم، ملا صالح۔

اس خط کے آخر میں ہے کہ: ابھی جنگ باقی ہے، انشاء اللہ مفسد کو عنقریب اس کے عمل کا بدلہ ملے گا۔

مولانا مہر نے تاریخ کلہوڑہ جلد اول میں مختلف دلائل سے میاں یار محمد کو صوفی شاہ عنایت کے خلاف کسی کارروائی کے ذمے دار گردانے سے بری قرار دیا ہے، ہم مولانا سے اس حد تک متفق ہیں کہ وہ ایک سرکاری کارندے کی حیثیت سے شاہی حکم پر اس جنگ میں شریک ہوئے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ اس جنگ میں اپنے بھائیوں اور بیٹوں کے ساتھ شریک تھے، خود اس اقتباس میں جو مولانا نے ان کے خط کا دیا ہے، اس میں صاف موجود ہے کہ (بہادروں نے مفسدوں کو تلوار پر رکھ لیا)، مولانا نے مندرجہ بالا اقتباس کو میاں یار محمد کا بیان قرار دیا ہے، اس فقرے سے ظاہر ہے کہ میاں یار محمد صوفی شاہ عنایت اور ان کی گروہ کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے، ممکن ہے کہ علماء نے جو شاہ عنایت کے خلاف چہ میگویاں کی تھیں وہ ان سے متاثر ہوں، بہر حال اس جنگ میں خود ان کا ذاتی جذبہ بھی موجود تھا، جیسا کہ خود مقالات الشعرا کے مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ: اعظم خاں نے میاں یار محمد خاں اور خطۂ سندھ کے ان تمام لوگوں کے نام امداد کے احکام حاصل کر لیے جن کے پاس لشکر تھے اور جو فقیروں سے پہلے ہی سے کینہ رکھتے تھے۔

میاں یار محمد کو کمک دینے کا انعام:

تحفۃ الکرام میں ہے کہ: جنگ جھوک میں اعظم خاں کو کمک پہنچانے کے صلے میں ساواتی اور چاچکان کے کچھ مواضع جیسے لکڑی، ڈنڈو، حجام، دورنگ، رجب، ویسر پاچاتا، تھورو، موضع سائیں ڈنہ اور جھوک کے نواح میں دبی کی زمین کا کچھ حصہ بطور جاگیر ملا، پھر نواب شاکر خان کے جانے کے بعد روپاہ کا پرگنہ بھی انہوں نے اجارے میں لے لیا۔[2]

میاں یار محمد کا عہد:

صاحب تحفۃ الکرام نے میاں یار محمد کا دور اٹھارہ سال قرار دیا ہے، تحفۃ الکرام میں ہے کہ: ان کے ابتدائی نو سال جنگ و جدال اور قتال میں گزرے اور باقی ماندہ نو سال انہوں نے نہایت عیش و آرام سے گزارے، ان آخری نو سالوں میں سوائے جنگ جھوک کے اور کوئی واقعہ

---

[1] مقالات الشعرا، ص ۳۱۔

[2] تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۲۸-۳۲۹۔

پیش نہیں آیا۔[3]

میاں یار محمد نے اپنے زمانے میں امن و امان کے قائم کرنے کی کوشش کی اور اپنے علاقوں میں مفسدین کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیا، قبیلۂ نہمردی کے لوگ جو ٹھٹھہ اور نواح سیوستان میں ہمیشہ لوٹ مار مچا کر مخلوق خدا کو پریشان کرتے رہتے تھے، ان کی تادیب کی، اسی طرح قوم دل اور سوڈھا کے لوگ جو ہلچل مچاتے رہتے تھے، ان کا انسداد کیا اور ملک میں امن و خوشحالی کو بحال کرنے کی کوشش کی۔

وفات:

تحفتہ الکرام میں ان کا سنہ وفات بروز پیر یا منگل ۱۵ ذیقعدہ ۱۱۳۱ھ مرقوم ہے،[1] مراۃ عباسیہ میں ان کی تاریخ وفات ۱۱ ذیقعدہ ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۸ء) لکھی ہے۔[2] مولانا مہر نے مراۃ دولت باسیہ کی روایت کو ترجیح دی ہے۔

مختصر یہ کہ میاں صاحب نے رفیع الدولہ کے زمانۂ حکومت میں اور محمد شاہ کے جلوس سے چار دن پہلے وفات پائی۔

لُب تاریخ سندھ میں ہے کہ ان کا مقبرہ خدا آباد کہنہ میں ہے۔

اولاد:

نامہ نغز میں ہے کہ: ان کے پانچ صاحبزادے تھے (۱) نور محمد خان (۲) محمد خان (۳) محمد داؤد خان (۴) تاج محمد خان اور (۵) غلام حسین خان۔

میاں نور محمد کلہوڑہ

(ملقب بہ خدا یار خاں)

۱۱۳۲ھ (۱۷۱۹ء)

میاں یار محمد کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے میاں نور محمد نے اپنے آباؤ اجداد کی مسند کو زینت بخشی اور یہیں سے یہ خاندان درویشی اور فقر کی منزل سے نکل کر باقاعدہ شاہی کے ایوان میں داخل ہوا، ان کی مسند نشینی کا سنہ ۱۱۳۱ھ مشہور ہے، گو بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے دو ماہ تک اپنے والد کا سوگ منایا اور وہ ۱۱ محرم ۱۱۳۲ھ (۱۳ نومبر ۱۷۱۹ء) کو مسند نشین ہوئے۔ مسند نشین ہونے سے پہلے وہ اپنے باپ کے زمانے میں سیوستان میں نیابت کے عہدے پر مقرر تھے۔

گل دستہ نورس بہار کے دیباچے سے مولانا مہر نے منشی عبدالرؤف سیوستانی کی وہ تاریخ جلوس لکھی ہے، جو انہوں نے میاں یار محمد کی مسند نشینی کی کہی تھی، اور یہی زیادہ معتبر ہے۔

چو بر مسند نشستہ از ہدایت
ولایت مرتبت مہدی ثانی
ز اسمش گر بپرسی باتو گویم
بود نور محمد گر بدانی
جواں مردی، جوادی، دیں پژوہی
ز عدلش گرگ را با بز ستانی
غبارِ شور، ہر جا بود بنشست
بحاصل آمدہ امن و امانی
دلِ عالم چو گلشن بر شگفتہ
بہ گلہائے سرور و کامرانی
إلاھا! ایں دعا از محض خیر است
قبولش کن اجابت جاودانی
چو تاریخ جلوسش باز جستم
بگفتا ہاتفم از نکتہ دانی
کہ ہاں بر خیز از اخلاص برخواں
برت بادا مسلم ملک رانی[3]

۱۱۳۱ھ

میاں محمد داؤد کی مخالفت:

تحفتہ الکرام میں ہے کہ: اُن کا بھائی صاحبزادہ محمد داؤد خان تین سال تک اُن کا مخالف رہا۔[4] میاں نور محمد نے خود اس مخالفت کی تفصیلات دیتے ہوئے لکھا کہ:

جب والد مرحوم کا انتقال ہوا، تو میرا بھائی محمد داؤد خان محالات

---

(3) ایضاً۔ ص ۳۲۸۔

(1) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۲۹۔

(2) تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا) جلد اول، ص ۳۲۵، بحوالہ مراۃ عباسیہ دولت عباسیہ، ص ۹۲-۱۰۹، لب تاریخ سندھ، ص ۱۲۰۔

(3) تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا) جلد اول، ص ۵۵۷-۳۵۶ بحوالہ گلدست نورس بہار۔

(4) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۲۹۔

ٹھٹھہ میں تھا، وہ انتقال کی خبر سنتے ہی وہاں سے روانہ ہوا، جب شہداد پور پہنچا تو بعض غلط مشیروں نے اسے گھیر لیا اور وہ اس کے ساتھ ہو گئے، کچھ اس قسم کے مشیر پہلے سے بھی اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے ایسی غرض آمیز باتیں ملائیں، کہ میرا بھائی وہیں رک گیا اور میری مخالفت کی تیاریاں کرنے لگا، اس مخالفت کے لیے اس نے زیادہ لوگوں کو نوکر رکھ لیا۔

مجھے جب یہ معلوم ہوا تو میں نے اُسے لکھا کہ یہ طریقہ ہمارے بزرگوں کے خلاف ہے، مناسب یہ ہے کہ تم فوراً یہاں پہنچو اور والد کے مراسم تعزیت میں شریک ہو جاؤ لیکن میری اس بات کا اس نے اثر نہ لیا، بلکہ اس کا وہم اور بڑھ گیا، میں نے بھائی کی ان باتوں کو اس کی نوعمری اور لوگوں کے بہلانے پھسلانے پر محمول کیا، لہٰذا اُسے سمجھانے کے لیے بزرگ سادات، خاندان کے بزرگوں اور سلسلے کے معتبر فقیروں کو بھیجا، وہ جا کر میاں داؤد کو اور اس کے ساتھیوں کو لے آئے۔

محمد داؤد کی بیعت اور مزید مخالفت:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان بزرگوں کے سمجھانے پر چلا تو آیا تھا، مگر مخالفت کا بیج اس کے دل میں اُسی طرح پرورش پاتا رہا۔

چنانچہ آگے چل کر میاں نور محمد اسی خط میں لکھتے ہیں کہ:

داؤد نے آنے کے بعد مجھ سے ملاقات کی اور خاندانی طریقے کے مطابق مجھ سے بیعت بھی کر لی لیکن اُس نے ایک رات قیام کرنے کے بعد اس پر زور دیا کہ اسے ہٹڑی کی جانب جانے کی اجازت دی جائے۔ اگرچہ والد کے سوگ کے زمانے میں اُس کی یہ بات مناسب نہ تھی، لیکن میں نے اس خیال سے کہ اس کے دل میں کہیں اور مزید وہم پیدا نہ ہوں اُسے اجازت دے دی، ہٹڑی پہنچنے کے بعد اس نے سپاہی بھرتی کرنے شروع کر دیے، قلعے، فصیل اور بُرجوں کی تعمیر شروع کر دی، خندقیں کھدوائیں اور بکھر سے چند توپیں خریدیں اور انہیں قلعے کے بُرجوں پر نصب کرایا، مجھے جب یہ معلوم ہوا تو میں نے اسے خط لکھا اور فقیروں کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ یہ بچپن کی حرکتیں چھوڑ دے، جس میں اُسے سوائے شرمندگی کے کچھ حاصل نہ ہو گا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میاں نور محمد کی نصیحتوں کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوا اور وہ سامانِ جنگ اور رسد قلعے میں جمع کرتا رہا، اُسی زمانے میں میاں نور محمد اپنے اسلاف کے طریقے کے مطابق مختلف بزرگوں کے مزاروں کی زیارت کے لیے روانہ ہو گئے، اُنہیں خیال تھا کہ وہ اس موقع پر ملاقات کے لیے حاضر ہو گا اور کوئی نہ کوئی معذرت کرے گا اور اگر وہ نہ آیا تو وہ خود جائیں گے۔

اسی اثنا میں میاں داؤد نے راستوں پر مورچہ بندی کر لی، جب میاں نور محمد مورچہ بندی کے مقام سے تین کوس کے فاصلے پر اور ہٹڑی سے آٹھ کوس کے فاصلے پر تھے، تو اچانک میاں محمد داؤد کی طرف سے سادات کے ذریعہ میاں نور محمد کے پاس معافی کی درخواست پہنچی، ان لوگوں نے قسم کھا کر عہد و پیمان کیے اور میاں داؤد کے لیے امان طلب کی۔ اسی وقت فیصلہ کیا گیا کہ وہ پرگنہ چاندوکہ کے بجائے پرگنہ لاکھاوٹ میں رہے، میاں داؤد نے تین چار روز کی مہلت مانگی اور چند کشتیوں کی درخواست کی، تاکہ وہ تیار ہو کر لاکھاوٹ چلا جائے، میاں نور محمد نے یہ سب انتظام کر دیے اور اس کی لغزشوں سے چشم پوشی کی اور اپنے دو تین معتبر فقیروں کو بھی اس کے ساتھ کر دیا کہ جب اس کی شرمندگی دور ہو جائے تو وہ آنے میں تامل نہ کرے۔

کہتے ہیں کہ جب داؤد خان اطاعت قبول کر کے پہلی مرتبہ میاں نور محمد کے سامنے آیا تو منشی عبدالرؤف سیوستانی میر منشی، میاں نور محمد کے پاس اُس وقت موجود تھا، اس نے فوراً یہ شعر پڑھا:

قدرتِ حق را تماشا کن کہ آں داؤد خان
باوجودی صفدری تیری ز ترکش بر نداشت[1]

میاں نور محمد کی پہلی عرضداشت شاہ دہلی کی خدمت میں:

گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے کہ میاں نور محمد کی مسند نشینی کے وقت محمد شاہ دہلی کے تخت پر بیٹھ چکا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میاں یار محمد کی وفات کی اطلاع اُس وقت تک دہلی نہ پہنچی تھی، وہاں سے محمد شاہ کی تخت نشینی کی اطلاع رسمی طور پر میاں یار محمد کے نام سندھ آئی ہو گی، اس کے جواب میں میاں نور محمد نے جو عرضداشت بھیجی، اس کا ترجمہ یہ ہے:

موروثی غلام اپنے باپ کی جگہ فرمانبرداری کے لیے مستعد ہے، اطاعت و جان سپاری کے واجبات پورے کر رہا ہے، احکام کی تعمیل میں کوشاں ہے، ایرانی سرحد کے قلعوں سبی و گنجابہ نیز دوسرے علاقوں اور سیوستان کے دروں کی نگہبانی کے فرائض

---

[1] یہ تمام تفصیل تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد اول، ص ۵۸-۳۵۵ سے ماخوذ ہے۔

ادا کر رہا ہے، تمام معاملات کا بندوبست پہلے سے بھی بہتر پیمانے پر پیش نظر ہے۔

داؤد پوتوں سے جنگ:

تحفتہ الکرام میں ہے کہ: ۱۱۳۵ھ (۲۳-۱۷۲۲ء) میں داؤد پوترے ان سے جنگ کرنے کے لیے مستعد ہوئے، اس جنگ کی وجہ یہ تھی کہ میاں نور محمد کی طرف سے ملا جیند و ابڑو بکھر کے تعلقے میں پرگنہ جتوئی کے بعض زر خرید مواضعات کا منتظم تھا۔ شکار پور اور اس کی گرد و نواح کے مواضعات میر عبدالسمیع کی جاگیر میں شامل تھے، داؤد پوترے میر عبدالسمیع کی جاگیر میں مداخلت کرتے تھے اور میر عبدالسمیع کے باز پرس کرنے پر کوئی جواب نہ دیتے تھے۔ میاں نور محمد نے اپنے خدمتگار ٹھارو کو حضور میں بھیج کر عریضہ پیش کیا کہ یہ جاگیر میرے نام مقرر کر دی جائے اور ساتھ ہی میاں نور محمد نے داؤد پوتروں کی تادیب و سرزنش کا سر و سامان کر لیا۔ چنانچہ میاں صاحب نے تھوڑی سی جنگ کے بعد شکار پور کا محاصرہ کر کے داؤد پوتروں کو ہار ماننے پر مجبور کر دیا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ جاگیر کے چار حصے کر دیے جائیں، دو حصے جاگیر کے مالکوں اور ایک حصہ داؤد پوتروں کو اور ایک حصہ میاں نور محمد کو ملے، اس کے بعد میاں نور محمد نے اس فیصلے پر ان کی ضمانت لی اور ملا جیند و ابڑو کو اپنے حصے کے محاصل وصول کرنے کا منتظم مقرر کیا اور اسے شکار پور میں بٹھا دیا، جہاں شہر کے کنارے اس کا مکان تھا، سلیمان خان کھوسہ، حکیم خان، فرید خان اور دلاور خان بلوچوں کو اس کی کمک کے لیے مقرر کیا۔

اس اختلاف کی آگ دب تو ضرور گئی تھی، لیکن بجھی نہیں تھی، ۱۱۳۹ھ (۲۷-۱۷۲۶ء) میں میاں نور محمد نے شکار پور میں قیام کر کے داؤد پوتروں کی بیخ کنی کے لیے ایک لشکر روانہ کیا، جس نے دہلی کے قلعے میں انہیں گھیر لیا، بعد میں سادات کی سفارش پر انہیں امان ملی اور انہوں نے فتنہ و فساد کے خیال کو دل سے قطعی نکال دیا۔ نہاران کی وہ زمین جو بد نظمی کے زمانے میں داؤد پوتروں کے ہاتھ آگئی تھی، مکمل طور پر اصل مالکوں کو واپس مل گئی اور داؤد پوترے منتشر ہو کر دور دراز ملکوں یعنی ملتان کے پرگنوں جیسے پھلی، ملک امام الدین جویا، فرید خان لکھ دیرہ، تاین، بھاولپور، ہانسی، سمہ کے ملک، افغانوں کی سرحدوں کی قریب کی زمینوں پاک پتن اور صیرو غیرہ میں جا کر آباد ہو گئے۔

بالآخر دو سال کے بعد اپنے کیے پر پشیمان ہو کر انہوں نے میاں نور محمد سے ملازمت کی التجا کی، جس پر مناسب تنخواہیں عطا کر کے بکھر کے تعلقے کی زمین جو سرائیوں کے قبضے میں نئی نئی آئی تھی، اس میں جاگیریں اور مکانات دے کر انہیں آباد کیا گیا۔

بروہیوں سے جنگ:

گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے کہ کلہوڑوں اور بروہی والیان قلات سے اس وقت اختلاف شروع ہوا تھا کہ جب میاں یار محمد نے قلات میں پناہ لی تھی اور بروہیوں نے ان کے اہل و عیال کے ساتھ سخت بد سلوکیاں کی تھیں، لیکن یہ اختلاف اور بھی شدید اس وقت ہوا جب میاں صاحب کو سیوی اور گنجابہ شاہی حکم سے جاگیر میں ملا، لیکن یہ اختلاف دبا ہوا تھا۔

خوانین قلات کے متعلق اتنا اور سمجھ لینا چاہیے کہ احمد خاں بروہی کے بعد اس کا بیٹا محراب خاں قلات کا حاکم بنا تھا، وہ میاں نور محمد اور میاں داؤد کا تعاقب کرتے ہوئے زخمی ہوا اور تین روز کے بعد ان ہی زخموں سے وفات پائی، اس وقت محراب خاں کے دونوں بیٹے کم عمر تھے، اس نے وصیت کی تھی کہ میرے لڑکوں کے جوان ہونے تک میرے چچازاد بھائی سمندر بروہی کو میری جگہ حاکم بنایا جائے، سمندر نے سولہ سال حکومت کی، جب اس نے وفات پائی تو محراب خاں کا بڑا بیٹا میر احمد قلات کا حاکم بنا، لیکن اسے انتظامی اور حکومت کے امور سے دلچسپی نہ تھی، لہٰذا اس کے چھوٹے بھائی میر عبداللہ خان حاکم شال کوٹ نے موقع پا کر اپنے بھائی کو ۱۷۱۶ء میں معزول کر دیا۔ اور خود اس کی جگہ حاکم بن بیٹھا۔ میر عبداللہ نہایت شجاع اور بہادر انسان تھا، اس کا سکہ دور دور تک بیٹھ گیا، اسی نے سلطان حسین غلزئی کو شکست دے کر قندھار کے گرد و نواح کو تاخت و تاراج کیا اور شہباز کوہستان کا لقب اختیار کیا تھا۔

میاں نور محمد جو اپنی طرف سے بروہیوں سے اچھے تعلقات قائم رکھنا چاہتے تھے، وہ چالیس ہزار روپے سمندر کو سالانہ دیا کرتے تھے۔

میر سمندر کے بعد میر احمد نے چار سال حکومت کی۔ اس نے نہ اس روپے کا تقاضا کیا، نہ میاں نور محمد نے بھیجا، جب میر عبداللہ حاکم ہوا تو اس نے میاں نور محمد پر حملہ کرنے کی غرض سے لشکر جمع کرنا شروع کیا، میاں نور محمد کو معلوم ہوا تو انہوں نے چالیس ہزار روپے کی رقم اور ایک ہاتھی میر عبداللہ خاں کو بھیجا، اور یہ چیزیں میاں نور محمد کے آدمی بی بی نانی واقع درۂ بولان میں پہنچا گئے۔[1]

---

(1) تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد اول، مصنف مولانا مہر، ص ۳۹۰-۳۸۹، بحوالہ تاریخ بلوچستان، ص ۱۸۶۔

تحفتہ الکرام میں ہے کہ: ۱۱۴۲ھ (۱۷۶۲ء) میں مراد کلیری عرف گنجو سیوی کا ناظم مقرر ہوا، اس نے جوانمردی اور شجاعت اور حسن تدبیر کی بدولت قیصر مگسی زمیندار گنجابہ، میرو کودری قوم رند سردار علاقہ کشورہ، محال سنی کے سائیں گہرام لاشاری کی اولاد محال کچھی کے مالک میرو بلیدی، محال بھاگ ناڑی کے زمینداروں یعنی مھیان ابری اور لیھیا ماچھی، ڈھاڈر کے مالکوں، بازوئی قوم کے کالا خاں اور دوسرے کوہستان کے بلوچ زمینداروں اور کنکانی کے محالدار بہار خاں امرانی وغیرہ کو جس میں سے ہر ایک ہزاروں کے لشکر کا سردار تھا، شکستیں دے کر مطیع کرنے کے بعد خان قلات عبداللہ خان بروہی سے جو اپنے آپ کو کوہستان کا شہباز کہتا تھا جا کر پنجہ ملایا۔ آخر ۱۱۴۳ھ (۱۷۷۳ء) میں مراد کلیری نے فوج کشی، محاصرے اور جنگ کے بعد کرتہ کا قلعہ مبارک خاں سے چھین لیا، پھر اس کا لشکر پیش قدمی کرتا ہوا اسماعیل خاں بروہی کو شکست اور کاکر بروہی کو قتل کر کے فتح یاب ہوا۔[1]

عبداللہ خاں بروہی کی دو بیٹیاں میاں نور محمد کے صاحب زادوں کے نکاح میں:

عبداللہ خاں نے ان ناسازگار حالات سے مجبور ہو کر اپنی دو بیٹیاں میاں نور محمد کے دو صاحبزادوں سے بیاہ کر صلح کی۔[2] تحفتہ الکرام (طبع راشدی) کے حواشی میں راشدی صاحب نے لکھا کہ: میاں نور محمد کے بیٹے خدا داد کی شادی عبداللہ خاں کی دختر سے ۱۱۴۷ھ (۱۷۳۴ء) میں ہوئی اور میاں صاحب کے دوسرے بیٹے میاں مراد یاب خاں کی شادی عبداللہ کی بیٹی سے ۱۱۴۳ھ (۳۱-۱۷۳۰ء) میں ہوئی۔

میاں نور محمد کا حملہ:

اتفاق سے ۱۱۴۴ھ (۱۷۷۴ء) میں بروہیوں کے ایک قبیلے نے عہد شکنی کر کے فرید آباد کے قریب کی کاچھ کی سرزمین کو تاخت و تاراج کیا، اس پر میاں نور محمد نے بذات خود جوابی حملے کی ٹھانی، چنانچہ میاں نور محمد خود لاڑکانے میں منزل انداز ہوئے اور نامور سرداروں کو عبداللہ خاں سے جنگ کرنے کے لیے بھیج دیا، پھر جند ھیر (جانداری) کے قریب جہاں عبداللہ خان پیش قدمی کر کے آیا تھا، دونوں فریقین میں جنگ ہوئی، میر عبداللہ خان نے یہ جنگ نہایت مردانہ وار لڑی، لیکن عبداللہ خاں اس جنگ میں مارا گیا، اور بروہیوں کا زور ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا: تحفتہ الکرام (طبع راشدی) کے حواشی میں عبداللہ خان بروہی کے مارے جانے کا سنہ ۱۱۴۳ھ درج ہے۔ جند ھیر (جانداری) کی جنگ کے بعد میاں نور محمد کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ آگے بڑھ کر قلات پر قبضہ کر لیں، لیکن شاید انہوں نے اس وجہ سے اس اقدام کو گوارا نہ کیا کہ وہ اس کو اپنی عام پالیسی کے خلاف سمجھتے تھے، یا اس علاقے کو خشک اور بنجر سمجھ کر انہوں نے چھوڑ دیا۔

سندھ پر نادر شاہ کا حملہ:

میاں نور محمد ابھی اندرونی خلفشار سے نمٹ ہی رہے تھے کہ سندھ پر نادر شاہ کی صورت میں بلا کا نزول ہوا، دہلی کی لوٹ مار اور قتل عام کے بعد نادر ہندوستان سے یکم رمضان ۱۱۵۲ھ (۲۱ نومبر ۱۷۳۹ء) کو کابل پہنچا، اور اُس نے میاں نور محمد کے نام کابل سے حکم بھیجا کہ وہ کابل میں اُس سے ملیں، میاں نور محمد نے اس وفاداری کی بنا پر جو شاہانِ مغلیہ دہلی سے ان کی تھی اس فرمان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

ادھر نادر شاہ کو جب یہ اندازہ ہو گیا کہ میاں صاحب نے اُس کے حکم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تو وہ سندھ پر حملے کے لیے بجلی کی طرح کڑکا اور طوفان کی طرح روانہ ہوا، اگرچہ سرما کا موسم شروع ہو چکا تھا اور کابل سے سندھ پہنچنا کوئی آسان کام نہ تھا، لیکن وہ ۸ رمضان ۱۱۵۲ھ (۸ نومبر ۱۷۳۹ء) کو روانہ ہوا، اور ۲۱ دسمبر ۱۷۳۹ء کو پہاڑی علاقوں کو طے کر کے ۲۵ دسمبر ۱۷۳۹ء کو ڈیرہ اسماعیل خاں پہنچ گیا۔

ڈیرہ اسماعیل خان سے نادر شاہ نے اپنی فوج کا بڑا حصہ کشتیوں میں سوار کر کے ڈیرہ غازی خان بھیج دیا، اور وہاں سے لاڑکانہ جانے کے لیے روانہ ہوا۔

ڈیرہ غازی خان سے نادر شاہ نے ایک فرمان میاں نور محمد کے نام طلب کرنے کے لیے بھیجا، لیکن اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔

نادر کا فرمان زکریا خان کے نام:

نادر شاہ نے لاڑکانہ روانہ ہونے سے قبل ایک فرمان زکریا خان ناظم لاہور کے نام روانہ کیا، جس میں اُسے لکھا کہ: ہمارا ارادہ ہے کہ اس مرتبہ ہم سرما کا موسم سندھ میں گزاریں اور وہاں کے شر پسندوں کو تنبیہ کریں، ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ ملتان کی طرف فرار اختیار

---

(1) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۳۲۔

(2) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۳۲۔

کریں اور ہمارا لشکر ان کا تعاقب کرتے ہوئے دریائے سندھ کو عبور کرے گا، لیکن اسے سلطانی علاقے میں مداخلت نہ سمجھا جائے۔ تمہیں چاہیے کہ تم تیار اور مستعد رہو اور ضرورت پڑنے پر لاہور سے ملتان پہنچ جاؤ اور وہاں ٹھہر کر مفرورین کا راستہ روکنے کا انتظام کرو، اگر مفرورین حدود سندھ سے حدود ہند میں داخل ہوں تو ان راستہ روکنے کا اس طرح انتظام کرو کہ ہمارے لشکر کو دریائے سندھ کے عبور کرنے اور ان کے تعاقب کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

زکریا خان نے یہ فرمان دہلی بھیجا، وہاں سے تاکیدی حکم آیا کہ اس فرمان کی پوری پوری تعمیل کی جائے، چنانچہ اُس نے گزرگاہوں کی نگرانی شروع کردی۔

میاں نور محمد کے اقدامات:

میاں نور محمد کو جب نادری حملے کی اطلاع ملی تو انہوں نے یہ سوچ کر کہ نادر شاہ سے مقابلہ کرنا بے سود ہے، اس لیے اپنے دارالسلطنت خدا باد کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ جانے کا فیصلہ کیا کہ جہاں نادر شاہ کی نظر نہ پہنچ سکتی ہو، چنانچہ وہ یہ فیصلہ کرکے اپنا سارا ساز و سامان لے کر عمر کوٹ روانہ ہوگئے، جس کے چاروں طرف ریگستان تھا اور کسی بڑی فوج کو وہاں لے کر پہنچنا مشکل تھا۔

روانگی کے وقت میاں نور محمد کی ہدایت:

روانگی کے وقت میاں نور محمد نے اپنے عاملوں کو حکم دیا کہ رسد کا جتنا سامان جہاں کہیں ہو وہ جلا دیا جائے اور جو جلایا نہ جاسکے اُسے زمین میں دفن کردیا جائے، اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ نادر شاہ کو ناکام بنایا جائے، لیکن ان کی یہ تدبیر اس لیے اکارت گئی کہ یہ موسم وہ تھا کہ کھیتوں میں گیہوں اور جو اس قدر بڑھ چکے تھے کہ وہ جانوروں کے چارے کے کام آسکیں اور بعض جگہ جو غلہ دفن کیا گیا تھا، اُس کا پتا نادر شاہ کو چل گیا تھا۔

نادر شاہ کا اقدام:

نادر شاہ ۱۴ ذیقعدہ ۱۱۵۲ھ (یکم فروری ۱۷۴۰ء) کو لاڑکانہ پہنچا، وہاں پہنچنے کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ میاں نور محمد خدا باد چھوڑ کر صحرائی علاقے کی طرف نکل گیا ہے، وہ سواروں کا ایک دستہ لے کر فوراً ہی اس کے تعاقب میں روانہ ہوگیا، وہ اسی تلاش میں شہداد پور پہنچا، وہاں میاں نور محمد کی طرف سے اس کو تحائف ملے اور میاں نور محمد کی ایک عرضداشت بھی اُسے ملی، غالباً اس عرضداشت میں انہوں نے اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار کیا ہوگا، لیکن نادر شاہ اس سے مطمئن نہ ہوا، اور وہ عین اُس وقت جب کہ میاں نور محمد اپنے خزانوں کو دفن کرکے وہاں سے روانہ ہونے والا تھا، نوے میل کا فاصلہ طے کرکے عمر کوٹ کے سامنے جا دھمکا، اور اس نے چاروں طرف سے قلعے کو گھیر لیا۔

میاں نور محمد نے یہ اندازہ کرکے کہ مقابلے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، اپنے آپ کو نادر شاہ کے حوالے کرنے کے لیے یہ شرط پیش کی کہ اُس سے اور اس کے خاندان سے کوئی تعارض نہ کیا جائے گا، نادر شاہ نے ان کی یہ شرط منظور کرلی۔ اس معاہدے کے بعد میاں نور محمد نادر شاہ سے ملے۔ مآثر الامرا میں اس ملاقات کی تفصیل دیتے ہوئے لکھا ہے: کہ نادر شاہ نے میاں نور محمد سے پوچھا کہ تم خدا باد چھوڑ کر کیوں بھاگے تھے؟ میاں صاحب نے جواب دیا کہ: ہم آبا و اجداد سے ہندوستان کے بادشاہ کے نوکر تھے، اگر ہم آپ سے موافقت کرتے تو ہمارے اس طرزِ عمل سے آپ کو بھی ہم پر اعتماد نہ رہتا، میاں نور محمد کی یہ بات نادر شاہ کو معقول نظر آئی، اور اسی مجلس میں خوش ہوکر اُس نے میاں نور محمد کو حسب سابق ملک کے واپس کرنے کی بشارت دی۔[1]

خراج:

اس موقع پر جو رقم میاں نور محمد نے نادر شاہ کو بطور خراج دی وہ بقول انندرام مخلص کے بائیس لاکھ روپے اور ایک ہیرا تھا۔

صاحب مراۃ دولت عباسیہ کا بیان ہے کہ: زر و جواہر میں سے جو کچھ میاں صاحب کے پاس تھا، میرے دادا لالہ مانجھ مل کی معرفت نادر شاہ کی خدمت میں پیش کیا اور اپنا قصور معاف کرایا۔

صاحب تحفۃ الکرام میر علی شیر قانع کا بیان ہے کہ: جس رات کی صبح کو میاں نور محمد کا ارادہ عمر کوٹ سے نکل کر تلہار جانے کا تھا، اسی کی صبح کو نادر شاہ آفت ناگہانی کی طرح عمر کوٹ کے باہر نازل ہوگیا، اس لیے مجبور ہوکر میاں نور محمد اس کے سامنے گنہگاروں کی طرح ہاتھ باندھ کر حاضر ہوا اور اسے نادر شاہ اپنے ساتھ لے کر لاڑکانہ میں منزل انداز ہوا، اس کے بعد ایک کروڑ روپیہ لے کر اس نے میاں نور محمد کا ملک اس کو بخش دیا اور پٹھانوں کو سیوی اور داؤد پوتروں کو شکارپور عنایت کیا۔

---

[1] مآثر الامرا، ج ۱، ص ۸۲۹۔

ٹوبن مل کی تاریخ سندھ میں ہے کہ: نادر چند آدمیوں کے ساتھ عمر کوٹ پہنچا اور ایک درخت کے نیچے ٹھہرا، نور محمد خان نے دور بینی سے کام لے کر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا، اگرچہ میاں صاحب کے ساتھی چاہتے تھے کہ نادر سے مقابلہ کیا جائے، میاں نور محمد نے قابل اعتماد لوگوں کے ذریعہ سے قرآن شریف کا واسطہ دے کر اپنی تقصیرات کی معافی درخواست کی، نادر شاہ نے ایک کروڑ کی رقم نقد اور جواہرات کی صورت میں وصول کی۔

بیگ کا بیان ہے کہ: نور محمد کے مدفونہ خزانے میں ایک کروڑ کے لگ بھگ رقم تھی، اسے نکال کر نادر شاہ کے حوالے کرنا پڑا۔ ایڈوانی کا بیان ہے کہ: علاوہ ایک کروڑ روپے کے میاں صاحب پر بیس لاکھ روپے سالانہ کا خراج عائد کیا گیا۔

میاں صاحب کے ساتھ نادر کا سلوک:

تمام مورخ اس پر متفق ہیں کہ ملک کی حوالگی کے بعد نادر شاہ نے میاں صاحب کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا، یہاں تک کہ میاں صاحب کو شاہ قلی خان کے خطاب سے نوازا، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سندھ کو نادری حملے سے سخت نقصان پہنچا، اس ملک کی وہ دولت جو میاں نور محمد نے ملک کی فلاح و بہبود کے لیے جمع کی تھی، اس کا ایک ایک حبہ نادر شاہ لوٹ کر لے گیا، اس کے علاوہ اس نے ان کے کتب خانے کو بھی لوٹا اور سندھ کی نادر کتابیں بھی لوٹ کر لے گیا۔ چنانچہ میاں نور محمد نے اپنے وصیت نامے منشور الوصیت میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

رسالہ سہروردی مع رسالہ از چہاردہ خانوادہ نزد مایاں موجود بود لاکن از آمدن سفاک ناپاک برہمیں ملک سند، کتب خانہ ورسالہ ہا ہمگی رفتند۔

ملک کا بٹوارا:

علاوہ ازیں نادر شاہ نے جو سندھ کو عظیم نقصان پہنچایا وہ ملک کی تقسیم تھی، اس نے ملک کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ (سبی اور کچھی) عبداللہ خان بروہی کے بیٹے محبت خان بروہی والی قلات کو، شکارپور صادق محمد خان، داؤد پوترہ کو اور بقیہ سندھ میاں نور محمد کو دیا اور میاں صاحب کے سابقہ خطابات بحال رکھ کر "شاہ قلی خان" کا خطاب دیا، اور یہ شرط بھی عائد کی کہ میاں نور محمد کا ایک بیٹا دو ہزار فوج کے ساتھ مستقل طور پر نادر شاہ کی فوج کے ساتھ رہے، چنانچہ میاں صاحب نے اپنے بڑے بیٹے مراد یاب خان کو نادر شاہ کے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ کیا اور اپنے دوسرے بیٹے میاں غلام شاہ کو بھی اس کے ہمراہ کیا تاکہ ایک کو دوسرے سے ڈھارس ہو، اور پردیس میں ایک دوسرے کے معین و مددگار رہیں، کچھ دن کے بعد ان کا تیسرا بیٹا عطران بھی ایران چلا گیا اور یہ تینوں نادر شاہ کے قتل تک وہیں رہے۔

نادر شاہ کی واپسی:

وہاں سے نادر شاہ لاڑکانہ واپس آیا اور اس نے عاشورۂ محرم لاڑکانہ ہی میں گزارا اور یہیں نو روز کا جشن منایا اور پھر وہ ۱۱ محرم ۱۱۵۳ھ (۱۷۴۰ء) کو قندھار روانہ ہو گیا۔

سندھ پر نادری حملے کے اثرات:

نادر شاہ کے حملے سے سندھ پر بہت ہی ناگوار اثرات مرتب ہوئے، نادر شاہ کی لوٹ مار سے ملک کا خزانہ خالی ہو گیا، ملک کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی، شر پسند عناصر جو دبے ہوئے تھے، انہوں نے از سر نو سر اُٹھایا، ملک پر بیس لاکھ سالانہ خراج کا بوجھ پڑا۔

یہ وہ مصائب اور مشکلات تھیں، جن سے میاں نور محمد کو نادر شاہ کے جانے کے بعد سابقہ پڑا لیکن ان مصائب میں گھر جانے کے باوجود میاں نور محمد نے ہمت نہیں ہاری، اور نظم و نسق کے بحال کرنے کی طرف سب سے پہلے توجہ دی۔

نادر شاہ نے لاڑکانہ آنے کے بعد جب کہ میاں نور محمد عمر کوٹ چلے گئے تھے، آقا محمد کریم اصفہانی کو رعایا کا وکیل مقرر کیا تھا، اور اسے امین الملک کا خطاب دیا تھا میاں نور محمد نے ملک کے انتظامات کو از سر نو درست کرتے ہوئے سلطان ساتیہ کو اپنی طرف سے ٹھٹھہ کا ناظم مقرر کیا۔

تحفۃ الکرام میں ہے کہ سلطان ساتیہ نے شورہ قوم کو شکست دے کر مطیع کیا، جو نادری حملے کے زمانے میں خود سر ہو کر سرزمین کھند میں جو پرگنوں کا دل ہے، متانی، کنرو، آریسر اور کہیر، اور تعلقہ چاکرہالہ میں ہوندا اور لدھا نامی شوروں کی سرکردگی میں دست درازیاں کر رہے تھے، ان سے نمٹنے کے بعد وہ موضع ونگی تعلقہ چاچکان کے اربابوں۔ ارباب تماچی، طوغاچی، ٹھارو، سیلہ، کاھہ اور آسو سومرہ پر حملہ کر کے جو مالگزاری ادا کرنے کے لیے تیار نہ تھے، اس نے انہیں نیست و نابود کر دیا۔[1] ۱۱۵۵ھ (۱۷۴۰ء) میں نادر شاہ نے مظفر علی خاں بیات بیگلر

---

(1) تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۴۲۴۔

بیگی کو ان بحری جہازوں کو لانے کے لیے بھیجا، جو اس نے سورت بندر میں تیار کرائے تھے، وہ پہلے کراچی کے راستے سے ٹھٹھہ آیا، میاں نور محمد اس کی ملاقات کے لیے ٹھٹھہ آئے اور تقریباً ڈھائی مہینے تک اس کی مہمان داری کے لیے ٹھٹھہ میں رہے، جب یہ واپس ہوا تو میاں صاحب خدا آباد اپنے مرکز کو واپس ہوئے۔[1]

میاں نور محمد کا طرزِ عمل:

تحفتہ الکرام میں ہے کہ ۱۱۵۶ھ (۴۴-۱۷۴۳ء) میں سردار شاہ طہماسپ قلی خان جلائر داؤد پوتروں کی سرزنش کے لیے آیا۔ میاں نور محمد خاں مصلحت وقت کے پیش نظر گوشہ نشین ہو گیا، جس کی وجہ سے سندھ میں از سر نو بد انتظامی کا دور دورہ ہو گیا، چونکہ ٹھٹھہ کا ناظم سلطان سانتیہ اور شیخ شکر اللہ، میاں صاحب کی طلبی پر ٹھٹھہ کو خالی کر کے چلے آئے تھے، ادھر مظفر علی خاں بیگر بیگی سردار جلائر سے ملاقات کرنے کے لیے آیا ہوا تھا، چند دن تک ٹھٹھہ کا انتظام رضا بیگ شاہی وکیل فاضل بیگ، دھاراجا کے رانا اور ارباب ساجن رانیہ نے کیا، پھر میاں نور محمد سردار جلائر کی ملاقات کے لیے پورہ میں حاضر ہوا اور اپنے تیسرے بیٹے عطر خان کو بطور یرغمال دے کر واپس لوٹا۔ سلطان سانتیہ اور شیخ شکر اللہ پھر ٹھٹھہ واپس آ گئے۔[2]

ملک کی اندرونی شورشوں کا خاتمہ:

میاں نور محمد نے نادر شاہ کے جانے کے بعد ان اندرونی شورشوں کا خاتمہ کیا، جنہوں نے نادر شاہ کی لوٹ مار کے زمانے سے فائدہ اٹھا کر سر اٹھایا تھا۔ تحفتہ الکرام میں ہے کہ: ۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ء) میں شیخ شکر اللہ نے ککرالہ کے حاکم جام ہوتی کو نابود کر کے اس کی جگہ جام موہر کو مقرر کیا۔[3]

رانا دھاراجا کے خلاف دو تین برس تک کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ تحفتہ الکرام میں ہے کہ ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں جب سلطان فقیر نے وفات پائی اور مکلی کی پہاڑی میں مدفون ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا مسو فقیر اس کا جانشین ہوا، اس زمانے میں رانا دھاراجا کی شہ پر سو پہاڑی جنگ مجو افراد ٹھٹھہ کو لوٹنے کے لیے آئے، ان کی مدافعت کے لیے مسو فقیر، شیخ شکر اللہ، بولا خان اور جاکھرا نکلے اور پیر عالی کے مزار کے قریب منزل انداز ہوئے، چونکہ ان کا لشکر قبروں سے گزرا تھا، اسی سوءِ ادب کی سزا میں تیسرے دن مقابلہ ہونے پر ان ہزاروں نے سیکڑوں سے شکست فاش کھائی۔[4]

میاں نور محمد خاں کو جب اس شکست کی خبر معلوم ہوئی تو انہوں نے اپنے صاحبزادے محمد خداداد خان کو کثیر فوج کے ساتھ ٹھٹھہ بھیجا اور اس جرم کی پاداش میں کہ اس نے لشکر کو گزارتے وقت قبروں کی حرمت کا خیال نہیں رکھا، مسو فقیر کو نظامت سے برطرف کر کے اس کی جگہ بلاول فقیر نائج کو ناظم مقرر کیا، اور خود رانا دھاراجا کے مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔ رانا اپنے میں مقابلے کی طاقت نہ پا کر سمندر کے راستے سے نکل گیا اور قلعہ اپنے بعض غلاموں کی نگرانی میں چھوڑ گیا، قلعے کے ان چند آدمیوں نے اس کثیر لشکر کے ساتھ جنگ شروع کر دی، صاحبزادہ محمد خداداد خان نے ایک جعلی دستاویز کے ذریعہ سے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ قلعے پر قبضہ کر لینے کے بعد صاحبزادہ واپس چلا گیا۔[5]

رانا دھاراجا کا قتل:

کچھ زمانے کے بعد شیخ شکر اللہ نے حیلے بہانے سے کام لے کر بجار جو کھیہ کے ساتھ رانا کو صلح کا پیغام بھیجا وہ اس صلح کے پیغام کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے کشتی سے اترا تو شیخ شکر اللہ نے اسے قتل کرا دیا۔[6]

قلعہ کانجی پر حملہ:

تحفتہ الکرام میں ہے کہ ۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء) میں میاں نور محمد خان نے خود قلعہ کانجی پر حملہ آور ہو کر اسے فتح کر لیا، پھر ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) میں ان کچھی کافروں کو جنہوں نے قلعہ کانجی کی فتح کے بعد بدین کے مواضعات اور دوسرے مقامات پر شورش برپا کر رکھی تھی، ان کا قلع قمع کرنے کے لیے بہادر شاہ فقیر اور دوسرے سرداروں کی سرکردگی میں ایک لشکر بھیجا۔

نامۂ نغز میں ہے کہ: کانجی کا حاکم بہت بہادر اور ہنر مند تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی بڑا منافق اور ملحد تھا، اس نے اپنے قلعے میں تمام ضروری چیزیں جمع کر رکھی تھیں، قلعے کے چاروں طرف صحرا تھا، اور ارد گرد پانی

---

(1) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۲۴۔
(2) ایضاً۔ ص ۳۲۴-۳۲۵۔
(3) ایضاً۔ ص ۳۳۵۔
(4) تحفتہ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۳۵-۳۳۶۔
(5) ایضاً۔ ص ۳۳۵-۳۳۶۔
(6) ایضاً۔ ص ۳۳۶۔

بھرا ہوا تھا، نادر شاہ کی طرف سے میاں صاحب کو حکم ملا کہ اس قلعے کو فتح کیا جائے، اسی زمانے میں تاجن مندرہ میاں صاحب کے علاقے سے بھاگ کر قلعہ کانجی میں رہنے لگا۔

میاں نور محمد نے میر شاہو بلوچ کو اپنا ایلچی بنا کر کانجی کے پاس بھیجا، میر نے وہاں جا کر والی کانجی کو سمجھایا کہ اسے پناہ نہ دو، ورنہ میاں نور محمد کے ہاتھوں تم پر بڑی تباہی آئے گی، اس نے جواب دیا کہ میں تاجن کا ساتھ کسی طرح نہیں چھوڑ سکتا، وہ میری جان کے ساتھ ہے، میرے لیے یہ امر بھی عجیب ہے کہ میاں صاحب نے یہ پیغام مجھے کیوں بھیجا ہے، جب کہ نہ میں ان کے ماتحت ہوں اور نہ میرا تعلق ان سے ہے، میرا تعلق تو والیٔ کچھ سے ہے۔

اس جواب کے بعد میاں صاحب کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ قلعہ کانجی پر حملہ کریں، میاں صاحب نے ایک لشکر تیار کیا، جس میں میاں صاحب کے علاوہ صاحبزادہ احمد یار خاں، فضل علی خاں، عارف خاں، میر متارہ، تاج محمد بہائی خاں، شیخ محمد، شاہ بہارا، مراد کلیری، میر چاکر بلوچ، میر شاہو بلوچ، بختیار کھادر، کہاوڑ بلوچ، مسو سامیتہ، شیر بخشہ، دریا خاں ابڑو، شیخ شکر اللہ، پور روحل کھوسہ بلاول اور فتو حل شامل تھے۔ اس لشکر کو لے کر میاں صاحب قلعہ کانجی پر حملہ آور ہوئے اور قلعے کا محاصرہ کر لیا، پہلے قلعے کے ایک طرف سرنگ لگائی، اور اس میں بارود بھرا، اور اسے اُڑایا، سرنگ کا اُڑانا ہی تھا کہ قلعے کی دیوار اُڑ گئی، کانجی کے لشکر کو سخت نقصان پہنچا، آخر شکست کے آثار دیکھ کر والی کانجی نے درخواست کی کہ مجھ سے جس قدر چاہے روپیہ لے لو مجھے کچھ کی طرف جانے دو، مگر اس کی یہ درخواست نامنظور ہو گئی۔ پھر شاہ بہارا کی سفارش پر کانجی کی جاں بخشی کی گئی، لیکن اسے قید کر لیا گیا۔

کانجی کے قلعے کی فتح کی تاریخ باغ علی خائف نے نامہ نغز میں محرم ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) بیان کرتے ہوئے لکھا:

ہزار و صد و شصت یک بود کم
رقم بر سر سال ہجری ز دم

محمد پناہ رجا ٹھٹھوی نے قلعہ کانجی کے فتح کے موقع پر میاں صاحب کے سامنے یہ آیت بہ طور تاریخ پیش کی: "بنصر اللہ ینصر من یشاء" جس سے اس فتح کی تاریخ نکلتی ہے۔

نادر شاہ کی وفات:

۱۶ رجب ۱۱۵۳ھ (۱۷۴۰ء) کو نادر شاہ خوارزم کو مطیع کر کے ماہِ شوال چہار جو کے راستے سے مشہد پہنچا، چونکہ لزگی قبائل نے اس کے بھائی ابراہیم خاں کو قتل کر دیا تھا، وہ ان کی سرکوبی کے لیے مشہد سے نکلا، اور اس نے ابدالی کے لشکر کو اس مہم پر مقرر کیا۔[1]

اس سفر میں ۲۸ صفر ۱۱۵۴ھ (۱۷۴۲ء) کے موسم خزاں میں قلعہ اُولاد کے نزدیک ایک شخص نے جنگل سے نکل کر نادر شاہ پر فائر کیا، اور اس کو کسی قدر مجروح کر دیا۔ مہدی خاں کا بیان ہے کہ حملہ آور دلاور خاں تیمنی[2] کے فرزند کے غلاموں میں سے تھا۔

تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد اول میں ہے کہ نادر پر فائر کرنے والا پکڑا گیا، تو اس نے بتایا کہ اسے اس حملہ کرنے کے لیے نادر شاہ کے بیٹے اور ولی عہد رضا قلی نے آمادہ کیا تھا۔

جون ۱۷۴۱ء کو نادر شاہ تیسری دفعہ داغستان پہنچا اور تقریباً ڈیڑھ سال وہاں رہا، یہیں نادر شاہ کی بدگمانی اپنے بیٹے رضا قلی سے اس قدر بڑھی کہ اس نے اپنے بیٹے کی آنکھیں نکلوا کر اندھا کر دیا۔ بیٹے نے بھرے دربار میں باپ سے کہا کہ آپ نے میری آنکھیں نہیں نکلوائیں بلکہ سلطنتِ ایران کو اندھا کر دیا۔[3]

آخری زمانے میں نادر شاہ کے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا تھا اور اس کا ظلم و جور حد سے زیادہ بڑھ چکا تھا، یہاں تک کہ لوگ اور اس کے خاص خدمتگار بھی اس سے ڈرنے لگے تھے، اسی زمانے میں اس کے خلاف ہر طرف شورشیں برپا ہوئیں اور اہل سیستان جن سے اس نے تین لاکھ تومان مالیے کا مطالبہ کیا تھا، اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور خود اس کا بھتیجا علی قلی شورشیوں کا سرغنہ بنا، یہاں تک کہ طہماسپ خاں جلائر جو نادر شاہ کے بہت بڑے خیر خواہوں میں تھا وہ بھی اس کے ظلم و ستم اور حالات کو دیکھ کر اس فکر میں پڑ گیا کہ اس کی جگہ نادر شاہ کے کسی بیٹے کو تخت پر بٹھائے۔ نادر شاہ کے خلاف جو شورش برپا ہوئی، اس سے خراسان بھی متاثر ہوا اور رادکان میں خبوش قبیلے کے کردوں نے شاہی اصطبل کو لوٹ لیا۔

نادر شاہ ان کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا، ۱۱ جمادی ۱۱۶۰ھ (۲۰ جون ۱۷۴۷ء) کی شب میں فتح آباد میں محمد خان قجر، موسیٰ خان افشار،

---

(1) تعلیقات نوائے معارک، مرتب: آقای عبدالحیی حبیبی، ص ۷۶۵۔

(2) تیمنی: افغانوں کے غور قبیلے سے منسوب اور کاکڑ قبیلے کی ایک شاخ ہے (حاشیہ تعلیقات نوائے معارک نمبر ۱، تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد اول، ص ۵۰۱-۵۰۲)۔

(3) تعلیقات نوائے معارک، ص ۷۶۵ و تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ جلد اول، ص ۵۰۱-۵۰۲۔

خواجہ بیگ افشار اور صالح قرتلوی شامل تھے، نادر شاہ کو قتل کر دیا۔ نادر شاہ کے قتل کے بعد اس کے تمام خزانے برباد ہو گئے اور اس کی وسیع مملکت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خراسان کے بعض سرداروں نے ۲۷ جمادی الاخریٰ (۵ جولائی ۱۷۴۷ء) کو اس کے بھتیجے علی قلی میرزا کو ہرات سے لا کر تخت شاہی پر بٹھایا۔ اور تمام نادری شاہزادوں کو تہ تیغ کر دیا۔[1]

سندھ میں نادر شاہ کے قتل کی تاریخیں:

سندھ میں بھی نادر شاہ کے قتل کی تاریخیں نکالی گئیں، مقالات الشعرا میں ہے کہ جب نادر تخت پر بیٹھا تھا تو مخدوم روح اللہ نے اس کی تاریخ "الخیر فی ماوقع" (۱۱۴۸ھ) سے نکالی تھی، میر علی شیر قانع ٹھٹھوی مؤلف مقالات الشعرا نے جب یہ تاریخ سنی تو نادر شاہ کی تاریخ وفات "لاخیر فی ماوقع" (۱۱۴۸ھ) سے نکالی۔[2]

قاضی عبد القادر ٹھٹھوی نے نادر شاہ کی وفات پر حسب ذیل قطعۂ تاریخ وفات کہا:

فتنۂ نادر چو بروں شہ ز میاں
راحت آمد بہمہ عالمیاں
خوش خبر ہاتف فرمود ز غیب
"محو شد آفت نادر ز جہاں"[3]

۱۱۶۰ھ

احمد شاہ ابدالی:

نادر شاہ کے سپہ سالاروں میں احمد خان بن زماں خان بھی تھا، جو نادر کے بعد اس کی مشرقی میراث کا وارث بنا، یہ سڑبن کے قبیلے سدوزائی ابدالی یا درانی تھا، جو ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۴ء) میں زرغونہ قوم الکوزائی افغان کے بطن سے ملتان میں پیدا ہوا، اس کا باپ اور اس کے خاندان کے لوگ افغانوں کی طرف سے ہرات و قندھار اور ملتان میں حاکم تھے، اس نے ان ہی شہروں میں تربیت پائی۔ ۱۱۵۰ھ میں احمد خان اپنے بھائی ذوالفقار خان کے ساتھ شاہ حسین ہوتک بن میر ویس خان بادشاہِ قندھار کے حکم سے قید تھا، ۱۱۵۱ھ (۱۷۳۸ء) میں نادر شاہ نے شہر قندھار کو فتح کر لیا اور احمد خان کو رہا کر کے مازندران شمالی ایران میں جاگیر دی۔

۱۱۵۴ھ (۱۷۴۱ء) میں اسے نادر شاہ نے مازندران سے اپنے دربار میں طلب کر کے اور لشکر ابدالی کا سپہ سالار بنا کر اپنی ہمرکابی میں مقرر کیا، چھ سال تک جنگی مہموں داغستان و ایران کے سفروں میں وہ نادر شاہ کے ہمرکاب رہا، اور ان لڑائیوں میں اس نے شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ وہ نادری الطاف و کرم کا خاص مرکز بن گیا، یہاں تک کہ اس نے احمد خان کو یہ مژدۂ جاں فزا سنایا کہ میرے بعد تم بادشاہ ہو گے۔

جب نادر شاہ فتح آباد میں قتل ہوا، تو احمد خاں نے نادر شاہ کے اہل حرم کو اپنی پناہ میں لے کر ان کے قتل و غارت گری سے لوگوں کو منع کیا، جس کے نتیجے میں نادر شاہ کے اہل حرم نے "کوہ نور" مشہور ہیرا بطور انعام احمد خاں ابدالی کو دیا۔

نادر شاہ کے قتل کے بعد احمد خان ابدالی نے اپنے قبیلے کے سرداروں کے ساتھ قندھار کا رخ کیا اور قندھار کے مختلف قبیلوں کے سردار مزار شیخ سرخ متصل قلعۂ نادر آباد قندھار کے جنوبی حصے میں جمع ہوئے اور ان قبائل کے سرداروں نے ایک مجلس شوریٰ ترتیب دی، جس میں نور محمد خان میر افغان رئیس خلجی، محبت خان رئیس پوپلزئی، موسیٰ خان رئیس سھاکزئی، نصر اللہ خان رئیس نورزئی، حاجی جمال خان رئیس بارک زئی شریک تھے۔ ان سرداروں نے نو مجلسوں کے بعد احمد خان کو شوال ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں افغان کا بادشاہ منتخب کیا، جس وقت یہ بادشاہ بنا اس وقت اس کی عمر پچیس سال تھی۔ بادشاہ بنتے ہی ایک فقیر نے جس کا نام صابر کابلی تھا، احمد خان کی دستار میں ایک گیہوں کا خوشہ لگایا اور بادشاہ ہونے کی مبارکباد دی۔

احمد شاہ نے بادشاہ ہونے کے بعد اپنے آپ کو بجائے ابدالی کے جو اس کا قبیلوی نام تھا درانی کہلانا شروع کیا، جو اس سے قبل اس قبیلے ہی کے لیے بولا جاتا تھا اور اپنے سکے کے ایک طرف: "الحکم اللہ یا فتاح، احمد شاہ درانی" اور دوسری طرف:

حکم شد از قادر بیچوں بہ احمد پادشاہ
سکہ زن بر سیم و زر از پشتِ ماہی تا بماہ

احمد شاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد افغانستان کے نظم و نسق کو نئے سانچے میں ڈھالا اور شاہ ولی خان کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا، ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۰ء) میں اس نے شہر کنونی قندھار کی اپنے نام "احمد شاہی" کے نام سے بنیاد رکھی۔

پھر احمد شاہ نے اپنی مملکت کے لیے جو خراسان یا افغانستان کے نام

---

(1) تعلیقات نوائے معارک: مؤلف آقای عبد الحئی حبیبی، ص ۷۶۶۔
(2) مقالات الشعرا، ص ۸۱۲۔
(3) ایضاً۔ ص ۴۲۲-۴۲۳۔

سے مشہور تھی ایک لاکھ کا لشکر تیار کیا۔

۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں اس نے غزنی، کابل اور پشاور کو فتح کیا۔ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۹ء) میں وہ تیس ہزار سوار اور پیادوں کے ساتھ قندھار سے نکل کر براہ کابل و پشاور سو احل اٹک و جہلم تک پہنچا۔ شاہنواز خان حاکم لاہور نے بواسطہ وزیر الممالک قمر الدین خان دہلی سے امداد طلب کی اور دریائے چناب کے کنارے وہ احمد شاہی لشکر سے نبرد آزما ہوا، لیکن اس کی فوج نے شکست کھائی اور احمد شاہ نے لاہور کو فتح کر لیا، پھر وہ محمد شاہی لشکر کو شکست دے کر ۱۳ ربیع الاول ۱۱۶۱ھ میں سرہند میں داخل ہوا، پھر احمد شاہ نے سلطنت دہلی سے صلح کر لی اور دریائے سندھ کو دونوں مملکتوں کے درمیان سرحد قرار دیا۔

احمد شاہ کے ہندوستان سے واپس آنے کے بعد پنجاب میں نئے نئے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے، خصوصاً سکھوں نے زور پکڑا، جنوب میں مرہٹے اسلامی سلطنت کو چیلنج دینے لگے۔ ان شورشوں اور فتنوں کو شاہزادہ تیمور اور سپہ سالار جہاں خان نہ دبا سکے۔ ایسے نازک وقت میں ہندوستان کے مسلم زعما نے احمد شاہ ابدالی سے درخواست کی کہ وہ آکر ہندوستان کے مسلمانوں کو ان فتنوں سے نجات دلائے۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان بلانے کے لیے خط لکھے، ان دعوتوں کی بنا پر احمد شاہ ۱۱۷۲ھ (۵۹-۱۷۵۸ء) میں پشاور پہنچا اور وہاں سے لاہور ہوتا ہوا سہارنپور آیا، یہاں ہندوستان کے افغانوں کے بڑے بڑے سردار نجیب الدولہ، سعد اللہ خاں روہیلہ، حافظ الملک رحمت خاں، اور ان کے بیٹے عنایت خان اور دوندے خاں اور قطب خاں دس ہزار لشکر کے ساتھ احمد شاہ کے حضور میں پہنچے۔ اس طرح احمد شاہ کے لشکر کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی، اس نے ہندوؤں اور سکھوں سے متعدد جنگوں کے بعد آخری اور فیصلہ کن جنگ پانی پت کے میدان میں لڑی، جس میں دس لاکھ مرہٹے اور ہندو اس کے مقابل تھے، اس جنگ میں اُس نے دو لاکھ دشمنوں کو تہ تیغ کیا اور بتاریخ ۶ جمادی الآخری ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۰ء) میں اُس نے ان دشمنوں کے مقابلے میں عظیم الشان فتح حاصل کی۔

احمد شاہ نے اس فتح کے بعد شاہ عالم بن عالمگیر ثانی کو دہلی میں بادشاہ بنایا اور اس کے بیٹے میرزا جوان بخت کو نائب السلطنت، اور نواب شجاع الدولہ کو فرزند خاں اور رستم ہند کا لقب دے کر وزیر اعظم اور نواب نجیب الدولہ کو وزیر اعظم مقرر کیا، اور زین خان مہمند کو پنجاب کی حکومت پر فائز کر کے قندھار واپس ہو گیا۔

پنجاب میں پھر سکھوں نے سر اٹھایا اور جیسا سنگھ نامی ایک سکھ نے علم بغاوت بلند کیا، رنجیت سنگھ کا دادا چھمرت سنگھ بھی اس بغاوت میں شریک تھا، انہوں نے پنجاب کے نائب حکومت زین خان کا محاصرہ کر لیا، احمد شاہ کو معلوم ہوا تو وہ ان فتنہ پردازوں کی سرکوبی کے لیے ۱۱۷۵ھ (۱۷۶۳ء) میں لاہور پہنچا، اور روہی میں ۱۱ رجب ۱۱۷۵ھ کو بیس ہزار سکھوں کو شکست دے کر اور قتل کر کے پٹیالہ اور سرہند کی حکومت امیر سنگھ کے سپرد کر کے ۷ شعبان ۱۱۷۵ھ کو فاتحانہ لاہور لوٹ آیا۔[1]

احمد شاہ ابدالی اور سندھ:

سندھ میں نادر شاہ کے قتل سے اس کا طوق غلامی ختم ہوا تو احمد شاہ کی غلامی کی رسی اس کے گلے میں پڑی۔ احمد شاہ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں ہندوستان آیا، تو اُس نے میاں نور محمد کو شاہ نواز خاں کا خطاب دیا، اور میاں نور محمد سے معاہدہ لیا کہ وہ سالانہ خراج جو نادر شاہ کو دیتا تھا، وہ اب دربار قندھار میں ادا کرے گا۔ غالباً خراج کے بھیجنے میں کچھ تساہل ہوا تو احمد شاہ نے اس کے نام فرمان جاری کیا اور ادائی مالیے کی طرف اسے توجہ دلائی، باغ علی خائف نے نامۂ نغز میں اس فرمان کے مضمون کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

رساندی تو گر گنج در باج ما
شدی ایمن از تاب تاراج ما

جب احمد شاہ کا فرمان میاں نور محمد کو ملا تو اس نے دیبا و حریر اور اطلس اور کمخواب کے نہایت نفیس کپڑے اور قرنفل، مشک اور عود وغیرہ، ایک سفارت کے ذریعہ جو تین افراد پر مشتمل تھی اور جس کا سربراہ بہائی خان کلہوڑہ تھا احمد شاہ کو بھجوائے اور زبانی پیغام بھیجا، جسے باغ علی خائف نے نامۂ نغز میں نقل کیا ہے، جس کا ماحصل یہ تھا کہ:

سلامی رسانش بعجز و نیاز
کہ ای شاہ افغان گردوں فراز
منم بندۂ تاجدارِ تو ام
بہ فرمانبری نامدار تو ام
من از لطفِ تو چشم دارم بہی
بر شاہ من میکنم آگہی

---

[1] احمد شاہ ابدالی کے متعلق یہ تمام تفصیل تعلیقات نوائے معارک، مؤلف آقای عبدالحئی حبیبی، ص ۷۹-۷۶۹ سے ماخوذ ہے۔

جب یہ سفارت احمد شاہ ابدالی کے دربار میں پہنچی تو وہ بہت خوش ہوا اور میاں صاحب کے ساتھ اس کے روابط دوستانہ بہتر ہو گئے۔

دربار قندھار میں سندھ کا وکیل:

میاں صاحب کی طرف سے شیخ محمد محفوظ سرخوش[1] بن شیخ محمد مرید قانون گو قندھار اور کابل کا وکیل مقرر ہوا، جو ۱۱۶۸ھ (۱۷۵۴-۵۵ء) تک کابل میں تھا۔

لیکن معاہدے کے باوجود سالانہ خراج سندھ سے قندھار نہ پہنچ سکا۔ اس بنا پر پہلے تو احمد شاہ نے سردار جہاں خاں[2] کی سپہ سالاری میں ایک لشکر ہندوستان بھیجنے کے لیے تیار کیا، جس کے متعلق ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۳ء) میں سارے سندھ میں شہرت ہو گئی کہ سردار جہاں خاں ایک لشکر کے ساتھ ہندوستان آ رہا ہے، لیکن ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۳ء) کے اواخر میں معلوم ہوا کہ خود بھی بادشاہ سندھ کی طرف آ رہا ہے۔

گدو مل کی سفارت:

۴ محرم ۱۱۶۷ھ (یکم نومبر ۱۷۵۳ء) کو جب احمد شاہ محمد آباد کے ریگستان میں پہنچ چکا تھا، تو میاں نور محمد نے بعجلت تمام دیوان گدو مل[3] کو بطور سفیر کے احمد شاہ کے پاس بھیجا، تاکہ وہ اس کو میاں صاحب کی اطاعت و فرمانبرداری سے واقف کرائے۔ گدو مل سکھر کے پُل کے قریب لشکر گاہ شاہی میں پہنچا لیکن تین چار روز تک باریاب نہ ہو سکا۔ جب شاہی سواری نوشہرہ میں آئی تو گدو مل حضور شاہی میں باریاب ہوا اور اس نے احمد شاہ کو راضی کرنے کی کوشش کی، اگرچہ احمد شاہ سخت غضبناک تھا لیکن گدو مل نہایت ہوشیار اور تجربہ کار شخص تھا، اس نے بادشاہ کی نفسیات کو سمجھ کر اپنی طلاقت لسانی سے کام لیا، اور بادشاہ کے غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کیں، وہ احمد شاہ کے بزرگوں اور اولیاء اللہ کے ساتھ عقیدت سے واقف تھا، اس لیے اس نے چند بوریاں خاک سے بھر کر اپنے ساتھ لیں اور انہیں دوسرے تحائف کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا بادشاہ نے اس سے پوچھا ان بوریوں میں کیا ہے؟ گدو مل نے جواب دیا حضور! یہ سندھ کا بہترین تحفہ ہے، یعنی سندھ کے جلیل القدر بزرگوں کے مزاروں کی خاک ہے، احمد شاہ اس تحفے سے بہت خوش ہوا اور اس کا سارا غصہ اسی وقت فرو ہو گیا اور اس کے بعد اس نے سندھ کے لوگوں سے نہایت ملائمت کا برتاؤ کیا۔

میاں صاحب کے صاحب زادوں کی واپسی:

گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے کہ میاں صاحب کے دو صاحبزادوں کو نادر شاہ بطور یرغمال کے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ جب طہماسپ جلائر داؤد پوتروں کی سرزنش کے لیے آیا، تو وہ میاں صاحب کے تیسرے فرزند کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

نادر کے قتل کے بعد ایران میں ہنگامے شروع ہو گئے تو ان ہنگاموں میں اس کے بیٹے اور پوتے مارے گئے صرف ایک پوتا شاہ رخ باقی رہ گیا تھا جو مشہد میں تخت نشین ہوا لیکن تخت نشینی کے بعد بھی وہ طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار رہا یہاں تک کہ اندھا کیا گیا۔

نادر شاہ کا ایک بھتیجا ابراہیم طہران میں حکومت کا دعویدار ہو گیا، میاں نور محمد کے فرزند اسی ابراہیم کے پاس تھے۔ عین اس زمانے میں جب کہ یہ ہنگامہ آرائیاں ہو رہی تھیں، میاں صاحب کے فرزندوں نے فیصلہ کیا کہ ہم میں سے ایک کو سندھ پہنچنا چاہیے تاکہ وہ پیری اور عالم ضعیفی میں اپنے والد کے پاس رہے، اور اُن کی خدمت کے لیے کمربستہ رہے، چنانچہ فیصلہ ہوا کہ محمد مراد یاب خان سندھی لشکر میں جس کی تعداد دو ہزار تھی، ایک ہزار آدمی لے کر سندھ روانہ ہو چنانچہ میاں محمد مراد یاب خان نے ایک ہزار آدمی ساتھ لیے اور طہران سے مسقط روانہ ہو گیا، جہاں سے براہ راست سندھ کے لیے جہاز مل سکتا تھا، شیخ غلام محمد بھی جو کلہوڑوں کا ایک امیر تھا اور میاں محمد مراد یاب خان کے ساتھ گیا تھا، واپسی میں وہ بھی ساتھ تھا۔[4]

---

(1) (رک) مقالات الشعراء، ص ۳۹۱-۳۹۸۔

(2) سردار جہان خان پوپلزائی: قندھار کے پوپلزائی قبیلے کے سرداروں میں تھا، جو احمد شاہ ابدالی کے زمانے میں سپہ سالاری اور خانخاناں کا منصب رکھتا تھا، یہ شخص اکثر جنگوں میں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ تھا اور سپہ سالار تھا (مقالات الشعراء، ج ۳، ص ۳۹۲)۔

(3) گدو مل: ایک مدت تک احمد شاہ ابدالی کے ہاں سندھ کے کلہوڑوں کی طرف سے ان کا سفیر رہا۔ یہ سندھ کے مشہور خاندان ادیو مل شاہوانی کا فرد تھا۔ ادیو مل ہاجی پور سے سکھر میاں آدم شاہ کلہوڑہ کے پاس آیا، جو کلہوڑوں کا جد امجد تھا، اور شکارپور میں تجارت کرنے لگا، اور وہاں کا مشہور ساہوکار ہو گیا، اس کا نواسہ کلہوڑوں کے دربار میں مشیر مقرر ہوا اور بارہا کلہوڑوں کی طرف سے دہلی اور قندھار میں ان کا سفیر رہا۔ احمد شاہ ابدالی کے سندھ میں آنے کے وقت اس نے نمایاں خدمات انجام دیں، اس نے سندھ میں ٹنڈو گدو مل آباد کیا تھا (تعلیقات نوائے معارک، مؤلف: آقای عبدالحی حبیبی، ص ۹۹۹)۔

(4) یہ تمام تفصیل تاریخ کلہوڑہ (جلد اول) ص ۵۱۸-۵۱۹ سے ماخوذ ہے۔

غلام شاہ اور عطر خان کی واپسی:

کچھ دن کے بعد جب ابراہیم نے شکست کھائی اور افراتفری پیدا ہوئی تو میاں صاحب کے فرزند غلام شاہ اور عطر خان نے بھی اپنے وطن واپس ہونے کا ارادہ کیا، انہوں نے خزانے سے کچھ روپے اور جواہرات لیے اور کاشان روانہ ہوگئے، پھر کرمان پہنچے، کرمان سے روانہ ہوئے تو قرہ داغ میں جنگ پیش آئی، دونوں بڑی بہادری سے لڑے اور اپنا راستہ صاف کر کے آگے بڑھے، پھر مکران کے مشہور شہر کیچ میں پہنچ کر اپنے والد میاں نور محمد کو اطلاع دی کہ ہم کیچ تک پہنچ گئے ہیں اور ہمارا بڑا بھائی سمندر کے راستے سے پہنچے گا۔ پھر یہ دونوں بیٹے ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۹ء) کو سندھ پہنچے اور میاں غلام شاہ آٹھ سال کے بعد اور میاں عطر خان چار سال کی جدائی کے بعد اپنے باپ سے ملے۔

صاحبزادہ محمد مراد یاب جو ان دونوں سے پہلے روانہ ہوا تھا، لیکن وہ کسی وجہ سے نہ پہنچ سکا اور نہ اس کی کوئی خبر آئی، میاں صاحب کو اس کی مفارقت کا بہت رنج تھا، چنانچہ اپنے وصیت نامے میں انہوں نے لکھا کہ: یہ گنہگار اپنے بیٹے کے فراق میں مثل حضرت یعقوب کے روتا رہتا ہے، خدا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں اس غریب الوطن کو بخیریت واپس لائے۔[1]

تحفۃ الکرام میں ہے کہ: ۱۱۶۳ھ (۱۷۵۰ء) میں گل محمد خراسانی ٹھٹھہ کا ناظم مقرر ہوا، اسی سال مراد یاب خان کے مسقط آنے اور شیخ غلام محمد کے وفات پانے کی خبر ملی، جس پر میاں صاحب نے شیخ شکر اللہ کو صاحبزادے کے لانے کے لیے جہاز لے کر روانہ ہونے کا حکم دیا۔ ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۰-۵۱ء) میں شیخ شکر اللہ جہاز لے کر بندر گاہ مسقط کی طرف روانہ ہوا، لیکن اس سفر میں شیخ شکر اللہ نے وفات پائی اور میاں محمد مراد یاب خاں خیریت کے ساتھ سندھ پہنچا اور اپنے باپ کے دیدار سے فیضیاب ہوا۔[2]

محمد مراد یاب خاں کی ولی عہدی:

میاں صاحب، میاں محمد مراد یاب خان کی واپسی سے بہت خوش ہوئے اور ان کی خوشی اور مسرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ دفتر اور وزارت دونوں چیزیں محمد مراد یاب خان کے حوالے کر کے اُسے خدا باد میں مقیم کر کے خود اپنے بنائے ہوئے شہر محمد آباد میں مقیم ہوگئے۔[3]

سابق ولی عہد کی ناراضگی:

میاں مراد یاب خان کی واپسی کے قبل ولی عہدی کے منصب پر میاں خداداد خان فائز تھا، جب یہ منصب میاں مراد یاب خان کے سپرد ہوا تو خداداد خان کو ولی عہدی کے چھن جانے سے اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ سندھ چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا اور پھر واپس نہ آیا۔[4]

میاں محمد مراد یاب خان کی معزولی:

باپ نے جس انتہائی شوق و ذوق کے ساتھ میاں مراد یاب خان کو ولی عہد بنایا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میاں نور محمد کی توقعات کے مطابق پورا نہ اترا، اور وہ حکومت کے کاروبار کو صحیح طور پر نہ چلا سکا، جس کی وجہ سے یہ عہدہ اس سے واپس لے لیا گیا۔[5]

میاں نور محمد کی وفات:

تحفۃ الکرام میں ہے کہ: ۱۱۶۶ھ میں جب احمد شاہ ابدالی کے سپہ سالار سردار جہان خان کی سندھ میں آمد کی خبر مشہور ہوئی تو میاں نور محمد کو فکر پیدا ہوئی، لیکن یہ جلد ہی رفع ہوگئی۔ اسی سال کے آخر میں خود احمد شاہ ابدالی کے سندھ سے ہوتے ہوئے ہندوستان جانے کی خبر مشہور ہوئی، تو ۴ محرم ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳-۵۴ء) کو احمد شاہ کی آمد کی یقینی خبر سن کر میاں نور محمد، محمد آباد سے تلہار چلے گئے، اور راستے میں سے گدومل کو اظہار اطاعت و فرمانبرداری کے لیے احمد شاہ کی لشکر گاہ بھیجا اور خود جیسلمیر کی مشرقی جانب روانہ ہوگئے، راستے میں کورہرہ کے گھاٹ کے قریب خناق کے مرض میں مبتلا ہو کر ۱۴ صفر ۱۱۶۷ھ (۹ دسمبر ۱۷۵۳ء) کو وفات پائی،[6] اور ان کی لاش محمد آباد لا کر دفن کی گئی۔

میاں نور محمد کی اولاد:

میاں نور محمد کے حسب ذیل فرزند تھے۔

۱۔ میاں محمد مراد یاب خان، جو سربلند خان کے لقب سے ملقب ہوا اور تین برس کی حکومت کے بعد معزول ہوا۔

---

(1) یہ تمام تفصیل تاریخ معصومی (جلد اول)، ص ۵۱۸-۵۱۹ سے ماخوذ ہے۔

(2) تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۳۶-۳۳۷۔

(3) ایضاً۔ ص ۳۳۷۔

(4) تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ)، ص ۳۳۷۔

(5) ایضاً۔ ص ۳۳۷۔

(6) ایضاً۔ ص ۳۳۷-۳۳۸ و تعلیقات نوائے معارک، ص ۷۸۲۔

۲۔ میاں عطر خان: جو کچھ مدت تک سندھ کے ایک حصے کا حکمران رہا۔
۳۔ میاں خداداد خان: جو محمد مراد یاب خان کی غیر حاضری میں ولی عہد ہوا تھا۔
۴۔ میاں احمد یار خان۔
۵۔ میاں غلام شاہ: جو سترہ سال سندھ کا حکمران رہا۔
۶۔ میاں غلام نبی: جو ایک سال کی تخت نشینی کے بعد شہید کیا گیا۔
۷۔ میاں عبدالنبی: جس کے زمانے میں کلہوڑہ خاندان کی حکومت کا آفتاب غروب ہوا۔

میاں نور محمد کے عہد حکومت پر تبصرہ:

میاں نور محمد کا دورِ حکومت سندھ کی تاریخ کا درخشاں دور حکومت تھا، وہ خود ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے اور انہوں نے اپنے زمانے میں اپنے ملک کی وہ نمایاں خدمات انجام دیں جو سندھ کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ میاں صاحب کا شاندار کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ملک کی اندرونی شورشوں کو ختم کر کے ملک میں امن و امان کو بحال کیا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے زمانے میں جو سندھ پر آفتیں آئیں، میاں نور محمد نے ان آفتوں کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا اور وہ ان مصائب کے طوفانوں میں ایک پہاڑ کی طرح جمے رہے، میاں نور محمد نے ملک سے قزاقی اور رہزنی کی فضا کو ختم کر کے، زراعت و تجارت کی طرف لوگوں کو لگایا، اور اُن کے زمانے میں ملک میں زراعت و تجارت کو خوب ترقی ہوئی، انہوں نے نہروں سے آبیاری کو ترقی دی اور ملک کو ہر اعتبار سے خوش حال بنانے کی کوشش کی۔

علم و فضل، شعر و ادب کے بھی وہ قدر دان تھے۔ اُن کے دور میں علماء و شعرا اور ادیب نہایت مطمئن اور خوشحال زندگی بسر کرتے تھے، اُن شعرا کے میاں نور محمد نے وظیفے مقرر کیے تھے۔ اس کے دور کے علماء و شعرا اور مصنفین کا ہمیں پتا چلتا ہے، ان کے نام یہ ہیں۔

سلیمان بیگ اسلم ایرانی، ابو الحسن خان ایرانی، ابو تراب منعم، تراب ابن ابو احمد خان، جعفر شیرازی، صاحب "جعفر جامع" (اس یہ کتاب میاں نور محمد کے لیے لکھی تھی، ابھی اس کی یہ تالیف مکمل ہوئی تھی کہ میاں نور محمد نے وفات پائی)، داؤد خان برادر میاں نور محمد صاحب صید المراد مطبوعہ ۱۹۰۸ کلکتہ، زکی کرمانی، محمد زماں، محمد محفوظ خوش، میر عبدالجلیل بلگرامی، میر محمد بلگرامی، میر غلام علی آزاد، عاشق اصفہانی، منشی عبدالرؤف بکھری صاحب نورس بہار، شیوک رام عطارد صاحب "منشات عطارد" علی رضا، میر قمر الدین عطارد لاہوری، میر زا علی مدد ایرانی، علی گازرونی، اسد اللہ غالب، فنا جالندھری، میر علی شیر قانع ٹھٹھوی، قانع سیوستانی، قوی فاروقی، محسن ٹھٹھوی، شیخ حرمل، مستمند کاشانی، حکیم عبدالرزاق اصفہانی مشرب، نجم الدین، میر نسیم امروہوی، محمد وفا سیوستانی جامع "نورس بہار" مخدوم معین بیراگی، علامہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی، شاہ عبداللطیف بھٹائی[1] یہ سب علماء و شعرا و ادیب و اہل قلم میاں نور محمد کے عہد کی یادگار ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم و فضل، شعر و ادب کے لحاظ سے بھی، اس کا دور نہایت کامیاب دور تھا۔

میاں نور محمد کا وصیت نامہ: منشور الوصیت:

میاں نور محمد کا وہ وصیت نامہ جو انہوں نے اپنے صاحبزادوں کے لیے منشور الوصیت کے نام سے لکھا تھا اور جو سندھی ادبی بورڈ سے شائع ہو چکا ہے یہ وصیت نامہ اُن کے بلند خیالات، اسلامی اور سیاسی فکر، وسیع تجربات اور دانشوری کا آئینہ دار ہے۔ اور اس سے اُن کی صحیح شخصیت اور کردار کا اندازہ ہوتا ہے، اس لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کے کچھ اقتباسات اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کریں کہ یہ نصائح آج بھی ہمیں فکر و عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ اُنہوں نے اس وصیت نامے کے شروع میں اس کے مرتب کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

وجہ ترتیب وصیت نامہ:

ایں مذنب بی بضاعت و بے طاعت	اس گنہگار، بے بضاعت اور بے
راچند خیالہا از سببہائی محبت پدری و	طاعت کے دل میں محبت پدری
فرزندی بخاطر گزشت کہ عمر عزیز	اور فرزندی کے سبب سے چند
بسر رسید، و علامتہای قیامت روز	خیالات دل میں گزرے کہ عمر
بروز نمودار، و زمانہ آخر، پس باید	عزیز ختم ہو رہی ہے اور علامات
کو بہ برخورداران کامگاران نشیب	قیامت روز بروز نمایاں ہو رہی ہیں

---

(1) تحفۃ الکرام (طبع راشدی) حاشیہ، ص ۴۶۱-۴۶۲ علماء و شعرا کے حالات کے لیے دیکھیے بالترتیب مقالات الشعراء، ص ۶۳، ۸۰، ۸۱، ۱۳۲، ۱۵۰، ۲۱۲، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۹۱، ۳۱۶، ۳۹۰، ۴۲۱، ۴۲۶، ۴۲۶، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۳، ۴۵۹، ۴۹۷، ۵۲۹، ۵۳۱، ۶۵۴، ۷۰۲، ۷۵۵، ۷۶۰، ۸۰۶، ۸۱۳، وفا سیوستانی، مخدوم محمد معین، مخدوم محمد ہاشم شاہ، شاہ عبداللطیف بھٹائی کے حالات کے لیے دیکھیے مکمل مقالات الشعراء۔

ایں مذنب بی بضاعت و بے طاعت راند خیالہا از سببہائی محبت پدری و فرزندی بخاطر گزشت کہ عمر عزیز بسر رسید، و علامتہای قیامت روز بروز نمودار، و زمانہ آخر، پس باید کہ بہ برخورداران کامگاران نشیب و فرازِ زمانہ گفتہ نشود کہ آگاہ بودہ دل از دنیای سرد کنند، و متوجہ بدرگاہِ الٰہی شوند۔

اس گنہگار، بے بضاعت اور بے طاعت کے دل میں محبت پدری اور فرزندی کے سبب سے چند خیالات دل میں گزرے کہ عمر عزیز ختم ہو رہی ہے اور علاماتِ قیامت روز بروز نمایاں ہو رہی ہیں اور زمانہ آخر ہے، بس مناسب ہے کہ برخورداران کامگاران کو زمانے کے نشیب و فراز سمجھائے جائیں، تاکہ وہ ان سے آگاہ ہو کر اس ذلیل دنیا سے دل سرد کریں اور بارگاہ الٰہی کی طرف متوجہ ہوں۔

عبادت کی تلقین:

اپنے صاحبزادوں کو عبادات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا کہ:

کامگاران من! ہمہ وقت و ہمہ حال نیازمند بدرگہ بی نیاز باید بود، و بیداریِ نیم شب عادت کنند۔۔۔ و از یاد حق ہیچ وقت غافل نباشند[1]

میرے کامگارو! ہر وقت اور ہر حال میں اس درگاہ بے نیاز کا نیاز مند ہونا چاہیے اور آدھی رات کی بیداری کی عادت ڈالو۔۔۔ اور کسی وقت خدا کی یاد سے غافل نہ ہو۔

تلاوت قرآن مجید:

و تلاوت قرآن مجید اگر زیادہ شدہ آید چہ بہتر، والا یک ختم قرآن بلا نماغہ در ہر ماہ ہریک از شمایاں میخواندہ باشد۔۔۔ پس افضل و اولیٰ آنست کہ از جملہ اذکار تلاوت قرآن مجید و خواندن درود بر افضل البشر علیہ الصلوٰۃ و السلام اختیار کنند۔[2]

تلاوت قرآن مجید اگر زیادہ کی جائے تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں، ورنہ ایک قرآن بلاناغہ ہر ماہ تم میں سے ہر ایک کو پڑھنا چاہیے، پس اولیٰ و افضل تمام اذکار میں تلاوت قرآن مجید اور افضل البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود پڑھنا ہے جسے تمہیں اختیار کرنا چاہیے۔

اہل بیت کی محبت:

محبت اہل بیت کے متعلق اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے لکھا کہ:

محبتِ اہل بیت ہمیشہ و ہمہ وقت یکساں باشد و محبت ذوالقربیٰ فرض عین و عین فرض۔[3]

اہل بیت کی محبت ہمیشہ اور ہر وقت یکساں ہونی چاہیے اور ذوالقربیٰ کی محبت فرض عین اور عین فرض ہے۔

مقدمات کے متعلق وصیت:

مقدمات کے فیصلوں میں وصیت کرتے ہوئے لکھا کہ:

اگر مقدمہ اسلام واقع سود آں را بعلماء رجوع کنند، ہرچہ بموجب شرع شریف فتویٰ دہند، بر آں عمل کنند۔۔۔ وسوای مقدمہ اسلام اگر دیگر قضیہ روی دہد در سیاست آں۔ چنانچہ دست برید و گوش بریدن شتابی نکنند کہ دیر حق ظاہر میشود۔[4]

اگر مقدمہ اہل اسلام کا ہو تو ایسے مقدمات میں علماء کی طرف رجوع کریں، وہ جو شریعت شریفہ کے مطابق فتویٰ دیں، اُس پر عمل کریں اور مسلمانوں کے مقدمے کے سوا اگر دوسروں کا مقدمہ پیش ہو تو اس کی سزا میں مثلاً ہاتھ کاٹنے اور کان کاٹنے میں جلدی نہ کریں (بلکہ سزا دینے سے پہلے اس پر خوب غور کرلیں) کہ حق دیر میں ظاہر ہوتا ہے۔

علماء و صلحاء کی محبت:

علماء و صلحاء کی محبت و عقیدت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے تحریر کیا کہ:

چوں از کارہای دنیوی فارغ شوند صحبت یا علماء و صلحاء مقرر کنند۔۔۔ و پیوستہ باعوام نشستن عادت نکنند، و نہ ہمیشہ خلوت گزیں باشند کہ نہ کثرت کثرت و نہ وحدت وحدت، کہ مدام با عوام نشستن طریقۂ اہل بازار است، و ہمیشہ در

جب دنیاوی کام سے فارغ ہوں تو علما اور صلحا کے ساتھ صحبت کا وقت مقرر کریں اور ہمیشہ عوام کے ساتھ بیٹھنے کو عادت نہ بنائیں، اور نہ ہمیشہ تنہائی میں رہیں، کیونکہ نہ ہر وقت کی بھیڑ بھاڑ اچھی ہے اور نہ تنہائی، ہمیشہ عوام کے ساتھ

---

(1) منشور الوصیت، ص ۲۔
(2) ایضاً۔ ص ۳۔
(3) ایضاً۔ ص ۳۔
(4) منشور الوصیت، ص ۵۔

خلوت بودن طریقہ درویشان است۔[1]

بیٹھنا بازاریوں کا طریقہ ہے اور ہمیشہ خلوت میں رہنا درویشوں کا طریقہ ہے۔

رضامندی شرفا:

اسی طرح شرفانوازی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا کہ:

رضا مندی اہل البر و شرفا برخود لازم دانند۔[2]

نیکوں اور شرفا کی رضا مندی کو اپنے لیے لازم جانیں۔

کسرِ نفسی:

اخلاقیات میں کسر نفی اور استقلال وہمت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا کہ:

ہر آفریدہ را بہتر بدانند۔۔۔ وخود را از خاک کمتر شمارند۔۔۔ چو از جای احوال ہیبت ناک برسد۔۔۔ استقلال از دست ندہند۔[3]

خدا کی تمام مخلوق کو بہتر جانو۔۔۔ اور اپنے آپ کو خاک سے کمتر سمجھو۔۔۔ جب کسی طرف سے کوئی ہیبت ناک حالات ظاہر ہوں تو استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

حقوق:

بادشاہ کے ذمے جو حقوق عائد ہوتے ہیں، ان کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا کہ:

اول حق غربا و مساکین ویتیماں و مظلوماں عاید بگردن می شود، وروز شب فکر ملک داری وتردد دوست ودشمن دامن گیر۔[4]

اول غربا، مسکینوں، یتیموں، مظلوموں کا حق اس (بادشاہ) کی گردن پر عاید ہوتا ہے اور شب و روز ملک کی حفاظت اور دوست و دشمن کی فکر اسے ہوتی ہے۔

یادِ مرگ:

انہوں نے اپنے فرزندوں کو وصیت کی کہ وہ موت کو اور یوم حساب کو فراموش نہ کریں، چنانچہ انہوں نے لکھا کہ:

ونیز آدم را باید کہ روز محشر و مرگ خود را ہمیشہ یاد نماید۔[5]

اور نیز انسان کو چاہیے کہ حشر کے دن اور اپنی موت کو ہمیشہ یاد رکھے۔

اپنی حالت:

اپنی حالت کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ:

و احوال خود ایں مذنب این است کہ اگر حلال خور رامی بینم، قسم ذات پاک آں بی نیاز کہ ہماں حلال خور را بہتر از خود ہزار بار می بینم و می دانم کہ مثل من عصیانہا نکردہ باشد۔[6]

اور خود اس گنہ گار کا یہ حال ہے کہ اگر میں حلال خور کو دیکھتا ہوں، قسم ہے اس ذات پاک بے نیاز کی کہ اس حلال خور کو اپنے سے ہزار درجہ بہتر سمجھتا ہوں اور جانتا ہوں کہ اس نے میری طرح گناہ نہیں کیے ہوں گے۔

عیاشی کی خرابیاں:

عیاشی کی خرابیاں بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

و عیش و عشرت شعار خود نسازند کہ آرام سراسر غفلت است، از یاد حق آدم را دور می اندازد، و غور ملک بر صاحب ملک لازم۔[7]

اور عیش و عشرت کو اپنا شعار نہ بنائیں کہ آرام سراسر غفلت ہے اور عیش آدمی کو یاد حق سے دور کر دیتا ہے، اور ملک کی فلاح و بہبود پر غور وفکر ہر ملک والے کے لیے لازم ہے۔

روزہ ونماز کی تاکید:

اپنے فرزندوں کو روزہ ونماز کی تاکید کرتے ہوئے لکھا کہ:

وبروزہ و نماز و زکوات روز و شب مشغول باشد۔

اور روزہ و نماز اور زکوات میں ہمیشہ شب وروز مشغول رہیں۔

روز محشر کہ جاں گداز بود
اولین پرسش نماز بود

روز محشر کہ جان گداز بود
اولین پرسش نماز بود

---

(1) ایضاً۔ص۵۔
(2) ایضاً۔ص۶۔
(3) منشور الوصیت، ص۷۔
(4) ایضاً۔ص۷۔
(5) ایضاً۔ص۷۔
(6) منشور الوصیت، ص۷۔
(7) ایضاً۔ص۷۔

کہ میاں ما مسلماناں و کافران ہمیں فرق است۔

کہ ہم مسلمانوں اور کافروں میں یہی روزہ، نماز اور زکوٰۃ فرق ہیں۔

چہار مذہب:

چاروں مذہبوں کے حق ہونے کے متعلق لکھا کہ:

و باید کہ مذاہب ہر چہار بر حق باید دانست فاما بزرگان ما در مذہب امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بودند، و شمایاں نیز ہمیں مذہب اختیار کنید۔

اور چاروں مذاہب (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) کو حق جانو، لیکن چونکہ ہمارے بزرگ مذہب امام ابو حنیفہ کے مقلد تھے، اس لیے تم بھی وہ مذہب اختیار کرو۔

سلسلۂ طریقت:

اپنے سلسلۂ طریقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ:

و ہم از چہاردہ خانوادہ بزرگان ما در طریقۂ سہروردی ہستند،۔۔۔ سید میراں محمد جونپوری کہ پیر و مرشد مایان است، ہم بر طریقۂ مزکور بود۔[1]

چودہ (تصوف) کے خانوادوں میں سے ہمارے بزرگ سلسلہ سہروردیہ کے مرید ہیں، سید میراں محمد جون پوری کہ ہمارے پیر و مرشد ہیں، وہ بھی اسی طریقے میں تھے۔

نظام مملکت:

نظام مملکت کے سلسلے میں میاں صاحب نے اپنے فرزندوں کو حسب ذیل وصیتیں کیں:

ولی عہدی:

اپنے بعد ولی عہدی کے متعلق اپنے فرزندوں کو وصیت کی:

و شما برخورداران را لازم کہ: نظر بر اسلاف خود نمودہ بموجب قانون سرداری نو چشم محمد مراد خاں را قبول کنند۔

اور تم برخورداروں پر لازم ہے کہ اپنے اسلاف کے طریقے کو ملحوظ رکھتے ہوئے قانون کے موجب نور چشم محمد مراد خان کی سرداری کو قبول کریں۔

چوں سبحانہ تعالیٰ از تصدق سید السادات علیہ افضل الصلواتہ و اکمل التحیات در زندگی ایں مذنب آورد، پس ہر ہمہ را یک جانشانیدہ انچہ گفتنی باشد گفتہ میشود، و اگر بعد حیات من خدایش آورد نور چشم مذکور را سردار مستقل بجائے ما دانستہ ہیچ باب از حکم و صلاح او انحراف نورزند۔[2]

اگر حق سبحانہ تعالیٰ سید السادات علیہ افضل الصلواتہ و اکمل التحیات کے تصدق سے اس گنہگار کی زندگی میں اس کو لے آیا تو میں تم بھائیوں کو یک جا بٹھا کر جو کچھ کہنا ہے کہوں گا، اگر میری حیات کے بعد خدا اس کو لائے تو نور چشم محمد مراد کو ہماری بجائے اپنا مستقل سردار جان کر کسی باب میں اس کے حکم اور مشورے سے انحراف نہ کریں۔[3]

زمینداران سندھ کے متعلق وصیت:

زمینداران سندھ کے متعلق وصیت کرتے ہوئے لکھا کہ: جو سندھ کے زمیندار ہیں، اُن کے ملک کو خدائے تعالیٰ نے بتصدق رسول مقبول علیہ الصلواتہ والسلام ہم گنہگاروں پر رحم فرما کر (اس کی حکومت) ہمارے حوالے کی ہے، ان کے جو معمول ہم نے مقرر کیے ہیں، اس میں تفاوت نہ ہونا چاہیے۔۔۔ زینہار عہد شکنی نہ کرنا کہ مستحقوں اور مظلوموں کی بددعا بہت اثر رکھتی ہے اور جلد قبول ہوتی ہے۔[4]

جاگیرات کا انتظام:

میاں نور محمد نے میاں محمد مراد یاب کی ولی عہدی کے ساتھ اپنے دوسرے صاحبزادوں کے گزارے کے لیے بھی مختلف پرگنے مقرر کیے تاکہ بعد میں اُن میں اختلاف و افتراق نہ ہو۔ چنانچہ اپنے وصیت نامے میں لکھا کہ: میں نے زمین کے اس ٹکڑے کو کہ خدائے تعالیٰ نے بطفیل

---

[1] سید محمد جون پوری: ولادت: ۸۴۷ھ، جام نظام الدین سمہ کے عہد حکومت میں براہ جیسلمیر ٹھٹھہ پہنچے اور ۹۰۵-۶ھ میں اٹھارہ ماہ سندھ میں مقیم رہے اور یہاں سے افغانستان روانہ ہوئے، انہوں نے ۱۹ ذیقعدہ ۹۱۰ھ (۲۳ اپریل ۱۵۰۵ء) کو فراہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے (حاشیہ منشور الوصیت نمبر ۹، ص ۱۵)۔

[2] منشور الوصیت، ص ۱۱-۱۲۔

[3] جس زمانے میں کہ نادر شاہ، سندھ سے ایران واپس ہوا تو وہ بطور یرغمال کے محمد مراد خان کو اپنے ہمراہ لے گیا تھا، ۱۱۶۱ھ میں نادر شاہ کے قتل کے بعد وہ وطن کے ارادے سے روانہ ہو کر ۱۱۶۴ھ میں سندھ پہنچا، میاں نور محمد کے دوسرے فرزند میاں غلام شاہ و میاں عطر خان کو بھی وہ بطور یرغمال کے ایران لے گیا تھا، یہ دونوں بھائی ۱۱۶۲ھ میں سندھ واپس آئے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وصیت نامہ ۱۱۶۲ھ اور ۱۱۶۳ھ کے درمیان کسی وقت تحریر ہوا (رک: منشور الوصیت: حاشیہ ص ۱۲ حاشیہ نمبر (۱) مرتب: سید حسام الدین راشدی)۔

[4] منشور الوصیت، ص ۱۰۔

رسول مقبول علیہ افضل الصلوات و اکمل التحیات اس گنہگار کو عطا کی تھی، ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ تقسیم کر دی ہے تاکہ تم میں ہر ایک اپنے حصے پر قابض و متصرف ہو۔

۱۔ پرگنہ لاکھاوٹ جو سرکار سیوستان میں ہے اور پرگنہ لدہ گاگن مع روہڑی کے جو سرزمین لدہ گاگن میں ہے نور چشم راحت جان خدا داد خان کو دی۔

۲۔ پرگنہ گاگری اور پرگنہ اُلور جو سرکار بکھر میں ہے نور دیدہ لخت جگر عطر خان کو دی۔

۳۔ ضلع شہداد پور جو سرکار نصرپور میں ہے، اور پرگنہ ماتھیلہ جو سرکار بکھر میں واقع ہے نور دیدہ احمد یار خاں کو دی۔

۴۔ سوائے پرگنات مذکور کے جو اس گنہگار کے قبضے میں ہیں، ان کا مالک میری زندگی میں اور میرے بعد نور چشم محمد مراد ہو گا۔

۵۔ نصف پرگنہ کندیارہ اور نصف تپہ رانی پور اور نصف پرگنہ باغبان اور دسواں حصہ کاچھ اور چوتھا حصہ موضع فتح پور جو میرے برادر مرحوم و مغفور محمد خان کے پاس تھے، اس کے بعد وہ نور چشمی فضل علی فرزند محمد خان کو دیے گئے۔

۶۔ برخوردار غلام نبی و عبدالنبی خرد سال ہیں، اور تمہارے بھائی اور تمہارے فرزندوں کی جگہ ہیں۔ پرگنہ جنیجہ مع وچولہ میں نے ان دونوں برخورداروں کو دیا۔

۷۔ برخوردار غلام شاہ کو مختلف پرگنوں سے مختلف حصے دیے گئے۔

۸۔ جو فصلانہ اور یومیہ تمہاری ماؤں کے لیے مقرر ہے، اس میں فرق نہ آئے۔

۹۔ جو فصلانہ مرحوم و مغفور غلام حسین کی حین حیات میں اس کے فرزندوں کے لیے مقرر کیا گیا تھا، وہ اس کے فرزندوں کو دیا جائے، اس میں فرق نہ آنا چاہیے۔[1]

ہندو میر منشیوں کے متعلق وصیت:

پیشی کے میر منشیوں کے متعلق وصیت کی کہ: پیشی میں ہندو محرر ہرگز نہ رکھیں کہ بعض جگہ لکھنے پڑھنے کے موقع پر احادیث اور قرآن مجید کی آیتیں لکھنی پڑتی ہیں اور یہ احادیث اور قرآن مجید کے لکھنے میں عاجز ہوتے ہیں، اس لیے ان کو اس عہدے کے علاوہ لکھنے پڑھنے اور حساب کتاب کے دوسرے عہدوں پر لگانا چاہیے۔[2]

خاتمہ:

میاں نور محمد نے اس وصیت نامے کو اس وصیت پر ختم کیا ہے کہ:

واز ملاقات اہل اللہ غافل نباشند کہ ملاقات اہل اللہ کیمیا است۔[3]

اور اہل اللہ کی ملاقات سے غافل نہ ہوں کہ اہل اللہ کی ملاقات کیمیا ہے۔

وصیت نامے کے مندرجہ بالا اقتباسات پر میاں نور محمد کی زندگی کا یہ باب ختم ہوتا ہے۔

کلہوڑہ خاندان کا دوسرا فرمانروا

محمد مراد یاب خان

۱۱۶۷ھ (۵۴-۱۷۵۳ء) تا ۱۱۷۰ھ (۱۷۵۷ء)

میاں نور محمد کے غریب الوطنی میں وفات پا جانے کے بعد، تمام اُمرا نے متفقہ طور پر ۱۶ صفر ۱۱۶۷ھ میں محمد مراد یاب خان کو عمر کوٹ میں سندھ کا حکمران بنا دیا اور احمد شاہ ابدالی شاہ افغانستان سے درخواست کی جو اُس وقت نوشہرہ میں تھا کہ سندھ کی حکومت مراد یاب خان ہی کے حوالے کی جائے، احمد شاہ نے ان کی درخواست قبول کر لی اور مراد یاب خان کو میاں نور محمد کا جانشین تسلیم کر کے اُسے شاہ نواز خان کا خطاب مرحمت کیا۔

میر ابوالقاسم سراج الدین محمد متخلص بہ قاسم نے "اِن فضلہٗ کان علیک" سے اس کی تاریخ جلوس نکالی ہے۔[4]

محمد مراد یاب خان کے کارنامے:

محمد مراد یاب خان نے سندھ کی حکومت حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلے ٹھٹھہ کی گورنری پر شیخ ظفر اللہ کو مامور کیا،[5] پھر وہ عمر کوٹ سے نصرپور کی طرف روانہ ہوا۔ اُس کے کارندوں نے اس کے حکم پر نصرپور میں پہنچ کر خیمے لگائے اور وہیں باقاعدہ اُس کے جلوس کی

---

(1) منشور الوصیت، ص ۱۹-۲۲۔

(2) ایضاً۔ ص ۲۴۔

(3) ایضاً۔ ص ۲۶۔

(4) تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ، جلد ۱ (تالیف مولانا مہر) ص ۵۷۵-۵۷۸۔

(5) تحفۃ الکرام (طبع راشدی)، ص ۴۶۳۔

رسم ادا کی۔ محمد مرادیاب خان کے قیام کے بعد یہاں ایک نیا شہر آباد ہو گیا، جس کا نام مراد آباد رکھا گیا۔

یہ شہر محرم ۱۱۷۱ھ (ستمبر ۱۷۵۷ء) میں دریائے سندھ کی طغیانی کی زد میں آکر برباد ہو گیا، اب اس شہر کا نام و نشان تک موجود نہیں۔[6]

جام گکرالہ سے جنگیں:

تحفتہ الکرام میں ہے کہ وہ اسی سال کے آخر میں جام گکرالہ سے جنگ کی طرف متوجہ ہوا، کیونکہ یہاں کے جام ہر زمانے میں کلہوڑا خاندان کی مخالفت کرتے رہے تھے، یہ کلہوڑا حکومت کے لیے ایک سنگ گراں تھے جو اُن کی راہ میں حائل تھے۔ محمد مرادیاب خان نے اپنی حسن تدبیر اور لڑائیاں کر کے اُن کے زور کو توڑ دیا اور جام گکرالہ کو "کودار یہ" سے ڈیرے کی طرف بھگا کر خود اُچھ لنجاری، مراں اور کجی کی زمینیں حاصل کر لیں اور کجی کو چھاونی قرار دے کر ہر مقام پر مضبوط قلعے بنائے اور اُنہیں مستحکم کیا۔

محمد مرادیاب خان دو سال تک نہایت اطمینان اور سکون سے سندھ کی حکومت چلاتا رہا، لیکن اپنی حکومت کے چوتھے سال ۱۱۷۰ھ (۵۷-۱۷۵۶ء) میں اُس نے ایسے طریقہ کار اختیار کیے جنہوں نے ملک کے نظم و نسق کو ابتر بنا دیا، رعایا میں اُس کی طرف سے بددلی پیدا ہوئی، آخر اُسے سندھ کی حکومت سے معزول ہونا پڑا۔

صاحب تحفتہ الکرام نے اس کی معزولی اور قید کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ: اُس نے سرائی سرداروں کو خصوصاً اور عام رعایا کو عموماً تکلیفیں پہنچانا شروع کر دیں اور چونکہ وہ شاہی عمال کے تسلط اور چیرہ دستیوں سے تنگ آچکا تھا، اس لیے اُس نے ملک میں جھاڑو پھیر کر اپنے ملک سے باہر کسی اور جگہ جانے کا پختہ ارادہ کر لیا، وہ اپنے اس منصوبے کے تحت سندھ سے اپنا خزانہ مسقط منتقل کرتا رہا اور خود بھی اس نے مسقط جانے کے تیاریاں مکمل کر لیں۔[1]

محمد مرادیاب خان کی معزولی:

ظاہر ہے کہ اُس کا یہ طریقہ کار ملک کے بہی خواہ کس طرح گوارہ کر سکتے تھے، آخر ۱۳ ذوالحجہ ۱۱۷۰ھ (۹ اگست ۱۷۵۷ء) کو اس کے سرداروں نے باہمی مشورہ کر کے اور جتھا بنا کر راتوں رات اُس کی حویلی کو گھیر لیا، صبح کے وقت اُسے اور اس کے بیٹوں اور بعض دوسرے لوگوں کو جو اس کے ساتھ تھے قید کر لیا۔[2]

انشائے عطارد میں ایک خط ہے، جو میاں عبدالنبی کے عہد میں شاہ افغانستان کی خدمت میں بھیجا گیا تھا، اس میں مرادیاب خان کی معزولی کا بھی ذکر کیا گیا ہے، ہم مولانا غلام رسول مہر کی کتاب تاریخ کلہوڑہ جلد دوم صفحہ ۵۵۱ سے اس کا اقتباس ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

انشائے عطارد میں ہے کہ: محمد مرادیاب خان اپنے خاندان کے رسم و آئین سے منحرف ہو گیا اور اُس نے وہ طور طریقے اختیار کیے جو خاندانِ عالیہ عباسیہ کے شایان شان نہ تھے، اس پر تمام فقرا، بلوچ اور جاٹوں نے مجتمع ہو کر متفقہ طور پر صلاح مشورے سے میاں غلام شاہ مرحوم کو اپنا مرشد قرار دے کر خود اس کی مریدی سے مشرف ہوئے اور ملکی و مالی اختیارات کی باگ ڈور اس کے سپرد کی اور خود شاہی خدمات کی بجا آوری میں دل و جان سے کوشاں رہے۔[3]

مرادیاب خان کی وفات:

مرادیاب خان کچھ عرصے تک قید میں رہا، پھر رہا ہوا، شہداد پور سے وہ نوشہرہ پھر خدا آباد کہنہ پہنچا۔

شوال ۱۱۷۱ھ (جون ۱۷۵۷ء) میں مرادیاب خان نے وفات پائی۔

اولاد:

محمد مرادیاب خان کے دو لڑکے تھے، ایک کا نام حسن علی اور دوسرے کا نام عباس علی تھا، یہ دونوں لڑکے میاں غلام شاہ کے عہد میں ناحق مارے گئے۔[4]

میاں مرادیاب خان کے دورِ حکومت پر تبصرہ:

میاں مرادیاب خان کی مدت حکومت تقریباً پونے چار سال تھی، اس مختصر سی مدت حکومت میں اس نے اپنے ابتدائی دو سال میں جو طریقہ کار اختیار کیا وہ مستحسن تھا، اگر وہ نیک نیتی سے اسی روش پر چلتا رہتا تو شاید اُسے قید اور معزولی کی سزا بھگتنی نہ پڑتی، اپنے مریدوں اور رعایا پر

---

(6) ترجمہ تحفتہ الکرام، ص ۳۳۹-۳۴۰۔

(1) تحفتہ الکرام، اردو ترجمہ، ص ۳۴۰۔

(2) تحفتہ الکرام، اردو ترجمہ، ص ۳۴۱۔

(3) تاریخ کلہوڑا، ج ۲، ص ۵۹۱ بحوالہ انشائے عطارد، ص ۱۷۵-۱۷۶۔

(4) ایضاً۔ ص ۵۹۲۔

مظالم نے اُسے یہ روز بد دکھایا، پھر دولت کی ہوس اور ملک سے غیر وفا دارانہ روش نے کہ وہ ملک کو معاشی بدحالی میں مبتلا کر کے ملک کی دولت کو اپنے تصرف کے لیے مسقط لے جانا چاہتا تھا، اُس کی تباہی کے دن کو اور قریب سے قریب تر کر دیا۔

میاں غلام شاہ کلہوڑا

۱۱۷۰ھ (۵۷-۱۷۵۶ء) تا ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء)

مراد یاب خان کے بعد سندھ کا حکمران میاں غلام شاہ کلہوڑا کو بنایا گیا یہ ۱۳ ذی الحجہ ۱۱۷۰ھ (۵۷-۱۷۵۶ء) کو تختِ سلطنت پر بیٹھا۔ یہ میاں نور محمد کا پانچواں بیٹا تھا، لیکن اس کے لیے افغانی دربار سے منظوری حاصل ہونا ضروری تھی، جو اس وقت تک حاصل نہ ہوئی تھی۔

میاں غلام شاہ کے عنان حکومت کے سنبھالنے کے ایک ماہ بعد مراد آباد کو دریائے سندھ نے گھیر لیا، جس کی وجہ سے میاں غلام شاہ کو مراد آباد چھوڑ کر نکلنا پڑا۔

الہ آباد کی بنیاد:

میاں غلام شاہ نے مراد آباد چھوڑ کر اپنے والد کے آباد کردہ شہر محمد آباد کے قریب ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی، جس کا نام اس نے الہ آباد رکھا۔

احمد یار خان کی بغاوت:

سرائی سردار اور دوسرے اُمرا میاں غلام شاہ کی اطاعت کر کے اس کے گرد جمع ہونے لگے، لیکن مراد یاب خان کے حقیقی بھائی احمد یار خان نے جو اس وقت خدا آباد میں تھا، بغاوت اختیار کی اور پھر ملک میں ایک انتشار کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔

محمد عطر خان کی مخالفت:

اس کے دوسرے بھائی محمد عطر خان نے جو اس وقت بطور یرغمال کے افغانی دربار میں تھا، مراد یاب کی معزولی کی خبر سنتے ہی احمد شاہ ابدالی سے سندھ کی حکومت کی سند حاصل کر لی، احمد یار خان کو جب یہ معلوم ہوا کہ عطر خان افغانی دربار سے سندھ کی حکومت کا پروانہ حاصل کر چکا ہے، تو اس نے خدا آباد میں بیٹھے بیٹھے محمد عطر خان کے لیے لشکر تیار کرنا شروع کیا، تاکہ وہ غلام شاہ کی مخالفت میں عطر خان کو کمک پہنچائے۔

ادھر جب سرائی سرداروں کو معلوم ہوا کہ محمد عطر خان سندھ کی حکومت کا پروانہ حاصل کر چکا ہے تو وہ بددل ہو کر میاں غلام شاہ کا ساتھ چھوڑنے لگے، میاں غلام شاہ نے اس صورتحال کو محسوس کیا تو وہ مجبور ہو کر ۲۵ صفر ۱۱۷۱ھ (۸ نومبر ۱۷۹۷ء) کو ملک چھوڑ کر جیسلمیر روانہ ہو گیا۔ جواہر عباسیہ میں ہے کہ جب میاں غلام شاہ جیسلمیر پہنچا تو میر بہرام خان ٹالپر نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا، فوج کے صرف چند آدمی اس کے ساتھ رہ گئے۔

محمد عطر خان کی سندھ میں واپسی:

محمد عطر خان جب سندھ واپس لوٹا تو عوام کا خیال تھا کہ وہ دوبارہ محمد مراد یاب خان کو سندھ کا فرمانروا بنائے گا اور اسی بنا پر احمد یار خان نے اس کی کمک کے لیے لشکر جمع کیا تاکہ اس کی وجہ سے اس کا حقیقی بھائی محمد مراد یاخان پھر برسر اقتدار آسکے گا، لیکن عوام کی توقع اور احمد یار خان کی تمنا نقش بر آب ثابت ہوئی۔ محمد عطر خان نے سندھ پہنچتے ہی بغیر اس کے کہ وہ مراد یاب خان سے ملے حکم دیا کہ اُسے خدا آباد میں رہنا چاہیے، عوام اس کے اس طرز عمل سے بہت مایوس ہوئے لیکن چونکہ وہ حکومت کا پروانہ حاصل کر چکا تھا، اس لیے سب خاموش رہے۔

صاحبِ تحفتہ الکرام نے ان تمام تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ: اوائل ربیع الثانی میں محمد مراد بھی اُس کے پاس پہنچا، سرائیوں کو توقع تھی کہ یہ کام عطر خان نے اپنے بھائی کی بھلائی کے لیے کیا ہے، لیکن چونکہ حکومت کا نشہ بہت غرض آلود ہے، عطر خان نے اپنے بھائی کی آمد کی خبر سن کر بغیر اُس سے ملاقات کیے حکم دیا کہ وہ خدا آباد میں رہے۔ وہ اپنے اس طرز عمل سے لوگوں کی نظر میں گر گیا، لیکن چونکہ وہ بادشاہ کا مقرر کردہ تھا، اس لیے مجبوراً لوگوں نے اس کی اطاعت کی۔[1]

بیکانیر کا قصد:

میاں غلام محمد شاہ نے جیسلمیر سے بیکانیر کا قصد کیا اور بیکانیر پہنچتے ہی اس نے اپنے ایک معتمد وکیل کو بہاولپور کے رئیس محمد مبارک خان ثانی کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ وہ اس کے لیے آرام و اطمینان سے رہنے کا بندوبست کرے۔ اس پیغام کے ملتے ہی محمد مبارک خان نے اس کے جواب میں اپنا قاصد میاں غلام شاہ کے پاس روانہ کیا اور کہلایا کہ وہ

---

(1) تحفتہ الکرام (طبع راشدی)، ص ۴۶۶۔

بلا تکلف بہاولپور چلے آئیں، چنانچہ محمد مبارک خان کی اس دعوت پر میاں غلام شاہ بہاولپور میں آکر مقیم ہو گیا۔

غلام شاہ کے بعد سندھ کی حالت:

میاں غلام شاہ کے سندھ سے روانہ ہونے کے بعد سندھ کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ عطر خان کے مظالم اور اس کی بدمزاجیوں نے رعایا کو اس قدر بددل بنا دیا کہ: مرأتہ عباسیہ میں ہے کہ عطر خان کی غفلت، بدمزاجی اور مظالم کی وجہ سے اراکین ملک سندھ اپنی جان سے بیزار ہو گئے، اور رعایا اس کے ظلم اور دست درازیوں کی وجہ سے چیخ اٹھی، اس کے اُمرا میں سے ہر ایک نے خفیہ معاہدہ لکھ کر میاں غلام شاہ سے گزارش کی کہ وہ سندھ آجائیں۔

غلام شاہ کی سندھ کو روانگی:

سندھ کے اُمرا کی خواہش اور اصرار کے بعد میاں غلام شاہ نے محمد مبارک خان رئیس بہاولپور سے مشورہ کیا اور مدد کا طالب ہوا، مبارک خان نے اپنے اقربا میں سے اپنے حقیقی بھائی فتح محمد خان، مہر دخان، احمد خان فیروزانی کو ان کے علاوہ اپنے معتمد جام خان علانی کو میاں غلام شاہ کے ہمراہ کر دیا، ادھر میاں غلام شاہ نے بھی اپنے آدمی ملتان بھیج کر سعد اللہ خان بابی، شیر محمد خان اور دوسرے افغانوں کو ملازم رکھ لیا اور وسط رمضان میں اپنے صاحبزادے سرفراز خان کو اپنے اہل وعیال کے ساتھ وہیں چھوڑ کر سندھ کی طرف روانہ ہوا۔[1]

روہڑی کی جنگ:

ادھر جب محمد عطر خان اور میاں احمد یار خان کو معلوم ہوا تو وہ بھی ایک عظیم لشکر لے کر میاں غلام شاہ کے مقابلے کے لیے نکلے، چنانچہ آخر رمضان ۱۱۷۱ھ (۱۱ جون ۱۷۵۸ء) کو روہڑی کے باہر نہر امر کس[2] کے کنارے دونوں میں خون ریز جنگ ہوئی، میاں غلام شاہ کے پاس اگرچہ لشکر کم تھا لیکن تقدیر اس کا ساتھ دے رہی تھی، لشکر کی قلت کے باوجود اس نے عطر خان اور احمد یار خان کے لشکروں کو شکستِ فاش دے کر نہر کو عبور کر لیا، اور وہ دونوں بھاگ کھڑے ہوئے۔

میاں غلام شاہ نے فتح حاصل کرنے کے بعد دوسرے دن عید الفطر کی نماز روہڑی میں ادا کی اور وہاں سے روانہ ہو کر سیوستان پہنچا۔[3]

محمد مراد یاب کی تعزیت:

سیوستان میں اس نے اپنے بھائی مراد یاب خان کی تعزیت اس کے پس ماندگان سے کی، جس کا انتقال ہو چکا تھا۔

شوال ۱۱۷۱ھ کے آخر میں وہ الہ آباد میں منزل انداز ہوا، یہاں اُس کا صاحبزادہ بھی متعلقین کے ساتھ آکر اس کے دیدار سے مشرف یاب ہوا۔ چند روز وہ الہ آباد رہ کر محمد آباد چلا گیا، اُس کی حکومت کی مدت ۱۳ ذوالحجہ ۱۱۷۰ھ تا ۲۵ صفر ۱۱۷۱ھ (۱۷۹۷ء) تقریباً اڑھائی ماہ تھی۔[4]

احمد یار خان اور عطر خان کی گرفتاری اور رہائی:

اوپر گزر چکا ہے کہ احمد یار خان اور عطر خان کو روہڑی میں شکست ہو گئی تھی، یہ دونوں حالات کو نامساعد پا کر قلات پہنچے، قلات کا والی محمد نصیر خان[5] میاں غلام شاہ کا دوست تھا، اس نے ان دونوں کو جیل خانے میں ڈال دیا، دیوان گدومل[6] نے جو سندھ کی طرف سے دربار شاہی میں وکیل تھا، ان دونوں کی رہائی کے لیے کوشش کی، اتفاقاً ایک موقع پر نصیر خان نے شاہی لشکر کی مدد نہیں کی، جب اُس سے حکومت کی طرف سے باز پرس کی گئی تو وہ جنگ کے لیے تیار ہو گیا، احمد شاہ ابدالی کی فوجوں نے قلات کا محاصرہ کر لیا، اُس وقت احمد یار خان اور عطر خان قید سے چھوٹے، دیوان گدومل کی سعی سے شاہی حکم جاری ہوا کہ افغان سردار عطر خان کو لے کر سندھ جائے اور اُسے وہاں مسند نشین کرے اور احمد یار خان ہمارے دربار میں رہے۔[7]

---

(1) تاریخ سندھ (کلہوڑہ) جلد ۲، ص ۵۹۸-۵۹۹۔

(2) نہر امر کس: یہ نہر روہڑی کے قریب واقع تھی، اب ویران وخشک ہے۔ (تحفتہ الکرام، طبع راشدی، ص ۴۶۶، حاشیہ نمبر ۱)۔

(3) تحفتہ الکرام اردو ترجمہ، ص ۳۸۳۔

(4) تحفتہ الکرام اردو ترجمہ، ص ۳۸۳۔

(5) میر نصیر خان، بن میر عبداللہ خان: تاریخ جلوس ۱۱۶۴ھ: وفات ۱۲۰۸ھ (نوائے معارک، شجرۂ خاندان قلات، مشمولہ تعلیقات)۔

(6) دیوان گدومل: یہ ایک طویل عرصے تک کلہوڑا امرا کی طرف سے احمد شاہ ابدالی کے دربار میں سفیر رہا، سندھ میں ٹنڈو گدومل اُسی کا آباد کیا ہوا ہے، حیدرآباد کا خاندان گدوانی اسی کی طرف سے منسوب ہے، اس خاندان کے افراد ٹالپوروں کے آخری عہد تک دربار میں دخیل رہے (نوائے معارک، ص ۹۹۹)۔

(7) تاریخ کلہوڑا، جلد ۲، ص ۶۰۰-۶۰۱۔

سندھ کی تقسیم:

تحفۃ الکرام میں ہے کہ عطر خان، عطائی خان نامی ایک امیر کو اپنی کمک کے لیے ساتھ لے کر سندھ کی طرف روانہ ہوا، ادھر میاں غلام شاہ کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بھی ربیع الثانی ۱۱۷۲ھ (دسمبر ۱۷۵۸ء) کو ڈیرے کی طرف جاکر کچی پہنچا اور پھر اور نگا بندر عبور کر کے کچی کا شاہ گڑھ نام رکھ کر اسے اپنی رہائش گاہ بنایا، پھر شاہ گڑھ کے مقابل شاہ بندر کے نام سے ایک بندر گاہ تعمیر کرائی اور ایک حویلی اور ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا اور اپنے اہل و عیال کو اپنے صاحبزادے محمد سرفراز خان کی نگرانی میں چھوڑ کر خود بھائیوں کے مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔

عطر خان جب اپنے افغانی لشکر کے ساتھ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کرتا ہوا سندھ پہنچا، وہ مقصودہ فقیر کو مقدمتہ الجیش کے طور پر آگے کیے ہوئے مقابلے کے لیے بڑھتا چلا آرہا تھا۔ چند دن میں یہ لوگ علاقہ چاچکان میں پہنچے، یہاں پہنچنے کے بعد دونوں لشکروں میں چپقلش شروع ہوئی، عطر خان نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ وہ اس لڑائی میں کامیاب نہیں ہو سکتا، آخر دونوں میں صلح کی گفتگو شروع ہوئی، نتیجتاً ملک کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ شاہ گڑھ سے نصرپور تک جس میں ٹھٹھہ بھی شامل تھا، میاں غلام شاہ کے حصے میں آیا اور بقیہ سندھ اس کے بھائیوں عطر خان اور احمد یار خان کو ملا۔ یہ میاں غلام شاہ کی حکومت کا دوسرا دور تھا جس میں وہ ایک تہائی سندھ پر حکمراں ہوا، جس کے بعد میاں غلام شاہ گڑھ میں مقیم ہو گیا، اور عطر خان نوشہرہ میں جاکر ٹھہرا۔[1]

رمضان ۱۱۷۲ھ (مئی ۱۷۵۹ء) تک تو اس معاہدے پر عمل ہوتا رہا، لیکن اسی عرصے میں احمد یار خان اور عطر خان کے درمیان اختلاف پیدا ہوا، جلد ہی دربار شاہی پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ عطر خان میں صلاحیت نہیں ہے کہ وہ سندھ کی حکومت چلا سکے، چنانچہ احمد یار خان اپنے بیٹے کو بطور یرغمال کے دربار شاہی میں چھوڑ کر اور سندھ کی حکومت کا پروانہ حاصل کر کے عازم سندھ ہوا، میاں غلام شاہ کو جب دونوں بھائیوں کے اختلاف کا حال معلوم ہوا تو وہ بھی رفع فساد کے لیے نکلا، عطر خان نے جب یہ صورت حال دیکھی تو وہ سخت وحشت زدہ ہوا۔ اُس نے ۲ شوال ۱۱۷۲ھ (۲۹ مئی ۱۷۵۹ء) کو میاں غلام شاہ کو ایک خط لکھا، جس میں تحریر کیا کہ میں ہمیشہ کے لیے ملک چھوڑ کر باہر جا رہا ہوں، اب تم جانو اور احمد یار خان جانے۔ اُس وقت تک احمد یار خان سندھ نہیں پہنچا تھا۔ میاں غلام شاہ نے بڑھ کر سارے سندھ پر قبضہ کر لیا، اُس نے پہلے لاڑکانہ پر پیش قدمی کی اور جن کھوسہ سرداروں نے افراتفری مچا رکھی تھی اور خدا آباد کو لوٹا تھا، ان سب کو تہ تیغ کیا، اس کے بعد وہ سیوہن کی طرف بڑھا اور اس کا فاتح لشکر قلعہ جو یہ اور ٹلی لک پر حملہ آور ہوا، یہ دونوں مقام کھوسوں کی پناہیں اور گڑھ بنے ہوئے تھے، وہاں سے وہ فتح و کامرانی کے ساتھ واپس لوٹا،[2] یہاں سے میاں غلام شاہ کی حکمرانی کا چوتھا دور شروع ہوا۔

میاں غلام شاہ کی حکومت کا مستقل دور:

میاں غلام شاہ کے قبضے میں جب پورا سندھ آیا تو یہ وہ زمانہ تھا کہ احمد یار خان اور عطر خان ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے، سندھ کی تقسیم کا عمل جو ان بھائیوں نے قائم کیا تھا، ختم ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی امن و اطمینان کی صورت میاں غلام شاہ کو میسر نہ تھی، اس کی ایک سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ اسے افغانی حکومت سے باقاعدہ سندھ کی حکومت کا پروانہ نہ ملا تھا، دوسری یہ کہ اگرچہ عطر خان اور احمد یار خان سندھ سے باہر چلے گئے تھے، لیکن وہ دونوں داؤد پوترہ اور خوانین کے پاس پناہ گزیں ہو گئے تھے، اور موقع کی تاک میں تھے۔ اس کے علاوہ اس گڑبڑ کے زمانے میں ملک کے بعض چھوٹے چھوٹے سردار سرکش ہو چکے تھے، جن کی گوشمالی کیے بغیر ملک میں امن قائم نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ تھے وہ حالات جب چوتھی مرتبہ میاں غلام شاہ نے سارے سندھ کی حکومت سنبھالی۔

ٹھٹھہ کی طرف توجہ:

اُس نے سندھ کی حکومت سنبھالتے ہی سب سے پہلے ٹھٹھہ کی طرف توجہ کی، کیونکہ یہ بڑا مظلوم شہر تھا اور عطر خان کے ہاتھوں اس شہر کے لوگوں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچتی تھیں۔ تحفۃ الکرام میں ہے کہ جو کھیہ قبیلے کے قزاقوں نے دن دہاڑے ٹھٹھہ پر یورش کی اور قتل و لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ ٹھٹھہ کے محلے مولا کو بہت بے دردی سے لوٹا اور اس محلے کے گھروں کو مسمار کر کے فرار ہو گئے، اس کے علاوہ عطر خان کے زمانے میں جو یہاں حاکم مقرر تھا، جب یہاں افغانی لشکر آیا تو اس کی

---

(1) تحفۃ الکرام (طبع راشدی) ص ۴۶۸۔

(2) یہ تمام تفصیل تحفۃ الکرام اردو ترجمہ، ص ۳۴۴ تا ۳۴۶ سے ماخوذ ہے۔

بدانتظامی کی وجہ سے یہاں کے لوگوں پر اس لشکر کے ہاتھوں اتنے سخت مظالم ہوئے کہ جن کا تصور بھی ناممکن ہے۔[1]

یہاں غلام شاہ نے سب سے پہلے ٹھٹھہ کے انتظامی حالت کو درست کرنے کی طرف توجہ کی اور محمد قائم کو کلتاش کو ٹھٹھہ کا حاکم مقرر کیا، جس نے وہاں پہنچ کر وہاں کے باشندوں کو موقوف شدہ حاکم کے کارندوں کے مظالم اور پٹھانوں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلائی اور افغانوں کے بے اندازہ ظلم و ستم کا سلسلہ ختم کیا۔[2]

عطر خان اور احمد یار خان کی شورشیں:

عطر خان اور احمد یار خان جو سندھ سے فرار ہو کر داؤد پوتروں اور خوانین کے پاس مقیم تھے اور بہادر خان علانی اور اختیار خان مندہانی کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے، جو بہاولپور کے مغربی حصے کے سردار تھے، احمد یار خان تو چند روز ان کے پاس ٹھہر کر ہندوستان روانہ ہو گیا اور عطر خان گڑھی اختیار خان میں مقیم ہو کر داؤد پوتروں مقصود اور اختیار خان کی مدد سے سندھ پر فوج کشی کی تیاری کرنے لگا۔

یہ خبر جب محمد مبارک خان ثانی والی بہاولپور کو ملی تو اُسے ان کا یہ طریقہ پسند نہ آیا۔ اس نے بہادر خان اور اختیار خان کو کہلا بھیجا کہ تمہارا یہ طریقہ صحیح نہیں، میاں غلام شاہ ہماری سعی سے سندھ کا حاکم بنا ہے، وہ ایک خوش قسمت اور بلند ہمت انسان ہے، تم ہرگز عطر خان کی مدد نہ کرو، جو اپنے ملک سے فرار ہو کر تمہارے پاس مقیم ہے، لیکن ان دونوں نے اس کی نصیحت پر کوئی توجہ نہ دی۔

ادھر جیسلمیر کا راجا ایک مدت سے داؤد پوتروں کے اس وجہ سے خلاف تھا کہ انہوں نے اس کے کچھ علاقے دبا لیے تھے، اُسے جب یہ معلوم ہوا کہ داؤد پوترے عطر خان کی مدد کر رہے ہیں، اُس نے اس موقع کو غنیمت جان کر میاں غلام شاہ کو لکھا کہ آپ میری مدد کیجیے اور داؤد پوتروں نے جو میرا علاقہ دبا لیا ہے، واپس دلائیے۔ میاں غلام شاہ نے راجا جیسلمیر کی اس تحریک پر بہادر خان کو خط لکھا کہ وہ راجا کے غصب کیے ہوئے علاقے واپس کر دے۔ بہادر خان بجائے اس کے کہ اس کے علاقے واپس کرتا، اس نے جیسلمیر پر حملہ کر دیا اور ریاست کے مرکزی شہر پر باج مقرر کیا۔[3]

بہادر خان نے میاں غلام شاہ کے ساتھ لوگوں کی ہمدردیاں دیکھ کر عطر خان کی مدد میں اپنی سرگرمیوں کو اور تیز تر کر دیا اور اپنی قوم کے دوسرے سربرآوردہ لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ اس موقع پر عطر خان کی مدد کریں۔ لیکن ان سربرآوردہ لوگوں نے جواب دیا کہ تم عطر خان سے بے شمار روپیہ لے چکے ہو، ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم غلام شاہ کے خلاف عطر خان کو مدد دیں۔

میاں غلام شاہ کی صلح پسندی:

میاں غلام شاہ کو جب عطر خان کی یہ فتنہ انگیزیاں معلوم ہوئیں تو اس نے اپنی صلح پسندانہ طبیعت کے مطابق رفع شر کے لیے محمد مبارک خان والیٔ بہاولپور کو ایک خط میں لکھا کہ میں اپنے بھائی عطر خان کو معقول جاگیر اور مدد معاش دینے کے لیے تیار ہوں، آپ اس معاملے میں پڑ کر رفع شر کی کوشش کریں۔

میاں غلام شاہ کے اس خط کی بنا پر مبارک خان نے اپنے ایک ہمسائے علی مراد کو لکھا کہ وہ بہادر خان کو سمجھائے اور عطر خان کو جاگیر لینے پر راضی کر کے اُسے رخصت کر دے تاکہ اس فتنے کا سدباب ہو۔ علی مراد نے ہر چند بہادر خان کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنی بات پر اڑا رہا اور غیض و غضب میں میاں غلام شاہ کو بُرا بھلا کہتا ہوا اٹھا، یہاں تک کہ جوش غضب میں دروازے پر ٹھوکر کھا کر اس کے سر سے پگڑی گر گئی۔ علی مراد نے مایوس ہو کر ایک اور تدبیر سوچی اور رستم خان نوحانی کے ذریعے بہادر خان کو پیغام بھیجا کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ غلام شاہ کثیر افواج اور اسلحہ کا مالک ہے، اس سے جنگ آسان نہیں، اُس سے جنگ کے لیے تمہیں چند روز انتظار کرنا چاہیے، یہاں تک کہ ہم مبارک خان کو اس پر تیار کر لیں کہ وہ ہماری مدد کرے، ایسی صورت میں اگر صلح کی صورت نکل آئی تو ایک باعزت صلح ہو گی، اگر جنگ کی نوبت آئی تو بھی ایک کامیاب جنگ ہو گی۔ لیکن بہادر خان نے اس کی اس تجویز کو بھی رد کر دیا اور جواب میں کہلا بھیجا کہ عطر خان میرے گھر پر مدد کا طالب ہو کر آیا ہے میں اس کے لیے اپنی جان قربان کر دوں گا اور جب تک اُسے سندھ کا حاکم نہ بنا لوں گا، دم نہ لوں گا۔[4]

---

(1) تحفۃ الکرام اردو ترجمہ، ص ۳۴۵-۳۴۶۔

(2) الضاً۔ ص ۳۴۷۔

(3) یہ تمام تفصیل تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا) جلد دوم، ص ۶۰۹ تا ۶۱۱ سے ماخوذ ہے۔

(4) ماخوذ از تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا) ج ۲، ص ۶۱۰-۶۱۲۔

اباوڑو کی جنگ:

جب میاں غلام شاہ کو اندازہ ہو گیا کہ جنگ ناگزیر ہے تو وہ اپنے لشکر کے ساتھ اباوڑو پہنچا، یہاں غلام شاہ اور بہادر خان میں سخت لڑائی ہوئی، میاں غلام شاہ نے چھ ہزار سواروں کے ساتھ ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا، بہادر خان کمین گاہ سے نکل کر سامنے آیا تو باہو خان نامی افغان نے اُسے پہچان کر شور بلند کیا، غلام شاہ کے لشکریوں نے اس پر گولیوں کی بارش شروع کی، دو گولیاں بہادر خان کے اور دو اس کے گھوڑے کے لگیں، دونوں کے دونوں ایک دم ڈھیر ہو گئے، ایک شخص نے دوڑ کر بہادر خان کا سر کاٹ کر غلام شاہ کے سامنے پیش کیا۔ غلام شاہ نے اُسے انعام سے نوازا، بہادر خان کے بھائی قائم خان اور احمد خان نے جب یہ رنگ دیکھا تو وہ عطر خان کو اپنے ساتھ لے کر فرار ہو گئے۔[1]

میاں غلام شاہ کا ارادہ تھا کہ وہ گڑھی اختیار خان کو برباد کر دے، کیونکہ یہی مقام فتنوں کا ماویٰ و ملجا تھا، لیکن محمد مبارک خان اور علی مراد کی کوششوں سے وہ اس ارادے سے رک گیا اور اباوڑو سے لوٹ آیا، جب وہ دشمنوں اور ملک کی تسخیر سے پورے طور پر مطمئن ہو گیا تو اُس نے ۲۵ محرم ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) نئے آباد کردہ شہر شاہ پور میں چھاونی ڈالی اور اپنے صاحبزادے اور متعلقین کو شاہ گڑھ سے اپنے پاس بلا لیا۔[2]

جام ککرالہ کی سرزنش:

آخر ۱۱۷۳ھ (۶۰-۱۷۵۹ء) میں میاں غلام شاہ حاکم ککرالہ جام ڈلیسر کی گوشمالی کی طرف متوجہ ہوا، جس نے غلام شاہ کی عدم موجودگی میں سرکشی کے طریقے اختیار کیے تھے، پہلے میاں غلام شاہ نے محمد صدیق ویس اور دوسرے اُمرا کو جام کے مقابلے کے لیے بھیجا، جنہوں نے جام سے پہلے پے در پے شکستیں دے کر اُسے اُس کے ملک سے نکال دیا، پھر ۷ ماہ صفر ۱۱۷۴ھ (۸ دسمبر ۱۷۶۰ء) کو اُسے اُس کے قلعہ آباد سے کچھ کی طرف دربدر کر دیا، اس کا بیٹا ہر دورجی جو پہلے ہی سے میاں غلام شاہ کے ہمرکاب رہتا تھا، وہ بدستور میاں غلام شاہ کی خدمت میں رہا۔[3]

خطاب، انعام، سند:

۱۱۷۵ھ (۱۷۶۱ء) میں میاں غلام شاہ کو شاہی دربار سے "ہزیر جنگ شاہ ویردی خاں" کا خطاب ملا اور سند حکومت دی گئی۔ اس کے علاوہ ایک ہاتھی اور دوسری شاہانہ نوازشوں سے سرفراز کیا گیا۔[4]

تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد ۲ میں ہے کہ اُس کو یہ تمام اعزازات دیوان گدومل کی حسن تدبیر اور کوششوں سے حاصل ہوئے جو افغانی دربار میں سندھ کا وکیل تھا۔[5]

کچھ کی یورشیں

پہلی یورش:

کچھ پر میاں غلام شاہ کے حملہ کرنے کی وجوہ یہ تھیں کہ ۱۷۶۰ء میں راجا لیکھا کا بیٹا کچھ کا فرمانروا ہوا، اس کے زمانے میں دیو کرن کا بیٹا پونجا سیٹھ نامی تھا، جس کے باپ کو راجا لیکھا نے قتل کرا دیا تھا، باپ کا انتقام لینے کا خیال اس کے دل میں پختہ تھا، اُس نے راجا لیکھا کے زمانے میں اس کے بیٹے سے دوستی پیدا کر لی اور بیٹے کو باپ کا مخالف بناتا رہا، یہاں تک کہ جب راجا لیکھا کا بیٹا کچھ کا فرمانروا ہوا تو پونجا سیٹھ کو توقع تھی کہ وہ اسے اپنا وزیر بنائے گا، لیکن اُس نے اس کی طرف توجہ نہ دی، بلکہ اُسے قتل کر دینا چاہا، آخر وہ وہاں سے فرار ہو کر کنٹھ کوٹ پھر وہاں سے ویراواہ پہنچا، اور دیوان گدومل سے خط و کتابت شروع کی، یہاں تک کہ میاں غلام شاہ نے اس کو اپنے پاس بلا لیا یہی شخص آخر میں کچھ پر حملے کا محرک بنا۔

تحفتہ الکرام میں ہے کہ ۹ ربیع الثانی ۱۱۷۶ھ (۲۸ اکتوبر ۱۷۶۲ء) کو 'کچھ' کے کافروں کو راہ راست پر لانے کے لیے میاں غلام شاہ روانہ ہوا۔ راستے میں اُس نے سندری کا قلعہ فتح کیا۔ آگے بڑھا تو کوہ جاڑا پر اُس نے تقریباً چھ ہزار کافروں کو تہ تیغ کیا،[6] اُس وقت "کچھ" کا فرماں روا راؤ لیکھا کا بیٹا تھا، جو ۱۷۶۰ء میں "کچھ" کا فرماں روا ہوا تھا۔

تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد دوم میں مولانا غلام رسول مہر نے

---

(1) ماخوذ از تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) ج۔۲ ص، ۶۱۰-۶۱۲

(2) یہ تمام تفصیل تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ، جلد ۲، ص ۶۱۳-۶۱۴ اور تحفتہ الکرام اردو ترجمہ، ص ۳۴۶-۳۴۷ سے ماخوذ ہے۔

(3) تحفتہ الکرام اردو ترجمہ، ص ۳۴۷۔

(4) ایضاً۔ ص ۳۴۷-۳۴۸ و تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ، جلد ۲، ص ۶۱۳۔

(5) تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ جلد ۲، ص ۶۱۷۔

(6) تحفتہ الکرام اردو ترجمہ، ص ۳۴۸۔

اس جنگ کی اہمیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ: "جارہ" کی جنگ کو اس مہم میں بڑی اہمیت حاصل ہے، سندھی فوج ستر ہزار تھی، راؤ نے راستے کے تمام کنوؤں میں پتھر بھروا دیے تھے، اور "کچھ" جیسے ملک میں پانی کے بغیر پیش قدمی دشوار تھی، لیکن اس رکاوٹ کے باوجود میاں غلام شاہ کے ارادے میں کوئی تزلزل پیدا نہ ہوا اور یہ مشکلات سد راہ نہ بن سکیں۔[1]

ٹوبن مل کا بیان ہے کہ جارہ پہاڑ پر جو لوگ سب سے پہلے پہنچے، اُن کا سردار میر بہرام ٹالپر تھا اور حق یہ ہے کہ جنگ جارہ میں اسی کی مردانگی سے فتح ہوئی، اگر سندھی نیچے بیٹھے رہتے تو پہاڑ کے اوپر سے اُن پر گولہ باری کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا اور وہ نہ آگے بڑھ سکتے، نہ وہاں ٹھہر سکتے۔[2] تحفتہ الکرام میں ہے کہ کوہ جارہ سے فاتح و منصور ہو کر میاں غلام شاہ آگے بڑھا، اب اس کی فوجیں کچھ کے دارالحکومت بھوج سے بارہ کوس کے فاصلے پر رہ گئیں، بستہ بندر اور لکھپت بندر کے قلعے بھی اس نے فتح کر لیے۔[3]

مولانا غلام رسول مہر نے اپنی تالیف 'تاریخ سندھ' میں اس کی کچھ اور تفصیلات دی ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ جب میاں غلام شاہ کی فوجیں "کچھ" سے بارہ کوس پر رہ گئیں، تو راؤ نے پونجا سیٹھ کے ذریعہ صلح کا پیغام بھیجا اور بستہ اور لکھپت بندر میاں صاحب کے حوالے ہوئے اور صلح میں ایک شرط یہ بھی قرار پائی کہ راؤ کی بہن کی شادی میاں غلام شاہ سے ہو گی۔ پونجا سیٹھ نے ان شرائط صلح کے پورا کرانے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔[4]

ان کامیابیوں کے بعد وہ ۲ رجب ۱۱۷۶ھ / ۱۷ (جنوری ۱۷۶۳ء) کو اپنے مرکز شاہ پور واپس پہنچ گیا۔[5]

دوسری یورش:

میاں غلام شاہ جب کچھ سے واپس آ گیا تو پونجا سیٹھ شرائط صلح پورا کرانے کے لیے وہیں رہ گیا تھا۔ لیکھا کے بیٹے نے جب یہ دیکھا کہ اس کے سر سے خطرہ ٹل چکا ہے وہ شرائط صلح کے پورا کرنے میں ٹال مٹول کرنے لگا، پونجا سیٹھ نے ہر چند اس کو سمجھایا کہ یہ بد عہدی ہے، جو تمہارے لیے مناسب نہیں، وہ اس پر اور بھی برہم ہوا اور اس نے پونجا سیٹھ کو بلا کر اسے زہر کا پیالہ اپنے ہاتھ سے پلایا، جس سے اس کا کام تمام ہو گیا۔

میاں غلام شاہ کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو اس نے دوبارہ کچھ پر فوج کشی کا ارادہ کیا اور ۱۱۷۸ھ (۶۵-۱۷۶۴ء) میں اس نے دوبارہ کچھ پر حملہ کیا اور قلعہ مُورو کو فتح کر کے وہ بھوج سے پانچ کوس کے فاصلے پر منزل انداز ہوا، راؤ کچھ نے دوبارہ صلح کی درخواست کی اور اپنے چچیرے بھائی ایسوجی نامی کی بیٹی سے غلام شاہ کی شادی کر دی۔ یہ شادی ۲۸ شعبان ۱۱۷۶ھ (۱۳ مارچ ۱۷۶۲ء) کو ہوئی۔ میاں غلام شاہ نے اس حرم کو سندھ رانی کا خطاب دیا۔[5]

دوسرا خطاب:

کچھ سے فاتحانہ واپسی پر میاں غلام شاہ کو افغانی دربار سے صمصام الدولہ کا خطاب ملا، واپس ہونے کے بعد میاں غلام شاہ نے کثرتِ گرد و غبار اور تیز ہواؤں کی وجہ سے شاہ پور چھوڑ کر نیا شہر شاہ پور کے نام سے آباد کیا اور وہاں منتقل ہو گیا۔ یہ شاہ پور اب بھی تعلقہ سکرنڈ میں ایک معمولی گاؤں کی حیثیت سے موجود ہے۔[6]

انگریزوں کا قدم:

۲۶ ستمبر ۱۶۱۳ء کو انگریزوں کا پہلا قدم سندھ میں آیا۔ وہ اس طرح کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس ہدایت پر کہ سندھ تک اپنے تجارتی دامن کو وسیع کیا جائے، انگریز جہاز راں سندھ تک پہنچے، ۲۶ ستمبر ۱۶۱۳ء کو پہلا انگریزی جہاز سندھ کی مشہور بندرگاہ دیبل میں آیا، پھر جمیز اول شاہ انگلستان کا سفیر ٹامس رو سندھ آیا۔ ۱۶۳۵ء میں انگریزوں نے ٹھٹھہ میں پہلی تجارتی کوٹھی کی بنیاد رکھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ یہاں سے قلمی شورہ خرید کر یورپ بھیجا جائے، لیکن کسی وجہ سے یہ کوٹھی ۱۶۶۲ء میں بند کرنی پڑی، اس کوٹھی کے بند کرنے کے پچانوے سال بعد انگریزنے پھر اس کی ضرورت محسوس کی کہ سندھ میں پھر از سر نو اپنی تجارت کی بنیاد رکھی جائے، چنانچہ ۲۲ ستمبر ۱۷۵۸ء کو رابرٹ سمپسٹن کی کوششوں پر میاں غلام شاہ کے حکم سے انہیں کوٹھی کے قائم کر لینے کا اجازت نامہ ملا، اور جارج بوشیئر جو بمبئی کی ٹکسال کا افسر تھا، اس تجارتی کوٹھی کا منتظم

---

(1) تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ، جلد ۲، ص ۶۲۶۔
(2) تحفتہ الکرام اردو ترجمہ، ص ۳۴۸۔
(3) تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد ۲، ص ۶۲۸۔
(4) تحفتہ الکرام اردو ترجمہ - ص - ۳۴۸
(5) یہ تمام تفصیل تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد ۲، ص ۶۳۸-۶۳۹ سے ماخوذ ہے۔
(6) تحفتہ الکرام اردو ترجمہ، ص ۳۴۸ و تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ، جلد دوم، ص ۶۳۲۔
(7) تحفتہ الکرام اردو ترجمہ، ص ۳۴۸ و تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ، جلد دوم، ص ۶۳۹۔

اور سیموئیل بیون اس کا نائب مقرر ہوا۔[1] اس وقت بھی انگریز کا مقصد اس کوٹھی سے قلمی شورے کی تجارت تھا، جو سندھ میں بکثرت پیدا ہوتا تھا اور بارود سازی کے لیے مختلف ممالک کو اس کی ضرورت تھی۔ ۲۲ اپریل ۱۷۶۱ء انگریز کی جانب سے مسٹر ارسکن نے ایک اور اجازت نامہ حاصل کر لیا، جس کے ذریعہ سے کمپنی کو شورے کی تجارت کا اجارہ مل گیا۔ پہلا پروانہ ۲۲ ستمبر ۱۷۵۸ء کو حاصل کیا گیا۔ دوسرا پروانہ ۱۱ اکتوبر ۱۷۵۸ء کو لیا گیا۔

ان پروانوں کے ذریعہ سے میاں غلام شاہ نے انگریز کو تجارت میں بڑی مراعات دی تھیں، لیکن اس کے باوجود انگریزوں نے اپنی خود غرضیوں کو نہ چھوڑا، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ میاں صاحب نے کچھ کے حملے کے موقع پر امداد کے طور پر ایک مسلح جہاز مانگا، لیکن انگریزوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ راؤ کچھ سے ہمارے تعلقات خوشگوار ہیں، ہم آپ کو جہاز دے کر اس سے اپنے تعلقات بگاڑ نہیں سکتے۔

اسی طرح میاں صاحب کا ایک آدمی علی نواز خان بہت سا قیمتی سامان لے کر سورت فرار ہو گیا، میاں نے اس کی گرفتاری کے لیے انگریزوں سے مدد چاہی، لیکن انگریزوں نے اس پر ذرا توجہ نہ دی۔

اس کے علاوہ ایک مرتبہ میاں صاحب نے انگریزوں سے کہا کہ دس ہزار گولے مناسب نرخ پر بنوا دو لیکن انگریزوں نے اُسے بھی ٹال دیا۔ اس قسم کے متعدد واقعات پیش آئے، جس کی بنا پر انگریز میاں صاحب کی نظر میں بتدریج گرتے چلے گئے، اس کے علاوہ بعض سرکاری ملازم بھی انگریزوں کی طرز روش کو دل سے ناپسند کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح بھی جلد ممکن ہو ان غیر ملکیوں کو دیس نکالا مل جائے۔ گلاب رائے جو ٹھٹھہ میں چنگی افسر تھا، وہ طرح طرح کی رکاوٹیں انگریزوں کے معاملات میں ڈالتا رہتا تھا، انگریز اس قسم کے کارندوں کی شکایتیں میاں صاحب سے کرتے رہتے تھے، ایک دفعہ میاں صاحب نے ان کی شکایتوں کی بنا پر کہا، تم ہمارے ملک میں اپنے تجارتی فائدے کے لیے آئے ہو۔ ہم نے تمہیں تجارت میں ہر طرح کی سہولت اور مراعات دی ہیں، لیکن تم نے اس طویل عرصے میں ہماری ایک خواہش بھی پوری نہیں کی، اور ہر معاملے میں جو تمہارے سپرد کیا گیا، ٹال مٹول سے کام لیتے رہے، لیکن اس احساس کے باوجود میاں غلام شاہ نے انگریزی کوٹھی کو بند نہیں کیا۔[2]

عطر خان کی اطاعت:

تحفۃ الکرام میں ہے کہ عطر خان کا ساتھی مقصود فقیر فوت ہو گیا جس سے اس کی بڑی قوت ٹوٹ گئی، اب وہ ناکام اور پشیمان ہو کر اپنے بھائی میاں غلام شاہ کی خدمت میں ۱۱۷۸ھ (۶۵-۱۷۶۴ء) کو حاضر ہوا اور اس کی اطاعت قبول کر لی، میاں غلام شاہ نے بھی اُس کی تعظیم و تکریم میں کوئی کمی نہیں کی، اس طرح ان دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ و پیکار کا سلسلہ جو طویل عرصے سے چلا آتا تھا ختم ہو گیا۔[3]

ڈیرہ جات کی حکومت:

تحفۃ الکرام میں ہے کہ ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ء) میں میاں غلام شاہ کے حسن انتظام سے خوش ہو کر احمد شاہ ابدالی نے ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان کی نگرانی اور انتظام بھی میاں غلام شاہ کے سپرد کیا۔ اسی سال ماہ ربیع الاول کی ابتدا میں بنفس نفیس وہاں کا انتظام درست کرنے کے لیے ان علاقوں میں گیا۔ اور تین ماہ کے عرصہ میں سرکشوں کو مطیع کر کے اور جابجا انتظام کے لیے اپنے آدمی مقرر کر کے واپس ہوا، لیکن کچھ دن بعد ہی فتنہ و فساد کی آگ پھر ان علاقوں میں مشتعل ہو گئی۔ نصرت نامی ایک شخص اس فتنہ فساد میں پیش پیش تھا، جس کی وجہ سے ایک سال تک مسلسل جنگ ہوتی رہی، اسی عرصے میں یعنی ۱۷۶۸ء میں سردار جہاں خاں[4] نے یہ ملک اپنے نام حاصل کر کے میاں غلام شاہ کے تمام حاکموں کو اس علاقے سے بیدخل کر دیا، لیکن ۱۱۸۳ھ (۱۷۶۹ء) میں یہ علاقہ پھر میاں غلام شاہ کی تحویل میں دے دیا گیا، اور وہ خود وہاں کا انتظام بحال کرنے کے لیے وہاں پہنچا، اس کے علاوہ ملتان کی حکومت بھی وہاں کے حاکم کی مدد سے میاں غلام شاہ کے نام کی گئی۔[5]

---

(1) تحفۃ الکرام اردو ترجمہ، ص ۳۸۴، تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ، جلد دوم ص ۶۳۹۔

(2) یہ تمام تفصیل تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد ۲، ص ۶۳۵-۶۴۷ سے ماخوذ ہے۔

(3) تحفۃ الکرام اردو ترجمہ، ص ۳۴۸-۳۴۹۔

(4) سردار جہان خاں (پوپلزئی) قندھار کی قوم پوپل زئی کے سرداروں میں تھا اور احمد شاہ ابدالی کے زمانے میں سپہ سالار اور خانخاناں کا منصب رکھتا تھا، وہ اکثر جنگوں میں ابدالی کا سپہ سالار رہا (مقالات الشعراء، حاشیہ نمبر ۳، ص ۳۹۲ (بحوالہ سراج التواریخ و حیات افغانی)۔

(5) تحفۃ الکرام (طبع راشدی)، ص ۴۷۲۔

ٹھٹھہ کے انتظامات:

ٹھٹھہ چونکہ سندھ کا ایک مرکزی شہر تھا، میاں صاحب نے اپنے دور حکومت میں اس کی طرف خاص توجہ دی، اس نے پہلے محمد قائم کو کلتاش کو وہاں کا ناظم مقرر کیا، پھر محرم ۱۱۸۴ھ (مئی ۱۷۷۰ء) میں حبیب فقیر نائج کو ٹھٹھہ کا ناظم بنایا، اس کے بعد مراد فقیر نظامانی ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) تک اس شہر کا ناظم رہا۔

حیدرآباد کی بنیاد:

میاں غلام شاہ نے اپنے دورِ حکومت میں اپنی حکومت کے مختلف مرکز بدلے، اسے تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ آخر میں اس نے اپنا دارالحکومت بنانے کے لیے دریائے سندھ کے کنارے اس مقام کو پسند کیا جو قدیم زمانے میں نیرون یا نیرون کوٹ کہلاتا تھا۔ یہ ایک مضبوط پہاڑی پر واقع تھا، ذیقعدہ ۱۱۸۲ھ (مارچ ۱۷۶۹ء) میں اس نے اس مقام پر قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا، جب یہ قلعہ تعمیر ہو کر مکمل ہو گیا تو اس کا نام حیدرآباد رکھا۔ اس مقام کے ٹیلے پر شہر تعمیر کرا کے وہاں کی رعایا کو قلعہ کی حفاظت میں آباد کیا۔ ماہ ذوالحجہ میں ڈیرہ غازی خان سے واپس آنے کے بعد وہ اسی قلعے میں سکونت پذیر ہو گیا۔[1]

مختلف شعرا نے حیدرآباد کی تاریخیں کہیں، میاں سرفراز خاں کی کہی ہوئی تاریخ یہ ہے:

از عطا ہائے واھب و منّاں
حیدرآباد گشت آباداں

۱۱۸۲ھ

یارب اجعل ھذا البلد امنا[2]

۱۱۸۲ھ

وفات:

میاں غلام شاہ کلہوڑہ نے سولہ سال کی حکومت کے بعد بروز جمعرات ۳ جمادی الاولیٰ ۱۱۸۶ھ (۲ اگست ۱۷۷۲ء) کو وفات پائی۔ مولانا غلام رسول مہر نے تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) میں اس کی وفات کی مستند تاریخ ۱۳ جمادی الاولیٰ قرار دی ہے، کیونکہ ۳ جمادی الاولیٰ کو جمعرات کا دن نہیں پڑتا، کہتے ہیں کہ اس پر لقوہ اور فالج کا حملہ ہوا اور گفتگو سے معذور ہو گیا۔ اس کی فوری اطلاع اس کے فرزند میاں سرفراز خاں کو دی گئی، تمام اعزہ اور اراکین سلطنت جمع ہو گئے، مختلف علاج کیے گئے، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا، آخر جان جان آفرین کے سپرد کی۔ اس شعر سے اس کی تاریخ وفات نکلتی ہے:

غلام شاہ کہ بودہ غلام شاہ نجف
مقام کردہ ارم حمدلی بشاہ نجف

اس کے فرزند میاں سرفراز خاں نے بھی اس کی حسب ذیل تاریخ وفات کہی:

آہ از بے مہریِ گردونِ دوں
آہ از نیرنگِ چرخِ نیلگوں
خسرو دوراں غلام شاہ دیں
آں کہ بوسیدہ فلک او را زمیں
روضۂ پر نور چوں قصرِ بہشت
دل کشا چوں جنت مینو سرشت
سال تاریخش سرافراز از خیال
جستجو می کرد باصد اختلال
ناگہ از تنزیل در داد ایں ندا
ہاتفے جنات فیھا خاندا

۱۱۸۶ھ

میاں صاحب کو حیدرآباد میں دفن کیا گیا اور قبر پر نہایت خوبصورت قبہ بنایا گیا۔

مائی گلاں:

میاں غلام شاہ کے متعلق روایت ہے کہ اس کی ماں مائی گلاں تھی جو ایک طوائف تھی، جس نے تائب ہو کر میاں نور محمد سے نکاح کر لیا تھا۔ سندھ میں اس کے متعلق ایک عجیب مقولہ سرائیکی زبان میں مشہور ہے:

گلاں وچوں گل پیدا تھیا
کجھ کھلیا ہے، کجھ کھلسے[3]

(ترجمہ: گلاں سے جو پھول پیدا ہوا ہے، وہ کس قدر کھلا ہے، اور ابھی اور کھلے گا)۔

---

(1) تحفۃ الکرام اردو ترجمہ، ص ۳۴۹-۳۵۰۔

(2) رسالہ نئین زندگی (سندھی) ماہ فروری، ۱۹۵۴ء۔

(3) لب تاریخ سندھ، ص ۱۳۱۔

اولاد:

میاں غلام شاہ نے کئی شادیاں کی تھیں، ان کی ایک بیوی راؤ کچھ کے چچازاد بھائی کی بیٹی تھی، دوسری بیوی کا نام مائی بہو بیگم تھا، جو مائی دولت کے نام سے مشہور تھی، یہ جاں نثار خاں گوجر کی بیٹی اور نواب اللہ داد خاں کی حقیقی بہن تھی۔

میاں صاحب کے دو صاحبزادے محمد سرفراز خاں، دوسرے میاں محمود خاں تھے۔ سرفراز خاں میاں غلام شاہ کے بعد سندھ کا حکمران ہوا، میاں محمود خاں بھی چند دن سندھ کے حکمران رہے۔[1]

میاں غلام شاہ کی حکومت پر تبصرہ:

میاں غلام شاہ نہایت ہی نیک سیرت، شجیع اور بہادر انسان تھا، اس نے اپنے سندھ کے سولہ سالہ دور حکومت میں نہایت کامیاب حکومت کی بعض لوگ تو اس کے دور کو عہدِ کلہوڑا کا سب سے زریں دور قرار دیتے ہیں، اس نے اپنے دورِ حکومت میں ملک کے امن و امان کے بحال کرنے کی کوشش کی، اہل ملک کی خوش حالی کی طرف توجہ کی، نئے نئے شہروں کی تعمیر کی، احمد شاہ ابدالی نے اس کی خدمت اور اس کے حسن انتظام سے متاثر ہو کر اسے دو مرتبہ خطاب اور تحائف سے نوازا۔ اس نے شر پسند عناصر کا خاتمہ کر کے ملک کی وحدت کو پارہ پارہ ہونے سے بچایا، بستہ بندر اور لکھپت وغیرہ راؤ کچھ سے حاصل کر کے اپنے ملک کو وسیع کیا، داؤد پوتروں سے شہر اُچ اور قلعہ سبزل لے کر سندھ میں شامل کیے، اسی طرح شہر کراچی اور اس کے ارد گرد کے علاقوں کو خان قلات بروہی سے لے کر سندھ کی حکومت کو وسیع تر کر دیا، اس نے عوام کی روحانی اور اخلاقی قدروں کو بھی بلند کرنے کی کوشش کی۔

مخدوم محمد ہاشم نے جو سندھ کے ایک متبحر عالم تھے، میاں غلام شاہ کو ان خلاف شرع باتوں اور برائیوں کی طرف توجہ دلائی، جو عوام میں رونما ہو رہی تھیں، مخدوم محمد ہاشم کی تجویز کے مطابق اس نے اپنے ملک کے تمام حکام کے نام فرمان جاری کیا، جس میں حکم دیا گیا۔

۱۔ ایام محرم میں ماتم کرنے اور تابوت نکالنے سے روکا جائے (۲) تمام نشی اشیا کے استعمال کو ممنوع قرار دیا جائے (۳) جوئے، فاحشہ عورتوں اور فواحش کو بند کیا جائے (۴) جاندار چیزوں کی تصویریں نہ اُتاری جائیں (۵) داڑھی مٹھی بھر رکھی جائے اور کسی کو مونڈنے کی اجازت نہ دی جائے (۶) کسی مرنے والے کی تعزیت کے موقع پر مردوں اور عورتوں کو نوحہ کرنے اور چیخ کر رونے سے روکا جائے (۷) مسلمانوں کو نماز روزے اور دوسری جانی و مالی عبادات کا پابند بنایا جائے۔[2]

اس کی سیرت و اخلاق کی کمزوریوں میں صرف ایک بات جو ایک مورخ کو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے اپنے مشیر خاص راجا لیکھی کے مشورے سے ۱۱۷۴ھ (۶۱-۱۷۶۰ء) میں اپنے بھائی میاں مراد خان کے دو بیٹوں عباس علی اور حسین علی کو کشتی میں بٹھا کر غرق کرایا[3]، بلاشبہ یہ ایک ایسی حرکت ہے جس پر نکتہ چینی کی جا سکتی ہے، لیکن بحیثیت مجموعی اس کی خوبیوں کا پلڑا اس کی کمزوریوں کے مقابل جھکا ہوا ہے۔

میاں محمد سرفراز خاں

۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء) تا ۱۱۸۹ھ (۷۶-۱۷۷۵ء)

سندھ کی فرمانروائی:

میاں غلام شاہ کی وفات کے دوسرے یا تیسرے دن اس کا بیٹا میاں محمد سرفراز خاں ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء) اپنے باپ کی جگہ مسند حکومت پر بیٹھا۔

اس کی مسند نشینی کے دو ماہ بعد احمد شاہ ابدالی نے ۲۰ رجب ۱۱۸۷ھ (۱۷۷۳ء) کو وفات پائی، اس کی جگہ اس کا بیٹا تیمور شاہ[4] تخت نشین ہوا۔ اُس زمانے میں چونکہ سندھ افغانستان کے تحت تھا، میاں سرفراز خاں نے میر بہرام ٹالپر کو تعزیت کے لیے تیمور شاہ کے پاس قندھار بھیجا، تیمور شاہ نے میاں سرفراز خاں کو خلعت، حکمرانی کی سند اور خدا یار خاں کے خطاب سے نوازا۔[5]

ڈیرہ جات کی حکومت:

نیز ڈیرہ جات کی حکومت بھی میاں سرفراز خاں کو دی گئی، چنانچہ ذوالحجہ ۱۱۸۱ھ (مارچ ۱۷۷۳ء) کو وہ خود ڈیرہ جات گیا اور چار ماہ وہاں قیام کر کے ان علاقوں کے نظم و نسق کو درست کیا، پھر ۱۲ ربیع الآخر ۱۱۸۷ھ (جولائی ۱۷۷۳ء) کو حیدر آباد واپس لوٹا۔

---

(1) ماخوذ از تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا) جلد ۲، ص ۶۸۵-۶۸۶۔

(2) تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا) جلد ۲، بحوالہ اخبار الوحید (خاص نمبر) ۱۵ جون ۱۹۳۶ء۔

(3) تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا) جلد ۲، ص ۶۷۲۔

(4) تیمور شاہ: وفات روز یکشنبہ ۷ شوال ۱۲۰۷ھ (نوائے معارک ص ۷۶۱)۔

(5) تحفۃ الکرام (طبع راشدی) ص ۴۷۶۔

کچھ پر یورشیں:

میاں سرفراز خاں نے کچھ پر بھی دو مرتبہ حملہ کیا، اس نے پہلا حملہ براہ کھادڑہ اور سمرا سر شعبان ۱۱۸۸ھ (اکتوبر ۱۷۷۴ء) میں کیا تھا، یہ حملہ کئی مہینے جاری رہا، جب اس کا لشکر کنٹی کوٹ پہنچا تو میاں سرفراز نے وہاں کے ٹھاکر کی لڑکی سے شادی کرلی۔ راؤ کچھ نے حالات کو نامساعد پا کر شاندار طور پر میاں کا استقبال کیا، میاں نے اس کے تمام مفتوحہ علاقے اس کے حق میں واگذار کر دیے اور کچھ سے گجرات کی طرف آیا، پھر پار کر ہوتے ہوئے اور وہاں کے سرداروں کو اطاعت پر مجبور کرتے ہوئے حیدرآباد واپس آیا، دوسرے حملے کی تفصیلات تاریخوں میں نہیں ملتی۔

ٹالپروں کی، دربار کلہوڑہ میں حیثیت

میر بہرام سے بدگمانی:

کلہوڑوں کے دربار میں ٹالپروں کو ابتدا ہی سے بڑا رسوخ اور اعتماد حاصل تھا، اس خاندان کا پہلا شخص جس نے میاں یار محمد کی نظر میں بڑا اعتماد اور رسوخ حاصل کیا، وہ میر شہداد خان تھا، میر شہداد خاں نے ۲ رجب ۱۱۴۷ھ (۱۸ نومبر ۱۷۳۴ء) کو وفات پائی۔ میر شہداد خاں کے بعد اس کے تین فرزند تھے: میر جام نندو، میر چاکر اور میر بہرام خان انہوں نے کلہوڑہ دربار میں نہایت اہمیت حاصل کرلی تھی، خصوصاً میر بہرام نے اپنی نمایاں خدمت کی وجہ سے کلہوڑوں کے دربار میں ممتاز مقام حاصل کیا تھا، وہ میاں غلام شاہ کا بھی معتمد اور مشیر تھا، اور میاں سرفراز خاں کے عہدِ حکومت میں بھی اس کی حیثیت بہت بلند تھی۔ اس خصوصیت اور تقریب کی وجہ سے دربار کے دوسرے سردار اور مصاحب اس پر رشک کرتے تھے، خصوصاً راجا لیکھی، جو میاں غلام شاہ کے عہدِ حکومت میں اس سے رشک و حسد رکھتا تھا، اس فکر میں رہتا تھا کہ وہ میر بہرام کو کلہوڑہ فرمانرواؤں کی نظر میں گرائے لیکن میاں غلام شاہ کے عہد میں اسے کوئی موقع نہیں ملا، البتہ جب میاں سرفراز خاں مسند نشین ہوا تو اس نے موقع پا کر میاں سرفراز سے میر بہرام کی جھوٹی شکایتیں لگانی شروع کر دیں، مجملہ اور شکایتوں کے اس نے میاں سرفراز کو یہ بھی سمجھایا کہ اسے میر بہرام کی طرف سے چوکنا رہنا چاہیے، کیونکہ وہ آپ کو گرانے کی خفیہ خفیہ فکریں کر رہا ہے اور اس نے خفیہ طور پر مجھے بھی پیغام بھیجا ہے کہ میں بھی اس کے ساتھ ناپاک سازش میں شریک ہو جاؤں۔ اب آپ اسے زیادہ موقع نہ دیجئے اور جلد ہی اسے کیفر کردار تک پہنچایے، باوجود اس کے کہ میر بہرام کی اطاعت کشی اور وفاداری میاں سرفراز کے نزدیک بھی مسلم تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجا لیکھی کے بار بار کہنے سے، اس کی باتیں میاں سرفراز کے دل میں گھر کرنے لگیں اور وہ اس سے بدگمان ہو کر مکدر رہنے لگا۔

دیوان گدّو مل کا مشورہ:

دیوان گدو مل نے جو کلہوڑوں کا نہایت وفادار اور معتمد تھا، اس نے جب یہ محسوس کیا کہ میاں سرفراز، میر بہرام سے مکدر رہنے لگا ہے اور حکومت میں ایک نیا فتنہ جنم لے رہا ہے، اس نے ایک موقع پر بر بنائے خیر خواہی میاں سرفراز کو سمجھایا اور کہا کہ میں آپ کا نمک خوار ہوں میرا فرض ہے کہ میں اچھا اور برا دونوں چیزوں کو آپ کے سامنے رکھ دوں، خدا کے لیے آپ فتنہ پردازوں کی فتنہ پردازی سے دور رہیے، اور اس معاملے میں جلدی نہ کیجیے اور ٹالپروں کے قبیلے کو اپنا مخالف نہ بنایئے، کیونکہ اس منصوبے سے جو میر بہرام کے خلاف بنایا گیا ہے عظیم فتنہ برپا ہوگا اور آپ کی ناموس پر بھی حرف آئے گا، اگر آپ کو میر بہرام کی طرف سے ایسا ہی اندیشہ ہے تو اس پر مزید احسان کر کے اس کی گردن کو جھکا دیجیے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میاں سرفراز پر دیوان گدو مل کی نصیحتوں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔

میر بہرام کا ردِ عمل:

میر بہرام نے جلد ہی میاں سرفراز کے طرز عمل سے محسوس کر لیا کہ وہ اس سے کبیدہ خاطر ہے اور ایک روز اس پر کوئی مصیبت آنے والی ہے، اس نے ان حالات کا اندازہ کرتے ہوئے اپنے بیٹے میر بجار اور میر صوبدار کو بلا کر انہیں تمام صورتحال سے آگاہ کر کے کہا کہ اب ہماری تقدیر میں جو لکھا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا لیکن ہم نے میاں سرفراز کی وفاداری کا حلف اٹھایا ہے، ہم اس عہد پر آخر تک ثابت قدم رہیں گے، تقدیر سے کسی کو مفر نہیں، میں تم دونوں کو خدا کی امان میں دیتا ہوں، اور حکم دیتا ہوں کہ کچھ دن کے لیے مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ اور تقدیر کے کرشمے دیکھو۔

میر بجار نے باپ کا یہ حکم سنتے ہی حج کے لیے رختِ سفر باندھ لیا، لیکن میر صوبدار نے باپ سے کہا کہ میں آپ سے جدا ہونا نہیں چاہتا، میری آرزو ہے کہ میں اپنا سر آپ کے قدموں میں قربان کر دوں، میرے لیے دعا فرمایئے کہ میری تمنا پوری ہو۔

میر بہرام کی شہادت:

میاں سرفراز خاں راجا لیکھی کے بہکانے سے میر بہرام سے متنفر ہو چکا تھا اگرچہ وہ بظاہر میر بہرام کے ساتھ بہت اچھی طرح ملتا تھا، لیکن اُس نے میر بہرام اور اس کے بیٹے میر صوبدار کے قتل کا فیصلہ کر لیا تھا، آخر اُس نے میر بہرام خاں اور اس کے بیٹے میر صوبدار کو شہید کرا دیا۔ میر عظیم الدین نے واقعہ قتل کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فتح نامہ میں لکھا کہ میر بہرام کو اس نے اپنی خاص مجلس میں بلایا، جس میں اس کے خاص مصاحبوں کے سوا کوئی اور موجود نہ تھا، اور ایک خط نکال کر میر بہرام کو دیا کہ یہ میر بجار کا خط ہے۔ میر بہرام عینک لگا کر اس خط کو پڑھنے لگا، وہ بالکل بے خبر ہو کر خط کو غور سے پڑھ رہا تھا کہ اچانک حسین نامی ایک شخص نے پیچھے سے ایسی تلوار ماری کہ اس کا سر تن سے علیحدہ ہو گیا۔

فریر نامہ میں مزید تفصیلات یہ ہیں کہ باپ اور بیٹا دونوں آئے، ان دونوں کو جب وہ دروازے پر تھے حکم ملا کہ اپنی تلواریں اُتار دو۔ چنانچہ میر بہرام نے اپنی تلوار اُتار کر ایک بچے کے حوالے کر دی، مگر میر صوبدار نے تلوار نہیں اُتاری اور وہ دروازے پر کھڑا ہوا۔ راجا لیکھی کے بیٹے اللہ بخش سے باتیں کرتا رہا، اسی اثنا میں میر بہرام مارا گیا۔

عبدالمجید جو کیہ نے اپنی تاریخ میں اس قتل کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا کہ میر صوبدار نے اپنے باپ کو مشورہ دیا تھا کہ قتل ہونے سے بہتر ہے کہ ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے، لیکن میر بہرام نے اس مشورے کو قبول نہ کیا۔ ۱۵ جمادی الآخر ۱۱۸۹ھ (۱۳ اگست ۱۷۷۵ء) کو میر بہرام میر صوبدار کے ہمراہ میاں سرفراز کے سلام کے لیے آیا اور مجلس میں اپنی جگہ بیٹھ گیا، اس کے آتے ہی میاں سرفراز اُٹھا، اس وقت راجا لیکھی، اللہ بخش جھنجن اور جام فیروز اس کے ساتھ تھے، جن سے اس نے وہاں سے اُٹھ کر ایک علیحدہ مقام میں مشورہ کیا، اسی درمیان حسین نامی ایک شخص نے میر بہرام کے سر قلم کرنے کا عہد کیا، میر بہرام کو بلایا گیا اور اس کا سر وہیں قلم کر دیا گیا، اس کی خبر ایک ملازم نے میر صوبدار کو پہنچا دی، اس نے اسی وقت اللہ بخش لیکھی کا پیٹ چاک کر دیا۔ ہر طرف سے میر صوبدار پر تلواریں برسنے لگیں اور بالآخر وہ شہید ہو گیا۔

میر بہرام کے قتل کا اثر:

میر بہرام اور اس کے بیٹے کا مظلومانہ قتل نہ صرف میاں سرفراز خاں کی معزولی اور اسیری کا سبب بنے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ آئندہ چل کر کلہوڑہ حکومت کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

پہلا اثر اس مظلومانہ قتل کا یہ ظاہر ہوا کہ عوام میں میاں سرفراز خاں کے خلاف نفرت اور حقارت کی لہر دوڑ گئی۔ ہر شخص نے ملک کے ان وفاداروں کے قتل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا، اس کے علاوہ میر کے اعزہ و اقربا میں ان دونوں بیگناہوں کے قتل کے انتقام کا جذبہ شدت سے اُبھرا اور میر بہرام کے چچیرے بھائی میر فتح خاں کی سربراہی میں ٹالپروں اور بلوچوں نے مجتمع ہو کر خدا آباد پر ہلہ بول دیا۔ فتح نامہ میں ہے کہ اس ہلے کے بعد وہ اس قدر ہراساں ہوا کہ وہ خدا آباد سے اس قدر بدحواس ہو کر اپنے پانچ چھ ساتھیوں کے ساتھ دریا کی طرف بھاگا کہ اسے جوتے پہننے کا ہوش تک نہ رہا اور ایک کشتی میں سوار ہو کر حیدرآباد پہنچا، قلعۂ حیدرآباد میں اگرچہ اس کے پاس مال و دولت اور سامان حرب کافی تھا لیکن اس کی قسمت نے یاوری نہ کی[1] ادھر فتح خاں نے قلعے کو فتح کر لیا۔ حیدرآباد پہنچنے کے بعد خون شہیداں اور بھی رنگ لایا، میاں سرفراز کی نیند حرام ہو گئی، ہر وقت میر بہرام کا سایہ اسے نظر آتا اور وہ چیخنے لگتا، راجا لیکھی اور اللہ بخش جھنجن اور محراب جتوئی جو میر بہرام کے قتل کے سب بڑے محرک تھے، ان سب نے میاں سرفراز کا ساتھ چھوڑ دیا اور میر فتح خان سے جا ملے۔[2]

میاں محمود خاں کی مسند نشینی

۱۱۸۹ھ (۷۶-۱۷۷۵ء)

فتح نامہ میں ہے کہ میر فتح خاں نے میاں سرفراز کے چھوٹے بھائی میاں محمود خاں کو میاں سرفراز کی جگہ مسند نشین کیا اور ایک شخص کو اپنا نائب بنا کر اس کے پاس چھوڑا، اور خود حیدرآباد کی طرف روانہ ہو گیا اور اس نے سات دن میں قلعۂ حیدرآباد فتح کر لیا۔ میاں سرفراز جب قلعے سے باہر نکلا تو اس نے نہایت برہم ہو کر راجا لیکھی سے کہا تو بھی کتنی بری قسم کا کتا ہے کہ تو نے مجھے کیا مشورہ دیا تھا اور خود کیا عمل کیا، خدا تجھے میری طرف سے اس کا بدلہ دے گا، میرے اقبال کی کلاہ آسمان پر پہنچی ہوئی تھی، تیرے مکر سے میں زمین پر پہنچ گیا، چونکہ میں نے تجھ جیسے مکار کو پہچانا نہیں تھا، اس لیے میں نے ناحق اپنے وفادار امیر کو مار ڈالا، اسی

---

(1) فتح نامہ عظیم ٹھٹھوی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۳۸۔
(2) ایضاً۔ ص ۳۹۔

طرح وہ میر بہرام کی تعریف بے حد کرتا رہا اور راجا لیکھی پر نفرین و ملامت کرتا رہا، لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اب میاں سرفراز کی یہ سب باتیں بے سود تھیں۔

میر عظیم الدین نے فتح نامہ میں اس واقعہ کو اس طرح منظوم کیا ہے کہ:

بروں آمد از قلعہ و آں قلعگی
ہمی گفت کہ اے راجہ تو بد سگی
چہ گفتی مرا و چہ کردی بمن
سزایت دہد کرد گارِ ز من
بچرخ بریں می رساندم کلاہ
بمکرت نشستم بخاکِ سیاہ
چو نشاخم چوں تو مکار را
بنا حق بکشتم وفادار را
ہمی گفت بر راجہ نفرین بسے
ہمی کرد بر میر تحسین بسے[1]

آخر میاں سرفراز کو قید کر دیا گیا اور اس نے قلعہ کی کنجیاں اور خزانہ میر فتح خاں کے حوالے کر دیا۔ فتح نامہ میں ہے کہ جب قلعے کی یہ کنجیاں میر فتح خاں کے حوالی کی گئیں، تو اس نے یہ کہہ کر ان کے لینے سے انکار کر دیا کہ یہ میرا کام نہیں، ہمارا سردار میر بجار ہے، جب وہ آئے گا تو جو چاہے کرے گا، میں نے یہ کام مال و زر کے حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا، میں نے تو انتقام کی آگ بجھانے کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے، میر بجار جلد حرمین شریفین کی زیارت سے آئے گا اور وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ جو چاہے کرے گا۔[2]

فریر نامہ میں ہے کہ:

راجہ لیکھی و اللہ بخش جھنجن کلید خزانہ پیش میر فتح خاں حاضر کردند۔ میر صاحب موصوف گفت کہ من برائے خزاین دودمان کلہوڑہ نامہ نیامدہ ام، بلکہ خون خواہی شہیدان خود آمدہ ام الحمد اللہ کہ امید بہ کام رسید، حالا میر بجار خان کہ سردار تمامی بلوچان و مایاں است، و مختار کل جزو کل امورات سندھ است دریں جا از حرمین شریفین زادھاما اللہ شرفاً و تعظیماً مراجعت خواہند فرمود، ہر چہ خواہش او خواہد بود خواہد کرد۔

راجا لیکھی کو جب یہ خبر ملی کہ میر فتح خاں نے قلعہ اور خزانے کی کنجیاں لینے سے انکار کر دیا تو وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا اور اس نے اپنے بیٹے تاجہ کو جو میاں محمود خاں کے دربار میں تھا، کوشش کر کے مدارالمہام بنا دیا اور مال و دولت کو اپنے خود غرض ساتھیوں اللہ بخش جھنجن، پیروز پتافی اور کھوسہ قوم میں بے دریغ لٹانا شروع کر دیا، تاکہ وہ ان کو اپنا ہم خیال بنائے۔ میر فتح خاں خاموشی سے یہ حالات دیکھتا رہا اور لشکر لے کر اپنے ٹھکانے پر چلا گیا اور میر بجار کا انتظار کرنے لگا تاکہ اس کے آنے کے بعد راجا لیکھی کو اس کے کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ راجا لیکھی نے بھی اس کا اندازہ کر لیا اور وہ خوف و دہشت سے بے حد ہراساں ہوا، اس نے ایک اندھیری رات میں محمود خاں کو اٹھایا اور ایک ایسی جگہ لے گیا، جس کے چاروں طرف پانی تھا، پھر اس نے بلوچوں اور ٹالپروں کے زیر کرنے کے لیے سوچا کہ کیوں نہ ایسی تدبیر اختیار کی جائے کہ جس کی بنا پر سندھ کا کوئی زبردست قبیلہ اس کی حمایت میں کھڑا ہو جائے، چنانچہ اس نے بڑے غور و فکر کے بعد سیاست کی ایک نئی بازی کھیلنے کا ارادہ کیا۔ اس کی نگاہِ انتخاب نے سندھ کی فرمانروائی کے لیے غلام نبی بن میاں نور محمد کو چنا، جو جونیجہ قبیلے کا نواسا تھا اور جس کے متعلق اس کا خیال تھا کہ اگر میاں غلام نبی کے معاملے میں ذرا بھی چوں وچرا کی گئی تو ایک بہت بڑا قبیلہ اس کی حمایت میں اُٹھ کھڑا ہو گا۔[3]

میاں سرفراز چند ماہ قید رہا، آخر میں خاندان کلہوڑہ کے آخری حکمراں میاں عبدالنبی کلہوڑہ نے سرفراز اور اپنے خاندان کے بعض دوسرے افراد کو قتل کر دیا، جس کی تفصیل آیندہ میاں عبدالنبی کے حالات میں آئے گی۔

میاں غلام نبی کی فرمانروائی

۱۱۸۹ھ (۷۶-۱۷۷۵ء) تا ۱۱۹۰ھ (۱۷۷۶ء)

مختصر یہ کہ اس تدبیر کے مطابق اس نے میاں محمود خاں کو معزول کر کے میاں غلام نبی کو سندھ کا فرمانروا بنایا، میاں غلام نبی کے متعلق میر عظیم الدین ٹھٹھوی نے لکھا ہے کہ وہ نہایت عقل مند، صاحب فکر، کرم پیشہ، سادات کا قدردان، مسافر نواز اور فقیر آشنا انسان

---

(1) فتح نامہ میر عظیم الدین، ص ۳۹۔

(2) ایضاً۔ ص ۴۰-۳۹۔

(3) فتح نامہ۔ عظیم ٹھٹھوی، ص ۴۱-۴۰۔

تھا، بروں سے دور رہتا تھا۔ بظاہر وہ راجا لیکھی سے قریب تھا، لیکن دل میں اس سے نفرت کرتا تھا، جب وہ بلوچوں کی شکایات اس کے سامنے پیش کرتا تو وہ اس سے منہ پھیر لیتا، اگر وہ راجا لیکھی کو کبھی دور سے بھی دیکھ لیتا تو دل ہی دل میں اس پر لاحول بھیج کر خدا کی امان چاہتا۔[1]

میر بجار کی آمد:

یہاں تک کہ اسی زمانے میں میر بجار کی آمد کی خبر سندھ پہنچی، راجا لیکھی کو اپنا انجام بد نظر آنے لگا اور وہ اسی دہشت میں مر گیا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اس نے میر بجار کی آمد کی خبر سن کر زہر کھالیا۔

راجا لیکھی کا فتنہ ختم ہوا تو اس کے بیٹے تاجہ نے فتنہ پردازیوں میں سر اُٹھایا، کیونکہ وہ فتنہ پردازیوں میں اپنے باپ کا صحیح جانشین تھا، بقول عظیم ٹھٹھوی کے کہ اگرچہ اس میں علم و فضل، عقل کا فقدان تھا، لیکن اپنے باپ کے نقش قدم پر مکر و فریب، دغابازی میں بالکل ابلیس تھا غلام نبی کو اس سے دلی نفرت تھی، وہ صرف ضروری احکام کے لیے اس کو بلاتا، ورنہ اس سے دور رہتا، وہ اس کی یاوہ گوئی سے بے حد تنگ تھا، بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بلبل کو زاغ کے ساتھ ہم قفس کر دیا گیا ہے وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ مجھے اس سے خون کی بو آتی ہے، اس کی ساری باتیں جھوٹی اور غلط ہوتی ہیں اور اس کا چہرہ مجھے قاتلوں کا سا معلوم ہوتا ہے۔

میر بجار قلات میں:

میر بجار حج سے واپسی میں جہاز پر کراچی آیا، جو اس زمانے میں قلات میں شامل تھا اور کراچی سے قلات گیا، اس زمانے میں قلات کا حاکم خان محمد نصیر خاں تھا، محمد نصیر خاں نے اس کا شاندار استقبال کیا اور اس کی تعظیم و تکریم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، یہاں تک کہ محبت و اخوت کا رشتہ مستحکم کرنے کے لیے اس نے اپنی پگڑی بدلی اور اس کی امداد و اعانت کے لیے ایک فوج تیار کی، لیکن میر بجار نے اس صورت حال کو دیکھ کر محمد نصیر خاں کو قسم دے کر کہا کہ اگرچہ میں مظلوم و بے کس ہوں لیکن میں سوائے خدا کے کسی کی مدد نہیں چاہتا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے در کے سوا مجھے اور کوئی در درکار نہیں، میرے لیے باعثِ شرم ہے کہ میں اپنے ہی ملک پر فوج لے کر چڑھائی کروں، میں ایسے ہی جاؤں گا، اگر خدا نے میری مدد کی تو فتح ہماری ہوگی، اگر ایسا نہ ہوا تو میں اسے خدا کی رضا سمجھ کر اس پر راضی رہوں گا، میں خدا کی رضا سے جنگ نہیں کر سکتا، مجھے یقین ہے کہ اس کے فضل کا دامن تنگ نہیں۔

محمد نصیر خاں نے میر بجار کی یہ باتیں سن کر روتے ہوئے اسے خدا حافظ کہا اور اس کا دامن پکڑ کر کہا کہ مجھے آپ سے بے حد شرمندگی اور ندامت ہے کہ میر بہرام جو بمنزل میرے باپ کے تھا اور جس کا انتقام لینا میرا سب سے بڑا فرض تھا، لیکن میں آپ کا انتظار کرتا رہا، اور جب کہ آپ آگئے ہیں تو آپ مجھے انتقام لینے میں اپنا رفیق کیوں نہیں بناتے اور مجھے غمگین کیوں بناتے ہیں؟ میر بجار نے جواب دیا کہ میں نے خدا سے مدد چاہی ہے اور پنجتن پاک میرے مددگار و ناصر ہیں، تم تو صرف میرے لیے دعا کرو اور مجھے خدا کے حوالے کرو۔[2]

میر بجار کی سندھ میں آمد:

میر بجار قلات سے روانہ ہو کر سندھ پہنچا، تو میر عبداللہ خاں بن میر بجار خاں، میر فتح علی خاں، میر فتح خاں، میر غلام علی، میر سہراب، میر محمود خاں، میر اللہ یار، میر ٹھارہ خاں اور دوسرے بہت سے بلوچ سردار اس کی باپ کی تعزیت اور اس کے استقبال کے لیے موجود تھے، ان سب نے کلہوڑوں کے مظالم کو بالتفصیل بیان کیا، یہ سب جلد از جلد کلہوڑوں پر ہلّہ بول دینے کے خواہاں تھے۔

میر بجار کا جنگ میں توقف:

لیکن میر بجار اپنے ملک میں خانہ جنگی پسند نہیں کرتا تھا، وہ اپنی عاقبت اندیشی کی وجہ سے محض انتقام کے جوش میں ملک کو جنگ کی جہنم کی آگ میں جھونکنا نہیں چاہتا تھا اور دوسرے اسے اس کا بھی انتظار تھا کہ وہ ملک کی رائے عامہ کو معلوم کرنا چاہتا تھا، اس نے آگے بڑھ کر حیدرآباد سے چھ کوس اس طرف ڈیرے ڈال دیے۔

میاں غلام نبی اپنے حالات کے لحاظ سے مجبور تھا، کیونکہ لیکھی اور اس کا بیٹا تاجہ اس پر چھائے ہوئے تھے، اس لیے وہ مجبور ہو کر میر بجار کے پاس تعزیت کے لیے نہ آیا، اللہ بخش جھنجن، محراب جتوئی، پیروز پتافی اور ان کے دوسرے ساتھی، چونکہ اپنے کیے ہوئے اعمال کو جانتے تھے، انہوں نے میاں غلام نبی کو اپنے کنٹرول میں لے کر جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔[3]

---

(1) فتح نامہ - عظیم ٹھٹھوی، ص ۳۱۔

(2) فتح نامہ - عظیم ٹھٹھوی، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۴۳-۴۲۔

(3) فتح نامہ - عظیم ٹھٹھوی، ص ۴۴۔

میر بجار کے نام میاں غلام نبی کا خط:

ان سب نے مشورہ کر کے میاں غلام نبی سے ایک خط بصورت فرمان میر بجار کے نام لکھوایا، جس میں اس نے میر بجار کو لکھا کہ: تمہارا مقصد یہاں قیام کرنے سے کیا ہے؟ اور تم کیا چاہتے ہو؟ تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اگر تم جنگ کا ارادہ رکھتے ہو تو بسم اللہ اور اگر یہ ارادہ نہیں تو اپنا راستہ لو۔[1]

میر بجار کا ردعمل:

میر بجار کو جب یہ خط ملا اور اسے ان کا کمینہ پن معلوم ہو گیا، لوگوں میں اس خط سے اور بھی جنگ کا جوش پیدا ہو گیا، لیکن پھر بھی اس نے تحمل سے کام لیا، وہ لوگوں کو جنگ سے روکتا رہا اور دوسرے دن وہ اپنا ساز و سامان لے کر عمر کوٹ روانہ ہو گیا۔ عمر کوٹ قلعے پر کھوسہ قبیلے کا قبضہ تھا، انہوں نے جب میر بجار کی آمد کی خبر سنی تو وہ قلعہ چھوڑ کر فرار ہو گئے اور میر بجار اطمینان سے قلعے پر قابض ہو گیا۔[2]

کھوسہ قبیلے نے قلعہ چھوڑتے چھوڑتے اس کی اطلاع میاں غلام نبی کو بھی دے دی تھی، لہٰذا تاجہ لیکھی ایک لشکر تیار کر کے اور میاں غلام نبی کو ساتھ لے کر عمر کوٹ کی طرف روانہ ہوا، لیکن اسے اندازہ تھا کہ عمر کوٹ کے قلعے کو میر بجار سے واپس لینا آسان نہیں، اس لیے اس نے مکر و فریب کی ایک نئی راہ اختیار کی۔[3]

مکر و فریب کا نیا حربہ:

اس نے اللہ بخش جھنجن کو سکھا پڑھا کر میاں غلام نبی کو میر بجار کے پاس بھیجا، جس نے میر بجار کے پاس پہنچ کر پہلے تو اس کے باپ کی تعزیت نہ کرنے کی بے حد معذرت کر کے اپنی صفائی پیش کی، پھر تاجہ کی سخت شکایتیں کیں اور کہا کہ وہ اتنا بُرا آدمی ہے کہ ہم سب مل کر اس کا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں، لیکن آپ نے جو میاں غلام نبی کو ان کے خط کا جواب بھیجا، وہ ہمارے آقا کی رائے میں مناسب نہ تھا اور ہمیں بھی پسند نہیں آیا، آپ کو چاہیے کہ آپ آقا کا اعزاز کریں اور اس کی تعظیم و تکریم کو اپنے دل میں جگہ دیں، اور اس اعزاز کے اظہار میں قلعے سے باہر آ کر قیام کریں، لیکن اوپر فتح نامہ کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ میر بجار نے میاں غلام نبی کے خط کا جواب ہی نہ دیا تھا لیکن یہاں صاحب فتح نامہ نے اس کے جواب کا تذکرہ کیا ہے، ہمارے خیال میں اس کی سوائے اس کے کوئی تاویل نظر نہیں آئی کہ ممکن ہے میر بجار نے چلتے چلتے کوئی جواب لکھ دیا ہو، جس کا تذکرہ اللہ بخش جھنجن نے اپنی گفتگو میں کیا ہے۔

بہر حال میر نے اللہ بخش جھنجن کو نہایت اعزاز سے رکھا اور اس کے کہنے کے مطابق قلعہ سے باہر آ کر قیام کیا، تاجہ لیکھی اور اس کے ساتھیوں نے جب یہ دیکھا کہ فریب کا جادو چل گیا ہے تو اس نے اپنے دو ہزار سپاہی قلعے میں بٹھا دیے، میر بجار متوقع تھا کہ اب صلح کی کوئی بات چیت شروع ہو گی، لیکن اسی لیت و لعل میں دو ماہ گزر گئے اور میر بجار نے سمجھ لیا کہ یہ محض فریب تھا اور اب سوائے جنگ کے کوئی اور چارہ نہیں، تو اس نے تاجہ لیکھی کو لکھا کہ اے دشمن دیں! تو کیوں خاموش بیٹھا ہے اگر تو مرد ہے تو میدان جنگ میں آ، خدا جسے چاہے گا فتح دے گا، تو میاں غلام نبی کو اپنی جگہ چھوڑ دے اور اپنے زر کے ہوس کے بندوں کو مقابلے پر لے کر آ۔[4]

جب لیکھی کو میر بجار کا یہ پیغام ملا، تو اس نے غلام نبی کے حضور میں اپنے سب خود غرض ساتھیوں کو طلب کر کے مشورہ کیا، میاں غلام نبی لڑائی کے حق میں نہ تھا، وہ کہتا تھا کہ صلح بہتر ہے، لیکن وہ تاجہ کے سامنے مجبور تھا، تاجہ چاہتا تھا کہ کسی طرح جنگ ہو، چنانچہ جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔[5]

لانیاری کی جنگ:

لانیاری تعلقہ شہدادپور میدان جنگ بنا، میر بجار کی فوج چھ ہزار جنگجو سپاہیوں پر مشتمل تھی اور میاں غلام نبی کی فوج میں تیس ہزار آدمی تھے، دونوں فوجوں کے درمیان شدید خوں ریز جنگ ہوئی۔ صاحب فریر نامہ اور فتح نامہ نے اسی لڑائی کا نقشہ اپنی اپنی کتابوں میں کھینچا ہے۔ جسے ہم طوالت کی وجہ سے یہاں نظر انداز کرتے ہیں۔[6]

میاں غلام نبی کی شہادت:

میاں غلام نبی نے جب جنگ میں اپنی شکست کے نمایاں آثار دیکھے تو انہوں نے خفیہ طور پر اپنے ایک ساتھی کو قرآن مجید دے کر میر

---

(1) ایضاً۔ ص ۴۴۔
(2) فتح نامہ۔ عظیم ٹھٹھوی، ص ۴۴۔
(3) ایضاً۔ ص ۴۴۔
(4) فتح نامہ۔ عظیم، ص ۴۶۔
(5) ایضاً۔ ص ۴۶۔
(6) فتح نامہ۔ عظیم، ص ۴۶۔

بجار کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ قرآن مجید گواہ ہے کہ میں اس جنگ سے متنفر تھا۔ لیکن میں ان ظالموں کے پنجے میں گرفتار ہوں، وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں، میں اس کلام مجید کو اپنا شفیع بناتا ہوں، جس طرح بھی ممکن ہو مجھ تک پہنچے۔

خدا جانے کس طرح تاجہ لیکھی کو یہ خفیہ پیغام معلوم ہو گیا، وہ جوشِ غضب میں اپنے چند ساتھیوں کو لے کر میاں غلام نبی کے پاس پہنچا اور میاں سے کہا کہ ہمیں پہلے ہی روز سے اندازہ تھا کہ تو ہمیں بُرا سمجھتا ہے، اچھا اگر تو ہمیں پسند نہیں کرتا تو تو بھی کیوں خوش رہے، یہ کہہ کر میاں صاحب کے جوشن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی تلوار ماری اور میاں غلام نبی کو شہید کر دیا، میر عظیم الدین ٹھٹھوی نے اس شعر میں میاں غلام نبی کی تاریخ وفات نکالی ہے:

چو بگریخت آں خرپرستِ شقی
دلم گفت سالش شکست شقی

۱۱۹۰ھ

تاجہ لیکھی کا فرار:

تاجہ لیکھی نے جب اپنے ولی نعمت کو شہید کر دیا تو وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر دریا کی طرف بھاگا اور کشتی میں سوار ہو کر شاہ گڑھ پہنچ گیا۔

میر بجار کا دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک:

جب میر بجار کو میاں غلام نبی کی شہادت کی خبر معلوم ہوئی، تو وہ اس کی نعش کے پاس دوڑا ہوا آیا اور نعش کے قریب بیٹھ کر افسوس کرتا رہا، پھر اس نے حکم دیا کہ میاں کی نعش کو صندوق میں رکھا جائے اور اس پر زربفت کا غلاف ڈالا جائے۔ جب تابوت تیار ہو گیا تو اس نے نہایت تزک واحتشام سے چند آدمیوں کے ساتھ یہ صندوق حیدرآباد روانہ کیا۔

پھر اس نے قاتلوں کے تعاقب میں فوج روانہ کی، اسی عرصے میں اللہ بخش جھنجن، محمد حسن، محراب جتوئی میر کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے قصوروں پر نادم ہو کر معافی کے خواہاں ہوئے۔ میر بجار نے ان سب کو معاف کر دیا۔

میاں سرفراز اور میاں غلام نبی کے عہدِ حکومت پر تبصرہ:

میاں سرفراز کی حکومت اور میاں غلام نبی کی حیات کا باب چونکہ ختم ہو رہا ہے، اس لیے کلہوڑہ خاندان کے ان دونوں فرمانرواؤں کے متعلق تاریخی حقائق کی روشنی میں ہم یہاں مختصر تبصرہ ضروری سمجھتے ہیں۔

سندھ کے تمام مورخ اس پر متفق ہیں کہ میاں سرفراز خاں بڑا عالم، سخن فہم، سخن سنج اور شاعر تھا، اس کے دربار کی زینت مشہور شاعر اور اس دور کے بڑے بڑے عالم تھے، سخاوت و فیاضی میں بھی وہ بے مثل تھا، علماء و فضلا اور اہل کمال کو ان کے علم و ہنر کے مطابق نوازتا، صاحبِ فریرنامہ نے اس کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا کہ:

محمد سرفراز خاں حاکے بود دانش مند و فضیلت پرور در علم و شعر فہمی یکتائے روزگار بود، و قدر شعراء و علماء کما ینبغی بجامی آورد۔

شاہ فقیر اللہ علوی جو سندھ کے مشہور عالم و درویش تھے، ان کے بعض مکاتب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہ صاحب سے بعض علمی سوالات کرتا رہتا تھا، آپ کے ایک مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ اس نے دعوات و تصرفات کے متعلق سوال کیا تھا۔

سندھ کا مشہور مورخ میر علی شیر قانع بھی اس کا بے حد معرف اور معترف نظر آتا ہے اس نے متعدد قصیدے اس کی شان میں کہے ہیں۔ اس کے علم و ہنر کی قدردانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قانع ایک قصیدے میں لکھتا ہے کہ:

ز قدر دانی آں بحر فضل و کانِ کرم
رواج یافتہ جنس سخن کہ داشت کساد
ز در گہت کہ بود مرجع ذوی الافہام
برائے اہل کمال است بس خجستہ معاد

اُس کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ خوش گو شاعر تھا اور سندھی زبان کا تو بہت بڑا شاعر تھا، کہتے ہیں کہ سندھی زبان میں نعت و منقبت کی ابتدا اُسی سے ہوئی، اس کے چند شعر ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

ہستی موہوم در دنیا سرائے بیش نیست
ویں طلسم زندگانی ہم حبابے بیش نیست
اسپ و فیل و تاج و تخت و اعتبار ایں جہاں
می نماید ہر چہ در چشم تو خوابے بیش نیست
در جہاں از شوقِ دل سامان ابادی مخواہ
بے گماں معمورۂ او جز خرابی بیش نیست

--

آسیاں بستم ز نادانی برنگ عندلیب
اے خوشا! باد سحر گہ کز چمن آزاد رفت

خوش آں گروہ کہ با یاد حق ہم آغوش اند
برنگِ پیکرِ تصویر جملہ خاموش اند
بعقلِ کل ہمہ دانائے جلوۂ ذات اند
بچشمِ مردمِ ظاہر اگرچہ بے ہوش اند

--

گفتم کہ صبح وصل نمایاں شود نشد
شامِ دراز ہجر بپایاں شود نشد
با سرفراز نالہ چو قمری کند مکرد
یا آں قد چو سرو خراماں شود نشد

--

تو اے مرغِ چمن دل شاد می کن
بمرغان قفس ہم یاد می کن
تو چوں باگل نشینی ہم نگاہی
بدام افتادۂ صیاد می کن
تو چوں بر شاخ گل باشی نوا سنج
بیاد ما دے فریاد می کن
تو چوں پروازگیری در گلستاں
ز بالِ بستۂ من یاد می کن
تغافل چند اے سروِ سرفراز
ز بندم پا بلطف آزاد می کن

--

سرافراز از اہل سندھ کسے شعرت نمی فہمد
بہ بند ابن دستۂ گل را بر اہل صفاہاں بر

--

دوش دیدم نخستہ دختر کے
ایستادہ بناز در برکے
دست بگرفتمش بہ ہندی گفت
چھوڑ دے ہاتھ چوریاں کرکے

ان تمام خوبیوں کے باوجود، اور اس عقل و دانش کے باوصف کہ اس نے ملک سے انگریزوں کی تجارت کو ختم کیا اور انہوں نے مجبور ہو کر اپنی تجارتی کوٹھی یہاں بند کر دی۔ اس کے علاوہ میاں سرفراز نے ملک کی زراعت و تجارت کو بھی ترقی دی، ضلع حیدرآباد میں "سرفراز" واہ نہر اُسی کی جاری کی ہوئی تھی اور اس کے دوسرے اچھے کارناموں کو دیکھتے ہوئے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس عقل و دانش کے باوصف اُس نے راجا لیکھی کے فریب میں آکر میر بہرام جیسے دانا اور وفادار امیر کو کیسے قتل کرایا، اس بارے میں سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ:

قدم پست و بلندِ دہر میں تھرا ہی جاتا ہے
چلے بچ کر کوئی کتنا ہی ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

میاں غلام نبی کی حیثیت اپنی چند روزہ فرمانروائی کے زمانے میں شاہ شطرنج کی سی تھی، لیکن جہاں تک کہ اس کے ذاتی اوصاف کا تعلق ہے، وہ اپنے ذاتی اوصاف میں اپنے باپ میاں نور محمد کا نمونہ تھا اور اس نے اپنے مجبورانہ دور حکومت میں بھی جہاں تک ممکن ہو سکا اخلاقی بلندیوں کو پیش نظر رکھا۔

صاحب فریر نامہ نے اس کے ذاتی اوصاف کو سراہتے ہوئے لکھا کہ:

غلام نبی صاحبے بود با حلم و کرم، بصورت معنوی و ظاہری پیراستہ و از فتنہ ہائے راجہ لیکھی بیزار، ہر گاہ راجہ لیکھی شکایت میر صاحباں کردے ازاں روے تافتے۔

میر عظیم الدین ٹھٹھوی اس کے اوصاف و محاسن کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہے:

غلام نبی جونکہ دستار بست
بخلق و بخوبی پدر کار بست
ہمہ لطف و فرزانگی پیشہ کرد
بہر امر خوش فکر و اندیشہ کرد
جوانے خردمند پیر آشنا
مسافر پرست و فقیر آشنا
کرم پیشہ و قابل و قدرداں
بآل نبی چوں پدر مہرباں

سندھ کے مورخ و شاعر قانع ٹھٹھوی نے بھی اسے اپنے قصائد میں سراہا ہے۔ ایک قصیدے میں کہتا ہے کہ:

گزیدہ دوحۂ عباس و زیب نامہ عز
بہ خلق و خلق نہ دیدہ مثال او دوراں
سریر سند بہ ذاتش چناں منور شد

کز انفعال شدہ ماہ تیر در سرطاں
کسے کہ شد بوجودِ سہ غلام نبی
گزیدہ باد بالطاف ایزد مناں
فروغ نور محمد بلے ز جبہۂ او
بہ چشم دہر ز روزِ الست بود عیاں
منم غلام علی شیر قانع از لطفش
توئی غلام نبی اے گزیدۂ رحمان

میاں عبدالنبی

۱۱۹۰ھ (۷۷-۱۷۷۶ء) تا ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء)

میاں عبدالنبی کی سنگدلی:

میاں عبدالنبی عرف غلام رسول میاں نور محمد کا چھوٹا بیٹا تھا۔ جب میاں غلام نبی کا تابوت حیدرآباد پہنچا، اس وقت میاں عبدالنبی حیدرآباد میں تھا، اُس زمانے میں سرفراز خاں، اس کا بیٹا محمد خاں، بھائی محمود خاں اور چچا عطر خاں حیدرآباد کے قلعے میں قید تھے۔ میاں عبدالنبی نے سب سے پہلے اپنے بھائی میاں غلام نبی کی تجہیز و تکفین کرائی۔ اس کے بعد اس نے سوچا کہ اگر ان قیدیوں کو زندہ چھوڑا گیا، تو میں ان کے مقابلے میں سندھ کا فرمانروا نہیں بن سکتا، اس لیے مناسب یہی ہے کہ ان سب کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے، چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کرنے کے بعد جونیجہ قوم کے ان لوگوں کو بلایا، جو ان قیدیوں کی حفاظت پر مامور تھے اور ان سے کہا کہ میرے دوستو! مجھے ان قیدیوں کی بڑی فکر ہے، ان پر ایسی تیز دستی کرو کہ یہ جلد قید ہستی سے رہا ہو جائیں۔ میرا یہ طرزِ عمل اپنے بھائیوں کے ساتھ کوئی نیا نہیں، بلکہ مجھ سے پہلے بادشاہوں نے بھی مصلحت کی بنا پر اپنے بھائیوں کو قتل کیا ہے۔ اس حکم پر ان لوگوں نے جا کر ان سب کو قتل کر دیا۔ اس طرح خاندان کلہوڑہ کی یہ پانچ اہم شخصیتیں مظلومانہ شہید ہوئیں، جن میں میاں غلام نبی بھی شامل ہے۔[1] کسی نے ان سب کی تاریخ شہادت: "پنج کم از گل باغ عباس" نکالی ہے۔

۱۱۹۱ھ

میر بجار کی تمنا:

میر بجار یہ جانتے ہوئے بھی کہ میاں سرفراز اس کے باپ اور بھائی کا قاتل ہے، لیکن وہ اس کو فرمانروائی کا اہل اور قابل سمجھتا تھا۔ وہ ملک کی مصلحتوں کے تقاضے کی بنا پر چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ میاں سرفراز کو سندھ کا فرمانروا بنائے، ابھی وہ اس امر میں غور و فکر کر ہی رہا تھا کہ اسے ان چاروں کی شہادت کی خبر ملی۔

اب اس کے لیے کوئی چارہ نہ تھا کہ اسی خاندان کے نالائق فرد میاں عبدالنبی ہی کو سندھ کا فرمانروا بنائے۔

میر بجار جنگ لانیاری میں کامیاب ہونے کے بعد خدا باد نو میں مقیم ہو گیا تھا، اس نے اس خبر کے بعد دو معتبر آدمی میاں عبدالنبی کے پاس حیدرآباد بھیجے اور کہلایا کہ اب اس خاندان میں تم ہی اس کے مستحق ہو کہ ملک کی فرمانروائی کو سنبھالو، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ تم یہاں آؤ اور اپنے بھائی کی جگہ مسند نشین ہو۔

میاں عبدالنبی کو جب یہ پیغام ملا تو وہ شان و شوکت سے روانہ ہو کر دو تین روز میں ہالہ کندی پہنچا، دوسرے دن میر بجار بھی اپنے امیروں کے ساتھ ہالہ کندی آ گیا اور سندھ کے مشہور بزرگ حضرت مخدوم نوح ہالائی کی درگاہ میں میر بجار نے اس کی فرمانروائی کی دستار باندھی۔

میاں عبدالنبی کے فرمانروا ہونے کے بعد میر بجار نے ملک کے انتظامات کو خود سنبھال لیا، ملک کے نظم و نسق کو نئے سرے سے درست کیا، رعایا کی پریشانی کو دور کیا، ملک میں ہر طرف مسرت اور شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔[2]

اللہ بخش جھنجن کی حاضری اور قید:

حالات سے مجبور ہو کر اللہ بخش جھنجن بھی میاں عبدالنبی کے سلام کے لیے دربار میں آیا۔ میاں عبدالنبی کو اپنے بھائی کی شہادت کا واقعہ یاد آ گیا اور اس نے نہایت برہم ہو کر اس سے کہا کہ او بدبخت تو میرے بھائی کو اس عالم میں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا، تجھ پر جان کا خوف اس قدر غالب ہوا کہ تو نے اپنے آقا کو بھی بھلا دیا، اگر لیکھی اس ظلم پر اُتر آیا تھا تو تجھے کیا ہوا تھا کہ تو نے غفلت برتی، تجھے لیکھی کا اتنا پاس کیوں تھا؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اس نے جو کچھ تجھے دیا وہ ہمارا ہی مال تھا، تو نے ہمارے حق نمک کا بھی پاس نہ کیا، پھر اُس نے حکم دیا کہ اسے قید میں

---

(1) فتح نامہ - عظیم ٹھٹھوی، ص ۴۹۔

(2) فتح نامہ - عظیم ٹھٹھوی، ص ۵۰۔

ڈال دیا جائے چنانچہ وہ قید کر دیا گیا۔[1]

لیکھی کی گرفتاری اور رہائی:

فتح نامہ میں ہے کہ اسی عرصے میں میر بجار کی فوج کے ہاتھ راجا لیکھی اور اس کے بیوی بچے پڑ گئے، جب انہیں میاں عبدالنبی کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اس کے اپنے بھائی پر مظالم یاد کر کے ان کے قتل کرنے کا حکم دیا، مگر میر بجار نے ان دشمنوں پر رحم کھا کر میاں عبدالنبی سے ان کی جاں بخشی اور رہائی کی سفارش کی۔ اس کی بنا پر یہ سب رہا کر دیے گئے۔[2]

عزت یار خاں کی ہنگامہ آرائی:

میر بجار اس فکر میں تھا کہ ملک کے نظم و نسق کو بہتر بنا کر عوام میں امن اور خوشحالی کو بحال کرے اور ملک کو بام ترقی پر پہنچائے کہ اچانک ایک نیا فتنہ اُٹھا، جس نے اس کی کوششوں کو برباد کر کے رکھ دیا۔

ہوا یہ کہ احمد یار خاں کا بیٹا عزت یار خاں دربار افغانستان ہی میں تھا۔ اسی زمانے میں دربار افغانستان میں سندھ میں افراتفری، بدامنی اور کئی سال سے خراج کے وصول نہ ہونے کی شکایات پیش ہوئیں۔ تیمور شاہ یہ شکایات سن کر نہایت برہم ہوا، اس نے عزت یار خاں کو بلوایا جو ایک طویل عرصے سے وہاں مقیم تھا، وہ اسی وقت حاضر ہوا، تیمور شاہ نے اس سے نہایت لطف و مہربانی سے پیش آتے ہوئے کہا کہ تم ایک مدت سے سندھ کی حکومت کے امیدوار تھے، اب میں تمہیں سندھ کی حکومت دیتا ہوں یہ کہہ کر اس کے نام سندھ کی حکومت کا پروانہ لکھوایا، اور ایک ہاتھی اور خلعت سے نواز کر درانیوں اور بابریوں کا دس ہزار کا لشکر اور ایک ہزار ترکی سوار اس کے ساتھ کیے، اور محفوظ خاں وکیل کو اس کے ساتھ کیا۔ قمر الدین نائب ڈیرہ جات کو لکھا کہ وہ خزانے سے ان کی تنخواہ ادا کرے اور ڈیرہ جات سے افغانوں اور بلوچوں کا لشکر اس کمک کے لیے تیار کرے، ملتان اور شکارپور کے حاکموں، میر نصیر الدین خاں والی قلات اور داؤد پوتروں کو ہدایت بھیجی کہ وہ بھی عزت یار خاں کی امداد و اعانت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں۔ ادھر کھوسوں کا بھی ایک لشکر اس کی مدد کے لیے پہنچا۔[3]

عزت یار خاں کا خط:

جب عزت یار خاں کے پاس ادھر اُدھر سے تیس ہزار لشکر جمع ہو گیا تو عزت یار خاں نے ایک خط میر بجار کے نام لکھا کہ عبدالنبی معزول کیا جا چکا ہے۔ اب میں سندھ کا ناظم ہوں، اگر تم میری اطاعت کرو گے اور صدقِ نیت سے مجھے سلام کرو گے تو میں ملک کا تمام کاروبار تمہارے حوالے کر دوں گا اور تمہیں اپنا مدار المہام بناؤں گا، میں بھی تو اس خاندان کا غیر نہیں ہوں، میرا دادا بھی تو خدایار خاں ہے، اگر تمہارا ارادہ جنگ کا ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ قتل و خوں ریزی سے کوئی فائدہ نہیں۔[4]

میر بجار کا جواب:

میر بجار نے اسے جواب میں لکھا کہ: آپ نے اپنے مکتوب سے میری عزت افزائی کی ہے، چونکہ عبدالنبی آپ کا چچا ہے، ان سے آپ کا جنگ کرنا اپنے باپ سے جنگ کرنا ہے، جہاں تک میرا تعلق ہے تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ میرے قدیم ولی نعمت ہیں اور میں ان کی وفاداری میں ثابت قدم ہوں، میرے دل میں صدق و خلوص سے ان کی جگہ ہے، میں ان کے قدموں پر اپنا سر نثار کر دینا اپنے لیے باعث فخر سمجھتا ہوں۔

اس کے بعد میر بجار اٹھارہ ہزار فوج لے کر روہڑی پہنچا۔ وہاں دو سو کشتیاں پہلے ہی سے تیار تھیں، دو ایک روز میں دریا پر پُل تیار ہو گیا اور میر بجار کا لشکر دریا کو عبور کر کے شکارپور پہنچ گیا۔[5]

لکھی اور شکارپور کے درمیان دونوں لشکروں میں خوں ریز جنگ ہوئی، جس میں عزت یار خاں کی فوج کے بہت سے آدمی مارے گئے، جو باقی بچے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، عزت یار خاں بھی محفوظ خاں کے ساتھ جان بچانے کے لیے فرار ہو گیا، اس کا سارا ساز و سامان ہاتھی، خیمہ خاص، مسند، پالکی، نالکی بلوچوں کے ہاتھ آئی۔[6]

شکارپور کا محاصرہ:

میدانِ جنگ سے بھاگ کر افغان لشکر کا کچھ حصہ شکارپور کے قلعے میں قلعہ بند ہو گیا اور جنگ کی تیاری کرنے لگا۔ میر بجار کو معلوم ہوا تو اس نے شہر کا محاصرہ کر لیا، جب محصور افغان عاجز ہو گئے تو انہوں نے قلعے کا

---

(1) فتح نامہ - عظیم، ص ۵۱۔
(2) ایضاً - ص ۴۹-۵۰۔
(3) فتح نامہ - عظیم، ص ۵۳-۵۴۔
(4) ایضاً - ص ۵۴۔
(5) فتح نامہ - عظیم، ص ۵۴۔
(6) ایضاً - ص ۵۵۔

دروازہ کھول دیا، میر بجار نے لشکر میں منادی کرادی کہ اگر میرے کسی لشکری نے زبردستی دودھ کا ایک گھونٹ بھی کسی کا پیا تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ کیونکہ یہ شہر بادشاہ کا ہے اور ہم اُس کے غلام ہیں، دوسرے دن صبح کو اس نے قیدیوں میں سے سرداروں کو یکے بعد دیگرے میاں عبدالنبی کے سامنے پیش کیا اور ہر ایک کو حسب حیثیت خلعت، انعام اور گھوڑے اور خرچ راہ دے کر رخصت کیا۔[1]

اس جنگ کی تاریخ "آخرش اماں" سے نکالی گئی۔[2]

۱۱۹۳ھ

تیمور شاہ کا حملہ:

تیمور شاہ کو جب اپنے لشکر کی شکست کی خبر معلوم ہوئی اور حسد پرور لوگوں نے نمک مرچ لگا کر شکست کی خبروں کو بیان کیا اور کہا کہ ملک کا نظم درہم برہم ہو گیا ہے، سندھ کے بلوچوں نے آداب شاہی کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور اپنے حدود سے متجاوز ہو چکے ہیں۔ اب بجار کی جرأت حد سے بڑھ چکی ہے، اس واقعہ کی شہرت ایران و ہندوستان میں ہو گی، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ بہ نفس نفیس بادشاہ کو اس کا تدارک کرنا چاہیے، اگر سندھیوں کو اس کی سزا نہ دی گئی تو دوسرے علاقوں کے حاکموں کی جرأت بڑھ جائے گی۔ ضرورت ہے کہ سندھیوں کو ایسی عبرت ناک سزا دی جائے کہ پھر کسی کو ایسی جرأت نہ ہو۔ تیمور شاہ یہ باتیں سن کر نہایت برہم ہوا، اس نے اپنے اراکین دولت کو طلب کیا اور حکم دیا کہ فوراً جنگ کی تیاری کی جائے، چنانچہ تیمور شاہ ایک کثیر لشکر لے کر سندھ کی طرف روانہ ہوا، محفوظ خاں، میر بجار کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر اس کا خیر خواہ بن چکا تھا، اس نے میاں عبدالنبی کو خبر دی کہ بادشاہ ایک عظیم لشکر کے ساتھ سندھ کی طرف روانہ ہو چکا ہے، میں نے حالات کو درست کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن میری کچھ نہیں چلی۔ اب آپ اس سخت ترین مشکل کو حل کرنے کے لیے کوئی تدبیر سوچیے۔ مزاج شاہی اس قدر برہم ہے کہ اس کی برہمی کو جس قدر بیان کیا جائے کم ہے۔ میرا خیال ہے کہ خراج کے ادا کرنے سے بھی یہ برہمی کم نہ ہو گی۔ بہر حال اس ابتلا کے ٹالنے کی جو صورت بھی ممکن ہو کیجیے۔[3]

میر بجار کا ردِ عمل:

میر بجار کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ میاں عبدالنبی کو ساتھ لے کر بلوچوں کے ایک لشکر کے ساتھ فوراً روہڑی روانہ ہو گیا، روہڑی پہنچ کر اُس نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ دریا پر کشتیوں کا پُل تیار کیا جائے۔ پھر چند منزل آگے بڑھ کر تیمور شاہ کی خدمت میں عریضہ بھیجا، اس میں لکھا کہ بعض خود غرضوں نے بارگاہ سلطانی میں نہایت غلط باور کرایا ہے اگر میری خوش نصیبی سے مجھے آپ اپنے حضور میں حاضری کی اجازت دیں تو میں آپ کی بارگاہ میں ان خود غرضوں کے جھوٹ کا پول کھول دوں گا۔ میری بڑی تمنا ہے کہ آپ میری یہ گزارش قبول فرمائیں اور مجھے حاضری کا موقع عطا فرمائیں۔[4]

میر بجار کا یہ معروضہ تیمور شاہ کو اس وقت ملا، جب وہ شکارپور سے دو منزل کے فاصلے پر تھا۔ میر کے اس خط نے تیمور شاہ کی آتش غضب پر پانی کا کام کیا، جب اُسے یہ خبر بھی ملی کہ میر نے اس کے لیے دریا پر کشتیوں کا پُل بھی بنایا ہے، تاکہ اسے دریا کے عبور کرنے میں زحمت نہ ہو، تو اُسے یقین ہو گیا کہ میر کے متعلق جس قدر شکایتیں پیش کی گئی ہیں، وہ سب جھوٹی ہیں، اس وقت میر کے ساتھ بلوچوں کی تیس ہزار فوج تھی، اُس نے خود بھی تیمور شاہ کے پاس حاضر ہو کر معذرت اور صفائی پیش کی، اور کہا، افغانی فوج نے مجھے مجبور کر دیا، ورنہ میں ہرگز جنگ نہ کرتا۔ میرا خلوص نیت میرے اس طرز عمل سے ظاہر ہے کہ جو برتاؤ میں نے شاہی افواج کے امیروں کے ساتھ کیا، اس کی شہادت وہ خود دیں گے۔ تیمور شاہ میر بجار کی اس معذرت اور صفائی پیش کرنے سے بالکل مطمئن ہو گیا اور اس نے اُن فتنہ پردازوں سے جنہوں نے میر کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کی تھیں کہا کہ میر اپنی باتوں میں بالکل سچا ہے، اگر اس کی نیت خراب ہوتی تو وہ شاہی لشکر کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیوں کرتا۔[5]

ادھر محفوظ خاں نے جب یہ دیکھا کہ بادشاہ کا کچھ رنگ بدلا ہے، تو چند سادات اور قرآن مجید کو لے کر حاضر ہوا، جنہوں نے تیمور شاہ سے عرض کیا کہ آل نبی اور قرآن مجید کا واسطہ دے کر ہم گزارش کرتے ہیں کہ حضور یہاں سے واپس ہو جائیں۔[6]

---

(1) فتح نامہ عظیم۔ ص ۵۶۔
(2) تکملہ مقالات الشعرا۔
(3) فتح نامہ۔ عظیم ٹھٹھوی، ص ۵۸۔
(4) فتح نامہ۔ عظیم ٹھٹھوی، ص ۵۸-۵۹۔
(5) فتح نامہ۔ عظیم ٹھٹھوی، ص ۵۹۔
(6) فتح نامہ عظیم ٹھٹھوی۔ ص ۵۹۔

تیمور شاہ کی واپسی:

ان تمام باتوں سے تیمور شاہ بالکل مطمئن ہو گیا اور میاں عبدالنبی کو سند حکومت عطا کی۔ فریر نامہ میں ہے کہ پھر تیمور شاہ نے حکم دیا کہ اس فوج کشی میں جو اخراجات ہوئے ہیں وہ میر بجار اور عبدالنبی ادا کریں، میاں عبدالنبی اور میر بجار خدا سے چاہتے تھے کہ جنگ نہ ہو، انہوں نے اس کو منظور کر لیا۔[2]

فتح نامہ عظیم میں تاوان جنگ کا ذکر نہیں بلکہ صرف اس قدر ہے کہ میاں عبدالنبی و میر بجار کی تسکین کے لیے تیمور شاہ نے لکھا ہے کہ ہم ان کی تقصیرات معاف کرتے ہیں، اب جلد یہ خراج کا روپیہ بھیجیں تاکہ فوج کی تنخواہیں ادا ہوں اور اس ادائیگی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہو گا کہ ان کے حاسد و کینہ پرور نادم اور شرمندہ ہو جائیں گے۔

اس کے بعد تیمور شاہ لوٹ گیا اور میر بجار بھی اپنے مرکز کو واپس چلا آیا۔

خلعت و خطاب:

مولانا غلام رسول مہر مؤلف تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ اس موقع پر تیمور شاہ نے میاں عبدالنبی کو معتمد الدولہ شاہ نواز خاں فیروز جنگ کا خطاب دیا، اور خطاب کے ساتھ ایک ہاتھی بھی دیا، جس کی جھول زریں تھی اور عراقی گھوڑے عطا کیے جن کی تاریخ "خلعت با امن" سے نکلتی ہے۔

۱۱۹۴ھ

میر بجار کی شہادت:

میر بجار جس قدر اپنے ملک کی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہا تھا، اُسی قدر ملک میں نئی پیچیدگیاں پیدا ہوتی جاتی تھیں، یہاں تک کہ میر بجار کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔

میر بجار کے واقعۂ شہادت کی تفصیل میں سخت اختلاف ہے بعض اس قتل کا ذمہ دار میاں عبدالنبی کو بتاتے ہیں، ان میں سے بعضوں کا خیال ہے کہ میاں عبدالنبی نے میر بجار کو اس لیے قتل کرایا تھا کہ وہ میر بجار کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھتا تھا کہ اس کو راہ سے ہٹائے بغیر اُس کے لیے خود مختار حکومت کا موقع پیدا نہیں ہو سکتا۔

بعضوں کا خیال ہے کہ عبدالنبی نے میر بہرام کی بیٹی کا رشتہ مانگا تھا، میر بجار کی طرف سے انکار ہوا تو اُسے قتل کرا دیا۔

بعض کہتے ہیں کہ میر بجار نے راجا بجے سنگھ والئی جودھپور کی لڑکی کا رشتہ مانگا تھا، اس پر وہ سخت طیش میں آیا اور میر بجار کی جان کا دشمن ہو گیا۔

بعضوں کا خیال ہے کہ جودھپور کی سرحد کے قریب میر نے ایک قلعہ بنوایا تھا، جس کی بنا پر راجا کو خیال پیدا ہوا کہ اگر ٹالپروں کی فوجیں اس قلعہ میں رہیں گی تو اس کا ملک خطرے میں پڑ جائے گا، اس لیے اُس نے میر کو قتل کرا دیا۔

جواہر عباسیہ میں ہے کہ میاں عبدالنبی کی والدہ نے شیخ محفوظ اس کے بیٹے شیخ قمر الدین، منشی بالک رام اور آدھا اور بودھا دربانوں کو میر کے قتل کے مشورے میں شریک کیا۔ جب قتل کی سازش مکمل ہو گئی، تو پھر میر کے خلاف تیمور شاہ کے پاس مختلف قسم کی شکایتیں لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ مہاراجا جودھپور سے مدد طلب کی کہ وہ اس سازش کو کامیاب بنانے میں ان کی مدد کرے، چنانچہ مہاراجا جودھپور نے میر کو قتل کرنے کا پکا ارادہ کر لیا، اس نے اپنے دو راٹھوروں کو اس غرض کے لیے آمادہ کیا اور ان سے اس قتل پر مختلف نوازشوں اور عطا کے وعدے کیے گئے۔ انہیں کہا گیا کہ اگر وہ میر بجار کو قتل کر دیں گے تو انہیں ناگور میں تیس ہزار کی جاگیر دی جائے گی۔ چلتے وقت انہیں دوشالے، موتیوں کے گوشوارے اور خلعت وغیرہ عطا کیے۔

میر نصیر خاں والئی قلات نے وعدہ کیا کہ اگر بلوچوں نے ذرا بھی سر اٹھایا، تو وہ ان کا قلع قمع کر دے گا۔[3]

فتح نامہ میں ہے کہ راجا جودھپور نے دو راٹھوروں کو اپنا وکیل بنا کر میر بجار کے پاس بھیجا۔ یہ دونوں میاں عبدالنبی اور میر بجار سے علیحدہ علیحدہ ملے۔ انہوں نے ایک دن میر بجار سے کہا کہ ہمارے پاس مہاراجا جودھپور کا ایک خط آیا ہے، جس کا مضمون آپ کو تنہائی میں سنایا جا سکتا ہے۔ میاں عبدالنبی نے مہاراجا کو کئی خط لکھے ہیں، جن میں آپ کی شکایتیں لکھی ہیں۔ چونکہ یہ مکتوب ہندی میں ہے، اس لے اس کے مضمون و مطالب کو یہاں کوئی نہیں سمجھ سکتا، اگر آپ تنہائی کا کوئی موقع دیں تو ہم یہ خط آپ کو پڑھ کر سنائیں، میر بجار نے ان کی یہ بات مان لی، اس نے اپنی

---

(1) تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد دوم، ص ۷۸۴، بحوالہ فریر نامہ، ص ۴۔

(2) میر بجار کے قتل کے متعلق یہ تمام تفصیلات تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد دوم، ص ۹۶-۷۹۳ بحوالہ جواہر عباسیہ ماخوذ ہیں۔

مجلس سے سب کو رخصت کر دیا، صرف ایسر نامی ایک لڑکا باقی رہ گیا، جو ان دو کافروں کی طرف سے یہ پیام لے کر آیا تھا۔ جب بالکل خلوت ہو گئی تو میر نے ان دونوں راٹھوروں کو بلایا، یہ دونوں اپنے ساتھ دو اور آدمیوں کو لے کر آئے، دونوں بیٹھ گئے اور دو خط لے کر اس کے سامنے کھڑے ہوئے اور دونوں نے خنجر اس کے پہلو میں بھونک دیا، میر بجار نے اس حالت میں بھی اپنی تلوار کے وار سے ان چاروں کو جہنم رسید کر دیا۔[1] میر بجار نے ان زخموں کی تاب نہ لا کر شہادت پائی اور سندھ اپنے ایک بڑے خیر خواہ، مدبر، شجیع اور حق شناس سے محروم ہو گیا، یہی قتل خاندان کلہوڑہ کی حکومت کے آفتاب کے غروب ہونے کا سبب بنا۔

منشی بال چند نے ان دو مصرعوں میں میر کی تاریخ شہادت نکالی ہے:

۱۔ بمحفل شہدا جلوہ کرد میر بجار

۱۱۹۳ھ

۲۔ میر شد با جمہر ہندو شہید

۱۱۹۳ھ

میر عظیم الدین ٹھٹھوی کے اس مصرعے سے میر کی شہادت کی تاریخ نکلتی ہے۔

شہید ابن شہید ولی امیر بجار

۱۱۹۳ھ

میر عبداللہ:

میر بجار کا بیٹا میر عبداللہ اپنے باپ کی شہادت کے وقت موجود نہ تھا۔ میر فتح خاں نے میر بجار کی تجہیز و تکفین کا سامان کیا۔ میر کی شہادت سے سارے شہر میں کہرام مچا ہوا تھا، ہر ایک اس شجیع، بہادر اور نیک خصلت انسان پر گریاں کناں تھا، باپ کی شہادت کی خبر سن کر میر عبداللہ واپس آیا۔ میر عبداللہ اپنے باپ کی طرح ہوشمند اور اخلاق و عادات میں اپنے باپ کے نقش قدم پر تھا اور اس میں باپ کی ساری خوبیاں جمع ہو گئی تھیں، اس کے آتے ہی تمام بلوچوں نے اسے اپنا سردار تسلیم کر لیا۔

عام طور پر یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ میاں عبدالنبی کے اشارے سے میر بجار کو شہید کیا گیا ہے اور اب اس نے کھوسوں اور لیکھیوں کو خطوط لکھے ہیں کہ وہ ٹالپروں کے مقابلے میں اس کی مدد کریں۔

لیکن نیک دل میر عبداللہ نے اس خبر کو غیر معتبر سمجھا، اس کو یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ اس کے باپ نے میاں عبدالنبی کا کیا بگاڑا تھا جو اس نے اسے قتل کرایا، اس نے اس خبر کے بیان کرنے والوں سے کہا کہ میں اپنے آقا کے متعلق یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ وہ ہمارے خاندان کی جاں نثاریوں کے باوجود ہمارا دشمن ہو گا۔[2]

میاں عبدالنبی کا فرار:

ادھر میاں عبدالنبی کو جب یہ خبر ملی کہ میر عبداللہ واپس آ گیا ہے، تو چونکہ اس کے دل میں چور تھا اس لیے اس نے جان کے خوف سے عافیت اسی میں دیکھی کہ وہ سندھ سے فرار ہو جائے، وہ اپنے خاندان اور خوب مال و زر لے کر قبیلہ جھنجن کے دو سو آدمیوں اور قبیلہ جھنجن اور جتوئی کو جنہیں وہ اپنا خیر خواہ سمجھتا تھا، ساتھ لے کر راتوں رات دریا کو عبور کر کے قلات روانہ ہو گیا اور اپنے بیٹوں محمد عارف اور تاج محمد اور بھتیجے شاہ محمد کو چند مصاحبین کے ساتھ جودھپور بھیج دیا۔[3]

میر عبداللہ پر فراری کا ردِ عمل:

میر عبداللہ جو میاں عبدالنبی سے نہایت حسن ظن رکھتا تھا، وہ میاں عبدالنبی کی فراری کی خبر سن کر حیران رہ گیا، اس نے پھر بھی حسن ظن کو نہ بدلا اور اپنے دو آدمیوں کو قرآن مجید دے کر میاں عبدالنبی کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان یہ قرآن ہے، مجھے آپ سے کسی قسم کی بدگمانی نہیں، مگر آپ کے مشیروں میں چند لوگ ایسے ہیں کہ جو فتنوں میں بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں، بظاہر وہ آپ کے دوست ہیں، لیکن حقیقت میں آپ کے دشمن ہیں، اگر آپ ان کے مشورے پر عمل کریں گے تو یہ آپ کو دربدر کر دیں گے، آپ اپنے ملک میں واپس آیئے اور اپنی حکومت سنبھالیے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ ملکوں ملکوں ڈھونڈیں گے تو ہم جیسے جاں نثار آپ کو کہیں نہ ملیں گے۔

میاں عبدالنبی اس مخلصانہ پیغام کے بعد واپس آنے کے لیے تیار تھا، مگر اس کے خود غرض مشیروں نے اسے واپس آنے نہ دیا، میر عبداللہ کے قاصد ناکام واپس لوٹ آئے۔

---

(1) فتح نامہ۔ عظیم، ص ۶۴-۶۳۔

(2) یہ تمام تفصیل فتح نامہ عظیم، ص ۶۷-۶۶ سے ماخوذ ہے۔

(3) فتح نامہ۔ عظیم، ص ۶۷۔

قاصدوں کے ناکام واپس لوٹنے پر میر عبداللہ نے افسوس کے ساتھ کہا کہ اس شخص نے اپنے خاندان میں کس قدر خرابی پیدا کی ہے، نہ خود مسند حکومت پر رہا اور نہ اس نے کسی کو جو اس کے خاندان میں حکومت کے اہل تھے زندہ چھوڑا، اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ اسی خاندان کے کسی فرد کو مسندِ حکومت پر بٹھانے کے لیے تلاش کیا جائے کسی نے کہا کہ اس خاندان کا ایک فرد صادق علی خاں عباسی ہے،[1] جو فلاں جگہ مقیم ہے اور بہت نیک اور خدا پرست انسان ہے، اسے مسند حکومت پر بٹھانا چاہیے، میر عبداللہ نے اس انتخاب سے اتفاق کر لیا اور اس کو بلانے کے لیے آدمی بھیجے۔[2]

صادق علی خاں

چند روز کے بعد صادق علی خاں دریا کے راستے سے گھاٹ پر پہنچا، تو میر عبداللہ نے گھاٹ پر پہنچ کر اس کا استقبال کیا، پھر اسے شہر میں شان و شوکت سے لایا اور مسند حکومت پر بٹھایا۔[3]

عبدالمجید جو کھیہ نے اپنی تاریخ کلہوڑہ و استقرار حکومت ٹالپران میں لکھا ہے کہ ٹالپر ڈیرہ شاہ پور میں جو ہالہ کنڈی کے قریب ہے ٹھہرہ گئے، اسی مقام پر کلہوڑوں کی رسم مسند نشینی ادا ہوتی تھی، اور میاں صادق علی خاں کو مسند نشین کیا، اور داد و ستد کے تمام امور اس کے سپرد کیے۔[4]

فتح نامہ میں ہے کہ میاں صادق علی جب مسند نشین ہوا تو وہ فقر اور تجرید کی طرف مائل تھا، چونکہ فقر و قناعت اس کا شعار تھا، اس لیے وہ دنیاوی امور پر کوئی نظر نہیں رکھتا تھا اور تمام مہماتِ امور کا مدار میر عبداللہ پر تھا اور وہی حکومت کے نظم و نسق کو چلاتا تھا۔[5]

---

(1) حواشی تاریخ سندھ میں بحوالہ حکیم محمد عباسی، میاں صادق علی کا نسب نامہ اس طرح منقول ہے، صادق علی بن میاں اللہ بخش بن میاں محمد شفیع بن میاں محمد اسلام خاں بن یار محمد خاں، لیکن مولانا مہر کا خیال ہے کہ اسلام خاں یار محمد کا بیٹا نہیں بلکہ بھتیجا تھا۔ تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد ۲، حاشیہ نمبر ۱)

(2) فتح نامہ - عظیم، ص ۶۸۔

(3) فتح نامہ - عظیم، ص ۶۸۔

(4) تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد ۲، ص ۸۱۵ بحوالہ تاریخ عبدالمجید جو کھیہ، ص ۵۰ مملوکہ ڈاکٹر غلام نبی بخش خان بلوچ۔

(5) فتح نامہ - عظیم، ص ۶۹۔

مہاراجا جودھپور اور بروہیوں کی یورش:

اسی زمانے میں خبر ملی کہ مہاراجا بجے سنگھ والیٔ جودھپور ایک کثیر فوج لے کر سندھ پر حملے کے ارادے سے آرہا ہے۔ دوسری طرف سے خبر آئی کہ میاں عبدالنبی محمد نصیر والیٔ قلات سے ایک بڑی فوج لے کر سندھ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے نہمردیوں کے قبیلے کو مال و زر کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ لیکن میر عبداللہ ان دونوں خبروں کو سن کر بالکل نہیں گھبرایا۔ اس نے اپنے مشیروں میر فتح علی، فتح خاں، میر سہراب اور سلطان جنگ[6] کو بلایا اور کہا کہ جنگ نے ہمیں دو طرف سے گھیر لیا ہے، اب تمہارا کیا مشورہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارا مشورہ وہی ہے جو آپ کا ہے، ہمارا سر آپ کے قدموں پر نثار ہے۔ میر نے کہا میرا خیال ہے کہ پہلے ہمیں کفار سے نمٹنا چاہیے، پھر ہمیں دشمن کی فکر کرنی چاہیے۔ ہم آج اور کل تیاری کریں گے اور پرسوں صبح روانہ ہو جائیں گے، انشاء اللہ فتح ہماری ہو گی۔[7]

جودھپور والوں سے جنگ:

تیسرے دن صبح کو میر عبداللہ ایک کثیر فوج کو اور صادق علی کو ہمراہ لے کر جودھپور والوں کے مقابلے کے لیے نکلا۔ ایک بے آب و گیاہ صحرا سے گزر کر انہیں ایک ٹیلا نظر آیا، جس پر جودھپور کے لشکر کے سو راٹھور سردار بیٹھے ہوئے تھے۔ اس ٹیلے کے نیچے جودھپوریوں کی بیشمار فوج جمع تھی۔ اس فوج کا سپہ سالار بجے سنگھ والیٔ جودھپور کا بیٹا اور اس کا داماد تھا۔ جودھپوری فوج نے جب سندھی فوج کو آتے دیکھا تو انہوں نے اپنی کثرت کی وجہ سے مطلقاً سندھی فوج کی پروا نہیں کی۔ میر عبداللہ نے وہاں پہنچتے ہی جنگ کی تیاری شروع کی اور اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا، خود قلب میں رہا اور میاں صادق علی کو بھی اپنے ساتھ رکھا، میمنے اور میسرے پر میر فتح علی خاں اور میر سہراب کو مقرر کیا، میر فتح خاں، میرزا فقیر اور اس کے بیٹے باغہ فقیر کو سب سے آگے رکھا۔ یہ سندھی فوج زیادہ تر نظامانیوں، لغاریوں اور جمالیوں پر مشتمل تھی۔

میر فتح علی خاں نے میسرے سے ایسا شدید حملہ کیا کہ اسکے مقابل میں جو راٹھور تھے بھاگ کھڑے ہوئے، پھر ہر طرف سے سندھی فوج نے ایسے شدید حملے کیے کہ تھوڑی ہی دیر میں جودھپوری فوج جنس،

---

(6) سلطان جنگ میرزا فقیر کا لقب تھا۔

(7) فتح نامہ - عظیم، ص ۶۹-۷۰۔

خیمے، توپیں، مال وزر، اونٹ اور ہاتھی وغیرہ چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی، یہ سارا مال غنیمت سندھی فوج کے ہاتھ آیا، اس فتح نے سندھی فوج کے حوصلوں کو بلند کر دیا، تمام سندھ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔[1]

بروہیوں کا حملہ:

جودھپور والوں کی اس لائی ہوئی مصیبت سے میر عبداللہ کو ابھی نجات حاصل ہوئی ہی تھی کہ ایک شتر سوار میر عبداللہ کے پاس غلام علی کا خط لے کر پہنچا کہ میاں عبدالنبی محمد نصیر والیٔ قلات سے ایک کثیر فوج لے کر آرہا ہے، اور اس کے ساتھ محمد نصیر کا داماد رزق نامی بھی ہے۔ جھنجن، کھوسہ، نہمردی قبیلے کا ایک جم غفیر اس کے ساتھ ہے، اور انہوں نے لاڑکانہ کو عبور کر لیا ہے۔ یہ خبر سن کر میر عبداللہ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ کمریں نہ کھولیں، بلکہ دوسری جنگ کے لیے تیار ہو جائیں، چنانچہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگ کے لیے روانہ ہو گیا۔[2]

پُل چالک کے قریب جنگ:

میر عبداللہ، میاں صادق علی کو لے کر اپنی فوج کے ساتھ پُل چالک کے قریب پہنچا، یہیں اس کا دشمنوں سے مقابلہ ہوا، میر عبداللہ نے دیکھا کہ میاں عبدالنبی نے اپنی فوج کو تین دستوں میں تقسیم کیا ہے، ایک خود اس کا خاص دستہ ہے، جو جتوئی اور کھوسہ قبائل کے افراد پر مشتمل ہے، دوسرا دستہ قلاتی فوجیوں کا ہے، جس کا سردار زرق نامی ہے، تیسرا دستہ نہمردیوں کا ہے۔ میر عبداللہ نے یہ دیکھ کر اپنے لشکر کو بھی تین دستوں میں ترتیب دیا۔ اس نے ایک دستہ مرتب کر کے اس کا سرگروہ مرزا فقیر، باغہ فقیر اور صادق علی کو مقرر کیا اور حکم دیا کہ وہ میاں عبدالنبی کے دستے کا مقابلہ کریں۔ دوسرا دستہ جو نظامانیوں پر مشتمل تھا، اس کا سردار فتح خاں کو بنا کر اُسے حکم دیا کہ وہ نہمردیوں کے دستے کا مقابلہ کریں اور خود اپنے ہمراہیوں کے ساتھ بروہیوں کے مقابل ہوا۔ میمنہ پر میر فتح علی کو اور میسرے پر میر سہراب کو متعین کیا۔ اس طرح فوجوں کی ترتیب کے بعد دونوں لشکروں میں خوں ریز جنگ شروع ہوئی، میر کی فوجوں نے اس شجاعت کے ساتھ جنگ لڑی کہ وہ قلب دشمن میں پہنچ گئے۔ زرق اور اس کے اہم ساتھی مارے گئے، اسی طرح دشمن کی فوج کا ایک اہم سردار محراب نامی تہہ تیغ ہوا، ان کے علاوہ اس جنگ میں دشمن کے اور بہت سے اہم سردار کام آئے، یہاں تک کہ میاں عبدالنبی کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ اپنا سارا ساز و سامان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس فتح نے میر عبداللہ کی شہرت کو اور بھی چار چاند لگا دیے۔[3]

میر عبداللہ کی ملک کے حالات کو بہتر بنانے کی سعی:

میر عبداللہ نے ان جنگوں سے فرصت پا کر ملک کی خوشحالی کی توجہ کی۔ میر عبداللہ نے سارے ملک سے دو محصول معاف کر دیے جو خدا یار خاں کے عہد سے چلے آتے تھے، ایک پیش کش اور دوسرا سرشماری، یہ دونوں محصول عوام کے لیے سخت تکلیف کے باعث تھے۔ ان محصولوں کے وصول کرنے میں بہت سی رعایا ضائع ہو جاتی تھی۔ جیسے ہی یہ محصول معاف ہوئے تو لوگوں نے ان کی معافی پر عید کی طرح خوشی منائی۔[4]

میاں عبدالنبی کی فتنہ پردازیاں:

ادھر میر عبداللہ اس فکر میں لگا ہوا تھا کہ ملک میں خوشحالی، امن واطمینان بحال ہو، ادھر میاں عبدالنبی نئی نئی فتنہ پردازیوں میں مشغول تھا۔ وہ جنگ چالک سے فرار ہو کر سیدھا قلات پہنچا۔ محمد نصیر خاں والیٔ قلات نے اس کے شکست کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے تعلقۂ حاجی پور کی نصف مالگزاری مقرر کر دی، یہ اپنے بال بچوں اور اپنی والدہ کو لے کر حاجی پور میں مقیم ہو گیا، یہاں سے وہ تیمور شاہ کے دربار میں پہنچا، اور اپنے حالات سنا کر مدد کا طالب ہوا۔[5]

جب قلات واپس پہنچا تو اسے معتبر ذرائع سے یہ خبر معلوم ہوئی کہ دربار افغانستان کا ایک سردار مدد خاں نامی کثیر شاہی فوج لے کر محمد بہاول کے ملک میں آیا ہے، اور محمد بہاول اپنی جان کے خوف سے فرار ہو چکا ہے۔ اس نے یہ خبر سن کر اپنے چند معتبر آدمی مدد خاں کے پاس تحفے تحائف دے کر اور روپے دینے کا وعدہ کر کے روانہ کیے اور ان کے ذریعہ کہلایا کہ بلوچوں نے مجھ پر بے حد مظالم کیے ہیں، یہاں تک کہ مجھے اپنے ملک سے نکال دیا ہے۔ اگر آپ میری مدد کریں تو میری کاربراری ہو سکتی ہے۔ اس طرح شاہی لشکر میں محفوظ خاں کے پاس بھی قاصد

---

(1) یہ تمام تفصیل فتح نامہ عظیم، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۷۲-۷۳ سے ماخوذ ہے۔
(2) فتح نامہ عظیم، ص ۷۳۔
(3) فتح نامہ - عظیم ٹھٹھوی، ص ۷۴ تا ۷۶۔
(4) فتح نامہ - عظیم، ص ۷۷۔
(5) تاریخ سندھ (کلہوڑہ) جلد ۲، بحوالہ جوہر عباسیہ۔

بھیجے، چنانچہ اُس کی مدد کے لیے دربار شاہی سے بہت سی مدد، مدد خاں اور محمد نصیر کے نام پہنچی اور محمد نصیر کو حکم دیا گیا کہ سردار مدد خاں اسحاق زئی کو میاں عبدالنبی کی امداد کے لیے متعین کیا گیا ہے، وہ لشکر لے کر آئے گا، لہٰذا تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ بروہیوں اور بلوچوں کا لشکر مدد خاں کی امداد کے لیے روانہ کرو۔ اُس زمانے میں نصیر خاں بیمار تھا، اس نے اخوند ملا فتح محمد خاں اور بروہی اور بلوچ سرداروں کو اس غرض سے روانہ کیا کہ وہ مدد خاں کے ساتھ رہ کر اس کی اعانت کریں۔ مختصر یہ کہ عبدالنبی بروہیوں اور نہمردیوں کا لشکر لے کر مدد خاں کے پاس آیا، مدد خاں نے سب سے پہلے اُس سے مطالبہ کیا کہ وہ فوج کا سفر خرچ فوراً ادا کرے، اس کے علاوہ اس رقم کا نصف ادا کرے جس کا اس نے وعدہ کیا ہے۔ مدد خاں کے رقم وصول کنندہ ہر وقت اسے تنگ کرتے رہتے تھے، یہاں تک کہ اس نے عاجز آکر کہا کہ میرا خزانہ میرے قلعے میں مدفون ہے، جب ہم اس قلعے پر قبضہ کرلیں گے تو میں موعودہ رقم پائی پائی ادا کروں گا، اُس وقت تک لوٹ مار سے اپنی ضرورتیں پوری کرتے رہو۔ مدد خاں نے اسی وقت سے لوٹ مار شروع کردی، لیکن مدد خاں کو میاں عبدالنبی کا اعتبار نہیں آیا، اس نے اس کی خاص مصاحبوں تاجہ لیکھی کے بیٹے بلاول، تاجہ ساتیہ اور اس کے مدار المہام بوڈہ دربان کو بلوا کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ان کے ہاتھ پاؤں اور گردنوں میں زنجیریں ڈالی جائیں اور انہیں مار مار کر ان سے خزانے کا پتا پوچھا جائے اور ان کو ڈنڈے لگائے جائیں، اس حکم پر اُن کو اس قدر ڈنڈے لگائے[1] گئے کہ ان میں سے اکثر کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے۔

مدد خاں کی سندھ پر آفت:

مدد خاں کیا تھا، سندھ کے لیے ایک عذاب تھا جو اس کی صورت میں نازل ہوا، وہ جس طرف سے بھی گزرا آبادیوں کو تہہ تیغ اور ویران کرتا ہوا چلا گیا۔ لوٹ مار میں اس کے لشکر کا یہ حال تھا کہ وہ ٹوٹا ہوا بوریا بھی نہ چھوڑتے تھے۔ اس ظالم نے پورے سندھ کو خاک سیہ کرکے برابر کردیا۔ اس کے فوجی بے خطا لوگوں کو مارتے تھے۔ جدھر سے بھی اُس کی فوج گزری آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہوتی گئیں۔

عظیم ٹھٹھوی نے اس کے لشکریوں کے مظالم کا دردناک نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا:

همه بے حیا و ظلوم و جهول — نه خوف از خدا و نه شرم رسول
همه بے کس آزار و بے زور کش — همه ناتواں دشمن و مور کش
همه موذی و ناکس و نابکار — همه نیش زن کژدم و کهنه مار
همه بے نصیب از صفا و سلوک — همه بے سبب کش چو دیوانه خوک
همه باضعیفاں ستیزاں چو برق — همه روز میداں گریز آں چو برق
رعیت کشد تیغ شان بے دریغ — گریزند بینند چوں روئے تیغ
بغارت چناں دست گسترده اند — که تابوریائے کهن برده اند[2]

یہ وہ بلا تھی کہ جسے سندھ کا ایک نالائق اور ناعاقبت اندیش سپوت میاں عبدالنبی سندھ پر لے کر آیا تھا۔

میر عبداللہ خاں کا جذبہ ہمدردی:

جب میر عبداللہ خاں کو مدد خاں کی اس سفاکی و خون ریزی و قتل و غارت گری کا حال معلوم ہوا تو وہ بے چین ہوگیا، اُس نے میر فتح علی، فتح خاں اور میر سہراب کو بلا کر کہا، سندھ پر جو مصیبت مدد خاں کے ہاتھوں آئی ہے اور لوگ جس طرح تباہ و برباد کیے جارہے ہیں اُس کا تقاضہ ہے کہ ہم مظلوموں کی مدد کے لیے نکلیں، میر کی اس دعوت پر سب آمادۂ پیکار ہوگئے، صرف فتح خاں نے کہا کہ ذرا اس پر غور کرلیجے کہ یہ شاہی فوج ہے، اور ظل اللہ کا احترام سب پر واجب ہوتا ہے، میرا خیال ہے کہ ان پر ہمیں تلوار نہ اٹھانی چاہیے۔ میر عبداللہ نے جواب دیا تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بادشاہ وہ ہے جس میں خدا کی صفات ہوں اور خلق خدا کی پرورش خدا کی طرح کرتا ہو، بادشاہ وہ ہے جو مخلوق خدا کو آرام پہنچاتا ہو نہ کہ جو مخلوق خدا کا خون بہاتا ہو اور شرفا کی عزت برباد کرے، ہم رعایا سے خراج و عشر وصول کرتے ہیں تو ہمارے لیے یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ ہم رعایا کو اس پریشاں حالی میں چھوڑ دیں۔[3]

جنگ کے لیے روانگی:

چنانچہ میر عبداللہ خاں، مدد خاں سے جنگ کے لیے ایک فوج لے کر روانہ ہوا، میر فتح علی، میر سہراب اس کے ساتھ تھے۔ صرف میر فتح خاں اور بعض نظامانی قبیلے کے سردار میر عبداللہ کی رائے سے اختلاف کی وجہ سے نہیں نکلے، جب میر عبداللہ دو منزلیں طے کرچکا تو ان لوگوں کو خود ہی اپنی غلط رائے کا احساس ہوا اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ میر

---

(1) فتح نامہ۔ عظیم، ص ۷۷-۷۸۔

(2) فتح نامہ۔ عظیم، ص ۷۸۔

(3) فتح نامہ۔ عظیم، ص ۷۹۔

عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قرآن مجید کو ہاتھ میں لے کر کہا کہ اس کتاب الٰہی کا اتباع ہم سب پر فرض ہے۔ خدا اور رسول پاک کا واسطہ دے کر ہم کہتے ہیں کہ آپ ایک عرضی ہماری قبول فرمایے، وہ یہ ہے کہ آپ جنگ میں پیش دستی نہ کیجیے، بلکہ تدبیر سے دشمنوں کو شکست دیجیے۔ دشمن جب ایک دو روز میں یہاں پہنچے گا تو ہم ان کے راستے میں بیٹھ جائیں گے، جب وہ ہم پر حملہ کرے گا تو ہم "البادی اظلم" کے تحت اُسے کاٹ کر رکھ دیں گے۔ میر عبداللہ نے ان کی گزارش کو قبول کر لیا اور وہیں مقیم ہو گیا اور اپنے فوجی دستوں کو مضبوط کرنے لگا۔[1] اسی عرصے میں میر کے جاسوسوں نے خبر دی کہ مدد خاں کی فوج اب یہاں سے چھ کوس کے فاصلے پر ہے۔ جب میر کو یہ اطلاع ملی تو وہ جنگ کے لیے تیار ہو گیا، ادھر میاں عبدالنبی کے جاسوسوں نے افغانی فوج میں خبر پہنچائی کہ میر جنگ کے لیے بالکل تیار ہے، وہ راستے میں ایک کثیر لشکر لے کر مقابلے کے ارادے سے ٹھہرا ہوا ہے۔ جب مدد خاں کو یہ معلوم ہوا تو اس نے اپنی فوج کے دستوں کی تعداد بڑھا دی، پھر اپنے رفقا سے مشورہ کیا، سب نے مشورہ دیا کہ لڑائی سے پہلے صلح کی کوشش مناسب ہے، دوسرے دن صبح کو اس نے پھر اپنے جاسوسوں کو بھیجا، جاسوس خبر لائے کہ میر اسی طرح اپنے لشکر کو لے کر مقابلے کے لیے ڈٹا ہوا ہے۔[2]

مدد خاں کا خط:

ان تمام حالات سے واقف ہونے کے بعد اپنے رفقا کے مشورے کے مطابق مدد خاں نے میر عبداللہ خاں کو لکھا کہ: آپ بہت بڑے بہادر اور عقلمند ہیں۔ ہمیں آپ سے بجز اخوت و مروت کے کچھ اور سروکار نہیں، میاں عبدالنبی نے جو مظالم آپ پر کیے ہیں، میں ان سے واقف ہوں، اس نے آپ کے بارے میں نہ صرف ایک مرتبہ غلطی کی ہے، بلکہ وہ بار بار اپنی غلطیوں کو دہراتا رہا ہے۔ میں نے اس کا دل کسی کی طرف سے بھی صاف نہیں پایا اور اس موقع پر میں اس کا اظہار نامناسب سمجھتا ہوں۔ اُس کے جو مشیر ہیں، وہ بھی سب کے سب جھوٹے اور مفتری ہیں، نہ انہیں مردانگی سے حصہ ملا ہے اور نہ وہ عقل و فرزانگی ہی سے بہرہ مند ہیں، اس لیے میں نے ان سب کو زنجیریں پہنا دی ہیں۔ اب مناسب یہ ہے کہ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ میں میاں عبدالنبی کے ساتھ خدا آباد جاؤں گا۔ کیونکہ یہ کہتا ہے کہ وہاں اس کا خزانہ مدفون ہے، اگر یہ خزانہ مل گیا تو خیر، ورنہ اس کا جھوٹ ظاہر ہو جائے گا اور یہ بادشاہ کی نظر میں جھوٹا ثابت ہو گا، پھر میں خود بھی یہ تمام حالات بلا کم و کاست بادشاہ سے عرض کروں گا۔ خدا جانتا ہے کہ میں آپ سے دوستی کا خواہش مند ہوں۔

جب مدد خاں کے وکیلوں نے یہ خط میر عبداللہ خاں کو پہنچایا، تو میر نے ان وکلا کا نہایت اعزاز و احترام کیا اور انہیں گھوڑے اور خلعت انعام میں دیے۔

میر عبداللہ خاں کا جواب:

پھر میر نے اپنے وکلا اللہ داد لیکھی بن جان نثار اور انبرت رائے کو مدد خاں کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ میں اور میرے ساتھی بادشاہ کے جاں نثار ہیں اور آپ کو میں بجائے اپنے چچا کے سمجھتا ہوں، مجھے آپ کے حکم کی فوری تعمیل کرنی چاہیے تھی، لیکن میں نے قسم کھائی تھی کہ خواہ کتنی ہی بڑی فوج سے مقابلہ کیوں نہ ہو، میں منہ نہیں موڑوں گا۔ میں اس قسم کو نہیں توڑ سکتا، اگر آپ خدا آباد جانا چاہتے ہیں تو دریا کے راستے چلے جائیں، جب آپ کی فوج گزر جائے گی تو میری قسم پوری ہو جائے گی اور میں آپ کی مرضی کے مطابق اپنی فوج لے کر عمر کوٹ چلا جاؤں گا۔ چونکہ ہمارا سارا ساز و سامان وہیں ہے، ہم وہیں مقیم ہو جائیں گے۔

مدد خاں نے بھی ان ایلچیوں کا بڑا اعزاز و اکرام کیا اور وہ دریا کے ساتھ ساتھ روانہ ہو گیا۔[3]

دوسرے دن وہ اس شان سے خدا آباد پہنچا کہ اُس کے آگے نہر دیوں کے اور اس کے بعد بروہی دستے تھے، اس کے علاوہ اس کے ساتھ کثیر لشکر تھا۔ خدا آباد پہنچنے کے بعد اس نے میاں عبدالنبی سے تقاضا کیا کہ وہ بتائے کہ مدفون خزانہ کہاں ہے جس کا اس نے وعدہ کیا تھا؟ میاں عبدالنبی نے چاروں طرف اپنے آدمی بھیجے کہ وہ جائیں اور رعایا میں سے جن لوگوں کے پاس بھی ایک جو کے برابر سونا چاندی ہو اُسے لوٹ مار کر کے لے آئیں۔ چنانچہ یہ ظالم جا بجا پہنچے، انہوں نے حصول زر کے لیے رعایا پر وہ مظالم توڑے جو حد تحریر سے باہر ہیں، انہوں نے بہت سے گھروں کو بے چراغ کر دیا اور ان جاہل کندہ ناتراشوں نے ایک ایک پیسے کے لیے دو دو سو آدمیوں کی گردن ماری اور ایسی لوٹ مار اور قتل و غارت گری مچائی کہ ملک میں کوئی مالدار باقی نہ رہا اور زر کا نام عنقا ہو گیا۔[4]

---

(1) فتح نامہ - عظیم، ص ۸۰۔
(2) ایضاً - ص ۸۲۔
(3) یہ تمام تفصیل فتح نامہ - عظیم، ص ۸۳-۸۴ سے ماخوذ ہے۔
(4) فتح نامہ - عظیم، ص ۸۴۔

مدد خاں کے مظالم:

دوسری طرف مدد خاں کی فوجوں نہر دیوں، افغانیوں اور بروہیوں نے اہل سندھ پر وہ مظالم توڑے کہ انسان و حیوان میں کوئی فرق اٹھا نہ رکھا۔ ملک کو اس قدر مفلس و قلاش کر دیا کہ نہ کسی کے بدن پر کپڑا چھوڑا اور نہ کسی کے سر پر پگڑی باقی رہی۔ عظیم ٹھٹھوی نے ان مظالم کی دردناک داستان بیان کرنے سے اپنے عجز کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

مرا طاقت شرح آں جور نیست
ز کس جز حق امید آں غور نیست

عظیم نے لکھا ہے کہ ان وحشیانہ مظالم سے رعایا چیخ اُٹھی اور رو رو کر یہ دعائیں مانگنے لگی:

ز بیچارگی ہر ضعیف و یتیم — ہمی گفت نالاں برب العظیم
الٰہی خداوند عالم توئی — کشایندۂ بند عالم توئی
بقدرت پناہ ضعیفاں توئی — توانای ہر ناتواناں توئی
ستم پیشۂ ملک تاراج کرد — در اقلیم ما ظلم معراج کرد
فروماندگاں را ز تو داوری — توئی داورے ما بہر داوری
تو سر پنجۂ ظلم را بشکنی — تو درندہ ناخن ز بُن برکنی
چساں بسپری اے خدائے بزرگ — تو ایں گلۂ گوسفنداں بگرگ
بدریاں تواں غوطہ زد بیدرنگ — بکشتی ما ناخدا شد نہنگ
عنان ضعیفاں بسرکش مدہ — تو ایں مشت خس را بہ آتش مدہ
چنان ظلمت ظلم تاریک کرد — شبِ مرگ با خلق نزدیک کرد
تو بردار ایں اژدھام بلا — ز حالِ اسیرانِ دامِ بلا
بما ایں قیامت کم از حشر نیست — تزلزل کم از بعث و ز نشر نیست
دلِ عالم از جفا شد دو نیم — ترحم کن اے کردگار عظیم[1]

میر عبداللہ کی برہمی:

میر عبداللہ کو جب عمر کوٹ میں ان ہولناک مظالم کی اطلاع ملی تو وہ ملک کے عوام پر ان مظالم کو سن کر بے حد غمگین و ملول ہوا اور اس نے اپنے مصاحبین سے کہا کہ فتح خاں کی رائے غریبوں پر کیا مصیبت لائی ہے۔ اے خدا تو خوب جانتا ہے کہ ان اہل دانش کی رائے نے میرے بال و پر باندھ دیے ہیں، اس جرم کے متعلق مجھ سے باز پرس نہ کرنا۔ تجھے معلوم ہے کہ مدد خاں کے ان مظالم نے میری روح کو گھٹا دیا ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ میرا اس معاملے میں کوئی قصور نہیں، تجھے معلوم ہے کہ میرے ساتھیوں کے مشورے کا نتیجہ ہے، میں اگرچہ عوام کے سامنے منفعل اور شرمندہ ہوں، لیکن تو حقیقتِ حال کو خوب جانتا ہے، میرے عقل مند ساتھیوں نے مجھ پر ظلم کیا ہے کہ مجھے اس شرمندگی میں مبتلا کیا ہے۔ لوگ دشمنوں کے ہاتھوں ظلم برداشت کرتے ہیں، مجھے دوستوں نے اس شرمندگی اور ندامت میں مبتلا کیا ہے۔ دانشور نادانوں کے ہاتھوں سے نقصان اٹھاتے ہیں، میں نے دانشوروں کی وجہ سے یہ ندامت برداشت کی ہے۔[2]

میر فتح علی خاں پر اس گفتگو کا اثر:

میر فتح علی خاں نے جب میر عبداللہ کی یہ گفتگو سنی تو میر عبداللہ کی اس گفتگو نے اس پر بڑا گہرا اثر کیا اور بے تاب ہو کر اس نے اپنے چچا میر سہراب سے کہا کہ چچا جان! اب بیٹھنے کا وقت نہیں اور اپنے بھائی غلام علی سے کہا کہ اے وہ کہ حضرت علیؓ کا نام تیرے حرز جاں ہے اٹھ اور جنگ کی تیاری کر اور میر عبداللہ کا ساتھ دے۔ اس وقت اس کو راضی رکھنا واجب ہو گیا ہے، ہم کب تک تدبیریں سوچتے رہیں گے، اب وقت آگیا ہے کہ تقدیر پر بھروسا کر کے اُٹھیں، تاکہ جو خدا کی رضا ہو وہ پوری ہو۔ اس کے بعد جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میر فتح خاں کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اب مناسب یہ ہے کہ ہمیں اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلنا چاہیے، اگر مدد خاں سے ان کی بات چیت ہو گی، تو ہم خاموشی سے سنیں گے، اور اگر جنگ ہو گی تو ہم اپنے ساتھیوں کو جنگ سے روکیں گے۔ اس تصفیے کے بعد وہ ایک دستہ لے کر میر عبداللہ کے لشکر میں آیا اور میر عبداللہ کو سلام کیا۔ میر عبداللہ نے اُس سے کہا اے پیرِ سندھ! ہم نے تیری رائے کے مطابق صلح کی تھی، تو نے دیکھا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سندھ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، تیری رائے سے ایک جہان پر تباہی آئی، کیا اب بھی تجھ کو خدا کا خوف نہیں آتا؟ میر فتح خاں نے جواب دیا کہ آپ نے جو فرمایا وہ بالکل بجا و درست ہے۔ میں اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے حواس باختہ ہو چکا ہوں، مخلوق خدا کو جو مصیبتیں اُٹھانی پڑیں واقعی وہ میری غلط رائے کی وجہ سے پیش آئیں۔ بہر حال خدا کی تقدیر پوری ہو کر رہی، لیکن اب مدد خاں کا ظلم حد سے بڑھ چکا ہے اور اس کا علاج سوائے تلوار کے کچھ نہیں۔ اب

---

(1) فتح نامہ۔ عظیم، ص ۸۵۔

(2) فتح نامہ عظیم، ص ۸۶۔

جو آپ نے عزم کیا ہے وہ مبارک اور نیک ہے، لیکن مناسب یہ ہے کہ جنگ سے پہلے گفتگو سے رفع شر کرنا چاہیے۔ یہ بات سن کر میر عبداللہ خاموش ہو گیا۔

مدد خاں کی تیاریاں:

مدد خاں کو جب میر عبداللہ کی جنگی تیاریاں معلوم ہوئیں، تو اس نے اپنے مشیروں سے مشورہ کیا اور مشورے کے بعد اس نے کہا کہ ہم یہاں بیٹھ کر کچھ نہیں کر سکتے، ہمیں شہر سے باہر نکل کر تیاری کرنی چاہیے۔ چنانچہ وہ دوسرے دن خدا باد روانہ ہو گیا، ادھر میر عبداللہ بھی تیزی سے روانہ ہوا۔ جب مدد خاں کا لشکر دو کوس کے فاصلے پر رہ گیا، تو میر عبداللہ نے الٰہداد کے ذریعہ ایک خط مدد خاں کو بھیجا۔[1]

میر عبداللہ کا خط:

اس خط میں میر عبداللہ نے لکھا کہ: اے نامور سردار! میں نے آپ کے قول پر اعتماد کیا، میرے پیش نظر آپ کی سرداری تھی، لیکن آپ کے قول کی سچائی کہاں گئی۔ آپ نے پہلے کیا کہا اور آخر میں کیا کیا، آپ کا ظاہر کیا تھا اور باطن کیا نکلا، آپ کی ظالم فوج کے ہاتھوں اس ملک کو کیا کیا مظالم برداشت کرنے پڑے، اگر خدا کسی کو قوت و اقتدار عطا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی مخلوق کے ساتھ لطف و محبت سے پیش آئے۔ بہتر کو اپنے سے کمتر پر مظالم نہیں کرنے چاہئیں۔ کیا آپ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا حسن سلوک چیونٹی کے ساتھ نہیں سنا؟ تمام لوگ ایک خدا کے بندے ہیں۔ اُس خدائے غیور سے انسان کو شرم کرنی چاہیے۔[2]

مدد خاں کا جواب:

مدد خاں اس خط کو پڑھ کر فرط غیرت سے سر در گریبان ہو گیا، اس نے اسی وقت اپنے ایک خاص قاصد کے ذریعہ سے میر عبداللہ کو جواب بھیجا، اس میں لکھا کہ:

> اے نوجوانِ میر ہوشمند! میں نے تیرے پیام کو آویزۂ گوش بنا لیا ہے۔ تو ہمت و شجاعت میں شیروں سے بڑھ کر ہے اور ہوشمندی میں زمانے کے بوڑھوں سے آگے نکل گیا ہے۔ میں نے تمہارے پیام کو غور سے پڑھا، بلاشبہ یہ پیام ایک وعظ و نصیحت ہے۔ مجھے بھی خدا کی مخلوق پر ظلم کرنا پسند نہیں اور حتی المقدور میں خدا کے بندوں پر اذیت روا نہیں رکھتا، لیکن جب عبدالنبی نے اپنے وعدے کے مطابق روپیہ نہ دیا تو مجبوراً لشکر میں بغاوت پھیل گئی، اس کی باز پرس خدا کی طرف سے لشکر سے ہو گی۔ میں فطرتاً ستم پیشہ اور ظلم خو نہیں ہوں۔ باقی رہا تمہارے ساتھ میرا قول تو میں اپنے قول کا پکا ہوں۔ میں نے کئی مرتبہ بادشاہ کے حضور میں عرضیاں بھیجیں کہ تمہارے سوا سندھ کا انتظام کوئی نہیں کر سکتا، وہاں سے جواب آیا ہے کہ میں ملک کے انتظام پر جس کو چاہوں مقرر کروں، لیکن یہ ضروری ہے کہ ملک کا خراج بروقت ادا ہوتا رہے۔ اب تم اگر مجھے قول دو اور مجھے مطمئن کر دو تو میں بادشاہ کے دربار میں تمہاری طرف سے ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر تم صدقِ دل سے ہمارے دوست ہو تو تم اور میر فتح علی خاں، میر سہراب اور فتح خاں چاروں کے چاروں ہماری مہمانی قبول کرو اور اپنے لشکر کو رخصت کر دو، اور اس کے بعد آ کر ہم سے ملاقات کرو، اگر تم اس طرح بادشاہ کی اطاعت کا مظاہرہ کرو گے تو بادشاہ کی نظر میں تمہاری عزت اور مرتبہ دوچند ہو جائے گا۔ تمہاری دلی امید پوری ہو گی اور تمہارے دشمن خوار اور ذلیل ہوں گے۔

جب مدد خاں کا یہ جواب میر عبداللہ کو ملا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جب ہم میں صفائی ہو چکی اور محبت کے یہ دعوے ہیں تو مدد خاں کا یہ مشورہ کس لیے ہے کہ ہم اپنے لشکر کو واپس کر دیں؟ پھر اس نے مدد خاں کو جواب میں کہلا بھیجا کہ میری فوج میری برادری پر مشتمل ہے، میں انہیں الگ نہیں کر سکتا، اگر میں ان کو جانے کے لیے کہوں بھی تو وہ اس پر سخت برہم ہوں گے۔[3]

یکایک میر فتح خاں نے کہا کہ یہ ہمارے سردار کا حکم ہے، ہمیں مدد خاں کے حکم کو بسر و چشم ماننا چاہیے، ہمیں اس کے حکم سے سرتابی نہ کرنی چاہیے، خواہ اس میں ہمارا فائدہ ہو یا نقصان۔ میر عبداللہ نے جب فتح خاں کی یہ بات سنی تو وہ نہایت مکدر ہوا اور اس نے میر فتح علی خاں اور میر سہراب سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگرچہ جنگ ہمارے لیے آسان ہے لیکن

---

(1) فتح نامہ۔ عظیم، ص ۸۷۔

(2) ایضاً۔ ص ۸۸۔

(3) فتح نامہ۔ عظیم، ص ۸۹-۹۰۔

ہم میں آپس میں پھوٹ پڑ چکی ہے اور جب آپس میں اتفاق نہ ہو تو پھر جدائی ہی مناسب ہے، اب مناسب یہ ہے کہ میر فتح خاں مدد خاں کے پاس چلا جائے، وہ جو کچھ اس سے حاصل کرے گا، ہم بھی دیکھ لیں گے۔ میر عبداللہ کے اس کہنے پر میر فتح علی خاں اور میر سہراب نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ آپ ہمارے سلطان ہیں، چنانچہ یہ دونوں کے دونوں میر عبداللہ کے ساتھ لڑائی کے لیے نکل پڑے، میر غلام علی نے روانہ ہوتے وقت میر فتح خاں کو کہلا کر بھیجا کہ اے دانشور میر! ہم جنگ کے لیے تیار ہو چکے ہیں، تم بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ، ہم نہایت تنہائی محسوس کر رہے ہیں، تم اس امر میں بالکل تامل نہ کرو، میر فتح علی خاں بھی ہمارے ساتھ ہے، لیکن میر فتح خاں نے اس پیغام کی بالکل پروانہ کی اور وہ باغہ فقیر کے ساتھ اپنے آدمیوں کو لے کر عمر کوٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔[1]

جب میر عبداللہ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو اس نے اپنے رفقا سے کہا کہ اب ہمیں میر فتح خاں اور مدد خاں کے ملاپ کا تماشہ دیکھنا چاہیے اور ہمیں اس کے نتیجے کا انتظار کرنا چاہیے۔ میر عبداللہ اپنے لشکر کو لے کر دین گڑھ روانہ ہو گیا۔

جب مدد خاں کو ٹالپروں میں اس اختلاف کا حال معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوا، اور اس نے خوشامد و چاپلوسی سے میر فتح خاں کو اپنے دام میں پھانسنے کا ارادہ کیا۔ اس خبر کے سنتے ہی کہ فتح خاں اس کے پاس آ رہا ہے، اس نے اپنے آدمی اس کے استقبال کے لیے بھیجے اور اس کی آمد پر بڑے خلوص و محبت کا اظہار کرتے ہوئے فتح خاں سے کہلا بھیجا کہ اے میر دانشور! میں نے ٹالپروں کی جماعت میں سب سے زیادہ تم کو ہوشمند اور عقلمند پایا، میری سعادت مندی ہے کہ تم میرے ساتھ ہو اور عنقریب تمہارے جاہ و منصب کو بلند کیا جائے گا۔ تم میرے پاس جس قدر جلد ممکن ہو پہنچو، یہ پیغام مدد خان نے اپنی طرف سے نواب جنگ کے ذریعہ اور میاں عبدالنبی کی طرف محمد حسن کھادر کے ذریعہ بھجوایا تھا، دونوں نے عمر کوٹ کے قلعے میں پہنچ کر میر فتح خاں کو ہر طرح کا یقین و اطمینان دلایا۔ میر فتح خاں ان دونوں کے چکمے میں آ کر مدد خاں کے پاس پہنچا، مدد خان اس کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آیا اور دوران گفتگو میں اسے بھائی کہہ کر مخاطب کیا اور اسے لے کر روہڑی روانہ ہو گیا۔ جب مدد خاں نے اس پر پوری طرح قابو پا لیا، تو چند منزلوں کے بعد اس نے اپنی روش بالکل بدل دی اور فتح خاں سے نہایت بے مروت ہو کر کہا کہ تم باغی ہو، اس لیے تمہیں اپنی رہائی کے لیے دو لاکھ روپے ادا کرنے ہوں گے، مجبوراً فتح خاں کو یہ تاوان قبول کرنا پڑا، پھر اس نے حکم دیا کہ بتاؤ میر عبداللہ، میر فتح علی خاں، میر سہراب اور میر غلام علی کہاں ہیں، ان کو خط لکھ کر بلواؤ، ورنہ میں تمہیں زندہ نہ چھوڑوں گا۔ اب میر فتح خاں کو ہوش آیا، اور اپنی غلطی محسوس ہوئی، مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا، اس کے سوا اس کے لیے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خط لکھے، چنانچہ روہڑی سے اس نے مدد خاں کی منشاء کے مطابق میر صاحبان کو بلاوے کا خط لکھا۔[2]

فتح خان کی رہائی:

چنانچہ یہ خط ایک شتر سوار کے ہاتھ روانہ کیا گیا، یہ خط بھیج کر میر فتح خاں اپنے خیمے میں آیا، اب وہ اپنی رائے پر بے حد متاسف تھا۔ یہاں آنے کے بعد دیکھا کہ مدد خاں نے پچاس افغان سپاہی اس کے پہرے پر مقرر کیے ہیں، اب اسے چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، لیکن پھر بھی اس نے غور و فکر کر کے ایک تجویز سوچی، اس نے اپنے ساتھیوں میں سے چند سواروں کو بہ آواز بلند حکم دیا کہ تم فلاں فلاں گاؤں میں جاؤ اور فلاں فلاں ہندو سیٹھ سے روپیہ وصول کر کے لاؤ، تاکہ یہ روپیہ مدد خاں کی خدمت میں پیش کر دیا جائے اور ساتھ ہی موقع پا کر خفیہ طور پر انہیں ہدایت کی کہ فلاں فلاں درخت کے نیچے گھوڑے تیار رکھو، جب رات کی تاریکی خوب چھا گئی اور پہرے دار سو گئے تو اس نے ایک پہرے دار کا بھیس بدلا اور گھوڑے پر سوار ہو کر رفو چکر ہوا، اور میر عبداللہ سے جا ملا۔

مدد خاں کی تدبیریں:

جب مدد خاں کو معلوم ہوا کہ میر فتح خاں فرار ہو چکا ہے تو اس نے ہر طرف آدمی دوڑائے، لیکن سب ناکام لوٹے۔ مدد خاں کو یقین ہو گیا کہ میر جنگ میں تاخیر نہ کریں گے، اس لیے وہ فوراً روہڑی سے روانہ ہو کر اوباوڑہ پہنچا اور وہاں مقیم ہو گیا اور اس نے میر عبداللہ کے پاس اپنے خاص قاصد بھیجے اور کہلایا کہ میر فتح خاں آپ کے پاس پہنچ چکا ہے۔ اس نے آپ سے ہماری بہت شکایتیں کی ہوں گی، لیکن وہ میری باتیں نہیں سمجھ سکا ہے، میرا مقصد تو آپ سے ملنا تھا، اب بھی میری یہی آرزو ہے کہ کسی طرح آپ سے ملاقات ہو اور آپس کے اختلافات دور ہو جائیں۔ میں چاہتا تھا کہ عبدالنبی کو خود آپ کے حوالے کروں، اب بھی کاش آپ میری بات مان لیں، لیکن اگر آپ کو میری باتوں پر شبہ ہو، تو میں

---

[1] ایضاً۔ ص ۹۰۔

[2] فتح نامہ۔ عظیم، ص ۹۲۔

قرآن مجید بھیج رہا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ یہ فتنہ وفساد ختم ہو جائے اور میں بادشاہ کے سامنے سرخرو ہوں۔

میر عبداللہ کو جب مدد خاں کا یہ پیغام ملا، تو اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں نے پہلے بھی کہلا دیا تھا اور اب پھر کہلا رہا ہوں کہ یہ بیہودہ اور فضول باتیں بار بار دہرانے سے کیا فائدہ، اس قسم کی باتوں کو سوائے پراگندگی دماغ کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ سرداروں کو مختصر بات کرنی چاہیے، اور اپنے قول پر پکا ہونا چاہیے۔ اگر آپ کو میری ملاقات کا اشتیاق ہے، تو مجھے بھی آپ سے ملاقات کا اشتیاق ہے۔ اگر مجھے بادشاہ کا پاس نہ ہوتا تو میں خود آکر درد کا درمان کرتا، اس کے بعد اس نے میر فتح علی کو حکم دیا کہ تیار ہو جاؤ اور مدد خاں کے قاصدوں کو رخصت کر دو، اور کہلا دو کہ اگر تمہیں ہماری ملاقات کا اشتیاق ہے تو ہمارا انتظار کرو۔[1]

فریر نامہ میں ہے کہ قاصدوں نے مدد خاں کو جب میر عبداللہ کا پیغام پہنچایا تو وہ اسی دن دریا کو عبور کر کے افغانستان چلا گیا اور میاں عبدالنبی کو بے یار و مددگار چھوڑ گیا، بلکہ اس کے مصاحبوں کو پابہ زنجیر کر کے اپنے ساتھ لیتا گیا۔ عبدالنبی اس انقلاب سے حیران رہ گیا۔[2]

میاں عبدالنبی کی روباہ بازیاں:

اب میاں عبدالنبی تنہا رہ گیا اور وہ ایسی تدبیریں اختیار کرنے لگا جو اسے تباہی کی طرف لے جانے والی تھیں۔ اس نے ایک طرف تو باغہ فقیر کو میر عبداللہ کے پاس صلح کے لیے بھیجا اور دوسری طرف نواب بہاول خاں کے پاس بہاول پور آدمی بھیجے کہ وہ اس کی صلح میر عبداللہ سے کرادیں۔ اس کے علاوہ فضل علی خاں سے بھی التجا کی کہ وہ میر عبداللہ سے صلح کرادے۔ نواب بہاول خان نے اپنے بھائی سردار خاں اور فضل علی کو میر عبداللہ کے پاس صلح کے لیے بھیجا۔ ادھر میر فتح خاں بھی صلح کے لیے محرک بنا، ساتھ ہی میاں عبدالنبی نے میر عبداللہ کے پاس قرآن مجید بھیجا، جس پر لکھا کہ اگر میں میر عبداللہ سے دھوکا کروں تو خدا مجھے دین و دنیا سے نامراد رکھے۔

جب یہ قرآن مجید میر عبداللہ کے پاس پہنچا تو اس نے نہایت عقیدت و احترام سے اسے بوسہ دیا اور سر پر رکھ کر میر فتح علی خاں سے کہا کہ میں اپنے باپ دادا اور چچا کے طریقے پر چلوں گا اور انہیں کے طریقے پر اس دنیا سے رخصت ہوں گا، میرے بعد میرے بچے بہرام خاں اور غلام حسین خاں یتیم رہ جائیں گے، میں انہیں تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ میاں عبدالنبی کے خیمہ گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میاں عبدالنبی اس سے بظاہر نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آیا، دوسرے دن وہ میر عبداللہ کے خیمے میں آیا اور بہت معذرت کی، میر عبداللہ نے ملک کا انتظام سنبھال لیا، اور دونوں کے دونوں کہنہ خدا باد جا کر مقیم ہو گئے۔ لیکن میر عبداللہ جب بھی اس کے دربار میں آتا تھا، اپنے ساتھ لاؤ لشکر کو ضرور لاتا تھا جس کی وجہ سے میاں عبدالنبی کو جواب بھی اس سے کینہ رکھتا تھا، اپنے بغض و عناد کے نکالنے کا موقع نہ ملتا تھا۔[3]

لہٰذا اس نے مکاری اور دغابازی کے لیے ایک نیا ڈھونگ رچایا۔ وہ ایک رات فقیروں کا بھیس بدل کر میر عبداللہ کی قیام گاہ پر پہنچا اور اس نے میر سے نہایت التجا و لجاجت سے کہا کہ یا تو آپ مجھے مار ڈالیے یا قید کر لیجیے۔ چونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے قرآن مجید پر معاہدہ کرنے کے بعد آپ کو تسلی نہیں ہوئی، اس لیے میں آج بالکل تن تنہا آپ کے پاس آیا ہوں، اب آپ جو بھی سلوک میرے ساتھ چاہیں کریں۔ آپ جب بھی میرے پاس آتے ہیں، اپنے کچھ آدمی ساتھ لے کر آتے ہیں، خدا کے لیے میری جانب سے اپنے دل سے خدشات نکال دیجیے۔

میر عبداللہ چونکہ ایک نیک دل انسان تھا، وہ میاں عبدالنبی کے مکر و فریب کو نہ سمجھا اور اس نے جواب دیا کہ میں آئندہ آپ کے دربار میں تنہا آیا کروں گا، آپ نے جس روز سے مجھے قرآن مجید بھیجا ہے، اسی دن سے میرے دل میں آپ کی طرف سے کوئی خدشہ باقی نہیں رہا۔

دوسرے دن صبح کو میر عبداللہ نے اپنے تمام لشکر اور میر فتح علی، غلام علی، میر سہراب اور الہیار ٹھارہ وغیرہ کو خدا باد نو[4] بھجوا دیا، صرف اس کے پاس میر فتح خاں، میرزا، اور چند بلوچ اور کچھ اہلکار باقی رہ گئے۔

اب میر عبداللہ جب میاں عبدالنبی کے پاس جاتا تو صرف دو ایک آدمیوں کو ساتھ لے کر جاتا۔[5]

میر عبداللہ اور میر فتح خاں کی گرفتاری:

میاں عبدالنبی نے جب اپنی فتنہ سامانیوں کے لیے سازگار فضا پیدا

---

(1) فتح نامہ عظیم، ص ۹۳-۹۴۔

(2) تاریخ کلہوڑا، ج ۲، بحوالہ فریر نامہ، ص ۸۵۵-۸۵۶۔

(3) فتح نامہ عظیم، ص ۹۵-۹۶۔

(4) خدا باد نو: یہ گاؤں تعلقہ ہالہ میں ہے، میر فتح علی خاں یہیں بتا تھا اور اس کا مزار بھی یہیں ہے۔ (قدیم سندھ، قلیچ بیگ، ص ۱۰۵)۔

(5) فتح نامہ عظیم، ص ۹۶-۹۷۔

کرلی تو اس نے ایک دن علی الصبح اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ مسلح ہو کر آئیں، جب میر عبداللہ خاں اور میر فتح خاں حسب دستور اُس کے دربار میں آئے تو میاں عبدالنبی اپنے آدمیوں کو ان کی نگرانی کی خفیہ ہدایت کر کے چلا گیا۔ یہ آدمی میر عبداللہ اور فتح خاں کے پاس پہنچے اور کہا کہ میاں نے حکم دیا ہے کہ آپ اپنے ہتھیار ہمارے حوالے کر دیں، میر عبداللہ نے فوراً ہی تلوار کے قبضے پر ہاتھ ڈالا، مگر فتح خاں نے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میاں ہمارا امتحان لینا چاہتا ہے۔ میر عبداللہ نے کہا کہ مجھے اس امتحان کی حقیقت معلوم ہے اور تم بھی عنقریب اس حقیقت کو جان لوگے، لیکن چونکہ میں قرآن مجید پر حلف اُٹھا چکا ہوں، اس لیے میں مظلومی کے اجر کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتا۔ یہ کہہ کر میر عبداللہ نے تلوار اُن کے حوالے کر دی، اس کے ساتھ میر فتح خاں نے بھی اپنے ہتھیار ان کے حوالے کر دیے۔ ہتھیار لیتے ہی ان دونوں کو قید میں ڈال دیا گیا۔[1]

میر عبداللہ کے خیمے میں قتل و غارتگری:

ان دونوں کو قید کرنے کے بعد میاں عبدالنبی کے آدمی میر عبداللہ کے خیمہ گاہ کی طرف دوڑے۔ خیمے میں تقریباً ایک سو بلوچ موجود تھے، اُن میں میرزا بھی تھا جو اپنی بیماری کی وجہ سے لیٹا ہوا تھا، میاں عبدالنبی کے آدمیوں نے خیمے میں جا کر اچانک حملہ کر دیا۔ بلوچوں نے بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس قتل و غارتگری میں میاں کے دو سو آدمی مارے گئے اور ایک سو بلوچ شہید ہوئے۔

میر عبداللہ اور میر فتح خاں کی شہادت:

میر عبداللہ اور میر فتح خاں قید ہونے کے بعد تلاوتِ کلام مجید میں مشغول تھے، اچانک تلاوت کرتے ہوئے جلاد نے اس کی گردن ماری۔ قرآن مجید، میر کے ہاتھ سے گر گیا اور اس کا سر بھی قرآن مجید کے پاس گرا اور قرآن مجید کی پیشانی پر میر عبداللہ کے خون سے کلمہ "یا قدیر" منقوش ہو گیا۔ اسی طرح میر فتح خاں کا سر بھی تن سے جدا کیا گیا، غرض کہ اس غلط اقدام اور ناعاقبت اندیشی سے میاں عبدالنبی نے اپنے لیے نئی مصیبتیں اور سندھ کے لیے نئی آفتیں کھڑی کر دیں۔[2]

عظیم ٹھٹھوی نے حسب ذیل تاریخ شہادت لکھی:

میر عبداللہ بن بجار ابن بہرام شیر
چوں بہ تیغ خدعہ بر میراث آبا شد شہید
ہاتف سال شہادت گفت ناگہ صبح گاہ
وائے واویلا شہید ابن الشہید ابن الشہید۔[3]

۱۱۹۹ھ

ہالانی کی جنگ

میر عبداللہ اور میر فتح خان کی شہادت کی خبر جب خدا باد پہنچی تو کہرام مچ گیا، میر فتح علی خاں کا یہ حال تھا کہ وہ جوش انتقام سے مغلوب ہو کر یہ چاہتا تھا کہ فوراً میاں عبدالنبی پر ہلہ بول دے، لیکن میر سہراب نے اس سے کہا کہ ہمارے لیے مناسب ہے کہ پہلے ہم اپنے اہل و عیال کو کسی محفوظ جگہ چھوڑ آئیں اور پھر ہلہ بولیں، مگر میر فتح علی کہتا تھا کہ میں اب بغیر انتقام لیے ایک منٹ نہیں رک سکتا۔ آخر میر سہراب نے کہا کہ جوش انتقام میں ہم سب کا یہی حال ہے، جو آپ کا ہے، لیکن ذرا اس پر غور کر لیجیے کہ اگر بعد میں راجپوتوں نے حملہ کر دیا تو کیا ہوگا۔ پہلے ہمیں اپنے اہل و عیال کو دین گڑھ پہنچانا چاہیے پھر انتقام کے لیے جانا چاہیے۔ میر فتح علی نے اس کی تجویز مان لی، ٹالپروں نے اپنے اہل و عیال کو دین گڑھ پہنچایا، پھر انتقام کے لیے روانہ ہوئے۔ تقریباً چھ ہزار بلوچ ان کے ساتھ تھے اور میر سہراب، غلام علی، باغو خاں، ٹھارہ خان الھیار وغیرہ جیسے نامور اور بہادر بھی ان کے ساتھ شریک تھے، لیکن میر سہراب نے محسوس کر لیا کہ جس کے مقابلے کے لیے ہم یہ فوج لے کر جا رہے ہیں، اس کے مقابلے کے لیے یہ فوج کم ہے، وہ میر فتح علی خاں سے اس امر میں مشورہ کرنے کے بعد ونگہ[4] گیا، جہاں بلوچ رہتے تھے، اس کا منشا یہ تھا کہ وہاں سے نندہ اور دوسرے سرداروں کا لشکر اپنی مدد کے لیے لے آئے۔ اس کوشش میں ایک ہفتہ لگ جانے کا اندازہ تھا۔ لیکن میر سہراب کو روانہ کر کے میر فتح علی نے اس کمک کے آنے کا انتظار نہیں کیا، اور میاں عبدالنبی پر حملہ کر دیا۔ میاں عبدالنبی کی فوج کثیر تھی، لیکن اس کے باوجود شکست کھا کر بھاگ کھڑی ہوئی، اس فوج کی ابتری کا یہ عالم تھا کہ دھنگانہ جتوئی کو غلام حسن جھنجن کی خبر نہ تھی اور پیروز کلیری

---

(1) فتح نامہ عظیم، ص ۹۷-۹۸۔
(2) فتح نامہ عظیم۔ ص ۹۸-۹۹۔
(3) ایضاً۔ حاشیہ نمبر ۱، ص ۹۹۔
(4) ونگہ: یہ ہالانی سرکار چاچکا میں ایک علیحدہ پرگنہ تھا، اس میں بہت سے بزرگ گزرے ہیں جن میں درویش چرکس مشہور ہیں (قدیم سندھ، قلیچ بیگ، ص ۹۳)۔

ان دونوں سے الگ ہو کر کسی اور طرف نکل گیا تھا۔ اس لڑائی میں میروں کے ہاتھ بے شمار مال غنیمت آیا۔

میاں عبدالنبی کی نئی تیاریاں:

جب یہ شکست خوردہ سردار میاں عبدالنبی سے ملے تو میاں نے انہیں غیرت دلاتے ہوئے کہا کہ تم مرد نہیں بلکہ عورتیں ہو، تمہیں چرخا کاتنا چاہیے۔ تم دس ہزار فوج ساتھ لے کر گئے، وہ فوج تمہارے کیا کام آئی؟ اس نے غصے میں ان کی پگڑیاں چھین لیں اور دوسروں کو سردار منتخب کیا۔[1]

فریر نامہ میں ہے کہ اس کے سرداروں نے جواب دیا کہ ہمارا اس میں کیا قصور ہے؟ یہ شکست آپ کے مظالم کا نتیجہ ہے، اب آپ کثیر لشکر لے کر نکلیے اور دشمن کی بہادری کے جوہر ملاحظہ کیجیے۔

مختصر یہ کہ اس نے پھر نئے سرے سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور از سر نو لشکر جمع کرنا شروع کیا۔ اس نئے لشکر کا سالار محمد حسن کھادر کو بنایا، اس لشکر میں لیکھی، کھوسے، نہمردی اور افغان بھی شامل تھے۔ اس لشکر کی تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ تھی، اس کے علاوہ اس نے سردار خاں اور اسحاق شاہ کو محمد حسن کا نائب بنایا۔

جنگ ہالانی:

میاں کا یہ لشکر جب ہالانی پہنچا، تو میر فتح علی خاں ہالانی سے چھ کوس کے فاصلے پر تھا، جب میر فتح علی خاں کو معلوم ہوا تو اس نے جنگ کے لیے صف آرائی کی۔ غلام علی اور اللہ یار نے میر فتح علی خاں سے کہا کہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا لشکر میاں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ مناسب یہ ہے کہ ہم ایک دو روز میر سہراب کا انتظار کر لیں جو صبح شام میں کمک لے کر آنے والا ہے۔ میر فتح علی خاں نے جواب دیا تم توکل کو بھول گئے، ہمیں اللہ پر بھروسا کرنا چاہیے، اور قلت و کثرت کی پروا نہ کرنی چاہیے، ہمارا مددگار خدا ہے اور وہ ہر شے پر غالب ہے۔

عرض یہ کہ میر فتح علی اس تھوڑے سے لشکر کو لے کر عبدالنبی کے کثیر لشکر کے مقابلے کے لیے جنگ کرنے نکلا، پہلے تیروں اور بندوقوں سے جنگ چلتی رہی، پھر میر فتح علی خاں نے گھوڑے سے اتر کر تلوار سنبھالی، اسی وقت میر سہراب بھی کچھ فوج کی کمک لے کر ونگہ سے پہنچا۔ محمد حسن کھادر بڑی بہادری سے لڑا، لیکن اس کے دستے کو میر سہراب نے پسپا کر دیا، اور محمد حسن، خیرہ خاں مری کے ہاتھ سے مارا گیا۔

(1) فتح نامہ عظیم، ص ۱۰۵-۱۰۶۔

اس کے بعد اس کے بھائی محمد باقر کھادر نے اس کی جگہ سپہ سالاری کا منصب سنبھالا، لیکن وہ بھی مارا گیا، پھر میر فتح علی خاں نے عام حملے کا حکم دیا، اس حملے میں میر سہراب نے سامیتہ کا اور الہداد نے تاجہ کا سر قلم کر دیا۔ میر غلام علی نے بھی سینکڑوں کو موت کے گھاٹ اُتارا، الھیار اور ٹھارہ بھی بپھرے ہوئے شیر کی طرح لڑے اور غنیم کے بہت سے لوگوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ باغہ فقیر نے بھی اس دن بہادری کے بہت جوہر دکھائے۔ اس میدان جنگ میں بقول میر عظیم ٹھٹھوی اس قدر خون بہا کہ زمین خون سے لالہ زار نظر آتی تھی۔

ز خون سیہ باطناں سر بسر
زمین لالہ زار آمد اندر نظر
چناں موج خوں بر زمیں شد رواں
کہ گردوں ہمی رفت دامن کشاں
نماند از زمین خشک یک مشتِ خاک
کہ بر سر کشد آں از غم سینہ چاک[2] (عظیم)

میاں عبدالنبی کی شکست اور فرار:

اس سخت ترین آویزش کے بعد میاں عبدالنبی کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی، میاں عبدالنبی اپنی فوج کی پسپائی کے منظر اور فرار کو دیکھ کر ایک جھیل میں گھس گیا اور وہاں سے دریا کا رخ کیا، اور سیدھا قلات پہنچا۔ اس فتح کی تاریخ "فتح علی" (۱۱۹۶ھ) سے نکلتی ہے۔

اس جنگ کے بعد کلہوڑا خاندان کی حکومت کا آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو کر ٹالپروں کی حکومت کی بنیاد پڑی اور ملک کے تمام اہل نظر و فکر نے یہ فیصلہ کیا کہ اب ملک کی زمام حکومت میر فتح علی خاں سنبھالے جو ٹالپروں میں سب سے زیادہ صاحب نظر اور مدبر ہے۔

فتح کے بعد:

اس فتح کے بعد میر فتح علی خاں نوشہرہ چلا گیا۔ میاں عبدالنبی کی فوج کا ایک سردار بلاول لیکھی بھاگ کر ہالار پہنچا، میاں عبدالنبی کے دو سردار تاجہ جتوئی اور دھنگانہ جتوئی میر کی خدمت میں حاضر ہو کر معذرت خواہ ہوئے اور وہ معافی حاصل کر کے میر کے ملازم ہو گئے۔

ادھر میاں عبدالنبی شکست کھا کر سیدھا قلات پہنچا اور نصیر خان والیِ قلات سے مدد کا ملتجی ہوا، یہ سندھ پر نئی مصیبتیں نازل کر کے قلات

(2) فتح نامہ میر عظیم، ص ۱۰۹-۱۱۰۔

پہنچا تھا، اس کے اہل و عیال حیدر آباد میں تھے، عمر کوٹ مہاراجا جودھپور کے حوالے کر چکا تھا، کراچی بندر اور کنوؤں سے سیر اب ہونے والا علاقہ میر نصیر خاں والیِ قلات کو دے چکا تھا۔ سندھ پر ان نئی مصیبتوں کو لا کر وہ قلات پہنچا تھا، نصیر خاں نے مدد کے سوال پر اس سے کہا کہ ہم نے پہلے تمہاری مدد کی لیکن تم سے کچھ نہ ہو سکا۔ جودھپور کے والی نے تمہیں مدد دی لیکن پھر بھی تم کچھ نہ بنا سکے۔ مدد خاں نے تمہیں گدی پر بٹھایا، لیکن تم اپنے عہد پر قائم نہ رہے اور خانہ بدوش ہو گئے۔ اب مجھے کیوں بار بار پریشان کرتے ہو؟ مگر اس پر بھی میاں عبدالنبی اصرار کرتا رہا، آخر مجبور ہو کر نصیر خاں کو کچھ نہ کچھ مدد دینی پڑی۔[1]

میاں عبدالنبی کی تیسری بار شکست:

نصیر خاں والیِ قلات نے خفیہ طور پر ایک خط میر فتح علی خاں کو بھیجا، جس میں لکھا کہ آپ اپنے کسی معتبر آدمی کو میرے پاس بھیجیے کہ بعض مشورے آپ سے ضروری ہیں۔ میر فتح علی خاں نے قیصر فقیر[2] کو فوراً روانہ کیا، جب یہ والیِ قلات سے ملا، تو اُس نے خلوت میں قیصر فقیر سے کہا کہ مجھے میاں عبدالنبی کی مدد سے کوئی دلچسپی نہیں، لیکن اس بے حیا کو مطلقاً شرم نہیں آتی، اب یہ تیسری مرتبہ کانٹوں کی طرح میرے دامن سے اُلجھ گیا ہے، میں نے اس سے نہایت سخت دست گفتگو کی لیکن وہ اس پر بھی گڑگڑاتا رہا اور بے غیرتی کے ساتھ اپنی مدد کے لیے مجھ سے التجا کرتا رہا، جب وہ رونے کے قریب آگیا تو میں مجبور ہو گیا اور میں نے اس سے کہا کہ میں تجھے اس شرط پر مدد دیتا ہوں کہ میری فوج تمہیں خدا باد کہنہ چھوڑ آئے گی، آگے تم جانو اور تمہارا کام۔ اب تم میری طرف سے میر فتح علی خاں سے کہہ دینا کہ وہ ہماری فوج سے جنگ نہ کرے، اس لیے کہ وہ لڑائی کے ارادے سے نہیں آئے گی، جب یہ فوج وہاں پہنچے، تو آپ شکار میں وقت گزاریں۔ قیصر فقیر یہ پیغام لے کر رخصت ہو گیا اور اس نے میر فتح علی خاں کو من و عن یہ پیغام پہنچا دیا۔ میر فتح علی خاں نے یہ پیغام سن کر محمد نصیر والیِ قلات کو خط لکھا کہ آپ نے جو پیغام مجھے بھیجا ہے، وہ مجھے قبول ہے، میں اپنا لشکر لے کر وانگہ چلا جاؤں گا اور دشمن کے لیے جگہ خالی کر دوں گا۔ آپ کی فوج شوق سے اسے چھوڑنے آئے اور دریا تک اُسے چھوڑ کر چلی جائے، لیکن اگر آپ کے لشکر نے دریا کو عبور کیا تو ہمیں اس سے دور نہ سمجھنا چاہیے، اگر ایک نے بھی دریا سے اس طرف قدم بڑھایا تو اس کا سر سلامت نہیں رہے گا۔

اس قرارداد کے بعد حسب وعدہ میر فتح علی خاں پوری مدافعت کی تیاری کر کے شکار کے لیے چلا گیا، لیکن اُس نے ہر لحہ حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کی۔[3]

میاں عبدالنبی کی ناکامی:

ادھر عبدالنبی قلات سے بروہیوں کی فوج لے کر ہتڑی ضلع سیوستان پہنچا۔ مشرق کی طرف سے جودھپوری فوج میدان جنگ میں آنے کے لیے تیار ہو گئی۔ بروہی فوج نے ہتڑی سے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا، کیونکہ نصیر خاں والیِ قلات نے انہیں منع کر رکھا تھا، جودھپوری فوج سے کہا گیا کہ وہ آگے بڑھے، انہوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ پہلے آپ دریا عبور کر کے ادھر آئیں، تب ہم جنگ کریں گے، بروہیوں سے دریا عبور کرنے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا، جب اُن کے پاس خرچ کے لیے کچھ نہ رہا تو انہوں نے میاں کا مال و اسباب لوٹ لیا اور اونٹ، گھوڑے، خیمے جو کچھ ان کے ہاتھ لگا لے کر چلتے ہوئے، جودھپوری فوج بھی یہ حال دیکھ کر واپس ہو گئی۔

میر عظیم الدین ٹھٹھوی نے اس واقعہ کی تاریخ حسب ذیل شعر میں نکالی ہے:

پئی سال ایں ماجرا در کتاب
خرد گفت تاریخ دشمن خراب[4]

۱۱۹۷ھ

تاریخ کلہوڑہ جلد دوم میں ہے کہ میاں عبدالنبی بھاگ کر سیدھا قلات پہنچا اور میر محمد نصیر خاں والیِ قلات نے اُسے حاجی پور میں بٹھا دیا۔[5]

حیدر آباد کی فتح:

جب میر فتح علی خاں کو معلوم ہوا کہ دشمن ناکام ہو کر واپس جا چکا ہے، تو وہ سیر و شکار موقوف کر کے واپس لوٹا اور خدا باد روانہ ہو گیا، جب وہ ضلع حیدر آباد میں پہنچا تو اُس نے باغہ فقیر کو حکم دیا کہ وہ نہمردیوں کو قید کر لے، نہمردیوں کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ خود آئے، اور نادم ہو کر

---

(1) فتح نامہ عظیم، ص ۱۱۴۔
(2) قیصر فقیر: وفات ۱۲۲۲ھ (فتح نامہ عظیم، حاشیہ ۱)۔
(3) فتح نامہ، عظیم ص ۱۱۶۔
(4) فتح نامہ عظیم۔ ص ۱۱۸-۱۱۹۔
(5) تاریخ کلہوڑہ، جلد دوم، ص ۸۷۶۔

اپنی خطاؤں کے لیے حلف اُٹھا کر معذرت خواہ ہوئے اور امان چاہی۔ میر فتح علی خاں نے اُن کو معاف کر دیا، پھر اُس نے غلام علی ابن قیصر فقیر اور حاجی احمد کو ککرالہ بھیجا تاکہ وہ مخالفین کی سرکوبی کریں، ککرالہ میں کامیابی کے بعد، میر فتح علی خاں شاہ پور آیا اور وہاں اُس نے حاجی احمد کو ایک کثیر فوج کے ساتھ مقرر کیا کہ وہ حیدرآباد پر حملہ کرے۔[1]

تاریخ کلہوڑہ میں ہے کہ میر فتح علی خاں نے ۱۱۹۸ھ (۱۷۷۲ء) میں حیدرآباد کو فتح کر لیا، میاں عبدالنبی کے متعلقین کو نہایت عزت و احترام سے حاجی پور بھجوا دیا، جہاں میاں عبدالنبی مقیم تھا۔ مائی بہو بیگم جو مائی دولت کے لقب سے مشہور تھی اور میاں غلام شاہ کی بڑی بیگم تھی بہاول پور چلی گئی۔ غلام شاہ کی یہ بیگم جاں نثار خاں گوجر کی بیٹی اور نواب اللہ داد خاں کی حقیقی بہن تھی۔ نواب اللہ داد اُس وقت بہاولپور میں تھا، اُسی کے پاس یہ بیگم ٹھہری، اس بیگم کے ساتھ میاں سرفراز خاں کی بیگم مائی سون بائی بھی تھی، جو نورنگ خاں جسکانی بلوچ کی بیٹی تھی۔[2]

میر فتح علی خاں اگرچہ سندھ کا فرمانروا بن چکا تھا، لیکن ابھی تک اُسے دربار افغانستان کی منظوری حاصل نہ تھی اور بغیر دربار افغانستان کی منظوری کے اُس کی حکومت تسلیم نہیں کی جاسکتی تھی، ادھر میاں عبدالنبی ڈیرہ جات میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ گدو مل جو اُس زمانے میں دربار افغانستان میں سندھ کا وکیل تھا، اُسے معلوم ہوا کہ عنقریب بحیثیت ایک فریادی کے میاں عبدالنبی تیمور شاہ کے دربار میں آنے والا ہے، اُس نے فوراً میر فتح علی خاں کو کہلا کر بھیجا کہ آپ فوراً اپنے نمائندے جو ہوش مند اور صاحب تدبیر ہوں دربار افغانستان میں روانہ کریں، میر فتح علی خاں نے ابراہیم شاہ، قیصر فقیر اور میرزا غلام علی کو اپنا نمائندہ بنا کر روانہ کیا۔

ادھر میاں عبدالنبی بھی بطور مستغیث دربار افغانستان میں پہنچ چکا تھا اور وہ ہر ایک سے اپنی مظلومیت کی داستان بیان کرتا پھرتا تھا۔ محفوظ خاں اس کا ہمنوا تھا اور اُس کی تائید میں تھا، وہ ہر ایک کو اُس کا ہمدرد بنانے کی کوشش کرتا، لیکن اُس کی برگشتگیٔ تقدیر سے بے خبر تھا۔ اسی عرصے میں میر فتح علی خاں کے نمائندے دربار شاہی میں پہنچے اور انہوں نے وہ معروضہ تیمور شاہ کے سامنے پیش کیا، جو میر فتح علی خاں نے ان کے ہاتھ بھجوایا تھا۔[3]

(1) فتح نامہ عظیم، ص ۱۱۹-۱۲۰۔
(2) تاریخ کلہوڑہ، جلد دوم، ص ۸۷۶-۸۷۷۔
(3) فتح نامہ، عظیم ص ۱۲۳۔

معروضہ:

میر فتح علی خاں نے اس معروضے میں لکھا تھا کہ اے شاہ نامدار سرداروں کو آپ کی غلامی پر فخر ہے۔ میاں عبدالنبی نے میری شکایت آپ کے دربار میں پہنچائی ہوگی، لیکن بادشاہ سے کوئی حقیقت حال پوشیدہ نہیں۔ مظالم اس قدر واضح ہیں کہ میں اُن کی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اسی کے مظالم سے میر عبداللہ اور میر فتح علی خاں نے شہادت پائی اس نے قرآن مجید پر معاہدہ لکھ کر اس کی خلاف ورزی کی ہے، اس نے قرآن مجید کا بھی احترام نہیں کیا۔ ابتداء میں اس نے اپنے بھائیوں کے ساتھ جو کچھ کیا وہ بھی حضور سے پوشیدہ نہیں۔ ان سب نے اس کے ظلم و ستم کا شکار ہو کر جان دی، ان حالات میں اے خسرو ذیجاہ! کسی طرح مناسب نہیں کہ یہ ظالم آپ کی بارگاہ میں بار پائے۔[4]

تیمور شاہ کا فیصلہ:

تیمور شاہ نے بغیر کسی غور و فکر کے فیصلہ کر دیا کہ سندھ دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، ایک حصے پر ٹالپر قابض ہوں، اور دوسرے حصے پر میاں عبدالنبی کا قبضہ رہے۔ میاں عبدالنبی نے عرض کیا کہ میر فتح علی خاں کے پاس خاصی فوج ہے، مجھے نصف ملک پر کیسے قبضہ مل سکتا ہے میرے ساتھ شاہی فوج کی جائے، اس پر تیمور شاہ نے بوستان خاں اور اخلاص خاں دو افغانی سرداروں کو فوج دے کر اس کے ساتھ بھیج دیا۔ میر کے نمائندوں نے یہ سارا واقعہ لکھ کر میر کو بھیج دیا۔[5]

میر فتح علی خاں کا ردعمل:

جب میر فتح علی خاں کو دربار افغانستان کے اس فیصلے کا علم ہوا تو اس نے اپنی جگہ طے کر لیا کہ وہ اس فیصلے کو قبول نہ کرے گا۔ وہ فوراً چالیس ہزار بہادر بلوچوں کے ساتھ روہڑی کی طرف روانہ ہو گیا، تاکہ عبدالنبی اور اس کی فوج جو وہ لے کر آرہا ہے، اُسے سندھ کے شمالی سرے پر ہی روک لے۔ ادھر میر کے نمائندے دربار افغانستان میں اس کوشش میں لگے رہے کہ سندھ کی تقسیم کا فرمان کسی طرح منسوخ ہو جائے۔

ادھر میاں عبدالنبی کو میر فتح علی خاں کی آمد کی خبر مٹھن گڑھ ضلع ڈیرہ جات میں ملی۔ اس کے ساتھی اس قدر کثیر فوج کا نام سن کر

(4) ایضاً۔ ص ۱۲۴۔
(5) فتح نامہ عظیم ٹھٹھوی، ص ۱۲۴-۱۲۵۔

جنگ سے جی چرانے لگے۔ اُنہوں نے وہیں سے دربار شاہی میں معروضہ بھیجا کہ میر فتح علی خاں چالیس ہزار فوج کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ آپ کو ہماری فوجی طاقت کا علم ہے، اب جو حکم ہو اُس کی تعمیل کی جائے۔ اس عرصے میں میاں عبدالنبی کا حمایتی محفوظ خاں وفات پا چکا تھا، اور میر کے نمائندے دربار شاہی میں رسوخ حاصل کر چکے تھے۔ میر کے نمائندوں نے بوستان خاں اور اخلاص خاں کے نام فرمان حاصل کر لیا کہ سندھ کی تقسیم منسوخ کی جاتی ہے۔ اس لیے ہماری فوج واپس آجائے۔ اسی کے ساتھ میر کے نمائندوں کے ہاتھ دربار شاہی سے میر کے لیے خلعت اور سندھ کی نظامت کا پروانہ بھیجا گیا۔ افغانی فوج مٹھن گڑھ سے واپس لوٹ گئی، اس طرح سندھ دو حصوں میں تقسیم ہونے سے بچ گیا اور تنہا میر فتح علی خاں کو سندھ کی حکومت تفویض ہوئی۔ میر عظیم الدین نے اس واقعہ کی تاریخ "زدل خلعت ملکی آمد ندا" سے نکالی ہے۔[1]

۱۱۹۹ھ

فتح آباد کی بنیاد:

میر فتح علی خاں نے اس خرخشے سے نجات پا کر اطمینان کا سانس لیا اور ایک نئے شہر فتح آباد کی بنیاد رکھی۔ اس میں تالاب اور محل بنوایا۔ جس کی خوبصورتی کا نقشہ میر عظیم الدین نے فتح نامہ میں تفصیل سے کھینچا ہے۔[2]

ٹالپروں میں پھوٹ:

اس کے بعد کچھ دن میر فتح علی خاں اطمینان و سکون سے حکومت کرتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ ملک کی وحدت پارہ پارہ نہ ہو، اور ٹالپر آپس میں شیر و شکر رہیں، چنانچہ اُس نے ان تمام مصالح کے پیش نظر آمدنی کے لحاظ سے ملک کے سات حصے کیے، چار حصے اپنے اور اپنے تین بھائیوں کے لیے رکھے، دو حصے میر سہراب خاں کو دیے اور ایک حصہ میر ٹھارہ خاں کو دیا، لیکن یہ تقسیم میر سہراب اور ٹھارہ خاں کو پسند نہ آئی، وہی میر فتح علی خاں جو ان سب کی آنکھ کا تارا بنا ہوا تھا، اب انہیں اس کا اقتدار ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ خود مستقل طور پر اقتدار حاصل کریں، چنانچہ میر سہراب چپکے سے نکل کر روہڑی پہنچا اور وہاں اُس نے قوت حاصل کر کے اپنے لیے مستقل اقتدار حاصل کر لیا۔ اسی سے ریاست خیرپور کی بنیاد پڑی۔ ٹھارہ خاں یہاں سے نکلا اور اُس نے شاہ بندر پہنچ کر وہاں اپنے استقلال کے ڈنکے بجائے۔ اس طرح سندھ کے تین مرکز بن گئے اور ہر ایک کی طرف سے علیحدہ علیحدہ خراج کی رقمیں دربار شاہی میں پیش ہوتی تھیں۔[3]

میاں عبدالنبی کی فریب کاریاں:

میاں عبدالنبی جو ڈیرہ جات میں پانچ چھ سال سے مارا مارا پھر رہا تھا، اُسے جب یہ خبر ملی کہ ٹالپروں میں اختلاف رونما ہو چکا ہے، تو اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اُس نے فوراً میر قمرالدین کے ذریعہ دربار افغانستان میں معروضہ بھیجا کہ آپ نے اگرچہ مجھ پر بارہا مہربانیاں فرمائیں، لیکن میرا مقدر ناساز گار رہا، اب میرے لیے ایک نادر موقع پیدا ہو چکا ہے، ٹالپروں میں اختلاف رونما ہو چکا ہے، اور اُن میں سے اکثر روگرداں ہو چکے ہیں، اگر اس وقت آپ میری مدد فرمائیں تو میری کامیابی یقینی ہے، اگر میں اس مرتبہ بھی ناکام ہو گیا تو پھر کبھی میں امداد کا طالب نہیں ہوں گا۔

فریر نامہ میں ہے کہ ساتھ ہی اُس نے یہ بھی لکھا کہ میر سہراب نے مجھے لکھا ہے کہ اگر میں اُس کے پاس جاؤں تو وہ میرا ساتھی بن جائے گا کیونکہ اُسے میر فتح علی خاں سے خوف لگا ہوا ہے، اگر حضور اس موقع پر میری مدد فرمائیں تو کیا عجب ہے کہ میرا مقدر ساز گار ہو اور میں اپنے آباو اجداد کے ملک کو اپنے معاندوں سے حاصل کر لوں۔[4]

میاں عبدالنبی کے لیے نیا فرمان:

میر قمرالدین کی بھاگ دوڑ اور کچھ تیمور شاہ کے رحم کھانے کی وجہ سے ۱۲۰۲ھ (۱۰۸۸ء) میں میاں عبدالنبی کو سندھ کی حکومت کا پروانہ مل گیا، تیمور شاہ نے سردار احمد خان نورزئی اور بوستان خان کو ایک کثیر لشکر دے کر حکم دیا کہ وہ سندھ کو حاصل کر کے میاں عبدالنبی کو مسند حکومت پر بٹھائیں، ادھر محمد نصیر والی قلات کے نام بھی حکم صادر ہوا کہ وہ اس مہم میں ہمارے سرداروں کو مدد دے۔ اس کے علاوہ ڈیرہ جات سے بھی لشکر جمع کیا گیا، یہاں تک کہ یہ فوج دریائے ملتان کو عبور کر کے بہاولپور پہنچی، مخدوم بہاول والی بہاولپور دہشت سے قلعہ میں گوشہ گیر ہو گیا۔ اس کے علاقے میں وہ لوٹ مار ہوئی کہ رعایا مفلس ہو گئی، دو ماہ تک یہ لشکر اس علاقے میں مقیم رہا اور اس سارے علاقے کو تباہ و برباد

---

(1) فتح نامہ عظیم، ص ۱۲۶۔

(2) ایضاً۔ ص ۱۲۸۔

(3) ماخوذ از تاریخ کلہوڑہ، جلد ۲، ص ۸۸۲-۸۸۳۔

(4) تاریخ کلہوڑہ، جلد ۲، ص ۸۸۳ بحوالہ فریر نامہ، ص ۱۱۰۔

کرتا رہا۔[1]

پھر اس لشکر نے سندھ کا رخ کیا، جب یہ لشکر خیر پور کے قریب پہنچا تو احمد خاں نورزئی نے اپنی جانب سے میرزا سہراب کو اور میاں عبدالنبی نے اپنی طرف سے اپنے بیٹے تاج محمد خاں اور تاجہ لیکھی، سلطان لیکھی اور شیخ قمر الدین کو اپنا وکیل بنا کر میر سہراب کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ اگر تم اس وقت ہماری مدد کروگے تو آیندہ تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جائے گا، لیکن میر سہراب اس فریب میں نہ آیا، اور اُس نے فوراً میر فتح علی خاں کو قرآن مجید پر عہد لکھ کر تحریر کیا کہ میرے اور آپ کے درمیان یہ کلام اللہ ہے، میں مخالفوں سے جنگ کے لیے بالکل تیار اور آپ کے لیے چشم براہ ہوں، امید ہے کہ آپ اپنے لشکر فتح ظفر کے ساتھ اسی طرف روانہ ہوں گے، اور میں بھی آپ کے لشکر کے ساتھ مل جاؤں گا اور ہم مل کر اس کا دماغ درست کریں گے۔

ادھر افغانی لشکر پیش قدمی کرتا ہوا روہڑی ہوتے ہوئے ہالہ کنڈی پہنچ گیا اور وہاں سے میر فتح علی خاں کو شاہ تیمور کا فرمان بھیج دیا کہ یا تو سندھ کی حکومت چھوڑ کر چلا جائے، ورنہ سخت سزا پائے گا۔ میر فتح علی خاں کو جب افغانی سرداروں کا یہ پیغام ملا، تو اُس نے اپنے امیروں سے مشورہ کیا، اُن کے مشورے کے بعد اہل و عیال کو کچھ اور جیسلمیر بھیج دیا اور خود مقابلے کے لیے نکل پڑا۔ میر فتح علی خاں نے پہلا کام یہ کیا کہ افغانوں نے جابجا راستوں میں عبور کرنے کے لیے جو پُل بنائے تھے، وہ توڑ دیے۔ جب دشمن کا لشکر دو منزل کے فاصلے پر رہ گیا، تو میر سہراب اپنے وعدے سے منحرف ہو کر قلعہ شاہ گڑھ میں جا بیٹھا، اُسے اندیشہ ہوا کہ اگر میر فتح علی خاں کو شکست ہوئی تو اُس کی ریاست چھن جائے گی، اس لیے بہتر یہ ہے کہ دونوں سے علیحدہ رہ کر اس جنگ کا تماشا دیکھا جائے۔[2] میر فتح علی خاں کو جب میر سہراب کے جانے کی خبر معلوم ہوئی، تو فریر نامہ میں ہے کہ اس خبر کو سن کر اس نے کہا حسبی اللہ و نعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیر، اگر اُس نے قلعے میں پناہ لی ہے تو میں حافظ حقیقی کے حصار میں پناہ حاصل کرتا ہوں۔[3]

افغانوں سے جنگ:

فتح نامہ میں ہے کہ اس کے بعد میر فتح علی خاں نے اپنی فوج کو جنگ کی تیاری کا حکم دیا، دونوں فوجوں کے درمیان ایک نالہ حائل تھا، میر فتح علی خاں کے پاس دس ہزار فوج تھی اور احمد خاں نورزئی کے ساتھ چالیس ہزار کا لشکر تھا۔ احمد خان نورزئی نے اپنے لشکریوں کو حکم دیا کہ تم چالیس ہزار ہو اور میر فتح علی خاں کے پاس صرف دس ہزار فوج ہے، بندوقوں سے ایسی صف بندی کرو کہ دشمن نالے کو عبور کرنے نہ پائے اور نالے پر اس طرح قبضہ رکھو کہ دشمن کو ایک قطرہ پانی نہ مل سکے، کیونکہ یہاں سے دس دس کوس تک کہیں پانی نہیں، اگر تم نے اس نالے پر قبضہ رکھا اور پانی کا قطرہ دشمن کے لشکر میں نہ پہنچنے دیا تو تم کامیاب ہوگے اور دشمن ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جائے گا۔ یہ نالہ بہت وسیع اور گہرا تھا اس لیے اس کا عبور کرنا مشکل تھا، جب میر فتح علی خاں کی فوج نالے کے اس کنارے پر پہنچی تو دشمن کی فوج نے گولیاں برسانی شروع کر دیں اور اس قدر سخت جنگ ہوئی کہ بقول میر عظیم الدین کے:

شد از ہر دو سو راست جنگ تفنگ
ہوا تا فلک برد غوغائے جنگ
ز آوازہ طبل و صدائے تفنگ
گریزاں شد از بیشہ شیر و پلنگ
تفنگ آنچناں تیز باراں نمود
کہ در لحظہ صد خانہ ویراں نمود
چناں کار بندوق بالا گرفت
کہ آتش بدامانِ صحرا گرفت

میر فتح علی خاں نے جب بندوق کی لڑائی کا یہ رنگ دیکھا تو اُس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ تلواروں سے حملہ آور ہو اور نالے میں کود پڑے اور دشمن کو مار کر بھگا دے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور میر فتح علی خاں کی فوج نے بغیر کسی کشتی اور پُل کے دریا کو عبور کر لیا اور افغانی فوج پر تلواروں سے حملہ کیا اور دشمن کے پرخچے اُڑا دیے، جس کی وجہ سے دشمن کی فوج تتر بتر ہو گئی۔ افغانی فوج اس طرح بھاگی کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ عبدالنبی، احمد خاں نورزئی اور بوستان خاں نے جب یہ رنگ دیکھا تو خود بھی بھاگ کھڑے ہوئے اور تین کوس کے فاصلے پر جا کر تینوں نے دم لیا۔ میر فتح علی خاں کی فوج بھاگنے والوں کا تعاقب کرنے لگی۔ افغانی فوج کے سرداروں نے جب اپنی شکست خوردگی کو اچھی طرح محسوس کر لیا تو انہوں نے میر فتح علی خاں کے پاس ایک ایک آدمی قرآن مجید دے کر بھیجا کہ قرآن مجید کے طفیل میں ان

---

(1) فتح نامہ عظیم، ص ۱۳۳-۱۳۴۔
(2) فتح نامہ۔ عظیم، ص ۱۳۷-۱۳۸۔
(3) ایضاً۔ ص ۱۳۹۔

کی جاں بخشی کرے، امیر فتح علی خاں کے پاس جب یہ قاصد قرآن مجید لے کر پہنچا تو میر فتح علی خان قرآن مجید کی تعظیم بجالایا اور اُس نے فوراً اپنے سواروں کو روانہ کیا کہ وہ تعاقب کرنے والوں کو روک دیں اور لشکر میں عام منادی کرائی کہ اب کوئی شخص دشمن پر کسی قسم کا حملہ نہ کرے۔

میر عظیم الدین نے اس شاندار فتح کی تین تاریخیں فتح نامہ میں دی ہیں، جنہیں ہم فتح نامہ سے یہاں نقل کرتے ہیں۔[1]

۱۔ بفرمود حق سال نصرت قریں
ز "انا فتحنالک فتحاً مبین"

۱۲۰۲ھ

۲۔ ز دل سال ایں فتح شد منجلی
بحکم از ازل فتح فتح علی

۱۲۰۲ھ

۳۔ ہمیں سال فتح مبارک علی
بہ فتح علی حکم فتح ازل

۱۲۰۲ھ

تیمور شاہ کا جوشِ انتقام:

تیمور شاہ کو جب احمد خاں نورزئی کی شکست کا حال معلوم ہوا تو وہ نہایت غضبناک ہوا اور مدد خاں اور کثیر لشکر کو لے کر ملتان پہنچا، وہیں قلات کا رئیس ایک کثیر فوج لے کر اس سے آملا، تیمور شاہ نے حکم دیا کہ پہلے ہمیں بہاولپور پہنچ کر داؤد پوتروں کو سزا دینی چاہیے کہ جنہوں نے شاہی لشکر کی مدد نہیں کی۔ ہر ایک مجھ سے یہی بیان کرتا ہے کہ داؤد پوترے باغی ہیں، مدد خاں اور فوج کے دوسرے سرداروں نے پہلے بہاول نگر پر قبضہ کرلیا اور ان کے ہاتھوں بہاولپور پر بڑی تباہیاں آئیں۔

ادھر جب تیمور شاہ قندھار سے روانہ ہونے لگا تھا تو اس کی اطلاع میر فتح علی خاں کو دے دی گئی تھی کہ بادشاہ سندھ آنے والا ہے۔ جب یہ خبر بار بار میر فتح علی خاں کو ملی تو میر فتح علی خاں نے اپنے مصاحبوں سے کہا کہ میں تو بادشاہ کا غلام ہوں، مجھے اس کی اطاعت کے بغیر کوئی چارہ نہیں، میرا ہرگز بادشاہ سے جنگ کا ارادہ نہیں۔ بلکہ جب بادشاہ یہاں آئے گا تو میں یہ قطعہ زمین جس پر میں قابض ہوں اس کی نذر کر کے کسی اور سمت چلا جاؤں گا۔ اگر وہ کسی اور [illegible] کا مالک بنانا چاہے تو میں اس کے لیے بھی حاضر ہوں۔[2]

لیکن تیمور شاہ بہاولپور ہی سے واپس لوٹ گیا، پھر پائندہ خان بارک زئی کو میاں عبدالنبی کے ساتھ سندھ بھیجا اور اس سے کہا کہ تمہیں جنگ نہیں کرنی چاہیے، بلکہ ایسی تدبیر اختیار کرنی چاہیے کہ میر فتح علی خاں تمہاری اطاعت اختیار کرے، ادھر محمد نصیر خاں والیِ قلات کے نام حکم جاری کیا کہ وہ اپنا تمام لشکر لے کر خاں کے ساتھ ہو۔ ادھر میر فتح علی خاں کے وکیل شاہی دربار میں کوشاں تھے کہ کسی طرح فیصلہ ان کے حق میں ہو جائے۔ اسی عرصے میں پائندہ خاں داؤد پوتروں کی سرحد میں داخل ہوا، یہیں اس کے ساتھ محمد نصیر خاں والیِ قلات ایک کثیر فوج لے کر آملا، جس کی وجہ سے پائندہ خاں کو بڑی تقویت پہنچی، پھر یہ دونوں مل کر سندھ کی طرف بڑھے۔[3]

آخر میں وکلا کی کوششوں سے تیمور شاہ نے فرمان جاری کیا کہ پائندہ خاں اور نصیر خاں فوراً واپس آجائیں، اُس وقت یہ دونوں لاڑکانہ میں تھے کہ انہیں بادشاہ کا فرمان ملا کہ ٹالپروں کے گناہ معاف کر دیے گئے انہوں نے روپیہ خزانے میں داخل کر دیا ہے اور کلہوڑوں سے بڑھ کر خدمت گزاری کا عہد کیا ہے۔ اس فرمان کے ملتے ہی یہ دونوں واپس ہو گئے۔

اب میاں عبدالنبی تنہا رہ گیا۔ اس نے جب یہ رنگ دیکھا تو وہ پریشان ہو کر بھاگا۔ پریشانی اور اضطراب کا یہ عالم تھا کہ دو گھوڑے اس کی سواری میں ہلاک ہو گئے، تیسرے گھوڑے پر وہ حاجی پور پہنچا۔

میاں عبدالنبی کا حشر:

میاں عبدالنبی کا بیٹا محمد عارف جودھپور میں مدت سے اس انتظار میں مقیم تھا کہ شاید مہاراجا کی طرف سے کوئی امداد کی صورت نکل آئے، اور سندھ کی حکومت کسی طرح مل جائے لیکن جب وہ بالکل مایوس ہو گیا تو وہ بہاولپور کے مشہور مقام ڈیراوڑ میں پہنچا۔ والیِ بہاولپور نے اس کی مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، عبدالنبی کی درخواست اور نواب امین الملک کی سفارش پر بھکر اور لیہ کے علاقے بطور جاگیر ان کو مل گئے اور چالیس ہزار روپے بطور امداد عطا ہوئے۔

لیکن تقدیر میاں عبدالنبی کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ ۱۲۰۷ھ (۱۷۹۳ء) میں تیمور شاہ کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا زمان شاہ تخت پر بیٹھا، اس کے کارندوں نے میاں عبدالنبی سے مالیے کی ایک لاکھ بیس ہزار کی رقم کا جو اس کے ذمے باقی نکلتی تھی سختی سے مطالبہ کیا۔ جب میاں

---

(1) فتح نامہ عظیم، ص ۱۴۰۔

(2) فتح نامہ عظیم، ص ۱۴۷-۱۴۹۔

(3) ایضاً۔ ص ۱۶۴۔

عبدالنبی کے لیے کوئی چارہ نہ رہا تو اس نے امین الملک کے ذریعہ سے یہ تصفیہ کرایا کہ میاں عبدالنبی پانسو اونٹ پیش کردے اور جب تک یہ اونٹ پیش نہ ہوں اس کا پوتا غلام علی جس کی عمر اس وقت دس سال کی تھی بطور یرغمال رکھا جائے لیکن یہ شرط منسوخ ہوئی اور بعد میں اس بچے کو امین الملک کی سفارش پر یرغمال کی مصیبت سے نجات ملی۔

میاں عبدالنبی سے اگرچہ مالیہ وصول کرنے میں حکومت کا رویہ نرم تھا، لیکن اس کے باوجود وہ رقم کا کچھ حصہ بھی ادا نہ کرسکا، اس پر میاں عبدالنبی نے مزید یہ غضب کیا کہ جب زمان شاہ نے اسے حکم دیا کہ وہ قندھار کی مہم میں شریک ہو، تو اس نے یہ حکم نہ مانا، جس پر زماں شاہ کو اس قدر غصہ آیا کہ میاں کی جاگیر ضبط کرلی اور نواب محمد خاں کو اس جاگیر کا ناظم مقرر کردیا۔ جب نواب محمد خاں اس جاگیر پر قبضہ لینے کے لیے آیا تو میاں اس کے مقابلے کے لیے تیار ہوگیا اور میاں کا بیٹا محمد عارف میدان میں نکلا، اور اس بہادری سے لڑا کہ نواب محمد خاں اور اس کے ساتھیوں کو فرار پر مجبور کردیا، ان میں سے کچھ آدمی ایک کھیت میں چھپ گئے، محمد عارف جب اپنے ساتھیوں کو لے کر تعاقب کرتا ہوا اس کھیت کے پاس پہنچا، تو ان لوگوں نے اندھا دھند گولیاں چلائیں، ایک گولی محمد عارف کو لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ تاجہ لیکھی کا بیٹا راجا بھی اسی لڑائی میں مارا گیا۔ جوان بیٹے کی موت نے میاں کی کمر توڑ دی اور تمام علاقے نواب محمد خان کے حوالے کرکے، بیٹے کو لیہ میں دفن کیا اور خود اہل وعیال کو لے کر جودھپور روانہ ہوگیا۔

۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) میں جب میاں عبدالنبی جودھپوریوں سے ناراض ہوکر بہاولپور آیا تو خواجہ لطافت علی ناظر کی کوششوں سے جو اس خاندان کا زر خرید غلام تھا راجن پور ضلع ڈیرہ غازی خان کا علاقہ میاں کو مل گیا، لیکن یہاں اس پر نئی مصیبت یہ آئی کہ جس گھر میں یہ رہتا تھا اس میں آگ لگ گئی، سارا زر و جواہر اور قیمتی سامان جل کر خاک ہوگیا، صرف ایک موتی بچ رہا تھا، اس کی بھی آگ کی حرارت کے سبب آب و تاب جاتی رہی تھی، غریب نے اسے بیکانیر کے شاہوکاروں کے پاس چار پانچ ہزار میں گروی رکھ کر خانہ داری کا سامان از سر نو خریدا۔

میاں عبدالنبی کی وفات:

۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) میاں عبدالنبی نے راجن پور ہی میں وفات پائی اور اس پر خاندان کلہوڑہ کا اسی سالہ دور حکومت ختم ہوگیا۔ میاں کے تین فرزند تھے (۱) محمد عارف جو لیہ میں دفون ہے (۲) تاج محمد متوفی ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) جو راجن پور کی جاگیر کا وارث بنا (۳) فضل علی خاں جو بعد میں حاجی پور میں مقیم ہوگیا۔[1]

کلہوڑادور حکومت پر تبصرہ:

۱۔ کلہوڑہ دور حکومت کے جب ہم تعمیری اور اصلاحی کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں، تو ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ انہوں نے سندھ کی جغرافی وحدت کو بحال رکھنے کے لیے انتہائی کوشش کی۔ یار محمد خاں اور نور محمد خاں کے دور حکومت میں ہمیں اس کے نقوش واضح طور پر ملتے ہیں۔

۲۔ کلہوڑہ حکمرانوں نے ملک میں آبپاشی اور زراعت کو ترقی دی اور اس طرح ملک کے وسائل معیشت کو بہتر بنانے کے لیے انتہائی کوشش کی۔ میاں نور محمد نے اپنے دور حکومت میں تین بڑی نہریں کھدوائی تھیں جن میں دو بیس بیس میل لمبی اور ایک دس میل لمبی تھی۔ اس طرح ملک کی زراعت میں ترقی ہوئی اور اس عمل سے ملک کی آبادکاری میں مدد ملی اور لوگ اخلاقی جرائم کو چھوڑ کر اپنی روزی کمانے میں لگے۔

۳۔ کلہوڑہ حکمرانوں نے اپنے دور حکومت میں ملک میں امن و امان کی بحالی کے لیے بھی انتہائی کوشش کی اور اس طرح عوام میں خوش حالی اور اطمینان کو بحال کیا۔

علوم وفنون:

کلہوڑہ دور حکومت میں علوم وفنون کو بھی خاصی ترقی ہوئی۔ مولانا غلام رسول مہر نے تاریخ کلہوڑہ جلد دوم میں اس خصوص میں کپتان ہملٹن کی ایک شہادت پیش کی جو ۱۶۹۹ میں ٹھٹھہ آیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ:

> شہر ٹھٹھہ دینیات، لسانیات اور سیاسیات کی تدریس و تعلیم کے سلسلے میں خاص شہرت کا مالک ہے، وہاں چار سو کالج ہیں، جن میں نونہالوں کو ان علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔[2]

اس ایک شہر کی تعلیمی حالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک میں تعلیم کا کس قدر چرچا ہوگا۔

کلہوڑہ دور کے علماء وفضلا، شعراء وادیب:

کلہوڑہ دور کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہمیں ان کے دور

---

(1) یہ تمام تفصیل تاریخ کلہوڑہ جلد دوم، ص ۸۹۴ تا ۸۹۹ سے ماخوذ ہے۔

(2) تاریخ کلہوڑہ جلد ۲، ص ۹۷۷ بحوالہ سندھ کے اقتصادی حالات ص ۱۳۴۔

میں بڑے بڑے علماء و شعرا و ادیب ملتے ہیں جنہوں نے سندھ کے نام کو روشن کیا اور جن کی بدولت سندھ میں علم و فضل کو غیر معمولی ترقی ہوئی، ہم ان میں چند کا مختصر آتذکرہ یہاں کرتے ہیں۔

مخدوم محمد معین:

مخدوم محمد معین بن مخدوم محمد امین بن مخدوم طالب اللہ لاکھ دل (المتوفی ۱۱۶۱ھ) اس دور کے جلیل القدر علماء میں تھے، تحفتہ الکرام میں ہے کہ مخدوم محمد معین مخدوم عنایت اللہ کے شاگرد تھے، خدائے تعالیٰ نے اس ذات ستودہ صفات کو اپنے وقت کے جملہ فنون کمال کا جامع پیدا کیا تھا، ان کے جد امجد مخدوم طالب اللہ موضع "والی" تعلقہ روہاہ وپٹ باراں کے رہنے والے تھے۔ مخدوم محمد معین کے والد مخدوم محمد امین نے موضع والی کی سکونت ترک کرکے ٹھٹھہ میں سکونت اختیار کی۔ مخدوم محمد معین نے یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی اور علوم معقول و منقول میں کمال حاصل کرکے علامہ وقت بن گئے۔ علم و فضل میں کمال حاصل کرنے کے بعد میاں ابو القاسم نقشبندی[1] کے مرید ہوئے۔ آخری زمانے میں شاہ عبد اللطیف بھٹائی ملقب بہ 'تارک' سے بھی بہت دوستانہ و یارانہ رہا۔

راگ اور سماع کے بڑے شائق تھے، علم موسیقی سے خوب واقف تھے، ہندی اور فارسی میں شعر کہتے تھے، فارسی میں تسلیم، ہندی میں پیراگی تخلص کرتے تھے، صاحب تصانیف کثیرہ تھے، ان کی تصانیف میں حسب ذیل کتابوں کا پتا چلتا ہے۔

۱۔ رسالہ اویسیہ (فارسی) جس میں طریقہ اویسیہ پر بحث کی گئی ہے۔

۲۔ شرح رموز عقائد الصوفیہ: یہ رسالہ انہوں نے نواب مہابت خاں[2] کی تحریک پر لکھا تھا۔

۳۔ ۴۔ دو رسالے اثبات رفع یدین کے بارے میں ہیں (رکوع اور سجدے میں) ان میں سے ایک رسالہ عربی میں ہے اور ایک فارسی میں۔

۵۔ رسالہ در تردید ابن الھمام: اس رسالے میں اس پر بحث کی گئی ہے کہ امامت میں قاری، اعلم پر مقدم ہے۔

۶۔ ایقاظ الوسنان۔

۷۔ غایتہ الفسخ لمسئلہ الفسخ

۸۔ رسالہ در تحقیق اہل بیت مذکورہ در آیت تطہیر۔

۹۔ رسالہ در بحث حدیث المصراۃ۔

۱۰۔ غایتہ الایضاح فی المحاکمۃ بین النووی و ابن الصلاح۔

۱۱۔ ابراز الضمیر للمنصف الخبیر۔

۱۲۔ انوار الوجد من مخ المجد۔

۱۳۔ رسالہ در تنقید بر دو مقام از فتح القدیر۔

۱۴۔ رسالہ در تحقیق معنی حدیث "لانورث ماترکنا صدقۃ"۔

۱۵۔ مواھب سید البشر فی حدیث الائمۃ الاثنی عشر۔

۱۶۔ رسالہ قرۃ العین فی البکاء علی الامام الحسین۔

۱۷۔ الحجۃ الجلیہ فی نقض الحکم بالافضلیہ۔

۱۸۔ رسالہ در اثبات اسلام ابی طالب۔

۱۹۔ رسالہ در بحثِ تناسخ۔

۲۰۔ دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنۃ بالحبیب۔

ان کی وفات کے حالات میر علی شیر قانع نے تحفتہ الکرام میں لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ شاہ عبد اللطیف بھٹائی نے ایک روز اپنے گاؤں میں اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں سے فرمایا کہ چلو اپنے دوست کے آخری دیدار کے لیے چلیں، یہ کہہ کر آپ ٹھٹھہ آئے اور محفل سماع منعقد ہوئی، مخدوم محمد معین بھی اس محفل میں شامل ہوئے، محفل سماع شباب پر تھی کہ عین سرمستی و ذوق کے عالم میں مخدوم محمد معین اُٹھے اور اندر تشریف لے گئے، اسی عالم میں واصل الی اللہ ہوئے۔ شاہ بھٹائی نے ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت فرمائی، جب ٹھٹھہ سے رخصت ہونے لگے تو فرمایا ٹھٹھہ میں ہمارا آنا اس عزیز دوست کے لیے تھا، آج یہ بھی ختم ہوا۔

مخدوم محمد معین اپنے مرشد مخدوم ابو القاسم نقشبندی کے پائیں میں مکلی میں مدفون ہوئے۔ مخدوم معین کی وفات پر متعدد شعرا نے تاریخ ہائے وفات کہیں، جن میں سے چند یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

محسن ٹھٹھوی[3] جو اس دور کا مشہور شاعر تھا، اس نے اپنے قطعہ تاریخ میں حسب ذیل شعر کے مصرع ثانی میں آپ کی تاریخ وفات نکالی ہے۔

---

[1] مخدوم ابو القاسم معروف بہ حضرت نقشبندی، لقب نور الحق، مرید و خلیفہ شاہ سیف الدین نبیرۂ حضرت مجدد الف ثانی وفات، ۷ شعبان ۱۱۳۸ھ: مدفن مکلی (تذکرہ صوفیائے سندھ، ص ۶۰۱)۔

[2] نواب مہابت خاں کاظم بن محمد منعم خاں صوبیدار ٹھٹھہ از ۱۱۳۲ھ تا ۱۱۳۵ھ وفات ۱۱۳۵ھ، تاریخ وفات رضی عنہ (رک: مقالات الشعراء حاشیہ نمبر ۱، ص ۱۱۰)۔

[3] محمد حسن بن نور محمد بن ابراہیم بن یعقوب ٹھٹھوی: وفات ۲۰ شوال ۱۱۶۳ھ (رک: مقالات الشعراء، ص ۷۰۲-۷۳۵)۔

لاجرم سال فوت او گفتند
قطرۂ دُر بحر واصل شد

۱۱۶۱ھ

ایک اور شاعر محمد پناہ رجا[1] نے اپنے قطعۂ تاریخ کے اس شعر میں آپ کی تاریخ وفات نکالی ہے۔

آمد بسالِ رحلتِ او ایں ندا ز غیب
ناجی شد او کہ آل محمد معین اوست[2]

۱۱۶۱ھ

مخدوم محمد ہاشم:

مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی بن عبدالغفور بن عبداللطیف بن عبدالرحمان بن خیرالدین سندھی بتورائی ۱۰ ربیع الاول ۱۱۰۴ھ (۱۶۹۲ء) میں پیدا ہوئے۔ مخدوم ضیاء الدین کے شاگرد تھے، علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے، ساری عمر تبلیغ دیں، احیائے سنت اور ترویج شریعت کرتے رہے، چونکہ آپ کی زبان میں تاثیر اور قلم میں طاقت تھی، اس لیے آپ کی تبلیغ سے بہت سے ذمی مسلمان ہوئے۔ مخدوم محمد ہاشم نے اُس وقت کے سلاطین نادر شاہ اور احمد شاہ کو پُر زور خطوط لکھے۔ مخدوم محمد ہاشم کی مختلف علوم پر متعدد تصانیف ہیں، جنہوں نے آپ کے نام کو عرب و عجم میں روشن کر دیا۔ مخدوم محمد ہاشم کے نواسے مخدوم غلام محمد کا بیان ہے کہ آپ کی تصانیف کی تعداد (۱۵۰) ہے، جن کے نام سید حسام الدین راشدی نے تکملۂ مقالات الشعراء کے فٹ نوٹس صفحہ ۵۲ تا ۵۹ پر دیے ہیں۔ مخدوم محمد ہاشم نے ۶ رجب ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۱ء) میں وفات پائی، اور مکلی میں مدفون ہوئے۔[4]

مخدوم عبدالرؤف:

کلہوڑہ دور کے علماء و فضلا میں مخدوم عبدالرؤف بھی بڑے صاحبِ علم و فضل بزرگ تھے۔ تحفۃ الکرام میں ہے کہ مخدوم عبدالرؤف بن مخدوم عمر اپنے وقت کے عارف کامل تھے، وہ ہوش سنبھالنے سے لے کر وفات تک حسن اخلاق سے مزین رہے، ان کا تمام وقت عبادت و ریاضت میں صرف ہوتا تھا، ان کی کرامتیں بے شمار ہیں۔ میاں نور محمد کلہوڑہ ان کا بے حد خدمت گزار تھا اور اُن کے ارشاد کی تعمیل کے لیے ہر وقت بسر و چشم تیار رہتا تھا۔ مخدوم عبدالرؤف نے ۱۱۶۶ھ (۵۳-۱۷۵۲ء) میں وفات پائی۔ شیخ ابراہیم قاضی زادۂ ہالہ کنڈی نے ان کی تاریخ وفات "کان ولیاً رؤف الخلق" سے نکالی ہے۔[5]

(۱۱۶۶ھ)

علامہ محمد حیات سندھی:

اسی عہد کے علماء میں علامہ محدث محمد حیات بن ابراہیم سندھی بھی ہیں۔ ان کی ولادت سندھ کے کسی قریہ میں ہوئی، تحصیل علم کے لیے ٹھٹھہ تشریف لائے اور مخدوم محمد معین سے تعلیم حاصل کی، پھر ہجرت کر کے حرمین شریفین تشریف لے گئے اور مدینہ طیبہ میں توطن اختیار کیا۔ ابتداء میں شیخ ابو الحسن بن عبدالھادی سندھی کی خدمت میں رہے اور وہاں کے شیوخِ حدیث شیخ عبداللہ بن سالم اصبری، شیخ محمد ابو طاہر بن ابراہیم کورانی اور ابو الاسرار حسن بن علی العجیمی اور دوسرے اکابر حدیث سے، حدیث کی اجازت حاصل کی۔ درس کے علاوہ خلوت کو پسند فرماتے تھے اور ہمیشہ نماز باجماعت مسجد نبوی میں صف اول میں ادا کرتے تھے۔

آپ کی تصانیف میں شرح ترغیب و ترہیب، مختصر الزواجر، شرح الحکم العطائیہ و حکم الحدادیہ اور شرح اربعین، الایقاف علی سبب الاختلاف، رسالہ فی رد بدعۃ التعزیہ، تحفۃ الانام فی العمل بحدیث النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام مشہور ہیں۔ علامہ محدث محمد حیات سندھی نے ۱۶ صفر ۱۱۶۳ھ (۱۷۵۰ء) میں وفات پائی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔[6]

علامہ محمد حیات سندھی کے شاگردوں میں شیخ احمد بن عبدالرحمان شامی، شیخ محمد سعید، شیخ عبدالقادر خلیل، شیخ عبدالقادر بن احمد بن عبدالقادر سید غلام علی آزاد بلگرامی، شیخ محمد فاخر زائر الٰہ آبادی، مولانا محمد زاہد سورتی، شیخ عبدالخالق یمنی، سید عبدالرحمان العید روسی، بانی تحریک مجدد شیخ محمد بن عبدالوہاب مشہور ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں "شیفتہ" نے

---

(2) محمد پناہ رجا، وطن ٹھٹھہ، شاگرد میر حیدر الدین ابوتراب کامل ٹھٹھوی (رک: مقالات الشعراء، ص ۲۲۴)۔

(3) یہ تمام تفصیل تکملہ مقالات الشعراء، ص ۲۴۱-۲۴۵، تذکرۂ صوفیائے سندھ، ص ۲۳۹۔ مقدمۂ دراسات اللبیب مرتب مولانا عبدالرشید نعمانی، مقالات الشعراء سے ماخوذ ہے۔

(4) تحفۃ الکرام، مقالات الشعراء، ص ۸۴۱-۸۴۲، فٹ نوٹس تکملہ مقالات الشعراء، مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۵۲، تذکرۂ صوفیائے سندھ (تالیف اعجاز الحق قدوسی)، حاشیہ نمبر ۳، ص ۲۴۰۔

(5) تحفۃ الکرام، اردو ترجمہ، ص ۴۹۵۔

(6) تاریخ کلہوڑہ جلد ۲، ص ۱۰۰ بحوالہ اتحاف النبلا۔

بھی آپ سے سند حاصل کی تھی۔[1]

شاہ فقیر اللہ علوی:

شاہ فقیر اللہ علوی بن شاہ عبدالرحمان بن شاہ شمس الدین بھی اسی دور کے علماء میں ہیں۔ یہ گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں روتاس میں پیدا ہوئے۔ آپ کا وطن حصارک وجلال آباد (افغانستان) ہے۔

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد شاہ فقیر اللہ علوی ایک طویل عرصے تک مختلف ممالک کا سفر کرتے رہے اور زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ اسی زمانے میں آپ نے سلسلۂ نقشبندیہ کے بزرگ حضرت شیخ محمد مسعود دائم کے دست حق پرست پر بیعت کی، سلسلۂ نقشبندیہ کے علاوہ سلسلہ قدریہ میں بھی آپ نے اجازت حاصل کی۔

شاہ فقیر اللہ ایک طویل عرصے تک قندھار میں مقیم رہے، قندھار میں آپ نے خود بھی تعلیم حاصل کی اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہیں درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔

مختلف ممالک کی سیاحت کے بعد آپ ۱۱۵۰ھ (۳۸-۱۷۳۷ء) میں شکارپور (سندھ) میں تشریف لائے، سندھ کی سرزمین آپ کو کچھ اس طرح پسند آئی کہ آپ نے شکارپور ہی کو اپنا وطن بنالیا اور یہاں ایک خانقاہ کی بنیاد رکھی جو آپ کے بعد سلسلۂ نقشبندیہ کا ایک بڑا روحانی مرکز بنا۔

شاہ فقیر اللہ کی ذات گرامی علم وفضل، زہد وورع، عرفان وتصوف کا وہ سرچشمہ تھی کہ سندھ، پشاور، لاہور، ہرات وقندھار سے لوگ آپ کی خدمت میں کھنچ کھنچ کر آتے اور عرفان کے نور سے منور ہو کر جاتے تھے۔

شاہانِ وقت آپ کے یہاں حاضری کو اپنے لیے سرمایۂ سعادت سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں افغانستان میں احمد شاہ ابدالی برسر اقتدار تھا۔ قلات میں نصیر خاں بلوچ کی حکمرانی تھی، سندھ میں میاں سرفراز خان کلہوڑہ مسند آرائے سلطنت تھا اور مکران میں محمد خاں بلوچ کی حکومت تھی۔ یہ چاروں کے چاروں فرمانروا آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کی بارگاہ کی آستان بوسی کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے اور آپ اُن کی ذہنی اور فکری تربیت فرماتے تھے۔

آپ کے مکاتیب کے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے کئی خطوط احمد شاہ ابدالی کے نام لکھے ہیں، جس میں اُس کو حسن خُلق، خدا ترسی، اعلائے کلمۃ الحق اور صبر کی نصیحتیں فرمائی ہیں۔ احمد شاہ ابدالی کے وزیر اعظم شاہ ولی خاں اور ابدالی کے ولی عہد شاہزادہ سلیمان کے نام بھی آپ کے کئی خطوط ملتے ہیں، جن میں آپ نے ان دونوں کو متعدد نصائح اور اخلاقی درس دیے ہیں۔

اسی طرح ہمیں نصیر خاں والی قلات، محمد سرفراز خاں کلہوڑہ والیٔ سندھ اور محمد خاں بلوچ والیٔ مکران کے نام بھی آپ کے خطوط ملتے ہیں، جن میں آپ نے ان کو حق شناسی، مردم پروری، عرفان اور نکوکاری کی تلقین کی ہے، اور بعض عرفان وتصوف کے مسائل کو نہایت واضح اور دلکش انداز میں پیش فرمایا ہے۔

شکارپور کے قیام کے دوران شاہ فقیر اللہ علوی نے ایک عظیم الشان کتب خانے کی بنیاد رکھی، جس میں متعدد نادر اور نایاب کتابیں تھیں، لیکن افسوس ہے کہ آپ کے بعد پچاس سال ہی میں اخلاف نے اسلاف کے اس گنج گراں مایہ کو تلف کر دیا۔ اب بھی اس کتب خانے کے بعض قلمی نسخے کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ جامع ترمذی کا ایک قلمی نسخہ جو حرم کعبہ میں بیٹھ کر لکھا گیا تھا اور جس پر متعدد علماء کے اسناد قرات واجازت ثبت ہیں اور شاہ فقیر اللہ نے بھی اپنے قلم سے اس پر چند سطریں تحریر فرما کر اپنی مُہر ثبت کی ہے۔ یہ بیش بہا نسخہ سید حسام الدین صاحب راشدی کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔

شاہ فقیر اللہ علوی نے تصانیف کا ایک بیش بہا ذخیرہ چھوڑا، جن کی تعداد (۱۷) ہے، ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں:

(۱) فتح التحیل فی المدارج التکمیل (۲) براہین النجات من مصائب الدنیا والعرصات (۳) فیوضاتِ الٰہیہ (۴) طریق الارشاد فی تکمیل المؤمنین والاولاد (۵) منتخب الوصول (۶) وثیقۂ الاکابر (۷) قطب الارشاد (۸) فتوحات الغیبیہ فی شرح عقاید الصوفیہ (۹) جواہر الاوراد (۱۰) قصیدۂ مبرور (۱۱) کتاب الازھار فی ثبوت الآثار (یہ کتاب عربی میں ہے) (۱۲) فوائد فقیر اللہ (۱۳) شرح قصیدہ بانت السعاد (۱۴) ملفوظات (یہ کتاب ۲۳۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا ایک نسخہ حافظ خان محمد کے پاس کوئٹہ میں موجود ہے) (۱۵) مکتوبات شاہ فقیر اللہ علوی (۱۶) ملفوظات وعملیات (۱۷) شرح ابیات مشکل مثنوی، یہ نسخہ ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا ایک نسخہ کابل میں پایا گیا ہے۔)

حضرت شاہ فقیر اللہ علوی کو شعر وسخن سے بھی دلچسپی تھی۔ آپ فارسی، عربی اور پشتو میں شعر کہتے تھے، فارسی میں آپ کا تخلص "فقیر" تھا۔

---

[1] مقدمہ دراسات اللبیب، مرتب مولانا عبدالرشید نعمانی، ص ۵۳۔

۳ صفر ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۱ء) کو حضرت شاہ فقیر اللہ علوی واصل الی اللہ ہوئے۔ آپ کا مزار شکار پور (سندھ) میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔[1]

علی مدد:

علی مدد ایران کا رہنے والا تھا، حکمت، جفر، نجوم اور رمل میں یگانۂ روزگار تھا۔ میاں نور محمد کے دربار میں اتنا بلند رتبہ حاصل کیا تھا کہ اس کے برابر بہت کم لوگوں کو رتبہ حاصل ہوا۔ مخیر، فیاض تھا اور اس کا دستر خوان وسیع تھا۔ شادی کے بعد سیوستان میں مقیم ہو گیا تھا۔

مولوی محمد صادق:

مولوی محمد صادق بن مخدوم عنایت اللہ واعظ، مخدوم محمد معین کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ ٹھٹھہ کے رہنے والے تھے، علوم عقلی میں یگانۂ روزگار اور اپنے ہم عصروں میں بے مثل مانے جاتے تھے۔ لیکن مشہور نہیں تھے۔ قانع کے استاد میاں نعمت اللہ اکثر علوم عقلیہ میں ان کے شاگرد ہیں۔ کلہوڑہ دور حکومت میں جب شیخ شکر اللہ کو ٹھٹھہ کا ناظم اور میرک محمد احسن کو شیخ الاسلام مقرر کیا گیا تھا، یہ دونوں اُن کے احترام و اعزاز کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔[2]

میر نجم الدین عزلت:

میر نجم الدین عزلت ولد محمد رفیع رضوی بکھری۔ میر محمد رضوی، یوسف بکھری کی اولاد میں تھے۔ جامع کمالات اور صاحب علم و فضل تھے، مخدوم محمد معین کے بھانجے اور اُن کے ارشد تلامذہ میں تھے، اپنے اُستاد ہی کی زندگی میں درس و فتویٰ کے منصب پر فائز ہو چکے تھے۔ خود عزلت کے شاگرد بھی مرتبہ کمال کو پہنچے، جن میں میاں احمد طالب علم اور میاں محمد باقر واعظ[3] نے غیر معمولی شہرت حاصل کی، میر نجم الدین نے متعدد تصانیف چھوڑیں، ان کی تصانیف میں اُن کا وہ رسالہ جو اُنہوں نے "یک روزی منطق" کے طرز پر لکھا تھا مشہور ہے۔ فارسی میں اُن کی تصانیف "طوطی نامہ" کو جس کی عبارت تخشی[4] سے بھی زیادہ شیریں ہے، غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ شاعری میں "عزلت" تخلص کرتے تھے، میر نجم الدین عزلت نے ۱۱۶۰ھ (۴۸-۱۷۴۷ء) میں وفات پائی۔[5]

میاں نعمت اللہ:

میاں نعمت اللہ بن میاں عبد الجمیل[6] طالب علم، مخدوم محمد ضیاء الدین کے نواسے تھے، بڑے صاحب کمال بزرگ تھے۔ چوبیس سال کی عمر میں جامع کمالات علمیہ ہو چکے تھے، چودہ علوم میں اپنے والد محترم کی طرح کامل تھے، درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے، ان کا ایک مدرسہ بھی تھا، سندھ کے مشہور مورخ میر علی شیر قانع کو بھی اُن سے شرف تلمذ حاصل تھا، قانع نے میزان الصرف سے شرح ملا تک تمام کتابیں ان ہی بزرگ سے پڑھی تھیں، کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔

میر علی شیر قانع ٹھٹھوی:[7]

سندھ کی ادبی، ملکی، سیاسی اور روحانی تاریخ کو جس نے حیات نو بخشی، وہ میر علی شیر قانع ٹھٹھوی ہے۔ علمی اور تاریخی اعتبار سے اگر اسے سندھ کا حسن کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا، اگر آج ہمیں اس کی کتابیں نہ ملتیں اور سید حسام الدین راشدی جنہوں نے اس دور میں سندھ کی تاریخ کو محفوظ کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا، اگر اس کی کتابوں کو ایڈٹ نہ کرتے تو یقیناً سندھ کی تاریخ کے بہت سے گوشے پردۂ خفا میں رہتے اور سندھ کی تاریخ کے بعض اہم واقعات تک ہماری رسائی نہ ہو سکتی۔ سندھ کی تاریخ کے دوسرے محقق ڈاکٹر نبی بخش بلوچ پروفیسر سندھ یونیورسٹی بھی اہل علم کے شکریے کے مستحق ہیں کہ قانع کی بعض

---

(1) یہ تمام حالات آقائے حبیبی کے مضمون شاہ فقیر اللہ جلال آبادی سے ماخوذ ہیں۔ جو رسالہ سروش (فارسی) شمارہ ۲۱، جلد دوم، ۱۵ مارچ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔

(2) مقالات الشعراء، ص ۳۶۰۔

(3) میاں محمد باقر واعظ: ولد خلیفہ محمد رضا، زہد و تقویٰ میں اپنے وقت میں بے نظیر تھے، باوجود کثرت احتیاج کے متوکلانہ زندگی بسر کرتے تھے، اہل دنیا کی فتوحات قبول نہ کرتے تھے اور نہ اپنی احتیاج میں اہل دنیا کی طرف رجوع کرتے تھے۔ شیخ شکر اللہ و تھی میاں نور محمد کلہوڑہ سے ان کے لیے کچھ وجہ معاش مقرر کرلائے، لیکن انہوں نے قبول نہ کیا، اختیاری مسکنت و فقر میں باوجود اسی فضل و کمال کے انہوں نے وفات پائی (تحفۃ الکرام اردو ترجمہ، ص ۶۹۸)۔

(4) تخشی: سید ضیاء الدین بدایونی تخشی، اپنے وقت کے یگانۂ روزگار اہل کمال میں تھا اور سلطان الاولیا شیخ نظام الدین قدس سرہ سے عقیدت رکھتا تھا، سلک السلوک، عشرۂ مبشرہ، طوطی نامہ اُس کے تصانیف ہیں، تخشی نے دہلی میں ۷۵۰ھ میں وفات پائی، طوطی نامہ اُس نے ۷۳۰ھ میں تصنیف کیا تھا۔ (فٹ نوٹ مقالات الشعراء، نمبر ۳ مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۴۳۸)۔

(5) مقالات الشعراء، ص ۴۳۷-۴۳۸۔

(6) میاں عبد الجمیل، داماد مخدوم ضیاء الدین، وفات: ۱۱۵۴ھ (مقالات الشعراء، ص ۱۵۷)۔

(7) مقالات الشعراء، ص ۳۶۰۔

اہم کتابوں کی سندھی اور اردو ترجموں کی تصحیح کر کے، اور اُن پر ضروری اور مفید حواشی لکھ کر قانع کے کام کو آگے بڑھایا ہے، قانع عہد کلہوڑہ کا وہ گل سرسبد ہے کہ جس کی بدولت اس دور میں گلشن تاریخ میں بہارِ نو آئی اور جس نے اپنی کتابوں سے دورِ حاضر کے مورخین کو سندھ کی بعض اُن اہم اور تاریخی معلومات سے مالامال کیا، جن سے وہ پہلے آشنا نہ تھے۔

قانع نے اپنے اور اپنے خاندان کے حالات، مقالات الشعراء میں لکھے ہیں، جس میں قانع نے اپنا سلسلۂ نسب اس طرح درج کیا ہے۔

میر علی شیر قانع بن سید عزت اللہ بن سید محمد کاظم بن سید محمد مقیم بن سید ظہیر الدین ثانی، بن سید شکر اللہ ثانی، بن سید ظہیر الدین والاسلام المعروف بہ سید جادم اول بن سید قاضی شکر اللہ شیرازی، بن سید وجیہ الدین بن سید نعمت اللہ بن سید عرب شاہ بن امیر سید کسیم الدین محمد المعروف بہ میرک شاہ بن امیر سید عطاء اللہ جمال الدین محدث بن امیر سید فضل اللہ المحدث الدشتکی الشیرازی۔[1]

ان کے بزرگوں میں جو سب سے پہلے قندھار سے ٹھٹھہ آئے وہ قاضی شکر اللہ شیرازی بن وجیہہ الدین تھے، جو ۹۲۷ھ (۲۱-۱۵۲۰ء) میں اپنے تین رفقا سید شاہ مبین، سید کمال اور سید عبداللہ کے ساتھ ٹھٹھہ تشریف لائے۔

سید شکر اللہ ہی وہ بزرگ ہیں کہ جن کی نسل سے ٹھٹھہ کے سادات شکر الٰہی کا سلسلہ جاری ہوا اور جنہیں شاہ حسن ارغون نے اُن کے علم و فضل اور دینی عظمت و بزرگی کے تحت اپنی حکومت کا پہلا شیخ الاسلام مقرر کیا تھا، لیکن اس عہدے کی پابندیاں سید صاحب کو پسند نہ آئیں اور کچھ عرصے کے بعد سید صاحب اس عہدے سے علیحدہ ہو گئے۔

ان ہی کی اولاد سے سندھ کا لافانی مورخ، بے مثل تذکرہ نگار، یگانۂ روزگار، شاعر میر علی شیر قانع ٹھٹھوی ہے، جس کا سلسلۂ نسب ساتویں پشت میں قاضی شکر اللہ شیرازی سے جاملتا ہے۔

قانع کا اصل نام غلام علی شیر ہے، وہ ۱۱۴۰ھ (۲۸-۱۷۲۷ء) میں میاں نور محمد کلہوڑہ کے عہد حکومت میں پیدا ہوئے، "خلق انساناً من السلالۃ" سے اُن کی تاریخ ولادت نکلتی ہے۔

قانع نے ٹھٹھہ میں ہی اُس وقت کے اکابر علماء سے تعلیم و تربیت حاصل کی اگرچہ اُن کی تعلیم و تربیت کے متعلق کوئی تفصیل ہمیں تذکروں اور تاریخوں میں نہیں ملتی، لیکن انہوں نے ضمناً اپنے بعض اساتذہ کا تذکرہ مقالات الشعرا میں کیا ہے، ان میں میاں نعمت اللہ، میاں محمد صادق[2]، میاں عبدالجمیل[3] کے دونوں فرزند، آخوند محمد شفیع[4]، جس سے قانع نے قصائد عرفی، عروض سیفی اور چند سبق پڑھے تھے، آخوند ابوالحسن "بے تکلف"[5]، مولوی مرزا جعفر شیرازی[6] ہیں۔

شعر و سخن کا ذوق قانع کو ابتدا ہی سے ملا تھا، بارہ سال کی عمر میں جب کہ وہ تعلیم میں مشغول تھے شعر کہنے لگے تھے۔ اسی عمر میں انہوں نے آٹھ ہزار اشعار کا اپنا دیوان مرتب کیا تھا، جس میں تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی تھی، اس میں انہوں نے نام کو بطور تخلص استعمال کیا تھا، لیکن نہ معلوم کس وجہ سے انہوں نے یہ دیوان دریا برد کر دیا۔

۱۱۵۵ھ (۴۳-۱۷۴۲ء) میں پھر قانع میں جذبۂ ذوق شعری بیدار ہوا اور شاعری میں میر حیدر الدین ابوتراب کامل[7] سے جو اس

---

(1) "دشتک" شیراز کے اس محلے کا نام ہے جہاں یہ بزرگ رہا کرتے تھے۔ آجکل شہر کے اس حصے کو "لب آب" کہتے ہیں (مقدمہ تحفۃ الکرام، حاشیہ نمبر 1- مرتبہ سید حسام الدین راشدی-ص-1)

(2) میاں محمد صادق: یہ میاں نعمت اللہ کے بڑے بھائی تھے، عالم باعمل اور نہایت نیک سیرت اور پاک باطن بزرگ تھے، ایک سال حرمین شریفین میں رہ کر انہوں نے سند حدیث حاصل کی، کچھ عرصہ جونا گڑھ میں بھی رہے، پھر واپس چلے آئے، دوسری مرتبہ جب جونا گڑھ جا رہے تھے تو راستے میں کچھ میں انہوں نے وفات پائی۔

(3) میاں عبدالجمیل: میاں رحمت اللہ کے صاحبزادے اور مخدوم علی احمد عرف قمری (برادر مخدوم آدم) کی اولاد میں تھے، صاحب نسبت بزرگ تھے، انہوں نے ۱۱۵۴ھ میں وفات پائی (حاشیہ مقدمہ تحفۃ الکرام ص ۲۱ بحوالہ تحفۃ الکرام و مقالات الشعراء)۔

(4) آخوند محمد شفیع: وفات ۱۱۶۵ (مقالات الشعراء، ص ۳۳۹)۔

(5) آخوند ابوالحسن "بے تکلف" ٹھٹھوی: فارسی میں قانع کے اُستاد تھے، نہایت طباع و صاحب استعداد بزرگ تھے، ان کے مکتب میں بلا استثنیٰ ہندو و مسلم تعلیم پاتے تھے (مقالات الشعراء، ص ۱۱۴)۔

(6) میرزا جعفر شیرازی: یہ سیر و تفریح کے لیے سندھ آئے تھے، یہاں دھاراجہ کے راجا اجمال کے پاس کچھ عرصہ رہے۔ مخدوم محمد معین ان کے علم ذاتی و جوہر صفاتی کی وجہ سے ان کے دوست بن گئے، مرزا جعفر کے علم و فضل کی شہرت سن کر یہاں خداداد خاں بن میاں نور محمد کلہوڑو نے انہیں بلا کر اپنا معتمد خاص مقرر کیا، میاں خداداد خاں جب ہندوستان چلے گئے تو میاں نور محمد نے انہیں اپنے دربار سے وابستہ کر لیا، پھر میاں مراد یاب خاں کے دربار سے وابستہ رہے، کچھ عرصے بعد معزول ہو گئے، وہ علم جفر اور تکسیر میں عامل و کامل تھے، میاں نور محمد کے لیے انہوں نے "جفر جامع" نامی ایک کتاب بھی لکھی تھی، لیکن وہ مکمل نہ ہو سکی، ۱۱۶۷ھ میں انہوں نے وفات پائی (مقالات الشعراء، ص ۱۵۰-۱۵۱)۔

(7) میر حیدر الدین ابوتراب کامل: بن میر رضی الدین محمد "فدا"، صاحب کمال بزرگ اور مرجع اہل کمال تھے، فقر کو اختیار کیے ہوئے تھے۔ شادی نہیں کی تھی،

دور کے یگانۂ روزگار شاعر تھے شرف تلمذ حاصل کیا۔ کامل نے ان کا تخلص "مظہری" تجویز کیا، جس سے ان کی شاعری کے دور نو کا سنہ ۱۱۵۵ھ برآمد ہوتا ہے۔ کچھ دن تک قانع یہ تخلص اختیار کیے رہے، بعد میں انہوں نے یہ تخلص بدل کر اپنا تخلص "قانع" رکھا اور آخر عمر تک اسی تخلص سے مشہور رہے۔

قانع، غلام شاہ کلہوڑا (۱۱۷۰-۱۱۸۶ھ) کے عہد میں ۱۱۷۵ھ میں اس خاندان کی تاریخ لکھنے پر مامور ہوئے، حکم شاہی کے مطابق انہوں نے ایک تاریخ نظم میں شاہنامے کے طرز پر اور ایک نثر میں لکھنی شروع کی، لیکن یہ دونوں کتابیں مکمل نہیں ہوئیں اور وہ نہ معلوم کس وجہ سے ترک ملازمت کر کے ٹھٹھہ چلے آئے۔

قانع کی ساری عمر سوائے دو چار سفروں کے ٹھٹھہ میں بسر ہوئی اور وہ ساری عمر تالیف و تصنیف میں مشغول رہے۔

قانع کی وہ تصانیف جن کا اب تک پتا چل سکا حسب ذیل ہیں۔

۱۔ دیوان علی شیر: (۱۱۵۲ھ) یہ وہ دیوان ہے جو انہوں نے بارہ سال کی عمر میں جمع کیا تھا، لیکن کسی وجہ سے دریابُرد کر دیا۔

۲۔ مثنوی شمۂ از قدرت حق: (۱۱۶۵ھ) یہ اس کتاب کا تاریخی نام ہے، لیکن اس کا کوئی نسخہ نہیں ملتا، اس کے چند شعر، مقالات الشعرا میں قانع نے دیے ہیں۔

۳۔ مثنوی قضا و قدر: (۱۱۶۷ھ) یہ کتاب قانع نے آقا رضا نگہت شیرازی کی تحریک پر لکھی تھی، اس کا ایک نسخہ سندھی ادبی بورڈ میں موجود ہے۔

۴۔ نو آئین خیالات: (۱۱۶۹ھ) یہ اس کتاب کا تاریخی نام ہے اور قانع نے لکھا ہے کہ یہ نثر میں تھی، اس کا اب تک کوئی نسخہ نہیں ملا۔

۵۔ مثنوی قصہ کا مروپ: (۱۱۶۹ھ) یہ مثنوی تین ہزار اشعار پر مشتمل تھی، لیکن اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔

۶۔ دیوان غم: (۱۱۷۱ھ) یہ اس کتاب کا تاریخی نام ہے، اس میں نو ہزار اشعار ہیں، لیکن اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔

۷۔ ساقی نامہ: (۱۱۷۴ھ) اس کا کوئی مکمل نسخہ موجود نہیں، البتہ اس کے اقتباسات مقالات الشعرا میں ملتے ہیں۔

۸۔ واقعات حضرت شاہ: (۱۱۷۴ھ) یہ ایک ہزار اشعار پر مشتمل تھا لیکن اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔

۹۔ چہار منزلہ: (۱۱۷۴ھ) یہ ایک ہزار اشعار کی مثنوی تھی، لیکن اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔

۱۰۔ ترویج نامۂ حسن و عشق: (۱۱۷۴ھ) یہ کتاب نثر میں تھی، لیکن اس کا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔

۱۱۔ اشعار متفرقہ در صنائع و تاریخ (۱۱۷۴ھ) یہ کتاب ایک ہزار اشعار پر مشتمل تھی، لیکن اس کا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔

۱۲۔ بوستان بہار: معروف بہ مکلی نامہ (۱۱۷۴ھ) یہ ایک مختصر سا رسالہ نظم و نثر میں ہے، جس میں قبرستان مکلی کے مقابر و مناظر کے حالات و کیفیات لکھے گئے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ بخط مصنف سندھی ادبی بورڈ میں موجود ہے، اور اس کے جامع اور مکمل حواشی سید حسام الدین راشدی نے "حواشی مکلی نامہ" کے نام سے سندھی میں مرتب کیے ہیں، جو سندھی ادبی بورڈ سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ حواشی اپنی معلومات اور اہمیت کے لحاظ سے تاریخ سندھ میں خصوصاً ٹھٹھہ کے آثار اور اشخاص کی تاریخ میں گراں قدر معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہیں۔

۱۳۔ مقالات الشعرا: (۱۱۷۴ھ) یہ سندھ کے فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے، جس کا ایک نسخہ بخطِ مصنف سندھی ادبی بورڈ میں موجود ہے، جسے سید حسام الدین راشدی نے ایڈٹ کیا ہے اور ۱۹۵۷ء میں سندھی ادبی بورڈ سے شائع ہو چکا ہے۔

۱۴۔ تاریخ عباسیہ: (۱۱۷۵ھ) یہ تاریخ غلام شاہ کلہوڑہ کے حکم سے قانع نے لکھنی شروع کی تھی، لیکن نامکمل رہی، اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔

۱۵۔ تاریخ عباسیہ (نظم) (۱۱۷۵ھ): یہ کتاب بھی نامکمل رہی اور اس کے ناقص مسودے کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔

۱۶۔ تحفتہ الکرام: (۱۱۸۱ھ) یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی تیسری جلد سندھ کی تاریخ پر مشتمل ہے، یہ تینوں جلدیں یکجا

باوجود اس کے کہ تنگدستی سے بسر کرتے تھے۔ اکثر اہل دول نواب مہابت خاں کاظم وغیرہ نے بصد عجز و نیاز ان کا وظیفہ مقرر کرنا چاہا، لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا، وہ اہل دنیا سے متنفر اور عزلت گزیں تھے، ان کی صحبت قال اللہ و قال الرسول سے خالی نہ ہوتی تھی، فارسی اور ہندی میں بے نظیر شعر کہتے تھے، ان کی زبان سندھی نہ تھی لیکن اس میں بھی شعر کہتے تھے۔ ۱۱۶۴ھ میں وفات پائی، قانع نے ان کی تاریخ وفات "ان للمتقین جنت" سے نکالی ہے، قانع نے ان کے بعض فارسی اور ہندی اشعار مقالات الشعرا میں نقل کیے ہیں۔ مقالات الشعراء، ص ۶۷۰-۶۷۵)۔

۱۳۰۴ھ میں مطبع ناصری دہلی سے تحفتہ الکرام کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ حال ہی میں اس کو سید حسام الدین راشدی نے ایڈٹ کر کے ضروری حواشی اور شجروں کے ساتھ مرتب کیا ہے، جسے سندھی ادبی بورڈ نے شائع کیا ہے۔

۱۷۔ مثنوی اعلان غم: (۱۱۹۲ھ) یہ کتاب برٹش میوزیم میں موجود ہے اور ۳۵۶ صفحات پر مشتمل ہے، جس کے ہر صفحے میں ۳۴ سطریں ہیں۔ غالباً یہ مثنوی مصائب اہل بیت میں نظم کی گئی ہے۔

۱۸۔ زبدۃ المناقب (۱۱۹۲ھ): ٹھٹھہ کے کتب خانوں کی فہرستوں میں اس کتاب کے متعلق تحریر ہے کہ یہ کتاب ۳۶۲ صفحات پر مشتمل اور ۱۷ سے لرک ۲۰ سطری سطر پر ہے، اس میں (۱۲۰۰) شعر ہیں۔

۱۹۔ مختار نامہ (۱۱۹۴ھ): یہ کتاب مختار ثقفی کے حالات پر ہے اور ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس کے ہر صفحے پر ۳۴ یا ۳۶ سطریں ہیں۔ اس میں سات ہزار اشعار ہیں جو ۱۱۹۴ھ میں تالیف ہوئے، اس کا ذکر ٹھٹھہ کے کتب خانوں کی فہرستوں میں موجود ہے، اب اس کا ایک نسخہ سندھی ادبی بورڈ میں موجود ہے۔

۲۰۔ نصاب البلغاء (۱۱۹۸ھ): یہ کتاب لغات اور حیات انسانی کی مختلف مصطلحات پر مشتمل ہے، اس کو قاموس کہا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب (۱۸۵) صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب کا ایک خطی نسخہ بخط مؤلف مولانا محمد ابراہیم گڑھی یا سینی مرحوم کے کتب خانے میں موجود ہے۔

۲۱۔ مثنوی ختم السلوک: (۱۲۹ھ) اس کتاب کا سنہ تالیف کلمات "ختم السلوک" سے نکلتا ہے، یہ مثنوی تصوف کے رموز و نکات پر مشتمل ہے اور ۲۸۶ صفحات ہیں، ہر صفحے پر ۱۵ سطریں ہیں، کتاب میں ایک مقدمہ، اکیس مقالے اور ایک خاتمہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ بخط مؤلف سندھی ادبی بورڈ میں موجود ہے۔

۲۲۔ طومار سلاسل گزیدہ: (۱۲۰۲ھ) یہ اس کتاب کا تاریخی نام ہے۔ اس میں مشاہیر تصوف سندھ کی طریقت کے سلسلے درج کیے گئے ہیں یہ سندھ کے صوفیا کے حالات پر بہترین کتاب ہے۔ اس کا ایک خطی نسخہ بخط مؤلف سندھی ادبی بورڈ میں موجود ہے۔

۲۳۔ شجرۂ طریقت اہل بیت: (۱۲۰۲ھ) یہ اس کتاب کا تاریخی نام ہے یہ سندھ کے سادات کے نسب ناموں پر مشتمل ہے، افسوس ہے کہ اب یہ کتاب ناپید ہے۔

۲۴۔ معیار سالکان طریقت: (۱۲۰۲ھ) اس کتاب میں تقریباً ایک ہزار مشاہیر روحانی کا تذکرہ ہے۔ اس میں سندھ کے مشاہیر و صوفیا اور سندھ کے باہر کے بزرگان دین کے حالات ہیں۔
اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم (ADD 21-1589) میں موجود ہے۔ جو سنہ ۱۲۴۶ھ میں مراد علی خاں ٹالپور والی سندھ (متوفی ۱۲۴۹ھ) کے لیے لکھا گیا تھا۔

۲۵۔ روضتہ الانبیاء: اس کا سنہ تالیف معلوم نہیں لیکن منظوم ہے اور ٹھٹھہ کے کتب خانوں کی فہرستوں میں اس کا نام موجود ہے۔

۲۶۔ زینت الاخلاق: یہ کتاب منظوم ہے اور نصائح پر مشتمل ہے۔

۲۷۔ غوثیہ: یہ کتاب سلوک و معرفت پر ہے اور منظوم ہے۔

۲۸۔ مثنوی قصاب نامہ: یہ ٹھٹھہ کے ایک قصاب زادے کی ایک منظوم داستان ہے، یہ بیاض مکلی نامہ میں موجود ہے، یہ بیاض سندھی ادبی بورڈ میں موجود ہے، اس مثنوی کے (۲۶۳) اشعار ہیں۔

۲۹۔ میزان والافکار: (منظوم۔)

۳۰۔ تذہیب طباع

۳۱۔ سرفراز نامہ: یہ کتاب پند و نصائح پر ہے، جس کا نام غالباً میاں سرفراز عباسی کے نام کی مناسبت سے "سرفراز نامہ" رکھا گیا ہے۔

۳۲۔ حدیقۂ غلباء: یہ فارسی شعرا کے منتخب اشعار کا مجموعہ ہے جو مختلف عنوانوں کے تحت جمع کیا گیا ہے، اس کا ایک نسخہ بخط مؤلف سندھی ادبی بورڈ میں موجود ہے اس کے جملہ صفحات (۲۶۲) ہیں۔

۳۳۔ مثنوی کانِ جواہر:

۳۴۔ میزان فارسی:

۳۵۔ رسالہ معمامع شرح: نظم و نثر میں ہے۔

۳۶۔ لب تاریخ گلبوڑہ: اس کا نام میر مائل کی فہرست میں موجود ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں تیسری کتاب تھی جو قانع نے لکھی تھی۔

۳۷۔ بیاض محک الشعراء: یہ مختلف فارسی گو شعرا کے کلام کا انتخاب ہے جو قانع نے محسن کی "محک کمال" کے طرز پر کیا تھا، اس کا ایک نسخہ اول و آخر ناقص سندھی ادبی بورڈ میں موجود ہے۔

۳۸۔ دیوان اشعار: میر مائل کی فہرست میں اس کا نام موجود ہے، لیکن اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔

۳۹۔ قصائد و منقبت: اس کتاب میں اپنے قصائد و مناقب کو یکجا جمع کر دیا ہے اور یہ بیاض مکلی نامہ میں موجود ہے، جو سندھی ادبی بورڈ کے کتب خانے میں ہے۔

۴۰۔ انشائے قانع: یہ چند مکاتیب کا مجموعہ ہے، جو ۳۲ صفحات پر مشتمل

ہے اور سندھی ادبی بورڈ میں موجود ہے۔

۴۱۔ مثنوی محبت نامہ: یہ مثنوی (۱۵۹) اشعار پر مشتمل ہے، جو "بیاض مکلی نامہ" میں شامل ہے۔

۴۲۔ ۴۳۔ ان دونوں کے نام میر مائل کی فہرست میں اس طرح مٹ گئے ہیں کہ پڑھے نہیں جاتے۔

یہ وہ سرمایۂ علمی ہے جو قانع نے اپنے بعد چھوڑا، قانع کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مائل بہ شیعیت تھا، اگرچہ اس نے "طومار سلاسل گزیدہ" میں اپنا اور اپنے والد کا سلسلۂ طریقت طریقۂ نقشبندیہ میں اس طرح دیا ہے۔

میر عزت اللہ، مرید- میاں محمد (نبیرۂ مخدوم آدم ٹھٹھوی)، مرید مخدوم ابو القاسم نقشبندی ٹھٹھوی (المتوفیٰ ۱۱۳۸ھ) مرید شیخ سیف الدین مرید برادر خود- محمد معصوم ولد مجدد الف ثانی۔

میر علی شیر قانع، مرید- شیخ عبد الاحد، مرید والد خود- حاجی غلام معصوم، مرید- شیخ محمد اسماعیل، مرید- حضرت قیوم زماں محمد صبغتہ اللہ، مرید- خواجہ محمد معصوم ولد مجدد الف ثانی۔

میر قانع نے ۶۴ سال کی عمر میں ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۸ء) میں وفات پائی اور ۱۲۰۲ھ تک باوجود اپنی علالت و بیماری کے تالیف و تصنیف میں مشغول رہے۔[1]

ان کی قبر اگرچہ متعین نہیں، لیکن یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ خاندان شکر الٰہی کے قبرستان مکلی میں مدفون ہوئے۔

یہ کلہوڑہ عہد کے بعض علماء کا تذکرہ ہم نے کیا ہے، لیکن اس دور کے علما و فضلا کی فہرست طویل ہے، مختصر یہ ہے کہ مخدوم جعفر بوبکانی، سید علی رضا، غلام علی بن محمد باقر، شیخ محمد رضا اور بہت سے دوسرے صاحب علم و فضل اس دور میں گزرے ہیں۔

شعر و ادب

محسن ٹھٹھوی:

شعر و ادب کی بھی کلہوڑہ حکمرانوں نے خاصی سرپرستی کی، اُن کے دور میں افق شاعری پر جو بدر کامل بنکر نمودار ہوا وہ محسن ٹھٹھوی تھا۔

محسن ٹھٹھوی عہد کلہوڑہ کا وہ مشہور فارسی گو شاعر ہے، جس نے اپنی بلند پایہ شاعری سے سندھ کو غیر معمولی عظمت بخشی، یہ عظیم المرتبت شاعر سندھ کی ادبی تاریخ میں صفِ اول کے شعرا میں شمار ہوتا ہے، اس کے کلام میں رندی و سرمستی، عشق کی کیفیت، محبت کی تڑپ، علوئے تخیل، تاثیر اور دل نشینی پائی جاتی ہے، اس کے تغزل میں حافظ کی چھاپ ہے، وہ حافظ سے بے حد متاثر نظر آتا ہے، وہ ایک جگہ اپنے مقام کی بلندیوں اور سخن شناسوں کے فقدان کی شکایت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

کم نیستم ز طالب و عرفی دریں زماں
دارم سخن بسے و ندارم سخن شناس

اصنافِ سخن میں شاید ہی کوئی صنف ایسی ہو، جس میں اس نے اپنی طباعی و جودت کے جوہر نہ دکھائے ہوں۔

لیکن افسوس ہے کہ جتنا بڑا وہ شاعر ہے، اُسی قدر اس کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں، قانع، مقالات الشعرا میں اگر اس کے مختصر حالات نہ لکھ دیتا تو تحقیق و جستجو کا وہ باب جو عہد حاضر میں اس کے لیے کھلا ہے شاید وہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا۔

قانع نے مقالات الشعرا میں اس کا سلسلہ نسب اس طرح درج کیا ہے۔

محمد محسن ولد نور محمد بن ابراہیم بن یعقوب ٹھٹھوی

محسن کے آبائی پیشے کے متعلق قانع کا بیان ہے کہ اس کا آبائی پیشہ ریشم فروش تھا، سن شعور کو پہنچنے کے بعد محسن رنگین طبع نکلا، قدرت نے اُسے شاعرانہ طبیعت و دیعت کی تھی، آغاز شعور ہی میں اُس کے ذوق شعری نے اُسے نواب لطف علی خاں "ہمت"[2] سے وابستہ کر دیا، جس نے اُس کی تربیت کی اور وہ اس عرصے میں دوسرے اہل کمال سے مستفید ہوتا رہا۔

قانع اس کی شاعری کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

در تحتہ بایں کمالیت شاعری و لطافت سخن و ملاحتِ کلام کسے برنیامدہ، رواج طرز اُستادانِ عجم و سند از تمثیل بندی و مناسبات شعری ازوست[3]

---

(1) قانع کے یہ تمام حالات مقدمہ تحفتہ الکرام اور مقدمہ مقالات الشعرا مرتب سید حسام الدین راشدی سے ماخوذ ہیں۔

(2) نواب لطف علی خاں ہمت: کا نام میر محمد شفیع تھا، حضرت میر محمد یوسف بکھری کی اولاد میں تھا، یہ نواب عطر خاں کے بعد بالاستقلال حکمران بن بیٹھا، نظم و نثر میں بڑا ملکہ رکھتا تھا۔ ۱۱۴۵ھ میں اس نے وفات پائی (تحفتہ الکرام اُردو ترجمہ، ص ۳۰۹)۔

(3) مقالات الشعراء، ص ۷۰۲۔

قانع کا بیان ہے کہ محسن کی شاعری کے حسن قبول کا یہ عالم تھا کہ اس کی زندگی ہی میں اس کی شہرت عام ہو چکی تھی، جو اہل ذوق ٹھٹھہ آتے اور اس کے کلام کی خوبیاں اُن کے علم میں آتیں، وہ اس کا کلام نقل کر کے لے جاتے۔

دوسرے اکثر اہل کمال کی طرح محسن بھی ناقدریٔ روزگار کا شکار تھا۔ قانع نے اس کے فنی محامد و محاسن کو بیان کرتے ہوئے آخر میں لکھا کہ:

> در ملک بیقدر واقع شدہ، ورنہ سخنش سزاوار زیب مجلس اُمرا است۔[1]

میاں نور محمد کلہوڑہ نے اُس کی سرپرستی کرتے ہوئے پندرہ روپے ماہوار اس کا روزینہ مقرر کر دیا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ وظیفہ اس کے لیے ناکافی تھا وہ زندگی کی تلخیوں اور ناسازگاری روزگار کو ساری عمر محسوس کرتا رہا جس کی عکاسی اس کے بعض قصیدوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ محسن نے ۲۰ شوال ۱۱۶۳ھ (۱۷۵۰ء) میں بیالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

اُس کی تصانیف میں حسب ذیل تصانیف کا پتہ چلتا ہے:

(۱) دیوان محسن: یہ دیوان سندھی ادبی بورڈ سے شائع ہو چکا ہے جسے محب مکرم حبیب اللہ صاحب رشدی مرحوم نے ایڈٹ کیا تھا، جس پر اُن کا ایک بسیط اور پُر از معلومات مقدمہ بھی ہے۔

(۲) محکِ کمال (۳) عقد دوازدہ گوہر (۴) طرز دانش اور (۵) حملۂ حسینی۔

محسن کے چند اشعار ہم ذیل میں دیتے ہیں کہ جن سے اُس کے کمال فنی اور شعری بلندیوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

اے گل خود رو، سرو، سمن بو، نرگس جادو، زلف معنبر
از توبہ نالش بلبل و قمری، وز تو بنازش آہو و عنبر
لمعۂ رویت، شمۂ بویت، حلقۂ مویت، چشم نکویت
ماہ دل آرا، عنبر سارا، نقش چلیپا، گردش ساغر
ہم بہ تکلم، ہم بہ تبسم، ہم بہ نگاہی، ہم بہ ادائی
زینت گوشی، راحت ہوشی، آفت شہری، غارت کشور

دل را اسیر زلف سیہ فام کردہ ایم
صبح طرب حوالہ بایں شام کردہ ایم

من نمی گویم ز دنیا سیم و زر باید گرفت
حاصل عمر از بتان سیمبر باید گرفت

محسن از عشق تو در پیری نخواہد توبہ کرد
میکشی ہر چند در ماہتاب باشد بہتر است
زمین قابل میخانہ دارد طرفہ تاثیرے
اگر زاہد درو مسواک کارد تاک بر خیزد

اے شوخ: چشم و زلفت در ملک دلستانی
شاہِ جہانِ اول، صاحبقران ثانی
دارا شکوہ خطت، اورنگ زیب عارض
ابرو لبان افسر سرگرم سائبانی

از بسکہ گرد کینہ جہاں را گرفتہ است
یک سینہ بے غبار بعالم نیافتیم
یاراں رقم کنید بلوح مزار ما
رفتیم زیں خرابہ و ہمدن نیافتیم[2]

رجا ٹھٹھوی:

محمد پناہ "رجا" یہ بھی کلہوڑہ دور کا ایک بلند پایہ شاعر ٹھٹھہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے میر حیدرالدین ابوتراب کامل سے فیضان شاعری حاصل کیا تھا۔ میر متارہ وزیر سندھ کی مصاحبت میں تھا، نہایت سنجیدہ فکر، خوش فکر اور پُر حوصلہ شاعر تھا، نمونتاً اس کے چند شعر ذیل میں دیے جاتے ہیں:

یک ابر رشک ریز نشد آنقدر کہ ما
یک بحر ایں نداشت بساماں گہر کہ ما
تیغ نکردہ قتل شہیداں کہ چشم تو
زخمے نخورد بر جگر خود سپر کہ ما

بیا و جلوہ دہ در محشر عشاق قامت را
از ایں بالا بلند آوازہ کن شورِ قیامت را

---

(1) ایضاً۔ ص ۷۰۲۔

(2) یہ اشعار دیوان محسن ٹھٹھوی سے انتخاب کیے گئے ہیں۔

می دہد بسمل شدن تسکیں دل بیتاب را
بعد کشتن بیقراری میرود سیماب را[1]

داؤد خاں عباسی

مصنف: صید المراد

داؤد خاں عباسی بن یار محمد خدا یار خاں ثابت جنگ عباسی برادر میاں نور محمد والیِ سندھ کا تذکرہ صاحب مقالات الشعرا نے مقالات الشعرا میں بحیثیت ایک شاعر کے کیا ہے، اسی بنا پر ہم بھی اس کا تذکرہ شعر و ادب کے عنوان کے تحت کر رہے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی شاعری سے زیادہ اُس کے علم و فضل کا پلہ بھاری ہے، وہ خود بھی صاحب علم و فضل تھا اور ساتھ ہی معارف نواز اور علماء پرور امیر تھا۔ اس کی علمی قدر دانیوں کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ قانع نے اس کی قدر دانیوں اور علمی سرپرستیوں کو سراہتے ہوئے لکھا کہ وہ صاحب دل اور فیاض امیر تھا۔ طب میں اُسے پوری دستگاہ حاصل تھی، حکیم میر عبدالرزاق مشرب[2] اور دوسرے اہل کمال داؤد خان عباسی کی سرپرستی میں حسب مراتب نہایت عزت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔

میاں داؤد خاں عباسی کی ایک تصنیف "صید المراد فی قوانین الصیاد" ہے۔ جسے کرنیل ڈی۔ سی فلٹ نے ۱۹۰۸ء میں نہایت اہتمام سے شائع کیا تھا، یہ کتاب ۴۳۳ صفحات، اکتیس ابواب اور خاتمے پر مشتمل ہے، کتاب کا موضوع شکاری جانور اور ان کی خصوصیات ہیں۔

قانع نے اُس کے ایک قصیدے کے چند شعر مقالات الشعرا میں نقل کیے ہیں جن میں سے بعض اشعار ہم نمونتاً یہاں درج کرتے ہیں۔

شبنم را کی رباید مہر بے حکمت زگل
گرچہ باشد جذبہ اش پُر زور از آہن ربا

رنگ تا محشر نہ بندد پنجۂ خورشید را
گر ایاغ صبح و شام چرخ گردد پُر حنا
کے پذیرد رنگ یک برگ گلے در گلستاں
آسماں خونِ شفق را گر کند بروے طلا[3]

سرخوش:

شیخ محمد محفوظ ولد شیخ محمد مرید کا تخلص سرخوش تھا، ابتداء فدائی تخلص کرتا تھا، اس کی ذات میں علوم و فنون جمع تھے، نہایت خوش اخلاق تھا۔ میاں نور محمد کی طرف سے سردار جہاں خاں کے پاس کابل میں وکالت کے فرائض بھی انجام دیے، تاریخ کے کہنے میں کمال رکھتا تھا، نمونتاً اس کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں:

گہ کشی، گاہ زندہ می سازی
دلبری ہم کم از خدائی نیست

خراب کرد فغانِ تو آسماں اے دل
ترا کہ گفت کہ رو در پئی بتاں اے دل

صلح کردم بوسۂ دہنش
چہ کنم وقت تنگ میباشد[4]

سرافراز:

محمد سرافراز ولد میرزا شاد کا تخلص سرافراز تھا، اس کے اجداد نو مسلم تھے، خود منصب دار تھا، شعر بھی کہتا تھا۔ اس نے ۱۱۶۹ھ میں وفات پائی۔[5]

چتر بھوج:

صاحب مقالات الشعرا کا بیان ہے کہ ٹھٹھہ کے ہندوؤں میں کوئی شخص بھی فن انشا میں چتر بھوج کا ہمسر نہیں تھا۔ اکثر حکام ہند کے پاس بطور منشی رہا اور فن منشی گری میں بلاغت میں اُسے کمال حاصل تھا۔ اس نے طویل عمر پائی اور ۱۱۷۱ھ میں فوت ہوا، نظم و نثر میں کمال رکھتا تھا، خصوصاً

---

(1) رجا کے حالات اور اُس کے یہ اشعار مقالات الشعرا ص ۲۲۳-۲۳۲ سے ماخوذ ہیں۔

(2) میر عبدالرزاق مشرب: اصفہان کے سادات خاندان سے تھا اور جمیع علوم کا جامع تھا، خصوصاً جفر اور حساب میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا، طب میں بقراط وقت تھا اور سخاوت میں حاتم کی مثل تھا، اکثر فقرا کا علاج اور تیمار داری خود کرتا تھا، شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آیا اور عالمگیر کے عہد میں بریلی میں مقیم ہو گیا اور وہاں کے سادات سے رشتہ دارانہ تعلقات پیدا کیے۔ ایک زمانے تک نوازش خاں رومی صوبیدار کشمیر کے پاس رہا، آخر میں سندھ آیا اور میاں داؤد خاں عباسی سے وابستہ ہو گیا، مشرب نے ۱۱۲۷ھ میں وفات پائی (مقالات الشعرا، ص ۷۶۰)۔

(3) داؤد خاں عباسی کے یہ حالات مقالات الشعرا ص ۲۱۲ اور تاریخ کلہوڑہ جلد ۲، ص ۱۰۱۱-۱۰۲۰ سے لیے گئے ہیں۔

(4) مقالات الشعرا، ص ۲۹۱-۲۹۸۔

(5) مقالات الشعرا، ص ۲۹۱۔

ہجو میں تاریخ کہنے میں اُسے کمال حاصل تھا۔ میر علی شیر قانع نے مقالات الشعرا میں اس کی کہی ہوئی تاریخوں کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔[1]

حسن:

معین الدین حسن ولد میر ابو المکارم شہود، شعر بہت اچھا کہتا تھا ایک دفعہ اپنا مکان تعمیر کرا رہا تھا اور تعمیر مکان میں لوہے کی میخوں کی بجائے رسیوں سے کام لے رہا تھا، کسی نے کہا جب خدا نے مقدرت دی ہے تو میخیں کیوں نہیں استعمال کرتے، اُس نے جواب میں فی البدیہہ یہ شعر کہے:

خانۂ بے بقائے فانی را
بہہ ازیں دیگرے چہ آراید
فکر بیت دگر چرا نہ کنی
کہ ترا جاوداں بکار آید[2]

سندھی شاعری کا روشن آفتاب
شاہ عبد اللطیف بھٹائی

کلہوڑہ عہد میں یوں تو سندھی کے بھی بہت سے شاعر تھے، لیکن اس عہد میں جو سندھی شاعری کے آسمان پر آفتاب بن کر طلوع ہوا وہ شاہ عبد اللطیف بھٹائی تھے، سندھی شاعری میں جو شہرت اور مقبولیت بحیثیت ایک روحانی پیشوا اور شاعر کے شاہ عبد اللطیف بھٹائی کو میسر آئی وہ دوسروں کا حصہ نہ بن سکی، سارے سندھی شاعروں میں بحیثیت شہرت اور مقبولیت کے کوئی اُن کا ہمسر نظر نہیں آتا، اگر ایک طرف ان کی ذات فیوض برکات کا سرچشمہ تھی تو دوسری طرف اُن کی شاعری اپنے اندر عرفان و تصوف و اثر و تاثیر، سوز و گداز، حب وطن کا ایک خزینہ لیے ہوئے تھی۔ اُن کی شاعری نے سندھی شاعری میں تصوف کی روایت کو سنوارا اور نکھارا۔ ان کی شاعری میں ہمیں ایک نیا شعور، ایک نیا احساس، ایک نیا جذبہ اور ایک نئی لگن ملتی ہے۔ وہ سندھ کے ایک قومی و ملی شاعر تھے۔ اُن کے پاکیزہ نغموں سے سندھ کے گاؤں، قصبے اور شہر گونج اُٹھے۔ اُن کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس سے تعلیم یافتہ طبقہ بھی لطف اندوز ہوتا ہے اور ناخواندہ طبقہ بھی اُن کے اشعار سن کر ایک لذت محسوس کرتا ہے۔ آج بھی عورتیں گھروں میں، کسان کھیتوں میں، بچے گلیوں میں، صوفیا خانقاہوں میں شاہ کے کلام کو پڑھتے اور سر دھنتے ہیں۔

شاہ عبد اللطیف سید عبد الکریم کی اولاد میں تھے جو ٹیاری کے باشندے تھے، لیکن بلڑی میں مقیم ہو گئے تھے، آپ کے پڑپوتے سید حبیب شاہ بلڑی کی سکونت ترک کر کے پھر اپنے اصل وطن ٹیاری آ گئے تھے۔ یہی شاہ عبد اللطیف کے والد تھے۔

شاہ عبد اللطیف کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

شاہ عبد اللطیف بن سید حبیب شاہ بن سید عبد القدوس بن سید جمال بن سید عبد الکریم بن سید اللہ۔

شاہ عبد اللطیف ۱۱۰۱ھ (۹۰-۱۶۸۹ء) ہالہ حویلی میں پیدا ہوئے، جہاں اُن کے والد سید حبیب شاہ ان کی پیدائش کے وقت مقیم تھے۔ شاہ عبد اللطیف کا لڑکپن ہالہ حویلی میں ہی گزرا، پھر شاہ حبیب کوٹری چلے آئے تو یہ بھی اپنے والد کے ساتھ کچھ زمانہ کوٹری میں رہے۔

شاہ نے کن مدارس میں تعلیم پائی اور کن اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب طے کیا، اس سلسلے میں اُن کے تمام تذکرہ نگار خاموش ہیں بلکہ مشہور تو یہ ہے کہ شاہ نے کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور وہ اُمی تھے لیکن ہماری رائے میں یہ قیاس صحیح نہیں، کیونکہ اُن کی شاعری اور کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے بڑے عالم تھے، عربی، فارسی، اور ہندی پر اُن کو بڑی قدرت تھی، قرآن مجید، حدیث، تصوف اور دوسرے علوم پر اُن کی گہری نظر تھی، قرآن و احادیث کے اعلیٰ مضامین کو اور تصوف کے معارف اور اصطلاحوں کو اُنہوں نے جس دلکش انداز میں اپنی سندھی شاعری میں سمویا ہے، یہ سب چیزیں اُن کے علم و فضل کی شاہد ہیں۔

بعد میں جس مقام کو شاہ نے اپنے قیام کے لیے پسند فرمایا، وہ اب "شاہ بھٹ" کے نام سے مشہور ہے، بھٹ سندھی میں ریت کے ٹیلے کو کہتے ہیں، جو ان کے قیام کے بعد خوب آباد ہوا۔ اسی مقام پر انہوں نے بیٹھ کر علم و عرفان کے چشمے جاری کیے اور رشد و ہدایت کی وہ شمع روشن کی جس کی روشنی سندھ سے نکل کر دور دور تک پھیلی۔

شاہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے بہت سے انقلابات دیکھ چکے تھے، جب اورنگ زیب نے وفات پائی تو اس وقت ان کی عمر اٹھارہ

---

(1) ایضاً۔ ص ۱۶۳-۱۶۴۔

(2) ایضاً۔ ص ۱۷۵۔

سال کی تھی، یہ وہ دور تھا جب سلطنت مغلیہ کے عروج کا آفتاب زوال پذیر ہو رہا تھا، خود ان کے وطن میں خاندان کلہوڑہ کی حکومت مرکزی حکومت کا جوا کندھے سے اُتار کر تیزی سے خود مختاری کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ انہوں نے وہ وقت بھی دیکھا تھا جب نادر شاہ[1] نے سندھ کو لوٹا اور کلہوڑہ، فرمانروا ایران کے باج گزار بنے۔ ان کے سامنے وقت بھی آیا جب احمد شاہ ابدالی نے دندناتے ہوئے دہلی اور سندھ کو کابل کے ماتحت بنایا۔

یہی وہ زمانہ تھا، جب ایک طرف سیاسی نظام متزلزل ہو رہا تھا اور دوسری طرف اخلاقی قدروں کی گرفت ڈھیلی ہو رہی تھی، فکر و عمل اخلاق و کردار کا قوام بگڑ رہا تھا، طبقاتی تفاوت نے غریبوں کی زندگی کو ایک عذاب بنا دیا تھا، زندگی کی ساری راحتیں امیر اور دولتمند طبقے کے لیے تھیں اور غریب بیچارے زمین کا بوجھ بنے ہوئے تھے۔ صوفیاء خام اور علماء سُو رشد و ہدایت کے پردے میں گمراہیوں کو جنم دے رہے تھے۔ یہ تھا وہ ماحول جس نے شاہ عبداللطیف کے حساس دل کو بے حد متاثر کیا، انہوں نے وقت کی آواز کو پہچانا اور دکھی انسانیت کو محبت کا پیغام دیا، ان کی ساری زندگی کی جد و جہد کا مقصد یہ تھا، کہ انسانوں کے رشتے کو خدا سے جوڑا جائے، رسول اکرم ﷺ کی محبت سے قلوب کو گرمایا جائے۔ بگڑی ہوئی زندگی کو حسن اخلاق اور پاکیزہ کردار سے آراستہ کیا جائے۔ ظلم کے خبیث درخت کو اُکھیڑ کر دنیا کو محبت و خلوص سے آشنا کیا جائے۔

بھٹ میں قیام فرمانے کے بعد تقریباً چالیس سال تک اس مقصد کے لیے شاہ نے جو انتھک کوشش کی ہے، انکی پوری شاعری اس کی گواہ ہے، انہوں نے اپنے پیغام کو عام کرنے کے لیے سندھ کی ان رومانی داستانوں کو بنیاد بنایا جنہیں سندھ کے لوگ بڑے ذوق و شوق سے سنتے تھے۔ ان ہی کہانیوں کے پردے میں اُنہوں نے عوام کے دکھوں اور غموں کی ترجمانی کی ہے، خالق اور مخلوق کی محبت ان کی شاعری کا موضوع خاص ہے۔ ان کی شاعری میں تصوف اور شعریت کا ایک حسین امتزاج ہے، جس سے پڑھنے والا ان کے نغموں میں ایک روحانی کیف محسوس کرتا ہے۔

شاہ کے مجموعہ کلام کا نام "شاہ جو رسالو" ہے، یہ کلام ان کے مریدوں اور فقیروں نے جمع کیا تھا ان کے بعض مرید تو ایسے تھے کہ انہیں شاہ کا پورا کلام زبانی یاد تھا، ہاشم، تمر اور بلال کے متعلق تو مشہور ہے کہ شاہ کا کوئی شعر ایسا نہ تھا، جو ان کو زبانی یاد نہ ہو، شاہ جو رسالو کو سب سے پہلے ڈاکٹر ٹرمپ نے جرمنی کے شہر لائپزگ سے سنہ ۱۸۶۶ء میں طبع کرایا تھا، اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، پھر اس کا ایک ایڈیشن ڈاکٹر گربخشانی نے شائع کیا، حال ہی میں اس کا ایک ایڈیشن سندھی ادبی بورڈ سے شائع ہوا ہے۔

شاہ کی شاعری پر ان کے تبصرہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ سندھی زبان، سندھ کی قدیم تہذیب اور تصوف کے رموز و معارف سے واقف ہو، اس کے بغیر ان کے شعر کی روح تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔ ہم ان کے چند اشعار کا ترجمہ ذیل میں دیتے ہیں۔

ایک جگہ خود ہی اُنہوں نے اپنے کلام کے مقصد اور مطمح نظر کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

"اس کلام کو معمولی اشعار نہ سمجھو، یہ آیاتِ ربانی ہیں۔ یہ آیات پڑھنے والوں کو محبوب حقیقی کی طرف لے جاتی ہیں۔

محبوب کی شان استغنا اور جمال کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

میرا محبوب اپنی شان جمال کے ساتھ خراماں ہوتا ہے، زمین بسم اللہ پکار اُٹھتی ہے۔

دیکھو جہاں جہاں اس کے قدم گزرے ہیں، وہاں راہ بھی بوسہ زن ہے، حوریں ایک طرف ادب سے کھڑی ہیں۔

اے چاند! تو میرے محبوب کا مقابلہ کرتا ہے، میں تجھے للکارتا ہوں، تو چودھویں رات کا جو سنگھار چاہے کر، ساری کائنات کا حسن اکٹھا کر لے، لیکن میرے محبوب کے ایک جلوے کی بھی برابری نہیں کر سکتا۔

شاہ کی شاعری کا اصل موضوع "وحدۃ الوجود" ہے، اس موضوع کو انہوں نے شاعری میں نئے نئے انداز سے پیش کیا ہے، فرماتے ہیں:

معرفت حقیقی حاصل کرنے کے لیے بہت سے راستے ہیں، کوئی بھی راہ اس کا مشاہدہ کرا سکتی ہے، ایک قصر ہے، جس کے لاکھوں دروازے اور ہزاروں کھڑکیاں ہیں، جس طرف نظر پھیرتا ہوں، اُدھر خدا کا جلوہ ہے"۔

حب الوطنی شاہ کی شاعری کا موضوع خاص ہے، وہ نت نئے طریقوں سے اپنے اہل وطن کے قلوب میں محبتِ وطن کے چراغ کو

---

[1] نادر شاہ کی آمد سندھ آواخر ۱۱۵۲ھ: واپسی براہ لاڑکانہ ۱۱ محرم ۱۱۵۳ھ: نادر شاہ کا قتل ۱۱۶۰ھ (فٹ نوٹس مقالات الشعراء، ص ۷۸-۲۷۶)۔

روشن کرنا چاہتے ہیں۔ ماروی کے پردے میں وہ اپنے ہم وطنوں کو حب الوطنی کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں:

اگر میں پردیس میں مر جاؤں تو میری مٹی بیابانوں میں بستے ہوئے غریب رشتے داروں کے ساتھ ملانا اور میری میت کو آبائی وطن کی باڑوں سے دھواں دینا۔

وہ اپنے اہل وطن کی جامد اور بے عمل زندگی کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے ہیں اور اس جمود کے طلسم کو توڑنے کے لیے وہ سندھی معاشرے کی ایک قدیم رسم کو تمثیل بنا کر انہیں عمل اور حسن عمل کی دعوت دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

"تمہیں کاتنے سے ذرا دلچسپی نہیں، سوتے ہوئے کروٹیں بدل رہی ہو، یکایک عید آئے گی، لوگ نئے کپڑوں سے محروم رہیں گے، خود تمہارے پاس کپڑے نہیں ہوں گے، تمہاری سہیلیاں تمہیں باہر لے جانے کے لیے آئیں گی۔

--

گرمی سردی میں چلتے رہو، بیٹھنے کا وقت نہیں کہیں ایسا نہ ہو اندھیرا ہو جائے، اور محبوب کے قدموں کا شرف نہ حاصل ہو سکے۔

بارش کی پہلی بوند پڑنے پر اہل سندھ کی زندگی میں جو ولولے اور اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں، ان کی عکاسی شاہ کے قلم نے جس انوکھے انداز سے کی ہے، وہ اشعار سندھی ادب کا بہترین شاہکار ہیں۔

"کل رات پدم جھیل پر بارش کے دیوتا نے گھڑے کے گھڑے انڈیل دیے، لیکن وہ جن کے شوہر پردیس میں ہیں، ان بادلوں کو دیکھ کر غمگین ہیں"۔

--

"وہ موسم آگیا جب لوگ خوش ہو کر باتیں کرتے ہیں اور موسیقی کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، کسان اپنے ہل درست کر رہے ہیں، گلہ بان خوش ہیں اور میرے محبوب نے بارش کی خوشی میں اچھے سے اچھے کپڑے پہنے ہیں"۔

--

ساون کی رات آئی، قہقہے اور چہچہے بلند ہو رہے ہیں۔ کوئل کی تیکھی تیکھی کوک فضا کو چیرتی ہے۔ ہاریوں نے ہل جو لیے، گویے خوش ہیں۔ برکھا کی رات آگئی، خوشی کے چہچہے اور میٹھے زمزمے بلند ہوئے۔ مٹکے مکھن سے بھرپور ہو گئے۔

ایک جگہ وہ راہ محبت کے راہیوں کو عشق کی راہ کی کٹھنائیوں سے واقف کراتے ہوئے نہایت شیریں الفاظ میں دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

دار اور سولی پر چڑھنے کی دعوت دی جا رہی ہے، میرے ساتھ اگر کسی کو چلنا ہے تو چلے، دار پر جانا تو ان لوگوں کا کام ہے جو محبت کا نام لیتے ہیں۔ سولی عاشقوں کو اپنی طرف بلا رہی ہے، اگر تم عشق و محبت کے طالب ہو تو پیچھے مت ہٹو، پہلے سر تن سے الگ رکھو، پھر محبت کا نام لو۔ سولی اور دار تو در حقیقت عاشقوں کے لیے باعث زیب و زینت اور ہار ہے، ہچکچانا یا پیچھے ہٹنا تو ان کے لیے عتاب ہے، وہ تو بر ملا دار پر چڑھتے ہیں، محبت کی راہ و رسم پر قربان ہونا اور سر تن سے جدا ہونا تو عاشقوں کا ایک ادنیٰ کرشمہ اور ان کی زندگی کا جزو لاینفک ہے۔[1]

شاہ عبداللطیف نے ۶۳ سال کی عمر میں ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) میں وفات پائی اور بھٹ میں ہی مدفون ہوئے۔

تاریخ وفات ان دو مصرعوں سے نکلتی ہے:

(۱) گردیدہ محو عشق وجود لطیف میر ۱۱۶۵ھ

(۲) شد محو در مراقبہ جسم لطیف پاک ۱۱۶۵ھ

صاحب مقالات الشعرا کا بیان ہے کہ جس روز آپ کی وفات ہوئی آپ کے بعض مرید اس صدمۂ جاں کاہ کو برداشت نہ کر سکے اور جان دے دی۔

آپ کا روضہ مبارک کلہوڑہ خاندان کے فرمانروا میاں غلام شاہ نے ۱۷۵۴ء میں تعمیر کرایا اور راجا جیسلمیر نے نوبت نذر کی۔

شاہ عبداللطیف نے اپنے ایک عزیز دوست میرزا مغل بیگ کی لڑکی سے نکاح کر لیا تھا، مگر اولاد کوئی نہیں ہوئی۔[2]

عبدالرؤف منشی:

عبدالرؤف منشی کلہوڑہ عہد کا ایک نامور ادیب اور انشا پرداز تھا۔ اس کے منشاءات اور مکاتیب کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے سرکاری خط و کتابت میں پر تکلف اور استعارہ آمیز طرز تحریر کو چھوڑ کر سلیس اور سادہ اسلوب نگارش کو جنم دیا ہے۔ یہ موضع ہنگورچہ مضافات بکھر کا رہنے والا تھا۔ فن انشا میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا، پہلے یہ نواب خدا یار

---

(1) یہ تمام اشعار نذر لطیف شائع کردہ محکمہ اطلاعات سندھ کے مختلف مضامین سے ماخوذ ہیں۔

(2) یہ تمام تفصیل مقالات الشعرا ص ۴۲۸-۴۲۹۔ تحفتہ الکرام اُردو ترجمہ ص ۴۷۵، تذکرہ صوفیائے سندھ، ص ۱۷۲-۱۸۸ سے ماخوذ ہے۔

خاں کی سرکار میں میر منشی مقرر ہوا، پھر نور محمد کلہوڑہ کے عہد میں بھی وہ اسی خدمت پر مامور رہا اس کی وفات کے بعد اس کا نواسہ عبداللہ اس کی جگہ پر میر منشی مقرر ہوا۔[1]

میرزا معز اصفہانی:

میرزا معز اصفہانی بھی بڑا صاحب علم و فضل انسان تھا۔ یہ ۱۱۶۶ھ میں ٹھٹھہ پہنچا، تو اس کے علم و فضل کی قدر دانی کرتے ہوئے میاں محمد مراد یاب خاں نے نہایت نیاز مندی سے اسے اپنے حضور میں طلب کر کے مولوی محمد جعفر شیرازی سے بھی زیادہ اس کو مقرب بنایا، کچھ مدت یہ اس کے پاس رہا، پھر وہاں سے بمبئی اور بمبئی سے دکن چلا گیا۔[2]

یہ ہم نے عہد کلہوڑہ کے بعض مشاہیر شعرا اور ادیبوں کا ذکر کیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں بے شمار شعرا اور ادیب تھے، جن کے حالات ہمیں تذکروں اور اس دور کی تاریخوں میں ملتے ہیں، لیکن ہم بنظر اختصار ان کو ترک کرتے ہیں۔

کلہوڑہ دور کے شہر اور عمارتیں

کلہوڑہ دور کے شہر اور عمارتوں کا حال تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) جلد دوم تالیف، مولانا غلام رسول مہر سے لے کر ہم اختصار کے ساتھ یہاں پیش کرتے ہیں۔

خدا باد:

یہ کلہوڑہ حکومت کا ابتدائی دارالسلطنت تھا، اس کا بانی یار محمد خاں الخاطب بہ خدا یار خاں تھا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس مقام کا نام اس سے پہلے شکار پور پنہواری تھا، خدا یار خاں نے اس کا نام بدل کر "خدا باد" رکھا۔ کلہوڑوں کے دور میں اس شہر کو غیر معمولی ترقی ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ اس شہر کے کھنڈر کم و بیش پچاس ایکڑ میں پھیلے ہوئے ہیں، اب بھی اس شہر کی دو عمارتیں موجود ہیں، ایک جامع مسجد اور دوسرے میاں یار محمد خاں کا مقبرہ، یہ مقبرہ میاں غلام شاہ نے بنوایا تھا۔

سندھ کے ایک شاعر اور مورخ ملک باغ علی خائف نے اپنی کتاب نامۂ نغز میں اس شہر کی حسن و خوبصورتی، رونق و آبادی اور بہترین آب و ہوا کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے کہ:

ہوا خوش دل و باغباں دل پذیر
"خدا باد" شہر است جنت نظیر

میر علی شاہ شائق نے میاں عبدالنبی کے عہد کے خدا آباد کے حسن و نکھار کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

ویں خدا بادی کہ اندر وی خدا آباد کرد
ہم چو نام خود خدا باد است شہر جان فزا
باد خود آباد چوں در سینۂ اقلیم سند
راحتِ دلہای پیچاں پوں دم روح خدا
خانہ ہائش چوں جناں، جانانہ ہائش جاں ستا
دلبرانش دل ربا دل دادگانش در عزا
گل عذارانش بہ زیبا چہرۂ چوں لالہ زار
خوش مقال و رمز فہم و نکتہ دان و آشنا
قصر سلطان درمیان و درمیانش گلستاں
دست قدرت را نگار و پایِ قدرت را حنا

محمد آباد:

اس شہر کی بنیاد میاں نور محمد نے رکھی تھی اور یہ بھی ایک خوبصورت شہر تھا۔

مراد آباد:

یہ شہر نصرپور سے متصل دریا کے دوسرے کنارے پر آباد تھا، جب میاں مراد یاب خاں کے نام فرمان حکومت جاری ہوا تو یہیں میاں مراد یاب کی رسم جلوس ادا ہوئی تھی۔ ۱۷۵۴ء میں اسی مقام پر یہ شہر آباد ہوا، جس کا نام مراد یاب کی مناسبت سے مراد آباد رکھا گیا، لیکن کچھ مدت کے بعد یہ شہر طغیانی کی وجہ سے برباد ہو گیا، اب اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں۔

الہٰ آباد:

مراد آباد کی تباہی کے بعد میاں غلام شاہ کلہوڑہ نے ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی، جس کا نام الہٰ آباد رکھا، بعد میں یہ شہر شاہ پور کے نام سے مشہور ہوا، لیکن یہ شہر کچھ دن ہی کلہوڑوں کا مرکز رہا۔ اب یہ شہر معمولی حالت میں ہے۔

---

(1) مقالات الشعرا، ص ۴۲۱۔

(2) ایضاً۔ ص ۷۶۴-۷۶۵۔

شاہ گڑھ اور شاہ بندر:

میاں عطر خاں اور میاں غلام شاہ کی کشمکش کے زمانے میں جب کہ میاں عطر خاں نے عطائی خاں کو لے کر سندھ پر چڑھائی کر دی تھی، تو میاں غلام شاہ جنوبی علاقے کی طرف ہٹ گیا تھا۔ اس نے کچھ کو اپنا مرکز بنا کر اس کا نام شاہ گڑھ رکھا تھا اور اس کے قریب ہی ایک بندرگاہ کا انتظام کیا تھا، جس کا نام "شاہ بندر" رکھا تھا، جب یہ کشمکش ختم ہوئی تو میاں غلام شاہ نے اس مرکز کو ترک کر دیا۔

حیدرآباد:

میاں غلام شاہ کے آباد کردہ شہروں میں جس شہر کو غیر معمولی عظمت و شہرت حاصل ہوئی وہ شہر حیدرآباد ہے، جسے دارالسلطنت کی حیثیت حاصل تھی، یہ شہر کلہوڑوں کے بعد بھی ٹالپروں کا دارالسلطنت رہا اور آج بھی اس کا شمار پاکستان کے صوبہ سندھ کے بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔ یہ شہر میاں غلام شاہ نے نیرن کوٹ کی جگہ آباد کیا تھا۔

خداباد نو:

یہ شہر ہالہ سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر تھا، جس کی بنیاد میاں سرفراز خاں کے عہد میں پڑی۔ بعد میں بلوچوں نے اس کو اپنا تخت گاہ بنایا تھا۔ میر فتح علی خاں اس شہر میں رہا تھا۔

عمارتیں

کلہوڑہ عہد کی عمارتیں جن کا اب تک پتا چل سکا، حسب ذیل ہیں:

شاہ بہارا کا مقبرہ:

شاہ بہارا کا مقبرہ لاڑکانہ میں ہے، جہاں شاہ بہارا ایک مدت تک حاکم رہا۔ یہ مقبرہ میاں آدم شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔

میاں آدم شاہ کا مقبرہ:

یہ مقبرہ بھی میاں غلام شاہ کا بنوایا ہوا ہے، جو سکھر میں واقع ہے۔

شاہل محمد کا مقبرہ:

یہ مقبرہ بھی میاں غلام شاہ کا تعمیر کردہ ہے، جو قنبر سے ۶ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

میاں نصیر محمد کا مقبرہ:

میاں نور محمد اور محمد مراد یاب کی تصویر

یہ عمارت میاں یار محمد خاں کی تعمیر کردہ ہے۔

لاڑکانہ کا قلعہ:

یہ بھی عہد کلہوڑہ کی تعمیر ہے۔ اب اس کا کوئی نام و نشان باقی نہیں ہے۔

درگاہ پیر رکن شاہ: تعمیر ۱۱۷۹ھ- درگاہ پیر شاہنشاہ: تعمیر ۱۱۷۵ھ۔

قلعہ بدین:

یہ ۱۷۵۰ء میں تعمیر ہوا، جسے مدد خاں نے برباد کیا۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کا مقبرہ:

یہ بھٹ میں واقع ہے، جسے میاں غلام شاہ کلہوڑہ نے تعمیر کروایا تھا۔

میاں نور محمد کا مقبرہ:

یہ غالباً میاں مراد یاب کے عہد میں تعمیر ہوا۔

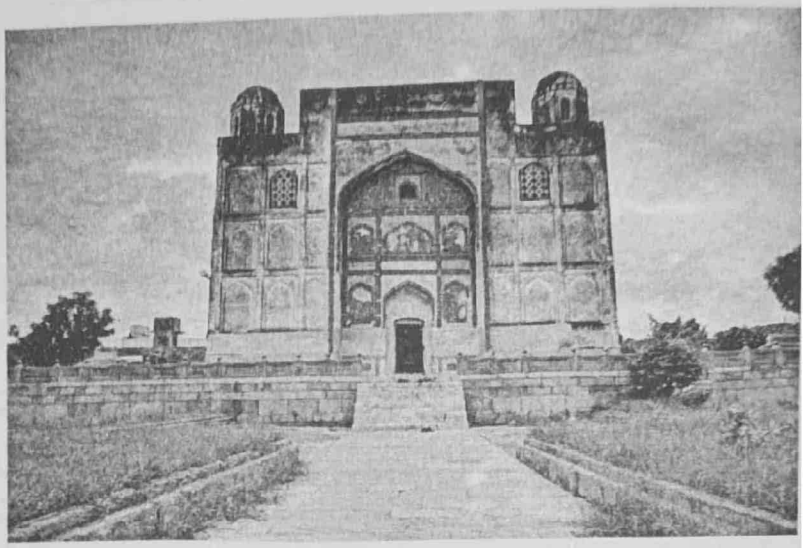

میاں غلام شاہ کلہوڑو کا مقبرہ

میاں غلام نبی کلہوڑو کا مقبرہ

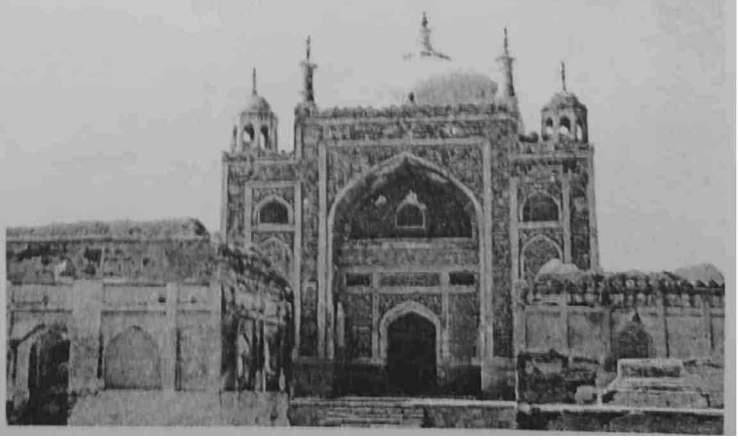

میاں نور محمد کلہوڑو کا مقبرہ

باب :26

ٹالپوروں کا دور حکومت

ٹالپوروں کا عہد

۱۱۹۹ھ (۱۷۸۴ء) - ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء)

ٹالپوروں کی اصل:

ٹالپور بلوچوں کی ایک شاخ ہیں۔ بلوچوں کا دعویٰ ہے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضہ کی اولاد سے ہیں۔ تاریخوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پانچویں صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں کرمان اور مکران (موجودہ ایرانی بلوچستان) سے بلوچستان میں آئے اور یہاں سکونت اختیار کرلی، جس کے بعد اس ملک کا نام بلوچستان پڑا، اس وقت بھی بلوچ سب سے زیادہ بلوچستان ہی میں آباد ہیں۔ اس کے بعد یہ پھیلنا شروع ہوئے۔ ان میں سے بعض سندھ میں اور بعض دوسری جگہوں پر آکر آباد ہوئے اور زراعت، سپاہ گری اور دوسرے پیشوں میں مشغول ہوگئے۔

وجہ تسمیہ:

ٹالپور کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ "ٹالہ" ان بلوچوں کے ایک خاندانی بزرگ کا نام تھا اور "پور" فارسی میں اولاد کو کہتے ہیں۔ ان ہی دو لفظوں سے مرکب ہوکر "ٹالہ پور" بنا، پھر عوام کے کثرت استعمال سے یہ ٹالپور ہوگیا۔ خود ٹالپوروں کی بھی بہت سے شاخیں ہیں، لیکن ہمارا مقصود صرف وہ ٹالپر ہیں جو کہ حیدرآباد، خیرپور اور میرپور میں حکمراں ہوئے، اس لیے ہم صرف ان کا ذکر کریں گے۔ ان سب کا جد اعلیٰ ککہ یا ککو خاں عرف سلیمان خاں تھا۔ ککو خاں کے آٹھ بیٹے تھے، لیکن ہم یہاں اس کے دو بیٹوں کا تذکرہ کریں گے، جن کی اولاد سے حیدرآباد، خیرپور اور میرپور کے میر تھے، ان میں سے بڑے بیٹے کا نام ہوتک خاں اور تیسرے بیٹے کا نام مانک خاں تھا۔

میرانِ حیدرآباد:

ہوتک خاں کی اولاد سے میران حیدرآباد و خیرپور تھے۔ ہوتک خان کا ایک بیٹا شہداد خاں نامی تھا، سندھ کا مشہور شہر شہدادپور اسی کا آباد کیا ہوا ہے۔ شہداد خاں نے ۱۱۴۷ھ (۱۷۳۴ء) میں وفات پائی اور شہدادپور سے بارہ میل شمال مشرق کی جانب شہر شاہ پور کے متصل ایک شاہی قبرستان میں مدفون ہوا جس کو اب بھی قبہ میر شہداد کہتے ہیں۔

شہداد خاں کے یوں تو کئی بیٹے تھے، لیکن اس کے دو بیٹے جن کا تذکرہ یہاں مقصود ہے، میر چاکر خاں اور میر بہرام خاں تھے۔ میران خیرپور کا خاندان اسی چاکر خاں کی اولاد سے ہے، یہ خاندان پہلے شہدادائی کے نام سے مشہور تھا، پھر چاکرانی کے نام سے مشہور ہوا۔ چاکر خان ایک بڑا زمیندار تھا، اب تک تعلقہ شہدادپور میں اس کا بنا کردہ شہر "شاہ پور چاکر" کے نام سے مشہور ہے۔

دوسرا بیٹا میر بہرام خاں تھا، یہ وہی میر بہرام خاں ہے جس کا تذکرہ ہم کلہوڑہ عہد حکومت میں کرچکے ہیں، جو ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) میں میاں محمد سرفراز کے ہاتھوں شہید ہوا۔

میر بہرام خان کے بھی کئی بیٹے تھے، لیکن اس کا ایک بڑا بیٹا میر صوبدار تھا، جو اپنے والد کے ساتھ ۱۱۸۹ (۷۶-۱۷۷۵ء) میں شہید ہوا اور یہ دونوں باپ بیٹے خداباد میں مدفون ہوئے۔ حیدرآباد کے میروں کا خاندان اسی میر بہرام خاں کی اولاد سے ہے۔

میر صوبدار کے چار بیٹے میر فتح علی خاں، میر کرم علی خاں، میر غلام علی خاں اور میر مراد علی خاں تھے۔ یہ وہی میر فتح علی خاں ہے جو "فاتح سندھ" کہلاتا ہے۔

میرانِ خیرپور:

میر چاکر خاں کے بھی اگرچہ کئی بیٹے تھے، لیکن میر سہراب خاں

اس کا نامور بیٹا تھا، جو میر فتح علی خاں فاتح سندھ کا رفیق دوم تھا۔ میران خیر پور اسی کی اولاد سے ہیں۔

میرانِ میر پور:

مانک خاں بن ککہ خان کے بھی کئی بیٹے تھے، چنانچہ میر پور کے میر، مانکانی کے نام سے اسی مناسبت سے مشہور ہیں۔ مانک خان کے بڑے بیٹے کا نام میر اللہ یار خاں تھا، میر اللہ یار خاں کے بھی کئی بیٹے تھے، جن میں سے ایک میر مسو خاں تھا، میر مسو خاں کے بھی متعدد فرزند تھے، لیکن اس کا بڑا بیٹا میر فتح خاں تھا، میر فتح خاں کے بھی کئی بیٹے تھے۔ لیکن اس کے دوسرے بیٹے میر ٹھارہ خاں نے فتح ملک سندھ میں شرکت کی تھی اور اسی کی اولاد سے میران میر پور ہیں۔

چونکہ کلہوڑہ حکومت کا آفتاب غروب ہونے کے بعد سندھ کی حکومت تین حصوں میں تقسیم ہو کر ٹالپور کے یہ تین خاندان تین حصوں میں حکمران ہوئے، اس لیے تمہیداً ان خاندانوں کا تذکرہ ضروری تھا۔

میر فتح علی خاں فاتح سندھ

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں، گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے کہ میاں عبدالنبی فرار ہو کر جودھپور چلا گیا، اور اس نے راجن پور ضلع ڈیرہ غازی خاں میں وفات پائی۔ آج بھی اُس کی اولاد وہاں موجود ہے، جو "صاحبزادگانِ سندھ" کے نام سے مشہور ہے۔

کلہوڑوں کے بعد میر فتح علی نے سندھ پر تسلط حاصل کیا اور وہ ٹالپور خاندان میں سندھ کا سب سے پہلا فرمانروا بنا۔

چونکہ ٹالپوروں میں پھوٹ کے آثار پیدا ہو چکے تھے، لہٰذا ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۴ء) میں ان ابتدائی آثار کو دیکھ کر میر فتح علی خاں نے ملک کی فلاح و بہبود اسی میں سمجھی کہ ملک کو تقسیم کیا جائے، چنانچہ اس نے ملک کو سات حصوں میں تقسیم کر کے چار حصے اپنے اور اپنے بھائیوں کے لیے لے لیے، اس کا دارالسلطنت حیدرآباد قرار پایا۔ دو حصے میر سہراب خاں کو اور ایک حصہ میر ٹھارہ خان کو دیا۔ اول الذکر کا دارالسلطنت خیر پور اور آخر الذکر کا مرکز میر پور قرار پایا۔ تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ۔ جلد دوم) میں ہے کہ یہ تینوں علیحدہ علیحدہ خراج کی رقمیں دربار کابل کو پیش کرتے تھے، لیکن "لُب تاریخ سندھ" میں ہے کہ حیدرآباد اور میر پور کے حکمران مل کر خراج کی رقم ادا کرتے تھے اور خیر پور کے حکمران علیحدہ براہ راست اپنی خراج کی رقم پیش کرتے تھے۔ آخر ایک زمانے کے بعد شاہ خراسان و امیران خراسان کی نااتفاقی کی وجہ سے یہ خراج موقوف ہوا اور سندھ کے یہ تینوں ٹالپر خاندان آزاد اور خود مختار فرماں روا بن گئے۔

بظاہر یہ سندھ کی انتظامی تقسیم تھی، کوئی اختلاف اور رنجش ان تینوں حکومتوں میں نہ تھی، بلکہ ان سب نے مل کر مرکزی حیثیت میر فتح علی خاں کو دی تھی، جس کا پایۂ تخت حیدرآباد تھا۔ میر سہراب خان اور میر ٹھارہ خاں نے اپنی حکومتوں کی حیثیت ایک ریاست کی سی رکھی جو بالکل مرکز کے اشارے پر چلتی تھی۔ حیدرآباد کی حکومت چار بھائی میر فتح علی خاں، میر غلام علی خاں، میر کرم علی خاں اور میر مراد علی خاں چلاتے تھے۔ اس کو "چویاری حکومت" کہتے تھے، یہ پہلی چویاری تھی جو ان چاروں بھائیوں پر مشتمل تھی۔ ان چاروں بھائیوں میں سے جب کسی کی وفات ہوئی تو اس کی جگہ اس کے بیٹے کو ملی۔

تینوں حکومتوں کا نظام کار:

ان تینوں حکومتوں کا نظام کار یہ تھا کہ اگر کوئی دشمن ان کی طرف رخ کرتا تو یہ متفق طور پر متحد ہو کر اس کی مدافعت کرتے اگر یہ کسی حصۂ ملک پر قابض ہو جاتے، تو اس کو انصاف کے تقاضوں کے مطابق تقسیم کر لیتے۔ ٹالپوروں نے اپنی متفقہ جدوجہد سے ان تمام کھوئے ہوئے علاقوں کو حاصل کر لیا تھا کہ جو میاں غلام شاہ کے عہد حکومت میں سندھ میں داخل تھے، اور بعد میں وہ دوسروں کے قبضے میں چلے گئے تھے، مثلاً سبزل کوٹ کو انہوں نے دوبارہ نواب بہاول پور سے، اسی طرح کراچی اور اس کے مضافات کو خاں قلات سے اور شکار پور اور اس کے نواح کو افغانوں سے اور لکھپت اور بست کو راجا بھوج سے اور عمر کوٹ اور ریگستان کو راجا جودھپور سے واپس لیا۔ ان کے علاوہ بھی سندھ کے اکثر قصبات جو کلہوڑہ فرمانرواؤں کے زمانے میں ان کے ہاتھ سے نکل گئے تھے، انہوں نے ان کو دوبارہ حاصل کر کے سندھ میں داخل کیا۔[1]

فتح نامہ عظیم میں میر عظیم الدین نے ضلع کورہ کو میر محمد نصیر خاں والیِ قلات سے واپس لینے کے سلسلے میں لکھا کہ ضلع کورہ (کراچی) ایسا مقام ہے کہ اس میں غلہ اس کثرت سے پیدا ہوتا ہے، جیسے نمک کان میں۔ اس کی سالانہ مالگزاری تین لاکھ روپے ہے، ہمیشہ یہ سرزمین سندھ سے متعلق تھی، لیکن جب میاں عبدالنبی نے سندھ

---

[1] لب تاریخ سندھ، ص ۴۶-۱۴۵۔

پر یورش کرنے کے لیے والیِ قلات سے امداد طلب کی اور والیِ قلات سے بروہیوں کی فوج لے کر سندھ پر چڑھائی کی، اور ٹالپوروں نے اسے شکست فاش دی تو اس لشکر میں محمد نصیر خان والیِ قلات کا داماد بھی تھا، جو اس لڑائی میں مارا گیا۔ محمد نصیر خان کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے میاں عبدالنبی سے اپنے عزیزوں کا خون بہا طلب کیا۔ میاں عبدالنبی نے ضلع کورہ (کراچی) کو اس خون بہا کے عوض میں دے دیا اور اس طرح یہ علاقہ سندھ سے جدا ہو کر قلات کا جزو بن گیا۔ لیکن جب میر فتح علی خاں سندھ کا فرمانروا ہوا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ کس قدر عجیب انسان ہے کہ یہ اپنے مقتولین جنگ کا خون بہا آج تک کھا رہا ہے، حالانکہ اب ان مقتولین کی ہڈیوں کا بھی نشان باقی نہ رہا ہوگا، مگر ابھی تک یہ اس خون بہا سے سیر نہیں ہوا۔ میر غلام علی نے کہا کہ اس کا تدارک ضروری ہے اور اس کا منہ اس حرام خوری سے بند کرنا چاہیے، لیکن اگر ہم اس پر چڑھائی کریں گے تو اندیشہ ہے کہ کہیں ہم پر یہ جدید خوں بہا کا دعویٰ نہ کر بیٹھے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں حقیقت دربار افغانستان میں لکھنی چاہیے، چنانچہ میر فتح علی خاں نے اس ضمن میں دربار افغانستان کو معروضہ روانہ کیا، اُس معروضے پر تیمور شاہ نے محمد نصیر الدین والیِ قلات کو لکھا کہ تم اس علاقے سے بہت خوں بہا کھا چکے چونکہ یہ علاقہ سندھ سے متصل ہے، میں یہ علاقہ میر فتح علی خاں کے سپرد کرتا ہوں، تمہیں یہ علاقہ فوراً میر فتح علی خاں کے حوالے کر دینا چاہیے، ورنہ یہ علاقہ تم سے اس طرح لیا جائے گا کہ دنیا تمہارا تماشا دیکھے گی، اگرچہ محمد نصیر والیِ قلات نے اس علاقے کو اپنے پاس رکھنے کے لیے تیمور شاہ کے پاس بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن تیمور شاہ نے اس کی ایک نہ سنی اور یہ علاقہ اس کو میر فتح علی خاں کے حوالے کرنا پڑا۔ اس واقعہ کے کچھ دن بعد ہی تیمور شاہ[1] نے وفات پائی اور اس کا بیٹا زمان شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی اپنے ایلچیوں کے ہاتھ میر فتح علی خاں، میر غلام علی خاں[2]، میر کرم علی خاں، میر مراد علی خاں، امیران سندھ کو خلعت بھیجے[3]۔ میر عظیم نے اس خلعت سے نوازنے کی تاریخ: بگو خلعت ملک آباد باز (۱۲۰۸ھ) سے نکالی ہے۔

(1) تیمور شاہ: تخت نشینی ۱۱۸۶- وفات: ۷ شوال ۱۲۰۷ھ نوائے معارک تعلیقات آقائے حبیبی، ص ۷۹۱-۷۸۷،

(2) (شاہ زمان: تخت نشینی ۱۲۰۷ھ - معزولی: ۱۲۱۵ھ) تعلیقات، ص ۴۔

(3) فتح نامہ عظیم، ص ۱۷۵۔

میرانِ حیدرآباد

(پہلی چویاری)

میر فتح علی خاں فاتح سندھ:

میر فتح علی خاں نے تقریباً ۱۸ سال تک نہایت سکون واطمینان سے سندھ پر حکومت کی اور ۹ محرم ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں وفات پائی۔

سندھ کے مشہور شعرا مائل ٹھٹھوی اور ثابت ٹھٹھوی نے بالترتیب اس کی وفات کی حسب ذیل تاریخیں کہیں:

مائل ٹھٹھوی

گشت چوں میر واصل شہدا
جایش اندر بہشت بنمودند
سال فوتش بہشتیاں بخطاب
"راضی اللہ عنک" فرمودند

۱۲۱۷ھ

ثابت علی "ثابت" کی یہ تاریخ وفات میر فتح علی خاں کے مزار کے گنبد کے دروازے پر کندہ ہے۔

شب شہادت شاہِ شہید رحلت کرد
امیر فتح علی خاں خدیو صاحب عصر
بگفت ثابت زوار سال تاریخش
مکین قصر بہشت و مکاں بہشتی قصر[1]

میر فتح علی خاں کی نعش خداباد نو لے جائی گئی اور وہ اپنے بزرگوں کے پہلو میں مدفون ہوا۔

اولاد:

میر فتح علی خاں کی وفات سے کچھ گھنٹے پہلے اس کو ایک لڑکا پیدا ہوا تھا، جس کا نام صوبدار خاں رکھا گیا تھا۔ پیدائش کے دوسرے ہی دن اسے اپنے باپ کی جگہ مسند نشین کر دیا گیا۔[5]

وفات سے کچھ پہلے میر فتح علی خاں نے سندھ کی حکومت کی سربراہی اپنے بھائی میر غلام علی خاں کے سپرد کی، جس کی حیثیت میر فتح

(4) یہ دونوں تاریخیں تعلیقات تکملہ مقالات الشعرا مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۶۷-۵۶۶ سے ماخوذ ہیں۔

(5) یہ تمام تفصیل لب تاریخ سندھ، ص ۱۴۶ سے ماخوذ ہے۔

علی خاں کی حکومت کے زمانے میں وزیر خارجہ کی سی تھی۔[1]

میر فتح علی خاں کی حکومت پر تبصرہ:

میر فتح علی خاں ایک مدبر، ہوشمند، شجیع اور عاقبت اندیش فرمانروا تھا۔ اس نے سترہ برس کی عمر میں سندھ کو فتح کیا، کلہوڑہ دور کے آخری خلفشار اور ملک میں بدامنی کو دیکھ کر اس کی بڑی تمنا یہ تھی کہ ملک میں خوش حالی اور امن وامان کا دور دورہ ہو، جنگ سے اسے بالطبع نفرت تھی، لیکن جب وہ جنگ کے لیے مجبور کر دیا جاتا تھا تو پھر منہ نہیں موڑتا تھا۔ اس کے شجاعانہ کارناموں کی داستان گزشتہ اوراق میں گزر چکی ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس قدر بہادر اور شجیع انسان تھا۔ حکومت کے نظم ونسق کو وہ نہایت کفایت شعاری اور بردباری سے چلاتا تھا۔ وہ فرمانروائی کے طریقوں اور فنون سیاست سے پوری طرح واقف تھا، حکومت کے شعبوں میں وہ اپنے عزیزوں اور بلوچ سرداروں کو اُن کی حسب حیثیت جگہ دیتا تھا تاکہ کسی کے لیے شکایت کا موقع پیدا نہ ہوسکے، سیر وشکار کا شوقین تھا، حیدرآباد سے لے کر سیوہن تک دریائے سندھ کے کنارے کنارے اس کی متعدد شکار گاہیں بنی ہوئی تھیں، علماء وشعرا کا بہت قدردان تھا، سفر وحضر میں علماء وشعرا اس کے ساتھ رہتے تھے اس کے ادبی وشعری ذوق کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اُس نے "سسی پنہوں" کے قصے کو مولانا جامی کی "یوسف زلیخا" کے طرز پر نئے سرے سے فارسی میں نظم کرایا تھا۔[2]

فتح علی خاں کے دربار کا ملک الشعراء:

میر فتح علی خاں کے درباری شعرا میں، جس نے غیر معمولی عظمت حاصل کی وہ میر عظیم الدین بن سید یار محمد (برادر میر علی شیر قانع ٹھٹھوی صاحب مقالات الشعرا) تھا، یہ ۱۱۶۳ھ (۵۰-۱۷۴۹ء) میں ٹھٹھہ میں پیدا ہوا، زبدۃ المعاصرین کے مؤلف میر حسن الحسینی نے اُس کے کمال فن کو سراہتے ہوئے لکھا کہ:

> سندی اصلش از دیول (ٹھٹہ) بباشد، و در کمال فصاحت وبلاغت وسخن پردازی عدیل ونظیر نداشتہ۔

عظیم اپنی شہرت وکمال کی بنا پر میر فتح علی خاں ٹالپور والی سندھ کے دربار سے وابستہ ہوگیا اور اس کی عظمت فن نے اس دربار میں اُسے "ملک الشعرا" کے مرتبے تک پہنچایا۔

مؤلف تذکرہ زبدۃ المعاصرین نے عظیم کا سنہ وفات ۱۲۳۴ھ لکھا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اُس نے یکم صفر ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۳ء) میں وفات پائی اور کوہ مکلی پر مدفون ہوا۔ مائل ٹھٹھوی نے اس شعر میں اس کی تاریخ وفات نکالی ہے:

> روح القدس بسالِ وفاتش زغیب بود
> گفتا بجا "محب علی العظیم" بود

عظیم کی جو تالیفات ہمیں ملتی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) مثنوی سیر دل: یہ مثنوی میر عظیم نے ۱۲۰۶ھ میں نظم کی تھی جو ۱۳۱۶ اشعار پر ختم ہوتی ہے۔

(۲) فتح نامہ:

یہ مثنوی اُس نے بطرز شاہنامہ فردوسی بحر رزمیہ میں میر فتح علی خاں والی سندھ کے حکم سے ۱۱۹۹ھ میں لکھی۔

یہ پہلی منظوم تاریخ ہے کہ جو کلہوڑوں کے زوال اور ٹالپوروں اور کلہوڑوں کی جنگوں اور سندھ میں ٹالپوروں کی حکومت کے قیام کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔

سبب تالیف لکھتے ہوئے خود عظیم نے اس کتاب کے سنہ تالیف کو نظم کیا ہے:

> بفرمود آں ہاتف نیک فال
> نمی فتح نامہ بتاریخ سال
> ۱۱۹۹ھ

عظیم کی یہ مثنوی ۱۹۶۷ء میں سندھی ادبی بورڈ سے شائع ہوچکی ہے، جسے شیر محمد نظامانی صاحب نے ایڈٹ کیا ہے۔

(۳) دیوان عظیم:

یہ پہلا دیوان ہے، جسے عظیم نے میر فتح علی خاں کے حکم سے ۱۲۱۰ھ میں ترتیب دیا تھا، اُس وقت اس کی عمر چالیس سال کی تھی، جس کا تذکرہ اس نے اس دیوان کے دیباچے میں کیا ہے۔ اس دیوان کی ترتیب کے بعد میر عظیم ۱۹ سال زندہ رہا، اس نے اس دیوان کے دو نسخے اپنے ہاتھ سے لکھے، ایک میر فتح علی خاں کے لیے اور دوسرا اس کے بھائی میر غلام علی خاں کے لیے، یہ دونوں نسخے اب تک محفوظ ہیں، ان میں سے ایک نسخہ سید حسام الدین راشدی کے ذاتی کتب خانے میں ہے اور دوسرا نسخہ میر نور

---

[1] جنتہ السندھ، ص ۶۱۶۔

[2] جنت السندھ، ص ۶۱۶۔

محمد خاں ٹالپور کے کتب خانے میں حیدرآباد میں موجود ہے۔

(۴) دیوان عظیم اردو:

عظیم کا ایک دیوان اردو میں بھی ہے، جس کا مخطوطہ سندھی ادبی بورڈ میں موجود ہے۔

(۵) مثنوی ہیر ورانجھا:

یہ مثنوی میر عظیم نے ۱۲۱۴ھ میں نظم کی تھی۔ یہ مثنوی ۱۹۵۷ء میں سندھی ادبی بورڈ سے شائع ہو چکی ہے۔

(۶) انشائے عظیم:

یہ عظیم کے مکتوبات کا مجموعہ ہے، جس کا خطی نسخہ سندھی ادبی بورڈ میں موجود ہے۔[1]

میر غلام علی خاں

۱۶ محرم ۱۲۰۷ھ (۱۸۰۲ء) تا ۶ جمادی الثانی ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۱ء)

میر فتح علی خاں کے بعد اس پہلی چوپاری حکومت کا سربراہ ۱۶ محرم ۱۲۰۷ھ (۱۸۰۲ء) کو میر غلام علی خاں بنا۔ اس کی دستار بندی کے وقت تمام میر بشمول میر سہراب موجود تھے۔[2] میر غلام علی خاں ایک نیک دل، زیرک فرمانروا تھا اور امور حکمرانی کو خوب جانتا تھا، اس کا دور سندھ میں خوشحالی، امن اور اطمینان کا دور تھا۔ عظیم نے اُس کے دور کی طمانیت، خوش حالی کو سراہتے ہوئے لکھا کہ:

عروس جہاں را خدا داد نو
بصد عز و اقبال داماد نو
زر و سیم در ملک بسیار شد
زہر قسم اموال انبار شد
گدایاں سراسر توانگر شدند
ثنا خوانِ درگاہِ داور شدند
دریں ملک یکسر گدائی نماند
ز دریوزہ صوت و صدائی نماند

چناں کشور سند آباد شد
کہ ہر خاطرِ غمزدہ شاد شد
ستمگر کہ بکشاد دست ستم
شدہ دست او از سیاست قلم[3]

اس نے اپنی حکومت کے نظم و نسق میں اخلاقی قدروں کی اور مذہبی اصولوں کی پابندیوں کی طرف خاص توجہ دی۔ عظیم لکھتا ہے کہ:

زبد کاران در دہر نامی نماند
نشانی ز نوع حرامی نماند
بدلھا نماندہ خیال زنا
زنا را نماندہ بجای ہنا
شدہ ہر مکاں شغل صوم و صلواۃ
بذکرِ خدا شد بسی التفات
چناں بر زمیں کوس تقویٰ و زید
کہ آوازہ اش گوشِ گردوں شنید
ملائک بگفتند با اتحاد
کہ صد آفریں بر چنیں شاہ باد

روپیہ کورہ جس کا وزن تیمور شاہ کے سکے سے کم نہ تھا، اسی امیر کے زمانے میں ڈھالا گیا۔

میر ٹھارہ خاں سے جنگ:

۱۲۱۸ھ (۱۸۰۳ء) میں میر غلام علی خاں اور میر ٹھارہ خاں میں کسی بات پر اختلاف ہو گیا، نوبت جنگ تک پہنچی، میر غلام علی خاں نے میر محمود کی سرکردگی میں ایک فوج روانہ کی، میر ٹھارہ خاں بھی جنگ کے لیے نکلا۔ دونوں فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا، میر ٹھارہ خاں کو شکست ہوئی، زخمی حالت میں میر محمود، میر ٹھارہ خاں کو کشتی میں بٹھا کر میر غلام علی خاں کے پاس لایا۔ میر غلام علی خاں نے اس کے زخموں کا علاج کرایا اور اچھے ہونے کے بعد اُسے نہایت عزت و احترام اور خلعت دے کر رخصت کیا۔[4]

انگریزوں سے معاہدہ:

گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے کہ انگریزوں سے سندھ کے روابط

---

(1) یہ تمام تفصیل تکملۂ مقالات الشعرا کے حاشیہ نمبر ۱، ص ۳۹۴ مرتب سید حسام الدین راشدی اور مقدمہ فتح نامہ عظیم مرتب شیر محمد نظامانی سے ماخوذ ہے۔

(2) جنت السندھ،

(3) فتح نامہ عظیم۔

(4) فتح نامہ عظیم، ص ۱۸۸-۱۹۱۔

تجارتی میاں غلام شاہ کلہوڑہ کی حکومت کے زمانے ۱۷۵۸ء میں قائم ہوئے اور انگریزوں کی چند تجارتی کوٹھیاں ٹھٹھہ اور شاہ بندر میں موجود تھیں۔ ان تجارتی تعلقات کو ٹالپور خاندان کے ابتدائی فرمانرواؤں نے بھی مستحکم رکھا اور اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کے سوداگروں نے سندھ سے خاصا منافع حاصل کیا۔

لیکن انگریز سوداگروں کے سندھ سے یہ تعلقات شاہ زمان سلطنت افغانستان کے مقاصد کے خلاف تھے، لہٰذا اُس نے حکم دیا کہ وہ انگریزوں سے اپنے تعلقات منقطع کرلیں۔

جب میر غلام علی حیدرآباد کی مسند فرمانروائی پر بیٹھا تو اس نے ۱۸۰۳ء میں اپنا ایک نمائندہ بمبئی بھیجا، تاکہ پھر وہ انگریز تاجروں کو سندھ میں لائے لیکن بمبئی کے انگریز حکمرانوں نے پہلے تو اپنے سابقہ تجارتی نقصانات کا مطالبہ کیا لیکن شاہ زمان شاہ افغانستان کے ہندوستان کے مغربی علاقوں پر حملے کے خدشے سے کپتان ڈیوٹ سٹن کو میر غلام علی خاں کے دربار میں حیدرآباد بھیجا، کپتان مذکور نے مندرجہ ذیل معاہدہ میر غلام علی خاں سے کیا:

۱۔ دونوں حکومتیں عہد کرتی ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے کی دوست رہیں گی اور ایک دوسرے کے دوست کو بھی دوست سمجھیں گی اور ایک دوسرے کے مخالف کو اپنا مخالف سمجھیں گی اور اس عہد کی ہمیشہ پابند رہیں گی۔

۲۔ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کو فوجی مدد دیں گی۔

۳۔ ایک حکومت کا دشمن دوسری حکومت کی سرزمین میں پناہ حاصل نہ کرسکے گا۔

۴۔ اگر سندھ کی حکومت کے مامورین، حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کی کسی بندرگاہ سے سامان جنگ خریدنا چاہیں تو اس معاملے میں حکومت کمپنی ان کی مدد کرے گی، بشرطیکہ وہ اسلحہ کی قیمت نقد ادا کریں۔

۵۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک وکیل روابط اور تعلقات کو مضبوط کرنے کے لیے ہمیشہ دربار سندھ میں رہے گا۔

۶۔ تاوان کا دعویٰ جو سابق سے دونوں حکومتوں کے درمیان موجود ہے، اُسے اس معاہدے کے ذریعہ سے کالعدم قرار دیا جاتا ہے۔

۷۔ صرف شہر ٹھٹھہ میں انگریزوں کی ایک تجارتی کوٹھی، کلہوڑہ عہد حکومت کے مطابق رہے گی۔

(۲۴ جولائی ۱۸۰۸ء یکم جمادی الثانی ۱۲۲۳ھ)

ٹالپور عہد حکومت میں یہ معاہدہ پہلا بنیادی طوق تھا جو سندھ میں انگریزوں کی غلامی کا پڑا، بعد میں یہ غلامی کی زنجیر کس کس طرح مضبوط ہوئی، اُس کی تفصیل آیندہ اوراق میں آئے گی۔

دوسرا معاہدہ:

۹ نومبر ۱۸۲۰ء کو ایک اور معاہدہ روابط دوستی اور محبت بڑھانے کے لیے حکومت انگلشیہ اور حکومت سندھ کے درمیان ہوا، جس کی شرائط حسب ذیل تھے۔

۱۔ سرکار انگلشیہ اور میر کرم علی و میر مراد علی کے درمیان ہمیشہ روابط دوستی مستحکم رہیں گے۔

۲۔ سابق معاہدے کے مطابق دونوں حکومتوں کے وکیل ایک دوسرے کی مملکت میں رہیں گے۔

۳۔ میرانِ سندھ اپنی سرزمین میں کسی اہل یورپ اور اہل امریکا کو قیام کی اجازت نہ دیں گے، اگر طرفین کی رعایا میں سے کوئی شخص کسی مملکت میں اطاعت اور اچھے رویے کے ساتھ سکونت اختیار کرنا چاہے گا تو وہ اس مملکت میں سکونت اختیار کرسکے گا۔ لیکن اگر یہ شخص سرکش اور مجرم ہوگا تو دونوں حکومتوں کو حق حاصل ہوگا کہ وہ اس کو گرفتار کرلے یا سزا دے یا اسے اپنی مملکت سے نکال دے۔

۴۔ میرانِ سندھ ہمیشہ قبیلہ کھوسہ کی لوٹ مار سے اپنی داخلی سرحدوں میں نگرانی رکھیں گے اور انھیں اجازت نہ دیں گے کہ وہ حکومت انگلشیہ کی سرزمین میں داخل ہوکر کوئی گڑبڑ مچائیں۔

واضح رہے کہ یہ معاہدہ میر اسماعیل شاہ وکیل میر کرم علی خاں رکن الدولہ اور میر شاہ مراد علی خاں امیر الدولہ اور مسٹر الفنسٹن گورنر بمبئی کے درمیان بروز پنجشنبہ ماہ صفر میں ہوا اور انشاء اللہ اس کی خلاف ورزی نہ ہوگی (میر اسماعیل شاہ) اس معاہدے کی حکومت عالیہ ہند نے ۱۰ فروری ۱۸۲۱ء کو توثیق کی۔[2]

وفات:

ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس معاہدے کے بعد میر غلام علی خاں دو سال تک امن و امان سے حکومت کرتا رہا۔ ایک دن وہ شکار کے لیے گیا۔ اُس نے ایک ہرن شکار کیا، ذبح کرتے وقت ہرن کا سینگ اُس کے پاؤں

---

(1) تازہ نوائے معارک، تعلیقات ص ۵۳-۹۵۲

(2) نوائے معارک، ص ۹۵۳-۹۵۴۔

میں لگا، جس کی وجہ سے اُس کا پاؤں زخمی ہو گیا۔ طبیبوں نے اس زخم کا بہت علاج کیا مگر فائدہ نہ ہوا، آخر ۶ جمادی الثانی ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۱ء) کو میر غلام علی خاں نے وفات پائی۔ اس کا جنازہ خدا باد نو لے جایا گیا اور اپنے بزرگوں کے پہلو میں مدفون ہوا۔

علما و شعرا کی قدر دانی:

یہ بھی اپنے بھائی میر فتح علی خاں کی طرح علما و شعرا کا قدر دان تھا۔

میر کرم علی خاں

۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) تا ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء)

میر غلام علی خاں کی وفات پر اس کا بھائی میر کرم علی خاں ۶ جمادی الثانی ۱۲۲۷ھ کو مسند فرمانروائی پر بیٹھا۔ اس نے اپنے آپ کو سرکار عظمت مدار کے لقب سے موسوم کیا۔ یہ میر مراد علی خان کے مشورے سے حکومت چلاتا تھا، بڑا سخن سنج، صاحبِ فضل، شاعر اور علماء و ادبا و شعرا کا قدر دان تھا۔ اس کی قدر افزائیوں کی بدولت ایران اور خراسان کے بہت سے علماء نے حیدر آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ٹھٹھہ کے علمی زوال کے بعد حیدر آباد علوم و فنون کا مرکز بنا۔

گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے کہ میر فتح علی خاں کے ابتدائی زمانے میں خراسان و امیرانِ خراسان کی نااتفاقی کی وجہ سے ٹالپوروں نے خراج دینا بند کر دیا تھا۔

لیکن جب شجاع الملک تخت پر بیٹھا تو ۱۲۲۱ھ (۷-۱۸۰۶ء) میں پہلی مرتبہ وزیر شیر محمد خاں[1] کے ساتھ وہ میرانِ سندھ سے خراج وصول کرنے شکارپور آیا اور "باغ شہزادہ" میں منزل انداز ہوا۔ دو تین ماہ کے اندر میرانِ سندھ نے خراج ادا کیا اور بیش بہا تحائف پیش کیے اور اپنی حسن خدمات اور فرمانبرداری کا مظاہرہ کر کے شاہ شجاع الملک کو خوش کر دیا۔[2] تاریخ عروج بارک زائی کے حواشی میں ہے کہ شاہ شجاع الملک نے سترہ لاکھ روپیہ میران سندھ سے وصول کیا تھا، شیرازی کا بیان ہے کہ یہ خراج تیس لاکھ روپے تک پہنچا تھا۔ میران سندھ بیس لاکھ روپیہ لے کر آئے تھے جس میں سے شاہ شجاع نے دس لاکھ روپے لیے۔[3]

یہ خراج لینے کے بعد شاہ شجاع الملک ڈیرہ جات کے راستے سے کابل واپس ہو گیا اور چار سال تک کابل میں نہایت اطمینان سے زندگی بسر کرتا رہا، لیکن جب پھر میرانِ سندھ خراج کی ادائیگی میں تاخیر کرنے لگے تو پھر وہ دوبارہ ۱۲۲۵ھ (۱۱-۱۸۱۰ء) میں عازم پشاور ہوا اور شکارپور پہنچا۔ میرانِ سندھ نے دوبارہ اخلاص و فرمانبرداری کا معاہدہ کیا اور خراج کا تقریباً بیس لاکھ روپیہ اور اس کے علاوہ نفیس تحفے شاہ کے سامنے پیش کیے، میرانِ حیدر آباد کا مشیر نواب ولی محمد خاں لغاری خراج کے ادا ہونے تک بطور یرغمال ڈیرۂ غازی خان تک شاہ شجاع کے ہمرکاب رہا، ڈیرۂ غازی خان میں اس نے یہ تمام مالیہ ادا کیا اور خلعت فاخرہ اور نقد سے سرفراز ہو کر حیدر آباد واپس ہوا[4] اور شجاع الملک پشاور روانہ ہو گیا۔ شجاع الملک پشاور پہنچا ہی تھا کہ وزیر شیر محمد خاں جسے اُس نے مہم کشمیر پر بھیج رکھا تھا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر کابل پہنچا تو میر واعظ[5] جو ایک بہت بڑے عالم و عارف تھے، شیعہ و سنی فساد میں شہید ہو چکے تھے، وزیر شیر محمد خاں کو کابل پہنچنے کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ شاہ شجاع الملک نے ان کو شہید کرایا ہے۔ یہ شجاع الملک کے مقابلے کے لیے ایک فوج لے کر کابل سے پشاور پہنچا اور تہکال تعلقہ پشاور میں ان دونوں میں جنگ ہوئی۔ وزیر شیر محمد خان اس جنگ میں مارا گیا۔ اس فتح و فیروزی کے بعد چند دن شاہ شجاع الملک پشاور ٹھہرا، اسی اثنا میں وزیر فتح خان نے محمود شاہ کو پھر تخت پر بٹھا دیا اور ایک کثیر لشکر جمع کر کے شاہ شجاع الملک کے مقابلے کے لیے پشاور روانہ ہوا، تملہ میں دونوں کے درمیان جنگ ہوئی اور شاہ شجاع الملک کی فوج میں وزیر اکرم خان اور غفور خان نوفلزئی جیسی شخصیتیں قتل ہوئیں۔ وزیر فتح خاں کی اس فتح کے بعد شاہ شجاع الملک فرار ہو گیا۔ اور اپنے بیوی بچوں کو لے کر دریائے اٹک کو عبور کر کے عازم لاہور ہوا اور رنجیت سنگھ کے پاس پناہ لی۔ رنجیت سنگھ نے پہلے تو اُسے بہت عزت و

---

(1) شیر محمد خاں: بن شاہ ولی خاں بامیزائی۔

(2) تازہ نوائے معارک، ص ۱۸۔

(3) تاریخ عروج بارک زائی، ص ۴۴ و حاشیہ نمبر ۶۔

(4) تازہ نوائے معارک، ص ۱۹-۲۱۔

(5) میر واعظ: میر سیف الدین ولی کی اولاد سے تھے، ان کا نام سید احمد تھا مگر مشہور میر واعظ کے لقب سے تھے، تسنن میں سخت عصبیت رکھتے تھے اور شیعوں کے بہت خلاف تھے۔ ۱۲۱۹ھ (۵-۱۸۰۴ء) جب کابل میں شیعہ سنی جھگڑا ہوا تو میر واعظ نے "مسجد پل خشتی" میں شیعوں کے قتل عام کا فتویٰ دیا، جس سے کابل میں دونوں فرقوں کے درمیان قتل عام کا بازار گرم ہوا، ۱۲۲۵ھ (۱۱-۱۸۱۰ء) میں میر واعظ بعض متعصبین کے ہاتھوں شہید ہوئے اور شیعوں نے ان کا سر کاٹ کر نیزے پر چڑھا کر شجاع الملک کے پاس احمد شاہی بھجوا دیا اور ان کی جگہ ان کا بیٹا میر معصوم معروف بہ حافظ جی جانشین ہوا (تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۰۲-۸۰۳)۔

احترام سے رکھا، لیکن جب وہ حکومت کی ہوس میں لاہور سے پشاور گیا اور وہاں سے اسیر و گرفتار کر کے کشمیر لے جایا گیا اور وہاں سے بالا حصار کشمیر میں محبوس کر دیا گیا۔ کچھ دن بعد وہ وہاں سے چھوٹ کر لاہور واپس ہوا تو رنجیت سنگھ نے اس مرتبہ اُسے کوہ نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے قید میں ڈلوا دیا، اور طرح طرح کی سختیاں کر کے یہ ہیرا اُس سے حاصل کیا، لیکن پھر بھی رنجیت سنگھ نے اسے نہ چھوڑا، آخر مجبور ہو کر کسی نہ کسی طرح چپکے سے پہلے اس نے اپنے بیوی بچوں کو لدھیانے روانہ کیا اور پھر خود اس مکان میں جس میں وہ قید تھا نقب لگا کر خود بھی فرار ہوا، اور لدھیانے پہنچ گیا یہ علاقہ چونکہ انگریزوں کا تھا انگریزوں نے اُس کی خوب پذیرائی کی اس لیے کہ انگریز چاہتے تھے کہ اُسے افغانستان کی سیاست میں آلۂ کار بنائیں۔ لہٰذا انگریزوں نے اس کی مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، یہاں تک کہ اس کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔[1]

رنجیت سنگھ اور میرانِ ٹالپور:

سکھوں کی حکومت کا مؤسس رنجیت سنگھ (۱۷۸۰-۱۸۳۹ء) سردار مہن سنگھ کا بیٹا تھا، جو ۲ نومبر ۱۷۸۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۹۲ء میں سکھوں کے ایک گروہ سوکر چکیہ کا اپنے باپ کی جگہ سردار مقرر ہوا۔ بچپن میں چیچک کی وجہ سے اس کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی، ۱۷ سال کی عمر میں اس نے اپنی ماں کو زہر دے کر زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ جب شاہ زمان بن تیمور شاہ، بادشاہ افغانستان پنجاب آیا تو رنجیت سنگھ اس کے دربار میں پہنچا، ۱۷۹۹ء میں شاہ زمان نے اسے لاہور کا حاکم مقرر کیا۔ ۱۸۰۲ء میں رنجیت سنگھ نے امرتسر پر حملہ کیا اور اُسے اپنی حکومت میں داخل کر لیا، ۱۸۰۵ء میں جب جسونت رائے ہولکر نے اس کے پاس پناہ لی تو اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے معاہدہ کیا اور اس معاہدے کے مطابق اس نے ہولکر کو پنجاب سے نکال دیا، پھر اس نے لدھیانہ اور اس طرف کی دوسری ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۰۸ء میں برطانوی ہند کے عہدہ داروں نے سر مٹکاف کو رنجیت سنگھ سے اس معاہدے کے لیے بھیجا کہ وہ دریائے ستلج کے کنارے سے آگے نہ بڑھے اور اپنے مقبوضات کو ستلج سے آگے نہ بڑھائے۔ چنانچہ ۲۵ اپریل ۱۸۰۹ء کو رنجیت سنگھ اور انگریزوں میں ایک تحریری معاہدہ ہو گیا کہ ستلج برطانوی اور سکھوں کی حکومتوں کے درمیان حد فاصل ہو گا۔

۱۸۰۹-۱۸۱۰ء میں رنجیت سنگھ نے ملتان پر یورش کی اور اس شہر کو اپنا باج گزار بنا لیا۔

۱۸۱۲ء میں اس نے راجا پنجاب کا لقب اختیار کیا۔ ۱۸۱۹ء میں اس نے راجا کا لقب اختیار کر کے کشمیر پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۸۲۰ء میں وہ دریائے ستلج اور دریائے سندھ کے درمیان تمام سرزمین پر قابض ہو گیا۔ ۱۸۲۳ء میں اس نے شہر پشاور اور اس کے اطراف کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ رنجیت سنگھ نے ۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو انتقال کیا۔

رنجیت سنگھ کی پالیسی انگریزوں کے ساتھ بڑی دوستانہ تھی اور وہ سقوطِ سلطنت افغانستان کے بڑے عوامل میں تھا اور آزاد میرانِ سندھ کے لیے ایک عظیم خطرہ تھا، اسی بنا پر انگریز اس کو مدد دیتے تھے اور اسی کے ذریعہ سے شمال مغربی ہندوستان میں وہ اپنی مخالف قوتوں کو کچلتے تھے، اگر رنجیت سنگھ انگریزوں کی افغانستان کی پہلی جنگ ۱۸۳۹ء میں مدد نہ کرتا اور ان کو اپنے علاقے سے گزرنے کا راستہ نہ دیتا تو ممکن تھا کہ وہ مصیبت جو ملت افغانستان اور سندھ کے سر پر آئی شاید وہ نہ آتی، اور ٹالپوروں نے اس کے خوف سے مجبور ہو کر جو مذاکرات انگریز نمائندوں سے کیے اور ان کے سنگین معاہدات میں اپنے آپ کو جکڑا، شاید اس کی نوبت بھی نہ آتی، اور یہ اپنی آزادی کی حفاظت کر سکتے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ رنجیت سنگھ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر میرانِ سندھ اُس سے اپنے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کے لیے ہر سال ایلچیوں کے ذریعہ بہترین تحائف اور سوغاتیں خالصہ دربار میں لاہور بھیجتے لیکن اس کا مطالبہ تھا کہ وہ ۱۲ لاکھ روپے جو خراج کے طور پر سالانہ کابل کو ادا کرتے تھے، اب اُس کو دیں۔ میروں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے اس کا ملتان کا نائب دیوان ساونوں مل اور کنور نونہال سنگھ مٹھن کوٹ میں خالصہ فوج اور توپ خانے سے اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے لگے، جس کی وجہ سے ٹالپوروں کے سیاسی حلقوں میں بے چینی پیدا ہوئی اور میر کرم علی خان نے بلوچ سرداروں کو فوج اکٹھی کرنے کے لیے حکم دیا، لیکن میر مراد علی خان نے کہا کہ جب ملتان کا نواب اور ڈیرہ جات کے بلوچ رنجیت سنگھ کے آگے جھک چکے ہیں تو ان حالات میں ہمارا جنگ کرنا قرین مصلحت نہیں، میر کرم علی خان نے اس رائے سے متفق ہو کر اپنے دربار کے وزیروں میں سید آغا اسماعیل شاہ کو بمبئی کے گورنر کے پاس روانہ کیا اور اُس کی حفاظت کے لیے تین ہزار بلوچی لشکر توپخانی کے ساتھ اُس کے ساتھ کیا، یہ بمبئی پہنچا تو بمبئی کا گورنر

---

[1] تازہ نوائے معارک، ص ۳۰-۳۵۔

ماؤنٹ سٹیورٹ ایلفنسٹن اُس کے ساتھ نہایت عزت واحترام کے ساتھ پیش آیا، آغا اسماعیل شاہ نے صورت حال سے گورنر کو آگاہ کیا، گورنر نے یہ تمام رپورٹ گورنر جنرل کو کلکتے بھیجی، گورنر جنرل نے لدھیانے کے برٹش پولیٹیکل ایجنٹ کپتان ویڈ کو لکھا کہ وہ خالصہ سرکار کو اطلاع دے کہ وہ سندھ پر حملہ کرنے کا خیال اپنے دل سے نکال دے، اگر اس نے سندھ پر حملہ کیا تو ہم اس سے پہلے ملتان پر حملہ کر دیں گے، چنانچہ اس کے بعد انگریزوں کے دباؤ کی وجہ سے رنجیت سنگھ نے سندھ پر حملہ کا خیال چھوڑ دیا اور دیوان ساونمل نے کنور نونہال سنگھ کی معرفت ایک تسلی بخش خط میروں کو لکھا۔[1]

اسی زمانے میں شاہ شجاع الملک سردار محمد عظیم خاں سے شکست کھا کر واردِ شکارپور ہوا اور یہاں کے مالیات کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اندازہ کر لیا کہ شکارپور کا مالیہ انتظام امور سلطنت کے لیے کافی نہیں، اس لیے اس نے میرانِ سندھ کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی، پہلے اس نے میر صاحبان کے نام خطوط لکھے اور پھر چند دن کے بعد حضرت مخدوم لعل شہباز قلندر[2] کے مزار کی زیارت کے بہانے سے کشتی کے ذریعے اپنے چند مصاحبین کے ساتھ میرانِ سندھ کی ملاقات کے لیے روانہ ہوا، پہلے وہ دوھہ پہنچا، جیسے ہی میران خیرپور کو اس کی آمد کی اطلاع ہوئی تو فوراً ہی میر سہراب خان، میر رستم خان، میر مبارک خان اور دوسرے صاحبزادگان اس کے استقبال کے لیے خیرپور سے دوھہ پہنچے اور آداب شاہی بجالائے اور انہوں نے مہمانداری کے حقوق ادا کرنے میں کوئی کمی نہ کی۔ شاہ شجاع نے میرانِ خیرپور کو خلوت میں بلا کر لطیف پیرائے میں ان کو اپنی امداد پر آمادہ کیا، پھر وہ وہاں سے روانہ ہو کر حیدرآباد پہنچا، لیکن جب یہ حیدرآباد پہنچا تو اس زمان میں میر کرم علی خاں اور مراد علی خاں شکارپور کے لیے گئے ہوئے تھے، جب انہیں شکار میں معلوم ہوا تو وہ اپنے مرغوب مشغلۂ شکار کو چھوڑ کر جلد حیدرآباد واپس آئے اور اپنے کارپردازوں پر سخت ناراض ہوئے کہ انہوں نے شاہ شجاع کی آمد کی اطلاع پہلے سے کیوں نہیں دی اور طوعاً و کرہاً شاہ شجاع کے مقربین سے مل کر اوپرے دل سے خدمت گزاری اور جانفشانی کا وعدہ کیا۔ شاہ شجاع الملک میروں کے اس ظاہر خلوص کو دیکھ کر نہایت متاثر ہوا اور ان کو نوازشات، شاہانہ اور عنایات خسروانہ کا امیدوار بنا کر ان سے معاہدے کی تحریک کی، اگرچہ میر بلطائف الحیل اس معاہدے سے پہلو تہی کر رہے تھے اور ان کی دلی خواہش تھی کہ کسی طرح یہ معاہدہ نہ ہو، لیکن شاہ شجاع الملک کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور شاہ شجاع نے کہا کہ وہ اس وقت تک حیدرآباد سے نہ جائے گا، تاوقتیکہ یہ معاہدہ مکمل نہ ہو، کئی روز اس معاہدے کے مباحث میں گزرے، آخر مجبور و لاچار ہو کر حسب ذیل معاہدہ میرانِ حیدرآباد نے شاہ شجاع الملک سے کیا۔ اس معاہدے کے شرائط حسب ذیل تھے۔

معاہدہ:

حلف کے ساتھ میروں نے یہ عہد کیا کہ شاہ شجاع الملک کا دشمن ہمارا دشمن سمجھا جائے گا اور ہمارا دشمن شاہ شجاع الملک کا دشمن متصور ہو گا اور دونوں ملک ایک دوسرے کے نفع و نقصان اور عزت و ناموس کو اپنی عزت و ناموس اور نفع و نقصان محسوس کریں گے اور ایک دوسرے کی مدد میں ذرا بھی دریغ نہ کریں گے۔

اس معاہدے کے بعد شاہ شجاع الملک حیدرآباد سے روانہ ہو گیا، چلتے وقت میرانِ حیدرآباد نے مبلغ پچیس ہزار روپے نقد اور دوسرے نفیس تحائف پیش کیے اور چند علاقے محال گوسرچی[3]، قلعہ کرن[4] اور گڑھی یاسین[5] اور محال روپاہ کا[6] تیسرا حصہ بطور مدد معاش کے شاہ شجاع الملک کے لیے واگزاشت کیا اور میرانِ خیرپور کو لکھا کہ مقررہ دیہات جو شکارپور سے متعلق کیے گئے ان کا مالیہ ماہ بہ ماہ حسب اقساط شاہ

---

(1) جنت السندھ، ص ۶۳۶-۶۳۹۔

(2) مخدوم لعل شہباز قلندر: بن عثمان سندھ کے مشہور صوفیائے کرام میں ہیں۔ یہ ۵۳۸ھ میں پیدا ہوئے اور سلطان محمد خان شہید ابن سلطان بلبن کے زمانے (۶۶۲ھ) میں ملتان تشریف لائے۔ ۶۴۹ھ میں سیوہن تشریف لائے اور یہیں سکونت اختیار کی، سیوہن ہی میں آپ نے شعبان ۶۵۰ھ میں وفات پائی، آپ کا مزار مبارک سیوہن می زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ (تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۵۹-۸۶۰)۔

(3) گوسرچی: شکارپور کے جنوب مشرق میں تقریباً بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ (سندھ گزیٹر، ص ۸۲۴)۔

(4) قلعہ کرن: بیرون شکارپور تقریباً چار میل کے فاصلے پر گڑھی یاسین کی شاہراہ پر واقع ہے۔

(5) گڑھی یاسین: شکارپور کے جنوب میں ۱۸ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۱۸۷۰ء میں اس کا مالیہ دو لاکھ بیس ہزار روپے اور یہ ۹۹ گاؤں پر مشتمل تھا اور اس کی آبادی ۷۵ ہزار نفوس پر مشتمل تھی اور اس کی پیمائش ۴۰۲ مربع میل تھی (گزیٹر سکھر، ص ۲۲)۔

(6) روپاہ: شمال شکارپور میں جیکب آباد اور شکارپور کے درمیان واقع ہے۔

شجاع الملک کی خدمت میں بھیجا جائے۔

شاہ شجاع الملک حیدرآباد سے واپس ہوتا ہوا خیرپور آیا۔ میرانِ خیرپور نے اُس کے استقبال و احترام میں کوئی کمی اٹھا نہ رکھی۔ شاہ شجاع الملک نے میرانِ خیرپور سے بھی اُسی قسم کا معاہدہ کرنا چاہا جیسا کہ اُس نے میرانِ حیدرآباد سے کیا تھا، لیکن چونکہ میر سہراب ایک جہاں دیدہ اور تجربہ کار انسان تھا، اس نے جواب دیا کہ میرے خیال میں میرانِ حیدرآباد کا معاہدہ کافی ہے۔ اب کسی جداگانہ عہد و پیمان کی ضرورت نہیں۔ اس معاملے میں آپ ہمیں معذور سمجھیے، ہر چند کہ شاہ شجاع الملک نے اس معاہدے پر بے حد اصرار کیا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا، بلکہ میر سہراب میرانِ حیدرآباد کی عقل و دانش پر افسوس کرتے ہوئے کہا کرتا تھا کہ حقیقت یہ ہے کہ مہمات بادشاہی کا چلانا سخت مشکل ہے، میرانِ حیدرآباد اس عہد و پیمان کو پورا نہ کر سکیں گے اور اس طرح وہ فضول اپنے آپ کو بدنام کریں گے اور عہد شکنی کے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔[1]

شاہ شجاع الملک کے مظالم:

آخر ایسا ہی ہوا۔ شاہ شجاع الملک شکارپور واپس آیا اور دو سال تک شکارپور میں رہ کر خراساں کے حصول کے لیے جنگ کی تیاریوں میں مشغول رہا۔ ہفتے میں ایک مرتبہ اُس کی فوجیں ہزاری دروازے کے باہر جنگی مشقیں کرتی تھیں، ان جنگی مشقوں میں توپوں کی آواز جب میرانِ سندھ کے کان میں پہنچی تو وہ اپنے کیے پر پشیمان ہو کر اپنے دل ہی دل میں کہتے تھے کہ یہ کیا بلا ہم نے مول لے لی ہے اور اس بلا کو اپنے قریب و جوار میں رکھ کر ہم کس عذاب میں مبتلا ہوئے ہیں، وہ سوچتے رہتے تھے کہ کون سی صورت ایسی ہو کہ شجاع الملک کو خراسان روانہ کیا جائے۔

ادھر شاہ شجاع الملک کے مظالم حد سے زیادہ بڑھ گئے جس کسی کے پاس رعایا میں وہ دولت کا نام سنتا ظلم و تعدی سے وہ روپیہ اس سے حاصل کیے بغیر چین نہ لیتا تھا۔ عیاشی و بدکاری میں وہ اس درجہ بڑھ چکا تھا کہ اُس کے ان دونوں عیوب کو بیان کرتے ہوئے منشی عطا محمد شکارپوری نے لکھا کہ:

> ہر جا کہ سراغ دختر باکرۂ مطہرہ می یافت اشہبِ ظلم می تاخت: و جای کہ چراغ دولت را افروختہ می دید پروانہ وار خود را رسانیدہ بتاخت و تاراج آن می پرداخت۔

خان الکوزئی کی وفات کے بعد اُسے اس کی دولت کا حال معلوم ہوا تو اس نے جبراً اس کی تمام دولت اور اثاث البیت پر قبضہ کر لیا اور اس کی مستورات کو قید میں ڈال دیا۔ ان کو اس قدر سخت سزا دیتا تھا کہ ناکارہ بندوقوں کو اُن کے کندھوں پر رکھ کر دھوپ میں کھڑا کرتا تھا۔

اس کی عیاشی کا یہ عالم تھا کہ جمعہ خان فوفلزئی کی مستورات بادشاہ کے ڈر سے اونٹوں پر موضع بیچانچی کے قریب سے گزر رہی تھیں، اسے معلوم ہوا تو اس نے اپنے ایک مصاحب نیکو خاں کو حکم دیا کہ وہ جائے اور ان عورتوں میں دیکھے کہ کون سی باکرہ ہم آغوشی کے لائق ہے۔ وہ گیا تو عورتوں میں شور و غل مچ گیا، آخر جمعہ خان کی بیٹی کو جس کی منگنی ہو چکی تھی اس کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اُسے زبردستی شکارپور لایا گیا۔ ہر چند اس قافلے کے مردوں نے کہا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے لیکن اس نے اس کی پروانہ کی اور زبردستی اس سے نکاح کر لیا۔ اسی طرح ساہوکاروں پر اس کے مظالم بہت بڑھ چکے تھے۔ اس کے اس قسم کے مظالم سے شکارپور کی رعایا تنگ آ چکی تھی۔ شکارپور کی رعایا نے مجبور ہو کر میرانِ سندھ سے درخواست کی کہ کسی طرح ان کو شاہ شجاع الملک کے مظالم سے نجات دلائی جائے۔

میرانِ سندھ کا اقدام:

آخر میرانِ سندھ نے اپنی اور شکارپور کی رعایا کی نجات اس میں دیکھی کہ شاہ شجاع الملک سے اپنا رشتہ توڑ کر، سردار محمد عظیم خاں سے اپنے تعلقات کو استوار کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے سید محمد کاظم شاہ کو اپنا وکیل بنا کر کابل بھیجا اور اپنی عرضداشت میں اُسے لکھا کہ شکارپور میں روز بروز جنگی تیاریاں زوروں پر ہیں، ہم خیر خواہوں کی رائے یہ ہے کہ خود بدولت مع حشم و خدم کے شکارپور میں رونق افروز ہوں، تاکہ ہم اور آپ مل کر شاہ شجاع الملک کو جس راستے سے وہ آیا ہے، اُس راستے سے رخصت کر دیں۔ جو کچھ بھی اس سفر میں اخراجات ہوں گے وہ اور سندھ کا مالیہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔[2]

سید محمد کاظم شاہ نے کابل پہنچ کر میرانِ سندھ کا یہ معروضہ سردار محمد عظیم کے سامنے پیش کیا۔ سردار محمد عظیم شکارپور آنے کے لیے تیار ہو گیا اور اپنے بھائیوں اور سرداروں دوست محمد خاں اور شیر دل خاں اور اپنے اُمرا اور چالیس پچاس ہزار فوج ساتھ لے کر میرانِ سندھ کے وکیل

---

[1] ماخوذ از تازہ نوائے معارک، ص ۱۰۷ تا ۱۱۴۔

[2] تازہ نوائے معارک، ص ۱۱۹-۱۲۷۔

کے ہمراہ براہِ احمد شاہی سفر کرتا ہوا قلات کی سرحد بر ڈاڈھر پہنچا۔

اس کی اطلاع جب شاہ شجاع الملک کو ملی تو وہ دہشت زدہ ہوا اور اس نے ان اُمرا و خوانین کو خفیہ طور پر لکھا جو سردار محمد عظیم کے ساتھ تھے کہ اب اتفاق سے سردار محمد عظیم خان ہمارے جال میں آپھنسا ہے۔ اب تم لوگوں کی کیا رائے ہے۔

اس کے اُمرا و خوانین نے جواب دیا کہ ہم آپ کے حلقہ بگوش اور خدمت گزار ہیں اور آپ کی سلطنت کے لیے تشنہ لب، جیسے ہی سردار محمد عظیم خاں آپ کے مقابلے کے لیے نکلے گا، عین میدانِ جنگ میں ہم اُس سے جدا ہو کر آپ کے ساتھ آملیں گے اور اس طرح اس کو گرفتار کر کے آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔[1]

جب شجاع الملک کو سردار محمد عظیم کے خوانین کے یہ خط ملے تو وہ مطمئن ہوا، تو پھر اُس نے میرانِ سندھ کو خط لکھے کہ اب سردار محمد عظیم خان آچکا ہے اب ہمیں تمہاری استقامت و عزم کو دیکھنا ہے۔ میرانِ خیرپور اور میرانِ حیدرآباد متفقہ طور پر طے کر چکے تھے کہ وہ شجاع الملک کو شکارپور سے نکال باہر کریں گے، اس لیے ان پر شجاع الملک کے لکھنے کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اپنے حصول مدعا میں زیادہ کوشش کرنے لگے۔ چنانچہ حیدرآباد کے میروں میں میر کرم علی خاں اور میر مراد علی خان اور دوسرے میر اور میرانِ خیرپور میں سے میر سہراب خاں و میر رستم خاں اور دوسرے میر باہمی مشاورت سے جنگ کے سازو سامان سے تیار ہو کر وارد لاڑکانہ ہوئے اور چند دن وہاں ٹھہرے۔ پھر وہاں سے قبۂ مرحوم محمد شاہل عباسی[2] میں منزل انداز ہوئے اور آیندہ کے متعلق تدبیریں سوچنے لگے۔[3]

شاہ شجاع الملک کی روانگی:

سردار محمد عظیم خاں ۱۲۳۶ھ (۲۱-۱۸۲۰ء) میرانِ سندھ کی استدعا پر سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا "بھاگ"[4] پہنچا، بھاگ پہنچنے پر اُس نے میران سندھ سے بجائے مالیہ کے وہ اخراجات طلب کیے جو اس نے کابل سے شکارپور تک ہر ایک منزل کا ایک ایک لاکھ روپیہ مقرر کیا تھا۔ یہ اخراجات میرانِ سندھ کی نظر میں بہت زیادہ تھے۔ چونکہ وہ اس قدر رقم ادا نہ کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے اس سے کچھ کم دینا چاہا لیکن وہ کم پر تیار نہ تھا اور اس بنا پر وہ میرانِ سندھ سے جنگ کی تیاری میں لگ گیا۔

میرانِ سندھ نے جب اُس کا یہ رویہ دیکھا تو اُنہوں نے اپنے وکیل کو عرضداشت کے ساتھ شاہ شجاع الملک کے پاس شکارپور بھیجا اور اس عرضداشت میں لکھا کہ جس کا ماحصل یہ تھا کہ سردار محمد عظیم خاں طمع کے صندوقوں کو اس طرح کھولے ہوئے آیا ہے کہ اگر روئے زمین کے خزانے بھی اُن میں اُلٹ دیے جائیں تو یہ ہرگز نہ بھریں گے۔ یہ سودائے خام اپنے سر میں رکھتا ہے۔ ہم نے از روئے مصلحت اور عاقبت اندیشی سردار ممدوح سے چشم پوشی کی ہے اور طریقۂ تحمل و بردباری کو اپنا شعار بنایا ہے کہ طرفین سے مسلمانوں کا کشت و خون نہ ہو۔ لیکن سردار محمد عظیم خاں کو کشمیر اور لشکر خراساں کی وجہ سے اس قدر گھمنڈ ہے کہ وہ آپ سے سرکشی کرنا چاہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب شکار کا پیمانۂ عمر لبریز ہو جاتا ہے تو وہ شیر سے جنگ کا آغاز کرتا ہے۔ شاید اس کو بدبختی یہاں لے کر آئی ہے کہ ایسا بیہودہ خیال اُس کے دل میں سمایا ہے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ آپ فوراً شکارپور سے قبۂ محمد شاہل عباسی میں تشریف لے آئیں گے، تاکہ ہم سرکار کے ہمرکاب ہو کر اپنی جان آپ پر تصدق کریں۔[5]

شاہ شجاع نے میرانِ سندھ کے اس معروضے کے آنے کے بعد اپنے مصاحبوں سے مشورہ کیا، آخر طوعاً و کرہاً بنا بر مصلحت و دور اندیشی اس نے اپنے حرم کو مع سامان نقد و جنس دریا کے راستے سے سندھ روانہ کیا اور اُن کی عزت و ناموس کی حفاظت کے لیے میرانِ سندھ کو خاص تاکید لکھی، پھر اپنے بیٹے محمد تیمور کو روانہ کیا اور دوبارہ لکھا کہ:

اولاً حرم محترم، دوماً شاہزادۂ کامگار روانہ نمودہ شد
ایں ہمہ بار ناموس بر گردن آں عالیجاہان است[6]

لیکن میرانِ سندھ پر شاہ شجاع الملک کی ان تحریروں اور نصائح کا مطلقاً اثر نہ تھا۔

پھر خود شاہ شجاع الملک شکارپور سے جانبِ سندھ روانہ ہوا۔ شکارپور سے نکل کر وہ چند دن تک عیدگاہ میں منزل انداز رہا، یہاں تک کہ دوبارہ میران سندھ کا وکیل اس کے پاس آیا اور اس کے التجا کرنے پر یہ وہاں سے روانہ ہو کر گڑھی یاسین پہنچا، یہاں اُسے میرانِ سندھ کا عریضہ ملا، جس میں لکھا تھا کہ: سردار محمد عظیم خاں کے وکلا ہمارے پاس آئے ہیں، جو بتاتے ہیں کہ وہ صلح کی طرف مائل ہیں، جناب عرفان مآب

---

(1) ایضاً-ص ۱۳۲-۱۳۳۔

(2) قبہ محمد شاہل عباسی: لاڑکانہ سے ۶ میل کے فاصلے پر ہے (سندھ گزیٹر ص ۴۹۸)۔

(3) تازہ نوائے معارک، ص ۱۳۱-۱۳۶۔

(4) بھاگ: ۳۴ میل کے فاصلے پر ڈاڈھر سے جانب جنوب شکارپور کے راستے پر واقع ہے۔

(5) تازہ نوائے معارک، ص ۱۳۷ تا ۱۴۰۔

(6) ایضاً-ص ۱۴۱-۱۴۳۔

پیر میاں غلام محی الدین سرہندی[1] اور سید اسماعیل شاہ مطالبات کے سلسلے میں سردار محمد عظیم خاں کی طرف سے مامور ہیں۔ اگر اس نے سرکار کی اطاعت و فرمانبرداری قبول کرلی تو فبھا، ورنہ ہم سرکار پر اپنی جان تصدق کردیں گے، فی الحال سرکار وہیں قیام کریں، جو گرہ ناخن تدبیر سے حل ہوسکتی ہے، اس کو دانتوں سے کھولنے کی ضرورت نہیں۔[2]

شجاع الملک کے پاس جب میرانِ سندھ کا یہ معروضہ پہنچا تو وہ سخت حیرانی میں رہا اور اس نے اپنے مصاحبین سے مشورہ کیا اور چند روز میں قبہ محمد شاہل عباسی میں میران سندھ کے لشکر کے قریب منزل انداز ہوا۔ میرانِ سندھ کو جب اُس کی آمد کی خبر معلوم ہوئی تو انہوں نے نواب ولی محمد خان لغاری اور سید محمد کاظم شاہ کو محض دکھاوے کے لیے تھوڑی دور اُس کے استقبال کے لیے بھیجا اور اپنی لشکر گاہ سے کچھ دور کے فاصلے پر اُسے ٹھہرایا اور اس کی مہمانداری کے شایانِ شان لوازم بجا لائے۔ دوسرے دن میرانِ سندھ میر کرم علی خاں، میر مراد علی خاں والیانِ حیدرآباد اپنے خاص عملے کے ساتھ حاضر ہو کر مراسم شاہی بجا لائے اور اخلاص و خلوص کا بے پایاں اظہار کیا۔

واپس جانے کے کچھ دیر بعد انہوں نے اپنے معتمد منشی خوشی رام کو شاہ شجاع الملک کے پاس اپنے ایک عریضے کے ساتھ بھیجا، جس میں اپنے خلوص و نیاز مندی کا اظہار کرکے لکھا کہ: خراساں کے اُمرا و خوانین سے سردار محمد عظیم خاں کا جس قسم کا اتفاق و اتحاد ہے وہ آپ پر اظہر من الشمس ہے کہ وہ سب کے سب دل سے آپ کے صداقت شعار اور مخلص ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ وہ عرائض جو ان خوانین اور سرداروں نے آپ کو لکھے ہیں۔ وہ آپ ہمیں روانہ کردیں، تاکہ ان کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوسکے کہ وہ کس قدر آپ سے متفق اور قریب ہیں۔ شاہ شجاع الملک کے حکم پر اُمنائے دولت نے یہ عرائض و خطوط سب کے سب منشی خوشی رام کے حوالے کردیے۔ میرانِ سندھ نے یہ عرائض و خطوط مطالعہ کرکے اپنے معتبر آدمی کے ہاتھ سردار محمد عظیم خاں کے پاس بھجوا دیے، اور اسے لکھا کہ خوانین خراسان جو آپ کے ہمرکاب ہیں یہ بظاہر آپ کے ساتھ ہیں۔ اور دل سے شجاع الملک کے ساتھی ہیں، ان کے ان خطوط سے یہ سب کچھ آپ پر واضح ہوگا، ہم باوجود خوانین خراسان کی منافقت کے آپ کے بہی خواہ ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ خدانخواستہ کوئی گزند آپ کو پہنچے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ قدیم سے جو طریقۂ اتحاد و خلوص ہمارے اور آپ کے درمیان ہے، اسے باقی رکھا جائے اور وہ اخراجات و مالیہ جو آپ نے ہم سے طلب کیا ہے، اس سے قطع نظر کیا جائے۔[3]

میرانِ سندھ شجاع الملک کے یہ خطوط بھیج کر اپنے جواب کے منتظر تھے کہ اسی زمانے میں خان الکوزئی کا خالو سردار محمد عظیم خاں کے لشکر سے چار سو سواروں کے ساتھ فرار ہو کر شجاع الملک سے جا ملا۔ شجاع الملک نے اسے خلعت فاخرہ سے سرفراز کیا۔ اس واقعہ نے بھی میرانِ سندھ کی لکھی ہوئی عرضداشت کی تصدیق کردی، پھر اس کے بعد بھی آہستہ آہستہ اس کے لشکر کے دستے کے دستے اس سے کٹ کر شجاع الملک کے پاس جاتے رہے۔ سردار محمد عظیم خاں اپنے لشکر کی یہ حالت دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ ایک روز اس نے اپنے اُمرا اور خوانین کو خلوت میں طلب کرکے شجاع الملک کے وہ خطوط جو میرانِ سندھ نے اس کو بھجوائے تھے، انہیں دکھلائے، اور ہنستے ہوئے ان سے کہا کہ شاید شجاع الملک نے ہندوستان میں رہ کر مہر کنی کا کام سیکھ لیا ہے کہ وہ تمہاری طرف سے جعلی خطوط لکھ کر تمہاری جعلی مہریں بنا کر ان پر لگا دیتا ہے، اور اس طرح وہ میرانِ سندھ کو یہ بتا کر کہ کتنا تفرقہ اور نفاق ہمارے لشکر میں ہے ان کو اپنی طرف مائل کررہا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے وہ خطوط ہر ایک خاں کو دیے، جنہیں دیکھ کر وہ سخت شرمندہ ہوئے، اور آپس میں کہنے لگے کہ یہ سب فتنہ میرانِ سندھ کا کھڑا کیا ہوا ہے کہ وہ اس ذریعہ سے اپنے تعلقات ہمارے سردار سے استوار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد سردار محمد عظیم خان کے سردار اور خوانین احتیاط برتنے لگے، اور وہ اس کے ممنون ہوئے کہ اس کے بعد بھی کوئی سخت رویہ محمد عظیم خان نے ان کے ساتھ اختیار نہیں کیا، بلکہ ان کے ساتھ زیادہ مہربانی سے پیش آنے لگا۔

---

[1] پیر غلام محی الدین: کا تعلق حضرت مجدد الف ثانی کے خاندان سے ہے۔ یہ ۱۷۹۰ء میں پشاور سے سندھ آئے اور سکھوں کے غلبے کی وجہ سے انہوں نے پشاور کی سکونت ترک کرکے ۱۸۰۶ء میں شکارپور میں سکونت اختیار کی۔ میرانِ سندھ ان سے عقیدت رکھتے تھے، انہوں نے ان کی تنخواہ بھی مقرر کی تھی اور وسیع زراعتی زمین ان کو دی تھی۔ اسی طرح شاہان افغانی تیمور شاہ، زمان شاہ، محمود شاہ اور ایوب شاہ سدوزئی نے بھی شکارپور میں ان کو بڑی مراعات دی تھیں، پیر غلام محی الدین حیدرآباد کے متصل مدفون ہوئے۔ (تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۵۷-۸۵۸)۔

[2] تازہ نوائے معارک، ص ۱۴۶-۱۴۷۔

[3] تازہ نوائے معارک، ص ۱۴۴-۱۵۰۔

میرانِ سندھ نے اس تدبیر سے سردار محمد عظیم خان کو رام کر کے اس مالیہ و اخراجات کی ادائی کا بندوبست کیا، جس کا وعدہ وہ اس سے کر چکے تھے۔

اس کے علاوہ انہوں نے سردار محمد عظیم خاں سے مشورہ کر کے تمام شاہراہوں پر چوکی اور پہرے بٹھا دیے کہ کوئی سوار یا پیادہ سردار محمد عظیم خان کے لشکر سے فرار ہو کر شجاع الملک کے پاس جانے نہ پائے، چنانچہ کتنے ہی سوار اور پیادے جو سردار محمد عظیم خان کے لشکر سے فرار ہو کر شجاع الملک کے پاس جا رہے تھے قتل کر دیے گئے۔

جب شجاع الملک کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے میرانِ سندھ سے نہایت برہم ہو کر کہا کہ یہ کون سی دوستی اور اخلاص ہے کہ تمہارے لوگ ہر اس سوار اور پیادے کو مار ڈالتے ہیں جو سردار محمد عظیم خاں کے لشکر سے بھاگ کر ہمارے پاس آتا ہے۔

میرانِ سندھ نے نہایت تملق اور چاپلوسی کے ساتھ معذرت کرتے ہوئے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ روزانہ چوکی اور پہرے کے لوگ بدلتے رہتے ہیں اور یہ اپنے، بیگانے کو نہیں پہچانتے، اس لیے نادانستہ طور پر اس کے مرتکب ہوئے ہیں۔ آیندہ ان کو ہدایت کر دی جائے گی کہ وہ ایسا نہ کریں۔[1]

مختصر یہ کہ میرانِ سندھ ظاہر میں شجاع الملک کے ساتھ تھے اور باطن میں سردار محمد عظیم خاں کے ساتھ اور اس طرح اپنا مطلب نکالنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔

آخر ۱۲۳۶ھ (۲۱-۱۸۲۰ء) میں میرانِ سندھ نے سردار محمد عظیم کو مالیہ اور اخراجات کی مقررہ رقم سے ہٹا کر اس پر راضی کر لیا کہ وہ اس کا نصف ادا کر دیں گے۔ اس طرح اُس سے اپنے تعلقات کو مستحکم کر لینے کے بعد اُسے ملاقات کے لیے دعوت دی، لیکن سردار محمد عظیم خان اپنے اُمرا و خوانین پر بے اعتمادی کی وجہ سے اس ملاقات کے لیے راضی نہ ہوتا تھا۔ اُس نے میرانِ سندھ کو لکھ بھیجا کہ جب تک شجاع الملک دریا کے اُس طرف نہ چلا جائے گا، اُس وقت تک یہ ملاقات ممکن نہیں۔ میرانِ سندھ کو جب اُس کا یہ منشا معلوم ہوا تو انہوں نے قبہ شاہل محمد عباسی میں اپنے وکلا کو بھیج کر شاہ شجاع الملک سے التجا کی کہ تعزیت دنیا کی رسم ہے، ہم مرحوم وزیر فتح خاں[2] کی تعزیت سردار محمد عظیم خاں سے کرنا چاہتے ہیں، لیکن سردار موصوف آپ کے قیام کی وجہ سے اس پر آمادہ نہیں، اگر آپ دریا کو عبور کر کے اُس طرف منزل انداز ہوں تو سرکار کی عین نوازش ہو گی۔ ہم مراسم تعزیت ادا کرنے کے بعد

---

[1] تازہ نوائے معارک، ص ۱۵۱-۱۵۴۔

[2] وزیر فتح خاں بن سردار پایندہ خاں- تاریخ افغانستان کی نہایت اہم شخصیت ہے، جس نے افغانستان کی تاریخ کے دھارے کو بدل کر رکھ دیا اور افغانستان کو ایک قرن تک خانہ جنگی میں مبتلا رکھا اور خانوادۂ سدوزئی احمد شاہ ابدالی کی حکومت کا تختہ الٹ کر حکومت کو خانوادہ محمد زائی سردار پایندہ خاں میں منتقل کر دیا۔
جب شاہ محمود دوسری مرتبہ فتح خاں کی امداد سے تخت پر بیٹھا تو اس نے اپنا وزیر فتح خاں کو مقرر کیا۔ حکومت کے تمام اختیارات اس کو حاصل تھے اور شاہ محمود برائے نام بادشاہ تھا۔ فتح خان نے ان اختیارات سے فائدہ اٹھا کر دریائے سندھ سے لے کر کابل و قندھار تک حکومت کے اہم عہدوں پر اپنے بھائیوں کو مقرر کیا، صرف ایک ہرات کی حکومت پر حاجی فیروز الدین برادر شاہ محمود باقی رہ گیا۔ جب ۱۸۱۶ء (۱۲۲۳ھ) میں فتح علی شاہ قاچار نے شاہزادہ حسن علی میرزا کی قیادت میں ہرات پر لشکر بھیجا تو وزیر فتح خاں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور شاہ محمود سے اس کی مدافعت کی اجازت طلب کی۔ اس نے ہرات پہنچ کر حاجی فیروز الدین کو گرفتار کر کے قندھار بھیج دیا اور خود اپنے بھائیوں سردار کھندل خان اور سردار شیر دل خاں کے ساتھ ہرات کے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے شاہزادہ کامران پسر شاہ محمود نے اس واقعہ سے محسوس کر لیا کہ فتح خاں کا اقتدار اُس کے باپ سے بھی زیادہ بڑھتا جا رہا ہے اور آیندہ اس کا یہ اقتدار خود اُس کے لیے بھی مضر ہو گا، اس لیے وہ اس سے کینہ رکھنے لگا، اور اس فکر میں لگ گیا کہ اس کے اور اس کے بھائیوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو ختم کیا جائے۔
وزیر فتح خاں اور اس کے بھائیوں نے حاجی فیروز الدین کو قندھار بھجوانے کے بعد اس کے زر و جواہر کو خوب لوٹا۔ سردار دوست محمد خاں ایک لشکر کے ساتھ حاجی فیروز کے حرم میں داخل ہوا اور عورتوں کے زیورات کو لوٹا اور اُن کی بے حرمتی کی، اور اپنے بھائی وزیر فتح خان کے ڈر سے کشمیر بھاگ گیا۔ یہ امر شاہ محمود اور کامران کو نہایت ناگوار ہوا، اور کامران کو اس بہانے سے باپ کو مشتعل کرنے کا خوب موقع ملا، آخر ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۸ء) میں اُس کی آنکھ میں سلائی پھروائی گئی اور اسے اندھا کر دیا گیا، اور یہی ناعاقبت اندیشی کامران کے زوال اور اس خاندان شاہی کے سقوط کا ذریعہ بنی۔ اس کے بھائی جو بر سر اقتدار تھے اس عمل سے ان میں غصہ اور جوش پیدا ہوا، اور کشمیر سے ہرات تک ان باپ بیٹوں کی مخالفت شروع ہوئی۔ دوست محمد خاں نے کشمیر سے واپس آ کر کابل پر قبضہ کر لیا اور شاہ محمود کو غزنی کی طرف نکال دیا۔ ادھر کامران تیس ہزار کا لشکر لے کر اپنے باپ کی مدد کے لیے غزنی پہنچا، جب کامران کا لشکر غزنی اور کابل کے درمیان سید آباد وردگ پہنچا تو فتح خان نابینا اور دوسرے درانی سردار جو اس کے ساتھ تھے، ان سب کو طرح طرح کی تکلیفیں دے کر قتل کرا دیا، اور اس کے جوڑ جوڑ کو جدا کیا گیا۔ فتح خاں وزیر کا واقعہ قتل ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۸ء) میں پیش آیا۔ فتح خاں کے ٹکڑوں کو غزنی میں مزار علی لالا کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ (تعلیقات نوائے معارک)، ص ۸۵۲۔

اُس اختلاف کو بھی دور کرنے کی کوشش کریں گے جو آپ دونوں کے درمیان ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ سارا معاملہ آپ کی منشا کے مطابق طے ہو جائے گا اور اس تدبیر سے سردار محمد عظیم خاں اور اس کے اُمرا و خوانین تمام کے تمام آپ کے فرمانبردار ہو جائیں گے۔[1]

شاہ شجاع الملک پہلے ہی میرانِ سندھ کی نیت اور ارادوں کو سمجھ چکا تھا۔ وہ اس پیغام پر اور اچھی طرح سمجھ گیا کہ یہ تمام حیلہ اُس کو وہاں سے رخصت کرنے کے لیے ہے، وہ طوعاً و کرہاً قبہ سے نقل مکانی کر کے لاڑکانہ میں منزل انداز ہوا، لیکن وہاں بھی میرانِ سندھ نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور مختلف طریقوں پر کوشش کر کے اُسے دریا کے عبور کرنے کی ترغیب دی، چنانچہ شاہ شجاع الملک اُن کی اس حرکت سے برہم ہو کر دریا کو عبور کر کے اس کنارے پر مقیم ہوا۔ وہ میرانِ سندھ کی اس بدعہدی کو دیکھ کر نہایت محزون و متاسف تھا۔[2]

میرانِ سندھ اور محمد عظیم خاں کی ملاقات:

شاہ شجاع الملک کے دریا عبور کرنے کے بعد میرانِ سندھ نے سردار محمد عظیم خاں[3] سے ملاقات کی، سب سے پہلے انہوں نے مرحوم وزیر فتح خاں کی فاتحہ خوانی کی۔ اس فاتحہ خوانی کے سلسلے میں سردار محمد عظیم خاں نے میرانِ سندھ کو، اس صحرا میں نہایت پُر تکلف دعوت دی، دستر خوان پر طرح طرح کے کھانے تھے، جن کے نام سے بھی یہ آشنا نہ تھے۔

دوسرے دن میرانِ سندھ نے سردار محمد عظیم خاں کو اپنی قیام گاہ پر ایک شاندار دعوت دی اور مختلف قسم کے کھانے کابل اور خراساں کے باورچیوں سے تیار کرائے، خصوصاً مچھلی جو کہ اہل سندھ کی مرغوب ترین غذا ہے۔ سردار محمد عظیم خان اور اس کے خوانین اور اُمرا نے یہ مچھلی نہایت رغبت سے کھائی۔

ان دعوتوں اور ضیافتوں نے دونوں کے تعلقات کو اور مستحکم کیا، اور دونوں کے درمیان موثق عہد و پیمان ہوئے اور میرانِ سندھ نے نہایت قیمتی اور نفیس تحائف سردار محمد عظیم خاں، اس کے بھائیوں اور اس کے اُمرا کو پیش کیے، جن میں میر خانی بندوقیں، جوہر دار اور مرصع تلواریں اور بیش قیمت کپڑے شامل تھے۔ ان سب کی مجموعی قیمت تقریباً ایک لاکھ روپے تھی۔ اس کے علاوہ مبلغ بارہ لاکھ روپے عوض اخراجات لشکر و مالیہ کے دینے کا وعدہ کیا۔ سردار محمد عظیم خاں نے بھی اُن کو خلعت سے سرفراز کیا اور اپنے وکلا کو سندھ میں مامور کیا، اس کے بعد میرانِ سندھ نے واپسی کی اجازت حاصل کی۔ میرانِ حیدرآباد اپنے مستقر حیدرآباد کو اور میران خیرپور خیرپور کو جھمپتی[4]، کشتیوں پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔

شاہ شجاع الملک نہایت مایوس و محزون دریا کے کنارے چند روز تک بمقام درازہ پڑا رہا، وہاں اُس نے عرفان مآب قدوۃ العارفین میاں قبول محمد[5] سے ملاقات کی، نوبت یہاں تک پہنچی کہ اپنے سپاہیوں کی تنخواہ بھی ادا نہ کر سکا اور سپاہی اس کے متصدیوں سے آمادۂ فساد ہو گئے۔ آخر بہ ہزار مشکل اپنے سپاہیوں، سواروں اور پیادوں کی تنخواہ ادا کی، اور چند توپ بردار کشتیاں بطور امانت میر رستم علی خاں والیِ خیرپور کے پاس رکھ کر براہ جیسلمیر لدھیانے کا رخ کیا اور راستے میں ریگستان، پانی اور کھانے پینے کی سخت تکلیفیں اُٹھا کر بہزار خرابی لدھیانہ پہنچا۔[6]

سردار محمد عظیم خاں میرانِ سندھ کی مصالحت کے بعد شکارپور پہنچا، اور "باغ شاہی" میں منزل انداز ہوا، چند روز کے بعد اُس نے میرانِ سندھ سے وہ مالیہ اور اخراجات وصول کر لیے جن کا انہوں نے وعدہ کیا تھا، اور حکومت شکارپور کو اپنے قبضے میں لے کر وہاں کے نظم و نسق کو درست کیا، اور چند دن کے بعد اپنی جگہ شیر دل خاں کو شکارپور کی نظامت سپرد کر کے براہ کچھی[7] شکارپور سے خراسان روان ہو گیا، شیر دل کی نیابت میں مُلا مومن خان غلزائی، نیابت نظامت شکارپور پر مامور ہوا، جو نہایت انصاف پرور، کریم الاخلاق انسان تھا۔ یہ تقریباً سات آٹھ ماہ تک نیابت کے فرائض انجام دیتا رہا۔[8]

---

(1) تازہ نوائے معارک، ص ۱۵۸-۱۵۹۔

(2) تازہ نوائے معارک، ص ۱۶۰۔

(3) سردار محمد عظیم خاں بن سردار پایندہ خاں ۱۲۰۰ھ میں پیدا ہوا اور ۱۱۸۳ء میں ۸۳ سال کی عمر میں وفات پائی اور مزار عاشقان و عارفان کامل کے مغربی جانب کابل میں مدفون ہوا۔ (تازہ نوائے معارک، ص ۸۷۱)۔

(4) جھمپتی: سندھ میں چھوٹی سرکاری کشتی کو کہتے ہیں۔

(5) میاں قبول محمد: مخدوم عبدالوہاب (۱۰۹۰ھ) کے خاندان سے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب ۱۴ پشتوں کے بعد حضرت عمر فاروق رضہ سے جا ملتا ہے، ان ہی کے بھتیجے سندھ کے مشہور صوفی سچل سرمست تھے، میاں قبول محمد ۱۲۴۰ھ میں اس مشہور خاندان کے سجادہ نشین تھے۔ آپ نے ۱۲۴۵ھ میں وفات پائی (تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۶۲)۔

(6) تازہ نوائے معارک، ص ۱۶۴-۱۶۵۔

(7) کچھی: جیکب آباد اور سبی کے درمیان کا علاقہ کچھی کہلاتا ہے، جو جیکب آباد کے شمال میں ۶۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

(8) تازہ نوائے معارک، ص ۱۶۸۔

شکارپور پر میران سندھ کا قبضہ:

مُلا مومن خان غلزائی کے بعد سردار رحمدل خاں[1] بن سردار پایندہ خان قندھار سے ناظم شکارپور مقرر ہو کر آیا اور ملا مومن خان غلزائی معزول ہو کر خراساں چلا گیا۔ سردار رحمدل خاں ۱۲۳۹ھ (۱۷۲۶ء) تک شکارپور کا ناظم رہا، لیکن جب شیر دل خاں کابل سے کامیاب ہو کر قندھار آیا تو اُس نے اپنے آنے کے ایک دو ماہ بعد اپنے بھائی رحمدل خاں کو شکارپور سے واپس بلا کر اُس کی جگہ اپنے خسر کے بیٹے عبدالمنصور خاں کو نیابت حکومت شکارپور پر مقرر کیا۔[2]

ابھی اس کو آکر چار ماہ ہی گزرے تھے کہ شکارپور پر قبضہ کرنے کے لیے رنجیت سنگھ کا غلغلہ بلند ہوا، بلکہ یہ افواہ پھیل گئی کہ جنرل وینتورہ فرانسیسی[3] جس نے رنجیت سنگھ کی فوجوں کی تربیت یورپ کے اصول جدید پر کی تھی اپنا لشکر لے کر ڈیرہ غازی خان تک پہنچ چکا ہے۔

اس خبر کو سُن کر میرانِ سندھ نے فیصلہ کیا کہ انہیں شکارپور پر قبضہ کر لینا چاہیے، کیونکہ اگر سکھوں نے اس پر قبضہ کر لیا تو وہ بھی مامون نہ رہیں گے، چنانچہ اس فیصلے کے بعد اُنہوں نے نواب ولی محمد خان لغاری کو جو ان کا بہترین مشیر اور امیر تھا، اس پر مامور کیا کہ وہ شکارپور سے افغانوں کو نکال کر اُسے اپنے قبضے میں لے آئے۔

نواب ولی محمد خان لغاری کا خط:

نواب ولی محمد خان لغاری نے لاڑکانہ پہنچ کر عبدالمنصور خان کو پہلے ایک خط بھیجا جس میں لکھا کہ: اب جب کہ یہ یقینی ہو گیا ہے کہ خالصہ سنگھ کی فوج شکارپور پر قبضہ کرنے کے لیے آرہی ہے، تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ شکارپور ہمارے قرب و جوار میں ہے، خدانخواستہ اگر سکھوں نے اس پر قبضہ کر لیا تو سکھوں کے اس قبضے سے جو خراب نتائج نکلیں گے وہ براہ راست ہم پر اثر انداز ہوں گے، اس بنا پر ہمیں اس خرابی کا علاج پہلے ہی سے کر لینا چاہیے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اہل خراساں میں اُن کے مقابلے کی طاقت نہیں، خراساں کے سردار خراساں میں پڑے ہوئے ناصری بکروں کا گوشت، پشاوری چاول، صاحبی خلیلی اور کشمش انگور، سرد خربوزے، انار، بہی دانہ اور فالودہ اُڑا رہے ہیں اور ٹھنڈا پانی پی رہے ہیں۔ اس لیے وہ اس قدر سرد ہو چکے ہیں کہ ان کی رگوں میں اسلامی غیرت بھی خون نہیں دوڑاتی اور اگر بالفرض ہم یہ مان بھی لیں کہ وہاں سے لشکر آپ کی امداد کے لیے آئے گا تو وہ اتنے دور دراز ہیں کہ لشکر آنے تک ملک شکارپور ہاتھ سے نکل چکا ہو گا۔ ان حالات میں مناسب یہ ہے کہ ملک شکارپور آپ ہمارے حوالے کریں کہ ہم پھر بھی مسلمان ہیں۔ اب عافیت اسی میں ہے کہ آپ بلا توقف خراساں تشریف لے جائیں اور سرداران خراساں کے ساتھ مرغ پلاؤ اُڑائیں اور یہ ملک ہمارے حوالے کریں، لیکن اگر آپ کا کچھ اور ارادہ ہے تو پھر "ہمی میدان و ہمی گو" ناحق ہمیں اندیشہائے دور و دراز میں نہ ڈالیے کہ اس سے آپ کو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔[4]

نواب عبدالمنصور خان کو جب نواب ولی محمد خان لغاری کا یہ خط ملا، تو وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ سوائے اس کے اس کا کوئی علاج اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ خراساں کی طرف روانہ ہو جائے۔ پھر بھی اُس نے جواب میں میرانِ سندھ کو ایک خط بھیجا، جس میں لکھا کہ: لشکر خالصہ سنگھ بہت مختصر ہے اور حدود ڈیرہ غازی خان میں وہ اپنے علاقوں کے انتظام کے لیے آیا ہے، اس کا ارادہ شکارپور پر حملے کا نہیں، کیونکہ وہ شکارپور کے اکثر متعلقہ علاقے لے چکا ہے، صرف شکارپور باقی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ اہل خراساں سے اس قدر بے مروتی کا برتاؤ کریں گے کہ وہ شکارپور پر بھی قبضہ کر لیں گے اور اس بدنامی کا بار اپنے ذمے لیں گے۔[5]

لیکن میرانِ سندھ نے اس کے اس خط کی مطلقاً پروا نہیں کی، وہ سلطنت خراساں کی درہمی برہمی سے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے اور انہوں نے اس اقدام کے لیے خالصہ سنگھ کے لشکر کی آمد کو صرف ایک بہانہ بنایا تھا۔

---

(1) رحمدل خاں بن پایندہ خاں: تولد: ۱۲۱۱ھ (۱۷۹۶ء) وفات: رجب ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۸ء) مدفن نجف (شجرہ بارک زئیاں مشمولہ نوائے معارک)۔

(2) تازہ نوائے معارک، ص ۲۳۰-۲۳۱۔

(3) جنرل وینتورہ فرانسیسی: اصلاً ایطالیہ کا باشندہ تھا۔ یہ وہ شخص ہے کہ جس نے رنجیت سنگھ کے لشکر کو یورپ کے اصول جدید پر مرتب و منظم کیا، وینتورہ پہلے ایران آیا، بعد ازاں مارچ ۱۸۲۲ء میں لاہور آیا تو رنجیت سنگھ نے اپنے لشکر کی تربیت اس کے سپرد کی۔ ۱۸۲۳ء میں جب اس نے افغانوں کی جنگ میں نمایاں کارنامے انجام دیے تو رنجیت سنگھ نے اس کی بڑی تنخواہ مقرر کی اور وسیع اراضی دی۔ یہ ہمیشہ رنجیت سنگھ کی لشکر کشی میں شریک رہتا تھا اور اس نے رنجیت سنگھ کی اہم فوجی خدمات انجام دیں، آخر میں لاہور کا جج اور حاکم بنایا گیا۔ ۱۸۴۳ء میں یہ اس خدمت سے علیحدہ ہوا اور ۱۳ اپریل ۱۸۵۸ء میں اُس نے تاولوس میں انتقال کیا۔ (تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۷۳)۔

(4) تازہ نوائے معارک، ص ۲۳۱-۲۳۳۔

(5) تازہ نوائے معارک، ص ۲۳۳-۲۳۴۔

چنانچہ ۱۲۳۹ھ (۱۷۲۶ء) میں نواب ولی محمد خان لغاری تھوڑا سا لشکر اور چند سرکردگان کو ساتھ لے کر شکارپور پہنچا، اور "باغ شاہی" میں خیمہ زن ہوا اور جمعہ خان بارکزائی کو بلا کر پہلے تو اُسے نشیب و فراز سمجھائے، پھر اُسے حکم دیا کہ وہ جاکر فوراً ہی عبدالمنصور خان کو شکارپور سے خراساں روانہ کرے اور ہمارے پروانے کے وصول ہونے کی تاریخ سے شکارپور کا تمام مالیہ عبدالمنصور سے واپس لے کر ہمیں پہنچائے، ورنہ اُس کے حق میں بہتر نہ ہوگا اور یہ مالیہ اُس سے وصول کیا جائے گا۔

جمعہ خان یہ دہشتناک باتیں سُن کر واویلا کرتا ہوا عبدالمنصور خان کے پاس آیا اور نواب ولی محمد خان لغاری کے اس حکم سے اُسے مطلع کیا۔ عبدالمنصور خان نے ان دونوں باتوں کا اس وقت کوئی صاف جواب نہیں دیا، بلکہ ٹالنے کے لیے چند روز کی مہلت طلب کی۔ جمعہ خان نواب ولی محمد خان لغاری کا غصہ دیکھ چکا تھا، اس لیے وہ بار بار عبدالمنصور خان سے کہتا تھا کہ میں خواہ مخواہ دونوں کے درمیان مصیبت میں مبتلا ہوں، نواب خواہ مخواہ مجھے بلا کر غصے ہوتا ہے اور میری آبرو لیتا ہے اور آپ علیحدہ بے پروا بنے ہوئے ہیں۔[2]

اسی اثنا میں نواب ولی محمد لغاری کا ایک خدمتگار دلاور اپنے چند اوباش ساتھیوں کے ساتھ شہر میں داخل ہوا اور قصر سیٹھ میارام میں ٹھہرا، اور سارے شہر میں اُس نے میرانِ سندھ کی حکومت کی منادی کرائی اور جابجا شہر کے اہم مقامات اور کوتوالی میں اپنے آدمی مقرر کیے اور شہر کی کنجیاں اپنے ہاتھ میں لے لیں۔

دوسرے دن یہ خدمتگار نہایت بن ٹھن کر اور تلوار لٹکا کر شہر کے نظارے کے لیے نکلا۔ لوگ اُسے دیکھ کر محوِ حیرت ہو کر آپس میں سرگوشیاں اور افسوس کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ وائے شکارپور وائے شکارپور! وہ شہر جو حکام و سلاطین خراساں اور اُمرائے عالی مقام کا مرکز تھا، آج میرانِ سندھ کے کارپردازوں کی وجہ سے شکارپور کی زمام حکومت ایک ایسے بیہودہ خدمتگاروں کے ہاتھ آئی ہے۔[3]

عبدالمنصور خان اور نواب لغاری کی ملاقات:

تیسرے دن عبدالمنصور خان بموجب مصلحت "باغ شاہی" میں نواب ولی محمد خان لغاری کی ملاقات کے لیے گیا۔ نواب نے اُس کے آنے کو غنیمت سمجھ کر اُس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور نہایت گرم جوشی سے رخصت کیا اور اُس نے بھی نواب کے حکم کی تعمیل کی اور اونٹوں اور گاڑیوں پر اپنا سامانِ لدوا کر شکارپور سے گڑھی یاسین روانہ ہوگیا۔ گڑھی یاسین پہنچ کر وہ سامانِ سفر درست کرنے لگا۔ ابھی سامانِ سفر مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ دوبارہ نواب ولی محمد خان لغاری کا حکم پہنچا کہ اُسے گڑھی یاسین سے روانہ ہو جانا چاہیے۔ مجبوراً وہ عازم خراساں ہوگیا۔ لیکن حکومت شکارپور سے علیحدہ ہونے پر نہایت متاسف اور غمگین تھا۔

عبدالمنصور خان کے شکارپور سے چلے جانے کے بعد نواب ولی محمد لغاری نہایت مسرور اور خوش تھا اور اپنے مصاحبوں سے کہتا تھا کہ مسرت کا مقام ہے کہ ملک شکارپور جو قدیم سے اہلیان سلطنت کو محبوب تھا بغیر کسی زحمت اور لڑائی جھگڑے کے ہمارے ہاتھ آگیا۔

ملک شکارپور کی میرانِ سندھ میں تقسیم:

چند دن تک نواب ولی محمد خان لغاری فتح محمد خان گوری اور رئیس احمد گھور کے ساتھ جو میرانِ خیرپور کے معتمد تھے نظم و نسق چلاتا رہا۔ پھر اُس نے اس ملک کو سات حصوں میں تقسیم کرکے چار حصے میرانِ حیدرآباد کو اور تین حصے میرانِ خیرپور میں تقسیم کیے، پھر ان دونوں علاقوں کے میران سندھ نے شکارپور میں اپنے کارکن اور حاکم مقرر کیے، صاحب تازہ نوائے معارک کا بیان ہے کہ یہ ایسے نااہل تھے کہ ان کی حکومت کے دور میں یہ علاقہ روز بروز مائل بہ تنزل ہوتا گیا۔

آخر چند ماہ کے بعد میرانِ حیدرآباد نے سید محمد کاظم شاہ کو اور میرانِ خیرپور نے فقیر عالم خان مری کو شکارپور میں حاکم مقرر کیا۔

سید کاظم شاہ کا حکومت شکارپور کے لیے انتخاب ایک موزوں انتخاب تھا، وہ نجابتِ ذات اور حسنِ صفات میں یگانۂ روزگار، اہل علم کا قدردان، شرفا نواز اور نہایت فیاض تھا۔ اس نے شکارپور کی حکومت سنبھالتے ہی وہاں کے انتظاماتِ حکومت کو نہایت خوش اسلوبی سے چلایا، ہر وضیع و شریف اس کے حسنِ اخلاق سے نہایت متاثر اور اس کا ثناخوان تھا، لیکن اس کے اکثر ماتحت غصہ ور اور اُن میں مروت کا ذرا شائبہ نہ تھا اور ذرا ذرا سی بات پر برہم ہوتے تھے۔

اس کے بالکل برعکس فقیر عالم خان مری شراب و شاہد میں ہمیشہ غرق رہتا، ایک یاوہ گو اور اوباش انسان تھا، اس کی اوباشیوں کی ایک طویل داستان ہے، جسے ہم بوجہ طوالت یہاں حذف کرتے ہیں۔

---

[2] تازہ نوائے معارک، ص ۲۳۴-۲۳۵۔

[3] یہ تمام تفصیل تازہ نوائے معارک، ص ۲۳۵ سے ماخوذ ہے۔

حضرت سید احمد شہید:

اسی زمانے ۱۲۴۲ھ (۲۷-۱۸۲۶ء) میں حضرت سید احمد شہید بریلوی[1] اپنے مجاہدین کی جماعت کے ساتھ جو سکھوں سے جہاد کرنے کے لیے صوبۂ سرحد تشریف لے جارہے تھے سندھ تشریف لائے اور انہوں نے میرانِ سندھ، یہاں کے سادات، علمائے کرام، مشائخ عظام اور اُمرا اور ہر خاص وعام کو جہاد میں شرکت کے لیے دعوت دی۔ منشی عطا محمد شکارپوری، مؤلف تازہ نوائے معارک نہایت افسوس کے ساتھ لکھتا ہے کہ اہل سندھ میں ایک شخص نے بھی اپنی دوں ہمتی اور خواہشات نفس کی بنا پر اس سعادت کو حاصل نہیں کیا، بلکہ بعضوں نے ان کے مجاہدین کی مختصر اور بظاہر بے سرو سامان جماعت کو دیکھ کر بے جا لب کشائی کی۔ بعضوں نے آپ کو فریبی قرار دیا، بعضوں نے آپ کو وہابی کہا اور بعضوں نے آپ کو انگریزوں کا جاسوس ٹھہرایا، وہ حیران تھے کہ یہ مٹھی بھر مجاہدین کیا جہاد کرسکتے ہیں اور کس طرح نظام جہاد کو چلاسکتے ہیں۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ منشی عطا محمد شکارپوری نے اپنے اس بیان میں کچھ مبالغے سے کام لیا ہے، یہاں تک تو یہ بات صحیح ہے کہ یہاں کے لوگ اس دعوت جہاد میں شریک نہیں ہوئے اور بعض لوگ انہیں انگریزوں کا جاسوس سمجھتے تھے، لیکن جہاں تک حضرت کی عظمت واحترام اور مہمانداری کا تعلق ہے، میرانِ سندھ میں سے اکثر نے اس میں کمی نہیں کی، اجمال اس تفصیل کا یہ ہے کہ سید صاحب براہ جودھپور سندھ میں داخل ہوئے، جب وہ میرپور پہنچے تو آپ کے میرپور پہنچنے سے پہلے ہی سید چورن شاہ نے جو کارو کے رہنے والے تھے، میرپور کے حاکم علی مراد کو جاکو بتادیا کہ یہ غازی ہندوستان سے ہجرت کرکے سندھ کو دارالاسلام سمجھ کر یہاں آئے ہیں ان پر کسی قسم کا شبہ نہ کیا جائے، لیکن سید چورن شاہ کے سمجھانے کے باوجود علی مراد کے دل سے شک وشبہات نہ گئے، اس لیے وہ خود آپ کی ملاقات کے لیے نہ آیا، لیکن سید صاحب کی خدمت میں نذر بھیج دی اور دو سوار راستہ بتانے کے لیے آپ کے ساتھ کردیئے۔

میرپور سے روانہ ہوکر تیسرے روز سید صاحب ٹنڈو الٰہیار پہنچے، وہاں میرانِ حیدرآباد کی طرف سے دو آدمی آئے اور سارے حالات دریافت کرکے انہوں نے میرانِ حیدرآباد کو اطلاع دی، وہاں سے حکم آیا کہ سید صاحب شوق سے تشریف لائیں اور اس علاقے کو اپنا گھر سمجھیں، چنانچہ ٹنڈو الٰہیار سے روانہ ہوکر آپ نے ٹنڈو جام ہالہ میں قیام کیا۔ جام ہالہ سے روانہ ہوکر آپ پھلیلی ندی کے مشرقی کنارے پر جس کے مغربی کنارے پر حیدرآباد واقع ہے، مقیم ہوئے۔

میرانِ حیدرآباد کو جب آپ کی آمد کا حال معلوم ہوا تو اُنہوں نے سید صبغتہ اللہ ولایتی کو آپ کے استقبال کے لیے روانہ کیا۔ سید صبغتہ اللہ مکہ معظمہ میں سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرچکے تھے اور میر کرم علی خاں میر حیدرآباد کے مصاحب تھے۔ شہر حیدرآباد سے دو تیر کے فاصلے پر لشکر مجاہدین ٹھہرایا گیا، میرانِ حیدر آباد کی طرف سے مجاہدین کی تواضع کے لیے مٹھائی بھیجی گئی اور ضروری جنس لشکر میں پہنچائی گئی، آم اور خربوزے بھی بڑی مقدار میں مجاہدین کے لیے بھیجے گئے۔

تیسرے روز جمعہ تھا۔ میرانِ حیدرآباد نے سید صاحب کو کہلا بھیجا کہ جمعہ کی نماز آپ قلعے میں ہمارے ساتھ ادا فرمائیں، چنانچہ آپ آٹھ آدمیوں کو ساتھ لے کر قلعے میں تشریف لے گئے، میرانِ حیدرآباد آپ سے مل کر بے حد خوش ہوئے اور جب آپ نے ان سے ہجرت اور جہاد کے ارادے کا تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا کہ کچھ دن آپ بھی یہاں قیام فرمایئے اور اپنے اہل وعیال کو یہاں ٹھہرادیجیے۔ آپ نے فرمایا: اگر میں کچھ دن یہاں ٹھہرا تو سردیاں شروع ہوجائیں گی اور پھر سفر میں برف باری کی دشواریاں پیش آئیں گی۔ جب میرانِ حیدرآباد نے یہ دیکھا کہ آپ قیام کے لیے کسی طرح تیار نہیں تو انہوں نے آپ کی خدمت میں بطور نذر ایک ہزار روپے، ایک بندوق اور ایک جوڑ طمنچوں کی پیش کی۔

حیدرآباد کے قیام کے دوران میں جو لوگ آپ کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے ان کی تعداد بڑی کثیر ہے، لیکن ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ میر اسماعیل شاہ نائب وزیر حیدرآباد، حافظ محمد یوسف جو گورنر بمبئی کی طرف سے دربار سندھ میں وکیل تھا، اس نے آپ کے قیام کے زمانے میں کئی مرتبہ آپ کی دعوت کی اور آپ کی خدمت میں بیش بہا تحائف پیش کیے، محمد یوسف خاں جو اُمرائے سندھ میں سے تھا۔

حیدرآباد کے میروں نے اگرچہ آپ کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی، لیکن ان کا قلب ذوق جہاد سے بالکل خالی تھا۔ ظاہر ہے کہ سید صاحب کے لیے ان میں اور ان کے شہر میں کیا کشش ہوسکتی تھی۔

چنانچہ آپ ذیقعدہ ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۷ء) کو حیدرآباد سے پیر

---

[1] حضرت سید احمد شہید بریلوی: ولادت: ۶ صفر ۱۲۰۱ھ (۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء) بروز دوشنبہ۔ شہادت: ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۱ء) بروز جمعہ، مقام شہادت: بالا کوٹ ضلع ہزارہ (سیرت سید احمد شہید)۔

گوٹ[1] روانہ ہوئے، اسی روپے پر دو کشتیاں آپ نے کرائے پر لیں، ایک بجرہ میرانِ حیدرآباد نے عاریۃً دیا، سارا مال و اسباب ان کشتیوں پر رکھا، کمزور اور ضعیفوں کو بھی کشتیوں میں بٹھایا، توانا اور صحت مند غازی براہ خشکی، گھوڑوں اور اونٹوں پر روانہ ہوئے۔

جب یہ کارواں رانی پور پہنچا تو سید صالح شاہ بغدادی نے جو رانی پور کے ایک بزرگ تھے سارے لشکر کو کھانا کھلایا، یہ وہ زمانہ تھا جب سید صبغتہ اللہ اول اپنے والد پیر محمد راشد روضہ والا[2] کی جگہ مسند آرائے رشد و ہدایت ہو چکے تھے، اس خاندان میں یہ پہلے پیر ہیں جو "پیر پاگارا" (صاحب دستار) کے لقب سے مشہور ہوئے۔ "مسند نشینان پیر پگارا" ان ہی کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کے دوسرے بھائی پیر محمد یامین جھنڈا یا علم لے کر دوسری جگہ چلے گئے۔ اس لیے انہوں نے "پیر جھنڈا" کے لقب سے شہرت پائی۔

سید صبغتہ اللہ اول نے جب مسند رشد و ہدایت کو سنبھالا، اس وقت پنجاب پر سکھ چھائے ہوئے تھے اور سندھ پر انگریز اور سکھ دونوں نظریں جمائے ہوئے تھے، سید صبغتہ اللہ اول نے جب یہ دیکھا کہ سکھ، حکومت سندھ کی جانب پھیلنے لگے ہیں تو آپ نے جہاد کا عزم مصمم کر لیا۔ آپ کا کوئی وعظ جہاد کی ترغیب اور فضائل سے خالی نہ ہوتا تھا، کچھ اور لار کے مرید جو بُعدِ مسافت کی وجہ سے آپ کے مواعظ میں شریک نہ ہو سکتے تھے آپ اُن پر خطوط کے ذریعہ سے جہاد کی اہمیت واضح کرتے اور انہیں جہاد کے لیے دعوت نامے لکھتے۔

اپنے انہیں مریدوں میں سے سید صبغتہ اللہ نے ایسے سرفروش اور جانباز مجاہدوں کی جماعت تیار کی جو وقت پڑنے پر ملتِ اسلامیہ کے لیے اپنی جان کی بازی لگا سکیں، ان مجاہدین کو "حُر" کا لقب دیا گیا اور یہی سندھ میں "حُر تحریک" کا پہلا نقطہ تھا۔ حضرت سید احمد شہید اور سید صبغتہ اللہ اول دونوں کا نقطۂ نظر ایک تھا، دونوں یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان سے سکھوں اور انگریزوں کا اقتدار ختم کر کے اسلامی نظام حکومت بر سر عمل لایا جائے۔

حضرت سید احمد شہید پہلے ہی حضرت سید صبغتہ اللہ اول کی تعریف سن چکے تھے اور آپ سے ملنے کے مشتاق تھے۔ جب حضرت سید احمد شہید مجاہدین کے ساتھ سرحد جاتے ہوئے سندھ تشریف لائے اور آپ کا قیام رانی پور میں ہوا تو اتفاق سے سید صبغتہ اللہ اپنے ایک سو مریدوں کے ساتھ رانی پور آئے ہوئے تھے، یہیں آپ کی پہلی ملاقات حضرت سید احمد شہید سے ہوئی، دونوں ایک دوسرے سے مل کر بے حد خوش ہوئے اور حضرت سید صبغتہ اللہ نے آپ کو اپنے وطن پیر گوٹھ تشریف لے چلنے کی دعوت دی، جس کو حضرت سید احمد شہید نے منظور فرما لیا۔ کسی ضرورت سے حضرت صبغتہ اللہ کو ایک دن رانی پور میں ٹھہرنا پڑا، لیکن آپ نے حضرت سید احمد شہید اور مجاہدین کو اپنے بھائی کے ہمراہ پیر گوٹھ بھجوا دیا۔

۱۷ ذیقعدہ ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۶ء) کو حضرت سید احمد شہید پیر گوٹھ پہنچے، حضرت سید صبغتہ اللہ کے مریدوں اور بھائیوں نے مہمان نوازی اور مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، دوسرے دن حضرت سید صبغتہ اللہ بھی تشریف لے آئے اور انہوں نے حضرت سید احمد شہید اور مجاہدین کی مہمان داری کا اس قدر اہتمام کیا کہ خود اپنے ہاتھ سے کھڑے ہو کر آپ کو اور مجاہدین کو کھانا کھلواتے تھے۔ تیسرے روز سید صاحب نے انہیں باصرار روکا اور لشکر میں رسد بٹنے لگی، تقریباً تیرہ روز حضرت سید احمد شہید پیر گوٹھ میں مقیم رہے، اور وہاں سے شکار پور روانہ ہوئے۔

دونوں کے خلوص و محبت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حضرت سید احمد شہید نے اپنے اہل و عیال کو حضرت سید صبغتہ اللہ کی حفاظت میں پیر گوٹھ میں چھوڑا۔ دونوں میں مسلسل خط و کتابت جاری رہی۔ حضرت سید احمد شہید کی روانگی کے وقت دونوں میں یہ فیصلہ ہوا کہ جب صحیح طور پر جنگی مرکز قائم ہو جائے گا تو سید صبغتہ اللہ بھی وہاں پہنچ جائیں گے، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ سید صبغتہ اللہ جانے کے لیے بالکل تیار تھے اور اس کی اطلاع آپ نے حضرت سید احمد شہید کو دے بھی دی تھی کہ اچانک افغانستان اور پشاور کا راستہ ایرانی سرداروں کے عناد کی وجہ سے مخدوش ہو گیا اور آپ وہاں نہ پہنچ سکے۔

جو اعتماد اور خلوص حضرت سید احمد شہید اور حضرت سید صبغتہ اللہ میں تھا اس کا اندازہ اُن خطوط سے ہوتا ہے، جو آپ نے سید صبغتہ اللہ کو

---

[1] پیر گوٹ: یہ گاؤں ضلع سکھر میں واقع ہے، سید صاحب کے زمانے کا پیر گوٹھ دریا کے دست برد میں آگیا، اب تقریباً پانچ میل ہٹ کر نیا گوٹ اسی نام سے آباد ہوا ہے۔

[2] پیر محمد راشد: بن سید محمد بقا، ولادت: ۱۱۱۷ھ (۱۷۰۶ء) وفات: ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷-۱۸ء) (تذکرہ صوفیائے سندھ، ص ۲۶۳-۲۷۲) ان ہی بزرگ کے نام سے ان کی اولاد راشدی خاندان سے موسوم ہوئی۔ راشدی خاندان آج بھی اپنی وجاہت، شرافت اور علمی عظمت کے لحاظ سے سندھ کے ممتاز ترین خاندانوں میں شمار ہوتا ہے۔ سندھ کے عہد حاضر کے مشہور مورخ سید حسام الدین راشدی اور سندھ کے مشہور صحافی پیر علی محمد راشدی اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔

مختلف اوقات میں لکھے۔ ایک خط میں میدانِ جہاد سے سید صبغتہ اللہ کو تحریر فرمایا:

> آپ تمام مسلمانوں کو دعوت دیں اور مخلصین کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر سکھوں کی سرحد سے متصل محفوظ مقام پر بیٹھ جائیں اور جہاد شروع کر دیں، اپنے اہل و عیال کے ساتھ میرے اہل و عیال کو بھی کسی ایسی جگہ بٹھا دیں جو دشمن کی دسترس سے باہر ہو۔

جب سرحد میں حضرت سید احمد شہید کے ہاتھ پر بیعتِ امامت ہو چکی تو آپ نے اپنے نائب بیعت لینے کے لیے مختلف علاقوں میں بھیجے۔ محمد قاسم کو سندھ بھیجتے ہوئے سید صبغتہ اللہ کو ایک گرامی نامے میں تحریر فرمایا:

> سندھ میں نیابتاً میری جانب سے بیعت لینے کے اہل صرف آپ تھے، لیکن چونکہ آپ کے بھائی رقابت کے مرض میں مبتلا ہیں، اس لیے اندیشہ ہے کہ اسی باعث اس امر مسنون کی بجا آوری سے محروم نہ رہ جائیں، لہٰذا میں نے اس نیابت کے لیے دوسرے آدمی کو بھیج دیا۔

جب آپ پنج تارے سے راج دواری روانہ ہونے لگے تو آپ نے سید صبغت اللہ کو ایک خط میں لکھا کہ:

> اگر ہماری زندگی جہاد ہی میں پوری ہو جائے، تو ہمارے اہل و عیال کو حرمین شریفین پہنچا دیجیے۔[1]

حیدرآباد سے روانہ ہو کر آپ شکارپور پہنچے۔ نوائے معارک میں ہے کہ اُس وقت شکارپور کا حاکم سید محمد کاظم شاہ حسینی تھا۔ وہ نہایت تپاک اور احترام سے حضرت سید احمد شہید سے ملا، ملاقات کے دوران حضرت سید احمد شہید نے قرآن و حدیث کی روشنی میں اُسے دعوت جہاد دی، چنانچہ اُس نے آپ سے وعدہ کیا کہ جب جہاد کا وقت آئے گا تو وہ اپنے ساتھ مجاہدین کی ایک جماعت لے کر جہاد میں شرکت کی سعادت حاصل کرے گا، لیکن جب یہ موقع آیا اور آپ نے اُسے دعوت نامہ بھیجا تو دنیا طلبی اور حکومت شکارپور کی ہوس نے اس کا دامن نہ چھوڑا اور متعدد مرتبہ شرکتِ جہاد کے دعوت ناموں کے وصول ہونے کے بعد بھی وہ اس میں شرکت کی سعادت حاصل نہ کر سکا۔[2]

۱۴ ذی الحجہ ۱۲۴۱ھ (۲۰ جولائی ۱۸۲۶ء) کو حضرت سید احمد شہید شکارپور سے روانہ ہو کر عازمِ خراساں ہوئے۔ شہر کے اکابر، علماء، لشکری اور عوام چار کوس تک آپ کو رخصت کرنے کے لیے گئے۔[3]

حضرت سید احمد شہید کی حیاتِ طیبہ کے اس حصے کو ہم نے یہاں پیش کر دیا ہے جس کا تعلق سندھ سے تھا۔ حضرت کے باقی تفصیلی حالات کے لیے آپ کی سوانح حیات سید احمد شہید، مؤلف مولانا غلام رسول مہر اور سیرت سید احمد شہید مولف مولانا سید علی ندوی کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

میر کرم علی خاں کی وفات:

۱۲ جمادی الثانی ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) میں میر کرم علی خاں والیٔ حیدرآباد نے مرض آکلہ میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ باغ ارم اور "بادا بہشتش بارگاہ" سے اُس کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ میر کرم علی خاں کو اُس کے خاندانی مقابر ٹالپوراں میں ایک گنبد خاص میں دفن کیا گیا۔ اس کے سنگ مزار پر یہ کتبہ ثبت ہے:

> تاریخ-وفات مرحوم-جنت آرام گاہ میر کرم علی خاں ٹالپور-
> علیہ الرحمتہ دوازدھم جمادی الثانی ۱۲۴۴ھ۔[4]

میر کرم علی خاں شعراً اور اہلِ علم و فضل کا قدر ان تھا اور خود بھی فاضل، صاحب ذوق، سخن سنج اور شاعر تھا۔

اُس کی تالیفات میں اُس کا دیوان "دیوان کرم" کے نام سے موسوم ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اس کی دوسری تالیف "مجموعہ دلکشا" ہے، جس میں اُس نے اپنے ذوق کے مطابق متقدم اور متاخر شعرا کے اشعار کو جمع کیا تھا۔[5]

میر کرم علی خاں کے دور کی علمی و ادبی ترقیاں:

میر کرم علی خاں کے دربار سے بہت سے شعرا، اہل علم و فضل وابستہ تھے، اُس کی علمی و ادبی سرپرستی کی وجہ سے اُس کے دور میں شعر و ادب، علم و فضل کو خوب فروغ ہوا۔

---

(1) حضرت سید احمد شہید کے متعلق یہ تمام تفصیل "سید احمد شہید" صفحہ ۳۰۵-۲۹۶ سے ماخوذ ہے۔

(2) تازہ نوائے معارک، ص ۲۴۵-۲۴۶۔

(3) سید احمد شہید، مؤلف مولانا غلام رسول مہر، ص ۳۱۲۔

(4) تازہ نوائے معارک، ص ۳۶۶-۳۶۷ تعلیقات تکملۂ مقالات الشعرا، مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۷۲۸۔

(5) تعلیقات تکملہ مقالات الشعرا، مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۷۲۸۔

جو علماء و فضلا اور شاعر اس کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، ان میں سے ہم یہاں چند کا تذکرہ کرتے ہیں۔

میر غلام علی مائل:

میر غلام علی مائل بن میر علی شیر قانع ٹھٹھوی جو میر کرم علی خاں کا درباری شاعر تھا، ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ء) میں پیدا ہوا۔ یہ ابتداء میر غلام علی خان سے وابستہ تھا، لیکن میر کرم علی خاں کی مسند نشینی کے بعد وہ اس سے وابستہ ہو گیا۔

۱۹- ذوالحجہ ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۶ء) کو مائل نے وفات پائی۔ اس کا مجموعہ کلام "کلیاتِ مائل" کے نام سے ۱۹۵۹ء میں سندھی ادبی بورڈ سے ۵۳۷ صفحات پر شائع ہو چکا ہے، جسے محمود احمد عباسی اور محمد حبیب اللہ رشدی مرحوم نے ایڈٹ کیا ہے۔[2]

اس کے کلیات میں ہمیں غزلیات، قصائد، قطعات، مراثی غرضیکہ اصناف شاعری میں ہر صنف ملتی ہے لیکن جس صنف میں اس کے جوہر کھلتے ہیں وہ اس کی تاریخ گوئی ہے جس میں وہ اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ اس نے تین سو سے زیادہ واقعات کے مادہ تاریخ کہے ہیں کہ جن سے سندھ کی تاریخ و تمدن پر روشنی پڑتی ہے۔ صاحبِ تکملۂ مقالات الشعرا مخدوم محمد ابراہیم خلیل[3] نے اُسے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ:

> مائل تخلص، رموز شناس کلام خفی و جلی میر سید غلام علی بن میر علی شیر قانع تخلص است – در تاریخ گوئی بسیار رواں طبع است۔[4]

اس کے چند شعر ہم یہاں نمونتاً نقل کرتے ہیں:

سیر گلشن بہ گل عذار خوش است
بادہ خوردن بہ میگسار خوش است
دلِ زارم ز درد پُر داغ است
سیر ایں تازہ لالہ زار خوش است

در خمِ دامِ زلف پُر پیچش
مرغِ جانم شکار خواہد شد
آخر ایں دل بفیض سوز و گداز
شمعِ بزم وقار خواہد شد

میر صابر علی صابر:

سید صابر علی صابر، یہ میر مائل کا بیٹا تھا۔ صاحب تکملۂ مقالات الشعرا کا بیان ہے کہ یہ نظم و نثر میں ماہر تھا، پہلے تخلص سائل کرتا تھا، لیکن اپنے والد کے تطابق میں، اس نے صابر تخلص اختیار کیا۔ صابر نے اگرچہ غزلیں بھی کہی ہیں، لیکن مرثیے زیادہ کہے ہیں، خیال ہے کہ اس کا دیوان جمع ہی نہیں ہوا، یا جمع تو ہوا لیکن ضائع ہو گیا۔ کہیں کہیں اس کا کلام ملتا ہے۔ صابر نے ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں وفات پائی۔ ڈاکٹر سدارنگانی نے اپنی کتاب میں اس کے چند شعر نقل کیے، جن میں سے دو شعر یہ ہیں:

ترک اسبابِ تعلق ہر کہ کرد آزاد شد
خانہ اش را حاجت فرش و در درگاہ نیست

مجنوں نیم کہ شکوہ کنم از جفای یار
من "صابرم" کہ صبر بجور و جفا کنم[4]

ان کے علاوہ اس دور کے شعرا اور اہل علم میں مخدوم نور محمد بوبکانی، آخوند نور محمد ہالائی، میرزا خسرو بیگ چرکس، میر کاظم شاہ سرخوش، سلیمان صباحی، عبدالمجید جوکیو، صاحب "تاریخ بلوچی"، منشی صاحب رائے آزاد، میر ہوتک افغان، آقا محمد عاشق، میرزا مظہر، سید طباطبائی، منشی دولہ رام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

میر مراد علی خان

۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) تا ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء)

میر کرم علی خان کو کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) میں اس کی وفات کے بعد اس کی جگہ اس کا بھائی میر مراد علی خان مسند نشین ہوا اس نے اولاً آپ کو "سرکار بلند اقتدار" کے لقب سے اور بعد میں "سرکار جہاں مدار" کے لقب سے ملقب کیا اس کا سجع یہ تھا:

(۱) بحق حضرت نبی ولی یافت از حق بہ مراد علی۔

---

(1) مقدمہ کلیات مائل مرتب حبیب اللہ رشدی مرحوم، ص ۱۸-۲۶۔

(2) مخدوم محمد ابراہیم خلیل: بن مخدوم عبدالکریم ٹھٹھوی: ولادت: جمادی الاولیٰ ۱۲۴۳ھ وفات: ۱۳۱۳ھ بعمر ۷۰ سال (تکملہ مقالات الشعراء، ص ۲۴۸)۔

(3) ایضاً۔ ص ۵۳۷۔

(4) تکملۂ مقالات الشعرا، ص ۳۵۱ و تعلیقات تکملہ مقالات الشعرا مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۳۵۳۔

(۲) بندۂ مصطفیٰ مراد علی۔

اس کی انگوٹھی پر یہ کندہ تھا:

از تقاضای حکمت ازلی گشت میر جہاں مراد علی[1]

یہ صائب الرائے، ہوشمند اور دانا انسان تھا، اس نے اپنے حسن تدبیر سے ملک میں کسی شورش و فساد کو اُبھرنے کا موقع نہ دیا اور اپنے بھائی کے تمام مال اور ملک کو اپنے قبضے میں لے آیا۔ کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اس کی ملکیت میں کوئی رخنہ پیدا کر سکے۔ اس نے میر کرم علی خان کے پس ماندگان اور منسوبین کو بھی اپنے حسنِ سلوک سے ممنون و متشکر بنایا اور ملک کے نظم و نسق کو اس خوبی سے چلایا کہ ہر شخص اس کا قائل ہو گیا۔ اس کی شخصیت اپنے محاسن اور خوبیوں کی وجہ سے بڑی پہلو دار اور دلکش شخصیت تھی، لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود اس کا سب سے بڑا عیب اس کا بخل اور اس کی تنگ دلی تھی۔ یہی عیب آیندہ چل کر اس کی مملکت کے لیے مضر بنا۔ منشی عطا محمد شکار پوری نے اپنی کتاب تازہ نوائے معارک میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

عالی جاہ میر مراد علی خاں والیِ حیدرآباد باوجود ایں ہمہ خزاین و دفائن کہ از تعداد شمار بیروں بود، نہایت سخت دل و دست تنگ بود۔[2]

انگریزوں کا معاہدہ:

۲۰ اپریل ۱۸۳۲ء کو میر مراد علی خان نے ہنری پاٹنجر[3] سے حسب ذیل معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ بتاریخ ۱۸ ذیقعدہ ۱۲۴۷ھ (۲۰ اپریل ۱۸۳۲ء) لفٹننٹ کرنل پاٹنجر نمایندہ انگریز اور میر مراد علی خان ٹالپور کے درمیان لکھا گیا۔ جس کی توثیق ۱۹ جون ۱۸۳۲ء کو شملہ میں لارڈ بنٹک گورنر جنرل ہند کی طرف سے کی گئی، اس معاہدے کی حسب ذیل شرائط تھیں۔

۱۔ دونوں حکومتوں کے درمیان جو خلوص و محبت کے روابط سابقہ معاہدوں سے قائم کیے گئے ہیں، وہ دونوں کے درمیان ہمیشہ قائم اور باقی رہیں گے، اب بوساطت لیفٹننٹ کرنل پاٹنجر ایلچی اس میں مزید اور مفید مواد شامل کیا جا رہا ہے، تاکہ دونوں حکومتوں کے روابط مضبوط اور یگانگت اور بڑھے اور یہ روابط اور یگانگت میر کرم علی خان کے اخلاف میں نسلاً بعد نسل باقی رہے۔

۲۔ طرفین معاہدہ کنندہ کبھی ایک دوسرے کے علاقے پر دستِ طمع دراز نہ کریں گے۔

۳۔ حکومت انگریز کی خواہش یہ ہے کہ ہندوستان کے تاجروں کو آمد و رفت اور مال تجارت کے حمل و نقل کی اجازت سندھ کے بری اور دریائے سندھ کے راستوں سے دی جائے تاکہ دونوں مملکتوں کے باشندے ایک دوسرے کے علاقوں میں جا سکیں۔ حکومت حیدرآباد اس کو تین شرائط کے ساتھ قبول کرتی ہے۔

شرط اول: دونوں حکومتوں میں کسی کو یہ حق حاصل نہ ہو گا کہ مذکورہ راستوں سے جنگی سامان لائیں۔

شرط دوم: مذکورہ راستوں سے مسلح جہاز اور کشتیاں نہ آسکیں گی۔

شرط سوم: کسی انگریز تاجر کو مستقل سندھ میں قیام کی اجازت نہ ہو گی، البتہ وہ آجا سکیں گے اور اپنے کام انجام دینے کے بعد ہندوستان واپس چلے جائیں گے۔

۴۔ جس زمانے میں سوداگرانِ ہندوستان تجارت کے لیے سندھ آئیں، ان کے لیے لازم ہے کہ وہ ہندوستان کی حکومت سے پاسپورٹ حاصل کریں اور وہ اس کی اطلاع اپنی آمد سے پہلے ناظم اعلیٰ انگلیشیہ مقیم کچھ یا کسی دوسرے انگریز عہدہ دار کے توسط سے حکومت حیدرآباد کو دے دیں۔

۵۔ حکومت حیدرآباد نے جو محصولات تجارتی اشیاء پر لگائے ہیں، اس میں کسی قسم کی کمی و بیشی نہ ہو گی اور امور تجارت میں کسی قسم کی مزاحمت نہ کی جائے گی، تمام مملکت حیدرآباد کے محصول وصول کنندہ ملازمین کو اس کی ہدایت دے دی گئی ہے کہ ان احکام جدیدہ کے جاری کرنے کے بہانے سے تاجروں کے کام میں خلل نہ ڈالیں۔ نیز حکومتِ حیدرآباد ان تمام اشیاء کی فہرست جن کی درآمد پر محصول لیا جائے گا پہلے حکومت ہند کو بھیج دے۔

۶۔ سابقہ معاہدوں کے مواد پر جو دونوں حکومتوں کے درمیان سابق میں ہو چکے ہیں کسی قسم کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

---

(1) تعلیقات تکملہ مقالات الشعراء، ص ۷۳۰ مرتب سید حسام الدین راشدی۔

(2) نوائے معارک، ص ۲۷۳۔

(3) سر ہنری پاٹنجر: ولادت: ۱۷۸۹ء، ۱۸۰۶ء میں بمبئی کی فوج میں شامل ہوا، ۱۸۰۸ء میں پہلی مرتبہ سندھ بھیجا گیا، پھر ۱۸۲۹ء میں دوبارہ سندھ بھیجا گیا، ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۴ء تک مدراس کا گورنر رہا۔ ۱۸ مارچ ۱۸۵۶ء میں اس نے وفات پائی۔ اس نے ایک کتاب سفر بلوچستان و سندھ کے نام سے لکھی تھی۔ (تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۹۱-۸۹۲)۔

۷۔ ہمیشہ طرفین میں وکلا کا تبادلہ دوستی اور مودت کو بڑھانے کے لیے اور ایک دوسرے کی مصالح کی بنا پر برضامندی ہوتا رہے گا۔[1]

(مہر کمپنی، دستخط ڈبلیو، سی پنک و مہر گورنر جنرل)

انگریز اس قسم کے معاہدوں سے اپنے اثر و رسوخ کو سندھ میں مضبوط کرتے جاتے تھے اور میرانِ سندھ بغیر عاقبت اندیشی کے ان پر دستخط کرتے جاتے تھے اور انگریزوں کی غلامی کے جال کو اپنے گرد مضبوط کرتے جاتے تھے۔

نواب ولی محمد خان لغاری کی وفات:

نواب ولی محمد خان لغاری جو میرانِ حیدرآباد کا بے نظیر مشیر تھا اور ملک چاندوکہ[2] کا نظم و نسق بالکلیہ اس کے اختیار میں تھا، اس نے ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱ء) میں اس معاہدے سے ایک سال قبل وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد ہی سے میرانِ سندھ کے اتحاد و اتفاق میں نفاق و اختلاف کا رخنہ پڑا۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ میر مراد علی خان بخیل اور سخت دل تھا، اس کا مظاہرہ نواب ولی محمد لغاری کی وفات کے بعد بہت زیادہ ہوا۔ بات یہ ہوئی کہ نواب ولی محمد خان لغاری اپنی زندگی میں اپنے ملک کے خارجہ تعلقات کو بہتر اور مستحکم کرنے کے لیے دوسرے ملکوں سے بہت زیادہ مراسلت کرتا اور قاصدوں کو بھیجتا تھا، اگرچہ ان قاصدوں کی آمد و رفت میں خاصے مصارف ہوتے تھے، لیکن اس کا فائدہ اس روپے کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا، جو ان قاصدوں کی آمد و رفت اور آپس کے تبادلہ خیالات اور باہمی مراسلت سے ملک کو پہنچتا تھا۔ میر مراد علی خان اپنے فطری بخل کی وجہ سے روپے کو ان اعلیٰ فوائد کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتا تھا اور اس کے ان اخراجات کو فضول اور بے کار سمجھتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ نواب ولی محمد خان ملک چاندوکہ کا تمام مالیہ قاصدوں کی آمد و رفت میں بالکل برباد کیے جا رہا ہے، اس جنون کا کیا علاج کیا جائے۔

چنانچہ نواب ولی محمد خان لغاری کی وفات کے بعد اسے قاصدوں کے اخراجات سے نجات مل گئی اور اب اس نے بہادر خان کھوکھر کو سمندر خان دورانی بامیزائی کے ساتھ ملک چاندوکہ اور شکارپور کی مختار کاری پر مقرر کیا اور سید محمد کاظم جو چند سال سے حکومت شکارپور پر مامور تھا، میر مراد علی خان کی کم التفاتی کی وجہ سے معزول ہو کر واپس ہوا۔[3]

ایک عجیب واقعہ:

جس رات کو سید محمد کاظم شکارپور سے روانہ ہو رہا تھا، اس رات ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک فروزہ رنگ ستارہ زمین پر ٹوٹ کر گرا۔ عوام و خواص اس واقعہ کو دیکھ کر حیران ہو گئے اور انہیں خیال ہوا کہ ضرور کوئی حادثہ رونما ہونے والا ہے۔[4]

شاہ شجاع الملک کی شکارپور میں آمد:

اس واقعہ کے چند ماہ بعد ۱۲۴۸ھ (۳۳-۱۸۳۲ء) میں میر مراد علی خان والیٔ حیدرآباد نے مصلحتِ وقت کے لحاظ سے شاہ شجاع الملک کو سندھ آنے کی دعوت دی۔ اگرچہ میران خیرپور شاہ شجاع کی آمد کو دل سے ناپسند کرتے تھے لیکن میر مراد علی خان کی وجہ سے کچھ بول نہ سکتے تھے۔ چنانچہ شاہ شجاع الملک لدھیانہ سے منازل طے کرتا ہوا شکارپور پہنچا۔ میر مراد علی والیٔ حیدرآباد کی طرف سے سید محمد کاظم شاہ کو اس کے استقبال کے لیے قلعہ سبزل تک بھیجا گیا اور میرانِ خیرپور کی طرف سے فتح محمد خان غوری کو اس کے استقبال کے لیے مقرر کیا گیا، یہ دونوں شاہ کے استقبال کے لیے گئے اور نہایت عزت و احترام سے اسے شکارپور لے کر آئے۔ شاہ کی آمد سے پہلے ہی میرانِ خیرپور کی طرف سے میر زنگی خان اور میران حیدرآباد کی طرف سے میر جہاں خاں شکارپور پہنچ چکے تھے، جو رعایائے شکارپور کو تسلی و تشفی دے رہے تھے کہ وہ شاہ کی آمد سے پریشان نہ ہوں اور کسی قسم کے خطرات دل میں نہ لائیں۔ لیکن جس روز یہ دونوں امیر شکارپور داخل ہوئے، لوگ جمع ہو کر "دروازۂ لکھی" کے باہر ان کی آمد کا نظارہ کر رہے تھے۔ ان امیروں کے ساتھ جو سوار تھے، انہوں نے لوگوں کے ہجوم کو دیکھ کر اپنے گھوڑے دوڑانے شروع کیے، جیسے ہی ان سواروں نے اپنے گھوڑے دوڑائے، ان میں سے بعض کی پگڑیاں زمین پر گر پڑیں اور بعض خود زمین پر آ رہے، لوگوں نے اس کو شگونِ بد خیال کیا۔

آمد سے پہلے میرانِ سندھ اور شجاع الملک میں معاہدہ یہ تھا کہ شجاع الملک میرانِ سندھ سے چالیس ہزار روپے اخراجات کے لے کر چالیس دن کے بعد خراساں چلا جائے گا، لیکن یہ مدت گزر گئی اور میرانِ

---

(1) تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۹۵۶-۹۵۸۔

(2) چاندوکہ: ایک جگہ کا نام ہے، جو لاڑکانہ میں واقع ہے اور آدم شاہ کلہوڑہ کی زمینداری کا مرکز تھی۔

(3) یہ تمام تفصیل تازہ نوائے معارک، ص ۲۷۲-۲۷۳ سے ماخوذ ہے۔

(4) ایضاً۔ ص ۲۷۴۔

سندھ نے حسب معاہدہ وہ چالیس ہزار روپے بھی ادا کر دیے، مگر شجاع الملک موسم گرما کی شدت اور لُو کو بہانہ بنا کر شکارپور سے نہ گیا، بلکہ وہ سامان جنگ و آلات حرب اور پیادہ و سوار فوجیں جمع کرنے لگا۔ میر زنگی خان اور میر جہاں خاں شکارپور میں اس انتظار میں پڑے ہوئے تھے کہ وہ شکارپور سے جائے تو یہ اپنے اپنے مستقر کو واپس لوٹیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ شجاع الملک کسی طرح جانے کا نام ہی نہیں لیتا تو ان کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک و خدشات پیدا ہونے لگے۔ آخر انتظار سے تنگ آکر اور شجاع الملک سے اجازت لے کر یہ دونوں اپنے اپنے مستقر کو واپس ہو گئے۔

سید محمد کاظم شاہ جو اس وقت ناظم شکارپور تھا، وہ بھی شجاع الملک کی خدمت گزاری کے لیے وہاں موجود تھا، وہ تمام انتظامات کو بخوبی انجام دے رہا تھا اور ایسی تدبیریں اختیار کر رہا تھا کہ کسی طرح شجاع الملک خراساں روانہ ہو جائے۔

لیکن شجاع الملک کچھ اور سفر خرچ اور اونٹ باربرداری کے لیے چاہتا تھا، جب یہ مطالبہ میر مراد علی خان کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہلا بھیجا کہ ایسے اونٹ جو خراسان تک سامان لے جا سکیں ملک سندھ میں نہیں۔ اگر آپ سامان کو گاڑیوں میں ڈال کر ملک کچھی میں منزل انداز ہوں تو وہاں بہت سے اونٹ ایسے مل سکیں گے۔

شجاع الملک میر مراد علی خان کا یہ جواب سن کر نہایت حیران ہوا اور سید کاظم شاہ کو جو اس وقت سلام کے لیے حاضر ہوا تھا کہا کہ کبھی سلطنت کا ساز و سامان بھی گاڑیوں پر گیا ہے، آیا یہ باتیں میر مراد علی خان صداقت و خلوص سے کر رہا ہے یا بطورِ مذاق و استہزا کے ایسا کہتا ہے۔ مختصر یہ کہ ڈیڑھ ماہ تک شجاع الملک اور میر مراد علی خان میں اونٹوں اور سفر خرچ پر گفت و شنید ہوتی رہی، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

میر مراد علی خان کی وفات:

اسی زمانے میں ۶ جمادی الثانی ۱۲۴۹ھ[1] (۱۸۳۳ء) میں اچانک میر مراد علی خان والیٔ حیدرآباد نے وفات پائی اور اپنے بھائی میر کرم علی خان کے پہلو میں مقابرِ ٹالپوران میں مدفون ہوا، اس کے مزار پر یہ کتبہ ثبت ہے۔

تاریخ وصال مرحوم مغفور میر مراد علی خان علیہ الرحمۃ ششم جمادی الثانی ۱۲۴۹ھ۔

میر مراد علی کی وفات پر شاہ شجاع ملک کا تاثر:

جب میر مراد علی خان کی وفات کی خبر شاہ شجاع الملک کے اراکین دولت کو ملی تو وہ نہایت غمناک اور اندوہ گیں ہوئے اور اپنے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے کہ مرحوم میر موصوف نہایت ہوشمند، تجربہ کار اور زمانے کے نشیب و فراز کو دیکھے ہوئے تھا اور وقت شناس تھا۔ اب اس کے بیٹے نوجوان ہیں اور زمانے کے سرد و گرم سے ناواقف ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ ہماری سرکار سے کیسے تعلقات قائم کرتے ہیں۔

میر مراد علی خان کی شخصیت:

میر مراد علی خان کی شخصیت بحیثیت مجموعی بہت دلکش شخصیت تھی، وہ خود بھی نہایت سخن سنج، سخن شناس اور صاحب علم و فضل انسان تھا اور علماء، دانشوروں اور ادیبوں کی نہایت قدر افزائی کرتا تھا۔

اس کی تالیف میں اب تک اس کی حسب ذیل تصانیف اور تالیفات کا پتا چل سکا ہے۔

(۱) دیوان فارسی: اس کا ایک نسخہ کتب خانہ ٹالپوری میں موجود ہے۔

(۲) محک خسروی: اس کتاب میں اس نے جنگ سے متعلق متقدم اور متاخر شعرا کے اشعار کو بترتیب قافیہ جمع کیا ہے اور معاصر شعرائے سندھ کی غزلوں کو بھی اس نے جمع کیا ہے، یہ کتاب اس نے ۱۲۳۷ھ (۲۲-۱۸۲۱ء) میں مکمل کی۔

(۳) طب مراد: تصنیف ۱۲۴۶ھ (۳۱-۱۸۳۰ء)۔

اس کی قدر افزائیوں کو دیکھ کر اس دور کے بعض مصنفین نے اپنی کتابیں اس کے نام سے معنون کی تھیں، مثلاً زبدۃ المعاصرین کے مصنف میر حسن الحسینی نے اپنی کتاب کو اسی حکمران کے نام سے معنون کیا تھا۔[2]

---

[1] تاریخ وفات ہم نے تعلیقات تکملہ مقالات الشعرا سے لی ہے، تازہ نوائے معارک میں مراد علی خان کا سنہ وفات ۱۲۴۸ھ درج ہے جو اس لیے صحیح نہیں کہ کتبہ مزار کے خلاف ہے۔

[2] یہ تمام تفصیل تعلیقات تکملہ مقالات الشعرا، مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۷۳۰-۷۳۱ سے ماخوذ ہے۔

میر نور محمد خاں و میر محمد نصیر خاں

۱۲۳۹ھ (۱۸۳۳ء) تا ۱۲۵۵ھ (۱۸۴۰ء)

میر مراد علی خان کی وفات کے بعد ۶ جمادی الثانی ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء) میں اس کا بڑا بیٹا میر نور محمد خان جو اس کا ولی عہد بھی تھا اپنے باپ کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے بھائی میر محمد نصیر خان کو مراسم عزا پرسی اور تہنیت جلوس کامرانی کے لیے مقرر کیا، اس کے علاوہ میر نصیر خان اور میر محمد خان خلف میر غلام علی خان اور میر صوبیدار خان ولد میر فتح علی خاں اپنے اپنے حصوں پر متصرف و قابض تھے۔ ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ القاب سے ملقب تھا، مثلاً میر نور محمد خان "سرکار عالی مدار" کے لقب سے، میر نصیر خان "سرکار فیض آثار" کے لقب سے، میر محمد خاں "سرکار ذوالاقتدار" اور میر صوبیدار خان "سرکار حشمت مدار" کے لقب سے ملقب تھے۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے حصے پر حاکم اور قابض تھا، لیکن مجموعی حیثیت سے ملک کا حاکم میر نور محمد خاں تھا۔[1]

اپنے والد کے انتقال کے بعد دونوں بھائی میر نور محمد خاں و میر نصیر خاں اپنے والد کے مال اور ملک کے ترکے کی تقسیم میں مشغول رہے، اگرچہ یہ دونوں بھائی ذاتی طور پر بھی کافی دولت کے مالک تھے، لیکن باپ کی دولت نے ان کو اور بھی متمول اور دولتمند بنا دیا تھا۔

صاحبِ نوائے معارک کا بیان ہے کہ ایک تو مال و دولت کی کثرت اور دوسرے نشۂ جوانی اور حکمرانی نے ان کو ناعاقبت اندیش بنا دیا تھا۔ اسی وجہ سے ان کے ہمنشین و مصاحب رنگریز، نیل گر، حمال، دلال وغیرہ اراذل لوگ تھے۔

شجاع الملک کے اراکین دولت نے شاہ کی اجازت سے پہلے تو ان دونوں کے والد کی وفات پر ایک تعزیت نامہ لکھا اور قاضی محمد حسن[2] کے ذریعہ سے باتفاق سید محمد کاظم شاہ یہ خط شاہ کے دستخطوں سے خلعت فاخرہ کے ساتھ میرانِ حیدرآباد کو بھجوایا اور زبانی قاضی موصوف سے اخراجاتِ سفر اور اونٹوں کے لیے بھی کہلایا، لیکن میرانِ حیدرآباد کے مشیروں نے میرانِ حیدرآباد کو مشورہ دیا کہ اخراجاتِ سفر اور اونٹوں سے بالکل صاف انکار کر دیا جائے۔ چنانچہ نہ صرف اُنہوں نے صاف جواب دے دیا، بلکہ جواب دینے میں بھی سخت اور درشت لہجہ اختیار کیا۔

شجاع الملک اور اس کے اراکین دولت نے اس پر بھی تحمل و بردباری سے کام لیا، وہ چاہتے تھے کہ فتنہ و فساد کی آگ نہ بھڑکے اور معاملہ صلح و آشتی سے طے ہو جائے، شجاع الملک کے اراکین دولت اسی سعی و کوشش میں مصروف تھے، لیکن میرانِ حیدرآباد نے اُن کے اس طرزِ عمل کو غلط سمجھا اور وہ یہ سمجھے کہ شجاع الملک کے اراکین دولت ہمارے والد کی وفات کے بعد ہمیں طفل مکتب سمجھتے ہیں، اِسی بنا پر ہم سے روپیہ اینٹھنے اور ہمارے ملک پر قبضہ جمانے کی فکر میں ہیں۔ ان کے ذلیل اور سفلہ ہمنشینوں نے انہیں اور بھی چڑھایا، اور اُن سے کہا کہ اگر حضور نے یہ بات مان لی تو بسم اللہ ہی غلط ہو جائے گی۔ آپ کی حکومت کا ابتدائی زمانہ ہے، یہ بادشاہ جو اپنے ساتھ چند ننگے بھوکے ہندوستانیوں اور افغانیوں کو لیے پھرتا ہے، اگر اس وقت آپ نے اس کے معمولی دباؤ میں آکر اس کو اخراجات اور اونٹ دے دیے تو پھر آیندہ آپ حکومت کیسے چلا سکیں گے۔ اگر آپ کی سیاست اور حکومت کا ابھی سے غلط نقش بیٹھ گیا تو ہر شخص کی جرأت بڑھ جائے گی اور یہ ہر کہ ومہ آپ سے مالیے کا مطالبہ کرنے لگے گا۔

میرانِ حیدرآباد نے ان سفلہ ہمنشینوں کی رائے کو صائب سمجھ کر شجاع الملک سے سرکشی اختیار کی اور جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

شاہ شجاع الملک نے ہر چند اُن کو شفقت آمیز نصائح سے بھرپور خطوط لکھے، لیکن انہوں نے ان خطوط کو ذرہ برابر بھی وقعت نہ دی۔ مجبوراً شجاع الملک نے فیصلہ کیا کہ اُسے شکارپور میں ابھی اور قیام کرنا چاہیے۔ اس فیصلے کے بعد اُس نے میرانِ حیدرآباد کو اطلاع دی کہ بعض ضروری امور کی وجہ سے ہماری روانگی فی الحال خراسان نہ ہو سکے گی، البتہ جب ہم ان ضروری امور سے فارغ ہو جائیں گے تو خراسان روانہ ہو جائیں گے۔

میرانِ حیدرآباد کو جب شجاع الملک کا یہ پیغام ملا تو وہ نہایت برہم ہوئے اور انہوں نے مصلحت اس میں دیکھی کہ ابھی شجاع الملک کی فوج بہت کم ہے اور وہ خود پریشان ہے، اس لیے مناسب یہ ہے کہ ہم فوراً لشکر جمع کر کے حملہ آور ہوں اور اُسے شکارپور سے نکال دیں۔ ادھر جب

---

(1) لب تاریخ سندھ، ص ۱۵۱-۱۵۲۔

(2) قاضی محمد حسن: ان کا لقب خان علما تھا۔ یہ شجاع الملک کی طرف سے رنجیت سنگھ کے دربار میں سفیر تھا اور شجاع الملک کا پیش امام بھی رہا۔ قاضی محمد حسن نے ۱۸۳۸ء کے بعد وفات پائی (تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۳۶-۸۳۸)۔

شجاع الملک کو یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ بھی جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔[1]

سید محمد کاظم شاہ جو اس واقعہ کے پیش آنے سے قبل میرانِ حیدرآباد کی طرف سے وکیل کی حیثیت سے شجاع الملک کے لیے قیمتی تحائف اور گھوڑے لے کر روانہ ہو چکا تھا، اُسے اس خبر کی اطلاع خیرپور میں ملی۔ وہ اس خبر کو سُنتے ہی وہیں رک گیا، ہر چند کہ شجاع الملک کے خطوط اُسے خیرپور پہنچے جس میں اُسے ہر طرح کی طمانیت دلائی گئی تھی اور شاہ کی طرف سے لکھا گیا تھا کہ تم بمنزل ہمارے فرزند کے ہو اور تم پر ہماری عنایت بیشمار ہے، جب شکارپور ہمارے قبضے میں آئے گا تو تمہیں ہماری طرف سے شکارپور کا حاکم بنایا جائے گا تمہیں یہاں آنا چاہیے اور کسی قسم کا وہم اپنے دل میں نہ لانا چاہیے کہ وکلا کی تذلیل اور ہتک کسی دین اور آئین میں جائز نہیں۔

لیکن سید محمد کاظم شاہ نے ان تمام خطوط اور ترغیبات کے باوجود خیرپور کو نہ چھوڑا، بلکہ اُس نے اپنے چھوٹے بھائی سید محمد تقی کو جو اُس زمانے میں نیابتِ شکارپور کے عہدے پر مامور تھا اور وہیں ٹھہرا ہوا تھا، خیرپور بلانے کی ٹھانی، چنانچہ رحیم خان کھوسہ کو جس سے اس کی بہت دوستی تھی اس پر متعین کیا کہ وہ اندھیری رات میں جب کسی کو خبر نہ ہو چپکے سے اُسے لے آئے، لیکن سید محمد تقی نے خوف کی وجہ سے اس طرح آنے کو پسند نہیں کیا، بلکہ وہ شجاع الملک سے رخصت حاصل کر کے راتوں رات خیرپور پہنچا اور اپنے بھائی سید محمد کاظم شاہ سے ملاقات کی۔[2]

کارپردازانِ میرانِ سندھ کی شکارپور سے فراری:

آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ میرانِ سندھ کے کارپرداز جو شکارپور میں متعین تھے، ۱۲۴۸ھ (۳۳-۱۸۳۲ء) میں جان کے خوف سے ڈر کر فرار ہو گئے۔ اُس وقت شکارپور اور اُس کے متعلقہ علاقوں کی رعایا شجاع الملک کے پاس حاضر ہوئی اور انہوں نے شاہ شجاع الملک سے عرض کیا کہ میرانِ سندھ کے مقرر کردہ عہدہ دار خود بخود ملک چھوڑ کر فرار ہو چکے ہیں۔ اس وقت سارا ملک حاکموں سے خالی ہے۔ اُس زمانے میں جب کہ یہ عہدہ دار موجود تھے اُس وقت بھی رہزن اور ڈاکو ہم غریبوں کو لوٹتے رہتے تھے، اب جب کہ ملک عہدہ داروں سے خالی ہے تو ان لوگوں نے لوٹ مار میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے، شب و روز لوٹ مار مچائے ہوئے ہیں، جب تک حضور انتظام نہ فرمائیں گے اور غریب رعایا کی حفاظت اور نگہبانی نہ کی جائے گی ہمیں بلوچ لوٹتے رہیں گے۔

رعایا کی اس درخواست کے بعد شجاع الملک نے ملک کی حفاظت کے لیے تمام علاقۂ شکارپور میں اپنے آدمی مقرر کر دیے، شجاع الملک کے کارپردازوں نے اپنے اپنے متعینہ علاقوں میں رعایا کو تسلی اور تشفی دی کہ وہ فرار نہ ہوں اور اطمینان سے اپنے گھروں میں رہیں۔[3]

میرانِ سندھ کا غم و غصہ:

میرانِ سندھ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کے تمام کارپرداز اور عہدہ دار شکارپور کا علاقہ چھوڑ کر فرار ہو چکے ہیں، تو ان کے غم و غصے کی کوئی انتہا نہ رہی، سب سے پہلے میرانِ خیرپور نے کچھ لشکر جمع کیا اور میر مبارک خان اور میر زنگی خان کی سرکردگی میں یہ لشکر وارد روہڑی ہوا۔ ان دونوں نے لشکر کو حکم دیا کہ وہ دریا کو عبور کر کے سکھر میں منزل انداز ہوں، پھر وہ باہم آپس میں مل کر سوچنے لگے کہ کس تدبیر سے شجاع الملک کو شکارپور سے نکالا جائے۔

فقیر عالم خان مری جو ایک عرصے تک شکارپور کی حکومت پر رہا تھا اور وہاں کی حکومت کا لطف اُٹھا چکا تھا اور اس کے دل میں اس دور حکومت کی یاد کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ وہ بھی اپنے بیٹے جہان خاں اور لشکر کے ساتھ دریا کو عبور کر کے واردِ سکھر ہوا، یہ سب مل کر شکارپور کے حصول کے دم بہ دم نعرے لگاتے تھے، دوسرے روز فقیر عالم خاں مری سکھر سے سوار ہو کر رعایا کی تاخت و تاراج کے لیے روانہ ہوا، پہلے اس نے جعفر آباد اور قریہ آباد[4] وغیرہ میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔[5]

حاجی ہدایت اللہ جو شجاع الملک کی طرف سے محال گوسرجی پر مامور تھا، اس خبر کے سنتے ہی گوسرجی سے چند سواروں کے ساتھ مری کے مقابلے کے لیے آیا، اس نے پہلے مری کو ہدایت دی کہ وہ فتنہ و فساد سے باز آجائے لیکن مری نے اس کی ہدایت کی بالکل پروا نہ کی، بلکہ فتنہ و فساد کی آگ کو اور بھڑکایا، اگرچہ مری مذکور کے پاس کثیر لشکر تھا اور

---

(1) یہ تمام تفصیل تازہ نوائے معارک، ص ۲۸۰-۲۸۴ سے ماخوذ ہے۔

(2) یہ تمام تفصیل تازہ نوائے معارک، ص ۲۸۴-۲۸۷ سے ماخوذ ہے۔

(3) تازہ نوائے معارک، ص ۲۸۸-۲۸۹۔

(4) جعفر آباد و قریہ آباد: یہ دونوں گاؤں پانچ میل کے اندر سکھر سے شکارپور جانے والی سڑک پر واقع ہیں۔

(5) تازہ نوائے معارک، ص ۲۸۹-۲۹۰۔

حاجی ہدایت اللہ خاں کے پاس کچھ سوار تھے، لیکن اس نے میدانِ کارزار سے منہ نہیں موڑا اور مقابلے کے لیے نکلا اور نہایت ثابت قدمی اور استقلال سے مقابلہ کیا۔ اتفاق سے ایک بندوق کی گولی عالم خاں مری کو لگی اور وہ مارا گیا۔ اس کے بعد عالم خاں مری کا بیٹا جہان خان اپنے باپ کے مارے جانے سے غضبناک ہو کر میدانِ جنگ میں نکلا، اور مست ہاتھی کی طرح اس نے حاجی ہدایت اللہ کو بندوق کے وار سے مار ڈالا۔ سردار کے مارے جانے سے اس کے پیادہ اور سوار منتشر ہو گئے، جہان خاں مری نے حاجی ہدایت اللہ خاں کا سر کاٹ کر اسے جھنڈے پر چڑھایا اور بے رحمی کے ساتھ اس کے سر کو ٹھوکریں لگائیں اور اس کی داڑھی پر تھوکا، وہ جوشِ غضب میں بادشاہ کے انتقام کو بالکل بھولے ہوئے تھا۔[1]

شجاع الملک کا غصہ:

۱۲۴۸ھ (۳۳-۱۸۳۲ء) میں جب حاجی ہدایت اللہ خان امیر کبیر شجاع الملک، جہان خاں مری کے ہاتھ سے مارا گیا تو یہ خبر سن کر شجاع الملک اور اس کے اراکین دولت نہایت غضبناک ہوئے، شجاع الملک نے سمندر خان کو تین ہزار سوار اور پیادہ فوج اور سات توپ بردار کشتیاں دے کر حکم دیا کہ میران خیرپور نے ہمارے ادب کو بالکل ملحوظ نہیں رکھا، اس لیے اب ہم مجبور ہیں۔ لہٰذا تم میرانِ خیرپور کے لشکر کے مقابلے کے لیے جاؤ اور ہمت و شجاعت سے مقابلہ کرو۔

ادھر میرانِ خیرپور میں عالم خاں مری کے مارے جانے کی وجہ سے آتشِ غضب و انتقام بھڑک اُٹھی۔ بلوچ سرداروں کی ایک جماعت جو محبت خاں مری، دھنگانہ خاں مری، جلال خاں مری[2] اور جلبانی[3] اور باکرانی[4] قبائل کے لوگوں پر مشتمل تھی، اس کے علاوہ میر رستم خاں اور سید میاں غلام مرتضیٰ شاہ بھی ان میں شامل تھے، یہ سب میر علی مراد خاں کی اجازت سے انتقام لینے کے لیے اس شان سے روہڑی پہنچے کہ ٹالپوری ٹوپیاں اپنے سروں پر ٹیڑھی رکھے ہوئے اور مونچھوں پر تاؤ دیے ہوئے تھے۔ انہوں نے دریا کو عبور کیا اور سکھر پہنچ کر رعایائے سکھر پر وہ مظالم توڑے کہ جو حدِ تحریر سے باہر ہیں، یہاں تک کہ انہوں نے وہاں کے مشہور بزرگ حضرت شاہ خیر الدین علیہ الرحمۃ کی درگاہ[5] کے ادب کو بھی ملحوظ نہیں رکھا۔ یہ بیان صاحب تازہ نوائے معارک کا ہے، جو شاہ شجاع کا منشی تھا، ہمارا خیال ہے کہ اس نے اس معاملے میں مبالغے سے اور جنبہ داری سے کام لیا ہے، چونکہ میرانِ سندھ نہایت علم دوست اور علما و صوفیائے کرام کے بے حد عقیدت مند تھے، یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ شاہ خیر الدین جیسے جلیل القدر بزرگ کی درگاہ کے ادب و احترام کو ملحوظ نہ رکھتے۔ منشی عطا محمد کی اصل عبارت یہ ہے کہ: امیران خیرپور۔۔۔ مع جمعیت لشکر موفورہ۔۔۔ عبور دریا نمودہ در مقام سکھر رسیدہ دست ظلم بتخریب رعایای سکھر از تکالیف مالا یطاق دراز نمودند و ادب درگاہ فیض پناہ حضرت شاہ خیر الدین علیہ الرحمۃ مرعی نداشتند۔ ممکن ہے کہ اس کا مقصد یہ ہو کہ اس شہر میں حضرت کی درگاہ کے موجود ہوتے ہوئے بھی میرانِ سندھ نے اس شہر کی رعایا پر مظالم کیے اور اُس نے ان مظالم کو درگاہ کی بے ادبی سے تعبیر کر دیا ہو۔

تازہ نوائے معارک کے مؤلف کے متعلق آقائے حبیبی نے اپنے مقدمے میں لکھا کہ یہ شخص حالات کے لکھنے میں راست گو اور غیر جانبدار نظر آتا ہے اگرچہ اُس نے ایک انگریز مسٹر استویک کی خواہش پر یہ کتاب لکھی، لیکن انگریزوں کی لشکر کشی میں ان کی تعریف و طرفداری نہیں کی اور یہی رویہ اس نے سندھ اور افغانستان کے لوگوں کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ اُسے ایک منصف اور عفیف مورخ کہہ سکتے ہیں۔

سید محمد کاظم شاہ جو اس زمانے میں خیرپور میں مقیم تھا، اس نے ہر چند اس فتنہ و فساد کو فرو کرنے اور شجاع الملک اور میرانِ خیرپور میں صلح و اتحاد کے پیدا کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن ناکامی ہوئی۔ آخر اُس نے میرانِ خیرپور سے اپنے شکارپور جانے یا نہ جانے کے متعلق مشورہ کیا، لیکن میرانِ خیرپور نے میرانِ حیدرآباد کے عتاب کے ڈر سے اُس کو یہ جواب دیا کہ ہم اس معاملے میں تمہیں کچھ مشورہ نہیں دے سکتے کہ تم خیرپور میں رہو یا جاؤ، بالکلیہ تم اپنی مرضی کے مختار ہو۔[6]

---

(1) یہ تفصیل نوائے معارک، ص ۲۹۰-۲۹۱ سے ماخوذ ہے۔

(2) مری: بلوچوں کا ایک قبیلہ ہے جو بالائی سندھ اور بلوچستان میں آباد ہے۔

(3) جلبانی و باکرانی: یہ بھی بلوچوں کے دو قبیلے ہیں اور بالائی سندھ میں آباد ہیں۔

(4) ایضاً۔

(5) مزار حضرت شاہ خیر الدین: یہ درگاہ سکھر کہنہ میں واقع ہے اور اس کا گنبد آسمانی رنگ کا ہے۔ شاہ خیر الدین ۸۹۸ھ (۱۴۹۲ء) میں پیدا ہوئے اور علوم دینیہ کی تعلیم بغداد سے حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سندھ تشریف لائے اور بلڑی میں سکونت اختیار کی، کچھ مدت کے بعد سکھر میں منتقل ہو گئے اور اپنی وفات تک اسی شہر میں رشد و ہدایت میں مصروف رہے۔ ان کا خاندان اب تک سکھر میں موجود ہے۔ تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۷۹-۸۸۰)۔

(6) تازہ نوائے معارک، ص ۲۹۴-۲۹۵۔

سید محمد کاظم شاہ اسی کشمکش میں تھا کہ چند دن کے بعد اُسے میرانِ حیدرآباد کی طرف سے پروانہ وصول ہوا، جس میں لکھا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرانِ خیرپور کے دستر خوان کے پُر تکلف کھانوں کے مزے تمہیں خیرپور سے نکلنے نہیں دیتے، اب تمہیں چاہیے کہ تم فوراً خیرپور سے لاڑکانہ روانہ ہو کر بہادر خان کھوکھر سے جا کر ملو۔

جب سید محمد کاظم شاہ کو یہ حکم ملا تو اگرچہ یہ حکم اس کو نہایت ناپسند تھا اور اپنے نوجوان میروں کی عقل و دانش پر اُسے افسوس آتا تھا، لیکن تعمیل حکم کے لیے وہ مجبور تھا، آخر وہ مجبور ہو کر خیرپور سے لاڑکانہ روانہ ہوا، اور اس کی پہلی منزل ٹنڈو لقمان خان[1] میں ہوئی اور اسی رات کو عالم خان مری کے مارے جانے کی خبر خیرپور میں پہنچی، سارے شہر میں آہ و بکا کا بازار گرم ہو گیا اور خیرپور کے ہر کوچہ و بازار میں بلوچوں کی تگ و دو شروع ہو گئی، جو سندھی میں یہ نعرہ لگاتے تھے۔ ٹھہرو عنقریب ہم بھی ایسا ہی کریں گے اور تمہارے شجاع کو نہ چھوڑیں گے۔

صبح کو سید محمد کاظم شاہ اپنے سفر کا ارادہ موقوف کر کے اس خبر کی صحت کے معلوم کرنے کے لیے واپس خیرپور آیا اور میر رستم خان کے سلام سے مشرف ہوا، اور اس نے اُن سے کہا کہ جب سکھر میں یہ گڑبڑ ہو رہی ہے، تو ایسی صورت میں میر الاڑکانہ جانا کیسے ممکن ہے۔ ابھی میر رستم خان اُسے کوئی جواب بھی دینے نہ پایا تھا کہ وہ اچانک اٹھا اور بغیر اپنا جواب سنے میر رستم خان کو خدا حافظ کہہ کر اپنے بھائی سید محمد تقی کے ساتھ سکھر روانہ ہو گیا۔ منشی عطا محمد شکارپوری صاحبِ تازہ نوائے معارک کا بیان ہے کہ اُس نے مجھ سے بھی بے حد اصرار کیا کہ میں بھی اُس کے ساتھ چلوں، لیکن میں نے اُسے جواب دیا کہ عقلا نے ہر کپڑے کو جسم کے اندازے کے مطابق سیا ہے اور ہر ہنر کی انگوٹھی اُس اہل ہنر کے ذوق کے مطابق اس کی انگلی میں پہنائی ہے۔ باز کا کام بطخ انجام نہیں دے سکتی اور نہ طوطی کی خوش آواز کوّے سے ممکن ہے۔ میرا کام قلم چلانا ہے، اور یہ میدان شمشیر زنی کا ہے، میرے لیے قلم کی سریر آرائی کافی ہے۔ میری رائے میں ناحق مسلمانوں کی خوں ریزی کسی حالت میں بھی جائز نہیں، اگر یہ جہاد کی صورت ہوتی تو اس کی شرکت میں کوئی مضائقہ نہ تھا، اس جنگ میں بے سود مارے جانے سے سوائے خسر الدنیا والآخرۃ کے کچھ حاصل نہیں۔ میں اس سے یہ کہہ کر اپنے وطن شکارپور کی طرف روانہ ہو گیا، باوجود کہ اُس کے بھائی سید محمد تقی نے بھی اُسے روکنے کی انتہائی کوشش کی، لیکن اُس نے اس کی بات کو بھی ان سنا کر دیا اور روہڑی کی جانب روانہ ہو گیا۔ جب یہ شہر سے باہر نکلے تو اس نے دیکھا کہ لوگ مری خاں کے جنازے کو لیے چلے آ رہے ہیں۔ سید محمد کاظم شاہ نے اس کو اپنے لیے شگونِ بد سمجھا، اور ایک شال اُس کے جنازے پر ڈال کر اپنے دل میں طرح طرح کے وساوس لیے ہوئے روہڑی پہنچا اور وہاں سے وہ اور اس کے ساتھی بلا تاخیر دریا کو عبور کر کے سکھر پہنچے۔ صاحبِ نوائے معارک کا بیان ہے کہ میرانِ سندھ کا یہ لشکر جس نے کبھی باہر والوں سے جنگ نہ کی تھی اور اُن کی شمشیر زنی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنی تلوار کو کتے، بلی، مرغ اور بکری کے جھگڑوں پر آپس ہی میں خود اُٹھایا تھا۔ وہ اپنی غلط شجاعت اور بہادری کے نشے میں مست اور سرشار ہو کر اپنی زبان سے نازیبا کلمات نکال رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ شجاع الملک کی فوج میں اکثر فلاکت زدہ پیادے اور کچھ سوار ہوں گے، جنہیں شکست دے کر ہم شکارپور میں داخل ہو جائیں گے اور بادشاہ، وزرا اور اُمرا کو اسیر و دستگیر کر کے شکارپور میں خوب لوٹ مار مچائیں گے اور وہاں سے مال غنیمت زر و زیورات ہاتھیوں پر لاد کر لائیں گے اور شکارپور کو دشمنوں سے اس طرح صاف کریں گے کہ پھر دوبارہ کسی کو اس طرف رخ کرنے کی جرأت نہ ہو گی۔ لیکن تقدیر اُن کی اس خام خیالی پر ہنس رہی تھی۔[2]

جنگ کھرڑی:

آخر ۱۲۴۹ھ (۳۴-۱۸۳۳ء) میں میرانِ خیرپور اور شاہ شجاع کے درمیاں جنگ ہوئی۔ یہ جنگ کھرڑی کے نام سے موسوم ہے شاہ شجاع نے اپنے لشکر کا سپہ سالار سمندر خان کو مقرر کیا اور سوار و پیادوں کا لشکر جس کی تعداد تین ہزار تھی اور سات توپ بردار کشتیاں اس کے ساتھ روانہ کیں۔ یہ لشکر شکارپور سے ہر روز تین چار کوس کی منزلیں طے کرتا ہوا سات آٹھ دن میں جعفر آباد پہنچا۔[3]

میرانِ خیرپور کا لشکر جو کثیر تعداد میں تھا "نالہ لالہ و آہ" میں جو سکھر کے متصل ہے، دشمن کی گھات میں چھپ کر بیٹھا۔

---

(1) ٹنڈو لقمان خاں، یہ خیرپور کے شمال میں بالکل خیرپور کے متصل واقع ہے، اس کی آبادی ۱۵۰۰ نفوس پر مشتمل ہے، ۱۷۷۵ء میں اس کی بنیاد لقمان خان ٹالپور نے رکھی تھی (گزیٹر سندھ، ص ۸۳۵)۔

(2) یہ تمام تفصیل تازہ نوائے معارک، ص ۲۹۵-۲۹۹ سے ماخوذ ہے۔

(3) جعفر آباد: یہ گاؤں سکھر سے چار میل اس طرف شکارپور سے سکھر جانے والی سڑک پر واقع ہے۔

سمندر خان جو میرانِ سندھ کے طریقہ جنگ سے واقف تھا، سکھر کی سڑک سے بالکل نہیں ہٹا۔ اس نے میرانِ سندھ کے لشکر سے آدھ کوس کے فاصلے پر اپنے لشکر کے ڈیرے جمائے اور اپنا جھنڈا درختوں پر نصب کیا پھر وہاں اس نے تھوڑا سا لشکر چھوڑ کر طبل جنگ بجانے والوں کو حکم دیا کہ وہ طبل جنگ بجائیں اور خود وہاں کے واقف کاروں کی رہنمائی میں کچھ سوار اور پیادے اور دو توپیں لے کر نہایت خفیہ طریقے پر کہ دشمن کو بالکل معلوم نہ ہو سکے کوہ آدم شاہ[1] پر چڑھا، اور یکبارگی میرانِ سندھ کے لشکر پر اس پہاڑی سے حملہ کر دیا۔ میرانِ سندھ کا لشکر دریا کے کنارے خیمے ڈالے ہوئے غافل پڑا تھا اور انہیں توقع تھی کہ اس طرف سے حملہ ہو گا۔ جدھر شجاع الملک کے لشکر کا جھنڈا درخت پر نصب ہے اور جدھر سے طبل جنگ کی آوازیں آ رہی ہیں۔ لیکن اچانک "کوہ آدم شاہ" سے حملہ ہونے پر اور توپوں کی آواز سن کر میرانِ سندھ کا لشکر حیران رہ گیا، چونکہ انہوں نے کوہ آدم شاہ کی طرف سے کسی مدافعت کا انتظام نہ کیا تھا، اس لیے انہوں نے گھبرا کر بغیر کسی نظم وضبط کے کوہ آدم شاہ کا رخ کیا۔[2]

غلام مرتضیٰ شاہ اور سید محمد کاظم شاہ کی شہادت:

میرانِ سندھ کے لشکر میں میاں غلام مرتضیٰ شاہ نہایت شجیع اور بہادر انسان تھا، وہ اسلحہ سے آراستہ ہو کر اپنے دستے کے ساتھ میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوا اور اپنے رفقا اور دوستوں سے کہہ کر گیا کہ ان مٹھی بھر چڑیوں کو جو پہاڑ پر جمع ہوئی ہیں، ان کو ابھی بھگا کر مظفر اور منصور اور کامیاب ہو کر واپس آتا ہوں۔

سید محمد کاظم نے جب یہ دیکھا کہ اس کا قدیم اور مخلص دوست بغیر غور وفکر کے فیصلہ کیے ہوئے میدانِ جنگ کی طرف چلا جا رہا ہے، تو اسے نہایت افسوس ہوا، وہ شجاع الملک کے لشکر کی قوت کو جانتا تھا، لیکن کچھ بول نہ سکتا تھا۔ اس کے لیے موقع نہ تھا کہ وہ اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر اسے روک لے، ورنہ شاید وہ اس سے بھی دریغ نہ کرتا۔ آخر اس کو جاتا دیکھ کر وہ بھی جانے پر مجبور ہوا اور یہ شعر پڑھتا ہوا:

سخن درست بگویم، نمی تواند دید
کہ می خورند حریفان و من نظارہ کنم

گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے دوست کے ساتھ میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے سید غلام مرتضیٰ شاہ سے آگے بڑھ کر اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے اور شجاع الملک کے چند لشکریوں کو موت کے گھاٹ اُتار کر خود بھی گولی سے زخم کھا کر وفات پائی۔[3]

اس کے بعد سید غلام مرتضیٰ شاہ برہنہ تلوار ہاتھ میں لے کر نکلا، لیکن ابھی وہ کسی سے مقابل نہ ہوا تھا کہ اچانک ایک گولی اس کو لگی اور زمین پر آ رہا۔ عالم نزع میں اس نے ایک آہ سرد بھر کر کہا کہ مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں ہلاک ہو گیا، اور ایک غدار سے بھی مقابلہ نہ کر سکا۔[4]

اس کے بعد شجاع الملک کے پیادوں میں سے ایک روہیلے نے اس کا سر قلم کر کے اس کا قیمتی لباس اس کے جسم سے اُتار لیا اور اس کے تمام ہتھیار لے لیے، اس کے بعد دریا خان نظامانی جو میرانِ حیدرآباد کے وزیر خاص کا ملازم تھا، میدانِ جنگ میں آیا، لیکن سمندر خان کا بھتیجا اس کی طرف گھوڑا دوڑا کر لپکا اور تلوار کے ایک ہی وار میں اس کا خاتمہ کر دیا اور اس کی بہترین تلوار لے لی، پھر جہان خاں مری بلوچوں کی رسم کے مطابق اس شان سے نکلا کہ پچاس ساٹھ بلوچوں کے پیراہن کے دامن ایک دوسرے سے بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے شجاع الملک کے بہت سے لشکریوں کو کیفر کردار تک پہنچایا اور نہایت شجاعت و بہادری سے ان کا مقابلہ کیا، یہ مقابلے میں جما ہی تھا اور معرکہ کارزار گرم تھا کہ بلوچوں نے ایک غلطی یہ کی کہ گھوڑوں سے اُتر کر پا پیادہ ننگی تلواریں لے کر پہاڑی کی طرف دوڑے لیکن یہ پہاڑی پر پہنچ نہ سکے۔ شجاع الملک کے لشکریوں نے انہیں پہاڑی کی طرف آتا دیکھ کر بندوقوں اور تیروں کی بارش شروع کر دی۔ جس کے نتیجے میں بہت سے بلوچ مارے گئے۔[5]

ادھر فتح محمد خان غوری وزیر، میر رستم خان، محبت خان مری وغیرہ جو "نالہ لالہ وآہ" میں چھپے ہوئے تھے، انہوں نے سر نکال کر یہ بھی نہ دیکھا کہ ان کے لشکر پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ گھمسان کی لڑائی کے وقت زمین پر پڑے ہوئے تھے اور سانس بھی نہیں لیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے لشکر میں امن چین ہے۔

شجاع الملک کے لشکر کے تمام سوار خراسانی اور پیادے روہیلے اور

---

[1] کوہ آدم شاہ: سکھر سے مشرقی جانب ایک چھوٹی سی پہاڑی بنام کوہ آدم شاہ موجود ہے۔ آدم شاہ کلہوڑوں کا مورث اعلیٰ تھا، وہ ایک جنگ میں شہید ہوا۔ اور اس کے مریدوں نے اس کو اسی پہاڑی پر دفن کیا۔

[2] تازہ نوائے معارک، ص ۳۰۰-۳۰۱۔

[3] تازہ نوائے معارک، ص ۳۰۳۔

[4] تازہ نوائے معارک، ص ۳۰۴۔

[5] یہ تمام تفصیل تازہ نوائے معارک، ص ۳۰۳ تا ۳۰۵ سے ماخوذ ہے۔

ہندوستانی تھے، جو سب کے سب ہتھیار بند تھے، انہوں نے بلوچ مقتولوں کے سونے اور چاندی کو دیکھ کر خوب لوٹا، جس بلوچ کو وہ مارتے تھے بے رحمی سے اس کا سر قلم کرتے اور لاش کو زمین پر پھینک دیتے۔[1]

میرانِ سندھ کے شجاع اور بہادر سرداروں کے مارے جانے کے بعد بلوچوں کے لشکر میں بد دلی پیدا ہو گئی اور انہوں نے اپنے میں تاب مقاومت نہ پا کر دریا کے راستے سے راہ فرار اختیار کی۔ جیسے ہی اس بقیہ لشکر کے افراد شکست کھا کر دریا کے کنارے کشتیوں میں بیٹھنے کے لیے پہنچے، اس وقت میر مبارک خان اور میر جنگی خان جو میرانِ سندھ کے حکم سے روہڑی ہی میں ٹھہرے ہوئے تھے، جب انہیں اپنے لشکر کی شکست کی خبر ملی تو انہوں نے نہایت برہم ہو کر حکم دیا کہ کشتیاں گھاٹ پر روک دی جائیں اور لشکر کے کسی بلوچ کو دریا عبور نہ کرنے دیا جائے۔

اب میرانِ سندھ کا شکست خوردہ لشکر دو مصیبتوں میں مبتلا ہو گیا۔ ایک طرف تو سمندر خان کا لشکر ان کا تعاقب کر رہا تھا، دوسری طرف کشتیوں کی مسدودی نے ان کے لیے فرار کا کوئی راستہ باقی نہ رکھا تھا، جب وہ آتش جنگ سے گھبرا کر دریا کی طرف آتے تھے اور کشتیوں کو نہ پاتے تو وہ سمندر خان کے لشکر کی تعاقب کے وجہ سے دریا میں غرق ہونے کو ترجیح دیتے۔ اگر سکھر کی طرف واپس جاتے تو سمندر خان کے سپاہیوں کی تلواریں اُن کو موت کے گھاٹ اُتار دیتیں۔ اس لیے اکثر بلوچ لشکریوں نے دریا میں غرق ہو کر جان دینا پسند کیا۔ ان کے ہوش و حواس اس قدر غائب تھے کہ بعض بلوچ دریا میں کھڑے ہونے کے باوجود پانی پانی پکار رہے تھے اور حواس باختگی کی وجہ سے باوجود اس کے کہ پانی میں کھڑے ہوئے تھے، پانی کو نہیں دیکھتے تھے، بعض بلوچ ملاحوں کی خوشامد کرتے تھے کہ وہ انہیں دریا کے پار اُتار دیں، بعض بلوچ دریا کو گھوڑے کی دُم پکڑ کر عبور کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور دریا کے بیچ میں پہنچ کر غرق ہو جاتے تھے۔ غرضیکہ ایک افراتفری اور سراسیمگی میران سندھ کے لشکر میں پھیلی ہوئی تھی۔[2]

جب میر مبارک خان اور میر جنگی خان نے پورے طور پر اندازہ کر لیا کہ اُن کا لشکر سمندر خان کے لشکر کے مقابلے میں بالکل ٹھہر نہیں سکتا اور بے دریغ دریا میں غرق ہو رہا ہے، تو انہوں نے مجبوراً ملاحوں کو حکم دیا کہ وہ ان کے لشکر کو دریا پار کرائیں۔ چنانچہ باقی ماندہ لشکر نواب احمد خان لغاری کے ساتھ جو میاں غلام مرتضیٰ شاہ اور سید محمد کاظم شاہ کا دوست تھا دریا کو عبور کر کے بکھر کے قلعے کے نیچے کھرڑی میں فروکش ہوا، اور اپنے مقتولین پر حسرت سے ہاتھ ملنے لگے۔ فتح محمد خان غوری اور محبت خان مری جو نالہ لالہ و آہ میں چھپے ہوئے تھے، اس ہزیمت کے بعد نالے سے نکلے، اور ادھر اُدھر دیکھتے، ڈرتے کانپتے، اُفتاں و خیزاں بڑی مشکل سے دریا تک پہنچے اور کشتی میں سوار ہو کر روہڑی آئے، اور اس پر خدا کا شکر بجالائے کہ اُنہیں نئی زندگی ملی۔

سمندر خان اس فتح و فیروزی پر نہایت خوش ہوا اور اُس نے اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ دیے اور بلند آواز سے کہا کہ میدانِ جنگ دشمنوں سے صاف ہو چکا ہے اور اگر اب بھی کسی میں مقابلے کی ہمت ہو تو بسم اللہ ہمیں گوی و ہمیں میدان[3]۔ لیکن اس کے اس رجز پر بھی کسی نے مقابلے کی جرأت نہ کی، اور انہوں نے اس شکست کے بدلے کو میرانِ سندھ کے مشورے اور تدبیر پر موقوف رکھا۔[4]

سمندر خان کی روانگی:

سمندر خان اس فتح و کامیابی کے بعد شکارپور پہنچا اور آداب بندگی بجالا کر مال غنیمت سے لدے ہوئے ہاتھی شجاع الملک کے سامنے پیش کیے۔ شجاع الملک نے اُسے انعام و اکرام اور خلعت فاخرہ سے نوازا۔

شجاع الملک کے لشکریوں نے بلوچوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کے ساتھ ساتھ لوٹ مار کر کے اُن کے مال و دولت سے بھی خوب ہاتھ رنگے تھے وہ ٹالپوری زربفت و کمخواب کی ٹوپیاں ٹیڑھی سر پر رکھ کر اور کاشان کی چادریں اور لاڑ کی رنگین لوئیاں اپنے کندھوں پر ڈال کر اور طلائی و نقرئی مرصع تلواریں اپنے پہلو میں لٹکا کر دف بجا بجا کر بلوچوں کا مذاق اُڑاتے تھے۔

میرانِ سندھ کی مقابلے کے لیے مدیجی میں آمد:

اس شکست کے بعد ماہ صفر ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء) میرانِ خیرپور کی شکست کی خبر سن کر میرانِ حیدرآباد بے قرار ہو گئے اور اسلحہ جمع کرنے اور جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ جنگی تیاریاں کر لینے کے بعد وہ شجاع الملک کا مقابلہ کرنے کے لیے طوفان کی طرح اپنے لشکر کے ساتھ

---

(1) تازہ نوائے معارک، ص ۳۰۵-۳۰۶۔

(2) تازہ نوائے معارک، ص ۳۰۶-۳۰۷۔

(3) ایضاً۔ ص ۳۰۸-۳۰۹۔

(4) ایضاً۔ ص ۳۱۰۔

حیدرآباد سے روانہ ہو کر لاڑکانہ میں منزل انداز ہوئے۔ یہیں میرانِ خیرپور بھی اپنے لشکر کے ساتھ اُن سے آکر مل گئے۔

شجاع الملک کو میرانِ سندھ کی جنگی تیاریوں کی مختلف خبریں پہنچ رہی تھیں۔ شجاع الملک نے بھی چار ہزار سوار اور پیادوں کا لشکر مرتب کیا، اور آٹھ توپ بردار کشتیاں ساتھ لے کر "باغ شاہزادہ" سے روانہ ہو کر شکارپور کے متصل جانب جنوب باغ شاہی میں ٹھہرا۔

میرانِ سندھ لاڑکانہ سے روانہ ہو کر دریا کے کنارے کنارے سفر کی منزلیں طے کرتے ہوئے موضع مدیجی[1] میں مقیم ہوئے اور چند کشتیاں بھی دریائی راستے سے اپنے ساتھ لے کر آئے، تاکہ اگر خدانخواستہ شکست رونما ہو تو وہ اُن پر بیٹھ کر فرار ہو سکیں۔

مدیجی میں پہنچنے کے بعد میرانِ سندھ نے شجاع الملک سے مراسلت شروع کی اور پیر میاں نظام الدین اور پیر محی الدین سرہندی کو اپنا قاصد بنا کر شجاع الملک کے پاس بھیجا۔ پیر صاحبان نے شجاع الملک کو میرانِ سندھ کی جانب سے صلح کی تلقین کی، شجاع الملک نے پیر صاحبان کی بات مان کر شریف خان ضبط بیگی اور قاضی محمد حسن کو پیر صاحبان کے مشورے سے میرانِ سندھ کے پاس بھیجا۔ میرانِ سندھ نے اپنی حکمت عملی کی بنا پر ان دونوں سے کچھ شکوہ و شکایت اور کچھ اظہار خلوص و محبت کی باتیں کیں اور اپنی جانب سے صلح و صفائی کا یقین دلانے کے لیے اپنے ایک امید کبیر کھوکھر خان کو شجاع الملک کے پاس روانہ کیا، کھوکھر خان سے سمندر خان کے بے حد دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ سمندر خان کے توسط سے شجاع الملک تک پہنچا اور نہایت حسن تدبیر سے اس نے میرانِ سندھ کی جانب سے شجاع الملک کو اس بات پر راضی کر لیا کہ میرانِ سندھ باربرداری کے لیے پانسو اونٹ اور چار لاکھ روپے نقد بعوض اخراجات اور ایک لاکھ روپیہ بعوض ناف مالی[2] پیش کریں گے اور کھوکر خان ایک سو سواروں کے دستے کے ساتھ قندھار تک شجاع الملک کے ساتھ حاضر رہے گا۔[3]

شجاع الملک کی خراساں کو روانگی اور دوبارہ سندھ میں آمد:

اسی عہد و پیمان کے بعد شجاع الملک ماہ صفر ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء) میں حسب معاہدہ اونٹ اور روپے لے کر خراساں روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد میرانِ حیدرآباد، حیدرآباد اور میرانِ خیرپور، خیرپور واپس لوٹ گئے۔[4]

شجاع الملک نے قندھار پہنچ کر وہاں کے سرداروں اور امیر دوست محمد خان سے شکست کھائی اور وہ لودھیانہ جانے کے خیال سے واپس لوٹا، جب وہ گنجابہ پہنچا اور دوبارہ لشکر جمع کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ یہیں سمندر خان نے سیوی سے آکر اُس سے ملاقات کی اور یہ دونوں مل کر لشکر جمع کرنے کی فکر کرنے لگے۔ لیکن اتفاق یہ ہے کہ سمندر خان[5] اسی زمانے میں سخت بیمار ہوا اور وہ بیماری سے مجبور ہو کر سیوی واپس ہو گیا اور وہیں اُس نے وفات پائی۔

شجاع الملک کو جب اس کی وفات کی خبر ملی تو وہ نہایت غمگین اور ملول ہوا اور لشکر جمع کرنے کا ارادہ فسخ کر کے اُس نے سندھ کا رخ کیا، اور منزلیں طے کرتا ہوا روجھان[6] پہنچا۔[7]

جس زمانے میں کہ شجاع الملک روجھان میں مقیم تھا، سید محمد تقی ناظم شکارپور برادر سید محمد کاظم شاہ کے دماغ میں ایک نیا سودا سمایا اور وہ شجاع الملک سے اپنے بھائی سید محمد کاظم شاہ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے جو جنگ کھرڑی میں مارا گیا تھا، شکارپور سے کچھ ترک اور افغان سوار لے کر روجھان روانہ ہوا۔[8]

سید محمد تقی جب جاگن[9] نامی گاؤں میں پہنچا تو وہاں اُسے معلوم ہوا کہ شجاع الملک فوراً ہی روجھان سے لاڑکانہ روانہ ہو رہا ہے۔

اس خبر کے سنتے ہی سید محمد تقی نے شاہ کے تعاقب میں جاگن سے لاڑکانہ کا رخ کیا، لیکن راستے میں اس کے بخل کی وجہ سے اس کا لشکر بھوکوں مرنے لگا۔ موسم سرما اور بھوک کی مصیبت اُٹھاتے ہوئے آدھی رات کو یہ لشکر لاڑکانہ پہنچا، لیکن بے سود، کیونکہ ان میں شجاع الملک سے لڑنے کی طاقت ہی نہ تھی، لہٰذا سید محمد تقی ناکام ہو کر شکارپور واپس ہوا۔[10]

---

[1] مدیجی: تعلقہ نوشہرو میں نہر گھاڑ کے کنارے شکارپور سے جنوب میں ۳۰ میل دور اور لاڑکانہ سے ۲۶ میل دور واقع ہے۔

[2] ناف مالی: ایک قسم کا خراج جو اس نام سے وصول کیا جاتا تھا۔

[3] تازہ نوائے معارک، ص ۳۱۶-۳۲۱۔

[4] ایضاً۔ ص ۳۱۹۔

[5] سمندر خاں: وفات: وسط سال ۱۲۵۰ھ (۳۵-۱۸۳۴ء)۔

[6] روجھان: دریائے سندھ کے دائیں کنارے شکارپور سے سو میل کے فاصلے پر شمال مشرق میں واقع ہے۔

[7] تازہ نوائے معارک، ص ۳۴۳۔

[8] تازہ نوائے معارک۔ ص ۳۴۵۔

[9] جاگن: یہ موضع شکارپور سے شمال مغرب میں ۱۲ میل پر ہے۔

[10] تازہ نوائے معارک، ص ۳۴۵-۳۵۰۔

شجاع الملک اور لاڑکانہ کے مختار کار کی گفتگو:

جس زمانے میں کہ شجاع الملک لاڑکانہ پہنچا، اُس وقت وہاں کا مختار کار سید محمد کاظم شاہ کا والد میر اسماعیل شاہ تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے مارے جانے کی وجہ سے شجاع الملک سے نہایت ترش روئی سے پیش آیا اور مہمانداری کے مراسم بھی بجانہ لایا۔

ہر چند کہ شجاع الملک کے اراکین دولت نے اُس سے کہلایا کہ تمہارے فرزند سید محمد کاظم شاہ کے مارے جانے سے شاہ بھی نہایت ناخوش ہیں، باوجود کہ شاہ نے اس کو متعدد مرتبہ لکھا کہ تم بمنزل ہمارے فرزند کے ہو، تم ہمارے پاس آجاؤ اگر ملک شکارپور ہمارے قبضے میں آئے گا تو ہم تمہیں حاکم بنائیں گے، لیکن اس تمام لکھنے کے باوجود تمہارا فرزند نہیں آیا اور وہ میرانِ خیرپور کے لشکر سے ملا رہا، یہاں تک کہ وہ خود اپنے ہاتھوں ہلاک ہوا، اس لیے ہم سے ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں، خود کردہ را علاجے نیست، تقدیر الٰہی یہی تھی۔ تمہاری ہم سے ترش روئی اور ناراضگی بالکل بے وجہ ہے۔[1]

اس کے بعد میر اسماعیل شاہ جو کہ ذی ہوش اور دانا انسان تھا، اس بات کو معقول جان کر خاموش ہو گیا اور اس نے ایک خط کے ذریعہ سے شجاع الملک کے آنے کی اطلاع میرانِ حیدرآباد کو دی، جن سے وہ متعلق تھا۔[2]

میرانِ حیدرآباد کو جب یہ اطلاع ملی کہ شجاع الملک لاڑکانہ آچکا ہے اُنہوں نے اُسی وقت مختار کار لاڑکانہ کو پروانہ لکھا کہ وہ شجاع الملک کا شاندار استقبال کرے اور لوازم مہمانداری بجالائے اور ہماری طرف سے شجاع الملک سے حیدرآباد آنے کی استدعا کرے اور اُسے حکم دیا کہ وہ حیدرآباد کے سفر میں خود بھی شاہ کے ساتھ رہے۔[3]

شجاع الملک کی حیدرآباد میں آمد:

چنانچہ جب شجاع الملک حیدرآباد پہنچا تو میرانِ حیدرآباد نے اُس کی تعظیم و توقیر اور مہمانداری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ چند دن تک شجاع الملک حیدرآباد میں رہا، اس کے اراکین دولت نے میرانِ حیدرآباد کو عند الملاقات وہ باتیں جنہیں وہ اُن کی فلاح و بہبود کے لیے بہتر سمجھتے تھے سمجھائیں اور اُن سے کہا کہ کسی صورت میں بھی وہ شجاع الملک سے نہ توڑیں، صرف شکارپور اور قلعہ بکھر شجاع الملک کو دے دیں کہ اُس کے آس پاس رہنے میں خود میرانِ سندھ کا بھی فائدہ ہے۔

میرانِ سندھ نے ان سب باتوں کے جواب میں اُن سے کہا کہ مصلحت وقت کا تقاضا یہ ہے کہ فی الوقت سرکار اشرف لدھیانہ تشریف لے جائیں۔ چند ماہ کے بعد ہم اس امر پر غور و خوض کر کے جو کچھ بھی فیصلہ ہو گا، اس سے سرکار اشرف کو مطلع کریں گے۔

اس کے بعد میرانِ سندھ نے شجاع الملک کو اس پر راضی کر کے بہت سے تحفے تحائف، خیمے، ایک ہاتھی اور چند ہزار روپے نقد سفر خرچ کے طور پر پیش کئے اور اپنے چند امیروں کو مقرر کیا کہ وہ اس کو ان کی سرحد تک نہایت خیر و خوبی سے پہنچا کر آئیں، چنانچہ شجاع الملک منزلیں طے کرتا ہوا براہ جیسلمیر ۱۷ ذیقعدہ ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) کو لدھیانہ پہنچا اور وہیں مقیم ہو گیا۔[4]

شجاع الملک کا خط میرانِ سندھ کے نام:

دو تین سال کے بعد ۱۲۵۱ھ (۳۶-۱۸۳۵ء) میں شجاع الملک نے اپنے وکلا کے ہاتھ میرانِ حیدرآباد کو اپنے خاص دستخطوں سے ایک خط روانہ کیا، جس میں لکھا کہ: تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم باہمی مشورہ کر کے ہمیں چند ماہ میں بلا لوگے، لیکن اس کو تین سال گزر چکے اور تم لوگوں کا مشورہ ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔ عجیب مشورہ ہے کہ جس کا اتنی طویل مدت گزر جانے پر بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہمیں ہر طرح تمہاری فلاح و بہبود مقصود ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ریاست سندھ کا شیرازہ منتشر نہ ہو، لیکن تمہیں دوست و دشمن کی کوئی تمیز نہیں، خواب غفلت میں پڑے ہو، جب تمہارے سر کے نیچے سے تکیہ نکل جائے گا، اس وقت آنکھ کھلے گی اور ادھر اُدھر دیکھوگے کہ تمہارے سر کے نیچے سے تکیہ کس نے کھینچ لیا ہے۔ ہمارا تمہارے قرب و جوار میں رہنا تمہارے لیے آرام دہ تکیے کی مانند ہے، تم اپنے معاندین سے خواہ وہ کوئی بھی ہوں ہمیشہ امان اور آرام میں رہوگے اور ہمارے ہوتے ہوئے کوئی ملک سندھ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے گا اور روز بروز سندھ غیر معمولی ترقی کرے گا، تم سے جو ہم نے قلعۂ بکھر اور صرف شکارپور کا

---

(1) ایضاً۔ ص ۳۵۱-۳۵۲۔

(2) ایضاً۔ ص ۳۵۲۔

(3) تازہ نوائے معارک، ص ۳۵۲-۳۵۳۔

(4) ایضاً۔ ص ۳۵۳-۳۵۴۔

مطالبہ کیا ہے، یہ کوئی زرخیز علاقہ نہیں، بکھر کا مطالبہ صرف اس لیے ہے کہ ہماری حرم محترم اس میں رہ سکیں، اور شکارپور کے لینے سے غرض یہ ہے کہ دورانِ قیام میں ہمارے اخراجات چل سکیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا بدبختی اور ادبار ہے کہ اس معاملے کی اہمیت تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ بہرحال تم جانو، مگر یہ خوب یاد رکھو کہ کچھ دن کے بعد اگر تم نے یہ نہ مانا تو سخت شرمندہ ہو کر دست تاسف ملو گے۔ لیکن میرانِ حیدرآباد نے اس خط کی بالکل پروانہ کی، بلکہ جواب میں ادھر اُدھر کی باتیں لکھ کر اور قاصدوں سے میٹھی میٹھی باتیں بنا کر اُنہیں رخصت کر دیا۔[1]

انگریزوں کی ریشہ دوانیاں:

شجاع الملک اپنا سب کچھ جنگ قندھار میں غارت کر چکا تھا اور اس کے ہزاروں آدمی مارے جا چکے تھے، لیکن اس کے باوجود خراسان کے فتح کرنے کا سودا اس کے دماغ میں سمایا ہوا تھا، لہٰذا اس نے میرانِ سندھ سے مایوس ہو کر خراسان کو حاصل کرنے کے لیے انگریزوں سے گٹھ جوڑ شروع کی۔ انگریز اپنے مفاد کی خاطر اس کے لیے تیار ہو گئے۔

چنانچہ گورنر جنرل ہند لارڈ آکلینڈ[2] نے آواخر نومبر ۱۸۳۹ء کو جغرافائی اور دریائی تجارت کی تحقیقات کے لیے برنس کی سرکردگی میں ایک وفد مقرر کیا، جس کے اراکین میں لفٹننٹ رابرٹ لیچ[3] انجینئر لشکر بمبئی، لفٹیننٹ جان وڈ بحریہ ہند کا ایک عہدہ دار اور ڈاکٹر پرسیول[4] تھے، بظاہر یہ وفد سندھ کی اراضی اور بحری تجارت کی تحقیقات کے لیے اور شمالی ہندوستان، افغانستان، بخارا اور ایران کی سیاحت کے لیے مقرر کیا گیا تھا، لیکن انگریزوں کے اس وفد سے سیاسی مقاصد یہ تھے کہ وہ کابل اور خراسان کے راستوں کا فوجی نقطۂ نظر سے جائزہ لیں۔

چنانچہ یہ وفد ۱۲۵۲ھ (۳۷-۱۸۳۶ء) میں شکارپور اور سندھ پہنچا اور اس وفد نے تھوڑے ہی دنوں میں اندازہ لگا لیا کہ سندھ کی حکومت کی بنیاد ریت پر کھڑی ہے اور باد مخالف کا ایک جھونکا اُسے متزلزل کر سکتا ہے۔[5]

سندھیوں کا انگریزوں سے اجنبیت کا یہ عالم تھا کہ جب یہ وفد شکارپور پہنچا، تو شکارپور کے لوگ ٹھٹ کے ٹھٹ اُن کو دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ اسکندر برنس اپنے خیمے سے باہر نکل کر از راہ تمسخر اُن سے کہتا کہ آؤ آؤ، ہماری دُم اور سینگوں کو دیکھو، لوگ اس کی اس بات پر ہنستے تھے، اور بعض اُس سے کہتے کہ تمہاری دُم اتنی لمبی ہے کہ انگلستان تک پہنچتی ہے اور تمہارے سینگ اتنے دراز ہیں کہ وہ خراسان سے جا ملیں گے۔ وہ خود بھی لوگوں کی ان باتوں پر ہنستا۔ غرضیکہ چند یوم کے بعد یہ وفد دریائی راستے سے بحری راستے کا جائزہ لیتے ہوئے ڈیرہ جات اور باغبان روانہ ہو گیا اور وہاں سے پشاور کے راستے سے کابل پہنچا اور امیر دوست محمد خان سے ملاقات کی، ان ملاقاتوں میں اس وفد نے کوشش کی کہ شجاع الملک اور رنجیت سنگھ اور امیر دوست محمد خان کے بگڑے ہوئے تعلقات استوار ہو جائیں اور طرح طرح کی محبت آمیز باتیں اس سے کیں، لیکن امیر دوست محمد خان نے مطلقاً ان باتوں کی طرف توجہ نہ دی۔ جب انگریزوں کا یہ وفد مایوس ہو گیا اور انہوں نے دیکھ لیا کہ اُن کی دال کسی طرح نہیں گلتی، تو انہوں نے خفیہ طور پر امیر دوست محمد خان کے خوانین سے مل کر اور انہیں روپے پیسے کا لالچ دے کر اپنی راہیں ہموار کیں اور انہیں جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ روپے سے امیر دوست محمد خان کے خوانین اور اُمرائے کابل کو شجاع الملک کے لیے ہموار کیا جا سکتا ہے۔[6]

یہ تمام معلومات اور انتظام کر کے اسکندر برنس اس وفد کے ساتھ کابل سے براہ پشاور لدھیانہ لوٹا۔

---

(1) یہ تمام تفصیل تازہ نوائے معارک، ص ۳۵۶-۳۵۸ سے ماخوذ ہے۔

(2) لارڈ آکلینڈ: (۱۷۷۴-۱۸۴۹ء) گورنر جنرل ہند، اس کا نام جارج ایڈن آکلینڈ تھا اور یہ لارڈ آکلینڈ اول کا دوسرا بیٹا تھا، جو ۲۵ اگست ۱۷۷۴ء میں پیدا ہوا، کرسٹ چرچ آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی اور مختلف خدمات انجام دینے کے بعد ۱۴ اپریل ۱۸۳۶ء کو ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا، اسی نے شجاع الملک کو امیر دوست محمد خان کی جگہ دوبارہ تخت کابل پر بٹھایا، اور ۱۸۴۱ء تک شجاع الملک حکومت کرتا رہا۔ لارڈ آکلینڈ نے یکم جنوری ۱۸۴۹ء کو انتقال کیا (تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۹۳-۸۹۴)۔

(3) رابرٹ لیچ: یہ فن تعمیر کا بہت بڑا ماہر انجنیئر تھا، اس نے اس مہم میں نمایاں کارنامے انجام دیے، اور کافی معلومات حاصل کیں۔ یہ قلات میں بھی رہا تھا، اور اس نے ایک کتاب بنام تاریخ "قلات" لکھی ہے۔ (تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۹۰)۔

(4) ڈاکٹر پرسیول: پرسیول بارٹن لارڈ، یہ جان لارڈ کا بیٹا تھا۔ یہ ۱۸۰۸ء میں پیدا ہوا اور ڈبلن میں طب کی تعلیم حاصل کی، اور ۱۸۳۲ء میں بمبئی میں بحیثیت ڈاکٹر کے مقرر ہوا، جب امیر دوست خان اور انگریزوں کی لڑائی پروان میں ہوئی تو یہ اس جنگ میں ۲ نومبر ۱۸۴۰ء کو مارا گیا۔ (تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۹۰۴-۹۰۵)۔

(5) تازہ نوائے معارک، ص ۳۶۲-۳۶۳۔

(6) تازہ نوائے معارک۔ ص ۳۶۰-۳۶۲۔

ادھر رابرٹ لیچ اسی مشن پر کابل سے قندھار پہنچا اور اس نے اپنے مقاصد کے تحت وہاں کے سرداروں کو اپنے مقاصد کے لیے بہت ہموار کرنا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی، پھر اُس نے ان سے مایوس ہو کر اُمرائے خوانین قندھار کو جنگ زرگری سے ہموار کیا، چنانچہ حاجی خان کاکری وغیرہ کو روپے پیسے کا لالچ دے کر اپنی راہ پر لے آیا، پھر اُس نے یہاں سے فارغ ہو کر امیر محراب خاں[1] والیٔ قلاتِ سے ملاقات کی اور اسے بہت سا روپیہ دے کر اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ انگریزی فوجوں کو کچھی، دادھر اور شال کوٹ سے گزرنے کی اجازت دے دے گا۔

میرانِ سندھ کو اپنی راہ پر لانے کی کوشش:

پوٹنجر[2] اسی مقصد کے لیے میرانِ حیدرآباد کے پاس پہنچا اور نہایت ہوشیاری اور تدبر سے نرم و گرم باتیں کر کے اس نے انہیں اس پر راضی کر لیا کہ وہ نہ صرف انگریزی فوجوں کو اپنے علاقے سے گزرنے دیں گے بلکہ فوجی سامان بھی اپنے علاقے کے خشکی اور دریائی راستے سے جانے دیں گے، میر محراب خان اور میرانِ سندھ دونوں کے دونوں اپنی اس ناعاقبت اندیشی سے ناواقف تھے کہ اس کا انجام کتنا خطرناک ہو گا۔[3]

انگریزی فوجوں کی نقل و حرکت:

سکندر برنس نے لدھیانہ پہنچ کر خراساں کے تمام حالات کی رپورٹ شجاع الملک کو دی اور پھر یہ سب جنگی سامان اور فوج کی فراہمی میں مصروف ہو گئے۔[4]

۳ نومبر ۱۸۳۹ء (۲۵ شعبان ۱۲۵۵ھ) انگریزوں کی فوج شاہجہان آباد سے روانہ ہوئی۔ ابھی اس نے تین منزلیں ہی طے کی تھیں کہ انگریزوں کے اس لشکر میں ہیضے اور طاعون کی وبا پھوٹ پڑی۔ تقریباً پانسو لشکری اس مہلک بیماری میں مرے۔ یہ ہزار دقت و خرابی یہ فوج فیروزپور میں داخل ہوئی۔[5]

اسی اثنا میں لارڈ آکلینڈ بھی سولھویں رجمنٹ، ساتویں رجمنٹ، جو گوروں پر مشتمل تھی۔ تیسرا رسالہ جو گورہ سواروں پر مشتمل تھا، کالوں کا دوسرا رسالہ، بائیسویں پلٹن اور چھ توپ خانہ، ان کے علاوہ چوتھا رسالہ جس میں سپہ سالار کمانڈرن چیف جنرل فین بھی تھا، کو لے کر فیروزپور آیا۔

اسی زمانے میں مہاراجا رنجیت سنگھ والیٔ لاہور اور اس کا بیٹا کھڑک سنگھ مع تیس ہزار مسلم فوج کے ساتھ جو کیل کانٹے سے بالکل لیس تھی، لارڈ آکلینڈ کی ملاقات کے لیے آکر دریا کے کنارے لنگر انداز ہوا۔

رنجیت سنگھ نے لارڈ آکلینڈ سے ملاقات کرنے کے بعد پلٹن کے ہر آدمی میں ایک ایک روپیہ تقسیم کیا، اس کے علاوہ سات خوش رنگ ولائتی گھوڑے طلائی ساز و سامان کے ساتھ، ایک ہاتھی مع ہودج کے جس پر سونا چاندی منڈھا ہوا تھا اور دوسرے نفیس تحائف لارڈ آکلینڈ کو پیش کیے۔ لارڈ آکلینڈ نے بھی اسے دو گنگا جمنی توپیں عنایت کیں۔[6]

اس کے بعد کمانڈرن چیف چوتھی پلٹن اور توپ خانہ فیروزپور میں چھوڑا اور باقی تمام فوج لے کر شجاع الملک کے ساتھ بہاولپور پہنچا اور سر کلوڈیڈ شاہزادہ محمد تیمور کے ساتھ انگریزی افواج اور رنجیت سنگھ کی آٹھ پلٹنیں لے کر درۂ خیبر روانہ ہوا۔[7]

انگریزی فوج کی بہاولپور میں آمد:

جب لارڈ آکلینڈ انگریزی فوج اور شجاع الملک کے ساتھ ۲۹ دسمبر ۱۸۳۸ء کو بہاولپور کے علاقے میں داخل ہوا تو والیٔ بہاولپور نے ان کے لیے پہلے ہی سے سڑکیں صاف اور درست کرائی تھیں اور راستے کے جھاڑ جھنکاڑ کٹوا کر اس کا بھی انتظام کیا کہ رہزن اور ڈاکو راہ میں کسی قسم کی لوٹ مار نہ مچا سکیں۔

منشی عطا محمد شکارپوری کا بیان ہے کہ والیٔ بہاولپور نے اس فوج کے لیے اتنا اہتمام کیا تھا کہ ہر قسم کا غلہ اور آٹے کی ہزاروں بوریاں اور شکر سفید، گڑ، گھی، چاول، بکرے، انڈے، مرغ اور مرغیاں ہزاروں کی تعداد میں مہیا کیے۔ فوج جو چیز طلب کرتی تھی، اس کو ملتی تھی، نواب

---

(1) محراب خاں والیٔ قلات: ۱۱۲۸ھ میں اپنے باپ کے بعد تخت نشین ہوا اور شاہزادہ معزالدین حکمران ملتان سے درۂ موورہ میں جو جنگ ہوئی تھی، ایک کاری زخم لگنے سے تین روز کے بعد مر گیا (تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۸۲)۔

(2) پوٹنجر: سرہنری پوٹنجر: ولادت ۱۳ اکتوبر ۱۷۸۹ء، بحریہ ہند میں ملازمت ۱۸۱۰ پھر ۱۸۰۸ء میں سندھ بھیجا گیا، اس کے بعد اس نے متعدد خدمات انجام دیں۔ ۱۸۲۹ء میں پھر سندھ بھیجا گیا۔ ۱۸۳۱ء میں یہ انگریزوں کا سندھ میں سفیر مقرر ہوا۔ ۱۸ مارچ ۱۸۵۶ء میں مرا۔ اس کی ایک کتاب سفر بلوچستان و سندھ کے نام سے ہے (تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۹۲)۔

(3) تازہ نوائے معارک، ص ۳۶۳۔

(4) تازہ نوائے معارک، ص ۳۶۵۔

(5) ایضاً۔ ص ۳۶۵-۳۶۶۔

(6) ایضاً۔ ص ۳۶۸۔

(7) تازہ نوائے معارک، ص ۳۶۹۔

بہاول خان کا بیٹا، اس انگریزی فوج کے استقبال کے لیے دو منزل گیا اور کمانڈرن چیف پر ایک سو اشرفیاں نچھاور کیں۔ کمانڈرن چیف بھی اس سے نہایت مہربانی کے ساتھ پیش آیا، اس طرح وہ ان کو لے کر بہاولپور میں داخل ہوا، دو روز تک انگریزی فوج نے بہاولپور میں قیام کیا۔ پھر وہاں سے فوج احمد پور[1] آئی۔[2]

انگریزی فوج کی روہڑی میں آمد:

۲۴ جنوری ۱۸۳۹ء کو یہ فوج احمد پور سے روانہ ہو کر روہڑی میں داخل ہوئی اور دریائے سندھ کے کنارے خیمہ زن ہوئی۔

اسکندر برنس کی والیٔ خیر پور سے ملاقات:

انگریزی فوج کے خیر پور پہنچنے سے پہلے لارڈ اسکندر برنس خیر پور جا کر میر رستم خان والیٔ خیر پور سے ملا، اور اپنے خلوص کا یقین دلا کر اس نے میر رستم خان کو اس طرح رام کیا کہ اس نے انگریزی فوج کے قلعہ بکھر سے گزرنے اور دریا پر پُل بنانے کی اجازت دے دی۔

انگریزوں کے دریا پر پُل بنانے کے چند مقاصد تھے، جن میں سے ایک مقصد یہ تھا کہ ہر خاص و عام کو خراساں تک معلوم ہو جائے کہ ہندوستان اور بمبئی سے اس قدر فوج آئی ہے کہ بغیر پُل کے اس کا عبور کرنا مشکل ہے۔ دوسرا یہ کہ اتنے بڑے دریا پر پل بنانا کوئی آسان کام نہیں، جب یہ پل بن جائے گا، تو لوگ اس کو دیکھ کر محو حیرت ہوں گے۔ تیسرا یہ کہ اس حیلے سے انگریزوں کا مقصد قلعہ بکھر پر قبضہ کر لینا تھا اور میرانِ خیر پور ان کی چال بازیوں سے ناواقف تھے۔[3]

عروج بارک زئی میں ہے کہ اس پُل کو کپتان ٹامسن اور بنگال کے دوسرے انجنیئروں نے بنایا تھا، اور ۳ فروری ۱۸۳۹ء کو انگریزی فوج نے اس پُل پر سے عبور کیا۔[4]

ادھر رابرٹ لیچ شکار پور میں فوج کا سامان مثلاً گجاوے اور صندوق وغیرہ بنوانے میں مصروف تھا، اس نے وہاں فوج کے پڑاؤ کے لیے دروازہ ہزاری اور ہاتھی[5] کے باہر نہر رالیس واہ[6] کے متصل دو کوس کا جنگل کٹوا کر صاف کرایا اور اس کام پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا، جس سے لوگ حیران تھے۔

قلعہ بکھر پر انگریزوں کا قبضہ:

کچھ دن کے بعد ولیم مکناٹن مع فوج اور توپ خانے کے حدود خیر پور میں داخل ہوا۔ میرانِ خیر پور کی طرف سے اُس کے استقبال کے لیے نفیس تحائف کے ساتھ میر زنگی خاں اور فتح علی خاں غوری کو مامور کیا گیا تھا۔ یہ مکناٹن سے ملے، اور میرانِ خیر پور کی جانب سے نفیس تحائف پیش کیے، سپہ سالار کمانڈرن چیف وغیرہ روہڑی میں دریائے سندھ کے کنارے خیمہ زن تھے اور میر رستم خان والیٔ خیر پور ہیر لو میں جو روہڑی سے چار کوس کے فاصلے پر ہے، بلوچوں کے لشکر کے ساتھ مقیم تھا۔ یہیں لارڈ نے اپنے دو سرداروں اور پچاس سواروں کے ساتھ میر رستم خان سے ملاقات کی اور میر رستم خان کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے شیشے میں اُتارا اور اس کو مرعوب کرنے کے لیے اپنے لشکر میں لے کر آیا۔ انگریزی فوج کے کمانڈرن چیف نے صبح ہی سے اپنی فوج کو مسلح اور مرتب کر رکھا تھا۔ میر رستم خان ان فوجی تیاریوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک گھنٹے کی ملاقات کے بعد انگریزوں نے اس کا اندازہ لگا لیا کہ وہ تاب مقاومت نہیں رکھتا۔ میر رستم خان نے حالات کا رخ دیکھ کر قلعہ بکھر کو خالی کر دیا اور انگریزوں نے اس پر قبضہ کر کے دو توپیں، چار کشتیاں اور ان کشتیوں پر کچھ سوار فوج قلعے میں بھیج دی اور قلعے پر اپنا جھنڈا لہرا دیا اور اس قلعے کو سامان رسد کے رکھنے کے لیے اپنا مرکز بنایا۔

میرانِ خیر پور قلعہ بکھر پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کی وجہ سے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہے تھے، لیکن زبان پر کوئی حرف شکایت نہیں لا سکتے تھے۔ انگریزوں نے میروں کے اس تکدر کو محسوس کر کے فوراً ہی اس کے مداوا کی فکر کی اور ایک لاکھ روپیہ فتح محمد خان غوری وزیر میر رستم خان والیٔ خیر پور کو اس وجہ سے دے کر کہ وہ مہم خراساں کے لیے میر رستم خان کی دل جوئی ضروری سمجھتے تھے، اُن کے زخموں پر مرہم رکھ کر ان کو راضی کر لیا۔[7]

---

(1) احمد پور: بہاولپور کے جنوب مغرب میں ۳۴ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

(2) تازہ نوائے معارک، ص ۳۷۰۔

(3) تازہ نوائے معارک، ص ۳۷۲۔

(4) عروج بارک زئی، ترجمہ فارسی عبد الرحمٰن پڑواک، ص ۱۷۰۔

(5) دروازہ ہزاری و ہاتھی: شکار پور شہر کے آٹھ دروازے تھے، ان میں سے دروازہ ہزاری اور دروازہ ہاتھی مشہور ہیں۔

(6) نہر رالیس واہ: شکار پور میں دریائے سندھ سے دو نہریں نکلتی ہیں، ایک جنوب سے اس کا نام چوتاداری ہے اور دوسری شمال سے اس کا نام رالیس واہ ہے۔

(7) یہ تمام تفصیل تازہ نوائے معارک، ص ۳۷۳-۳۷۶ سے ماخوذ ہے۔

انگریزی فوج کی بمبئی سے کراچی میں آمد:

۱۲۵۵ھ (۴۰-۱۸۳۹ء) میں انگریزی فوج سر جان کین، جنرل ویلشائر اور اوٹرام کی سرکردگی میں، رسالے، گوروں اور تلنگوں کی پلٹن، توپ خانہ کے ساتھ بمبئی سے کراچی پہنچی اور کراچی سے ٹھٹھہ میں داخل ہوئی۔ میر شیر محمد خان والی میرپور نے انگریزوں کی آمد کی خبر سن کر ان کے مقابلے کے لیے بلوچوں کے لشکر کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا، اس معاملے میں حیدرآباد کے حکمران میر صوبدار خان اور میر محمد خان بھی اس کے ساتھ تھے۔ ان سب نے مل کر اتنا بڑا لشکر جمع کیا تھا کہ اس کا کوئی شمار نہ تھا۔ یہ جنگ کے نعرے لگا رہے تھے، سوائے میر نور محمد خان کے جو اُن کا ہمنوا نہ تھا باقی میرانِ حیدرآباد سب کے سب اس مہم میں شریک تھے۔ اس لشکر نے سب سے پہلے انگریزوں کے گودام کو لوٹ لیا، جو چھاؤنی میں تھا۔ انگریزوں کی یہ چھاؤنی حیدرآباد سے تین میل کے فاصلے پر دریائے سندھ کے کنارے پر واقع تھی جسے بلوچی لشکر نے ۱۵ فروری ۱۸۴۳ء کو لوٹا تھا۔[1]

اس ہنگامے نے سندھ میں تفرقے کی آگ کو بھڑکا دیا۔ ولیم مکناٹن جو شکارپور میں ٹھہرا ہوا تھا، جب اسے اس واقعے کی اطلاع ملی تو اس نے اُسی وقت دیوان جیٹھ مل کو جو میرانِ حیدرآباد کی طرف سے شکارپور کی نظامت کے عہدے پر فائز تھا، اُسے تحریری طور پر مطلع کیا کہ سرکار انگلشیہ کو اس وقت خراساں کی مہم درپیش ہے۔ اس موقع پر میرانِ سندھ کے لیے موزوں نہیں کہ وہ انگریزی فوج کے ساتھ جنگ میں مشغول ہوں۔ اگر انہوں نے اس کے بعد گڑبڑ بندنہ کی تو پہلے ہم ان سے نمٹیں گے اور بعد میں خراساں کا رخ کریں گے اور انہیں ان کے کیے کا مزہ چکھائیں گے۔ پھر اُس نے کمانڈرن چیف اور برنس وغیرہ کو جو دریائے سندھ کے کنارے روہڑی میں پڑے ہوئے تھے حکم دیا کہ وہ فوراً حیدرآباد روانہ ہو جائیں۔ ادھر دیوان جیٹھ مل نے بھی ایک عرضداشت لکھ کر جس میں وہ سب باتیں تھیں جو ولیم مکناٹن نے اُس سے کہی تھیں، ایک چھوٹی کشتی میں اپنے معتبر آدمی کے ہاتھ میرانِ حیدرآباد کو بھجوائی۔[2]

میر نور محمد خان کی صلح وصفائی کی کوشش:

میر نور محمد خان جو شروع ہی سے اس مہم سے علیحدہ تھا جب اُسے دیوان جیٹھ مل کی یہ عرضداشت ملی تو اس نے میر شیر محمد خان کو اس جنگ سے روکا اور اس بات کو رفع دفع کرنے کی کوشش کی اور چوبیس لاکھ روپے اس نقصان کے عوض میں جو انگریزوں کی چھاؤنی اور گودام کے لٹنے سے انگریزوں کو پہنچا تھا بطور تاوان بھجوائے اور اس طرح اُس نے انگریزوں کو راضی کر لیا۔[3]

ادھر انگریزی فوج کا سپہ سالار جب روہڑی سے روانہ ہو کر ہالہ کنڈی میں داخل ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ میر شیر محمد خان سے صلح ہو چکی ہے، اس لیے وہ وہیں سے روہڑی واپس ہو گیا اور دریائے سندھ کا پُل عبور کر کے شکارپور پہنچا اور جنرل ویلشائر[4]، سر جان کین اور اٹرام وغیرہ لشکر اور لڑائی کے ساز و سامان کے ساتھ براہ سیوستان لاڑکانہ میں داخل ہوئے اور وہاں سے براہ جھل اور طنبو[5] خراساں روانہ ہو گئے۔ اور شجاع الملک، ولیم مکناٹن، سپہ سالار کمانڈرن چیف اور اسکندر برنس وغیرہ شکارپور سے فوج اور اسلحہ حرب کے ساتھ خراساں روانہ ہوئے۔

جیکب آباد کے قلعے پر انگریزوں کا قبضہ:

جب انگریزی فوج خان گڑھ کے قریب پہنچی، جو آج کل جیکب آباد کہلاتا ہے تو جیکب آباد کے قلعے سے گولوں کے برسنے اور بندوقوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اس میں ایک گولہ دوسری کمپنی کے سپہ سالار کو لگا، وہ اسی وقت مر گیا، پوسٹن جو ایک انگریز فوجی عہدہ دار تھا، اس نے اس قلعے کی فتح کا ارادہ کیا اور کچھ فوج اور چار توپیں لے کر اس نے قلعے کا

---

(1) اس سن میں کچھ غلط معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ انگریزی چھاؤنی کو لوٹنے کا واقعہ ۱۸۴۳ء کا ہے (حاشیہ ۴، تازہ نوائے معارک ص ۳۷۸)

(2) تازہ نوائے معارک، ص ۳۷۷-۳۷۹۔

(3) ایضاً۔ ص ۳۷۹-۳۸۰۔

(4) ویلشائر (۱۷۸۹-۱۸۶۲ء) سر توماس ویلشائر فرزند کیپٹن جان ویلشائر ۲۴ اگست ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوا اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۳۸ رجمنٹ برطانیہ میں ملازم ہو کر اس نے جنوبی امریکا، پرتگال اور نیوزیلینڈ میں خدمات انجام دیں۔ ۱۸۲۶ء میں ہندوستان بھیجا گیا۔ ۱۸۲۷ء میں یہ لفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر مقرر ہوا، اور ۱۸۳۹ء میں اس نے ایک ڈویژن فوج کی سپہ سالاری کی جو بمبئی سے غزنی اور کابل کو فتح کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ واپسی میں اس نے ۱۲ نومبر ۱۸۳۹ء کو قلات بلوچستان پر قبضہ کر لیا، جس کی وجہ سے KCB کے مرتبے تک پہنچا۔ ۳۱ مئی ۱۸۶۲ء کو اس کا انتقال ہوا۔ (تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۹۸۔)

(5) جھل و طنبو: جھل سرزمین کچھی میں واقع ہے اور لاشاری اور گمسی قبائل کا مسکن ہے اور طنبو بھی کچھی میں واقع ہے اور عمرانی قبائل کے بلوچ وہاں رہتے ہیں۔ (حاشیہ نمبر ۵، نوائے معارک، ص ۳۸۰ بحوالہ تاریخ بلوچستان، ص ۳۱۳-۳۱۵)۔

رخ کیا اور پچاس گولے مار کر اس قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس لڑائی میں چھ آدمی انگریزی فوج کے اور آٹھ آدمی بلوچوں کے جو قلعے کے اندر تھے مارے گئے۔ قلعہ فتح کرنے کے بعد، رات کو انگریزی لشکر اس میں ٹھہرا، اور صبح کو وہاں سے انگریزی فوج نے کوچ کیا۔ چونکہ انگریزی فوج کی داستان قندھار و کابل ہمارے موضوع سے باہر ہے، اس لیے مختصراً اہم تسلسل باقی رکھنے کے لیے اتنا اشارہ ضروری سمجھتے ہیں کہ انگریزی فوج نے حاجی کاکر کی نمک حرامی کی وجہ سے بغیر کسی لڑائی کے قندھار فتح کر لیا۔ قندھار کے بعد اس فوج نے غزنی کے قلعہ کو فتح کیا، اور امیر دوست محمد خان کے بیٹے غلام حیدر خان کو جو وہاں کا حاکم تھا گرفتار کر لیا۔ فتح غزنی کے بعد اس فوج نے کابل کا رخ کیا اور یہاں بھی خوانین کی نمک حرامی اور دغابازی کی وجہ سے امیر دوست محمد خان حاکم کابل کو بلخ اور بخارا بھاگنا پڑا اور انگریزوں نے یکم جمادی الثانی ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں کابل فتح کر لیا، کابل فتح کرنے کے بعد شہر کے باہر انگریزوں نے اپنی چھاؤنی بنا کر اس میں اقامت اختیار کی۔ برنس شہر میں سرائے نواب امین الملک میں مقیم ہوا، ایک ماہ کے بعد انگریزی فوج کے افسروں نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ بمبئی کی فوج جس راہ سے آئی تھی، اسی راہ سے واپس ہو، کیونکہ راستے میں ان کا ارادہ قلات پر بھی قبضہ جمانے کا تھا، اس لیے جنرل ویلشائر حاجی کاکر کو اپنے ہمراہ لے کر کچھ فوج اور سامان حرب کے ساتھ براہ پشاور روانہ ہوا، اس نے راستے میں دو تین ہزار فوج اور چند توپوں کے ساتھ قلات پر حملہ کیا اور وہاں کے والی محراب خاں[1] کو شہید کر کے ملا رحیم داد اور محمد حسن[2] کو زندہ گرفتار کر لیا۔ سات روز تک انگریزی فوج قلات کو لوٹتی رہی، اس کے علاوہ بارہ لاکھ روپے نقد اور جواہرات خزانہ شاہی سے لیے اور قلات پر قبضہ کر لیا۔[3]

راس نیبل کا ایجنٹی سندھ پر اور ٹامس پوسٹن کا کلکٹری شکارپور پر تقرر:

اسی زمانے میں راس نیبل انگریزوں کی طرف سے سندھ کا ایجنٹ مقرر ہو کر شکارپور آیا۔ اس کے آنے کے بعد ولیم ایسٹوک ولایت چلا گیا اور ٹامسن پوسٹن کلکٹری شکارپور پر مقرر کیا گیا اور ایسٹوک خورد کو کلکٹر کے ساتھ خزانے پر مقرر کیا گیا۔ یہ سب کے سب بڑے ہوشیار اور تجربہ کار انگریز تھے۔ انہوں نے سندھ کا مختلف حیثیتوں سے جائزہ لیا۔ سب سے پہلے انہوں نے افغانی، بلوچی، سندھی، فارسی اور عربی زبان سیکھی اور یہاں تک ان زبانوں میں مہارت پیدا کی کہ ان زبانوں کی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا، پھر انہوں نے سندھ کی آباد اور غیر آباد اراضی کی پیمائش کی اور جنگل اور شور زمینوں کا سروے کیا، خانہ شماری اور مردم شماری کی، ملک سندھ کے مختلف حیثیتوں سے نقشے تیار کیے اور بعضوں نے مختلف تجارتی گودام بنائے، ان کاموں میں روپیہ پانی کی طرح بہایا اور چھپری[5] کے مقام پر لب دریا نہایت شاندار بنگلے تعمیر کیے، سندھ کے لوگوں نے روپیہ اس طرح بے دریغ خرچ کرتے ہوئے کسی کو نہ دیکھا تھا، اس لیے وہ انگریزوں کی اس شاہ خرچی کو نہایت حیرت اور تعجب سے دیکھتے تھے۔ لیکن سندھ کے عوام کا شعور بیدار تھا، وہ ان کے ان کارناموں کے باوجود انگریز کو سخت ناپسند کرتے تھے اور ان کے طوق غلامی اور ان کے اپنے ملک پر تسلط کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کا اندازہ منشی عطا محمد شکارپوری صاحب تازہ نوائے معارک کے اس بیان سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے بعض لوگوں کو کہتے ہوئے سنا کہ جس ملک میں ایک انگریز آ جائے، اسے ایک نہ جانو کیونکہ وہ ہزار یاجوج ماجوج اپنے ساتھ رکھتا ہے اور جہاں سینکڑوں انگریز جمع ہو جائیں تو سمجھ لو کہ ہزاروں شیاطین یک جا جمع ہو گئے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام ایک شیطان سے امن نہ پا کر بہشت سے محروم ہو گئے، چہ جائیکہ ہزار شیاطین یک جا جمع ہوں، پس افسوس ہے سندھ کی سرزمین پر کہ یہاں کے لوگ جو انگریز کے فتنے سے ناواقف غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں انگریزوں کی فتنہ پردازیوں کی خبر ہی نہیں، یہاں انگریزوں کی اس تعداد میں آمد سندھ کے جلد از جلد تباہ ہونے کی علامت ہے۔[5]

---

(1) محراب خان: ۱۲۳۲ھ (۱۷-۱۸۱۶ء) میں قلات کی تخت خانی پر بیٹھا۔ وہ ایک شجیع اور بہادر انسان تھا۔ اپنے ملک میں انگریزی استعمار کو سخت ناپسند کرتا تھا، جب انگریزوں نے ۱۸۳۹ء میں خراساں پر چڑھائی کی تو اس نے ان کے مقاصد سے بالکل اتفاق نہیں کیا، بلکہ ان کے مواصلات کے ذرائع کو درۂ بولان سے منقطع کر دیا، انگریزوں نے اس کی خانی کو برقرار رکھنے کے لیے معاہدہ کرنا چاہا مگر وہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوا، اس مرد مجاہد نے ۵ ماہ رمضان یوم جمعہ ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) کو انگریزوں سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔

(2) ملا رحیم داد و محمد حسن: یہ دونوں والی قلات میر محراب خان کے وزیر تھے، جن کو انگریزوں نے گرفتار کر کے بکھر کے قلعے میں قید کر دیا تھا۔

(3) انگریزوں کی خراساں کی مہم کی تفصیلات کے لیے دیکھیے تازہ نوائے معارک، ص ۴۰۸-۴۱۵ اور عروج بارک زئی۔

(4) چھپری کو اب سکھر نو کہتے ہیں۔

(5) تازہ نوائے معارک، ص ۴۱۸-۴۲۰۔

سندھیوں کے اس مقولے سے وہ شدید نفرت جو انگریزوں کے خلاف ان کے قلوب میں تھی، اس کا اندازہ اس تاثر سے ہوتا ہے، جس کا اقتباس ہم نے اوپر دیا ہے۔

سندھ کے نظم و نسق کے لیے ایمیل کا تقرر:

انتظامی حیثیت سے سندھ کے اپنے مقبوضہ علاقے کے نظم و انتظام کے لیے انگریزوں نے پہلے ولیم ایسٹوبک کا تقرر کیا تھا۔ وہ کچھ دن بعد جب ولایت جانے لگا تو اُس کی جگہ کپتان ایمیل اس خدمت پر مقرر ہوا۔ اس نے مقامی لوگوں میں قبیلۂ افغان، بلوچ، کھوسہ اور کھری کے کچھ لوگوں کو تین چار سو کی تعداد میں بحیثیت سوار کے ملازم رکھا۔ سوار کی تنخواہ پندرہ روپے سے بیس روپے تک اور جمعدار کی تنخواہ پچاس روپے مقرر کی۔ الف خان ترین بھی اُسی زمانے میں چالیس پچاس سواروں کے ساتھ انگریزوں کی ملازمت میں منسلک ہوا اور رفتہ رفتہ انگریزوں نے اس کی خدمات کے مد نظر اُسے خان بہادر کا خطاب دیا۔ کپتان ایمیل اس نئی سپاہ کو لے کر شکارپور سے شاہ پور پہنچا، لیکن اس کے باوجود سندھ کے کوہستانی بلوچوں نے انگریزی فوج کا مقابلہ کرنے میں ذرا بھی کمی نہ کی اور ایمیل بھی ان کے تعاقب اور مار دھاڑ میں ذرا بھی دریغ نہ کرتا تھا، لیکن اس سے بلوچوں کی شجاعت و بہادری اور تابِ مقاومت میں کوئی کمی نہ ہوتی تھی، بہر حال اس سے کام نہ چلا اور اس کی ناکامی کی خبر عام ہوگئی۔

میرانِ سندھ میں افتراق اور سندھ میں انگریز چھاؤنی کا قیام:

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب تک میرانِ سندھ میں میر کرم علی خاں، میر مراد علی خاں فرمانروایانِ حیدرآباد اور میر سہراب خان والیٔ خیرپور اور اُن کے مشیر نواب ولی محمد خان لغاری اور سید میاں گولہ شاہ وغیرہ زندہ رہے، انگریز اس ظاہر دوستی کے سہارے جو انہوں نے اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لیے میروں سے کر رکھی تھی سندھ میں اپنی چھاؤنی قائم کرنے کے لیے بہت سی تدبیریں اختیار کرتے رہے، لیکن چونکہ میران سندھ بھی ملک داری اور حکمرانی کا خوب تجربہ رکھتے تھے، وہ اپنی حکمت عملی اور تدبر سے انگریزوں کو اس امر سے باز رکھتے رہے۔ اگر انگریز اس مسئلے میں ذرا بھی کوئی حرکت کرتے، میران سندھ بھی نہایت سلیقے اور تدبیر سے سرداران خراساں سے فوجی مدد طلب کرتے، انگریز بھی ان کی ہوشمندی اور بیدار مغزی کو سمجھ گئے تھے، اس لیے انگریز اپنی اس آرزو کو پورا کرنے کے لیے کسی موقع کے منتظر تھے۔ اور یہ آرزو زبان پر نہ لاتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بندرگاہ کراچی وغیرہ میران سندھ کے قبضے میں ہے۔ جس کی وجہ سے وہ کوئی حرکت نہیں کرسکتے۔

یہاں تک کہ اُن کی یہ دیرینہ آرزو پوری ہونے کا وقت آگیا۔ متذکرہ بالا میرانِ سندھ اور اُن کے مشیر وفات پاگئے۔ حیدرآباد کے پرانے میروں کی جگہ میر نور محمد خان اور میر محمد نصیر خان نے لی اور خیرپور کے میر سہراب کی جگہ اُس کے بیٹے میر رستم خاں، میر مبارک خاں اور میر علی مراد خاں مسند نشین خیرپور ہوئے۔ میران اور میران حیدرآباد میں دستار بندی ریاست پر اختلاف پیدا ہوا اور آپس کا یہ افتراق اور نفاق روز بروز بڑھتا گیا۔

انگریزوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور وہ دوستی کے پردے میں سندھ پہنچے، کوئی ان میں سے سفیر بن کر آیا اور کوئی سندھ کی پیمائش کے بہانے سے سندھ میں داخل ہوا، پہلے انہوں نے میر نور محمد خاں والیٔ حیدرآباد سے مل کر اُسے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے شیشے میں اُتارا اور اُس سے حسب ذیل معاہدہ کیا، جس کا مفہوم یہ تھا کہ: میران سندھ کا ملک کراچی سے لے کر سبزل اور دوسرے ریگستانی قلعوں تک حسب دستور سابق میران سندھ کے تصرف میں رہے گا۔ انگریز سرکار اُس میں بالکل مداخلت نہ کرے گی، مگر انگریز سرکار ایک چھاؤنی واقع کوٹلہ لب دریائے سندھ پر قائم کرے گی اور اس چھاؤنی پر جو اخراجات آئیں گے، وہ قسطاً سال بہ سال میران سندھ انگریز سرکار کو ادا کریں گے یہ چھاؤنی سندھ کی حفاظت کے لیے ہوگی، اگر کوئی بھی دشمن کسی طرف سے یا خراساں سے حملہ کرے گا تو یہ چھاؤنی اس کا دفاع کرے گی۔[1]

یہ معاہدہ جو میران سندھ کے لیے آیندہ غلامی کا طوق بننے والا تھا۔ میران سندھ اپنی خوش فہمی سے اس پر خوش تھے کہ انگریزوں نے اُن کے ساتھ اتنا اچھا اور شریفانہ معاہدہ کیا ہے بعد میں انگریز اُن سے اسی قسم کے اور معاہدے کرتے رہے اور یہ اُن معاہدوں پر طوعاً و کرہاً راضی ہوتے گئے۔[2]

انگریزوں کی دریائی رستے سے خراساں پر یورش کی اجازت طلبی:

جب میران سندھ کو انگریزوں نے اپنے مدعا کے مطابق ان معاہدوں کی زنجیروں میں اچھی طرح جکڑ لیا تو انہوں نے دوستی اور خیر

---

(1) تازہ نوائے معارک، ص ۶۱۱-۶۱۳۔

(2) ایضاً۔ ص ۶۱۳۔

خواہی کے انداز میں میران سندھ سے خراساں پر یورش کے لیے دریائی راستے سے اجازت چاہی۔ میران سندھ کے لیے ان معاہدوں کی روشنی میں سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان کو دریا اور خشکی کے راستے سے گزرنے کی اجازت دے دیں۔

امیر دوست محمد خاں کا میران سندھ کے نام ایک بصیرت افروز خط:

جب اس کی خبر والیان خراساں کو ملی کہ میران سندھ نے انگریزوں کو اپنے ملک سے دریائی اور خشکی کے راستوں سے گزرنے کی اجازت دے دی تو وہ نہایت ناخوش ہوئے اور امیر دوست محمد خاں نے ایک خط میرانِ سندھ کو لکھا، جس کا مضمون یہ تھا کہ: آپ سب ہمیشہ سلطنت خراساں کے بہی خواہ رہے ہیں اور ہمیشہ مال گذاری ادا کرتے رہے ہیں۔ کچھ عرصے سے ملک کی بعض بد انتظامیوں کی وجہ سے مال گذاری کی ادائی بند ہے۔ اس کے علاوہ بعض شاہی علاقوں پر بھی آپ نے قبضہ کرلیا ہے۔ اس طرح آپ نے تمرد اور سرکشی اختیار کی ہے، مزید یہ کہ انگریزوں کو اپنے ملک سے گزرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اب اگر آپ اس امر پر بالکل مجبور تھے، تو اپنے رویے سے شاہی خزانے کی مدد کیجیے، پھر میں جانوں گا، رہے انگریز تو میں ان سے خوب اچھی طرح نمٹ لوں گا، اگر اس موقع پر آپ نے کوتاہی کی تو یقین جانیے کہ عیسائیوں کا دین اختیار کرنا پڑے گا:

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہر گز بمنزل نخواہد رسید

فی الحال جو طرز عمل آپ نے اختیار کیا ہے یہ شان اسلام اور اخلاص کے خلاف ہے۔ یہ جو کچھ بھی آپ کر رہے ہیں، اپنے حق میں کانٹے بو رہے ہیں۔ ہم لوگ تو گرگ باراں دیدہ ہیں، انگریزوں کے حملے کی ہمیں مطلقاً پروا نہیں۔ ہم تو جہاد کی دولت حاصل کرنے کی سعادت خدا سے چاہتے ہی تھے، الحمد اللہ کہ خود شکار اپنے پاؤں سے چل کر صیاد کے گھر آرہا ہے، آپ عنقریب ہی ان کا انجام دیکھ لیں گے اور سن لیں گے کہ کس طرح یہ غازیانِ خراساں کا شکار ہوتے ہیں، ہمیں آپ لوگوں پر افسوس ہے، کیا آپ نے یہ حدیث نہیں سنی کہ جو کسی ظالم کی مدد کرتا ہے، اللہ اس پر ہی اس ظالم کو مسلّط کرتا ہے، یہ جو کچھ غلط اقدام آپ نے کیا ہے اُس کا نتیجہ بھی عنقریب آپ کے سامنے آئے گا۔[1]

افسوس ہے کہ میران سندھ نے امیر دوست محمد خاں کے اس خط کے بعد بھی جس میں اُن کے لیے بصیرت، نصیحت اور عبرت کا سامان موجود تھا، کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا، بلکہ وہ اس خط پر اس کا مذاق اُڑاتے تھے اور استہزا آمیز رباعیاں پڑھتے تھے اور اس کے بعد وہ اور بھی انگریزوں کے خلوص و محبت میں مستحکم ہو گئے تھے۔

ادھر انگریز میروں کی اس اجازت سے جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ وہ بندرگاہ فیروز پور سے دریائی راستے سے دخانی جہازوں اور کشتیوں میں متواتر سامان حرب و رسد لا رہے تھے اور قلعہ بکھر میں جمع کر رہے تھے اور چھپری کو اپنی چھاؤنی بنا چکے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے شکار پور میں بھی اپنی ایک اور چھاؤنی قائم کی تھی اور مختلف طور پر وہ سندھ کے متعلق تحقیقات کر کے اپنے مفید مطلب معلومات حاصل کر رہے تھے، ساتھ ہی سندھی، بلوچی، افغانی کتابوں کو ایڈٹ اور ترجمے کر رہے تھے۔ وہ اس سے بھی خوب واقف ہو چکے تھے کہ میران سندھ کس قدر غفلت کے نشے میں سرشار اور ملکداری سے بے خبر ہیں۔ میران سندھ کی بے خبری اور غفلت کو دیکھ کر انگریز اور بھی زیادہ مطمئن تھے اور وہ سمجھ چکے تھے کہ یہ لوگ "ملخ چہ خفتہ وچہ بیدار" کے مصداق ہیں۔ چند روز تک معاہدوں کی پابندی کی بنا پر وہ بالکل خاموش رہے۔

میر نور محمد کی وفات:

لیکن ان ہی دنوں جمادی الثانی ۱۲۵۵ھ (۴۰-۱۸۳۹ء) میں میر نور محمد خان والیٔ حیدرآباد نے وفات پائی۔ جس کے بعد انگریزوں کی سندھ پر قبضہ کرنے کی ہوس تیز ہو گئی۔ اب انہیں کچھ خیال تھا تو صرف میر علی مراد خان کا تھا، جس سے وہ کچھ احتیاط برتتے تھے، لیکن انہوں نے اس پر بھی جال ڈالے اور اس کو طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر اپنا اس درجہ مطیع و فرمانبردار بنایا کہ وہ دوسرے میران سندھ کو بھی انگریزوں سے وفاداری اور ان سے خلوص اور اتفاق کی تلقین کرنے لگا، اگرچہ دوسرے میران سندھ پر اس کی تلقین کا کوئی اثر نہیں ہوا، بلکہ وہ اس کی اس تلقین کو برائی اور دشمنی پر محمول کرتے تھے اور اس سے سرکشی اختیار کیے ہوئے تھے۔[2]

---

[1] تازہ نوائے معارک، ص ۶۱۵-۶۱۶۔

[2] تازہ نوائے معارک، ص ۶۱۷-۶۱۹۔

خراساں سے ناکام واپس آنے پر سندھ میں انگریزوں کی نئی چالبازیاں:

مختصر یہ کہ ۱۲۵۸ھ (۴۳-۱۸۴۲ء) میں جب انگریز خراساں سے ناکام ہو کر واپس آئے تو انہوں نے سندھ میں نئی دسیسہ کاریاں شروع کیں۔ سب سے پہلے انہوں نے وہ تمام مکانات چھاؤنیوں کے نام سے جو سکھر اور شکار پور وغیرہ میں بنوائے تھے، ان چھاؤنیوں اور بنگلوں کو توڑ دیا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ عام و خاص کو معلوم ہو جائے کہ انگریز اب سندھ سے بالکلیہ اپنا بوریا بستر باندھ کر چلے جا رہے ہیں، حالانکہ یہ ان کی ایک مکاری تھی۔

بہ شعبدہ گری کر کے انہوں نے میران سندھ سے مطالبہ کیا کہ وہ کراچی بندر، قلعہ بکھر اور کیتہ[1] انہیں دے دیں لیکن بلوچ خراساں کے افغانوں کی بہادری اور شجاعت کے افسانے سن کر چوکنا ہو چکے تھے، انہوں نے اپنے مشیروں اور مصاحبوں سے مشورہ کیا، مشیروں اور مصاحبوں نے انہیں مشورہ دیا کہ انگریز خراساں سے ذلیل و خوار ہو کر اور شکست فاش کھا کر سندھ پہنچے ہیں۔ پہلے تو ان کا مطالبہ صرف بندرگاہ کراچی تک محدود تھا، اب جب کہ یہ پریشان ہیں تو ان کی ہوس اور بھی بڑھ گئی ہے اور بجائے ایک جگہ کے تین مقامات کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ مقامات انہیں ہرگز نہ دینے چاہئیں۔

اس مشورے کے بعد میران سندھ نے انگریزوں کے اس مطالبے کو پورا کرنے میں لیت و لعل شروع کر دی اور ان کے مقابلے کے لیے خراساں کے غازیوں کا رویہ اختیار کیا۔ اور کوہستان کے بلوچوں نے بغیر اس حقیقت کو سوچے ہوئے کہ اہل خراساں اور ان کی طاقت میں کتنا فرق ہے، انگریزوں کے لشکر پر شب خون مارنے کی فکر کرنے لگے۔ انگریز بھی مصلحتاً جابجا اپنی فوج لگائے ہوئے تھے اور میرانِ سندھ کے اس ارادے کا انہیں خوب اندازہ تھا، اب وہ اس فکر میں تھے کہ میران سندھ کو ان کے رویے کا مزہ چکھانا چاہیے۔[2]

انگریزوں کا نیا معاہدہ:

آخر ۲۴ نومبر ۱۸۴۲ء کو گورنر بمبئی نے ایک نئے معاہدے کا مسودہ بھیجا اور سندھ کے انگریز عہدہ داروں کو حکم دیا کہ وہ میران سندھ سے اس معاہدے پر دستخط لے کر فوراً یہ معاہدہ واپس کریں۔[3]

یہ معاہدہ جو میران حیدرآباد سے دستخط لینے کے لیے ۴ نومبر ۱۸۴۴ء[4] کو بھیجا گیا، اس کے شرائط حسب ذیل تھے۔

۱۔ اُمرائے حیدرآباد وہ تمام مصارف جو سابقہ معاہدوں کے مطابق انگریزی سرکار کو دیتے تھے۔ وہ جنوری ۱۸۴۳ء کے بعد سے معاف کیے جاتے ہیں۔

۲۔ یکم جنوری ۱۸۴۵ء سے میران حیدرآباد کے سارے علاقے میں صرف کمپنی کا سکہ جاری ہو گا۔

۳۔ انگریز سرکار وقتاً فوقتاً میران حیدرآباد کے لیے یہ سکے ڈھالے گی، جس کے ایک جانب شاہ انگلینڈ کی تصویر یا کتبہ حسب تجویز حکومت انگریز، اور دوسری طرف میران حیدرآباد جو لکھوانا چاہیں وہ دیا جائے گا۔

۴۔ جو سکے میران حیدرآباد کے لیے ڈھالے جائیں گے۔ وزن، قیمت اور چاندی میں کمپنی کے سکے کے برابر ہوں گے اور سکے ڈھالنے کے لیے چاندی، یا اس کی قیمت حوالے کرنے کے چار ماہ بعد جتنے بھی سکوں کی فرمائش ہو گی وہ انگریزی ٹکسال ڈھال کر دے دے گی اور سکہ سازی کے مصارف میران حیدرآباد سے نہیں لیے جائیں گے اور یہ مصارف انگریزی سرکار کے ذمے ہوں گے۔

۵۔ اس معاہدے کے بعد سے میران حیدرآباد اپنا سکہ ڈھالنے کے مجاز نہ ہوں گے۔

۶۔ دخانی کشتیوں کی ضروریات کے مد نظر دریائے سندھ کے سو سو گز کے فاصلے سے انگریز سرکار لکڑیاں کاٹ سکتی ہے، لیکن اگر میران مذکور کسی خاص جگہ سے چاہیں کہ لکڑی نہ کاٹی جائے تو انگریزی حکومت اس میں مداخلت نہ کرے گی۔

۷۔ ان شرائط کے ساتھ جنہیں سر چارلس نیپئر ضروری سمجھے، کراچی اور ٹھٹھہ انگریزی حکومت کے حوالے کیا جائے گا اور عہدہ داران

---

(1) کیتہ: اصل متن میں یہ نام کیتہ ہی درج ہے ممکن ہے کہ یہ سہو کتابت ہو اور یہ نام کیتی ہو جو دریائے سندھ کے آخری جنوبی حصے میں جیرک میں دریائے شور سے ملا ہوا واقع ہے۔ ۱۸۴۵ء میں یہ ڈیلٹائے سندھ میں ایک تجارتی شہر تھا (نوائے معارک، حاشیہ ۱، ص ۶۲۰-۶۲۱)۔

(2) تازہ نوائے معارک، ص ۶۲۰-۶۲۱۔

(3) تازہ نوائے معارک، ص ۶۲۲۔

(4) تازہ نوائے معارک میں اس معاہدے کی تاریخ ۲۴ نومبر ۱۸۴۲ء درج ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کا مسودہ ۴ نومبر کو ہوا ہو گا، اور یہ مسودہ سندھ ۲۴ نومبر کو پہنچا ہو گا۔

حکومت انگریز کو حق ہو گا کہ کراچی اور ٹھٹھہ کے درمیان جو بھی علاقے ہیں، ان میں بغیر کسی موانع اور مزاحمت کے گشت کریں اور وہ تمام سرحدات جن کو حکومت انگریز اور حکومت میران حیدرآباد میں میجر جنرل نیپیر مقرر کرے گا۔ وہاں تک انگریز حکام حکمرانی کا حق رکھیں گے۔

۸۔ اراضی سبزل کوٹ اور بہاولپور کی موجودہ سرحدات سے روہڑی تک کا پورا علاقہ نواب بہاولپور کو دے دیا جائے کہ وہ یار قدیم اور خیر خواہ حکومت برطانیہ ہے۔

۹۔ میر صوبدار کو جو ہمیشہ سلطنت برطانیہ کا خیر خواہ رہا ہے بعوض کراچی پانچ ہزار روپے مالگذاری کی جاگیر عطا کی جائے۔

۱۰۔ جو کمشنر میجر نیپیر کی طرف سے اس معاہدے کی تکمیل پر مقرر ہو گا، وہ ضروری چھان بین کے بعد اس جاگیر کا تعین کرے گا۔

۱۱۔ جو اراضی کہ اس معاہدے کی رو سے میران موصوف کو دی گئی ہے، وہ متفرق جگہ پر واقع ہے اور ان کی مال گذاری بھی یکساں نہیں اس لیے کمشنر موصوف متعین کرے گا کہ کس قدر نقد روپیہ یا دوسری اراضی میران موصوف کو دینی چاہیے۔ البتہ میران موصوف عمدہ زمین کو چھوڑ کر کم قیمت زمین نہیں لیں گے۔

۱۲۔ اگر زمین کی مالگذاری اس زمین کی قیمت سے مناسبت نہ رکھتی ہو گی تو حکومت انگریز اس کا بھی تصفیہ کرے گی اور اس معاملے میں اپنے نفع کے لیے کوشش نہ کرے گی۔[1] (شملہ ۴ نومبر ۱۸۴۲ء)

اسی قسم کے معاہدے کا مسودہ گورنر بمبئی نے میران خیرپور کے لیے بھی بھیجا، جس کا تفصیلی تذکرہ ہم آیندہ میرانِ خیرپور کے حالات میں کریں گے۔

میجر جنرل سر چارلس نیپیر جو سرکار انگریزی کی طرف سے اس وقت مختار کار اور سندھ کی تمام فوج کا سردار اور سندھ کا گورنر تھا، اُس نے میران سندھ سے ان جدید معاہدوں کے متعلق طول طویل گفتگو کی، انہیں سمجھایا، لیکن میرانِ سندھ ان معاہدوں پر دستخط کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور مختلف طریقوں سے پہلو تہی کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے انگریزوں کو از راہ دوستی اپنے ملک سے خراساں پر حملہ کرنے کے لیے گزرنے کی اجازت دی، ان کا مطلب پورا ہو چکا، اب مناسب یہ ہے کہ وہ جس راستے سے آئے ہیں، اسی راستے سے واپس جائیں۔[2]

اس کے باوجود نیپیر نے میروں کو دوبارہ سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ بہتر یہ ہے کہ وہ ان معاہدوں پر دستخط کر دیں، ورنہ وہ بہت نقصان اُٹھائیں گے۔ اس کے علاوہ اس نے میجر اوٹرام کو جو میران سندھ کے خیر خواہوں میں شمار ہوتا تھا، اُسے میروں کے پاس سمجھانے کے لیے بھیجا۔

میجر اوٹرام کی میران حیدرآباد میں نفاق ڈالنے کی کوشش:

میجر اوٹرام نے میران حیدرآباد میں پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل کیا، اُس نے سب سے پہلے اپنا دام تزویر میر صوبدار پر پھیلایا اور اپنے وکلا کے توسط سے اُسے یقین دلایا کہ اگر وہ اس معاہدے پر دستخط کر دے گا تو میرانِ حیدرآباد کی دستار سرداری اُس کے سر پر رکھی جائے گی اور اُسے میران حیدرآباد کا سردار بنایا جائے گا۔ اس طرح اُس نے میران حیدرآباد کے درمیان نفاق کی چنگاری بھڑکائی۔

ادھر اُس نے سکھر پہنچ کر میر علی مراد خان والیٔ خیرپور سے ملاقات کی اور اُسے بھی دستار سرداری کا لاسہ لگا کر اس قدر اپنا ہمنوا بنایا کہ میر علی مراد اُس کے استقبال کے لیے کچھ لشکر اور تین توپ بردار کشتیاں لے کر خیرپور کے متصل نونار پہنچا، اور اُسے توپوں کی سلامی دی۔

میرانِ خیرپور میں میر رستم خاں، میر نصیر خاں، میر محمد حسن خاں اور میر محمد علی خاں اس صورت حال سے بالکل بے خبر تھے۔ جب یہ حالات سے باخبر ہوئے تو میر علی مراد پر سخت برہم ہوئے، بعد میں میر رستم خاں اپنی خاص سواری پر نونار پہنچا اور میر علی مراد خان سے ملاقات کر کے بظاہر فتنہ و فساد کو رفع کر دیا۔[3] اس کے بعد میر علی مراد خان نے جو طریق کار اختیار کیا، اُس کی تفصیل ہم آیندہ میرانِ خیرپور کے حالات میں درج کریں گے۔ فی الحال ہم میرانِ حیدرآباد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

میر علی مراد خان والیٔ خیرپور کے طرز عمل سے ناراض ہو کر میر رستم خان و میر نصیر خان والیانِ خیرپور میران حیدرآباد سے امداد و اعانت کی امید میں حیدرآباد پہنچے۔ اتفاق سے اُس وقت میران حیدرآباد میں میر محمد نصیر خان اور میر شہداد خان شکارپور کے لیے گئے ہوئے تھے، اور صرف میر صوبدار خان، میر محمد خان اور میر حسن علی خان قلعۂ حیدرآباد میں موجود تھے، لیکن یہ سب میران خیرپور سے نہایت سرد مہری کے ساتھ پیش آئے اور مطلقاً ان کی پذیرائی نہیں کی، مگر جب دو تین روز کے بعد میر محمد نصیر خان و میر شہداد خان شکارپور سے واپس

---

(1) تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۹۷۶-۹۷۸۔

(2) تازہ نوائے معارک، ص ۶۲۲۔

(3) تازہ نوائے معارک، ص ۶۲۳۔

ہوئے تو انہوں نے میران خیرپور کی دلجوئی اور مہمانداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور انگریزوں سے جو موجودہ صورت حال پیش آرہی تھی، جس کے لیے وہ سفر کر کے آئے تھے اُن سے اُس موضوع پر گفتگو کی۔

ہر چند کہ میران حیدرآباد کے دل میں انگریزوں سے لڑائی اور مقابلے کا خیال نہ تھا، کیونکہ میجر اوٹرام نے جو میران سندھ کا خیر خواہ سمجھا جاتا تھا، میران سندھ سے انگریزوں کے مطلوبہ علاقے لے لینے کا تحریری اقرار نامہ لے لیا تھا۔

بختیار خاں لغاری کی انگریزوں سے بغاوت:

لیکن اسی اثنا میں بختیار خاں لغاری تریاقی جو ہمیشہ افیون کی پنک میں رہتا تھا، میر رستم خان کے دربدر ہونے کی خبر سن کر ہوش میں آگیا اور اُس نے انگریزوں سے مقابلے کی ٹھانی، اور غلام محمد خان لغاری کھنبڑی والا کو اپنے ہمراہ لے کر پہلے تو اُس نے اپنے خاندان اور قبیلے کو اپنا ہمنوا بنایا، پھر یہ دونوں میر جان محمد خان ولد میر بوڈہ خان مرحوم کے پاس گئے اور میر جان محمد کے توسط سے اُس گھریلو جھگڑے کو نمٹایا جو محمد لغاری ولد لقمان خان ٹالپور مرحوم اور قبیلہ لغاری کے درمیان کسی رشتے پر عرصے سے چلا آتا تھا۔ اس طرح اُنہوں نے سارے قبیلہ لغاری کو متحد و متفق بنایا، ان جھگڑوں کے ختم ہونے کے بعد جب پوری قوم یک دل و یک جان ہوگئی تو ان سب نے اور ساری قوم لغاری نے قرآن مجید کی قسم کھا کر انگریزوں سے مقابلہ کرنے کا عہد کیا۔ لغاری قوم کے افراد نعرہ لگاتے تھے کہ:

ایں ملک سندھ بمنزلہ مادر ما بلوچان است
کہ از پستان شیر پیدائش آں پشت بہ پشت
پرورش یافتہ ایم حقوق مادر و پدر بر
اولاد بسیار است، نہایت جان را نثار
راہ خدمت ایں والدہ خواہیم نمود[1]

(ترجمہ) یہ ملک سندھ ہم بلوچوں کے لیے بمنزل ماں کے ہے کہ جس کی چھاتیوں سے ہم پشت بہ پشت دودھ پی کر پلے اور بڑھے ہیں، ماں باپ کے اولاد پر حقوق بہت ہیں۔ ہم اپنی مادر وطن پر جان نثار کریں گے۔

ان نعروں اور باہمی قول و قرار کے بعد غلام محمد خان لغاری میر محمد نصیر خان والی حیدرآباد کے پاس گیا اور اُس سے کہا کہ یہ امر کتنا افسوسناک ہے کہ میر رستم خان ریگستان میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ اب وہ ہمارے دروازے پر التجا لے کر آیا ہے، اُس نے ہم بلوچوں کی غیرت کو جھنجوڑا ہے۔ یہ ملک سندھ جو بمنزل ہماری ماں کے ہے، ہم اُسے کس طرح انگریزوں کے تصرف میں دے سکتے ہیں۔ اگر آپ بھی اس کے لیے تیار ہو جائیں کہ انگریز ہمارے ملک پر تصرف نہ کر سکیں تو اس سے کون سی عمدہ اور بہتر بات ہو سکتی ہے۔ اگر ہم اس راہ میں فاتح اور منصور ہوئے تو یہ فتح ہماری بلند ہمتی اور عظمت کی دلیل ہوگی اور اگر ہم اس راہ میں قربان ہوگئے تو بھی ہم اپنی مادر سندھ کا حق ادا کر کے سعادت دارین حاصل کریں گے۔

میر محمد نصیر خان نے ہر چند غلام محمد کو سمجھایا اور اس ارادے سے روکا اور کہا کہ لڑائی کا نام ہی برا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ میدانِ جنگ میں کس فریق کو فتح و نصرت حاصل ہوگی۔ اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ ہم انگریزوں کے مقابلے میں کامیاب بھی ہو جائیں گے، تو پھر بھی ہم سندھ کے خرمن امن و امان میں ایک ایسی چنگاری لگا دیں گے جو ہمیشہ کے لیے اہل سندھ کو خائف اور بے آرام بنا دے گی۔ مخالفت اور دشمنی ایک تنکے کی بھی اچھی نہیں، چہ جائیکہ انگریزوں کی دشمنی۔

میر محمد نصیر خان کو غیرت دلانے کی کوشش:

لیکن ان تمام نصیحت آمیز باتوں کا غلام محمد پر بالکل اثر نہیں ہوا اور وہ اپنی بات پر جما رہا۔ دوسرے دن صبح کو غلام محمد دوسرے سرکردہ بلوچوں کے ساتھ شمشیر ہاتھ میں، کلام اللہ سر پر، لباس زنانہ دوپٹہ اور چولی وغیرہ بغل میں دبا کر میر محمد نصیر خان کے پاس آیا اور کہا کہ سب سے اول آپ کلام اللہ کو دیکھ کر اسی وقت سوار ہو جائیں تاکہ ہم انگریزوں کے مقابلے کے لیے روانہ ہوں اور اگر آپ سوار نہیں ہوتے اور جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے تو پھر مناسب یہ ہے کہ یہ زنانہ لباس پہن کر گھر میں بیٹھ جائیں اور ریاست چھوڑ دیں۔

میر محمد نصیر خان اس صورت حال کو دیکھ کر نہایت پریشان ہوا، اور وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اگر وہ بلوچوں کے اس کہنے پر جنگ کا حکم دیتا ہے، تب بھی آپس میں شور و شر پیدا ہوتا ہے، اگر انکار کرتا ہے تب بھی فتنہ و فساد کی آگ بھڑکتی ہے۔ وہ عجیب مشکل میں تھا اور دو شخصوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ مجبوراً اس نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ وہ میر صوبدار خان کی عداوت کو جو اس زمانے میں انگریزوں کی دوستی کی طرف

---

[1] یہ تمام تفصیل تازہ نوائے معارک، ص ۶۵۶-۶۵۸ سے ماخوذ ہے۔

مائل تھا اس کی مخالفت مول لے اور انگریزوں سے جنگ میں بلوچوں کا ساتھ دے۔

جنگ میانی:

چنانچہ وہ طوعاً و کرہاً بلوچوں کی مرضی کے مطابق قلعہ حیدرآباد سے سوار ہو کر باغ میر فتح علی خان میں آیا۔

اسی اثنا میں اطلاع ملی کہ حیات خان مری وڈیرہ اور فہیم خان مری اپنے گھروں سے سوار ہو کر حیدرآباد کی طرف آرہے تھے کہ انگریزوں کی فوج نے انہیں راستے میں گرفتار کر لیا اور اب وہ انہیں نہیں چھوڑتے۔ بلوچوں کی ایک جماعت اس خبر کو سن کر مشتعل ہوگئی اور اُنہوں نے انگریزی چھاؤنی پر حملہ کر دیا اور خوب لوٹ مار مچائی اور قتل و غارتگری کی۔

جب یہ صورت حال میجر اوٹرام کو معلوم ہوئی جو میران سندھ کا خیر خواہ تھا تو وہ فوراً ایک کشتی پر سوار ہو کر مقام واردات کی طرف روانہ ہوگیا۔[1]

انگریزی فوج کو روانگی کا حکم:

چارلس نیپیر اُس وقت ہالہ کنڈی میں تھا، جو حیدرآباد سے بیس کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس نے جب چھاؤنی کی لوٹ مار کی خبر سنی تو وہ غصے سے بید کی طرح کانپنے لگا اور اسی وقت اُس نے فوج کو روانہ ہونے کا حکم دیا اور خود دریائے سندھ کے کنارے کنارے مسافت طے کرتا ہوا اُن جنگلوں میں جو میرانِ حیدرآباد کی شکار گاہوں کے لیے مخصوص تھے، خیمہ زن ہوا اور دوسرے دن اس نے اپنے لشکر کو صف آرائی کا حکم دیا۔[2]

میرانِ حیدرآباد کو جب اس کی خبر ہوئی تو میر محمد نصیر خان، میر شہداد خان، میر رستم خان اور میر صوبدار کا بیٹا بارہ ہزار لشکر اور چند توپ سواروں کے ساتھ کاتھری (میانی) میں جس کا فاصلہ حیدرآباد سے تین کوس ہے منزل انداز ہوئے۔

اسی زمانے میں دوست محمد خدمتگار نے میرانِ حیدرآباد کو خبر دی کہ انگریزوں نے پانسو سواروں کا لشکر اس نواح میں متعین کیا ہے، ذرا ہوشیار رہیے۔

اس خبر کے ملنے پر میرانِ حیدرآباد نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ سوار ہو کر سامنے سے انگریزی فوج کو روکیں، لیکن ایک بھی بلوچ نے اس پر عمل نہیں کیا۔ ۱۷ فروری ۱۸۴۳ء کو جب سورج بلند ہوا اور انگریزوں کی فوج دور سے نظر آنے لگی تو میر جان محمد خان نے بلوچوں کے لشکر کو للکارا اور کہا کہ تم نے ابھی کچھ دن ہوئے کلام اللہ کی قسم کھائی تھی اب وقت مقابلے اور مردانگی کا ہے، تم نے ساری عمر سندھ کی سرزمین سے کھایا ہے، اب وقت کا تقاضا ہے کہ تم اس سرزمین پر قربان ہو جاؤ، لیکن اس آواز پر سوائے چند بلوچوں کے جن میں حاجی خدا بخش اپنے پچاس ساٹھ سواروں کے ساتھ، مراد علی خاں چانک، نصیر خان چانک، حاجی غلام محمد ٹالپور، مبارک خان ٹالپور، میر غلام شاہ خلف، میر محراب خان ٹالپور اور میر جان محمد خان مردانہ وار میدان جنگ کی طرف بڑھے اور پروانہ وار اپنے آپ کو اپنے وطن کی شمع آزادی پر قربان کیا، لیکن چونکہ انگریزی فوج کا مدار جنگ، بندوق اور توپ پر ہے اور بالکل آخر میں وہ تلوار استعمال کرتے ہیں، اسی طرح بخلاف انگریزوں کے بلوچوں کی بہادری کا جوہر شمشیر زنی ہے، اس لیے انگریزوں کی بندوقوں اور توپوں کی زد میں آکر بہت سے بلوچ شہید ہوئے، لیکن پھر بھی بعض بہادر بلوچ جو انگریزی فوج کی بندوقوں اور توپوں سے بچ گئے تھے، وہ انگریزوں کے لشکر میں گھس گئے اور اپنی شمشیر زنی کے وہ جوہر دکھائے کہ کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ ان کے علاوہ عبداللہ خان نظامانی اور میرزا خان نظامانی نے جو نظامانی دستے کے سرگروہ تھے انہوں نے بھی انگریزوں کے مقابلے میں شجاعت کے جوہر دکھانے میں کمی نہیں کی اور اپنے آپ کو اپنے وطن کی سرزمین کی حفاظت میں قربان کر دیا۔ محمد علی خان لغاری، دریا خان لغاری، غلام حیدر لغاری اور دیگر لغاری جانباز اس جنگ میں مارے گئے۔

جنگ میانی کا مال غنیمت:

میانی کی جنگ میں بلوچوں کی شکست کے بعد میران حیدرآباد بھی قلعہ حیدرآباد میں واپس آگئے۔ انگریزی فوجوں نے میدان جنگ میں پہنچ کر بلوچ جو کچھ اسباب و سامان چھوڑ گئے تھے وہ اور اس کے علاوہ توپ خانہ اور میران حیدرآباد کے خیمے جو وہاں پڑے ہوئے تھے وہ سب لوٹ لیے اور پرانے خیموں کو بیکار سمجھ کر ان میں آگ لگا دی اور انہیں خاکستر

---

[1] تازہ نوائے معارک، ص ۶۵۸۔

[2] تازہ نوائے معارک، ص ۶۵۸-۶۵۹۔

کر دیا۔[1]

شکست کے بعد میران حیدرآباد کا ردعمل:

میران حیدرآباد جب قلعے میں پہنچے تو اس اندیشے سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میر صوبدار خان جو انگریزوں کی طرف مائل ہے، ہمیں انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار نہ کرادے۔ اس لیے انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب ہمیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ مشورے کے بعد انہوں نے یہ رائے قائم کی کہ ہمیں انگریزوں سے ملاقات کرنی چاہیے اور اس ملاقات کے لیے پہلے ہمیں خط لکھنا چاہیے، چنانچہ انہوں نے پہلے جنرل چارلس نیپیر کو ایک خط لکھا، جس میں تحریر کیا کہ ہمیں بلوچوں کی حماقت پر افسوس ہے کہ انہوں نے آپ سے جنگ کی ٹھانی اور اس جنگ میں خود اپنی شرکت پر بھی اظہار معذرت کیا اور لکھا کہ بعض ناگریز مجبوریوں کی وجہ سے ہمیں بذات خود اس جنگ میں شریک ہونا پڑا اور آخر میں سلام اور ملاقات کی تمنا ظاہر کی۔[2]

میرانِ حیدرآباد کی گرفتاری:

چارلس نیپیر نے میروں کے اس خط کا جواب اپنی شاطرانہ پالیسی کی بنا پر نہایت تسلی اور تشفی آمیز دیا اور ملاقات کا وقت بھی دے دیا، لیکن میر اس کی فریب بازیوں سے بالکل غافل رہے۔

دوسرے دن میران حیدرآباد لباس فاخرہ پہن کر اور مرصع تلواریں کمر میں لٹکا کر خوش رفتار اور طلائی زین سے آراستہ گھوڑوں پر سوار ہو کر خراماں خراماں جنرل چارلس نیپیر کی ملاقات کے لیے پہنچے۔[3]

جنرل چارلس نیپیر نے ملاقات کے دوران سوائے میر نصیر خان کے کسی میر کی طرف التفات نہیں کیا۔ تھوڑی دیر یہ ملاقات رہی، اسی اثنا میں جنرل چارلس نیپیر نے چوکی اور پہرے کے محافظ دستے کو حکم دیا کہ وہ پرکار کی طرح میروں کو اپنے گھیرے میں لے لیں۔ اس وقت میروں کی آنکھیں کھلیں، لیکن یہ مصیبت خود باہمی افتراق کی وجہ سے اپنے ہاتھوں سے لائی ہوئی تھی، اس لیے تاسف لاحاصل تھا۔[4]

انگریزوں کا قلعۂ حیدرآباد میں داخلہ:

میران حیدرآباد کی گرفتاری کے بعد جنرل چارلس نیپیر نے اپنی پلٹن کو حکم دیا کہ وہ قلعۂ حیدرآباد میں داخل ہو۔ چنانچہ بغیر کسی مزاحمت کے انگریزی فوج قلعۂ حیدرآباد میں داخل ہو گئی اور انگریزوں نے اپنی فتح و نصرت کے جھنڈے قلعے کے برجوں پر لہرائے اور اس مسرت و خوشی میں شادیانے بجوائے۔[5]

سندھ پر انگریزوں کے قبضے کا اعلان:

پھر سارے شہر میں منادی کرائی کہ ملک سندھ کو سرکار انگلشیہ نے فتح کر لیا ہے اور اب سرکار انگریز کی طرف سے اس ریاست کی حکومت میر صوبدار خان کے سپرد کی گئی ہے۔ آیندہ سے تمام بلوچوں کی سرداری میر صوبدار خان سے متعلق ہو گی۔

انگریزوں کی قلعۂ حیدرآباد میں لوٹ مار:

انگریزوں نے قلعۂ حیدرآباد میں داخل ہونے کے بعد میروں کے خزانوں، دفینوں اور توشک خانوں پر اپنے سپاہیوں کا پہرہ مقرر کیا اور پختہ اور خام ڈیروں پر بھی محافظت کے لیے پہرہ مقرر کیا۔

اس انقلاب سے سارا شہر سناٹے میں آگیا، ایک عظیم مصیبت تھی جو سارے شہر پر انگریزوں کی صورت میں نازل ہوئی تھی۔ سندھ کا ہر آدمی اس انقلاب اور ان واقعات پر جو پیش آئے نہایت رنجیدہ اور محزون تھا۔[6]

میر صوبدار کا انجام:

میر صوبدار خان انگریزوں کی اس بخشی ہوئی سرداری سے جو اسے انگریزوں سے ہمدردی اور نوازشوں سے ملی تھی اور جس کی بنیاد صرف اسے فریب دینے پر تھی، اپنے دل میں بہت خوش تھا، لیکن اسے اپنے انجام کی خبر نہ تھی۔[7]

دوسرے دن انگریز عہدہ دار قلعے کے معائنے کے لیے اور میر صوبدار خان سے ملاقات کے لیے پہنچے۔ میر صوبدار خان اپنی کچہری میں دربار لگائے بیٹھا ہوا، لباس فاخرہ پہنے ہوئے انگریز عہدہ داروں کا انتظار

---

[1] تازہ نوائے معارک، ص ۶۶۱-۶۶۲۔
[2] تازہ نوائے معارک، ص ۶۶۳-۶۶۴۔
[3] ایضاً- ص ۶۶۴۔
[4] ایضاً- ص ۶۶۴۔
[5] تازہ نوائے معارک، ص ۶۶۴-۶۶۵۔
[6] ایضاً- ص ۶۶۵۔
[7] تازہ نوائے معارک، ص ۶۶۶۔

کر رہا تھا۔ جیسے ہی انگریزی عہدہ دار میر صوبدار کی کچہری میں داخل ہوئے میر صوبدار خان نے سروقد کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ انگریز عہدہ داروں نے سرد مہرانہ صاحب سلامت کے بعد میر صوبدار خان کی گرفتاری کا حکم دیا۔ انگریزی سپاہیوں نے اسے قزاقوں کی طرح گرفتار کر کے ہاتھی کی برہنہ پشت پر سوار کیا، اور اس طرح کشاں کشاں اسے قلعے سے چھاؤنی تک لے کر آئے۔

حیدرآباد کے عوام و خواص میر صوبدار خان کی گرفتاری سے حیرت میں پڑ گئے کہ کہاں انگریزوں نے اس کو یہ عزت دی تھی کہ پوری ریاست کا اس کو سردار بنایا تھا۔ کہاں یہ بے عزتی کہ اس ذلیل طریقے سے اس کو گرفتار کرایا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ انجام تھا میر صوبدار کے اس طرز عمل کا کہ وہ دو گھوڑوں پر سواری کیے ہوئے تھا۔ اِدھر اس نے اپنے بھائی میروں کے ساتھ مل کر ان کی رفاقت پر کلام اللہ کی قسم کھائی۔ ادھر انگریزوں سے بھی وہ اپنی ذاتی کامیابی کے لیے بھی ساز باز کیے ہوئے تھا، جس کا یہ لازمی نتیجہ تھا جو اس صورت میں ظاہر ہوا کہ وہ ادھر کا رہا نہ اُدھر کا۔[1]

میروں کی گرفتاری کے بعد انگریز قلعۂ حیدرآباد کی طرف متوجہ ہوئے۔ ڈیرہ ہائے خام میں جن کی تعداد دو سو تھی جو کچھ سامان، زر و زیور اور قیمتی کپڑے تھے، وہ سب انگریزوں نے لے لیے۔ اسی طرح جو کچھ پختہ ڈیروں میں تھا، اسے بالکلیہ حاصل کر کے اسے ٹنڈو محمد یوسف خدمت گار میں جمع کیا۔

چند دن کے بعد انگریزوں نے حیدرآباد کے تمام خزانے اور دفینے نقد، اونی اور نفیس کپڑے، بیش بہا ہتھیار، مرصع تلواریں، رومی، خراسانی اور میر خانی بندوقیں، جواہر دار خنجر اور چھریاں، ولائتی گھوڑے، اونٹ اور بہترین مویشی، زنانہ مرصع طلائی زیورات جن کی قیمت لاکھوں روپے تک پہنچتی تھی اور دو کروڑ تیس لاکھ روپے نقد جو میرانِ حیدرآباد کے توشخانے میں جمع تھے، اس تمام ساز و سامان پر اپنا قبضہ جمایا۔

اس کے علاوہ قلعۂ حیدرآباد کے ان واقف کار ملازموں نے جن پر میروں کو اعتماد تھا اور ان کے سوا کوئی نہ جانتا تھا کہ کہاں کہاں میروں کا روپیہ زمین میں دفن ہے، انگریزوں سے ایک ایک سو روپیہ لے کر میروں کے ان مدفونہ خزانوں کی نشان دہی کی اور انگریزوں نے ان مقامات کو کھدوا کر وہ روپیہ بھی اپنے قبضے میں کیا۔

ان واقعات کے بعد دو ماہ تک سندھ میں وہ افراتفری اور ابتری پھیلی کہ قلم ان کی تحریر سے قاصر ہے۔ لیکن انگریزوں نے بڑی فراست اور مکاری سے میر علی مراد خان والیٔ خیرپور سے نیا معاہدہ کیا اور جو علاقے اس کی سرداری سے تعلق رکھتے تھے، ان کی سرداری اور حکومت میر علی مراد خان کے سپرد کی اور جو علاقے والیٔ قلات سے تعلق رکھتے تھے وہ میر محمد نصیر خان کے تصرف میں دے کر حسب سابق اس کو وہاں کا حاکم بنایا۔

اس طرح اپنی حیلہ وری اور مکاری سے انگریزوں نے میر علی مراد خان کے توسط سے سندھ کے تمام بلوچ سرداروں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنایا۔

میران حیدرآباد چند دن تک تا صدور حکم گورنر جنرل ہندوستان، حیدرآباد میں قید رہے اور اس مدت میں انگریز بلوچوں کے تمام قبائل کے انتظامات درست کرنے میں لگے رہے اور فتنہ و فساد کی جو آگ انگریزوں کے قبضے کی وجہ سے سندھ میں مشتعل ہو گئی تھی، انہوں نے اسے مختلف تدبیروں سے فرو کیا۔[2]

لیکن جب شیر سندھ میر شیر محمد خان والیٔ میرپور کی شکست سے پہلے اس کا ایک ساتھی میر شاہ محمد خان انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا، جس کی تفصیل آیندہ اوراق میں میران میرپور کے ضمن میں آئے گی، تو انگریزوں نے اسے اسیر و دستگیر کر کے جنرل نیپیر کے پاس حیدرآباد بھجوایا تاکہ وہ اسے دخانی جہاز میں بمبئی بھجوا دے۔

۸ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں میر شاہ محمد خان گرفتار ہوا تھا۔ جنرل چارلس نیپیر شیر سندھ میر شیر محمد خان کو شکست دینے کے بعد حیدرآباد آیا۔[3]

میران حیدرآباد و خیرپور کی نظر بندی:

اس نے حیدرآباد آتے ہی، میران حیدرآباد میں میر محمد نصیر خان، اور اس کے بیٹوں کو اور میر محمد خان، میر صوبدار خان اور میر شہداد خان کو اور میران خیرپور میں سے میر رستم خان اور میر نصیر خان کو دخانی جہاز میں بمبئی روانہ کیا۔[4]

---

(1) یہ تمام تفصیل تازہ نوائے معارک، ص ۶۶۵ تا ۶۶۶ سے ماخوذ ہے۔

(2) یہ تمام تفصیل تازہ نوائے معارک، ص ۶۶۹ سے ماخوذ ہے۔

(3) تازہ نوائے معارک، ص ۶۷۳-۶۷۴۔

(4) تازہ نوائے معارک، ص ۶۷۴۔

زخموں پر نمک:

جس روز یہ میر صاحبان انگریزوں کے ظلم و ستم کی بنا پر اپنے وطن سے جلاوطن ہو کر بمبئی لے جائے جا رہے تھے۔ انگریزوں نے اہل سندھ کے زخموں پر اور نمک چھڑکا اور حیدرآباد کے عوام اور تاجروں میں اعلان عام کرایا کہ میران سندھ جو پہلے تمہارے حاکم تھے۔ انگلستان کی سیاحت کے لیے جا رہے ہیں، تم میں سے جو ان سے الوداعی ملاقات کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ اس اعلان کو سن کر تمام حیدرآباد میران سندھ کو رخصت کرنے کے لیے نکل پڑا، لیکن جب انہوں نے میران سندھ کی حالت زار دیکھی تو کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس سے آنسو نہ بہہ رہے ہوں۔ اس طرح میران سندھ اپنے اہل و عیال اور ریاست و امارت کو چھوڑ کر بے کسی اور بے بسی کے عالم میں بمبئی روانہ ہوئے۔[1]

جب یہ بمبئی پہنچے تو گورنر بمبئی کے حکم سے کپتان بروس، کپتان اولیور لحب مجسٹریٹ و سکریٹری تعلقات عامہ میران سندھ کے استقبال کے لیے گودی پر موجود تھے۔ اسکوٹ صاحب سکریٹری نے میر نصیر خان کو ہاتھ پکڑ کر جہاز سے اتارا اور دو اسپہ گاڑی میں سوار کیا اور پورے اعزازات کے ساتھ گورنر کے ایوان خاص میں ٹھہرایا۔ چند دن کے بعد میر نصیر خان کو کلکتہ کے قریب دمدمہ میں، میر شہداد خان کو قلعۂ سورت میں اور میر رستم خان کو پونہ شہر کے متصل ساسور میں نظر بند کر دیا اور انگریز گورنمنٹ نے ان کا پندرہ ہزار روپیہ ماہانہ مشاہرہ مقرر کر دیا، کچھ دن تو یہ آرام سے رہے، لیکن چند ہی دن میں انہیں اپنے وطن کی یاد ستانے لگی۔ انہوں نے اپنے ملک کو حاصل کرنے اور اپنی رہائی کی کوششیں شروع کر دیں اور بہت سی عرضداشتیں انگریزی گورنمنٹ کو بھیجیں۔ لندن کے کورٹ میں مقدمہ دائر کر کے ان تمام الزامات کے جواب دیے جو چارلس نیپیر نے ان پر لگائے تھے۔ لندن کے کورٹ میں میروں کی طرف سے بعض انگریز وکیلوں نے ان کی پیروی کی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ خیال تھا کہ انگریزی عدالت میر محمد نصیر خان والیٔ حیدرآباد کو ان کے لواحقین کے ساتھ سندھ کی مسند ریاست پر پھر بٹھا دے کہ اسی عرصے میں خبر پہنچی کہ شیر سندھ میر شیر محمد خان کمک حاصل کرنے کے لیے سرداران قندھار کے پاس گیا ہے۔ عدالت نے اس خبر کے بعد اپنے فیصلے کو میر شیر محمد خان کے اس اقدام کے نتیجے پر محفوظ کر لیا کہ اچانک اسی زمانے میں ۶ ماہ ربیع الثانی ۱۲۶۱ھ (۱۴ اپریل ۱۸۴۵ء) کو عین صحت و تندرستی کے عالم میں میر محمد نصیر خان پر جب کہ وہ نماز اور اوراد میں مشغول تھا اچانک سکتہ کا عارضہ ہوا اور اسی میں اس نے حالت اسیری و نظر بندی میں دمدم (کلکتہ) میں وفات پائی۔

بعضوں کا خیال ہے کہ میر محمد نصیر خان جلاوطنی اور ریاست سندھ کے ہاتھ سے نکل جانے کے غم کو برداشت نہ کر سکا اور زہر کا پیالہ پیا، جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی۔[2] واللہ اعلم بالصواب۔

اس کا سجع جو ایران سے درست ہو کر آیا تھا وہ یہ تھا کہ:

سزد گر نہد بر ثریا سریر
کسی را کہ باشد محمد نصیر[3]

دوسرا سجع یہ تھا:

علی و حسین و حسن دستگیر
خدا یار و یاور محمد نصیر[4]

میر محمد نصیر خان کا مزار ٹالپوروں کے قبرستان میں حیدرآباد میں اپنے والد میر نور محمد خان کے مزار کے پہلو میں واقع ہے جس پر یہ کتبہ نصب ہے۔

وفات حضرت میر محمد صاحب مغفرت رضوان میر نصیر خان علیہ رحمہ والغفران بتاریخ ہفتم ماہ ربیع الثانی ۱۲۶۱ھ۔[5]

انگریزوں کے ظلم و ستم:

انگریزوں کے ظلم و ستم کا اندازہ اس عرضداشت سے بھی ہوتا ہے جو بیگماتِ میرانِ حیدرآباد نے ملکہ وکٹوریہ کے نام روانہ کی تھی۔ اس عرضداشت پر دستخط کرنے والی حسب ذیل بیگمات تھیں:

(۱) بیگم میر کرم علی خان (۲) بیگم نور محمد خان (۳) بیگم محمد نصیر خان (۴) بیگم میر صوبدار خان (۵) بیگم میر محمد خان۔

اس عرضداشت کا متن یہ تھا:

پورے دو سال گزرے جب سر چارلس نیپیر حیدرآباد سندھ آیا۔ اس کے ساتھ ایک زبردست فوج اور توپ خانہ تھا، اس نے ہمارے کل زیورات جواہرات اور جملہ قیمتی اشیا کو لوٹ لیا، اس لوٹ مار کے علاوہ وہ

---

(1) ایضاً، ص ۶۷۴

(2) تازہ نوائے معارک، ص ۶۷۷۔

(3) تکملہ مقالات الشعراء، ص ۱۰۴۔

(4) حاشیہ نمبر ا تکملہ مقالات الشعراء، ص ۱۱۱۔

(5) حواشی تکملہ مقالات الشعراء، ص ۱۰۷-۱۰۸۔

ہمارے امیروں اور بچوں کو بھی چھین کر لے گیا اور انہیں قیدی بنا کر ہندوستان بھیج دیا۔ ہم لاچار خواتین زور و قوت سے محروم سر چارلس نیپیر کی آمد کے وقت اپنے محلات میں مقیم تھیں، خدا جانے یہ کونسی شرافت تھی کہ وہ ہماری رہائش گاہوں میں داخل ہو گیا اور ہمیں اس طرح لوٹا کہ زندہ رہنے کے واسطے ایک تنکا نہ چھوڑا۔ پورے دو سال گزر چکے ہیں کہ جب اُس نے ہم کو اپنے مکانات اور آبائی شہر سے بے گھر کیا اور مجبور کیا کہ ہم حیدرآباد سے باہر جھونپڑیوں میں مثل خانہ بدوشوں کے رہیں۔ ہم جس قسم کی مشکلات برداشت کر رہے ہیں، اُن کو خدا ہی بہتر جانتا ہے، ہم کو کھانے کپڑے تک کی تکلیف ہے۔ امیروں کی بیویاں ہونے کی وجہ سے ہم کو اس قدر شدید روحانی اذیت اور مایوسی لاحق ہے کہ ہمارے نزدیک زندگی بے مزہ ہو کر رہ گئی ہے۔ انسان کو موت اُس وقت آتی ہے، جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے، اس لحاظ سے یہ کوئی تکلیف دہ بات نہیں، لیکن ہم کو ہر نئے آنے والے دن میں موت جیسی ایک نئی اذیت اور نیز کرب و بے چینی سے واسطہ پڑتا ہے۔

ملکہ معظمہ!

ہم امید کرتے ہیں کہ آپ بحیثیت ملکہ جیسے کہ کبھی ہم بھی تھے، ہم مظلوموں سے ہمدردی کریں گی اور نظر ترحم مبذول فرمائیں گی، سر چارلس نیپیر نے ہم کو جن چیزوں سے محروم کر دیا ہے، وہ واپس دلائیں گی۔ چونکہ ہمارے قلوب اپنے بچوں اور امیروں کی جدائی کے غم میں مجروح ہوئے ہیں اس لیے ہم مایوسی کی انتہائی منزل میں داخل ہو گئے ہیں۔ ہم کو قوی امید ہے کہ آپ اس بے چینی کے اسباب کو دور فرمائیں گی، ورنہ ہمارے حق میں یہ بہتر ہو گا کہ ہم اپنی زندگیوں کا خاتمہ کر لیں۔[1]

میرانِ حیدرآباد کی سیرت و شخصیت

میر نصیر خان ٹالپر:

میر محمد نصیر خان بن مراد علی خان والیٔ حیدرآباد برادر نور محمد خان ٹالپور والیٔ حیدرآباد کی وفات کے بعد اُس کی جگہ مسند نشین ہوا۔ اس کے سیاسی کارنامے گزشتہ اوراق میں گزر چکے ہیں، یہاں ہم مختصر طور پر اُس کی سیرت و شخصیت پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

یہ ۱۴ محرم ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۴ء) کو قلعۂ حیدرآباد میں پیدا ہوا۔ اس نے اخوند محمد بچل متخلص بہ انور بن اخوند محمد صالح متعلوی سے علوم و دینی و دنیوی کی تعلیم حاصل کی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ، مستقل مزاج اور فیاض فرمانروا تھا۔ صاحب تکملۂ مقالات الشعرا نے اُس کے اوصاف و اخلاق کو سراہتے ہوئے لکھا:

از ہمہ تالپر ان عصر خود بمزیت اقبال زیست و سخاوت منش و کریم الطبع بر آمد۔

شاعری میں "جعفری" تخلص کرتا تھا۔ صاحب تصانیف تھا، اس کی تصانیف میں حسب ذیل تصانیف کا پتا چلتا ہے۔

(۱) دیوان فارسی (۱۲۳۳ھ) (۲) دیوان اُردو (۱۲۶۱ھ) (۳) سفر نامہ جعفری (۱۲۶۰ھ) (۴) مکاتیب جعفری، یہ اُن خطوط کا مجموعہ ہے کہ جو اُس نے دمدمہ سے اپنی بیگمات کو لکھے تھے اس مجموعہ کو میر حسن علی خان نے مرتب کیا تھا۔ (۵) مثنوی مرزا صاحبان (۶) مثنوی مختار نامہ (۱۲۴۱ھ)

اس کی انگوٹھیوں کے دو نگ ملے ہیں، جن پر لکھا ہوا ہے۔[2]

۱۔ بندۂ آل علی میر محمد نصیر ۱۲۳۵ھ۔

۲۔ امام علی و محمد نصیر ۱۳۵۷ھ۔

میر حسن علی خان:

سرکار رفعت مدار میر حسن علی خان بن میر نصیر خان ٹالپور ۲۶ ذیقعدہ ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۵ء) کو حیدرآباد میں پیدا ہوا۔ حکومت حیدرآباد ختم ہونے کے بعد کلکتہ میں انگریزوں کی قید میں رہا۔ ۱۸۶۳ء میں یہ رہا ہو کر حیدرآباد پہنچا۔ ۱۵ ذوالحجہ ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) کو اس نے وفات پائی۔ چھ سال کے بعد اُس کی نعش حیدرآباد سے منتقل کر کے ۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) کو کربلائے معلیٰ میں دفن کی گئی۔

میر حسن علی خان نہایت ہوشمند اور صاحب علم و فضل تھا۔ اس کی حسب ذیل تصانیف ہیں:

(۱) لسان الحق فی میزان الصدق در جواب میزان الحق پادریٔ فنڈر۔ (۲) مختار نامہ (منظوم سندھی) دو جلد میں۔ (۳) رویائے صادقہ (نثر و نظم فارسی)۔ (۴) نہر البکا (سندھی سلام و مرثیے)۔ (۵) مثنوی

---

[1] برصغیر کی خواتین پر انگریزوں کے مظالم مضمون سید مصطفیٰ علی بریلوی، مطبوعہ اخبار حریت ۱۲ فروری ۱۹۲۸ء بحوالہ کیپٹن ایسٹوک سندھ کا سول انڈیا بل ۱۸۵۸ء کا ضمیمہ اول ص ۸۴-۸۵ سے ماخوذ ہے۔

[2] مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۱۰۷-۱۱۱ سے ماخوذ ہے۔

فتح نامہ سندھ (سندھی) ترجمہ فتح نامہ فارسی، تالیف میر صوبدار خان میر- (۶) احسن البیان (اردو نثر) در جواب رسالہ تحقیق الایمان از پادری عماد الدین پانی پتی- (۷) رد خوارج (سندھی) در جواب ۳۲ سوالات میر محمد علی خان دربارۂ مسائل عزاداری- (۸) مجموعہ خطوط (فارسی) در جواب مکاتیب پادری فنڈر (۹) حالات شکار: میر حسن علی خان شکار کا بے حد شوقین تھا۔ اس نے دو جلدوں میں اپنے شکار کے حالات اور تجربات لکھے ہیں۔ (۱۰) مثنوی حملہ حیدری معروف بہ شہنشاہ نامہ (سندھی)- (۱۱) دیوان مناجات و منقبت- (۱۲) دیوانِ قصائد- (۱۳) مراثی

اس کی انگوٹھی پر یہ سجع کندہ تھا:

آسودہ بر سریر امارت بہ خوشدلی
فخر ملوک ظل الٰہی حسین علی[1] (۱۲۵۴ھ)

میر عباس علی خاں مومن:

میر عباس علی خاں بن میر نصیر خاں جعفری لقب سرکار شوکت مدار تھا، شاعر تھا اور مومن تخلص کرتا تھا۔ اس کا فارسی دیوان تھا، جو اس کے بیٹے میر عبدالحسین کی وفات کے بعد ضائع ہو گیا، البتہ اس کی ایک مثنوی ملتی ہے، جو صاحب تکملہ مقالات الشعرا نے کسی خطی بیاض سے تکملہ مقالات الشعرا میں بجنسہ نقل کر دی ہے۔

میر عباس علی خاں نے کلکتہ میں بعمر ۲۸ سال ۸ رجب ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) میں وفات پائی۔[2]

میر حسین علی خاں:

میر حسین علی خاں بن میر نور محمد خاں بن میر مراد علی خاں کا لقب سرکار دولت مدار اور تخلص حسین تھا۔ نظم و نثر فارسی، سندھی اور اردو میں مہارت رکھتا تھا۔ اس کی تصانیف یہ ہیں:

(۱) مناقب علوی: (فارسی نثر)
(۲) شاہد الامت: (فارسی)
(۳) لب لباب: (فارسی نثر)
(۴) دیوان حسین: (فارسی اور اردو)
(۵) دیوان حسین: (اردو)

یہ تین سجع اس کی مہر پر کندہ تھے:

(۱) کرد روشن زفیض لم یزلی
آفتاب جہاں حسین علی
(۲) بروز حشر مددگار او علی ولی
زفیض نور محمد زہی حسین علی
(۳) زنور محمد بود منجلی
چراغ مراد حسین علی

۲۶ ربیع الاول ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) کو میر حسین علی نے وفات پائی۔ اس کا مزار ٹالپوروں کے گنبد میں میر کرم علی خاں کے مزار کے متصل حیدرآباد میں واقع ہے۔[3]

میر صوبدار خاں:

سرکار حشمت مدار میر صوبدار خاں بن میر فتح علی خاں فاتح سندھ مذہباً اہل سنت و جماعت میں سے تھا۔ ماہر سخن سنج اور بلند پایہ شاعر اور صاحب تالیف و تصنیف تھا۔ میر تخلص کرتا تھا۔ اس کا سیاسی کردار گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے۔ ٹالپوروں کی حکومت ختم ہونے کے بعد اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ یہ بھی قید کر کے کلکتہ بھیجا گیا۔ ۱۴ رجب ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) کو اسی قید و بند میں اس نے وفات پائی۔ اس کی نعش کلکتہ سے لا کر اس کے باپ کے مزار کے پہلو میں خدا باد (متصل ہالا) دفن کی گئی۔ اس کی قبر پر یہ کتبہ نصب ہے:

وفات حضرت جنت مکان میر صوبدار خاں
علیہ رحمتہ- تاریخ چہار دہم ماہ رجب ۱۲۶۲ھ

اس کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

(۱) خمسۂ میر صوبدار حسب تفصیل مثنویات پر مشتمل ہے۔ مثنوی سیف الملوک، (تالیف ۱۲۴۷ھ) مثنوی فتح نامہ: یہ مثنوی کلہوڑوں اور ٹالپوروں کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۲۴۴ھ ہے۔ مثنوی خسرو شیریں: تالیف ۱۲۵۱ھ- مثنوی ماہ و مشتری: (تالیف ۱۲۵۵ھ) مثنوی جدائی نامہ: یہ مثنوی میر صوبدار نے کلکتے میں ۱۲۶۰ھ میں لکھی۔ اس کا ایک مخطوطہ کتاب خانہ بانکی پور میں اور ایک نسخہ ذخیرہ ٹالپوران میں موجود ہے۔

---

(1) یہ تمام تفصیل حاشیہ نمبر ۲ تکملہ مقالات الشعراء، مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۵۹۸-۵۹۹ سے ماخوذ ہے۔

(2) تکملہ مقالات الشعراء، ص ۷۴۷۔

(3) تکملہ مقالات الشعراء، ص ۷۵۵-۷۵۶۔

(۲) خلاصۃ التداوی: یہ کتاب طب یونانی پر ہے (۳) دیوان میر یہ دیوان ۱۲۴۰ھ میں مرتب ہوا، اس سے پہلے میر صوبدار کے تین دیوان گم ہو چکے تھے۔

میر صوبدار کے حسب ذیل سجع تھے۔

۱۔ ظل احمد تاج فرق صوبدار۔

۲۔ صوبدار جہاں ز فتح علی

اس کی انگوٹھی پر یہ سجع کندہ تھا:

صوبدارم من از نبی ول ولی ۱۲۵۸ھ۔[1]

میر محمد علی خاں:

سرکار ذوالاقتدار میر محمد علی خاں بن میر صوبدار خاں ۱۴ صفر ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء) میں پیدا ہوا، شاعر تھا اور بہرور تخلص کرتا تھا۔ اس نے یکم رجب ۱۲۷۸ھ (۶۲-۱۸۶۱ء) کو کلکتہ میں وفات پائی۔ اس کی تصانیف میں دو مثنویاں ہیں (۱) دستان رزم نادر شاہ (۲) قصہ رزم نامہ شیر۔[2]

میر شہداد خاں حیدری:

میر شہداد خاں بن میر نور محمد خاں اپنے والد کی وفات کے بعد حیدرآباد کی چوپاری حکومت میں شریک ہوا، ۱۸۴۳ء میں جب سندھ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تو انگریزوں نے دوسرے میران حیدرآباد کی طرح اسے بھی اسیر کیا اور سورت میں قید کر دیا۔ اس پر کیپٹن انس کے قتل اور فرنگیوں کے کیمپ میں آگ لگانے کا الزام تھا، لیکن جب اس مقدمے کی تحقیقات ہوئی تو لارڈ ڈلہوزی نے اسے بے قصور قرار دیا اور کلکتہ جانے کی اجازت دی۔ ۷ محرم ۱۲۸۴ھ (۲۸ اگست ۱۸۵۷ء) کو اس نے وہیں وفات پائی۔ اس کی نعش حیدرآباد لائی گئی اور ٹالپوروں کے قبرستان میں اپنے والد کے مزار کے پہلو میں مدفون ہوا۔ یہ کتبہ اس کی قبر پر کندہ ہے:

تاریخ وصال مرحوم میر صاحب میر شہداد خان

تالپر علیہ رحمۃ۔ ہفتم ماہ محرم ۱۲۷۴ھ

یہ دو سجعے اس کی انگوٹھی پر کندہ تھے:

(۱) خاک پائے مرتضیٰ شہداد خاں ۱۲۴۹ھ

(۲) خاک پائے مصطفیٰ و مرتضیٰ شہداد خان

سربلند از فضل حق پیوستہ باشد در جہان ۱۲۵۶-۱۲۵۷ھ۔ شاعر تھا اور حیدری تخلص کرتا تھا۔ اس کا دیوان، دیوان حیدری کے نام سے موسوم ہے جس کا ایک نہایت خوش خط مخطوطہ جو میاں نور محمد انور بن میاں عبدالقادر "جوہری" سیوستانی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، یہ نسخہ اس نے ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) مقام دمدم کلکتہ میں میر حسین علی خاں ٹالپور کے لیے لکھا تھا۔ ٹالپوروں کے کتب خانے حیدرآباد میں موجود ہے۔[3]

میر یار محمد خاں:

میر یار محمد خاں بن میر مراد علی خاں اگرچہ شاعر نہ تھا، لیکن فارسی نثر لکھنے میں اساتذہ کا درجہ رکھتا تھا۔ اس نے مسٹر فریئر[4] کمشنر سندھ کی خواہش پر فریئر نامہ کے نام سے ایک کتاب تاریخ سندھ پر لکھی تھی، جس میں ٹالپور عہد حکومت کے حالات نہایت تحقیق سے لکھے ہیں۔ میر یار محمد خاں نے ۲۱ رمضان ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲ء) میں وفات پائی۔[5]

میر سہراب خان - میرانِ خیرپور

۱۱۹۹ھ (۱۷۸۴ء) تا ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۰ء)

میر سہراب خاں:

میر سہراب خاں بن چاکر خاں (متوفی ۱۱۸۰ھ) بن شہداد خاں (متوفی ۲ رجب ۱۱۴۷ھ) بن ہوتک خاں (متوفی ۱۱۳۰ھ) بن ککو خاں یا ککہ خاں عرف سلیمان خاں ٹالپور (متوفی ۱۱۰۰ھ) حکومت خیرپور کا مؤسس اول اور پہلا فرمانروا تھا یہ ۱۷۴۵ء میں پیدا ہوا، اپنے گھرانے کے رسم و رواج کے مطابق تعلیم و تربیت حاصل کی، اور میران سندھ کے ساتھ ان تمام معرکوں میں شریک ہو کر داد شجاعت دیتا رہا جو اس زمانے

---

(1) میر صوبدار کے متعلق یہ تمام تفصیل تکملہ مقالات الشعراء، ص ۵۶۳-۵۶۴ و حواشی تکملہ مقالات الشعراء، ص ۵۶۴-۵۸۰ سے ماخوذ ہے۔

(2) تکملہ مقالات الشعراء، ص ۷۳۱-۷۳۲۔

(3) حاشیہ (۱) تکملہ مقالات الشعراء، مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۱۵۹-۱۶۰۔

(4) سر بارٹل فریئر: ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) میں بمبئی سے سندھ کا گورنر مقرر ہو کر آیا۔ اسی نے سندھی کا عربی رسم الخط اختراع کیا اور اس کے املا میں اصلاحیں کیں، سندھ میں مکاتب و مدارس قائم کیے اور دفاتر میں فارسی زبان ختم کر کے سندھی کو دفتری زبان بنایا۔ ۱۸۵۶ء میں یہ طویل رخصت لے کر سندھ سے چلا گیا (لب تاریخ سندھ، ص ۱۶۳-۱۶۵)۔

(5) تعلیقات تکملہ مقالات الشعراء، مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۷۴۷۔

میں پیش آئے۔ ۱۷۸۴ء میں جیسا کہ گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے ٹالپوروں نے انتظامی لحاظ سے سندھ کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ اس وقت خیرپور کا علاقہ میر سہراب خاں کے حصے میں آیا، جہاں اُس نے اپنی باقاعدہ حکومت قائم کی۔

قلعہ احمد آباد (کوٹ ڈیجی) کی تعمیر:

چونکہ وہ نہایت ہی دور اندیش اور بیدار مغز فرمانروا تھا، اُس نے بیرونی دشمنوں سے حفاظت اور مدافعت کے لیے خیرپور سے پندرہ میل کے فاصلے پر قصبہ احمد آباد جو آج کل کوٹ ڈی جی کہلاتا ہے، پہاڑی کے اوپر ایک مستحکم قلعہ تعمیر کرایا، چاروں طرف فصیل اور پہاڑیوں پر مورچے بنائے گئے، یہ قلعہ آج بھی کوٹ ڈی جی میں موجود ہے۔

عوام کی معیشت کو بہتر بنانے کی طرف توجہ:

دفاعی انتظام سے فارغ ہو کر میر سہراب خان نے عوام کے وسائل معیشت کو بہتر بنانے کی طرف توجہ دی۔ اُس زمانے میں عوام کی معیشت کا اکثر مدار زراعت اور کھیتی باڑی پر تھا، مگر اس علاقے میں پانی کم یاب تھا۔ میر سہراب خاں نے کاشتکاروں کی خوش حالی کے لیے، "میر واہ" کے نام سے ایک نہر کھدوائی، جو آج تک موجود ہے۔

فتوحات کی وسعت:

اپنے علاقے کے نظم و نسق کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے علاقے کو وسیع کرنے کی بھی کوشش کی۔ دریا پار افغانوں کے کچھ پرگنوں کو جو موغلی کے نام سے موسوم تھے اور بلوچ علاقوں کو جو پڑدیکہ کہلاتے تھے انہیں بزور شمشیر فتح کیا، ملحقہ علاقوں کے چند مقامات جن میں سکھر، نوشہرہ، روپاہ اور شاہ بیلہ وغیرہ شامل تھے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ شکارپور کا ضلع اور دوسرے شمالی علاقے جو میران سندھ کی متحدہ کوششوں سے فتح ہوئے تھے، ان کا تہائی حصہ بھی میر سہراب خاں کو ملا تھا۔ اس طرح اس کی حکومت کا دائرہ اور بھی وسیع ہو گیا۔ نواب محمد صادق خاں والیٔ بہاولپور کے مقابلے کے لیے اُچ شریف کے سادات کی شکایت کی بنا پر میران سندھ نے جب اپنی فوجیں بھیجیں تو نواب نے مقابلے کی تاب نہ پا کر صلح کر لی اور سادات اُچ کے حقوق بحال کر دیے اور سبزل کوٹ کا پرگنہ میران سندھ کے نذر کیا، خاص سبزل کوٹ قصبہ میر سہراب خاں کے حصے میں آیا، اس طرح خیرپور کا علاقہ اور بھی بڑھ گیا۔[1]

گوشہ نشینی:

میر سہراب خاں اپنی وفات سے کچھ سال پہلے حکومت کے نظام کو اپنے بیٹوں کے سپرد کر کے خود احمد آباد (کوٹ ڈیجی) میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ۱۸۲۹ء میں جب کہ میر سہراب خاں کی عمر ۸۹ سال کی تھی اس نے ایک وصیت نامہ مرتب کیا تھا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ: میں نے اپنا مفتوحہ و مقبوضہ ملک اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا ہے اور ہر ایک کو اس کے علاقے کی سند دے دی ہے۔ یہ وصیت نامہ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ میرے فرزندوں میں باہم کشمکش اور تصادم نہ ہو اور میرے خاندان میں صلح و آشتی باقی رہے۔ نیز خاندان ٹالپور کے دوسرے حکمرانوں اور بلوچ سرداروں کو معلوم ہو جائے کہ یہ ملک میری وصیت کے مطابق میری اولاد کے قبضے میں ہے۔ میری وفات کے بعد گدی اور دستار میرے بڑے بیٹے رستم خاں کو ملے گی، اس کے بعد میر مبارک خاں کو اور اس کے بعد میر علی مراد خاں کو۔

یہ وصیت نامہ ۱۲۴۴ھ (۴ فروری ۱۸۲۹ء) میں لکھا گیا۔[2]

وفات:

لب تاریخ سندھ میں ہے کہ میر سہراب خاں نے تقریباً ۴۷ سال حکومت کرنے کے بعد اپنے مقبوضہ ملک کو اپنے تین فرزندوں میں تقسیم کر دیا۔ چنانچہ دو حصے میر رستم خاں کو، ایک حصہ میر مبارک خاں کو اور ایک حصہ میر علی مراد خاں کو دیا اور خود گوشہ نشین ہو گیا۔

۲۷ صفر ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۰ء) میں جب کہ میر سہراب خاں کی عمر نوے سال کی تھی اس نے اپنے محل کے دریچے سے گر کر وفات پائی۔ حسب ذیل مصرعوں سے اس کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

۱۔ طشت از بام افتاد----

۲۔ سخی ولی میر سہراب بود----

صاحب تازہ نوائے معارک نے میر سہراب خاں کے اوصاف و اخلاق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ:

> عجب میر ممدوح کامل صفات و دانای زمانہ بود، بلکہ اسم اعظم در جبین نور آگین خود داشت، در ملک داری و غریب پروری و قدر شناسی و اشراف نوازی و مسافر پروری ضرب المثال عالم

---

[1] یہ تمام تفصیل تاریخ خیرپور، مرتب: نسیم امروہوی، ص ۴۱-۴۳ سے ماخوذ ہے۔

[2] یہ تمام تفصیل تاریخ خیرپور، مؤلف نسیم امروہوی، ص ۴۳-۴۴ سے ماخوذ ہے۔

تواں گفت۔[1]

اولاد:

میر سہراب خاں نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی بیگم کے بطن سے اس کے چار فرزند تھے، جن کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ میر رستم خاں: جس کی اولاد آجکل نارے کے قریب تعلقہ روہڑی کے مقام جنوبی میں آباد ہے۔

۲۔ میر غلام حیدر خاں: جس کی اولاد کوٹ میر محمد تعلقہ روہڑی میں رہتی ہے۔

۳۔ میر مبارک خاں: اس کے ورثا کندھرا اور ٹھٹھی تعلقہ روہڑی میں سکونت پذیر ہیں۔

۴۔ میر چاکر خاں: اس کے اخلاف پیر گوٹھ کے قریب راہوجے میں سکونت رکھتے ہیں۔

دوسری بیگم سے صرف ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام میر علی مراد خاں رکھا گیا، ان کی اولاد خیرپور میں آباد ہے اور ہز ہائنس میر علی مراد خاں دوم موجودہ نواب ریاست خیرپور ان ہی کی اولاد میں ہیں۔[2]

میر رستم خان

۱۲۴۶ھ (۱۸۳۰ء) تا ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء)

میر رستم خان:

میر سہراب خاں کی وفات کے بعد میر رستم خاں صاحب دستار ریاست ہوا۔ خیرپور کی یہ حکومت بھی ایسی ہی تھی، جیسی حیدرآباد کی چویاری حکومت تھی۔

میر سہراب خاں نے اپنی اولاد کے درمیان ریاست کی تقسیم اس لیے کی تھی کہ ان میں باہمی کوئی اختلاف رونما نہ ہو اور اس کے سب بیٹے اپنے اپنے حصوں پر قابض ہو کر صلح و آشتی سے رہیں، لیکن اس پیش بندی کے باوجود اس کے بیٹوں میں اختلاف کی آگ بھڑکی۔ صاحب تازہ نوائے معارک نے اس کی تفصیل دیتے ہوئے لکھا کہ میر سہراب کی وفات کے بعد اس کی اولاد میں فتنہ و فساد اور نفاق و عناد کی آگ بھڑکی۔ میر مبارک خاں نے جو نہایت ہی فصیح اللسان اور بلیغ البیان تھا، اس نے اپنی چرب زبانی سے میر علی مراد خاں کو شیشے میں اُتار لیا اور مختلف انداز میں اُسے میر رستم علی خاں کے خلاف بھڑکایا، ادھر اپنے بیٹوں میر محمد علی خاں، میر فضل محمد خاں اور میر علی محمد خاں اور خود کو نہایت تدبیروں سے میر علی مراد خاں کی ملازمت میں منسلک کیا۔

اور ملازمت کی جاگیرات کے عوض ہبر لو کا علاقہ میر علی مراد خاں سے حاصل کر لیا۔ کبھی یہ اپنے آپ کو میر علی مراد خاں کا وزیر بتاتا تھا، اور کبھی اس کی خدمت گزاری کے لیے پیادہ وار دوڑتا پھرتا تھا۔ وہ بلوچوں کا لشکر اپنے لیے اور میر مراد علی خان کے لیے جمع کر رہا تھا اور اس بہانے سے میر علی مراد خاں سے خوب روپیہ اینٹھ رہا تھا۔ شب و روز خیرپور کے بازاروں اور کوچوں میں شمشیر اور تلواروں کی آوازیں بلند ہوتی تھیں، اور وہ فوج جو اس نے میر علی مراد خاں کے روپے سے جمع کی تھی، عمدہ کھانے اور بھنگ کے پیالے پی کر خوب موٹی ہو رہی تھی۔ اس طرح وہ ایک زمانے تک خوشامد و چاپلوسی اور چالبازیوں سے آہستہ آہستہ روپیہ، ہتھیار، مرصع شمشیریں، سونا، چاندی اور بہترین لباس میر علی مراد خاں کے توشک خانے سے حاصل کرتا رہا، لیکن چند دنوں میں میر علی مراد خاں نے محسوس کر لیا کہ میر مبارک خاں دوستی کے پردے میں اس سے دشمنی کر رہا ہے۔ اس لیے میر علی مراد خاں اپنی حشم و خدم کے ساتھ احمد آباد (کوٹ ڈیجی) چلا گیا اور وہیں سکونت اختیار کر لی، لیکن اس کے باوجود اختلاف اور نفاق کی آگ جو روشن ہو چکی تھی وہ بھڑکتی رہی۔

ہر چند میر رستم خاں جو صاحب دستار ریاست تھا، اس اختلاف کی آگ کو ٹھنڈی کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن دلوں میں جو گرہ بیٹھ گئی تھی وہ دور نہیں ہوتی تھی اور یہ سب سندھ کی خرابی کے آثار تھے۔

میر رستم خاں کے انگریزوں سے معاہدے:

میر رستم خاں انگریزوں سے اچھے تعلقات رکھنے میں اس درجہ غلو کیے ہوئے تھا کہ وہ اس کی پروا کیے بغیر کہ ان معاہدوں کا اس کے ملک پر کیا اثر مرتب ہوگا، اس نے انگریزوں سے آنکھ بند کر کے کئی معاہدے کیے۔

معاہدہ ۱۰ جنوری ۱۸۳۹ء:

۱۰ جنوری ۱۸۳۹ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے میر رستم خاں والیٔ

---

(1) تازہ نوائے معارک، ص ۲۶۷-۲۶۸۔

(2) یہ تمام تفصیل تاریخ خیرپور، مؤلف: نسیم امروہوی، نمبر مارچ ۱۹۵۸ء ص ۴۳ سے ماخوذ ہے۔

خیرپور سے حسب ذیل معاہدہ کیا۔

۱۔ حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر رستم خاں ٹالپور اور اس کے ورثا اور جانشینوں کے درمیان اس معاہدے کی رو سے ہمیشہ دوستانہ تعلقات نسلاً بعد نسل قائم رہیں گے اور ہر ایک کا دوست و دشمن دوسرے کا دوست و دشمن سمجھا جائے گا۔

۲۔ انگریز حکومت، خیرپور اور اس کے حدود کی ہمیشہ محافظت کرے گی۔

۳۔ میر رستم خاں اور اس کے اخلاف اور جانشین ہمیشہ انگریز حکومت کی رائے کے مطابق کام کریں گے اور اس کی پوری اطاعت کریں گے اور انگریزی حکومت کے سوا کسی دوسری حکومت یا سردار سے کوئی رابطہ نہ رکھیں گے۔

۴۔ امیر مذکور اور اس کے ورثا و جانشین بغیر انگریز حکومت کی منظوری کسی حکومت یا کسی سردار سے کوئی عہد و پیمان نہ کریں گے، البتہ اپنے دوستوں اور رشتے داروں سے نوشت و خواند کر سکتے ہیں۔

۵۔ انگریزی حکومت بہ وقت ضرورت میر موصوف کو رقمی اور فوجی امداد دے گی تاکہ اندرون سندھ اور بیرون سندھ امن و امان برقرار رہے۔ لیکن انگریزی حکومت کبھی بھی میر موصوف اور اس کے جانشینوں کے مقبوضہ علاقوں اور ان کے قلعوں پر جو دریا کے اس طرف ہیں قبضہ نہ کرے گی۔

۶۔ امیر اور اس کے ورثا و جانشین کسی پر ظلم و ستم نہ کریں گے اور اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے گا تو اس کا فیصلہ انگریزی حکومت کرے گی۔

۷۔ امیر موصوف اور اس کے ورثا و جانشین اپنے ملک کے خود مختار حاکم ہوں گے اور انگریز حکومت کے حکام ان کے اختیارات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کریں گے، و نیز امیر موصوف کی نسبت رعایا، خدمتگاروں اور اقربا کی اگر کوئی شکایت اور استغاثہ پیش ہوگا تو انگریز حکام اس میں دخل نہ دیں گے، اور نہ ایسی شکایات کو سنیں گے۔

۸۔ میر رستم خاں سندھ میں تجارت کو فروغ دینے کے لیے اور تاجروں کی آمد و رفت کو دریائے سندھ سے بڑھانے کے لیے وعدہ کرتا ہے کہ وہ تاجروں کی آسائش کے لیے کافی سہولتیں دے گا۔

۹۔ دوستی اور تعلقات کو بڑھانے کے لیے حکومت خیرپور اور حکومت انگریزی کے درمیان طے پایا کہ انگریزوں کا ایک وکیل دربار خیرپور میں رکھا جائے گا اور دربار خیرپور بھی اگر چاہے تو اپنا ایک وکیل دربار حکومت انگریز میں بھیج سکتا ہے، لیکن انگریزی حکومت کے وکیل کو حق ہوگا کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنی سکونت بدلتا رہے اور اس کی حفاظت کے لیے حکومت ہند مناسب تعداد میں اپنی مرضی کے مطابق محافظ مقرر کرے گی۔

یہ معاہدہ بحیثیت سفیر جارج آکلینڈ گورنر جنرل، کرنل سر اسکندر برنس نے مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۸۳۸ء ۶ شوال ۱۲۵۴ھ کو لکھا، اور ۱۰ جنوری ۱۸۳۹ء کو گورنر جنرل کی طرف سے بمقام لشکر گاہ بھاگا بورانا ایچ ٹارنس سکریٹری گورنمنٹ ہندوستان نے اس پر دستخط کیے۔[1]

اس معاہدے کو غور سے پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ انگریزوں نے اپنا تسلط قائم کرنے کی کس طرح کوشش کی ہے اور مزید تعجب اس پر ہے کہ میر رستم خاں نے اس معاہدے کو کس طرح اپنے لیے قابل قبول سمجھا۔ پھر جو ضمیمہ اس معاہدے میں شامل کیا گیا وہ انگریزوں کی دھاندلی کی ایک ادنیٰ سی مثال ہے، جس کا ترجمہ ہم ذیل میں دیتے ہیں:

ضمیمہ معاہدہ ۱۰ جنوری ۱۸۳۹ء:

چونکہ انگریز حکومت نے معاہدہ کیا ہے کہ وہ حکومت خیرپور کے موجودہ اور آیندہ دشمنوں سے حفاظت کرے گی اور دریائے سندھ کے اس طرف اور اس طرف کے قلعوں پر تصرف نہ کرے گی۔ اس بنا پر میر رستم خاں اور اس کے اخلاف اقرار کرتے ہیں کہ جنگ کے اوقات میں اگر گورنر جنرل ہند قلعہ بکھر کو اسلحہ اور خزانے کی حفاظت کے لیے اپنے تصرف میں لائے تو میر خیرپور کو اس پر اعتراض نہ ہوگا۔

دستخط اسکندر برنس ایجنٹ گورنر جنرل و میر رستم خاں

۲۴ دسمبر ۱۸۳۸ء ۶ شوال ۱۲۵۴ھ۔

میران سندھ کی نااتفاقیاں:

گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے کہ جب تک میر کرم علی خاں اور میر مراد علی خاں والیٔ حیدرآباد اور میر سہراب خاں والیٔ خیرپور حیات تھے یہ سب اپنی دور بینی اور عاقبت اندیشی سے انگریزوں کے سیلاب کو روکے ہوئے تھے، انگریز جب کوئی تحریک سندھ میں اپنے قدم جمانے کے لیے کرتے تھے تو یہ اپنی صائب تدبیروں سے اس کو ٹالتے رہتے تھے، لیکن ان کی وفات کے بعد جب زمام حکومت ان کے اخلاف میر نور محمد خاں اور میر محمد نصیر خاں والیانِ حیدرآباد اور میر رستم خاں اور میر مبارک خاں اور میر علی مراد خاں والیانِ خیرپور نے سنبھالی تو ان میں

---

[1] یہ تمام معاہدہ تعلیقات تازہ نوائے معارک، مرتب: آقائے عبدالحی حبیبی، ص ۹۶۶-۹۶۸ سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

دستار بندی اور دستار ریاست کے جھگڑے پیدا ہوئے اور آپس میں کینہ و فساد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اتفاق کی جگہ نا اتفاقی اور نفاق نے لی، ان کے آپس کے اختلاف سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا جس کا تذکرہ ہم گزشتہ اوراق میں "میرانِ سندھ میں افتراق" کے ذیلی عنوان کے تحت کر آئے ہیں۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ انگریزوں نے خراسان سے ناکام واپس آنے کے بعد سکھر اور شکارپور (سندھ) میں جو چھاؤنیاں بنوائی تھیں، انہیں توڑ دیا تھا، اس سے ان کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ انگریز اب سندھ میں رہنا نہیں چاہتے، اس شعبدہ گری کے بعد انہوں نے میرانِ سندھ سے مطالبہ کیا کہ وہ کراچی بندر، قلعہ بکھر اور کیتہ انہیں دے دیں، لیکن میران سندھ نے اس مطالبے کے ماننے میں نہ صرف لیت و لعل کیا، بلکہ وہ انگریزوں کے لشکر پر شب خون مارنے کی تیاریاں کرنے لگے، انگریز ان کے ارادوں سے بے خبر نہ تھے، وہ خفیہ طور پر جابجا اپنی فوجیں لگائے ہوئے تھے، آخر ۲۴ نومبر ۱۸۴۲ء کو گورنر بمبئی نے ایک نئے معاہدے کا مسودہ سندھ کے انگریز عہدہ داروں کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ وہ میرانِ سندھ سے اس معاہدے پر دستخط لیں، میران حیدرآباد سے جو معاہدہ لیا گیا وہ گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے، میرانِ خیرپور سے اسی تاریخ میں جو معاہدہ کیا گیا، ہم اس کو بھی یہاں نقل کرتے ہیں۔

میرانِ خیرپور سے معاہدہ:

۴ نومبر ۱۸۴۲ء

۱۔ پرگنہ بھونک بھیرہ، ایک تہائی سبزل کوٹ، قریہ گھونگی، ملادر، چونگا، دادولہ، اور عزیز پور وغیرہ اور دوسری اراضی جو اب روہڑی اور بہاولپور کی سرحدات کے درمیان واقع ہے ہمیشہ کے لیے نواب بہاولپور کو دی جاتی ہے۔

۲۔ شہر سکھر، اور جزیرۂ بکھر اور دوسرے متصلہ جزیرے اور قصبہ روہڑی ان شرائط پر جن کو سر چارلس نیپیر منظور کرے گا، ہمیشہ کے لیے یہ علاقے انگریز گورنمنٹ سے متعلق ہوں گے۔

۳۔ وہ کمشنر جو میجر سر چارلس نیپیر کی طرف سے اس معاہدے اور دوسرے معاہدات پر جو میران حیدرآباد سے ہوئے ہیں، عمل کرائے گا، وہ زائد مالیات کو ان معاہدات کے بموجب کم کر دے گا، یا اس کے عوض میں دوسری اراضی بموجب مالیات دے گا۔ و نیز میرانِ خیرپور میر رستم خاں و میر نصیر خاں کے ساتھ اس معاہدے کے بموجب تقسیم اراضی میں ان کے منافع کو ملحوظ رکھے گا اور ان کی کمی اور نقصان کی تلافی کرے گا۔

۴۔ چونکہ امرائے خیرپور نے بموجب معاہدہ ۲۴ دسمبر ۱۸۳۸ء، تاجروں کو سہولت پہنچانے اور دریائے سندھ میں تجارتی کشتیوں کی آمد و رفت اور تجارت کو توسیع دینے کا عہد کیا ہے اور اسی طرح میرانِ حیدرآباد نے بروئے معاہدہ ۱۸۳۹ء عہد کیا ہے کہ وہ تجارتی مال جو کشتیوں کے ذریعے انگریزی لشکر گاہوں میں لایا جائے گا، ان سے محصول نہیں لیا جائے گا، اس بنا پر امرائے خیرپور بھی مقررہ معاہدہ ۱۸۳۸ء کو قبول کریں گے اور اس پر عمل کریں گے۔

۵۔ خیرپور میں صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈھالے ہوئے روپے یا وہ سکے جن کو بعد میں طے کیا جائے رائج ہوں گے۔

۶۔ سلطنت برطانیہ وقتاً فوقتاً خیرپور کے لیے سکے ڈھالے گی کہ جس کے ایک طرف شاہ انگلینڈ کی تصویر اور دوسری طرف وہ تحریر منقوش ہوگی جو امرائے خیرپور چاہیں گے۔

۷۔ بجنسہ شرط نمبر ۴ کے مطابق جو معاہدہ میرانِ حیدرآباد سے ہوا۔

۸۔ بجنسہ شرط نمبر ۵ کے مطابق جو معاہدہ میرانِ حیدرآباد سے ہوا۔

۹۔ بجنسہ شرط نمبر ۶ کے مطابق جو معاہدہ میرانِ حیدرآباد سے ہوا۔

۱۰۔ سلطنت انگریزی ان تمام دعووں سے قطع نظر کرتی ہے جو شاہ شجاع کے نذرانے اور سالانہ خراج جو میر مبارک خاں مرحوم اور اس کے فرزندوں میر نصیر خاں اور میر مبارک خاں کے دوسرے اخلاف پر ہیں۔[1] (۴ نومبر ۱۸۴۲ء شملہ)

یہ انگریزوں کے ایک دو معاہدے جو انہوں نے میران سندھ سے کیے تھے ہم نے یہاں نقل کر دیے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بقول منشی عطا محمد شکارپوری مؤلف تازہ نوائے معارک کے کہ انگریزوں نے یکے بعد دیگرے متعدد معاہدے میرانِ سندھ سے کیے اور اس طرح انہوں نے ان معاہدوں کے جال میں میرانِ سندھ کو خوب جکڑ لیا، اگر ان معاہدوں کو یک جا کیا جائے تو ایک دفتر ہو جائے۔[2]

اس سے قبل ۱۸۳۸ء میں سرکار انگلشیہ سے خیرپور اور حیدرآباد سندھ کے حکمرانوں نے جو معاہدہ کیا تھا، اس میں انہوں نے تسلیم کیا تھا

---

(1) تعلیقات تازہ نوائے معارک مرتب آقائے جنبی، ص ۶۲۲۔

(2) تازہ نوائے معارک، ص ۶۱۴۔

کہ ان کا جو تنازع مہاراجا رنجیت سنگھ، یا شجاع الملک یا برٹش گورنمنٹ کے دوسرے حلیفوں سے ہوگا، اس کا فیصلہ انگریز حکام کریں گے اور اس فیصلے کو میران سندھ بخوشی تسلیم کریں گے۔ اس عہد نامے کی بنا پر خیرپور اور حیدرآباد سندھ کے لیے انگریز ریذیڈنٹ مقرر کیا گیا اور شکارپور اور سکھر کے علاقے انگریزوں کے تصرف میں دے دیے گئے۔

۱۸۳۹ء میں میر مبارک خاں کا انتقال ہوگیا، ان کے وارث، اس کے پانچ بیٹے میر نصیر خاں، میر محمد علی خاں، میر فضل محمد خاں، میر علی محمد خاں اور میر ولی محمد خاں ہوئے۔ اس کا بڑا بیٹا میر نصیر خاں صاحب دستار ریاست ہوا اور چونکہ میر علی مراد خاں کے علاقے اس کی کم سنی کے زمانے میں میر مبارک خاں کی نگرانی میں تھے اور اس نے اپنے بھائی کی جاگیرات میں تصرف کرلیا تھا، لہٰذا جب میر نصیر خاں صاحب ریاست ہوا تو وہ سابقہ جھگڑا پھر کھڑا ہوا، اور میر علی مراد خاں نے اس کے تدارک کے لیے میر نصیر خاں پر زور ڈالا، اس تنازع میں میر رستم خاں نے میر نصیر خاں کی طرفداری کی، جس کی وجہ یہ تھی کہ میر علی مراد خاں نے میر رستم خاں کے دیوان فتح محمد غوری کی بے عزتی کی تھی، جس کی وجہ سے میر رستم خاں کے دل میں میر علی مراد خاں سے کینہ تھا، جب یہ جھگڑا زیادہ بڑھا تو خیرپور کے پولیٹیکل ایجنٹ راس بیلی اس کی تحقیقات پر مقرر ہوا، راس بیلی نے میر نصیر خاں اور میر علی مراد خاں کے بیان سن کر میر علی مراد خاں کے حق میں فیصلہ کیا، لیکن ابھی یہ فیصلہ نافذ نہ ہوا تھا کہ راس بیلی کا تبادلہ کوئٹہ بلوچستان ہوگیا اور میجر اوٹرام اس کی جگہ مقرر ہوا، میجر اوٹرام نے بھی راس بیلی کے فیصلے کو بحال رکھا اور توثیق کے لیے یہ فیصلہ گورنر جنرل کے پاس بھیج دیا، گورنر جنرل نے اس فیصلے کی توثیق کردی، لیکن ابھی طرفین کو اس فیصلے کی اطلاع نہیں ملی تھی کہ میر نصیر خاں اور میر علی مراد خاں لڑائی کے لیے اپنے فوجی دستے لے کر نکلے۔ ستمبر ۱۸۴۲ء میں نونہار[1] کے قریب دونوں کا مقابلہ ہوا، جس میں میر نصیر خاں کو شکست ہوئی، آخر صلح کی گفتگو شروع ہوئی اور میر علی مراد خاں کو نو دیہات دے کر صلح کرلی گئی، ان میں سات دیہات میر رستم خاں کے اور دو دیہات میر نصیر خاں اور میر محمد خاں کے تھے۔

میر رستم خاں کو یہ سات دیہات اس لیے دینے پڑے کہ اس جنگ میں میر نصیر خاں کی طرف سے لڑتے ہوئے اس کا بیٹا میر غلام محمد اسیر ہوگیا تھا۔ اس کی آزادی کی خاطر میر رستم خاں کو یہ جرمانہ ادا کرنا پڑا، اگرچہ بظاہر یہ صلح ہوگئی تھی، لیکن طرفین کے دل ایک دوسرے کے خلاف بھرے ہوئے تھے۔ بات بات میں طرفین تلواریں نکال لیتے تھے اور خانہ جنگی شروع ہوجاتی تھی۔

آخر میر علی مراد خاں نے اپنے وکیل علی حسن کو انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کپتان براؤن کے پاس بھیجا کہ وہ ثالث بن کر اس نزاع کا تصفیہ کرکے ہر فریق کے حدود ملکیت کا تعین کردے۔ لیکن اس نے صاف جواب دے دیا کہ یہ کام آپ کا اور میر رستم خاں کا ہے۔ آپ کو خود آپس میں صلح کرلینی چاہیے۔

اس کے علاوہ خاندان کے چھوٹے چھوٹے جھگڑے بھی اس اختلاف پر اثر انداز ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں اس اختلاف کے بڑھنے کی ایک نئی شکل پیدا ہوئی۔ ہوا یہ کہ میر رستم خاں کی تین بیگمات کے بطن سے آٹھ بیٹے تھے ایک بیگم کے بطن سے میر محمد حسین خاں، میر علی اکبر خاں، میر مرید حیدر خاں۔ دوسری بیگم کے بطن سے میر علی مردان خاں، میر شیر محمد خاں، میر علی بخش خاں اور میر غلام محمد خاں، تیسری بیگم کے بطن سے میر دوست محمد خاں تھا۔ میر رستم خاں نے اپنے بڑے بیٹے میر محمد حسین خاں کو اپنا ولی عہد بنانا چاہا اور بلوچ سرداروں نے بھی اس کو منظور کرلیا تھا۔ لیکن میر رستم خاں کے دوسرے بیٹوں کو جب معلوم ہوا تو وہ نہایت برہم ہوئے اور انہوں نے اس تقرر کی نہایت مخالفت کی، اس موقع پر میر علی مراد خاں نے اپنے ان بھتیجوں کی حمایت کی جو تقرر ولی عہد کے مخالف تھے۔ اس واقعہ نے اور بھی میر رستم خاں اور میر علی مراد خاں کے دل میں اختلاف کی دیواریں کھڑی کردیں۔[2]

نونہار کی جنگ اور عہد نامہ:

میران خیرپور کے یہی اختلاف اور جھگڑے نونہار کی جنگ کا باعث بنے۔ آخرکار میران خیرپور میں نونہار کی جنگ واقع ہوئی، جس میں میر علی مراد خاں کے بارہ ہمراہی اور میر رستم خاں اور میر نصیر خاں کے ساٹھ سپاہی قتل ہوئے اور اس لڑائی میں میر نصیر خاں کا بھائی میر محمد علی خاں جو ہراول کی فوج میں تھا زخمی ہوکر میدان جنگ سے بھاگ گیا اور اپنے پچاس ساٹھ سپاہیوں کے ساتھ ٹیلوں کی آڑ میں چھپ گیا۔ جہاں میر علی مراد خاں کے سپاہیوں نے اسے گھیر لیا۔ میر علی محمد خاں زخموں اور بھوک پیاس سے اس قدر نڈھال تھا کہ اس نے اپنے میں تاب و

---

[1] نونہار: اصل میں نونار ہے، یعنی نمک بنانے کی جگہ، یہ مقام خیرپور میں ٹنڈو مستی کے قریب واقع ہے۔

[2] یہ تمام تفصیل تاریخ خیرپور، مؤلف: نسیم امروہوی، ص ۴۵-۴۶ سے دی گئی ہے۔

مقاومت نہ پاکر اپنے آپ کو میر علی مراد خاں کے حوالے کر دیا۔

جب میر رستم خاں کو محمد علی خاں کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا تو اُس نے اپنے لڑکے میر مراد علی خاں کو اپنی مہر دے کر میر علی مراد کے پاس اس کی لشکر گاہ میں بھیجا اور زبانی کہلایا کہ آپ جو فیصلہ کریں مجھے منظور ہے۔ میری مہر حاضر ہے، آپ فیصلہ لکھ کر مہر ثبت کر دیں۔ میر علی مراد خاں نے جواب دیا کہ اصل جھگڑے کا سبب یہ ہے کہ والد مرحوم نے تقسیم کے اعتبار سے جو علاقہ مجھے مرحمت فرمایا تھا، میری کم سنی کے زمانے میں اس کی بعض جاگیروں پر قبضہ کر لیا گیا۔ وہ گاؤں جن پر میرا حق ثابت ہے، وہ مجھے واپس کر دیئے جائیں، تو پھر کوئی فساد باقی نہ رہے گا، جب میر مراد علی یہ پیغام لے کر واپس آیا تو میر رستم خاں خود قرآن مجید لے کر میر علی مراد خاں کی لشکر گاہ میں گیا، قرآن مجید کو درمیان میں رکھ کر طے پایا کہ میر علی مراد خاں کے علاقے اُسے واپس کر دیے جائیں۔ لیکن ابھی اس عہد نامے کو کچھ زمانہ بھی نہ گزرا تھا کہ میر نصیر خاں اور میر رستم خاں نے اپنی توپوں کی مرمت شروع کرا دی اور دونوں چچا بھتیجے مل کر لڑائی کی تیاریاں کرنے لگے، تاکہ میر علی مراد خان سے مقابلہ کریں لیکن میر رستم خاں کے بڑے فرزند میر محمد حسین خاں نے اس جنگ کے لیے مستعدی نہیں دکھائی۔ میر رستم خاں نے قرائن سے اندازہ کر لیا کہ وہ اس جنگ سے گریز کر رہا ہے۔ اُس نے یہ محسوس کر کے واضح طور پر میر محمد حسین خاں کو کہلا بھیجا کہ تمہیں اس جنگ میں ضرور شریک ہونا ہے، اگر تم اس جنگ میں شریک نہ ہو گے تو میں تمہاری بجائے میر نصیر خاں کو اپنا ولی عہد اور ٹالپوروں کا رئیس بنا دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی میر رستم خاں نے اُن تمام بلوچ سرداروں کی جائیدادیں ضبط کر لیں، جنہوں نے میر علی مراد خاں کا ساتھ دیا تھا۔

میر علی مراد خاں بھی اپنے بھائی اور بھتیجے کی جنگی تیاریوں سے غافل نہ تھا، اس نے جب یہ دیکھا کہ پانی سر سے گزرتا جا رہا ہے تو وہ انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کپتان براؤن کے پاس گیا اور اُسے میر رستم کا وہ معاہدہ دکھایا جو اُس نے قرآن مجید پر لکھ کر میر علی مراد خاں کو دیا تھا، میر رستم خاں نے کلام مجید پر لکھ کر وعدہ کیا تھا کہ وہ میر علی مراد خاں کے غصب کردہ علاقے اُسے واپس کر دے گا۔ میر علی مراد خاں نے یہ معاہدہ دکھا کر کپتان براؤن سے کہا کہ اب میر رستم خاں اس معاہدے کی تعمیل اور میرے مقبوضہ علاقے واپس کرنے سے انکار کرتا ہے، میں نے سمجھانے کے لیے اپنی والدہ اور پھوپھی کو بھی اُس کے پاس بھیجا، لیکن وہ اس معاہدے کے ایفا کے لیے تیار نہیں۔

کپتان براؤن نے میر علی مراد خاں کی شکایت سن کر جواب دیا کہ یہ آپ دونوں کا خانگی معاملہ ہے۔ میرے لیے مناسب نہیں کہ میں اس میں دخل اندازی کروں۔

میر رستم خاں اور میر علی مراد کا یہ معاہدہ "معاہدۂ نونہار" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ عہد نامہ زبان فارسی میں قرآن مجید کے چار خالی صفحات پر تحریر کیا گیا تھا اور میرزا قلیچ بیگ نے تاریخ خیرپور میں اسے نقل کیا ہے۔ جس کی عبارت یہ ہے۔[1]

عہد نامہ نونہار:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین۔ انجام کردو عہد بست میر رستم تالپر با میر علی مراد خان تالپر آنکہ چوں فی مابین میر علی مراد خاں و میر نصیر خاں بہ مقدمۂ رنگ سندر بیلی (نام علاقہ) خرخشہ وقوع آمد، و زیادتی خرج سپاہ کردہ مستعد جنگ با میر نصیر خاں شدہ۔ آمدہ۔ دریں حال ایں جانب بنابر دفعیہ فساد طرفین و بعد نظر بر اخراجات و مبالغ نقد و جاگیرات میر مذکور کہ در تصرف سپاہ خود دادہ دیہات خانتاھن و ابیانی (یہاں علاقوں کی تفصیل ہے) بمرضی خود و میر نصیر خاں در دست میر علی مراد خاں دادم کہ آں را از ابتداء فصل خریف ۱۲۵۳ھ بہ تصرف خود آرد۔ و بر آں انجام وکیل خود دارم، و دستخط صاحبان انگریز ہم خواہم شد داد، و گاہے مزاحم دیہات مذکور نہ خواہم شد و پسران من خواہ میر نصیر خاں چہ برادرانش دعویٰ ملک نخواہند کرد، اگر کردند کاذب خواہند گشت، و آنچہ دیہات ہبر لوئی و ابری شاہ بیلہ و محمد اباغ و ہلانی حق و ملک میر علی مراد خاں در تصرف میر مبارک خاں بود، میر علی مراد خاں، بمعرفت صاحبان انگریز گرفتہ متصرف شدہ، میر نصیر خاں و اولاد او گاہے دعوی دار دیہات صدر بسر خود یا معرفت صاحبان انگریز ہرگز نخواہد شد، اگر شد کاذب است، و ایں جانب بمعہ پسران خود طرفدار میر علی مراد خاں خواہم بود کہ حق بطرف اوست، و رنگ سندر بیلی بموجب امانت ایشان بدست میر علی مراد خاں خواہم داد۔ دریں انجام تفاوت نیست و نخواہد شد۔ وکفی باللہ شہیدا۔ تحریر تاریخ نہم ماہ شعبان ۱۲۵۸ھ۔

---

[1] عہد نامہ مذکور ایک ایسی فارسی عبارت میں ہے، جو نہ ایرانی روزمرہ کے مطابق ہے نہ مغلوں کی فارسی ہے، شاید اس کا سبب یہ ہو کہ یہ عہد نامہ میدان جنگ میں یوں ہی کسی غیر مشتاق سے قلم برداشتہ لکھ لیا گیا ہو (حاشیہ تاریخ خیرپور، ج ۱، ص ۴۸ مؤلف: نسیم امروہوی صاحب)۔

صحی میر نصیر خان تالپر۔ صحی[1] رستم فقیر تالپر مہر[2] میر اکبر علی

خلاصہ: اس عہد کا متن یہ ہے کہ:

میر رستم خاں سے دوستی اور مصالحت کا عہد نامہ کرتے ہیں، چونکہ میر علی مراد خاں اور میر نصیر خاں کے درمیان درنگ سندر بیلی (کی جاگیر) کے متعلق تکرار ہے اور زیادتی میر نصیر خاں کی ثابت ہو چکی ہے، اور اس لیے میر علی مراد خاں نے میر نصیر خاں سے جنگ کرنے کے لیے فراہمی فوج اور جمع آوری لشکر پر لاکھوں روپے صرف کیے ہیں، لہٰذا اس فتنہ وفساد کو دور کرنے کے لیے اور اس بات پر نظر کرتے ہوئے کہ میر مذکور بہت سا روپیہ سپاہ پر صرف کرنے کے لیے مجبور ہوا ہے۔ دیہات خاں ناکھن اور ابیانی (تفصیل دیہات) اپنی اور میر نصیر خاں کی مرضی سے میر علی مراد خاں کو دیے جاتے ہیں کہ وہ انہیں فصل خریف ۱۲۵۳ھ سے اپنے تصرف میں لائے۔ ان شرائط کی تکمیل کے لیے میں نے اپنا وکیل بھی مقرر کر دیا ہے اور صاحبان انگریز کے دستخط بھی اس کاغذ پر کرا دیے جائیں گے۔ میں یا میری اولاد یا میر نصیر خاں اور اس کے بھائی ہرگز ان علاقوں کا دعوی نہ کریں گے، اگر کریں تو جھوٹے ہوں گے۔ علاوہ ازیں موضع ببر لوئی ابری وشاہ بیلہ، محمد اباغ اور ہلانی پر میر علی مراد خاں کا حق ثابت ہے اور یہ اسی کی ملکیت ہیں۔ ان دیہات پر میر مذکور نے صاحب انگریزی کی معرفت قبضہ کر لیا ہے۔ ان علاقوں پر کبھی نصیر خاں دعوی نہ کرے گا اور اگر اس سلسلے میں کوئی نزاع ہو گی تو میں میر علی مراد خاں کا طرفدار ہوں گا، کیونکہ حق اسی کی طرف ہے اور سندر بیلہ کی آمدنی امینوں کی معرفت میر علی مراد خاں کو پہنچائی جایا کرے گی۔ خدا اس اقرار پر شاہد ہے۔ ۹ شعبان ۱۲۵۸ھ۔[3]

مختصر یہ کہ میران سندھ کی نااتفاقیاں بڑھتی جاتی تھیں، اور انگریز ان کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر سندھ پر اپنا قبضہ جمانے کے لیے اپنا جال مضبوط کرتے جاتے تھے اور وہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔

چنانچہ ۲۴ ماہ نومبر ۱۸۴۲ء کو گورنر بمبئی کا سر چارلس نیپیر کے نام (جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے سندھ میں مختار کار اور گورنر سندھ تھا) حکم پہنچا کہ وہ جدید عہد نامے پر دستخط لے کر جلد از جلد روانہ کرے، چنانچہ اس نے میران سندھ سے اس معاہدے پر دستخط کرانے کے لیے جو کوششیں کیں وہ ہم گزشتہ اوراق میں "میرانِ حیدرآباد سے معاہدے" کے ضمن مین ذکر کر آئے ہیں۔ اس لیے یہاں انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ میجر اوٹرام نے جو میران حیدرآباد میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی اور کس طرح میر صوبدار خاں کو دستار سرداری کا سبز باغ دکھا کر اپنا ہمنوا بنایا اور کس طرح میران حیدرآباد میں نفاق کی چنگاری کو بھڑکایا۔ وہ سب پہلے گزر چکا ہے۔

میران خیرپور پر دام تزویر:

حیدرآباد سے فارغ ہو کر میجر اوٹرام سکھر پہنچا، وہ میران خیرپور کے اختلاف کو خوب جانتا تھا، اسے معلوم تھا کہ ان کی کون سی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، چنانچہ اس نے سکھر پہنچ کر سب سے پہلے میر علی مراد خاں پر وہی نسخہ آزمایا جو میران حیدرآباد پر آزما کر وہ کامیاب ہو چکا تھا۔ جس کا تذکرہ ہم "میجر اوٹرام کی میران حیدرآباد میں نفاق ڈالنے کی کوشش" کے عنوان کے تحت کر چکے ہیں۔ اس طرح اس نے میر علی مراد خاں کو بھی صاحب دستار ریاست بنانے کا پیغام دے کر اپنے مقاصد کے لیے ہموار کر لیا۔

میران خیرپور میں بھی یہی دستار ریاست کی تمنا مختلف امیروں کے دل میں پرورش پا رہی تھی اور آخر کار یہی تمنا ان کی خود مختار اور آزاد حکومت کے زوال کا باعث ہوئی۔ میر علی مراد خاں اس دستار ریاست کا آرزو مند تھا، ادھر میر محمد حسن خان خلف میر رستم خاں بھی اس دستار سرداری کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے علاوہ میر علی مراد خاں بن میر رستم خاں بھی اس دستار ریاست کے امیدواروں میں سے ایک تھا، لیکن کسی کی امید بر نہ آئی تھی۔[4]

میر علی مراد خاں کی انگریزوں کی شہہ پر نئی تدبیریں:

میر علی مراد خاں انگریزوں سے یہ شہہ پا کر کہ وہ اسے صاحب دستار ریاست بنائیں گے، انگریزوں کی کوششوں کو کامیاب بنانے کے

---

[1] سندھی زبان میں دستخط کو کہتے ہیں۔

[2] تاریخ خیرپور، مؤلف: نسیم امروہوی، صفحہ ۴۸۔

[3] تاریخ خیرپور، مؤلف: نسیم امروہوی، ص ۴۸-۴۹۔

[4] تازہ نوائے معارک، ص ۶۲۳-۶۲۴۔

لیے نئی نئی تدبیروں میں مصروف ہو گیا۔

وہ ایک روز کوٹ ڈیجی سے خان پور آیا، جو خیر پور کے متصل واقع ہے اور اس نے میر رستم خاں کو آدمی بھیج کر بلوایا اور تنہائی میں جدردانہ طور پر اسے خوف دلایا کہ انگریز عنقریب ہم سب کو گرفتار کرنے والے ہیں۔ میر علی مراد خاں کا یہ تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا، میر رستم خاں نے یہ خبر سنتے ہی مضطرب ہو کر فوراً اپنے فرزندوں اور بھائیوں کو خط لکھا کہ: انگریزوں کے طریقہ کار سے مجھے یہ انداز ہوتا ہے کہ وہ ہماری گرفتاری کا ارادہ رکھتے ہیں، اس حالت میں توقف مناسب نہیں، تم سب فوراً ہی خیر پور سے کوچ کر کے، قلعہ جات ریگستان کی طرف روانہ ہو جاؤ اور میں میر علی مراد خاں کے ساتھ قلعہ احمد آباد جا رہا ہوں، وہاں دیکھیں گے کہ کیا صورت پیش آتی ہے؟[1]

میران خیر پور کی قلعہ جات ریگستان کی طرف روانگی:

جب میر رستم خاں کا یہ خط اس کے فرزندوں اور بھائیوں کو ملا، تو وہ گھبرا گئے اور فوراً روانگی کی تیاریاں کرنے لگے، چنانچہ ۲۵ ذیقعدہ ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) کی آدھی رات گزرنے پر یہ لوگ خیر پور سے نکلے اور میر محمد حسن خاں اور میر نصیر خاں ایک دوسرے کے ساتھ بھورٹی کی طرف روانہ ہوئے اسی طرح دوسرے صاحبزادے بھی اپنی مرضی کے مطابق جس طرف منہ اٹھا، روانہ ہو گئے۔

خیر پور سے میروں کی روانگی کی وجہ سے قیامت کا سماں نظر آتا تھا۔ خیر پور کے لوگ خواہ وہ ملازم تھے یا غیر ملازم اس واقعہ سے حیران و پریشان تھے۔ اکثر لوگ یہ واقعہ دیکھ کر خیر پور چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، جیسے ہی یہ لوگ خیر پور سے باہر نکلے، ایسے موقع کی تاک میں رہنے والے لوگوں نے انھیں لوٹ لیا۔

جس رات کو میرانِ خیر پور کا یہ قافلہ روانہ ہوا، اتفاق سے یہ رات ابر و باد اور بارش کی وجہ سے نہایت تیرہ و تار تھی۔ بارش کی شدت اور رات کی تاریکی کی وجہ سے خواتین شاہی نے جنھوں نے اپنی عمر میں کبھی اس قسم کی صعوبتیں نہ دیکھی تھیں راستے میں بہت تکلیفیں اٹھائیں اور نہایت تکلیفیں اٹھا کر میرانِ خیر پور کا یہ کارواں قلعہ جات ریگستان میں پہنچا۔[2]

(1) تازہ نوائے معارک، ص ۶۲۴-۶۲۵۔

(2) ایضاً۔ ص ۶۲۵۔

میر رستم خاں کی تخت و تاج سے دست برداری:

تاریخ خیر پور میں نسیم صاحب امروہوی نے میر رستم خاں کی تخت و تاج سے دست برداری کی وجوہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ: جب چارلس نیپیر نے ان شہروں پر قبضہ کرنے کا ارادہ کر لیا، جن کی تصریح نئے عہد نامے میں کی گئی تھی، اس وقت انگریزی فوج کی تعداد سکھر میں چھ ہزار کے قریب تھی اور کراچی میں دو ہزار سپاہی متعین تھے۔ چارلس نیپیر کو معلوم ہو چکا تھا کہ میر صاحبان کے لشکر کی تعداد بیس تیس ہزار سے زیادہ ہے، جنرل چارلس نیپیر نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ دریا پار کر کے روہڑی میں خیمہ زن ہو جائے اور برطانوی سپاہی بنگالی بٹالینوں کو سبزل کوٹ اور بھنگ بادپر قبضہ کرنے کا حکم دیا، سکھر میں اتنی فوج رہنے دی گئی کہ اگر لاڑکانہ سے حملہ ہو تو وہ شہر کی مدافعت کر سکے۔

میر رستم خاں کو جب انگریزی فوج کی اس نقل و حرکت کا علم ہوا تو وہ بے حد پریشان ہوا، وہ اس وقت متعدد مصائب میں گرفتار تھا۔ ایک طرف تو اس کے بیٹے دستار ریاست کے لیے آپس میں جھگڑ رہے تھے، دوسری طرف انگریز اس کی سرکوبی کے لیے بے چین تھے، تیسری طرف میر علی مراد خاں اس کے خلاف ہر قسم کا مواد فراہم کر رہا تھا۔ یہ تھے وہ حالات جس نے میر رستم خاں کے حوصلوں کو پست کر دیا۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ دستار حکومت اور مسند ریاست چھوڑ کر جو تمام جھگڑوں کی بنیاد ہے، انگریزوں کی پناہ میں چلا جائے، چنانچہ اس نے چارلس نیپیر[3] کو لکھا کہ مجھے اپنی پناہ میں آنے کی اجازت دیجیے، کیونکہ

(3) سر چارلس نیپیر: (۱۷۸۲-۱۸۵۳ء) کرنل جارج نیپیر کا بیٹا تھا، جو ۱۰ اگست ۱۷۸۲ء میں پیدا ہوا۔ تعلیم کے بعد ۱۷۹۴ء میں برطانیہ کی ۳۳ نمبر رجمنٹ میں شامل ہوا اور متعدد مہمیں سر انجام دے کر ۱۸۳۷ء میں میجر جنرل بنا۔ ۱۸۴۱ء میں ہندوستان اور ۱۸۴۲ء میں سندھ کے لشکر کا سپہ سالار مقرر ہوا اور میران سندھ سے معاہدے کیے۔ دسمبر ۱۸۴۲ء میں قلعہ امام گڑھ کو فتح کر لیا۔ ۱۷ دسمبر ۱۸۴۲ء میں جنگ میانی میں جو میران سندھ اور انگریزوں کے درمیان ہوئی فتح حاصل کی۔ اس جنگ میں اس نے اپنے دو ہزار لشکر سے سندھیوں کے بائیس ہزار لشکر کو شکست دی اور پھر ۲۴ مارچ ۱۸۴۳ء کو حیدرآباد کے متصل بمقام دبہ میر شیر محمد خاں شیر سندھ کو شکست دی۔ ۱۸۴۶ء میں لفٹننٹ جنرل کے عہدے پر فائز ہوا۔ ۱۸۴۷ء میں سارے ہندوستان کی فوجوں کا سپہ سالار مقرر ہوا۔ ۱۸۵۰ء تک وہ ہندوستان کا کمانڈر ان چیف تھا۔ آخر لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل کی مخالفت کی بنا پر اس نے اس عہدے سے استعفا دے دیا اور اپنے گھر چلا گیا۔ یہاں تک کہ ۲۹ اگست ۱۸۵۳ء میں اس نے انتقال کیا (تعلیقات تازہ نوائے معارک، آقای عبدالحئی حبیبی، ص ۹۵۰-۹۵۱)۔

مجھے اپنی اولاد اور بھائیوں کی طرف سے اندیشہ ہے۔ چارلس نیپیر نے جواب دیا کہ میں آپ کو انتہائی مجبوری کے عالم میں پناہ دے سکتا ہوں، لیکن بہتر یہی ہے کہ آپ اپنے بھائی میر علی مراد خاں کے پاس جاکر پناہ لیں، اور اُن سے صفائی کرکے اپنے عزیزوں کی ہمدردیاں حاصل کریں، چنانچہ میر رستم خاں نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور کوٹ ڈیجی میں میر علی مراد خاں کے پاس اپنے اہل و عیال سمیت چلا گیا، جب وہ میر علی مراد خاں کا مہمان تھا تو اُس نے میر علی مراد خاں کو مشورہ دیا کہ وہ انگریزوں کی طرفداری چھوڑ دے۔ کیونکہ وہ غاصب ہیں اور ہمیں اپنے آبائی ملک سے نکال کر خود قابض ہونا چاہتے ہیں۔ میر رستم خاں کی اس رائے سے میران حیدرآباد بھی متفق تھے۔ تجویز یہ تھی کہ سب میر صاحبان اپنے اہل و عیال کو کچھ کے علاقے میں روانہ کر دیں۔ پھر اطمینان سے یکسو ہو کر انگریزوں کے خلاف اس وقت تک جنگ جاری رکھیں، جب تک کہ دائمی شکست و فتح کا فیصلہ نہ ہو جائے۔ ابھی میر رستم خاں اور میر علی مراد خاں کے درمیان یہ گفت و شنید جاری تھی کہ سید علی گوہر شاہ[2] کے ایماسے میر نصیر خاں اور محمد حسین خاں بھی کوٹ ڈیجی آگئے اور یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اب میر علی مراد خاں اس مشورے کو قبول کر لیں گے اور تمام میر صاحبان انگریزوں کے خلاف متحد ہو جائیں گے، حقیقت میں اس منصوبے کا بانی میر رستم خاں کا دیوان فتح محمد غوری تھا۔

میر رستم خاں اور میر علی مراد خاں کے درمیان تفصیلی بات چیت ہوئی اور آخر کار میر رستم خاں نے قرآن مجید کے اوراق پر میر علی مراد خاں کے حق میں مسند و دستار کے دعوے سے دست برداری کا ایک عہد نامہ لکھ دیا۔

عہد نامہ دست برداری میر رستم خاں:

میر رستم خاں کی دست برداری کے عہد نامے کا متن حسب ذیل ہے: الحمد للہ والصلوۃ والسلام علی رسول اللہ وآلہ وسلم انجام کرد و عہد بست میر رستم خان تالپور با میر علی مراد خاں تالپور ایں معنی کہ دریں ولا دستار سرداری و برادری بہ انضمام عنان تمامی ملک خود بمعہ سرشماری و میر بحری و جزیہ و اجارہ و گزرہا و شکار ماہی کولاب ہا موافق تفصیل ذیل حسب قاعدہ و روش سرداران حیدرآباد در عہد سلطنت سرکار ذی اقتدار، گردوں وقار انگریز بہادر بدست میر علی مراد خاں کہ لائق سرداری است، ابتداء خریف ۱۲۵۳ھ بر رضا و رغبت بخشیدم، چنانچہ در زندگانی من بر مسند سرداری متمکن شدہ ملک مفصلۂ ذیل را بہ قبضۂ تدخیل خود در آورد، و ہمیں دستار و ہمیں ملک کہ من بہ خوابش و مرضی خود می بخشم دعویٰ دخل احدے از پسران و برادر زادگان من نیست و نخواہد بود، واگر کسے دعویدار شد کاذب است، و تصفیہ معمولات و معاملات برادری و نگاہ داشتن و گفتار و رفتار بصاحبان انگریز ہم منحصر برائے میر صاحب میر علی مراد خاں ممدوح، دریں جا قسم کلام اللہ درمیان است، تفاوت تار موئے نخواہد شد۔ کفیٰ باللہ شہیدا۔ تحریر فی التاریخ ہفدہم ماہ ذی القعدہ ۱۲۵۸ھ۔

فہرست املاک

پرگنہ کو نہیرہ و چھور و ایریجہ و کیکرہ۔ پرگنہ نوشہرو پیروز، پرگنہ کندیارہ، پرگنہ لدھ کا کن ہمہ خیرپور رولو ہری پرگنہ میرپور و مانیلہ و گھونگی، ملک ریگستان و رہنی و نارہ و قلعہ شاہ گر و سردار کہر وغیرہ قلعہ جات، پرگنہ اوبارہ و خیرپور دہرکی، پرگنہ امام واہ، پرگنہ بھونک و باسان سویم حصہ سنبل، پرگنہ مزار کہ۔ پرگنہ شکارپور موغلی، پرگنہ دوپارہ، پرگنہ بلدکہ، پرگنہ چک مزارچہ، پرگنہ کشور۔ مہر (رستم فقیر تالپر)

(ترجمہ عہد نامہ)

حمد و نعت و درود کے بعد مجھ میر رستم خاں ٹالپور نے میر علی مراد خاں سے عہد کیا کہ میں خاندان کی قیادت اور ملک کی حکومت کی دستار جس میں میر شماری، میر بحری، جزیہ، اجارہ، گزرگاہیں اور تالاب کی مچھلی کے شکار (کے مداخل) شامل ہیں، حسب تفصیل ذیل میرانِ حیدرآباد کے قاعدے اور روش کے مطابق عہد سلطنت انگریزی میں میر علی مراد خاں کو جو کہ سرداری

---

[2] سید علی گوہر شاہ: پیر صبغتہ اللہ کے چھوٹے صاحبزادے تھے، پیر صبغتہ اللہ کی وفات کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادے سید علی محمد اول ۱۲۴۶ھ میں اپنے والد کی وفات کے بعد مسند آرائے رشد و ہدایت ہوئے، لیکن چونکہ یہ عالم، شاعر، طبیب اور صاحب ذوق بزرگ تھے اور ہمیشہ خدمت علم میں مصروف رہتے تھے، اس لیے اپنے چھوٹے بھائی سید علی گوہر شاہ اصغر کو اپنی جگہ سجادہ نشین کرکے خود مسند سجادگی سے دست بردار ہو کر امور علمی اور خدمت خلق میں مشغول ہو گئے۔ سید علی گوہر شاہ بروز ۴ رجب ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱ جمادی الاولیٰ بروز شنبہ ۱۲۶۳ھ میں انہوں نے وفات پائی، یہ سندھی کے بلند پایہ شاعر تھے اور اصغر تخلص کرتے تھے (تعلیقات تازہ نوائے معارک، آقای حبیبی، ص ۸۷۵) تاریخ خیرپور، مؤلف: نسیم امروہوی، ص ۵۱-۵۲۔)

کا اہل ہے، ابتدائے خریف ۱۲۵۳ء سے اپنی رضا و رغبت سے بخشتا ہوں، اس طرح کہ وہ میری زندگی میں مسند سرداری پر متمکن ہو اور مفصلہ ذیل املاک کو اپنے قبضے میں لائے اور یہ دستار اور یہ ملک جو میں نے اُسے اپنی خوشی اور رضامندی سے بخشا ہے، اس میں میری اولاد یا بھتیجوں کو کوئی دخل نہیں ہے، اور نہ ہوگا، اگر کوئی شخص دعویٰ دار ہو تو وہ جھوٹا ہے، نیز خاندانی معاملات کا تصفیہ اور دیکھ بھال اور انگریزوں کے ساتھ گفت و شنید اور طرز عمل بھی میر علی مراد خاں ممدوح کی رائے پر منحصر ہوگا، میں اس سلسلے میں کلام اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ اس میں سر مو فرق نہ ہوگا اور اس معاملے میں خدائے تعالیٰ گواہی کے لیے کافی ہے۔ مورخہ ۱۷ ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ۔

میر علی مراد خاں خفیہ طور پر ان تمام معاملات سے چارلس نیپیر کو باخبر رکھے ہوئے تھا، چارلس نیپیر نے خواہش ظاہر کی وہ وہ میر رستم خاں سے ملاقات کر کے متنازع فیہ مسائل پر گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ اور اس طرح اس بدگمانی کو دور کرنا چاہتا ہے جو اُس کے دل میں انگریزوں کے خلاف پیدا ہوگئی ہے۔ مگر جب میر رستم خاں کو سر چارلس نیپیر کی اس خواہش کا علم ہوا تو اسے یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں چارلس نیپیر ملاقات کے بہانے اُسے بلا کر قید نہ کر لے۔ اس ڈر سے میر رستم خاں بھاگ کر ڈیرۂ تھر کی طرف چلا گیا۔[1]

ان واقعات سے شہر میں اس قدر گڑبڑ پھیلی کہ لوگ خوف زدہ ہو کر بے تحاشا خیرپور سے بھاگنے لگے اور چند روز میں بستی خالی ہوگئی، اس موقع کو غنیمت سمجھ کر میر علی مراد خاں نے اپنے وزیر شیخ علی حسین کو کوٹ ڈیجی سے خیرپور بھیجا، جس نے آسانی سے شہر پر قبضہ کر لیا اور جو کچھ خزانہ ہاتھ لگا اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔[2]

صاحب تازہ نوائے معارک کا بیان:

صاحب تازہ نوائے معارک منشی عطا محمد شکارپوری جو اس دور کا شاہد عینی ہے وہ لکھتا ہے کہ: میر رستم خاں نے قلعہ احمد آباد (کوٹ ڈیجی) میں آنے کے بعد دستار ریاست اور ملک سے دست برداری کا عہد نامہ میر علی مراد خاں بن میر مبارک خاں کے حق میں لکھ دیا اور وہ ملک جس کا تعلق دستار ریاست اور سرداری سے تھا، میر علی مراد خاں کے سپرد کر دیا اور پھر میر رستم خاں کوٹ احمد آباد سے قلعہ جات ریگستان کی طرف روانہ ہوگیا، اور اس کا وزیر فتح محمد خاں غوری گرفتار ہوگیا۔

منشی عطا محمد شکارپوری کا بیان ہے کہ اگرچہ میر رستم خاں کے زوال کو تقدیر کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے، لیکن بظاہر یہ تمام مصیبتیں اس کے وزیر بے تدبیر فتح محمد خاں غوری کی لائی ہوئی تھیں، جو سفید داڑھی ہونے کے باوجود تمام رات فسق و فجور میں مبتلا رہتا تھا۔

میر رستم خاں کا تعاقب:

۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں جب میر رستم خاں خیرپور سے فرار ہو گیا اور اس کی خبر سر چارلس نیپیر کو ہوئی تو وہ سکھر سے سوار، پلٹن اور توپ خانہ لے کر کوٹ ڈیجی میں داخل ہوا اور وہاں اس نے میجر اوٹرام[3] کو میر علی مراد خاں کے ساتھ حکم دیا کہ وہ دونوں میر رستم خاں کے تعاقب میں قلعہ جات ریگستان جائیں، چنانچہ میجر اوٹرام قلعۂ ریگستان میں جا کر میر رستم خاں سے ملا اور اس کی ہر طرح سے دل جوئی کی اور پوری طرح اطمینان دلایا کہ اس سے کسی قسم کا مواخذہ نہ ہوگا، بلکہ اس سے وعدہ کیا کہ امام گڑھ واپس لوٹنے کے بعد ہم تمہیں سابق کی طرح خیرپور کی مسند ریاست پر بٹھائیں گے اور تمہارے لوٹنے تک میں یہیں قلعہ جات ریگستان میں سکونت پذیر رہوں گا۔

میر رستم خاں اس وعدہ وعید اور ملاقات کے بعد امام گڑھ[4] روانہ ہوگیا، جہاں میر خاں کھوکھر رہتا تھا۔ میر محمد خاں نے جیسے ہی میر رستم خاں کی آمد کی خبر سنی، تو وہ قلعۂ امام گڑھ کو چھوڑ کر فوراً جیسلمیر

---

(1) تاریخ خیرپور، مؤلف: نسیم امروہوی، ص ۵۳۔

(2) ایضاً۔ ص ۵۳-۵۴۔

(3) میجر اوٹرام: (سر جیمز اوٹرام (۱۸۰۳-۱۸۶۳ء) لفٹننٹ جنرل اوٹرام ۲۹ جون ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوا اور تعلیم کے ۱۶ سال کی عمر میں ہندوستانی فوج میں شامل ہوگیا۔ ۱۸۲۰ء میں بمبئی رجمنٹ میں اجونٹ مقرر ہوا۔ ۱۸۳۹ء میں اس نے امیر دوست محمد خاں کا ہندوکش تک تعاقب کیا۔ ۱۸۳۹ء ہی میں حیدرآباد سندھ کا پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوا، ۱۸۴۱ء بالائی سندھ بھیجا گیا اور میران سندھ سے دوستی کی راہیں ہموار کیں، وہ میرانِ سندھ کا طرف دار تھا اور اس نے اس سلسلے میں ہندوستان اور انگلستان میں نمایاں کارنامے انجام دیے، یہاں تک کہ لفٹننٹ کرنل C.B ہوگیا۔ ۱۱ مارچ ۱۸۶۳ء کو آٹرام نے انتقال کیا (تعلیقات تازہ نوائے معارک، مؤلف: آقای حبیبی، ص ۸۹۸-۹۰۰)۔

(4) امام گڑھ: یہ مقام اب ٹنڈو میر امام ٹالپور کے نام سے موسوم ہے اور خیرپور سے جنوب مشرق میں اندازاً بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے (حاشیہ، نوائے معارک ۱، ص ۳۶)۔

روانہ ہو گیا۔ میجر آٹرام نے قلعہ امام گڑھ پہنچ کر جو کچھ قلعے میں سازو سامان تھا اسے اپنے قبضہ و تصرف میں لے لیا، اور توپ کے گولوں سے قلعے کو زمین کے برابر کر دیا۔ پھر وہاں سے لوٹ کر میر رستم خاں کے پاس آیا لیکن میر رستم خاں میجر آٹرام کے آنے سے پہلے ہی شہداد پور کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ میجر آٹرام کو میر رستم خاں کی اس حرکت پر افسوس ہوا کہ اس نے خود اپنے باپ کو دربدر کیا ہے۔[1]

میر رستم خاں شہداد پور میں:

جب میر رستم خاں شہداد پور پہنچا تو وہاں بارہ ہزار بلوچوں کا لشکر اس کے پاس آیا۔ اُن میں ہر ایک اپنی بہادری اور شجاعت کی ڈینگیں مارتا تھا۔ میر رستم خاں نے مصلحتاً اپنے بیٹے میر محمد حسن خاں کو اس لشکر کا سردار بنا کر خود میر محمد نصیر خاں کے ساتھ میرانِ حیدرآباد سے ملاقات کے لیے حیدرآباد روانہ ہو گیا۔

اسی زمانے میں میرانِ حیدرآباد کے وکلا علیحدہ علیحدہ مثلاً سید محمد تقی شاہ، میر حسین علی کی طرف سے اور اخوند بچل عطار باشی میر صوبدار خاں کی طرف سے، اسی طرح ایک وکیل میر محمد خاں کی طرف سے سر چارلس نیپیر سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے سر چارلس نیپیر سے ملاقات کی، لیکن یہ سب کے سب اپنے مقاصد میں ناکامیاب ہو کر حیدرآباد واپس چلے گئے۔[2]

میر علی مراد خاں پر انگریزوں کا لطف و کرم:

سر چارلس نیپیر نے میر علی مراد خاں کی اُن خدمات و جاں فشانی کی وجہ سے جو اس نے انگریزوں کی انجام دی تھیں، اپنے لطف و کرم سے نہایت خوش وقت اور ممنون کیا اور ان لوگوں کی سرکوبی پر مامور کیا جو انگریزوں سے بغاوت پر آمادہ تھے اور خود تھوڑا سا لشکر لے کر حیدرآباد کی طرف روانہ ہوا۔

لیکن انگریزوں کا رعب بلوچوں کے دل میں اس قدر بیٹھا ہوا تھا کہ جو اپنے آپ کو رستم زمان کہتے تھے، اگر وہ بھی انگریزی لشکر کا نام سن لیتے تھے تو ہوش و حواس کھو کر بید کی طرح کانپنے لگتے تھے اور دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوتے تھے، حالانکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ بلوچ قوم کے لوگ نہایت بہادر اور شجیع ہیں اور وہ میدانِ جنگ سے فرار کو اپنے لیے عار سمجھتے ہیں باوجودیکہ اُس وقت انگریزی فوج اس قدر قلیل تھی کہ اگر ان لوگوں کو ذرا بھی چھوٹ دے دی جاتی تو یہ انگریز فوج کا صفایا کر دیتے، لیکن میر علی مراد خاں جان و دل سے انگریزوں کی خدمت میں لگا ہوا تھا اور نہایت صدق و اخلاص سے اُن کا مددگار و معین بنا ہوا تھا۔ بلوچ میر علی مراد خاں کی وجہ سے ہتھیار ڈالے ہوئے منہ دیکھ رہے تھے اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔[3]

شکارپور سے میران سندھ کے کارکنوں کا فرار:

ادھر جب میر نصیر خاں اور میر رستم علی خاں امیرانِ خیرپور سے جدا ہو کر بے وطن ہوئے تو ان کے جو کارکن شکارپور کی حکومت کے تین حصوں پر مامور تھے شکارپور کو چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

اسی اثنا میں شیخ غلام حیدر بہ وساطت شیخ علی حسن عطار کارِ میر علی مراد خاں ان تین حصوں پر حاکم مقرر ہوا، وہ شکارپور آ کر انگریزوں کی چھاؤنی میں فروکش ہوا۔

ادھر میر نصیر خاں امیر خیرپور کے حکم کی بنا پر شکارپور وغیرہ اور اس کے متعلقہ علاقوں پر جو میر نصیر خاں سے تعلق رکھتے تھے، خدایار خاں درانی بامیزائی حاکم بن کر وہ ماری آیا۔ یہ بڑا ظالم انسان تھا اور لشکر کے لیے اپنے علاقے کے غریبوں سے کوڑے مار کر روپیہ وصول کرتا تھا، لوگ اس کے ظلم سے اپنا گھر بار چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ خدایار خاں نے آتے ہی شیخ غلام حیدر کا بھی مقابلہ شروع کیا اور قلعے پر حملے کیے لیکن کامیاب نہ ہوا۔ امیرانِ حیدرآباد کی جانب سے سید ابراہیم شاہ اور دیوان جیٹمل شکارپور کی حکومت پر مامور تھے۔ شکارپور کے آٹھوں دروازوں پر ان کا چوکی پہرہ تھا۔ وہ شیخ غلام حیدر اور خدایار خاں کے آدمیوں کو شکارپور شہر کے اندر نہیں آنے دیتے تھے، بلکہ جو مالگزاری کا حصہ ہوتا تھا شیخ غلام حیدر کو پہنچا دیتے تھے۔

تین چار روز کے بعد حافظ حکومت خان میر علی مراد خاں کی طرف سے تین چار سو سواروں اور پیادوں اور ایک توپ کے ساتھ کھوسہ نامی گاؤں میں آیا، جو شکارپور کے متصل واقع ہے، خدایار خاں قلعے کا محاصرہ چھوڑ کر اور اپنے لشکر کو لے کر حافظ حکومت خاں کے مقابلے کے لیے نکلا اور ایک نالے کی آڑ لے کر جنگ شروع کر دی، لیکن حافظ حکومت خاں اُسے شکست دے کر شکارپور میں داخل ہوا اور چند روز

---

(1) تازہ نوائے معارک، ص ۶۲۹-۶۳۰۔

(2) تازہ نوائے معارک، ص ۶۳۰-۶۳۲۔

(3) تازہ نوائے معارک، ص ۶۳۲-۶۳۳۔

وہاں ٹھہر کر بلدکہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس طرح شیخ غلام حیدر کو میران خیرپور کے حصے میں مداخلت کا خوب موقع مل گیا۔[1]

اسی زمانے میں خبر ملی کہ میر محمد نصیر خان بروہی والیٔ قلات نے اپنا لشکر قلعۂ روجھان پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا ہے، دیوان جیٹمل نے اپنے موکلوں کے حکم کے مطابق کچھ بلوچوں، افغانوں اور ہندوستانیوں کا لشکر ایک توپ کے ساتھ اپنے بیٹے نوتن داس کی سرکردگی میں قلعے کی مدافعت اور محافظت کے لیے مامور کیا۔

میر نصیر خاں والی حیدرآباد کی انگریزوں کے مقابلے کے لیے احتیاطی تدابیر:

ابھی نوتن داس جونیجہ نامی گاؤں میں جو شکارپور کے متصل واقع ہے۔ منزل انداز تھا کہ اتنے میں میر نصیر خاں والیٔ حیدرآباد کا پروانہ دیوان جیٹمل کے نام پہنچا، جس میں تحریر تھا کہ: اگرچہ ہم میں اور انگریزوں میں دوستانہ روابط قائم ہیں اور ہم اُن کے خلاف کوئی ارادہ نہیں رکھتے، لیکن میر رستم خاں والی خیرپور بعض خانگی جھگڑوں کی وجہ سے انگریزوں کے خوف سے دور دراز کا سفر کرکے ہمارے پاس ملتجی ہوا ہے، ہم نے اس ضمن میں اپنے وکیلوں کو انگریز حاکموں کے پاس بھیجا ہے کہ وہ گفتگو کرکے اس جھگڑے کو ختم کرادیں، لیکن انگریزوں کا ارادہ کچھ اور ہی معلوم ہوتا ہے۔ عقل مند کسی واقعے کے پیش آنے سے پہلے ہی اس کی روک تھام کی فکر کرتے ہیں، تمہارے لیے مناسب ہے کہ تم جس قدر لشکر فراہم کرسکو کرو اور تیار ہوکر ہمارے حکم کے منتظر رہو۔[2]

انگریزوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ دیوان جیٹمل لشکر جمع کررہا ہے تو سکھر کی چھاؤنی میں ایک تہلکہ مچ گیا اور انگریزوں نے اس خبر سے مرعوب ہوکر سکھر اور شکارپور کے راستے میں اپنی چوکیاں قائم کردیں۔

ادھر دیوان جیٹمل نے اپنے آقا کے حکم کے مطابق خوب لشکر جمع کیا اور میر نصیر خاں کے دوسرے حکم کا منتظر رہا، اس نے اس قدر کثیر لشکر جمع کیا تھا کہ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر مجھے انگریزوں سے لڑائی کا حکم مل جائے تو میں چار پانسو بلوچوں کو جو پیراکی میں ماہر ہیں، دریا کے راستے سے راتوں رات مشکوں کے ذریعہ اسلحہ کے ساتھ سکھر کی چھاؤنی پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کروں گا اور خود خشکی کے راستے اپنے لشکر اور توپ خانے کے ساتھ پہنچوں گا اور چھاؤنی کے چاروں طرف سے محاصرہ کرکے انگریزوں کو اس جنگ کا مزہ چکھاؤں گا، لیکن اس غریب کو کیا خبر تھی کہ:

مادرچہ خیالیم وفلک درچہ خیال

وہ غریب یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ افسوسناک خبر پہنچی کہ میرانِ حیدرآباد گرفتار کرلیے گئے۔ اس خبر کے سننے کے بعد وہ بظاہر اپنی عہدہ داری کا بھرم قائم رکھے ہوئے تھا، لیکن اندرونی طور پر بھاگنے کی فکر کرنے لگا۔[3]

آخر ایک روز وہ خفیہ طریقے پر شکارپور سے گڑھی یاسین روانہ ہوگیا۔ کچھ روز گڑھی یاسین میں ٹھہرا، لیکن جب حیدرآباد سے میروں کی گرفتاری کی بُری بُری خبریں آنے لگیں تو وہ وہاں سے کوٹ سلطان آیا، پھر وہاں سے محال مبارک پور پہنچا اور چند روز قلعۂ مبارک پور میں مقیم رہا۔ میرانِ حیدرآباد کی شکست کے بعد اس کی نظریں شیر سندھ میر شیر محمد خاں پر لگی ہوئی تھیں، لیکن اسی زمانے میں میر شیر محمد خاں کی شکست کی خبر بھی اسے ملی، اس خبر کو سن کر وہ دل شکستہ ہوکر مبارک پور سے دو سو سواروں کے ساتھ ملک کچھی کی طرف روانہ ہوگیا اور وہاں احمد خاں مگسی کے پاس ٹھہرا۔ یہیں اس کے پاس میر علی مراد خاں کا آدمی اسے واپس لانے کے لیے پہنچا، لیکن اس نے احمد خاں مگسی کے ذریعہ سے جانے سے صاف انکار کردیا، پھر وہ چند دن جھل میں ولی محمد خاں چاندیہ کے پاس ٹھہرا، یہاں اس کے پاس خرچ واخراجات کے لیے جو سرمایہ تھا ختم ہوگیا، لہٰذا وہ اپنے بال بچوں کو چاندیہ کے پاس چھوڑ کر خود قندھار روانہ ہوگیا۔ قندھار کے سردار اس کے ساتھ نہایت عزت واحترام کے ساتھ پیش آئے اور ایک لاکھ روپے پر اس نے اجارے پر کچھ کام لے لیا، چند دن کے بعد کسی وجہ سے ناخوش ہوکر وہ ملتان آیا اور مول چند ناظم ملتان کے متوسلین میں داخل ہوگیا، لیکن وہاں ناکامیوں کا منہ دیکھ کر لاہور پہنچا، اور میر شیر محمد خاں سے ملاقات کی، اور اس سے کچھ اخراجات سفر لے کر لدھیانہ پہنچا۔ وہاں سے آقا یاقوت ملازم شاہ شجاع الملک سے کچھ روپیہ لے کر کلکتہ پہنچا اور میرانِ سندھ کی ملاقات سے خوش وقت ہوا، جو اس زمانے میں وہاں نظر بند تھے۔ یہ چند روز میران سندھ کے پاس ٹھہر کر نوکری کی تلاش کرتا رہا، لیکن ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ آخر مجبور ہوکر براہ خشکی حیدرآباد سندھ آیا اور میر علی مراد

---

[1] تازہ نوائے معارک، ص ۶۳۵-۶۳۶۔

[2] تازہ نوائے معارک، ص ۶۳۶-۶۳۷۔

[3] تازہ نوائے معارک، ص ۶۳۹-۶۵۰۔

خاں سے ملا۔ میر علی مراد خاں نے اسے نہایت تسلی، تشفی دی اور پانچ روپیہ یومیہ بطور خرچ اس کا مقرر کر دیا، لیکن اس کی صحت جواب دے چکی تھی اور وہ بیمار رہنے لگا تھا۔ میر علی مراد خاں کے ملازموں میں اس کے آنے کی وجہ سے ایک خوف وہراس پیدا ہو گیا تھا اور وہ سوچنے لگے تھے کہ دیکھیے کس کروٹ اونٹ بیٹھتا ہے، یہاں تک کہ اسی بیماری میں جیٹمل کا انتقال ہو گیا، اگرچہ دیوان جیٹمل ہندو تھا، لیکن وہ میران حیدرآباد کا نہایت وفادار ملازم تھا۔ اس نے میران حیدرآباد کے لیے ہر موقع پر شجاعت اور بہادری کے جوہر دکھائے[1] ہم نے اختصار سے دیوان جیٹمل کے حالات یہاں لکھے ہیں، اس کے تفصیلی کارناموں کے لیے تازہ نوائے معارک کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

میر رستم خاں کی وفات:

میر رستم خاں کی داستان حیات ختم ہو چکی، میانی کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد میران خیرپور میر رستم خان، میر نصیر خاں اور میر ولی محمد خان انگریزوں کے جنگی قیدی بنے اور پونا بھیجے گئے۔ اسی زندان فرنگ میں ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں میر رستم خاں نے وفات پائی اور قید غم اور قید زنداں دونوں سے آزاد ہو گیا۔

میر رستم خاں کی سیرت و شخصیت:

میر رستم خاں کی سیرت و شخصیت کا عظیم پہلو یہ ہے کہ وہ سندھ میں انگریزوں کے اقتدار کو دل سے ناپسند کرتا تھا، اسی بنا پر وہ دربدر ہوا، ریگستانوں میں مارا مارا پھرا، حیدرآباد پہنچا اور ایک لحاظ سے اسی کی التجا پر جنگ میانی ہوئی، لیکن اس کی زندگی کا دردناک پہلو یہ ہے کہ اس کا سارا زمانہ پریشانی میں گزرا اور آخر عمر میں اس کے بیٹوں کے نفاق اور اختلاف نے اسے اور بھی دل گیر اور مغموم بنا دیا تھا۔

ایک انگریز کپتان (مسٹر پوسٹن) نے اس کی شخصیت و اخلاق و کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

> میر رستم خاں کے آٹھ بیٹے تھے اور یہ ملک و مال کے لیے نہ صرف خود آپس میں دست و گریباں رہتے، بلکہ اپنے بوڑھے دل شکستہ باپ کے لیے بھی باعثِ آزار بن گئے تھے۔ ان آلام و مصائب کے باعث میر رستم خاں کا بڑھاپا بڑی مایوسی کے عالم میں گزرا۔ درحقیقت ہمیں اس بدنصیب اور غم زدہ انسان کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے سندھ کے حکم رانوں میں ایسا نیک طبیعت اور کم آزار انسان کم ہو گا۔ وہ ایک وجیہ اور عمدہ چال چلن کا انسان تھا۔ جو اس سے ملتا تھا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ میر رستم خاں کی خواہش تھی کہ انگریزوں کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات رہیں، لیکن افسوس ہے کہ حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ میر رستم خاں بڑھاپے کے مصائب، سیاسی جھگڑوں جسمانی امراض، خاندانی تنازع اور خراب صلاح کاروں کی بدولت انجام کار تباہ ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے اہل خاندان اور اپنی رعایا کے درمیان کافی ہر دل عزیز تھا اور سب لوگ اس کا بے حد احترام کرتے تھے، لیکن اس وقت کے انقلاب انگیز حالات سے نمٹنے کے لیے زیادہ چالاک آدمی کی ضرورت تھی۔ میر رستم خاں اپنی ضعیفی اور منشیات کے استعمال کے سبب قوت ارادی سے محروم ہو چکا تھا اور یہ اس کے امکان سے باہر تھا کہ وہ اپنی مفسد مشیروں اور ناعاقبت اندیش رفقا کو قابو میں رکھ سکتا۔ خاندان ٹالپور کے اسباب زوال میں میر رستم خاں کی کمزور شخصیت بھی جو دوسرے کئی اعتبار سے پسندیدہ تھی، درحقیقت ایک موثر سبب کی حیثیت رکھتی ہے۔

آگے چل کر اس نے لکھا کہ:

> میر سہراب خاں ایک اولو العزم اور ہوشیار حکمراں تھا۔۔۔۔ لیکن اس کے جانشین میر رستم خاں میں نہ مستعدی تھی اور نہ یہ حوصلہ مندی اور نہ وہ علاقوں کی توسیع کا شوق رکھتا تھا۔ البتہ اس کا چھوٹا بھائی میر علی مراد خاں اپنے جلیل القدر باپ کے ان اوصاف سے متصف تھا، اس نے انگریزوں کے ساتھ اپنے مضبوط تعلقات قائم کر لیے تھے۔ اس دور اندیشی کے سبب میر رستم خاں کے مقابل جنگ اقتدار میں کامیاب ہوا۔[1]

میر علی مراد خاں اول

میر علی مراد خاں اول موجودہ ریاست خیرپور کے بانی انگریزوں کا یار وفادار ہونے کی حیثیت سے اور انگریزوں کی ہر قسم کی رضاجوئی اور ان کی خیر اندیشی کی وجہ سے اُس عہدنامے کے بعد جو میر رستم خاں نے

---

[1] تازہ نوائے معارک، ص ۶۵۰-۶۵۲۔

[1] کپتان پوسٹن کا یہ تبصرہ تاریخ خیرپور، مؤلف: نسیم امروہوی، ص ۵۵-۵۶ سے ماخوذ ہے۔

سر چارلس نیپیر کے ایما سے قرآن مجید کے سادہ اوراق پر اُس کے حق میں اپنی دست برداری کا لکھ کر دیا تھا، خیر پور کے حکمران بنے اور میر سہراب خاں کے بااختیار جانشین تسلیم کیے گئے۔

صاحب تازہ نوائے معارک نے انگریزوں سے اُن کی وفاداریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ:

> روزے کہ سرکار انگلیسیہ بعزم خیال خام تسخیر ملک خراساں رونق افزای ایں ملک سندھ گردید، جناب میر صاحب میر علی مراد خاں بہادر در شمع افروزی بزم مودت و وداد و ضیای چراغ مجلس موافقت و اتحاد و انوار گونا گوں خدمات از ہر قسم رضا جوئی و خیر اندیشی و بہ طلبی سرکار جہاں مدار انگریز بہادر بہ ہیچ وجہ من الوجوہ خود را معاف و مقصر نداشتہ۔[1]

آگے چل کر اُس نے کہا کہ باوجود اس کے کہ بعض بلوچ اُمراو رؤسا میر علی مراد خاں کے اس طرز عمل سے بہت ناخوش اور ناراض تھے، بلکہ اعتراض کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ انگریزوں کے ساتھ اس کی اس دوستی کے کچھ اچھے نتائج برآمد نہ ہوں گے لیکن میر موصوف کے دل پر ان نصائح کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا، یہاں تک کہ سارے سندھ میں خرابی رونما ہوئی، میر ان سندھ قید ہوئے، بعض نے بھاگ کر جان بچائی، سندھ پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوا، لیکن ان سب تباہیوں اور بربادیوں کو دیکھتے ہوئے بھی میر علی مراد خاں انگریزوں کی خدمت گزاری اور جانفشانی میں گامزن تھے۔ ان کی انگریزوں سے وفاداریوں کی مثالیں گزشتہ اوراق میں کافی گزر چکیں، لیکن دو ایک واقعات کا ذکر یہاں ضروری ہے، جن سے ہمارے خیال میں سندھ کو عظیم نقصان پہنچا۔

جب میر شیر محمد خاں "شیر سندھ" جس کا تذکرہ آیندہ میران میرپور کے ضمن میں آئے گا "دنبہ" کے میدان میں انگریزوں سے مقابلے کے لیے بلوچوں کا عظیم لشکر ساز و سامان سے لیس لے کر پہنچا، تو اُس کی ان تیاریوں کو دیکھ کر، تجربہ کار اور جنگ آزمودہ لوگوں کا خیال تھا کہ شیر سندھ کو شکست ہو جائے یہ ناممکن ہے، لیکن عین اس موقع پر میر علی مراد خاں نے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے میر شیر محمد خاں کے دادا میر احمد اور دوسرے لشکر کے سرداروں کو جو اس جنگ کے بانی مبانی اور مقدمۃ الجیش تھے عین میدان جنگ میں پہنچ کر اپنی نوازشوں اور گراں بہا ملازمتوں کی توقع دلا کر میر شیر محمد خاں سے جدا کر دیا، جس کی وجہ سے میر شیر محمد خاں کو شکست ہوئی اور انگریز بازی جیت گئے۔[2]

یہ مہم ختم ہوئی تو ولی محمد خاں چانڈیہ جو بارہ ہزار بلوچوں کے لشکر کا سردار تھا اور انگریزوں سے بغاوت کیے ہوئے تھا اور انگریزی گورنمنٹ اس سے خائف تھی۔ اُسے یہ خطرہ تھا کہ مبادا ایسا نہ ہو کہ یہ کسی فتنہ و فساد کا محرک بنے، میر علی مراد خاں کو معلوم ہوا تو وہ ایک لشکر لے کر چانڈو کہ پہنچا اور ولی محمد خاں چانڈیہ کو بلا کر اسے تنبیہ کی کہ وہ انگریزوں کا مطیع و فرمانبردار بنے، لیکن چانڈیہ اپنے ارادے پر جما رہا، آخر میر علی مراد خاں نے نہایت دلیری اور بہادری سے ولی محمد خاں چانڈیہ کو گرفتار کر کے سر چارلس نیپیر کے پاس حیدرآباد بھیج دیا، اس نے اُس سے اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد لے کر اُسے خلعت سے سرفراز کر کے اُس کے علاقے میں واپس بھیج دیا۔[3]

مختصر یہ کہ سندھ کے بلوچوں میں سے جو کوئی انگریزوں کے خلاف آواز اٹھاتا، میر علی مراد خاں اس تحریک کے بانی کو کچل دیتے، اگر میر علی مراد خاں کا انگس بلوچوں کے سروں پر نہ ہوتا اور وہ مطلق العنان ہوتے تو بقول صاحب تازہ نوائے معارک کے کہ اگر سد سکندری بھی اُن کی راہ میں حائل ہوتی تو اس کو بھی توڑ دیتے، لیکن مشکل یہ آپڑی تھی کہ میر علی مراد خاں نے بلوچوں کے سرداروں کے نام سخت احکامات جاری کیے تھے کہ اگر اُنہوں نے ذرا بھی کوئی حرکت انگریزوں کے خلاف کی تو وہ اُسی وقت موت کے گھاٹ اُتار دیے جائیں گے۔ اس لیے بلوچ انگریزوں کے خلاف دم نہیں مار سکتے تھے، ان کے علاوہ کوہستانی بلوچ جو شجاعت و بہادری کا پیکر تھے اور شجاعت و بہادری میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے اُن کے لیے خود میر علی مراد خاں لاکھوں روپیہ خرچ کر کے لشکر اور توپ خانے کے ساتھ سر چارلس نیپیر گورنر سندھ کے مشورے سے کوہستان گئے اور بجار خاں دوبکی اور قبیلہ جکھرانی جو انگریزوں کے خلاف مرکز تھا اس پر دھاوا بول کر اس قبیلے کے نامور لوگوں کو گرفتار کر کے لائے، جکھرانی قبیلے کے بلوچوں کو انگریزوں نے ملازم رکھ لیا اور بجار خاں اور اس کے اہل و عیال کو انگریزوں نے میر علی مراد خاں کے سپرد کیا، وہ ایک مدت تک خیر پور میں نظر بند رہا، یہاں تک کہ خیر پور ہی میں فوت ہوا۔[4]

---

[1] تازہ نوائے معارک، ص ۶۶۴۔

[2] تازہ نوائے معارک، ص ۶۹۶۔

[3] ایضاً۔ ص ۶۹۸۔

[4] تازہ نوائے معارک، ص ۶۹۸-۷۰۲۔

منشی عطا محمد شکارپوری نے اُن کے انگریزوں سے وفاداری اور خدمات گزاری کے واقعات کو تحریر کرتے ہوئے لکھا کہ میر علی مراد خاں کی انگریزوں سے وفاداری اور خیر خواہی کے اس قدر کثیر واقعات ہیں کہ اگر ان سب کو یکجا کیا جائے تو ایک کتاب تیار ہو جائے۔ وہ انگریزوں کی رضامندی کو ہر حال میں مقدم رکھتے تھے اور ان کی خدمات ادا کرنے میں کبھی اس کی پیشانی پر بل نہ آتا تھا، اگر کوئی ادنیٰ سا انگریز بھی اُن کی ملاقات کے لیے آجاتا تو اس کی مہمانداری کے فرائض انتہائی طور پر بجالاتے، اگر کوئی انگریز بندوق یا تمنچہ یا کوئی گھوڑا تحفتاً اس کو بھیج دیتا تو یہ اس سے صد گونہ زیادہ قیمتی تحائف اس کو پیش کرتے۔

خصوصاً جب کہ ہندوستان کا گورنر جنرل دورے پر سکھر چھاؤنی آیا تھا تو میر علی مراد خاں نے ملاقات کے وقت نہایت نفیس تحائف، رومی جواہر دار بندوقیں، اعلیٰ درجے کی تلواریں، مرصع زیورات اور جواہرات جن کے دیکھنے سے عقل حیران ہوتی تھی، ولایتی اور عربی گھوڑے، تیز رفتار اونٹ جن کی قیمت پچاس ساٹھ ہزار روپے ہوگی اس کے سامنے پیش کیے تھے۔ شاید انہیں اخلاص شعاریوں اور تحائف گزاریوں کا نتیجہ یہ تھا کہ اس نے میر علی مراد خاں کو خلعت فاخرہ اور اس ریاست کی حکمرانی سے سرفراز کیا تھا۔[1]

فاضل مؤلف "تاریخ خیر پور" نسیم امروہوی صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا کہ میر علی مراد خاں نے جنگ میانی اور سرحدی لڑائیوں میں انگریزوں کی جو امداد کی تھی، اس نے سرکار انگلشیہ کی نظر میں اُن کی وقعت کو بہت بڑھا دیا، خود انگریز حکام کی پالیسی یہ تھی کہ مغربی و شمالی ہندوستان میں اپنے چند مضبوط حلیف پیدا کیے جائیں، اس پالیسی کے پیش نظر والیٔ ریاست خیر پور، امیر بہاول پور، راجا جیسلمیر کے ساتھ اضافۂ تعلقات ضروری تھا، انہیں وجوہ کے پیش نظر روہڑی کا شمالی علاقہ (جو میر رستم خاں کی جاگیر میں تھا) اس کا بہت بڑا حصہ میر علی مراد خاں کو بطور انعام دے دیا گیا۔

وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ میر علی مراد خاں انگریزوں کی اس تنگ دلانہ قدر افزائی سے خوش نہ ہوئے،۔۔۔ بلکہ ان کی کوشش یہ تھی کہ قرآن مجید کے ورق پر میر رستم علی خاں نے جتنے علاقے میرے نام لکھے ہیں، وہ سب مجھے واپس کیے جائیں، اس غرض سے انہوں نے اپنا وکیل بھی گورنر جنرل کے پاس بھیجا۔ اس وقت چارلس نیپیر کو میانی کی جنگ درپیش تھی اور اتنے بڑے علاقوں کی مدافعت اس کے امکان سے باہر تھی، لہٰذا اس نے عارضی طور پر ان علاقوں کی نگہداشت میر علی مراد خاں کے سپرد کر دی۔ میر صاحب نے فقط ان علاقوں کے نظم و نسق پر ہی اکتفا نہ کیا، بلکہ سیوہن کے برطانوی ضلعوں کے انتظام میں بھی دخیل ہو کر ان کا لگان وصول کرنا شروع کر دیا۔ آخر جنگ کے بعد ۱۸۴۵ء میں جنرل کی سفارش پر ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر صاحب کے درمیان حد بندی کا ایک مسودہ تیار کیا گیا، اس مسودے کی رو سے میر صاحب کو رئیس خیر پور تسلیم کیا گیا اور اُن کی ریاست میں وہ اضلاع جو جنگ میانی سے قبل ریاستی حدود میں شامل تھے شامل کیے گئے، نیز جو علاقے میر رستم خاں کی ملکیت تھے، اُن پر میر صاحب کا حق تسلیم کیا گیا۔ ان جاگیرات کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ کولھیرا چھورا تھریجا۔ ۲۔ نوشہرہ۔ ۳۔ کنڈیارو۔ ۴۔ لاہو گاگن۔ ۵۔ خیر پور کا شہر۔ ۶۔ روہڑی۔ ۷۔ رن یا تھر۔ ۸۔ نارہ۔ ۹۔ شاہ گڑھ سردار گڑھ اور دوسرے قلعے۔ ۱۰۔ اباوڑہ۔ ۱۱۔ خیر پور ڈھرکی۔ ۱۲۔ امام واہ۔ ۱۳۔ شکارپور کا کچھ حصہ۔ ۱۴۔ موغلی۔ ۱۵۔ پچ اور مزدوکار۔ ۱۶۔ روپاہ۔ ۱۷۔ بڑوکا اور میر نصیر خاں کا ملک۔ ۱۸۔ میر پور۔ ۱۹۔ ماتھیلہ۔ ۲۰۔ مہرکی وغیرہ۔ ان علاقوں میں نمبر ۶، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۸، ۱۹ اور نمبر ۲۰ میر علی مراد خاں کو واپس کر دیے گئے۔[2]

جنرل چارلس نیپیر نے کمپنی اور رئیس خیر پور کے درمیان نئے معاہدے کا مسودہ اپنی سفارش کے ساتھ گورنر جنرل کی خدمت میں بھیج دیا، معاہدے کی منظوری میں بعض وجوہ سے تاخیر ہوئی، میر صاحب کو شبہ ہوا کہ شاید جنرل نیپیر نے کچھ اعتراضات کر دیے ہیں، جس کی وجہ سے اس کی منظوری میں تاخیر ہو رہی ہے، لیکن جنرل نے میر علی مراد خاں کی تشفی کر دی۔ آخر ۱۸۵۰ء میں گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی سندھ کے دورے پر آئے اور انہوں نے میر علی مراد خاں سے تفصیلی ملاقات کی، ان دنوں ممبئی کے گورنر جارج کلارک اور سندھ کے کمشنر مسٹر پرنگل تھے۔[3]

میر علی مراد خاں پر معاہدۂ نونہار میں تحریف کا الزام:

اسی زمانے میں ایک اور واقعہ پیش آیا، جس نے میر علی مراد خاں کو نہایت مشکلات اور پریشانی میں مبتلا کر دیا، وہ انگریز جن کی خدمات میر علی

---

[1] یہ تمام تفصیل تازہ نوائے معارک، ص ۷۰۳-۷۰۴ سے ماخوذ ہے۔

[2] تاریخ خیر پور، مؤلف: نسیم امروہوی، ص ۵۸-۵۹۔

[3] ایضاً۔ ص ۴۰-۵۹۔

مراد خاں نے تسخیر سندھ میں نہایت جاں فشانی اور محنت سے انجام دی تھیں، وہ انگریز جو میر علی مراد کی نہایت تعظیم و تکریم کرتے تھے اور جب میر علی مراد خاں اُن کی ملاقات کے لیے جاتے تھے تو اُن کو توپوں کی سلامی دیتے تھے اور اپنے کھانے کی میز پر بے تکلف اُن کو جگہ دیتے تھے، اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو رشتۂ مودت و اخلاص اُن کے اور انگریزوں کے درمیان ہے وہ کبھی ٹوٹنے والا نہیں، لیکن جب اس پر معاہدۂ نونہار میں تحریف کا الزام لگایا گیا تو انگریزوں نے اُن سے نہ صرف طوطے کی طرح آنکھیں بدل لیں بلکہ اُن کے درجے میں تنزل کر دیا۔

ہوا یہ کہ شیخ علی حسن جو ہندوستان کا رہنے والا تھا، اسکندر خاں خاکوانی کے توسط سے میر علی مراد خاں کی ملازمت میں منسلک ہوا، وہ ابتداءً چھ سات روپے ماہانہ پر میر صاحب کا بارگیر مقرر ہوا اور رفتہ رفتہ میر علی مراد خاں کی تمام مملکت کا مدار المہام بن گیا۔ وہ ریاست کے تمام حل و عقد کا مرکز تھا اور ریاست کے تمام اہم امور اس کے ہاتھ میں تھے۔ تنخواہ کے علاوہ لاکھوں روپے کے انعامات سے میر علی مراد خاں اس کو سرفراز کرتا تھا، لیکن میر موصوف کی ان تمام نوازشوں اور سرفرازیوں کے باوجود وہ اس قدر نمک حرام نکلا کہ اپنی نمک حرامیوں کی وجہ سے وہ میر علی مراد خاں کی نظروں سے گر گیا۔ میر علی مراد خاں نے اُسے ملازمت سے علیحدہ کر دیا، وہ چند دن پریشان حالی میں صدر بازار سکھر میں مقیم رہا، جب اس کے عملے کے سپاہیوں نے اُس سے تنخواہ کا مطالبہ کیا تو وہ ان تقاضوں سے تنگ آ کر ملتان اور لاہور بھاگ گیا، لیکن کہیں اس کو پناہ نہ ملی، آخر پریشان ہو کر میر محمد حسین خاں خلف میر رستم خاں کے پاس آیا، اور اُسے طرح طرح کے سبز باغ دکھائے اور اس کے صلاح مشورے سے انگریزوں کے پاس آیا اور بقول صاحب تازہ نوائے معارک اس نے میر علی مراد خاں کے خلاف ایک سازش تیار کی۔ وہ سازش یہ تھی کہ میر علی مراد خاں نے قرآن مجید سے معاہدۂ نونہار کا ورق نکال کر اس کی جگہ دوسرا ورق لکھ کر لگا دیا ہے اور اس میں تحریف کر کے انگریزوں کے بہت سے علاقے اپنے ملک میں داخل کر لیے ہیں، اس نے جعل سازی کا یہ مقدمہ گھڑ کر انگریزوں کے سامنے پیش کیا۔ آخر ۱۸۵۰ء میں اس الزام کی تحقیق کے لیے ایک انکوائری کمیشن مقرر کیا گیا، جو تین ممبروں یعنی مسٹر پرنگل کمشنر سندھ، میجر جیکب (سرحد) اور میجر لنگ پولیٹیکل ایجنٹ کاٹھیاواڑ اسٹیٹس پر مشتمل تھا مقرر ہوا۔ اس کمیشن نے اپریل ۱۸۵۰ء سے اپنے اجلاس شروع کیے، میر علی مراد خاں نے عہد نامہ میں تحریف سے بالکل انکار کیا اور شیخ علی حسن نے اپنے دعویٰ کے اثبات میں جو کاغذ پیش کیا اس پر میر علی مراد خاں کی وہ مہر لگی ہوئی تھی جو گم ہو چکی تھی اور جس کی اطلاع وہ اس وقت کے ریزیڈنٹ کو دے چکا تھا، غالباً یہ مہر شیخ حسن علی کے ہاتھ لگ گئی تھی اور اُس کی مدد سے اس نے میر علی مراد خاں کے خلاف جو جعلی کاغذات تیار کیے تھے، ان سب پر یہ مہر ثبت تھی، لیکن ججوں نے اس اتنے واضح ثبوت کی بھی پروا نہیں کی۔[1] ۱۸۵۱ء تقریباً ایک سال تک یہ کمیشن اس مقدمہ کی تحقیقات کرتا رہا، آخر کمیشن نے فیصلہ دیا کہ عہد نامہ میں واقعی تحریف ہوئی ہے اور اس تحریف سے کئی علاقے ریاستی حدود میں شامل کر لیے گئے ہیں، جن پر رئیس خیرپور کا کوئی استحقاق نہیں، نیز یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ عہد نامۂ نونہار کا ایک ورق قرآن مجید سے پھاڑا گیا ہے اور اس کی جگہ دوسرا ورق لگا دیا گیا ہے۔ ان وجوہ کے پیش نظر سرکار انگلشیہ ضروری سمجھتی ہے کہ رئیس خیرپور کے درجے میں تنزل کر دیا جائے اور صرف وہی علاقہ جو انہیں اپنے والد میر سہراب خاں سے ورثہ میں ملا ہے، ان کے قبضے میں چھوڑا جائے اور باقی علاقہ ضبط کر کے انگریزی علاقے میں شامل کر دیا جائے، اس حکم کی تعمیل میں جو علاقے برطانوی مقبوضات میں شامل ہوں گے، ان کے باشندگان کو یقین دلایا جاتا ہے کہ اُن کے حقوق و مفادات کا تحفظ کیا جائے گا۔[2]

مسٹر فریئر کے نام میر علی مراد خاں کے علاقوں کی ضبطی کا حکم:

اس فیصلے کے مطابق ماہ ربیع الاول ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۸ء) میں مسٹر فریئر[3] کمشنر سندھ کے نام گورنر جنرل ہند کا حکم صادر ہوا کہ وہ ان علاقوں کو چھوڑ کر جو میر علی مراد خاں کو اپنے باپ میر سہراب خاں سے ورثے میں ملے ہیں باقی تمام علاقے کو انگریزی علاقے میں شامل کرے اور میر علی مراد خاں کو عہدۂ ریاست سے برطرف کرے کہ اس نے معاہدے میں تحریف کر کے جرم عظیم کیا ہے، اسی قسم کا حکم مسٹر اسٹورٹ کلکٹر شکارپور اور دوسرے متعینہ پلٹنوں واقع شکارپور کے سپہ سالاروں کے نام بھی پہنچا

---

(1) تازہ نوائے معارک، ص ۷۲۰۔

(2) تاریخ خیرپور، مؤلف نسیم امروہوی، ص ۶۲ بحوالہ تاریخ خیرپور مؤلف قلیچ بیگ۔

(3) مسٹر فریئر (سر ہنری بارٹل اڈورڈ فریر) (۱۸۵۱- ۱۸۸۴ء) یہ ۲۹ مارچ ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوا، ۱۸۴۲ء میں سر جی آرتھر گورنر بمبئی کا خصوصی سیکریٹری مقرر ہوا پھر ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۹ء تک سندھ کا کمشنر رہا، پھر مختلف خدمتوں پر رہا، حکومت انگلشیہ نے ۲۹ مئی ۱۸۸۰ء میں انگلستان طلب کر لیا، ۲۹ مئی ۱۸۸۴ء میں وہیں فوت ہوا (تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۹۹۰-۹۹۱)۔

کہ وہ جھگڑے کی صورت میں لیس ہو کر تیار رہیں، چنانچہ مسٹر جیکب[1] چھاؤنی خان گڑھ (جیکب آباد) سے سواروں اور توپ خانہ کے ساتھ شکارپور پہنچا۔ پھر وہاں سے سکھر آیا، یہ سردی کا موسم تھا اور میر علی مراد خاں بمقام بھورتی سیر و شکار کے لیے ٹھہرے ہوئے تھے، اسے اس کی اطلاع نہ تھی کہ اس کے لیے انگریزوں کا لشکر آیا ہے جب مسٹر جیکب روہڑی پہنچا تو میر علی مراد خان کو حقیقت حال کی اطلاع ہوئی، وہ اپنے دل ہی دل میں کہتے تھے کہ میں نے انگریزوں کا کون سا ایسا قصور کیا ہے کہ انہوں نے یہ لشکر چڑھا کر مجھ پر بھیجا ہے، اُنہوں نے کمشنر اور کلکٹر شکارپور کو لکھا کہ میں ہمیشہ انگریزی حکومت کا تابع اور فرمانبردار رہا ہوں، میں نے اس کی خدمت انجام دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میری جان و مال سب انگریزی حکومت کا ہے۔ مجھے جہاں حکم ہو خواہ شکارپور خواہ کہیں اور، میں وہیں چلا جاؤں گا۔ حکومت انگریزی کو اس لشکر کشی کی کیا ضرورت ہے؟ میں تو ایک اشارے کا منتظر ہوں، جو حکم ہو گا اس کی تعمیل کروں گا۔ لیکن کسی نے اس کا جواب نہیں دیا۔

یہاں تک کہ میر علی مراد خاں بھورتی سے شکارپور چھوڑ کر نائچہ[2] آئے۔ اِدھر کمشنر اور اس کے ساتھ دو تین انگریز تھوڑی سے پیدل لشکر کے ساتھ کراچی سے دخانی جہاز میں سوار ہو کر روہڑی پہنچے۔ مسٹر جیکب پہلے ہی سے پٹنی میں روہڑی کے متصل منزل انداز تھا۔

دوسرے دن صبح کو کلکٹر اور دوسرے صاحب میر علی مراد خاں سے ملنے نائچہ گئے اور میر علی مراد خاں کو اپنے مدعا سے مطلع کیا، پھر میر علی مراد خاں کمشنر سے ملنے کے لیے پٹنی آئے، جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھا۔[3]

میر علی مراد خاں کی معزولی کے متعلق حکومت انگلشیہ کا اشتہار:

اس کے بعد حکومت انگلشیہ نے میر علی مراد خاں کے متعلق عوام کی اطلاع کے لیے ایک اشتہار جاری کیا، جس کا مضمون یہ تھا کہ:

ایک مدت سے حکومت انگلشیہ پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ میر علی مراد خاں امیر خیرپور نے دغابازی اور جعل سازی سے سندھ کے ان علاقوں پر جن پر سرکار انگریز کا حق ہے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے، جس کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا، جس میں میر صاحب خود حاضر تھے، اور انہیں اپنی صفائی کا موقع دیا گیا، لیکن جو الزام ان پر عاید کیا گیا تھا، وہ اس کے متعلق اپنی صفائی نہ پیش کر سکے اور گواہوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ انہوں نے قرآن مجید کے اس ورق کو نکال کر جس پر عہد نامہ نونہار لکھا ہوا تھا، اس کے عوض میں ایک دوسرا ورق شامل کر دیا، اس دغابازی سے وہ چند بڑے پرگنے ان دیہات کے عوض میں جو وہی نام رکھتے تھے، اپنی تصرف میں لے آئے اور اس طرح حکومت انگلشیہ کو نقصان پہنچا کر اپنی عزت اور ایمان کو برباد کیا۔۔۔ چونکہ میر صاحب کا جرم پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے، اس بنا پر حکومت ہند نے فیصلہ کیا ہے کہ میر صاحب کا قصور ایسے ہی بغیر سزا کے نہ معاف کیا جائے۔

لہٰذا حکومت انگلشیہ اعلان کرتی ہے کہ میر علی مراد خاں کو ان کے عہدۂ ریاست سے برطرف کیا جاتا ہے اور تمام ملک سوائے اس علاقے کے جو میر سہراب خاں سے اُنہیں وراثت میں ملے ہیں، انگریزی علاقے میں شامل کیا جاتا ہے، پس تمام رعایا جو ان علاقوں میں رہتی ہے، وہ آیندہ سے اپنے آپ کو انگریزی حکومت کی رعایا سمجھے اور اس کے احکام و قانون کی پابندی کرے تو انہیں کسی قسم کا ضرر نہ پہنچے گا۔[1] فقط ۱۹ ماہ جنوری ۱۸۵۲ مطابق ۹ ماہ ربیع الاول ۱۲۶۸ھ۔

میر علی مراد خاں کا ردعمل:

میر علی مراد خاں نے اس حکم کی تعمیل کی اور سرکار انگریزی کے کسی حکم سے منحرف نہیں ہوئے، البتہ اس فیصلے کے خلاف لندن میں اپنے وکلا کے ذریعہ سے اپیل دائر کی اور خود بھی اس کی پیروی کے لیے اپریل ۱۸۵۶ء میں لندن گئے اور وہاں وہ ڈیڑھ سال تک مقیم رہ کر اپنے مقدمے کی پیروی کرتے رہے، لیکن ناکام واپس ہوئے۔

جب میر علی مراد خاں لندن جا رہے تھے تو اُنہوں نے اپنے بڑے

---

(1) مسٹر جیکب: (۱۸۱۲-۱۸۵۸ء) ۱۱ جنوری ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۲۸ء میں بمبئی کے توپ خانہ میں شامل ہو گیا۔ ۱۸۴۱ء میں سندھ میں مقرر کیا گیا۔ جنگ میانی، شہداد پور اور امرکوٹ میں اس نے اپنی بہادری کے کارنامے دکھائے۔ ۵ دسمبر ۱۸۵۸ء میں دماغی عارضے میں مبتلا ہو کر مرا۔ (تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۹۹۲)۔

(2) نائچہ: میرپور میں ایک جگہ ہے جو پنوعاقل ضلع سکھر سے ملی ہوئی ہے اور دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر واقع ہے، قدیم زمانے میں یہاں ایک بند تھا، جو "نائچ بند" کے نام سے مشہور تھا۔ (حاشیہ نوائے معارک، ۲ ص ۷۲۶)۔

(3) تازہ نوائے معارک، ص ۷۲۵-۷۳۱۔

(4) تازہ نوائے معارک، ص ۷۲۹-۷۳۱۔

بیٹے میر شاہنواز خاں کو مدار المہام اور منشی کشن داس کو اس کا مشیر مقرر کیا۔ ابھی یہ لندن ہی میں تھے کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ۱۸۵۷ء میں مشہور جنگ آزادی شروع ہوئی، چونکہ میر مراد خان لندن ہی میں تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارکان نے لندن میں اُن سے درخواست کی کہ وہ اپنے جانشین میر شاہنواز خاں کو لکھ بھیجیں کہ وہ قیام امن میں انگریزوں کی مدد کرے، چنانچہ اُنہوں نے شاہ نواز خاں کو لکھا اور اس نے باپ کے حکم کی تعمیل کی، جس کا انگریزوں پر اچھا اثر پڑا۔ ۱۸۶۵ء میں جب مینسفلیڈ سندھ کا کمشنر ہو کر آیا، تو اس نے میر علی مراد خاں کی سلامی کی وہ پندرہ ضرب توپیں جو بند کر دی گئی تھیں پھر بحال کر دیں اور اس طرح میر صاحب کو عملاً والیٔ ریاست تسلیم کر لیا۔ ۱۸۹۱ء میں حکومت برطانیہ نے میر صاحب کو نائٹ گرانڈ کراس آف دی انڈین امپائر یعنی جی-سی-آئی کا خطاب دیا۔[1]

میر علی مراد خاں کی وفات:

میر علی مراد خاں نے چار ماہ کی علالت کے بعد ۲۵ رمضان ۱۳۱۱ھ (اپریل ۱۸۹۴ء) میں وفات پائی۔ لاش کربلائے معلّٰی لے جائی گئی اور ایک خاص حجرے میں دفن کی گئی۔[2]

میر علی مراد خاں کی سیرت و شخصیت:

میر علی مراد خاں غیر معمولی مدبر، سلیقہ مند، عالی دماغ، مستقل مزاج، اولو العزم فرمانروا تھے، اور ہمارے خیال میں سیاسی سوجھ بوجھ میں وہ تمام میروں پر فوقیت رکھتے تھے۔ علمی حیثیت سے بھی وہ اپنے ہم عصروں میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اسلامی فنون و تاریخ سے خاص طور پر شغف رکھتے تھے اور سندھی زبان و ادب پر بھی اسے عبور حاصل تھا۔ فنون لطیفہ خصوصاً موسیقی سے غیر معمولی شغف رکھتے تھے، اُن کے دربار میں اُن کی علم نوازیوں کی بدولت علماً اور شعرا آتے تھے اور وہ ان کی قدر افزائی کرتے تھے۔[3]

آخوندہ محمد قاسم بالائی سندھ کا سندھی اور فارسی گو مشہور شاعر اپنے ابتدائی زمانے میں حکومت انگلشیہ میں معمولی منشی کی حیثیت سے ملازم تھا، آخر ملازمت ترک کر کے میر علی مراد خاں والیٔ خیر پور اور میر حسن علی خاں ٹالپور (حیدر آباد) کے دامن دولت سے وابستہ ہو گیا۔ میر علی مراد خاں نے اس کی دو سو روپے تنخواہ اور میر حسن علی خاں نے اس کا پانچ روپے یومیہ مقرر کر دیا۔[4]

میرزا محمد باقر تاج متخلص بہ آصف جو فارسی کا ایک نغز گو اور شیریں گفتار شاعر تھا کچھ زمانے تک میر علی مراد خاں کا وزیر رہا تھا۔[5] میر علی مراد خود بھی شعر و سخن سے مناسبت رکھتے تھے اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اُن کے دو ایک شعر نمونتاً ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

آہ از فراق تو سر دامان من گرفت
پروانہ پیش شمع رہ انجمن گرفت
رفتم بہ کوئے دوست، دہم شرح اشتیاق
شوقم بگشت آتش دامان من گرفت
جز ہجر او نصیب نہ گشتم علی مراد
آں ہم زمان عمر بہ یغماز من گرفت[6]

صوفیہ اور اہل دل سے بھی خاص عقیدت رکھتے تھے، خصوصاً حضرت پچل سرمست سے بہت مانوس تھے۔ اُن کا فارسی دیوان میر علی مراد ہی نے اپنے اہتمام سے طبع کرایا تھا۔

میر علی مراد کی سیرت کا کمزور ترین پہلو ہماری رائے میں یہ تھا کہ اُنہوں نے اپنی کوششوں کو انگریزوں کی اطاعت و فرمانبرداری پر مرکوز رکھا۔ جس نے اہل سندھ کے جذبۂ آزادی کو کچل کر رکھ دیا اور سندھ پر انگریزوں کے تسلط قائم کرانے میں اُن کی بڑی مدد کی۔

میرانِ میرپور

میر ٹھارہ خاں:

میر ٹھارہ خاں بن فتح خاں (مقتول ۱۱۹۶ھ) بن موسیٰ خاں بانی میرپور بن اللہ یار خاں (۱۱۴۶ھ) بن مانک خاں (۱۱۳۳ھ) بن ککو خاں (۱۱۰۰ھ) بن شاہو خاں بن بجار خاں بن زنگی خاں۔ حکومت میرپور کا مؤسس اول اور پہلا فرمانروا تھا، جس نے میرپور خاص کو اپنی حکومت کا مستقر بنایا اور ریگستان کے بعض علاقوں کو اپنے مملکت میں

---

(1) تاریخ خیر پور، مؤلف: نسیم امروہوی، ص ۷۰-۷۱۔
(2) ایضاً-ص، ۷۲۔
(3) ماخوذ از تاریخ خیر پور، مؤلف: نسیم امروہوی، ص ۷۵۔
(4) حاشیہ تکملہ مقالات الشعراء مؤلف سید حسام الدین راشدی، نمبر ۲، ص ۴۶۶۔
(5) تکملہ مقالات الشعراء، ص ۳۸۔
(6) تاریخ خیر پور، مؤلف نسیم امروہوی، ص ۷۶۔

شامل کر کے اپنے مقبوضہ علاقے کو وسیع کیا، میر ٹھارہ خاں نے ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء) میں وفات پائی۔[1]

میر علی مراد خاں:

میر ٹھارہ خاں کی وفات کے بعد اسی سال اُس کا بیٹا میر علی مراد خاں مسندِ حکومت میر پور خاص پر بیٹھا۔ یہ نہایت خدا ترس اور فقیر دوست فرمانروا تھا۔ اس نے ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۷ء) میں وفات پائی اور اپنی وفات کے وقت تین بیٹے میر شیر محمد خاں، میر شاہ محمد خاں اور میر خان محمد خاں چھوڑے۔[2]

شیر سندھ میر شیر محمد خاں:

میر علی مراد خاں کی وفات کے بعد اُس کا بڑا بیٹا میر شیر محمد خاں جو تاریخ سندھ میں "شیر سندھ" کے لقب سے ملقب ہے، مسند حکومت پر بیٹھا۔ یہ تاریخ سندھ کی ایک اہم اور عہد آفریں شخصیت ہے۔ اُس زمانے میں حیدر آباد میں میر نصیر خاں ولد میر مراد علی خاں اور میر محمد خاں ولد میر غلام علی خاں اور میر شہداد خاں و میر حسین علی خاں پسران میر نور محمد خاں اور میر صوبدار خاں فرزند میر فتح علی خاں مختلف حصوں پر حکمراں تھے۔ اسی طرح خیر پور میں میر رستم خاں خلف میر سہراب خاں، میر علی مراد خاں خلف میر سہراب خاں و میر نصیر خاں ولد میر مبارک خاں پسر میر سہراب خاں کی حکومت تھی۔ یہ میرانِ خیر پور اگرچہ اپنے اپنے حصوں پر حکومت کرتے تھے، لیکن ان میں باہمی دلی محبت نہ تھی، اور میر پور خاص میں صرف میر شیر محمد خاں خلف میر علی مراد خاں حکمران تھا۔ تاریخ میں یہ ہے کہ یہ نہایت بہادر، شجیع اور خدا ترس انسان تھا۔[3]

میر شیر محمد خاں کا انگریزوں سے معاہدہ:

دوسرے میرانِ سندھ کی طرح انگریزوں نے میر شیر محمد خاں حکمران میر پور خاص کو بھی اپنے معاہدے کی زنجیروں میں جکڑا تھا۔ چنانچہ ۱۸ جون ۱۸۴۱ء کو جو انہوں نے میر شیر محمد خاں سے معاہدہ کیا، اس کی شرائط حسب ذیل تھیں۔

چونکہ اس سے پہلے میران حیدر آباد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ایک معاہدۂ دوستی و مودت طے پا چکا ہے، لہٰذا اسی مضمون کا ایک معاہدہ میر شیر محمد خاں اور کمپنی کے درمیان حسب ذیل شرائط پر منعقد کیا گیا۔

۱۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر شیر محمد خاں میں ہمیشہ دوستی اور محبت قائم رہے گی۔

۲۔ ہر سال یکم فروری کو میر شیر محمد خاں کی حکومت انگریزی سرکار کو مبلغ پچاس ہزار روپے انگریزوں کے اس لشکر کے مصارف کے لیے جو سندھ میں مقیم ہے، کمپنی کے سکے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ادا کرے گی۔

۳۔ انگریزی گورنمنٹ اس کا عہد کرتی ہے کہ وہ میر مذکور کی مقبوضہ سرزمین کی بیرونی حملوں سے حفاظت کرے گی۔

۴۔ میر شیر محمد خاں اپنی حکومت کا خود مختار حکمران ہو گا اور حکومت انگلشیہ اُس کے اختیارات میں مداخلت نہیں کرے گی اور نہ میر پور کی رعایا کی کوئی شکایت جو امیر مذکور کے متعلق ہو گی اسے سنے گی۔

۵۔ امیر موصوف پہلے ہی سے اپنے ملک کا خود مختار مالک ہے، لیکن اگر اس کا (سندھ) کے دوسرے اُمرا سے کسی امر پر اختلاف ہو گا تو وہ اس کی برطانوی ریذیڈنٹ مقیم سندھ کو اطلاع دے گا اور وہ ہندوستان کے گورنر جنرل کی منظوری کے بعد اس اختلاف کو رفع کرنے اور تصفیہ کرانے کی کوشش کرے گا۔

۶۔ چونکہ میر شیر محمد خاں کو فی الوقت بھی امیران حیدر آباد سے تقسیم اراضی پر اختلاف ہے لہٰذا اس کا فیصلہ بھی ریذیڈنٹ موصوف بحیثیت فریقین کے ثالث کے کریں گے۔

۷۔ اگر اُمرائے مذکور کی رعایا میں سے دوسرے امیر کی رعایا پر کوئی ظلم کرے اور امیر موصوف اندیشۂ بغاوت اور سرکشی کی بنا پر مجرم کو سزا نہیں دے سکتا، اس امیر کو چاہیے کہ وہ بتوسط ریزیڈنٹ برطانیہ گورنر جنرل کو اطلاع دے۔ اگر گورنر جنرل مناسب سمجھے گا تو مذکورہ مجرم کی گرفتاری کے لیے امداد دے گا۔

۸۔ امیر موصوف انگریزی گورنمنٹ کی بغیر اطلاع و منظوری کے کسی حکومت یا کسی دوسرے سردار سے عہد و پیمان نہ کرے گا، البتہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ مراسلت کر سکتا ہے۔

۹۔ امیر مذکور انگریزی گورنمنٹ کو صوابدید اور مشورے سے ہمیشہ امن

---

[1] لب تاریخ سندھ، ص ۱۵۳۔
[2] ایضاً۔
[3] لب تاریخ سندھ، ص ۱۵۳۔

و امان کے امور کی کوشش کرتا رہے گا۔ اگر ضرورت پڑے گی تو انگریزی گورنمنٹ امن قائم کرنے کے لیے فوجی امداد بھی دے گی، لیکن یہ فوج انگریزی افسر کے تحت کام کرے گی، اگر کوئی انگریزی فوج امیر موصوف کے ملک سے باہر کبھی جائے گی تو اس کے اخراجات سرکار انگریزی کے ذمے ہوں گے۔

۱۰۔ چونکہ سکہ کمپنی اور سکہ سکھرو (بکرو) یا سکہ تیموری کی قیمت مساوی ہے، اس بنا پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا سکہ امیر موصوف کے ملک میں جاری کیا جائے گا۔

۱۱۔ جو کشتیاں کہ دریا سے اور دریائے سندھ کے جانب سے شمال سے امیر موصوف کے ملک میں داخل ہو کر گزرتی ہیں، اُن سے محصول نہ لیا جائے گا۔

۱۲۔ اگر راستے میں تجارتی سامان کشتی سے اُتار کر فروخت کیا جائے تو اس سے رائج الوقت محصول لیا جائے گا۔ لیکن اگر مال مذکور لشکر گاہ اور انگریزی لشکر کی چھاؤنی میں فروخت کیا جائے گا تو اس پر محصول نہ لیا جائے گا۔

۱۳۔ تاجروں کو یہ حق ہو گا کہ مناسب موسم میں اپنا مال تجارت دریائے سندھ کے راستے سے لائیں اور دوسرے موسم میں فروخت کے لیے وہ سامان اپنے تجارتی خانگی گوداموں میں محفوظ کرلیں، اگر تاجران مذکور اپنے تجارتی سامان کو انگریزی لشکر گاہ کے علاوہ کہیں اور فروخت کریں گے تو اُن سے معمول کے مطابق محصول لیا جائے گا۔

۱۴۔ واضح ہو کہ یہ عہد نامہ جس کا ایک فریق گورنر جنرل اور دوسرا فریق میر شیر محمد خاں ہے، ان دونوں فریقوں نے منظور کیا ہے۔ سرکار ہندوستان کے جانشین اور امیر مذکور کے جانشین و ورثا ہمیشہ اس کی پابندی کریں گے۔ دستخط- آکلینڈ- ۲۷ ربیع الاول ۱۲۵۷ھ (۱۸ جون ۱۸۴۱ء) فورٹ ولیم بمبئی میں گورنر جنرل نے اس پر منظوری کے دستخط کیے۔[1] (ٹی ایچ میڈک سکریٹری گورنمنٹ ہند)

میر شیر محمد خاں کی انگریزوں سے پہلی آویزش:

گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے کہ ۱۲۵۵ھ (۴۰-۱۸۳۹ء) میں خراساں پر حملے کے لیے انگریزی فوج سر جان کین، جنرل ویلشائر اور اوٹرام کی سرکردگی میں رسالے، گوروں اور تلنگوں کی پلٹن اور توپ خانے کے ساتھ بمبئی سے کراچی پہنچی اور کراچی سے ٹھٹھہ میں داخل ہوئی تو میر شیر محمد خاں والی میرپور خاص نے انگریزوں کی آمد کی خبر سن کر ان کے مقابلے کے لیے بلوچوں کا ایک بڑا لشکر جمع کر کے انگریزوں سے جنگ کی تیاری کی تھی۔ اس معاملے میں حیدرآباد کے حکمران میر صوبدار خاں اور میر محمد خاں بھی اُس کے ساتھ تھے، سوائے میر نور محمد خاں کے جو ان کے ہمنوا نہ تھا، باقی سب کے سب میران حیدرآباد اس مہم میں شریک تھے۔ اس لشکر نے سب سے پہلے ۱۵ فروری ۱۸۴۳ء کو انگریزوں کی چھاؤنی میں داخل ہو کر جو حیدرآباد سے تین میل کے فاصلے پر دریائے سندھ کے کنارے واقع تھی، اُن کے ایک گودام کو لوٹ لیا، یہ ایسا شدید حملہ تھا کہ میجر اوٹرام جیسا کمانڈر بھی کشتی میں بیٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا لیکن میر نور محمد خاں جو اس مہم میں علیحدہ تھا، اُس نے میر شیر محمد خاں کو اس جنگ سے روکا اور اس نقصان کے عوض میں جو گودام کے لٹنے سے انگریزوں کو پہنچا تھا، چوبیس لاکھ روپے بطور تاوان انگریزوں کے پاس بھجوا دیے اور اس طرح انگریزوں کو راضی کرلیا، ہم اس واقعہ کو تفصیل سے گزشتہ اوراق میں لکھ آئے ہیں، اس لیے یہاں اس کی تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

جنگ دبہ:

گزشتہ اوراق میں ہم تفصیل سے ذکر کر آئے ہیں کہ سندھ پر قبضہ جمانے کے لیے انگریزوں نے کس چالاکی و عیاری سے میران سندھ سے اپنے تعلقات قائم کیے، پھر وہ آہستہ آہستہ اُن کے خانگی معاملات میں دخل انداز ہونے لگے، پھر اُن میں انہوں نے پھوٹ ڈالی اور ان میں بعض کو حکومت و سرداری کا لالچ دے کر اپنے بھائیوں سے غداری پر آمادہ کیا اور ساتھ ہی اُنہیں ایسے معاہدوں میں جکڑا کہ میرانِ سندھ کی حکومت کمزور ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ جنگ میانی پیش آئی، جس میں میروں کو شکست ہوئی اور میرانِ حیدرآباد و خیرپور جلا وطن ہو کر قید فرنگ میں پڑے، بلکہ اُن میں سے بعضوں نے اُسی قید فرنگ اور عالم غربت میں وفات پائی۔ میرانِ حیدرآباد اور خیرپور کے اس حشر نے میر شیر محمد خاں حکمران میرپور کی غیرت کو جوش دلایا اور وہ ایک کثیر لشکر لے کر سامان حرب سے لیس ہو کر انگریزوں سے لڑائی کے لیے حیدرآباد کی طرف روانہ ہوا اور منازل طے کرتا ہوا حیدرآباد سے چار کوس کے فاصلے پر ٹنڈو موسیٰ خاں کھتران کے متصل پھلیلی کے کنارے سمت مشرق میں خیمہ زن ہوا، اُدھر سے انگریزوں کی فوج مقابلے کے لیے آئی

---

[1] تعلیقات تازہ نوائے معارک (آقائی حبیبی)، ص ۹۷۴-۹۷۶۔

اور یہیں دونوں فوجوں میں ۲۴ مارچ ۱۸۴۳ء کو معرکہ کارزار گرم ہوا، جو "جنگ دبہ" کے نام سے موسوم ہے۔ اس جنگ میں انگریزی فوج کی کمان چارلس نیپیر کے سپرد تھی۔

ہوش محمد کے کارنامے:

جنگ دبہ میں جس دلیر اور بہادر سپاہی نے اپنی شجاعت کا لوہا انگریزوں سے منوایا، وہ آپ اپنی مثال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہوش محمد خاں میر صوبدار خاں حکمرانِ حیدرآباد کا غلام تھا۔ وہ اپنی شجاعت، بہادری اور غیر معمولی عزم و جرأت کی وجہ سے فوج کے کمانڈر کے بلند عہدے پر فائز ہوا، یہ اپنے فوجی دستے کے ساتھ نہایت آن بان سے میدان جنگ میں آیا اور اس شجاعت و بہادری سے لڑا کہ اس نے انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ میدان جنگ میں وہ یہ نعرہ 'مرویسوں پر سندھ نہ ڈیسوں' (ترجمہ) ہم مر جائیں گے مگر سندھ کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے، اپنی فوج کے حوصلے بلند کرتا رہا۔ آخر وہ یہ نعرہ لگاتے لگاتے انگریزوں کی فوج پر ٹوٹ پڑا اور دشمنوں کا مقابلہ کرتے کرتے شہید ہوا۔

چارلس نیپیر ہوش محمد کے شجاعت اور بہادری سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے ہوش محمد کی تجہیز و تکفین پورے فوجی احترام کے ساتھ کی۔ اسے حیدرآباد کے قلعے میں دفن کیا گیا اور قبر پر ایک توپ نصب کی گئی۔

سر چارلس نیپیر نے ہوش محمد کی شجاعت و بہادری کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ وہ مر چکا تھا مگر پھر بھی تلوار پر اس کے ہاتھ کی گرفت سخت تھی۔[1]

میر غلام علی خاں، رحیم خاں ٹالپور، علی خاں ٹالپر وغیرہ کے شجاعانہ کارنامے:

دبہ کے میدان جنگ میں علاوہ ہوش محمد کے جن بہادروں نے اپنی شجاعت کے نقوش چھوڑے اور جن کے شجاعانہ کارناموں کی وجہ سے تاریخ میں اُن کے نام محفوظ ہیں، اُن میں خاص طور پر قابل ذکر میر غلام علی خاں، خلف مرحوم عبداللہ ٹالپور، علی خاں ٹالپور، کمال خاں مری، نبی بخش مری اور نوحانی بلوچ ہیں۔ یہ دو تین سو سپاہیوں کے لشکر کے ساتھ دبہ کے میدان جنگ میں پہنچے اور انگریزوں کا نہایت پامردی سے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انگریزی فوج کے بہت سے سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، یہاں تک کہ چارلس نیپیر جو انگریزی فوج کی کمان کر رہا تھا ان کی شجاعت کے جوہر اور اپنی فوج کے کشتوں کے پشتے دیکھ کر اپنا سر پیٹنے لگا۔[2]

جنگ دبہ میں میر شیر محمد خاں کی شکست کے اسباب:

قریب تھا کہ انگریزوں کی فوج درہم برہم ہو کر شکست کھا جائے کہ اچانک سخت آندھی آئی اور گرد و غبار کی وجہ سے اس قدر تاریکی چھائی کہ زمین و آسمان کچھ نظر نہیں آتا تھا، اس پر بھی بلوچ اس شجاعت و بہادری سے لڑتے رہے کہ اُن کی شجاعت حدِ تحریر سے باہر ہے۔

عین اس موقع پر محمد خاں تھورہ جو بباطن انگریزوں سے ملا ہوا تھا اور بظاہر انگریزوں کے مشورے سے شیر محمد خاں کے ساتھ تھا۔ اُس نے اس طوفان اور اندھیاؤ میں چپکے سے میر شیر محمد خاں کے بارود خانے میں آگ لگا دی۔ تاہم ایک سخت مقابلہ ہوا۔ بعض امراء میر شیر محمد خاں کو آخر وقت نکال کر لے گئے تاکہ وہ دوسرے مقابلے کے لیے سلامت رہے۔ میر شیر محمد خاں وہاں سے نصرپور پہنچا، پھر وہاں سے وہ میرپور آیا۔

میر شیر محمد خاں کی ریگستان کی طرف روانگی:

میر شیر محمد خاں اپنے خاندان کو پہلے ہی ریگستان کی طرف روانہ کر چکا تھا، اب جو کچھ بھی اس کا ساز و سامان باقی تھا، وہ اُسے لے کر خود بھی ریگستان کی طرف روانہ ہو گیا۔

جنگ کو نہیرہ:

میر شیر محمد خاں لغاری امراء اور دوسرے رؤساء دوسری بار جمعیت کے ساتھ ابھ پور (موجودہ تعلقہ سنجھورہ) پہنچے۔ وہاں سے وہ شاہ پور چاکر آئے۔ مقصد یہ تھا کہ سیوہن کی طرف دریائے سندھ کے مغربی طرف جو چانڈیہ بلوچ اور دوسری قومیں اور ٹالپور امیر ہیں وہ دریا عبور کر کے سکرنڈ پہنچیں، یہاں سے میر شیر محمد خاں کی جمعیت ان کے ساتھ جا کر ملے اور وہ مل کر شمال کی طرف سے حیدرآباد پر حملہ کریں اور نیز خیرپور اور حیدرآباد کی رسد کو کاٹ دیں۔ انگریزوں کو اس منصوبے کا علم ہو گیا۔ چنانچہ سر چارلس نیپیر نے اپنی گھوڑ سوار فوج بھیج دی جو خفیہ طور پر شہداد پور سے شمال کی طرف پہنچی۔ میر شیر محمد خاں کی جمعیت نے شاہ

---

[1] ہوش محمد کے متعلق یہ تفصیل فیض محمد سومرو کے مضمون "جب ہوش محمد نے چارلس نیپیر کا مقابلہ کیا" شائع شدہ اخبار جنگ کراچی مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۶۹ء اور تازہ نوائے معارک، ص ۶۷۰-۶۷۱ سے ماخوذ ہے۔

[2] تازہ نوائے معارک، ص ۶۷۱۔

پور سے کوچ کر کے سکرنڈ کا رخ کیا۔ جب وہ کو نہیرہ کے وسیع بے آب میدان میں پہنچے تو دور سے ان کو فوج نظر آئی، انہوں نے سمجھا کہ یہ بلوچوں کا لشکر ہے جو سیوہن کی طرف سے آرہا ہے لیکن وہ انگریزوں کی گھوڑے سوار فوج تھی۔ میر شیر محمد کی پیدل فوج نے زبردست مقابلہ کیا۔ لغاریوں کے دو سو جوان مارے گئے۔ رات ہوگئی اور شکست کھا کر میر شیر محمد خاں واپس ابھ پور پہنچے، اس کے بعد یہ طے پایا کہ میر پور ماتھیلہ میں لغاری اور دوسری بلوچ اقوام کی جمعیت کو اٹھا کر کے آخری فیصلہ کن لڑائی کی جائے۔ اس کے بعد میر شیر محمد خان نواب احمد خاں لغاری ریگستان کی راہ سے میر پور ماتھیلہ کو روانہ ہوئے۔[1]

میر علی مراد خاں حکمران خیر پور کی انگریزوں سے وفاشعاریاں:

اِدھر شیر سندھ میر شیر محمد خاں انگریزوں کا تختہ الٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ انہیں سندھ سے باہر نکال دینے کی سعی میں مشغول تھا، اُدھر میر علی مراد خاں حکمران خیر پور انگریزوں کی خوشنودی مزاج کے لیے سندھ میں انگریزوں کے قدم مضبوط کرنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے، چنانچہ جب میر علی مراد خاں حکمران خیر پور کو معلوم ہوا کہ شیر سندھ میر شیر محمد خاں نے انگریزوں کے خلاف بڑا لشکر اور سامان حرب جمع کیا ہے اور بڑے پیمانے پر جنگی تیاریاں کی ہیں تو اس نے انگریزوں کی خوشامد اور اپنے آپ کو یار وفادار ثابت کرنے کے لیے شیر سندھ میر شیر محمد خاں کے لشکر میں پھوٹ ڈالی، اُس نے نہایت چالاکی سے میر احمد خاں لنگ کو جو میر شیر محمد خاں کا دادا تھا اور اس لشکر کے دوسرے بڑے سرداروں کو جو اس جنگ کے بانی مبانی تھے بڑی بڑی ملازمتیں دینے کا فریب دے کر میر شیر محمد خاں سے توڑ لیا اور اپنی اس چال سے سارے لشکر میں پھوٹ ڈال دی۔ جب شیر سندھ نے یہ دیکھا کہ وہ بڑے بڑے لوگ جن کی شجاعت پر اس جنگ کا دارومدار تھا، سب اُس سے ٹوٹ کر میر علی مراد خاں سے جا ملے ہیں اور لشکر میں افتراق پیدا ہو چکا ہے تو اس نے عافیت اسی میں دیکھی کہ وہ فرار ہو جائے، چنانچہ وہ فوراً وہاں سے روانہ ہو گیا۔

شیر سندھ کی یہ شکست اگرچہ تقدیر الٰہی تھی، لیکن سندھ پر یہ روز بد جس طرح وہ آیا بیان کیا جا چکا، میر شیر محمد خاں کے تعاقب میں انگریزی فوج کے سوار روانہ کیے گئے، کچھ نے اُس کے تعاقب میں قلعۂ عمر کوٹ کا رخ کیا اور کچھ ٹنڈو الہ یار کی طرف گئے، لیکن وہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔

میر شیر محمد خاں کی کمک حاصل کرنے کے لیے قندھار روانگی:

اس ہزیمت کے بعد میر شیر محمد خاں ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں سندھ میں انگریزوں کے مقابلے میں کمک حاصل کرنے کے لیے قندھار گیا، قندھار کے سرداروں نے اس کے اعزاز و اکرام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ میر شیر محمد خاں نے بھی چودہ پندرہ ہزار کے تحائف سرداران قندھار کی خدمت میں پیش کیے۔ میر شیر محمد خاں نے انگریزوں سے جنگ کے لیے فوجی امداد چاہی، لیکن سرداروں نے کہا کہ جو ہم سے ہو سکتا ہے ہم اُس میں دریغ نہ کریں گے، لیکن انگریزوں کا مقابلہ کچھ معمولی بات نہیں، اس کے لیے سامان اور زاد راہ کی ضرورت ہے، ہم جو تین چار ہزار کا لشکر رکھتے ہیں وہ بغیر طلب تنخواہ کے حاضر ہے، جو کچھ اُن کی تنخواہ ہوگی ہم اپنے کپڑے فروخت کر کے دیں گے، لیکن قبیلوں سے لشکر فراہم کرنا بغیر اخراجات اور زاد راہ کے ممکن نہیں، جب تک کہ تمام قبائل سے لشکر فراہم کر کے روانہ نہ کیا جائے، اُس وقت تک انگریزوں سے مقابلہ مشکل ہے اور یہ جو تین چار ہزار کا لشکر ہمارا ہے، یہ تو انگریزوں کی دو توپوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا، میر شیر محمد خاں نے اُنہیں جواب دیا کہ اس وقت اتنا روپیہ میرے پاس نہیں، البتہ جب قبائل کے سردار اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ شال کوٹ میں منزل انداز ہوں گے تو میں مبلغ دو لاکھ روپے سے ان کی خدمت کروں گا اور جب یہ دادہر میں ہوں گے تو میں وہاں مزید ایک لاکھ روپیہ ان کو دوں گا اور جب یہ ملک کچھی میں پہنچیں گے تو اس وقت لشکر کے تمام مواجبات تنخواہیں میرے ذمے ہوں گی۔

سردار طوعاً و کرھاً اس پر راضی ہو گئے اور میر افضل خاں کو میر شیر محمد کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ شال کوٹ جا کر رقم مذکورہ حاصل کرے، جب یہ رقم وصول ہو جائے گی تو اس کے بعد ہم قندھار سے روانہ ہو کر شال کوٹ پہنچیں گے۔

جب سردار افضل خاں میر شیر محمد کے ساتھ پشین پہنچا تو وہاں

---

[1] ہم جنگ کو نہیرہ کے تفصیلی حالات کے لیے محترمی جناب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ پروفیسر سندھ یونیورسٹی حیدرآباد کے ممنون ہیں، جن کا اُنہوں نے مسودے میں اضافہ کیا۔

اتفاق سے اس قدر شدید بارش ہوئی کہ ساری عمر ایسی بارش نہ ہوئی تھی، یہ تقریباً پندرہ روز وہاں پڑے رہے لیکن جس رقم کا وعدہ میر شیر محمد خاں نے سرداروں سے کیا تھا، وہ اُن کو نہ پہنچی۔ میر شیر محمد خاں نے معذرت کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ میں یہ رقم اور دادھر میں جس رقم کے دینے کا وعدہ کیا ہے، دادھر پہنچ کر اکٹھی ادا کروں گا، سردار محمد افضل خاں نے یہ صورت حال قندھار کے سرداروں کو لکھی۔ سرداروں نے جواب دیا کہ میر شیر محمد خاں کو اختیار ہے، اگر وہ چاہے تو ہمارے پاس چلا آئے وہ اور ہم ایک ساتھ رہیں گے، اور اگر وہ کسی اور طرف اپنے اہل و عیال کے ساتھ جانا چاہتا ہے، تو ہم مانع نہیں، اُسے خوش دلی کے ساتھ رخصت کر دو، چنانچہ سردار محمد افضل خاں نے اپنے معتبر آدمیوں کے ساتھ میر شیر محمد خاں کو دادھر روانہ کر دیا، دادھر میں کچھ رقم میر شیر محمد خاں کو ملی، میر شیر محمد خاں راتوں رات وہ رقم لے کر قلعہ کھان آیا اور یہیں احمد خاں لغاری بھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ کوہستان چاندیہ سے آکر اس کے ساتھ ملا۔[1]

قلعہ کھان سے میر شیر محمد خاں چھتر اور بوچی پہنچا اور انگریزوں کے لیے لشکر جمع کرنے لگا، وہ بوچی اور چھتر میں چند روز ٹھہرا لیکن انگریزوں سے مقابلے کی طاقت نہ پاکر واپس کھان آگیا۔ چند روز کے بعد وہاں سے ملتان اور پھر لاہور گیا۔[2]

لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے سامنے حاضری:

لاہور میں آنے کے بعد جب اُس نے انگریزوں سے مقابلے کے لیے ہر طرف سے راہیں بند دیکھیں، مجبوراً وہ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے سامنے حاضر ہوا اور انگریز گورنمنٹ نے اس کی جواں مردی اور شجاعت کی بنا پر بطور مدد معاش کچھ وظیفہ مقرر کر دیا اور اُس کے قیام کا انتظام لاہور میں کیا، وہ کچھ مدت تک لاہور میں ٹھہرا رہا۔ اُسی زمانے میں اس کا بھائی میر شاہ محمد خاں جو بمبئی میں نظر بند تھا، رہائی پاکر لاہور پہنچا اور میر شیر محمد خاں سے ملا، پھر یہ دونوں بھائی اپنے وطن میرپور خاص چلے آئے۔[3]

وفات:

سندھ کی آزادی کے علمبردار شیر سندھ میر شیر محمد خاں نے ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں اپنے وطن میرپور خاص میں وفات پائی اور آزادی کی تاریخ میں اپنا نام روشن کر گیا۔[4]

ٹالپور عہد پر تبصرہ

ٹالپور عہد ۱۷۸۳ء سے شروع ہو کر ۱۸۴۳ء پر ختم ہوتا ہے، ٹالپوروں کی حکومت کا یہ عہد تقریباً ساٹھ سال کا تھا، یہ دور اگرچہ بہت مختصر دور ہے اور باوجودیکہ ان کا یہ دور آپس کے اختلاف اور سیاسی جوڑ توڑ میں گزرا اور وہ اپنی حکومتوں کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے، لیکن مجموعی حیثیت سے ان کے دور کو ایک کامیاب دور کہا جاسکتا ہے۔

ٹالپوروں کی حکومت کا نظم و نسق:

ٹالپوروں کی حکومت کے نظم و نسق کے متعلق سید مصطفیٰ علی صاحب بریلوی نے روزنامہ اخبار "حریت" مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۶۷ء میں ۱۸۴۰ء کی ایک تاریخی دستاویز کے عنوان سے کیپٹن ڈبلو ہارٹ کی لکھی ہوئی ایک دستاویز کا ترجمہ جو میران سندھ کی حکومت کے نظم و نسق پر مشتمل ہے کیا ہے جس کے خاص خاص اقتباس اس مضمون میں ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

میران سندھ کی حکومت میں سول اور ملٹری عہدے ایک ہی ذات میں مرکوز ہوتے تھے، گورنر کا تقرر امیر کی جانب سے ہوتا تھا اور گورنر کو نواب کے لقب سے موسوم کیا جاتا تھا۔ گورنر کے اختیارات واضح نہیں تھے۔ لیکن اس کو سزائے موت دینے کا حق حاصل نہ تھا۔ ۱۸۴۰ء میں حیدرآباد کے امیروں کا جو گورنر تھا، اس کو تینوں امیروں کی منظوری حاصل تھی، چوتھے امیر میر صوبدار خان نے ایک ہندو مول چند نامی کو اپنی جانب سے مقرر کیا تھا، جو اس کی جانب سے کلکٹری کے فرائض بھی ادا کیا کرتا تھا۔

عام اختیارات کے بارے میں صرف ایک پابندی تھی کہ کسی انتظامی معاملے کی شکایت دربار حیدرآباد تک نہ پہنچے۔

---

(1) میر شیر محمد خاں کے سفر قندھار کی یہ تمام تفصیل نوائے معارک کے نسخہ (ب) سے لی گئی ہے، جس کو حاشیہ کی صورت میں آقائی حبیبی نے نوائے معارک کے، ص ۶۸۶، ۶۸۸ پر دیا ہے۔

(2) تازہ نوائے معارک، ص ۶۹۱۔

(3) تازہ نوائے معارک، ص ۶۹۲۔

(4) لب تاریخ سندھ، ص ۱۵۶-۱۵۷۔

کیپٹن ہارٹ کا بیان ہے کہ گورنر کو ملزموں کے بید لگوانے، ناک کان کٹوانے کا اختیار حاصل تھا، جہاں تک قطع و برید کا تعلق ہے، یہ سزا بہت ہی اتفاقی صورتوں میں دی جاتی تھی۔ اسمگلنگ کی سزا بید لگوانا تھی، یہ بید کھجور کی لکڑی کا ہوتا تھا اور جس وقت لگایا جاتا تھا، تو کھال میں پیوست ہو جاتا تھا، اگر ملزم جرمانہ ادا کر سکتا تو بعد ادائیگی جرمانہ ملزم کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔

گورنر کراچی کی فوجی قوت معمولی تھی، قلعۂ منوڑہ میروں کے قبضے میں تھا، اس وقت گنتی کے سپاہی وہاں متعین تھے۔ اصل میں جملہ مسلمان بلوچی قبائل رزرو فوجی تھے، اور ان کو ملیر وغیرہ میں بڑی بڑی جاگیریں حسب ضرورت فوجی خدمت کے وعدے پر ملی ہوئی تھیں۔

گورنر سکریٹریٹ:

علاقے کے محاصل وصول کرنے، جانچ پڑتال کرنے، حیدرآباد روپیہ روانہ کرنے، سرکاری ملازموں کی تنخواہوں کا باضابطہ حساب رکھنے کے لیے گورنر کراچی کا ایک بڑا دفتر تھا، جس میں منشی، عامل، آڈیٹر وغیرہ ہوتے تھے۔

ذرائع آمدنی:

میرانِ سندھ کے زمانے میں کراچی شہر بہت سے ٹیکسوں سے بچا ہوا تھا جو انگریز اقتدار کے بعد قائم ہوئے۔

کیپٹن ہارٹ لکھتا ہے کہ جب سے میروں نے کراچی فتح کیا ہے، یہ شہر ان بہت سے ٹیکسوں سے بری ہے، جو دوسرے شہر کے عوام کے لیے بہت تکلیف دہ ہیں۔

حکومت کی آمدنی کے لیے جو تھوڑے بہت ٹیکس عائد تھے، ان کی اول تو شرح بہت کم تھی، دوسرے حکومت ان ٹیکسوں کے وصول کرنے میں زیادہ سختی نہیں کرتی تھی۔

محل چبوترہ:

"محل چبوترہ" ٹیکس کی اصطلاح تھی، جو لوگ سامان تجارت لے کر آتے تھے، اس چبوترے پر متعینہ سرکاری آدمیوں کو دکھاتے تھے۔

عمارتی لکڑی، سوختنی لکڑی اور مچھلی وغیرہ بھی ٹیکس میں شامل تھی۔ نقل و حمل کے کام آنے والے جانور مثلاً بیل، اونٹ وغیرہ بھی ٹیکس تھا۔

جوئے کی ممانعت:

شہر اور نواح میں جوا کھیلنے کی سخت ممانعت تھی، خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا ملتی تھی اور رقم بھی ضبط کر لی جاتی تھی، لیکن سرکاری جوئے خانے میں جا کر جوا کھیلنا کوئی جرم نہ تھا، جہاں ہار جانے والے جواریوں کو عامل بطور قرض روپیہ دیتا تھا اور اس رقم کی وصول یابی میں سرکاری حکام مدد دیتے تھے۔ جو شخص جوئے میں جیت جاتا تھا، اسے دو کرانی روپے ٹیکس دینا پڑتا تھا، اون پر بھی ٹیکس لیا جاتا تھا۔

فوج:

حکومت ٹالپور کسی قسم کی فوج نہیں رکھتی تھی، صرف تھوڑے سپاہی قلعہ حیدرآباد میں متعین تھے، لیکن دربار کے حاضر باش لوگ آرڈر ملتے ہی چند دن میں ہزاروں فوجی جمع کر سکتے تھے۔[1]

سندھ کے متعلق ڈاکٹر برنس کے تاثرات:

ڈاکٹر برنس نے ٹالپوروں کے عہد میں سندھ کے متعلق اپنے تاثرات کو قلم بند کرتے ہوئے لکھا کہ:

> سندھ بارش نہ ہونے اور قحط کے نتیجے کی تباہیوں سے بچا ہوا ہے، نیز اس کی آزادی قائم ہے، قدرت نے اسے پورے سال جاری رہنے والے دریا سے نوازا ہے، جو زرخیزی اور تجارت کی ترقی کا سبب ہے، قدرت کی اس نوازش کو کسی زیادتی یا ظلم کے ذریعہ تباہ نہیں کیا جا سکتا، اس دریا سے کاشتکار اپنے کھیت کو سینچتا ہے اور بغیر کسی تکلیف کے مناسب موسم میں ایک اچھی فصل کی امید رکھتا ہے، اگر وہ چاہے تو اپنی زائد پیداوار دوسرے ملکوں کو سہولت اور منافع کے ساتھ برآمد کر دے۔

موجودہ حاکموں نے جہاں تک واقعاتی تعلق ہے، صوبۂ سندھ کو گزشتہ تیس سال میں پُر سکون حالت میں رکھا ہے اور کسی قسم کا غل و غش نہیں ہوا ہے۔[2]

---

(1) نظم و نسق کی یہ تمام تفصیل ۱۸۴۰ء کی ایک تاریخی دستاویز کیپٹن ڈبلو ہارٹ ترجمہ سید مصطفیٰ علی بریلوی روزنامہ اخبار حریت ۱۱ نومبر ۱۹۶۷ء سے منقول ہے نیز (دیکھو بمبئی گورنمنٹ ریکارڈ ۱۸۵۲ء جلد اول)۔

(2) ڈاکٹر برنس کے تاثرات - ترجمہ سید مصطفیٰ علی بریلوی، روزنامہ اخبار مشرق ۱۸ جون ۱۹۶۸ء۔

ٹالپوری عہد کے سکے:

میر فتح علی کو حکمران سندھ بناتے وقت تیمور شاہ نے یہ شرط عائد کی تھی کہ سندھ میں درانی سکہ جاری رہے گا۔ ۱۸ مئی ۱۷۹۳ء میں تیمور شاہ کی وفات کے بعد زمان شاہ کابل تخت پر بیٹھا، اس کے سکے پر یہ عبارت کندہ تھی:

قرار یافت بحکم خدائی ہر دو جہاں
رواج سکۂ دولت بنام شاہ زماں

۱۲۱۸ھ (۱۸۰۳ء) میں زمان شاہ کے بعد درانی سلطنت کمزور ہوگئی۔ ٹالپور جو پہلے ۱۲ لاکھ روپے خراج کابل سرکار کو دیتے تھے، میر غلام علی خاں نے وہ بند کر دیے۔ کشمیر، پنجاب، پشاور اور ڈیرہ جات پر ملتان تک رنجیت سنگھ نے قبضہ کر لیا، رنجیت سنگھ نے جو سکہ رائج کیا، اس کی عبارت یہ تھی:

دیگ، تیغ و فتح و بی درنگ
یافت از نانک گورو گوبند سنگھ

۱۸۳۸ء میں میر مراد علی خاں نے اشرفیاں اور روپے تیار کرائے۔ ترخانوں کے بعد ٹالپوروں کا یہ پہلا سکہ تھا جو رائج ہوا۔ ان سکوں کے ایک جانب ضرب سندھ اور دوسری جانب سلاطین جہاں کندہ تھا، بعد میں انگریزوں نے اپنے معاہدوں کے تحت جن کا تذکرہ گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے، میروں کے لیے سکے تیار کرائے۔ میر مراد علی خاں اور فتح علی شاہ قاچار کی دوستی اور تعلقات کے سبب دو قسموں کے ایرانی سکے گبری اور پیلی بھی سندھ اور بلوچستان میں رائج تھے، جن کی قیمت چار آنے کے برابر تھی۔ مسقط کا پیسا بھی سندھ میں چلتا تھا، پرتگالی ڈالر اور اطالوی اشرفیاں جو خالص سونے کی تھیں یہ بھی سندھ اور بلوچستان میں رائج تھیں، شہر میں کوڑیوں کا بھی چلن تھا، ایک پیسے کے برابر ۹۲ کوڑیاں ہوتی تھیں۔ ۱۹۰۰ء تک یہ سکے چلتے رہے، بعد میں انگریزی سکہ رائج ہوا اور یہ سب سکے ختم ہوگئے۔[3]

تعلیم:

میروں کی حکومت کو انگریزوں نے جس غلط انداز میں پیش کیا ہے، اُن میں ایک الزام یہ بھی ہے کہ میران ٹالپور کا زمانہ علم سے تاریکی کا زمانہ تھا، جہالت عام تھی اور ان کے دور میں تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ٹالپور فرمانرواؤں کو اپنے زمانے میں تعلیم کو عام کرنے سے بڑی دلچسپی تھی، انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں عوام کی تعلیم کے لیے جابجا مکاتب اور مدارس قائم کیے تھے، ان کے عہد میں خصوصاً سندھ میں چھ علمی مرکز مشہور تھے (۱) سیوہن (۲) ٹلٹی، (۳) کھڑا (۴) ٹیاری (۵) مہڑ (ولھار) (۶) عمر کوٹ۔ اس کے علاوہ انھوں نے گاؤں گاؤں اور شہر شہر شاہی خزانے سے روپیہ خرچ کر کے مکاتب کھولے تھے۔ بڑے مدارس کے نصاب میں صرف و نحو، منطق، فقہ، تفسیر، حدیث، معانی، بیان وغیرہ فنون پڑھائے جاتے تھے،[1] یہاں تک کہ ٹالپور خاندان کی بیگمات بھی تعلیم کے پھیلانے میں بڑی دلچسپی رکھتی تھیں۔ شہزادی خیراں نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور اس کے سارے اخراجات وہ خود اٹھاتی تھیں۔[2] مولائی شیدائی صاحب نے اپنی کتاب جنتہ السندھ میں ٹالپور عہد کے نظام تعلیم اور اس دور کے نصاب کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔

علوم و فنون کی سرپرستی:

تمام ٹالپور فرمانروا پڑھے لکھے، نکتہ سنج اور بعض ان میں سے عالم صاحب تالیف و تصنیف اور شاعر تھے اور اپنے دور کے علماء و شعرا کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کے تعلقات شریف مکہ، مسقط کے امام اور ایران کے قاچاری فرمانرواؤں سے قائم ہونے کی وجہ سے حیدرآباد سندھ میں خراساں، ایران اور عراق کے علما اور شعرا کی آمد و رفت کثرت سے ہوتی تھی اور ان میں سے بعض میروں کی قدر افزائیوں کو دیکھ کر یہیں رہ پڑے تھے۔ مقامی علما اور شعرا کی بھی وہ بڑی قدر کرتے تھے۔

میر کرم علی خاں کے دربار میں سندھ کے بڑے بڑے عالم اور شاعر اس کی قدر دانیوں کی وجہ سے جمع ہوگئے تھے۔

میر عظیم الدین ٹھٹھوی، میر مائل ٹھٹھوی، سید ثابت علی شاہ ثابت، میرزا محمد مظہر، آقا محمد عاشق، نواب ولی محمد خاں لغاری، منشی صاحب رائے آزاد، میر سید علی مشتاق، مخدوم نور محمد بوبکانی، آخوند نور محمد ہالائی، میرزا خسرو بیگ چرکس، میر صابر علی صابر ٹھٹھوی، میر کاظم شاہ سرخوش، سلیمان صاحی، عبدالمجید جوکیو صاحب تاریخ بلوچی، میر ہوتک خاں افغان، سید طباطبائی، منشی دولہ رام جیسے شعرا اور علما اس کے دربار کی زینت تھے۔[3]

---

(3) جنت السندھ - تالیف مولائی شیدائی، ص ۷۸۵-۷۸۶۔

(1) جنت السندھ - مولائی شیدائی، ص ۷۸۹-۷۹۰۔

(2) سندھ کی تاریخی کہانیاں، مؤلف اعجاز الحق قدوسی، ص ۲۶۹-۲۷۰۔

(3) تکملہ مقالات الشعرا، تعلیقات سید حسام الدین راشدی، ص ۷۲۸-۷۲۹۔
تفصیل کے لیے دیکھیے: مسلمانان کراچی اور سندھ کی تعلیم، از سید مصطفیٰ علی

سندھی شعر و ادب:

اُمرائے ٹالپور سب کے سب سندھی نژاد تھے اور خود عالم و شاعر تھے۔ ان کا دور سندھی ادب و شعر کے لیے بھی نہایت خوشگوار ثابت ہوا، سندھی میں منظوم میلاد ناموں کی بنیاد انہیں کے دور میں پڑی جس کا سہرا ان کے دور کے شاعر مخدوم عبدالرؤف بھٹی کے سر ہے، اس کے علاوہ اس شاعر نے فارسی عروض اور بحروں کو سندھی شاعری میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ اسی دور کا ایک ممتاز شاعر میاں عیسیٰ ہالائی تھا، اسی دور میں سندھ کے افقِ شاعری پر ایک اور ستارہ طلوع ہوا، جس کی ذات ولایت و شاعری کا سنگم تھی، یہ خواجہ محمد زماں لنواری والے (-۱۱۸۸ ۱۱۲۵ھ) تھے۔ خواجہ صاحب نے اپنی شاعری میں باقاعدہ اسلامی تصوف کو سمو کر طائرِ فکر کو ایک نئی پرواز بخشی، ان کی شاعری میں ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام تر تصوف کے مضامین پر مشتمل ہے۔

اسی دور میں ٹالپور اُمرا نے اپنی اپنی فیاضیوں، داد و دہش اور قدر دانیوں سے شعر و ادب کی سرپرستی کی، ان کے زمانے میں اصناف سخن میں مدح رسول اور مناجات کو سندھی میں جن شعرا نے بام عروج پر پہنچایا، اُن میں صاحبڈنہ فقیر، جمن چارن، پیر اشرف اور فتح فقیر کی مناجاتوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ان ہی کے عہد میں سندھی شاعری میں باقاعدہ مرثیہ گوئی کی بنیاد پڑی، کیونکہ ٹالپور اُمرا مرثیہ کہنے اور سننے کو اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ مرثیہ گوئی کی طرف سب سے پہلے میر کرم علی خاں (متوفی ۱۸۱۲ء) کے درباری شاعر ثابت علی شاہ (۱۷۴۰ء- ۱۸۱۰ء) نے توجہ کی اور سندھی شاعری کو مرثیے سے آشنا کیا، اُس نے فارسی آمیز زبان میں مرثیے لکھے۔

ثابت کا سندھی شاعری پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُس نے اپنی شاعری سے سندھی زبان میں بڑی وسعت پیدا کی، رزمیہ شاعری کو اس نے سب سے پہلے اختیار کیا۔

سندھی غزل کی ابتدا بھی اسی دور میں ہوئی۔ ثابت علی اور سچل سرمست نے پہلے غزلیں کہیں۔ اگرچہ فنی اعتبار سے ان کی غزلوں میں پختگی نظر نہیں آتی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انہیں کی رکھی ہوئی بنیادوں پر سندھی کے مستقبل کے شعرا نے غزل کے ایوان کو تعمیر کیا۔[1]

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بعد تصوف کی شاعری کی شمع کو جس نے روشن رکھا وہ سچل سرمست ہیں، جو اسی دور کی یادگار ہیں۔ حضرت سچل کو سندھ میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بعد سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہے، ان کا نام میاں عبدالوہاب ہے، ان کے والد کا نام میاں صلاح الدین اور دادا کا نام میاں صاحبڈنوں فاروقی تھا۔ سچل ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) میں ریاست خیرپور کے تعلقہ گنبٹ کے ایک چھوٹے سے گاؤں درازا میں پیدا ہوئے، انہوں نے اپنے والد کی وفات کے بعد اپنے چچا اور مرشد میاں عبدالحق کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ سچل نے ۱۴ رمضان ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) میں وفات پائی، تصوف کے رموز اور عارفانہ مضامین سے ان کا کلام معمور نظر آتا ہے، وحدت الوجود ان کا موضوع خاص ہے اور فلسفۂ وحدت الوجود کو انہوں نے نہایت دلکش انداز میں اپنی شاعری میں مختلف طریقوں پر پیش کیا ہے۔ سچل سندھی کے علاوہ ہندی، فارسی اور سرائیکی میں بھی شعر کہتے تھے۔[2]

عوامی قصوں کے منظوم کرنے کا شوق بھی ان ہی کے دور کی پیداوار ہے۔ حفیظ تیونہ اس راہ کا سب سے پہلا راہی ہے، جس نے سندھی میں داستان کو مسلسل نظم کی صورت میں سب سے پہلے قلم بند کیا اور مومل رانو کی داستان کو منظوم کیا۔ ٹالپوروں کے ابتدائی عہد میں اس نے وفات پائی۔ اس کے بعد حفیظ عبداللہ اس کے نقش قدم پر چلا، اُس نے لیلیٰ مجنوں کے قصے کو اپنا موضوع بنا کر سندھی میں نظم کیا۔

مولوی ولی محمد نے ۱۲۰۸ھ (۹۴-۱۷۹۳ء) میں عربی کی کتاب حکایات الصالحین کی حکایتوں کا سندھی میں دوہوں کی صورت میں ترجمہ کیا۔ اسی دور میں وائی کا نام کافی پڑا۔

اس دور کے سندھی کے صاحب طرز شعرا میں سید خیر شاہ پردیسی حیدرآبادی، صدیق فقیر سومرو، خلیفہ گل محمد ہالہ کندی (-۱۸۵۶ ۱۸۱۱ء)، ملا صاحبڈنہ، دیوان دلپت رائے صوفی سہوانی (متوفی ۱۲۵۷ء)، پیر علی گوہر شاہ اصغر (۱۸۱۶-۱۸۴۷ء)، محمد عارف صنعت شکارپوری (متوفی ۱۸۵۰ء)، خلیفہ کرم اللہ شکارپوری (متوفی ۱۸۵۵ء)، شاہو فقیر، غلام علی فقیر، دریاخاں، فتح محمد فقیر (متوفی ۱۲۵۹ھ، ۱۸۴۳ء)، حمل فقیر

بریلوی جو اس دور کی تعلیم کا تفصیلی تذکرہ ہے۔

[1] ٹالپور عہد کے شعرا کا یہ مواد سندھی ادب، مؤلف سید حسام الدین راشدی سے ماخوذ ہے۔

[2] سچل کے حالاتِ زندگی رسالو سچل سرمست، مرتب عثمان علی صاحب انصاری کے مقدمہ، ص ۴-۵ سے ماخوذ ہیں۔

لغاری (۱۷۷۹-۱۸۱۵ء) اور خلیفہ نبی بخش لغاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کی شاعری سے اس دور کے سندھی چمن شعر و ادب میں ایک نئی بہار آئی۔

نثر کی باقاعدہ ابتدا ان ہی کے دور میں ہوئی۔ اخوند عزیز اللہ متعلوی (۱۷۴۷-۱۸۲۴ء) نے جو ایک صاحب علم و فضل بزرگ تھے قرآن مجید کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا۔[1]

تالیف و تصنیف:

ٹالپوروں کے عہد میں تالیف و تصنیف کے ذوق میں بھی ترقی ہوئی، بہت سی کتابیں فارسی اور سندھی زبان میں لکھی گئیں، جو تاریخ و ادب میں نہایت اہم مانی جاتی ہیں۔ فتح نامہ میر عظیم الدین، انشائے عظیم، فتح نامہ میر صوبدار، فریر نامہ، تذکرہ زبدۃ المعاصرین مؤلف میر حسن الحسینی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کتب خانے:

ٹالپور فرمانرواؤں کو عمدہ اور نادر کتابیں جمع کرنے کا بھی ذوق تھا۔ ان کے اس ذوق کی وجہ سے حیدرآباد کے قلعے میں کئی کتب خانے قائم ہوگئے تھے۔ انگریزوں کے قبضے کے بعد ان کتب خانوں سے بہت سی کتابیں انگریز لے گئے، جو آج بھی یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔[2]

اُمرا و عہدہ دار:

ہم مختصر طور پر میران سندھ کے ان بعض اُمرا اور وزرا کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتے ہیں، جنہوں نے میرانِ ٹالپور کے عہد کی سیاست میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

نواب ولی محمد خاں لغاری وزیر مملکت و سپہ سالار افواج سندھ:

آقای عبدالحئی حبیبی نے تعلیقات نوائے معارک میں نواب ولی محمد خاں لغاری کا تعارف کراتے ہوئے اس کی سیاسی بصیرت، دانشمندی اور شجاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے اپنے زمانے کی عہد آفریں شخصیت قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

ایں شخص یکی از نوابغ سیاسی و اداری عصر خود است کہ در سر زمین سندھ ہمچوں او مردی دانشمند و جنگ جو و سیاست مدار و مدبر کم گزشتہ است۔[3]

اس مدبر و ہوشمند وزیر کے باپ کا نام غلام محمد خاں "نگار" تھا جو ٹالپوروں کے جد اعلیٰ میر بہرام خاں کا ایک درباری تھا، جس نے اپنے آقا کے ساتھ عہد کلہوڑہ ۱۱۹۸ھ (۸۴-۱۷۸۳ء) میں میاں عبدالنبی والیِ سندھ کے ہاتھوں جام شادت نوش کیا تھا۔[4]

اس کا بیٹا نواب ولی محمد خاں لغاری ۱۱۶۵ھ (۵۲-۱۷۵۱ء) میں پیدا ہوا اور تعلیم و تربیت کے بعد وہ پہلے میر فتح علی خاں ٹالپور کے دربار سے وابستہ ہوا اور جنگ ہالانی میں جو ۱۱۹۶ھ (۸۲-۱۷۸۱ء) میں میاں عبدالنبی کلہوڑہ اور ٹالپوروں کے درمیان ہوئی، اس نے شجاعت کے غیر معمولی جوہر دکھائے، جس کی بنا پر یہ میر فتح علی خاں کے دربار کا مقرب خاص اور سندھ کا مدار المہام بنایا گیا۔ اس کے کارناموں میں شاہ شجاع سے دوبارہ شکارپور کو واپس لے لینا ہے، جس کا تذکرہ ہم گزشتہ اوراق میں کر آئے ہیں۔

نواب ولی محمد خان لغاری ٹالپوروں کی حکومت کے ایک حصے (چاندوکہ) کا بھی حاکم تھا۔ اس کی حکومت سیوہن سے لے کر جیکب آباد تک تھی، حیدرآباد کے قریب قصبہ ٹنڈو ولی محمد اسی کے نام سے موسم ہے۔ وہ ٹالپور عہد کا ایک مسلم سیاستداں، مدبر اور شجیع انسان تھا اور اس دور کی جنگوں میں اس نے اپنی شجاعت اور بہادری کی وجہ سے غیر معمولی شہرت حاصل کی تھی۔ افغانستان اور سندھ کی اُلجھی ہوئی گتھیوں کو اس نے اپنے حسن تدبیر سے نہایت عمدگی سے سلجھایا تھا اس کے علاوہ انگریزوں اور ٹالپوروں کے اہم معاملات میں اس نے اپنی ذمہ داریوں کو نہایت عمدگی سے پورا کیا تھا، اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جب تک وہ زندہ رہا اس نے ٹالپور اُمرا کے شیرازہ مودت و اتحاد کو بکھرنے نہیں دیا اس کی وفات کے بعد ہی ٹالپور خاندان میں نفاق و اختلاف کی بنیاد پڑی اور ملک کا نظم و نسق درہم برہم ہوا، جو بالآخر اس خاندان کی حکومت کے زوال کا ثابت ہوا۔

برنس نے اپنی کتاب "دربار سندھ" میں نواب ولی محمد خاں کی شخصیت اور اس کے سیاسی تدبر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

---

[1] سندھی شعر و ادب کے متعلق یہ تمام مواد سندھی ادب، مؤلف، سید حسام الدین راشدی، ص ۶۲-۸۱ سے ماخوذ ہے۔

[2] سندھ کی تاریخی کہانیاں، ص ۲۷۰۔

[3] تعلیقات نوائے معارک، ص ۸۱۵۔

[4] حاشیہ تکملۂ مقالات الشعراء، مؤلف: سید حسام الدین راشدی، ص ۴۵۵۔

"ولی محمد خان اور سید اسماعیل شاہ یہ دونوں میرانِ سندھ کے بڑے وزیر ہیں اور خود امیران سندھ، ولی محمد خان کو وزیر سے خطاب کرتے ہیں وہ تمام امور میں حکومت کا مشیر خاص ہے اور تمام مقربان اور معتمد علیہ امیر اس پر بھروسا کرتے ہیں۔ اس کی عمر ستر سال کی ہو چکی ہے، لیکن اس کا بیٹا احمد خان جو تیس سالہ نوجوان ہے، ان تمام صفات سے خالی ہے اور کوئی صلاحیت نہیں رکھتا، نواب بلند پایہ شاعر ہے اور اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کے جوہر اس کے اشعار میں دیکھتے ہیں۔ وہ فارسی کا ایک جلیل القدر انشا پرداز ہے اس نے طب میں بھی کئی کتابیں لکھی ہیں، وہ اس دور کے دانشوروں میں سے ایک ہے، جو سندھ میں پیدا ہوا اس نے ایک کتاب طب پر لکھی ہے جسے اس نے میر مراد علی خاں شہزادۂ سندھ کے نام سے معنون کیا ہے۔"

نواب ولی محمد خان لغاری کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے آقاؤں میرانِ سندھ کا نہایت وفادار تھا وہ اپنی ساری زندگی نہایت عزت و احترام سے گزار کر ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۲ء) میں اس دنیا سے رخصت ہوا اس کا مزار ٹالپوروں کے مقابر اور شہر حیدرآباد کے درمیان موجود ہے، جہاں اس زمانے میں "باغ ولی محمد خاں" تھا، قبر پختہ اور سنگی ہے اور اس پر ایک سادہ سی عمارت بنی ہوئی ہے۔ نواب ولی محمد خاں کی علمی اور ادبی زندگی نہایت شاندار تھی وہ فارسی کا ایک بلند پایہ شاعر تھا اور "ولی" تخلص کرتا تھا۔ اس کی تصانیف میں سید حسام الدین صاحب راشدی نے تکملۂ مقالات الشعرا کی تعلیقات میں حسب ذیل تصانیف کا تذکرہ کیا ہے۔

(الف) دیوان ولی فارسی: یہ دیوان ۱۲۲۲ھ (۸-۱۸۰۷ء) میں مکمل ہوا۔

(ب) نزھتہ الابرار: (طب، فارسی) نواب ولی محمد خان خود بھی طبیب حاذق تھا اس نے یہ کتاب طب میں تالیف کی تھی، جس میں اس نے اپنے مجربات کو جمع کر دیا ہے۔

(ج) ساقی نامہ: اس کے دو ساقی نامے ہیں۔

(د) موعظت نامہ۔

(ھ) مثنوی ہیر و رانجھا: سال تصنیف بعد از ۱۲۲۷ھ۔ نواب ولی محمد خاں لغاری نے یہ مثنوی میر مراد علی خاں ٹالپور والیٔ سندھ کے حکم سے لکھی تھی۔ آقای عبدالحئی حبیبی نے اس کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ: اس کی مثنوی اور غزلیات میں اچھے اشعار بھی ہیں اور کمزور اشعار بھی، بعض اشعار نہایت سلیس و رواں اور دلکش و جاذب نظر ہیں، لیکن بعض میں شکستگی، تعقید اور ابہام موجود ہے، شاید یہ تعقید اور شکستگی ان تصحیفات کا نتیجہ ہے جو سندھ کے ان کاتبوں سے پیدا ہوئیں جو فارسی سے آشنا نہ تھے۔[1]

آغا اسماعیل شاہ وکیل:

ٹالپور کے اُمرا میں آغا اسماعیل شاہ کو بھی اپنے سیاسی کردار کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل ہے۔ آغا اسماعیل شاہ کا مورثِ اعلیٰ سید عبد الھادی اصفہان کا رہنے والا تھا، جب نادر شاہ نے اصفہان کو تہہ و بالا کیا تو سید عبدالھادی ترک وطن کر کے ۱۱۵۰ھ (۳۸-۱۷۳۷ء) میں مدراس پہنچا اور وہاں کے کسی نواب کا متوسل بن کر مدراس میں مقیم ہو گیا۔ چونکہ یہ طب میں مہارت رکھتا تھا، اس وجہ سے بہت جلد عوام و خواص میں مقبول ہو گیا، جب میاں نور محمد حاکم سندھ بیمار ہوا تو اس نے مدراس کے اس نواب کو جس سے سید عبدالھادی متوسل تھا اور میاں نور محمد کی اس نواب سے دوستی تھی اطلاع دی، نواب نے سید عبدالھادی کو میاں نور محمد کے علاج کے لیے سندھ بھیجا۔ سید عبدالھادی ابھی سندھ ہی میں تھا کہ نواب کا انتقال ہو گیا، جس کی بنا پر سید عبدالھادی سندھ ہی میں میاں نور محمد کے پاس مقیم ہو گیا۔ میاں سرفراز خاں عباسی والیٔ سندھ کے زمانے میں سید عبدالھادی کا بیٹا ابراہیم شاہ بھی ایران سے آکر اپنے باپ سے ملا اور وہ بھی سندھ میں مستقلاً متوطن ہو گیا۔ ۲ شعبان ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء) میں سید عبدالھادی نے وفات پائی اور اس کی جگہ اس کا بیٹا سید ابراہیم شاہ اپنے باپ کی جگہ پر فائز ہوا۔ کلہوڑوں کے بعد جب حکومت سندھ میرانِ ٹالپوروں میں منتقل ہوئی، تو سید ابراہیم شاہ ان کے دربار میں بھی نہایت معزز و مفتخر رہا اور اعلیٰ عہدوں پر پہنچا۔ سید ابراہیم شاہ نے ۲ ذیقعدہ ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) میں لاڑکانہ میں وفات پائی۔ اسی ابراہیم شاہ کا بیٹا آغا اسماعیل شاہ تھا جو ٹالپوروں کے عہد میں اہم اور جلیل القدر عہدوں پر فائز رہا۔ آغا اسماعیل شاہ بارہ سال تک حکومت سندھ کی جانب سے کابل میں سفیر رہا اور ایک مدت تک شکارپور کا حاکم رہا۔ سندھ میں ایک چھوٹا سا شہر ٹنڈو اسماعیل شاہ کے نام سے آباد ہے، جس میں آغا

---

[1] نواب ولی محمد خاں لغاری کے یہ حالات تعلیقات تازہ نوائے معارک، مؤلف آقای الحئی حبیبی، ص ۸۱۴-۸۲۰ اور تعلیقات تکملۂ مقالات الشعرا مؤلف، سید حسام الدین راشدی، ص ۶۲۵-۶۲۷ سے ماخوذ ہیں۔

اسماعیل شاہ کی اولاد آج بھی رہتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آغا اسماعیل شاہ وزیر فتح خاں کی گرفتاری کے بعد ہرات سے سندھ آیا اور ٹالپوروں کے دربار میں سیاسی خدمات انجام دینے لگا کیونکہ یہ ۱۲۳۶ھ (۲۱-۱۸۲۰ء) میں میر کرم علی خاں اور میر مراد علی خاں والیان حیدرآباد کی طرف سے بحیثیت سفیر گورنر بمبئی کے دربار میں گیا تھا اور انگریزوں سے ۹ نومبر ۱۸۲۰ء کا معاہدہ الفنسٹن کے ساتھ میران حیدرآباد کی طرف سے اسی نے لکھا تھا۔

اس کے بعد سید اسماعیل شاہ لاڑکانہ کا مختار کار مقرر ہوا، اور شاید اس نے ۱۲۵۰ھ (۳۵-۱۸۳۴ء) کے بعد وفات پائی۔ اس کے دوسرے بھائی آغا زین العابدین[1]، آغا کاظم شاہ،[2] آغا تقی شاہ بھی شکارپور اور کراچی میں صوبیدار رہے۔

میسن نے اپنی روئداد سفر میں سید اسماعیل شاہ کے حالات اور شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ: وہ شیراز کے شیعہ سادات سے ہے، جو حیدرآباد کے قریب سکونت رکھتا ہے اور میر مراد علی خان اور اس کے بیٹے کے دربار کا بہت مقرب اور معتمد ہے، ہمیشہ سفارت اور نمایندگی کی اہم خدمات اس کے سپرد کی جاتی ہیں۔ خراساں میں وزیر فتح خان کے دربار میں اور حکومت بمبئی میں سفارت کے لیے اسی کو بھیجا گیا تھا۔ بمبئی میں یہ نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ ایک عالیشان محل میں ٹھہرایا گیا، جہاں یہ ماہانہ پانچ ہزار روپے لیتا تھا۔ یہ شخص نہایت چالاک اور زیرک ہے، بمبئی کی سفارت کے دوران اس نے کوشش کی کہ حکومت بمبئی اپنے وفد کو حیدرآباد بھیجے، چنانچہ اس کی کوششوں سے حکومت بمبئی نے ایک وفد مسٹر ہنکی سمتھ کی سرکردگی میں سندھ بھیجا اور اس نے ٹھٹھہ میں اس وفد کی بحیثیت مہمان شاہی کے شاندار پذیرائی کی، لیکن خفیہ طور پر میران حیدرآباد کو لکھا کہ ان مغرور فرنگیوں کو جس قدر بھی ذلیل کیا جاسکے کیجیے اور کسی ترکیب سے برطانوی جھنڈے کو جو ٹھٹھہ میں اس وفد کی فرودگاہ پر لہرا رہا تھا، گرا دیجیے۔ میران حیدرآباد نے اس کے مشورے کو پسند نہیں کیا اور کہا کہ اگر ہم نے یہ رویہ اختیار کیا تو ممکن ہے کہ برطانوی وفد ہمارے اس طرز عمل سے لوٹ جائے، لیکن چونکہ سید اسماعیل شاہ ان امیروں پر چھایا ہوا تھا، مجبوراً انہوں نے ولی محمد خان لغاری کو چند بلوچ سواروں کے ساتھ بھیجا۔ اس نے اس جگہ پہنچ کر جہاں یہ وفد ٹھہرا ہوا تھا، برطانیہ کے جھنڈے کو نیچے گرا دیا اور اُن کے چند آدمیوں کو قتل کر دیا۔ جب اس واقعہ سے گڑبڑ پیدا ہوئی تو اس نے نہایت لطیف حیل سے سمجھایا کہ یہ کام صحرائی ڈاکوؤں کا ہے، اور میران حیدرآباد کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس طرح سے اس نے برطانوی وفد کو بھی مطمئن کر دیا اور دوسری طرف میران حیدرآباد نے بھی اُسے انعام و اکرام سے نوازا کہ اس نے نہایت ہی حسن تدبیر سے اس اہم کام کو انجام دیا۔

برنس نے نواب ولی محمد خان لغاری اور اسماعیل شاہ کے متعلق لکھا کہ: اگرچہ ٹالپور حکومت کے یہ دونوں اراکین دولت طبیب، شاعر اور مؤلف ہیں، لیکن ان کی سیرت میں نمایاں تفاوت ہے۔ میران سندھ نے ان متضاد سیرت، شخصیتوں کو جو ایک دوسرے کی رقیب ہیں، اپنی دوستی کے لیے چُنا ہے۔ انہوں نے سید اسماعیل شاہ کو ملک کے اندرونی اور بیرونی معاملات پر مقرر کیا ہے، لیکن حقیقی عزت اور اعتماد انہیں نواب ولی محمد خان لغاری پر ہے، اس لیے کہ وہ نواب پر اعتماد کلی رکھتے ہیں، لیکن سید اسماعیل شاہ پر انہیں اس قدر اعتماد اور اعتبار نہیں، چنانچہ میر مراد علی خاں والی حیدرآباد نے اپنے وصیت نامے میں اپنے اخلاف کو لکھا کہ: وہ ولی محمد خان لغاری کے مشوروں پر پورا اعتماد کریں اور سید (اسماعیل شاہ) سے محتاط رہیں اور احتراز کریں، اس لیے کہ ولی محمد خیر خواہ اور درست انسان ہے، لیکن سید (اسماعیل شاہ) مغرور اور خسیس ہے۔[3]

نظام الاوقات:

ڈاکٹر برنس نے لکھا ہے کہ امیران سندھ کا نظام الاوقات بہت مرتب ہے، وہ صبح ہی طلوع آفتاب سے دو گھنٹے پہلے بیدار ہو کر کاروبار سلطنت شروع کر دیتے ہیں، شکایات سنتے ہیں اور معاملات طے کرتے

---

(1) آغا زین العابدین: یہ دو سال تک شکارپور میں صوبیدار رہا اور چھ سال تک کراچی میں حکومت کرتا رہا، بلند پایہ شاعر اور علم طب کا ماہر تھا۔ آغا زین العابدین نے ۲ جمادی الاول ۱۲۸۸ھ بروز جمعہ وفات پائی اور حیدرآباد میں مدفون ہوا (تکملہ مقالات الشعراء، ص ۳۱۲-۳۱۳ و حواشی تکملہ مقالات الشعراء، مرتب سید حسام الدین راشدی، ص ۳۱۶-۳۱۷)۔

(2) آغا کاظم شاہ: یہ تیرہ سال تک شکارپور کا حاکم رہا اور ٹالپوروں اور افغانوں کی جنگ میں جو ۱۲۴۸ھ (۳۳-۱۸۳۲ء) میں سکھر اور شکارپور کے درمیان واقع ہوئی تھی، افغانوں کے ہاتھ سے شہید ہوا اور وہیں مدفون ہوا۔ (حواشی تکملہ مقالات الشعراء، ص ۳۱۷)۔

(3) یہ تمام تفصیل تعلیقات تازہ نوائے معارک مؤلف آقای عبدالحئی حبیبی ص ۱۹۷-۱۹۹ و حواشی تکملہ مقالات الشعراء مؤلف سید حسام الدین راشدی ص ۳۱۷-۳۱۵ سے ماخوذ ہے۔

ہیں۔ طلوع آفتاب کے قریب وہ محلات واپس چلے جاتے ہیں۔ تبدیلی لباس اور حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر جلد ہی دربار میں واپس آجاتے ہیں، جہاں کل خاندان کے افراد پابندی کے ساتھ جمع ہوتے ہیں۔ پوری ریاست سے جو اطلاعات اور خطوط وصول ہوتے ہیں، وہ ایک ڈھیر کی شکل میں پیش کیے جاتے ہیں، پھر سارا وقت اُن کے پڑھنے اور احکامات دینے میں گزر جاتا ہے۔ یہ سلسلہ گیارہ بجے تک جاری رہتا ہے اس کے بعد وہ قیلولہ کرنے چلے جاتے ہیں، دو بجے پھر سب جمع ہو جاتے ہیں اور شام تک مجتمع رہتے ہیں۔ شام کے دربار میں جونیر پرنس اپنا دربار علیحدہ منعقد کرتے ہیں، پھر شب باشی کو چلے جاتے ہیں۔ حیدرآباد کی پہلی "چویاری حکومت" کے متعلق لکھا کہ ان چار بھائیوں کو شراب نوشی سے سخت نفرت تھی حقہ یا افیون کا کیا ذکر۔ امیروں کا خاندان فرائض مذہبی کی ادائیگی میں خاصا سخت ہے۔[2]

میرانِ سندھ کے زوال کے اسباب:

میران سندھ کا زوال اگرچہ تقدیر الٰہی تھا، لیکن ان کی حکومت کے زوال کے اسباب جو تاریخ کی روشنی میں سامنے آتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ان کی حکومت کے زوال کا سب سے بڑا سبب وہ اختلاف و افتراق تھا، جو ان میں باہمی پیدا ہو گیا تھا اور جس سے انگریزوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔

۲۔ میر علی مراد خاں اول والی خیرپور اور میر صوبدار والیٔ حیدرآباد کی انگریز دوستی اور ان دونوں کی دستار ریاست کی ہوس نے بھی بڑی حد تک سندھ میں انگریزوں کے قدم کو مضبوط کیا، خصوصاً اس وقت جب کہ شیر سندھ میر شیر محمد خان نے انگریزوں کے خلاف ایک بڑا لشکر جمع کیا تھا اور وہ انگریزوں کو سندھ سے باہر نکال دینے کی فکر میں تھا، عین اس موقع میر علی مراد خاں حکمران خیرپور نے انگریزوں کی رضامندی کے لیے جس طرح شیر سندھ کے دادا امیر احمد خاں لنگ کو اور اس کے لشکر کے دوسرے بڑے بڑے سرداروں کو بڑی بڑی ملازمتوں کا لالچ دے کر شیر سندھ کے لشکر سے توڑا اور ان میں پھوٹ ڈالی اور اس طرح شیر سندھ کو انگریزوں

میر نصیر محمد ٹالپور

کے مقابلے میں ناکام بنایا، میر علی مراد خاں کا یہ اقدام ٹالپوروں کے زوال حکومت کا سبب عین اُس وقت بنا جب کہ شیر سندھ ٹالپوروں کی حکومت کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنا چاہتا تھا۔

۳۔ ٹالپور حکومت کے زوال کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انگریزوں کی وفاداری اور خدمت گزاری اور اپنی مصلحتوں کی بنا پر ٹالپوروں نے انگریزوں کو خراساں پر حملے کے لیے اپنے ملک سے گزرنے کی اجازت دے دی اور یہ بھول گئے کہ انگریز ایک روز اُن کے ملک کو بھی نہ چھوڑے گا۔

۴۔ میرانِ سندھ اگرچہ بامروت اور غریب پرور تھے، لیکن ان کے نظام حکومت میں بعض ایسے ظالم اور مردم آزار اور رشوت خور عہدہ دار بھی آگئے تھے، جن سے رعایا بہت ناخوش تھی۔ یہ وہ اسباب تھے جو ٹالپوروں کی حکومت کے زوال کا سبب بنے۔

خدا کا شکر ہے کہ تین سال کی گردش قلم نے آج اپنی منزل کو پالیا اور میں یہ جلد ٹالپور عہد کے اختتام پر ختم کر رہا ہوں، خدا میری اس محنت کو حسن قبول کی دولت سے نوازے۔ آمین۔

---

(2) ڈاکٹر برنس، مضمون سید مصطفیٰ علی بریلوی، مطبوعہ روزنامہ حریت کراچی، مورخہ ۱۸ جون ۱۹۶۸ء۔

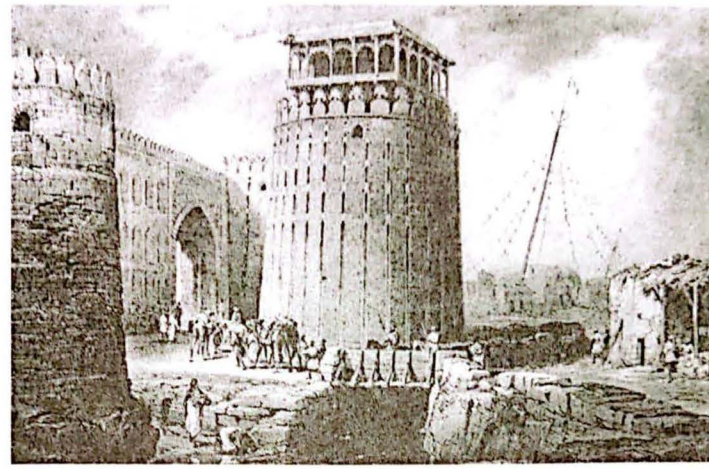

پکا قلعہ حیدرآباد

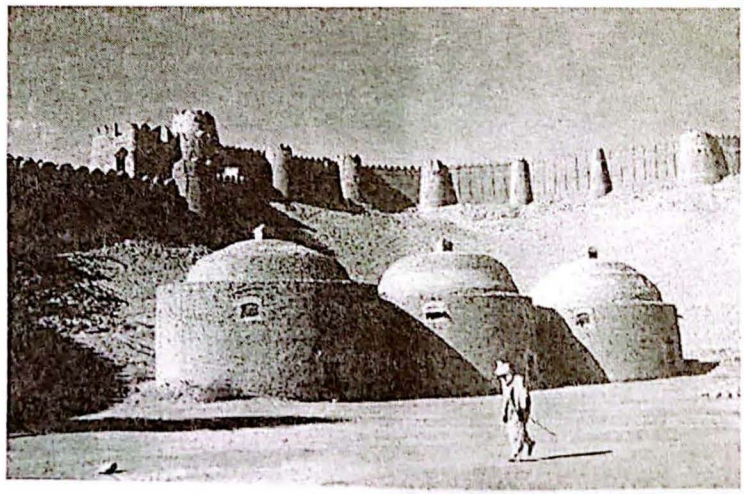

کوٹ ڈجی قلعہ خیرپور

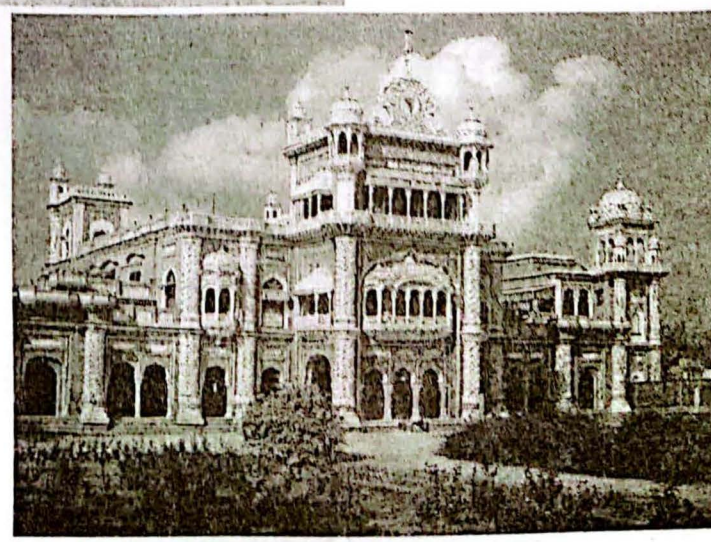

فیض محل خیرپور میرس

باب :27

سندھ میں انگریزوں کی آمد

تاریخ کے اعتبار سے فروری اور مارچ ۱۸۴۳ء کا وہ دن بہت منحوس تھا جب میانی اور دبہ میں انگریزوں نے میر ٹالپوروں کو شکست دے کر سندھ پر اپنا قبضہ جمایا اور سندھ میں اسلامی حکومت کے چراغ کو گل کر دیا۔ یہ سب کچھ انگریزوں کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا، جس کا خواب وہ برسوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی باقاعدہ ابتدا میاں غلام شاہ کلہوڑہ کے عہد میں ہوئی۔

مولانا مہر مرحوم نے تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) حصہ دوم میں لکھا ہے کہ ابتدا میں دو انگریز ٹھٹھہ آئے جنہیں ایک پرتگیزی پادری نے زہر دے کر مار ڈالا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے کارکنوں کو ہدایت کر دی تھی کہ سندھ کو بھی اپنی تجارتی سرگرمیوں میں شامل کیا جائے۔ اس کے بعد انگریز جہاز ران برابر ٹھٹھہ پہنچنے کی کوشش کرتے رہے، چنانچہ ۱۰۲۲ھ (۲۶ ستمبر ۱۶۱۳ء) میں پہلا انگریزی جہاز بندرگاہ دیبل میں داخل ہوا۔ پھر جیمز اول شاہ انگلستان کا سفیر ٹامس رو سندھ آیا۔

سندھ میں انگریزوں کی پہلی تجارتی کوٹھی:

چنانچہ انگریزوں نے ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) میں ٹھٹھہ میں پہلی تجارتی کوٹھی قائم کی جو قلمی شورہ خرید کر یورپ بھیجتی تھی، لیکن یہ کوٹھی بعض وجوہ کی بنا پر ۱۰۷۳ھ (۱۶۶۲ء) میں بند کر دینی پڑی۔ یہ وہ ابتدائی قدم تھا جو انگریزوں نے سندھ پر اپنا قبضہ جمانے کے لیے اُٹھایا، کیوں کہ برصغیر پاک و ہند میں اکثر مقامات پر وہ تاجروں کے بھیس میں آئے اور یہاں بھی انہوں نے وہی حربہ استعمال کیا۔

سندھ میں انگریزوں کی تجارتی کوٹھی کو بند ہوئے پچانوے سال گزر چکے تھے اور انگریز جنگ پلاسی میں میر جعفر کو نظامت کا لالچ دے کر کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ بہار، بنگال اور اُڑیسہ میں وہ اپنے قدم جما چکے تھے۔ جنگِ پلاسی کی فتح نے انگریزوں کی ہوس ملک گیری کو اور بھی بڑھا دیا تھا، لہٰذا انہوں نے دوبارہ سندھ پر توجہ دی اور فیصلہ کیا کہ سندھ سے تجارتی تعلقات کو از سر نو تازہ کیا جائے، چنانچہ ۱۱۷۲ھ (۲۲ ستمبر ۱۷۵۸ء) میں میاں غلام شاہ کلہوڑہ کے دربار سے انگریزوں کو تجارت کا پروانہ ملا۔ رابرٹ سمپٹن نے اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے میاں غلام شاہ کلہوڑہ کے دربار میں گفت و شنید کی۔ اُس وقت انگریزوں کے پیشِ نظر قلمی شورے کی، جو سندھ میں بکثرت پیدا ہوتا تھا، تجارت تھی۔ اس تجارتی کوٹھی کی اجازت ملنے کے بعد جارج بوشر، جو بمبئی کی ٹکسال کا افسر تھا، اس کا افسر مقرر ہوا۔ شاہ بندر میں انہوں نے اپنا مرکز قائم کیا اور پریتم داس روپ چند کو قلمی شورہ بہم پہنچانے کا ٹھیکہ دے دیا۔ یہ پروانہ انہیں ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۳ء) میں ملا۔

دوسرا پروانہ:

انگریز سندھ میں صرف ایک مرتبہ قدم جمانے کا بہانہ تلاش کر رہے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ آئندہ مغربی سیاست کی مشینری کو اس سرزمین میں کس طرح چلایا جائے گا۔ اس کے بعد انہوں نے پاؤں پھیلانے شروع کیے اور کچھ مزید مراعات کے طالب ہوئے۔ چند دن کے بعد ۱۱۷۲ھ (۱۱ اکتوبر ۱۷۵۸ء) میں میاں غلام شاہ کلہوڑہ کی طرف سے جو پروانہ انگریزوں کو ملا، اس میں انہیں خاص رعایتیں دی گئیں۔ یہ رعایتیں حسب ذیل تھیں:

(۱) دوسروں سے درآمد کا جو محصول لیا جاتا ہے، انگریزوں سے اس کا نصف محصول لیا جائے۔

(۲) انگریزوں کو یہ رعایت بھی حاصل ہوگی کہ جو مال بک نہ سکے، وہ اسے واپس لے جائیں گے اور اس پر اُن سے کسی قسم کا محصول نہ لیا جائے گا۔

(۳) جہازوں کے لیے رسد بلا محصول خرید سکتے ہیں۔

(۴) مسٹر سمپٹن چاہیں تو ٹھٹھہ میں بندر گاہ میں اپنے رہنے کے لیے مکان بنالیں، لیکن اور کسی انگریز کو گھر بنانے کی اجازت نہ ہوگی۔

اس پروانے میں انگریزوں کے ساتھ یہاں تک رعایت برتی گئی کہ انگریزوں کے سوا کسی فرنگی قوم کو سندھ میں شورۂ قلمی خریدنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

پھر انگریز آہستہ آہستہ اپنے دیس سے اونی کپڑا لاکر فروخت کرنے لگے۔

انگریزوں کی روش:

میاں غلام شاہ کلہوڑہ نے انگریزوں کے ساتھ یہ رعایت اس لیے برتی تھی کہ ضرورت کے وقت انگریز بھی اُن کے کام آئیں گے، لیکن انگریز اپنی ذاتی منفعت اور اپنی سیاسی مصلحتوں کے علاوہ کچھ اور نہیں جانتے تھے۔

انگریزوں کی سیرت و خصلت کا اندازہ اس طرزِ عمل سے کیجیے جو اُنہوں نے میاں غلام شاہ کلہوڑہ سے روا رکھا۔

جب میاں غلام شاہ کلہوڑہ نے پہلی مرتبہ "کچھ" پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، تو انگریزوں سے میاں صاحب نے کہا کہ ایک مسلح جہاز میری مدد کے لیے بھیج دو، لیکن انگریزوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "راؤ کچھ" سے ہمارے تعلقات دوستانہ ہیں اور ہم اُن سے بگاڑ پیدا نہیں کرسکتے۔

ایک دفعہ میاں صاحب نے انگریزوں سے کہا کہ دس ہزار گولے بنوا دو اور مناسب قیمت پر ہمیں دے دو۔ انگریزوں نے یہ فرمائش بھی پوری نہ کی۔ پھر میاں صاحب نے انگریزوں سے دو ماہر توپچی مانگے، تجارتی کوٹھی کے کارکنوں نے اپنے طور پر بمبئی لکھ بھیجا کہ اگرچہ اس فرمائش کو پورا کر دینے سے ہمارے کاروبار کو فائدہ پہنچے گا، لیکن دور اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ اس فرمائش کو پورا نہ کیا جائے، چنانچہ میاں صاحب کو لطائف الحیل سے ٹال دیا گیا۔

انگریزوں کی اس میں مصلحت یہ تھی کہ وہ اپنی تجارت کی خاطر سندھ کو جو اس وقت افغانستان کا باج گزار تھا، کمزور اور افغانستان کا محکوم رکھنا چاہتے تھے۔ میاں غلام شاہ خوب سمجھتے تھے کہ انگریزوں کا منشا کیا ہے۔ وہ فرنگی تاجروں کی اس روش کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح یہ تاجر تنگ ہو کر ملک سے باہر نکل جائیں۔ انہوں نے اپنے افسروں کو بھی اسی قسم کی ہدایات دے کر رکھیں تھیں، چنانچہ ٹھٹھہ میں ان کے چونگی افسر گلاب رائے کے متعلق انگریزوں کا بیان ہے کہ وہ ہر موقع پر انگریزوں کے کاروبار میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا کر دیتا تھا۔ کبھی ان کا مال روک لیتا، کبھی محصول کا فیصلہ کرنے میں دیر لگا دیتا۔ انہوں نے گلاب رائے کی شکایت میاں صاحب کے دربار میں بھی کی تھی اور وہاں سے تاکیدی فرمان بھی حاصل کیا تھا۔

انگریزوں نے جب بار بار سرکاری کارندوں کے متعلق شکایتیں کیں، تو ایک موقع پر میاں صاحب نے کہا کہ تم تاجر ہو اور اپنے تجارتی فائدے کے لیے میرے ملک میں آئے ہو۔ میں نے تمہیں زیادہ سے زیادہ رعایتیں دیں، لیکن تم نے چار سال میں میری ایک بھی فرمائش پوری نہ کی۔ جب بھی مجھے کوئی ضرورت پڑی، تم نے اس میں ٹال مٹول سے کام لیا۔ تم صرف نفع حاصل کرنے کے خواہش مند ہو، لیکن تمہیں اس سلسلے میں اس کا احساس نہیں ہوا کہ جس ملک میں بیٹھ کر اور رعایتیں حاصل کرکے یہ دولت کما رہے ہو، ضرورت کے وقت اس کی خدمت بھی تم پر واجب ہے۔ شکایات کا حق فریقین میں سے اگر کسی کو ہے تو صرف مجھے ہے۔[1]

فرمانروائے سندھ کے تجارتی پروانے:

میاں غلام شاہ کلہوڑہ نے تجارتی کوٹھی قائم ہونے کے بعد جو پروانے جاری کیے، ان کا تاریخ وار خلاصہ درج ذیل ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوسکے گا کہ اس نیک فطرت فرمانروائے سندھ نے کس قدر تجارتی رعایتیں ان کو دی تھیں اور ان کا جواب انگریزوں نے کیا دیا۔

خلاصہ تجارتی پروانہ جو ۱۱۷۲ھ (۲۲ ستمبر ۱۷۵۸ء)

قاضی محمد یحییٰ کے دستخط سے جاری ہوا:

انگریزوں کے متعلق اس پروانے میں حکم دیا گیا تھا کہ: سمپٹن صاحب گماشتہ سرکار کمپنی انگریزی نے آج ہم کو اطلاع دی ہے کہ جملہ اسباب پر جو صاحب موصوف سرکاری کمپنی کے لیے خرید کرکے بمبئی روانہ کرتے ہیں، یہ نرخ بازار ڈیڑھ روپے سیکڑہ سے زیادہ دستوری نہیں دیتے، چنانچہ ہم اس کو منظور کرکے حکم دیتے ہیں کہ صاحب موصوف سے سوائے رقم معمولی کے ایک حبہ نہ لیا جائے۔ (یہ بھی حکم دیا جاتا ہے کہ) کسی طرح کی مزاحمت ان کی تجارت میں نہ کریں اور یہ بھی حکم دیا جاتا ہے کہ بوجہ عدم فروختگی کے کوئی جنس واپس لے جانا چاہیں، تو اس پر

---

[1] یہ تمام تفصیل تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) حصہ دوم۔ ص ۶۳۸ تا ۶۴۷ سے ماخوذ ہے۔

کسی قسم کا محصول نہیں پڑے گا اور نہ کوئی جنس از قسم کھانے پر جو سمپٹن صاحب اپنے جہاز پر کسی مقام سے روانہ کریں، اور ان کے باغ کے لیے بھی کچھ مطالبہ نہ کریں، اور نہ کوئی بادبان، کشتی یا جہاز وغیرہ پر کسی قسم کی مزاحمت کریں، اور نہ اُن کے کپڑوں کے صندوق کسی طرح پر کھلیں، اور نہ اُن کی آمد و رفت میں کسی طرح کی دست اندازی ہو۔ اگر سمپٹن صاحب کوئی مکان "اورنگا بندر" میں خواہ ٹھٹھہ میں خرید کریں یا بنائیں، تو ہمارے تابعین کو چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو، ان کو مدد دیں تاکہ عمارت مطلوبہ پر زیادہ صرف نہ ہو۔ غرض کہ ہر طرح کی دل جوئی اور دلاسا صاحب موصوف کے کارِ تجارت میں کرنا چاہیے کہ جس سے نہایت بہبودی سرکار کی متصور ہے۔[1]

اسی سال بلکہ اسی تاریخ کو ایک دوسرا پروانہ میاں غلام شاہ کے دربار سے جاری ہوا۔

خلاصہ پروانہ ۱۱۷۲ھ (۲۲ ستمبر ۱۷۵۸ء):

اس پروانے میں تقریباً وہی سب ہدایتیں ہیں جو پہلے پروانے میں آچکی ہیں، لیکن اس پروانے میں مزید یہ ہدایت دی گئی:

> اگر صاحب موصوف کوئی جنس ہمراہیوں کے آسایش کے لیے از قسم گائے، بھیڑ، بکری ٹھٹھہ سے یا کہیں اور سے خرید کر کے جہاز میں لے جائیں، تو ان سے اس پر محصول طلب نہیں کرنا چاہیے اور نہ روئی پر جو ادھر اُدھر سے لاتے ہیں کسی طرح کا محصول طلب کیا جائے۔

پھر مسٹر برابرٹ سمپٹن کو بذریعہ مراسلہ ۱۱ دسمبر ۱۷۵۸ء (۱۱۷۲ھ) اس کی اطلاع دی گئی کہ ملازمین کو اس قسم کی ہدایتیں کر دی گئی ہیں، لہٰذا آپ یہ دل جمعی تمام جو سامان چاہیں، خرید کر تجارت کریں۔

پھر ۱۱۷۵ھ (۲۲ اپریل ۱۷۶۱ء) میں تین پروانے جاری کیے گئے۔ پہلے پروانہ میں ہے:

> چونکہ مسٹر ارسکن ریزیڈنٹ سرکار انگریزی نے سندھ میں آ کر اپنے افسرانِ اعلیٰ کی طرف سے درخواست کی ہے کہ تجارت کو باہمی فروغ دیا جائے، لہٰذا ہم نے اس درخواست کو منظور کر لیا ہے اور حکم دیتے ہیں کہ سوائے انگریز کے اور کوئی قوم ولایتی اجناسِ سوداگری ملک سندھ یا صوبہ ٹھٹھہ اور بچور میں خواہ اور کسی بندرگاہ متعلقہ سرکار ہذا میں لے آنے اور لے جانے کے مجاز نہ ہوں گی۔

اس پروانے میں انگریزوں کو یہ رعایت دی گئی کہ انگریزوں کا سامان جو ہماری کسی بندرگاہ سے روانہ ہوگا، وہ مستوجب ادائے محصول نہ ہوگا۔ ان کے تجارتی جہازوں اور کشتیوں کو اجازت کے بعد کوئی نہ روکے اگر کوئی جہاز یا کشتی ریت پر آجائے یا وہ ہماری سرحد میں شکستہ ہو جائے، تو ایسی صورت میں جملہ اہالیانِ سرکار کا فرض ہوگا کہ پوری پوری مدد دیں۔ اگر کچھ سامان وغیرہ ایسے جہاز کا بچ جائے، تو وہ فوراً ریزیڈنٹ بہادر کے سپرد کر دیا جائے۔

دوسرا پروانہ جو رمضان ۱۱۷۴ھ (۲۲ اپریل ۱۷۶۱ء) کو جاری کیا گیا وہ بھی ان ہی مراعات کے سلسلے میں تھا۔ مسٹر ارسکن نے محصول موری کی معافی کی درخواست کی تھی، چنانچہ انگریزوں کو محصول موری بھی معاف کر دیا گیا۔

تیسرا پروانہ ۱۱۷۴ھ (۲۲ اپریل ۱۷۶۱ء) کو جاری ہوا۔ یہ بھی ارسکن صاحب کی درخواست پر جاری ہوا کہ ان سے محصول موری و مصری یا گزربانی نہ لو۔ ہمارے توابعین ان کو کسی طرح پر ایذا نہ پہنچائیں۔[2]

ان تمام پروانوں کے ذریعے وہ تمام مراعات جو انگریزوں کو دی گئیں اور انگریزوں نے ان مراعات کے عوض میں جو سلوک میاں غلام شاہ کے ساتھ کیا، ہم گزشتہ اوراق میں تحریر کر چکے ہیں۔ انگریز صرف اپنے تجارتی اور سیاسی مقاصد کے غلام تھے۔ وہ جب تک کسی کو اپنے مقاصد کے لیے مفید سمجھتے تھے، اُسے استعمال کرتے تھے، ورنہ دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیتے تھے۔

کوٹھی کی بندش:

میاں غلام شاہ کلہوڑہ نے ۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۱۸۶ھ (۲ اگست ۱۷۷۲ء) کو وفات پائی۔ اُن کے جانشین میاں سرفراز خان کلہوڑہ ہوئے۔ میاں سرفراز خاں کے زمانے میں سندھ کے حالات بہت بگڑ گئے۔ انگریزوں نے بھی محسوس کر لیا کہ سندھ کی سرزمین، جو اُن کی

---

(1) اس پروانے کا خلاصہ تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) حصہ دوم۔ ص ۶۵۱ تا ۶۵۳ سے ماخوذ ہے۔

(2) یہ تینوں پروانے اور بقیہ وہ پروانے جو سابق میں گزر چکے ہیں، تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) حصہ دوم۔ ص ۶۵۱ تا ۶۶۴ سے ماخوذ ہیں۔

اقتصادی چراگاہ بنی ہوئی تھی، اب اُن کے لیے مفید نہیں رہی، چنانچہ ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) میں اُنہوں نے سندھ میں اپنی تجارتی کوٹھی بند کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور کوٹھی بند کر دی گئی۔

میرانِ سندھ اور انگریز

انگریز اگرچہ میاں سرفراز خاں کلہوڑہ کے عہدِ حکومت میں حالات اور وقت کے لحاظ سے سندھ میں اپنی تجارتی کوٹھی بند کر چکے تھے، لیکن سندھ کے متعلق ان کے تجارتی اور سیاسی مقاصد اُسی طرح برقرار تھے کہ یکایک سندھ میں ایک اور انقلاب آیا۔ ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۴ء) میں کلہوڑوں کا آفتابِ حکومت غروب ہو کر ٹالپور ان کی جگہ تخت نشین ہوئے، ٹالپوروں کے خاندان میں جس نے سب سے پہلے سندھ پر تسلط حاصل کیا، وہ میر فتح علی خاں تھا جس کو "فاتح سندھ" کے لقب سے یاد کیا گیا۔ وہی ٹالپور خاندان کا سیاسی مدبر تھا۔ اس نے ملک کو انتظامی حیثیت سے سات یکساں حصوں میں تقسیم کر کے چار حصے اپنے اور اپنے تین بھائیوں کے لیے رکھے جن کا دارالحکومت حیدرآباد قرار پایا۔ دو حصے میر سہراب خان کو دیے، جن کا دارالسلطنت خیرپور بنا اور ایک حصہ میر ٹھارہ خاں کو دیا جس کا مرکز میرپور قرار پایا۔ ان تینوں کے جد اعلیٰ ککو خاں ٹالپور تھے۔

میر فتح علی خاں "فاتح سندھ" کے والد کا نام میر صوبدار خاں تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے: میر فتح علی خاں، میر کرم علی خاں، میر غلام علی خاں اور میر مراد علی خاں۔ ان کا دارالسلطنت حیدرآباد تھا۔ حیدرآباد کو ان حکومتوں میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ میر سہراب خاں کا دارالحکومت خیرپور اور میر ٹھارہ خاں کا دارالحکومت میرپور تھا۔ یہ سندھ کی انتظامی تقسیم تھی۔ ان تینوں حکومتوں میں کوئی اختلاف اور رنجش نہ تھی، بلکہ ان سب نے مل کر مرکزی حیثیت میر فتح علی خاں کو دی تھی۔ میر سہراب خاں اور میر ٹھارہ خاں نے اپنی حیثیت ریاست کی سی رکھی اور مرکزی حیثیت حیدرآباد کو دی۔

چویاری حکومت:

حیدرآباد کی حکومت 'چویاری' کہلاتی تھی، یعنی کہ چار بھائیوں نے یاروں اور دوستوں کی طرح مل کر ایک متحدہ انتظامیہ (کونسل) کی حیثیت میں حکمرانی کی۔ میر فتح علی خاں کی وفات کے بعد ۱۶ محرم ۱۲۰۷ھ (۱۸۰۲ء) کو اس انتظامیہ کا سربراہ میر فتح علی خاں کے باقی تین بھائیوں میں سے بڑا بھائی میر غلام علی خاں بنا اور میر فتح علی خاں کے فرزند صوبدار خاں کو چویاری کا ممبر بنا دیا گیا۔ اسی طرح میر غلام علی خاں کی وفات پر تیسرا بھائی میر کرم علی خاں ۶ جمادی الثانی ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) کو چویاری کا سربراہ اور ان کی وفات پر چوتھا بھائی میر مراد علی خاں چویاری کا سربراہ بنا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سندھ افغانستان کا باج گزار تھا۔

ٹالپوروں کے دورِ حکومت میں انگریزوں کی شاخ تمنا پھر ہری ہوئی اور ملک گیری کی ہوس نے ان کی اقتدار کی بھوک کو تیز تر کر دیا۔ انگریزوں نے دوبارہ سندھ میں ٹالپوروں کے دربار کا رخ کیا۔ اب ان کے سیاسی مقاصد بہ نسبت تجارتی مقاصد کے زیادہ تھے۔ وہ افغانستان پر حملہ کرنا چاہتے تھے، لیکن سندھ ان کے راستے میں سدِ سکندری بنا ہوا تھا۔ انگریزوں کے سیاسی مقاصد کے حصول میں سندھ کباب میں ہڈی بنا ہوا تھا جسے وہ جلد سے جلد نکال کر باہر پھینک دینا چاہتے تھے، وہ اس اختلاف کا بھی اندازہ کر چکے تھے جو افغانستان اور ٹالپور امیروں میں آہستہ آہستہ پیدا ہو رہا تھا۔ وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ٹالپور امیروں کے دربار میں آئے جس کے لیے وہ مدتوں سے تیاریاں کر رہے تھے۔

سب سے پہلے انگریزوں نے ٹالپور امیروں کو اپنی دوستی و خلوص کا فریب دیا، لیکن اس وقت میر کرم علی خاں اور میر مراد علی خاں والیان حیدرآباد اور میر سہراب خاں والیٔ خیرپور جیسے عاقبت اندیش اور مدبر فرمان روا اور ان کے باتدبیر مشیر نواب ولی محمد خاں لغاری اور میاں گولہ شاہ زندہ تھے۔ انگریزوں نے امیروں کو فریب دے کر یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ بیرونی مدافعت کے لیے سندھ میں ایک چھاؤنی کے قیام کی ضرورت ہے، لیکن ٹالپور امیر انگریزوں کی دسیسہ کاریوں کو سمجھتے تھے اور فرمان روائی کے طور و طریق سے واقف تھے، لہٰذا وہ انگریزوں کو لطائف حیل سے ٹالتے رہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سرزمین سندھ پر انگریزوں کے قدم جمیں۔ انگریزوں نے جب بھی اس قسم کا سوال اٹھایا، انہوں نے نہایت عمدگی سے اس کو ٹال دیا۔ وہ فوراً ہی خراسان سے کمک طلب کر لیتے تھے جس سے انگریز اپنے دلی منصوبوں کو اپنے دل ہی میں رکھتے تھے اور حرفِ مدعا زبان پر نہ لاتے تھے اور سندھ میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کرتے تھے، تاہم موقع و محل کے منتظر تھے۔ جب پہلی 'چویاری' کے ارکان (چار بھائیوں) نے وفات پائی اور زمام حکومت حیدرآباد میں میر مراد علی خاں کے بیٹوں میر نور محمد خاں اور میر محمد نصیر

خاں کے ہاتھ آئی اور خیرپور کی حکومت میر سہراب خاں کے بیٹوں میر رستم خاں، میر مبارک خاں اور میر علی مراد خاں پر منتقل ہوئی، تو انگریزوں نے اپنے سیاسی مقاصد کی کامیابی کا خواب دیکھا اور پھر سے خیر خواہی کا لبادہ اوڑھ کر کبھی وہ سفیروں کے بھیس میں اور کبھی دریائے سندھ کی پیمائش کے بہانے سے در آئے۔

ٹالپور امیروں سے انگریزوں کا پہلا معاہدہ:

ٹالپور فرمان روا انگریز دوستی کے فریب میں آگئے۔ اس طرح انگریزوں نے اپنی مکاریوں اور فریب کی راہوں کو ہموار دیکھ کر اپنے معاہدوں کے جال میں ٹالپور امیروں کو جکڑا۔ میر نور محمد خاں سب سے پہلے انگریزوں کی ان چالوں سے متاثر ہوا اور ایک معاہدہ پر راضی ہو گیا۔

یہ پہلا معاہدہ تھا جو انگریزوں نے ٹالپور امیروں سے کیا۔ اس کے مطابق یہ طے پایا کہ کراچی سے لے کر قلعہ سبزل کوٹ تک اور تمام وہ قلعے جو ریگستان میں ہیں، حسب سابق میران سندھ کے قبضہ و تصرف میں رہیں گے اور انگریز اس میں کسی قسم کا تصرف نہ کرے گا، لیکن وہ چھاؤنی جو انگریزوں کی طرف سے کوٹڑی میں دریائے سندھ کے کنارے قائم ہو گی، اس کے مصارف کے لیے میرانِ سندھ ہر سال تین لاکھ روپے انگریزوں کو ادا کریں گے۔ اگر کوئی دشمن خراسان وغیرہ کی طرف سے حملہ کرے گا، تو انگریزی حکومت اس کی مدافعت کرے گی۔

امیر اس معاہدے سے خوش تھے اور اس کو اپنی تجربہ کاری اور ہوشمندی کا ثبوت سمجھتے تھے کہ انہوں نے ایک اچھا معاہدہ کیا ہے جس سے سرحدات کی حفاظت اور مدافعت ہو گی۔

انگریز اس بنا پر خوش تھے کہ انہیں اس معاہدے کی وجہ سے سندھ میں قدم جمانے کا موقع مل گیا ہے اور اس معاہدے سے خراسان پر حملہ کرنے کی راہیں ہموار ہو گئی ہیں، لیکن وقت نے آگے چل کر بتایا کہ انگریز اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے اور ٹالپوروں نے اپنی حکومت کھو دی۔

اس معاہدے کے بعد انگریزوں کی چیرہ دستیاں بڑھتی گئیں اور انہوں نے امیروں پر متعدد معاہدے مسلط کیے جن کو امیروں نے طوعاً و کرہاً قبول کیا۔ انگریزوں نے ان معاہدوں میں اپنے مقاصد و مطالبات کی روح کو ہی پیش نظر رکھا۔

ہم ان معاہدات کو ذیل میں نقل کرتے ہیں تاکہ یہ حقیقت سامنے آسکے کہ ان معاہدوں میں انگریزوں نے کس چالاکی سے سندھ کو اپنے جال میں پھنسایا۔[1]

معاہدات جو میران سندھ اور انگریزوں کے درمیان ہوئے:

(۱) میر غلام علی خان ٹالپور اور برطانیہ سرکار کے درمیان معاہدہ:

جب میر غلام علی خاں حیدرآباد کی مسند شاہی پر بیٹھا، تو ۱۸۰۳ء (۱۲۱۸ھ) میں اپنے نمایندے کو بمبئی بھیجا تاکہ انگریز تاجروں کو سندھ میں تجارت کی اجازت دی جائے، مگر انگریزوں نے اس سے الٹا تاوان طلب کیا جو انہیں ان تجارتی کوٹھیوں کے بند کرنے میں ہوا تھا۔ انگریز کی اس کی وقت کی سیاست کا یہی اقتضا تھا، کیونکہ میران سندھ کے تعلقات افغانستان کے دربار سے زیادہ تھے۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ کپتان ڈیوٹ سٹن کو اپنا نمایندہ بنا کر حیدرآباد بھیجا جائے، چنانچہ میر غلام علی خاں کے دربار میں اُسے بھیجا گیا جس نے میر غلام علی خاں سے حسب ذیل معاہدہ کیا:

۱۔ دونوں حکومتیں ایک دوسرے کی دوست رہیں گی اور دونوں حکومتوں کے دوستوں کو اپنا دوست اور دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھیں گی، یہ عہد دوامی ہو گا۔

۲۔ عند الضرورت دونوں حکومتیں ایک دوسرے کو فوجی مدد دیں گی۔

۳۔ دونوں حکومتیں ایک دوسرے کے مخالفین کو پناہ نہ دیں گی۔

۴۔ اگر سندھ کی حکومت کا کوئی نمائندہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی کسی بندرگاہ سے سامان جنگ خریدنا چاہے گا، تو کمپنی کی حکومت اس کی مدد کرے گی۔

۵۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے دربار سندھ میں ایک آدمی کا تقرر کیا جائے گا۔ تاکہ وہ روابط دوستی اور خیر سگالی کے بڑھانے میں مفید ہو۔

۶۔ دعویٰ تاوان جو سابق میں دونوں حکومتوں میں موجود تھا، اُسے بہ کلی منسوخ کیا جاتا ہے۔

۷۔ صرف ٹھٹھہ شہر میں ایک تجارتی کوٹھی کلہوڑوں کے زمانے کے مطابق قائم کی جائے گی۔ یہ عہد نامہ خدا کے فضل سے مستحکم رہے گا۔[2]

۲۴ جولائی ۱۸۰۸ء (غرہ جمادی الثانیہ ۱۲۲۳ھ)

(۲) معاہدہ جو مسٹر سمتھ کے ساتھ کیا گیا:

۱۔ یہ معاہدہ حکومت انگلیشیہ اور حکومت میران سندھ میر غلام علی، میر

---

(1) یہ تمام تفصیل تازہ نوائے معارک، ص ۶۱۱ تا ۶۱۴ سے ماخوذ ہے۔

(2) تعلیقات تازہ نوائے معارک، از (حبیبی)، ص ۹۵۲ تا ۹۵۳۔

کرم علی اور میر مراد علی کے درمیان ہوا جو ہمیشہ دوستی کا مظہر رہے گا۔

۲۔ دونوں حکومتوں کے درمیان کبھی دشمنی نہ ہوگی۔

۳۔ حکومت انگلیشیہ اور حکومت سندھ کے دربار میں مقابلتاً وکیل مقرر ہوں گے۔

۴۔ حکومت سندھ فرانسیسی لوگوں کو اپنی سرزمین میں کبھی سکونت اور آباد ہونے کی اجازت نہ دے گی۔

۱۰ رجب ۱۲۲۴ھ (۲۱ اگست ۱۸۰۹ء)

نوٹ: اس معاہدے کے لیے مسٹر ہانکی سمتھ کو سندھ بھیجا گیا۔ اس نے معاہدے کو لکھا۔[1]

(۳) معاہدہ جو میرانِ سندھ اور الفنسٹن کے درمیان ہوا:

یہ معاہدہ دوستی اور محبت میرانِ سندھ اور حکومت انگلیشیہ کی باہمی رضامندی سے ہوا۔ حکومت سندھ کی طرف سے میر اسماعیل شاہ اور سرکار انگلیشیہ کی طرف سے آنریبل گورنر بمبئی مکمل اختیار کے ساتھ مقرر کیے گئے تھے۔ اس معاہدے کی شرائط حسب ذیل تھیں:

۱۔ انگریز سرکار اور میر کرم علی اور میر مراد علی میں ہمیشہ روابط دوستی استوار رہیں گے۔

۲۔ دونوں حکومتوں کے درمیان وکلا کا تقرر برقرار رہے گا۔

۳۔ میرانِ سندھ اپنی سرزمین میں (انگریزوں کے سوا) کسی اہل یورپ اور اہل امریکہ کو قیام کی اجازت نہ دیں گے۔ اگر طرفین کی رعایا میں سے کوئی اطاعت اور نیک سیرتی کے ساتھ رہنا چاہے، تو یہ قیام عارضی ہوگا۔ اگر کوئی شخص مجرم و سرکش ہو تو وہ حکومت جس کا وہ رہنے والا ہے، مجاز ہوگی کہ وہ اس کو پکڑے اور سزا دے یا اس کو اپنے وطن سے جلاوطن کر دے۔

میرانِ سندھ اپنی رعایا میں قبیلہ کھوسہ وغیرہ کی، جو لوٹ مار مچاتے ہیں، نگرانی کریں گے اور ان کو کھلی چھوٹ نہ دیں گے کہ وہ انگریزی علاقے میں جا کر لوٹ مار مچائیں۔

(تحریر ۹ نومبر ۱۸۲۰ء (مہر ایسٹ انڈیا کمپنی) امفا الفنسٹن صاحب)

اس معاہدے کی حکومت ہند نے ۱۰ فروری ۱۸۲۱ء کو توثیق کی۔[2]

(۴) معاہدہ خیر سگالی جو میر خیر پور سے کیا گیا:

یہ معاہدہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر رستم خان ٹالپور کے درمیان بتوسط کرنل ہنری پاٹنجر بتاریخ ۲ ذیقعدہ ۱۲۴۷ھ (۱۴ اپریل ۱۸۳۲ء) کو ہوا جس کی توثیق ۱۹ جون ۱۸۳۲ء (۱۲۴۸ھ) کو شملہ میں لارڈ بینٹنگ گورنر جنرل نے کی۔ اس معاہدے کی شرائط حسب ذیل تھیں:

۱۔ دونوں حکومتوں کے درمیان ہمیشہ دوستی رہے گی۔

۲۔ دونوں فریق اس پر متحد ہیں کہ نسلاً بعد نسل ایک دوسرے کے اقتدار میں دخل نہ دیں گے۔

۳۔ حکومت انگلیشیہ سرکار خیر پور سے اس کی توقع رکھتی ہے کہ ہند کے سوداگروں کو دریائے سندھ اور دوسرے خشکی کے راستوں سے ان شرائط پر جو سرکار حیدرآباد اور میر مراد علی خان نے قبول کی ہیں، آمد و رفت کی اجازت دی جائے گی۔

۴۔ سرکار خیر پور اس سے متفق ہے کہ ایک تحریری فہرست کے بموجب جو اشیا سندھ میں لائی جائیں گی، ان پر عادلانہ محصول وصول کرے اور اس فہرست کے موجب لے اور تاجروں کو سرکاری کارروائی میں پریشان نہ کرے۔

(مہر کمپنی ایسٹ انڈیا کمپنی - املا ڈبلیو - سی - بینٹنگ - مہر گورنر جنرل)[3]

(۵) میر مراد علی خاں ٹالپور سے ہنری پاٹنجر کا معاہدہ جو ۱۸ ذیقعدہ ۱۲۴۷ھ (۱۳ اپریل ۱۹۳۲ء) کو ہوا:

یہ معاہدہ حیدرآباد میں لیفٹیننٹ کرنل پاٹنجر اور میر مراد علی خاں ٹالپور کے درمیان ہوا۔ اس کی شرائط حسب ذیل تھیں:

۱۔ روابط محبت دونوں حکومتوں کے درمیان جو سابقہ معاہدوں میں کیے گئے ہیں، دوام اختیار کریں گے، لیکن اب لیفٹیننٹ کرنل پاٹنجر کے توسط سے دوسرا مفید مواد اس میں شامل کیا جا رہا ہے تاکہ روابط دوستی استوار ہوں۔

۲۔ دونوں معاہدہ کنندہ ایک دوسرے کے ملکوں پر حرص و آز کی نظر نہ ڈالیں گے۔

۳۔ حکومت انگلیشیہ اس کی خواہش رکھتی ہے کہ ہندوستان کے تاجروں کو جو اپنے مال تجارت کو خشکی اور دریائے سندھ کے راستے سے لانا چاہتے ہیں، اس کی اجازت دی جائے گی کہ وہ ایک حکومت سے

---

(1) ایضاً - ص ۲۵۳ تا ۲۵۴۔

(2) تعلیقات تازہ نوائے معارک (از حبیبی صاحب) ص ۹۵۴ تا ۹۵۵۔

(3) تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۹۵۶۔

دوسری حکومت میں اپنا مال لا اور لے جا سکیں۔ حکومت حیدرآباد نے اس کو تین شرطوں سے منظور کیا ہے:

شرط اول: کسی شخص کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ ان راستوں سے جنگی سامان لائے۔

شرط دوم: ان راستوں سے کوئی مسلح جہاز اور کشتی سر زمین سندھ میں داخل نہ ہو سکے گی۔

شرط سوم: کسی انگریز تاجر کو سندھ میں مستقل قیام کی اجازت نہ دی جائے گی، حسب ضرورت قیام کرنے کے بعد وہ ہندوستان واپس ہو جائیں گے۔

۴۔ جس وقت کہ ہندی تاجر تجارت کے لیے سندھ آئیں گے، انہیں چاہیے کہ وہ حکومت ہند سے پاسپورٹ حاصل کریں اور اپنی آمد کی اطلاع بتوسط ناظم اعلیٰ مقیم "کچھ" یا کسی دوسرے ذریعے سے جو حکومت انگلیشیہ کا ہو، حکومت حیدرآباد کو دیں۔

۵۔ حکومت حیدرآباد نے تمام مال تجارت کے محصول کی ایک فہرست مرتب کی ہے کہ جس میں کمی بیشی نہ ہو سکے گی۔ تجارتی مال میں کسی قسم کی مزاحمت نہ کی جائے گی، نیز حکومت حیدرآباد محصولات کی ایک فہرست جو تجارتی مال پر وصول کیا جائے گا، حکومت ہند کو دے گی۔

۶۔ سابقہ معاہدات کہ جن کی دونوں حکومتیں توثیق کر چکی ہیں، ان سابقہ معاہدات میں کوئی تبدل و تغیر نہ ہو سکے گا۔

۷۔ ہمیشہ وکلائے طرفین مقرر ہوں گے جو روز افزوں دوستی اور ایک دوسرے کی مصلحتوں کا خیال رکھیں گے۔

(مہر کمپنی-مہر گورنر جنرل)

(۶) میر نور محمد خاں اور میر نصیر خاں ٹالپور کا کرنل ہنری پاٹنجر ایجنٹ گورنر جنرل سے معاہدہ:

اس معاہدے کی حسب ذیل شرائط تھیں:

۱۔ چونکہ امیرانِ سندھ اور حکومت انگلیشیہ میں محبت اور دوستی موجود ہے، اس بنا پر گورنر جنرل ہند ارادہ رکھتے ہیں کہ جو اختلاف میرانِ سندھ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ میں موجود ہے، اس کو رفع کریں تاکہ دونوں حکومتوں میں صلح و آشتی کی فضا پیدا ہو۔

۲۔ ان دونوں حکومتوں میں فیصلے کے لیے تجویز کی جاتی ہے کہ ایک نفر وزیر مختار حکومتِ انگلیشیہ کی طرف سے حیدرآباد میں مقرر کیا جائے اور اس کے عوض میں امیرانِ سندھ اپنے وکیل کو دربار حکومت انگلیشیہ میں بھیجیں۔

لیکن انگریزوں کے خود مختار وزیر کو اس کا اختیار ہوگا کہ وہ بوقت ضرورت اپنی رہائش کو تبدیل کرلے اور حکومت انگلیشیہ کی طرف سے اس خود مختار وزیر کے لیے ایک محافظ مناسب دستہ مقرر کیا جائے گا۔[1]

(شملہ- ۲۰ اپریل ۱۸۲۸ء- لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل نے اس معاہدے کی توثیق کی)۔

(۷) معاہدہ جو ۱۰ جنوری ۱۸۳۹ء کو میر خیرپور، میر رستم خاں سے ہوا:

اس معاہدے کے شرائط حسب ذیل تھے:

۱۔ حکومت انگلیشیہ اور میر رستم خاں ٹالپور اور اُن کے جانشینوں میں مراتب دوستی دائمی قائم ہیں، ایک کا دوست دشمن دوسرے کا دوست دشمن سمجھا جائے گا۔

۲۔ حکومت انگلیشیہ حکومت خیرپور کو ہمیشہ محفوظ رکھے گی۔

۳۔ میر رستم خاں اور اُن کے اخلاف و جانشین ہمیشہ حکومت انگریز کی رائے کے مطابق عمل کریں گے اور پوری اطاعت کریں گے۔ اور سوائے انگریزی حکومت کے دوسری حکومتوں یا سرداروں سے روابط نہ رکھیں گے۔

۴۔ امیر مذکور اور اس کے ورثاء و جانشین حکومت انگلیشیہ کی منظوری اور موافقت کے بغیر کسی دوسری حکومت یا سردار سے عہد و پیمان نہیں کریں گے، البتہ اپنے دوستوں اور اقربا سے خط و کتابت کر سکتے ہیں۔

۵۔ انگریز سرکار عند الضرورت میر صاحب موصوف کو انتظامی اور فوجی امداد دے گی تاکہ اندرون سندھ یا ان شہروں میں جو سندھ کے آس پاس ہیں، امن برقرار رہے، لیکن انگریزی حکومت امیر کے اور اس کے جانشینوں کے مقبوضہ علاقوں اور طرفین کی فلاح و بہبود کے لیے ان قلعوں پر جو دریائے سندھ کے اس طرف یا اس طرف واقع ہیں، قبضہ نہ کرے گی۔

۶۔ امیر اور اس کے ورثاء و جانشین کسی پر ظلم نہ کریں گے۔ اگر اس قسم کا اتفاقاً کوئی اختلاف رونما ہوا تو اس کا فیصلہ انگریز حکومت کرے گی۔

۷۔ امیر، اس کے ورثا اور جانشین خود مختار حاکم ہوں گے اور حکومت

---

[1] تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۹۶۵-۹۶۶۔

انگلیشیہ کے کارکن ان کے رواج میں کوئی مداخلت نہ کریں گے، نیز شکایتوں اور خدمتگاروں کے استغاثوں کو اور اُن کے اقربا اور رعایا کے استغاثوں کو سوائے امیر کے اور کوئی نہ سنے گا۔

۸۔ میر رستم خاں تاجروں کی آمد و رفت کو فروغ دینے کے لیے اس کا وعدہ کرتے ہیں کہ سوداگروں کو آرام پہنچانے اور تجارت کو وسیع کرنے میں ہر ضروری سہولت بہم پہنچائیں گے۔

۹۔ محبت اور دوستی کو ترقی دینے کے لیے مابین حکومت انگلیشیہ اور خیرپور طے پایا کہ ایک بااختیار وزیر انگریزوں کی طرف سے دربار خیرپور میں رہے گا اور امیر بھی اپنے وکیل دربار حکومت انگلیشیہ میں بھیجیں گے، لیکن بااختیار انگریزی وزیر کو اس کا حق ہوگا کہ وہ اپنی جائے سکونت کو وقتاً فوقتاً تبدیل کرتا رہے اور اس وزیر کی حفاظت کے لیے ایک محافظ دستے کو مناسب تعداد میں اپنی مرضی سے متعین کرے گی۔

یہ عہد نامہ سر اسکندر برنس سفیر نے لکھا اور ۲۴ دسمبر ۱۸۳۸ء (۶ شوال ۱۲۵۴ھ) کو جارج اکلینڈ گورنر جنرل نے بمقام چھاؤنی پونہ اس کی توثیق کی۔

ضمیمہ

چونکہ دولت انگلیشیہ نے عہد کیا ہے کہ حکومت خیرپور کو ہر قسم موجودہ اور آیندہ دشمنوں سے محفوظ رکھے گی، اور دریائے سندھ کے اس طرف اور اس طرف کے قلعوں میں کسی قسم کا کوئی تصرف نہ کرے گی، اس بنا پر میر رستم خاں اور اس کے اخلاف اقرار کرتے ہیں کہ اگر اوقاتِ جنگ میں گورنر جنرل چاہیں تو قلعہ بکھر کو اسلحہ اور خزانے کی حفاظت کے لیے اپنے تصرف میں لاسکتے ہیں، میر خیرپور کو اس پر کسی قسم کا اعتراف نہ ہوگا۔[1]

مہر رستم خاں امیر خیرپور - مہر اسکندر برنس

اقرار نامہ

ایک اقرار نامہ بھی اسکندر برنس ایلچی گورنر جنرل کی طرف سے جو اس عہد نامے کا ضمیمہ ہے، میر مبارک خاں والی خیرپور کے ساتھ اس مضمون کا معاہدہ طے پایا۔

سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی اقرار کرتی ہے کہ میر مبارک خاں والی خیرپور کی مقبوضہ اراضی کو میر مبارک خاں کا حق جان کر اس پر حریصانہ نگاہیں نہ ڈالے گی اور نہ اس کے انتظام میں مداخلت کرے گی۔

نیز اس کا بھی اقرار کیا جاتا ہے کہ انگریز سرکار کا دوستی و خلوص میں وہی مراعات برتے گی جو عہد نامہ میر رستم خان سے کیا گیا ہے۔

نوٹ: اسی طرز کا اقرار نامہ میر محمد خاں اور میر علی داد خاں سے بھی تاریخ مذکور میں کیا گیا ہے۔

(۸) عہد نامہ جس کی رو سے کراچی کو حکومت انگلیشیہ کے سپرد کیا گیا:

۵ فروری ۱۸۳۹ء (۱۲۵۵ھ) کو حاصل بن بچہ خاں گورنر قصبہ کراچی اور خیر محمد و مسیتا خاں ملازم میر نور محمد خاں کشتی و لیسلی پر سر فریڈرک لیوس مت لینڈ سپہ سالار افواج انگریزی مقیم سندھ نے اس معاہدے کو املا کیا۔ اس معاہدے کی شرائط حسب ذیل تھیں:

۱۔ آج گورنر موصوف قلعہ و قصبہ کراچی کو افواجِ انگریزی کے سپرد کرتا ہے۔

۲۔ آج کے دن یا اس کے بعد ہر منظورہ موقع پر افواج میران سندھ برگیڈیئر ولینٹ قصبہ مذکور کے ماتحت مشغول ہوں گی اور تمام وسائل حمل و نقل، کشتی اور اونٹ وغیرہ کرائے کی ادائیگی کے بعد حکومت سندھ مہیا کرے گی اور لوازم خوراک وغیرہ بھی قیمت مروجہ پر فراہم کرے گی۔ جب ان شرائط کی پابندی کی جائے گی تو انگریز حکام ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے عہد کرتے ہیں کہ قلعے میں جو (انگریز) سکونت رکھیں گے اور جو سامان ان کے پاس ہوگا وہ حکومتِ سندھ کی امانت ہوگا اور باشندگان مذکور حسب سابق اپنے مشاغل پر محصول ادا کریں گے اور انگریزوں کے تجارتی جہاز بندرگاہ مذکور میں اپنی آمد و رفت جاری رکھیں گے۔

(خیر محمد اور علی رکھی اس کے گواہ تھے)

(۹) معاہدہ انتظامی جو میران سندھ اور لارڈ آکلینڈ کے درمیان ۵ فروری ۱۸۳۹ء (۱۲۵۵ھ) کو ہوا:

اس معاہدے میں واضح کیا گیا ہے کہ اگرچہ دوستی اور روابط کے

---

[1] یہ معاہدہ اور ضمیمہ تازہ نوائے معارک، ص ۹۶۶ تا ۹۶۸ سے ماخوذ ہے۔

کئی معاہدے میرانِ سندھ سے کیے جاچکے ہیں، لیکن اس زمانے میں حالات کے لحاظ سے ان میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی، اس لیے مابین کمپنی انگریز بہادر اور سرکار میرانِ حیدرآباد حسب ذیل دفعات کا اضافہ کیا جاتا ہے:

۱۔ سرکار کمپنی انگریز بہادر اور امیرانِ حیدرآباد میر نور محمد خاں، میر نصیر محمد خاں، میر محمد خاں اور میر صوبدار خاں کے درمیان اس معاہدے سے دوستی کو فروغ ہوگا۔

۲۔ اس معاہدے کی رو سے انگریز فوج کی ایک چھاؤنی سندھ کے شہروں میں قائم کی جائے گی۔ یہ چھاؤنی ٹھٹھہ شہر میں یا دوسری جگہ دریائے سندھ کے مغربی جانب بموجب گورنر جنرل ہند قائم کی جائے گی، فوج کی تعداد پانچ ہزار جنگی فوجیوں سے زیادہ نہ ہوگی۔

۳۔ میر نور محمد خاں اور میر نصیر محمد خاں اور امیر محمد خاں (میرانِ سندھ، حیدرآباد) اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ہر ایک مبلغ ایک ایک لاکھ روپیہ خواہ سکہ کمپنی خواہ سکہ بھاکرو (یعنی تیموری) جملہ تین لاکھ روپے اخراجات چھاؤنی کے سال بہ سال ادا کریں گے۔ میر صوبدار خاں چھاؤنی کے اخراجات سے بری ہوگا۔

۴۔ سرکار کمپنی انگریز بہادر اور امیرانِ حیدرآباد اپنے اپنے دشمنوں کے آپ ذمہ دار ہوں گے۔

۵۔ امیرانِ حیدرآباد کہ جو اس معاہدے کے شریک ہیں اپنے اپنے مقبوضہ علاقوں کے مالک ہوں گے اور عدالت سرکار انگریز ان کے معاملوں میں مداخلت نہ کرے گی اور ان کی رعایا کی فریاد انگریزی سرکار میں مسموع نہ ہوگی۔

۶۔ البتہ امیرانِ سندھ کا اقرار کرتے ہیں کہ اس صورت میں کہ جب ایک امیر دوسرے امیر کے خلاف استغاثہ کرے تو ایسے استغاثے ریذیڈنٹ بہادر کے پاس پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس قسم کے استغاثے گورنر جنرل ہند کی منظوری کے بعد ان کے فیصلوں پر ریزیڈنٹ غور کرسکتا ہے۔

۷۔ اس صورت میں جب کہ ایک امیر کی رعایا دوسرے امیر کی رعایا پر تعدی کرے اور وہ امیر اس کی تعدی کے جواب میں اپنی رعایا کی حمایت کرے تو ایسی صورت میں ریذیڈنٹ بہادر کو اختیار ہوگا کہ اس واقعہ کی اطلاع گورنر جنرل ہند کو دے اور گورنر جنرل کی منظوری کے بعد مظلوم امیر مذکور کی مدد کرے اور اس قسم کے مرتکبان جرائم کی سزایابی کا انتظام کرے۔

۸۔ امیرانِ سندھ بغیر سرکار انگریز کی اطلاع کے کسی سردار یا کسی ملک سے سوال و جواب نہ کرسکیں گے، لیکن سلسلۂ مراسلت دوستانہ دوستوں کے ساتھ اور اپنے بھائیوں کے ساتھ جاری رہے گا۔

۹۔ جن امور کا تعلق حفاظت سے ہے امیرانِ سندھ انگریز حکومت کے فرماں بردار اور معین و مددگار رہیں گے اور ان مشکل اوقات میں تین ہزار نفر سوار اور پیاد عندالطلب حکومتِ انگریز کو دیں گے۔ یہ لشکر انگریزی فوجوں کے ساتھ بھیجا جائے گا اور اس کی حیثیت انگریزی فوجوں کے ماتحت کی ہوگی جس کے معمولی اخراجات انگریزی حکومت ادا کرے گی۔

۱۰۔ چونکہ روپیہ سرکار کمپنی اور سکۂ تیموری قیمت میں برابر ہیں، امیرانِ سندھ کو اپنے علاقے میں سکۂ کمپنی جاری کرنے میں کوئی عذر نہیں، لیکن جب تک کہ انگریز سندھ میں کوئی دارالضرب قائم نہ کریں، جو افغانستان کی مہم کے بعد قائم ہوگی وہ سکۂ تیموری ضرب کرائیں گے۔

۱۱۔ تجارتی کشتیوں پر جو بالائے سندھ یا پائیں سندھ روانہ کی جائیں گی امیرانِ سندھ کے حدود میں یعنی دریائے شور سے لے کر مائی تک جو دریائے سندھ کے سمت شمال میں ہے اور امیرانِ سندھ کی سرحد ہے، کسی قسم کا محصول نہ لیا جائے گا۔

۱۲۔ اگر کوئی تاجر اپنے مال تجارت کو اثنائے راہ میں اتار کر فروخت کرنا چاہے تو اس صورت میں اس سے معمولی محصول لیا جائے گا، لیکن اگر محل فروخت انگریزی چھاؤنی ہو تو محصول نہیں لیا جائے گا۔

(۱۰) معاہدہ جو ۱۸ جون ۱۸۴۱ء (۲۷ ربیع الاول ۱۲۵۷ھ کو میر شیر محمد خاں والیٔ میرپور اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ہوا:

اس معاہدے کی شرائط حسب ذیل تھیں:

۱۔ میر شیر محمد خاں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے روابط دوستی ہمیشہ قائم رہیں گے۔

۲۔ ہر سال یکم فروری کو سرکار میر شیر محمد خاں سرکار انگریزی کو مبلغ پچاس ہزار روپے سکۂ کمپنی کی صورت میں مصارفِ لشکر کے لیے، جو انگریزوں کا سندھ میں رہے گا، ادا کرے گی۔

۳۔ سرکار انگریز اس کا عہد کرتی ہے کہ امیر مذکور کے مقبوضہ علاقے کی بیرونی حملوں سے حفاظت کرے گی۔

۴۔ میر شیر محمد خاں اپنی مملکت کے خود مختار حاکم ہوں گے اور انگریزی حکومت اس میں مداخلت نہ کرے گی اور نہ میرپور کی رعایا کی شکایات کو سنے گی۔

۵۔ سابق معاہدے کے مطابق امیر موصوف اپنے علاقے کا خود مختار مالک ہے۔ اگر اس کا دوسرے امیروں سے اختلاف ہو تو وہ برطانوی ریذیڈنٹ مقیم سندھ کو اطلاع دے اور وہ گورنر جنرل ہند کی منظوری کے بعد اختلاف کے رفع کرنے اور تصفیئے میں کوشش کرے گا۔

۶۔ چونکہ میر شیر محمد خاں کا امرائے حیدرآباد سے تقسیم اراضی میں بالفعل اختلاف ہے، اس بنا پر اس کا فیصلہ بھی اگر فریقین ان کو ثالث قرار دیں تو وہ فیصلہ کریں گے۔

۷۔ اگر کوئی امرائے مذکور کی رعایا میں سے دوسرے امیر کی رعایا پر ظلم کرے اور امیر موصوف بسبب بغاوت و سرکشی کے اس کی طاقت نہیں رکھتا کہ وہ اس کو سزا دے سکے تو اس کے لیے مناسب ہے کہ بواسطۂ ریذیڈنٹ برطانوی گورنر جنرل ہند کو اس کی اطلاع دے۔ اگر گورنر جنرل مناسب سمجھیں گے تو مجرم کی گرفتاری کے لیے امداد دیں گے۔

۸۔ امیر موصوف بغیر اطلاع و منظوری سرکار انگریز کے کسی حکومت یا سردار سے عہد و پیمان یا نوشت و خواند نہیں کر سکتے، البتہ دوستوں یا اقربا سے مراسلت کر سکتے ہیں۔

۹۔ امیر مذکور کو انگریزوں کے مشورے اور صوابدید سے ہمیشہ امور امن و امان میں کوشش کریں گے۔ اگر ضرورت پڑے گی تو امن و امان کے برقرار رکھنے میں انگریز فوجی امداد اس کو دیں گے، لیکن ان کا لشکر کمانڈر افسر انگریزی کے تحت ہو گا۔ اگر فوج امیر موصوف کی مملکت سے باہر بھیجی جائے گی تو اس کے مصارف سرکار انگریز پر ہوں گے۔

۱۰۔ چونکہ سکۂ تیموری اور سکۂ انگریزی کی قیمت برابر ہے، اس لیے سکۂ انگریزی امیر موصوف کی مملکت میں رائج کیا جائے گا۔

۱۱۔ وہ تجارتی کشتیاں جو دریائے سندھ میں شمال کی جانب سے اور امیر موصوف کی مملکت سے گزرتی ہیں، اُن سے محصول نہ لیا جائے گا۔

۱۲۔ اگر کوئی تاجر راستے میں اپنا مال فروخت کرنا چاہے اور وہ مال فروخت ہو جائے، تو ایسے تاجروں سے رائج الوقت محصول لیا جائے گا، لیکن اگر مال تجارت انگریزی لشکر گاہ یا چھاؤنی میں فروخت کیا گیا ہے، تو ان سے کوئی محصول نہ لیا جائے گا۔

۱۳۔ تاجروں کو یہ حق حاصل ہو گا کہ مناسب موسم میں اپنا مال تجارت دریائے سندھ سے لائیں اور اپنے تجارتی گوداموں میں دوسرے موسم کے لیے رکھیں، لیکن اگر سوداگر اپنے مال کو گوڑہ باڑی یا کسی دوسری جگہ (جو انگریزی لشکر گاہ نہ ہو گی) فروخت کریں گے تو اُن سے محصول لیا جائے گا۔

۱۴۔ واضح ہو کہ یہ عہد نامہ ایک جانب سے گورنر جنرل ہند اور دوسری جانب سے میر شیر محمد خاں نے منظور کیا ہے۔ اخلافِ سرکار ہند اور ورثا و جانشینانِ امیر مذکور ہمیشہ اس معاہدے کو ملحوظ رکھیں گے۔[1]

آکلینڈ نے یہ معاہدہ ۲۷ ربیع الاول ۱۲۵۷ھ (۱۸ جون ۱۸۴۱ء کو لکھا اور ۱۶ اگست ۱۸۴۱ء کو فورٹ ولیم بمبئی میں گورنر جنرل ہند نے اس کی توثیق کی۔

ٹی۔ ایچ میڈک سیکریٹری گورنمنٹ ہند۔

(۱۱) معاہدہ جو نومبر ۱۸۴۲ء کو ہوا:

اس معاہدے کی شرائط حسب ذیل تھیں:

۱۔ اُمرائے حیدرآباد از روئے معاہدات گزشتہ جو انگریزوں کو مصارف دیتے تھے وہ جنوری ۱۸۴۳ء (۱۲۵۹ھ) سے معاف کیے جاتے ہیں۔

۲۔ ابتدائے جنوری ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) سے اُمرائے حیدرآباد کے تمام شہروں میں صرف سکۂ کمپنی رائج ہو گا۔

۳۔ دارالضرب کا تیہ حکومت انگلیشیہ وقتاً فوقتاً اُمرائے حیدرآباد کے لیے سکے ڈھالے گی، ان سکوں کے ایک طرف انگریز بادشاہ کی تصویر یا کتبہ حسب تجویز حکومت انگلیشیہ اور دوسری طرف نوشتۂ اُمرائے حیدرآباد ہو گا۔

۴۔ مسکوکہ کا تیہ اُمرائے مذکور کے لیے ڈھالے جائیں گے اور اس کی چاندی کی قیمت اور ان کا وزن سکۂ انگریزی کے برابر ہو گا۔ چاندی کے وصول ہونے کے چار ماہ بعد مسکوکات فرمائشی دارالضرب انگلیشیہ تیار کر کے دے گی اور سکہ سازی کے مصارف امیرانِ مذکورہ سے نہ لیے جائیں گے۔

---

[1] ماخوذ از تعلیقات (حبیبی صاحب) تازہ نوائے معارک، ص ۹۷۴ تا ۹۷۶۔

۵۔ اس معاہدے کے مطابق امیران حیدرآباد سکہ سازی کا حق نہیں رکھیں گے۔

۶۔ دخانی کشتیوں کی ضروریات رفع کرنے کے لیے دریائے سندھ کے سوگز کے فاصلے سے لکڑی کاٹی جائے گی، لیکن اگر کسی جگہ پر امیرانِ سندھ چاہیں گے تو وہاں کی لکڑی کے بارے میں حکومت انگلیشیہ کوئی مداخلت نہ کرے گی۔

۷۔ اُن شرائط پر جن کو سر چارلس نیپیر ضروری سمجھیں کراچی اور ٹھٹھہ حکومتِ انگلیشیہ کے سپرد کیا جائے گا اور انگریز بغیر کسی مانع کے اپنی آمد و رفت جاری رکھ سکیں گے اور اُن تمام سرحدات پر جن کو میجر جنرل مقرر کرے کارکنانِ انگلیشیہ حکمرانی کا حق رکھیں گے۔

۸۔ اراضی سبزل کوٹ سرحدات موجودۂ بہاولپور سے روہڑی تک تمامًا نواب بہاولپور کو 'کہ دوست اور خیر خواہِ قدیم برطانیہ کا ہے' دی جاتی ہے۔

۹۔ میر صوبدار کو، جو خیر خواہ دولتِ برطانیہ ہے، کراچی کے عوض مبلغ پانچ ہزار روپے کی جاگیر مال گزاری عطا کی جاتی ہے۔

۱۰۔ میجر جنرل نیپیئر کی طرف سے جو کمشنر اس معاہدے کی تکمیل کے لیے مقرر کیا جائے گا، تحقیق کے بعد لوازم جاگیر مذکور کو متعین کرے گا۔

۱۱۔ جو زمین اس معاہدے کی رو سے امیروں کو دی گئی ہے متفرق جگہ واقع ہے اور ان زمینوں کا مالیہ بھی یکساں نہیں، اس بنا پر کمشنر موصوف متعین کرے گا کہ کس قدر روپیہ نقد یا دوسری اراضی امیرانِ موصوف کو دی جائے، لیکن امیران موصوف گراں بہا اراضی کو چھوڑ کر کم قیمت اراضی قبول نہ کریں گے۔

۱۲۔ اگر مالیہ زمین اس کی قیمت سے مناسبت نہیں رکھتا ہو گا اس کا بھی حکومت انگریزی تصفیہ کرے گی اور محض اپنے نفع کے لیے کوشش نہ کرے گی۔[1]

(شملہ - ۴ نومبر ۱۸۴۲ء)

(۱۲) معاہدہ جو امیران خیرپور سے ۴ نومبر ۱۸۴۲ء (۱۲۵۸ھ) کو ہوا:

اس معاہدے کی دفعات حسب ذیل تھیں:

۱۔ پرگنہ بھونک بھیرہ، ایک ثلث سبزل کوٹ اور قصبہ گونکی و ملادر و چونگا و دادولہ و عزیز پور اور دیگر اراضی جو اب بہاولپور اور روہڑی کی سرحدات کے درمیان واقع ہیں، یہ علاقے ہمیشہ کے لیے نواب بہاولپور کو دیے جاتے ہیں۔

۲۔ شہر سکھر اور جزیرۂ بکھر اور دوسرے متصلہ جزائر اور قصبہ روہڑی بشرطیکہ سر چارلس نیپیر چاہیں ہمیشہ سرکار انگریز سے متعلق رہیں گے۔

۳۔ میجر جنرل سر چارلس نیپیر کی طرف سے مقرر کردہ کمشنر اس معاہدے اور دوسرے معاہدے جو امیرانِ حیدرآباد سے کیے گئے ہیں وہ زاید مالیے کو ان معاہدوں کے بموجب کم کرے گا یا اس کے مقابل میں دوسری زمین مالیت کا اندازہ کر کے دے گا، نیز امیرانِ خیرپور میر رستم خاں و میر نصیر خاں کو بموجب اس معاہدے کے تقسیم اراضی میں اُن کے نفع کو ملحوظ رکھا جائے گا جس سے ان کی کمی کی تلافی ہو سکے گی۔

۴۔ چونکہ اُمرائے خیرپور نے بموجب معاہدہ ۲۴ دسمبر ۱۸۳۸ء عہد کیا ہے کہ وہ تاجروں کی آسائش کا خیال رکھیں گے اور تجارتی کشتیوں کو انگریزی چھاؤنیوں تک پہنچانے میں کسی قسم کا محصول نہ لیں گے، نیز اُمرائے حیدرآباد نے وہی دفعات مقرر کر کے اس عہد نامے کو قبول کیا ہے، لہٰذا اُمرائے خیرپور سے بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس معاہدے پر عمل کریں گے۔

۵۔ خیرپور میں صرف سکۂ انگریزی یا وہ سکۂ مقررہ جاری ہو گا جس کی شکل و صورت کا تعین بعد میں ہو گا۔

۶۔ دولتِ برطانیہ وقتاً فوقتاً خیرپور کے ایسے سکے ڈھالے گی جس کے ایک طرف شاہ انگلینڈ کی تصویر ہو گی اور دوسری طرف اُمرائے خیرپور جو چاہیں گے وہ منقش ہو گا۔

معاہدوں پر تبصرہ

گزشتہ اوراق میں ہم انگریزوں کی وہ متعدد معاہدے نقل کر آئے ہیں جو انہوں نے امیران سندھ کے ساتھ کیے تھے۔ ان معاہدوں سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انگریزوں نے سندھ میں اپنے اثر و نفوذ کو کس طرح بڑھایا اور مغرب کی سیاست کے جال میں امیرانِ

---

[1] تعلیقات تازہ نوائے معارک (حبیبی صاحب) ص ۹۷۶ تا ۹۷۷۔

سندھ کو کس طرح پھنسایا۔ ان معاہدوں کا طرز تحریر بتدریج دوستی کی بجائے حاکمانہ ہوتا گیا یہاں تک کہ انہوں نے اپنے معاہدوں میں جکڑ کر امیرانِ سندھ کو کاٹھ کی پتلی بنا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ مشرق کے ان سادہ دل اور نیک فطرت حکمرانوں نے جیسا کہ معاہدہ (۱) میر غلام علی خاں کے معاہدے میں گزر چکا ہے جب وہ مسند حکمرانی پر متمکن ہوا تو اس نے تجارت کو فروغ دینے کے لیے اپنا قاصد بمبئی بھیجا تا کہ وہ انگریز تاجروں کو دوبارہ سندھ میں لائے جو عہد کلہوڑہ میں اپنی تجارتی کوٹھیاں شاہ بندر اور ٹھٹھہ میں قائم کر چکے تھے۔ مشرق کا یہ حکمران مغرب کی سیاسی چالبازیوں کو نہیں جانتا تھا۔ وہ اس سے بھی ناواقف تھا کہ انگریز کی خاصیت اس گھاس کی طرح جو ایک مرتبہ لباس میں داخل ہونے کے بعد خواہ کپڑوں کو کتنا بھی جھٹکو اوپر چڑھتی چلی جاتی ہے۔ انگریز نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر نیک فطرت امیر سے مطالبہ کیا کہ عہدِ کلہوڑہ میں جو خسارہ ان کوٹھیوں کے بند کرنے سے ہوا تھا وہ حکومت ٹالپور ادا کرے۔ یہ مطالبہ تو انگریزوں نے صرف رونگھے میں کر دیا تھا، لیکن اب سندھ میں ان کی سیاسی مصلحتوں کا تقاضہ شدید تھا کہ وہ سندھ میں اپنے اثر و رسوخ کو تبدریج بڑھا کر امیرانِ سندھ کو سیاسی "سلو پائزن" دے کر پورے سندھ کو ہڑپ کر لیں۔

سندھ پر قبضہ کرنے میں انگریزوں کی سیاسی مصلحتیں:

سندھ پر انگریزوں کے قبضہ کرنے کی سیاسی مصلحتیں یہ تھیں:

۱۔ اگر سندھ پر انگریز قبضہ کر لیں تو ان کے مقبوضہ علاقے وسیع ہو جائیں گے اور ایک تجارتی منڈی ان کے ہاتھ آئے گی اور دریائی راستے سے وہ اپنی تجارت کو فروغ دے سکیں گے۔

۲۔ برصغیر کے مقبوضہ علاقوں نے انگریزوں کی ملک گیری کی بھوک کو تیز تر کر دیا تھا۔ اب وہ خراسان پر حملے کا خواب دیکھ رہے تھے، لیکن سندھ ان کے راستے میں حائل تھا، چنانچہ انہوں نے ابتداً ٹالپوروں پر اپنی دوستی کے حربے کو استعمال کیا۔ ان کو نرم پا کر انگریزوں کو شہ ملی اور وہ اپنے رویے میں آہستہ آہستہ حاکمانہ رنگ پیدا کرتے گئے۔ خود انگریز طاقتور ہوتے گئے اور ٹالپوروں کو اپنی چالاکیوں سے کمزور کرتے گئے۔

سندھ ٹالپوروں کا ملک تھا اور وہ اس سرزمین کے مستقل فرمانروا تھے۔ انگریزوں کی حیثیت ان رہزنوں کی طرح تھی جنہوں نے اس برصغیر میں کہیں لوٹ مار سے اور کہیں اپنی عیاریوں سے کچھ علاقے حاصل کر لیے تھے۔ ٹالپوروں کی حکومت کو ایک آئینی حیثیت حاصل تھی بہ نسبت ان کے جنہوں نے تجارت کو بٹ ماری کا ذریعہ بنایا تھا، لیکن یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ انگریزوں اور ٹالپوروں کے معاہدوں میں مساویانہ روح کہیں نظر نہیں آتی، بلکہ انگریز ان معاہدوں میں فریق ثانی کی کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر اپنی تحریروں کی روش میں وہ طریقے اختیار کرتا جاتا ہے جو طرز عمل ایک حاکم کا محکوم کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر یہ معاہدے عدل و انصاف اور اخلاقی بلندی سے بالکل خالی ہیں۔ سندھ کے شہروں میں انگریز چھاؤنیوں کا قائم کرنا پھر انگریزی سفیر کو یہ اختیار ہونا کہ وہ سندھ میں وقتاً فوقتاً اپنی سکونت بدلتا رہے گا، پھر اس کی حفاظت کے بہانے اپنے فوجی دستے کا مقرر کرنا، حد یہ ہے کہ کراچی پر قبضہ جمانا، کسی دوسرے ملک سے یا کسی سردار سے انگریز کے بغیر علم و اطلاع کے خط و کتابت کی ممانعت، محصولات حمل و نقل کی آمدنی میں حسب منشائے انگریز کمی، دریائے سندھ کے اطراف سے دخانی کشتیوں کے لیے لکڑی کاٹنا، کراچی اور ٹھٹھہ کو انگریزوں کے سپرد کر دینے کا معاہدہ، پھر انگریزوں کا اپنے فرمانبرداروں کو جاگیریں دینے کا عمل، پھر فوجیں انگریزوں کی اور ملک سندھ کا جو امیران سندھ کی حفاظت کے بہانے سے رکھی جائیں گی، امیرانِ حیدرآباد سے سال بہ سال تین لاکھ روپے وصول کرنا، یہاں تک کہ سندھ کے سکے کو بھی مٹا دینا، سرحدات کے ٹکڑوں کو دوسروں کے علاقے میں دے دینا، یہ وہ رسوائی کے داغ ہیں جو انگریزوں کے دامن سے مٹ نہیں سکتے۔[1]

ٹالپوروں کی انگریزوں سے مرعوب ہونے کی وجوہ:

ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ ٹالپوروں کے عہد میں سندھ افغانستان کا باج گزار تھا، لیکن یہ خراج ٹالپوروں کو ناگوار تھا اور وہ مکمل خود مختاری کا خواب دیکھ رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خراسان و امیران خراسان کی نااتفاقی کی وجہ سے ٹالپوروں نے یہ خراج خراسان کو دینا بند کر دیا تھا۔

جب شجاع الملک ۱۲۲۱ھ (۷-۱۸۰۶ء) میں تخت پر بیٹھا تو وزیر شیر محمد خاں کے ساتھ شکار پور آیا اور امیرانِ سندھ سے خراج کا مطالبہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ بیس لاکھ روپے بطور خراج لے کر گیا۔ شجاع الملک جب پشاور پہنچا تو کابل میں فساد ہو چکا تھا۔ وزیر فتح خاں نے اس کی جگہ محمود شاہ کو تخت پر بٹھا دیا تھا۔ شجاع الملک فرار ہو کر لاہور آیا اور رنجیت

---

(۱) ہم نے یہ باتیں گزشتہ اوراق پر نقل کیے گئے معاہدوں سے لی ہیں۔ (مؤلف)۔

سنگھ کے پاس پناہ لی۔ رنجیت سنگھ نے پہلے تو اسے عزت سے رکھا، لیکن جب وہ حکومت کی ہوس میں لاہور سے پشاور گیا تو کشمیر میں قید کر دیا گیا۔ کچھ دن کے بعد وہ چھوٹ کر لاہور آیا تو رنجیت سنگھ نے "کوہ نور" ہیرا حاصل کرنے کے لیے اسے قید خانے میں ڈال دیا۔ آخر وہ کسی نہ کسی طرح بھاگ کر لدھیانہ پہنچا۔ لدھیانہ چونکہ انگریزی عملداری میں تھا، لہٰذا انگریزوں نے اسے افغانستان کی سیاست میں کارآمد اور مفید سمجھ کر خوب پذیرائی کی۔ یہاں تک کہ اس کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا، لیکن شجاع الملک کے دل سے تمنائے شاہی کبھی نہیں گئی۔ انگریزوں کے اس دوست کے سر پر شاہی کا بھوت سوار تھا اور یہ انگریزوں کے ہاتھوں ایک کھلونا بنا ہوا تھا۔ شجاع الملک میرانِ سندھ کے لیے وہ خطرہ تھا جس کو انگریزوں نے جنم دیا تھا۔ یہ انگریزوں کے کس بل پر شکار پور میں رہا، اس نے شکار پور کے قیام کے زمانے میں سندھ پر جو مظالم توڑے وہ تحریر سے باہر ہیں۔ ہم تاریخ سندھ کے جلد دوم صفحہ ۶۱۹ اور ۶۲۰ پر اس کی تفصیل سے صراحت کر چکے ہیں۔

میران سندھ کا تیسرا دشمن رنجیت سنگھ تھا جسے ۱۷۹۹ء (۱۲۱۴ھ) میں شاہ زمان بادشاہ افغانستان نے لاہور کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اس نے ۱۸۰۲ء (۱۲۱۷ھ) میں امرتسر پر حملہ کر کے اسے اپنی حکومت میں داخل کر لیا۔ اس کے بعد اس نے لدھیانہ اور اس طرف کی دوسری ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۰۸ء (۱۳۱۶ھ) میں انگریزوں نے مسٹر منکارف کو بھیجا کہ وہ رنجیت سنگھ سے معاہدہ کرے کہ وہ دریائے ستلج سے آگے نہ بڑھے۔ چنانچہ ۲۵ اپریل ۱۸۰۹ء (۱۲۱۴ھ) کو یہ معاہدہ ہوا۔ ۱۸۰۹ء (۱۲۲۴ھ) یا ۱۸۱۰ء (۱۲۲۵ھ) میں رنجیت سنگھ نے ملتان پر یورش کی اور اس شہر کو اپنا باج گزار بنا لیا جب اس نے تخت پر بیٹھنے کے بعد دریائے ستلج اور دریائے سندھ کے درمیان تمام سرزمین پر قبضہ کر لیا۔ اس کی پالیسی انگریزوں کے ساتھ نہایت دوستانہ تھی۔ وہ سقوطِ سلطنت افغانستان کے بڑے عوامل میں تھا اور اس کا وجود میرانِ سندھ کے لیے عظیم خطرہ تھا۔ چنانچہ اس خطرہ سے محفوظ ہونے کے لیے میروں نے انگریزوں سے کمزور معاہدات کیے اور اپنے آپ کو انگریزوں کے معاہدوں کے جال میں جکڑ لیا۔ رنجیت سنگھ کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور طاقت کو دیکھ کر میرانِ سندھ ہر سال ایلچیوں کے ذریعے اس کو تحفے تحائف بھجواتے، لیکن رنجیت سنگھ کچھ اور ہی خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ بارہ لاکھ روپے جو خراج کے طور پر میرانِ سندھ کابل کو ادا کرتے تھے وہ اس کو بھی ادا کریں۔ میرانِ سندھ کو ڈرانے دھمکانے کے لیے اس کے ملتان کے نائب مٹھن کوٹ میں اپنی فوجی طاقت اور توپوں کا مظاہرہ کرنے لگے جس کی وجہ سے میرانِ سندھ میں طے ہوا کہ وہ انگریزوں کو ذریعہ بنا کر صلح کی بنیاد ڈالیں۔ چنانچہ قاصد کو گورنر کے پاس بمبئی روانہ کیا گیا۔ بمبئی کا گورنر ماؤنٹ سٹیورٹ ایلفنسٹن قاصد کے ساتھ نہایت احترام سے پیش آیا۔ گورنر بمبئی نے یہ رپورٹ گورنر جنرل ہند کو کلکتے بھیجی اور گورنر جنرل نے لدھیانے کے پولیٹیکل ایجنٹ کپتان وریڈ کو لکھا کہ وہ خالصہ سرکار کو مطلع کرے کہ وہ اپنے دل سے سندھ پر حملہ کرنے کا خیال نکال دے۔ اگر اس نے سندھ پر حملہ کیا تو ہم اس سے پہلے ملتان پر حملہ کر دیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد رنجیت سنگھ نے سندھ پر حملہ کرنے کا خیال چھوڑ دیا اور ایک تسلی بخش خط میروں کو لکھا۔

یہ تھے وہ تین خطرات جن میں میرانِ سندھ گھرے ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ ذہین و چالاک اور طاقتور دشمن انگریز تھا۔ ان معاہدوں میں جو کمزوری نظر آتی ہے وہ ایک کمزور کی کمزوری ہے جو ایک طاقتور کے مقابلے میں ہوتی ہے، لیکن مصلحت اور حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ وہ معاہدے جو مظالم و جابر قوتوں کے ساتھ ہوتے ہیں، ان میں مظلوم فریق اپنے حق کی محرومی پر آہ بھی نہیں بھر سکتا، لیکن انگریز اس وقت بھی اپنے مفاد کی سوچ رہا تھا۔ لیمبرک نے اپنی کتاب "سر چارلس نیپ" میں لکھا ہے کہ گورنر جنرل ایلن برو سکھوں سے تنازع کی بنا پر اس کا حامی تھا کہ چونکہ سکھوں سے کسی وقت بھی آویزش ہو سکتی ہے، اس لیے سندھ میں ایک فوجی اڈہ قائم کیا جائے۔ گورنر جنرل کی خواہش تھی کہ تمام فوجی چوکیوں پر انگریزوں کے موثر فوجی یونٹ رکھے جائیں تاکہ وہ دفاع کر سکیں۔

لارڈ ایلن برو کو سر چارلس نیپیر نے بتایا تھا کہ یہاں حمل و نقل کے ذرائع صرف اونٹ ہیں اور گزشتہ چار سال کے عرصے میں بہت سے اونٹ مارے گئے ہیں۔ ایلن برو نے جواب دیا کہ اونٹوں کی یہ قلت عارضی ہے، اس لیے ہدایت دی جاتی ہے کہ پورے سندھ میں فوج منظم رہنی چاہیے اور کیل کانٹے سے لیس ہونی چاہیے تاکہ وہ فوری طور پر حرکت میں آ سکے۔ سامان اٹھانے والے اونٹوں کی کور قائم کی جائے اور سندھ یونٹ میں بنگال اور بمبئی کی فوجیں بھی شامل کی جائیں۔

انگریز کی فوجی تیاریاں:

اس مقصد کے لیے بہاولپور سے دو ہزار اونٹ خرید کر ستمبر

۱۸۴۳ء(۱۲۵۹ھ) میں سندھ روانہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

نیپیر نے مزید مشورہ دیا کہ اونٹوں سے جنگ میں بھی کام لیا جائے اور ہر اونٹ پر مسلح سپاہی متعین کیا جائے۔ ایسی ہی ایک یونٹ بنگال کی فوج میں بھی تھی۔ نیپیر نے یہ مشورہ بھی دیا کہ "سندھی ہارس" (گھوڑ سوار فوج) کی تعداد دگنی کی جائے۔

بعض انگریز جنہوں نے میرانِ سندھ کے زوال میں نمایاں کردار ادا کیا۔

اب ہم ان انگریزوں کے مختصر حالات دیتے ہیں جنہوں نے ٹالپوروں کے زوال میں نہایت نمایاں اہم کردار ادا کیا۔

(۱) لارڈ ایلین برو گورنر جنرل ہند (۱۷۹۰ء- ۱۸۷۱ء)

یہ ایڈورڈ براؤن ایلین برو کا بیٹا تھا۔ سینٹ کالج کیمبرج میں تعلیم پائی اور ۱۸۱۳ء میں لارڈ مہر بردار شاہی ہوا۔ اُسی نے ۱۸۳۲ء میں الگزنڈر برانس کو لاہور بھجوایا جس نے انگریزوں کی بڑی خدمات انجام دیں (جن کو ہم اس کے تذکرے میں بیان کریں گے)۔ ایلن برو اکتوبر ۱۸۴۱ء میں ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا اور ۲۸ فروری ۱۸۴۲ء سے ۱۵ جون ۱۸۴۴ء تک اس عہدے پر مامور رہا۔ ۱۸۴۲ء میں اس نے سر چارلس نیپیر کے مشوروں سے سندھ کو فتح کر کے ہندوستان سے ملحق کیا۔ اسی کے حکم سے سندھ صوبہ بمبئی کا جزو بنا۔ ۲۲ دسمبر ۱۸۷۱ء کو ایلین برو کا انتقال ہوا۔[1]

(۲) سر جیمز آؤٹرم (۱۸۰۳ء- ۱۸۶۳ء)

سر جیمز آؤٹرم ۲۹ جون ۱۸۰۳ء(۱۲۱۸ھ) کو پیدا ہوا۔ مارشل کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۶ سال کی عمر میں ہندوستان کی فوج میں شامل ہوا۔ ۱۸۲۰ء(۱۲۳۶ھ) میں وہ بمبئی کی فوج میں ایجوٹنٹ مقرر کیا گیا۔ وہ نہایت بہادر تھا۔ ۱۸۲۵ء(۱۲۴۱ھ) سے ۱۸۳۲ء(۱۲۴۸ھ) تک اس کے مارے ہوئے شیروں کی تعداد (۱۹۱) تھی۔ وہ پولیس اور فوج کے متعدد عہدوں پر رہ کر ۱۸۳۸ء(۱۲۵۴ھ) میں جنرل لارڈ کین کے مشیروں میں شامل ہوا اور بمبئی کی فوج کے ساتھ قندھار، غزنی اور کابل گیا۔ ۱۸۳۹ء(۱۲۵۵ھ) میں اس نے جنوبی افغانستان کی مہم میں حصہ لیا۔ ۱۸۳۹ء(۱۲۵۵ھ) میں حیدرآباد سندھ کا پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوا۔ ۱۸۴۱ء(۱۲۵۷ھ) میں وہ بالائی سندھ بھیجا گیا اور میانی کی جنگ ۱۵ فروری ۱۸۴۳ء(۱۲۵۹ھ) میں انگریزی لشکر کی مردانہ وار حفاظت کی، یہاں تک کہ لفٹیننٹ کرنل C-B ہو گیا۔ ۱۸۴۷ء(۱۲۶۴ھ) میں بڑودہ کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ چونکہ رسوت ستانی سے متہم تھا، اس لیے حکومت بمبئی نے اسے معزول کر دیا، لیکن لارڈ ڈلھوزی نے اسے پھر اسی خدمت پر بحال کر دیا۔ ۱۸۵۴ء(۱۲۷۱ھ) میں اسے لکھنؤ کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ جب ۱۸۵۶ء(۱۲۷۳ھ) میں اودھ کی ریاست اس کی سفارش پر برطانوی ہند سے ملحق کی گئی تو اسے وہاں کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا گیا اور اس نے انگریزوں کی خواہش کے مطابق بہترین کارنامے انجام دیے۔ ۱۸۵۸ء(۱۲۷۵ھ) میں جب بغاوت رونما ہوئی تو اس نے ان کا مقابلہ کیا اور پھر لکھنؤ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۵۸ء(۱۲۷۵ھ) سے لے کر ۱۸۶۰ء(۱۲۷۷ھ) تک برٹش کونسل کا رکن رہا۔ ۱۸۶۱ء(۱۲۷۸ھ) میں اسے انگریزوں نے KCSI، DEL کا لقب دیا۔ ۱۱ مارچ ۱۸۶۳ء (۱۲۸۰ھ) میں اس کا انتقال ہوا اور احتراماً کلیسائے ویسٹ منسٹر میں دفن کیا گیا۔ اس کی یادگار میں کلکتہ اور لندن میں یادگاریں قائم کی گئیں۔[2]

(۳) مسٹر برنس (۱۸۰۵ء- ۱۸۴۱ء)

مسٹر برنس ولد جیمس برنس مشہور انگریز شاعر برنس کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اکاڈیمی مانٹروس میں تعلیم پائی اور ۱۶ سال کی عمر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں منسلک ہوا۔ ۱۸۲۳ء(۱۲۳۹ھ) میں سورت میں مقرر کیا گیا اور ۱۸۲۵ء میں "کچھ" تبدیل ہوا۔ ۱۸۳۰ء میں تحفتاً گھوڑوں کی ایک جوڑی لے کر دربار رنجیت سنگھ میں گیا۔ ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۵ء تک انگلستان میں رہا۔ جب وہ ہندوستان واپس آیا تو یہ میرانِ سندھ کے ساتھ دریائے سندھ کی پیمائش (سروے) پر مقرر کیا گیا اور وہ حیدرآباد سندھ کے میروں سے مذاکرات کرتا رہا۔

۱۸۳۶ء میں اسے امیر دوست محمد خاں کے دربار میں کابل بھیجا گیا۔ انگریز چاہتے تھے کہ اپنے زور بازو سے شاہ شجاع کو تخت کابل پر بٹھائیں۔ اس وقت انگریزوں نے برنس کو سندھ اور بلوچستان کے راستوں کو کشادہ کرنے کے لیے متعین کیا۔ دو سال تک کابل میں رہا۔ آخر لوگوں نے اس کے مخالف ہو کر ۲ نومبر ۱۸۴۱ء کو کابل میں اسے قتل کر دیا۔[3]

---

[1] ماخوذ از تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۹۴۸ تا ۹۴۹۔

[2] تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۹۸ تا ۹۰۰۔

[3] تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۸۸ تا ۸۸۹۔

(۴) رابرٹ لیچ:

برطانوی استعمار میں رابرٹ لیچ نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس کا اہم کام جو انگریزوں کی خوشنودی کا سبب بنا وہ سندھ اور افغانستان کے درمیان راستوں کی تلاش اور ان درّوں کی تحقیق ہے جو دریائے سندھ کی وادی اور افغانستان کے درمیان ہیں۔ یہ کارنامہ اس نے ۱۸۳۰ء میں انجام دیا۔

"یادداشتھائے کابل" میں برنس نے لکھا ہے کہ لفٹیننٹ لیچ نے پہلے دریائے سندھ کی اراضی اور اس کے دروں کی سیاحت کی اور کافی معلومات حاصل کیں۔ اس نے کابل اور قلات میں بھی انگریزوں کی منشا کے مطابق نمایاں خدمات انجام دیں۔ رابرٹ لیچ نے قلات کی سکونت کے زمانے میں ایک کتاب بھی "تاریخ قلات" کے نام سے لکھی تھی۔[2]

(۵) سر چارلس جیمس نیپیر (۱۷۸۲ء- ۱۸۵۲ء)

سر چارلس جیمس نیپیر نے میران سندھ کی حکومت کو ختم کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کے ہاتھوں ٹالپوروں کی حکومت کا آفتاب غروب ہوا، وہ یہی چارلس نیپیر ہے۔ یہ ۱۰ اگست ۱۷۸۲ء میں پیدا ہوا۔ کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۷۹۴ء میں ۲۳ رجمنٹ عساکر برطانیہ میں شامل ہوگیا۔ ۱۷۹۹ء میں وہ سر چارلس جیمز ڈف کا مددگار تھا۔ ۱۸۰۳ء میں اس نے لوز رجمنٹ ۵۰ کی ہسپانیہ میں قیادت کی۔ ۱۸۱۳ء میں ممالک متحدہ امریکا کی جنگوں میں شریک رہا۔ مختصر یہ ہے کہ مختلف مرحلوں کو طے کرتا ہوا ۱۸۳۷ء میں عہدۂ میجر جنرل تک پہنچا اور یونان میں برطانوی لشکر کی قیادت کی۔ ۱۸۴۱ء میں ہندوستان آیا اور عسکری سیاست میں شریک ہوگیا اور لارڈ ایلن برو کو سیاسی مشورے دینے لگا۔ ۱۸۴۲ء میں لشکر محاذ سندھ کا کمانڈر مقرر ہوا اور میران سندھ سے مختلف معاہدے کیے۔ دسمبر ۱۸۴۲ء میں سندھ کے قلعہ امام گڑھ کو اس نے فتح کر لیا۔ پھر ۱۷ جنوری ۱۸۴۳ء (۱۲۵۹ھ) کو مشہور میانی کی جنگ میں فتح حاصل کی۔ پھر ۲۴ مارچ ۱۸۴۳ء کو دبہ کے میدان میں، جو حیدرآباد کے نزدیک ہے، میر شیر محمد خاں، حکمراں میرپور کو شکست دی۔ آخر میں ۱۴ جون ۱۸۴۳ء میں شہداد پور کے میدان میں ٹالپوروں کی رہی سہی قوت کو کچل دیا۔

سندھ کو فتح کرنے کے بعد نیپیر اور جنرل آؤٹرم کے درمیان فتح سندھ کی بعض باتوں کے بارے اور اس بارے میں کہ امرائے ٹالپور سے کیا رویہ رکھا جائے، اختلاف رونما ہوا۔ نیپیر نے اس جدید حکومت کی تشکیل کی جو سندھ میں میران سندھ کے بعد انگریزوں کو حاصل ہوئی تھی۔ ۱۸۴۴- ۱۸۴۵ء میں اس نے سندھ کے قبائل سرحدات شمالی کی سرزنش کی۔ ۱۸۴۶ء (۱۲۶۳ھ) میں روہڑی کے لشکر کی تشکیل کی، یہاں تک کہ لفٹیننٹ جنرل کے عہدہ پر پہنچا۔ پھر اس نے سندھ کی حکمرانی سے استعفا دے دیا۔

۱۸۴۷ء نیپیر کل ہند کی فوج کا سپہ سالار مقرر ہوا۔ ۷ مئی ۱۸۴۹ء سے ۶ دسمبر ۱۸۵۰ء تک ہندوستان کی فوج کا کمانڈر ان چیف رہا۔ لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہند کی مخالفت کی بنا پر نیپیر نے اس خدمت سے استعفا دے دیا اور خانہ نشین ہوگیا۔ ۲۹ اگست ۱۸۵۳ء کو اس نے انتقال کیا اور سینٹ پال کے گرجا میں مدفون ہوا۔

وہاں اس کے مجسمہ پر ایک کتبہ ہے جس میں لکھا ہوا ہے کہ:

"جنرل دوربین حکمران باکفایت مرد عادل"

تاریخ کی روشنی میں پوچھا جاسکتا ہے کہ وہ کیسا مرد عادل تھا کہ اس نے میران سندھ اور ان کی بیگمات پر کیا مظالم نہ توڑے، اسی نے میران سندھ کو قید کرکے جلاوطن کیا۔ اس کی انتظامیہ مشینری نہایت سخت تھی۔ سندھ کو غلام بنانے اور ٹالپور امیروں کو اسیر فرنگ کرنے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔

تاریخ اپنے مجرموں کو معاف نہیں کرتی۔ وہ سو سال کیا ہزار سال کے بعد بھی آئینہ دکھاتی ہے اور داغ دار چہروں اور روشن چہروں کو جدا جدا امتیاز بخشتی ہے۔

لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل ہند (۱۷۸۴ء- ۱۸۴۹ء):

لارڈ آکلینڈ جارج آکلینڈ اول کا دوسرا بیٹا تھا۔ یہ ۲۵ اگست ۱۷۸۴ء (۱۱۹۹ھ) کو پیدا ہوا اور کرائسٹ چرچ آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۳۴ء میں لارڈ بحریہ ہوا۔ ۴ اپریل ۱۸۳۶ء کو ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ اسی کے زمانے میں انگریزوں کی منشا کے مطابق شاہ شجاع کابل میں تخت پر بیٹھا۔ کابل کو حاصل کرنے کے بعد اس کے صلے میں انگریزوں نے آکلینڈ کو "ارل" کا خطاب دیا۔ اگرچہ ہندوستان میں اس

---

[2] تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۲۰۔

کی عمر کا بڑا حصہ افغانستان سے مسائل جنگ کے بارے میں گزرا، لیکن چونکہ اس کے بعض معاہدوں پر جو سندھ کے امیروں سے ہوئے تھے دستخط موجود ہیں، اس لیے ہم نے اس کا تذکرہ یہاں کر دیا ہے۔[1]

موہن لال:

اب ہم اس شخص کا تذکرہ کرتے ہیں جس کے تذکرے سے شرم و ندامت سے ہماری گردن جھک جاتی ہے۔ موہن لال کے حالات پڑھ کر ہمیں حکیم الامت علامہ اقبال رحمہ کے وہ اشعار یاد آتے ہیں جن میں انہوں نے فرمایا ہے:

کے شب ہندوستاں آید بروز
مرد جعفر، زندہ روحِ او ہنوز
تاز قیدِ یک بدن وا می ربد
آشیاں اندر تنِ دیگر نہد
گاہ او را باکلیسا ساز باز
گاہ پیش دیریاں اندر نیاز
از نفاقش وحدتِ قوے دو نیم
ملتِ او از وجودِ او لئیم
ملتے را ہر کجا غارت گرے است
اصلِ او از صادقے یا جعفرے است
الاماں از روحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفرانِ ایں زماں[2]

ٹالپوروں کے عہد کی روحِ جعفر و صادق کا تذکرہ کرتے ہوئے جو موہن لال کے جسد میں پنہاں تھی اور جس نے کلیسا کو کامیاب بنانے کے لیے ہندو مسلم دونوں ملتوں سے رشتہ جوڑا تھا، جس کا دین و آئین صرف جلب منفعت اور تجارت تھا، علامہ کے اشعار کو اس کے حسب حال پا کر ہم نے یہاں نقل کر دیا ہے تاکہ چشم بصیرت اس کے حالات سے عبرت حاصل کر سکے۔

موہن لال کا اسلامی نام میرزا قلی کشمیری تھا۔ ابتداً ہندو تھا۔ بعد ازاں مسلمان ہوا، لیکن وہ اپنے ہندوانہ نام موہن لال سے بھی مشہور رہا۔ اس نے اپنا یہ اسلامی نام سیاسی مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے رکھا تھا یا وہ سمجھتا تھا کہ وہ اپنے سیاسی مقاصد کو مسلمانوں کے لباس میں رہ کر نہایت عمدگی سے حاصل کر سکے گا اور وہ جاسوسی کی خدمات کو اس ہیئت میں اچھی طرح انجام دے سکے گا۔ انڈین بیلوگرافی میں اس کے حالات اس طرح قلم بند کیے گئے ہیں:

> موہن لال منشی ولد پنڈت بودھ سنگھ دہلوی جس نے انگلش کالج دہلی میں تعلیم پائی اور جوانی کی عمر میں لفٹیننٹ الیگزینڈر برنس اور ڈاکٹر جے۔ جی جیراڈ کے ساتھ ۱۸۳۲ء میں بحیثیت منشی فارسی کے ایران روانہ کیا گیا۔ حکومت ہند کا اس کے روانہ کرنے کا یہ مقصد تھا کہ دریائے سندھ کے مغربی ممالک کا ایک عمومی جائزہ لیا جائے۔

موہن لال نے اس سفر میں اطلاعات فارس میں برنس کی مدد کی۔ برنس نے اپنی کتاب "سفر نامہ بخارا" میں اس کی قابلیت اور قابل اعتماد ہونے کا کئی جگہ تذکرہ کیا ہے۔ موہن لال نے برنس کی خواہش پر اپنا روزنامچہ لکھا ہے جس میں اس کے مشاہدات کا مفصل تذکرہ ہے۔ یہ روزنامچہ ۱۸۴۳ء (۱۲۵۹ھ) میں "روزنامچہ سفر پنجاب و افغانستان و ترکستان و خوارزم" کے نام سے ایک حصہ فارسی میں شائع ہو چکا ہے۔

افغانستان کی پہلی جنگ میں انگریز سفیر کا اتاشی تھا، اس کے بعد اس کی عمر کا بڑا حصہ دہلی میں گزرا۔

موہن لال نئے تجربوں کے ساتھ افغانستان سے لوٹا۔ اس وقت انگریز افغانستان پر حملہ کرنا چاہتے تھے اور شاہ شجاع کو، جو انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا، افغانستان کا بادشاہ بنانا چاہتے تھے اور اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے سندھ اور بلوچستان کے راستوں میں امن ضروری تھا۔ پہلے تو انگریزوں نے برنس کو منتخب کیا تاکہ وہ میر رستم خاں حکمراں خیرپور سے معاہدہ کرے، لیکن میر رستم خاں نے اس پر توجہ نہیں کی اور برنس ناکام ہو کر واپس ہو گیا۔

فرنگی استعمار پسندوں کی یہ عادت رہی ہے کہ جب وہ براہِ راست کسی امر میں ناکام ہو جاتے ہیں تو مقامی جاسوسوں پر اس کام کو چھوڑتے ہیں کہ وہ اس سرزمین کے لوگوں کی عادت و اطوار سے بھی واقف ہوتے ہیں اور ان کے مزاج کو بھی جانتے ہیں۔ چنانچہ یہ کام موہن لال کے سپرد کیا گیا اور اس نے میر رستم خاں سے اپنی تجربہ کاری کی بنا پر معاہدہ ۲۴ دسمبر ۱۸۳۸ء (۱۲۵۴ھ) جس میں ۱۰ دفعات ہیں انگریز کے منافع کو خصوصیت سے پیش نظر رکھ کر لکھوالیا، جسے رستم خاں ٹالپور نے

---

[1] تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۸۹۳ تا ۸۹۴۔

[2] جاوید نامہ کلیات اقبال فارسی، ص ۷۳۲ تا ۷۳۳۔

مجبوراً لکھا۔

قلعہ بکھر افغانستان پر انگریزوں کی لشکر کشی کے دوران میں بڑی اہمیت رکھتا تھا اور انگریز اس قلعے کی بے حد ضرورت محسوس کرتے تھے۔ اس موقع پر بھی موہن لال نے میر رستم خاں ٹالپور سے مذاکرات کر کے انگریزوں کے تمام مقاصد کو میر موصوف سے قبول کرایا اور اس سے انگریزوں کی منشاء کے مطابق معاہدہ لکھوایا۔

۱۸۳۹ء میں جب انگریزوں کا لشکر شاہ شجاع کی امداد کے لیے شکارپور کے اور درۂ بولان کے راستے افغانستان روانہ ہوا تو میکناٹن اور برنس اس لشکر کی قیادت کر رہے تھے اور موہن لال نے اپنے جاسوسوں کے جال کو قندھار تک بچھا دیا تھا۔

مختصر یہ ہے کہ موہن لال سندھ اور بلوچستان کی تسخیر میں انگریز کی پسِ پردہ سیاست کا ایک اہم مہرہ تھا۔ موہن لال کی جاسوسی کا تجربہ اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ اسی نے قندھار کے امیروں کو اپنا ہمنوا بنا کر بغیر کسی طویل مقاومت کے قندھار پر انگریزوں کا قبضہ کرایا تھا۔ اسی کی وجہ سے ۲۵ اپریل ۱۸۳۹ء کو شاہ شجاع اور ولیم مکناٹن قندھار میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے۔ انگریزوں کے لیے کابل میں موہن لال کے کارنامے حیرت ناک اور عجیب ہیں۔ اس کے ابلیسانہ کارناموں پر کہنا پڑتا ہے کہ وہ انسان کی صورت میں ایک شیطان تھا۔ اسی کی چالبازیوں سے کابل ۷ اگست ۱۸۳۹ء کو فتح ہوا اور شاہ شجاع پھر تخت پر بیٹھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس نے افغانستان کی پہلی جنگ میں جاسوسی کی اہم خدمات انجام دیں اور جاسوسی کر کے اہم اطلاعات انگریزوں کو بہم پہنچائیں اور اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر قبائلی سرداروں کی مہم میں شریک ہو کر انگریزوں کی مشکلات کو حل کیا۔ اس زمانے کے بہت سے اہم لوگوں کو اغوا کر کے انگریزوں کا ہمنوا بنایا۔ مجاہدین کی صفوں میں رخنے ڈالے۔ غازی عبداللہ خاں اچکزئی کو جو مجاہدین کے ایک دستے کی قیادت کر رہے تھے، شہید کیا۔ بہت سے انگریز افسروں کو موت سے نجات دلائی۔ صالح محمد خان کشمیری کی قید سے بہت سے انگریزوں کو رشوت دے کر چھڑوایا۔ باوجودیکہ وہ خود بھی قید تھا، اس نے قید میں بھی انگریزوں کے لیے حیرت ناک کارنامے انجام دیے۔ اس وقت جب کہ انگریز ابھی افغانستان تک نہیں پہنچے تھے، اس نے سندھ سے لے کر قندھار تک جاسوسوں کا جال بچھا دیا تھا۔ کابل میں اس شیطان سیرت انسان نے انگریزوں کی جاسوسی کے لیے وہ کارنامے انجام دیے کہ عقل حیران ہوتی ہے۔

انگریز کی یہ عادت رہی ہے کہ جب بھی اس نے اہل مشرق کو اپنے مفاد میں استعمال کیا ہے، وہ اپنا کام نکلنے تک ان کی خوب آؤ بھگت کرتے ہیں، لیکن جب ان کا مطلب نکل جاتا ہے تو وہ ایک چچوڑی ہوئی ہڈی کی طرح اسے اپنی سیاست کے دسترخواں سے دور پھینک دیتے ہیں جیسے ان کا کبھی اس سے واسطہ ہی نہ تھا۔ چنانچہ موہن لال کا بھی یہی حشر ہوا۔ وہ ہندوستان واپس آیا تو انگریزوں کا مطلب اس سے نکل چکا تھا اور وہ انگریزی بساطِ سیاست کا ایک ناکارہ مہرہ بن چکا تھا۔ انگریز اس سے آنکھیں پھیر چکے تھے۔ اب اس کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر کوچہ و بازار میں انگریزوں کی خدمات کی سندیں لیے پھرتا تھا، لیکن کوئی اس کا پرسان حال نہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ اسی دھن میں لندن گیا۔ خود وہ کہتا ہے کہ میں ان خدمات کے بعد انگریزوں کا مطعون و مردود ہو گیا، میں نے استعمار کو مضبوط کرنے کے لیے جو خدمات انجام دیں، مطلب نکل جانے کے بعد کوئی نہیں جو ان پر تحسین و آفریں کے پھول برسائے۔

موہن لال نے اپنی کتاب میں متعدد صفحات اپنی خدمات پر، جو اس نے انگریزوں کے لیے انجام دیں، سیاہ کیے ہیں۔ آخر میں اس نے لکھا کہ میری یہ تمام خدمات بھلا دی گئیں اور میرے اس داستان کے لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ یہ ہے انجام اس شخص کا جس نے اپنی ملت و وطن سے غداری کی تھی۔[1]

جنرل جان جیکب (۱۸۱۲ء - ۱۸۵۸ء)

جنرل جان جیکب، ریورنٹ سٹفن لانگ جیکب کا بیٹا تھا۔ یہ ۱۱ جنوری ۱۸۱۲ء کو پیدا ہوا۔ ۱۸۲۸ء (۱۲۴۴ھ) میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے توپ خانہ بمبئی میں شامل ہو گیا۔ اس نے جنگ میانی میں، جو ۱۷ فروری ۱۸۴۳ء (۱۲۵۹ھ) کو ہوئی، نمایاں حصہ لیا۔ لیمبرک نے اپنی کتاب "سر چارلس نیپیر" میں لکھا ہے کہ جنگ میانی میں ہر اول دستے کی قیادت جان جیکب ہی کر رہا تھا اور ۱۰۰ سپاہی نالوں اور نہروں میں توپوں کے لیے راستہ بنانے کی خاطر ساتھ چل رہے تھے۔ اس پارٹی کے ساتھ ۹ پونڈ کا گولہ پھینکنے والی ۲ توپیں تھیں۔ جیکب نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میروں کی پیدل فوج کی تعداد ۸ ہزار اور گھڑ سوار فوج کی تعداد تین ہزار ہے۔

جیکب نے بلوچ فوج سے ۵۰۰ گز کے فاصلے پر اپنا مورچہ قائم کیا

---

[1] تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۹۴۰ تا ۹۴۷۔

تھا۔ مختصر یہ کہ میانی کی جنگ میں اس نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ شہداد پور اور امر کوٹ کی جنگوں میں بھی وہ شریک رہا اور کوہستان سندھ میں لڑائیاں لڑیں۔ ۱۸۴۷ء میں وہ بالائی سندھ کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا اور C.B کا لقب پایا۔ ۱۸۵۱ء (۱۲۶۴ھ) میں اس نے اپنے نام پر "خان گڑھ" کا نام جیکب آباد رکھا جو آزادی کے حاصل کرنے کے تیس برس بعد بھی ہمیں دورِ غلامی کی یاد دلاتا ہے اور اس شہر کا یہ نام آج بھی ہماری رسوائی کا داغ بنا ہوا ہے اور اس جنرل کی یاد دلاتا ہے جس نے ہمیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑا تھا۔ میران سندھ کی حکومت کا تختہ الٹ کر اس پاک سرزمین پر انگریزوں کا پرچم لہرانے میں بڑا معین و مددگار تھا۔

جیکب ۵ دسمبر ۱۸۵۸ء کو دماغی عارضے میں مبتلا ہو کر مرا۔ انگریزوں کے نزدیک اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سندھ میں انگریزوں کے اثر و نفوذ کو قوی کیا اور سندھ میں جنرل اوٹرام کے کارناموں پر ایک کتاب لکھی۔ (1)

افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ میران سندھ میں سے جس شخص نے سب سے زیادہ انگریزوں کی خیر خواہی کی اور وفاداری کا رویہ اختیار کیا وہ میر علی مراد خاں اول والی خیرپور تھے۔

جس دن سے انگریز نے خراساں کی تسخیر کے ارادے سے سندھ میں قدم جمائے، اسی دن سے میر علی مراد خاں بہادر نے انگریزوں کی بزم محبت و خلوص کی شمع روشن کی تھی، وہ ان کی موافقت کے روشن چراغ تھے جو انگریزوں کی گوناگوں خدمات سے ان کی رضاجوئی کا راستہ ڈھونڈھتے رہتے اور انگریز بہادر کی طلب پر کسی حالت میں اپنے آپ کو معذور اور قاصر نہ سمجھتے تھے۔ بعض بلوچ امرا اور رؤسا ان کے انگریزوں کے ساتھ اس رویے سے سخت ناراض تھے، لیکن ان کے دل پر کچھ اثر نہ ہوتا، یہاں تک کہ پورے سندھ میں خرابی رونما ہوئی۔ (2)

جنگ میانی اور جنگ دبہ
(لیمبرک کی نظر میں)

اگرچہ ہم اختصار سے جنگ میانی اور جنگ دبہ کے حالات تاریخ سندھ جلد دوم میں تحریر کر چکے ہیں، لیکن اب ہم لیمبرک کی کتاب "سر چارلس نیپیر اینڈ سندھ" سے جنگ میانی اور جنگ دبہ کے حالات تفصیل سے پیش کرتے ہیں جو انگریزوں کے نقطہ نگاہ سے لکھے گئے ہیں، تاہم بعض حقائق پر غمازی کرتے ہیں۔

جنگ میانی کی ابتدا:

لیمبرک نے اپنی کتاب سر چارلس نیپیر میں لکھا ہے:

اچانک خبر آئی کہ بلوچی پیش قدمی کر رہے ہیں۔ اس وقت ریذیڈنسی میں کپتان جیمس آؤٹرام (Outram) کی بائیسویں رجمنٹ کی ایک کمپنی تھی جس کی کمان کپتان کانوے (Conway) کے پاس تھی۔ کل آٹھ انگریزی افسر تھے جن میں وہ خود اور ای۔ جی براؤن بھی شامل تھا۔ کانوے نے یہ خبر سن کر صحن کی چھت اور دیواروں کے پاس سپاہیوں کو متعین کر دیا۔ مزید اس نے پلینٹ (Planet) نامی جہاز کی توپیں بھی لگا دیں۔ اسی دوران میں دوسرا جہاز سیٹلائٹ (Settelite) بھی آگیا، گو اس میں گولہ بارود نہیں تھا۔

انگریزی لشکر نے یہ منصوبہ بنایا کہ ان دو جہازوں سے سپاہیوں کو بحفاظت تمام نکال کر لے جایا جائے، لیکن سہ پہر کو بلوچ چھ توپیں لے کر آپہنچے اور دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ بڑی دقت سے جہازوں کی بندوقوں کی بدولت سپاہی جہاز پر سوار ہو سکے۔

مٹیاری میں انگریزی فوجوں کا اجتماع:

۱۶ فروری ۱۸۴۳ء کو حیدرآباد سے ۱۶ میل شمال کی جانب مٹیاری کے مقام پر اوٹرام خود سر چارلس نیپیر سے جا ملا۔ نیپیر نے سکھر سے مزید فوجی کمک منگائی۔ اوٹرام نے تجویز پیش کی کہ سٹیمر میں جو فوجی سپاہی ہیں، وہ ٹھٹھہ کے کوئلے کے ڈپو کی نگرانی کریں اور میانی کے گرد جو شکار گاہیں ہیں، ان میں آگ لگا دی جائے، کیونکہ اس کو یہ اطلاع ملی تھی کہ بلوچ ان شکار گاہوں میں پناہ لینے والے ہیں۔

نیپیر نے اوٹرام کی اس تجویز پر غور کرنے کے بعد اوٹرام کو دو سو سپاہی دیے، مگر فوج کا بڑا حصہ اپنے پاس رکھا۔

پھلیلی نہر کے کنارے بلوچوں کے خیمے:

۱۴ فروری ۱۸۴۳ء کو بلوچوں نے پھلیلی نہر کے پاس اور قرب و جوار کے جنگلات میں اپنے خیمے لگا لیے۔

---

(1) تعلیقات تازہ نوائے معارک، ص ۹۹۲۔

(2) تازہ نوائے معارک، ص ۶۹۴ تا ۶۹۵۔

والی سندھ میر نصیر خاں اسی دن شام کو کچھ اسلحہ اور محل کے سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر پہنچ گیا۔ حیدرآباد کے ٹالپوروں کی یہ باقاعدہ اور مستقل فوج تھی۔

اسلام کی خاطر لڑو:

دوسرے دن شہداد خاں اور اس کا چھوٹا بھائی حسین علی بھی آگئے۔ ان کی ماں نے ان دونوں بھائیوں کو رخصت کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اسلام کی خاطر انگریزوں پر ضرب کاری لگائیں۔

انگریزوں نے معاہدے کے خلاف بڑی بددیانتی سے جنگ کا عزم کرلیا، لہٰذا سندھ کا لشکر جو حیدرآباد میں موجود تھا وہی مقابلے کے لیے آیا، مگر انگریزوں نے ان کی تعداد بڑھا چڑھا کر بیان کی اور اپنی تعداد کم بتائی تاکہ ان کی جنگ میں کامیابی کو مزید فروغ ہو۔

اوٹرام نے اندازہ لگایا کہ میروں کی فوج اٹھارہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ نیپیر کے جاسوس ان کی تعداد بیس ہزار بتانے لگے، لیکن نیپیر کے پاس فقط دو ہزار آٹھ سو سپاہی اور بارہ توپیں تھیں۔ ان میں سے بھی اکثر ناتجربہ کار تھے، حالانکہ سندھ ہارس رجمنٹ تین سال سے مختلف لڑائیوں میں حصہ لے کر تجربہ حاصل کرچکی تھی۔ پھر یہ بتایا گیا کہ نیپیر کے سپاہی موسم کی سختی اور آرام کی کمی کے باعث تھکے ہوئے تھے، لیکن وہ خود اس راز سے واقف تھا کہ سپاہی سے زیادہ سے زیادہ کام کس طرح لیا جائے۔ لیمبرک رقم طراز ہے کہ سپاہیوں اور خصوصاً افسروں کو تین سال سے الاؤنس نہ ملا تھا، مگر وہ سمجھتے تھے کہ چند دن میں لوٹ مار کا موقع ہاتھ آنے والا ہے۔ بلوچوں کو وہ کمتر درجے کا سپاہی سمجھتے تھے۔

جان جیکب پانسو آدمیوں کو لے کر اصل فوج سے ساٹھ میل آگے چل رہا تھا۔ اُس نے اپنے متعلق لکھا ہے کہ اگر سات ہزار فوج نے بھی مجھ پر حملہ کیا تو میں اُسے مار بھگاؤں گا۔

اوٹرام کا خیال یہ تھا کہ سندھ کے سپاہی جب اپنے شہروں کے بچاؤ کی خاطر اور اپنی آن کے لیے لڑیں گے تو وہ بہترین سپاہی ثابت ہوں گے۔ ان کا ریذیڈنسی پر نیم دلی کے ساتھ بندوقیں سر کرنا اور بات ہے۔

اگرچہ اوٹرام حیدرآباد کی طرف پیش قدمی مناسب نہیں سمجھتا تھا، مگر نیپیر کا خیال اس کے برعکس تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر بلوچوں کو ذرا بھی ڈھیل دی گئی تو اُسے کمزوری کے مترادف سمجھا جائے گا۔ نیپیر نے لکھا ہے کہ اتنی بڑی فوج پر حملہ کرنا اندیشے سے خالی نہیں، لیکن اس اندیشے میں بھی مسرت شامل ہے۔

جان جیکب کی پیش قدمی:

۱۷ فروری ۱۸۴۳ء کی صبح کو برطانوی فوج کو کوچ کا حکم مل گیا۔ جیکب سندھ ہارس اور مدراس سیپرز کو لے کر آگے بڑھا جن کی کمان کپتان ہنڈرسن (Hendersin) کررہا تھا۔ برطانوی فوج کی یہ کیفیت تھی کہ ایک سو سپاہی نہروں اور نالوں پر توپیں لے جانے کا انتظام کررہے تھے۔ نو پونڈ گولہ پھینکنے والی دو توپیں جیکب کے ساتھ تھیں۔ سورج نکلتے نکلتے برطانوی فوج سات میل دور پھلیلی نہر کی ایک خشک شاخ تک پہنچ گئی۔ برطانوی فوج پھلیلی نہر کے بائیں کنارے پر مارچ کررہی تھی کہ اتنے میں برطانوی فوج کو دور سے توپ چلنے کی آواز سنائی دی۔ جنرل آگے بڑھا اور اس نے جیکب کو حکم دیا کہ وہ قریبی شکار گاہ کا چکر لگا کر رجمنٹ کو اس کے پیچھے لے جائے، لیکن جلد ہی معلوم ہوگیا کہ بلوچ فوج سامنے ہی ہے۔ خود جنرل نے ایک میل دور سے دوربین لگا کر دیکھا اور اندازہ کیا کہ بلوچوں کے ساتھ آٹھ ہزار پیدل اور تین ہزار سوار ہیں۔[1] جیکب تیزی سے آگے بڑھا اور بلوچوں سے پانسو گز کے فاصلے پر پہنچ گیا۔ جیسے ہی جیکب گھوڑے پر آگے بڑھا، اس پر بندوق سے فائر کیا گیا۔ اسے معلوم ہوگیا کہ بلوچ گاؤں میں چھپے ہوئے ہیں۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ بلوچوں کی تعداد کتنی ہے۔

میر نصیر خاں[2] نے اپنے آدمیوں کو مزید فائرنگ کرنے سے روکا۔ میر نصیر خاں کا خیال تھا کہ شاید جیکب صلح کی گفتگو کرنے آیا ہے، لیکن جیکب پلٹ آیا اور اس نے جنرل کو ایک نوٹ بھیج کر تفصیلات سے آگاہ کیا۔

میر نصیر خاں کی شجاعت:

جب جیکب نہ آیا تو میر نصیر خاں ٹالپور نے سندھ ہارس پر اپنی توپوں کے منہ کھول دیے، لیکن برطانوی سپاہ نے اپنی صفوں کو درہم برہم نہیں ہونے دیا۔ اچانک فٹزجیرالڈ (Fitz Gerelad) ایک 'اسکواڈرن' کی کمک لے کر پہنچا۔ اس اسکواڈرن کے پہنچنے کے بعد جنرل نے یہ فیصلہ کیا کہ بلوچوں پر قلب سے حملہ کیا جائے، لیکن ایک گھنٹہ گزر چکا تھا، مگر

---

(1) دوربین سے یہ گنتی کرلینا ایک معجزہ سے کم نہیں۔

(2) میر نصیر خاں ٹالپور بن مراد علی خاں، ولادت ۱۴ محرم ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۴ء) شاعری میں "جعفری" تخلص کرتا تھا (تاریخ سندھ، جلد ۲، ص ۱۱۷ از اعجاز الحق قدوسی)۔

برطانوی فوج کا بیشتر حصہ ابھی تک نہ پہنچ سکا تھا، کیونکہ ندی نالوں سے گزرتے ہوئے اُن کے گولہ بارود کو حادثات پیش آگئے تھے۔

ادھر سندھ ہارس پر بلوچ توپ خانہ لگاتار گولے برسا رہا تھا اور بلوچ شکار گاہ کے قریب سے داہنی جانب سے بندوقوں کی باڑھ مار رہے تھے۔ بعض بلوچ سپاہی مردانہ وار سامنے آکر اور گھوڑوں سے اتر کر نشانے باندھ کر بندوقیں سر کر رہے تھے۔ ان کے عمل سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پیش قدمی کر رہے ہیں۔

جیکب کے جوابی حملے:

جیکب پھر اپنی پرانی جگہ پر آگیا اور اس نے بھی توپ خانہ استعمال کرنا شروع کیا۔ ایک گھنٹے تک بلوچوں اور برطانوی فوجوں میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے فائرنگ ہوتی رہی۔ جیکب کے چھ گھوڑے مارے گئے، لیکن اس کی رجمنٹ بلوچوں کے حملے کو برداشت کرتی رہی۔

برطانوی فوج کو مزید کمک:

آخر کار برطانوی فوج کا ایک بڑا دستہ کمک کے لیے موقع پر پہنچ گیا اور سندھ ہارس کی پشت پر تین سو گز کے فاصلے پر استادہ ہو گیا تاکہ سوار فوج کے لیے کافی جگہ باقی رہے۔ یہاں سے شکار گاہ کی دیوار بھی اتنی ہی دور تھی اور دیوار پر بلوچ بندوقچی تعینات تھے۔

جنرل نیپیر نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ ناشتے سے فارغ ہو جائیں اور وہ خود اس موقع پر گھوم پھر کر حملے کا موقع تلاش کرتا رہا۔ جیکب اور فٹز جیرالڈ کا خیال تھا کہ حملہ صرف قلب فوج سے کیا جاسکتا ہے، لیکن جنرل میمنہ اور میسرہ سے اور عقب سے بچاؤ کی صورت تلاش کر رہا تھا۔ بلوچ فوج برابر گولہ باری کر رہی تھی، لیکن اُن کے گولے عام طور پر برطانوی فوج سے دور گر رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں شکار گاہ کی دیوار سے بندوقچی غائب ہو گئے، صرف ایک آدمی بیٹھا رہ گیا۔

اب برطانوی توپ خانہ دائیں طرف لایا گیا۔ اس کے برابر برابر مدراس سیپرز کی ایک کمپنی تھی۔ نیپیر نے پیش قدمی کا حکم دیا۔ بائیسویں، پچیسویں، بارھویں رجمنٹ اور گرینڈیئر گارڈز آگے بڑھے اور نیپیر کے حکم سے دیوار پر بیٹھے ہوئے آدمی کو نشانہ بنایا گیا، چنانچہ وہ گر گیا۔

دو سو گز مارچ کرنے کے بعد برطانوی فوج کو رک جانے کا حکم دیا گیا اور بندوقچیوں نے باڑھیں مارنی شروع کر دیں۔

موسم گرم ہو چکا تھا۔ برطانوی فوج ۲۵۰ گز اور آگے بڑھ کر فائرنگ کر رہی تھی۔ بلوچی توپوں کی سرگرمی میں کچھ کمی آچکی تھی۔ برطانوی فوجی دستے ۳۰۰ گز جا کر رک چکے تھے۔ برطانوی توپ خانے نے گولہ باری شروع کر دی تھی جس سے بلوچوں کی توپیں خاموش ہو گئیں تھیں، چار توپیں پھلیلی میں اتار دی گئیں۔

میجر ویڈنگٹن (Weddingtion) لکھتا ہے کہ شکار گاہ پر گراب سے فائرنگ کی گئی، لیکن نیپیر کو اب بھی اپنے اطراف کے بچاؤ کی فکر تھی۔ اس نے شکار گاہ کی دیوار کو ۱۰۰ گز کے قریب سے دیکھا، تو اسے اطمینان ہوا کہ اس دیوار میں فائرنگ کرنے کے سوراخ نہیں تھے۔

آخری پیش قدمی:

آخری پیش قدمی کے لیے برطانوی فوج میں بگل بجایا گیا۔ سوار تیزی سے آگے بڑھے، بائیسویں رجمنٹ ایک ڈھلان سے نیچے اتری تو ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں، کیونکہ پھلیلی کے محاذ جنگ پر ان کی منتظر دس ہزار تلواریں چمک رہی تھیں۔ بلوچ فوج پورے عزم کے ساتھ ان کے مقابلے کے لیے ڈٹی ہوئی تھی۔ ادھر قلب میں بندوقچی نہر کے کنارے سیڑھیاں سی بنا کر تیار بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے وہ لوگ جمع تھے جو پورے جوش و خروش اور عزم و حوصلے کے ساتھ اس مقابلے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے اپنی تعداد اور پوزیشن اب تک دشمن سے پوشیدہ رکھی تھی۔ بائیسویں رجمنٹ نے ان پر گولیوں کی باڑھ ماری۔ بلوچ آگے بڑھے۔ انہوں نے بندوقیں پھینک دیں اور ڈھال اور تلوار لے کر ان پر جھپٹ پڑے۔ برطانوی فوج نے سخت لڑائی کے بعد انہیں کنارے تک دھکیلا۔

بائیسویں رجمنٹ جنگ میں کودی نہیں، بلکہ وہ اپنی جگہ رکی رہی۔ اگلی فوجی لائنیں فائر کرتی تھیں اور پھر جھک کر بندوقیں بھرنے لگتیں تو ان کی پیچھے والی لائین فائرنگ شروع کر دیتی۔

جب تک بلوچوں کی تعداد میں کمی نہیں ہو گئی برطانوی سپاہی اپنے افسروں کی رائے کے خلاف اپنے تجربے کی بنا پر اسی طرح فائرنگ کرتے رہے اور یہی طریقہ بہتر ثابت ہوا۔

دائیں طرف سے مدراس سیپرز توپ خانے کی مدد کر رہا تھا۔ میدان جنگ میں چار توپیں اور بیس پونڈ وزنی گولہ گرانے والی ایک توپ آگے لائی گئی۔ قبائلی شکار گاہ میں تھے اور اُن کی بندوقوں سے سیپرز، توپ خانے اور بائیسویں رجمنٹ کو کافی نقصان پہنچ رہا تھا۔

کپتان ھٹ:

اسی دوران کپتان ھٹ (Hutt) نے شکار گاہ کی دیوار میں سوراخ کر کے اس میں توپ کے نال سے نشانہ باندھا اور بقیہ چوکیوں سے میر نصیر خاں کی سوار فوج پر گولے برسائے جس سے دایا بازو کسی قدر محفوظ ہو گیا، لیکن ٹیو (Tew) مارا گیا جو بائیسویں رجمنٹ کی ایک کمپنی کی کمان کر رہا تھا، لیکن ھٹ کی فائرنگ سے بلوچ رکے رہے۔ اگر بلوچ چاہتے تو ایک سخت حملہ کر کے برطانوی فوج کی توپیں چھین سکتے تھے۔

سندھ کی فوج نے اپنے سپاہی ہر نالے اور گڑھے میں بٹھا رکھے تھے جو بندوقوں سے لیس تھے۔

گرینڈیئر گارڈز کے سپاہی جب سلطان شاہ نامی گاؤں سے آگے بڑھے تو بلوچوں نے پچاس آدمی مع گھوڑوں کے زمین پر گرا لیے۔ جیکب کے آدمیوں کا جانی نقصان کافی ہوا اور اس کا اپنا گھوڑا بھی زخمی ہوا۔

پھلیلی کا میدان جنگ:

پھلیلی کے پاس پہنچ کر جیکب کی پیش قدمی رک گئی۔ سامنے بلوچ بندوقچی اس کی تاک میں تھے۔ مجبوراً اس نے پیچھے لوٹنے کا حکم دیا اور اپنے آدمیوں کو جس قدر تیزی سے ممکن تھا، نکال لانے کی کوشش کی۔ ادھر گرینڈیئر گارڈز کے کمانڈر میجر کلیبرن (Clibborn) نے بھی گاؤں پر حملہ نہ کیا کیونکہ اس کے پاس صرف ۲۰۰ سپاہی تھے، مگر وہ دور دور سے فائرنگ کرتا رہا۔

میانی کی جنگ کی شدت:

پھلیلی کے کنارے سخت لڑائی ہو رہی تھی۔ بندوقوں کی آواز، گرد اور دھوئیں سے ساری فضا بھری ہوئی تھی۔ دوپہر کا وقت گزر چکا تھا۔ گراب کی فائرنگ سے بلوچوں کی لاشوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ کئی دفعہ بلوچوں نے تلواروں سے بھی حملہ کیا، لیکن برطانوی فوجوں کی قطار باوجود بلوچوں کے سخت دباؤ کے قائم رہی اور ہر دفعہ بلوچوں کو واپس جانا پڑا۔

جنرل نیپیر اپنی فوج کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔ باوجودیکہ میجر ٹیز ڈیل (Teas Dale) اور میجر جیکس مارے جا چکے تھے۔ لفٹیننٹ کرنل پی فادر (Pee Father) شدید زخمی ہو گیا تھا۔

میر نصیر خاں ٹالپور کی ہدایت:

میر نصیر خاں نے اپنے کمانڈر میر جان محمد سے کہلوایا کہ وہ ایک بھرپور حملہ کرے جان محمد نے شدید حملہ کیا، لیکن عین اس وقت نیپیر کے ایڈی کمپ سے لفٹیننٹ میگ مرڈ اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھا اور جان محمد کو مار ڈالا۔ جان محمد ٹالپور ایک جری سپاہ سالار اور تجربہ کار سپاہی تھا۔ جان محمد کی شہادت بلوچوں کا عظیم نقصان تھی۔

میر نصیر خاں ٹالپور کا نیا کمانڈر:

جان محمد ٹالپور کی شہادت کے بعد میر نصیر خاں نے شہوانی قبیلے کے غلام شاہ ٹالپور کو نیا کمانڈر مقرر کیا۔

ٹالپوروں کی شکست کی وجوہ:

لیمبرک نے ٹالپوروں کی شکست کی وجوہ اور اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> اگر بلوچوں میں تنظیم ہوتی اور ان کے سرداروں میں ٹھنڈے دماغ سے مستقل مزاجی کے ساتھ کام کرنے کا مادہ ہوتا تو وہ کامیاب ہو جاتے، لیکن وہ ان صفات سے محروم تھے۔ وہ بلا کسی رابطے کے انفرادی طور پر (میانی کی جنگ میں) الگ الگ اپنی کوششوں میں مصروف تھے، لیکن باوجود اس انتشار کے انگریزی فوج کو ان کا مقابلہ کرنے میں سخت دقت پیش آ رہی تھی۔

ٹالپوروں کے شمع آزادی کے پروانے:

ہم تاریخ سندھ جلد دوم صفحہ ۶۹۸ تا ۷۰۰ میں ٹالپور فوج کے شمع آزادی کے ان پروانوں کا تذکرہ تفصیل سے کر چکے ہیں جنہوں نے میانی کے میدان جنگ میں اپنی جانیں قربان کیں یا شجاعت و بہادری کے جوہر دکھا کر حضرت امیر مینائی کے اس شعر کو حقیقت بنایا کہ:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے امیر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

لیکن اس موقع پر ہم ذہن کو تازہ کرنے کے لیے تازہ نوائے معارک سے ان لوگوں کے ناموں کی ایک فہرست دینا چاہتے ہیں جو جنگ میانی اور جنگ دبہ کے ہیرو ہیں اور تاریخ سندھ کے روشن ستارے ہیں۔

تازہ نوائے معارک میں ہے کہ جس نے سب سے پہلے انگریزوں

سے مقابلے کی ٹھانی وہ بختیار خان لغاری تریاقی تھا جو ہمیشہ افیون کے نشے میں رہتا تھا۔ یکایک انگریزوں کی زیادتیوں کو دیکھ کر ہوش میں آگیا۔ اس نے میر جان محمد خان ولد میر بوڈھ خان کو اپنا ہمنوا بنایا اور پورے قبیلہ لغاری کو متحد و متفق کر کے قرآن مجید پر حلف لیا کہ وہ انگریزوں کا مقابلہ کریں گے۔ ان دونوں کی کوششوں نے لغاری قوم میں ایک نئے جذبے کو اُبھارا۔ لغاری قوم کا ہر فرد نعرے لگانے لگا کہ:

یہ ملک سندھ ہم بلوچوں کے لیے بمنزل ماں کے ہے کہ جس کی چھاتیوں سے ہم پشت بہ پشت دودھ پی کر پلے، بڑھے ہیں۔ اولاد پر ماں باپ کے حقوق بہت ہیں۔ ہم اپنی مادرِ وطن پر جان نثار کریں گے۔

تازہ نوائے معارک میں ان جان بازوں کی فہرست ملتی ہے جنہوں نے جنگ میانی میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے یا اپنے وطن عزیز کی حفاظت کے لیے اپنی جانوں کی قربانیاں پیش کیں۔

ان محبان وطن میں حاجی الحرمین حاجی خدا بخش، مراد علی خاں چانگ، غلام محمد خان ٹالپور اور فہیم خان مری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔[1]

نیپیر میدان جنگ میں:

میانی کی جنگ شباب پر تھی کہ نیپیر میجر ویڈ نگٹن اور کوالپلی والا کے ہمراہ اچانک اس طرح فوج کے سامنے آیا کہ اس کا سر کھلا ہوا تھا اس وقت ایک بلوچ اس کی طرف دوڑا۔

نیپیر کا یہ عالم تھا کہ اس کی کلائی نو دن پہلے دولت پور میں زخمی ہو چکی تھی کیونکہ اس نے ایک اونٹ والے کو مکا مارا تھا۔ کلائی کے زخمی ہونے کی وجہ سے وہ اپنی مدافعت نہیں کر سکتا تھا۔ نیپیر پر حملے کا ارادہ دیکھ کر لیفٹیننٹ مارسن جلدی سے آگے بڑھا، اس کو چوٹ آئی، لیکن برطانوی فوج نے آگے بڑھ کر اپنی سنگین بلوچ کے پیٹ میں اتار دی۔ نیپیر اپنی جگہ کھڑا رہا، وہ سمجھ چکا تھا کہ لڑائی نازک مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔

لڑائی کا یہ نازک مرحلہ دیکھ کر نویں بنگال پیدل فوج کو حکم دیا گیا کہ وہ آگے بڑھے۔

میجر گیرٹ کو حکم ملا کہ دوسرے اسکواڈرن کو فوراً جنگ میں جھونک دو۔

ادھر بنگال لائٹ سوار فوج پھلیلی میں پہنچ کر بلوچوں کو منتشر کرنے لگی۔

دوسری طرف سے جیکب نے سندھ فوجی کیمپ پر دباؤ ڈالا۔ کیمپوں کی حفاظت پیدل دستے کر رہے تھے جو تلواروں اور ڈھالوں سے لیس تھے۔ انہوں نے سخت مقابلہ کیا، لیکن سندھ ہارس کی بندوقوں کا دباؤ سخت تھا۔ پھر بھی سندھ کے دستے کے سپاہی مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سب ختم ہو گئے۔

ٹالپوروں کی شکست کے آخری لمحات:

آخر کار میر نصیر خان ٹالپور کا کیمپ اور جھنڈا انگریزوں کے ہاتھ آگیا۔ شکست کے آثار دیکھ کر بلوچوں کی فوج تتر بتر ہونے لگی۔ چار ہزار سوار، جو ریزرو میں تھے اور شہزادوں کی کمان میں تھے، بغیر لڑے جنگ سے الگ ہو گئے۔ وہ قبائل جو گراب کے حملے نہایت شجاعت اور بہادری سے برداشت کرتے تھے ہمت ہار بیٹھے۔ دریا کی طرف سے حملہ ہوا اور سخت لڑائی ہوئی، لیکن نہ کسی نے پناہ مانگی اور نہ پناہ دی گئی، بلوچ فوج کے قدم اکھڑ رہے تھے اور ان میں عجیب خلفشار پھیل رہا تھا۔

قصبۂ سلطان شاہ کا انخلاء:

قصبہ سلطان شاہ اگرچہ انگریز فوجوں نے خالی کرا لیا تھا، مگر انگریزوں کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ کپتان ککشن (Cooksion) مارا گیا۔ ٹکر (Tucker) کو پانچ زخم آئے۔

میر نصیر خاں اور میر شہداد خاں کی حیدرآباد واپسی:

جب میر نصیر خاں اور میر شہداد خاں[2] نے دیکھا کہ اب شکست کے آثار کھلم کھلا نظر آرہے ہیں تو وہ دونوں حیدرآباد کی طرف روانہ ہو گئے۔

لیمبرک کا بیان:

لیمبرک نے لکھا ہے کہ شکست کے باوجود بلوچوں کے حوصلے بلند تھے وہ بھاگے نہیں، بلکہ آہستہ آہستہ واپس جا رہے تھے۔ وہ دشمنوں کو گھورتے ہوئے کہتے تھے کہ آؤ اب بھی دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ بلوچ فوج کا

---

[1] ماخوذ از تازہ نوائے معارک، ص ۶۵۳-۶۶۰۔

[2] میر شہداد خاں بن نور محمد، سورت میں قید رہا، ۲۸ اگست ۱۸۵۷ء کو کلکتہ میں وفات پائی۔ نعش حیدرآباد لائی گئی اور ٹالپوروں کے قبرستان میں دفن کی گئی (حاشیہ نمبر ا تکملہ مقالات الشعراء، ص ۱۵۹)۔

دایاں بازو محفوظ تھا اور پھر سلطان شاہ قصبے پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ بلوچوں نے فائرنگ بھی کی، لیکن گراب پھر برسنے لگا، میروں کی فوج اگرچہ پست ہو چکی تھی، لیکن بلوچوں کے جوش میں کمی نہیں آئی تھی۔

برطانوی فوج کے کشتے اور زخمی:

میانی کا میدان بلوچوں کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ برطانوی فوج کے ۲۵۶ زخمیوں میں سے ۶۲ مر چکے تھے۔

بلوچوں کے کشتگانِ ستم:

بلوچوں کے نقصان کی تعداد دو ہزار سے چھ ہزار تک بتائی گئی ہے۔ نیپیر نے اب اپنا کیمپ میر نصیر خاں کے کیمپ کے قریب لگایا۔ میر نصیر خاں کے کیمپ کو لوٹا گیا۔

نیپیر کا میدان جنگ کا نظارہ:

شام کو نیپیر نے پھلیلی جا کر میدانِ جنگ کو دیکھا۔ بلوچوں کی سینکڑوں لاشیں بے گور و کفن میدانِ جنگ میں پڑی ہوئی تھیں۔

ضمیر کی آواز:

نیپیر کا ضمیر شاید اندر سے اسے ملامت کر رہا تھا، بے ساختہ اس نے کہا: کیا میں اس سفاکی کا ذمہ دار ہوں؟ لیکن اسے جواب دیا گیا کہ آپ نہیں بلکہ اس خون کی ذمہ داری میروں پر عائد ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کے اس جواب سے مطمئن ہوا اور رات کو گھوڑے بیچ کر سو گیا۔ صبح کو اوٹرام میروں کی شکار گاہیں جلا کر واپس آیا تو وہ بڑی مشکل سے اسے جگا سکا۔

میانی کی جنگ کی شکست کے بعد:

میر نصیر خاں کے شکست خوردہ سپاہی اور قبائلی پھر اس کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے۔ دس ہزار آدمی حیدرآباد کی دفاع کے لیے اس کے گرد تھے۔ سردار احمد خان لغاری جس نے ریذیڈنسی پر حملہ کیا اس کی رائے یہ تھی کہ دریائے سندھ کو پار کر کے دوبارہ جنگ شروع کی جائے، مگر میرزا حسن کا خیال تھا کہ میر محمد اور میر صوبدار سے بھی مشورہ لیا جائے۔

ادھر میر صوبدار انگریزوں کا حلیف ہونے کی حیثیت سے ان سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ۱۸ فروری کو اس نے اپنے وزیر اوتاری کو جنرل نیپیر کے پاس بھیجا۔ نیپیر نے اس سے کہلایا کہ دوپہر سے پہلے تمام میروں کو لے کر آئے۔ وہ سب آ کر ہتھیار ڈالیں ورنہ حیدرآباد پر حملہ کر دیا جائے گا۔

حیدرآباد:

جنگ میانی کے بعد چارلس نیپیر نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ حیدرآباد کے قلعے کو میر صوبدار کے قبضے میں نہیں رہنے دے گا اگرچہ وہ انگریزوں کا حلیف تھا۔ اس کی رائے میں ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ قلعے میں ہتھیار موجود تھے اور ٹالپور خاندان کے دوسرے لوگ قلعے میں موجود تھے۔ اسے اندیشہ تھا کہ جب میروں کا میانی کی جنگ کی شکست کا زخم مندمل ہو گا تو اس کا امکان ہے کہ بلوچ حملہ کر کے قلعے پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بلوچوں کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد قلعے کو تاوانِ جنگ سمجھتا تھا۔ میر صوبدار انگریزوں کی اس چال کو نہ سمجھ سکا۔ جیسے ہی میر صوبدار دوسرے میروں کو قلعے سے باہر لے کر نکلا، نیپیر نے فوراً قلعے میں اپنے فوجی دستے متعین کر دیے اور پولین جیک قلعے کی اونچی برجی پر لہرا دیا گیا۔ ایجنٹوں اور قیدیوں سے کہا گیا کہ وہ انگریز افسروں کو قلعے کی سیر کرائیں۔ پھر ایجنٹوں کو حکم دیا گیا کہ وہ تمام پبلک املاک پر قبضہ کر لیں، یہ حکم عام تھا اس میں پبلک اور پرائیویٹ کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔

خزانے کی تلاش۔ نیپیر کا خط:

اسی دن نیپیر نے (گورنر جنرل) لارڈ ایلن برو کو خط لکھا کہ مجھے گمان ہے کہ محل کے زنانے حصے میں بہت سا خزانہ جمع ہے، لیکن ہم عورتوں کے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سلسلے میں کیوں کر پیش قدمی کروں۔ میں حضور سے یہ التجا کرتا ہوں کہ خزانے پر قبضہ کرنے کے لیے واضح احکامات جاری فرمائیں۔ میرے خیال میں خزانہ بہت بڑا ہے۔ مجھ پر یہ احسان ہو گا اگر مجھے اس جھنجھٹ سے دور رکھا جائے۔

اس خط کے آخر میں نیپیر نے لکھا کہ میں نے سنا ہے کہ جواہرات اور سونا بڑی تعداد میں اس خزانے میں موجود ہے۔ ان لوگوں نے اصل خزانہ زنانے حصے میں جمع کر رکھا ہے اور بہانہ یہ ہے کہ یہ عورتوں کے جواہرات ہیں۔

میں نے فی الحال یہ حکم دیا ہے کہ عورتوں کی اور ان کے خزانے کی پوری نگرانی کی جائے۔

میر صوبدار جنرل نیپیر کی نظر میں:

اسی خط میں نیپیر نے لکھا کہ: میں نے میر صوبدار کو قید نہیں کیا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میانی کے میدان میں اس کے سپاہی تھے، لیکن

یہ سپاہی اس کی مرضی کے خلاف آئے تھے۔ وہ بہادر آدمی نہیں ہے اور اسے خود اپنے ہی بلوچوں کے ہاتھوں قتل ہونے کا اندیشہ لگا ہوا ہے۔

نیپیر کا دوسرا خط:

دو دن بعد نیپیر نے گورنر جنرل کو دوسرے خط میں لکھا کہ اب میں نے میر صوبدار کو گرفتار کر لیا ہے۔ یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ وہ خود تو جنگ سے علیحدہ رہا مگر میانی کے میدان میں اس کے پانچ ہزار جنگ جو سپاہی لڑے تھے۔

سوال یہ ہے کہ نیپیر نے میر صوبدار کے متعلق اپنی رائے کیوں بدلی؟ خیال یہ ہے کہ نیپیر کو بعد میں معلوم ہوا کہ میر صوبدار نے تحریری طور پر میر نصیر خاں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ جنگ میں حصہ لے گا، چنانچہ اس کے آدمیوں نے حصہ لیا بھی تھا، اگرچہ وہ دورانِ جنگ خود قلعے میں رہا تھا۔

میر صوبدار کی گرفتاری:

۲۳ فروری ۱۸۴۳ء کو میر صوبدار کو گرفتار کر کے باغ میں لایا گیا اور میران سندھ کی بدقسمتی میں اسے بھی شریک کر لیا گیا یعنی قید ہوا۔ میر صوبدار کے وزیر اوتاری کا بیان ہے کہ میر صوبدار کی گرفتاری کے بعد وہ نیپیر کے منشی علی اکبر کے پاس گیا، منشی علی اکبر نے اس سے کہا کہ اگر اسے روپیہ دیا جائے تو وہ جنرل نیپیر سے میر صوبدار کی سفارش کر دے گا۔ اوتاری کے پاس جتنا روپیہ تھا، وہ اس نے منشی علی اکبر کو دے دیا۔

میر صوبدار کے خلاف شہادت:

۲۳ فروری ۱۸۴۳ء کو میر صوبدار کے خلاف شہادت پیش ہوئی کہ ۱۴ فروری ۱۸۴۳ء کو میر نصیر خاں کے افسروں کے ساتھ میر صوبدار کے سپاہی کام کر رہے تھے۔ اب قلعے میں صرف حسین علی اور دوسرے کمسن شہزادے خواتین کے ساتھ رہ گئے تھے۔ انگریزوں کے قبضے کے بعد قلعے اور حیدرآباد کے عوام پر جو کچھ گزری وہ ہم تاریخ سندھ جلد دوم میں تفصیل سے لکھ آئے ہیں، یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

برطانوی علاقے میں کراچی کا شمول:

کراچی سے ۱۶ فروری ۱۸۴۳ء کو اطلاع آئی کہ جو کھیہ اور نہمردیہ قبائل کے سرداروں نے اپنے اپنے قبیلوں کو حکم دیا ہے کہ انگریز چھاؤنی کو تباہ کر دیا جائے۔ سیٹھ ناؤمل نے جو انگریزوں کا دیسی ایجنٹ تھا، میروں کا نام سیاہ فہرست میں درج کر کے اس کی اطلاع متعلقہ افسروں کو دی۔ پریڈی نے طاقت کا مظاہرہ کیے بغیر کسی خون خرابے کے شہر کو قبضے میں لے لیا اور اعلان کر دیا کہ یہ برطانوی مقبوضہ علاقہ ہے۔

کراچی کی ایک مشہور سڑک پریڈی اسٹریٹ آج بھی ہمیں فرنگی دورِ استبداد کی یاد دلا رہی ہے۔

سندھ پر انگریزوں کے قبضے کا اعلان:

لیمبرک نے لکھا ہے کہ انگریزی فوج کے قلعۂ حیدرآباد میں داخل ہونے کے بعد ٹالپوروں کے تمام ملازموں کی تلاشیاں لی جانے لگیں، عورتوں کی تلاشی ایک سابقہ طوائف لیتی تھی جو اب لفٹیننٹ لیسن (Leeson) کی داشتہ تھی۔ وہ تلاشی کے لینے میں بہت سخت تھی۔ میروں کے وزیر اور عملے کے اکثر لوگ گرفتار ہو چکے تھے۔[1]

برآمد شدہ گھریلو سامان، کڑھا ہوا ریشم، آلات، قالین اور قیمتی پارچہ جات اور دوسرے آرائشی قیمتی سامان کا نیلام قلعے کے باہر کیا گیا اور کوئی اس ظلم پر کچھ نہ بول سکتا تھا۔

آخر فروری ۱۸۴۳ء میں لارڈ ایلن برو کا حکم آیا کہ سوائے سونے، ہتھیار اور اناج کے بقیہ سامان نیلام کر کے روپیہ داخل کیا جائے۔

تازہ نوائے معارک میں ہے کہ سارے شہر میں منادی کرائی گئی کہ سندھ کو سرکار انگلشیہ نے فتح کر لیا ہے اور اب سندھ انگریزوں کا علاقہ ہے۔

اعلیٰ دماغ کے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ فتح کے بعد فاتحین کو یہ حق حاصل نہیں کہ عورتوں اور بچوں کے ذاتی سامان پر قبضہ کرے۔ جب اس کی شکایت جنرل سے کی گئی تو اس نے یہ شکایتیں تحقیق کے لیے ان ہی ایجنٹوں کے پاس بھیج دیں جن کے خلاف وہ شکایتیں کرتے تھے۔ قلعے کے علاوہ بھی لوٹ مار ہر جگہ ہو رہی تھی۔

اہل سندھ کے اقوال انگریزوں کے بارے میں:

سندھ میں برطانیہ کا رویہ اس بدمعاش کا سا تھا جسے باہر سڑک پر کوئی مارے اور وہ گھر کے اندر جا کر اپنی بیوی کی پٹائی کر دے۔

(ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن، بحوالہ "سر چارلس نیپیر اینڈ سندھ" مؤلف لیمبرک)

---

[1] میران سندھ کی گرفتاری کی تفصیل ہم تاریخ سندھ، جلد دوم، پر لکھ چکے ہیں، یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں (مؤلف)۔

افسوس اب سندھ جاتا رہا، کیوں کہ انگریزوں نے دریا کو دیکھ لیا جو اس کی فتح کا راستہ ہے۔

(عبرت کدۂ سندھ)

برائی ہو چکی کیوں کہ تم (انگریزوں) نے ہمارا ملک دیکھ لیا۔

(عبرت کدۂ سندھ، ص ۲۰۹)

جس ملک میں ایک انگریز آجائے، اسے ایک نہ جانو، کیونکہ وہ ہزار یاجوج ماجوج اپنے ساتھ رکھتا ہے۔

افسوس ہے سندھ کی سرزمین پر یہاں کے لوگ، جو انگریز کے فتنے سے ناواقف ہیں، انھیں انگریزوں کی فتنہ پردازیوں کی خبر ہی نہیں۔ انگریزوں کی اس تعداد میں آمد سندھ کے جلد از جلد تباہ ہونے کی علامت ہے۔

(تازہ نوائے معارک، ص ۶۱۱-۶۱۳)

میر شیر محمد خان شیر سندھ:

اب بلوچوں کا آخری سہارا میر شیر محمد شیر سندھ تھا۔ بلوچوں کا جنگ جو گروہ اس کے گرد جمع ہونے لگا۔ وہ قیامتیں جو حیدرآباد والوں کے سر پر انگریزوں کے ہاتھوں ٹوٹ رہی تھیں وہ ان سے باخبر تھا۔

۳ مارچ ۱۸۴۳ء کو میر شیر محمد کو جنرل چارلس نیپیر کا خط ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ:

> تم شکست خوردہ فوجوں کو جمع کر رہے ہو اور تم نے اپنی سپاہ کی تعداد بڑھالی ہے۔ اگر حیدرآباد آکر ہمارے کیمپ میں اپنی بے گناہی ثابت نہ کی تو میں تمہارے خلاف پیش قدمی کروں گا اور تمھیں سخت سزا دوں گا۔[1]

اگرچہ میر شیر محمد جانتا تھا کہ میروں کی جائیداد ضبط کرلی گئی اور احتجاج بے سود رہا، باوجود کہ وہ اپنی بے گناہی کا ثبوت رکھتا تھا، لیکن اس کے ضمیر نے اس کی غیرت ملی کو للکارا اور حب وطن نے اس کو گرمایا۔

میر شیر محمد کی جنگی تیاریاں:

میر شیر محمد نے جنگ کے لیے اپنے آپ کو مستحکم کرنے کا پختہ عزم کرلیا۔ چنانچہ اس نے میر نور محمد ٹالپور کی بیوہ سے اس جنگی تیاری کے لیے تین لاکھ روپے قرض لیے۔ بلوچ اور دیہات کے دوسرے لوگ جو ایک بار پھر قسمت آزمائی کے خواہاں تھے، اس کے گرد جمع ہونے لگے۔

چند دن کے بعد نیپیر کو اطلاع ملی کہ میر شیر محمد نے تیس ہزار آدمی جمع کرلیے ہیں جس پر نیپیر کو بہت تعجب ہوا۔ چنانچہ اس نے فیروزپور سے کمک طلب کی اور اس کی طلب پر دیسی رجمنٹ اور توپ خانہ بھیج دیا گیا۔ خود ایلن برو نے بھی یہ حالات سن کر اسے تیار رہنے کا حکم دیا تھا۔ بمبئی کی حکومت کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ کوئلے اور گراب سے بھرے ہوئے دو اسٹیمر روانہ کرے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لارڈ ایلن برو کس قدر چوکس تھا۔

اسی زمانے میں اطلاع ملی کہ بلوچوں نے دریائے سندھ کے کنارے لکڑی اور کوئلے کے کئی گوداموں کو آگ لگادی اور بمبئی سے خلیج کچھ کے راستے جو ڈاک کا راستہ تھا اور کراچی کے راستے میں گڑبڑ پیدا کردی۔ کراچی سے رسل و رسائل کھولنے کے لیے اس نے اپنے معتمد آدمی کو ۱۳۰ سواروں کے ساتھ جھرک بھیجا تاکہ وہاں قیام کرکے حالات کو درست کرے، لیکن بلوچوں نے جھرک پر حملہ کردیا اور وہ آدمی چند ساتھیوں کے ساتھ بمشکل جان بچا کر حیدرآباد کی طرف فرار ہوا۔

نیپیر کی پوزیشن:

اس وقت نیپیر کی پوزیشن نہایت نازک تھی۔ اس کے پاس مدافعت کے لیے فوج کافی نہ تھی، قلعۂ حیدرآباد پوری طرح محفوظ نہ تھا اور اسے سکھر اور کراچی سے کمک کا انتظار تھا۔ لیمبرک کا خیال ہے کہ نیپیر اتنی نازک پوزیشن میں تھا کہ اگر بلوچ دست بدست لڑائی کے علاوہ دوسرے فنونِ جنگ سے بھی واقف ہوتے تو نیپیر کو سخت حالات کا سامنا کرنا پڑتا۔

گرمی روز بروز بڑھ رہی تھی اور نیپیر اس سخت موسم کو اس انتظار میں برداشت کر رہا تھا کہ شیر محمد کا خزانہ ختم ہوجائے۔

میر شیر محمد کا پیغام:

۸ مارچ ۱۸۴۳ء کو سکھر سے اکیسویں پیدل فوج ۶۰۰ سنگین برداروں کے ساتھ نیپیر کی کمک کو پہنچی۔

۱۵ مارچ ۱۸۴۳ء کو شیر محمد شہر سے بارہ میل دور تک پیش قدمی کرچکا تھا۔ اس نے نیپیر کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ تمام قیدیوں کو رہا کردے

---

[1] پارلیمانی دستاویزات ۱۸۴۳ء۔

اور خزانہ واپس کر دے تو وہ نیپیر سے تعارض نہیں کرے گا۔

جب شیر محمد کا قاصد یہ پیغام لے کر آیا تو اتفاق سے اسی وقت شام کی توپ چلی۔ نیپیر نے قاصد سے کہا کہ یہی اس کا جواب ہے۔

نیپیر کا ٹالپور قیدیوں کے نام ایک خط:

ادھر نیپیر کو قیدی ٹالپوروں کی شکایتیں پہنچ رہی تھیں، اُدھر شیر محمد کی جنگی تیاریاں بھی اس کے پیشِ نظر تھیں۔ ان سب باتوں نے مل کر نیپیر کے مزاج کو برہم کر دیا تھا۔ ۱۸ مارچ ۱۸۴۳ء کو نیپیر نے جو خط قیدی ٹالپوروں کو بھیجا اس کے اسلوب نگارش میں کافی تلخی اور برہمی پائی جاتی ہے۔ اس نے قیدی ٹالپوروں کے نام ایک خط میں لکھا کہ:

مجھے آپ کا خط ملا، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میر شیر محمد سے آپ کی سازش کی وجہ سے مجھے بہت کچھ کرنا ہے اور میں اس رویے کو آئندہ برداشت نہیں کروں گا۔ اگر آپ جھوٹ بول کر مجھے زیادہ تنگ کریں گے، جیسا کہ آپ کے خطوں سے ظاہر ہوتا ہے، تو میں آپ کو جیل بھجوا دوں گا۔ جس کے آپ مستحق ہیں۔ آپ نظر بند ہیں۔ اگرچہ میں آپ کو قتل نہیں کروں گا، جیسا کہ آپ نے اپنے آدمیوں سے انگریزوں کو قتل کرایا ہے، لیکن میں ہتھکڑیاں لگا کر جہاز پر سوار کراؤں گا۔ شہزادو! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اگر قیدی ان کے خلاف جو ان کے فاتح ہیں سازش کرتے ہیں تو اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔ خاموش ہو جایئے ورنہ آپ کو اپنی حماقت کے نتائج برداشت کرنے پڑیں گے۔۔۔ میں آئندہ آپ کے خطوں کا جواب نہیں دوں گا جو سفید جھوٹ سے بھرے ہوتے ہیں جسے میں برداشت نہیں کر سکتا۔[1]

ہم لیمبرک کی تحریروں پر آخر میں تبصرہ کریں گے، لیکن اس خط کے لب و لہجے کی درشتی اور تہدید آمیز طرزِ نگارش کو دیکھ کر صرف ہم اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ کیا یہی سلوک فاتحین کا اپنے مفتوحین کے ساتھ ہوتا ہے؟ کیا یہ ہی رواداریاں ہیں کہ جن کی سرزمین پر آپ نے اپنے ہوس اقتدار اور اپنے ذاتی اغراض کے لیے قبضہ کیا تھا ان کو ایسے توہین آمیز خط لکھ کر ان کی عزتِ نفس کو مجروح کیا جائے؟ کیا وہ لوگ اسی سلوک کے مستحق تھے؟

نیپیر کا معائنہ:

۱۸ مارچ ۱۸۴۳ء کو نیپیر سندھ ہارس اور بنگال سوار فوج کے ساتھ معائنے کے لیے نکلا۔ اس معائنے سے اس کا مقصد تھا کہ وہ شیر محمد کی توجہ اس آنے والی کمک سے ہٹائے اور اس عمل سے شیر محمد پر یہ واضح کرنا بھی مقصود تھا کہ وہ اپنے محفوظ کیمپ کو چھوڑنے اور مقابلہ کرنے سے نہیں ڈرتا۔ وہ میر شیر محمد پر اپنی دھاک بٹھانا چاہتا تھا۔

جنگ دوآبہ[2] (۲۴ مارچ ۱۸۴۳ء)

ہوسٹری، دوآبہ اور ٹنڈو جام یہ سب حیدرآباد سے مشرق میں واقع ہیں اور دس میل اراضی میں پھیلے ہوئے ہیں۔

نیپیر نے معائنے کے بعد واپسی پر سپاہیوں کو حکم دیا کہ میانی میں وہ ۲۷۰۰ کے مقابلے میں ۶ ہزار اور دس توپوں کے مقابلے میں ۱۵ توپوں کے باوجود جیتے تھے اور اب ۲۴ مارچ ۱۸۴۳ء کو چھ ہزار سپاہی پندرہ ہزار کے مقابلے میں پیش قدمی کریں گے۔ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم بہادری دکھلاؤ، کیوں کہ تم بہادر تو ہو ہی، بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ فوجی نظم و ضبط کا دورانِ جنگ میں پورا پورا خیال رکھو، بغیر حکم کے کوئی گولی نہ چلائے، سپاہی قطار میں رہیں۔ شانے سے شانہ ملا کر مضبوطی سے جمے رہیں۔ اگر تم نے ایسا کیا تو کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔

جنگ دوآبہ کی تیاریاں:

میجر اسٹیک ایک چھوٹی بریگیڈ لے کر حیدرآباد آ رہا تھا۔ وہ ہالہ پہنچ چکا تھا کہ خبر ملی کہ چالیس ہزار آدمی اس پر حملہ کرنے والے ہیں۔ نیپیر کو معلوم ہوا تو اس نے میک مرڈ کو حکم دیا کہ وہ ٹیاری ایک اسکواڈرن لے کر اسٹیک سے جا ملے۔ ۲۱ مارچ ۱۸۴۳ء کو میک مرڈ روانہ ہوا۔

اب نیپیر کو مزید کمک کی امید نہ تھی، لیکن اسی دن سہ پہر کو نیپیر کی خوشی کی انتہا نہیں رہی جب اس نے دیکھا کہ سکھر کی فوج کمک کے لیے چلی آ رہی ہے۔

۲۲ مارچ ۱۸۴۳ء کو اسٹیک تیزی سے روانہ ہوا۔ میانی کے قریب شیر محمد کے بلوچوں سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی، لیکن لسبیلی نے توپوں کے منہ کھول دیے اور بلوچوں کو منتشر کر دیا۔ بالآخر اسٹیک بہ حفاظت تمام حیدرآباد پہنچ گیا۔ نیپیر نے حیدرآباد سے باہر آ کر اس کا استقبال کیا۔

---

[1] پارلیمانی دستاویزات ۱۸۴۴ء۔

[2] گزشتہ صفحات میں جہاں کہیں یہ مقام دبہ چھپ گیا ہے، اسے دوآبہ پڑھا جائے۔

دوآبہ کے محاذ جنگ کا نقشہ:

۲۳ مارچ ۱۸۴۳ء کو نیپیر نے اپنی فوج کو آرام کا موقع دیا اور نقشۂ جنگ نئے سرے سے مرتب کیا۔ کیمپ کی حفاظت رنگروٹوں، کشتی کے ملاحوں اور میر علی مراد کے بچے کھچے آدمیوں کے سپرد کی گئی جن کی کل تعداد آٹھ سو تھی۔ نیپیر کے پاس مجموعی فوج کی تعداد پانچ ہزار تھی جن میں گیارہ سو سوار بھی شامل تھے۔ نیپیر نے پورے محاذ کا نقشہ بنایا۔

میر شیر محمد کے وکیلوں کی آمد:

جب وہ اس پر غور کر رہا تھا کہ اتفاق سے عین اس موقع پر میر شیر محمد کے وکیل آگئے اور انہوں نے جنرل نیپیر کو شیر محمد کی طرف سے پیغام دیا کہ وہ ہتھیار ڈال دے۔ نیپیر نے ان وکلا کو اپنی فوج کی لائنیں دکھا کر کہا کہ وہ جا کر اپنے آقا کو اس کی اطلاع دے دیں۔ وکلا نے کہا کہ تفصیل سے ہماری بات سنی جائے۔ دو بجے دن تک ان سے بات چیت ہوتی رہی۔ آخر جواباً جنرل نیپیر نے شیر محمد کو لکھا کہ جب میدان جنگ میں جنرل اپنی فوج کو لے کر آئے تو شیر محمد خود ہتھیار ڈال دے۔

آخر جنگ دوآبہ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ۲۳ مارچ ۱۸۴۳ء کی شام کو جنرل نے مدراس سیپرز، دو رجمنٹ پیدل اور دو توپیں پھلیلی بھیج دیں اور خود بھی ۲۴ مارچ ۱۸۴۳ء کو سورج نکلنے سے پہلے وہاں پہنچ گیا۔

گورنر جنرل کا مراسلہ۔سندھ کو برطانوی علاقے میں شامل کر لیا گیا:

اسی وقت لارڈ ایلن برو کا مراسلہ وصول ہوا کہ سندھ کو ممالک مقبوضہ قرار دے کر برطانوی علاقے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ جنرل نے اس مراسلے کے ملنے پر میانی کی فتح پر فوج کا شکریہ ادا کیا اور افسروں اور سپاہیوں سے انعام و ترقی دینے کا وعدہ کیا اور امید ظاہر کی کہ آئندہ بھی ہماری فتح ہو گی۔

معرکہ کارزار:

۲۴ مارچ ۱۸۴۳ء کو برطانوی فوج نے پیش قدمی شروع کی۔ صورتِ حال یہ تھی کہ آگے آگے سندھ ہارس، اس کے پیچھے مدراس سیپرز کا توپ خانہ تھا جو نہروں کے کناروں پر راستہ بنا رہا تھا۔

افواہ یہ گرم تھی کہ شیر محمد ہوسڑی، دوآبہ یا ٹنڈو جام میں ہے۔ چار میل طے کرنے کے بعد ایک کسان نے بتایا کہ میر شیر محمد کا لشکر اب جگہ چھوڑ کر دو میل شمال کی طرف چلا گیا ہے۔

دوآبہ کی لڑائی:

چارلس نیپیر نے سندھ ہارس کو معائنے کے لیے بھیجا اور جلد ہی جان جیکب نے شیر محمد کی پوزیشن معلوم کر لی کہ شمالاً اور جنوباً اس کے سپاہی بلوچوں کی بندوقوں کی زد میں ہیں۔

ادھر بلوچ نے موقع پاتے ہی فوراً اپنی گیارہ توپوں سے گولہ باری شروع کر دی۔ یہ گولہ باری کمک آنے تک سندھ ہارس کو برداشت کرنی پڑی، لیکن اس کی یہ مشکل میانی کے مقابلے میں کم رہی، کیونکہ تھوڑی ہی دیر کے بعد کمک آگئی۔ نیپیر نے اس جنگ کا اتنا اہتمام کیا کہ فوج کی خود قطار بندی کی۔ برطانوی فوج، بلوچ فوج سے بارہ سو گز کے فاصلے پر تھی، لیکن برطانوی فوج کا بایاں بازو بلوچوں کی زد پر تھا، اس لیے برطانوی فوج کو وہاں سے ہٹایا گیا، اس میں کچھ دیر لگی۔

جنرل نے مدراس سیپرز کو حکم دیا کہ بھاری توپوں کے لیے جگہ بنائے۔ برطانوی فوج کی بائیں جانب پھلیلی تھی جس کے دوسری طرف گھنا جنگل نظر آتا تھا۔ سامنے اور دائیں طرف مٹی کا ایک ٹیلہ تھا جس سے بلوچوں کے سر اور ان کی بندوقوں کا دھواں نظر آتا تھا، کنارے پر اترنے کے لیے جگہ جگہ تختے لگے ہوئے تھے۔

بالکل بائیں جانب ایک باغ تھا جس کے متعلق یہ خیال تھا کہ اس پر بلوچوں کا قبضہ ہے۔

جب نیپیر اپنی فوجوں کا معائنہ کر رہا تھا، ایک گولی نیپیر کے چہرے کے پاس سے گزری اور ایک سپاہی کو لگی۔ اس بنا پر نیپیر کو خیال ہوا کہ مزید تاخیر سے اس کی فوج کا جوش ٹھنڈا ہو جائے گا، اس لیے اس نے فوراً فائرنگ کا حکم دیا، لیکن یہ فائرنگ مؤثر نہ ہوئی، اس لیے توپوں کو مزید پانسو گز آگے بڑھایا گیا تاکہ فائرنگ مؤثر ہو۔

ادھر بلوچ برطانوی فوج پر متواتر فائرنگ کر رہے تھے۔ اب برطانوی توپ خانے کے مزید پانسو گز آگے بڑھانے کے اقدام سے برطانوی فوجوں کے گولے بلوچوں کے گولہ بارود کے ذخائر پر پڑنے لگے تو وہ پھٹنے اور خود بلوچوں کے جسم کے پرزے پرزے ہوا میں اڑتے نظر آنے لگے۔

پھلیلی کے گھنے جنگل میں بلوچوں کی تلاش:

پھلیلی کے اس کنارے پر جو گھنا جنگل تھا نیپیر کا خیال تھا کہ اس

گھنے جنگل میں بلوچ لشکر چھپا ہوا ہے، اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ اس جنگل کی طرف پیش قدمی کی جائے اور فائرنگ جاری رہے۔ اگر وہاں بلوچ چھپے ہوئے ہوں تو ان پر جھپٹ کر حملہ کیا جائے۔

بلوچوں کی ناریجا گاؤں سے پیش قدمی:

نیپیر کے اس حکم پر سوار آگے بڑھے تو ناریجا گاؤں سے بندوقوں کی فائرنگ شروع ہو گئی۔ قیاس کے برخلاف اس گاؤں میں کافی تعداد میں بلوچ پوشیدہ تھے۔ جیشائر کی آدھی کمپنی کھیت میں رہی لیکن یہ وقت تھا کہ نقشہ جنگ کو نہیں بدلا جا سکتا تھا۔

اسی وقت اطلاع ملی کہ دائیں طرف کی برطانوی فوج نے پیش قدمی شروع کر دی ہے۔ جنرل گھوڑے کو دوڑا کر اس طرف پہنچا۔ فوج بریگیڈیئر میجر اسٹک کے زیر کمان تھی اور اس کے ساتھ جان جیکب اور کپتان ڈیلامین تھے جو نہایت تجربے کار افسر تھے اور افغانستان میں جنگ کی سختیاں جھیل چکے تھے۔ ان تینوں افسروں میں سے کس نے پیش قدمی کا فیصلہ کیا اس کا نام بتانا مشکل ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پیش قدمی ہوئی اور جنرل کی اطلاع کے بغیر ہوئی۔

جب جنرل موقع پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ڈیلامین آگے تھا اور اس کی کمپنی بڑی تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ میر شیر محمد کے بائیں طرف پیچھے سے پہنچ گئی۔

ادھر دوسری کمپنی نے میر کی فوج پر سامنے سے حملہ کیا، لیکن قبل اس کے کہ بلوچ بندوقیں سر کریں، گھوڑے سوار ان کی صفوں میں پہنچ چکے تھے۔ یہ دونوں رجمنٹیں شیر محمد کے سواروں پر ٹوٹ پڑیں۔

اُدھر لیفٹیننٹ سمتھ جب ناریجا گاؤں کے سامنے والے کنارے پر پہنچا، اس نے ان جگہوں کا معائنہ کیا جہاں توپیں نصب کر کے گولہ باری کی جا سکتی تھی۔ اگرچہ لیفٹیننٹ سمتھ مارا گیا، لیکن وہ گاؤں اور پھلیلی کے درمیان راستے کا پتا دے کر مرا۔

چارلس دائیں طرف سے دوبارہ گھوڑا دبا کر میجر پول کے پاس پہنچا۔ جب وہ چالیس گز کے فاصلے پر بلوچ دستے پر حملہ کر رہا تھا، تو دوسری طرف سے بھی گولیوں کا مینہ برس رہا تھا۔ بلوچ کثیر تعداد میں خندقوں میں چھپے ہوئے تھے، یہ خندقیں صرف چھ گز پر تھیں۔ سنگینوں سے مقابلہ ہو رہا تھا۔ اگرچہ انگریزی فوج کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی مگر بلوچ بھی کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔

ہٹ کی کمان میں پچیسویں رجمنٹ کے توپ خانے نے میر شیر محمد کے ریزرو سپاہیوں پر قریب سے گولے برسا کر سخت نقصان پہنچایا اور انگریز فوج ان تختوں سے کگاروں کے اوپر چڑھ گئی جو بلوچوں نے اپنے استعمال کے لیے لگائے تھے۔

جنگ کا التوا:

اب شیر محمد نے دوسرے دن کے لیے لڑائی ملتوی کر دی جس کا مشورہ ہوش محمد قنبرانی[1] نے دیا تھا۔ اگرچہ ہوش محمد نہایت بہادری اور شجاعت سے لڑتا رہا لیکن آخر میدان جنگ میں شہید ہوا۔

ادھر دست بدست لڑائی ہو رہی تھی۔ جنرل نے اپنی فوجوں کو حکم دیا کہ وہ دیہات کی طرف توجہ کریں، کیونکہ ابھی تک ناریجا گاؤں پر قبضہ نہیں ہو سکا تھا۔ اس گاؤں کے مکانوں میں بندوقوں کی نالیاں سر کرنے کے سوراخ تھے اور قبائلی بڑی تعداد میں اس گاؤں میں جمع تھے۔

میر شیر محمد کی فوج دو حصوں میں بٹ گئی:

یہاں تک کہ پچیسویں رجمنٹ نے سخت حملہ کیا اور میر کی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اب بائیں طرف برطانوی فوج آسانی سے بڑھنے لگی، لیکن فائرنگ نہ کر سکتی تھی کیونکہ دائیں طرف برطانوی سوار بالکل سامنے تھے۔ اس کا شدید اندیشہ تھا کہ وہ نشانے کی زد میں نہ آ جائیں۔

گاؤں میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ میر کے قریب ایک میگزین میں آگ لگ گئی، وہ پھٹا تو انگریز فوج کے کئی سپاہی مارے گئے، لیکن نیپیر کو خراش بھی نہیں آئی۔

ناریجا کی محصوری۔ بلوچوں کی پسپائی:

آخر برطانوی فوجوں کی بائیسویں رجمنٹ نے ناریجا کا محاصرہ کر لیا اور بلوچوں کو پسپا ہونا پڑا۔ فرار ہوتے ہوئے، جنرل نے بنگال سوار اور پونہ ہارس کے ساتھ بلوچوں کا کئی میل تک تعاقب کیا اور انہیں نقصان پہنچا لیکن برطانوی فوج نے اس کی بھاری قیمت ادا کی۔

بنگال سوار فوج کا کپتان گیرٹ بلوچوں کے ہاتھ سے مارا گیا،

---

[1] ہوش محمد قنبرانی: میر صوبدار کا غلام تھا، اس نے جنگ دوآبہ میں اپنی شجاعت کا لوہا انگریز سے منوایا، جنگ دوآبہ میں وہ اس شجاعت سے لڑا کہ انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ میدان جنگ میں اس کا نعرہ تھا کہ ہم مر جائیں گے مگر سندھ کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے، چنانچہ وہ دشمنوں کا مقابلہ کرتے کرتے شہید ہوا (مؤلف)۔

برطانوی فوج کی کوشش تھی کہ وہ بلوچوں کو دریائے سندھ تک پہنچنے سے باز رکھے، کیوں کہ اگر بلوچ دریائے سندھ تک پہنچ جاتے تو وہ دریا پار کر کے اپنے ساتھیوں سے پہاڑوں میں جا ملتے۔

اب بلوچ فوج بالکل منتشر ہو چکی تھی، انگریزی فوج کو اپنی فتح کا یقین ہو چکا تھا۔ نیپیر واپس آیا تو اس کا "تھری چیرز" کے نعرۂ تحسین سے استقبال کیا گیا۔

اس جنگ میں بیسویں رجمنٹ کی تعداد کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ اس رجمنٹ کے انتالیس آدمی مارے گئے تھے، تئیس زخمی ہوئے تھے، لیکن بلوچوں کا جانی نقصان بہت ہوا تھا، کوئی دو ہزار بلوچ کام آئے۔ ۲۷ مارچ ۱۸۴۳ء کو جنرل نے میر شیر محمد کے دارالخلافہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن میر شیر محمد نے کوئی مزید کوشش نہیں کی۔

میرانِ ٹالپور کی نظر بندی اور بمبئی روانگی:

۱۵ مارچ ۱۸۴۳ء (۱۲۵۹ھ) کو نیپیر کو گورنر جنرل ہند کا حکم ملا کہ وہ ٹالپور شہزادوں کو بمبئی روانہ کر دے، چنانچہ اس نے نوجوان حسین علی اور میر نصیر خاں اور اس کے چاروں بیٹوں اور میر صوبدار کو قلعے سے نکال کر جہاز پر روانہ کر دیا۔ ہم ان قیدیوں کی تفصیل تاریخ سندھ جلد دوم صفحہ ۷۰۷ تا صفحہ ۷۰۹ میں لکھ چکے ہیں۔ یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

حسین علی خان ٹالپور کی حسن و جوانی، اس کی ماں اور نئی بیاہتا بیوی کو چھوڑنے کی وجہ سے غالباً نیپیر کو اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی اور اس نے اسٹیمر روانہ ہونے سے پہلے اسے پانچ روپے نقد دیے۔

فوجی حکومت قائم ہونے کے بعد:

فوجی حکومت قائم ہونے کے بعد نیپیر نے سرداروں اور زمینداروں کو حکم دیا کہ وہ آکر اپنی وفاداریوں کا اعلان کریں اور اپنی املاک واپس لے لیں۔

جو لوگ ابھی تک لڑتے رہے تھے، ان کا سربراہ جام آف جوکھیا تھا جس نے انگریزوں کے دستوں کا صفایا کیا تھا اور یہ وہی سردار تھا جس نے جھرک میں ایک کیمپ تباہ کیا تھا۔

نیپیر نے کراچی کے کمانڈر کو حکم دیا کہ وہ جام کا صفایا کر دے۔ سیٹھ ناؤمل نے راستہ دکھانے کے لیے گائیڈ فراہم کیے۔ جام اور اس کے ساتھیوں نے کچھ دن کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔

میر شیر محمد کی آزادیٔ وطن کے لیے جدوجہد:

میر شیر محمد انگریزوں کے سامنے نہیں جھکا۔ وہ ایک بلند ہمت نوجوان تھا۔ انگریز عمرکوٹ فتح کر چکے تھے، لیکن وہ ان کی اس فتح کو اہمیت نہ دیتا تھا، چونکہ یہ اس کا علاقہ نہ تھا، وہ پنجاب کی طرف بھی نہیں بھاگا۔ گاؤں والے اسے مفت غلہ پہنچاتے تھے اور برطانوی فوجی کارروائیوں سے آگاہ کرتے تھے۔

جیکب ناؤکوٹ کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتا تھا، اگرچہ نیپیر اس کے خیال سے متفق تھا، لیکن وہ اس کام کے لیے یہ وقت مناسب نہ سمجھتا تھا۔ کیونکہ گرمی زیادہ تھی، طغیانی کا موسم آرہا تھا۔

میر شیر محمد کی گرفتاری کے لیے نیپیر کا نیا منصوبہ:

نیپیر نے چھاپہ ماروں کے ذریعہ سے شیر محمد کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا۔

یکم مئی ۱۸۴۳ء کو شیر محمد کونہرا میں تھا اور تقریباً دس ہزار آدمی اس کے ہمراہ تھے، جن میں سے اکثر میر رستم علی کے ساتھی تھے۔

میر شیر محمد نے صلح کی گفتگو کرنی چاہی، وہ چاہتا تھا کہ اس کا خزانہ اس کو واپس کر دیا جائے، لیکن نیپیر بلا شرط ہتھیار ڈالنے پر مصر تھا۔

جیکب کے لیے یہ تو ممکن تھا کہ وہ شیر محمد کو جنوب کی طرف جانے اور ڈیلٹا کے جنگلوں میں پناہ لینے سے باز رکھے، لیکن اسے اس کا بھی امکان نظر آتا تھا کہ دریائے سندھ کے مغربی علاقے کے قبائلی دریا پار کر کے میر سے مل جائیں گے۔ اسے ۵ مارچ ۱۸۴۳ء سے متواتر یہ اطلاعیں مل رہی تھیں کہ چانڈیو قبائل ایسا کر رہے ہیں۔ چانڈیو قبائل کا سردار ولی محمد میانی میں ایک کثیر تعداد لوگوں کی لے کر نیپیر کا تعاقب کر رہا تھا۔ میر علی مراد خاں (والیٔ خیرپور) نے ولی محمد کو گرفتار کر کے نیپیر کے پاس بھیج دیا تھا، مگر نیپیر نے اسے معاف کر دیا تھا۔ جب وہ اپنے علاقے میں واپس آیا تو وہ نیپیر کے اس احسان سے متاثر تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ نیپیر کے اس احسان کا بدلہ ضرور چکائے گا۔

شاہ محمد کا ایک جعلی خط:

شیر محمد کے بھائی شاہ محمد نے حیدرآباد کے محاذ جنگ سے نیپیر کے نام ایک خط لکھا جس میں اس نے تحریر کیا تھا کہ وہ اپنے بھائی شیر محمد کو قتل کرنے کے لیے تیار ہے، لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ خط جعلی تھا۔ شیر محمد نے اپنے بھائی شاہ محمد کو اپنے خاندان کی ذمہ داری

سونپی تھی اور وہ لکی کی پہاڑیوں کے قلعے علی آباد (رنی کوٹ) میں جو ٹالپوروں نے اپنی حفاظت کے لیے تیس برس پہلے بنایا تھا، پناہ گزین تھا۔

نیپیر نے یہ جعلی خط دونوں بھائیوں میں نفاق کی آگ بھڑکانے کے لیے شیر محمد کو بھجوا دیا اور لکھا کہ اپنے بھائی شاہ محمد سے ہوشیار رہو۔

مئی کے شروع میں نیپیر نے لفٹیننٹ کرنل رابرٹس کو سکھر سے سیوھن بھیجا اور ایک اسٹیمر کپتان ناٹ کی سرکردگی میں دریا سے روانہ کیا تاکہ وہ بلوچوں کو دریا پار کرنے سے باز رکھیں اور ان کی کشتیوں کو بھگا دیں۔ اسے یہ خبر ملی تھی کہ لکی کے پہاڑیوں کے قریب بلوچ اپنی کشتیاں جمع کر رہے ہیں۔

اس خبر کے ملنے پر اس نے انڈرسن کو روانہ کیا۔ جب یہ لکی کے قریب پہنچا تو ۲۷ مئی کو تین سو بلوچوں نے اس پر فائرنگ کی۔ اس فائرنگ میں برطانوی کشتی کا کمانڈر طرز زخمی ہوا، لیکن برطانوی فوج نے بلوچوں کو بھگا دیا اور ان کا کافی نقصان ہوا۔

شاہ محمد کی جھڑپیں:

نیپیر نے یکم جون ۱۸۴۳ء کو روزنامچے میں لکھا ہے کہ شاہ محمد نے اسے معافی کا ایک خط بھی لکھا تھا۔

۷ جون ۱۸۴۳ء کو شاہ محمد پیر آری کے قریب خیمہ زن تھا اور اس کی میر علی مراد کے آدمیوں سے جو انگریزوں کا یار وفادار تھا جھڑپیں بھی ہوئیں، لیکن اب وہ رابرٹس کی زد میں تھا۔ رابرٹس کو ۹ جون ۱۸۴۳ء کو شاہ محمد کی پیر آری میں خیمہ زن ہونے کی خبر ملی۔ نیپیر نے ۷ اور ۸ جون کی رات میں توپ خانے، سواروں اور ۹۰۰ آدمیوں سے اس پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا، شاہ محمد کی پوزیشن نیپیر کو معلوم ہو چکی تھی۔ وہ اس وقت درختوں کے ایک جھنڈ میں تھا، جس کے چاروں طرف گھنی باڑ تھی۔

والٹر کو حکم:

رابرٹس نے کپتان والٹر کو حکم دیا کہ وہ بائیں طرف جا کر بلوچوں کے فرار ہونے کا راستہ روکے اور اگر ممکن ہو تو انہیں دائیں طرف دھکیل دے تاکہ وہ پوری طرح توپوں کی زد میں آجائیں۔

اس حکم پر والٹر تیزی سے روانہ ہوا اور اس نے نہایت سرعت سے حملہ کیا۔ حملے کی اس پھرتی پر بلوچ بھی حیران رہ گئے۔ ۸۰ بلوچ شہید ہوئے اور باقی منتشر ہو گئے۔ دائیں جانب سے توپ خانہ آگے بڑھا۔ باغ میں تلاشی لی گئی۔

شاہ محمد نے ہتھیار ڈال دیے:

شاہ محمد نے تین چار ملازموں کے ساتھ ہتھیار ڈال دیے۔ رابرٹس میر شاہ محمد، ۱۷ قیدیوں، دو توپوں، ایک جھنڈی اور میر علی مراد کے کچھ گرفتار شدہ سواروں کو جنہیں شاہ محمد نے قید کر رکھا تھا لے کر سیوھن واپس آگیا۔ اس جھڑپ میں بقول لیمبرک برطانوی فوج کا نقصان کم ہوا۔ کپتان لنکاسٹر مارا گیا۔ دو حولدار اور ۶ سپاہی زخمی ہوئے۔ ادھر بلوچوں کے ۹۰ افراد شہید ہوئے۔

میر شیر محمد نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری:

نیپیر کا دلی منشا پورا ہو رہا تھا۔ اس لڑائی سے سندھ کے مغربی علاقے کے قبائل اس قدر پست ہوئے کہ اب ان میں شیر محمد کا ساتھ دینے کی ہمت نہیں رہی۔ لیکن شیر محمد کا حوصلہ بلند تھا۔ وہ اب بھی انگریزوں سے دو دو ہاتھ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا اور انگریزوں سے مقابلے کے لیے وہ فوجیں جمع کر رہا تھا۔

شیر محمد کا تعاقب:

اگرچہ گرمی سخت تھی اور نیپیر بھی گرمی سے پریشان تھا، لیکن سندھ ہارس کے سپاہی اس گرمی کے عادی تھے۔ نیپیر نے جیکب کو حکم دیا کہ وہ میر شیر محمد کا تعاقب کرے۔ اس وقت میر شیر محمد میر پور سے پچیس میل شمال میں آدمی اور غلہ اکٹھا کر رہا تھا۔

۴ جون ۱۸۴۳ء کو برساتی ہوائیں چلنی شروع ہوئیں۔ اسی تاریخ کو وہ مدت ختم ہو رہی تھی، جو نیپیر نے میر شیر محمد کو ہتھیار ڈالنے کے لیے دی تھی۔

نیپیر خود جنوب سے شیر محمد کا راستہ روکنے کے لیے روانہ ہوا۔ جیکب کو جو فرض سونپا گیا تھا، وہ یہ تھا کہ وہ میر شیر محمد کو ریگستان کی طرف نہ جانے دے۔

۹ جون کو نیپیر نے اپنے روزنامچے میں لکھا کہ رابرٹس اور جیکب مل کر شیر محمد کو پکڑ سکتے ہیں۔

۱۰ جون ۱۸۴۳ء کو جیکب میر پور سے چلا اور ۱۳ جون کو شہداد پور پہنچا۔ اسی شام کو نیپیر اٹھائیسویں رجمنٹ لے کر حیدرآباد سے روانہ ہوا۔ اسے معلوم ہوا کہ میر شیر محمد سکرنڈ سے جنوب کی طرف روانہ ہو گیا ہے جہاں اس نے میر علی مراد کو قلعہ بند ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اسے خیال تھا کہ رابرٹس نے دریا کو عبور کر لیا ہے۔ شیر محمد کی رائے میں رابرٹس کی پیش قدمی روکنے کے لیے شہداد پور ہی بہترین مقام تھا۔

۱۳ جون ۱۸۴۳ء کو ۱۱ بجے شب میں میر شیر محمد کے ایک برہمن ملازم نے جیکب کے کیمپ میں آکر اطلاع دی کہ اس کا آقا آٹھ دس ہزار آدمیوں کو لے کر حملہ کرنے والا ہے۔

جیکب کا میر شیر محمد سے مقابلہ:

۳ بجے صبح کو جیکب نے کچھ آدمی کیمپ کی نگرانی کے لیے چھوڑے اور آٹھ سو آدمی لے کر وہ شیر محمد کے مقابلے کے لیے نکلا۔

یہ خبر پا کر بلوچ لشکر ایک نالے کے کنارے رک گیا اور تین توپوں کے دہانے جیکب کی فوج پر کھول دیے۔ جیکب نے بھی جوابی کارروائی کی۔ جنگ شروع ہو گئی اور گرد و غبار کے بادل اڑنے لگے۔ اس ہڑبونگ میں شیر محمد کا رابطہ اپنے آدمیوں سے ٹوٹ گیا اور بلوچ لشکر میں افواہ اڑ گئی کہ ایک اور برطانوی فوج کا دستہ آرہا ہے جو ان پر دوسری طرف سے حملہ کرنے والا ہے اس سے بلوچ سراسیمہ ہو گئے اور اپنی جگہ چھوڑ کر منتشر ہونے لگے۔

راستہ خراب تھا اور جیکب آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔ مجبوراً اسے قیدیوں کو لے کر واپس ہونا پڑا۔ بقیہ بلوچ سراسیمہ ہو کر جنگل اور ریت کے ٹیلوں کی طرف نکل گئے۔ پانچ چھ بلوچ سپاہی مارے گئے۔

سرداروں میں میر شیر محمد کا بھائی میر خان محمد، میر رستم خان کا بیٹا میر محمد اور نصیر خاں کا ایک بہنوئی (یا سالا) تھا۔

یہ ٹالپور خاندان کی آخری امید تھے۔ جیکب نے اپنے مراسلے میں بتایا کہ شیر محمد دس سواروں کے ساتھ دریا کی طرف گیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ پہلے وہ اپنے خاندان کے پاس رنی کوٹ جائے گا اور ان کے بغیر ریگستان میں پناہ نہیں لے گا، لیکن دراصل وہ شمال کی طرف گیا تھا۔

گرمی کی شدت:

رابرٹس دریا پار نہ کر سکا تھا، گرمی سے اس کی فوج کا برا حال تھا۔ نیپیر خود جیکب کی امداد کے لیے جانا چاہتا تھا، لیکن ۱۵ جون کی صبح میں اسے لو لگ گئی، وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہوا تھا کہ جیکب کا مراسلہ آیا، جس میں اسے کامیابی کی خبر دی گئی تھی۔ اس خوشخبری نے اسے نئی تازگی بخشی، خود اس کا قول ہے کہ مجھے اپنی اس تکلیف میں جیکب کے مراسلے سے اتنا ہی فائدہ ہوا، جتنا ڈاکٹر گین کی دوا سے۔

اٹھائیسویں رجمنٹ کے ۳۱ سپاہی اور ایک افسر گرمی کی شدت سے مر چکے تھے۔ نیپیر خود ایک پالکی میں سوار ہو کر چلتا تھا۔

ولیم نیپیر نے جیکب کو لکھا کہ تم نے میر شیر محمد کو شکست دے کر چارلس نیپیر کو اچھا کر دیا۔

برطانوی فوج کی جدید تنظیم:

اب برطانوی فوج کی جدید نقطۂ نظر سے تنظیم کی گئی۔ کراچی کے ساتھ رابطہ قائم کرنا تھا، جنوبی مشرقی علاقے میں میر شیر محمد کے کچھ آدمی اب بھی سرگرم عمل تھے، جنہیں نیپیر نے شیر محمد کے سپاہی نہیں بلکہ ڈاکو قرار دیا۔

اب سوائے علی مراد کے علاقے کے پورا سندھ انگریزوں کے قبضے میں آچکا تھا۔

آخری شعلہ:

میر مبارک علی کا ایک بیٹا میر محمد علی ایک لشکر لے کر اپنے علاقے واگزار کرانے کے لیے آیا اور میر علی مراد کے مقرر کردہ افسروں کو نکال باہر کیا۔ یہ علاقہ روہڑی سے ۲۵ میل شمال مشرق میں تھا۔ اس نے کہا کہ وہ برطانوی حکومت کے سامنے سر جھکانے کو تیار ہے بشرطیکہ اسے پنشن دی جائے اور سندھ میں رہنے دیا جائے۔ مگر نیپیر نے اسے دشمن قرار دیا۔

سکھر کا کمانڈر دریائے سندھ کے چڑھنے کی وجہ سے اس کی سرکوبی کے لیے نہ جا سکا۔ لیکن علی مراد کے آدمیوں نے اسے شروع جولائی میں مار بھگایا اور وہ پہاڑوں کی طرف چلا گیا۔

لارڈ ایلن برو کی ہدایت:

اسی زمانے میں لارڈ ایلن برو کی طرف سے ہدایت آئی کہ تمام سامان جو جنگ میں ہاتھ لگا ہے وہ فوج کو بطور انعام دے دیا جائے۔ یہ سامان جو فوج میں بطور انعام تقسیم کیا گیا ایک اندازے کے مطابق اس کی قیمت تقریباً ۵۰ ہزار پونڈ تھی۔

چارلس نیپیر لکھتا ہے کہ گورنر جنرل کی اس فیاضی کو دیکھ کر (جو بقول شخصے حلوائی کی دکان اور دادا جی کے فاتحہ کی مصداق تھی) میری

آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس لیے کہ میں نے انعام کے متعلق کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ بلکہ میں صرف اپنے کام کے متعلق سوچتا تھا۔ میانی اور دوآبہ کے دور میں میری حالت اتنی خراب تھی کہ میں اور کچھ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ قلعوں، شہروں اور دریاؤں پر قبضہ کرنے کے منصوبے، اسیر، قیدی، خزانہ اور چالیس ہزار دشمن میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ ایک بڑا ہسپتال تھا اور ان سب کی حفاظت کے لیے دو ہزار پانسو نفر میرے پاس تھے۔

انگریزوں کا سندھ پر مکمل قبضہ:

جنگ میانی کے پانچ ماہ بعد میران سندھ کا آفتاب حکومت غروب ہو چکا تھا۔ سندھ انگریزوں کے زیر اقتدار آ چکا تھا۔ لارڈ ایلن برو نہایت خوش تھا اور اس کی کونسل کے ممبر نہایت مطمئن تھے۔

مظلوم میر اپنے وطن سے دور قید و بندِ فرنگ کی سختیاں جھیل رہے تھے اور شاہی خواتین انگریزوں کی استبداد کی چکی میں پیسی جا رہی تھیں۔

فتح سندھ کے بعد چارلس نیپیر کا ایک خط:

چارلس نیپیر نے سندھ میں اپنا پورا اقتدار جمانے کے بعد لارڈ ایلن برو کو ایک خط میں لکھا کہ:

یور ایکسلنسی!

آئندہ کافی زمانے تک سخت دیکھ بھال میں ڈھیل نہیں آنی چاہیے اور نہ فوج میں کمی ہونی چاہیے۔ چوکسی اور فوجی طاقت یور ایکسلنسی کی کوششوں میں ضروری عنصر ہیں تاکہ صوبے میں بحالی پیدا ہو سکے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ سندھ میں سول حکومت کے قیام میں وہی سرگرمی اور ذہن کی تیزی دکھلائیں گے جو اس وقت دکھلا رہے ہیں جب سے کراچی میں وارد ہوئے ہیں۔ آپ کو جلد یہ اطمینان بخش احساس ہو جائے گا کہ سارے عوام کی خوش حالی ہی ان فتوحات کا اعلیٰ ثمر ہے، جو آپ نے حاصل کی ہے۔[1]

لیمبرک اور صاحب تازہ نوائے معارک کے بیانات پر تبصرہ:

ہم تاریخ سندھ جلد دوم میں مشرقی مصنف منشی عطا محمد شکارپوری کی کتاب "تازہ نوائے معارک" سے جنگ میانی اور جنگ دوآبہ کے متعلق ان کے تاثرات اور تفصیلات پیش کر چکے ہیں۔ اب ہم نے اس تیسری جلد میں ایک مغربی مصنف مسٹر لیمبرک کی کتاب "چارلس نیپیر اینڈ سندھ" سے جنگ میانی اور دوآبہ کے متعلق یہ تفصیلی اقتباسات پیش کیے ہیں۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی مؤرخین دونوں کا ان جنگوں کے متعلق نقطۂ نظر معلوم ہو اور دونوں کی دی ہوئی تفصیلات قارئین کے سامنے آئیں کہ یہ ٹالپوروں اور انگریزوں کی بنیادی جنگیں ہیں اور ان ہی دو جنگوں کے نتیجے میں انگریزوں نے ٹالپوروں کی بساط سلطنت الٹ کر اپنی حکومت کی بنیاد رکھی ہے۔

جب ہم ان دونوں بیانات کی روشنی میں ٹالپوروں کے زوال کے اسباب و علل کا تجزیہ کرتے ہیں تو چند برافگندہ نقاب حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

۱۔ سب سے بڑی وجہ ہماری رائے میں یہ ہے کہ انگریزوں کی اس برصغیر میں ملک گیری اور اقتدار کی ہوس اور خود غرضی اور مفاد پرستی ہے۔ اس کے علاوہ خراسان پر حملہ کرنے کے لیے انہیں بری اور بحری راستے کی ضرورت تھی اور وہ ضرورت سندھ کو حاصل کیے بغیر پوری نہ ہو سکتی تھی۔ اس مقصد بر آری کے لیے انہوں نے سندھ پر قبضہ جمایا۔ وہ ایک رولر مشین کی طرح سندھ پر بلائے بے درماں بن کر نازل ہوئے اور اپنے استبداد اور نئے آلات حرب سے ٹالپوروں کی قوت کو کچل کر رکھ دیا۔

۲۔ انگریزوں نے ابتداءً ہر جگہ اپنے قدم جمانے کے لیے سوداگروں کا بھیس بدلا ہے، وہ کلہوڑوں کے عہد میں ابتداءً تاجروں کے بھیس میں آئے اور رفتہ رفتہ سندھ کو اپنے اقتصادی مفاد کی خاطر بہترین چراگاہ پا کر اس پر قبضہ جمانے کی سوچنے لگے۔ یہاں تک کہ ٹالپوروں کے عہد میں انہوں نے سندھ پر مکمل قبضہ کر لیا۔

۳۔ ٹالپوروں کے اقتدار کے زوال میں خود ٹالپور بھی اپنے اس زوال کا کئی وجوہ سے سبب بنے ہیں۔

ابتداءً ٹالپوروں کی حکومت کا طریقہ کار یہ تھا کہ ان کی تینوں

---

[1] جنگ میانی اور جنگ دوآبہ کی یہ تمام تفصیل سر چارلس نیپیر اینڈ سندھ، تالیف لیمبرک، صفحہ ۱۳۱ تا ۱۳۵ سے ماخوذ ہے۔

حکومتیں متفق تھیں۔ اگر کوئی دشمن ان پر حملہ کرتا تو یہ متحد ہو کر اس کی مدافعت کرتے۔ اگر یہ کسی ملک پر قابض ہو جاتے تو اسے انصاف سے برابر برابر تقسیم کر لیتے تھے۔

جب تک یہ متحد رہے ایک مستحکم قوت بنے رہے، لیکن رفتہ رفتہ اختلاف اور نفاق کی یہ خلیج بڑھتی گئی۔ انگریز نے، جس کا سیاست میں ہمیشہ یہ اصول رہا ہے کہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو، ان کو حرص و طمع کا لالچ دے کر ان کے نفاق کو اور ہوا دی۔ جب تک میر کرم علی خاں، میر مراد علی خاں (حیدرآباد) اور میر سہراب خاں والیٔ خیرپور جیسے تجربہ کار فرماں روا حیات تھے، وہ اپنی ہوشمندی سے انگریزوں کے سیلاب کو روکے ہوئے تھے۔ وہ انگریزوں کی چالوں کو سمجھتے تھے اور سندھ میں انگریز کے قدم جمانے کی ہر تدبیر کو باطل کر دیتے تھے۔

لیکن جب حکومت ان کے اخلاف کے ہاتھ آئی تو ان میں مسند و دستار کے جھگڑے شروع ہو گئے۔ انگریز ایسے موقع کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے ٹالپوروں میں نفاق اور اختلاف کو دیکھ کر حرص و طمع کے جال کو وسیع کر دیا۔ صید، صیاد کی طرف کھنچ کھنچ کر آنے لگا۔ پھر تو ٹالپوروں کی یہ حالت ہوئی کہ کوئی انگریزوں کا یار وفادار بنا، کسی کو حیدرآباد کی حکومت کا لالچ دے کر اسے ہمنوا بنایا، حریت پسند ٹالپوروں کی راہ میں خود انہوں نے رخنے ڈالے۔

میانی اور دوآبہ میں اگر ٹالپوروں کی شکست کے اسباب کو تلاش کیا جائے تو اس کے بڑے سبب تین نظر آتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب ان کی باہمی نااتفاقی تھی۔ جس سے انگریزوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کا دوسرا سبب یہ تھا کہ انہوں نے اپنے مصالح کے پیش نظر انگریزوں کو آسان شرائط پر اپنے ملک سے گزرنے کی اجازت دے دی۔ تیسرا بڑا سبب جو ان کی شکست کا باعث ہوا، وہ یہ تھا کہ اگرچہ بلوچ فطرتاً بہت بہادر و شجیع ہیں لیکن ان کا واسطہ میدان جنگ میں شمشیر سے پڑا تھا اور وہ دست بدست اور آمنے سامنے کی لڑائی کے گر جانتے تھے۔ جدید اسلحہ کی لڑائی سے اگرچہ وہ ناآشنا نہ تھے لیکن جدید اسلحہ کے استعمال کے وہ اتنے ماہر نہ تھے جتنے انگریز ان کے استعمال کی مہارت رکھتے تھے۔

جنگ میانی اور جنگ دوآبہ کے بعد:

ہم تاریخ سندھ جلد دوم میں تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کر لینے کے بعد، کس ذلت آمیز طریقے پر سندھ کے حکمرانوں کو قید کر کے پہلے بمبئی اور پھر کلکتہ میں نظر بند کیا۔ ان کی بیگمات پر مظالم توڑے، حیدرآباد کے تمام خزانے لوٹے، مال غنیمت میں اونی اور نفیس کپڑے، قیمتی ہتھیار، میر خانی بندوقیں، جواہر سے مرصع خنجر، طلائی زیورات جن کی قیمت لاکھوں روپے تھی، دو کروڑ تیس لاکھ روپے نقد اور دوسرا ساز و سامان حاصل کیا اور میروں کے واقف کار ملازموں سے ایک ایک چیز کو معلوم کر کے لوٹا۔ جنگ میانی کے میدان میں میروں کی شکست کے بعد میدان جنگ میں جو ان کی توپیں اور خیمے تھے سب لوٹ کر لے گئے، توشک خانوں کا صفایا کر دیا۔ میروں کے زوال کے بعد دو ماہ تک سندھ میں وہ افراتفری رہی کہ قلم اس کے بیان سے قاصر ہے۔

سندھ پر ۱۸۵۷ء کی تحریک کے اثرات

قبل اس کے کہ سندھ پر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (۱۲۷۴ھ) کے اثرات کو بیان کر دیا جائے، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر ان علل و اسباب کو بیان کر دیا جائے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ کا سبب بنے۔ اس کا پہلا سبب یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ایک اجنبی حکومت تھی جسے عوام ابتداءً تو اپنی دیسی حکومت کا کارندہ سمجھتے رہے لیکن جب انگریزوں نے پاؤں پھیلائے اور پورے ملک پر قبضہ جمانا شروع کیا، اس وقت اہل ہندوستان کی آنکھیں کھلیں اور اس وقت انہیں اپنی آزادی کی فکر رونما ہوئی۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریز نے بڑی دھوکے بازی اور عیاری سے ملک پر قبضہ کیا تھا۔ جسے اس ملک کے عوام نے بری طرح محسوس کیا اور انگریزوں کے خلاف بلا امتیاز مذہب و ملت عام نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں اگرچہ میران سندھ ہتھیار ڈال چکے تھے اور جنگ آزادی سے چودہ برس پہلے انگریز پورے سندھ کو ہڑپ کر چکا تھا اور سندھ کا مطلق العنان حکمران بن چکا تھا۔ لیکن تحریک آزادی کا شعلہ جوالہ سندھ میں بھی پہنچا اور شمع آزادی کے پروانوں نے غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینا چاہا۔ اس وقت سندھ کا کمشنر سر بارٹل فریئر تھا۔

خان بہادر خداداد خاں جس نے انگریزوں کے سایۂ عاطفت میں تاریخ سندھ "لب تاریخ سندھ" کے نام سے لکھی اور اس تاریخ میں انگریزوں کا حق نمک خوب ادا کیا ہے۔ اپنے وفادارانہ انداز میں یوں رقم طراز ہے:

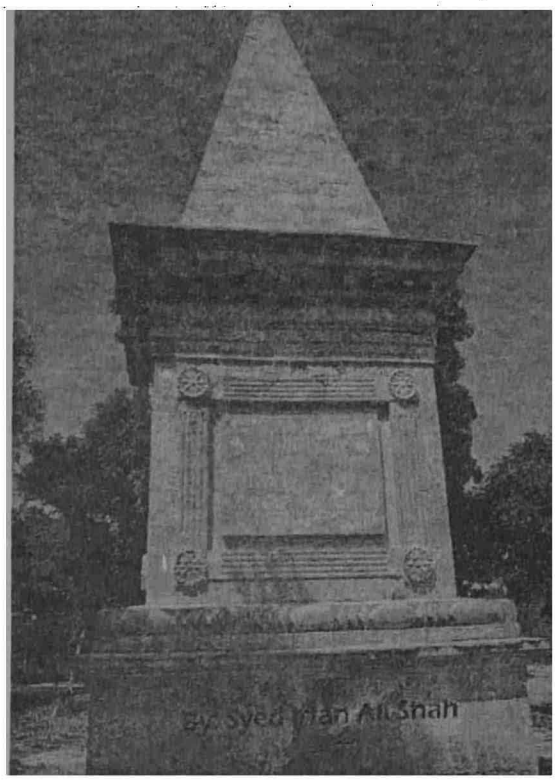

میانی کی جنگ کی یادگار، حیدرآباد

"۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) میں ہندوستان کے اکثر حصوں میں فساد عظیم اور غدر عامہ رونما ہوا۔ اس کے بدِ نظر سندھ کے بڑے شہروں جیسے کراچی، حیدرآباد، شکارپور اور جیکب آباد کے بعض عملداروں، سپاہیوں نے بھی مختلف پلٹنوں میں شورش و فساد کا رخ اختیار کیا اور نافرمان ہوگئے۔ لیکن افسران بالا کی فراست و تدبّر اور صلاحیت سے (جیسا کہ سر آنریبل گبس صاحب بہادر جوڈیشل اسسٹنٹ کمشنر سندھ ہیں) یہ مشکل مہم احسن طریقے پر سرانجام پائی۔ فسادی بروقت گرفتار کیے گئے اور اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔ ان میں سے بعض کو توپوں سے اڑایا گیا اور بعض کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ اس موقع پر جنہوں نے انگریزوں کی امداد و اعانت اور خیر خواہی کی، وہ مورد انعام و اکرام ٹھہرے۔ مؤلف کو یاد آتا ہے کہ اس سخت وقت میں سندھ کے جتوئیوں کے سردار امام بخش خاں اور خاں بہادر الف خان ترین افغان پر انگریزوں کی بدخواہی اور پہلو تہی کا الزام لگایا گیا۔ اول الذکر کی جاگیر جو ہزاروں روپے کی آمدنی کی تھی اور دوسرے کا سالانہ وظیفہ ایک ہزار روپے ضبط کر لیا گیا۔[1]

افسوس ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں اہل سندھ نے مزید کیا کردار ادا کیا، ہمیں اس اجمال کے سوا کوئی تفصیل نہیں ملی۔ لیکن قیاس چاہتا ہے کہ اہل سندھ انگریزوں کے زخم خوردہ تھے۔ انگریزوں نے ان سے فریب کاری سے کام لیا اور انہوں نے ٹالپوروں سے معاہدوں کو توڑا تھا۔ ٹالپوروں کی حکومت اہل سندھ کی ملکی حکومت تھی۔ اگرچہ اس کے زوال کو چودہ سال بیت چکے تھے لیکن پھر بھی زخم ہرے تھے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اہل سندھ نے بھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہوگا۔ کیونکہ وہ غلامی کے عذاب سے آشنا ہو چکے تھے اور آزاد و خود مختار ملکی حکومت کی بہاریں دیکھ چکے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے بربریت و ظلم و ستم کے واقعات سے تاریخ کی کتابوں کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ اگرچہ بظاہر یہ تحریک ناکافی نظر آتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ عوامی تحریک تھی۔ جن مجاہدوں نے اس تحریک میں کام کیا خواہ وہ میدان جنگ میں شہید ہوئے ہوں یا جلاوطن کیے گئے ہوں یا پھانسیوں پر لٹکائے گئے ہوں، وہ ہماری تاریخ آزادی کا وہ روشن دیباچہ ہیں کہ جن پر ہماری تاریخ آزادی کو فخر ہے۔ یہ سب ہمارے لیے قابل صد فخر اور احترام ہیں۔ اس راہ میں کامیابی اور ناکامی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن پھر بھی ایک قاری کے دل میں یہ سوال کھٹکتا ہے کہ یہ ہمہ گیر تحریک کن وجوہ کی بنا پر ناکام ہوگئی۔ ہمارے خیال میں اس تحریک کی ناکامی کے وجوہ حسب ذیل تھے:

۱۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ تحریک تیاری اور تنظیم کے بغیر شروع ہوگئی تھی۔

۲۔ اس تحریک کے کام کرنے والوں میں جنگی مہارت کی کمی تھی۔

۳۔ اس تحریک کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بعض ملکی عناصر نے بھی ساتھ نہیں دیا۔ جیسے سکھ ریاستیں، دولت آصفیہ یا بعض دوسرے خطے جن کی وجہ سے انگریزوں کو تقویت پہنچی اور تحریک کے لیے نقصان کا باعث ہوئے۔

۴۔ افراد کی رقابتوں نے بھی اس تحریک کو پنپنے نہ دیا۔

---

(۱) ل تاریخ سندھ، ص ۱۶۷۔

باب: 28

عہد انگریز

فروری ۱۸۴۳ء (۱۲۵۹ھ) تا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء (۱۳۶۷ھ)

پہلا گورنر سندھ
سر چارلس جیمز نیپیر
(Sir Charles James Napier)

"لب تاریخ سندھ" میں ہے کہ میر صاحبان کی حکومت ختم ہونے کے بعد سوائے مرحوم میر علی مراد خاں ٹالپور کے جن کی حکومت کو انگریزوں نے ان کی وفاشعاریوں کی بنا پر مصلحتاً اپنے تحت باقی رکھا باقی ٹالپوروں کی حکومت پورے سندھ میں ختم ہوگئی تھی اور انگریز اس پر قابض ہو چکے تھے۔ چونکہ چارلس نیپیر جنگ میانی میں اپنی عظمت کا سکہ بٹھا چکا تھا اس لیے لارڈ ایلن برو گورنر جنرل ہندوستان نے اس کو چند مددگاروں کے ساتھ سندھ میں برطانیہ کا پہلا گورنر اور پولیٹیکل ایجنٹ ریونیو مقرر کیا اور فوجی اختیارات بھی اس کو دیے گئے۔

اس نے چارج لینے کے بعد میر سہراب خاں ولد میر علی مراد خان کا وہ حصہ جو سندھ میں اس کو ملا تھا، اس کے ورثا کے حق میں واگزاشت کر دیا۔ اب اس کی حیثیت ایک ریاست کی سی تھی جو آئندہ انگریزوں کے سائے میں پروان چڑھی۔

۱۸۴۵ء میں جنرل چارلس نیپیر کی سفارش کی بنا پر میر صاحب خیرپور اور انگریز کے درمیان حد بندی کا مسودہ تیار ہوا جس کی بنا پر میر علی مراد خاں کو رئیس خیرپور تسلیم کیا گیا اور ان کی ریاست میں وہ اضلاع شامل کیے گئے جو جنگ میانی سے قبل ریاستی حدود میں شامل تھے۔ نیز وہ علاقے بھی شامل کیے گئے جو میر رستم خاں کی ملکیت تھے۔ یہ انگریزوں کی طرف سے صلہ تھا ان تمام خدمت گزاریوں اور وفاداریوں کا جو میر علی مراد خاں نے انگریزوں کے لیے انجام دیں تھیں۔

منشی عطا محمد شکارپوری نے تازہ نوائے معارک میں لکھا ہے کہ:

> میر علی مراد خاں کی انگریزوں سے وفاداری اور خیر خواہی کے اس قدر کثیر واقعات ہیں کہ اگر ان سب کو یکجا کیا جائے تو ایک کتاب مرتب ہو جائے۔

لیکن انگریزوں کی طرف سے ان تمام خدمات کا اعتراف یہ تھا کہ انہیں خود مختار علاقے کو کھو کر ایک مسلوب الاختیار ریاست کا نواب بنایا گیا۔ نونہار کے معاہدے کی تحریف کا الزام ان پر لگایا گیا۔ کمیشن نے فیصلہ دیا کہ عہد نامہ میں تحریف ہوئی ہے۔ رئیس خیرپور کے درجے میں تنزل کیا جائے اور صرف وہ علاقے ان کے قبضے میں چھوڑے جائیں جو میر سہراب خاں کے ورثے میں انہیں ملے ہیں۔ میر علی مراد خاں نے لندن جا کر کمیشن کے فیصلے کے خلاف اپیل کی جو منظور ہوئی۔

اشتہار حدود سندھ:

حیدرآباد کے ٹالپور میروں کو قید کرنے کے بعد چارلس نیپیر نے حکم دیا کہ برطانوی فوجیں قلعہ میں داخل ہوں، چنانچہ بغیر کسی مزاحمت کے انگریزی فوج قلعے میں داخل ہوگئی اور انگریزوں کے جھنڈے قلعے کے برجوں پر لہرائے گئے۔

جب چارلس نیپیر گورنر سندھ ہو کر آیا تو اس نے ملک سندھ کے اس حصے پر اپنے قبضے کو مضبوط کیا جو میران سندھ کے قبضے میں تھا۔

پھر چارلس نیپیر نے مشتہر کیا کہ سندھ کے حدود جو میران ٹالپور کے قبضے میں تھے، اب وہ سرکار برطانیہ کے قبضہ و تصرف میں آچکے ہیں۔ ان زمینوں کا خراج آئندہ حکومت برطانیہ کو دیا جائے۔ سندھ کے رہنے والوں میں سے اگر کوئی شخص اس حکم کی خلاف ورزی کرے گا تو وہ

سزا کا مستوجب ہوگا۔ وہ جاگیرداران و معافی داران جو ۱۷ فروری ۱۸۴۳ء کو جن زمینوں پر قابض و متصرف تھے وہ حاضر ہو کر سلامتی کا پروانہ حاصل کر کے معافی کی زمینات پر قابض ہوں۔ ۱۷ فروری ۱۸۴۳ء سندھ میں انگریزوں کی فتح یابی کی تاریخ ہے۔ پروانہ جات سلامتی ملکہ وکٹوریہ کی پیدائش کے دن دیے گئے۔ میر شیر محمد خاں کی گرفتاری کے متعلق بھی جو مفرور تھا ضروری تجویزیں عمل میں لائیں گئیں۔

انتظامیہ کو مؤثر بنانے کے لیے کراچی میں میجر صفری پریڈی کو کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر کیا گیا اور مناسب عملے کے ساتھ اسے کلی اختیارات دیے گئے۔ اسی طرح ضلع حیدرآباد میں کپتان راتھ بورن کو مقرر کیا گیا۔ شکارپور میں کپتان گولڈنی[1] (Goledeny) کو مقرر کیا گیا۔ جس نے اپنے مفوضہ فرائض انجام دینے شروع کیے۔

سندھ کے ہر ضلع میں جدا جدا ڈپٹی کلکٹر مقرر کیے گئے۔ ڈپٹی کلکٹروں کے ماتحت سندھ کے ملکی کارپرداز مقرر کیے گئے جو ملک کے انتظام و انصرام میں مشغول ہو گئے۔

پولیس کے ملازموں، سواروں اور پیادوں کے لیے سندھ کی حفاظت اور چوروں کی گرفتاری کا کام کپتان مارسٹن کے سپرد ہوا، جس کو کمانڈر پولیس کا لقب دیا گیا۔

سندھ اگرچہ فتح ہو چکا تھا لیکن اس کو مزید مستحکم کرنے کے لیے اور ریونیو کو منظم کرنے کے لیے انگریزی حکومت کو سول اشخاص کی تلاش ہوئی اور چارلس نیپیر ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) میں اپنی خدمات سے سبکدوش ہو کر ولایت چلا گیا۔

کمشنر اول
مسٹر پرنگل (Mr. Pringle)
(۱۸۴۷ء - ۱۸۵۰ھ)

چارلس نیپیر کے بعد سندھ میں گورنری کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔ ۱۸۴۷ء میں پرنگل کمشنر ہو کر کراچی آیا۔ پرنگل بمبئی میں چیف سیکریٹری کے عہدے پر فائز تھا۔

اسی کے زمانے میں کمشنر سندھ، گورنر بمبئی کے تحت ہوا۔ اس وقت بمبئی کا گورنر سر جارج کلارک تھا۔

تحریف معاہدۂ نونہار کا قضیہ:

اسی کمشنر کے زمانے میں معاہدہ نونہار کی تحریف کا واقعہ پیش آیا جس نے میر علی مراد خاں والیٔ خیرپور کو سخت پریشانیوں میں مبتلا کر دیا۔ اگرچہ ہم اس واقعہ کا تفصیل کے ساتھ تاریخ سندھ جلد دوم میں ذکر کر چکے ہیں لیکن تسلسل واقعات کے لیے یہاں مختصر طور پر اس کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ چارلس نیپیر کے زمانے میں ۱۸۴۵ء میں جنرل نیپیر کی سفارش پر خیرپور اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان حد بندی کے معاہدے کا ایک مسودہ تیار کیا گیا تھا جس کی رو سے وہ اضلاع جو جنگ میانی سے قبل ریاست کے حدود میں شامل تھے، شامل کیے گئے۔ نیز ان علاقوں پر بھی، جو میر رستم خاں کی ملکیت تھے پر میر علی مراد خاں والی خیرپور کا حق تسلیم کیا گیا تھا۔

اس سے قبل میر علی مراد خاں اور ان کے بھائی میر رستم خاں کے درمیان ایک معاہدہ ہو چکا تھا۔ یہ معاہدہ قرآن مجید کے سادہ اوراق پر لکھا گیا تھا۔ جس میں میر رستم خاں نے میر علی مراد خاں کے حق میں مسند و دستار کے دعویٰ سے دست برداری کا اعلان کیا تھا۔ تاریخ سندھ میں یہ عہد نامہ نونہار کہلاتا ہے۔

اس میں دیہہ کی جگہ پرگنہ لکھ دینے کا الزام میر علی مراد خاں والی خیرپور پر لگایا گیا۔ اس کی مخبری شیخ علی حسین نے کی تھی جو میر علی مراد خاں والیٔ خیرپور کا دیوان اور انگریزوں کا معتمد تھا۔ اس زمانے میں سندھ کا کمشنر مسٹر پرنگل (Pringle) تھا۔ ۱۸۴۸ء میں گورنر بمبئی نے مسٹر پرنگل کو حکم دیا کہ وہ اس واقعہ کی تحقیق کر کے رپورٹ دے۔ ۱۸۵۰ء میں طے پایا کہ اس کی تحقیقات کے لیے ایک انکوائری کمیشن بٹھایا جائے۔ اس انکوائری کمیشن کے تین میمبر تھے (۱) مسٹر پرنگل کمشنر سندھ (۲) میجر جیکب (۳) میجر لنگ (پولیٹیکل ایجنٹ کاٹھیاواڑ)۔ اس کمیشن نے اپریل ۱۸۵۰ء میں سکھر میں اپنے اجلاس شروع کیے، سب سے پہلے گواہان استغاثہ پیش کیے گئے۔ پھر مدعا علیہ نے جواب دہی کی اور اپنے گواہ پیش کیے۔ پہلے گواہ شیخ علی حسین ولد امام بخش نے بیان دیا کہ یہ تحریف اس کے سامنے ہوئی اور قرآن مجید کے پہلے صفحے پر "دیہہ" کے بجائے ماتھیلہ میرپور اور گھوٹکی کے ساتھ "پرگنہ" کا لفظ اس کی موجودگی میں بڑھایا گیا، پھر عہد نامے کے دوسرے صفحے کو پھاڑ کر قرآن مجید میں دوسرا ورق چسپاں کیا گیا۔ شیخ علی حسین نے بیان کیا کہ قرآن

---

[1] میجر گولڈنی: شکارپور کا کلکٹر تھا، چارلس اس پر اور لفٹیننٹ راتھ بورن پر بہت بھروسا کرتا تھا۔ (سر چارلس نیپیر اینڈ سندھ، لیمبرک)۔

مجید کا جو صفحہ پھاڑا گیا تھا وہ میرے پاس موجود ہے۔ مسٹر ٹونرمل اور وٹھل رام نے بھی اس واقعہ کی تصدیق کی۔

میر علی مراد خان نے جواب دعویٰ میں ظاہر کیا کہ شیخ علی حسین وغیرہ ان کے دشمن ہیں اور انہوں نے بربنائے عداوت یہ تہمت لگائی ہے۔ میر صاحب نے کہا کہ شیخ نے لاکھوں روپے کی خیانت کی تھی، حالانکہ میر ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ میری مہر اُن کے پاس رہتی تھی۔ منشی ٹونرمل کے بارے میں انہوں نے کہا وہ خائن اور سزا یافتہ ہے لہٰذا اس کی شہادت مجروح ہے۔ میر صاحب نے اپنے بیان میں عہد نامۂ مذکور کی صداقت پر زور دیا اور کہا کہ اس کا ایک لفظ بھی نہیں بدلا گیا۔ میر صاحب نے اپنی طرف سے سات گواہ پیش کیے۔

مختصر یہ ہے کہ ۱۸۵۱ء کا پورا سال انکوائری کمیشن کے تحقیقات میں صرف ہوگیا۔ آخر کمیشن نے فیصلہ دیا کہ واقعی عہد نامے میں تحریف ہوئی ہے اور اس طرح کئی علاقے ریاستی حدود میں شامل کر لیے گئے ہیں۔

۳۱ جنوری ۱۸۵۲ء کو گورنر جنرل کی اجازت کے بعد سر بارٹل فریئر نے جو مسٹر پرنگل کی جگہ سندھ کا کمشنر ہو کر آیا تھا، یہ فیصلہ سنایا کہ سرکار انگلشیہ کو یہ یقین ہوگیا ہے کہ سندھ کے انگریزی اضلاع کے کچھ علاقے ایک جعل سازی کے ذریعہ ریاست خیرپور میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ جن پر رئیس خیرپور کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔ نیز یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ عہد نامہ تونہار کا ایک ورق قرآن مجید سے پھاڑا گیا ہے اور اس کے بجائے دوسرا ورق لگا دیا گیا ہے۔ جس سے معاہدۂ مذکور کی نوعیت بدل گئی ہے۔

ان وجود کے پیش نظر سرکار انگلشیہ اس چیز کو ضروری سمجھتی ہے کہ رئیس خیرپور کے درجے میں تنزل کر دیا جائے اور جو علاقہ انہیں اپنے والد میر سہراب علی خاں سے ورثے میں ملا ہے وہی ان کے قبضے میں چھوڑا جائے اور باقی علاقے ضبط کر کے انگریزی اضلاع میں شامل کر دیے جائیں۔[1]

نسیم امروہوی صاحب مؤلف "تاریخ خیرپور" نے ان تمام مؤرخین کی تردید کی ہے اور اس الزام کو ایک فرضی افسانہ قرار دیا ہے۔

وہ اس قرآن پاک کو استدلال بناتے ہیں جو میر حاجی غلام حسین (کوٹ ڈیجی) کے کتب خانے سے دستیاب ہوا ہے، جس کے بارھویں اور تیرھویں صفحے پر میر رستم خاں کا عہد نامہ ثبت ہے۔ ان کا بیان ہے کہ صفحہ ۱۲ کی عبارت ۱۳ سے مربوط ہے، دونوں صفحات کی سیاہی اور طرز تحریر میں کوئی فرق نہیں۔ پرگنہ میرپور اور ماتھیلہ صریح اور غیر مشکوک الفاظ میں لکھے ہوئے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ یہ دونوں علاقے میر نصیر خاں کی ملکیت تھے اور میر علی مراد خاں نے دیہہ کے بجائے پرگنہ کا لفظ بنا دیا تھا۔ انہوں نے اپنی تاریخ خیرپور میں لکھا ہے کہ اس عہد نامے کو دیکھ کر اس کی پوری پوری تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہ دونوں علاقے میر رستم خاں کی ملکیت تھے نہ کہ میر نصیر خاں کی۔ پھر نسیم امروہوی صاحب نے لکھا کہ انگریزوں نے یہ سازش اس لیے کی تھی کہ ریاست کی وسعت صاحب ریاست کو طاقتور نہ بنائے۔ پھر انہوں نے سندھ کے مشہور مؤرخ میرزا قلیچ بیگ پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ وہ تاریخ خیرپور میں حقیقت نگاری کی بہ نسبت جذبات سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ نسیم صاحب امروہوی نے جناب مرزا قلیچ بیگ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

> ان کی کتاب کے مطالعہ کے بعد (یہ معلوم ہونے لگتا ہے) کہ میرزا (قلیچ بیگ) صاحب میرانِ حیدرآباد سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں اور ان کے بالمقابل میرانِ خیرپور کو انہوں نے ہر موقع پر پست کرنے کی کوشش کی ہے، جو مؤرخانہ دیانت داری کے منافی ہے۔[2]

یہ نسیم امروہوی صاحب کی میرزا قلیچ بیگ کے متعلق ذاتی رائے ہے۔ لیکن تاریخ کے دھارے کون موڑ سکتا ہے۔ قرآن حکیم کا وہ نسخہ جو انہیں میر غلام حسین کے کتب خانے سے دستیاب ہوا ہے اور جس پر یہ معاہدہ لکھا ہوا ہے، اس کے متعلق سب سے پہلے یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا یہ وہی نسخہ ہے جو انکوائری کمیشن کے سامنے پیش ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ انکوائری کمیشن نے قرآن حکیم کے کسی نسخے کو دیکھ کر تحریف معاہدے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ سب سے پہلے نسیم صاحب کو یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ جو نسخہ انکوائری کمیشن کے سامنے پیش ہوا تھا وہ نسخہ وہی تھا، جو حاجی غلام حسین ٹالپور کے کتب خانے سے انہیں دستیاب ہوا تھا یا قرآن مجید کا کوئی دوسرا نسخہ تھا۔ اگر وہ کوئی دوسرا نسخہ تھا تو یہ اس

---

(1) یہ اقتباس ہم نے "تاریخ خیرپور" مؤلفہ جناب نسیم امروہوی ص ۶۰-۶۱-۶۲ سے لیے ہیں جو انہوں نے میرزا قلیچ بیگ مؤلف تاریخ خیرپور اور دوسرے مؤرخین سے لیے ہیں۔

(2) "تاریخ خیرپور"، مرتب نسیم امروہوی۔

نسخے کی نقل ٹھہرتا ہے جو ان کے دعویٰ کی دلیل نہیں بن سکتا۔

اسی طرح اس قرآن مجید کے لکھے ہوئے معاہدے سے یہ ثابت کرنا کہ یہ دونوں علاقے میر رستم خاں کی ملکیت تھے نہ کہ میر نصیر خاں کی، یہ بھی اس پر منحصر ہے کہ پہلے یہ ثابت کیا جائے کہ یہ قرآن مجید کا نسخہ وہی ہے جو انکوائری کمیشن کے پیش نظر رہا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ فاضل مؤلف جناب کیم امروہوی کے دلائل میں ہمیں کوئی وزن نظر نہیں آتا، لہٰذا ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

مسٹر پرنگل ہی کے زمانے میں ۱۸۴۹ء میں لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہندوستان نے سندھ کا دورہ کیا۔

اسی کمشنر کے زمانے میں بلوچی اور سندھی پلٹنیں قائم ہوئیں۔ جو سندھ کی حدود میں رہتی تھیں۔

۱۸۴۹ء میں قلعۂ ملتان اور پنجاب پر حکومت انگلشیہ نے قبضہ کیا۔ انگریزوں کی منشا کے مطابق مسٹر پرنگل نے بہت سے انتظامی امور انجام دیے۔ اسی کے زمانے میں تحریف معاہدۂ نونہار (خیرپور) کا واقعہ پیش آیا۔

۱۸۵۰ء میں یہ خدمت کمشنری سے استعفا دے کر انگلستان روانہ ہو گیا۔[1]

کمشنر دوم

سر بارٹل فریئر

(Sir Bartle Frere)

(۱۸۵۱ء - ۱۸۵۶ء)

"لائف آف سر بارٹل" (سر بارٹل کی سوانح حیات) جلد اول میں ہے کہ چارلس نیپیر ۱۸۴۷ء میں انگلستان واپس چلا گیا، چونکہ انگریزوں کی رائے میں ابھی سندھ پر قبضہ مستحکم نہ ہوا تھا، اس لیے ریونیو کو منظم کرنے کے لیے انہیں سول اشخاص کی تلاش ہوئی۔ انہوں نے سندھ کا پہلا کمشنر مسٹر پرنگل کو بنایا جو بمبئی میں چیف سیکریٹری کے عہدے پر فائز تھا۔ لارڈ آکلینڈ نے عارضی طور پر کرنل میوٹل کو جو سیکریٹری تھا کمشنر سندھ کے عہدے پر مقرر کیا۔

پھر اس خدمت کے لیے مسٹر فریئر کا انتخاب کیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۵ سال تھی۔ اس کی کم عمری اور جونیارٹی پر اعتراضات کیے گئے کیونکہ ۶۰ سینئر افسر پہلے سے موجود تھے، اس لیے کہ سندھ کی کمشنری کو معمولی نہیں سمجھا جاتا تھا۔

جنوری ۱۸۵۱ء کو فریئر جہاز سے کراچی پہنچا۔ کراچی اس وقت بالکل غیر متمدن تھا۔ یہاں نہ سڑکیں تھیں، نہ کوئی بندرگاہ، نہ کوئی ڈاک بنگلہ تھا، نہ کوئی گرجا تھا، انتہا یہ ہے کہ جہازوں کو مرمت کے لیے بمبئی بھیجا جاتا تھا۔ انڈیا گورنمنٹ کا سلوک سندھ کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا تھا۔

فریئر کے آنے کے بعد ملک پر سکون تھا اور میران سندھ نظر بند ہو کر ملک سے باہر جا چکے تھے۔ اس نے سب سے پہلی فرصت میں بندرگاہ کی طرف توجہ دی۔ اس کے پیش نظر ایسی بندرگاہ کی تعمیر تھی جو سال بھر استعمال ہو سکے۔ اس نے اپنی آمد کے بعد گورنمنٹ سے پندرہ سو روپے کی منظوری چاہی، لیکن اسے بندرگاہ کی تعمیر کے لیے یہ منظوری نہ ملی۔ گورنمنٹ نے لکھا کہ جب تک کہ محکمۂ تعمیرات کا کوئی آدمی یہ رپورٹ نہ دے منظوری نہیں مل سکتی۔

۱۸۵۷ء میں جب جنگ آزادی شروع ہوئی تو یہ کام تعطل میں پڑ گیا۔ فریئر نے ۱۸۵۹ء میں گورنمنٹ کو لکھا: کراچی کی بندرگاہ کا مسئلہ فنڈ کی وجہ سے تعطل میں نہیں ڈالا جا سکتا، کراچی کی بندرگاہ دفاعی اور تجارتی مفاد کے لیے سندھ اور پنجاب کے لیے بہت ضروری ہے، بلکہ ضرورت کے لحاظ سے یہ کلکتہ کی بندرگاہ پر مقدم ہے، گورنمنٹ کو جو عارضی نقصان ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ہوا ہے، وہ نہ ہوتا اگر سڑکوں اور بندرگاہ کا کام پورا ہو جاتا۔[2]

اگرچہ مسٹر پرنگل کے زمانے میں والیٔ خیرپور سے تحریف عہدنامہ نونہار کا جھگڑا شروع ہو گیا تھا، لیکن عملی طور پر ان علاقوں کی ریاست خیرپور سے علیحدگی کا عمل فریئر کی کمشنری کے زمانے میں ہوا۔

فریئر کا سب سے بڑا کارنامہ، جس کو انگریز مؤرخوں نے بڑی رنگ آمیزیوں کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان کے ہمنوا مؤرخوں نے بھی بڑی اہمیت دی ہے، وہ اس کا نظام تعلیم ہے جس کو اس نے سندھ میں رائج کرنے کی کوشش کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے سندھ میں تعلیم کو عام کیا اور سندھ میں جابجا مدرسے اور اسکول قائم کیے۔

اہل سندھ پر اس کا ایک احسانِ عظیم یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس نے اہل سندھ کی سہولت کے لیے سندھی حروف تہجی کے لیے عربی حروف کا اختراع کیا۔

---

(1) ماخوذ از تاریخ غالب سندھ، ص ۱۶۱ تا ۱۶۲۔

(2) یہ تمام تفصیل "لائف آف سر بارٹل" جلد اول، مصنف جان مارنیٹو سے ماخوذ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سر رچرڈ برٹن نے فریئر کو یہ مشورہ دیا تھا کہ عربی حروف کو سندھی میں تبدیل کرنا چاہیے اور اس کے مطابق سندھی کے حروف تہجی تیار کرنے چاہئیں۔ لیکن جارج بینگ ڈپٹی کلکٹر نے جو سندھی اور سنسکرت کا جاننے والا تھا اس نے اعتراض کیا اور کہا کہ ہندی سندھی الفاظ قدیم سے رائج ہیں، سردست دیوناگری حروف استعمال کرنے چاہئیں۔ اس اختلاف پر سر بارٹل فریئر بہت حیران ہوا۔ آخر عربی حروف تہجی کا سوال ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کے سامنے پیش ہوا۔ ۱۸۵۳ء میں کورٹ آف ڈائریکٹر نے سندھی عربی حروف تہجی کے حق میں فیصلہ دیا اور اس کام کے لیے دس ہزار روپے منظور کیے۔[1]

سندھ کے ایک فاضل محقق پروفیسر بدوی مرحوم نے سر بارٹل فریئر کی سندھی زبان کی کوششوں کو پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ہندوؤں کے اپنے حروف تہجی تھے، جو دیوناگری کی نامکمل اور الجھی ہوئی نقل تھے۔ بعض اوقات انہیں سمجھنے میں بڑی مشکل پیش آتی تھی۔ مسلمان عربی سندھی رسم الخط میں لکھتے تھے۔ فریئر کی خواہش تھی کہ ملک میں سندھی زبان کو رواج دیا جائے، لیکن اس کے حروف تہجی موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ امر بڑا دقت طلب تھا۔ عدالتوں میں جہاں یورپین افسر کام کرتے تھے وہاں ایک ترجمان افسر مقرر کیا جاتا تھا کہ وہ عوام اور افسروں کے درمیان رابطے کا کام دے، جس میں بڑی دشواری پیش آتی تھی۔

فریئر کا خیال تھا کہ سول اور فوجداری معاملات کے سلسلے میں سندھی زبان بہت ضروری ہے۔

فریئر نے اس معاملے میں اپنے مشیروں سے مشورہ کیا۔ سر رچرڈ برٹن کی رائے تھی کہ سندھی زبان کے لیے عربی رسم الخط مناسب ہے، مگر دوسرے مشیر کیپٹن اسٹاک نے اس کی مخالفت کی اور سندھی زبان کے لیے دیوناگری رسم الخط کی سفارش کی۔

جب فریئر کے مشیروں میں اختلاف پیدا ہوا تو اس نے یہ معاملہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے سپرد کیا۔ ایک سال کے بعد اس کی منظوری آئی کہ آزمائشی طور پر عربی سندھی حروف تہجی استعمال میں لائے جائیں۔

اس کے بعد فریئر نے مسٹر ایلس اسسٹنٹ کمشنر کے مشورے پر سندھ کے عالموں کا ایک اجلاس طلب کیا تاکہ اس مسئلے میں ان کا مشورہ لیا جائے۔ ایلس اس اجلاس کا چیئرمین مقرر ہوا۔

سندھی کے باون حروف:

اجلاس نے فیصلہ کیا کہ عربی حروف تہجی کے ۲۹ حروف پراکرت کے مستعمل حروف سے ملا کر ۵۲ حروف کر دیے جائیں۔[2]

فریئر کی تجویز:

حروف تہجی کی اختراع کے بعد فریئر نے سرکاری ملازمتوں میں سندھی پڑھنے اور لکھنے کو لازمی قرار دیا۔

اس کے علاوہ اس نے ان افسروں کے لیے سو روپے کا نقد انعام رکھا جو سندھی زبان کے تحریری امتحان میں کامیاب ہوں۔

نیز اس نے فارسی، اردو، مرہٹی، گجراتی اور انگریزی کتابوں کو سندھی زبان میں ترجمے کرنے کی ترغیب دی۔

دسمبر ۱۸۵۲ء کو ایلس نے کمشنر کو رپورٹ دی کہ دس کتابیں حساب، جغرافیہ اور تاریخ وغیرہ پر سندھی زبان میں تیار کرالی گئی ہیں۔

سندھی زبان کا سکول:

سیٹھ ناؤمل نے اپنی یادداشت میں لکھا کہ ۱۸۵۳ء میں کراچی میں ایک اسکول کھولا گیا۔ مجھ سے استدعا کی گئی کہ میں اپنے خاندان کے بچوں کو اس سکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجوں۔ میں نے اپنے پوتے عالم چند کو خاندان کے دس بارہ بچوں کے ساتھ بھیجا۔ فریئر نے سندھی تعلیم کا پورا انتظام ایک قابل افسر گولڈ اسمتھ کے سپرد کیا۔

فریئر نے سندھی زبان کو دفاتر میں رائج کیا:

کلہوڑوں اور ٹالپوروں کے عہد میں دفاتر کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ فریئر نے دفاتر کو فارسی زبان کے رواج کو بند کر کے سندھی کو دفاتر کی سرکاری زبان قرار دیا۔

"لب تاریخ سندھ" میں سندھ کے آخری دور کے مؤرخ خداداد خاں نے لکھا:

> مرقومہ سالوں میں سندھ کے رہنے والوں کی سہولت کے مدِ

---

[1] ماخوذ از مسلمانان کراچی و سندھ کی تعلیم، مصنف سید مصطفیٰ علی بریلوی، ص ۶۹۔

[2] یہ بیان انگریزوں کے ریکارڈ کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سندھ کے علماء سینکڑوں برس پہلے عربی حروف پر نقاط کے اضافے سے نئے سندھی حروف بنا کر استعمال میں لا چکے تھے۔ (ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ)۔

نظر (فریئر نے) سندھی رسم الخط کے لیے عربی حروف کا اختراع کیا اور سندھی املا میں ضروری اصلاحیں کیں اور سندھ کے شہروں میں مکتب اور مدارس قائم کیے اور علوم کی تعلیم کو سندھی میں رواج دیا۔ نیز سرکاری دفاتر میں فارسی کے رواج کو بند کر کے سندھی زبان اور سندھی خط کو رواج دیا۔ اس وجہ سے سندھ کے رہنے والوں کو اس سے لکھنے پڑھنے میں سہولت میسر آئی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ اس میں مسٹر ایلس اسسٹنٹ کمشنر سندھ کے مشورے بھی شریک تھے۔[1]

اسسٹنٹ کمشنر کی رپورٹ:

وہ خانگی مکاتب و مدارس جو عربی و فارسی کے ذریعہ سے اسلامی روح کو طلبہ میں بیدار کرتے تھے وہ نابود ہو گئے۔

اسسٹنٹ کمشنر نے ۱۸۵۲ء کو اپنی رپورٹ میں لکھا کہ موجودہ مکاتب فارسی و عربی کے اب برائے نام رہ گئے ہیں۔ یہ وہ مدارس ہیں جن میں کبھی فارسی اور عربی علم و ادب کے چرچے زوروں پر تھے۔

خیرپور کے بعض شہروں کا برطانوی علاقے میں شمول:

۱۸۵۲ء میں لارڈ مارکوئیس آف ڈلہوزی کے حکم پر سر بارٹل فریئر اُن دیہات اور قصبوں کی واپسی کے لیے، جن کی معاہدۂ نونہار میں تحریف ثابت ہو چکی تھی، روہڑی کے قرب و جوار میں آکر ٹھہرا اور ان علاقوں اور زمینوں کو قبضے میں لے کر ضلع شکارپور اور ضلع حیدرآباد میں شامل کر دیا۔ یہ قصبے اور گاؤں جو انگریز علاقے میں شامل کیے گئے، وہ ڈھرکی، مصرکی، ماتھیلہ، ساھستی، لدہ گاگن، چک ہزارجہ اور روپاہ وغیرہ تھے۔

بعض عہدوں کا قیام:

سر بارٹل فریئر نے انتظامی حالات کو بہتر بنانے کے لیے پٹہ داروں، کارداروں، مختار کاروں اور اس سے بالا افسروں کا تقرر سندھ کے ہر ضلع میں کیا اور سرکاری رقم وصول کرنے اور زمینداروں اور آبادکاروں کے ساتھ رعایت کے اصول بنائے۔

ان ہی سالوں میں نواب بہاولپور کی وفات کی خبر آئی اور گورنمنٹ نے ولی عہد کے بالغ ہونے تک ریاست بہاولپور کو اپنے قبضے میں لے لیا۔[2]

سر بارٹل فریئر نے ہی مقدمات دیوانی کے فیصلے کے لیے حیدرآباد اور شکارپور میں منصف مقرر کیے اور اُن سے بالا مجسٹریٹوں کو مقرر کیا۔ ان منصفوں کو اُس زمانے میں سپرنٹنڈنٹ جج کہتے تھے۔

میونسپلٹی کا قیام:

سر بارٹل فریئر کے زمانے ہی میں قاعدہ ۲۶ مجریہ ۱۸۵۲ء جاری ہوا جس کی رو سے شہروں کی صفائی اور آراستگی مقصود تھی۔ اس محکمے کا نام میونسپلٹی رکھا گیا۔ یہ محکمہ مختلف قواعد پر مشتمل تھا۔

اسی کے زمانے میں نالہ ٹارہ مشرقی کی مرمت اور فراخی ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کسان اور زمیندار آباد ہوں۔

میران سندھ کی وطن واپسی:

اسی کے زمانے میں یعنی ۱۸۵۳ء میں اکثر میر صاحبان حیدرآباد اور میرپورخاص، جو برطانوی علاقوں کلکتہ، ہزاری باغ، پونہ اور لاہور میں نظر بند تھے، اپنے وطن واپس آئے اور بقدر قوت لایموت ان کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔

سر بارٹل فریئر کی سندھ سے سبکدوشی:

سر بارٹل فریئر نے آخر سال ۱۸۵۶ء میں تبدیلیٔ آب و ہوا کے لیے اٹھارہ ماہ کی رخصت لی اور انگلستان چلا گیا۔[3]

چارلس نیپیر کے متعلق فریئر کا تاثر:

چارلس نیپیر کے متعلق لیمبرک نے فریئر کا تاثر قلم بند کرتے ہوئے لکھا کہ وہ بہت بڑا سیاست دان تھا اور انتظامی مسائل کا ماہر تھا۔ اگر رات کو سوتے سے اٹھایا جاتا تب بھی وہ انتظامیہ کے بارے میں تفصیلی نوٹ لکھنے کی اہلیت رکھتا تھا۔

لیمبرک کی فریئر کے متعلق رائے:

لیمبرک نے سر بارٹل فریئر کو سراہتے ہوئے لکھا کہ وہ خود بہت قابل شخص تھا جسے بمبئی کی حکومت اور لارڈ ڈلہوزی کی اعانت حاصل تھی۔ اُس نے سندھ کی آمدنی بڑھانے کی کوشش کی۔[4]

---

(1) لب تاریخ سندھ، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ۔

(2) لب تاریخ سندھ، ص ۱۶۴۔

(3) یہ تمام تفصیل لب تاریخ سندھ، ص ۱۶۳-۱۶۵ سے ماخوذ ہے۔

(4) چارلس نیپیر کے متعلق لیمبرک کی یہ رائے اور فریئر کے متعلق یہ رائے لیمبرک کی کتاب "سر چارلس نیپیر اینڈ سندھ" سے ماخوذ ہے۔

کمشنر سوم
جنرل جیکب (Jaccob)

جنرل جیکب ایک طویل عرصے سے پولیٹیکل عہدے پر مامور تھا۔ اس نے بلوچ سرداروں پر اپنا اثر قائم کر لیا تھا وہ نیپیر کی فوج کا ہر اول تھا۔ اس نے میانی کی جنگ میں اہم کردار ادا کیا تھا، پھر میر شیر محمد والیٔ میرپور کی شکست میں بھی پیش پیش رہا۔ اسی نے نیپیر کو بگتیوں کے متعلق اطلاعات فراہم کیں اور مری قبیلے سے مذاکرات کیے۔[1]

جیکب، بارٹل فریئر کی جگہ ۱۸۵۶ء میں جیکب آباد سے قائم مقام کمشنر سندھ ہو کر آیا۔ اُس زمانے میں ابتداءً گبس اور اسٹورٹ اس کے نائب تھے۔ سرکاری امور نہایت جرأت سے انجام دیتا تھا۔

اُس نے اہل سندھ پر اُن کے قلوب کو ہاتھ میں لینے کے لیے اجناس کی قیمتوں میں خریداروں کی مرضی کے مطابق کمی کر دی۔ اسی طرح اُس نے مزدوروں کی اجرت کو اُن کی خواہش کے مطابق بڑھا دیا۔ آزادی کی نعمت کو چھین کر جیکب پیٹ کی آسودگی سے اہل سندھ کے دلوں کو تسلی دینا چاہتا تھا۔ ۱۸۵۶ء میں میر علی مراد خاں والی خیرپور نے لندن جا کر پریوی کونسل میں بورڈ کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کی، لیکن کونسل نے بورڈ کے فیصلے کو برقرار رکھا۔

۱۸۵۶ء ہی میں کپتان میگڈالن (Megdallen) پنجاب سے عملے کے ساتھ سندھ پہنچا اور سندھ کے اکثر حصوں، گھروں اور شہروں کا سروے کیا۔ برجوں اور میناروں کے حدود مقرر کیے۔ آج تک اس کے قائم کیے ہوئے نشانات موجود ہیں۔

۱۸۵۷ء میں وہ بوشہر (ایران) کی طرف فسادات کی وجہ سے گیا اور اس کی عدم موجودگی کے زمانے میں مسٹر ایلس (Mr. Ellis) سندھ کا کمشنر ہوا جو دکن میں کمشنر تھا۔ پھر بارٹل فریئر رخصت سے واپس آ کر کمشنری کے عہدے پر فائز ہوا۔

تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کا سندھ پر اثر:

سر بارٹل فریئر کے زمانے میں ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی جدوجہد پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ سندھ کے بڑے بڑے شہروں میں بھی اس کے اثرات پڑے، خصوصاً کراچی، حیدرآباد، شکارپور، جیکب آباد میں بعض عملداروں اور فوج کے سپاہیوں نے اس تحریک میں حصہ لیا۔ سندھ کے شمع آزادی کے پروانوں کو بارٹل فریئر اور مسٹر گبس جوڈیشل اسسٹنٹ کمشنر سندھ نے اپنے مظالم کی رولر مشین میں کچلا۔ بعض کو توپوں سے اُڑا دیا گیا اور بعضوں کو دار پر لٹکایا گیا۔ انگریزوں کے خیر خواہ انعام و اکرام سے نوازے گئے۔

خداداد خاں نے لب تاریخ سندھ میں لکھا ہے کہ: بخلاف ان کے فتح خاں جتوئی بن امام بخش جتوئی اور پیر بخش ترین بن خاں بہادر الف خان جو تعلقہ شکارپور میں رہتے ہیں اور پیدائش سے زمینداری پر ان کا گزارہ ہے، انگریزوں کی وفاداریوں کی بنا پر مسٹر فریئر کی نظر میں مستحق انعام و اکرام ٹھہرے اور ان کو "سر" کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔[2]

۱۸۵۷ء میں کراچی سے کوٹری تک ریل گاڑی کی منظوری آئی اور مسٹر فریئر نے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ اسی کے زمانے میں ملیر تک ریلوے جاری ہوئی۔

۱۸۵۸ء میں انگریزوں نے مصلحت کی بنا پر سر فریڈرک گولڈز مانڈ (Sir Frederic Oldsmind) کو عمرکوٹ کے راستے سے جیسلمیر رنجیت سنگھ والیٔ جیسلمیر اور ٹھاکر بھوت سنگھ ٹھاکر پوکراں کی ملاقات کے لیے بھیجا۔ فریڈرک کے ماتحت کپتان ڈکنسن (Dickenson) کو بھی رسالہ سندھ ہارس کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ مؤلف "تاریخ لب سندھ" بھی اُن کے ساتھ تھا۔ اس کی انگریزوں سے وفاداریوں کی بنا پر اس کو ایک شمشیر، دو تھان چھپی زری، دستار اور شال بنارسی سے نوازا گیا۔ خود اس نے انگریزوں کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہوئے لکھا ہے کہ میرے حق خدمت گزاری کو ضائع نہیں کیا گیا کہ یہ پسندیدہ طریقہ کرم نما سرداروں کا ہے۔

۱۸۵۹ء کے آخر میں بارٹل فریئر ممبر کونسل کلکتہ مقرر ہوا۔ روانگی کے وقت اُس نے الوداعی ایڈرس دیا جس میں کہا کہ میں نو سال تک سندھ میں رہا ہوں اور میں نے ہمیشہ اس ملک کی فلاح و بہبود چاہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی روانگی سے پہلے یہاں کے لوگوں سے ملاقات کروں اور اپنی نمک حلالی اور ان کی نیک روش پر اظہار خیال کروں۔۔۔ میں جہاں بھی رہوں گا اس ملک کی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھوں گا۔

جنرل جان جیکب پولیٹیکل سپرنٹنڈنٹ سرحد سندھ ناظم رسالہ سندھ نے ۱۸۵۹ء میں انتقال کیا۔

---

[1] چارلس نیپیر اینڈ سندھ (لیمبرک)۔

[2] لب تاریخ سندھ، ص ۱۶۸۔

کمشنر چہارم
مسٹر انواریٹی (Mr. J.D. Inverarity)

بارٹل فریئر کے بعد انواریٹی ۱۸۵۹ء میں سندھ کا کمشنر ہو کر آیا، اس کا بھی ہیڈ کوارٹر کراچی تھا۔ اس کے نائب مسٹر شا اسٹورٹ اور مسٹر گبس تھے۔ اس کے زمانے میں ریل گاڑی دادبچی تک جاری ہوئی۔ چنانچہ سر جارج کلارک گورنر نے کراچی پہنچ کر کمشنر کے ساتھ ۱۸۶۱ء میں اس کا افتتاح کیا۔

تھرپارکر کے راناؤں کی شورش:

۱۸۶۲ء میں تھرپارکر کے راناؤں، جاگیرداروں اور اُن کے ساتھیوں نے گورنمنٹ برطانیہ کے خلاف شورش کی۔ انہوں نے شہر کو آگ لگادی اور تحصیل کے خزانے کو لوٹ لیا۔ بعض لوگوں کو قتل اور بعض لوگوں کو زخمی کر دیا، اور "کرہ کھارا" میں جو شہر تھرپارکر کے قریب ہے چھپ گئے۔ انواریٹی دوسرے عملے کے ساتھ بلوچ رجمنٹ اور دوسرے عملداروں اور چند ٹھاکروں اور زمینداروں کو ساتھ لے کر وہاں پہنچا اور مفروروں کو گرفتار کیا اور ان کو سخت سزائیں دیں۔ انگریز کے جن وفاداروں نے اس امر میں ان کی حمایت کی تھی ان کو انعام و اکرام سے نوازا، بعض کو جاگیریں دیں اور بعض کو بارانی زمینیں اور بعض کو تلواریں اور لونگی (ریشمی کپڑے) دیے اور کامیاب ہو کر کراچی لوٹا۔

اسی سال اس نے نالہ بیگاری اور مشرقی نارا اور دریائے شور پر بند باندھنے کا حکم دیا، تاکہ جہازوں کی آمد و رفت میں سہولت ہو۔

اسی سال چند مصور یورپ سے سندھ آئے اور انہوں نے یہاں کے اکثر محترم معزز مردوں اور عورتوں کی تصویریں بنائیں کہ جن کی لندن کے ایک جلسے میں پبلسٹی کے لیے ضرورت تھی۔ لب تاریخ سندھ کے یار وفادار کو بمبئی میں ان تصاویر کی پبلسٹی کے لیے بھیجا گیا۔ وہ انگریزوں کی اس خدمت کو باحسن الوجوہ انجام دے کر کراچی لوٹا۔

۱۸۶۲ء میں مسٹر انواریٹی کے کمشنری کے زمانے ہی میں لب تاریخ سندھ کے مؤلف خداداد خاں نے اپنی دوسری تصنیف تکمران نامہ مکمل کی جو انگریزوں کی قصیدہ خوانی کا ایک شاہکار ہے۔

۱۸۶۲ء میں مسٹر انواریٹی کو گورنمنٹ بمبئی کی کونسل میں ترقی دے کر ممبری پر مقرر کیا گیا۔

اسی زمانے میں میجر جنرل سر فریڈرک گولڈ سمنڈ، جو اس کا نائب تھا، رخصت پر لندن چلا گیا۔[1]

کمشنر پنجم
مسٹر ایس مینسفیلڈ
(Mr. S. Mansfild)

آخر سال ۱۸۶۲ء میں بمبئی سے مسٹر ایس مینسفیلڈ (S. Mansfield) سندھ کا کمشنر ہو کر آیا۔ اس کے ماتحت مسٹر میکسملر (Max (Muller) اور مسٹر آر سکین (Erskine) اور بعد میں مسٹر جان مور (John Moore) تھے۔

دامن گردی:

اس نے سندھ کے اکثر علاقوں کے دفاتر کی جانچ پڑتال کی جن کا انتظام "راؤ بہادر دامن راؤ برہمن" کے سپرد تھا۔ جو حیدرآباد کے کلکٹر کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اس نے بہت سی بدعنوانیاں کی تھیں اور خدا کی مخلوق کو بے حد پریشان کیا تھا۔ لوگ اس کے زمانے کو "دامن گردی" کا زمانہ کہتے تھے، اس کو مینسفیلڈ نے موقوف کیا۔ وہ سزا کے خوف سے بھاگ گیا اور اس کا خمیازہ اس کے ماتحتوں کو بھگتنا پڑا۔

۱۸۶۳ء میں مینسفیلڈ تار برقی کے لیے خلیج فارس کی طرف روانہ ہوا۔ اسی زمانے میں موسم سرما میں سبزل کوٹ کے جنگل ماچھیکہ میں مینسفیلڈ شکار کے لیے گیا اور لاڑکانہ کی طرف سے براہ نصیر آباد واپس ہوا۔ اس کے دونوں نائب اس کے ساتھ تھے۔

فوجداری اور دیوانی کی علیحدگی:

۱۸۶۵ء میں مینسفیلڈ نے امور فوجداری اور دیوانی کو، جو کمشنر سندھ کے تحت اس کے نائب انجام دیتے تھے، علیحدہ کر کے جوڈیشل کمشنر سندھ کے حوالے کر دیا اور صدر کورٹ سندھ قائم کیا۔

بارٹل فریئر کی سندھ میں آمد:

اسی زمانے میں بارٹل فریئر بحیثیت گورنر بمبئی کے سندھ کے دورے پر آیا اور سندھ میں عمرواہ، تھرواہ، مقھرواہ اور دوسرے نالوں

---

[1] یہ تمام تفصیل لب تاریخ سندھ، ص ۱۷۱ تا ۱۷۸ سے ماخوذ ہے۔

کی تعمیر کو دیکھ کر حیران ہو گیا کہ جس جگہ کے لوگ پینے کے پانی کے لیے سرگرداں اور پریشان تھے، اب وہ پانی ملنے کی وجہ سے خوش ہیں۔

لوکل فنڈ کا قیام:

۱۸۶۵ء میں مینسفیلڈ نے لوکل فنڈ کے نام سے ایک ٹیکس کسانوں اور زمینداروں پر لاگو کیا جو آج تک جاری ہے۔ مینسفیلڈ دورے سے واپسی کے بعد چھ ماہ کی رخصت پر انگلستان چلا گیا۔

کمشنر ششم
ایڈی رابرٹس (Eddy Roberts)

مینسفیلڈ کی رخصت کے زمانے میں مسٹر ایڈی رابرٹس قائم مقام کمشنر ہو کر کراچی آیا اور امور کمشنر سندھ کا منصرم ہوا۔ اس زمانے میں جان مور اس کا نائب تھا۔ اگرچہ اس نے امورِ سندھ کو اچھی طرح انجام دیا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ چھ ماہ کے لیے منصرم تھا۔

سیٹھ ناؤمل کو تمغہ:

اس نے انگریزوں کی خیر خواہی اور وفاداریوں کی بنا پر فریئر ہال میں ایک عالی شان دربار منعقد کر کے سیٹھ ناؤمل کی خدمات کے اعتراف میں ۲۹ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو ایک تقریر کی جس میں اس نے ان خدمات کو سراہا جو سیٹھ نے انگریز حکومت کی انجام دی تھیں۔ اس نے کہا کہ:

> تم نے سلطنت برطانیہ کی بے حد خدمات انجام دیں ہیں۔ ان خدمات کے پیش نظر ملکہ معظمہ نے شفقت کی بنا پر "کمپینن آف دی موسٹ اینگز الٹیڈ آرڈر آف دی اسٹار آف انڈیا" کے خطاب سے تم کو معزز فرمایا ہے۔ ان خدمات کی بنا پر تم اس سے قبل بھی انعامات سے سرفراز ہو چکے ہو، ۱۸۵۲ء ایک سو روپیہ پنشن (وظیفہ) مقرر کی۔ ۱۸۶۰ء میں جاری کی گئی یہ پنشن تمہاری زندگی تک تھی اب تمہاری دو پشت تک مبدل کر دی گئی۔ اس کے علاوہ زمین جاگیر کے طور پر جس کی آمدنی ایک ہزار دو سو روپے ہے، تمہیں دی گئی ہے۔

انگریزوں کی وفاداریوں کی فہرست:

اس نے تقریر میں سیٹھ ناؤمل کی خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے انگریزی حکومت سے وفاداریوں اور ملک وملت سے غداریوں کی فہرست کو پیش کرتے ہوئے کہا:

> تم نے شروع ہی سے انگریز حکومت کی ایسی خدمات انجام دی ہیں کہ اس زمانے کے لوگ ان خدمات سے واقف نہیں۔ میں ان خدمات پر مختصر روشنی ڈالتا ہوں۔
>
> تمہاری خدمات کا آغاز ۱۸۳۹ء سے ہوتا ہے، مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب انگریزی حکومت نے شجاع الملک کی امداد کے لیے بنگال سے افغانستان لشکر بھیجا تھا اور دوسرا لشکر بمبئی سے اس کے ساتھ جانے کے لیے روانہ ہوا تھا تو تم نے رسد اور سامان کے نقل و حمل میں انتہائی کوشش کی تھی۔
>
> جب کابل میں قتل وغارت گری کے بعد ہمارے فوجی قید ہو گئے تھے اور ان قیدیوں کی رہائی کے لیے برطانوی حکومت نے دوسرا لشکر بھیجا تھا اور جب اس لشکر کا گزر سندھ سے ہوا تھا تو اس وقت بھی تم نے کافی مدد دی تھی۔
>
> ۱۸۴۳ء میں میرانِ سندھ اور انگریز حکومت میں جنگ ہو رہی تھی، اس وقت اگرچہ تمہاری جان و مال خطرے میں تھی، مگر تم نے نہایت کوشش سے میر صاحبان کی صحیح خبریں اور میر صاحبان کی اسکیمیں حکومت برطانیہ کو پہنچائیں تھیں کہ ان پر حکومتِ برطانیہ کے کارندوں کی فوجی نقل و حرکت منحصر تھی۔ استوبک، پاٹنجر اور اوٹرام کے زمانے میں اور ایام غدر (تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کے عہد) میں دو ڈھائی سال تک تم نے اپنی وفاداریوں کو ثابت کیا اور گورنمنٹ برطانیہ کے لطف و کرم کو اپنی لیاقت و مروت سے بڑھایا۔
>
> ان تمام خدمات کے صلے میں تمہیں حکومت برطانیہ سے پنشن، جاگیر اور خطاب عطا ہوا ہے۔

میر شیر محمد خاں ٹالپور کو شجاعت وبسالت پر تمغہ:

میر شیر محمد خاں شیر سندھ جس کی شجاعت و بہادری کا لوہا انگریز دشمن نے بھی مانا تھا، مثل مشہور ہے کہ جادو وہ ہے جو سر پر چڑھ کر بولے۔ انگریز نے بھی اس کا اس طرح اعتراف کیا کہ مینسفیلڈ نے عمر کوٹ میں دربار منعقد کر کے اسے ستارۂ ہند کا خطاب اور تمغہ دیا۔

مسٹر مینسفیلڈ بھی ۱۸۶۷ء میں ترقی پا کر بمبئی کی کونسل میں چلا گیا۔[1]

---

[1] یہ تمام تفصیل لب تاریخ سندھ، ص ۱۸۵ تا ۱۸۷ سے ماخوذ ہے۔

کمشنر ہفتم

مسٹر ہیولاک (W.H. Havelock)

قائم مقام کمشنر سندھ

ہیولاک ۱۸۶۷ء میں منصرمانہ طور پر قائم مقام کمشنر سندھ ہو کر کراچی آیا۔ جان مور اس کا نائب تھا۔ دستور کے مطابق اس نے امور سرکاری انجام دیے۔ لیکن اس کے زمانے میں جو اہم کام ہوئے، ان کی تفصیل یہ ہے:

پولیس کے عہدہ داروں کے انگریزی نام:

ہیولاک نے پولیس کے عہدے داروں کے نام بدل کر انگریزی میں رکھے۔ ابتدا میں پولیس کے عہدہ دارانِ اضلاع کو جو یورپین تھے کپتان پولیس کہتے تھے اور عہدہ دارانِ ملکی کو رسالدار، صوبہ دار، جمعدار، حوالدار، نائک، سپاہی اور سوار کے نام سے پکارا جاتا تھا اور شہری پولیس کے عہدے داروں کو فوجدار کے نام سے پکارتے تھے۔

نئے انتظام میں پولیس کے اضلاع کے یورپین عہدہ داروں کو ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس پکارا جانے لگا اور پولیس کے ملکی عہدہ داروں کو انسپکٹر اور چیف کانسٹیبل، ہیڈ کانسٹیبل کے القاب سے ملقب کیا گیا اور بڑے شہروں کے عہدہ داران پولیس کو ٹاؤن انسپکٹر کے لقب سے پکارا جانے لگا۔ اس کمشنر نے رہے سہے فارسی ناموں کا بیڑہ غرق کر کے پولیس کے محکمے میں انگریزی القاب اور ناموں کو رواج دیا اور اس طرح عوام کے رخ کو انگریزی کی طرف غیر شعوری طور پر موڑا۔

منصوبی کمشنری کی ایک سال سے زائد مدت گزارنے کے بعد ہیولاک بمبئی واپس چلا گیا، اور جاتے جاتے منشی خداداد خاں مؤلف لب تاریخ سندھ کو بھی پولیس کے محکمے میں ٹھونس گیا۔ گویا یہ حضرت تاریخ وانشا سے رخ موڑ کر پولیس میں آئے۔[2]

کمشنر ہشتم

سر ولیم میری ویدر

(Si William Mere Wether)

لیمبرک نے لکھا ہے کہ پہلے میری ویدر جیکب کا اسسٹنٹ تھا۔ اس نے بگتیوں کے خلاف مہم جوئی کر کے انہیں ایسی شکست دی کہ وہ سر نہ اٹھا سکے۔[3]

سندھ کی کمشنری:

ولیم میری ویدر ۱۸۶۸ء میں ملک حبشہ کی فتح کے بعد سندھ کا کمشنر ہو کر کراچی آیا۔ اُس کا سینئر نائب جان مور تھا۔ ولیم میری ویدر فوجی تھا اور سندھ سے خوب واقف تھا۔ جنگ میانی اور دوآبہ میں شریک رہا اور پھر چند سال تک جیکب آباد میں اہم خدمتوں پر مامور رہا۔ پنجاب اور بلوچستان اور حبشہ میں بھی اُس نے انگریزی حکومت کی اہم خدمات انجام دیں۔ اُسی کے زمانے میں سندھ آفیشل گزٹ جاری ہوا جو سرکار کی انتظامیہ خبریں ملازمین سرکار تک پہنچاتا تھا اور جو سرکاری ملازمین کے لیے مفید تھا۔ اسی کے زمانے میں کشتیوں کے بجائے اسٹیمر روہڑی سے سکھر تک چلائے گئے۔

اس کے زمانے ۱۸۶۹ء میں فریئر ہال میں صنعت کاروں کی ایک نمائش منعقد ہوئی جو ایک ہفتے تک جاری رہی تاکہ عوام میں صنعت کاری کا شعور بیدار ہو۔

آثارِ قدیمہ کی تاریخ:

اسی زمانے میں ولیم میری ویدر نے حکم دیا کہ سندھ اور اس کے کوہستانی علاقے کے گردونواح میں جس قدر قدیم مساجد، روضے، عمارات، شہر اور عجائبات ہیں، ان کی مختصر تاریخ خداداد خاں مؤلف لب تاریخ سندھ مرتب کرے اور اس حکم کے مد نظر آثار قدیمہ مثلاً پیر حاجی منگہ شاہ بلاول، لاہوت لامکان اور درات، رتی کوٹ، کراچی ضلع سے، نصرپور اور ٹنڈہ فضل ٹالپور اور مخدوم نوح ہالائی، رھمکی بازار، لعل اڈیرہ وغیرہ ضلع حیدرآباد سے، خواجہ خضر اور منارۂ میر محمد معصوم بکھری، شاہ خیر الدین، قاسم خانی، قلعۂ بکھر وغیرہ ضلع شکارپور سے درجہ بدرجہ لکھے جائیں۔ یہ حالات سندھی زبان میں ہوں گے اور حکومت سندھ ان کو انگریزی میں ترجمہ کرائے گی۔ جب یہ تاریخ آثار قدیمہ تیار ہو جائے گی تو ملازمین حکومت سندھ کو اور لندن میں بارٹل فریئر کو روانہ کی جائے گی۔

خداداد خاں نے یہ تاریخ مرتب کی اور اس کا بیان ہے کہ اس کے اکثر نسخے سندھی اور انگریزی میں ان کے پاس موجود ہیں۔

---

[2] لب تاریخ سندھ، ص ۱۸۸ تا ۱۹۳۔

[3] سر چارلس نیپیر اینڈ سندھ، لیمبرک۔

والیٔ قلات کے خلاف بغاوت:

۱۸۷۰ء میں بلوچستان میں میتھری کے درمیان بعض سرداروں نے والیٔ قلات کے خلاف بغاوت کر دی اور وہ افغانستان اور بلوچستان میں آنے جانے والے تجارتی قافلوں کو لوٹنے لگے۔

گورنمنٹ بمبئی کے حکم سے ولیم میری ویدر اُن کے مقدمات کے فیصلوں کے لیے مزید چار ماہ تک جیکب آباد میں خیمے ڈال کر رہا۔

قوانین جرگہ کا انعقاد:

اُسی زمانے میں سرحدی بلوچوں کے لیے "قوانین جرگہ" نافذ کیے گئے اور اُن کی منظوری گورنمنٹ سے حاصل کی گئی۔ اس کی اس تجویز سے سرحدی بلوچوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

اسی سال نالۂ سکھر عرف "شہداد واہ" کی ترمیم اختتام کو پہنچی۔

اسی سال ولیم میری ویدر نے مٹھن کوٹ پہنچ کر حدود سندھ اور پنجاب کا فیصلہ کیا۔

۱۸۷۲ء میں لارڈ میو گورنر جنرل ہندوستان کے قتل کی خبر سندھ میں مشہور ہوئی۔

بلوچستان کی سندھ سے علیحدگی:

بلوچستان جو فتح سندھ (۱۸۴۳ء) سے سندھ میں شامل تھا اور کمشنر سندھ کے ماتحت تھا سندھ سے علیحدہ کر کے ایجنٹ گورنر جنرل ہندوستان کے ماتحت کر دیا گیا۔ یہ ولیم میری ویدر کی کمشنری سندھ کے زمانے میں ہوا۔

ولیم میری ویدر کی ترقی:

۱۲۹۲ھ (۱۸۷۷ء) میں میری ویدر لندن پارلیمنٹ کا ممبر مقرر ہو کر کراچی سے بمبئی روانہ ہو گیا۔

میری ویدر ٹاور اور میری ویدر گارڈن:

میری ویدر ٹاور اور میری ویدر گارڈن اُسی غلام بنانے والے انگریز کی یادگار ہیں۔

میری ویدر ٹاور وہ بڑا برج ہے جو اہلیان کراچی کے چندے سے انتہائے حدود شہر کراچی میں اس کے دور کی یادگار کے طور پر بنایا گیا تھا اور کراچی کے باغوں میں سے وہ باغ جہاں میرانِ سندھ ٹھہرتے تھے، وہ میری ویدر گارڈن کے نام سے موسوم ہوا۔

آج پاکستان بننے کے اتنے برس گزرنے کے بعد بھی ہمیں ہر "بس" پر میری ویدر ٹاور لکھا ہوا نظر آتا ہے تو آنکھیں خون روتی ہیں کہ یہ وہ شخص ہے جس نے میانی اور دوآبہ کی جنگ میں انگریزوں کی طرف سے ہمیں غلام بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا، آج بھی پاکستان کا سب سے بڑا شہر ان بسوں کی بدولت اس استحصال پسند انگریز کے نام سے گونجتا ہے جو میری ویدر ٹاور تک جاتی ہیں اور ہماری غیرتِ ملی کو للکارتا ہے کہ جیکب آباد اور میری ویدر ٹاور کے ناموں کو بدل کر اُن عظیم قومی رہنماؤں کے نام پر رکھا جائے جنہوں نے پاکستان کے لیے بے مثال قربانیاں دی تھیں۔

کمشنر نہم

ایف ڈی میلول (F.D. Melvill)

قائم مقام کمشنر

میری ویدر کے بعد ایف ڈی میلول ۱۸۷۷ء میں قائم مقام کمشنر ہو کر آیا۔ اس کے ماتحت مسٹر ڈبلیو بی وارنر تھا۔ میلول اس سے قبل جوڈیشل کمشنر سندھ اور سندھ کی عدالت کا جج بھی رہا تھا۔ اُس نے امور عدالت میں دلچسپی لے کر انہیں بہتر بنایا اور اپنی عارضی کمشنری کی مدت پوری کر کے چلا گیا۔[1]

کمشنر دہم

ایچ۔ این۔ بی ارسکین

(Henry Nepier Bruce Erskine)

مسٹر ایچ۔ این۔ بی ارسکین، میلول کے بعد ۱۸۷۹ء میں قائم مقام کمشنر ہو کر آیا۔ وہ چند دن اسسٹنٹ کمشنر سندھ بھی رہا تھا اور کراچی کا کلکٹر بھی۔ اس کے زمانے میں پہلے سر چارلس الرونت، پھر ڈاکٹر جان پالن، اس کے بعد مسٹر ایچ لی درجہ بدرجہ اُس کے اسسٹنٹ کمشنر رہے۔

---

(1) لب تاریخ سندھ، ص ۲۰۶-۲۰۷۔

امور جاگیرات وغیرہ:

ایچ این بی ارسکن نے امور جاگیرات و عطائے زمینات لائق آبادی وغیر آبادی، قانون زمینات دریابردی، دریاخوردی اور دریاگزاشتی بنائے۔ یہ قانون ایک طویل عرصے تک جاری رہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی کمشنر کے زمانے (۱۸۸۶ء) میں خداداد خاں نے تاریخ جاگیرات بھی اس کمشنر کی فرمائش پر لکھی تھی اور ڈاکٹر جان پالن نے اس کی تکمیل پر خداداد خاں کا شکریہ ادا کیا تھا۔

مدرستہ الاسلام اور دیارام کالج کا قیام:

۱۸۸۵ء میں اسی کمشنر کے زمانے میں مدرستہ الاسلام اور دیارام کالج قائم ہوا۔

۱۸۸۷ء میں خداداد خاں (مؤلف لب تاریخ سندھ) کو اس کی انگریزوں سے وفاداریوں کے صلے میں حکومت بمبئی نے خاں صاحب کے خطاب سے نوازا۔

ارسکن کی لندن روانگی:

۱۸۸۷ء میں ارسکن اپنی خدمت سے سبکدوش ہو کر انگلستان روانہ ہوا۔ اس انگریز کی بھی کراچی اور بندر کراچی میں باغیچہ ارسکن اور بندر ارسکن کے نام سے یادگاریں قائم کی گئیں اور حسب عادت مؤلف لب تاریخ سندھ نے اس کے تذکرے کے آخر میں رطب اللسان ہو کر اس کا حق نمک ادا کیا۔[2]

کمشنر یازدہم
مسٹر ٹریور

۱۸۸۷ء میں مسٹر ٹریور سندھ کا کمشنر ہو کر کراچی آیا۔ اس کا نائب مسٹر مور اور بعد میں جیکسن تھا، لیکن وہ چند روز کمشنر رہا۔

اسناد جاگیرات:

اس کے زمانے میں متفرق جاگیرداروں یعنی سرحد سندھ کے بلوچوں اور لاڑکانہ کے جاگیرداروں کو اسناد جاگیر عطا کی گئیں۔

مسٹر ٹریور کی روانگی:

ٹریور اپنی حسن کارگزاری کی بنا پر کونسل کلکتہ کی ممبری سے سرفراز ہو کر چلا گیا۔[3]

کمشنر دوازدہم
سر چارلس پرچرڈ
(Sir Charles Purchard)

۱۸۸۸ء میں سر چارلس پرچرڈ بمبئی سے کراچی وارد ہوا اور امور کمشنر سندھ کا بحیثیت منصرمانہ چارج لیا۔ ابتداءً اس کا نائب ڈاکٹر جان پالن، پھر میولس اور بعد میں ایچرلی تھا۔

مدرستہ الاسلام اور دیارام کالج کا سنگ بنیاد:

۱۸۸۸ء میں لارڈ ڈفرن گورنر جنرل ہندوستان نے سندھ آکر مدرستہ الاسلام کراچی اور دیارام کالج کا سنگ بنیاد رکھا اور بمبئی واپس ہوا۔

پارومل خوب چند سیوستانی پر مقدمہ:

۱۸۸۸ء میں پارومل خوب چند سیوستانی پر، جو سرحد سندھ کا ڈپٹی کلکٹر تھا، رشوت ستانی کا مقدمہ چلا اور اس پر جرم ثابت ہو گیا۔ آخر ملازمت سے برطرف کیا گیا اور اپنی بے عزتی کے رنج میں گھل گھل کر مر گیا۔

میر علی مراد خاں کے لیے ۱۹ توپوں کی سلامی:

میر علی مراد خاں والیٔ خیرپور کے لیے مزید دو توپوں کی سلامی منظور کی گئی، گویا اُن کے لیے مجموعی ۱۹ توپوں کی سلامی ہو گئی جو ان کے لیے عمر بھر سر کی جاتی رہیں۔

آبکاری کا نظام:

آب کاری کا نظام جو بے قاعدہ تھا اس کمشنر نے اس کو منظم کیا۔

چارلس پرچرڈ کی روانگی:

۱۸۸۹ء میں سر چارلس پرچرڈ بمبئی کی کونسل کی ممبری پر چلا گیا۔[1]

---

[2] لب تاریخ سندھ، ص ۲۰۷ تا ۲۱۶۔

[3] لب تاریخ سندھ، ص ۲۳۱ تا ۲۳۲۔

[1] لب تاریخ سندھ، ص ۲۱۷ تا ۲۳۱۔

کمشنر سیزدہم
ایچ ای ایم جیمس (Mr. H.E.M James)
اسٹار آف انڈیا

ایچ ای ایم جیمس ۱۸۸۹ء میں بمبئی سے کراچی آیا اور سندھ کا کمشنر ہوا۔ اس کا نائب شروع میں جیکسن، اس کے بعد لیوکس اور سلیڈن رہا۔ چونکہ جیمس کمشنری کی کرسی سے پہلے تین چار سال تک سندھ کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹر رہا تھا اور ۱۸۷۲ء میں نائب کمشنر سندھ بھی رہ چکا تھا اس لیے سندھ کی متعلق اس کا تجربہ وسیع تھا۔

میر علی مراد خاں والیٔ خیر پور کو خطاب:

اسی کے زمانے (۱۸۹۱ء) میں ملکۂ انگلستان نے میر علی مراد خاں والیٔ خیر پور کو جی۔ سی۔ آئی ای کا خطاب دیا (جو گرانڈ نائیٹ آف کراس آف دی انڈین امپیر کا مخفف تھا)۔ لارڈ ہیرس گورنر بمبئی نے شکار پور پہنچ کر اس تقریب کا اہتمام کیا۔ اکثر میر صاحبان، جاگیر دار، معززین، فوجی اور سول یورپین اور سرکاری ملازمین اس جلسے میں موجود تھے اور جیمس کمشنر سندھ بھی وہاں موجود تھا، والیٔ خیر پور کو نہایت عزت و احترام سے تمغۂ شاہی اور جبہ دیا گیا۔ ۱۹ توپوں کی سلامی سر کی گئی۔

مؤلف لب تاریخ سندھ کو خطاب:

۱۸۹۳ء کے آغاز میں جیکب آباد میلۂ اسپاں کے موقع پر خداداد خاں مؤلف لب تاریخ سندھ کو "خان بہادر" کا خطاب اور قادر داد خان کو سی۔ آئی۔ ای کا تمغہ عطا کیا گیا۔

میرانِ سندھ کے وظائف:

۱۸۹۳ء میں جیمس سکھر پہنچا اور ایک ماہ تک وہاں ٹھہرا۔ خیر پور کے اکثر میرانِ ٹالپور کو جو پنشن بردار (وظیفہ خوار) تھے اپنے پاس بلا کر اُن کے حالات و ضروریات، آمدنی و خرچ، شادی و غمی اور ان کے اہل و عیال کے حالات اور کیفیتِ گزر اوقات پوچھی اور اس کی رپورٹ حکومت بمبئی کو بھیجی۔ اس رپورٹ میں خاندانِ میر پور خاص اور میرانِ حیدر آباد کا بھی تذکرہ تھا۔ اس رپورٹ کا گورنمنٹ پر کافی اثر ہوا۔ گورنمنٹ بمبئی نے ان میروں کے متعلق جو حکمرانوں کی صف میں آتے تھے وظیفہ گزاروں کی پنشن مناسب پشت بہ پشت مقرر کی اور وہ لوگ جو اس صف میں نہیں آتے تھے اُن کے مناسب حال حیات تک ایک پشت یا تاحیات وظیفہ مقرر کیا اور ایسے بعض لوگ جن کا کوئی وظیفہ نہیں تھا، اُن کے لیے ملازمت اور کاشتکاری کی تجویز کی۔

ٹالپوروں کی اولاد کے متعلق جن کی عمر پندرہ سال ہو چکی تھی ان کو انگریزی تعلیم کے لیے مدرستہ الاسلام کراچی میں داخل کیا گیا۔ ان کی پوشاک اور خوراک کا خرچ گورنمنٹ نے اپنے ذمے لیا۔

ہمارے خیال میں پچاس برس کے بعد ٹالپوروں پر انگریزوں کی اس نوازش کو، جن کی حکومت پر انہوں نے غاصبانہ قبضہ کیا تھا، ٹالپوروں کی اشک شوئی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

کمشنر چہاردہم
سر چارلس اولیونٹ
(Sir Charles Ollivant)
قائم مقام کمشنر

۱۸۹۵ء میں چارلس اولیونٹ کاٹھیاواڑ کی پولیٹیکل ایجنسی سے قائم مقام کمشنر ہو کر کراچی آیا۔ وہ قبل ازیں ۸۱-۱۸۸۰ء میں بھی نائب کمشنر سندھ رہا تھا اور حالات سندھ سے خوب واقف تھا۔ اُس زمانے میں اس کے ماتحت مسٹر جی سلیڈن تھا۔

مسٹر بینٹن کا قبول اسلام:

۱۸۹۵ء میں مسٹر بینٹن عہدہ دار پولیس سرحد سندھ عیسویت کو چھوڑ کر مسلمان ہو گیا۔ بظاہر اس پر کوئی جرح قدح نہیں کی گئی، لیکن انگریز کے اندرونی تعصب کی یہ کیفیت تھی کہ چند روز کے بعد اس کا تبادلہ دکن کر دیا گیا۔

خداداد خاں کی تالیف "لب تاریخ سندھ":

خداداد خاں کی تالیف "لب تاریخ سندھ" کا بڑا حصہ دراصل انگریزوں کی قصیدہ خوانی اور انگریزی حکومت سے اس کی خیر خواہی اور اُن نوازشوں کا جو وقتاً فوقتاً انگریزوں نے اس پر کی ہیں، انگریزوں کے نثر میں قصیدۂ مدحیہ اور ان انعامات خطابات کے تذکرہ پر مشتمل ہے جو اس کو انگیزوں کی بارگاہ سے ملے تھے۔ خصوصاً اس کی تاریخ کا وہ حصہ، جو عہد

انگریز سے متعلق ہے، اس میں اس کا قلم انگریزوں کی چاپلوسیوں کو بیان کرتے ہوئے نہیں تھکتا۔ وہ دراصل انگریزوں کا ایک پرچہ نویس ہے اور اس نے اپنی کتاب میں انگریزوں کا حق نمک پوری طرح ادا کیا ہے۔

حر مجاہدوں کے متعلق مؤلف "لب تاریخ سندھ" کی غلط بیانیوں پر تبصرہ:

خداداد خان مؤلف "لب تاریخ سندھ" نے چارلس اولیونٹ قائم مقام کمشنر سندھ کے حالات میں حر مجاہدوں کے متعلق نہایت ہی غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ یہ حریت پسند جنہوں نے حکومتِ برطانیہ کے چھکے چھڑا دیے تھے، یہ ان کی حریت پسندی اور انگریز دشمنی کو شورش و فساد قرار دیتا ہے۔ ان کے عقائد و افکار کو حضرت پیر پاگارہ کے متعلق غلط رنگ میں کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس فرقے کے اکثر مرید و معتقد درگاہ کنگری کے سجادہ نشینوں کو نعوذ باللہ خدائی اوصاف سے متصف کرتے ہیں۔ ان مردانِ مجاہد کے متعلق ہم کہیں آئندہ تفصیل سے لکھیں گے کہ حر کا نقطۂ آغاز کیا تھا اور کس مقدس فریضے کے لیے حضرت شاہ صبغتہ اللہ اول نے اپنے مریدوں کی اس جماعت کی بنیاد رکھی تھی اور کس طرح لوگ جذبۂ حریت اور اعلاء کلمۃ الحق سے سرشار ہو کر حروں کی جماعت میں شریک ہوئے تھے۔ اب ہم صرف اتنا اشارہ کر دینا چاہتے ہیں کہ محترمی ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے لب تاریخ سندھ کے صفحہ ۲۵۶ کے حاشیے میں لکھا ہے کہ: قاضی عثمان سندھی جو شوکانی کے شاگرد تھے اور محمد بن عبدالوہاب موحد کی تعلیمات سے متاثر تھے وہ اپنے وطن سندھ آکر حر مجاہدوں کی ایک جماعت میں شریک ہو گئے تھے۔ اس عالم حق کے ہتھیاروں میں سے آج بھی ایک خنجر ان کی اولاد میں محفوظ ہے اور ان کی کتابوں میں سے ایک مجموعۂ قلمی جو امام تیمیہ کے رسائل پر مشتمل ہے اور اُن میں سے بعض رسائل ابھی تک شائع نہیں ہوئے اور جن کا املا شیخ محمد بن عبدالوہاب نے کرایا تھا سندھ یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

حضرت سید صبغتہ اللہ اول کے نام حضرت سید احمد شہید کا ایک خط:

ڈاکٹر صاحب نے اس حاشیے کے آخر میں حضرت سید احمد شہید کا ایک مکتوب، جو انہوں نے میدانِ جہاد سے حضرت شاہ صبغتہ اللہ اول کے نام لکھا تھا، نقل کیا ہے۔ جس کا ترجمہ ہم ذیل میں دے رہے ہیں۔

اس خط سے حر تحریک پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ بانی تحریک حر کا کتنا تقدس و احترام حضرت سید احمد شہید کی نظر میں تھا۔ انہوں نے اس خط میں لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از امیر المومنین سید احمد بخدمت بابرکت سجادہ نشین محافل ارشاد و تلقین راہ نمائے ارباب صدق و یقین مرجع مستفیدین، ملاذ مرشدین ہادی راہ الہ مخدومی حضرت شاہ صبغتہ اللہ صاحب مداللہ ظلال ھدایتہ علیٰ رؤس الطالبین الیٰ یوم الدین۔

سلام مسنون اور دعائے اجابت مقرون کے بعد معلوم ہو کہ آپ کا مکتوب گرامی جو رغبت جہاد، احیاء سنت اور اقامت جہاد اور استیصال کفر و عناد پر مشتمل تھا ملا۔ آپ کے مقاصد اس خط سے اور آنے جانے والوں سے معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کام کے انجام دینے کی جو رغبت اور اس مہم کی تکمیل کا جو جذبہ آپ میں پایا جاتا ہے، وہ آپ جیسے عالی ہمت کو زیب دیتا ہے:

"ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

ہر چند کہ اب یہ ممکن نہیں کہ آپ اس خارستان کوہ دشت کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے رونق شکن یاسمین و ریحان بنائیں، لیکن وقت کی ضرورت کا تقاضا ہے کہ مخلص محبین کو اور تمام سچے مؤمنون کو اور اس ملک کے مشاہیر کو آپ جہاد کی رغبت دلاتے رہیں، بلکہ ایک جماعت کو ساتھ لے کر ایسی جگہ بیٹھ جائیں جو دشمنوں کے گزند سے محفوظ ہو اور حدود اقوام سکھ سے متصل ہو اور ظالموں کی دسترس سے باہر ہو اور اس فقیر کے اہل و عیال کو بھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ اس محفوظ مقام پر ٹھہرائیں اور اس جماعت کو جو آپ کے ساتھ ہو ذوق جہاد سے آراستہ کریں تاکہ آوازۂ جہاد اور کفر و فساد کے استیصال کا غلغلہ ہر جگہ تک پہنچے۔

چارلس اولیونٹ کی کمشنری کے زمانے میں حروں کی تحریک کو خداداد خاں مؤلف "لب تاریخ سندھ" تاریخ کو مسخ کر کے شورش و فساد کے نام سے تعبیر کرتا ہے اور ان مردانِ حق آگاہ کو لُر کا لقب دیتا ہے، جس کے معنی سندھی زبان میں بے بنیاد اور بدکار کے ہیں۔ ان حریت پسندوں کے متعلق اس نے لکھا:

سرکاری ذی الاقتدار نے حکمت عملی کے ساتھ فوج، پولیس، جاسوسوں اور پیر علی گوہر شاہ وغیرہ کی مدد سے یہ شورش دبائی، بعض

حروں کو گرفتار کیا گیا، بعض مارے گئے اور بعض کو دار پر چڑھایا گیا۔ جن لوگوں نے گورنمنٹ برطانیہ کی اس امر میں مدد کی تھی ان کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔

دراصل واقعہ یہ تھا کہ جب حر حریت پسندوں کی جدوجہد آزادی کی تحریک تیز تر ہو گئی تو انگریز حکومت نے جہاں تشدد اور ظلم و ستم سے کام لیا اور حر تحریک کو کچلنے کے لیے جہاں اور بہت سے حربے استعمال کیے وہاں ایک حربہ یہ بھی تھا کہ پیر علی گوہر شاہ (پیر پاگارہ) کو طرح طرح سے مجبور کیا گیا کہ وہ حر تحریک کو بند کر دیں۔ حضرت پیر پاگارہ پر حکومت کا دباؤ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ حضرت پیر علی گوہر شاہ نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ بجائے اس کے کہ تحریک ہی ختم ہو جائے اس کی شدت کو کم کر دیا جائے کیونکہ تحریک کے ختم ہو جانے سے یہ بہتر تھا کہ اس وجود کو باقی رکھا جائے اور عارضی طور پر تحریک کے زور کو کم کر دیا جائے۔ اسی کو خداداد خاں مؤلف لب تاریخ سندھ نے اُسے پیر علی گوہر شاہ کی انگریزوں کو مدد دینے سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا یہ لکھنا پیر علی گوہر شاہ پر صریح افترا ہے۔

چارلس اولیونٹ کی سبکدوشی:

۱۸۹۶ء کے درمیان میں سر چارلس اولیونٹ اپنی کارگزاریوں کی بنا پر گورنمنٹ بمبئی کا وزیر اعظم اور بعد میں کونسلر مقرر ہو کر چلا گیا۔[1]

مسٹر ایچ ای ایم جیمس

(Mr. H.E.M James)

دوسری مرتبہ کمشنری سندھ پر

۱۸۹۶ء میں ایچ ای ایم جیمس دوبارہ کمشنر سندھ بن کر سندھ آیا۔ "لب تاریخ سندھ" میں ہے کہ بقول اس کے حروں کی شورش اور خوں ریزی بند ہو چکی تھی اور وہ حکومتِ بمبئی کو اس کی اطلاع بھی دے چکا تھا کہ بچو نامی موچی نے جو حروں کا سرگروہ تھا گوریلا جنگ کا آغاز کر دیا اور اس نے ان حملوں میں نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کیں کہ انگریز حیرت میں رہ گئے۔ پولیس اور فوج اس کے مقابلے سے قاصر ہو گئی۔ آخر انگریزی حکومت نے اپنے نظام جاسوسی سے کام لیا اور اپنے جاسوسوں کو حروں کے بھیس میں ان کی کمین گاہوں کی طرف روانہ کیا۔ یہ بچو کے ساتھیوں سے مل گئے اور اُن کے رازوں سے واقف ہو کر وقتاً فوقتاً انگریزی حکومت کو اس کی اطلاع دیتے رہے۔ انگریزی حکومت نے کمین گاہوں کا محاصرہ کر لیا اور بم باری شروع کر دی جس سے جنگلات تباہ اور مورچے برباد ہو گئے۔ پیر پاگارہ کو نہایت پریشان کیا گیا اور حروں کی جدوجہد آزادی کو بند کرنے کے لیے نہایت دباؤ ڈالا گیا۔ پیر صاحب نے مجبوراً اور مصلحتاً فی الوقت حروں کو ان سرگرمیوں سے روک دیا۔ حروں پر انگریزوں نے وہ مظالم توڑے کہ ان کی مثال ۴۴-۱۹۴۳ء میں شہید حریت حضرت سید صبغتہ اللہ ثانی کے دور ہی میں ملتی ہے۔

انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے مظالم کی یاد کو تازہ کر دیا:

برصغیر میں انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں دہلی میں جو مظالم توڑے تھے، سندھ میں ۱۸۹۶ء میں مظالم کی اس خونچکاں داستان کو پھر دہرایا گیا۔ پروپیگنڈے میں انگریزوں کو کمال حاصل ہے۔ سندھ میں آزادی کی اس داستان کو انہوں نے تاریخ کا جزو بننے نہ دیا۔ اُن کے مورخین اور پرچہ نویسوں نے پیر علی گوہر شاہ اور حضرت پیر صبغتہ اللہ ثانی کو تحریک آزادی کے اعلیٰ کردار کو رہزنوں اور ڈاکوؤں کی صورت میں پیش کیا اور سندھ کی اُس دور کی زریں تاریخ کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ حقیقتوں کو اس قدر بگاڑا کہ جھوٹ پر سچ کا گمان ہونے لگا۔

بچو فقیر کی داستان صاحب تاریخ سندھ کی زبانی:

خداداد خاں مؤلف لب تاریخ سندھ کے کردار کے متعلق ہم گزشتہ اوراق میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ وہ انگریزوں کا اس قدر ثناخواں اور ان کی داد و دہش سے اس قدر متاثر ہے کہ وہ حروں کا تذکرہ بھی نہایت حقارت سے کرتا ہے۔ مثلاً بچو (حر) کے متعلق اس نے جیمس کمشنر سندھ کے زمانے میں جب وہ دوبارہ کمشنر سندھ ہو کر آیا تھا لکھا ہے کہ:

> ۱۸۹۶ء میں بچو موچی جو مشہور حر تھا، بلکہ حروں کا سرگروہ تھا، شہر سانگھڑ ضلع تھرپارکر میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی گرفتاری کے بعد جیمس نے شادی پلی موضع میں ایک دربار منعقد کیا اور ان میں سے اکثر عہدہ داران پولیس اور ملکی لوگوں اور زمینداروں وغیرہ کو جنہوں نے ان فسادیوں کے استیصال میں گورنمنٹ کی مدد کی تھی تلواریں اور لونگیاں وغیرہ دے کر

---

[1] سر چارلس اولیونٹ کے یہ تمام حالات لب تاریخ سندھ، ص ۲۵۴ تا ۲۶۳ سے ماخوذ ہیں۔

انعام و اکرام سے نوازا اور پیر علی گوہر شاہ کو شمس العلماء اور خان بہادر محمد یعقوب خان کو سرداری کے لقب سے نوازا۔

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی صراحت:

سندھ کی تاریخ کے ایک عظیم محقق نے جنہوں نے "لب تاریخ سندھ" کو ایڈٹ کیا ہے "بچو موچی" پر توضیحی نوٹ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ مؤلف "لب تاریخ سندھ" سے سہو ہوا ہے کہ اس نے بچو کو موچی لکھا ہے حالانکہ وہ خاصخیلی قبیلے سے تھا اور موچی اس کا دوسرا ساتھی تھا، جس کا نام "گلہ" تھا۔ حروں کی دوسری مہم جو ۹۶-۱۸۹۵ء میں انگریزوں کے خلاف چلی اس کے بارہ قائد تھے، جو "دوازدہ باغی" کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے ایک انقلابی کونسل بنائی تھی۔ اُن میں آٹھ کے نام بالتحقیق معلوم ہیں (۱) بچو خاصخیلی، جس کو بادشاہ قرار دیا گیا (۲) پیر بخش وسان، جس کا لقب وزیر تھا (۳) گلہ کفش دوز (۴) نگیہ چانگ (۵) بھلو گاھ (۶) خمیسہ وسان (۷) ختہ قاضی (۸) فلاں قصائی۔[1]

جیمس کی روانگی:

اسی زمانے میں جیمس تیسری مرتبہ امور قحط سالی کے تصفیے کے لیے کلکتہ روانہ ہوا۔

کمشنر پانزدہم

مسٹر ونگیٹ (Mr. Wingate)

قائم مقام کمشنر

۱۸۹۷ء میں جیمس کی جگہ مسٹر ونگیٹ قائم مقام کمشنر سندھ ہو کر آیا۔ اس کے ماتحت مسٹر جی سلیڈن اور بعد میں مسٹر لارنس تھے، جو اس کے نائب یا مددگار تھے۔

کراچی میں مرض طاعون:

اس کمشنر کی حکومت کے زمانے میں کراچی میں مرض طاعون پھیلا۔ خداداد خاں جو انگریزوں کی تعریف کے پل باندھتا ہے، وہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ یہ وبا ٹھٹھہ، حیدرآباد، کوٹری، سکھر اور شکارپور اور سندھ کے دوسرے دیہات اور مواضعات میں پھیل گئی۔ حکومت انگلشیہ نے اس کے دفعیے کے لیے طرح طرح کی تدابیر اختیار کیں۔ یورپین ڈاکٹر اس کے لیے مقرر کیے گئے، جن کی کوششوں سے یہ بیماری دور ہوئی اور آہستہ آہستہ تمام شہروں سے اس مرض کا انسداد ہوا۔ اس وبا میں پانچ ہزار انسانوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کا وضاحتی نوٹ:

عہد حاضر کے سندھ کی تاریخ کے محقق ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے لکھا کہ اس مرض مہلک سے مرنے والوں کی جو تعداد خداداد خاں نے دی ہے، وہ اعداد بالکل غلط ہیں۔ اُن لوگوں کا بیان ہے، جنہوں نے اس وبا کو دیکھا تھا کہ دو لاکھ سے زائد انسان پورے سندھ میں اس مرض سے مرے اور نواحی اضلاع خصوصاً دیہات اور قصبوں میں انگریزی حکومت کی طرف سے علاج اور دوا کا کوئی بندوبست نہ تھا۔

مسٹر ونگیٹ کی روانگی:

لطف یہ ہے کہ اس بے پروا اور غافل کمشنر کو پلیگ میں حسن کارگزاری کی بنا پر ترقی دے کر بمبئی حکومت کا چیف سیکریٹری بنایا گیا اور دوسرے انتظام تک مسٹر آر جائلس کلکٹر کراچی کو عارضی طور پر کمشنر سندھ کا عہدہ سپرد کر دیا گیا کہ جب تک جیمس واپس ہو، وہ اس وقت تک اس عہدے پر کام کرے۔

مسٹر آر جائیلس (Mr. R. Giles)

قائم مقام کمشنر سندھ

مسٹر ونگیٹ کے بعد ۱۸۹۸ء میں مسٹر آر جائیلس سندھ کا قائم مقام کمشنر ہو کر آیا۔ چونکہ یہ سندھ کے اکثر اضلاع میں ڈپٹی کلکٹر اور شکارپور و کراچی کا کلکٹر رہا تھا، اس لیے سندھ کے متعلق اس کا تجربہ بڑھا ہوا تھا۔ ابتدا میں مسٹر جی سلیڈن اس کا نائب و مددگار تھا۔

حروں کا جذبہ آزادی:

اس کے زمانے میں حروں کے جذبہ حریت نے انگریزوں کے طوق غلامی کو توڑنا چاہا۔ پھر شاہ مردان پر دباؤ ڈالا گیا اور صورت حال کچھ

---

[1] لب تاریخ سندھ، ص ۲۶۴۔

بہتر ہو گئی۔[1]

مسٹر ایچ ای ایم جیمس
(Mr. H.E.M James)
کی دوبارہ سندھ کی کمشنری پر آمد

۱۸۹۸ء میں مسٹر جیمس دارالسلطنت کلکتہ کے امور قحط سالی سے فارغ ہو کر دوبارہ سندھ کی کمشنری پر آیا۔ مسٹر کینڈل اس کا مددگار تھا۔

مسٹر جیمس کی روانگی:

۱۸۹۸ء میں مسٹر جیمس کمشنری سندھ سے سبکدوش ہو کر بمبئی روانہ ہوا۔ کیماڑی پر اس کی رخصتی پارٹی کی گئی۔

مسٹر آر جائیلس (Mr. R. Giles)
تیسری مرتبہ کمشنری سندھ پر

۱۸۹۸ء میں جیمس کی جگہ تیسری مرتبہ آر جائیلس قائم مقام کمشنر سندھ ہو کر آیا۔ ابتداء میں اس کا مددگار مسٹر کینڈل، اس کے بعد مسٹر وان اور پھر مسٹر ریو تھے۔

اس نے سندھ کے اکثر حصوں کا دورہ کر کے آباد و غیر آباد، سیلابی اور چاہی زمینوں کا معائنہ کر کے لگان مقرر کیا۔

مسٹر جیمس تیسری مرتبہ کمشنری سندھ پر

۱۸۹۹ء میں ممبری کونسل بمبئی سے جیمس کمشنری سندھ پر آیا۔

دسمبر ۱۸۹۹ء میں شاہ مردان کے مقدمے میں کامیابی کی خبر عام ہوئی۔ سر مظفر علی شاہ نے عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کی، لیکن یہ اپیل ۲۳ دسمبر ۱۸۹۹ء کو رد کر دی گئی۔

انگریزوں کی خوشامد کا صلہ

اسی کمشنر کے زمانے میں مارچ ۱۹۰۰ء میں سکھر کے جلسۂ عام میں خداداد خاں مؤلف لب تاریخ سندھ کو اس کی انگریز پرستیوں کے صلہ میں جیمس کمشنر سندھ نے اس کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے اور تین سو ایکڑ زمین کی سند جاگیر مری اور اپنی تقریر میں کہا کہ:

سر چارلس نیپیئر

مسٹر خداداد خاں ۱۸۵۳ء میں گورنمنٹ برطانیہ کی ملازمت میں منسلک ہوا۔ ۱۸۵۵ء میں فریڈرک گولڈ سمنڈ کے تحت صیغہ جاگیرات و پولیٹیکل متعین ہوا۔ اس نے ہندوستان کے غدر کے زمانے میں گولڈ سمنڈ کے ساتھ انگریزوں کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے بیابانوں اور ریگستانوں کے دورے کیے۔ مخصوص اور خفیہ مشن پر جو اب تک خفیہ ہے، اسے جیسلمیر اور مارواڑ روانہ کیا گیا۔ پھر ۱۸۶۱ء میں خفیہ امور کے سلسلہ میں اس کا انتخاب ہوا اور اسے سر ہنری گرین پولیٹیکل ایجنٹ بلوچستان کے ہمراہ گوادر اور مکران روانہ کیا گیا۔ ۱۸۶۲ء میں اس نے جام لس بیلہ اور خان قلات کے علاقے میں تار برقی میں مدد دی۔۔۔ ولیم میری ویدر (کمشنر سندھ) اس پر بے حد اعتماد کرتا تھا اور چند خفیہ نازک سیاسی امور اس کے سپرد کیے گئے اور اس کی کمال واقفیت سے ولیم میری ویدر نے فائدہ اٹھایا۔۔۔ پنتالیس سال کی ملازمت کے بعد وہ اپنی ملازمت سے پنشن پر سبکدوش ہو رہے ہیں۔[2]

پھر مسلسل انگریزوں کے کمشنر آتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۶ء میں سندھ بمبئی پریذیڈنسی سے علیحدہ کر دیا گیا اور اسے خود مختار صوبے کی حیثیت ملی۔ سر لینسی لارڈ گراہم اپریل ۱۹۳۶ء میں گورنر سندھ ہو کر آیا اور ۱۹۴۱ء تک سندھ کا گورنر رہا۔ اپریل ۱۹۴۱ء میں سر ہوچ ڈوسندھ کا گورنر ہو کر آیا اور ۱۹۴۶ء تک سندھ کا گورنر رہا۔ جنوری ۱۹۴۶ء میں سر فرانسس مودی سندھ کا گورنر ہو کر آیا۔ یہاں تک کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان عالم وجود میں آیا اور ۱۹۴۷ء میں سندھ کے پہلے گورنر سر غلام حسین ہدایت اللہ مقرر ہوئے۔

---

[1] لب تاریخ سندھ، ص ۲۷۲ تا ۲۷۳۔

[2] لب تاریخ سندھ، ص ۲۸۹ تا ۳۰۳۔

باب :29

سندھ میں انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کی سیاسی تحریکیں

سندھ کے پہلے بزرگ جنہوں نے سندھ میں شمع آزادی روشن کی[1]

اگرچہ ۱۸۲۶ء میں سب سے پہلے جو منظم مذہبی اور سیاسی تحریک ٹالپوروں کے عہد میں سندھ میں آئی، وہ حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹالپوروں کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد برطانوی حکومت کے استبداد نے اہل سندھ کے قلوب میں حریت کے چراغ کو روشن کر دیا تھا۔ غیر ملکی حکومت کا طوفان پوری استعمارانہ قوت سے انہیں کچل رہا تھا اور اس صوبے کے بزرگ حریت و آزادی کی شمع کو روشن رکھنے کے ساتھ اسلامی روح، اسلامی فکر، اسلامی کردار اور اسلامی سرمایۂ زندگی کو محفوظ رکھنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔

ٹیاری کے مخدوم عبدالکریم جو میروں کے عہد میں سندھ کے بڑے عالم تھے، انگریزی حکومت سے بیزار ہو کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہاں سے اپنے شاگردوں اور مریدوں کی انگریزی سامراج کے خلاف جدوجہد کی رہنمائی کرتے رہے۔ حضرت سید صبغتہ اللہ اول نے جس طرح ان کا ساتھ دیا اور انگریزوں اور سکھوں کے خلاف جو رہنمائی کی وہ ہم حضرت سید احمد شہید کی تحریک کے ضمن میں آیندہ اوراق میں تحریر کریں گے۔

مخدوم عبدالکریم کا لگایا ہوا یہ بیج شمالی اور جنوبی سندھ میں شجر ثمر دار بنتا گیا۔ شہداد پور اور شہداد کوٹ ضلع لاڑکانہ میں مولانا نور محمد اور ان کے دو صاحبزادوں مولانا گل محمد اور مولانا غلام صدیق نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی۔ مولانا غلام صدیق کی انگریز سامراج سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ اگر شہداد کوٹ میں کوئی انگریز آجاتا تو وہ شہر میں نہ نکلتے کہ مبادا وہ انگریز آفیسر جس نے سندھ کو غلام بنایا تھا، کہیں نظر آجائے، اگر اتفاق سے باہر آبھی جاتے تو منہ ڈھانپ لیتے۔

ان کے مشہور مرید مولانا عبدالقادر پنہور، مولانا عبدالرحمٰن سکھری اور مولانا تاج محمود امروٹی تھے۔ مولانا امروٹی نے آزادی کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

جب خلافت کی تحریک شروع ہوئی تو شمالی سندھ میں مولانا تاج محمود امروٹی اور جنوبی سندھ میں مولانا محمد صادق کھڈے والے اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ پیر رشید الدین جھنڈے والے اور شیخ عبدالمجید سندھی بھی تحریک خلافت میں شریک ہو گئے۔[2]

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ کے عالموں، رہنماؤں اور عوام کے قلوب میں آزادی کی کتنی تڑپ تھی اور وہ انگریزوں کی غلامی کے جوئے کو کس طرح اُتار کر پھینک دینا چاہتے تھے۔

ٹالپوروں کے عہد میں (۱۸۲۶ء) سب سے پہلے جو مذہبی اور سیاسی تحریک سندھ میں آئی، وہ حضرت سید احمد شہید بریلوی کی مذہبی اور سیاسی تحریک تھی۔

اگرچہ اس تحریک کا سرچشمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تھے جنہوں نے اٹھارویں صدی عیسوی کی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا

---

(1) ملخص سندھ کوائرلی، مضمون آزادی کی جدوجہد میں سندھ کا حصہ، مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی، ص ۷ تا ۱۹۔

(2) یہ تمام تفصیل سندھ کوائرلی مضمون مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی، ص ۷ تا ۱۹ سے ماخوذ ہیں۔

زمانہ دیکھا تھا۔ عالمگیر کی وفات ہو چکی تھی۔ اس کے بیٹے آپس میں دست و گریباں تھے۔ صوبے خود مختاری کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مرکز کو کمزور پا کر سعادت علی خاں اودھ میں، علی وردی خاں بنگال میں اور نظام الملک دکن میں اپنا اقتدار قائم کر چکے تھے۔ جو علاقہ مرکز کے قبضے میں تھا وہاں جاگیرداری اور اجارہ داری کی رسمیں جاری تھیں۔ جاگیردار حکومت کا ٹیکس ادا کرنے سے گریزاں تھے، دوسری طرف وہ جونک کی طرح کسانوں کا خون چوس رہے تھے۔ ہر طبقہ پریشان حال اور اقتصادی بدحالی میں گرفتار تھا، مرکز کے ملازمین جنہیں نقد تنخواہیں ملتی تھیں ان کی بدحالی کا یہ عالم تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ ہر ایک کاسۂ گدائی ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔

مرکز کی کمزوریوں سے اندرون ملک دوسری سیاسی طاقتیں ابھر رہی تھیں۔ سکھ، مرہٹے، جاٹ اس قدر سر اٹھائے ہوئے تھے کہ انہوں نے اپنی لوٹ مار، قتل و غارتگری سے سماجی زندگی کی چولیں ہلا کر رکھ دیں تھیں۔ عین اس زمانے میں، جب کہ اخلاقی پستی اور معاشی زبوں حالی نے اس برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، ایک بیرونی طاقت بلی کی طرح دبے پنجوں کے ساتھ لیکن بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے اس برصغیر میں اپنے قدم جما رہی تھی۔ آخر اس نے بتدریج پورے ملک پر اپنا قبضہ جما لیا، یہ تھے انگریز۔

نادر شاہ:[1]

برصغیر کا انحطاط شباب پر تھا کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ خدا کا عذاب بن کر نازل ہوا اور دہلی میں قتل عام کرا کر سب کچھ لوٹ کر لے گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بائیس کروڑ روپے خزانہ شاہی سے اور تقریباً نوے کروڑ کے جواہرات اور تخت طاؤس وغیرہ قلعہ معلیٰ سے اس کے ہاتھ لگے۔ اس نے اس کے علاوہ جو دولت شہر سے حاصل کی اس کی تعداد ستر کروڑ بتائی جاتی ہے۔

اس نے سب سے بڑا نقصان یہ کیا کہ ملک کی جغرافیائی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ دریائے سندھ تک کا پورا علاقہ اور پنجاب کے کچھ علاقے ایران کے ساتھ ملحق کر دیے۔ اگرچہ دہلی سے دریائے سندھ تک کا علاقہ محمد شاہ کے پاس رہا، لیکن خزانہ خالی اور معاشی حالات ابتر ہونے کی وجہ سے اس سے کچھ کرتے دھرتے بن نہ آتی تھی۔

سکھ:

نادر شاہ کے حملے کے بعد سکھوں نے ہنگامہ آرائی شروع کی۔ ۱۷۶۴ء میں انہوں نے لاہور پر قبضہ کر کے جہلم سے جمنا تک اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ سکھوں کی ہوس اقتدار اور بڑھی۔ ۱۷۶۵ء سے لے کر ۱۸۰۰ء تک اٹک سے لے کر کرنال تک اور ملتان سے لے کر جموں تک ان کے قبضے میں آ گیا۔

رنجیت سنگھ:[2]

رنجیت سنگھ شاہ زمان بن تیمور شاہ والی افغانستان کے حکم سے لاہور کا حکمران مقرر ہوا۔ ۱۸۰۲ء میں اس نے امرتسر پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۰۹ء میں اس نے ملتان کو لوٹا اور اس شہر کو باج گزار بنایا۔ ۲۵ اپریل ۱۸۰۹ء میں رنجیت سنگھ اور انگریزوں کا معاہدہ ہوا کہ وہ ستلج سے آگے نہیں بڑھے گا اور دریائے ستلج دونوں حکومتوں کے درمیان سرحد ہو گا۔

رنجیت سنگھ کے زمانے میں سکھوں کی طاقت عروج پر پہنچ گئی۔ سکھوں کی تحریک جب تک مذہبی تھی، مسلمان فرمانروا ان کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آتے تھے۔ بابر کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ ہندوستان آیا تو گرونانک کے پاس عقیدت مندانہ حاضر ہوا۔

مختصر یہ ہے کہ جب تک سکھ رہنماؤں نے سیاست میں دخل نہیں دیا، مسلم فرمانروا ان کا احترام کرتے رہے۔ لیکن جوں ہی سکھ کی مذہبی تحریک نے سیاسی چولا بدلا، مسلم فرمانرواؤں نے ان کی مخالفت کی۔

گورو ارجن سنگھ:

گورو ارجن سنگھ نے سکھوں کا ایک سیاسی نظام مرتب کیا۔ اورنگ زیب کے بعد سکھوں کے مظالم اس قدر بڑھ گئے کہ سیر المتاخرین میں ہے کہ:[3]

حاملہ عورتوں کے پیٹ چیر کر ان کا جنین نکالتے اور اس کو قتل کر دیتے تھے۔

لوگ سکھوں کے مظالم سے تنگ تھے۔ شاہ عبدالعزیز نے

---

[1] نادر شاہ بن امام قلی بن نذر قلی، مقام ولادت کوہکان، تاریخ ولادت ۲۲ اکتوبر ۱۶۸۸ء، حملہ دہلی ۲۴ فروری ۱۷۳۹ء، وفات ۲۰ جون ۱۷۴۷ء (تازہ معارک ص ۷۵۰ تا ۷۶۶)

[2] رنجیت سنگھ ولد سردار مہن سنگھ، ولادت ۲ نومبر ۱۷۸۰ء، تلسط لاہور ۱۷۹۹ء، انتقال ۲۷ جون ۱۸۳۹ء (تازہ معارک ص ۸۳۱-۸۳۰)

[3] سیر المتاخرین، ص ۴۰۲۔

سکھوں کے مظالم سے تنگ آکر اپنے چچا کو عربی میں ایک شعر لکھا، جس کا ترجمہ ہے:

سردیوں کا موسم آگیا اور دل پریشان ہے
سکھ قوم سے، اور دل کا یہ اندیشہ معقول ہے

مرہٹے:

اورنگ زیب کے بعد مرہٹوں نے سر اُٹھایا، بادشاہوں کی کمزوری اور ان کے امرا کی نااتفاقیوں نے مرہٹوں کو لوٹ مار اور قتل وغارتگری کا خوب موقع دیا۔ لوگوں کو اپنی زندگی وبال جان معلوم ہونے لگی۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی کہ وہ آئے اور ان کے مظالم سے نجات دلائے۔ چنانچہ احمد شاہ آیا اور پانی پت کے میدان میں اس نے مرہٹوں کی قوت کو پارہ پارہ کر دیا۔

جاٹ:

جاٹوں نے دہلی اور آگرہ کے اطراف میں اپنی گڑھیاں بنا کر قتل وغارت گری شروع کر دی تھی۔

اہل دہلی کی پریشانیوں کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے حافظ جاراللہ کو ایک خط میں لکھا ہے کہ:

دہلی میں ایک عظیم حادثہ رونما ہوا۔ جاٹوں نے دہلی کے شہر کہنہ کو لوٹا اور حکومت ان کے فساد کو روکنے سے قاصر رہی۔ انہوں نے مال لوٹا، عزتوں کو برباد کیا اور مکانات کو آگ لگادی۔

یہ حادثہ اوائل رجب ۱۱۶۱ھ میں شروع ہوا اور آخر شعبان تک رہا۔[1]

ادھر عام مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اور اُدھر مغلیہ حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اس پریشانی کے عالم میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے نجیب الدولہ کو ایک خط لکھا۔ جس میں تحریر فرمایا کہ:

ایک اہم بات یہ ہے کہ مسلمانان ہندوستان نے خواہ وہ دہلی کے ہوں، خواہ اس کے علاوہ کسی اور جگہ کے — کئی صدمات دیکھے ہیں اور چند بار لوٹ مار کا شکار ہوئے ہیں۔ چاقو ہڈی تک پہنچ گیا ہے۔ رحم کا مقام ہے۔ خدا اور اس کے رسول کا واسطہ دیتا ہوں کہ کسی مسلمان کے مال کے درپے نہ ہوں۔

[1] حضرت شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۸۹۔

انگریزوں کا تسلط:

ہمارا سب سے بڑا دشمن انگریز تھا۔ جو اپنی زیرکی اور عیاری کی وجہ سے ہندوستان پر قبضہ جمانے کے لیے کچھوے کی چال چل رہا تھا۔ وہ اس وقت کے ہندوستان میں، سیاسی انتشار، اخلاقی گراوٹ اور معاشی بدحالی کا تماشا دیکھ رہا تھا اور اس کا بہ نظر غائر مطالعہ کر رہا تھا کہ خود سماجی زندگی کو یہاں کے باشندے کس طرح تباہ کر رہے ہیں۔ جب یہ زوال مکمل ہو گیا تو اس نے سب سے پہلے ۱۸۵۷ء میں جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کو جعفر غدار سے سازش کر کے شہید کرایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں اقتصادی خوشحالی کا مرکز بنگال تھا۔ انگریز بنگال پر قبضہ کر کے بگلا بھگت کی طرح مطمئن ہو کر بیٹھ گیا اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی فکر میں لگ گیا۔

سراج الدولہ کی شکست دراصل دوسروں کی لائی ہوئی نہیں بلکہ خود اپنوں کی لائی ہوئی شکست تھی۔ ملت اسلامیہ کی تاریخ میں جعفر و صادق اپنی سیہ کاریوں کی بدولت درس عبرت وبصیرت بن گئے ہیں۔

اقتصادی بدحالی:

اقتصادی بدحالی کا یہ عالم تھا کہ معاشی زندگی کا قوام بگڑ چکا تھا، حضرت شاہ ولی اللہ نے مغل بادشاہ کو ایک خط میں لکھا:

امور سلطنت کے ضعف کا سبب خالصہ کی کمی اور خزانے کی تنگی ہے۔

معاشرے اور تمدن کی یہ کیفیت تھی کہ کبھی جو دہلی درویشوں کی خانقاہوں کا مرکز اور علم و عرفان کا گہوارہ بنی ہوئی تھی، وہاں معاشرے اور تمدن کا توازن درہم برہم ہو چکا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے معاشرے کے بگڑتے ہوئے حالات کو دیکھ کر احمد شاہ ابدالی[2] کو ایک خط میں لکھا کہ:

اگر یہی حالت رہی تو چند روز بھی نہ گزریں گے کہ مسلمان ایسی قوم ہو جائیں گے کہ وہ نہ اسلام کو جائیں گے، نہ کفر کو۔

اس کے علاوہ انگریزوں کے تسلط نے ہندوستان کے معاشی حالات پر ایک اور ضرب کاری لگائی۔ انگریزوں نے ہندوستان کی دولت

[2] احمد شاہ ابدالی: احمد خاں بن زماں خاں ابدالی درانی ولادت ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۲ء)، مقام ولادت ملتان، تخت نشینی رجب ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء)، فتح پانی پت ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۰ء)، (تازہ نوائے معارک، ص ۷۶۹ تا ۷۷۹)۔

کے رخ کو انگلستان کی طرف پھیر دیا۔ دیسی صنعتوں کو ختم کر کے ہندوستان کے کاریگروں اور ہنر مندوں کو مفلس و قلاش بنایا اور ہندوستان کو انگلستان کی منڈی بنا کر انگلستان کے مال کی کھپت کو ہندوستان میں تیز تر کر دیا اور ہندوستان کے معاشی حالات کو تباہ کر دیا۔

مذہب و اخلاق:

اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے مسلمان پستی کے انتہائی دور سے گزر رہے تھے۔ بیرونی طاقتیں اور اندرونی خلفشار، مغلیہ حکومت کے ڈھانچے کو کمزور سے کمزور تر کر رہے تھے۔ ایک عجیب بے کیف زمانہ تھا۔ اخلاقی قدروں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ بادشاہوں کی زندگی عیاشانہ اور مسرفانہ تھی۔ علماء سوء اور صوفیائے خام نے غیر اسلامی فکر و کردار کو اپنا طریقہ کار بنایا ہوا تھا، تصوف کے سرچشمے قرآن و حدیث سے ہٹ چکے تھے، صوفیائے خام توہمات کو ہوا دے کر اپنے بازاروں کی رونق بڑھا رہے تھے۔ فسق و فجور عام تھا، بری رسومات رواج پا رہی تھیں۔ کاہلی اور فضول خرچی نے زندگی کو ایک عذاب بنا دیا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تحریک

ان یاس انگیز حالات میں مسلمانان ہند کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے والے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ہیں، جو اُفق ہندوستان پر آفتاب بن کر روشن ہوئے۔ شاہ صاحب نے مسلمانان ہند کی ساری پستیاں دیکھی تھیں۔ اُن کو قدرت نے دل ہمہ درد سے نوازا تھا۔ شاہ صاحب نے حالات کو بد سے بدتر دیکھ کر ایک تحریک کی بنیاد رکھی کہ جو ایسا انقلاب لائے جو سماج کے معاشی، سیاسی، اقتصادی غرضیکہ پورے ڈھانچے کو بدل ڈالے اور عوام کے قلوب میں اسلام کی روح کو بیدار کرے، شاہ صاحب نے اپنے قلم کو بھی اس جہاد کے لیے وقف کیا اور اصلاحی نظریات کو مرتب کر کے ان کے فروغ و اشاعت کے لیے ٹریننگ سینٹر قائم کیے۔ ان کی تحریک انسانوں کے بنیادی حقوق، بین الاقوامی تحفظات، سیاست اور نظام حکومت کے بنیادی اصول اور عام مسلمانوں کی دینی زندگی اور جذبۂ جہاد پر مشتمل تھی۔ حجتہ اللہ البالغہ، البدور البازغہ، فیوض الحرمین اور تفہیمات میں حضرت شاہ صاحب کی تحریک کے عناصر پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ نے اپنے نظریات کو کبھی ترجمہ قرآن مجید کے رنگ میں پیش کیا اور کبھی اپنی کتابوں کے ذریعے سے پیش کیا۔

افسوس ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کو اس تحریک کے نشر و اشاعت کے لیے پریس کی طاقت میسر نہ ہو سکی۔ صرف ان کے قلم کی طاقت کتابوں تک محدود رہی۔ جو ان کی وفات کے ڈیڑھ سال بعد چھپیں۔ حضرت شاہ صاحب کے ذرائع ابلاغ محدود تھے۔ ان کی نشر و اشاعت کا ذریعہ تقریریں تھیں یا تعلیم و تربیت کے وہ حلقے تھے جو انہوں نے قائم فرمائے تھے۔ اگر ان کو عہد حاضر کے ابلاغ کے ذرائع میسر آتے تو ہندوستان کی کوئی تحریک اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔

حضرت شاہ عبد العزیز:

حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے حضرت شاہ عبد العزیز اُن کے جانشین ہوئے، انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک کو عوام کا ایک جذبہ بنا دیا۔ اس تحریک کے لیے ہزاروں نوجوان اپنی زندگیاں وقف کر چکے تھے اور یہ تحریک ایشیا کے مسلمانوں کے مزاج کا ایک جزو بن چکی تھی۔ شاہ عبد العزیز نے ولی الٰہی تحریک کو عام بنانے کے لیے جو طریقہ ہائے کار اختیار کیے وہ یہ تھے۔

(۱) درس و تدریس (۲) روحانی تربیت (۳) عوامی جلسوں اور اجتماعات میں تقریریں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت شاہ عبد العزیز کی تربیت گاہ سے جو حضرات تربیت پا کر نکلے وہ آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔

حضرت شاہ عبد العزیز کو اس راہ کی سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا، ان کے ساتھ غنڈہ گردی کی گئی، ان کا مکان ضبط کر لیا گیا۔ آپ کو مع اہل و عیال کے شہر بدر کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ آپ کے قتل کی سازش کی گئی اور آپ کو دو مرتبہ زہر دیا گیا، لیکن آپ آواز حق کو بلند کرنے سے نہ رکے۔

انگریزوں کا اقتدار بڑھتا جا رہا تھا۔ شمالی ہند میں میمن سنگھ اور چاٹگام سے لے کر دہلی تک انگریزوں کا اقتدار قائم ہو چکا تھا کہ حضرت شاہ عبد العزیز نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا۔

انگریزوں کے خلاف فتویٰ:

حضرت شاہ عبد العزیز کے اس فتویٰ کا ماحصل یہ تھا کہ:

قانون سازی کے جملہ اختیارات عیسائیوں کے ہاتھ میں ہیں، مذہب کا احترام ختم ہے، شہری آزادیاں سلب کر لی گئیں ہیں، لہٰذا ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس اجنبی طاقت سے اعلان

جنگ کرے اور جب تک اس کو ملک بدر نہ کردے اس ملک میں زندہ رہنا اپنے لیے حرام جانے۔[1]

حضرت سید احمد سید بریلوی:

اس کے بعد جنہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک کی اپنے خون سے آبیاری کی اُن میں یہ تین نام گل سر سید کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں اور ہماری تاریخ آزادی کا عنوان جلی ہیں، جن کی عطا کردہ روشنی میں ہمارے قافلے آیندہ آگے بڑھتے رہیں گے۔

(۱) حضرت سید احمد شہید بریلوی (۲) مولانا محمد اسماعیل شہید (۳) مولانا عبدالحیؒ۔

یہ تینوں بزرگ ہماری آزادی کا وہ سنگ بنیاد ہیں، جس پر سو سال کے بعد حضرت قائد اعظم علیہ الرحمہ نے اسلامی مملکت کا وہ قصر آزادی تعمیر کیا، جو ہمارا وطن ہے اور جسے ہم پاکستان کہتے ہیں۔

یہ ان ہی بزرگوں کی برکت ہے کہ جہاں جہاں ان بزرگوں کے قدم گئے وہیں وہیں سے انگریز اور سکھوں کا نشان مٹ گیا۔

حضرت سید احمد شہید رائے بریلی کے رہنے والے تھے۔ آپ کے بزرگوں کی خانقاہ تکیہ علم اللہ کے نام سے مشہور تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اس خانقاہ کو اپنی تعلیم و تربیت کا مرکز بنایا تھا۔

حضرت سید احمد شہید نے جو کچھ بھی تعلیم پائی، حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی سے حاصل کی جو اکبر آبادی مسجد[2] میں درس دیتے تھے۔ ۱۲۲۲ھ میں حضرت سید احمد شہید نے حضرت شاہ عبدالعزیز سے سلسلہ نقشبندیہ، قادریہ اور چشتیہ میں بیعت کی۔

انقلابی پروگرام:

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے حضرت سید احمد شہید کی قیادت میں ایک جماعت بنائی، جس کے مشیر مولانا عبدالحیؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہید قرار دیے گئے۔ اس جماعت کا فرض قرار دیا گیا کہ:

(۱) ملک میں روح انقلاب پیدا کی جائے۔ یہ انقلاب صرف سیاسی نہ ہو بلکہ سماجی اصلاح بھی اس کا مقصد ہو۔

(۲) رضاکاروں کو بھرتی کر کے فوجی تربیت دی جائے۔

(۳) مالیہ فراہم کیا جائے۔

اس مقصد کے لیے مردان حق کا یہ کارواں ۱۲۲۴ھ (۱۸۱۸ء) میں پچاس آدمیوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ جس نے دہلی سے رائے بریلی تک اور رائے بریلی سے بنارس اور لکھنؤ کا دورہ کیا۔ اس دورے میں زیادہ تر سماجی اصلاح اور جہاد فی سبیل اللہ پر زور دیا گیا۔ اصلاحی خدمات کے ساتھ ورزش اور چاند ماری بھی جاری رہی۔

اس کے بعد سید صاحب کی قیادت میں متعدد دورے کیے گئے، یہاں تک کہ ۱۸۲۲ء میں ایک کارواں کے ساتھ آپ نے حج کیا۔

حرمین شریفین سے مراجعت کے بعد سید صاحب جہاد کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ ان کی دلی تمنا یہ تھی کہ اسلام اپنی صحیح شکل و صورت میں پوری عظمت سے جلوہ گر ہو۔ وہ ہر مسلمان کے قلب میں ایثار و قربانی کی روح پیدا کرنا چاہتے تھے۔ حج سے آنے کے بعد ایک سال اور دس مہینے دعوتِ جہاد میں بسر ہوئے۔ آپ کا جہاد کی نیت سے ہجرت کا عزم ایک نیا عزم تھا۔

سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جہاد:

دراصل سید صاحب کا یہ عزم جہاد سکھوں کے بھی خلاف تھا اور انگریزوں کے بھی۔ پنجاب کی سکھ حکومت مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھا رہی تھی۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اُن کا یہ عزم سکھوں کے خلاف تھا۔ لیکن دراصل سید صاحب کا عزم جہاد سکھوں اور انگریزوں دونوں کے خلاف تھا۔ سید صاحب کا خیال تھا کہ تمام مسلمانوں کو جہاد کی روح سے معمور کر دیا جائے۔ ان کی تمنا یہ تھی کہ اعلاء کلمۃ الحق ہو، وہ صرف سکھوں سے نہیں بلکہ تمام غیر مسلم قوتوں سے لڑنا چاہتے تھے اُن کے نزدیک انگریزوں کا خطرہ سب سے بڑا خطرہ تھا۔

سندھ میں حضرت سید احمد شہید کی تحریک

حضرت سید احمد شہید مورخہ ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء (۱۲۴۲ھ) بعزم جہاد و ہجرت مجاہدین کے ایک چھوٹے سے کارواں کے ساتھ رائے بریلی سے اجمیر روانہ ہوئے۔ مجاہدین کی جماعت بندی رائے بریلی ہی میں کر لی

---

[1] ہم نے حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے حالات کی تفصیل علماء کا شاندار ماضی، جلد ۲، ص ۱ تا ۸۸ سے چیدہ چیدہ لی ہے۔

[2] اکبر آبادی مسجد، تعمیر مسجد: ۱۰۶۱ھ (۱۶۵۰ء)، بعہد شاہجہان، بانی مسجد: اعزاز النساء بیگم شاہجہاں، خرچہ تعمیر: ڈیڑھ لاکھ روپے (سید احمد شہید، مولانا مہر، ص ۷۱)۔

گئی تھی۔ گوالیار پہنچنے کے بعد سید صاحب نے مجاہدین کو پانچ جماعتوں میں تقسیم کیا اور اُن کے سپہ سالار مقرر فرمائے۔ گوالیار سے ٹونک تشریف لائے۔ ٹونک سے اجمیر تشریف لائے۔ اجمیر سے پالی تشریف لائے پھر کٹھیار سے جودھ پور آئے۔ اس کے بعد سندھ میں داخل ہوئے۔

جب آپ سندھ میں تشریف لائے تو اس وقت سندھ میں ٹالپوروں کی حکومت تھی۔ جیسے ہی میران حیدرآباد کو آپ کی تشریف آوری کا حال معلوم ہوا، انہوں نے سید صبغتہ اللہ ولایتی کو آپ کے استقبال کے لیے بھیجا۔ سید صبغتہ اللہ مکہ معظمہ ہی میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اور وہ اس وقت میر کرم علی خاں کے مصاحب تھے۔

شہر حیدرآباد سے دو تیر کے فاصلے پر مجاہدین کا لشکر ٹھہرایا گیا۔ میران حیدرآباد کی طرف سے مجاہدین کی تواضع کے لیے مٹھائی بھیجی گئی اور ضروری جنس لشکر میں پہنچائی گئی۔ آم اور خربوزے بھی بڑی مقدار میں بھیجے گئے۔

تیسرے دن جمعہ تھا۔ میرانِ حیدرآباد نے کہلا بھیجا کہ جمعہ کی نماز آپ قلعے میں ہمارے ساتھ ادا فرمائیں۔ چنانچہ سید صاحب آٹھ آدمیوں کو ساتھ لے کر قلعے میں گئے۔ میرانِ حیدرآباد آپ سے مل کر بے حد خوش ہوئے۔ ہجرت و جہاد کا عزم دیکھ کر وہ متحیر ہوئے پھر انہوں نے کہا کہ کچھ دن آپ یہاں قیام فرمایئے اور اپنے اہل و عیال کو بھی یہاں ٹھہرا دیجیے، آپ نے فرمایا اگر میں یہاں کچھ دن ٹھہرا تو سردیاں شروع ہو جائیں گی اور پھر سفر میں برف باری کی دقتیں پیش آئیں گی۔ میروں نے آپ کی خدمت میں ایک ہزار روپیہ نقد، ایک بندوق اور ایک جوڑی طمنچوں کی پیش کی۔

بقول مولانا غلام رسول مہر مرحوم حیدرآباد میں سید صاحب کے دست حق پرست پر ہزارہا لوگوں نے بیعت کی جن میں خاص طور پر قابل ذکر یہ ہیں:

(۱) میر اسماعیل شاہ جو نائب وزیر کے عہدے پر مامور تھے۔

(۲) حافظ مولوی محمد یوسف جو گورنر سندھ کی طرف سے دربار میرانِ حیدرآباد میں وکیل تھے۔

(۳) محمد یوسف خاں جو اُمرائے سندھ میں سے تھے۔[1]

پیر گوٹھ میں قیام:

میرانِ حیدرآباد نے اگرچہ خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، لیکن اُن کا قلب ذوق جہاد سے خالی تھا، لہٰذا سید صاحب کے لیے اُن میں اور اُن کے شہر میں کیا کشش ہو سکتی تھی۔

آپ ذیقعدہ ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۷ء) کو حیدرآباد سے پیر گوٹھ روانہ ہوئے۔ دو کشتیاں آپ نے کرائے پر لیں اور ایک بجرہ میران حیدرآباد نے عاریتاً دیا۔ مجاہدین کا یہ کارواں جب رانی پور پہنچا تو سید صالح شاہ بغدادی نے سارے لشکر کو کھانا کھلایا۔ یہیں آپ کی ملاقات حضرت سید صبغتہ اللہ شاہ اول سے ہوئی۔

سید صبغتہ اللہ اول جن کا ذوق جہاد سید احمد شہید کی تحریک سے ہم آہنگ تھا

حضرت سید صبغتہ اللہ اول بن حضرت پیر محمد راشد سندھ کے مشہور صوفیائے کرام کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو حضرت پیر محمد راشد روضہ دھنی کے بعد مسند آرائے رشد و ہدایت ہوئے اور دستارِ سجادگی ان کے سر پر باندھی گئی۔ اس خاندان میں یہ پہلے پیر ہیں جو "پیر پاگارہ" (صاحب دستار) کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت سید علی مکی رحمتہ اللہ علیہ سے جا ملتا ہے جو اسلام کے ابتدائی دور میں حجاز سے نکل کر بغداد پھر سندھ پہنچے تھے۔ حضرت صبغتہ اللہ اول کا شجرۂ نسب یہ ہے:

سید صبغتہ اللہ اول بن سید محمد راشد (روضہ والا) بن سید محمد بقا بن سید محمد امام بن سید فتح محمد بن سید شکر اللہ بن سید عثمان بن سید کھتن بن سید سنگیرہ (سنجر) بن سید بولن بن سید حسین بن میر علی بن شاہ ناصر الدین بن سید عباس بن سید فضل اللہ بن شہاب الدین بن سید محمود بن سید محمد بن شاہ حسین بن چنگہ (شاہ چکن) بن سید علی مکی[2]۔ سید علی مکی عرب سے سندھ تشریف لائے اور لکی ضلع دادو میں جو اُن کے نام سے لکعلوی مشہور ہے سکونت اختیار کی۔ ان کی اولاد سادات لکیاری سے مشہور ہے۔

سندھ میں یہ خاندان سادات کا اہم ترین خانوادہ ہے۔ اس خاندان کے افراد تصوف اور علم و عمل کا آفتاب بن کر اُبھرے اور طریقت اور علوم و فنون اسلامیہ کی خدمت سے سندھ کو گل و گلزار بنا دیا۔ اس

---

[1] یہ تمام تفصیل سید احمد شہید، تالیف مولانا مہر، ص ۲۹۸ تا ۳۰۰ سے ماخوذ ہے۔

[2] تکملہ مقالات الشعراء، حاشیہ نمبر 1، ص 422۔

خاندان میں بہت سے شعراء، اہل کمال اور اصحاب تصوف ایسے پیدا ہوئے کہ تاریخ سندھ کو ان پر فخر ہے۔

ان کے دوسرے بھائی محمد یاسین علم یا جھنڈا لے کر دوسری جگہ چلے گئے اور پیر جھنڈا کے لقب سے مشہور ہوئے۔

پیر صبغتہ اللہ شاہ اول کی وفات کے بعد جس نے مسند سجادگی کو آراستہ کیا وہ پیر علی گوہر اول ہیں۔ ان کی وفات کے بعد جس نے مسند سجادگی کو زینت بخشی وہ پیر حزب اللہ شاہ ہیں۔ ان کی وفات کے بعد جو مسند آرائے رشد و ہدایت ہوئے وہ پیر گوہر ثانی ہیں۔ پھر شاہ مردان سریر آرائے بزم طریقت ہوئے۔ شاہ مردان کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے پیر صبغتہ اللہ ثانی جلوہ افروز مسند طریقت ہوئے جنہوں نے انگریزوں سے بغاوت کر کے دار و رسن کی آزمائش کو قبول کیا مگر فرنگی استبداد کے سامنے سر نہ جھکایا۔ بلاشبہ وہ آزادی کے علمبردار تھے۔ ہم موقع و محل سے اس مرد مجاہد کے حالات لکھیں گے۔

پیر سید صبغتہ اللہ ثانی کی شہادت کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادے پیر سکندر شاہ، شاہ مردان ثانی کے لقب سے اب مسند سجادگی پر رونق افروز ہیں۔ اُن کے سیاسی اور ملی کارناموں سے پاکستان کا ہر فرد واقف ہے۔

چونکہ حضرت سید صبغتہ اللہ اول کا تعلق حضرت سید احمد شہید کی تحریک سے ہے، اس لیے ہم حضرت سید صبغتہ اللہ اول کے حالات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

سید صبغتہ اللہ اول نے جب مسند رشد و ہدایت کو زینت بخشی تو اس وقت ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ پنجاب پر سکھوں کا تسلط تھا اور سندھ پر انگریز اور سکھ نظریں جمائے ہوئے تھے۔ ان مایوس کن حالات نے مسلمانوں کو سراسیمہ، حیران اور پریشان بنا رکھا تھا۔ سارے معاشرے پر تنزل و انحطاط کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ مذہب کی روح ختم ہو چکی تھی۔ لوگ صدہا اخلاق عیوب اور گمراہیوں میں مبتلا تھے۔ رسمی تصوف اس لیے بے روح ہو کر رہ گیا تھا کہ وہ جمال شریعت سے آراستہ نہ تھا۔ ان بگڑے ہوئے حالات میں حضرت سید پیر صبغتہ اللہ اول نے رشد و ہدایت کی شمع روشن کی۔

سکھ سندھ کی طرف پھیلنے لگے اور انگریز اپنے معاہدوں کی زنجیروں کے ذریعے اہل سندھ کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے لگے تو حضرت پیر صبغتہ اللہ اول نے جہاد کا عزم مصمم کر لیا۔ آپ کا کوئی وعظ جہاد کی ترغیب اور فضائل سے خالی نہ ہوتا تھا۔ "کچھ" اور "لار" کے مرید ان کے مواعظ میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔ لہٰذا آپ ان پر خطوط کے ذریعے سے جہاد کی فضیلت اور اہمیت کو واضح کرتے تھے۔

سید صبغتہ اللہ شاہ اول کی روحانی اور علمی مقبولیت کا اندازہ اس بیان سے کیجیے جو سید حمید الدین نے سید صبغتہ اللہ شاہ اول کے متعلق تحریر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

> باشندگان سندھ کے نزدیک سارے ملک میں ان (پیر صبغتہ اللہ) جیسا کوئی شیخ و مرشد نہیں۔ تقریباً تین لاکھ بلوچ ان کے مرید ہیں۔ مرجع خلائق ہیں۔ جاہ و جلال سے زندگی گزار رہے ہیں۔ جود و کرم، اخلاص و مروت میں شہرۂ آفاق ہیں۔

ان کا کتب خانہ بڑا عجیب و غریب کتب خانہ ہے۔ بادشاہوں اور امرا کے پاس بھی ایسا کتب خانہ نہ ہو گا۔ پندرہ ہزار معتبر کتابیں اس میں موجود ہیں۔

حُر تحریک کا نقطۂ اول:

ان ہی مریدوں میں سے حضرت سید شاہ صبغتہ اللہ اول نے ایسے سرفروش اور جاں باز مجاہدوں کی جماعت تیار کی جو وقت پڑنے پر ملت اسلامیہ کے لیے اپنی جان کی بازی لگا سکے۔ ان ہی مجاہدین کو "حُر" کا لقب دیا گیا اور یہی حُر تحریک کا نقطۂ آغاز تھا۔[1]

پہلی ملاقات:

جب حضرت سید احمد شہید رانی پور تشریف لائے تو اتفاق سے حضرت سید صبغتہ اللہ اول بھی اپنے ایک سو مریدوں کے ساتھ رانی پور آئے ہوئے تھے۔ یہیں آپ کی ملاقات حضرت سید احمد شہید سے ہوئی۔ دونوں کے خیالات و افکار میں ہم آہنگی تھی، دونوں جذبۂ جہاد سے سرشار تھے، روحانی ہم آہنگی نے دلی ربط کو اور بھی قوی کر دیا تھا۔

پیر گوٹھ میں تشریف آوری کی دعوت:

حضرت سید صبغتہ اللہ اول نے حضرت سید احمد شہید کو اپنے وطن پیر گوٹھ چلنے کی دعوت دی۔ لیکن خود سید صبغتہ اللہ اول کو کسی ضروری کام کی وجہ سے ایک دن رانی پور میں ٹھہرنا پڑا۔ لیکن آپ نے حضرت سید احمد شہید اور غازیوں کو اپنے بھائی کے ہمراہ پیر گوٹھ بھیج دیا۔

---

[1] یہ تمام تفصیل تذکرہ صوفیائے سندھ، ص ۲۷۳ تا ۲۷۴ سے لی گئی ہے۔

مہمان نوازی:

۱۷ ذیقعدہ ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۶ء) کو حضرت سید احمد شہید پیر گوٹھ پہنچے۔ حضرت سید صبغتہ اللہ اول کے مریدوں اور بھائیوں نے مہمان نوازی اور خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

دوسرے دن حضرت سید صبغتہ اللہ اول بھی پیر گوٹھ تشریف لے آئے۔ انہوں نے بنفس نفیس حضرت سید احمد شہید اور مجاہدین کی مہمان داری کا اس قدر اہتمام کیا کہ خود کھڑے ہو کر مجاہدین کو کھانا کھلاتے۔

باہمی اعتماد و خلوص:

جو اعتماد و خلوص ان دونوں بزرگوں کے درمیان پیدا ہو گیا تھا، اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت سید احمد شہید نے اپنے اہل و عیال کو حضرت سید صبغتہ اللہ اول کی حفاظت میں پیر گوٹھ میں چھوڑا۔ میدان جہاد سے بھی دونوں میں مسلسل خط و کتابت جاری رہی۔

حضرت سید احمد شہید کے سید صبغتہ اللہ اول کے نام خطوط:

اس خلوص و محبت کا اندازہ ان دو بزرگوں کے درمیان ان خطوط سے بھی ہوتا ہے جو آپ نے سید صبغتہ اللہ اول کے نام میدان جہاد سے لکھے:

ایک خط میں میدان جہاد سے تحریر فرمایا کہ:

> آپ تمام مسلمانوں کو دعوت دیں اور مخلصین کی ایک جماعت ساتھ لے کر سکھوں کی سرحد سے متصل کسی محفوظ مقام پر بیٹھ جائیں اور جہاد شروع کر دیں۔ اپنے اہل و عیال کے ساتھ میرے اہل و عیال کو بھی کسی ایسی جگہ بٹھا دیں جو دشمن کی دسترس سے باہر ہو۔

بیعت امامت کے بعد ایک خط:

جب سرحد میں حضرت سید احمد شہید کے دست مبارک پر بیعت امامت ہو چکی تو آپ نے مختلف علاقوں میں اپنے نائب بھیجے۔ چنانچہ محمد قاسم کو اپنا نائب بنا کر سندھ بھیجا اور ان کو سید صبغتہ اللہ اول کے نام ایک خط دیا۔ یہ خط حضرت سید احمد شہید کے دلی جذبات، محبت و خلوص کا آئینہ دار ہے۔ اس خط میں تحریر فرمایا کہ:

> سندھ میں نیابتاً میری جانب سے بیعت لینے کے اہل صرف آپ تھے۔ لیکن چونکہ آپ کے بھائی رقابت کے مرض میں مبتلا ہیں، اس لیے اندیشہ ہے کہ اسی باعث اس امر مسنون کی بجا آوری سے محروم نہ رہ جائیں۔ لہٰذا میں نے اس نیابت کے لیے دوسرے آدمی کو بھیج دیا۔

پنج تارے سے راج دواری روانہ ہونے کے وقت آپ نے سید صبغتہ اللہ اول کو ایک خط میں لکھا کہ:

> اگر ہماری زندگی جہاد میں پوری ہو جائے تو ہمارے اہل و عیال کو حرمین شریفین پہنچا دیجیے۔

روانگی کے وقت فیصلہ:

جب حضرت سید احمد شہید پیر گوٹھ سے شکارپور روانہ ہونے لگے تو دونوں بزرگوں کے درمیان فیصلہ ہوا کہ جب باقاعدہ جنگی مرکز قائم ہو جائے گا تو سید صبغتہ اللہ اول بھی شرکتِ جہاد کے لیے وہاں پہنچ جائیں گے۔ لیکن اتفاق یہ ہوا کہ سید صبغتہ اللہ شرکت جہاد کے لیے بالکل تیار تھے اور اس کی اطلاع آپ نے حضرت سید احمد شہید کو دے بھی دی تھی کہ اچانک افغانستان اور پشاور کا راستہ درانی سرداروں کی وجہ سے مخدوش ہو گیا اور سید صبغتہ اللہ اول باوجود عزم مصمم کے وہاں نہ پہنچ سکے۔ سندھ میں سید صبغتہ اللہ اول تحریک سید احمد شہید کا اہم کردار ہیں۔

حضرت سید احمد شہید کے اہل و عیال کب تک سندھ میں رہے:

مولانا مہر مرحوم نے جماعت مجاہدین میں سید عبدالرحمٰن کے حالات کے ضمن میں لکھا کہ:

> یہ سید صاحب کے چھوٹے بھانجے تھے۔ سید عبدالرحمٰن پہلے خاندان کی مستورات کے ساتھ ٹونک پہنچے، پھر سندھ گئے اور سید صاحب کے انتظام کے مطابق پیر گوٹھ میں سید صبغتہ اللہ شاہ کے پاس ٹھہر گئے۔ سید صاحب چاہتے تھے کہ اہل و عیال اور دوسرے متعلقین کو اپنے پاس سرحد بلوالیں۔ لیکن درانی سرداروں کی عداوت کے باعث راستے مخدوش ہو گئے تھے اور اہل و عیال کے محفوظ پہنچنے کی صورت نہ رہی تھی۔ اسی حالت میں سید صاحب نے بالاکوٹ میں شہادت پائی۔۔۔

سید عبدالرحمٰن نے تمام متعلقین کے ساتھ تقریباً دس سال سندھ میں گزارے۔

تاریخ ٹونک سے معلوم ہوتا ہے کہ میر علی مراد خاں والیٔ خیرپور نے سید عبدالرحمٰن کو اپنے مصاحبوں میں شامل کر لیا تھا۔ ۱۸۴۰ء میں نواب وزیر الدولہ نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ چنانچہ وہ سید صاحب کے اہل وعیال اور دوسرے متعلقین کے ساتھ سندھ سے تشریف لائے۔[1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید صاحب کے اہل وعیال تقریباً دس برس تک سندھ میں رہے۔

سید صبغتہ اللہ شاہ ثانی کی فرنگی استبداد کے خلاف بغاوت:

خاندان پیر پاگارہ میں روحِ جہاد روزِ اول ہی سے موجود تھی۔ سید صبغتہ اللہ شاہ اول کے حالات میں لکھا جا چکا ہے کہ ان کا کوئی وعظ ترغیبِ جہاد سے خالی نہ ہوتا تھا۔ سندھ پر انگریزوں اور سکھوں کا دباؤ بڑھتا جاتا تھا۔ ہندوستان میں حضرت سید احمد شہید کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ دونوں کی تحریکیں ہم آہنگ تھیں، دونوں کی تمنا تھی کہ ان کے مرید و معتقد اشاعت اسلام اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ غلامی کا ہیبت ناک عفریت جو ہندوستان کے مختلف حصوں کو نگل رہا تھا، اس کو دیکھ کر دونوں چاہتے تھے کہ ان کی سرزمین اس کی پرچھائیوں سے بھی پاک رہے۔ دونوں کی تمنا تھی کہ اس سرزمین کو دارالاسلام بنایا جائے۔ دونوں معاشرے کی فلاح، روحِ جہاد میں سمجھتے تھے۔ ایک حضرت شاہ ولی اللہ کے فکری و نظری خاکوں میں عملی رنگ بھر رہا تھا، دوسرا سندھ میں سرفروش مجاہدین کی ایک جماعت تیار کر رہا تھا۔ جن کا نام "حُر" تھا۔

سعی بندے کی جانب سے ہے اور نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ فرنگی قہرمانی قوتیں غالب ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ پورا ہندوستان ان کے قبضے میں آگیا۔ لیکن کچھ مردانِ حق آگاہ ایسے بھی تھے کہ انہوں نے ان نامساعد حالات میں بھی ہمت نہیں ہاری۔ ان کے پائے استقلال کو ذرا بھی لغزش نہیں ہوئی اور وہ انگریز کی مخالفت میں سینہ سپر رہے۔

اُن ہی میں حضرت صبغتہ اللہ شاہ ثانی بھی تھے، جن کی تصویر کو انگریزی اخبارات اور ہندو مؤرخین نے انگریز کے اشاروں پر نہایت برے انداز میں مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ دوسرے طرف خود اس عظیم روحانی رہنما کے حالات پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے بلند ارادوں اور شجاعت و بہادری کا اندازہ ان کے خاندانی ماحول سے لگایا جا سکتا ہے۔

جدوجہد آزادی کا جذبہ اور انگریزوں سے نفرت انہیں ورثے میں ملی تھی۔

محترمی ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے جو عہد حاضر میں سندھ کی تاریخ کے عظیم محققوں میں ہیں لکھا ہے کہ:

> پیر پاگارہ کے خاندان میں آزادی کی جدوجہد کی بنیاد حضرت صبغتہ اللہ شاہ اول (متوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء) نے رکھی۔ جنہوں نے سندھ میں حضرت سید احمد شہید کی آواز پر لبیک کہہ کر مجاہدین کا ایک دستہ بطور امداد روانہ کیا تھا اور اسی لیے ان کی تحریک کو "حر تحریک" کہا جانے لگا۔ اس طرح اس خاندان میں یہ جذبہ حریت موروثی طور پر چلا آرہا تھا۔

حضرت سید صبغتہ اللہ شاہ اول نے حر مجاہدین کا یہ دستہ ۱۸۲۹-۳۰ء میں بھیجا تھا۔ جب کہ انگریز ہندوستان پر قبضہ جمانے کی فکر کر رہے تھے۔

حضرت سید صبغتہ اللہ ثانی نے بھی یہ جذبہ حریت اپنے آباء و اجداد سے ورثے میں پایا تھا۔ انہیں فرنگی استبداد سے شدید نفرت تھی۔

خاندان پیر پاگارہ نے اور سندھ کے عوام نے انگریزوں کے تسلط کی ہمیشہ مخالفت کی۔ حضرت سید صبغتہ اللہ ثانی کو بھی یہ جذبہ اپنے اجداد سے وراثت میں ملا تھا۔

پیر پاگارہ خاندان انگریزوں کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا:

حضرت پیر پاگارہ کا خاندان انگریزوں کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت سید صبغتہ اللہ اول نے جب کہ انگریز ہندوستان پر قبضہ جمانے کی فکر میں تھے، اپنے خاندان کی جانب سے ۳۰-۱۸۲۹ء میں حر مجاہدین کا ایک دستہ حضرت سید احمد شہید کی حمایت میں روانہ کیا تھا۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سکھ سندھ کی طرف پھیلنے لگے تھے اور انگریز میران سندھ کو اپنے معاہدوں کی زنجیروں میں جکڑ رہے تھے۔ ان نامساعد حالات میں حضرت سید صبغتہ اللہ اول نے ملت اسلامیہ کی فلاح ذوق جہاد میں دیکھی اور "حر تحریک" کی بنیاد رکھی۔ ادھر سندھ کے عوام بھی انگریزوں کے اقتدار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور خاندان

---

[1] جماعت مجاہدین، مولانا مہر، ص ۱۴۰ تا ۱۴۲۔

پیر پاگارہ ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس لیے یہ مقدس خاندان انگریزوں کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔

دوسری طرف پیر پاگارہ حضرت شاہ حزب اللہ ثانی ۱۸۴۷ء-۱۸۹۰ء کے زمانے میں حروں کی جماعت کا واضح رجحان انگریزوں کے خلاف ہونا شروع ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۸۹۶ء میں حروں کے رجحان نے انگریزوں کے خلاف ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی اور انگریزی حکومت نے بھی پیر پاگارہ کے خلاف منظم طور پر کارروائیاں شروع کر دیں تھیں۔ حروں کی جماعت کے ہر فرد کو انگریزوں کے ہاتھوں طرح طرح کے مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ حر جماعت کے بہت سے افراد کو جلاوطنی کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں۔ حر جماعت کے بااثر افراد کو دیسا پور ضلع احمد نگر جلاوطن کر دیا گیا۔ آزمائشی کیمپوں کا سلسلہ جاری کیا گیا اور فوج اور دوسری ملازمتوں میں سندھیوں کا تقرر بند کر دیا گیا۔

خوشامد پسند عناصر کی انگریزوں کو خوش کرنے کی کوششیں:

اگرچہ سندھ کے خوشامد پسند عناصر نے انگریزوں کو خوش رکھنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ نسیم امروہوی نے تاریخ خیرپور میں لکھا کہ ہز ہائنس میر امام بخش خاں ٹالپور (۱۹۰۹ء-۱۹۲۱ء) والیٔ خیرپور نے پہلی عالمگیر جنگ (۱۹۱۴ء) میں انگریزوں کا ساتھ دیا اور حسب ذیل طریقوں پر حکومت برطانیہ کی مدد کی:

۱۔ تیس ہزار بیاسی روپے ایک ہوائی جہاز کی خریداری کے لیے دیے۔

۲۔ ۱۹۱۶ء میں دس ہزار روپے وار فنڈ میں اور دو ہزار روپے لارڈ کچنر کے امدادی فنڈ میں دیے۔

۳۔ ۱۹۱۸ء میں ساڑھے چار لاکھ روپے جنگی قرضے میں دیے۔ نیز سپاہیوں کے بچوں کی تعلیم کے لیے سات ہزار روپے دیے۔ ہز ہائنس کی اس فیاضانہ امداد کے پیش نظر حکومت برطانیہ نے ان کو کرنل کا اعزازی عہدہ دیا اور میر صاحب کے صاحبزادے میر غلام علی خاں کو جو ولایت میں زیر تعلیم تھے اور جنگی خدمات بجالا رہے تھے۔ لیفٹیننٹ کا عہدہ دیا۔[1]

انگریز، حروں پر کامل نظر رکھے ہوئے تھے اور ان پر طرح طرح کے مظالم توڑے جاتے تھے۔ ان مظالم اور کڑی نگرانی نے حروں میں انگریزوں کے خلاف شدید جذبۂ نفرت کو ابھارا۔

حضرت سید صبغتہ اللہ ثانی کی ولادت ۱۳ صفر ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں ہوئی۔ بارہ سال کی عمر میں اپنے والد محترم کی وفات کے بعد مسند آرائے رشد و ہدایت ہوئے۔ ان کے والد محترم شمس العلماء شاہ مردان اول مشہور بہ کوٹ قلانے ۷ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۰ء) میں وفات پائی۔ جب پیر صبغتہ اللہ ثانی نے مسند سجادگی کو رونق بخشی تو انگریز متوقع تھے کہ وہ انگریزوں کی تربیت میں پرورش پاکر فرنگی سیاست کی بساط کے لیے ایک اچھا مہرہ ثابت ہوں گے۔ لیکن انگریزوں کی توقع کے خلاف وہ ابتدا ہی سے ایک منفرد طبیعت کے مالک تھے۔ ان میں تدبر و تفکر بھی تھا اور انگریزی سامراج سے شدید نفرت بھی ان کو ورثے میں ملی تھی۔ شجیع و بہادر، جرأت مند و جفاکش، شخصیت و کردار میں خود اعتمادی، خود داری اور استقلال یہ اوصاف ان کے آئینۂ اخلاق میں نمایاں نظر آتے تھے۔ ان اوصاف نے انہیں بڑی کڑی آزمائشوں سے گزارا۔ لیکن انہوں نے حق کی راہ میں مردانہ وار ساری مصیبتوں کو جھیلا۔ یہاں تک کہ حق کی سربلندی کے لیے انہوں نے دار و رسن کو قبول کیا۔

سید صبغتہ اللہ ثانی کا نظریہ:

حضرت سید صبغتہ اللہ ثانی کا نظریہ یہ تھا کہ خدائے تعالیٰ نے سب کو آزادی اور عزت سے نوازا ہے۔ ہر وہ قوم جو دوسروں کے آزادی کے حقوق پر غاصبانہ ڈاکہ ڈالتی ہے اور ان کی آزادی کو سلب کرتی ہے، وہ غاصب ہے اور اپنے اس ظلم کی وجہ سے قابل نفرت ہے۔ اس نظریے نے شاہ صاحب میں انگریزوں کے خلاف شدید جذبۂ نفرت کو ابھارا تھا اور انگریز بھی ان سے کھٹکتے تھے۔

عہد حاضر میں سندھ کی تاریخ کے محقق ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے لکھا ہے کہ:

ایک دفعہ پیر پاگارہ نے اپنے چچا مرحوم علی گوہر شاہ ثانی[2] کی ایک سند، جو انگریزوں نے دی تھی، فریم کے ساتھ کمرے سے باہر پھینک دی۔ انگریز افسروں کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ نہایت برہم ہوئے اور پیر صاحب سے بدلہ لینے کی فکر کرنے لگے۔

---

[1] تاریخ خیرپور، تالیف نسیم امروہوی، ص ۹۳، ۹۴۔

[2] پیر سید علی گوہر شاہ بن حضرت سید صبغتہ اللہ اول، ولادت ۴ رجب ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء)، وفات ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء)، تکملۂ مقالات الشعراء، حاشیہ، سید حسام الدین راشدی، ص ۴۴۴۔

قتل کا مقدمہ:

آخر حضرت پیر صبغتہ اللہ ثانی کو قتل کے ایک سنگین مقدمے میں لپیٹ لیا گیا۔ انگریزی اقتدار کے لیے اس مقدمے کے لیے مدعی اور گواہ پیدا کر لینے کیا مشکل تھے۔ چنانچہ انگریز اس میں بھی کامیاب ہو گئے۔

حضرت قائد اعظم کی وکالت اور پیروی:

یہ مقدمہ سکھر میں چلا اور حضرت قائد اعظم علیہ الرحمہ نے حضرت پیر صبغتہ اللہ شاہ ثانی کی طرف سے اس مقدمے کی وکالت اور پیروی کی۔ فرنگی حکومت کے کارندوں نے حضرت قائد اعظم پر زور ڈالا کہ وہ اس مقدمے کی پیروی نہ کریں۔ کیونکہ حکومت انہیں کسی حال میں بھی اس مقدمے سے بری کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ لیکن قائد اعظم نے حق و انصاف کے نام پر اپنے پیشے اور اپنے موکل سے غداری کرنے سے انکار کر دیا اور جج سے اس مقدمے کی ناانصافیوں پر سخت احتجاج کیا۔

دس سال کی سزا:

اس مقدمے میں حضرت سید صبغتہ اللہ ثانی کو دس سال قید کی سزا دے کر رتناگری جیل (پونا) بھیج دیا گیا۔

اسی جیل خانے میں انہوں نے اپنے جد امجد حضرت پیر محمد راشد (روضہ دھنی) کی ملفوظات کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ فارسی، سندھی اور اردو کی بہت سے کتابیں پڑھیں اور ان کتابوں سے اخذ کر کے ایک انتخاب مرتب کیا۔

یہیں انہیں ہندوستان کی سیاست کو سمجھنے کا موقع ملا اور یہیں انہوں نے انگریزوں کی غیر منصفانہ پالیسی اور "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" پر غور کر کے ایک سیاسی منشور مرتب کیا۔

جیل سے رہائی:

جیل سے رہا ہو کر جب وہ اپنے وطن سندھ واپس آئے تو انہوں نے سب سے پہلے اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت کی طرف توجہ دی۔ انہوں نے حکم دیا کہ ان کے مرید ہر قسم کے نشے سے احتراز کریں اور سادگی اور کفایت شعاری کو اپنا شعار بنائیں۔ انہوں نے خواتین کو بھی اشیائے استعمال میں بچت کا حکم دیا۔

کڑنگ میں مرکز کا قیام:

سانگھڑ کے قریب کڑنگ میں اپنی تحریک کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک بنگلہ تعمیر کرایا۔ اس بنگلے کی حیثیت ایک مرکز کی تھی۔ جہاں مریدین آکر قیام کرتے تھے۔ اس مرکز کی حفاظت کے لیے مریدوں کا پہرہ لگوایا۔ رات کو پیر صاحب لباس تبدیل کر کے فقرا کے لباس میں گھومتے اور جو شخص نشے میں مبتلا نظر آتا، اُسے بلا کر سخت تنبیہ کرتے۔ پھر حضرت پیر صبغتہ اللہ ثانی نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ جماعت کا کوئی شخص ولایتی کپڑا نہ پہنے بلکہ ملک کا بنا ہوا کپڑا استعمال کرے۔

وہ انگریزوں کے خلاف بلا امتیاز مسلم و غیر مسلم ایک متحدہ محاذ قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ ہندو اور مسلمان آپس میں اتفاق سے رہیں اور کسی جھگڑے اور اختلاف میں نہ پڑیں۔

ولایتی کپڑے کے بائیکاٹ نے جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا۔ لہٰذا انگریزوں نے حروں کی نگرانی کے متعلق سخت احکام جاری کیے۔

غازیوں کی تنظیم:

حضرت پیر صبغتہ اللہ ثانی نے اس تحریک کو منظم بنانے کے لیے غازیوں کی ایک فہرست مرتب کی اور خود بھی مختلف اوقات میں غازیوں کا معائنہ کیا۔ مریدوں کو حکم دیا کہ وہ گاؤں گاؤں جا کر غازیوں کے ناموں کی ایک فہرست مرتب کریں۔

معائنے کی صورت:

پیر صاحب کڑنگ کے بنگلے میں مختلف اوقات میں غازیوں کا معائنہ کرتے۔ معائنے کی صورت یہ ہوتی کہ مرید آکر پندرہ پندرہ کی ٹولیوں میں بیٹھ جاتے، جو کوئی اس قطار میں بیٹھتا، پیر صاحب اس سے پوچھتے اب تم غازی ہو گئے ہو۔ وہ جواب دیتے ہاں قبلہ! پھر فرماتے تمہیں مبارک ہو کہ تم غازیوں کی فہرست میں آگئے ہو تم پر سیکڑوں رحمتیں نازل ہوں۔ اس موقع پر ایک کافی عام ہو گئی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ:

وہ شخص مرد میدان نہیں جو اپنا سر بچالے
بلکہ مرشد کو سر نذر کرنے ہی میں ہماری عید ہے

مسجد منزل گاہ کا جھگڑا:

اسی زمانے میں مسجد منزل گاہ کا جھگڑا شروع ہوا جس کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ پیر صاحب نے اپنے غازیوں کو تاکید کی کہ وہ ہر جگہ امن و امان کو بحال رکھیں۔ پیر صاحب نے پوری طاقت سے انگریز حکومت کی اس سازش کو ناکام بنا دیا جس کے ذریعے سے وہ

ہندو مسلم شر پسندوں کو اُکسا کر حضرت پیر پاگارہ اور اُن کی جماعت حروں کے خلاف سخت اقدامات کا بہانہ تراشنا چاہتی تھی۔ انگریز کا مقصد یہ تھا کہ اگر پیر صاحب کے زیر اثر دیہات میں کچھ ہندو مارے جائیں تو اس سے ایک تو بڑا فائدہ یہ پہنچے گا کہ ہندو مسلم اتحاد خطرے میں پڑ جائے گا، دوسرا یہ کہ اس بہانے سے غازیوں پر پابندی لگانے کا موقع ہاتھ آ جائے گا، لیکن انگریز کی یہ منافقانہ پالیسی ناکام رہی اور پیر صاحب کو اس سازش کا علم ایک رات پہلے سانگھڑ کے بنگلے میں ہو گیا اور فوراً ہی آپ نے امن و امان کو بحال رکھنے کی تدبیریں اختیار کیں اور غازیوں نے ایسے اقدامات کیے کہ حملہ آور پیر صاحب کے گاؤں میں ہندوؤں پر حملے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس اسکیم کی ناکامی کے بعد دوسرے دن ہندوؤں کا ایک وفد سکھر کے کلکٹر سے ملا۔ اس وفد نے کلکٹر سے کہا کہ رات پیر صاحب کے غازیوں نے ہماری جانیں بچائیں اور پورے گاؤں میں امن برقرار رکھا، ہم پیر صاحب کے شکر گزار ہیں۔

انگریزوں کی ایک نئی ترکیب:

انگریزوں نے اپنی اس تجویز کی ناکامی کو دیکھ کر ایک نئی ترکیب سوچی۔ کچھ دن کے بعد سکھر کے کلکٹر نے پیر صاحب کو بلوا بھیجا۔ پیر صاحب نے اپنے خلیفہ احمد کو کلکٹر سکھر سے ملاقات کے لیے بھیجا۔ کلکٹر اُن سے بظاہر بہت اچھے طریقے سے پیش آیا اور کہا کہ پیر صاحب کو ہمارا پیغام پہنچایئے کہ اُنہوں نے امن عامہ بحال کرنے کا جو کام پیر گوٹھ میں انجام دیا ہے اس کو گورنمنٹ بنظرِ استحسان دیکھتی ہے اور اس نے ان خدمات کے صلہ میں ایک تلوار اور ایک بندوق انعام کے طور پر مقرر کی ہے۔ نیز میری سفارش پر انہیں خطاب دینا بھی منظور کیا ہے۔ امید ہے کہ پیر صاحب اس انعام کو منظور فرمائیں گے۔

پیر صاحب نے انگریز کے انعام اور خطاب کو ٹھکرا دیا:

پیر صاحب نے انگریزی حکومت کے انعامات اور خطاب کو ٹھکرا دیا اور خلیفہ احمد سے کہا جاؤ اور کلکٹر سے کہو کہ ہتھیار میرے پاس موجود ہیں اور پیر پاگارہ کا خاندانی خطاب میرے لیے کافی ہے، مجھے آپ کے انعام اور خطاب کی ضرورت نہیں۔

خلیفہ احمد نے پیر صاحب کا یہ جواب کلکٹر سکھر کو پہنچا دیا، کلکٹر نے خلیفہ احمد سے کہا کہ پیر صاحب نے انعام اور خطاب نہ قبول کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔

فرنگی حکومت کا یقین کامل:

جب فرنگی حکومت کو یقین کامل ہو گیا کہ پیر صاحب کسی کالج اور دباؤ میں آنے والے نہیں اور وہ انگریز حکومت کے کسی طرح بھی وفادار نہیں ہو سکتے تو انہوں نے تشدد کا آخری حربہ استعمال کرنے کے لیے تمام کاغذی کارروائیاں مکمل کر لیں۔

مرکز میں غازیوں کو تربیت:

ادھر پیر صاحب نے بھی فرنگی سامراجیت کے ظلم و تشدد سے بچنے کے لیے سانگھڑ کے کڑنگ والے بنگلے کو اپنا مرکز بنایا اور چھ ماہ وہاں مستقل قیام کرنے کا ارادہ کیا۔ اس بنگلے میں غازیوں کو سپاہیانہ تربیت دی جاتی تھی۔ عوام میں مشہور ہو گیا تھا کہ پیر صاحب اس بنگلے میں اپنے مریدوں کو بندوق اور ریوالور چلانے کی تربیت دے کر انگریزوں کے خلاف لڑائی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ پیر صاحب کا بڑا مقصد یہ تھا کہ مریدوں کی جماعت کو منظم اور طاقتور بنایا جائے تاکہ فرنگی استعمار پسند طاقت کو مفلوج کر کے حریت کے چراغ کو سندھ کی شبِ تاریک میں روشن کیا جائے۔

انگریز بھی پیر صاحب کے ارادوں سے ناواقف نہیں تھا۔ وہ اپنے ذہن میں ان کو باغی تسلیم کر چکا تھا اور اس فکر میں تھا کہ کسی بہانے سے ان کی قوت کو کچل دے۔

سب سے پہلے انگریز حکومت نے حروں کے خلاف جو قدم اٹھایا وہ یہ تھا کہ جہاں کہیں بھی فتنہ و فساد ہوتا وہ حروں کی طرف منسوب کرتے اور ناکردہ گناہ حر گرفتار کر لیے جاتے۔ پھر انگریزی حکومت نے مزید زیادتی یہ کی کہ ہر چھوٹے بڑے حر کے لیے پولیس چوکیوں میں ہفتے میں اور بعض کی دو تین دن کے بعد اور بعض کی روزانہ حاضری لازمی قرار دی۔ کڑنگ کے بنگلے پر بھی پولیس کا ایک دستہ متعین کیا گیا تاکہ جب بھی ضرورت ہو، پیر صاحب کے خلاف کارروائی کی جا سکے۔ پیر صاحب نے ان غلط اقدامات کے خلاف احتجاج کیا۔ خصوصیت سے حکومت کو اس طرف توجہ دلائی کہ حروں کا پولیس چوکیوں پر حاضری کا طریقہ غلط ہے۔ روزانہ حاضری دینے کے لیے انہیں میلوں پیدل چلنا پڑتا ہے اور یہ بات انصاف کے خلاف ہے۔ لیکن حکومت اس احتجاج کے باوجود تشدد پر قائم رہی۔ جس پر پیر صاحب نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ وہ آئندہ پولیس چوکیوں پر حاضری نہ دیں۔ بلکہ اپنے گھروں میں

اپنے کاموں میں مشغول رہیں۔ یہ گویا سندھ میں سول نافرمانی کی طرف پہلا قدم تھا۔

سول نافرمانی اور گرفتاریاں:

اس پر فرنگی حکومت نے دھڑا دھڑ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پیر صاحب نے اپنے خاص خاص مریدوں کو روپوشی کا حکم دیا۔ حکومت کا دباؤ روز بروز شدید ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ سرعام گولیاں چلنے لگیں اور سرکاری افسر پیر صاحب کے اور ان کے مریدوں کے خلاف رپورٹیں بھیجنے لگے۔ اس زمانے میں بعض لوگوں نے پیر صاحب کو مشورہ دیا کہ اگر آپ سرکار کی خیر خواہی کریں تو حکومت اس کے عوض میں بہت کچھ دینے کو تیار ہے۔ لیکن پیر صاحب نے انہیں جواب دیا کہ رشوت میرے مذہب میں حرام ہے۔

کراچی میں نظر بندی:

آخر بہت سی رپورٹوں کے بعد پیر صاحب کو کراچی میں نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن پیر صاحب نے مطالبہ کیا کہ اگر ان کا کوئی قصور ہے تو ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ اس کے علاوہ کراچی کی نظر بندی کے بارے میں مجھے کوئی تحریری حکم نامہ دکھایا جائے کہ آخر کس کے حکم سے مجھ کو نظر بند کیا گیا ہے۔ ورنہ میں اس پابندی کے خلاف قدم اٹھاؤں گا۔ مگر انہیں کوئی جواب نہ ملا۔ اس وقت سندھ کے وزیر اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ تھے۔ پیر صاحب نے وزیر اعلیٰ سے کہا کہ حکومت کی یہ نظر بندی بے جا ہے اور وہ اس کے لیے آمادہ نہیں۔ وزیر اعلیٰ نے جواب دیا کہ وہ احکام کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔ وہ پیر صاحب کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

پیر صاحب نظر بندی کے قانون کو توڑ کر گڑنگ پہنچے:

پیر صاحب نظر بندی کی پروا نہ کرتے ہوئے موٹر میں راتوں رات گڑنگ کے بنگلے میں پہنچے اور مریدوں کو بتایا کہ ان کے خلاف حکومت کارروائیاں کر رہی ہے۔ اگر بات بڑھ جائے تو حروں کو بد دل ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی منظم جدوجہد جاری رکھیں۔ اس کے بعد پیر گوٹھ پہنچے اور وہاں بھی یہی احکام دیے۔

بغاوت کا مقدمہ:

کراچی سے فرار کے بعد فرنگی حکومت کو موقع مل گیا کہ وہ پیر صاحب پر بغاوت کا مقدمہ چلائے۔ اس کے علاوہ حکومت نے حروں کے خلاف کارروائیاں تیز تر کر دیں۔

بنگلے کا محاصرہ، بم باری اور مارشل لاء کا نفاذ:

انگریزی حکومت نے تشدد اور استبداد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ پیر صاحب کے بنگلے کا محاصرہ کر لیا گیا۔ بنگلے پر بم باری کی گئی۔ درگاہ شریف میں پیر صاحب کی حویلیوں اور گاؤں کو بارود کے ذریعے کھنڈرات بنایا گیا۔ پیر صاحب کو بمشکل تمام گرفتار کیا گیا۔ لیکن یہ پہاڑ جیسی مصیبتیں بھی حروں کے پائے استقلال کو متزلزل نہ کر سکیں۔

سندھ میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ پھر بھی سرزمین سندھ کے حریت پسند فرزند پولیس اور فوج کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔ ان کی بہادری اور شجاعت کی تفصیل ایک مستقل کتاب چاہتی ہے۔

عورتوں نے بھی اس جہاد حریت میں حصہ لیا۔ بہت سی خواتین کے کارنامے اس ضمن میں حیرت انگیز ہیں۔

پیر صاحب کی تربیت بے حد مؤثر ثابت ہوئی اور پیر صاحب کی غیر حاضری کی باوجود حر غازیوں نے انگریزوں سے جنگ جاری رکھی۔ سندھ کے عوام نے بھی اس جنگ میں حصہ لیا۔ فوج اہل سندھ پر مارشل لا کی صورت میں ایک عذاب نازل کرتی رہی۔ پیر گوٹھ اور گڑنگ میں حروں کے مکان نذر آتش کیے گئے۔ حر بلکہ عام مرید بھی گرفتار کیے گئے۔ بہت سوں کو جیلوں اور کیمپوں میں بند کر دیا گیا۔ ہزاروں بے گناہ شہید، سینکڑوں عورتیں بیوہ اور ہزاروں بچے یتیم ہوئے۔

اس ظالمانہ ماحول میں سندھ کے بڑے بڑے زمیندار اور وڈیرے خاموش تماشائی بنے تماشہ دیکھتے رہے اور اس ظلم پر کسی کو مجال دم زدن نہ تھی۔

سزائے موت:

حکومت برطانیہ نے پیر صاحب پر بغاوت کا مقدمہ چلا کر موت کی سزا دی جو عموماً اکثر حریت پسندوں کا مقدر رہی ہے۔

بنا کردند رسمے خوش بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

موت کی سزا کو پیر صاحب نے مردانہ وار سنا، خوفِ مرگ ان کے دل سے نکل چکا تھا۔ وہ حیاتِ جاودانی کے طالب تھے، اس لیے انگریزی حکومت کے اس ظالمانہ فیصلے سے ان کی پیشانی پر شکن تک نہ

آئی اور انہوں نے موت کا استقبال مسکراتے ہوئے کیا۔

ایک انگریز افسر کی شہادت ہے کہ میں پیر صاحب کی زندگی کی آخری رات کافی دیر تک ان کے ساتھ رہا۔ سزائے موت سننے کے بعد بھی ان کے صبر و سکون میں فرق نہیں آیا تھا۔ آپ نے اسے حیرت زدہ دیکھ کر فرمایا۔ حیران کیوں ہوتے ہو، حق کی راہ میں شہادت حاصل کرنا میرے آباواجداد کی سنت ہے۔ ہم جس چیز کو حق سمجھتے ہیں اس کے لیے ہنستے کھیلتے پھانسی کے تختے پر چڑھ جانا ہمارے لیے عین عبادت ہے۔ وہ اس رات حسب معمول گہری نیند سوئے۔

شہادت:

آخر اس پروانۂ شمع حریت کو ۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء کو دار پر چڑھایا گیا۔ اس خون ناحق سے شمع آزادی اور لو دینے لگی۔ چار سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ غلامی کی شب تاریک کے اندھیرے چھٹے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو حضرت قائداعظم علیہ الرحمہ کی رہبری میں ہماری آزادی کی نورانی صبح طلوع ہوئی اور ہم نے مملکت اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کو پالیا، جس کا خواب حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، مولانا محمد علی جوہر، حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ دیکھتے چلے آرہے تھے۔ کتنے مظلوموں کے خون نے اس گلشن آزادی کی آبیاری کی ہے۔ کتنے آنسو ہیں جو اس گلشن آزادی کی تمنا میں بہائے گئے۔ کتنے حریت پسندوں کی خاک و خون میں تڑپتی ہوئی لاشیں ہیں، جو اس گلشن کی بہاریں دیکھنے کی تمنا میں رخصت ہوئے، لیکن وہ اس گلشن کی بہاریں نہ دیکھ سکے۔ ہم سب پاکستانیوں کا ان پر سلام ہو اور خدا کی رحمتیں ان پر نازل ہوں کہ یہ پاکستان برصغیر کی ملت اسلامیہ کی مجموعی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

اخلاق:

پیر صاحب کے آئینہ اخلاق میں جو جوہر نمایاں نظر آتے ہیں، وہ خشیت الٰہی ہے۔ وہ اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے تھے۔ موت کا خوف اپنے دل سے نکال چکے تھے اور فرنگی سامراجی حکومت سے شدید نفرت رکھتے تھے جو برصغیر کے مسلمانوں کا خون جونک کی طرح چوس رہی تھی۔

ایک دفعہ گڑنگ بنگلے میں ایک ڈپٹی کلکٹر نے اُن سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ انگریزی افسروں کی عزت نہیں کرتے؟ پیر صاحب نے جواب دیا کہ ان کے طور و طریق اور حرکات و سکنات کو دیکھنے کے بعد جب بھی میں ان انگریزی افسروں کی عزت کا ذرا سا تصور بھی اپنے دل میں لاتا ہوں تو مجھے اپنی شرافت میں شک ہونے لگتا ہے، کیونکہ میں حسینی ہوں۔ (پیر صاحب کا مقصد اس جواب سے یہ تھا کہ صحیح طریقے پر چلنے والوں کی عزت کرتا ہوں، میں حسینی ہوں، میں فاسق افراد کی عزت نہیں کر سکتا)۔

ایک دفعہ ایک مرید نے اُن سے پوچھا کہ انگریزوں کی لڑائی میں کسے کامیابی ہوگی؟ آپ نے فرمایا کہ انشاء اللہ ہم کامیاب ہوں گے۔

عشق رسول ﷺ اُن کے خمیر میں تھا۔ اتباع رسول ﷺ کا یہ عالم تھا کہ اپنے کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت کی طرف خاص توجہ دیتے۔ علی الصبح اُٹھ کر ورزش کرتے پھر فجر کی نماز میں مشغول ہو جاتے۔ اپنے مریدوں کے کام میں ہاتھ بٹاتے۔ اناج کٹواتے اور گوداموں میں رکھواتے۔ معمولی کام میں بھی عار محسوس نہ کرتے۔ کسی کے لیے بددعا نہ کرتے۔[1]

آپ نے حق و صداقت کی راہ میں ہر صعوبت کو برداشت کیا۔ پیر صاحب ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۸ء تک رتناگری، مدناپور، ڈھاکہ اور ترچ شاہی وغیرہ جیلوں میں رہے۔ آپ پر ناجائز ہتھیار رکھنے کا جرم عائد کر کے یہ سزا دی گئی۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۰ء کو آپ کو پھر کراچی سے ناگپور جیل بھجوا دیا گیا۔ یہاں تک کہ اس مرد حق آگاہ پر فرنگی سامراج نے ڈیفنس آف انڈیا کے تحت مقدمہ چلا کر ۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء کو سزائے موت دے دی، فرنگی حکومت خوش تھی کہ اس نے اپنی راہ کے کانٹے کو دور کر دیا، لیکن اسے کیا خبر ہے کہ شہادت ہی تو مقصود و مطلوب مومن ہے۔ اس راہ میں کامیابی قابل قدر اور جان دینا بھی حیات جاودانی ہے۔

پھانسی کی اطلاع مل چکی تھی۔ صبح کو پھانسی دی جانے والی تھی۔ موت اپنے شہپر کھول چکی تھی لیکن پیر صاحب کے اطمینان کا عجیب عالم تھا۔ پھانسی کے لیے مقررہ وقت سے ذرا پہلے عبادت ختم کی اور خود سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ وقت ہو گیا ہے اب چلنا چاہیے۔ سپرنٹنڈنٹ کا بیان ہے کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں کوئی ایسا مرد، جس نے موت کا اس استقامت سے سامنا کیا ہو نہیں دیکھا۔[2]

---

(1) پیر صبغتہ اللہ کے یہ تمام حالات رسالہ مہران سوانح نمبر ۱۹۵۷ء محترمی جناب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کے سندھی مضمون پیر پاگارو سید صبغتہ اللہ ثانی، ص ۲۵۱ تا ۲۶۵ سے ماخوذ ہیں۔

(2) تذکرہ پیران پگارا، تجمل چودھری، ص ۱۹۴ تا ۱۹۶، بحوالہ ہفت روزہ لیل و نہار، ۱۳ مئی ۱۹۷۳ء۔

نشان مرد مومن با تو گویم
چون موت آید تبسم بر لب اوست

۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء کو فجر کے وقت اس جاں باز حریت کو دار پر چڑھایا گیا۔ جس نے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۳ء تک یعنی تیرہ سال تک سندھ میں برطانوی سامراج کے چھکے چھڑا رکھے۔ جس کی تحریکِ آزادی کو نہایت بے دردی سے کچلا گیا۔ ہر مادی طاقت کو اس کے خلاف استعمال کیا گیا۔ لیکن اس کے آہنی عزم و ثبات میں جنبش نہیں ہوئی۔ جس کے مرکز پر بمباری کی گئی اور پھر اُسے ڈائنامیٹ سے اڑا کر کھنڈر میں تبدیل کر دیا گیا۔ جس کے جاں نثار مریدوں نے اور خود اس روحانی پیشوا نے اپنے خون سے ایسی شجاعت کی داستان لکھی جو ہماری تاریخ آزادی کا ایک روشن باب ہے۔

۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء کی غمگین اور اداس صبح میں اس مست مئے الست نے موت کے جام کو شہد سے شیریں سمجھ کر پی لیا اور خدا کی رحمتوں نے اسے آغوش میں لے لیا۔

خلفاء کو پیر صاحب کی زیارت کرائی گئی۔ سندھ کی سرزمین کی بدقسمتی یہ ہے کہ آج تک یہ عقدہ لاینحل حل نہیں ہو سکا کہ پیر صاحب کا جسدِ مبارک کہاں مدفون ہے۔[1]

پیر سید صبغتہ اللہ شاہ ثانی کی تصانیف میں ہمیں صرف وہ بیاضیں ملتی ہیں جس میں آپ نے سلوک و معرفت کے مختلف نکتوں کو قلم بند کیا ہے۔ یہ بیاض سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس بیاض میں پیر صاحب نے یہ نوٹ دیا ہے۔[2]

میں نے جو کچھ لکھا ہے رتناگری جیل میں لکھا ہے، مدناپور سینٹرل جیل میں کچھ نہیں لکھا، کیوں کہ سرکار عوام تک اسے پہنچنے نہیں دیتی، اور کتاب کے لکھنے میں سخت دقتوں کا سامنا ہے۔ اگر زندگی ہے تو جیل سے باہر آکر لکھوں گا، اب تو صرف جیل میں مطالعہ جاری ہے، جس پر میں نشان لگا رہا ہوں۔

سید تراب علی شاہ راشدی:

پیر پاگارہ خاندان کے ایک بزرگ سید تراب علی شاہ راشدی کا تذکرہ بھی اجمالی حیثیت سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی خاندان کے فرد ہیں جس نے آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ خصوصاً تحریکِ خلافت اور تحریکِ ہجرت کابل میں ان کا اہم کردار ہے۔

۱۹۲۰ء میں صوبہ سندھ وہ واحد صوبہ تھا جس نے منظم طریقے پر افغانستان کی طرف ہجرت کے لیے قدم اٹھایا۔ اس تحریک میں مولانا ابو الکلام آزاد کی شخصیت کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ خود مولانا آزاد نے تحریک ہجرت کو منظم اور فعال بنانے کے لیے صوبہ سندھ میں حضرت سید تراب علی شاہ راشدی کو ماذون مجاز قرار دیا تھا۔

سندھ میں باقاعدہ ہجرت کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔ رئیس المہاجرین جان محمد جونیجو اس کمیٹی کے سیکریٹری اور صدر پیر سید تراب علی شاہ راشدی تھے۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۸ء تک سندھ میں جتنی بھی آزادی کی تحریکیں چلیں ان سب میں سید تراب علی شاہ راشدی پیش پیش تھے۔

یہ درویش سیرت انسان تعلقہ قنبر ضلع لاڑکانہ کے موضع علی خان میں رہتے تھے۔ فرنگی حکومت سے شدید نفرت اور بیزاری رکھتے تھے۔

پیر علی محمد راشدی کا بیان ہے کہ پیر سید تراب علی شاہ پر بلوچستان میں داخل ہونے کی پابندی لگی ہوئی تھی اور وہ کسی ضرورت سے بلوچستان جانا چاہتے تھے۔ پیر علی محمد راشدی کے دادا مرحوم کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے سندھ کے کمشنر سے کہا۔ کمشنر نے جواب دیا کہ یہ پابندی ابھی ختم ہو سکتی ہے، بشرطیکہ آپ سید تراب علی شاہ کو یہاں لے آئیں۔ دادا مرحوم نے کمشنر کی خواہش کا تذکرہ سید تراب علی شاہ سے کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ کام مجھ سے ہو سکتا تو یہ پابندی مجھ پر کیوں ہوتی۔ ہمیں ایسی سیر مطلوب نہیں جس کی بدولت ہمیں اپنا اصول توڑنا پڑے۔ یہ حقیقت ان کے ذہن نشین تھی کہ دنیائے اسلام کو اس وقت تک نجات حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ برٹش استعمار سے نجات حاصل نہیں کر لیتی، اس لیے وہ ہر اس تحریک کا ساتھ دیتے تھے جو مسلمانانِ عالم کو انگریزوں کے آہنی پنجے سے نکالنے والی ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے برصغیر کی ہر تحریک آزادی میں حصہ لیا، بلکہ سندھ میں ان تمام تحریکوں کی رہنمائی کی۔

سید تراب علی شاہ راشدی نے ۱۹۳۸ء میں اپنے وطن موضع علی خان میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

پیر علی محمد راشدی اور پیر حسام الدین راشدی اسی خاندان کے فرد ہیں۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھیے کہ حضرت پیر پاگارہ کا خاندان اور پیر جھنڈا کا خاندان اور راشدی خاندان ایک خاندان کے مختلف نام

---

[1] تذکرہ پیران پاگارہ، ص ۱۸۸۔
[2] مہران سوانحی نمبر، ۱۹۵۷ء، ص ۲۶۵۔

یا ایک ہی خاندان کی مختلف شاخیں ہیں۔ پیر محمد راشد (روضہ دھنی) اس خاندان کے جد اعلیٰ ہیں، جن کے چار صاحب زادے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں:

(1) پیر محمد شاہ

(2) پیر محمد یاسین (جدِ خاندان پیر جھنڈا)

(3) پیر صبغت اللہ شاہ اول (بانی تحریک حر و پیر پاگارہ اول)

(4) پیر ھدایت اللہ

پیر صبغتہ اللہ شاہ اول کے چھ صاحبزادے تھے۔ ان میں سے پانچویں صاحبزادے پیر علی گوہر اول تھے۔ پیر صبغتہ اللہ شاہ اول کی وفات کے بعد مسند رشد و ہدایت کو پیر علی گوہر اول نے زینت بخشی اور یہ پیر پاگارہ دوم ہوئے۔ اب تک پیر پاگارہ خاندان کے چھ بزرگ گزر چکے ہیں۔ جنہوں نے مسند پیر پاگارہ اول کو زینت بخشی۔ ساتویں سجادہ حضرت پیر سکندر شاہ معروف بہ شاہ مردان ثانی سجادہ نشین حال ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی پیر نادر شاہ ہیں۔ حضرت پیر سکندر شاہ معروف بہ شاہ مردان ثانی ہر اس تحریک میں حصہ لے رہے ہیں جو ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے۔ وہ ایک عظیم روحانی پیشوا بھی ہیں اور سیاسی تحریکوں میں ان کی خدمات بھی نمایاں ہیں۔

اس خاندان میں وہ شاخ پیر پاگارہ کہلاتی ہے، جو پیر علی گوہر اول کی اولاد ہیں۔ یہ پیر علی گوہر اول کی اولاد ہیں۔ اس شاخ کے ساتھ مسند سجادگی مختص ہے۔ پیر جھنڈا وہ لوگ کہلاتے ہیں جو پیر محمد یاسین جھنڈا والے کی اولاد ہیں۔

پیر علی محمد بن سید صبغتہ اللہ اول کی اولاد نے عموماً اپنے آپ کو اپنے جد اعلیٰ پیر محمد راشد (روضہ دھنی) سے نسبت دی اور وہ راشدی کہلائے۔ پیر حامد شاہ کے صاحبزادے پیر علی محمد راشدی، پیر حسام الدین راشدی اور پیر احمد شاہ راشدی ہیں۔

اپنے نام کے ساتھ سب سے پہلے راشدی کی نسبت کس نے استعمال کی:

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ پیر علی محمد راشدی نے سب سے پہلے راشدی کی نسبت اپنے نام کے ساتھ لگائی، مگر یہ بات ہماری رائے میں صحیح نہیں۔

سب سے پہلے یہ نسبت حضرت سید صبغتہ اللہ شاہ ثانی کی ان بیاضوں میں نظر آتی ہے جو انہوں نے رتناگری جیل میں لکھی تھیں۔ اس بیاض پر پیر صاحب کا ایک نوٹ ہے۔ بیاض کے آخری صفحے (۱۲۲) کی بائیں جانب دیوان حافظ کے شعر اور چند اردو کے اشعار نقل کیے ہیں۔ آخر میں پیر صاحب نے اس طرح دستخط کیے ہیں:

"سید پیر محمد صبغتہ اللہ شاہ جلالی راشدی"۔[1]

اس بیاض سے تبرکاً ایک ٹکڑا ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

اس کتاب میں ہم نصیحت کی باتیں لکھتے ہیں تاکہ لوگ برے کاموں سے بیزار ہوں اور خدا کو یاد کریں اور خدائے پاک اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے منہ نہ موڑیں۔

گردن از حکم خدایت بر متاب
تا نمانی روز محشر در عذاب[2]

رتناگری جیل میں ہی انہوں نے اپنے جد اعلیٰ سید پیر محمد راشدی (روضہ دھنی) کے ملفوظات کا مطالعہ کیا۔

اپنے جد امجد کے ملفوظات کے متعلق لکھا کہ:

میں نے فارسی کے یہ تمام اشعار حضرت روضہ دھنی کے ملفوظات سے منتخب کیے۔ ان اشعار کے پڑھنے والوں کو میری نصیحت ہے کہ ان اشعار میں سے کچھ اشعار ضرور یاد کرلیں۔ یہ اشعار عجیب معنی اور شوق رکھتے ہیں۔ میں نے ۵ جمادی الآخر ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو اس بیاض کی تحریر کو ختم کیا۔

(سید پیر محمد صبغتہ اللہ شاہ ہاشمی، جلالی، راشدی)

اسی بیاض میں ایک اور جگہ لکھا کہ:

اس کتاب میں دیوان حافظ سے کل ارسٹھ رباعیاں منتخب کرکے لکھی ہیں۔ یہ سب رباعیاں ہفتہ کے دن رتناگری جیل میں، جمادی الاول ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو لکھ کر ختم کیں۔

(سید پیر محمد صبغتہ اللہ ہاشمی، جلالی[3] بوقت ساڑھے نو بجے)

اب ہم سندھ کی اس تحریک کو ختم کرتے ہیں جس کی بنیاد ۱۸۲۶ء میں سید احمد شہید نے سندھ سے گزرتے ہوئے رکھی۔ جس کی آبیاری حضرت سید صبغتہ اللہ اول نے کی اور حضرت سید صبغتہ اللہ ثانی نے جس حریت کو اپنے خونِ شہادت سے لالہ زار بنایا۔ خدا کی ان پر رحمتیں ہوں۔

---

(1) رسالہ مہران سوانح نمبر، ۱۹۵۷ء ص ۲۶۵۔

(2) ایضاً۔ ص ۲۶۰۔

(3) ایضاً۔ ص ۲۶۲۔

باب :30

تحریک خلافت

۱۹۱۱ء میں طرابلس کی جنگ چھڑی۔ ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کا آغاز ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑی، جلد ہی اس جنگ میں ترکی کو گھسیٹ لیا گیا جس کی وجہ سے برصغیر کے مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ ترکی اس زمانے میں خلافت کا مرکز تھا اور مسلمان اسی وجہ سے اس کو تمام عالم اسلامی کا نقطۂ اتحاد تصور کرتے تھے۔ ان حالات میں برصغیر کے مسلمانوں کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۱۹ء میں خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ مارچ ۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی کی طرف سے ایک وفد مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں روانہ کیا گیا تاکہ یورپی اقوام اور خصوصاً برطانیہ پر خلافت کی اہمیت کو واضح کرے۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں یہ وفد ناکام لوٹا۔

ہندوؤں نے بھی اس صریح ظلم و ناانصافی کو دیکھ کر مسلمانوں کا ساتھ دیا اور وہ بھی اس تحریک میں شریک ہوگئے۔

۱۹۲۰ء میں سارا ملک بلا امتیاز مذہب و ملت خلافت کی تحریک میں شریک ہوگیا۔ انگریزی مال کا بائیکاٹ ہونے لگا۔ لوگوں نے سرکاری ملازمتیں ترک کردیں۔ وکلا نے عدالتوں میں جانا چھوڑ دیا۔ سرکاری خطابات واپس کیے جانے لگے اور جیلیں مظلوموں سے بھری جانے لگیں۔ ہندوؤں کی شدھی اور سنگھٹن کی تحریک نے ہندو مسلم اتحاد کے خواب کو ناکام بنا دیا۔ ادھر ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ سے مسلمانان ہند میں شدید مخالفت کا ردعمل ہوا۔ مسلمانان ہند اس رپورٹ کے شدید مخالف تھے۔

خلافت کی تحریک نے ترک موالات کی تحریک کو شباب پر پہنچایا۔ پورے ہندوستان میں ترک موالات کی تحریک تیزی سے پھیلتی گئی۔[1]

تحریک خلافت اور سندھ:

جولائی ۱۹۲۱ء میں خلافت کانفرنس کراچی کے اجلاس میں ایک قرارداد منظور ہوئی جو برصغیر کے ۴۷۱ علماء کرام کے فتویٰ پر مبنی تھی۔ یہ فتویٰ ترک موالات کے سلسلے میں حاصل کیا گیا تھا۔ اس قرارداد میں پاس کیا گیا کہ مسلمان نہ تو فوج میں بھرتی ہوں اور نہ فوج کی بھرتی میں مدد دیں۔

اس جرم میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، پیر غلام مجدد ساکن ٹیاری[2]، مولانا نثار احمد کانپوری، تیر تھ جی عرف وینکٹ رامن شور اور شنکر اچاریہ پر وہ تاریخی مقدمہ چلایا گیا، جس کی عدالت خالق دینا ہال کراچی میں قائم کی گئی تھی۔ اس مقدمہ کا جج جوڈیشل کمشنر کراچی بی سی کنیڈی تھا۔ مقدمہ کا نمبر ۳۳ تھا۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی جوہر نے وہ معرکہ آرا بیان دیا جو ہماری تاریخ کا ایک جلی عنوان ہے۔ اس مقدمے میں سوائے شنکر اچاریہ کے ان تمام شمع آزادی کے پروانوں کو دو دو سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

راقم الحروف نے اس کلام مجید کی زیارت کی ہے، جس کے مطالعے سے کراچی جیل میں مولانا محمد علی جوہر نے اس مقدمے کی تیاری کی تھی۔ یہ سیل کا انگریزی ترجمہ ہے اور اس پر مولانا نے خود لکھا ہے کہ کراچی جیل میں صرف یہ قرآن مجید کا نسخہ میرے پاس تھا اور میں نے اسی کے مطالعے سے اس مقدمے کی تیاری کی ہے۔

قرآن حکیم کا یہ نسخہ مجھے میرے عزیز دوست اور سیاسی رہنما

---

[1] اقبال کے سیاسی افکار، ص ۷۵۔

[2] پیر غلام مجدد ساکن ٹیاری بن میاں عبدالحلیم سرہندی، ولادت ۶ رجب، ۱۳۰۰ھ (۱۳ مئی ۱۸۸۳ء)، مقام ولادت ٹیاری۔ ۱۹۲۰ء میں خلافت تحریک میں حصہ لیا۔ ۸، ۹، ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی جوہر اور ان کے رفقاء پر جو مقدمہ چلایا گیا ان میں یہ بھی شریک تھے۔ پیر صاحب نے ۱۶ جمادی الثانی ۱۳۷۷ھ (۹ جنوری ۱۹۵۸ء) میں وفات پائی۔ (جنب گذاریم جن سین، جلد اول، ص ۲۱۰ تا ۲۱۲)۔

جناب آغا بدر الدین درانی مرحوم سابق اسپیکر سندھ اسمبلی نے دکھایا تھا اور میرے پوچھنے پر بتایا تھا کہ ان کے عزیز دوست مشہور قانون دان مسٹر اے۔ کے بروہی کو بندر روڈ کے ایک ٹھیلے پر پرانی کتابیں بیچنے والے سے ملا۔ مولانا محمد علی جوہر کی تحریر اور دستخط کو دیکھ کر بروہی صاحب نے اس گراں بہا تحفے کو حاصل کیا اور آغا صاحب کی نذر کیا۔

قرآن حکیم کا یہ بیش بہا نسخہ چند سال پہلے تک آغا بدر الدین درانی مرحوم کے ذاتی کتب خانے آشیانہ ادب میں تھا اور یقیناً وہیں اب بھی موجود ہو کیونکہ ان کے چھوٹے بھائی جناب آغا صدر الدین نے اپنے بھائی کی لائبریری کو نہایت عمدہ حالت میں رکھا ہے۔

آغا بدر الدین مرحوم نے اسی زمانے میں مقدمہ کراچی پر نہایت تحقیق و کاوش سے کراچی کے ایک انگریزی روزنامہ میں ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ جس میں اس مقدمے سے متعلق تمام اہم شخصیتوں کے فوٹو تھے۔

ہلال احمر سندھ:

۱۹۱۱ء میں اٹلی کی حکومت نے ترکوں سے طرابلس میں جنگ شروع کی جس سے ترکوں کو کافی نقصان پہنچا۔ ترکوں کی امداد کے لیے چندہ جمع کرنے کے لیے پورے ہندوستان میں ہلال احمر کے نام سے انجمنیں قائم کی گئیں۔ سندھ میں بھی ۱۹۱۹ء میں ایک انجمن ہلال احمر میر ایوب خاں کی صدارت میں قائم کی گئی۔ جس کے سیکریٹری اور خزانچی سیٹھ عبداللہ ہارون تھے۔[1]

خلافت کانفرنس کا سندھ میں پہلا جلسہ:

خلافت کی تحریک کے زمانے میں ۷، ۸، ۹ فروری ۱۹۲۰ء کو لاڑکانہ میں ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں سر بر آوردہ انقلابی لیڈروں مثلاً علی برادران، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا عبدالباری اور مسٹر گاندھی وغیرہ نے شرکت کی۔ مولانا رشد اللہ پیر جھنڈے والے نے خطبۂ صدارت پڑھا۔ سندھ کے رہنماؤں میں سے مولانا تاج محمود امروٹی، پیر تراب علی راشدی، جی ایم سید، مخدوم معین الدین کنیاری اور سید اسد اللہ ٹکرائی اس جلسے میں شریک ہوئے۔

اس کانفرنس کے بعد عملی قدم اٹھانے کے لیے سن کے شہر میں خلافت کمیٹی کا اجلاس مولانا فتح محمد سیوھانی کی صدارت میں ہوا، جس میں سندھ کے اکثر سر بر آوردہ سیاسی رہنما مثلاً شیخ عبدالمجید سندھی، ڈاکٹر نور محمد، شیخ عبدالعزیز (سکھر)، مولوی محمد سلیمان واعظ وغیرہ شریک ہوئے۔ اس کمیٹی میں رزولیوشن پاس ہوا کہ ترکوں کے لیے چندہ جمع کیا جائے۔ اس کے بعد سندھ کے مختلف شہروں میں خلافت تحریک کے جلسے ہوئے۔[2]

سندھ کی دوسری اور تیسری خلافت کانفرنس:

سندھ کی دوسری خلافت کانفرنس سکھر اور تیسری خلافت کانفرنس جیکب آباد میں ہوئی اور اس طرح سندھ میں ہجرت کی قرارداد پاس ہوگئی۔ اس قرارداد کی تائید مولانا تاج محمود امروٹی نے نہ صرف مذہبی گروپ سے کرائی بلکہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں سے بھی حاصل کی۔ سندھ کی مسلم سیاسی اور مذہبی تحریکوں میں پیر جھنڈا، مولانا امروٹی، مولانا رشد اللہ اور پیر تراب علی شاہ کا بہت اہم کردار ہے۔ خصوصاً سندھ میں خلافت تحریک کو کامیاب بنانے کا سہرا تو انھی بزرگوں کے سر ہے۔[3]

ہجرت کابل کی تحریک

سندھ میں ہجرت کی قرارداد:

اپریل ۱۹۲۰ء میں سیوھن میں مولانا عبدالکریم درس کی صدارت میں صوبائی خلافت کمیٹی کا جلسہ ہوا، جس میں رئیس غلام محمد بھرگڑی نے ایک زوردار تقریر کی، ہجرت کے متعلق قرارداد پاس ہوئی۔ مولانا تاج محمود نے نہ صرف مذہبی گروہ بلکہ انگریزی دان، جدید تعلیم یافتہ طبقے، نوجوانوں کی تائید بھی حاصل کرلی تھی۔ قدیم وضع کے لوگوں میں مولانا محمد ہاشم، مولانا عبدالکریم حسینی، مولانا دین محمد وفائی تھے اور انگریزی دانوں میں جان محمد جونیجو بیرسٹر، غلام محمد نانا اور محمد امین کھوسو تھے۔ جان محمد جونیجو نے اپنی ساری جائیداد فروخت کردی اور افغانستان کی طرف ہجرت کی۔[4]

---

(1) جنب گزاریم جن سین، جلد ۲، ص ۴۴۔

(2) سندھ جو سید، ص ۴۱، باب ۴۔

(3) سندھ کواٹرلی، مضمون مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی، جلد نمبر ۲، ۱۹۷۷ء، ص ۷ تا ۱۹۔ حضرت مولانا تاج محمود امروٹی، مصنف ابو بکر شبلی، ص ۹۔

(4) سندھ کواٹرلی، شمارہ ۲، ۱۹۷۷ء، ص ۱۔ تا ۱۹۔

ادھر تحریک ترک موالات سندھ میں زور پکڑتی گئی۔ جیکب آباد خلافت کانفرنس میں رئیس غلام محمد بھرگڑی نے اعلان کیا کہ تمام سرکاری عہدے، میونسپل، کمشنری، لوکل بورڈ کی ممبری وغیرہ سب چھوڑ رہے ہیں۔ ان کی یہ تقریر اس قدر اثر انگیز تھی کہ سندھ کے عوام میں ترک موالات کا جوش بے حد بڑھ گیا اور سندھ کے کتنے ہی لوگوں نے انگریزوں سے قطع تعلق کا اعلان کیا۔[1]

ہجرت کمیٹی:

اس کے بعد سندھ میں باقاعدہ ہجرت کمیٹی قائم ہوئی۔ ہجرت کا مسئلہ جب سامنے آیا تو یہ ضروری سمجھا گیا کہ ہندوستان سے ہجرت منظم اور باضابطہ ہو۔ مسلمان منظم اور متحد ہو کر ہجرت کریں۔

مولانا آزاد نے ہجرت کے امور پر توجہ دلاتے ہوئے لکھا کہ:

ہجرت کی جو صورت اس وقت ہندوستان میں درپیش ہے اس کی صورت یہ نہیں ہے کہ فرداً فرداً ہر شخص بطور خود نکل کھڑا ہو، بلکہ ہجرت کے تمام اعمال جماعت کے ساتھ انجام پانے چاہئیں۔ اس بات کا فیصلہ کرنا صاحب جماعت کا کام ہے کہ کس شخص کو فوراً ہجرت کرنا چاہیے اور کس شخص کی استعداد ایسی ہے کہ اس کا قیام اندرونی خدمات کے لیے مطلوب و مفید ہے۔

پھر مولانا آزاد نے لکھا کہ:

ہجرت کے لیے بیعت ہجرت ضروری ہے۔۔۔ ضروری ہے کہ جو لوگ ہجرت کریں پہلے ہجرت پر بیعت کریں۔

ہجرت کے مسائل میں مرکزی حیثیت مولانا آزاد کو حاصل تھی۔ مولانا آزاد نے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بیعتِ ہجرت کے مجاز مقرر کئے تھے۔ سندھ میں حضرت پیر تراب علی شاہ راشدی کو مولانا آزاد نے ماذون و مجاز قرار دیا تھا۔[2]

تحریک ہجرت میں سندھ کا کردار:

سندھ نے ہجرت میں نہایت منظم قدم اٹھایا۔ ہجرت کمیٹی کے صدر پیر سید تراب علی شاہ راشدی اور سکریٹری جان محمد جونیجو تھے۔ لوگ جوق در جوق ہجرتِ کابل کے لیے اپنا نام لکھوانے لگے۔ سب سے زیادہ ہجرت کرنے والے صوبۂ سندھ کے لوگ تھے۔ ہجرت کمیٹی کو جب کوئی ہجرت کے لیے اپنا نام بھیجتا تو ہجرت کمیٹی اس کی صحیح رہنمائی کرتی اور اس کے حالات کے مطابق اس کو مشورہ دیتی۔

مہاجرین سندھ کا پہلا قافلہ:

سندھ کے مہاجرین کا پہلا قافلہ جولائی ۱۹۲۰ء میں لاڑکانہ سے روانہ ہوا۔ مہاجرین کی اسپیشل ٹرین سات سو مہاجرین کو لے کر افغانستان روانہ ہوئی۔ مہاجرین کے اس کارواں کے رئیس چونکہ جان محمد جونیجو تھے، اسی نسبت سے وہ رئیس المہاجرین کہلاتے ہیں۔ سید پیر تراب علی شاہ راشدی اور علی انور شاہ راشدی مہاجرین کو خدا حافظ کہنے کے لیے پشاور تک گئے۔ ہر اسٹیشن پر سیکڑوں آدمیوں نے ان کا استقبال کیا۔

یہ قافلہ ۱۹ جولائی ۱۹۲۰ء کو جلال آباد پہنچا۔ گورنمنٹ افغانستان نے اگرچہ مہاجرین کو سہولتیں دیں لیکن بے نظمی کی وجہ سے مہاجرین کو شکایات ہونے لگیں۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں رئیس المہاجرین ایک وفد لے کر مولانا محمد علی جوہر سے ملاقات کے لیے روانہ ہوئے۔

وہ مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ اجمیر خلافت کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے۔ بخار کی وجہ سے جلسے میں نہ آسکے اور فارسی میں اپنی تقریر لکھ کر بھجوائی۔ ان کے بخار نے خوفناک صورت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ ۲۷ رجب مطابق ۱۶ اپریل ۱۹۲۱ء کی صبح کو رحمت حق سے جا ملے۔ ان کے جنازے کی نماز خواجہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں مولانا حکیم معین الدین نے پڑھائی اور ساگر تالاب کے کنارے مدفون ہوئے۔[3]

جن اکابرین نے انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے لیے عظیم الشان قربانیاں دیں اور ہجرت کابل کی جدوجہد میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے، ان میں رئیس المہاجرین جان محمد جونیجو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس تحریک کے دو اہم لیڈر نظر آتے ہیں۔ ایک سید تراب علی شاہ راشدی جو اس کمیٹی کے صدر تھے، جن کا تذکرہ ہم پیر پاگارہ کے حالات کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ دوسرے جان محمد جونیجو ۱۸۸۶ء (۱۳۰۴ھ)۔

ہجرت کابل تحریک کے لیڈر۔ رئیس المہاجرین جان محمد جونیجو:

جان محمد جونیجو لاڑکانہ کے ایک گاؤں دھامڑہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام حاجی کریم بخش تھا جو ایک متمول اور خوش حال زمیندار تھے۔

---

(1) "مہران سوانح نمبر ۱۹۵۷ء، ص ۲۸۵۔

(2) رسالہ الولی، فروری ۱۹۷۳ء، "سید تراب علی شاہ راشدی،" مضمون ابو سلمان شاہجہاں پوری، ص ۴۰۲ تا ۴۲۷۔

(3) یہ تمام تفصیل رسالہ مہران سوانح نمبر ۱۹۵۷ء، ص ۲۸۳ تا ۲۸۷ سے ماخوذ ہے۔

فارسی اور سندھی کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ ۱۹۱۲ء میں بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مسلمانوں میں دوسرے نوجوان تھے جنھوں نے سندھ کے مسلمانوں میں بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ مغرب کی ہوا کھاتے ہی لوگ مغرب زدہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن انگلینڈ میں رہنے کے بعد بھی ان کی وضع واطوار میں کوئی فرق نہ آیا۔ کچھ دن کراچی میں رہے۔ پھر لاڑکانہ میں مستقل وکالت شروع کر دی۔

کچھ دن کے بعد اُن کے والد نے وفات پائی اور زمینداری کا کام بھی ان کے ذمے آپڑا۔

مسلم لیگ کی ممبری:

۱۹۱۷ء میں جب رئیس غلام محمد بھرگڑی کی کوششوں سے کراچی میں سندھ مسلم لیگ کی شاخ قائم ہوئی تو اس کے ابتدائی ممبروں میں جان محمد جونیجو بھی تھے۔ قومی زندگی میں جب قدم رکھا تو تھوڑے ہی عرصے میں فنافی القوم ہو گئے۔

عربی انگریزی سکول میں حصہ:

مارچ ۱۹۱۸ء میں شیخ عبدالعزیز نے سکھر میں ایک کانفرنس طلب کی اور ایک عربی انگریزی سکول قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جان محمد جونیجو نے اس میں بڑی فراخ دلی سے حصہ لیا اور دو طلبا کے لیے وظیفہ دینا منظور کیا۔ لیکن افسوس ہے کہ تحریک خلافت کی ہل چل کے باعث یہ منصوبہ عملی جامہ نہ پہن سکا۔

تحریک خلافت:

۱۷ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو لکھنؤ میں ایک آل انڈیا مسلم کانفرنس بلائی گئی۔ اس کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ برٹش گورنمنٹ کا جو جشن ترکی کے حصے بخرے کرنے پر ۱۳ نومبر تا ۱۶ نومبر ۱۹۱۹ء کو منایا جانے والا ہے، اس کا بائیکاٹ کیا جائے اور اس دن ہندوستان کے چھوٹے بڑے شہروں میں ترکی سلطنت کے بقا واستحکام کے لیے دعائیں کی جائیں۔ اس طرح پہلا یوم خلافت منایا جائے۔ چنانچہ سندھ میں رئیس المہاجرین نے حضرت پیر تراب علی شاہ راشدی کی مدد سے اس یوم دعا کے منانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ اور اپنے بنگلے کے سامنے بڑی دھوم دھام سے ایک عام جلسہ کیا۔

آل انڈیا خلافت کانفرنس دہلی:

نومبر ۱۹۱۹ء کو آل انڈیا خلافت کانفرنس کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں یہ رزولیوشن پاس کیا گیا کہ گورنمنٹ جو صلح کا جشن نومبر میں منا رہی ہے، اس کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اس کی تائید جمعیۃ العلماء ہند اور سندھی لیڈروں کے وفد نے بھی کی۔ جس میں رئیس المہاجرین شامل تھے۔ لاڑکانہ میں تحریک خلافت کا کام اُن کے ذمے کیا گیا۔ چنانچہ انھوں نے پیر تراب علی شاہ راشدی کے ساتھ مل کر سرگرمی سے خلافت کا کام شروع کیا۔ کالی جھنڈیوں سے جلوس نکالا اور جشن کے موقع پر ہڑتال کی۔

خلافت کانفرنس حیدرآباد:

۴ جنوری ۱۹۲۰ء کو حیدرآباد میں پہلی مرتبہ خلافت کا جلسہ ہوا، جس میں انگریزوں کے خلاف رئیس المہاجرین جونیجو نے آتش فشاں تقریر کی۔

خلافت کانفرنس لاڑکانہ:

۶، ۷، ۸ جون ۱۹۲۰ء (۱۳۳۹ھ) کو رئیس المہاجرین کی کوششوں سے خلافت کانفرنس لاڑکانہ میں زیر صدارت پیر جھنڈا منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کے ممتاز لیڈر مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبدالجبار لکھنوی، مولانا آزاد، رئیس غلام محمد بھرگڑی، سیٹھ عبداللہ ہارون، مولانا امروٹی، گاندھی جی، ڈاکٹر کچلو وغیرہ شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں فیصلہ ہوا کہ ایک وفد بمبئی بھیجا جائے اور برٹش گورنمنٹ کے افسروں کے مظالم کے خلاف جو وہ سندھ میں کر رہے ہیں، گورنر سے ملاقات کی جائے۔ اس وفد کے ممبر پیر جھنڈا، مولانا دین محمد وفائی اور دوسرے معززین نامزد کیے گئے۔ چنانچہ یہ وفد بصدارت رئیس غلام محمد بھرگڑی بمبئی پہنچا، لیکن اس وفد کو دس دن بمبئی میں رہنے کے بعد بھی گورنر سے ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔

سیوہن خلافت کانفرنس:

اپریل ۱۹۲۰ء میں مولانا عبدالکریم درس کی صدارت میں خلافت کا ایک جلسہ ہوا۔ جس میں رئیس مرحوم نے ایک زوردار تقریر کی۔

ہجرت کابل کی تحریک:

اسی جلسے میں ہجرت کابل کی تحریک پاس ہوئی، جس نے جیکب آباد کانفرنس میں عملی صورت اختیار کی۔

جیکب آباد کی کانفرنس میں پہلی مرتبہ رئیس جان محمد جونیجو نے گورنمنٹ کے بائیکاٹ کا سوال اٹھایا۔

جیکب آباد میں جان محمد جونیجو نے اعلان کیا کہ میں سرداری کی کرسی، میونسپل کمشنری، لوکل بورڈ کی ممبری، یہاں تک کہ بیرسٹری کی ڈگری سب چھوڑتا ہوں اور لگان دینے سے بھی انکار کرتا ہوں۔

سندھ میں ترک موالات کا یہ پہلا نقطہ تھا جو جان محمد جونیجو نے رکھا۔ ان کی تقریر کا یہ اثر تھا کہ سندھ کے بہت سے لوگوں نے ترکِ موالات میں سرگرمی سے حصہ لیا۔

ہجرت کمیٹی:

اس کے بعد باقاعدہ ہجرت کمیٹی مقرر ہوئی۔ جس کے صدر پیر تراب علی شاہ راشدی اور سکریٹری جان محمد جونیجو منتخب ہوئے۔ ہجرت کابل کا باقاعدہ دفتر کھولا گیا۔ ہجرت کے لیے لوگوں نے دھڑا دھڑ اپنے نام لکھوانے شروع کیے۔ جان محمد کا بنگلہ ہجرت کمیٹی کا دفتر مقرر ہوا۔

برٹش گورنمنٹ کا عتاب:

جان محمد جونیجو استعمار پسندوں اور فرنگی قوت کا مقابلہ کر رہے تھے کہ انہیں برٹش گورنمنٹ کے عتاب کا ہدف بننا پڑا۔ حکومت نے ان کی زمینوں کو پانی دینا بند کر دیا۔ مگر جان محمد جونیجو نے اس کی پروا نہیں کی۔ بلکہ وہ برابر ہجرت کی تیاریوں میں لگے رہے۔ یہ سارے ہندوستان میں پہلے سندھی مجاہد تھے جنہوں نے ہجرت کی۔

ہجرت کا نظارہ:

جب تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ رختِ سفر بندھنے لگا۔ جولائی ۱۹۲۰ء کو لاڑکانہ شہر سے پہلی اسپیشل ٹرین سات سو مہاجرین کو لے کر افغانستان روانہ ہوئی۔ اس کارواں کے میر کارواں رئیس مہاجرین جان محمد جونیجو تھے۔ سندھ کے مسلمانوں کی ہجرت نے گورنمنٹ برطانیہ کو پریشان کر دیا۔ لیکن اس کی کامیابی کا سہرا رئیس المہاجرین نواب جان محمد خان جونیجو کے سر ہے جو پہلی اسپیشل ٹرین لے کر گئے تھے۔ مہاجرین کی یہ ٹرین جن جن اسٹیشنوں پر ٹھہری، مسلمانوں کے آپس میں والہانہ محبت کے عجیب روح پرور نظارے دیکھنے میں آتے تھے۔ لاڑکانہ سے روہڑی تک ہزاروں مسلمانوں نے مہاجرین کو الوداع کہا۔ سندھ کے باہر بھی ہر اسٹیشن پر لوگ جوق در جوق ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو کر ان کا استقبال کر رہے تھے۔

یہ کارواں ۱۹ جولائی ۱۹۲۰ء کو جلال آباد پہنچا۔ افغان حکومت نے اگرچہ مہاجرین کو کافی سہولتیں دیں، لیکن کثرتِ مہاجرین نے کچھ بد نظمی پیدا کر دی۔

رئیس المہاجرین کی ایک وفد کے ساتھ واپسی:

اس کے ازالے کے لیے رئیس المہاجرین ایک وفد کے ساتھ مولانا محمد علی موہر کی خدمت میں آئے۔ مولانا ترکِ موالات کے سلسلے میں اس وقت ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کر رہے تھے۔ رئیس المہاجرین بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے اور مولانا کے ساتھ ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔

لاڑکانہ کے جوڈیشل کمشنر کا نوٹس:

نومبر کی آخری تاریخوں میں الہ آباد کانگریس کے اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد لاڑکانہ پہنچے۔ سندھ کے جوڈیشل کمشنر نے جونیجو صاحب کو نوٹس دیا کہ وہ اپنی کراچی اور جیکب آباد والی تقریروں کی جواب دہی کریں۔ رئیس المہاجرین نے جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ میں افغانستان کے بادشاہ کی رعیت ہوں۔ انجمن مہاجرین ہند کی طرف سے آیا ہوں۔ گورنمنٹ اگر چاہتی ہے وہ مجھ سے جواب لے تو اسے چاہیے کہ وہ بمبئی کی حکومت کی طرف سے افغانستان کو لکھے۔

مختصر یہ ہے کہ بمبئی خلافت کمیٹی نے پچاس لاکھ روپے کی امداد مہاجرین افغانستان کے لیے دی، جسے رئیس المہاجرین نے ایک دم کابل روانہ کر دیا اور پانچ لاکھ روپے کی امداد کا مزید وعدہ کیا۔

اس کے بعد مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ اجمیر شریف خلافت کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے۔

وفات:

اجمیر ہی میں رئیس المہاجرین کو بخار آیا، جس کی وجہ سے وہ جلسے میں شریک نہ ہو سکے۔ لیکن انہوں نے اپنی تقریر فارسی میں لکھ کر بھیجی۔ بخار نے بیماری کی خوفناک صورت اختیار کر لی۔

۱۶ اپریل ۱۹۲۱ء (۲۷ رجب المرجب ۱۳۳۵ھ) کو سفر اور ہجرت کے عالم میں اس بندۂ مخلص نے وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اُن کے جنازے کی نماز مولانا حکیم معین الدین اجمیری نے پڑھائی اور انہیں ساگر تالاب کے کنارے دفن کیا گیا۔[1]

---

[1] یہ تمام تفصیل رسالہ مہران سوانح نمبر ۱۹۵۷ء، ص ۲۸۳ تا ۲۸۵ سے ماخوذ ہے۔

باب: 31

سندھ میں تحریک انقلاب
(عرف ریشمی رومال)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ اپنے علم و عمل اور تقویٰ و تقدس اور سیاسی بصرت کے اعتبار سے ایک عہد آفریں شخصیت تھے۔ انگریزوں کی چیرہ دستیوں اور بلقان و طرابلس کی جنگ نے حضرت شیخ الہند کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا تھا۔ عالم اسلامی کی مظلومیت اور پریشانی کو دیکھ کر حضرت شیخ الہند بے حد متفکر رہتے تھے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ چکے تھے کہ جب تک ہندوستان انگریزوں کے چنگل سے آزاد نہیں ہوگا، ہندوستان کو چین نہیں مل سکتا۔ حضرت شیخ الہند نے اس فرض کی ادائیگی کو ضروری سمجھا اور دہلی پہنچ کر اپنے شاگرد رشید مولانا عبید اللہ سندھی سے، جو اس وقت نظارۃ المعارف القرآنیہ کی خدمت انجام دے رہے تھے، فرمایا کہ تم شاخوں کی اصلاح کر رہے ہو، حالانکہ ہماری روایات و تہذیب کے پیڑ کی جڑوں کو فرنگی روایات و تہذیب کا کیڑا لگ چکا ہے۔ ہماری تمنا اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہندوستان سے انگریزی حکومت کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند نے مولانا عبید اللہ سندھی کو اپنا ہم خیال اور تحریک آزادی کے لیے سربکف ہونے کے لیے رضامند کر لیا۔

اس تحریک کا بنیادی نقطۂ نظر جہاد تھا، اس لیے اس تحریک کے مجاہدین کے لیے اسلحہ اور سامان حرب کی ضرورت تھی۔

تحریک کے قابل اعتماد اراکین:

اس تحریک کے قابل اعتماد اراکین یہ تھے:

(۱) حاجی فرنگ زئی۔
(۲) مولانا سیف الرحمان۔
(۳) مولانا محمد میاں (منصور انصاری) الیہٹوی۔
(۴) مولانا عزیز گل۔
(۵) مولانا احمد اللہ پانی پتی۔
(۶) مولانا ظہور محمد خاں سہارنپوری۔
(۷) شیخ عبد الرحیم سندھی۔
(۸) مولانا غلام محمد دین پوری۔
(۹) مولانا ابو الحسن تاج محمود امروٹی۔
(۱۰) مولانا محمد صادق کراچوی۔
(۱۱) مولانا فضل ربی۔
(۱۲) ڈاکٹر انصاری مرحوم۔
(۱۳) حضرت مولانا عبد الرحیم رائے پوری۔

انقلابی تحریک کی شاخیں:

اس تحریک کی پانچ شاخیں قائم کی گئیں تھیں:

(۱) دین پور۔
(۲) امروٹ۔
(۳) کراچی محلہ کھڈہ۔
(۴) دہلی۔
(۵) چکوال۔

تحریک میں عمومیت:

یہ تحریک عمومیت کا رنگ لیے ہوئے تھی۔ اس تحریک میں شیخ آزادی کے پروانے حضرت شیخ الہند کے کرائے کے مکان میں، جو کوٹھی کے نام سے مشہور تھا، آکر ٹھہرتے تھے اور شیخ الہند ان سے تبادلہ

خیالات کرتے تھے۔ اس تحریک کا مرکز باغستان تھا۔ دہلی میں مولانا عبیداللہ سندھی نے ایک ادارہ نظارۃ المعارف کے نام سے قائم کر رکھا تھا، انگریزوں کو ان پر شبہ ہو گیا اور جاسوس ان کے پیچھے لگ گئے۔ اس بنا پر شیخ الہند نے مولانا عبیداللہ سندھی کو حکم دیا کہ وہ افغانستان چلے جائیں۔ چنانچہ مولانا سندھی کابل ہجرت کر گئے۔

سندھ کوارٹرلی میں مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے لکھا ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی اپنے استاد محترم کے حکم کی بنا پر کابل جانا چاہتے تھے مگر ان کے پاس روپے کی کمی تھی۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون سے انہیں پانچ ہزار روپے دلوائے۔

شیخ عبدالرحیم بلوچستان کی سرحد تک مولانا سندھی کے ساتھ گئے۔

ریشمی رومال سے یہ تحریک کیوں موسوم ہوئی؟

اس انقلابی تحریک کا نام ریشمی رومال کی تحریک کیوں پڑا؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی نے کابل سے ریشمی رومال پر لکھے ہوئے تین خطوط شیخ عبدالحق کے ذریعے شیخ عبدالرحیم کو حیدرآباد بھجوائے تھے۔ جن میں شیخ عبدالرحیم کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ حجاز جائیں یا کسی معتبر آدمی کے ساتھ یہ خط شیخ الہند کو بھجوا دیں۔ ان خطوط کے نامہ بر شیخ عبدالحق پنجاب کے کچھ طلبہ کے ساتھ افغانستان گئے تھے اور وہ اللہ نواز خاں کے بچوں کے اتالیق تھے۔ خدا جانے کیا صورت پیش آئی کہ انہوں نے یہ خط شیخ عبدالرحیم کو پہنچانے کے بجائے اللہ نواز خاں کے والد خان بہادر رب نواز خاں کو دے دیے اور خاں بہادر کے ذریعے یہ خط پنجاب کے گورنر مائیکل اوڈائر کے پاس پہنچ گئے اور اس طرح برطانوی حکومت کو جدوجہد آزادی کی اس تحریک کا پتا چل گیا جو حضرت شیخ الہند، مولانا عبیداللہ سندھی اور شیخ عبدالرحیم وغیرہ نے شروع کی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ عبدالرحیم کا پیچھا کیا گیا۔ حضرت شیخ الہند کو چار برس تک مالٹا میں قید رکھا گیا، آخر شیخ الہند نے پولیس کے مظالم سے مجبور ہو کر اپنی داڑھی منڈوا دی اور بھیس بدل کر پولیس کے چنگل سے نکل بھاگے۔ شیخ عبدالرحیم سرہند چلے گئے اور وہاں وہ مزدوری کر کے پیٹ پالتے رہے اور گمنامی کی حالت میں وفات پائی۔[1]

اس بنا پر ہماری سیاسی تاریخ میں اس کا نام ریشمی رومال کی تحریک پڑا۔ شیخ عبدالرحیم آزادی کی تمنا لیے جو اپنوں کی وجہ سے ناکام ہونے لگی قبر میں چلے گئے۔

سندھ میں ریشمی رومال کی تحریک کے لیڈر

ریشمی رومال کی تحریک کے مؤسس و بانی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اس کے علاوہ مولانا عبیداللہ سندھی اس تحریک کے وہ رکن رکین ہیں جنہوں نے اہل سندھ کو اس تحریک سے متعارف کرایا اور سندھ کی سیاست اور تاریخ میں گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

تحریک شیخ الہند میں مولانا سید محمد میاں ناظم جمعیۃ العلماء ہند نے لکھا ہے کہ اس تحریک کا مقصد عالم اسلامی کا اتحاد تھا۔ اس کے بانیوں کا خیال تھا کہ بغیر تشدد کے اس برصغیر سے انگریزوں کو نکالنا ممکن نہیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اسلحہ اور مجاہدین ضروری ہیں۔ چنانچہ اس کا مرکز باغستان قرار پایا اور ہندوستان کے کچھ شہروں میں اس کی شاخیں قائم کی گئیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی اس تحریک کی اہم ترین شخصیتوں میں سے تھے۔ سندھ کے جن بزرگوں نے اس تحریک میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے، ان میں شیخ عبدالرحیم، عبدالقیوم، عبداللہ (مولانا عبیداللہ سندھی کا خادم)، مولوی محمد صادق کھڈے والے اور عبدالحق طالب علم (جس کے ذریعے سے مولانا عبیداللہ سندھی نے کابل سے یہ خط شیخ عبدالرحیم کے نام حیدرآباد سندھ بھیجے تھے) شامل تھے۔

مولانا سید محمد میاں اپنی کتاب "شیخ الہند کی تحریک" میں سی آئی ڈی کی رپورٹوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ۱۴ اگست ۱۹۱۶ء کو ملتان کے خان بہادر رب نواز خاں نے ملتان ڈویژن کے کمشنر کو زرد ریشمی کپڑے کے تین ٹکڑے دکھائے۔ خان بہادر نے بتایا کہ انہیں یہ خط عبدالحق سے ملے ہیں جو ان کے لڑکے کا اتالیق تھا۔ یہ کابل سے بھیجے گئے تھے اور حیدرآباد سندھ میں شیخ عبدالرحیم کو دیے جانے تھے۔[2]

---

(1) سندھ کوارٹرلی ۱۹۷۷ء، نمبر ۲، مضمون مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی، ص ۷ تا ۱۹۔

(2) شیخ الہند کی تحریک، مولانا سید محمد میاں، ص ۱۸۰ - ۱۸۱۔

ریشمی خطوط کے مضامین:

پہلا ریشمی خط شیخ عبدالرحیم کے نام تھا جس میں مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا تھا کہ شیخ الہند کو (یہ دوسرا خط) مدینہ منورہ بھیجنا ہے اور ان کو خبردار کرنا ہے کہ وہ کابل نہ آئیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے شیخ عبدالرحیم کو یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اس خط کے پہنچانے کے لیے پانی پت کے مولوی حمداللہ سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔ دوسرا خط شیخ الہند کے نام تھا۔ تیسرا ریشمی ٹکڑا ان واقعات سے شروع ہوتا ہے جو جدہ سے آنے کے بعد مولانا عبیداللہ سندھی کو پیش آئے تھے۔

کہتے ہیں کہ عبدالحق اپنے مربی خاں بہادر رب نواز خاں سے ملنے گیا تھا۔ رب نواز خاں نے اس پر کچھ اس طرح اثر ڈالا کہ وہ ریشمی خطوط دکھانے پر مجبور ہو گیا۔ رب نواز خاں نے یہ خطوط اپنے قبضے میں کر لیے اور ان خطوط کو اور عبدالحق کو فوراً کمشنر ملتان ڈویژن کے سامنے پیش کر دیا۔[1]

شیخ عبدالرحیم

شیخ عبدالرحیم کے متعلق ہم گذشتہ اوراق میں مختصر طریقے پر ان کے سوانحی حالات لکھ آئے ہیں۔ سی آئی ڈی نے ان کے متعلق لکھا کہ:

> شیخ عبدالرحیم بھگوان داس زمیندار کا بیٹا ہے۔ ہندو سے مسلمان ہوا۔ دوسرے باحیثیت ہندوؤں کو مسلمان بنانے کی کوشش کی۔ پیشے کے اعتبار سے درزی ہے۔ حیدرآباد میں حکیم عبدالحکیم کے مکان کے پاس گاڑی احاطے میں رہا کرتا تھا۔

سر عبداللہ ہارون:

سر حاجی عبداللہ ہارون کے متعلق سی آئی ڈی نے لکھا کہ:

> یہ مولوی محمد صادق کھڈہ کراچی اور ابوالکلام آزاد اور اتحاد اسلامی کے دوسرے انتہا پسندوں کا کٹر حامی ہے۔[2]

عبدالحق

عبدالحق، جو ریشمی خطوط کے نامہ بر تھے، کے متعلق سی آئی ڈی کی رپورٹ میں ہے کہ:

> (عبدالحق) ہندو سے مسلمان ہوا۔ اس کا پرانا نام جیون داس ہے۔ وہ لڑکا ہے لورنڈا رام ساکن موضع ورچھا تھانہ جنجیال ضلع شاہ پور کا۔ انٹرنس تک پڑھا ہے۔ ۱۹۰۹ء میں سکول چھوڑ دیا۔ ۱۹۱۲ء میں اسلام قبول کیا۔ خان بہادر رب نواز خاں نے اپنے دونوں لڑکوں کا اتالیق مقرر کیا۔ خان بہادر رب نواز کے لڑکے اللہ نواز نے اس کو جہاد کرنے والے طالب علموں کی جماعت میں شامل ہونے کے لیے ابھارا۔ فروری ۱۹۱۵ء میں اس نے سرحد پار کی۔ جولائی ۱۹۱۶ء میں اسے حیدرآباد شیخ عبدالرحیم کے پاس (تین ریشمی خطوط دے کر) بھیجا گیا۔ جنود ربانیہ کی فہرست میں وہ میجر تھا۔[3]

شیخ ابراہیم سندھی

شیخ ابراہیم سندھی کے متعلق سی آئی ڈی کی رپورٹ میں یہ اندراج ہے۔ شیخ ابراہیم سندھی سابق پروفیسر حبیبیہ کالج عبدالمجید مدیر "الحق" کا شریک کار ہے۔ اس نے مولانا عبیداللہ سندھی کو سفر کابل میں مدد دی۔ سازش کا ایک اہم رکن ہے اور حجاز اور کابل کے موجودہ سازشوں کے درمیان رابطے کا کام کرتا ہے۔ جنود ربانیہ کی فہرست میں کرنل ہے۔ اس کا موجودہ پیشہ معلوم نہیں۔[4]

مولانا محمد صادق کھڈے والے

مولانا محمد صادق کھڈے والے بھی ریشمی رومال کی تحریک میں شریک تھے۔ مولانا محمد صادق کھڈہ، کراچی کے متعلق سی آئی ڈی کے جو اندراجات ہمیں ملتے ہیں ان سے ان کے عزم و استقلال اور حق پر ثابت قدمی کا پتا چلتا ہے۔ سی آئی ڈی نے ان کے متعلق لکھا کہ:

> مولوی محمد صادق جنود ربانیہ کی فہرست میں شامل ہے۔ وہ جنگ کے بعد سے جہاد کے لیے پروپیگنڈہ کر رہا ہے۔ ۱۹۱۵ء-۱۹۱۶ء میں قلات کی شورش میں اس کا ہاتھ ہے۔ اب وہ کاروار میں نظر بند ہے۔[5]

---

(1) شیخ الہند کی تحریک۔ مولانا سید محمد میاں، ص ۱۸۰-۱۸۱

(2) ایضاً۔ ص ۲۹۶۔

(3) ایضاً۔

(4) ایضاً، ص ۴۱۰-۴۱۱۔

(5) ایضاً۔ ص ۴۵۷۔

حکیم عبدالقیوم:

حکیم عبدالقیوم حیدرآباد (سندھ) کے متعلق سی آئی ڈی نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ:

عبدالقیوم حیدرآباد کا میونسپل کمشنر ہے اور شیخ عبدالرحیم کا ساتھی ہے۔

مولانا سید تاج محمود امروٹی

سرزمین سندھ کے روحانی پیشوا مولانا سید تاج محمود امروٹی کو سندھ کے سیاسی، مذہبی اور سماجی رہنماؤں میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی مذہبی اور سیاسی خدمات بے شمار ہیں۔ ریشمی خطوط کی تحریک میں بھی انہوں نے نمایاں حصہ لیا۔ وہ حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈی کے مرید و خلیفہ ہیں۔ یہیں ان کی ملاقات مولانا عبیداللہ سندھی سے ہوئی۔ مولانا عبیداللہ سندھی ہی حضرت شیخ الہند سے ان کے تعارف کا ذریعہ بنے۔ حضرت شیخ الہند دو دفعہ امروٹ تشریف لائے۔ جب ۱۹۱۵ء میں مولانا عبیداللہ سندھی نے حضرت شیخ الہند کے حکم سے کابل جانے کا ارادہ کیا تو مولانا امروٹی نے انہیں ہر طرح کی مدد پہنچائی۔

ریشمی خطوط جو مختلف اوقات میں مختلف اشخاص کے نام روانہ کیے گئے تھے، ان میں سے ایک خط مولانا امروٹی کے نام بھی تھا۔ جس کو فتح محمد نامی شخص لے کر آیا تھا۔ حکومت برطانیہ کو کسی طرح یہ خط مل گیا اور اس نے مولانا امروٹی کو کراچی میں نظر بند کر دیا۔ اس سلسلے میں کراچی کے کمشنر نے مولانا امروٹی سے پوچھ گچھ کی، لیکن کوئی ثبوت فراہم نہ ہونے کی وجہ سے مولانا امروٹی کو چھوڑ دیا گیا۔

یہیں سے مولانا امروٹی کی سیاسی زندگی کا موڑ شروع ہوا۔ خلافت تحریک، ترکِ موالات تحریک اور ہجرت کابل کی تحریک میں وہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ خلافت کی تحریک کے بعد وہ جمعیۃ العلماء ہند میں شامل ہو گئے اور آخر وقت تک جمعیۃ العلماء ہند کے لیے کام کرتے رہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ان کی تبلیغ سے بہت سے غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے۔

حضرت تاج محمود امروٹی ۵ نومبر ۱۹۲۹ء کی شب میں رحمتِ حق سے جا ملے۔

مولانا عبیداللہ سندھی

سندھ میں دیوبندی مکتبہ فکر کے علماء کے بہت اثرات رہے ہیں۔ ان اثرات کو مقبول بنانے میں مولانا عبیداللہ سندھی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ سندھ میں ریشمی رومال کی تحریک کا حلقہ گو وسیع نظر نہیں آتا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سندھ کی جن محترم شخصیتوں نے اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا ہے، ان میں مولانا عبیداللہ سندھی، شیخ عبدالرحیم سندھی، مولانا تاج محمود امروٹی، مولانا محمد صادق کھڈے والے تھے، جو ہمیں سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی اگرچہ خاکِ پنجاب سے پیدا ہوئے۔ لیکن سندھ کی سیاست میں ان کا اہم کردار ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی سندھی کہلانے لگے۔

وہ سیال کوٹ پنجاب کے ایک گاؤں (چیانوالی) میں ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء کو ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان پیشہ کے لحاظ سے زرگر تھا، لیکن بعد میں اس خاندان کے افراد ساہوکارہ اور سرکاری ملازمت بھی کرنے لگے تھے۔ ان کے والد رام سنگھ ان کی پیدائش سے چار ماہ پہلے فوت ہو چکے تھے۔ مولانا عبیداللہ کے دو ماموں جام پور ضلع ڈیرہ غازی خان میں پٹواری تھے۔ یہ خاندان اُن کے پاس چلا آیا۔

مولانا کی تعلیم ۱۸۷۸ء میں جام پور کے مڈل اسکول میں تیسری جماعت سے شروع ہوئی۔

اسلام کا مطالعہ:

۱۸۸۴ء میں سکول کے ایک آریہ سماجی لڑکے نے ان کو "تحفتہ الہند" نامی کتاب لا کر دی۔ مولانا نے اس کا گہرا مطالعہ کیا اور آہستہ آہستہ اسلام کے نقوش ان کے دل پر ثبت ہوتے گئے۔ پھر مولانا اسماعیل شہید کی کتاب "تقویتہ الایمان" نے ان کی ایمانی صلاحیت کو اور تقویت دی۔ مولوی محمد صاحب لکھوی کی پنجابی تصنیف "احوال الآخرۃ" سے مولانا نے نماز کا طریقہ سیکھا اور اپنا نام خود عبیداللہ تجویز کیا۔

اظہارِ اسلام:

۱۵ اگست ۱۸۸۷ء کو مولانا صداقت کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑ کر اپنے رفیق عبدالقادر کے ساتھ کوٹلہ رحم شاہ ضلع مظفر گڑھ پہنچے اور اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔

اعزہ نے پیچھا کیا تو وہ سندھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ دوران سفر عبدالقادر سے عربی صرف کی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔

مرشد طریقت:

سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈی والے کی خدمت میں پہنچے اور چند ماہ ان کی صحبت میں رہے۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت مولانا کی طبیعت ثانیہ بن گئی۔ حضرت حافظ محمد صدیق نے ایک روز از راہ شفقت فرمایا کہ عبیداللہ نے اللہ کے لیے اپنے ماں باپ کو چھوڑا اور اس لیے اس کے ماں باپ ہم ہیں۔

مولانا کا بیان ہے کہ آج بھی اس کلمے کی تاثیر میرے قلب میں موجود ہے اور میں انہیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں۔ میں نے راشدی قادری سلسلے میں ان سے بیعت کی۔ یہ ان ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ میں بڑے سے بڑے انسان سے بہت کم مرعوب ہوتا ہوں۔

مرشد کی دعا:

چند ماہ بعد مولانا نے طلب علم کے لیے سفر کی اجازت چاہی۔ ان کے مرشد نے ان کے لیے دعا فرمائی کہ خدا کرے کہ تمہارا پالا کسی راسخ عالم سے پڑے۔ مولانا کا بیان ہے کہ مرشد کی یہ دعا خدا نے قبول فرمائی اور مجھے مولانا شیخ الہند کی خدمت میں دیوبند پہنچا دیا۔

دیوبند روانگی سے پہلے ریاست بہاولپور کی ایک دیہاتی مسجد میں عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر دین پور پہنچے۔ وہاں مولانا ابو سراج غلام محمد صاحب اور مختلف اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند پہنچے اور ۱۸۸۹ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے مختلف دینی کتب مثلاً شرح عقائد، مسلم الثبوت، دورہ حدیث، جامع ترمذی وغیرہ کا درس لیا۔ گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے سنن ابوداؤد کے کچھ اسباق پڑھے۔

سندھ میں دوبارہ آمد:

۲۰ جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۰ء) کو مولانا بھرچونڈی ضلع سکھر واپس آئے۔ حافظ محمد صدیق بھرچونڈی والے مولانا کے آنے سے دس دن پہلے وفات پا چکے تھے۔

مولانا سندھی امروٹ میں:

مولانا سندھی حضرت حافظ محمد صدیق کے دوسرے خلیفہ حضرت تاج محمود امروٹی کے پاس امروٹ گئے۔ وہ بھی کمال شفقت سے پیش آئے اور بمنزل باپ کے ثابت ہوئے۔ انہوں ہی نے مولانا کی شادی مولوی محمد عظیم کی لڑکی سے کرادی۔

ذوق مطالعہ:

پیر جھنڈے والے کا کتب خانہ بے نظیر تھا۔ مولانا کے تکمیل مطالعہ میں اس کتب خانے کو بڑا دخل ہے۔

بزرگان سندھ کے ساتھ ہمنشینی:

مولانا سندھی مولانا رشید الدین اور پیر جھنڈے والے کے متعلق لکھتے ہیں کہ میں نے ان کی کرامتیں دیکھیں اور ذکر اسماء الحسنیٰ انہی سے سیکھا۔ مولانا ابو تراب راشد اللہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ علم حدیث کے ماہر، جید عالم اور صاحب تصانیف تھے۔

مکتبہ فکر:

مولانا سندھی جس مکتبہ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں اس کا سلسلہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے شروع ہو کر شاہ ولی اللہ دہلوی تک پہنچتا ہے۔ خود انہوں نے تحریر فرمایا کہ میری علمی اور سیاسی ترقی میں ان بزرگوں کا ہاتھ ہے۔ حدیث کے سلسلے میں حجۃ اللہ البالغہ کا تعارف حضرت شیخ الہند نے کرایا تھا۔ انہوں نے علماء کی ایک جماعت کو حجۃ اللہ البالغہ پڑھائی بھی اور حضرت شیخ الہند سے پڑھی بھی۔

سیاسی رجحان:

مولانا سندھی نے لکھا کہ:

> مولانا اسماعیل شہید کے حالات پڑھے اور ان کے حالات نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ دیوبند کی طالب علمی کے زمانے میں مولانا عبدالکریم دیوبندی نے سقوط دہلی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا تھا۔ بچپن میں میں نے بوڑھی عورتوں سے پنجاب کے انقلاب کے تکلیف دہ حالات سنے تھے۔

مولانا اسماعیل شہید نے میرے فکر و نظر میں ایک عظیم تبدیلی پیدا کی اور میری فکر و نظر کا سانچا بدل گیا۔

مولانا سندھی کی تربیت جس ڈھب سے ہوئی تھی۔ اس نے اُن کی سوچ کو انقلابی بنا دیا اور وہ اپنے وطن کو فرنگیوں کی غلامی سے آزادی دلانے کے لیے بے چین رہنے لگے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ان شاگردوں پر مشتمل جنہوں نے ان سے حجۃ اللہ البالغہ کا درس لیا تھا ایک جماعت بنائی اور کام شروع کر دیا۔

دیوبند واپسی:

۱۸۹۷ء میں پھر مولانا سندھی دیوبند پہنچے۔ مولانا سندھی نے بعض مسائل جہاد کے ضمن میں حضرت شیخ الہند سے اس جماعت کا تذکرہ کیا جو انہوں نے قائم کی تھی۔ حضرت شیخ الہند نے اس کی تحسین فرمائی اور بعض گراں مشورے دیے اور مولانا سندھی کو اس کام کے جاری رکھنے کی وصیت فرمائی۔

دارالرشاد، گوٹھ پیر جھنڈا:

مولانا نے امروٹ واپس آکر ایک مدرسہ قائم کرنے کی کوشش کی، مگر اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱-۲ء) میں مولانا راشد اللہ پیر جھنڈا نے اس نہج پر اپنے گاؤں میں مدرسہ قائم کر دیا، جیسا مولانا سندھی چاہتے تھے اور مولانا سندھی کی مرضی کے مطابق ہی اس مدرسے کا نام بھی رکھا۔ مولانا سندھی نے اس مدرسے کے نظام کو سات سال تک اپنی مرضی کے مطابق چلایا۔

جمعیت الانصار دیوبند کا پیغام:

۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں حضرت شیخ الہند نے مولانا سندھی کو دارالعلوم دیوبند بلا لیا۔ جمعیت الانصار قائم ہو چکی تھی۔ حضرت شیخ الہند نے جمعیت کا کام مولانا سندھی کے سپرد کیا۔

نظارۃ المعارف دہلی:

۱۳۳۱ھ (۱۳-۱۹۱۲ء) میں دہلی میں نظارۃ المعارف قائم ہوا۔ حضرت شیخ الہند نے مولانا سندھی کو اس ادارے کے انتظام کے لیے دہلی بھجوا دیا۔ خود شیخ الہند نے مولانا سندھی کی ملاقات مشاہیر سیاسی رہنماؤں سے کرائی۔

ہجرت کابل:

اس ادارے میں ابھی قرآن مجید کے دس پاروں کا درس مکمل ہوا تھا کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کے شعلے بھڑک اٹھے اور ترکی سلطنت کے حصے بخرے کرنے کے مشورے ہونے لگے۔ حضرت مولانا شیخ الہند نے مولانا سندھی کو حکم دیا کہ وہ ہجرت کر کے کابل چلے جائیں۔ چنانچہ مولانا سندھی خفیہ طور پر ہجرت کر کے کابل چلے گئے۔ انہوں نے کابل میں بیٹھ کر فرنگیوں کے خلاف اسلامی حکومتوں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ ان کی تحریک کا نام "ریشمی رومال کی تحریک" ہے۔

وہ جہاں بھی رہے قرآن حکیم کے عمیق مطالعے کو اپنا رہبر بنایا۔ سیاسی اعتبار سے وہ حضرت شاہ ولی اللہ کو اپنا رہبر سمجھتے تھے اور ان کی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔

وطن کو واپسی:

۱۹۳۶ء میں انڈین نیشنل کانگریس اور دوسرے اداروں نے ان کی وطن کی واپسی کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ یکم نومبر ۱۹۳۷ء کو واپسی کی اجازت ملی اور یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو مولانا کو پاسپورٹ دینے کا فیصلہ ہوا اور مولانا ہندوستان واپس آئے۔[1]

ہندوستان میں مولانا کا پروگرام:

"خطبات و مقالات مولانا عبید اللہ سندھی" میں مولانا نے اپنی خود نوشت سوانح میں اپنا ہندوستان میں واپسی پر پروگرام تحریر کیا ہے:

(۱) میں انڈین نیشنل کانگریس کا ممبر تو ضرور رہوں گا تاکہ عدم تشدد کے متعلق میری ذمہ داری قومی قانون کے اندر منضبط رہے، لیکن کانگریس کے کام میں عملی طور پر شرکت نہیں کروں گا۔

(۲) میرا محبوب مشغلہ فلسفہ کمام ولی اللہ کی تعلیم و اشاعت ہو گا۔

(۳) جب کبھی حالات مناسب پیدا ہوئے تو میں نیشنل کانگریس میں فلسفۂ امام ولی اللہ کی روشنی میں اقتصادی اصول پر اپنا گروپ تشکیل کروں گا۔

مولانا سندھی سات سال تک کابل کی حکومت میں شریک رہ کر ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کرتے رہے۔ ۱۹۱۶ء میں میر حبیب اللہ نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد مولانا انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو کر اس کے داعی بن گئے۔

---

[1] یہ تمام حالات خود نوشتہ حالات زندگی "خطبات و مقالات مولانا عبید اللہ سندھی" ص ۶۳ تا ۷۹۔ "مہران" سوانحی نمبر، مضمون جناب علی نواز وفائی، ص ۳۶۶ تا ۴۰۴ سے ماخوذ ہیں۔

۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ کے دور میں مولانا نے کانگریس کمیٹی کابل کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے انڈین نیشنل کانگریس سے کر دیا اور مولانا اس کے پہلے صدر قرار پائے۔

۱۹۲۲ء ہی میں مولانا ترکی گئے۔ اس کے علاوہ سات ماہ ماسکو میں رہے اور سوشلزم کا مطالعہ اپنے رفیقوں کی مدد سے کرتے رہے۔

یہ عرصہ مولانا نے اپنی مذہبی تحریک کو، جو حضرت شاہ ولی اللہ کی فلسفے کی ایک شاخ ہے، اس زمانے کے لادینی حملوں سے محفوظ رکھنے کی تدابیر سوچنے میں گزارا۔ تین سال تک مولانا ترکی میں رہے اور تحریک اتحاد اسلام کا تاریخی مطالعہ کیا۔

جن کتابوں نے مولانا کی نظر میں وسعت پیدا کی وہ حضرت شاہ ولی اللہ کی بدور بازغہ، خیر کثیر، تفہیمات الہیہ اور الطاف القدس اور مولانا رفیع الدین دہلوی کی تکمیل الاذھان، مولانا اسماعیل شہید کی عبقات اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی قاسم العلوم اور تقریر دل پذیر اور آب حیات ہیں۔ سب سے زیادہ فائدہ مولانا کو قرآن حکیم کے مطالعے اور تلاوت سے ہوا جس نے مولانا کے نظریات کو وسعت بخشی۔

مولانا سندھی کی وطن واپسی:

مولانا اور اُن کے رفقاء کار جب تک باہر رہے وہ ایک ایسے انقلابی پروگرام پر عمل کرتے رہے جس کا مقصد دنیا کو سامراج کے ظلم و تشدد سے نجات دلانا تھا۔ یہ ان ہی بزرگوں کی خدمات کا ثمر ہے کہ آج ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔

جب وہ ہندوستان واپس تشریف لائے تو عمر کی طوالت، عظیم سعی جدوجہد اور طویل مسافرت نے ان کی توانائیوں کو مضمحل کر دیا تھا۔ چنانچہ موت نے ان کو اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنا دے سکتے۔

وفات:

مولانا عبید اللہ سندھی ۲۲ اگست ۱۹۴۴ء کو رحمت حق سے جا ملے۔ دین پور میں مدفون ہوئے جہاں حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈی کے خلیفہ اول مولانا ابو السراج غلام محمد رہتے تھے۔ مولانا آج ہم میں نہیں، لیکن ان کے علمی اور سیاسی کارنامے ہمیں روشنی کا مینار بن کر راہ دکھاتے رہیں گے۔[1]

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

۱۸۸۴ء میں سول سروس کے ایک رکن مسٹر ہیوم کو خیال پیدا ہوا کہ اگر (بلا امتیاز مذہب و ملت) ہندوستان کے مشہور مدبر ہر سال جمع ہو کر ملک کے تمدنی حالات پر بحث کریں اور آپس میں دوستانہ تعلقات رکھیں تو ملک کے لیے یہ بات مفید ثابت ہو گی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریز ہندوستان میں معاشرتی ارتباط چاہتے تھے اور اس بہانے سے ہندوستان کی تمام جماعتوں کو سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے۔

لارڈ ڈفرن نے مسٹر ہیوم کی اس بات سے اتفاق کیا اور کہا کہ یہ پارٹی "نیشنل کانگریس" کے نام سے قائم ہو گی۔ مسٹر ڈفرن نے یہ وعدہ بھی ہیوم سے لیا تھا کہ جب تک وہ ہندوستان میں ہیں، ان کا نام نہ ظاہر کیا جائے۔[2]

ہیوم نے دسمبر ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد رکھی جس سے ہندوستان کی زندگی میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ اور یہ ادارہ روشن خیال، محب وطن افراد کا مرکز بن گیا۔ یہ ادارہ انگریزوں کی وفاداری کے سائے میں ہندوستان کی انتظامیہ، مشینری کی شکایت اور اس کی نااہلیت پر تنقید کرنے لگا۔ وہ مزید اصلاحات کے لیے انگریزوں سے مؤدبانہ عرض و معروض بھی کرتا۔ کانگریس کی تمام سرگرمیوں کا محور یہ توقع تھی کہ برطانوی حکومت ایک نہ ایک دن ملک میں جمہوری حکومت قائم کر دے گی۔

حکومت برطانیہ نے اصلاحات کی دوسری قسط ۱۸۹۲ء کے قانون کی صورت میں عطا کی جس کی رو سے بلدیات، جامعات، تجارتی اداروں اور صوبے کی کونسلوں میں ہندوستانی ارکان لیے جانے لگے۔[3]

مسلمان خلوص دل کے ساتھ کانگریس کی تحریک میں شریک تھے لیکن جلد ہی ہندوستان کے مسلمانوں نے محسوس کر لیا کہ ہندو اور برطانوی حکومت دونوں ان کو فریب دے رہے ہیں۔ انگریز نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی، اس لیے وہ اپنے اقتدار کی چکی میں انہیں پیس رہا تھا۔ ہندو انہیں متحدہ قومیت کا فریب دے کر اپنی مفاد پرستی کا الو سیدھا کرنا چاہتے تھے۔ وہ متحدہ قومیت کے پر فریب پردے میں ہندو راج کا خواب دیکھ رہے تھے۔

---

[2] سیاسیات ملیہ، زبیری، ص ۲۱۔

سب سے پہلے ملت اسلامیہ کے نبض شناس سر سید احمد خاں نے ہندوؤں کی اس فریب کاری کو محسوس کیا۔ سر سید ابتدا میں تو ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے۔ لیکن جوں جوں ہندوؤں کی فریب کاریوں کا پردہ چاک ہوتا گیا، وہ برصغیر کے مسلمانوں میں دو قومی نظریے کے تصور کو فروغ دیتے ہوئے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دینے لگے۔

۱۸۸۶ء میں انہوں نے علی گڑھ میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی۔

۱۸۸۹ء میں لوکمانیہ گنگا دھر تلک کانگریس کے صدر ہوئے۔ اگرچہ یہ قوم پرستی کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے لیکن فرقہ پرستی اور مسلم دشمنی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ان کے زمانے میں ہندوؤں کے چھپے ہوئے ارادے لبوں پر آنے لگے۔ انہوں نے کانگریس میں ایسی تحریکیں شروع کیں، جن کا مقصد ہندو راج کا احیا اور ہندو دھرم کو از سر نو زندہ کرنا تھا۔ ان کی آتش فشاں تقریروں نے دونوں قوموں میں تعصب کی آگ کو بھڑکا دیا۔ اُن کی یہ تحریکیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ چنانچہ متحدہ قومیت کا طلسم ٹوٹتا گیا۔

اردو اور ہندی کے قضیے نے اسے اور بھی ہوا دی۔ اس طرح سر سید کی مخالفت کے باعث اور ہندوؤں کے متعصبانہ طرز عمل سے دو قومی نظریہ پروان چڑھا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے شدت سے محسوس کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو مل کر سب کے لیے کوشش کرنا محال ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوؤں کے متعصبانہ طرز عمل نے برصغیر کے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ جوں جوں متحدہ قومیت کے نام پر ہندوؤں کی تنگ نظری اور حکومت وقت کی بے جا طرفداری بڑھتی گئی، برصغیر کے صاحب بصیرت مسلمانوں میں دو قومی نظریہ کا تصور مستحکم ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ برصغیر کے مسلمانوں پر یہ حقیقت آئینے کی طرح روشن ہو گئی کہ قومیں وطن سے نہیں، بلکہ مذہب سے بنتی ہیں۔ انہوں نے اس تصور کو اپنایا کہ اس برصغیر میں دو قومیں بستی ہیں۔ ایک مسلمان، دوسری ہندو۔ ان دونوں قوموں کی برصغیر میں اکثریت ہے، مگر دونوں کا تہذیب و تمدن الگ الگ ہے۔ دونوں قوموں کی فلاح اسی میں ہے کہ دو قومی نظریہ کو بنیاد بنا کر سیاسی مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ کانگریس کے متعصبانہ رویے نے مسلم رہنماؤں میں مسلم حقوق کی حفاظت کا خیال پیدا کیا۔ لیکن دو قومی نظریے کی شمع سر سید نے روشن کر کے ملت اسلامیہ پر احسان عظیم کیا ہے۔ کانگریس نے سر سید کے ذریعے ملت اسلامیہ کو پرچانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن سر سید اس معاملے میں ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بلکہ سیاسیات میں حصہ لینے سے کنارہ کش رہے اور انہوں نے مسلمانوں کو ہمیشہ کانگریس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا۔

سندھ میں کانگریسی تحریک:

سندھ میں جن کانگریسی کارکنوں نے کانگریس کی تحریک کو آگے بڑھایا، وہ زیادہ تر ہندو تھے۔ ان میں جو نام ہمیں نظر آتے ہیں، اُن میں آچاریہ کرپلانی، جیرام داس، دولت رام، ڈاکٹر چوئترام گڈوانی[1] اور سیٹھ ہرچند رائے کا شمار چوٹی کے کانگریسی لیڈروں میں ہوتا تھا۔

کراچی میں کانگریس کا پہلا اجلاس:

کراچی میں کانگریس کا اجلاس ۱۹۱۳ء میں رئیس غلام محمد بھرگڑی اور سیٹھ ہرچند رائے کی دعوت پر منعقد ہوا۔ اس سیشن میں سب سے پہلے سیٹھ ہرچند رائے نے کانگریس پلیٹ فارم سے سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کی تحریک پیش کی۔

سندھ کے دوسرے کانگریسی لیڈر تو زیادہ تر آل انڈیا کانگریس کے عمومی کاموں میں گھرے رہتے تھے لیکن ڈاکٹر چوئترام نے سندھ کے گوشے گوشے کے ہندوؤں میں کانگریس کا پیغام پہنچایا اور سندھ میں کانگریسی تحریک کو مستحکم اور مضبوط بنایا۔ کانگریسی تحریک میں کام کرنے والے نوجوانوں کی ایک جماعت پیدا کی۔ ڈاکٹر چوئترام کا کانگریسی شعور ۱۹۱۶ء میں آل انڈیا کانگریس لکھنؤ کے اجلاس میں بیدار ہوا جس کی صدارت لوکمانیہ تلک کر رہے تھے۔ تعصب کے عفریت کا منحوس سایہ لوکمانیہ تلک کی صدارت کے زمانے میں ہی پڑنا شروع ہوا تھا۔ سندھ مختلف ہندو فرقہ پرست لیڈروں کی آماجگاہ ان ہی ڈاکٹر صاحب کے دور میں بنا۔ ۱۹۱۳ء میں لالہ لاجپت رائے کراچی آل انڈیا نیشنل کانگریس میں شرکت کے لیے کراچی آئے۔ ڈاکٹر چوئترام نے ان کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی اور ان سے تقریر کرائی۔

تھوڑے ہی دن کے بعد پنڈت مدن موہن مالویہ کراچی آئے اور ڈاکٹر نے انہیں بھی حیدرآباد میں تقریر کرنے کی دعوت دی۔

لکھنؤ کانگریس کے بعد ۱۹۱۶ء میں ڈاکٹر نے سندھ اور ہندوستان کا

---

[1] ڈاکٹر چوئترام گڈوانی، ولادت، ۲۵ دسمبر ۱۸۸۹ء، بمقام حیدرآباد۔

دورہ کیا اور ہر جگہ کانگریس کمیٹیاں قائم کرائیں۔ ۱۹۱۸ء میں وہ خود حیدرآباد کانگریس کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں وہ صوبے کے صدر مقرر ہوئے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کا رکن مقرر کیا گیا۔

سب مسلمان اس پر متفق تھے کہ صوبۂ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک صوبہ قرار دیا جائے، مگر ڈاکٹر چوئترام، شری جیرام داس اور پروفیسر گھنشام داس نے صوبۂ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کی مخالفت کی جبکہ ہرچندرائے، وشن داس، مسٹر رستم جیٹمل، پرسرام، جمشید نسروانجی نے سندھ کے علیحدہ صوبہ بننے کی حمایت کی۔ پروفیسر چھبلانی کی رائے میں سندھ علیحدہ صوبہ بننے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے حالات دینے کے بعد سندھ کے پرانے سیاسی رہنما محترم جی ایم سید نے لکھا کہ "ڈاکٹر چوئترام کا رجحان ہندو تہذیب کی حفاظت، ان کی ترقی کے لیے کوشش، گئو رکشا کا ہندوؤں میں پرچار، ان کے فلاح و بہبود کے کام کی طرف زیادہ تھا، چنانچہ ان سب باتوں کا اثر ان کی خدمات میں نمایاں نظر آتا ہے، لیکن ان کی عظمت کو ان کے جذبات سے نہیں پرکھا جاسکتا، بلکہ ہمیں ان کو اس آئینے میں دیکھنا چاہیے کہ ان کا وطن کی آزادی کی کوششوں، خدمت خلق، دیش کی سیوا میں کیا حصہ ہے۔" ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر وہ چیزیں جو جی ایم سید صاحب نے لکھیں، تعصب اور فرقہ پرستی نہیں تو اور تعصب کس چیز کا نام ہے؟[1]

سندھ کے ابتدائی مسلم کانگریسی لیڈر:

سندھ کے مسلم کانگریسی لیڈروں میں جو نام نمایاں نظر آتے ہیں، اُن میں رئیس غلام محمد مرحوم بھرگڑی، سر عبداللہ ہارون، پیر الٰہی بخش، میر علی احمد ٹالپور وغیرہ ہیں جو ابتدائی دور میں کانگریس کے ممبر رہے لیکن سندھ کے مسلم کانگریسی لیڈروں پر جوں جوں کانگریس کے متحدہ قومیت کے فریب کھلتے گئے وہ کانگریس سے دور ہوتے گئے اور نشان منزل پاکر مسلم لیگ میں شریک ہوتے گئے۔

بیسویں صدی عیسوی میں سندھ کے سیاسی اور قومی اُفق پر جو ستارہ طلوع ہوا، وہ سر حاجی عبداللہ ہارون تھے۔ انہوں نے اپنی جان و مال کو بے دریغ قومی اور سیاسی کاموں پر صرف کیا۔ وہ نہ صرف ایک بڑے تاجر تھے، بلکہ سندھ کی تحریکِ آزادی میں انہوں نے بڑا رول ادا کیا ہے۔ پاکستان کی تاریخ انہیں کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ انہوں نے تجارت میں اپنی محنت اور جفاکشی سے ترقی کی۔ سادگی اور کفایت شعاری ان کا شعار رہا۔ لیکن سیاسی اور قومی تحریکوں میں وہ حاتم دوراں تھے۔ رفاہ عامہ کے کام ہوں یا کانگریس کی تحریک ہو یا مسلم لیگ کی تحریک یا ریشمی رومال اور خلافت کی تحریک ہو یا سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تحریک غرضیکہ ہر تحریک میں ان کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ برصغیر کی آزادی کی تمام تحریکوں میں انہوں نے حصہ لیا۔ آخر مسلم لیگ کے ہو رہے اور نظریۂ پاکستان کو اپنا کر اپنی تمام توانائیاں اس کے لیے وقف کر دیں۔ ۱۹۱۷ء میں وہ کانگریس تحریک میں شامل ہوئے۔

۱۹۱۹ء میں جب کانگریس اور خلافت تحریکیں شروع ہوئیں تو سر عبداللہ ہارون سندھ خلافت کمیٹی کے صدر چنے گئے۔

۵، ۶ اپریل ۱۹۲۰ء کو سندھ پراونشل کانگریس سکھر کے اجلاس میں وہ بطور صدر اپنا خطبۂ صدارت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حاجی سر عبداللہ ہارون نے ۲۷ اپریل ۱۹۴۲ء کو وفات پائی۔[2]

کانگریسی تحریک کو سب سے زیادہ سندھ کے ہندوؤں نے قبول کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں سندھ کے مسلم رہنما بھی اس میں شریک ہوئے، لیکن جوں جوں کانگریس سندھ کے کٹر فرقہ پرست ہندوؤں کے قبضے میں آتی گئی سندھ کے مسلم رہنما اس سے دور ہوتے گئے اور بالآخر فرقہ پرست ہندوؤں کے طرز عمل نے مسلمانوں کو کانگریس کی تحریک سے بالکل علیحدہ کر دیا۔ ابتدا میں مسلمانان سندھ کے کانگریس سے مخلص اور وفادار ہونے کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ۵، ۶ اپریل ۱۹۲۰ء کو مشہور قومی رہنما سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون نے جن کی خدمات کو نہ تو کانگریس فراموش کر سکتی ہے اور نہ مسلم لیگ، سکھر میں سندھ پراونشل کانگریس کے صدارتی خطبے میں کہا کہ مادر وطن کی گزشتہ شان و شوکت کو حاصل کرنا اور اس کے مستقبل کو روشن بنانے کی کوشش کرنا ہر ہندوستانی کا فرض ہے۔ کانگریس ملک کی آزادی کے لیے جو کوششیں کر رہی ہے، وہ تعریف کی مستحق ہیں۔ ہمیں متفقہ طور پر ملک کی آزادی کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ میرے مذہب نے مجھے جمہوریت کا سبق دیا ہے۔ آخر میں انہوں نے اپیل کی کہ مسلمان کانگریس میں شریک ہو کر ملک کو آزاد کرائیں۔[3]

---

(1) یہ تمام حالات جنب گزاریم جن سین، جی ایم سید، جلد ۳، ص ۷۵ تا ۹۸ سے ماخوذ ہیں۔

(2) جنب گزاریم جن سین، جی ایم سید، جلد ۲، ص ۳۹ تا ۶۳۔

(3) جنب گزاریم جن سین، جلد ۲، ص ۴۷۔

اس تقریر سے اندازہ کیجیے کہ ابتداء میں مسلمانان سندھ کس قدر مخلصانہ طور پر کانگریس کے بہی خواہ تھے، لیکن سندھ کانگریس بھی متحدہ قومیت کے پردے میں رام راج کے خواب دیکھ رہی تھی۔ لہٰذا اس نے جلد ہی سندھ میں اپنی آب و تاب کھودی اور مسلمانانِ سندھ اس سے جدا ہوتے گئے۔

سندھ میں مسلم لیگ کا قیام

جناب جی ایم سید نے اپنی کتاب "جنب گزاریم جن سین" جلد ۲، ص ۴۸-۴۹ پر لکھا کہ:

> ۱۹۱۸ء میں سندھ میں پہلی مسلم لیگ رئیس غلام محمد خان بھرگڑی نے قائم کی۔ اس وقت تک کانگریس اور کالعدم مسلم لیگ کے اجلاس اکٹھے ہوئے تھے۔۔۔ جب سیٹھ عبداللہ ہارون صوبائی مسلم لیگ کے صدر مقرر ہوئے تو اس وقت رئیس بھرگڑی ولایت میں خلافت اور مسلم لیگ کے لیے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے ۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی کی طرف سے اخبار الوحید جاری کیا۔ جس کے پہلے ایڈیٹر قاضی عبدالرحمٰن مقرر ہوئے۔

ہمارا خیال ہے کہ سندھ میں ۱۹۱۸ء میں جو مسلم لیگ غلام محمد بھرگڑی نے قائم کی یہ مسلم لیگ کے ابتدائی نقوش ہیں۔ ورنہ باضابطہ مسلم لیگ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں بصدارت قائداعظم قائم ہوئی۔

قائداعظم محمد علی جناح

قائداعظم محمد علی جناح ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔* ابتدائی تعلیم گوکل داس تیج پرائمری اسکول بمبئی میں حاصل کی۔ کچھ دن سندھ مدرستہ الاسلام کراچی میں بھی زیر تعلیم رہے۔ اس مدرسے کے دروازے پر لکھا ہوا ہے:

> علم حاصل کرنے کے لیے آؤ اور خدمت کے لیے جاؤ۔[1]

پھر مشن ہائی اسکول کراچی میں داخل ہوئے اور یہیں سے میٹرک کا امتحان دیا اور ۱۸۹۲ء میں سولہ سال کی عمر میں میٹریکولیشن کیا۔ اپنے والد جناح پونجا کے ایک دوست مسٹر جریڈرک کے مشورے پر آپ بیرسٹری کے لیے انگلستان روانہ ہوئے۔

قائداعظم خوجہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور خوجے سات صدی سے سندھ میں آباد ہیں۔ ان کے ایک لیڈر سید صدرالدین سندھی، سندھی زبان میں شعر کہتے تھے۔

قائداعظم نے لندن پہنچ کر "لنکن ان" میں داخلہ لیا اور ۱۸۹۶ء میں بیرسٹری کر کے ہندوستان واپس آئے۔

۱۸۹۷ء میں قائداعظم بمبئی گئے اور وہاں سے اپنی وکالت کا آغاز کیا۔ انہوں نے اپنی محنت اور اصولوں کی پابندی کے باعث وکالت کے میدان میں جو کامیابیاں حاصل کیں وہ ضرب المثل بن چکی ہیں۔

قائداعظم کی سندھ کی سیاست میں رہنمائی:

قائداعظم کا ابرِ کرم یوں تو ہندوستان کے ہر صوبے پر برسا اور انہوں نے ہر صوبے کو سیاسی بصیرت عطا فرمائی، لیکن سرزمین سندھ سے ان کا بنیادی تعلق اس وجہ سے بھی تھا کہ کراچی میں وہ پیدا ہوئے۔ یہ صوبۂ سندھ کی خوش نصیبی تھی کہ اس گوہر شب چراغ کی آخری آرام گاہ بھی یہ خطہ قرار پایا۔

صوبہ سندھ پر ان کا بڑا احسان یہ ہے کہ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء میں دستوری اصلاحات پر غور کرنے کے لیے قائداعظم کی ایما پر جو کانفرنس بلائی گئی تھی، اس میں سیاسی تنظیموں سے سمجھوتہ کرنے کی جو شرائط پیش کی گئی تھیں، ان میں سب سے پہلی شرط یہ تھی کہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے الگ صوبہ بنایا جائے۔ ۱۹۲۹ء میں قائداعظم نے اپنے ۱۴ نکات میں اس مطالبے کو شامل کیا۔ ۲۲ نومبر ۱۹۳۸ء کو کلکتہ میں آل پارٹیز نیشنل کنونشن میں قائداعظم نے ایک بار پھر مطالبہ کیا کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔

قائداعظم کی سندھ میں دوبارہ تشریف آوری:

سندھ سے بمبئی کی علیحدگی کی تحریک جاری تھی کہ ۱۹۲۹ء ہی میں پیر پاگارہ (حضرت صبغتہ اللہ دوم) کے مقدمے کی پیروی میں قائداعظم کو دوبارہ سندھ آنا پڑا۔ وہ پیر صاحب پاگارہ کی طرف سے وکیل کی حیثیت سے سکھر کی عدالت میں پیش ہوئے۔ اس دوران میں

---

*بعض روایات مطابق ٹھٹھہ کے 'جھرک' سٹی میں پیدا ہوئے جو کہ خوجہ (اسماعیلیوں) کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

[1] رسالہ برگ گل، قائداعظم نمبر، اردو کالج کراچی، ص ۶۶، مضمون جناب محمد عبداللہ قریشی۔

قائد اعظم ہفتے اور اتوار کا دن کراچی میں گزارتے تھے۔

صوبہ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی:

قائد اعظم کی پے در پے کوششوں اور آل انڈیا مسلم لیگ کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رو سے سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے خود مختیار صوبائی درجہ دیا گیا۔ اس سلسلے میں گورنمنٹ آف انڈیا (تشکیل سندھ) آرڈر ۱۹۳۶ء، مورخہ ۳ مارچ ۱۹۳۶ء کو بکنگھم پیلس سے جاری کیا گیا جس کے مطابق یکم اپریل ۱۹۳۶ء سے سندھ کو صوبائی درجہ مل گیا۔[1]

"الوحید" کا سندھ آزاد نمبر:

اس مسرت میں کہ سندھ ایک علیحدہ صوبہ بنا۔ روزنامہ "الوحید" (سندھی) نے ۱۵ جون ۱۹۳۶ء میں سندھ آزاد نمبر شائع کیا جو سندھ کے صوبہ بننے پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

نوے سال کے بعد سندھ ایک علیحدہ صوبے کی حیثیت سے عالم وجود میں آیا۔ سندھ کے آخری کمشنر گبسن تھے۔ صوبہ سندھ کی علیحدگی کے بعد ہی ان کا تبادلہ ہو گیا اور ان کی جگہ سر لانسی لاٹ گراہم سندھ کے پہلے گورنر مقرر ہوئے۔

سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تحریک میں جو سندھی رہنما پیش پیش رہے ان کے نام یہ ہیں:

(۱) ہز ہائی نس سر آغا خان سوم۔ (۲) سر غلام حسین ہدایت اللہ۔ (۳) خان بہادر محمد ایوب کھوڑو۔ (۴) سر سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون۔ (۵) شیخ عبدالمجید سندھی۔ (۶) سید میراں محمد شاہ۔ (۷) نور محمد وکیل وغیرہ۔[2]

برصغیر کے رہنما جنہوں نے سندھ کی علیحدگی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا:

برصغیر کے رہنماؤں میں جنہوں نے اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا اُن میں: (۱) سر آغا خاں سوم مرحوم۔ (۲) سر محمد شفیع مرحوم۔ (۳) سر فضل حسین مرحوم۔ (۴) ڈاکٹر شفاعت احمد خاں وغیرہ ہیں۔

---

(۱) رسالہ برگ گل قائد اعظم نمبر، ۱۹۷۶ء، مضمون رحمت فرخ آبادی، ص ۲۴۵۔

(۲) (۲) یہ تمام تفصیل تاریخ سیاست سندھ، مولائی شیدائی، ص ۶۶-۶۷ سے ماخوذ ہے۔

سندھ صوبائی اسمبلی ۱۹۳۷ء کے عام انتخابات

سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت:

سندھ صوبائی اسمبلی کے پہلے عام انتخابات ۱۹۳۷ء میں منعقد ہوئے اور پہلی مرتبہ سندھ اسمبلی میں وزارت قائم ہوئی۔ اگرچہ مسلم پولیٹیکل پارٹی کو، جس کے پارٹی لیڈر سر غلام حسین ہدایت اللہ تھے، اسمبلی میں تین نشستیں ملیں، لیکن جمہوری اصولوں کے خلاف گورنر نے سر غلام حسین ہدایت اللہ کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ انہوں نے ایک عدد وزارت اور اسپیکر کے عہدہ کا لالچ دے کر ہندوؤں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ سندھ میں اسمبلی کا اجلاس ۲۷ اپریل ۱۹۳۷ء کو ہوا۔ اتحاد پارٹی اور کانگریس پارٹی کے اراکین خان بہادر اللہ بخش کی قیادت میں مخالف بنچوں پر بیٹھے۔ اس عرصے میں سر غلام حسین کے ہندو ممبروں میں سے آزاد ہندو گروپ کے وزیر لکھی گوبند رام نے استعفا دے دیا۔ ان کی جگہ سر غلام حسین نے ہندو گروپ کی خواہش کے خلاف ڈاکٹر ہیمنداس اڈوانی کو وزیر مقرر کیا۔ اسی زمانے میں اسپیکر اسمبلی بھوج سنگھ کے انتقال کی وجہ سے سید میراں محمد شاہ سندھ اسمبلی کے اسپیکر منتخب ہوئے جس کی وجہ سے ہندو ممبر سر غلام حسین ہدایت اللہ کے خلاف ہو گئے۔ انہوں نے اپنی وزارت کو بچانے کے لیے وزیروں کی تعداد بڑھانی چاہی جس پر گورنر آمادہ نہ ہوا۔ نتیجہ کے طور پر وزارت ٹوٹ گئی۔[3]

خان بہادر اللہ بخش کی وزارت:

سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت کے خاتمے پر گورنر سندھ نے اتحاد پارٹی کے خان بہادر اللہ بخش کو نئی وزارت بنانے کی دعوت دی۔ کانگریس اگرچہ اس وزارت سے علیحدہ رہی مگر اس نے اللہ بخش کی وزارت کی تائید کا وعدہ کر لیا۔

۲۳ مارچ ۱۹۳۸ء کو اللہ بخش وزارت نے حلف اٹھایا۔ خان بہادر اللہ بخش نے وزارت کی پالیسی مرتب کی، جس میں تحریر کیا گیا کہ سندھ کے اندرونی حالات کے مد نظر کچھ ترامیم کے ساتھ کانگریس کے تعمیری پروگرام پر عمل کیا جائے گا۔

---

(۳) پیران پاگارہ، ص ۱۷۳-۱۷۴، رسالہ برگ گل، قائد اعظم نمبر، ۱۹۷۶ء۔

اس وزارت کو مضبوط بنانے کے لیے سردار پٹیل اور مولانا ابو الکلام آزاد نے سندھ کا دورہ کیا اور اس طرح حکومت میں کانگریس کا اثر و نفوذ بڑھ گیا۔

خان بہادر نے اپنی بقا کے لیے سندھ اتحاد پارٹی کو ختم کر کے کانگریس اور آزاد ہندو گروپ کی حمایت حاصل کرنے کی پالیسی اختیار کی۔[1]

سر سیٹھ عبد اللہ ہارون کی مسلم لیگ کے لیے کوششیں:

ان حالات کے تحت سندھ میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ سب سے پہلے سر سیٹھ عبد اللہ ہارون نے سندھ میں مسلم لیگ قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے سندھ میں صوبائی مسلم لیگ کانفرنس کے انعقاد کی کوشش کی اور یوں سندھ صوبائی مسلم لیگ کا دفتر نیپیر روڈ پر کراچی میں قائم ہوا۔

پہلی سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس:

سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس ۸ اکتوبر تا ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء بصدارت حضرت قائداعظم منعقد ہوئی، جس میں برصغیر کے مسلم لیگی رہنما بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

مطلوب الحسن سید نے لکھا ہے کہ اس موقع پر کراچی میں قائداعظم کا شاندار استقبال کیا گیا۔ سر سیٹھ حاجی عبد اللہ ہارون نے اردو میں خطبہ استقبالیہ پڑھا اور قائداعظم کی اس جدوجہد کا تذکرہ کیا جو انہوں نے برصغیر میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے کی تھی۔ انہوں نے سندھ کی سیاست اور اس میں کانگریس کے کردار پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ کانگریس نے ہندو مہاسبھا کے ساتھ مل کر کس طرح مسلمانوں کو اُن کے جائز حقوق سے محروم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے سندھ کی اقلیتوں کو یقین دلایا کہ اگر ان کا کردار مثبت رہا تو مسلم لیگ ان کے جائز حقوق کا پورا پورا تحفظ کرے گی۔

قائداعظم نے اپنے صدارتی خطبے میں کانگریس کے رام راج منصوبے کی پوری قلعی کھول دی۔[2]

سندھ صوبائی مسلم لیگ کی ۱۹۳۸ء کی قرارداد:

جناب جی ایم سید نے لکھا ہے کہ اس اجلاس میں ۵ نمبر کی قرارداد شیخ عبد المجید سندھی نے پیش کی اور سر حاجی عبد اللہ ہارون نے اس کی تائید کی۔ وہ قرارداد یہ تھی:

> سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس وسیع و فراخ برِ اعظم ہند کے قیام امن کے مفاد میں اور بے روک ٹوک ثقافتی تعمیر و ترقی معاشی اور سماجی بہبود اور دونوں قوموں کی جو ہندو اور مسلمان کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں، سیاسی حق خودارادی کے مفادات کے پیش نظر یہ چیز قطعی طور پر ضروری سمجھتی ہے کہ ہندوستان کو دو وفاقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یعنی مسلم ریاستوں کا وفاق اور غیر مسلم ریاستوں کا وفاق۔ چنانچہ یہ کانفرنس کل ہند مسلم لیگ سے سفارش کرتی ہے کہ دستور کی ایسی اسکیم وضع کرے جس کے تحت مسلم اکثریتی صوبے، مسلم دیسی ریاستیں اور وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے، ایک اپنے ذاتی وفاق کی شکل میں مکمل آزادی حاصل کر سکیں اور وہ بھی اس طرح کہ ہندوستانی سرحدوں کے اس پار واقع دوسری کسی بھی مسلم ریاست کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ اس وفاق میں شامل ہو سکے اور غیر مسلم اقلیتوں کے لیے ہر قسم کے تحفظات کے ساتھ ہند کے غیر مسلم وفاق میں مسلم اقلیتوں کو دیے جا سکتے ہوں۔[3]

۷ نومبر ۱۹۳۸ء کو سر عبد اللہ ہارون نے اپنا خطبہ استقبالیہ، قائداعظم کا خطبہ صدارت اور مندرجہ بالا قرارداد کی نقلیں ہز ہائی نس سر آغا خاں سوم کو بھجوا دیں۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو پنجاب اور بنگال کے وزرائے اعلیٰ اور قائداعظم کے سامنے اسمبلی کے چاروں گروپوں سے معاہدہ طے پایا جس پر خان بہادر اللہ بخش، پیر الٰہی بخش، سر غلام حسین ہدایت اللہ، میر بندے علی، جی ایم سید اور شیخ عبد المجید سندھی نے دستخط کیے۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ مسلمان اراکین پر مشتمل ایک متحدہ اور مضبوط مسلم لیگ پارٹی بنائی جائے۔ اس کے علاوہ بھی اس معاہدے میں کچھ شرطیں تھیں۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو خان بہادر اللہ بخش اس معاہدے سے پھر گئے اور انہوں نے کہا کہ وہ اور ان کے ساتھی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی میں اس وقت شریک ہوں گے جب انہیں پہلے سے یقین دلایا جائے کہ پارٹی اتفاق رائے سے انہیں اپنا لیڈر منتخب کرے گی اور انہیں وزیر اعظم کی حیثیت سے کام جاری رکھنے کی اجازت دے گی۔

---

[1] رسالہ برگ گل، قائداعظم نمبر ۱۹۷۶ء، ص ۲۵۰ تا ۲۵۱۔

[2] رسالہ برگ گل، قائداعظم نمبر ۱۹۷۶ء، ص ۲۵۰ تا ۲۵۱۔

[3] پاکستان منزل بمنزل، جناب شریف الدین پیرزادہ، ص ۱۹۴-۱۹۵۔

ہر چند انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن وہ اپنی شرط پر اڑے رہے اور آخرکار اٹھ کر چلے گئے۔ اس کے بعد سر غلام حسین ہدایت اللہ اور میر بندے علی ٹالپور اللہ بخش وزارت میں شامل ہو گئے۔

وزارتی بحران:

۱۹۳۹ء کے اوائل میں پھر وزارتی بحران پیدا ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے اللہ بخش وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی تھی۔ لیکن اللہ بخش اپنی وزارت بچانے کے لیے ہندوؤں کے سامنے جھک گئے اور تحریک عدم اعتماد ناکام ہو گئی۔

اسی زمانے میں اوم منڈلی کے مسئلے پر اللہ بخش وزارت کو پھر خطرہ لاحق ہو گیا اور اللہ بخش وزارت ایک بار پھر ہندوؤں کے سامنے جھک گئی۔ اسی طرح ایک اور مسئلہ ہنومان مندر آرٹلری کراچی کا تھا جو اوم منڈلی کے مسئلے کی طرح حل کیا گیا اور ہندوؤں کو خوش کر دیا گیا۔

مسجد منزل گاہ سکھر:

مارچ ۱۹۳۹ء کو مسجد منزل گاہ سکھر کے مسئلے کو سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس میں اٹھایا گیا۔ اس کے بعد اس مسئلے کو صوبائی مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی میں اٹھایا گیا۔ اس مسئلے نے یہاں تک زور پکڑا کہ اللہ بخش وزارت کا خاتمہ کر کے دم لیا۔ فروری ۱۹۴۰ء میں اللہ بخش وزارت ختم ہو گئی۔

میر بندے علی کی وزارت:

مسجد منزل گاہ سکھر کے قضیے نے سندھ میں فرقے وارانہ حیثیت اختیار کر لی تھی۔ کانگریس اور کٹر ہندو لیڈر علی الاعلان سکھر کے ہندوؤں کو کھلم کھلا پرائیویٹ لشکر ترتیب دینے کی ترغیب دینے لگے تھے۔

خان بہادر اللہ بخش کی وزارت کے بعد ۱۸ مارچ ۱۹۴۰ء کو میر بندے علی کی وزارت نے حلف اٹھایا۔ میر بندے علی کی وزارت میں سندھ کے مشہور سیاسی رہنما جناب جی ایم سید بھی شریک تھے۔ خان بہادر کھوڑو اور شیخ عبدالمجید سندھی وزیر تھے۔ جی ایم سید کو وزارت تعلیم، انڈسٹری اور لیبر کے شعبے دیے گئے۔ ۵ ستمبر ۱۹۳۹ء کو وہ قائداعظم سے ملے اور سندھ کی صورت حال سے آگاہ کیا۔ قائداعظم نے جی ایم سید سے فرمایا کہ ان بگڑے ہوئے حالات کو درست کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عوام میں سیاسی بیداری پیدا کی جائے۔ جی ایم سید نے لکھا ہے کہ پہلا موقع تھا کہ مجھے حسب خواہش قائداعظم سے گفتگو کا موقع ملا اور میں ان کی رعب دار شخصیت سے بے حد متاثر ہوا۔[1]

میر بندے علی وزارت کو مسلم لیگ کی تائید اور حمایت حاصل تھی۔ ہندو ابتدا ہی سے اس وزارت کے خلاف تھے اور کانگریس ہائی کمان اس وزارت سے علیحدہ پریشان تھی۔ کانگریس کے صوبائی رہنماؤں نے اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کو دعوت دی۔

ایک اور وزارتی بحران:

نومبر ۱۹۴۰ء میں سندھ میں پھر وزارتی بحران پیدا ہو گیا۔ مولانا آزاد کی کوشش تھی کہ سندھ اسمبلی کے تمام ارکان کو جمع کر کے سندھ میں مخلوط وزارت قائم کی جائے۔ مسلم لیگ اراکین کی رائے یہ تھی کہ تمام مسلم اراکین متحد ہو کر سندھ کے لیے کام کریں اور اللہ بخش گروپ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے دو سیٹس وزارت میں اُسے دی جائیں۔ لیکن کانگریسی گروپ نے اللہ بخش پر دباؤ ڈالا کہ جب تک انہیں وزیر اعظم مقرر نہ کیا جائے وہ مخلوط وزارت میں شریک نہ ہوں۔ لیکن بعد میں خان بہادر ایوب کھوڑو، جی ایم سید نے اللہ بخش کو وزارت میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ جی ایم سید نے گورنر کو وزیر ہونے کی حیثیت سے اپنا استعفا دے دیا اور ۲۳ نومبر ۱۹۴۰ء کو خان بہادر اللہ بخش دوبارہ وزیر بنے۔

اچانک سندھ کی سیاست میں ایک نیا موڑ آیا۔ خان بہادر اللہ بخش کی وزارت مضبوط بنیادوں پر قائم تھی۔ انگریزوں کے ظلم و ستم کی چکی بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ حریت پسند دھڑا دھڑ انگریزوں کے عطا کردہ خطابات واپس کر رہے تھے۔ خان بہادر اللہ بخش اگرچہ حکومت سے مخلصانہ تعاون کر رہے تھے مگر خطابات کی واپسی نے جو ہل چل مچا دی تھی انگریزوں نے اس کا سارا غصہ اللہ بخش وزارت پر اتارا اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو ان کی وزارت کو برخاست کر دیا۔

سر غلام حسین ہدایت اللہ کی نئی وزارت:

خان بہادر اللہ بخش کی وزارت برخاست ہونے کے بعد ان ہی کی کابینہ کے ایک وزیر سر غلام حسین ہدایت اللہ کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی۔ گورنر کا یہ اقدام نہایت غیر جمہوری تھا، کیونکہ سندھ اسمبلی میں اکثریت مسلم لیگ پارٹی کی تھی اور اس کے لیڈر خان بہادر ایوب کھوڑو تھے۔ دستوری قاعدے کے مطابق یہ دعوت انہیں دینی

---

[1] سندھ جو سید، محمد امین کھوسو، ص ۵۰۔

چاہیے تھی۔

سر غلام حسین کو جب یہ دعوت ملی تو انہوں نے مسلم لیگ پارٹی کو عہدوں کا لالچ دے کر توڑنا چاہا۔

اُس وقت کے صوبائی مسلم لیگ کے صدر جناب یوسف عبداللہ ہارون نے قائداعظم کو ساری صورت حال سے مطلع کیا۔ قائداعظم نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو جواب دیا کہ مسلم لیگ سر غلام حسین کی وزارت میں شریک نہیں ہو سکتی۔ ایسا کرنا مسلم لیگ کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔

سندھ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے دو گروپ:

سر غلام حسین کی وزارت میں سندھ اسمبلی پارٹی کے دو گروپ بن گئے۔ ایک اس بات کے حق میں تھا کہ وزارت میں شامل ہوا جائے اور دوسرا اس کا مخالف تھا۔

۸ نومبر ۱۹۴۲ء کو ورکنگ کمیٹی کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ سندھ سے اس میں شرکت کے لیے خان بہادر ایوب کھوڑو، ہاشم گزدر اور جی ایم سید دہلی گئے اور یہاں کے تمام حالات سے قائداعظم کو آگاہ کیا۔ ورکنگ کمیٹی نے یہ معاملہ نواب محمد اسماعیل خاں، جناب حسین امام، خواجہ ناظم الدین اور چودھری خلیق الزمان کے سپرد کیا۔ چنانچہ نواب صاحب اور چودھری خلیق الزمان نے سندھ کا دورہ کیا اور غلام حسین وزارت کے حق میں فیصلہ دیا۔ چنانچہ مسلم لیگ کی ہدایت کے پیش نظر سر غلام حسین کی وزارت کو مسلم لیگ کی حمایت حاصل ہو گئی۔

سندھ اسمبلی کا بجٹ اجلاس مارچ ۱۹۴۳ء میں منعقد ہوا۔ اُس وقت سندھ اسمبلی کے ۳۵ مسلمان ارکان میں سے ۲۹ اراکین مسلم لیگ اسمبلی پارٹی میں شامل تھے۔ اسی دوران ایک اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ہدایت کے پیش نظر خود سر غلام حسین ہدایت اللہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

سندھ میں پہلی مسلم لیگی وزارت:

اس طرح سندھ کے صوبے میں پہلی مسلم لیگی وزارت قائم ہوئی اور تقسیم کے وقت تک یہ مسلم لیگی وزارت قائم رہی۔

سندھ صوبائی اسمبلی میں مطالبہ پاکستان کی حمایت کی قرارداد:

قائداعظم نے سندھ کی سیاست میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سندھ اسمبلی نے سب سے پہلے پاکستان کے مطالبے کی حمایت کی۔ جناب جی ایم سید اس وقت مسلم لیگی ممبر تھے۔ انہوں نے ۳ مارچ ۱۹۴۳ء کو سندھ اسمبلی کے اجلاس میں مطالبہ پاکستان کی حمایت میں مندرجہ ذیل قرارداد پیش کی:

> میں ایوان کے سامنے یہ قرارداد پیش کرنے کے لیے آیا ہوں کہ یہ اسمبلی سندھ سرکار کی طرف سے وائسرائے ہند کی معرفت بادشاہ سلامت کو حکومت صوبۂ سندھ کی جانب سے مسلمانانِ سندھ کے جذبات اور خواہشوں سے واقف کرا دینا چاہتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان مذہب، فلسفۂ حیات، معاشرتی رسموں، اقتصادی عقیدوں کی وجہ سے مختلف ہونے کے سبب ایک جداگانہ قوم ہے اور ایک جداگانہ قوم کی حیثیت میں ہندوستان کے خطوں میں جہاں ان کی اکثریت ہے خود مختار قومی حکومت کے قائم کرنے کی حق دار ہے۔ ان کے مستقبل میں آزادانہ زندگی گزارنے کے لیے اُن کے نظریۂ حیات کے مطابق ترقی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی بھی ایسی کوشش ان کے لیے قابل قبول نہ ہو گی کہ وہ زبردستی ایک مرکزی حکومت کے تحت رکھے جائیں۔[1]

سندھ اسمبلی کی قرارداد ہماری تاریخ آزادی میں زبردست اہمیت رکھتی ہے۔ یہ قرارداد اس قرارداد پاکستان کی حمایت میں تھی جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ لاہور کے جلسے میں منظور ہوئی تھی۔ کونسل نے صوبۂ سندھ کے اس اقدام کو سراہا تھا اور اس کی سفارش کی تھی کہ دوسرے مسلم اکثریت کے صوبے بھی سندھ کے اس اقدام کا اتباع کریں۔

سندھ کے متعلق قائداعظم کا ارشاد:

۲۴ دسمبر ۱۹۴۳ء کو مسلم لیگ کا اکتیسواں سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ قائداعظم نے رسم پرچم کشائی ادا کرتے ہوئے وہ الفاظ فرمائے جو سندھ اور اہلیان کراچی کے لیے باعث صد فخر و نازش رہیں گے۔ آپ نے فرمایا:

> اگر ہم اپنے آپ کو متحد رکھے رہے تو ہم اپنا مقصد حاصل کر لیں گے۔ اس مقد کے حاصل کرنے میں سندھ کو ایک اہم کردار ادا کرنا ہے۔ کراچی یقیناً پاکستان کا دروازہ ہو گا۔ پاکستان

---

[1] جی ایم سید کے سیاسی مضامین، ص ۹۔

میں سندھ، پنجاب، شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان شامل ہوں گے۔

۱۳ جون ۱۹۴۳ء کو صوبائی مسلم لیگ کونسل کی میٹنگ میں جس میں قائداعظم بھی موجود تھے، مسٹر جی ایم سید کو صوبائی مسلم لیگ کا متفقہ طور پر صدر منتخب کیا گیا۔

۲۰ ستمبر ۱۹۴۵ء کو قائداعظم کی ایما پر سید میراں محمد شاہ مسلم لیگ میں شریک ہو گئے۔

سندھ مسلم کالج کا افتتاح:

۲۱ جون ۱۹۴۳ء کو قائداعظم نے کراچی میں سندھ مسلم کالج کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ایک مستحسن اقدام ہے۔ خدا کرے کہ پیر الٰہی بخش کی کوشش کامیاب ہو۔ سندھ مسلم کالج کے بورڈ کے پہلے اراکین سر ہدایت اللہ، خان بہادر کھوڑو، یوسف ہارون، حاتم علوی اور محمد ہاشم گزدر تھے۔ پیر الٰہی بخش اس کے پہلے صدر تھے۔[1]

سندھ صوبائی اسمبلی کے انتخابات (۲۱ جنوری ۱۹۴۶ء):

سندھ صوبائی اسمبلی کے انتخابات ۲۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو منعقد ہوئے۔ اسمبلی میں مسلم نشستوں کی تعداد ۳۵ تھی۔ مختلف پارٹیوں نے جو نشستیں حاصل کیں ان کی تفصیل یہ ہے:

مسلم لیگ: ۲۷ مسلم نشستیں
جی ایم سید گروپ: ۴ مسلم نشستیں
قوم پرست گروپ: ۴ مسلم نشستیں
کانگریس گروپ: ۲۱ غیر مسلم نشستیں
یورپین امیدوار: ۳ نشستیں
مزدور سیٹ: نشست

اس طرح مسلم لیگ سندھ اسمبلی میں سب سے بڑی پارٹی تھی، جس کے لیڈر سر غلام حسین ہدایت اللہ تھے۔ لیکن مولانا آزاد اور سردار پٹیل کے مشورے سے کانگریس نے سید گروپ کو ساتھ ملا کر اس کے جی ایم سید کو اپنا لیڈر بنا لیا اور گورنر سے کہا کہ اب وہ تشکیل وزارت کی دعوت جی ایم سید کو دیں اور اکثریتی جماعت کو نظر انداز کر دیں۔ لیکن سندھ کے گورنر نے مسلم لیگ پارٹی لیڈر سر غلام حسین ہدایت اللہ کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ کانگریس کے اور اس کی ہمنوا جماعتوں نے کئی مرتبہ تحریک عدم اعتماد پیش کی جو ہمیشہ ناکام رہی۔ وزارت کے آئے دن کی تبدیلیوں سے مجبور ہو کر گورنر نے اسمبلی توڑ دینے کا فیصلہ کیا۔

سندھ اسمبلی کے نئے انتخابات (۹ دسمبر ۱۹۴۶ء):

۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کو سندھ اسمبلی کے نئے انتخابات منعقد ہوئے۔ اس مرتبہ مسلم لیگ نے پینتیس نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ جن میں جی ایم سید کی نشست بھی شامل تھی۔ اس طرح سندھ میں ایک مستحکم مسلم لیگی حکومت قائم ہو گئی۔

پیرزادہ عبدالستار کا بیان ہے کہ قائداعظم نے سندھ کی سیاست میں بہت دلچسپی لی اور ان کی اس بات سے ہمارا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔

سندھ یونیورسٹی کے قیام کی منظوری:

۱۹۴۶ء میں سندھ کی قانون ساز اسمبلی نے سندھ یونیورسٹی کی منظوری دی۔[2] ۱۹۴۷ء میں سندھ یونیورسٹی قائم ہوئی۔

قیام پاکستان:

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی نورانی صبح کو قائداعظم کی رہنمائی میں برصغیر کے مسلم قومیت کے کارواں نے اپنی منزل مقصود کو پا لیا اور پاکستان وجود میں آ گیا اور قائداعظم نے اس خواب کو جسے حضرت شاہ ولی اللہ سے لے کر حضرت سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال رحمۃ اللہ دیکھتے چلے آ رہے تھے، شرمندۂ تعبیر کر کے دکھا دیا۔

پاکستان کے پہلے گورنر جنرل:

۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان دستور ساز اسمبلی کا جلسہ مسٹر جوگندر ناتھ منڈل کی عارضی صدارت میں ہوا۔ ایوان نے گورنر جنرل کے لیے قائداعظم کا نام منظور کیا۔ نواب زادہ لیاقت علی خان کو وزیر اعظم پاکستان منتخب کیا گیا۔ صوبۂ سندھ کے پہلے وزیر اعلیٰ خان بہادر ایوب کھوڑو تھے۔ ان سب نے قائداعظم کو مبارکباد دی۔[3]

تحریک آزادی میں سندھ نے جو کردار ادا کیا ہے اور قائداعظم علیہ الرحمہ کو سندھ کی سیاست میں جو دلچسپی تھی، اسی کے نتیجہ میں صوبۂ سندھ کو یہ فخر حاصل ہے کہ پاکستان کا پہلا دارالحکومت شہر کراچی بنا۔

---

[1] سندھ کوارٹرلی، جلد ۵، شمارہ ۱، ص ۳۰-۳۱۔

[2] سندھ کوارٹرلی، جلد ۵، شمارہ ۱، ص ۳۰-۳۱۔

[3] رسالہ برگ گل، قائداعظم نمبر، مضمون قائداعظم اور سیاست سندھ، جناب رحمت فرخ آبادی، ص ۲۴۱ تا ۲۸۳۔

سندھ کے مسلم لیگی لیڈر

سندھ کے مسلم لیگی لیڈروں کی تعداد کثیر ہے۔ سندھ کے مسلم لیگی رہنماؤں میں ممتاز شخصیتوں کے نام یہ ہیں۔ ہز ہائی نس سر آغا خان سوم جو مسلم لیگ کے موسسین میں تھے اور ان کی ولادت بھی کراچی (سندھ) میں ہوئی تھی۔ رئیس غلام محمد بھرگڑی، حاجی سر عبداللہ ہارون، جی ایم سید، شیخ عبدالمجید سندھی، جان محمد جونیجو، خان بہادر محمد ایوب کھوڑو، سر غلام حسین ہدایت اللہ، قاضی فضل اللہ اور جناب مولا بخش سومرو وغیرہ ہم چند ممتاز سیاسی شخصیتوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

ہز ہائی نس سر آغا خان سوم

اسماعیلی فرقے کے روحانی پیشوا اقدس مآب جناب آغا خان سوم ۲ نومبر ۱۸۷۷ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ وہ آٹھ سال کی عمر میں اپنے والد محترم آغا علی شاہ آغا خان دوم کے جانشین بنے۔ اپنے والد محترم کی طرح انہیں بھی برصغیر کے مسلمانوں کی بہبود، تعلیم اور ترقی سے بڑی گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے ۱۹۰۳ء میں انہیں امپیریل لیجلیٹو کونسل کا ممبر مقرر کیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف پچیس سال کی تھی۔

وہ سر سید احمد خان اور تحریک علی گڑھ کے زبردست حامی رہے اور انہوں نے مسلم یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔

مسلم لیگ اور تحریک پاکستان سے ان کا بڑا گہرا تعلق رہا اور وہ تمام عمر قائداعظم کے بڑے حامی رہے۔

سندھ پر انگریزوں کے تسلط کے بعد سندھ کے مسلمانوں کی حالت نہایت خستہ ہوتی جارہی تھی۔ اکثریت میں ہونے کے باوجود وہ ہر میدان میں پیچھے رہتے جارہے تھے۔ یہی بات مسلمانان سندھ کی سیاسی بیداری کا باعث بنی۔ چنانچہ سندھ میں صوبہ بمبئی سے علیحدگی کی آواز اٹھنے لگی۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۵ء تک کانگریس اور مسلم لیگ میں اس موضوع پر زبردست سیاسی بحث جاری رہی۔

آغا خان سوم نے گول میز کانفرنس کے موقع پر سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کی پرزور وکالت کی۔ بالآخر ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات کے تحت سندھ کا صوبہ الگ ہوگیا۔ ۱۹۴۶ء میں اُن کی یورپ سے واپسی کے موقع پر مسلمانان سندھ نے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں خراج تحسین پیش کرنے کے لیے سر غلام حسین ہدایت اللہ کی سرکردگی میں کراچی کے عیدگاہ میدان میں آغا خان جامع مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہز ہائی نس آغا خان نے ۱۰ لاکھ کی خطیر رقم کا اعلان کرتے ہوئے اس مسجد کے لیے فاتح سندھ محمد بن قاسم کے نام پر محمدی جامع مسجد کا نام تجویز کیا۔[1]

مسٹر جی الانہ نے مجھ سے بیان کیا کہ بوجوہ اس مسجد کا منصوبہ عملی جامہ نہ پہن سکا۔

مختصر یہ ہے کہ ہز ہائی نس سر آغا خان سوم نے برصغیر اور خاص طور پر سندھ کے مسلمانوں کی ہر فلاح و بہبود کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ مسلم لیگ کے تو وہ مؤسسین میں سے تھے۔

رئیس غلام محمد بھرگڑی

رئیس غلام محمد خان بھرگڑی سندھ کی ان معزز ترین ہستیوں میں سے ہیں، جن کا نام آزادی کی تاریخ میں ہمیشہ جلی حروف سے لکھا جائے گا۔ وہ کانگریس میں اُس وقت شریک ہوئے جب سندھ کے مسلمان وڈیرے کانگریس کے نام سے بھی خوف کھاتے تھے۔ کانگریس میں شمولیت سے قطع نظر بعد میں وہ ہر اُس تحریک میں نظر آتے ہیں جو مسلمانان سندھ کی فلاح و بہبود کے لیے اس صوبے میں شروع ہوئی۔ مسلم لیگ کی تحریک ہو یا خلافت کی تحریک یا ہجرت کابل کی تحریک یا ریشمی رومال کی تحریک سماجی تحریکیں ہوں یا سیاسی تحریکیں وہ ہر تحریک میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔

بیسویں صدی میں جن لوگوں نے سندھ کی سیاسی اور قومی زندگی میں اہم کردار ادا کیا ہے، ان میں سب سے نمایاں نام رئیس غلام محمد بھرگڑی کا ہے، وہ جب تک حیات رہے، ان کی زندگی کا ہر لمحہ سیاسی اور قومی خدمات کے لیے وقف رہا۔

رئیس غلام محمد خان کے آباء و اجداد بلوچ قوم سے تھے اور ڈیرہ غازی خان کے رہنے والے تھے۔ ان کے جد اعلیٰ رئیس علی خان بھورگڑہ

---

[1] ہز ہائینس آغا خان سوم کے یہ حالات کتابچہ ہز ہائینس آغا خان سوم مؤلف جی الانہ، شایع کردہ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن، پاکستان کراچی سے ماخوذ ہیں۔

ضلع ڈیرہ غازی خان سے سندھ آئے تھے۔

رئیس غلام محمد خان کے والد کا نام ولی محمد خان تھا۔ رئیس غلام محمد خان ڈینگان، تعلقہ جیمس آباد، حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ قرآن شریف اور فارسی کی تعلیم گھر میں پائی۔ پھر سندھ مدرسہ کراچی میں تعلیم کے لیے بھیجے گئے۔ علی گڑھ سے میٹرک پاس کیا اور زمینداری کے کاروبار میں مشغول ہوگئے۔ ۱۹۰۵ء میں انگلینڈ گئے۔ ۱۹۰۸ء میں بیرسٹری کی سند لے کر واپس آئے اور حیدرآباد میں وکالت شروع کی۔ ۱۹۰۹ء میں وہ کانگریس میں شامل ہوئے۔

۱۹۰۹ء کے اواخر میں یہ زمینداروں، جاگیرداروں کی طرف سے بمبئی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ انہوں نے بمبئی کونسل میں رہ کر مسلمانان سندھ کی تعلیمی پستی کو دیکھ کر مسلمان زمینداروں کی آمدنی سے فی روپیہ ایک پیسہ فنڈ وصول کرنے کا بل پیش کیا۔ سیٹھ ہرچند رائے نے اس بل کی تائید کی۔ چند مفاد پرست زمینداروں نے اس بل کی مخالفت کی۔ چونکہ سرکار خود سندھ میں تعلیم کو عام کرنے کے خلاف تھی، دوسرا وہ یہ سمجھتی تھی کہ اس بل کو پاس کرنا کانگریسیوں کی قوت کو بڑھانا ہے، اس لیے اس نے زمینداروں کی مخالفت کو بہانہ بنا کر اس بل کو کھٹائی میں ڈال دیا۔

فروری ۱۹۲۰ء میں بمبئی آل انڈیا خلافت کانفرنس کی صدارت کے لیے اُن کا انتخاب ہوا۔ اس کانفرنس میں سیٹھ چھوٹانی نے خطبہ استقبالیہ دیا اور رئیس غلام محمد نے پر مغز خطبہ صدارت پڑھا۔

۳۱ مارچ ۱۹۲۳ء کو لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس کی صدارت رئیس بھرگڑی نے کی اور ایک عالمانہ اور بصیرت افروز خطبہ پڑھا۔ خطبے میں لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان کی مسلم آزاد پالیسی کا ذکر تھا۔

سندھ کی صحافت کی بھی انہوں نے بڑی مدد کی۔ اخبار الامین کا پورا پورا خرچ وہ اٹھاتے تھے۔ "سندھ واسی" اخبار کی بھی مدد کرتے تھے۔ غریب طالب علموں کی تعلیم کے لیے انہوں نے وظیفے دیے۔

زمیندار ایسوسی ایشن کے بانی وہی تھے۔ ۱۹۱۸ء میں سندھ میں مسلم لیگ کی شاخ سب سے پہلے انہوں ہی نے قائم کی۔ حیدرآباد کالج کو کامیاب بنانے میں انہوں نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ سندھ کے عام و خواص میں مقبول تھے۔ اُن کی زندگی سرتاپا عمل تھی اور انہوں نے سیاسی اور معاشرتی فلاح و بہبود میں آخر دم تک حصہ لیا۔

ان کے خاص مقربین میں مسٹر غلام علی الانا، نور محمد وکیل، شیخ عبدالمجید سندھی، جیٹھمل پرسرام، جیرام داس، دولت رام وغیرہ تھے۔ اُن کے سیاسی دوستوں میں غلام علی چھاگلا، قائداعظم محمد علی جناح، راجا صاحب محمود آباد اور سیٹھ ہرچند رائے وشن داس تھے۔

رئیس غلام محمد بھرگڑی نمونیا کے مرض میں مبتلا ہو کر ۹ مارچ ۱۹۲۴ء کو رحمت حق سے جا ملے۔ حیدرآباد میں صف ماتم بچھ گئی۔ ڈینگان میں مائنانی کے مقام پر اس گنجینۂ خیر کو دفن کیا گیا۔[1]

حاجی سر عبداللہ ہارون

غلام محمد بھرگڑی کے بعد سندھ کے سیاسی اور قومی اُفق پر جو ستارہ طلوع ہوا وہ سر حاجی عبداللہ ہارون ہیں۔ انہوں نے اپنے جان و مال کو بے دریغ قومی اور سیاسی کاموں پر صرف کیا۔ وہ نہ صرف ایک بڑے تاجر تھے، بلکہ سندھ کی تحریک آزادی میں انہوں نے بڑا رول ادا کیا ہے۔ پاکستان کی تاریخ انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

سر عبداللہ ہارون ۱۸۷۲ء میں ایک میمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے تجارت میں اپنی مسلسل محنت اور جفاکشی سے ترقی کی۔ سادگی اور کفایت شعاری ساری عمر اُن کا شعار رہا، لیکن سیاسی اور قومی کاموں میں وہ حاتم دوران تھے۔ رفاہ عامہ، تحریک مسلم لیگ اور برصغیر کی تمام تحریکوں میں انہوں نے حصہ لیا اور آخر مسلم لیگ کے ہو رہے اور نظریہ پاکستان کو اپنا کر اپنی تمام توانائیاں اس نظریے کے لیے وقف کر دیں۔

انہوں نے ۱۹۰۱ء میں سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی۔ سب سے پہلے انہوں نے پبلک جلسوں میں حصہ لینا شروع کیا۔

انجمن ہلال احمر:

۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس کے موقع پر ترکوں کی امداد کے لیے برصغیر میں انجمن ہلال احمر کے زیر اہتمام چندہ جمع کرنے کی مہم شروع ہوئی۔ سندھ میں میر ایوب علی خان صاحب کی صورت میں انجمن ہلال احمر کی شاخ قائم ہوئی، جس کے سیکریٹری اور خزانچی سر عبداللہ ہارون تھے، اکتوبر ۱۹۱۳ء تک وہ چندہ جمع کر کے بھیجتے رہے۔

---

[1] رئیس اعظم غلام محمد کے یہ حالات جنب گزاریم جن سین، جلد اول، صفحہ ۱۴۰ تا ۱۶۳ سے ماخوذ ہیں۔

۱۹۱۳ء میں کراچی کے شہری کاموں میں دلچسپی لینی شروع کی اور کراچی میونسپلٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔

خلافت کمیٹی:

جنگ کے بعد برصغیر میں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ۱۹۱۹ء میں سر عبداللہ ہارون سندھ خلافت کمیٹی کے صدر چنے گئے۔

لاڑکانہ میں خلافت کانفرنس کا بڑا اجلاس ہوا۔ جس کی صدارت پیر رشد اللہ شاہ جھنڈے والے نے کی، اس میں یہ شریک رہے۔ اس کے کچھ دن بعد آل انڈیا خلافت کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں رئیس غلام محمد بھرگڑی کی صدارت میں ہوا۔ اس میں سر عبداللہ ہارون نے شرکت کی بلکہ مولانا شوکت علی کی پیش کی ہوئی تجویز نمبر ۵ کی تائید کی، جس میں کہا گیا تھا کہ خلافت تحریک کے پرچار کے لیے یورپ میں ایک وفد بھیجا جائے، جس کے لیے تین لاکھ روپے اکٹھے کیے جائیں۔

سندھ پراونشل کانگریس کی صدارت:

آپ نے ساتویں اجلاس کی ۵، ۶ اپریل کو سندھ پراونشل کانگریس سکھر میں صدارت کی اور اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔

آل انڈیا خلافت کمیٹی کی صدارت:

۱۹۲۸ء میں سر عبداللہ ہارون آل انڈیا خلافت کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔

اسی سال سندھی اور انگریزی کے روزنامہ اخبارات جاری کیے۔

۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم تنظیم کانفرنس الہ آباد کی صدارت کی۔

سندھ میں مسلم لیگ کی تنظیم:

سر عبداللہ ہارون کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اتحاد پارٹی کو چھوڑ کر مسلم لیگ کی تنظیم شروع کی اور مسلم لیگ کی آواز کو گھر گھر تک پہنچا دیا۔ ۱۹۳۸ء جب مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی شریک ہوئی، سر عبداللہ ہارون اس کے ممبر ہوئے اور آخر وقت تک مسلم لیگ کے ساتھ رہے۔ ۱۹۳۹ء میں وہ صوبائی سندھ مسلم لیگ صدر منتخب ہوئے۔

سکھر کی مسجد منزل گاہ ہو، یا صوبۂ سندھ کا بمبئی سے علیحدگی کا مسئلہ وہ صوبے کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں ہر وقت پیش پیش نظر آتے ہیں۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مشین کا ایک ایسا پرزہ بن چکے تھے کہ جس کو مسلم لیگ کے نظام میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی ممبری:

۱۹۴۰ء میں وہ اپنی مخلصانہ خدمات کی وجہ سے آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر چنے گئے۔

وفات:

۲۷ اپریل ۱۹۴۲ء کو حاجی سر عبداللہ ہارون نے حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے وفات پائی۔ ان کی خالی جگہ پر مرکزی اسمبلی میں ان کے صاحبزادے جناب یوسف ہارون بغیر کسی مخالفت کے منتخب ہو گئے۔

خان بہادر محمد ایوب کھوڑو

سندھ کے سیاست دانوں میں جنہوں نے غیر معمولی شہرت حاصل کی، ان میں سے ایک خان بہادر محمد ایوب کھوڑو ہیں۔ انہوں نے ملک کی مختلف تحریکوں میں حصہ لیا۔ وقت کی حکومتوں اور صاحب اقتدار طبقے کی مخالفت کی۔ جیل کی سختیاں جھیلیں اور آئینی حدود کے اندر رہتے ہوئے اسمبلی میں عہدے حاصل کیے اور انتظامی، قانونی اور شخصی مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ دی۔ ان کی سیرت میں بعض خامیاں سہی، لیکن مجموعی حیثیت سے وہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ ایک مستقل مزاج انسان تھے۔ ابتدا ہی سے مسلم لیگی تھے۔ انہوں نے ذاتی مفاد کی خاطر کبھی مسلم لیگ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ شروع میں سندھ محمڈن ایسوسی ایشن کے ممبر ہوئے۔ اس کے بعد مسلم لیگ میں آئے اور آخر تک مسلم لیگی رہے۔ سندھ کے بہت سے سیاست دانوں نے اپنی راہیں بدلیں اور وقتی مصلحتوں کی بنا پر مختلف پارٹیوں سے سودا بازی کرتے رہے، لیکن کھوڑو صاحب کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ون یونٹ کے وقت بہت سے مسلم لیگیوں نے مسلم لیگ کا ساتھ چھوڑ کر ری پبلکن پارٹی میں شرکت اختیار کی تھی لیکن محمد ایوب کھوڑو بدستور مسلم لیگ کے لیے کام کرتے رہے۔

کراچی کو سندھ سے جدا کرنے کی مخالفت میں وہ پیش پیش تھے

لیکن اُس وقت بھی انہوں نے مسلم لیگ کو نہیں چھوڑا۔

یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں اپنے سیاسی مخالفین کو بری طرح کچلا۔ سندھ کے بعض سیاست دانوں کی رائے کے مطابق انہوں نے ون یونٹ کے بنانے میں مدد کی یا بقول بعض کے وہ مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ سیاست میں داخل ہوئے۔ لیکن یہ سب وہ باتیں ہیں کہ آئندہ دور کا مؤرخ ہی ان کے متعلق کوئی فیصلہ کرے گا۔ کہا جاتا ہے کہ سندھ کے ہندو انہیں بغض و عناد کی وجہ سے اورنگ زیب کہتے تھے۔ ہمارے خیال میں ان کا یہ لقب ان کے نظریۂ سیاست اور مسلم دوستی کا ایک اعتراف ہے۔

علاقائی عصبیت کی مسموم ہوائیں جو پاکستان بننے کے بعد صوبہ سندھ میں چلیں، اس کا تھوڑا غبار ان کے دامن پر بھی نظر آیا ہے۔ لیکن کون ہے جس کو عیبوں سے پاک انسان کہا جاسکتا ہے۔

خان بہادر محمد ایوب کھوڑو کے والد کا نام میاں شاہ محمد خان کھوڑو تھا جو ایک خوش حال زمیندار تھے اور لاڑکانہ کے ایک گاؤں عاقل گوٹھ میں رہتے تھے۔

میاں شاہ محمد کے چار صاحبزادے تھے:

(۱) خان بہادر محمد ایوب خان (۲) حاجی محمد مراد خان۔ (۳) محمد نواز خان (۴) میاں علی گوہر خان۔

خان بہادر محمد ایوب کھوڑو ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے سندھی اسکول میں پائی۔ ثانوی جماعتوں کی تعلیم لاڑکانہ کے مدرسے میں حاصل کی۔ چھ جماعتیں پاس کرنے کے بعد سندھ مدرسہ کراچی میں داخل ہوئے اور وہیں سے میٹرک پاس کیا۔ پھر سندھ کالج میں داخلہ لیا۔ ایف۔ اے کا پہلا سال کامیاب کر کے تعلیم چھوڑ دی اور زمینداری سنبھال لی۔

۱۹۲۳ء میں بمبئی لیجسلیٹو کونسل کے لاڑکانہ سے ممبر چنے گئے اور صوبۂ سندھ کی علیحدگی تک بمبئی کونسل کے ممبر رہے۔

۱۹۲۶ء میں سندھ محمڈن ایسوسی ایشن کے ممبر ہوئے۔ سندھ زمیندار اخبار سکھر کے مینجنگ ڈائریکٹر رہے جس کو آغا نظر علی اور پیر علی محمد شاہ راشدی نکالتے تھے۔

طویل عرصے تک بمبئی یونیورسٹی سینیٹ کے ممبر رہے۔

صوبۂ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کی تحریک جب شروع ہوئی تو کھوڑو صاحب نے ایک کتاب "اسٹوری آف سفرنگ آف سندھ" لکھوا کر چھپوائی۔

۱۹۲۹ء میں انہوں نے سائمن کمیشن اور سندھ فنانشل انکوائری کمیشن کے سامنے صوبۂ سندھ کی علیحدگی کے لیے مدلل کیس پیش کیا۔

۱۹۳۶ء میں جب سندھ کی علیحدگی کے لیے ایک سال کے لیے انتظامی کونسل مقرر ہوئی تو یہ اس کے ممبر مقرر ہوئے۔

۱۹۳۹ء میں جب جی ایم سید نے وزارت چھوڑی تو سندھ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر خان بہادر ایوب کھوڑو مقرر ہوئے جو ۱۹۴۱ء تک رہے۔ جب سر غلام حسین ہدایت اللہ مسلم لیگ میں شریک ہوگئے تو ان کو پارٹی کا لیڈر چنا گیا۔

جب سر حاجی عبداللہ ہارون صوبائی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے تو خان بہادر نے اُن کے ساتھ مل کر مسلم لیگ کو مقبول بنانے کی بڑی کوشش کی۔

جب مسجد منزل گاہ سکھر کی مسلمانوں کو واپسی کا جھگڑا شروع ہوا تو خان بہادر کو کچھ دن کے لیے اُن کے گاؤں گوٹھ عاقل میں نظر بند کر دیا گیا۔

جولائی ۱۹۴۲ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔

کھوڑو صاحب نے راست اقدام کی تحریک کے زمانے میں 'خان بہادری' کا خطاب گورنمنٹ کو واپس کر دیا جس پر گورنر نے اُن کی وزارت کو ڈس مس کر دیا اور سر غلام حسین ہدایت اللہ کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔

۱۴ مئی ۱۹۴۳ء کو خان بہادر اللہ بخش کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۴۴ء کو کھوڑو صاحب کو اس قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ ۱۱ ماہ تک یہ مقدمہ چلتا رہا۔ ۱۳ اگست ۱۹۴۵ء کو وہ اس مقدمے سے بری ہو کر چھوٹے۔

پاکستان کے قیام کے بعد:

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہوا، تو گورنر مودی کی جگہ سر غلام حسین ہدایت اللہ گورنر مقرر ہوئے اور کھوڑو صاحب نے سندھ کی وزارت عظمیٰ سنبھالی۔

۱۹۴۸ء میں کھوڑو کی وزارت ڈس مس ہوئی اور اُن کی جگہ سندھ کا وزیر اعظم پیر الٰہی بخش کو مقرر کیا گیا اور کھوڑو صاحب پر پروڈا کے تحت کیس چلا، جس پر انہیں سزا ہوگئی۔ اس سزا کی مدت پوری کرنے کے بعد

وہ چھوٹے اور کچھ وقت وزارت سے باہر رہے۔

اس عرصے میں یوسف ہارون سندھ کے وزیر اعلیٰ رہے۔ وہ جب آسٹریلیا میں پاکستان کے ہائی کمشنر مقرر ہوئے تو ان کی جگہ قاضی فضل اللہ سندھ کے چیف منسٹر مقرر ہوئے۔

ون یونٹ:

۱۹۵۴ء میں مرکزی حکومت نے مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو ملا کر ون یونٹ قائم کرنے کی تجویز سندھ کی صوبائی حکومت کے سامنے پیش کی۔ عجیب بات یہ ہے کہ سندھ اسمبلی میں اس تحریک کے پرزور حامی کھوڑو صاحب اور پیر علی محمد راشدی تھے۔ کھوڑو صاحب اُس وقت سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں نے ہر طریقے کو استعمال کر کے ون یونٹ کی تحریک سندھ اسمبلی میں پاس کرائی تھی۔ جی ایم سید نے لکھا ہے کہ قاضی محمد اکبر بھی اس تحریک کی موافقت میں شریک تھے۔

لیکن جب ون یونٹ بن گیا تو انہوں نے صوبائی سندھ مسلم لیگ کے ذریعہ سے ون یونٹ کے خلاف آواز اٹھائی اور ۱ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو پاکستان مسلم لیگ کونسل کے ڈھاکا کے اجلاس میں ون یونٹ کے خلاف ایک تحریک پیش کی جس کو مسلم لیگ کی مرکزی قیادت نے منظور نہیں کیا۔

نتیجہ کے طور پر انہوں نے مسلم لیگ سے اپنا اٹھائیس سال پرانا رشتہ توڑ لیا۔[1]

قاضی فضل اللہ

قاضی فضل اللہ بن قاضی میاں عبداللہ سندھ کے معمر سیاست دانوں میں سے ہیں۔ یہ ۱۵ جنوری ۱۹۰۲ء کو قصبہ نوشہرہ ضلع لاڑکانہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں سندھ مدرسہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر علی گڑھ کالج میں پڑھنے کے لیے بھیجے گئے۔ خلافت کی تحریک کے زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علموں کو حکم دیا گیا کہ وہ بائیکاٹ کریں تو قاضی فضل اللہ بھی ان طالب علموں میں تھے، جنہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں داخلہ لیا۔

۱۹۲۱ء کے آغاز میں مولانا محمد علی جوہر کے حکم سے تعلیم چھوڑ کر وہ ترک موالات اور خلافت تحریک میں کام کرنے لگے۔ ۱۹۲۳ء تک مختلف قومی تحریکوں میں کام کرتے رہے۔ خلافت تحریک کا زور کم ہوا تو قاضی صاحب نے حیدرآباد کے نیشنل کالج میں داخلہ لے لیا۔ پھر کراچی کے ڈی جے کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد شہانی لا کالج کراچی میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۹ء میں ایل ایل بی کا امتحان کامیاب کیا۔

قاضی فضل اللہ نے ۱۹۳۱ء میں لاڑکانہ میں وکالت شروع کی اس کے بعد جناب محمد حنیف صدیقی کے ساتھ شکارپور میں وکالت کرتے رہے۔

سیاست میں شمولیت:

۱۹۳۹ء میں لاڑکانہ اسکول بورڈ کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۴۴ء میں لاڑکانہ کے میونسپلٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔

۱۹۴۵ء میں ضلع لاڑکانہ لوکل بورڈ کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۴۶ء میں جب سندھ اسمبلی ختم کر کے گورنر مودی نے نئے انتخابات کرائے تو قاضی صاحب سندھ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ گورنر مودی کے پنجاب چلے جانے کے بعد سر غلام حسین ہدایت اللہ سندھ کے گورنر مقرر ہوئے اور کھوڑو صاحب نے چیف منسٹری کا چارج لیا تو اُن کی وزارت میں قاضی فضل اللہ صوبائی وزیر رہے۔

۸ مئی ۱۹۵۰ء کو جناب یوسف ہارون کے آسٹریلیا میں ہائی کمشنر مقرر ہونے کی وجہ سے قاضی فضل اللہ کو سندھ کا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ ان کی وزارت میں میر غلام علی ٹالپور، سید میراں محمد شاہ، آغا غلام نبی پٹھان وزیر مقرر ہوئے۔

جب کھوڑو صاحب اپنے کیس سے بری ہوئے تو انہوں نے ۲۵ مارچ ۱۹۵۱ء کو صوبۂ سندھ کے وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ کھوڑو صاحب کی وزارت میں قاضی فضل اللہ وزیر داخلہ رہے۔

۱۹۵۳ء میں سندھ اسمبلی کا نیا انتخاب ہوا۔ قاضی صاحب قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے سندھ اسمبلی کے ممبر منتخب نہ ہو سکے۔

مرکزی حکومت کے مشورے اور میر غلام علی ٹالپور کی مدد سے پیرزادہ عبدالستار کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی۔ اس وزارت میں قاضی فضل اللہ کے بھانجے قاضی عبدالمنان کو وزیر بنایا گیا اور قاضی فضل اللہ کو لوکل سیلف گورنمنٹ کے ایکٹ میں ترمیمی کمیٹی کا چیئرمین

---

[1] یہ تمام تفصیل جنب گزاریم جن سیں، مؤلف جی ایم سید، جلد ۲، ص ۱۹ تا ۲۰۳ اور رسالہ مہران سوانح نمبر ۱۹۵۷ء، ص ۴۵ تا ۵۰ سے ماخوذ ہیں۔

مقرر کیا گیا۔

۹ نومبر ۱۹۵۴ء کو سندھ کو ون یونٹ سے ملانے پر پیرزادہ عبدالستار کے انکار کرنے کی وجہ سے گورنر جنرل غلام محمد نے پیرزادہ وزارت کو ڈسمس کر دیا اور خان بہادر کھوڑو کو وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔

۲۱ جون ۱۹۵۵ء کو اسمبلی کے لیے چناؤ ہوئے تو قاضی فضل اللہ بھی اُمیدوار تھے۔ انتخاب کے دن صبح کے وقت ان کو گرفتار کر کے ہالہ جیل بھیج دیا گیا جس کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

جب ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ بن گیا، تو مغربی پاکستان کی اسمبلی کے لیے قاضی صاحب ٹھٹھہ ضلع اور لاڑکانہ ضلع سے ممبر منتخب ہوئے۔ انہوں نے لاڑکانہ کی ممبری قبول کی۔ ڈاکٹر خان صاحب مغربی پاکستان حکومت کے وزیر اعلیٰ بنے۔ یہ ری پبلکن پارٹی کی وزارت تھی۔ قاضی صاحب کو بھی وزیر بنایا گیا۔ انہیں آبپاشی کی وزارت دی گئی۔ یہ ۱۹۵۸ء تک وزیر رہے۔

۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو مارشل لا لگا تو قاضی صاحب وزارت کے بعد لاڑکانہ میں وکالت کرنے لگے اور اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرنے لگے۔

پیر الٰہی بخش

پیر الٰہی بخش کا تعلق سعد آباد تعلقہ سیوھن کے پیر جی گوٹھ سے ہے۔ اُن کے دادا کا نام پیر غلام حسین تھا۔ ان کے خاندان کے مرید کاٹھیاوار ریاست میں زیادہ ہیں۔

پیر الٰہی بخش ۱۸۹۷ء میں پیر جی گوٹھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں میٹرک پاس کیا۔ پھر تعلیم کے لیے علی گڑھ کالج میں بھیجے گئے۔

مولانا محمد علی جوہر کے حکم کی بنا پر جن طلبہ نے ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ کالج کو چھوڑا اُن میں سے ایک وہ بھی تھے۔ انہوں نے کالج کو چھوڑ کر جامعہ ملیہ دہلی میں داخلہ لیا۔ اس درسگاہ کا سنگ بنیاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے رکھا تھا، جس کے چانسلر حکیم اجمل خان مرحوم تھے۔

کچھ مدت جامعہ ملیہ میں تعلیم پانے کے بعد پیر الٰہی بخش نے تعلیم چھوڑ دی اور اپنے وطن سندھ آ گئے۔

تحریک خلافت:

جب سندھ میں خلافت تحریک شروع ہوئی تو پیر الٰہی بخش ۸۔ ۹۔ ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو صوبۂ سندھ خلافت کانفرنس، کراچی میں شریک ہوئے۔ جس کی صدارت مولانا محمد علی جوہر نے کی تھی۔ اسی کانفرنس کے نتیجہ میں کراچی کے مشہور مقدمہ بغاوت میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، پیر غلام مجدد سرہندی کو سوائے شری شنکر اچاریہ کے دو دو سال کی سزا دی گئی تھی۔

کانگریس اور خلافت کمیٹی کی ممبری:

پیر الٰہی بخش آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور آل انڈیا خلافت کمیٹی کے بھی کچھ عرصے ممبر رہے۔

علی گڑھ میں دوبارہ تعلیم:

خلافت تحریک کے ختم ہونے کے بعد پیر الٰہی بخش نے پھر علی گڑھ یونیورسٹی میں اپنی تعلیم شروع کی، جہاں سے انہوں نے ۱۹۲۹ء میں ایم اے کیا تھا۔ ایل ایل بی کی ڈگری لی اور لاڑکانہ میں وکالت شروع کر دی۔

سندھ اسمبلی کی ممبری:

سندھ کے بمبئی سے علیحدہ ہونے کے بعد ۱۹۳۷ء میں سندھ اسمبلی کے لئے جو انتخاب ہوا، اس میں پیر الٰہی بخش دادو کے خان بہادر یار محمد خاں جونیجو اور پاٹ کے ایک بااثر وکیل کو شکست دے کر سندھ اسمبلی کی ممبری کے لیے منتخب ہوئے۔ اُس وقت یہ سندھ اتحاد پارٹی کے ممبر تھے۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت بننے کے بعد اتحاد پارٹی کے ممبر، جن کی تعداد شروع میں ۲۴ تھی، آہستہ آہستہ پارٹی چھوڑتے گئے، یہاں تک کہ ان کی تعداد ۸ یا ۹ رہ گئی۔ اتحاد پارٹی کے لیڈر خان بہادر اللہ بخش مرحوم تھے اور انہوں ہی نے وزارت بنائی تھی، لیکن پیر الٰہی بخش اتحاد پارٹی کے اس حال میں بھی وفادار رہے۔

۲۳ مارچ ۱۹۳۸ء کو اللہ بخش وزارت نے حلف اٹھایا۔ اللہ بخش وزارت میں پیر الٰہی بخش وزیر مال رہے۔ پیر الٰہی بخش، اللہ بخش وزارت میں مارچ ۱۹۴۰ء تک رہے۔ جب بندہ علی خان کی وزارت آئی تو یہ وزارت سے علیحدہ ہو گئے۔

۱۹۴۱ء میں اللہ بخش وزارت دوبارہ قائم ہوئی تو پیر الٰہی بخش دوبارہ وزیر بن گئے۔

مسلم لیگ میں شرکت:

۱۹۴۳ء میں گورنر نے اللہ بخش وزارت کو ڈس مس کر دیا اور

غلام حسین ہدایت اللہ کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ پیر الٰہی بخش مسلم لیگ میں شریک ہوگئے۔

۱۹۴۶ء میں وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ممبر منتخب ہوئے۔ اسی سال ستمبر کے مہینے میں گورنر نے اسمبلی ختم کردی اور دسمبر میں نئے چناؤ ہوئے۔

پاکستان کے قیام کے بعد:

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ سندھ کے گورنر مقرر ہوئے، صوبہ سندھ کے وزیر اعلیٰ کھوڑو صاحب منتخب ہوئے۔

۱۹۴۸ء میں کھوڑو صاحب کا کراچی کے سوال پر مرکزی حکومت سے اختلاف پیدا ہوا۔ انہوں نے کراچی کو مرکزی حکومت کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ مرکزی حکومت نے انہیں ڈس مس کر دیا۔ پیر الٰہی بخش کو کھوڑو صاحب کی جگہ صوبہ سندھ کا وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔

۱۹۵۰ء میں جی ایم سید کے دائر کردہ اپیل کے فیصلے میں پیر الٰہی بخش کو ڈسکوالیفائڈ کرنے کی سفارش کی گئی۔ اس وقت پیر الٰہی بخش وزارت اور اسمبلی سے علیحدہ ہوگئے۔

وہ نہایت کریم النفس، خوش خلق اور صوم و صلوٰۃ کے بے حد پابند تھے۔ اُن کے سیاسی کارناموں کے علاوہ اُن کی تعمیری خدمات بہت سی ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں سندھ مسلم کالج کا قیام جس کا افتتاح حضرت قائد اعظم نے کیا تھا، سندھ یونیورسٹی کا قیام، مفت تعلیم بالغاں مہاجرین کے لیے پیر الٰہی بخش کالونی کا قیام جیسے کارنامے ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

جی ایم سید

جی ایم سید کا نام سید غلام مرتضیٰ شاہ ہے۔ وہ مٹیاری سادات کی سنائی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے جدِّ اعلیٰ سید امیر علی شاہ امیر تیمور کے ہندوستان پر حملے کے وقت ملتان آئے۔

ان سیدوں میں پانچ بڑے بزرگ پیدا ہوئے:

(۱) سید حیدر علی شاہ (متوفی ۱۵۳۰ء)۔

(۲) شاہ عبدالکریم بلڑی (متوفی ۱۶۲۰ء)۔

(۳) سخی ہاشم شاہ مٹیاری (متوفی ۱۶۸۸ء)۔

(۴) حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی (متوفی ۱۷۵۲ء)۔

(۵) شاہ بکی رلس لیلہ۔

جی ایم سید، سید حیدر شاہ علیہ الرحمہ کے چودھویں سجادہ نشین ہیں اور سید محمد شاہ کے صاحبزادے ہیں، جو سادات کی سنائی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں، جی ایم سید ۱۷ جنوری ۱۹۰۴ء کو سن شہر ضلع دادو میں پیدا ہوئے۔

سماجی کردار:

جی ایم سید نے پہلے سماجی زندگی کی ابتدا کی اور پھر سیاسی زندگی میں قدم رکھا۔ انہوں نے ۱۹۱۹ء میں سماجی اصلاح کی ایک انجمن اپنے شہر میں قائم کرکے اپنی سماجی زندگی کا آغاز کیا۔

مارچ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے سندھ کے پیروں اور سادات کی ایک انجمن قائم کی۔ اس انجمن کا مقصد رسوم بد سے اجتناب، بدعتوں کا انسداد، کفایت شعاری اور تعلیم کو عام کرنا تھا۔

۱۹۲۶ء میں شاہ حیدر کے سالانہ عرس میں فیصلہ ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیم و تنظیم اور سماجی سدھار کے لیے سندھ میں کانفرنسوں کو رواج دیا جائے۔ ۱۹۳۰ء میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس کے موقع پر اس کا نام بدل کر سندھ کلچر مرکز رکھا گیا۔

۱۹۲۹ء میں جی ایم سید نے کراچی میں عورتوں کی اصلاح و تعلیم کے لیے ایک انجمن قائم کی۔[1]

سیاسی کردار:

جی ایم سید کی سیاست کا دور ۱۹۲۰ء سے شروع ہوتا ہے جب وہ پہلی مرتبہ لاڑکانہ کی خلافت کانگریس میں شریک ہوئے۔ انہوں نے باوجود نو عمری کے اس کانفرنس سے بہت کچھ سیکھا۔ اس کے بعد وہ سندھ کے مختلف شہروں میں تحریک خلافت کے جلسوں میں شریک ہونے لگے۔

۱۹۲۴ء میں جب برصغیر کے کارکنوں نے لوکل باڈیز میں کام کرنا شروع کیا، وہ تعلقہ لوکل بورڈ کے صدر اور کراچی ضلع لوکل بورڈ کے وائس پریذیڈنٹ منتخب ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے کانگریس کا پرچار شروع کر دیا اور خالق دینا ہال میں نوجوان بھارت سبھا کے پلیٹ فارم سے سرکار برطانیہ کے خلاف سخت تقریریں کیں۔

---

[1] یہ تمام تفصیل سندھ جو سردار محمد امین کھوسو، باب ۲، ص ۳۱ تا ۳۹ سے ماخوذ ہے۔

سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کے تحریک:

اسی زمانے ۱۹۲۸ء میں بمبئی سے سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تحریک شروع ہوئی، اس تحریک میں جی ایم سید نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ اس تحریک کے سلسلے میں کئی کانفرنسیں ہوئیں وہ سب میں شریک رہے۔

آخر وہ منزل آئی کہ ان کے اختلافات قائداعظم سے شدت اختیار کر گئے۔ انہوں نے نہ صرف مسلم لیگ سے استعفادے دیا بلکہ انہوں نے ایک متوازی مسلم لیگ قائم کرلی۔ پھر آہستہ آہستہ سیاست کی دنیا کے کئی اُلٹے سیدھے چکر کاٹنے کے بعد انہوں نے "جئے سندھ" کے نعرے کی بنیاد ڈالی اور بہت سے مقامی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

شیخ عبدالمجید سندھی

شیخ عبدالمجید سندھی ۷ جولائی ۱۸۸۹ء کو ٹھٹھہ کے ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام لیلارام تھا جو محکمہ مال میں منشی تھے۔ یہ اپنے والد کی چوتھی اولاد تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم ٹھٹھہ میں حاصل کی۔ ۱۸۹۶ء میں ان کے والد کو پنشن ملی اور وہ کراچی میونسپلٹی میں ملازم ہوگئے۔ شیخ صاحب بھی اپنے والد کے ساتھ کراچی چلے آئے۔ سندھی کے پہلے درجے میں اُس پرائمری اسکول میں داخلہ لیا جہاں اب بولٹن مارکیٹ کے سامنے انسپکٹر آف اسکولز کا دفتر ہے۔

شیخ صاحب کی فطرت ابتدا ہی سے نیک تھی۔ وہ شروع ہی سے ہندو مندروں اور مسلمان خانقاہوں میں حاضر ہوئے اور تلاش حق میں لگے رہتے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ہدایت ابدی کو پالیا۔ وہ بیس برس کی عمر میں ڈاکٹر ضیاء الدین کے جد امجد جناب عبدالرحیم کے دست حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور ان کا نام جیٹھانند کی جگہ عبدالمجید رکھا گیا۔

میٹرک کے امتحان میں وہ کامیاب ہوچکے تھے۔ کچھ عرصہ انہوں نے لدھیانہ (مشرقی پنجاب) میں تعلیم پائی۔ علامہ اقبال اور جماعت احمدیہ کے مولوی محمد علی سے ملاقات کی۔ ان ملاقاتوں میں ان کا ذوق آگاہی اور سیاسی شعور بیدار ہوا۔

۱۹۱۱ء میں شیخ صاحب ہلال احمر میں شریک ہوئے اور ترکوں کے لیے اس میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔

۱۹۱۳ء میں ڈی جے کالج میں داخلہ لیا۔ کالج چھوڑنے کے بعد "الحق" کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دیے۔ اور تحریک خدام کعبہ کے رکن بنے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسجد کانپور کا حادثہ ہوچکا تھا۔ شیخ صاحب نے مسجد کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کی اور اس سلسلے میں مظہر الحق صاحب سے خط و کتابت کی۔

۱۹۱۴ء میں "الحق" کی ایڈیٹری سے علیحدہ ہوئے، تو غریب ہاریوں کے بچوں کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا۔ وہاں سے علیحدہ ہوئے تو رام سوامی کوارٹر میں اسی طرز کا ایک مدرسہ قائم کیا، لیکن شیخ صاحب کی سیاسی مصروفیتیں بہت تھیں۔ مدرسے کا انتظام مولانا تاج محمود امروٹی کے سپرد کردیا جو ان کے پرانے دوست تھے۔

۱۹۱۵ء میں رئیس غلام محمد بھرگڑی کے اخبار روزنامہ "الامین" کی ادارت انہیں سونپ دی گئی۔

۱۹۱۶ء میں دوسری دفعہ شیخ صاحب نے شیخ عبدالرحیم کے ساتھ ہندوستان کا دورہ کیا۔ اسی زمانے میں اُن کے مولانا عبیداللہ سندھی سے تعلقات قائم ہوئے۔

ریشمی رومال کا انکشاف ہونے کے بعد شیخ عبدالرحیم روپوش ہوگئے۔ پھر اس کے بعد ان کا حال کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ مولانا عبیداللہ سندھی بھی کابل چلے گئے۔ اسی سلسلے میں عبدالمجید سندھی کو ڈیفنس آف انڈیا کے تحت رتناگری جیل میں نظر بند کردیا گیا۔ ان کی نظر بندی کی مدت تین سال تھی۔ تحریک خلافت میں سرگرم حصہ لینے کی بنا پر دو سال اور سیاسی پابندیوں کی خلاف ورزی پر ایک سال کی سزا ہوئی۔ انہوں نے قید فرنگ کی سختیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

۱۹۲۸ء میں مسلم لیگ دہلی کے اجلاس میں انہوں نے سندھ کو علیحدہ صوبہ قرار دینے کا ریزولیشن پیش کیا۔ اس سے پہلے مئی ۱۹۲۷ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس بمبئی میں حاجی عبداللہ ہارون کے ساتھ سندھ کی علیحدگی کا مسئلہ پیش کیا اور اجلاس نے اس کی حمایت کی تھی۔

سماجی کردار:

وہ عوام و خواص میں بے حد مقبول تھے، قیام پاکستان سے قبل ۱۹۳۷ء میں انہوں نے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں لاڑکانہ کی نشست سے سر شاہنواز بھٹو کو شکست دی تھی۔

قیام پاکستان سے قبل انہوں نے وزارت تعلیم اور مالیات کے

قلمدان سنبھالے۔ مختصر یہ ہے کہ انہوں نے سندھ کی ہر اس سیاسی اور ملی تحریک میں حصہ لیا جس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد انہوں نے معاشرتی انصاف کی مہم چلانے اور بدعنوانیوں سے پاک سیاست اور صحیح جمہوریت چلانے کے جذبے سے آل پاکستان عوامی پارٹی کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا، لیکن جیسے جیسے ملک کے سیاسی امور میں بدعنوانیاں، بے انصافیاں اور خود غرضیاں راہ پاتی گئیں، وہ سیاست سے کنارہ کش ہوتے گئے۔ اس کے علاوہ عمر کی طوالت اور ضعف پیری نے بھی انہیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ سیاست سے دست کش ہو جائیں۔ ادھر بیماریاں اُن کا پیچھا نہ چھوڑتی تھیں۔

وفات:

۹۰ برس کی عمر میں انہوں نے حیدرآباد کے لیاقت میڈیکل کالج میں وفات پائی۔ ۲۴ مئی ۱۹۷۸ء کو مسلمانوں کا یہ بے لوث خدمت گزار، علاقائی عصبیت سے پاک سرمایۂ افتخار، قیادت کا یہ روشن چراغ بجھ گیا۔

شیخ عبدالمجید سندھی کی وصیت کے مطابق ٹھٹھہ کے مشہور قبرستان مکلی میں میرزا عیسیٰ ترخان کے مقبرے کے قریب ان کو دفن کیا گیا۔[1]

سر غلام حسین ھدایت اللہ:

سر غلام حسین ہدایت اللہ پہلے سیاستدان ہیں جو پاکستان بننے کے بعد سب سے پہلے صوبۂ سندھ کے گورنر بنے۔

جی ایم سید نے لکھا ہے کہ سیاست دانوں کی دو قسمیں ہیں:

ایک وہ سیاست دان ہیں جنہوں نے عوامی تحریکوں میں حصہ لیا۔ اس گروہ کے سیاست دانوں میں سندھی مسلمانوں میں مرحوم غلام محمد خان بھرگڑی، حاجی عبداللہ ہارون، شیخ عبدالمجید سندھی وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ دوسرے پارلیمنٹری سیاست دان ہیں۔ اس گروہ میں سر غلام حسین ہدایت اللہ، سر شاہنواز خاں بھٹو، مرحوم اللہ بخش خاں سومرو، خان بہادر کھوڑو وغیرہ ہیں۔

پہلے گروہ کے سیاست دانوں نے اپنی سیاست کے بنیادی اصول مقرر کیے ہیں۔ وہ اُن کے مطابق شخصی نفع اور نتیجے سے بے نیاز ہو کر کام کرتے رہتے ہیں۔ یہ نظریاتی سیاست دان ہیں۔ نظریاتی سیاست دانوں کو فوری طور پر اپنے عمل کا نفع یا نتیجہ حاصل نہیں ہوتا، اُن کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ اقتدار حاصل کیا جائے۔

دوسری قسم کے سیاست دان ہر موقع سے فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ موقع سے فائدہ نہ اٹھانا ان کے نزدیک کم فہمی اور تدبر کے خلاف ہے۔

سر غلام حسین ہدایت اللہ عملی سیاست اور تدبر میں اول درجے کے ماہر تھے۔ ان کو سیاست دانوں کا استاد کہا جاسکتا ہے۔ خوش نصیبی کے علاوہ اُن کی کامیاب زندگی میں ان کی دانشمندی اور تدبر کو بھی بڑا دخل ہے۔

انہوں نے اپنے سیاسی تجربے سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ سندھ کے مسلمانوں کے تین گروہ طاقتور ہیں۔ (۱) زمیندار اور جاگیردار۔ (۲) پیر، سید اور علماء۔ (۳) انتظامیہ میں کام کرنے والے۔

ان تینوں گروہوں میں تنظیم اور اتحاد مفقود ہے۔ وہ ان تینوں گروہوں کے نبض شناس تھے۔ انہوں نے اپنی سیاست میں تینوں گروہوں کو خوش رکھنے کی کوشش کی اور آخر وقت تک کامیابی ان کے قدم چومتی رہی۔ انہوں نے اپنی جذباتی غلطی کے بعد دوسری مرتبہ کبھی دھوکا نہیں کھایا۔

سر غلام حسین ہدایت اللہ ۱۸۷۸ء میں شکارپور (سندھ) میں پیدا ہوئے۔ سندھ مدرسے سے میٹرک پاس کیا۔ وکالت کی سند گورنمنٹ لا سکول بمبئی سے حاصل کی اور ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد میں وکالت شروع کی۔ ۱۹۰۹ء میں لوکل بورڈ حیدرآباد کے وائس پریذیڈنٹ مقرر ہوئے۔ ان کی سرگرم سیاسی زندگی نومبر ۱۹۱۲ء سے شروع ہوئی۔

۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس لندن میں بمبئی سرکار کی طرف سے شریک ہوئے۔ وہاں انہوں نے سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کی موافقت میں زوردار تقریر کی۔

۱۹۳۷ء میں چناؤ میں یہ مسلم پولیٹیکل پارٹی میں زمینداروں کی طرف سے سندھ اسمبلی میں ممبر منتخب ہوئے۔ وہ یونائیٹڈ پارٹی کی وزارت میں بھی نظر آتے ہیں۔ تھوڑے دن کے بعد مسجد منزل گاہ کا سوال اٹھا اور اللہ بخش وزارت کو شکست ہوئی اور بندہ علی خاں کی وزارت قائم ہوئی۔ یہ اس عرصے میں وزارت سے باہر رہے۔ دوبارہ اللہ بخش وزارت

---

[1] یہ تمام حالات اخبار "جنگ" مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۷۸ء، مضمون جناب اقبال صدیقی اور ہفت روزہ سندھی اخبار "صبح سندھ" ۹ جولائی ۱۹۷۲ء، مضمون جناب مظہر یوسف سے ماخوذ ہیں۔

اس شرط پر برسر اقتدار آئی کہ کچھ عرصے کے بعد وزیر اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ ہوں گے۔ لیکن یہ شرط مسلم لیگ ہائی کمان نے نامنظور کر دی۔

جب ۱۹۴۱ء میں میر بندہ علی کی وزارت کو شکست ہوئی اور اللہ بخش کی وزارت دوبارہ قائم ہوئی تو سر غلام حسین ہدایت اللہ اس میں وزیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں کانگریس نے "کویٹ انڈیا" کی تحریک چلائی۔ کانگریس کے تمام لیڈر جیل میں چلے گئے۔ سندھ میں یونائیٹڈ پارٹی کی وزارت میں کانگریس کی اکثریت تھی۔ لہٰذا خان بہادر اللہ بخش نے تقاضا کیا کہ وہ بھی استعفا دیں۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ نے اللہ بخش کی وزارت کو اس لیے ڈس مس کر دیا کہ اس کو بادشاہ کی وفاداری کی قسم سے انکار تھا۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ۱۹۴۷ء میں مسٹر مودی جو سندھ کے گورنر تھے، ان کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا گیا اور ان کی جگہ سندھ کا پہلا پاکستانی گورنر سر غلام حسین ہدایت اللہ مقرر ہوئے اور کھوڑو وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔ جب کراچی کو سندھ سے جدا کرنے کا سوال پیدا ہوا، تو کھوڑو صاحب نے کراچی کو سندھ سے جدا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ کھوڑو صاحب کی وزارت ڈس مس ہو گئی۔

سر غلام حسین ہدایت نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو وفات پائی اور کراچی کی پرانی عید گاہ میں مدفون ہوئے۔[1]

سید میراں محمد شاہ

سید میراں محمد شاہ ٹیاری کے سادات میں سے تھے اور ٹکڑ کے رہنے والے تھے۔ سید میراں محمد شاہ ۱۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو قصبہ ٹکڑ تعلقہ ٹنڈو محمد خان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حافظ محمد یوسف اور حافظ ہارون سے حاصل کی۔ سندھ مدرسہ کراچی سے ۱۹۲۱ء میں میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد سندھ ڈی جے کالج میں داخلہ لیا اور وہیں سے بی اے، ایل ایل بی پاس کیا اور حیدرآباد میں وکالت شروع کر دی۔

مارچ ۱۹۲۴ء میں سن میں ٹیاری سادات کانفرنس میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اس کے بعد ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ حیدرآباد کے جوائنٹ سیکریٹری مقرر ہوئے۔

۱۹۲۵ء میں حیدرآباد میونسپلٹی کے ممبر چنے گئے۔ ۱۹۲۸ء میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔

بمبئی صوبے کی طرف سے سائمن کمیشن کو مدد دینے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی، اس میں بھی شاہ صاحب نے بحیثیت ممبر کے کام کیا۔ شاہ صاحب ۱۹۳۶ء تک بمبئی کونسل کے ممبر رہے۔

۱۹۳۷ء میں جب سندھ اسمبلی کا انتخاب ہوا تو حیدرآباد شہر اور تعلقے سے سندھ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ کچھ دن سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت میں پارلیمنٹری سیکریٹری بھی رہے۔

دیوان بھوج سنگھ اسپیکر کے انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء میں سندھ اسمبلی کے اسپیکر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۶ء تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔

اس کے بعد سندھ گورنمنٹ کے مختلف عہدوں پر مختلف چیف منسٹروں کی وزارتوں میں رہے۔

۱۹۵۲ء میں پاکستان گورنمنٹ کی طرف سے اسپین کے سفیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں واپس آئے اور کراچی امپرووومنٹ ٹرسٹ کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۷ء تک اس عہدے پر رہے۔

ادبی خدمات:

شاہ صاحب سندھی ادبی بورڈ کے چیئرمین بھی رہے۔ اس کے بعد اس ادبی و علمی ادارے کے ممبر رہے۔ کچھ دن اس ادارے کے آنریری سیکریٹری بھی رہے۔ کچھ دن شاہ لطیف کلچرل کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے۔

شاہ صاحب شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے اور میر اور مہجور تخلص کرتے تھے۔ اُن کے سرمایہ شاعری میں کافیاں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ نثر میں بھی اُن کے مضامین ملتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی کوئی کتاب مکمل نہیں ملتی۔ شاہ صاحب راگ کے بھی شوقین تھے۔

مختصر یہ ہے کہ شاہ صاحب کے آئینۂ اخلاق میں انسانی محبت، زندہ دلی، اور خلوص کے جوہر نمایاں نظر آتے ہیں۔

وفات:

شاہ صاحب نے ۱۶ نومبر ۱۹۶۳ء کو وفات پائی۔[2]

---

[1] جنب گزاریم جن سیں، جلد ۲، ص ۱۵۴ تا ۱۶۶۔

[2] یہ تمام تفصیل جنب گزاریم جن سیں، جلد ۲، ص ۲۵۰ تا ۲۵۵ سے ماخوذ ہے۔

حاجی محمد ہاشم گزدر

حاجی محمد ہاشم گزدر کے والد کا نام میاں فیض محمد تھا۔ ۱۸۹۰ء میں جیسلمیر (راجپوتانے) میں پیدا ہوئے۔

۱۹۰۳ء میں سندھ مدرسہ کراچی میں داخلہ لیا۔ وہیں سے ۱۹۱۰ء میں میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد ڈی جے کالج سندھ میں داخل ہوئے۔ ۱۲-۱۹۱۱ء میں انٹر کا امتحان دیا اور پونا انجنیئرنگ کالج میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ انڈیا کے انسٹیٹیوٹ آف انجنیئرز کے ممبر بنے اور ریاست بہاول پور کے چولستان صحرا کے سروے کے شعبے میں ملازم ہوگئے۔ وہاں سے نکلنے کے بعد حیدرآباد دکن میں عثمان ساگر اور حمایت ساگر کے پراجکٹوں میں ملازمت کی۔

۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۳ء تک آپ ضلع لوکل بورڈ کراچی میں انجنیئر رہے۔ خان بہادر اللہ بخش خاں گبول کی پریذیڈنٹی کے زمانے میں کراچی کے کلکٹر مسٹر گبس نے انہیں ملازمت سے علیحدہ کر دیا۔

۱۹۳۴ء کے آغاز میں حاجی گزدر بمبئی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور سندھ کے علیحدہ صوبہ بننے تک ممبر رہے۔

سیاسی زندگی:

سندھ اسمبلی میں پہلی بار وہ اتحاد پارٹی کی طرف سے منتخب ہو کر آئے۔ لیکن جب اتحاد پارٹی نے ہندوؤں سے گٹھ جوڑ کر لیا اور سر غلام حسین کی وزارت ٹوٹنے پر اللہ بخش کی وزارت وجود میں آئی تو یہ اتحاد پارٹی چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔

۱۹۴۲ء میں اللہ بخش وزارت ڈس مس ہوئی۔ لیکن یہ سیاست کے ہر دور میں مسلم لیگ سے وابستہ رہے۔

۱۹۴۶ء میں چناؤ کے بعد گزدر صاحب سندھ اسمبلی کی طرف سے مرکزی قانون ساز اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے اور پاکستان قائم ہونے کے بعد بھی انہوں نے بحیثیت ممبر کے قانون ساز اسمبلی میں کام کیا۔ یہاں تک کے ڈپٹی اسپیکر منتخب ہوئے۔ وہ ون یونٹ قائم ہونے تک اس عہدے پر فائز رہے۔

۱۹۵۵ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے چناؤ میں آئے اور اکتوبر ۱۹۵۸ء تک مغربی پاکستان اسمبلی کے ممبر رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۸ء میں مارشل لا لاگو ہوا اور یہ حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں گرفتار کیے گئے۔ ۱۹۶۱ء میں صدر پاکستان نے ان کو اس شرط پر معاف کر دیا کہ وہ سیاست میں حصہ نہ لیں گے۔

وہ نماز روزے کے سختی سے پابند تھے اور فقہ کے پختہ حامی تھے۔ ان کا بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ہمیشہ مسلم لیگ سے وابستہ رہے اور سیاسی مقاصد کے لیے انہوں نے کبھی اپنا رخ نہ بدلا۔ باوجود ترغیبات کے کنونشن مسلم لیگ میں شامل نہ ہوئے، یہاں تک کہ سیاست سے ریٹائر ہو کر گوشہ گیر ہوگئے۔ (1)

پیر غلام مجدد جان سرہندی

پیر غلام مجدد سرہندی اپنی ملی خدمات اور خالق دینا ہال کراچی کے اس مقدمے کی وجہ سے جو مولانا محمد علی جوہر اور اُن کے رفقا پر چلا گیا تھا، جس میں خود پیر صاحب بھی شریک تھے، غیر معمولی شہرت و عظمت رکھتے ہیں۔

پیر غلام مجدد ۱۳ مئی ۱۸۸۳ء کو سندھ کے مشہور شہر ٹیاری میں پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے دینی تعلیم مولوی حاجی حسین اللہ پاٹائی سے ٹیاری میں حاصل کی۔

۱۹۰۴ء میں حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ نبوی ﷺ سے مشرف ہوئے۔

ان کے والد محترم خواجہ عبدالحلیم جان نے ۱۹۱۳ء میں وفات پائی اور پیر غلام مجدد سرہندی نے اُن کی جگہ مسند سجادگی کو زینت بخشی۔ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پیر صاحب اپنے ابتدائی دور میں اسلام کی تبلیغ اور درس و تدریس میں لگے رہے۔

۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت شروع ہوئی، تو وہ اس میں دلچسپی لینے لگے اور خلافت کانفرنسوں میں تقریریں کرنے لگے۔

پیر سرہندی کے علاوہ اس وقت سندھ میں کئی مشہور پیر تھے۔ راشدی پیروں میں پیر صاحب جھنڈے والے، مولوی غلام احمد صاحب ملکانی، کاماری شریف والے پیر، اور مولانا تاج محمود امروٹی۔ ان سب نے نہایت جوش و خروش سے تحریک خلافت میں حصہ لیا۔ ان میں بہت سے

---

(1) حاجی محمد ہاشم گزدر کے حالات جنب گزاریم جن سیں، جلد اول، ص ۲۵۵ تا ۲۵۸ سے ماخوذ ہیں۔

کارکن جیلوں میں بند رہے، ان میں سب سے پہلے جن پیروں کو گرفتار کر کے کیس چلایا گیا، وہ پیر محبوب شاہ جھنڈے والے، اُن کے چھوٹے بھائی پیر رشد اللہ اور پیر تراب علی شاہ راشدی تھے۔ ان کی گرفتاری سے سارے سندھ میں شور برپا ہوا۔ دوسرے پیر مولوی فیض الکریم تھے جنھوں نے پیروں کے وقار کو سخت مجروح کیا اور خلافت پر ترکوں کے حق نہ ہونے کے فتویٰ پر دستخط کیے جو اُن کے لیے نہایت بدنامی کا باعث ہوا۔

پیر غلام مجدد سرہندی کو محمد علی جوہر کے مقدمے میں سزا:

سندھی پیروں میں سب سے پہلے شخص پیر غلام مجدد سرہندی ہیں، جنھیں ۸، ۹، ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں منعقد ہونے والی خلافت کانفرنس میں یہ ریزولیوشن پاس کرنے پر کہ کوئی مسلمان انگریزی فوج میں بھرتی نہ ہو، دو سال کی سزا سنائی گئی اور مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا نثار احمد کانپوری اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو بھی دو دو سال کی سزا دی گئی۔ پیر غلام مجدد سرہندی نے عزم و استقلال کے ساتھ رتناگری جیل میں یہ سزا کاٹی۔ اسی جیل میں انہوں نے قرآن مجید حفظ کیا۔ اسی سزا نے اُن کو عالم گیر شہرت کا مالک بنا دیا۔

پیر غلام مجدد سرہندی نے رتناگری جیل سے رہا ہونے کے بعد مختلف سیاسی اور سماجی تحریکوں میں حصہ لیا۔ جب کانگریسی مسلم لیڈر کانگریس سے کنارہ کش ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو پیر صاحب بھی مسلم لیگ میں شریک ہو گئے۔

آخر وقت میں اُن کا قیام حیدرآباد میں رہا اور انہوں نے سید علی اکبر شاہ سے مل کر حیدرآباد میں ایک دینی درس گاہ "جامعہ عربیہ" کے نام سے قائم کی۔

مختصر یہ ہے کہ پیر غلام مجدد سرہندی بہت بڑے عالم، مذہبی معلومات کے ماہر، پیکر حسن اخلاق اور نہایت مہمان نواز تھے، خدمت خلق اُن کا شعار تھا۔

وفات:

پیر صاحب نے ۹ جنوری ۱۹۵۸ء کو وفات پائی۔[1]

---

[1] پیر صاحب کے یہ تمام حالات جنب گزاریم جن سیں، جلد اول، ص ۲۱۰ تا ۲۱۲ سے ماخوذ ہیں۔

حاجی مولیٰ بخش سومرو

حاجی مولیٰ بخش سومرو بن حاجی محمد عمر سومرو شکارپور (سندھ) کے رہنے والے ہیں اور جناب اللہ بخش مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ انہوں نے کوئٹہ پبلک اسکول سے سینیئر کیمبرج تک پڑھا۔ فارسی سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۳۴ء میں شکارپور میں فرسٹ کلاس آنریری مجسٹریٹ رہے۔

سیاسی زندگی:

۱۹۴۳ء کے اواخر میں وہ سیاسی زندگی میں داخل ہوئے اور خان بہادر احمد خان سدابی کی وفات کی وجہ سے سندھ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ کچھ وقت سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت میں غیر مسلم لیگی وزیر رہے۔

پاکستان بننے کے بعد وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ جناب یوسف ہارون نے جب اپنی وزارت سے کھوڑو صاحب کے حمایتوں کو نکالا تو حاجی صاحب وزیر ہو گئے۔

۱۹۵۳ء میں وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے ممبر چنے گئے۔

۱۹۵۴ء میں جب پیرزادہ عبدالستار کی وزارت سندھ کے ون یونٹ میں شامل کرنے سے انکار پر ڈس مس ہوئی اور کھوڑو صاحب سندھ کے وزیر اعلیٰ اس شرط پر مقرر ہوئے کہ وہ سندھ اسمبلی سے ون یونٹ کی تحریک منظور کرائیں گے تو کچھ دن کے لیے اس وزارت میں حاجی مولیٰ بخش بھی وزیر ہوئے۔ اس وزارت میں پیر علی محمد راشدی، قاضی محمد اکبر، سید نور محمد شاہ بھی وزیر تھے۔ اسی زمانے میں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے لیے سندھ اسمبلی کی طرف سے ممبر منتخب ہوئے۔ اسی زمانے میں وہ مرکزی حکومت کے اسٹیٹ منسٹر بھی رہے۔ کچھ مہینوں کے بعد وہ اکتوبر ۱۹۵۸ء تک مہاجرین کی آبادکاری کے وزیر رہے۔

۱۹۵۸ء میں جب ملک میں مارشل لا نافذ ہوا اور بہت سے سیاست دان ایبڈو کے تحت سیاست سے خارج کیے گئے، اس وقت سے یہ اپنے شکارپور میں مقیم ہیں۔

۱۹۷۸ء میں کچھ دن کے لیے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر مملکت اسلامیہ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کے مشیر بھی رہے، جب

عبوری حکومت کی تشکیل ہوئی تو یہ معذرت کر کے اس خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔

شخصی زندگی:

حاجی صاحب شخصی طور پر مجموعۂ خوبی ہیں۔ مجسم حسن اخلاق ہیں۔ اسلامی زندگی ان کا شعار ہے۔ ارکان اسلام کے شدت سے پابند ہیں۔ لوگوں کے جائز کام نکالنے میں وہ حاتم دوراں ہیں۔

جناب اللہ بخش سومرو

جناب اللہ بخش سومرو سندھ کے اس مشہور قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنہوں نے سندھ میں سالہا سال تک فرمان روائی کی۔ ان کے والد محترم کا نام حاجی محمد عمر سومرو تھا۔ جناب اللہ بخش حاجی محمد کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ یہ ۱۹۰۰ء میں شکارپور (سندھ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی اسکول میں حاصل کی۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کو ان کے والد نے زمینداری کے انتظام میں لگا دیا۔

۱۹۲۳ء میں وہ جیکب آباد میونسپلٹی اور ضلعی لوکل بورڈ سکھر کے ممبر چنے گئے۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں یہ خان بہادر جان محمد خان پٹھان سلطان کوٹ، ضلع سکھر کے مقابلے میں بمبئی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور بمبئی کونسل میں انہوں نے سر شاہنواز بھٹو کے دست راست ہونے کی حیثیت سے کام کیا۔ یہاں تک کہ وہ بمبئی کونسل میں سندھ کے مسلمانوں کے لیڈر قرار پائے۔ ۱۹۳۶ء تک جب تک کہ سندھ صوبہ بمبئی میں شامل رہا یہ بمبئی کونسل کے ممبر رہے۔

اتحاد پارٹی:

جب ۱۹۳۶ء میں اتحاد پارٹی ہوئی تو یہ اس میں شامل ہو گئے۔ سندھ صوبائی اسمبلی کے پہلے عام انتخابات ۱۹۳۷ء کے اوائل میں منعقد ہوئے۔ انتخابات میں جن سیاسی پارٹیوں نے حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ مسلم پولیٹیکل پارٹی، پارٹی کے لیڈر سر غلام حسین ہدایت اللہ۔
۲۔ سندھ آزاد پارٹی، پارٹی کے لیڈر شیخ عبدالمجید سندھی۔
۳۔ سندھ اتحاد پارٹی، پارٹی کے لیڈر سر شاہنواز بھٹو، سر سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون۔
۴۔ کانگریس پارٹی۔

انتخاب میں ان پارٹیوں کا نتیجہ یہ رہا:

۱۔ مسلم پولیٹیکل پارٹی — کل ۳ نشستیں ملیں۔
۲۔ سندھ آزاد پارٹی — کل ۳ نشستیں ملیں۔
۳۔ سندھ یونائٹڈ پارٹی (اتحاد پارٹی) اسمبلی کی ۶۰ نشستوں میں سے ۲۲ حاصل کیں۔ لیکن اس کے لیڈر سر شاہنواز بھٹو اور سیٹھ عبداللہ ہارون شکست کھا گئے۔
۴۔ کانگریس پارٹی، اسے صرف ۷ نشستیں ملیں، لیکن بعد میں کچھ آزاد ممبروں کی شمولیت سے کانگریسی ممبروں کی تعداد ۱۱ ہو گئی۔

ان انتخابات کے بعد گورنر سر نسلیٹ گرہام نے وزارت بنانے کے لیے سر غلام حسین ہدایت اللہ کو دعوت دی، جن کے بقول جناب رحمت فرخ آبادی کے تین ممبر منتخب ہو کر آئے تھے اور بقول جناب جی ایم سید کے صرف پانچ ممبر منتخب ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کو ایک وزارت دے کر اور اسمبلی میں اتحاد پارٹی کے سینئر ممبر جناب سید میراں محمد شاہ کو اسپیکر شپ دے کر راضی کر لیا۔ اتحاد پارٹی کے ممبروں نے خان بہادر اللہ بخش کو اپنا لیڈر اور جناب ہاشم گزدر کو ڈپٹی لیڈر چنا۔ ادھر اتحاد پارٹی نے کانگریس پارٹی سے گٹھ جوڑ کر لیا۔

دوبارہ اللہ بخش وزارت:

اس کے بعد اللہ بخش نے کانگریس اور آزاد ہندو اراکین کی مدد سے وزارت بنائی۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء (۱۳۶۲ھ) کو پیر اللہ بخش وزارت کو انگریز حکمرانوں نے اس بناء پر برخاست کر دیا کہ کانگریس کے حکم سے انہوں نے خطابات واپس کیے تھے اور اللہ بخش کابینہ کے ایک وزیر سر غلام حسین ہدایت اللہ کو وزارت سازی کی دعوت دی تھی۔ یہ ایک غیر جمہوری اقدام تھا کیونکہ اللہ بخش کے بعد سندھ اسمبلی کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ تھی۔

۱۹۴۲ء میں وزارت کی برخاستگی کے بعد اللہ بخش سماجی کاموں کی طرف توجہ دینے لگے۔

۱۴ مئی ۱۹۴۳ء کی صبح کو شکارپور میں کہیں سے واپس آ رہے تھے کہ کچھ نامعلوم آدمیوں نے ان پر پستول سے فائر کیے۔ یہ حملہ ایسا شدید اور اچانک ہوا کہ اللہ بخش صاحب اس کی تاب نہ لا سکے اور جان جان آفریں کے حوالے کر دی۔

پیر علی محمد راشدی

پیر علی محمد شاہ راشدی نے سیاست اور صحافت کو اپنا کر معراج کمال تک پہنچایا۔

اہل سیاست میں اُن کی سیاسی زندگی متنازعہ فیہ ہے، لیکن یہ سب مانتے ہیں کہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین انسان ہیں۔

شکارپور اور لاڑکانہ صوبہ سندھ کا وہ یونان ہے، جس نے اُنیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں ممتاز سیاستدانوں کو جنم دیا۔

سر غلام حسین ہدایت اللہ مرحوم، جناب محمد ایوب کھوڑو، پیر علی محمد راشدی، اللہ بخش سومرو، قاضی فضل اللہ، حاجی مولی بخش سومرو سندھ کے ان ہی دو شہروں میں پیدا ہوئے۔

پیر علی محمد راشدی پیر محمد راشد بانی تحریک حر کی اولاد ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو اپنے جد اعلیٰ پیر محمد راشد (روضہ دھنی) سے نسبت دی اور یوں راشدی کہلائے۔ اُن میں سے ایک سید محمد حامد شاہ راشدی (متوفی ۱۳۵۶ھ) ۳۸-۱۹۳۷ء تھے، جن کے تین صاحبزادے ہیں، (۱) پیر علی محمد شاہ راشدی جن کا یہ تذکرہ ہے۔ (۲) پیر سید حسام الدین شاہ راشدی (جن کا تذکرہ آگے آئے گا)۔ (۳) سید احمد شاہ راشدی۔

پیر علی محمد شاہ راشدی بن محمد سید حامد شاہ راشدی ۱۵ اگست ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولوی محمد سومار اور مولوی محمد صدیق میرپور خاص سے حاصل کی۔ انگریزی تعلیم ماسٹر محمد رفیق اور اس کے بعد نصرت شہر کے اسٹیشن ماسٹر سے پائی۔ تقریباً چھ درجے تک انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے ذوق مطالعہ کی بنا پر اپنے علم میں غیر معمولی اضافہ کیا۔

صحافتی زندگی:

راشدی صاحب کی سیاسی اور صحافتی زندگی کا آغاز ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ساتھ شروع ہوا ہے، لیکن ان کی زندگی میں صحافت کو تقدم حاصل ہے۔

۱۹۲۴ء میں پیر علی محمد شاہ راشدی نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز "سندھ نیوز" اخبار کی نامہ نگاری سے کیا۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۲۴ء کو سندھ تعلیمی کانفرنس حیدرآباد میں حصہ لیا۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۱ء تک سندھ محمڈن ایسوسی ایشن کے سرگرم کارکن رہے۔ ۱۹۲۶ء میں "الحزب" نکالا اور اس کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۲۸ء میں اخبار "الراشد" کی ایڈیٹری کی۔ سکھر سے اخبار "الامین" جاری ہوا تو یہ اس کے ایڈیٹر ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء تک رہے۔

۱۹۲۷ء میں راشدی صاحب خان بہادر محمد ایوب کھوڑو کے سیکریٹری کے فرائض انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سندھ کے علیحدہ صوبہ بنائے جانے کے لیے تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اس وقت خان بہادر کھوڑو کی طرف سے راشدی صاحب ہی کام کر رہے تھے۔

۱۹۲۹ء میں جب سندھ زمیندار اخبار سکھر سے نکلا تو راشدی صاحب نے کچھ دن اس کے ایڈیٹر ہونے کی حیثیت سے کام کیا۔ یہ اخبار آغا نظر علی خان کی نگرانی میں کھوڑو صاحب نے نکالا تھا۔

۱۹۳۴ء میں ایک اخبار "ستارۂ سندھ" سکھر سے نکلنا شروع ہوا۔ یہ اخبار ۱۹۳۷ء تک نکلتا رہا جس کے مینیجنگ ڈائریکٹر راشدی صاحب تھے۔

۱۹۳۶ء میں اُنہوں نے "صبح سندھ" نکالنا شروع کیا، جو اتحاد پارٹی کی حمایت میں مضامین لکھتا تھا۔

۱۹۳۷ء میں الیکشن سے کچھ پہلے راشدی صاحب نے ہر پارٹی کے امیدواروں کے پروپگنڈے کے لیے ایک اخبار نکالا تھا۔

۱۹۴۰ء میں انہوں نے "مسلم وائس" ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار پہلے سکھر سے اور بعد میں کراچی سے نکالنا شروع کیا۔ یہ سیاسی اور ادبی مسائل پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ اخبار ۱۹۴۶ء تک چلتا رہا۔

۱۹۴۵ء میں جب جی ایم سید کا اختلاف مسلم لیگ سے ہوا اور اخبار "الوحید" نے جی ایم سید کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کیا تو راشدی صاحب جی ایم سید کی حمایت کے لیے اخبار "قربانی" اور اس کا پریس خرید کر کراچی آئے۔ اس کے پہلے ایڈیٹر مولوی خیر محمد نظامانی تھے، لیکن کچھ دن کے بعد اس بنا پر کہ مولوی نظامانی پارٹی کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے، اخبار کی نگرانی اور ایڈیٹری پیر علی محمد شاہ راشدی کے سپرد ہوئی۔ اخبار کی نگرانی اور ایڈیٹری میں دونوں کا نام ہوتا تھا لیکن اہم مضامین اور ایڈیٹوریل پیر علی محمد راشدی صاحب ہی لکھتے تھے۔ مشہور کتاب "فریاد سندھ" پہلے قسط وار مضامین کی صورت میں اخبار "قربانی" ہی میں چھپی۔

۱۹۴۷ء میں کھوڑو صاحب کے دور وزارت میں اخبار "قربانی" بند کر دیا گیا۔

۱۹۴۸ء میں جب سندھ کے مشہور انگریزی اخبار "سندھ آبزرور"

کا انتظام کھوڑو صاحب کے ہاتھ میں آیا، تو اس وقت سے ۱۹۴۹ء یعنی دو سال تک راشدی صاحب اس اخبار کے ایڈیٹر رہے اور بقول جی ایم سید کے انہوں نے سندھی نقطۂ نظر کو پورے طور پر پیش کیا۔

۱۹۵۲ء میں راشدی صاحب نے ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار "اسٹیٹسمین" نکالنا شروع کیا۔

کچھ وقت راشدی صاحب پاکستان نیوز پیپر ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے اور اس سلسلے میں انہوں نے ایک وفد کے ساتھ ہندوستان، مصر اور انگلینڈ کے دورے کیے۔

راشدی صاحب کا شمار سندھی زبان کے صف اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے تاریخ، نفسیات اور جنرل معلومات کی اہم کتابوں کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی ادبی حیثیت کو ہم انشاء اللہ آئندہ اوراق میں تحریر کریں گے۔

راشدی صاحب ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۸ء تک سندھی ادبی بورڈ کے ممبر بھی رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ وہ سندھ کی سیاست کے ہر دور میں نمایاں رہے ہیں۔ انہوں نے سیاست کی بدولت وزارت بھی دیکھی اور سفارت بھی۔ اتحاد پارٹی ہو یا مسلم لیگ پارٹی، سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت ہو یا اللہ بخش کی وزارت، مسلم لیگ صوبہ سندھ ۱۹۳۸ء کا اجلاس ہو یا مسجد منزل کا جھگڑا، اس دور کی سیاسی تاریخ میں پیر علی محمد راشدی کے چھوڑے ہوئے نقوش نمایاں نظر آتے ہیں۔

باب :32

انیسویں اور بیسویں صدی کے علمائے کرام

جنہوں نے تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں اہم کردار ادا کیا

سندھ کو ہر دور میں ہماری علمی اور مذہبی تاریخ میں ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ برصغیر میں سب سے پہلے اسلام کے آفتاب نے اسی سرزمین کو منور و تاباں بنایا۔ ہر زمانے میں اس خطۂ ارضی میں ایسے مردان حق آگاہ پیدا ہوئے جو علم و آگاہی کی دولت سے مالامال تھے اور علم و عمل، اصلاح اخلاق اور تزکیۂ نفس کا سرچشمہ تھے۔ ان کی درسگاہوں نے اس خطہ میں ایمان و عمل کی قوتوں کو اجاگر کر کے خدا شناسی کی فضا قائم کی اور معصیت کے تمام سوتوں کو خشک کر دیا۔ آج سندھ کا ہر شہر و قصبہ ان کی علمی خدمات کا گواہ ہے۔

ابو معشر نجیح، امام اوزاعی، حافظ ابو محمد سالم سندھی، ابو عبدالملک محدث سندھی، ابو اسحاق ابراہیم سندھی موصلی وغیرہ یہ وہ جلیل القدر علمائے دین ہیں جو اگرچہ سندھی النسل ہیں، لیکن انہوں نے اپنے وطن سندھ سے نکل کر اپنی دینی اور علمی خدمات سے عرب میں جا کر اپنے وطن کے نام کو روشن کیا۔

مولانا عبدالغفور مفتون ہمایونی

مولانا عبدالغفور کی ولادت ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) میں قصبہ ہمایوں تعلقہ شکارپور سندھ میں ہوئی۔ مولانا ہمایونی کے والد محترم کا نام حضرت خلیفہ مولانا محمد یعقوب ہے۔

مولانا محمد یعقوب نے اپنے ہونہار فرزند مولانا عبدالغفور کو تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا۔ جب مولانا محمد یعقوب نے ۱۸۵۶ء (۱۲۷۳ھ) میں وفات پائی تو انہوں نے بقیہ علوم کی تکمیل مولوی سلطان محمد سیت پوری جو ان کے والد محترم کے شاگرد تھے، سے کی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا عبدالغفور نے اپنے قصبے کے مدرسے سے تعلیم دینی شروع کی۔ مولانا کے علم کا فیض عام ہوا۔ ان کے تلامذہ میں جن لوگوں نے غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کی، ان میں سے چند نام یہ ہیں: مولوی عبدالرحیم صاحب شکارپوری، مولوی فاضل محمد بلوچستانی، مولوی نبی بخش کولاچی، مولانا محمد مبارک، مولوی محمد اسماعیل شاہلی وغیرہ۔

مولانا ہمایونی یوں تو اکثر علوم و فنون میں یگانۂ روزگار تھے لیکن فقہ میں ان کا جواب نہ تھا۔ فقہ کے تبحر میں سندھ، بلوچستان، خراسان اور ہندوستان میں ان کی نظیر نہ ملتی تھی۔ بلوچستان کے حاکم شرعی، شاہی جرگوں کے موقع پر ان کو بلاتے اور اہم معاملات میں ان سے فیصلے کراتے تھے۔ ہر دل عزیزی ان کا بڑا وصف تھا۔ وہ ہر طبقے اور ہر فرقے میں مقبول تھے۔ لوگ ان سے دعا کے طالب ہوتے اور ان کے دروازے پر دعا کے طالبوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔

تصنیف و تالیف:

مولانا ہمایونی کے فتاویٰ کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے جن میں دو جلدیں فارسی میں "فتاویٰ ہمایونی" کے نام سے چھپ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ علم طب میں ایک کتاب سندھی میں "فرہنگ ہمایونی" کے نام سے چھپی۔ مولانا ہمایونی شعر کا بھی بلند ذوق رکھتے تھے اور فن شاعری میں ماہرانہ مہارت رکھتے تھے۔ ان کا تخلص مفتون تھا۔ سندھی میں غزلوں اور کافیوں کا ایک مجموعہ "دیوان مفتون" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ (1)

---

(1) مولانا ہمایونی کے یہ حالات رسالہ مہران سوانح نمبر، ۱۹۵۷ء ص ۸۶ تا ۸۷ سے ماخوذ ہیں۔

مولانا حافظ اسد اللہ ٹکرائی

سید حکیم حاجی حافظ قاضی اسد اللہ ٹکرائی ولد سید اللہ بخش شاہ ۱۵ شعبان ۱۸۶۸ء (۱۲۸۵ھ) کو پیدا ہوئے۔

ان کے ابتدائی اساتذہ میں حافظ محمد یوسف ہیں جن سے انہوں نے سندھی، فارسی اور فقہ پڑھی۔ پھر نو ماہ کی قلیل مدت میں قرآن مجید حفظ کیا۔ چیدہ چیدہ مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی اور مکتوبات حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ پڑھے۔

علم حدیث پڑھنے کے لیے ہندوستان کی مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کا قصد کیا۔ وہاں کے مشہور شیخ الحدیث شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے اُن پر خاص توجہ دی۔ طب میں اُن کے استاد میراں محمد شاہ اول ہیں۔

تحریک خلافت میں شمولیت:

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو، مسلمان مل کر انگریزوں کی غلامی کے جوئے کو اپنی گردن سے اُتار کر پھینک دینا چاہتے تھے۔ تحریک آزادی شروع ہو چکی تھی۔ خلافتِ عثمانیہ کی تائید میں ہندوستان میں تحریک خلافت عمل میں آچکی تھی۔ حافظ اسد اللہ ٹکرائی نے اس تحریک میں شامل ہو کر پورے سندھ کا دورہ کیا اور مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔

امن سبھا:

تحریک خلافت کو کمزور بنانے کے لیے انگریزوں کی حکومت نے امن سبھا کا حربہ نکالا۔ ملت فروش پروانہ وار امن سبھائی تحریک میں شریک ہونے لگے۔ حیدرآباد کے قاضی ابراہیم شاہ بھی امن سبھا کی تحریک میں شریک ہو گئے جس سے مسلمانوں کو سخت صدمہ پہنچا۔ ان کو لوگوں نے لاکھ سمجھایا مگر وہ ایک نہ مانے۔

قاضیِ شہر کی حرکت:

رمضان المبارک میں عید الفطر سے کچھ پہلے ابراہیم شاہ نے جو قاضی شہر تھے، مسٹر گبسن کلکٹر کو اطلاع دی کہ یہ لوگ عید کی نماز کے بعد انگریزوں کے خلاف ریزولیوشن پاس کرنا چاہتے ہیں۔ گبسن نے فوراً آرڈر دیا کہ عید گاہ چھاؤنی کے علاقہ میں ہے، اس لیے انگریزوں کے خلاف جو کوئی بھی زبان سے ایک لفظ نکالے گا فوراً گرفتار کر لیا جائے گا۔ خلافت تحریک کے حامی مجبور ہوئے کہ شاہ بندر کی کے میدان میں عید کی نماز ادا کی جائے، لیکن ابراہیم شاہ کے بھائی محمود شاہ نے اعتراض کیا کہ وہ جگہ نماز کے لیے مناسب نہیں۔

آخر قدم والے میدان میں نماز عید کا فیصلہ ہوا، امامت کے فرائض علامہ اسد اللہ شاہ نے ادا کیے۔ اسی وقت سے مسلمانوں نے قاضی ابراہیم شاہ کا بائیکاٹ کر دیا اور علامہ اسد اللہ کو شہر کا قاضی مقرر کیا گیا۔

حافظ اسد اللہ شاہ بڑی مؤثر اور دل نشین تقریر کرتے تھے۔ دوران تقریر میں جب انگریزوں کی استبدادیت اور ظلم و ستم کا تذکرہ کرتے تو چہرہ غصے سے لال ہو جاتا اور ایسی اثر انگیز تقریر ہوتی تھی کہ سامعین بے حد متاثر ہوتے تھے۔

مولوی فیض الکریم کا رسالہ:

علماء سوء ہر دور میں پیدا ہوتے رہے، ان کی سیاست کا مقصد اپنے دور کے صاحبان اقتدار سے جاہ و منزلت کا حاصل کرنا اور اُن کو خوش کرنا تھا، مولوی فیض الکریم بھی اسی قبیل کے عالم تھے۔

مولوی فیض الکریم نے محض انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے تحریک خلافت کے خلاف ایک رسالہ تحقیق الخلافت کے نام سے لکھا جو حیدرآباد کے کلکٹر مسٹر گبسن کو بھجوایا۔

علامہ اسد اللہ نے اس کے جواب میں رسالہ اثبات الخلافت للدولت العثمانیہ تحریر کیا۔

علامہ کا ذریعہ معاش طبابت تھا۔ انہوں نے ٹکر میں ایک دواخانہ کھول رکھا تھا۔

تصانیف نظم و نثر:

علامہ ایک بہترین نثر نویس تھے۔ سید میراں محمد شاہ ثانی نے ان کی نثر نویسی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ: اگرچہ ان کا اسلوب نگارش سادہ تھا۔ مگر وہ ادبی عناصر کو شامل کر کے اپنے مضمون کی دلچسپی کو بڑھا دیتے تھے۔

ان کی تصانیف میں بہار اخلاق، ہدیۂ اسدیہ، الانتصار فی جواب الاشتہاء اور فتح الہادی وغیرہ ہیں۔

اگرچہ وہ ایک عالم دین اور طبیب تھے، لیکن شاعرانہ

ماحول نے ان کو پاکیزہ ذوق شاعری عطا کیا تھا۔ اسد تخلص کرتے تھے۔ سندھی اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ حضرت اسد اللہ شاہ نے ۵۹ برس کی عمر میں ۱۹۲۷ء میں وفات پائی۔[1]

مولوی عبد اللہ لغاری

مولوی عبد اللہ لغاری بن نہال خان لغاری ۱۸۷۱ء (۱۲۸۸ھ) میں قصبہ داد لغاری تعلقہ میرپور ماتھیلہ میں پیدا ہوئے۔ مولوی محمد یعقوب نے اُن کا نام عبد اللہ رکھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم مولوی محمد امین لغاری سے حاصل کی۔ اس کے بعد مولوی عبد القادر صاحب سے قصبہ پنھواری میں تعلیم پائی۔ پھر نوشہرہ فیروز میں قاضی محمد عالم، قاضی عبد الرؤف، قاضی عبد الحفیظ اور مولوی فیض الکریم سے اکتساب علم کیا۔ پھر جہاں بھی اُن کو چشمہ شیریں ملا انہوں نے اپنی تشنگی علم بجھائی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے وطن واپس آئے۔

مولانا عبید اللہ سندھی سے ملاقات:

۱۸۹۸ء کے بعد امروٹ شریف میں اُن کی ملاقات مولانا عبید اللہ سندھی سے ہوئی۔ اس ملاقات نے زندگی کا ایک نیا ورق الٹا۔ مولانا عبید اللہ کی شخصیت اور اُن کی انقلابی تحریک نے اُن کے دل کی دنیا کو بدل دیا، اور وہ مولانا سندھی تحریک میں اُن کے رفیق کار ہو گئے۔

مولانا سندھی کے خیالات سے اُن کے متاثر ہونے کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اُن کے جد اعلیٰ میاں احمد خاں لغاری ٹالپور "جنگ کوہیڑا" میں میر شیر محمد خان شیر سندھ کی فوج کے ایک سالار تھے۔ انگریزوں کو نکالنے کا خواب جو میر شیر محمد خان ٹالپور نے دیکھا تھا، اُس کی تعبیر کا امکان مولانا عبید اللہ سندھی کی انقلابی تحریک میں انہیں نظر آتا تھا۔ انگریزوں کی پہنچائی ہوئی چوٹیں پھر ہری ہو گئیں اور ملک سے انگریزوں کو نکالنے کا خیال پھر پختہ ہو گیا۔ یوں مولوی عبد اللہ لغاری، مولانا عبید اللہ سندھی سے وابستہ ہو گئے۔

ادارے کا قیام:

مولانا عبید اللہ سندھی کے سیاسی نظریات کو بر سر عمل لانے کے لیے ایک ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے لیے امروٹ شریف میں ایک مدرسہ اور پریس قائم کیا گیا اور وہیں سے "اخوان المسلمین" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا گیا۔ لٹریچر کی اشاعت کے سلسلے میں طحاوی کی عقاید کے نام سے رسالہ بھی شائع کیا گیا اس ادارے کے منیجر مولوی عبد اللہ لغاری تھے، تقریباً تین سال ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۱ء تک یہ ادارہ چلتا رہا۔ امروٹ جیسے چھوٹے گاؤں میں اس ادارے کے ذریعہ سے سیاسی پروگرام کو کامیاب بنانا مشکل نظر آیا تو مولانا عبید اللہ سندھی، پیر جھنڈے والے سے ملے۔ پیر صاحب نے تین سو روپے ماہوار اس ادارے کے خرچ کے طور پر منظور کیے اور پیر صاحب جھنڈا کے مشورہ کے مطابق مولانا عبید اللہ سندھی اپنا مرکز پیر صاحب کے گاؤں میں قائم کرنے پر رضامند ہو گئے۔ مولوی عبد اللہ لغاری بھی گوٹ پیر جھنڈا پہنچے۔

دار الرشاد کا قیام:

مولوی عبد اللہ لغاری کی رائے کے مطابق مولوی محمد صاحب لغاری کو جام پور ضلع ڈیرہ غازی خاں سے اور مولوی محمد امیر صاحب کو جھنگ سے بلایا گیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی مدرسے کے ناظم اور مہتمم مقرر ہوئے مولوی عبد اللہ لغاری کو نائب مہتمم مقرر کیا گیا اور تعلیم کی نگرانی اور طلبہ کی تربیت اُن کے سپرد کی گئی۔ مدرسے کا نام دار الرشاد رکھا گیا۔ اس مدرسے کا مقصد طلباء میں ذہنی بیداری اور اسلام کے فکر و نظر کو مستحکم کرنا قرار پایا۔

پیر احسان اللہ شاہ راشدی

یہ علم و عمل کے آفتاب راشدی گھرانے میں ۱۸۹۵ء (۲۷ رجب ۱۳۱۳ھ) کو گوٹ پیر جھنڈا تعلقہ ہالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ گوٹ پیر جھنڈا میں گزرا۔ لیکن برادری کے تنازع کی وجہ سے انہیں یہ گوٹ چھوڑنا پڑا اور پیر گوٹ میں درگاہ شریف کے قریب سکونت اختیار کر لی۔

پیر احسان اللہ نے گوٹ پیر جھنڈا میں اپنے والد کے قائم کیے ہوئے مدرسے میں تعلیم پائی۔ جن اساتذہ کے سامنے انہوں نے زانوئے ادب طے کیا، ان میں مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا محمد صاحب، مولوی

---

[1] حضرت اسد اللہ ٹکرائی کے یہ حالات رسالہ مہران سوانح نمبر، ۱۹۵۷ء، ص ۱۲۶ تا ۱۲۸ سے ماخوذ ہیں۔

الٰہی بخش، مولانا احمد علی لاہوری، مولوی خدا بخش صاحب، مولوی محمد اکرم صاحب بالائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسی درسگاہ میں انہوں نے درس و تدریس کی خدمت انجام دی اور خاندانی طریقے پر انہوں نے اپنے بزرگوں کے رشد و ہدایت کے چراغ کو روشن رکھا۔

خاندان راشدی کا طریقہ تصوف قادریہ ہے۔ پیر احسان اللہ راشدی نے اپنے والد محترم کے دست حق پرست پر سلسلہ قادریہ میں بیعت ہو کر ان کی مسند سجادگی کو زینت بخشی تھی۔ اس طرح وہ سلسلۂ قادریہ کے گوہر تابندہ تھے۔

تصانیف:

پیر احسان اللہ راشدی نے جو تصانیف یادگار چھوڑدیں ان میں رسالہ المقالات المحبوبیہ فی الدعا بعد صلوۃ المکتوبہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ایک اور کتاب جو نامکمل چھوڑی، وہ خیمتہ الزجاجہ فی شرح ابن ماجہ ہے۔ پیر صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد قرآن حکیم کی تعلیمات کی اشاعت اور سنتِ رسول ﷺ کی ترویج تھا۔

مطالعہ کا ذوق:

انہیں کتابوں کے مطالعے کا ذوق غیر معمولی تھا۔ انہوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں اور شام، مصر، مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ سے کثیر رقم خرچ کر کے حدیث کی کتابوں کی نقول منگوائی تھیں۔

خطیب بغدادی کی مشہور کتاب تاریخ بغداد جو اس وقت تک چھپی نہ تھی، پیر صاحب نے مصر سے اس کا فوٹو حاصل کیا تھا۔ تاریخ اصفہانی کا فوٹو ڈاکٹر کرنکو محافظ کتب خانہ لندن کی معرفت حاصل کیا تھا۔

صحیح ابن خزیمہ اور دوسری نایاب تفسیروں کے متعلق ڈاکٹر کرنکو کی معرفت جرمن حکومت سے فوٹو یا نقول حاصل کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن فوٹو اور کاتب نہ ملنے کی وجہ سے ان کتابوں کی نقول نہ حاصل ہو سکیں۔ حیدرآباد دکن کے مشہور علمی ادارے دائرۃ المعارف کی بھی وہ رکن رہے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری کا خراج عقیدت:

پیر احسان اللہ راشدی یوں تو گنجینۂ علم تھے۔ لیکن فن رجال میں اس دور میں ان کا جواب نہ تھا۔

ایک دفعہ مولانا ثناء اللہ امرتسری ان سے ملنے کے لیے آئے اور تین دن تک ان کا قیام رہا۔ جب مولانا امرتسری رخصت ہونے لگے تو انہوں نے فرمایا کہ آج فن رجال کا امام اگر کوئی ہے تو وہ پیر احسان اللہ راشدی ہیں۔

وفات:

افسوس ہے کہ اس یگانہ روزگار علم دین نے صرف ۴۵ برس کی عمر میں وفات پائی۔[1]

مولانا مفتی محمد صاحبداد

حضرت مولانا مفتی محمد صاحبداد ۱۸۹۸ء (۱۳۱۶ھ) میں لونی ضلع سبی (بلوچستان) میں پیدا ہوئے۔

قرآن مجید کی تعلیم سید خواجہ محمد شاہ سے حاصل کی۔ عربی اور فارسی کی تعلیم مولانا محمد یوسف سے حاصل کی۔ اس کے بعد سندھ کی مختلف دینی درسگاہوں میں پڑھا۔ ۱۹۱۷ء میں مدرسہ قاسمیہ گڑھی یاسین ضلع سکھر میں علامہ مفتی محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ سے سند فراغت حاصل کی۔ علامہ نے انہیں اصول و فروع، معقول و منقول کی اجازت دی۔ اس کے بعد مولانا صاحبداد درس و تدریس اور علوم دینیہ کی اشاعت میں مصروف ہو گئے۔

۱۹۲۱ء میں مولانا صاحبداد نے سلطان کوٹ میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور حضرت مولانا عبدالباقی ہمایونی کے مشورے پر باقاعدہ درس و تدریس، تبلیغ اور نشر و اشاعت کا کام شروع کر دیا۔

مولانا الٰہی بخش، مولانا ولی محمد کٹیاری، مولوی میاں دوست محمد، الحاج مولوی عبدالستار صاحب یہ سب حضرات ان ہی کے خوشہ چیں ہیں۔ مولانا نے سندھ مدرسہ کراچی میں بھی کچھ وقت دینیات کی تعلیم دی۔

قاضی القضاۃ ریاست قلات کے عہدے پر:

مولانا مفتی صاحبداد جولائی ۱۹۳۴ء میں بلوچستان کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ محمد حسن مجددی کے انتخاب پر ریاست قلات کے قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ لیکن درویشانہ بے نیازی اور

---

[1] رسالہ مہران سوانح نمبر، ۱۹۵۷ء، ص ۱۵۳ تا ۱۵۵۔

شاہانہ تلون مزاجیوں نے انہیں زیادہ ٹکنے نہ دیا۔ اچانک ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کو تباہ کن زلزلہ آیا جس نے کوئٹہ اور قلات کو سخت نقصان پہنچایا۔ خان معظم قلات نے ان کو سلطان کوٹ بھجوا دیا۔

سیاسی زندگی:

مولانا ۱۹۳۹ء میں مسلم لیگ میں شریک ہوگئے اور کانگریسی حکومت کے خلاف مسجد منزل گاہ سکھر کی آزادی کی تحریک میں بڑا حصہ لیا۔

پاکستان قائم ہونے کے بعد مولانا سندھ اور کراچی کے جمعیت اہل سنت کے صدر منتخب ہوئے۔

جب موجودہ حضرت پیر پاگارہ نے مسند سجادگی کو زینت بخشی تو انہوں نے پیر گوٹ میں جماعت اور عام مسلمانوں کی دینی اصلاح کے لیے "جامعہ راشدیہ" کے نام سے ایک عظیم دینی درسگاہ قائم کی اور اس درسگاہ کا شیخ الجامعہ مولانا مفتی صاحبداد کو مقرر کیا گیا۔ مولانا مفتی صاحبداد آخر حیات تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔

صحافت اور تالیف:

آخر وقت تک مولانا صحافت اور تالیف و تصنیف میں حصہ لیتے رہے۔ انہوں نے ایک مذہبی اور علمی رسالہ الہایوں مولانا ہمایونی کی یادگار میں جاری کیا جو تین سال تک جاری رہا۔ پھر علماء اور صوفیائے کرام کے اصرار پر سلطان کوٹ سے ماہنامہ اسلام جاری کیا۔

مولانا نے بہت سی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں جن میں چند کے نام یہ ہیں: (۱) البلاغ المبین (۲) فتاوی الھمایونی (۳) اخلاق النبی، سماع موتیٰ وغیرہ۔[1]

مولانا محمد قاسم گڑھی یاسینی

مولانا محمد قاسم گڑھی یاسینی ۱۸۵۷ء (ربیع الثانی ۱۳۰۵ھ) میں گڑھی یاسین میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پوری تعلیم اپنے والد مولانا محمد ہاشم یاسینی سے حاصل کی۔ اپنے والد کی وفات کے بعد مولانا عبدالغفور ہمایونی سے سند فراغت حاصل کی۔

مولانا کے فیوض علمی سارے سندھ، مکران، بلوچستان، پنجاب اور افغانستان میں پھیلے اور دور دور سے طالب علم اس شمع علم کے گرد پروانہ وار جمع ہونے لگے۔

ان کی درسگاہ علمی سے جو لوگ فارغ التحصیل ہو کر نکلے، ان میں ان کے بھائی مولانا محمد ابراہیم گڑھی یاسینی، مولانا صاحبداد خان، مولانا احمد قاضی مکران، مولانا ولی محمد (بلوچستان)، مولانا صاحبڈنو قرنی، مولوی فضل محمد گڑھی یاسینی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شاعری:

علم و فضل کے ساتھ مولانا شاعری کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ فارسی اور سندھی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ فارسی میں زیادہ کہتے تھے۔ ان کے چند شعر تبرکاً ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

ساقی بیار جام جہاں بیں پر از شراب
تا عکس صورتش نگرم در شرابِ ناب
زلال وصل از جامِ وفا در کام تشنہ ریز
بروز عمر عطشانم چو صائم تابکے داری
ہم از بلبل شنیدم قاسما میگفت با نالہ
دل دلدادہ را در درد دانم تابکے داری

بدہ ساقی مئے باقی بدستِ عاشق مضطر
کہ جام بادہ گلگوں در کفِ میخوار می زیبد
بیا قاسم ز اوجِ عرش خوش خواں ایں غزل خوش را
کہ چوں مہ در نجوم، این شعر در اشعار می زیبد

تصانیف:

مولانا کی تصانیف میں ان کے فتاویٰ کی ایک جلد "فتاویٰ قاسمیہ" کے نام سے چھپ چکی ہے اور پانچ چھ جلدیں غیر مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔ ان کی تصانیف میں بعض رسالے بھی مسودوں کی شکل میں موجود ہیں۔

مولانا کے فتاویٰ کو غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی۔ بعض اوقات بلوچستان کے حاکم مولانا کو بلا کر ان کی شرعی رائے کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔

---

[1] مولانا کے یہ حالات رسالہ مہران سوانح نمبر، ص ۲۳۷ تا ۲۳۹ سے ماخوذ ہیں۔

وفات:

مولانا ۱۹۳۰ء کو رحمتِ حق سے جا ملے۔ سارے سندھ میں اس جلیل القدر عالم دین کی موت پر صف ماتم بچھ گئی۔ ان کا مزار پر انوار گڑھی یاسین میں ہے۔[2]

مولانا عبدالکریم چشتی

مولانا عبدالکریم چشتی ان بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں جن کی سیاسی، علمی، سماجی اور رفاہی خدمات بے شمار ہیں۔ وہ ۱۸۹۸ء میں شکارپور سندھ میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید کی تعلیم حاجی عبدالغفور سے حاصل کی۔ سندھی اور اردو کی تعلیم کے بعد وہ عربی اور فارسی کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے ابتدائی صرف و نحو کی کتابیں مولانا غلام رسول صاحب چشتی سے پڑھیں اور علوم و فنون کی بڑی کتابیں علامہ عبدالرحمٰن میمن سے پڑھیں۔ مولانا عبدالکریم چشتی نے باقاعدہ طب بھی پڑھی تھی اور پھر دوا خانہ بھی قائم کیا تھا۔

سیاسی زندگی:

ان کی سیاسی زندگی کی ابتداء ۱۹۱۷ء میں ڈاکٹر اینی بسنٹ کی تحریک "ہوم رول لیگ" سے ہوئی۔ پھر وہ ۱۹۱۸ء میں کانگریس میں شریک ہوگئے۔ کچھ دن کے بعد انہوں نے اپنے استاد مولانا عبدالرحمٰن کے مشورے سے "انجمن مجاہدین اسلام" قائم کی اور دو برس تک اس انجمن کو چلاتے رہے۔

جب مسلم سیاست میں ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کا غلغلہ بلند ہوا تو یہ خلافت تحریک میں شریک ہوگئے۔ ۱۹۲۰ء میں مسلم لیگ کے ممبر بنے۔

جب تحریک سول نافرمانی چلی تو یہ اس بنا پر جیل بھیج دیے گئے کہ انہوں نے بلا اجازت جلوس نکالا تھا۔ اس پاداش میں یہ ایک ماہ جیکب آباد جیل میں رہے۔ پھر دفعہ ۱۴۴ کے تحت سول نافرمانی کی وجہ سے چار ماہ میہڑ جیل میں اور پھر دفعہ ۱۰۸ کے تحت بغاوت کے سلسلے میں بارہ ماہ نصیر آباد جیل میں رہے۔

تعلیمی اور اصلاحی تحریکوں سے دل چسپی:

۱۹۲۱ء میں مولانا چشتی نے ایک دینی مدرسے کی بنیاد رکھی جس کو چھ سال تک مولانا چلاتے رہے۔

۱۹۲۴ء میں مولانا نے شکارپور میں انجمن اسلام قائم کی اور بڑی سرگرمی سے اس کے چلانے میں حصہ لیا۔

مولانا چشتی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سندھ کے چپے چپے پر ہندو مسلم اتحاد کا پیغام پہنچایا اور تحریک آزادی کا پرچار کیا۔

مولانا چشتی نے سیاسی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض دینی کو بھی محسوس کیا اور پوری قوم کو خواب غفلت سے جگایا۔ انہوں نے اپنے مواعظ میں رزق حلال، تجارت، نظم و ضبط اور تبلیغ پر بہت زور دیا۔ اُن کا قلم اور زبان ہمیشہ خدمتِ اسلام کے لیے وقف رہے۔

مولانا عبدالکریم چشتی نے اپنی عمر کا بڑا حصہ تعلیمی اور اصلاحی تحریکوں میں صرف کیا وہ مدرسہ محمودیہ، جمعیت العلماء اسلام شکارپور، انجمن اہل سنت شکارپور اور دارالھدیٰ ٹیڑھی شریف کے صدر اور نائب صدر رہے۔

صحافتی زندگی:

مولانا زبان و قلم اور عمل کے دھنی تھے۔ ان کا سندھ کی صحافت میں بھی بڑا کردار ہے۔ "صداقت"، "الحنیف" اور "پیغام" یہ تمام اخبارات ان کی یادگار ہیں۔

تالیف و تصنیف:

تالیف و تصنیف میں بھی اُن کا ذوق بلند تھا۔ انہوں نے اڑتالیس کتابیں سندھی میں اور سات کتابیں فارسی میں لکھیں۔ یہ کتابیں اس قدر مقبول ہوئیں کہ اُن کے چار چار پانچ ایڈیشن چھپے۔

ہم عصر علماء میں آپ کو بہت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ بالائی سندھ میں مولانا چشتی کے والد کے سینکڑوں مرید تھے جنہوں نے اُن کے آبائی سلسلۂ چشتیہ میں بیعت کی تھی۔[1]

مولانا دین محمد وفائی

مولانا دین محمد وفائی ۱۸۹۴ء (۲۷ رمضان ۱۳۱۱ھ) کو اپنے آبائی

---

[2] یہ حالات ملخص از رسالہ مہران سوانح نمبر ۱۹۵۷ء، ص ۱۱۸ تا ۱۲۱ سے ماخوذ ہیں۔

[1] رسالہ مہران سوانح نمبر ۱۹۵۷ء، ص ۲۴۰-۲۴۳۔

گاؤں کٹی عرف بھی آباد تعلقہ گڑھی یاسین میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم کا نام خلیفہ گل محمد تھا جو بھٹی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے جوہر قابل کو ابتداً اُن کے والد نے نکھارا اور سنوارا اور نونہار فرزند نے اپنے پدر بزرگوار سے فارسی پند نامہ عطار تک پڑھا۔ نو برس کی عمر میں والد کا سایہ شفقت سر سے اُٹھ گیا اور تعلیم و تربیت کا سارا بوجھ والدہ کے دوش پر آرہا۔

مولانا وفائی نے فارسی کی بقیہ تعلیم اپنے عزیز میاں جی محمد عالم سے حاصل کی۔ اس کے بعد عربی کی تعلیم مولانا ابو الفیض غلام عمر جتوئی سے پائی۔ وہ تعلیم کے لیے پانچ سال تک مولانا ابو الفیض جتوئی کی خدمت میں اُن کے گاؤں سونی جتوئی تعلقہ لاڑکانہ میں رہے۔ مولانا ابو الفیض سے انہوں نے منطق میں کبریٰ، ملا جلال، میر زاہد اور درس نظامیہ کی دوسری متداول کتابیں پڑھیں" ۲۸ سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد استاد محترم نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ سندھ مدرسہ، کراچی میں معلمی کی خدمت انجام دیں۔ چنانچہ استاد محترم کے مشورے پر سندھ مدرسہ تشریف لے گئے اور دو سال تک کراچی کی اس درسگاہ میں تعلیم دیتے رہے۔ یہیں ان کی ملاقات حاجی حسن اللہ پاٹائی سے ہوئی جن کے فیض نے اس پارس کو کندن بنایا۔

مولانا وفائی کی علمی شہرت کی خوش بو سارے سندھ میں پھیلتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء میں مولانا وفائی نے کراچی چھوڑ دیا اور جیلانی پیر صاحب کے صاحبزادوں کی تعلیم کے لیے رانی پور چلے گئے۔ وہاں وہ ۱۹۱۶ء تک رہے۔

تلاحا شریف کو روانگی:

رانی پور چھوڑنے کے بعد مولانا وفائی تلاحا آئے جہاں اُن کے سپرد حاجی امام الدین شاہ راشدی کے صاحبزادوں کی تعلیم و تربیت کے فرائض سپرد ہوئے۔ تلاحا میں پیر سید محمد رشد اللہ صاحب العلم (جھنڈے والے) کے فیض صحبت نے اس ہیرے کو اور بھی جلادی۔

سیاسی زندگی:

اس وقت تحریکِ خلافت کا زور تھا۔ مولانا وفائی تلاحا شریف کو الوداع کہہ کر تحریک خلافت میں شریک ہو گئے۔

اسی زمانے میں جب کہ تحریکِ خلافت کا زور تھا، اس تحریک کو دبانے کے لیے انگریز نے علماء سوء سے کام لیا۔ مولوی فیض الکریم نے ترکوں کی خلافت کے خلاف حجاز کے شریف حسین کے حق میں ایک رسالہ لکھا جس پر کتنے ہی علماء سو اور صوفیائے خام نے دستخط کیے تھے۔ اس رسالے کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا اور یہ رسالہ ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا گیا جس سے خلافت تحریک کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہوا۔

مرد حق آگاہ مولانا دین محمد وفائی نے محسوس کیا کہ اس موقع پر خاموشی گناہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے مولانا شیخ عبدالعزیز مالک اخبار "الحق" سکھر کے ساتھ مل کر اس رسالے کے خلاف زور شور سے لکھنا شروع کیا۔

ادھر قدوۃ السالکین مولانا تاج محمود امروٹی رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں اس رسالے کا جواب رسالہ تحقیق الخلافت رد رسالہ اظہار الکرامت کے نام سے مرتب کیا گیا، جو مارچ ۱۹۲۰ء میں لاڑکانہ کی خلافت کانفرنس میں تقسیم کیا گیا۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کے مشاہیر علماء اور رہنما شریک تھے۔

اس کے بعد ہی مولانا وفائی کو جمعیت العلمائے سندھ کا ناظم منتخب کیا گیا اور مولانا نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

صحافتی زندگی:

مولانا وفائی کی کراچی کی زندگی کو خاص اہمیت حاصل ہے دراصل کراچی ہی سے مولانا کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ صحافتی زندگی میں جنہوں نے مولانا وفائی کی ہمت افزائی کی، ان میں مولانا عبداللہ صاحب میرپوری اور شیخ عبدالعزیز محمد سلیمان مالک اخبار "الحق" سکھر شامل ہیں۔ ان دونوں بزرگوں نے مولانا وفائی کو صحافتی مضامین لکھنے کی طرف توجہ دلائی۔

مولانا وفائی تصنیف و تالیف اور صحافت کی طرف جزوی طور پر پہلے ہی سے متوجہ تھے اور رانی پور کے زمانے میں انہوں نے قادیانیوں کے رد میں ایک رسالہ "صحیفہ قادریہ" کے نام سے شائع کیا تھا، اور تلاحا کی رہائش کے زمانے میں پیر عبدالغفار شاہ راشدی کی سرپرستی میں "الکاشف" ماہوار رسالہ جاری کیا تھا۔

مارچ ۱۹۲۰ء میں کراچی سے اخبار الوحید جاری ہوا، تو مولانا وفائی کو اس اخبار کا معاون مدیر مقرر کیا گیا۔ ادھر مولانا نے اپنی ادارت میں رسالہ توحید جاری کیا، وہ ایک طرف الوحید کے لیے مضامین بھیجتے اور دوسری طرف اپنے ماہوار رسالے "توحید" کے لیے علمی، ادبی تاریخی مضامین لکھتے تھے۔

۱۹۳۶ء میں سندھ بمبئی پریذیڈنسی سے الگ ہو کر ایک علیحدہ صوبہ بنا۔ اس موقع پر اخبار "الوحید" نے اپنا ایک خاص نمبر (سندھ آزاد نمبر) نکالا جس میں سندھ کی گذشتہ تاریخ، تہذیب، علم و ادب کے بہترین شہ پارے شامل کیے گئے۔ سندھ کی صحافت میں اس وقت یہ نمبر خاص اہمیت کا حامل تھا۔ ان میں سے اکثر مضامین مولانا وفائی کی تخلیق تھے۔

۱۹۲۶ء میں مولانا تبلیغی کاموں کے سلسلے میں ایک سال تک کراچی سے باہر رہے، جس کی وجہ سے ان کا رسالہ "توحید" بند ہو گیا۔

۱۹۲۷ء میں مولانا وفائی نے پیر سید حزب اللہ شاہ کی سرپرستی میں سکھر سے ہفتہ وار اخبار "الحزب" جاری کیا لیکن یہ زیادہ وقت چل نہ سکا اور مولانا اخبار الوحید کی ادارت میں دوبارہ منسلک ہو گئے۔

۱۹۳۴ء میں مولانا نے اپنا رسالہ "توحید" دوبارہ جاری کیا جو اُن کی زندگی کے آخری تک جاری رہا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی واپسی:

۱۹۳۹ء میں مولانا عبید اللہ سندھی سندھ میں واپس آئے اور سندھ میں ولی اللہی تحریک شروع کی، تو مولانا وفائی نے اس تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا۔

اس تحریک سے مولانا وفائی کے عشق کا اندازہ اس سے کیجیے کہ انہوں نے اخبار "الوحید" سے ۲۳ سالہ پرانے رشتے کو توڑ لیا۔ اور اللہ بخش سومرو مرحوم کے جاری کردہ اخبار "آزاد" کی ادارت میں شریک ہو گئے۔

تصنیف و تالیف:

مولانا وفائی نے اپنی صحافتی زندگی کی مصروفیتوں کے باوجود بہت سی مذہبی، علمی اور ادبی کتابوں کا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا۔ جن میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں: راحت الروح تذکرہ مخدوم حضرت نوح ہالائی، الہام الباری ترجمہ تجرید البخاری (۵ جلدوں میں)، ترجمہ فتوح الغیب (نامکمل)، اعتقاد صحیح (مذہب اہل حدیث)، تذکرہ مشاہیر سندھ، ہندو دھرم اور قربانی، توحید اسلام ترجمہ تقویۃ الایمان وغیرہ۔

مولانا وفائی نے اپنے بعد بہت بڑا علمی سرمایہ چھوڑا، ان کی کچھ کتابیں چھپی ہیں اور کچھ کتابیں چھپنے کے بعد نایاب ہو گئیں ہیں اور بہت سی کتابیں مسودوں کی صورت میں ضائع ہو گئیں۔ مولانا وفائی کی اہم تصنیف مشاہیر سندھ ہے۔

مولانا وفائی کی آخری تصنیف لطف اللطیف ہے۔ یہ کتاب مولانا نے اپنی وفات سے تین ماہ پہلے لکھنی شروع کی تھی اور نومبر ۱۹۴۹ء میں اس کتاب کو مکمل کیا تھا۔ مولانا کی زندگی میں یہ کتاب چھپنا شروع ہو گئی تھی۔ لیکن کتاب کی طباعت ابھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ مولانا رحمت حق سے جا ملے۔

شاعری:

مولانا وفائی شعر کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ ان کا تخلص وفائی تھا۔ اگرچہ وہ اپنی علمی اور قومی مصروفیات کی وجہ سے شاعری کو زیادہ وقت نہ دے سکے۔ پھر بھی انہوں نے چمنستان شاعری میں جو پھول کھلائے ہیں، وہ ان کے رسالہ توحید میں اوراق گل کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔

وفات:

آخر علم و عمل کا یہ پیکر ۱۸ اپریل ۱۹۵۰ء (۲۲ جمادی الثانی ۱۳۲۹ھ) کو راہی عالم بقا ہوا۔[1]

---

[1] مولانا وفائی کے یہ حالات زندگی رسالہ مہران سوانح نمبر، ۱۹۵۵ء، ص ۱۷۸ تا ۱۸۳ سے ماخوذ ہیں۔

باب :33

انگریزی عہد کے سندھی زبان کے مصنف، ادیب، شاعر اور صحافی

۱۸۴۳ء تا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء

ہم فریئر کے حالات میں پہلے لکھ چکے ہیں کہ انگریزوں نے سندھ میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد اہل سندھ کو ذہنی طور پر غلام بنانے کے لیے فارسی زبان کو سب سے پہلے دیس نکالا دیا اور دفاتر میں سندھی کے سکے کو رواں دواں کر دیا۔ اس راہ میں سب سے بڑی مشکل رسم الخط کی تھی، جس کو ۱۸۵۲ء میں ایک کمیٹی کے ذریعے اس طرح حل کیا گیا کہ عربی حروف تہجی میں نقطے لگا کر خالص سندھی آوازوں کے لیے نئے نئے الفاظ گھڑے گئے اور ملے ہوئے الفاظ مثلاً بھ۔ ٹھ وغیرہ کے لیے نقطوں سے کام لیا گیا مثلاً بھ کو سندھی رسم الخط میں پ کی صورت دی گئی۔

پھر چند سندھی لغات اور قواعد کی کتابیں مرتب کی گئیں۔ یہ سب کتابیں انگریز مصنفین نے تیار کیں۔ درسی کتابوں اور تصانیف کا سلسلہ بھی شروع کرایا گیا۔ تراجم کا کام بھی شروع کرایا گیا۔ خود انگریز اہلکاروں کے لیے بھی سندھی بولنا طرۂ امتیاز قرار دیا گیا۔

"سندھی رسم الخط کی تحریک" کے عنوان سے نیاز احمد صدیقی نے رسالہ "العلم" میں لکھا کہ:

> سندھی حروف تہجی اور تحریری زبان کے لیے سندھ برطانوی حکام کا رہین منت ہے۔
>
> چارلس نیپیر نے جب سندھ فتح کیا تو ایسے حروف تہجی نہ تھے جو عام طور پر رائج ہوں۔ تمام تحریری کاروبار منشی کرتے تھے۔ وہ فارسی رسم الخط میں سندھی زبان لکھتے تھے۔ کتاب ابوالحسن سندھی ملا مسجدوں میں پڑھاتے تھے۔ یہ سندھی کو عربی رسم الخط میں لکھنے کی ابتدائی کوشش تھی اور واٹن کی "گرامر آف سندھی" کا بھی یہی مقصد تھا۔ یہ کتاب ۱۸۶۶ء میں لکھی گئی۔

فتح سندھ کے آٹھ سال بعد جب بارٹل فریئر نے سندھ کا نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لیا تو اس وقت دو برطانوی افسر تھے جو سندھی بول سکتے تھے لیکن کلرکوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو سندھی لکھ سکتا ہو۔ اس لیے سندھی حکام کو سندھی زبان کے امتحان پاس کرنے کے لیے احکام جاری کیے گئے، لیکن سندھی کے حروف تہجی کا تعین کرنا ضروری تھا۔ صرف دو افسر ایک کیپٹن رچرڈ اور دوسرے کیپٹن اسٹیک سندھی جانتے تھے، لیکن ان کے خیالات ایک دوسرے کے ضد تھے۔ رچرڈ عربی رسم الخط کے حق میں تھا اور اسٹیک ہندی رسم الخط کے حق میں جو ہندو تاجروں میں رائج تھا۔ فریئر کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ ہندو عربی رسم الخط قبول نہ کریں گے اور مسلمان ہندی رسم الخط سے انکار کریں گے، لیکن ۱۸۵۲ء میں ایسٹ انڈیا کے کورٹ آف ڈائریکٹرز نے عربی حروف تہجی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ مسٹر ایلس کو عربی حروف کا کام سپرد کیا گیا۔ عربی میں کل ۲۹ حروف ہیں لیکن سندھی کے ۵۲ حروف تہجی سندھی لہجوں اور اس کی صوتی خصوصیات کو قائم رکھنے کے لیے بنائے گئے۔

اس نئے رسم الخط نے بڑی جلدی ترقی کی اور سندھی زبان صوبے کی سرکاری زبان بن گئی۔

۱۸۷۲-۱۸۷۶ء تک سندھ میں کوئی مستقل ایجوکیشنل انسپکٹر مقرر نہیں کیا گیا، بلکہ یہ فرائض یورپین افسر انجام دیتے تھے جو دوسری ذمہ داریوں کی وجہ سے تعلیمی پالیسی میں کوئی دلچسپی نہ لیتے تھے۔

ہندی حروف تہجی کی فضیلت کی تحریک ایک دکنی برہمن نارائن جگن ناتھ نے اٹھائی، جو سندھ کا ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر بھی تھا۔ آگے چل کر جناب نیاز احمد صدیقی نے لکھا:

> اس قسم کی کوشش کہ عربی رسم الخط کے بجائے کوئی ہندی رسم الخط رائج کیا جائے، محض بے نتیجہ اور ناکامی کے مترادف

ہے۔ اب ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس خوبصورت زبان سے واقف ہو اور اپنی تمام کوششیں اس علاقائی زبان کے سکھانے میں صرف کرے۔[1]

دیوان پربھ داس آنند رام اور مرزا صادق علی خان بہادر:

دیوان پربھ داس، آنند رام اور مرزا صادق علی خان بہادر سے سندھی کو سرکاری زبان بنانے کے بعد نصاب کی کتابیں لکھوائی گئیں۔ ۱۸۵۴ء میں پہلا نارمل اسکول قائم ہوا۔ اسی سال جغرافیہ اور تاریخ کی دس کتابیں لکھوائی گئیں۔

سرکاری کوششوں کے ساتھ ساتھ غیر سرکاری طور پر بھی تصنیف و تالیف کے ذوق کو عام کیا گیا۔

۱۸۵۳ء سے ۱۸۷۰ء تک سندھی مصنفین کی کئی کتابیں اور تراجم ہمیں ملتے ہیں۔

گر بخشانی:

اس دور کے ہندو نثر نگاروں میں جس نے سندھ کے آخری دور کے سرمایۂ شاعری اور گنج شاعری کو صحیح طور پر محفوظ رکھنے کی کوشش کی وہ گر بخشانی تھا۔ اس نے سندھ کے عظیم المرتبت صوفی شاعر و مفکر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مجموعۂ شاعری "شاہ جو رسالو" کو نہایت تحقیق کے ساتھ جدید اسلوب پر ایڈٹ کیا اور اس طرح اس گنج گراں مایہ کو محفوظ کر دیا۔ اس کی اور کئی کتابیں بھی ہمیں ملتی ہیں جو اس دور کے نثری ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

گر بخشانی کا خاندان حیدرآباد سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے ۱۹۲۸ء میں لندن یونیورسٹی سے انگریزی شاعری میں تصوف پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ جھوک کے شاہ عنایت صوفی شہید کا بے حد معتقد تھا۔ شاہ عبداللطیف کے کلام میں غیر معمولی درک رکھتا تھا۔ مثنوی مولانا روم پر اس کی گہری نظر تھی۔ گر بخشانی ۱۱ فروری ۱۹۴۷ء کو کراچی میں فوت ہو گیا۔[1]

[1] یہ تمام تفصیل رسالہ العلم اپریل تا جون ۱۹۷۱ء، ص ۱۰۳ تا ۱۰۶، مضمون "سندھی رسم الخط کی تحریک سندھ کے ایک سابق گورنر کے قلم سے" مترجمہ نیاز احمد صدیقی شبلی کالج، اعظم گڑھ سے ماخوذ ہے۔

[1] جنب گزاریم جن سین، جلد ۲، ص ۳۰۴ تا ۳۰۷ سے ڈاکٹر گر بخشانی کے حالات زندگی ماخوذ ہیں۔

بھیرو مل مہر چند اڈوانی:

سندھ کے ہندوؤں میں ایک اور مصنف کا نام مشہور ہے۔ یہ بھیرو مل مہر چند اڈوانی تھا۔ اس کو عرف عام میں کاکو بھیرو مل کہا جاتا تھا۔ وہ سندھی لسانیات کا بڑا عالم تھا۔ جغرافیہ اور قدیم تہذیب و تمدن کے جاننے والوں میں اس کا شمار صف اول میں ہوتا تھا۔ بھیرو مل کی لکھی ہوئی کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں: (۱) سندھی گرامر۔ (۲) گل قند۔ (۳) سندھی بولی کی تاریخ۔ (۴) قدیم سندھ۔ (۵) لطیفی سیر۔ (۶) موھن جو دڑو (انگریزی) وغیرہ۔

بھیرو مل حیدرآباد کے عامل خاندان کی ایک شاخ اڈوانی میں ۱۸۷۰ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوا۔ ایکسائز کے محکمے میں ۲۸ سال اور کالج میں ۱۳ سال ملازمت کی۔ اس کی ادبی زندگی کی ابتدا ۱۹۰۵ء میں درسی کتابوں کے لکھنے سے ہوئی۔ پاکستان بننے کے بعد وہ کچھ دن کراچی میں رہا۔ نومبر ۱۹۴۹ء میں بمبئی چلا گیا۔ ۷ جولائی ۱۹۵۰ء کو فوت ہوا۔[2]

جیٹھ مل پرس رام:

اس دور کا ایک اور ادیب اور نثر نگار جس نے سندھی نثر نگاری میں ایک نئی روش کا آغاز کیا اور جس کی تحریروں میں فکر و تخیل، مشاہدہ اور احساس کا ایک نیا رنگ ملتا ہے، وہ جیٹھ مل پرس رام تھا۔

اس کے علاوہ ہندو نثر نگاروں میں لال چند امر ڈنڈمل خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ سندھی ادب کی خدمت میں صرف کیا۔

اسی دور میں علامہ داؤد پوتہ نے نثر کے ذریعے علمی تحقیقات کو آگے بڑھایا۔[1]

میرزا قلیچ بیگ:

اسی دور میں خاک سندھ سے ایک شخص اٹھا جس نے سندھی نثری ادب، سندھی شاعری، افسانہ نویسی، تاریخ، تحقیق، ناول نگاری غرضیکہ سندھی ادب کے گلشن میں طرح طرح کے پھول کھلائے۔ جس نے انگریزوں کے عہد میں سب سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ وہ خان بہادر میرزا

[2] بھیرو مل کے حالات زندگی جنب گزاریم جن سین، جلد ۲، ص ۳۲۸ تا ۳۳۲ سے ماخوذ ہیں۔

[1] روزنامہ حریت (ادبی گزٹ)، ۱۹ اپریل ۱۹۶۹ء، مضمون اعجاز الحق قدوسی۔

قلیچ بیگ ہیں۔ یہ ۱۸۵۳ء (۴ محرم ۱۲۷۰ھ) میں حیدرآباد کے ٹنڈے ٹھوڑو گوٹ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام میرزا فریدون بیگ تھا۔ اُن کے جوہر قابل کو اُن کے والد نے نکھارا اور سنوارا۔ شعر و شاعری میں انہوں نے اپنے والد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور سندھی شاعری کے افق پر آفتاب بن کر طلوع ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ بمبئی کے ایلفنسٹن کالج میں داخل ہوئے اور اپنی خداداد قابلیت سے اسکالرشپ حاصل کیا۔ انہوں نے سنسکرت، گجراتی، مرہٹی زبانیں بھی سیکھیں اور کالج میں فیلو مقرر کیے گئے جہاں وہ فارسی کی تعلیم دینے لگے۔ بمبئی سے وہ متاع تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن سندھ لوٹے اور محکمہ مال میں ملازم ہوگئے۔ ۱۹۰۹ء میں وہ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے اور اسی عہدے سے پنشن لی۔ ان کا طرز زندگی نہایت سادہ اور بے تکلف تھا۔ قدیم وضعداری اور شرافت کا پیکر تھے۔

۷۶ برس کی عمر میں ۳ جولائی ۱۹۲۹ء کو اس یگانۂ روزگار عالم اور بے مثل شاعر نے اس جہان فانی کو الوداع کیا۔ وہ بلبل ہزار داستان تھے، شاعری کی کوئی صنفِ سخن ایسی نہ تھی جس کی زمین کو انہوں نے آسمان نہ بنایا ہو۔ اُن کا نام سندھ کی علمی و ادبی تاریخ میں ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جائے گا۔[1]

پیر علی محمد راشدی:

پیر علی محمد راشدی بھی اسی دور کی یادگار ہیں جنہوں نے صحافتی ادب اور نثری ادب کو غیر معمولی ترقی دی، جن کا تذکرہ پچھلے صفحات پر ہو چکا ہے۔

خان بہادر محمد صدیق میمن اور مولانا چشتی:

خان بہادر محمد صدیق میمن اور مولانا چشتی بھی اسی عہد کی لائق فرد ہیں جن کی نثر نویسی کی عظمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

لطف اللہ حیدرآبادی اور امام بخش خادم:

اس دور میں تراجم اور قصہ نویسی کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ لطف اللہ حیدرآبادی (متوفی ۱۸۹۸ء) نے رجب علی بیگ سرور کی تصنیف "فسانہ عجائب" کو سندھی کی مقفیٰ عبارت میں ترجمہ کیا۔ امام بخش خادم شکارپوری نے "چہار درویش"، "الف لیلہ"، "حاتم طائی" اور بہرام گور کے قصوں کو اردو اور فارسی سے سندھی میں منتقل کیا۔

عبدالرؤف ہالائی:

عبدالرؤف ہالائی نے "گل بکاؤلی"، "داستان امیر حمزہ" اور "گل و صنوبر" کو اردو سے سندھی کا جامہ پہنایا۔

عثمان ڈیپلائی:

زمانہ اور آگے بڑھ گیا۔ عثمان ڈیپلائی نے سندھی میں طبع زاد ناول اور ڈرامے لکھے اور مولانا عبدالحلیم شرر کے ناولوں کے تراجم بھی کیے۔

اسی دور میں سندھی شاعری کا رخ بھی بدلا۔ پہلے سندھی شاعری میں خالص سندھی ماحول کی عکاسی ہوتی تھی اور یہاں کی شاعری پر مقامی جذبات و تخیل کی گہری چھاپ تھی، لیکن اس عہد میں میر حسن علی، میر عبدالحسین خاں، سید فاضل شاہ اور میرزا قلیچ بیگ نے سندھی شاعری میں نئے اسالیب اور نئے خیالات کی راہیں کھولیں اور ایرانی تصورات کو سندھی شاعری میں داخل کیا۔ یہ چاروں دور جدید کے نقیب اور پیش رو تھے۔ پھر اسی عہد میں اصناف شاعری میں ہر صنف کی طرف توجہ کی گئی۔

میر عبدالحسین خانگی (۱۸۵۱ء تا ۱۹۲۴ء) سندھ کے حکمران ٹالپور خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ غزل گوئی کو اپنایا اور اس کو کمال تک پہنچایا۔

قادر بخش بیدل روہڑی (۱۸۱۴ء- ۱۸۷۲ء)، اخوند محمد قاسم ہالائی (۱۸۱۹ء- ۱۸۹۱ء)، محمد حسن بیکس روہڑی (۱۸۵۸ء- ۱۸۸۱ء)، خلیفہ گل محمد، حافظ حامد ٹکرائی (متوفی ۱۸۹۷ء)، غلام محمد شاہ گدا، غلام علی سبز پوش، میاں علی نواز علوی، پیر غلام شاہ راشدی (متوفی ۱۹۰۱ء) (جن کے کلام میں سوز و گداز کا یہ عالم تھا کہ وہ آنسوؤں کے بادشاہ کہلاتے تھے)، امام بخش خادم شکارپوری، شمس الدین بلبل، مرتضائی ٹھٹھوی، سید امیر علی شاہ، پیرل فقیر، میاں خیر محمد، سندھی زبان کے صاحب تصنیف ادباء و شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔

ہجویہ شاعری کو بھی اس دور میں فروغ حاصل ہوا۔ محمد ہاشم مخلص اور مولوی نور محمد نظامانی نے اس صنف کو اپنایا۔ ان کی ہجو میں بڑی جان اور نشتر کی سی تیزی ہے۔

طنزیہ شاعری کے رنگ میں قومی شاعری کو سب سے پہلے سندھی شاعری میں شمس الدین بلبل نے اختیار کیا، ان کے کلام میں حضرت اکبر

---

[1] میرزا قلیچ بیگ کے حالات زندگی "دیوان قلیچ" کے مقدمے (تالیف جناب اجمل بیگ میرزا)، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۵۶ء سے ماخوذ ہیں۔

الہ آبادی کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

اسی دور میں شعرا نے سندھی زبان میں تاریخ کے استخراج کو اپنا محور بنایا۔ ہدایت علی شاہ نجفی، میاں مرتضائی، غلام محمد شاہ گدا اور میرزا قلیچ بیگ ہمیں سندھ میں اس صنف کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ ان سب نے تاریخی قطعات کہہ کر تاریخ گوئی کی صنف کو بام عروج تک پہنچایا۔

قومی شاعری کے ابتدائی نقوش بھی ہمیں اس دور میں ملتے ہیں۔ قومی شاعری کے پہلے علمبردار اللہ بخش ابوجھ (متوفی ۱۹۰۱ء) ہیں، جنہوں نے مولانا حالی کے طرز پر سندھی میں مسدس لکھی، جس کا مقصد سندھی مسلمانوں کو اُن کے ماضی اور حال کی داستان سنا کر ترقی کے راستے پر گامزن کرنا تھا۔ ابوجھ کی یہ مسدس سندھی میں قومی شاعری کی پہلی آواز تھی، جس سے سندھی شاعری پہلی مرتبہ آشنا ہوئی۔ ان کی یہ سندھی مسدس سندھ میں بہت مقبول ہوئی۔

صحافتی ادب:

صحافتی ادب نے بھی اس عہد میں ترقی کی اور سندھ سے جو رسائل واخبارات جاری ہوئے، ان میں سے بعض نام یہ ہیں:

مفرح القلوب، اخبار اکلیل، اخبار معین الاسلام، سندھ سدھار، معاون اسلام، الحق حیدرآباد اور سکھر، آفتاب سکھر، بہار اخلاق سکھر، الوحید اور توحید کراچی، سندھ زمیندار سکھر، قربانی، تعلیم، الانکشن لاڑکانہ۔

اس دور کی صحافت نے جس میں اس زمانے کے مختلف سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی تحریکوں کا امتزاج تھا، سندھی ادب کو نئے الفاظ، نئے آہنگ، اور نئے طرز نگارش سے مالامال کیا۔

انگریزوں کے آخری عہد کے شعراء:

انگریزوں کی آخری دور یعنی بیسویں صدی کے نصف تک کے سندھی شعرا کے نام یہ ہیں:

محمد صدیق مسافر، نواز علی نیاز، حاجی محمود خادم، محمد بخش واصف، مولوی احمد ملاح، مولوی ثنائی، حیدر بخش جتوئی، مراد علی کاظم، جمعہ خان غریب، علی محمد قادری، غلام سرور قادری، غلام احمد نظامی، اللہ بخش عقیلی سرشار، غلام علی سرور، محمد ابراہیم خلیل اور مخدوم محمد زماں طالب المولیٰ، رشید احمد لاشاری۔

انگریزوں کے آخری عہد کے نثر نگار (۱۸۴۹ء- ۱۹۲۹ء):

انگریزوں کے آخری عہد کے نثر نگاروں میں جو نام ہمیں نمایاں نظر آتے ہیں، ان میں میرزا قلیچ بیگ، حکیم فتح محمد سیوستانی اور مولانا دین محمد وفائی (متوفی ۱۹۵۰ء) ہیں۔ سید حسام الدین راشدی اور ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ اور میرزا قلیچ بیگ نے سندھی ادب کو باغ و بہار بنایا۔

شمع تاریخ و تحقیق کے پروانے

ڈاکٹر داؤد پوتہ:

جنہوں نے سندھی ادب میں تاریخ و تحقیق کو رواج دیا اور ذوق تاریخ کو عام کیا، اس چمنستان کے گلہائے سر سبد میں شمس العلماء ڈاکٹر داؤد پوتہ، مولانا دین محمد وفائی، پیر حسام الدین راشدی اور ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ہیں۔ شمس العلماء ڈاکٹر داؤد پوتہ عہد انگریزی میں اس راہ کے پہلے راہی ہیں، سندھ میں اور اہل تحقیق میں ان کا نام بڑی عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ ۲۵ مارچ ۱۸۹۶ء کو تلہٹی تعلقہ سیوہن ضلع دادو کے ایک گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں سندھ مدرسہ کراچی سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۲۱ء میں فارسی میں بی۔ اے فسٹ کلاس میں پاس کیا۔ بمبئی یونیورسٹی سے فارسی اور عربی میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۴ء میں گورنمنٹ سے اسکالرشپ ملا اور وہ سندھی اور عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے کیمبرج یونیورسٹی میں ڈاکٹری کے لیے داخل ہوئے۔ مشہور مستشرقین ڈاکٹر آر۔ اے نکلسن اور ڈاکٹر براؤن نے ان کے جوہر قابل کو نکھارا اور سنوارا۔ ۱۹۲۷ء میں بعنوان "عربی کا فارسی شاعری پر اثر" مقالہ لکھ کر انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر داؤد پوتہ نے تعلیم کی راہ میں بڑی مشقتیں اٹھائیں یہاں تک کہ زمانہ طالب علمی میں حصولِ علم کے لیے محنت و مزدوری بھی کی، لیکن اپنے عزم کو کبھی پست نہ ہونے دیا۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۲۷ء کو وہ کامیابیوں سے ہمکنار ہو کر اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر اپنے وطن واپس ہوئے اور سندھ مدرستہ الاسلام کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یونیورسٹی آف بمبئی کا فیلو مقرر کیا گیا۔ بعد ازاں اسماعیل کالج اندھیری بمبئی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۹۳۰ء تک اس کالج میں پروفیسر رہے۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۸ء تک وہ بمبئی میں مختلف تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ مختلف سرکاری خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۰ء میں وہ

ڈائریکٹر تعلیمات کے عہدے پر فائز ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کا علمی اور تحقیقی پایہ بہت بلند ہے۔ ایڈیٹنگ اور تحقیق کی راہوں کے وہ سب سے پہلے راہی ہیں، جنہوں نے اس میدان میں نئی شمع جلائی اور علم و ادب کو فروغ دینے کے لیے نئی راہیں تلاش کیں۔ ان کی شاہکاریوں تو تقریباً ۲۱ کتابیں ہیں لیکن اہل علم جن دو کتابوں کو حرز جاں بنائے ہوئے ہیں وہ تاریخ سندھ کو دو قدیم اور مستند کتابیں چچ نامہ اور تاریخ معصومی ہیں، جن کو ڈاکٹر صاحب نے جدید طرز پر ایڈٹ کر کے تمام اہل علم کو اور سندھ پر کام کرنے والوں کو اپنا رہین منت بنالیا ہے۔[1]

حکیم فتح محمد سیوستانی:

حکیم فتح محمد سیوستانی بن حکیم غلام محی الدین سیوستانی نے جو عباسی خاندان کے ایک گوہر گراں مایہ تھے، سندھی نثری اور شعری ادب کو آگے بڑھایا۔ ان کی تصانیف میں ابو الفضل و فیضی، میرن جی صاحبی، آفتاب ادب، تنویر الایمان اور خصوصاً رسول اکرم ﷺ کی سیرت مبارک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ادب کے علاوہ سیاست میں بھی حصہ لیا۔ وہ خلافت اور کانگریس اور آخر میں جمعیتہ العلماء ہند کی تحریکوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے صاحبزادے حکیم محمد احسن ہیں جو کراچی میونسپلٹی کے میئر اور نائیجریا میں حکومت پاکستان کے ہائی کمشنر رہے ہیں۔ حکیم فتح محمد سیوستانی نے ۱۳ دسمبر ۱۹۴۳ء کو وفات پائی۔[2]

ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کے بعد جنہوں نے سندھ کی تاریخ و تحقیق کو آگے بڑھایا اور سندھ ادب میں تاریخ و تحقیق کے رنگا رنگ پھول کھلائے اور اسالیب تاریخ و تحقیق کو نئی تازگی بخشی، ان میں سندھ کے دو جلیل القدر ادیبوں کے نام نمایاں نظر آتے ہیں، ایک پیر حسام الدین راشدی اور دوسرے ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ۔

پیر حسام الدین شاہ راشدی:

یہ پیر علی محمد شاہ راشدی کے منجھلے بھائی تھے۔ انہوں نے تاریخ و تحقیق کو اپنا موضوع بنایا اور بلاشبہ اپنے موضوع کو معراج کمال تک پہنچایا۔ پیر حسام الدین راشدی بلاشبہ پاکستان کے محققین اور تاریخ کے دانشوروں میں سے تھے جن کی شہرت وطن سے نکل کر بیرونی ممالک تک پہنچ چکی ہے۔ وہ ہماری علمی دنیا کے وہ گل سرسبد ہیں جنہوں نے پاکستان کی علمی خوشبو سے اندرون و بیرون ملک دنیا کو مہکایا۔ ان جیسا کتابیات کا عالم بہت کم دیکھنے میں آئے گا۔

سندھی ادبی بورڈ کی ملازمت کے زمانے میں مجھے ان سے تربیت کا موقع ملا، اور آج سندھ کی تاریخ میں جو تھوڑی بہت شدھ بدھ مجھے حاصل ہے وہ انہی کی رہین منت ہے۔ جس کے لیے میں ان کا بصمیم قلب شکر گزار ہوں۔

پیر حسام الدین راشدی ۲۰ ستمبر ۱۹۱۱ء میں راشدی پیروں کے گوٹھ میں نصرت سٹیشن کے قریب پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم مولوی محمد سومار سے حاصل کی۔ اس کے بعد مولوی محمد الیاس پنوھر سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مولوی سید علی شاہ لکیاری ساعدی سے پڑھا۔ سندھی کے چوتھے درجے تک پڑھنے کے بعد، سکندر نامہ تک فارسی کی تعلیم گھر میں پائی۔ خانگی طور پر انگریزی کی تعلیم نصرت کے ریلوے اسٹیشن کے ماسٹر سے حاصل کی۔ چوتھے درجے تک پڑھنے کے بعد ذوق مطالعے کو اپنا رہبر بنایا۔ ذوق کتب خوانی اور اخبارات نے ان پر علم کے دروازے کھول دیے۔ مطالعے کی وسعت نے ان کو اس بلند مرتبے پر پہنچایا کہ آج وہ تاریخ و ادب کے ممتاز محققین میں شمار ہوتے ہیں۔

شروع میں سید حسام الدین راشدی نے بھی صحافت کو اپنا پیشہ بنایا۔ ۱۹۲۶ء میں اخبار جاگن کے نامہ نگار رہے۔ ۱۹۲۹ء میں رسالہ المنار میں کچھ دن ایڈیٹری کا کام کیا۔ کچھ دن اخبار پیغام کے نامہ نگار رہے۔ کچھ دن اخبار سندھ زمیندار کے بھی ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۳۴ء میں ستارہ سندھ جاری ہوا اور اس کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۴۱ء میں الوحید جاری ہوا، اس میں بغیر نام کے متعدد مضامین لکھے۔ ۱۹۴۵ء میں قربانی جاری ہوا، اس میں بھی پیر حسام الدین راشدی کے متعدد ایڈیٹوریل نوٹ بغیر نام کے شائع ہوئے۔

صحافت ان کی تشنگی نہ بجھا سکی اور وہ صحافت سے منہ موڑ کر ذوق مطالعہ کی تسکین میں محو ہو گئے۔ ان کا محبوب ترین مشغلہ یہ ٹھہرا کہ نادر و نایاب خطی اور مطبوعہ نسخوں کو جمع کر کے ان کا مطالعہ کریں اور ایک اچھا کتب خانہ جمع کریں۔ چنانچہ ان کی دونوں آرزوئیں پوری ہوئیں۔ ان

---

(1) رسالہ مہران سوانحی نمبر، جنب گزارین جن سین، جلد ۲۔

(2) جنب گزاریم جن سین، جلد اول، ص ۱۷۹ تا ۱۸۰۔

کا ذاتی کتب خانہ پاکستان کے بہترین کتب خانوں میں سے سمجھا جاتا تھا۔ ان کے ذوقِ مطالعہ نے ان کو اس منزل پر پہنچایا کہ ان کا شمار پاکستان کے مشہور و ممتاز دانشوروں میں ہوا۔ راشدی صاحب کے عظیم الشان کتب خانے کی ہر کتاب ان کے گہرے مطالعہ کی منہ بولتی تصویر نظر آتی ہے۔

سندھ پر ان کا احسان عظیم یہ ہے کہ انہوں نے سندھ کے فارسی کے اکثر مخطوطوں کو خود ایڈٹ کیا اور اس طرح انہیں محفوظ کر دیا۔ اسی طرح سندھ کی تاریخوں کو ایڈٹ کر کے اس قفل کو سندھ کے اسکالروں کے لیے کھول دیا، جن تک رسائی ناممکن تھی۔ سندھ کے عربی مخطوطوں کو عربی کے بہترین اسکالروں سے ایڈٹ کرایا۔

ان کے حواشی کو معلومات اور تحقیق کی بلاشبہ انسائیکلوپیڈیا کہا جاسکتا ہے۔ مقالات الشعراء، تکملۂ مقالات الشعراء، تحفتہ الکرام، مظہر شاہجہانی ان کی ایڈٹ کی ہوئی وہ کتابیں ہیں جن کی مہک ہمارے ملک سے نکل کر دوسرے ممالک تک پہنچی۔ حواشی مکلی نامہ ان کی معرکہ آرا کتاب ہے جو ٹھٹھہ کی عظمت ماضی اور قدیم آثار کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔ قانع کی تحفتہ الکرام پر انہوں نے مفید حواشی لکھ کر تاریخ سندھ کی بہت سے گتھیوں کو سلجھایا ہے۔ ان کی علمی اور تاریخی خدمات کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اتنا کام کیا ہے جو ایک ادارے کے انجام دینے کا تھا۔

وفات:

پیر حسام الدین راشدی یکم اپریل ۱۹۸۲ء کی اداس صبح اپنے خالق حق سے جا ملے۔

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ:

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ اپنی تعلیمی، علمی، ادبی اور ثقافتی خدمات کی وجہ سے پورے ملک میں غیر معمولی عزت و احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ ان محققین میں ہیں جنہوں نے سندھی ادب کی بھی آبیاری کی ہے اور سندھ کے آخری دور کی تاریخ کی بعض کتابوں کو بھی ایڈٹ کیا ہے۔ انہوں نے سندھ کی ثقافت و تہذیب، معاشرت اور کلچر پر بیسیوں مضامین اور متعدد کتابیں لکھیں۔ ان کے ذہن میں بڑی وسعت ہے۔ انہوں نے سندھی لوک ادب کو متعدد جلدوں میں جمع کیا۔ سندھی لغت بھی ان کا شاہکار ہے۔ ڈاکٹر بلوچ نے تعلیم، ادب، لغت، شاعری، تاریخ، ثقافت، موسیقی اور آثار قدیمہ پر بیش بہا کتابیں اور انگریزی، فارسی اور عربی میں وقیع مقالے لکھے ہیں۔ ایک محقق، عالم، دانشور اور مبصر ہونے کی حیثیت سے یورپ اور مشرق کے تعلیمی اور ثقافتی اجلاسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی ہے۔ ان کی علمی و ادبی و تعلیمی خدمات کو بنا پر حکومت پاکستان کی طرف سے انہیں تمغۂ پاکستان سے نوازا گیا ہے۔

ڈاکٹر بلوچ بلوچوں کی ایک شاخ لغاری قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی ولادت گوٹھ جعفر خان لغاری تعلقہ سنجھورو ضلع سانگھڑ میں ہوئی۔ مدرسہ نوشہرو فیروز سے میٹرک پاس کیا۔ بہاء الدین جوناگڑھ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری بمبئی یونیورسٹی سے ۱۹۴۱ء میں لی۔ ۱۹۴۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم۔ اے پاس کیا اور ساری یونیورسٹی میں اول نمبر آئے۔ پھر تعلیم و تربیت اور اعلیٰ مطالعے کے لیے یورپ گئے اور کولمبیا یونیورسٹی (امریکا) سے ایجوکیشن میں ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ واپس آنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں وہ کچھ دن حکومت پاکستان کی وزارت داخلہ میں حکومت پاکستان کے شعبہ اطلاعات و نشریات میں افسر بکار خاص مقرر ہوئے۔ لیکن چونکہ یہ کام ان کے مزاج کے مطابق نہ تھا، اس لیے اس خدمت سے مستعفی ہو کر ۱۹۵۱ء میں وہ سندھ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ تعلیم مقرر ہو گئے۔ پھر وہ وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی مقرر کر دیے گئے۔ بعد میں اسلام آباد میں وزارت تعلیم اور وزارت ثقافت میں اعلیٰ عہدوں پر مامور رہے۔ اسلامیہ یونیورسٹی اسلام آباد کے وائس چانسلر بھی رہے۔ دم تحریر بلوچ صاحب ہجرہ کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔

میر رحیم داد خان مولائی شیدائی:

میر رحیم داد خان مولائی شیدائی مرحوم نے بھی تاریخ و تحقیق کے کام کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے سندھی زبان میں "جنت السندھ" کے نام سے سندھ کی مکمل تاریخ لکھی۔ روضتہ السندھ، تاریخ ہندوستان، تاریخ بلوچستان، سفینتہ النوح، تمدن سندھ، تاریخ سیاست سندھ وغیرہ مولائی شیدائی کی وہ کتابیں جو ان کے ذوق تاریخ و تحقیق کا پتا دیتی ہیں۔

مولائی شیدائی تمام عمر ناقدری روزگار کا شکار رہے۔ ساری عمر پریشان حالی میں گزاری۔ وہ سندھی کے شاعر بھی تھے اور شیدائی تخلص کرتے تھے۔ اکثر اردو اور سندھی کے اخبار اور رسائل ان کو علامہ لکھتے تھے لیکن اس عظیم دانشور نے اپنی ساری زندگی تنگ دستی اور افلاس میں گزاری۔ لوگ انکے مقالوں اور مضامین کو بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔

رحیم داد خان مولائی شیدائی کے والد کا نام شیر محمد خان تھا۔ اس بوڑھے مؤرخ نے سکھر کے ایک جھونپڑے میں ۱۸۹۴ء میں جنم لیا۔ مذہبی تعلیم کے بعد وہ سندھی اسکول میں داخل کیے گئے۔ سندھی چوتھی جماعت تک پڑھنے کے بعد مطالعہ کا ذوق پیدا ہوا۔ اُس زمانے میں ہری سنگھ سکھر کے کتب خانے کی بہت شہرت تھی۔ انہوں ں نے کلاسیکل اردو ادب کی سب کتابیں اسی کتب خانے سے پڑھیں۔ ذوق مطالعہ نے اگے قدم بڑھایا تو تنگی و ترشی کے باوجود کتابیں خرید کر پڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ سکھر کے اینگلو ورنیکلر سکول میں داخل ہوئے۔ ایلسن کے انقلاب فرانس کی سب جلدوں اور مارلیسن کی تاریخ غدر (جنگ آزادی) کی تمام جلدوں کا وہیں مطالعہ کیا۔ کلاسیکل ادب میں داستان امیر حمزہ مولائی شیدائی کی پسندیدہ کتاب تھی، جس کو بار بار انہوں نے پڑھا تھا۔ اسی کتاب نے ان کے رخ کو تاریخ کی طرف موڑا۔ مولائی شیدائی کا بیان ہے کہ یہی کتاب میری تاریخ نگاری کا اصل محرک بنی۔

۱۹۱۳ء میں چھ درجے تک انگریزی تعلیم پانے کے بعد انہوں نے سکول کو خیر باد کہہ دیا اور ریلوے کے محکمے میں فائرمین بھرتی ہو گئے۔ ملازمت میں ترقی کرتے کرتے سیکنڈ گارڈ اور پھر گارڈ ہو گئے۔

مولائی شیدائی نے اپنے اس قلمی نام کی وجہ یہ لکھی کہ جب وہ ریلوے گارڈ تھے تو وہ اپنا وقت ستارۂ سندھ کے دفتر میں پیر علی محمد راشدی کے دفتر میں گزارتے تھے۔ ایک دفعہ دفتر میں پیر علی محمد راشدی، پیر حسام الدین راشدی اور مولانا دین محمد وفائی موجود تھے۔ اخباروں میں مضامین لکھنے والوں کا تذکرہ چھڑا اور پیر علی محمد راشدی نے مولائی شیدائی سے کہا کہ تم سرکاری ملازم ہو، احتیاط کا تقاضا ہے کہ اپنے مضامین میں کوئی فرضی نام اختیار کرو۔ انہیں راشدی صاحب کی یہ تجویز معقول نظر آئی اور انہوں نے کہا تو پھر میرا کوئی قلمی نام تجویز بھی تو کیجیے۔ علی محمد راشدی نے ان کا تخلص اُن کی فقیرانہ طبیعت کو دیکھ کر مولائی تجویز کیا۔ پیر حسام الدین راشدی نے کہا کہ ان کا شیدائی تخلص موزوں رہے گا۔ مولانا دین محمد وفائی کے دماغ میں اتفاق سے اس وقت کوئی قلمی نام نہ آیا۔ راشدی برادران کو اپنے اپنے قلمی نام پر اصرار تھا۔ مولانا دین محمد وفائی نے تصفیہ کیا کہ کیوں نہ یہ مرکب قلمی نام مولائی شیدائی رکھ دیا جائے۔ اُسی دن سے ان کا قلمی نام مولائی شیدائی قرار پایا۔ یہ نام اس قدر مقبول ہوا کہ لوگ ان کا اصل نام رحیم داد خاں بھول گئے۔

مولائی شیدائی کی شہرت کا سنگ بنیاد مولانا دین محمد وفائی کا رسالہ توحید بنا۔ مولانا وفائی اور پیر علی محمد راشدی نے اخبار سندھ زمیندار اور رسالہ توحید میں مولائی شیدائی کا شاندار تعارف لکھ کر ان کی شہرت کو چار چاند لگائے۔

مولائی شیدائی ۱۹۳۹ء میں ریلوے کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو سندھی اخبار "آزاد" کے نائب ایڈیٹر مقرر ہوئے، چونکہ اخبار کی پالیسی کانگریس کی موافقت میں تھی، اس لیے جلد ہی مستعفی ہو گئے۔

پھر انہوں نے حیدرآباد کے کسی کارخانے میں بحیثیت سپروائیزر ملازمت کر لی۔ فرصت کے اوقات میں انگریز افسروں کو اردو بھی پڑھاتے تھے۔ لیکن یہ سب چیزیں ان کی ادبی، تاریخی اور صحافتی زندگی سے بعید تھیں۔

آخر جب مسٹر عبدالشکور نے حیدرآباد سے اخبار ہلال پاکستان جاری کیا تو ضیاء الدین بلبل نے ہلال پاکستان کی چیف ایڈیٹری کے لیے مولائی شیدائی کا نام پیش کیا۔ مولائی شیدائی نے اخبار کو دلچسپ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، لیکن سرپرستوں کی ناقدری کا شکار ہو کر انہیں استعفا دینا پڑا۔

۱۹۵۰ء میں وہ پروفیسر اے۔ بی حلیم کی وائس چانسلری کے زمانے میں سندھ یونیورسٹی کے فیلو ایک سو روپے ماہوار پر مقرر ہوئے۔ فیلوشپ کے پہلے سال میں مولائی شیدائی نے روضتہ السندھ کے نام سے ایک کتاب سندھ کے تاریخی جغرافیائی حوالوں سے تالیف کی۔ انہوں نے دوسری کتاب تاریخ ہندوستان سندھی میں ترجمہ کر کے اپنے حواشی اور فٹ نوٹس کے ساتھ سندھ یونیورسٹی کو پیش کی۔ اسی طرح انہوں نے تمدن عرب کے طرز پر تمدن سندھ کی تین جلدیں لکھیں۔ ۱۹۵۵ء میں مولائی شیدائی کا فیلوشپ کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

سفینتہ النوح بھی اُن کے زمانہ فیلوشپ کی یادگار ہے جو مخدوم محمد زماں طالب المولیٰ سجادہ نشین حضرت مخدوم غوث الحق نوح ہالائی کی تحریک پر مولائی شیدائی نے دو جلدوں میں مرتب کی تھی۔ پہلی جلد میں حضرت مخدوم نوح ہالائی کی حالات ہیں اور دوسری جلد میں اُن کے ملفوظات طیبہ ہیں۔ جب تک مولائی شیدائی یہ کتاب لکھتے رہے مخدوم طالب المولیٰ کی طرف سے انہیں ایک سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا رہا۔ پھر مخدوم محمد زماں طالب المولیٰ کی علم نوازیوں نے اُن کا تاعمر ۲۵ روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔[1]

---

[1] رسالہ مہران نمبر ۱۹۵۷ء، ص ۵۳۵ تا ۵۵۰ سے مولائی شیدائی کے حالات ماخوذ ہیں۔

مولائی شیدائی زندگی کا طویل سفر طے کر کے ۸۴ سال کی عمر میں ۱۲ فروری ۱۹۷۸ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

سندھ میں اُردو کا پہلا فقرہ:

سندھ میں اردو کی داستان عجیب و غریب ہے۔ صدیوں پہلے کی بات ہے آٹھویں صدی ہجری ۷۶۰ھ (۵۹-۱۳۵۸ء) میں سندھ میں اردو کا سب سے پہلے فقرہ بولا گیا۔ اس کی قدامت کو دیکھتے ہوئے بعض محققین کا یہ گمان ہے کہ اردو نے سب سے پہلے سندھ ہی کی سرزمین پر جنم لیا۔ تاریخ فیروز شاہی (عفیف) میں ہے کہ جب پہلی مرتبہ سلطان فیروز شاہ تغلق جام بابنیہ فرمانروائے سندھ سے شکست کھا کر گجرات گیا۔ اور ٹھٹھہ کو فتح نہ کر سکا تو اہلِ سندھ نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اس کو سندھ کے مشہور شیخ پٹھا دیبلی کی کرامت قرار دیتے ہوئے کہا کرتے تھے:

"برکت شیخ پٹھا اک موا اک نٹھا"۔

تاریخ فیروز شاہی (عفیف) کی اصل عبارت جسے ہم نے مقدمۂ یازدھم سے لیا یہ ہے:

و اول کرت کہ سلطان فیروز از ٹھٹھہ بے غرض سمگ گجرات باز گشت ٹھٹھیاں این سخن را ورد حجت ساختند و میگفتند "برکت شیخ پٹھا اک موا اک نٹھا"۔

"اک موا" سے اُن کا اشارہ محمد شاہ تغلق کی طرف تھا، جس نے ٹھٹھہ ہی میں بیمار ہو کر وفات پائی اور "اک نٹھا" سے اُن کا اشارہ فیروز شاہ تغلق کی طرف تھا، جو جام بابنیہ سے شکست کھا کر گجرات جا چکا تھا۔

سندھ میں اُردو شاعری کی ابتدا:

سندھ میں اردو شاعری کی ابتدا کب سے ہوئی؟ اس کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن اگر ماضی کے دھندلکوں میں دور تک نظر دوڑائی جائے تو اُردو شاعری کی تاریخ میں ہماری نظر ملا عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی سے آگے نہیں بڑھتی۔ ملا عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی سندھ کا وہ پہلا اُردو گو شاعر ہے جس نے فارسی شاعری کے ساتھ سندھ میں اُردو شاعری کی بھی داغ بیل ڈالی۔ سندھ کے ادبی تذکرہ نگاروں نے اس کے حالات میں بہت اختصار سے کام لیا ہے، جس سے ایک قاری کے ذہن میں اس کی کوئی مکمل تصویر نہیں اُبھرتی۔

میر علی شیر قانع نے اپنے تذکرے مقالات الشعراء میں اس کے دورِ حیات کو متعین کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

و از عہد شاہجہاں تا دور محمد شاہ
در سخن وری شار الیہ بودہ[2]

اگرچہ عطا اس زمانے کے رسم و رواج کے مطابق فارسی گو شاعر تھا، لیکن اس نے اُردو غزل کو اپنایا اور اُردو میں غزلیں اور اشعار کہے، وہ سندھ میں اُردو کا محسن اور پہلا غزل گو شاعر تھا۔

عطا ۱۶۳۰ء (۱۰۴۰ھ) میں ٹھٹھہ میں پیدا ہوا۔ اس نے تحصیل علم کے بعد شاعری کی طرف توجہ کی اور اپنی اسّی سالہ مشق سخن سے اس منزل پر پہنچا کہ سندھ کے قدیم فارسی گو شعرا میں فنی پختگی، نازک خیالی، قادر الکلامی اور زور گوئی کے اعتبار سے سندھ کی فارسی شاعری کی ادبی تاریخ میں ہمیں اس کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ میر علی شیر قانع نے اُس کے فارسی کلام پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ:

شعرش مذاق متقدمین دارد[3]

عطا نے اپنی زندگی کو کس قدر تلخ گزارا اور وہ کس قدر ناقدری روزگار کا شکار رہا، اس کی داستان طویل ہے۔

اپنی قادر الکلامی اور زود گوئی پر عطا خود یوں نغمہ سرا ہے:

نسخۂ ابیات دیوانم گزشت از سی ہزار
لیکن این در و گوہرا نیست اکنوں جوہری

صاحب مقالات الشعراء نے اس کی وسعت طبع آزمائی کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

در انشا و نعت نبوی و منقبت مرتضوی لکت بیت باختتام رسانیدہ۔[4]

عطا سندھ میں اُردو کا پہلا شاعر ہے:

ہمیں عطا کی فارسی شاعری کے متعلق کچھ نہیں کہنا، لیکن ہمیں اس نقطۂ نظر سے اُس کے اُردو کلام کو پیش کرنا ہے کہ وہ سندھ میں اُردو کا پہلا شاعر ہے۔ اسی نے سب سے پہلے سندھ میں محسوس کیا کہ جو زبان آج عالم طفلی سے گزر رہی ہے، اس میں ہمہ گیر بننے کی بڑی صلاحیت ہے۔ لہٰذا اُس نے اُردو کو بھی ذریعۂ شاعری بنایا اور اس زبان کی ابتدائی نشو و نما میں حصہ لیا۔ اُس کا نام اُردو شاعری ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ

---

(2) مقالات الشعراء، قانع ٹھٹھوی، ص ۴۴۲۔
(3) ایضاً، ص ۴۴۴۔
(4) ایضاً، ص ۴۴۲۔

جاوید رہے گا۔ تاریخی اعتبار سے بھی یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ بعض دکنی شعرا کا ہمعصر ہے۔ اس اعتبار سے عطا کی اُردو شاعری کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

عطا کے کلام میں عہد حاضر کی شاعرانہ لطافتوں اور رنگینیوں کو ڈھونڈنا ایک فعل عبث ہے، بلکہ ہمیں اس کے اُردو کلام پر اس نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیے کہ وہ ایک ایسا شاعر ہے، جس نے اس وقت اُردو میں شاعری کی جب اُردو عالم طفلی میں پرورش پا رہی تھی۔

عطا کی اُردو شاعری:

عطا ٹھٹھوی کی اُردو شاعری کے چند نمونے یہ ہیں:

عطا اس بھوک سوں ہم لوک رہتا
ز خوردن ساگ لونی سوک رہتا
مری جاں دیکھنا پھر دکھ نہ دینا
کہ محتاج تو کے مفلوک رہتا
دو کلک از دعا گویاں مقابل
مدد پایا مراد چوک رہتا
ترا پیوستہ جشن است و مرا فقر
نہ یاد از گریۂ معلوک رہتا
کہاں وہ پوچھنا، ہنسنا، کھلانا
نظر بر مور کے مملوک رہتا

چگونہ سند بستا باز سکھ سوں
عنادی گر میان جھوک رہتا

عطا خبطا کہاں خاموش رہتا
سخن گر از زبان ہر گوش رہتا
چوں مجنوں ذو فنون زار ایں جا
کہ بے پرواز خود بے ہوش رہتا
ز خود خون جگر پیتا و جیتا
بدرد و داغ ہم آغوش رہتا
مسافر را ہمیں آب و ہوا خوش
کز اشک و آہ دوشا دوش رہتا
چو گل رنگ حنا بندی بریزد
چو نیلوفر کہ نیلی پوش رہتا

غبار فقر مرا روپ رو برگن بھبوت
چہ کلک است کہ از بھوک جوگیاں ماریت
بہ سینہ سوختہ پھر دیکھنا نہ دکھ دینا
ز دل شکستہ نہ پینا لہو سچ اے میت

جو وے سدھار جاگ کیا نیند بایلی
صد بار ہارنا نہ کبھی داؤ جیتنا
ہشیار کھیلنا، دکھ اپنا نہ سوجھنا
سب چھوڑنا نہ مال پرایا سمیتنا

وہ اپنے وطن اور اہل وطن کی شرفا گردیوں کو دیکھ کر اپنے درد کو شعر کے سانچے میں ڈھالتے ہوئے کہتا ہے:

اے مسلماناں وطن بیداد ہے
جور ہے، بیداد ہے، فریاد ہے
آشنا بیگانہ، یار اغیار گشت
خود حقوقِ ما ہمہ برباد ہے
جز سکوت و شکر جائے شکوہ نیست
کار بے اصلاح پر افساد ہے[1]

سندھ میں مغل گورنروں کے عہد میں اردو شاعری کا فروغ:

اکبر نے سندھ ۱۵۹۲ء (۱۰۰۰ھ) میں فتح کیا اور اسی وقت سے سندھ میں مغل گورنروں کی آمد شروع ہوئی۔ ملا عبدالحکیم عطا ٹھٹوی بھی عہد شاہجہانی کا شاعر ہے جس کی قدردانی میں نواب ظفر خاں احسن جو ۱۶۵۲ء میں ٹھٹھہ کا گورنر ہو کر آیا، کو بڑا دخل ہے۔ صرف اسی زمانے میں عطا نے اپنی قدر افزائیوں کا زمانہ دیکھا۔ لیکن اس کی مسرتوں کا یہ دور لحۂ پرفشاں کی طرح دو سال میں ختم ہو گیا، کیونکہ ۱۶۵۴ء میں ظفر خاں کا تبادلہ ہو گیا اور شہزادہ دارالشکوہ ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر ہو کر آیا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سندھ میں مغل گورنروں، جن میں اکثر خود شاعر تھے اور ان کے مصاحبین شعراء کی آمد و رفت نے اردو شاعری کو سندھ سے روشناس کرایا۔ کتنے ہی اردو

---

[1] اردو کے یہ تمام اشعار "دیوان عطا" شائع کردہ سندھی ادبی بورڈ سے ماخوذ ہیں۔

شاعر اور ادیب مغل گورنروں کے ساتھ سندھ پہنچے۔ ان کی ملاقاتیں اور رسم و راہ سندھی شعراء اور ادیبوں سے ہوئی۔ ان ملاقاتوں اور رسم و راہ نے سندھی شعراء اور ادیبوں میں اس کا ذوق پیدا کیا کہ وہ اس نئی زبان میں بھی شعر کہیں اور اردو ادب کو بھی اپنائیں۔

سندھ میں جب ولی گجراتی کا دیوان پہنچا تو یہ سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ثابت ہوا۔

آپس کے میل ملاپ نے سندھی شعرا میں اردو میں شاعری کا رجحان پیدا کیا۔ ہمیں سندھی کے بعض شعرا ایسے بھی ملتے ہیں۔ جنہوں نے تفنن طبع کے طور پر فارسی اور سندھی شاعری کے ساتھ اردو میں بھی طبع آزمائی کی۔

شیخ ورد، عبدالسبحان فائز ٹھٹھوی، مخدوم محمد معین بیراگی، میر حیدرالدین ابوتراب کامل یہ سب سندھی شعرا اردو کے بھی شاعر ہیں۔

میر حیدرالدین ابوتراب کامل سندھ کے ان اردو نواز شعرا میں سے ہیں جن کی اردو شاعری نے عالمگیر شہرت حاصل کی اور سندھ کے ایوان شاعری میں میر حیدرالدین کامل پہلے شخص ہیں جنہوں نے سندھ میں اردو شاعری کو بڑی وسعت دی۔ اگرچہ وہ اردو، سندھی، فارسی مختلف زبانوں میں شعر کہتے تھے، لیکن جذبات، خیالات اور احساسات کی ترجمانی ہمیں جو ان کی اردو شاعری میں ملتی ہے وہ کسی اور زبان میں نہیں ملتی۔ ان کی اردو منظومات میں منظر نگاری، تشبیہ اور محاکات کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ ہم ان کے چند شعر تبرکاً یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ اندازہ ہوسکے کہ سندھی شعرا نے بھی اردو شعر و ادب کے فروغ میں کتنا اہم کردار ادا کیا ہے فرماتے ہیں:

لبوں دلبر کے میرے قتل پر بیڑا اٹھایا ہے
خدایا خون سوں میرے تو اس کو سرخ رو کرنا

خالِ رخسار پر اچنبا ہے
کال کے کھیت میں اگا ہے تل

دوست بخشے گا دوست سب کے سب
گرچہ عاصی ہوں اس کا آسی ہوں

زلفاں کے اگر ساتھ اُڑاؤ تو اُڑوں گا
سو بار اگر مار لڑاؤ تو لڑوں گا

وعدہ ہوئے دریغ جو اس لب سوں ہم سنے
یہ اہل قیمتی دکھو جھوٹا نکل گیا

منقبت میں بھی کامل کا جواب نہیں، فرماتے ہیں:

یا علی عمرھا ست حیرانم
در بدر ہوں بہت پریشانم
دے مجھے ساز بخش سامانم
رحم کن رحم از غلامانم
یا علی میں غلام تیرا ہوں

توں کرم پیشہ ہے کریم ہے توں
مخلصاں اپنے پر رحیم ہے توں
روزی و رزق کا قسیم ہے توں
حق کی نعمت ہے توں نعیم ہے توں
یا علی میں غلام تیرا ہوں

کامل نے ۱۷۴۹ء (۱۱۶۳ھ) میں وفات پائی۔[1]

کامل کی اردو شاعری اس بات کی غماز ہے کہ سندھی شعرا بھی اردو میں شعر کہتے تھے اور کوئی لسانی تعصب سندھی ادیبوں اور شاعروں اور ہندی ادیبوں اور شاعروں کے درمیان نہ تھا۔

ٹالپور عہد حکومت کے بعد اُردو کے شاعر:

ٹالپور خاندان کے تمام فرمانروا سندھی نژاد تھے، لیکن سب کے سب علوم و فنون کے قدر دان تھے۔ خود بھی عالم و شاعر تھے۔ ان کا عہد شعر و ادب کے لیے نہایت خوشگوار تھا۔ ٹالپوروں کے دور میں جہاں سندھی اور فارسی کے شعر و ادب کو ترقی ہوئی وہیں اردو شاعری کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی۔

یہاں تک کہ ٹالپور فرمانرواؤں میں میر کرم علی خاں، میر مراد علی خاں، میر صوبدار خاں اور میر محمد نصیر خاں جعفری یہ سب کے سب فرمانروا وہ ہیں جنہوں نے اپنی شاعری سے اردو کے گلستان شاعری کو باغ و بہار بنایا۔

---

[1] یہ تمام اشعار تذکرہ امیر خانی، مرتبہ پیر حسام الدین راشدی، ص ۲۳۳ تا ۲۵۲ سے لیے گئے ہیں۔

جعفری ۱۸۰۴ء میں قلعہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۴۳ء میں ٹالپوروں کی حکومت کا آفتاب غروب ہوا اور انگریزوں نے قبضہ جمایا اور شاہی خاندان کے افراد کے ساتھ یہ بھی قید فرنگ میں ڈالے گئے۔ پہلے بمبئی میں اور پھر پونا اور ساسور میں انہیں قید رکھا گیا۔ آخر میں قیدی بنا کر کلکتے لائے گئے۔ اور اسی قید خانے میں وہ ۱۶ اپریل ۱۸۴۵ء کو قید فرنگ اور قید حیات دونوں سے آزاد ہو گئے۔

علماء اور شعرا اُن کے دربار کی زینت تھے۔ انہوں نے دیوان فارسی، فارسی کی دو مثنویاں، سفر نامہ جعفری اور ایک اردو دیوان اپنی یادگار چھوڑا۔ اردو کا یہ دیوان انہوں نے ساسور اور کلکتے کی قید کے زمانے میں مرتب کیا تھا۔ جعفری کے اردو کے چند اشعار ہم یہاں نقل کرتے ہیں جس سے ٹالپوروں کے زوال کے بعد اور انگریزی عہد کے آغاز میں سندھ میں اردو شاعری کے ابتدائی ارتقاء کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

مرا سینہ تو ہے گنج سعادت عشق جاناں کا
یہ سر ہے بہر سجدہ، شکر کرتا ہوں میں سبحاں کا

پڑا ہوں بستر غم پر نہیں گر پوچھنے والا
ترا دیدار چارہ ہے دلِ بیمار ہجراں کا

کروں تعریف قد کی، یا کروں زلفِ پریشاں کی
زباں سے کچھ بیاں ہوتا نہیں اس شاہِ خوباں کا

ہوئی ہے شرمگیں آنکھوں سے تیری چشم آہو بھی
خجل ہوتا ہے تیرے رخ سے رخِ خورشید تاباں کا

دعائے جعفری کی صبح کو گر ہے تو بس یہ ہے
کہ روضہ دیکھ لوں میں یا خدا شاہِ خراساں کا

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ سندھ کی سرکاری زبان فارسی تھی، لیکن ساتھ ساتھ اُردو کا بھی چرچا تھا۔ اردو وہ زبان تھی جو سندھ کو برِعظیم کے دوسرے علاقوں سے ملانے کا کام دیتی تھی۔[1]

اردو ادب کے محقق اور نقاد جمیل جالبی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں بھی بیان کیا ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام ہیئت کے اعتبار سے بھی اردو شاعری کی قدیم ترین روایت سے وابستہ ہے اور اُن کے کلام میں سینکڑوں الفاظ سندھی اور اردو کا مشترک سرمایہ ہیں۔ مثلاً جگت، رات، تیل فلیل، طعنہ، سہاگ، ٹولہ، پلنگ، مستورات، میت (مسجد)، مہار، قطار۔

جالبی صاحب نے ایک طویل فہرست ان اردو الفاظ کی دی ہے جو ہمیں شاہ کے کلام میں ملتے ہیں۔[2]

پھر ان کی جستجو اور تحقیق نے انہیں اس منزل پر پہنچایا کہ شاہ کے کلام کا وہ نسخہ جو ۱۸۶۷ء میں بمبئی سے چھپا تھا اور قاضی ابراہیم نے بمبئی سے اُسے شائع کیا تھا وہ کہیں سے اُن کے ہاتھ لگا، شاہ کی شاعری کے متعلق انہوں نے لکھا کہ شاہ کا کلام مختلف لسانی اثرات کو گھلانے ملانے کا ایک تخلیقی عمل ہے۔ لسانی سطح پر اس آنکھ مچولی کی یہ چند مثالیں دیکھیے۔[3]

کہن آنکھاں آنکھاں کوئی نہ بتاوے بات
ہی واتا نوں لوگوں نے اپنی صاحب دی

—

داغ سینے پہ غم کا ہے ماتم کا یا علی
جنڈلے آیا، خبر لے آیا سوز کرو شاہ قاسم کا

جالبی صاحب نے شاہ کے کئی شعر اس نوعیت کے اس رسالے میں سے دیے ہیں۔

سرزمین سندھ سے ایک اور شاعر اٹھا، جس نے اردو کے گلستان شاعری میں وہ پھول کھلائے کہ اردو شاعری کا چمن مہک اٹھا۔ یہ میر محمود صابر تھا۔ اس کا دیوان شوق افزاء کے نام سے اس کی یادگار ہے۔ یہ استر آباد کا رہنے والا تھا۔ دہلی میں پیدا ہوا۔ آب و دانہ ٹھٹھہ لے کر آیا۔ ٹھٹھہ میں ہی سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) میں پیدا ہوا۔ قانع کا بیان ہے کہ ایک لاکھ اشعار اس نے کہے تھے۔

جالبی صاحب نے لکھا کہ وہ ولی گجراتی سے بے حد متاثر تھا۔ وہ خود کہتا ہے:

میں ریختہ ولی کا، دل خوش ہوا ہے صابر
حقا ز فکر روشن، ہے انوری کے مانند[3]

---

[1] تاریخ ادب اردو جلد اول، ص ۶۸۱۔

[2] ایضاً۔ ص ۶۸۳۔

[3] ایضاً۔ ص ۶۸۳-۶۸۴۔

[3] تاریخ ادب اردو جلد اول، صفحہ ۶۸۷ بحوالہ مخطوطہ شوق افزاء، از کتب خانہ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ۔

گر ریختہ ولی کا لب ریز ہے شکر سوں
مضمون شعر صابر قند و شکر تری ہے

صابر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے جالبی صاحب نے لکھا کہ صابر کی شاعری انداز بیان کے رچاؤ، زبان کی صفائی اور مضمون آفرینی کے اعتبار سے دلچسپ ہے۔ آخر میں انہوں نے لکھا کہ صابر کا کلام تبرک کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ وہ سندھ میں ولی کے معیار سخن کی شمع جلاتا نظر آتا ہے۔

جالبی صاحب نے سندھ میں اردو شاعری کے فروغ کے سلسلے میں کامل کے بھتیجے میر حفیظ الدین کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

مقالات الشعرا میں ہے کہ میر حفیظ الدین علی ۱۱۹۰ھ (۱۷۷۶ء) میر حیدر الدین ابو تراب کامل کے بھتیجے تھے، طبع عالی رکھتے تھے اور صاحب کمال تھے۔ باوجود کم سوادی، کم نظری اور گراں گوشی کے زبان ہندی میں شعر کہتے تھے اور وہ اپنے دور کے خسرو ثانی تھے۔

قانع نے لکھا ہے کہ وہ دوھے، کبت اور نکات ہندی کو نظم کرتے تھے۔ ان کا اکثر کلام ہندی میں ہے۔

ڈاکٹر جالبی صاحب نے خسرو ثانی کے لقب کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اُن کے اشعار معنی کے اعتبار سے پہیلی اور کہہ مکرنی کے دائرے میں آتے ہیں اور یہی چیز امیر خسرو اور میر حفیظ الدین علی میں مشترک ہے، ورنہ شیرینی و لطافت میں میر حفیظ الدین علی کو امیر خسرو سے کوئی نسبت نہیں۔[1]

جالبی صاحب نے اردو شاعری کے ارتقا میں میاں محمد سرفراز عباسی ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) اور روحل کا بھی تذکرہ کیا ہے اور ان کی اردو شاعری کی بڑی خوب صورت مثالیں دی ہیں۔ اردو شاعری کے خد و خال کو آراستہ کرنے میں ہفت زبان شاعر سچل سرمست کو بھی بڑا دخل ہے۔ وہ شاہ کے بعد سندھی زبان کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ عہد حاضر کے محقق جالبی صاحب نے ان پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

سچل کے سندھی کلام میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو کسی زبان کے بلند پایہ شاعر میں ہونی چاہئیں اُن کے کلام کا بڑا حصہ ہمہ اوست کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری سے اردو کے دامن کو بھی مالامال کیا ہے۔ سچل کی شاعری خواہ سرائیکی ہو یا سندھی، فارسی ہو یا اردو، انہوں نے ان تمام زبانوں کی شاعری میں تصوف کے پس منظر میں اپنی نگاہ کی بلندی، اپنے دل کی تڑپ اور اپنے کیف کی حالت کو اپنے تمام اشعار میں سمویا ہے۔ اس حق کے عاشق نے اپنی شاعری سے صوبہ سندھ میں ایک ایسی ہم آہنگ معاشرت کی بنیاد رکھی، جس نے اس صوبے میں تبلیغ اسلام میں بڑی مدد دی۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سے پیغام دیا ہے کہ انسانی حقوق میں سب برابر ہیں۔ امیر و غریب کا طبقاتی فرق ذہن انسانی کی پیداوار ہے، ورنہ ظاہر و باطن اسی ایک حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ اس حقیقت کو انہوں نے سندھی اشعار میں سمو کر بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر جالبی نے اُن کے اردو شاعری کے شاہکار اشعار اپنی بیش بہا تصنیف تاریخ ادب اردو میں نقل کیے ہیں۔ سچل کے یہ چند اردو اشعار ہم ان کی کتاب سے یہاں نقل کرتے ہیں:

مری آنکھوں نے اے دلبر عجب اسرار دیکھا تھا
میان ابر اس خورشید کا انوار دیکھا تھا
مرا تو کام تھا اُس ہادی و رہبر کی صورت سے
اُسی صورت کا میں نے ہر جگہ دیدار دیکھا تھا

آخر یہ مطلب پالیا، مرشد نے یہ ہم سے کہا
بن عشق دلبر کے سچل کیا کفر کیا اسلام ہے
عاشق جلا دے آگ میں ساری کتابوں کے ورق
اک نام میرا یاد کر، یہ دوست کا پیغام ہے

تیرے فراق سے میں دیوانہ بن چکا ہوں
مجھ کو ہوئی ہے حاصل الفت میں جگ ہنسائی
آؤ سنو اے یارو! ہے عشق انتظاری
آرام ہے نہ پل پھر ہر دم ہے بیقراری

برپا ہے سب مشکل بازی کون رے ہاتھ لگائے گا
جس نے ہاتھ لگایا اُس کو سارا ہوش گنوائے گا

دلبر کے در پہ میں تو دیوانہ ہو رہا ہوں
یارو! میں دو جہاں سے بیگانہ ہو رہا ہوں[2]

---

(1) تاریخ ادب اردو جلد اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۶۹۰-۶۹۱۔

(2) سچل کے اردو کے یہ تمام اشعار ڈاکٹر جمیل جالبی کی تالیف تاریخ ادب اُردو جلد اول، ص ۶۹۲ تا ۶۹۴ سے ماخوذ ہیں۔

ڈاکٹر جالبی نے اپنے اس باب کو علامہ آئی آئی قاضی مرحوم کے حوالے سے اُن کی اس رائے پر ختم کیا ہے کہ:

> اردو بین الاقوامیت، بین الاقوامی قومیت کی علامت ہے۔ یہ زبان دنیا کی تین عظیم تہذیبوں ہند آریائی (انڈو جرمانک) سامی اور منگول تہذیبوں کا سنگم ہے۔ یہ زبان سارے ایشیا کی لنگوافرینکا بننے کے لیے موزوں ہے۔[2]

مختصر یہ ہے کہ عہد شاہجہانی میں اُردو شاعری کا جو پودا عطا ٹھٹھوی نے ۱۶۳۰ء میں لگایا تھا، وہ مغل کے دور میں ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ عہد انگریزی سے سندھی شعرا نے اردو شاعری کو سندھی اور فارسی کے بعد غیر معمولی ترقی دی۔ یہاں تک کہ غزل کو سندھی شاعری کی صنف میں شامل کر لیا۔

غزل خالص ایرانی اور اُردو صنف سخن ہے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی جب ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا تو مہاجر اور سندھی شعرا اور ادیبوں نے مل کر اردو ادب اور شاعری کو بھی فروغ دیا۔ شاہ جو رسالو کا منظوم اردو ترجمہ سندھی زبان کے مشہور شاعر و ادیب شیخ ایاز نے کیا اور اس محبت کے پیام کو اردو دان طبقے تک پہنچایا۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا اور سندھ پاکستان کا ایک صوبہ بنا تو اردو کے اس کارواں میں اور بھی لکھنے والے ہندوستان سے آکر شامل ہو گئے۔ اُردو ملک کی قومی زبان بن گئی اور لاکھوں آدمی جن کی مادری زبان اُردو تھی یہاں آکر بس گئے۔ اُردو لکھنے والے حضرات پہلے سے یہاں موجود تھے اُن سے رسم و راہ بڑھی اور اُردو تیزی سے پھیلنے لگی۔ باہر سے آنے والوں میں علماء، اُدباء، شعراء، صحافی سب ہی قسم کے لوگ شریک تھے۔ انہوں نے اردو کی ترویج و ترقی میں کیا کردار ادا کیا اور خود ان کی زبان پر سندھ نے کیا اثرات ڈالے؟ یہ تمام موضوعات ایک الگ مضمون کیا بلکہ مکمل کتاب چاہتے ہیں۔

ہماری یہ کتاب ۱۹۴۷ء تک کے تاریخی، معاشرتی، ادبی اور علمی حالات کے مطالعے تک محدود ہے۔ اس کے بعد سندھ کی تاریخ، پاکستان کی تاریخ کا حصہ ہے۔ اور اردو زبان و ادب کا حال اس کا ایک جزو ہے۔

انیسویں بیسویں صدی عیسوی میں سندھ کا معاشرہ اور تمدن

اُنیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں سندھ کے معاشرے اور تمدن کی خصوصیات کا جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ یہاں کے تہذیبی حالات پر نظر ڈالی جائے۔

سندھ اس برصغیر میں اسلامی تہذیب و تمدن کا بڑا مرکز رہا ہے۔ برصغیر میں سندھ ہی وہ ملک ہے، جہاں سب سے پہلے اسلام کا آفتاب طلوع ہوا۔ سندھ ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کو باب الاسلام کہا جاتا ہے۔ حجاز سے جو اسلامی علم و عمل کی موجیں اٹھیں، وہ دریائے سندھ سے ٹکرائیں اور اس برصغیر کو اسلام کے نور سے منور کر دیا۔ سندھ میں حجاز سے اسلامی علوم اور روحانی قافلوں کی آمد و رفت شروع ہوئی اور سندھ کو اسلامی علوم و فنون کا مرکز بنا دیا۔ مولانا اسلامی نے اسی خاک پاک سے جنم لیا، موسیٰ بن یعقوب ثقفی کی پوری زندگی سندھ میں گزری، ہارون بن عبداللہ ملتانی، ابو معشر سندھی، ابو نصر سندھی، ابو العطا سندھی، کشاجم سندھی یہ سب سندھ کے گوہر تابندہ ہیں جنہوں نے اسلامی علوم و فنون سے آراستہ ہو کر اسلام کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔

عربوں کی سادہ زندگی نے سندھ کے تمدن و معاشرت پر بڑا اثر ڈالا۔ سادہ زندگی اور سادہ تمدن اسلام کے وہ تحائف ہیں جو عربوں کے آنے کے بعد سندھ میں عام ہوئے۔ علوم اسلامیہ کی دولت سندھ میں عام ہوئی۔ احادیث نبوی کا چرچا خوب پھیلا۔ سندھ میں بڑے بڑے مفسرین اور محدثین پیدا ہوئے۔ رفتہ رفتہ سندھ میں ایسے مردان حق آگاہ پیدا ہوئے کہ ان کی موجودگی نے سندھ کو مرکز توجہ بنا دیا۔ علم و عرفان نے اسلامی سیرت کی تشکیل کی نئی راہیں اختیار کیں۔ جس زمانے میں تصوف کی داغ بیل عرب میں پڑی، اسی زمانے میں سندھ میں بھی اس کی نشو و نما ہوئی۔ بہت سے اکابر صوفیا اور جلیل القدر بزرگ ان ہی ابتدائی صدیوں میں سندھ میں پیدا ہوئے جن کی کشش و جذب نے دوسرے ممالک کے صوفیائے کرام کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ شیخ ترابی، شیخ عثمان مروندی، شیخ نوح بکھری اسی خاک پاک میں پیوست ہوئے۔ شیخ صدر الدین محمد احمد سیوستانی اسی سرزمین سے اٹھے۔ ان بزرگوں کی وجہ سے سندھ کا چپہ چپہ تصوف، عرفان اور رشد کا گہوارہ بن گیا۔ سندھ کے مختلف شہر الور، دیبل، سیوستان، منصورہ، ٹھٹھہ، بکھر وغیرہ عرفان و تصوف، اصلاح اخلاق اور تزکیۂ نفس کا سرچشمہ بنے رہے اور سندھ میں سماجی انقلاب لانے کا باعث بنے۔ ان ہی شہروں کی خانقاہیں تھیں جن کے نظام اصلاح و تربیت نے نہ صرف اخلاقی قدروں کو بلند کیا بلکہ ایمان و عمل کی قوتوں کو اجاگر کر کے خدا شناسی کی فضا پیدا کی اور معصیت کے تمام سوتوں کو خشک کر دیا۔

۱۸۴۳ء زوال عہد ٹالپور تک ہمیں کچھ نہ کچھ اس فضا کے نشانات ملتے ہیں۔ ۱۸۴۳ء میں سندھ انگریزوں کے اقتدار میں آیا اور انہوں نے سندھ کے تمدن و معاشرت کی بنیاد الٹ دی۔

---

[2] تاریخ ادب اردو، جلد اول، جالبی، ص ۶۹۵۔

برطانوی عہد سے پہلے ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات انتہائی شگفتہ نظر آتے ہیں۔ ان کی زندگی کے ہر شعبے میں خلوص و محبت، اتحاد و یگانگت اور مذہبی رواداری تھی۔ لیکن انگریزوں کے عہد میں یہ رواداریاں ختم ہوئیں اور برصغیر کے ہر خطے پر جہاں بھی انگریز نے اقتدار حاصل کیا پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو پر عمل کیا۔ اس نے کوشش کی کہ مذہب کی روح ختم کرنے کے لیے اہل ہند کو فرنگی نظام تعلیم سے ذہنی مفلس بنایا جائے تاکہ وہ غلامی اور محکومی کے خوگر ہو سکیں۔ پھر اس نے ہر جگہ علماء سوء اور صوفیائے خام کا لشکر پیدا کیا۔ خود مسلمانوں کو وہابی، سنی اور شیعہ کہہ کر آپس میں لڑوایا۔ انگریزوں کے اشارے سے مناظروں اور مباحثوں کی بنیاد پڑی۔ انگریزوں کی ان تمام اداؤں سے سندھ کے مسلمانوں کو نقصان عظیم پہنچا۔

میکالے کا نظام تعلیم انگریزوں کی غلامی کی ایک مشین تھا جو رزق کا وسیلہ تو بنا ہوا تھا۔ لیکن انگریزی تہذیب و تمدن اور افکار و خیالات کی نشر و اشاعت کا بڑا ذریعہ بھی تھا۔ اس نظام تعلیم سے مسلمانان سندھ اس بنا پر استفادہ نہیں کر سکتے تھے کہ مغربی تعلیم کے لیے فیس بہت گراں تھی اور صوبۂ سندھ کے غریب مسلمان اقتصادی اور معیشت کے اعتبار سے نہایت پس ماندہ ہو چکے تھے۔

انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں بے علمی نے سندھ کے مسلمانوں پر جہالت کے دروازے کھولے۔ جہالت اپنے جلو میں غیر اسلامی فکر و کردار کو لے کر آئی۔ اسلامی تصوف کے چشمے گدلے ہوئے۔ اوہام پرستی اور جہالت کا زور عام ہوا۔ پیر حسام الدین راشدی نے اپنی کتاب "ھو ڏوٺي هو ڏينهن" میں جس میں انہوں نے لاڑکانہ اور سکھر میں اپنی زندگی کی سرگذشت اور وہاں کی معاشرتی، تمدنی، تہذیبی جھلکیاں دی ہیں، کہیں کہیں انہوں نے عہد انگریز میں سندھ کے اس دور کے حالات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے عہد انگریز میں سندھ کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ:

سندھ میں وہابیت درحقیقت ردِ عمل تھا پیروں (صوفیائے خام)، سیدوں، سجادوں کی بداعمالیوں، سیہ کاریوں کا جنہوں نے سندھ کے مسلمانوں کو دین سے دور کر دیا تھا۔ سندھ کے عوام جاہل، تعلیم سے بے خبر، صحیح رہنما سے محروم، اور نہ اچھے برے کی تمیز کی فکر۔۔۔۔ ان توہمات نے اُن میں ضعف ایمان کی کمزوری اور توہمات کو عام کیا تھا۔ مہینے میں پہلا پیر یا مہینے کا پہلا جمعہ یا ہفتے کا دن پیر کے نام سے خاص ہوتا تھا۔۔۔۔ ان سب غیر شرعی باتوں کا سندھ میں رواج تھا جو تنزل کے دور کا خاصہ ہیں۔ اُس وقت سندھ میں کوئی ایسا شہر باقی نہ تھا، جس کے متعلق سننے میں نہ آیا ہو کہ وہاں سوا لاکھ پیر مدفون ہیں۔ ان اجتماعی مرکزی شہروں کے علاوہ سندھ کے دیہاتوں میں علیحدہ علیحدہ مزار تھے۔۔۔۔ جن میں لوگ بڑی عقیدت سے جاتے تھے۔ سندھ کی توہم پرستی اور قبر پرستی کا یہ عالم تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سرزمین پر نہ خدا کا ذکر ہے اور نہ رسول کا بلکہ سارے اختیارات نعوذ باللہ پیروں کے اختیار میں آگئے ہیں۔ ایمان کی کمزوری، غلط عقاید اور اسلام سے سراسر انحراف، اہل سندھ ان تمام برائیوں میں مبتلا تھے، وہ بجائے اس کے کہ اپنی معیشت کو اپنی کمائی سے مستحکم کرتے، وہ رسمی پیروں اور دھوکے باز مرشدوں کے چکر میں پڑ کر ہمیشہ مفلس و قلاش رہتے اور رسمی پیر ان کی غلط عقیدت کی چراگاہ سے فائدہ اٹھا کر سرسبز و شاداب رہتے تھے۔ تعلیم کا مقصد صرف اُن کے نزدیک نوکری تھا، لیکن انسانیت کو اس علم سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے اور علم کے حصول کا اصل مقصد کیا ہے، وہ اس سے بے بہرہ تھے۔

غرضیکہ سندھ میں مصنوعی پیروں کی خانقاہیں شباب پر تھیں۔

اس فکری زبوں حالی کے دور میں جب کہ سندھ کے مسلمانوں کو انگریزوں کی حکومت نے زوال کی انتہا پر پہنچا دیا تھا۔ جب کہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اگر زمانہ کچھ دن اور اس حالت پر رہتا تو وہ حالت قریب تھی کہ مسلمانان سندھ نہ اسلام کو جانتے نہ کفر کو۔ مسلمانوں کا سیاسی زوال ہو چکا تھا، لیکن ذہنی شعور ابھی مردہ نہ ہوا تھا۔ کچھ بیدار مغز انسان تجدید و احیائے دین کے نئے راستے تلاش کر رہے تھے۔

انگریزوں کے عہد میں جس نے سب سے پہلے فکر صحیح کی شمع روشن کی، وہ مولانا دین محمد وفائی تھے۔ خدا ان پر اپنی ہزاروں رحمتیں نازل کرے۔

مولانا وفائی نے "توحید" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اس رسالے کے ذریعہ سے انہوں نے علماء سوء اور صوفیائے خام کے متعلق بہت کچھ لکھا اور صحیح اسلامی عقاید کی نشر و اشاعت کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے رسالے میں غلط اعتقادات کی نشاندہی کی۔ مولانا وفائی کے مضامین نے عوام و خواص پر گہرا اثر چھوڑا۔ ان کی ہمنوائی میں اور کچھ مردان حق آگاہ آگے بڑھے، مولانا عبدالکریم چشتی اور مولانا محمد ہاشم واعظ الاسلام نے بھی اپنی زندگی کا اعلیٰ مقصد اصلاح اور احیائے دین کو قرار دیا۔ مولانا وفائی نے دین کی اساس کو مضبوط کرنے کے لیے صحیح بخاری کا سندھی زبان میں نہایت عمدہ اور سلیس ترجمہ کیا۔ "توحید" کے علاوہ اخبار "الوحید" کو بھی انہوں نے دین کی خدمت کا ذریعہ بنایا، چونکہ اخبار "الوحید" ایک سیاسی اخبار تھا اس لیے اس میں کچھ مصلحت بینی سے بھی کام لینا پڑتا تھا، لیکن رسالہ "توحید" میں، نہ کوئی سیاسی مصلحت تھی اور نہ کوئی غیر سیاسی مصلحت، بلکہ اس کا مقصد توحید دین کی خدمت کرنا تھا۔ اس کی متواتر اور یکساں پالیسی نے سندھ کے مسلمانوں کے صحیح شعور کو بیدار کیا۔

اخبار "توحید" میں مولانا وفائی نے اسلامی تاریخ اور اسلامی مشاہیر اور بزرگوں کی سوانح پر بہت سے مضامین لکھے، جس نے سندھ کے مسلمانوں کے خیالات کی کایا پلٹ دی۔

مولانا وفائی کو سندھ کا مولانا شبلی کہا جائے تو بالکل بجا ہوگا۔ وہ یقیناً سندھ کے دور جدید کے بہت بڑے عالم تھے، جنہوں نے اسلامی عقائد کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ پہلے عربی دان ادیب عالم تھے جنہوں نے سندھ کے متعلق عربی زبان کی تاریخوں اور ادبی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا ہمارے قدیم سندھی عالموں سے جنہوں نے عربی دنیا میں علمی کارنامے چھوڑے ہیں وہ اُن سے خوب واقف تھے اور مولانا نے پہلی مرتبہ ان کا تعارف رسالہ "توحید" کے ذریعہ سے کرایا۔ مثلاً میاں میر سندھی، مولانا محمد حیات سندھی، مخدوم عبداللہ ورحمتہ اللہ سندھی، ابو الحسن صغیر، ابو الحسن کبیر سندھی، ابو عطاء سندھی، ابو رجا سندھی وغیرہ یہ سب بزرگ مولانا وفائی کی دریافت ہیں۔۔۔

مختصر یہ کہ مولانا وفائی نے اپنی تمام صلاحیتیں علمائے سوء اور صوفیائے خام کے خلاف صرف کیں۔ "توحید" ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔[1] یہاں تک کہ انگریز دشمنی کی پاداش میں سترہ سال کی جلاوطنی کے بعد مولانا عبید اللہ سندھی سندھ پہنچے، ان کے دوسرے ساتھیوں میں مولوی عبید اللہ لغاری تھے، اُس وقت مسلم لیگ اپنے نئے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد کئی صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہو چکی تھیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے کراچی بندر پر اترتے ہی کانگریس کی حمایت کا اعلان کیا، کیونکہ بیس سال پہلے انہوں نے جو آزادی کی تحریک شروع کی تھی، اُس وقت سب کانگریسی تھے۔ اُن کے ذہن میں کانگریس کی بڑی وقعت تھی، اسی لیے مولانا سندھی نے کانگریس کی حمایت کا اعلان ضروری سمجھا کیونکہ مولانا سندھی کے ذہن میں قومی بنیادوں پر آزادی ہندوستان کا سترہ سال قبل کا نقشہ تھا۔ اس کے علاوہ مولانا سندھی کے رفیق اور دوست مولانا حسین احمد مدنی، مولانا کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، ڈاکٹر کچلو، رفیع احمد قدوائی وغیرہ سب ہی کانگریس کے علمبردار تھے۔

مولانا سندھی نے پورے ہندوستان کا گشت کیا۔ اپنے پرانے ساتھیوں اور رفیقوں سے ملے اور ہر جگہ سیاسی تقریریں کیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے سندھ کے دینی علماء کی تنظیم کی جو فالج زدہ عضو کی طرح بیکار اور معطل ہو کر رہ گئے تھے۔ علمائے سندھ کو آمادہ کیا کہ وہ سندھ کی سیاست میں حصہ لے کر دنیا سے روشناس ہوں اور گوشہ نشینی کی زندگی کو ترک کریں۔

ساتھ ہی مولانا سندھی نے علماء کے ساتھ پیروں، مرشدوں اور سجادہ نشینوں پر زور دیا کہ وہ غیر شرعی حرکات اور عفونت آمیز عالم سے اپنے آپ کو نکال کر شائستہ دنیا کے باشندے بنیں۔

مولانا سندھی نے انگریزی عہد کے نظام تعلیم کی خرابیوں کو سمجھ کر ایک ایسے نظام تعلیم کی ضرورت محسوس کی جس کے ذریعہ سے ایسے طلباء کو تیار کیا جائے جو آگے چل کر ملک وملت کے لیے بہتر ثابت ہو سکیں۔

چنانچہ گوٹ پیر جھنڈا میں اس نوعیت کی درسگاہ بھی قائم کی۔ اس مرکز کے چلانے کے لیے چند ہزار روپیوں کی ضرورت تھی۔ اس روپے کو اکٹھا کرنے کے لیے مولانا سندھی ہر اس شخص سے ذکر کرتے تھے جو مولانا سندھی سے ملنے کے لیے آتا تھا۔ سید حسام الدین راشدی کا بیان ہے کہ مولانا کی آخری زیارت مجھے اس وقت نصیب ہوئی جب میں پیر الٰہی بخش کے ساتھ کھڈہ کے مدرسے کے بالاخانے میں ان کی مزاج پرسی کے لیے گیا تھا۔ مولانا سندھی اسہال کے مرض میں مبتلا تھے اور نہایت کمزور ہو چکے تھے۔ اس ملاقات کے موقع پر مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ اگر تم اس تحریک میں شامل ہو جاؤ تو ہماری سب مشکلات آسان ہو جائیں۔ معلوم ہوا کہ مولانا کو اس وقت صرف سات ہزار روپے کی ضرورت ہے اور کوئی ایسا نہیں جو مولانا کو سات ہزار روپے دے دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سندھ کے قحط الرجال میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں تھا کہ جو مولانا کی اس تمنا کو پورا کر دے۔

بہر حال مولانا کی طبیعت نہ درست ہو سکی اور نہ سات ہزار روپے جمع ہو سکے اور نہ تعلیمی مرکز قائم ہو سکا۔ یہاں تک کہ کچھ دن بعد مولانا سندھی رحمت حق سے جا ملے۔[1]

پیر حسام الدین راشدی نے اس آٹھویں باب کو ختم کرتے ہوئے لکھا کہ:

> مولانا سندھی جلاوطنی کی مدت پوری کر کے سندھ اس وقت پہنچے، جب ذہنی طور پر بالکل ختم ہو چکے تھے۔ ساری قوتیں کمزور ہو چکی تھیں۔ وہ تمام کام بیک وقت پورا کرنا چاہتے تھے جو ناممکن ہے۔[2]

انیسویں بیسویں صدی عیسوی میں سندھ کے معاشرتی طبقے:

---

[1] یہ تمام تفصیل جناب سید حسام الدین راشدی کی تالیف "هو ڏوٺي هو ڏينهن" کے صفحہ ۳۴۲ تا ۳۶۳ سے جستہ جستہ ماخوذ ہے۔

[1] یہ تمام تفصیل "هو ڏوٺي هو ڏينهن" کے باب ۸، ص ۳۶۷ تا ۳۷۳ سے ماخوذ ہیں۔

[2] ایضاً، ص ۳۷۳۔

گزشتہ اوراق میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ انگریزوں کے عہد میں علوم دینیہ سے ناواقفیت نے کس درجہ سندھ کے مسلمان کو اوہام پرستی، قبر پرستی اور ریاکار پیروں کے چنگل میں گرفتار کر دیا تھا۔

اب سندھ کی معاشرت کا بھی تھوڑا سا حال سنتے چلیے کہ سندھ کی معاشرتی زندگی میں کوئی توازن نہ تھا۔ سندھ کی سماجی حالت اس درجہ تباہ تھی کہ ہر شخص امتیاز ما و تو میں گرفتار تھا۔ زندگی کی ساری لذتیں اونچے طبقے کے لوگوں کے لیے مخصوص تھیں۔ سندھ کے غریب عوام مصائب کی چکی میں پس رہے تھے خصوصاً غریب مسلمان جانوروں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔

سندھ کے ہندو:

سندھ کا سب سے بااثر طبقہ ہندوؤں کا تھا جن کے قبضے میں تمام اقتصادیات کی شہ رگ تھی۔ سندھ کے غریب مسلمان سر سے لے کر پاؤں تک ان کے پاس گروی تھے۔ سندھ کے غریب کسان کی گاڑھے پسینے کی سب کمائی، ان ہندو بنیوں کے گھر میں آتی تھی، ہر قسم کی تجارت ان کے قبضے میں تھی۔ تمام تعلیمی اداروں اور ملازمتوں پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ وہ نہ صرف سندھ کے حقیقی مالک بنے ہوئے تھے بلکہ سندھ کی ساری مخلوق انکے رحم و کرم پر تھی، جس پر انہوں نے کبھی بھولے سے رحم و کرم نہ کیا تھا۔ یہ مسلمانان سندھ کی معیشت کے لیے وہ جونک تھے جو ان کے خون کے آخری قطرے کی کمائی کو بھی چوس لینا چاہتے تھے۔ ان کی بدولت سندھ کا مسلمان مفلس و قلاش ہو چکا تھا۔

سندھ کے مسلمان زمیندار اور جاگیر دار:

دوسرا طبقہ جو سندھ کے غریب مسلمانوں کی معیشت کو دیمک کی طرح کھائے جا رہا تھا اور جو غریبوں کے جسم کا مالک و مختار ہوا ہوا تھا، وہ وڈیرا تھا۔ سندھ کے غریب ان کے غلام تھے۔ عزت و آبرو، ننگ و نام، آزادی اور تکلیف غرض کہ سب پر وڈیروں کا قبضہ تھا۔ مصنوعی مرشدوں کے بعد یہ طبقہ ظلم و ستم میں سب سے زیادہ طاقتور تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سندھ کے عوام برائے نام انگریز کے ماتحت تھے۔ دراصل وہ سب کے سب وڈیروں کے محکوم تھے۔ کسی گاؤں کا وڈیرا اگر گاؤں والوں سے ناراض ہے تو نہ ان کی زمین میں بوائی ہو سکتی تھی، نہ کٹائی۔ کسی کو قتل کرا دینا ان کے لیے ایک کھیل تھا۔

تیسرا طبقہ انتظامیہ کا تھا۔ جس میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے۔ یہ حکومت کے سامنے وڈیروں اور بیوپاریوں کی دست درازیوں کے لیے جواب دہ تھا۔ لیکن در حقیقت ان کے جرائم کا پشتیبان تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور طبقہ تھا۔ جس کو اہل سندھ 'شاہد' کہتے تھے۔ شاہد پولیس کے ساتھ ہمیشہ رہتے تھے جو تمام کیسوں اور مقدمات میں پولیس یا زمیندار کی طرف سے گواہی دیتے تھے۔ شاہدوں کا گزر بسر جھوٹی شہادتوں پر ہوتا تھا اور پولیس ان کی آؤ بھگت کرتی تھی۔

اس کے ماسوا پولیس کے مشیر ہوتے تھے۔ یہ جھوٹے گواہوں کے ساتھ پولیس کے ساتھ رہتے تھے اور مشیر نامے پر جس کو پولیس بناتی تھی، دستخط کرتے تھے جو پولیس کے جھوٹے کیس کو عدالت میں سچا کرنے میں مدد و معاون ہوتے تھے۔ مشیر عموماً چالاک اور شر پسند ہوتے تھے۔

کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو پولیس کے کیسوں میں رشوت کے لینے دینے میں مدد کرتے تھے یہ مختلف طبقوں سے ہوتے تھے۔ وڈیروں اور زمینداروں کے کام دار، اس طبقے کا کوئی آدمی بھی کام دھندا نہ کرتا تھا۔ بلکہ ان کی گزر بسر اسی بٹ ماری پر ہوتی تھی۔ پولیس کو جب رشوت کی ضرورت پڑتی تو یہ لوگوں کے خلاف جھوٹی درخواستیں اور عرضیاں دلواتے اور پولیس کو ان بے گناہ انسانوں سے رشوت دلواتے، اور رشوت لینے کے بعد یہ عرضیاں داخل دفتر ہو جاتی تھیں۔

انگریزوں کے عہد میں سندھ کی پولیس اس لیے نہ تھی کہ وہ عوام کی محافظ ہو اور صوبے میں امن و امان پیدا کرے بلکہ اس کا کام آزار، ظلم، تشدد، استبداد، جھوٹ اور رشوت ستانی تھا۔[1]

سید حسام الدین راشدی نے عہد انگریز میں سندھ کے پولیس کے ان دردناک عذابوں کی جو دردناک فہرست اپنی تصنیف "هو ڏوٺي هو ڏينهن" کے صفحات ۳۸۱ تا ۳۸۳ میں دی ہے، اس کے پڑھتے ہی انسان کا رواں کھڑا ہو جاتا ہے۔ انگریز حکومت مسلمانوں کو جن کی اکثریت تھی، جہالت، افلاس، اوہام پرستی، کاہلی اور سستی کا خوگر بنا کر ایک پلڑے میں رکھنا چاہتی تھی اور سندھ کی ہندو اقلیت کو دولت اور علم سے آراستہ کر کے دوسرے پلڑے میں رکھنا چاہتی تھی۔ یہ ایک ایسا ظلم تھا، جس نے سندھ کے مسلمان کا ذاتی اور ملی کردار مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔

یہاں تک کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی نورانی صبح طلوع ہوئی، قائد اعظم نے انگریزوں کی بساط سلطنت الٹ کر کرہ ارض پر ایک نئے ملک پاکستان کو وجود عطا کیا اور سندھ نے بھی پاکستان کے دوسرے صوبوں کی طرح انگریزی حکومت کے عذاب سے جو ان پر ۱۰۴ سال سے مسلط تھا، نجات پائی۔ الحمد للہ رب العالمین!

---

[1] یہ تمام تفصیل "هو ڏوٺي هو ڏينهن" (راشدی) باب ۸ سے ماخوذ ہے۔

ISBN: 978-969-9866-12-8

Digitized By M. H. Panhwar Institute Of Sindh Studies, Jamshoro.